محدثِ کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ

کی مفصل سوانح حیات

حیاتِ ابو المآثر

جلد اول

از

ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی

باہتمام

حضرت مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی



مدیر

المجمع العلمی

مرکز تحقیقات و خدماتِ علمیہ

پوسٹ بکس نمبر ۱، مئو ۲۷۵۱۰۱ (الہند)

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کی مفصل سوانح حیات

حیاتِ ابوالمآثر

جلد اول

از: ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی

باہتمام

حضرت مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی

ناشر

المجمع العلمی

مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ

پوسٹ بکس نمبر ۱، مئو ۲۷۵۱۰۱ (الہند)

فہرست مضامین

دوسرا باب

تیسرا باب

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹاں باب

ساتواں باب

آٹھواں باب

نواں باب

دسواں باب

فہرست مضامین

علامہ اعظمی فتنوں کے تعاقب میں ۸۰

مخطوطات ومسودات کی چند عکسی تصاویر ۸۹

دفاع حنفیت ۱۰۵

اردو تراجم ۵۱۱

دیباچہ طبع دوم

الحمدللہ و کفی، و سلام عبادہ الذین اصطفی،

اس کتاب کا پہلا اڈیشن عرصہ ہوا ختم ہو چکا تھا، علم دوست حضرات کی طرف سے اس کی طلب بھی برابر کی جارہی تھی، اور دوسرے اڈیشن کے لئے مسلسل تقاضا ہو رہا تھا۔ راقم کا خیال تھا کہ دوسری اشاعت میں کچھ ضروری اضافہ ہو جاتا تو کتاب کی افادیت کچھ اور بڑھ جاتی، لیکن اس کے لیے فرصت درکار تھی جو اس خاکسار کو میسر نہیں تھی، جس کی وجہ سے اس کا معاملہ امروز وفردا پہ ٹلتا رہا۔ اسی اثناء میں خداوند کریم کے فضل و کرم سے اس کتاب کی دوسری جلد بھی طبع ہو کر منظر عام پر آ گئی، جلد ثانی کی طباعت واشاعت کو تقریباً آٹھ مہینے کی مدت گزر چکی ہے۔ دوسری جلد کی اشاعت کے بعد اس پہلی جلد کا مطالبہ بھی پہلے کی بہ نسبت دو چند ہو گیا، اور جن قارئین کے ہاتھوں میں دوسری جلد پہنچی، اور پہلی جلد ان کی نگاہ سے نہیں گزری تھی، ان کی طرف سے جلد اول کا شدید اصرار ہونے لگا، ارباب ذوق وشوق کے اس اصرار اور تقاضے کے پیش نظر اس کی طبع ثانی ضروری اور ناگزیر محسوس کی جانے لگی، جن اضافوں کا خیال تھا، ان کے لیے تو اپنی عدیم الفرصتی مانع بنتی رہی، لیکن یہ ضروری معلوم ہوا کہ پہلے اڈیشن میں کتابت وطباعت یا دوسری نوع کی جو غلطیاں رہ گئی تھیں، کم از کم ان کی تصحیح واصلاح کا کام کیا جا سکے، چنانچہ پوری کتاب پر ایک غائر نظر ڈال کر تصحیح اغلاط کی گئی، چند مقامات پر ضروری حک واضافہ بھی کیا گیا۔ کچھ ضروری حواشی بھی بڑھائے گئے۔ اس طرح دوسرا اڈیشن پریس کے حوالے کرنے کے لیے تیار کیا گیا۔

طبع اول کی طرح طبع ثانی کے لیے بھی اہل علم ونظر کے شکریے کے سب سے زیادہ مستحق ہمارے مخدوم بزرگ، سرپرست ادارہ جگر گوشۂ محدث کبیرؒ، حضرت مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی دامت برکاتہم ہیں، جن کی غیر معمولی عنایت وتوجہ کی برکت سے یہ کتاب دوبارہ طبع ہو کر منظر عام پر آرہی ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ پہلے طبع کی طرح، دوسرے طبع کو بھی شرف قبول عطا فرمائے، آمین۔

وما توفیقی إلا باللہ.

مسعود احمد اعظمی

یکم ذیقعدہ ۱۴۳۲ھ = ۳۰ر ستمبر ۲۰۱۱ء

دیباچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ و کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ وبعد!

پیش نظر کتاب ایک ایسی شخصیت کے نقوش حیات ہیں، جس کی بلند قامتی کے سامنے کوہ ہمالہ کی بلندی بھی پست نظر آتی ہے، یہ اس ذات ستودہ صفات کی کتاب زندگی کے کچھ صفحات ہیں، جس کی رفعت وعظمت کا سراغ لگانے کیلئے جب لوگوں کی نگاہیں اٹھتی تھیں تو تھک کر واپس لوٹ جاتی تھیں، ان اوراق کے اندر اس مرد حق آگاہ کی زندگی کے بکھرے ہوئے واقعات کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس نے ایک چھپر میں وہ کر عرصہ دراز تک قلمروئے علمی پر حکمرانی کی جس نے عمر تمام ترایک گمنام اور دور افتادہ بستی میں گذاری، لیکن اس کے نام کا سکہ مصر وشام کے بازار علم وادب میں چلتا رہا، اس کے علم وفضل اور کمال وعظمت کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کی نشو ونما بیسویں صدی عیسوی کے ہندوستان کے کسی دور افتادہ قصبے میں نہ ہوئی ہو، بلکہ وہ دوسری اور تیسری صدی ہجری کے کوفہ و بصرہ و بغداد اور سمرقند و بخارا میں پروان چڑھا ہو۔ ایسے باکمال کے سوانح تو وہ لوگ لکھ سکتے ہیں، جو علم و بصیرت والے ہیں، مطالعہ و مشاہدہ کی قوت رکھتے ہیں، جو چھان پھٹک اور جانچ پرکھ کی صلاحیت رکھتے ہیں، یہ کسی بے بضاعت طالب علم کے بس کی بات نہیں، آپ کے سامنے جو یہ چند صفحات ہیں ان کی حیثیت "جہد المقل" سے زیادہ نہیں!!!

محدث کبیر، محقق جلیل حضرۃ العلامہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کی شخصیت اس قدر متنوع اور مختلف الجہات تھی کہ ان کو اپنے وقت کے ایک بڑے عالم و مؤرخ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ہندوستان کے دوائر علم میں شمار کیا تھا۔ علامہ اعظمیؒ نے جس عہد میں آنکھ کھولی تھی، اس وقت پورے ہندوستان میں باطل فرقے، دیوبندیت

وحنفیت اور مسلک حق کے خلاف محاذ بنائے اور پر اجمائے ہوئے تھے، خود آپ کا قصبہ مئو رفتہ رفتہ ان فرقوں کی جد وجہد کا مرکز اور ان کی تگ ودو کا عرصہ گاہ بنتا جارہا تھا، مختلف فرقے اپنی اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے یہاں سرگرم عمل تھے، علامہ اعظمی نے اپنی علمی زندگی کے آغاز میں اس محاذ پر کمان سنبھالی، مخالفین سے مباحثے اور علمی معرکے کئے، ان کے خلاف قلمی وکلامی جنگیں لڑیں، تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ ان کا بھرپور رد کیا مناظروں کی ضرورت پیش آئی تو مناظروں میں حصہ لیا، اس دور میں دیوبندیت وحنفیت کی حمایت میں شائع ہونے والے اہم مجلات ورسائل میں آپ کے بیشمار مضامین شائع ہوئے، چنانچہ النجم اور الفرقان کے علاوہ العدل (گوجرانوالہ) ضیاء الاسلام اور القاسم (امرتسر) وغیرہ کے صفحات آپ کے مضامین سے مزین رہا کرتے تھے، یہ آپ کا عہد شباب تھا اور جوانی کے اس دور میں بھی آپ کے علم وفضل کا جادو اس طرح سر چڑھ کر بولتا تھا، کہ مخالفین کے بڑے بڑے ارباب دستار اور اصحاب وجاہت کے ناطقے محض آپ کے نام سے سربہ گریبان رہا کرتے تھے، یہ دور درس وتدریس، تصنیف وتالیف، تقریر وخطابت، بحث ومباحثہ، سوال وجواب، شعر وشاعری، معرکہ آرائی ہر طرح کی سرگرمیوں سے عبارت تھا۔

پھر ایک دور وہ آیا جب اس ہنگامہ خیز زندگی کو تیاگ کر خلوت گزینی کی زندگی اختیار کی، اور گوشۂ عافیت میں پناہ لے کر اپنے شہباز ہمت کا رخ علم وفن کے ایک دوسرے افق کی طرف موڑا، اب آپ کی توجہ کا مرکز حدیث وسنت کے وہ مخطوطات ونوادرات بنے جن کو ایک نظر دیکھنے کیلئے اہل علم کی نگاہیں ترستی رہتی تھیں، جو تدوین حدیث کے دور میں عالم وجود میں آئے تھے، پھر بتدریج اہل علم کی دسترس سے دور ہوتے چلے گئے، اور ان کی رسائی سے باہر ہونے کی وجہ سے وہ ناپید ہونے کے حکم میں تھے، علامہ اعظمی نے متعدد بیش قیمت مخطوطات کو، جن کے وجود سے بڑے بڑے باخبر علماء بے خبر تھے، گوشۂ گمنامی سے باہر نکال کر ان پر سالہاسال کی محنت صرف کر کے، ان کے لئے اپنا خون جگر جلا کر، اور

ان کو اپنے عالمانہ و محققانہ تعلیقات و حواشی سے سجا سنوار کر جب دنیائے علم کے سامنے پیش کیا تو لوگوں کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں، اور اطراف واکناف عالم سے تحسین و آفریں کی صدائیں بلند ہونے لگیں، حدیث کے مخطوطات پر آپ کی یکے بعد دیگرے تحقیقات نے جریدۂ "علم" پر آپ کے نام کو دوام بخش دیا۔

ایسی عظیم اور عبقری شخصیت کی سوانح عمری لکھنا کوئی آسان کام نہیں، اس کے لئے کسی ایسے اہل علم اور صاحب قلم کی ضرورت ہے، جس کا حافظہ قوی، مطالعہ وسیع و عمیق اور قلم رواں دواں ہو، جس نے ان کے مختلف ادوار حیات کو قریب سے دیکھا اور ان کی کتاب زندگی کو اچھی طرح پڑھا اور اس کا مطالعہ کیا ہو، لیکن افسوس کہ ان میں سے اکثر حضرات اس دنیا سے گذر کر مغفور لھم ہو چکے ہیں، اور جو گنے چنے لوگ بقید حیات ہیں اور اس کام کو کرنے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں ان کی حد سے بڑھی ہوئی مصروفیات اس کیلئے ان کو فرصت نکالنے کی اجازت نہیں دیتیں، یہ عاجز و ناکارہ ان تمام باتوں سے تہی مایہ تو ہے ہی، اس پر ستم یہ کہ اس نے اس آفتاب علم کو اس وقت دیکھا تھا، جب وہ غروب کے قریب تھا، اور ان کی گذشتہ زندگی سے اس کی واقفیت نہ ہونے کے درجہ میں تھی۔ لہذا یہ جو کچھ آپ کے سامنے ہے وہ "رحمٰن" کا کرم اور اس کے "حبیب" کی کرامت ہے۔

آج سے تقریباً ایک سال قبل جب اس کتاب کی ترتیب کا آغاز کیا گیا، تو سب سے اہم مسئلہ جو راقم الحروف کے سامنے تھا، وہ ان کی ان تحریروں کی تلاش و جستجو تھا جو شکستہ تسبیح کے دانوں کی طرح جہاں تہاں بکھری ہوئی تھیں، اگرچہ حضرۃ الاستاذ علیہ الرحمۃ نے اپنی حیات سے متعلق بعض بعض مواقع پر دو چار صفحات قلمبند فرمائے تھے، چنانچہ مولانا عبداللطیف صاحب نعمانیؒ کے وصال کے بعد "تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی" کیلئے جو مضمون سپرد قلم کیا تھا، اس میں صاحب تذکرہ کے ساتھ نہایت اختصار کے ساتھ اپنی زندگی کی سرگذشت تحریر فرمائی تھی، اسی طرح بعض عرب فضلاء و ناشرین کی طلب پر اپنی طالب علمی اور تدریسی زندگی اور تصنیفات و تحقیقات کے متعلق کچھ موٹی موٹی باتیں لکھ

کر روانہ کی تھیں۔ آپ کی وفات کے بعد مجلہ ترجمان الاسلام بنارس کا "مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی" نمبر شائع ہوا، اس خصوصی اشاعت میں نہایت بیش قیمت اور معلومات افزا مضامین شائع ہوئے، مگر ساتھ ہی واقعہ یہ ہے کہ مضمون نگار حضرات کے فکر و قلم کی بازی گاہ زیادہ تر آپ کے علمی کارنامے تھے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی علمی زندگی ہی لوگوں کے سامنے تھی، ذاتی اور نجی زندگی سے لوگوں کی واقفیت بہت اجمالی تھی، اور یہی وجہ ہے کہ ان تمام مضامین کے جمع و ترتیب کے بعد بھی ذاتی زندگی کا جو خاکہ بنتا تھا وہ بڑا مبہم اور غیر واضح تھا۔ آپ کے بارے میں بالتفصیل کچھ لکھنے سے پیشتر کسی چیز کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، تو وہ تحریریں تھیں جو نہ یکجا تھیں نہ مربوط و مرتب، علامہ اعظمیؒ کی عادت یہ تھی کہ کبھی کسی بات کے لکھنے کا ارادہ فرماتے، تو سامنے جو کاغذ نظر آتا اسی پر نوٹ کر دیتے، یہاں تک کہ خط کے لفافے اور پوسٹ کارڈ وغیرہ کی خالی جگہوں کو بھی تصرف میں لایا کرتے تھے، لکھنے کے بعد حفاظت کا کوئی خاص اہتمام نہیں تھا، وہ کاغذ پڑا ہے تو پڑا ہے ورنہ دستبرد زمانہ کا شکار بھی ہو سکتا ہے، اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کے ہاتھ کی تمام تحریریں محفوظ ہوں گی، لیکن جو باقیماندہ ہیں وہ لعل و گہر کی حیثیت رکھتی ہیں، اور وہ ان صفحات کے طول و عرض میں اس طرح جا بجا بکھری ہوئی ہیں کہ قارئین کو یہ ایک خود نوشت سوانح معلوم ہو گی، اور ناظرین صاف طور پر یہ محسوس کریں گے کہ اس عاجز نے صرف اس میں ربط قائم کیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے کبھی فرمایا تھا، کہ میری سوانح عمری میرے خطوط سے لکھی جا سکتی ہے، اس لئے راقم الحروف کو ان خطوط کی بھی خاص طور پر تلاش ہوئی جن سے آپ کے واقعات زندگی پر روشنی پڑتی ہے، چنانچہ انبار سے نکل کر ایسے بہت سے خطوط سامنے آتے رہے، جو اس کتاب کے اہم ترین مواد بنے، آپ کی بات اس طرح حرف بحرف صادق آئے گی، اس سے پہلے اس کا گمان بھی نہ تھا لو اقسم علی الله لأبرّہ کتابوں میں پڑھا تھا، آج حقیقت بن کر سامنے آ گئی۔ قسمت بھی یاوری کر رہی تھی اور تقدیر اس فرمایہ کی مدد

کرنے پر تلی ہوئی تھی، حسن اتفاق یہ ہوا کہ اس کام کو شروع کرنے کے کچھ ہی دنوں بعد مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی کی کتاب "مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے" چھپ کر سامنے آئی، اس میں علامہ اعظمی کے مکاتیب کا خاصہ ذخیرہ موجود تھا، اور بہت سی کار آمد باتیں ہمیں اس کتاب میں شائع خطوط میں ملیں۔

اس کی ترتیب اور اس کے مواد کی فراہمی میں بہت سے حضرات کا اس ناچیز کو تعاون حاصل رہا ہے، جن کا شکریہ ادا کرنے سے راقم الحروف قاصر ہے، صاحبزادگان محترم حضرت مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی زید مجدھم اور جناب الحاج سعید احمد صاحب الاعظمی مدظلہ کا بطور خاص ممنون و مشکور ہوں، کہ ان دونوں حضرات بالخصوص اول الذکر کی مسلسل توجہ و عنایت اور ہمت افزائی کی بدولت یہ کتاب پایۂ تکمیل تک پہنچی۔ ان کے علاوہ جناب ڈاکٹر عبدالمعید صاحب اور جناب انوار الحق صاحب محشر بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ موقع بموقع مواد فراہم کر کے ناچیز کی اعانت فرماتے رہے، دوسرے بزرگوں میں مولانا نظام الدین اسیر صاحب ادروی استاذ جامعہ اسلامیہ بنارس و مدیر مجلّہ "ترجمان الاسلام" اور مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی دامت برکاتھم مدیر تحریر مجلّہ "المآثر" نے دیرینہ اور بزرگانہ شفقت سے کام لے کر اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود تقریباً پوری کتاب پر نظر ثانی فرمائی، جس کی وجہ سے یہ حقیر کاوش اس قابل ہوئی کہ اہل نظر کے سامنے پیش کی جاسکے، مولانا اسیر صاحب نے احقر کی درخواست پر بیش قیمت پیش لفظ تحریر فرما کر اسکی افادیت میں اضافہ فرمایا، اور اپنے ان اساتذہ یا مثل اساتذہ کے احسان و کرم کا شکریہ ادا کرنے کیلئے تو میرے پاس الفاظ ہی نہیں جنھوں نے اپنے تاثرات تحریر فرما کر اس کو سند اعتبار بخشی۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کے سائے کو دراز اور ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور دین متین کی خدمت کی ان کو بیش از بیش توفیق عنایت فرمائے۔ آمین، وما توفیقی الا باللہ۔

مسعود احمد الاعظمی
۲۹ ستمبر ۱۹۹۹ء

تقاریظ و تاثرات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

الحمد للہ وحدہ والصلاۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ

احقر کو یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ امیر الہند اول محدث کبیر علامہ جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کے حالات زندگی، اور ان کی علمی و تحقیقی خدمات کا مفصل تذکرہ حضرت کے نواسے عزیزم مولوی مسعود احمد صاحب سلمہٗ نے نہایت کاوش اور تحقیق کیساتھ بہت اچھے انداز میں مرتب کیا ہے، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس صدی میں حضرت امیر الہند قدس سرہ اہل علم کی صفوں میں اور علم و تحقیق کے میدان میں بالخصوص فن حدیث اور اس کے متعلقات میں جس درجہ اہمیت کے حامل تھے، اسے سب جانتے ہیں، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ حضرت والا کے خاص قدر دانوں میں تھے، ان کی خدمات کا دائرہ اس صدی کے تین چوتھائی حصہ پر محیط ہے، ان کی بارگاہ علم میں عرب و عجم نے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ اور اخیر دور میں شدید ضعف اور بڑھاپے کے باوجود، نہایت نازک حالات میں ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی سربراہی جس طرح آپ نے فرمائی ہے وہ ایک یادگار اور قابل فخر کارنامہ ہے۔ حضرت کی وفات کے بعد علم و دین اور ملک و ملت کے وسیع دائرہ خدمت میں بہت زیادہ خلا ہوا ہے۔

یہ ہم سب پر قرض تھا کہ حضرت کے حالات و سوانح کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا بہت زیادہ قابل مبارکباد ہیں برادر محترم مولانا رشید احمد صاحب، خلف اکبر حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ کہ انھوں نے اس پر توجہ کی، اور اپنی نگرانی میں یہ بیش قیمت دستاویز مرتب

کروائی اور اس کی اشاعت کا انتظام و انصرام کیا، اور بہت ہی سعادت و خوش بختی ہے عزیزم مولوی مسعود احمد سلمہ کی کہ انھوں نے اپنے عظیم المرتبت نانا کے احوال و وقائع مرتب کیے۔

اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل و کرم سے قبول فرمائے، اور تمام ملت اسلامیہ کیلئے نافع اور رہنما بنائے۔ آمین، فقط

اسعد غفرلہ

(جامع) مسجد رشید، دار العلوم دیوبند

۲۳؍ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ

☆☆☆☆☆

حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب معروفی دامت برکاتھم
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ وصحبہ أجمعین

اس ملک میں ہر دور میں نامور علماء ومشائخ پیدا ہوئے اور انھوں نے نمایاں علمی، دینی اور تعلیمی خدمات انجام دیں، ان ہی علماء کرام میں ہمارے ممدوح امیر الہند، محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی قدس سرہ بھی ہیں، جو اپنی علمی خدمات کی وجہ سے پورے ملک میں جانے پہچانے جاتے ہیں، عوام اور خواص نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ آپؒ کا نام لیتے ہیں، علمی دنیا میں آپ کی شہرت و مقبولیت ہے، عجم سے لیکر عرب تک آپ کی علمی خدمات بالخصوص علم حدیث سے آپؒ کے شغف کا چرچا ہے، آپ سے استفادہ کرنے اور سند حدیث لینے کیلئے ملک اور بیرون ملک سے علماء آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، آپ بہت خوش دلی سے ان کا استقبال کرتے اور بڑے شوق سے ان کی مہمان نوازی فرماتے اور حدیث کی سند عطا فرماتے تھے۔

حضرت مولانا فراغت کے بعد برابر درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، اور دورۂ حدیث کے ساتھ دیگر علوم وفنون کی بڑی بڑی کتابیں پڑھاتے رہے، اللہ تعالیٰ نے ہر فن میں کمال عطا فرمایا تھا، علم اسماء الرجال میں امتیاز خاص حاصل تھا، اس فن میں آپ کو جو امتیازی شان حاصل تھی اس میں کوئی آپ کا ثانی نہیں تھا، راویوں کے نام میں صحت تلفظ کا بڑا اہتمام تھا، حضرت مولانا کی زبان سے جو نام جس طرح نکلتا تھا، کتابوں میں تحقیق کے بعد وہی صحیح ثابت ہوتا تھا۔

حدیث کی جو کتابیں چھپی ہوئی ملتی ہیں، اہل علم کے سامنے وہی ہوتی تھیں، حضرت مولانا کی عقابی نگاہیں ان سے بہت آگے رہا کرتی تھیں، حدیث کے قلمی ذخیرہ

پر آپ کی بڑی گہری نظر تھی اور آپ کی دلی خواہش تھی کہ وہ تمام ذخیرہ منظر عام پر آجائے، فرماتے تھے کہ احادیث کا قلمی ذخیرہ اگر چھپ جائے تو مستشرقین کے اعتراضات کا عملی جواب ہو جائے گا، اور گمراہ کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ختم ہو جائے گا، اسی طرح غیر مقلدین کے اعتراضات بھی باقی نہیں رہیں گے، اس لئے کہ اس ذخیرہ میں فتاویٰ صحابہؓ کرامؓ اور اقوال تابعینؒ کا بڑا حصہ موجود ہے، اور ساتھ ہی ساتھ علماء کرام کے سامنے بھی وہ ساری احادیث آجائیں گی جو مطبوعہ کتابوں میں نہیں ہیں۔

چنانچہ آپؒ اخیر عمر میں درس و تدریس کا کام کم کر کے قلمی کتابوں کی اشاعت کے کام میں پوری توجہ سے منہمک ہو گئے، اور اس بیش قیمت ذخیرہ کو پردۂ گمنامی سے باہر نکالنے کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، عالم اسلام کے مختلف کتب خانوں میں ان کتابوں کے جو قلمی نسخے تھے ان کی نقلیں منگوائیں، اور ان کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کر کے ان کے نصوص کی تصحیح کی اور جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی اس پر تعلیق و تحشیہ کی زحمت برداشت کی، کتابوں کے شروع میں ان پر عالمانہ و فاضلانہ مقدمے لکھے اور جس طرح بن پڑا ان کتابوں کو چھپوایا۔ مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند حمیدی، سنن سعید بن منصور، کتاب الزہد والرقائق اور حدیث کی دوسری دسیوں کتابیں آپ کی توجہ سے چھپ کر عام ہوئیں، اور علمی دنیا نے دیکھا کہ کتنا عظیم ذخیرۂ حدیث تھا جو ہماری دسترس سے باہر تھا، حضرت مولانا اعظمیؒ کا احسان عظیم ہے کہ ان قیمتی ذخائر کا پتہ لگایا، اور اپنے تعلیقات و حواشی کے ساتھ چھپوایا، اس خدمت حدیث پر موافق و مخالف سارے اہل علم نے آپؒ کو مبارکباد دی اور آپؒ کی خدمات کو خوب سراہا۔

حضرتؒ مولانا کا مطالعہ نہایت وسیع و عمیق تھا، اور کثرت مطالعہ کی وجہ سے حدیث کے سلسلے میں ذوق ایسا پختہ ہو گیا تھا کہ حضرت مولانا ایوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظم مدرسہ مفتاح العلوم فرماتے تھے کہ حضرت الاستاذ شاہ انور صاحب رحمۃ اللہ علیہ اگر کسی حدیث کے سلسلہ میں کوئی جملہ فرما دیتے تھے تو اس حدیث کے بارے میں تلاش و جستجو کے بعد اسی طرح کی بات ضرور ملتی تھی، یہی حال حضرت مولانا کا ہے۔

حضرت مولانا کا حافظہ پرانے زمانے کے محدثین جیسا تھا، جو چیز ایک دفعہ نظر سے گذر جاتی وہ محفوظ رہتی تھی، آپؒ اپنے زمانے کے امام ذہبیؒ اور ابن حجرؒ تھے۔ جن لوگوں نے مولانا کے ساتھ کچھ دن گذارے ہیں وہ جانتے ہیں کہ آپ کا حافظہ کس غضب کا تھا اور کس قدر پختہ اور صحیح یادداشت تھی، اخیر عمر میں جب صحت نے تقریباً جواب دے دیا تھا، اس وقت بھی جب ہدایہ اخیرین اور مشکوٰۃ وغیرہ پڑھاتے تو کتابیں سامنے نہیں رکھتے تھے، مگر کیا مجال ہے کوئی طالب علم کوئی جملہ یا سطر ترک کردے اور مولانا نہ ٹوکیں، فوراً فرماتے تھے صحیح عبارت اس طرح ہے۔

حضرت مولانا کی جیسی نظر حدیث اور درسیات پر تھی، یہی حال عربی ادب کا تھا، اس پر بھی بڑی عمیق نظر تھی، چنانچہ جس طرح احمد محمد شاکرؒ کی مسند احمد کی شرح پر آپ نے لکھا اور انھوں نے آپؒ کے علم و فضل اور کمال کا اعتراف کیا، اسی طرح ان کے بھائی محمود محمد شاکر نے "کتاب نسب قریش" کی جب تحقیق کی، تو ان کی غلطیوں پر آپؒ نے گرفت فرمائی اور جو کمی تھی اس کو ظاہر کیا۔

عبداللہ چکڑالوی نے جب انکار حدیث کا فتنہ پیدا کیا، اور اس کے برگ و بار مقالات و رسائل کی شکل میں ظاہر ہوئے، تو اس وقت کچھ لوگوں نے حضرت مولانا کو اس طرف توجہ دلائی، مولانا نے بروقت "نصرۃ الحدیث" کے نام سے اس کا رد لکھا اور اسے شائع کیا، حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کی خدمت میں جب یہ کتاب پہنچی تو آپؒ نے اس کا مطالعہ فرمایا اور حضرت مولانا کو مبارکباد دی اور دلی خوشی کا اظہار فرمایا۔

مختصر! یہ کہ حضرت مولانا نے پوری اکیڈمی کا کام تنہا انجام دیا، جس کی تفصیل اس کتاب میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے، مجھے توقع ہے کہ حضرت والا کے یہ سوانح حیات بعد والوں کے لئے شمع راہ ثابت ہوں گے اور اندازہ ہوگا کہ پہلے علماء کرام کتنی محنت کیا کرتے تھے اور اپنے بعد والوں کیلئے کیا کیا کام کر گئے۔

اخیر میں اس "حیات ابوالمآثر" لکھنے اور لکھوانے والے اور شائع کرنے والے کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، یہ بہت عظیم خدمت ہے جو انجام پذیر ہوئی۔

العارض نعمت اللہ غفرلہ

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی رحمۃ اللہ علیہ
مفتی دار العلوم دیوبند

الحمد لله و كفى وسلام على عباده الذين اصطفىٰ

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس بر صغیر میں بڑے بڑے جید الاستعداد علماء کرام پیدا ہوئے، اور انہوں نے اپنی زندگی میں علمی، دینی اور تعلیمی خدمات انجام دیں۔

ان ہی ممتاز و مخصوص علماء کرام میں محدث کبیر، امیر الہند حضرت الاستاذ العلام مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ بھی تھے، جن کی پوری زندگی درس و تدریس، تصنیف و تالیف، اور خدمت حدیث و تفسیر و فقہ میں گذری، ہزاروں علماء آپ کی تعلیم و تربیت سے فیض یاب ہوئے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم و عمل سے نوازا تھا، اور آپ کی ذات "دائرۃ المعارف" کی حیثیت رکھتی تھی۔

علم حدیث اور فن اسماء الرجال سے خاص شغف تھا، پوری دنیائے اسلام میں خادم حدیث کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے، اور عرب و عجم میں جو علماء کرام حدیث سے ذوق رکھتے تھے وہ دور دراز سے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے آپ کی خدمت میں مئو حاضر ہوتے اور آپ سے حدیث کی اجازت و سند حاصل کرتے، اور بہت سے غیر ملکی علماء بذریعہ خط و کتابت اس شرف کو حاصل کرنے کی سعی فرماتے اور کامیاب ہوتے تھے۔

حضرت الاستاذ کی قلمی کتابوں پر بڑی گہری نظر تھی، آپ نے بہت سی کتب حدیث کا قلمی نسخہ مختلف کتب خانوں سے حاصل کیا جو گوشہ گمنامی میں پڑی تھیں، ان پر محنت کی اور اپنی تحقیق و تعلیق سے مزین فرمایا، پھر ان کو مختلف جگہوں سے شائع کرایا، جن کو دیکھ کر اور مطالعہ کر کے جلیل القدر علماء کرام کے دلوں سے آپ کے لئے دعائیں نکلیں اور آپ کو دیکھنے کا انھیں شوق پیدا ہوا، چنانچہ بہت سے علماء آئے اور مولانا سے ملے اور گفتگو کی۔

حدیث کی جو کتابیں آپ کی تحقیق و تعلیق اور تحشیہ کے ساتھ شائع ہوئیں، وہ کئی کئی ضخیم جلدوں میں ہیں، مصنف عبد الرزاق گیارہ جلدوں میں، مصنف ابن ابی شیبہ پندرہ جلدوں میں، المطالب العالیہ چار ضخیم جلدوں میں، مسند حمیدی دو جلدوں میں سوچیے! تنہا ایک شخص نے ان تمام کتابوں کی تمام جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا، پھر مقابلہ کیا، پھر تعلیق و تحقیق کی زحمت برداشت کی، اور ساتھ ہی ہر ایک پر مقدمہ لکھا، جو محنت ایک اکیڈمی کے بس کی نہیں تھی، حضرت الاستاذؒ نے تن تنہا وہ خدمت انجام دی، آپ نے کس قدر محنت مشقت برداشت کی ہوگی، اور دن رات لگ کر کام کیا ہوگا، اس کا اندازہ بھی مشکل ہے۔

ان کے علاوہ دسیوں دوسری کتابیں بھی آپ کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ شائع ہوئیں، جیسے "سنن سعید بن منصور" "کتاب الزہد والرقائق" وغیرہما، اللہ تعالیٰ نے غضب کا حافظہ عطا کر رکھا تھا، ہزاروں حدیثیں نوک زبان پر تھیں، اور ہزاروں عربی اشعار حافظہ میں محفوظ تھے، اسباق پڑھاتے ہوئے طلبہ میں ذوق پیدا کرنے کیلئے کبھی اس کا ذکر فرماتے تھے اور ہم طلبہ سن کر حیرت زدہ رہتے تھے۔

مسند احمد کی شرح جب احمد محمد شاکر نے شائع کی تو اس کی جلدیں منگوائیں، ان کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، اور پھر اس پر عالمانہ، محققانہ انداز سے استدراک و تعقبات لکھ کر ان کی خدمت میں بھیجا، جس سے وہ کافی متاثر ہوئے، اور شکریہ کا خط لکھا اور اپنی کتاب میں اس کو چھاپا، اور آپ کی تحقیق کو سراہا۔

علمی دنیا میں جب آپ کی شہرت ہوئی تو ممالک عربیہ سے بہت ساری دعوتیں آئیں کہ تشریف لائیں، ان ممالک میں مصر، مدینہ منورہ، بغداد، مراکش، شام اور قطر بھی شامل ہیں، صحت نے اجازت دی تو بعض جگہ تشریف بھی لے گئے اور بعض جگہ اپنی صحت کی کمزوری کی وجہ سے نہیں جاسکے، غیر ممالک میں جب جانا ہوا تو وہاں کے علمائے کرام آکر ملے ان سے علمی گفتگو ہوئی تو اس علمی گفتگو سے وہاں کے علماء کرام بہت زیادہ متاثر ہوئے، اور آپ کی حدیث دانی پر حیرت کا اظہار کیا۔

قدردانی ہر طرف سے ہوئی، خود اپنے ملک کے تمام بڑے تعلیمی اداروں نے پیش کش کی کہ یہاں آکر درس و تدریس کی مسند کو زینت بخشیں، خود دارالعلوم دیوبند نے جو ایشیا کا سب سے بڑا تعلیمی اور علمی ادارہ ہے، صدارت افتاء کی دعوت دی، اس کے لئے خود شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ اور حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہما اللہ مئو تشریف لے گئے ، پھر حضرت مولانا ابراہیم صاحبؒ اور حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ کے بعد صدارت تدریس کے لئے دعوت دی گئی اور اصرار کے ساتھ بلایا گیا، دارالعلوم ندوۃ العلماء نے دعوت دی، اسی طرح دارالمصنفین اعظم گڑھ اور دوسرے اداروں نے بھی دعوت دی، لیکن طبیعت میں نزاکت تھی، صحت بھی زیادہ مضبوط نہیں تھی، اس لئے وطن چھوڑنے کی ہمت نہیں کی، سارا علمی کام گھر بیٹھ کر کرتے رہے، یقین کریں اپنے ان علمی کاموں میں کسی سے قطعاً کوئی مدد نہیں لیتے تھے، بلکہ تنہا کرتے تھے، لیکن کبھی طبیعت میں علمی کبر و غرور نہیں پیدا ہوا، وہی سادہ زندگی برابر رہی جو ایک قدیم عالم دین کا شیوہ تھا بلکہ دوسرے جو علماء کرام خدمت اقدس میں حاضر ہوئے ان کی تعظیم و تکریم کی اور ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

پھر حالات نے مجبور کیا تو غیر مقلدین کا رد لکھا، بدعتیوں کا رد لکھا، شیعوں کا رد لکھا، اور رافضیوں کا دندان شکن جواب دیا، اور اہل قرآن کا جب فتنہ اٹھا تو آپ نے اس کے رد میں "نصرۃ الحدیث" کے نام سے کتاب لکھی، جس پر حضرت تھانویؒ نے بہت سی دعائیں دیں، اور دوسرے علماء نے بھی۔

ایک زمانہ میں جب ملک میں دعوت و تبلیغ کی ضرورت ہوئی اور لوگوں نے جلسوں میں شرکت کی دعوت دی تو ملک کے مختلف حصوں میں جاکر تقریریں بھی کیں، اور اپنے مواعظ حسنہ سے ملک و ملت کو مستفید فرمایا، ضرورت پڑنے پر بہت سارے مناظرے بھی کئے، اور جو مقابل میں آئے ان کو شکست فاش دی۔ غیر مسلک والے آپ کے نام سے گھبرانے لگے تھے، اخیر زندگی میں احباب اور بزرگوں نے اصرار کیا تو ارشاد و بیعت کی خدمت بھی انجام دینی پڑی، اور بہت سے مخصوص لوگوں کو بیعت فرما کر سلسلہ

میں داخل کیا۔

آپ کی حیات میں آپ یہ بھی پڑھیں گے کہ پانچ سال کیلئے یوپی اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہوئے، مگر اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، نہ ایک دن کیلئے اس سلسلہ میں کہیں گئے، اور نہ کسی سے ایک جملہ کہا، لوگوں نے اپنی پارٹی کی جیت کیلئے ایسا کیا تو پہلے انکار کیا، مگر جب وہ سب نہیں مانتے تو خاموشی اختیار کرلی، صدر جمہوریہ کی طرف سے علمی ایوارڈ بھی دیا گیا آپ نے اسے بادل نخواستہ قبول کیا۔

مختصر! یہ کہ حضرت الاستاذ قدس سرہ نے اپنی زندگی میں بہت سارے کام انجام دیئے، زیادہ وقت جامعہ مفتاح العلوم کی تدریس وتعمیر اور طلبہ کی تعلیم وتربیت پر خرچ کیا، اخیر میں ''المعہد العالی'' قائم فرمایا اور مدرسہ ''مرقاۃ العلوم'' کی داغ بیل ڈالی اور یہاں دورۂ حدیث تک کی کتابیں پڑھائیں، اور اس وقت مئو میں بس یہی ایک تعلیمی ادارہ ہے جو حکومت سے ملحق نہیں ہے، بلکہ آزاد ہے ورنہ دوسرے سارے مدارس اسلامیہ حکومت کے کنٹرول میں چلے گئے، اب حضرت کی یادگار یہی مدرسہ ہے، اللہ تعالیٰ تادیر اس کو قائم رکھے، اور یہ دینی علوم کی ترویج واشاعت میں برابر مشغول رہے۔

عزیز مکرم مولانا ڈاکٹر مسعود احمد ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں جو مولانا کی وفات کے بعد آپ کی حیات مرتب کرنے میں منہمک رہے اور اسے مکمل کیا، رب العالمین ان کی اس گراں قدر محنت کو قبول فرمائے، اور اسی کے ساتھ جامعہ مرقاۃ العلوم مئو کے مہتمم حضرت مولانا رشید احمد صاحب دامت برکاتہم بھی لائق مبارکباد ہیں کہ یہ سارے کام ان کی نگرانی میں انجام پذیر ہوئے، اور وہی حیات ابوالمآثر کو چھپوار ہے ہیں۔

بس ان چند سطروں پر خاکسار اپنی یہ تحریر ختم کرتا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ زیر نظر کتاب کو قبول فرمائے اور حضرت الاستاذؒ کے درجات بلند سے بلند تر فرمائے۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔

محمد ظفیر الدین غفرلہ
مفتی دارالعلوم دیوبند
۱۰/جمادی الاخری ۱۴۲۰ھ

محترم جناب مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب مدیر المآثر مئو

ایک ایسی شخصیت جس کا علم گہرا تھا اور وسیع بھی! ایک ایسا عالم جس کی نظر ثاقب تھی اور ہمہ گیر بھی! ایک ایسا شب زندہ دار، جس میں محدثین کی سی جانکاہی تھی اور صوفیاء کا ساسوز بھی! وہ علم کا طالب تھا، اور علماء کا استاذ بھی! اس کو دیکھ کر علماء حدیث کے حیرت انگیز حافظوں کی تصدیق ہوتی تھی اور ائمہ اجتہاد کی ذہانتوں کا یقین آتا تھا، اس کی ژرف نگاہی کے سامنے عقلیں ششدر رہ جاتی تھیں، اور اس کے ورع و تقویٰ کو دیکھ کر ایمان تازہ ہوتا تھا، وہ غیرت وحیا کا پتلا تھا، وہ دینی صلابت میں بے نظیر تھا، وہ صحت علم اور حسن عمل کا جامع تھا، اس کی ہیبت اور اس کے وقار کے سامنے بڑے بڑے اساطین علم کی گردنیں جھکی رہتی تھیں، وہ عرصۂ دراز تک ایک سفالہ پوش تنگ و تاریک حجرے میں رہا کیا، مگر اس کے علم کا نور چہار دانگ عالم کو روشن کرتا رہا۔

۱۴۱۲ھ میں روشنیٔ علم کا یہ پیکر اپنے خالق و مالک کے حضور پہونچ گیا، اس کے خاکی بدن نے مٹی کی چادر اوڑھ لی اور اس کی نورانی روح مرکز نور میں روپوش ہو گئی، ہمارے درمیان سے اس کا وجود ناسوتی اٹھ گیا، لیکن اس کا علم؟ سب کہاں، کچھ تلامذہ کے سینوں میں کچھ کاغذ کے سفینوں میں محفوظ ہے جس سے آنے والی نسلیں استفادہ کرتی رہیں گی، اور ہاں اس کے احوال و سوانح کی یاد دلوں میں؟ وہ بھی سب کہاں؟ قدرے قلیل باقی رہ گئی، اس کے بھی محو ہو جانے کا اندیشہ لگا رہا۔

علم کے ہر حلقے سے تجویزیں آئیں کہ احوال و سوانح کا جو کچھ حصہ لوگوں کی یادداشت میں اور مختلف اوراق میں محفوظ اور بکھرا ہوا ہے، اسے جمع کر کے مرتب کر دیا جائے، تاکہ اس عظیم شخصیت کا مجموعی خاکہ نگاہوں میں آجائے۔

یہ تجویز واجب التعمیل تھی، اس کیلئے قرعۂ فال اسی دیوانے کے نام نکالا گیا، جو یہ سطریں اس وقت لکھ رہا ہے، اے کاش کہ اس قاصر القلم سے یہ کام بن پڑتا۔ لیکن قرعۂ فال جس دیوانے کے نام نکلا تھا، جب وہ کچھ لکھنے کا ارادہ کرتا تو اس کا قلم تھرا جاتا، موضوع کی اہمیت اور خود اس کی بے لیاقتی دامن گیر ہوتی۔ اسی کش مکش میں دن گذرتے گئے، اچانک معلوم ہوا کہ حضرت اقدس کے اہل بیت ہی میں سے ایک ذہین و فطین صاحب علم و قلم، جو حضرت ہی کے شاگرد ہیں، چپکے چپکے حضرت کی سوانح حیات عربی میں مرتب کر چکے ہیں۔ ایک حیرت آمیز خوشی ہوئی، حیرت اس پر کہ کتنی خاموشی سے کام شروع ہوا اور پایۂ تکمیل کو پہونچ بھی گیا۔ اور خوشی اس پر کہ حضرت کی اولاد ہی نے یہ فریضہ انجام دیا، یہ ہیں حضرت کے نواسے، مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ کے بھانجے اور حاجی سعید احمد صاحب (کشمیر ٹیکسٹائلس) کے فرزند گرامی مولانا مسعود احمد صاحب! جو المآثر کے صفحات میں ڈاکٹر مسعود احمد صاحب کے عنوان سے جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں۔

دل میں خیال آیا کہ ماشاءاللہ نوجوانی ہی میں قلم پختہ ہے، انھیں کے قلم سے اردو میں بھی سوانح آجاتی تو "حق بحقدار رسید" کا مصداق ہوتا۔ کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ اردو سوانح کا بھی سفر تقریباً آدھا طے ہو چکا ہے، پھر جوان کا کام دیکھا تو تلاش و جستجو تحقیق و تفتیش، اقتباس و ترتیب اور نادر معلومات کا ایک مرقع نظر آیا۔ یہ خاموش کاوش بہت قابل قدر ہے، اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے، کتاب کی تعریف و توصیف پر کچھ نہیں عرض کرنا ہے۔ "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے" پڑھئے اور خود فیصلہ کیجئے، حضرت اقدس کی برکت سے انکے حالات کا مرقع کتنا دل آویز ہے۔

حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ کی وفات کے بعد سے مسلسل حضرت کے علوم اور ان کے تذکرے کی خدمت ہو رہی ہے، ترجمان الاسلام بنارس نے محدث اعظمی نمبر شائع کیا، مدرسہ مرقاۃ العلوم مئو سے المآثر کا اجرا عمل میں آیا، جو بحمد اللہ اب تک اس خدمت میں سرگرم ہے۔ حضرت کے نام پر عظیم الشان مکتبہ تعمیر ہوا، جس میں حضرت کا سارا علمی

سرمایہ محفوظ کر دیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ اس ایک شخص کی خاموش کاوش اور لگن اور اس کے حسن نیت کا ثمرہ ہے جسے حضرت اقدس کیساتھ فرزندی کا شرف حاصل ہے، اور تلمذ کا بھی! یہ ہیں حضرت اقدس کے خلف الرشید حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی دامت برکاتھم۔

مولانا موصوف حضرت کے سفر وحضر کے رفیق اور کاتب رہے ہیں، اور حضرت کے علمی کارناموں میں شریک رہے ہیں۔ چونکہ مولانا کا خط پاکیزہ ہے، اور طبیعت میں احتیاط بہت زیادہ ہے، اس لئے مسودہ تیار کرنا، اس کو آخری شکل دینا، عموماً مولانا رشید احمد صاحب کی ذمہ داری ہوا کرتی تھی، اس باب میں حضرت اقدس کو ان پر بڑا اعتماد تھا، انتظامی سلیقہ کی بنا پر حضرت نے انھیں کو مدرسہ مرقاۃ العلوم کا ناظم بھی منتخب فرمایا تھا جو بفضل خدا اب تک انھیں کی نظامت میں سرگرم عمل ہے۔

غیرت وخودداری اور خاموش کارگذاری میں مولانا موصوف ٹھیک اپنے والد گرامی کے نقش قدم پر ہیں، ان کی نگرانی اور اہتمام میں کتنے اہم کام انجام پاگئے، لیکن نہ کوئی اعلان ہے نہ اشتہار!

مولانا موصوف جامعہ مفتاح العلوم مئو کے فارغ التحصیل ہیں، اجازت حدیث انھیں اپنے والد محترم رحمہ اللہ کے علاوہ عالم اسلام کے مشہور بزرگ محدث حضرت علامہ زاہد الکوثری نور اللہ مرقدہ سے بھی حاصل ہے۔

یہ حقیر وخاکسار رسمی طالب علمی سے فراغت کے بعد سے مسلسل تدریس کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ باقاعدہ مضامین لکھنے کا اتفاق بہت کم ہوا تھا۔ اکا دکا کتابیں اس کے قلم سے نکلی تھیں۔ لیکن تحریر و قلم سے کچھ زیادہ مناسبت نہ تھی۔ اصل ذوق تدریس ہی کا تھا، اور اب بھی ہے، تدریس کیساتھ تحریر و قلم کے میدان میں کھینچ لانا، یہ مولانا موصوف ہی کے حکم اور محبت کا نتیجہ ہے۔ المآثر کا اجرا طے ہوا، تو اس کوتاہ قلم کو اس کا مدیر مقرر فرمایا، جس کے نتیجے میں مسلسل مضامین لکھنے کا اتفاق ہوا، اور علمی حلقوں میں ایک نئے اہل

قلم کا تعارف ہوا۔

غرض مولانا کی لگن یہ ہے کہ حضرت کے علمی و تحقیقی کاموں کو زندہ رکھا جائے، اس پر اضمحلال طاری نہ ہونے پائے۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی یہ بھی ہے، کہ حضرت کا مفصل تذکرہ لکھوانے کا شدید داعیہ ان کے قلب میں پیدا ہوا، ان کا فیصلہ یہ تھا کہ اسی قاصر القلم سے لکھوائیں گے۔ میرے قصور ہمت کے باوجود ان کے اس جذبہ میں کوئی کمی نہیں آئی، تو اللہ تعالیٰ نے گھر ہی کے ایک باصلاحیت عالم کو اس کام کیلئے مستعد فرمادیا، جنھوں نے دوسری مشغولیتوں کے ساتھ بہت کم مدت میں ایک مستند، معیاری اور محققانہ تذکرہ مرتب فرمادیا۔

حضرت کی ان علمی یادگاروں کے بقاء و تحفظ میں مولانا رشید احمد صاحب کے صاحبزادگان، بالخصوص مولانا ازہر رشید صاحب اور مولانا انور رشید صاحب بھی جہت دلچسپی لیتے ہیں، بحمد اللہ حضرت اقدس کی نسل اور خاندان میں دین اور علم کا ذوق زندہ ہے، حضرت کے پوتوں اور نواسوں میں بہت کثرت سے اصحاب علم ہیں۔

حضرت کے دوسرے صاحبزادے حاجی سعید احمد صاحب اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے تحصیل علم کی تکمیل تو نہیں کر سکے، تاہم ان کے صاحبزادگان میں اصحاب فراغت موجود ہیں، حضرت کی علمی یادگاروں کے سلسلے میں بڑے بھائی کی معیت میں انھیں بھی بہت دلچسپی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس گھرانے کو علم و فضل سے اور دین و تقویٰ سے ہمیشہ آباد وشاداب رکھے۔ آمین

اعجاز احمد اعظمی

۵؍رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ

xxxxxxxxxxx

مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

یہ ہمیشہ سے دستور چلا آرہا ہے کہ سلاطین نے جس جگہ کو اپنا مرکز بنایا وہاں ہر علم وفن کے لوگ بھی دھیرے دھیرے جمع ہوتے چلے گئے، اور ملک کے چیدہ پسندیدہ دل و دماغ کا مستقر یہ راجدھانیاں بنتی گئیں، لیکن سلاطین کی ایک دوسرے سے آویزش جنگ و محاربہ بھی تاریخ کا ایک بڑا حصہ ہے، ایسی صورت میں راجدھانی کا سکون ختم ہو جانا، اہل علم و نظر کا انتشار کا شکار ہو جانا بھی إن الملوك إذا دخلوا قرية أفسدوها وجعلوا اعزة أهلها أذلة وكذلك يفعلون، کی روشنی میں ایک حقیقت ہے۔

اس آیت میں قرآن کریم نے اسی فلسفۂ ملوکیت کا ذکر فرمایا ہے، آویزش و بدامنی میں سب سے زیادہ اضطراب اہل علم کا جو علمی کاموں میں لگے رہتے ہیں، ہوتا ہے، نتیجۃً عالی دماغ اور علمی استحضار کے لوگ راجدھانی کو چھوڑ کر نواحی کی طرف منتقل ہو جاتے، تاکہ اس بے ثباتی سے ان کے کام کو نقصان نہ پہونچے۔

دہلی ہندو پیریڈ سے لے کر انگریزوں کے عہد تک دارالسلطنت رہا کیا اور وہ، خواہ وہ ہستنا پور ہو یا شاہجہاں آباد یا کسی اور نام سے اسے یاد کیا گیا ہو، ہر زمانے میں راجدھانی رہا کیا، ظاہر ہیکہ ان تمام ادوار میں بدامنی، قتل و غارت کے واقعات و حادثات پیش آتے رہے، نتیجۃً دہلی کے اطراف میں فکر بلیغ، طبع بلند، راسخ العلم اذکیا و عقلاء کی بڑی تعداد سکونت پذیر ہوتی گئی، خود انگریز جیسے جہاں گرد و جہاں دید قوم نے کلکتہ میں وہ بات نہیں پائی اور دہلی کو اپنا مستقر بنایا، آج بھی ملک کی راجدھانی وہی ہے، اس طرح دہلی اور اس کے قریبی علاقوں میں اہل علم و تدبیر و تدبر کا حلقہ بڑھتا گیا، رامپور کو دیکھئے روہیلہ خاندان کے حکمرانوں سے بریلی و اطراف بریلی کو جو منافع نصیب ہوئے وہ آپ کے سامنے ہے۔

اسی طرح جونپور کم و بیش ایک صدی تک مختلف سلاطین کا دار السلطنت رہا، اگر شیر شاہ سوزی نے اسے آباد کیا، اہل کمال کا مجمع اس کے گرد جمع ہو گیا تو ہمایوں کی واپسی سے اس پر منفی اثر پڑا، لوگوں نے جونپور کو خیر باد کہا، مونگیر کے جونپوری شیخان اسی زمانے کی دین ہیں، بہر حال ان سلاطین جونپور کے زمانے میں جونپور کے اطراف میں راجدھانی کے ناسازگار حالات پر لوگوں نے پناہ لی، اعظم گڈھ چونکہ جونپور ہی کا ایک پرگنہ تھا اور زیادہ دور بھی نہیں تھا، اس لئے اہل کمال خود اور ان کے خاندان نے اعظم گڈھ کو اپنا مسکن و مستقر بنایا، چریاکوٹ کا ذکر آپ کو آئین اکبری میں نظر آئیگا، وہاں مولانا فاروق چریاکوٹی، غلام مخدوم چریاکوٹی جیسی شخصیات پیدا ہوئیں، سر شاہ سلیمان انگریزوں کے دور کے پہلے چیف جسٹس پھر دی فیڈرل کورٹ، جو بعد میں سپریم کورٹ کہلانے لگی کے پہلے چیف جسٹس بھی رہے، شبلی نعمانی جیسا ہمہ جہت باکمال اسی اعظم گڈھ نے پیدا کیا، عبدالسلام ندوی جیسا برجستہ نگار جن کے مسودہ کی کبھی تبییض نہیں کرنی پڑی، حافظ حمید الدین فراہی جیسا عالم علوم قرآن جن کے حادثۂ مرگ کی اطلاع سید سلیمان ندوی نے عبدالماجد دریابادی کو ان لفظوں میں دی کہ: ”آج آفتاب اسلام متھرا کے ظلمتکدہ میں ڈوب گیا“ سہیل اعظمی جیسا ذکی و ذہین بدیہہ گو شاعر جس نے کم سے کم ۲۵ ہزار اشعار اردو فارسی میں کہے ہوں گے، گو زمانہ نے صرف دو ہزار اشعار محفوظ رکھے، جنھوں نے اپنے ایک مصرع میں اعظم گڈھ کی علمی تاریخ مرتب کردی ہے، اسی اعظم گڈھ نے پیدا کیا ع

جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے

اعظم گڈھ نے صرف علوم ظاہری کے ماہرین ہی پیدا نہیں کئے، بلکہ یہاں اہل اللہ اور خدا رسیدہ بزرگوں کا ایک بڑا طبقہ بھی پیدا ہوا، مولانا شاہ عبدالغنی، مولانا شاہ وصی اللہ ان کے سرخیل ہیں، جن کے بارے میں علامہ ابراہیم بلیاوی صدر المدرسین نے فرمایا کہ یہ دونوں بزرگ اس دور کے حاجی امداد اللہ ہیں، اور مؤخر الذکر سے خود علامہ نے باوجود شاگرد ہونے کے بیعت کی اور خلعت خلافت سے نوازے گئے، مولانا عبدالرحمٰن

مبارکپوری، حافظ عبداللہ غازیپوری، مصطفیٰ اعظمی جیسے محدثین بھی یہیں پیدا ہوئے۔

وہ آفتاب علم و آگہی بھی اسی زمین سے طلوع ہوا (جس کو دنیا محدث کبیر علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمی کے نام سے جانتی ہے) جس کی تیز کرنوں سے علم حدیث کے مخفی گوشے منور ہوگئے، جس سے رجال حدیث کی دوصدی کی تاریخ آئینہ بن کر سامنے آگئی، نام، زمانہ، ولدیت، لقاء، معاصرت، وطنیت، احتیاط و تورع پر سیر حاصل بحث کرکے رجال کا مقام ان کی حیثیت واضح فرمادی، اس سلسلے میں مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ "الحاوی لرجال الطحاوی" ہے جو زیور طبع سے آراستہ ہوکر اہل علم کے سامنے آرہی ہے، اس کے مطالعہ سے مولانا کی عبقریت، زیرکی، دانائی، باریک بینی اہل علم کے سامنے مجسم ہوکر آجائے گی۔

اس وقت مولانا کی سوانح حیات کے پروف کا کچھ حصہ میرے سامنے ہے، اس کے مطالعہ سے جو باتیں میرے سامنے آئیں، اسے بے دریغ لکھ رہا ہوں۔

(۱) اگر مولانا علم حدیث کے امیر المؤمنین نہ ہوں ممکن ہے، مگر آپ رجال حدیث کے امیر المؤمنین بلاشک وشبہہ ہیں، اس درجہ کا عالم رجال اخلاف میں کہیں نظر نہیں آتا، اسلاف میں بھی معدودے چند ہیں۔

مولانا اعظمی مخطوطات حدیث نبوی کے سب سے بڑے عالم تھے، آپ اس سلسلہ میں اس بات کی سعی فرماتے کہ قدیم سے قدیم تر مخطوطہ سامنے آجائے، اس لئے کہ دور نبوت سے قرب کیوجہ سے ان میں صیانت ودیانت کا عنصر غالب رہتا ہے، بہ نسبت بعد کے مخطوطات کے کہ اس میں متاخرین نے متقدمین کی طرح احتیاط نہیں برتی، چنانچہ ان کی بالغ نگاہی کا ثبوت جامع عبدالرزاق کے مخطوطہ کے سلسلہ میں ڈاکٹر حمید اللہ جیسے کثیر المطالعہ مخطوطات پر نظر رکھنے والے عالم اور حضرت مولانا کے درمیان جو استدراکی مکاتبت ہوئی اور اس کے جامع معمر بن راشد ہونے کی تردید مولانا نے فرمائی، اس سلسلہ میں طویل مکاتبت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مولانا کی تحقیق کو تسلیم کرلیا

یہی نہیں۔ بلکہ ان کو شاہ ولی اللہ ثانی کے لقب سے یاد فرمایا۔

(۲) مولانا کی حدیثی خدمات جو سامنے آئی ہیں وہ ایسی ہیں کہ ان پر صدیوں تک لوگ ریسرچ کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کرتے رہیں گے۔

(۳) آپ نے حدیثی خدمات کے علاوہ فرق باطلہ کے سلسلہ میں جو سرمایہ چھوڑا ہے اس کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا ذہن کس قدر ثاقب اور طبیعت کس قدر حاضر تھی، چنانچہ نصرۃ الحدیث جو اہل قرآن کے رد میں آپ نے لکھی اس پر مقدمہ لکھنے کی پیش کش مولانا مناظر احسن گیلانی نے فرمائی، اور حضرت تھانوی نے لکھا کہ اگر میں کوشش کرتا تو ایسی پر تحقیق کتاب نہ لکھ پاتا۔

(۴) آپ نے شیعیت جو یہودیت کی ردیف ہے، اور اموی و عباسی دور کے خلفاء کے آل رسول پر مظالم اور اس طبقہ کی نام نہاد حب آل رسول کے نتیجہ میں فروغ ہوا، بعد کو سلاطین نے بھی سرپرستی کی اور ہندوستان میں تو تیمور کے بعد اکثر سلاطین نے اس کی ہمنوائی کی، پھر نوابین اودھ کا دوران کے لئے فصل بہار ثابت ہوا، رد شیعیت میں مولانا عبدالشکور نے وہ کام کیا کہ سابقین میں سے بھی کسی نے نہیں کیا، مولانا اعظمی جو خود کو نمایاں نہ کرنے کا مزاج رکھتے تھے، اس تحریک رد شیعیت میں برابر کے شریک رہے، آپ کے تین رسالے بھی اس سلسلہ میں مطبوع ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ دارالمبلغین کے قیام کے زمانے میں آپ کی وجہ سے اس تحریک میں جان آگئی۔

داستاں ان کے اداؤں کی ہے رنگیں لیکن
اس میں کچھ خون تمنا بھی ہے شامل میرا

(۵) غیر مقلدیت جو اعتزال کی ایک شاخ ہے، آپ نے اس کے رد میں بھی وہ نمایاں خدمات انجام دیں کہ ان کے علماء و اساطین قبروں میں بھی بے چین نظر آتے ہیں، مولانا کی وہ تقریر جو آپ نے علامہ ثناء اللہ امرتسری کی موجودگی میں ضلع گونڈہ میں رد قراءت خلف الامام پر کی تھی، اگر ٹیپ ریکارڈ میں ٹیپ ہوتی تو آج قراءۃ خلف الامام پر

اس سے بہتر کوئی رسالہ نہ پہلوں کا ہوتا نہ پچھلوں کا، مولانا امرتسری کے تقلید کی تعریف پر جو سوالیہ اخبار میں نکلا، جس کا مسکت جواب مولانا نے دے کر مولانا امرتسری کو ان کے علمی مقام کی سیر کرادی، مولانا نے "الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعۃ" میں طلاق کے بارے میں جو تحریر فرمایا اس کے جواب کیلئے بناسپتی محدثین کی ایک ٹولی مبارکپور میں جمع ہوئی اور ان کی کاوش سے الآثار المتبوعۃ سامنے آئی، جس کا جواب مولانا نے الازھار المربوعۃ میں دیا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی نے معارف مئی ۱۹۳۷ء میں جو لکھا ہے، وہ پڑھنے کے لائق ہے، اس مسئلہ پر عامر عثمانی نے مولانا کی تائید ہی نہیں کی بلکہ تجلی کا مستقل نمبر نکال کر اس بحث کیلئے گفتگو کا دروازہ بند کر دیا، اگرچہ غیر مقلدین تنویر الآفاق کے نام پر تسوید الآفاق کرتے رہ گئے۔

مولانا نے رکعات تراویح کا تعین اور حنفیہ کا عمل بیس رکعات کا ثبوت جناب نبی کریم ﷺ سے اور حضرت فاروق اعظم کے زمانے سے آج تک بیس پر اجماع امت کا ثبوت تحریر فرمایا، اس کا جواب انوار المصابیح کے نام سے شائع ہوا، پھر مولانا کے شاگرد مولانا عبد الباری کے قلم سے مذیل رکعات تراویح کے نام سے شائع ہوا جس نے غیر مقلدین کو خاموش کر دیا(۱)

البانی جو عربی دنیا میں اپنی حدیث دانی کی دھاک بٹھائے ہوئے تھے، ہندوستان کے غیر مقلدین بھی اس پر ناز کرتے تھے، حضرت مولانا نے چار جز میں الالبانی شذوذہ وأخطاءہ کے نام سے ایسا تعاقب کیا کہ حدیث کے اس بحر بیکراں کو ذرا سی آب جو ثابت کر دیا، جس میں چند چلو پانی ہو، عربی دنیا میں سب سے زیادہ اشاعت پذیر یہ کتاب ہوئی اور پھر دوسرے علماء عرب کا بھی ہیاؤ کھل گیا، انہوں نے بھی البانی کی تردید و تعاقب کیا۔

(۱) یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ رکعات تراویح مذیل بھی علامہ اعظمی ہی کی تصنیف ہے، جو مولانا عبد الباری صاحب کے نام سے شائع ہوئی تھی (مسعود الاعظمی)

ہر مدعی کے واسطے علم سخن کہاں
یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

التنقید السدید علی التفسیر الجدید کے نام سے خواجہ عبدالحئ پروفیسر جامعہ ملیہ کارد کیا، جس پر مولانا تھانوی نے مبارکباد دی اور دعائے برکت سے نوازا۔

رضاخانیت جو حقیقت میں سلاطین و امراء کی پیداوار ہے، انھوں نے اپنے سجدۂ تعظیمی، آداب و کورنش کے جواز کے لئے علماء سوء کی ایک ٹولی کو قبروں پر کھڑا کر دیا، اور اس طرح کے لوگوں نے اس جماعت کی سرپرستی کی، ان میں کوئی بالغ نگاہ عالم پیدا نہیں ہوا، ابوالفضل فیضی کی طرح دنیادار علماء ہمیشہ اس جماعت سے وابستہ رہے، لے دیکے ان میں مولانا احمد رضا خانصاحب کی ایک شخصیت نظر آتی ہے، جو پہلے اعلیٰ حضرت تھے، اب امام احمد رضا ہو گئے ہیں، انھوں نے اپنے طریقہ کی تائید میں بہت کچھ لکھا، مگر مولانا عبدالحئ حسنی نے ان کی خوبیاں گنانے کے بعد کثیر الشتم علی معاصریہ وشدید التکفیر لکھ کر ان کی پوری تاریخ لیاقت، علم وہنر سامنے کر دیا، اسی لئے مولانا نے ان کے خلاف بہت کم لکھا کہ یہ لوگ مخاطبت کے لائق ہی نہیں تھے، پھر بھی مولانا نے دو رسالے شارع حقیقی اور احکام النذر لاولیاء اللہ تصنیف فرمائے، خود احقر نے اپنی کمسنی کے زمانے میں ادری کے مناظرہ میں علماء رضاخانی مولانا حشمت علی وغیرہ کو دیکھا کہ دونوں ہاتھ میں تسبیح اور منہ میں بدگوئی وسب وشتم کے سوا کچھ نہ تھا۔

(۶) مولانا کا ادب بھی غیر معمولی تھا، اس سلسلہ میں عربی مراثی اور دوسرے کلام سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ صرف نثر ہی نہیں نظم پر بھی یکساں قادر ہیں۔

(۷) مولانا عربی اردو فارسی زبان پر یکساں کمان رکھتے تھے۔

(۸) مولانا کا حافظہ سابقین اولین کی طرح تھا، اس کا ثبوت ان کتابوں کے علاوہ اس بیت بازی سے، جو مولانا عبدالرحیم فاروقی اور مولانا کے مابین جب کبھی وہ مئو آتے، کئی کئی رات صبح تک جاری رہتی، ہوتا ہے۔

(۹) مولانا ذکاوت کے اعتبار سے بھی عبقری تھے، ان کی ذکاوت، اصابت رائے کا اندازہ ان کی تصانیف سے کیا جاسکتا ہے۔

(۱۰) مولانا نے مفتاح العلوم مئو میں صدر مدرسی کیلئے مولانا ابوالحسن عراقی، جو مولانا کے استاذ بھی ہیں، کی پیشکش کو قبول کیا، پھر اسی مدرسہ کے ہو کر رہ گئے، تا آنکہ سیاست حاضرہ کے بعض افراد کی ناشائستگی، جو علمی ماحول و مزاج کے بالکل خلاف ہے، سامنے آنے سے مولانا کی بددلی کا سبب بنی، اور مولانا نے اپنے ہی ہاتھوں سے سینچے ہوئے اس باغ کو ہمیشہ کیلئے خیر باد کہدیا، انا للہ وانا الیہ راجعون

(۱۱) مرقاۃ العلوم کا قیام آپ کی حیات میں ہو گیا، اس کی عمارت کا بیشتر حصہ آپ کے دور حیات میں تعمیر ہو گیا، آپ کے صاحبزادے مولانا رشید احمد اعظمی اسے پروان چڑھا رہے ہیں۔

مولانا کو دنیاوی وجاہت و مناصب میں سے بھی بے منت غیرے بہت سے مناصب و مراتب نصیب ہوئے، آپ نے دارالعلوم دیوبند کے صدر الافتاء وصدر مدرسی کو قبول نہیں کیا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث رہے، اس کی عاملہ کے ممبر اور دارالعلوم کے شو، یٰ کے ممبر رہے، یوپی اسمبلی کے ممبر رہے، اسی زمانہ میں سمپورنانند جو وزیراعلیٰ اور پارٹی کے لیڈر تھے مولانا کو کسی بزرگ کے مکتوب پر کسی کام کے انجام نہ دینے کو لکھا، جب سمپورنانند نے اس کا ذکر کیا تو مولانا نے ان سے بے نیازانہ بیباکانہ فرمایا کہ میں نے آپ سے ٹکٹ طلب کیا تھا؟ کوئی وعدہ کیا تھا؟ آپ کی کانگریس کو دو سیٹیں جیتنی تھیں اور وہ کام میرے بغیر نہ ہوتا، اس لئے آپ نے ٹکٹ دیا تھا، وہ کام ہو گیا، میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کو مجھ سے اس سوال کی کیسے ہمت ہوئی، اس پر وزیراعلیٰ خاموش ہو گئے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا میں دنیاوی اعزاز واحترام سے بے رغبتی غیر معمولی طور سے تھی، مزید روشنی کیلئے منتخب ہونے کے بعد جو مکتوب مفتی ظفیر الدین کے نام لکھا ہے، معلوم ہوگا، ان سب کے باوجود دوبارہ آپ ہی کو کانگریس نے نامزد کیا، آپ کے انکار پر

مولانا (عبداللطیف) نعمانی کے حصہ میں یہ اعزاز آیا۔

(۱۳) صدر جمہوریہ نے آپ کو عربیت کی سند افتخار پیش کی۔

(۱۴) آپ کو امیر الہند کا خطاب دیا گیا، یہ وہ خطاب ہے جو مولانا آزاد کو بھی علماء ہند لاہور میں پیش نہ کر سکے تھے۔

(۱۵) مولانا مختلف یونیورسٹیوں کے ممتحن رہا کیے، اور بعض کے ایکزیکیٹو کے ممبر بھی رہے۔

(۱۶) سید سلیمان ندوی آپ سے حدیث اور فقہ کے مسائل میں بلا تکلف رجوع کرتے اور آپ کی اصابت رائے پر عمل کرتے، سید صاحب نے میرے سامنے والد صاحبؒ سے یہ بات کہی کہ فقہی مسائل میں ان کی نظر دقیق ہے، اس لئے ان سے رجوع کرتا ہوں۔

میرے والد گرامی باوجود معاصر ہونے کے مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ مولانا حبیب الرحمٰن کی نظر حدیث پر شاہ انور کشمیری کی طرح ہے۔

مسند احمد جس کی تحقیق علامہ احمد محمد شاکر نے کی اس پر ان کے ملاحظات دیکھنے کے بعد مولانا کو جو مکتوب انھوں نے بھیجا اس سے اندازہ کیجئے کہ مولانا کا علمی مقام اور احترام ان کے دل میں کس قدر تھا، ان کے خط کے ایک حصہ کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

آپ کا عمدہ گرامہ نامہ ملا، آپ کی ہر گرفت قابل قدر لائق تسلیم ہے، میں یہ آپ کی دلجوئی اور مدارات کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ اعتراف حقیقت کے طور پر کہہ رہا ہوں، اس گراں بہا عنایت پر دل کی گہرائیوں سے مشکور ہوں، امید کہ آپ سنت مطہرہ نبوی کی خدمت کے جذبے میں اپنی رہنمائی اور ملاحظات سے مزید نوازیں گے، آپ کے ان ملاحظات کو دیکھ کر میں نے یہ جان لیا کہ آپ اس دور کے عظیم ترین علماء حدیث میں سے ایک ہیں۔

مولانا کو جو قبول عام حاصل ہوا، وہ مئو کی پوری تاریخ میں کسی کو نہیں ملا، نہ کسی عالم کو نہ صوفی کو نہ شاعر کو، لوگ مولانا پر پروانہ وار گرتے تھے، آپ کے چند کلمات سننے

کو اپنی سعادت جانتے، ان کے ہاں نشست برکت مانتے، چنانچہ ان کی موت کے بعد رمضان کے مہینہ میں مارچ کی کھلی دھوپ میں تقریباً دو لاکھ عوام شریک نماز جنازہ ہوئے، عمل تدفین افطارِ صوم کے بعد تک جاری رہا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ ومغفرۃ تامۃ

سوانح نگار عزیز گرامی ڈاکٹر مسعود احمد مولانا کے نبیرہ ہیں، ابھی کم عمر ہیں، اور بہ عمر کمتر بعلم برتر کی بہترین مثال ہیں، ماشاء اللہ انھوں نے سوانح کے تمام ہی گوشے کو بہت سلیقے سے جمع کیا، پھر شگفتہ اردو میں منتقل کیا، عربی زبان پر تو وہ قادر تھے ہی، انگریزی عبارتوں کے ترجمہ سے جو نہایت درجہ شگفتہ وشائستہ ہیں، ان کی قدر ومنزلت میرے دل میں اور بڑھ گئی ہے، مولانا کی ''نصرۃ الحدیث'' کا عربی ترجمہ جو زیر طباعت ہے، پھر المآثر کا استدراک والا حصہ ان کے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کی شہادت ہیں۔ دعا ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ، اگر قلم کے بجائے رقم کردیا جائے تو ذومعنی ہو جائے گا۔

میں یہ مضمون اپنے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

باد بہار گلشن علمت چناں وزید
کز وے ہزار باغ بہ ہندوستاں دمید

مکتوب

حضرت مولانا سعید الرحمٰن صاحب الاعظمی الندوی مد ظلہ العالی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ

محب عزیز ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی علیگ زاد مجد کم السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ　　　　مزاج شریف،

عنایت نامہ مورخہ ۲۰ راگست کافی تاخیر سے موصول ہوا، "حیات ابوالمآثر" کا کام آپ نے جس خوش اسلوبی اور سلیقے سے انجام دیا ہے وہ ہم وابستگان دامن ابوالمآثر کے لئے باعث فخر وسعادت ہے، فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے اس عظیم انسان کے خط وخال کو کس دقت نظر اور مہارت سے مرتب کیا ہے، اور ایک بے مثال شخصیت کا کتنی خوبی سے تعارف کرایا ہے، اس زندگی میں نہ صرف عام لوگوں یا طلبائے علوم اسلامیہ کیلئے بہت سے دروس وعبر ہیں، بلکہ اہل علم ونظر کیلئے خاص طور سے اس میں بڑا ذخیرہ موجود ہے، اور تاریخ کے علمائے متقدمین اور محدثین عظام کے نمونے اور مثالی تذکرے اس زندگی کی زینت ہیں۔

حضرت مرحوم نور اللہ مرقدہ، دراصل اسلام کے اس زریں دور اور اس عظیم صدی کی نمائندگی کر رہے تھے جو تدوین حدیث اور رجال ورواۃ سنت کے ابھرنے اور تاریخ کی زینت بننے کا دور ہے، وہ اپنے زمانے کے خلاف دور اول کے محدثین وعلمائے اصول کا زندہ نمونہ تھے، ان کا تبحر علمی اور تعمق وبصیرت ہندوستان کی علمی تاریخ میں ایک زبردست اضافہ خیال کیا جاتا ہے۔

ان شاء اللہ تعالیٰ اس کتاب کے محتویات اور ان کی تاریخی حیثیت ہندوستان کے

اسلامی کتب خانہ میں اور فن تراجم میں ایک خاص اہمیت کا مقام رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کی مخلصانہ جد و جہد کو قبول فرمائیں اور کتاب شائع ہو کر تمام علمی حلقوں میں قبول عام حاصل کرے، آمین

نیک تمناؤں اور مخلصانہ دعاؤں کے ساتھ آپ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

ماموں جان مدظلہ اور اپنے والد صاحب مدظلہ اور سبھی حضرات کی خدمت میں سلام مسنون پیش کر دیں، ممنون ہوں گا۔

بقیہ الحمدللہ سب خیریت ہے،

والسلام
مخلص
سعید الرحمٰن الاعظمی
مدیر البعث الاسلامی
۱۱ر ستمبر ۹۹ء

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆☆☆☆

تمہید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

از

صاحب زادۂ محترم مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ

والد محترم امام العصر محدث جلیل، ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کی وفات کو تقریبا آٹھ سال کا عرصہ گذر رہا ہے، ان نابغۂ روزگار اور عبقری ہستیوں میں تھے، جو علم و عمل اور سلوک و عرفان کی پیکر جمیل ہوا کرتی تھیں، ایسی ہستیاں مدتوں میں کبھی عرصۂ عالم میں جلوہ گر ہوا کرتی ہیں، حضرت کی حیات میں بھی لوگوں کو، بالخصوص ممتاز اہل علم حضرات کو اس کا احساس تھا کہ یہ گدڑی میں خود کو چھپائے ہوئے ایک لعل بے بہا ہے، اجمالاً اتنا سب کو معلوم تھا کہ حضرت اقدس علیہ الرحمہ "بڑے مولانا" ہیں ، صرف مئو اور اعظم گڈھ کے پیمانے پر نہیں ، بلکہ ہندوستان گیر پیمانے پر، بلکہ اور زیادہ واقفیت رکھنے والے دنیا کے پیمانے پر آپ کو "بڑے مولانا" مانتے تھے، لیکن یہ واقفیت زیادہ تر اجمالاً تھی، اس "بڑے مولانا" کے تحت کیا کیا تفصیلات پنہاں تھیں، اسے قریب والوں نے تو کچھ ضرور جانا، اور انھوں نے قدر کی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جاننے والوں کی تعداد، نہ جاننے والوں کے مقابلے میں کم، بہت کم تھی۔

جب تک کوئی بڑی ہستی موجود ہوتی ہے ،اس سے لوگ اپنے مسائل و معاملات میں فائدہ تو اٹھاتے ہیں، لیکن اس کے رتبہ کی بلندی اور اس کی شان کی اہمیت سے غافل

رہتے ہیں، اپنے قریب پاتے ہیں، اپنے درمیان دیکھتے ہیں۔ بشریت کے تمام تقاضوں اور لوازم کے ساتھ دیکھتے ہیں تو یہ خیال اکثر دھندلا دھندلا سا رہتا ہے کہ ہمارے بیچ رہنے والی یہ شخصیت ہم سے کتنا فاصلہ رکھتی ہے۔

کسی چھوٹے بڑے صاحب علم و تحقیق کو کوئی علمی ضرورت پیش آتی، تو بے تکلف اس کا ذہن مئو کے اسی بوریہ نشین پر پہونچتا تھا اور وہاں اس مسئلہ کی گتھی سلجھ ہی جاتی تھی، اور اس طرح سلجھ جاتی تھی، جیسے اس میں کوئی الجھاؤ تھا ہی نہیں۔

لیکن یہی شخصیت جب اپنا وقت پورا کر کے اٹھ گئی، تو اصحاب علم کو یتیمی کا احساس ہونے لگا سوالات اب بھی پیدا ہوتے ہیں، مگر جواب دینے والی زبان خاموش ہو گئی، گتھیاں اب بھی الجھتی ہیں، مگر سلجھانے والی انگلیاں ساکن ہو گئیں، اشکالات اب بھی ہوتے ہیں، لیکن انھیں حل کرنے والا دماغ ہم سے دور ہو چکا، کتاب اور مقالے اب بھی نظر ثانی کے محتاج ہوتے ہیں، مگر ان کی اصلاح کرنے والا قلم رک گیا۔ اب شدت سے احساس ہونے لگا کہ مولانا کیا چیز تھے؟ اب مولانا کو نہیں دیکھ سکتے، ان سے ملاقات نہیں کر سکتے، ان کے پاس خط نہیں لکھ سکتے، تو جنھوں نے انھیں نہیں دیکھا ہے اور جن لوگوں کو ان کی دید و زیارت سے محرومی رہی ہے، سب کو جستجو ہوئی کہ اس صاحب عظمت کی عظمت تفصیل سے جانی جائے۔ عرصہ تک علم و فضل کے قلمرو میں ان کی تحقیق و رہنمائی کا سکہ رواں رہا ہے، اب ان کی پوری زندگی اپنے تمام علمی کمالات کے ساتھ ماضی بن چکی ہے، اور ماضی ایک ایسا پردہ ہے جو وقت گذرنے کے ساتھ دبیز اور تہدار ہوتا جائے گا۔ دیکھنے والوں کا حافظہ بھی بہت کچھ ضائع کر دے گا، اور جنھوں نے نہیں دیکھا ہے وہ دیکھنے والوں سے کتنا سن پائیں گے؟

پس ضرورت تھی ابھی جب کہ ماضی کا پردہ دبیز نہیں ہوا ہے، اسے چاک کر کے اس صاحب عظمت اور باکمال شخصیت کو علم و معرفت کی روشنی میں لایا جائے۔ اس سلسلہ میں پہل کرنے والے، ہم سب کے شکریے کے مستحق، مولانا اسیر ادروی ہیں۔ انھوں نے ترجمان الاسلام کا خصوصی نمبر حضرت مولانا پر شائع کیا، اس میں مختلف اصحاب تحقیق اور

ارباب قلم نے حضرت کی زندگی کے بہت سے گوشوں پر روشنی ڈالی۔ ان مضامین میں ایک اہم مضمون مسند احمد بن حنبل کی تحقیقات و تعلیقات پر حضرت کے استدراکات کے متعلق ہے، یہ تحقیقات مصر کے نامور محدث علامہ احمد محمد شاکر علیہ الرحمۃ کے محققانہ قلم سے شائع ہوئے تھے، انھوں نے دعوت دی تھی کہ اہل علم حضرات اس کا بغور مطالعہ کر کے اس کے بیش و کم کا جائزہ لیں، اور کسی نے تو نہیں، حضرت مولانا نے ان تحقیقات پر مفصل نقد لکھا تھا، اس نقد کو محدث مصر نے نہایت خوشی اور کشادہ دلی کے ساتھ قبول کر کے اپنے تعلیقات کے ساتھ شائع کیا تھا۔ انھیں استدراکات کی روشنی میں مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی نے مذکورہ مضمون مرتب کیا تھا، اس مضمون سے جہاں حضرت محدث جلیل نور اللہ مرقدہ کی وسعت مطالعہ، قوت گرفت، ذہانت و فطانت اور ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں یہ بھی احساس ہوا کہ مولانا اعجاز احمد صاحب میں ماشاءاللہ تحریر و قلم کی صلاحیت اور زبان و بیان کا ملکہ ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت اقدس کے علوم و معارف کے سمجھنے اور اسے سمجھانے کا عمدہ سلیقہ ہے، انھوں نے یہ مضمون مئو میں مدرسہ مرقاۃ العلوم میں رہ کر مرتب کیا تھا۔ کئی دن کی باہمی ملاقات اور ہم نشینی اور مشوروں کے نتیجے میں مجلّہ "المآثر" کا اجراء طے پا گیا اور پھر اس میں حضرت اقدس کے تحقیقات و تعلیقات اور نقد و استدراک کا تعارف مسلسل مولانا کے قلم سے نکلتا رہا، اس کے بعد عزیزم مولوی مسعود احمد سلمہ نے "استدراکات محدث کبیر" کے عنوان سے لکھنا شروع کیا، اور یہ سلسلہ تاہنوز جاری ہے، اور اب وہ عنوان المآثر کا ایک مستقل کالم کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، ان مضامین کو پڑھ کر عام طور سے اہل علم کا یہ تاثر سننے میں آیا کہ حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ کو، ان کے علم کی وسعت و گیرائی کو، اور ان کے کمال کی بلندیوں کو جیسے ہم نے جانا ہی نہ تھا، ان مضامین سے ان کے جمال و کمال کا علم ہو رہا ہے۔

مجلّہ تسلسل کے ساتھ نکلتا رہا۔۔۔ اور الحمد للہ اب بھی نکل رہا ہے۔۔۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ احساس بھی بڑھتا رہا کہ حضرت اقدس کی مستقل سوانح عمری لکھی جانی چاہئے۔ جس سے بیک وقت اور ایک تسلسل کے ساتھ حضرت کی زندگی اور کارنامے، نیز آپ کے

فضل و کمال اور خصائص و امتیازات پڑھنے والوں کے سامنے آجائیں۔

لیکن یہ کام کچھ ایسا نہ تھا کہ سرسری طور پر انجام دے لیا جائے، حضرت ایک زبردست محدث تھے، محقق تھے، فقیہ تھے اور بھی بہت کچھ تھے، ان سب امتیازات و خصوصیات اور زندگی کے احوال کو سمیٹ کر اکٹھا کرنا، ایک دشوار گذار امر تھا، اس کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو حضرت کی زندگی ـــ جو ماشاء اللہ تقریباً ایک صدی کو محیط تھی ـــ کے احوال کو جانتا ہو، یا جاننے کی استعداد رکھتا ہو، مطالعہ و مشاہدہ کی قوت بھی رکھتا ہو، علوم حدیث و فقہ سے اسے مناسبت بھی ہو، پھر زبان و بیان کی قدرت بھی رکھتا ہو، اور وہ اس کام کے لئے یکسو بھی ہو، کیونکہ حضرت کے وہ احوال و سوانح جن کا تحریر میں لانا ضروری ہے، ان کا حصول زیادہ تر ان بوسیدہ اوراق، پرانے خطوط، منتشر تحریروں اور چھوٹی بڑی ان پرچیوں سے ہو سکتا ہے، جن پر حضرت نے کچھ یادداشتیں، کچھ تاریخیں اور کچھ وقائع و حوادث لکھ رکھے ہیں، اور خوش قسمتی سے ان کا بڑا حصہ محفوظ ہے، لیکن بے ترتیب! ان سب کو جمع کرنے، انھیں الٹنے پلٹنے اور الٹ پلٹ کر پڑھنے میں جہاں بڑی دیدہ وری کی ضرورت ہے، وہیں طویل فرصت بھی درکار ہے۔

ماشاء اللہ مولانا اعجاز احمد صاحب میں یہ سب صلاحیتیں موجود ہیں، لیکن چونکہ وہ ایک مدرسہ میں مدرس ہیں، صرف مدرس ہی نہیں، ذمہ دار مدرس ہیں، علاوہ ازیں ان کے ساتھ اور بھی کئی مشاغل لگے ہوئے ہیں، جن میں وہ ہر وقت گھرے رہتے ہیں، اس کے باوجود انھیں کو مکلف کیا گیا کہ وہ یہ کام انجام دیں۔ چنانچہ انھوں نے اس کا آغاز بھی کر دیا، لیکن سوانح لکھنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ یہاں حضرت کے کتب خانہ میں مقیم ہوتے اور تمام منتشر تحریروں اور حضرت کے مسودات وغیرہ کو جمع کرتے، انھیں پڑھتے، مگر بُعد مسافت اور ایک مدرسہ کی ذمہ داری کی وجہ سے وہ اس کا موقع نہیں نکال پاتے تھے، اس لئے کام کی رفتار سست بلکہ معدوم تھی، لیکن اللہ کو جس سے جو کام لینا ہوتا ہے اس کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔

حضرت کی حیات مبارکہ میں ان کی تمام کتابیں ایک بڑے ہال میں رکھی ہوئی

تھیں، لیکن کتابوں کی وہ کثرت تھی کہ ہال میں داخل ہوتے ہی باوجود وسعت کے اس کی تنگ دامانی کا احساس ہونے لگتا تھا، نیچے اوپر کتابوں کا انبار تھا، قدرے ترتیب ان کتابوں میں تھی تو ضرور، مگر ان سے استفادہ بہت مشکل تھا، احباب کے مشوروں سے طے کیا گیا کہ ایک بڑی لائبریری حضرت کے نام پر بنوائی جائے، چنانچہ اس کی تعمیر شروع کر دی گئی، جیسے ہی اس کی تکمیل ہوئی، اور منصوبہ بنا کہ حضرت کی کتابیں، ترتیب کے ساتھ اس میں منتقل کر دی جائیں، اسی وقت حضرت کے عزیز نواسے اور شاگرد مولوی مسعود احمد سلمہ جو مدرسہ مرقاۃ العلوم اور دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے وہاں سے فارغ ہو کر گھر آگئے ، کتابوں کی منتقلی اور ترتیب وتہذیب کے کام میں برخورداران عزیز مولوی ازہر اور مولوی انور سلمہما کے ساتھ مولوی مسعود احمد سلمہ بھی شریک ہوگئے ، اس دوران انھیں کاغذات اور مسودات اور حضرت کی منتشر تحریرات اور بہت سے خطوط پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے کتب خانہ کے کام کے ساتھ ساتھ حضرت کا تذکرہ عربی زبان میں لکھنا شروع کر دیا، یہ کام انھوں نے اس خاموشی سے کیا کہ شاید ہی چند لوگوں کو اس کا علم ہوا ہو، یہ تذکرہ مکمل کر کے انھوں نے بعض اصحاب نظر، جن کو عربی تحریر پر دسترس حاصل ہے، کے سامنے پیش کیا، جس نے پڑھا اس کی تحسین کی۔

پھر جس خاموشی سے انھوں نے عربی زبان میں تذکرہ لکھا، اسی خاموشی سے اردو میں سوانح کا کام شروع کر دیا، چونکہ حضرت کی تمام تحریریں، خطوط اور مختلف یادداشتیں نگاہ سے گذر چکی تھیں، ماشاء اللہ ذہن بہت اخاذ پایا ہے ، حضرت کی شاگردی کے ساتھ نسبی قرابت بھی ہے، اس لئے مناسبت پوری موجود ہے ، ذہانت وذکاوت سے بہرۂ وافر پایا ہے، اللہ کی طرف سے یہ سعادت ان کے لئے مقدر تھی، ضرورت کے تمام معلومات مہیا ہوتے گئے ، اور ان کا قلم رواں دواں رہا۔

کتاب مکمل ہونے کے بعد جب نظر کے سامنے آئی تو نہایت مسرت کے ساتھ حیرت بھی ہوئی کہ ایک نو آموز نے کس طرح پرزے پرزے سے معلومات جمع کئے،

پھر انھیں ترتیب دیا، اور مرصع کر کے پیش کیا، مولانا اعجاز احمد صاحب اور بعض دوسرے اہل علم نے دیکھا تو بیحد پسند کیا، اور عزیزم موصوف کی تحقیق و تفتیش اور ان کی جدوجہد وکاوش اور ان کی قلمی اور علمی صلاحیت کی داد دی۔

المآثر میں شائع شدہ ان کے استدراکات سے اہل علم کی نگاہ میں وہ پہلے ہی ایک مقام پیدا کر چکے تھے۔ اب اس سوانح حیات کی ترتیب و تبویب جب ان کے قلم سے ان اہل علم کے سامنے آئی تو مزید ان کی صلاحیت اور ان کے فضل کا انھیں معترف ہونا پڑا۔

ہمارے دیار بلکہ ملک کے مشہور اہل قلم اور بہت سی کتابوں کے مصنف مولانا نظام الدین صاحب اسیر ادروی نے عزیز موصوف سلمہ کی لکھی ہوئی اس سوانح کا مسودہ ملاحظہ فرمایا تو انھوں نے بھی اسے بیحد پسند کیا، چونکہ مولانا اسیر صاحب ایک منجھے ہوئے صاحب قلم اور حضرت محدث کبیرؒ کے شاگرد اور ان سے گہری عقیدت رکھتے ہیں، اس وجہ سے ان سے گذارش کی گئی کہ اس سوانح پر وہ اپنا مقدمہ تحریر فرمادیں، مولانا نے اسے بڑی خوشی سے قبول کیا اور انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں اس پر مقدمہ لکھا۔

اس کتاب سے حضرت کے حالات ضروری تفصیلات کے ساتھ سامنے آگئے، اس طرح اس صدی کی ایک نہایت باوقار علمی شخصیت کی زندگی آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ ہوگئی، جس سے رہ نوردان علم وفضل کو ہمیشہ روشنی ملتی رہے گی، اور بزرگان پیشین کی یاد تازہ ہوتی رہے گی، ان شاء اللہ۔

اللہ تعالیٰ خواہر زادۂ عزیز مولوی ڈاکٹر مسعود احمد سلمہ کو جزائے خیر عطا فرمائے، کہ اس طرح انھوں نے نانا کی شاگردی کا حق ادا کرنے کی سعی مشکور کی، اور اہل علم اور طلبہ کیلئے روشنی کا ایک خزانہ مہیا کر دیا، اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائیں، اور اسے نافع بنائیں۔

مولف سلمہ حضرت کے علمی کمالات اور آپ کی تصنیفات پر مستقل ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں جسے سوانح کا دوسرا حصہ قرار دے لیجئے، یا مستقل علیحدہ کتاب تصور فرمایئے، ان شاء اللہ اس کے بعد جلد ہی وہ بھی منظر عام پر آئے گی۔

پیش لفظ

پیش لفظ

جناب مولانا نظام الدین اسیر ادروی صاحب مدظلہ

پہاڑیوں پر اگنے والے پودے اپنی کوتاہ قامتی کے باوجود دور سے نظر آتے ہیں، اونچے اور بلند معلوم ہوتے ہیں، اور پہاڑیوں کے دامن میں پنپنے والے درخت جب اپنی فطری نشو ونما اور اپنی مضبوط جڑوں کی طاقت سے تناور درخت بن جاتے ہیں اور ان کی گھنی شاخوں کا سایہ ان پہاڑیوں کے پودوں پر چھا جاتا ہے اور ان کی نشو ونمارک جاتی ہے تب کہیں جاکر پہاڑیوں پر رہنے والے لوگوں کی نگاہوں میں آتے ہیں، اور ان کی بلند قامتی کا اعتراف کیا جاتا ہے۔

کچھ ایسا ہی حال مرکزی مقامات جیسے دہلی وغیرہ اور اس کے مضافات اور قرب و جوار کے اضلاع میں اہل علم اور صاحب فضل و کمال کا ہوتا ہے، وہ بہت جلد ملک و قوم میں روشناس ہو جاتے ہیں، مرکزی تنظیموں سے وابستگی اور علمی مراکز سے روابط کیوجہ سے اخباروں اور رسالوں میں ان کا ذکر آنے لگتا ہے، وقت، حالات، ماحول اور عوامی سرگرمیوں کے بہاؤ میں ان کی عظمت و شہرت کا سفینہ اس ساحل سے اس ساحل تک پہونچ جاتا ہے۔

اس کے برخلاف مرکزی مقامات سے دور دراز کے علاقوں کی قد آور سے قد آور شخصیتوں کی عظمت و سربلندی کا اعتراف بہت بعد میں ہوتا ہے اور اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے فضل و کمال اور علمی کارناموں کی وجہ سے اہل علم کے دل و دماغ پر مرعوب کن حد تک چھا جاتی ہیں، ان کی باتوں میں وزن، ان کی رایوں میں بے پناہ گہرائی، ان کی تحریروں میں ژرف بینی دقیقہ رسی اور نکتہ شناسی کا وہ جوہر ہوتا ہے جس کی آب و تاب، چمک دمک دوسروں کی نگاہوں کو خیرہ کرنے لگتی ہے، یعنی علمی کمال حاصل کرنے کے لئے جب وہ اپنی پوری زندگی تج دیتی ہیں تب کہیں جاکر لوگ ان کو پہچانتے ہیں اور سر عقیدت خم کرتے ہیں۔

ضلع اعظم گڈھ جو اتر پردیش کے ایک دم مشرقی کنارے پر واقع ہے، دہلی سے آٹھ سو کیلو میٹر دور ہے، اس مردم خیز دور افتادہ خطے میں جو ہمالیائی شخصیتیں پیدا ہوئیں وہ انھیں حالات سے گذری ہیں، ان پر اہل علم اور دانشوروں کی نگاہیں اس وقت پڑیں جب وہ اپنی بے پناہ قوت پرواز سے کام لیکر اتنی بلندیوں پر پہونچ گئیں کہ ان کی طرف نگاہیں اٹھانے والوں کے سروں سے دستار فضیلت گر گر گئی، انھوں نے برصغیر ہی کے اہل علم سے نہیں خراج تحسین حاصل کیا بلکہ پورے عالم اسلام کی علمی دنیا کو متاثر کیا، عرب و عجم دونوں نے ان کے فضل و کمال کا صدق دلی سے اعتراف کیا اور ان کی عبقریت کو تسلیم کیا اور ان کے علمی کارناموں کو اپنے لئے دلیل راہ بنایا۔ انھیں ہمالیائی شخصیتوں کی پر شکوہ فہرست میں محدث جلیل ابوالمآثر حضرت علامہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کا نام نامی و اسم گرامی جلی حروف میں لکھا ہوا ہے، جو ۱۶؍مارچ ۱۹۹۲ء کو سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

علمی دنیا میں آپ کا نام انتہائی ادب و احترام سے لیا جاتا ہے، ان کے علمی و تحقیقی کارناموں نے پوری دنیائے اسلام کو متاثر کیا اور برصغیر کی عظیم ترین شخصیتوں میں ان کو شمار کیا گیا، آپ کی ذات میں موجود خداداد اور وہبی صلاحیتوں کا کرشمہ تھا کہ ہمیشہ ایک طرح کی خلوت نشینی اور تنہائی کی زندگی گذاری لیکن ان کی علمی عظمت و شہرت ہر سمت از خود پھیلتی چلی گئی، علم حدیث، اسماء الرجال اور فقہ کی دقیق سے دقیق ترین بحثوں میں آپ کی رائے قول فیصل کا درجہ اختیار کر گئی۔

آپ کی دینی خدمات اور علمی سرگرمیوں کا آغاز تو اس وقت ہوا جب بیسویں صدی کا ربع اول ختم ہو رہا تھا، اس سے پہلے انیسویں صدی کے نصف آخر میں اسلام اور مسلمان دونوں کا وجود خطروں میں گھرا ہوا تھا، کیوں کہ ۱۸۵۷ء کی ہمہ گیر بغاوت کے بعد برطانوی استعمار کی انتقامی کارروائیوں نے مسلمانوں پر جو قیامت توڑی وہ انتہائی ہولناک تھی، اس تباہی و بربادی میں جہاں مسلمانوں کا ہزار سالہ اقتدار افسانۂ ماضی بن گیا وہیں اسلام پر کاری ضرب لگائی گئی، خانقاہیں ویران اور مدارس اسلامیہ کھنڈر بن گئے جس کی وجہ سے

سب سے اہم اور نازک مسئلہ ہندوستان میں اسلام کے تحفظ وبقا کا پیدا ہو گیا۔

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی پر اللہ تعالیٰ ہزاروں رحمتیں نازل کرے کہ اسلام کے تحفظ وبقاء کے لئے انھوں نے انتہائی خطرناک حالات اور نازک ترین ماحول میں ایک گمنام بستی دیوبند میں دارالعلوم قائم کیا جو مایوسیوں کے گھنے اندھیرے میں ایک ننھا سا چراغ تھا جو بعد میں چل کر آفتاب وماہتاب بنا، دارالعلوم دیوبند کا قیام درحقیقت اس ملک میں اسلام کی حفاظت کے لئے تعمیر کئے جانے والے قلعوں کی پہلی بنیادی اینٹ تھا اور مذہبی حصار بندی کی مہم کا نقطۂ آغاز تھا، یہ اسلام کے تحفظ وبقا کے لئے چلائی جانے والی ایک خاموش تحریک تھی اور مسلمانان ہند کے لئے بانگ جرس، جس نے شکست خوردہ تھکے ہارے قافلے کو اذن سفر دیا اور سمت سفر متعین کر دی، پھر پورے ملک میں بیداری کی ایک لہر اٹھی اور ہر طرف زندگی کے آثار نظر آنے لگے، جس طرح تالاب کے ساکن پانی میں ایک چھوٹا سا پتھر پھینک دیا جاتا ہے تو اس سے جو لہریں پیدا ہوتی ہیں وہ تالاب کی سطح پر کروٹیں لیتی ہوئی دوسرے کنارے تک پہونچ کر ہی رکتی ہیں، بالکل یہی حال دیوبند میں دارالعلوم کے قیام کا ہوا، وہاں سے تحفظ اسلام کے جذبے سے قیام مدارس کی شکل میں جو لہر اٹھی تو ضلع اعظم گڈھ تک اس کو پہونچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم قائم ہوا، ابھی انیسویں صدی ختم بھی نہیں ہوئی کہ دارالعلوم دیوبند کے نہج پر ضلع اعظم گڈھ میں کئی چھوٹے بڑے مدارس قائم ہو گئے اور دینی تعلیم کے زمزمے گونجنے لگے۔

محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی قدس سرہ کے والد محترم مولانا محمد صابر صاحبؒ نے اسی دور میں علم حاصل کیا اور مختلف اساتذہ سے حدیث کی کتابیں پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، مئو شہر کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس چونتیس سالہ تاریک ترین دور میں اس کو دو روشن چراغ مل گئے، ایک مولانا امام الدین پنجابیؒ جو مولانا احمد علی محدث سہارن پوری کے شاگرد اور مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کے خلیفہ اور ان کے اصلاحی مشن کے نمائندہ تھے، مئو میں مستقل قیام کیا جب کہ ان کا وطن ثانی موضع ادری تھا، ان کی

آل اولاد یہیں قیام پذیر رہی، لیکن وہ زندگی کے آخری لمحہ تک مئو میں اصلاح وتزکیۂ نفس کے فرائض انجام دیتے رہے اور تعلیم و تدریس کا بھی ہمیشہ مشغلہ رکھا، مئو کی کئی مشہور علمی شخصیتوں کو ان سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ دوسری شخصیت مولانا عبدالغفار صاحبؒ کی تھی جو دارالعلوم دیوبند کے سرپرست مشہور محدث اور شیخ طریقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاگرد رشید تھے، انھیں سے علم حدیث حاصل کیا تھا، انھوں نے مئو اور دوسرے مختلف مقامات پر مسند تدریس بچھائی اور علوم اسلامی کی تعلیم و تدریس میں پوری زندگی گذاری ان کے مشہور و ممتاز تلامذہ میں سب سے ممتاز اور عالمی شہرت کے مالک محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی قدس سرہٗ ہوئے۔

محدث اعظمی قدس سرہٗ بیسویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوئے، مختلف مقامات میں جاکر تعلیم حاصل کی، دورۂ حدیث دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم مئو میں رہ کر مکمل کیا اور فوراً ہی درس و تدریس شروع کردی، فطری اور خداداد صلاحیتوں کا یہ کرشمہ تھا کہ آپ کے علم و فضل اور کمال فن نے بالکل ابتدائی دور ہی میں پورے ضلع کو متاثر کیا اور اس کا ظہور اس شان سے ہوا کہ عوام و خواص ہی نہیں مشاہیر اہل علم کے دل و دماغ پر چھا گئے، اسی علمی کمال کا فیض تھا کہ احیاء اسلام کی جو تحریک دارالعلوم دیوبند نے چلائی تھی اس میں اہم رول ادا کیا اور اسلام کی صحیح تعلیمات و روایات کی روشنی میں اصلاح و تبلیغ کے مشن میں کامیاب ہوئے۔

جب آپ تعلیم سے فارغ ہوئے تو ضلع اعظم گڈھ مذہبی گروہ بندیوں کی تیز آندھی کے جھونکے میں آچکا تھا اور صحیح اسلامی تعلیمات کی راہ میں تین سمتوں سے تاریکی کے مہیب سائے لہرانے لگے تھے، اس کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ بہار کے ایک طالب علم مولانا شاہ نذیر حسین صاحب شاہ اسحاق محدث دہلوی کے حلقۂ درس سے فیضیاب ہوکر نکلے تو انھوں نے دہلی کی ایک مسجد میں قیام کرکے چند ہی برسوں میں ایک نئے فرقہ کی بنیاد ڈال دی ان کا حلقۂ درس قائم تھا انھوں نے اپنے شاگردوں کو اپنے نئے مسلک کی ترویج اور

نشرواشاعت میں جوش و جذبہ سے بھر دیا، ضلع اعظم گڈھ میں ان کے دو شاگرد انتہائی پر جوش تھے اور اپنے استاد کے مسلک کو پھیلانے میں اپنی ہر امکانی جد و جہد صرف کر دی، ایک حافظ عبداللہ مئوی ثم غازیپوری جنھوں نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز مئو شہر کو بنایا دوسرے مولانا سلامت اللہ جیراجپوری تھے جو مولانا اسلم جیراج پوری استاد جامعہ ملیہ دہلی کے والد تھے۔

میاں شاہ نذیر صاحب کے یہ دونوں شاگرد اپنے عقیدہ و مسلک میں نہایت متشدد اور اس کے پر جوش مبلغ تھے، مولانا سلامت اللہ جیراجپوری کے جارحانہ انداز بیان کی تردید کے لئے علامہ شبلی نعمانی کو میدان میں آنا پڑا، ان سے مباحثے بھی کئے اور ان کے مسلک کی تردید میں کتاب بھی لکھی، مئو شہر میں یہ مسلک اپنے مخصوص طرز عمل اور ایک خاص حکمت عملی کی وجہ سے فروغ پاتا رہا، بیسویں صدی کے آغاز میں وہ ایک طاقتور حلقہ بن چکا تھا، اس فتنہ کو اس کے خول میں بند کرنے کے لئے علامہ اعظمی اپنے رفقاء کے ساتھ میدان عمل میں آئے اور تقریر و تحریر کے ذریعہ اس فتنہ پر قابو پایا اور اس کا آگے بڑھتا ہوا قدم رک گیا۔

دوسرا فتنہ بریلی سے سیلاب کی طرح امنڈتا ہوا چلا اور ضلع اعظم گڈھ کی سرحدوں تک آپہونچا اور مئو سے قریب قصبہ ادری میں ایک ہندوستان گیر شہرت کا مناظرہ ہوا جس میں اصل مناظر تو علامہ اعظمی کے شاگرد مولانا محمد منظور نعمانی سنبھلی تھے، لیکن علامہ اعظمی نے مناظرہ میں اہم کردار انجام دیا، اس مناظرہ میں کامیابی کا اثر یہ ہوا کہ پورا ضلع بدعات و خرافات کی لعنتوں سے ... صرف چند آبادیاں سمندر میں جزیرہ کی حیثیت میں رہ گئیں اور وہ اصلاح پذیر نہیں ہوئیں۔

تیسرا فتنہ جس کا مرکز تنقل تو لکھنؤ تھا لیکن اس کے مسموم اثرات بہت دور تک تھے، وہ شیعیت کا فتنہ تھا، علامہ اعظمی کے روابط امام اہل سنت مولانا عبدالشکور لکھنوی سے بہت مستحکم تھے اس لئے امام اہل سنت نے شیعہ مجتہدین کی اہم ترین کتابوں کی تردید کے لئے علامہ اعظمی کو منتخب فرمایا، آپ نے شیعہ مجتہدین کی کتابوں کے جواب میں انتہائی معرکۃ الآراء رسالے اور کتابیں لکھیں جو اسی زمانہ میں شائع ہوئیں اور پھر اس محاذ پر کچھ

دنوں کے لئے سناٹا چھا گیا۔

غرضیکہ ان تینوں محاذوں پر علامہ اعظمی نے اپنے علمی فضل و کمال اور وسعت مطالعہ کیوجہ سے کامیاب جنگ کی اور فریق مخالف کی زبان بند کر دی، ان تینوں فتنوں کے رد میں آپ نے جتنی کتابیں اور رسالے لکھے اگرچہ ان کا لب ولہجہ مناظرانہ ضرور تھا لیکن کبھی کوئی جواب الزامی اور سطحی نہیں دیا، ہر فرقہ اور ہر فتنہ کے رد میں آپ کا انداز تحریر ہمیشہ عالمانہ اور محدثانہ رہا، جو تحریر فرمادیا حرف آخر بن گیا، ان کے رد میں جو دلائل و براہین دیئے وہ پتھر کی لکیر بن گئے اور آج تک ان کتابوں اور رسالوں کی یہ حیثیت قائم ہے، یہ علامہ اعظمی کے نوجوانی کا دور تھا ابھی آپ کی تدریسی زندگی کا آغاز ہوا تھا، معرکہ آرائی، بحث و مباحثہ عمر کا تقاضا تھا، ٹھوس علمی کاموں کی بنیاد تو بعد میں پڑی، جب آپ جامعہ مفتاح العلوم کے شیخ الحدیث ہوئے۔

ان علمی سرگرمیوں کیوجہ سے ہندوستان کے مشاہیر علماء کی نگاہیں علامہ اعظمی پر پڑنے لگی تھیں، جوہر کی قدر وقیمت جوہری پہچاننے لگے تھے، امام اہلسنت مولانا عبدالشکور لکھنوی نے سب سے پہلے آپ کے علمی مقام و مرتبہ کو پہچانا، اس دور کی ایک دوسری اہم علمی شخصیت علامہ سید سلیمان ندوی کی تھی وہ ان دنوں دارالمصنفین اعظم گڈھ میں قیام پذیر تھے، اور علامہ شبلی کی سیرۃ النبی کی مزید جلدیں مرتب کر رہے تھے، علامہ اعظمی بغرض مطالعہ دارالمصنفین جایا کرتے تھے، علامہ ندوی سے تعارف ہوا انھوں نے گفتگو سے اندازہ لگایا کہ فن حدیث اور اسماء الرجال میں ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اس تاثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن روایتوں کے بارے میں سید صاحب کو شبہہ ہوتا تو علامہ اعظمی سے استصواب کرتے، بحث کرتے ان کے دلائل سنتے اور پھر انھیں کی رائے کو ترجیح دیتے۔

اسی دور میں علامہ اعظمی نے رجال طحاوی پر کام شروع کیا اور ایک ضخیم کتاب مرتب فرمائی، جس کے کچھ حصے کو دیکھ کر علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے حیرت واستعجاب کا اظہار فرمایا اور کہا کہ اس کم عمری میں اتنی اہم ترین کتاب کی تصنیف؟ لیکن کتاب کی ترتیب کے

بعد وہ مسودہ علامہ اعظمی کے کاغذات کے انبار میں پڑا رہا اور طباعت کی نوبت نہیں آئی اب مستقبل قریب میں اس کے شائع ہونے کے کچھ آثار نظر آرہے ہیں، خدا کرے کہ یہ کتاب جلد از جلد شائع ہو جائے۔

اسی دور میں مصر کے مشہور محدث احمد محمد شاکر کی مسند احمد کی شرح شائع ہو رہی تھی اور علامہ اعظمی کے مطالعہ میں تھی، آپ نے شرح میں کئی غلطیاں، خامیاں، سہو قلم اور لغزشیں پائیں، آپ نے اپنی رائے مصنف کو لکھے گئے اپنے خط میں ظاہر فرمائی اور اپنی رائے کے بارے میں ثبوت وشہادت بھی پیش کی، جب یہ مفصل خط احمد محمد شاکر مصنف کتاب کو ملا تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ ہندوستان جیسے غیر اسلامی ملک میں اتنا بڑا محدث اور علوم نبوت کا مزاج داں موجود ہے۔ انھوں نے پورے ادب واحترام کے ساتھ اپنی غلطیوں کو تسلیم ہی نہیں کیا بلکہ اپنی کتاب کی پندرہوں جلد میں اپنی غلطی پر انتباہ کا پورا واقعہ لکھ دیا اور علامہ اعظمی کے شکریہ کے ساتھ ساتھ بہت سی دعائیں دیں، یہ مصنف کے ظرف اور بلند اخلاق کی بات تھی کہ انھوں نے برملا اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا اور خود اپنی تصنیف میں اس کا ذکر کر کے اس واقعہ کو سند دوام بھی دیدی۔

اسی دور میں مصر کے ایک محقق عالم حنفیت کی زبردست وکالت کرنے والے علامہ زاہد الکوثری کا علمی تعاون کیا تو اس کا ذکر نہایت شاندار الفاظ میں علامہ کوثری نے اپنی کتاب میں کیا، اسی واقعہ کے بعد شام کے مشہور حنفی عالم جو اصول حدیث پر عبور کی وجہ سے اس فن میں ابو عبداللہ الحاکم نیساپوری سے کسی طرح کم نہیں تھے، انھوں نے علامہ اعظمی سے عقیدتمندانہ تعلق قائم کیا آپ سے اجازت حدیث لے کر اپنا استاد اور شیخ تسلیم کر لیا۔

علامہ اعظمی کا خاص موضوع حدیث اور فن اسماء الرجال تھا اور ان میں آپ کو درجۂ کمال حاصل تھا اور جب کسی اہل علم کو کسی خاص موضوع سے دلچسپی بڑھ جاتی ہے تو اس کا قدم کسی منزل پر نہیں رکتا، غور وفکر، تلاش وجستجو، تحقیق وتفتیش کی تمام راہوں میں تگ ودو بڑھ جاتی ہے تاکہ اس فن کی تمام جزئیات پر اس کو مکمل عبور حاصل ہو جائے،

رطب ویابس کے پرکھنے کا اسکو ملکہ ہو جائے، کھرے کھوٹے کی شناخت میں اس کو کمال حاصل ہو جائے، اس لئے اس فن کے تمام ذخیرۂ علمی تک رسائی کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے، بالکل یہی حال علامہ اعظمی کا تھا۔

اس سلسلہ میں آپ کی دلچسپی اس حد تک بڑھی کہ تدریسی زندگی ان کی علمی تشنگی کو بجھانے میں حارج نظر آنے لگی، اس لئے آپ نے اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور اپنے خام سفالہ پوش مکان کی ایک چھوٹی سی کوٹھری تک اپنے کو محدود کرلیا، جب کہ آپ کو مرکزی اداروں میں بڑے بڑے منصبوں اور بڑی بڑی تنخواہوں کی پیشکش کی گئی، لیکن آپ نے ان کی طرف نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی، وہ اس معاملہ میں علامہ سیوطی کے ذہن و مزاج کے بن گئے، جنھوں نے آبادی چھوڑ کر ایک باغ میں سکونت اختیار کرلی کیونکہ وہ اپنی علمی سرگرمیوں کے لئے عوامی رابطہ کو سخت مضر سمجھتے تھے، اپنے جھونپڑے سے باہر کی دنیا سے بے خبر اور بے تعلق ہو گئے، وہ صرف اپنے علمی کاموں کے ہو کر رہ گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسلامی علوم وفنون کی تاریخ میں زندۂ جاوید ہو گئے اور پوری علمی دنیا میں شہرت دوام کے مالک ہو گئے، جب کہ انھوں نے طائر شہرت کے سارے پر کتر دیئے تھے، لیکن آج ان کے ذکر خیر سے تمام اسلامی علوم کے مراکز گونج رہے ہیں، اور ان کی کتابوں کے حوالے دیئے جا رہے ہیں۔

اس کے برخلاف بعض شخصیتیں شہرت وناموری کے وسائل اختیار کرتی ہیں، لیکن ان کی یہ شہرت وناموری کسی علمی کارنامے کی وجہ سے نہیں ہوتی، اس لئے ان کی شہرت وناموری، عزت واحترام اعزاز واکرام کی حیثیت ایک تیز آندھی کی ہوتی ہے، جو آئی اور گذر گئی، ان کا شور وغوغا ان کی زندگی تک ہے ان کی آنکھیں بند ہوئیں اور شہرت کے نقارے خاموش ہوئے۔

علامہ اعظمی اول الذکر ذہن ومزاج کے علماء کی صف میں تھے، انھوں نے شہرت وناموری کے سارے دروازے از خود بند کر دیئے تھے، لیکن ان کے عظیم علمی کارناموں

نے ان کو پوری اسلامی دنیا میں روشناس کرادیا اور آج تصنیف و تالیف کے میدان میں کام کرنے والے علامہ اعظمی کے حوالے دینے میں فخر محسوس کرتے ہیں، اور ہمیں یقین ہے کہ آئندہ علم و تحقیق کا معیار بلند سے بلند تر ہو جائے گا تو علامہ اعظمی کے افکار و خیالات اور آپ کی علمی تحقیقات کو بطور سند پیش کیا جائے گا۔

علامہ اعظمی کی شہرت کا راز ان کے عظیم الشان علمی کارناموں میں پوشیدہ ہے جو مسلسل عالمی پیمانے پر شائع ہوتے رہے، بر صغیر ہی نہیں عرب ممالک حجاز شام اور مصر سے لے کر یورپ کے دانشکدوں تک آپ کی کتابیں پہونچیں عظمت و احترام کے ہاتھوں لی گئیں اور پڑھی گئیں۔

آپ نے اپنی زیادہ توجہ حدیث کے ان مخطوطات کی طرف فرمائی جو صحاح ستہ سے پہلے عالم وجود میں آئیں، اب تک مستشرقین صحاح ستہ کو پیش نظر رکھ کر احادیث کی صحت سے انکار کرتے تھے، کیوں کہ یہ سارے احادیث کے مجموعے تیسری صدی میں مرتب ہوئے، جب ان کتابوں سے پہلے کے مجموعے دریافت ہو گئے اور صحاح ستہ کی سندوں کی تصدیق و تائید ہو گئی تو بڑی حد تک ان کی زبانیں بند ہوئیں اور منکرین حدیث کا زور ٹوٹا، محدث اعظمی نے احادیث کے جن مخطوطات کو اپنی تصحیح اور تعلیق و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا اس کا اجمالی تعارف یہاں دیا جارہا ہے۔

مسند حمیدی : (الامام الحافظ ابو بکر عبداللہ بن زبیر الحمیدی المتوفی ۲۱۹ھ)

حمیدی امام بخاری کے استاذ ہیں ان کا مرتب کردہ مجموعہ حدیث مسند حمیدی کے نام سے اہل علم میں معروف ہے، مسند حمیدی کے تین مخطوطے ہندوستان کے کتب خانوں میں تھے، چوتھا مخطوطہ دمشق کے کتب خانہ ظاہریہ میں تھا ان کے علاوہ اور کہیں کسی نسخے کا پتہ نہیں تھا آپ نے ہندوستان کے تینوں مخطوطات کو پیش نظر رکھ کر کام شروع کر دیا اور جب کتاب پریس میں چلی گئی تو چوتھا مخطوطہ حاصل ہوا جس سے مسند حمیدی کے نصف آخر میں استفادہ کیا گیا، علامہ اعظمی نے مسند میں مذکور حدیثوں کو دوسرے مجموعہائے حدیث میں

تلاش کرا کے ان کے حوالے دیئے، اگر اس کے متعدد طرق ہیں تو اس کی بھی نشاندہی کر دی گئی، تصحیح متن کے ساتھ ساتھ الفاظ غریبہ کا معنی و مفہوم بھی بتادیا ہے، اور جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں حدیث کی تشریح و توضیح اس کے حقیقی مفہوم و مراد کی بھی تعیین فرمادی ہے، تعلیقات و تحشیہ اور توضیحات نے کتاب کی ضخامت کو تقریباً دوگنا کردیا ہے، جہاں کوئی ایسی روایت ہے جو مسند حمیدی کے علاوہ دوسرے مجموعوں میں نہیں ہے اس پر محققانہ کلام کیا گیا ہے۔ جیسا کہ رفع یدین کی روایت کے سلسلہ میں کیا گیا ہے چونکہ یہ کتاب مسانید کے اصول پر ہے اس لئے کسی خاص مسئلہ سے متعلق حدیث کی تلاش دشوار تھی، آپ نے ابواب فقہیہ کے انداز پر اس کی ایک فہرست مرتب فرما کر اس مشکل کو آسان کردیا ہے، کتاب ۱۹۶۳ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔

کتاب الزهد والرقائق: (الامام شیخ الاسلام عبداللہ بن مبارک المروزی المتوفی ۱۸۱ھ)

عبداللہ بن مبارک دوسری صدی ہجری کے محدث ہیں، آپ کی کتاب کا نمونہ شاہ قطر نے علامہ اعظمی کو بطور ہدیہ بھیجا تھا، آپ نے اپنے ذرائع سے کتاب کے دوسرے مخطوطوں کا پتہ چلایا تو معلوم ہوا کہ مصر میں اس کے تین مخطوطے ہیں، اس کی مائیکرو فلم منگوائی، ان چاروں مخطوطوں کو پیش نظر رکھ کر تصحیح متن کی گئی، تمام روایتوں کی تخریج کی گئی اور بتایا گیا کہ محدثین و مفسرین نے کہاں کہاں ان کا ذکر کیا ہے، حوالے مستند دیئے گئے ہیں اور کمزور حوالوں سے صرف نظر کیا گیا ہے، دقیق الفاظ کی تشریح کردی گئی ہے، مختصر لفظوں میں کہیں کہیں حدیث کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ تمام غلطیوں کی نشاندہی کر کے ان کی تصحیح کی گئی، مرسل، معضل روایتیں جن راویوں کی ہیں ان کی فہرست مرتب کردی گئی ہے، اسی طرح مقطوع اور موقوف روایتوں کے راویوں کی بھی فہرست دی گئی ہے، محقق نے اصل کتاب سے پہلے ۶۳ صفحات کا ایک مقالہ سپرد قلم کیا ہے، جس میں آپ نے بتایا ہے کہ اسلام میں زہد و رقائق کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے بعد آپ نے اس موضوع پر مرتب کی جانے والی اٹھارہ کتابوں کی نشاندہی کی ہے، کتاب پہلی بار ۱۳۸۵ھ میں شائع ہوئی۔

سنن سعید بن منصور: (الامام الحافظ سعید بن منصور بن شعبۃ الخراسانی المکی المتوفی ۲۲۷ھ) سعید بن منصور المکی امام احمد بن حنبل، امام مسلم اور امام ابوداؤد جیسے اکابر محدثین کے شیخ اور استاد ہیں، اور خود انھوں نے امام مالک اور حماد بن زید سے روایت کی ہے، محدثین ان کی کتاب السنن سے واقف تھے، جو صحاح ستہ سے بہت پہلے مرتب ہوئی تھی، لیکن متاخرین کو اس کے کسی نسخہ کا پتہ نہ چل سکا تھا، خدا جزائے خیر دے ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس (فرانس) کو انھوں نے اس مخطوطہ کو ڈھونڈھ نکالا جو ترکی کے مشہور کتبخانہ کوبریلی میں تھا، لیکن پوری کتاب کے بجائے صرف اس کی تیسری جلد کا مخطوطہ ملا، وہی مخطوطہ محقق علام علامہ اعظمی کے پاس آیا اور آپ کی تصحیح اور تعلیق و تحشیہ کے بعد کتاب منظر عام پر آئی، کسی کتاب کا اگر ایک ہی مخطوطہ ہو تو اس کی تصحیح و تحقیق ایک دقت طلب امر بن جاتی ہے، نصوص کے ایک ایک لفظ کی تصحیح و تحقیق اسی وقت ممکن ہے جب احادیث کے دوسرے مجموعوں پر محقق کی پوری نظر ہو، علامہ اعظمی نے اپنے وسعت مطالعہ کی بنا پر مخطوطہ کی ہر ہر روایت کی تحقیق و تصحیح کی، جہاں کہیں سہو یا کتابت کی غلطی نظر آئی اس کی نشاندہی فرمائی اور تصحیح کر کے مستند حوالہ دیدیا، غریب الفاظ کے معانی و مفہوم اور کہیں کہیں روایت کی توضیح بھی فرمادی ہے، کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

المصنف: (الامام الحافظ ابو بکر عبد الرزاق بن ہمام الصنعانی المتوفی ۲۱۱ھ)
مصنف عبد الرزاق احادیث و آثار کا ایک نہایت عظیم الشان ذخیرہ ہے جس سے امام احمد ابن حنبل، اسحاق بن راہویہ، امام بخاری، امام مسلم جیسے جلیل القدر محدثین اور اساطین امت نے استفادہ کیا ہے، لیکن اس کا کوئی مکمل نسخہ دنیا کے سامنے نہیں آسکا تھا، اس کتاب کے اجزا دنیا کے مختلف کتب خانوں میں بکھرے ہوئے تھے، ضرورت تھی ان تمام اجزاء کو جمع کر کے تصحیح، تعلیق و تحشیہ سے مزین کر کے علمی دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور مکمل کتاب اہل علم کے سامنے آجائے، لیکن دنیا بھر میں بکھرے ہوئے ان اجزاء کا اکٹھا کرنا، ساڑھے چھ ہزار صفحات کی کتاب اور اکیس ہزار احادیث پر مشتمل اس مجموعۂ حدیث کے

مخطوطے کو حرفاً حرفاً پڑھنا، ہر حدیث کی تخریج کرنا حدیث کے دوسرے متداول مجموعوں کو پیش نظر رکھ کر متن کی تصحیح کرنا، پورے ایک ادارہ کا کام تھا، اس امر عظیم کو علامہ اعظمی نے تن تنہا انجام دیا اور آج وہ علمی دنیا کے سامنے پوری تحقیق اور تحشیہ کے ساتھ طبع ہو کر آچکی ہے، جس نے پوری علمی دنیا کو علامہ اعظمی کے فضل و کمال کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا، آپ نے متن کی تصحیح پر پوری توجہ فرمائی، ایک ایک لفظ کو جانچا، پرکھا ہے، حتی کہ سہو کتابت سے بھی کسی لفظ کی کمی و بیشی ہو گئی ہے تو اس کو بھی حوالوں کے ساتھ درست کر دیا ہے، مصنف کی روایتوں کو حدیث کے دوسرے مجموعوں میں تلاش کر کے اس کے حوالے دیدیئے ہیں، نصوص کی تصحیح کے وقت تقریباً پینتیس مجموعہائے حدیث کو پیش نظر رکھا گیا ہے، ہر ایک کے حوالے حواشی میں موجود ہیں، کتاب گیارہ ضخیم جلدوں میں ہے، پہلا ایڈیشن ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا، اس کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن بیروت سے شائع ہو کر علمی دنیا میں پہونچا۔(۱)

المطالب العالیة بزوائد (حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ)

المسانید الثمانیة: حافظ ابن حجر عسقلانی نے آٹھ مسندوں کی روایتوں کو ابواب فقہیہ کی ترتیب پر جمع کیا ہے، یہ کتاب مخطوطہ کی شکل میں تھی، علامہ اعظمی کو اس کی تلاش تھی، سعیدیہ لائبریری حیدر آباد میں اس کا ایک نسخہ تھا مگر وہ ناقص تھا، مکتبہ علمیہ کے مدیر شیخ محمد سلطان نمنکانی نے ترکی کے کتب خانوں سے اس کو ڈھونڈھ نکالا، وہاں ان کو کتاب کے دو مخطوطے ملے، دونوں کے فوٹو لیکر علامہ اعظمی کو ارسال کر دیئے، آپ نے متن کی تصحیح کی اور موجودہ طرز کے مطابق علامتوں اور نشانوں کے ساتھ نقل کرایا اور اضافہ کی عبارت کو قوسین کے درمیان رکھا تاکہ اصل کتاب سے امتیاز باقی رہے، روایتوں پر نمبر شمار ڈالے، تصحیح میں کمال احتیاط کے پیش نظر اس موضوع پر مرتب کی جانے والی ایک اور کتاب حافظ شہاب بوصیری کی " مختصر اتحاف السادة المهرة فی

(۱) پہلا ایڈیشن بھی بیروت ہی سے شائع ہوا تھا۔ (مسعود)

زوائد المسانید العشرۃ" کو سامنے رکھا۔ روایتوں کے بارے میں آپ نے اپنی رائے بھی دی ہے، حدیث کے مرفوع، موقوف، مرسل یا موصول ہونے کی وضاحت کی، سند کے رجال پر بھی کلام کیا ہے اور اس سلسلہ میں آپ نے اپنی دوٹوک رائے دی ہے، کتاب کویت کے مطبعہ عصریہ (۱) سے ۱۹۷۰ء میں چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

مختصر الترغیب والترھیب: (حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ)

یہ کتاب مشہور محدث حافظ منذری کی کتاب کی تلخیص ہے، کتاب میں ہر طرح کی روایتیں تھیں، حافظ ابن حجر نے تلخیص میں صحیح روایتوں کو لیا اور کمزور روایتوں کو ترک کردیا، کتاب مختصر ہو گئی اور مستند بھی۔ کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی تھی، علامہ اعظمی کو ہندوستان کے کتب خانوں میں اس کے تین مخطوطے ملے، آپ نے ان کو سامنے رکھ کر متن کی تصحیح کی، راویوں کے ناموں میں کہیں کہیں فرق تھا اس کی وضاحت فرمائی کتاب مکتبہ الغزالی دمشق سے شائع ہوئی۔ (۲)

المصنف لابن ابی شیبۃ: (عبداللہ بن محمد بن ابی شیبۃ العبسی المتوفی ۲۳۵ھ)

مصنف ابن ابی شیبہ احادیث کا ایک ضخیم مجموعہ ہے، علامہ اعظمی نے تصحیح متن کے ساتھ تعلیق و تحشیہ میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے، کتاب کا مکمل مسودہ تیار ہے، بہت پہلے مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس کی پانچ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، میرا خیال ہے کہ اب اس کی ساری جلدیں شائع ہو چکی ہوں گی۔ (۳)

علامہ اعظمی کے ان کے علاوہ بھی کئی دوسرے علمی شاہکار ہیں جیسے تلخیص

(۱) یہ کتاب مطبعہ عصریہ سے چھپ کر کویت کی وزارت اوقاف کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

(۲) یہ کتاب پہلی دفعہ مجلس احیاء المعارف مالیگاؤں سے شائع ہوئی، دوبارہ اس کو مکتبۃ الغزالی دمشق نے شائع کیا۔

(۳) علامہ اعظمی کی حیات میں اس کی چار جلدیں شائع ہوئی تھیں، آپ کی وفات کے بعد سارا مسودہ ناشرین کے پاس چلا گیا، اب معلوم نہیں وہ کس مرحلہ میں ہے (مسعود)

خواتم جامع الأصول، کشف الاستار، تکمیل الاذہان ، وغیرہ وغیرہ شائع ہو کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ علامہ اعظمی کا پہلا علمی شاہکار الحاوی لرجال الطحاوی کا مکمل مسودہ طباعت کے لئے بالکل تیار ہے، اب تک یہ کتاب شائع نہیں ہو سکی ہے۔" الاتحافات السنیة بذکر محدثی الحنفیة" بھی مکمل ہے، طباعت کے انتظار میں ہے،ان کے علاوہ آپ کی اٹھارہ کتابیں مختلف موضوعات پر اردو زبان میں ہیں۔

یہ علامہ اعظمی کے حالات و واقعات اور علمی کارناموں کی مختصر اور ایک اجمالی فہرست ہے ، اسی اجمال کی تفصیل آپ کو اس کتاب میں ملے گی جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، کتاب کے مصنف ایک نوجوان اور ذہین و فطین عالم ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی ہیں جو جدید وقدیم دونوں طرز کے علمی مراکز کے فیض یافتہ ہیں ، اور تصنیف و تالیف کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، مصنف نے کتاب کی ترتیب، میٹر اور مواد کی تلاش و جستجو میں محنت اور بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے، علامہ اعظمی کی ستر سالہ علمی زندگی کی تحریروں، مسودوں، مخطوطات ومکتوبات اور دوسرے بہت سے کاغذات کے انبار کو گرد و غبار سے صاف کیا، کاغذات کے ہر چھوٹے بڑے ٹکڑوں کو ہیرے جواہرات کی طرح سنبھال کر رکھا ان کو پڑھا اور ان کا بارک بینی سے جائزہ لیا اور ان سے جو معلومات حاصل کیں، ان کو بڑے سلیقہ سے اس کتاب میں پیش کر دیا ہے، کتاب مکمل طور پر محدث اعظمی کی تحریروں کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے، ذاتی معلومات اور غیر مستند روایتوں کا کتاب میں کوئی دخل نہیں، اس لئے کتاب ہر طرح اور ہر اعتبار سے مستند اور قابل اعتبار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کتاب عوام وخواص کے ہر طبقہ میں اور بالخصوص اہل علم کے ہر حلقہ میں شرف پذیرائی حاصل کرے گی۔

اسیر ادروی

مدیر ترجمان الاسلام بنارس

پہلا باب

وطن اور خاندان

پہلا باب

وطن اور خاندان

وطن اصلی مئوناتھ بھنجن سے سات آٹھ کلو میٹر کے فاصلہ پر شمال مشرق کی سمت "ادری" نام کا ایک مشہور قصبہ ہے، علامہ اعظمی کا خاندان وہیں آباد تھا، آپ کے پردادا جن کا نام "خوشحال" تھا، ترک وطن کر کے مئو آئے اور دریائے ٹونس کے کنارے محلہ پٹھان ٹولہ میں فروکش ہوئے، علامہ اعظمی نے خود لکھا ہے:

"خوشحال جد پدر من از ادری انتقال مکان کردہ بمو آمد و در محلہ پٹھان ٹولہ اقامت کرد"

(میرے پدر بزرگوار کے دادا خوشحال ادری سے نقل مکان کر کے مئو آئے اور محلہ پٹھان ٹولہ میں اقامت اختیار کی)

نسب خوشحال تک آپ کا نسب یہ ہے: "حبیب الرحمٰن بن محمد صابر بن عنایت اللہ بن خوشحال"۔ چند پشتوں کا یہ مختصر نسب نامہ آپ نے اپنی یاد داشت اور متفرق اوراق پر تحریر فرمایا ہے، اس کے بعد خوشحال کی ولدیت ایک جگہ سلطان اور دوسری جگہ فخر الدین لکھی ہے، لیکن اس میں کوئی تعارض نہیں قرار دیا جا سکتا، اس لئے کہ ممکن ہے ایک ہی شخصیت کے دو نام ہوں، یا ایک لقب یا عرفی نام ہو اور دوسرا اصلی نام۔ خوشحال کا انتقال ۱۲۹۲ھ کے لگ بھگ ہوا۔

خوشحال کے کئی ایک اولاد ہوئی، جن میں ایک علامہ اعظمی کے جد امجد "عنایت اللہ" تھے۔
عنایت اللہ کے حالات زندگی تمام تر پردۂ خفا میں ہیں، ان کی نسبت سوائے اس کے کچھ اور نہیں معلوم کہ ۱۳۱۰ھ تک وہ بقید حیات تھے، لیکن ان کے صاحبزادے اور علامہ اعظمی کے والد محترم کے متعلق جو واقعات اور تصریحات ملتی ہیں، وہ ان کے ورع و تقوی کی شہادت دیتی ہیں، اس سے کم از کم اتنا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اولاد کی تعلیم و تربیت میں ان کا لازمی طور پر اہم اور بڑا حصہ رہا ہوگا، اور زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ ان کے صاحبزادے مولانا محمد صابر صاحب انھیں کا اثر قبول کر کے اس درجہ تک پہونچے ہوں گے۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

والد ماجد مولانا محمد صابر صاحبؒ عنایت اللہ مرحوم کی صلب سے مولانا محمد صابر صاحب پیدا ہوئے، تاریخ ولادت کا بتصریح علم نہیں، لیکن چونکہ خود علامہ اعظمی نے ان کی عمر وفات کے وقت تہتر یا چہتر برس لکھی ہے، اس حساب سے ان کا سال پیدائش ۱۲۹۰ھ یا ۱۲۹۲ھ ہو سکتا ہے۔

مولانا محمد صابر صاحب نے مولانا عبد الغفار صاحب عراقی مئوی اور ان کے بھائی مولانا ابوالبرکات صاحب اور مولانا ابوالحسن صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، درسیات کی بیشتر کتابیں اسی خانوادۂ علم و ادب کے بزرگوں سے پڑھ کر علوم مروجہ کی تحصیل کی، اور مولانا ابوالحسن صاحب کی خدمت میں صحاح ستہ پڑھ کر ۱۳۲۹ھ میں سند فراغ حاصل کی۔

مولانا محمد صابر صاحب گوناگوں اوصاف کے حامل تھے، علم کی لگن اور تعلیم و تدریس کی اس قدر تڑپ تھی کہ عمر عزیز کا تقریباً نصف حصہ محلہ کی مسجد میں بڑی عمر والوں کو تعلیم دینے میں گذار دیا، تذکرۂ علماء اعظم گڈھ کے مصنف لکھتے ہیں:

"اور تقریباً ۳۶ سال تک اپنے محلے کی مسجد میں بڑی عمر والوں کو فارسی اور دینیات کی تعلیم دیتے رہے۔ اس طویل مدت میں ایک کثیر جماعت نے آپ سے استفادہ کیا۔"(۱)

(۱) دیکھئے ضمیمہ تذکرۂ علماء اعظم گڈھ

ان کے استاد مولانا ابو الحسن عراقی مئوی کے ہاتھوں جب مدرسہ مفتاح العلوم کا قیام عمل میں آیا، تو بیک وقت ان کو نائب ناظم اور خزانچی کا عہدہ تفویض کیا گیا، جس کو ایک مدت تک وہ نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے، اور کام کی نزاکت کے باوجود ان کی امانت و دیانت کی بدولت دامن ہمیشہ بے داغ اور شک وشبہہ سے پاک رہا۔

مولانا اپنے وقت کے کاملین میں تھے، نہایت متقی وپاکباز، عابد وزاہد، متواضع اور خاکسار، اور مکارم اخلاق کے پیکر تھے، قناعت و استغناء ان کی طبیعت کا خاصہ تھا، علامہ اعظمی اپنی بیاض میں تحریر فرماتے ہیں:

"پدر بزرگوار وولی نعمت ایں فقیر عالم باسند و تلمیذ مولانا عبد الغفار و اخویہ و در طریقہ چشتیہ مرید حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، بغایت متشرع و متقی وزاہد و تہجد گذار و مہمان نواز و بے نفس و خوش اخلاق بود، وكان أواها تلاء أ للقرآن…"

(اس فقیر کے پدر بزرگوار اور ولی نعمت سند یافتہ عالم اور مولانا عبد الغفار صاحب اور ان کے دونوں بھائیوں کے شاگرد اور سلسلۂ چشتیہ میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید تھے، حد درجہ پابند شریعت، خدا ترس، دنیا بیزار، تہجد گذار، مہمان نواز اور خوش اخلاق تھے، بہت زیادہ گریہ وزاری اور قرآن کی تلاوت کرنے والے تھے۔)

تھوڑے فرق کے ساتھ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

" كان والدى من عباد الله الصالحين والعلماء العاملين، معروفا بصلاحه وتقواه وملازمة التلاوة والذكر بين العامة والخاصة، مرموقاً اليه بنظر الإجلال، معتقداً بين المسلمين وغيرهم، اشتغل بالفقه والتفسير على الشيخ أبى الحسن المئوى وقرأ عليه الكتب الستة من الصحاح حرفاً حرفاً وتلقن الذكر من العارف بالله الشيخ أشرف على التهانوى الفقيه المحدث المفسر"(۱)

(۱) المآثر ج۴ ش۳ ص۹۱۔

(میرے والد اللہ کے نیک بندوں اور باعمل علماء میں تھے، اپنی نیکی و پارسائی، پابندیٔ تلاوت اور ذکر واذکار کے باعث عوام وخواص سب میں مشہور تھے، عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، مسلم اور غیر مسلم سب ان کے عقیدتمند تھے، فقہ و تفسیر کا درس مولانا ابوالحسن مئوی کی خدمت میں حاصل کیا اور انھیں کے پاس صحاح ستہ حرفاً حرفاً پڑھی اور محدث و مفسر و فقیہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے ذکر سیکھا۔)

معاملات کے کھرے اور صاف ستھرے تھے، اجیر کو اس کی اجرت اور مزدور کو مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دیدیتے تھے، مزدور نے اپنا کام ختم کیا نہیں کہ مزدوری اس کے ہاتھ میں ہوتی، چنانچہ ان کے بارے میں مولانا رشید احمد صاحب کی روایت ہے:

"وہ اپنے یہاں جب مزدور کو کام پر لگاتے تھے، تو ان کا کام اور وقت پورا ہونے سے پہلے ہی ہر ایک مزدور کی اجرت الگ ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو جاتے، اور جونہی مزدور اپنے کام سے فارغ ہوتا اسے فوراً مزدوری دیدیتے۔" (۱)

اسلامی آداب، اخلاقی اقدار اور انسانی اخوت و ہمدردی کے بڑے قائل تھے، اونچ نیچ ذات پات کا کوئی امتیاز نہیں تھا، ان کے نزدیک بڑا وہی تھا جسے شریعت نے بڑا قرار دیا ہو، بالادستی یا زیردستی ان کے یہاں بڑائی کا معیار اور امتیاز کا پیمانہ نہیں تھی، ان کی نگاہ میں ہر وہ شخص عزت و احترام کا مستحق تھا جس کی توقیر کا اسلام نے حکم دیا ہے، یہ عزت و توقیر اس حد تک تھی کہ:

"گھر پر جو مزدور کام کرتے تھے، گھر کے بچوں کو حکم تھا کہ ہر ایک کی عمر کے لحاظ سے اس کے تعظیمی خطاب کے ساتھ نام لیں، خواہ وہ کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو، مثلاً فلاں بھیا، فلاں چچا، فلاں بابو وغیرہ۔" (۲)

سلام کرنے میں بہت پیش پیش تھے، آشنا ہو یا غیر آشنا جہاں کوئی مسلمان صورت شخص نظر آتا فوراً سلام کرتے، مولانا کا یہ ایسا وصف تھا کہ اس میں کوئی ان سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا، ہمیشہ سلام کرنے میں پہل کرتے اور سامنے والا کوشش کے باوصف ان پر سبقت نہیں کر سکتا تھا۔

(۱) المآثر ج ۴ ش ۳ ص ۸۷ (۲) ایضاً

بڑے علم دوست، غریب پرور، سیر چشم اور مہمان نواز تھے، مہمانوں کی خاطر داری بڑی فراخ دلی اور کشادہ جبینی سے کرتے، طلبہ کی خوب مدارات کرتے اور ان میں سے کچھ کے قیام و طعام اور دیگر ضروریات کی کفالت بھی کرتے تھے، مولانا اعجاز احمد صاحب، مولانا رشید احمد صاحب اور حاجی سعید احمد صاحب کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

"ہمیشہ اپنے گھر پر مدرسہ کے چند غریب طلبہ کو رکھتے تھے، جو دن کو مدرسہ میں تعلیم حاصل کرتے اور رات میں مولانا کے یہاں مقیم ہوتے، کھانا ناشتہ سب یہیں ہوتا، راقم الحروف جس گاؤں کا رہنے والا ہے، وہاں کے کئی طلبہ مولانا مرحوم کی اس فیاضی اور کشادہ دستی سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔"(۱)

مطالعہ کے شوقین اور کتابوں کے دلدادہ تھے، ذکر و شغل کیساتھ مطالعہ و کتب بینی میں بھی وقت صرف کرتے۔ بہت سی کتابیں جو ان کی خرید کردہ اور مملوکہ رہ چکی ہیں، علامہ اعظمی کے کتب خانے میں اب بھی محفوظ ہیں، جو عربی فارسی اردو ہر قسم کی کتابوں پر مشتمل ہیں۔ اور موضوع کے تنوع کی وجہ سے ان کے ذوق سلیم اور کثرت مطالعہ کا پتہ دیتی ہیں۔

امانت و دیانت کے ساتھ انتظامی صلاحیت، سلیقہ مندی نظافت اور لطافت و پاکیزگی بھی بدرجۂ کمال تھی، چھوٹے چھوٹے کام میں بھی حسن انتظام نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔

ان کے اخلاق فاضلہ اور صفات حمیدہ نے ان کو خاص و عام، صغیر و کبیر یہاں تک کہ بزرگوں کی نگاہ میں بڑا اور معزز و مکرم بنادیا تھا، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سے بیعت تھے، مگر خود شیخ کے نزدیک مرید کی قدر کس قدر تھی اس کے لئے مولانا حبیب الرحمٰن جگدیش پوری کے درج ذیل الفاظ پڑھئے:

"ان کے شیخ و مرشد حضرت تھانویؒ انھیں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کے ساتھ بڑا حسن ظن رکھتے تھے، جس کا اندازہ حضرت محدث اعظمی کی اس روایت سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ مولانا نے ان کے ذریعہ ایک رومال حضرت

(۱) المآثر ص ۸۹

تھانویؒ کی خدمت میں بھیجا، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن دامت برکاتہم نے حضرت تھانوی سے عرض کیا کہ والد صاحب نے یہ ہدیہ میں پیش کیا ہے تو حضرت تھانوی نے اس کو سر پر رکھ کر فرمایا، یہ آپ کے والد صاحب کا ہدیہ نہیں تبرک ہے۔"(۱)

والدہ ماجدہ علامہ اعظمی کی والدہ کا نام کلثوم تھا، جو عبدالرحیم صاحب ساکن قاسم پورہ مئو کی صاحبزادی تھیں، عبدالرحیم صاحب کے ایک بھائی حافظ قطب الدین نے ترک وطن کر کے مالیگاؤں میں سکونت اختیار کی، اور دوسرے بھائی ولی اللہ بمبئی میں جاں بحق ہوئے۔

آپ کی والدہ مرحومہ بھی نہایت نیک نفس، خوش خلق، پاکباز، عبادت گذار اور وفا شعار خاتون تھیں، کم گوئی اور خاموش طبعی ان کا وصف خاص تھا، ان کی نسبت خود علامہ اعظمی کے یہ الفاظ پڑھئے:

" كانت رحمها الله حلس بيتها ، لا تخرج من البيت إلا لحاجة كعيادة إحدى النساء في المحلة أو من أهل قرابتها أو زيارة إحدى بنتيها أو أخيها، بغایت پابند نماز وروزہ بود، وکم سخن وخاموش طبع۔"

(مرحومہ خاتون خانہ تھیں، صرف ضرورت کے بقدر گھر سے نکلتی تھیں، جیسے بستی یا رشتہ داری کی کسی عورت کی عیادت کرنی ہو یا اپنے بھائی یا اپنی دونوں لڑکیوں میں سے کسی سے ملنے کیلئے جانا ہوا، نماز روزہ کی نہایت پابند اور کم گو خاموش طبع تھیں۔)

۶/ رجب ۱۳۷۲ھ بروز یکشنبہ ظہر کے وقت اس جہان فانی سے رحلت فرما گئیں، اور دریائے ٹونس کے کنارے اپنے مرحوم شوہر کے پہلو میں مدفون ہوئیں، اللہ ان نیک روحوں پر اپنی رحمت ورضوان کی بارش فرمائے۔ آمین

اس نخل کمال سے حبیب الرحمٰن الاعظمی جیسا نونہال وجود میں آیا۔ ان کے علاوہ اس شجرۂ مبارکہ سے جو شاخیں نکلیں ان میں تین صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں، صاحبزادوں کے نام ہیں (۱) محمد (۲) احمد (۳) محمد، ان میں سے پہلے دونوں صاحبزادے بہت

(۱) ضمیمہ تذکرۂ علماء اعظم گڈھ

پہلے انتقال کر چکے تھے، آخری لڑکے مولوی محمد صاحب نے طویل زندگی پائی، اور مفتاح العلوم سے فارغ بھی ہوئے، ۲۲ر شوال بروز بدھ ۱۴۱۱ھ مطابق ۸ر مئی ۱۹۹۱ء کو ان کی وفات ہوئی۔

صاحبزادیوں کے نام یہ ہیں: مریم، فاطمہ، رقیہ، میمونہ۔

☆☆☆

علامہ اعظمی نے فرمایا:

آپ کا اور ہمارا اس بات پر ایمان ہے، اور اگر کسی کا ایمان نہیں ہے تو ہونا چاہئے کہ دنیا چاہے جتنی آگے بڑھ جائے، سائنس چاہے جس قدر ترقی کر جائے، اور لوگوں کی نگاہ میں لوگوں کی زبان پر چڑھا ہوا لفظ یعنی روشن خیالی، جتنا بھی زیادہ پھیل جائے، آج کل ترقی یافتہ لوگ اپنے لئے عربی زبان میں "متنور" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، یعنی نئی روشنی کے لوگ، یہ نئی روشنی جس قدر بھی تیز ہو جائے، بہر حال اسلام کے جو احکام ہیں، قرآن کی جو تعلیم ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی جو ہدایات ہیں وہ آج بھی اسی طرح رہیں گی، جس طرح آج سے تقریباً چودہ سو برس پہلے تھیں اور قیامت تک اسی طرح رہیں گی، وہی احکام رہیں گے، وہی تعلیمات رہیں گی، وہی ہدایات رہیں گی، اسلام کا وہی نظریہ رہے گا، اسلام کی وہی ساری حقیقتیں رہیں گی، جو اسلام نے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دی ہیں، قرآن کریم جن سے مملو ہے، بھرا ہوا ہے، وہ ساری حقیقتیں اپنی جگہ پر رہیں گی، اس نئی روشنی کو اسلام کی روشنی کے سامنے ماند ہونا پڑے گا، اس کے سامنے اسلام کی روشنی ماند نہیں ہو سکتی، اس روشنی کے جو تقاضے ہیں، اسلام کے تقاضوں کے آگے انھیں دبنا پڑے گا اور اسلام ان کے نیچے نہیں دبے گا، اسلام ہمیشہ کے لئے ایک ابدی تعلیم ہے، وہ قیامت تک کے لئے ایک نہ مٹنے والی اور نہ دبنے والی تعلیم اور ہدایت ہے، اس ہدایت کے اندر کوئی تحریف نہیں ہو سکتی، کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، وہ کوئی تغیر پذیر چیز نہیں ہے۔ اس بات کے اوپر ہمارا ایمان ہے اور اگر کسی کا نہیں ہے تو اس کو ایمان لانا چاہئے، وہ مومن اسی وقت ہوگا جب کہ اس بات کے اوپر وہ یقین رکھے۔

المآثر ج ۳ ش ا ص ۸۴

☆☆☆☆☆☆☆

دوسرا باب

ولادت سے تکمیلِ تعلیم تک

دوسرا باب

ولادت سے تکمیل تعلیم تک

ولادت اور نشو ونما بیسویں صدی عیسوی کے آغاز اور چودہویں صدی ہجری کے عشرۂ ثانیہ کے آخر میں ہندوستان کے مردم خیز صوبہ اتر پردیش کے مشرقی افق سے علم وفضل کا ایک آفتاب طلوع ہوا، ۱۹۰۱ء مطابق ۱۳۱۹ھ - غالباً جمادی الاخری - کا کوئی وقتِ مسعود اور ساعتِ مبارکہ تھی، جب ضلع اعظم گڈھ کے قدیم اور مشہور قصبہ مئو میں محدّث جلیل حضرت مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمان الاعظمی کی ولادت باسعادت ہوئی۔

مولانا عبدالغفار صاحب مئوی عراقیؒ کے والد بزرگوار شیخ عبداللہ عراقیؒ نے تاریخی نام ''اختر حسن'' تجویز فرمایا، دوسرا نام یا - شاید - لقب ''حبیب الرحمان'' رکھا گیا، جس سے مملکت علم میں شہرت دوام حاصل ہوئی۔ اپنے لیے جس کنیت کا انتخاب فرمایا، اس میں بھی امتیازی شان جلوہ گر رہی، اور ''ابوالمآثر''(۱) کا لفظ آپ کی ذات والا صفات پر کچھ یوں منطبق ہوا کہ زندگی عظیم الشان اور قابل صد رشک کارناموں سے عبارت ہوگئی۔ خلق خدا نے ارادت وعقیدت اور فرطِ ادب سے ''بڑے مولانا'' کا خطاب بخشا، جو آپ کا علامتی نام بن گیا، اور آپ کے لیے ایسا خاص ہوا کہ اس فضل وشرف میں آپ کا کوئی اور شریک وسہیم نہ ہوسکا۔ امام اعظم - حضرت امام ابوحنیفہؒ - کی طرف منسوب ہوکر اپنے لیے ''الاعظمی'' کی نسبت اختیار فرمائی(۲)۔

علامہ اعظمیؒ نے جس خاندان اور جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، وہ سامان عیش و

---

(۱) زمانۂ طالب علمی کے ایک خط میں خودکو ''ابوالفیض'' لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً اپنی کنیت ابوالفیض رکھی تھی، لیکن بعد میں اس کو چھوڑ کر ''ابوالمآثر'' اختیار کیا۔

(۲) علامہ اعظمیؒ نے مفتی محمد ظفیر الدین صاحب کو حدیث کی جو سند دی ہے، اس میں لکھا ہے: أبو المآثر حبيب الرحمان الأعظمي مذهباً. (المآثر جلد۱، شمارہ۳، ص:۲۸) لیکن اپنی اس نسبت کا نہایت خوبصورت سبب مولانا ابوالوفا افغانیؒ کو لکھے ہوئے ایک خط میں بیان کیا ہے، لکھا ہے:

''اعظمی اسی طرح کی نسبت ہے، جس طرح کی عارف جامی کی نسبت ہے، فرماتے ہیں:

مولدم جام و رشحۂ قلمم جرعۂ جام شیخ الاسلامی ست
زاں سبب در جریدۂ اشعار بدو معنی تخلصم جامی ست

میرا بھی مولد تابع اعظم گڈھ میں ہے، اور امام اعظم رحمہ اللہ کا متبع ومقلد ہوں، اس لیے بدو معنی اعظمی ہوں''۔

راحت سے محروم ،مال و متاع اور مادی دولت سے خالی اور عاری تھا، سر چھپانے کو معمولی سا سفالہ پوش، خام اور نیم تاریک مکان تھا، اور دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد کسی طرح نانِ شبینہ کا انتظام ہو جاتا، مگر اسی کے ساتھ اللہ نے ایک دوسری لیکن اس سے بڑی نعمت سے نوازا تھا، وہ دولت تھی خشیت الٰہی، خوف خدا، زہد و ورع اور طہارت و تقویٰ، گھر کی پوری فضا دینداری، راستبازی اور مکارمِ اخلاق میں رچی بسی تھی۔ والد اور والدہ دونوں شریعت کے پابند، اتباع سنت میں طاق اور عبادت و طاعت میں فائق تھے۔ خاص کر والد کے متعلق تو یہ پڑھ ہی چکے ہیں کہ تعلیم و تربیت میں اپنے زمانہ میں فرد تھے۔ ان تمام عوامل نے ان کے نوخیز ذہن پر گہری چھاپ چھوڑی اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں زبردست اور موثر کردار ادا کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوچہ علم میں قدم رکھنے سے پہلے ہی دین و مذہب اور شریعت مطہرہ کی عظمت دل و دماغ میں بیٹھ چکی تھی، یہ نقش اولؒ تھا اس کے بعد جتنے نقوش مرتسم ہوئے ان کی حیثیت ثانوی تھی۔

بزرگوں کی دعائیں اور بشارتیں | علامہ اعظمیؒ کو اللہ رب العزت نے جو ذہانت وفطانت فطرتاً ودیعت فرمائی تھی، اس کے آثار وعلامات چہرے و بشرے سے بچپن میں ہی ہویدا تھے، جو لوگ قیافہ شناس تھے اور نگاہِ دوررس رکھتے تھے، انھوں نے پوشیدہ صلاحیتوں اور روشن و تابناک مستقبل کو کم سنی ہی میں بھانپ لیا تھا، انھوں نے دعائیں دیں اور سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا، چنانچہ اس قسم کے کچھ واقعات علامہ اعظمی نے اپنے قلم ایجاز رقم سے خود تحریر فرمائے ہیں، لکھتے ہیں:

"وقد شهدعظماء العلماء بجودة قريحتي والبراعة على أقراني في صغري، منهم:الشيخ ابو البركات(۱) بن عبدالله العراقي شيخ أبي، فانه كان

(۱) مولانا ابو البرکات مئوی ۱۲۹۳ھ میں مئو میں پیدا ہوئے، مولانا عبد الغفار صاحب عراقیؒ کے چھوٹے اور مولانا ابو الحسن عراقیؒ بانی مدرسہ مفتاح العلوم کے بڑے بھائی تھے، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اس کے بعد نوانگر بلیا میں اپنے برادر بزرگ مولانا عبد الغفار صاحب سے مختلف علوم وفنون=

اذا رآنی یتمثل بقول الشاعر: اگر پدر نتواند پسر تمام کند ۰۰۰ ومنهم الشیخ عبد الحق البیلی بھیتی (۱)، فانه لما رأی خزانة کتب والدی سلمه الله، قال: هذا الصبی سیقدر هذه الکتب حق قدرها، ودعا لی الشیخ مولانا أشرف علی(۲) بالبرکة ومسح یده علی راسی وکنت اذ ذاك ابن خمس أو ست،

کی کتابیں پڑھیں اور بالآخر قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہو کر تکمیل علم کی، اس کے بعد درس و تدریس کا آغاز کیا، لیکن عمر نے زیادہ وفا نہ کی اور ۳۹ برس کے سن میں ۱۳۳۲ھ میں طاعون کی وباء میں وفات پائی۔

(۱) ان کا تذکرہ کہیں نہیں مل سکا، علامہ اعظمی کے اساتذہ میں تھے، آپ نے ان سے علم تجوید حاصل کیا تھا۔

(۲) حکیم الامت، مجدد طریقت و تصوف حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۲ء) میں تھانہ بھون میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۲۹۵ھ میں دار العلوم میں داخل ہوئے، اس وقت سے لے کر ۱۳۰۱ھ تک مسلسل دار العلوم دیوبند میں رہ کر حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صدر المدرسین دار العلوم دیوبند اور دیگر اساتذہ دار العلوم سے تعلیم حاصل کر کے فارغ ہوئے، فراغت کے بعد آپ کانپور کے مدرسہ میں مدرس مقرر ہوئے، وہاں چودہ سال تک درس و تدریس، وعظ و تقریر اور فتاویٰ کے ذریعہ علم و دین کی خدمت سر انجام دیتے رہے۔ ۱۳۱۵ھ میں کانپور سے ترک تعلق کر کے متوکلا علی اللہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں اقامت فرمائی اور اسی خانقاہ میں بیٹھ کر اصلاح امت اور تجدید دین کا عظیم ترین کارنامہ انجام دیا، مرشد کامل مرجع علماء و مشائخ حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی سے بیعت ہوئے اور پھر خلیفہ بنائے گئے، اس راہ سے بے شمار افراد کی دینی رہنمائی فرمائی اور ان کو صراط مستقیم پر لگایا، آپ سے بیعت ہونے والوں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تصنیف و تالیف شب و روز کا مشغلہ تھا، قرآن پاک کا اردو میں ترجمہ کیا، بیان القرآن کے نام سے عالمانہ تفسیر لکھی، بدعات و خرافات اور مشرکانہ رسم و رواج کی دنیا میں آپ کے نام سے ہمیشہ زلزلہ برپا رہا، بہت سی بدعات و خرافات سے مسلمانوں کو نجات دلائی، ۱۶ر رجب ۱۳۶۲ھ ۲۰ر جولائی ۱۹۴۳ء کو ۸۲ سال کی عمر میں تھانہ بھون میں وفات پائی۔ (کاروانِ رفتہ ص ۳۵-۳۴)

ومنهم : الشيخ عبدالغفار ،(۱) والشيخ الهمش كريم بخش السنبلي (۱) وأثنى على شيوخي بما في إجازاتهم فلتراجع."

(متعدد اہل علم نے میرے بچپن میں میری جودت طبع اور میرے ہمسروں پر میرے تفوق و برتری کی شہادت دی ہے، جن میں میرے والد کے استاذ مولانا ابوالبرکات بن عبداللہ عراقی ہیں، وہ جب مجھے دیکھتے تو یہ مصرعہ پڑھتے ع

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

انھیں میں مولانا عبدالحق پیلی بھیتی بھی ہیں، انھوں نے جب میرے والد کے کتب خانہ کو دیکھا تو فرمایا: یہ بچہ ان کتابوں کا پورا پورا حق ادا کرے گا۔ اور جس وقت میں پانچ سال کا تھا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے میرے سر پر دست شفقت پھیر کر برکت کی دعا فرمائی، میری جودت طبع کی شہادت دینے والوں میں مولانا عبدالغفار صاحب اور مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی بھی ہیں، اسی طرح میرے اساتذہ نے مجھے جو سندیں عطا فرمائی ہیں ان میں میری تعریف کی ہے)

ابتدائی تعلیم ہمارے پاس موجود تحریروں سے یہ گمان ہوتا ہے کہ آپ کی رسم بسم اللہ نسبتاً تاخیر سے شروع ہوئی تھی، خود آپ ہی کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۳۲۸ھ یا ۱۳۲۹ھ میں مولانا ابوالحسن صاحب عراقی کے پاس قرآن کریم شروع کیا۔ والد ماجد چونکہ اعلیٰ درجہ کے تجربہ کار معلم اور بلند پایہ مربی تھے، لہٰذا تعلیم و تربیت کی ذمہ داری انھوں نے خود سنبھالی، اور ان کے پاس نیز حافظ عبداللہ عرف دُولہ کے پاس قرآن کریم پڑھا اور تقریباً ایک سال کی مدت (۱۳۲۹ھ) میں ختم کیا، تجوید کا ایک منظوم رسالہ مولانا عبدالحق پیلی بھیتی سے پڑھا اور اس کو زبانی یاد کیا۔ اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پندنامہ عطار تک والد محترم کے پاس پڑھیں، غالباً ۱۳۳۱ میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب

(۱) ان حضرات کا ذکر آگے اساتذہ کے ذیل میں آئے گا۔

اورنگ آبادی کے پاس گلستان و بوستاں وغیرہ پڑھی۔ اس کے بعد دارالعلوم مئو میں داخل ہوئے اور وہاں فارسی کتابوں میں یوسف زلیخا، اخلاق محسنی اور سکندرنامہ وغیرہ کا درس لیا، عربی کی بعض ابتدائی کتابوں کا سبق مولانا عبدالعزیز مئوی اور مولانا محمد صابر مئوی (بلاقی پورہ) سے حاصل کیا۔ اس کے بعد مولانا ابوالحسن صاحب مئوی عراقی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان سے متعدد کتابیں مثلاً کافیہ، شرح جامی اور فصول اکبری وغیرہ پڑھی۔

علامہ اعظمی کے باقیات صالحات میں ایک نہایت بوسیدہ اور سال خوردہ کتاب ان کے ہاتھ کی نقل کی ہوئی ہے، اس پر لکھی ہوئی ایک عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دنوں مولانا ابوالحسن صاحب کے پاس بہادر گنج میں بھی تعلیم حاصل کی، مذکورہ بالا تحریر کا جو فقرہ اس مقام سے متعلق ہے وہ یہ ہے:

"إنی اذ کنت ببهادرگنج طالب العلم بها عندالمولوی الیلمعی مولاناوأستاذنا محمد ابوالحسن فی سلخ جمادی الأولیٰ سنة ١٣٣٤ھ"

(یعنی جمادی الاولیٰ ۱۳۳۴ھ میں جس وقت میں اپنے استاد مولانا ابوالحسن صاحب کے پاس بھادر گنج میں طالب علمی کی زندگی گذار رہا تھا)

میرا خیال ہے کہ علم کی راہ میں گھر سے باہر نکلنے کا یہ پہلا موقع رہا ہوگا۔ مولانا ابوالحسن صاحب کے پاس صرف و نحو کی مشق و مزاولت، شوق و لگن کے ساتھ کر کے ٹھوس صلاحیت بہم پہنچائی، خود لکھتے ہیں:" وأتقن علم النحو و الصرف عند مولانا ابی الحسن السابق الذکر."

مدرسہ انجمن اسلامیہ گورکھپور میں مولانا ابوالحسن صاحب عراقیؒ کے بڑے بھائی مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی اپنے وقت کے جلیل القدر عالم اور یکتا مدرس و مربی تھے، ان کو تربیت اور مردم سازی میں کمال حاصل تھا، علم و فضل کی شہرت تھی اور درس و تدریس کا آوازہ دور دور گونجتا تھا، ان کے زمرۂ تلامذہ میں بعض بڑی نامور شخصیتوں کے نام آتے ہیں، تقریباً دو دہائیوں تک بلیا کے قصبہ نوانگر کو علم کی روشنی سے منور رکھنے کے

بعد گورکھپور کے مدرسہ انجمن اسلامیہ میں ملازمت اختیار کرلی تھی، یہ مدرسہ خونی محلہ میں واقع تھا، یہاں آپ کے سرچشمۂ علم سے کسب فیض کرنے آپ کا وہ شاگرد پہنچا جس نے علم وادب کی تاریخ میں آپ کا نام زندہ جاوید کردیا، شاگرد کا خود بیان ہے:

"۱۹۱۶ء میں مولوی عبدالحی مرحوم(۱)، مولوی فاروق(۲)، مولوی

(۱) مولانا عبدالحی مرحوم کے والد کا نام سلامت اللہ تھا، جو اولیا سے مشہور تھے، مئو کے محلہ بھکاری پورہ کے باشندہ تھے، علامہ اعظمی کے ہم سبقوں میں تھے، مئو کے علاوہ دیوبند میں بھی کچھ مدت تک آپ کے ہم درس رہے، دیوبند کے علاوہ مینڈھو میں بھی تعلیم حاصل کی، مگر سند فراغت دارالعلوم مئو سے مولانا کریم بخش صاحب کے پاس کتب حدیث پڑھ کر ۱۳۴۱ھ میں حاصل کی۔ فراغت کے بعد ۱۳۴۳ھ میں پورہ معروف کے مدرسہ معروفیہ میں صدر مدرس مقرر ہوگئے اور ۱۳۵۵ھ تک لگاتار تیرہ سال مشکوٰۃ وجلالین وغیرہ کا درس دیتے رہے، پھر اس سے علحدہ ہوگئے اور ۱۳۵۶ھ میں اشاعت العلوم پورہ معروف کا قیام عمل میں آیا تو اس سے وابستہ ہوگئے اور سات برس یعنی ۶۳ھ تک اس میں درس وتدریس کا کام انجام دیتے رہے، ذی قعدہ ۱۳۶۳ھ میں وفات پائی، شوال ۱۳۵۲ھ سے ۱۳۵۵ھ تک مدرسہ معروفیہ سے آپ کی زیر ادارت ایک ماہنامہ المعروف بھی نکلا۔ پورہ معروف کے متعدد اہل علم ان کے شاگردوں میں ہیں (دیکھئے تذکرۂ علماء اعظم گڈھ ص ۱۳۹-۱۳۸ ماہنامہ ترجمان دارالعلوم اکتوبر ۹۶ء ص ۲۷)

(۲) مولوی محمد فاروق بن عصمت اللہ بن عبدالغفور بن منور ۱۳۱۸ھ میں پیدا ہوئے، ۱۳۲۷ھ میں قرآن شریف پڑھنا شروع کیا، ابتدائی تعلیم قدیم طرز پر گھریلو معلموں کے پاس حاصل کی اردو فارسی کتابیں دارالعلوم مئو اور بمبئی میں پڑھیں، بمبئی سے مئو واپس آئے اور دارالعلوم مئو میں دوبارہ داخل ہو کر گلستاں بوستاں پڑھنے کے بعد عربی پڑھنا شروع کی اور ملا تک کا نصاب وہیں پورا کیا، پھر کچھ دن الہ آباد میں رہے اور وہاں سے واپس پھر مئو آئے، علامہ اعظمی اور دیگر ہم سبقوں کے ساتھ دیوبند گئے، اور بیمار ہو کر واپس آئے، اور بالآخر دارالعلوم مئو سے ۱۳۴۱ھ میں فارغ ہوئے۔ فراغت کے بعد درس و تدریس شروع کی مگر چار پانچ مہینوں بعد یہ مشغلہ ترک کردیا، کچھ دنوں بعد طب کی =

عبداللطیف اور میں نے۔ ملا کا امتحان دینے کیلئے اس کا کورس پڑھنا شروع کیا، مگر چند ہی دنوں میں ان لوگوں کا ساتھ چھوڑ کر میں حضرت مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی کے ساتھ گورکھپور چلا گیا، اور اپنے مناسب حال درس نظامی کی کتابوں میں شریک ہو گیا۔"(۱)

گورکھپور ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء کے اواخر، یا ۱۳۳۵ھ کے اوائل میں پہنچے، والد محترم بذریعہ خط خبر گیری فرماتے رہتے، چنانچہ ایک خط میں، جو ۴ر صفر ۱۳۳۵ھ بروز جمعہ کا مکتوب ہے، لکھا ہے:

"بعد دعوات مزید حیات وترقی درجات کے واضح ہو کہ یہاں بفضلہٖ تعالیٰ خیریت ہے، صحتوری آں عزیز از بارگاہ رب العزت مطلوب۔ پوسٹ کارڈ آں عزیز باعث طمانینت و مسرت ہوا، حالات مندرجہ سے واقفیت ہوئی، ...... دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم کو امتحان میں کامیاب کرے۔"

باپ کو بیٹے اور جگر پارے کی کس قدر فکر دامن گیر رہتی تھی اور ان کو تحصیل علم کی خاطر محنت و مشقت اور جد و جہد کیلئے کس طرح ترغیب دیتے رہتے تھے، اس کا نمونہ ایک دوسرے مکتوب میں ملاحظہ ہو:

"... پوسٹ کارڈ تمہارا آیا، حال معلوم ہوا، دنیا دار المحن ہے، مصائب خواہ بواسطۂ خلق، یا بے واسطہ منجانب اللہ ہوں اوس پر صبر کرنا چاہئے:

وانی لصبار علی ما ینوبنی و حسبك أن الله قد أثنی علی الصبر

= طرف میلان ہوا اور لکھنؤ جا کر تکمیل الطب کا کورس کیا، اور مشغلۂ طبابت عمر بھر جاری رکھا۔

مولانا نہایت خوشحال اور فارغ البال گھرانے کے چشم وچراغ تھے، کپڑے کی تجارت تھی اور کاروبار وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا تھا، بمبئی و کلکتہ میں ان کی دوکانیں تھیں۔ مگر اس دولت فراواں کے باوجود بڑے علم دوست، سادہ لوح اور خداترس تھے، علامہ اعظمی کے بڑے شیدائی تھے۔ اگست ۱۹۸۳ء میں وفات پائی۔

(۱) تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی ص۹

اللہ تعالیٰ استقلال اور تحمل عنایت کرے۔ تم اپنے کام میں چست رہو، علم کا شوق ولذت حاصل کرو سب آسان ہو جائے گا:

وسهری لتنقیح العلوم ألذ لی　　من صوت غانیة و طیب غنائی

و صریر اقلامی علی صفحاتها　　أشهی من الدوکاه و العشاق

"جو اپنے کام میں پوری طرح مشغول ہوتا ہے اوسے دوسری جانب التفات برا معلوم ہوتا ہے...."

مذکورہ بالا خط ۱۵ ربیع الآخر ۱۳۳۵ھ کا نوشتہ ہے، اس پر ڈاکخانے کی جو مہر ثبت ہے وہ فروری ۱۹۱۷ء کی کسی تاریخ کی ہے جو نہایت مبہم اور ناصاف ہے۔

مولانا محمد صابر صاحب کا ایک اور مکتوب ملاحظہ ہو جو مولانا عبدالغفار صاحب کے نام انجمن اسلامیہ گورکھپور ہی کے پتہ پر روانہ کیا گیا ہے، لیکن تاریخ سے عاری ہے، لکھتے ہیں:

"ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، ہم لوگ مع الخیر ہیں، حضوری مزاج وہاج کے طالب ہیں۔ مدعائے ضروری یہ کہ برخوردار حبیب الرحمٰن سلمہ کا خط آج آیا ہے، لکھا ہے مجھ کو بخار آتا ہے، طبیعت گھبراتی ہے، شہر مین طاعون ہے۔ جب سے یہ خط آیا ہے دل کو سخت تشویش ہے، جی چاہتا ہے دوڑا چلا آؤں اور حبیب الرحمٰن کو مکان پر لاؤں آج کل بیماری کے سبب سے دل بہت چھوٹا ہو رہا ہے، ابھی خط لکھا ہی جا رہا ہے کہ جناب حضرت مولانا ابوالفضل امام الدین پنجابی(۱) صاحب کے رحلت کی خبر آگئی، تجہیز و تکفین کی غرض سے جا رہا ہوں، دل مشوش ہے، لکھا نہیں جاتا ہے، عرض یہ ہے کہ حبیب الرحمٰن کو جلد مکان پر بھیج دیجئے، اگر آنے میں توقف ہو تو جوابی کارڈ ارسال ہے، جواب سے مشرف کیا جاؤں۔"

(۱) مولانا ابوالفضل امام الدین پنجابیؒ ایک جہانگرد مجذوب صفت بزرگ تھے، مشہور محدث مولانا =

اغلب یہ ہے کہ یہ خط ۲/ جمادی الاخری ۱۳۳۵ھ کا تحریر کردہ ہے، کیونکہ جس
= احمد علی سہارنپوری کے شاگرد تھے، گھومتے پھرتے مئو پہنچے اور یہیں کے ہو رہے، ان کے بارے میں صاحب تذکرۂ علماء حال نے لکھا ہے "آپ کا وطن اصلی تو پنجاب ہے لیکن بالفعل، آپ قصبہ مئو ضلع اعظم گڈھ میں مقیم ہیں، آپ شاگرد جناب مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری ہیں" (ص ۱۵) مئو کے بہت سے اہل علم نے آپ سے اکتساب کیا جن میں مولانا عبدالغفار صاحب عراقی اور مولانا سلطان احمد صاحب مشہور ہیں، آپ نے شہر کی شاہی جامع مسجد میں کچھ دنوں درس دیا جس سے لوگوں نے ان کو بانی مدرسہ مفتاح العلوم سمجھ لیا، اس کی تحقیق آگے مفتاح العلوم کے تذکرے میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ علامہ اعظمی نے نزھۃ الخواطر (۸/۶۷) کے حاشیہ پر استدراکا لکھا ہے: " مولانا امام الدين الفنجابي : هاجر من بلاده و توطن أدري، تلمذ عليه شيخنا عبدالغفار العراقي و كثيرون من علماء مئو ، درس في اله داد پوره وجامع (كتره) زرته مراراً، و كان يتمنطق برداء أو كساء ، ولا تزال في يده عكازة كبيرة ، وكان يفترش كساء ه في المسجد تحت الساعة ويصلي عليه، وكان لا يقيم اللغة الأردية، ولا ياكل من طعام احد إلا نادراً وكانت فيه حدة، واعتراه يبس في دماغه في أخرة، وكان يجوب البلاد، زار النواب صديق حسن فظنه مسكينا سائلا ، فعين له سبع ربابي(جمع ربية) شهريا ، كان يانس الى ابي وربما أتى بيتنا ."

یعنی مولانا امام الدین پنجابی نے اپنے وطن سے ہجرت کی اور ادری کے قریب مقیم ہوگئے، آپ کے پاس ہمارے استاد مولانا عبدالغفار عراقی اور مئو کے بہت سے علماء نے زانوئے تلمذ تہ کیا، الہ داد پورہ اور جامع مسجد کٹرہ میں درس دیا، میں نے ان کی بارہا زیارت کی ہے، کسی کپڑے یا چادر کو کمر کے گرد لپیٹے رہتے تھے ان کے ہاتھ میں ہر وقت ایک بڑی سی چھڑی رہتی، اپنی چادر مسجد میں گھڑی کے نیچے بچھالیتے اور اس پر نماز پڑھتے، اردو زبان صحیح نہیں بول پاتے تھے، اور شاذ و نادر کسی کا کھانا کھاتے، مزاج میں تیزی تھی اور اخیر عمر میں دماغ میں خشکی پیدا ہو چلی تھی، شہر شہر گھومتے، نواب صدیق حسن خاں صاحب سے ملاقات کی تو انھوں نے ان کو مسکین اور سائل سمجھ کر ۷/ روپے ماہوار وظیفہ مقرر کردیا، میرے والد سے مانوس تھے، اور کبھی کبھی ہمارے گھر بھی تشریف لاتے۔"

دن یہ خط لکھا گیا ہے اس دن مولانا امام الدین پنجابی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی ہے، اور علامہ اعظمی نے "وفیات الاعیان" پر مشتمل اپنی بیاض میں ان کی تاریخ وفات یہی تحریر فرمائی ہے، لکھا ہے:

"مولانا امام الدین پنجابی ۲ر جمادی الاخری ۱۳۳۵ھ قبر در احاطہ مسجد پورہ الہ داد"

مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں علامہ اعظمیؒ کو اپنے استاد سے بڑا گہرا تعلق اور بھرپور قلبی لگاؤ تھا، آپ قدم بہ قدم حق شاگردی ادا کرنے کی کوشش کرتے، خدمت کرتے اور شراب علم کشید کرتے۔ شدہ شدہ ایک سال کا عرصہ گورکھپور میں گذارا، دوسرے سال مولانا عبد الغفار صاحبؒ گورکھپور چھوڑ کر بنارس چلے گئے اور وہاں کے قدیم مدرسہ مظہر العلوم میں بصیغۂ تدریس ملازم ہو گئے، کچھ ہی دنوں کے بعد شاگرد رشید بھی پہونچے، اور طالب علموں کی صف میں شامل ہو گئے، علامہ اعظمیؒ خود رقمطراز ہیں:

"لیکن جب گورکھپور سے (غالباً) ۱۹۱۷ء کے اواخر میں مولانا عبد الغفار صاحب بنارس منتقل ہو گئے تو میں بھی ان کی خدمت میں پہنچا اور مدرسہ مظہر العلوم سے ۱۹۱۸ء میں "ملا" کا اور مارچ ۱۹۱۹ء میں "ملا فاضل" کا امتحان دیا" (۱)

علامہ اعظمیؒ کے والد محترم کو مولانا عبد الغفار صاحب کی ذاتِ گرامی پر مکمل اعتماد تھا، اور ان کے طریقۂ تعلیم و طرز تربیت سے پوری طرح مطمئن اور خوش تھے، اور اپنے فرزند کو اس طرح ان کے سپرد کیا گویا وہ انھیں کے ہو رہے:

سپردم بتو مایۂ خویش را   تو دانی حساب کم و بیش را

چنانچہ ۱۷ر ستمبر ۱۹۱۷ء کو بنارس کے پتے پر صاحبزادے سلمہ کو لکھتے ہیں:

"دیگر احوال یہ ہے کہ خط آیا حال معلوم ہوا، پڑھنے کے باب میں جو مولانا کی رائے ہو وہ کرو، اور آنے کے باب میں میری طرف سے اجازت ہے مگر اس میں بھی مولانا کی رائے ضروری ہے..."

---

(۱) تذکرۂ مولانا عبد اللطیف نعمانی ص ۱۰

والد محترم کی تنبیہ و تاکید اور توجیہ و تربیت کا انداز ایک اور خط میں ملاحظہ فرمائیں:

"مدعا ضروری یہ کہ دو تین روز سے بندہ کی طبیعت کسی قدر ناساز ہے، بخار اور درد اعضاء میں مبتلا ہوں، آج بفضلہٖ تعالیٰ طبیعت اور دنوں سے اچھی ہے۔ اس کی وجہ معلوم نہیں ہوئی کہ جب سے تم گئے ہو کوئی خط کیوں نہیں لکھا؟ شاید تم کو خیال میری باتوں کا ہے، لڑکوں کو ایسا خیال کرنا دلیل ہے اونکی کم فہمی کی، والد واستاد کی خفگی لڑکوں اور شاگردوں کے حق میں رحمت ہے،" ضرب الصبیان کالماء في البستان" تو مثل مشہور ہی ہے، حدیث شریف میں بھی وارد ہے: " لا ترفع عصاك عنهم" یعنی چھڑی اولاد سے الگ نہیں رکھنا چاہئے، ہر وقت تنبیہ کرتے رہنا چاہئے۔ جب خود شارع علیہ السلام کا حکم ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اولاد کو تنبیہ نہ کیا جائے، اب اگر اولاد فہیم ہوں تو سمجھیں ورنہ وہ جانیں انکا کام جانے، دیکھو جن لوگوں کے والدین اولاد کی تنبیہ سے غافل ہیں اونکی کیا حالت ہے! اور جن کی تنبیہ ہوتی رہتی ہے وہ کیسے ہیں!"

علامہ اعظمیؒ جس طرح خود طلب علم میں محنت و مشقت برداشت کرتے، آبلہ پائی و بادیہ پیائی کرتے، اسی طرح دوسروں کو بھی اس بات کی ترغیب دیتے رہتے، اور اسی ترغیب و تحریک کے جواب میں قصبہ بہادر گنج کے مولوی عبدالرشید صاحب نے ۱۷ر صفر ۱۳۳۶ھ کو علامہ اعظمیؒ کے پاس بنارس کے پتہ پر درج ذیل خط لکھا:

"برخوردار من! نصیحت گری کچھ عمر پر مبنی نہیں، لیاقت اور علم و عمل کے اعتبار سے ہوتی ہے، پھر تمہاری یہ تحریر کہ اپنے اصلی وطن کو چھوڑو تو البتہ علم کی بہار دیکھو! تو ہم نے تمہاری نصیحت بسر و چشم قبول کیا، بایں شرط کہ اپنے مدرسہ میں ہم لوگ کے جاگیر کا انتظام کرو، شاید بوجہ تمہاری طبیعت لگ جائے...."

امتحان ملا و ملا فاضل | مدرسہ مظہر العلوم بنارس کے اندر آپ کی مدت طالب علمی دو

سال رہی، اس دوران آپ ملا (۱۹۱۸ء) اور مُلا فاضل (۱۹۱۹ء) کے امتحانات میں شریک ہوئے، اس وقت کے امتحانات آج کل کی طرح محض خانہ پری کیلئے نہیں ہوا کرتے تھے، اور نہ ہی اتنے سہل اور آسان ہوتے کہ ہر کس وناکس بلاتامل وتردد شریک ہو جاتا، بلکہ اس کے برعکس اتنے سخت اور حوصلہ شکن ہوتے کہ طالب علم کو سوچ کر ہی پسینہ آجاتا، اور ہمت اس کا ساتھ چھوڑ بیٹھتی، جس سال علامہ اعظمیؒ ملا فاضل کے امتحان میں شریک ہوئے اس سال پورے یوپی میں صرف تین طالب علم سیکنڈ ڈویژن سے کامیاب ہوئے، چنانچہ آپ کے ایک دوست مولانا بشیر احمد صاحب مئویؒ ۷ / مئی ۱۹۱۹ء مطابق ۶ / شعبان ۱۳۳۷ھ کو یہ خط لکھتے ہیں:

"... گذارش یہ ہے کہ عرصہ سے نہ تو کوئی آپ کا سرفراز نامہ آیا، نہ میں ہی نے کوئی خط لکھا، شکایت کس طرف سے ہو؟ عوض معاوضہ گلہ ندارد، ہمارے جناب ماسٹر صاحب پاس ہوگئے۔ شاید فیض الحسن (۱) نے لکھا بھی ہوگا اور

(۱) مولانا فیض الحسن فیض ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم دارالعلوم مئو اور مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں حاصل کی، فراغت کے بعد ۱۹۲۱ء میں درس وتدریس کا آغاز کیا، اور متعدد مقامات مثلاً بون پو.. سہارنپور، فرخ آباد، غازی آباد، اور مرزاپور کے سرکاری اسکولوں میں تدریسی خدمات انجام دیں، ۱۹۵۵ء میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ شاعر تھے، فیض تخلص تھا اور وسیم خیر آبادی و نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ (تذکرۂ سخنوران مئو ص ۱۳۔ ۱۲)

مولانا فیض الحسن علامہ اعظمی کے خاص احباب میں تھے، غالباً ان کے ہم درس بھی تھے، دونوں بزرگوں میں مضبوط دوستانہ روابط تھے، خط وکتابت کا سلسلہ زمانۂ طالب علمی ہی سے قائم تھا۔ طالب علمی میں ایک دوسرے کو زیادہ تر خطوط عربی میں لکھا کرتے تھے، چنانچہ اس زمانے کے بعض یادگار خط اب بھی بحمد اللہ محفوظ ہیں، شاعری بہت عمدہ کرتے تھے، انکے اس وقت کے خطوط جب وہ بسلسلۂ ملازمت متعدد مقامات پر مقیم رہے زیادہ تر شعروں اور غزلوں پر مشتمل ہیں، بلکہ بعض خط تو ایسے ہیں جس میں غزل یا نظم کے علاوہ نثر کا ایک لفظ بھی نہیں، خطوط کے مطالعہ سے ان کی سخن سنجی و سخن فہمی کے علاوہ طبیعت کی روانی اور دراکی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں وفات پائی۔

شاید ہم سے پہلے ہی آپ کو اس بات کی خبر ہوئی ہوگی کہ آپ فاضل میں سیکنڈ پاس ہوئے ہیں، اور عبدالحی بھی سیکنڈ پاس ہوئے ہیں، بڑی خوشی کی بات ہے، کل سیکنڈ تین ہیں، جس میں دو مئو کے ایک لکھنؤ کا طالب علم ہوا ہے ع

رہے گا خلد میں بھی یاد اب مئو برسوں

یہاں پھر مشاعرہ شروع ہو گیا، پہلے مشاعرہ میں یہ طرح تھی:

روئے روشن کا کسی کے انتظار ان کو بھی ہے

اور اب کی جو مشاعرہ کل ہونے والا ہے اوسکی طرح یہ ہے:

نہ یہ غرض تھی کہ جینا حرام ہو جائے

اور اس کے بعد والے مشاعرہ میں جو طرح مقرر ہوگی انشاء اللہ اس کو لکھوں گا، امید کہ آپ بھی کہہ کر مشاعرہ کے وقت پر ارسال فرمادیں گے، اور کیا عجب کہ آپ آئندہ مشاعرہ میں رونق افروز ہی ہوں، آپ کب تک تشریف فرما ہوں گے؟"

مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں آپ کے دور طالب علمی کے یادگار تبرکات میں نحو کی ایک کتاب أوضح المسالك الى الفية ابن مالك پر آپ کے جابجا تحریر کردہ حواشی ہیں، مولانا مجیب الغفار صاحب استاذ مدرسہ مظہر العلوم اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:

حضرت ابوالمآثر رحمۃ اللہ علیہ کے مظہر العلوم کے ساتھ گوناگوں قلبی تعلقات کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کے کچھ مآثر علمیہ اور یادگاروں سے بھی جامعہ کو نوازا ہے، ان میں سب سے زیادہ اہم "أوضح المسالك الى الفية ابن مالك" تاليف العالم الشهير جمال الدين أبي محمد عبدالله بن يوسف بن هشام الانصاری ہے، جو ان کی مفید تعلیقات سے مزین ہے اور جامعہ مظہر العلوم کے کتب خانہ کی زینت بنی ہوئی ہے، یہ تعلیقات سر ورق سے لیکر کتاب کے صفحہ ۱۸۶ تک نہایت جلی اور عمدہ خط میں پھیلی ہوئی ہیں، ہر تعلیق کے بعد ان کا دستخط موجود ہے، کہیں حبیب بن الصابر تو کہیں حبیب الرحمٰن، اور کسی جگہ

حبیب الرحمٰن الاعظمی، حبیب الرحمٰن المئوی ہے تو دوسری جگہ حبیب بن المولوی محمد صابر ثبت ہے۔ مولانا کی تعلیقات کے ساتھ مزین یہ گرانمایہ کتاب فن نحو کے رجسٹر کے اندر ۷۳ میں درج ہے۔ مولانا کی یہ تعلیقات ان کے طالب علمی یا مدرسی کے دور کی معلوم ہوتی ہیں، میرا رجحان دور طالب علمی ہی کی طرف ہے اس لئے کہ ۳۰ر جنوری ۱۹۱۹ء جیسا کہ نیچے آرہا ہے ان کی طالب علمی ہی کا دور ہے۔ واللہ اعلم

کتاب کے آخر میں بانسی کاغذ پر ان کے دو شعر بھی مع ان کے دستخط کے مرقوم ہیں، لکھتے ہیں۔ لأختر من سکنة منو

مرے نصیب کہ وہ خود ہی حال دل پوچھیں
اثر ضرور ہے کچھ نالۂ سحر میں بھی

ایضاً
اس آسمان کا رخ پھیر دوں جدھر چاہوں
دیا ہے یہ طپش دل نے اختیار مجھے" (۱)

دار العلوم دیوبند میں | غالباً بنارس میں دور طالب علمی کے یہ آخری ایام رہے ہوں گے۔ اس کے بعد مدارس دینیہ کے دستور کے مطابق تعطیل کلاں ہوئی ہوگی، ایک ڈیڑھ مہینہ کا عرصہ والدین کے سایۂ لطف و کرم میں گھر کی تربیت گاہ پر گذرا ہوگا، ہندوستان کے دینی مدارس کے طلبہ کیلئے عمر کا یہ وہ مخصوص مرحلہ ہوتا ہے، جب دیوبند کا شوق طاری ہوتا ہے، اور ہر طالب علم کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کا داخلہ دار العلوم دیوبند میں ہو اور وہ اپنی زندگی کے کچھ ایام وہاں کی روح پرور اور ایمان افروز فضا میں گذارے، اور وہاں کے علمی سوتوں سے بقدر توفیق الٰہی اپنی روح کو سیراب کرے۔ جاذبۂ شوق نے علامہ اعظمی کو بھی کھینچا اور وہ رخت سفر باندھ کر دیوبند کیلئے نکل کھڑے ہوئے، فرماتے ہیں:

---

(۱) ترجمان الاسلام ص ۶۲-۶۱ جنوری۔ مارچ ۹۳ء

"شوال ۱۳۳۷ھ غالباً جولائی ۱۹۱۹ء میں، میں نے دارالعلوم دیوبند میں پہلی دفعہ داخلہ لیا" (۱)

دیوبند آپ دسویں شوال کی شب میں پہنچے، جولائی کی غالباً ۹ر تاریخ تھی، کیونکہ ایک خط میں جسے اپنے رفیق عزیز مولوی فیض الحسن صاحب مئویؒ کے نام تحریر فرمایا ہے، مؤرخہ ۱۹ر شوال مطابق ۱۸ر جولائی ۱۹۱۹ء کو ارقام فرماتے ہیں:

ثم لا يخفى عليك أيها الحبيب اللبيب أن أخاك قد وصل الى دارالعلوم الواقعة فى ديوبند فى الليلة العاشرة من شهر شوال"

ترجمہ: اے میرے دانا دوست تجھے یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ تیرا رفیق دس شوال کی شب میں دیوبند پہنچا۔

امتحان داخلہ حضرت مولانا رسول حسن خاں صاحبؒ نے لیا، اور جن کتابوں کا امتحان ہوا، ان میں ہدایہ اور شرح سلم تھی، جیسا کہ مولانا فیض الحسن صاحب کے خط میں مذکورہ بالا عبارت کے بعد معاً تحریر فرماتے ہیں:

"فامتحنه المولوى رسول خان الفنجابى فى الهداية وفى شرح سلم لملّا حسن ففاز أخوك"

یعنی تیرے اس دوست کا امتحان ہدایہ اور شرح سلم کا مولوی رسول خاں صاحب پنجابی نے لیا، اور وہ کامیاب ٹھہرا۔

یہ خط مولوی عین الحق صاحب سیوانی کی معرفت ارسال کیا گیا، اور مذکورہ بالا دونوں خطوط پر مرسِل اور مرسَل الیہ کا جو پتہ درج ہے وہ حجرہ نمبر ۳۹ کا ہے، اس کے بعد آپ کو جو خطوط لکھے گئے وہ حجرہ نمبر ۹۵ کے پتہ پر روانہ کئے گئے۔ غالباً آپ کا قیام عارضی طور پر مولوی عین الحق صاحب سیوانی کے پاس رہا ہوگا اور کمرے کا تعین آپ کیلئے بعد میں ہوا ہوگا۔

---

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۰

آپ کے ہمعصروں اور ہم عمروں میں جو لوگ اس وقت زیر تعلیم تھے، ان میں مئو کے جن حضرات کا ذکر ہے وہ یہ ہیں:

"وهھنا من معارفك المولوی عبدالحی، والمولوی محمد فاروق، والمولوی نثار الدین، والمولوی عبداللطیف وأیوب . . . ."

یعنی جو لوگ یہاں آپ کے شناسا ہیں ان میں مولوی عبدالحی، مولوی محمد فاروق، مولوی نثارالدین، مولوی عبداللطیف اور مولوی ایوب ہیں۔

جو کتابیں اس وقت آپ کے شامل درس تھیں ان کے بارے میں لکھا ہے:

"والآن تحت تدرسی کتب الذیل: الهدایة، وملا حسن، والمیبذی، والمقامات الحریریة، والجلالین."

یعنی جو کتابیں میں اس وقت پڑھ رہا ہوں وہ ہیں: ہدایہ، ملا حسن، میبذی، مقامات حریری اور جلالین۔

فصلی بیماری دیوبند میں اس سال فصلی بیماری چلی، اور یہ وبا اتنی متعدی ثابت ہوئی کہ اس کی زد میں مئو کے کئی احباب آگئے اور ان کو مجبوراً مئو واپس آنا پڑا، اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"اسی سال مولوی عبداللطیف بھی دیوبند گئے تھے، مگر وہ میرے بعد پہونچے تھے، ان کا داخلہ ہو گیا تھا، اسباق ہو رہے تھے کہ مدرسہ میں فصلی بیماری پھوٹ پڑی، اور مولوی عبداللطیف اور ان کے رفقاء مولوی عبدالحی اور مولوی فاروق تینوں زد میں آگئے، مجبوراً تینوں کو گھر واپس ہونا پڑا۔"(۱)

دیوبند کی آب وہوا علامہ اعظمی کو بھی راس نہیں آرہی تھی، اور وہاں پہونچ کر وہ بھی شروع ہی سے مختلف عوارض میں مبتلا رہے، علم کا ذوق اور آگہی کی طلب تھی جو ان کو

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص۔۱۰

پابہ رکاب رکھتی تھی، ورنہ گھر کے حالات بھی کچھ اطمئنان بخش نہیں تھے، نہ صرف یہ کہ اطمئنان بخش نہیں تھے، بلکہ تشویشناک بھی تھے، جیسا کہ والد محترم ۱۷ ذی قعدہ ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۷ اگست ۱۹۱۹ء کو لکھتے ہیں:

"بخار آنے پھر شفا پانے کا حال معلوم ہوا، اللہ کا ہر حال میں شکر ہے •• بندہ کو بھی بخار آ گیا تھا، دو تین ہفتہ مبتلا رہا، اب بفضلہٖ تعالیٰ شفا نصیب ہوئی، کئی جمعہ کے بعد آج جمعہ پڑھنے گیا تھا، ورنہ ضعف سے جانا دشوار تھا، بہر کیف خدا کا شکر ہے کہ اب اچھی طبیعت ہے، البتہ ضعف باقی ہے۔

••••مریم کی حالت سابق دستور ہے، جب اوٹھایا جاتا ہے تو اٹھتی ہے، اللہ تعالیٰ شفا بخشے، باقی سب لوگ مع الخیر ہیں •••"

تھانہ بھون حاضری اور حضرت تھانوی سے بیعت اس سال غالباً ذی الحجہ کی تعطیل میں علامہ اعظمی نے تھانہ بھون کا سفر کیا، تھانہ بھون حاضری کا مقصد محض حضرت تھانوی سے ملاقات اور ان کی زیارت تھا، لیکن وہاں جا کر بیعت جیسی نعمت کبریٰ سے شرفیاب ہوئے، جس کی تفصیل تصوف کے باب میں آئے گی۔

بیماری کی شدت اور وطن واپسی بیماری کا زور، روز بروز بڑھتا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے تشویشناک صورت اختیار کر گئی (۱) والد محترم بھی اس صورتحال سے متفکر اور پریشان خاطر تھے، اپنی بے چینی کا اظہار انھوں نے ۱۴ محرم ۱۳۳۸ھ م ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء کے ایک مکتوب میں اس طرح کیا:

"دستی خط و پوسٹ کارڈ دونوں پہونچے، حالات دریافت ہوئے " لکل شئی آفة

(۱) یہ فصلی بیماری اس قدر شدید تھی کہ اس کا شکار ہو کر کئی طالب علم اور دارالعلوم کے ایک استاذ مولانا غلام رسول ہزاروی اس بیماری میں جاں بحق ہو گئے۔ سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم (۱/۲۵۲) میں ۱۳۳۷ھ کے حادثات میں لکھتے ہیں: "دیوبند میں اس سال انفلوئنزا کی بڑی شدت تھی، ایک مہینہ سے زیادہ دارالعلوم بند رہا، آٹھ دس طالب علم انفلوئنزا کی نذر ہو گئے"

وللعلم آفات" کا مضمون ہے، دیکھئے اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے۔ فاروق و عبدالحی وغیرہ کے آنے سے دل کو تشویش ہوئی، جس سے معلوم ہوا کہ بیماری کی کثرت ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے رحم فرماویں اور ہر پریشانی رفع کریں اور علم کی ترقی کی صورت پیدا کریں۔"

وہی ہوا جس کا ڈر تھا، چند ہی دنوں بعد خود علامہ اعظمی بھی بیماری کی لپیٹ میں آگئے، علالت شدید سے شدید تر ہوتی گئی، اور وطن واپسی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا، لکھا ہے:

"اس سال بیماری کا بہت زور تھا، ان لوگوں کے جانے کے ایک ماہ بعد میں بھی سخت بخار میں مبتلا ہوا، میری حالت تشویشناک دیکھ کر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی(۱) نائب مہتمم (دارالعلوم دیوبند) نے مولوی یعقوب سکروری کے ساتھ مجھے گھر بھیج دیا، کرایہ کے پیسے پاس میں نہیں تھے، تو مہتمم صاحب نے دفتر سے قرض دلوادیا جس کو آنے کے بعد والد صاحب نے ادا کیا"(۲)

(۱) مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کے خلف الرشید تھے، تعلیم تمام تر دارالعلوم میں حاصل کی، اور وہیں سے ۱۳۰۰ھ میں سند فراغت حاصل کی اور علم و عمل کی دنیا میں باکمال بن کر چمکے متبحر عالم اور عربی زبان وادب کے اداشناس ادیب تھے۔ آپ کی شخصیت ہمہ جہت اور علم و فضل مسلم تھا، وفور علم کے ساتھ انتظام وانصرام اور نظم و نسق کا ملکہ بھی بدرجۂ اتم تھا، ۱۳۲۵ھ م ۱۹۰۷ء میں آپ نے دارالعلوم دیوبند کے نیابت اہتمام کا عہدہ سنبھالا، بلکہ یہ منصب مجبور کر کے آپ کے سپرد کیا گیا، اور آپ نے بھی اس ذمہ داری کو اس خوبی سے نبھایا کہ نیابت اہتمام کا آپ کا دور مثالی دور مانا گیا، سیاست میں بھی ثاقب نظر رکھتے تھے، صاحب تصنیف تھے اور تصانیف میں "اشاعت اسلام" معروف بہ "دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا؟" اپنے موضوع پر معرکۃ الآراء خیال کی جاتی ہے۔ ۴/ رجب ۱۳۴۸ھ م ۱۹۲۹ء کی شب میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ (دیکھئے تاریخ دارالعلوم ۲: ۶۰۔۵۸)

(۲) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۱

مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں بحیثیت مدرس وطن واپسی کے بعد جب صحتیاب ہوئے ہیں تو ابھی تعلیمی سال کے کئی مہینے باقی تھے، اور آپ بے سبب یہ سال ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے، اس لئے مظہر العلوم بنارس کے ارباب بست وکشاد سے بغرض تدریس سلسلہ جنبانی کی، منتظمین مدرسہ نے، جو آپ کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے، اس پیشکش کا خوشی سے خیر مقدم کیا اور آپ کی درخواست منظور کرتے ہوئے ناظم مدرسہ جناب مولوی صفی الرحمٰن صاحب نے آپ کے پاس ۲۲ر جنوری ۱۹۲۰ء کو یہ خط روانہ کیا:

"آپ کے اس ارادہ سے میں بہت خوش ہوا، آپ مدرسہ میں تشریف لاکر طلبہ کو تعلیم دیجئے وخود بھی مولانا عبدالرشید صاحب سے تکمیل فرمائیے..."

کچھ پس وپیش کے بعد فروری ۱۹۲۰ء سے تدریس کا آغاز کردیا، خود فرماتے ہیں:

"بیماری کی وجہ سے اور اس لئے کہ میں نے فروری ۱۹۲۰ء میں مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں پڑھانے کیلئے ۱۵؁ ماہوار اور کھانے پر ملازمت کرلی تھی (اس وقت مدرس عربی سوم کی تنخواہ پندرہ روپئے خشک ہوا کرتی تھی)"(۱)

ایک عجیب خواب اگرچہ انسان کی زندگی میں خواب کی کوئی خاص حقیقت نہیں ہوتی اور اکثر خواب ایسے ہوتے ہیں جو "اضغاث احلام" کی قسم کے ہوتے ہیں، کہ حالت بیداری میں ان کا خیال بھی نہیں آسکتا، لیکن یہ بھی مسلّم ہے کہ بعض خواب آدمی کی زندگی میں پیش آنے والے حادثات وواقعات کے پیش نظر سچے ثابت ہوتے ہیں، ان کی حیثیت رویائے صالحہ کی ہوتی ہے، بنارس کے زمانۂ قیام میں علامہ اعظمیؒ نے بھی ایک خواب دیکھا تھا، جس کو انھوں نے خود ہی ایک جگہ قلمبند فرمایا ہے، مگر اس کے وقت کی تحدید نہیں کی ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں دیکھا، یا دور تدریس میں، بہر حال اس کو ان ہی کے الفاظ میں ہم یہاں نقل کررہے ہیں:

"ولما کنت مقیما فی بنارس رأیت ذات لیلة فیما یری النائم

(۱) تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی، ص ۱۱

أنی عند المولوی عبدالحی (۱) فی لکنؤ. والشیخ متزی بازار اسود وعلیه قمیص ابیض، ربعة کث اللحیة کاحسن ما یکون الرجال، فامرنی فجلست علی سریر فی بیته وامر زوجته، وهی جالسة علی السریر الذی أنا علیه ، باحضار ورق التنبول الماکول فی اکناف الهند ، و جعل الشیخ یظهر البشاشة والانبساط بمکانی عنده فسررت بغایة شفقته علیّ ، و محبته ایای، فلما استیقظت بقیت متحیراً لا ادری ماذا یکون تأویله ،فلما الهمنی الله تعالیٰ جمع تراجم محدثی الحنفیة بدأت بانتخاب الرجال علی شرطی من "الفوائد البهیة "وزدت علیها رجالاً کثیرین ، خطر ببالی أن هذا هو تأویل الرؤیا التی رأیتها فی بنارس "

(۱) فقیہ و محدث شیخ المعقول والمنقول مولانا محمد عبدالحی بن عبدالحلیم انصاری لکھنوی فرنگی محلیؒ ۱۲۶۴ھ میں باندہ میں پیدا ہوئے، حفظ قرآن کے بعد اپنے والد کے پاس معقولات و منقولات کی متعدد درسی کتابیں پڑھیں، پھر اپنے ماموں مفتی مولانا نعمت اللہ لکھنوی سے ہیئت کی کتابیں پڑھیں، اور سترہ سال کی عمر میں تحصیل علم سے فارغ ہوگئے، مگر اسی عمر میں تقریباً تمام اسلامی علوم وفنون میں دستگاہ بہم پہنچالی تھی۔ فراغت کے بعد ایک عرصہ تک حیدر آباد میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، اور اسی دوران سعادت حج سے بھی بہرہ مند ہوئے، ۱۲۷۹ھ میں پہلا حج والد ماجد کی حیات میں ان کے ساتھ ادا کیا، اور دوسرا ان کی وفات کے بعد ۱۲۹۳ھ میں ادا کیا۔ قیام حجاز کے دوران حرمین شریفین کے بہت سے علماء سے ملاقات کرکے ان سے حدیث کی اجازت و سند حاصل کی، پھر حیدر آباد سے رخصت لے لی اور لکھنو میں درس وافادہ کی مجلس سجائی، اور وہیں ۲۹ ربیع الاول ۱۳۰۴ھ کو چالیس سال سے بھی کم عمر میں وفات پائی، (نزہۃ الخواطر ۲۳۹/۸-۲۳۴)

مولانا عبدالحی فرنگی محلی چودھویں صدی کے اجلۂ علماء میں تھے ، معقولات و منقولات دونوں میں آپ کا تبحر علمی اور فضل و کمال مسلّم تھا، حدیث و فقہ میں نادرۃ العصر اور یگانۂ روزگار تھے، آپ نے پوری عمر درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور وعظ و تذکیر میں صرف کی، اللہ رب العزت نے آپ کے وقت میں بڑی برکت عطا فرمائی تھی، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ کچھ کم چالیس سال کی عمر پائی لیکن بشمول حواشی و تعلیقات کے سو سے زائد کتابیں تصنیف فرمائیں۔

(جب میں بنارس میں مقیم تھا تو ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ میں لکھنو میں مولانا عبدالحی صاحب کے پاس ہوں، مولانا عبدالحی صاحب سیاہ تہ بند اور سفید کرتے میں ملبوس ہیں۔ میانہ قد، گھنی داڑھی، غرض بہترین آپ کا حلیہ تھا، انھوں نے مجھے حکم دیا تو میں ان کے گھر میں موجود ایک چارپائی پر بیٹھ گیا، اور انھوں نے اپنی بیوی کو جو اسی چارپائی پر جس پر میں بیٹھا تھا، بیٹھی ہوئی تھیں، پان لانے کا حکم دیا، مولانا میری حاضری کی وجہ سے فرحت وانبساط کا اظہار فرماتے رہے، ان کی اس شفقت اور اپنے ساتھ اس محبت کی وجہ سے مجھے بھی بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ پھر جب میں بیدار ہوا تو حیران رہ گیا اور اس کی کوئی تاویل نہ کر سکا، پھر جب اللہ جل شانہ' نے محدثین احناف کے تذکروں کو جمع کرنے کی میرے دل میں بات ڈالی اور میں "فوائد بھیۃ" سے اپنی شرط کے مطابق افراد کا انتخاب کرنے لگا اور اس پر بہت سے دوسرے لوگوں کا بھی اضافہ کیا، تو اس وقت میرے دل میں خیال گذرا کہ یہ میرے بنارس کے خواب کی تاویل ہے)

مدرسہ مظہر العلوم بنارس کیلئے یہ بڑے فخر واعزاز کی بات ہے کہ آپ نے وہاں سے مشغلۂ تدریس کا آغاز کیا اور ایک سال سے زائد تقریباً ڈیڑھ سال کی مدت تک نہایت خوش اسلوبی سے اس اہم فریضہ کو انجام دیتے رہے۔ مولانا مجیب الغفار صاحب اعظمی شیخ الحدیث مدرسہ مظہر العلوم بنارس اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

"آپ کا دوسرا دور مظہر العلوم میں مدرسی کا ہے، آپ نے تدریس کی مبارک خدمات کا آغاز یہیں سے فرمایا ہے، اس سے قبل آپ نے کسی ادارہ میں تدریس کی خدمت انجام نہیں دی تھی، حضرت حق نے یہ اولیت مظہر العلوم ہی کیلئے مقدر فرمائی تھی"(۱)

مظہر العلوم بنارس کے زمانۂ تدریس ہی میں غالباً آپ نے فاضل ادب

(۱) مجلہ ترجمان الاسلام ص ۵۴۔ جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء

پنجاب یونیورسٹی کا امتحان پاس کیا، جو اس زمانے میں بڑا اہم اور مشکل امتحان سمجھا جاتا تھا(۱)
دارالعلوم دیوبند میں دوبارہ داخلہ | علامہ اعظمی تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی میں تحریر فرماتے ہیں:

"شوال ۱۳۳۸ھ میں دیوبند نہیں جاسکا۔"(۲)

اب یہ بات قطعی طور پر نہیں معلوم کہ بنارس میں بغرض تدریس کتنے دنوں قیام فرمارہے، شوال ۱۳۳۸ھ سے قبل اور اس کے بعد مجموعی طور پر تقریباً ڈیڑھ سال کی

(۱) یہاں اس بات کی وضاحت کردوں کہ فاضل ادب کے اس امتحان کا علم مولانا عبدالحفیظ رحمانی لوہرسن کے ذریعہ ہوا، علامہ اعظمیؒ ایک مرتبہ (غالباً ۱۹۸۵ء میں) لوہرسن تشریف لے گئے تھے (خوش قسمتی سے اس سفر میں راقم الحروف بھی بطور خدمتگار حضرت کے ساتھ تھا) اس وقت مولانا عبدالحفیظ صاحب نے ایک مختصر سا انٹرویو آپ سے لیا تھا، اس سوانح کی ترتیب کے وقت میں نے خط لکھ کر مولانا رحمانی سے اس سلسلے میں دریافت کیا تو انھوں نے ازراہ مہربانی اپنی یادداشت سے نقل کرکے میرے پاس ایک مفصل جواب لکھا جس میں موضوع زیر بحث سے متعلق ان کے الفاظ یہ ہیں:
"حضرت محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نوراللہ مرقدہ سے لوہرسن تشریف آوری کے موقع پر راقم الحروف نے چند سوالات کیے تھے، ان میں پہلا سوال یہ تھا کہ کتنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دیوبند دارالعلوم میں داخلہ کیلئے تشریف لے گئے؟ محدث اعظمی نے فرمایا کہ میں فاضل کرنے کے بعد دیوبند گیا تھا۔ میں نے کہا یعنی پنجاب یونیورسٹی کا امتحان فاضل ادب پاس کرنے کے بعد؟ فرمایا: جی ہاں۔ عرض کیا کہ یہ امتحان تو اس زمانہ میں بہت اہم سمجھا جاتا تھا؟ فرمایا: جی ہاں! اس قدر مشکل تھا کہ اجازت کی سہولت کے باوجود کوئی ہمت نہیں کرتا تھا، عرض کیا: جب ہی تو مولانا ثناءاللہ امرتسری مرحوم فاضل ادب پنجاب لکھنے میں بہت فخر محسوس کرتے تھے؟ فرمایا: مجھے تو اس پر کوئی فخر وناز نہیں ہے اور اس وقت بھی نہیں تھا جب امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی۔ مقصد یہ دکھانا تھا کہ درس نظامی کے اچھے طلبہ ہر نصاب پر حاوی ہونے کی استعداد رکھتے ہیں اور وہ میں نے کرکے دکھادیا۔"

(۲) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۲

مدت پوری کی پوری آپ نے بنارس ہی میں گذاری یا کہیں اور۔

جب شوال ۱۳۳۹ھ میں نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوا تو شوق دیوبند نے ایک بار پھر مہمیز لگائی، روانگی سے پیشتر علامہ ابراہیم بلیاوی (۱) سے رابطہ قائم کیا، علامہ بلیاوی کا ایک مکتوب جو جون ۱۹۲۱ء کا تحریر کردہ ہے اور علامہ اعظمی کے گھر کے پتہ پر روانہ کیا گیا ہے، ان کے خطوط کے ڈھیر میں موجود ہے اس خط کی عبارت یہ ہے:

"مکرمی جناب مولوی صاحب! السلام علیکم

نوازش نامہ آیا، حالات معلوم ہوئے، احقر ۲؍ شوال سے بخار جاڑہ میں مبتلا ہے۔ لہذا دیوبند کے جانے میں تاخیر ہوگی، آپ لوگ دیوبند چلے جائیں، اور مولوی عبدالسمیع صاحب سے مل کر اپنا داخلہ کرالیں۔"

اب پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کے سلسلے میں ایک نہایت اہم واقعہ پیش آیا، جس سے علامہ اعظمی کی لیاقت اور استعداد و صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، اس واقعہ کا ذکر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب جگدیش پوری یوں فرماتے ہیں:

(۱) شیخ المعقول والمنقول علامہ ابراہیم بلیاوی ۱۳۰۴ھ میں بلیا کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے، تاریخی نام غلام کبریا رکھا گیا۔ مولانا حکیم جمیل الدین نگینوی، مولانا فاروق احمد چریا کوٹی اور مولانا ہدایت اللہ خان کے علاوہ مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی سے بھی شرف تلمذ حاصل رہا، ۱۳۲۷ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔ فراغت کے بعد مختلف مدارس میں مثلاً مدرسہ عالیہ فتحپوری، عمری ضلع مراد آباد، دارالعلوم مئو، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، اور جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل وغیرہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دئے، ۱۳۷۷ھ میں حضرت مولانا مدنیؒ کے انتقال کے بعد دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس مقرر ہوئے، اور تادم واپسیں اس منصب پر متمکن رہے، ۲۴؍ رمضان ۱۳۸۷ھ کو آپ کی وفات ہوئی اور قبرستان قاسمی میں مدفون ہوئے۔

(دیکھئے تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲: ۱۰۵۔۱۰۳)

"علم و فن کی تحصیل و تکمیل کے بعد شوال ۱۳۳۷ھ م ۱۹۱۷ء (۱) میں آپ دارالعلوم دیوبند پہنچے اور داخلہ کا امتحان دیا تو اس میں امتیازی نمبرات حاصل ہوئے، حضرت مہتمم صاحب کو اس غیر معمولی کامیابی پر استعجاب ہوا اور اطمئنان خاطر کے لئے دوبارہ شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی (۲) کے پاس امتحان بھیج دیا، مولانا موصوف امتحان میں بہت سخت گیر تھے، طلبہ عام طور پر ان کے پاس امتحان سے گھبراتے تھے، حضرت شیخ الادب نے دیوان متنبی اور حماسہ کا دوبارہ امتحان لیا جس میں آپ کو پہلی بار سے زیادہ نمبرات ملے۔" (۳)

اس واقعہ کو مولانا جگدیش پوری صاحب نے ۱۳۳۷ھ کا قرار دیا ہے، لیکن اغلب یہ ہے کہ یہ واقعہ پہلے سفر (۱۳۳۷ھ) کا نہیں، بلکہ دوسرے سفر (۱۳۳۹ھ) کا ہے، کیونکہ ۳۷ھ کے بارے میں خود علامہ اعظمیؒ کی تحریر سے واضح ہو چکا ہے کہ آپ کا امتحان مولانا رسول خاں صاحب نے لیا تھا، مولانا اعزاز علیؒ کا اس میں کوئی تذکرہ نہیں ہے، دوسری بات یہ کہ واقعہ کی نوعیت بھی ذرا مختلف ہے، اصل قصہ وہ ہے جو مولانا عبدالحفیظ رحمانی لوہرسن نے خود علامہ اعظمی کی زبان سے سن کر اپنی یادداشت میں قلم بند کیا ہے کہ:

(۱) یہ سنہ غلط ہے، ۱۳۳۷ھ کی مطابقت ۱۹۱۷ء سے نہیں بلکہ ۱۹۱۹ء سے ہے۔

(۲) شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ علیہ امروہہ کے باشندے تھے، ۱۳۲۱ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، ابتداءً آپ نے حضرت شیخ الھندؒ کے ایماء پر مدرسہ نعمانیہ پورینی ضلع بھاگلپور میں تعلیم دی، بعد ازاں شاہجہاں پور منتقل ہو گئے اور وہاں ایک مدرسہ افضل المدارس کے نام سے قائم کیا، ۱۳۳۰ھ میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہوئے، اور وہاں تا حیات تدریسی و انتظامی امور انجام دیتے رہے، آپ ایک جامع الفنون شخصیت کے مالک تھے، لیکن عربی ادب اور فقہ میں ید طولیٰ حاصل تھا، جس کی وجہ سے "شیخ الادب والفقہ" کے خطاب سے متعارف ہوئے۔ ۱۳۷۴ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا، (دیکھئے تاریخ دارالعلوم ۲: ۹۲-۹۳)

(۳) ماہنامہ دارالعلوم وفیات نمبر ص ۱۵۲

"میں نے (مولانا عبدالحفیظ رحمانی نے) عرض کیا کہ داخلہ کا امتحان کس مدرس کو دینا پڑا تھا؟ فرمایا کہ میرے داخلہ کا امتحان مفتی محمد شفیع صاحب (۱) نے لیا جو اس وقت معین المدرسین تھے، انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ عربی ادب کی کوئی کتاب ضرور پڑھ لو، میں نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مفتی صاحب کو حیرت ہوئی اور انھوں نے مقامات حریری میرے سامنے کھول کر رکھ دیا اور ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ میں نے کتاب بند کر کے وہ مقامہ زبانی سنا دیا۔ مفتی صاحب نے آفریں کہنے کے بعد اپنا یہ تاثر کہ "ان کو ادب پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے آپ مزید اطمئنان حاصل کرلیں" لکھ کر مولانا اعزاز علی صاحب کے پاس بھیج دیا۔

مولانا اعزاز علی صاحب نے مقامات حریری دے کر فرمایا کہ کوئی مقامہ پڑھو اور ترجمہ کرو، میں نے ایک مقامہ زبانی سنانا شروع کیا، مولانا نے روک کر دو تین الفاظ کے نحوی صرفی تحلیل کیساتھ معنی پوچھے جو میں نے ضروری تفصیل کیساتھ بتا دئے۔ اس کے بعد مولانا اعزاز علی صاحب نے فرمایا: "ہاں مولوی صاحب تم کو مزید عربی ادب پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، تم اپنے لئے جو مناسب سمجھو وہ پڑھو۔" اس طرح ان دونوں بزرگوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔"

تھانہ بھون میں دوبارہ حاضری عید الاضحیٰ کی تعطیل میں اس بار پھر آپ نے موقع سے فائدہ اٹھایا، اور تھانہ بھون کا قصد کیا، اپنے ہم سبق مولوی عبدالمجید صاحب کو ایک خط

(۱) ۱۳۱۴ھ میں پیدا ہوئے، دیوبند آپ کا وطن اصلی تھا، دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی اور ۱۳۳۶ھ میں وہیں سے فارغ ہوئے، ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم میں ابتدائی درجات کے مدرس مقرر ہوئے، اور اپنی ذہانت وفطانت اور استعداد کی بدولت بہت جلد ترقی کر کے علیا کے اساتذہ میں شامل ہو گئے، ۱۳۵۰ھ میں منصب افتاء پر فائز ہوئے، تقسیم وطن کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۴۹ء میں پاکستان چلے گئے، اور وہیں شوال ۱۳۹۶ھ (۶/اکتوبر ۱۹۷۶ء) میں آپ کی وفات ہوئی (تاریخ دارالعلوم ۲: ۱۳۱-۱۳۰)

میں ۶/ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ مطابق اگست ۱۹۲۱ء کو لکھتے ہیں:

"آج شام کی ٹرین سے میں تھانہ بھون حضرت مولانا اشرف علی صاحب سے ملنے جارہا ہوں"

دیوبند سے واپسی دیوبند کی آب وہوا آپ کے حق میں سازگار نہیں تھی اور نہ ہی وہاں کی سند فراغت مقدر تھی، مثل مشہور ہے: "**تجری الریاح بما لا تشتھی السفن**" اس بار بھی بیماری کے علاوہ کچھ دیگر مشکلات و مصائب سے دوچار ہوئے اور بتقاضائے مشیت الٰہی آپ کو گھر واپس آنا پڑا، خود فرماتے ہیں:

"۱۳۳۹ھ اور ۱۳۴۰ھ کا زمانہ بڑا ہنگامہ خیز زمانہ تھا، تحریک ترک موالات بہت شدت اختیار کر چکی تھی، دوسرے شہروں کی طرح دیوبند میں طلباء کے سروں سے بدیسی کپڑے کی ٹوپیاں اتاری اور جلائی جاتی تھیں، انھیں ایام میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند میں گرفتار ہوئے، عصر کے بعد "دوِش" آئی، مگر ایسا ہنگامہ پیدا ہوا، اور آدمیوں کا اتنا ہجوم وازدحام ہوا کہ اس وقت گرفتاری عمل میں نہ آسکی، مولانا محترم کا قیام حضرت شیخ الہند کے نئے مکان میں اور میرا اور میرے چند ساتھیوں کا قیام حضرت شیخ الہند کے پرانے مکان میں تھا، مولانا کے ساتھ ساتھ ہم سب رات بھر پولیس اور فوج کے گھیرے میں رہے، اس دن ہم بہت دیر میں سوئے تھے، صبح کو اٹھے تو معلوم ہوا کہ بہت رات گئے نئے مکان سے مولانا کو گرفتار کرکے لے گئے۔

ان حالات سے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت مشوش اور پریشان تھے، چاہتے تھے کہ وطن واپس ہو جاؤں، اسی اثناء میں مجھے اس سال بھی بخار آگیا، والد صاحب نے اطلاع ملتے ہی لکھ بھیجا کہ تم مہتمم صاحب سے رخصت لے کر مکان چلے آؤ، چنانچہ صفر یا ربیع الاول ۱۳۴۰ھ میں، میں مئو چلا آیا۔"(۱)

---

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۵۔۱۴

دیوبند میں اس دفعہ آپ نے جن اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، ان میں امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا سید اصغر حسین میاں دیوبندی تھے۔ ان حضرات کے پاس آپ نے بالترتیب جامع ترمذی، صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد پڑھی۔

دارالعلوم مئو میں داخلہ اور فراغت دیوبند سے واپسی کے بعد جب شفایاب ہو کر بستر علالت سے اٹھے ہیں تو ناچار مئو کے قدیم مدرسہ دارالعلوم میں داخلہ لیا اور مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی، تلمیذ رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ، کے پاس صحاح ستہ پڑھ کر دورۂ حدیث کی باقاعدہ تکمیل کی اور سند فراغت و دستار فضیلت حاصل کی، ان کے پاس معقولات کی باقی ماندہ کتابوں اور توضیح و تلویح و اقلیدس وغیرہ کا درس بھی لیا۔ علامہ اعظمیؒ دارالعلوم مئو سے اپنی فراغت کا حال یوں بیان فرماتے ہیں:

"صحت یابی کے بعد اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ دارالعلوم مئو میں دورے کی کتابیں تمام کرلوں، خوش قسمتی سے مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی دارالعلوم مئو میں تشریف لا چکے تھے، اور ان کے پاس ہمارے صرف ایک رفیق مولوی عبدالمجید صاحب دورہ پڑھ رہے تھے، میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا، شعبان ۱۳۴۰ھ میں دورۂ حدیث ختم ہوا، اور شوال ۱۳۴۰ھ میں بصیغۂ مدرسی وہیں میرا تقرر ہو گیا۔"

دستار فضیلت میرا گمان ہے کہ فراغت کے سال ہی آپ کے سر پر دستار فضیلت باندھ دی گئی، دستار فضیلت پانے کا ذکر آپ کے تذکروں میں سوائے ایک جگہ کے کہیں اور مجھے صراحۃً نہیں مل سکا، انھوں نے اپنی دستار بندی کی طرف ایک جگہ اشارہ کیا ہے، اور وہ "نزھۃ الخواطر" (۸/۲۶۷) کا ایک حاشیہ ہے، جس میں مولانا عبدالعلیم رسولپوری کے تذکرہ سے نزھۃ الخواطر پر استدراک کیا گیا ہے، وہ حاشیہ یہ ہے:

" مولانا عبدالعلیم (المعروف بلعل محمد) الرسولپوری

المبارکپوری، کان فاضلاجلیلاً من تلامذۃ الشیخ عبدالحی اللکنوی، تلمذ علیه کثیرون ، منھم المولوی عبدالمجید المئوی وابنه المولوی عبدالباقی المحامی ، جرت بینه و بین الحافظ عبدالله الغازی فوری مناظرۃ، وله فی الرد علی المولوی أحمد رضا وتلمیذہ رسالة" درۃ التاج الأنور فی أذان الخطبة عندالمنبر" وله غیر ذلك ، درس العلم فی چشمۂ رحمت (بغازی پور) زماناً ، و خلفه بعدہ ابنه المولوی محمد شعیب ، وھو الذی ألبسنی العمامة حین تخرجت من دارالعلوم(بمئو)،مات فی حادثة اصطدام قطار بآخرفی سنة"

(مولانا عبدالعلیم رسولپوری مبارکپوری معروف بہ لعل محمد مولانا عبدالحی لکھنوی کے بڑے فاضل شاگردوں میں تھے، بہت سے لوگوں نے آپ کے پاس علم حاصل کیا، انھیں میں مولوی عبدالمجید مئوی اور ان کے (مولانا عبدالعلیم کے) لڑکے مولوی عبدالباقی وکیل ہیں، ان کے اور حافظ عبداللہ غازیپوری کے درمیان مناظرہ ہوا، مولوی احمد رضا اور ان کے شاگرد کے رد میں ایک رسالہ "درۃ التاج الانور فی اذان الخطبۃ عند المنبر" کے نام سے تصنیف فرمایا، ان کی اس کے علاوہ بھی کتابیں ہیں، چشمۂ رحمت غازیپور میں ایک مدت تک درس دیا، ان کے بعد ان کے صاحبزادے مولوی محمد شعیب ان کے جانشین ہوئے، دارالعلوم مئو سے جب میں فارغ ہوا تو ان ہی نے میری دستار باندھی، ٹرین کے ٹکراؤ کے ایک حادثہ میں ــــہ میں آپ کی وفات واقع ہوئی۔)

مندرجہ بالا تحریر میں ــــہ وفات کا ذکر نہیں ہے ،شاید اس وقت آپ کے ذہن میں تاریخ وفات نہ رہی ہو، صاحب تذکرۂ علماء اعظم گڑھ نے ان کی تاریخ وفات ۲۲/اپریل ۱۹۲۲ء مطابق ۱۳۴۱ھ لکھی ہے ، اور تفصیل سے اس حادثہ کا ذکر بھی کیا ہے۔(۱)

(۱) دیکھئے تذکرۂ علماء اعظم گڈھ ص ۱۷۰-۱۶۷

سند فراغت تحصیل علم سے فراغت اور تکمیل علم و فن کے بعد مدرسہ دار العلوم کی جانب سے جو سند آپ کو پیش کی گئی، اس کا ایک حصہ ہدیۂ ناظرین ہے:

" فإن الأخ الصالح البار المولوی حبیب الرحمن بن المولوی محمد صابر المتوطن مئومن مضافات أعظم گڈه قد وصل هذه المدرسة العربية العالية الاسلامية الكائنة بمئو بعد ما حضر مجالس دروس الأفاضل و الأكارم والأماثل ، وأخذ عنهم مختصرات العلوم و مطولاتها غير ما ذكر فی هذه الورقة من العلوم العربية و متعلقاتها، فقرأ من علم التفسير الجلالين ، ومن علم الحديث صحيحی الإمامين الهمامين البخاری ومسلم وسنن أبی داؤد،و النسائی، والترمذی، وابن ماجه ، والمؤطاين للإمامين القدوتين مالك و محمد ، وشرح معانی الآثار للطحاوی، ومن علم اصول الفقه التوضيح والتلويح، ومن علم المعقول شرح السلم لمولانا حمد الله، والقاضی، ومير زاهد رساله مع غلام يحيىٰ ، ومير زاهد ملا جلال و حواشيه لبحر العلوم ، ومن علم الفلسفة الميبذی و صدرا، ومن علم الرياضی المقالة الأولی من اقليدس، ومن علم الصرف الشافية، وبقی مدة ما قرأ علی طريقة حسنة، رضی عنه الأساتذة و أركان المدرسة، وهو عندنا جيد الفكر سليم الطبع، متوقد الذهن ذو استعداد مناسب وقابلية تامة قادر علی الدرس والإفادة . . . "

(یعنی برادر نیک و صالح مولوی حبیب الرحمٰن بن مولوی محمد صابر ساکن مئو ضلع اعظم گڈھ نے مئو میں واقع اس اعلیٰ اسلامی عربی درسگاہ میں داخلہ لیا، اس سے قبل انھوں نے مختلف اہل فضل و کمال کے درس میں شرکت کی، اور اس کاغذ پر مذکور علوم عربیت اور اس کے متعلقات کے علاوہ علم و فن کی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھیں، تفسیر میں جلالین، حدیث میں صحاح ستہ، امام مالک و امام محمد کی موطا،

امام طحاوی کی شرح معانی الآثار۔ اصول فقہ میں توضیح و تلویح، معقولات میں مولانا حمد اللہ کی شرح سلم اور قاضی، حاشیہ غلام یحیی بر میر زاہد(۱)، میر زاہد ملا جلال اور ملا بحر العلوم کے اس پر حواشی، فلسفہ میں میبذی اور صدرا، ریاضی میں اقلیدس کا پہلا مقالہ، اور صرف میں شافیہ پڑھی۔ مدت تعلیم کے دوران حسن سیرت کے حامل رہے، ان سے اساتذہ اور اراکین مدرسہ خوش رہے۔ ہمارے نزدیک وہ فکر صائب، طبیعت سلیمہ، ذہن رسا، درس و افادہ کی بھرپور قوت و صلاحیت اور مناسب استعداد کے مالک ہیں۔)

مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی کی بخشی ہوئی سند

مذکورہ بالا عبارت اس سند کا اقتباس ہے جو رسمی طور پر علامہ اعظمی کو مدرسہ دار العلوم کی طرف سے عطا کی گئی تھی، اس کے علاوہ جن لوگوں نے آپ کو انفرادی طور پر سندوں سے سرفراز کیا ان میں سے آپ کے استاد مولانا کریم بخش صاحب سنبھلیؒ اور مولانا عبدالغفار صاحب عراقی، اور دار العلوم مئو کے اس وقت کے ناظم مولانا عبدالمجید صاحب مئوی ہیں، ان حضرات نے آپ کو جو سندیں دی ہیں ان میں علامہ اعظمیؒ کے علم وادب، فہم و فراست اور سلوک و سیرت کی جس طرح تعریف و توصیف کی ہے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اساتذہ عطا فرما کر علامہ اعظمیؒ کی تعظیم و تکریم نہ فرما رہے ہوں۔ بلکہ ایسے لائق اور ہونہار شاگرد کو سند دینا وہ اپنے لئے باعث اعزاز سمجھ رہے ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ ان تینوں سندوں کا بھی اس جگہ ذکر کر دیا جائے، سب سے پہلے مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی کی سند ملاحظہ ہو:

" أما بعد! فيقول احقر عباد الله ذى العرش، عبده الشهير بمحمد كريم بخش ، عصمه الله يوم الأخذ والبطش ،ان الفاضل اللبيب

(۱) علامہ سید سلیمان ندوی اس کتاب کی نسبت حیات شبلی ص ۲۲ میں لکھتے ہیں: "حاشیہ غلام یحیی بر میر زاہد درس نظامی میں لیاقت کی آخری منزل ہے۔"

والأديب الأريب العالم اليلمعي، المولوى حبيب الرحمن الأعظمى سلمه الله العلى ، المئوى موطنا والحنفى مذهبا، قد تردّد اليّ و حضر بين يديّ ، و أخذ من كتب الحديث الصحاح الست، بعضها قراء ة بنفسه و بعضها بقراء ة غيره عليّ وهو يسمع، والمؤطاين للإمامين الهمامين مالك بن أنس الأصبحى ومحمد بن الحسن الشيبانى حتى عبر عليها و أتى على آخرها ، فطلب منى الإجازة فأجبته لذلك . . . "

(اللہ کا یہ حقیر بندہ محمد کریم بخش اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو اپنی گرفت سے محفوظ رکھیں، کہتا ہے کہ فاضل دانا، ادیب اریب، عالم ذکی مولوی حبیب الرحمٰن الاعظمی مئوی حنفی سلمہ اللہ میرے پاس آتے جاتے اور میرے درس میں شریک ہوتے رہے ، میرے پاس کتب حدیث میں صحاح ستہ کا کچھ حصہ انھوں نے خود پڑھا اور کچھ حصہ دوسرے نے پڑھا اور انھوں نے سنا، اس کے علاوہ میرے پاس امام مالک بن انس اصبحی اور امام محمد بن الحسن الشیبانی کی موطا پڑھی اور ان کتابوں کو پوری پڑھ کر انھیں ختم کیا۔ پھر مجھ سے ان کی اجازت مانگی تو میں نے ان کی اس درخواست کو قبول کرلیا۔)

حضرت مولانا عبدالغفار صاحب کی عطا کردہ سند آپ کے استاد محترم و مکرم حضرت مولانا عبدالغفار صاحب نے، جن کو اپنے شاگرد کی ذہانت وفطانت، لیاقت و قابلیت اور طلب و جستجو کا سب سے زیادہ اندازہ تھا، یہ سند عطا فرمائی:

" ان العزيز الحفى المجتنى من أزهار البستان ، بستان العلوم والفنون والراغب اليها بالجنان ، هو مع حداثة سنه و غضاضة غصنه قد هز الدوحة المورقة ، والشجرة المثمرة، حتى فاق فى العلوم والفنون على الأقران ، بإنعام جيبه منها والأدران، حبى و فلذة كبدى، أعنى المولوى حبيب الرحمن بن المولوى محمد صابر المئوى

الأعظمي ...."

(خرمن علم و فن سے خوشہ چینی کرنے والے اور دل سے اس کی طرف راغب رہنے والے، عزیز مکرم نے اپنی کم عمری اور صغر سنی کے باوجود علم کے شاداب و پھلدار درخت کو حرکت دی، یہاں تک کی علم و فن میں اپنے ہمسروں پر فائق و برتر ہو گئے، اور اپنے جیب و دامن کو اس سے اچھی طرح بھر لیا، میرا محبوب اور میرے جگر کا ٹکڑا، مولوی حبیب الرحمٰن بن مولوی محمد صابر مئوی الاعظمی...)

حضرت مولانا عبدالمجید صاحب ناظم مدرسہ کی سند

ناظم مدرسہ مولانا عبدالمجید (۱) صاحب نے بھی اپنی طرف سے ایک سند عطا فرما کر گویا خلعت فاخرہ سے نوازا انھوں نے اپنی عطا کردہ سند میں اس بات کی طرف بھی واضح طور پر اشارہ کیا کہ علامہ اعظمی نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں تعلیم بھی دی، مولانا عبدالمجید صاحب کی عطا کردہ سند کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

"إني اصدق أن الفاضل الأديب والفارغ الأريب قد حضر

(۱) مولانا شاہ عبدالمجید بن شاہ مولوی کریم بخش بن مولوی محمد قائم بن مولوی شاہ کمال مئوی تقریباً ۱۲۷۱ھ میں مئو میں پیدا ہوئے، جن اساتذہ سے علم حاصل کیا ان میں مولانا امام الدین پنجابیؒ، مولانا عبدالعلیم رسولپوری اور مولانا محمد فاروق چریاکوٹی قابل ذکر ہیں، مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد طبابت کی طرف متوجہ ہوئے اور طب کا پیشہ اختیار کیا۔ مولانا نے درس و تدریس کا مشغلہ رکھا، اور عرصۂ دراز تک مظہر العلوم بنارس میں خدمت تدریس کے علاوہ صدارت کے عہدہ پر بھی فائز رہے، وہاں سے علیحدگی کے بعد دارالعلوم مئو کے ناظم منتخب ہوئے، دینی و دنیاوی وجاہت کے مالک تھے، تادم مرگ جامع مسجد شاہی کے امام بھی رہے، ۷۷ برس کی عمر میں ۱۳۵۱ھ میں وفات پائی، اور آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

(تذکرۂ علماء اعظم گڈھ ص ۲۱۰۔۲۰۸)

هذه المدرسة حين نظامي فيها، فقرأ ما في هذا القرطاس من الكتب الدرسية والفنون الرسمية مع تنقيح الرموز المخفية و توضيح النكات الخفية وعلمها طالبيها و نفع كما انتفع فصار خير الأماثل وبلغ الى ما يبلغ اليه الأفاضل على أن الفاضل السميدع المجاز قد فاز في امتحان الملا والفاضل و أنا منه على ثقة أنه قابل للتدريس والتعليم لأنه بذل جهده حق الجهد في التفهم والتفهيم ۰۰۰)

(میں تصدیق کرتا ہوں کہ فاضل ادیب اور فارغ اریب اس مدرسہ میں میری نظامت کے وقت داخل ہوئے اور انھوں نے اس سند کے اندر مذکور درسی کتابوں اور رسمی فنون کو مخفی اسرار اور پوشیدہ نکات کی تنقیح و توضیح کے ساتھ پڑھا، اور طالب علموں کو ان کی تعلیم دی، اور اس طرح استفادہ کے ساتھ افادہ بھی کیا، یہاں تک کہ وہ منتخب ترین لوگوں کی صف میں کھڑے ہو گئے، اور فاضل ترین افراد کے درجہ تک پہنچ گئے، اس پر مستزاد یہ کہ اس فاضل برتر نے ملا اور فاضل کا امتحان پاس کیا، مجھے ان پر پورا اعتماد ہے کہ وہ تدریس و تعلیم کے قابل ہیں، کیونکہ انھوں نے فہم و تفہیم میں پوری پوری کوشش صرف کی ہے۔)

طالب علمی کے زمانے میں علامہ اعظمی کے تعلیم دینے کے ذکر پر مجھے مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات یاد آگئی جو انھوں نے ایک ملاقات کے دوران خود راقم الحروف سے فرمائی تھی، انھوں نے اس ناچیز سے فرمایا تھا کہ میں نے مولانا (مولانا اعظمیؒ) سے متعدد کتابیں اس وقت پڑھی تھیں جب وہ دارالعلوم مئو میں طالب علم تھے۔

قارئین اوپر ذکر کی گئی ان اسناد کو غور سے پڑھیں اور الفاضل اللبيب ، الأديب الأريب، العالم اليلمعي، الفاضل الأديب ، الفارغ الأريب ،اور الفاضل السميدع، جیسے خطابات کو دیکھیں کہ وہ علامہ اعظمیؒ کو اس وقت نوازے جا رہے ہیں کہ ابھی ان کی عمر صرف ۲۱؍ برس ہے، اور ان خطابات کو عطا کرنے والے ان کے وہ اساتذہ یا مثل اساتذہ

ہیں جنھوں نے ان کی زندگی کے ہر ہر پہلو کا بغور جائزہ لیا ہے، اور ان کی استعداد و صلاحیت کو خوب خوب پرکھا ہے، بالخصوص مولانا عبدالغفار صاحب عراقیؒ سے علامہ اعظمیؒ کو جو ملازمت رہی ہے، اس کی روشنی میں استاذ نے شاگرد کے نشست و برخاست، رفتار و گفتار، نوشت و خواند، سلوک و سیرت، ادب و سلیقہ، مواظبت درس، فہم و فراست، رسائی فکر و ذہن اور جد و جہد گویا ہر ایک عمل کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہوگا، تب جاکر تعریف و توصیف کے یہ بلند آہنگ کلمات ان کے نوک قلم پر آئے ہوں گے۔

اسناد حدیث: علوم عربیہ واسلامیہ میں بالعموم، اور علم حدیث کے اندر بالخصوص سند کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ رجال یا رواۃ کا وہ سلسلہ جو متن تک پہنچائے اس کو سند کہتے ہیں، ابتدائے اسلام سے لیکر زمانۂ تدوین تک سند کی اہمیت اس درجہ رہی ہے کہ اس کو کسی بھی علم و فن کا اہم ترین عنصر مانا جاتا رہا، یہی وجہ ہے کہ علم و فن کی قدیم کتابوں کا اگر آپ مطالعہ کریں تو علم حدیث کو تو چھوڑ دیجئے ادب عربی وعلوم عربیت کی کتابوں میں بھی اسانید کا ایک سیل رواں نظر آئے گا، عربی ادب یا علوم عربیہ کی قدیم تصانیف مثلاً جاحظ کی البیان والتبیین، ابوالفرج اصفہانی کی الاغانی، ابو علی قالی کی الامالی یا اس قسم کی دیگر تصنیفات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بداہۃً معلوم ہو جاتی ہے کہ مصنف بسا اوقات ایک جملہ، بلکہ صرف ایک لفظ، یا ایک کلمہ کو نقل کرنے کیلئے ایک نہیں کئی سلسلۂ اسناد ذکر کر جاتا ہے، اور اس چیز کا اس قدر اہتمام اس لئے کیا جاتا تھا کہ جو بھی بات ہو محقق، مدلل اور مضبوط ہو۔ پھر یہی چیز محرک بنی طبقات کی کتابوں کی تالیف کا، مثلاً ادباء کے طبقات، نحویوں کے طبقات، لغویوں کے طبقات۔

جہاں تک فن حدیث کا سوال ہے تو اس میں سند کو بنیاد اور اساس تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں سند کے بغیر کوئی بات قابل قبول ہی نہیں سمجھی جاتی۔ سند یا اسناد ہی علم حدیث کا عماد اور ستون ہے، اسی وجہ سے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ (متوفی ۱۸۱ھ) نے (جو امام بخاری کے استاذ الاساتذہ تھے) فرمایا: "الإسناد من الدين فلولا الاسناد لقال

من شاء ما شاء "عبداللہ بن مبارکؒ کے اس تاریخی جملہ کا مطلب یہ ہے کہ سند دین کا جزو ہے، اگر سند نہ ہوتی تو جس کا جو جی چاہتا کہہ دیتا۔ امام مسلمؒ نے یہ اور اس قسم کے دیگر بہت سے اقوال صحیح مسلم کے مقدمہ میں ذکر فرمائے ہیں، جن سے سند کی اہمیت و فضیلت پر روشنی پڑتی ہے، اور جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کتنا مہتم بالشان علم ہے۔

چونکہ فن حدیث علامہ اعظمیؒ کی علمی جولانگاہ رہا ہے، اس میں انھوں نے عبقریت و امامت کے جوہر دکھائے ہیں، ان کے بیشتر تحقیقی و تصنیفی کارنامے فن حدیث ہی سے متعلق رہے ہیں، اور انھوں نے قدماء محدثین کے طرز پر اسناد حدیث کے حصول کا اہتمام برتا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پیشتر ایک نظر علامہ اعظمیؒ کی ان سندوں پر ڈال لیں جو انھوں نے متعدد اساتذہ کے واسطے سے مختلف طرق سے حاصل کی ہیں۔

علامہ اعظمیؒ کو جن اساتذہ سے سند و اجازت حاصل ہوئی، ان میں سب سے پہلا نام مولانا عبدالغفار صاحب مئوی عراقیؒ کا ہے، ان کے پاس مشکوٰۃ المصابیح اور ترمذی حصہ اول پڑھی، مولانا عبدالغفار صاحب شاگرد تھے امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد (۱) گنگوہی قدس سرہ کے۔

---

(۱) حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کے والد کا نام ہدایت احمد بن پیر بخش بن غلام حسن بن غلام علی بن علی اکبر بن قاضی محمد اکبر انصاری تھا (نزھۃ الخواطر ۸/۱۴۸) آپ کا وطن اصلی رام پور تھا، ۱۲۴۴ھ م ۱۸۲۹ء میں نانہالی وطن گنگوہ میں پیدا ہوئے، اور وہیں نشو و نما پائی، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم گنگوہ میں ہی اپنے ماموں اور دوسرے لوگوں سے حاصل کی، اس کے بعد دہلی کا سفر کیا اور وہاں مفتی صدر الدین دہلوی اور استاذ العلماء مولانا مملوک علی نانوتوی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے، سند و اجازت مولانا عبدالغنی مجددی سے اور خرقۂ خلافت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے حاصل ہوا، حضرت حاجی صاحب کو اپنے اس مرید پر بڑا فخر و ناز تھا۔ مولانا رشید احمد صاحب کی عمر ابھی ۲۷ برس تھی کہ ۱۸۵۷ء کا وہ روح فرسا اور خوں چکاں حادثہ پیش آیا جس سے مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ عروج=

دوسرے استاد جن سے صحاح ستہ کی اکثر کتابوں کا درس لیا، مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی مراد آبادیؒ ہیں، وہ شاگرد تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ کے۔

شارح مسلم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ دیوبندی سے صحیح مسلم ازاول تا کتاب الزکوۃ پڑھی، وہ بھی حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے۔

آپ کے اساتذہ میں مولانا اصغر حسین صاحب دیوبندیؒ بھی تھے، ان کے پاس سنن ابو داؤد شروع سے کتاب الصلوٰۃ کے آخر تک پڑھی، یہ بھی حضرت شیخ الہند کے شاگرد تھے۔

امام العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے پاس جامع ترمذی از ابتدا تا کتاب الحج پڑھی دیوبند کے دوسرے اساتذہ کی طرح شاہ صاحبؒ بھی حضرت شیخ الہند کے ہی شاگرد تھے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی(۱) کو شرف تلمذ حاصل تھا قاسم العلوم والخیرات،

=واقتدار کی فلک بوس عمارت زمین بوس ہو گئی، اور جس کے نتیجہ میں ہندوستانی مسلمانوں پر ذلت و ادبار کی مہر لگ گئی، حضرت گنگوہی نے اس وقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی قیادت میں شاملی کا معرکہ لڑا، جس کے بعد انگریزوں کی دار و گیر کا شکار بھی ہوئے، لیکن قدرت کو ان سے ہندوستانی مسلمانوں کے دین وملت کی حفاظت کیلئے کام لینا تھا اس لئے جان سے بچ گئے۔ حضرت گنگوہی کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی بدعت پر کاری ضرب لگائی اور اس کے زور کو توڑا، جزاہ اللہ عن جمیع المسلمین خیرا، بیعت وارشاد کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا، ہندوستان کے بڑے بڑے نامور علماء آپ کے چشمۂ فیض سے فیضیاب ہوئے، اور نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام میں پھیل کر اس سلسلہ کو مزید آگے بڑھایا، اسی طرح بے شمار لوگ آپ کے ہاتھوں پر تائب ہو کر از سر نو حظیرۂ اسلام میں داخل ہوئے، ۹ر جمادی الثانیہ ۱۳۲۳ھ م ۱۱ر اگست ۱۹۰۵ء کو رشد وہدایت کا یہ آفتاب ۷۸ سال کی ضیا پاشی کے بعد غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (مولانا رشید احمد گنگوہی حیات اور کارنامے، نزہۃ الخواطر، تذکرۂ علماء حال)

(۱) شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی ۱۲۶۸ھ م ۱۸۵۱ء میں بریلی میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد=

بانیٔ دارالعلوم حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱) اور امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

= مولانا ذوالفقار علی دیوبندی محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر تھے، دیوبند میں نشو ونما حاصل ہوئی، اور اپنے چچا مولانا مہتاب عالم دیوبندی کے پاس ابتدائی کتابیں پڑھیں، ۱۲۸۳ھ م ۱۸۶۶ء میں مسجد چھتہ سے جب دارالعلوم دیوبند کا آغاز ہوا، تو آج کے ازہر ایشیا کے وہ اکیلے طالب علم تھے جنھوں نے اپنے ہی نام کے ایک مخلص وماہر استاد اور بلند پایہ عالم دین ملا محمود دیوبندی کے پاس انار کے سن رسیدہ درخت کے نیچے کتاب کھول کر پہلا سبق حاصل کیا، ان کے والد مولانا ذوالفقار صاحب خود بھی علم وادب میں بڑے باکمال تھے، چنانچہ بہت سی کتابیں انھوں نے اپنے والد ماجد سے بھی پڑھیں، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، حضرت نانا توی کے سامنے اس وقت زانوئے تلمذ تہ کیا جب حضرت نانوتوی میرٹھ میں تصحیح کتب کی خدمت انجام دے رہے تھے، خلافت حضرت گنگوہی سے حاصل ہوئی۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، صدر المدرسین، بڑے بڑے ارباب علم و ہنر اور عبقری شخصیتوں کے استاذ و مربی تھے، ان کے شاگردوں میں ایک سے بڑھ کر ایک آفتاب وماہتاب تھے، آزادیٔ وطن کے لئے عمر بھر انگریزوں کے خلاف برسرپیکار رہے، آزادی کی خاطر انھوں نے کئی ایک تحریکیں بھی چلائیں، جس میں تحریک ریشمی رومال بہت مشہور ہوئی، حصول آزادی کے لئے انھوں نے قید وبند کی صعوبت بھی برداشت کی اور ساڑھے تین سال جزیرۂ مالٹا میں اسیر فرنگ بن کر رہے، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد آپ ہی کے دست مبارک سے رکھی گئی، تصانیف میں ترجمۂ قرآن کو بے مثل شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، ۳۰ر نومبر ۱۹۲۰ء مطابق ۱۳۳۹ھ کو اس جہان فانی سے رخت سفر باندھا، اور قبرستان قاسمی میں مدفون ہوئے، (نزہۃ الخواطر، تاریخ دارالعلوم دیوبند، تذکرۂ علماء حال)

(۱) حضرت نانوتویؒ کی ولادت ضلع سہارنپور کے مردم خیز قصبہ نانوتہ میں ۱۲۴۸ھ م ۱۹۳۳ء میں ہوئی، والد کا نام شیخ اسد علی تھا، قرآن کریم اور فارسی کی ابتدائی کتابیں نانوتہ میں پڑھیں، دیوبند میں آپ کی قرابتداری تھی، فارسی وغیرہ پڑھنے کے بعد دیوبند آپ کو منتقل کر دیا گیا، جہاں مولوی مہتاب علی سے عربی پڑھنا شروع کی۔ لیکن جلد ہی وہاں سے اٹھا کر آپ کو سہارنپور بھیج دیا گیا، کچھ مدت تک وہاں بھی پڑھتے رہے، پھر جاذبۂ توفیق دہلی لے گیا، اس وقت دہلی کے عربک کالج میں آپ کے ہم وطن =

=مولانا مملوک علی نانوتویؒ درس و تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے، وہ ایک جلیل القدر عالم اور بڑے پایہ کے مربی تھے، ان کے درس کی شہرت دور دور پھیلی ہوئی تھی، حضرت نانوتوی بارہ سال کی عمر میں ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء میں عربک کالج میں داخل ہوئے اور پانچ سال کے بعد علم و فن کی تکمیل کر کے باہر نکلے، دوران تعلیم آپ کی ذہانت و فطانت کا پورے کالج میں چرچا رہا، عمر کی ابھی ۲۴ منزلیں ہی طے کی تھیں کہ ہندوستان کی تاریخ میں وہ زلزلہ خیز انقلاب آیا، جس نے اس ملک کی چولیں ہلا کر رکھ دیں، پورے ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، اور بڑے پیمانے پر قتل و غارتگری اور خونریزی ہوئی، جس میں مسلمانوں کو خاص طور سے اور اہل علم کو علی وجہ الاخص نشانہ بنایا گیا، انگریزوں کے اس ظلم و ستم اور قتل و خونریزی کے خلاف جگہ جگہ بغاوتیں اور معرکے ہوئے، جس میں شاملی کے معرکے کو خاص شہرت حاصل ہوئی، اس معرکے میں حضرت نانوتوی نے شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ انگریزوں کے ہوش اڑ گئے، ہنگامۂ جنگ کے فرو ہونے کے بعد انگریزی پولیس انھیں مدت تک تلاش کرتی رہی لیکن اسے ناکامی رہی، خون کے دریا بہانے کے بعد بھی جب اسلام اور مسلمان اپنی سخت جانی کی وجہ سے زندہ بچ گئے تو اسلام کے قلعہ پر بمباری کے لئے انگریزوں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا جو پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک تھا اور وہ تھی عیسائیت کی تبلیغ اور مسلمانوں کو اسلام سے بیزار کرنے کی تحریک، یہ وہ میدان تھا جس میں حضرت نانوتوی کے جوہر زیادہ کھلے اور انھوں نے اسلام کی بھرپور مدافعت کی، عیسائیوں سے مناظرے اور آریوں سے مباحثے ہوئے اور اسلام ہر مرتبہ سر بلند رہا، اسی طرح شیعیت کے بڑھتے ہوئے دھارے کو بھی روکا، ان کی اس جدوجہد کے نتیجہ میں جدید علم کلام وجود میں آیا، جس کے وہ بانی تھے، لیکن آپ کا سب سے روشن کارنامہ تحریک دیوبندیت ہے جو دارالعلوم کی صورت میں جلوہ گر ہوئی، علمی کارناموں میں تصنیفات کے علاوہ تصحیح کتب کا کام بھی ہے، جس کے لئے متعدد مطبعوں میں ملازمت کی، ایسی ہی ایک ملازمت کے دوران انھوں نے صحیح بخاری کے آخری پانچ پاروں کے حواشی تحریر فرمائے، آپ کی طبیعت میں سادگی اور انکسار و تواضع حد درجہ تھا، رہن سہن عام آدمیوں کا سا تھا، رکھ رکھاؤ بالکل نہیں تھا، جس کی وجہ سے وہ شخص جو آپ سے واقف نہ ہوتا دیکھ کر عالم ہی نہ سمجھتا، ۴؍ جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ م ۱۸۷۹ء میں اپنے رب کی پکار پر لبیک کہا اور عالم آخرت کو سدھارے۔

(تاریخ دارالعلوم، مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے)

سے ، یہ دونوں بزرگ حضرت مولانا عبدالغنی دہلوی(۱) مہاجر مکی کے شاگرد تھے ، شاہ عبدالغنی صاحبؒ کو اجازت حاصل تھی مسند الآفاق مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلویؒ (۲)

(۱) امام محدث مولانا عبدالغنی بن ابی سعید دہلوی، مجدد الف ثانی سید احمد سرہندی کی اولاد میں تھے، شعبان ۱۲۳۵ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے والد سے موطا امام محمد اور شاہ مخصوص اللہ بن رفیع الدین دہلوی سے مشکوۃ پڑھی اور شاہ اسحاق صاحب دہلوی سے حدیث کی دیگر کتابیں پڑھیں، اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور ان کے ہمراہ ۱۲۴۹ھ میں حج و زیارت کے لئے حرمین گئے، وہاں شیخ عابد سندھی اور بعض دیگر اہل علم سے حدیث کی سند حاصل کی اور خود بھی درس وافادہ کی مجلس جمائی۔ ۱۸۵۷ء (۱۲۷۳ھ) کے ہنگامۂ رستاخیز کے بعد اپنے اہل و عیال کے ساتھ حرمین ہجرت فرماگئے، اور پہلے مکہ گئے پھر مدینہ جاکر حدیث کے درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ علم و عمل، زہد و تقوی، حلم و وقار، پرہیزگاری، تواضع وانکسار اور حسن اخلاق میں یگانۂ روزگار تھے، ۱۶؍ محرم ۱۲۹۶ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ (نزھۃ الخواطر ۷؍ ۲۹۰۔۲۸۹)

(۲) حضرت مولانا شاہ اسحاق بن محمد افضل دہلوی مہاجر مکی، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے نواسے اور ان کے علم کے وارث تھے، ۸؍ ذی الحجہ ۱۱۹۶ھ یا ۱۱۹۷ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے، اپنے نانا کے آغوش تربیت میں نشو ونما پائی، اکثر درسی کتابیں شاہ عبدالقادر دہلویؒ کی خدمت میں پڑھیں، فقہ و حدیث میں مہارت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں رہ کر بہم پہنچائی، اور ان کے علم کے حامل اور سچے جانشین ہوئے، اور درس وافادہ کا سلسلہ شروع کیا، ۱۲۴۰ھ میں حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے، وہاں شیخ عمر بن عبدالکریم سے حدیث کی سند حاصل کی، اور ہندوستان لوٹ کر سولہ سال تک حدیث کا درس دیتے رہے، ۱۲۵۸ھ میں دوبارہ حجاز تشریف لے گئے اور مکہ میں مقیم ہوگئے۔ آپ سے ایک زمانہ نے فیض پایا، ہندوستان کے اسناد حدیث کے سلسلے چاہے وہ غیر مقلدین کے ہوں یا احناف کے آپ کی ذات پر جاکر مل جاتے ہیں۔ ۲۷؍ رجب ۱۲۶۲ھ کو مکہ میں فوت ہوئے اور قبر معلی میں مدفون ہوئے (نزھۃ الخواطر ۷؍ ۵۲۔۵۱)

سے، اور ان کو اپنے نانا مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ دہلوی سے، شاہ عبدالعزیز صاحب (۱) کو سعادت حاصل تھی اپنے والد ماجد مولانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی (۲) سے حدیث پڑھنے کی، اور شاہ صاحب نے اپنے تمام سلسلوں کو اپنی کتاب "الیانع الجنی" میں نقل کر دیا ہے جو وہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔

(۱) حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز بن ولی اللہ بن عبدالرحیم دہلویؒ ۲۵ر رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ کو پیدا ہوئے، اپنے والد کے پاس قرآن حفظ کیا اور انھیں کے سایۂ تربیت میں تعلیم پائی، آپ کی عمر ابھی سولہ سال تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا، لہذا بقیہ کتابیں دوسرے اہل علم سے پڑھیں، علم و فضل، عقل و فہم، سرعت ادارک، قوت حافظہ اور طہارت و تقویٰ میں نادرۂ روزگار تھے، پندرہ سال کی عمر میں مشغلۂ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، پچیس برس کی عمر سے متعدد خطرناک امراض سے دوچار ہوئے، مگر اس کے باوجود درس و افتاء کا سلسلہ جاری رکھا، حتی کہ آپ کے حلقۂ درس سے بے شمار افراد باکمال بن کر چمکے۔ تبحر علمی، تصنیف و تالیف، تحریر و تقریر، قوت بیان اور بداہت و استحضار میں آپ کے پایہ کو بہت کم لوگ پہنچ سکے، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، بلاغت اور منطق و فلسفہ وغیرہ پر بہت سی بیش قیمت کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ ۷ر شوال ۱۲۳۹ھ کو اسی سال کی عمر میں وفات پائی اور دہلی میں اپنے والد کے جوار میں مدفون ہوئے۔ (نزہۃ الخواطر ۲۶۷/۷۔۲۶۸)

(۲) ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون کو نشأۃ ثانیہ عطا کرنے والے امام الائمہ مولانا شاہ ولی اللہ احمد بن عبدالرحیم دہلوی ۴ر شوال ۱۱۱۴ھ دارالحکومت دہلی میں پیدا ہوئے، شاہ صاحبؒ اس علمی سلسلہ کے طلائے ناب تھے جو پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے، اکثر کتابیں اپنے والد کے پاس پڑھیں، آپ کا سینہ علم و عرفان سے منور اور دل تجلیات ربانی کا مظہر تھا، آج ہندوستان میں علم دین کی جو بہار نظر آ رہی ہے وہ انھیں کے فیضان کا اثر ہے، ۱۱۴۳ھ میں حجاز کا سفر فرمایا اور دو سال حرمین میں قیام فرما کر وہاں کے علماء خاص کر شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی سے حدیث کی کتابیں پڑھ کر سند و اجازت حاصل کی، شاہ صاحب کے اوپر اللہ کے انعامات بارش کی طرح برستے تھے، علم و معرفت اور حکمت الٰہیہ کا اللہ نے ان کے اوپر دروازہ کھول رکھا تھا، شاہ صاحب کی تصنیفات شمار سے باہر ہیں۔ ۱۱۷۶ھ میں ۶۲ برس کی عمر میں وفات پائی اور دہلی کے مقبرہ مہدیان میں مدفون ہوئے۔

علامہ اعظمی نے مذکورہ بالا سندوں کے علاوہ اپنے استاذ مولانا عبدالغفار صاحب کے پاس رسالۃ الاوائل پڑھ کر اس کی تمام حدیثوں کی اجازت حاصل کی، مولانا عبدالغفار صاحب کو رسالۃ الاوائل کی اجازت مولانا عبدالحق الہ آبادی مہاجر مکی (۱) سے حاصل تھی، اور ان کو اجازت تھی نواب مولانا قطب الدین صاحب دہلوی (۲) سے، نواب قطب الدین صاحب کو اجازت شاہ محمد اسحاق صاحب سے حاصل تھی، ان کو شیخ عمر بن عبدالکریم مکی سے، وہ شاگرد تھے شیخ محمد طاہر پسر شیخ محمد سعید بن سنبل کے، انھوں نے حدیث پڑھی تھی اپنے والد بزرگوار علامہ شیخ محمد سعید سنبل (۳) سے، اور شیخ سعید سنبل نے رسالۃ الاوائل میں اس کے بعد کے تمام طرق کو ذکر کر دیا ہے۔

(۱) شیخ الدلائل مولانا عبدالحق الہ آبادی مہاجر مکی، الہ آباد کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، ابتدائی نشو و نما کے بعد دہلی کا سفر کیا اور مولانا قطب الدین دہلوی وغیرہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، ۱۲۸۳ھ میں مکہ مکرمہ ہجرت فرماگئے اور وہاں شاہ عبدالغنی دہلویؒ سے حدیث کی سند و اجازت حاصل کی، پچاس سال تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہ کر مصروف درس و افادہ رہے، ان سے اپنے وقت کے بڑے بڑے اہل علم نے کسب فیض کیا، تصانیف کے اندر " الاکلیل " کو بہت شہرت حاصل ہوئی، ۱۹ر شوال ۱۳۳۳ھ کو مکہ ہی میں فوت ہوئے اور جنت المعلیٰ میں مدفون ہوئے۔ (نزہۃ الخواطر ۸/ ۲۲۱-۲۲۰)

(۲) حضرت مولانا قطب الدین بن محی الدین حنفی دہلوی کا شمار اپنے وقت کے بڑے فقہاء و محدثین میں ہوتا تھا، مولانا شاہ اسحاق صاحب دہلوی کی خدمت میں رہ کر فقہ و حدیث کا درس لیا، بڑے عابد و زاہد اور متقی تھے، تصنیف و تالیف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، فقہ حنفی کی حمایت و مدافعت میں پیش پیش رہتے، شیخ نذیر حسین دہلوی کے رد میں انھوں نے کئی کتابیں لکھیں، اخیر عمر میں حجاز چلے گئے تھے، اور ۶۵ سال کی عمر میں ۱۲۸۹ھ میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ (نزہۃ الخواطر ۷/ ۳۸۸-۳۸۷)

(۳) محمد سعید بن محمد سنبل مجلائی شافعی مکہ کے باشندہ تھے اور مسجد حرام میں درس و افتاء کی خدمت انجام دیتے تھے، طائف میں ۱۱۷۵ھ م ۱۷۶۱ء میں فوت ہوئے۔ تصانیف میں رسالۃ الاوائل کے علاوہ دیگر کتابیں بھی ہیں۔ (الاعلام ۶/ ۱۴۰)

حضرت محدث کبیرؒ کی ایک اور سند مولانا عبدالرحمٰن صاحب بھوپالی کے واسطہ سے ہے، مولانا عبدالرحمٰن صاحب شاگرد مولانا عبدالقیوم صاحبؒ(۱) کے تھے، اور مولانا عبدالقیوم صاحب داماد حضرت شاہ اسحاق صاحب دہلویؒ کے تھے، اور شاہ صاحب سے ان کو شرف مصاہرت کے علاوہ شرف تلمذ اور اجازت حدیث بھی حاصل تھی۔

اسناد عالی و اسناد نازل سند کی اہمیت اور حضرت محدث کبیرؒ کے سلسلۂ اسانید کے ذکر کے بعد ایک بات اور عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ سند کی دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک عالی اور دوسری نازل۔ عالی اس سند کو کہتے ہیں جس کے سلسلہ میں راویوں کی تعداد کم ہو، اور نازل اس سند کو کہتے ہیں جس میں راویوں کی تعداد زیادہ ہو، اس کو یوں سمجھئے کہ مذکورہ بالا تمام سندیں حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ کے واسطے سے ہیں، گویا ان کی حیثیت واسطۃ العقد کی ہے لیکن آخری سند میں علامہ اعظمی اور شاہ صاحب کے درمیان صرف دو واسطے ہیں، ایک مولانا عبدالرحمٰن بھوپالی، دوسرے مولانا عبدالقیوم صاحب، لہذا یہ سند عالی ہوئی، اسی طرح مولانا عبدالغفار صاحب کے طریق سے جو دونوں سندیں ہیں ان میں تین تین واسطے ہیں، اول میں مولانا عبدالغفار صاحب، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولانا عبدالغنی صاحب مجددی۔ ثانی میں مولانا عبدالغفار صاحب کے بعد مولانا عبدالحق صاحب الہ آبادی اور ان کے بعد نواب قطب الدین صاحب، یہ دونوں سندیں پہلی سند کے مقابلہ میں نازل ہوئیں۔ ان کے علاوہ باقی جو سندیں ہیں ان سب میں آپ کے اور شاہ صاحب کے درمیان چار چار واسطے ہیں تو وہ ان سب سے نازل ہوئیں۔

(۱) حضرت مولانا عبدالقیوم بن عبدالحی بڈھانوی ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے، حضرت سید احمد شہیدؒ کے پاس قرآن حفظ کیا اور انھیں کے دست حق پرست پر بیعت کی، اپنے وقت کے ممتاز اہل علم سے علم حاصل کیا، اور شاہ اسحاق صاحب دہلوی سے فقہ و حدیث کی کتابیں پڑھ کر اجازت حاصل کی، ان کا شمار اپنے وقت کے علماء و فقہاء و کاملین میں ہوتا تھا، بڑی تعداد میں لوگوں نے ان سے استفادہ کیا، ۱۲۹۹ھ میں ستر سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ (نزھۃ الخواطر ۷/۲۹۸-۲۹۷)

دار العلوم المدرسة العالية

بسم الله الرحمن الرحيم — نحمده ونصلي على رسوله الكريم

الحمد لله الذي جعل الشريعة المطهرة مقياسا للحلال والحرام وآثارها تبيانا ومعالم يهتدي بها المتخلصون من غياهب الظلام واقام لها ائمة قائمين بامر الله لا يضرهم من خذلهم ولا يخافون في الله لومة لائم ثم استخلفهم في كل عصر جماعة يحفظون الدين وينقلون الاحكام فالعلماء من حملة العلوم ورثة الانبياء العظام والصلوة والسلام على من ارسله حين ما ظلمت الدنيا واحاطتها حنادس الكفر من جميع الجهات لينقذها من الملة الحنيفية ويطهرها عن دنس الشرك ونجاسة الاذناب الاذى المهتدين صلوات الله عليه وسلامه للشريعة اصولا بينها وفروعا وفصولا حتى صارت منيعة الاركان وعلى آله واصحابه الذين هم خير الانام وسائر الائمة المجتهدين خصوصا سيدنا ابي حنيفة النعمان واصحابه الكرام وبعد فان العلوم سيما العلوم الدينية لجمة فلما اتاني من ناصع الامر وفقه الله والدين وهدى الى معالم الحق واليقين وبعد فان الاخ الصالح المولوي عبد الرحمن بن المولوي محمد صابر البستوي من مضافات اعظمكده قد دخل هذه المدرسة العربية العالية الاسلامية الكائنة بمو بعد ما حضر مجالس درس الافاضل والاكارم والاماثل واخذ عنهم مختصر العلوم ومشكلاتها غير ما ذكر في هذه الورقة من العلوم العربية ومتعلقاتها فقرأ من علم التفسير الجلالين ومن علم الحديث صحيحي الامامين الهمامين البخاري ومسلم وسنن ابي داؤد والنسائي وابن ماجه والموطا للامامين ... والجامع للترمذي ... للطحاوي ومن علم اصول الفقه التوضيح والتلويح ومن علم المعقول شرح السلم لمولانا حمد الله والقاضي ومير زاهد رساله مع غلام يحيى ومير زاهد ملا جلال وحواشيه لبحر العلوم ومن علم الفلسفة الميبذي وصدرا ومن علم الرياضي المقالة الاولى من اقليدس ومن علم الصرف الشافية وبقية كتبها على طريقة حسنة رضي عنه الاساتذة واركان المدرسة وهو عندنا جيد الفهم سليم الطبع متوقد الذهن ذو استعداد تام وقابلية تامة قادر على التدريس والافادة ولان لما طلب منا الاجازة اجزناه وكتبنا له هذه الورقة لتكون سندا وتذكرة عند مس الحاجة ونوصيه وبالله التوفيق ان يتقي الله سرا وعلانية ويتبع السنة السنية مشتغلا بنشر الاحكام الشرعية مكبا على مطالعة الكتب الدرسية مجدا في ترويج العلوم الدينية وان يكون مقتفيا لآثار السلف الصالحين مجتنبا عما احدثه المبتدعة من الاختراع في الدين عاضا بنواجذه على ما مضى عليه القرون المشهود لها بالخير من الصحابة والتابعين والائمة المجتهدين وان لا ينسانا في دعواته الصالحة والله الموفق والمعين وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين وكان ذلك لست عشر خلت من شعبان سنة احدى واربعين وثلثمائة والف من هجرة سيد عالم الانس والجان صلوات الله وسلامه عليه ما دارت الافلاك وسبحت الاملاك

امضاءات الاكابر والمدرسين

تیسرا باب

اساتذہ

تیسرا باب

اساتذہ

یہ علامہ اعظمی کی خوش نصیبی تھی کہ ان کو اپنے وقت کی بلند پایہ اور گرانمایہ علمی شخصیتوں کے خرمن علم سے خوشہ چینی کی سعادت نصیب ہوئی، آپ کو جن اصحاب فضل وکمال کے دامن فضل سے وابستگی اور سرچشمۂ علم وفن سے کسب فیض اور اکتساب علم کا شرف حاصل ہوا ان میں کئی ایک اس زمانہ کے عبقری اور علم وفن کی آبرو تھے، بلکہ ان میں چند ایسے بھی تھے کہ ان جیسے صدیوں میں بہ مشکل پیدا ہوتے ہیں۔

آپ نے جن اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ان میں زمانہ کے ایسے نابغہ ویکتا ہیں، جن کی نسبت کچھ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا، مگر چونکہ صاحب سوانح کے سوانح حیات اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتے، جب تک ان کا تذکرہ نہ ہو جن کے فیوض تعلیم وتربیت صاحب سوانح کے کردار وشخصیت کی تکمیل میں ممد ومعاون رہے ہیں، اس لئے ذیل میں ہم مختصراً آپ کے ان اساتذہ کا ذکر کر رہے ہیں جن سے آپ کو باقاعدہ شرف تلمذ حاصل رہا۔

مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی استاذ العلماء مولانا عبدالغفار بن شیخ عبداللہ بن شیخ تراب علی بن شیخ میہان بن شیخ ہمت علی عراقی مئوی حنفی کی ولادت ۲ صفر ۱۲۸۳ھ کو آپ کے آبائی مکان واقع محلہ اورنگ آباد قصبہ مئو میں ہوئی (۱) نزہۃ الخواطر

(۱) تذکرۂ علماء اعظم گڈھ ص ۱۷۱

میں آپ کے بارے میں یہ الفاظ مذکور ہیں: "الشیخ الفاضل عبدالغفار ابن عبدالله المئوی الأعظم گڈھی أحد العلماء المشهورین ۰۰۰"(۱)

(یعنی شیخ فاضل عبدالغفار بن عبداللہ مئوی اعظم گڈھی مشہور علماء میں سے ایک ۰۰۰) والد محترم نے تاریخی نام ظہور المنان تجویز کیا، تعلیم وتربیت کی ابتدا گھر سے ہوئی، قرآن کریم اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد کے پاس پڑھیں، فارسی زبان سیکھنے کے بعد مولانا جمال الدین مئوی اور مولانا فیض اللہ مئوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور ان سے نحو وصرف، حدیث وفقہ اور منطق کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، اسی اثنا میں مولانا امام الدین پنجابیؒ نے جہاں گردی کرتے ہوئے مئو وارد ہو کر رخت سفر کھولا، مولانا عبدالغفار صاحب نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک عرصہ تک ان کی تعلیم وتربیت سے بہرہ مند ہوتے رہے، اس کے بعد تحصیل وتکمیل کے لئے گھر سے باہر قدم نکالا، راستہ میں جو منزل سب سے پہلے آئی وہ ضلع بلیا کا قصبہ نوانگر تھا، وہاں کے مدرسہ انوار العلوم میں شاہ عبدالغنی مجددی کے شاگرد رشید مولانا حکیم عبداللہ مجددی مصروف درس وافادہ تھے، ان سے استفادہ کے بعد مرزاپور کا رخ کیا، وہاں ایک دوسرے فاضل بزرگ مولانا عبدالاحد الہ آبادی تلمیذ مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے درس وتدریس کا بازار گرم کر رکھا تھا، ان سے بہت ساری کتابیں پڑھنے کے بعد سند یافتہ ہو کر گھر لوٹے، یہ ۱۸۸۶ء م ۱۳۰۴ھ کا سال تھا اور مولانا کی عمر ابھی ۲۱ر سال سے کچھ اوپر تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے علم وفضل کی شہرت نصف النہار پر تھی، مولانا عبدالغفار صاحب نے علم کے اس مہر درخشاں سے بھی اپنے سینہ کو منور کرنا چاہا عالم اشتیاق میں لکھنو پہنچے۔ مگر وہ وہاں پہنچے تو مولانا عبدالحی صاحب کی زندگی کی شام ہو چلی تھی، اور آپ کے پہنچنے کے چند ہی دنوں کے بعد علم وفضل کا وہ نیر تاباں غروب ہو گیا۔

مولانا عبدالغفار صاحب کو مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی مرگ ناگہانی کا سخت صدمہ پہنچا

(۱) نزہۃ الخواطر ۸: ۲۶۹

اور اپنی محرومی پر بہت شکستہ دل اور آزردہ خاطر ہوئے، لیکن رحمت رب سے مایوس نہیں ہوئے، اور لکھنؤ ہی میں قیام کر کے اپنی عنان توجہ ایک دوسرے علم کی طرف مبذول کی، یعنی لکھنؤ کے مشہور و معروف حکماء سے طب کی تعلیم حاصل کی۔

لکھنؤ میں ایک سال قیام رہا، دوسرے سال یعنی ۱۳۰۵ھ میں گنگوہ کا رخ کیا اور تقریباً ۹ مہینے (ذی قعدہ ۱۳۰۵ھ سے شعبان ۱۳۰۶ھ تک) حضرت گنگوہی قدس سرہ کی خدمت میں گذار کر صحاح ستہ پڑھی اور سند و اجازت حدیث سے سرفراز اور حضرت گنگوہیؒ کے ارشد و نامور تلامذہ میں شمار ہوئے۔

فراغت کے بعد وطن تشریف لائے اور درس و تدریس کی بساط بچھائی، چند سال جامع مسجد شاہی میں تعلیم دی، لیکن کچھ ہی مدت بعد یہ سلسلہ ختم کر کے ۱۳۰۸ھ میں مہاراج گنج گئے، دو تین سال تک وہاں تدریسی خدمت انجام دی، ۱۳۱۱ھ میں مدرسہ انوار العلوم نوانگر بلیا کے اہل حل و عقد کے اصرار پر وہاں منتقل ہو گئے، اور مدت مدید تک اس سے وابستہ رہے، اس دوران بے شمار طلبگاران علم نے آپ سے کسب فیض کیا، اور درس کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ علم و فضل کا شہرہ بھی عام ہو گیا۔

۱۳۲۱ھ میں حج کی سعادت سے مشرف ہوئے، اور وہاں شیخ الدلائل مولانا عبدالحق صاحب الہ آبادی مہاجر مکی (متوفی ۱۳۳۳ھ) سے حدیث کی اجازت و سند حاصل کی۔

انوار العلوم نوانگر میں تقریباً اٹھارہ سال تک فریضۂ تدریس انجام دینے کے بعد ایک بار پھر مہاراج گنج گئے، لیکن دو ہی سال کا عرصہ گذرا تھا کہ ۱۳۳۱ھ میں گورکھپور کے مدرسۂ اسلامیہ میں بحیثیت صدر مدرس تشریف لے گئے، اور یہیں آپ کے تلمیذ ارشد حضرت علامہ اعظمی نے آپ کے سامنے غالباً پہلی بار جبین عقیدت خم اور زانوئے تلمذ تہ کیا، ۱۳۳۴ھ میں مدرسہ مظہر العلوم بنارس کی صدارت تدریس کو بھی رونق بخشی لیکن چند سال بعد دوبارہ گورکھپور چلے گئے، اور آخر تک وہاں تدریسی خدمت انجام دیتے رہے۔

عظیم الشان تدریسی اور تصنیفی و تالیفی خدمات کی انجام دہی کے بعد ۱۳۴۱ھ میں جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ عید گاہ اورنگ آباد مئو کے جانب جنوب نیاپورہ جانے والے راستہ کے بالکل قریب مزار ہے۔ رحمه الله رحمة واسعة.

مولانا عبدالغفار صاحبؒ سے بیشمار طلباء علم نے علم پڑھا، آپ کے بہت سے شاگرد ناموار ہوئے، لیکن آپ کے جس شاگرد کو آفاقی شہرت و ناموری حاصل ہوئی وہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ ہیں۔ علامہ اعظمیؒ نے اپنے استاذ کو ان بلند آہنگ الفاظ سے یاد فرمایا ہے: "... العلامة الفهامة الفقيه النبيه الشيخ ابى الانوار عبدالغفار بن عبدالله العراقى"

علامہ اعظمیؒ نے مولانا عبدالغفار صاحبؒ سے گورکھپور کے زمانہ طالب علمی میں "نورالانوار" اور "شرح وقایہ" وغیرہ کتابیں پڑھیں، پھر جب بنارس پہنچے ہیں تو وہاں درس نظامی میں داخل عربی ادب کی جملہ کتابوں کے علاوہ بدیع الزماں ہمدانی کی مقامات، زمخشری کی "اطواق الذہب" ابن قتیبہ کی "الشعر والشعراء" کا کچھ حصہ، قصیدہ بانت سعاد، دیوان ابوالعتاھیۃ، اور کتب بیان و معانی، منطق میں ملا حسن کی شرح سلم اور حدیث واصول حدیث میں مشکوٰۃ شریف، شرح نخبہ کا کچھ حصہ اور جامع ترمذی جلد اول تقریباً مکمل پڑھی۔ علامہ اعظمیؒ فرماتے ہیں:

"وواعدنى الشيخ مراراً بكتب إجازة علم الأدب لكن اخترمته المنية دون ايفاء وعده ، فلم يفرد لى إجازة الأدب ، لكنه أجازنى بجميع ما أجازه شيوخه فد خلت فى تلك الاجازة العامة "

(حضرت استاد نے بارہا مجھ سے علم ادب کی اجازت کو لکھ کر دینے کا وعدہ کیا، لیکن ایفاء عہد سے پہلے ہی داعیٔ اجل آ پہنچا، جس کی وجہ سے وہ مجھے ادب کی خصوصی اجازت نہیں دے سکے، مگر انھوں نے مجھے ان تمام چیزوں کی اجازت عطا کی ہے جن کی ان کے اساتذہ نے انھیں دی ہے، لہذا اس عام اجازت میں میں داخل ہوں)

اور اعیان الحجاج (۲؍۳۸۳) میں فرماتے ہیں:

"آپ حضرت گنگوہی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ آپ کے تلامذہ میں مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی صدر المدرسین دار العلوم دیوبند تھے، ناچیز کو بھی آپ ہی کی خدمت میں کچھ شُدبُد حاصل ہوئی ہے۔"

مولانا مرحوم کی جلالت شان اس درجہ پہنچی ہوئی تھی کہ ان کو علم میں حضرت تھانویؒ کے ہم پایہ شمار کیا جاتا تھا، مولانا عثمان صاحب معروفی استاذ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا عبدالغفار صاحب کو علم میں حضرت تھانوی م ۱۳۶۲ھ ر ۱۹۴۳ء کا ہم پایہ کہا جاتا تھا"(۱)

اللہ تعالیٰ نے آپ کو تعلیم وتربیت اور مردم سازی کی استعداد کے ساتھ تصنیف وتالیف کے ملکۂ تامہ سے بھی نوازا تھا، چنانچہ آپ نے متعدد موضوعات پر گرانقدر تصنیفات یادگار چھوڑیں۔ شاعر بھی تھے اور ضیا تخلص کرتے تھے، ایک مجموعۂ کلام "تحفۂ ضیائی" مطبوع ہے۔ سلوک وتصوف میں حضرت چاند شاہ ٹانڈوی سے مجاز بیعت تھے۔

مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی | مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی کی تاریخ ومقام ولادت کا علم نہیں ہو سکا، تیرہویں صدی کے اواخر یا چودہویں صدی کے اوائل میں غالباً سنبھل میں آپ کی ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم سنبھل ہی میں حاصل کی اور متوسطات تک پڑھنے کے بعد امروہہ گئے، کچھ دنوں تک وہاں زیر تعلیم رہنے کے بعد دیوبند روانہ ہوئے اور دار العلوم میں داخلہ لیا، حضرت شیخ الہندؒ کے پاس صحاح ستہ پڑھ کر ۱۳۱۷ھ میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی اور سند حدیث حاصل کی۔

ہاپوڑ اور کانپور کے مدرسہ جامع العلوم میں تدریسی خدمات انجام دیں، جامع العلوم میں منصب صدارت پر بھی فائز رہے، غالباً ۱۳۴۰ھ میں مئو آئے اور مدرسہ دار العلوم میں

(۱) ترجمان دار العلوم اکتوبر ۱۹۹۶ء ص ۳۱

شیخ الحدیث وصدر مدرس ہوئے، اور کئی سال تک درس وافادہ کی مجلس سجائے رکھی، یہاں آپ کے خرمن علم سے خوشہ چینی کرنے والوں میں علامہ اعظمی اور مولانا عبداللطیف نعمانی جیسے جلیل القدر اہل علم تھے، اور یہیں رئیس المناظرین مولانا محمد منظور نعمانی بھی آپ کے دامن تربیت سے وابستہ رہے، آپ کے شاگردوں میں ان حضرات کے علاوہ مولانا سید فخر الدین احمد مراد آبادی (سابق شیخ الحدیث شاہی مراد آباد ودارالعلوم دیوبند) تھے، جنھوں نے ہاپوڑ کے زمانۂ قیام میں آپ سے علم حاصل کیا تھا۔ اس طرح ان کے متعدد شاگرد فخر روزگار ہوئے۔

آپ کا شمار جید الاستعداد علماء میں ہوتا تھا، علم وعمل میں ممتاز اور درس وتدریس میں طاق تھے، تلامذہ کی عظمت وبلندی کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ مردم سازی میں فرد اور باکمال تھے۔ بالخصوص مولانا محمد منظور نعمانیؒ تو انھیں کے تربیت یافتوں میں شمار ہوتے تھے ۔علامہ اعظمی سے ان کی مراسلت بھی تھی اور ان کے متعدد مکاتیب علامہ اعظمی کے نام پائے جاتے ہیں۔

سن وفات تاریخ دارالعلوم (۸۶/۲) اور کاروان رفتہ (ص ۲۱۶) میں ۱۳۶۲ھ مکتوب ہے، جب کہ علامہ اعظمی نے اپنی بیاض میں ۱۷ر شوال ۱۳۶۱ھ ارقام فرمایا ہے (۱) وفات سنبھل (مراد آباد) میں ہوئی۔

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری | امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کشمیر کے ایک گاؤں دودھ وان میں ۲۷ر شوال ۱۲۹۲ھ کو پیدا ہوئے، قرآن کریم اور ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم مولانا سید معظم شاہ سے حاصل کی ۱۳۱۰ھ میں دیوبند پہنچے، وہاں چار سال رہ کر حدیث وتفسیر کے علاوہ مختلف علوم وفنون کی تکمیل کی اور ۱۳۱۴ھ میں سند فراغ حاصل کی، اس کے بعد ایک دوسرے منبع علم وعرفان گنگوہ تشریف لے گئے اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ سے سند واجازت حدیث کے علاوہ خرقۂ خلافت پایا اور اس

(۱) الفرقان کی اشاعت خاص ۱۹۹۸ء "بانیٔ الفرقان نمبر" (ص ۶۰۶) پر بھی سن وفات ۱۳۶۱ھ درج ہے۔

طرح ظاہر کے ساتھ باطن کو بھی منور کرنے کا سامان بہم پہنچایا۔

دہلی کے مدرسہ امینیہ سے درس و تدریس کا آغاز کیا، وہاں کئی برس تک اس خدمت کو انجام دینے کے بعد ۱۳۲۰ھ م ۱۹۰۳ء میں کشمیر چلے گئے اور اپنے وطن اور علاقہ میں علم کا نور پھیلانے کے لئے ایک مدرسہ فیض عام کے نام سے قائم کیا۔ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں حج بیت اللہ کے ارادے سے حجاز تشریف لے گئے اور سعادت حج کے علاوہ کچھ مدت تک حجاز میں قیام فرما کر وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ فرمایا، اور شیخ حسین بن محمد جسر طرابلسی سے حدیث کی سند حاصل کی۔

۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے اور کئی سال تک بلا معاوضہ و مشاہرہ دار العلوم میں تدریسی امور انجام دیتے رہے، ۱۳۳۳ھ میں جب شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب عازم حجاز ہوئے تو شاہ صاحب کو اپنا جانشین بنا کر مسند صدارت پر بٹھایا۔۔۔۔۔۔ آپ اس منصب پر تقریباً بارہ سال متمکن رہے اور اس اثنا میں بخاری اور ترمذی کا درس نہایت تحقیق و تدقیق اور کمال و مہارت کے ساتھ دیتے رہے تا آنکہ ۱۳۴۶ھ کے اوائل میں دار العلوم کے ارباب اہتمام سے آپ کے کچھ اختلافات ہوگئے۔ جس کی وجہ سے دار العلوم کو خیر باد کہہ دیا، اور ڈابھیل تشریف لے گئے، ڈابھیل کے لوگوں نے شاہ صاحب کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کئے اور جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین میں جب آپ نے نزول اجلال فرمایا تو آپ کے نور علم سے وہاں کا ذرہ ذرہ چمک اٹھا، وہ اپنے درس و افادہ سے پانچ سال تک رزم میں بزم کا سماں پیدا کرتے رہے، لیکن اسی دوران بواسیر جیسے مہلک مرض کا شکار ہوگئے، امراض کی شدت سے مجبور ہو کر دیوبند آئے اور وہیں ۳/ صفر ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء کو آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور ساٹھ سال کی عمر میں علم و فضل کا یہ نیر تاباں اس عالم آب و گل سے روپوش ہوگیا۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ذہانت و فطانت، فہم و ذکاوت، جودت طبع، وفور علم، وسعت مطالعہ اور دیگر بہت سی خصوصیات کے لحاظ سے نادرۂ عصر اور نابغۂ روزگار اور درس و تدریس، بالخصوص تدریس حدیث میں یگانہ و یکتا تھے، نہ جانے کتنے تشنگان علم و طلبگاران فضل آپ

کے فیض سے مستفیض ہوئے۔ برصغیر کی بساط درس و تدریس پر نظر آنے والے بیشتر اصحاب فضل و کمال شاہ صاحب ہی کے فیض یافتہ تھے۔

شاہ صاحب کی عبقریت اور وفور علم کا اعتراف بڑے بڑے معاصر اہل علم و فضل نے کیا ہے، ۱۳۳۰ھ میں مصر کے مشہور عالم سید رشید رضا صاحب ہندوستان تشریف لائے تو اپنی سیاحت کے دوران وہ دارالعلوم کے معائنہ کے لئے دیوبند تشریف لے گئے، علامہ رشید رضا کے استقبال میں دارالعلوم میں جو تقریب ہوئی اس میں شاہ صاحب نے عربی زبان میں نہایت فصیح و بلیغ اور برجستہ تقریر کی، سید رشید رضا شاہ صاحب کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فرمایا:

والله مارأيت مثل هذا العالم الجليل قط۔ میں نے اس جلیل القدر عالم جیسا آدمی نہیں دیکھا

شاہ صاحب کی متعدد تصانیف ان کی یادگار ہیں، جن میں کچھ تو ایسی ہیں جو ان کے درسی افادات ہیں جس کو ان کے شاگردوں نے مرتب کیا ہے، انھیں میں صحیح بخاری پر آپ کی تقریر ہے جو فیض الباری کے نام سے مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی کی ترتیب سے چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی بانیان دارالعلوم دیوبند میں ایک مشہور بزرگ مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ (متوفی ۱۳۲۵ھ م ۱۹۰۷ء) تھے، ان کے تین صاحبزادے بڑے صاحب علم و فضل ہوئے، جن کے وجود سے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کا گھرانہ "ایں خانہ ہمہ آفتاب است" کا مصداق بن گیا تھا، ان کے اخلاف میں مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی سابق مفتی دارالعلوم دیوبند تھے، جن کا ذکر اسی باب میں آئے گا۔ دوسرے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندی (متوفی ۱۳۴۸ھ م ۱۹۲۹ء) تھے، آپ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے، آپ کا قلمی شاہکار اور معرکۃ الآراء تصنیف "دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا" ہے۔ اور تیسرے مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی جن کا ذکر درج ذیل ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی مذکورہ بالا عثمانی خانوادے کے گل سرسبد تھے، اس خانوادے

کا نام سب سے زیادہ آپ ہی کے نام سے روشن ہوا۔ وہ ۱۳۰۵ھ م ۱۸۸۷ء میں بمقام بجنور پیدا ہوئے (۱)۔ بچپن ہی میں قرآن حفظ کر لیا تھا، اس کے بعد مزید تعلیم کے لئے دارالعلوم میں داخل کر دئے گئے، اور ۲۰/ بیس سال کی عمر میں ۱۳۲۵ھ م ۱۹۰۷ء میں دارالعلوم ہی میں علم وفن کی تکمیل کی۔ (۱)

فراغت کے بعد فروغ کا دور شروع ہوا اور پہلی منزل جو سامنے آئی وہ دہلی کا مدرسہ امینیہ تھا، جس کے وہ صدر مدرس مقرر ہوئے، مدرسہ امینیہ میں آپ نے تقریباً تین سال تدریس وصدارت تدریس کا منصب سنبھالے رکھا، ۱۳۲۸ھ م ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم دیوبند کے ارباب بست وکشاد نے ان کے لئے دارالعلوم میں مناسب جگہ تجویز کی اور ان کو دہلی سے دیوبند بلا لیا گیا۔ وہاں سالہا سال تک درس وتدریس کی خدمت انجام دی، بالخصوص درس حدیث کی شہرت دور دور پہنچی۔ ۱۳۴۶ھ م ۱۹۲۸ء میں جب دارالعلوم دیوبند میں کچھ اختلافات ظہور میں آئے تو شاہ صاحب کے ساتھ آپ بھی دارالعلوم چھوڑ کر جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل تشریف لے گئے اور اس کی ترقی اور فروغ کے لئے شاہ صاحبؒ کے سہیم وشریک ہوئے۔

۱۳۵۲ھ کے اوائل میں شاہ صاحبؒ کے وصال کے بعد آپ کو شیخ الحدیث کا منصب سپرد کیا گیا، اس منصب کو سنبھالے ہوئے ابھی دو ہی سال گذرے تھے کہ دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام سے مفاہمت عمل میں آگئی اور ۱۳۵۴ھ م ۱۹۳۵ء میں دارالعلوم تشریف لائے اور ۱۳۶۲ھ م ۱۹۴۳ء تک بحیثیت صدر مدرس دارالعلوم کی خدمات انجام دیتے رہے (۲)

تقسیم ہند سے کچھ پہلے پاکستان ہجرت کر گئے اور قیام پاکستان کے بعد وہاں بہت سی سیاسی، ملی اور دینی خدمات انجام دیں، سیاست سے ان کا تعلق پاکستان ہجرت کرنے سے قبل بھی رہا، اور بعض اہم سیاسی امور میں انھوں نے سرگرم حصہ بھی لیا۔

---

(۱) تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲:۹۸

(۲) تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲:۹۹، ۲۴۰

وفات پاکستان کی ریاست بھاول پور میں ۲۱؍ صفر ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۳؍ دسمبر ۱۹۴۹ء کو چند گھنٹے کی علالت کے بعد ہوئی اور پاکستان کے مشہور شہر کراچی میں مدفون ہوئے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے مسلم شریف کے درس کو آفاقی شہرت حاصل تھی، اور اس درس سے استفادہ کی نعمت بہت کچھ علامہ اعظمیؒ کے حصہ میں بھی آئی، صحیح مسلم آپ نے ان سے اس وقت پڑھی جب تحصیل علم کی غرض سے دوبارہ ۱۳۳۹ھ میں دیوبند تشریف لے گئے تھے (۱)۔ علامہ عثمانیؒ کے دل میں آپ کی حد درجہ قدر و منزلت تھی اور ایک عرصے تک ان سے سلسلۂ مراسلت بھی رہا، علامہ عثمانیؒ نے شاگرد رشید علامہ اعظمیؒ کو جو خطوط لکھے ہیں وہ علامہ اعظمی کی یادگار میں شائع ہونے والے مجلّہ "المآثر" جلد نمبر ۷ شمارہ نمبر ۱ میں صفحہ ۸۲ تا ۹۲ شائع ہو چکے ہیں، جن سے استاذ و شاگرد کے تعلقات پر بہت حد تک روشنی پڑتی ہے۔

علامہ اعظمی کا اپنے استاذ علامہ عثمانیؒ سے اس درجہ تعلق خاطر تھا کہ جب علامہ عثمانی مرحوم ہندوستان سے پاکستان ہجرت فرما گئے تو علامہ اعظمیؒ نے اپنے شاگرد مفتی محمد ظفیر الدین صاحب کو ایک خط میں اس پر اس طرح اظہار تاسف کیا:

> "مجھ کو بھی کسی کے پاکستان جانے کا کوئی رنج نہیں، لیکن حضرت مولانا شبیر احمد (عثمانی) رحمۃ اللہ علیہ اور سید صاحب کے پاکستان منتقل ہو جانے کا صدمہ دل سے کبھی نہیں جا سکتا"۔ (۲)

علامہ عثمانی کی وفات پر علامہ اعظمیؒ نے عربی زبان میں ۱۳۷ اشعار پر مشتمل ایک زبردست مرثیہ لکھا، جس کے چند اشعار یہ ہیں:

أرانی و قلبی دائما یتوجع — ولست أری دمعی عن العین یقلع

یفجعنی دھری فلا یکتفی بوا — حد بل بحبر بعد آخر یفجع

---

(۱) علامہ اعظمی نے علامہ عثمانی سے صحیح مسلم جلد اول تا کتاب الزکوۃ پڑھی تھی۔ دیکھئے المآثر جلد نمبر ۷ شمارہ نمبر ۱ صفحہ ۸۳۔

(۲) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۶۰

خليل و محمود ، عزيز و أنور　　و أشرف ، كانوا بيننا ثم أقشعوا
ومن بعدهم مولای شبير أحمد　　الإمام الهمام القرم أمسى يودع

یہ پورا مرثیہ برہان ج ۲۰ ش ۳ میں شائع ہوا ہے۔

مولانا اصغر حسین دیوبندیؒ مولانا اصغر حسین دیوبندی کی ۱۲۹۴ھ میں دیوبند میں ولادت ہوئی (۱)، قرآن کریم اور فارسی کی ابتدائی تعلیم والد ماجد شاہ محمد حسن (متوفی ۱۳۱۲ھ) کے پاس حاصل کی، بعدازاں دارالعلوم (دیوبند) میں داخل ہوئے اور ۱۳۲۰ھ میں فراغت پائی۔

تکمیل کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد پر جونپور کی اٹالہ مسجد کے مدرسہ میں صدارت تدریس کا عہدہ سنبھالا اور سات سال تک درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، جونپور کے زمانۂ قیام میں آپ کے علم و فضل کے ساتھ زہد و تقویٰ اور ورع و تدین کی بھی بڑی شہرت ہوئی، چنانچہ ۱۳۲۶ھ م ۱۹۰۹ء میں جب مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کا قیام عمل آیا تو آپ ہی کے ہاتھوں سے اس کا افتتاح ہوا، اس واقعہ کا ذکر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے حیات شبلی میں کیا ہے، لیکن اس مقام پر مصنف علیہ الرحمہ سے ایک عجیب و غریب سہو ہوا ہے، وہ فرماتے ہیں:

> "اس زمانہ میں مولانا سید اصغر حسین صاحب جواب دیوبند کے مدرسہ میں ہیں، اور نہایت مقدس بزرگ ہیں، اٹالہ کی جامع مسجد جونپور میں پچیس ۲۵ برس سے مدرس تھے، وہ تشریف لائے اور ان کے ہاتھوں سے مدرسہ کا افتتاح ہوا"۔ (۲)

غالباً سبقت قلم کی وجہ سے پانچ برس کا پچیس برس ہو گیا ہے۔

مولانا اصغر حسین صاحب نے ۷/ سال تک جونپور میں درس و افادہ کا سلسلہ جاری رکھا، ۱۳۲۸ھ میں آپ کو دیوبند طلب کیا گیا جہاں رسالہ "القاسم" کے ادارتی امور

(۱) تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲: ۹۰

(۲) حیات شبلی ص ۶۸۲

اور ساتھ ہی مختلف کتابوں کے اسباق بھی آپ کے سپرد ہوئے۔(۱) پوری زندگی "در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق" کا نمونہ رہی، چنانچہ شریعت و طریقت دونوں کو متوازن طور پر قائم رکھا، وفور علم اور عمق فہم اس پر مستزاد، اجازت و خلافت شیخ المشائخ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے حاصل تھی۔

شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کی جب وفات واقع ہوئی تو متعدد اہل علم اور اکابر کی موجودگی کے باوجود نماز جنازہ کی امامت آپ نے فرمائی

۱۳۶۴ھ میں وفات پائی آپ کی وفات کا قصہ تاریخ دارالعلوم میں یوں مذکور ہے:

"۱۳۶۳ھ کے اواخر میں اپنے متوسلین کی دعوت پر گجرات تشریف لے گئے، راندیر میں قیام تھا کہ اچانک حرکت قلب بند ہوگئی اور ۲۲؍ محرم الحرام ۱۳۶۴ھ بروز دوشنبہ داعیٔ اجل کو لبیک کہا وہیں دفن ہیں (۲)

دیوبند کے خاندان سادات میں ایک مشہور صاحب دل تھے، جن کی سادگی اور سادہ لوحی کے عجیب و غریب واقعات لوگوں نے لکھے ہیں، میاں جی منے شاہؒ کے نام سے معروف تھے، مولانا اصغر حسین صاحب کو ان سے شرف بیعت بھی حاصل تھا، ان کے بارے میں سید محبوب رضوی نے " تاریخ دارالعلوم دیوبند" میں لکھا ہے کہ وہ مولانا اصغر حسین کے ماموں تھے (۳) جبکہ مولانا انظر شاہ صاحب نے حضرت شاہ صاحبؒ کی سوانح حیات "نقش دوام" کے حاشیہ میں مولانا اصغر حسین کو ان کا نواسہ لکھا ہے (۴)

بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو مولانا اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا علم و فضل مسلم تھا، ان کے علم کی یادگار ان کی وہ تصنیفات ہیں جن کی تعداد کم و بیش ۳۵؍ ہے، جو

(۱) تاریخ دارالعلوم ۲:۹۰

(۲) تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۹۱

(۳) تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۹۱

(۴) نقش دوام ص ۵۳

فقہ و فرائض اور تاریخ وغیرہ کے موضوعات پر تصنیف کی گئی ہیں (۱)

علامہ اعظمیؒ کو میاں صاحب سے شرف تلمذ اس وقت حاصل ہوا جب وہ طلب علم کے لئے دوبارہ دیوبند تشریف لے گئے، ان سے آپ نے سنن ابی داؤد جلد اول تا کتاب الصلوٰۃ پڑھی تھی۔

مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی | مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی کے صاحبزادے اور علامہ شبیر احمد عثمانی کے برادر بزرگ تھے، ۱۲۷۵ھ میں دیوبند میں ولادت ہوئی، علوم وفنون کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں کی، تاریخ دارالعلوم میں ان کا سال فراغت ۱۲۹۵ھ درج ہے (۲) مگر نزہۃ الخواطر (۸/۳۲۰) اور اسی کی متابعت میں تذکرۂ علماء اعظم گڈھ (ص ۶۹) کے حاشیہ میں ان کا سال فراغ ۱۲۹۸ھ مذکور ہے۔ تاریخ دارالعلوم کا بیان قرین صواب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں اس کے بعد تحریر ہے: "۱۲۹۸ھ کے جلسۂ دستار بندی میں آپ کو سند و دستار حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے دست مبارک سے عطا ہوئی"(۳) بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب نزہۃ الخواطر کو سال فراغت اور سن دستار بندی میں اشتباہ ہو گیا ہے۔ واللہ اعلم

فراغت کے بعد کچھ دنوں تک معین المدرسین کی حیثیت سے دارالعلوم کی خدمت انجام دیتے رہے، اور اس دوران فتویٰ نویسی کی مشق بھی کرتے رہے، پھر آپ کا تقرر میرٹھ کے کسی مدرسہ میں ہوا اور ایک مدت تک وہاں درس و تدریس کے بعد ۱۳۰۹ھ میں دارالعلوم کے ارباب حل وعقد کی نظر انتخاب پڑی اور دارالعلوم کی نیابت اہتمام کے لئے آپ کو منتخب کیا گیا، پھر ایک سال بعد شعبۂ افتاء کی خدمت سپرد کر دی گئی، اس کے علاوہ درس و تدریس کے فرائض بھی باحسن وجہ انجام دیتے رہے۔ ۱۳۴۶ھ میں جب شاہ صاحبؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے بعض وجوہ سے دارالعلوم چھوڑا تو آپ

(۱) تاریخ دارالعلوم ص ۹۱

(۲) تاریخ دار لعلوم ۲:۵۴۷و۲۴

(۳) تاریخ دار لعلوم ۲:۵۴۷و۲۴

بھی اپنے فرائض سے مستعفی ہوگئے، ۱۳۴۲ھ میں شاہ صاحبؒ کے زمانۂ علالت میں جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں شاہ صاحب کی جگہ پر بخاری شریف کا درس دیا۔ ۱۷؍ جمادی الثانیہ ۱۳۴۲ کی شب میں مختصر سی علالت کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

مفتی صاحب کے زمانہ میں دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ افتاء کو غیر معمولی وسعت و ترقی حاصل ہوئی، انھوں نے اپنے تفقہ، فہم و بصیرت، قوت استدلال اور بداہت و استحضار کی بدولت اس شعبہ کو شہرت کے آسمان پر پہنچادیا، تقریباً چالیس سال تک انھوں نے دارالعلوم کے شعبۂ افتاء کی خدمت انجام دی اور اس مدت میں آپ کے فتوی نویسی کی شہرت پورے ملک میں پھیل گئی، صاحب نزہۃ الخواطر نے آپ کی نسبت ”احد فقهاء الحنفية“(۱) یعنی فقہائے حنفیہ میں سے ایک لکھاہے۔ پھر آگے فرماتے ہیں:

” وكانت له ملكة راسخة في الإفتاء و خبرة تامة بالفقه، واستحضار لمتونه و جزئياته ، يكتب الجواب عفو الساعة فيض الخاطر، ولا يحتاج الى المراجعة أو التغيير في اكثر الاحيان ، هذا مع تحر للصواب ، و دقة في تحرير المسائل . والمام بالحوادث والنوازل ، وقد داوم على ذلك أربعين سنة ، وكتب من الاجوبة و أصدر من الفتاوى ما يملأ بطون الدفاتر “(۲)

یعنی ان کو فتوی نویسی میں پورا ملکہ اور فقہ میں مہارت تامہ حاصل تھی ،فقہ کے متن اور جزئیات کا پوری طرح استحضار تھا، جواب بلا تکلف اور برجستہ لکھتے تھے، اور اکثر وبیشتر ان میں ترمیم یا کتابوں سے مراجعت کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی، صحت کا قصد، فتوی نویسی میں دقت رسی اور حوادث وواقعات کا علم اس پر مستزاد تھا، چالیس سال کی مدت تک آپ نے فتویٰ نویسی کی اور اتنے سارے جوابات اور فتوے لکھے جن کے لئے کئی دفاتر درکار ہیں۔

(۱) نزہۃ الخواطر ۸: ۳۲۰

(۲) ایضاً ۸: ۳۲۱

شریعت کے ان اہم امور کی انجام دہی کے ساتھ طریقت و تصوف کے بھی ذوق آشنا تھے، چنانچہ آپ کو مولانا رفیع الدین دیوبندی سے بیعت اور حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے اجازت حاصل تھی، اس رتبہ تک رسائی کے لئے تقریباً ڈیڑھ سال حرمین شریفین میں قیام کر کے حضرت حاجی صاحب کی خدمت گذاری کی تھی۔

آپ کے مزاج میں غایت درجہ انکسار و تواضع تھا، اخلاق و عادات نہایت کریمانہ تھے، مجبور و بے سہارا افراد کی امداد و اعانت اور ان کی حاجت بر آری روز مرہ کے مشاغل و لوازم میں سے تھی۔

مفتی صاحب علامہ اعظمیؒ کے استاذ تھے، علامہ اعظمیؒ نے ان سے دیوبند کے پہلے سفر میں فیض حاصل کیا تھا، اس وقت آپ نے ان سے تفسیر قرآن میں جلالین پڑھی تھی۔

مولانا رسول خاں ہزاروی پاکستان میں واقع ضلع ہزارہ کے اچھڑیاں نامی گاؤں میں ۱۲۸۸ھ م ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم ہزارہ ہی میں حاصل کی، ۱۳۲۰ھ میں دیوبند کا قصد کیا اور دارالعلوم میں داخلہ لے کر علم و فن کی تکمیل کی اور ۱۳۲۳ھ میں سند فراغت حاصل کی۔(۱)

فراغت کے بعد تدریسی زندگی شروع کی اور سب سے پہلے مدرسہ دارالاسلام میرٹھ میں صدر مدرسی کا عہدہ سنبھالا، ایک مدت تک تعلیم و تدریس اور صدارت کے فرائض انجام دینے کے بعد ۱۳۳۳ھ میں دارالعلوم کے لئے بحیثیت مدرس ان کا تقرر ہوا، تقریباً بیس سال یعنی ۱۳۵۳ھ تک دارالعلوم میں حدیث و تفسیر اور منطق و فلسفہ کا درس دیتے رہے، ۱۳۵۳ھ میں لاہور چلے گئے اور اورینٹل کالج لاہور میں شعبۂ عربی کے استاذ مقرر ہو کر وہیں مقیم ہو گئے۔ ۱۳۷۰ھ میں وہاں سے ریٹائر ہوئے، اس کے بعد جامعہ اشرفیہ لاہور کے صدر مدرس ہوئے، اور تادم مرگ اسی کی خاک سے جڑے رہے۔ ۲۳ر رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ کو ۱۰۳ سال کی عمر میں اپنے وطن مالوف اچھڑیاں میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے(۲)

---

(۱) تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲:۹۷ (۲) ایضاً ۲:۹۸-۹۷

تاریخ دارالعلوم دیوبند میں ان کے بارے تحریر ہے:

"حضرت مولانا رسول خاں صاحب معقولات کے ساتھ منقولات میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے، علوم نقلیہ وعقلیہ کو طالب علم کی استعداد کے مطابق اس طرح سمجھاتے تھے کہ مسئلہ شاگرد کے ذہن نشین ہو جاتا تھا، ان کا درس تفہیم کے لحاظ سے ممتاز سمجھا جاتا تھا، درسی تقریر جامع اور پر مغز ہوتی تھی، وجیہ اور پر وقار تھے تقریر کے وقت چہرے پر وقار برستا تھا، طرز بیان صاف اور مؤثر ہوتا تھا، ہر علم وفن کی کتابیں انھیں گویا ازبر تھیں، طلباء ذوق وشوق سے ان کے درس میں شریک ہوتے تھے، دارالعلوم دیوبند کے ممتاز اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا، ان کی عمر کے تقریباً ۷۰ سال درس وتدریس میں گذرے"(۱)

مولانا موصوف بھی علامہ اعظمیؒ کے اساتذہ میں تھے، آپ نے ان سے بیضاوی شریف پڑھی تھی۔

مولانا حکیم محمد حسن دیوبندی شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے چھوٹے بھائی تھے، تعلیم تمام تر دیوبند میں حاصل کی، ۱۲۹۵ھ میں فراغت پائی۔ فراغت کے بعد طب کی تعلیم حاصل کی، ۱۳۰۲ھ میں ان کا تقرر دارالعلوم میں بحیثیت مدرس عربی وطبیب ہوا، طب کی تعلیم کے ساتھ طلباء کے علاج ومعالجے کی خدمت بھی انجام دیتے تھے، اور بایں ہمہ حدیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ کی کتابیں بھی پڑھایا کرتے تھے، عمر عزیز کا بیشتر حصہ دارالعلوم کی خدمت کی نذر کیا، اور اس خدمت کو ہی اپنا فرض اولین اور سعادت کبریٰ سمجھ کر زندگی بتادی، بالآخر ۱۵ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ کو ایک مدت کی خدمت گذاری کے بعد جان جانِ آفریں کے سپرد کی، اور قبرستان قاسمی میں پیوند خاک ہوئے ان تمام اوصاف وخصائل کے ساتھ سالک طریقت بھی تھے، اور عالم ربانی مرشد کامل مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کی بیعت سے مشرف تھے، ان کی نسبت تاریخ دارالعلوم میں روداد دارالعلوم کے حوالہ سے مذکور ہے:

(۱) تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲:۹۸

"آپ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کے اصحاب و خدام خاص میں سے ہیں، اور طریقۂ سلف پر علماً و عملاً قائم ہیں، کتب طب کی تعلیم اور مدارات طلباء آپ کا مستقل کام ہے، مگر اس کے ساتھ ہی علم حدیث و فقہ و تفسیر کی کئی بڑی جماعتوں کا درس بھی آپ کے متعلق رہتا ہے۔"(۱)

تذکرۂ علماء حال، مصنفہ مولانا محمد ادریس نگرامی، میں ان کی بابت تحریر ہے:

"مدرسۂ دیوبند میں آپ مدرس ہیں، کتب طبیہ کا درس بہت اچھا دیتے ہیں"(۲)

علامہ اعظمی ان کے شاگردوں اور فیض یافتوں میں تھے، اور ان کے پاس آپ نے ہدایہ جلد ثالث کے کچھ حصے پڑھے تھے۔

مولانا ابوالحسن مئویؒ مولانا ابوالحسن صاحب عراقی مئوی، مولانا عبدالغفار صاحب مئوی کے چھوٹے بھائی تھے، ۱۲۹۶ھ میں مئو میں پیدا ہوئے، چونکہ علمی و دینی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، اس لئے ابتدائی تعلیم و تربیت کا انتظام گھر میں ہوا، پھر اپنے برادر بزرگ مولانا عبدالغفار صاحب کے دامن تربیت سے وابستہ ہو کر نوانگر بلیا گئے، اور مدرسہ انوار العلوم میں زیر تعلیم رہ کر جملہ علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد جاذبۂ توفیق نے آستانۂ حضرت گنگوہیؒ تک پہنچایا، چنانچہ حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں ہی آپ نے صحاح وغیرہ کی کتابیں پڑھ کر دورۂ حدیث کی تکمیل اور سند فراغ حاصل کی، اس کے کچھ سال بعد جب کہ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے درس کی شہرت سنی تو دیوبند کا شوق دامنگیر ہوا، وہاں حضرت شاہ صاحب کے حلقۂ درس میں حاضر ہو کر ان کے فیضان علم سے مستفیض ہوئے۔(۳)

مولانا ابوالحسن نے فراغت کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا، حضرت مولانا گنگوہیؒ کے ہاتھوں فراغت کے بعد ہی تدریسی مہم شروع کر دی تھی، مفتاح العلوم

(۱) تاریخ دار العلوم ۲:۴۹
(۲) تذکرہ علمائے حال ص ۷۵
(۳) تذکرۂ علماء اعظم گڈھ ۷ ۳۔۳۶

کی تاریخ میں آگے آئے گا، کہ مولانا ابوالحسن صاحب نے ہی ۱۳۲۷ھ میں جامع مسجد شاہی کٹرہ (مئو) میں مدرسہ مفتاح العلوم قائم کیا، آپ کے ہاتھ پر وہیں علامہ اعظمی کے والد ماجد نے ۱۳۲۹ھ میں صحاح ستہ پڑھ کر فراغت پائی، تقریباً دودہائیوں تک اس کے ناظم رہے، اور ۱۳۴۸ھ میں تمام کاروبار مدرسہ اپنے شاگرد رشید علامہ اعظمی کے سپرد کر دیا۔

درس وتدریس کیساتھ وعظ وتذکیر کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ احسان وسلوک سے بھی خاص تعلق تھا، اور حضرت تھانوی کے ہاتھوں بیعت اور خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے تھے۔

مولانا تین دفعہ سعادت حج وزیارت سے بھی مشرف ہوئے تھے، پہلا حج ۱۳۲۵ھ میں ۲۹ سال کی عمر میں کیا تھا۔ فتویٰ نویسی میں اونچا پایہ رکھتے تھے، مصنف تھے اور کئی تصنیفات یادگار بھی چھوڑی ہیں۔ ۱۳۶۱ھ میں وفات پائی، اور محلہ اورنگ آباد میں عیدگاہ کے پیچھے مدفون ہوئے۔

علامہ اعظمی کے اساتذہ میں تھے اور آپ نے ان کے پاس کافیہ وشرح جامی وغیرہ کتابیں پڑھی تھیں اور انھیں کے پاس خط کی مشق بھی بہم پہنچائی تھی۔(۱)

مولانا محمد صابر مئوی ۱۸۶۶ء کے حدود میں مئو کے محلہ بلاقی پورہ میں پیدا ہوئے، والد کا نام حافظ محمد اسمٰعیل تھا۔ مولانا سلطان احمد صاحب مئوی کے پاس متوسطات تک کی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد کانپور گئے اور مولانا احمد حسن صاحب کانپوریؒ کے پاس بقیہ کتب درس کی تحصیل کی اور سند فراغ پائی۔

حصول علم سے فارغ ہونے کے بعد درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا، اولاً آپ مدرسہ دارالعلوم مئو میں مدرس مقرر ہوئے اور عرصۂ دراز تک اس میں تدریسی خدمت انجام دیتے رہے، اس کے بعد یہاں سے علیحدہ ہو کر مظہر العلوم بنارس چلے گئے اور کچھ دنوں وہاں تدریسی خدمات انجام دیں۔ یکم نومبر ۱۹۴۹ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

---

(۱) اعیان الحجاج ۲:۲۸۵

مولانا مرحوم درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے، چنانچہ فارسی قواعد پر انھوں نے ایک کتاب "نظام الفوائد" کے نام سے دو حصوں میں تصنیف فرمائی، جس میں فارسی قواعد کی نہایت آسان اور سہل زبان میں توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ (تذکرۂ علماء اعظم گڈھ ۲۷۸۔۲۷۹)

آپ کے زمرۂ تلامذہ میں علامہ اعظمی بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے خود اپنے استاد کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:

"مولانا محمد صابر بن حافظ اسمٰعیل (بلاقی پورہ مئو) شاگرد مولانا احمد حسن کانپوری و مرید شاہ وارث حسن و استاد ایں فقیر بود، بدارالعلوم مئو و مظہر العلوم بنارس درس داد، بعارضۂ وجع قلب دراواخر ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ وفات یافت اولئك لهم الخيرات۔"

یعنی مولانا محمد صابر بن حافظ اسمٰعیل (بلاقی پورہ مئو) مولانا احمد حسن کانپوری کے شاگرد، شاہ وارث حسن کے مرید اور اس غریب کے استاد تھے، دارالعلوم مئو اور مظہر العلوم بنارس میں درس دیا، آخر ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ میں دل کی بیماری میں انتقال ہوا۔ تاریخ وفات "أولئك لهم الخيرات" ہے۔

☆☆☆

علامہ اعظمی "حسن ادب" میں نقل فرماتے ہیں:

لازم ہے کہ شاگرد اپنے جملہ امور میں اپنے استاذ کا مطیع و منقاد رہے، اس کی رائے و تدبیر سے باہر نہ ہو، جس طرح بیمار حکیم حاذق کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اسی طرح اپنے کو اس کے ہاتھ میں دیدے، جس بات کا قصد کرے اس میں اس سے مشورہ کرے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرے، اس کے احترام میں مبالغہ کرے، اور اس کی خدمت کو قرب خداوندی کا موجب جانے، اور یقین کرے کہ استاذ کے سامنے ذلیل ہونا عزت ہے، اس کے لئے جھکنا فرض ہے، اور اس کے لئے تواضع سربلندی۔

المآثر ج ۳ ش ۱ ص ۲۲

چوتھا باب

تدریسی و تصنیفی سرگرمیاں اور دیگر حالات

چوتھا باب

تدریسی و تصنیفی سرگرمیاں اور دیگر حالات

دارالعلوم مئو کی مدرسی زمانۂ طالب علمی کی اگر بنارس کی مدرسی کو چھوڑ دیا جائے، تو علامہ اعظمی کی تدریسی زندگی کا باقاعدہ آغاز شوال ۱۳۴۰ھ سے ہوتا ہے، شعبان ۱۳۴۰ھ میں مدرسہ دارالعلوم مئو سے فراغت پائی، اور اسی مدرسہ سے شوال سے درس و تدریس کی ابتدا فرمائی۔ آپ کی پوری عمر تدریسی مہمات سے عبارت تھی، کم و بیش ستر سال کی طویل مدت تک اس اہم خدمت کو ایک مقدس فریضے کی طرح انجام دیتے رہے، اس دوران آپ کی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز اور حالات میں مدوجزر آئے، تلخیٔ ایام اور زمانہ کے مصائب و آلام سے بھی دوچار ہوئے، کچھ ایسے موڑ بھی آئے کہ تصنیفی، تالیفی اور تحقیقی مشغولیات کے سبب یا کسی اور وجہ سے درس و تدریس کی سرگرمی متروک رہی، لیکن یہ تعطل زیادہ دنوں تک باقی نہ رہتا، اور تعلیم و تربیت کی ضرورت کا شدید ترین احساس ان کو مسند درس پر لا بٹھاتا کہ:

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی : حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

چنانچہ آپ زندگی کے آخری ایام تک دورۂ حدیث اور اعلیٰ درجات کی کتابوں کے ساتھ ابتدائی جماعتوں کے طلبہ کے ابجد درست کراتے رہے۔

اوپر گذر چکا ہے کہ درس و تدریس کا باقاعدہ آغاز دارالعلوم مئو سے کیا، بابت سنہ ۱۹۱۸ء لغایۃ ۱۹۲۴ء مطابق ۱۳۴۲ھ مدرسہ دارالعلوم کی جو روداد شائع ہوئی ہے۔ اس میں مدرسہ مذکورہ کے فارغ التحصیل طلبہ میں جو وہاں یا کسی دوسرے مقام پر تدریسی خدمات

انجام دیتے ہیں، علامہ اعظمی کا نام سر فہرست ہے۔

علامہ اعظمی کا طغرائے امتیاز یہ بھی تھا کہ ابتداء ہی میں دورہ حدیث کی کتابیں پڑھائیں، دارالعلوم کی تدریسی زندگی کے دوران صحاح ستہ کی کوئی نہ کوئی کتاب آپ کے زیر درس رہی، ذاتی کتب خانہ میں سنن ابوداؤد کا جو قدیم نسخہ ہے اس پر آپ ہی کے دست مبارک سے یہ تحریر درج ہے:

"قد شرعت فی اقراء أبی داؤد سنة ٤١ ھ ثم فی سنة ٤٣ ھ فی شوال"

(شوال ۴۳۔۱۳۴۱ھ میں میں نے ابوداود پڑھانا شروع کیا)

اس دور میں جن لوگوں کو آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا، ان میں سلطان المناظرین مولانا محمد منظور نعمانی، دارالعلوم دیوبند کے سابق استاد مولانا محمد حسین بہاری اور آپ کے تلمیذ اعز مولانا عبدالجبار صاحب مئوی تھے، یہیں سے آپ کے شاگردوں کی پہلی کھیپ فارغ ہو کر نکلی، جن میں سے اکثر آپ کے ہم عمر و ہم عصر تھے، بلکہ ان میں سے بیشتر اپنی عمر طبعی بسر کر کے آپ کی حیات میں ہی اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

دارالعلوم مئو میں تدریسی سلسلہ چند سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکا، اور تین سال یا کچھ زیادہ مدت ہوئی ہوگی کہ بعض اسباب کی بنا پر آپ وہاں کے منصب تدریس سے مستعفی ہو گئے۔

ابتدائی تصنیفات علامہ اعظمی کی ذات مدرسہ دارالعلوم کے لئے قابل فخر اور باعث ناز تھی، درس و تدریس میں تو جو کمال حاصل تھا وہ تھا ہی، اس کے علاوہ آپ کے اندر اور کتنی صلاحیتیں مضمر تھیں، اس کا اندازہ اسی روداد سے ہوتا ہے۔ اس کے صفحہ ۷ پر تحریر ہے:

"تصنیف و تالیف کے میدان میں دارالعلوم کا قدم اگرچہ ابھی تک پیچھے ہے، لیکن دارالعلوم نے اس خدمت کو بالکل نظر انداز نہیں کیا ہے، بلکہ اس میدان میں بھی زور آزمائی کی ہے، اور اپنے جوہر دکھائے ہیں، چنانچہ جناب

مولوی ابوالمآثر حبیب الرحمٰن صاحب مدرس مدرسہ دار العلوم جو بحالت عدم موجودگی صدر مدرس صاحب صیغۂ تعلیم کے نگراں وذمہ دار ہیں جنھوں نے اس میں تکمیل بھی کی ہے، حسب ذیل رسائل تالیف کئے ہیں۔"

اس کے نیچے آپ کی تصنیفات کے نام ذکر کئے گئے ہیں، جن کی تعداد ۱۲ ہے، ان میں تین کتابیں ایسی ہیں جن کے نام کے ساتھ قوسین میں (عربی) لکھا ہوا ہے۔ اس سے اس جوہر قابل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۳۴۲ھ میں آپ کا سن تیئیس (۲۳) برس سے زیادہ نہیں تھا، اور اس کمسنی میں ایک درجن رسائل تالیف کر چکے تھے، ملاحظہ ہو:

"الحج القویۃ، السیر الحثیث، التوصیۃ بأسرار التسمیۃ (عربی)
حدر اللثام عن وجہ القراءۃ خلف الامام، معجزات وکرامات، اسلام اور صنف نازک، کشف المعضلات فی رد حل المغلقات، القول المختار فی التری بزی الکفار، الروض المجود فی تقدیم الرکبتین عند السجود، توطین الجائشۃ بشرح البناء بعائشۃ، تذکرۃ أدباء الهند (عربی) الاتحافات السنیة بذکر محدثی الحنفیة (عربی)۔"

اس فہرست پر ایک نگاہ ڈالنے سے مضامین کے تنوع کا اندازہ ہوتا ہے، اس میں پہلا رسالہ مطبوع ہے، اور "کشف المعضلات ..." ایک مجلس کی تین طلاق کے اثبات میں قسط وار الفقیہ فروری مارچ اپریل ۱۹۲۴ء میں چھپا ہے۔

اہل علم سے تعلقات اسی زمانہ میں آپ کے ہندوستان کے بعض نامور اہل علم سے تعلقات قائم ہوئے، جن میں امام اہلسنت مولانا عبدالشکور لکھنوی کاکوروی (۱) اور

(۱) مولانا عبدالشکور بن ناظر علی بن فضل علی ۲۴؍ ذی الحجہ ۱۲۹۳ھ کو کاکوری میں پیدا ہوئے، نشوونما اور ابتدائی تعلیم فتح پور میں پائی، اس کے بعد لکھنؤ گئے۔ اور مولانا عین القضاۃ حیدر آبادی سے درس نظامی کی تکمیل کی، اور حکیم عبدالولی مرحوم سے فن طب پڑھا، دار العلوم ندوہ اور مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ میں درس وتدریس کے علاوہ دہلی میں مرزا حیرت دہلوی کے پریس میں ایک مدت تک ملازمت کی =

علامہ سید سلیمان ندوی (۱) کے اسماء گرامی سر فہرست ہیں ، ان کے علاوہ

= اور مرزا حیرت کے ایماء پر قرآن کریم اور صحیح بخاری کا اردو میں ترجمہ کیا، ۱۳۵۱ھ میں لکھنؤ میں دارالمبلغین کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا جو ملک گیر شہرت کا حامل ہوا۔ مولانا عبدالشکور صاحب ایک شعلہ بیان خطیب و مقرر، بلندپایہ مناظر اور صاحب علم و عمل مبلغ تھے۔ شیعیت، بدعت اور اباحیت سے پوری عمر برسرپیکار رہے۔ بالخصوص شیعیت کے لئے ان کی ذات شمشیر برہنہ تھی، جس کی وجہ سے وہ امام اہلسنت کے لقب سے ملقب ہوئے، متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں، جن میں علم الفقہ کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی، ۱۷ر ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ کو وفات پائی، علامہ اعظمی کا آپ سے خاص تعلق تھا، آپ کے سیکڑوں خطوط علامہ اعظمی کے پاس محفوظ تھے، جو مجلّہ "المآثر" میں قسط وار شائع ہو رہے ہیں، علامہ اعظمی سے آپ کے تعلق کی تفصیل "المآثر" ج ۷ ش ۲ و ۳ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

(۱) علامہ سید سلیمان ندوی ۲۲ر نومبر ۱۸۸۴ء مطابق ۲۳ر صفر ۱۳۰۲ھ کو جمعہ کے دن صوبہ بہار کے مردم خیز گاؤں دیسنہ ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے، ان کے والد ریاست اسلام پور کے شاہی طبیب تھے، سید صاحب نے تعلیم کا آغاز گھریلو طرز پر کیا اور فارسی و عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی، اس کے بعد اپنے والد کے پاس اسلام پور چلے گئے، وہاں سے پھلواری شریف پٹنہ آئے، پٹنہ سے دربھنگہ گئے، وہاں سے ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ منتقل ہو گئے، اور دارالعلوم ندوہ میں داخلہ لیا، ندوہ میں پانچ سال زیر تعلیم رہ کر ۱۹۰۶ء میں فراغت پائی۔ قیام ندوہ کے دوران ہی علامہ شبلی نعمانی کے دامن تربیت سے وابستہ ہو گئے تھے، علامہ شبلی نے ان کو اس طرح صیقل کیا کہ وہ بہت جلد علم و فضل کی دنیا کے آفتاب بن گئے، اور شبلی نعمانی نے جو کام ادھورے چھوڑے ان کو کمال و تمام تک پہنچایا، علامہ شبلی نے دارالمصنفین کا جو خاکہ تیار کیا تھا اس میں رنگ بھرا، سیرت النبی کی باقیماندہ جلدوں کی تکمیل کی، سید صاحب نے ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی، اس کے بعد پوری عمر اس کی تعمیر و ترقی کے لئے کوشاں رہے۔ ۱۹۱۶ء میں رسالہ "معارف" جاری کیا۔ مدت مدید تک وہ ندوہ کے معتمد تعلیم رہے۔ ۱۹۴۶ء میں نواب حمید اللہ خاں والیٔ بھوپال کی دعوت پر بھوپال کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے، جون ۱۹۵۰ء میں پاکستان منتقل ہو گئے اور اس کے ساڑھے تین سال بعد ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء م ۱۴ر ربیع الاول ۱۳۷۳ھ کو کراچی میں وفات پائی۔

مولانا مرتضی حسن چاندپوری(۱) وغیرہ سے خط و کتابت رہی۔

مدرسہ مظہر العلوم میں بحیثیت صدر مدرس | مدرسہ مظہر العلوم بنارس کے ساتھ آپ کا تعلق زمانۂ طالب علمی ہی سے تھا، فراغت سے قبل عمر عزیز کا خاصا حصہ یہاں صرف کیا تھا، پہلے تو دو سال مولانا عبدالغفار صاحب کے زیر سایہ طالب علمی کے زمانے میں گذارے، دوبارہ اس وقت جب دیوبند کے پہلے سفر سے واپسی کے بعد یہاں تدریسی خدمت انجام دی، ان سابقہ تعلقات کی بنا پر اس سے یک گونہ تعلق ہو چکا ہوگا، اور یہاں کی آب و ہوا اور فضا سے ایک حد تک مانوس رہے ہوں گے۔ جاذبۂ توفیق ایک بار پھر اسی کاشی نگری کی طرف لے چلا اور دار العلوم مئو سے کنارہ کشی کے بعد دوسرا پڑاؤ بنارس کا یہی مدرسہ ہوا، بنارس والے گویا سراپا اشتیاق تھے، انھوں نے آپ کی آمد کو نعمت غیر مترقبہ سمجھا، ان کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کئے، اور ان کے سپرد مسند صدارت کی، وہاں وہ تین سال (۱۳۴۴ھ سے ۱۳۴۷ھ تک) صدارت تدریس کے عہدہ پر قائم رہے، اور تدریسی امور کے ساتھ فرائض صدارت بھی باحسن وجوہ انجام دیتے رہے۔

پٹنہ و مرزاپور کا سفر اور خدا بخش لائبریری کی زیارت | بنارس میں قیام کے اسی زمانہ میں آپ نے پٹنہ کا سفر کیا، اور پہلی بار خدا بخش لائبریری (بانکی پور۔ پٹنہ) کی زیارت کی، آپ کے ذخیرۂ مکتوبات میں ایک خط ۲۵؍ شعبان ۱۳۴۴ھ کا مرزاپور سے لکھا ہوا ہے، اس خط کو آپ نے والد محترم کے نام تحریر فرمایا تھا، اس کی عبارت یہ ہے:

(۱) مولانا مرتضی حسن چاندپوری، چاندپور ضلع بجنور کے باشندہ تھے ۱۳۰۴ھ میں دار العلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، مراد آباد اور دربھنگہ وغیرہ کے مدارس میں درس و تدریس کے فرائض انجام دئے۔ پھر دار العلوم دیوبند پہنچے اور وہاں شعبۂ تعلیم اور شعبۂ تبلیغ کی نظامت کے علاوہ درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دی۔ اپنے زمانہ کے بلند پایہ خطیب اور بے نظیر مناظر تھے، بدعات اور قادیانیت کے خلاف انھوں نے بہت سے معرکے سر کئے، ۱۳۷۱ھ م ۱۹۵۱ء میں وطن مالوف میں وفات پائی۔

"... کمترین آج داناپور سے چل کر ۱۲ بجے مرزاپور پہنچا، یہاں مولانا عبدالشکور صاحب مرزاپوری (۱) کے یہاں اترا۔ کل شاید یہاں وعظ ہوگا ... عبدالجبار پہونچ گئے ہوں گے، ان سے سفر کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں ..."

اس کے علاوہ اپنی یادداشت میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے:

"۲۴ر شعبان ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۰ر مارچ ۱۹۲۶ء کو پہلی بار کتب خانہ بانکی پور کی سیر کی اور حسب ذیل کتابیں دیکھیں۔"

مظہر العلوم سے استعفا بنارس میں کوئی تین سال کی مدت گذری ہوگی کہ کچھ ایسے حالات پیش آگئے جن سے مجبور ہو کر وہاں سے دستبرداری کا فیصلہ کرنا پڑا، (۲) اور انجام کار کاروبارِ مدرسہ سے سبکدوش ہو کر ۱۳۴۴ھ کے وسط میں گھر کی راہ لی، اس کا

(۱) مولانا عبدالشکور مرزاپوری کے حالات معلوم نہیں ہو سکے، غالباً جونپور کے باشندہ تھے اور مرزاپور میں مطب کرتے تھے، حیات شبلی کے صفحہ آخر کے ایک حاشیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۰ء میں کانپور کے مدرسہ الٰہیات میں زیر تعلیم تھے، اور یہ ان کی تکمیل کا سال تھا، ممکن ہے اسی کی طرف منسوب کر کے اپنے کو الٰہی لکھتے رہے ہوں، بڑے پایہ کے عالم و مصنف تھے، متعدد کتابیں ان کی یادگار ہیں، طبیعت ظریف اور بذلہ سنج پائی تھی، علامہ اعظمی سے آپ کے بڑے مضبوط روابط تھے ایک دفعہ ان کے بارے میں علامہ اعظمی سے ڈاکٹر عبدالمعید صاحب نے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ میری ان سے دوستی تھی اور میں ان سے ملنے کے لئے ناؤ پر بیٹھ کر مرزاپور جاتا تھا۔ ان کے متعدد خطوط علامہ اعظمی کے نام موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ دوستی ہی نہیں بے تکلفی بھی تھی۔

(۲) مولانا عبدالعلیم صاحب مئوی (استاذ جامعہ مظہر العلوم بنارس) سے یہ معلوم ہوا کہ علامہ اعظمی نے ان سے کبھی فرمایا تھا کہ بنارس چھوڑنے کا سبب یہ تھا کہ اس وقت کے ناظم مدرسہ "حی علی الصلوٰۃ" پر کھڑے ہونے کے فتویٰ پر آپ سے دستخط کرانا چاہتے تھے، چونکہ یہ بدعت ہے، اس لئے آپ نے اس پر تعاون کرنے کے بجائے مدرسہ ہی چھوڑ دینا مناسب سمجھا۔

تذکرہ مولانا محفوظ الرحمٰن نامی کے ایک خط میں جو یکم رجب ۱۳۴۷ھ کا تحریر فرمودہ ہے، یوں ہے:

"عزیزم سلمہ! وعلیکم السلام

آپ کے دو خط مجھے ملے، آپ کی یہ شکایت ایک حد تک بجا ہے کہ جواب میں تاخیر ہوئی، مگر اس کا جو سبب آپ نے تجویز کیا ہے وہ نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ بنارس میں بعض ارکان مدرسہ کی بعض حرکتیں مجھے ایسی ناپسند ہوئیں کہ میں نے وہاں اپنا قیام کسی طرح مناسب نہیں سمجھا، میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مکان جاکر استعفا روانہ کردوں کہ چھوٹے بھائی محمد کی علالت کی خبر پہنچی، میں نے دو روز کی رخصت لی اور مکان پہونچ گیا اور دوسرے دن استعفا روانہ کردیا، اس وقت سے اب تک لکھنے پڑھنے کے کاموں سے اتنی بیگانگی ہے کہ احباب سے خط و کتابت تک بند ہوگئی ہے۔"

دفع المجادلہ بمبئی کے روافض نے عید مباہلہ کے نام سے ایک قبیح رسم ایجاد کی تھی، اور اسے سال بسال منعقد کیا کرتے تھے اور بھولے بھالے سنیوں کو اس میں شریک کرکے حضرت علیؓ کا افضل الصحابہ اور خلیفہ بلا فصل ہونا سمجھایا کرتے تھے، امام اہلسنت مولانا عبدالشکور فاروقی نے "آیت مباہلہ" کے نام سے ایک کتاب لکھ کر اس رسم کا ابطال کیا، امام اہلسنت کی کتاب کے جواب میں ایک شیعہ مولوی اعجاز حسین بدایونی نے "برہان مجادلہ" لکھی، شیعہ مولوی کی کتاب کا جواب علامہ اعظمی نے "دفع المجادلہ" کے نام سے اسی زمانہ میں تصنیف فرمایا، جس میں آیت مباہلہ کی تفسیر بیان فرمائی اور شیعوں کی اس سے متعلق گمراہی کا پرزور رد کیا۔ آگے چل کر علامہ اعظمی نے شیعوں کے رد و ابطال میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیے، یہ کتاب گویا اس کا دیباچہ تھی، اس کے بعد حضرت امام اہلسنت کے نزدیک آپ کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی۔

علامہ اعظمی اور مدرسہ مفتاح العلوم مدرسہ مفتاح العلوم کے لئے اس کے یوم تاسیس ہی سے علامہ اعظمیؒ کی خاندانی خدمات رہی ہیں۔ آپ سے پہلے آپ کے والد مرحوم و مغفور اس کی خدمت کرتے رہے، پھر آپ کی مدرسہ سے وابستگی کے بعد بھی والد محترم مختلف ذمہ داریاں سر انجام دیتے رہے، اور جہاں تک خود علامہ اعظمیؒ کی ذات کا تعلق ہے، تو انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس کی نذر اور اس کے بال و پر سنوارنے میں صرف کیا، علامہ اعظمی نے زمانۂ طالب علمی کے کچھ ایام بھی اس میں گذارے، چنانچہ "روداد مدرسہ عربیہ مفتاح العلوم بابت ۱۳۴۶ھ لغایت ماہ ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ" میں صفحہ ۲ پر کچھ فضلاء کے نام ذکر کئے گئے ہیں، جنھوں نے مفتاح العلوم میں تعلیم حاصل کی اس کے بعد دوسری جگہوں پر تدریسی خدمات انجام دیں، ان میں علامہ اعظمی کا نام بھی درج ہے۔ مفتاح العلوم کی نشو و نما، اس کی توسیع و ترقی، اور اس کے فروغ میں ان کے دوسرے احباب و رفقاء کار بھی شریک و سہیم رہے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک نا قابل انکار حقیقت ہے، کہ مدرسہ مفتاح العلوم کو نہ صرف بر صغیر بلکہ عالم اسلام میں متعارف کرانے میں اور اس کی توسیع و ترقی میں سب سے اہم اور نمایاں کارنامے علامہ اعظمیؒ کے رہے ہیں، بلکہ کچھ گوشے اور پہلو تو ایسے ہیں جس میں علامہ اعظمیؒ کا کوئی دوسرا سہیم و شریک نہیں ع

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق

مفتاح العلوم کی اجمالی تاریخ مدرسہ مفتاح العلوم کا قیام ۱۳۲۷ھ میں مولانا ابوالحسن صاحبؒ مئوی عراقی کے دستِ مبارک پر عمل میں آیا، اور اس کا تاریخی نام شمس الفیوض رکھا گیا (۱) مولانا ابوالحسن صاحب نوراللہ مرقدہ نے ابتداءً جامع مسجد شاہی میں بیٹھ کر درس دیا، مولانا موصوف ۱۳۴۱ھ تک تقریباً چودہ سال نہایت خاموشی، سادگی اور توکل کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیتے رہے، درمیان میں ایک صاحب اور، آپ کے معاون اور رفیق کار ہوئے، اور وہ تھے جناب حافظ محمد عثمان صاحب مرحوم۔ روداد مدرسہ

(۱) روداد مدرسہ عربیہ مفتاح العلوم بابت ۱۳۴۶ھ لغایت ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ

سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۴۱ھ میں حافظ محمد عثمان صاحب کی وفات واقع ہو گئی جس کی وجہ سے مدرسہ کے تدریسی کام کو روک دینا پڑا، اور پھر تقریباً تین سال بعد یعنی صفر ۱۳۴۴ میں دوبارہ اس سلسلہ کا آغاز کیا گیا، اور اس دفعہ اس کی جگہ محلہ الہ داد پورہ کی مسجد تجویز کی گئی، اور کچھ سالوں تک تدریسی امور وہیں انجام پاتے رہے، روداد میں مدرسہ مفتاح العلوم کی اس وقت کی جو صورتحال درج ہے، اس کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے:

"جب محلہ الہ داد پورہ میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ شروع ہوا اور بطریقۂ ماضیہ مولوی ابوالحسن (۱) صاحب درس دینے لگے تو جناب حکیم مولوی محمد صابر (۲) صاحب ساکن محلہ الہ داد پورہ نے اپنے محلہ کے باشندگان سے چندہ کی تحریک کی محلہ کے حضرات نے باوجود غربت کے مختصر ساماہوار چندہ کا اقرار کیا مگر اس مختصر چندہ کی وصولی بھی چند ہی روز رہی۔ پس حکیم صاحب موصوف نے سفیروں کے ذریعہ سے کچھ آمدنی کی صورت نکالی جس سے کسی طرح کام نکلتا گیا۔ اگرچہ بعض وقت مشکلات پیش آتے تھے۔ مگر تعلیمی کام کی انجام دہی میں کوتاہی نہیں ہوئی، بعدہٗ مولوی صاحب موصوف نے حکیم صاحب موصوف کو ناظم مدرسہ قرار دیا۔ اور کچھ اشتہارات طبع کرائے جس سے مدرسہ کی آمدنی میں اضافہ ہوا اور جو کچھ رقم آتی تھی ناظم موصوف کے پاس جمع ہوتی تھی۔ پھر ناظم صاحب موصوف کو سفر

---

(۱) حالات کے لئے اساتذۂ علامہ اعظمی کا باب ملاحظہ فرمایئے۔

(۲) حکیم محمد صابر صاحبؒ کے بارے میں علامہ اعظمیؒ نے اپنی بیاض میں لکھا ہے: "مولوی حکیم محمد صابر پسر حافظ عثمان، تلمیذ استاذی مولانا عبدالغفار ساکن الہ داد پورہ مئو۔ کان یحبنی و یجلنی. توفی ۶۔ج ۲۔ ۱۳۶۳ھ "یعنی مولوی حکیم محمد صابر، حافظ عثمان صاحب کے فرزند اور میرے استاذ مولانا عبدالغفار صاحب کے شاگرد الہ داد پورہ کے باشندے تھے۔ مجھ سے محبت اور میرا اکرام کیا کرتے تھے۔ ۶؍ جمادی الاخری ۱۳۶۳ھ میں وفات پائی۔

حرمین شریفین پیش ہوا، بعد واپسی ناظم صاحب موصوف بینائی سے بالکل معذور ہوگئے اس لئے بعد میں جو رقوم مدرسہ میں آئیں مولوی صاحب موصوف کے پاس رکھی گئیں اور بجائے مولوی صاحب کے تعلیمی کام کے لئے ایک مدرس کا اضافہ کیا گیا اور مولوی صاحب نائب ناظم سمجھے گئے۔ اب چونکہ حکیم صاحب ناظم اول معذور ہیں اس لئے اس سے دستبردار ہوگئے اور نظامت کا کام بذمہ نائب ہے۔"(۱)

روداد مذکورہ بالا میں صفحہ نمبر ۵ پر "مدرسہ ہذا کے تعلیمی حالات" کے تحت ۱۰ دفعات درج ہیں، جس میں نمبر ۲ کے ذیل میں لکھا ہے:

"اس مدرسہ میں فارسی، عربی، صرف، نحو، منطق، حکمت، فلسفہ، بلاغت، عقائد، فقہ، اصول فقہ، حدیث، تفسیر کی موافق درس نظامیہ کے تعلیم ہوتی ہے، اور اکثر منتہی طلبہ دارالعلوم دیوبند بھیج دئے جاتے ہیں، گویا یہ مدرسہ دارالعلوم دیوبند کی ایک شاخ ہے یا اس کی مشین تعلیمی کا ایک پرزہ ہے۔ مگر دینیات کی طرف طلبہ کو زیادہ رغبت دلائی جاتی ہے، اس لئے منہاج العابدین امام غزالی و ترجمہ قرآن مجید وغیرہ بھی پڑھایا جاتا ہے۔"

اسی روداد مذکورہ بالا میں ص ۶ پر عہدہ داران وارا کین مجلس انتظامی مدرسہ مفتاح العلوم کا ایک نقشہ درج ہے جس کے صدر ہیں مولانا حکیم شاہ محمد عمر صاحب (۲) محلہ

(۱) روداد مذکورہ بالا ۳۔۴

(۲) ان کی نسبت علامہ اعظمی ایک جگہ لکھتے ہیں: "مولوی شاہ محمد عمر اورنك آبادی قرأ اکثر الکتب عندالمولوی امام الدین الفنجابی نزیل مئو۔ وبعضها علی ابی الحسنات مولانا عبدالحی اللکنوی وبایع علی ید الشاہ فضل رحمن الگنج مرادآبادی۔ کان یحبنی محبة الولد توفی ۱۳۵۸ھ (رحلت نمود شه عمر)"

(مولوی شاہ محمد عمر اورنگ آبادی نے اکثر کتابیں مولوی امام الدین پنجابی نزیل مئو اور کچھ ابوالحسنات مولانا عبدالحی لکھنوی سے پڑھیں، اور شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مجھ سے اولاد کی طرح محبت کرتے تھے۔ ۱۳۵۸ھ میں فوت ہوئے (رحلت نمود شه عمر) مادۂ تاریخ ہے)

نورنگ آباد، مئو۔ نائب صدر ہیں جناب حکیم مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب (۱) نورنگ آباد مئو، اور دوسرے نائب صدر ہیں جناب حاجی ولی محمد میانجی صاحب (۲) ناظم ہیں جناب مولوی ابوالحسن صاحب نائب ناظم ہیں جناب مولوی محمد صابر صاحب (پدر بزرگوار علامہ اعظمیؒ) اور وہی خازن بھی ہیں، اور دوسرے نمبر کے نائب ناظم ہیں جناب مولوی فیاض احمد صاحب نورنگ آباد مئو۔ ان حضرات کے علاوہ دیگر ممبران کی تعداد ۱۰ ہے۔ علامہ اعظمیؒ کے والد محترم پر گویا دوہری ذمہ داری تھی، ایک نائب ناظم ہونےکی اور دوسرے خازن ہونے کی۔

اس وقت جس روداد کے حوالے سے ہم بات کر رہے ہیں، اغلب یہ ہے کہ اس زمانہ کی ترتیب ہے جب علامہ اعظمی بنارس میں تدریسی امور سرانجام دے رہے تھے۔ اس کے مرتب مولانا ابوالحسن صاحب ہیں اور تصدیق کنندگان میں جن حضرات کے اسماء گرامی درج ہیں وہ ہیں جناب حکیم مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب نائب صدر، وجناب مولوی محمد صابر صاحب نائب ناظم مدرسہ ہٰذو جناب قاری مولوی محمد صاحب مدرس اول مئوی اعظم گڈھی۔ روداد مطبع حکیم گورکھپور کی مطبوعہ ہے۔

اس وقت جو مجلس تعلیمی تشکیل دی گئی تھی، اس کے بارے میں صفحہ نمبر ے پر "موجودہ اراکین مجلس تعلیمی" کے عنوان کے ذیل میں کل آٹھ ارکان کے اسماء گرامی درج ہیں جو حسب ذیل ہیں:

---

(۱) علامہ اعظمی کے استاذ اور خسر تھے۔ ان کی تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔

(۲) علامہ اعظمی نے اپنی بیاض میں ان کے بارے میں لکھا ہے: "میانصاحب ولی محمد اورنك آبادی كان فی سنة ۱۳۵۷ھ ابن ۹۵ سنة ... كان یاتینی كثیراً و توفی رمضان من تلك السنة المذكورة مبطونا."

علامہ اعظمی فرماتے ہیں: میانصاحب ولی محمد اورنگ آبادی ۱۳۵۷ھ میں ۹۵ برس کے تھے، میرے پاس بہ کثرت آتے تھے، اسی سال (۱۳۵۷ھ) میں شکم کی بیماری میں وفات پائی۔

۱۔ جناب مولوی ابوالحسن صاحب ۲۔ جناب مولوی محمد صابر صاحب۔ ۳۔ جناب مولوی محمد صاحب ۴۔ جناب مولوی فیاض احمد صاحب ۵۔ جناب مولوی شاہ محمد عمر صاحب ۶۔ جناب مولوی حبیب الرحمٰن صاحب ۷۔ جناب حکیم مولوی محمد سعد اللہ صاحب ۸۔ جناب مولوی ابوالہاشم صاحب۔

صفحہ نمبر ۲۱ پر ایک گوشے میں ایک چھوٹے سے کالم کے اندر ایک اطلاع درج ہے جو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کے گوش گذار کر دی جائے۔ وہ اطلاع یہ ہے:

"واضح ہو کہ ناظم موجودہ بوقت قیام مدرسہ لڑکوں کو تعلیم دیتے ہیں اور بوقت ضرورت مدرسہ سفر کی صعوبت بھی اختیار کرتے ہیں اور مدرسہ کی آمدنی و خرچ کا حساب بھی درست کر دیا کرتے ہیں مگر فقط سہ ماہوار نفقۂ عیال کیلئے وظیفہ کے طور پر لیتے ہیں۔ اس لئے سفر وغیرہ میں مدرسہ کی رقم سے علاوہ تنخواہ کے کچھ اعانت کر دی جاتی ہے۔ اور آئندہ بھی بغرض بہبودیٔ مدرسہ ہر بہی خواہِ مدرسہ کیلئے خواہ ناظم یا غیر ناظم اس کا لحاظ کیا جائیگا۔"

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ناظم ہو یا غیر ناظم اس کے لئے اتنی ہی رقم لینا روا ہے، جو نفقۂ عیال کیلئے کافی ہو سکے، اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ اس سے زیادہ لینا گویا بانیان مدرسہ کے وضع کردہ اصول و ضوابط سے انحراف ہے۔

صفحہ ۳۰ پر جو نقشۂ امتحان مدرسہ اور طلباء کے حاصل کردہ نمبرات درج ہیں، ان سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عربی جماعتوں میں کل چھ طالب علم تھے، جن میں دو مشکوٰۃ اور شرح وقایہ پڑھنے والے تھے، دو شرح جامی اور قطبی پڑھنے والے، ایک طالب علم کافیہ اور علم الصیغہ پڑھنے والا، اور ایک طالب علم میزان و منشعب، شرح مائۃ عامل اور ہدایۃ النحو پڑھنے والا تھا، یہ عربی درجات کی صورتحال تھی، اور بیس پچیس طلبہ فارسی اور پرائمری کے درجات میں تھے۔

اور ص ۳۲ پر جو روداد کا آخری صفحہ بھی ہے، ۹۔ اشعار پر مشتمل ایک نظم

بعنوان "مدح مدرسہ مفتاح العلوم مع تاریخ" اور "قطعہ تاریخ طبع روداد" چھپا ہوا ہے۔ مدرسہ سے متعلق جو نظم ہے اس کا ایک شعر نذر قارئین ہے:

کیوں نہ اس کا نام ہو شمس الفیوض
نورالانواری ہے مفتاح العلوم
۱۳۲۷ھ

یہ مدرسہ مفتاح العلوم کے قیام کی ایک اجمالی تاریخ تھی، اس سے ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مدرسہ کی نشو و نما میں علامہ اعظمیؒ کے والد ماجد مرحوم کا کیا عمل دخل رہا ہے، اور وہ انتظامی امور سے لے کر تعلیمی معاملات تک کس طرح ہر کام میں پیش پیش رہے اور اپنی خدمات اس کے لئے وقف کرتے رہے اور اس کی توسیع و ترقی میں علامہ اعظمی کا کیا حصہ رہا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ ۱۳۴۶ھ کا جو نقشہ ہم نے پیش کیا ہے، اس میں جو سب سے اونچی جماعت ہے، وہ مشکوٰۃ شریف اور شرح وقایہ پڑھنے والوں کی ہے، اس میں کل دو طالب علم ہیں۔ مشکوٰۃ شریف کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ جماعت آج کے اعتبار سے موقوف علیہ کی ہوگی، اور شرح وقایہ کے حساب سے دیکھا جائے تو درجۂ چہارم کی۔ اگر ہم اس جماعت کو موقوف علیہ کی بھی مان لیں، تو اگلے سال یعنی ۱۳۴۷ھ میں جب علامہ اعظمی نے دورۂ حدیث کا درس دے کر اس کی نشاۃ ثانیہ کی ہے تو دو طالب علموں کی یہ جماعت بڑھ کر آٹھ طلباء کی ہوئی۔ چنانچہ فضلاء مدرسہ کا جو پہلا بیچ (Batch) فارغ التحصیل ہو کر نکلا ہے ان کی تعداد آٹھ تھی، جن میں کئی ایک بیرون مئو کے بھی تھے۔

بانی کون ہے؟ مدرسہ مفتاح العلوم کی جو تاریخ ہم نے اجمالاً ذکر کی ہے، اس کے تناظر میں یہ بات بلا خوف لومۃ لائم کہی جا سکتی ہے، کہ مدرسہ کے قیام کا جو رشتہ حضرت مولانا امام الدین صاحب پنجابی قدس سرہ العزیز سے جوڑا جاتا ہے، وہ بات خلاف تحقیق ہے، اور تاریخی لحاظ سے اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ مولانا امام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جامع مسجد کٹرہ میں کچھ عرصہ تک درس دیا تھا، اور اسی عرصہ میں

مولانا عبدالغفار صاحب عراقیؒ مئوی اور مولانا سلطان احمد صاحب (۱) مئوی وغیرہ نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا، اور علوم وفنون کی مختلف کتابوں کا آپ سے درس لیا تھا، لیکن یہ باقاعدہ مدرسہ کا قیام نہیں تھا اور نہ ہی مولانا امام الدین صاحبؒ کے ذہن میں اس کے قیام کا کوئی تصور رہا ہوگا، وہ بس ایسے ہی تھا جیسے آج بھی ہوتا چلا آرہا ہے کہ کسی محلے کے کوئی مولوی یا عالم کسی مسجد میں بیٹھ کر دو چار طالب علموں کو چھوٹی بڑی کتابیں پڑھا دیا کرتے ہیں، اس سے نہ وہ مسجد موجودہ اصطلاح میں مدرسہ ہو جاتی ہے، اور نہ ہی وہ پڑھانے والے بانیان مدرسہ کہے جاتے ہیں۔

مفتاح العلوم کی تاریخ علامہ اعظمی کے قلم سے مفتاح العلوم کی تاریخ سے متعلق یہاں میں علامہ اعظمیؒ کی ایک تحریر نقل کر دوں، جس سے مدرسہ کا قیام اور اس کی تاریخ بالکل واضح اور بے غبار ہو جاتی ہے، آپ تحریر فرماتے ہیں:

"یہ مدرسہ ۱۳۲۷ھ میں قائم ہوا، جیسا کہ اس کی پہلی مہر میں کندہ ہے، اس کا افتتاح جامع مسجد کٹرہ میں ہوا، لیکن نہ اس کا کوئی باضابطہ نظام تھا، نہ اس کی اپنی عمارت تھی، نہ سرمایہ۔ اس لئے اس کے بانی مولانا ابوالحسن عراقی کبھی اس کو جامع مسجد کٹرہ میں چلاتے تھے اور کبھی احاطہ شاہ محمد عمر میں۔

---

(۱) مولانا سلطان احمد مئوی شعبان ۱۲۸۵ھ میں مئو میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم قصبہ مئو کے دیگر اساتذہ کے علاوہ مولانا امام الدین پنجابی سے حاصل کی، اس کے بعد غازیپور چلے گئے، اور وہاں کے مدرسہ چشمۂ رحمت میں مولانا محمد فاروق چریا کوٹی اور حافظ عبداللہ غازیپوری وغیرہما کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، اور وہیں سے ۱۳۰۹ھ میں سند فراغ حاصل کی۔ فراغت کے بعد وطن میں آکر درس وتدریس کا آغاز کیا، مدرسہ دارالعلوم مئو کا قیام وبنا ان ہی کی طرف منسوب اور مشہور ہے، مولانا بے پناہ صلاحیت واستعداد اور بہت علم وفضل کے مالک تھے لیکن عمر نے زیادہ وفا نہ کی اور چالیس برس کے سن میں ۱۳۲۵ھ میں اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔ (تذکرہ علماء اعظم گڑھ ص ۱۰۰)

۱۳۲۲ھ سے پہلے مفتاح العلوم کا وجود نہ تھا، نہ کسی دوسرے نام سے یہاں کوئی مدرسہ قائم ہوا تھا۔ البتہ تیرہویں صدی کے اخیر میں علاقۂ سورت سے ایک عالم مولانا امام الدین نامی سیاحت کرتے ہوئے وارد مئو ہوئے، اور یہاں کی خاک ان کی دامنگیر ہوگئی، انھوں نے بطور خود کبھی جامع مسجد میں اور کبھی الہ داد پورہ کی مسجد میں درس دینا شروع کردیا، ان درسوں میں اس عہد کے تمام ہونہار طلبہ شریک ہوتے تھے، جو بعد میں بہت بلند پایہ عالم و فاضل، مدرس و مصنف اور خطیب و واعظ ہوئے، لیکن مولانا امام الدین نے جو عام طور پر پنجابی کے نام سے مشہور تھے، کوئی مدرسہ قائم نہیں کیا تھا، وہ ذاتی حیثیت سے نجی طور پر درس دیتے تھے، ان کی نہ تو تنخواہ تھی، نہ وہ کسی نظام کے ماتحت درس دیتے تھے۔

ان کے درس میں تسلسل بھی نہ تھا، کبھی کسی سال پڑھا رہے ہیں تو پڑھا رہے ہیں، دوسرے سال نہیں جی چاہا یا کسی وجہ سے متوحش ہوئے تو قرب و جوار کے مواضع اور اضلاع میں سیاحی کرنے لگے، اور ادھر ۱۳۲۲ھ سے دس بارہ سال پہلے سے تو انھوں نے درس کا سلسلہ بالکل ہی ختم کردیا تھا، اور اس سے بھی پہلے انھوں نے شاہ پور (ادری) میں نکاح کرکے وہیں رہنا شروع کردیا تھا، اور وہیں سے سیاحت کو نکل جایا کرتے تھے۔ بہر حال ۱۳۲۲ھ سے پہلے بیسیوں سال بلکہ زیادہ تک جامع مسجد میں درس و تدریس کا کوئی منظم یا غیر منظم سلسلہ قائم نہیں تھا۔ اسی طرح اس مدت میں موجودہ دارالعلوم کا بھی وجود نہ تھا، (۱) البتہ مولانا سلطان احمد مرحوم نے قاسم پورہ چوپھال کی مسجد میں بغیر کسی نظام کے درس

---

(۱) یہ بات خلاف واقعہ اور حقیقت سے دور ہے کہ مولانا سلطان احمد نے ۱۲۹۳ھ میں دارالعلوم قائم کیا اس وقت تو مولانا کی عمر ابھی گیارہ سال کی تھی، وہ پڑھ کر فارغ بھی نہیں ہوئے تھے، ۱۳۰۹ھ ان کی طالب علمی کا دور تھا، اس سال وہ عالم و فاضل ہوئے، ظاہر ہے کہ مدرسہ انھوں نے ۱۳۰۹ھ کے بعد ہی قائم کیا ہوگا۔ (علامہ اعظمی)

دینا شروع کر دیا تھا، مولانا سلطان احمد مرحوم کے بعد اسی سلسلۂ درس و تدریس کو اس جگہ منتقل کر دیا گیا جہاں آج دار العلوم ہے، اور اس کو ایک نظام کے ماتحت دار العلوم کے نام سے جاری کیا گیا۔

۱۳۲۷ھ اور اس کے کئی سال بعد تک دار العلوم مئو میں فوقانی درجات نہیں تھے، نہ دورۂ حدیث کا انتظام تھا، اور مولانا ابوالحسن کے پاس بعض ایسے طلبہ تھے جن کے لئے ممکن نہ تھا کہ کہیں باہر جا کر اپنی تعلیم پوری کر سکیں، شاید اسی لئے مولانا نے جامع مسجد شاہی کٹرہ میں مفتاح العلوم کی بنیاد ڈالی، جہاں مولانا علی احمد کوئیریا پاری، مولانا حبیب الرحمٰن عراقی، مولانا ابوالخیر پسر مولانا شاہ محمد عمر وغیرہ نے اونچی کتابوں کا درس لے کر تکمیل کے لئے دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور لوگ مثلاً مولانا محمد صابر (پٹھان ٹولہ) نے اونچی کتابوں کے علاوہ صحاح ستہ کا درس لے کر مفتاح العلوم سے سند فراغ حاصل کی، مولانا محمد صابر کا سال فراغ ۱۳۲۹ھ ہے اور ان کی سند جو مدرسہ کی مہر کے علاوہ مولانا عبدالغفار اور مولانا شاہ محمد عمر کی مہروں سے بھی مزین ہے، میرے پاس موجود ہے۔

۱۳۲۹ھ میں اور اس کے بعد اکثر و بیشتر یہ مدرسہ احاطۂ شاہ محمد عمر میں جاری رہا اور ۱۳۲۹ھ و ۱۳۴۴ھ کے درمیان اس سلسلہ کا انقطاع بھی اس طرح ہو گیا کہ مولانا ابوالحسن عراقی نے لار ضلع گورکھپور (حال ضلع دیوریا) میں مفیض العلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم کر لیا، پھر ۱۳۴۴ھ (میں) دوبارہ منظم شکل میں مفتاح العلوم کی تاسیس ہوئی ...

۱۳۴۶ھ میں مدرسہ کے صدر انجمن شاہ محمد عمر صاحب تھے، اور ناظم مولوی ابوالحسن صاحب، نائب ناظم مولوی محمد صابر صاحب (پٹھان ٹولہ) اور میں اس کی مجلس تعلیمی کا رکن تھا (دیکھئے روئداد مدرسہ ۱۳۴۶ھ تا ۱۳۴۷ھ)۔

شوال ۱۳۴۷ھ سے مدرسہ نے ترقی کی طرف دوسرا قدم اٹھایا، جس

کی تفصیل یہ ہے کہ: "اب بحمد اللہ! اس مدرسہ میں عربی کی مکمل تعلیم کا انتظام ہو گیا، چار مستقل تنخواہ دار مدرسین اور تین اعزازی مدرسین بڑی خوبی و خوش اسلوبی سے فرائض تعلیم انجام دینے لگے۔ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ اس سال ۱۱ لڑکے حدیث شریف کے دورہ میں شریک ہیں" (اشتہار مدرسہ ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ)۔ یہ وہ دور ہے جب میں نے مدرسہ کی طرف توجہ کی اور اس کا انتظام عملاً میں نے سنبھالا، یہ اشتہار بھی میرا ہی شائع کیا ہوا ہے۔ اس لئے کہ مولوی ابوالحسن صاحب اس وقت حج کیلئے حجاز چلے گئے تھے۔"

مفتاح العلوم کی نشأۃ ثانیہ

پنجاہ سال خدمت ایں خانہ کردہ ام — وامروز نیست ہمرہ من جز فسانہ ہیچ

۱۳۴۹ھ میں علامہ اعظمی مدرسہ مظہر العلوم سے مستعفی ہو گئے، اور گھر کا قصد کیا، اور پھر گھر ہی کے ہو کر رہ گئے:

فألقت عصاها واستقر بها النوى — كما قرّ عينا بالإياب المسافر

(اس نے اقامت اختیار کی اور اسے قرار حاصل ہوا، جس طرح گھر لوٹ کر مسافر کی آنکھ ٹھنڈی ہو جاتی ہے)

اس وقت مدرسہ مفتاح العلوم چراغ سحری ہو رہا تھا اور قریب تھا کہ ہوا کا کوئی معمولی سا جھونکا اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو گل کر دے، آپ کے استاذ محترم مولانا ابوالحسن صاحب" اس مدرسہ کے ناظم تھے، اور بڑی مشکل سے اس جھلملاتے ہوئے چراغ کو سنبھالے ہوئے تھے، والد محترم کا بھی اس ادارہ سے گہرا تعلق تھا، لیکن ضعف اور پیرانہ سالی کے باعث ان حضرات کے قوی مضمحل اور اعصاب کمزور ہو چکے تھے، ایسی حالت میں اس ادارہ کی ترقی کے بارے میں تو کیا سوچتے اس کے وجود کو باقی رکھنا ان لوگوں کیلئے دشوار ہو رہا تھا۔ اس کی حالت اس مریض کی سی ہو چکی تھی جس کا کوئی بھی دم دمِ واپسیں ہو سکتا ہے، اور اسے کسی مسیحا نفس کا انتظار تھا جو اپنے نفس کی گرمی سے اس میں دوبارہ جان ڈالتا۔

علامہ اعظمی" جب بنارس سے مستعفی ہو کر مئو تشریف لائے تو استاذ محترم

مولانا ابوالحسن صاحب عراقی نے اس موقع کو غنیمت باردہ جانا، اور شاگرد عزیز کے سامنے یہ تجویز رکھ دی کہ وہ مدرسہ مفتاح العلوم سے وابستہ ہو جائیں، آپ استاد کی حکم عدولی نہیں کر سکتے تھے، اس لئے مجبوراً یا بطیب خاطر اس پیش کش کو قبول کر لیا، استاد جوہر شناس تھے، وہ اپنے شاگرد کی علمی، درسی وتدریسی، تحریری و تقریری اور نظم و نسق کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے، ع "قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری" ان کی عقابی اور دور رس نگاہ نے شاگرد کے اندر مضمر قوتوں اور پوشیدہ توانائیوں کو دیکھا ہوگا، علم اور دین کیلئے وہ ان کی تڑپ، لگن اور دھن، صبر واستقلال، ثابت قدمی وپامردی اور اخلاص وللّٰہیت کے سچے جذبوں سے یقینی طور پر باخبر رہے ہوں گے، جن کی کسی ادارہ کو ترقی کی راہ میں سب سے زیادہ ضرورت پڑتی ہے علامہ اعظمی نے استاد کے اصرار کو دیکھا تو اس سے وابستگی کیلئے اپنی آمادگی ظاہر فرمادی:

ایک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف ان کے قدم آتے ہیں

علامہ اعظمی نے مفتاح العلوم میں قدم کیا رکھا، مدرسہ کے دن پھر گئے، جس دن آپ مدرسہ میں داخل ہوئے ہیں، اس دن آپ کے جلو میں مدرسہ کی شہرت و ناموری بھی داخل ہوئی، مفتاح العلوم کے اندر آپ کے نزول اجلال کا پہلا دن اس کی تعمیر و ترقی اور عروج وبلندی کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا، وہی مدرسہ جو اپنے وجود وبقا کیلئے جد و جہد کر رہا تھا، اور جس کیلئے اپنے وجود کو باقی رکھنا مشکل ہو رہا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے اس تیزی سے آگے بڑھا کہ معمولی سی مدت میں شہرت کے آسمان پر پہنچ گیا۔

دو معتبر شہادتیں اوپر ص ۱۶۳ پر علامہ اعظمی کی جو تحریر نقل ہوئی ہے، اس سے آگے آپ متصلاً فرماتے ہیں:

"مدرسہ کا یہی وہ دور ہے جس کے بارے میں مولانا عبداللطیف صاحب

"مفتاحی ڈائری" ۱۳۸۷ھ میں رقمطراز ہیں:

"۱۳۴۴ھ میں جب شیخ الحدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے اس طرف اپنی توجہ مبذول کی اور مدرسہ کو دوبارہ اس کے اصلی گھر (شاہی مسجد) منتقل کر کے (۱) ایک نئی زندگی دینے کی کوشش کی، تو یہ مدرسہ بہت جلد ترقی کر گیا... آپ نے ۱۳۴۴ھ سے ۱۳۶۷ تک مفتاح العلوم میں صدر مدرسی کے فرائض انجام دئے اور ۱۳۶۶ سے ۱۳۷۱ تک نظامت کا عہدہ بھی سنبھالا۔"

"اور مولانا ایوب صاحب ناظم مفتاح العلوم، روئداد مدرسہ از شوال ۱۳۴۷ تا ذی الحجہ ۱۳۴۸ میں اس زریں دور کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"۱۳۴۴ھ سے پہلے کا جو زمانہ گذرا ہے وہ قابل اعتبار نہیں، ۱۳۴۴ھ میں اس مدرسہ کے نظم ونسق کی دوبارہ تجدید ہوئی اس وقت سے مدرسہ نے ترقی کرنی شروع کی اور بجائے ایک مدرس عربی وایک حافظ کے دو مدرس وایک حافظ، اور حساب وریاضی کے لئے ایک ٹرینڈ مدرس کا تقرر ہوا...

پھر ۱۳۴۷ میں سہ بارہ نظم ونسق کی تجدید نے مدرسہ کو بڑی بڑی شاندار درسگاہوں کے دوش بدوش لا کھڑا کر دیا اور اب یہ مدرسہ خالص اسلامی علوم کا مرکز، دینی تعلیم کا سرچشمہ اور مذہب کا گہوارہ بن گیا ہے (ص ۲)۔"

علامہ اعظمی کا ذاتی بیان مذکورہ بالا اقتباس سے آگے کی تحریر اس تفصیل کا اجمال ہے جو آئندہ صفحات میں آرہی ہے، اس لئے مناسب ہوگا کہ یہیں آپ کا وہ بیان بھی نقل کر دیا جائے، جو مذکورہ بالا تحریر کے معاً بعد ہے فرماتے ہیں:

جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے (۲) مدرسہ کا صدر مدرس ۲۳۔ برس تک یہ ناچیز رہا۔

---

(۱) ۱۳۴۴ میں مدرسہ کی ابتداء محلہ الہ داد پورہ میں کی گئی تھی (دیکھو روئداد ۱۳۴۶ ص ۳) (علامہ اعظمی)

(۲) مولانا عبد اللطیف صاحب کی تحریر کی طرف اشارہ ہے (مسعود)

اور تقریباً ۶ برس صدر مدرس و ناظم دونوں کے عہدے میرے ہی پاس تھے، اس طرح تقریباً ۲۹ برس تک میں نے مدرسہ کی خدمت اس ایثار و قربانی کے ساتھ انجام دی کہ اس کے مقابل میں ڈابھیل، عالیہ کلکتہ اور دارالعلوم دیوبند کی پیشکش اور اونچی تنخواہوں کو قبول نہیں کیا۔ حتی کہ دارالعلوم دیوبند سے شیخ الاسلام مولانا حسین احمدؒ اور مولانا قاری طیب صاحب نے مئو کا سفر صرف اس مقصد سے کیا کہ مجھ کو دیوبند لے جائیں، مگر نہ مدرسہ مجھ کو چھوڑ سکا نہ میں مدرسہ کو۔"

کاروان بنتا رہا علامہ اعظمیؒ جانب منزل چلے تو اکیلے، لیکن لوگ آتے رہے، ساتھ ہوتے رہے اور کاروان بنتا رہا، چنانچہ آپ کی وابستگی کے کچھ عرصہ بعد مولانا عبداللطیف صاحب نعمانیؒ اور پھر مولانا محمد ایوب صاحب اعظمیؒ (۱) بھی آپ کے شریک سفر ہو گئے، علامہ اعظمیؒ خود فرماتے ہیں:

"جب میں بنارس چھوڑ کر مئو آیا تو مولانا ابوالحسن صاحبؒ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور مجھے باصرار تمام مفتاح العلوم میں لا کر بٹھا دیا، دو ماہ کے بعد مولانا عبداللطیف صاحب عید اضحیٰ کی تعطیل میں مئو آئے تو میں نے ان کو بھی روک لیا، مفتاح العلوم جو چراغ سحری ہو رہا تھا، اس کو اس طرح حیات نو ملی، اور اس کی نشأۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا، تھوڑے ہی دنوں کے بعد مولانا ایوب صاحب کو دیوریا سے بلا کر نظامت کا عہدہ ان کو تفویض کر دیا گیا۔

زمانہ کروٹیں لیتا رہا اور مفتاح العلوم سال بسال ترقی کرتا رہا، مختلف اوقات اور حالات میں ہم تینوں نے مدرسہ کی صدارت اور نظامت کی ذمہ داریوں کو سنبھالا۔" (۲)

---

(۱) مولانا محمد ایوب صاحب اور مولانا عبداللطیف صاحب کے حالات جستہ جستہ اس کتاب میں آپ پڑھیں گے، مولانا ایوب صاحب نے (جیسا کہ آگے آئیگا) بعض ناخوشگوار حالات کے سبب مفتاح العلوم سے علیحدگی اختیار کر لی تھی، اور کئی سال تک جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے، ۲۰ر شوال ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۹۸۴ء کو مئو میں وفات واقع ہوئی۔

(۲) تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۵

اور پھر اس قافلۂ اہل جنوں میں ایک اور فرد کا اضافہ ہوا، جس کا اندازہ ایک ایسی تحریر سے ہوتا ہے جو علامہ اعظمیؒ کے منتشر اوراق میں دستیاب ہوئی، یہ تحریر ہے تو کسی اور کے قلم سے لیکن اغلب یہ ہے کہ علامہ اعظمیؒ کے ایماء یا املاء سے لکھی گئی ہے وہ تحریر یہ ہے:

"شوال ۱۳۴۷ھ میں مولانا ابوالحسن نے اپنا قائم کیا ہوا مدرسہ مولانا کے سپرد کر دیا، اور خود حج کو چلے گئے، اس سال مولانا نے تن تنہا جامع مسجد کے فرش پر پہلی بار دورۂ حدیث کی تعلیم دی، اور مدرسہ کا پورا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ڈھائی ماہ کے بعد مولانا عبداللطیف کو جو سنبھل میں مدرس تھے شریک کر لیا۔ پھر کئی ماہ بعد مولانا محمد ایوب مرحوم کو جو دیوریا کی جامع مسجد میں پڑھاتے تھے، دیوریا سے بلا کر ناظم کے عہدہ پر فائز کر دیا، اور کچھ دنوں کے بعد مولانا شمس الدین صاحب (کیاری ٹولہ پرشین ٹیچر جیون رام ہائی اسکول) (۱) کو نائب ناظم اور معین مدرس کی خدمت سپرد کی۔"

تیز رفتار ترقی یہ چاروں حضرات، بالخصوص عناصر ثلاثہ مدرسہ مفتاح العلوم کی تعمیر و ترقی کیلئے کس طرح مصروف کار اور کوشاں رہے، اور اس کیلئے کس عمل پیہم، جہد مسلسل، اتحاد واتفاق اور ہم آہنگی کا مظاہرہ کرتے رہے، اور کس طرح قدم بقدم اور شانہ بشانہ چلتے اور بڑھتے رہے، اور اس کو بام عروج تک پہنچانے میں ان کو کیسی تند و تیز ہواؤں، اور ناخوشگوار، حوصلہ شکن و صبر آزما حالات کا مقابلہ کرنا پڑا ہے، اس کیلئے مولانا محمد ایوب صاحبؒ کی یہ تحریر ملاحظہ فرمایئے:

(۱) کچھ کتابوں میں علامہ اعظمی کے ہم سبق تھے، لیکن فراغت آپ کے ایک سال بعد ۱۳۴۱ھ میں دارالعلوم مئو سے پائی، جیون رام ہائی اسکول میں فارسی کے ٹیچر تھے، مفتاح العلوم میں آنے کے بعد مدت العمر اس سے وابستہ رہے، اور نظم و نسق کی ذمہ داری کے ساتھ درس و تدریس کی خدمت بھی آخر وقت تک انجام دیتے رہے، جمادی الاولی ۱۳۹۲ھ میں سفر آخرت فرمایا۔

"مدرسہ پہلے الہ داد پورہ کی مسجد میں تھا، مگر طلبہ کی کثرت وہجوم کی وجہ سے جامع مسجد شاہی کٹرہ میں منتقل کر دیا گیا، جامع شاہی کا وسیع صحن وسائبان درسگاہوں کا کام دینے لگا، اس وقت مدرسہ کی مخصوص عمارت نہیں تھی، بیرونی طلبہ شہر کی مختلف مساجد کے کمروں میں ٹھہرائے جاتے تھے، ان دونوں حضرات یعنی حضرت مولانا اعظمی (مدظلہ) وحضرت مولانا نعمانیؒ نے درس وتدریس کی خدمت سنبھالی اور اس حقیر کو انتظام واہتمام کی خدمت سپرد ہوئی، ہم میں سے ہر ایک نے اپنی پوری وبھرپور صلاحیت واستعداد سے کام لیا، اور سرگرم عمل ہو گئے، حالانکہ اس وقت مدرسہ کو ترقی دینا تو درکنار اس کی بقا بھی مشکل تھی، اس لئے کہ مدرسہ دارالعلوم جو شہر کا پرانا مدرسہ تھا اور اس نے ملک میں کافی شہرت ومقبولیت حاصل کر لی تھی، اس کے اراکین دممبران شہر کے متمول ترین لوگ تھے، اور ان کو عوام میں کافی اثر ورسوخ حاصل تھا، وہ لوگ مدرسہ مفتاح العلوم کے سخت مخالف تھے، وہ کسی قیمت پر مفتاح العلوم کی بقا کے روادار نہ تھے، مگر چونکہ پڑھانے والے حضرات اعلی قابلیت کے مالک اور درس وتدریس میں یکتائے روزگار سمجھے جاتے تھے، درس جمتا گیا اور علمی حلقہ میں کافی شہرت ومقبولیت حاصل ہو گئی، دور دور سے تشنگان علم کھنچے چلے آتے تھے، اور چند ہی سالوں میں بیرونی طلبہ سے مدرسہ بھر گیا۔"(۱)

اس طرح مختصر سی مدت میں مدرسہ مفتاح العلوم کا نام ملک کے طول وعرض میں پھیل گیا، حضرت علامہ اعظمیؒ اور مولانا عبداللطیف نعمانیؒ کے درس کی شہرت سن سن کر دور دراز مقامات سے شائقین علم آتے، سرچشمۂ حبیب ولطیف سے اپنی تشنہ کامی کا علاج کرتے اور شادکام واپس جاتے، مدرسہ کی روداد بابت شوال ۱۳۴۷ھ لغایۃ ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ میں لکھا ہے:

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ۴۶-۴۵

"مفتاح العلوم میں درس نظامیہ کے موافق تمام علم و فن کی کتابیں، مثلاً تفسیر و حدیث، اصول حدیث، اصول فقہ، معقول و فلسفہ، صرف و نحو، حساب و ریاضی وغیرہ وغیرہ پڑھائی جاتی ہیں، اور ہر ایک فن کیلئے نہایت قابل اور ذی استعداد مدرس رکھے گئے ہیں۔ جن کے حسن تعلیم و بے نظیر قابلیت کا نتیجہ ہے کہ اطراف و اکناف ہند سے مثلاً اعظم گڈھ، غازیپور، جون پور، مظفر پور، لکھنؤ، در بھنگہ، بہار، چمپارن، بتیا، بنارس وغیرہ وغیرہ، جوق در جوق شائقین و تشنگان علم چلے آتے ہیں۔"(۱)

مولانا ظفیر الدین صاحب مفتاحی تحریر فرماتے ہیں:

"اس ضمن میں مئو کے مدارس کا تذکرہ بھی آیا، مرحوم عبدالعزیز مئوی نے بتایا کہ مفتاح العلوم مئو میں تعلیم بہت عمدہ ہوتی ہے اور اس مدرسہ میں دو مدرس بڑی شہرت کے مالک ہیں، ایک مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور دوسرے مولانا عبداللطیف نعمانی، یہ مناظر بھی ہیں، اور علم فقہ اور حدیث کے ماہر اور بالغ النظر استاذ بھی، بلکہ معقولات میں بھی یہ حضرات اپنا ثانی نہیں رکھتے..."(۲)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"مفتاح العلوم میں میری حاضری دو شخصیتوں کی علمی شہرت کی وجہ سے ہوئی تھی... مگر عجیب اتفاق، جن دو شخصیتوں کا نام سن کر مفتاح العلوم آیا تھا، ان میں سے کسی کے پاس میرا سبق اس پہلے سال نہیں گیا۔ اس کا بے انتہا غم ہوا، ،اساتذہ میں ان دو کے بے پناہ اثرات تھے..."(۳)

---

(۱) ص ۵

(۲) ترجمان الاسلام ۱۱۔۱۲ ص ۱۳۶

(۳) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۰۱

شیخ الحدیث بھی اور صدر المدرسین بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ مدرسہ مفتاح العلوم کی تعمیر وترقی اور ایک مکتب نما سے جامعہ تک کے تمام تدریجی مراحل کو طے کرانے میں تینوں ارباب فضل وکمال (علامہ حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا عبد اللطیف نعمانی اور مولانا محمد ایوب اعظمی رحمھم اللہ) کی سہ طرفہ کوششیں کار فرما ہی ہیں، اور یہ تینوں حضرات جس حسن انتظام واتفاق وانسجام، ہم نفسی اور ہم آہنگی کے ساتھ اس کی توسیع کیلئے سعی مسلسل کرتے رہے، اس کی مثال مشکل سے ملے گی، تاہم اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ ان میں علامہ اعظمیؒ کی حیثیت سالار قافلہ، میر کارواں اور سید الطائفہ کی تھی، اور آپ کی ذات کو وہی مقام ومرتبہ حاصل تھا جو ستاروں کے درمیان ماہ چہاردہ کا شب کا ہوا کرتا ہے۔

ھو البدر والناس الکواکب حولہ وھل یشبہ البدر المضئی الکواکب

(وہ چودھویں کا چاند ہے اور لوگ اس کے گرد ستاروں کے مانند ہیں۔ اور کیا ستارے چودھویں رات کے روشن چاند کی طرح ہو سکتے ہیں)

علامہ اعظمی نے مدرسہ مفتاح العلوم میں تعلیم وتدریس ہی نہیں، بلکہ اس کی ہمہ جہتی ترقی کا آغاز کس شان اور کس آن بان سے کیا؟ ادارہ کی پوری تاریخ شاہد ہے، مدرسہ میں اپنے ورود مبارک کے دن سے لے کر ۲۲/ سال تک متواتر شیخ الحدیث اور صدر مدرس کے فرائض انجام دیتے رہے، مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی مرتب فتاوی دار العلوم دیوبند تحریر فرماتے ہیں:

> "اس وقت (۱۳۴۷ھ) سے لے کر ۱۳۶۹ھ تک برابر مفتاح العلوم کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس رہے، اور بلاناغہ ہر سال یہاں دوسری کتابوں کے ساتھ دورۂ حدیث کی کتابیں بھی پڑھاتے رہے۔ عام طور پر آپ کے یہاں بخاری شریف مکمل اور ترمذی شریف مکمل ہوا کرتی تھی۔"(۱)

(۱) ترجمان الاسلام ۱۱۔۱۲ ص ۱۴۴

ایک دوسرے مضمون میں لکھتے ہیں:

"مولانا اعظمیؒ صدر المدرسین اور شیخ الحدیث تھے اور مولانا نعمانی نائب الصدر، دورہ کے اسباق میں بخاری و ترمذی صدر المدرسین کے یہاں ہوتی تھی اور مسلم و ابو داؤد نائب الصدر کے پاس، ان اسباق کے علاوہ بھی تین تین اسباق ان حضرات کے پاس مزید ہوتے تھے۔"(۱)

مولانا کریم بخش سنبھلی کے تاثرات ۱۳۴۷ھ لغایت ۱۳۴۸ھ کی جس روداد کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کے صفحہ ۱۲ پر مولانا کریم بخش صاحبؒ (استاذ علامہ اعظمی) صدر مدرس مدرسۃ الشرع سنبھل کے تاثرات یوں منقول ہیں:

"خاکسار نے امسال مدرسہ مفتاح العلوم واقع جامع شاہی مئو کا امتحان تحریری کتب احادیث و دیگر فنون میں لیا۔ الحمد للہ طلبہ نے اچھے خاصے اور اعلیٰ درجہ کے نمبر حاصل کئے، بلکہ بعض طلبہ نمبر انعامی کے بھی مستحق ہوئے، اور ان کو انعامی نمبر بھی عطا کئے گئے۔ اس سے طلبہ کی محنت اور جانفشانی کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے، اور در حقیقت یہ مولوی فاضل مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سلمہ صدر مدرس و مولوی عبداللطیف صاحب سلمہ کی قابلیت اور حسن تعلیم کا ثمرہ اور اراکین مدرسہ کے حسن انتظام کا نتیجہ ہے۔ مدرسہ کی حالت بہت زیادہ قابل تحسین ہے۔"

تعلیمی شباب کا زمانہ اور اس حالت کو بہت زیادہ قابل تحسین بنانے میں علامہ اعظمی قدس سرہ العزیز نے کیا خدمات اور کیسے کارنامے انجام دیئے تھے، اس کے لئے بھی مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب کی طرف رجوع کریں، جنھوں نے اس حالت کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا تھا، وہ فرماتے ہیں:

(۱) تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۰۱

"مفتاح العلوم کا یہ دور کہنا چاہئے تعلیمی شباب کا زمانہ تھا، ہر درجہ میں کافی طلبہ تھے اور اساتذہ اسباق و مطالعہ کے باب میں بہت سخت۔ یوں سمجھئے کہ بد محنت کی اسباق میں اچھی خاصی پٹائی بھی ہوتی تھی، حضرت مولانا مدظلہ اور مولانا نعمانیؒ دونوں عبارت خوانی میں ایک زیر زبر کی غلطی برداشت نہیں کرتے تھے، ترجمہ میں مولانا نعمانی ایک حد تک نرم تھے، مگر حضرت مولانا اعظمی مدظلہ ترجمہ میں بھی اتنے ہی سخت تھے جس قدر عبارت کی صحت میں، کیا مجال کہ کوئی غلط ترجمہ کر کے نکل جائے۔ ہمارے بہت کم ساتھی تھے جنھوں نے عبارت خوانی یا ترجمہ میں مار نہ کھائی ہو۔(۱)

اور عربی زبان کے کہنہ مشق ادیب، اور علامہ اعظمی کے شاگرد رشید مولانا سعید الرحمٰن صاحب اعظمی اپنے بچپن کے نقوش و تاثرات میں لکھتے ہیں:

"ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میرے ننھے سے دل و دماغ میں رعب و خوف کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ قاری صاحب (۲) کی زبان سے اچانک نکلا "بڑے مولانا" اور دیکھا تو ایک وجیہ اور بہت رعب دار و پر وقار بزرگ جامع مسجد کے مشرقی دروازہ پر بے تکلف دیوار کا سہارا لئے ہوئے کھڑے ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ بڑے مولانا ہیں جو مدرسہ کے سب سے بڑے عالم اور سب کے بزرگ ہیں۔ اس دن سے میں نے بڑے مولانا کی عزت و عظمت کو جو لوگوں کے دلوں میں پنہاں تھی سمجھا۔ یہ اپنی کم عمری میں عظمت و رعب کا سب سے پہلا نقش تھا جو میرے دل پر مرتسم ہوا اور آج تک وہ نقش قائم ہے۔"(۳)

---

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ۱۰۲-۱۰۱

(۲) قاری صاحب سے مراد قاری عبدالمنان صاحب ہیں، جو مفتاح العلوم کے شعبۂ تجوید میں قراءت کے قدیم ترین استاذ تھے۔ محلہ پٹھان ٹولہ کے باشندہ تھے۔ ۱۸؍ جمادی الاولی ۱۴۱۴ھ مطابق ۴؍ نومبر ۱۹۹۳ء کو وفات پائی (المآثر ج ۲ ش ۲ ص ۲۹)

(۳) تذکرۂ مولانا عبداللطیف ۱۰۹-۱۰۸

مفتاح العلوم کا عہد زریں ترقی کی دو قسمیں ہوتی ہیں : ایک عمودی (Vertical) دوسرے افقی (Horizontal) پہلی قسم کا تعلق کیفیت سے ہوتا ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے کہ اچھی استعداد اور بہتر صلاحیت کے اساتذہ کی خدمات بہم پہنچائی جائیں، اور ہونہار، زیرک اور محنت و جانفشانی کا مظاہرہ کرنے والے طلبہ داخل کئے جائیں۔ دوسری قسم میں کمیت کا اعتبار کیا جاتا ہے، جو اساتذہ اور طلبہ کی تعداد، عمارتوں کی توسیع، درسگاہوں اور رہائش گاہوں کی کثرت و قلت سے متعلق ہوتی ہے۔ علامہ اعظمی اور ان کے رفقاء شروع ہی سے دونوں نہج پر زور صرف کرتے رہے، اور مدرسہ کی توسیع و ترقی کیلئے اپنی تمام تر ظاہری و باطنی توانائیوں کو کام میں لاتے رہے، حکومت کے تعاون یا سرکاری امداد کا تو کوئی چکر نہیں تھا، عوام کے چھوٹے چھوٹے عطیوں کے ذریعہ ایک ایسا عظیم ادارہ تعمیر کیا، جس کی حدود اگرچہ وسیع نہ تھیں، لیکن فیض رسانی کے لحاظ سے اس وقت کے ملک کے اہم تعلیمی اداروں مثلا دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، مدرسہ شاہی مراد آباد اور دار العلوم ندوۃ العلماء کی صفوں میں شامل تھا۔

وقت گذرتا رہا، شب و روز کی جدوجہد کے ثمرات ظاہر ہوتے رہے، تشنگان علم و فن کا ورود و صدور ہوتا رہا، اور اس کی علمی چہل پہل میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا، مختلف ادارے، مدارس اور مراکز کے اہل علم و فن اور اصحاب فضل و کمال بھی موقع بموقع اپنی تشریف آوری سے مشرف فرماتے، بسا اوقات ارباب علم و فضل کا اچھا خاصا اجتماع ہو جاتا، کبھی سالانہ امتحان کے بہانے، کبھی کسی جلسہ کے موقع پر، اور کبھی کسی اور تقریب کے طفیل اہل بصیرت اور ارباب فکر و نظر آتے، طلبہ کے طور طریقے، ان کی خوش اطواری و سلیقہ شعاری اور نظام تعلیم و تربیت کا بغور اور بنظر غائر جائزہ لیتے، اور مسرور و مطمئن ہو کر ستائش آمیز اور تعریفی کلمات کہتے ہوئے واپس تشریف لے جاتے۔

معیار تعلیم اتنا بلند تھا کہ امتحان کے پرچے ملک کے مشہور و معروف اہل علم و فن بناتے، اوپر گذر چکا ہے کہ نشاۃ ثانیہ کے بعد پہلے سال کا امتحان تحریری مولانا کریم بخش

صاحب سنبھلی صدر مدرس مدرسۃ الشرع سنبھل نے لیا تھا، اور ۵۴-۱۳۵۳ھ کی روداد میں ص ۴ پر درج ہے:

"امسال دورۂ حدیث کے پرچوں میں صحیح بخاری، و ترمذی شریف کے سوالات حضرت حجۃ الاسلام علامۃ العصر سیدی مولانا شبیر احمد عثمانی مدظلہ العالی نے منتخب فرمائے تھے۔"

اور یہ بات بھی آپ کے علم میں آچکی ہے کہ یہ دونوں کتابیں (بخاری و ترمذی) حضرت علامہ اعظمی کے زیر درس رہا کرتی تھیں۔

۵۴-۱۳۵۳ھ کا زمانہ ایک لحاظ سے ابھی مدرسہ کا عہد اول تھا، کسمپرسی اور بے سروسامانی کا وقت تھا، مال وزر کی افراط اور فراوانی نہیں تھی، اور نہ ہی وسیع و عریض اور بلند وبالا عمارتیں تھیں، اور بے سروسامانی کے اس زمانہ میں علامہ اعظمیؒ کا مدرسہ کے مفاد کیلئے کیا حصہ (Contribution) رہا ہے، وہ بھی اس محولہ بالا روداد میں مندرج ہے، "شعبہ تصنیف و تالیف" کے عنوان کے تحت صفحہ نمبر ۵ پر لکھا ہے:

"افسوس اس شعبہ کی تکمیل کیلئے جن اسباب و مواد کی ضرورت ہے وہ ہمارے پاس نہایت کمزور ہیں، جس سے ہم میدان ترقی میں تیز روی کے ساتھ نہیں چل سکتے، مثلاً کتب خانہ، مستقل عمارت کا ہونا تو از بس ضروری و لازمی چیز ہے، مگر ہم اس سے بھی محروم ہیں، اور یہ تمام تر تصنیفیں جناب مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن صاحب صدر مدرس (جن کی قابلیت علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں) کے قلم فیض رقم کی رہین منت ہیں۔"

اخلاص اور ایثار و قربانی اخلاص اور للّٰہیت دینی مدارس کی سب سے بڑی دولت اور عظیم ترین متاع ہے، بلکہ کہنا چاہئے کہ یہی رأس الشئی ہے، اور جہاں سے یہ چیز اٹھی وہاں سے ساری پونجی ختم ہوئی۔ دنیوی جاہ و حشمت اور مال وزر کی خواہش سے اگر قلب پاک و صاف ہو، نفس حرص و آز اور ہوی و ہوس کا بندۂ بے دام نہ ہو، اور دل کے اندر ایثار و قربانی

کا جذبہ موجود ہو تو کوئی بھی مدرسہ یا ادارہ کم سے کم مدت میں بلندی کے مدارج طے کر سکتا ہے۔ مدرسہ مفتاح العلوم اس وقت ایسے پاک طینت اور صاف باطن افراد سے معمور تھا جس کی شہادت ہندوستان کے ایک بلند پایہ عالم نے دی ہے، روداد مذکورہ بالا میں ص ۱۲۔۱۳ پر مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ کے یہ تاثرات مذکور ہیں:

"یہ مدرسہ ہندوستان کے ان چند مخصوص مدارس میں سے ہے جن میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے میں طلبہ کو مخلصانہ مشورہ دیا کرتا ہوں، کیونکہ یہاں کے نظام پر مجھے خاص اعتماد ہے، مدرسہ کو خوش قسمتی سے مدرسین بھی غیر معمولی قابلیت کے میسر آگئے ہیں، جو نہایت قلیل مشاہروں پر انتہائی ایثار کے ساتھ مدرسہ کی تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں، مجھے بلاواسطہ معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے بعض مدرسین کو دوسری جگہ سے بڑے بڑے مشاہروں پر طلب فرمایا گیا لیکن ان کے اخلاق نے مدرسہ ھذا کی موجودہ قلیل رقم کو ترجیح دی اور وہ یہیں مقیم ہیں۔"

"بعض مدرسین" سے اشارہ کس شخصیت کی طرف ہو سکتا ہے! اہل نظر اور انصاف پسند قارئین کے لئے اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ عقلمنداں را اشارہ کافی ست۔

شعبۂ تصنیف و تالیف اور تصنیفی سرگرمیاں | اس چمنستان علمی کی تزئین و آرائش میں علامہ اعظمی کا کتنا عظیم الشان حصہ رہا ہے، اس کا کچھ اندازہ قارئین کو مندرجہ بالا سطروں سے ہوا ہوگا، اب ایک اور اقتباس آپ کے تبحر علمی اور جلالت فن سے متعلق پڑھئے جو روداد مذکورہ بالا میں درج ہے:

"اس مدرسہ میں تصنیف و تالیف کا بھی ایک شعبہ ہے اور شعبہ میں بحمد اللہ خاطر خواہ اور امید سے زیادہ کام بھی ہو رہا ہے، چنانچہ آپ یہ سن کر بہت خوش ہوں گے کہ جناب مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن صاحب صدر مدرس نے جن کی قابلیت علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ حال ہی میں ایک کتاب "الحاوی

لرجال الطحاوی نہایت ہی مفید ونادر تصنیف فرمائی ہے۔"(۱)

یہ زبردست تصنیفی کارنامہ اس وقت کا ہے جب کہ عمر کے تیس سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے، اور آپ کی شناخت علمی دنیا میں اس طرح ہو چکی تھی کہ آپ کی ذات محتاج تعارف نہیں تھی بقول مجاز:

اس محفل کیف و مستی میں، اس انجمن عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے، ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

روداد مدرسہ بابت ۱۳۷۷ھ میں مرقوم ہے:

"جامعہ میں تصنیف کا بھی ایک مستقل شعبہ قائم ہے اور مقام مسرت ہے کہ اس شعبہ کو ملک کے مشہور محدث اور زبردست اہل قلم حضرت العلامہ جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ کی مستقل سرپرستی حاصل ہے"۔(۲)

علامہ اعظمی علیہ الرحمہ نے مفتاح العلوم میں عمر عزیز کا جو حصہ گذارا وہ آپ کا عہد شباب تھا، اس وقت آپ کے دست و بازو قوتوں اور توانائیوں سے بھرپور تھے، بائیس سال کی مدت کچھ کم نہیں ہوتی (بائیس سال باقاعدہ تدریس اور صدارت و مشیخت کے، ورنہ آپ کے دست مبارک نے پچاس سال تک اس کی چمن بندی اور بہار آفرینی میں اہم کردار انجام دیا) یہ دور مفتاح العلوم کا بھی عہد زریں تھا، اس اثناء میں ملک کے اطراف وجوانب، بلکہ بسا اوقات بیرون ملک سے بھی نہ جانے کتنے طالبان گوہر علم آئے، آئے تو تہی دست اور خالی دامن، لیکن جب لوٹے تو علم وادب کے لعل و گوہر اور یاقوت و جوہر سے جیب و دامن کو بھر کے گئے:

فعاجوا فأثنوا بالذی أنت اهله ولو سکتوا أثنت علیك الحقائب

علامہ اعظمی کا اپنے ہم عصروں اور ہم نفسوں کے درمیان جو نمایاں اور ممتاز مقام

---

(۱) ص۵ (۲) ص۷

تھا، اس کیلئے مثالاً عرض ہے:

"مولانا اعظمی مدظلہ کا پہلا گھنٹہ تصنیف و تالیف کیلئے خالی رہتا، عموماً دوسرے گھنٹہ میں تشریف لاتے، پہلے آکر جامع شاہی کے دروازے پر کھڑے ہوتے۔ آپ کے آتے ہی پورے مدرسہ میں اساتذہ سے لے کر طلبہ تک سب ہوشیار ہو جاتے، پھر مولانا مدظلہ اپنی درسگاہ دارالحدیث میں جو مسجد سے باہر کچے مکان میں تھی جاکر پڑھانے بیٹھ جاتے، اور جس درجہ کا سبق ہوتا اس کے طلبہ پہنچ جاتے، مولانا مدظلہ کے سوا سارے مدرسین کی درسگاہیں جامع شاہی میں تھیں۔ حضرت الاستاذ مولانا عبداللطیف نعمانیؒ بھی جامع شاہی کے فرش پر ہی بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے۔"(۱)

بڑھنی کا مناظرہ بڑھنی نیپال کی سرحد پر بستی کا ایک گاؤں ہے ۱۹۲۹ء میں یہاں غیر مقلدوں سے ایک مناظرہ ہوا، اس وقت اس گاؤں کی آبادی مذہب اور تعلیم سے قریب قریب بے بہرہ تھی، غیر مقلدین نے یہاں کی فضا کو ہموار اور اپنے مناسب حال دیکھ کر غیر مقلدیت کی تبلیغ شروع کی، اور یہاں کے ناخواندہ لوگوں میں سے چند افراد کو حرف شناس بنا کر درجۂ اجتہاد تک پہنچا دیا، دیکھتے ہی دیکھتے یہ سیلاب بلا بہت سے خانوادوں کو بہا لے گیا، لیکن قدرت کا یہ عجیب کرشمہ کہ غیر مقلدین کے تربیت یافتوں میں ایک نوجوان مدارج تعلیم طے کرنے کے بعد غیر مقلدیت کے بڑھتے ہوئے دھارے کے لئے سد راہ بن گیا، چنانچہ اس نوجوان فاضل نے ایک جلسہ منعقد کر کے علماء احناف میں سے بعض بلند پایہ ہستیوں کو دعوت دی، جن میں امام اہلسنت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی، مولانا عبدالشکور مرزاپوری، علامہ اعظمی، مولانا عبداللطیف نعمانی، اور مولانا محمد ایوب مئوی وغیرہ حضرات تھے، اس جلسہ کی نمایاں کامیابی یہ رہی کہ تین اشخاص نے عین جلسہ

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۰۲

میں تبدیل مسلک کا اعلان کیا۔

احناف کی یہ کامیابی غیر مقلدوں کیلئے بہت دلآزار ثابت ہوئی، اور انھوں نے اپنی سرگرمیاں اور تیز کردیں، یہاں تک کہ احناف کو مناظرہ کا چیلنج دیدیا۔ اور ۸/جون ۱۹۲۹ء مناظرہ کی تاریخ متعین کردی، اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کیلئے علامہ اعظمی، مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی کو ساتھ لیکر بستی پہنچے، شرائط مناظرہ طے کرنے میں کئی روز تک مسلسل ردوکد ہوتی رہی، علامہ اعظمی اور مولانا نعمانی نے ہر ممکن کوشش کی کہ حق وناحق کا فیصلہ ہو جائے، لیکن مخالفین کسی شرط پر بھی آمادہ نہیں ہوئے، اور شرائط مناظرہ طے کرنے میں ہی راہ فرار اختیار کر گئے، اور علامہ اعظمی اور مولانا نعمانی اپنی فتحمندی پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے مئو واپس ہو گئے۔(۱)

الحاوی کی تصنیف ایک اہم علمی کارنامہ | اس زمانے میں آپ نے جو ایک بڑا اہم اور ممتاز علمی کارنامہ انجام دیا وہ "الحاوی لرجال الطحاوی" کی تصنیف ہے، حافظ ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامہ (متوفی ۳۲۱ھ) ایک جلیل القدر حنفی محدث گذرے ہیں، ان کی دو کتابیں ۔۱۔ "شرح معانی الآثار" اور ۲۔ "شرح مشکل الآثار" بہت شہرت اور اہمیت کی حامل ہیں، مسلک حنفی کے نقطۂ نظر سے یہ دونوں کتابیں نہایت بلند پایہ اور معرکۃ الآراء خیال کی جاتی ہیں۔ علامہ اعظمی نے ان دونوں کتابوں کے رجال ورواۃ کو جمع کرکے ان کے حالات قلمبند کیے، اس کے جمع وترتیب سے آپ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۸ھ میں فارغ ہوئے، جیسا کہ آپ نے اپنی اس کتاب کے آخر میں ذکر فرمایا ہے اور " انه والله تصنیف شریف" اس کا مادۂ تاریخ نکالا ہے، جس کے اعداد ۱۳۴۸ برآمد ہوتے ہیں، یہ علامہ اعظمی کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس میں کوئی ان کا ثانی نہیں، کیونکہ "شرح معانی الآثار" کے رجال پر تو متعدد اہل علم نے کام کیا، لیکن "شرح مشکل الآثار" کی خدمت آپ کی بے نظیر

(۱) اس مناظرہ کی تفصیل علامہ اعظمی نے اپنے قلم سے کئی صفحوں میں لکھی ہے، جس کو راقم نے نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے اور صرف اس کا خلاصہ بیان کیا ہے۔

انفرادیت ہے، "الحاوی" کی قدر و قیمت کیلئے اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیری اور علامہ شبیر احمد عثمانی جیسے جہابذۂ فن نے اس کی تحسین و ستائش کی ہے، اس کتاب کی تصنیف کے وقت آپ کی عمر محض انتیس سال تھی۔

دار المطالعہ والتصنیف کا قیام اور تذکرہ کا اجرا ان ہی ایام میں آپ نے دار المطالعہ والتصنیف کے نام سے ایک ادارہ کی داغ بیل ڈالی، بلکہ غالباً مفتاح العلوم ہی کے اندر اس کا ایک باقاعدہ شعبہ قائم کیا، اس دار المطالعہ کا تذکرہ اس زمانے کی بعض تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ یہاں سے ربیع الاول ۱۳۴۹ھ میں آپ نے "تذکرہ" کے نام سے ایک علمی و دینی مجلہ جاری کیا، آپ خود ہی اس کے ایڈیٹر تھے، لیکن اس کا صرف ایک ہی شمارہ نکل سکا، اس کا آپ نے خاکہ یہ بنایا تھا کہ اس کے اندر قرآن، حدیث، علم کلام جدید، اخلاق و تصوف، تاریخ و سیر، ادب و تنقید اور تراجم وغیرہ سے متعلق علمی و فکری مقالات و مضامین شائع کیے جاتے (۱)

التنقید السدید علی التفسیر الجدید اسی دور میں آپ نے "التنقید السدید علی التفسیر الجدید" نامی رسالہ تصنیف فرمایا، جو مولوی عبدالحی پروفیسر جامعہ ملیہ کی کتاب "التفسیر الجدید" کی تفسیری تحریفات کا پرزور رد ہے، علامہ اعظمی کا یہ رسالہ "النجم" لکھنؤ میں ذی قعدہ ۱۳۴۹ھ میں ۴۸ صفحات میں شائع ہوا، یہ رسالہ علمی حلقوں میں نہایت مقبول ہوا، چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اس کی تعریف و توصیف اس طرح فرمائی:

> "احقر اشرف علی تھانوی عفی عنہ نے اس تنقیدی مضمون کو غایت شوق سے حرفاً حرفاً دیکھا اور اس حدیث کا مصداق پایا، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ، ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين و تاويل الجاهلين (مشکوٰۃ عن البیہقی)

(۱) راقم السطور کو تذکرہ کے جاری ہونے کے متعلق کوئی بات معلوم نہیں تھی، اس سلسلے میں شکر گزار ہوں اپنے بزرگ کرم فرما جناب مولانا حکیم عزیز الرحمن صاحب کا کہ انھوں نے اس کی طرف توجہ دلائی۔

ماشاء اللہ قوت استدلال، حسن ادا، دفع شبہات، لین کلام غرض ہر پہلو سے بے تکلف اس شعر کا نمونہ ہے۔

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جااینجاست

بارك الله تعالى فى إفادات المصنف وإفاضاته"

اور حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے ۲۸/رجب ۱۳۵۰ھ کے ایک خط میں یہ توصیفی کلمات تحریر فرمائے:

"سبحان اللہ عنوان اور معنون، تعبیر اور معبر عنہ کے لحاظ سے یہ بے نظیر رسالہ ہے ... رسالہ کا موضوع باوجودیکہ تنقید و مناظرہ ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس متانت و تہذیب اور انصاف و حق گوئی کا ثبوت اس تحریر میں دیا گیا ہے، عموماً مناظرانہ تحریریں اس سے خالی دیکھی گئی ہیں ... بہر حال رسالہ ہر حیثیت سے اپنے موضوع میں جامع اور متین و معقول ہے ..."

ہمشیرہ کی وفات ۶/جمادی الثانیہ ۱۳۵۱ھ مطابق ۷/اکتوبر ۱۹۳۲ء کو آپ کو ایک دلگداز حادثہ سے دوچار ہونا پڑا، یعنی آپ کی ایک ہمشیرہ طویل علالت کے بعد اس دنیا سے فوت ہو گئیں، ان کی وفات کی خبر ۱۸/جمادی الثانیہ ۱۳۵۱ھ ۱۹/اکتوبر ۱۹۳۲ء کے "العدل" گوجرانوالہ میں شائع ہوئی:

"حضرت ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی (مد ظلہ) کی ہمشیرہ صاحبہ نو ماہ سے بعارضہ دق مبتلا تھیں، افسوس ہے کہ ۶/جمادی الثانیہ ۵۱ھ کو دس بجے دن میں ان کا انتقال ہو گیا۔"

الاعلام المرفوعة فی حکم الطلقات المجموعة تین طلاق کا مسئلہ ایک معرکۃ الآراء مسئلہ ہے، ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوں گی یا تین طلاق شمار ہوں گی، یہ اہل سنت کا تقریباً اجماعی مسئلہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی، علامہ اعظمی نے اہلسنت کے موقف کی حمایت میں تینوں کے وقوع اور اثبات پر ایک نہایت محقق

کتاب "الاعلام المرفوعة فی حکم الطلقات المجموعة" اسی عہد میں تصنیف فرمائی، یہ کتاب اتنی محقق ومدلل اور اپنے فن پر اس قدر حاوی اور جامع ہے کہ علامہ شبیر احمد عثمانی جیسے اہل علم اپنے تلامذہ کو اس کے مطالعہ کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔

تنبیہ الکاذبین | امام اہلسنت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نے ایک کتاب "تنبیہ الحائرین" تصنیف فرمائی تھی، ایک شیعی مصنف مولوی اعجاز حسن بدایونی نے اس کا جواب "تنبیہ الناصبین" کے نام سے لکھا تھا، مولوی اعجاز حسن بدایونی کے اس رسالہ کا جواب علامہ اعظمی نے "تنبیہ الکاذبین" کے نام سے تحریر فرمایا، علامہ اعظمی کا یہ جواب "النجم" لکھنؤ ج ۱۱ ش ۱۔۵۔۶، ۱۳۵۲ھ میں شائع ہوا، اس میں شیعوں کے عقیدۂ تحریف قرآن کا مسکت جواب دیا گیا ہے۔

ادری کا مناظرہ اور علامہ اعظمی کی سرپرستی | وسط اکتوبر ۱۹۳۳ء (۱۳۵۲ھ) ضلع اعظم گڈھ کے قصبہ ادری میں ایک زبردست اور ہنگامہ خیز مناظرہ ہوا، مناظرہ کا پس منظر یہ تھا کہ بریلوی حضرات نے قصبہ کے اندر بریلویت کی طرف دعوت کی نہایت سرگرمی کے ساتھ مہم چلا رکھی تھی، آئے دن ان کی تقریریں ہوتیں جن میں علماء دیوبند کی شان میں گستاخیاں اور دشنام طرازیاں کی جاتیں، یہاں تک کہ خاص اسی دعوت و تبلیغ کیلئے دو بریلوی عالم مولوی نعیم الدین مراد آبادی اور مولوی حشمت علی خاں کو ادری بلایا گیا، جن کی زہر افشانیوں سے ادری کی پوری فضا مسموم ہو گئی، ان کی زبان بندی کیلئے مجبور ہو کر علماء دیوبند کو پیش قدمی کرنی پڑی، چنانچہ ان کے مقابلہ کیلئے علامہ اعظمی، مولانا عبداللطیف نعمانی، مولانا منظور نعمانی اور غالباً مولانا ایوب اعظمی ادری پہنچے، ان حضرات کو دیکھ کر ہی بریلوی علماء کے ہوش اڑ گئے، اور دیوبندیوں کی دعوت مبارزت کے باوجود بریلوی مولویوں نے فرار کی ہر ممکن کوشش کی، مگر ان کی ایک نہ چلی، بالآخر مناظرہ ہوا اور بریلویوں کو اس میں شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اس مناظرہ میں علامہ اعظمی کی حیثیت ایک سرپرست اور سالار کی تھی، جن کی

زیر قیادت دیوبندیوں نے یہ میدان فتح کیا، اس کے اندر آپ مرجع کا کام کرتے تھے، مولانا نظام الدین اسیر ادروی فرماتے ہیں:

"۱۳۵۲ھ میں قصبہ ادری ضلع اعظم گڈھ کے ہنگامہ خیز مناظرہ نے پورے ضلع کو متاثر کیا، مجھے یاد ہے یہ مناظرہ مولانا اعظمی کی بروقت مداخلت اور پیش قدمی کی وجہ سے ہوا۔

اس کا آغاز مولانا عبداللطیف نعمانی نے کیا اور خاتمہ مولانا محمد منظور نعمانی نے، مولانا اعظمی بحیثیت سرپرست ہر نشست میں اسٹیج پر بروقت رہنمائی کیلئے موجود رہتے اور دلائل اور جوابات کی نشاندہی اور ہدایت کا فریضہ انجام دیتے تھے"(۱)

الازہار المربوعہ | آپ کی کتاب الاعلام المرفوعۃ کا جواب ایک غیر مقلد عالم مولانا عبداللہ شائق نے "الآثار المتبوعة" کے نام سے لکھا، علامہ اعظمی نے اس کا نہایت مفصل رد "الأزهار المربوعة" کے نام سے دو جلدوں میں تصنیف فرمایا، اس کا ایک حصہ تصنیف کے بعد فوراً شائع بھی ہوا تھا، لیکن دوسرا حصہ حلیہ طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکا، طلاق ثلاثہ کے مسئلے پر اعلام اور ازہار یہ دونوں ایسی کتابیں ہیں، جن کی نظیر احادیث و آثار قوت استدلال اور زور بیان کے لحاظ سے اردو زبان کے اندر کوئی دوسری موجود نہیں۔

اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں: "اس بحث میں ہمارے ہندی دوست مصر کے مشہور حنفی مصری عالم شیخ نجیب سابق شیخ ازہر سے بہت آگے نکل گئے ہیں، جنھوں نے اسی بحث پر ایک رسالہ الابحاث فی التطلیقات الثلاث لکھا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ عقلیات کے علاوہ نقلیات میں بھی ہندوستان کا علم بحمد اللہ مصر سے زیادہ ہے۔"(۲)

نصرۃ الحدیث | "حق گو" کے نام سے کسی منکر حدیث نے ایک کتاب "میں منکر حدیث کیوں ہوا؟" کے نام سے لکھی، یہ کتاب مشہور اہل حدیث مولانا ثناء اللہ امرتسری کے

(۱) ترجمان الاسلام شمارہ ۱۳ ص ۳۱

(۲) معارف ص ۳۹۶ صفر ۱۳۵۶ھ مئی ۱۹۳۷ء

پریس ثنائی برقی پریس امرتسر سے شائع ہوئی تھی، اس کے اندر نہایت سوقیانہ اور بیہودہ انداز میں سلف صالحین، ائمہ و محدثین حتی کہ صحابۂ کرامؓ تک پر بہتان طرازی وافتراء پردازی کی گئی تھی، اور انکار حدیث کے بھونڈے اور مضحکانہ اسباب پیش کئے گئے تھے، اس کتاب کا رد لکھنے کیلئے مولانا محمد بہاء الحق قاسمی امرتسری نے علامہ اعظمی سے درخواست کی، یہ ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے، علامہ اعظمی نے "نصرۃ الحدیث" کے نام سے اس کا نہایت عالمانہ اور محققانہ جواب لکھ کر مولانا بہاء الحق صاحب کی تحریر کے مطابق دو مہینے میں ان کے پاس بھیج دیا، اس کا پہلا ایڈیشن آفتاب برقی پریس امرتسر سے مولانا قاسمی ہی کے اہتمام سے شائع ہوا۔

چند سال کے عرصے میں علامہ اعظمی کے یہ ایسے شاندار علمی کارنامے تھے، جن کے ذریعہ آپ کا نام پورے برصغیر کے علمی حلقوں میں روشن ہو گیا۔

مئو آئمہ کے جلسہ میں شرکت کے لئے دعوت علامہ اعظمی کو عہد شباب ہی میں ہندوستان گیر شہرت حاصل ہو گئی تھی، آپ کا نام ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیل چکا تھا، سن کی کمی کے باوجود علمی حلقوں میں پوری طرح مقبول ہو چکے تھے، آپ کو اہم تقاریب میں مدعو اور پیچیدہ اور نازک ترین مواقع پر یاد کیا جاتا، آپ کی ذات مجلسوں اور جلسوں کی زینت ہوتی، ملک کے طول و عرض میں ہونے والے بہت کم ایسے جلسے ہوتے جن میں اجلۂ علماء کے ساتھ آپ کی شرکت کو بھی ضروری نہ خیال کیا جاتا ہو، اس جگہ ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں مئو آئمہ الہ آباد میں کسی جلسے کا انعقاد طے پایا، جس میں شرکت کیلئے ہندوستان کی مشہور و معروف شخصیتوں کے ساتھ علامہ اعظمی کو بھی دعوت دی گئی، چنانچہ ۲۱ر ستمبر ۱۹۳۶ء کو مئو آئمہ سے مولانا محمد حسن صاحب ناظم مدرسہ انوار العلوم نے علامہ اعظمی کے پاس درج ذیل خط لکھا:

"۔۔۔ گرامی نامہ باعث تشکر وامتنان ہوا، جلسہ کی تاریخیں ۲۹ر ۳۰ر رجب مطابق ۱۶ر ۱۷ر اکتوبر ۳۶ء یوم جمعہ شنبہ مقرر ہو چکی ہیں، اطلاعاً عرض ہے

امید کہ جناب والا ان تاریخوں کو محفوظ رکھیں گے، مولانا عبدالوہاب (۱) صاحب دربھنگہ، مولانا سید حسین احمد (۲) صاحب مدنی صدر المدرسین دیوبند، حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب وغیرہ کی تشریف آوری کی امید ہے۔"

(۱) ۱۲۹۰ھ م ۱۸۷۳ء میں بلاسپور حیاگھاٹ ضلع دربھنگہ میں پیدا ہوئے، حضرت شیخ الہند کے خاص شاگردوں میں تھے، مڈل کلاس تک انگریزی پڑھی، اس کے بعد مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں عربی پڑھنا شروع کیا، اس کے بعد دیوبند گئے، اور وہاں سے ۱۳۲۳ھ میں فراغت حاصل کی، فارغ ہونے کے بعد ان کو انھیں کی مادر علمی مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں صدر المدرسین بنایا گیا، یہیں ساری زندگی تعلیم و تدریس میں گذاردی ان کی ذات سے بہار میں کافی فیض پہونچا اور بہار میں دینی تعلیم کو فروغ حاصل ہوا، دربھنگہ ہی میں ۱۳۶۷ھ م ۱۹۴۷ء میں ۷۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ (کاروان رفتہ ص ۱۸۸)

(۲) مولانا مدنی کا وطن اصلی ٹانڈہ ضلع فیض آباد ہے، ۱۹؍ شوال ۱۲۹۶ھ م ۱۸۷۹ء کو قصبہ بانگر مئو ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم پرائمری اسکول میں حاصل کی، ۱۳۰۹ھ م ۱۸۹۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور ۱۳۱۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے، تکمیل علم کے بعد والدین کے ہمراہ حجاز روانہ ہوگئے۔ اور مدینہ منورہ میں اقامت گزیں ہوئے، حجاز کیلئے روانگی سے پہلے حضرت گنگوہی سے بیعت ہوچکے تھے، مکہ مکرمہ پہنچ کر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی صحبت سے بھی فیض اٹھایا، مدینہ منورہ میں قیام کے دوران ۱۰؍ سال تک مسجد نبوی میں حدیث کا درس دیا، اس اثنا میں کئی دفعہ ہندوستان کا قصد کیا، ساتھ ہی تحریک آزادی میں بھی حصہ لیتے رہے، جس کی پاداش میں ۱۳۳۵ھ میں انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہوکر حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء کے ہمراہ جزیرہ مالٹا میں قید کئے گئے، جس سے ۱۳۳۸ھ میں رہائی ملی ۱۵؍ محرم ۱۳۴۰ھ م ۱۸؍ ستمبر ۱۹۲۱ء کو دیوبند سے گرفتاری ہوئی جس کے بعد کراچی کا مشہور مقدمہ پیش آیا اور دو سال پھر قید میں گذارے، ۱۳۴۶ھ میں شاہ صاحب اور ان کے رفقاء کی علیحدگی کے بعد دارالعلوم کے صدر منتخب ہوئے، اس طرح آپ کی پوری زندگی سیاسی، سماجی، علمی اور درسی و تدریسی سرگرمیوں سے معمور رہی، متعدد بار آپ نے قید فرنگ میں اسارت کی زندگی گذاری، لیکن کبھی پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی، علم کا فیضان ہر جگہ جاری رہا یہاں تک کہ قید خانے میں بھی مولانا محمد علی جوہر نے ان سے ترجمۂ قرآن پڑھا، آپ کی ذات بے پناہ صلاحیتوں کا مجموعہ تھی، علم و فضل، زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت، فہم و فراست، تفکر و تدبر، اتباع سنت اور سعی و عمل میں ان کی نظیر بہت کم ملے گی۔ ۱۲؍ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۶ھ م ۵؍ دسمبر ۱۹۵۷ء کو یہ آفتاب جہانتاب غروب ہوگیا۔

سیوہارہ کے جلسے کے لئے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی دعوت

سیوہارہ یا امروہہ کے کسی اور قصبہ میں انصاری برادری کے کسی شیعہ مولوی نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا، عوام میں علانیہ شیعیت کی تبلیغ اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دیا کرتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے سنی حضرات اس کے دام فریب میں آکر شیعیت کی دلدل میں پھنس گئے، اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی(۱) کی نظر انتخاب علامہ اعظمی پر پڑی، وہ ۲۹/اپریل تا ۱۹۴۳ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اگرچہ بندہ کو جناب والا کے ساتھ براہ راست ہم مجلسی کا شرف حاصل نہیں ہے، تاہم غائبانہ کافی تعارف حاصل ہے، اور اسی جرأت پر یہ عریضہ ارسال ہے یہاں شیعہ آبادی بہت ہے اور عرصہ سے ایک شخص بشیر احمد، انصاری برادری کا آتا ہے اور چہلم کے موقع پر سخت اشتعال انگیز تقریریں کرتا ہے، یہاں کی انصاری برادری پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ اہل سنت اس امر کے خواہش مند ہیں کہ امسال اگر یکم ربیع الاول سے وسط ربیع الاول کی تاریخوں میں سے دو تین تاریخوں کے لئے یہاں کوئی خوش بیان مقرر انصاری برادری کے تشریف لا سکیں جو اپنے انصاری برادری کے فرد ہونے کا اعلان بھی کرتے ہوں، تو یہاں کے ماحول کے لئے بیحد ضروری ہے اور بہت مفید۔ براہ کرم جواب باصواب سے فوراً مطلع فرمائیے۔

---

(۱) مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ۱۳۱۸ھ میں سیوہارہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے، تعلیم سیوہارہ کے علاوہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں پائی، ۱۳۴۲ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، مدراس، دیوبند، ڈابھیل اور کلکتہ وغیرہ میں تدریسی خدمات انجام دی، ندوۃ المصنفین کے بانیوں میں تھے، ۱۹۴۲ء میں جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے، آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم کو جمانے کے لئے جو انتھک جدوجہد کی وہ یاد رکھنے کے قابل ہے، بڑے شعلہ بیان مقرر اور بلند پایہ مصنف تھے، سرگرم سیاست میں حصہ لینے کے باوجود متعدد بیش قیمت کتابیں لکھیں، ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

اس خط کے تقریباً پندرہ دن بعد ۳/ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۵/ مئی ۱۹۳۷ء کے ایک دوسرے مکتوب میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

"گرامی نامہ چند روز ہوئے موصول ہو کر باعث عزت ہوا تھا، مگر میں مسلسل بارہ روز سے سفر میں تھا، اس لئے جواب نہ دے سکا، معافی کا خواستگار ہوں حضرت والا کو دراصل یہاں کی سیرت کمیٹی دعوت دینا چاہتی ہے اور مجھ کو سفیر بنایا ہے، شکر ہے کہ حضرت نے وعدہ فرمالیا۔ اب ایک اور ایسے مقرر کا انتخاب فرمالیجئے جو آپ کے علاوہ خوش تقریر اور حسن بیان کا حامل ہو، غالباً جلسے وسط ربیع الاول ہی میں ہوں گے، جب ہر دو حضرات کی جانب سے حتمی منظوری ہو جائے گی، تب سفر خرچ روانہ کیا جائے گا، آج بھی چند روز کے لئے میں باہر جارہا ہوں۔ مہتمم صاحب کی خدمت میں سلام مسنون۔

انصاری برادری کی شرط اس لئے لگائی گئی ہے، کہ لکھنؤ کا بشیر احمد شیعی یہاں کی انصاری برادری کو محض برادری کے نام پر تبلیغ کرتا ہے اور بعض افراد پر محض اسکے انصاری ہونے کی وجہ سے اس قدر اثر پڑا ہے کہ وہ نیم شیعی ہو گئے ہیں بقیہ کے لئے خطرہ ہے۔"

یہ چند خطوط یہاں صرف اس لئے ذکر کر دئے گئے، تاکہ ان کے ذریعہ اہل علم اور طبقۂ علماء میں علامہ اعظمی کی شہرت و مقبولیت، ان کے مقام و مرتبہ اور قدر و منزلت کا کسی حد تک اندازہ لگایا جاسکے، اس زمانہ کے خطوط کا احصاء و احاطہ نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہی ان کا احاطہ مقصود ہے، ورنہ یہ داستان بہت طولانی ہو گی۔ ان خطوط کے لئے ایک علحدہ اور ضخیم دفتر کی ضرورت ہے، اس جگہ صرف نمونہ کے طور پر چند گرامی ناموں کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

مہوا بسم اللہ کا مناظرہ غالباً یہ بھی اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ "مہوا بسم اللہ خاں" میں اہلحدیث اور احناف کے درمیان ایک زبردست مناظرہ ہوا، بلکہ مناظرہ کی نوبت ہی نہیں آئی، اور یک طرفہ تقریر پر حق و ناحق کا فیصلہ ہو گیا، اس مناظرہ کی ضرورت اس طرح پیش آئی کہ کنٹرو بوڑیہار اور مہوا بسم اللہ خان ضلع گونڈہ کے دو قریبی مواضعات ہیں، اور دونوں کے درمیان صرف ایک کیلو میٹر کا فاصلہ ہے، کنٹرو بوڑیہار میں غیر مقلدین آباد ہیں اور مہوا بسم اللہ میں احناف۔ یہاں غیر مقلدوں نے جارحانہ انداز میں غیر مقلدیت کی ترویج و اشاعت شروع کی، اس بڑھتے ہوئے فتنہ کو روکنے کیلئے، امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ نے ایک نوجوان عالم مولانا حفیظ اللہ خان کو ایک جلسہ کے انعقاد کا مشورہ دیا۔ احناف کے جلسے کے انعقاد کی تاریخ متعین ہوئی اور انھیں تاریخوں میں غیر مقلدین نے بھی اپنے جلسے کا اعلان کر دیا اور اس کے لئے غیر مقلد عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری کو بلایا، ادھر احناف کی طرف سے مولانا عبدالشکور صاحبؒ، علامہ اعظمی کو لے کر پہونچے، اس کی روداد مولانا عبدالحفیظ رحمانی کی زبانی سنئے، جسے انھوں نے مولانا حفیظ اللہ خان سے سن کر قلمبند کیا ہے:

> "بالآخر جلسے کی تاریخ آئی اور پورے اہتمام سے ایک ہی باغ میں دونوں جماعتوں کے جلسے کا انتظام کیا گیا، اسٹیج آمنے سامنے لگا، امام اہلسنت نے اپنے جلسے کا آغاز کرتے ہوئے مولانا ثناء اللہ امرتسری کو مخاطب فرمایا اور کہا کہ آپ پہلے تقریر کریں گے یا میں اپنے کسی مقرر کو تقریر کیلئے کھڑا کر دوں، مولانا امرتسری نے قرأت خلف الامام کا موضوع پیش کرتے ہوئے کہا کہ پہلے اپنے مقرر سے آپ اس پر بحث کرائیں اور یہ ثابت کریں کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا ناجائز ہے۰۰۰ امام اہلسنت نے ایک نوجوان عالم مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے نام کا اعلان کیا اور اس موضوع پر تقریر کرنے کا حکم صادر فرمایا۔
> مولانا اعظمی جب تقریر کیلئے کھڑے ہوئے تو ان کو دیکھ کر ہم لوگوں کو

حیرت بھی ہوئی اور چہرے بھی اتر گئے کہ غیر مقلدوں کے پہاڑ سے مقابلہ کیلئے امام اہلسنت نے ایک نوجوان کو اکھاڑے میں اتار دیا ہے، اللہ ہی خیر کرے ۰۰۰ لیکن مولانا حفیظ اللہ خان مرحوم نے نہایت جذباتی اور خوشی و مسرت کے لہجے میں بتایا کہ مولانا اعظمی نے خطبۂ ماثورہ کے بعد فرمایا کہ قرأت خلف الامام جس کو غیر مقلدین سب سے اہم اور اپنا مضبوط اور مدلل مسئلہ سمجھتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان کے استدلال میں مکڑی کے جالوں کے تاروں سے بھی زیادہ ضعف اور کمزوری ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے کیا سوچ کر تقریر کیلئے اس موضوع کو پیش کیا ہے، ان جملوں کے بعد مولانا اعظمی نے غیر مقلدین کے تمام دلائل کا محدثانہ اسلوب میں تجزیہ شروع کیا اور بحث و نظر کا وہ باب کھولا کہ پورے مجمع پر سناٹا چھا گیا، اور اہل علم دم بخود تھے کہ فاضل مقرر سراپا کتب خانہ ہے یا کوئی تحریر اشاراتی سامنے رکھ کر بحث کر رہا ہے، اور یہ سلسلہ فجر کی اذان تک جاری رہا اور یہ طویل ترین بحث ساری رات جاری رہنے کے باوجود بقول فاضل مقرر نامکمل ہی رہی، تکمیل کیلئے آئندہ نشست کا اعلان فرمایا، دوسری رات حضرت مولانا اعظمی نے پھر اسی موضوع کو پایہ تکمیل تک پہونچانے کیلئے تقریر شروع فرمائی اور یہ رات بھی اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے گذر گئی۔ مولوی حفیظ اللہ خان مرحوم نے بتایا کہ ہم تو حیرت زدہ تھے ہی غیر مقلدین اس قدر مبہوت ہوئے کہ کوئی جواب دینے پر آمادہ نہیں ہوا، چنانچہ تیسری رات امام اہلسنت نے مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم کو مخاطب کرتے ہوئے دعوت دی کہ آپ خود یا اپنے کسی منتخب عالم کو جواب دینے کیلئے کھڑا کریں، لیکن بحث کا انداز وہی ہوگا جس محدثانہ اسلوب میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے پیش کیا ہے، لیکن غیر مقلدین کی صفیں درہم برہم ہو گئیں اور کوئی جوابی تقریر کیلئے آمادہ نہیں ہوا ۰۰۰ "(۱)۔

(۱) المآثر، ج۸ ش۱ص ۱۰۲۔۱۰۱

شارع حقیقی بریلیوں اور بدعتیوں نے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مقام الوہیت تک پہنچانے کیلئے مختلف مشرکانہ عقائد گھڑ لئے تھے، اور عوام میں ان کی تدسیس کیلئے ہر ممکن کوشش کیا کرتے تھے، اسی قسم کی ایک کوشش مولوی سید محمد کچھوچھوی کی کتاب "التحقیق البارع فی حقوق الشارع" تھی، جس کے اندر مصنف نے رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو احکام شرع دینے میں مختار مطلق قرار دیا تھا کہ وہ جس چیز کو چاہتے بلا حکم الٰہی اپنی طرف سے حلال یا حرام کر سکتے تھے۔ علامہ اعظمی نے اس کا رد "شارع حقیقی" کے نام سے کیا۔ جو ماہنامہ الفرقان (بریلی) ۱۳۵۷ھ میں قسط وار شائع ہوا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لئے سید سلیمان ندوی کی پیشکش علامہ اعظمیؒ کی شہرت کو شہپر جبریل ملا تھا، مختصر سی مدت میں ان کا نام اور ان کے علم و فضل کا آوازہ علمی دنیا میں اس طرح گونجا کہ ہندوستان کے ہر اہم اور موقر ادارے میں ان کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ اور ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک تمام اہم تعلیمی ادارے ان کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کرنے لگے۔ ان تعلیمی اداروں اور اہل علم کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے مختلف اوقات میں آپ کو اپنے یہاں بلانے کی کوشش کی اور دعوت نامے بھیجے۔ اس میں سب سے پہلا نام علامہ سید سلیمان ندویؒ کا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ سے علامہ اعظمی کا تعلق تحصیل علم سے فراغت کے بعد ہی قائم ہو چکا تھا، سید صاحب اپنے تجربہ کی روشنی میں علامہ اعظمی کے ایسے قائل تھے کہ بہت کم کسی کے ہوئے (۱)، اسی بنا پر انھوں نے دارالعلوم ندوہ اور دارالمصنفین اعظم گڈھ

(۱) سید صاحب کے علامہ اعظمی سے جو تعلقات تھے ان کی نسبت ہم آگے تفصیل سے عرض کریں گے، اس وقت ہم یہاں ایک عینی شاہد کی بات نقل کر رہے ہیں، مولانا عبدالباری آثری ۲۲ر فروری ۱۹۵۶ کے ایک خط میں علامہ اعظمی کو لکھتے ہیں: "سید صاحب آپ کو پا کر اور دیکھ کر کتنا خوش ہوتے تھے۔ وہ منظر اب تک میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔" "سید صاحب علامہ اعظمی کے حد درجہ =

میں علامہ اعظمی کو بلانے کی بھرپور کوشش کی، اور بارہا اس کے لئے پیشکش کی، سید صاحب نے اسی قسم کی ایک کوشش ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء میں ندوہ میں آپ کے تقرر کیلئے کی، اس سلسلے میں تین خطوط قابل ذکر ہیں، سب سے پہلا خط مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم (۱) کا ہے جو سید صاحب کے نام ہے اور ۱۶/ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو لکھنؤ سے لکھا گیا ہے، اس میں لکھتے ہیں:

= معترف تھے اور اس علمی اعتراف کی وجہ سے وہ دارالمصنفین چھوڑنے سے قبل علامہ اعظمی کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے، چنانچہ مولانا عبدالباری اثری ہی ۱۲/ جولائی ۸۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں: "اعظم گڈھ میں سید صاحب علیہ الرحمہ کے تنہا آپ ہی دوست تھے، اور آپ کو بہت ہی عزیز رکھتے تھے، جب آپ دارالمصنفین تشریف لاتے تھے، تو آپ کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے، اور باصرار آپ کو روک لیتے تھے، اور جب تک آپ رہتے تھے آپ ہی کے ساتھ مشغول رہتے تھے، انھوں نے جب نواب حمید اللہ والی بھوپال کی دعوت پر بھوپال جانے کا فیصلہ کر لیا۔ تو آپ ہی کو اپنا قائم مقام اور یہاں کے رفقاء اور مصنفین کا نگراں بنانا چاہتے تھے، مگر افسوس کہ ۰۰۰ کسی قیمت پر آپ کی سیادت و بالادستی قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوئے اور سید صاحب کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی، جس کا مجھ کو بھی بہت افسوس ہوا۔"

(۱) مولانا حکیم عبدالعلی لکھنوی ۱۳۱۱ھ میں رائے بریلی میں پیدا ہوئے، دارالعلوم ندوہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دیوبند گئے، اور وہاں سے ۱۳۲۹ھ میں فراغت پائی، فراغت کے بعد انگریزی تعلیم کی جانب متوجہ ہوئے، اور ۱۳۳۷ھ میں بی، ایس، سی کا امتحان دیا جس میں وہ فرسٹ آئے، ۱۳۴۴ھ میں لکھنؤ میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا۔ مولانا مدنی سے بیعت تھے اور ڈاکٹر ہونے کے باوجود بہت سادہ، متواضع اور متقی و عبادت گذار تھے، مغربی تہذیب و ثقافت کے سخت ناقد تھے، ۱۳۵۰ھ میں ندوہ کے مہتمم مقرر ہوئے، اور تادم واپسیں یہ فریضہ انجام دیتے رہے، ۳/ ذی قعدہ ۱۳۸۰ھ م ۱۹۶۱ء میں لکھنؤ میں وفات پائی، (تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲: ۱۱۴-۱۱۳، کاروان رفتہ ص ۱۷۳)

"مولانا عبدالشکور صاحب سے خط لکھوا کر بھجوا رہا ہوں، امید ہے کہ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سے طے فرما کر مجھے مطلع فرمائیں گے تا کہ ... صاحب کو سبکدوشی کی اطلاع دی جائے ..."

اس کے بعد سید صاحب علامہ اعظمی کے پاس تحریر فرماتے ہیں:

"مکرمی مولوی حبیب الرحمٰن صاحب زاد لطفہ!

السلام علیکم۔ میں نے آپ کے سامنے ندوہ کی تجویز پیش کی تھی، اس کے متعلق ڈاکٹر عبدالعلی اور مولوی مسعود علی (۱) صاحب سے گفتگو ہوئی سب نے پسند کیا۔ آپ نے مولوی عبدالشکور صاحب کا خیال لکھا تھا تو ان سے بھی ذکر کیا گیا، انھوں نے آپ کو خط لکھ کر ڈاکٹر صاحب کو دیا ہے وہ ملفوف ہے۔

تنخواہ بالفعل ص۔ ہو سکتی ہے، امید ہے کہ آپ کمی بیشی کا خیال نہ فرمائیں گے، آپ کا جواب آئے تو ڈاکٹر صاحب کو مطلع کروں"۔

والسلام

۹؍ رمضان ۱۳۵۸ھ سید سلیمان

اس جگہ امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی کا مکتوب بھی ذکر کر دینا بے موقع نہ ہوگا، ان کے خط کی تاریخ یکم رمضان ہے، لکھتے ہیں:

(۱) مولانا مسعود علی ندوی بھیارہ ضلع بارہ بنکی میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے، دارالمصنفین اعظم گڈھ کے ناظم تھے، علامہ شبلی نعمانی کے انتقال کے بعد دارالمصنفین کے انتظام کو سنبھالنے، درست کرنے میں اہم رول ادا کیا، تعمیرات کا کام بہت حسن وخوبی سے کیا، تعمیری ذوق بہت اچھا تھا، ادارہ کی بیشتر عمارتیں انھیں کی جدوجہد کی یادگار ہیں، تحریک خلافت میں حصہ لیا، ساری عمر دارالمصنفین کے لئے وسائل فراہم کرنے میں صرف کردی۔ ۲۷؍ اگست ۱۹۶۷ء (۱۳۸۷ھ) کو اعظم گڈھ میں وفات پائی، (کاروان رفتہ ص ۲۴۰)

"جامع الفضائل مولانا حبیب الرحمٰن صاحب زیدت حسناتکم!

بعد سلام مسنون آنکہ یہ سن کر کہ آپ دارالعلوم کے لئے بلائے گئے ہیں، بہت مسرت ہوئی، اللہ مبارک کرے۔۔۔"

پھر علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ نے اپنے مذکورہ بالا خط کا حوالہ دیتے ہوئے ۳۰؍نومبر ۱۹۳۹ء کو لکھا:

"میں نے رمضان المبارک میں آپ کو خط لکھا تھا، لیکن آپ کا جواب نہیں آیا، پھر ڈاکٹر عبدالعلی صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ بغرض علاج دہلی گئے تھے، اور اب واپس آئے ہیں، تب خیال ہوا کہ اب آپ کا جواب آئے گا، مگر ہنوز محرومی رہی، آپ کے اس خط میں بھی اس کا ذکر نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ وہ خط شاید نہیں ملا، وہی ندوہ میں آجانے کی تحریک تھی۔"

کھانسی کی شکایت اور علاج کیلئے دہلی کا سفر علامہ اعظمی تقریباً پوری عمر امراض و عوارض سے دوچار رہے، بیماری زندگی کے ہر دور میں ان کے ساتھ ساتھ رہی، بسااوقات بعض بڑے خطرناک امراض آپ پر حملہ آور ہوئے، چنانچہ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ زمانۂ طالب علمی میں کئی بار بیمار اور صاحب فراش ہوئے، اور دو دفعہ دیوبند سے بیماری کی وجہ سے واپس آئے۔ اسی طرح سید سلیمان ندوی کے خط سے چند سطر پیشتر معلوم ہو چکا ہے کہ علاج کے واسطے دہلی بھی تشریف لے گئے تھے، یہ ۱۳۵۸-۱۳۵۷ھ کی بات ہے کہ کھانسی کی شکایت ہوئی، بہت دوا علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، بالآخر علاج کیلئے دہلی کا سفر کرنا پڑا، ۱۸؍ذی قعدہ ۱۳۵۸ھ کے ایک خط میں حکیم الامت حضرت تھانوی کی خدمت میں لکھتے ہیں:

"۔۔۔گذشتہ سال جاڑوں میں کھانسی کی سخت شکایت پیدا ہو گئی، جس میں مہینوں تک پریشان رہا، کسی علاج سے فائدہ نہیں ہوا، جب موسم بدلا تو خود بخود یہ شکایت جاتی رہی، اس سال پھر اواخر رجب ہی میں یہ شکایت عود کر آئی،

اور برابر علاج کرتا رہا، لیکن کچھ نفع نہیں ہوا، رات کے وقت اتنا پریشان ہوتا تھا کہ سونا دشوار ہو جاتا تھا، گھنٹوں تک مسلسل کھانستا رہتا تھا، جس کی وجہ سے سر اور سارے بدن میں سخت درد پیدا ہو جاتا تھا، پھر بعض اطباء نے یہ بھی کہا کہ اندر بخار بھی رہا کرتا ہے، اس لئے والد صاحب کے اشارہ سے اواخر شعبان میں بغرض علاج دہلی گیا، اور تقریباً بیس دن وہاں قیام کر کے علاج کیا، وہاں بھی نفع نہیں معلوم ہوا۔ دہلی سے چلتے ہوئے اپنی طبیعت سے تھوڑا کشتۂ مرجان لے لیا تھا، مکان پہونچ کر اسی کا استعمال شروع کیا، دوسری تیسری شوال سے کھانسی میں بہت کمی معلوم ہوئی اور رفتہ رفتہ یہ شکایت جاتی رہی، والحمد للہ، اب خدا کے فضل واحسان سے بالکل یہ شکایت نہیں ہے، دوا کا استعمال جاری ہے۔

البتہ کھانسی کے ساتھ درد کمر میں بھی مبتلا ہو گیا تھا، وہ اب بھی باقی ہے، اس کیلئے دعا کا خواستگار ہوں ...“

احکام النذر لاولیاء اللہ اولیاء اللہ کے لئے جو نذریں مانی جاتی ہیں، اور اس سلسلے میں جو بدعات وخرافات اور مشرکانہ رسوم ادا کی جاتی ہیں، ان کی حقیقت وحرمت کے بیان کے لئے آپ نے رسالہ ”احکام النذر لاولیاء اللہ وتفسیر ما اُھل بہ لغیر اللہ“ تحریر فرمایا، یہ رسالہ الفرقان (بریلی) میں شوال۔ ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ میں شائع ہوا۔

ارشاد الثقلین یہ رسالہ آپ نے شیعیت کے رد میں تصنیف فرمایا، شیعوں کے ایک رسالہ ”اتحاد الفریقین“ کا مسکت اور دندان شکن جواب دیا، اور حضرت علی اور خلفاء ثلاثہؓ کے درمیان باہمی اتحاد اور حضرت علی کی نگاہ میں ان کے پیش رو خلفاؓ کی عظمت کو ناقابل انکار دلائل سے ثابت کیا، یہ رسالہ الداعی (لکھنؤ) میں شوال۔ ذیقعدہ۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ کے شماروں میں شائع ہوا۔

اہل دل کی دلآویز باتیں صوفیائے کرام اور بزرگان دین کے واقعات پر مشتمل دو حصوں میں یہ ایک مختصر سی اصلاحی کتاب ہے، اس کے اندر آپ نے بہت سے سبق آموز

واقعات جمع کر دیئے ہیں، جن سے آپ کے ذوق تصوف کا اندازہ ہوتا ہے، یہ کتاب ۱۳۶۰ھ میں معارف پریس اعظم گڈھ سے شائع ہوئی، اس کے متعلق حضرت تھانویؒ نے یہ کلمات ارشاد فرمائے:

"رسالہ کی زیارت سے دل خوش ہوا، اللہ تعالیٰ طالبین علم و عمل کیلئے نافع فرمائے، و سیفعل ان شاء اللہ تعالیٰ، طالب علموں اور مبتدیان طریق کیلئے بہت مفید ہے۔"(۱)

تعزیہ داری اور دیگر مراسم عزاداری سنی نقطۂ نظر سے اس رسالہ میں تعزیہ داری اور عزاداری کے دیگر مراسم پر سنی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ رسالہ ربیع الاول۔ ربیع الثانی اور جمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ میں الفرقان (بریلی) میں قسط وار شائع ہوا۔

ابطال عزاداری ردّ شیعیت ہی کے سلسلے میں آپ نے اسی سال ایک اور رسالہ تحریر فرمایا، جو "ابطال عزاداری" کے عنوان سے جمادی الآخرہ تا ذیقعدہ ۱۳۶۱ھ میں الداعی (لکھنؤ) میں شائع ہوا، یہ رسالہ آپ نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کی فرمائش پر تحریر فرمایا تھا

تحقیق اہل حدیث اپریل ۱۹۴۳ء میں مئو آئمہ ضلع الہ آباد میں اہل حدیث کانفرنس مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی کی زیر صدارت ہوئی، اس کانفرنس کے جواب میں اکتوبر ۱۹۴۳ء (غالباً ۱۳۶۲ھ) کو مئو آئمہ ہی میں احناف کانفرنس زیر صدارت مولانا قاری محمد طیب صاحب ہوئی، اس کے آخری اجلاس میں علامہ اعظمی نے ایک مفصل تقریر فرمائی، جس میں مولانا ابوالقاسم بنارسی کے اپریل والے خطبۂ صدارت کا تاریخی لحاظ سے تجزیہ کر کے اس کا جواب دیا، علامہ اعظمی کی یہ تقریر اتنی پسند کی گئی کہ لوگوں کے شدید اصرار پر اس کے مباحث کو اور پھیلا کر آپ نے "تحقیق اہل حدیث" کے نام سے شائع کیا،

(۱) اہل دل کی دلآویز باتیں ص ۲

۱۹۴۳ء میں ہی یہ کتاب اکبر پریس الہ آباد سے طبع ہوئی۔

تدریسی مشغلہ سے استعفا | مولانا ظفیر الدین صاحب تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی (ص ۱۰۳) میں لکھتے ہیں:

"میری طالب علمی کے اخیر سال میں حضرت الاستاد مولانا اعظمی مدظلہ کو ارباب مدرسہ کی طرف سے کوئی تکلیف پہونچی، اس کے نتیجہ میں مولانا نے مدرسہ آنا بند کردیا۔"

علامہ اعظمی کیلئے یہ بڑا صبر آزما اور ابتلاء کا دور تھا، مدرسہ مفتاح العلوم سے آپ کو جو بے پناہ محبت تھی اور جو والہانہ شغف تھا، اس کی وجہ سے اس سے علٰحدگی کسی صورت سے آپ کو گوارانہ تھی، ہر چند کہ ہندوستان کے اہم اور مرکزی تعلیمی ادارے آپ کیلئے ہمہ وقت چشم براہ بلکہ دیدہ و دل فرش راہ کئے ہوئے تھے، لیکن ان کی جانب کبھی توجہ نہیں فرمائی، محض اس لئے کہ اپنے ہاتھ سے آراستہ کئے ہوئے چمن کو چھوڑنا آپ کو منظور نہ تھا، مگر جب انتظامیہ کے بعض افراد کے رویے سے آپ کی خودداری کو ٹھیس پہنچی تو آپ نے ایک نہایت اہم فیصلہ کیا، وہ فیصلہ آپ کا استعفا تھا، جس کی اصل کاپی ہمارے پاس موجود ہے اور ہم اس کو بعینہ قارئین کے سامنے پیش کردینا چاہتے ہیں، یہ استعفا نامہ ۲ر رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ کا نوشتہ ہے اور اس کی عبارت یہ ہے:

"بخدمت اراکین انتظامیہ مفتاح العلوم مئو

بعد سلام مسنون آنکہ

آپ لوگ جانتے ہیں کہ میں بعض سخت امراض میں مبتلا ہو گیا ہوں، جس کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ دماغ اور دوسرے قویٰ بھی پہلے سے کمزور ہو گئے ہیں۔ اب تک تو میں نے کامل پندرہ سال تک جس طرح ممکن ہوا

قیام، پھر بقا، پھر ترقی کے لئے اپنے آپ کو قربان کیا، لیکن اب درس و تدریس کے ساتھ دوسری دماغی محنتوں کا تحمل مجھ سے نہیں ہو سکتا، علاوہ بریں مدرسہ کے حالات بھی اب پہلے سے بہت مختلف ہیں، میں پہلے دن جب مدرسہ میں بالکل تن تنہا بیٹھا تھا، اس دن صرف میرا اور میرے سات آٹھ شاگردوں کا نام مدرسہ مفتاح العلوم تھا، اور آج اللہ کے فضل سے اس دن کے شاگردوں کی تعداد سے زیادہ مدرسین کی تعداد ہے۔ اس دن بجز تھوڑے سے غریب عوام اور تین چار موجودہ اراکین کے کوئی اس مدرسہ کا نہ ہمدرد تھا نہ ہمنوا۔ کام کرنے والوں اور ساتھ دینے والوں کی اتنی کمی تھی کہ جب مدرسہ قائم ہونے کے ساتھ ہی اس وقت کے ناظم صاحب حج کو چلے گئے تو ناچیز ہی مدرس بھی تھا اور فرائض نظامت کی انجام دہی بھی تمام تر اسی کے ذمہ تھی، لیکن آج خدا کا شکر ہے کہ مدرسہ کے ہمدردوں کا شمار ممکن نہیں، کام کرنے والے بھی بکثرت پیدا ہو گئے ہیں، اس دن مدرسہ کی تحویل میں ایک پیسہ بھی نہ تھا اور آج خدا کی مہربانی سے کئی ہزار نقد موجود ہیں، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ آج میری کمی سے مدرسہ کو کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا، اور آج مدرسہ کو اس بات پر پورا قابو حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے اس جگہ کا انتظام نہایت سہولت سے کرلے۔ پس اراکین انتظامیہ کو میں اطلاع دیتا ہوں کہ وہ اگر ضرورت سمجھیں تو میری جگہ کا انتظام یکم شوال تک کرلیں، یکم شوال سے میں مدرسہ کی ملازمت سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ ہاں اگر یکم شوال تک وہ انتظام نہ کرپائیں تو زیادہ سے زیادہ یکم ذی قعدہ تک میں اور موقع دے سکتا ہوں، اگرچہ اتنا موقع پانے کا بھی محتاج نہیں ہو سکتا، تاہم مجھے اپنی طرف سے صاف صاف بات کہنی چاہئے کہ اس کے بعد میری طرف سے کوئی گنجائش نہیں۔"

(نوٹ) ۱۔ میں نے یکم شوال کی میعاد اراکین کی آسانی کیلئے مقرر کی ہے، اگر وہ اس کو نہ چاہتے ہوں تو مجھے آج ہی سے سبکدوش ہونا منظور ہے۔

۲۔ میری یہ سبکدوشی صرف ملازمت سے ہے، بلا ملازمت اپنی خوشی سے جو جو خدمتیں بآسانی میرے لئے ممکن ہوں گی ان کے لئے میں ہمہ تن مستعد ہوں"۔

والسلام

محمد حبیب الرحمٰن الاعظمی صدر المدرسین

مفتاح العلوم مئو۔ اعظم گڑھ

۲/ رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ"

مذکورہ بالا تحریر کا طرز نگارش صاف بتا رہا ہے کہ کسی بات سے آپ کو سخت تکلیف پہونچی تھی، جس کی وجہ سے بہت دل برداشتہ تھے، اور ملازمت سے سبکدوشی کا تہیہ کر لیا تھا، اور اس تمام صورتحال کے باوجود مفتاح العلوم کی خدمت کیلئے ہر طرح تیار اور کمر بستہ تھے۔ مگر صورتحال کا ذہن پر اس قدر اثر ہوا کہ بہت دنوں تک مسلسل الجھنوں میں مبتلا رہے، ۲۶/ ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۳/ دسمبر ۱۹۴۴ء کو مفتی ظفیر الدین صاحب کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"سلام مسنون ودعائے عافیت کے بعد معلوم ہو کہ رمضان سے لے کر اب تک ایسی الجھنوں میں تھا کہ تم کو بلا واسطہ خط لکھنے کی نوبت نہیں آئی ۰۰۰(۱)

بہر حال علامہ اعظمیؒ کم از کم ۶۳۔۶۴ھ کا پورا سال بغیر معاوضہ کے، ملازمت سے بے نیاز ہو کر، مفتاح العلوم کی خدمت سرانجام دیتے رہے، اور اس خدمت میں ذرہ برابر کمزوری اور کوتاہی نہیں آنے دی۔ مفتی ظفیر الدین صاحب ہی کو ۳/ ستمبر ۱۹۴۵ء مطابق ۲۵/ شعبان ۱۳۶۴ھ کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۴۵۔

"۰۰۰ میرا معاملہ یہ ہے کہ میں نے اب تک قبول ملازمت سے انکار کیا ہے۔اب وہ لوگ شاید پھر جلسۂ عام کر کے مجھ کو مجبور کرنے کی کوشش کریں۔ نتیجہ کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، مگر ارادہ تب بھی نہیں ہے۔"(۱)

فقہی مسائل میں علامہ اعظمی سے استصواب کی مولانا مدنی کی تجویز

مولانا نظام الدین اسیر ادروی ترجمان الاسلام (ش ۱۳ ص ۵۔۶) میں لکھتے ہیں:

"۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علماء ہند کا کل ہند سالانہ اجلاس سہارنپور میں ہوا، اس میں دوسرے مسائل کے ساتھ امارت شرعیہ کا نظام قائم کرنے کا مسئلہ در پیش ہوا، ورکنگ کمیٹی ایک مسئلہ پر متفق ہو گئی، مگر علماء سہارنپور کو دلائل کی بنیاد پر اس سے اختلاف تھا، اور یہ اختلاف تحریری طور پر ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش بھی کر دیا گیا، ارکان عاملہ میں برہمی پیدا ہو گئی، علماء سہارنپور اور مجلس عاملہ دونوں کو اپنے اپنے نقطۂ نگاہ پر اصرار تھا، اور محاذ آرائی کی شکل اختیار کرتا جارہا تھا، جلسہ کی صدارت دنیائے اسلام کی ایک مقتدر شخصیت انجام دے رہی تھی، وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی تھی، صدر نے اپنے اختیارات خصوصی سے اس فیصلہ کو کالعدم قرار دے کر آئندہ کیلئے ملتوی کرنے کا حکم دیا اور یہ تجویز متفقہ طور پر منظور کرائی کہ جمعیۃ علماء کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے جب بھی کوئی فقہی مسئلہ پیش ہو تو محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی سے استصواب کئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔یہ تجویز پوری مجلس عاملہ نے متفقہ طور پر منظور کی جب کہ مولانا اعظمی اجلاس میں موجود بھی نہیں تھے۔ یہ مولانا اعظمی کی فقہی بصیرت پر کلی اعتماد اور ان کے فضل و کمال کا اعتراف کئی درجن عظیم المرتبت علماء و مشائخ کی مجلس میں کیا جارہا ہے اور کسی کو اس سے مجال اختلاف نہیں تھا۔"

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۴۶

دارالعلوم دیوبند سے صدارت افتاء کی پیشکش علامہ اعظمی کو مختصر سی عمر میں جو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہو چکی تھی، اور علمی و فقہی لحاظ سے آپ کا تفوق و کمال اور فضیلت و برتری جس طرح تسلیم کی جا چکی تھی، اس کے گونا گوں شواہد موجود ہیں نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ملک میں بھی جب کسی اہم علمی منصب کیلئے کسی جید الاستعداد اور صاحب نظر عالم کی تلاش ہوتی تو بسا اوقات سب سے پہلے علامہ اعظمی ہی پر نگاہ ٹکتی، لیکن ان تمام مواقع پر آپ کا معاملہ ہمیشہ استغناء اور بے نیازی کا رہا اور فرق مراتب ملحوظ رکھتے ہوئے پوری انکساری کے ساتھ ان عہدوں کو قبول کرنے سے انکار یا معذرت فرماتے رہے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۵ء میں ازہر ایشیا دارالعلوم دیوبند کی صدارت افتاء کے لئے ایک ماہر فقہ و افتاء کی ضرورت و تلاش ہوئی، یہ وہ دور تھا جب آج کل کی طرح قحط الرجال کی صورتحال نہیں تھی، ابھی ملک تقسیم نہیں ہوا تھا، اور ہندوپاک اور بنگلہ دیش کی تفریق نہیں ہوئی تھی، اس غیر منقسم ہندوستان میں ایک سے بڑھ کر ایک عبا قرۂ علم و فضل موجود تھے، اور خود دیوبند بڑے بڑے اصحاب فضل و کمال سے معمور تھا، لیکن ارباب حل و عقد کو اس منصب کے شایان شان کوئی شخصیت نظر آئی تو وہ مئو کی اس دور افتادہ بستی میں تھی۔

مولانا منظور صاحب نعمانی ۱۳۶۳ھ میں دارالعلوم کی مجلس شوری کے رکن منتخب ہوئے، اس سال کے اواخر میں شوری کی نشست میں صدر مفتی کے نام پر غور و خوض کیا گیا تو اپنے استاد علامہ اعظمی کا نام اس منصب کیلئے ان ہی نے پیش کیا، جسے تمام ارکان مجلس نے نہ صرف یہ کہ بلا تامل و تردد کے قبول فرمایا بلکہ اس تجویز پر مسرت و ابتہاج کا اظہار بھی کیا، اور اسی نشست میں یہ بات طے پائی کہ علامہ اعظمی کی منظوری حاصل کرنے

کیلئے شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنیؒ اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مئو تشریف فرما ہو کر ان کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں، ان تمام باتوں کی اطلاع خود مولانا منظور صاحب نعمانیؒ نے ۷؍ محرم الحرام ۱۳۶۴ھ کے لکھے ہوئے ایک خط کے ذریعہ دی، جس کے کچھ حصے حسب ذیل ہیں:

"...شاید علم ہو کہ اس سال سے میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری میں لے لیا گیا ہوں، ۲۸۔۲۹ ذی الحجہ کو مجلس کا انعقاد ہوا تھا، وہاں ایک چیز یہ طے کی گئی تھی کہ اپنے حلقہ کے جو ممتاز اہل علم ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ دارالعلوم میں جمع کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور حتی الوسع انھیں سے دارالعلوم کو بھرا جائے۔ اس سلسلہ میں میں نے مجلس کی جناب کی طرف توجہ دلائی اور یہ طے کر لیا گیا کہ ضرور لانے کی سعی کی جائے۔

... بہر حال میری گذارش پر مجلس نے بالاتفاق یہ طے کر دیا کہ "صدر مفتی" کی جگہ کیلئے جناب کو جلد از جلد بلانے کی کوش کی جائے۔ اور طے یہ ہوا کہ چونکہ مفتاح العلوم کو چھوڑنا بھی آپ کیلئے آسان نہ ہوگا، اس لئے ان مشکلات پر قابو پانے کے واسطے بجائے خط کتابت کے خود حضرت مولانا حسین احمد مدظلہ اور مولانا محمد طیب صاحب مئو کا سفر کریں، بلکہ یہ تجویز خود حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ کی طرف سے آئی جو منظور ہوئی، اب مجھے معلوم نہیں کہ آیا یہ حضرات ابھی مئو کیلئے گئے یا نہیں، یا اگر ابھی نہیں جا سکے ہیں تو مراسلت ہی کے ذریعہ اس بارہ میں کوئی سلسلہ جنبانی ہوئی ہے یا نہیں۔....

مجلس شوری اس وقت الحمد للہ غالباً ہر دور سے اچھی اور نفع دینی کی حامل ہے اور جو ان میں زیادہ بااثر حضرات ہیں وہ سب آپ سے خاص تعلق رکھنے

والے ہیں۔ میری تجویز کا حضرت مفتی صاحب (۱)، حضرت مولانا حسین احمد صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا بشیر احمد صاحب (۲)، مولانا خیر محمد صاحب (۳)

(۱) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مراد ہیں، جو ۱۲۹۲ھ میں شاہجہاں پور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وطن مالوف میں حاصل کی، اس کے بعد مراد آباد گئے جہاں مولانا عبدالعلی میر ٹھی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور آخر میں ۱۳۱۳ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت پائی، فراغت کے بعد مدرسہ عین العلم شاہجہاں پور میں مدرس مقرر ہوئے اور وہیں سے فتویٰ نویسی کا آغاز بھی کیا، ۱۳۲۱ھ کے اواخر میں باصرار مدرسہ امینیہ دہلی کی صدارت تدریس کی مسند تفویض کی گئی، جسے نہایت عمدگی اور ذمہ داری سے تاحیات نبھاتے رہے، ۱۳۵۵ھ سے ۱۳۷۲ھ تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے، سیاست سے بھی بڑا گہرا تعلق تھا، تحریک آزادی کے سلسلے میں کئی دفعہ قید بھی ہوئے۔ ایک مدت تک جمعیۃ علماء ہند کے صدر بھی رہے، مفتی صاحب کو یوں تو تمام علوم اسلامیہ پر دستگاہ حاصل تھی، لیکن فقہ وفتوی میں ان کی نگاہ نہایت دوررس تھی، اپنے وقت کے اجلۂ علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا، حدیث وفقہ ہو یا شعر وادب ہر ایک میں ان کا کمال و تفوق مسلم تھا۔ ذکاوت وذہانت اور فہم وفراست میں ضرب المثل تھے، ۱۳؍ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲؍ ۸۱۔۷۹)

(۲) آپ کے حالات مجھ کو نہیں ملے۔

(۳) پنجاب کے ضلع جالندھر کے باشندہ تھے۔ ۱۸۹۵ء م ۱۳۱۳ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم جالندھر کے علاوہ گلاؤ ٹھی میں حاصل کی، اور بریلی سے مولانا محمد یسین صاحب کے ہاتھوں سند فراغ حاصل کی، ذہنی اور فکری طور پر آپ کی وابستگی دارالعلوم دیوبند سے رہی، اور ایک مدت تک اس کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین رہے، جالندھر میں ۱۳۴۹ھ م ۱۹۳۲ء میں خیر المدارس کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا، ملک کی تقسیم کے وقت پاکستان ہجرت کر گئے اور ملتان میں مقیم ہوئے، وہاں خیر المدارس ہی کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، حضرت تھانویؒ سے بیعت و خلافت حاصل تھی، علم وفضل اور زہد وتقویٰ میں بڑے کامل تھے۔ ۲۰؍ شعبان ۱۳۹۰ھ کو ملتان میں وفات پائی۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲؍ ۱۲۳۔۱۲۲)

مولانا محمد طیب صاحب (۱) سب ہی نے نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا اور بالخصوص حضرت مولانا مدنی، مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے تو میرے اندازوں سے زیادہ آپ کی مدح اور اعتماد کا اظہار کیا۔۔۔"

یہ خط بہت طویل ہے جس کو ہم نے اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے، اور صرف انھیں باتوں کو نقل کیا ہے جو اس مقام سے متعلق ہیں۔ بہر حال مجلس شوری کی تجویز کے مطابق مولانا مدنیؒ اور قاری طیب صاحبؒ مئو تشریف لائے اور اصرار کے ساتھ اس عظیم الشان منصب کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کی، مولانا حبیب الرحمٰن جگدیش پوری لکھتے ہیں:

"۱۳۶۴ھ م ۱۹۴۵ء میں جب کہ محدث عصر مفتاح العلوم مئو میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے تدریسی و تعلیمی خدمات انجام دے رہے تھے، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی صدر المدرسین دار العلوم دیوبند اور اور حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی مہتمم دار العلوم دیوبند نے مئو آکر بیک زبان صدارت افتاء کا

(۱) مولانا قاری محمد طیب صاحب محرم ۱۳۱۵ھ جون ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے، ۷ر سال کی عمر میں دار العلوم میں داخل کر دیا گیا، دار العلوم کا شعبۂ قرأت جب شروع ہوا تو آپ اس کے سب سے پہلے طالب علم تھے، ۱۳۳۷ھ م ۱۹۱۸ء میں فراغت پائی، تعلیم و تربیت، نشو نما اور تحصیل و تکمیل سب کچھ دار العلوم ہی میں عمل میں آیا، تکمیل کے بعد دار العلوم ہی میں درس و تدریس کا آغاز کیا اور یہ سلسلہ زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا، ۱۳۴۳ھ م ۱۹۲۴ء میں دار العلوم کے نائب مہتمم مقرر ہوئے اور پانچ سال بعد ۱۳۴۸ھ م ۱۹۲۹ء میں اس وقت کے مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا انتقال ہو گیا، تو اہتمام کا بار قاری صاحب کے اوپر ڈال دیا گیا، اس وقت سے لیکر پچاس سال تک آپ دار العلوم کے مہتمم رہے، اور پوری عمر دار العلوم ہی کی خدمت میں گذار دی، آپ کے دور اہتمام میں دار العلوم نے بہت زیادہ ترقی کی، وہ بہت سی صلاحیتوں اور گوناگوں اوصاف و کمالات کے مالک تھے، ۶ر شوال ۱۴۰۳ھ ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو وفات پائی اور قبرستان قاسمی میں اپنے جد امجد حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

اہم ترین منصب پیش کیا مگر اہل مئو بالخصوص جامعہ مفتاح العلوم کے ارباب بست وکشاد کسی طرح سے مفارقت پر راضی نہیں ہوئے۔"(۱)

علامہ اعظمی ان دونوں حضرات بالخصوص مولانا مدنی کی شخصیت، ان کے مرتبہ و مقام، ان کے ساتھ گہرے روابط اور ادب واحترام کی وجہ سے ان کی تشریف آوری اور اصرار سے ایک قسم کا بوجھ محسوس کرنے لگے تھے، جس کے باعث ان کی اس پیشکش سے انکار نہیں کر سکے، اور بجبر واکراہ اپنی آمادگی ظاہر کردی، لیکن ارباب مدرسہ کو جب ان کی اس آمادگی کا علم ہوا تو وہ کسی صورت سے بھی اس بات پر راضی اور تیار نہ ہوئے کہ علامہ اعظمی مفتاح العلوم چھوڑ کر جائیں۔

دارالمبلغین (لکھنؤ) کی طرف سے پیشکش علمی حلقوں میں جب یہ خبر پھیلی کہ علامہ اعظمی مدرسہ مفتاح العلوم کی ملازمت سے دستبردار ہو گئے ہیں تو بہت سے حضرات کو، جن کو آپ سے ربط و تعلق تھا، اپنی مراد پوری ہوتی دکھائی دینے لگی ایک اندازے کے مطابق ۱۳۶۴ھ کا پورا سال ملازمت کی حدود و قیود سے آزاد ہو کر مفتاح العلوم کی خدمت سرانجام دی، ناممکن تھا کہ اہل علم کو اس واقعہ کی خبر نہ لگے، چنانچہ جب ان کو اس کی اطلاع ملی تو لوگوں نے آپ کو بلانے کی اپنے اپنے طور پر کوشش کی، اسی سلسلے کا ایک مکتوب مولانا عبدالرحیم صاحب لکھنوی برادر خورد مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی کا ہے، جو ۲۶ر شعبان ۱۳۶۴ھ کا نوشتہ ہے، اس کا مضمون یہ ہے:

"...بخدمت محترم مجمع الفضائل مولانا حبیب الرحمٰن صاحب زید مجدھم
السلام علیکم
آپ کی برداشتگیٔ قلب اور مدرسہ سے قطع تعلق کی خبر تو معلوم ہوئی تھی اور اس خبر سے کچھ قلق بھی ہوا تھا کیونکہ میرا یقین ہے کہ آپ بانی مدرسہ ہیں، لیکن مفصل حال مولوی عبدالستار صاحب پورہ معروف کی زبانی معلوم ہوا،

(۱) دارالعلوم وفیات نمبر ص ۱۵۵۔۱۵۴

ماشاء اللہ کان وماشاء یکون۔ اب تو مجھے حق حاصل ہے کہ عرض کروں، جب آپ کا تعلق مدرسہ سے تھا تو اس وقت آپ کو مجبور سمجھنا ضروری تھا، لیکن اب تو نہ آپ کو کوئی عذر ہو سکتا ہے اور نہ دارالمبلغین کسی عذر کے قبول کرنے کو تیار ہو سکتا ہے، دارالمبلغین کے حقوق آپ پر کئی اعتبار سے ہیں، لہٰذا التماس ہے کہ بعد رمضان آپ قیام دارالمبلغین منظور فرمائیں۔"

سید سلیمان ندوی کی پیشکش دارالمصنفین کیلئے ندوہ کیلئے سید صاحب کی دعوت کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، اس کے کوئی ۶؍سال بعد ۱۳۶۴ھ میں سید صاحب نے ایک دفعہ پھر آپ کو دارالمصنفین میں لانے کی کوشش کی، ۲۱؍رمضان ۱۳۶۴ھ کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"... میں نے زبانی اشارہ بھی کیا اور آپ کا اشارۂ قبول بھی سمجھا کہ آپ ہمارے مہمان ہو جائیں، یعنی دارالمصنفین آکر قیام فرمائیں، جو نذرانہ وہاں ملتا ہے وہی یہاں بھی حاضر رہے گا، سیرت و تالیفات میں میری مدد فرمائیں، فتاوی کا کام کریں اور جو مناسب موضوع نظر آئے تحقیقات کے لئے اور جو علمی کام مشورہ سے طے پائے، ہو سکتا ہے کہ بعض طالب العلم درجۂ تکمیل پڑھیں بھی ..."

والد کی وفات ۱۳۶۵ھ کے آخر میں ایک ڈیڑھ مہینے کی علالت کے بعد آپ کے والد ماجد وفات پاگئے۔ وفات کا اثر علامہ اعظمی کی ذات پر جو پڑا وہ ان کی اس تحریر سے ظاہر ہے:

"از وفات او آنچہ بر من گذشت از حد بیان بیرون است" (ان کی وفات سے مجھ پر جو گذری وہ حد بیان سے باہر ہے)

والد محترم کی وفات کا اندوہناک حادثہ ۲۱؍ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو پیش آیا، آپ نے خود تحریر فرمایا ہے:

"توفی بذات الریة فی الساعة الثانیة نهاراً یوم السبت فی

إحدى وعشرين من ذى الحجة سنة ١٣٦٥ و كان ابن خمس وسبعين او ثلث و سبعين ... "

(یعنی آپ کی وفات ۲۱/ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ بروز سنیچر دو بجے دن میں گردہ کی بیماری میں ہوئی، وفات کے وقت عمر ۷۵ یا ۷۳ سال تھی)

والد کی وفات کے ایک ہفتہ بعد ۲۸/ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو شاگرد عزیز مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی کو یہ خط لکھا:

"ایک ڈیڑھ ماہ سے رشید احمد بھی بیمار ہے اور اسی کے ساتھ سیدی و وسیلۃ یومی وغدی حضرت پدر بزرگوار بھی بیمار ہوئے، عیداضحی کے ایک دن پہلے مسجد آنے جانے لگے اور عید میں بھی گئے، وہ دن عافیت سے گذرا، رات گذرنے نہیں پائی تھی کہ قے دست کے بعد جاڑا بخار شروع ہو گیا، تین چار دن کے بعد نمونیہ ہو گیا، بالآخر ۲۱/ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو پونے دو بجے دن میں ان کا وصال ہو گیا، اس وقت سے میرا جو حال ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے، والد صاحب کی نسبت کچھ لکھنا پدرم سلطان بود کا مصداق ہوگا۔"(۱)

سید سلیمان ندویؒ کو، جو اس وقت بھوپال میں مقیم تھے، جب اس حادثہ کی خبر ملی تو انھوں نے ایک خط میں جو ۳/ دسمبر ۱۹۴۶ کا مؤرخ ہے تعزیتی کلمات لکھنے کے بعد فرمایا:

"اگر کبھی مئو سے ہٹ کر اگر کہیں چندروزہ دل بہلانے کو جی چاہے تو غریب خانہ حاضر ہے۔"

اس حادثہ سے علامہ اعظمی کی زندگی کس حد تک متاثر ہوئی تھی، اس کو جاننے کیلئے ایک خط پڑھئے جسے تقریباً پونے دو سال بعد مفتی ظفیر الدین صاحب کے پاس لکھا ہے، یہ خط ۲۲/ رمضان ۱۳۶۷ھ کو لکھا گیا ہے، فرماتے ہیں:

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔۱۲ ص ۱۴۶

"میں چاہتا ہوں کہ باہر نکلوں، مگر والد صاحب کی وفات اور بھائی کی علحدگی کی وجہ سے گھر کی فکر میں ایسا مبتلا ہوں کہ دو دن کے لئے بھی کہیں جانا مشکل ہو رہا ہے۔"(۱)

مفتاح العلوم کی نظامت | مدرسہ مفتاح العلوم کی نشاۃ ثانیہ سے لے کر دو دہائیوں سے زیادہ تک متواتر آپ صدر المدرسین اور شیخ الحدیث رہے، اور اس اثناء میں مولانا محمد ایوب صاحب نظامت کے فرائض انجام دیتے رہے، ۱۳۶۶ھ میں مولانا ایوب صاحب عہدۂ نظامت سے سبکدوش ہو گئے، لہذا ارباب حل و عقد اور منتظمین نے یہ چاہا کہ علامہ اعظمی ہی اب نظامت کے فرائض بھی انجام دیں، ان کی شخصیت چونکہ خالص علمی، تصنیفی اور تحقیقی تھی، اس لئے اس قسم کے انتظامی امور سے فطرتاً اباء کرتے تھے، ہمیشہ یہی چاہتے اور خواہش کرتے رہے کہ مالیاتی عہدوں اور انتظامی امور میں بنفس نفیس مبتلا نہ ہوں اور خود کو ان سے دور رکھیں، کیونکہ اس بات کا پورا امکان تھا کہ یہ ذمہ داریاں آپ کی علمی اور تصنیفی و تحقیقی زندگی کو متاثر کر دیتیں، لیکن جب ارباب مدرسہ کا اصرار بڑھا تو زیادہ انکار کی گنجائش نہ رہی اور مدرسہ سے تعلق خاطر کی وجہ سے اس بار گراں کو بھی سر پر اٹھانا پڑا۔

اپنی اس ذمہ داری کے بارے میں مولانا ظفیر الدین مفتاحی کو ۲۸/ ذی قعدہ ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۴/ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے ایک خط میں اطلاع دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"آج کل بے حد عدیم الفرصۃ ہوں، ناظم صاحب نے اپنے عہدے سے سبکدوشی حاصل کر لی ہے، عارضی طور پر یہ بار بھی مجھے ہی اٹھانا پڑا، تعمیر کا کام بہت تیزی سے جاری ہے، اس کے ساتھ دورہ (حدیث) کے اسباق کی تعلیم بھی جاری ہے۰۰۰"(۲)

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔ ۱۲ ص ۱۴۶

(۲) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۵۲

نظامت کا عہدہ آپ نے ذی قعدہ ۱۳۶۶ھ میں سنبھالا، اور اس طرح کئی سال تک نظامت، صدارت اور شیخ الحدیث کے منصب پر آپ فائز رہے، اور اس مدت میں درس و تدریس کے ساتھ مدرسہ کی تعمیر و ترقی کا کام بھی پوری سرگرمی سے جاری رہا، مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی تحریر فرماتے ہیں:

"۱۳۶۶ھ میں احباب اور اہل شہر کے اصرار پر آپ کو مفتاح العلوم کی نظامت کا عہدہ بھی قبول کرنا پڑا، اور ۱۳۷۱ھ تک اس عہدہ کے فرائض انجام دیتے رہے، تعمیرات پر اس زمانہ میں خصوصی توجہ دی اور بہت سارے کمرے تعمیر کرادئے۔"(۱)

علامہ اعظمی نے مفتاح العلوم کی تعمیر و ترقی کیلئے اپنے آپ کو کس طرح مٹایا اور جب جب موقع آیا اس کیلئے اپنے جسم و جان کو کیسے کیسے قربان کیا، اور اس کے فروغ و ارتقاء کیلئے اپنی تمام تر قوتوں اور توانائیوں کو کس طرح صرف کیا اس کو اس ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ۵/ ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ م ۶/ فروری ۱۹۴۸ء کو ایک خط میں مفتی ظفیر الدین صاحب کو لکھتے ہیں:

"صبح کو ناشتہ کے بعد مدرسہ جاتا ہوں، ساڑھے بارہ یا ایک ڈیڑھ بجے واپس آتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں، پھر مدرسہ جاتا ہوں تو ساڑھے سات آٹھ بجے شب میں واپس آتا ہوں، بتاؤ "نظام مساجد"(۲) کب دیکھوں۔"(۳)

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔۱۲ ص ۱۴۵

(۲) مفتی ظفیر الدین صاحب کی کتاب کا نام ہے، غالباً ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے، جس پر علامہ اعظمی سے نظر ثانی کرانا چاہتے تھے۔

(۳) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۵۲

امور مدرسہ سے سبکدوشی ۲۲ برس کی طویل مدت تک صدارت تدریس و مشیخت حدیث اور وقتاً فوقتاً نظامت کے فرائض کی انجام دہی کے بعد ۱۳۶۹ھ میں ان تمام گراں باریوں سے سبکدوشی حاصل کرنی چاہی، اور یہ ارادہ کیا کہ یکسوئی اور پوری توجہ اور تندہی کے ساتھ تحقیقی و تصنیفی مہمات میں مشغول ہو جائیں، لکھتے ہیں:

"بالآخر غالباً ۱۳۶۹ھ میں مختلف اسباب کی بنا پر میں نے علیحدگی اختیار کرلی، جس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ میرے پیش نظر بعض بہت اہم تصنیفی خدمتیں تھیں، جن کیلئے کامل یکسوئی درکار تھی۔"(۱)

اسی سال (۱۳۶۹ھ) آپ پہلی دفعہ سعادت حج سے بہرہ مند ہوئے تھے، اور حج پر روانہ ہونے سے قبل ان تمام عہدوں سے سبکدوشی حاصل کرنے کے لئے انتظامی کمیٹی کو اپنا استعفا سپرد کردیا تھا، مگر نظامت سے استعفا انتظامیہ نے منظور نہیں کیا، جس کی وجہ سے دو سال اور آپ مدرسہ کی نظامت فرماتے رہے۔

لیکن اس کنارہ کشی کے بعد بھی مدرسہ مفتاح العلوم ہمہ وقت آپ کا محتاج رہا، اور یہ احتیاج جب بھی بڑھ جاتا تو بغیر کسی پس و پیش کے تدریسی عمل کیلئے آمادہ ہو جاتے، مفتی ظفیر الدین مفتاحی صاحب فرماتے ہیں:

"مفتاح العلوم کی ذمہ داری برابر قبول کرتے رہے، مفتاح العلوم سے علیحدگی کے باوجود جب ضرورت ہوئی بلا معاوضہ اسباق بھی پڑھاتے رہے"(۲)

اس صورت میں کبھی آپ کے پاس صحاح ستہ میں سے کوئی کتاب ہوتی، کبھی حدیث کی کوئی دوسری کتاب، اور کبھی ادب یا کسی اور فن سے متعلق کوئی کتاب اپنے درس میں رکھ لیتے، چنانچہ مفتی ظفیر الدین صاحب کو ۱۱ر ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ کو لکھے گئے ایک مکتوب مین تحریر فرماتے ہیں:

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۵

(۲) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔۱۲ ص ۱۴۵

"چند دنوں سے میں نے حماسہ اور ابن ماجہ پڑھانا شروع کر دیا ہے۔"(۱)

ایک دوسرے مکتوب میں جو ۲۸؍ فروری ۱۹۷۳ء کا نوشتہ ہے فرماتے ہیں:

"میں روزانہ مفتاح العلوم جاتا ہوں، ایک گھنٹہ بخاری پڑھاتا ہوں اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ انتظامات کی دیکھ بھال کرتا ہوں، میں نے بلا معاوضہ یہ بوجھ اٹھالیا ہے، صرف اس لئے کہ طلباء کا نقصان نہ ہو، اور مدرسہ کے ہمدرد لوگ بددل اور مایوس نہ ہوں، لیکن ہر وقت یہ فکر دامنگیر ہے کہ ہر ضروری شعبہ کی ذمہ داری سنبھالنے کیلئے ایک ایک موزوں آدمی مل جائے یا تیار ہو جائے۔"(۲)

مولانا عبداللطیف صاحب مفتاحی ڈائری ۱۳۸۶ھ (ص ۸) میں فرماتے ہیں:

"آپ کا (علامہ اعظمی کا) شمار علم حدیث کے ایک متبحر عالم کی حیثیت سے آج علمی دنیا کی چند مقتدر ہستیوں میں ہوتا ہے، آپ نے ۱۳۴۷ھ سے ۱۳۷۰ھ تک مفتاح العلوم کی صدر مدرسی کے فرائض انجام دئے اور ۱۳۶۶ھ سے ۱۳۷۱ھ تک نظامت کا عہدہ بھی سنبھالا۔ اب اگرچہ آپ نے پڑھنے پڑھانے کا یہ سلسلہ ختم کر دیا ہے، لیکن ایک مربی اور سرپرست کی حیثیت سے مدرسہ کو اب بھی آپ سے پورا فیض پہنچ رہا ہے۔"

یہاں تک کہ ایک زمانہ ایسا آیا جب تحقیقی مشاغل میں مصروفیت حد سے زیادہ بڑھ گئی، اور روزانہ صرف پڑھانے کے واسطے مدرسہ جانا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو گیا تھا، اور دوسری طرف شرف تلمذ اور حصول برکت کیلئے طلبہ کا شوق بھی بڑھا ہوا تھا، تو محلہ کی مسجد میں طلبہ کو بلا کر طحاوی شریف وغیرہ کا درس دیا، مفتاح العلوم اور اس کے طالب علموں کے ساتھ علامہ اعظمی کا حد درجہ شغف و تعلق اور غایت درجہ شفقت تھی کہ انتہائی مصروفیت کے وقت بھی بقدر استطاعت خدمت کرتے رہے، اور طالبان علم حدیث و

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔۱۲ ص ۴۵

(۲) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۸۸

تشنگان علم وفن کی حاجت بر آری فرماتے رہے۔

پہلا سفر حج | شوال ۱۳۶۹ھ م اگست ۱۹۵۰ء میں کسی کام کیلئے آپ بمبئی تشریف لے گئے، بمبئی کے مشہور اردو روزنامہ "جمہوریت" نے ۲۸ر شوال ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۳ر اگست کو یہ خبر شائع کی:

"آج روزنامہ جمہوریت کے دفتر میں ہندوستان کے مشہور عالم دین حضرت علامہ مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی صاحب مد ظلہم تشریف لائے ..."

اس وقت بمبئی کے واقف کاروں اور شناساؤں نے اصرار کیا کہ آپ اس سال فریضۂ حج ادا کرلیں لیکن کچھ طبعی موانع کی وجہ سے برابر پس وپیش میں تھے، بمبئی سے ۱۵ر اگست ۱۹۵۰ء کو مولانا عبدالجبار صاحب مولوی مختار احمد صاحب اور صاحبزادے مولوی رشید احمد صاحب کو ایک مشترکہ خط میں لکھتے ہیں:

"... محمدی سے مولوی یوسف صاحب بنوری بھی حج کیلئے روانہ ہوگئے، اس سال حضرۃ شیخ مولانا حسین احمد صاحب بھی تشریف لے جانے والے ہیں، مولانا قاسم شاہجہاں پوری(۱) ابھی بمبئی میں مقیم ہیں اور ممکن ہے آخری جہاز کی روانگی تک مقیم رہیں، شیخ انجینئر بھی زور دے رہے ہیں کہ تم بھی چلے جاؤ، میں نے ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا، مگر بہر حال دو تین دن میں مجھے کوئی قطعی

(۱) مولانا ابوالقاسم شاہجہاں پوری نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، عوامی تحریکات میں پیش پیش رہا کرتے تھے اپنی پوری زندگی قومی اور ملی خدمات کے لئے وقف کر رکھی تھی، انتہائی جری بہادر اور نڈر تھے، بڑے سے بڑے خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے تھے، ہندستان کی تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ جمعیۃ علمائے اتر پردیش کے ایک عرصہ تک ناظم اعلیٰ رہے، جس کی وجہ سے مستقل لکھنؤ میں سکونت رہا کرتی تھی، آخر عمر میں لکھنؤ کی سکونت ترک کرکے فتح پور اپنی بیٹی کے پاس چلے گئے تھے اور وہیں وفات واقع ہوئی۔ (کاروان رفتہ ص ۱۵)

فیصلہ کر لینا ہے، یہ بات ابھی تم تین شخصوں سے کہہ رہا ہوں، جب علانیہ کہنے کا وقت آجائے گا اس وقت علانیہ بھی کہوں گا، میں ابھی یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس مسئلہ پر غور کرنے کی خبر بھی لوگوں کو دوں …"

اسی طرح ۱۹ر اگست کے ایک خط میں فرماتے ہیں:

"… میں شیخ انجینئر کے یہاں سوتا ہوں، ان کا بھی بے حد اصرار ہے کہ میں بغیر حج کیے واپس نہ جاؤں، آج مولوی عبدالرحیم لکھنوی ملے ان کا بھی اصرار ہے لیکن میں ابھی مذبذب ہوں، سید (۱) سے پوچھ کر لکھو کہ کیا کیا جائے، اگر دل مطمئن ہو تو خیر ورنہ سال آئندہ ان کو بھی حق رفاقت ادا کرنا پڑیگا، مولانا عبدالشکور لکھنوی یکم ستمبر کو ۹ر بجے صبح لکھنؤ سے روانہ ہوں گے، ان کے ساتھ پچاس آدمیوں کا قافلہ ہے، آج شفیق جونپوری بھی حج کو جا رہے ہیں …"

بہر حال کئی روز کے پس و پیش اور غور و فکر کے بعد اس مقدس فریضہ کی ادائگی کیلئے عزم مصمم فرمایا، اور رفاقت کیلئے آپ کے تلمیذ و رفیق مولانا عبدالجبار صاحب نہایت خوشی اور سعادتمندی کے ساتھ تیار ہو گئے، اور وہ بھی اس سفر پر ساتھ روانہ ہوئے، بمبئی سے ہی ۵ر ستمبر کے ایک خط میں اپنے بھائی، صاحبزادوں اور مولوی مختار احمد صاحب کو لکھتے ہیں:

"… آج بفضلہ تعالیٰ کرایہ کا روپیہ جمع ہو گیا دونوں آدمیوں کا، اور پاسپورٹ بھی بن گیا، صرف سید کے سرٹیفکٹوں کی تصدیق باقی ہے، جو انشاء اللہ کل ہو جائے گی اور سعودی ٹیکس بھی کل جمع ہو گا۔ حضرت مولانا لکھنوی پہلے آگئے، مولانا حفظ الرحمٰن سے بھی آج ملاقات ہوئی، وہ صرف دیکھ بھال کیلئے آئے ہیں، اب جہاز ۸ر ستمبر کو بعد نماز جمعہ روانہ ہو گا اور انشاء اللہ قران کا احرام باندھا جائے گا …"

---

(۱) مولانا عبدالجبار صاحب مراد ہیں

علامہ اعظمی کا معمول یہ تھا کہ جب سفر میں ہوتے تو اپنی کیفیت سے باخبر رکھنے کیلئے بہت کم وقفہ سے خط لکھتے، اور گھر کے حالات سے واقف رہنے کیلئے اہل خانہ کو اس بات کی تاکید کرتے کہ جلد جلد وہ خط لکھا کریں، اس طرح کہ ہر دن کی خیر وعافیت علم میں آتی رہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے مکاتیب میں بہت کم مدت کا وقفہ نظر آتا ہے، بمشکل ایک دو یوم کا خلا ہوتا ہے، مثلاً ۵/ ستمبر کے بعد ۷/ ستمبر کو روانگی سے ایک روز پیشتر مذکورہ بالا حضرات کو لکھتے ہیں:

"آج غالباً بمبئی سے یہ آخری خط ہے، اس لئے کہ کل جمعہ کی نماز کے بعد روانگی ہے، آج پاسپورٹ وغیرہ اور خریداری اشیاء سے فراغت ہوگئی، کل حمید زائر حرم سے بھی ملاقات ہوئی وہ بھی جا رہے ہیں، آج معلوم ہوا کہ راجہ سلیم پور و جہانگیر آباد وغیرہ بھی اس جہاز میں ہیں، غرضیکہ اکابر دین و دنیا کے اس ہجوم میں ایک فقیر بے نوا بھی ہے…"

۳/ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۶/ ستمبر ۱۹۵۰ء کو دخانی جہاز سے جب وہ مقام یلملم کے قریب پہونچے تو اپنے صاحبزادوں اور بھائی کے نام لکھا:

"لبيك اللهم لبيك لبيك لا شريك لك لبيك ان الحمد و النعمة لك والملك لا شريك لك . آج شام کے قریب جہاز یلملم کی محاذات میں پہونچے گا، اس وقت ہم احرام کی تیاری میں ہیں، بہت سے لوگوں نے کل ہی سے احرام باندھ رکھا ہے، کل ۸ بجے ان شاء اللہ تعالیٰ ہم جدہ پہونچ جائیں گے، اور جدہ سے یہ خط روانہ کریں گے، پہلے طبیعت کچھ بد مزہ تھی، لیکن اب بحمدہ تعالیٰ بہت اچھی ہے، مسائل کے بیان اور تحقیق میں وقت کٹ رہا ہے، وعظ کے لئے بھی اصرار ہوا مگر میں نے قبول نہیں کیا، علمائے کرام بڑی ہمت افزائی فرمارہے ہیں، بلکہ مسائل میں رجوع کرتے ہیں فالحمد للہ وحدہ، خصوصاً مولانا لکھنوی بہت مہربان ہیں، دل چاہتا ہے کہ خداوند تعالیٰ تم لوگوں کو علم کا شوق عطا فرمائے اور تم لوگوں کو بھی علمائے وقت کا یہی اعتماد و قبول نصیب ہو…"

مکہ پہونچنے کے بعد کئی دن تک اشغال و مصروفیات کی وجہ سے خط لکھنے کی نوبت نہیں آئی، ۷رذی الحجہ بروز سہ شنبہ ذرا سی فرصت ملی تو اس کا فائدہ اٹھایا اور حرم شریف۔ زادہ اللہ حرمۃً وشرفاً۔ میں بیٹھ کر خط یہ لکھا:

"عزیزانم! السلام علیکم۔ جدہ سے ایک خط روانہ ہو چکا ہے، جدہ سے ہم لوگ اسی دن بعد عشاء روانہ ہوگئے، اور مکہ مکرمہ پہونچتے ہی راتوں رات طواف وسعی سے فراغت حاصل کی، اس کے ۱۵رمنٹ کے بعد اذان فجر ہوگئی، ہم لوگوں نے تھوڑی سی سہولت کے لحاظ سے تمتع کیا، آج بعد عشاء ان شاء اللہ منی کو اونٹ کی سواری سے روانگی ہے، سنت تو ۸ کو ہے مگر اس میں بڑی دشواری معلوم ہو رہی ہے اور یہ بھی اندیشہ ہے کہ اس صورت میں دوسری سنت چھوٹ جائے گی، بہر حال اب ۱۳۔ سے پہلے خط لکھنے کی نوبت نہیں آسکتی، الحمد للہ ہم لوگ بخیر ہیں، سید عمر مدنی کے پاس ہیں، سلطان وغیرہ کی قیام گاہ پر ٹھہرے ہیں، مولوی عبداللہ (۱) صاحب رات بھر ہمارے ساتھ جاگتے رہے سڑک پر آدھی رات

(۱) مولانا عبداللہ زمزمی مراد ہیں، والد کا نام غلام محمدؒ تھا، وطن اصلی غالباً لاہور تھا۔ ان کے والد (غلام محمد) صغر سنی ہی میں مکہ پہنچ گئے، مکہ کے کسی شیخ نے ان کو اپنا مولیٰ بنا لیا، بڑے ہو کر انھوں نے وہیں شادی کی جن کی صلب سے مولانا عبداللہ زمزمی جیسا عابد و زاہد اور دانا و فرزانہ بیٹا تولد ہوا، مولانا زمزمی باب ابراہیم کے قریب رباط ابی نمی کے کسی خلوہ میں رہا کرتے تھے، بعد میں یہ رباط منہدم کردی گئی تو شارع المنصور پر منتقل ہوگئے، صاحب علم و فضل ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت عابد و زاہد، متقی و متقشف، پاکباز و شب زندہ دار اور صاف دل، سیر چشم اور فیاض طبع تھے، علماء ہند کے بڑے قدرداں تھے، اور علامہ اعظمی کے تو عاشق زار تھے، ان کے عشق و شیفتگی کیلئے یہی کافی ہے کہ ان کے انتظار میں آدھی رات سڑک پر گذار دی، حج کے اسی سفر میں علامہ اعظمی کی ان سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی تھی، اور اس ملاقات کے بعد آپ کی محبت اور بڑھ گئی، شوال ۱۳۸۶ھ میں جان جان آفریں کے سپرد کی، ان کی نسبت علامہ اعظمی کے تاثرات آگے کہیں نقل کئے جائیں گے۔

تک ہماری راہ دیکھتے رہے، ہدیوں سے ابھی انھوں نے لاد دیا ہے، بار بار ہاتھ چھوتے ہیں، پیر پکڑتے ہیں، سر کا بوسہ دیتے ہیں، الحاصل اللہ کی بڑی عنایات ہیں ... یہ خط مصلی حنفی سے ذرا فاصلہ پر بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ اور اس طرح کہ درمیان میں بار بار کعبہ مشرفہ کی طرف نگاہ اٹھ رہی ہے، ساتھ ہی سید صاحب بھی بیٹھے ہوئے ہیں، خدا یہ دن تم سب کو بھی نصیب فرمائے ..."

علامہ اعظمی کے خطوط کسی سفر نامہ سے کم نہیں ہوتے، اگر صرف ان کے تمام خطوط مرتب کر دیئے جائیں تو ایک اچھا خاصا سفر نامہ تیار ہو جائیگا، خط لکھنے کا ان کو بہت اہتمام تھا، اور چھوٹی چھوٹی چیز بھی وہ خط میں لکھ جاتے تھے۔ ۱۴ر ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ م ۲۶ر ستمبر ۱۹۵۰ء کو مولوی رشید احمد و مولوی مختار احمد صاحب کو لکھتے ہیں:

"آج یہاں ۱۴ر ذی الحجہ اور ۲۶ ستمبر ہے، ہم لوگ ۷ر ذی الحجہ کو بعد عشاء بسواری شغدف منی روانہ ہوئے اور فجر سے پہلے منیٰ پہونچ کر ہم نے فجر کی نماز مسجد خیف میں ادا کی۔ مکہ سے منیٰ کو روانگی آٹھ کو چاہئے تھی مگر اونٹ کی سواری سے آٹھ کو جانا سخت دشوار نیز مخل بالمقصود تھا، اس لئے مذکورہ بالا صورت اختیار کی گئی، منی سے نویں کو آٹھ بجے صبح عرفات روانہ ہوئے، عرفات روانگی سے گھنٹہ بھر پہلے پانی برسا اور بہت اولے گرے، ہم لوگ ایک چھپر کے نیچے چھتری اوڑھے ہوئے تھے، اس وجہ سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہونچا، ہمارے علم میں اس کی وجہ سے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا، عشاء کے قریب وہاں سے موٹر سے مزدلفہ روانہ ہوئے اور یہاں مغرب و عشاء میں جمع کیا، بارش کی وجہ سے سردی ہوگئی تھی اس لئے کمل اوڑھ کر لیٹے، سحر سے بہت پہلے جاگے، پھر غلس میں نماز فجر پڑھی لیکن طلوع سے پہلے روانگی ممکن نہ ہوئی۔ مجبورا دن نکلنے کے بعد موٹر سے منیٰ آئے اور رمی کے بعد اپنا اپنا دم تمتع دیا اور اپنے اپنے والد کی جانب سے قربانی کی، گیارہ ذی الحجہ کو موٹر سے مکہ آئے اور طواف زیارت سے

سبکدوشی حاصل کی اور ظہر کی نماز حرم میں پڑھ کر پھر منیٰ چلے گئے، اس کے بعد ۱۲/ ذی الحجہ کو بعد مغرب وہاں سے مکہ واپس ہوئے، کل یعنی ۱۳/ کو کچھ زکامی شکایت ہو گئی، سر میں گرانی تھی اس لئے خط لکھنے پر طبیعت آمادہ نہ تھی ....
مولوی عبداللہ صاحب زمزمی حد سے زیادہ محبت فرماتے ہیں ...“

مکہ مکرمہ سے ایک اور خط میں ۲۲/ ذی الحجہ مطابق ۴/ اکتوبر چہار شنبہ کے روز مولانا رشید احمد صاحب کو لکھتے ہیں:

”... نئی بات یہ ہے کہ مئو سے جو لوگ پہلے آئے ہیں سرکاری اعلان میں ان کی روانگی مدینہ کی تاریخ ۵ محرم ہے، میں کوشش کر رہا ہوں کہ انھیں کے ساتھ مجھ کو بھی اجازت ہو جائے بلکہ یہ بھی کوشش کر رہا ہوں کہ ان سے پہلے ہی ہو جائے، کوشش (کے بعد) جو نتیجہ بر آمد ہو گا فوراً مطلع کروں گا، مجھ کو تو آج ہی موقع مل گیا تھا مگر وہ اجازت تنہا میرے لئے ہوتی اس لئے سید کے خیال سے میں نے مسترد کر دیا، اس سال مصر جانے کا خیال اب نہیں ہے، اب حجاج بہت سے نکل گئے، رات کو بڑے اطمئنان سے طواف و استلام، دعاء عند الملتزم، صلاۃ تحت المیزاب کا موقع مل جاتا ہے ...“

اس خط کے بعد کا کوئی خط یا اس سفر سے متعلق تفصیل ہمیں دستیاب نہیں ہو سکی، جبکہ اس کے بعد تقریباً ایک مہینہ تک مسلسل سفر جاری رہا، کیونکہ پاسپورٹ پر بمبئی پہنچنے کی جو تاریخ درج ہے وہ ۳/ نومبر ۱۹۵۰ء ہے، یعنی یہ مدت سفر لگ بھگ دو مہینے رہی۔

علامہ اعظمیؒ کے خطوط میں متعدد ایسے حضرات کے نام آپ پڑھ چکے ہیں جو اس سال سفر حج پر روانہ ہوئے۔ ۱۲/ ستمبر ۱۹۵۰ء مطابق ۲۶/ ذی قعدہ ۱۳۶۹ھ کے اخبار ”الجمعیۃ“ میں ”افکار و مطالعات“ کے کالم میں ”علماء ہند کا سفر حج“ کے عنوان سے بعض اہل علم کے نام شائع ہوئے جو اس سال اس سعادت بیش بہا سے مشرف ہوئے، اور ان کے نام کے بعد ان کا مختصر تعارف درج ہے، اس فہرست میں جو نام سب سے پہلا اور سر فہرست

ہے، اس کا عنوان ہے "مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی" اور اس کے ذیل میں تحریر ہے:

"حضرت مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی موجودہ دور میں علماء سلف کی زندہ یادگار ہیں، سینہ علوم وفنون کا سمندر ہے، اور چہرہ مہرہ اسلامی اخلاق کا نمونہ یا علم وفضل کے اعتبار سے اپنی مثال آپ، علم وفضل کے مالک ہیں اور ہر علم میں کمال حاصل ہے،

مدرسہ مفتاح العلوم مئو اعظم گڈھ کے شیخ الحدیث ہیں، دارالعلوم دیوبند کے مرکزی دارالافتاء میں جہاں ہر سال پچیس ہزار فتاوی کا جواب دیا جاتا ہے، حضرت مولانائے محترم کی فقہی رائے خاص طور پر مستند اور معتبر سمجھی جاتی ہے۔

مولانا ایک درجن سے زائد تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں حنفی قانون واحکام کی تائید کی گئی ہے، طحاوی شریف کی عربی شرح (۱) الحاوی کے نام سے ایک جلیل القدر کتاب لکھی ہے، اس کتاب کی بنا پر مولانا بین الاسلامی علمی حلقوں میں مستند تسلیم کیے جاتے ہیں، مصر، شام اور حجاز کے علماء کے حلقوں میں آپ کی خاص قدر کی جاتی ہے•••

حضرت مولانا محمدی جہاز سے حجاز تشریف لے گئے ہیں، امید ہے کہ حجاز کے علمی حلقے مولانائے محترم کو صمیم قلب سے خوش آمدید کہیں گے۔"

علامہ اعظمیؒ اور امام اہلسنت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کے علاوہ اس سال جن اہل علم کے حج پر جانے کا "الجمعیۃ" کے اس شمارے میں ذکر ہے، ان میں قابل ذکر مولانا عبدالحق صاحب مدنی (۲) اور مولانا فخرالدین احمد صاحب شیخ الحدیث مدرسہ شاہی

(۱) "الحاوی" طحاوی شریف کی شرح نہیں ہے، بلکہ طحاوی کے رجال ورواۃ اور ان کے حالات پر مشتمل ہے۔

(۲) مولانا عبدالحق صاحب مدنیؒ کا شمار جلیل القدر اور ممتاز اہل علم میں ہوتا تھا، آبائی وطن دیوبند تھا، والد فوجی سرجن تھے اور ترکی حکومت کی طرف سے مدینہ میں مقرر تھے، مدینہ منورہ ہی میں آپ کی پیدائش اور حرم نبوی میں تعلیم ہوئی، اس وقت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ مسجد نبوی =

مراد آباد ہیں، آخرالذکر کی نسبت علامہ اعظمی نے خود اپنی بیاض میں لکھا ہے: "بار اول کہ حج کردیم ماواودر باخرہ ہم سفر بودیم" (جب میں نے پہلی دفعہ حج کیا تو دخانی کشتی میں میرا اور ان کا ساتھ تھا)

علامہ قاسم بن قطلوبغا کے استدراک کی تحقیق واشاعت

حافظ ابن حجرؒ (متوفی ۸۵۲ھ) نے ہدایہ کی احادیث کی تخریج "الدراية" کے نام سے کی تھی، لیکن اس کے اندران سے بہت سی احادیث کی تخریج رہ گئی تھی جوان کو مل نہیں سکی تھیں، علامہ حافظ قاسم ابن قطلوبغا (متوفی ۸۷۹ھ) نے ان احادیث کو دریافت کیا اور ان کو درایہ کے حاشیہ پر تحریر فرمایا، خوش قسمتی سے علامہ اعظمی کو وہ اصل نسخہ ہاتھ آگیا جس پر علامہ قاسم بن قطلوبغا نے حافظ ابن حجرؒ کا استدراک کیا تھا، علامہ اعظمیؒ نے ان استدراکات کو نقل کر کے اپنی تعلیقات کے ساتھ مزین کیا اور اس کو علامہ زاہد کوثری کے پاس مصر بھیج دیا، جو "منية الألمعي فيما فات الزيلعي" کے ساتھ ۱۳۶۹ھ م ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا، علامہ اعظمی کے اس کام کی اتنی اہمیت تھی کہ علامہ زاہد کوثری نے منية الالمعي کے مقدمہ میں اس کا نہایت بلند آہنگ الفاظ میں ذکر کیا، اور تشکر آمیز انداز میں اس کو سراہا۔

= میں درس حدیث کی مسند سجائے ہوئے تھے، اسی زمانہ میں مولانا عبدالحق مدنی نے بھی ان سے کسب فیض کیا اور ان کے ممتاز تلامذہ میں شمار ہوئے، مولانا نے مختلف مدرسوں میں کام کیا اور مختلف ملکوں میں تدریسی خدمات انجام دیں، چنانچہ وہ مدینہ سے سفر کر کے ہندوستان آئے اور کراچی میں مسند درس بچھائی، اس کے بعد مدرسہ امدادیہ مراد آباد میں شیخ الحدیث بنائے گئے، پھر اس سے قطع تعلق کر کے مدرسہ قاسمیہ شاہی مراد آباد کا عہدۂ اہتمام سنبھالا، اور اس کی تعمیر و ترقی کیلئے انتھک کوشش کر کے پورے ملک میں اس کو روشناس کرایا، ۱۳۷۳ھ مطابق (۱۹۵۴ء) میں دیوبند میں وفات پائی، اور وہیں مزار قاسمی میں مدفون ہوئے۔ (مولانا محمد قاسم نانوتوی حاشیہ ص ۱۵۴-۱۵۳) علامہ اعظمی نے ان کا ذکر اپنے مضمون (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر، ص ۱۴۹) میں کیا ہے اور ان کو "ممتاز عالم، ادیب اور مفسر" لکھا ہے۔

اسمبلی کی رکنیت علامہ اعظمی اگرچہ خالص علمی آدمی تھے، بھیڑ بھاڑ، شور وغل اور ازدحام کی جگہوں سے وہ فطرتاً گریز اور اباء کرتے تھے، یکسوئی کیساتھ کنج تنہائی میں بیٹھ کر لکھنا پڑھنا اور علم دین کی خدمت کرنا آپ کا بہترین مشغلہ اور محبوب عمل تھا، اسی میں آپ کو ہر چیز سے زیادہ راحت اور دل و دماغ کو سکون حاصل ہوتا تھا، بقول حافظ شیراز ع

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

اس کے باوجود سیاسی مسائل سے بالکلیہ لاتعلقی اور چشم پوشی نہیں برت سکتے تھے، یہ سچ ہے کہ سیاست سے کوئی خاص سروکار نہیں تھا، اور انھوں نے اپنے دامن کو سرگرم سیاست سے ہمیشہ بچائے رکھا، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ سیاسی معاملات اور ملکی حالات کو یکسر نظرانداز کرتے رہے ہوں، بلکہ وہ بے پناہ سیاسی بصیرت کے حامل تھے اور گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر بھی نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام اور عالم انسانیت میں پیش آنے والے واقعات پر گہری نظر رکھتے تھے، مولانا علی میاں ندوی مدظلہ اپنے تعزیتی مکتوب میں فرماتے ہیں:

> "اس علمی تفرد و امتیاز کے علاوہ مولانا کے اخلاق، فہم و فراست، ملت کے مسائل سے واقفیت و فکر مزید برآں ہے، اس لئے نہ صرف علمی حلقہ میں ایک عظیم خلا پیدا ہوا ہے، بلکہ ملت کی صف قیادت میں بھی ایک بڑی جگہ خالی ہوگئی ہے، جس کا پر ہونا بظاہر اسباب بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔"(۱)

آزادی سے پہلے برطانوی سامراج کے زمانے میں انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی میں بھی شریک رہے، اور وقت پڑنے پر محفل درس سے باہر آکر رزمگاہ آزادی میں حصہ لیا، اپنی اس سرگرمی کی نسبت ایک جگہ خود لکھا ہے:

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔۱۲ ص ۲۰

"جنگ آزادی میں تقریر و تحریر کے ذریعہ حصہ لیا۔ اور اپنے شاگردوں کو جیل بھجوا کر ان کے بال بچوں کی کفالت کی۔"

۱۹۴۷ء میں ملک انگریزوں کے پنجۂ اقتدار سے آزاد ہوا، اس کے بعد مسلمانوں پر جو گذری وہ ایک دردناک داستان ہے، جس کو بیان کرنے کی یہاں حاجت نہیں، آزادی وطن کے تقریباً ساڑھے چار سال بعد فروری ۱۹۵۲ء (غالباً ۱۳۷۱ھ) میں آزاد ہندوستان کا پہلا عام انتخاب (General Election) ہوا، اس وقت ملک کے اکابر اہل علم انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ تھے۔ مئو کے حلقۂ انتخاب میں دو ہی پارٹیاں سرگرم تھیں، ایک کانگریس دوسرے کمیونسٹ، بلکہ ایک تیسری پارٹی ہندو مہاسبھا بھی میدان میں تھی، صورت حال کچھ ایسی نازک تھی کہ کانگریس کا پلڑا ان میں سب سے کمزور نظر آرہا تھا، اور کمیونسٹ امیدوار کے جیتنے کے امکانات زیادہ واضح نظر آرہے تھے، اس صورت میں کمیونسٹوں اور کمیونزم کی جڑیں نہ صرف مئو بلکہ اس کے اطراف میں بھی کافی مضبوط ہو جاتیں، جو فی الواقع ایک تشویشناک اور فکر انگیز کیفیت ہو سکتی تھی، آزادی کے بعد یہ پہلا عام انتخاب تھا اور جو طاقت فتح حاصل کرتی اس کی قوت میں اضافہ ہوتا اور اس کے گہرے اثرات پڑتے، ان وجوہ سے ارباب بصیرت و سربراہان ملت ایک قسم کے مخمصہ کی کیفیت سے دوچار تھے، سربرآوردہ لیڈروں میں کوئی شخصیت ایسی جاذب نہ تھی، جسے قبول عام حاصل ہو اور جو صرف اپنے شخصی اور انفرادی مقام و مرتبہ کے سبب کانگریس کی فتح اور فریق مخالف کی شکست کا باعث بن سکے، بصورت دیگر مئو کا حلقہ انتخاب ہمیشہ کیلئے کمیونسٹ یا ہندو مہاسبھا کا مرکز و مستقر بن جاتا۔

یہ تشویشناک حالات علامہ اعظمی کیلئے بھی کچھ کم فکر انگیز نہ رہے ہوں گے، اس پوری صورتحال کے پیش نظر ان کی یا دوسرے لوگوں کی نگاہ مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی کی طرف اٹھتی تھی، اس موقع پر علامہ اعظمی نے اپنے اثرات کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کیا، اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے پاس، جو اس وقت کانگریس کے سرکردہ

لیڈروں اور مسلمانوں کے مؤقر رہنماؤں میں تھے، ۲۳/ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو ایک خط اس بابت لکھا کہ آئندہ ہونے والے جنرل الیکشن کیلئے مولانا عبداللطیف نعمانی کو ٹکٹ دیدیا جائے، وہ خط بعینہٖ ملاحظہ ہو:

"مئو۔۔۔اعظم گڈھ

۲۳/اکتوبر ۱۹۵۱ء

محترم جناب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

غالباً جناب کو معلوم ہوگا کہ مئو کے حلقہ سے مولوی عبداللطیف صاحب نے کانگریس کے ٹکٹ کے لئے درخواست دی ہے، اس حلقہ سے اور بھی درخواستیں ہوں گی، لیکن مجھ کو امید ہے کہ آپ مولوی عبداللطیف صاحب کی درخواست پر خاص توجہ مبذول فرمائیں گے، اور اس باب میں امکانی کوشش سے دریغ نہیں کریں گے، درخواستیں اب مرکز میں پہونچ چکی ہوں گی، اس لئے اس موقع پر یاددہانی مناسب معلوم ہوئی،

والسلام

حبیب الرحمٰن الاعظمی

۲۰/ محرم ۱۳۷۱ھ"

علامہ اعظمی نے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے پاس یہ خط لکھا اور یہ سوچا بھی نہیں کہ ع

زمانہ چال قیامت کی چل گیا

یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ دلی کے سیاسی پنڈت حلقۂ مئو کی ناؤ کو پار لگانے کیلئے ان کے اپنے نام کی مالا جپ رہے ہیں، وہاں جو کچھ فیصلہ ہوا وہ خود ان کے اور

دوسروں کیلئے غیر متوقع اور متحیر کن تھا، کانگریس کے ٹکٹ کے اس وقت جتنے امیدوار تھے، سب کی جیت کانگریس ہائی کمان کو موہوم سی نظر آرہی تھی، اور جو نام پارٹی کیلئے تقریباً یقینی جیت کا ضامن بن سکتا اس کا سیاست سے کوئی عملاً تعلق ہی نہیں تھا، بہرحال کانگریس کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے پارٹی کے ٹکٹ کے لئے علامہ اعظمی کے نام کا انتخاب کیا، اور کانگریس کے اعلیٰ عہدیداروں نے علامہ اعظمی کو آمادہ کرنے کے لئے الگو رائے شاستری کو بطور خاص مئو بھیجا، ہرچند کہ آپ اس نامزدگی سے مسلسل انکار اور اس سے بیزاری کا اظہار کرتے رہے، لیکن آپ کی ایک نہ چلی اور بجبر واکراہ آپ کے نام سے پرچہ داخل کردیا گیا۔

یہ بات بطور خاص قابل ذکر ہے کہ پوری انتخابی مہم کے دوران علامہ اعظمی نے الیکشن سے متعلق کسی بھی معاملے میں کوئی حصہ نہیں لیا، نہ جلوسوں اور جلسہ گاہوں میں گئے، نہ تقریروں اور اسپیچوں میں شرکت کی اور نہ ہی کنویسنگ (Canvassing) کی غرض سے کسی کے دروازے یا گھر پہ گئے، گھر کے ایک کونے میں بیٹھے پوری خاموشی سے اس تماشائے رستاخیز کو دیکھتے رہے، چونکہ آپ سیاسی آدمی تھے نہ سیاست آپ کا میدان، قومی مفاد اور ملی ہمدردی کے جذبوں کے تحت گاہے ماہے جمعیۃ علماء ہند وغیرہ کے جلسوں میں شریک ہو جایا کرتے تھے لیکن طبعی اور عملی طور پر وہ سیاست سے دور، کوسوں دور تھے۔ سیاست سے دوری اور خالص علمی طبیعت، انتخابی مہم سے یکسر لا تعلق کئے ہوئے تھی، اور لوگوں کے ہزار اصرار کے باوجود کسی قسم کی بھی شرکت کے لئے وہ خود کو آمادہ نہ کرسکے، اس موقع کی پوری تفصیل علامہ اعظمی نے اپنے شاگرد مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی کو ۲۱؍ فروری ۱۹۵۲ء کے ایک خط میں یوں لکھی:

"عزیزم سلمہ اللہ!

سلام مسنون۔ بحمدہ تعالیٰ بخیریت ہوں، اس دفعہ جواب میں تاخیر

قصد اً ہوئی۔ دو ماہ سے سخت الجھن میں تھا، حادثہ یہ پیش آیا کہ میرے طلب یا خواہش بلکہ وہم و گمان کے بغیر مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے مجھے کانگریس کی طرف سے اسمبلی کا امیدوار نامزد کر دیا، اور میری ہر طرح کی بیزاری وکنارہ کشی کے باوجود امیدوار رہنا پڑا اور ہر چند کہ میں اس کام کے لئے نہ ایک قدم چلا، نہ کسی سے اس کیلئے ایک لفظ کہا، پھر بھی زبردستی کانگریسی امیدوار کی حیثیت سے نو دوسرے امیدواروں کے مقابلہ میں کھڑا رکھا گیا، پرسوں خدا خدا کر کے ••• ۶ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے میری کامیابی کی خبر مجھ کو سنائی گئی، اس بات کی خوشی تو ضرور ہے کہ ناکامی کی رسوائی سے اللہ تعالیٰ نے بچالیا، لیکن ممبری کا سودا نہ پہلے تھا، نہ اس کامیابی کے بعد ہی اس سے کوئی انس ہے، خدا ہی کو بہتر معلوم ہے کہ آگے کیا ہوگا، انتظار تھا کہ نتیجہ معلوم ہو جائے تو پورا قصہ ایک دفعہ سنا دیا جائے، میں نے اس سلسلہ میں پہلی بار آج صرف تین جگہ دوستوں کو خط لکھا ہے، سید صاحب کو باوجودیکہ ادھر میں نے دو خط لکھے، لیکن واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوئی (۱)، باوجودیکہ پوری داستان معلوم ہونے کے بعد میرا کوئی عمل دخل اس کاروبار میں ثابت نہیں ہوتا، پھر بھی میں اس چیز کے فکر سے شرمندگی محسوس کرتا ہوں، والسلام

حبیب الرحمٰن الاعظمی"

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کی رکنیت

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کی

(۱) علامہ سید سلیمان ندویؒ کو جب علامہ اعظمی کی یوپی اسمبلی کی رکنیت کی اطلاع ملی تو انھوں نے ۱۱ر فروری ۱۹۵۳ء کو کراچی سے تبریک و تہنیت کے ایک خط میں لکھا: "••• سب سے پہلے تو آپ کو دعائے ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة کی مقبولیت پر مبارکباد دینی ہے کہ ماشاءاللہ حج و زیارت سے بھی فراغت ملی اور یوپی اسمبلی کی رکنیت سے بھی سرفرازی ہوئی، [illegible] [illegible] •••"

رکنیت ایک اہم منصب اور قابل قدر اعزاز تھا، اب سے پہلے یہ اعزاز اسی کو بخشا جاتا تھا جو دور اندیشی، فراست و بصیرت اور اصابت رائے کے علاوہ علم و عمل کے لحاظ سے بھی امتیاز و تفوق کا حامل ہوتا تھا، دارالعلوم کا نظام شروع سے ہی شورائی رہا ہے، جس کے اصول قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور دیگر بانیان دارالعلوم نے وضع کئے تھے، اور جس کی رکنیت کا شرف ہر دور میں اکابر علماء ہند کو حاصل رہا ہے۔ ۱۳۷۱ھ (۱) میں علامہ اعظمیؒ کا بھی اس منصب کیلئے انتخاب عمل میں آیا، اور تادم واپسین یہ رکنیت بر قرار رہی۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ کے لئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی کوشش

کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کا شمار علوم عربیہ اور اسلامی علوم وفنون کی تعلیم دینے والے ملک کے نہایت اہم اداروں میں ہوتا ہے، یہ ادارہ ایک جامعہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور گذشتہ زمانے میں اس میں تدریس اور اس کی لیکچرر شپ اہم اعزاز سمجھا جاتا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ ملک کی بعض گرانقدر اور مؤقر علمی شخصیتیں اس میں تدریس و تعلیم کی خدمت انجام دے چکی ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں وہاں پروفیسر حدیث و تفسیر (ہیڈ مولانا) کی ایک جگہ خالی ہوئی اس وقت مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۲) اس مدرسہ کے پرنسپل تھے، اس خالی شدہ جگہ

(۱) علامہ اعظمیؒ نے اپنے کاغذات میں کہیں کہیں زندگی کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے، چنانچہ ایک کاغذ پر دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کی رکنیت کا سال آپ نے ۱۳۷۱ھ لکھا ہے، لیکن تاریخ دارالعلوم دیوبند (۱۲۶/۲) میں ۱۳۷۳ھ مذکور ہے۔

(۲) مولانا سعید احمد اکبر آبادی تقریباً ۱۳۲۵ھ م ۱۹۰۷ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے، آبائی وطن بچھرایوں ضلع مراد آباد تھا، لیکن پیدائش اور نشو ونما آگرہ میں ہوئی اس لئے اکبر آبادی کی نسبت سے مشہور ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، بعد ازاں مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل ہوگئے، آخر میں دارالعلوم دیوبند سے سند فراغ حاصل کی، فراغت کے بعد اورینٹل کالج لاہور سے =

کا اشتہار ملک کے اہم اردو اور انگریزی اخباروں میں شائع ہوا، لیکن مولانا اکبر آبادی اس سے واقف تھے کہ کون سی شخصیت اس جگہ کی زینت اور قدر و منزلت میں اضافہ کا سبب بن سکتی ہے، چنانچہ انھوں نے اس کے لئے علامہ اعظمی کے پاس ۲۱/ مئی ۱۹۵۲ء کو ایک خط لکھا، جس کا کچھ حصہ حسب ذیل ہے:

> "اب ضروری بات یہ ہے کہ مدرسۂ عالیہ میں پروفیسر حدیث و تفسیر یعنی ہیڈ مولانا کی جگہ جس پر مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی کام کر رہے تھے، خالی ہوئی ہے دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا جناب والا اس کو قبول فرما سکتے ہیں؟ اگر ایسا ہو سکے تو میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی اور بات نہیں ہو سکتی! اگر آپ اس کو قبول فرمانے پر آمادہ ہوں تو پھر یہ تحریر فرمائیں کہ اس سلسلہ میں آپ کی طرف سے

= مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا، اس کے بعد درس و تدریس کا آغاز کیا اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرس مقرر ہوئے، دو سال کے بعد دہلی چلے گئے اور مدرسہ عالیہ فتحپوری میں السنۂ شرقیہ کے استاذ مقرر ہوئے، اسی زمانہ میں دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج سے ایم اے کیا اور پھر اسی کالج میں لیکچرار ہو گئے ۱۳۶۸ھ م ۱۹۴۸ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل منتخب ہوئے، ۱۳۷۸ھ م ۱۹۵۸ء میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات (فیکلٹی آف تھیالوجی) کے ڈین مقرر ہوئے، دارالعلوم دیوبند سے ان کا بڑا گہرا تعلق تھا، جس کی مجلس شوریٰ کے وہ ممبر بھی تھے، ۱۴۰۲ھ میں جب دارالعلوم میں شیخ الہند اکیڈمی قائم ہوئی تو وہ اس کے صدر منتخب ہوئے، اس کے علاوہ ۱۳۵۷ھ م ۱۹۳۸ء سے ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہونے والے بلند پایہ علمی ماہنامہ "برہان" کے تادم مرگ مدیر رہے، علی گڈھ کے زمانۂ قیام میں کناڈا کی شہرۂ آفاق میک گل یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بھی جا چکے تھے، اور دنیا کے بہت سارے ممالک کے دورے بھی کئے، مولانا بڑے صاحب علم و فضل اور باکمال شخص تھے، تصنیف و تالیف اور بحث و تحقیق میں ان کو ملکہ حاصل تھا، انھوں نے کئی ایک بلند پایہ اور محققانہ کتابیں تصنیف فرمائیں، جو بحث و تحقیق کا شاہکار ہیں، علامہ اعظمی کے علم و فضل کے بڑے قائل تھے، ان کے علم و تحقیق پر اعتماد کرتے تھے اور مشکل مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے، علاج و معالجہ کی غرض سے پاکستان گئے ہوئے تھے کہ وہیں ۴/ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۵ء کو سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

شرائط کیا ہوں گی! اور آپ کے ایم ایل اے ہونے کا کیا ہوگا، ایک سرکاری افسر تو ایم ایل اے نہیں ہوسکتا۔

کلکتہ میں آپ کو اپنے علمی مشاغل میں یکسوئی کے ساتھ مصروف رہنے کا کافی موقع ملے گا۔

امید ہے کہ جواب باصواب سے جلد مطلع فرمائیں گے۔"

مولانا اکبر آبادی کا یہ خط پرنسپل کلکتہ مدرسہ کے لیٹر پیڈ پر دہلی سے لکھا گیا ہے، اس خط کے پانے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے غالباً گریڈ اور اس سے حاصل شدہ سہولیات کی نسبت دریافت فرمایا ہوگا، تو اس کے جواب میں مولانا اکبر آبادیؒ نے ایک دوسرا خط ۱۷ جون ۱۹۵۲ء کو مراد آباد سے لکھا، جس میں درج ذیل تفصیلات تحریر فرمائیں:

"اس پوسٹ کا اعلان گورنمنٹ مغربی بنگال کی طرف سے انگریزی اور اردو کے اخبارات میں حال ہی میں ہو چکا ہے، الجمعیۃ، مدینہ اور قومی آواز میں غالباً آپ کی نظر سے بھی گذرا ہو، اب آپ کے مستفسرہ امور کی نسبت عرض کرتا ہوں۔

۱۔ گریڈ اگرچہ ڈھائی سو سے شروع ہوتا اور سات سو پچاس تک جاتا ہے، لیکن آپ جیسے حضرات کو خاص گریڈ بھی دیا جاسکتا ہے، یعنی آغاز میں تین سو یا ساڑھے تین سو سے ہوسکتا ہے، مہنگائی وغیرہ الاؤنس مل کر ۴۵۰ روپیہ کے قریب پڑیں گے۔

۲۔ بہتر یہ ہے کہ آپ معاملہ ... تین سال کیلئے یا پانچ سال کیلئے اس میں آپ کو سہولت ہے ورنہ اگر آپ چاہیں تو معاملہ باقاعدہ بھی ہوسکتا ہے۔

۳۔ یہ جگہ پروفیسر حدیث و تفسیر کی ہے، گزیٹیڈ آفیسر کی پوسٹ ہے، آپ ہیڈ مولوی بھی ہوں گے یعنی صدر الاساتذہ۔ کلکتہ مدرسہ کے دو شعبے ہیں ایک ہائی اسکول، اور دوسرا عربی ڈیپارٹمنٹ، ہائی اسکول کا ہیڈ، ہیڈ ماسٹر ہوتا ہے اور

عربی ڈیپارٹمنٹ جو کالج کی حیثیت رکھتا ہے اس کا ہیڈ ہیڈ مولوی ہوتا ہے اور پرنسپل ان دونوں کا افسر اعلیٰ ہوتا ہے، ہیڈ مولوی بالفاظ دیگر وائس پرنسپل بھی ہوتا ہے۔"

پھر دو اور جزئیات لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ یہ پوسٹ آپ کے مذاق کے مطابق ہو گی، مدرسہ عالیہ کلکتہ ایک تاریخی ادارہ ہے اور اس کا مستقبل بہت شاندار ہے، اگر مدرسہ آپ کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو مدرسہ کی خوش قسمتی ہو گی اور آپ بھی بے کیف نہیں ہوں گے۔ اوقات مدرسہ کے بعد آپ کو تحقیق و مطالعہ کیلئے کافی موقع ملے گا۔ اگر آپ اس کے لئے آمادہ ہوں تو ازراہ کرم "مسٹر اے پی۔ نیوگی ڈپٹی سکریٹری وزارت تعلیم "گورنمنٹ مغربی بنگال، کلکتہ کے نام فوراً درخواست بھیج دیجئے، رسمی طور پر ایسا کرنا ضروری ہے، باقی معاملات تو میں خود دیکھ لوں گا۔"

بعض اور خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طرف علامہ اعظمی کا کچھ رجحان تھا، لیکن اس کے باوجود آپ نے اس پیشکش کو قبول نہیں کیا، جس کے بعد ۱۳ر مئی ۱۹۵۵ء کو مولانا اکبر آبادی نے ایک خط میں لکھا: "محض یہی جذبہ تھا جس کی وجہ سے میں ڈرتے ڈرتے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا ورنہ میں جانتا تھا کہ آپ کا اس کو قبول کرنا آسان نہیں ہے۔"

دوسرا سفر حج | یہ سفر دو سال بعد ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۲ء میں ہوا، اس میں بھی مولانا عبدالجبار صاحب ہمراہ تھے، کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا ہے:

"احقر نے پہلا حج ۱۳۶۹ھ میں، اور دوسرا ۱۳۷۱ھ میں کیا، ان دونوں سفروں میں مولوی عبدالجبار سلمہ ساتھ تھے۔"

اس سفر میں بمبئی پہنچنے سے ایک روز پہلے ۱۰ر اگست بروز یکشنبہ اخبار جمہوریت میں اس سال پھر یہ خبر شائع ہوئی۔

"اسلامی ہند کے جلیل القدر عالم اور محدث حضرت مولانا الحاج مفتی حبیب الرحمٰن صاحب ایم ایل اے (مئو اعظم گڈھ) ۱۰ر اگست بروز اتوار بمبئی تشریف لا رہے ہیں، آپ مغل سرائے بمبئی ایکسپریس (الہ آباد ایکسپریس) سے

۴ر بجے صبح بمبئی پہونچیں گے اور جناب محترم اے اے شیخ انجینئر کے مکان ڈنکن روڈ پر قیام فرماہوں گے۔ مولانا موصوف اس دور کے صف اول کے علماء میں شمار ہوتے ہیں اور اسلامی فقہ کے رموز واسرار پر خاص دستگاہ رکھتے ہیں۔"

اس سفر کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی روداد ایک روزنامچہ کی صورت میں آپ نے قلمبند کی ہے، اگرچہ اس میں روانگی سے لے کر ارکان ومناسک کی ادائگی تک تمام تفصیل آگئی ہے، مگر پھر بھی یہ نامکمل ہے، باوجودیکہ یہ داستان بہت طویل ہے، لیکن کافی دلچسپ ہے، اس لئے پورا روزنامچہ انھیں کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں:

"۱۷۔ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ مطابق ۹ر اگست ۱۹۵۲ء کو مولوی عبدالجبار صاحب مئوی کو ساتھ لے کر ۱۱ر بجے رات کو گھر سے بلا اطلاع نکلا اور رات کے ڈھائی بجے کی ٹرین سے بنارس اور بنارس سے ۶ر بجے صبح کو مغل سرائے اور وہاں سے ۹ر بجے بمبئی میل پر سوار ہو کر بمبئی روانہ ہوا، اور ۱۱ر اگست (مطابق ۱۹ر ذی قعدہ) کو ۲ بجے دن میں بمبئی پہونچا۔ اسٹیشن سے سیدھا اپنے مخلص کرم فرما جناب شیخ سعید صاحب انجینئر کے مکان پر پہونچا اور ۲۲ر ذی قعدہ تک ہم دونوں وہیں مقیم رہے، انجینئر صاحب کے یہاں پہونچ کر کھانا کھایا اور کچھ دیر ستائے اس کے بعد مئو کے حجاج سے ملنے کیلئے مسافر خانہ آئے، دوسرے دن ٹکٹ لینے پھر مسافر خانہ جانا ہوا، چیچک اور کالرا کے انجکشن کے سرٹیفکٹ حاصل کئے بغیر چونکہ ٹکٹ نہیں ملتا، اس لئے ہم نے دونوں سرٹیفکٹ مئو سے لے لئے تھے، مگر چیچک کا نشان بمبئی کے ڈاکٹر کو مشکوک معلوم ہوا اس لئے اس نے دوبارہ ٹیکہ لگایا، اور سرٹیفکٹ پر تصدیق کرکے سرٹیفکٹ دیدیا۔ اب ۳ر سال سے حجاج کو اپنے پاسپورٹ پر اپنا فوٹو چسپاں کرنا حکومت کی طرف سے لازم قرار دیا گیا ہے، اس کے بغیر پاسپورٹ نہیں مل سکتا اسلئے مجبوراً فوٹو بھی کھنچوالیا اس کے بعد پاسپورٹ ملنے میں کوئی دشواری بھی نہیں، چنانچہ وہ بآسانی مل گیا، ہاں مئو کے بعض حجاج کا

پاسپورٹ حاصل کرنے میں بڑی زحمت پیش آئی، اس لئے کہ ان کے پاس چیچک کے ٹیکہ اور کالرا کے انجکشن لینے کے سرٹیفکٹ نہیں تھے اور قانون کے مطابق کالرا کے دوانجکشن اس طرح لینے چاہئیں کہ ایک ہفتہ کے بعد دوسرا لیا جائے اور اس کو بھی ایک ہفتہ ہو جائے تب جہاز پر سوار ہونے کی اجازت ہوگی، ایسا کرنے سے وہ حاجی صاحب ساتھ نہیں جاسکتے تھے، اور بمبئی میں ساتھیوں سے چھوٹ جانے کے بعد ۱۵ر دن کا قیام ان کیلئے کم مصیبت نہ تھا، بہر حال کسی طرح خدا خدا کر کے ان کا پاسپورٹ بن گیا اور ہم لوگوں کے ساتھ وہ بھی روانہ ہوگئے، اس سال مئو سے حاجی سلطان (قاسم پورہ) حاجی ولی محمد خیاط (پٹھان ٹولہ) حاجی محمد سلیم کوٹھا (قاسم پورہ) وغیرہ ہم سے ہفتہ عشرہ پہلے اور کوپاگنج سے مولوی اسلام الحق صاحب اور عبدالسلام خان بھی ہم سے کئی دن پہلے بارادۂ حج بمبئی پہونچ چکے تھے، مگر جہاز میں ہم سب ایک ساتھ روانہ ہوئے۔

اسی سال رمضان سے پہلے حاجی محمد شفیع (جہانگیر) مئوی اور حاجی عبدالحکیم مئوی مکہ معظمہ پہونچ چکے تھے، اور شوال میں حافظ محمد یوسف (پہاڑ پورہ مئو) مکہ معظمہ پہونچے تھے، چونکہ یہ تینوں صاحب حج سے پہلے مدینہ کی زیارت سے فارغ ہو چکے تھے اس لئے بعد حج بہت جلد وطن واپس ہوگئے، ایام حج میں مکہ، منیٰ، عرفات وغیرہ میں یہ لوگ بھی ہم لوگوں کے ساتھ تھے، وطنی ہونے کے علاوہ ساتھ ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہم سب کا معلم ایک تھا، یعنی حسن اکبر، اور ہم سب معلم کے ایک ہی مکان واقع صفا میں ٹھہرے بھی تھے، یہ مکان اس لحاظ سے بہت اچھا تھا کہ حرم اور ہمارے مکان کے درمیان صرف سڑک حائل تھی۔

۱۴ر اگست ۱۹۵۲ء مطابق ۲۲ر ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ، آج سوا پانچ بجے شام کو ایس ایس اسلامی نے جس پر ہم سوار تھے ساحل بمبئی کو خیرباد کہا، ۱۰ر بجے دن میں نوجوان صالح ولی عمر بھروچہ اپنی کار شیخ صاحب کے مکان پر لائے، اور

وہاں سے مجھ کو اور مولوی عبدالجبار ومولوی اسحاق بنارسی کو اس میں بٹھا کر گودی پہونچا دیا، گودی میں مالیگاؤں کے عبدالرزاق سیٹھ، ماسٹر عبدالرحمن، مولوی الیاس صاحب اور ان کے بھائی وکیل صاحب کے علاوہ مولوی عبدالستار معروفی وغیرہ سے دیر تک ملاقات اور بات چیت رہی، جہاز میں شیخ صاحب، حکیم اعظمی، حاجی تجمل حسین، مولانا منظور نعمانی، حامد میاں غازی انصاری ایڈیٹر جمہوریت اور طاہر انصاری وغیرہ حضرات ملنے آئے ۔اس جہاز سے مولانا مہدی حسن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا نقی صاحب مالیگاؤں، مولانا اختر حسین صاحب خلف رشید حضرت میاں صاحب مولانا اصغر حسین دیوبندی، سید عبدالرب صاحب صوفی ایم اے وابستہ دامن حضرت تھانوی، خان بہادر محمد احمد صاحب ریٹائرڈ کلکٹر (رائے بریلی) اور حکیم شریف الدین صاحب بقائی (دہلی) بھی سفر کر رہے ہیں، میرے کیبن میں پختونستان تحریک کے علمبردار مولوی محمد اکبر خانصاحب پشاوری دوسری سیٹ پر تشریف فرما ہیں، گورے چٹے نوجوان جوشیلے پٹھان ہیں، مفتی صاحب سے خط وکتابت کا سلسلہ تو مدتوں پہلے سے جاری تھا، لیکن ملاقات کی نوبت آج بعد مغرب آئی جب کہ ان کے صاحبزادے محمد میاں نے ان کو بتایا کہ یہ حقیر ان کے قریب ہی بیٹھا ہوا ہے، یہ سن کر مفتی صاحب اٹھے اور بڑے تپاک سے آکر ملے پھر بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

۱۵/ اگست ۱۹۵۲ء مطابق ۲۳/ ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ آج صبح کو بہت دیر تک صوفی عبدالرب صاحب سے باتیں ہوئیں، ان کو میری طرف سے کچھ بے رخی کا احساس ہوا تھا، جو بحمد اللہ زائل ہو گیا، ان سے گفتگو ہی کے دوران میں مولوی محمد ہاشم فرنگی محلی خلف الرشید مولوی صبغۃ اللہ شہید سے تعارف ہوا، ان کو اس جہاز کے امیر الحج نے اپنا نائب مقرر کیا ہے۔ آج تمام جہاز میں سناٹا چھایا ہوا ہے، لوگ کہتے ہیں روپیہ میں چودہ آنے لوگ دوران سر، متلی اور چکر میں مبتلا ہیں جو جہاں پڑا

ہے، پڑا ہے، چند ہی آدمی چل پھر رہے ہیں، کل بعد مغرب میں، مولوی عبدالجبار اور حاجی ولی محمد کیبن کے باہر بینچ میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے، عشاء سے پہلے میں نے حاجی ولی محمد سے کہا کہ تم اپنا اور مولوی عبدالجبار کا کمبل تکیہ نیچے سے یہاں لیتے آؤ اور یہیں سوؤ، کھانا بھی میرے ساتھ کھا لینا، وہ بیچارے نیچے گئے تو لوٹے ہی نہیں، صبح کو جب حاجی سلطان آئے تو معلوم ہوا کہ حاجی ولی محمد سامان لے کر آ ہی رہے تھے کہ ان کو چکر آنے شروع ہو گئے اور وہ اور باقی تمام لوگ مولوی اسلام الحق صاحب کوپا گنجی، عبدالسلام خاں، حاجی محمد سلیم دلال، حاجی سلامت اللہ اور ساتھ کی تینوں عورتیں سب اسی حالت میں ہیں، سارے کے سارے پڑے ہوئے ہیں، کسی سے سر نہیں اٹھایا جاتا۔ ہم لوگ بحمد اللہ اس حال میں تو نہیں ہیں، مگر طبیعت بے حد بدمزہ اور کھانے سے متنفر ہے، میں نے دن میں کھانا بالکل نہیں کھایا، رات میں بھی فاقہ ہی رہا۔ مولوی عبدالجبار کی بھی یہی حالت ہے، میں نے آج رات بینچ میں کاٹی، کیبن میں گرمی تھی، مفتی صاحب بھی باہر لیٹے تھے، مفتی صاحب پر بہت کم اثر ہے، صوفی عبدالرب صاحب بالکل چہ غم ہیں، مولوی نقی بہت متاثر ہیں، حاجی سلطان پر کوئی اثر نہیں ہے۔

آج جمعہ تھا جہاز میں جمعہ نہیں ہوتا، ظہر کی نماز کے وقت جب مولوی ہاشم نے اوقات نماز کا اعلان کیا تو ایک صاحب بڑی برہمی سے بولے کہ امیر الحج متشرع نہیں ہے، اور حج کمیٹی کو انتخاب امیر کا کوئی حق نہیں، ہم خود امیر منتخب کریں گے، مولوی ہاشم صاحب میرے پاس بھاگے ہوئے آئے کہ جلدی وہاں پہونچئے اور ہنگامہ فرو کرائیے، میں فوراً گیا تو دیکھا کہ صوفی عبدالرب صاحب کھڑے ہو چکے ہیں، بحمد اللہ ان کی تقریر سے ہنگامہ فرو ہو گیا اور ان صاحب نے اعلان کر دیا کہ میں نے اپنی تحریک واپس لی، اس کے بعد صوفی صاحب نے میرا تعارف کرایا اور امامت کیلئے اصرار کیا، مگر میں نے خود ان کو امامت پر مجبور کیا۔

۱۶ر اگست ۱۹۵۲ء م ۲۴ر ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ آج پریشانی کل سے زیادہ ہے، میں اور میرے رفیق مولوی عبدالجبار دن بھر کیبن سے باہر نہیں نکلے، نماز بھی کیبن ہی میں پڑھتے ہیں، نیچے کے رفقائے وطن کا حال بالکل ویسا ہی ہے، حاجی ولی محمد جب سے پڑے ہیں اب تک اٹھے نہیں، حاجی سلطان چند بار اوپر آئے۔

۱۷ر اگست ۱۹۵۲ء م ۲۵ر ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ یوم یکشنبہ، آج مفتی صاحب میری عیادت کو آئے اور بہت دیر تک بیٹھے رہے، میرے کیبن میں مولوی اکبر خاں بھی بہت متاثر ہیں اور چل پھر نہیں سکتے، دریا میں تلاطم بہت زیادہ ہے، ہوا بھی تیز ہے، جہاز فٹ بال بنا ہوا ہے۔ اس جہاز کا انتظام محمدی سے خراب ہے، ہماری غذا بالکل بند ہے، آج ایک ابلا ہوا انڈا میں نے اور ایک مولوی عبدالجبار نے کھایا، پان کب چھوٹنے والا ہے مگر مزہ اس میں بھی نہیں آتا، قبض کی شکایت ہے ایک دن کے ناغے سے اجابت ہوتی ہے اور بہت خشک۔

۱۸ر اگست م ۲۶ر ذی قعدہ، آج میں خود ذرا دیر کیلئے مفتی صاحب کے کیبن میں جو بالکل متصل ہے گیا اور وہاں لیٹا بیٹھا رہا، مفتی صاحب نے نمکین بسکٹ، چٹنی اور کافی سے تواضع کی، میرا جی بہلانے کیلئے دارالعلوم دیوبند کے دفتر محاسبی کے ایک ملازم کے کئی دلچسپ قصے سنائے، نماز مغرب کے وقت وہاں سے اپنے کمرہ مین آیا۔ آج کئی دنوں کے بعد ہم دونوں نے کھچڑی کھائی جو فرمائش دیکر بالکل سادی پکوائی گئی تھی، اس وقت جو بدمزگی ہے اس میں سوائے سرخ مرچوں کے اچار کے اور کوئی ترکاری یا سالن یا دال مرغوب نہیں ہے، تلاطم شاید دن بدن بڑھتا ہی جارہا ہے، درمیان میں کسی منزل کا نشان ہی نہیں ملتا، جی بالکل ڈوب گیا ہے، جہاز ۲۴ر گھنٹے میں زیادہ سے زیادہ ۱۸۶ میل کی رفتار سے چلتا ہے، میں جب سے کیبن میں آیا ہوں یعنی ۱۶ر سے اب تک سوائے قضائے حاجت کے باہر نہیں نکلا۔ بس آج تھوڑی دیر کیلئے مفتی صاحب کے پاس گیا ہوں۔

۱۹/ اگست ۱۹۵۲ء م ۲۷ ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ سہ شنبہ، آج بھی ہوا اور تلاطم کا وہی حال ہے، آج میں ذرا دیر کیلئے جہاز کے اس حصہ تک گیا جس کو مسجد بنا رکھا گیا ہے، وہاں صوفی عبدالرب بستر ڈالے ہوئے تھے، کئی دنوں کے بعد آج ان سے ملاقات ہوئی، میری صورت دیکھ کر اور حال معلوم کر کے انھوں نے بڑی معذرت کی اور نہ ملنے کا افسوس ظاہر کیا اور ملتے رہنے کا عہد کیا، چنانچہ وہاں سے اٹھنے کے بعد جلد ہی میرے کمرہ میں آئے، اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد خان بہادر صاحب بھی تشریف لائے، عیادت نہ کر سکنے کی معذرت پیش کی۔ آج مفتی صاحب بھی میرے دیکھنے کو آئے اور دیر تک بیٹھے رہے، ان کی موجودگی ہی میں پروفیسر عبدالمنان صاحب بیدل پٹنہ اور صالح سنبل صاحب ملنے آئے، بیدل صاحب بہت دیر تک گفتگو فرماتے رہے اور انھوں نے تفصیل سے اپنی اس خط و کتابت کا حال سنایا جو وہ مسلسل کئی سال سے حجاج کی آسانیوں کیلئے گورنمنٹ آف انڈیا وغیرہ سے کر رہے ہیں، آج صوفی صاحب کئی بار تشریف لائے، بعض مسائل بھی دریافت کئے، رات میں خان بہادر صاحب نے ایک تکیہ استعمال کرنے کو دی اور اس کیلئے خود ہی انھوں نے زحمت فرمائی، جزاہ اللہ خیراً، خان بہادر صاحب بانس بریلی کے باشندہ ہیں، اور اس وقت مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوری سے بیعت ہو گئے ہیں، اور اس جہاز میں وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ عازم حج ہیں، صوفی صاحب کو بھی وہی لئے جا رہے ہیں۔ آج بارہ بجے تک جہاز نے ۹۴۹ میل کی مسافت طے کی۔

۲۰/ اگست م ۲۸ ذی قعدہ، آج بارہ بجے تک ہم بمبئی سے ۱۱۷۵ میل دور نکل آئے، اب جہاز کی رفتار تیز کر دی گئی ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ رفتار اور تیز ہو گی۔ اور امید ہے کہ جہاز انشاء اللہ ۲۴/ اگست کی صبح تک جدہ پہونچ جائے گا۔ آج مفتی صاحب پھر تشریف لائے اور کئی گھنٹے بیٹھے رہے، مولوی تقی صاحب

بھی بعض مسائل میں گفتگو کرنے کیلئے آگئے، بعض مسائل میں ان سے اور مفتی صاحب سے کچھ نوک جھونک بھی ہوئی، مجھ سے انھوں نے حضرت عمرؓ کے اس اثر کا حوالہ پوچھا جس سے غیر مقلدین تنفیذ طلاق ثلاث سے ان کا رجوع ثابت کرتے ہیں، میں نے عرض کیا کہ اس کو ابن القیم نے اغاثة اللهفان میں اسماعیلی کے حوالہ سے نقل کیا ہے جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں: "ما ندمت علی شئی ندامتی علی ثلاث أن لا أكون حرمت الطلاق" میں نے عرض کیا ان الفاظ سے تنفیذ طلاق سے رجوع کیونکر ثابت ہوتا ہے، مفتی صاحب نے بھی میری تائید کی، اس کے بعد دوسرے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، جواب اذان وغیرہ کے بعد دعا میں مفتی صاحب رفع یدین کو جائز مانتے ہیں، مولوی نقی صاحب کو اس میں تردد ہے، میرا رجحان بھی جواز کی طرف ہے۔

مولوی نقی صاحب کے جانے کے بعد صوفی عبدالرب صاحب آگئے اور انھوں نے ایک تحریر پڑھ کر سنائی جو بعض حجاج کی خواہش پر انھوں نے لکھی تھی، اس میں افراد تمتع اور قران کے شروع سے اخیر تک کے اعمال کی تفصیل تھی سنانے سے ان کا مقصود اطمئنان حاصل کرنا تھا، مفتی صاحب نے بھی اس کو سنا، ان تمام مجالس میں مولوی عبدالجبار اور مولوی اکبر خاں بھی شریک تھے۔

شام کو بعد مغرب حیدرآباد کے ڈاکٹر عبدالغفار اور صفدر حسین صاحب وکیل اور امجد علی صاحب رامپوری تشریف لائے اور صحت کے بعد تقریر و وعظ کا وعدہ کرا گئے، ان کے جانے کے بعد کئی صاحب کاٹھیاواڑ کے مسائل پوچھنے آئے اور بہت سے مسائل پوچھ ڈالے۔

آج بعد عشاء خان بہادر وہ تکیہ پھر دے گئے، میں سو گیا تھا اس لئے مولوی عبدالجبار سلمہ کو دیکر چلے گئے۔ آج دریا میں سکون ہے، ہوا بھی نرم ہے، جہاز میں بھی حرکت بہت کم ہوگئی ہے، اب حجاج کو بھی سکون ہے، کچھ چہل پہل

پیدا ہو چلی ہے، ہم وطن حجاج جو ڈیک میں ہیں ان کے سکون کی خبر بھی حاجی سلطان لائے ہیں، وہ لوگ کچھ کھانے پینے لگے، آج ہم لوگوں نے بھی دال روٹی کھائی ہے، جہاز میں پانی بہت کھاری دیا جارہا ہے اس لئے لیمن پینے پر ہم مجبور ہیں۔

مفتی صاحب نے آج ہی احرام باندھ لیا ہے، حالانکہ میقات ابھی بہت دور ہے۔

۲۱/اگست ۱۹۵۲ء م ۲۹/ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ، آج ۲۴ گھنٹوں میں جہاز نے ۲۹۱ میل کی مسافت طے کی، اب جدہ ۸۹۵ میل رہ گیا، آج رات کو ۳/بجے کے قریب عدن کی محاذات سے جہاز گذرے گا، آج پہلے دن ولی محمد اوپر آئے اور میں بھی ان لوگوں کی قیامگاہ تک مولوی عبدالجبار کی معیت میں گیا اور دیر تک بیٹھا رہا، وہاں سب نے مل کر ناشتہ کیا، جہاز کی رفتار تیز ہونے کے باوجود بالکل تکلیف دہ نہیں ہے، دریا بالکل ساکن ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑی تھالی رکھی ہوئی ہے، کل سے دردسر کی تکلیف ہے اگرچہ بہت شدید نہیں ہے، کسی کسی وقت زیادہ ہو جاتا ہے، مولوی نقی صاحب اور مفتی صاحب سے علمی مذاکرات رہتے ہیں، آج بھی مفتی صاحب دیر تک ہمارے کمرہ میں رہے، آج صوفی عبدالرب کو بخار ہو گیا ہے، کئی گھنٹے وہ میری سیٹ پر قابض رہے، اور میں ان کی جگہ پر مسجد میں لیٹا رہا، آج جہاز میں کافی چہل پہل ہے، مسافرین کی حالت اچھی ہے، نہانے دھونے میں مصروف ہیں، آج مولوی نقی صاحب نے بعد عصر اور مولوی عبدالجلیل آسامی ایم ایل اے نے بعد عشاء وعظ کہا، آج سے دریا میں دوسرے جہاز بھی نظر آرہے ہیں۔

۲۲/اگست م ۳۰/ذی قعدہ، آج جمعہ ہے، آج ۲۴/گھنٹے میں ۲۹۶ میل مسافت طے ہوئی، تقریباً ساڑھے بارہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جہاز چل رہا ہے، اب جدہ ۵۹۹ میل رہ گیا ہے، امید ہے کہ پرسوں یکشنبہ کو ۱۰ بجے دن کے قریب

جدہ پہونچ جائے گا، آج دن نکلنے کے بعد سے ہر دو طرف ساحل نظر آنے لگے، پہاڑوں کی قطار دکھائی دیتی ہے، چڑیاں بھی بکثرت اڑتی نظر آتی ہیں، جہاز بھی بکثرت دکھائی پڑتے ہیں، آج بارہ بجے سے پہلے ہمارا جہاز میرے خیال میں باب المندب میں داخل ہو گیا اور اس وقت ہم مخایا حدیدہ کے سامنے چل رہے ہیں، گرمی بہت سخت ہو گئی ہے، قبلہ بھی بدل گیا ہے، کہتے ہیں کہ کل ٹمپریچر ۱۱۳ ہو جائے گا، آج بہت سے لوگوں نے احرام کے کپڑے پہن لئے، ہم لوگ انشاء اللہ کل صبح کو احرام باندھیں گے، آج ہم لوگ دوسری دفعہ ڈیک میں اپنے ہم وطنوں کی قیامگاہ تک گئے اور دیر تک باتیں کیں، آج صوفی عبدالرب کا بخار ہلکا ہے، مجھے فروٹ سالٹ کی تین خوراکوں کے بعد اجابت ہوئی، سدے معلوم ہوتے تھے، مفتی صاحب آج بھی ہمارے کمرے میں تادیر بیٹھے رہے، بعد ظہر پیچ میں تھوڑی دیر باتیں ہوئیں، آج ایک صاحب ہندوستانی لباس میں ملے اور ملتے ہی بولے۔ "أنت حبيب الرحمن"؟ میں نے کہا، "نعم"! اس کے بعد وہ لپٹ گئے اور لگے دعائیں دینے، میں نے کہا " من أنت ؟" انھوں نے کہا أنا رجل من العرب حضرمی ." میں نے کہا" حضرمی "؟ کہا" نعم" ! میں نے کہا " من أين تسافر " کہا" من حیدر آباد" میں نے کہا" أنت مقيم هناك" کہا " نعم " اس کے بعد دعا کیلئے کہا اور میری پیشانی اور ہاتھ چومے گردن پر بوسہ دیا اس کے بعد میں نے کہا" الى الملتقى ان شاء الله " آج حکیم شریف الدین صاحب اور مولوی ہاشم اور صوفی عبدالرب نے بعض مسائل پوچھے، وعظ کیلئے بہت اصرار ہے، مگر میری طبیعت بالکل موزوں نہیں ہے، یہ روزنامچہ بھی بادل ناخواستہ اور مولوی عبدالجبار صاحب کے اصرار سے لکھ رہا ہوں۔ آج مولوی محفوظ الرحمٰن (۱) کے دور کے ایک رشتہ دار شیخ نور محمد پارک سرکس کلکتہ سے ملاقات ہوئی۔

(۱) غالباً مولانا محفوظ الرحمٰن نامی مراد ہیں، جن کا تذکرہ تلامذہ کے ذیل میں آچکا ہے۔

۲۳ر اگست ۵۲ء، آج جہاز میں بہت چہل پہل ہے، سمندر میں ادھر ادھر مختلف جہاز نظر آرہے ہیں، لوگ خوش ہیں کہ کل ہمارا جہاز ساحل جدہ پر لنگر انداز ہوگا اور اس قید سے عنقریب رہائی ملے گی۔

۲۴ر اگست، آج ایک بجے دن کے بعد جہاز ساحل پر لنگر انداز ہوا، ہم لوگ مطمئن بیٹھے رہے اور عصر کے وقت جہاز سے اتر کر بس پر سوار ہوئے اور کسٹم پہونچے، حاجی سلطان وغیرہ پہلے پہونچ چکے تھے بعد میں ہم پہونچے، مولوی عبدالجبار نے جاکر سامان ڈھونڈھا، بمشکل تمام ایک سامان یہاں سے ایک وہاں سے ملا، سامان پہونچانے کا انتظام نہایت غلط اور سخت پریشان کن ہے، بعد مغرب پھر بس پر سوار ہوکر ہم مدینۃ الحجاج پہونچے اور وکیل معلم کی ہدایت کے مطابق (پسر سید حسن اکبر معلم) نے ہم کو اس کے ایک کمرہ میں پہونچادیا، اس میں بس اتنی جگہ تھی کہ ساتھ میں جو دو عورتیں ہیں ان کو ہم نے وہاں بٹھادیا اور خود باہر نکل کر وضو کیا، اور نماز مغرب سے فراغت حاصل کی، اب کھانے اور سونے کی فکر ہوئی، پہلے ایک کھانے کی دوکان پر پہونچے، دو پراٹھے اور دو ہاف پلیٹ شوربے اور گوشت لے کر بھوک کو کچھ تسکین دی گئی، ایک پراٹھہ نس (آدھے ریال) میں ملا ہے، تین روپے میں دو آدمیوں کا پیٹ نہیں بھرا۔

اس کے بعد اپنے کمرہ کے سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ سامان والا ٹرک آکر سامان پھینک گیا ہے، بڑی دقتوں سے اپنا سامان تلاش کیا اور کچھ دیر اسی پر بیٹھے رہے، لیکن یہاں کم از کم پوری رات گذارنی ہے، اس لئے اس طرح کب تک بیٹھے رہیں، خیال ہوا کہ اندر جگہ تو نہیں، کوئی چیز بچھانے کی ہو تو اسی کو باہر بچھا کر آرام سے بیٹھیں، معلوم ہوا کہ کوئی چیز نہیں، مجبوراً میں نے چٹائی والی جانماز بچھائی اور اس پر بیٹھا، اس کے بعد حاجی سلطان نے اپنا بستر کھولا اور اس کا کور نکال کر بچھایا، سونے کا وقت آیا تو بھائی اسحاق انصاری علیگڈھی نے اپنا فولیو

لا کر بچھادیا، مگر اثنائے شب میں وہاں کی خنکی برداشت نہ کرسکا، اور دوسرے کمرہ میں بھائی اسحاق کے بستر پر جالیٹا، باقی رفقاء حاجی سلطان کے کور پر لیٹے، صبح کو بہت سویرے آنکھ کھلی، وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد باجماعت نماز ادا کی، مولوی نقی صاحب نے پان کھلایا، گھنٹوں کے بعد چائے پی۔ جی چاہتا تھا کہ اسی وقت بس مل جاتا تو ٹھنڈے ٹھنڈے مکہ چلے جاتے، اس کے علاوہ یہاں دن بھر سایہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر یہاں وہاں بیٹھنے کی زحمت سے نجات مل جاتی، مگر دوپہر کے قریب تک کچھ خبر نہیں ملی۔ دوپہر کے قریب علی نے بتایا کہ تین بجے کے بعد موٹر آئے گا، ہم نے تین تک انتظار کیا مگر کیسا موٹر، آخر بار بار کے تقاضے کے بعد خدا خدا کر کے رات کے دس بجے موٹر آیا، اور ہم اس پر سوار ہو کر ایک بجے رات کے بعد مکہ معظمہ پہونچے اور صفا پر سید حسن اکبر کے مکان میں اسباب رکھا، چند منٹ سستانے کے بعد طواف کرنے چلے گئے، مگر اذان کا وقت قریب تھا اس لئے پانچ شوط کے بعد مطاف میں صفیں لگ گئیں اور طواف روکنا پڑا، بعد نماز اس کو پورا کر کے طبیعت کا اندازہ لگایا تو سعی کی ہمت نہیں پڑی، اس لئے ستانے کیلئے قیام پر چلا آیا اور بہت دیر کے بعد سعی کر کے قصر کرایا اور نہا کر کپڑے بدلے، جدہ میں جہاز ہی پر قدوائی صاحب کی زبانی معلوم ہو گیا تھا کہ آج یہاں چوتھی تاریخ ہے، جب کہ ہم لوگوں کے حساب سے ابھی دوسری تھی، قدوائی صاحب کو مولوی سید محمد میاں ہمارے پاس ملانے کو لائے تھے، اس ملاقات کے بعد وہ کئی دفعہ کسٹم اور مدینۃ الحجاج میں ملے، مولوی احمد عبداللہ نے مجھ سے کہا وہ آپ سے ملنے کے بہت مشتاق ہیں، رات کو وہ میری قیامگاہ پر آئے بھی تھے، کھانا کھانے کیلئے قنصلیہ لیجانا چاہتے تھے، مگر میں موجود نہ تھا۔ مولوی نقی صاحب مل گئے تھے ان کو لے جا کر کھلایا، قنصلیہ میں آج کل چریا کوٹ کے ایک ڈاکٹر ملازم ہیں، ہم نے قبض کی شکایت کی تو انھوں نے ایک

خوراک دست آور سفوف کی دی مگر ہم پریشانی میں اس کو استعمال نہ کر سکے۔

یہاں (جدہ میں) فی کس ایک سو چودہ روپے ہندی مااللعہ فیس معلمی اور ایک گنی یعنی عہ ہندی کرایہ مکان مدینۃ الحجاج اور عہ ہندی کرایہ بس از جدہ تا مکہ ادا کرنا پڑا۔

۲۶ راگست آج ہم مکہ معظمہ میں ہیں، بعد عصر مولوی عبداللہ زمزمی سے ملاقات ہوئی، صبح کو یوسف گرہست ۰۰۰ برکت اللہ اور محمد خیر آبادی وغیرہ ملنے آئے تھے۔، آج طبیعت بہت بدمزہ رہی، رات بھر کی بیداری کا یہ اثر تھا، حجاج کی کثرت کی وجہ سے مسجد میں جگہ نہیں ملتی۔

۲۷ راگست، آج معلم نے خیمہ کا کرایہ فی کس عہ اور موٹر کا کرایہ فی کس عہ وصول کیا، کل صبح کو منیٰ کو روانگی ہے، ہم نے پیدل کا ارادہ کیا تھا، مگر حاجی سلطان کی بی بی کے مرض کی وجہ سے سواری کا کرایہ ادا کیا۔

۲۸ راگست، آج ظہر سے بہت پہلے موٹر سے ہم لوگ منیٰ روانہ ہوئے گرمی سخت ہے، موٹر شبیکہ میں کھڑا تھا، صفا سے وہاں تک پیدل جانا پڑا، منیٰ پہونچ کر ایک خیمہ میں معلم صاحب نے ٹھہرایا، وہیں دن بھر رہے، دھوپ اور گرمی کی شدت کی وجہ سے مسجد خیف میں نہ جا سکے، مغرب کی نماز مسجد خیف میں ادا ہوئی، وہاں امام مکہ اور ایک دوسرے مصری میں امامت کے باب میں جھڑپ ہو گئی اس لئے ہم نے الگ نماز پڑھی، شام کو مسجد خیف کے پیچھے دال بھات پکایا گیا، عشاء کے بعد کھا پی کر خوب سوئے۔

۲۹ راگست۔ آج تقریباً گھنٹہ بھر دن نکلنے کے بعد عرفات کیلئے موٹر سے روانہ ہوئے، جبل رحمت سے بہت قریب خیمہ پڑا ہوا تھا، اس میں ٹھہرے، معلم صاحب نے چائے پلائی، دھوپ کی تیزی کی وجہ سے مسجد نمرہ جانے کی ہمت نہیں ہوئی، خیمہ ہی میں ظہر و عصر اپنے اپنے وقت میں باجماعت ادا ہوئی، شام کو قبل مغرب جبل رحمت کے پاس جا کر کھڑے ہو کر کچھ دیر تمام رفقاء کے ساتھ دعا

مانگی۔ غروب کے بعد بہت دیر انتظار کے بعد بس ملا۔ راستہ میں موٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا، اس لئے کئی گھنٹہ میں مزدلفہ پہونچے، بس میں گرمی کی شدت اور بھوک سے بڑی تکلیف ہوئی، مزدلفہ پہونچ کر فوراً نماز مغرب و عشاء باجماعت پڑھی گئی، اس کے بعد کچھ باسی روٹیاں کھا کر پانی پیا، چار فنجان والی ایک کیتلی چائے نس ریال (تقریبا ۱۲ر) میں لی۔ اس کے بعد ستانے کیلئے لیٹ گئے، لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی، صبح صادق سے کچھ پہلے آنکھ کھلی، وضو کر کے چند رکعتیں پڑھیں اس کے بعد نماز فجر باجماعت پڑھی گئی، اس کے بعد موٹر کا انتظار شروع ہوا مگر دس بجے دن سے پہلے موٹر نہ آسکا، خدا کا شکر ہے کہ اس دن بہت دیر تک بدلی تھی، جب دھوپ نکلی تو فوراً ہم لوگ اس سائبان میں چلے گئے جو حکومت کی طرف سے بنا ہوا ہے، وہاں بہت دیر انتظار کے بعد بس ملا، بس میں خدا جانے کتنے مسافروں کو جانوروں کی طرح بھر کر منیٰ لایا گیا، سنا جاتا ہے کہ بہت سے لوگ مزدلفہ کے میدان میں دھوپ میں پڑے پڑے مر گئے؛ بعض کا ناگفتہ بہ حال تو ہم نے بھی دیکھا تھا۔ موٹروں کا انتظام معقول نہیں ہے، ڈرائیور کمانے کی فکر میں حجاج کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔

منیٰ پہونچ کر ہم سب خیمہ میں داخل ہو گئے اور عصر سے پہلے تک باہر نکلنے کی ہمت نہ کر سکے، عصر کے بعد کچھ لوگ رمی عقبہ کیلئے گئے اور ہم لوگ ان کی واپسی کے انتظار میں بیٹھے رہے، جب وہ واپس ہوئے تو میں مع مولوی عبدالجبار کے رمی کیلئے گیا اور واپس آنے والوں میں کچھ لوگ قربانی کیلئے چلے گئے، جب ہم رمی کو چلے ہیں اس وقت بھی ہوا نہایت گرم تھی اور راستہ میں بہت سے لوگ دم توڑتے ہوئے ملے، یہ منظر دیکھ کر ہم لوگ حواس باختہ تھے، خدا خدا کر کے ہم نے رمی کی اور جلدی سے خیمہ میں واپس آگئے، مولوی عبدالجبار کے چہرہ کا رنگ فق تھا، میں بھی بہت پریشان خاطر تھا، واپس آکر نماز مغرب ادا کی، اس کے بعد قربانی کرنے والے لوگ واپس آئے اور جو کچھ ساتھ لائے تھے اس کے پکانے میں مصروف

ہو گئے، عشاء کے بعد کھانا کھایا گیا اس کے بعد خیمہ کے اندر ہی سب سو گئے۔

۳۱؍ اگست ۱۱؍ ذی الحجہ، آج طواف زیارت کرنا ہے اور خیال ہے کہ سویرے ہی مکہ چلے جائیں، اس لئے میں ناشتہ پکانے سے منع کر رہا ہوں، معلم کے لڑکے سے تاکید کی وہ ایک ٹرک کرایہ پر لایا، ہم سب لوگ اس پر سوار ہو کر چلے مگر راستہ میں پاکستانی مگر راستہ میں پاکستانی اور سعودی فوج کے مظاہرات ہو رہے تھے، اس لئے گھنٹوں ٹرک کو روکنا پڑا، بہت دیر بعد اجازت ملی اور کسی طرح مکہ پہونچے، پہونچ کر فوراً مولوی عبداللہ کے یہاں جاکر وضو کیا اور طواف زیارت سے فارغ ہو کر سعی شروع کر دی، بدقت تمام اس سے فراغت ہوئی، اس کے بعد کرایہ والے مکان میں ستانے کیلئے آگئے، سعی کے ہر چکر میں پانی یا شربت پینے کی ضرورت پڑتی تھی، کھانا کچھ کھایا نہ تھا، اس لئے پیاس نہ بجھتی تھی، عصر تک ستانے کے بعد منی واپس جانے کیلئے پھر ٹرک تلاش کی گئی اور سب لوگ اس پر سوار ہو کر مغرب سے اتنے پہلے منی پہونچ گئے کہ رمی جمرات سے فارغ ہو کر نماز مغرب ادا کی گئی، اس کے بعد حاجی شفیع وغیرہ نے مل کر کھانا پکایا اور کھا پی کر سب لوگ سو گئے۔

یکم ستمبر ۱۲؍ ذی الحجہ، ابھی کچھ لوگوں کو مزید قربانیاں کرنی تھیں، اس لئے آج سویرے ہی کئی آدمی قربانی کرنے چلے گئے، ادھر میں نے دیکھا کہ قریب پاس کے خیمے اکھڑ رہے ہیں اور آج کا موسم بھی بہت سخت معلوم ہوتا تھا اس لئے میں نے معلم سے کہا کہ بس والے کو بلائے اور قربانی کرنے والے واپس آجائیں تو ہمارا سامان اور ہم کو اسی وقت مکہ پہونچا دے، ہم لوگ شام کو آکر رمی کرلیں گے، معلم نے اس کو پسند کیا اور واپس آگیا، بہت دیر کے بعد قربانی والے واپس ہوئے اور ہم سب لوگ ۹ بجے کے قریب بس پر سوار ہو کر مکہ آگئے، شام کو قبیل عصر میرے سوا سب لوگ کرایہ کے ٹرک پر منی گئے اور رمی کی میری طبیعت خراب ہو گئی اس لئے میں نہ جاسکا اور اپنی طرف سے مولوی عبدالجبار کو

رمی کیلئے مامور کیا، وہ لوگ واپس ہوئے تو معلوم ہوا کہ بڑی پریشانیوں سے پہونچنا ہوا، اور واپسی بھی بڑی دقت سے ہوئی، فی کس پانچ ریال خرچ ہوئے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ رہ گئے ان کو اور بھی پریشانیاں پیش آئیں، حتی کہ بہت سے لوگ اپنا سامان لادے ہوئے پیدل آئے، منجملہ ان کے حاجی عبدالحی گھوسی والے اور محمد میاں خیر آبادی بھی تھے۔

۲/ ستمبر م ۱۳/ ذی الحجہ، اب تمام مناسک حج سے فراغت حاصل ہو گئی، حجاج پھر سب مکہ میں جمع ہو گئے اور حرم میں بے اندازہ ہجوم ہے، نماز پڑھنا مشکل ہے، یہ بھیڑ جمعہ سنیچر تک کم ہو گی۔

جب سے ہم مکہ معظمہ آئے ہیں برابر خطوط کا انتظار رہتا ہے، منی سے واپسی پر یہ انتظار اور بڑھ گیا ہے اور اس کی وجہ سے بڑی تشویش رہا کرتی ہے۔

۳/ ستمبر م ۱۴/ ذی الحجہ، آج بہت سے وطنی حجاج ملنے کو آئے، ان میں سے بعض نے ۱۲/ کو طواف زیارت نہیں کیا تھا ان کو مسئلہ بتایا کہ دم دینا ہے، حافظ عبدالحفیظ چکراوالے ملنے آئے، ان کو حکیم یسین چکراوی لائے تھے، آج مفتی صاحب سے ملاقات کو ہم گئے۔

۴/ ستمبر ۱۹۵۲ء م ۱۵/ ذی الحجہ، غالباً اس تاریخ میں مفتی شفیع دیوبندی سے ملاقات ہوئی، ان کی ملاقات ایسی خشک رہی کہ پھر ملنے کو جی نہیں چاہا، مولوی تقی صاحب سے، جب سے ہم مکہ آئے ہیں ملاقات نہیں ہوئی، حاجی تجمل اور مولوی شفیع راستہ میں مل گئے تھے ان سے معلوم ہوا کہ فخریہ کے کسی مکان میں ٹھہرے ہیں، خیر آباد کے حجاج کی اقامتگاہ میں دو ایک بار جانا ہوا، مولوی عبداللہ صاحب کے یہاں روزانہ یا ایک دو دن کے ناغہ سے برابر جاتا ہوں۔

۵/ ستمبر م ۱۶/ ذی الحجہ، اب مکان سے خطوط آگئے ہیں، چونکہ عدن یا کامران سے اب کی دفعہ کوئی خط نہیں بھیجا جا سکا اس لئے اہل وطن بہت بے چینی سے خط کا انتظار کر رہے ہیں، ہم کو تو فی الجملہ اطمینان ہو گیا مگر ان کو جب جدہ

والا خط ملے گا اسی وقت اضطراب رفع ہوگا۔

۶ر ستمبر ۱۷ر ذی الحجہ، آج مفتی صاحب ملاقات کو آئے مگر میں موجود نہ تھا،

۷ر ستمبر ۱۸ر ذی الحجہ، آج مولوی اکبر و مولوی محمد میاں اور مولوی ظہور الاسلام فتحپوری ملاقات کو آئے۔

۸ ستمبر ۱۹ر ذی الحجہ، آج پروفیسر عبدالمنان بیدل اور صالح سنبل اور مولوی محمد میاں ملنے آئے، پروفیسر صاحب نے مولوی محمد کا ایک مضمون جس کو انھوں نے ٹھیک کیا تھا سنایا اور اس کی نسبت میری رائے حاصل کی، میں نے ایک عربی مضمون ان کو دیا کہ وہ کونسل ہند کو اخبارات میں اشاعت کیلئے دیدیں، البلاد السعودیہ میں ایک دن کبار حجاج الہند کی ایک غلط اور نامکمل فہرست شائع ہوئی تھی میں نے اس مضمون میں ایک صحیح فہرست دی تھی، پروفیسر صاحب بہت معتقدانہ آتے ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ حریری صاحب مکہ آئے ہوئے ہیں۔ کل اتفاقی طور پر صوفی عبدالرب صاحب سے مقام ابراہیم کے قریب ملاقات ہوگئی تھی، ان سے معلوم ہوا کہ خان بہادر محمد احمد صاحب سخت بیمار ہوگئے تھے، امید زیست منقطع ہو چکی تھی، مگر اب بحمد اللہ صبح و شام حرم آتے ہیں مولوی عبداللہ صاحب زمزمی نے دور سا... ایک الرسالۃ المستطرفۃ ۰۰۰ ہدیہ کیا

۹۔ ستمبر ۲۰ر ذی الحجہ، آج خیر آباد والوں نے دعوت کی، آج بعد ظہر مدرسہ فخریہ کی عمارت میں ہم مولوی نقی اور مولوی اختر حسین صاحب سے ملنے گئے اور دیر تک وہاں بیٹھے رہے، شام کو بعد عصر حرم جارہا تھا کہ راستہ میں صفا کے قریب حریری صاحب ملے انھوں نے فرمایا کہ میں تمہارے ہی پاس جارہا تھا، اس وقت کھڑے کھڑے بہت دیر تک بات چیت ہوئی، اور یہ طے پایا کہ میں ان کے ساتھ ہی مغرب کی نماز حرم میں پڑھوں، مگر آج خلیفہ بن عبدالعزیز(۱) ملک الحجاز والنجد کی آمد آمد تھی، سڑک پر پولیس کا سخت پہرہ تھا، ادھر سے ادھر جانا

(۱) مگر یہ خبر غلط تھی، در حقیقت امیر سعود ولی عہد طواف کرنے آئے تھے (حبیب الرحمٰن الاعظمی)

ممکن نہ تھا، اس لئے ان کے گذرنے کا انتظار کرنا پڑا، بہت دیر کے بعد وہ باب عالی سے حرم میں گئے تو ہم کو راستہ ملا، باب علی کے پاس پہونچ کر میں نے دیکھا کہ حریری کہیں نظر نہیں آرہے ہیں، میں نے سمجھا وہ پہلے داخل ہو گئے اس لئے میں پھر داخل ہو گیا، مگر اندر جانے کے بعد جب وہ نہیں ملے تو میں نے سمجھ لیا کہ وہ آگے بڑھ گئے اندر پہونچا تو معلوم ہوا کہ شاہزادہ صاحب طواف کر رہے ہیں، طواف سے فارغ ہوتے ہی اذان ہونے لگی، وہ اس وقت مقام ابراہیم میں تھے، بعد ازاں صفیں لگ گئیں اور نماز شروع ہو گئی، اقامتگاہ پر لوٹنے کے بعد مولوی عبدالجبار نے بتایا کہ نماز شروع ہونے کے بعد پولیس نے امام کے پیچھے کے تمام مصلیوں کو ہٹا کر ان کو کھڑا کیا اور نمازیوں کو نماز توڑ کر پیچھے ہٹنا پڑا۔

۱۰۔ ستمبر ۲۱/ذی الحجہ، آج میں باب الواسطیہ کے پاس حریری کی تلاش میں صبح کو کھڑا تھا کہ مولوی عبدالجبار بنارسی مل گئے اور وہ اپنی اقامتگاہ لے گئے، وہیں حریری صاحب بھی تھے، وہاں گھنٹوں مختلف تذکرے رہے، ناشتہ بھی وہیں ہوا، اس کے بعد وہ محمد مجددی مدنیؒ صاحب سے ملانے کیلئے مجھ کو لے چلے، ان سے پہلے اسمعیل و مولوی اسحاق صاحب دہلوی سے انھوں نے ملایا اور تعارف کرایا، اس کے بعد محمد صاحب نے مجھ سے میرا مکان پوچھنے کے بعد دریافت کیا مجلۃ الحج کے گم شدہ پرچوں کے باب میں آپ ہی نے مجھ کو خط لکھا تھا؟ میں نے کہا ہاں، انھوں نے کہا میں نے پرچے دوبارہ بھیج دئے تھے۔ میں نے کہا ہاں وہ ملے تھے! اس کے بعد محمد صاحب نے پوچھا اب کون سا پرچہ باقی رہ گیا ہے؟ میں نے کہا سنہ خامسہ کا عدد خامس، انھوں نے کہا وہ بھی مل جائے گا، اس کے بعد میں نے دفتر مجلۃ الحج دیکھنے کی خواہش کی، انھوں نے کہا! بہت شوق سے تشریف لائیے: میں نے کہا جگہ نہیں دیکھی ہے، انھوں نے کہا میری دوکان سے کسی لڑکے کو ساتھ لیکر آیئے مگر دو تین دن کے بعد، اس لئے کہ ابھی زحمہ بہت ہے، اس کے بعد میں اقامتگاہ پر آگیا، وہاں پہونچا تو دیکھا کہ برخوردار رشید احمد اور مختار کے خطوط

۳/ ستمبر اور ۵/ ستمبر کے آئے ہوئے رکھے ہیں، مصر وغیرہ کا پاسپورٹ بھی اعظم گڈھ سے حاصل کر کے مختار نے بھیج دیا ہے، وہ بھی ساتھ آگیا ہے، عرفات و منیٰ سے واپسی کے بعد میری طبیعت خراب ہو گئی اور دو تین دن نہایت شدت کا بخار آیا، کمزوری بہت ہو گئی، اس لئے کہیں جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، اچھے ہونے کے بعد ایک دن مجلۃ الحج کے دفتر گیا، وہاں شیخ محمد مجددی سے ملاقات ہوئی، انھوں نے چائے سے تواضع کی اور سعید عامودی ایڈیٹر الحج سے ملایا، عامودی صاحب سے مختصر سی گفتگو عربی میں ہوئی، مجددی سے بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی، انھوں نے گھر پر آنے کی دعوت دی مگر اتفاق نہیں ہوا۔

۲۵/ ذی الحجہ، آج مکتبہ الحرم الشریف دیکھنے کو گیا، مولوی محمد نور بنگالی ثم المکی مولانا عبید اللہ سندی مرحوم کے شاگرد آج کل مکتبہ کے مہتمم یا لائبریرین ہیں، نہایت متشدد اور مغلوب الغضب آدمی ہیں، تنقید میں نہایت بے باک ہیں اور بہت سخت کلام، مولانا مرحوم سے شاید زیادہ تر انھوں نے یہی سیکھا ہے۔ بہر حال انھوں نے مکتبہ کی فہرست دی، میں نے اس میں سے مندرجہ ذیل کتابیں نوٹ کیں۔ ۱۔فوائد البزار، ۲۔ کشف الالتباس عن الأحاديث التی تدور بين الناس لمحمد غرس الدين بن أحمد غرس الدين، مخطوطہ ۱۰۶۹ھ، ۳۔ الكافی شرح الوافی لحافظ الدين النسفی، نسخہ کاملہ، ۴۔ كمال الدراية فی شرح النقاية للشمنی، ۵۔ المحيط البرهانی ۶۔ اللباب فی الجمع بين السنة والكتاب لأبی محمد علی بن أبی زكريا بن مسعود المنبجی المكتوب سنة ۷۳۴ بالمدرسة الظاهرية علی يد عبدالله بن محمد بن ابراهيم الحنفی عرف والده بابن المهندس. اور یہی ایک کتاب میں نے نکلوا کر دیکھی۔ دوبارہ اس لئے موقع نہیں ملا کہ محمد نور صاحب کچھ بیمار ہو گئے تھے، انھوں نے ایک رسالہ عربی میں لکھا ہے، جس میں انھوں نے بہت شرح وبسط سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی

ہے کہ جو نمازیں سنن مؤکدہ کہی جاتی ہیں ان کے ترک سے کچھ مؤاخذہ نہیں ہے، اور علماء کو اس پر زور نہ دینا چاہیئے۔ میں نے وہ رسالہ محمد فیروز صاحب ناگپوری کے توسط سے پورا دیکھا ہے۔ اس وقت تک طبع نہیں ہوا تھا، مجھے رسالہ پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ (۱)

اس دن جب میں کتب خانہ میں پہونچا تو معلوم ہوا کہ محمد حسنین مخلوف مفتی مصر ابھی اٹھ کر جارہے ہیں، مجھے افسوس ہوا کہ ذرا پہلے نہ آیا کہ ان سے بھی ملاقات ہو جاتی۔

اب کی دفعہ مکہ معظّمہ میں ہمارا قیام ۹ محرم ۱۳۷۱ھ تک تھا، ۹ کو ہمارے رفقاء کو مدینہ جانے کی اجازت اور سواری ملی، مکہ سے جدہ تک موٹر کا کرایہ فی کس ۱۶ ہندوستانی اور جدہ سے مدینہ کا ۱۳۵ ہندوستانی ادا کرنا پڑا، ادائیگی کے وقت فی کس ۵ مکان کا کرایہ بھی دیا گیا جو نسبۃً کم ہے۔ رات کو عشا کے قریب موٹر روانہ ہوا، بحرہ پہنچ کر موٹر رک گیا اور وہیں میدان میں کمبل ڈال کر ہم لیٹ گئے، صبح کو سویرے اٹھ کر ڈیرے سے دور قضائے حاجت کے لیے گیا، فارغ ہو کر وضو کیا، باجماعت نماز پڑھی، اس کے بعد موٹر جدہ روانہ ہوا، جدہ پہنچ کر زائد سامان وکیل معلم صالح بسیونی کے مکان میں بحفاظت رکھوایا، موٹر کے اوپر سے جب سامان اترنے لگا تو معلوم ہوا کہ رفقاء میں سے حاجی سلامت اللہ کا بستر غائب ہے، معلوم ہوتا ہے وہ راستہ میں گر گیا اور کسی کو احساس نہیں ہوا، جدہ سے مکہ جاتے ہوئے میرا اور مولوی عبدالجبار کا ڈرام جو بمبئی سے زمزم لانے کے لیے خریدا تھا، گر گیا اور ہر چند تلاش وجستجو کی گئی مگر نہیں ملا، ہاں جدہ کی گودی سے لے کر مکہ تک کے درمیان مولوی تقی صاحب کا ایک جھولا یا ڈبہ گر گیا تھا وہ البتہ مدینہ سے واپسی کے بعد ان کو مل گیا۔

سامان رکھنے کے بعد ہمارا موٹر مدینۃ الحجاج کے پاس گیا، وہاں پہنچ کر

(۱) علامہ اعظمی نے مولوی نور محمد کے رسالہ کا رد فرمایا، جو دیوبند سے اس وقت شائع ہونے والے عربی مجلہ دعوۃ الحق (محرم ۱۳۸۷ھ = مئی ۱۹۶۷ء) میں حول السنن الرواتب کے نام سے شائع ہوا۔

ہمارے ڈرائیور نے آگے جانے سے انکار کردیا، منتظمین اس کو مجبور کرتے تھے مگر وہ برابر انکار پر مصر تھا، پھر معلوم نہیں اس کو کیا تاوان دینا پڑا اور ہم کو ایک دوسرا ڈرائیور دیا گیا، اب مصیبت یہ تھی کہ پہلا ڈرائیور موٹر کے ہر مسافر سے ایک ایک ریال (زبردستی) بخشش وصول کرچکا تھا، دوسرا ڈرائیور آیا تو اس نے پھر بخشش کا مطالبہ کیا، ہمارے موٹر میں زیادہ تر حیدرآبادی حجاج تھے، انھوں نے دینے سے انکار کردیا، اب ڈرائیور کسی طرح گاڑی لے چلنے کو تیار نہیں اور وہ بخشش دینے کو آمادہ نہیں، بالآخر میں نے ان کو بہت سمجھایا تو ان میں سے کچھ لوگوں نے اور بقیہ تمام حجاج نے آمادگی ظاہر کی اور روپیہ وصول ہونا شروع ہوا تو میں نے ڈرائیور کو سمجھایا کہ گاڑی لے چلو ہم سب سے وصول کرکے دیدیں گے اور اگر کوئی نہ دیگا تو اس کی طرف سے ہم دیدیں گے، اس نے اعتماد کرلیا اور بے تأمل آکر اس نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ وہ مجھ سے بہت خوش تھا اور مدینہ پہونچ کر اس نے خواہش کی کہ واپسی میں بھی آپ کوشش کرکے ہماری گاڑی پر آیئے۔

بہرحال ہم جدہ سے غالباً ۲/ بجے دن کو روانہ ہوئے ظہر کی نماز ہم نے یہیں پڑھ لی تھی، عصر کی نماز ذھبان میں پڑھی اور روانہ ہوگئے، مغرب کی نماز آگے کی ایک منزل قضیمہ میں ہوئی اس کے بعد رابغ پہونچکر شام کا کھانا کھایا پھر نماز عشا سے فارغ ہوکر موٹر میں بیٹھے تو بستان میں آکر اترے، تقریباً بارہ بج چکے تھے، میدان میں کمبل بچھا بچھا کر سوئے، اور صبح سویرے قضائے حاجت سے فراغت کے بعد نماز پڑھی اور موٹر میں سوار ہوگئے، موٹر ڈرائیور بہت برہم تھا کہ بہت دیر کردی، میرے بہت کہنے سننے سے تو موٹر چلانے پر آمادہ ہوا، اس میں شبہہ نہیں کہ حجاج بڑی لاپروائی کرتے ہیں، اطمنان سے سوئے بیٹھے رہتے ہیں، ڈرائیور کی بات اور رفقاء کی تکلیف انتظار کا کچھ لحاظ نہیں کرتے، بعض اوقات ایک دو آدمیوں کیلئے تمام مسافر گھنٹوں موٹر میں بیٹھے بیٹھے انتظار کی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ بستان سے چل کر

ہمارا موٹر ۹۔ دس بجے دن کے قریب مسیجید میں آکر کھڑا ہوا۔ یہاں قہوہ خانہ ہے اس میں کراسی (بہت اونچے اونچے پایوں کی چارپائیاں جو صرف ایک شخص کے لیٹنے کے برابر ہوتی ہیں) پڑی ہوئی تھیں، بہت سے مسافر چارپائیوں پر اور بہت سے زمین ہی پر کمبل ڈال کے لیٹ گئے، تھوڑی دیر بعد دکان سے کھانا لیکر کھایا گیا، اس کے بعد نماز ظہر ہوئی، ان سب کاموں سے فارغ ہو کر اور ستا کر چار بجے کے بعد موٹر روانہ ہوا، ایک منزل میں عصر کی نماز پڑھی گئی، پھر موٹر چلا تو مغرب کے وقت ذوالحلیفہ پہونچ گیا، جس کو اب بیر علی کہتے ہیں، وہاں باجماعت مغرب کی نماز پڑھی گئی اور ایک فنجان چائے سے کچھ تکان نکالی گئی، اس کے بعد موٹر میں بیٹھے اب کی دفعہ موٹر مدینہ ہی جا کر رکا، جب ہم پہونچے تو مسجد نبوی میں نماز عشا ہو چکی تھی۔

۱۲۔ محرم کو عشا کے وقت ہم مدینہ پہونچے، بہاء الدین مزور کے دروازہ پر سامان پہونچا کر مکان تلاش کرنے کیلئے آدمی بھیجے، تھوڑی دیر کے بعد پاس ہی کی ایک دوکان پر کھانا کھایا، اس کے بعد مدرسہ شرعیہ میں سامان پہونچوایا، مدرسہ شرعیہ بالکل مسجد نبوی کے پاس پورب جانب مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے بڑے بھائی مولانا سید احمد فیض آبادی ثم المدنی کا قائم کیا ہوا ایک مدرسہ ہے، مدرسہ کی دو منزلہ عمارت بہت عمدہ ہے، مدرسہ سے متعلق اور بھی کئی مکان ہیں، زائرین کو مدرسہ میں بلا معاوضہ رہنے کیلئے جگہ مل جاتی ہے، مدرسہ میں ہمارے ساتھیوں کو ایک کمرہ مل گیا، اور دفتر کا کمرہ مجھے اور مولوی اختر حسین صاحب دیوبندی کو نیز مولوی نقی کو عنایت ہوا جو بہت آرام دہ اور کشادہ ہے، مدرسہ اور مسجد نبوی کے درمیان بیس گز سے زیادہ فاصلہ نہ ہوگا۔

اس دفعہ ہم کو مدینہ منورہ میں بیس دن اقامت کی سعادت حاصل ہوئی اور حق تعالیٰ کے فضل سے ہر وقت جماعت کے ساتھ اس مقدس مسجد میں نماز اور

روضۂ اقدس کے پاس صلوٰۃ وسلام کی توفیق حاصل ہوئی، شاید ایک وقت علالت کی وجہ سے حاضر نہیں ہوا تھا، ورنہ ایک وقت کے سوا جہاں تک یاد ہے غیر حاضری نہیں ہوئی۔ اب کی دفعہ مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے چھوٹے بھائی مولانا سید محمود صاحب سے تعارف اور ملاقات کا شرف ملا، موصوف نے ایک دن میری اور تقریباً بیس دوسرے حجاج کی دعوت کی، جن میں پروفیسر عبدالمنان بیدل اور مولوی عبدالجلیل صاحب ایم ایل اے (آسام) مولوی اختر حسین دیوبندی، مولوی نقی (مالیگاؤں) مفتی مہدی حسن (مگر وہ شریک نہیں ہوئے) قابل ذکر ہیں۔

اتفاق سے اس وقت مولانا عبدالمجید الحریری البنارسی (جو اس سال سفیر ہند برائے جدہ نہیں تھے، لیکن حجاز ہی میں مقیم تھے، اور اب ان کی جگہ ایک سال قبل سے مسٹر مصطفیٰ کامل قدوائی سفیر تھے، اور حریری صاحب کو ولی عہد حکومت سعودیہ نے دارالسلطنت ریاض کے شاہی کتب خانہ کے مہتمم کے منصب پر سرفراز کیا ہے) مدینہ میں موجود تھے اور مع اہل وعیال اور ساز وسامان کے ریاض جانے کی تیاری کر رہے تھے، اور ٹرک اور ہوائی جہاز کا انتظار کر رہے تھے، اس لئے روزانہ دن یا رات میں گھنٹوں مدرسہ میں آکر بیٹھتے، سوکھے پان کھاتے اور کھلاتے اور مزے مزے کی باتیں کرتے، کسی کسی وقت علمی مذاکرات کا سلسلہ بھی چھڑ جاتا، مدینہ منورہ میں جو علمی نوادر جا بجا موجود ہیں بڑی محنت سے انھوں نے اس کا ٹوہ لگایا ہے اور ان کی فہرست مرتب کی ہے جو مجھے دکھا رہے تھے، ان کا خیال ہے کہ ان کو ریاض کے کتب خانہ کیلئے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے، اور ان میں سے بعض کی اشاعت کی بھی کوشش کریں گے، مجھے اس کام سے بڑی دلچسپی ہے، انھوں نے خط لکھنے کا وعدہ کیا تھا مگر شاید بھول گئے ورنہ معلوم ہوتا کہ اس سلسلے میں اب تک کیا ہوا۔ ان کے ساتھ اس وقت ان کے لڑکے عبیداللہ بھی تھے جو کئی سال سے بسلسلۂ تجارت حجاز ہی میں رہتے ہیں، ان

کی تعلیم تو انگریزی ہے مگر اب خاصی عربی بول اور لکھ لیتے ہیں۔

اب کی دفعہ بھی ایک بار مسجد قبا، بئر اریس، اور وہاں سے جبل احد کے قریب مزارات شہدائے احد رضی اللہ عنھم اور مسجد الفتح مسجد القبلتین اور دیگر مشاہد متبرکہ کی زیارت سے مشرف ہوا، میں مفتی مہدی حسن کی معیت میں گیا تھا، دوسرے (دن) مولوی عبدالجبار دوسرے رفقاء کے ساتھ گئے۔

بقیع کی زیارت کئی بار کی، پہلی دفعہ مسجد غمامہ اور اس کے آس پاس کی مساجد کی زیارت بھی کی تھی، بیرحاء کا پانی پہلے بھی پیا تھا اس دفعہ بھی پیا، یہ کنواں اب بہاء الدین مزور کے مکان کی پشت پر ایک مکان کے اندر پڑ گیا ہے، مگر اس طرح کہ باہر سے لے سکتے ہیں، میں نے مولوی اسلام الحق کو بھی اس کنویں کی زیارت کرائی۔

بیر بضاعہ کو دیکھا اور اس کا پانی دونوں دفعہ حاصل ہوا، بیر بضاعہ سے آج بھی سنچائی ہوتی ہے، اب اس میں مشین لگ گئی ہے، اس کے ارد گرد ترکاریوں اور جوار وغیرہ کے کھیت اور باغ ہیں۔

بیر اریس کا پانی بھی دونوں دفعہ پینا نصیب ہوا، نہایت سرد و شیریں پانی تھا، اس میں بھی ہر چلانے کی جگہ اور سامان دیکھا، یہ کنواں بالکل مسجد قبا کے قریب بیر خاتم کے نام سے اس کی شہرت ہے۔

مسجد قبا سے مسجد الفضیخ کو راستہ جاتا ہے مگر ہم دھوپ ہو جانے کی وجہ سے نہ جا سکے۔

مناخہ (مدینہ کے بازار کے پاس ایک جگہ) میں ٹیکسیاں اور لاریاں کرایہ کی مل جاتی ہیں، جو ایک ایک دو دو ریال فی کس کرایہ پر قبا اور تمام مشاہد کی زیارت کرا دیتی ہیں، مدینہ منورہ میں حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی کے نواسہ کی زیارت بھی ہم نے کی۔ ایک معمولی دوکان ان کا ذریعہ معاش ہے ایک صاحب

وہاں مولوی محمد نمنکانی ہیں، وہ مدرسۃ الشرع میں پڑھاتے بھی ہیں اور کتابوں کی دوکان بھی رکھی ہے، ان کے پاس کوثری صاحب کی اکثر کتابیں تھیں، انھیں کے یہاں میں نے تلخیص سنن ابی داؤد للمنذری مع تہذیب السنن لابن القیم کا کامل مطبوعہ مصر نسخہ دیکھا، افسوس کہ روپے کی کمی کی وجہ سے خرید نہ سکا۔

اثناء قیام مدینہ میں اب کی دفعہ ایک بار مدرسۃ الشرع کا کتب خانہ بھی دیکھا، فہرست سے مندرجہ ذیل کتابیں میں نے نوٹ کیں۔

۱۔ الوجیز للإمام الفقیه ابی عبدالله محمدبن محمد السرخسی مکتوب سنة ۸۵۸

۲۔ ملجأ القضاة عند تعارض البینات للشیخ ابی محمد غانم البغدادی (قلمی)

۳۔ منح الغفار شرح تنویر الأبصار لمخمد عبدلله التمرتاشی ״

٤۔ معدن الحقائق شرح کنز الدقائق لمحمد بن محمد السمرقندی ״

۵۔ شرح النقایه لعلی القاری مطبوعه قازان (روس)

٦۔ شرح تحفة الملوك لابن الملك ״

۷۔ تحریر المسائل علی النوازل و تحفة الملوك

۸۔ المنخول للغزالی

۹۔ تعلیقات الطحطاوی علی الدرالمختار۔ نہایت عمدہ قلمی نسخہ دو ضخیم جلدوں میں۔اگرچہ یہ چھپ گئی ہے پھر بھی یہ قلمی نسخہ قابل قدر ہے۔

ان میں سے ۲ ۳ ۴ ۶ اور ۹ کو میں نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اور زیادہ توجہ سے الوجیز کو دیکھا۔ رضی الدین سرخسی نے چھوٹی بڑی چار کتابیں محیط کے نام سے لکھی ہیں، یہ چوتھی محیط ہے، کتاب کا خط نستعلیق ہے، ضخامت ایک سو سرسٹھ ورق ہے۔

میں کتب خانہ دیکھنے ۲؍ صفر ۱۳۷۲ھ کو گیا تھا، میں کتاب بھی دیکھ رہا تھا

اور شیخ محمد بن ترکی نجدی کا درس ابی داؤد بھی سن رہا تھا۔

اس سال حجاج کو وطن واپس کرنے کیلئے جہازوں کی تعداد بہت کم تھی، اس لئے بہت دیر دیر میں جہاز ملتے تھے اور جدہ میں حجاج کی بہت بڑی تعداد اکٹھا ہو گئی، اس کے نتیجہ میں ان لوگوں کو جو مدینہ میں تھے، مدینہ سے جدہ جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی، بہت سے لوگوں کے پاس پیسے کم تھے وہ جلد از جلد واپس لوٹ جانا چاہتے تھے، کتنے ملازم تھے جن کی رخصت ختم ہو رہی تھی، اس لئے مدینہ میں رکے ہوئے حجاج سخت پریشان تھے، ہمارے رفقاء کا بھی یہی حال تھا، اس پر طرہ یہ کہ مفتی مہدی حسن اور مولوی نقی کو ان کے مزور نے کسی طرح اجازت دلوا کر جدہ روانہ کر دیا، اب گھبراہٹ اور بڑھی اسلئے میں نے یہ طے کیا کہ اب سید محمود صاحب سے کوشش کرا کے سیارہ (موٹر) کا انتظام کرنا چاہئے، یہ خبر کہیں سے مولوی عبدالجلیل آسامی اور پروفیسر عبدالمنان بیدل نے بھی سن لی اور بہت مصر ہوئے کہ ہمارے لئے بھی موٹر کا انتظام کرا دیجئے، میں نے سید محمود کے پاس جا کر صورت حال بیان کی اور پچاس مسافروں کیلئے ایک بڑے موٹر کا انتظام کرانے کیلئے کہا، انھوں نے فوراً اپنے لڑکے سید حبیب صاحب کو بلا کر مجھ سے ملایا، اور بہت اونچا تعارف کرا کے کہا کہ تم ابھی امیر مدینہ (گورنر) کے پاس جا کر آپ کیلئے اور آپ کے پچاس رفقاء کیلئے ایک موٹر کی اجازت کا خط بنام شرکۃ السیارات العربیہ لے آؤ۔

یہ آٹھ بجے صبح کا قصہ ہے، دن کے بارہ بجے میں کھانا کھا رہا تھا کہ سید صاحب کا ملازم آیا اور اس نے خوشخبری سنائی کہ اجازت مل گئی، آپ ابھی میرے ساتھ چلئے! اس کے بعد وہ مجھے شرکۃ السیارات کے منتظم اعلیٰ کے پاس لے گیا اور اس کو خط دیا، منتظم نے اس سے کچھ سوالات کئے، ملازم نے میری طرف اشارہ کر کے کہا هو يفهم العربية، اس کے بعد منتظم نے مجھ سے کچھ باتیں کیں،

پھر کہا شام کو موٹر مل جائے گا، چنانچہ اسی دن ہم کو موٹر مل گیا، لیکن دوسرے حجاج میں ہلچل مچ گئی اور انھوں نے مزوروں اور کمپنی والوں کو بہت پریشان کیا کہ اجازت نہیں ہے توان کو موٹر کیسے مل گیا، ان لوگوں نے جواب دیا کہ بابا یہ گورنر سے اجازت لائے ہیں تم بھی لاؤ تو ہم کو کیا عذر ہے۔

بہر حال ہم تمام اہل مئو کو پانچ اور پروفیسر عبدالمنان مع اپنے رفقاء کے نیز مولوی عبدالجلیل مع تمام رفقاء کے ۳/ صفر ۱۳۷۲ھ کو بعد نماز عشاء یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔

می روم سوئے وطن وز درد دل بے اختیار
نالۂ دارم کہ پنداری بغربت می روم

اور دوسرے دن شام کو ٹھیک مغرب کے وقت جدہ پہونچ گئے، پہونچتے ہی معلوم ہوا کہ کل مظفری جہاز جارہا ہے، مگر اب بکنگ کی بالکل گنجائش نہیں ہے، مگر یہ بھی معلوم ہوا کہ پھر بھی کوشش پیروی سے کچھ لوگ لے لئے جاتے ہیں، اس لئے آپ بھی کونسل صاحب سے مل کر کوشش کیجئے، میں نماز مغرب سے فارغ ہو کر مدینۃ الحجاج سے جہاں اب جہاز سے اتر کر اور مدینہ سے واپسی میں حجاج کا قیام ہوتا ہے قنصلیۃ الھند (انڈین کونسلیٹ) گیا، اور قدوائی صاحب سے باتیں کیں، انھوں نے صاف انکار کیا، اس پر مجھے طیش آیا اور میرے لہجہ میں کچھ تندی و تلخی پیدا ہو گئی، جس کی انھیں ناگواری ہوئی، اس کے بعد وہ چلے گئے، چونکہ مفتی مہدی حسن صاحب کا قیام وہیں تھا، تھوڑی دیر کے بعد قدوائی صاحب کے یہاں سے ان کا کھانا آیا اور قدوائی صاحب نے مجھ سے بھی کھانے کو کہا، میں نے انکار کیا مگر وہ بیحد مصر ہوئے اور مفتی صاحب ان سے زیادہ، بالآخر دونوں نے مل کر مجھے کھانے پر مجبور کر دیا، اس کے بعد قدوائی صاحب نے مجھ سے کہا کہ اب ایک سیٹ فرسٹ کلاس کی خالی ہو گئی ہے، اور آپ تنہا جا سکتے ہیں، میں نے کہا رفیقوں کو

چھوڑ کر میں نہیں جا سکتا، لوگ مجھے سمجھانے لگے تو میں نے کہا کم از کم ایک جگہ ڈیک میں بھی دیجئے تا کہ ایک رفیق تو ساتھ ہو، اس کیلئے معذوری ظاہر کی تو میں نے بھی جانے سے معذوری ظاہر کی، پھر انھوں نے کہا اچھا ہم اخیر وقت تک کوشش کریں گے، اگر تیسرے درجہ کی بھی ایک جگہ مل گئی تو آپ چلے جائیے گا، مگر جہاز چھوٹنے سے کچھ پہلے انھوں نے آکر اطلاع دی کہ کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ انجام کار جہاز روانہ ہو گیا اور میں اپنے تمام رفقاء کے ساتھ جدہ میں رہ گیا اب پریشانی کا وہ عالم کہ الامان والحفیظ کتنے حجاج تھے کہ کھانے کا ٹھکانا نہیں تھا، اور کتنے تھے جو کم و بیش ایک ماہ سے جدہ میں پڑے ہوئے اکتا گئے تھے اور ابھی کم از کم بیس پچیس دن سے پہلے جہاز ملنے کی کوئی توقع نہیں تھی، دن رات یہی ذکر اور شب و روز یہی فکر تھی، حجاج کا ہجوم در ہجوم قدوائی کو قنصلیہ میں اور جب وہ روزانہ شام کو مدینۃ الحجاج آتے تو یہاں پر گھیرے رہتا تھا، مگر قدوائی کے پاس سوائے تسلی و دلاسا کی باتوں کے دوسرا کیا علاج تھا، ہاں ناداروں کی تکلیف کا ان کو اور انجمن خدام النبی والوں کو احساس اور اس کی فکر بہت تھی، اس لئے خدام النبی والوں نے دونوں وقت قنصلیہ کھانا پکوا کر ایسے حجاج کو کھانا کھلانے کا انتظام کیا اور جہاز آنے تک روزانہ سیکڑوں آدمیوں کو دونوں وقت کھانا کھلاتے رہے، اس فیاضی کا سہرا دراصل ہمارے دوست سیٹھ احمد غریب کے سر ہے، مگر راتوں کو جاگ کر اور دن میں دوڑ دھوپ کر کے انتظام کرنا اور اتنے بڑے کام کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کا سہرا ہمارے دیرینہ محب مخلص مولوی احمد عبداللہ صاحب (بمبئی) کے سر ہے۔

جہاز کے انتظار میں دوسرے حجاج کے ساتھ ۱۱ دن ہم بھی جدہ میں پڑے رہے، قدوائی صاحب کا سخت اصرار تھا کہ آپ قنصلیہ میں آجائیں میں نے کہا: میں تنہا نہیں ہوں اور رفقاء سے علحدہ بھی نہیں ہونا چاہتا، تو انھوں نے رفقاء کو

ساتھ لانے کیلئے بار بار اصرار کیا مگر میری طبیعت آمادہ نہیں ہوئی، اور معذرت کرتا رہا، کسی کسی دن بہت مجبور کر کے انھوں نے اپنے ساتھ کھانا بھی کھلایا، ایک دن موٹر بھیج کر اپنے (یہاں) بلایا، قدوائی صاحب کی ان عنایتوں کا میں شکر گذار ہوں، مگر اس سال ہزارہا حجاج کو کم و بیش مہینہ مہینہ بھر جدہ میں پڑے رہنے اور بہت سے پہلے آنیوالوں کو بعد میں اور بعد میں آنے والوں کو پہلے جہاز میں جگہ مل جانے کی شکایت بھی مجھ کو ان سے ہے اور اس کا تمامتر ذمہ دار میں انھیں کو سمجھتا ہوں، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کے عملہ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو بعد میں آنیوالوں کو دوسرے مستحقوں کے مقابلہ پہلے بک کرتے ہیں اور قدوائی صاحب کا دامن بھی اس سے پاک نہیں ہے، فرق یہ ہے کہ قدوائی محض مروت اور پاس و لحاظ کی بنا پر ایسا کرتے ہیں اور دوسروں کی نسبت بیسیوں حجاج کی زبانی دوسری باتیں بھی میں نے سنی ہیں۔

اس سلسلہ کے ایک دلچسپ واقعہ کی (جس کا الزام میں قدوائی صاحب یا ان کے عملہ کو نہیں دیتا) تحقیق تو میں نے کی اور سچ پایا اور وہ یہ کہ سورت کے دو دولتمند حاجیوں کو واپسی کی جلدی تھی، مگر جہاز میں جگہ نہیں تھی اور دوسرے لوگ ان کے مقابلہ میں زیادہ مستحق تھے تو انھوں نے یہ تدبیر کی کہ ایک حاجی اور ان کی بیوی کا حق سفر چار سو روپے میں خرید لیا اور ان کی بکنگ کینسل کرا کے اپنی بکنگ کرالی، جن مراد آبادی حاجی نے اپنا اور اپنی بیوی کا حق بیچا تھا میں نے خود اس کو پوچھا تو انھوں نے اس کی تصدیق کی۔

بہت سے لوگ قنصلیہ کے ڈاکٹر سے بیماری کا سرٹیفکٹ حاصل کر کے بھی دوسرے صحیح مستحقوں کا حق غصب کر کے مستحق بن جاتے ہیں، یہ باتیں انتظامی حیثیت سے سخت معیوب و قابل شکایت ہونے کے علاوہ شرعی حیثیت سے بھی سخت ناپسندیدہ ہیں جن کا لحاظ ان لوگوں کو کرنا تو بہت ضروری ہے جو

ہزاروں روپیہ صرف کر کے ایک فریضۂ شرعی کی ادائگی کیلئے ہزاروں میل کا سفر کرتے ہیں۔

جدہ میں جبری قیام شروع ہونے کے وقت ہی سے میرا خیال تھا کہ یہاں جدہ میں رہ کر کیا کریں گے، اس موقع کو غنیمت سمجھنا چاہیئے اور جب تک جہاز نہیں ملتا اس وقت تک مکہ معظمہ میں قیام کرنا چاہیئے، مگر مولوی احمد عبداللہ صاحب سے معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز کی ایک کمپنی سے بات چیت ہو رہی ہے، اور عنقریب معاملہ طے ہو کر ایک جہاز بمبئی جائے گا، آپ بھی اسی سے چلے جایئے، پانی کے جہاز میں میرا ٹکٹ فرسٹ کلاس کا تھا اور صرف واپسی کا جو کرایہ ہوائی جہاز کا انھوں نے بتایا، اس میں اور پانی کے جہاز کے کرایہ میں کچھ زیادہ تفاوت نہیں تھا، اس لئے میں بھی یہی سوچنے لگا کہ ہوائی جہاز ہی سے چلا جاؤں، دوسرے لوگوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے بھی یہی رائے دی، اس وجہ سے میں اب ہوائی جہاز کا انتظار کرنے لگا، مگر جب کئی دن گذر گئے تو میں نے یہ طے کر لیا کہ اب میں مکہ معظمہ چلا جاؤں گا، چنانچہ ۳ر نومبر ۱۹۵۲ء م ۱۴ر صفر ۱۳۷۲ھ کو میں مکہ چلا گیا اور چلتے چلتے مولوی احمد عبداللہ نے مجھ سے یہ کہا آپ جایئے بات طے ہو جائیگی تو میں روانگی سے ایک دن پہلے فون سے آپ کو مطلع کر دوں گا، اب کی دفعہ مکہ پہونچ کر میں نے یہ ارادہ کیا کہ کسی مکان میں رہنے کے بجائے حرم محترم ہی میں رات گذارنے کا کوئی ٹھکانا بنانا چاہیئے، چونکہ موسم اب بہت خوشگوار ہو گیا تھا اس لئے سردی گرمی کا بھی کوئی سوال نہیں تھا، بہت آسانی سے شب و روز حرم میں رہنا ممکن تھا، الحمد للہ کہ ایک ہفتہ تک اسی صورت سے مکہ میں قیام ہوا۔ وہاں پہونچنے پر کسی طرح ہمارے معلم سید حسن اکبر کو ہماری آمد کی خبر معلوم ہو گئی دوسرے دن فجر کی نماز اور طواف سے فارغ ہو کر میں مطاف سے نکل رہا تھا کہ سید حسن اکبر مجھے حاشیۂ مطاف پر بیٹھے ہوئے نظر آئے، سلام و مصافحہ کے

بعد انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا کہ چلئے! میں نے کہا: کہاں؟ انھوں نے کہا چلئے ناشتہ کر لیجئے، میں ان کے ساتھ ہولیا، راستہ میں انھوں نے شکایت کی کہ آپ میرے گھر کیوں نہ اترے اور وہیں قیام کیوں نہ کیا، میں نے پوری بات ان کو سمجھائی تو وہ اس پر راضی ہوئے کہ اچھا قیام کے باب میں اپنی مرضی پر عمل کر لیجئے مگر دونوں وقت کا کھانا اور ناشتہ بے تکلف میرے گھر کیجئے اور بلاوے کے انتظار میں نہ رہئے، مجھ کو یہ بار ان پر ڈالنا تو گوارا نہ تھا مگر وہ کسی طرح نہیں مانے، اس لئے جب تک رہا ان کے گھر کھانا اور ناشتہ ہوا، حق تعالیٰ کا یہ بھی کرم ہے کہ اس نے یہ صورت پیدا کر دی، ورنہ ہر چند کہ میں دکان سے کھانا لیکر کھانے کا عزم مصمم کر کے گیا تھا مگر واقعہ یہ ہے کہ مجھ کو وہاں کے کھانے سے سیری نہیں ہوتی اور نہ وہ میرے مذاق کا ہوتا ہے۔ اس غیبی انتظام کی وجہ سے کھانے کا بہت آرام تھا، سید حسن اکبر کے اجداد کاٹھیاواڑ گجرات سے یہاں آئے ہیں اور اب بھی وہاں سے ان کے تعلقات ہیں، ان کی ایک بہن بہت اچھی اردو بولتی ہیں، وہ خود بھی اردو سے اچھے واقف ہیں، اس ہندوستانیت کی وجہ سے ان کے گھر کے کھانوں میں ہندوستانی کھانوں کا مزہ رہتا ہے، ایک دن انھوں نے بازار کا بہت عمدہ اور نہایت لذیذ ہریسہ بھی منگوا کر کھلایا، اس دفعہ قیام مکہ کے اثناء میں ایک دن سید عمر مدنی کے ایک عزیز کے یہاں شادی کی ایک دعوت میں بھی شرکت کی نوبت آئی، پہلے ایک نہایت چھوٹی سی پیالی جس میں قہوہ کی چند بوندیں تھیں، پیش ہوئی، تھوڑی دیر کے بعد دستر خوان بچھا اور بڑی بڑی تھالیوں میں پلاؤ لا کر رکھا گیا، اس کے ساتھ کچھ جلیبیاں بھی تھیں، ایک ایک تھالی میں کئی کئی آدمیوں نے مل کر کھایا۔"

یہ روزنامچہ یہاں آکر ختم ہو جاتا ہے لیکن سفر ابھی پورا نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے یہ داستان تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہے، اس روداد سفر کو ہم بعض خطوط اور دیگر تحریروں سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سفر کے دوران آپ نے جہاز اور حجاز سے اپنے اعزہ

اور متعلقین کو بہت سارے خطوط لکھے، آپ کے ایک شاگرد اور خادم خاص و حاضر باش مولوی مختار احمد مرحوم کا ذکر اوپر کئی مواقع پر آچکا ہے، علامہ اعظمی نے اس سفر میں ان کے پاس جو خطوط لکھے وہ خاصے دلچسپ ہیں، ان میں سے چند ایک ایسے ہیں جو بڑی شرح وبسط اور فرحت وانبساط کے عالم لکھے گئے ہیں، جن کا ذکر انشاء اللہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا، ۲۷/ اگست ۱۹۵۲ء مطابق ۷/ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ بروز چہار شنبہ مکہ معظمہ سے لکھتے ہیں:

"صفا پر سید حسن اکبر صاحب کے مکان میں اس وقت قیام ہے، جس بالا خانہ پر ہم ہیں وہاں سے وہ مقام جہاں سے إن الصفا والمروة پڑھ کر سعی شروع کی جاتی ہے، شاید بیس گز کے فاصلے پر ہو، شب وروز مسلسل سعی کرنے والوں کی آوازیں کان میں آتی رہتی ہیں، اور ابتدائے مسعی سے کئی گز دور تک ان کی سعی کا منظر نگاہوں کے سامنے ہے، چونکہ اس سال ۲۵/ برس کے بعد جمعہ کو حج ہو رہا ہے اس لئے مجمع بھی بہت زیادہ ہے، بعض اوقات ہمارے بالا خانہ کے سامنے تک سعی کی سڑک پر بھی صفیں لگ جاتی ہیں، آج رات میں بالکل صبح منی کی روانگی ہے اب کئی دنوں کے بعد وہاں سے واپس ہو کر خط لکھنا ممکن ہوگا، اس لئے میں نے سوچا کہ آج فرصت نکال کر خط لکھ دوں، جہاز کے غیر وطنی رفقاء یہاں الگ الگ جا پڑے، اکثر سے ابھی تک ملاقات بھی نہیں ہوئی، وطنی لوگ البتہ چلے آرہے ہیں اور اکثر مسائل پوچھنے والے بھی آتے ہیں، کل مولانا عبداللہ زمزمی نے مالابار کے بہت سے پان ہدیہ کئے، ہم جو پان بمبئی سے لائے ہیں اکثر سوکھ چکے، پھر بھی امید ہے کہ عرفات ومنیٰ سے واپسی کے بعد بھی دو ایک دن چلیں گے، اس لئے ابھی تک اس کی تکلیف نہیں ہے، یہاں گرمی کافی ہے، لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں ہے، بمبئی سے روانہ ہونے کے بعد آج پہلے دن میں نے مذاق کے مطابق کھانا پایا، جدہ میں بھی تقریباً بھوکا ہی رہا، میں بہت دبلا ہو گیا ہوں، مگر پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، الحمد للہ نہ مریض ہوں نہ کوئی دوسری بات، بس جہاز میں غذا نہ

ملنے کی وجہ سے لاغری ہے، ویسے طبیعت بحمد للہ ہشاش بشاش ہے، سید صاحب مجھ سے بھی اچھے ہیں۔"

جہاں ایک دنیا علامہ اعظمی سے عقیدت و محبت رکھتی تھی، وہیں اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی تھے جن کو آپ سے بلاوجہ کی کد اور پرخاش رہا کرتی تھی، اور جو وقتاً فوقتاً آپ کے درپئے آزار بھی رہا کرتے تھے، آپ جب حج کیلئے روانہ ہوئے تو اس قماش کے کچھ لوگوں نے آپ کی بابت کچھ بے سروپا باتیں اڑائیں، ممکن ہے آپ کے وہ حریف جو چند مہینے قبل یوپی اسمبلی کے الیکشن کے موقع پر آپ کے مقابلے میں بری طرح مات کھا چکے تھے بوکھلاہٹ کا شکار رہے ہوں اور آپ کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھا کر من گھڑت قصے مشہور کئے ہوں، اور اس کی خبر مولوی مختار صاحب نے خط کے ذریعہ آپ کو دی ہو تو اس کے جواب میں ۲۲/ ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۱/ ستمبر ۱۹۵۲ء کو مکہ مکرمہ سے ایک خط میں یہ لکھنا پڑا ہو:

"میں نے شاستری جی کے باب میں کوئی خط مولوی حفظ الرحمٰن یا کسی دوسرے کو نہیں لکھا یہ کسی دشمن کی کارروائی ہے، میں اس قسم کی حرکات کا نہ عادی ہوں، نہ ایسی باتوں سے مجھے کوئی دلچسپی ہے، میری دوستی یا دشمنی اس طرح کی نہیں ہوتی۔"

اس سفر میں مولوی مختار مرحوم کے نام جو متعدد خطوط لکھے ان میں ایک مکتوب ۱۴/ محرم ۱۳۷۲ھ مطابق ۴/ اکتوبر ۱۹۵۲ء کا مدینہ منورہ پہونچنے کے دو تین بعد کا تحریر فرمودہ ہے، اس میں لکھتے ہیں:

"الحمد للہ کہ ہم لوگ یکم اکتوبر ۱۹۵۲ء کو عشا کے وقت مدینہ منورہ پہونچے، میری طبیعت بحمد اللہ اچھی تھی، اس لئے کوئی تکلیف نہیں، آنے کے ساتھ ہی تم لوگوں کے خطوط مل گئے تھے، مگر کچھ تو کسل اور کچھ یہاں کی مشغولی کی وجہ سے جواب آج لکھنے کی نوبت آئی، ابھی ابھی قبا وغیرہ سے واپس آیا ہوں، یہاں کا موسم مکہ معظمہ سے اچھا ہے، اس دفعہ مولانا مدنی کے بھائی کے مدرسہ میں

قیام ہے، مفتی مہدی حسن صاحب وغیرہ کا ساتھ ہے، مسجد نبوی اور مدرسہ کے درمیان سوائے راستہ کے کوئی دوسری چیز حائل نہیں ہے۔"

مدینہ منورہ سے ہی ۲۳ر محرم مطابق ۱۳ر اکتوبر کو ایک بہت مفصل خط لکھا، پورا خط نقل کرنے کی گنجائش نہیں، مگر اس کا کچھ حصہ ہدیۂ ناظرین ہے، لکھا ہے:

"... میں نے تم سب کی طرف سے حضور اقدس میں سلام عرض کر دیا ہے، اپنے حق میں اکثر سلام کے بعد عرض کیا کرتا ہوں

فکن لی شفیعا یوم لا ذو شفاعة : بمغن فتیلا عن حبیب بن صابر (۱)

... گھر پر خرچ کیلئے معلوم نہیں روپیہ ہے یا نہیں، رشید احمد نے کچھ نہیں لکھا، مفتی صاحب وغیرہ اور سارے حجاج بہت پریشان ہیں، جدہ میں ہوتا تو تم لوگوں کے خطوط سے جی بہلتا مگر وہاں کا قیام بہت تکلیف دہ ہے، تم لوگوں کا جی اب مجھ سے بھر گیا اس لئے کچھ خیال نہیں کرتے، حالانکہ میں یہاں پہونچ کر بھی تم لوگوں کو نہیں بھولا، اپنے بچوں وغیرہ کے ساتھ تم لوگوں کو ہر موقع پر یاد رکھا

---

(۱) صحابی رسول حضرت سواد بن قاربؓ کا شعر ہے، جسے علامہ اعظمی نے اپنے حسب حال بنایا ہے، اصل شعر یوں ہے:

فکن لی شفیعا یوم لا ذو شفاعة بمغن فتیلا عن سواد بن قارب

سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہے گئے ایک قصیدے کا یہ آخری شعر ہے، جس کو احمد بن عبدالسلام جراوی نے الحماسة البصریة (۱/۸۷) میں غلطی سے ایک دوسرے صحابی سواد بن غزیہ کی طرف منسوب کیا ہے، جبکہ حافظ ابو نعیم اصفہانی نے معرفة الصحابة (۳/۱۴۶) اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے اصابہ (۲/۹۶) میں اس کی نسبت سواد بن قارب کی طرف کی ہے، ان دونوں کتابوں میں الفاظ کا ذرا سا فرق ہے اور "بمغن فتیلا..." کی جگہ پر "سواك بمغن ..." ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے:
(میری اس دن شفاعت فرمایئے جس دن کوئی شفاعت کرنے والا سواد بن قارب (حبیب بن صابر) کے کچھ کام نہیں آسکتا)

بہر حال جو مجھے پوچھتا ہو اس کو سلام کہو، اگر چہ غریب الدیار و آوارۂ وطن کو پوچھ ہی کون سکتا ہے، میں نے رشید احمد کو نہیں لکھا کہ اس سفر میں جب بھی اپنے بچے یا تم لوگ یاد آگئے ہو نم دیدہ ہو گیا ہوں، مگر تم لوگوں کیلئے یہ طویل فرصت آزادی، بے قیدی اور اپنی مرضی کے مطابق رہنے سہنے کا ایک زریں موقع ہاتھ آگیا ہے، خیر مجھے یقین ہے آج نہیں تو کل میری قدر ہو گی، خط طویل ہوتا جاتا ہے اور جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں اس کا عشر عشیر بھی نہیں لکھ سکا اور نہ لکھ سکتا، کوشش کرو کہ بے کہے سمجھ جاؤ۔

اگر کوئی دوسرا انتظام نہ ہو سکا تو غالباً یکم نومبر کو یہاں سے روانگی ہو گی، یہ سولہ دن خدا بہتر جانتا ہے کیسے کٹیں گے، مسجد نبوی میں جتنی دیر ٹھہرنا ہوتا ہے وہ ساعت تو غنیمت کبریٰ ہے، اس وقت نہ کوئی گھبراہٹ ہوتی ہے نہ پریشانی، مگر مسجد سے باہر جو وقت گذرتا ہے مشکل سے ختم ہوتا ہے، لیکن ہمہ وقت مسجد میں رہنا بھی ممکن نہیں ...“

۱۴/ اکتوبر کو جدہ سے تحریر فرما رہے ہیں:

”میں آج خط لکھنے کے قابل نہیں ہوں، زکام، درد سر اور درد جسم سے پریشان ہوں، ۱۶۔ا۔ کا جہاز کل ۲۳/ کو روانہ ہو گیا اور ان شاء اللہ ۸۔ نومبر کو غالباً یہی جہاز روانہ ہو گا، جس سے تمام رفقاء سفر روانہ ہوں گے، میں بہت کمزور ہو گیا اور اب زیادہ قیام سے جی بھی گھبرا رہا ہے اور کمزوری بھی بڑھتی جاتی ہے، اس لئے مجبوراً ۲۸/ اکتوبر کو ہوائی جہاز سے ان شاء اللہ تعالیٰ چلا آؤں گا، مولوی عبدالجبار کی رفاقت ومعیت کی حرص میں کل کا جہاز ٹکٹ ملنے کے باوجود چھوڑ دیا، مگر اب مصلحت یہی معلوم ہوتی ہے کہ ہوائی جہاز سے چلا آؤں۔“

۶/ نومبر کو مکہ معظمہ سے لکھے گئے ایک خط میں ارقام فرماتے ہیں:

"عزیزم مختار احمد سلمہ اللہ

سلام مسنون ودعاہا، میں ۳/ نومبر سے مکہ مکرمہ میں ہوں، تم لوگ ہوائی جہاز سے میرا انتظار کر رہے ہو گے، مگر یہاں قصہ ہے کہ

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جاکمند   دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

۲۸ کے بعد خبر ملی کہ ۳۱/ اکتوبر کو جہاز جائے گا، مگر ۳۱ کو یہ اطلاع پہونچی کہ اب ۲/ نومبر کو جائے گا اور اب انشاء اللہ اس میں تخلف نہ ہوگا، مگر افسوس کہ ۲/ کی صبح بالکلیہ پیام یاس سنا دیا گیا، اس لئے میں ۳/ کو یہاں چلا آیا، اور ۵/ کو مولوی عبدالجبار کو بھی یہیں بلالیا، خیال تھا کہ یہاں سے بعد نماز جمعہ (۷۔ نومبر کو) جدہ اور ۸ کو جدہ سے بسوئے بمبئی روانگی ہوگی مگر

ما کل ما یتمنی المرء یدرکہ   تجری الریاح بما لا تشتھی السفن

اب یہ اعلان ہو گیا کہ مظفری ۱۴/ کو جدہ سے روانہ ہوگا، عزیز من! حق تعالیٰ کی بندہ نوازی ہے کہ اس نے اس سفر میں دوبارہ اپنے گھر کی زیارت کرائی، اور اب کی دفعہ بحمدہ تعالیٰ شب و روز باب الوداع پر، عین اس جگہ جہاں بیت ام ھانی تھا، رہتا ہوں، اور "مان نہ مان میں تیرا مہمان" بس انھیں کا مہمان بنا ہوا ہوں، وہ اپنے بندوں سے مہمان نوازی کراتے ہیں، میں یہاں اپنے ساتھ بدن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں لایا ہوں، حتی کہ رومال بھی جدہ میں چھوڑ آیا ہوں، مگر الحمد للہ بستر تکیہ چادر سب موجود ہے، پان کا سامان بھی مل گیا ہے، الحمد للہ سوکھے پانوں کے بنے ہوئے بیڑے ہمہ وقت مہیا ہیں، شب و روز میں کسی وقت "سیاہ پوش نگار" آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا، راتوں کو (اولاً چاندنی راتیں ہیں، پھر بجلی کے قمقمے اندھیری راتوں کو بھی حرم میں شب ماہتاب بنائے رہتے ہیں) گھنٹوں بیٹھا اس کے دیدار سے آنکھوں کو منور اور دل کو مسرور کرتا رہتا ہوں، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس گھر کے مالک نے اپنے بندوں کے قلوب میں جو رحمت و مودت ودیعت

فرمائی ہے اس کے تقاضا سے اعزہ اقرباء کی اس تکلیف کے تصور سے جو ان کو ہمارے انتظار میں ہو گی ایک قلبی اذیت ہے، مگر افسوس کہ اس کا کوئی علاج اختیار میں نہیں ہے، میں تو آج آمادہ ہوں کہ کوئی جہاز ارزاں نرخ پر ہندوستان پہونچا دے تو چلا آؤں، مگر جس کے گھر ہوں جب تک اس کا حکم نہ ہو کچھ نہیں ہو سکتا

وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ رب العالمین ۰۰۰"

اس سفر سے آپ کی واپسی بذریعہ ہوائی جہاز ہوئی، راستے میں کئی مقامات پر توقف کرنے کے بعد بمبئی پہونچے اور وہاں پر کئی دن کے قیام کے بعد مئو کیلئے روانہ ہوئے، اور کس سادگی سے مئو پہونچے اس کی نسبت ایک مختصر سی یادداشت میں لکھتے ہیں:

"۹ر نومبر ۱۹۵۲ء ۲۱ر صفر ۱۳۷۲ھ کو جدہ ہوائی اڈہ پر جیبوتی ایرویز پر ۹ر بجے عربی ٹائم (۳ بجے شب) سے سوار ہوئے، ۲۔ بجے عربی (۱۰ر نومبر تقریباً ۸ بجے صبح) بحرین ہوائی اڈے پر پہونچے، تھوڑی دیر کے بعد شہر میں ایک ہوٹل میں قیام کیا، بعد نماز ظہر بحرین کے بازار کی سیر کی، یہاں ہندوستانی تاجر دوکاندار بہت ہیں، اردو عموماً لوگ سمجھ لیتے ہیں، عربی اور ایرانی زیادہ بولی جاتی ہے، اصل زبان عربی ہے یہاں تازے پان ملتے ہیں، ۴ر کے ۸ پان ہم نے بھی لئے۔

۱۰ر نومبر ۳ بجے شب میں ہوائی جہاز بحرین سے روانہ کر ۱۱ر نومبر ۷ بجے صبح مسیرہ پہونچا، وہاں سے ۸۔ بجے اٹھا اور بمبئی ۲۔ بجے دن میں سانتا کروز پر اترا۔ ۱۳ر کو ساڑھے بارہ بجے شب میں کاشی اکسپریس سے ہم مئو روانہ ہوئے۔

۱۵ر نومبر ۱۹۵۲ء کو ہم ۲ بجے دن مئو اسٹیشن پہونچے، ہم نے کسی کو اطلاع نہیں کی تھی، اس لئے اسٹیشن پر یا بنارس میں کوئی نہیں ملا، جس کی خوشی کوئی ہم سے پوچھے، مئو پہونچ کر دو رکشے کئے، ایک پر میں اور ایک پر مولوی عبدالجبار سیدھے اپنے مکان پہونچے۔"

لکھنؤ میں قیام اور دارالمبلغین میں سلسلۂ افادات

امام اہلسنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی علیہ الرحمہ سے آپ کا تعلق زمانۂ طالب علمی سے تھا، یہ تعلق روزافزوں رہااور مرورزمانہ کیساتھ اتنا قوی اور وسیع ہوا کہ حضرت امام اہلسنت کے جملہ اہل خانہ و متوسلین کے ساتھ رشتۂ صداقت و محبت قائم ہو گیا۔ ۱۳۵۱ھ میں امام اہلسنت نے لکھنؤ میں دارالمبلغین قائم کیا تھاتواس کو قوت واستحکام عطا کرنے کیلئے سب سے پہلے علامہ اعظمی کو دعوت دی تھی اور انھوں نے تقریبادو مہینے دارالمبلغین میں قیام فرماکرامام اہلسنت کی فرمائش کی بجاآوری کی تھی، علامہ اعظمی لکھتے ہیں:

"پھر جب امام اہلسنت نے دارالمبلغین کی بنیاد ڈالی توکام کی ابتداء اور بنیاد کو مستحکم کرنے کیلئے سب سے پہلے اس ناچیز کو منتخب کیا، ناچیز نے اس مقصد کیلئے کم وبیش دوماہ دارالمبلغین مین قیام کیا۔"(۱)

"اس طرح اس ادارہ کے قیام کے وقت سے کسی نہ کسی جہت سے آپ کی وابستگی رہی، لیکن جب ۱۹۵۲ مطابق ۱۳۷۱ھ میں بحیثیت ممبر اسمبلی آپ کا انتخاب عمل میں آیا توپانچ سال تک لکھنؤ میں قیام پر مجبور ہوئے، علامہ اعظمی سیاسی آدمی تھے نہ سیاست سے آپ کو کوئی سروکار، آپ نے جو خالص علمی مزاج پایا تھااس کے تحت حکومت کی طرف سے فراہم کردہ سرکاری قیام گاہ میں قیام نہایت وحشت خیز ثابت ہوتا، اوراس سے بھی زیادہ صبر آزما تعلیمی، تدریسی اور علمی سرگرمیوں سے بے تعلقی اور تصنیف وتحقیق کے مشاغل سے قطع تعلق ہوتا۔ اس پریشانی کا حل یہ نکالا کہ دارالمبلغین میں قیام کرنے کو سرکاری قیام گاہ پر ترجیح دی،، اسی زمانہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء اور وہاں کے منتظمین و متعلقین سے بھی آپ کے تعلقات بڑھے،

(۱) المآثر ج ۷ ش ۳ ص ۸۱

تعلقات پہلے بھی کبھی خراب نہ تھے، لیکن اس زمانہ میں مزید وسعت وقوت آئی، دارالمبلغین اور ندوۃ العلماء ان دونوں اداروں کے مدرسین وطلباء نے آپ کے لکھنؤ کے قیام کو غنیمت باردہ جانا اور خوب خوب کسب فیض کیا، اور خود علامہ اعظمی نے بھی وہاں کے کتب خانوں بالخصوص ندوہ کے کتب خانے میں موجود مطبوعات و مخطوطات سے بھرپور استفادہ کیا:

منعم بدشت وکوہ وبیاباں غریب نیست ہر جاکہ رفت خیمہ زدو بارگاہ ساخت

مولانا سعید الرحمٰن صاحب اعظمی ایڈیٹر البعث الاسلامی فرماتے ہیں:

"وفی هذه الایام بالذات أتاح الله سبحانه و تعالی لأستاذنا الجلیل العلامة الأعظمی أن ینتخب عضواً فی مجلس الشیوخ لولایة اترا برادیش، و تحتم علیه أن یقضی معظم أوقاته فی لکناؤ ، و فعلاً رضی بالاقامة فی مدرسة دارالمبلغین التی أسسها امام أهل السنة فضیلة الشیخ الکبیر عبدالشکور الفاروقی-رحمه الله- لتعلیم العلوم الاسلامیة و تدریب الطلبة علی الاسلام علی الوجه الصحیح ، فکانت اقامة العلامة المرحوم فی هذه المدرسة بمثابة سند قوی لطلبة العلم والمدرسین فیها الذین کانوا یراجعونه فی المشکلات العلمیة و یستفیدون من وجوده ولا سیما علماء أسرة امام اهل السنة کالشیخ عبدالرحیم الفاروقی شقیقه الصغیر والشیخ عبدالسلام الفاروقی نجله الکبیر- رحمهما الله تعالی - و غیرهما و کانوا فرحین جدا باقامة العلامة الاعظمی فی هذه المدرسة ،وانتهزت أنا هذه الفرصة و تابعت زیارة الاستاذ الکبیر والاستفادة منه، فکنت احضر کل یوم بعد صلاة العصر وأجلس لدیه وأستفید منه ، واعتبرت ذلك نعمة من الله کبیرة علیّ. (۱)

(۱) البعث الاسلامی، جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ۔ نومبر ۱۹۹۲ء۔ ص ۸۵۔ ۸۴

مولانا موصوف نے انھیں الفاظ کو معمولی سی کمی و بیشی کے ساتھ خود ہی اردو کا جامہ بھی پہنایا ہے، لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ترجمہ خود انھیں کی زبانی سن لیں:

"انھیں ایام میں علامہ اعظمی کو اسمبلی کا رکن منتخب کیا گیا جس کی وجہ سے لکھنؤ میں ان کا قیام لازمی سا ہو گیا، آپ امام اہلسنت مولانا عبدالشکور صاحب علیہ الرحمہ کے قائم کردہ مدرسہ دارالمبلغین میں فروکش ہوئے، مولانا کی ذات مدرسہ کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی، اس مدرسہ میں طلبہ سے لے کر اساتذہ تک علامہ اعظمی کے وجود کو مغتنم سمجھتے رہے، اور مشکل و پیچیدہ مسائل میں مولانا کی طرف مراجعت کیا کرتے۔ اس استفادہ میں خانوادۂ فاروقی کے افراد مولانا عبدالرحیم فاروقی، ان کے برادر اصغر، اور مولانا عبدالسلام صاحب فاروقی پیش پیش تھے اور اپنی قسمت پر ناز کرتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ عصر کے بعد علامہ اعظمی کی مجلس لگتی تھی جس میں مستفیدین اور بڑے بڑے علماء کرام موجود ہوتے تھے، میں بھی مجلس میں پابندی کے ساتھ حاضر ہوتا اور زریں موقع سے استفادہ کی بھرپور کوشش کرتا رہا(۱)

جمعیۃ علماء ہند کی رکنیت | سرگرم سیاست سے آپ کا تعلق اگر چہ نہیں تھا، لیکن قومی و ملی مسائل سے آپ کی دلچسپی تقسیم وطن سے پہلے بھی رہی اور بعد بھی، اور یہی محرک تھا کہ جمعیۃ العلماء کے جلسوں اور اجلاسوں میں اکثر و بیشتر شرکت فرماتے، جمعیۃ کے اراکین و عہدیداران کے نزدیک آپ کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور آپ کی رائے اور مشورہ کی قدر کی جاتی تھی، جس کا اندازہ ذیل میں مذکور دو خطوں سے ہوگا جو مولانا احمد سعید دہلوی (۲) کے لکھے ہوئے ہیں، پہلا خط ۱۴ر مئی ۱۹۴۴ء کا نوشتہ ہے، اس کی

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۳ ص ۱۹-۱۸

(۲) حافظ احمد سعید دہلوی جمعیۃ علماء ہند کے ناظم و صدر کے عہدوں پر فائز رہ چکے تھے، اپنے وقت کے =

عبارت یہ ہے:

"مخدوم ومکرم زید مجدکم

السلام علیکم۔ایک عریضہ پیشتر ارسال خدمت کر چکا ہوں، اس گرمی میں آپ کو تکلیف دینے کی وجہ یہ ہے کہ بعض معاملات نہایت اہم پیش آگئے ہیں، مسئلہ حج کے متعلق ابھی آواز بلند نہ کی گئی تو امسال بھی حج کی اجازت ملنا موہوم ہوگا، اسی طرح فلسطین میں سخت قوانین کا نفاذ ہو رہا ہے۔ عراق و ایران کی آزادی کا مسئلہ ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کانگریس اور لیگ کی گفتگو شروع ہونے والی ہے ،اور گورنمنٹ سے غالباً کوئی سمجھوتہ ہوگا، اس سے پیشتر کہ یہ باتیں ہوں، جمعیۃ علماء ہند کی تجویز جو لاہور میں پاس ہوئی ہے اس کا اعلان کرنا ہے، اسی طرح مقامی صوبہ دہلی کے بعض امور ہیں جن کے متعلق آواز بلند کرنی ہے ان تمام امور کا خیال کرتے ہوئے آپ کی شرکت اس اجلاس میں بہت ضروری ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ جمعیۃ علماء اور مسٹر جناح کا بھی آپس میں تبادلہ خیالات

=بلند پایہ اور زبان آور خطیب تھے، زور خطابت کی وجہ سے "سحبان الہند" کے خطاب سے سرفراز ہوئے، ۱۸۸۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، تعلیم کا آغاز حفظ قرآن سے کیا، ۱۳۲۸ھ میں مدرسہ امینیہ دہلی میں داخل ہوئے اور وہیں سے ۱۳۳۶ھ میں فراغت پائی، ملکی سیاست میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ جہاد آزادی میں پیش پیش اور انگریزی حکومت کے خلاف برسرپیکار رہے، اپنی سیاسی زندگی میں ۸ دفعہ جیل گئے، جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ رہے اور مولانا مدنیؒ کے انتقال کے بعد اس کے صدر منتخب ہوئے، ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کے بعد مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی اور بالخصوص دہلی کے مسلمانوں پر جو تباہی نازل ہوئی، اس میں مسلمانوں کی حفاظت کیلئے مثالی اور ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا، ۴؍دسمبر ۱۹۵۹ء مطابق ۱۳۷۹ھ کو دہلی میں وفات پائی۔

(کاروان رفتہ ۲۱۔۲۰)

ہو، لہٰذا دہلی پہنچنا آپ کا ضروری ہے۔"

اس خط کے دو ہی دن بعد ۱۶؍ مئی ۴۴ء کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"محترم و مکرم زید مجدکم

السلام علیکم۔ جناب کی خدمت میں یکے بعد دیگرے دو عریضے ارسال کر چکا ہوں، میرے ان عریضوں سے جمعیۃ علماء صوبہ کے سالانہ اجلاس کی اہمیت اور ضرورت کا علم ہو گیا ہوگا، میں آپ کے جواب کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں، آپ کے جواب موصول ہونے پر پروگرام کی ترتیب موقوف ہے۔ آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ آپ کو تین دن کی نیت سے آنا چاہئے تاکہ سبجیکٹ کمیٹیوں میں آپ کی رائے اور اجلاس عام میں آپ کی تقریر سے استفادہ کیا جا سکے..."

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات سے جمعیۃ علماء کے اعلیٰ عہدیداروں کے نزدیک علامہ اعظمی کی رائے اور مشورے کی قدر و قیمت کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، یہ دونوں خط جس وقت کے ہیں ممکن ہے صوبائی جمعیۃ کی رکنیت حاصل رہی ہو، اس وقت تک آپ مرکزی جمعیت کے رکن نہیں ہوئے تھے، تا آنکہ ۱۹۵۳ء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ نے مرکزی جمعیۃ علماء ہند کی رکنیت کے لئے آپ کا انتخاب فرمایا، اس وقت کے ناظم عمومی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ایک خط میں جو ۱۱؍ اگست ۱۹۵۳ء کا مکتوب ہے اطلاع دیتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

"بڑی مسرت کے ساتھ یہ اطلاع آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں کہ صدر محترم حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی نے مرکزی جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کی چند خالی شدہ نشستوں میں سے ایک نشست پر آپ کو بحیثیت رکن نامزد فرمایا ہے۔

امید ہے کہ آپ اس نامزدگی کو قبول فرمائیں گے اور بواپسی ڈاک اپنی

منظوری سے مجھے مطلع فرما کر ممنون فرمائیں گے۔"

مجلس انتظامی دارالعلوم ندوہ کی رکنیت ۱۹۵۴ء میں دارالعلوم ندوہ نے بھی اپنی انتظامی کمیٹی کا رکن منتخب کیا، ۵/اپریل ۱۹۵۴ء کو لکھے گئے ایک خط میں ناظم ندوہ مولانا ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم نے اس کی اطلاع دی:

"میں دلی مسرت کے ساتھ اطلاع دیتا ہوں کہ مجلس انتظامی ندوۃ العلماء منعقدہ ۲۵/مارچ ۵۴ء نے آپ کو مجلس انتظامی ندوۃ العلماء کا رکن منتخب کیا ہے، امید ہے کہ آپ اس انتخاب کو منظور فرمائیں گے اور از راہ کرم اپنی منظوری سے مجھ کو مطلع کریں گے۔"

یرقان کی بیماری اور شفایابی ۱۹۵۵ء کے اواخر میں آپ کے اوپر یرقان کی شدید بیماری کا حملہ ہوا، جس کی نسبت تحریر فرمایا ہے:

"ابتلائے فقیر حبیب الرحمٰن الاعظمی بمرض یرقان بتاریخ ۲۴/دسمبر ۵۵ء وشفایابی ازاں در اواخر جنوری ۵۶ء مطابق اوائل جمادی الاخری ۷۵ھ"

(فقیر حبیب الرحمٰن الاعظمی ۲۴/دسمبر ۵۵ء کو یرقان کی بیماری میں مبتلا ہوا، اور جنوری ۵۶ء کے اواخر مطابق جمادی الاخری ۱۳۷۵ھ کے اوائل میں اس سے شفایاب ہوا)

بیماری کی اس خبر سے علمی حلقوں میں تشویش واضطراب کی لہر دوڑ گئی، اہل علم نے جب اس تشویشناک خبر کو سنا تو آپ کی صحت و تندرستی اور خیر وعافیت کے لئے خدا سے دعا مانگی، چنانچہ یہ خبر جب روزنامہ "الجمعیۃ" میں شائع ہوئی تو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی (۱) نے آپ کے پاس ۱۶/جنوری ۱۹۵۶ء کو یہ خط لکھا:

(۱) مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ۱۱/صفر ۱۸۹۲ء کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم لدھیانہ جالندھر اور امرتسر کے مدرسوں میں پائی، اور دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، پوری زندگی=

"۰۰۰ آج اخبار الجمعیۃ میں یہ خبر پڑھ کر بہت ہی تشویش ہو گئی ہے کہ آپ یرقان کی بیماری میں شدید مبتلا ہیں، اور اخبار میں یہ بھی لکھا ہے کہ غذا نہ ملنے کے باعث کمزوری بہت بڑھ گئی ہے، میں نے جس وقت سے یہ خبر پڑھی ہے اسی وقت سے برابر آپ کے لئے دعا کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے ۰۰۰" (۱)

استدراک بر شرح مسند احمد عصر حاضر کے ایک بڑے مصری عالم و محدث شیخ احمد محمد شاکر نے مسند امام احمد بن حنبل کی تحقیق کر کے اسے شائع کیا شیخ احمد شاکر نے اس کتاب کی تیسری جلد میں یہ اعلان شائع کیا کہ:

"میں اطراف عالم کے علماء حدیث سے یہ امید کرتا ہوں کہ اس مسند پر جہاں کہیں ان کو کوئی استدراک یا ملاحظہ یا بحث و تعقیب نظر آئے، اسے میرے پاس بھیج دیں، ان ملاحظات کی تمحیص و تجزیہ کرنے کے بعد جو تحقیق سے میرے نزدیک صحیح ثابت ہوگا، ان کو میں آنے والے اجزاء میں ذکر کر دوں گا۔"

= انگریزوں کے خلاف جہاد کیلئے وقف کر رکھی تھی، جس کی پاداش میں متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں، تحریک خلافت میں پیش پیش رہے، پھر جب مجلس احرار قائم ہوئی تو اس میں شامل ہو گئے، ایک عرصہ تک احرار کے صدر بھی رہے، شروع ہی سے جمعیۃ العلماء سے وابستہ ہو گئے تھے اور عرصۂ دراز تک اس کے رکن رکین رہے، آپ کا شمار احرار کے شعلہ بیان خطیبوں میں ہوتا تھا، تقسیم وطن کے بعد لدھیانہ سے دہلی آگئے اور زندگی کے باقیماندہ ایام وہیں گذارے، اور وہیں سے فساد کے شکار مظلوموں اور ضرور تمندوں کی حاجت روائی اور چارہ جوئی کیلئے جدوجہد کرتے رہے، ۱۱ر صفر ۱۳۷۱ھ کو دہلی میں وفات پائی، اور جامع مسجد شاہجہانی کے شمالی جانب اس کے ملحقہ قبرستان میں مدفون ہوئے۔ (تاریخ دار العلوم دیوبند ۲: ۱۴۶۔ ۱۴۴۔ المآثر ج ۶ ش ۴ ص ۹۶۔ ۹۵)

(۱) المآثر ج ۶ ش ۴ ص ۴۶

اس اعلان کے بعد آٹھ سال تک کہیں سے ان کو کوئی استدراک و تعقیب یا ملاحظہ موصول نہیں ہوا، آٹھ سال بعد ذیقعدہ ۱۳۷۵ھ میں مصر، بلکہ عالم اسلام سے ہزاروں میل دور سے ان کے پاس ایک طویل ترین استدراک پہنچا، جسے دیکھ کر شیخ احمد شاکر کی حیرت و مسرت کی انتہانہ رہی، یہ استدراک علامہ اعظمی کا تھا، اس استدراک کو شیخ احمد شاکر نے مسند کی پندرہویں جلد میں بعینہٖ شائع کیا اور اس کی تمہید میں بڑے بلند آہنگ اور توصیفی الفاظ میں علامہ اعظمی کا ذکر کیا، اور شکریہ کا اظہار فرمایا، یہ استدراکات مسند احمد کی پندرہویں جلد کے پچاس صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، جبکہ علامہ اعظمی نے صرف آٹھ ہی جلدوں پر استدراک لکھا تھا۔

دارالعلوم ندوہ میں صحیح بخاری کا درس جن دنوں آپ اسمبلی کے ممبر تھے آپ کی مدت رکنیت ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث شاہ محمد حلیم عطا کا صفر ۱۳۷۵ھ میں وصال ہو گیا، مولانا حلیم عطا کی وفات ندوہ کیلئے ایک عظیم حادثہ تھا، یہ ایسا سانحہ تھا جس کی وجہ سے وہاں کی مسند حدیث خالی ہو گئی تھی، لیکن یہ ندوہ کی خوش بختی تھی اور خداوند قدوس کا عجیب و غریب کرشمہ کہ ندوہ کو فوراً ہی ایک نعم البدل مل گیا، اہل ندوہ بالخصوص مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی نے علامہ اعظمی کی خدمت میں یہ درخواست گذاری کہ وہ اپنی ذات سے دارالعلوم ندوہ کے اس خلا کو پر کریں، علامہ اعظمی بطیب خاطر اس خدمت کے لئے تیار ہو گئے اور کم و بیش ڈیڑھ سال تک اس کی مسند حدیث کو رونق و زینت بخشتے رہے، مولانا سعید الرحمٰن صاحب اعظمی ندوی نے ان تمام حالات کا بنفس نفیس مشاہدہ کیا ہے اور اپنے اس مشاہدے کی روشنی میں فرماتے ہیں:

"لقد كانت الايام تمضي وأنا مكب على الدراسة والاستفادة اذ قيض الله سبحانه و تعالىٰ أن تنتدب جامعة ندوة العلماء ، محدث الهند الكبير الشيخ الاعظمي -رحمه الله- منتهزة فرصة اقامته في

لكناؤ ، ولكى يشغل مشيخة الحديث فيها ، التى حدثت بوفاة المحدث الكبير فضيلة الشيخ محمد حليم عطاء - رحمه الله - فى شهر صفر ١٣٧٥ھ (شيخ الحديث فى ندوة العلماء)، فما استطاع المحدث الاعظمى أن يرفض طلب سماحة العلامة الندوى، و أبدى استعداده لذلك خلال إقامته فى لكناؤ ، مما بعث السرور فى النفوس أساتذة و طلابا ٠٠٠ و بدأ العلامة الأعظمى يدرس صحيح البخارى فى السنة النهائية للاختصاص فى الشريعة الاسلامية، و غمر السرور قلوب الطلبة و اعتزوا بذلك"

اس اقتباس کو اردو زبان میں خود مولانا سعید الرحمٰن صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمایئے، لکھتے ہیں:

"میں زندگی اسی انداز سے گذار رہا تھا کہ دار العلوم ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں علامہ اعظمی کے قیام کو بنا غنیمت سمجھ کر ان کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی، تاکہ مولانا شاہ محمد حلیم عطا کی موت سے مسند حدیث ایک مدت سے جو سونی پڑی تھی، اس کو زینت بخشیں، یہ درخواست استاذ گرامی حضرت (مولانا علی میاں صاحب مدظلہ) نے کچھ اس طرح پیش کی کہ وہ اسے مسترد نہ کر سکے۔ اور لکھنؤ میں قیام کی حد تک اس کے لئے تیار ہو گئے، یہ خبر مژدۂ جانفزا بن کر طلبہ و اساتذہ کے درمیان پھیل گئی اور تمام لوگوں نے انتہائی مسرت کا اظہار کیا، اس زمانہ میں مولانا عمران خاں ندوی (۱) دار العلوم کے مہتمم تھے، انھوں نے علامہ اعظمیؒ

(۱) مولانا عمران خاں ندوی بھوپال کے رہنے والے تھے، ندوہ سے فراغت پائی اور جامع ازہر مصر میں تعلیم حاصل کی، سید سلیمان ندویؒ کے شاگرد عزیز تھے، دار المصنفین کے رکن اور ندوہ کے مہتمم رہ چکے تھے، بھوپال کی عظیم الشان مسجد تاج المساجد کی تعمیر نوان کا خاص اور یادگار کارنامہ ہے، انتظام و انصرام، عزم و ارادہ اور قوت عمل میں اپنی مثال آپ تھے، تقریباً ۱۸ ر سال تک ندوہ کے مہتمم رہے ۲۲ ر

کے گھنٹوں کی ترتیب قائم کی اوران کے قیام کا معقول انتظام کیا، اور علامہ اعظمی فضیلت کے سندی سال والوں کو بخاری شریف کا درس دینے لگے"(۱)

دارالعلوم ندوہ کی اس خدمت کا آپ نے کوئی معاوضہ نہیں قبول فرمایا، ندوہ کی طرف سے حق الخدمۃ کے طور پر کچھ رقم پیش بھی کی گئی مگر آپ نے وہ رقم لوٹادی، آپ کی تحریروں میں مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی مدظلہ کے نام کا ایک خط ہے، جو ۲۳ر فروری ۱۹۵۷ء کا مکتوب ہے، پتہ نہیں اس کی نقل روانہ کی گئی یا نہیں، پھر بھی ہم اس کو قارئین کے ملاحظہ کیلئے نقل کئے دیتے ہیں، لکھا ہے:

"صدیقی المحترم سلام مسنون!

پرسوں پانچ سو روپیہ کا ایک بیمہ آیا تھا، میں نے اس کو واپس کر دیا ہے، اس سے آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوں، جب میں آؤں گا اس وقت جو حکم آپ کا ہوگا بسروچشم منظور کروں گا، مگر اس وقت اس کو وصول کرنے کیلئے میری طبیعت کسی طرح آمادہ نہیں ہوئی۔

مجھے پہلے بھی شبہہ تھا اور اب اور قوی ہو گیا کہ شاید جو بات آپ نے طے کی تھی وہ کسی کو بار ہوئی اور اس پر عمل درآمد نہیں ہو سکا، اس لئے آپ نے یہ نئی صورت تجویز فرمائی، جس کا ذکر تقریراً یا تحریراً آپ نے کبھی نہیں کیا تھا، ایسی صورت میں جو میرے کھانے پینے پر مدرسہ کا صرف ہوا اسی کا مجھ کو افسوس ہے چہ جائیکہ مزید کوئی بار ڈالوں۔

کھانسی کی شکایت ابھی باقی ہے، دوا پی رہا ہوں، اب جناب کا مزاج کیسا ہے، مولانا منظور صاحب اگر ہوں تو ان کو بھی سلام کہئے، اور اگر ان کے سفر کا کوئی

= ۲۲ر اکتوبر ۱۹۸۶ء کو ۷۳ برس کی عمر میں وفات پائی، اور بھوپال میں مدفون ہوئے (دیکھئے معارف نومبر ۱۹۸۶ء اور تاریخ ندوۃ العلماء حصہ دوم ص ۴۴۳)

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۳ ص ۱۹

پروگرام ہو تو اس سے مطلع فرمائیے کرم ہوگا"(۱)

(۱) مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پاس جو خطوط دونوں بزرگوں کے موجود ہیں ان کی روشنی میں اس خط کا پس منظر مختصر طور پر ذکر کر دیا جائے، بظاہر سمجھ میں یہ آتا ہے کہ شاہ حلیم عطا علیہ الرحمۃ کے انتقال کے بعد علامہ اعظمی نے عارضی طور پر ندوہ کے اندر صحیح بخاری کا درس دینا منظور فرمالیا تھا، لیکن یہ صورت چونکہ عارضی تھی۔ اس لئے ارباب مدرسہ بالخصوص مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کو اس سلسلہ میں بڑی تشویش تھی، اور ان کی یہ شدید خواہش تھی کہ مولانا اعظمی ندوہ کے اندر مستقل قیام کو منظور فرمالیں، انھوں نے اپنی اس خواہش کا بڑے شدومد کے ساتھ متعدد خطوط میں اظہار کیا اور وہاں کے مستقل قیام کیلئے اصرار کرتے رہے، اس سلسلے میں انھوں نے ۱۳ر محرم ۱۳۷۷ھ کو ایک خط لکھا:

"سب سے پہلے تو اس کا شکریہ ادا کرنا اپنا نہایت خوشگوار فرض سمجھتا ہوں کہ جناب والا نے خادمین دارالعلوم کی یہ درخواست منظور فرمالی کہ حدیث شریف کا درس شروع فرمائیں، اس سے ہم کو جو اعانت و تقویت حاصل ہوئی اس کا اظہار الفاظ میں دشوار ہے، طلبہ و اساتذہ و منتظمین دارالعلوم سب اس بات سے نہایت مسرور ہیں۔

لیکن چونکہ یہ صورتحال عارضی ہے اس لئے ایک بے اطمینانی سی ہے، دارالعلوم کی تعلیم وانتظام کے بارے میں جو سکون واستقرار درکار ہے وہ ایسی صورتحال میں مفقود ہے۔

اس لئے میں آپ سے اب پرزور و باصرار درخواست کروں گا کہ جناب والا دارالعلوم سے مستقل تعلق تدریس کا فیصلہ فرمالیں، مجھے یہ معلوم ہے کہ بعض اہم اداروں نے اس سے پیشتر یہ پیشکش کی تھی اور آپ نے عذر فرمادیا تھا، لیکن ہم کو قوی امید ہے کہ آپ ہم کو مایوس نہ فرمائیں گے، بہت سے اسباب ایسے جمع ہیں جو آپ کے قیام کی سفارش کرتے ہیں اور امید دلاتے ہیں کہ آپ کی ذات سے یہاں انشاء اللہ نفع ہوگا، اور آپ کو یہاں پورا تعاون واعتماد حاصل ہوگا اور سکون قلب ودماغ کے ساتھ علم دین کی خدمت کا موقع ملے گا۔

= ہم آپ سے اس وقت یہ چاہتے ہیں کہ آپ فی الفور صحیح بخاری پڑھائیں، جب نشاط و قوت محسوس ہو تو کچھ اضافہ فرمالیں۔

دارالعلوم اس وقت اپنی مالی دقتوں کے پیش نظر دو سو روپیہ ماہوار پیش کریگا...“

جب مولانا علی میاں صاحب کا اصرار بڑھا تو آپ نے چند شرائط کے ساتھ اس درخواست کی منظوری کی ہامی بھر لی اور وہ بھی بجبر و اکراہ، علامہ اعظمی کی یہ بڑی خوبی تھی کہ وہ جب کسی سے کسی قسم کا بھی معاملہ فرماتے تو اپنی افتادِ طبع، صاحب معاملہ کی طبیعت و مزاج اور نباہ کے تمام پہلوؤں پر غور و فکر فرما کر اپنی شرائط پہلے ذکر فرمادیتے، اس کے بعد ان امور کی پابندی کی پوری کوشش کرتے، چنانچہ مولانا علی میاں کے پیہم اصرار کے بعد جو تحریر آپ نے لکھی وہ حسب ذیل ہے:

”آپ حضرات کی محبت، اخلاق اور پیہم اصرار کی وجہ سے آج میں اپنے کو جس کشمکش میں پاتا ہوں دوسرے کسی موقع پر ایسی سخت کشمکش سے میں دوچار نہیں ہوا تھا، ایک طرف طبیعت کسی پابندی کو قبول کرنے کیلئے کسی طرح آمادہ نہیں ہے، دوسری طرف آپ حضرات کی نجبت اور اصرار کے پیش نظر اس پیشکش کو قطعی رد کردینے کی جرأت اس لئے نہیں ہوتی کہ اس سے بے مروتی اور جفا کا الزام اپنے اوپر عائد ہوتا ہے، اس کی شرمندگی الگ ہے کہ میرے آخری فیصلہ کے انتظار کی مدت زیادہ سے زیادہ طویل ہوتی جارہی ہے، جو آپ حضرات کیلئے موجب کلفت و اذیت ہے، اس لئے ہر چند کہ مجھے اب بھی پورا شرح صدر نہیں ہے لیکن آپ کی محبت کی قدردانی اور اصرار کے احترام کے تقاضے سے آج جناب کو مطلع کرتا ہوں کہ سردست میں دارالعلوم ندوہ سے تعلق کو ترجیح دیتا ہوں۔ اور اس یقین واذعان کی بنا پر ترجیح دیتا ہوں کہ یہ تعلق میری وارستہ مزاجی و آوارہ طبعی سے مزاحم و مصادم نہ ہوگا، اور اس کی وجہ سے مجھ پر کوئی ایسی نا ملائم پابندی عائد نہ ہوگی جو قطع تعلق پر مجھ کو مجبور کردے، اس سلسلہ میں بعض جزئیات کی تصریح بھی =

= میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کو سامنے رکھ کر آپ اور دوسرے ذمہ دار حضرات غور کر لیں کہ ان باتوں کی موجودگی میں میرا تعلق دار العلوم کے مفاد کے خلاف تو نہیں ہے۔

(۱) میں مہینہ میں دو بار ایام تعطیل کے علاوہ تین تین دن غیر حاضر رہوں گا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دو دفعہ کے بجائے ایک ہی دفعہ چھ دن کیلئے غیر حاضر رہوں۔

(۲) مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند، مجلس عاملہ مرکزی جمعیۃ علمائے ہند، اور صوبائی یا مرکزی جمعیۃ کے سالانہ اجلاسوں کے مواقع پر بھی حسب ضرورت مدرسہ سے میں غیر حاضر رہوں گا۔

(۳) میں دن میں صرف دو گھنٹے کار تعلیم انجام دے سکتا ہوں، اس سے زیادہ کی ذمہ داری لینے کیلئے میری طبیعت آمادہ نہیں ہے۔

(۴) ان دو گھنٹوں کے علاوہ مجھ پر کوئی پابندی نہ ہو گی، ان گھنٹوں کے بعد میں جہاں چاہوں گا آجا سکوں گا۔

(۵) ان مستثنیات سے فائدہ اٹھانے کیلئے قانونی طور پر اجازت حاصل کرنا میرے لئے ضروری نہ ہوگا، اخلاقی طور پر صرف اطلاع دیدینا کافی ہوگا۔

ان شرائط کے ساتھ اپنی آمادگی کی اطلاع دیتے ہوئے میں گذارش کروں گا کہ ایک بار پھر غور کر لیا جائے کہ میری ذات سے مدرسہ کا جو فائدہ متوقع ہے وہ حاصل بھی ہو گا یا نہیں، جب کہ میرا حال یہ ہے کہ اب ہی کی دفعہ میں صرف چار دن کیلئے گھر آیا تھا، مگر ایسے حالات و واقعات پیش آئے کہ چار دن کے بجائے ۱۵۔ دن مدرسہ سے غیر حاضر رہنا پڑا، اور عنقریب اکتوبر کے مہینہ میں بسلسلۂ شرکت اجلاس جمعیۃ پھر ایسی ہی طویل غیر حاضری متوقع ہے۔

اچھی طرح غور و فکر کرنے کے بعد جو رائے ہو اس سے مجھے مطلع فرمائیں،

حبیب الرحمٰن الاعظمی

۲۱/ ستمبر ۱۹۵۶ء

=علامہ اعظمی کے مذکورہ بالا خط اور شرائط کے جواب میں مولانا علی میاں صاحب نے ایک خط ۲۰؍ صفر ۱۳۷۶ھ کو لکھا، جس میں تحریر فرمایا:

"آپ نے اپنی تحریر گرامی میں جو تفصیلات درج فرمائی ہیں، وہ میرے نزدیک سوائے اس جز کے جس کا تعلق آپ کے ہر ماہ دو یا کم سے کم ایک سفر سے ہے کچھ اشکال کا باعث نہیں، اس جز میں بھی جو اشکال ہے وہ محض اس بنا پر ہے کہ اس وقت مدرسہ میں تعلیمی انہماک کی ایک مخصوص فضا پیدا کرنا نہایت ضروری ہے، اس لئے اگر آپ اس جز پر نظر ثانی فرما سکیں تو بہت بہتر ہوگا اور ہم لوگوں کی بڑی مساعدت، لیکن اگر اس میں ترمیم یا تخفیف کی مطلقاً گنجائش نہ ہو تو یہ تعلیمی سال بہر حال اس جز کے ساتھ بھی مکمل فرمادیں، اور آئندہ تعلیمی سال کے موقع پر پھر نظر ثانی فرمالیں..."

بہر حال علامہ اعظمی نے ندوہ سے تعلق کیلئے اپنی رضامندی یا نیم رضامندی کا اظہار فرمادیا، مگر چونکہ آپ نہایت حساس دل اور خوددار طبیعت کے مالک تھے اس لئے آپ کو ندوہ کے بعض ذمہ داران کے رویہ سے شاید اندازہ یہ ہوا کہ تمام حضرات ان شرائط سے خوش نہیں ہیں، لہذا آپ نے نہایت خوبصورت انداز میں معذرت فرمادی، جس کا قلق مولانا علی میاں مدظلہ کو بھی بہت رہا اور وہ بار بار خطوط میں اپنے اس قلق کا اظہار فرماتے رہے، حتی کہ انھوں نے اپنے ایک خط میں جو بہت مفصل ہے یہاں تک لکھا:

"میں اس وقت تک دارالعلوم کے تعلق پر اصرار کروں گا جب تک کہ آپ سختی سے منع نہ فرمادیں گے، اور آپ کا طرز عمل مجھے مایوس اور منع نہ کردے گا، جس کی آپ کے تعلق واخوت سے امید نہیں، اب اس کی درخواست کہ آپ اس مخلصانہ عریضہ کے جواب میں جلد ایسا خط لکھ دیں جس سے دل کو اطمئنان ہو، اور یہ معلوم ہو جائے کہ آپ ہم سے ناراض نہیں ہیں۔"

ان تمام واقعات کے بعد علامہ اعظمی نے وہ خط تحریر فرمایا جو اوپر متن میں ذکر کیا گیا ہے۔

اسمبلی کی رکنیت کا اختتام اور وطن واپسی | پانچ سال بعد جب اسمبلی کی مدت رکنیت ختم ہوئی تو علامہ اعظمیؒ نے وطن واپسی کا قصد کیا، دارالمبلغین اور اس کے متعلقین و متوسلین کو تو آپ کی روانگی اور مفارقت کا افسوس تھا ہی، اہل ندوہ کی بھی آزردگی و افسردگی کچھ کم نہیں تھی، وہاں کے لوگوں کی خواہ منتظمین ہوں، اساتذہ ہوں، یا طلبہ، شدید ترین خواہش تھی کہ آپ مزید قیام فرما کر سلسلۂ درس وافادہ کو جاری رکھیں، لیکن آپ اس پر آمادہ نہ ہو سکے اور مدت رکنیت ختم ہوتے ہی لکھنؤ کو چھوڑ کر گھر کی راہ لی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی رقم طراز ہیں:

"وظل العلامة الأعظمي يفيد الطلاب بعلمه العميق و بصيرته النافذة الى أكثر من مدة سنة و نصف حتى اقترب موعد الانتخابات الجديدة التي جرت في بداية عام ۱۹۵۷م (۱۳۷۷ھ) وأوشكت عضوية المجلس التشريعي للولاية على النهاية، ولم يعد له مبرر للإقامة المستقلة في لكناؤ، فأراد أن يغادر الى وطنه و يشرف على شئون مدرسته ، واعتذر عن الاستمرار في العمل التدريسي، رغم أن جميع المسئولين الكبار لندوة العلماء ، قد أصروا على بقائه فيها كمرجع علمي كبير" (۱)

"علامہ اعظمی ڈیڑھ سال تک ابر کرم بن کر طلبہ اور اساتذہ پر یکساں برستے رہے، حتی کہ ۱۹۵۷ء میں جب نئے الیکشن کا زمانہ قریب آگیا اور اسمبلی تحلیل کر دی گئی تو اب پھر لکھنؤ میں قیام کا کوئی جواز باقی نہیں رہا اور واپسی کے ارادہ کا اظہار فرمایا، ہر چند کہ طلبہ، اساتذہ اور ذمہ داران مدرسہ نے قیام پر اصرار کیا لیکن آپ نے مزید اقامت سے معذرت کر دی، اور وطن مالوف اعظم گڈھ واپس ہو گئے، اور اپنے مدرسہ کے انتظام وانصرام میں مصروف ہو گئے (۲)"

(۱) البعث الاسلامی ج نمبر ۷ ۳ ش ۹ ص ۸۶ (۲) ترجمان الاسلام ش ۱۲ ص ۲۰

لکھنؤ سے واپسی کے بعد بھی ندوہ سے تعلق صفحات گذشتہ میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان میں علامہ اعظمیؒ اور مولانا علی میاں ندوی کی، ندوہ میں قیام کے سلسلے میں، مراسلت کی کچھ تفصیل بھی آئی ہے، جس سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ علامہ اعظمی نے اپنی طبیعت اور مزاج اور ذمہ داران کے بعض رویہ کا تجزیہ کرنے کے بعد ملازمت قبول نہ کرنے کو ترجیح دی، لیکن آپ کے اس فیصلہ کے بعد بھی مولانا علی میاں کا جو اصرار تھا، اس کے پیش نظر آپ کی وسیع الظرفی اسے یکسر نظرانداز بھی نہیں کر سکتی تھی، لہٰذا ندوہ سے تھوڑا بہت تعلق اس کے بعد بھی آپ نے باقی رکھا، چنانچہ قاضی اطہر مبارکپوری کو ایک خط میں ۲۳/نومبر ۱۹۵۷ء کو لکھتے ہیں:

"میں اس دفعہ ندوہ اس لئے چلا گیا تھا کہ ان لوگوں کا اصرار تھا کہ اگر مستقل قیام سے انکار ہے تو عارضی طور پر ہفتہ دو ہفتہ کیلئے کبھی کبھی آجایا کیجئے، چنانچہ اب کی دفعہ بارہ دن رہ کر آرہا ہوں..."

یک حرف کاشکیست کہ صد جانوشتہ ایم علامہ اعظمی کی لکھنؤ سے واپسی کے بعد بھی ایک مدت تک مولانا علی میاں صاحب کا اس بات کیلئے اصرار رہا کہ آپ اپنی خدمات ندوے کیلئے وقف کردیں، ان کی یہ شدید ترین خواہش تھی اور اس خواہش کا اظہار بار بار وہ خطوط میں کرتے رہے، مولانا علی میاں صاحب ۲۶/ ستمبر ۱۹۶۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"انھیں تحقیقات اور خصوصیات کی بنا پر میرے دل میں آپ کی جو قدر و منزلت ہے۔ اس کو خدا جانتا ہے، کاش کہ آپ پھر اس پر غور فرماتے، کہ آپ صرف دارالعلوم میں قیام کر لیتے، اور صرف آپ سے رہنمائی حاصل کی جاتی، اور عام استفادہ کیا جاتا، اب کوئی شخص نظر نہیں آتا جس سے ہم جیسے طالب علم رجوع کریں بہر حال ع

یک حرف کاشکیست کہ صد جانوشتہ ایم

مدرسہ شاہی مراد آباد سے دعوت | ۱۳۷۷ھ کے اوائل میں مدرسہ قاسمیہ شاہی مراد آباد سے آپ کو دعوت دی گئی کہ وہاں قیام فرما کر مدرسہ کے لوگوں کو استفادہ کا موقع عنایت فرمائیں، جس کیلئے مولانا فخر الدین صاحب صدر المدرسین و مہتمم مدرسہ شاہی مراد آباد(۱) نے آپ کے پاس ۲۸ر صفر المظفر ۱۳۷۷ھ کو درج ذیل خط لکھا:

ذوالمجد والکرم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"۰۰۰ ایک موذبانہ درخواست ہے اور امید ہے کہ جناب والا ضرور شرف قبولیت سے نوازیں گے۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ حضرت والا ملازمت سے قطعاً بے نیاز ہیں مگر غالباً نیازمندوں پر کرم فرمائی سے بے نیاز نہ ہوں گے، مدرسہ شاہی کو آپ کی ضرورت ہے اور فوری ضرورت ہے، انشاء اللہ آپ کو یہاں کوئی پریشانی نہ ہوگی، بس تشریف آوری کا انتظار ہے، ضروری امور بعد میں طے ہو جائیں گے ۰۰۰"

اس خط کو پانے کے کچھ ہی دنوں بعد یعنی ۱۰ر ربیع الاول ۱۳۷۷ھ کو علامہ اعظمیؒ نے مفتی ظفیر الدین صاحب کو ایک خط لکھا تو اس میں اس بلاوے کا بھی تذکرہ کیا:

(۱) آبائی وطن ہاپوڑ تھا، آپ کے دادا اجمیر میں تھانے دار تھے، مولانا فخر الدین صاحب وہیں اجمیر میں ۱۳۰۷ھ ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے، قرآن کریم اور درسیات کی ابتدائی کتابیں گھر پر پڑھیں، دہلی اور گلاوٹھی کے مدرسوں میں بھی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد دار العلوم دیوبند گئے اور وہیں سے ۱۳۲۸ھ م ۱۹۱۰ء میں فارغ ہوئے، فراغت کے بعد دار العلوم میں مدرس ہوگئے، پھر کچھ عرصہ بعد ان کو مدرسہ شاہی مراد آباد بھیج دیا گیا، جہاں تقریباً نصف صدی (۴۸ سال) تک حدیث و فقہ کا درس دیتے رہے، ۱۳۷۷ھ م ۱۹۵۷ء میں حضرت مدنیؒ کے انتقال کے بعد دار العلوم دیوبند کے منصب شیخ الحدیث کیلئے آپ کا انتخاب عمل میں آیا، درس و تدریس کے علاوہ سیاست سے بھی آپ کو تعلق تھا، اور قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلی تھیں، حضرت مدنیؒ کی جمعیۃ علماء ہندؒ کی صدارت کے زمانہ میں دو دفعہ نائب صدر، اور آپ کے انتقال کے بعد ایک عرصہ تک اس کے صدر بھی رہے، ۲۰ر صفر ۱۳۹۲ھ/۵ر اپریل ۱۹۷۲ء کو مراد آباد میں جان جان آفریں کے سپرد کی اور وہیں مدفون ہوئے، (تاریخ دار العلوم ۲/۱۰۸-۱۰۵)

"مراد آباد سے مولانا فخر الدین صاحب نے لکھا تھا کہ شاہی میں چلے آیئے۔ میں نے معذرت کر دی۔"(۱)

رکعات تراویح تراویح کی رکعتوں کے سلسلے میں غیر مقلدین نے ایک عرصے سے جو شور و غوغا کر رکھا ہے، اور امت مرحومہ کے ساڑھے بارہ سو برس کے معمول سے انحراف کر کے جو ایک فتنہ برپا کیا ہے، اس کے متعلق علامہ اعظمی نے یہ رسالہ تالیف فرمایا، جس میں پر زور دلائل سے یہ ثابت کیا کہ تمام عالم اسلام میں فاروق اعظمؓ کے زمانہ سے برابر بیس یا بیس سے زیادہ رکعتوں پر عمل در آمد رہا ہے، اور بیس والی مرفوع روایت کو یکسر نا قابل اعتبار کہنا، اور آٹھ کی روایتوں کی تصحیح اور ان پر اعتماد از روئے تحقیق اصول حدیث و مسلمات مخالفین کی روشنی میں قطعاً صحیح نہیں ہے، یہ کتاب ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء میں معارف پریس اعظم گڈھ سے چھپ کر شائع ہوئی، ہندوستان کے علمی حلقوں میں اس کتاب کی بہت زیادہ مقبولیت اور پذیرائی ہوئی، چنانچہ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ایک خط میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"رسالہ اپنی گوناگوں خصوصیات کے لحاظ سے منفرد ہے، جو حضرت مصنف کی علمی عظمت کو دیکھتے ہوئے کوئی عجیب بات نہیں۔"

آگے پھر لکھتے ہیں:

"مجموعی طور پر رسالہ محققانہ اور دلچسپ ہے جو ایک جویائے عمل کے لئے کافی حجت اور شافی سند ہے۔"

لیکن اس کی جو داد تحسین حضرت مولانا مدنیؒ نے دی ہے، اس سے بڑھ کر اس کیلئے کوئی سند نہیں ہو سکتی، آپ ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں:

"مدعیان حدیث کی گندم نمائی اور جو فروشی کی وجہ سے بہت سے اشخاص اس غلطی میں مبتلا تھے کہ آٹھ رکعات تراویح کا ثبوت شرعی موجود ہے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی زید مجدھم کی اس حقیقت نمائی نے

---

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۶۷

جو موصوف نے اس رسالہ میں فرمائی ہے، باطل کے پردوں کی دھجیاں اڑا دیں اور کالشمس فی رابعۃ النہار ظاہر کردیا کہ مدعیان حدیث کے دعاوی باطلہ ہرگز قابل التفات نہیں ہیں۔ میں نے رسالہ مذکورہ کو ابتدا سے اخیر تک مطالعہ کیا ہے۔ میں حضرت مولف ممدوح کی تحقیقات انیقہ اور دلائل قویہ پر حضرت کو مبارکباد دیتا ہوں جنھوں نے ان مدعیوں کے خرمنہائے تزویر پر صواعق محرقہ برسا کر نیست ونابود کردیا ہے، جزاہ اللہ احسن الجزاء فی الدارین ...."

آٹھ سال بعد مفتاح العلوم میں درس حدیث علامہ اعظمی کو مفتاح العلوم سے ایک والہانہ تعلق تھا، اور اسی تعلق کی بنا پر وہ اس کی خدمت کیلئے ہر وقت تیار رہتے تھے، لیکن تحقیقی و تصنیفی مشاغل، اسمبلی کی رکنیت اور دیگر بہت سی مصروفیات کے باعث باقاعدہ سلسلہ تقریباً آٹھ سال تک منقطع رہا، اور درس وتدریس کی گرم بازاری سرد پڑی رہی، مولانا محمد موسی میاں (۱) افریقی کو ۱۱ر شعبان ۱۳۷۸ھ کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

(۱) مولانا محمد بن موسی میاں افریقی کا آبائی وطن سملک ضلع سورت ہے، مگر ان کا خاندان چند پشت سے جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں آباد ہو گیا تھا، وہیں تقریباً ۱۳۲۲ھ م ۱۹۰۴ء میں تولد ہوئے، تعلیم کیلئے ہندوستان بھیج دیا گیا، چنانچہ انھوں نے پالن پور میں تعلیم وتربیت پائی، ۱۳۴۲ھ میں دار العلوم (دیوبند) میں داخلہ لیا اور ۱۳۴۴ھ میں تکمیل کی، فراغت کے بعد جوہانسبرگ چلے گئے اور وہاں اپنا تجارتی کاروبار سنبھالا، مگر اسی کے ساتھ دینی، علمی اور اسلامی خدمت بھرپور اور ٹھوس طریقے پر انجام دیتے رہے، اللہ تعالی نے انھیں دین ودنیا دونوں نعمتوں سے نوازا تھا، دولت کی ریل پیل تھی، جس کو انھوں نے دینی وملی کاموں میں بیدریغ صرف کیا، چنانچہ اسلامی اور عصری علوم کی تعلیم کیلئے جوہانسبرگ میں واٹروال اسلامک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا، اور دار العلوم دیوبند کے منہج کے مطابق طلبہ کیلئے مفت تعلیم کا انتظام کیا، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی تعمیر وترقی میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے، ڈابھیل میں مجلس علمی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس سے نہایت قیمتی اور نایاب کتابیں شائع ہوئیں، غرض علم ودین کی اشاعت کیلئے انھوں نے نہایت قابل قدر کارنامے انجام دیئے اور بے محابا دولت صرف کی، متعدد علمی اداروں کا یہ پشتیبان ۱۶ر اپریل ۱۹۶۳ء، ۲۱ر ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ کو جوہانسبرگ کی خاک میں روپوش ہو گیا، اللہ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کا بہترین اجر عطا فرمائے، آمین (تاریخ دار العلوم ۲: ۱۵۰ تا ۱۵۱)

"...مدرسہ مفتاح العلوم جو میرے وطن میں ہے اور جس میں بیس برس سے زیادہ میں نے حدیث کا درس دیا ہے اس میں تیس سال سے برابر دورۂ حدیث ہوتا ہے اور کم و بیش پچیس طالب علم شریک دورہ ہوتے ہیں وہاں بھی میں نے آٹھ سال سے درس دینا ترک کر دیا ہے، کارکنان برابر متقاضی و مصر ہیں، لیکن میں نے دوبارہ تعلق قائم نہیں کیا، جیسا کہ میں اس سے پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔

اگر مجھ کو اپنے حالات سے مجبور ہو کر درس کا مشغلہ پھر جاری ہی کرنا پڑے گا تو میں اپنے ذاتی و خانگی حالات کی بنا پر وطن ہی کے مدرسہ کو ترجیح دوں گا..."

یہ ترجیح عملی طور پر اس وقت ظہور پذیر ہوئی جب اس کے دوسرے ہی سال مفتاح العلوم میں درس و تدریس کا از سر نو آغاز کیا، حالات سے مجبور ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں، کارکنان کا اصرار و تقاضا ضرور رنگ لایا کہ وہ محفل درس جو ایک مدت سے سونی پڑی ہوئی تھی ایک بار پھر پر شور ہو گئی۔ مفتاح العلوم کی ۱۳۷۸ھ کی روداد (ص ۲) میں "محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کا درس حدیث" کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

"اس خبر کی اطلاع دیتے ہوئے ہم بہت فخر محسوس کرتے ہیں کہ محدث کبیر حضرت العلامہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دامت برکاتھم نے خدام جامعہ کی درخواست منظور فرماتے ہوئے اس سال طلبہ دورۂ حدیث کو درس دینا شروع فرما دیا ہے، و نیز طلبہ کی نگرانی اور ان کی تربیت کے پیش نظر حضرت مولانا اپنی خرابیٔ صحت اور پیرانہ سالی کے باوجود بسا اوقات پوری مدت جامعہ میں ہی گذارتے ہیں، اس طرح جامعہ کے طلبہ اور دار الاقامہ کو ایک ایسے مربی کی سرپرستی حاصل ہو گئی ہے جس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے، خدا سے دعا

ہے کہ وہ حضرت مولانا کے سایۂ عاطفت کو تادیر اساتذہ و طلبہ پر باقی رکھے، آمین۔"

دکن کا ایک سفر علامہ اعظمی کے متفرق اوراق میں کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چھوٹی چھوٹی تحریریں ملتی ہیں، جو اس قدر مختصر ہوتی ہیں کہ ان سے صرف آپ کے احوال و سوانح کی طرف ہلکا سا اشارہ مل جاتا ہے، ایک کاغذ پر اپنے ایک سفر کے بارے میں یہ لکھا ہے:

"سفر حیدر آباد و اورنگ آباد و گلبرگہ و احمد آباد از ۸ر نومبر ۵۸ء تا ۲۳ دسمبر ۵۸ء اواخر ربیع الثانی ۷۸ھ تا اوائل جمادی الاخری ۷۸ھ"

مختلف اداروں اور یونیورسٹیوں کے ممتحن کی حیثیت سے آپ کا تقرر

پنجاب یونیورسٹی ملک کے طول و عرض کی متعدد یونیورسٹیوں اور تعلیمی بورڈوں نے علامہ اعظمی کو دینی و اسلامی علوم کیلئے ممتحن (Examiner) مقرر کیا۔ آپ کے منتشر اوراق میں اس نوعیت کا جو سب سے پہلا دستاویزی ثبوت ہمیں دستیاب ہوا، وہ ۱۹۵۶ء کا "پنجاب یونیورسٹی سولن شملہ" کا ہے، جس میں مذکورہ یونیورسٹی کے رجسٹرار آفس کی طرف سے آپ کو امتحان کی کاپیاں جانچنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے، اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ امتحان کے پرچۂ سوالات بھی آپ ہی نے تشکیل دیئے ہوں گے، ہم نے اوپر جس دستاویز کا ذکر کیا ہے وہ پنجاب یونیورسٹی رجسٹرار کے سپرنٹنڈنٹ کی جانب سے ۳۰ر اپریل ۱۹۵۶ء کو جاری کردہ ایک خط ہے، جس کی عبارت درج ذیل ہے:

"I have to inform you that you have also to act as Examiner for evaluation of answer-book in --- paper V for the Molvi Fazil Examination held in june 1956.

You are requested to let this office know your address for answer -books in the appended form.

(میں آپ کو اس بات کی اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ جون میں ہونے والے مولوی فاضل کے امتحان کے پانچویں پرچے کی کاپیوں کو جانچنے کیلئے بھی آپ کو ممتحن کی حیثیت سے کام کرنا ہے۔

لہذا آپ سے گذارش ہے کہ کاپیاں ارسال کرنے کیلئے اپنے پتہ سے ملحقہ فارم کے ذریعہ دفتر کو اطلاع دیں)

ویسٹ بنگال مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کئی سال تک "ویسٹ بنگال مدرسہ ایجوکیشن بورڈ" کی جانب سے ہونے والے امتحان "ممتاز المحدثین" کے لئے ممتحن رہے، اس سے متعلق سب سے پہلا جو کاغذ ملا وہ ۲۴/ اگست ۱۹۵۶ء کو جاری کردہ ایک اطلاع ہے، اس وقت بورڈ کے رجسٹرار مولانا سعید احمد اکبر آبادی تھے، اور اطلاع نامہ انھیں کے دستخط سے روانہ کیا گیا ہے، جس کی عبارت یہ ہے:

" Sir I have the honour to inform you that you have been appointed Paper -setter and Examiner in Bukhari Sharif II of Mumtazul Muhaddethin examination to be conducted by the West Bengal Madrasah Education Board in 1957.

Your acceptance of the appointment must reach this office on or before the 10 Sep. 1956. "

(میں آنجناب کو یہ اطلاع دیتے ہوئے اعزاز محسوس کرتا ہوں کہ ویسٹ بنگال مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کی طرف سے منعقد کئے جانے والے ممتاز المحدثین کے امتحان ۱۹۵۷ء کیلئے بخاری شریف جلد ثانی کے امتحان اور تشکیل سوالات کے لئے آپ کو نامزد کیا گیا ہے۔

اس نامزدگی کی منظوری ۱۰/ ستمبر یا اس سے قبل دفتر میں ضرور پہنچ جانی چاہئے)

علامہ اعظمی کے کاغذات میں ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۴ء تک کے خطوط اسی مضمون کے ملے، جو اس بات کی دلیل ہیں کہ کم از کم ۹/ برس آپ اس کے ممتحن رہے، اور آپ کے تشکیل شدہ جو پرچے ملے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۲ء تک بخاری شریف جلد ثانی کے ممتحن رہے، اور ۱۹۶۳ء و ۱۹۶۴ء میں جلد اول کے پرچے تشکیل دیئے۔

بہار بورڈ اور ناگپور یونیورسٹی | بہار مدرسہ ایگزامینیشن بورڈ کے فاضل تفسیر، اور ناگپور یونیورسٹی کے مولوی فاضل کے بھی ممتحن رہے، ناگپور یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو جو خطوط ملے ان سب کی عبارت تھوڑے بہت فرق سے رجسٹرار ڈاکٹر (S.V. Bhagwat) کی طرف سے یہ ہے:

" *I am directed to inform you that Nagpur University has appointed you to be the paper- setter and examiner in Arabic (Maulvi Fazil) Paper VI at the next HIGHER DIPLOMA IN ORIENTAL LEARNING examination ....*"

(یعنی مجھے آنجناب کو یہ اطلاع دینے کی ہدایت کی گئی ہے کہ ناگپور یونیورسٹی نے مشرقی تعلیم میں ہایر ڈپلوما کے امتحان مولوی فاضل کے لئے تشکیل سوالات و امتحان کے واسطے آپ کو نامزد کیا ہے)

دار العلوم ندوہ | انھیں ایام میں دار العلوم ندوہ لکھنؤ نے بھی آپ کو علیا کی جماعتوں کیلئے ممتحن مقرر کیا، اور کئی سال تک ندوہ کے لئے اس خدمت کو بھی انجام دیا، مثلاً ۲۵ر جنوری ۱۹۵۸ء کو ندوہ کے اہتمام کی طرف سے یہ خط آپ کی خدمت میں ارسال کیا گیا:

مکرمی محترمی دام مجدہ!

"بعد سلام مسنون کے گذارش ہے کہ دار العلوم کا سالانہ امتحان ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء سے شروع ہونے والا ہے، امید ہے کہ جناب حسبۃ للہ امتحان کی زحمت گوارا فرمائیں گے..."

کئی برس تک ندوہ کے ممتحن رہے، مختلف سالوں میں مختلف کتابوں کا امتحان آپ کے ذمہ رہا، کبھی صحیح مسلم، کبھی سنن ابو داؤد، کبھی ہدایہ اور کبھی کوئی دوسری کتاب، اور بسا اوقات یہ بھی ہوتا کہ ایک سال میں ایک سے زائد کتابیں آپ کے ذمہ ہوتیں مثلاً ۷۸-۱۳۷۷ھ میں مسلم شریف کامل اور ابو داؤد شریف کامل کا امتحان لیا۔

اس کے علاوہ دیگر معاملات کے لئے بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء کو جب علامہ اعظمیؒ کی ضرورت پڑی تو ان کی خدمات حاصل کیں، اور علامہ اعظمیؒ اس کے لئے برضا و رغبت تیار بھی ہوئے، مثال کے طور پر ۵/مارچ ۱۹۶۲ء کو مولانا ابوالعرفان ندوی عمید دارالعلوم ندوہ(۱) کی جانب سے درج ذیل تحریر علامہ اعظمیؒ کی خدمت میں روانہ کی گئی:

"ایک زحمت دینے کیلئے یہ عریضہ ارسال خدمت ہے، ادھر دو سال سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سندی درجات میں یہ نظام جاری کیا گیا ہے کہ طلبہ اپنے لئے کوئی علمی یا دینی موضوع انتخاب کر کے اس پر ایک تحقیقی مقالہ تیار کریں (جن کے صفحات کی تعداد مقرر کر دی گئی ہے) ان کی عام رہنمائی کے لئے دارالعلوم کے اندر یا باہر کسی فاضل کا انتخاب کرایا جاتا ہے، مگر طلبہ کی کوئی عملی یا تحریری امداد نہیں کی جاتی، وہ معلومات کو خود ہی اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں، یہ نظام تجربہ سے بہت مفید ثابت ہوا۔ اس ذریعہ سے ملک کے مختلف فضلاء اور اہل نظر سے ان طلبہ کے علمی روابط بھی قائم ہو جاتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ ان کی آئندہ زندگی میں بھی مفید ہوں گے اور ان کو کچھ مطالعے، غور کرنے اور معلومات کو ترتیب دینے کا موقع بھی مل جائے گا۔

اس سلسلہ میں "رجال الحدیث الاحناف" مقالہ کی جانچ کے لئے آپ کو زحمت دی جارہی ہے، دارالعلوم سے دلچسپی اور آپ کے علمی ذوق کی بنا پر امید ہے آپ اس زحمت کو گوارا فرمائیں گے ..."

---

(۱) مولانا ابوالعرفان صاحب ندویؒ کھیتا سرائے ضلع جونپور سے متصل موضع پسری کے رہنے والے تھے، دارالعلوم دیوبند، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور دارالعلوم ندوہ میں تعلیم پائی، فراغت کے بعد سید سلیمان ندوی کی زیر تربیت دارالمصنفین سے کچھ دنوں وابستہ رہے، تقریباً ۴۵ سال تک ندوہ کی تعلیمی و انتظامی خدمات انجام دیں، وسیع المطالعہ اور وسیع النظر عالم تھے، شخصیت بہت باغ و بہار اور بھرپور تھی، ۱۷/نومبر ۱۹۸۸ء کو وفات پائی۔ (ماہنامہ دارالعلوم وفیات نمبر ۸۷-۸۶)

اسی مضمون کی تحریر دوسرے سال یعنی ۱۹۶۳ء میں بھی روانہ کی گئی، جس کی آخر کی سطریں یہ ہیں:

"اس سلسلہ میں "الامام الشافعی..." مقالہ کی جانچ کیلئے آپ کو زحمت دی جارہی ہے..."

مذکورہ بالا امتحانات کے علاوہ آپ تقریباً سات سال اتر پردیش عربی فارسی بورڈ کے بھی ممتحن رہے۔

اعیان الحجاج ۱۹۵۸ء میں آپ کی بے نظیر کتاب "اعیان الحجاج" تنویر پریس (لکھنؤ) سے طبع ہو کر مکتبہ اعظمی (مئو) سے شائع ہوئی، یہ کتاب انبیاء کرام، صحابۂ عظامؓ، علماء و صلحاء اور عظیم شخصیات کے حج و زیارت کے بصیرت افروز واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو مولانا عبداللہ زمزمیؒ نے دیکھا تو اس کو "اعجب العجائب" کے لفظ سے یاد کیا۔ ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ برہان ج ۴۱ ش ۲ میں اس کتاب پر نہایت شاندار تبصرہ شائع ہوا۔

بچی کی علالت اور وفات خاصان خدا کیلئے آزمائش اور مصائب بھی بہت ہوتے ہیں، تقدیر الٰہی ان کا ہر طرح امتحان لیتی رہتی ہے، علامہ اعظمی کی بھی پوری زندگی مصائب سے بھری اور ابتلاء سے عبارت رہی، لیکن واہ رے ثابت قدمی! پائے استقامت میں کبھی معمولی سی لغزش و لرزش بھی نہیں آئی۔ حوادث روزگار ان کے ساتھ ساتھ رہے لیکن وہ ہمیشہ "فصبر جمیل" کا ورد کرتے رہے۔ ان کی ایک صاحبزادی صفیہ خاتون کی بیماری ان کے لئے سخت آزمائش کا سبب بنی رہی، وہ ایک طویل عرصے تک شدید ترین بیماری اور تکلیف میں مبتلا رہیں، علامہ اعظمیؒ نے ان کی بیماری کا بعض خطوط میں اس طرح ذکر کیا ہے جس سے درد کی کسک صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ ۵/شوال ۱۳۷۸ھ مطابق ۱۴/اپریل ۱۹۵۹ء کو مولانا محمد موسی میاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"الحمد للہ کہ میں نے گنجائش پاکر دوبارہ ڈاکٹری علاج اپنی لڑکی کا شروع

کر دیا، مگر اس کا مرض بہت بڑھ چکا ہے صرف ہڈی اور چمڑہ باقی ہے، خود سے کروٹ بھی بدل نہیں سکتی، بہر حال خدا کا نام لے کر برابر علاج ہو رہا ہے آج سب سے بڑی فکر اسی کی ہے دن بدن وہ کمزور ہوتی جارہی ہے آپ بھی خدائے تعالیٰ سے دعا فرمائیں۔"

۲۹/اپریل ۱۹۵۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"کئی دنوں سے عریضہ لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا مگر آج کل لڑکی کی طبیعت پہلے سے بھی زیادہ نازک ہو گئی ہے اس لئے ذہنی انتشار بہت بڑھ گیا ہے، آپ کی عنایت و مہربانی کی بدولت علاج اور ڈاکٹروں کی طرف رجوع کرنے میں بہت سہولت پیدا ہو گئی ہے اس لئے بہت تندہی سے علاج ہو رہا ہے، لیکن شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے، کسی وقت کچھ افاقہ محسوس ہوتا ہے تو دوسرے وقت بہت نا قابل اطمینان حالت ہو جاتی ہے، بہر حال دعا کا خواستگار ہوں"

لیکن یہ تمام علاج معالجے بے سود ثابت ہوئے، دست قضا کے سامنے ساری تدبیریں مغلوب ہو گئیں اور ۲۱/شوال ۱۳۷۶ھ کو شفیق باپ مہربان ماں اور تمام اہل خانہ کو حسرت و یاس میں ڈوبا ہوا چھوڑ کر عالم آخرت کو سدھاریں، باپ پر بچی کی وفات کا جو اثر ہوا اس کو بھی ایک خط میں پڑھئے جو مولانا محمد میاں ہی کو ۱۹/مئی ۱۹۵۹ء مطابق ۱۰/ذیقعدہ ۱۳۷۸ھ کو لکھا گیا ہے، کس قدر رنج و حسرت میں ڈوبی ہوئی تحریر ہے یہ:

"سب سے پہلے نہایت رنج و غم کے ساتھ آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ ۲۱/شوال ۱۳۷۸ھ کو عزیزہ صفیہ خاتون جو سب لڑکیوں میں نہایت عزیز تھی اور جس کی تشویشناک علالت کا ذکر بار بار کر چکا ہوں وہ اس زندگی میں ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گئی، حق تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے۔

اس کی وفات کے صدمہ اور تجہیز و تکفین کے ترددات کے باعث دن بھر تعب سے دوسرے دن مجھ کو بخار اور پسلی میں درد ہو گیا، ہفتہ بھر کے بعد

آرام ہوا مگر نقاہت اب بھی ہے، طبیعت میں تقاضا تو فوراً اطلاع دینے کا تھا مگر ان پریشانیوں میں اور کئی دنوں سے خط کے انتظار میں دیر ہوئی۔"

رکعات تراویح مذیل علامہ اعظمی کی کتاب "رکعات تراویح" جب چھپ کر شائع ہوئی، تو ایک غیر مقلد عالم نے اس کا جواب "انوار مصابیح" کے نام سے لکھا، آپ نے انوار مصابیح کا رد کیا اور اس کو رکعات تراویح مذیل کے نام سے شائع کیا، یہ کتاب ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۹۶۰ء میں تنویر پریس لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہوئی۔

تیسرا حج ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۶۱ء میں ادا فرمایا اس سفر کی تفصیل نہیں معلوم ہو سکی، البتہ اس سال کا پاسپورٹ ان کے کاغذات میں محفوظ ہے، اس پر ثبت مختلف مہروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سفر پہ روانگی بمبئی سے بذریعہ طیارہ ہوئی، پاسپورٹ پر سانتا کروز ایرپورٹ سے ڈیپارچر کی جو مہر لگی ہے وہ ۳۰/اپریل ۱۹۶۱ء کی ہے جو ذی قعدہ کی غالباً ۱۵/ر تاریخ تھی، اور واپسی میں بمبئی پہنچنے کی جو تاریخ ہے وہ ۴/جون ۱۹۶۱ء درج ہے۔

ادارۂ نشر و شاعت کے قیام کیلئے فکر خداوند قدوس نے علامہ اعظمیؒ کو عجیب و غریب علمی ذوق اور جوش وولولہ عطا فرمایا تھا، ان کا علمی ذوق و شوق اور کام کرنے کا جذبہ ان کو کسی منزل پر قرار نہیں لینے دیتا تھا، اسلامی علوم وفنون کی اشاعت کے ساتھ ان کا شغف نا قابل بیان حد تک تھا، پورے خلوص قلب اور اخلاص نیت کے ساتھ ان کی یہ کوشش رہتی کہ مسلمانوں میں علم دین کا رواج ہو اور اسلامی علوم وفنون کی ممکن حد تک ترویج کی جائے، اسی سلسلے میں آپ نے تصنیف و تالیف اور نشر واشاعت کے ایک ادارہ کے قیام کی نسبت سوچنا شروع کیا، ۱۹۵۷ء اور اس کے بعد تین چار سال تک اس فکر کا آپ کے دل و دماغ پر بہت شدت کے ساتھ غلبہ رہا، اس زمانہ میں ان کے دل میں یہ شدید خواہش رہا کرتی تھی کہ ایک ایسے ادارے کا قیام عمل میں آئے جس کے ذریعہ سے ان با صلاحیت اور صاحب استعداد فضلاء کے اندر جو علمی و تحقیقی کام کرنا چاہتے ہیں، بحث و تحقیق اور تصنیف و تالیف کا صاف ستھرا ذوق پیدا کیا جا سکے، اس طرح ان کے ذوق اور

صلاحیت کو نشو و نما اور فروغ پانے کے مواقع حاصل ہوں گے اور ادارہ کے ذریعہ نشر و اشاعت کا کام ہوگا، اس فکر میں ان کے شریک مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری(۱) بھی رہے ،اور دونوں بزرگ ایک مدت تک اس کے امکانات پر غور اور کام کیلئے لائحہ عمل تیار کرتے رہے، جیساکہ قاضی اطہر صاحب لکھتے ہیں:

"اسی زمانہ میں خیال ہوا کہ بمبئی یا مئو میں ایک علمی ادارہ قائم کیا جائے جس میں تصنیف و تالیف اور نشر واشاعت کا کام ہو اور اس کے امکانات پر غور کیا جانے لگا۔"(۲)

قاضی اطہر صاحب کے نام علامہ اعظمی کے جو خطوط ہمارے سامنے ہیں، ان میں سب سے پہلے ۲۴؍ فروری ۱۹۵۷ء کے ایک خط میں اس کی طرف قاضی صاحب کی توجہ مبذول کرائی ہے:

(۱) مؤرخ جلیل مولانا قاضی اطہر مبارکپوری ۴؍ رجب ۱۳۳۴ھ مطابق ۷؍ مئی ۱۹۱۶ء کو ضلع اعظم گڈھ کے مردم خیز قصبہ مبارکپور میں پیدا ہوئے، آپ کا نام عبدالحفیظ تھا لیکن علمی دنیا میں قاضی اطہر مبارکپوری کے نام سے مشہور ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۳۵۰ھ میں مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں عربی تعلیم شروع کی۔ احیاء العلوم میں مروجہ نصاب مکمل کرنے کے بعد مدرسہ شاہی مراد آباد گئے اور ۱۳۵۹ھ میں وہیں سے فارغ التحصیل ہوئے، فراغت کے بعد چار پانچ سال احیاء العلوم میں درس و تدریس کی خدمت انجام دی، اس کے بعد کار تدریس چھوڑ کر صحافت کی دنیا میں آئے اور امرتسر، لاہور، بہرائچ، بمبئی وغیرہ میں رہ کر مختلف رسائل و جرائد کیلئے مقالہ نگاری اور ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، تاریخ ان کا خاص فن تھا، اور اس میں ان کو سند سمجھا جاتا تھا، تاریخ کے علاوہ دیگر فنون پر بھی قدرت حاصل تھی ،بیسیوں تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں، لیکن ان سب میں "رجال السند والھند" کو بہت شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، موصوف بڑی خوبیوں کے حامل تھے، محنتی، جفاکش، قناعت پسند اور سادہ طبیعت کے انسان تھے، بایں ہمہ علم و فضل تعلی اور خود نمائی نام کو نہیں تھی، ۱۴؍ جولائی ۱۹۹۶ء مطابق ۲۷؍ صفر ۱۴۱۷ھ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ دیکھئے ترجمان الاسلام قاضی اطہر نمبر

(۲) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔ ۱۲ ص ۳۹

"دوسری بات جو میں نے عزیز موصوف کے خط میں لکھی تھی معلوم نہیں اس کی نسبت کھو جانے والے خط میں کچھ لکھا تھا یا نہیں بہر حال اب آپ لوگوں کا جو خیال ہو اس سے مطلع فرمایئے، آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ میری مراد تصنیفی ادارہ کے قیام سے ہے۔"

ان تمام باتوں کے باوجود علامہ اعظمیؒ چونکہ بہت زیادہ محتاط طبیعت کے مالک تھے اور کسی کام کیلئے کوئی اقدام کرنے سے قبل اس کے مالہ وما علیہ پر اچھی طرح غور فرماتے تھے، اس کے بعد نہایت احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے اور آگے بڑھتے تھے، جس وقت آپ ادارہ کے قیام کے مسئلہ پر غور فرما رہے تھے، اس وقت آپ کے سامنے کچھ موانع ایسے تھے جن پر قابو پانا بظاہر دشوار نظر آرہا تھا۔ اس کے قیام کیلئے آپ کی نظر میں دو جگہیں تھیں، مگر پریشانی یہ تھی کہ ان دونوں ہی جگہوں کے کچھ ایسے مخصوص حالات تھے جن کی وجہ سے ان کو خوب اطمئنان اور شرح صدر نہیں ہو پاتا تھا، پہلی جگہ تو ان کا اپنا وطن اور مولد و مسکن مئو تھا، اور دوسرا مقام جو زیر غور تھا وہ بمبئی، ہندوستان کا عروس البلاد جہاں اس وقت قاضی اطہر صاحب فروکش تھے۔ اور ان دونوں ہی مقامات کے بارے میں ان کا اپنا جو تجزیہ تھا اسے ۲۲/اکتوبر ۱۹۶۰ء کے ایک خط میں قاضی اطہر صاحب کو لکھا:

"اپنے (قرب) وجوار میں اب بھی میرا خیال ہے کہ جیسا ادارہ آپ چاہتے ہیں قائم ہونا مشکل ہے، اُسی طرف (بمبئی) ایسے ادارے قائم ہو سکتے ہیں اور چل بھی سکتے ہیں، اس طرف (اپنے قرب وجوار میں) بخل حسد، اور بے ذوقی نے راستے بند کر رکھے ہیں، لیکن اُدھر (بمبئی) جو خرابیاں ہیں ان کا انکار بھی ممکن نہیں۔(۱)

علامہ اعظمی کا یہ بے لاگ تجزیہ طویل تجربے کی روشنی میں تھا اور اپنے اس تلخ تجربہ کی وجہ سے وہ عجلت میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے، قاضی اطہر صاحب پھر لکھتے ہیں:

(۱) ترجمان الاسلام شمارہ ۱۱۔ ۱۲ ص ۳۹

"میں ادارہ کے قیام کے سلسلہ میں متعدد بار مولانا کی خدمت میں مئو گیا اور وہیں ادارہ کے قیام کی کوشش کی ، مولانا کے رفیق خاص مولانا عبداللطیف صاحب مرحوم جو اس وقت مئو میونسپلٹی کے چیرمین تھے، انھوں نے اس رائے سے بالکلیہ اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کے لئے زمین اور عمارت کا ذمہ لیتا ہوں تصنیف و تالیف آپ لوگوں کا کام ہے، اس کے باوجود مولانا مرحوم کی شدت احتیاط اور اس وقت کی صورتحال کی وجہ سے ادارہ مئو میں قائم نہ ہو سکا۔"(۱)

اس شدت احتیاط کے باوجود اس وقت دل و دماغ پر یہ مسئلہ پوری طرح حاوی رہا۔ اس ادارہ کے قیام سے آپ کا کوئی ذاتی مفاد یا معاشی مسئلہ وابستہ نہیں تھا، بس یہ سودا سوار تھا کہ کچھ کام کریں اور کچھ لوگوں کو کام کے لائق بنادیں، یہ کام ایسا تھا کہ انفرادی طور پر تو ممکن نہیں تھا، اجتماعی طور پر کیا جا سکتا تھا، ۳۰ر نومبر ۱۹۵۸ء کے ایک خط میں قاضی صاحب کو پہلے ہی لکھ چکے تھے:

"میں نے تو بہت پہلے لکھنؤ سے آپ کو اور مولانا اسحاق کو متوجہ کیا تھا کہ سوچ کر کوئی کام کرنا چاہئے، اور میرے نزدیک انفرادی کے بجائے اجتماعی کام ہونا چاہئے، مگر اس وقت آپ کی بدگمان طبیعت نے معلوم نہیں کس بنیاد پر اس گذارش کو قطعاً قابل التفات قرار نہیں دیا، حالانکہ مجھے یہ حسن ظن ہے کہ حالات کے قطعی علم کی بنا پر میری یہ تحریک غرض پرستی (مثلاً فکر معاش) پر آپ کے نزدیک محمول نہیں ہو سکتی ، اس لئے کہ الحمد للہ میرا ذریعہ معاش اس وقت بھی نقد تھا اور آج بھی ہے، مگر میرا وحشی مزاج اس سے راضی نہ ہوا اور آج بھی نہیں ہے۔"

خطوط سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مالیگاؤں میں اس کے قیام کے لئے کچھ

(۱) ترجمان الاسلام شمارہ ۱۱۔۱۲ ص ۳۹

کوشش کی گئی لیکن وہ بار آور نہیں ہوئی، مگر پھر بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا اور اس کام کی فکر دل و دماغ پر مستقل طاری رہی۔ قاضی صاحب کو ۲۳ جولائی ۱۹۵۹ء کو لکھتے ہیں:

"تیسری بات یہ ہے کہ میں ابھی تک یہ "ہوس" رکھتا ہوں کہ کوئی علمی کام ضرور ہونا چاہیئے، مالیگاؤں کا تجربہ تو ہو چکا، اب کوئی دوسری صورت سوچئے اور برابر خیال میں رہیئے، مایوس ہو کر بیٹھ نہ جانا چاہیئے، میرے پیش نظر اپنا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے، بس کام کا شوق ہے اور یہ خواہش کہ کچھ لوگ کام میں لگ جائیں، مالیگاؤں میں کام شروع ہوا ہوتا تو مولوی حبیب الرحمٰن خیر آبادی سے کچھ کام لیا جاتا جو رفتہ رفتہ کام کے لائق ہو جاتے۔ بہر حال سوچئے۔"

مالیگاؤں میں مجلس احیاء المعارف کا قیام اور علامہ اعظمی کا تعاون

کافی تفکر و تدبر اور کوشش و کاوش کے باوجود آپ کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہیں آرہا تھا، کہ اسی اثناء میں مولانا عبدالحمید نعمانیؒ نے مالیگاؤں میں ایک ادارہ "معہد ملت" کے نام سے قائم کیا، مولانا عبدالحمید نعمانی مرحوم نے ابتداءً یہ کوشش کی کہ علامہ اعظمی سال میں کچھ وقت نکال کر معہد ملت میں قیام کریں، اس طرح وہاں کے لوگوں کو آپ کے خرمن علم سے خوشہ چینی کا کچھ موقع مل جائے گا، لیکن علامہ اعظمی اپنی عدیم الفرصتی کے سبب اس کے لئے تیار نہ تھے، اس کے بعد مولانا نعمانی مرحوم نے ایک دوسری تجویز یہ رکھی کہ مالیگاؤں میں ہی نشر و اشاعت کا ادارہ قائم کیا جائے، یہ تجویز علامہ اعظمیؒ کی خواہش و منشا کے عین مطابق تھی، لہٰذا آپ جلد یا بدیر اس سے تعاون کیلئے آمادہ ہو گئے، تفصیل قاضی اطہر صاحب مرحوم کی زبانی پڑھئے:

"اس کی صورت یہ ہوئی کہ مالیگاؤں کے مولانا عبدالحمید نعمانی مرحوم جن کا آبائی وطن مبارکپور ہے، مولانا کی علمی شہرت سن چکے تھے، انھوں نے مالیگاؤں میں "معہد ملت" کے نام سے ایک درسگاہ کی بنیاد رکھی اس کے افتتاحی جلسہ میں میری کوشش سے دولت کویت کے مدرسہ کویتیہ کے استاذ مدحت

اسمٰعیل میرے ساتھ شریک ہوئے، اور تدریسی خدمت کیلئے مولانا بشیر احمد مبارکپوری مرحوم، مولانا محمد عثمان صاحب مبارکپوری، اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب خیر آبادی بلائے گئے، اس کے بعد مولانا نعمانی اپنی بعض تالیفات و تراجم کی کتابت کیلئے بمبئی آتے جاتے رہے اور ہم لوگوں سے ملتے جلتے رہے، انھوں نے چاہا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کسی صورت سے سال میں چند ماہ "معہد ملت" میں قیام کریں اور ان سے علمی استفادہ کیا جائے۔ مولانا مرحوم اس کے لئے تیار نہ تھے تو مولانا نعمانی نے یہ تجویز رکھی کہ مالیگاؤں میں ایک نشریاتی ادارہ قائم کیا جائے جس میں حدیث کی نادر و نایاب کتابوں کی تصحیح و تعلیق مولانا کی نگرانی میں ہو اور وہیں سے ان کو شائع کیا جائے۔ یہ تجویز مولانا کیلئے بڑی پرکشش تھی گویا ان کی دیرینہ دلی مراد پوری ہو رہی تھی، مگر جیسا کہ مولانا نے اپنے خط میں لکھا ہے، بمبئی اور اطراف بمبئی کے ذہن و مزاج اور حالات سے مطمئن نہیں تھے، جب مولانا نعمانی کا تقاضا زیادہ ہوا تو مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ نعمانی بار بار تقاضا کرتے ہیں، مالیگاؤں چلو اور ادارہ کے قیام کیلئے فضا سازگار کی جائے، چنانچہ بمبئی سے مولانا، میں اور حاجی تکی زبیر صاحب مالیگاؤں گئے اور وہاں کے اہل علم میں سے مولانا عبدالقادر صاحب، مولانا عثمان صاحب اور دیگر علماء کے ساتھ معہد ملت کے مذکورہ بالا اساتذہ کی جدوجہد سے مجلس احیاء المعارف کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور ایک ہفتہ وہاں رہ کر اس کے جملہ انتظامات کئے گئے۔"(۱)

انتقاء الترغیب والترھیب کی اشاعت اس ادارے کے ساتھ علامہ اعظمی نے اپنا علمی تعاون اس طرح کیا کہ امام ابو محمد عبدالعظیم بن عبدالقوی منذریؒ کی مشہور کتاب "الترغیب والترھیب" جس کا اختصار حافظ ابن حجرؒ نے کیا ہے اور جس کا نام "انتقاء الترغیب والترھیب" ہے، تصحیح و تعلیق کے بعد شائع کرنے کے لئے دی۔ ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۶۰ء

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔ ۱۲ ص ۴۰۔ ۳۹

میں یہ کتاب مذکورہ بالا ادارے سے شائع ہوئی جو ادارہ کا پہلا اور اہم ترین کارنامہ تھا۔

بالآخر وہی ہوا جس کا ان کو اندیشہ تھا، ان کے خدشات سچ ثابت ہوئے، وہ آپ کی توقعات پر شاید پورا نہیں اترا اور نہ ہی آپ کے حسب منشا کام ہوا، آپ نے دل برداشتہ ہو کر ۶ ررمضان المبارک ۱۳۸۰ھ کو جو ۱۹۶۱ء کے ابتدائی مہینوں میں سے کوئی تاریخ رہی ہو گی، قاضی اطہر صاحب کو تحریر فرمایا:

"عزیز من! میں نے تو بار بار لکھا کہ کوئی صورت بتاؤ تو اپنی ساری علمی تگ و دو اسی کیلئے وقف کر دی جائے مگر افسوس کہ کوشش کے باوجود نہ مئو میں کوئی بات بن سکی نہ بمبئی میں، میری کوشش اور مداخلت سے ایک چیز ہو گئی تھی تو میں نے بے معاوضہ، بلکہ ہرج اور کچھ خرچ کر کے ایک کام پورا کر دیا تاکہ ان "باآبرو" لوگوں کے ساتھ میری بھی بدنامی نہ ہو، اب نہ آگے کا کوئی پروگرام اُن کے سامنے ہے، نہ میرے اندر اس قدر قربانی کی ہمت ہے، نہ ان کے ساتھ چلنے کی"

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے وائس چانسلر شیخ ابن باز کی دعوت

علامہ اعظمی علیہ الرحمۃ کو جو عالمگیر شہرت و مقبولیت، اور عالم اسلام کے علمی حلقوں میں جو رتبۂ بلند اور عزت و سربلندی نصیب ہوئی تھی، اس کا اندازہ ان ان گنت دعوت ناموں سے ہو گا جو نہ صرف عالم عرب اور عالم اسلام بلکہ بہت سے غیر اسلامی ممالک سے بھی رسمی اور غیر رسمی طور پر آپ کے پاس ارسال کئے گئے، اسی نوع کا ایک دعوت نامہ ۱۳۸۱ھ میں یا اس سے کچھ قبل جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے اس وقت کے نائب رئیس الجامعۃ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز (۱) کی طرف سے آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا، لیکن علامہ اعظمیؒ نے اپنی

(۱) شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن عبدالرحمن بن عبداللہ آل باز، سعودی دارالحکومت ریاض میں ۱۳۳۰ھ میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں قرآن کریم حفظ کیا، اس کے بعد ریاض کے علماء سے دیگر اسلامی و شرعی و عربی علوم وفنون حاصل کئے، انھوں نے سعودی عرب کے مختلف مقامات پر تدریس وافتاء وقضاء کے فرائض انجام=

مصروفیات کے پیش نظر اس سفر سے معذرت فرمادی، ہماری یہ محرومی ہے کہ اصل دعوت نامہ جو شیخ ابن باز نے آپ کی خدمت میں ارسال فرمایا تھا نہیں مل سکا، لیکن آپ کا معذرت نامہ وصول کرنے کے بعد شیخ ابن باز نے جو خط لکھا تھا وہ دستیاب ہوا، شیخ کا یہ خط ۱۰؍رجب ۱۳۸۱ھ کو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے لیٹر پیڈ پر لکھا گیا ہے، اس میں فرماتے ہیں:

"من عبدالعزيز بن عبدالله بن باز الى حضرة الاخ المكرم حبيب الرحمن الاعظمى . وفقه الله آمين

سلام عليكم ورحمة الله و بركاته،

اشارة الى خطابكم الكريم المؤرخ ١٠/٦/ ١٣٨١ حول اعتذاركم من عدم تمكنكم من اجابة دعوتنا لكم فى موسم الحج الماضى ، نفيدكم بأن محبكم قد عذركم أعانكم الله وأثابكم . . ."

(عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کی جانب سے برادر مکرم جناب حبیب الرحمٰن الاعظمی وفقہ اللہ کی خدمت میں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:۔ آنجناب کے والا نامے مورخہ ۱۰؍جمادی الاخری ۱۳۸۱ھ کے حوالے سے گذشتہ موسم حج کے موقع پر ہماری دعوت کی قبولیت سے معذرت کے سلسلہ میں، ہم آپ کو خبر دینا چاہتے ہیں کہ آپ کے اس محب نے آپ کا عذر قبول کرلیا، اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کریں اور صلہ عطا فرمائیں)

=انجام دئے، چنانچہ ۱۳۵۷ھ سے ۱۳۷۱ھ تک خرج کے قاضی رہے، ۱۳۷۱ھ سے ۱۳۸۰ھ تک ریاض کے کلیۃ الشریعۃ وغیرہ میں تدریسی خدمات انجام دی، ۱۳۸۱ھ سے ۱۳۹۰ھ تک جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے وائس چانسلر رہے، ۱۳۹۰ھ میں اس کے چانسلر مقرر ہوئے جس پر وہ ۱۳۹۵ھ تک برقرار رہے، ۱۳۹۵ھ میں ادارات البحوث العلمیۃ والافتاء والدعوۃ والارشاد کی رئاسۃ عامہ کے منصب پر فائز ہوئے، اس کے علاوہ مختلف علمی، دینی اور سماجی واجتماعی عہدوں پر فائز رہے آپ کا شمار سعودی عرب کے صف اول اور عالم اسلام کے ممتاز ترین اہل علم میں ہوتا تھا، علم وفضل کے ساتھ نہایت کشادہ دست، سیر چشم اور سخی وفیاض تھے، ۱۳؍مئی ۱۹۹۹ء مطابق ۲۶؍محرم ۱۴۲۰ھ کو فوت ہوئے۔

رسالۃ الاوائل کی طباعت واشاعت ۱۳۸۲ھ م ۱۹۶۲ء میں علامہ اعظمی نے شیخ محمد سعید سنبل کے رسالۃ "الاوائل" کو نہایت اہتمام کے ساتھ چھپوا کر شائع کرایا، اس میں شیخ سعید سنبل نے حدیث کی ۴۳ کتابوں کی ایک ایک حدیث (عموماً پہلی حدیث اور کسی کتاب کی آخری حدیث کو) اپنی سند سے نقل کیا ہے، اس رسالہ کو عموماً حدیث کا ذوق رکھنے والے سند واجازت کے حصول کے لئے پڑھا کرتے ہیں۔

مدرسہ مفتاح العلوم کا ایک ناخوشگوار واقعہ ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء میں جب دوسرا جنرل الیکشن ہوا تو مولانا عبد اللطیف نعمانی مرحوم الیکشن میں جیت کر اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، جس کے بعد لازمی طور پر ان کو مئو چھوڑ کر ۵ رسال لکھنؤ میں قیام کرنا پڑا۔ دوسری جانب علامہ اعظمیؒ جب لکھنؤ سے آئے تو مدرسہ کی ذمہ داریوں سے بہت حد تک سبکدوش رہے، کمیٹی کے سرپرست اعلیٰ رہے، اور بوقت ضرورت اور طلبہ واساتذہ کے اصرار پر کچھ کتابیں پڑھا دیا کرتے، ان کی تربیت واصلاح کیلئے بھی کوشش کرتے رہتے، یہ سب بطیب خاطر اور برضا ورغبت کرتے رہے، لیکن مدرسہ کا کوئی عہدہ قبول نہیں کیا، نتیجہ کے طور پر تمام ذمہ داریاں مولانا محمد ایوب صاحبؒ کے حصہ میں آئیں اور مولانا نعمانی مرحوم کی عدم موجودگی میں پورے پانچ سال تک انھوں نے تمام تعلیمی وانتظامی ذمہ داریاں حسن وخوبی سے انجام دیں، علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> "... مگر جب وہ (مولانا عبد اللطیف نعمانی) یوپی اسمبلی کے ممبر چن لئے گئے تو مولانا محمد ایوب صاحب نے تعلیمی اور انتظامی دونوں ذمہ داریوں کو سنبھالا، اور دونوں کو خوبصورتی کے ساتھ نباہا۔" (۱)

پانچ سال بعد جب مولانا نعمانی مرحوم کی مدت رکنیت ختم ہوئی اور دوبارہ مفتاح العلوم تشریف لائے، تو ایک نہایت ناخوشگوار واقعہ یہ پیش آیا کہ مولانا محمد ایوب صاحبؒ اور مولانا عبد اللطیف صاحبؒ کے مابین کسی بات پر اختلاف ہو گیا، اختلاف کی یہ خلیج بڑھتی گئی، حتی کہ

(۱) تذکرۂ مولانا عبد اللطیف نعمانی ص ۱۵

مولانا محمد ایوب صاحبؒ نے دل برداشتہ ہو کر مدرسہ چھوڑ دیا، مولانا اعظمیؒ فرماتے ہیں:

"ممبری کی مدت ختم ہونے کے بعد جب مولانا عبداللطیف صاحب نے دوبارہ مدرسہ میں آنا چاہا تو اس وقت ان میں اور مولانا ایوب صاحب میں تھوڑی نااتفاقی اور بدمزگی پیدا ہو گئی جس کے نتیجہ میں مولانا ایوب صاحب نے مدرسہ چھوڑ دیا، اور کچھ دنوں کے بعد مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل میں شیخ الحدیث کا عہدہ قبول کرلیا۔"(۱)

مفتاح العلوم کی نشاۃ ثانیہ کے بعد مدرسہ کا یہ پہلا ناخوشگوار اور افسوسناک واقعہ تھا، جو ظہور پذیر ہوا، اور مدرسہ کی توسیع وترقی کے تین اہم عناصر میں سے ایک عنصر الگ ہو گیا۔

مولانا محمد ایوب صاحب اعظمیؒ ۱۳۸۱ھ میں مفتاح العلوم سے علحدہ ہوئے، کچھ دنوں بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ چلے گئے اور کم وبیش ڈیڑھ سال وہاں تدریسی خدمت انجام دی، بعد ازاں علامہ اعظمیؒ کی سفارش پر ڈابھیل تشریف لے گئے، اور جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل میں مسند حدیث سنبھالی، تقریباً بیس سال تک وہاں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے، ڈابھیل پہونچنے کے بعد مولانا محمد ایوب صاحب علیہ الرحمۃ نے علامہ اعظمی کے ساتھ خط وکتابت اور مراسلت کا سلسلہ برابر قائم رکھا، اس وقت ڈابھیل سے لکھے ہوئے مولانا محمد ایوب صاحبؒ کے متعدد خطوط ہمارے سامنے موجود ہیں، جن میں سے پہلا خط جو ڈابھیل پہنچنے کے بعد علامہ اعظمیؒ کی خدمت میں لکھا تھا، پیش خدمت ہے، یہ خط ۲۹ رربیع الثانی ۱۳۸۴ھ کا نوشتہ ہے لکھتے ہیں:

"مولانائے محترم اطال اللہ بقاءہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ سے رخصت ہو کر بحمد اللہ بخیر وعافیت یہاں پہونچ گیا، طلبہ واساتذہ وارکین مدرسہ بڑے اخلاق ومروت سے پیش آئے، مہتمم صاحب نے دو آدمی سورت بھیج دیا جس سے یہاں تک پہونچنے میں بڑی

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۵

آسانی ہوگئی، میرے متعلق بخاری شریف و ترمذی شریف دو کتابیں رکھی ہیں اور اسباق شروع بھی ہو گئے ہیں، بحمد اللہ لڑکے خوش و اراکین مطمئن معلوم ہوتے ہیں، اللہ کی ذات سے قوی امید ہے کہ جو کلمۂ خیر بھی آپ نے میرے متعلق کہا ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کو حرف بحرف صادق فرمائیں گے، اور میں رسوائی کا باعث نہ بنوں گا، ابھی کھانے کا کوئی خاص نظم نہیں ہے، کھانا دو وقتہ مہتمم صاحب کے گھر سے آجاتا ہے، ناشتے کا بھی معقول انتظام ہے کوئی تکلیف نہیں، اور طبیعت بھی بفضلہ اچھی ہے۔ آپ کی تصنیفات سے جامعہ کے اساتذہ وغیرہ بالکل ناواقف ہیں، بہت اچھا ہوتا کہ جب آپ تشریف لائیں تو متعدد نسخے رکعات اور اعلام ونصرۃ الحدیث کے لیتے آئیں، اور اگر تشریف آوری میں دیر ہو تو رکعات و اعلام مرفوعہ کے دو دو نسخے بذریعہ ڈاک بھیج دیں پیسے میں آکر ادا کرو دوں گا، یا جب آپ تشریف لائیں گے اس وقت دیدوں گا، مہتمم صاحب وغیرہ آپ کی تشریف آوری کے بیحد متمنی ہیں، کاشی اکسپریس سے میل نہیں ہے کافی تکلیف کا باعث ہے، بمبئی میل سے میل اچھا ہے، بھساول سے سورت تک ۱۲ر گھنٹہ کا راستہ ہے، میں اچھا ہوں، امید ہے مزاج گرامی اچھے ہوں گے، میری طرف سے مولانا عبدالجبار و مولانا عبدالباری صاحبان وغیرہ کو سلام مسنون عرض ہے...“

رہبر حجاج حج کے مسائل اور اس کے احکام پر آپ نے مختصر مگر جامع رسالہ ”رہبر حجاج“ تصنیف فرمایا، یہ رسالہ ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۳ء میں پہلی بار طبع ہوا۔

مسند حمیدی تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں علامہ اعظمی نے اپنی عنان توجہ ایک دوسرے فن کی طرف موڑی، یعنی اس پیرانہ سالی کو پہنچنے کے بعد، جب کہ مختلف امراض و عوارض آپ کی زندگی کے ساتھی بن چکے تھے، قویٰ میں ضعف اور اضمحلال آگیا تھا، حدیث کی کتابوں کی تحقیق و تعلیق اور تخریج و تحشیہ کا وہ کام شروع کیا، جس میں بے پناہ قوت و ہمت کی

ضرورت پڑتی ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کی زندگی اور ان کی تعلیمات سے متعلق عینی شاہدوں کے بیانات، جو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اور اپنے کانوں سے سن کر بیان کیے ہیں، ان کو جن لوگوں نے سلسلہ بسلسلہ سن کر دوسری صدی ہجری یا تیسری صدی میں قلمبند کیا ہے، یا عہد نبوی میں پھر عہد خلفاء میں جو نوشتے عالم وجود میں آئے تھے، ان کی مدد سے ان سے مکمل تر اور جامع تر مجموعہ تیار کیا ہے، دنیا کے کتب خانوں میں ان کی کھوج لگا کر ان کے قلمی نسخوں کے فوٹو حاصل کر کے ان کی نقلیں تیار کرائیں، ان کو ایڈٹ کیا، ان کی توضیح و تشریح کی اور یہ بتایا کہ فلاں بیان اور فلاں حدیث و روایت اور کہاں کہاں پائی جاتی ہے۔

آپ کی تحقیق سے اس نوعیت کا جو سب سے پہلا مجموعہ منظر عام پر آیا، وہ "مسند حمیدی" ہے، اس سے قبل اگرچہ "انتقاء الترغیب والترھیب" آپ کی تحقیق سے شائع ہو چکی تھی، لیکن وہ انتخاب بہت بعد کا ہے۔ مسند حمیدی کو دوسری صدی کے اواخر یا تیسری صدی ہجری کے اوائل کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے، اس کے مرتب ابو بکر عبداللہ بن الزبیر الحمیدی (متوفی ۲۱۹ھ) امام بخاری کے استاد تھے، علامہ اعظمی نے شام اور ہندوستان کے متعدد کتب خانوں سے اس کتاب کے مخطوطے یا ان کا عکس حاصل کر کے، ان سب کو سامنے رکھ کر ایک صحیح نقل تیار کی اور کتاب کو نہایت دیدہ ریزی اور دقیقہ رسی کے ساتھ ایڈٹ کیا۔ جو مجلس علمی ڈابھیل سے ۱۳۸۲ھ م ۱۹۶۳ء میں دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

اس کتاب کی اہل علم میں بہت پذیرائی ہوئی، اس کی مقبولیت کے لئے اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے، کہ نہ صرف ہندوستان اور عالم اسلام، بلکہ دنیائے علم و فن کے علمی مجلوں میں اس پر تبصرے شائع ہوئے۔ چنانچہ دمشق کے عربی ماہوار رسالہ "حضارة الاسلام" اور "مجلة المجمع العلمی العربی" جمادی الاولی ۱۳۸۳ (اکتوبر ۱۹۶۳ء) ص ۶۸۶۔۶۸۸ اور جنیوا (سوئزرلینڈ) کے مؤقر عربی رسالے "المسلمون" محرم۔ صفر ۱۳۸۵ھ (مئی۔ جولائی ۱۹۶۵ء) ص ۱۴۳۔۱۴۵ پر اس کتاب پر ریویو پڑھنے کے قابل ہے۔

جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل کا جلسۂ دستار بندی اور علامہ اعظمیؒ کی صدارت

مولانا محمد ایوب صاحب علیہ الرحمۃ مفتاح العلوم سے قطع تعلق کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں رہے، اس کے بعد ڈابھیل گئے۔ ان کے ڈابھیل جانے کے تقریباً سوا سال بعد جامعہ تعلیم الدین (ڈابھیل) کا جلسۂ دستار بندی منعقد ہوا، جس کی صدارت کیلئے علامہ اعظمیؒ کا انتخاب ہوا اور مقررین میں مولانا ابوالوفاء صاحب شاہجہانپوری (۱) جیسے خطیب و مقرر تھے، تاریخ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں اس جلسہ کی نسبت لکھا ہے:

"۳ شعبان ۸۵ھ مطابق ۲۸ نومبر ۱۹۶۵ء کو بعد نماز عشاء نو تعمیر شدہ دارالطعام (ڈائننگ ہال) میں سالانہ جلسۂ دستار بندی منعقد ہوا، جس کی صدارت ہندوستان کے مایۂ ناز محدث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ نے فرمائی، بارش کی وجہ سے جلسہ ہال میں رکھا گیا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، باہر بھی بہت مجمع تھا، قراءت و نظم کے بعد رپورٹ پیش کی گئی پھر مولانا ابوالوفاء شاہجہاں پوری کا وعظ ہوا" (۲)

(۱) اپنے دور کے بے مثال خطیب اور زبردست مناظر تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے مخصوص تلامذہ میں تھے، فراغت کے بعد دارالعلوم کے استاذ بھی رہے لیکن قدرت نے ان کی فطرت میں صحرانوردی لکھ دی تھی، اس لئے وہ تقریر و خطابت کے بادشاہ بن کر ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگاتے رہے۔ قادیانیوں اور رضاخانیوں سے بہت سے مناظرے کئے، جمعیۃ علماء ہند کے اہم رہنماؤں میں تھے، برطانوی حکومت کے خلاف ان کی تقریروں نے قید و بند کی بھی راہ دکھائی، شعر و شاعری سے بھی آپ کو دلچسپی تھی، عارف تخلص تھا، صرف نعت پاک کہتے تھے۔ آپ کی تقریر کا موضوع بھی سیرت پاک ہوا کرتا تھا۔ ۱۴۰۰ھ م ۱۹۷۹ء میں شاہجہاں پور میں فوت ہوئے۔

(۲) تاریخ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل ۱۵۴

اس کے بعد اگلے صفحہ پر علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا نقل معائنہ درج ہے، جس میں اپنے رفیق محترم مولانا محمد ایوب صاحب کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

"۔۔۔خوش قسمتی سے مدرسہ کو ہمارے محترم دوست جناب مولانا محمد ایوب صاحب (اعظمی) کی خدمات حاصل ہو گئی ہیں، جس کی وجہ سے مدرسہ کا تعلیمی معیار بلند اور اس کا پایۂ عظمت و وقار بہت اونچا ہو گیا ہے۔۔۔"(۱)

چوتھا حج | ۱۳۸۴ھ اور مسیحی تقویم کے حساب سے ۱۹۶۵ء میں چوتھا حج کیا، اس سفر سے متعلق جو باتیں علامہ اعظمیؒ نے اپنی یادداشت میں تحریر فرمائی ہیں وہ یہ ہیں:

۲۸/ذی قعدہ مطابق یکم اپریل کے خانہ میں لکھتے ہیں:

"ہوائی جہاز سے حج کیلئے روانگی ۶/بجے شام بمبئی سے"

۲۹/ذی قعدہ ۲/اپریل میں لکھتے ہیں:

"طلوع آفتاب سے پہلے جدہ پہونچا، جدہ سے احرام باندھ کر جمعہ سے پہلے مکہ پہونچا، ٹیکسی والے نے فی کس ۶/ریال لئے۔"

سعودی تقویم اور ہندی تقویم میں دو دن کا فرق رہا ہوگا، اس لئے ۳۰/ذی قعدہ کے تحت لکھتے ہیں:

"۳/کی شب میں طواف و سعی سے فراغت حاصل کی، ۳۵/ریال منیٰ عرفات کا کرایہ ادا کیا۔"

۱۱/اپریل کے ذیل میں تحریر ہے: "آج وقوف عرفہ ہوا"

۱۲/اپریل کو لکھتے ہیں:

"آج مزدلفہ سے قبیل طلوع چل کر قریب ظہر منیٰ پہونچے، رمی اور نحر سے فراغت قبیل مغرب ہوئی، ۳۰/ریال میں بکرا ملا۔"

---

(۱) تاریخ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل

۲۰/اپریل منگل کے دن لکھتے ہیں:

"آج شیخ یحییٰ امان مکی سے ملاقات ہوئی۔"

۲۲/اپریل جمعرات کو لکھا ہے:

"آج عبدالرحمٰن معلمی، شیخ بہجۃ البیطار شامی، شیخ حسن مشاط مکی سے ملاقات ہوئی۔"

۴/محرم ۱۳۸۵ھ - ۶/مئی ۱۹۶۵ء بروز پیر لکھتے ہیں:

"۶/مئی کو غروب کے وقت جدہ سے روانگی، ۷/مئی کو ۱۰/بجے دن میں بمبئی پہونچا۔"

۹/محرم - ۱۱/مئی بدھ کے دن لکھا ہے:

"۱۱/مئی کو بمبئی سے روانہ ہوا، ۱۲۔ کو رات میں مکان پہونچا۔"

اس سفر میں آپ کی ملاقات بہت سے اہل علم وفضل سے ہوئی، جن میں چند ایک کا نام اوپر گذر چکا ہے، ان کے علاوہ مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی (۱) سے بھی آپ کی ایک طویل ملاقات رہی، جس کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

(۱) وطن میرٹھ تھا، ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم الہ آباد کے انگریزی اسکول میں پائی، ۱۳۳۰ھ میں سہارنپور بھیج دیے گئے اور ۱۳۳۶ھ میں مظاہر علوم سے فارغ ہوئے، وہاں ۱۳۳۷ھ میں معین مدرس مقرر ہوئے، مگر جلد ہی اس کو چھوڑ کر دیوبند چلے گئے اور وہاں ۱۳۳۹ھ میں دورۂ حدیث میں شریک ہو کر شاہ صاحب کے پاس صحیح بخاری پڑھی، کچھ سال وہاں بھی معین المدرسین رہے، مگر ۱۳۴۶ھ میں شاہ صاحب کے ساتھ ڈابھیل چلے گئے اور ۱۷/سال تک وہاں تدریسی خدمت انجام دی، وہیں انھوں نے شاہ صاحب کی وفات کے بعد بخاری شریف پر ان کے افادات کو فیض الباری کے نام سے مرتب کیا، ۱۳۶۲ھ م ۱۹۴۳ء میں ندوۃ المصنفین سے وابستہ ہو کر اس کے لئے ترجمان السنۃ لکھی، ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان اور پھر وہاں سے مدینہ منورہ ہجرت فرماگئے۔ ۵/رجب ۱۳۸۵ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پائی، اور جنۃ البقیع میں مدفون ہوئے۔ (تاریخ دار العلوم دیوبند ۲/۱۴۲-۱۴۱)

"زرته فی داره المرة الأخیرة فی أواخر ذی الحجة سنة أربع و ثمانین وثلثمائة والف فتحدث معی برهة طویلة و أهدی لی الجزء الثالث من تالیفه ."

(میں نے ان سے آخری ملاقات ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ کے اواخر میں ان کے مکان پر کی، وہ مجھ سے دیر تک گفتگو کرتے رہے اور اپنی کتاب کا تیسرا حصہ مجھے ہدیہ کیا۔)

اس سفر سے واپسی کے بعد گھر سے ۱۸؍ محرم ۱۳۸۵ھ ۲۱؍ مئی ۱۹۶۵ء کو شیخ ابو غدہ کے پاس ایک خط لکھا جس میں بعض عرب علماء کی ملاقات کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے:

"وقد اتفقت فی هذه الرحلة زیارة الشیخ محمد بهجة البیطار، والشیخ مصطفی الزرقاء ،والشیخ محمد مبارك،والشیخ محمد الشامی والشیخ النبهانی . . ."

(اس سفر میں شیخ محمد بہجۃ البیطار، شیخ مصطفیٰ زرقاء، شیخ محمد مبارک، شیخ محمد شامی اور شیخ نبہانی سے ملاقات ہوئی)

کتاب الزہد والرقائق: علامہ اعظمی نے جن مخطوطات پر تحقیقی کام کیا ہے، ان میں سب سے قدیم امام ربانی عبداللہ بن المبارک مروزی (متوفی ۱۸۱ھ) کی کتاب الزہد والرقائق ہے، اس کا زمانۂ تصنیف ہجرت کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد ہے، اس کتاب کو آپ نے تین قلمی نسخوں کی مدد سے ایڈٹ کیا ہے، ایک نسخہ ترکی سے، دوسرا اسکندریہ سے اور تیسرا دمشق (شام) سے حاصل کیا۔ یہ کتاب ۱۳۸۵ھ م ۱۹۶۶ء میں مجلس احیاء المعارف سے پہلی دفعہ شائع ہوئی۔ یہ کتاب بھی علمی حلقوں میں نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی گئی، بالخصوص عربوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سابق شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمودؒ نے علامہ اعظمی کی اس علمی خدمت کو" الامام الربانی الزاهد عبدالله بن المبارك " میں ان الفاظ میں داد تحسین دی ہے:

"كتاب الزهد والرقائق ... وقد حققه و علق عليه الأستاذ المحدث المحقق الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي وقد بذل المحقق جهداً مشكوراً حتى أخرجه في صورة دقيقة و في طبعة أنيقة ..."(۱)

(اور کتاب الزہد والرقائق... استاذ محدث و محقق شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی نے اس کی تحقیق کی ہے اور اس پر تعلیقات لکھی ہیں اور اس کی تحقیق میں قابل شکر کوشش صرف کی ہے، حتی کہ اس کو بہتر اور پاکیزہ صورت میں شائع کیا۔)

اسی طرح شیخ الازہر نے اپنی کتاب (الامام الربانی) کی پیشانی پر جو ہدیہ کی عبارت لکھی ہے، اس میں یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں:

"الى السيد الاستاذ حبيب الرحمن الأعظمي تحية تقدير واعتراف بفضله في تحقيق كتاب الرقائق لابن المبارك."

(سید استاذ حبیب الرحمٰن الاعظمی کی خدمت میں ابن مبارک کی کتاب الرقائق کی تحقیق میں ان کے فضل کا اعتراف اور اس کو تسلیم کرتے ہوئے)

جامعہ نظامیہ حیدر آباد کی نصاب کمیٹی کی رکنیت اور تشکیل نصاب

جامعہ نظامیہ حیدر آباد، ہندوستان کا بالخصوص جنوبی ہند کا مشہور تعلیمی ادارہ ہے، اپنے مخصوص تعلیمی نظام کی وجہ سے یہ ہمیشہ خاص اہمیت کا حامل رہا ہے، ۱۹۶۷ء میں اس کے نصاب درس میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت محسوس کی گئی، اس پر غور و خوض کرنے کیلئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، اس کمیٹی کے رکن علامہ اعظمیؒ بھی بنائے گئے، آپ کے نام نامی کی پیش کش خصوصی طور پر مولانا سید ابوالحسن علی میاں صاحب نے کی، رکنیت کی اطلاع دینے کیلئے ۲۶ ستمبر ۱۹۶۷ء مطابق ۲۱ ۱۳۸۷ھ کو مولانا علی میاں صاحب نے علامہ اعظمی کے پاس یہ خط لکھا:

(۱) الإمام الرباني ص ۱۲۰

"حکومت حیدر آباد مدرسہ نظامیہ کی اصلاح کی تجویز پر غور کر رہی ہے اس کیلئے اس نے ایک کمیٹی بنائی ہے، میں نے آپ کا نام بھی پیش کیا تھا، اس نے منظور کر لیا ہے اور مجھے اطلاع دی ہے، اور آپ کا پتہ دریافت کیا ہے، یہ سفر غالباً میری واپسی کے بعد ہو سکے، مدعو حضرات حکومت کے مہمان ہوں گے اور وہیں سے اس کے مصارف ادا ہوں گے۔"(۱)

اس کے بعد جب نصاب تشکیل دیا گیا تو علامہ اعظمیؒ کی اس میں اہم مشارکت یہ رہی کہ انھوں نے اس کے کچھ ایسے رہنما اصول وضع کئے، جن سے اس کی ترتیب میں استفادہ کیا گیا، مولانا علی میاں صاحب ۱۴/ جون ۱۹۶۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مولانا ابوالعرفان صاحب نے محمد رابع کی رفاقت و شرکت کے ساتھ جامعہ نظامیہ کا نصاب تیار کر لیا، ان لوگوں کی درسی مشغولیت کی وجہ سے اس میں بھی دیر لگی، اس نصاب کی ترتیب میں آپ کے تحریر کردہ رہنما اصول سے بھی فائدہ اٹھایا گیا، میں نے لفظ بلفظ سن لیا اور مجھے مجموعی طور پر اس سے اتفاق ہے، ایک آدھ جگہ میں نے ترمیم بھی کر دی ہے، اس کام میں اتنی تاخیر ہو گئی ہے کہ مزید تاخیر کی گنجائش نہیں، سکریٹری صاحب کے تقاضے کا خط آئے ہوئے بھی خاصے دن ہو گئے، لیکن آپ کی نظر پڑنے سے پہلے اس کا بھیجنا مناسب نہ معلوم ہوا، لہذا اس کی نقل آپ کے پاس مرسل ہے۔ اب آپ یہ خط ملاحظہ فرماتے ہی اس پر نظر ڈال کر مطلع فرمائیں کہ اس کو براہ راست یہاں سے بھیج دیا جائے، اگر رائے بریلی کے پتہ پر تار دیدیا جائے تو اور بہتر ہوگا۔"

(۱) مولانا رشید احمد صاحب اعظمی سے معلوم ہوا کہ جامعہ نظامیہ کے تشکیل نصاب کیلئے جامعہ کی دعوت پر آپ نے باقاعدہ حیدر آباد کا سفر بھی فرمایا، حکومت کی طرف سے قیام کا انتظام ایک شاندار ہوٹل میں کیا گیا تھا، مگر مولانا ابوالوفا افغانی، جو اپنے وقت کے عظیم عالم و محقق تھے، اور علامہ اعظمی سے شدید محبت رکھتے تھے، اصرار کر کے اپنے دولت خانہ پر لے گئے، چنانچہ علامہ اعظمی جب تک حیدر آباد میں رہے انھیں کے یہاں مقیم رہے، اس وقت نصاب کمیٹی کی جو میٹنگ ہوئی تھی اس میں رہنما اصول طے کئے گئے تھے۔

دارالعلوم دیوبند سے صدارت تدریس کی پیشکش | ازہر ایشیا دارالعلوم دیوبند کی مسند صدارت نہایت بابرکت اور باعث عزت و تکریم سمجھی جاتی رہی ہے، اس کی مسند پر حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ (۱) حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا ابراہیم بلیاویؒ جیسے علم کے آفتاب و ماہتاب جلوہ افروز رہ چکے ہیں، دارالعلوم دیوبند کی صدارت کی نسبت بجا طور سے کہا جا سکتا ہے کہ:

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

۲۴؍ رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ کو شیخ المعقول والمنقول علامہ ابراہیم بلیاوی صاحبؒ کی وفات کا سانحۂ دلگداز جب پیش آیا، تو ایک بار پھر دارالعلوم کے ارباب بست وکشاد کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ یہ مسند صدارت کسی موزوں شخص کے سپرد کرکے اس خلا کو پُر کیا جائے، اور صدارت افتاء کے ۲۳؍ سال بعد صدارت تدریس کا یہ قرعۂ فال بھی علامہ اعظمیؒ کے نام نکلا، لیکن واہ رے بے نیازی! کہ:

تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

اس بار بھی آپ نے معذرت فرمادی اور شاگرد عزیز مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی کو ۲۵؍ شوال ۱۳۸۷ھ (۲) کو یہ خط لکھا:

---

(۱) مولانا مملوک علی نانوتوی استاذ عربک کالج دہلی کے خلف الرشید تھے نانوتہ ضلع سہارنپور میں ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء) میں پیدا ہوئے، دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر المدرسین تھے، اکابر علماء دیوبند آپ کے شاگرد تھے، جید عالم تھے اور جذب و سلوک کا آپ کے اوپر غلبہ رہا کرتا تھا۔ ۳؍ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ میں فوت ہوئے۔ (تاریخ دارالعلوم ۱: ۱۹۸۔ کاروان رفتہ ص ۲۶۹)

(۲) ترجمان الاسلام کے مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نمبر میں ۲۵؍ شوال ہے، جب کہ "مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے" میں ۵؍ شوال درج ہے، کسی ایک میں کتابت کی غلطی ہے۔

"علامہ کی وفات کے بعد دیوبند سے جو خط لکھا تھا وہ پہلے مل گیا تھا، آج وطن سے بھیجا ہوا تمہارا خط ملا۔ تم نے جو باتیں لکھی ہیں وہ بعید از قیاس نہیں ہیں میرا خیال ہے کہ ہر دو فریق مجھے اس لئے گوارا کرلیں گے کہ ہر ایک کے سامنے آئندہ جو اندیشے ہوں گے، وہ میرے باب میں یا تو نہ ہوں گے، یا بہت کم ہوں گے، مگر میں اپنے دل کو جہاں تک ٹٹولتا ہوں، میرے دل کے کسی گوشہ میں یہ تمنا نہیں ملتی۔ میں وہاں کے ماحول سے بہت متوحش ہوں، میں انشاء اللہ وہاں کا رنگ قبول نہیں کرسکتا اور امید نہیں کہ میرا رنگ وہاں مقبول ہو۔"(۱)

مکتوب الیہ مفتی محمد ظفیر الدین صاحب اس بات کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں:

"حضرت کو دیوبند کی آب و ہوا کبھی موافق نہیں آئی، جب کبھی شوریٰ میں تین دن کیلئے بھی آئے تو بیمار ضرور ہوئے اور مجھے دوا کی فکر کرنا پڑی، ایک بڑی وجہ دیوبند سے وحشت کی یہ بھی تھی کہ حضرت نے جس قدر بھی علمی اور تعلیمی کام کیا، سب گھر پر بیٹھ کر کیا، ظاہری طور پر شہرت کی وجہ آپ کے ساتھ کچھ بھی نہیں تھی، جو کچھ تھا وہ آپ کی علمی خدمت، علوم دینیہ میں مہارت بالخصوص علم حدیث سے شغف تھا، اللہ تعالیٰ نے دل و دماغ اور فکر و ذہن متقدمین جیسا عطا کیا تھا، مئو جیسی چھوٹی اور صنعتی جگہ میں رہ کر پورے عالم اسلام میں روشناس ہوئے اور برصغیر سے لے کر سعودی عرب، کویت اور مصر تک کے علماء کرام نے آپ سے حدیث کی سند اور اجازت حاصل کی، طبیعت غیور اور بے نیاز پائی تھی، شہرت طلبی کے جذبہ سے سینہ پاک تھا، نام و نمود سے کوسوں دوری تھی، مگر مقبولیت خداداد تھی اور غالباً علوم نبوت سے دلچسپی کا فیضان تھا۔"(۲)

---

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔ ۱۲ص ۱۶۰ (۲) ایضاً ص ۱۶۱۔۱۶۰

سنن سعید بن منصور اس کتاب کی اہمیت اس سے سمجھی جا سکتی ہے کہ اس کے مؤلف امام سعید بن منصور (متوفی ۲۲۷ھ) امام مسلم جیسے جلیل القدر محدث کے استاذ تھے، علم حدیث کا یہ بیش بہا اور نادر و نایاب نسخہ بڑی اہمیت کا حامل تھا، صدیوں سے بڑے بڑے نامور علماء و محدثین اس کی صورت دیکھنے کو ترستے تھے۔ خدائے تعالیٰ نے اس کتاب کو منظر عام پر لانے کا شرف بھی خاک ہندوستان کے حصے میں لکھ رکھا تھا، اس مخطوطے کو ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی فرنساوی نے ترکی کے ایک کتب خانے میں دریافت کیا اور مجلس علمی کے بانی و سرپرست مولانا محمد موسیٰ میاں کو اس کی اطلاع دی، مولانا نے ڈاکٹر صاحب کو خط لکھا کہ آپ اسے ہندوستان مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کے پاس بھیج دیں میں ان کو لکھ رہا ہوں کہ آپ اس کی تحقیق فرمادیں، علامہ اعظمی نے اس کی تحقیق اور احادیث کی تخریج کی، اس کی صرف دو ہی جلدیں دستیاب ہو سکیں، جو آپ کے ایڈٹ کرنے کے بعد مجلس علمی ڈابھیل سے ۱۳۸۷ھ م ۱۹۶۷ء اور ۱۳۸۸ھ م ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئیں، اس طرح ہندوستان کی کلاہ افتخار میں ایک اور طرہ کا اضافہ ہوا۔ علامہ اعظمی جس زمانہ میں اس کی تحقیق فرمارہے تھے، ڈاکٹر حمید اللہ نے مولانا ابراہیم میاں کو خط لکھا تھا کہ مولانا اعظمی سنن سعید بن منصور کی تحقیق کیا کر رہے ہیں، کتاب کو چار چاند لگا رہے ہیں۔

مجمع بحار الانوار ہندوستان کے مشہور محدث اور اکبری دور کے زبردست عالم مولانا محمد طاہر پٹنی (متوفی ۹۸۶ھ) کی جامع اور بہترین کتاب حدیث کے لغت پر ہے، یہ کتاب لکھنؤ کے مشہور پریس منشی نول کشور سے متعدد بار چھپی تھی، مگر ان نسخوں میں غلطیاں بکثرت تھیں علامہ اعظمی نے اپنے تعاون سے اس کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کرا کے اس کی تصحیح، اور اس کو ایڈٹ کر کے از سر نو اشاعت کے قابل بنایا۔ اس کتاب کی پانچوں جلدیں ۱۳۸۷ھ م ۱۹۶۷ء سے ۱۳۹۵ھ م ۱۹۷۶ء کے درمیان مجلس دائرۃ المعارف النعمانیہ حیدر آباد سے شائع ہوئیں۔

حکومت کویت کی وزارۃ الاوقاف کی دعوت

۱۳۸۸ھ م ۱۹۶۸ء سے ۱۳۹۰ھ ۱۹۷۰ء تک تقریباً تین چار سال مسلسل آپ کو کویت کی وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية کی جانب سے کویت کے سفر اور قیام کے لئے دعوت دی جاتی رہی ۔ کویت کی وزارت اوقاف نے اسلامی علوم وفنون اور علمی کتابوں کی اشاعت میں بعض بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، اُن دنوں وزارت کی طرف سے " الموسوعة الفقهية" (فقہی انسائیکلوپیڈیا) کی جمع وترتیب کا کام ہو رہا تھا، اس سلسلے میں علامہ اعظمی کو بھی دعوت دی گئی کہ آپ وہاں کم وبیش ایک سال قیام فرمائیں اور دوران قیام انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب سے متعلق جو ذمہ داری آپ کے سپرد کی جائے اس کو انجام دیں، اس کے لئے وہاں کے نامور عالم وفقیہ شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء کی طرف سے، جو اس مہم کے نگراں تھے، پہلے دعوت نامہ بعد ازاں یاددہانی کے متعدد خطوط (Reminders) آئے، کافی پس وپیش اور تردد وتامل کے بعد کسی صورت سے علامہ اعظمی نے اس سفر اور اس مہم کی ادائیگی کیلئے اپنے ذہن کو سازگار کیا۔ شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء کو جب آپ کی آمادگی کا خط موصول ہوا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی ۔ شیخ زرقاء کے اولیں خطوط جن میں وہ دعوتنامہ اور سفر کے شرائط تھے ، وہ تو ہمیں مل نہیں سکے کہ ہم ان کو یہاں ذکر کریں، البتہ آخر کے دو خط ملے جو ہماری بات کی شہادت کیلئے کافی ہیں، شیخ کے دونوں خط جو دستیاب ہوئے ہیں ان میں پہلا وہی ہے جسے علامہ اعظمی کی آمادگی کے بعد انھوں نے تحریر فرمایا ہے اور جو ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ مطابق ۳۰ جون ۱۹۶۹ء کا مکتوب ہے، ذیل میں ہم اس خط کا ایک اقتباس نقل کر رہے ہیں کیونکہ پورا خط بہت طویل ہے اور فل اسکیپ کے دو صفحات پر مشتمل ہے۔ لکھتے ہیں:

" صاحب الفضيلة الأستاذ الجليل الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي المحترم حفظه الله تعالى وأدام للمسلمين نفعه.

السلام عليكم :

وبعد فاحمد الله تعالىٰ اليكم راجيا من فضله أن تكونوا بخير و عافية

من كل مكروه.

تلقيت الآن رسالتكم العزيزة المؤرخة فى ٦/٤/١٣٨٩ھ جوابا على رسالتى الأخيرة اليكم. وقد كان سرورى عظيما جداً بما تضمنته من استعدادكم للمجئى هنا للتعاون فى مشروع الموسوعة بما يمكن أن يستفاد فيه من فضيلتكم فى هذاالمشروع الجلل، بارك الله فيكم و قواكم وإيانا على متابعة الخدمة لهذه الشريعة الغراء الخالدة.

أفدتم في رسالتكم المشار إليها أنكم تأملون أن يتحقق مجيئكم فى أول شهر آب المقبل، فأقول لفضيلتكم إن الأفضل أن يكون مجيئكم بعد ذلك بنحو أربعين يوماً، أى ما بين ١٠-١٥/ من شهر أيلول (سبتمبر) ذلك لأنى سأكون غائبا خلال آب و حتى اليوم العاشر من شهر أيلول فى إجازتى السنوية إن شاء الله. فالمناسب أن يكون مجيئكم فى موعد عودتي من إجازتى. لذلك بادرت الآن الكتابة اليكم لترتبوا قدومكم الميمون ان شاء الله واستعدادكم له على هذا الأساس.

هذا رأى و اقتراح، وليس حتما، فإذا وجدتم أن تأخركم إلى أول شهر أيلول يخشي أن يكون تتجدد لكم به عوائق جديدة، فعجلوابالمجيء فى أول شهر آب وأترك لكم الخيار فى ذلك، و سأترك لكم قبل غيابى موضوعاً تخططونه و تكتبون فيه إذا رجحتم المجيء قبل عودتى."

(فضیلت مآب استاذ جلیل و مکرم شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی! اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائیں اور مسلمانوں کیلئے آنجناب کے فیض کو تادیر باقی

باقی رکھیں۔

السلام علیکم۔

میں بحمد اللہ بخیر ہوں اور اس کے فضل سے امید کرتا ہوں کہ آنجناب بھی بخیر وعافیت ہوں گے۔

میرے آخری خط کے جواب میں ۶؍ ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ کا آپ کا تحریر کردہ والانامہ موصول ہوا۔

میں بہت زیادہ مسرور ہوا جب میں نے اس کو انسائیکلوپیڈیا کے پروجیکٹ کے سلسلے میں تعاون کے لئے آپ کی یہاں آمد کی آمادگی پر مشتمل پایا؛ تاکہ اس عظیم پروجیکٹ میں آنجناب کی ذات سے ممکن طور پر استفادہ کیا جا سکے، اللہ تعالیٰ آپ کے کام میں برکت عطا فرمائیں اور آپ کو اور ہم کو اس روشن اور ابدی شریعت کے لئے خدمت کو جاری رکھنے کی قوت بخشیں۔

آپ نے اپنے مذکورہ بالا خط میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ آئندہ اگست میں یہاں آپ کی تشریف آوری کی امید ہے۔ تو میں آنجناب سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بہتر ہوگا کہ آپ اس کے چالیس دنوں بعد یعنی ۱۰؍ سے ۱۵؍ ستمبر کے دوران تشریف لائیں، کیونکہ میں اگست میں اور ۱۰؍ ستمبر تک اپنی سالانہ چھٹی کی وجہ سے غیر حاضر رہوں گا، لہذا بہتر ہوگا کہ آپ کی تشریف آوری چھٹی سے میری واپسی کے بعد ہو ، اسی لئے میں بغیر کسی تاخیر کے آپ کے پاس یہ خط لکھ رہا ہوں، تاکہ آپ اپنے قدوم میمنت لزوم کا پروگرام اسی کے موافق ترتیب دیں۔

یہ میری رائے اور تجویز ہے کوئی حتمی فیصلہ نہیں، لہذا اگر آپ یہ محسوس کریں کہ ستمبر کے شروع تک مؤخر کرنے کی صورت میں نئی رکاوٹوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، تو پھر آپ اگست کے آغاز میں

تشریف لائیں، اس کا اختیار آپ کو ہے ، میری واپسی سے قبل اگر آپ تشریف لانا چاہیں تو میں اپنی عدم موجودگی میں ایک موضوع چھوڑ جاؤں گا جس کا لائحہ عمل تیار کر کے آپ لکھنا شروع کردیں گے...)

مشغولیات کی کثرت، عدیم الفرصتی اور تنگی اوقات کی وجہ سے بڑی ردوکد کے بعد کسی سفر کا پروگرام بناتے تھے، بالخصوص طویل سفر سے متعدد موانع آپ کے سامنے رہتے تھے، اور اکثر و بیشتر ایسا ہوتا کہ ایک دفعہ اگر پروگرام مؤخر یا ملتوی ہو جاتا تو دوبارہ اس کے پیش آنے کے امکانات بہت ہی کم، بلکہ نہیں کے برابر ہوتے تھے، اس پروگرام کا حال بھی وہی ہوا، ایک بار مؤخر ہوا پھر ہوتا ہی رہا، چنانچہ شیخ مصطفیٰ زرقاء کا دوسرا خط جو ہمارے پیش نظر ہے وہ ۱۱ر رجب ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۲ر ستمبر ۱۹۷۰ء کا ہے، جس میں فرماتے ہیں:

"صاحب الفضيلة الأستاذ الجليل الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي المحترم زاده الله عافية و قوة .

السلام عليكم .

وبعد. فأسأل المولى أن تكون حالتكم الصحية جيدة . وأن تكون آثار العملية الجراحية قد ولت وعاد اليكم نشاطكم المعهود ، وحينئذ أجد الفرصة سانحة لتكرار العرض على فضيلتكم للحضور الى الكويت والقيام بمهمة عضو في هيئة تحرير الموسوعة ، وذلك لمدة سنة مبدئيا ، بالشروط والتعليمات المبينة لسيادتكم سابقاً وبمرتب شهرى (ليس معه أى توابع أو علاوات) قدره / ۳۵۰ / ثلاثماية و خمسون دينارا كويتيا . . . ."

(فاضل گرامی استاذ جلیل مکرمی جناب حبیب الرحمٰن الاعظمی صاحب اللہ تعالیٰ آپ کو مزید عافیت و قوت نصیب فرمائیں۔

السلام علیکم۔ میں خدا سے دعاگو ہوں کہ آنجناب کی صحت بہتر ہو اور

آپریشن کے اثرات زائل ہو چکے ہوں اور آپ کی نشاط وسرگرمی معمول پر آگئی ہو، اس وقت میں یہ موقع غنیمت سمجھ رہا ہوں کہ کویت حاضری اور انسائیکلوپیڈیا کے ایڈیٹوریل بورڈ میں ایک ممبر کی حیثیت سے اپنی مہم کی ادائگی کے سلسلے میں آنجناب سے دوبارہ عرض کروں اور یہ کم از کم ایک سال کے لئے ہوگا، انھیں شرائط وہدایات کے ساتھ جو آنجناب سے پہلے عرض کئے جاچکے ہیں، اور ۳۵۰/ تین سو پچاس کویتی دینار کے مشاہرہ کے ساتھ (جس میں دیگر سہولیات ولوازمات شامل نہیں ہوں گے ...)

بہر حال علامہ اعظمیؒ کا یہ سفر مؤخر ہونے کے بعد منسوخ ہوگیا، اس کی منسوخی کے متعدد عوامل میں ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اسی دوران آپ کو بیروت کا ضروری سفر پیش آیا اور وہاں چار مہینے قیام کرنا پڑا (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) البتہ آپ نے فقہی انسائیکلوپیڈیا کی خدمت ضرور انجام دی، لیکن کویت جاکر اور وہاں شاہی مہمان بن کر نہیں، اور نہ ہی درہم ودنیار اور مال وزر کی لالچ میں۔ وزارۃ الاوقاف کی تحریک پر ہی انسائیکلوپیڈیا کا کام کیا، لیکن سفالہ پوش مکان کے نیم تاریک گوشے میں بیٹھ کر، محض علم اور دین کی خدمت کے جذبے سے اور اسی کے ساتھ گھر بیٹھے ہی انسائیکلوپیڈیا کے متعدد مقالات پر نظر ثانی کا کام بھی کیا۔

ایک اور صاحبزادی کی وفات۔ پہلی صاحبزادی کی وفات کے دس سال بعد اسی قسم کا ایک اور جانکسل واقعہ بھی آپ کو سہنا پڑا، اور ایک اور بچی کو اپنے ہاتھوں قبر میں اتارنا پڑا، جب کہ آپ کی صاحبزادی زکیہ خاتون ۱۸/ محرم ۱۳۸۹ھ م ۶/ جون ۱۹۶۹ء کو اس دنیا سے کوچ کر گئیں، علامہ اعظمی خود لکھتے ہیں:

"زکیہ خاتون بنت حبیب الرحمٰن الاعظمی، والدہ مولوی ضیاء الحسن سلمہ ۱۸/ محرم ۱۳۸۹ھ مطابق ۶/ جون ۱۹۶۹ء کو سوا دس بجے دن میں بیس

اکیس دن کی بیماری کے بعد انتقال کر گئی، اپنی والدہ کی آنکھوں کی معذوری کے بعد سے بڑی حد تک میرے کھانے ناشتہ کی دیکھ ریکھ وہی کرتی تھی، اس کا اکلوتا لڑکا دورۂ حدیث میں تھا، اس کی فراغت کی خوشی میں افسوس کہ وہ شریک نہ ہو سکی، واللہ تعالیٰ أعلم بمصالح عباده"

احتباس بول اور آپریشن ارشاد نبوی ہے کہ جو خدا کا جتنا زیادہ مقرب ہوتا ہے اس کی آزمائش بھی اتنی ہی سخت ہوتی ہے، بچی کے انتقال کے ایک ماہ بعد علامہ اعظمی ۷ر جولائی ۱۹۶۹ء کو بمبئی کے ایک سفر پر روانہ ہوئے، ابھی ٹرین ہی پر تھے کہ جبل پور سے پہلے احتباس بول کی شکایت ہوئی، اس کے بعد دو آپریشن ہوئے، ایک جبل پور میں اتر کر فوراً اور دوسرا بمبئی میں، اس واقعہ کا ذکر ایک خط میں یوں کیا ہے:

"اسی اثناء میں ۷ر جولائی ۱۹۶۹ء کو مجھے بمبئی کا سفر پیش آیا اور ریل میں مجھے احتباس بول کی شکایت ہوئی، جس نے اتنی شدت پکڑی کہ مجھے جبل پور اتر کر ہسپتال میں داخل ہونا پڑا، وہاں موت و زیست کی کشمکش میں ایک چھوٹے آپریشن کے بعد ربر کی نلکی کے ذریعہ پیشاب جاری کیا گیا، اس کے بعد اسی حالت میں بمبئی جا کر ایک نرسنگ ہوم میں داخل ہوا اور وہاں غدود مثانہ کا آپریشن ہوا، چالیس دن تک وہاں رہا۔"

اس آپریشن کے دوران وہ کن تکالیف اور صبر آزما کیفیات سے گذرے، اس کے متعلق اسی خط میں چند سطر بعد لکھتے ہیں:

"میں اس علالت اور عملیہ جراحیہ کے دوران میں جن حالات سے گذرا ہوں بس اللہ ہی بہتر جانتا ہے، خیر حق تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے گویا دوبارہ زندگی بخشی۔"

آپریشن کے بعد اس کے اثرات آپریشن کے بعد اصل مرض تو زائل ہو گیا،

لیکن اس کے شدید اثرات دوسرے اعضاء پر ظاہر ہوئے جو مدت تک بر قرار رہے، مثلاً کمزوری، نقاہت اور دوران سر، یہ سب شکایتیں کافی دنوں تک رہیں، اس کا ذکر بھی اسی مذکورہ بالا خط میں کیا ہے۔ خیال رہے کہ یہ گرامی نامہ آپریشن کے تقریباً ۹ر ماہ بعد ۲۱ر اپریل ۱۹۷۰ء م ۱۴ر صفر ۱۳۹۰ھ بروز منگل کا نوشتہ ہے:

"بمبئی سے وطن آکر مہینوں چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا، اب تھوڑی دور چل پھر لیتا ہوں، مگر چلنے کی حالت میں جسم ڈگمگاتا ہے، توازن قائم نہیں رہتا، رات میں یہ کیفیت بڑھ جاتی ہے۔ بہر حال انھیں حالات میں اب لکھنے پڑھنے بھی لگا ہوں۔"

اس حالت و کیفیت کا تذکرہ اس زمانے کے کئی خطوط میں ملتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا خط سے پہلے مفتی ظفیر الدین صاحب کو لکھ چکے تھے:

"واقعی بڑا سخت ابتلا تھا، اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے اس سخت مرحلہ سے سلامتی کے ساتھ گذار دیا، آپریشن میں الحمد للہ کوئی تکلیف وغیرہ نہیں ہے، لیکن دوران سر کی شکایت اتنی شدید ہے کہ ابھی تک مسجد جانے کے قابل نہیں ہوں، جسم قابو میں نہیں رہتا(۱)

بیروت کا سفر مصنف عبد الرزاق کی تحقیق علامہ اعظمی کا وہ عظیم الشان علمی و تحقیقی کارنامہ ہے جو علم حدیث کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھنے کے قابل ہے، آپ کے اس تحقیقی شاہکار کی گونج اس کی طباعت و اشاعت کے بہت پہلے سے علمی حلقوں میں سنائی دینے لگی تھی۔ علامہ اعظمی نے عالم اسلام کے مختلف کتب خانوں سے اس کے قلمی نسخوں کی فراہمی، نقل، اور ان کے مقابلہ اور تحقیق و تعلیق میں دس سال کی جو شبانہ روز محنت و مشقت اور جاں سوزی و جگر کاوی کی وہ آپ ہی کا حصہ تھا، ان تمام مراحل سے گذرنے کے بعد جب کتاب تیار ہو کر اس قابل ہوئی کہ پریس میں دی جا سکے تو اس کے

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۹۲

لئے بھی آپ نے خصوصی اہتمام فرمایا، مجلس علمی کی طرف سے اس کتاب کو نشر ہونا تھا، مجلس سے فرمائش و فہمائش کر کے لندن سے اعلیٰ درجہ کے کاغذ منگوائے، طباعت کی نگرانی اور فرموں کی دیکھ بھال کیلئے بنفس نفیس بیروت کا سفر کیا، اور تقریباً چار مہینے بیروت میں قیام فرما کر کتاب کے فرموں کی دیکھ بھال اور چھپائی کے کاموں کی نگرانی فرماتے رہے، اس سفر میں معاون کی حیثیت سے اپنے بڑے صاحبزادے مولانا رشید احمد صاحب اعظمی کو ساتھ رکھا، جو شروع ہی سے مخطوطات وغیرہ کے نقل و تحریر میں آپ کے دست راست اور کتب حدیث کی تحقیق و تخریج میں آپ کے معاون رہے ہیں۔

بیروت کے آپ نے دو سفر کئے، پہلا سفر ستمبر ۱۹۷۰ء کے اواخر میں ہوا، بمبئی کے سانتا کروز ایرپورٹ سے ۲۴ر ستمبر ۱۹۷۰ء کو صبح پانچ بجے روانہ ہوئے۔ جہاز کویت ایرپورٹ پر کئی گھنٹے رکا رہا، اور وہاں سے بیروت کے لئے شام ساڑھے چار بجے پرواز ہوئی، یہاں ایک خط کا کچھ حصہ ذکر کردوں جو بیروت پہنچنے کے اگلے روز یعنی ۲۵ر ستمبر کو وہاں کے ہوٹل "بوریواج" سے اپنے ایک محب و عقید تمند شیخ عبدالستار ابو غدہ مقیم کویت کو لکھا تھا:

"... فالأسف كل الأسف أني أبرقت اليكم من بومباى مساء ٢٣-سبتمبر أني أنزل في مطار الكويت ذاهباً الى بيروت، فان تفضلتم بالمجئى الى المطار كان أحرى، ولكن الظن أن البرقية لم تصل اليكم الى ظهر ٢٤ سبتمبر وإني قد مكثت في المطار ست ساعات وغادرته في الساعة الرابعة والنصف .."

(مجھے افسوس بہت افسوس ہے کہ بمبئی سے میں نے ۲۳ر ستمبر کی شام میں آپ کو ٹیلیگرام کیا کہ میں بیروت جاتے ہوئے راستے میں کویت اتروں گا۔ لہذا اگر آپ ایرپورٹ آسکیں تو بہت بہتر ہوگا، لیکن میرا اندازہ ہے کہ تار ۲۴ر ستمبر کی دوپہر تک آپ کو نہیں مل سکا، میں ایرپورٹ پر چھ گھنٹے رکا رہا، اور وہاں سے میں نے ساڑھے چار بجے کوچ کیا۔)

مصنف بیروت کے مشہور عالم پریس دارالقلم میں طبع ہو رہی تھی، آپ وہاں کم وبیش چار مہینے قیام فرما رہے، ابتداءً قیام مذکورہ بالا ہوٹل (بوریواج) میں رہا، لیکن آپ کا مزاج ہوٹل کی رہائش اور وہاں کے ماحول سے مانوس نہیں تھا، جلد ہی ایک قسم کی وحشت سی محسوس کرنے لگے اور شیخ زہیر شاویش کے مکان پر ایک فلیٹ کرائے پر لیکر وہاں منتقل ہو گئے، صاحبزادۂ محترم مولانا رشید احمد صاحب اعظمی ایک آدھ مہینہ ساتھ رہے اس کے بعد شدید بیماری کی وجہ سے ان کو عمرہ کرتے ہوئے وطن واپس ہونا پڑا، جس کے بعد علامہ اعظمی کو کافی پریشانیاں جھیلنی پڑیں، شیخ عبدالستار ابو غدہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"...وبما أني كنت في هذه الأيام مهموماً جداً لمغادرة ولدى رشيدأحمد بيروت مضطرا اليها ، لوعكة شديدة أصابته . ثم عولج و صحّ والحمد لله ولكنا خفنا أن تعاوده ، فأرسلناه إلى الحجاز) تأخرت في الاجابة ..."

(اس خط کے جواب میں اس وجہ سے تاخیر ہوئی کہ میں ان دنوں اپنے لڑکے رشید احمد کے سخت بخار کی بنا پر مجبوراً بیروت سے کوچ کر جانے کی وجہ سے بہت متفکر تھا، پھر ان کا علاج کیا گیا اور بحمداللہ وہ صحت یاب ہو گئے، لیکن ہمیں خدشہ ہوا کہ بخار دوبارہ عود نہ کر آئے، اس لئے ہم نے ان کو حجاز بھیج دیا۔)

آپ کے بیروت میں قیام کی خبر جب محقق فاضل ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی مقیم پیرس کو ملی، تو انھوں نے ۸ر رمضان المبارک کو پیرس سے ایک خط لکھا جس میں تحریر فرمایا:

"مولوی ابراہیم میاں (۱) کے خط سے معلوم ہوا کہ آں محترم مصنف عبدالرزاق کی طباعت کے لئے بیروت تشریف لا چکے ہیں، "شاہ ولی اللہ ثانی" کی یہ خدمت حدیث عنداللہ ماجور، عندالناس مشکور ہو گی۔ اللہ تعالیٰ بہت دنوں آپ کا سایہ ہم سب پر سلامت رکھے اور آپ کو صحت وعافیت سے خدمت علم میں مشغول۔

(۱) مولانا محمد میاں کے لڑکے اور ان کے انتقال کے بعد مجلس علمی کے ناظم تھے

میں انشاء اللہ یکم مارچ کو استانبول پہنچوں گا اور تین ماہ یعنی ختم مئی تک وہاں رہنا ہے اگر اس اثناء میں آں محترم وہاں کچھ دنوں کے لئے تشریف لاسکیں تو ترکی اہل علم بھی مستفید ہوں گے اور آں محترم بھی ترکی خزائن علمی اور مخطوطات سے واقف ہو سکیں گے، ترکی میں تقریبا دس لاکھ قلمی کتابیں سرکاری کتبخانوں میں ہیں، صرف استانبول ہی میں کچھ نہیں تو ڈھائی لاکھ مخطوطے ہوں گے اور الحمد للہ اچھی حالت میں ہیں ...""

قیام بیروت کے دوران ہی ۱۹؍ رمضان المبارک کو عمرہ کی غرض سے حجاز تشریف لے گئے اور وہاں تقریباً ۲۰؍یوم قیام فرمارہے، رمضان کا آخری عشرہ اور شوال کا اول عشرہ وہاں گذار کر دوبارہ بیروت تشریف لے گئے، حجاز سے شیخ عبدالستار ابو غدہ کو ایک اور خط لکھا، جو غیر مؤرخ ہے، شیخ عبدالستار ابو غدہ سے آخر وقت تک علامہ اعظمیؒ کی نہایت سرگرم مراسلت رہی، وہ عالم عرب کے مشہور عالم شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ کے بھتیجے ہیں، اور علامہ اعظمی کی تحقیق سے کویت کی وزارۃ اوقاف کی طرف سے شائع ہونے والی کتاب المطالب العالیہ کی طباعت کی نگرانی کرتے تھے۔ آپ نے حجاز سے ان کے پاس جو خط تحریر فرمایا تھا اس کا کچھ حصہ ہدیۂ ناظرین ہے:

" ... و أخبركم أن ولدى رشيد أحمد ، بعد زيارة الحرمين وصل الى بومباى فى ۳۰/ من الشهر العاشر واليوم عندى طالب هندى يسمى اقبال أحمد، دعوته من الجامعة الاسلامية (بالمدينة) على أجازة شهر وسيخلفه حين أعود من الحجاز تلميذ آخر دعوناه من الهند ... و لا يخطر ببالك أنى اتحمل هذه المتاعب طمعا فى مبلغ كبير من المكافاة أو كمية ضخمة من نسخ الكتاب ، فليس هنا شئى منهما ، و إنما اقتحمت غارب الاغتراب حرصا على ان لا يذهب ما بذلته من جهود مضنية سدى ، (يضيع إذا) (۱)

لم يشرف تصحيح الملازم أو يبقى فى التعليقات فراغ تكون الحاجة داعية الى سده .

وقد بلغ الى عمكم الكريم الشيخ عبدالفتاح نزولى فى بيروت ، وجاء نى من عنده كتاب بالبريد يسألنى فيه عن موعد سفرى الى الحجاز وما اليه ، وقد أرسلت اليه جواب رسالة .

وأنا كما تعلمون مقيم فى بيت الشيخ زهير ،و عنده مكتبة قيمة ، أجد فيها ما أحتاج اليه من الكتب للمراجعة فاغنى ذلك عن تكليف السيد عبدالعزيز بإحضار المعجم المفهرس عندى .

وأفيد ونى عن الجزء الثانى من المطالب هل جاء طبعه ببطوء، ام توقف؟ و أصول الجزء الثالث معى فى هذه السفرة ،و لكنها تصير جاهزة للطبع حين أكرّر فيها النظر ، وهذا عسير نظراً الى كون أوقاتى كلها مشغولة بتصحيح الملازم ، حتى انى لا أكاد اختلس الفرصة لكتب الرسائل ، فإن كان فى النية إخراج الثالث الى نهاية العام (آخر الشهر الثانى عشر) فأفيدونى ، حتى أحجز شيئا من الوقت للمطالب ، لكنى أظن أنه لا يفيد شيئا ، لأنى لا أعود من الحجاز إلا الى نهاية الأسبوع الأول من الشهر الثانى عشر .

هذا وأرجو أن يكون السيد عقيل عاد معافىً، وأرجو إبلاغ تحياتى إليه والى السيد خبير الموسوعة، وإنى والله متأسف جداً على عدم إجابتى إياه عن رسالته الكريمة ، وليس السبب إلا ما قد تعلمون من مرض رشيد ، وعودته الى الوطن وبقالى وحيداً ثم انقطاعى الى المصنف بكليتى ، وقد وصلت رسالة السيد خبير الموسوعة فى بيتى بعد ما وعدت مدير المجلس العلمى بتلبية دعوته

و تجهزت للسفر فعلاً، ومع ذلك فانی أفكر فی ان أفوض تصحيح الملازم و تكرير النظر فی التعليقات الی احد أصحابی ، فإن تم هذا، أخبرت السيد خبير الموسوعة باستعدادی للقيام بما يامرنی إن شاء الله ، والسلام عليكم .

(آپ کو معلوم ہو کہ میرے لڑکے رشید احمد حرمین کی زیارت کے بعد ۳۰/ اکتوبر کو بمبئی پہونچ گئے، اور اس وقت میرے پاس اقبال احمد نامی ایک ہندوستانی طالب علم ہیں، جن کو ایک مہینہ کی چھٹی پر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے میں نے بلا رکھا ہے ، اور جس وقت میں حجاز سے واپس لوٹوں گا توان کی جگہ ایک دوسرا طالب علم لے لے گا، آپ کے دل میں یہ خیال نہ گذرے کہ میں ان مشقتوں کو کسی بڑے معاوضہ یا کتاب کے نسخوں کی بھاری تعداد کے لالچ میں برداشت کر رہا ہوں ۔ ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں ہے، میں اس سفر کی مشقت کو محض اس وجہ سے برداشت کر رہا ہوں کہ میں فرموں کی تصحیح کی نگرانی نہ کروں تو (کتاب کی تحقیق میں) میں نے جو جانگسل محنت کی ہے کہیں رائگاں نہ ہو جائے۔ یا تعلیقات میں کچھ خلا باقی نہ رہ جائے جس کو پر کرنے کی ضرورت ہے۔

آپ کے عم محترم شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کو بیروت میں میرے قیام کی خبر مل چکی ہے، اور میرے پاس بذریعہ ڈاک ان کا خط آیا تھا، جس میں میرے حجاز وغیرہ کے سفر کی نسبت دریافت کیا تھا، میں نے اس خط کا جواب بھیج دیا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں شیخ زہیر (شاویش) کے گھر قیام پذیر ہوں ان کے پاس ایک قیمتی کتب خانہ ہے جس میں مجھے حوالہ کی ضروری کتابیں مل جاتی ہیں، لہذا اس نے شیخ عبدالعزیز کو معجم مفہرس کی فراہمی سے بے نیاز کر دیا ہے۔

. المطالب العالیہ کی دوسری جلد کی طباعت میں کچھ تاخیر ہے یا رکی ہوئی ہے؟ تیسری جلد کی اصلیں اس سفر میں میرے ساتھ ہیں، لیکن وہ نظر ثانی کے بعد طباعت کے قابل ہوں گی، اور یہ فرموں کی تصحیح میں مصروفیت کی وجہ سے بظاہر دشوار نظر آرہا ہے، یہاں تک کہ خطوط لکھنے کا موقع بھی نہیں نکل پاتا۔ اگر سال کے اختتام تک تیسری جلد کی اشاعت کا ارادہ ہو تو مجھے بتایئے، تاکہ میں مطالب کیلئے بھی کچھ وقت نکال سکوں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اس لئے کہ دسمبر کے پہلے ہفتے کے آخر میں تو میں حجاز سے لوٹوں گا۔

امید ہے کہ شیخ عقیل بعافیت واپس ہوگئے ہوں گے، ان سے اور خبیر الموسوعۃ (شیخ مصطفی زرقاء) سے امید ہے کہ میرا اسلام پہونچادیں گے، ان کے خط کا کوئی جواب نہ دے سکنے کی وجہ سے میں متاسف ہوں، اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں رشید احمد کی بیماری ، اس کی وطن واپسی، میری تنہائی اور پھر مصنف کی طرف بالکلیہ توجہ کے علاوہ کوئی دوسری اس کی وجہ بھی نہیں ہے، ان کا خط مجھے گھر پر اس وقت ملا تھا جب کہ میں مدیر مجلس علمی کی دعوت کی قبولیت کا وعدہ کر چکا تھا اور عملی طور پر سفر کیلئے تیار ہو چکا تھا، اس کے باوجود میں اس وقت سوچ رہا ہوں کہ فرموں کی تصحیح اور تعلیقات پر نظر ثانی کا کام اپنے کسی شاگرد یا ساتھی کے حوالہ کردوں اگر ایسا ہو جاتا ہے تو میں ان کو ان کی فرمائش کی انجام دہی کیلئے اپنی آمادگی سے آگاہ کروں گا۔)

علامہ اعظمی کی مشقت و پریشانی کا علم جب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو ہوا تو انھوں نے پھر ایک خط ۲۴ر رمضان المبارک ۱۳۹۰ کو دوشنبہ کے روز لکھا:

"عنایت نامہ باعث سرفرازی ہوا، ان مشکلات کے باوجود آں محترم خدمت حدیث شریف کئے جارہے ہیں، اسی تناسب سے اجر بھی بڑھتا جارہا ہے،

کاش میں ملازمت کے پھندے میں نہ ہوتا، میں خوشی سے بیروت آجاتا اور ممکنہ خدمت کی سعادت حاصل کرتا، بہر حال مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔۔۔۔"

باوجودیکہ یہ ایام بڑی مصروفیت اور عدیم الفرصتی کے تھے، اہل علم سے رابطہ رہا اور افادہ واستفادہ کا سلسلہ برابر جاری رہا، وہاں کے بہت سے ارباب فضل وکمال نے آپ کی وہاں موجودگی کو بساغنیمت جان کر بھرپور علمی فائدہ اٹھایا، نیز بیروت کے قرب وجوار کے بعض مشہور مقامات کی زیارت بھی کی، مثال کے طور پر ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں ایک جگہ لکھا ہے: " ثم وصلت الی مدینة طرابلس "(رحلۃ ابن بطوطہ ۱/۷۳) یعنی میں طرابلس کے شہر پہونچا، علامہ اعظمی نے سفر نامہ کے اس مقام پر لکھا ہے: " وصلت الی قلمون ولم أصل الی طرابلس ' ونزلت فی قلمون فی بیت السید رشید رضا، و عزیت أقاربه علی وفاة أخیه " یعنی میں قلمون گیا ہوں اور طرابلس نہیں جا سکا اور قلمون میں سید رشید رضا کے مکان پر قیام کیا اور ان کے بھائی کی وفات پر ان کے اعزہ و اقارب کی تعزیت کی۔

بیروت کے علمی حلقوں میں علامہ اعظمیؒ کی پذیرائی، ان کے وہاں قیام سے وہاں کے اہل علم کی مسرت وابتہاج اور بعض ملاقاتوں اور زیارتوں کا اندازہ اس ایک خط سے کیا جا سکتا ہے، جسے ۱۵/رمضان ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۳/نومبر ۱۹۷۰ء کو املا کرا کر مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے پاس روانہ فرمایا تھا، ذیل میں پورا خط منقول ہے:

"عزیزم قاضی اطہر صاحب السلام علیکم

آپ کے خط سے آپ کی خیریت اور وہاں کے حالات معلوم ہونے سے بہت سکون واطمینان ہوا، ہم یہاں جمعرات ۲۴/ستمبر ۱۹۷۰ء کو غروب آفتاب کے وقت پہونچے تھے، دوسرے دن جمعہ کی نماز الجامعۃ الامریکیۃ کے قریب ایک مسجد میں پڑھی، ہم پہونچے تو امام صاحب خطبہ دے رہے تھے۔ داڑھی مونچھ بالکل صاف، عبا پہنے ہوئے تھے خطبہ کے آخر میں جوش وخروش یکبارگی

دعا مانگی اور سامعین نے خوب دھوم دھام سے آمین کہی۔ مصلیوں میں شافعیوں کی کثرت تھی اور امام صاحب بھی شافعی تھے، ایک آدھ پاکستانی بھی تھے، سنیچر کو الشیخ محمد زہیر الشاویش ملنے کے لئے آئے، یہ ایک ممتاز عالم ہیں، ان کے پاس ایک مکتبہ تجاریہ ہے، اصلاً شامی ہیں، مگر یہاں بلدیہ بیروت سے باہر حازمیہ میں ایک اچھا خاصا سہ منزلہ مکان بنا رکھا ہے، اس وقت ہمارا قیام بھی اسی مکان میں ہے، شیخ زہیر کا ذاتی کتب خانہ بہت اچھا ہے، اتوار کو شیخ زہیر کا فون آیا کہ شیخ ناصر الدین البانی دمشق سے تشریف لائے ہوئے ہیں، وہ ملنا چاہتے ہیں کب آئیں؟ ہم نے کہا جس وقت جی چاہے تشریف لا سکتے ہیں، تھوڑی ہی دیر کے بعد آگئے، بہت تپاک سے ملے دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، پھر افریقی صاحب نے شیخ زہیر سے کہا تھوڑی دیر کیلئے کہیں تفریح کو چلیں، شیخ زہیر کے پاس اپنی کار ہے اور خود ہی چلاتے بھی ہیں اور یہاں یہ عام دستور ہے۔ تقریباً ہر متوسط الحال کے پاس گاڑی ہے اور خود چلاتا ہے، مصنف جس پریس میں چھپتی ہے اس میں دو شریک ہیں اور حسن اتفاق سے دونوں ایک ہی بلڈنگ میں سکونت پذیر ہیں مگر دونوں کے پاس الگ الگ کار ہے، بہر حال ہم سب نیچے اترے اور کار میں سوار ہونے کے بعد رائے ہوئی کہ امام اوزاعی چلیں، شیخ ناصر الدین بھی ساتھ تھے، یہاں جس مقام پر امام اوزاعی مدفون ہیں وہ علاقہ امام اوزاعی کے نام سے مشہور ہے، وہاں ایک پرانی مسجد اور مسجد کے پیچھے اوزاعی کی پختہ قبر ہے، پاس ہی میں بہت خوبصورت نئی مسجد بھی بن گئی ہے، قبر کی زیارت کر کے نکلنے لگے تو مجاور سے جو دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا شیخ ناصر صاحب فرمانے لگے کہ یہاں نماز جائز نہیں ہے، اس نے کہا شیخ الازہر تو آئے تھے اور یہاں نماز پڑھ کر گئے ہیں، وہ کچھ دیر اس سے الجھے رہے پھر آکر موٹر میں بیٹھے تو کچھ دیر تک اسی مسئلہ پر اظہار خیال فرماتے رہے، موٹر میں بیٹھنے کے بعد رائے ہوئی کہ صیدا تک چلیں، چنانچہ صیدا (جو بہت قدیم شہر ہے

اور ہم نے جو حصہ دیکھا وہ بہت خوبصورت ہے) بلکہ صور کے قریب تک گئے صور بھی نہایت قدیم اور مشہور شہر ہے جو اسرائیل کی سرحد پر ہے۔ یہاں سے شیخ زہیر نے ہم کو ہوٹل پہونچا دیا اور خود شیخ ناصرالدین صاحب کو لے کر حازمیہ چلے گئے، شیخ ناصرالدین بالکل بچپن میں شام آئے تھے اور عربی زبان بالکل نہیں جانتے تھے، وہ اکثر فصحہ میں گفتگو کرتے ہیں، انھوں نے مسند حمیدی کا مقدمہ پڑھا ہے، مجھ سے کہہ رہے تھے کہ ظاہریہ کا جو نسخہ آپ نے منگایا ہے اس کے علاوہ بھی ایک نسخہ ظاہریہ میں ہے، دمشق آیئے گا تو دکھاؤں گا۔ بہرحال تھوڑی دیر تک اچھی صحبت رہی، صیدا جاتے ہوئے سڑک کے کنارے ایک جگہ کچھ درخت نظر آئے، پوچھا کہ یہ کونسا درخت ہے تو شیخ زہیر نے بتایا کہ اس کو ہم لوگ مشمش ہندی کہتے ہیں، غور سے دیکھا تو وہ لوکاٹ تھا، شیخ زہیر کے باغ میں امرود کے کئی درخت ہیں۔ بچپن میں ہم لوگوں کو کمثری کا ترجمہ امرود بتایا گیا تھا، یہاں آکر معلوم ہوا کہ امرود کو جوافہ کہتے ہیں، کمثری دوسرا پھل ہے، ہم نے اس کو بھی کھایا ہے، وہ بالکل ناگ (ہندوستان کے مشہور پھل) کے مشابہ ہوتا ہے بلکہ میرے لئے ان دونوں میں تمیز بھی دشوار ہے۔

بیروت میرے لئے عجیب جگہ ہے، یہاں مجھے دینی ماحول نظر نہیں آتا۔ اس لئے طبیعت کو توحش ہے، یہاں کہیں آنا جانا بغیر سواری کے ممکن نہیں اور سواریاں بھی گراں، جمعہ کی نماز پڑھنے جایئے تو چار لیرے خرچ ہو جائیں گے، ایک لیرہ کی قیمت چار روپئے ہے۔ اس لئے ضرورت شدیدہ کیلئے ہی جانا ہوتا ہے، اپنے طور پر جو حضرات ملنے آئے ایک شیخ سعدی یاسین خطیب جامع ابی بکر ہیں، جو اچھے عالم ہیں اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں بیروت کے نمائندہ ہیں، ایک اور عالم شیخ عبداللہ حبشی ہیں، انھوں نے شیخ ناصرالدین کا رد بھی لکھا ہے جو میری نگاہ سے نہیں گذرا، ایک دن وہ بھی تشریف لائے تھے، اچھے متشرع اور

زاہد عالم معلوم ہوتے ہیں، صلاح الدین منجد بھی بیروت ہی میں رہتے ہیں، انھوں نے بھی آنے کو کہا تھا اور ایک شخص کے ذریعہ اپنے مکان پر چلنے کی دعوت بھی مجھ کو دی تھی، مگر اب تک نوبت نہیں آئی...“

علامہ اعظمیؒ نے وفیات الاعیان پر مشتمل اپنی یادداشت جو مرتب فرمائی ہے، اس میں شیخ سعدی یاسین کا جہاں ذکر فرمایا ہے وہاں لکھتے ہیں:

”الشیخ سعدی یاسین خطیب مسجد ابی بکر فی بیروت ، اجتمعت به مراراً و صلیت خلفه و رافقته الی قلمون فی عزاء الشیخ عبدالرحمن (أخی صاحب المنار) ...“

(شیخ سعدی یٰسین بیروت کی مسجد ابی بکر کے خطیب، ان سے میری بارہا ملاقات ہوئی ہے، میں نے ان کے پیچھے نماز پڑھی ہے اور شیخ عبدالرحمٰن (برادر سید رشید رضا) کی تعزیت کیلئے میرا ان کا قلمون تک ساتھ رہا ہے)

اسلامی علوم و فنون کے نشر و اشاعت کے اس عظیم مرکز میں تقریباً چار مہینے قیام اور حصول سعادت و فراغت حج و عمرہ کے بعد فروری ۱۹۷۱ء میں ہندوستان واپسی ہوئی، اور ۲۷/ فروری کو مالیگاؤں کے مدرسہ معہد ملت تشریف لے گئے، چنانچہ مالیگاؤں سے شائع ہونیوالے ماہوار عربی جریدے ”الأضواء“ نے مارچ و اپریل کے نشریہ میں یہ خبر شائع کی:

”استقبل أساتذة معهد ملت سماحة الشیخ العلامة الکبیر فخر المحدثین حبیب الرحمن الأعظمی یوم ۲۷ من فبرایر سنة ۱۹۷۱. بعد عودته من سفر طویل استغرق عدة اشهر ، قام خلالها بطبع الکتاب "المصنف" لعبدالرزاق (مع تحقیقات فضیلة الشیخ). لقد تم طبع ثلاثة أجزاء من هذا الکتاب فی مطابع دارالقلم (بیروت) علی نفقة المجلس العلمی (دهابیل، الهند) وستتم الاجزاء البقیة فی مدة سنة

بالتقریب ان شاء الله .هذا وقد زار الشیخ خلال سفره المراکز العلمیة فی لبنان والسعودیة، واتصل بأصحاب العلم و المعرفة فیها .

طلب اساتذة المعهد من سماحة الشیخ أن یقدم لهم انطباعاته عن الشرق الاوسط ، فشرفهم الشیخ بخطابه الموجز البلیغ الملئی بالافکار العالیة والنصائح الغالیة . صرّح الشیخ فی خطابه بانه توجد الرغبة الشدیدة فی الأقطار العربیة للرقی العلمی لا سیما العلوم الاسلامیة،ولکنهم یعترفون بان الهند متقدمة فی هذاالمجال .

لقد استفاد به کثیر من رجال العلم والباحثین الاسلامیین من مختلف الکلیات والمعاهد فی هذه الرحلة ، فقد اتصل به غیر مرة فضیلة الشیخ عبدالفتاح ابو غده واستفاد منه فی دراسته و تحقیقه حول مصنفات الشیخ مولانا عبدالحی .

التمس منه الباحث الاسلامی الکبیر الدکتور حمید الله أن یزور ترکیا أثناء وجوده بها . و کذلک وجهت الیه دولة الکویت الدعوة لاعداد الموسوعة الفقهیة . انتهت هذه الجلسة بالدعاء.

(معہد ملت کے اساتذہ نے علامہ کبیر فخر المحدثین حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کا ان کے کئی مہینوں کے طویل سفر سے واپسی کے بعد ۲۷ر فروری ۱۹۷۱ء کو استقبال کیا۔ مولانا نے اپنے اس سفر کے دوران (اپنی تحقیق سے شائع ہونے والی کتاب) مصنف عبدالرزاق کی طباعت کی نگرانی فرمائی اس کتاب کے تین حصے مجلس علمی ڈابھیل کے خرچ پر بیروت کے پریس دارالقلم سے شائع ہو چکے ہیں، اور اس کے بقیہ حصے بھی کم و بیش ایک سال کی مدت میں انشاءاللہ چھپ جائیں گے، مولانا نے اپنے اس سفر میں لبنان اور سعودی عرب کے علمی مراکز کے دورے بھی کئے اور ارباب علم و فن سے ملاقاتیں کیں۔

معہد ملت کے اساتذہ نے حضرت مولانا کے سامنے یہ درخواست گذاری کہ وہ مشرق وسطی کے سلسلہ میں اپنے تاثرات کا اظہار فرمائیں، تو آپ نے ان کے سامنے مختصر، فصیح وبلیغ اور فکر ونصیحت سے بھرپور تقریر فرمائی، مولانا نے اپنی تقریر میں اس بات کی وضاحت فرمائی کہ عرب ممالک میں علمی ترقی بالخصوص علوم اسلامیہ کی طرف زبردست رجحان پایا جاتا ہے، البتہ وہ لوگ اس میدان میں ہندوستان کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں۔

اس سفر میں مختلف اسلامی اداروں اور کالجوں کے بہت سے علماء و محققین نے آپ سے استفادہ کیا، چنانچہ بارہا شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے آپ سے ملاقات کی اور حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی کتابوں کی تحقیق ومطالعہ کے سلسلہ میں آپ سے فائدہ اٹھایا۔

بیروت کے اثناء قیام عظیم اسلامی محقق ڈاکٹر حمید اللہ نے آپ سے ترکی کے سفر کی درخواست کی، اسی طرح کویت کی حکومت نے آپ کو فقہی انسائیکلوپیڈیا کی تیاری کیلئے دعوت دی، دعا پر اس جلسہ کا خاتمہ ہوا۔)

عمرہ ۱۳۹۰ھ بیروت ہی سے آپ نے رمضان المبارک میں حجاز کا قصد کیا اور سعادت عمرہ سے مشرف ہوئے، آپ نے ایک خستہ کاغذ پر اپنے تمام حجوں کا سنہ ذکر کیا ہے اس پر لکھا ہے:

"پانچواں حج بیروت سے ۱۳۹۰ھ (۱۹۷۱ء) میں کیا، اسی سال رمضان ۱۳۹۰ھ میں بیروت سے عمرہ کیا فالحمد لله علی ذلك."

بیروت سے جدہ تک کا سفر مڈل ایسٹ ایرلائنز کے طیارے کے ذریعہ ہوا، اور ٹکٹ پر اسکے جاری ہونے کی جو تاریخ درج ہے وہ ۱۲/نومبر ۱۹۷۰ء ہے، اس سفر میں آپکی ملاقات غالباً بیروت واپسی کے وقت، شیخ محمد نصیف سے ہوئی، چنانچہ ایک جگہ لکھا ہے:

"قد زرته في شوال سنة ۱۳۹۰ھ وأتحفني بعدة كتب و

بالغ فی إکرامی ،"

(میں نے ان کی شوال ۱۳۹۰ھ میں زیارت کی انھوں نے مجھے متعدد کتابیں ہدیہ کیں، اور میرا مبالغہ آمیز اکرام کیا)

حج ۱۳۹۰ھ ابھی چند سطر پہلے پانچویں حج سے متعلق علامہ اعظمی کی ایک تحریر نظر سے گذر چکی ہے، جب حج کا موسم آیا تو ذی الحجہ کے اوائل اور جنوری کے اواخر میں وہیں سے عازم حج ہوئے۔ ۳/ ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ مطابق ۳۰/ جنوری ۱۹۷۱ء کو تلمیذ اعز مولانا عبدالجبار صاحب مرحوم کو ایک خط لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"عزیزم مولوی عبدالجبار سلمہ اللہ السلام علیکم

الحمدللہ بخیر ہوں، میں ۲۵/ جنوری کو شب میں جدہ اور جدہ سے مکہ معظمہ آگیا، دن میں اکثر مدرسہ فخریہ میں رہتا ہوں، رات کو اب تک مصطفیٰ (۱) کے گھر سوتا ہوں، کھانا مئو کے حجاج کے یہاں اور مصطفیٰ کے یہاں اب تک کھایا

(۱) ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی ۱۳۵۰ھ م ۱۹۳۲ء میں مئو کے محلہ کیاری ٹولہ میں پیدا ہوئے حصول تعلیم کیلئے انگریزی اسکول میں داخل کئے گئے، اس کے بعد دارالعلوم مئو میں داخلہ لیا وہاں انھوں نے درس نظامی کی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد مدرسہ شاہی مراد آباد اور پھر دیوبند گئے اور وہیں سے ۱۹۵۲ء میں فارغ التحصیل ہوئے، فراغت کے بعد مصر گئے اور ۱۹۵۵ء میں جامع ازہر سے عربی زبان وادب میں اختصاص کیا۔ ۱۹۵۶ء میں قطر میں عربی زبان کے استاذ کی حیثیت سے کام کیا، اور اگلے ہی سال وہ قطر کی پبلک لائبریری (المکتبة العامة) کے نگراں مقرر ہوئے، کئی سال اس اہم عہدے پر فائز رہ کر خوش اسلوبی سے اس ذمہ داری کو نبھایا، اس کے بعد انھوں نے ریسرچ شروع کی اور ۱۹۶۶ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، ڈاکٹریٹ کے بعد وہ سعودی عرب لوٹے، اور وہاں مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں فرائض تدریس انجام دئے، اب وہ سعودی شہری قرار دئے جا چکے ہیں، ڈاکٹر صاحب اپنی حدیثی خدمات کی وجہ سے فیصل ایوارڈ سے بھی سرفراز ہو چکے ہیں۔ اور ان کی متعدد تصنیفات وتحقیقات اہل علم میں قبولیت حاصل کر چکی ہیں۔

ہے، اعلان تو ابھی نہیں ہوا مگر امید یہی ہے کہ وقفہ جمعہ کو ہوگا، کل ہم نے خود چاند دیکھا تھا، بہت اونچا اور کافی بڑا تھا، دوسری رات کا چاند معلوم ہوتا تھا، اس لئے آج جمعہ کو ۲رذی الحجہ ہوئی، کل میں منیٰ وغیرہ دیکھنے گیا تھا، رشید احمد کا خط بیروت میں ملا تھا، یہاں سعید احمد کا خط ملا نیز بشیر احمد کا، حالات کا علم ہوا، حافظ ظہور کے ذریعہ بھیجی ہوئی کل چیزیں پہونچ گئیں، اقبال اسی دن آگئے تھے جس دن میں بیروت سے آیا، ڈاکٹر مصطفیٰ اور اقبال مطار پہونچ گئے تھے، مصطفیٰ کی گاڑی سے مکہ آیا۔

حجاج کی کثرت سے حرم میں نماز پڑھنا مشکل ہو گیا ہے۔ کسی کسی وقت سڑک پر پڑھنی پڑی، آج جمعہ کی نماز بھی غالباً سڑک پر ہوگی، یہاں آج کل کسی سے ملاقات بہت مشکل ہے، حکومت کی طرف سے اعلان ہو گیا کہ حج جمعہ کو ہوگا۔ کل جمعہ کے وقت سے ہم نے بالائی منزل میں نماز شروع کر دی ہے، وہاں گنجائش رہتی ہے، نیچے تو سڑک تک صفیں لگی رہتی ہیں، یہاں ٹکٹ ملنا بھی سخت دشوار ہو گیا ہے اس لئے جدہ سے خط بھجوا رہا ہوں، سب حال پوچھنے والوں کو سلام کہو، تین دن سے یہاں سردی بڑھ گئی ہے، امید کی جاتی ہے کہ حج کے موقع تک شاید کم ہو جائے۔(۱)

آج ایک افریقی نے بتایا کہ مولوی ضیاء الحسن بمبئی سے روانہ ہو چکے ہیں مگر مجھے اب تک کوئی خبر نہیں ہے مولانا ذکریا نے سلام کہلایا ہے۔ اور یہ کہ روزانہ شام کو میرے ساتھ کھانا کھایا کریں، آج بعد عشاء ایک دعوت میں ملیں گے تو معذرت کرلوں گا۔"

دائرۃ المعارف العثمانیہ کی لٹریری کمیٹی کی ایڈوائزری "دائرۃ المعارف العثمانیہ" حیدر آباد کا ایک مشہور و معروف اور نامور ادارہ ہے، اس کی شہرت ہندوستان کی حدود پار کر کے اطراف عالم میں پھیلی ہوئی ہے، شاید ہی دنیا کا کوئی ایسا خطہ یا علمی حلقہ ہو

(۱) خط کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو دوسرے دن مکمل کیا ہے۔

جہاں یہ ادارہ اپنی گرانقدر خدمات اور بیش قیمت مطبوعات کی وجہ سے جانا اور پہچانا جاتا ہو، متقدمین اہل علم اور اسلاف کی بہت سی نادر و نایاب کتابوں کی طباعت و اشاعت کا شاندار سہرا اس ادارہ کے سر ہے، بہت سی ایسی کتابیں جن کا لوگ محض نام سنتے اور کتابوں میں حوالے دیکھتے تھے، جو اپنے وجود کے لحاظ سے اہل علم کیلئے عنقا صفت تھیں، دائرۃ المعارف نے ان کو چھاپ اور شائع کر کے سہل الحصول اور علمی دنیا کو قیامت تک کے لئے اپنا ممنون احسان بنادیا، اس معروف و مشہور ادارے نے سنہ ۱۹۷۱ء میں علامہ اعظمی کو اپنی لٹریری کمیٹی کا ایڈوائزر منتخب کیا، جس کی اطلاع ۷؍ جون ۱۹۷۱ء کے ایک خط کے ذریعہ آپ کو دی گئی، اطلاع نامہ کی عبارت حسب ذیل ہے:

".... I feel pleasure to convey that under resolution No. XIII of the 49 th Meeting of the executive committee of the Dairatul-Maarif-il-Osmania, held on the 31st March , 1971, you have been appointed " External Advisor to the literary committee of the Dairatul- Maarifi-il- Osmania."

You are requested kindly to communicate your acceptence at an early date and oblige. "

(میں مسرت کیساتھ آنجناب کو یہ اطلاع دیتا ہوں کہ دائرۃ المعارف العثمانیہ کی ایگزیکیوٹیو کمیٹی نے ۳۱؍ مارچ ۱۹۷۱ء کو منعقدہ اپنے اجلاس میں تجویز نمبر ۱۳ کے تحت آپ کو دائرۃ المعارف کی لٹریری کمیٹی کا خارجی مشیر مقرر کیا ہے۔

لہذا آنجناب سے درخواست ہے کہ جلد از جلد اپنی منظوری کی اطلاع دے کر ممنون فرمائیں)

بیروت کا دوسرا سفر اوپر گذر چکا ہے کہ کئی مہینے بیروت میں قیام کے بعد حج سے کچھ پیشتر حجاز تشریف لے گئے اور حج سے فراغت کے بعد فروری ۱۹۷۱ء کے آخر میں وطن واپس ہوئے، مگر اس وقت تک مصنف پوری چھپ نہیں سکی تھی، اور اس کی صرف تین ہی جلدیں منظر عام پر آسکی تھیں، لہذا اس کے فرموں کی دیکھ بھال کا کام بعض لوگوں کے حوالے کیا اور خدا پر بھروسہ کر کے خود ہندوستان چلے آئے، لیکن بگمر(۱)

آنے کے بعد بھی کتاب کی طباعت کے سلسلے میں ہر وقت متفکر اور مشوش رہا کرتے، چنانچہ اس زمانے میں اپنے شناساؤں بالخصوص عرب فضلاء کو جو خطوط لکھے ہیں اکثر میں شدید تشویش کا اظہار پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر چند ہی مہینے گذرے کہ دوبارہ بیروت کے سفر کا عزم فرمایا، ۱۶/ اگست ۱۹۷۱ء کو اپنے ایک قدیم فاضل شناسا بغداد کے شیخ صبحی سامرائی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"... وأحسبكم تستبشرون بسماع المصنف لعبدالرزاق قد ظهرت منه ثلاثة اجزاء، وأنا إن شاء الله سأسافر إلى بيروت و شيكا، حتى أشرف على طبع بقية أجزائها وفي نيتي أن أزور بغداد في هذه السفرة ..."

(میں سمجھتا ہوں کہ آپ سن کر خوش ہوں گے کہ مصنف عبدالرزاق کی تین جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں اور میں اس کے بقیہ اجزاء کی طباعت کی نگرانی کے لئے جلد ہی ان شاءاللہ بیروت کا سفر کروں گا، میرا ارادہ ہے کہ اس سفر میں بغداد کی بھی زیارت کروں۔)

اس دفعہ آپ کا ارادہ کویت، ترکی، مصر اور بغداد کی زیارت کا بھی تھا، اور ان تمام مقامات کے سفر کیلئے کرایہ کے پیسے بھی ادا کئے جا چکے تھے، چنانچہ برٹش اوور سیز ایرویز کارپوریشن کے چیف رزرویشن آفیسر جے۔ ایل ملہوترا کا ایک خط ۲۱/ مئی ۱۹۷۱ء کا لکھا ہوا آپ کے کاغذات میں محفوظ ہے، جس میں تحریر ہے:

"We are pleased to inform you that we have recieved economy class fare for your Delhi/ Beirut. Istanbul/ Cairo/ Baghdad/ Delhi......"

(ہم خوشی کے ساتھ آپ کو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ دہلی سے بیروت، استانبول، قاہرہ، بیروت، بغداد، دہلی کے آپ کے سفر کا درمیانی درجہ کا کرایہ ہمیں موصول ہو چکا ہے۔)

پہلی دفعہ بیروت میں نزول اجلال کے ٹھیک ایک سال بعد ۲۶/ ستمبر ۱۹۷۱ء

مطابق ۵/ شعبان ۱۳۹۱ھ کو دوبارہ پہنچے، ایک خط میں اپنے ایک شامی شاگرد شیخ عبدالوہاب زاہد ہندی حلبی کو لکھا ہے:

"وصلت بيروت مساء ٢٦ من الشهر التاسع، وسامكث هنا إن شاء الله شهرا أو شهرين، وفي نيتي أن أزور حلب قريبا إن تيسر لي رفيق يرشدني و يساعدني، وكذا أزور دمشق أيضاً إن شاء الله . . ."

(میں ۲۶/ ستمبر کی شام میں بیروت پہنچا، یہاں ایک دو مہینے ان شاء اللہ میرا قیام رہے گا، اگر کوئی معاون اور رفیق سفر مل جائے تو جلد ہی حلب کی زیارت کا بھی میرا ارادہ ہے، اور اسی طرح دمشق کی زیارت کا بھی۔)

حلب کے بارے میں تو نہیں معلوم کہ آپ اس سفر میں جاسکے یا نہیں، البتہ کویت میں کچھ قیام فرمایا، اس کے علاوہ دمشق بھی تشریف لے گئے، اپنی ایک یادداشت میں لکھتے ہیں:

"اتوار ۲۶/ ستمبر ۱۹۷۱ء۔ ۵/ شعبان ۱۳۹۱ھ، کویت میں عبداللہ العقیل اور عبدالستار ابوغدہ سے ملاقات ہوئی شام کو بیروت پہونچے۔

۷/ شعبان منگل کو بعلبک گئے۔

قبل رمضان دمشق گیا، مکتبہ ظاہریہ دیکھا، جامع اموی، اور مزار حضرت ابوالدرداء کی زیارت کی، شعیب ارناؤط عبدالقادر ارناؤط و ناصر البانی وغیرھم سے ملاقات ہوئی۔

آخر جمعہ رمضان (۲۴ تاریخ) کو عبدالفتاح ابوغدہ سے دارالارشاد میں ملاقات ہوئی، ۲۶/ کو ریزیڈنس الروشہ میں دوبارہ ملاقات ہوئی، وہیں عبدالحکیم عابدین سے بھی ملاقات ہوگئی۔"

اس سفر کی زیادہ تفصیل نہیں مل سکی، دیگر مقامات کی زیارت کا جو آپ کا ارادہ

تھا، ان میں صرف شام کا سفر کیا لیکن اور جو مقامات ہیں ترکی، مصر اور بغداد وغیرہ ان کا سفر نہیں ہو سکا، اس دفعہ آپ نے جو خط لکھے ان میں صرف ایک خط مل سکا جو ۲۱/ اکتوبر ۱۹۷۱ء کا مکتوب ہے، وہ حسب ذیل ہے:

"عزیزانم مولوی رشید احمد و سعید احمد سلمھما اللہ! سلام مسنون

الحمد للہ ہم لوگ خیریت سے ہیں، یہاں کل چہار شنبہ کے دن سے روزہ شروع ہو گیا ہے ۔ کل ہی سے حرمین، مصر و شام اور بغداد و اردن میں بھی روزہ شروع ہوا ہے، یہاں چار بج کر بیس منٹ پر صبح صادق اور چار انچاس پر غروب ہے، موسم نہ بہت گرم ہے نہ بہت ٹھنڈا، رات میں کھلی جگہ پر تراویح کی کچھ رکعتیں پڑھی گئیں تو خنکی محسوس ہوئی ، ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان میں آج پنج شنبہ کو روزہ شروع ہوا ہوگا۔

بغداد سے کتابوں کے آنے کی بھی اطلاع ملی ، آج صبحی سامرائی کو کتابوں کے پہونچنے کی اطلاع بھیج رہا ہوں، یہاں بھی ان کا خط آیا تھا، اجازت نامہ بھی بھیج رہا ہوں۔

کل مالیگاؤں سے تفسیرات ابن تیمیہ کے مزید سو صفحات آئے ہیں، آج یا کل پانی کے جہاز سے مندرجہ ذیل کتب بھیج رہا ہوں: مصنف عبدالرزاق ثالث، کتاب الزھد طبع بیروت، جامع الاصول مجلد چھ اجزاء زاد المسیر ۹/۸، شرح السنة پانچ اجزاء الأمثال العربیه القدیمة ایک عدد، الاسرار المرفوعه ایک عدد حجة الوداع طبع بیروت ایک عدد۔

مولانا ابوالوفاء افغانی کو ایک خط لکھ دو کہ میں نے ان کے لئے زاد المسیر نو اجزاء کامل اور مکتب اسلامی کی کچھ اور منشورات پانی کے جہاز سے بھجوائی ہیں، مولانا بھی کتاب الحجہ اور جو رسائل موجود ہوں بھجوادیں تو بہتر ہے ، یہاں کا پتہ بھی مولانا کو لکھ بھیجو۔

مدرسہ (مفتاح العلوم) کیلئے تاج العروس کی مطبوعہ جلدوں کو کہہ آیا تھا کہ عبدالستار ابو غدہ خرید کر مئو بھیج دیں....“

مفتیٔ لبنان کا ہدیہ | ان دونوں سفروں میں علامہ اعظمی کی بہت سے اہل علم سے ملاقات ہوئی، ان ہی میں مفتیٔ لبنان شیخ حسن خالد ہیں، ان سے آپ کی متعدد ملاقاتیں ہوئیں، ۱۰ر شوال ۱۳۹۱ھ ۲۹ر نومبر ۱۹۷۱ء کو مفتیٔ لبنان نے اپنی تصنیف ”الشهيد فی الإسلام“ علامہ اعظمی کو بطور سوغات پیش کی، اور اس کی پیشانی پر یہ عبارت تحریر فرمائی:

” مع أصدق التحية وأجمل التقدير الى العلامة الكبير المحدث والمحقق الجليل الأستاذ حبيب الرحمن الاعظمى . . .“

(خالص ترین سلام اور بہترین خراج تحسین کے ساتھ علامہ محدث کبیر، اور محقق جلیل استاذ حبیب الرحمٰن الاعظمی کی خدمت میں...)

اس دفعہ بیروت میں دو مہینے سے کچھ زیادہ مقیم رہے۔ ۹ر مئی ۱۹۷۲ء کے ایک خط میں، مجلس علمی کراچی کے مدیر مولانا طاسین صاحب متوفی (۱۹۹۹ء) کو لکھتے ہیں:

”میں دوبارہ بیروت جاکر دو مہینے سے کچھ زیادہ رہ کر چلا آیا۔“

مصنف عبدالرزاق | امام عبدالرزاق صنعانی (متوفی ۲۱۱ھ) ایک بڑے پایہ کے محدث گذرے ہیں، ان کی کتاب ” المصنف “ علم حدیث کا جامع اور بیش قیمت دیوان ہے، جو عرصہ سے نایاب تھا، علامہ اعظمی نے اس کتاب کے مخطوطے کو حاصل کر کے نہایت محنت و جانفشانی اور دقیقہ رسی کے ساتھ اس کی تحقیق کی، حتی کہ اس کی طباعت کی نگرانی اور فرموں کی دیکھ بھال کیلئے بیروت کے دو دو سفر کیے۔ اس عظیم الشان علمی خدمت پر سر زمین ہند جس قدر بھی فخر کرے کم ہے، علامہ اعظمی نے اس کام کیلئے اپنے کو جس طرح وقف کر دیا تھا، اس کی مثال مشکل سے ملے گی، علامہ اعظمی کا یہ کارنامہ فن حدیث پر

پر تحقیقی کام کے علاوہ عربی ادب کی بھی خدمت ہے ،اس کتاب سے پہلی ودوسری صدی ہجری کا عربی ادب نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

یہ کتاب ۱۳۹۰ھ م ۱۹۷۰ء اور ۱۳۹۲ھ م ۱۹۷۲ء کے درمیان ۱۱ ضخیم جلدوں میں خوبصورت ٹائپ سے اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر دارالقلم بیروت سے چھپ کر مجلس علمی (ڈابھیل۔سورت) سے شائع ہوئی۔

یہ کتاب جب مصر، شام، عراق، حجاز، اور مغرب ومراکش کے اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچی، تو علامہ اعظمی کے اس عظیم الشان اور بیش بہا علمی کارنامے کو دیکھ کر، ان کے ذہنوں میں عظمت رفتہ کی یاد تازہ ہوگئی۔

المطالب العالیہ علامہ اعظمی کی مصروفیت کا عجیب وغریب حال تھا، قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ نے صحیح کہا ہے کہ یہ شعر

جوانی سے بھی زیادہ وقت پیری جوش ہوتا ہے : بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے

کسی اور پر صادق آئے نہ آئے محدث کبیر علامہ اعظمیؒ پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

اس کی ایک روشن مثال یہ ہے کہ مصنف عبدالرزاق کی تحقیق کا کام زوروں پر ہے ،اسی کے ساتھ " المطالب العالیه بزوائد المسانید الثمانیه" کی تحقیقی خدمت بھی انجام دے رہے ہیں۔یہ کتاب حدیث کی آٹھ بڑی بڑی کتابوں کا ایک انتخاب ہے جو ممتاز حافظ حدیث علامہ ابن حجر عسقلانی کی کاوش کا نتیجہ ہے ،ترکی سے اس کا مخطوطہ حاصل کر کے عالمانہ ومحققانہ انداز میں اس کو ایڈٹ کیا، یہ جاننے کے لئے کہ وہ کتنا بڑا علمی کام ہے، صرف یہ عرض کردینا کافی ہوگا کہ حکومت کویت کی وزارت اوقاف نے اس کو علامہ اعظمی سے حاصل کر کے ،اس کی طباعت پھر اس کی تقسیم کا انتظام سرکاری پیمانے پر کیا، یہ کتاب چار جلدوں میں ہے، جو ۱۳۹۰ھ م ۱۹۷۰ء اور ۱۳۹۳ھ م ۱۹۷۳ء کے درمیانی عرصہ میں وزارة الاوقاف کویت سے شائع ہوئی۔

عرب ممالک میں اس کی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ سال بھر بھی نہ گذرنے پایا تھا

کہ دمشق کے ایک تاجر نے فوٹو آفسیٹ سے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کردیا۔

الالبانی شذوذہ و أخطاءہ بیروت کے سفر سے واپسی کے بعد علامہ اعظمی کے قلم سے وہ شاہکار عالم وجود میں آیا جس نے علمی دنیا میں غلغلہ اور دنیائے سلفیت میں زلزلہ برپا کردیا۔ شیخ ناصر الدین البانی وہ سلفی عالم ہیں جن کے قلم کی دھار تلوار سے زیادہ تیز ہے، ائمہ و محدثین اور سلف صالحین بالخصوص علماء احناف میں بہت کم ایسے ہوں گے جو ان کے وار سے بچے ہوں، شیخ البانی نے متعدد کتابیں لکھی ہیں، جن میں وہ بہت سی جگہوں پر اہل علم کے وضع کردہ اصولوں سے انحراف کرتے ہیں، وہ خود ایک اصول ایک کتاب میں بناتے ہیں، مگر اپنا ہی اصول جب ان کے مزعومہ نظریہ کے خلاف ہوتا ہے تو دوسری جگہ اس کو توڑ دیتے ہیں۔ شیخ البانی نے جب علامہ اعظمی سے ملاقات کی تو خواہش ظاہر کی کہ علامہ اعظمی میری کتابیں پڑھ کر اپنی رائے لکھیں، چنانچہ زہیر شاویش سے (جو ان کی کتابوں کے ناشر تھے) کہہ کر وہ کتابیں مئو بھجوائیں، جس کے نتیجہ میں الألبانی شذوذہ و أخطاءہ معرض وجود میں آئی۔

اُس دور میں شیخ البانی کے علم اور ان کی زبان و قلم کی تیزی سے اکثر علماء عرب مرعوب تھے، لیکن علامہ اعظمی نے جب البانی صاحب کی غلطیوں کی گرفت کی اور ان کی تضاد بیانی کو واشگاف کیا تو دلوں پر ان کا جو طلسم طاری تھا وہ یکلخت ٹوٹ گیا، اور عرب علماء اور خاص طور پر مذاہب اربعہ کے پیروکار آپ کے بہت شکر گذار ہوئے، یہ کتاب چھوٹے چھوٹے چار اجزاء میں چھپی ہے، جس کے مجموعی صفحات لگ بھگ پونے دوسو ہیں، ۱۹۸۵ء میں یہ کتاب کویت کے "دار العروبة للنشر والتوزيع" سے دوبارہ شائع ہوئی، تو کویت کی کتابوں کی ایک نمائش میں یہ کتاب اتنی بڑی تعداد میں فروخت ہوئی کہ مولانا بدر الحسن قاسمی مقیم کویت نے خط لکھا:

"یہاں دار العروبہ للنشر والتوزیع نے "الالبانی اخطاؤہ و شذوذہ" کو بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا اور معرض الکتاب العربی میں بہت فروخت ہوئی"

(مکتوب ۱۳/۳/۱۹۸۵ء)

مفتاح العلوم میں اسکول کے قیام کی تحریک اور علامہ اعظمی کا موقف

۱۹۷۱ء میں مدرسہ مفتاح العلوم کے اندر بعض اراکین کی طرف سے اسکول کے قیام کیلئے کوشش کی گئی۔ یہ علامہ اعظمی کی زندگی کا مصروف ترین زمانہ تھا، اس وقت آپ کی علمی اور تصنیفی و تحقیقی مشغولیات پورے شباب پر تھیں، اسفار کی کثرت اس پر مستزاد تھی، چنانچہ اسی دور میں بیروت کے دو طویل سفر بھی پیش آئے، اسکول کے قیام کی تحریک شروع کرنے سے پہلے ہی شاید محرکین کے ذہن میں یہ بات رہی ہو کہ علامہ اعظمی اس تجویز سے اتفاق نہیں کریں گے، لیکن اس وقت حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم کاغذات میں دیکھتے ہیں کہ آغاز تحریک سے تقریباً ایک سال قبل ایجنڈا کے رجسٹر سے علامہ اعظمی کا نام اڑا دیا گیا، اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے کہ آپ کے نام پر سفیدی پھیر کر کس ظالم نے اپنا اعمالنامہ سیاہ کیا تھا، بہر حال آپ کے طویل اسفار اور گوناگوں مصروفیت کے باعث ان کو اس ناروا اقدام کا موقع ہاتھ آگیا، اسکول کے قیام کی اس تحریک کا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ مولانا عبداللطیف نعمانی علیہ الرحمۃ بھی اس کے حق میں تھے، لیکن اس تجویز و تحریک کے خلاف علامہ اعظمی کا شدید رد عمل سامنے آیا، یہ معاملہ ابھی پس و پیش ہی میں تھا کہ علامہ اعظمی بیروت کے دوسرے سفر پر روانہ ہو گئے، آپ کی روانگی کے کچھ ہی دنوں بعد ۱۰ر شعبان ۱۳۹۰ھ مطابق یکم اکتوبر ۱۹۷۱ء کو جمعہ کے دن نماز جمعہ کے بعد مدرسہ کی کمیٹی منعقد ہوئی، اس کمیٹی کے لئے جو ایجنڈا پاس ہوا تھا اس کے موضوع زیر بحث کا عنوان ہی تھا "انگریزی اسکول کا قیام مولانا کے تاثرات پر غور"، اس وقت کمیٹی میں سب سے پہلے اسی مسئلہ پر بحث ہوئی کہ کمیٹی میں لائے بغیر رجسٹر سے یہ نام (علامہ اعظمی کا نام) خارج کیسے کر دیا گیا، جب کہ یہ نام سرفہرست رہا کرتا تھا، اس وقت کچھ اراکین نے کھل کر علامہ اعظمی کی مخالفت کی، اور بات صرف مخالفت تک نہیں رہی بلکہ آپ کی ذات کو طنز و تعریض کا نشانہ بھی بنایا، اس صورتحال اور علامہ اعظمی کی ذات پر حملہ سے مولانا عبداللطیف صاحب طبعی طور پر دل گرفتہ ہوئے اور بالآخر انھوں نے یہ فراخدلانہ

پیشکش کی کہ مدرسہ کا کلی اختیار مولانا (علامہ اعظمی) کے ہاتھ میں دیدیا جائے، اور ہم تمام لوگ مع مدرسین وملازمین مستعفی ہو جائیں، وہ جس کو چاہیں رکھیں اور جس کو چاہیں نکال دیں۔

یکم اکتوبر کی وہ نشست بغیر کسی فیصلہ کے برخاست ہو گئی، اس کے بعد ایک آدھ اور نشستوں کے بعد اس تجویز پر خط تنسیخ پھیر دیا گیا، لیکن اس سے مجال انکار نہیں کہ اس واقعہ سے اختلاف وانشقاق کی ایک نیو پڑ گئی تھی، جس کے اثرات کئی سال بعد ظہور پذیر ہوئے۔

نئے مکان کی تعمیر اور اس میں منتقلی | اب تک علامہ اعظمی پرانے مکان میں جوان کا آبائی مکان تھا، اور جسمیں اب آپ کے بڑے صاحبزادے مولانا رشید احمد صاحب سکونت پذیر ہیں، زندگی گذارتے رہے، لیکن آپ کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے وہ مکان ناکافی تھا، اور علمی کاموں کی انجام دہی کے لئے کافی دقت ودشواری کا آپ کو سامنا کرنا پڑتا، چنانچہ اپنے محلہ میں قریب ہی ایک زمین تھی، اسمیں اپنی ضرورت کے مطابق تعمیر کرایا، اور وہاں منتقل ہو گئے، اسی مکان میں آج کل آپکے چھوٹے صاحب زادے حاجی سعید احمد صاحب اقامت گزیں ہیں۔ ۱۹/اپریل ۱۹۷۲ء م ۴/ربیع الاول ۱۳۹۲ھ کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"... مجھے اپنے لکھنے پڑھنے کے لئے جگہ کی بہت ہی تنگی تھی۔ ضرورت کے وقت کتابوں کے تلاش کرنے میں کبھی کبھی ایک ہفتہ صرف ہو جاتا تھا۔ اس لئے کہ کتابیں بالکل غیر مرتب رکھی ہوئی ہیں، اس لئے محلہ ہی میں ایک زمین تھی، اسمیں ایک کمرہ بنوا رہا ہوں، آج کل تقریباً دن بھر وہیں رہتا ہوں، وہیں جتنا موقع ملتا ہے، کچھ پڑھتا اور نوٹ کرتا رہتا ہوں" (۱)۔

سیریا سے ترتیب مخطوطات کے لئے دعوت | ۱۹۷۲ء میں سیریا (شام) کے تین

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۸۷

مشہور شہر حمص، حماۃ اور حلب کے مفتیوں کی طرف سے آپ کی خدمت میں ایک مشترکہ دعوت نامہ پیش کیا گیا، اس دعوت کا مقصد یہ تھا کہ شام میں کچھ عرصہ قیام فرما کر وہاں موجود مخطوطات کی ترتیب کا کام آپ انجام دیں، اخراجات کا تمام باران لوگوں کے سر ہوتا، اس دعوت کا ایک دوسرا پہلو یہ تھا کہ ہندوشام کے درمیان ثقافتی تبادلے کو فروغ حاصل ہو، اس سلسلے میں انھوں نے پہلے ایک خط انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز (Indian council for cultural relations) آزاد بھون نئی دہلی کو لکھا، کونسل سے وہاں کی پروگرام آرگنائزر محترمہ بندنا بنرجی نے اپنی ایک تحریر کے ساتھ ملحق کر کے علامہ اعظمی کے پاس مئو روانہ کردیا، قارئین کے سامنے پہلے محترمہ بندنا بنرجی بعدہ حمص اور حلب و حماہ کے مفتیوں کا خط پیش کیا جارہا ہے، مس بنرجی کی تحریر ۳؍اکتوبر ۱۹۷۲ء کی کونسل کے لیٹر پیڈ پر یہ ہے:

"Maulana Habib al rahman
sheikh ul Hadis, Madrasa Islamia
Mau Nath Bhanjan . Distt Azamgarh. U.P.
Dear Sir,

I am directed to enclose herewith copy of a letter received from the Mufties of Homs and hama , two cities in Syria regarding possibility of your visit to Syria. We shall be grateful if you kindly let us know if the offer is acceptable to you "

(مولانا حبیب الرحمٰن صاحب، شیخ الحدیث مدرسہ اسلامیہ
مئوناتھ بھنجن، ضلع اعظم گڈھ اترپردیش

" جناب والا! مجھے ہدایت ملی ہے کہ شام کے شہر حمص و حماہ کے مفتیوں کی طرف سے موصول ایک خط کی نقل روانہ کروں، یہ خط آپ کی شام کی زیارت کے امکان سے متعلق ہے، برائے کرم آپ ہمیں مطلع فرمائیں کہ کیا یہ پیشکش آنجناب کیلئے قابل قبول ہے ")

اب وہ خط ملاحظہ فرمایئے جو سیریا سے انڈین کونسل کو لکھا گیا تھا، اس کی تاریخ

تحریر ۱۰ ر جون ۱۹۷۲ء:

" We have known from the works of the great Indian scholar, Maulana Habib al Rahman Al Azami, that he is one of the greatest authorities in traditions in this age. We have read his works and commentaries and have greatly benefited from his knowledge.

We would like to inform, you that we have a big number of manuscripts on traditions in Homs and Hama. We, however, regret to say that there is no body well qualified here to interpret and comment on these manuscripts. In view of the above, We request you to do us a favour and send this scholar on a visit to Syria to help us to evaluate the value of these manuscripts. We shall bear all expenses of his travel and residence in Syria. As the job is difficult one, his stay may extend to one year in Syria.

We hope that you will approve of his visit to our country as we need him urgently for the academic studies taking place here.

Thanking you in advance for your approval for his visit in the name of mutual co-operation between the scholar of our two countries."

(ہم عظیم ہندوستانی محقق مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے کارناموں سے یہ جان چکے ہیں کہ وہ عصر حاضر میں حدیث کے مستند ترین علماء میں سے ایک ہیں، ہم ان کے کاموں اور تحقیقات کو پڑھ چکے ہیں اور ان کے علم سے بہت زیادہ مستفید ہوئے ہیں۔

ہم آپ کو اطلاع دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس حمص و حماہ میں بڑی تعداد میں حدیث کے مخطوطات موجود ہیں، اور اسی کے ساتھ ہمیں یہ بات

نہایت افسوس کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ یہاں کوئی شخص اتنا باصلاحیت نہیں ہے، جو ان مخطوطات کی صحیح طور پر تعبیر و تبصرہ کر سکے، مذکورہ بالا باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہماری ایک مدد کریں اور محقق موصوف کو سیریا بھیج کر ان مخطوطات کی قدر و قیمت کو متعین کرنے میں ہمارے ساتھ تعاون کریں، ان کے سفر اور شام میں قیام کے تمام اخراجات ہم برداشت کریں گے، چونکہ کام قدرے مشکل ہے، اس لئے سیریا میں ان کا قیام ایک سال تک کھنچ سکتا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ ہمارے ملک کے ان کے سفر کو منظور فرمائیں گے، کیونکہ یہاں ہونیوالے علمی دراسات کے لئے ہمیں ان کی فوری ضرورت ہے۔

دونوں ملکوں کے محققین کے درمیان باہمی تعاون کے نام پر ہونے والے ان کے سفر کے لئے آپ کی منظوری کا پیشگی شکریہ۔)

اس خط کے نیچے ان تین حضرات کے نام مذکور ہیں، جن کی طرف سے یہ خط لکھا گیا ہے، اور وہ ہیں حمص کے مفتی شیخ محمد طیب العطاسی، حلب میں خادم حدیث شیخ عبدالباسط ابوالنصر اور حماۃ کے مفتی شیخ بشیر المراد۔

مولانا عبداللطیف نعمانی کی رحلت اور علامہ اعظمی کی گرانباری

دسمبر ۱۹۷۲ء کے اواخر میں علامہ اعظمی کلکتہ تشریف لے گئے، ابھی آپ کلکتہ ہی میں تھے کہ ادھر مئو میں ایک دل فگار سانحہ رونما ہوا، وہ یہ کہ آپ کے ہمدم دیرینہ، رفیق معزز اور سفر وحضر کے ساتھی مولانا عبداللطیف صاحب نعمانیؒ حرکت قلب بند ہو جانے سے واصل بحق ہو گئے، مولانا نعمانیؒ کی رحلت کا حادثہ ۳ر جنوری ۱۹۷۳ء م ۳۰ر ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ کو پیش آیا، ۴ر جنوری کو ظہر کی نماز کے بعد نماز جنازہ ادا کی گئی، اس کے بعد مدرسہ کے جنوب مغربی سمت میں تدفین عمل میں آئی، اس سانحہ کی خبر علامہ اعظمی کو ٹیلی فون کے

دی گئی، جس کو سننے کے بعد ان پر جو گزری ہوگی اس کا احساس کچھ انھیں کو ہوا ہوگا۔ اس کے بارے میں وہ خود تحریر فرماتے ہیں:

"وہاں سے جس دن شام کو میری روانگی تھی، اس دن صبح کو ٹرنک کال کے ذریعہ اچانک یہ جانکاہ خبر ملی کہ مئو میں مولانا عبداللطیف صاحب انتقال فرماگئے۔

اس خبر کا جو اثر دل و دماغ پر پڑا بیان سے باہر ہے، تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اب بنارس جانے والا کوئی پلین نہیں ہے، اس لئے ہم سب دل تھام کر بیٹھ گئے کہ جنازہ میں شرکت تو نا ممکن ہے، اب کل قبر ہی کی زیارت کا امکان ہے۔

مئو آنے پر مفصل معلوم ہوا کہ مولانا نے عشاء کی نماز کے بعد مطالعہ کیا، دس بجے کے قریب بیت الخلاء گئے اور واپسی میں بے قابو ہو کر بیچ میں ہی بیٹھ گئے اور جب اٹھا کر لائے گئے تو چند ہی منٹ میں روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔"(۱)

مولانا محمد عثمان صاحب معروفی اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

"۶/ ذوالحجہ ۱۳۹۲ھ کو بعد نماز جمعہ شاہی مسجد میں محدث جلیل ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دامت برکاتھم نے قدرے تفصیل سے آپ کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی اور مسلمانوں کو صبر کی تلقین فرمائی ..."(۲)

اور مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی نے مولانا نعمانیؒ کی تدفین اور علامہ اعظمی کی تقریر اور ان کے اوپر مدرسے کی ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

"... مولانا مرحوم کی وفات کے بعد یہی ہوا کہ مفتاح العلوم کا سارا

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۷

(۲) ایضاً ص ۶۵

بوجھ آپ پر آگیا، اور یہی وجہ ہے کہ مجموعی طور پر وفات کا جو غم حضرت مولانا اعظمی مدظلہ کو ہوا، شاید کسی کو نہیں ہوا ہوگا۔ جن لوگوں نے مولانا مدظلہ کی جامع شاہی کی وہ تقریر سنی ہے جو آپ نے مولانا نعمانیؒ کی وفات کے بعد کی تھی۔ ان کو اندازہ ہوا ہوگا۔ ربیع الاول ۱۳۹۳ھ میں جب مئو حاضری ہوئی تو ٹیپ ریکارڈ سے وہ تقریر خاکسار نے بھی سنی تھی ۰۰۰ بڑا اچھا ہوا کہ حضرت الاستاذ مولانا اعظمی مدظلہ کی خصوصی توجہ سے آپ کو مفتاح العلوم کے ایک گوشہ میں خانۂ خدا کے زیر سایہ سپرد خاک کیا گیا ۰۰۰(۱)

مولانا نعمانیؒ قدس سرہ کی تجہیز و تکفین کے چند یوم بعد جب غم کچھ ہلکا ہوا تو سب سے اہم مسئلہ مدرسے کے نظم و نسق اور فرائض صدارت و نظامت تھے، کوئی ایسی شخصیت رہی نہیں جو ان ذمہ داریوں کو کماحقہ سنبھال اور ادا کر سکتی، مجبوراً علامہ اعظمی ہی گرانبار ہوئے، اور ضعف و ناتوانی کے باوجود ایک بار پھر آپ نے مدرسہ کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی، اور وہ بوجھ جس سے عمر بھر بھاگتے رہے، کہن سالی کے باوجود اپنے شانوں پر لادلیا، اور نہ چاہتے ہوئے بھی صرف مدرسہ کے مفاد کے پیش نظر یہ بوجھ برداشت کر لیا، چنانچہ حضرۃ الاستاذ مولانا عبدالجبار صاحب اعظمی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

"تیسرے روز کمیٹی منتظمہ نے باتفاق رائے پاس کیا کہ اب حضرت مولانا مدظلہ مدرسہ کے مہتمم اور صدر مدرس کے کام انجام دیں گے۔

مولانا اس وقت پوری طرح مدرسہ کی جانب متوجہ ہیں، نماز جمعہ کے بعد عوام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ: مولانا مرحوم نے میری ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی اس وجہ سے میں مدرسہ کی ذمہ داری سے بڑی حد تک سبکدوش تھا، اب جبکہ میرے سوا کوئی مدرسہ کا سنبھالنے والا نہیں رہا، تو اس کا بار میں اپنے

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۰۷

اوپر محسوس کرتا ہوں، لہذا اس کا تعلیمی اور انتظامی کام حتی المقدور میں انجام دوں گا، البتہ تمام لوگوں کا تعاون میرے ساتھ ہونا چاہئے۔"(۱)

اس پوری صورتحال اور علامہ اعظمی کی گرانباری اور پریشانی کو خود انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں، مولانا عبداللطیف نعمانی مرحوم کی وفات اور مدرسہ کی باگ ڈور سنبھالنے کے تقریباً تین ہفتے بعد اپنے تلمیذ رشید مفتی ظفیر الدین مفتاحی کو خط لکھا، یہ خط ۲۹؍جنوری ۱۹۷۳ء کا مرقوم ہے، اس میں فرماتے ہیں:

"تمہارے دونوں خطوط ملے، جواب میں تاخیر کا سبب ظاہر ہے، مولانا عبداللطیف صاحب کی وفات میرے لئے ایک صدمہ جانکاہ ہونے کے علاوہ بہت سی پریشانیوں کا سبب بھی بن گئی ہے، مدرسہ کی خدمت کی ذمہ داریاں نہ میں نے قبول کی ہیں، نہ میرے اوپر ڈالی گئی ہیں، وہ از خود میرے سر آگئی ہیں، اس لئے کہ یہ ساری ذمہ داریاں میں ہی ان کے سپرد کرکے ان کی زندگی میں سبکدوش ہو گیا تھا۔

مجبوراً روزانہ مدرسہ جاتا ہوں، بخاری کی جلد اول پڑھاتا بھی ہوں، بعض اور اسباق بھی پڑھاتا ہوں، اب سب کو منتقل کر رہا ہوں، بخاری جلد ثانی مولانا عبدالجبار کے حوالہ کردی ہے، انتظامی امور کی دیکھ بھال خود ہی کر رہا ہوں۔"(۲)

مولانا محمد ایوب صاحب کو دوبارہ لانے کی خواہش اوپر لکھا جا چکا ہے کہ مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی مرحوم جب اسمبلی کی رکنیت کے اختتام کے بعد دوبارہ مفتاح العلوم میں آئے تو ان میں اور مولانا محمد ایوب صاحب علیہ الرحمۃ میں کچھ نااتفاقی ہو گئی، اور اس کے نتیجہ میں صورتحال قدرے مخدوش ہو گئی، جس کی وجہ سے مجبوراً

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۸۲

(۲) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۹۳

مولانا محمد ایوب صاحبؒ کو مدرسہ چھوڑنا پڑا۔ اب جب زمام مدرسہ علامہ اعظمیؒ کے ہاتھ میں آئی تو ان کی یہ خواہش ہوئی کہ مولانا محمد ایوب صاحب کو ایک بار پھر مدرسہ میں لائیں۔ چنانچہ مفتی ظفیر الدین صاحب کے مذکورہ بالا خط میں اس کے بعد لکھتے ہیں:

"مولانا ایوب صاحب آجاتے تو بوجھ ہلکا ہو جاتا، مگر درمیان سال میں بلانے سے وہاں کا نقصان ہوگا اور شاید وہ بھی قبول نہ کریں (۱)

واقعہ یہ ہے کہ علامہ اعظمی کو مدرسہ مفتاح العلوم سے ایک والہانہ عشق تھا، اس کی محبت رگ وپے میں رچی بسی تھی۔ یہ شغف اور شیفتگی اخلاص پر مبنی تھی، آپ کی کوئی غرض یا ذاتی مفاد اس سے وابستہ نہیں تھا، مفتاح العلوم انھیں کی ذات سے چمکا، بڑھا اور مشہور و معروف ہوا، اس سے لیا کچھ نہیں اور دیا سب کچھ تھا، مفتاح العلوم ان کی شہرت و ناموری کیلئے زینہ یا ذریعہ نہیں بنا، بلکہ اس کے برعکس اس کی شہرت وناموری آپ کی رہین منت رہی، دلوں کا بھید تو اللہ بہتر جانتا ہے، لیکن اس کی توسیع و ترقی میں جس جوش و جذبہ اور محنت و لگن کا مظاہرہ کیا اس کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ایک لمحہ کیلئے بھی اس سے کوئی فائدہ یا منفعت حاصل کرنے کا آپ کے دل میں خیال گذرا ہوگا۔

مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی تجویز اسی سال (۱۳۹۲ھ) رجب میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں اصحاب شوریٰ کی تجویز پر آپ نے اس بات کی ہامی بھرلی، کہ سال میں کچھ روز دارالعلوم میں قیام کرکے وہاں کے اساتذہ و طلبہ کو استفادہ کا موقع فراہم کریں گے، اور یہ تجویز جو تجویز نمبر ۱۲ ہے، دارالعلوم کے لیٹر پیڈ پر نقل کرکے مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم کے ایک خط کے ساتھ ملحق کرکے دفتر دارالعلوم کی طرف سے آپ کی خدمت میں روانہ کی گئی، تجویز کی عبارت یہ ہے:

"نقل تجویز مجلس شوریٰ رجب ۱۳۹۲ھ

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۹۳

۱۲۔ مجلس شوریٰ شیخ الحدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کے اس وعدہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس کا احترام کرتی ہے کہ آپ دیوبند تشریف لاکر کچھ روز قیام فرمایا کریں، اور طالبان علوم کو استفاضہ کا موقع دیا کریں گے۔ مجلس اس وعدہ کا احترام کرتے ہوئے توقع رکھتی ہے کہ حضرت ممدوح سال میں چند بار اس افادہ کا موقع دیا کریں گے۔ حضرت موصوف سے اس سلسلہ میں رابطہ رکھا جائے، آمدورفت اور قیام کے جملہ انتظامات من جانب دارالعلوم کئے جائیں۔"

قاری محمد طیب صاحب کا خط اور یہ تحریر ۱۷ رجب ۱۳۹۲ھ کی مکتوب ہے، لیکن اس کے چند ہی مہینے بعد مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی کا انتقال ہو جانے سے آپ کے اوپر مفتاح العلوم کی جو ذمہ داریاں آئیں وہ اس افادہ کے لئے سدِّ راہ بن گئیں۔

فتح المغیث | ابوالفضل زین الدین عبدالرحیم بن الحسین العراقی (متوفی ۸۰۶ھ) ایک بڑے محدث گذرے ہیں، انھوں نے اصول حدیث پر "الفیة الحدیث" کے نام سے ایک منظوم رسالہ تصنیف فرمایا، اس الفیہ کی شرح نثر میں مشہور محدث حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) نے ۳ ضخیم جلدوں میں "فتح المغیث" کے نام سے کی، یہ شرح بہت مفصل اور مبسوط ہے اور علم اصول حدیث کے اندر نہایت جامع، وقیع اور اہم خیال کی جاتی ہے، یہ کتاب دستیاب تھی اور مصر و ہند سے چھپ چکی تھی، لیکن کتابت وطباعت کی اغلاط سے پر تھی، جس کی وجہ سے اس سے کماحقہ فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا تھا، علامہ اعظمی ؒ نے اس کے مطبوعہ نسخوں کا باہم مقابلہ کرکے ایک صحیح اور پاکیزہ نسخہ تیار کیا اور مطبعۃ الاعظمی مئو اعظم گڈھ سے چھاپ کر شائع کیا۔

چھٹا حج | ۱۹۷۳ء مطابق ۱۳۹۳ھ میں آپ نے چھٹی بار حج کیا، اس سفر کے تعلق سے علامہ اعظمی نے اپنی یادداشت میں جو باتیں تحریر فرمائی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

یوم الاحد ۲۳ر دسمبر ۱۹۷۳ء۔ دن میں بارہ بجے سعودی طائرہ زمین سے اٹھا، سوا پانچ گھنٹے میں جدہ پہونچنے کا اعلان ہوا۔

عبدالغنی جدہ کو ۲۱ر دسمبر ۱۹۷۳ء کو تار دیدیا گیا تھا۔ (گیارہ روپے) میں تار ہوا اس طرح کے تار کو لیٹر ٹیلیگرام کہتے ہیں۔

ایرپورٹ پر سامان وزن کیا گیا تو ۷ ۳ر کیلو ہوا مگر لے لیا گیا۔

۲۳ر ہی کو رات میں مکہ پہونچا، فخریہ میں قیام ہوا، دوسرے دن علی میاں اور مولوی منظور ملنے کو آئے۔

حج ۲ر جنوری ۱۹۷۴ء کو ہوا، اس دن ہندوستان میں ۷ر ذی الحجہ تھی۔

مکہ۔ شیخ الازہر، رشید فارسی، صالح قزاز، حسنین مخلوف، محمد نور سیف، محمد الحسن بن علوی مالکی، محمد الحافظ التیجانی، عبدالفتاح ابو غدہ، محمد علی صابونی، بن باز حمد ابراہیم صلیفیح، محمد نمر الخطیب وغیرہم سے ملاقاتیں ہوئیں۔

۲۸ر جنوری کو مدینہ گیا۔ ۲ر کو جدہ واپس ہوا۔ ۴ر کو ہندوستانی ٹائم سے ساڑھے گیارہ بجے جدہ سے روانہ ہوا اور تین بج کر چالیس منٹ پر بمبئی پہونچ گیا، حاجی شمس الدین بکری والوں کے یہاں قیام ہوا۔"

علاوہ بریں وفیات پر مشتمل اپنی بیاض جو مرتب فرمائی ہے، اس میں ایک جگہ شیخ علال فاسی کا ذکر کیا ہے۔ اس میں اور باتوں کے ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں:

"وقد استمعت الی محاضرته فی مقر الرابطة فی موسم الحج عام ۱۳۹۳ھ"

یعنی ۱۳۹۳ھ کے حج کے موسم میں رابطہ عالم اسلامی کے دفتر میں میں نے ان کا لیکچر سنا۔

اسی سفر کی بابت ایک جگہ اور لکھا ہے :

"چھٹا حج میں نے ۱۳۹۳ھ میں کیا، فخریہ میں قیام تھا، اسی سال شیخ الازہر سے ملاقات ہوئی۔"

علامہ اعظمی کا کتابوں اور کتب خانوں سے تعلق و شغف محتاج بیان نہیں ، بالخصوص ایسی لائبریریوں کے، جہاں مخطوطات پائے جاتے ہوں، وہ فریفتہ و دلدادہ تھے، اس سفر میں مدینہ منورہ کی لائبریری "المكتبة العامة "میں تشریف لے گئے اور متعدد مخطوطات کے نام نوٹ کئے، اور اشارات کے لئے نہایت مختصر طور پر ایک جگہ نوٹ کر دیا۔ آپ کی تحریر یہ ہے:

"محرم ۱۳۹۴ھ۔ المكتبة العامة بالمدينة المنورة

ا۔ المطالب العالیۃ، مکتوبہ ۸۷۱ھ کامل۔ ورق بے حد کمزور و وزیدہ

۲. اطراف مسند احمد لابن حجر، جلد اول تا مسانید ابن مسعود فقط۔ مکتوبہ قدیم، شاید سخاوی کے ہاتھ کا ہوا مؤلف کے۔

۳. فتح المغيث شرح ألفية للعراقي ، كلاهما هو التبصرة والتذكرة .

٤. تقييدات ابن نقطة

٥. جزء عن تاريخ أحمد بن أبي خيثمة "

علامہ اعظمی کے تئیں عربوں کی عقیدت و محبت اور شیفتگی و گرویدگی کا جو دلآویز منظر پروفیسر محمد اجتباء صاحب ندوی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس کی نسبت ان کا بیان ہے:

"۱۹۷۳ء کے آخر میں، سعودی وزارت تعلیم کی دعوت پر ریاض گیا ۷۴ء کے حج کی سعادت حاصل کرنے کیلئے ریاض سے مکہ مکرمہ حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ حضرت محدث اعظمی کا قیام مدرسہ فخریہ میں ہے، پہلی فرصت میں حاضر ہوا، کئی برس کے بعد ملاقات ہوئی تھی لپٹا لیا، شفقت و محبت سے حالات پوچھے

رہے ، کمرہ کے ایک کونہ میں بڑی سادگی، تواضع اور انکساری سے تشریف فرماتھے ، اور عرب و عجم کے علماء و محدثین اور محققین خدمت میں حاضر ہوتے تھے، سند حدیث لیتے تھے اور تاثر و عقیدت سے مالامال لوٹتے تھے ۔"(۱)

جامع ازہر مصر کی دعوت | ۱۹۷۴ء میں جامع ازہر مصر سے حدیث و تفسیر سے متعلق کچھ تحقیقات کے لئے آپ کو قاہرہ تشریف لے جانے کی دعوت دی گئی، چنانچہ شیخ الازہر کی ہدایت پر، ازہر کے ماتحت ادارے مجمع البحوث الاسلامیہ (Islamic Research Academy) کے سیکریٹری جنرل ڈاکٹر محمد عبدالرحمٰن بیصار نے درج ذیل خط آپ کی خدمت میں روانہ کیا، جو دفتر کے لیٹر پر ۲۰/مارچ ۱۹۷۴ء کا مکتوب ہے:

"فضيلة الأستاذ الشيخ حبيب الرحمن الأعظمى

السلام عليكم و رحمة الله و بركاته وبعد!

يسعدنا أن نرحب بفضيلتكم فى القاهرة ضيفاً على الأزهر الشريف من أجل دراسات تتعلق بالحديث والتفسير ... لبضعة أشهر وذلك بناء على توجيهات الإمام الأكبر شيخ الجامع الأزهر على أن تكون الزيارة من أول يونيو سنة ١٩٧٤ . مع رجاء أن نوافى بالموعد الذى تحددونه للحضور الى القاهرة بخمسة عشر يوما على الأقل .

و نحن إذ نوجه الدعوة لفضيلتكم يسرنا أن نسعد بوجودكم فى مصر لنستفيد من علمكم و يستفيد الأزهر من خبرتكم ..."

(استاذ فاضل شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

ہمارے لئے یہ سعادت کی بات ہے کہ قاہرہ میں، جامع ازہر کے مہمان

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۳ ص ۱۰۷-۱۰۶

کی حیثیت سے، حدیث و تفسیر سے متعلق تحقیقات کے سلسلے میں چند مہینوں کیلئے، ہم آپ کو خوش آمدید کہیں، یہ دعوت امام اکبر شیخ الازہر کی ہدایت پر دی جا رہی ہے، بایں طور کہ آپ کا سفر جون ۱۹۷۴ء کے آغاز سے ہو، امید ہے کہ قاہرہ تشریف آوری کے سلسلہ میں آپ جو وقت مقرر فرمائیں گے کم از کم پندرہ دنوں میں ہم تک پہنچ جائے گا۔

ہم آنجناب کی خدمت میں یہ دعوت نامہ گذارتے ہوئے اس بات سے خوش ہیں کہ مصر میں آپ کی موجودگی سے ہم سرفراز ہوں گے، تاکہ ہم آنجناب کے علم سے استفادہ کر سکیں اور ازہر آپ کے تجربہ سے فائدہ اٹھا سکے۔)

علامہ اعظمی کی مفتاح العلوم سے علیحدگی مدرسہ مفتاح العلوم کے لئے علامہ اعظمی کی خدمات اور قربانیاں اتنی عظیم الشان اور بیش بہا ہیں کہ انھیں حیطۂ تحریر میں لانا دشوار ہے، پھر بھی گذشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا جاچکا ہے، اس سے قارئین کو کسی حد تک اندازہ ضرور ہو سکتا ہے، علامہ اعظمی کی طبیعت کا یہ عجیب پہلو تھا، کہ ہند و بیرون ہند سے پیش کئے جانے والے اعلی علمی عہدوں اور اونچے اونچے مناصب کو کبھی خاطر میں نہیں لائے، آپ دیکھ چکے ہیں کہ کس کس طرح لوگوں نے بڑے بڑے مشاہروں اور خطیر تنخواہوں کی ترغیب دے کر اپنے اداروں میں بلانا چاہا، لیکن ادھر سے ہمیشہ بے نیازی بلکہ بیزاری رہی، مگر مفتاح العلوم کی کسی بھی خدمت کیلئے ہمہ وقت کمربستہ اور ہمہ تن تیار رہے۔

مولانا عبداللطیف صاحب نعمانیؒ کو اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ علامہ اعظمی کی شخصیت مدرسے کی سب سے قیمتی متاع ہے، وہی اس کے روح رواں اور وہی اس کے تاج کے آبدار موتی ہیں، انھیں کے دم سے مدرسہ کی بزم سجی ہے، اور ان ہی کے وجود سے اس کی رونق قائم ہے، یہی وجہ ہے کہ جس وقت علامہ اعظمی کی مصروفیات منتہائے کمال کو پہونچی ہوئی تھیں، مولانا نعمانی مرحوم نے اپنی ایک اہم خواہش کا اظہار کیا تھا، جس کو مفتی ظفیر الدین صاحب نے درج ذیل الفاظ میں قلمبند کیا ہے، لکھتے ہیں۔

"شوال ۱۳۹۲ھ میں وفات سے دوماہ پہلے حاضری ہوئی تو کئی مجلسوں میں فرمایا کہ دل چاہتا ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مدظلہ مفتاح العلوم میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف کی خدمات انجام دیں، جی چاہے تو ایک آدھ سبق پڑھا دیں، نہ جی چاہے نہ پڑھائیں، مگر دو تین گھنٹے لکھنے پڑھنے کا کام گھر کے بجائے یہیں بیٹھ کر ضرور کیا کریں، میں خود ہی خدمت میں حاضر ہو کر کہوں گا، تم لوگ بھی عرض کرو، چنانچہ اس کا تذکرہ خاکسار نے مولانا مدظلہ سے ان ہی دنوں میں کیا تھا، حضرت اقدس مدظلہ نے امید افزا انداز میں فرمایا سوچوں گا۔"(۱)

یہ مولانا نعمانی مرحوم کے دل کی آواز اور مدرسہ کے مفاد کے سلسلے میں اہم ترین خواہش تھی، جس کا اظہار انھوں نے وصال سے کچھ عرصہ قبل کیا تھا، پھر حالات خود ہی ایسے آن پڑے کہ علامہ اعظمی کو خود کو پوری طرح مفتاح العلوم کے حوالے کر دینا پڑا، لیکن یہ بات نہایت افسوس کی ہے کہ مولانا نعمانی نور اللہ مرقدہ کے ہی کچھ حلقہ بگوشوں نے ان کی خواہشات کو پامال اور ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا ان کے انتقال کے بعد بدترین انداز سے خون کیا۔

علامہ اعظمی نے اپنی تصنیفی و تحقیقی مصروفیات کی وجہ سے مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی کو اپنا جانشین بنا رکھا تھا، چنانچہ آپ کی جو تحریر صفحہ ۱۶۶ پر گذر چکی ہے، اس کے بعد متصلاً آپ ارقام فرماتے ہیں:

"جب میں نے مصنف عبدالرزاق کی تحقیق کا کام شروع کیا، تو مجبوراً میں نے اپنی جگہ مولوی عبداللطیف نعمانی کو سپرد کر کے کام کیلئے یکسوئی حاصل کرلی"

آپ نے صرف مصنف کے نام کو اس کی اہمیت کے پیش نظر ذکر کیا ہے، ورنہ یہ وہ زمانہ تھا کہ مصنف کی تحقیق کے ساتھ مسند حمیدی، سنن سعید، کتاب الزھد اور

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۰۷

المطالب العالیہ وغیرہ کی تحقیق کا کام بھی جاری تھا، یہ مہمات ایسی تھیں کہ آپ سے مکمل انہماک اور کامل یکسوئی کی متقاضی تھیں، جس کے نتیجہ میں طبعی طور پر مفتاح العلوم کی طرف آپ کی توجہ کم ہوگئی، جس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی علیہ الرحمۃ نے مدرسہ کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی سنبھال رکھا تھا۔

لیکن اسی کیساتھ یہ حقیقت بھی نہایت تلخ اور باعث افسوس ہے کہ حضرت مولانا عبداللطیف صاحبؒ کے گرد ایسے لوگ اکٹھا ہوتے گئے، جو علم وبصیرت سے محروم تھے، جن کا شیوہ صرف تملق تھا اور اسی پر بس نہیں، بلکہ وہ انتظامی امور میں دخیل اور مدرسہ کے معاملات پر غالب ہوتے جارہے تھے، اسی ذہنیت کے لوگوں نے مولانا محمد ایوب صاحبؒ کے اوپر حملہ کیا، اور اسی ذہنیت کے لوگ تھے کہ جب علامہ اعظمی نے مدرسہ کے اندر اسکول وکالج کے قیام کی تحریک کو روکنا چاہا، تو ان پر طعن آمیز اور گستاخانہ جملے کسے، یہ لوگ مجلس انتظامی پر حاوی ہوتے جارہے تھے، حالانکہ اس قسم کے لوگوں سے مدرسہ کے مفاد کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، بلکہ ضرر اور نقصان پہونچنے کا اندیشہ تھا، چنانچہ اس تسلط کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا نعمانیؒ کی وفات کے بعد ایسے حالات پیدا ہوگئے، جن کے پیش نظر علامہ اعظمی کو مدرسہ سے علحدگی کا فیصلہ کرنا پڑا۔ ۱۱ر مارچ ۱۹۷۵ء کو مالیگاؤں سے ایک خط میں حاجی عبدالغفار صاحب نعمانی کو (جو اس وقت مفتاح العلوم کے خزانچی تھے) لکھتے ہیں:

"میں بنگلور سے مدراس اور حیدرآباد ہوتا ہوا مالیگاؤں آگیا ہوں، مئو واپس ہونے کی مجھے کوئی جلدی نہیں ہے، مدرسہ کے حسابات کی جانچ پڑتال اگر ہوگئی ہو تو خیر ورنہ بلا تاخیر کمیٹی کیلئے نوٹس گشت کرادی جائے اور ۰۰۰ صاحب بغیر کسی لیت ولعل کے اپنی رپورٹ کمیٹی میں پیش کردیں اور تمام کاغذات اور رجسٹر کمیٹی کے حوالہ کردیں، کمیٹی کسی معتمد کے چارج میں ساری چیزیں دیدے، نیز رپورٹ پر حق وانصاف کا جو تقاضا ہو اس کے مطابق کمیٹی فیصلہ صادر کردے۔

میں اب مدرسہ کی ہر خدمت سے معذور ہوں، مگر مدرسہ چھوڑنے سے پہلے اس کی بقا کے لئے ایک ضروری مشورہ دے رہا ہوں، کہ آپ لوگ فوراً جدید انتخاب ممبران کا کر لیجئے جس میں قدیم ممبران میں سے کسی کو نہ لیجئے۔۔۔

میرا انتظار نہ کیا جائے، میں آنے کے بعد مدرسہ نہ آؤں گا، نہ کمیٹی میں شرکت کروں گا۔

حبیب الرحمٰن الاعظمی

۱۱۔مارچ ۱۹۷۵ء"

علیحدگی کے اسباب | علامہ اعظمی مفتاح العلوم سے قطع تعلق کا حتمی فیصلہ کر چکے تھے، لیکن آپ کے اس فیصلہ کے پس منظر میں کیا اسباب دعوامل کارفرما تھے، اور وہ کون سے حالات وواقعات رونما ہوئے جن کے نتیجہ میں آپ اس اہم ترین فیصلہ پر مجبور ہوئے۔ میں ان کو مختصر اً مالہ وماعلیہ کے ساتھ ذکر کر دینا چاہتا ہوں، اس کا سبب نہایت اجمال کے ساتھ آپ خود تحریر فرماتے ہیں:

"لیکن مولوی عبداللطیف صاحب کے انتقال کے بعد پھر اس کا (مدرسہ کا) انتظام اپنے ہاتھ میں لینا پڑا، مگر یہ سلسلہ صرف اس وجہ سے دیرپا نہ ہو سکا کہ مجلس انتظامی کا جدید انتخاب کئی سال سے نہیں ہوا تھا، نعمانی صاحب (۱) کے وقت میں بھی بار بار یہ تجویز پاس ہوئی کہ نیا انتخاب ضروری ہے اور میرے آنے کے بعد بھی، مگر ممبران ہمیشہ رکاوٹ ڈالتے رہے، اس لئے میں نے مدرسہ جانا بند کر دیا، اور لکھ کر بھیج دیا کہ جب تک نیا انتخاب نہ ہوگا میں مدرسہ نہیں آسکتا، انجام کار نیا انتخاب نہیں ہوا اور نعمانی کے لڑکوں نے ایک غیر قانونی مجلس میں نعمانی کے بڑے لڑکے کو ناظم اعلیٰ منتخب کر لیا، حالانکہ یہ انتخاب اور انتخابی مجلس بالکل ناجائز اور غیر قانونی تھی، مدرسہ کے دستور دفعہ

(۱) مولانا عبداللطیف نعمانی مراد ہیں

ے کی رو سے کوئی مجلس بغیر ناظم کے منعقد نہیں ہو سکتی ، اور یہ مجلس جس میں انتخاب ہوا، اس کو نہ میں نے بلایا تھا نہ میں نے اس کا حکم دیا تھا اور نہ میں اس میں موجود تھا۔"

مجلس انتظامی میں جس قسم کے لوگ غالب ہو چکے تھے، ان سے مدرسہ کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، بلکہ بہت نقصان پہنچ چکا تھا، اور مدرسہ کے قیام کے مقاصد اور دینی مصالح کو ذاتی مفادات اور سیاسی مصلحتوں کے مقابلہ میں پس پشت ڈالا جارہا تھا، اس لئے علامہ اعظمی مجلس انتظامی کو یکسر تبدیل کر دینے کا عزم کر چکے تھے ، مگر اراکین اس تبدیلی کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ صورتحال اس قدر ناگفتہ بہ اور وحشت خیز ہو چکی تھی کہ اس کا تصور بھی تکلیف دہ ہے، حتی کہ آپ اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں:

"پروسیڈنگ بک جس پر ابتدا سے مولانا عبداللطیف کے انتقال سے کچھ پہلے تک کی کارروائیاں درج تھیں گم کردی گئی۔
قبض الوصول کا رجسٹر بھی گم کردیا گیا۔"

صرف یہی نہیں، مدرسہ کے دستور العمل کو مسلسل پامال اور اس کے اصول و ضوابط کو رسوا کیا جاتا رہا، چنانچہ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ دفعہ ۷ کی خلاف ورزی کی گئی، جس کی نسبت مدرسہ کے دستور (قواعد متعلقہ ناظم مدرسہ) میں یہ مذکور ہے۔ "کوئی مجلس بغیر ناظم یا نائب ناظم اجلاس نہیں کر سکتی" یعنی دستور مدرسہ کی خلاف ورزی کر کے ناظم کا انتخاب کیا گیا، اور پھر نو منتخب ناظم نے کیا کیا بے ضابطگیاں کیں ان میں سے بعض باتیں علامہ اعظمی نے تحریر فرمائی ہیں، چنانچہ آپ نے لکھا ہے کہ دفعہ ۳ کی مخالفت کی گئی ، یعنی "ممبران عمومی کا انتخاب شہر کے جلسہ عام میں نہیں ہوا، بلکہ ناظم نے اپنی رائے سے کثیر افراد کو ممبر بنالیا" اور "ممبر خصوصی کی نامزدگی ناظم نے اپنے رائے سے کی" دستور العمل کی مخالفت کے زیر عنوان ان باتوں کے علاوہ اور بھی متعدد دفعات کی مخالفت آپ نے ذکر فرمائی ہے، جو اس بات پر صاف دلالت کرتی ہے کہ مدرسہ کی روح کو پے بہ پے ضرب پہنچائی جاتی رہی اور ان لگاتار ضربوں سے اس کی روح پوری طرح مجروح ہو چکی تھی۔

علامہ اعظمی کے خلاف جو محاذ آرائی کی گئی ،اس کا ایک بنیادی سبب یہ بھی تھا، کہ مدرسہ کا اتر پردیش عربی و فارسی بورڈ سے جو الحاق تھا اس کو آپ ختم کرانا چاہتے تھے، آپ کو مدرسے پر سرکاری اثر و نفوذ دیکھنا کسی طرح گوارا نہیں تھا، گویا ان کی خداداد بصیرت اور مومنانہ فراست اس سے مرتب ہونے والے اثرات اور آگے آنے والے خطرات کو دیکھ رہی تھی،اس لئے ان کی قطعی رائے یہ تھی کہ مدرسہ آزادانہ طور پر علم و دین کی خدمت انجام دے ،سرکار یا سرکاری امداد کا دست نگر اور محکوم نہ ہو، سرکاری امداد کی بنیاد پر دینی مدرسہ چلانا ،ان کے نزدیک مدرسہ کو سرکار کی تحویل میں دیدینے کے مترادف تھا، لیکن مخالفین کے لئے ان کا یہ نظریہ بھی قابل قبول نہ تھا، اور اس کی بنیاد پر بھی آپ کی سخت مخالفت کی گئی، یہاں تک کہ آپ کی نسبت بے سروپا حکایتیں اور جھوٹے افسانے گھڑے گئے جن سے آپ کا دامن پوری طرح پاک تھا۔

موقع پرستوں نے مفتاح العلوم سے علامہ اعظمی کی توجہ ہٹانے اور اس پر اپنی گرفت جمانے کے لئے وہ سیاسی بازیگری کی اور ایسے ایسے حربے اور ہتھکنڈے آزمائے، جن سے ادارہ کی پوری تاریخ شرمسار ہے ،ان کرم گستروں نے علامہ اعظمی اور ان کے متعلقین کے خلاف طرح طرح کی سازشیں رچیں، ان کی شہ پر کچھ طلباء نے مولانا عبدالجبار صاحب اور مولانا نعمت اللہ صاحب (۱) کی شان میں سخت گستاخی کی، اور

(۱) مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی معروفی ۱۳۵۴ھ میں پورہ معروف میں پیدا ہوئے، تعلیم اپنے قصبہ کے مدرسہ اشاعت العلوم میں حاصل کی، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند گئے اور وہاں سے ۱۳۷۲ھ میں فارغ التحصیل ہوئے، فراغت کے بعد درس و تدریس کا کام شروع کیا اور سب سے پہلے دارالعلوم تاؤلی ضلع مظفر نگر میں تدریسی خدمت انجام دی ،اس کے بعد علامہ بلیاوی کے حکم پر داماپور گئے اور وہاں کم عمری کے باوجود بخاری و ترمذی پڑھائی ،اس کے علاوہ مصباح العلوم کوپاگنج اور جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ میں بھی درس و تدریس کی خدمت انجام دی، ۱۳۹۳ھ م ۱۹۷۳ء میں علامہ اعظمی نے ان کو مفتاح العلوم میں شیخ الحدیث کا منصب تفویض کیا، اختلاف کے بعد وہاں =

بد تمیزی کی دنیا میں ایک مثال قائم کر دی، وہ دن مفتاح العلوم کی تاریخ کا تاریک ترین دن تھا، جب مولانا عبدالجبار صاحب کے سامنے سے چند سرکش طلبہ نے (جن میں سے بعض اب صاحب جبہ و دستار اور بقلم خود حدیث نبوی کے خدمت گذار بن گئے ہیں) دوران درس صحیح مسلم چھینی، ان تمام حالات و واقعات کا نتیجہ وہی ہوا جو ان شر انگیزوں کا مقصد تھا کہ علامہ اعظمی نے مفتاح العلوم کو ہمیشہ کیلئے داغ مفارقت دے دیا! مگر واہ رے استقامت کہ نصف صدی تک جس باغ کی اپنے خون جگر سے آبیاری کی، اس سے جدائی برداشت کر لی مگر اپنے نقطۂ نظر سے سمجھوتا کرنا ہرگز گوارا نہ کیا!

مدرسہ سے قطع تعلق کے جو اسباب و محرکات تھے، ان میں سے صرف اہم باتوں کو ہم نے اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے، ورنہ مدرسہ مفتاح العلوم کی اس وقت کی داستان طویل ہے، اور یہ داستان اب پارینہ بن چکی ہے، ان باتوں کا ذکر بھی اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ یہ واقعات آپ کی زندگی میں پیش آنے والے سب سے زیادہ تکلیف دہ، غم انگیز اور روح فرسا واقعات تھے۔ اس حادثہ سے آپ کے دل و دماغ شدید طور پر متاثر ہوئے، کہ = سے مستعفی ہو کر علامہ اعظمی کے ایماء پر مظہر العلوم بنارس گئے، اور پھر علامہ اعظمی نے ہی دارالعلوم دیوبند کے لئے آپ کا نام تجویز کیا، چنانچہ اس وقت آپ دیوبند میں استاذ حدیث ہیں، اور وہاں کے سب سے مؤقر اور تبحر استاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔

علامہ اعظمی مدرسہ مفتاح العلوم کو ترقی کی انتہا پر دیکھنا چاہتے تھے، اسی لئے نہایت خیر خواہی کیساتھ آپ نے اس کی مسند حدیث کے لئے مولانا نعمت اللہ صاحب کا انتخاب فرمایا تھا مگر

وکم من موقف حسن أحیلت ‌ ‌ ‌ محاسنه فعدّ من الذنوب

آپ کا یہ فیصلہ کچھ لوگوں کو ناگوار گذرا، لیکن علامہ اعظمی جوہر شناس تھے، ان کی قیافہ شناسی صلاحیتوں کو چہروں پر پڑھ لیتی تھی، مولانا نعمت اللہ صاحب کی اس وقت علمی حلقوں میں شہرت و مقبولیت اور ان کی علمی عظمت نے علامہ اعظمی کے فیصلہ کی صحت کے لئے وافر ثبوت فراہم کر دیئے ہیں، اور ان کے حسن انتخاب پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

جس چمن کو اپنے خون پسینے سے سینچا، جس کی عمر بھر اپنے لہو سے آبیاری کی جس کی ایک ایک شاخ اور ایک اک پتی کی تراش خراش میں اپنی قوتوں اور توانائیوں کو صرف کیا، جس کی ہوا اور فضا میں آپ کی سانسوں کی مہک اور زمزموں کی گونج تھی، جس کے منبر ومحراب، درودیوار اور ایک ایک اینٹ پر جاہ وجلال اور عظمت وشوکت کے تابندہ نقوش چھوڑے تھے، جس میں نصف صدی تک علم وفن کے جام ومینا لنڈھائے اور کوثر وتسنیم بہائے تھے، تاحیات جس کے دست گرہ کشا، روح رواں اور فکر رسا رہے، اس کو اپنی زندگی ہی میں اپنی آنکھوں سے خزاں رسیدہ ہوتے بھی دیکھا، یہ اوقات آپ پر کس قدر شاق اور کیسے کربناک گذرے ہوں گے اہل نظر کے لئے اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں! آپ کے خلاف جو ماحول بنایا گیا اس سے آپ کا کرب واضطراب اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ غم غلط کرنے اور ذہنی سکون حاصل کرنے کے لئے مئو سے باہر قصبہ بہادرگنج یا کہیں اور چلے جایا کرتے اور وہاں اپنے علمی کام کیا کرتے۔

شیخ الازہر کی آمد پر شوال ۱۳۹۵ھ کی آخری تاریخوں میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ اجلاس بہت شان وشوکت کے ساتھ منعقد ہوا، یہ اجلاس ۲۵/۲۶/۲۷/۲۸ شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۳۱/اکتوبر بروار ۲/۳/نومبر ۱۹۷۵ء کو منعقد ہوا، اجلاس کے انعقاد سے قبل ۲۹/شعبان ۱۳۹۵ھ مطابق ۷/ستمبر ۱۹۷۵ء کو ناظم ندوہ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے علامہ اعظمی کے پاس ایک خط بھیجا جس میں تحریر فرمایا:

"... عربی میں چھپا ہوا پروگرام پہونچا ہوگا، ہماری بڑی خواہش اور ضرورت ہے کہ کسی موضوع پر آپ بھی عربی میں کوئی مقالہ تیار فرمائیں، یہ اجلاس کے لئے بڑے فخر اور زینت کی بات ہوگی، دو تین موضوع ایسے معلوم ہوتے ہیں جن پر قلم اٹھانا شاید طبیعت کے خلاف نہ ہو۔

۱۔ علوم اسلامیہ اس وقت کس حالت میں ہیں رو بہ ترقی یا رو بہ زوال؟ اور اس میں کس طرح نئی روح پھونکی جاسکتی ہے؟

۲۔ ہندوستان میں صوفیائے کرام کی اشاعت اسلام کے میدان میں خدمات، انسانی سیرت کی تعمیر اور اخلاقی تربیت میں ان کا حصہ۔

۳۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان و تلامذہ کی اصلاحی و تجدیدی کوششیں اور ان کے اثرات۔

اس کے علاوہ آپ جس موضوع پر لکھنا پسند فرمائیں، ہمارے لئے فخر و مباہات کی بات ہوگی، افسوس ہے کہ وقت بہت کم رہ گیا ہے، ہماری خواہش تھی کہ عربی مقالہ کا اردو اور انگریزی میں خلاصہ تیار رہے، اور اردو کا انگریزی اور عربی میں، بہر حال ایک درخواست ہے جو آپ کی خدمت میں پیش کردی۔

ع

گر قبول افتد زہے عزوشرف

اگر ایک دو روز پہلے تشریف لے آئیں تو قیمتی مشوروں سے بھی استفادہ کا موقع ملے۔

الحمد للہ والد صاحب کی تلخیص الاخبار جس پر آپ نے از راہ کرم نظر ڈالی تھی، اور مولانا عبدالجبار صاحب نے مقابلہ و تصحیح کی زحمت گوارہ کی تھی۔ المکتب الاسلامی سے "تھذیب الأخلاق" کے نام سے شائع ہو کر آگئی ہے، میری متعدد کتابیں بھی ان مطابع نے شائع کی ہیں، انشاء اللہ تشریف آوری پر پیش کی جائیں گی..."

یہاں یہ ذکر کردینا ضروری ہے کہ علامہ اعظمیؒ ناسازیٔ طبع کے باعث مقالہ تیار نہیں کرسکے تھے، حتی کہ آپ وقت پر اجلاس میں شرکت بھی نہیں فرما سکے تھے، بلکہ آپ وہاں تاخیر سے پہونچے، اور طبیعت کے ہموار نہ ہونے کی وجہ سے سہارے سے چلتے پھرتے تھے۔

اس اجتماع میں ہندوپاک کے علاوہ عالم عرب و عالم اسلام کی عظیم و ممتاز ترین شخصیتوں نے شرکت کی، جن میں سرفہرست فاضل اجل شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمودؒ کا

نام نامی ہے۔ یہ وہی شیخ الازہر ہیں جنھوں نے اس اجتماع کے انعقاد سے ایک سال قبل علامہ اعظمی کو سفر مصر کی دعوت دی تھی ، شیخ الازہر جب ہندوستان تشریف لائے تو مختلف مقامات پر ہفتہ عشرہ سے زائد ان کا قیام رہا ،اس دوران علامہ اعظمی سے بھی ان کی مفصل ملاقات اور طویل رفاقت رہی۔

اجلاس کے اختتام کے بعد شیخ الازہر کے پروگرام میں بعض دوسرے مقامات کی زیارت ودید بھی شامل تھی، جس میں بمبئی اور ڈابھیل کا سفر بھی تھا، لہذا لکھنؤ سے شیخ الازہر ،علامہ اعظمی اور کچھ دیگر فضلاء بذریعہ طیارہ عروس البلاد بمبئی تشریف لے گئے،اور پھر وہاں سے علامہ اعظمی کچھ پہلے اور ان کے بعد ۱۱/ نومبر ۱۹۷۵ء مطابق ۶/ ذی قعدہ ۱۳۹۵ھ کو شیخ الازہر ڈابھیل پہنچے، جامعہ تعلیم الدین میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا، جس کی صدارت علامہ اعظمی نے فرمائی، اس میں شیخ الازہر کو بطور اعزاز دستار فضیلت پیش کی گئی، شیخ الازہر کے سر پر اس دستار کو باندھنے کا شرف بھی علامہ اعظمی کو حاصل ہوا۔

شیخ الازہر نے اس موقع پر عربی زبان میں ایک تقریر بھی فرمائی، اردو میں جس کی ترجمانی علامہ اعظمی نے فرمائی، "تاریخ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل" میں مذکور ہے:

> "دنیا کی سب سے قدیم اور بڑی اسلامی یونیورسٹی "جامعہ ازہر مصر" کے شیخ ڈاکٹر عبدالحلیم محمود صاحب ۱۱/ نومبر ۱۹۷۵ء ۶/ ذی قعدہ ۱۳۹۵ھ کو جامعہ میں رونق افروز ہوئے ،اس موقع پر ہندوستان اور گجرات کے دیگر اکابر علماء بھی تشریف فرما ہوئے، عوام کا ایک بہت بڑا مجمع اکٹھا تھا، مقامی علماء کے علاوہ محدث جلیل علامہ کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ اور فدائے ملت حضرت مولانا اسعد مدنی مدظلہ اور جنرل شاہنواز صاحب خاص طور سے قابل ذکر ہیں، جلسۂ عام کی صدارت مولانا اعظمی صاحب نے فرمائی ... جامعہ کی طرف سے شیخ الازہر کو اعزازی عمامہ دیا گیا۔ اس " عمامة الفضيلة والتكريم " کو شیخ الازہر کے سر پر ہندوستان بلکہ دنیا کے مسلّم ماہر حدیث مولانا

حبیب الرحمٰن مدظلہ نے باندھا، جس کو شیخ الازہر نے بخوشی قبول فرمایا۔۔۔ جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ کے پروگرام کے بعد شیخ الازہر نے عربی زبان میں تقریر کی جس کی ترجمانی شیخ المشائخ حضرت مولانا اعظمی نے کی۔۔۔۔(۱)

کتنا عجیب وغریب وپر کیف اور روح پرور منظر رہا ہوگا! وقت کی دو عظیم ترین اور مقدس شخصیتوں کا اجتماع ہے، ایک طرف شیخ الازہر دوسری طرف شیخ العرب والعجم، ایک مملکت علم کا تاجدار، دوسرا علم کے تاج کا جوہر آبدار، ایک کا دست ناز ہے اور دوسرے کا سر نیاز، دست بھی مبارک! دستار بھی مبارک! سر بھی مبارک!!!

اس تقریب میں شیخ الازہر کے علاوہ مصر کے وزیر اوقاف شیخ محمد حسین ذھبی بھی تھے، وزیر موصوف نے تقریر کرتے ہوئے علامہ اعظمی کے بارے میں فرمایا کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے محدث ہیں، تو شیخ الازہر نے درمیان میں ٹوکا کہ عالم اسلام کے سب سے بڑے عالم ہیں ع: قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

ان تمام واقعات کے مولانا ابوبکر غازیپوری عینی شاہد تھے، میں نے ان سے اس تقریب کی تفصیلات دریافت کی تو انھوں نے از راہ کرم پوری داستان تحریر فرمادی جو ان ہی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

"جامعہ ازہر کی تاریخ میں ڈاکٹر عبدالحلیم محمود جیسا شیخ الازہر بہت دنوں کے بعد ہمیں نظر آتا ہے۔ شکل وصورت، علم وتقویٰ، نگہ کی بلندی میں ڈاکٹر عبدالحلیم محمود منفرد شخصیت کے مالک تھے، تواضع وانکساری میں علماء ہند کے مثنیٰ نظر آتے تھے، غالباً انھیں خصوصیات کی وجہ سے محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کا ان سے خاص ربط وتعلق تھا، اور شیخ الازہر بھی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی قدر کرتے تھے، مولانا کی علمی بلندی کا بہت کشادہ دلی کے ساتھ اعتراف کرتے تھے، شیخ الازہر کے منصب جلیل پر

(۱) تاریخ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل ص ۱۸۳

ہوتے ہوئے حضرت مولانا کے سامنے بہت متواضع انداز میں بیٹھتے اور گفتگو کرتے تھے، اس کا مشاہدہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے اس وقت کیا جب وہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لائے۔

۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ اپنا پچاسی سالہ جشن منارہا تھا، جس میں شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود بھی شریک ہوئے تھے، حضرت مولانا اسعد مدنی کے توسط سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل نے بھی شیخ الازہر کو اس موقع سے اپنے یہاں مدعو کیا، شیخ الازہر کو یہ اطلاع کی گئی تھی کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی بھی اس موقع پر تشریف لائیں گے، غالباً یہی چیز ان کے لئے اس کا باعث بن گئی کہ انھوں نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی دعوت کو بلاتردد اور بڑی خوشی سے قبول کرلیا، حالانکہ اس قسم کے سرکاری پوسٹ کے آدمی کا پروگرام بڑا بندھا اور نپا تلا ہوتا ہے، مگر شیخ الازہر نے حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا نام سن کر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل حاضر ہونے کی دعوت قبول فرمالی اور ۶/ ذی قعدہ ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۱/ نومبر ۱۹۷۵ء براہ بمبئی جامعہ تشریف لائے، مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ دوروز قبل ہی آپ کی پیشوائی کے لئے ڈابھیل تشریف لاچکے تھے۔

شیخ الازہر کی آمد پر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں ایک یادگار اور تاریخی اجلاس کا انعقاد ہوا تھا، جس کی صدارت حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے تھے، ہندوستان کی متعدد سرکاری و غیر سرکاری شخصیتیں موجود تھیں، آدمیوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ڈابھیل کی سرزمین پر امڈا ہوا تھا، شیخ الازہر کی تقریر کا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے خود ہی ترجمہ کیا اور دلچسپ بات اس ترجمہ کی یہ تھی کہ جب شیخ الازہر نے بعض عرب علماء کا تذکرہ کیا تو حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ان علماء کی مزید

خصوصیات سے بھی سامعین کو محظوظ کیا، جب علامہ زبیدی (۱) کا تذکرہ آیا تو شیخ الازہر کو یہ معلوم نہیں تھا کہ علامہ زبیدی ہندی الاصل ہیں، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے اس موقع سے عربی زبان میں دوران ترجمہ علامہ زبیدی کا مفصل تعارف کیا، اور جب یہ بتلایا کہ یہ اصلاً ہندی تھے تو شیخ الازہر اور ان کے رفقاء کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی، اور مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے اس تعارف پر انھوں نے بطور خاص تشکر کا اظہار کیا، اس موقع سے ہم نے یہ بھی معلوم کیا کہ حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ جس طرح فصیح عربی لکھنے پر بلا تکلف قادر تھے، اسی طرح بلا تکلف عربی زبان میں آپ تقریر بھی کر سکتے تھے۔

---

(۱) آپ کا نام مرتضیٰ بن محمد بن قادری بن ضیاء اللہ حسینی واسطی بلگرامی ہے، ۱۱۴۵ھ م ۱۷۳۲ء میں بلگرام میں ولادت ہوئی، بلگرام کے علاوہ سندیلہ، سورت اور دہلی وغیرہ میں علم کی تحصیل کی ۱۱۵۸ھ میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے ہاتھوں پر بیعت ہو کر نقشبندی سلسلے میں داخل ہوئے، پھر ۱۱۶۰ھ میں شیخ سید یٰسین عباسی نزیل اکبر آباد کے ہاتھوں پر سلسلہ چشتیہ سے بھی شرفیاب ہوئے، ۱۱۶۳ھ کے قریب جب کہ آپ کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی، رخت سفر باندھا اور حجاز جاوارد ہوئے، اور زیارت حرمین کے علاوہ وہاں کے علماء سے اکتساب فیض بھی کیا، دو سال بعد وہاں سے رخصت ہو کر یمن کے مشہور شہر زبید پہونچے، اور ایک مدت تک وہاں مقیم رہے، جس کی وجہ سے زبیدی کی نسبت سے معروف ہوئے، ایک عرصہ کے بعد وہاں سے سفر کیا اور مصر پہونچ کر سکونت اختیار کی اور وہیں ۱۲۰۵ھ م ۱۷۹۰ء میں طاعون کی بیماری میں وفات پائی۔

علامہ بلگرامی ایک بلند پایہ ادیب، لغت کے نکتہ داں و رمز شناس، علم حدیث کے ماہر اور انساب و اسماء الرجال کے زبردست عالم تھے، متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں جو کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں، تصنیفات میں "تاج العروس" امام غزالی کی "احیاء العلوم" کی شرح "اتحاف السادۃ المتقین" اور "عقود الجواہر المنیفۃ فی ادلۃ مذہب الامام أبی حنیفۃ" کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔

دوران تقریر شیخ الازہر اس بات کا بار بار خوشی سے اظہار بھی کر رہے تھے، کہ ان کی ترجمانی ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کا زبردست محدث اور عالم کر رہا ہے۔

شیخ الازہر کی تقریر سے پہلے مصر کے وزیر الاوقاف (شیخ محمد حسین ذھبی) نے تقریر کی تھی، انھوں نے دوران تقریر حضرت مولانا اعظمی رحمۃ اللہ کی طرف اشارہ کر کے یہ کہا، کہ یہ ہندوستان کے سب سے بڑے محدث ہیں جن سے ملنے کی ہمیں آج سعادت نصیب ہوئی ہے، اس پر شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے ان کو ٹوکتے ہوئے کہا کہ بل إنه اکبر علماء العالم الاسلامی (نہیں بلکہ وہ عالم اسلام کے سب سے بڑے عالم ہیں)۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل نے اس موقع پر شیخ الازہر کو عمامة الفضیلة والتکریم دینے کا فیصلہ کیا تھا، جب یہ عمامہ حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے سر پر اپنے ہاتھ سے باندھا، تو شیخ الازہر نے فرط مسرت و عقیدت سے حضرت مولانا کا ہاتھ چوم لیا، اور جب تک آپ کا ڈابھیل میں قیام رہا یہ عمامہ آپ کے سر پر رہا، اور ہمارے دوستوں نے بتلایا کہ جب وہ بمبئی تشریف لے گئے تو اس وقت بھی عمامہ آپ کے سر پر رہا۔

شیخ الازہر عبدالحلیم محمود کا قیام تقریبا ایک دن ڈابھیل میں رہا۔ ان کا زیادہ وقت پروگرام کے علاوہ حضرت اعظمیؒ کے ساتھ گذرتا تھا، ہم لوگ دیکھ رہے تھے کہ مصر کی سب سے عظیم جامعہ کا سب سے عظیم منصب پر فائز آدمی ہندوستان کے ایک بوریہ نشیں کے سامنے کتنی عقیدت و محبت سے بیٹھا ہوا علمی استفادہ کر رہا ہے اور تواضع وادب کا اظہار اس سے اس طرح ہو رہا ہے جیسے کسی بڑے عالم کے سامنے کوئی تلمیذ ہو۔""

☆☆☆

تلخیص خواتم جامع الاصول یہ بھی علامہ محمد طاہر پٹنی کی علمی کاوش کا نتیجہ ہے، جامع الاصول حدیث کی ایک مشہور و مستند کتاب ہے، اس کے خاتمہ (اخیر) میں حدیث کی چھ مشہور درسی کتابوں (صحاح ستہ) کے راویوں کا مختصر تعارف کیا گیا ہے، علامہ شیخ محمد طاہر نے اسی کا خلاصہ بیان کیا ہے۔

علامہ اعظمی نے اس کا قلمی نسخہ رام پور اور ندوہ کے کتب خانے سے برآمد کیا، اور بانکی پور سے اس کا فوٹو حاصل کر کے ایڈٹ کیا، ۱۳۹۵ھ میں پٹن کے ایک علم دوست اور مخیر تاجر عبدالغنی نورولی کے نفقہ پر مالیگاؤں سے شائع ہوئی۔

علامہ اعظمی پر دل کا دورہ اور طویل علالت اپنے عزیز ادارہ سے جدائی کوئی معمولی صدمہ نہیں تھا، علامہ اعظمی نے زندگی میں بہت سے مصائب و آلام جھیلے تھے، کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نزدیک جو جتنا زیادہ مقرب ہوتا ہے اس کی آزمائش بھی اتنی ہی سخت ہوتی ہے، انھوں نے بھی اپنی زندگی میں بہت ہی آزمائشوں کا سامنا کیا تھا، لیکن اسی کے ساتھ اللہ جل شانہ نے صبر و تحمل اور ضبط و برداشت کی بے پناہ قوت عطا فرمائی تھی، سخت ترین حالات سے دوچار ہونے کے باوجود کبھی آپ کے حوصلوں میں پستی، ارادوں میں ضعف، عزائم میں اضمحلال اور پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی، لیکن مفتاح العلوم کے پیش آمدہ واقعات، وہاں کی صورت حال اور اس سے مفارقت یہ ایسا غم تھا جو ناقابل برداشت تھا، بلکہ صرف ایک جدائی ہی کا صدمہ ہوتا تو جس طرح بہت سارے مصائب جھیلے تھے اسی طرح ایک دکھ اور سہا جا سکتا تھا، مگر ستم ظریفی یہ کہ کچھ سیاسی شعبدہ باز اور ان کے ایسے ہم نواؤں نے، تملق پسندی جن کا شعار اور کاسہ لیسی جن کی شریعت ہے۔ اس عظیم انسان کے خلاف ایسی ایسی الزام تراشیاں اور افترا پردازیاں کیں کہ الاماں والحفیظ! اور اسی پر بس نہیں بلکہ کچھ دریدہ ذہنوں نے تو ہرزہ سرائی اور یاوہ گوئی تک سے دریغ نہیں کیا۔ آخر یہ صدمہ اپنی انتہائی بھیانک اور خطرناک صورت میں اس وقت ظاہر ہوا جب ۲۰/ مئی ۱۹۷۶ء مطابق ۲۱ یا ۲۲/ جمادی الاولی

۱۳۹٦ھ کو نہایت زبردست اور جان لیوا قسم کا قلب کا دورہ پڑا، اپنے ایک عرب نیاز مند کو لکھتے ہیں:

"وإني مريض على الفراش، وقد كانت أصابتني نوبة قلبية في ٢٠ مايو، وكانت شديدة. لكن الله تعالى قد من عليّ بالشفاء"

(میں اس وقت صاحب فراش ہوں، ۲۰ر مئی کو مجھے دل کا شدید دورہ پڑا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے شفا بخشی)

اس عارضہ کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مہینوں تک اس کے اثرات زائل نہیں ہوئے، چنانچہ اس حادثے کے ایک مہینے بعد ۲۱ر جون ۱۹۷٦ء کو شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمودؒ کو لکھتے ہیں:

"... فإني لا أزال أعاتب نفسي على عدم الاتصال بكم منذ فارقتكم في ڈابھیل، وذلك لانصرافي بالكلية الى إكمال بعض ما تركته نا قصا من تحقيق زوائد مسند البزار و غير ذلك، وإعادة النظر في بعض المسودات وابتلائي في اثناء ذلك بمختلف الأسقام حتى كانت آخر حملة للمرض في ٢٠ر مايو حيث أصبت بنوبة قلبية شديدة الخطر، لكن الله سبحانه تداركني بلطفه، وأنعم عليَّ بالشفاء العاجل، فصرت أصلي قاعدا بعد شهر ..."

(میں خود کو برابر اس بات پر ملامت کر رہا ہوں کہ ڈابھیل میں آنجناب سے جدا ہونے کے بعد آپ سے کوئی رابطہ نہیں قائم کر سکا، اور یہ زوائد مسند بزار وغیرہ کے بعض حصوں کی تحقیق کو جو ناقص چھوڑ دیا تھا ان کی تکمیل، کچھ مسودات پر نظر ثانی اور مختلف بیماریوں میں مبتلا رہنے کی وجہ سے تھا، یہانتک کہ بیماری کا آخری حملہ ۲۰ر مئی کو ہوا جبکہ میرے اوپر دل کا نہایت خطرناک دورہ پڑا، لیکن اللہ پاک نے لطف و کرم کا معاملہ فرمایا، اور جلد شفا عطا

فرمائی، لہذا ایک ماہ بعد اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ بیٹھ کر نماز پڑھ سکوں۔۔۔)

علامہ اعظمی پر طاری ہونے والے یہ لحات متعلقین کے لئے بھی قیامت سے کم نہیں تھے، ہر آدمی حواس باختہ اور از خود رفتہ، ہر چہرہ حیران و پریشان اور ہر شخص متفکر کہ نہ جانے تقدیر الٰہی سے کیا فیصلہ ہو، لیکن خدا کا کرم ہوا کہ کئی روز کی شدید ترین علالت کے بعد قدرے افاقہ ہوا اور مرض کی شدت میں کچھ کمی آئی، اسی اثناء میں ایک اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک دن قلم کاغذ طلب فرمایا، سب نے یہ سمجھا کہ شاید اب زندگی کے آخری لحات ہوں اور بطور وصیت کچھ کلمات ارشاد فرمائیں، بڑے صاحبزادے مولانا رشید احمد صاحب اعظمی قرطاس و قلم لے کر حاضر خدمت ہوئے، لیکن آپ کی زبان فیض ترجمان سے جو کچھ نکلا، عشق رسول اور حب نبی کا واضح اور سچا ثبوت تھا، آپ نے موت وزیست کی اس کشمکش میں جو املا فرمایا وہ ایک نعت نبیؐ تھی، جس کے ابتدائی دو اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں:

میں والہ و شیدا ہوں نبی عربیؐ کا مکی، مدنی، ہاشمی و مطلبی کا
ایماں ہے مرا زمزمہ خواں صدر خلافت صدیق، عمر، حضرت عثمان و علی کا

یہ پوری نعت علم و حکمت کے نور سے بھرپور ہے، اور جس حالت میں اس کو املا کرایا ہے اس حالت میں اس مضمون کا ذہن میں آنا اس مقرب بارگاہ خداوندی کی کھلی کرامت ہے۔ پوری نعت شاعری کے باب میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

اعیان الحجاج ۱۳۹۶ھ مطابق ۱۹۷۶ء میں "اعیان الحجاج" کا دوسرا حصہ اسرار کریمی پریس (الہ آباد) سے چھپ کر مکتبۂ اعظمی (مئو) سے شائع ہوا، اس میں آپ نے تابعین سے لے کر اپنے اساتذہ تک کے واقعات حج کا تذکرہ کیا ہے، یہ وہ ایمان افروز واقعات ہیں جن کو پڑھنے سے دل کے اندر حج و زیارت کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔

xxxxx

سفر شام علامہ اعظمی اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں:

"۱۳۹۸ھ ۲۵؍ ستمبر ۱۹۷۸ء کو دہلی سے دمشق کے لئے سیرین ایر لائن کے جہاز سے سفر کیا، ابوظبی میں ۳۔ گھنٹے جہاز رکا رہا، پھر ۱۵۔ منٹ دبئی میں، دہلی سے ۴۔ بجے آخر شب میں روانگی ہوئی، اور دمشق میں ۱۲۔ بجے وہاں کے ٹائم سے پہونچے، دمشق میں ۲۔ دن قیام کے بعد حلب روانہ ہوا..."

اس سفر کی نوعیت بیروت کے سفر سے مختلف تھی، اس میں آپ کے اوپر کام کا وہ بوجھ نہیں تھا، جو بیروت کے پورے سفر کا لازمہ تھا، یہ سفر شامی ارباب علم و فضل اور عقید تمندوں کی دعوت و اصرار پر محض دید وزیارت، ترویح نفس اور تسکین خاطر کے لئے تھا، علامہ اعظمی کو اللہ نے عجیب وغریب مقبولیت عطا فرمائی تھی کہ ان کے محبین و مخلصین نہ صرف برصغیر اور عالم عرب، بلکہ تمام عالم اسلامی، بلکہ پوری دنیا میں پائے جاتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان سے جس قدر محبت و مودت شامیوں کو تھی کسی اور جگہ کے لوگوں کو نہ رہی ہوگی، شام کے تقریبا تمام نامور اصحاب فضل و کمال آپ کے معترف و مداح تھے، ان میں سے کئی ایک ایسے ہیں جن کی محبت، گرویدگی کی حد تک تھی، انھیں میں ایک شیخ عبدالوہاب زاہد ہندی حلبی بھی ہیں، جنھوں نے آپ کو حلب آنے کی دعوت دی، علامہ اعظمی اپنے ایک خط میں شیخ نذیر حسین صاحب لاہور کو لکھتے ہیں:

"حلب سے میرے ایک شاگرد عبدالوہاب زاہد ہندی کئی سال سے حلب بلا رہے تھے، میری روانگی سے اڑھائی سال پہلے ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی بھیج دیا تھا، مگر جس وقت ٹکٹ آیا تھا، عین اسی وقت مجھے ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا، صحتیاب ہونے کے بعد یہ سفر زیادہ تر احتیاط کے پیش نظر ٹلتا رہا، میں ستمبر میں جمعیۃ العلماء کی ورکنگ کمیٹی میں شرکت کے لئے دہلی گیا ہوا تھا تو جی میں آیا کہ لاؤ ویزا حاصل کرنے کی دوبارہ کوشش کروں، اس لئے کہ ایک بار ویزا کی میعاد گذر چکی تھی، بہر حال مہربانوں نے بہت دوڑ دھوپ کی تو ویزا مل گیا،

جس دن ویزا ملا اسی دن سیرین ایرلائنز کے ہوائی جہاز کی روانگی بھی تھی، کوشش کرتے کراتے کسی طرح جگہ مل گئی اور میں دفعتاً بلا اطلاع دمشق کے لئے روانہ ہو گیا، سفر کا مقصد میری طرف سے "لقاءات علمیہ" اور چند مخطوطات کی جستجو اور اگر امکان ہو تو ان کو حاصل کرنے کی کوشش کے سوا اور کوئی چیز نہیں تھی، ویسے جانے پر حلب کے علاوہ دمشق، حمص اور حما کے بکثرت علماء نے حدیث کی سند اور اجازت حاصل کیا، دو تین مجلسوں میں مختصر خطاب کی بھی نوبت آئی، زیادہ تر مشغولیت کتب خانہ احمدیہ میں رہی، چند عالموں نے اپنے مؤلفات سنا کر یاد کھا کر تصحیح و تصویب بھی کرائی۔"(۱)

شام میں آپ کی موجودگی وہاں کے اہل علم کے لئے ایک بڑی نعمت تھی، جن شامی فضلاء نے آپ سے کسب فیض کیا اور سند و اجازت حاصل کی ان کی ایک طویل فہرست ہے، اس سفر میں شام کے مختلف شہروں اور تاریخی مقامات کا مشاہدہ کیا، لیکن بیشتر مدت علم و فن کے مشہور مرکز حلب میں گذری، جو فتوحات اسلامیہ کے عہد سے لے کر عصر حاضر تک لاتعداد اجلۂ اہل علم کا مولد و مسکن رہا ہے، اور جو موجودہ دور کے مشہور و نامور عالم و محدث علامہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کی جائے ولادت بھی ہے۔

شیخ عبدالوہاب زاہد کا قیام حلب کی جامع البختی میں تھا، علامہ اعظمی جب وہاں پہنچے ہیں تو وہ موجود نہیں تھے، اپنی قیامگاہ پہنچ کر جب علامہ اعظمی کو دیکھا ہے تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، انھوں نے (شیخ عبدالوہاب نے) اپنی ایک یادداشت میں لکھا ہے:

" وصلنا حلب مع أذان العصر و دخلنا جامع البختي فإذا بالحبيب المنتظر داخل غرفتي المتواضعة التي يحيط جدرانها

(۱) معارف اگست ۱۹۹۲ء ص ۱۴۹-۱۴۸

الكتب الخاصة بى، فأقبلت اليه معانقاً وقبلت يده ، ثم عانقه الشيخ محمد عوامه و قبل يده ثم عانقه الحاج محمود صيفجي وقبل يده ثم تحدثنا قليلا وصلينا العصر بجماعة بإمامة الشيخ حبيب الرحمن ، حيث صلى ركعتين صلاة قصر للمسافر و أتممنا صلاتنا ، ثم عدنا الى الغرفة ويظهر على اليشخ التعب والنصب ، و أحضرت طعام الغداء و تناولنا جميعا بفضل الله ،و تم الاتفاق على أن ياخذ الشيخ راحته هذااليوم من وعثاء السفر . "

(ہم عصر کی اذان کے ساتھ ساتھ حلب پہنچے اور جامع بختی میں داخل ہوئے، اچانک ہم دیکھتے کیا ہیں کہ وہ محبوب (علامہ اعظمی) جن کا ہمیں انتظار تھا، میرے اس معمولی کمرے میں تشریف فرما ہیں، جس کی دیواروں کا میری ذاتی کتابیں احاطہ کئے ہوئے ہیں، میں نے ان کی طرف بڑھ کر معانقہ کیا اور دست بوسی کی، پھر شیخ محمدعوامہ اور ان کے بعد الحاج محمود صیفجی نے ان سے معانقہ کیا اور ان کے ہاتھ چومے، پھر تھوڑی دیر ہم نے گفتگو کی اور شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی کی امامت میں عصر کی نماز باجماعت پڑھی انھوں نے قصر کیا اور دو رکعت پڑھی اور ہم نے اپنی نماز پوری کی، پھر ہم کمرے میں گئے، شیخ پر تکان کے آثار نمایاں تھے، میں نے دوپہر کا کھانا حاضر کیا اور خدا کے فضل سے ہم سب نے ساتھ بیٹھ کر کھایا، پھر اس بات پر اتفاق ہوا کہ شیخ آج کے دن آرام کر کے سفر کی تھکان دور کریں۔)

"آپ حلب پہنچے تو جمعرات کا دن تھا، اگلے روز جمعہ تھا، ا ن کی بابت شیخ عبدالوہاب لکھتے ہیں:

"استيقظنا قبيل الفجر . ثم صلينا صلاة الفجر ، و جلسنا بخدمة الشيخ حبيب الرحمن الأعظمی حفظه الله ، ثم جاء فضيلة

الاستاذ محمد عوامه الساعة العاشرة مع الدكتور ابوالفتح بيانونى وتشاورنا معاً على صلاة الجمعة وفى أى مسجد تكون ، وقالوا لو كانت الصلاة فى جامع الروضة عند فضيلة الشيخ طاهر خير الله ، وحضر عددمن الناس يسلمون على فضيلة الشيخ ، و بعد ذلك جهز الشيخ نفسه للذهاب الى صلاة الجمعة وانطلقنا بسيارة الأخ الحاج محمود صيفجى إلى جامع الروضة . و تم التعارف بين الشيخ حبيب الرحمن والشيخ طاهر قبيل الصلاة ، وأذن الموذن أذان الجمعة ، و صعد الشيخ طاهر و خطب بنا الجمعة . . . و بعد انتهاء الخطبة والصلاة قام الشيخ طاهر و عرّف الناس بالمحدث الكبيروالضيف الكريم فريد عصره ، ثم طلب منه أن يدعو الله لنا وللحاضرين فى هذا الجامع الممتلئ بالمصلين ، فقام فضيلته و شكر الناس على حفاوتهم به ، ثم دعا الله دعوة ذرفت منها العيون وخشعت لها القلوب ."

(فجر سے کچھ پہلے ہم بیدار ہوئے ، پھر فجر کی نماز پڑھی اور شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی حفظہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، دس بجے ڈاکٹر ابوالفتح بیانونی کے ہمراہ شیخ محمد عوامہ آگئے، ہم نے جمعہ کی نماز کی نسبت مشورہ کیا کہ کس مسجد میں پڑھی جائے، رائے یہ ہوئی کہ شیخ طاہر خیر اللہ کے پیچھے روضہ کی جامع مسجد میں نماز ادا کی جائے اور لوگ حضرت مولانا سے سلام بھی کرلیں، اس کے بعد شیخ نے خود کو نماز جمعہ کے لئے تیار کیا اور ہم لوگ الحاج محمود صیفجی کی کار سے جامع مسجد پہنچے، نماز سے کچھ پہلے شیخ حبیب الرحمٰن اور شیخ طاہر کے مابین تعارف ہوا، موذن نے اذان دی اور شیخ طاہر نے منبر پر چڑھ کر خطبہ دیا، خطبہ اور نماز کے ختم ہونے پر شیخ طاہر کھڑے ہوئے اور لوگوں سے محدث کبیر، مہمان مکرم

اور یکتائے روزگار شخصیت کا تعارف کرایا، پھر ان سے درخواست کی کہ نمازیوں سے بھری ہوئی اس جامع مسجد کے اندر ہمارے اور حاضرین کے لئے اللہ سے دعا فرمائیں، تو حضرت کھڑے ہوئے اور لوگوں کی عزت افزائی کا شکریہ ادا کیا، پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی جس سے آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور دلوں پر خشوع طاری ہو گیا)

شام میں آپ کی مدت قیام سوا مہینہ رہی، اس عرصے میں بہت سے اہل علم اور اصحاب کمال نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور اپنے اپنے طور پر فائدہ اٹھایا، ان ہی میں محقق فاضل شیخ محمد عوامہ مدظلہ ہیں، موصوف اس وقت حلب کے مدرسۃ التعلیم الشرعی میں استاذ تھے، وہ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ علیہ الرحمۃ کے شاگرد ہیں، اور اپنے استاذ ہی کی طرح علامہ اعظمی کے شیفتہ و وارفتہ، ممکن ہے علامہ اعظمی کی عقیدت و محبت کا سبق بھی اپنے انھیں استاذ کی درسگاہ میں پڑھا ہو، جب علامہ اعظمی حلب پہونچے تو اس موقع کو غنیمت کبریٰ سمجھا اور اپنی تصنیف " أثر الحديث فی اختلاف الفقهاء والمحدثين "جو پریس میں جانے کو تیار تھی، لیکر حاضر خدمت ہوئے، اور اس کو آپ کے پاس سبقاً سبقاً پڑھا، چنانچہ اس کے صفحہ ۱۴ پر لکھتے ہیں:

"وفی يوم الخميس السادس والعشرين من شوال للعام المذكور قدم بلدتنا حلب فضيلة العلامة الكبير، المحدث البارع النبيل مولانا الشيخ حبيب الرحمن الأعظمی، من كبار علماء الهند، حفظه الله تعالىٰ بخير و عافية ، فسررت أنی لم اكن قدّمت الرسالة الى المطبعة ، فقرأتها كلها على سماحته . . ."

(سال مذکور (۱۳۹۸ھ) میں ۲۶؍ شوال بروز جمعرات ہمارے شہر حلب میں فضیلت مآب علامہ کبیر، محدث ماہر و نبیل مولانا شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی حفظہ اللہ جو ہندوستان کے کبار علماء میں سے ہیں، تشریف لائے، میں

بہت خوش ہوا کہ کتاب ابھی پریس کے حوالے نہیں کی تھی، اس وقت میں نے آپ کی جناب میں پوری کتاب پڑھی....)

اوپر ہم لکھ چکے ہیں کہ حلب شیخ ابو غدہ کا وطن اور جائے پیدائش تھی، شیخ ابو غدہ کو علامہ اعظمی سے محبت و گرویدگی ناقابل بیان حد تک تھی، وہ عالم عرب میں علامہ اعظمی کے بہت بڑے معترف اور مداح تھے، علامہ اعظمی کے حلب پہنچنے پر شیخ ابو غدہ کی فرحت و مسرت کی انتہا نہ رہی ہوگی، ۲۵/ ذی قعدہ ۱۳۹۸ھ کو حلب ہی میں انھوں نے علامہ اعظمی کو ایک کتاب ہدیہ کی، کتاب کی پیشانی پر ہدیہ کی جو عبارت تحریر فرمائی اس سے آپ کی خوشی صاف چھلکی پڑتی ہے، وہ عبارت ہے:

" هدية متواضعة مقدمة الى شيخنا العلامة المحدث الناقد الضليع مولانا الشيخ حبيب الرحمن الاعظمي تذكاراً لتشريفه بالزيارة بلاد الشام و تكريمه مدينة حلب بمقامه فيها ، أمتع الله به و أكرم المسلمين بطول حياته النافعة و آثاره الماتعة . آمين ، من محبه عبدالفتاح ابو غده . "

(اپنے شیخ علامہ محدث، ناقد ماہر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی خدمت میں ایک حقیر ہدیہ، ملک شام کو اپنی تشریف آوری سے مشرف فرمانے اور حلب کو اپنے قیام سے عزت بخشنے کی یادگار کے طور پر، اللہ تعالیٰ ان سے فائدہ پہنچائیں، اور ان کی نفع بخش زندگی اور مفید کارناموں کی درازی سے مسلمانوں کو مشرف فرمائیں، آمین۔ ان سے محبت کرنے والے عبدالفتاح ابو غدہ کی طرف سے)

اس سفر میں علامہ اعظمی نے حلب کے علاوہ شام کے کئی ایک مشہور مقامات و زیارت گاہوں کی زیارت فرمائی، اور بہت سے صحابہ کرام اور صلحائے امت کی قبروں پر فاتحہ خوانی بھی کی، ایک کاغذ پر خود ان کی تحریر ہے:

"زرت في يوم الجمعة ۲/ ذی الحجة سنة ۱۳۹۸ھ في دمشق إلفيحاء ، قبر سيدنا بلال الحبشي رضی الله عنه، وقبر سيدنا عبدالله بن جعفر في مقبرة الباب الصغير ، ثم قبرالشيخ المحدث بدرا لدين الحسنی ، وقبر ولده تاج الدين، وقبر الشيخ ابراهيم الغلاييني، وقبر الشيخ مصطفی السباعی ، والشيخ عبدالكريم الرفاعي في نفس المقبرة، رحمهم الله تعالیٰ ثم مدفن الصحابي أبي بن كعب رضي الله عنه في الباب الشرقي ، ثم مدفن سيدنا دحية الكلبي في المزة ، ومدفن سعد بن أبي وقاص في المزة، ثم زرت في الصالحية أوحى الشيخ محی الدين بن عربی قبره ، في قبو بجوار جامع باسمه، و لقد زرت قبله بيومين بحمص مقام سيدنا خالد بن الوليد في جامع ضخم بناه السلطان الزاهد بيبرس في المائة السابعة

وقد سافرت قبل هذا من حلب الیٰ اللاذقية ،و من اللاذقية الی جبلة ، وزرت مقام سيدنا ابراهيم بن ادهم في الناحية الشرقية من الجامع ."

(۲/ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ کو جمعہ کے دن میں نے دمشق میں باب صغیر کے قبرستان میں سیدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کی قبروں کی زیارت کی، پھر اسی قبرستان میں شیخ بدرالدین حسنی محدث، ان کے فرزند شیخ تاج الدین، شیخ ابراہیم غلایینی ، شیخ مصطفیٰ سباعی اور شیخ عبدالکریم رفاعی رحمہم اللہ کی قبروں کی زیارت کی، پھر باب شرقی کے قبرستان میں صحابی رسول ابی بن کعبؓ اور مزہ میں سیدنا دحیہ کلبی اور حضرت سعد بن ابی وقاص(رضی اللہ عنہم)کی قبروں کی زیارت کی ، اس کے بعد صالحیہ

یا شیخ محی الدین بن عربی کے محلہ میں ان کی قبر کی زیارت کی، جو ان کے نام سے موسوم ایک جامع مسجد کے بغل میں ایک قبہ کے اندر واقع ہے ، اور اس سے دو دن پہلے میں حمص میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مقام کی زیارت ایک عظیم الشان جامع مسجد میں کر چکا تھا، جس کو پرہیز گار بادشاہ سلطان بیبرس نے ساتویں صدی ہجری میں بنوایا تھا۔

اور اس سے بھی پہلے میں نے حلب سے لاذقیہ اور لاذقیہ سے جبلہ تک کا سفر کیا تھا اور وہاں جامع مسجد کے مشرقی حصہ میں حضرت ابراہیم بن ادہم کی قبر کی زیارت کی تھی) .

ایک دوسرے کاغذ پر لکھا ہے :

"عبدالستار وزیر اوقاف شام سے ملاقات ہوئی۔

بذریعہ کار لاذقیہ گیا، وہاں سے بس پکڑی اور جبلہ گیا، ابراہیم ادہم کے مزار کی زیارت کی، بحر ابیض کے کنارے بیٹھ کر کھانا کھایا، پھر بس سے لاذقیہ اور لاذقیہ سے دوسری بس پر حلب آیا۔

جامع اموی (حلب) کے مغرب اور جنوب میں جو قدیم مدارس واقع ہیں ان کو دیکھا۔"

اس سفر میں حلب ودمشق میں جن لوگوں سے آپ کی ملاقات ہوئی اور جن میں سے اکثر نے آپ سے اجازت وسند حاصل کی، ان کی خاصی تعداد ہے، مثلاً: شیخ عبداللہ ناصح علوان، شیخ محمد عوامہ، شیخ ابوالفتح بیانونی، شیخ عبدالوہاب زاہد ہندی، شیخ طاہر خیر اللہ، شیخ محمد علی ادلبی، شیخ ساریہ عبدالکریم رفاعی اور ان کے برادران اسامہ اور عبداللہ رفاعی، شیخ جمال سیروان، شیخ وہبی سلیمان، شیخ نورالدین عتر، شیخ عبدالرؤف ابوطوق دمشقی اور ان کے علاوہ بہت سے دیگر فضلانے بھی حدیث کی اجازت لی ۔

دمشق میں شیخ محمد ابوالیسر عابدین(۱) ایک بڑے عالم و فاضل شخص تھے ،

(۱) شیخ ابوالیسر عابدین مفتی شام ابوالخیر عابدین کے بیٹے تھے ، اپنے والد کی طرح یہ بھی شام کے مفتی ہوئے ، اس کے علاوہ ڈاکٹر بھی تھے ، اور دمشق کے کلیۃ الحقوق (Law College) میں استاذ بھی ، وہیں عربی زبان کے صاحب طرز ادیب شیخ علی طنطاوی ان کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوئے ، علی طنطاوی نے اپنے ان استاد کا اپنی کتاب "ذکریات" میں کئی جگہ ذکر کیا ہے ، مثلاً حصہ اول میں صفحہ ۴۰ پر ان کا تذکرہ ضمناً کیا ہے ، پھر (۱۶۶/۲) پر کلیۃ الحقوق کے اپنے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: " وطائفة من العلماء منهم واحد كان مفتي الشام ، وكان أبوه من قبله مفتي الشام ، وكان يدرس لنا الاحوال الشخصية (أحكام الزواج والطلاق وما يتصل بهما) والفرائض والوصايا و أصول الفقه ، وهو النموذج الكامل لعلماء القرن الماضى وهو الشيخ ابو اليسر عابدين۔ "(علماء کی ایک جماعت تھی جن میں ایک مفتیٔ شام بھی تھے ، اور ان سے پہلے ان کے والد مفتی شام رہ چکے تھے ، وہ ہمیں پرسنل لاء (نکاح وطلاق اور اس سے متعلق احکام) فرائض ، وصایا اور اصول فقہ پڑھاتے تھے ، وہ گذشتہ صدی کے علماء کا کامل نمونہ تھے ، اور وہ شیخ ابوالیسر عابدین ہیں) وسعت مطالعہ کے ساتھ بڑے ہی ولولہ وشوق کے آدمی تھے ، طنطاوی لکھتے ہیں :" قرأ على أبيه الشيخ أبي الخير عابدين الحاشية مثلاً ، باجزائها الخمسة الكبار ثلاث مرات ، و أقرأها من بعد أكثر من ثلاث عشرة مرة "(۱۶۸/۲) مثال کے طور پر انھوں نے اپنے والد شیخ ابوالخیر عابدین کے پاس حاشیہ کی پانچوں جلدیں تین مرتبہ پڑھیں ، اور تیرہ سے زائد دفعہ اس کو پڑھایا بھی ہے ، علم وتفقہ کا حال یہ تھا:" كان الشيخ ابو اليسر فهرساً ناطقا (كمبيوتر) لكتب الفقه الحنفي ، تسأله عن المسألة فيدلك على موضعها من الكتاب التي هي فيه كأنه هو الذى وضعها بيده ."(۱۶۸/۲)(شیخ ابوالیسر فقہ حنفی کی کتابوں کا کمپیوٹر تھے ، ان سے کسی مسئلہ کی نسبت پوچھو تو اس کی کتاب میں ایسے ہی نشاندہی کرتے گویا خود انھیں نے اسے لکھا ہے) شیخ ابوالیسر بڑے کمال کے آدمی تھے ، وہ ڈاکٹر بھی تھے ، مگر ڈاکٹری انھوں نے کب پڑھی تھی ؟ اور کیونکر پڑھی تھی؟ اس کا عجیب وغریب قصہ ہے! جس وقت وہ کلیۃ الحقوق میں فرائض تدریس انجام دے رہے تھے ان ہی دنوں ان کو ڈاکٹری پڑھنے کا شوق پیدا ہوا ، لیکن مشکل یہ تھی کہ میڈیسن کی تمام کتابیں شام میں فرنچ زبان میں پڑھائی جاتی تھیں ، کیونکہ اس وقت شام فرانسیسیوں کے زیر تسلط تھا ، اور شیخ ابوالیسر کو =

=فرنچ زبان آتی نہیں تھی، اس مشکل کا حل انھوں نے کیا نکالا۔ طنطاوی لکھتے ہیں: " لقد کان أستاذ أ فی کلیة الحقوق ، فخطر له أن یدرس الطب ، ودراسة الطب لا تتم إلا بمعرفة اللغه الفرنسیة ، فتعلمها و صارطالباً نظامیاً فی (الطب) وهو أستاذ یدرس فی (الحقوق) حتی حاز شهادة (دکتور فی الطب) سنة ۱۹۲٦ ، " (۲ / ۱٦۹)(وہ لاکالج میں استاذ تھے، اس وقت انھیں طب پڑھنے کی سوجھی، اور فن طب فرانسیسی زبان کے علم کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا، لہذا پہلے انھوں نے فرانسیسی پڑھی، پھر یہ ہوا کہ وہ میڈیکل میں باقاعدہ طالب علم تھے اور لاء میں استاذ، یہاں تک کہ ۱۹۲٦ء میں ڈاکٹر آف میڈیسن کی سند حاصل کرلی)ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انھوں نے کلینک (Clinic) کھولا، اور اب وہ اپنا کلینک بھی دیکھتے تھے، لاء کالج میں پڑھاتے بھی تھے، اور اسی پر بس نہیں، درس وافادہ کا سلسلہ کہاں تک پھیلا ہوا تھا! جدید وقدیم اور دین ودنیا میں کس طرح ربط پیدا کیا طنطاوی نے لکھا ہے: " وله حلقة فی جامع الورد الذی یؤم فیه ویخطب الجمعة ، وکان یفتی المستفتین ، و یقرئ فی دارہ من یقصده من طلبة العلم. " (۲ / ۱٦۹) (جامع الورد میں، جس کے وہ امام وخطیب تھے، ان کا حلقہ لگتا، اور مسئلہ پوچھنے والوں کو مسائل بتلاتے، اور ان کے گھر اگر کوئی طالب علم آجاتا تو اس کو بھی پڑھاتے)ان مشاغل کے ساتھ ان کی ایک مصروفیت یہ بھی تھی " کانت له مکتبة کبیرة فیها الکثیر من المخطوطات النادرة ، فهو یعکف علیها، یقرأ دائما و یکتب " (۲ / ۱٦۹)(ان کی ایک بڑی لائبریری تھی، جس میں بہت سے نادر مخطوطات تھے، وہاں وہ ہر وقت کتابوں پر جھکے لکھا پڑھا کرتے) تصنیف و تالیف کا اتنا ستھرا ذوق اور ایسی قوت و قدرت کہ بقول طنطاوی: ترک ثلاثین مؤلفا مکتوبة بخطه رأیتها و کتبت عنها فی جریدة الایام الدمشقیة فی ۱۸ / ٥ / ۱۹٦۱ "(۲/۱٦۹)(۳۰ کتابیں اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی چھوڑیں، جن کو میں نے بچشم خود دیکھا ہے، اور دمشق سے نکلنے والے اخبار " الأیام " میں ۱۸ر مئی ۱۹٦۱ء کو ان پر لکھا بھی ہے) ان تمام خوبیوں کے ساتھ علم اتنا ٹھوس اور تاریخ پر دستگاہ ایسی کہ ان کی کتاب " أغالیط المؤرخین " کی داد تحسین علامہ اعظمی نے ان الفاظ میں دی ہے: " وہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا اردو ترجمہ بار بار شائع کیا جائے " (المآثر ج ۳ ش ۲ ص ٦۴) اس بات کا افسوس ہے کہ ان کی تصنیفات میں اس کتاب کے علاوہ کوئی اور چھپ نہ سکی، سال ولادت ۱۳۰۷ھ اور سال وفات ۱۴۰۱ھ ہے (امداد الفتاح ص ۹۳ و ۲۵۸)۔

یہ علامہ ابن عابدین شامی کے بھائی کے پوتے اور ماہر طبیب و معالج تھے، اور کافی ضعیف اور سن رسیدہ ہو چکے تھے، علامہ اعظمی نے ان کے گھر واقع حی الورد میں جاکر ان سے ملاقات کی، اس وقت شیخ ابوالیسر نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب " أغاليط المؤرخين " جو علامہ اعظمی کی پسند فرمودہ بھی ہے، ہدیہ کی اور اس کی پیشانی پر اہداء کی یہ عبارت تحریر فرمائی:

" تقدمة تذكار ومودة لسيادة الشيخ حبيب الرحمن الأعظمی رجاء دعوة صالحة، مع اسبال ذيل الستر على هفواتی المعتادة ، نسأله تعالى . . . والرضا مع حسن الختام بجاه النبی عليه الصلوٰة والسلام "

محمد ابو اليسر عابدين ٥/ ذی الحجة سنة ١٣٩٨

٦/ تشرين ثانی سنة ١٩٧٩

ساتواں حج دمشق سے ۶/ نومبر ۱۹۷۸ء م ۶/ ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ کو حج کے ارادہ سے جدہ کے لئے روانہ ہوئے، سفر شام کے شروع میں جس یادداشت کا تذکرہ ہے، اس کے آگے لکھتے ہیں:

"دمشق میں ۲۔ دن قیام کے بعد حلب روانہ ہوا، وہاں تقریباً سوا مہینہ رہ کر ۶۔ نومبر ۱۹۷۸ء مطابق ۶/ ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ دمشق سے بذریعہ سعودی ایرلائنز جدہ روانہ ہوا، ایک بجے رات میں مکہ مکرمہ پہونچا، ۲۲/ ذی الحجہ کو مدینہ منورہ روانہ ہوا، ۳۰ کو ہوائی جہاز سے جدہ آیا، ۲/ محرم ۱۳۹۹ کو جدہ سے بمبئی آیا، دس بجے رات میں بمبئی پہونچا تھا، ۵/ کو بمبئی سے چل کر ۷۔ کو ۴۔ بجے شب میں مئو آیا۔"

اس سفر میں سعادت حج سے مشرف ہونے کے علاوہ غالباً رابطہ عالم اسلامی کی کانفرنس میں بھی شریک ہوئے، کیونکہ آپ کے پاسپورٹ پر دمشق میں واقع سعودی کونسلیٹ کا جو ویزا لگا ہے، اس میں اوپر لکھا ہے: "لحضور مؤتمر رابطة العالم الإسلامی بجدة" یعنی جدہ میں ہونے والی رابطہ عالم اسلامی کانفرس میں شرکت کیلئے۔

المعھد العالی و مرقاۃ العلوم کی تاسیس | علامہ اعظمیؒ مفتاح العلوم کے واقعات اور وہاں کے کرم فرماؤں کے لگائے ہوئے زخموں سے بہت دل برداشتہ اور کبیدہ خاطر ہو چکے تھے، آپ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا اور جو ناروا سلوک کیا گیا تھا وہ نہایت ہمت شکن اور حوصلہ فرسا تھا، ان کی جگہ اگر معمولی عزم و حوصلہ کا کوئی شخص ہوتا تو ان حالات کی تاب نہ لا سکتا، باوجودیکہ آپ ۸۰۔ سال کی عمر کو پہونچ چکے تھے، مگر حالات کے آگے سپر انداز نہیں ہوئے، اور درس وافادہ کا سلسلہ بہر صورت جاری رکھا، بقول شاعر:

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

لہذا اس سلسلۂ درس وافادہ اور پیغام محبت کو جاری وساری رکھنے کیلئے ضعف و پیرانہ سالی کے باوجود ایک نئے کام کا آغاز کیا، اور اس کام کے لئے ایک ایسے ادارے کی بنیاد ڈالی جس کو اپنے طرز کا منفرد ادارہ بنانا چاہتے تھے، اس غرض کی تکمیل کے لئے اپنے مسکن سے قریب ہی چند بالشت زمین خریدی، اور کسی ظاہری اور دنیوی ساز وسامان کے بغیر صرف اللہ رب العزت پر توکل کرتے ہوئے" المعھد العالی للدراسات العلیا" کی طرح ڈالی ۔ کوئی شور ہوا نہ ہنگامہ، اشتہار چھپا نہ پمفلٹ تقسیم ہوا، نہایت خاموشی اور سکون، سادگی کے ساتھ، جو آپ کی طبیعت ثانیہ تھی، اس کام کی ابتداء ہوئی، لیکن اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے، اس نے اس ادارے کی تعمیر و ترقی کے لئے اسباب پیدا فرمائے، اس کے لئے آپ کا سب سے اہم اور بڑا اصول یہ تھا کہ حکومتی اور سرکاری امداد کے بغیر مسلمانوں کے چندے پر اس ادارہ کے قیام و بقاء کا انحصار ہو، اور دوسرا اہم اصول یہ تھا کہ جو تعلیم حاصل کی جائے وہ دنیوی مال و متاع اور حصول عز و جاہ کے لئے نہ ہو، بلکہ محض دین اور علم دین کی اشاعت و تبلیغ کے لئے ہو، اور اخلاص و نیک نیتی سب سے بڑا سرمایہ ہو، اخلاص وللہیت کی دعوت و تبلیغ آپ عمر بھر کرتے رہے اور اس نئے ادارے کے اساتذہ کو بھی آپ اسی کی تلقین کرتے رہے کہ ایک طالب علم اور عالم دین کی سب سے بڑی متاع اس کا خلوص اور نیک نیتی ہے۔

المعہد العالی کا قیام نہایت بلند اور عظیم مقاصد کے لئے ہوا تھا، اس سے آپ کا ارادہ یہ تھا کہ مدراس دینیہ کے فارغ التحصیل طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کے ذریعہ درس و تدریس بحث و تحقیق، تصنیف و تالیف اور دعوت و تبلیغ جیسے مختلف شعبوں کے لئے تیار کریں، اور ان کی ٹریننگ اس نہج سے کریں کہ عصر حاضر کے چیلنجوں اور نت نئے مسائل کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ اسلام اور علوم دینیہ کی صحیح طور پر خدمت بجالائیں، اس کے لئے علامہ اعظمیؒ نے خود ہی المعہد العالی کا نصاب ترتیب دیا، جو کتابیں دستیاب نہیں تھیں اسلامی اور عرب ممالک سے وہ کتابیں منگوائیں اور تن تنہا اس کام کا آغاز کر دیا۔ مدرسہ مفتاح العلوم کی تعمیر و ترقی میں آپ کے دور شباب کی امنگ اور جوش و جذبہ کار فرما رہا، تو یہاں نالۂ سحر اپنا اثر دکھاتا رہا، آپ کے خلوص نیت اور اخلاص وللّٰہیت کی برکت تھی کہ مختصر سی مدت میں اس کی خوشبو دور دور تک پھیلی، اور اس دور انحطاط میں ایسے ادارے کے قیام پر اہل علم نے بڑی خوشی و مسرت کا اظہار کیا، چنانچہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کو جب اس کی اطلاع ملی تو ۶؍ جنوری ۱۹۸۰ کے ایک خط میں اپنی قلبی کیفیت کا اظہار یوں کیا:

"مخدوم محترم حضرت مولانا دام مجدھم السامی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مکرمت نامہ ایسے وقت ملا کہ بمبئی کے لئے پابرکاب ہوں، وہاں تین چار روز قیام رہے گا۔ "المعہد العالی" کے قیام سے قلبی اور روحانی مسرت ہوئی، یہ تربیت گاہ خدا نے چاہا تو بے حد مفید ثابت ہوگی، اصل چیز تربیت ہی ہے، اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائے، بہ تقاضائے عمر و حالات کسی مصرف کا نہیں رہا، دل کڑھتا ہے مگر اپنے اختیار کی کوئی بات بھی نہیں ہے ... میرے ذمے جو خدمت رکھئے گا اس کے لئے دل و جان سے حاضر ہوں، لوگوں کو اندازہ نہیں ہے، آپ جیسی گرانمایہ شخصیت اب کہاں ملیں گی!! اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائیں..."

المعھد العالی کے ساتھ ہی آپ نے "مرقاۃ العلوم" کی اساس ڈالی، اس مدرسہ کا آغاز بھی یوں ہوا کہ ایک دو جماعتیں بچوں کی تھیں اور ان کو پڑھانے والے دو مدرسین تھے، دو تین طالب علم ابتدائی عربی جماعتوں میں تھے، کافی غور و خوض کے بعد آپ نے اس کا جو نصاب تعلیم تشکیل دیا وہ درس نظامی کے موجودہ نظام تعلیم سے بہت کچھ مختلف تھا، اس میں آپ کے اسی (۸۰) سالہ وسیع تجربات کا نچوڑ شامل تھا اور اس کے لئے لائحۂ عمل یہ بنایا کہ چند باقاعدہ مدرسین کے علاوہ المعھد العالی کے طلبہ ان کی تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دیتے، جبکہ طلبۂ معھد کے اسباق خود آپ پڑھاتے، علاوہ بریں ابتدائی درجات کی کئی ایک کتابیں بھی اپنے زیر درس رکھتے تھے، یہ علامہ اعظمی کے تواضع، کسر نفسی اور سادگی کی انتہا تھی، ملک و بیرون ملک کے اہم اور عظیم ترین تعلیمی اداروں سے اعلیٰ عہدے اور مناصب کی پیشکش کی گئی، لیکن کسی ایک کو بھی قابل التفات نہیں گردانا، ایک پودے کو خود اپنے ہاتھوں سینچ سینچ کو پروان چڑھایا اور جب تناور درخت ہوا تو عین عالم بہار میں چند نادانوں کی نادانی کی وجہ سے اس سے مفارقت اختیار کرنی پڑی، اور جس وقت کہ پوری دنیا کے علمی حلقوں میں آپ کی عظمت و عبقریت کا سکہ چل رہا تھا ایک معمولی سے نیم تاریک گوشہ میں بیٹھ کر معلم الصبیانی کر رہے تھے۔ عرب و عجم کے ممتاز ترین اہل علم و ہنر اور اصحاب فضل و کمال آپ کی دست بوسی کو اپنے لئے باعث فخر اور آپ کی ایک نگاہ کو اپنے لئے سرمایۂ سعادت سمجھ رہے ہیں، مگر آپ ان سب سے بے نیاز چند بچوں کو کبھی میزان و منشعب پڑھا رہے ہیں، اور کبھی ان سے دروس الادب اور منھاج العربیہ کے اسباق سن رہے ہیں، کیا زہد و تقویٰ، استغناء و قناعت، اخلاص و للّٰہیت اور خدمت علم و دین کی ایسی عجیب و غریب کوئی مثال مل سکتی ہے!

المعھد العالی کے سلسلہ میں آپ کی فکر کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہی۔ اس کی سب سے بڑی اور اہم وجہ یہ تھی کہ آپ کو جس قسم کے فضلاء درکار تھے، ان کی فراہمی مادیت پسندی کے اس دور میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھی، جو آتے تو وہ آپ کے وضع

کردہ معیار پر بہت کم پورے اترتے ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند برسوں بعد یہ شعبہ موقوف ہو گیا، البتہ آپ نے مرقاۃ العلوم کے غیر فارغ التحصیل طلبہ پر محنت اور توجہ صرف کی، ان کو عمدہ استعداد اور پختہ صلاحیت سے آراستہ کرنے کے لئے بیک وقت کئی کئی اسباق اپنے پاس رکھتے، کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی وقت میں نورالایضاح سے لے کر صحیح بخاری تک مختلف کتابیں اپنے ذمہ رکھیں، اور اس طرح منہاج العربیہ سے لے کر بخاری و ترمذی پڑھنے والے آپ کے شاگردوں کی سب سے پہلی جماعت ۱۶ر شوال ۱۴۰۷ھ کو فارغ التحصیل ہو کر نکلی، اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے صاحبزادے مولانا رشید احمد صاحب اعظمی کو نظامت کی ذمہ داری سپرد کی ، اور خود اس کی سرپرستی کے ساتھ تادم واپسیں مرقاۃ العلوم کے طلبہ کی تدریس و تعلیم کا مشغلہ جاری رکھا، اور الحمد للہ آج بھی آپ کے فیوض و برکات کے اثرات نظر آرہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے :

کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

دائمی تقویم کی ترتیب | اسی دور میں علامہ اعظمی نے ایک اہم خدمت یہ انجام دی کہ طلوع و غروب ، سحر و افطار اور نماز پنجگانہ وغیرہ کے اوقات کی ایک تقویم (جنتری) مرتب فرمائی، جو ظاہر ہے ایک آدھ سال میں نہیں انجام پاسکتی، بلکہ برسوں کی کاوش کے بعد ہی پوری ہو سکتی ہے ، اس تقویم کی ابتداءً کچھ لوگوں نے اگرچہ شدت سے مخالفت کی، لیکن علامہ اعظمی کا یہ عمل اس طرح مقبول ہوا کہ آج مئو اور اس کے اطراف ونواح میں تقریباً ہر جگہ اسی تقویم پر لوگوں کا عمل ہے، جس کو عنداللہ مقبولیت کی علامت کہا جا سکتا ہے۔

رفیقۂ حیات کی وفات | ۹ر جون ۱۹۷۹ء کو آپ کی رفیقۂ حیات ایک لمبی بیماری کے بعد وفات پا گئیں، اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں:

"رفیقۂ حیات حبیب اعظمی ، سیدہ آمنہ بنت مولوی عبدالعزیز اورنگ آبادی بتاریخ ۹ر جون ۱۹۷۹ء داغ مفارقت داد، انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ از روز وفات او

تا ایں دم بارہا ایں شعر اردو تکرار کردہ ام:

رنج تنہائی سہی لیکن بہل جاتا ہے دل کچھ تمہاری یاد سے کچھ نالہ و فریاد سے"

(حبیب اعظمی کی رفیقۂ حیات، سیدہ آمنہ بنت مولوی عبد العزیز اورنگ آبادی نے ۹/ جون ۱۹۷۹ء کو داغ مفارقت دیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، ان کی وفات کے دن سے اب تک بارہا اردو کے اس شعر کی تکرار کر چکا ہوں:

رنج تنہائی سہی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

رفیقۂ حیات کی وفات پر آپ کی شدت غم کا اندازہ ایک مکتوب سے بھی لگایا جاسکتا ہے، جو شیخ عبد اللہ ابراہیم انصاری قطر کے لئے لکھا گیا ہے، اس میں آپ لکھتے ہیں:

"فقد تلقیت رسالتکم السامیة وأنا مسافر سفرا قاصدا للترفیه عن نفسي و تنفیس ما أجده عني، وقد كنت مهموما حزينا مفجوعا بمصاب زوجتي رحمها الله۔۔۔۔"

(آپ کا گرامی نامہ مجھے اس حال میں ملا کہ میں تسکین قلب اور تخفیف غم کے لئے رخت سفر باندھ رہا تھا، کیونکہ میں اپنی اہلیہ رحمۃ اللہ علیہا کے حادثۂ وفات کی وجہ سے رنجیدہ و غمگین اور شکستہ خاطر تھا)

عالم اسلام کے ممتاز عالم، شیخ ابو غدہؒ کی مئو تشریف آوری

جون ۱۹۷۹ء مطابق رجب ۱۳۹۹ھ میں ممتاز شامی عالم بالخصوص حدیث اور علوم حدیث کے زبردست ماہر اور عظیم محقق علامہ شیخ عبد الفتاح ابو غدہ کی مئو تشریف آوری ہوئی، شیخ ابو غدہؒ علامہ اعظمی کے بڑے شیدائی اور عقیدت مند تھے، جب کہ خود ان کا شمار عالم اسلام کی ان نامور اور قد آور علمی شخصیتوں میں ہوتا تھا، جنھوں نے اپنے بعد اپنا مثل نہیں چھوڑا، مگر اس کے باوجود علامہ اعظمیؒ سے ان کی والہانہ محبت و عقیدت قابل رشک تھی، وہ جب مئو تشریف لائے تو تقریباً تین دن قیام فرمارہے، یہ تین دن مئو کے لئے تاریخی حیثیت کے حامل تھے،

عجیب کیف پرور اور جانفزا منظر تھا، جب نہ صرف مئو بلکہ اس کے اطراف کے بھی علماء وفضلاء جمع ہو گئے تھے، اور جب ان فضلاء کے درمیان وقت کی یہ دو عظیم شخصیتیں یکجا ہوتیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ آسمان علم وفضل کے آفتاب وماہتاب ہوں، علامہ اعظمیؒ نے شیخ ابوغدہؒ کی تشریف آوری کے موقع پر ان کے استقبال میں ایک قطعہ نظم فرمایا تھا جس کو سن کر شیخ ابوغدہؒ آبدیدہ ہو گئے تھے، وہ قطعہ یہ ہے:

أهلا بمقدمك الهنيئي و مرحبا　　يا عالم الشهباء إمام الشا م

لم يحو علم الفقه و الآثار شا　　مىً كجمعك بعد ذاك الشامي

شیخ ابوغدہؒ کے قیام مئو کے ان تین دنوں میں ایک دن جمعہ کا تھا، اس وقت مدرسہ مرقاۃ العلوم کی موجودہ مسجد ابھی تعمیر نہیں ہوئی تھی صرف ایک شیڈ تھا، جس میں کسی زمانہ میں پاور لوم ہوا کرتا تھا، علامہ اعظمی کے اصرار پر شیخ ابوغدہؒ نے نماز جمعہ کی امامت فرمائی، بعد ازاں ایک طویل تقریر کی اور دعا فرمائی، اس دن شیخ کی گریہ وزاری کا منظر قابل دید و لائق صد رشک تھا، آپ نے نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ علامہ اعظمیؒ کی درازیٔ عمر اور صحت وعافیت نیز عامۃ المسلمین کی خیر وعافیت اور صلاح وفلاح کے لئے دعا فرمائی تھی۔

علامہ اعظمیؒ کے پاس کوئی مہمان خانہ وغیرہ تو تھا نہیں، نہ ہی وسیع وکشادہ مکان تھا، معمولی سی تنگ جگہ میں زندگی بسر کرتے تھے جس کی دیواریں اور چھت سب نہایت خستہ حالت میں تھیں، مدرسہ مرقاۃ العلوم ابھی بالکل ابتدائی مرحلے میں تھا، اس کی عمارت ابھی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ لہذا مجبوراً آپ نے شیخ ابوغدہؒ کے قیام کا انتظام مدرسہ سے متصل ڈاکٹر نثار احمد انصاری صاحب کے مکان پر کیا، ڈاکٹر صاحب کا نہایت کشادہ مکان تھا جس میں زیریں حصہ ضرورت سے زائد تھا، شیخ ابوغدہ کے قیام کا انتظام ڈاکٹر صاحب کے مکان پر ان کی راحت و آرام کے لئے کیا تھا کہ وہاں ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوتی، نیز واردین وصادرین کے لئے بھی سہولت ہوتی، جب شیخ ابوغدہ علیہ الرحمۃ یہاں سے واپس

تشریف لے گئے ہیں تو ۱۷ر شعبان ۱۳۹۹ھ کو علامہ اعظمی کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں تحریر فرمایا:

"... أرسلت لكم من فترة رسالة من الرياض أجدد فيها شكرى لكم عما لقيته من حفاوة و تكريم ، أكرمكم الله، وأجدد هذا الشكر الآن أيضا ، وقد بالغتم في تكريمى ، وأرجو أن أمتع بزيارتكم في وقت معتدل ،أقيم عندكم في غرفتكم المتواضعة الرفيعة ، فأكون من أهل العباءة أهل البيت ، وأرجو من الله تعالىٰ أن أمتع بهذا في الآتى إن شاء الله ..."

(ریاض سے کچھ مدت قبل میں نے آپ کے پاس ایک خط لکھا تھا، جس میں آپ کے اعزاز واکرام کا میں نے شکریہ ادا کیا تھا، اللہ تعالیٰ بھی آپ کا اکرام فرمائیں، اس وقت پھر میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آنمحترم نے میری بہت زیادہ عزت افزائی فرمائی، میں اس بات سے پُرامید ہوں کہ کسی مناسب وقت پر پھر شرف ملاقات حاصل کروں اور آپ کے ساتھ آپ کے متواضع اور بلند کمرے میں قیام کروں، تاکہ میں آپ کے اہل خانہ میں شمار کیا جاؤں، اللہ کی ذات سے مجھے امید ہے کہ مستقبل میں ان شاء اللہ اس سعادت سے بہرہ ور ہو سکوں گا...)

قطر سے تیسری سیرت کانفرنس میں شرکت کے لئے دعوت

محرم ۱۴۰۰ھ (نومبر ۱۹۷۹ء) میں قطر کے دارالحکومت دوحہ میں سیرت نبوی (علی صاحبھا الصلاۃ والسلام) کی تیسری عالمی کانفرنس منعقد ہوئی، اس میں شرکت کے لئے علامہ اعظمی کو بھی مدعو کیا گیا، اصل دعوت نامہ تو ہمیں آپ کے کاغذات میں نہیں مل سکا، شاید کہیں گم ہو گیا ہو، دعوتنامہ موصول ہونے کے بعد آپ نے شرکت کا وعدہ فرمایا ہوگا، جس کے لئے کانفرنس کی آرگنائزنگ کمیٹی نے آپ کے مقالہ کے تقاضا کا خط لکھا، جو ۱۹ر رجب

۱۳۹۹ھ م ۱۴ ؍ جون ۱۹۷۹ء کا مکتوب ہے، اس کی عبارت یہ ہے:

”۰۰۰ فلا زالت اللجنة التحضيرية للمؤتمر العالمي الثالث للسيرة والسنة النبوية فى انتظار بحثكم الذى وعدتم بكتابته وإرساله الينا و ذلك لنتمكن من إعادة طباعته و تهيئته ليكون معداً اثناء المؤتمر ۰۰۰“

(سیرت و سنت نبوی کی تیسری عالمی کانفرنس کی آرگنائزنگ کمیٹی آپ کے مقالہ موعودہ کا برابر انتظار کر رہی ہے، تاکہ ہم اس کو دوبارہ چھاپ کر کانفرنس کے وقت کے لئے تیار کر سکیں)

لیکن اسی دوران اہلیہ مرحومہ کی وفات کا دلگداز سانحہ پیش آگیا، جس سے آپ کے دل و دماغ شدید طور پر متاثر ہوئے، اس صورت میں آپ بحث کہاں سے تیار کر سکتے، اس لئے آپ نے کمیٹی کے چیئرمین شیخ محمد عبداللہ ابراہیم انصاری کو خط لکھا جس میں مقالے کی تیاری سے معذرت کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

”وقد تيسرت لى فى تلك الفترة زيارة أخينا فى الله السيد أبى الحسن على الندوى فى لكناؤ فالتمست منه أن يخبركم عما أنا فيه و يعتذر اليكم عنى ، أنى لا أستطيع كتابة البحث الموعود و أنا مهموم القلب بهذه الدرجة ،لكنى أرجو أن يذهب الله عنى بعض ما يشغلنى عن إعداد البحث ويسلينى فأكتبه إن شاء الله .

فلعلّ الأستاذ الندوى نسى أن يكتب إليكم ، فمعذرة منى إليكم ، وعفواً عما قاسيتم من شدة الانتظار ، وتاخير كتابة البحث ۰۰۰“

(اسی اثنا میں میری ملاقات برادرم سید ابوالحسن علی ندوی سے لکھنؤ میں ہوئی، تو میں نے ان سے عرض کیا کہ میری مصیبت سے آپ کو باخبر کردیں اور میری طرف سے معذرت کرلیں کہ میں مقالہ موعودہ اس درجہ

رنجیدہ دلی کی حالت میں نہیں لکھ سکتا، لیکن مجھے امید ہے کہ اگر اللہ نے مقالہ کی تیاری کی رکاوٹ دور فرمادی اور میرا غم غلط ہو گیا تو میں ان شاء اللہ اس کو لکھ سکوں گا۔

شاید استاذ ندوی آپ کے پاس یہ لکھنا بھول گئے ہوں لہذا میں معذرت چاہتا ہوں اور مقالہ نویسی کی تاخیر اور آپ کو انتظار کی جو شدت برداشت کرنی پڑی ہے اس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں)

اس خط کی وصولی کے بعد چئیر مین شیخ عبداللہ انصاری نے پھر ایک خط ۵ر شوال ۱۳۹۹ھ م ۲۷ر اگست ۱۹۷۹ء کو لکھا جس میں تعزیت اور صبر و استقلال کی تلقین کے بعد تحریر فرمایا:

"تقديراً منا لحالتكم النفسية نفيدكم بأننا قد أعفيناكم من البحث على أن تكونوا باذن الله تعالىٰ عضوا عاملا فى المناقشات خلال أيام المؤتمر ... وسيكون لنا معكم اتصال آخر قريباً لترتيب اجراء ات السفر."

(آنجناب کی نفسیاتی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے ہم آپ کو اطلاع دینا چاہتے ہیں کہ بحث لکھنے سے آپ کے عذر کو ہم نے قبول کر لیا، اس شرط پر کہ کانفرنس کے دوران ہونے والے مذاکرات میں آپ عملی طور پر حصہ لیں، سفر کی کارروائیوں کی ترتیب کے لئے جلد ہی ہم آپ سے ایک بار پھر رابطہ قائم کریں گے۔)

اس مراسلت اور خط و کتابت کے بعد ذہنی طور پر علامہ اعظمی اس کانفرنس میں شرکت کے لئے آمادہ ہو گئے، اور کچھ ہی عرصہ بعد حج و زیارت کے لئے حجاز تشریف لے گئے، ان کا ارادہ تھا کہ اس فریضہ کی ادائگی کے بعد ادھر ہی سے قطر کا سفر بھی نمٹالیں گے، لیکن انسان چاہے کتنا بھی عظیم ہو جائے قدرت کے تکوینی فیصلوں کے سامنے بے بس ہے دیا

ہو جاتا ہے۔ حرم شریف پر اس سال یکم محرم کو شر پسند باغیوں کا ناپاک اور بدترین حملہ ہوا، جس کی وجہ سے کئی دنوں تک حرم شریف (زادہ اللہ شرفا) کے دروازے بند رہے اور بہت سارے امور معطل ہو گئے، ان حالات کے پیش نظر کانفرنس میں آپ کی شرکت غیر یقینی بلکہ عدم شرکت یقینی ہو گئی، چنانچہ ۸/ صفر ۱۴۰۰ھ مطابق ۲۸/ دسمبر ۱۹۷۹ء کو لکھا ہے:

"فاني والله متاسف جدا على أنه لم يمكن لي حضور موتمر السيرة ، لأجل أني كنت إذ ذاك محصوراً في غرفة تجاه باب اجياد بمكة المكرمة ، حتى انى لم استطع الاتصال بكم بالهاتف ، أو بالبرق ، وقد كنت عازما على الحضور صحبة السيد ابى الحسن على الندوى من جدة فلم يتيسر لى الاجتماع به لأجل الحادث الفظيع . . ."

(پس بخدا مجھے سیرت کانفرنس میں شریک نہ ہو سکنے کا بہت افسوس ہے ، کیونکہ میں اس وقت مکہ مکرمہ میں باب اجیاد کے سامنے ایک کمرے میں محصور تھا، یہاں تک کہ میں آپ سے ٹیلی فون یا ٹیلی گرام کے ذریعہ بھی رابطہ نہیں قائم کر سکا، جب کہ میں جدہ سے سید ابوالحسن علی ندوی کی رفاقت میں حاضری کا عزم کئے ہوئے تھا، لیکن اس روح فرسا واقعہ کی وجہ سے میری ان سے ملاقات بھی نہ ہو سکی)

شیخ ابو غدہ کی ریاض بلانے کی کوشش اس سال (۱۴۰۰ھ) شیخ ابو غدہ علیہ الرحمۃ نے آپ کو جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض میں ایک مہینہ کے لئے بلانے کی کوشش کی، اس بابت پہلے انھوں نے وکیل الجامعۃ سے گفتگو کی، پھر علامہ اعظمیؒ سے ان کی رائے طلب کی، شیخ ابو غدہ کے بھیجے ہوئے خطوط میں اس موضوع کا ایک خط، جس پر تاریخ درج نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو:

"سيدى الأجل:

اقترحت على وكيل الجامعة عندنا استزارتكم لجامعتنا لمدة

شهر، فوافق و رحب ، وطلب منى أن أقدم طلبا بذلك ، فقدمت طلبا واقترحت فيه أن يكون مقدمكم الينا من أوائل المحرم عام ١٤٠٠هـ إن شاء الله تعالىٰ ، و جعلت عنوان تبليغ دعوتكم عنوانى لأقوم أنا بمتابعة معاملة الدعوة فى الجامعة و لأتبلغها و أبلغها لفضيلتكم بسرعة . فأرجو أن تعرفونى بعنوانكم الممكن الاتصال به فى مكة المكرمة أو فى المدينة المنورة مع ذكر الهاتف الممكن الإستعانة به لإبلاغكم ، وأرجو أيضاً أن تعرفونى عن رأيكم فى التوقيت هل هو مناسب ، فإنى اخترته لأنكم هنا قريبون منا ، والجو عندنا ربما كان أقل برودة من الهند عندكم فتستريحون بلطافة الجو إن شاء الله تعالىٰ . . . "

(آقائے بزرگوار: میں نے وکیل جامعہ کے سامنے ایک مہینہ کے لئے ہماری یونیورسٹی کی آپ کی زیارت کی تجویز رکھی، تو انھوں نے میری اس تجویز سے اتفاق کیا اور اس کا خیر مقدم کیا، اور مجھ سے اس کے لئے ایک درخواست پیش کرنے کو کہا، لہذا میں نے ایک درخواست گذار دی اور اس میں یہ تجویز بھی رکھی کہ آپ کی تشریف آوری محرم ۱۴۰۰ھ کے اوائل میں ہو، اور آپ تک دعوت رسانی کے لئے میں نے اپنا پتہ دیدیا ہے، تاکہ میں اس معاملے کو بذات خود انجام دے سکوں اور سرعت کے ساتھ آپ تک دعوت نامہ پہنچا سکوں، لہذا مجھے امید ہے کہ مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں آپ اپنے ممکنہ پتہ سے آگاہ فرمائیں گے، اسی کے ساتھ کوئی ٹیلیفون نمبر بھی ذکر فرمائیں گے جس کی مدد سے آپ تک پیغام پہنچایا جاسکے، اسی طرح مجھے امید ہے کہ وقت کی نسبت بھی اپنے خیال سے آگاہ فرمائیں گے کہ کیا وہ مناسب رہیگا۔ اس وقت کا انتخاب میں نے اس لئے کیا ہے کہ آپ اس وقت ہم سے قریب ہوں گے اور یہاں کا موسم ہندوستان کی بہ نسبت کم سرد ہوگا، لہذا آپ موسم کی لطافت سے بھی انشاءاللہ آرام پائیں گے...)

آٹھواں اور آخری حج | علامہ اعظمی نے آٹھواں حج جو کہ ان کا آخری حج بھی ہے ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء میں کیا، یہ وہ سال ہے جب کہ حرم مکی۔ زادہ اللہ شرفاو عزاً۔ پر فتنہ پردازوں کا شرارت آمیز و قیامت خیز حملہ ہوا تھا(۱) علامہ اعظمی نے جس کاغذ پر اپنے حج کے سال لکھے ہیں، اس میں آخر میں تحریر ہے:

”آٹھواں ۱۳۹۹ھ۔ اسی حج میں پہلی محرم ۱۴۰۰ھ کو مخالفین حکومت سعودیہ کا فتنہ رونما ہوا اور حرم کے دروازے بند کر دیے گئے۔“

اس حج کی کسی قدر تفصیل آپ نے اپنی ایک یادداشت میں تحریر فرمائی ہے، ہم اس کو بتمامہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں، لکھتے ہیں:

”حج ۱۳۹۹ھ ۱۹۷۹ء

۱۷/ اکتوبر (۲۳/ ذی قعدہ) کار سے بنارس آیا، بنارس سے ۳ بجے دن میں بذریعہ کار الہ آباد روانہ ہوا، ۸/ بجے شب میں الہ آباد پہونچا، عبدالشکور صاحب کے یہاں قصر حافظ میں قیام ہوا، مولانا محمد احمد، و مولوی عمار و ڈاکٹر صلاح الدین

---

(۱) اس فتنہ کی نسبت علامہ اعظمی اپنی بیاض میں تحریر فرماتے ہیں: ”فتنۂ مدعی مہدویت در مکہ، نامش محمد بن عبداللہ بود، در حرم مکہ با اسلحہ کثیر و انبوہ مردم معتقداں داخل شد، و در عین نماز فجر درہائے حرم را از داخل بست و تا پانزدہ روز ابواب مسدود بودند، و مردم حجاج و غیر حجاج از نماز و طواف در حرم محروم ماندند، من نیز ازیں محروماں یکے بودم، ایں حادثہ در یکم محرم ۱۴۰۰ھ وقوع یافت۔“

(مکہ میں مدعیٔ نبوت، جس کا نام محمد بن عبداللہ تھا، کا فتنہ حرم مکہ میں بہت زیادہ اسلحے اور معتقدوں کی بھیڑ کے ساتھ داخل ہوا، ٹھیک فجر کی نماز میں حرم کے دروازے اندر سے بند کر دیے، پندرہ روز تک دروازے بند رہے، اور حاجی و غیر حاجی تمام لوگ حرم میں نماز و طواف سے محروم رہے، میں بھی ان ہی محروموں میں سے ایک تھا، یہ حادثہ یکم محرم ۱۴۰۰ھ کو واقع ہوا)

و مولوی قمر الزماں وہیں آکر ملے، دوسرے دن ۱۸۔ اکتوبر کو ان سب حضرات نے بمبئی میل پر ۱۰ بجے دن میں سوار کرایا۔ رشید احمد، سعید احمد مولوی محمد وغیرہ بھی رات کی گاڑی سے الہ آباد آگئے تھے۔ ۱۹/ اکتوبر کو صبح ۵ بجے منماڈ اسٹیشن پر بہت سے حضرات ملنے آئے، مولانا عثمان، شمس الضحیٰ وکیل، شمس الہدی وکیل، سید حمید، حاجی بفاتی، ڈاکٹر ریاض وغیرہ سب آئے تھے۔

۱۹/ اکتوبر۔ ساڑھے گیارہ بجے بوری بندر پہونچے، مولوی ابرار احمد برادر حاجی شمس الدین گاڑی لے کر آئے تھے، اپنے گھر لے جاکر ٹھہرایا۔ سامان رکھ کر جمعہ کی نماز عرب مسجد میں پڑھی، نماز کے بعد یوپی حج کمیٹی کے دفتر گئے، اپنے کاغذات معروف زکریا وغیرہ کے حوالے کئے، پھر حج کمیٹی میں محمد امین اگزکیٹیو آفیسر سے ملاقات کی، انھوں نے اطمینان دلایا کہ تینوں آدمیوں کو ۲۵ کی کے جہاز سے روانہ کردیں گے۔

۲۵ تک حاجی شمس الدین کے مکان ہی پر قیام رہا، ۷ بجے سے پہلے ہی مولوی ابرار نے ہم کو اپنی گاڑی پر ایرپورٹ پہونچایا، مولوی مستقیم ساتھ تھے، سید حمید وغیرہ اپنی گاڑی سے ہوائی اڈہ گئے، وہاں مولوی ظفر الحسن اور مولوی عبد الحلیم (۱) وغیرہ سے ملاقات ہوئی، ۱۱ بجے جہاز اڑا، ساڑھے تین بجے (سعودی عرب کے ۱۔ بجے) دن میں جدہ ایرپورٹ پر اترا، نماز ظہر سے فارغ ہوکر صوفی عبد الرحمن کے ساتھ ان کے اور نورولی کے یہاں چلا گیا، طبیعت نہایت ناہموار تھی اور بے حد تکان معلوم ہورہی تھی، نورولی کے گھر آرام کیا، کھانا کھایا، نماز

(۱) غالباً مولانا عبد الحلیم صاحب گورینی مراد ہیں، ابھی کل ہی (۱۰/ محرم ۱۴۲۰ھ م ۲۷/ اپریل ۱۹۹۹ء) آپ کی وفات کی جانکاہ خبر موصول ہوئی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، مولانا طویل عرصہ سے بستر علالت پر تھے، ان کی رحلت سے بڑا خلاء پیدا ہوگیا ہے، اللہ ان کے درجات کو بلند فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین

پڑھی اور چند منٹ سویا، پھر ۱۲ بجے شب میں ایرپورٹ آیا، عبدالعلی واحسان الحق انتظار میں تھے، ڈرافٹ بھنایا، اور دو بجے بس ملی فجر کی نماز کے بعد روانہ ہوئی، تھوڑی دور جاکر خراب ہوگئی، گھنٹوں انتظار کے بعد دوسری بس آئی، اس نے ۹ بجے دن میں مکہ کے اندر پہونچادیا، مگر بھیڑ کی وجہ سے ہم لوگ ۳ بجے بعد جمعہ سے پہلے اپنے اپنے ٹھکانے پر نہ پہونچ سکے۔

مولوی عبدالحلیم ساتھ تھے مکہ پہونچ کر الگ الگ ہوگئے۔

۲۶/اکتوبر یوم جمعہ۔ مدرسہ فخریہ میں قیام کیا، صابر سکندر نے دن کا کھانا کھلایا، وہاں حاجی تجمل، مولوی نصرت علی، حیات النبی، ظفرالحسن، سید ناصر علی شمس موجود ملے۔

۸/ذی الحجہ (ہندوستان کی ۷ ذی الحجہ) دوشنبہ ۲۹/اکتوبر ۱۹۷۹ء کو بس سے منی روانہ ہوئے، جلد ہی پہونچ گئے، سہ شنبہ (۳۰/اکتوبر) کو بس سے عرفات حاضر ہوئے، زوال سے بہت پہلے آگئے تھے، مکہ سے عبدالباسط بنارسی، اخلاق احمد، حفیظ الرحمٰن اعظم گڈھ وغیرہ کا ساتھ ہو گیا تھا، ہر جگہ یہ لوگ ساتھ رہے، مولوی رضوان بہرایچی کے انتظام میں عبدالباقی سکندر کے خیمہ میں قیام رہا، رضوان کے والد حافظ نعمان نے بھی خدمت گذاری کی۔

۱۰/ذی الحجہ (یکم نومبر) رات منی میں گذار کر ۴/بجے بس پر سوار ہو کر طواف زیارت کے لئے مکہ آیا، فجر کی نماز باجماعت حرم میں پڑھی اور فوراً ہی تن تنہا اسی بھیڑ میں طواف کیا، اب ۱۲ ذی الحجہ ہو گئی ہے، طواف سے فارغ ہو کر مولانا مشتاق کے گھر جاکر کنجی لی اور کمرہ کھول کر پڑ رہا، ۱۰/بجے تک ظفرالاسلام ساتھ رہے، ان کو بس کا کرایہ دے کر رمی کے لئے بھیج دیا۔

۱۲۔ کو رات میں ہمارے رفقاء اور مئو کے حجاج منی سے واپس ہوئے۔

۱۲/ذی الحجہ (۲ نومبر) کو جمعہ تھا، بیحد رش تھا، میں نے ظہر پڑھی، اس

دن منی سے آنے والوں کو بڑی پریشانی ہوئی۔

۱۳ر ذی الحجہ ۳ نومبر ۱۹۷۹ء۔ آج شیخ ابوالفتح بیانونی دن میں اور الاستاذ حسن ضیاء الدین عترزات میں ملنے آئے، مغرب سے پہلے سید لقمان بی بی پور والے ملنے آئے وہ حائل میں مدرس ہیں۔

۱۴ر ذی الحجہ ۴ر نومبر ۱۹۷۹ء۔ آج مولانا صدیق باندہ والے ملنے آئے، خریدنی کتب کے بارے میں مشورہ لیا، مولانا عبدالحلیم گوریٰنی والے بھی تشریف لائے، شیخ ابوالفتح ایک جماعت کے ساتھ آئے۔

۱۵ر لقمان نے پھل ہدیہ کئے، کچھ دوائیں دیں۔

۱۶ر انس ریاض گئے، آج ہی جدہ سے مولوی انعام الحق محمد آبادی ہندوستان جائیں گے، انھوں نے مکہ میں دووقت دعوت کی۔"

اسی قسم کی ایک تحریر ایک دوسرے کاغذ پر ملی، جس میں قدرے اختصار و تغیر کے علاوہ مضمون تقریباً یکساں ہے، جی چاہتا ہے اسے بھی ہدیۂ ناظرین کر دیا جائے فرماتے ہیں:

"۲۵ر اکتوبر کو بمبئی سے روانہ ہوئے، اسی دن جدہ پہونچے، ۲۶ر کو بعد نماز فجر بس سے مکہ روانہ ہوئے، ۳ر بجے بعد جمعہ مکہ پہونچے، فخریہ میں قیام ہوا، حاجی تجمل و مولوی نصرت علی و مولوی ظفرالحسن و حیات النبی بھی اسی کمرہ میں تھے، ۲۷ر کو ازہر (۱) ریاض سے آیا، ۲۸ کو اقبال آیا، عرفات میں مولوی افتخار و مولوی ہاشم وقوف کے بعد ملنے آئے، عرفات سے دیر میں روانگی ہوئی، ۱۱ر بجے مزدلفہ پہونچے، مزدلفہ سے سویرے چلے، غلس میں نماز پڑھ کر دعا کی اور روانہ ہوگئے، مگر مزدلفہ سے باہر وقت پر ہوئے، ۸ر بجے منی پہونچے، ۱۱ر کو بعد ظہر ازہر طواف زیارت کو مکہ آیا، وہ ایک بجے رات میں منی واپس ہوا، اور میں ۴ر بجے بس سے روانہ ہوا، فجر کی نماز باجماعت حرم میں پڑھی اور فوراً طواف کیا۔

(۱) مولانا ازہر رشید الاعظمی جو اس وقت جامعۃ الامام محمد بن سعود (ریاض) میں زیر تعلیم تھے۔

۲۴ر ذی الحجہ کو رابطہ گیا۔ ۲۷ر ذی الحجہ ۱۷ر نومبر۔ امام حرم سبیل سے ملا، ایک شیشی عطر اور تلخیص ہدیہ کی، انھوں نے کئی کتابیں دیں، مولوی شمیم سے صولتیہ میں ملا، انھوں نے باب العمرہ پر خلوہ کی کنجی دی۔

یکم محرم ۱۴۰۰ھ کو نماز فجر میں مسجد حرام پر باغیوں نے قبضہ کر لیا۔ آج تین دن ہو گئے ابھی دروازے نہیں کھلے، ۳ر محرم ۱۴۰۰ھ بعد مغرب۔

۱۴ر محرم تک دروازے نہیں کھلے، اس لئے ہم لوگ مدینہ ۱۳ر کو چلے آئے۔ سوا نو چلے قبل مغرب پہونچے۔"

علامہ اعظمیؒ کا یہ آخری حج تھا، اسی سفر میں مدینہ منورہ سے واپسی کے وقت آپ نے وہ پرسوز و جانگداز نعت موزوں فرمائی جس کا ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ حب نبی کا آئینہ دار اور عشق رسولؐ میں ڈوبا ہوا ہے، جس کا پہلا شعر ہے :

زاستانت با سرشک غم بیادت می روم
بادل صد چاک و با صد یاس و حسرت می روم

کشف الاستار عن زوائد مسند البزار حدیث کی اس کتاب کو گوشہ گمنامی سے باہر لانا پھر اس پر تحقیقی کام کر کے شائع کرنا بھی علامہ اعظمی کا نا قابل فراموش علمی کارنامہ ہے، تیسری صدی ہجری کی ایک تصنیف مسند بزار ہے، یہ کتاب اسی کا انتخاب ہے جو نویں صدی ہجری میں علامہ نور الدین ہیثمی کے ذریعہ انجام پایا ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں میں مؤسسۃ الرسالۃ (دمشق) سے چھپی ہے، دو جلدیں (اول و دوم) ۱۳۹۹ھ م ۱۹۷۹ء میں، تیسری ۱۴۰۴ھ، م ۱۹۸۴ء اور چوتھی ۱۴۰۵ھ ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔

شیخ یوسف القرضاوی اور بعض دیگر فضلاء کی مئو تشریف آوری ۲۱ر ۲۲ر ۲۳ر فروری کو دار المصنفین اعظم گڈھ میں بڑے پیمانے پر "اسلام اور مستشرقین" کے موضوع پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی، اس کانفرنس میں برصغیر ہندو پاک کے علاوہ عرب ممالک کی بعض مشہور شخصیتوں نے بھی شرکت کی، جس میں نمایاں

اور ممتاز نام علامہ ڈاکٹر یوسف قرضاوی مقیم قطر کا ہے، قرضاوی صاحب کا شمار اس وقت عالم اسلام کی قد آور علمی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا کانفرنس میں علامہ اعظمی مدعوئین خصوصی میں تھے، اور انھوں نے اس میں شرکت کی پوری تیاری بھی کر لی تھی، لیکن عجیب اتفاق کہ ان ہی دنوں ان پر دل کا دورہ پڑا جس کی وجہ سے وہ اعظم گڈھ جانے سے معذور رہے، کانفرنس میں شرکت کرنے والے بہت سے فضلاء علامہ اعظمی کی ملاقات کے خواہش مند تھے، ان لوگوں نے جب ان کو وہاں نہیں پایا تو کئی ایک مئو حاضر ہوئے، چنانچہ ایک شام علامہ ڈاکٹر یوسف قرضاوی بھی تشریف لائے، علامہ اعظمی سے ان کے فضیلت کدہ پر ملاقات کی، اور مدرسہ مرقاۃ العلوم کی مسجد میں تھوڑی دیر تقریر کی، جس میں علامہ اعظمی کے فضل و کمال، ان کی علمی خدمات اور ان کے تصنیفی و تحقیقی کارناموں کا بڑے بلند آہنگ الفاظ میں ذکر کیا اور خوب سراہا، اور علامہ اعظمی سے اپنی اس ملاقات پر نہایت مسرت و شادمانی کا اظہار کیا۔

شیخ یوسف قرضاوی کی آمد کے دوسرے دن پاکستان کے ایک نامور فاضل اور علامہ اعظمی کے پرانے نیاز مند شیخ نذیر حسین صاحب پنجاب یونیورسٹی لاہور اور ان کے ہمراہ ایک اور عقیدتمند عبدالرحمٰن کوندو صاحب تشریف لائے، شیخ نذیر حسین صاحب نے پاکستان واپس جانے کے بعد اپنی مئو تشریف آوری اور علامہ اعظمی کی خدمت میں حاضری کا اپنے ایک مضمون میں مفصل تذکرہ کیا ہے، جو ہدیہ ناظرین ہے:

"دوسرے دن ناشتہ کے بعد مجھے اور کوندو صاحب کو محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے مستقر کی تلاش ہوئی، مولانا اعظمی مولانا انور شاہ مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور کم وبیش پچاس برس سے حدیث کا درس دے رہے ہیں، مصنف عبدالرزاق کی اشاعت نے انھیں بین الاقوامی شہرت عطا کی ہے۔ بعض علمی مشکلات کے حل کیلئے راقم السطور ان سے رجوع کرتا رہا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مولانا کا وطن مئو ناتھ بھنجن ہے جو اعظم گڑھ سے

تین میل کے فاصلہ پر ہے اور وہاں بس جاتی ہے، میں اور کوندو صاحب بس سے سفر کرتے ہوئے ڈیڑھ گھنٹے بعد پوچھتے ہوئے مولانا اعظمی کے فضیلت کدے پر حاضر ہوئے، سلام مسنون کے بعد کوندو صاحب نے میرا تعارف کرایا تو مولانا اعظمی مجھ سے بغل گیر ہوئے، نہایت مسرت کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ میں تو دل کے دورے کی وجہ سے دارالمصنفین کے سیمینار میں شریک نہیں ہو سکا، میں نے اپنا بڑا بیٹا بھیج دیا تھا اور اسے تاکید کردی تھی کہ اگر شیخ صاحب (راقم السطور) لاہور سے آئے ہوں تو انھیں ضرور لایا جائے، میں نے عرض کیا بندہ خود حاضر ہو گیا ہے، فرمانے لگے کل رات مشہور مصری فاضل جناب یوسف القرضاوی بھی ان سے ملنے آئے تھے، اس کے بعد وہ اپنی بیٹھک میں لے آئے جہاں چاروں طرف الماریوں میں کتابیں بھری تھیں۔ انھوں نے اپنی شائع کردہ حدیث کی کتابیں دکھائیں، ان میں سے حدیث کی ایک نایاب کتاب زوائد البزار بیروت سے ۲ جلدوں میں نہایت آب و تاب سے شائع ہوئی ہے، اب مولانا اعظمی مصنف ابن ابی شیبہ کی تصحیح و تعلیق میں مصروف ہیں اور اس کی تین جلدیں چھپنے کے لئے حجاز بھیج چکے ہیں۔ کوندو صاحب نے مولانا اعظمی سے انوار الباری (ترجمہ و شرح اردو صحیح بخاری از سید احمد رضا بجنوری) کے متعلق رائے دریافت کی۔ مولانا اعظمی نے فرمایا کہ بجنوری صاحب نے بعض جگہ متشددانہ کلام کیا ہے اور حد اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں، جو اکابر علماء دیوبند کی علمی روایت کے خلاف ہے۔ مولانا نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے استاذ مولانا انور شاہ مرحوم و مغفور نے کبھی بھی کسی امام یا مجتہد کی تنقیص یا تحقیر نہیں کی، وہ ہمیشہ امام ابن تیمیہ کو شیخ الاسلام اور حافظ ابن حجر کو حافظ الحدیث کے لقب سے یاد کرتے رہے، راقم السطور نے صحیح بخاری کی مختلف شروح (فتح الباری اور عینی) کے متعلق ان کی رائے پوچھی، فرمانے لگے جہاں تک حدیث کے فنی مباحث کا

تعلق ہے، فتح الباری کو تمام شروح پر فوقیت حاصل ہے، لیکن عینی، عمدۃ القاری میں بعض معلومات (مثلا صرفی ونحوی مشکلات کا حل، بلاغی نکات کا بیان اور فقہی مسائل کی صراحت) فتح الباری سے زائد ہیں۔ اس لئے ایک مدرس یا صاحب ذوق عالم کے لئے ان دونوں شرحوں کا مطالعہ لازمی اور ضروری ہے، مولانا اعظمی فنون حدیث کے علاوہ تاریخ اور ادب کا بھی ستھرا ذوق رکھتے ہیں، طبقات اور تراجم کی کتابوں پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ میرے رفیق سفر کوندو صاحب کو سید علی ہمدانی اور کشمیر کے دوسرے علماء کے حالات کی جستجو تھی، وہ ان کے حالات دریافت کرتے رہے اور مولانا اعظمی متعلقہ کتب کی نشاندہی فرماتے رہے، کھانے کے بعد ہم نماز پڑھنے کے لئے قریب کی مسجد میں گئے، مولانا اعظمی نے یہ مسجد سات آٹھ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کرائی ہے، نماز کے بعد نمازیوں سے ہمارا تعارف کرایا اور مسجد کے تمام حصے بڑے شوق سے دکھائے، مسجد سے واپسی پر دیکھا کہ بہت سے ہندو ان کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں، معلوم ہوا کہ یہ مولانا سے تعویذ لینے آئے ہیں۔

مولانا اب درس و تدریس چھوڑ کر تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے ہیں، ان کی عمر اسی بیاسی برس کے قریب ہے۔ لیکن صحت ماشاءاللہ بہت اچھی ہے اور اپنی عمر سے کم معلوم ہوتے ہیں، مولانا گھر کے بھی خوشحال ہیں۔ یوپی اسمبلی کے ممبر رہ چکے ہیں، لیکن رہن سہن، بالکل سادہ اور درویشانہ ہے، علم و فضل کے باوجود غرور و تمکنت اور خودستائی نام کو نہیں، علمی انہماک کا یہ عالم ہے کہ اب بروکلمان کی تاریخ الادب العربی (عربی ترجمہ) پر استدراک لکھ رہے ہیں اور بعض شوقین طلبہ کو مقدمہ ابن الصلاح بھی پڑھاتے ہیں، طلباء کی آمد پر ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور مولانا نے دعائیں دے کر ہمیں رخصت کیا۔ مولانا کے بڑے صاحبزادے مولوی رشید احمد صاحب دور تک ہمیں چھوڑنے آئے۔ (المعارف لاہور۔ مئی ۱۹۸۲ء ص ۳۴ تا ۳۵)

امریکہ سے دعوت نامہ | شکاگو میں واقع امریکہ کے اسلامک سینٹر کے ڈائرکٹر مسٹر جابر محمد ہربرٹ نے الصلاۃ والاسلام کے نام سے امریکی مسلمانوں کے لئے ایک کتاب لکھی، ہربرٹ صاحب نے امریکہ میں اس کتاب کی وسیع پیانے پر اشاعت کا پروگرام بنایا، ان کا ارادہ تھا کہ اس کتاب کی تکمیل کے بعد رسم اجراء کی تقریب منعقد کریں، اس تقریب کے لئے انھوں نے دو شخصیتوں کا انتخاب کیا، ایک طنجہ کے مشہور عالم و محدث شیخ عبداللہ بن الصدیق الغماری اور دوسرے علامہ اعظمی کا، اس مقصد سے ۱۸؍ جنوری ۱۹۸۲ء کو شیخ احمد درویش نے علامہ اعظمی کے پاس درج ذیل خط بھیجا:

"إلى حضرة ريحانة الزمان مولانا المحدث الفاضل حبيب الرحمن الأعظمى نفعنى الله به تعالىٰ

السلام عليكم و رحمة الله و بركاته وبعد،

فقد كلفنى كل من مولاى المحدث السيد عبدالله الصديق الغمارى بطنجة۔ بالهاتف ۔ والسيد جابر محمد هربرت مدير البطل العالمى للملاكمة محمد على كلاى الذى أعمل عنده فى مؤسسته الاسلامية، بأن أتصل بسماحتكم طلبا أن تتكرم و تقبل الدعوة بالزيارة للمؤسسة يوم ۱۰ ؍ مارس ۱۹۸۲م

ذلك أن السيد جابر يريد جمع عمل الأحاديث الصحيحة والحسنة أو معظمها ، والسيد عبدالله بن الصديق قد تسلّم تذاكره ليحضر مع زوجته و خادمتها وأحد مساعديه۔

وكان السيد عبدالله جاء هنا قبل موسم الحج السابق لمدة ۱۱ يوما حيث راجع كتابا عن الصلاة للجماعة الاسلامية الأمريكية التى يرأسها أخو السيد جابر ولها قرابة ۲۰۰ فرع (مسجد أو مركز)بكافة ولايات أمريكا ، وأغلب المترددين من المسلمين

السمر ، وكان والد إمامهم (الإمام محمد وارث الدين) ويدعى الياجه محمد مدعيا للنبوة ثم لما توفي صحح ابنه الامام السالف الذكر المسيرة لعقيدة اهل السنة إلا انهم بالنسبة للحديث جماعة بكر ، وهم يهتمون بالحديث الصحيح والحسن لا غير.

والسيد عبدالله يرجوكم التفضل بقبول الدعوة حتى نرسل لكم التذاكر ، والسيد عبدالله سيحضر لمدة ٤ أشهر حيث يصل يوم ١٠ / مارس.

وأنتم بالخيار لجلوس كل المدة أو بعضها أو أكثر ، وسوف تجلسون في منزل محمد علي كلاى بشيكاغو وهو مكيف مركزيا ، وقد تبرع به محمد علي للمؤسسة و يبنى جابر علي مقربة من هذا المنزل مسجداً علي نفقته الخاصة . . .“

(ریحانۂ عصر محدث فاضل مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی خدمت میں!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھے میرے آقا سید عبداللہ بن صدیق غماری محدث مقیم طنجہ نے ٹیلیفون پر، اور مکہ بازی (Boxing) کے عالمی چیمپین محمد علی کلے کے سیکریٹری مسٹر جابر محمد ہربرٹ نے جن کے پاس ان کے اسلامی ادارے میں میں کام کرتا ہوں، ہر دو نے مجھے یہ حکم دیا، کہ میں آنمحترم سے رابطہ قائم کر کے یہ درخواست کروں کہ ۱۰/مارچ ۱۹۸۲ء کو ادارے کی زیارت کی دعوت قبول فرمائیں۔

اس دعوت کی غرض یہ ہے کہ مسٹر جابر محمد تمام صحیح اور حسن احادیث یا ان کے بیشتر حصے کو جمع کرنا چاہتے ہیں، سید عبداللہ بن صدیق نے اپنے ٹکٹ لے لئے ہیں تاکہ اپنی اہلیہ، خادمہ اور ایک معاون کے ساتھ تشریف لا سکیں ۔۔۔

سید عبداللہ یہاں گذشتہ موسم حج سے قبل ۱۱؍دنوں کے لئے آئے ہوئے تھے، اس وقت انھوں نے امریکہ کی اسلامی جماعت کے لئے لکھی گئی نماز پر ایک کتاب کی نظر ثانی فرمائی، اس جماعت کے صدر مسٹر جابر کے بھائی ہیں، اور اس کی تقریباً ۲۰۰ شاخیں مسجد اور مرکز کی صورت میں تمام امریکہ میں پھیلی ہوئی ہیں، اور اس کے بیشتر وارد و صادر سیاہ فام مسلمان ہیں۔ان کے امام، محمد وارث الدین کا باپ، جو الیاجہ محمد کے نام سے جانا جاتا ہے، مدعی نبوت تھا، پھر جب اس کی موت واقع ہوگئی تو مذکورہ بالا امام نے اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق اپنی روش درست کرلی، مگر یہ حدیث کی نسبت سے نوخیز جماعت ہے اور ان کے نزدیک صرف صحیح اور حسن حدیثوں کا اہتمام ہے۔

سید عبداللہ پرامید ہیں کہ آپ اس دعوت کو قبول فرمالیں گے تاکہ ہم ٹکٹ روانہ کردیں، سید عبداللہ ۴؍مہینے کے لئے تشریف لائیں گے اور دس مارچ کو یہاں پہونچیں گے۔

آپ کو اختیار ہے کہ چار مہینے قیام فرمائیں یا کم و بیش، آنجناب کا قیام شکاگو میں محمد علی کلے کے مکان پر ہوگا جو کہ (Central airconditioned) ہے اور جس کو محمد علی کلے نے مرکز کو عطا کردیا ہے، اور جابر اس مکان کے قریب اپنے صرفہ سے ایک مسجد تعمیر کررہے ہیں...)

مذکورہ بالا خط میں امریکی مسلمانوں کے امام محمد وارث الدین کے باپ کی نسبت یہ تحریر ہے کہ وہ مدعیٔ نبوت تھا، لیکن امام وارث الدین نے اپنی روش اور سیرت اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق کرلی تھی، اور ہر چند کہ مدعو کرنے والے جناب محمد جابر ہر برٹ کا تعلق الیاجہ محمد کے ساتھ خط سے بظاہر نظر نہیں آتا، مگر پھر بھی بہت تامل کے بعد اس سفر کے لئے علامہ اعظمی نے کسی طرح سے خود کو آمادہ کیا تو احتیاط کا پہلو پیش نظر رکھتے ہوئے سید احمد درویش کو جواب لکھا:

"فقد تلقیت رسالتکم التی علی غلافها ختم البرید المورخ بالثامن عشر من ینایر ۱۹۸۲م بکل غبطة و سرور، وقد زاد نی سرورا علی سرور أنها صارت سببا لنوع من تجدد العهد بالشیخ عبدالله الصدیق الغماری حفظه الله.

وإنی أرجوك أن ترفع سلامی و تحیاتی الی حضرة الشیخ، ثم تخبره أنی لبیت دعوة السید جابر امتثالا لأمره الشریف، و اعتمادا علیه فی أنه لا تکون تلبیتی هذه تصدیقا لدعوی نبوة أحد بعد سیدنا محمد صلی الله علیه وسلم، أو تاییدا لها، فإن عزمتم إرسال التذاکر فلتکن التذاکر ثلاثا ... ولتکن من دلهی إلی القاهرة، الی شیکاغو، والمقصود أن لا تفوتنی زیارة القاهرة بدءاً أو عوداً.

وإنی لا استطیع أن أمکث عندکم إلا أیاماً قلائل، و تفضلوا باهداء سلامی تحیة الاسلام الی السید جابر و ذویه."

علامہ اعظمی فرماتے ہیں کہ "آپ کا خط، جس کے لفافے پر ۱۸؍ جنوری ۱۹۸۲ء کی ڈاک کی مہر ثبت ہے، پا کر بڑی خوشی اور مسرت ہوئی، میری خوشی میں اس بات سے اور اضافہ ہو گیا کہ یہ شیخ عبداللہ صدیق غماری حفظہ اللہ کے ساتھ تجدید عہد کا سبب بنا۔

امید ہے کہ آپ میرا سلام و تحیہ جناب شیخ کی خدمت میں پہنچادیں گے، پھر آپ ان تک میرا یہ پیغام بھی پہنچادیں گے کہ میں نے مسٹر جابر کی دعوت کو، ان کے (شیخ عبداللہ غماری کے) حکم کی تابعداری کرتے ہوئے اور ان کے اوپر اس بات کے لئے اعتماد کرتے ہوئے قبول کرلیا ہے کہ میری یہ قبولیت، ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کی نبوت کے بعد، کسی کے دعویٰ نبوت کی تصدیق یا تائید کے لئے نہ سمجھی جائے، اس کے بعد اگر آپ ٹکٹ بھیجنا چاہتے ہیں تو ٹکٹ تین ہونے

چاہئیں، اور یہ کہ وہ دہلی سے قاہرہ اور قاہرہ سے شکاگو کے ہوں، اس کا مقصد یہ ہے کہ آمد یا رفت میں قاہرہ کی زیارت کا موقع فوت نہ ہو۔

اور میں آپ کے یہاں چند دن سے زیادہ قیام نہیں کر سکتا، میرا اسلام، جو اسلامی طرز سلام ہے، مسٹر جابر اور ان کے متعلقین تک پہنچا دیجئے۔"

علامہ اعظمیؒ اس سفر کے لئے آمادہ ہو گئے تھے، اور جہاں تک میرا خیال ہے اس سفر کا ایک بہت بڑا محرک قاہرہ کا شوق دید تھا، لیکن حالات نے مساعدت نہیں کی اور ناسازیٔ طبع کے باعث اس پروگرام کو ملتوی کرنا پڑا، اس کے بعد بھی کئی خطوط شیخ سید احمد دریش کے اس سفر کے لئے آئے، لیکن پھر آپ آمادہ نہیں ہوئے اور بہت سارے دعوتناموں کی طرح یہ دعوت نامہ بھی سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔

صدر جمہوریہ ایوارڈ ۱۹۸۴ء میں علامہ اعظمی کو ان کی شاندار علمی خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ایوارڈ دیا گیا، لیکن یہ ایوارڈ آپ کے لئے باعث اعزاز نہیں تھا، بلکہ اس کو قبول فرما کر آپ نے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ فرمایا، انھوں نے تمام علمی خدمات خلوص و للّٰہیت کے ساتھ انجام دی تھیں، حطام دنیا کی حرص میں نہیں، اور نہ دنیا ان کی خدمتوں کا معاوضہ دینے پر قادر تھی، اس ایوارڈ کو علامہ اعظمی کی نذر کرنے کے لئے ڈاکٹر مختار الدین آرزو سابق صدر شعبۂ عربی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے بھی کچھ کوشش کی تھی، چنانچہ علامہ اعظمی نے ان کو خط میں لکھا، جس کے لہجہ سے اظہار تشکر کے باوجود ناخوشی اور بیزاری صاف جھلکتی ہے:

"اب معلوم ہوا کہ جناب کا بھی اس میں ہاتھ ہے، چونکہ آپ نے نیک نیتی کے ساتھ میرے ساتھ ایک بہتر سلوک کیا ہے، اس لئے میں آپ کا شکر گذار ہوں، مگر میرے خیال میں پہلے میرا عندیہ معلوم کرنا ضروری تھا۔"(۱)

(۱) المآثر ج۲ ش۱ ص۷۹

مدرسہ مرقاۃ العلوم میں سلسلہ درس و تدریس

درس و تدریس کا سلسلہ پوری طرح کبھی متروک نہیں ہوا، بلکہ آخر دم تک جاری رہا، مرقاۃ العلوم کے قیام کے بعد بھی یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا، بلکہ اس وقت تو چراغ صبح کی طرح اور تیز بھڑکنا شروع ہو گیا تھا، اور اس کے ابتدائے قیام سے لے کر آخری لمحے تک اس کے طلبہ کو محض اپنی شفقت و عنایت اور لطف و کرم سے کسی نہ کسی کتاب کا سبق پڑھاتے رہے، بلکہ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ کئی کئی کتاب کا سبق اپنے پاس رکھتے۔

متنبی اور حماسہ کا درس

چنانچہ خود ہم نااہلوں نے ان سے ایک ایک سال میں کئی کئی کتابیں پڑھیں، ۵-۱۴۰۴ھ م ۸۵-۱۹۸۴ء میں ہماری جماعت کو دیوان متنبی و دیوان حماسہ پڑھایا، کچھ دنوں پہلے تک ناچیز کے پاس موجود دیوان حماسہ پر ایک کور چڑھا ہوا تھا، جس پر اس ناچیز نے زمانۂ طالب علمی میں یہ نوٹ لگایا تھا:

"۲۷/ جنوری ۱۹۸۵ء مطابق ۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ کو حضرت مولانا نے پہلا درس دے کر اس کتاب کو شروع کرایا، پھر اس کے بعد حضرت ہی کے پاس سبقاً سبقاً طلقاً طلقاً ہم سب یہ کتاب پڑھتے رہے۔"

مصنف ابن ابی شیبہ

ابوبکر بن ابی شیبہ (متوفی ۲۳۵ھ) اس کے جامع اور مصنف ہیں، یہ کتاب بھی مصنف عبدالرزاق ہی کی طرح قدیم اور ضخیم ہے، اس کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے تھے، اور اس کے کچھ اجزاء حیدر آباد اور ملتان وغیرہ سے شائع بھی ہوئے تھے، لیکن اس میں تصحیح و تحقیق کا اہتمام بالکل نہیں برتا گیا تھا، علامہ اعظمی نے بعض اہل علم کی فرمائش پر اس کی تحقیق و تعلیق اور تخریج و تحشیہ کا بیڑا اٹھایا، اور شبانہ روز کی محنت سے اس کی تقریباً ۱۵/ جلدوں پر تحقیق و تحشیہ کا کام انجام دیا، مگر اس کی اب تک صرف چار ہی جلدیں شائع ہو سکی ہیں، یہ چاروں ہی علامہ اعظمی کی حیات میں شائع ہوئی تھیں، پہلی ۱۴۰۳ھ م ۱۹۸۳ء میں اور تین ۱۴۰۴ھ م ۱۹۸۴ء میں۔ اس کے بعد کی جلدیں بھی ناشر کے پاس بھیجی جا چکی ہیں، اب پتہ نہیں کس مرحلہ میں ہیں۔

بغداد کی اسلامی کانفرنس کے لئے دعوت عراق، ایران جنگ سے پیدا شدہ صورتحال کے جائزہ کے لئے ۱۹۸۵ء میں ۲۲ تا ۲۵؍اپریل بغداد میں ایک عالمی اسلامی کانفرنس منعقد کی گئی، اس کانفرنس کی انتظامی کمیٹی نے علامہ اعظمی کے نام دعوتنامہ بھیجا جسے اس وقت کے عراقی سفیر برائے دہلی فخری اے کیوالقیسی نے اپنے ایک خط کے ساتھ ملحق کر کے ۱۵؍مارچ ۱۹۸۵ء کو آپ کے پاس روانہ کر دیا، وہ خط ہدیہ ناظرین ہے:

> *"... I Have the honour to forward herewith text of telex message dated 11th of March, 1985 from the preparatory committee for the second Popular Islamic Conference to be held in Baghdad during 22-25 April, 1985. I shall be grateful if your acceptance is kindly conveyed as soon as possible for further action."*
>
> (میں دوسری عوامی اسلامی کانفرنس کی انتظامی کمیٹی کی طرف سے ۱۱؍مارچ ۱۹۸۵ء کو جاری کردہ ایک ٹیلیکس پیغام کو آپ کی خدمت میں روانہ کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، جس میں آپ کو، ۲۲ تا ۲۵؍اپریل ۱۹۸۵ء کو بغداد میں منعقد ہونے والی دوسری عوامی اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لئے دعوت دی گئی ہے ۔ میں آپ کا بڑا شکر گذار ہوں گا اگر آپ کی منظوری کی اطلاع جلد از جلد ہمیں موصول ہو جائے تاکہ آگے کی کارروائی کی جاسکے۔)

آپ نے یہ دعوت منظور فرمائی اور منظوری کی اطلاع عراقی سفیر برائے دہلی کو روانہ فرمادی، اس کے بعد اس سلسلہ میں بڑا دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ بغداد جانے کے لئے گھر سے پوری طرح تیار ہو کر نکلے، لیکن ابھی بنارس کے بابت پور ایرپورٹ ہی پر تھے کہ طبیعت کچھ ناساز محسوس کی، ناسازیٔ طبع کا یہ معمولی سا احساس وہیں سے ان کو گھر واپس لے آیا یہ سفر سے وحشت کی وجہ سے تھا، ورنہ آپ کی طبیعت اس وقت ایسی نہ تھی کہ سفر جاری رکھا جاسکتا۔ آپ کی عدم شرکت سے وہاں کے منتظمین نے سخت افسوس کا اظہار کیا، اور کانفرنس کی کمیٹی کے سکریٹری جنرل محقق فاضل شیخ بشار عواد معروف نے (جو آپ کی

تحقیقات کے بڑے قدرداں بھی ہیں) اس کے اختتام کے بعد اظہار افسوس کرتے ہوئے اس کی قرارداد اور تفصیلات علامہ اعظمی کے ملاحظہ کے لئے خدمت عالیہ میں روانہ فرمائیں۔

سفر مصر: مصر فتوحات اسلامیہ میں داخل ہونے کے بعد سے ہی اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کا ایک اہم مرکز بن چکا تھا، اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اس کی مرکزیت میں اضافہ ہوتا گیا، اس خاک سے ہر دور میں اہل دولت و ثروت، ارباب فضل و کمال، فقہاء و ادباء اور محدثین و مؤرخین اٹھے اور نام آور ہوئے ہیں، اور یہی نہیں بلکہ اس کی مرکزیت دوسرے ملکوں کے اہل علم کو بھی اپنی طرف کھینچتی رہی ہے، جو پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تو کہیں اور، لیکن ان کے فیضان کا اصلی میدان یہی وادیٔ نیل رہی، مصر آج بھی تجدد پسندی اور مغربیت سے شدید طور پر متاثر ہونے کے باوجود، عربی اور اسلامی ادب و ثقافت اور علم و فن کا مرکز شمار ہوتا ہے۔ دنیا کی قدیم ترین اسلامی درسگاہ اسی سرزمین پر واقع ہے، یہاں کے کتب خانوں میں نہ جانے کتنے بیش قیمت اور نادر مخطوطات پائے جاتے ہیں جن کا کہیں اور وجود نہیں، یہاں سے ہر سال بے شمار کتابیں چھپتی ہیں اور عالم اسلام بلکہ سارے عالم کے علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کرتی ہیں۔

مصر کی یہ علمی و ادبی مرکزیت اہل علم کیلئے ہمیشہ باعث کشش بنی رہی ہے، اس کے سفر اور زیارت کی خواہش علامہ اعظمی کو بھی ہمیشہ رہی، چنانچہ پہلے سفر حج ۱۹۵۰ء سے لے کر کئی دفعہ ان کے دل میں اس کی تحریک از خود پیدا ہوتی رہی۔ ایک آدھ بار وہاں سے دعوت نامے بھی آئے اور آپ آمادۂ سفر بھی ہوئے، لیکن کسی مانع کی وجہ سے یہ سفر معرض تعویق میں چلا گیا۔ پھر نومبر ۱۹۸۵ء میں قاہرہ میں ایک عظیم الشان بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں شرکت کیلئے آپ کو بھی دعوت دی گئی۔ آپ نے اس سفر کا پروگرام بنایا، لیکن ارادہ و آمادگی کے باوجود، طبیعت و مزاج کی وجہ سے، کئی دفعہ ایسا محسوس ہوا کہ شاید اس بار بھی یہ سفر پیش آنے سے رہ جائے، لیکن جاذبۂ توفیق نے ساتھ نہیں چھوڑا، اور اکتوبر ۱۹۸۵ء کے اواخر میں آپ گھر سے دہلی کے لئے روانہ ہوئے

دہلی سے بمبئی گئے اور بمبئی سے قاہرہ کے لئے روانگی ۲۳ر نومبر کو ہوئی، اس سفر میں آپ کے بڑے صاحبزادے مولانا رشید احمد صاحب ہمراہ تھے، مصر میں آپ کا قیام ۱۳ر دن رہا، اس سفر میں مصری اہل علم اور کانفرنس کے شرکاء نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ اور بڑے پرتپاک انداز میں آپ کا استقبال کیا، ہوٹل ماریوت (Marriot Hotel) جہاں آپ کا قیام تھا، آنے جانے والوں کا ہر وقت ایک سلسلہ لگا رہتا، جن میں بیشتر تعداد ان اہل علم کی ہوتی جو آپ سے استفادہ کرتے اور اپنے اشکالات و مسائل حل کرتے، وہاں کی نمایاں شخصیتوں میں ایک نہایت فاضل شخص ڈاکٹر حسینی ہاشم تھے، یہ اس وقت وکیل الازہر تھے انھوں نے علامہ اعظمی سے ان کے مدرسے کا الحاق جامع ازہر سے کرانے کی اصرار کے ساتھ پیشکش کی، لیکن آپ مصر کی مغرب پسندی اور تجدد کے سیلاب کی وجہ سے اس کے لئے تیار نہ ہوئے۔

آپ کے کاغذات میں ایک تجویز ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو آپ نے تحریری طور پر صدر کانفرنس کے سامنے پیش کیا تھا، وہ تجویز یہ ہے:

"أقترح على رئيس المؤتمر، أن يتخذ قرارا بطبع طبقات ابن سعد من جديد، كاملا، مع العناية بتحقيق النص، فإن الكتاب طبع مرتين، وفيه نقص كبير في عدة مواطن، وهذا النقص يرجى تلافيه، من اعتماد ما يوجد من صور أو أفلام الكتاب في خزانة كتب جامعة الدول العربية بالقاهرة."

(میں کانفرنس کے صدر کے سامنے یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ وہ طبقات ابن سعد کی، تحقیق کے ساتھ، از سر نو مکمل طباعت کی قرارداد پاس کریں، اس لئے کہ یہ کتاب دو دفعہ چھپی ہے اور اس میں کئی جگہ نقص ہے، اور اس نقص کی تلافی کی امید قاہرہ کی جامعۃ الدول العربیہ کی لائبریری میں موجود کتاب کی تصویروں یا فلموں پر اعتماد کر کے کی جا سکتی ہے)

یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ علامہ اعظمی نے کبر سنی کے باوجود طبقات کی تحقیق کا حوصلہ بھی کیا تھا، اور ان کے دل میں اس عظیم الشان کام کی انجام دہی کا شدید داعیہ بھی پیدا ہوا تھا، چنانچہ انھوں نے اپنے اس ارادے کا اظہار وکیل ازہر ڈاکٹر حسینی ہاشم سے کیا، جو کانفرنس کے جنرل سکریٹری بھی تھے، تو انھوں نے اپنے دفتر کے لیٹرپیڈ پر جامعۃ الدول العربیہ کے مشرف، بریگیڈیر محمد عبدالظاہر ہاشم کے نام حسب ذیل تحریر لکھ کردی:

" فالمرجو التكرم بتمكين الشيخ حبيب الرحمن الأعظمی كبير محدثی الهند من تصوير نسخة من مخطوط الطبقات الكبرى لابن سعد الموجود بالجامعة و ذلك لما لفضيلته من جهود عظيمة فی خدمة السنة . "

(ہندوستان کے محدث کبیر شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی کو جامعہ میں موجود طبقات ابن سعد کے مخطوطے کی فوٹو کاپی کی فراہمی کی امید کی جاتی ہے، وہ اس لئے کہ حدیث کی خدمت میں جناب کی عظیم الشان خدمات ہیں۔)

لیکن آپ کی زندگی کا پیمانہ اب آہستہ آہستہ لبریز ہوتا جارہا تھا، اور یہ زندگی بھی اب انتہائی مصروفیت کی تھی، اور اس سفر کے بعد عمر نے اتنی وفانہ کی کہ یہ مہم انجام پاسکے، ورنہ اس کتاب کی تحقیق اگر آپ کے ہاتھوں ہوگئی ہوتی، تو ہندوستان کی علمی تاریخ میں ایک اور زریں باب کا اضافہ ہوگیا ہوتا، لیکن

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اسی کاغذ پر ایک دوسری تجویز بھی لکھی ہوئی ہے، وہ یہ ہے:

"وإن كتاب السيرة لمحمد بن إسحاق لا يوجد بكامله فيما أعتقد ، لكنه نقل إلى الفارسية فی عصر الحافظ عبدالعظيم المنذری ، وإن منها نسختين توجدان فی الهند ، إحداهما فی اله آباد، والأخرى فی سهارن پور ، فأقترح على الإمام الأكبر شيخ الأزهر أن يقرر

سماحته أخذ صورة الكتاب ثم نقله الى العربية ، ثم نشره ، عسى أن يسد مسد الأصل ، و يملأ الفراغ الذی نشعر به من فقد الأصل ."

(سیرۃ محمد بن اسحاق میرے علم کے مطابق پوری نہیں پائی جاتی، لیکن وہ حافظ عبدالعظیم منذری کے زمانہ میں فارسی میں نقل کی گئی تھی، جس کے دو نسخے ہندوستان میں پائے جاتے ہیں، ایک الہ آباد میں اور دوسرا سہارنپور میں، لہذا میں امام اکبر شیخ ازہر کے سامنے یہ تجویز رکھتا ہوں کہ آنجناب کتاب کی فوٹو لینے اور اسے عربی زبان میں نقل اور نشر کا فیصلہ کریں، امید ہے کہ وہ اصل کی جگہ لے سکے گی اور اس خلا کو پر کر سکے گی جو ہم اصل کی گمشدگی سے محسوس کرتے ہیں)

مصر میں آپ کا قیام تیرہ دن رہا، اور ۱۶ر نومبر کو وہاں سے واپسی کے لئے روانگی ہوئی، واپسی میں آپ کا ارادہ اردن رکنے کا تھا، اور اس کے لئے وزارت اوقاف کی فرمائش پر اردن کا ویزا بھی مل چکا تھا، مگر پھر طبیعت آمادہ نہ ہو سکی اور سیدھے وطن تشریف لائے۔

آپ کا یہ دورہ اس قدر مختصر تھا کہ مصری اہل علم ابھی آپ کے چشمۂ صافی سے اچھی طرح مستفید بھی نہ ہو سکے تھے، چنانچہ کانفرنس کے اختتام کے بعد وہاں کے وزیر اوقاف ڈاکٹر الاحمدی ابوالنور اور وکیل الازہر نے اصرار کر کے آپ کو روکنا چاہا، اور کہا کہ اب آپ ہمارے مہمان رہیں گے، مگر علامہ اعظمی مزید قیام کے لئے تیار نہ ہوئے اور واپسی کے بعد ڈاکٹر احمدی ابوالنور (۱) نے جلد ہی پھر علامہ اعظمی کو دعوت دے کر انھیں

(۱) ڈاکٹر الاحمدی ابوالنور علامہ اعظمی کے فضل و کمال کے بڑے معترف تھے، جس کا اندازہ ان کی اس بات سے ہوتا ہے جس کو وزیر احمد صاحب ندوی نے قاہرہ سے ۲۰ر اپریل ۸۶ء کو لکھا ہے کہ ایک اعظمی لڑکے کا ازہر میں مناقشہ (Viva Voce) ہوا، مناقش یہی ڈاکٹر صاحب موصوف تھے، انھوں نے اس لڑکے کے نام کیساتھ جب الاعظمی دیکھا تو فوراً بول پڑے: " أسرة الأعظميين التی يتزعمها الشيخ حبيب الرحمن الأعظمی حفظه الله، لا تزال تخدم السنة النبوية ." وہ سمجھتے تھے کہ اعظمی کوئی خاندان یا قبیلہ ہے اس لئے انھوں نے کہا (اعظمیوں کا خاندان جس کے سربراہ شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی حفظہ اللہ ہیں، برابر حدیث نبوی کی خدمت کر رہا ہے)

مصر بلانا چاہا، اور اس کے لئے انھوں نے خود ہی دو ٹکٹ بھیجنے کی بھی خواہش ظاہر کی، جیسا کہ ڈاکٹر صلاح الدین ندوی ازہری نے اس سفر کے تقریباً پونے دو مہینے بعد ۷ر جنوری ۱۹۸۶ء کو خط لکھا کہ وکیل ازہر داکٹر حسینی ہاشم نے ان کے پاس وزیر موصوف کا یہ پیغام بھیجا کہ ان کی خواہش ہے کہ مولانا اعظمی اگر قاہرہ آنے کا ارادہ کریں تو وہ (الاحمدی ابوالنور) دو ٹکٹ بھیج دیں، لیکن ما کل ما یتمنی المرء یدرکه.

جنوبی ہند کا ایک سفر شدید ترین تدریسی، تصنیفی اور تحقیقی مصروفیات اور علمی مشاغل کے باوجود آپ تقریباً ہر مہینہ اور ہر سال تھوڑا بہت وقت اندرون ملک کے سفر کے لئے نکال لیتے تھے، اور اس طرح سے مختلف اوقات میں تقریباً ملک کے ہر حصے کے سفر فرمائے، کتابوں اور بالخصوص نادر مخطوطات سے چونکہ آپ کو شیفتگی اور وارفتگی تھی، اسلئے ان مقامات کے سفر کا شوق زیادہ دامنگیر رہتا جہاں بڑے بڑے کتب خانے ہوں اور ان میں مطبوعات و مخطوطات کے قیمتی ذخائر ہوتے، ان کے علاوہ مذہبی، ملی اور علمی اداروں کی دعوتوں پر بھی آپ نے اندرون ملک بہت سے دورے کئے، یہاں ہم جنوبی ہند کے ایک سفر کا تذکرہ اس بنا پر کر رہے ہیں کہ اس کے بارے میں خود علامہ اعظمیؒ کی ایک تحریر ہمیں دستیاب ہوئی ہے، آپ کو یادداشت تحریر کرنے کی باقاعدہ عادت نہیں تھی، بس اتفاقیہ کبھی کوئی بات کسی کاغذ پر تحریر کر دیتے، چنانچہ ان منتشر تحریروں نے اس سوانح کی ترتیب میں ہماری بڑی رہنمائی بھی کی ہے۔ انھیں اتفاقی تحریروں میں یہ بھی ہے:

"۱۰ر مارچ ۱۹۸۶ء کو ساڑھے چار بجے بنارس سے روانہ ہوئے، دہلی ۶ر بجے پہنچے، ٹیکسی کر کے مسجد عبدالنبی آکر قیام کیا۔ ۱۱ کی صبح ۹ بجے ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوئے، بنگلور کیلئے پونے گیارہ بجے روانہ ہوئے، سوا بجے بنگلور پہونچے، ایرپورٹ پر استقبال کیلئے لوگ آگئے ان کے ساتھ شہر میں آکر مدنی منزل حریز ٹاؤن میں قیام ہوا، ۱۲ر کو اصلاح البنات اور جامعۃ العلوم میں دعا کیلئے گئے، اور مدرسہ شاہ ولی اللہ میں نماز عصر ادا کی، اس کے بعد سراج العلوم جلسۂ عام میں شریک ہوئے" [96]

بعد مغرب حفاظ کی دستار بندی عمل میں آئی یہ تقریب اس ناچیز کے ہاتھوں سے انجام پائی۔ ۱۴ر کی صبح کو سیلم کے لئے روانہ ہوئے، دھرم پوری مدرسہ معراج العلوم دیکھا، اور اس سے متعارف ہوا، مدرسہ کے ایک کارکن کے یہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ اس سفر میں مولانا معراج الحق (۱)، مولانا مرغوب الرحمٰن (۲)، مولانا سعید احمد پالنپوری (۳)، مولانا قمر الدین (۴) اور حاجی علاء الدین (۵) سیلم تک

---

(۱) رجب ۱۳۲۸ھ م ۱۹۱۰ء میں دیوبند میں پیدا ہوئے، آپ کے والد بزرگوار منشی نور الحق بسلسلۂ ملازمت پنجاب کے ایک قصبہ "برنالہ" میں مقیم تھے، وہیں آپ نے پرائمری درجات کی تعلیم پائی، اس کے بعد مڈل تک کی تعلیم دیوبند میں حاصل کی، بعد ازاں دیوبند میں ہی اردو فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، ۱۳۴۵ھ میں آپ کے والد کا تبادلہ سہارنپور ہو گیا، ساتھ ہی آپ بھی وہاں کے مدرسہ مظاہر علوم میں داخل ہو گئے، ۱۳۴۹ھ میں دار العلوم میں دوبارہ داخلہ لیا اور ۱۳۵۱ھ میں فراغت پائی، اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے "مولوی فاضل" کا امتحان دیا، درس و تدریس کی ابتدا مدرسہ ہاشمیہ جامع مسجد زکریا اسٹریٹ بمبئی سے کی، یہاں ۱۳۵۳ھ م ۱۹۳۴ء سے ۱۳۵۸ھ م ۱۹۳۹ء تک رہے، اس کے بعد گلبرگہ گئے، جہاں مدرسہ دینیہ روضتین کے اہتمام و صدارت کا منصب آپ کے سپرد رہا، ۱۳۶۲ھ ۱۹۴۳ء میں آپ کا تقرر دار العلوم میں ہو گیا، درس و تدریس کے علاوہ دار العلوم میں مختلف انتظامی ذمہ داریاں بھی آپ نے سنبھالیں، چنانچہ ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء سے ۱۳۹۳ھ ۱۹۷۳ء تک نیابت اہتمام کا عہدہ سنبھالا، اور ۱۴۰۲ھ سے تادم آخر صدارت تدریس کے منصب پر فائز رہے۔ ۷ر صفر ۱۴۱۲ھ ۱۸ر اگست ۱۹۹۱ء یکشنبہ کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا، (دار العلوم وفیات نمبر ۱۳۵۔۱۴۳)

(۲) دار العلوم دیوبند کے موجودہ مہتمم ہیں۔

(۳) دار العلوم میں استاذ حدیث ہیں تدریسی صلاحیت کمال کی ہے، درس ترمذی کو خاص شہرت حاصل ہے۔

(۴) بڑہل گنج گورکھپور کے باشندہ اور دار العلوم میں استاذ ہیں۔

(۵) گجرات کے باشندے، بمبئی کے چائے کے مشہور تاجر اور دار العلوم دیوبند کی شوریٰ کے رکن تھے، تبلیغی جماعت میں بہت پیش پیش رہتے تھے۔

ہم سفر رہے ، سیلم میں مولانا شفیق الرحمٰن خاں(۱) صاحب کا مسکن قیام گاہ رہا، ۱۳؍ کو بعد عصر مظاہر علوم سیلم کے چھ لڑکوں کو بخاری شریف ختم کرایا اور ان کی دستار بندی کی، پھر وہاں کے اساتذہ نے بخاری شریف کی پہلی حدیث پڑھ کر اجازت حاصل کی، بعد مغرب مدرسہ داؤدیہ (ایروڈ) وغیرہ کے اساتذہ نے بخاری شریف کی پہلی حدیث پڑھ کر اجازت حاصل کی، وہاں سے دوسرے دن ۱۴؍ مارچ کو وانمباڑی کے لئے بذریعہ کار روانہ ہوئے، براہ دھرم پوری و کرشنا گیری وانمباڑی دوپہر کو پہنچے، پروفیسر نصر اللہ لینے کیلئے سیلم پہونچے تھے، وانمباڑی میں حاجی عبدالحمید آلت تور کے مکان پر قیام رہا، بعد مغرب مسجد قادر پیٹ میں بیان ہوا، دوسرے دن ناشتہ کے بعد وانمباڑی کے مدرسہ معدن العلوم کو دیکھتے ہوئے وہاں سے روانہ ہوئے ۔ آمبور، عمر آباد، گڑیاتم ہوتے ہوئے پرنام بٹ کے مدرسہ وصیۃ العلوم پہنچے، وہاں پر دعا وغیرہ سے فارغ ہو کر پلمنیر کیلئے روانہ ہوئے، پرنام بٹ کے مدرسہ کے سرپرست مفتی نثار احمد صاحب اور ناظم مفتی سعید بن مفتی محمود صاحب مرحوم ہیں۔ حکیم ذکی الدین اور حکیم محمد امین بھی مدرسہ سے تعلق رکھتے ہیں، مفتی محمود صاحب مرحوم حضرت شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز تھے، اور ان کے لڑکے مولانا ابرار الحق صاحب کے مجاز ہیں۔ وہاں سے پلمنیر کے مدرسہ معہد العلوم الاسلامیہ پہنچے، جو صوبہ آندھرا میں ہے، اس کے ناظم و بانی مولانا عبدالرحیم صاحب ہیں، وہاں پر معہد کے سارے اساتذہ اور بنگلور کے بہت سے علماء جن کی تعداد ۲۲ تھی اوائل کی پہلی حدیث پڑھ کر اجازت حاصل کی، اس کے مدرسہ کی جدید عمارت کی بنیاد رکھی۔"

(۱) سیلم کے مدرسہ مظاہر علوم کے شیخ الحدیث ہیں، ذیقعدہ ۱۴۰۲ھ میں مئو آئے، اور ہماری جماعت کے ساتھ علامہ اعظمی کے صحیح بخاری کے درس میں شریک ہوئے، یہ مرقاۃ العلوم میں دورۂ حدیث کا آغاز تھا، جس میں موصوف کے علاوہ ایک جوان شامی فاضل شیخ ایمن رشدی سوید بھی شریک ہوئے، مولانا موصوف تقریباً دو ہفتے کے قیام کے بعد تشریف لے گئے۔

قراءت واجازت حدیث کی اس مبارک تقریب کا ۱۵ / مارچ ۱۹۸۶ء مطابق ۴/ رجب ۱۴۰۶ھ بروز سنیچر دس بجے دن میں انعقاد کیا گیا تھا، اس تقریب سعید کے لئے مولانا عبدالرحیم صاحب مدیر معہد نے خاص اہتمام کیا اور حصول برکت کے لئے علماء کے علاوہ اعیان شہر اور قرب وجوار کے معززین کو شرکت کی دعوت دی تھی، جس کیلئے انھوں نے باقاعدہ دعوتنامہ چھپوا کر اہل شہر میں تقسیم کرایا تھا۔

دست کار اہل شرف یہ علامہ اعظمی کی ایک قدیم تصنیف ہے لیکن زمانہ تصنیف کے بعد عرصۂ دراز تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکی تھی، یہ کتاب ان بلند پایہ اکابر کے تذکروں پر مشتمل ہے جن کا تعلق پارچہ بافی کے پیشہ سے تھا۔ ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹۸۵ء میں حسن پریس (مئو) سے چھپ کر مکتبۂ اعظمی (مئو) سے شائع ہوئی۔

بیضاوی، قطبی اور طحاوی کا درس اس وقت احساس نہیں تھا، مگر آج جب حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی وہ شفقت وعنایت یاد آتی ہے تو سوچ کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، آپ کا کرم موسلا دھار بارش کی طرح برستا تھا، لیکن زمین ہی شور تھی، اپنے اندر کچھ اگانے کی صلاحیت کہاں سے پیدا کرتی! قربان جایئے ان کی شفقت و عنایت کے! متنبی و حماسہ پڑھانے کے اگلے ہی سال (۶۔۱۴۰۵ھ) ہم نالائقوں کو تفسیر بیضاوی سورہ بقرہ تک، اس کے بعد قطبی تصدیقات اور امام طحاوی کی شرح معانی الآثار کے کچھ حصے پڑھائے، اس کے علاوہ ایک دوسری جماعت کو کچھ دنوں توضیح و تلویح اور حافظ ابن حجرؒ کی شرح نخبۃ الفکر اور ابتدائی درجے کو بچوں کو المنہاج الجدید پڑھائی۔

قطر یونیورسٹی سے دعوت ۱۹۸۶ء میں قطر یونیورسٹی کے مرکز بحوث السنۃ والسیرۃ (سنت وسیرت ریسرچ سینٹر) کی طرف سے علامہ اعظمی کو دو مہینے کے لئے قطر یونیورسٹی میں قیام اور وہاں رہ کر کچھ علمی امور کی انجام دہی کیلئے دعوت دی گئی، جس کیلئے وہاں کے مدیر جامعہ ا۔د۔ محمد ابراہیم کاظم نے آپ کی خدمت میں ایک خط روانہ کیا، جس وقت یہ

خط پہونچا ہے آپ جنوبی ہند کے سفر پر تھے، یہ علامہ اعظمی کی زندگی کا وہ دور تھا جب آپ جسمانی طور پر ضعف واضمحلال اور امراض کا شکار ہو چکے تھے، اس لئے ایک رفیق سفر کی شرط کے ساتھ اس سفر کیلئے آمادگی ظاہر فرمادی، آپ کی اس مشروط رضامندی کی اطلاع جب مدیر مرکز علامہ ڈاکٹر شیخ یوسف قرضاوی کو ملی ہے تو انھوں نے خوشی و مسرت کے عالم میں ۱۸؍ محرم ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۲؍ ستمبر ۱۹۸۶ء کو حسب ذیل خط روانہ فرمایا:

" فضيلة المحدث الكبير الشيخ / حبيب الرحمن الأعظمي

حفظه الله

السلام عليكم و رحمة الله و بركاته وبعد!

سبق لجامعة قطر أن أرسلت لفضيلتكم تدعوكم أستاذا زائراً لمدة شهرين لمركز بحوث السنة والسيرة، وطلبتم فضيلتكم بعد ذلك ضرورة السماح لمرافق لكم من بداية الرحلة حتى نهايتها.

يسرني أن أوضح لفضيلتكم أن جامعة قطر يشرفها حضوركم أستاذا زائراً لمدة شهرين للاستنارة برأيكم في جهود المركز، و بخاصة حول الموسوعة المقترحة للحديث النبوي الشريف.

كما يسرني أن أعلمكم أنه لا مانع من اصطحابكم من ترونه ليرافقكم في هذه الزيارة كما طلبتم.

فيرجى التفضل بموافاتنا ببيانات جوازي سفركم والمرافق و تحديد موعد حضوركم، حتى يمكن اتخاذ اللازم.

مع خالص تحياتي و تحيات الاخوة هنا من أساتذة كلية الشريعة وأعضاء المركز نسأل الله لكم الصحة والعافية في دينكم ودنياكم.

والسلام عليكم و رحمة الله وبركاته

مدير المركز . يوسف القرضاوي"

(فضیلت مآب محدث کبیر شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی حفظہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

قطر یونیورسٹی اس سے قبل جناب والا کی خدمت میں ایک دعوتنامہ ارسال کرچکی ہے، جس میں آنجناب کو سنت وسیرت ریسرچ سینٹر کیلئے دو مہینے کے واسطے استاذ زائر (Visiting Professor) کی حیثیت سے دعوت دی ہے اور اس کے بعد آنجناب نے آغاز سفر سے اختتام سفر تک ایک معاون کی اجازت کا مطالبہ کیا ہے۔

مجھے آنجناب سے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ قطر یونیورسٹی میں دو مہینے کیلئے استاذ زائر کی حیثیت سے آپ کی تشریف آوری مرکز کی کوششوں میں آپ کی رائے سے استفادہ کا شرف بخشے گی، بالخصوص حدیث نبوی کی مجوزہ انسائیکلوپیڈیا کے سلسلے میں۔

اسی طرح مجھے یہ عرض کرتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ اسکے لئے آپ کے حسب طلب ومنشا ایک رفیق سفر سے کوئی چیز مانع بھی نہیں ہے۔

لہٰذا امید ہے کہ آپ اپنے اور رفیق سفر کے پاسپورٹ کی تفصیلات اور تشریف آوری کے وقت کی تعیین سے مشرف فرمائیں گے، تاکہ اس کے لئے ضروری کارروائی کی جاسکے۔

میرا اور کلیۃ الشریعۃ کے میرے پروفیسر دوستوں اور مرکز کے ارکان کا پرخلوص سلام قبول فرمائیں، ہم خدا سے دین ودنیا کے اندر آپ کی صحت وعافیت کے لئے دعا گو ہیں۔

والسلام علیکم..... مدیر مرکز

یوسف قرضاوی)

حادثۂ لغزش پا علامہ اعظمی کی پوری زندگی ابتلاء سے عبارت رہی، عمر کے اخیر حصے میں جب کہ آپ کی ایک ایک سانس اور ایک ایک لمحے کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا، ایک اور سخت مصیبت سے دوچار ہوئے، ۱۹۸۶ء اگست یا ستمبر کی بات ہے کہ استنجاء کے لئے تشریف لے جارہے تھے، حمام رہائشی کمرے سے بالکل متصل ہی تھا، ناگاہ پاؤں پھسل گیا، بغیر سہارے کے تو آپ کا چلنا مشکل تھا پھسلنے کی صورت میں کہاں خود کو سنبھال سکتے تھے، بے اختیار زمین پر گرے، جس کے نتیجہ میں سخت چوٹیں آئیں اور سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہوئی کہ پسلی کی ہڈی پر شدید چوٹ آئی، اور بہت علاج و معالجے کے بعد بھی اس کا اثر ایک عرصے تک رہا، بلکہ شاید آخر تک مکمل طور پر زائل نہیں ہوا۔

انتخاب امیر الہند ہندوستان میں امارت شرعیہ کے قیام کے لئے طویل عرصہ سے کوشش کی جارہی تھی، برطانوی سامراج کے زمانے میں ہندوستان کے اکابر علماء قیام امارت کے لئے اپنی کوششیں صرف کر چکے تھے، جمعیۃ علماء ہند تو اپنے قیام کے آغاز ہی سے اس مسئلہ پر غور و خوض کر رہی تھی، لیکن سامراج کے زمانے میں چونکہ حالات موافق و مساعد نہیں تھے اور علماء و سربراہان ملت کے سامنے سب سے اہم مسئلہ انگریزوں کے پنجۂ اقتدار سے رہائی کا تھا، اس لئے ان کا یہ فکر حیطۂ عمل میں نہیں آرہا تھا۔

امارت شرعیہ کا فکر اساسی اور اس کا اصلی اور بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کا مسلم معاشرہ جو انتشار و پراگندگی کا شکار ہے، اس کی شیرازہ بندی کی جائے، اور اس کے منتشر اور بکھرے ہوئے شیرازوں کو اس طرح جوڑا جائے کہ وہ ایک یونٹ اور اکائی معلوم ہونے لگے، کیونکہ مسلمانوں کی اصل قوت اجتماع و اتحاد میں ہے نہ کہ افتراق و انتشار میں۔ اور اجتماعیت ہی میں اسلامی شان و شوکت اور قوت و عظمت کا راز مضمر ہے۔ لہذا ہندوستانی مسلمانوں کو ایسے مواقع فراہم کئے جائیں کہ وہ اسلامی شریعت کے مطابق اپنی زندگی گذار سکیں، اور اس کے قوانین کے تحت اپنے مسائل کو حل کر سکیں۔ اپنے اسی فکر کو روبہ کار

کو روبہ کار لانے کیلئے ۲؍نومبر ۱۹۸۶ء مطابق ۲۸؍صفر ۱۴۰۷ھ کو جمعیۃ نے دفتر جمعیۃ علماء ہند نئی دہلی میں اہل علم و فضل اور ارباب فکر و بصیرت کا ایک نمائندہ اجتماع بلایا، جس میں علامہ اعظمی کو باتفاق رائے امیر الہند اول منتخب کیا گیا ، علامہ اعظمی اپنی معذوری کے باعث اس اجتماع میں شریک نہ ہو سکے تھے ، لیکن امیر الہند ہونے کا ان کے جیتے جی ان سے زیادہ مستحق بھی کون ہو سکتا تھا، تاہم یہ امر بھی یقینی ہے کہ امارت نے ان کی قدر و منزلت نہیں بڑھائی بلکہ انھوں نے اپنی ذات سے اس کو اعتبار بخشا۔

مرقاۃ العلوم میں دورۂ حدیث اور علامہ اعظمی کا درس بخاری و ترمذی و مقدمہ مسلم

۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹۸۶ء میں مرقاۃ العلوم میں دورۂ حدیث کا آغاز ہوا، یہ سال ہم نااہلوں کا سندی سال تھا، ہم اس قابل تو ہرگز نہ تھے کہ محدث کبیر کے شاگرد کہلائے جاتے، کجا وہ آفتاب علم و فضل اور کجا یہ چند بے مقدار ذرے! چہ نسبت خاک را باعالم پاک!! واقعہ یہ ہے کہ آج تک اپنی نالائقی کا احساس ہر وقت دامنگیر رہتا ہے اور دل میں یہ خیال اکثر و بیشتر آتا رہتا ہے کہ :

خر عیسیٰ اگر بہ مکہ رود چوں بیاید ہنوز خر باشد

لیکن چونکہ ہم روایتی طور پر دورۂ حدیث پڑھنے کے مستحق ہو گئے تھے ، اس لئے اس روایت پر عمل بھی ضروری خیال کیا گیا، اگر چہ محدث کبیر کسی کے پابند نہیں تھے، مگر خورد نوازی کا بے پناہ جذبہ جو ان کے اندر موجزن رہتا تھا، کام آیا اور دورۂ حدیث کا باقاعدہ آغاز ہو گیا:

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

۲۵؍شوال بروز بدھ ۱۴۰۶ھ کو مسلم شریف کے مقدمے سے اس کی ابتداء ہوئی، چنانچہ آج بھی راقم الحروف کے پاس موجود مسلم شریف پر جلد ساز نے الگ سے جو ایک کاغذ لگا رکھا ہے، تحریر ہے:

"تلقينا الدرس الاول من هذا الكتاب على فضيلة مولانا (بارك

الله فی عمره و حیاته) صباح الاربعاء ۲۵ / شوال سنة ۱۴۰۶ھ)
(اس کتاب کا پہلا سبق ہم نے حضرت مولانا (اللہ ان کی عمروحیات میں برکت عطا فرمائے) کے پاس ۲۵ / شوال ۱۴۰۶ھ کو بدھ کے دن پڑھا)

آپ نے ہم لوگوں کو مسلم شریف کا صرف مقدمہ پڑھایا۔ اس کے بعد یہ کتاب حضرت مولانا عبدالجبار صاحبؒ اور مولانا نسیم اللہ صاحب کے سپرد کر دی۔ اسی طرح ترمذی شریف پر تحریر ہے:۔

"تلقینا الدرس الاول من هذاالکتاب علی فضیلة الشیخ حضرة الاستاذ أبی المآثر حبیب الرحمن الأعظمی صباح السبت ۲۸شوال سنة ۱۴۰۶ھ ثم کنا نقرأه علیه طلقا طلقا و درساً درساً"
(اس کتاب کا پہلا سبق ہم نے فضیلۃ الشیخ حضرت الاستاذ ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کے پاس ۲۸ / شوال ۱۴۰۶ھ سنیچر کی صبح کو پڑھا، پھر ہم آہستہ آہستہ اس کتاب کو آپ کے پاس پڑھتے رہے)

مقدمہ مسلم اور ترمذی شریف کے اسباق ہوتے رہے، لیکن بخاری شریف کا درس ابھی شروع نہیں ہوا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرۃ الاستاذ علامہ اعظمی مرحوم کا ارادہ یہ تھا کہ اس مبارک موقع پر ہندوستان کے اکابر اہل علم کو شرکت کی دعوت دیتے اور اہل علم کے اس اجتماع میں درس بخاری کا آغاز ہوتا لیکن ع

مادر چہ خیالیم و فلک در چہ خیال ست

عجیب اتفاق کہ انھیں دنوں ایک شامی فاضل شیخ ایمن رشدی سوید علامہ اعظمی سے بخاری شریف پڑھنے کیلئے مئو حاضر ہوئے، ان کی تشریف آوری غالباً ذی قعدہ کی پہلی تاریخ کو ہوئی تھی۔ ان کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ علامہ اعظمی کے پاس بخاری شریف سبقاً سبقاً پڑھ کر اجازت و سند حاصل کریں، جس کے لئے وہ تین ہفتے یہاں مقیم رہے، میرے

پاس موجود بخاری شریف پر ایک ٹوٹی پھوٹی عبارت درج ہے، اس میں تحریر ہے:

"بدأنا هذا الكتاب عند فضيلة الشيخ الاستاذ حبيب الرحمن الاعظمي يوم الخميس ۲/۱۱/۱۴۰۶ھ قرأناه عليه رواية ۲۲ يوما يقرؤه عليه الشيخ أيمن رشدى السويد و نحن نسمع حتى انتهينا إلى آخر كتاب الصوم ۲۳/۱۱/۱۴۰۶ھ صباح الخميس ، و بدأناه دراية صباح السبت ۲۵/۱۱/۱۴۰۶ھ"

(اس کتاب کو ہم نے حضرۃ الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے پاس جمعرات ۲/ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ کو صبح میں شروع کیا، ہم آپ کے پاس اس کتاب کو روایۃً ۲۲/دن تک اس طرح پڑھتے رہے کہ شیخ ایمن رشدی سوید پڑھتے اور ہم سنتے، یہاں تک کہ جمعرات ۲۳/ذیقعدہ ۱۴۰۶ھ کی صبح کو کتاب الصوم ختم کر ڈالی، پھر اس کے بعد ۲۵/ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ کی صبح کو معنی و مطلب کے ساتھ آپ کے پاس پڑھنا شروع کیا۔)

اس طرح علامہ اعظمی نے اس سال (۱۴۰۶-۷ھ م ۱۹۸۶-۸۷ء) بخاری شریف مکمل، ترمذی شریف کی دونوں جلدوں کے اکثر حصے، اور مقدمۂ مسلم پڑھائی، وہ زمانہ آپ کے نہایت ضعف اور کمزوری کا زمانہ تھا، نقاہت کی وجہ سے بیٹھ نہیں سکتے تھے، لیٹ کر پڑھاتے تھے، مگر کس قدر ہمت تھی کہ سوائے طبیعت کی خرابی یا سفر کے کبھی ناغہ نہیں ہوا، وقت معین پر طبیعت ہموار نہ ہوتی تو کسی دوسرے وقت بلا لیتے اور یہی نہیں پورے رمضان بخاری شریف پڑھائی، بالآخر ۱۶/شوال ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۳/جون ۱۹۸۷ء کو آپ نے مرقاۃ العلوم کی مسجد میں ایک عظیم الشان اجتماع میں بخاری شریف کا آخری درس دے کر اس کا اختتام فرمایا۔

حجاز کا آخری سفر اوپر گذر چکا ہے کہ ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ میں ایک شامی فاضل شیخ ایمن رشدی سوید مئو آئے، موصوف شامی الاصل ہیں، لیکن سعودی عرب کے شہر جدہ میں

سکونت پذیر ہیں، شام کے صدر حافظ الاسد کا جب وہاں کے علماء پر قہر ٹوٹا اور دار و گیر شروع ہوئی، تو بہت سے اہل علم کی طرح یہ بھی ترک وطن پر مجبور ہوئے، ۱۳۹۸ھ م ۱۹۷۸ء میں جب علامہ اعظمی نے شام کا سفر کیا تھا، اس وقت شیخ ایمن نے بھی آپ سے نیاز حاصل کی تھی اور عقیدت مندوں کے حلقے میں داخل ہوئے تھے۔

ان کے اندر علم کا شوق اور طلب و تڑپ بلا کی تھی، اس کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ صرف حدیث پڑھنے کی غرض سے ہزاروں میل کا سفر کر کے مئو آئے، اور ہر طرح کی مشقت برداشت کرتے ہوئے تقریباً ۳ / ہفتے قیام پذیر رہے اور علامہ اعظمی سے بخاری شریف کا درس لیتے رہے، علامہ اعظمی بھی موصوف کی رعایت کرتے ہوئے ضعف و نقاہت اور بسا اوقات طبیعت کی ناہمواری کے باوجود روزانہ کئی کئی صفحات پڑھا جاتے، چنانچہ تین ہفتہ کی اس مدت میں انھوں نے بخاری شریف کا معتد بہ حصہ پڑھ لیا، مگر ختم ہونے کی نوبت نہ آنے پائی، تین ہفتے قیام کے بعد وہ یہاں سے واپس تشریف لے گئے، یہاں سے جانے بعد بقیہ حصے کی تکمیل کیلئے ان کی خواہش ہوئی کہ علامہ اعظمی حجاز کا سفر فرمائیں، تاکہ ان کے ساتھ وہاں کے دوسرے اہل علم کو بھی استفادہ کا موقع ملے، اور آپ کو بھی زیارت و عمرہ کی ایک بار پھر سعادت حاصل ہو جائے، بالآخر ان کے جانے کے سوا سال بعد ربیع الاول ۱۴۰۷ھ میں کسی طرح اس سفر کے لئے وقت نکال سکے۔

علامہ اعظمی نومبر ۱۹۸۶ء کے شروع میں مئو سے دہلی، اور ۸ / نومبر ۱۹۸۶ء م ۷ / ربیع الاول ۱۴۰۷ھ کو دہلی سے جدہ کیلئے سعودی ایرلائنز کے طیارہ سے روانہ ہوئے، اس سفر میں آپ کے ہمراہ مولانا رشید احمد اعظمی اور فاضل محترم مولانا محمد یحییٰ صاحب ندوی بھی تھے، جہاز جب سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض پہنچا تو وہاں شیخ عبدالفتاح ابوغدہ اور بعض دوسرے اہل علم نے شاندار استقبال کیا، پھر اس کے بعد جدہ کیلئے روانہ ہوئے۔

اس سفر میں مولانا یحییٰ صاحب نے علامہ اعظمی کی عربوں میں مقبولیت اور پذیرائی کا جو منظر دیکھا اس کا تذکرہ وہ لطف لے لے کر کیا کرتے تھے، مستفیدین کا ایک

سلسلہ لگا رہتا تھا، علماء و طلباء آپ کے پاس استفادہ کی غرض سے اس طرح آتے جاتے کہ " طاروا الیہ زرافات و وحدانا " کی مثال بن گئے تھے، جسے خلوت پسندی کے اپنے مزاج کے باوجود محض علم و دین کی خدمت لئے آپ گوارا کرتے، چنانچہ اس سفر میں جدہ اور مکہ و مدینہ کے بہت سے اہل علم نے سند و اجازت حاصل کی۔

اس سفر میں آپ زیارت حرمین اور عمرہ سے بھی مشرف ہوئے، اسی موقع پر مولانا محمد یحییٰ صاحب نے سوال کیا کہ تمام محدثین اور اہل علم نے یہاں کوئی نہ کوئی خاص دعا ضرور کی ہے، آپ نے کیا دعا مانگی؟ علامہ اعظمی نے فرمایا، حافظ ابن حجر نے آب زمزم پیتے وقت یہ دعا کی تھی کہ مجھے امام ذہبی کا علم عطا فرما، میں نے آب زمزم پیتے وقت، بیر بضاعہ کا پانی پیتے وقت اور حطیم و ملتزم ہر جگہ یہی دعا کی کہ خداوندا! مجھے حافظ ابن حجر اور امام ذہبی دونوں کا علم عطا فرما، پھر آپ کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں اور تشکر و تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے دیا بھی۔

تقریباً ایک مہینہ قیام اور بھرپور افادہ و استفادہ کے بعد ۱۱ر دسمبر ۱۹۸۷ء کو وہاں سے بمبئی کے لئے روانہ ہوئے، بیرون ہند کا یہ آپ کا آخری سفر تھا، گویا یہ کہنا چاہئے کہ یہ مسک الختام تھا، اس کے بعد کسی بیرونی سفر کی نوبت نہیں آئی، تا آنکہ اس سفر پر روانہ ہو گئے جہاں سے واپسی نہیں ہوتی، اور جہاں آپ کا خیر مقدم نہ جانے کتنی اور کیسی کیسی مقدس روحوں نے کیا ہوگا۔

زیارت بغداد کی دوسری دعوت ۱۹۸۸ء کے اواخر میں عراقی سفارت خانہ واقع دہلی سے آپ کے پاس ایک خط آیا جس میں بغداد اور اس کے مقامات و مشاہد کی زیارت کیلئے دعوت دی گئی تھی، یہ خط عراقی سفیر اے ڈبلیو شیخلی کی طرف سے تھا، جو ۲۸ر ستمبر ۱۹۸۸ء کو لکھا گیا تھا، خط کی عبارت درج ذیل ہے:

"I have the honour to inform you that ministry of Aivkaf and Religious affairs, Republic of Iraq has extended an invitation for you to visit Iraq and the Holy Shrines there. The ministry has proposed end of October or early November. 1988

for this visit

It will be highly appreciated if you kindly advise us, as soon as possible, the date suitable and convenient to you for the above mentioned visit.

(میرے لئے آپ کو یہ اطلاع دینا باعث عزت ہے کہ جمہوریۂ عراق کے اوقاف اور مذہبی امور کی وزارت نے آنجناب کو عراق اور اس کے متبرک مقامات کی زیارت کے لئے دعوت دی ہے، وزارت نے اس زیارت کیلئے اواخر اکتوبر یا اوائل نومبر ۱۹۸۸ء کو تجویز کیا ہے۔

آپ کا بڑا کرم ہوگا اگر مذکورہ بالا زیارت کے لئے کسی موزوں اور مناسب تاریخ کا جلد از جلد تعین فرمادیں)

مراکش کی وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ کی دعوت

رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۹۸۹ء میں مراکش کی وزارت اوقاف و اسلامی امور کی جانب سے آپ کو اس غرض سے دعوت دی گئی کہ آپ وہاں کے قصر شاہی میں منعقد ہونے والی مجالس (رمضانی دروس) میں شرکت فرمائیں، جن کا انعقاد وہاں کے بادشاہ، شاہ حسن ثانی کرتے ہیں، اور ان میں اپنی صوابدید کے مطابق جس موضوع پر چاہیں درس دیں، ذیل میں مراکش کے وزیر اوقاف ڈاکٹر عبدالکبیر علوی مدعری کا خط مؤرخ ۱۲؍ جمادی الاولی ۱۴۰۹ھ مطابق ۲۲؍ دسمبر ۱۹۸۸ء نقل کیا جارہا ہے۔

صاحب الفضيلة الأستاذ حبيب الرحمن الأعظمي المحترم

إمام دار الحديث بالجمهورية الهندية

السلام عليكم و رحمة الله تعالىٰ و بركاته.

وبعد! فجريا على السنة الحميدة التي دأب عليها أمير المؤمنين جلالة الملك حسين الثاني نصره الله وأيده بعقد مجالس الدروس الحسنية في شهر رمضان المبارك وفي رحاب القصر الملكي العامر

بالرباط والتی یحضرها صفوة من علماء المملكة المغربية و بلاد العالم الاسلامی .

يشرفنی أن أوجه الی فضیلتكم الدعوةلحضور تلك الدروس الدينية الرمضانية،والمشاركة فيها بدرس دينی تلقونه بين يدی صاحب الجلالة فی الموضوع الذی ترتؤنه و تختارونه و تودون المشاركة به فی هذاالملتقی العلمی الفريد راجيامنكم موافاة الوزارة فی أقرب وقت ممكن بعنوان الدرس مع آية كريمة أو حديث شريف يكونان مفتحا للدرس و محوراً له . . . .“

فضیلت مآب استاذ محترم جناب حبیب الرحمٰن الاعظمی صاحب

ہندوستانی جمہوریہ کے امام دارالحدیث

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امیر المؤمنین شہنشاہ معظم حسن ثانی، اللہ تعالیٰ ان کی مدد اور تائید فرمائیں، اپنی عادت حسنہ و مستمرہ کے مطابق رمضان المبارک کے مہینے میں رباط کے قصر شاہی کے بھرے ہوئے ہال میں حسنی دروس کی مجلس منعقد کرتے ہیں، جس میں مراکش اور عالم اسلام کے چیدہ علماء شریک ہوتے ہیں۔

میرے لئے شرف کی بات ہے کہ میں آنجناب کو رمضان کے ان دینی دروس میں شرکت اور کسی درس کے ذریعہ حصہ لینے کی دعوت دوں، جس کو بادشاہ کے سامنے جس موضوع پر آپ چاہیں، پیش فرمائیں، اور جس کے ذریعہ آپ اس منفرد علمی اجتماع میں شرکت پسند فرمائیں، امید کرتے ہوئے کہ جلد از جلد وزارت کو کسی آیت یا حدیث شریف کے عنوان سے، جو درس کا نقطۂ آغاز اور محور ہو، مطلع فرمائیں)

×××××

المجمع العلمي العراقي کی رکنیت

فروری ۱۹۸۹ء مطابق رجب ۱۴۰۹ھ میں بغداد کے مشہور علمی ادارے المجمع العلمی العراقی (IRAQI ACADEMY) کی کمیٹی نے علامہ اعظمی کو اکیڈمی کا رکن منتخب کیا، جس کی اطلاع اکیڈمی کے چیئرمین ڈاکٹر صالح احمد العلی نے اس خط کے ذریعہ دی جو ۱۵/ مارچ ۱۹۸۹ء م ۸/ شعبان ۱۴۰۹ھ کا مکتوب ہے:

"یسرنی أنه أبلغکم بأن مجلس المجمع العلمی العراقی فی جلسته العاشرة المنعقدة فی الثانی والعشرین من شهر رجب سنة ۱۴۰۹ھ الموافق للثامن والعشرین من شهر شباط سنة ۱۹۸۹م قرر انتخابکم عضواً مؤازراً فیه تقدیراً لمکانتکم العلمیة الرفیعة ومجهوداتکم فی میادین اللغة والثقافة مما یعنی المجمع بدراسته.

وإننی إذأهنئکم بهذا الانتخاب الذی یوثق العلاقة العلمیة والثقافیة، أرجو تزوید المجمع بموجز عن سیرتکم العلمیة و عناوین أبحاثکم المنشورة لیحفظ۔مع الاعتزاز به۔ فی سجلاته۔۔۔"

(میں مسرت کے ساتھ آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ المجمع العلمی العراقی (IRAQI ACADEMY) کی کمیٹی نے ۲۲/ رجب ۱۴۰۹ھ مطابق ۲۸/ فروری ۱۹۸۹ء کو منعقد ہونے والے اپنے دسویں اجلاس میں آپ کے بلند علمی مقام اور ادب و ثقافت کے میدان میں آپ کی کاوشوں کی قدر دانی کرتے ہوئے اکیڈمی کا معاون ممبر منتخب کیا ہے۔

میں آنجناب کو اس انتخاب کی مبارکباد دیتے ہوئے، جو علمی اور ثقافتی رابطے کو مضبوط کرے گا، امید کرتا ہوں کہ اکیڈمی کو اپنی علمی زندگی اور شائع شدہ تحقیقات کے ناموں سے مختصر معلومات فراہم فرمائیں گے، تاکہ اسے فخر کے ساتھ اکیڈمی کے ریکارڈ میں محفوظ رکھا جائے۔)

بڑی صاحبزادی کی وفات ضعف و پیری کی حالت میں علامہ اعظمی کو ایک نہایت جانکاہ اور دلگداز صدمہ اس وقت سہنا پڑا جب آپ کی بڑی صاحبزادی عائشہ خاتون ایک مختصر سی علالت کے بعد داغ مفارقت دے گئیں، ان کا سانحۂ وفات ۱۹ر جنوری ۱۹۹۰ء کو پیش آیا۔ مرحومہ آپ کی اولاد ذکور واناث میں سب سے بڑی تھیں، اولاد کی نعمت سے محروم تھیں اور یہ حسرت دل ہی میں لے کر راہیٔ ملک بقا ہوئیں۔ أنعم الله عليها في دار كرامته شآبيب نعمه و رضوانه، وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً ستر سال تھی، کیونکہ علامہ اعظمی نے ان کی نسبت ایک جگہ تحریر فرمایا ہے:

"در شب بست و ہفتم شوال یوم شنبہ ۱۳۴۰ھ قبیل نماز صبح دخترم مسماہ عائشہ تولد شد۔"

(۲۷ر شوال بروز سنیچر ۱۳۴۰ھ کو نماز فجر سے کچھ پہلے میری لڑکی عائشہ پیدا ہوئی)

مرحومہ بڑی خوبیوں کی حامل خاتون تھیں، نرم خو، خوش اطوار، سلیقہ شعار، خوش مذاق اور پاکیزہ اخلاق والی عورت تھیں، اولاد جیسی نعمت سے محرومی کے باوجود تمام حسرتیں نہاں خانۂ دل تک رکھتی تھیں، چہرے پر یاس وافسوس کا سایہ اور لب پر گلہ و شکوہ کم ہی آنے دیتی تھیں۔ امور خانہ داری میں مہارت رکھتی تھیں، گھریلو انتظام وانصرام کا بلا کا ملکہ تھا، ان کا ہر کام حسن انتظام کا آئینہ اور خوبیٔ نظم و نسق کی تصویر ہوتا تھا، کوئی رشتہ دار یا مہمان ان کے یہاں وارد ہوتا تو اس کی ضیافت کے انتظامات اس طرح کرتیں کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ جاتا، مولانا محمد عثمان صاحب معروفی، مقیم حال مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، جو ان کے دور کے سسرالی رشتے دار ہیں، اپنے زمانہ طالب علمی کے واقعات میں لکھتے ہیں:

"۔۔۔ میرا قیام مفتاح العلوم میں تھا، لیکن اکثر کیاری ٹولہ عبدالغفور مؤذن کے گھر جایا کرتا، ان سے میری پھوپھی منسوب تھیں، ان کے بڑے

صاحبزادے حاجی محمد فاروق(۱) سے محدث کبیر کی بڑی صاحب زادی عائشہ خاتون منسوب تھیں، جو میری ضیافت اور راحت رسانی کا بے حد خیال فرمایا کرتی تھیں، جس سے اندازہ ہوا کہ محدث کبیر نے اپنی اولاد کی تربیت کتنے اعلیٰ طریق پر کی تھی۔"(۲)

امدادی وظائف کی تحقیقاتی کمیٹی کی ممبر شپ | ۱۹۹۰ء میں وزارت فروغ انسانی وسائل (Ministry of Human Resources Development) کے تعلیمی شعبے (Deptt. of Education) کی طرف سے عربی فارسی جیسی قدیم زبانوں کے اداروں کو دی جانے والی امداد و وظائف کی تحقیقاتی کمیٹی کا آپ کو ممبر نامزد کیا گیا، اس کی اطلاع دینے اور منظوری کی طلب کے لئے اسسٹنٹ ایجوکیشنل اڈوائزر جناب آر۔ کے۔ شرما (R.K. Sharma) نے ۶/جون ۱۹۹۰ء کو یہ خط ٹائپ شدہ بھیجا:

"This Ministry has a Grant-in-aid Committee to examine the applications from Voluntry Organizations engaged in the field of classical languages i.e. Arabic and Persian and recommend suitable financial assistance to such organizations.

I am happy to inform you that you have been nominated as a member of the above Committee for a period of two years. You may kindly convey your acceptance to serve on the Committee urgently..."

(اس وزارت کی ایک امدادی وظائف کمیٹی ہے، جو عربی اور فارسی جیسی قدیم زبانوں کے میدان میں مصروف رضاکار اداروں کی طرف سے پیش کی

---

(۱) علامہ اعظمی کے بڑے داماد، نیک، عبادت گذار اور ولی صفت بزرگ تھے، محلے کی مسجد (مرکزی مسجد) کے امام تھے، اور وقت کے بڑے پابند، ہمیشہ وقت سے پہلے پہنچ جاتے تھے، چھوٹے بڑے ہر ایک کی نگاہ میں ان کی بڑی عزت تھی۔ ۲۳ ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ م ۲۷ مئی ۱۹۹۲ء کو وفات پائی رحمہ اللہ وغفرلہ۔

(۲) ترجمان دارالعلوم اکتوبر ۱۹۹۶ء ص ۲۸

جانے والی درخواستوں کی تحقیق کرتی ہے، اور ان اداروں کے لئے مناسب مالی تعاون کی سفارش کرتی ہے۔

میں یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں کہ آپ دو سال کے لئے مذکورہ بالا کمیٹی کے ممبر نامزد کئے گئے ہیں، آپ برائے مہربانی جلد از جلد اپنی منظوری سے آگاہ فرما کر کمیٹی کے ساتھ تعاون فرمائیں۔)

بغداد کی عالمی کانفرنس کی طرف سے دعوت نامہ ا اگست ۱۹۸۹ء میں کویت پر عراق کے حملے کے بعد رد عمل کے طور پر اتحادیوں کا عراق پر جو زبردست حملہ ہوا، اس سے اظہار بیزاری کے لئے جون ۱۹۹۰ء میں بغداد میں ایک کانفرنس بڑے پیمانے پر منعقد کی گئی، اس میں شرکت کے لئے علامہ اعظمی کو بھی دعوت دی گئی اور دہلی میں واقع عراقی سفارت خانے کی طرف سے درج ذیل مضمون کا دعوت نامہ آپ کی خدمت میں بھیجا گیا:

"Dear sir ,

It gives me great pleasure to convey to you the invitation from International Popular Islamic Organization to participate in a Conference to confirm Solidarity with Iraq against the threat from the enemies in U.S.A., Britain and Zionists. The conference will take place in Baghdad from 16th June 1990 and will be attended by numerous Ulemas from Islamic Countries including representatives of all Islamic Institutions, Associations and organizations.

Please let me have your acceptance for this invitation as soon as possible in order that necessary action could be taken in this regard.

(محترم جناب ! .

بڑے احساس مسرت کے ساتھ انٹر نیشنل پاپولر اسلامک آرگنائزیشن کی طرف سے ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے یہ دعوت نامہ آپ کے پاس ارسال کر رہا ہوں، تا کہ امریکہ، برطانیہ۔ اور صہیونی دشمنوں کی جارحیت کے

خلاف عراق کے ساتھ اتحاد کو مضبوط کیا جا سکے، کانفرنس کا آغاز بغداد میں ۱۶/۱۸ جون ۱۹۹۰ء سے ہوگا، جس میں اسلامی ممالک کے متعدد علماء بشمول اسلامی اداروں، ہیئتوں، اور تنظیموں کے نمائندوں کے شرکت کریں گے، برائے مہربانی اس دعوت نامہ کی منظوری سے جلد از جلد آگاہ فرمائیں، تاکہ اس سلسلہ میں ضروری اقدامات کیے جا سکیں۔)

مرض الموت اور سانحۂ وفات اب آپ عمر کے اس مرحلے تک پہونچ گئے تھے کہ بلغ من العمر عتیا کا مصداق ہو گئے تھے، عوارض وامراض تو بہت سارے آپ کے اوپر طاری ہوئے تھے، لیکن سانسوں کی آمد ورفت نے ساتھ چھوڑنا کبھی گوارہ نہیں کیا، لیکن اب آہستہ آہستہ وقت موعود قریب ہوتا جارہا تھا، اور وہ گھڑی نزدیک آتی جارہی تھی جو ہر نفس کیلئے محتوم ومقدر ہے، اور اسی کے ساتھ آپ کی زندگی کے ایک ایک لمحے کی قیمت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا، اور ہر ہر سانس دنیائے علم وفن کے لئے بیش بہا اہمیت کی حامل ہوتی جارہی تھی، جو لوگ آپ کے مرتبہ ومقام سے صحیح طور پر واقف تھے وہ اب یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ قلمروئے علم کا یہ تاجدار اگر جدا ہو گیا تو دنیائے علم وفن کو ایک ناقابل بیان محرومی کا سامنا کرنا پڑے گا، مگر وہ حسرتناک ساعت قریب آتی رہی اور جسم وجان بتدریج ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑتے گئے۔

عمر کا یہ آخری حصہ تھا اور علامہ اعظمی پر بہت جلد جلد مختلف بیماریوں کے حملے ہوتے رہے، شعبان ۱۴۱۲ھ کے آخر اور مارچ ۱۹۹۲ء کے اوائل میں ضعف واضمحلال کی وجہ سے نہایت نحیف ونزار ہو گئے تھے، کوئی خاص مرض نہیں تھا بجز اس ایک مرض کے جو سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے، اور جس کا علاج دنیا کی کسی میڈیکل سائنس میں نہیں ہے، وہ پیری اور بڑھاپا تھا، علامہ اعظمی بھی اب اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے، اور اب آپ کے اوپر ایک طرح کی استغراقی کیفیت طاری ہوتی جارہی تھی، اسی عالم میں ایک روز جب کہ چند طالب علم آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، عجیب وغریب حالت میں فرمایا کہ اس

مہینے میں یہ کمرہ خالی ہو جائے گا، گویا اس وقت رحمت رب کو قریب ہوتے ہوئے محسوس کر رہے تھے، بہر حال اب دن بدن ضعف و اضمحلال یا بلفظ دیگر مرض کی شدت میں اضافہ ہوتا رہا، ڈاکٹر آتے، دیکھتے، تشخیص کرتے اور علاج تجویز کرتے مگر ہر دوا بے سود اور ہر علاج بے کار۔ نقاہت اس قدر ہو گئی تھی کہ کسی کام کے لئے بمشکل اشارہ تک کرپاتے، رمضان شروع ہوا تو آپ کے اوپر غشی کی سی حالت رہنے لگی، ڈاکٹر نے لوگوں کی آمد ورفت سے منع کر رکھا تھا، کوئی خاص آدمی آجاتا تو اس کو زیارت وعیادت کی اجازت دی جاتی تو بمشکل آنکھ کھول کر دیکھ لیتے۔

۹ر رمضان المبارک بروز یکشنبہ تقریباً دس بجے دن میں حالت بہت زیادہ خراب ہوئی اور سانسیں اکھڑ کر چلنے لگیں، زندگی کے دن پورے کرنے کے لئے معالج خاص ڈاکٹر نثار احمد انصاری نے آکسیجن لگایا، جلد ہی شدت مرض کی خبر پورے مئو میں اور اطراف مئو میں پھیل گئی، عیادت وزیارت کرنے والوں کی آمد ورفت کے ساتھ ساتھ شہر کے چھوٹے بڑے ڈاکٹر بھی آنا شروع ہو گئے، یہ وقت نہ صرف آپ کے متوسلین و منتسبین بلکہ پورے شہر کیلئے نہایت صبر آزما تھا، چہروں پر اداسی کے بادل اور لبوں پر مہر لگی ہوئی، ہر صورت تصویر یاس وحسرت اور ہر نگاہ سوالیہ بنی ہوئی! اگر کہیں کوئی گفتگو بھی ہوتی یا کوئی کسی سے کچھ پوچھتا بھی تو وہ ”بڑے مولانا“ ہی کی حالت اور کیفیت مزاج سے متعلق ہوتی، غرض یہ وقت پہاڑ بن کر گذرتا رہا! آکسیجن لگنے کے بعد سے علامہ اعظمی کی سانسیں یکساں طور سے چلتی رہیں، حالت میں کوئی خاص تغیر نہیں پیدا ہوا، غشی ایسی تھی کہ آنکھیں بھی نہیں کھلتی تھیں، ڈرپ کے ذریعہ جسم میں پانی اور قوت پہنچائی جاتی، اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ایک آدھ چمچہ پانی سے حلق اور دہانہ تر کر دیا جاتا، اسی کیفیت میں پورا ایک دن اور ایک رات اور پھر ۱۰ر رمضان المبارک کا دن بھی گذرا، دس رمضان المبارک کو افطار کے وقت حالت میں بظاہر کچھ سدھار اور افاقہ محسوس ہوا، مگر کیا خبر تھی کہ کچھ ہی دیر بعد قیامت صغریٰ بپا ہونے والی ہے

اور سرزمین مئو عرصۂ حشر بننے والی ہے!

عشرۂ رحمت ختم ہو رہا ہے، رحمت کے فرشتے اپنا دفتر لپیٹ رہے ہیں، ایام مغفرت کی آمد آمد ہے، روزہ دار افطار کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں، مؤذن اپنے رب کی بڑائی کی صدا لگاتا ہے، نماز کی طرف دعوت دیتا ہے، عین اسی وقت عاشق رسول، حدیث نبوی کا سب سے بڑا فدائی و جاں نثار داعیٔ اجل کو لبیک کہتا ہے اور اس کی روح اس شان سے واصل بحق ہوتی ہے کہ ایک طرف رحمت کے فرشتے سایہ کئے ہوئے ہیں اور دوسری سمت مغفرت کے ملائکہ اپنے پر پھیلائے ہوئے ہیں، ان شاء اللہ۔ ادھر زمین والوں کا حال یہ ہے کہ ایک کہرام مچ گیا ہے۔ اس فاجعہ کبریٰ کی خبر اس تیزی سے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں پھیلی ہے کہ جنگل کی آگ بھی کبھی اس تیزی سے نہ پھیلی ہو گی، انتقال کو چند لمحے بھی نہیں ہوئے ہیں کہ آخری زیارت و دیدار کرنے والوں کا ایک سیلاب موجیں مار رہا ہے، ہر آدمی ایک ہی سمت بھاگتا اور دوڑتا ہوا، پورا شہر كأنهم إلى نصب يو فضون کا منظر پیش کر رہا ہے، جسم مبارک وہیں رکھا ہوا ہے، جس کمرے میں حضرت نے زندگی کے آخری ایام گذارے ہیں، زیارت کرنے والے ایک راستے سے آتے اور دوسرے راستے سے نکل جاتے، بھیڑ کو قابو میں کرنے کے لئے منتظمین نے بڑی بڑی بلیاں اور بانس باندھ دیئے۔ ہر آدمی بے چین، ہر نفس بیتاب و بیقرار، ہر چہرہ اداس و پژمردہ اور ہر آنکھ اشکبار و خوں فشار! لوگوں کا ایسا گریہ اور ایسی آہ و فغاں چشم فلک نے بھی کم دیکھی ہو گی!

مولانا اعظمی کے وصال کی خبر نہ صرف برصغیر اور عالم اسلام بلکہ سارے عالم میں جس تیزی سے پھیلی ہے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، ذرا غور کیجئے کہ ۶ ر بج کر سات یا آٹھ منٹ پر مئو جیسے دور افتادہ مقام پر انتقال ہوتا ہے اور سات بج کر بیس منٹ پر آکاش وانی سے سوا سات بجے پردیس سے سوبانی نشریہ میں لکھنؤ سے انتقال کی خبر نشر ہو جاتی ہے۔ اور لندن سے بی بی سی اپنے ۹ ر بجے کی اردو بلیٹن میں اس خبر کو سارے عالم کے اردو دانوں تک پہنچا دیتا ہے، اور اسی وقت سے ہند و بیرون ہند سے تعزیت کرنے والوں کے تعزیتی پیغام آنا شروع ہو

جاتے ہیں۔

دوسرے دن ۱۱ر رمضان المبارک مطابق ۱۷ر مارچ کو ظہر کی نماز کے بعد اڑھائی بجے نماز جنازہ کا وقت طے تھا، ۱۲ بجے بند کمرے میں غسل دیا گیا، غسل دیتے وقت وہاں پر موجود لوگوں کی جو کیفیت تھی وہ ناقابل بیان ہے، تقریباً ایک بجے جنازہ باہر نکالا گیا، مشایعت کرنے والوں کی سہولت کے لئے تابوت کے چاروں پایوں پر بڑی بڑی بلیاں باندھ دی گئی تھیں، پھر بھی مشایعین کا ہجوم جس طرح بڑھا ہے معلوم ہوتا تھا بلیاں ٹوٹ جائیں گی ،اس وقت کے منظر کا جن لوگوں نے مشاہدہ کیا ہے آج بھی ان کی نگاہوں میں بسا ہوا ہے ،لوگ صرف ایک مرتبہ تابوت کو چھونے کیلئے اس طرح ایک دوسرے پر ٹوٹے ہیں کہ اپنی جان کی بھی پروا نہیں کی، کسی کے سر سے ٹوپی گر رہی ہے ، کسی کے ہاتھ سے گھڑی جا رہی ہے ،اور کسی کے چپل جوتے اس کے پاؤں کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں، مگر لوگ ہیں کہ ان تمام باتوں سے بے خبر ہیں، صرف ایک ہی سودا ہے کہ کسی طرح اس تخت چوبیں کو چھولیں جس پر "بڑے مولانا" کا جسم بے جان اپنے آخری سفر پر ہے ،اور اگر کوئی یہ بھی نہ کر سکتا تو اپنے رومال اور انگوچھے سے ہی ایک بار اس لکڑی کو مس کر دینا اپنے لئے باعث سعادت و برکت سمجھتا، تابوت اس طرح دست بدست اور شانہ بشانہ آگے بڑھتا گویا دریا میں مچھلی تیر رہی ہو۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جنازہ ریلوے گراؤنڈ پہنچایا گیا جہاں نماز جنازہ ادا کی جانے والی تھی ،جو مئو کا سب سے بڑا اور وسیع میدان ہے ،اور سر زمین مئو کی تاریخ میں پہلی دفعہ کسی کی نماز جنازہ اس میدان میں ادا کی گئی ہے، نماز جنازہ میں شرکت کیلئے مئو کے قرب وجوار کی تمام بستیاں مردوں سے خالی ہو گئی تھیں ،اس کے علاوہ اعظم گڈھ، جونپور، فیض آباد، لکھنؤ، دلی، بنارس اور کلکتہ تک کے لوگوں نے شرکت کی، کسی کی نماز جنازہ کا ایسا عجیب وغریب منظر لوگوں نے پہلی بار دیکھا جس میں تقریباً دو لاکھ روزہ دار بھوک وپیاس سے بے نیاز، شدت کی گرمی، چلچلاتی دھوپ اور سورج کی تند و تیز تمازت میں نماز ادا کر رہے ہوں اور دعاء رحمت ومغفرت کر رہے ہوں۔ ٹھیک دو بج کر تیس منٹ پر

پر آپ کے شاگرد رشید و تلمیذ اعز مولانا عبدالجبار صاحب مئوی نے آہوں اور سسکیوں کی صداؤں کے بیچ نماز پڑھائی، نماز کے بعد جنازہ جائے تدفین کی طرف لیجایا گیا، جہاں تقریباً ایک گھنٹہ بعد پہنچ سکا، اور تین چوتھائی صدی کی جلوہ تابانی کے بعد علم و عمل کا آفتاب لوگوں کی نگاہوں سے روپوش ہو گیا، جناب مولانا نظام الدین اسیر ادروی صاحب نے اس منظر کی بہت مؤثر تصویر کشی کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"جنازہ کی نماز اور جنازہ کی مشایعت کرنے والوں کی کثرت اگر عنداللہ مقبولیت کی علامت ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ خداوند قدوس کے مقبول اور مقدس ترین بندوں میں سے تھے، آپ خود غور کریں کہ مولانا موصوف عرصۂ دراز سے گوشۂ خلوت میں رہتے تھے، عوام سے بقدر ضرورت ہی رابطہ تھا، ایک گمنام اور غیر مشہور گلی میں آپ کی سکونت تھی، اس راستے سے گذرنے والا کوئی بھی شخص یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اس گلی کے ایک خام سفالہ پوش مکان میں ایک ایسی عظیم الشان شخصیت ہے کہ بقول حفیظ بنارسی:

دشت عجم سے تا بہ عرب جس کی دھوم تھی

لوگوں پر آپ کی عظمت، علوئے شان اور عنداللہ مقبولیت کا راز اس وقت کھلا جب ان کا جنازہ دیکھا، شہر کے سارے مسلم و غیر مسلم حیرت و استعجاب کی نگاہوں سے انسانوں کے اس سیلاب عظیم کو دیکھ رہے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم کو خبر بھی نہیں تھی کہ اس شہر میں کوئی اتنی عظیم شخصیت بھی رہتی ہے، ابتدائے شب میں جب آپ سفر آخرت پر روانہ ہو رہے ہیں اس وقت گنتی کے چند افراد موقعہ پر موجود ہیں، لیکن صبح ہوتے ہی سفید پوش انسانوں سے مئو کی گلیاں، سڑکیں، شاہراہیں بھر گئیں، مولانا کی رہائش گاہ کے چاروں طرف مسلمانوں کا جم غفیر اس طرح چھا گیا جیسے کسی بہت بڑے دریا میں یک بیک طوفانی سیلاب آ گیا ہو" (۱)

(۱) ترجمان الاسلام ۱۱۔۱۲ ص ۱۴

آگے مزید لکھتے ہیں:

"نماز جنازہ میں تخمیناً دولاکھ مسلمان شریک ہوئے، میرے محدود علم و مطالعہ کے مطابق اس پوری صدی میں ہندوستان میں کسی عالم دین کا اتنا بڑا جنازہ نہیں اٹھا، جس کی نماز جنازہ اتنے مقدس ترین اور اتنے بڑے مجمع نے ادا کی ہو، مولانا موصوف کے سوا دوسری کوئی مثال نہیں ملتی، دولاکھ مسلمانوں کا خالص یہ مجمع اور پھر اس مجمع کا ہر ہر فرد روزے سے، گرمیوں کا موسم ہے، ٹھیک دوپہر میں جنازہ اٹھتا ہے، ایک میل پاپیادہ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں لوگ مشایعت کرتے ہیں اور جب ریلوے گراؤنڈ میں پہنچتے ہیں جہاں نماز جنازہ ادا کی جانے والی ہے، پورے لق ودق میدان میں ایک درخت کا سایہ بھی نہیں، موسم گرما کا تمتمایا ہوا سورج سروں پر چمک رہا ہے، اس کی کرنیں روزہ داروں کے بھوکے پیاسے جسم پر تیر کی طرح برس رہی ہیں۔ اب دن کے دو(۱) بج جاتے ہیں، دھوپ کی تمازت اپنے شباب پر آجاتی ہے، دولاکھ روزہ رکھے ہوئے مسلمانوں کا مقدس و منتخب روزگار مجمع حضرت مولانا اعظمی کی نماز جنازہ پڑھتا ہے، دعائے مغفرت کرتا ہے، درجات کی بلندی کی دعائیں مانگتا ہے، کیا ہندوستان میں ایسی کوئی دوسری مثال پیش کی جاسکتی ہے؟

یہ شرف، یہ افتخار صرف محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہوا، مولانا موصوف کے زہد و تقویٰ، خلوص وللّٰہیت، علم و فضل، علوم اسلامی کی بے لوث اور بے غرض اشاعت اور ساری زندگی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی شب و روز خدمت اور بے پناہ جذبۂ احیاء سنت کے پیش نظر ہمارا ایمان ہے کہ جب آپ کی مقدس روح ملأ اعلیٰ میں پہونچی ہوگی تو رحمت خداوندی کہہ رہی ہوگی فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی اور جنت کے فرشتے صف بستہ استقبال کے لئے کھڑے رہے

(۱) یہ سبقت قلم ہے جنازہ کی نماز ڈھائی بجے ادا کی گئی تھی

ہوں گے اور پورے انبساط سے کہہ رہے ہوں گے سلام علیکم طبتم فیھا خالدین۔"(۱)

اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی ایڈیٹر مجلہ "معارف" اعظم گڈھ تحریر فرماتے ہیں:

"اپنے وطن میں مولانا کو جو مقبولیت حاصل تھی اس کا اندازہ ان کے جنازہ سے ہوا جس میں شرکت کے لئے دارالمصنفین سے راقم اپنے رفیق کار مولوی محمد عارف عمری اور مولوی احتشام علی ندوی کے ساتھ گیا تھا، مئو کے ہر گلی کوچہ میں آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے تھے، ہم لوگ بڑی زحمت سے مولانا کی قیامگاہ (پٹھان ٹولہ) پہنچے لیکن دید وزیارت کا شرف حاصل نہ کر سکے، ریلوے کے بڑے اور وسیع میدان میں جنازہ کی نماز کا اہتمام کیا گیا تھا، مولانا ہی کے ایک ہم نام اور اپنے اہل تعلق مولوی حبیب الرحمٰن ندوی (۲) کی معیت میں ریلوے میدان گئے، جہاں اتنے لوگوں نے نماز جنازہ ادا کی جن کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا، البتہ بعض لوگوں کو جب یہ کہتے سنا کہ مئو میں ابھی تک کسی کے جنازہ میں نہ اتنا بڑا مجمع ہوا تھا اور نہ آئندہ ہونے کی توقع، تو ہم نے بھی اپنے دل میں کہا یہ اس عہد کے امام زیلعی اور ملا علی قاری کا جنازہ ہے، جن کی زبان و قلم ہمیشہ احادیث کی شرح وترجمانی اور ان کی مشکلات و غوامض کو حل کرنے میں مصروف رہے ہیں اور جن کا وجود گرامی علوم نبوی کی خدمت و فروغ اور نادر و نایاب کتب احادیث کی طبع واشاعت کے لئے وقف رہا ہے۔"(۳)

---

(۱) ترجمان الاسلام ص ۱۵۔۱۴

(۲) مولانا ادری کے باشندہ تھے، لیکن مئو میں سکونت اختیار کر لی تھی، علامہ اعظمی کے تلامذہ میں تھے، افسوس کہ ۲۵ ر شوال ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۲ ر فروری ۱۹۹۹ء کو وفات پاگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون

(۳) معارف اپریل ۱۹۹۲ء ص ۳۱۲۔۳۱۱

حضرت علامہ اعظمیؒ کی وفات پر بعض بڑی حیران کن باتیں دیکھنے میں آئیں، لوگوں کا عام طور پر مشاہدہ رہا کہ غیر مسلموں کا تاثر اور رنج و غم بھی کچھ کم نہیں تھا، عموماً ہندوؤں کے چہروں پر یاس و حسرت کے بادل چھائے ہوئے دیکھے گئے، بلکہ اس موقع پر بہت سے ہندوؤں کو پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا گیا، اس سلسلے میں سب سے عجیب و غریب واقعہ اس وقت پیش آیا جب ریلوے گراؤنڈ (جہاں نماز جنازہ ادا کی گئی تھی) کے قریب واقع ایک مندر (جو ہندی بھون کے نام سے مشہور ہے) کے پجاری نے نمازیوں اور مشایعت کرنے والوں کے راحت و آرام کے لئے مندر کے دروازے کھول دیئے، اور اسی پر بس نہیں جو لوگ بے وضو تھے ان کے لیے اپنے ہاتھ سے وضو کا پانی فراہم کیا، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے قبل اس مندر کے دروازے تک بھی کسی مسلمان کا قدم نہیں پہنچا تھا، یہ حضرت مولانا اعظمیؒ کی غیر مسلموں کے اندر مقبولیت کی ایک مثال ہے۔

ایک عالم کا خواب مولانا ابو بکر ہاشمی (۱) حیدر آباد کے ایک صاحب علم و فضل اور مولانا ابوالوفاء افغانی کے مخصوص تلامذہ میں ہیں، انھوں نے علامہ اعظمی کے انتقال کے بعد جو تعزیتی خط لکھا اس میں اپنے حسب ذیل خواب کا ذکر کیا:

"چار روز قبل خواب میں مجھے بتلایا گیا تھا کہ کسی بڑے عالم دین کا انتقال ہونے والا ہے، آج تعبیر مل گئی" مکتوب ۱۷ر مارچ ۱۹۹۲ء

---

(۱) مولانا ابو بکر ہاشمی دارالعلوم دیوبند کے فضلاء میں ہیں، مولانا ابوالوفاء افغانی کے تربیت یافتہ ہیں، اس وقت دائرۃ المعارف العثمانیہ میں مصحح کے عہدہ پر فائز ہیں، ۲۴ر ربیع الآخر ۱۴۲۹ھ مطابق یکم مئی ۲۰۰۸ء کو آپ کی وفات ہوگئی۔

☆
☆☆

پانچواں باب

تلامذہ

پانچواں باب

تلامذہ

مولانا عبد الجبار صاحب مئوی

ماقصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم　　از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

ہمارے استاد و مربی اور علامہ اعظمی کے تلمیذ اعز و ارشد مولانا عبد الجبار صاحب مئوی رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۲۳ھ کے لگ بھگ مئو میں پیدا ہوئے، سکونت اصلاً چھتر پورہ کے قریب محلہ باغیچہ میں تھی، بعد میں وہاں سے ملک ٹولہ منتقل ہو گئے، اور وہیں رہائش اختیار کرلی۔

علامہ اعظمی علیہ الرحمۃ نے ۱۳۴۰ھ میں فراغت کے بعد دار العلوم مئو میں مسند تدریس سنبھالی، تو اس وقت مولانا عبد الجبار صاحب اس مدرسہ کے ایک طالب علم تھے، علامہ اعظمی کے زمانۂ تدریس میں ہی دار العلوم سے فارغ ہوئے، پھر جب آپ دار العلوم سے مستعفی ہو کر مظہر العلوم بنارس گئے تو ساتھ مولانا عبد الجبار صاحب بھی گئے، اور علوم و فنون کی مزید کتابیں پڑھ کر اعلیٰ استعداد بہم پہونچائی، اور دو سال بنارس میں طالب علمانہ قیام کے بعد واپس مئو لوٹے، اس طرح ہمارے علم کے مطابق ۱۳۴۰ھ کے قریب (دار العلوم سے) علامہ اعظمی کے ساتھ آپ کے ربط و تعلق کی ابتدا ہوئی، اور ۱۴۱۲ھ تک تقریبا ۷۲ سال یہ تعلق قائم رہا، اور تعلق ایسا کہ اکا دکا سے زیادہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

مولانا عبد الجبار صاحب نے ۱۳۴۲ھ میں دار العلوم مئو سے فراغت پائی، اس کے بعد مختلف مدارس میں درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔ علامہ اعظمی جب تک مفتاح العلوم مئو میں رہے، مولانا بھی وہاں کے زمرۂ مدرسین میں رہے، اور ادب و تفسیر و فقہ کے اسباق آپ سے متعلق رہے، پھر جب مولانا عبد اللطیف نعمانیؒ کے انتقال کے چند سال بعد کچھ موقع پرستوں نے علامہ اعظمی کے خلاف مدرسہ میں دسیسہ کاری

کا جال بنا تو مولانا عبدالجبار صاحب بھی اس کا شکار ہوئے، آپ کے ساتھ گستاخی کی گئی یہاں تک کہ کچھ شر پسند طلبہ نے دوران درس آپ کے سامنے سے صحیح مسلم چھینی، اور جب علامہ اعظمی نے مفتاح العلوم سے بالآخر مفارقت اختیار فرمالی تو مولانا عبدالجبار صاحب بھی اس سے علیحدہ ہو گئے۔

مفتاح العلوم سے مفارقت کے کچھ ہی دنوں بعد علامہ اعظمی کے ایما پر مظہر العلوم بنارس چلے گئے، وہاں کئی سال تک استاذ حدیث و تفسیر اور شیخ الحدیث رہے، اور نہ صرف اساتذہ و طلبہ بلکہ شہریوں میں بھی حد درجہ ادب و احترام اور عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے، مظہر العلوم بنارس میں آپ کا قیام لگ بھگ دس برس رہا، آخر میں بہت زیادہ کمزور ہو گئے، اور صحت سفر کے قابل نہ رہی تو مستقلاً مئو میں اقامت گزیں ہو گئے، اور مدرسہ مرقاۃ العلوم کو درس و افادہ کا مرکز بنایا، علامہ اعظمی کی وفات کے بعد تو آپ ہی کی ذات سب کا محور و مرکز ہو گئی تھی۔

مولانا ایک جید الاستعداد، باصلاحیت اور ماہر و آزمودہ کار مدرس اور صاحب فضل و کمال عالم تھے، جن لوگوں کو مولانا کی شاگردی حاصل رہی ہے ان کا اتفاق ہے کہ تعلیم و تدریس کا ان کے جیسا ملکہ کسی اور استاد کے اندر دیکھنے میں نہیں آیا، افہام و تفہیم کی قوت و صلاحیت ان کو قدرت نے بلا کی ودیعت کی تھی، سبق کو گھول کر پلانے کی مثال اگر کہیں حقیقی شکل میں دیکھنے کو ملی تو وہ مولانا کی ذات تھی، مشکل سے مشکل مسائل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مقامات کی تشریح وہ اس خوبی کے ساتھ اور ایسے دلنشیں انداز میں کرتے کہ معمولی سے معمولی طالب علم کی سمجھ میں بھی بات بآسانی آجاتی، درسی تقریر نہایت مختصر مگر جامع کرتے، نفس مسئلہ کو سمجھاتے، طولانی تقریر اور دور از کار باتوں سے اجتناب کرتے، ایک پتلی سی چھڑی درسگاہ میں ہمیشہ ساتھ رکھتے، جس سے بوقت ضرورت طالب علموں کی، مبتدی ہو یا منتہی، مرمت کرتے، مگر اصلاح کا انداز ایسا ہوتا کہ کوئی طالب علم برا نہ مانتا۔

مولانا کے اندر تصنیف و تالیف کا ملکہ بھی بدرجۂ اتم تھا، لیکن انھوں نے اس

طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی، تاہم کچھ کام اس میدان میں بھی اہم انجام دیئے، چنانچہ انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب میں داخل درسی کتاب "منثورات" کا سلیس اردو ترجمہ کیا، جو "باکورات" کے نام سے شائع ہوا، پھر اس کے بعد مشکل الفاظ کی لغوی تحقیق وتشریح "دلیل المنثورات" کے نام سے کی۔

مولانا کا ایک اہم قلمی کام "کتاب الزہد والرقائق" کا اردو ترجمہ ہے، کتاب الزہد امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد اور امام بخاریؒ کے استاذ الاساتذہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی تصنیف ہے جو علامہ اعظمی کی تحقیق وتعلیق سے شائع ہوئی ہے، مولانا عبدالجبار صاحب نے اس کتاب کا جامع ترجمہ "ایثار آخرت" کے نام سے کیا۔

لیکن ان کا سب سے اہم کارنامہ صحیح بخاری کے حواشی سے متعلق ہے، مولانا احمد علی سہارنپوری نے بخاری شریف کے پچیس پاروں اور حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتوی نے آخر کے پانچ پاروں کا نہایت جامع اور محقق و مدلل حاشیہ تحریر فرمایا، جو صحیح بخاری کے ہندوستان میں رائج نسخوں کے ساتھ شائع ہوتا رہتا ہے، یہ حاشیہ پہلی مرتبہ مولانا احمد علی سہارنپوری کے پریس سے پوری دقت و صحت کے ساتھ چھپ کر شائع ہوا، بعد میں ناشرین نے اس کی صحت کا خاص اہتمام نہیں برتا اور مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اس حاشیہ میں غلطیاں در آتی گئیں۔ مدرسہ مظہر العلوم کے زمانۂ تدریس میں جب صحیح بخاری کا سبق مولانا عبدالجبار صاحب کے سپرد ہوا تو شدت کے ساتھ آپ کو ان غلطیوں کا ادراک و احساس ہوا، اور پوری ہمت و حوصلہ کیساتھ ان کی تصحیح وتصویب کا بیڑہ اٹھایا، کام بہت دقیق ، باریک اور محنت طلب تھا، ہر آن کتابوں سے مراجعت کی ضرورت پڑتی تھی، لیکن مولانا مرحوم نے کئی برس کی شبانہ روز محنت سے اس مشکل کو آسان بناڈالا، اور ہر جلد کی الگ الگ تصحیح دو حصوں میں کی، اور اس کو بخاری شریف ہی کے سائز میں چھپوا کر شائع کیا تاکہ بآسانی اس کے ساتھ اس کی جلد بندی کی جاسکے، اس کا نام " التصویبات لما فی حواشی البخاری من التصحیفات" رکھا۔

مولانا عبدالجبار صاحب کو اپنے استاذ و شیخ سے جو عقیدت و محبت تھی اور جو

تعلق خاطر وطول ملازمت حاصل رہا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے، مولانا رشید احمد صاحب اعظمی تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت والد محترم کا وہ کمرہ جہاں بیٹھ کر انھوں نے علم حدیث کی خدمت انجام دی ہے، وہ کھپریل کا حجرہ جس میں کتابوں کے انبار کے درمیان وہ چھپ چھپ جاتے تھے، اس کے سامنے ایک مختصر سا صحن ہے، میں نے بچپن میں دیکھا ہے کہ ہر روز وہاں دو چارپائیاں بچھائی جاتی تھیں، ایک پر والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دوسری پر حضرت مولانا عبدالجبار صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہوتے۔"(۱)

مولانا صدق ووفا کا پیکر تھے، اپنے استاذ حضرت علامہ اعظمی کے لئے ان کی فنائیت مثالی اور نصیحت آمیز تھی، ستر بہتر سال کی مدت کوئی معمولی مدت نہیں ہوتی، اور نہ ہی طبیعت ہمیشہ ایک ڈھب پر رہتی ہے بقول داغ:

رہروِ راہ محبت کا خدا حافظ ہے اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

وہ اپنی زندگی استاد کے لیئے وقف کر چکے تھے، سفر وحضر میں ساتھ ہوتے، پہلے دونوں حج میں بھی ان کی رفاقت رہی، اور اگر علامہ اعظمی سفر میں ہوتے اور مولانا عبدالجبار صاحب گھر پر، تو گھر کی نگرانی اور تمام امور کی دیکھ بھال آپ ہی کے ذمہ ہوتی، باہر سے آنے والی ڈاک، خطوط ورسائل اور گھر کی خیر وعافیت سے ہر ایک دوروز پر بذریعہ خط علامہ کو اطلاع دیتے رہتے، وہ جسمانی طور پر اپنے استاد سے جدا ہوئے ہوں تو ہوئے ہوں، لیکن دل ودماغ ہمیشہ ساتھ ساتھ رہا۔

حاصل عمر نثارِ رہِ یارے کردم شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

اس وسیع وعریض مدت کی رفاقت وصحبت کے باوجود ادب واحترام اور تعظیم وتوقیر کا رشتہ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا، علامہ اعظمی کے سامنے ان کی نشست وبرخاست کا انداز ایسا ہوتا جیسے ان کے وجود کی کوئی حقیقت ہی نہ ہو، کم گو اور خاموش طبع تو نظر آتا تھے لیکن اپنے شیخ واستاد علامہ اعظمی کے سامنے مہر بلب ہو جاتے، ایسا معلوم ہوتا جیسے ان کے منھ میں زبان ہی نہ ہو،

(۱) المآثر ج ۲ ش ۳ ص ۵

بہت سخت ضرورت پڑنے پر ہوں ہاں کرتے ورنہ خاموش بیٹھے رہتے، الغرض حسن ادب کا ایسا نمونہ بہت کم کسی نے دیکھا ہوگا، علامہ اعظمیؒ کبھی کبھی ہماری بے ادبی دیکھ کر فرماتے کہ "تم لوگوں کو ادب سیکھنا ہے تو مولوی عبدالجبار صاحب سے سیکھو"

واقعہ یہ ہے کہ استاذ محترم مولانا عبدالجبار صاحب کی اپنے استاذ سے محبت و عقیدت اور صحبت و رفاقت کی داستان ایسی نہیں جسے حیطۂ تحریر میں لایا جاسکے، ان کی وفاداری کے متعلق علامہ اعظمی نے خود کشف الاستار کے مقدمہ میں یہ محبت آمیز جملہ لکھا ہے:

"خويصتي الشيخ عبدالجبار المئوي الذي هو مني بمنزلة الهيثمي من العراقي في الملازمة والصحبة ولكن أين أنا و هو، وأين العراقي والهيثمي." (١)

(میرے خاص الخاص شیخ عبدالجبار مئوی، جو میری معیت وصحبت کے التزام میں ایسے ہی ہیں جیسے علامہ ہیثمی اپنے استاذ عراقی کے نزدیک تھے، لیکن کہاں میں اور وہ اور کہاں عراقی اور ہیثمی۔)(۱)

ان سب باتوں کے ساتھ شرافت نفس، متانت و سنجیدگی، حلم و وقار، بے نفسی اور تواضع و سادگی کا جیتا جاگتا نمونہ اور حسن اخلاق کا مرقع تھے، یوں تو ہر کس و ناکس کے ساتھ نہایت خوش اخلاقی اور خندہ روئی سے پیش آتے، لیکن اپنے شاگردوں کے ساتھ ان کا برتاؤ والدین سے زیادہ شفقت و محبت کا ہوتا، اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ سادگی اور بے نفسی آپ کی ذات پر ختم ہوتی تھی۔

۱۰ر رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ کو جب علامہ اعظمی کا وصال ہوا ہے، تو جو خلاء مولانا عبدالجبار صاحب نے محسوس کیا ہوگا اور جدائی کا جو رنج و صدمہ انھوں نے سہا ہوگا اور لوگ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے، دنیا ان کی نظر میں ایک ویرانہ بن چکی تھی، جس کے اندر ان کیلئے کوئی کشش نہیں باقی رہ گئی تھی، بس زندگی کے دن پورے کر رہے تھے اور اس وقت کا انتظار جو ہر ذی نفس کا مقدر ہوتا ہے، نحیف و نزار اور کمزور و لاغر تو پہلے ہی ہو چکے تھے،

(١) كشف الاستار كلمة المحقق ج ١

استاد و شیخ کے فراق کا غم ان کو اندر اندر کھاتا اور اپنا کام کرتا رہا، بالآخر ۱۷ر رجب ۱۴۱۴ھ مطابق ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۳ء کو عین جمعہ کی اذان کے وقت پیام اجل آپہنچا، اسی روز عشاء کی نماز کے بعد مئو واطراف مئو کے ہزاروں آدمیوں نے نماز جنازہ پڑھی اور علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں داہنی جانب سپرد خاک کیا گیا۔

جان ہی دے دی جگرؔ نے آج پائے یار پر عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

ادھر ۱۹۹۳ء کا سال اپنی بساط لپیٹ رہا تھا، ادھر ایک دور ایک عہد کا خاتمہ ہو رہا تھا اور ایک عہد آفریں شخصیت اپنے رب کے حضور اخلاص و محبت، شرافت و کرامت، اور صدق و صفا کا دفتر کھول رہی تھی۔ رحمهما الله رحمة واسعة وأمطر عليهما شآبيب نعمه و رضوانه

مولانا محمد منظور نعمانی سلطان المناظرین حضرت مولانا محمد منظور نعمانی ۱۸ر شوال ۱۳۲۳ھ م ۱۶ر دسمبر ۱۹۰۵ء کو سنبھل میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن سنبھل اور دہلی کے مدرسہ عبدالرب میں حاصل کی، ۱۳۴۰ھ میں جب مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی صدر مدرس ہو کر دارالعلوم مئو آئے تو ان کے دامن تربیت سے وابستہ ہو کر مولانا منظور نعمانی بھی آئے، اور دارالعلوم میں داخل ہو کر ان کی زیر نگرانی تحصیل علم کرتے رہے، یہیں انھوں نے علامہ اعظمی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور ان سے کئی ایک کتابیں پڑھیں، دارالعلوم مئو میں ان کی مدت تعلیم تقریباً تین سال رہی، جس کے دوران انھوں نے متوسطات تک کی لگ بھگ سبھی کتابیں پڑھ ڈالیں، اس کے بعد تکمیل کیلئے دیوبند گئے اور وہاں سے ۱۳۴۵ھ میں سند فراغ حاصل کی۔

فراغت کے بعد اپنے وطن میں مدرسہ محمدیہ سے درس و تدریس کا آغاز کیا، ایک سال بعد امروہہ چلے گئے اور وہاں کے مدرسہ اسلامیہ چلہ میں تین سال تک یہ خدمت انجام دی، اس کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ موقوف ہو گیا، اور پھر کہیں باقاعدہ درس نہیں کی سوائے ندوہ میں چند سالہ تدریس حدیث کے۔

مولانا منظور نعمانی نے مشغلۂ درس و تدریس سے سبکدوش ہو کر اپنی عنان توجہ دوسری طرف موڑی، اور اپنی جد و جہد کا مرکز ایک دوسرا میدان بنایا، یہ میدان تھا اہلسنت

کی حمایت اور اہل باطل کا رد وابطال، اس کے لئے انھوں نے اپنی تمام قلمی، لسانی اور ایمانی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نہایت عظیم الشان کارنامے انجام دیئے، اور اسلام اور سنت وشریعت کی سربلندی کے لئے باطل قوتوں کے ساتھ عمر بھر برسرپیکار رہے، ان سے مناظرے اور مباحثے کئے، ان کی تحریروں اور تقریروں کی کاٹ کی، اور جب تک رہے اہل باطل کے لئے صاعقہ آسمانی بنے رہے۔

اس مقصد کے لئے ان کا سب سے اہم کارنامہ ماہنامہ الفرقان کا اجراء تھا، جسے انھوں نے محرم ۱۳۵۳ھ مطابق مئی ۱۹۳۴ء میں بریلی سے جاری کیا، جو بعد میں منتقل ہو کر لکھنؤ آگیا، الفرقان کے ذریعہ مولانا نے دین ومذہب کی بیش بہا خدمت انجام دی۔

تصنیف و تالیف میں بھی کمال حاصل تھا، تصنیفات کی تعداد پچاسوں ہیں، لیکن ان میں سے چند ایک کو خاص شہرت حاصل ہوئی، جن میں آپ کی معرکۃ الآراء کتاب "ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت" اور "بوارق الغیب" وغیرہ ہیں۔ آپ کی ایک عالمانہ و محدثانہ تصنیف "معارف الحدیث" ہے۔ جو متعدد جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کی پہلی جلد پر تقریباً چالیس صفحات میں علامہ اعظمی کا ایک فاضلانہ اور بیش قیمت مقدمہ بھی ہے۔

مولانا نعمانی علامہ اعظمی کے اولین شاگردوں میں تھے، وہ دارالعلوم مئو میں غالباً مولانا عبدالجبار صاحب کے ہم درس تھے، اپنے استاد سے حد درجہ عقیدت و محبت رکھتے تھے، اور عقیدت ومحبت کا یہ تعلق آخر تک قائم رہا، چنانچہ جولائی ۱۹۸۷ء میں ناچیز کو ایک دو دفعہ آپ کی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، اس وقت آپ صاحب فراش تھے، اور لوگوں سے ملنا جلنا عام طور پر متروک ہو چکا تھا، لیکن علامہ اعظمی کی شاگردی کے تعلق سے ملاقات گوارا فرمائی، غایت درجہ محبت وشفقت سے پیش آئے، اور ضعف واضمحلال کی اس حالت میں بھی خاصی دیر تک (تقریباً آدھے گھنٹہ تک) پاس بٹھائے رکھا، جب تک بیٹھا رہا اپنے استاد ہی کا ذکر فرماتے رہے، ان کی خیریت دریافت فرماتے، ان کی مشغولیات پوچھتے، اس وقت مولانا نے کئی ایک کتابوں کا نام بھی لیا جو انھوں نے زمانۂ طالب علمی میں علامہ اعظمی کے پاس پڑھی تھیں، لیکن افسوس کہ میں اپنی غفلت ولاپرواہی کی وجہ سے انھیں اس وقت نوٹ نہ کر سکا، اور "حسامی" کے سوا تمام کتابوں کا نام ذہن سے نکل گیا۔

۲۶؍ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق ۴؍مئی ۱۹۹۷ء کو آٹھ بجے شب میں انتقال فرمایا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ.

مولانا محمد حسین بہاری دارالعلوم دیوبند کے اپنے وقت کے استاذ الاساتذہ مولانا محمد حسین بہاری ۱۳۲۱ھ کے قریب صوبۂ بہار کے ضلع سیتامڑھی کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن اور چمپارن میں پائی، اس کے بعد مئو آئے اور دارالعلوم میں داخلہ لیا، یہ وہی وقت تھا جب مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی، علامہ اعظمی اور مولانا عبداللطیف نعمانی جیسے ارباب فضل و کمال دارالعلوم میں درس و تدریس کی بساط بچھائے ہوئے تھے، چنانچہ اسی زمانے میں انھوں نے علامہ اعظمی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور ان کے خرمن علم سے خوشہ چینی کی۔ دارالعلوم مئو کے بعد سنبھل گئے، اور ایک سال وہاں پڑھا، سنبھل سے مظاہر علوم سہارنپور اور سہارنپور سے دیوبند پہنچے، اور وہیں سے ۱۳۴۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

فراغت کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا، سب سے پہلے سہارنپور کے مدرسہ شاہ بہلول میں تعلیم دی، اس کے بعد راندیر (سورت) اور دہلی کے مدرسوں میں درس و تدریس کی خدمت انجام دی، ۱۳۶۷ھ میں اکابر دارالعلوم دیوبند کی نظر انتخاب آپ پر پڑی، اور دارالعلوم میں بحیثیت مدرس آپ کو بلا لیا گیا، اس وقت دہلی کے ایک مدرسہ میں محفل درس جمائے ہوئے تھے، دارالعلوم دیوبند میں آپ نے چالیس برس سے زائد مدت تک درس دیا، وہاں کی فضا سے کچھ ایسی انسیت پیدا ہوئی کہ مر کر بھی اس سے جدا نہ ہوئے اور وہیں کی خاک کا پیوند ہوئے۔

مولانا بہاری یوں تو مختلف علوم و فنون کے جامع تھے، لیکن معقولات میں خاص درک تھا، معقولات ان کا فن اختصاص تھا، اس فن کی بڑی بڑی کتابیں آپ کے زیر درس رہا کرتی تھیں، جن کو وہ بڑی عمدگی اور خوبی سے طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے، انتقال کے بیس بائیس برس قبل سے حدیث کی بعض کتابیں بھی آپ کے زیر درس رہنے لگی تھیں، اور معقولات کے بعد منقولات میں بھی اسی مہارت اور جامعیت کا ثبوت دیا۔ ۵؍رجب

۱۴۱۲ھ مطابق ۱۲ر جنوری ۱۹۹۲ء کو وفات واقع ہوئی (۱)۔ رحمہ اللہ

مولانا عبدالرشید حسینی مئوی تاریخ ولادت کا صحیح علم نہیں، مولانا عبدالجبار صاحب اور مولانا منظور نعمانی کے ہم درس و ہم عصر تھے، اس حساب سے سال پیدائش ایک آدھ سال آگے پیچھے ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم

دارالعلوم مئو میں تعلیم حاصل کی، وہیں سے فراغت پائی اور وہیں ان کو علامہ اعظمی سے نسبت تلمذ بھی حاصل ہوئی، درس و تدریس کا آغاز غالباً دارالعلوم مئو سے کیا اس کے بعد ایک عرصہ تک مفتاح العلوم مئو میں تدریسی خدمت انجام دیتے اور اس کے نہایت صاحب استعداد، باصلاحیت اور کامیاب مدرس شمار ہوتے رہے ہیں، کتب حدیث میں جامع ترمذی سے خاص شغف تھا، اور اس کے درس کی شہرت بھی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو علم دین کے ساتھ دینا کی دولت سے بھی نوازا تھا، جس کا اثر ان کی ظاہری حالت پر بھی نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔ وہ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے، خندہ رو، خوش اخلاق، خوش اطوار، خوش پوشاک تھے، نفاست پسند حد درجہ تھے، بڑے ذہین و فطین تھے اور طبیعت میں ظرافت اور بذلہ سنجی بہت تھی، بچوں سے بھی ہنس ہنس کر اور پر لطف باتیں کرتے تھے، ہم لوگوں نے مولانا کو بچپن میں دیکھا ہے، جب وہ مفتاح العلوم کے زمانۂ تدریس میں اکثر و بیشتر ہمارے غریب خانہ پر تشریف لایا کرتے تھے، ان کی صاف ستھری ہیئت، چہرے کے نقوش، ان کی بشاشت، ان کا قد و قامت اور سراپا اور سب سے بڑھ کر ان کی پر لطف باتیں اب بھی دل و دماغ میں بسی ہوئی ہیں۔ ۲۶ر ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ م ۱۵ر ستمبر ۱۹۸۲ء کو بدھ کے دن سفر آخرت پر روانہ ہوئے، رحمہ اللہ وغفرلہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنیؒ سے شرف بیعت حاصل تھا اور اسی نسبت سے خود کو حسینی لکھا کرتے تھے۔

(۱) اس کا اکثر حصہ ماہنامہ دارالعلوم وفیات نمبر سے ماخوذ ہے۔

مولانا محمد یحیی صاحب اعظمی سال پیدائش معلوم نہیں، دارالعلوم مئو میں تعلیم حاصل کی اور وہاں علامہ اعظمی سے بطور خاص کسب فیض کیا۔ علامہ اعظمی کے ذخیرۂ مکاتیب میں مولانا یحیی صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے جو خطوط محفوظ ہیں ان سے بظاہر اندازہ ہوتا ہے کہ شوال ۱۳۴۵ھ (مطابق ۱۹۲۷ء) میں دیوبند گئے اور وہاں ہدایہ کی جماعت میں داخلہ لیا، دیوبند سے مظاہر علوم سہارن پور گئے اور وہیں فاتحۂ فراغ پڑھی، خطوط سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ سہارن پور کے زمانۂ طالب علمی میں شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب کا قرب حاصل رہا، حضرت شیخ کے بعض مسودات کی تبییض وغیرہ کی خدمت بھی انجام دی، اور ان کی خدمت میں علامہ اعظمی کے سلام وپیام کے لئے واسطہ کا کام بھی کرتے تھے۔ مولانا یحیی صاحب نے مدرسہ مفتاح العلوم مئو میں سالہا سال تک فرائض تدریس انجام دیئے۔

ان کا شمار مفتاح العلوم کے باصلاحیت اور کامیاب مدرسین میں ہوتا تھا، عربی ادب سے ان کو خاص مناسبت تھی، اور ان کا ادب عربی کا درس مشہور تھا، سہارنپور سے علامہ اعظمی کی خدمت میں جو خط لکھے ہیں، وہ سب عربی ہی میں ہیں۔

مولانا سیدھے سادے، منکسر المزاج، متواضع اور بے نفس انسان تھے، متانت و سنجیدگی اور شرافت طبیعت ثانیہ تھی، نام ونمود اور تعلّی وترفع کی ہوا بھی نہ لگی تھی، نہایت خاموشی اور خلوص کے ساتھ درس وتدریس اور کتابوں کی تجارت میں عمر بسر کی۔

ان کا اپنے استاد علامہ اعظمی سے گہرا اور مضبوط تعلق تھا، اور یہ ربط و تعلق آخر تک استوار و برقرار رہا، وہ علامہ اعظمی کے مخصوص ابتدائی تلامذہ میں تھے، اور ان کو اپنے استاد کا دامن چھوڑنا گوارا نہ تھا، لیکن جب علامہ اعظمی دارالعلوم چھوڑ کر بنارس چلے گئے تو وہ بھی دیوبند اور سہارنپور سفر کر گئے، علامہ اعظمی کے پاس حدیث نہ پڑھ سکنے کا ان کو افسوس تھا، اور اپنی حسرت وافسوس کا اظہار انھوں نے ۲۲ ربیع الآخر ۱۳۴۸ھ کو سہارن پور سے لکھے ہوئے ایک خط میں اس طرح کیا:

"إني سعيت ما أمكن أن أحضر مجلس تدريسكم الحديث لكن الزمن الزمن لم يساعدني."

(میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ آپ کے درس حدیث کی مجلس میں شرکت کروں، لیکن زمانہ نے معاونت نہ کی)

۱۲ر شعبان ۱۳۹۶ھ مطابق اگست ۱۹۷۶ء کو وفات پائی، اللہ تعالیٰ ان کے اوپر اپنی رحمت کا سایہ فرمائے۔

مولانا عبدالستار معروفی آپ ضلع مئو کے مردم خیز قصبہ پورہ معروف میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مدرسہ معروفیہ میں پائی، اس کے علاوہ مصباح العلوم کوپاگنج، احیاء العلوم مبارکپور، اور دارالعلوم مئو میں بھی تعلیم حاصل کی، اور مظاہر علوم سہارنپور سے سند فراغ حاصل کی۔

فراغت کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہوگئے، اور اس مبارک مشغلے کو عمر بھر جاری رکھا، ابتداءً دارالعلوم مئو اور قاسم العلوم ہریا بھٹنی میں تدریسی خدمات انجام دیں، اس کے بعد مدرسہ معروفیہ اور پھر اشاعت العلوم پورہ معروف میں صدر مدرس مقرر ہوئے، مدرسہ بیت العلوم مالیگاؤں میں صدر مدرس و شیخ الحدیث اور دارالعلوم ندوہ میں شیخ الحدیث رہے، اس کے علاوہ دارالعلوم امدادیہ بمبئی میں بھی فریضۂ تدریس انجام دیا۔

مولانا عبدالستار صاحب، علامہ اعظمی کے خاص شاگردوں اور سعادتمند تلامذہ میں تھے، استاد کی عقیدت و محبت میں سرشار تھے، غالباً دارالعلوم مئو کے زمانۂ طالب علمی میں علامہ اعظمی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے، اور اس وقت سے تادم واپسیں اپنے استاد کے ادب و احترام میں کوئی کوتاہی نہیں کی، یہاں تک کہ آپکے دیگر افراد خانہ حتیٰ کہ خوردوں کے ساتھ بھی تعظیم و توقیر کا معاملہ فرماتے، بعض علمی و تحقیقی کاموں میں علامہ اعظمی کے معاون بھی رہے، چنانچہ مسند حمیدی کے مخطوطات کے مقابلہ میں آپ علامہ اعظمی کے شریک رہے، جیساکہ خود علامہ اعظمی نے مسند کے مقدمے میں ذکر فرمایا ہے۔

مولانا عبدالستار صاحب بڑے ذی علم، صاحب استعداد اور باصلاحیت انسان تھے، آپ کا فضل و کمال مسلم تھا، بہت وجیہ شخصیت کے مالک تھے، مگر ان تمام باتوں کے ساتھ سادگی اور تواضع کا پیکر تھے، بے نفسی و انکساری ایک ایک ادا سے ٹپکتی تھی، زمانۂ دراز تک علمی و تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد ۲۲ر رجب ۱۴۱۴ھ م ۶ر جنوری ۱۹۹۴ء کو مالیگاؤں میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے۔

مولانا محفوظ الرحمٰن نامی رسڑا ضلع بلیا کے باشندہ تھے، ولادت جمادی الثانیہ ۱۳۲۹ھ (مئی ۱۹۱۱ء) میں ہوئی، دیندار گھرانے کے چشم وچراغ تھے، غالباً ابتدائی تعلیم کے بعد مئو آئے، اور دارالعلوم مئو میں داخلہ لیا، وہیں علامہ اعظمی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، دارالعلوم مئو میں کئی سال رہے اور علامہ اعظمی کے دامن فضل سے خاص طور سے وابستہ رہے، اس کے بعد ۱۹۲۷ء (غالباً ۱۳۴۶ھ) میں دیوبند گئے اور وہاں کئی سال زیر تعلیم رہ کر علم وفن کی تکمیل کی۔

فراغت کے بعد اپنی علمی ودینی سرگرمیوں کے لئے بہرائچ کا انتخاب کیا، وہاں انھوں نے نورالعلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، اس مدرسہ کی نشو ونما اور تعمیر وترقی کے لئے انتھک کوششیں کیں، اور آخر وقت تک اس کے لئے اپنی فکری، علمی اور عملی صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کرتے رہے، اس کے اندر انھوں نے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ صنعت وحرفت کے شعبے قائم کئے۔

مولانا نامی اپنے وقت کے ایک جید الاستعداد اور باصلاحیت عالم اور عابد وپرہیزگار انسان تھے، قرآن کریم کے ساتھ خاص شغف تھا، اور قرآن کی تعلیم وتدریس کا ان کے اندر شدید جذبہ موجزن تھا، اس کے لئے انھوں نے مفتاح القرآن کے نام سے رسائل لکھے، قرآن پاک کی تعلیم وترجمہ کے مسلمانوں میں فروغ کی ان کو اس قدر فکر لاحق تھی کہ اس کے لئے انھوں نے متعدد مقامات کے دورے کئے، اسی کے ساتھ وہ خوش بیان واعظ ومقرر بھی تھے، بہرائچ میں حنفیت اور دیوبندیت کے فروغ کے لئے بھی بڑی قابل قدر کوششیں کیں۔

قدرت کی طرف سے ان کو دینی ودنیوی دونوں وجاہتیں عطا ہوئی تھیں، چنانچہ وہ متعدد اہم مناصب پر فائز رہے، بہرائچ میں ان کو بڑی مقبولیت اور عوام کے درمیان اعزاز واکرام حاصل تھا، ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر الیکشن لڑے (۱) اور لیگ جیسی طاقتور

---

(۱) کاروان رفتہ ص ۲۳۶

اور مسلمانوں میں اثر و رسوخ رکھنے والی پارٹی کے مقابلہ میں کامیاب ہوئے، اور لکھنؤ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، وہ وزارت تعلیم میں پارلیمنٹری سکریٹری بھی رہ چکے تھے، ان عہدوں کے علاوہ وہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی رہ چکے تھے۔

علامہ اعظمی سے جب سے نسبت تلمذ قائم ہوئی، اس وقت سے لے کر آخر دم تک ربط و تعلق بر قرار رکھا، خط و کتابت کا سلسلہ زمانۂ طالب علمی سے لے کر وفات سے کچھ پیشتر تک جاری رکھا، اہم امور میں آپ سے مشورے لیتے، اپنے مدرسے کے لئے اساتذہ و مدرسین کی تقرریوں میں آپ کی طرف رجوع کرتے، بلکہ کئی ایک موڑ پر انھوں نے علامہ اعظمی کو اپنے مدرسے میں درس و تدریس کے لئے بلانے کی کوشش بھی کی، علامہ اعظمی بھی ان کو عزیز رکھتے تھے، اور وعظ و تقریر و جلسوں میں ان کو کبھی کبھار دعوت بھی دیتے، شاگرد کے نام استاذ کے ایک خط کی نقل ہمارے سامنے موجود ہے، جو ۲۳ر جنوری ۱۹۳۴ء کا نوشتہ ہے وہ خط حسب ذیل ہے۔

"عزیز مکرم مولوی محفوظ الرحمٰن صاحب حفظہ اللہ

السلام علیکم۔ میں نے مئو میں آپ سے ذکر کیا تھا کہ میں نے ایک طالب علم کو آپ کے پاس جانے کا مشورہ دیا ہے، آج اس طالب علم کو اپنا رقعہ دے کر آپ کے پاس بھیجتا ہوں، اس کے وظیفہ کا انتظام کر کے مجھے اطلاع دیجئے، یہ لڑکا عزیز قوم ذل کا مصداق ہے، کبھی اس کا خاندان مئو میں بڑا نامی خاندان تھا، لیکن اب آوارگی کی وجہ سے نہ صرف بدنام بلکہ افلاس میں بھی مبتلا ہے۔

بہر حال اس کا خیال کیجئے اور تعلیم کے ساتھ تربیت کا بھی لحاظ رکھئے، تہذیب اخلاق کی طرف خاص توجہ درکار ہے، آپ کے مدرسہ کی کاپیاں دیکھ کر واپس کرتا ہوں اس کی رسید بھیجئے، زلزلہ کی وجہ سے جو نقصانات ہوئے ہیں ان کی تفصیل معلوم ہوگی، جامع مسجد کی بھی ایک مینار گر گئی ہے، اور سب خیریت ہے، والسلام

حبیب الرحمٰن الاعظمی ۲۳ر جنوری ۳۴ء"

رجب ۱۳۸۳ھ مطابق نومبر ۱۹۶۳ء میں فالج کے مرض میں وفات پائی۔

مولانا قاری ریاست علی بحری آبادی مئوی | آبائی وطن بحری آباد ضلع غازیپور تھا، وہیں ۱۹۰۰ء میں تولد ہوئے، لیکن عمر زیادہ تر مئو میں گزاری اور نقل وطن کر کے یہیں سکونت پذیر ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بحری آباد میں پائی، اس کے بعد مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ اور پھر سبحانیہ الہ آباد میں رہ کر تجوید و قرأت سبعہ کی تکمیل کی اور اس فن میں مہارت بہم پہنچائی۔

فن تجوید و قرأت کی تکمیل کے بعد کچھ دنوں بریلی میں اس کے استاد رہے، کچھ ہی دنوں بعد ۱۳۴۰ھ میں دارالعلوم مئو آگئے، اور یہاں تجوید و قرأت کے استاد مقرر ہوئے، مگر ساتھ ہی سلسلۂ تحصیل علم بھی جاری رکھا، اپنے وقت کی تقسیم اس طرح کی کہ چار گھنٹے طلبہ کو پڑھاتے اور دو گھنٹے خود طالب علم بن کر اساتذہ سے علم حاصل کرتے، اس طرح ۱۲ سال کی طویل مدت کے بعد ۱۳۵۲ھ میں سند فراغ حاصل کی، اسی زمانہ میں علامہ اعظمی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے مقامات حریری اور نورالانوار وغیرہ کا درس لیا۔

قاری صاحب کی علم و فن سے لگن کا اندازہ ان کی اسی ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ استاذ القراء کے عہدہ پر فائز رہتے ہوئے بارہ برس تک طالب علمی کی زندگی گذاری، تجوید و قرأت میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، اور اس میدان میں ان کے معاصرین میں بہت کم ان کے ہمسر ہوئے، اس فن میں ان کا فیض دور دور تک پہنچا اور ایک دنیا اس چشمۂ صافی سے فیضیاب ہوئی۔

قاری صاحب نے درس نظامی کی تکمیل کے بعد عربی درجات میں بھی درس و تدریس کا کاروبار شروع کیا، پوری عمر تدریسی خدمات انجام دیتے اور دارالعلوم کی خدمت کرتے گذار دی، ان کے فضل و کمال کی ایک شاندار مثال یہ تھی کہ شیخ القراء کے ساتھ دارالعلوم مئو کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین کا تاج بھی ان کے سر پر رکھا گیا۔

آخر عمر میں کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے تھے، اور بالآخر اسی بیماری میں ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ مطابق ۲۱ جنوری ۱۹۷۲ء کو جان جان آفریں کے سپرد کی، نماز جنازہ ان کے استاد محترم حضرت علامہ اعظمی نے پڑھائی تھی۔

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی اس کتاب میں یہ نام بے شمار بار آیا ہے، علامہ اعظمی کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ صوبہ بہار کے ضلع دربھنگہ کے ایک موضع پورہ نوڈیہا میں ۷/مارچ ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وطن اور راجپور نیپال کے مدرسہ محمودیہ میں پائی، ۱۹۳۴ء میں چھپرہ کے مدرسہ وارث العلوم میں داخل ہوئے، اور ۱۹۴۰ء تک وہاں رہ کر شرح وقایہ تک کی کتابیں پڑھیں، اسی اثناء میں علامہ اعظمی اور مولانا عبداللطیف نعمانی کے درس کا غلغلہ ان کے کانوں میں پڑا، اور جاذبۂ توفیق انھیں مدرسہ مفتاح العلوم مئو تک لایا، مفتاح العلوم میں انھوں نے شوال ۱۳۵۹ھ میں داخلہ لیا، اور چار سال قیام پذیر رہ کر شعبان ۱۳۶۳ھ م ۱۹۴۴ء میں علامہ اعظمی کے پاس بخاری وترمذی پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔

مفتاح العلوم مئو میں داخلہ کا اصل محرک ان ہی دونوں بزرگوں بالخصوص علامہ اعظمی کی شہرت تھی، جس کا آوازہ انھوں نے چھپرہ میں سنا تھا، اس وقت کا مفتاح العلوم آج کا مفتاح العلوم نہیں تھا، اس وقت یہ بلند وبالا عمارتیں نہ تھیں، کمروں کی کمی تھی، حتی کہ جامع مسجد کا فرش اساتذہ کی درسگاہ تھا، مگر تعلیمی لحاظ سے وہی مفتاح العلوم کا عہد شباب تھا، مفتی ظفیر الدین صاحب اسی بے سروسامانی کے زمانہ کی پیداوار ہیں، زمانۂ طالب علمی میں ان کا قیام محلہ باغیچہ کی مسجد میں رہا، پاس ہی مولانا عبدالجبار صاحب کی رہائش تھی، اس لئے انھوں نے ان سے بھی خوب فیض حاصل کیا، مفتی صاحب اس وقت علامہ اعظمی کے خاص خادموں میں تھے، اس زمانے میں بجلی ناپید تھی، لہذا علامہ اعظمی جب رات کے وقت سفر وغیرہ سے واپس آتے تو مفتی صاحب روشنی کا انتظام کر کے آپ کو لینے کے لئے اسٹیشن جاتے، اور اکثر ایسا ہوتا کہ وہ رات آپ مفتی ہی صاحب کی مسجد میں گذارتے، اس کے علاوہ بیماری وغیرہ کی حالت میں بھی خدمت گذاری کرتے۔

فراغت کے بعد درس وتدریس کا آغاز ہوا، ایک سال مفتاح العلوم میں ابتدائی درجوں کے مدرس رہے اور افتاء وغیرہ کی مشق کی، اس کے علاوہ مدرسہ معدن العلوم

نگرام، دارالعلوم معینیہ سانہہ مونگیر اور جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل وغیرہ میں کارہائے تدریس انجام دیئے، ۱۳۷۶ھ میں مفتی صاحب کو دارالعلوم دیوبند طلب کر لیا گیا، جہاں وہ شعبۂ تصنیف و تالیف میں ملازم ہوئے، اس کے بعد ان کو فتاویٰ دارالعلوم کی ترتیب کی ذمہ داری سونپی گئی، جس کو انھوں نے باحسن وجوہ انجام دیا، بعدازاں کتب خانہ دارالعلوم کا مدیران کو بنایا گیا، جس میں انھوں نے اپنی بہترین صلاحیت و قابلیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی فن وار ترتیب دی، اور اس وقت وہاں کے شعبۂ افتاء میں مفتی کے اہم منصب پر فائز ہیں جو ایک مقتدر علمی عہدہ ہے۔

مفتی صاحب بچپن ہی سے ذہین و فطین اور محنتی تھے، درس و مطالعہ کا شوق تھا، اپنی جماعت اور ہم درسوں میں ہمیشہ طاق رہے، ان کی یہی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے وہ اپنے اساتذہ کے مقرب اور منظور نظر تھے، ان کے روابط تو اپنے تمام اساتذہؒ ہی سے تھے، لیکن علامہ اعظمی کے ساتھ ان کی گرویدگی حد سے زیادہ تھی، اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت اور ارشاد و رہنمائی میں علامہ اعظمی کا خاص کردار رہا ہے، شاید و باید ہی کوئی ایسا اہم کام رہا ہو، جس میں وہ علامہ اعظمی سے مشورہ اور راہنمائی کے طالب نہ رہے ہوں۔ یہ علامہ اعظمی کی شاگرد کے اوپر غایت درجہ شفقت تھی کہ جب وہ مفتاح العلوم سے فارغ ہوئے تو آپ نے انتظامیہ پر زور دے کر تدریس و افتاء کی مشق کے لئے مفتاح العلوم میں ان کا تقرر کروایا۔ علامہ اعظمی کی شفقت کے بارے میں مفتی صاحب خود فرماتے ہیں:

”شفقت تو تمام ہی اساتذہ کرام کی رہی، لیکن حضرت الاستاذ مولانا اعظمی نے زیادہ توجہ فرمائی۔“(۱)

چند سطروں کے بعد پھر لکھتے ہیں:

”میرے سب کچھ حضرت اقدس ہی تھے، جب تک حضرت بقید حیات رہے، خاکسار اکتساب علم کرتا رہا، بڑی عنایتیں تھیں۔“(۲)

---

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ۱۴۱ (۲) ایضاً ۱۴۲

ان کی علمی خدمات میں ایک درجن سے زائد کتابیں ہیں، جو متعدد موضوعات پر انھوں نے تصنیف فرمائی ہیں، یہ تصنیفات تالیف و تصنیف کے ان کے ستھرے ذوق کی آئینہ دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کی عمر میں برکت عطا فرمائے، اور ان کے فیض کو جاری وساری رکھے۔

مولانا ضیاء الحسن صاحب اعظمی | ۲۰؍جنوری ۱۹۳۲ء کو مئو میں پیدا ہوئے، تعلیم متوسطات تک مفتاح العلوم مئو میں حاصل کی، اس کے بعد دیوبند گئے اور وہاں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے پاس بخاری پڑھ کر ۱۳۷۱ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ فراغت کے بعد دارالعلوم ندوہ جاکر عربی ادب میں تخصص کیا اور عربی زبان وادب کی بہترین صلاحیت بہم پہونچائی، ندوہ سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد علامہ اعظمی کے دامن تربیت سے وابستہ ہوئے، اور ان کے خوان علم سے بھرپور زلہ ربائی کی، یہ وہ زمانہ تھا کہ علامہ اعظمی سن وسال کے لحاظ سے اگرچہ عمر رسیدہ ہو چکے تھے، لیکن علمی و تحقیقی اعتبار سے یہ ان کا عہد شباب تھا، دوسری طرف مولانا ضیاء الحسن صاحب بھی استعداد و صلاحیت کے ساتھ بھرپور جوش وولولہ رکھتے تھے، علامہ اعظمی نے ان کی ابھرتی ہوئی صلاحیت اور جوش وولولہ کو دیکھتے ہوئے ان کے اوپر دست شفقت رکھا، اور اپنے تحقیقی مشاغل میں ان کو معاون و مددگار بنایا، اور پھر جب مصنف عبدالرزاق کی طباعت کے سلسلہ میں علامہ اعظمی کو سفر لبنان پیش آیا، اور بیروت میں صاحبزادۂ محترم مولانا رشید احمد صاحب بیمار ہو کر گھر واپس لوٹے، تو طباعت کی نگرانی اور اپنی معیت کے لئے مولانا کو بیروت طلب فرمایا، چنانچہ اس مقصد سے وہ خاصے عرصے تک بیروت میں قیام پذیر رہے۔

مولانا ضیاء الحسن صاحب نے پوری عمر علمی مشاغل اور درس و تدریس میں صرف کی، معہد ملت مالیگاؤں، مفتاح العلوم مئو اور مظہر العلوم بنارس وغیرہ میں تدریسی خدمت انجام دی، مظہر العلوم بنارس میں بیک وقت شیخ الحدیث اور صدر المدرسین کے عہدے پر فائز رہے، اس کے بعد ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مقرر ہوئے، اور آخر وقت

تک اس کی مسند کو رونق بخشتے رہے۔

ایک طویل اور صبر آزما علالت کے بعد ۲۳؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ مطابق ۴؍ جنوری ۱۹۸۹ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی علامہ اعظمی کے شاگردوں میں سب سے زیادہ نامور، عربی زبان کے کہنہ مشق ادیب اور شعلہ بیان خطیب مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی الندوی، مولانا محمد ایوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند دلبند ہیں، ۱۹۳۴ء میں مئو میں پیدا ہوئے، درس نظامی کا نصاب مفتاح العلوم مئو میں مکمل کیا، اور ۱۹۵۱ء میں فارغ التحصیل ہوئے، دورۂ حدیث کی کتابوں میں علامہ اعظمی کے پاس سنن ابن ماجہ پڑھی، ۱۹۵۲ء میں ندوہ میں داخلہ لیا اور دو سال زیر تعلیم رہ کر ادب عربی میں تخصص کی سند حاصل کی، اس کے بعد وہیں استاد مقرر ہوگئے، غالباً ۱۹۹۵ء میں (شعراء الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، بین الواقع والقریض) کے عنوان پر آپ نے دکتوراہ (Doctrate) کیا، جس کی بنیاد پر آپ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی، ۱۹۵۵ء میں ندوہ سے جب "البعث الاسلامی" نکلنا شروع ہوا تو اس کے مدیر (ایڈیٹر) منتخب ہوئے، اور ۱۹۷۹ء میں مولانا محمد حسنی کے انتقال کے بعد سے اس کے رئیس التحریر (Chief Editor) ہوئے، اور اپنے خلوص و لگن اور انتھک جدو جہد سے اس کو اعلیٰ معیار تک پہنچایا۔

"البعث الاسلامی" کی ادارت کے علاوہ ندوہ سے نکلنے والے ایک پندرہ روزہ اخبار "الرائد" کے نائب الرئیس العام بھی ہیں، ندوہ کے اور بھی کئی انتظامی عہدے آپ کے سپرد ہیں، چنانچہ وہ کلیۃ اللغۃ العربیۃ کے عمید اور ندوہ کے نائب مہتمم بھی ہیں

مولانا سعید الرحمٰن صاحب اعظمی علامہ اعظمی کے خاص شاگردوں میں ہیں، راقم السطور نے علامہ اعظمی کے سامنے جس ادب و احترام کے ساتھ ان کو نشست و برخاست کرتے ہوئے دیکھا ہے، شاگردوں میں مولانا عبدالجبار صاحب کے علاوہ اور کسی کو نہیں دیکھا۔ علامہ اعظمی کی شاگردی کا شرف ان کو بچپن ہی میں اس وقت حاصل ہو گیا تھا،

جب وہ عربی کی ابتدائی جماعتوں میں تھے، مولانا محمد ایوب صاحبؒ کی درخواست پر علامہ اعظمی نے آپ کو "القراءۃ الرشیدۃ" جزء اول پڑھائی، اس کے علاوہ کچھ حصے مقامات بدیع و مقامات حریری کے بھی پڑھائے، فراغت کے بعد عربی کتابت و انشاء کی مشق کرائی، جو ان کی ترقی کا سب سے بڑا ظاہری سبب بنی، اس قصے کو انھوں نے عربی اور اردو کے اپنے مضامین میں خود بہت تفصیل سے قلمبند کیا ہے، جس کا ایک اقتباس ہم اس جگہ نقل کر رہے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"... دوران طالب علمی ان کے قیمتی مشورے اور ہدایات میری زندگی کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے اور ان سے میں نے ادب عربی میں جو کچھ پڑھا وہی آگے چل کر ندوۃ العلماء میں داخلہ کا سبب اور ابا حضور کی دیرینہ آرزو کی تکمیل کا باعث بنا۔"

میں نے یہ صفحات لکھتے وقت مولانا کے پاس خط لکھ کر اس بابت مزید تائید و توثیق چاہی تو انھوں نے ازراہ عنایت یہ سطریں تحریر فرما کر روانہ فرمائیں:

"دورہ کے بعد والے سال میں والد صاحب رحمہ اللہ نے حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ میرے لڑکے سعید الرحمٰن کو عربی لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کرنے اور اصلاح لینے کی اجازت دیں، چنانچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے روزانہ ظہر کے بعد گھر پر اپنے دار المطالعہ میں حاضر ہونے کی اجازت دی اور ایک کتاب عربی ادب کی عطا فرمائی کہ میں اس کا اردو میں ترجمہ کر کے روزانہ خدمت عالیہ میں پیش کروں، کبھی کبھار اس اردو کو عربی میں تبدیل کرنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی بغیر اس کے کہ کتاب سے کوئی مدد لی جائے، اس سے بہت فائدہ ہوا اور کم و بیش پورے ایک سال تک روزانہ بلاناغہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں انشاء لے کر حاضر ہوتا رہا اور استفادہ کر کے واپس آتا تھا، شاید اسی پابندی کا نتیجہ تھا کہ عربی زبان و ادب

سے کسی قدر مناسبت پیدا ہوئی اور ندوہ جیسے عظیم ادارے میں خدمت کا موقع ملا۔"

استاد نے اپنے اس شاگرد رشید کی کس طرح تعلیم وتدریب کی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ اعظمیؒ نے ایک دفعہ راقم الحروف سے فرمایا کہ مولوی سعید الرحمٰن جب فارغ ہوئے تو مولوی ایوب صاحب نے مجھ سے کہا کہ سعید الرحمٰن کو عربی تحریر وانشاء کی مشق کرادیجئے، تو ایک آدھ سال تک وہ میرے پاس انشاء کی مشق کرتے رہے، اس کے بعد مولوی ایوب ہی کے کہنے پر میں نے ان کو ندوہ بھیج دیا، ان کے ندوے جانے کے کچھ دنوں بعد جب میں ندوہ گیا تو شاہ حلیم عطا (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم ندوہ) اپنی درسگاہ کی طرف سے آرہے تھے، مجھے گیٹ پر دیکھ لیا، بڑے تپاک سے ملے اور گلے لگا کر کہا "مولانا! آپ نے شاگرد نہیں شعلۂ جوالہ بنا کر بھیجا ہے۔ ۴

علامہ اعظمی کے الفاظ بعینہ یاد نہیں رہ گئے۔ مفہوم یہی تھا جو بیان کیا گیا ہے البتہ آخر کا جملہ بعینہ مذکور ہے۔

☆☆☆

علامہ اعظمی نے فرمایا:

ہم انگریزی پڑھنے کو بالکل منع نہیں کرتے مگر جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ غلط ہے، ایک لڑکا انگریزی پڑھتا ہے، تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ نماز وغیرہ تو مدرسہ میں جو طالب علم پڑھتے ہیں ان کا کام ہے، روزہ رکھنا ان کا کام ہے، ان کو ان چیزوں سے، اسلامی وضع قطع سے نہ کوئی دلچسپی ہے اور نہ اپنے لئے وہ ضروری سمجھتے ہیں، بلکہ وہ اپنے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ ان تعلیمات کی مخالفت کریں، اگر ایسا نہیں کرتے تو وہ اپنی نسبت سمجھتے ہیں کہ لوگ ہم کو دقیانوسی اور قدیم خیال کا آدمی تصور کریں گے، یہ ساری برائیاں ہیں - یہ برائیاں اسکولوں اور کالجوں سے تو دفع ہونے کی نہیں، لیکن کسی مجبوری کے تحت جب ہمارے بچے ان میں پڑھتے ہیں تو ان کی ذہنی تربیت کا انتظام کرنا چاہئے۔

المآثر ج ۳ ش ۱ ص ۸۷

☆☆☆☆☆

چھٹا باب

خانگی زندگی

چھٹا باب
خانگی زندگی

بیویاں علامہ اعظمی نے دو شادیاں کی تھیں، اور یہ دونوں شادیاں زمانہ طالب علمی ہی میں ہوئی تھیں، پہلی بیوی کا نام مقیمہ تھا، جو آپ کے استاد مولوی عبدالرحمٰن صاحب اورنگ آباد (مئو) کی صاحبزادی تھیں، لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور رخصتی سے پہلے ہی انتقال کر گئیں۔

مولوی عبدالرحمٰن صاحب کے ایک بھائی مولوی عبدالعزیز صاحب تھے جو مفتاح العلوم کے ابتداء قیام میں اس کے نائب صدر رہ چکے تھے، یہ بھی آپ کے استاد تھے جن سے ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں، علامہ اعظمی کی دوسری شادی انھیں کی دختر نیک اختر سے ہوئی، ان کا نام آمنہ خاتون تھا، اور اغلب یہ ہے کہ ان سے آپ کا نکاح ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ میں ہوا تھا، کیونکہ آپ نے ایک جگہ "قطعہ تہنیت شادی و تاریخ" کے عنوان سے یہ شعر لکھا ہے:

در ماہ عید قرباں از فضل کبریائی   فصل بہار آمد در باغ مصطفائی

اور اس کے نیچے "فیروز کتخدائی" تحریر ہے، جس کے اعداد ۱۳۳۸ برآمد ہوتے ہیں، اس کے علاوہ آپ کی نظموں میں ایک نظم سہرا کے عنوان سے ہے جو ۱۳۳۸ھ کی لکھی ہوئی ہے اور اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے، ویسے یہ بات تو بہر حال یقینی ہے کہ شوال ۱۳۳۹ھ سے قبل آپ کا عقد ہو چکا تھا۔ کیونکہ آپ کے ذخیرۂ مکاتیب میں اس زمانہ کے دیوبند سے لکھے ہوئے کچھ خطوط زوجہ کے نام کے ملتے ہیں۔

علامہ اعظمی نے اپنی بیاض میں اپنی اہلیہ کا نسب نامہ بھی تحریر فرمایا ہے، جو حسب ذیل ہے:

"آمنہ خاتون بنت مولوی عبدالعزیز بن میانصاحب ولی اللہ بن میاں جی جمال الدین عرف جمن بن طولن بن رجو بن صدور بن اسماعیل بن اشرف(۱) بن شہاب الدین(۲) بن خواجن بن جمال(۳) بن مدا۔"

انھوں نے عمر خاصی طویل پائی اور اپنے عظیم خاوند کیلئے بہترین رفیقۂ حیات ثابت ہوئیں، ان کی زندگی حسنِ معاشرت کا نمونہ تھی، زندگی کا ہر دکھ سکھ جھیلتی رہیں، لیکن زبان پر کبھی حرف شکایت نہ آنے دیا، علم و عمل، درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کی قدر و قیمت سے بہر طور آگاہ تھیں، اور اپنی خدمت گذاری سے شوہر کو ہمیشہ آرام پہنچاتی رہیں، ۹ر جون ۱۹۷۹ء کو عین سحر کے وقت آپ کا انتقال ہوا۔

اولاد و اعقاب دوسری شادی میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے بہت برکت عطا فرمائی، اولادیں آپ کی تمام ان ہی سے ہوئیں، اور خوب پھلیں پھولیں، چنانچہ وفات کے وقت آپ نے اولاد و احفاد و اسباط کا ایک بہت بڑا اور بھرا پرا کنبہ چھوڑا۔

ان سے آپ کی دس اولاد ہوئی: تین ذکور سات اناث، جن کے نام حسب

(۱) علامہ اعظمی نے ان کے نام پر حاشیہ کا نمبر دے کر لکھا ہے: " كان حيا في سنة ١١٢٥ ھ و قد باع النصف من محلة الباز التي ورثه هو و إخوانه من أبيه بمأتي روبية و روبية من منور بن مبارك بن گھاسی ۵۱ ." یعنی ۱۱۲۵ھ میں حیات تھے، انھوں نے نصف پورہ باز، جس کو انھوں نے اور ان کے بھائیوں نے اپنے والد سے وراثت میں پایا تھا، ۲۰۱ روپے میں منور بن مبارک بن گھاسی کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔

(۲) ان کے بارے میں حاشیہ میں لکھتے ہیں:" كان حيا في سنة ١١٠٣ ھ وهو عهد السلطان عالمگیر." یعنی ۱۱۰۳ میں جو کہ سلطان عالمگیر کا عہد ہے، بقید حیات تھے۔

(۳) ان کی نسبت لکھا ہے: " هو الذي اشترى محلة الباز بثلث مائة و ست و خمسين روبية من بانيها باز بن عالم الحائك (سفید باف)." انھوں نے ہی محلہ پورہ باز کو اس کے بانی باز بن عالم حائک (سفید باف) سے ۳۵۶ روپے میں خرید اتھا۔

ترتیب پیدائش یہ ہیں: عائشہ، اسماء، رضیہ تاریخی نام رضیۃ الرحمان، زکیہ، رشید احمد تاریخی نام فضل عظیم، صفیہ، خدیجہ، سعید احمد، مختار حسن، عبیدہ، ان میں تین صاحبزادیاں اور ایک چھوٹے صاحبزادے (مختار حسن) اپنے والد کی حیات ہی میں وفات پاگئے، صاحبزادے کی تاریخ وفات کا تو علم نہیں ہو سکا، صاحبزادیوں کی وفات کے بارے میں چوتھے باب میں لکھا جا چکا ہے۔

☆☆☆

علامہ اعظمی نے فرمایا:

زمانہ چاہے جتنا بھی ترقی کر جائے، روشنی چاہے جتنی بڑھ جائے، آپ اور ہم چاہے جتنے روشن خیال ہو جائیں، لیکن احکام اسلام کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، اور جو طریقۂ کار عائشہ صدیقہؓ اور فاطمہ زہراؓ کے لئے تھا وہی طریقہ تعلیم اور وہی طریقۂ تربیت آج ہماری اور آپ کی بیٹیوں کیلئے بھی رہے گا، چودہ سو برس پہلے محمد رسول اللہ ﷺ نے جس طرح عورتوں کے رہنے سہنے اور ان کی تعلیم کا انتظام کیا تھا، اسی کی روشنی میں، اسی کی مطابقت میں، اسی کی پیروی میں آج ہم کو بھی کرنا ہوگا، ہمارا یہ عذر اللہ کے نزدیک مسموع نہ ہوگا کہ ارے صاحب زمانہ بہت ترقی کر گیا تھا، فلاں چیز کا اگر خیال کیا جاتا تو دنیا کہتی کہ یہ لوگ کیسے تاریک خیال ہیں، کیسے دقیانوسی ہیں، اللہ کے نزدیک یہ عذر نہیں ہوگا۔ یہ دقیانوسیت نہیں ہے۔ یہ اپنے اصول، اپنے طریقہ کار اور اپنی مذہبیت کے اندر پختگی ہے۔

المآثر ج ۳ ش ۱ ص ۸۸ ـ ۸۹

☆☆☆☆☆☆☆

ساتواں باب

اخلاق و عادات، اوصاف و کمالات

ساتواں باب

اخلاق وعادات، اوصاف وکمالات

قدو قامت اور سراپا قد میانہ بلکہ پستی کی طرف مائل، رنگ سانولا، بدن قدرے چوڑا، سینہ دل کی طرح کشادہ اور فراخ، چہرہ نہایت بارعب اور پر جلال جو لوگ جہاندیدہ قسم کے ہیں ان کا خیال ہے کہ اس عصر کے علماء میں ایسا رعب اور جلال کسی اور شخصیت کے چہرہ پر نظر نہیں آیا۔ آنکھوں کے اندر زہد و تقوی کا نور، عقل و دانش کی چمک، جھکی اور فکر میں ڈوبی ہوئی، پیشانی چوڑی، ناک کچھ بڑی، دہانہ درمیانہ بڑا نہ چھوٹا، بال سنتی یعنی کانوں کی لووں تک بالکل سیدھے، بالوں میں خواہ سر کے ہوں یا داڑھی کے ۹۲ بیانوے سال کی عمر تک پوری طرح سفیدی نہیں آئی تھی، اور ابھی خاصے سیاہ تھے، دانت مصنوعی استعمال کرتے تھے، کیونکہ جتنے قدرتی تھے سب گر چکے تھے، آنکھوں کی روشنی نور بصیرت کی طرح تیز اور قوی، البتہ آخر عمر میں موتیابند کا پانی اتر آیا تھا جس کی وجہ سے آپریشن کرانا پڑا، اس لئے عینک کا بھی استعمال کرنا پڑا۔ لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب عمر اسّی پچاسی سے متجاوز ہو چکی تھی، داہنے ہاتھ میں انگشت شہادت، بیچ کی انگلی اور انگوٹھے میں کچھ گڑھا جو قلم پر گرفت کا نشان تھا، دو زانو ہو کر کہنیوں کے سہارے مطالعہ کرنے کی وجہ سے دونوں کہنیوں پر گٹّے پڑے ہوئے، ہاتھوں کا ملمس نرم و گداز تھا۔

علامہ اعظمی کی جسمانی ساخت کافی اچھی تھی، مدت حیات میں بہت سے عوارض میں وقتاً فوقتاً مبتلا رہے، اور بسا اوقات بہت جان لیوا قسم کی بیماریوں سے بھی دوچار ہوئے، لیکن دیکھنے والا بہت تندرست و توانا سمجھتا، دیکھنے سے بظاہر یہ نہ معلوم ہوتا کہ آپ کو کوئی بیماری ہے۔ جسمانی ساخت کو دیکھ کر یہ خیال گذرتا تھا کہ عہد شباب میں شاید تومند رہے

ہوں، اخیر عمر میں جب کہ مجموعۂ امراض ہو گئے تھے، سوائے اعصابی اور جسمانی کمزوری کے آپ کی مجموعی حالت و ہیئت میں کچھ خاص فرق نہیں آیا تھا، ہم نے تو خیر عمر رفتہ میں دیکھا، لیکن آپ کے شاگرد عزیز مفتی ظفیر الدین مفتاحی جو ۱۹۴۰ء میں پہلی دفعہ آپ کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے اور ۱۹۹۲ء تک برابر دیکھتے رہے ان کا بیان پڑھیے، وہ لکھتے ہیں:

> "خاکسار کا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یادداشت پر اور ظاہری صورت و شکل پر بڑھاپے کا کوئی ادنی اثر نہیں دیکھا گیا، ۱۹۴۰ء میں جس صورت شکل پر پہلی بار میں نے دیکھا تھا، رجب ۱۹۹۲ء یعنی وفات سے دو ماہ پہلے تک میں نے حضرت کو اسی شکل و صورت پر پایا، تکلیف تھی، کمزوری بھی تھی، مگر چہرے بشرے پر اس کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا تھا، یہی حال قوت حافظہ کا تھا۔ یہ اللہ کی دین تھی اور علم حدیث سے شغف کی برکت۔"(۱)

لباس و پوشاک گرمیوں میں عموماً موٹے ململ کا کالر دار کرتہ استعمال فرماتے، جو نہ چھوٹا ہوتا نہ غیر ضروری لمبا، اس کی درازی گھٹنوں سے کچھ نیچے ہوتی، سر پر دو پلی یا گول ٹوپی کے اوپر اکثر و بیشتر رومال بھی رہتا۔ گھر پر ہوتے یا مسجد و مدرسہ میں، بلکہ قرب و جوار کے قصبوں میں بھی تشریف لے جاتے تو تہبند پہنے رہتے، البتہ سفر پر بالخصوص لمبے سفر پر جاتے وقت پائجامہ پہن لیتے، جو شلوار نما رہتا تھا، کبھی صدری بھی استعمال کرتے تھے۔

سردی کے موسم میں عام طور پر اونی کپڑے کا کرتہ پہنتے، سردی جب شدت کی ہوتی یا آخر عمر میں جب ضعف زیادہ ہو گیا تھا تو کرتے کے نیچے علاوہ دیگر گرم کپڑوں کے روئی دار مرزئی بھی جسم مبارک پر ہوتی، اونی رومال اور شال کا بھی استعمال کرتے، عمامہ یا صافہ باندھنے کا معمول نہیں تھا، البتہ سخت سردی کے ایام میں اونی رومال وغیرہ سر پر لپیٹ کر رضائی سر سے ڈال کر جب بیٹھتے تو رعب و جلال دوچند اور شخصیت دلآویز ہو جاتی۔

شیروانی کا استعمال کبھی کسی خاص تقریب اور موقع سے کرتے، البتہ بیرونی ممالک

(۱) ترجمان الاسلام ۱۱۔۱۲ ص ۱۴۰

کے سفر پر جب گئے تو اکثر و بیشتر شیروانی ہی میں ملبوس رہے، چنانچہ بیروت و حجاز کے اسفار اور قاہرہ کی کانفرنس میں شیروانی ہی پہن کر شریک ہوئے، ان سب مواقع پر سر پر رومال بھی عموماً رہتا تھا۔

عیدین کے موقع پر یعنی نماز دوگانہ کیلئے بہترین قسم کی عبا زیب تن کرتے، جس میں سادگی کے ساتھ پرکاری بھی ہوتی۔ ہاتھوں میں خوبصورت پتلی سہارنپوری چھڑی آپ کی شخصیت کا جزو لازم تھی۔ آپ کے لباس اور ملبوسات کی خصوصیت سادگی تھی جس کا دامن کسی بھی موقع پر ہاتھ سے نہ چھوٹتا، نمائش اور دکھاوے کا معمولی شائبہ تک نہیں تھا۔

رہائش آپ کی رہائش گاہ اور مکان دیکھ کر آج کے علماء و محققین مشکل سے یہ باور کریں گے کہ دنیائے علم کا تاجدار اور قلمروئے علم کا یہ تخت نشین اتنے معمولی سے گھر میں رہتا ہوگا، چھپر کا مکان جس کی کوئی دیوار صحیح و سالم اور کوئی اینٹ سیدھی نہیں، نشست گاہ ہی آپ کی رہائشگاہ، وہی ملاقات کا کمرہ، وہی کتبخانہ، جس میں چاروں طرف کتابیں اور آلات کتابت بکھرے ہوئے اور ایک آدھ بالشت جگہ لیٹنے اور پاؤں پھیلانے کے لئے بمشکل خالی ہوتی، نشست گاہ کے سامنے اتر طرف ایک چھوٹا سا صحن جس کے ایک کونے میں ذاتی استعمال کا استنجا خانہ تھا، اسی صحن میں گرمی کے دنوں میں رات میں چارپائی ڈال دی جاتی جس پر آپ استراحت فرماتے، وہاں چارپائیاں عموماً دو رہا کرتی تھیں، ایک آپ کے لئے اور دوسری آپ کے شاگرد رشید مولانا عبدالجبار صاحب کے لئے۔

وہ آپ کا آبائی مکان تھا، اور وہیں آپ کے بیشتر تصنیفی و تحقیقی کارنامے انجام پائے، جنھوں نے دنیائے علم و تحقیق کے اندر آپ کے نام کی دھوم مچادی، پھر جب وہاں جگہ کی بہت زیادہ تنگی محسوس کی جانے لگی، تو چند قدم کے فاصلہ پر ایک قطعہ زمین خریدا اور وقتی طور پر ایک کمرہ بنوا کر منتقل ہوگئے، یہ ۷۲ء کے لگ بھگ کی بات ہے، اور زندگی کے آخری ایام میں اسی سے متصل پھر ایک زمین خریدی اور اپنی سہولت کے لحاظ سے دو کمرے تعمیر کرائے، ایک کمرہ نسبتاً وسیع جس کو کتبخانہ کے طور پر استعمال کیا، اور

دوسرا اپنی بود و باش کے لئے رکھا، یہ ایک بڑا احاطہ تھا جس میں اپنے شوق کے حساب سے کچھ پیڑ پودے لگائے، اور اسی احاطے کے جنوب مشرقی گوشے میں اپنی ابدی آرامگاہ کیلئے خود ہی جگہ تجویز فرمائی، اور اب آپ کے اسی کمرے اور کتبخانے کے ٹھیک اوپر ایک نہایت خوبصورت اور عالیشان لائبریری تعمیر کر دی گئی ہے، جس میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی تمام کتابیں اور نوادرات منتقل کر دیئے گئے ہیں، اور اس طرح بحمد اللہ لائبریری کی تعمیر کی آپ کی زندگی کی ایک بڑی خواہش کی تکمیل کر دی گئی۔

ماکل و مشرب | عہد شباب کے بارے میں تو سنا یہ گیا ہے، کہ بڑی فاقہ مستی میں زندگی گذاری ہے، اس لئے کھانے پینے کا زیادہ شوق بھی نہ رہا ہوگا۔ وقت پر جو کچھ میسر ہوا ہوگا کھالیا ہوگا۔ ماکل و مشرب میں جہاں تک میرا مشاہدہ ہے نہ کسی چیز میں بہت زیادہ رغبت ظاہر کرتے تھے، اور نہ کسی چیز سے بظاہر اباء کرتے تھے، آخر عمر میں جب میں نے دیکھا ہے اس وقت آپ ہائی بلڈ پریشر کے مریض اور دل کی بیماری کے مستقل شکار ہو چکے تھے اور ایک آدھ بار دل کا شدید دورہ بھی پڑ چکا تھا اس لئے بہت پھیکی غذا، یعنی ہلکے نمک اور کم مرچ مسالہ کی، تناول فرماتے تھے، زیادہ تر بکرے کا بالکل بچے کا نرم و ملائم گوشت اور نرم و گیلا چاول اور گھی میں ملی ہوئی روٹی، وجہ یہ تھی کہ دانت سب گر چکے تھے، اور مصنوعی دانت کے استعمال کے باوجود چبانے میں دقت پیش آتی تھی، کبھی کبھی فرمائش کر کے ہلکے مرچ مسالے کا مغز بنواتے۔ خوراک بہت کم تھی، بہت تھوڑا کھانا کھاتے۔ ناشتے کا کوئی خاص اہتمام نہیں تھا، چائے کے ساتھ بسکٹ یا اس قسم کی کوئی چیز تناول فرمالیا کرتے، دہی بھی اکثر و بیشتر استعمال میں رہا کرتا تھا، ایسا جو تازہ جما ہو اور ترش نہ ہو کہ بغیر شکر کے بھی کھایا جا سکے، لیکن چائے کے چمچے سے دو تین چمچے سے زیادہ نہیں لیتے تھے۔ چائے قریب قریب ہر وقت تھرماس یا کیتلی میں موجود رہتی جس سے واردین و صادرین کی بھی تواضع کرتے، اور خود بھی جب کام کرتے کرتے تھک جاتے تو نوش جاں فرماتے، چائے کے متعلق آپ کا کوئی خاص فلسفہ یا فارمولا نہیں تھا جو بعض اکابر کے یہاں نظر آتا ہے، حتی کہ اس

کے لئے تازگی کی بھی شرط نہیں تھی، بلکہ تھرماس کی گرم چائے یا کیتلی کی ٹھنڈی چائے بھی گرم کر کے پی لیتے، پان بغیر تمباکو کا کھاتے، خمیرہ و معجون کا استعمال ہمیشہ کرتے جو بدن اور حافظہ دونوں کو تقویت پہنچاتے۔

استغناء و بے نیازی | شخصیت کی تعمیر اور ذات کی تکمیل میں کچھ ایسے اوصاف و خصائل پوری قوت کے ساتھ کارپرداز رہے ہیں، جس میں آپ واضح طور پر دوسروں سے ممتاز نظر آتے ہیں، انھیں خصوصیات میں سے ایک وصف خاص استغناء تھا، یہ وصف آپ کی شخصیت کا ایک ایسا اہم عنصر تھا، جو دیگر تمام اوصاف پر حاوی اور بھاری تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ کبھی آپ نے دنیا اور حطام دنیا کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھا، آپ اس سے ہمیشہ اعراض اور اغماض برتتے رہے، طالب علمی کا عہد ہو یا اسکے بعد کا زمانہ، اقتصادی اور معاشی طور پر کبھی آسودگی اور بے فکری نہیں رہی، مگر اس کے باوجود کبھی دنیا کمانے کی فکر نہیں ہوئی۔ اس زمانے میں جب مفتاح العلوم سے ملنے والی تنخواہ کے صرف ۴۵ روپے پر گذارہ کرتے تھے، اور یہی نہیں ایک مہینے کی پوری پونجی لاکر والد محترم کے حوالے کر دیتے تھے، ہندوستان کے بڑے بڑے اداروں سے سات سات سو روپے ماہوار کی ملازمت کی پیش کش کی گئی، مگر اس کی طرف نظر التفات بھی نہیں کی۔

اوپر آپ تفصیل سے پڑھ آئے ہیں کہ صرف ہندوستان نہیں، بلکہ عالم اسلام سے کیسے کیسے جاہ و منصب آپ کے قدموں میں ڈالے گئے، لیکن ان کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی کبھی گوارا نہیں کیا، عالم اسلام کے اہم مدارس اور جامعات سے بلاوے آتے ہیں کہ آپ آکر اساتذہ کی تربیت اور فضلاء کی نگہداشت و اشراف کا عمل انجام دیں، لیکن وہ دھن کے ایسے پکے کہ معلم الصبیانی ہی میں خوش اور مگن نظر آتے ہیں۔

شاہ مراقش سے لے کر مکے بازی (Boxing) کی دنیا کے بے تاج بادشاہ (محمد علی کلے) تک کے دعوت نامے آتے ہیں، اور ان پر صرف ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر سردخانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔

یہاں میں آپ کے استغناء کی ایک مثال ذکر کردوں جسے ممکن ہے مادیت پسندی کے اس دور میں مبالغہ خیال کیا جائے لیکن ع

حدیث گرچہ غریب است راویاں ثقہ اند

آپ نے مصنف عبدالرزاق کی تحقیق و تعلیق کا جب بیڑا اٹھایا، تو بڑی محنت سے اس کتاب کے قلمی نسخوں کو مختلف کتب خانوں سے حاصل کیا، اور شبانہ روز کی محنت کے بعد دس سال کے طویل عرصے میں نہایت دیدہ وری اور عرق ریزی کے ساتھ اس کی ایک ایک حدیث کی تلاش و تحقیق کے بعد اپنی بیش قیمت تعلیقات سے سجا کر شائع کرنے کے قابل بنایا، جو گیارہ ضخیم جلدوں میں مجلس علمی ڈابھیل کی طرف سے بیروت میں چھپ کر شائع ہوئی، یہ علامہ اعظمی کا ایسا اہم اور عظیم الشان کارنامہ تھا کہ اس کا چرچا کتاب کی اشاعت سے قبل ہی عالم اسلام کے علمی حلقوں میں تحسین و ستائش کے ساتھ ہونے لگا تھا، اس عظیم کام کی رائلٹی (Royalty) کی نسبت جب آپ سے بات کی گئی، جو ۱۹۷۰ء میں، یعنی آج سے تقریباً تیس سال قبل، ہندوستانی کرنسی سے ۱۶ر لاکھ روپئے ہوتی تھی، تو آپ نے بڑی بے نیازی کے ساتھ جواب دیا کہ میں نے اس کام کو شروع کرتے وقت للہ (یا یہ فرمایا کہ بلا معاوضہ) اس کو انجام دینے کی نیت کرلی تھی۔

ایک اور واقعہ سن لیجئے، مولانا محمد یحیی صاحب ندوی سانہہ (مونگیر) ناچیز سے ایک دفعہ فرمانے لگے کہ حضرت مولانا (علامہ اعظمی) کو جس وقت کویت سے انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب کے لئے دعوت دی گئی تھی، تو وہ اقتصادی طور پر آپ کے لئے سخت تنگی اور عسرت کا دور تھا، اسی دوران ایک دن حضرت خدا بخش لائبریری پٹنہ تشریف لائے، تو میں نے عرض کیا کہ حضرت! کویت کی دعوت قبول کرلیجئے، تو آپ نے فرمایا: تمہاری ہی طرح دو اور دنیاداروں نے مجھے یہی مشورہ دیا تھا۔

آپ نے عظیم الشان علمی کارنامے جس بے نیازی و استغناء اور جذبۂ خلوص کے ساتھ انجام دئے وہ بہت تعجب خیز ہیں۔ یہاں آپ کے ایک خط کا ایک ٹکڑا پڑھ لیجئے جسے

۲۱/ستمبر ۱۹۶۷ء م ۱۵/جمادی الثانیہ ۱۳۸۷ھ کو مولانا ابراہیم میاں افریقی کے نام لکھا ہے:
"آپ نے اپنے عنایت نامہ میں میری مشکلات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، مشکلات کی تفصیل لکھنا علم کے نام کو بٹہ لگانا ہے"

یہ واقعات قرون اولیٰ کے محدثین وحفاظ کی یاد تازہ کردیتے ہیں، اور امید کی جاتی ہے کہ آپ کا شمار ان نفوس قدسیہ میں کیا جائے گا، جن کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے: "من المؤمنين رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه"

غیرت وخودداری | طبیعت بلا کی غیور پائی تھی، غیرت آپ کی سب سے قیمتی اور عزیز متاع تھی، عمر بھر جس کی کسی آبگینے کی طرح حفاظت کرتے رہے، اور زندگی کے کسی بھی حصے اور مرحلے میں اس پر کوئی بال نہیں آنے دیا، آپ کی زندگی میں بہت سارے نشیب وفراز آئے، تلخ وترش حالات سے دوچار ہوئے، دنیا کی دھوپ چھاؤں دیکھی، لیکن غیرت وخودداری کے اس ٹھوس جذبہ کو کبھی ٹھیس نہیں لگنے دی۔ امیر کبیر ہو، رئیس ہو یا بڑے سے بڑا وزیر کبھی کسی کے سامنے سر خم نہیں ہوا۔

مفتاح العلوم میں جس وقت شیخ الحدیث اور صدر مدرس تھے، تو وہاں کی تنخواہ کے ۴۵/روپے واحد وسیلۂ معاش تھے۔ لیکن جب غیرت حق کا مسئلہ آیا تو اس کو بھی لینے سے انکار کردیا، اور دو ڈھائی سال تک تمام امور بلا معاوضہ انجام دیتے رہے، مگر خودداری پر ایک لمحہ کے لئے بھی حرف نہیں آنے دیا۔

حمیت دینی | دینی حمیت آپ کے اندر بدرجۂ کمال موجود تھی، بلکہ آپ کی ذات اس صفت کا منتہا تھی، اس کی شاہد عدل وہ تصانیف ہیں جو آپ کے قلم فیض رقم سے وجود میں آئی ہیں۔ سنیت ہو یا دیوبندیت وحنفیت، ہر میدان میں دین کا آپ نے پرجوش دفاع کیا ہے، اور یہ سب کسی تعصب کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ تصلب فی الدین کے اثرات ومظاہر اور احقاق حق کا بے پناہ جذبہ تھا، جیسا کہ مفتی ظفیر الدین صاحب فرماتے ہیں:

"درس حدیث میں فرماتے تھے کہ مجھے کسی سے عناد نہیں ہے، حدیث میں نماز

کے سلسلہ میں متعدد روایتیں آئی ہیں، ایک پر اگر غیر مقلد عمل کرتے ہیں تو ان سے کیوں لڑا جائے، جب کہ وہ بھی حدیث سے ثابت ہے، لیکن جب وہ حنفیوں کو طعنہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث پر عمل نہیں کرتے، قیاس پر عمل پیرا ہیں تو اس وقت سوچو کیسے خاموش رہا جائے، اور یہ کیوں نہ بتایا جائے کہ ہم حدیث پر تم سے زیادہ عمل کرنے والے ہیں، اور تم سے زیادہ حدیث جاننے والے ہم ہیں (۱)۔"

اور واقعہ یہی ہے کہ جدل و مناظرہ اور تخاصم و تصادم آپ کے طبع و مزاج کے سر تا سر خلاف تھا، پڑھنا پڑھانا آپ کا شیوہ، بحث و تحقیق اور تصنیف و تالیف آپ کا مشغلہ اور درس و مطالعہ طبیعت ثانیہ تھا، کتاب ہو اور گوشۂ عافیت اس سے زیادہ پسندیدہ کوئی چیز نہیں تھی، ع

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

لیکن بات وہی ہے کہ جب مسلک اہلسنت، دیوبندیت یا حنفیت پہ زد آتی اور حق و صداقت کے خلاف غل مچایا جاتا، اس وقت آپ اپنی طبیعت کے خلاف مجبور ہو کر قلم اٹھاتے اور ع

چل مرے خامے بسم اللہ

پڑھ کر اپنے فرض منصبی کی انجام دہی میں مصروف ہو جاتے۔ مسلک اہلسنت کے اثبات میں دلائل و براہین کے انبار لگا دیتے اور مخالفین کے الزامات و اعتراضات کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیتے۔ اس وقت آپ کے قلم کی تیزی تلوار کی کاٹ کے مشابہ ہوتی، یہ سب باتیں میں کسی حسن عقیدت یا حسن ظن کی بنیاد پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ان کی تصانیف میری بات کے لئے شاہد عدل ہیں۔ آپ کی دینی حمیت کو جاننے کے لئے مثال کے طور پر ۱۱/ محرم ۵۸ھ کو حضرت تھانویؒ قدس سرہ کی خدمت میں لکھے گئے ایک مکتوب کا یہ اقتباس پڑھئے:

"آج کل ایک شیعی رسالہ (رجال بخاری) کے رد میں منہمک ہوں، حضرات صحابہ کی شان میں سخت گستاخی کی گئی ہے، دیکھ کر خون کھولنے لگتا ہے، اس

(۱) ترجمان الاسلام ۱۱۔ ۱۲/ ص ۱۶۱

کے رد میں اتنا انہماک ہے کہ بجز درس و فرائض شرعی و ضروریات کے اور کوئی
کام نہیں ہوتا، سارا وقت اسی میں صرف ہوتا ہے"

مذکورہ بالا اقتباس سے آپ کی حمیت دینی کے علاوہ حضرات صحابہ کرامؓ سے آپ کی بے پناہ محبت و عقیدت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

ادری کا مناظرہ ہو یا مہوا بسم اللہ کا جلسۂ عام اور ان کے علاوہ بے شمار مناظرانہ جلسے، ان سب میں شرکت کے پیچھے حق کے دفاع کی وہی روح کار فرما ہوا کرتی تھی، اور یہی دینی جوش تھا کہ اپنے جیتے جی جب تک طاقت و قوت رہی اپنے قصبہ مئو میں باطل فرقوں اور ان کے بڑے بڑے جغادریوں کا قدم نہیں جمنے دیا، بلکہ بہت سے مخالفین مئو کا نام سن کر گھبرا اٹھتے تھے۔

یہ دینی حمیت ہی کا ثمرہ تھا کہ آپ کے کلک گہربار سے اردو زبان میں بیسیوں بیش قیمت کتابیں وجود میں آئیں، جو سب کی سب اپنے موضوع و مواد کے لحاظ سے حرف آخر خیال کی جاتی ہیں، رد غیر مقلدیت میں رکعاتِ تراویح اور اعلام مرفوعہ، رد بریلویت میں شارع حقیقی اور رد روافض میں متعدد بیش بہا رسائل آپ کے اسی دینی اور مذہبی جوش و غیرت کی یادگار نشانیاں ہیں۔

ہندوستان میں جہاں بہت سارے فتنے پیدا ہوئے انھیں میں ایک فتنہ منکرین حدیث کا نوخیز فرقہ بھی تھا، صرف ہندوستان ہی نہیں مختلف شکلوں اور صورتوں میں انکار حدیث کا یہ فتنہ عالم عرب بالخصوص مصر میں بھی اٹھا، اردو زبان میں آپ کے قلم کے شاہکار "نصرۃ الحدیث" کے سوا آپ کی حدیثی تحقیقات کے پیچھے حجیت حدیث کے اثبات کا جذبہ بھی کار فرما تھا، اور یہی وجہ ہے کہ علامہ اعظمی نے تحقیق و تعلیق کے لئے جن مخطوطات کا انتخاب فرمایا، ان میں سے بیشتر مجموعے صحاح ستہ کے پہلے کے ہیں۔ کیونکہ منکرین کی طرف سے صحاح ستہ کے جامعین پر یہ تہمت لگائی جاتی ہے کہ ان لوگوں نے حدیثیں اپنی طرف سے وضع کرلی ہیں، لہذا احادیث کے ان مجموعوں کے سامنے آنے کے

بعد منکرین حدیث کا سب سے پہلا اعتراض ہی کافور ہو جاتا ہے ، اور ان کی بنائی ہوئی عمارت کی حیثیت تارِعنکبوت سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ بہر حال آپ کی تصنیفات تو ہماری دوسری جلد کا موضوع بحث ہوں گی، اور وہاں ان تمام موضوعات پر انشاء اللہ تفصیل سے گفتگو کی جاسکے گی۔

دینی حمیت کی عجیب و غریب مثال | گذشتہ دو صدیوں میں یورپ میں جو علمی بیداری آئی، اور اس کے نتیجہ میں تلاش و جستجو اور بحث و تحقیق کی جو طوفان خیز لہر اٹھی، تو ایک معتد بہ تعداد ان مستشرقین کی پیدا ہوئی جنھوں نے اسلامی علوم و فنون کو اپنا مجال اختصاص اور موضوع بحث بنایا۔ اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ حدیث و تاریخ اور سیرت کے بہت سارے قدیم مخطوطات انھیں اہل علم مستشرقین کی توجہ اور کوشش و کاوش کی بدولت زیور طباعت سے آراستہ ہو کر بازار علم و ادب کی زینت بنے، اور اس نسبت سے مسلمانوں کو ان کی خدمات کا بہر حال شکر گذار ہونا چاہئے۔

لیکن چند افراد کے استثناء کے ساتھ اسلامی علوم و فنون کے اندر اہل یورپ کی بڑھی ہوئی دلچسپی کے پس پردہ، خدمت علم کے علاوہ ایک مخصوص ذہنیت کار فرما رہا کرتی تھی، اور وہ یہ کہ اسلامی تاریخ کے صاف ستھرے اور بے داغ دامن کو داغدار کرنے کے لئے کبھی کبھی بڑی خطرناک قسم کی دسیسہ کاری اور زہر آمیزی سے کام لیا کرتے تھے۔ یوروپین محققین کے تحقیقی کارناموں میں ایک اہم کارنامہ "الطبقات الکبریٰ" کی تحقیق و اشاعت ہے، اس کی تحقیق مشہور جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ نے کی ہے اور ۸؍ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اس کتاب کے مصنف محمد بن سعد متوفی ۲۳۱ھ ہیں، چونکہ یہ کتاب اسلامی تاریخ کے قدیم مآخذ میں سے ہے اس لئے اس کو اسلامی تاریخ کے مآخذ میں خاص مقام اور اہم حیثیت حاصل ہے۔

اس کتاب کی اشاعت بلا شبہہ مستشرقین کا ایک اہم کام تھا، لیکن ان کے معہود طرز عمل کی وجہ سے ان کے اس تحقیقی عمل کی طرف سے شک و شبہہ اور بدگمانی کا

پیدا ہونا کہ

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

ایک بجا بات تھی، چنانچہ یہ بد گمانی مولانا عبدالرؤف صاحب داناپوری مصنفِ "اصح السیر" کے دل میں پیدا ہوئی اور انھوں نے اس کے متعلق مذکورہ کتاب کے مقدمہ میں مستشرقین کی انھیں دسیسہ کاریوں کی وجہ سے طبقات ابن سعد کے درجۂ استناد پر شک وشبہہ کا اظہار کیا، کہ موجودہ پوزیشن میں اس کی غیر متداول روایتوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔

مستشرقین کی خبث باطنی اور بد طینتی، اسلام اور تعلیمات اسلام کو زک پہنچانے کی نازیبا حرکتوں اور ہمہ وقتی سرگرمیوں کی وجہ سے اس شبہے نے علامہ اعظمی کے دل میں بھی سر ابھارا، مگر علامہ اعظمی نے دفع شبہات کے لئے کون سا عمل اپنایا؟ واقعہ یہ ہے کہ علامہ اعظمی کا یہ عمل ہندوستان کی علمی تاریخ کا روشن اور تابناک باب ہے جو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے اور حمیت دینی کی زندہ اور شاندار مثال ہے، دنیائے علم وفن کے نامور اور راستباز مصنف مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم لکھتے ہیں:

"مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی جو اس زمانہ کے نامور محقق اور محدث ہیں میں نے ایک خط کے ذریعہ انؔ سے اس بارے میں استصواب کیا تو مولانا نے تحریر فرمایا:

"پروفیسر سخاؤ پر یہ شبہہ اور بد گمانی بالکل بے جا ہے، میں نے خود طبقات کے مطبوعہ نسخہ کا مقابلہ اس کے اصل مخطوطہ کے ساتھ حرفاً حرفاً کیا ہے اور کہیں میں نے دونوں میں عدم مطابقت نہیں پائی۔"(۱)

قوت حافظہ | مولانا افضال الحق صاحب جوہر قاسمی تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت مولانا کو قدرت کے دست فیاض نے حافظہ غضب کا دیا تھا، اور اس

---

(۱) عثمان ذوالنورین ص ۲۴

قوت سے انھوں نے اپنے اندر فقہ، ادب عربی اور حدیث کے خزانے جمع کر لئے تھے"

واقعہ یہ ہے کہ آپ کی قوت حفظ علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور حافظ ابن حجرؒ کے مثل تھی، ایک بار کوئی چیز پڑھ لی، یا دیکھ یا سن لی تو برسوں تک وہ بات بعینہٖ دماغ میں محفوظ رہتی تھی ، آپ کے غیر معمولی قوت حافظہ کے عجیب وغریب واقعات ہیں جنھیں سن کر عقل دنگ رہ جاتی ہے، چند واقعات آپ بھی ملاحظہ فرمالیں، مفتی ظفیر الدین صاحب لکھتے ہیں:

"دیوان حماسہ کا سبق پڑھاتے ہوئے ایک دن فرمایا کہ تم لوگوں میں ادبی شوق وذوق نہیں ہے، اپنا حال سناتے ہوئے فرمایا کہ مجھے خیال ہوا کہ دیکھوں مجھے کتنے عربی اشعار یاد ہیں، تو اپنی یادداشت سے صرف ردیف الف کے پانچ سو اشعار لکھ گیا، پھر خیال آیا کہ کبر کہیں پیدا نہ ہو جائے یادداشت سے لکھنا بند کر دیا، پھر یہ بھی فرمایا کہ اب پہلا جیسا حافظہ نہیں رہا، میری طالب العلمی میں میرے حافظہ کی شہرت ہوئی، ایک شاعر صاحب نے کہا جو مئو ہی کے تھے، کہ میں کسی دن امتحان لوں گا پھر مانوں گا۔

مئو میں مشاعرہ ہوا ہی کرتا تھا، ایک مشاعرہ ہوا تو وہ صاحب اپنے نئے اشعار کہہ کر لے گئے اور دوسرے شعراء کے ساتھ انھوں نے اپنے بھی اشعار سنائے، میرا نام لے کر پکارا کہ حبیب الرحمٰن کے حافظہ کی بہت شہرت ہے وہ اسٹیج پر آجائے اور میں نے جو اشعار ابھی پڑھے ہیں یہاں آکر سنائے، مولانا فرمانے لگے میں مجمع سے نکل کر گیا، فرمایا کہ تم نے میرے اشعار سنے ہیں سناؤ، میں نے کھڑے ہو کر ان کی پوری غزل حرف بحرف پڑھ کر سنادی، فرمانے لگے !اچھا بھائی! آج سے میں تمہارے حافظہ کی گواہی دوں گا، اللہ تعالیٰ نے بڑی دولت سے تم کو نوازا ہے۔"(۱)

مولانا افضال الحق صاحب لکھتے ہیں:

"جن لوگوں نے مفتاح العلوم مئو کی مدرسی کا دور دیکھا ہے مثلاً مولانا صفی اللہ صاحب دیوریاوی جیسے حضرات وہ کہتے تھے کہ کبھی کبھی حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی کے بھائی مولانا عبدالرحیم صاحب فاروقی مفتاح العلوم آجاتے

(۱) ترجمان الاسلام ۱۱۔۱۲ ص ۱۳۹

تو مولانا اور وہ فاروقی صاحب اگر عشاء بعد بیت بازی شروع کر دیتے تو عربی فارسی شعروں میں سخت مقابلہ ہوتا اور صبح کی اذان تک کوئی کسی سے پیچھے نہیں رہتا تھا، کیونکہ قوت حافظہ دونوں حضرات کی عجیب وغریب تھی ۔"(۱)

یادداشت کا یہ حال صرف اشعار وابیات تک نہیں تھا، بلکہ احادیث ونصوص بھی آپ کے حافظے میں اسی طرح محفوظ رہتی تھیں، بلکہ ان کا معاملہ اشعار سے بھی بڑھ کرتا تھا ، مولانا افضال صاحب ہی ارقام فرماتے ہیں:

"مہوا بسم اللہ ضلع گونڈہ کا ایک دورافتادہ گاؤں تھا، شہری آبادی سے کوسوں دور، مگر مسلمانوں کا علاقہ ، وہاں ایک نوخیز عالم مولوی حفیظ اللہ صاحب نے ایک باغ میں جلسہ کرنا چاہا، مگر وہاں کے زمیندار نے روک دیا، کیونکہ جلسہ کرنے والے حنفی تھے اور باغ کا مالک غیر مقلد تھا، اس وقت مولوی حفیظ اللہ صاحب مظاہر علوم سہارنپور میں دورے کے طالب علم تھے ، انھوں نے جگہ بدل کر دھرم پور کے باغ میں جلسہ کیا اور اس کے لئے مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی جیسی برگزیدہ ہستیوں کے یہاں سفر کر کے انھیں تیار کیا اور غیر مقلدین کی وجہ سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور مولانا عبداللطیف صاحب کو بلا کر لے گئے ۔"(۲)

وہاں پہنچنے کے بعد اسٹیج پر علامہ اعظمی کے جس کمال کا ظہور ہوا، اس سے سامعین وقارئین کے حیرت واستعجاب کی انتہا نہ رہی، آپ کی تقریر کا موضوع تھا "قرأۃ خلف الامام"، اس ایک موضوع پر ان کی جولانی طبع اور قوت حافظہ کا حال مولانا افضال صاحب کی ہی زبانی سنئے:

"حضرت مولانا نے حدیث پڑھ کر اور اس کی سند اور متن پر بحث کر کے جب تقریر شروع کی ہے تو غیر مقلدین یہ دیکھ کر دم بخود تھے کہ ایک حنفی عالم

(۱) ترجمان الاسلام ۱۱۔۱۲ص ۱۷۲

(۲) ایضاص ۱۷۰

زبانی حدیث پڑھتا ہے اور اس پر حوالے کیساتھ بحث کرتا چلا جاتا ہے، ہم تو صرف یہ جانتے تھے کہ حنفی عالم صرف ابو حنیفہ کی فقہ پڑھتے ہیں، حدیث پڑھتے ہی نہیں، مگر آج دیکھا کہ ایک عالم ہے، حنفی ہے، جوان ہے اور اسے ایک موضوع پر سینکڑوں حدیثیں مستحضر ہیں جن کو بلا کسی کتاب اور کاپی کے زبانی پڑھتا چلا جاتا ہے۔"(۱)

عیاں راچہ بیاں! یہ واقعات تو طفولیت، شباب اور کہولت کے زمانوں کے ہیں فقیر نے تو خدا داد یادداشت کا کرشمہ اس وقت مشاہدہ کیا ہے جب عمر مبارک چوراسی پچاسی برس اور اس سے زائد ہو چکی تھی۔ ۸۵۔۱۹۸۴ء میں ناچیز کی جماعت نے آپ سے دیوان متنبی اور دیوان حماسہ پڑھا، حماسہ پڑھاتے وقت آپ کی طبیعت میں بڑا انشراح رہا کرتا تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے درس میں آپ کو بھی بڑا لطف آتا ہے۔ ایک روز کسی بات پر فرمانے لگے کہ چالیس سال بعد پڑھا رہا ہوں، اور اس چالیس سال کے بعد پڑھانے پر بھی یہ کیفیت تھی کہ آپ ضعف و نقاہت کے سبب لیٹے رہتے اور ہم ساتھی دونوں پہلوؤں کی طرف بیٹھے پڑھ رہے ہوتے، نہ کبھی آپ کو کتاب دیکھنے کی نوبت آئی نہ قاموس و معجم کی، جاننے والے حضرات اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دیوان حماسہ جیسی کتاب، جس میں غریب اور نامانوس الفاظ کی بھر مار ہے، چالیس سال کے بعد پڑھانا اور وہ بھی اس طرح کہ لغت تو در کنار کبھی حماسہ کی کتاب بھی ہاتھ میں لینے کی نوبت نہ آئے، کیا کسی کرشمہ سے کم ہے؟ الفاظ و معانی اور حوادث و واقعات ذہن کے نہاں خانے میں اس طرح محفوظ تھے جیسے کمپیوٹر میں کوئی چیز فیڈ (Feed) کردی جائے، الفاظ و معانی کا ایک موجزن دریا تھا جو پوری روانی کے ساتھ بہتا ہوا چلا جاتا تھا۔

عمر کے اس آخری حصے میں ہم ناقدروں کو مقامات حریری کے کچھ حصے سے لیکر دیوان متنبی، دیوان حماسہ، بیضاوی شریف، قطبی تصدیقات، طحاوی، مقدمہ مسلم، ترمذی اور بخاری شریف تک پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، زیادہ تر ایسا ہی ہوا کہ لیٹے رہے، یا بیٹھے بھی رہے تو کتاب کبھی سامنے نہ رہی، صرف یادداشت کے سہارے لاینحل عقدوں کو

(۱) ترجمان الاسلام ۱۱۔۱۲ص۱۷۱

حل کرتے چلے جاتے، اور کیا مجال ہے کہ ایک واو یا فا کا مطلب بیان کرنے سے رہ جائے۔ اور اسی پر بس نہیں حماسہ وغیرہ کے اشعار زبانی اس طرح یاد تھے کہ ایک مصرعہ ہم پڑھتے تو شعر کی تکمیل دوسرا مصرعہ پڑھ کر حضرت الاستاذ خود فرما دیتے، اس سے ان کی طبیعت کی روانی اور انشراح کا پتہ چلتا۔

آخر عمر میں جب آپ مصنف ابن ابی شیبہ ایڈٹ کر رہے تھے، تو دورۂ حدیث اور اس کے بعد کے ایک سال میں حوالے وغیرہ کی کتابیں ادھر سے ادھر کرنے کی تھوڑی بہت سعادت فقیر کے حصے میں بھی آئی والحمد للہ علی ذلک، اس وقت قوت حافظہ کے عجیب وغریب مظاہر دیکھنے میں آتے، ایک حدیث آتی اس کے لئے ارشاد ہوتا کہ فلاں کتاب کا فلاں باب دیکھو، دوسری آتی اس کے لئے حکم ہوتا فلاں کتاب دیکھو، اور شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا کہ اس کتاب میں نہ ملے۔ واقعہ یہ ہے کہ قدرت نے بلا کا حافظہ عطا فرمایا تھا۔[۵]

بداہت واستحضار | علامہ اعظمی کی نمایاں خصوصیات میں بداہت واستحضار بھی ایک اہم خصوصیت تھی، صرف اسی ایک وصف کو لیکر کوئی اگر لکھنا چاہے تو مستقل کتاب تصنیف کر سکتا ہے، اللہ جل شانہ کی طرف سے آپ کو عطا کردہ ایک عجیب وغریب نعمت تھی کہ بچپن کی پڑھی ہوئی چیزیں تو ایک طرف کہ وہ تو نقش کالحجر ہوتی ہیں، بعد میں بھی جو کوئی چیز آپ کی نظر سے گذری وہ ہر وقت اور ہر جگہ مستحضر رہتی تھی، یہ بات بالکل مشاہد و محسوس تھی کہ آپ کی جناب میں نہ صرف ہندوستان اور عالم اسلام بلکہ یورپ و امریکہ اور افریقہ وغیرہ ملکوں سے مسلم علماء اور عربی داں طبقے کی طرف سے علمی اشکالات و مسائل پر مشتمل خطوط آتے، جو اکثر و بیشتر مہینوں کی محنت اور ورق گردانی کے بعد بھی ان کے لئے پیچیدہ اور ناقابل حل رہتے، لیکن آپ انھیں مسائل کو کتابوں سے مراجعت کئے بغیر چند لمحوں اور جملوں میں اس طرح حل کرتے کہ وہ بے غبار ہو جاتے، اس نوعیت کی دو چار اور دس بیس نہیں سیکڑوں مثالیں اور واقعات ہیں، جو مستقل تصنیف کا موضوع ہیں، نمونہ کے طور پر میں یہاں صرف چند واقعات ذکر کروں گا۔

مولانا خورشید انور صاحب (استاذ مدرسہ تعلیم الدین مئو) راوی ہیں کہ جامع مسجد شاہی کے سابق امام مولانا حکیم منیر الدین صاحبؒ ایک بار فرمانے لگے کہ وہ دورۂ حدیث کے سال میں تھے، اور علامہ اعظمی بخاری شریف پڑھا رہے تھے، ایک دفعہ سید سلیمان ندویؒ اعظم گڈھ سے تشریف لائے اور سیدھے علامہ اعظمی کی درسگاہ میں پہنچے، اور کسی حدیث کی نسبت دریافت فرمایا کہ میں کئی دنوں سے اس کو تلاش کر رہا ہوں لیکن مل نہیں رہی ہے، آپ بتایئے کہاں ملے گی؟ راوی کا بیان ہے کہ حضرت مولانا (علامہ اعظمی) کے سامنے بخاری شریف کھلی ہوئی رکھی تھی، آپ نے کتاب بند کیا اور اسے جب دوبارہ کھولا تو کھلے ہوئے صفحہ پر سید صاحب کی مطلوبہ حدیث موجود تھی۔

علی گڈھ کے میرے زمانۂ طالب علمی میں استاذ محترم و مکرم ڈاکٹر محمد ظہور الحق صاحب کے بھائی، اردو زبان کے نامور اور معروف محقق و مصنف شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی کے سابق صدر اور اردو اکیڈمی لکھنؤ کے سابق چیرمین پروفیسر محمود الٰہی صاحب ایک دفعہ شعبۂ اردو کے کسی انٹرویو کے لئے تشریف لائے، ڈاکٹر ظہور الحق صاحب نے موصوف سے ملاقات کی غرض سے شام کے وقت فقیر کو دولت خانے پر طلب فرمایا، ناچیز حسب ارشاد وقت مقرر پر حاضر ہوا، پروفیسر محمود صاحب سے تعارف اور ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی، بہت خلیق، متواضع، خورد نواز اور سادگی پسند انسان معلوم ہوئے، اثناء گفتگو علامہ اعظمی کی بات نکل آئی، بلکہ اس وقت گفتگو کا مرکز و محور انھیں کی ذات و صفات اور خدمات تھیں، باتوں باتوں میں پروفیسر صاحب نے اپنے اوپر بیتے ہوئے ایک واقعہ کا ذکر کیا، انھوں نے فرمایا کہ اپنی کسی کتاب کی تصنیف کے دوران انھیں کسی مخصوص شخصیت کے تذکرے کی ضرورت تھی، ان ہی کا بیان ہے کہ اس کے لئے انھوں نے مہینوں علی گڈھ اور ندوہ وغیرہ کے کتب خانوں کی خاک چھانی، اور سیر وسوانح تذکرہ وتراجم کی بے شمار کتابیں الٹ پلٹ ڈالیں، مگر اس تمام کوشش و کاوش اور تلاش وجستجو کے بعد بھی مراد بر نہیں آئی اور جس چیز کی انھیں تلاش تھی اس کا کوئی سراغ ملا نہ منزل کا نشان، بالآخر انھوں نے علامہ اعظمی سے رجوع کیا، آپ کے پاس گویا الہ دین کا

چراغ تھا ایک لمحے اور جملے میں ان کی ساری مشکل اور الجھن کا خاتمہ ہو گیا۔

میں نے جب اس کتاب کی ترتیب و تسوید کا کام شروع کیا، تو اس واقعہ کی تفصیل کے لئے ایک خط لکھ کر پروفیسر صاحب سے دریافت کیا، تاکہ ایک بات جو زبانی سنی تھی تحریری شکل میں قارئین کے سامنے پیش کر دی جائے، انھوں نے میرے خط کا جو جواب مرحمت فرمایا وہ بعینہ ناظرین کے ملاحظہ کے لئے حاضر خدمت ہے، خط کی عبارت منجملہ دیگر باتوں کے یہ ہے:

"آپ نے علامہ مرحوم کے جس علمی واقعہ کی یاد دلائی ہے، وہ یہ ہے کہ مجھے اردو میں ترجمۂ قرآن کی ایک جلد ملی تھی، میں اسے شمالی ہند میں اردو نثر کا نقطۂ آغاز سمجھتا تھا۔ اس کے مصنف یعنی مترجم کے حالات کہیں سے معلوم نہیں ہوئے۔ میں چاہتا تھا کہ اس پر طویل مضمون لکھوں لیکن جب مترجم کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو تو قلم اٹھانا کچھ مستحسن نہیں تھا۔

ایک دن ڈاکٹر منور انجم مئو سے آئے تو میں نے ان سے کہا کہ آپ محدث جلیلؒ سے میرا سلام کہیے اور بعض نکات پر ان سے گفتگو کیجئے۔ میں نے تاکید کی تھی کہ ان کا جواب نوٹ کر لیجئے۔ وہ ملے اور میرا سوال نامہ ان کے سامنے رکھا تو فوراً جواب دیا کہ سلسلۂ مظہر جان جاناں کے اہل علم کا مطالعہ کروں تو اس مصنف کا حال معلوم ہو جائے گا۔

حوالے کی کتابیں میرے پاس تھیں، میں نے منور صاحب کے تحریری جواب کی روشنی میں سلسلۂ مظہر جان جاناں کو کھنگالا تو منزل مقصود سامنے تھی، اس سے محدث جلیل کے تبحر علم اور علم الرجال میں ان کے غیر معمولی مطالعے کی کیفیت عیاں ہوتی ہے۔"

اللہ اکبر! جس مشکل کے حل کے لئے مہینوں کی محنت بار آور نہیں ہوئی، اور نہ جانے علم و ادب کے کتنے دفتر کھنگالے گئے مگر ہنوز روز اول ہی رہا، مگر وہی مشکل جب

اپنے وقت کے سب سے بڑے بوریہ نشیں کی بارگاہ میں پہنچتی ہے تو کس آسانی سے صرف ایک فقرہ میں اس کی عقدہ کشائی ہو جاتی ہے، اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ع

اب انھیں ڈھونڈھ چراغ رخ زیبا لے کر

یہ چند واقعات میں نے بطور مثال ذکر کر دیئے ہیں، جب کہ آپ کی ذات کے ساتھ اس قسم کے دو چار نہیں صدہا واقعات وابستہ ہیں جن کا اگر احاطہ کیا جائے تو ایک خاصا ضخیم دفتر تیار ہو سکتا ہے۔

ذہانت و فطانت فاطر کائنات نے آپ کو جن بے حساب نعمتوں سے نوازا تھا انھیں میں ذہانت و فطانت اور ذکاوت بھی تھی، بہت سے دوسرے اوصاف کی طرح اس وصف میں بھی اپنے معاصرین و اقران میں ممتاز خیال کئے جاتے تھے، اس خوبی کی شہادت ہمعصروں کو تو چھوڑ دیجئے ان کے اساتذہ نے بھی دی ہے، اور تعریف کی ہے، ذہین سے ذہین افراد جس بات تک پہنچنے سے قاصر رہتے، آپ اپنی ذہانت کی بدولت نہایت آسانی سے اس کی تہ تک پہنچ جاتے ، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب معروفی (استاذ مدرسہ مرقاۃ العلوم) مولانا ہدایت اللہ صاحب معروفی کی روایت سے نقل کیا کرتے ہیں کہ مفتاح العلوم کے زمانۂ قیام میں امام اہلسنت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کے برادر خورد مولانا عبدالرحیم فاروقیؒ کی بہت آمد و رفت رہا کرتی تھی، اس وقت دونوں بزرگوں کی مجلسیں جمتیں اور علمی مباحثے ہوتے، مولانا عبدالرحیم صاحب خود بھی بہت ذہین و فطین تھے اور منطق و فلسفہ میں کامل و ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ جب آتے تو طلبہ سے بھی سوالات کرتے رہتے اور ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے، ایک دفعہ علامہ اعظمی نے (از راہ تلطف) کہا کہ کیا آپ لڑکوں کو پریشان کر رہے ہیں؟ مجھ سے بات کیجئے! مولانا عبدالرحیم صاحب نے کہا کہ اچھی بات ہے ، وہ گئے اور (غالباً) قاضی حمد اللہ لے آئے، اور اس کا سب سے مشکل مقام نکال کر علامہ اعظمی کے سامنے بڑھا اور کہا کہ ذرا اس کی وضاحت فرما دیجئے! آپ نے جب اس کی تقریر فرمائی، تو مولانا فاروقی نے قسم کھا کر کہا کہ اس مقام کی اس سے بہتر (یا ایسی) تقریر کسی نے نہیں کی، اس کے بعد علامہ اعظمی کا جواب سنئے، انھوں نے بھی قسم کھا کر کہا کہ آج تک میں نے

اس مقام کو دیکھا بھی نہیں!

آپ کی ذہانت وذکاوت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے جو حضرت مدنیؒ کی وفات پر آپ نے تاریخ وفات نکالی ہے، کسی بات کی طرف ذہن کس تیزی سے منعطف ہوتا تھا، اس کی دلیل کے لئے خود آپ کی زبان سے سنئے فرماتے ہیں:

"آج فجر کی نماز کے بعد تلاوت کر رہا تھا جب "فاما الذین آمنوا وعملوا الصلحت فهم فی روضة یحبرون" پر پہونچا تو یک بیک دل میں آیا کہ شاید "فی روضة یحبرون" سے سال وفات کے اعداد بر آمد ہوں، اس خیال کے آتے ہی رکا اور رک کر حروف کے اعداد پر غور کیا تو ٹھیک ۱۳۷۷ھ بر آمد ہوئے۔ فالحمد لله علی ذلك."(۱)

دقت نظر | آپ کے اوصاف ومحاسن اور فضائل وکمالات اس کثرت ووسعت سے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھا جائے اور کیا چھوڑا جائے، بیشمار خوبیاں ذہن میں آتی ہیں اور ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست، کا منظر پیش کرتی ہیں، اس وقت جذبات میں تلاطم اور ذہن میں طوفان سا برپا ہے، لیکن قرطاس وقلم کی تنگ دامانی دل ودماغ کا ساتھ دینے سے قاصر ہے، اسی کے ساتھ ڈر اس بات کا بھی ہے کہ کہیں مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی کی تہمت نہ عائد کر دی جائے۔ اس وجہ سے بہت ساری باتیں عمداً بھی نظر انداز کرنی پڑتی ہیں۔ آپ کی خوبیوں کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ:

لیس علی الله بمستنکر ... أن یجمع العالم فی واحد

بہت سارے کمالات جو آپ کے معاصرین میں انفرادی طور پر نظر آتے ہیں وہ ان تمام میں ان سے فائق نظر آتے ہیں، آپ کے صرف ایک وصف دقتِ نظر کو لے لیجئے۔ اس وصف خاص میں نہ صرف اپنے ہمعصروں پر فوقیت رکھتے ہیں، بلکہ گذشتہ کئی صدیوں تک آپ چلے جایئے آپ کی عقابی شان کی نظیر بہت کم نظر آئے گی۔ اور یہ بھی خیال نہ کیا

(۱) الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص ۴۵

جاننا چاہئے کہ یہ وصف حدیث اور علم حدیث کے ساتھ خاص تھا، بلکہ دیگر بہت سے فنون مثلاً فقہ و تاریخ وادب کے اندر بھی نظر کی وہی بلندی اور دقت دیکھنے کو ملے گی، جو حدیث کے اندر ہوگی، یہ بات اگر بالتفصیل ذکر کی جائے تو قصہ بہت طولانی ہو جائے گا اس لئے میں اس وقت اپنے دعوی کی دلیل دینے سے قصداً گریز کرتا ہوں، دلائل اگر دیکھنے ہوں تو مجلہ "المآثر" میں آپ کے فتاوی کے علاوہ ناچیز کی ترتیب سے شائع ہونیوالا سلسلہ وار مضمون "استدراکات محدث کبیر" ملاحظہ فرمائیں، اس میں مثالیں بکثرت مل جائیں گی۔

قوت استدلال خدائے ذوالجلال نے آپ کے اندر استدلال کا بلا کا ملکہ ودیعت فرمایا تھا، یہ قوت وصلاحیت آپ کے اندر حیرت انگیز حد تک تھی، پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل اور مشکل سے مشکل امور میں جب کہ بڑے بڑے اہل علم و فضل اور باکمال داناؤں کے ذہن میں کوئی دلیل نہ آتی اس وقت قرآن و سنت اور فقہ و تاریخ سے ایسے ایسے دلائل چن کر لاتے کہ عقل حیران رہ جاتی۔ آپ کی استدلالی شان دیکھنی ہو تو دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گئے فتاوی، نیز آپ کے مقالات و مضامین اور تصنیفات کا مطالعہ کیا جائے، ناظرین کو میرے دعوی کی صداقت کا خود بخود یقین ہو جائے گا۔ اس وقت مثال کے لئے صرف ایک واقعہ کا ذکر کروں گا۔ مولانا اسیر ادروی رقم طراز ہیں:

"ایک بار لکھنؤ میں ایک موقر ادارہ کی طرف سے ہندوستان کے مشاہیر صاحب درس وافتاء علماء کا اجتماع کیا گیا اور اس اجتماع میں ان لوگوں کو خاص طور سے مدعو کیا گیا جن کو فقہ سے دلچسپی تھی اور افتاء کا کام کرتے تھے، اس اجتماع نے کئی نشستوں میں بیمہ، انشورنس وغیرہ کے جواز کا فیصلہ کیا اور ان تمام دلائل کو جمع کر کے ایک تفصیلی فتوی مرتب کیا گیا اور اس فتوی پر اجتماع میں موجود تمام علماء کا اتفاق ہو گیا، مگر اس کی عام اشاعت سے پہلے ضرورت محسوس کی گئی کہ اگر مولانا اعظمی کی تائید و تصویب حاصل ہو جائے تو اس کو رسالوں اور

اخباروں میں اشاعت کیلئے دیدیا جائے، اجتماع نے ایک ذہین و فطین عالم کے ذریعہ یہ تحریر مولانا اعظمی کی خدمت میں بھیجی، مولانا نے یہ تحریر دیکھی، اس میں کئی باتیں آپ نے ایسی پائیں جن سے آپ اتفاق نہیں کر سکتے تھے، اس لئے آپ نے اس فتوی پر آٹھ صفحات میں اپنی رائے لکھی جو اس متفقہ فتوی کے خلاف تھی، علماء کے اس اجتماعی فتوی کے خلاف جو دلائل مولانا اعظمی نے تحریر فرمائے تھے اس کو پھر علماء کی مجلس میں پیش کیا گیا تاکہ ان پر غور کر کے اپنے سابقہ فتوی کو برقرار رکھا جائے یا اس کو رد کر دیا جائے، علماء کی اس مجلس نے متفقہ طور پر یہ کہا کہ مولانا اعظمی نے جن دلائل کی روشنی میں اس کے عدم جواز کا فیصلہ فرمایا ہے وہی صحیح ہے اس کو رد نہیں کیا جا سکتا اور فیصلہ کیا گیا کہ یہ فتوی واپس لے لیا جائے۔"

یہ تو ایک مثال ہے ورنہ اس قسم کے نہ جانے کتنے واقعات سے آپ کی حیات کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ قارئین محض اس ایک واقعے کو پڑھیں اور دل پر ہاتھ رکھ کر انصاف کے ساتھ فیصلہ کریں کہ کیا اس دور میں آپ کا کوئی ثانی پیش کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا اس بات میں ان کو مبالغہ کا شائبہ نظر آ رہا ہے کہ ع

ایسا کہاں سے لائیں کہ ان سا کہیں جسے

وسعت مطالعہ اور تبحر علمی مولانا محمد یحیی صاحب ندوی سانہہ (مونگیر بہار) ایک وسیع المطالعہ بذلہ سنج اور وارستہ مزاج آدمی ہیں، علامہ اعظمیؒ کے حد درجہ معترف، مداح اور عقیدتمند، اور غایت درجہ مزاج شناس۔ علامہ اعظمی کے فضل و کمال کی نسبت وہ فرمایا کرتے تھے، کہ اگر کوئی "مفخرۃ الھند" کہلانے کا مستحق ہے تو وہ حضرت مولانا (علامہ اعظمی) ہیں۔ اسی طرح آپ کے وفور علم کے متعلق ان کا یہ خیال ہے اور بارہا اس کا اظہار کیا ہے کہ "آپ کے علم کا صرف دس فیصد حصہ ظاہر ہوا ہے، نوے فیصد سینے ہی میں محفوظ لے کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔"

مولانا یحیی صاحب بلا کے طباع بھی ہیں، ان کی ان ہی خصوصیات، وارستگی طباعی اور وسعت مطالعہ کی وجہ سے علامہ اعظمی بھی ان سے بہت مانوس تھے، آپ کی حیات میں

وہ جب بھی مئو آتے تو ہفتوں اور مہینوں رہ جاتے، اور ان کے قیام کے دوران فرصت کے لمحات میں علامہ اعظمیؒ بھی خوش وقت رہا کرتے۔ مولانا محمد یحیی صاحب مسائل پوچھتے، سوالات کرتے اور اشکالات کا حل چاہتے تو آپ خوش ہوتے کہ ناقدروں کے اس جہان آباد میں ایک تو قدرداں ہے۔

جب علامہ اعظمی کا آخری سفر حجاز کا ۱۹۸۷ء میں عزم ہوا تو مولانا محمد یحیی صاحب نے حق رفاقت کی درخواست کی، ان کی درخواست قبول کر لی گئی اور سفر پر وہ بھی ساتھ روانہ ہوئے، اس سفر میں انھوں نے جو استفادہ کیا سو کیا، عربوں کے نزدیک علامہ اعظمی کی مقبولیت، پذیرائی اور دیدہ و دل میں جگہ دینے کے جو مناظر دیکھے اس سے بھی جی بھر کے لطف اندوز ہوئے۔ ایک روز انھوں نے آپ سے عجیب و غریب سوال کیا، کہ حضرت! اکثر اسلاف واکابر نے حطیم و ملتزم میں کوئی نہ کوئی مخصوص دعا کی ہے آپ نے کیا دعا مانگی؟ حضرت مولانا نے پہلے تو اس سوال کے جواب سے پہلو بچانا چاہا، لیکن سوال کرنے والا بھی اپنی ضد کا ایک پکا، جب یہ مصر ہو گئے تو علامہ اعظمی نے جو جواب دیا وہ حسب ذیل ہے۔

علامہ اعظمی نے فرمایا کہ حافظ ابن حجرؒ نے آب زمزم پیتے وقت اللہ سے دعا کی کہ مجھے امام ذہبیؒ کا علم عطا فرما، میں نے (علامہ اعظمی نے) آب زمزم پیتے وقت، حطیم و ملتزم میں، بیر بضاعہ کا پانی پیتے وقت اور مقبولیت کے دوسرے تمام مقامات پر یہ دعا کی کہ خداوندا! مجھے امام ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ دونوں کا علم عطا فرما۔ پھر آپ نے بطور تحدیث نعمت کے فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے دیا بھی۔

علامہ اعظمی کے اس واقعے کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ایک حدیث بھی آتی ہے، جس کی روشنی میں آپ کی اس بات کو سمجھنا ہمارے لئے قدرے آسان ہو سکتا ہے، سرکارؐ نے فرمایا تھا:

" مثل امتی کالمطر لا يدری أوله خير ام آخره" (میری امت کی مثال بارش کی طرح ہے، نہیں معلوم کہ بارش کا پہلا حصہ بہتر ہو گا یا آخری حصہ)

آپ کی وسیع و عمیق معلومات، وفور علم، ہمہ گیر ثقافت، معقولات و منقولات پر بے نظیر دسترس، اسلامی علوم و فنون میں براعت و مہارت اور علم حدیث، اسماء الرجال اور فن جرح و تعدیل کے اندر آپ کی مسلمہ امامت کو دیکھتے ہوئے خیال کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو درس و مطالعہ کی کس بے پناہ قوت و استعداد سے سرفراز فرمایا ہوگا۔ ذہانت و ذکاوت اور فہم و فطانت تو آپ کے اندر فطری اور وہبی تھی ہی، شب و روز کے مطالعہ اور کتب بینی نے نورٌ علی نور کا کام کیا، اور ان دونوں قوتوں کے امتزاج کے بعد جن فضائل و کمالات کا ظہور ہوا اس سے اگر کوئی شخص انکار، یا شک و شبہہ کا اظہار کرے تو اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے جو کسی عرب شاعر نے کہا ہے:

النجم تستصغر الأبصار صورته الذنب للطرف لا للنجم في الصغر

ستاروں کی صورت کو نگاہیں چھوٹا سمجھتی ہیں اس میں قصور نگاہ کا ہے نہ کہ ستارے کا

مطالعہ و کتب بینی کا آپ کے یہاں ہم کو وہی ذوق و شوق دیکھنے میں آتا ہے، جو ادوار گذشتہ کی بعض عبقری اور تاریخ ساز شخصیتوں کی تاریخوں میں ملتا ہے، آپ کے بارے میں سنا ہے کہ چراغ کی روشنی میں آپؒ کے والد آپ کو مصروف مطالعہ دیکھتے تو لخت جگر کی جگر سوزی دیکھ کر ان کو خیال گذرتا کہ یہ لڑکا توان کتابوں کے پیچھے اپنی صحت کو برباد اور اپنے آپ کو ہلاک کرلے گا، اس وقت متنبہ کرتے اور سونے کی تاکید کرتے، آپ بھی اطاعت والدین کا ثبوت دیتے ہوئے چراغ کی لو دھیمی کردیتے، کچھ دیر بعد جب اندازہ ہو جاتا کہ والد محترم سو گئے تو چراغ کی لو تیز کر کے پھر پڑھنا شروع کردیتے، اس کے بعد انہماک کا کبھی کبھی یہ حال ہوتا کہ گذرے ہوئے وقت کا احساس اس وقت ہوتا جب رات بھر کے جاگے ہوئے تاروں پر بھی نیند کا نشہ طاری ہو جاتا، اور سپیدۂ صبح رات کی تاریک اور سیاہ چادر کو چاک کر کے اپنے لئے جگہ بنا رہا ہوتا۔ تب اگر کچھ وقت باقی بچ رہا ہوتا تو تھوڑی دیر پیٹھ لگا کر فجر کی نماز کے لئے تیار ہو جاتے۔

بقدر الكد تكتسب المعالي ومن طلب العلى سهر الليالي

محنت کے بقدر بلندیاں حاصل کی جاتی ہیں ۔۔ جس نے بلندیوں کو طلب کیا وہ راتوں کو بیدار رہا

درس ومطالعہ کی یہ غیر معمولی قوت وصلاحیت زندگی کے ہر دور میں آپ کی شخصیت کا لازمی جزو رہی، اس سے آپ کی روح کو غذا اور بالیدگی، دل کو سکون اور قلب کو آسودگی حاصل ہوتی تھی۔ کتابوں میں ڈوب کر غم جہاں اور آلام روزگار سے یکسر غافل ہو جاتے تھے۔ آپ کی حالت وحیات "وخیر جلیس فی الزمان کتاب" (زمانے میں سب سے بہتر ہم نشیں کتاب ہے) کی عملی اور واقعی تفسیر تھی۔

مطالعہ کرتے وقت آپ کے انہماک اور استغراقی کیفیت کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے، جس کو مثالاً ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں، یہ اس زمانے کی بات ہے جب علم کی پیاس بجھانے کے لئے اکثر وبیشتر دارالمصنفین اعظم گڈھ تشریف لے جایا کرتے تھے، مئو میں کوئی ایسا کتب خانہ نہیں تھا جو آپ کی علمی تشنگی کے لئے آسودگی کا سامان فراہم کر سکتا، اس کے برعکس دارالمصنفین میں ایک تو سید صاحب (علامہ سلیمان ندوی) کا وجود، دوسرے شبلی اکیڈمی میں کتابوں کا بیش قیمت ذخیرہ، دونوں ہی باتوں میں آپ کے لئے بلا کی کشش تھی، پھر کیا تھا، جب تک کتب خانہ کھلا ہوتا آپ ہوتے اور روح کو غذا مہیا کرنے والی کتابیں ہوتیں، کتب خانہ بند ہونے کے بعد سید صاحب کی پر لطف صحبتیں ہوتیں، ان کی باتوں سے دل بہلاتے، بحث ومباحثے ہوتے اور دونوں اہل علم ایک دوسرے کی معلومات میں اضافہ فرماتے، یہ ایام علامہ اعظمی کے لئے بڑے خوش گوار ہوتے، جس کی وجہ سے اعظم گڈھ میں کبھی کبھی آپ کا قیام ہفتوں تک ہو جاتا، لیکن واقعہ کیا پیش آیا، اس کو بھی سنیے:

"اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ دوپہر میں کھانے کا وقت ہوا، دارالمصنفین بند ہو گیا، دستر خوان لگا تو سید صاحب نے پوچھا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نظر نہیں آرہے ہیں، لوگوں نے ادھر ادھر تلاش کیا لیکن کہیں پتہ نہ چلا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ دیکھو کتب خانہ میں نہ ہوں، چنانچہ دارالمصنفین دوبارہ کھولا گیا۔ دیکھا گیا کہ مولانا اعظمی مطالعہ میں غرق ہیں اور ان کو یہ بھی خبر نہیں کہ کتب خانہ دوبارہ کھولا گیا ہے، جب لوگوں نے آپ کو دوپہر کے کھانے کی اطلاع دی تو حیرت سے پوچھا کہ

اچھا! کھانے کا وقت ہو گیا!"(۱)

دارالمصنفین بند بھی ہوا اور کھلا بھی، مگر علم کا ایسا سودا کہ دونوں سے لاعلم رہے، اور سچ پوچھئے تو یہی ادائے دلنواز تھی جس پر خود سید صاحب کو بھی پیار آتا تھا۔

پڑھتے وقت آپ کی محویت کا یہ حال ہوتا کہ کبھی نماز کا وقت ہو جاتا اور آپ کو اس کا بھی احساس نہ ہوتا، جب مسجد پہنچتے تو تھوڑی بہت تاخیر ہو چکی ہوتی، جس کی وجہ سے تاسف و ندامت بھی ہوتی، علمی و تحقیقی زاویۂ نظر سے یہ کیفیت چاہے جتنی بھی خوش آئند رہی ہو، دینی اور دیانتی لحاظ سے اس کو اپنے لئے بہتر نہیں خیال فرمایا ہوگا، اس لئے اس کا روحانی علاج دریافت کرنے کی خاطر حضرت تھانویؒ کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں یہ تحریر فرمایا:

"بعض اوقات مطالعہ میں اتنا انہماک ہوتا ہے کہ مسجد دیر میں پہنچتا ہوں، اور لوگوں کو منتظر پا کر نادم و متاسف ہوتا ہوں کہ ان لوگوں کو میری وجہ سے تکلیف ہوئی"

مطالعہ میں آپ کو کیا کیف و سرور اور کیا حظ حاصل ہوتا تھا، مجھ جیسے کم سواد و کم ہمت کے حیز خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ فتح الباری کی اہمیت، قدر و قیمت اور حجم و ضخامت سے جو اہل علم ہیں وہ واقف ہیں۔ لیکن جو ناواقف ہیں ان کے لئے عرض کر دیا جائے کہ یہ حدیث کی اہم ترین اور عظیم ترین کتاب بخاری شریف کی شرح ہے، جو ۱۳ ضخیم جلدوں میں چھپی ہے۔ اس کتاب کے متعلق صاحبزادۂ محترم مولانا رشید احمد صاحب کا بیان ہے کہ والد صاحب نے اس کو تین مرتبہ بالاستیعاب پڑھا تھا۔

قارئین ودارسین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بالاستیعاب تین مرتبہ تو ایک طرف، ایک دفعہ بھی بلکہ ایک جلد بھی پڑھنا کوئی آسان کام نہیں۔ الا من وفقہ اللہ۔ اس زبانی روایت کی شہادت کیلئے ایک تحریری ثبوت بھی پیش کر دوں۔ فتح الباری کی

(۱) المآثر ج۲ ش۱ ص۴۷

نسبت تو ممکن ہے کسی کو خیال گذرے کہ چونکہ صحیح بخاری کی شرح ہے۔اور سب سے اہم واکرم شرح ہے،اور علامہ اعظمی بخاری پڑھایا کرتے تھے اس لئے یہ کتاب مطالعہ میں رہا کرتی تھی۔ لیکن علامہ شمس الدین سخاوی متوفی ۹۰۲ھ کی مشہور کتاب ہے" الضوء اللامع في أعيان القرن التاسع"۔ تاریخ و تذکرہ کی یہ کتاب چھ ضخیم جلدوں اور ۱۲ ار اجزاء پر مشتمل ہے،اس کتاب کی پہلی جلد کے سر ورق پر علامہ اعظمی کے قلم سے یہ عبارت منقوش ہے۔

"طالعت هذ الكتاب كله أعني أجزاء ه الاثني عشر قبل اليوم بسنوات مستعيراً إياه من مكتبة دارالمصنفين (باعظم گڈه)ثم لما اشتريته لمفتاح العلوم شرعت في قراء ته ثانيا سنة ۱۳۶۹ ه۔"

(میں نے اس کتاب کے تمام اجزاء کا آج سے برسوں پہلے دارالمصنفین (اعظم گڈھ) کے کتبخانہ سے مستعار لے کر مطالعہ کیا، پھر جب میں نے اس کو مفتاح العلوم کے لئے خریدا تو ۱۳۶۹ھ میں اس کو دوبارہ پڑھنا شروع کیا)

یہ واقعات میں نے مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ذکر کردئے ہیں،ورنہ آپ کے غیر معمولی ذوق مطالعہ، جگر کاوی اور جاں سوزی کی گواہی آپ کی ذاتی کتابوں کا نبش بہاذ خیرہ دے گا،اور علم کے لق ودق صحرا میں آپ کی رہ نوردی، آبلہ پائی، اور بادیہ پیمائی کی شہادت ہندوبیرون ہند کے مشہور و معروف کتب خانوں کے در و دیوار دیں گے۔

اور یہ بھی نہیں کہ یہ درس و مطالعہ کسی ایک یا دو فن،یا اسلامی علوم تک محدود و محصور ہو،بلکہ آپ کی حدود مطالعہ میں علوم عالیہ کے علاوہ علوم آلیہ،ادب وبلاغت، نحو وصرف، منطق وفلسفہ، طب وحکمت، طریقت وتصوف، حتی کہ قصص وروایات کی کتابیں بھی ہیں اور وہ بھی عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں۔اور ایسا بھی نہیں کہ سرسری طور پر ورق گردانی کی ہو،بلکہ صاف پتہ چلتا ہے کہ پوری باریک بینی اور دقت نظر کیساتھ ان کا مطالعہ فرمایا ہے۔"

کتابوں کا شوق شوق مطالعہ کے ساتھ کتابوں کا شوق بھی عشق کی حد تک تھا، کتابیں آپ کی غمگسار، مونس و غمخوار اور تنہائی کی رفیق تھیں۔ کون سی کتاب دنیا کے کس کتب خانے میں ہے، مطبوعہ ہے یا مخطوطہ اس کے بارے میں معلومات بہم پہنچانا آپ کا اہم ترین مشغلہ تھا۔ نہایت اہتمام کے ساتھ کتبخانوں کی فہرستیں منگواتے اور ان میں موجود کتابوں کے سلسلے میں آگاہی حاصل کرنے کے لئے بسا اوقات کئی کئی جلدوں پر مشتمل فہرستیں پڑھ جاتے، کوئی اہم کتاب کہیں چھپتی اور شائع ہوتی تو اس کی فراہمی کے لئے بقدر امکان کوشش کرتے۔ ابتدائی دور آپ کا پر مشقت اور عسرت و تنگی کا دور تھا، مگر اس کے باوجود گنجائش نکال کر حتی المقدور کتابوں کی خرید کے لئے کوشاں رہتے، پھر بعد میں بحمد اللہ معاشی تنگی جب دور ہوئی، تو اس وقت آپ کی آمدنی کا خاصہ حصہ کتابوں پر صرف ہوتا تھا۔ آپ کی تحقیق و تعلیق سے شائع ہونے والی کتابوں کا جو "حق الخدمۃ" آپ کو ملتا، وہ بسا اوقات سب کا سب کتابوں کی خرید پر خرچ ہو جاتا۔

مخطوطات کے ساتھ آپ کی شیفتگی وگرویدگی ناقابل بیان ہے، مخطوطات کے سلسلے میں وسیع تر معلومات اور اطلاعات کے باب میں بہت کم ایسے ہوں گے جو آپ کی ہمسری کا دعوی کر سکیں، برصغیر اور عالم عرب میں موجود مخطوطات سے تو آپ وہاں کا سفر کر کے اور فہرستیں پڑھ کر باخبر رہتے تھے، لیکن یورپ جانے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی، لہذا وہاں پائے جانے والے مخطوطات سے واقفیت ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس سے حاصل کرتے تھے، چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے مراسلت کا محور یورپ میں موجود اسلامی علوم وفنون کی کتابوں کے قلمی نسخے رہا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ حج کے کسی سفر میں کسی کتاب کا مخطوطہ آپ کے ہاتھ آگیا، اس کو نہایت اہتمام کے ساتھ بریف کیس میں رکھ کر اپنے ہم وطن کسی حاجی صاحب کے حوالے کر دیا اور سخت تاکید کی کہ بہت حفاظت کے ساتھ اس کو گھر تک لے چلنا ہے، حاجی صاحب بیچارے نے جب اس شدت سے تاکید کرتے ہوئے دیکھا تو پوچھا مولانا! اس میں سونا ہے کیا؟

ظاہر ہے ان کے نزدیک سونے سے زیادہ قیمتی چیز کا تصور ہی نہیں رہا ہو گا، آپ نے فرمایا: اس سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔

کتابیں چونکہ آپ کی زندگی کی سب سے قیمتی اور عزیز ترین متاع تھیں، اس لئے ان کی حفاظت بھی دل و جان سے کرتے تھے، لیکن حفاظت کے شدید اہتمام کے باوجود وسائل کی قلت کے باعث لکڑی کی الماریوں میں رہنے کی وجہ سے کبھی کوئی کتاب خراب ہو جاتی، مثلاً دیمک وغیرہ لگ جاتے تو اس وقت آپ کے رنج و قلق کی انتہا نہ رہتی اور مارے غم کے چٹائی کا فرش کانٹوں کا بستر بن جاتا۔

کتابوں، خاص طور پر مخطوطات کا شوق آپ کو اکثر و بیشتر جہاں گردی اور صحرا نوردی پر مجبور کرتا تھا، چنانچہ ہندوستان کے اہم علمی مراکز، جہاں بڑے بڑے کتبخانے اور لائبریریاں موجود ہیں، ان کے سفر کی غرض و غایت مطبوعات و مخطوطات کی تلاش و جستجو ہوتی، آپ کے لکھے ہوئے بعض خطوط کی نقلیں آپ کے اوراق میں محفوظ ہیں، جن سے اس کی طرف واضح طور پر اشارہ ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ۷ار رجب ۷۷ھ کو دیوبند سے مولانا عبدالجبار صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

"...میں آج یہاں کے کام سے فارغ ہو گیا، اب انشاء اللہ کل یہاں سے روانگی ہو گی، کچھ رام پور کا خیال ہے مگر سردی بہت ہے اس لئے ممکن ہے وہاں اترنے کی ہمت نہ کر سکوں..."

۴ر شعبان ۷۸ھ کو بہرائچ سے ارقام فرماتے ہیں:

"...شاید دیوبند سے مولوی ظفیر الدین صاحب نے خط لکھا ہو، میں دیوبند سے سہارنپور، وہاں سے لکھنو اور لکھنؤ سے بہرائچ آ گیا ہوں۔

پرسوں رسولی جانا ہے، اس کے بعد انشاء اللہ گھر ہی آؤں گا...."

شوق و طلب کا ایک نمونہ ۴۴ھ کے پٹنہ کے سفر کے ضمن میں بھی گذر چکا ہے۔ یہاں کچھ مثالیں اور ملاحظہ فرمالیں، ۲۷ر ستمبر ۱۹۵۹ء مطابق ربیع الاول ۷۹ھ کو

حیدر آباد سے مولانا محمد موسیٰ میاں کو ایک طویل خط میں لکھتے ہیں:

"۲ر ستمبر کو میرا سفر شروع ہوا، مالیگاؤں میں میرے کئی شاگرد مدرس ہیں، ان کو اطلاع کر دی تھی، وہ منماڈ اسٹیشن پر ملنے آئے اور باصرار مالیگاؤں لے گئے، پھر وہاں سے اہل علم کی ایک پارٹی نے طے کیا کہ برہان پور بھی کبھی علم کا مرکز رہا ہے، اور وہاں شیخ طاہر سندی اور شیخ فتح محمد محدث پیدا ہوئے ہیں، لہذا وہاں بھی کتابوں کی جستجو کرنی چاہیے، چنانچہ احقر نے برہانپور کا سفر کیا وہ حضرات بھی ساتھ تھے، وہاں مولوی سید احکام اللہ بخاری کا کتب خانہ دیکھا، کچھ قلمی کتابیں ان کے پاس ہیں، مگر حدیث و فقہ کی کوئی خاص چیز وہاں نہیں ہے۔ پھر شیخ برہان الدین راز الہ کی درگاہ کے سجادہ نشین سید حبیب الدین کا کتب خانہ دیکھا وہاں بھی اب کچھ نہیں ہے، یا ہے مگر انھوں نے سب چیزیں نہیں دکھائیں، برہانپور سے پھر مالیگاؤں آیا اور چار پانچ دن ٹھہر کر حیدر آباد کا قصد کیا، حیدر آباد پہنچا تو آپ کا والا نامہ ملا..."

اسی خط میں چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

"...روزانہ کسی نہ کسی کتبخانہ میں ۹۔ بجے سے چار بجے تک وقت صرف کرتا ہوں، شام تک تھک کر چور ہو جاتا ہوں، کل جامعہ عثمانیہ کا کتبخانہ دیکھا وہاں ایک نسخہ مسند حمیدی کا ملا، مگر روزانہ وہاں جا کر مقابلہ کرنا پڑے گا، جو میری قیام گاہ سے سات میل دور ہے، پرسوں جمعہ کے بعد سے آصفیہ میں مصروف رہا..."

اسی سفر میں طویل صحرا نوردی کے بعد بمبئی پہنچے جہاں سے ۱۰ر اکتوبر ۵۹ء کو مولانا محمد میاں کے پاس ایک اور مفصل خط لکھا، جس میں تحریر فرمایا:

"حیدر آباد سے ایک عریضہ روانہ کر چکا ہوں، اب میں کل سے بمبئی آگیا ہوں، ۱۔ یہاں اسرار المحبۃ للشاہ رفیع الدین کا نسخہ دستیاب ہو گیا اور اس کو

نقل کے لئے دیدیا ہے ۔ یہاں سامرود کے باب میں حافظ محمد شفیع اور مولوی سعید کے خطوط ملے کہ سامرود میں مصنف کا نسخہ نہیں ہے اور اس کی اطلاع آپ کو بھی ان لوگوں نے دیدی ہے ...“

درس و تدریس | اوپر یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ استاذ مرحوم نے درس و تدریس کا آغاز عنفوان شباب ہی میں اس وقت کیا تھا جب کہ تحصیل علم سے باقاعدہ فراغت نہیں نصیب ہوئی تھی ، اور ابھی تکمیل علم و فن سے بمراحل دور تھے۔ لیکن یہ سلسلہ ایک ڈیڑھ سال سے اوپر قائم نہیں رہا اور فریضہ تدریس چھوڑ کر پہلے آپ نے علوم کی تکمیل کی ، ۱۳۴۰ھ میں دارالعلوم سے باضابطہ فراغت حاصل ہوئی، اس کے بعد آپ نے باقاعدہ درس و تدریس کی ابتداء فرمائی، اور اب جو آپ کا فیضان شروع ہوا ہے تو اس کا سلسلہ تادم واپسیں برقرار رہا، ۱۳۴۰ھ سے لے کر ۱۴۱۲ھ تک تقریباً ستر بہتر سال تک آپ کے دم سے مسند درس کی رونق قائم رہی۔ اس عرصہ میں متعدد نسلوں اور بے شمار افراد نے، جن کا حصر و احاطہ ناممکن ہے، آپ کے خوان علم سے زلہ ربائی کی۔

آپ کا طرز تدریس جداگانہ تھا، طلبہ عبارت پڑھتے اور وہی ترجمہ بھی کرتے، آپ مطالب و معانی کی وضاحت فرمادیتے، آپ کے پاس عبارت خوانی، طلبہ کے لئے بڑی آزمائش کی چیز ہوتی تھی، عبارت پڑھنے والے طالب علم کے ہوش و حواس بہت مشکل سے بجا رہتے تھے۔ ایک تو غیر معمولی رعب و ہیبت، دوسرے ایک ایک حرف ایک ایک حرکت کا صحیح تلفظ اور ٹھیک ٹھیک ادائیگی ، عبارت پڑھنے والے کو گویا ہر ایک بات نظر میں رکھنی پڑتی تھی، مفتی ظفیر الدین صاحب ارقام فرماتے ہیں:

”عبارت خوانی ان کے درس میں لوہے کے چنا چبانے سے کم نہیں، کیا مجال کہ کوئی طالب علم ایک زبر زیر کی غلطی کر کے نکل جائے، اسی طرح ترجمہ میں بھی غلطی برداشت نہیں کرتے تھے، جہاں غلطی ہوئی مولانا کی طرف سے ہوں کی آواز آئی، اگر عبارت ٹھیک ہوگئی تو کچھ نہیں فرماتے، مگر ہوں کے بعد

بھی غلطی ٹھیک نہیں ہوئی تو مولانا کی چھڑی اٹھ جاتی اور ساتھ نحوی وصرفی ترکیب کے سوالات شروع ہو جاتے، طالب علم پر کپکپی طاری ہو جاتی۔ اسی وجہ سے جس کو عبارت پڑھنا ہوتی وہ دو چار کتابوں کی مدد سے سارے مسائل حل کر کے جاتا تھا۔"(۱)

استاذ مرحوم حضرت علامہ اعظمی۔ نوّر اللہ مرقدہ وبرّد مضجعہ۔ عبارت خوانی کے دوران طالب علم پر کتنی باریکی سے نگاہ رکھتے تھے، اس کا تماشہ ناچیز نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور مشاہدہ کیا ہے، ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ہم لوگوں کے دورۂ حدیث کا سال تھا، ہمارے ایک شریک درس بخاری شریف کی عبارت پڑھ رہے تھے، ایک جگہ " الفرَس" کا لفظ آیا، ساتھی نے اس کو "الفرْس" پڑھ دیا۔ بظاہر یہ ایک معمولی سی بات ہے، لیکن ایک بخاری پڑھنے والے کے لئے علامہ اعظمی کے نزدیک یہ چھوٹی سی بات بھی ناقابل برداشت تھی، چنانچہ آپ بہت خفا ہوئے اور سخت تنبیہ فرمائی۔

درسی تقریر میں افہام و تفہیم کے علاوہ ایجاز واختصار، ترتیب مقدمات اور نتائج کے استنباط پر حیرت انگیز قدرت اور عجیب وغریب ملکہ حاصل تھا۔ اللہ نے آپ کے اندر یہ عجیب وغریب موہبت وصلاحیت ودیعت فرمائی تھی کہ جو کتاب کی عبارت ہوتی آپ کی تقریر اسی ترتیب سے ہوتی، ہم نے آپ کی اس عظمت وشان کے مناظر اس وقت دیکھے ہیں جب آپ باعتبار عمر چراغ سحری ہو چکے تھے، اور ضعف وتعب کی وجہ سے لیٹ کر درس دیا کرتے تھے، اس عمر میں بھی وہ شان وشوکت پائی جاتی تھی، جو عہد شباب اور کہولت میں بدرجہا زیادہ رہی ہو گی، مگر اس صورت اور حالت میں بھی دیوان متنبی، حماسہ اور تفسیر بیضاوی اور دیگر کتابوں میں معانی ومطالب کی وضاحت اس حسن ترتیب سے فرماتے کہ نہ کوئی حرف چھوٹتا اور نہ توضیح کے درمیان کوئی لفظ ادھر سے ادھر ہوتا، اور عبارت بالکل آئینہ ہو جاتی۔ آپ درس میں لمبی چوڑی تقریر کے عادی تھے نہ قائل، بلکہ اس کے سخت خلاف تھے، یہ آپ کا کمال تھا کہ مشکل سے مشکل مباحث اور دشوار سے دشوار

(۱) ترجمان الاسلام ۱۱۔ ۱۲ ص ۱۳۸

مقامات کی وضاحت وتصریح چند فقروں میں اس طرح فرمادیتے کہ بات بے غبار ہو جاتی۔ بخاری اور ترمذی کے درس کے دوران نہ جانے کتنے مقامات پر یہ مشاہد و محسوس رہا ہے کہ وہ پیچیدہ مسائل و معانی جن پر دنوں اور ہفتوں تک بحث و تمحیص ہوتی رہتی ہے، ان کی اس طرح عقدہ کشائی کرتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان کے اندر کوئی تعقید رہی ہو۔

مطالعہ کی سخت تاکید فرماتے، اس کی اہمیت آپ کے نزدیک تکرار سے زیادہ تھی، بلکہ آپ تکرار کی افادیت کے چنداں قائل نہیں تھے۔ میں نے آپ کی تحریروں میں کہیں دیکھا ہے کہ خود بھی زمانۂ طالب علمی میں تکرار کے حلقوں میں نہیں بیٹھتے تھے، بلکہ انفرادی مطالعہ کو ترجیح دیتے تھے، آپ درس کے دوران استاذ کی تقریر بھی قلمبند کرنے کے حق میں نہیں تھے، ہم لوگ جب ترمذی شریف کا سبق آپ سے پڑھ رہے تھے تو ہمارے ایک ہم درس نے آپ کے افادات قلمبند کرنا چاہا، آپ نے سختی سے منع فرمادیا اور فرمایا کہ میری بات غور سے سنو اور اس کو سینے میں محفوظ رکھنے کی کوشش کرو، اصل علم وہی ہے جو سینے میں محفوظ رہ جائے۔

پابندیٔ اوقات علامہ اعظمیؒ کے نزدیک وقت بہت قیمتی متاع تھی ، وہ اپنے بیش قیمت اوقات کے ایک ایک لمحے کا حساب کتاب رکھتے اور اسے کام میں لاتے تھے۔ اگر کہا جائے کہ وہ لمحے کا سواں حصہ بھی ضائع نہیں کرتے تھے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے اوقات کے سخت پابند تھے، نشست و برخاست، درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور زیارت و ملاقات ہر عمل کے لئے ایک وقت مقرر تھا۔ شاید و باید ہی کبھی ایسا ہوتا ہو کہ ان کے معمولات میں تخلف یا خلل واقع ہوتا ہو، ان کا ہر کام الگ الگ اوقات پر منقسم تھا، صبح کے ناشتہ سے لے کر ناشئۃ اللیل تک کی تمام مصروفیات کے لئے وقت مقرر تھا، درس و تدریس کا وقت، تصنیف و تالیف یا تحقیق کا وقت خطوط نویسی کا وقت، بارہ بجتے ہی دوپہر کے کھانے کا وقت، عقیدتمندوں کے لئے دعا و تعویذ کا وقت، اور خواص سے ملاقات کا وقت، الغرض لیل ونہار کی ہر ساعت مصروفیت میں صرف ہوتی تھی۔

اگر وقت کی اس شدت سے پابندی نہ ہوتی، تو آپ نے جواتنے محیر العقول کارنامے

انجام دیئے ہیں، وہ شاید سامنے نہ آتے۔ آپ نے اپنے وقت کی قدر کی تو اللہ نے اسی قدر اس میں برکت عطا فرمائی۔ یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب نہ ہوگا کہ آپ کی زندگی میں بہت سے لوگوں کو آپ کی سخت مزاجی اور تند خوئی کا شکوہ تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ شکایت محض آپ کے مزاج و طبیعت سے ناواقفیت کی بنا پر تھی، ورنہ در حقیقت وہ بہت زیادہ نرم دل اور رقیق القلب تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ حد درجہ حساس، لطیف الطبع اور ذکی الحس تھے، اور اس لطافت طبع اور حساسیت کے ساتھ ان کی ذات سے متعلق دو چیزیں اور بھی تھیں جن میں وہ کسی دخل اندازی کو عموماً برداشت نہیں کرتے تھے۔ ایک ان کے اصول و ضوابط دوسرے اوقات۔ مگر عوام بیچارے عقیدت و محبت سے مجبور زیادہ تر بے وقت ہی آتے، اور تفصیلی ملاقات اور بات کی آرزو لے کر آتے، یہ بے وقت کی آمد علامہ اعظمیؒ کے دل و دماغ پر جس قدر شاق گذرتی وہ کسی سنگ گراں سے کم نہ ہوتی۔ اس صورت میں کبھی آپ ملنے سے انکار کر دیتے یا سخت بات کہہ دیتے تو لوگ اس کو تند خوئی اور تلخ مزاجی پر محمول کرتے، جب کہ یہ ان کے مزاج میں ہرگز نہیں تھا، صرف یکسوئی کا تقاضا تھا جس کے سبب ایسا کرنا پڑتا، اسی وجہ سے وہ اپنے اس طرز عمل پر کبھی کبھی متاسف بھی ہوتے۔

یہ غالباً وقت کی قدر و قیمت ہی کا اثر تھا کہ جب آپ نے اپنا مختصر سا رسالہ "اہل دل کی دل آویز باتیں" تالیف فرمایا، تو اس میں سب سے پہلا جو واقعہ ذکر کیا وہ وقت کی قدر و قیمت سے ہی متعلق ہے اور اس کا عنوان "وقت کی قدر و قیمت" قائم کیا ہے۔

کم گوئی! یہ علامہ اعظمیؒ کا ایک بہت خاص وصف تھا۔ آپ حد درجہ کم سخن اور خاموش طبع تھے، بقدر ضرورت تکلم فرماتے ورنہ خاموش رہتے، اور خاموشی بھی برائے خاموشی نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا جیسے فکر کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہوں، یہ آپ کا عجیب و غریب وصف تھا، ایک طرف سینہ علم و حکمت سے اس طرح معمور جس پر "کنیف ملئی علماً" کا قول صادق آئے، دوسری طرف زبان و دہن پر ایسی مہر سکوت جیسے قوت گویائی مفقود ہو، البتہ

علم کے اس سمندر میں جب کچھ تموج پیدا ہوتا تو کچھ جواہر پارے ساحل پر آکر بکھر جاتے۔ کوئی شخص آپ سے اگر کچھ دریافت کرتا تو اکثر و بیشتر صرف ہاں، نہیں میں جواب دیدیتے یا اگر کچھ فرماتے بھی تو بقدر ضرورت، لیکن وہی چند جملے حکمت و معنی سے بھرپور ہوتے۔ کم گوئی آپ کی ایسی صفت تھی کہ اس کی وجہ سے ان لوگوں پر، جو آپ کے تبحر علمی سے واقف نہ ہوتے، آپ کے علم کی حقیقت آشکارا نہیں ہوپاتی تھی۔

وعظ و تقریر: حضرۃ الاستاذ علامہ اعظمیؒ کی گوناگوں خصوصیات میں فن خطابت پر قدرت تامہ بھی تھی، گوکہ آپ واعظ شعلہ بیان تھے نہ مقرر خوش الحان، اس کے باوجود آپ کے اندر ایک اچھے واعظ اور ماہر و مشاق خطیب کے جملہ اوصاف موجود تھے، اور بہت سارے کمالات کی طرح وہ اس میدان میں بھی یکتا و بے مثل تھے، اور کم از کم خطۂ پورب میں خطابت کے اندر آپ کا ہم پایہ کوئی نہیں تھا۔

علامہ اعظمی کے اندر یہ کمال بھی عطیۂ قدرت اور خداداد تھا، درس و تدریس کے زمانۂ آغاز سے ہی مجالس وعظ و تذکیر میں جلوہ آرا نظر آتے ہیں، آپ کے خطوط کے پشتارہ میں پانچ دریاؤں کی سرزمین (پنجاب) سے لے کر مشرقی بہار تک کی مختلف مجلسوں اور محفلوں میں شرکت کے دعوت نامے شروع زمانہ سے ملتے ہیں۔ امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کا خطابت میں جو پایہ اور مرتبہ تھا وہ محتاج بیان نہیں، علامہ اعظمی ان کے نہایت معتمد اور مقرب تھے، حضرت امام اہلسنت کے مجموعۂ مکاتیب میں جو انھوں نے علامہ اعظمیؒ کے نام ارسال فرمائے ہیں، معتدبہ تعداد ایسے گرامی ناموں کی ہے جن میں جلسوں میں شرکت اور وعظ و تقریر کے لئے دعوت اور پیشکش ہے، ان خطوط کے مضامین سے صاف پتہ چلتا ہے کہ علامہ اعظمی کی ہمراہی و ہم سفری اور ہم مجلسی کو وہ اپنے لئے موجب فخر و ابتہاج سمجھتے تھے، اور علامہ اعظمی خود ایک موقع پر اس کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

"یاد نہیں کتنے جلسوں میں میری دعوت پر امام اہلسنت نے شرکت فرمائی

اور کتنے جلسوں میں ان کی خواہش پر میں نے ان کی معیت میں شرکت کی۔"(۱)

آپ کے خطوط کے انبار پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لینے سے ہی یہ ہویدا ہو جاتا ہے کہ ان کی خطابت کا چرچا اور شہرہ ریعان شباب میں ہی ہو گیا تھا، یہی ایک مثال لے لیجئے کہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے قصبہ میں انصاری برادری کے کسی شیعی نے فتنہ وفساد کا بازار گرم کر رکھا تھا، تو اس کی کاٹ کے لئے مولانا سیوہاروی کی نگاہ انتخاب آپ پر پڑی؛ اور آپ کو بلانے کے لئے انھوں نے متعدد خطوط روانہ فرمائے۔

اسی طرح نہ جانے کتنے جلسوں اور مجلسوں میں مشاہیر اہل علم اور اکابر قوم کی موجودگی میں ریاست وصدارت کی کرسی تفویض کی گئی۔ نومبر ۱۹۳۶ء میں اعظم گڈھ میں ایک جلسے کا انعقاد ہوا جس کے شرکاء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ تھے۔ اس اجلاس کی صدارت کا تاج علامہ اعظمی کے سر پر رکھا گیا تھا، ڈاکٹر منور انجم اقبال سہیل حیات اور شاعری (ص ۱۶۰) میں لکھتے ہیں:

"اسی طرح نومبر ۱۹۳۶ء میں جب مولانا موصوف (حضرت مولانا مدنیؒ) سدھاری اعظم گڈھ کے دینی جلسے میں شریک ہوئے جس کی صدارت محدث العصر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے کی تھی......"

اس ضمن میں یہ عرض کر دینا بے موقع نہ ہو گا کہ اس جلسے کی مناسبت سے اقبال سہیل نے شرکاء اجلاس بزرگوں کی شان میں فارسی میں ایک برجستہ اور پر اثر استقبالیہ نظم پیش کی تھی، اقبال سہیل نے اس کے اندر علامہ اعظمیؒ کو جس بلند آہنگ پیرایہ میں خراج تہنیت پیش کیا تھا وہ یہ شعر ہے:

وزاں پس آں حبیب ما، ادیب ما، خطیب ما : کہ ذاتش در مئو احناف را حصن حصیں آمد (۲)

علامہ اعظمیؒ جب تک مفتاح العلوم مئو سے وابستہ رہے، ان کا ہمیشہ کا یہ معمول رہا

(۱) المآثر ج ۷ ش ۳ ص ۷۹

(۲) دراصل یہ جلسہ علامہ سید سلیمان ندوی کی زیر صدارت ہونے والا تھا، سید صاحب اس وقت حج میں تھے، اور اسی روز واپس آنے والے تھے، لیکن جب آخر وقت تک ان کی واپسی نہیں ہوئی، تو صدارت کیلئے علامہ اعظمی کا نام پیش کیا گیا، اقبال سہیل جو نظم لکھ کر لائے تھے اس میں مذکورہ شعر نہیں تھا، انھوں نے وہیں برجستہ وہ شعر کہا اور کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پنسل سے لکھ کر علامہ اعظمی کے حوالے کیا، سہیل صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ شعر اب بھی علامہ کے کاغذات میں محفوظ ہے۔

کہ رمضان المبارک کے مہینے میں ہر جمعہ کو نماز جمعہ کے بعد وعظ فرماتے، ان کے مواعظ رمضان کے علاوہ سال کے دیگر مہینوں میں بھی ہوتے رہتے تھے، لیکن وہ معمول نہیں تھا، البتہ ماہ مبارک میں تقریباً یہ معمول بن چکا تھا، اور یہ معمول مفتاح العلوم سے مفارقت کے بعد بھی مدرسہ مرقاۃ العلوم سے متصل جامع مسجد رحمانی میں قائم رہا اور آخری عمر تک جاری رہا اور جس سال آپ کی وفات ہوئی ہے، اس سے پہلے تک آپ نے اس کو برقرار رکھا۔ آپ کے یہ مواعظ و مجالس مئو کی تاریخ کے لئے یادگار اور باعث صد افتخار ہیں، رمضان میں آپ کا وعظ سننے کے لئے لوگوں کا جو مجمع اڈتا تھا اس کی مثال مشکل سے ملے گی، نہ صرف مئو بلکہ قرب و جوار کے قصبات وقری سے بھی لوگ "بڑے مولانا" کی تقریر سننے کے لئے بڑی تعداد میں مئو آکر جمعہ کی نماز پڑھتے اور مولانا کی نصیحتوں سے مستفید و فیضیاب ہو کر واپس جاتے، رمضان کے آخری جمعوں میں تو لوگوں کا ہجوم اس قدر ہوتا کہ ان کی تعداد کا صحیح اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

علامہ اعظمی کا وعظ عجیب و غریب خصوصیت کا حامل ہوتا تھا، ان کا کلام " کلم الناس علی قدر عقولهم " کی تمثیل پیش کرتا تھا، حاضرین و سامعین کے مبلغ علم اور معیار عقل کے اعتبار سے وہ تقریر بھی فرماتے، موقع و مقام کی بھی پوری رعایت فرماتے، مجمع عوام کا ہوتا تو آپ کی تقریر نہایت عام فہم ہوتی جسے ہر کہہ ومہہ بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ لیکن اگر اہل علم کا اجتماع ہوتا اور کوئی علمی تقریب ہوتی، اس وقت آپ کی خطابت کا رنگ خالص علمی اور تحقیقی ہوتا، عموماً خطاب مختصر فرماتے، مگر جب کبھی طبیعت میں نشاط ہوتا اور سامعین میں ولولہ و شوق زیادہ ہوتا تو تفصیل سے بھی کام لیتے، رمضان کے جمعوں میں سامعین کے جاذبۂ شوق کو دیکھ کر بالعموم طویل تقریر فرماتے، چنانچہ ہم نے اخیر عمر میں جب کہ آپ انتہائی نحیف و نزار ہو چکے تھے، دیکھا ہے کہ ایک ایک گھنٹے سے زیادہ بلا تکان بولتے چلے جارہے ہیں۔

اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے کہ آپ کی تقریر حال و مقام کی مناسبت سے ہوتی، اسی

طرح سامعین کی نفسیات کی بھی حد درجہ رعایت ہوتی، ان رعایتوں کی وجہ سے آپ کی باتیں بڑی پر اثر ہوتی تھیں، اہل مجلس آپ کی ایک ایک بات غور سے سنتے اور دل میں اتارتے، آپ جب تقریر فرمارہے ہوتے تو سکوت وسکون کا حال عربی کے مشہور محاورہ کأن علی رؤسهم الطير کا ہوتا، آپ کے وعظ کی یہ عجیب وغریب تاثیر تھی کہ اسلاف کے تاریخی واقعات جب بیان فرماتے تو انداز اتنا موثر ہوتا کہ اگر واقعہ خوش کن ہوتا تو بے اختیار ہنسی آجاتی اور اگر کوئی حسرتناک اور رقت آمیز بات ہوتی تو پورے مجمع پر گریہ طاری ہوجاتا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مدرسہ مرقاۃ العلوم کی مسجد میں ایک دفعہ جمعہ کے دن اتفاق سے ۱۷ر رمضان کی تاریخ تھی۔ اس دن غزوہ بدر کے واقعہ کی اس انداز سے منظر کشی کی کہ سامعین میں شاید کوئی ایسا رہا ہو جس کی آنکھوں سے آنسو نہ رواں ہوگئے ہوں، اور یہ سارا بیان نہایت سادگی کے ساتھ سیدھے سادھے انداز میں ہوتا تھا۔

آپ کی مثال کسی ماہر نباض کی تھی کہ معاشرے میں رائج خرابیوں اور غیر شرعی امور پر نگاہ رکھتے اور ان کو دور کرنے کی بہر طور نصیحت فرماتے، اور اسلامی اخلاق اور دینی اقدار کے اپنانے کی ترغیب دلاتے، مولانا محمد عثمان صاحب معروفی تحریر فرماتے ہیں:

"صحن احیاء العلوم میں اجلاس تھا، اسٹیج کے پیچھے دیوار پر دو خوبصورت بنارسی ساڑیاں لگی ہوئی تھیں، حضرت نے ابتداء میں اس پر نکیر کی اور فرمایا کہ یہ زیبائش وآرائش کیا اسراف میں داخل نہیں ہے؟"(۱)

آپ کی تقریر کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ آپ کی باتیں نہایت پرمغز، جامع، مدلل اور معلومات افزا ہوتیں، اختصار اور جامعیت دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے مترادف ہوتا تھا، مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارکپوری (متوفی ۱۴۰۴ھ م ۱۹۸۴ء) فرماتے ہیں:

"ان کا (علامہ اعظمیؒ) وعظ یا تقریر ایک مہذب اور جامع متن کے درجہ میں ہوتا ہے جو حشو وزوائد سے پاک ہوتا ہے، اور جس کی لمبی شرح کی جاسکتی ہے۔

(۱) ترجمان دارالعلوم اکتوبر ۱۹۹۶ء ص ۲۰

دوسری خوبی آپ کے بیان میں یہ ہوتی ہے کہ دوسری بات پہلی بات کی دلیل ہوا کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ کی تقریر کو اہل علم بہت دلچسپی سے سنتے ہیں (۱)"

خطابت پر جس طرح اردو زبان میں قدرت حاصل تھی اسی طرح عربی زبان میں بھی دسترس تھی، اوپر گذر چکا ہے کہ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود علیہ الرحمہ کی تشریف آوری کے موقع پر جب علامہ مرتضی زبیدی کا شیخ الازہر کی زبان پر ذکر آیا، تو آپ نے عربی زبان میں برجستہ علامہ موصوف کا تعارف کرایا، اور ان کے ھندی الاصل ہونے کو دلائل سے ثابت کیا، اس موقع پر مولانا ابو بکر غازیپوری کا یہ جملہ آپ سن چکے ہیں کہ اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ حضرت مولانا کو جس طرح فصیح عربی لکھنے پر قدرت حاصل ہے اسی طرح عربی بولنے پر بھی قدرت حاصل ہے۔

قاہرہ کی سنت وسیرت کانفرنس کو جب آپ نے برجستہ خطاب فرمایا تو حاضرین اجلاس حد درجہ متاثر ہوئے، حتی کہ جب آپ واپس تشریف لائے تو مصر کے کئی فضلاء کے خطوط آئے جن میں انھوں نے آپ کے خطاب کی تحسین وستائش کی، ان میں سے کئی ایک خط اس کم سواد نے بچشم خود دیکھا ہے۔

اسی طرح جب آپ عربی زبان میں گفتگو فرماتے تو نہایت فصیح وبلیغ اور شستہ ورواں انداز والفاظ میں فرماتے، آپ کے لب ولہجہ اور انداز گفتگو کی تعریف وتوصیف خود عرب اہل علم کرتے، شامیوں نے باوجود شستہ اور ستھری عربی بولنے کے جب آپ کی گفتگو سنی تو بہت متحیر ہوئے، اور ہم نے خود علامہ شیخ ابو غدہؒ اور بعض دیگر عرب فضلاء کے ساتھ نہایت روانی اور بے تکلفی سے گفتگو کرتے ہوئے سنا اور دیکھا ہے۔ اس وقت محسوس یہ ہوتا کہ اردو زبان کی طرح یہ بھی گھٹی میں پڑی ہو۔

---

(۱) ترجمان دارالعلوم ص ۲۱

وسیع الظرفی | اعلیٰ درجہ کے وسیع الظرف اور کشادہ قلب تھے، کسی کے بدخواہ نہیں تھے۔ اگر آپ سے کوئی کسی معاملے میں مشورہ طلب کرتا تو دین ودنیا کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر اس کو بہتر سے بہتر مشورہ دیتے۔ آپ کی وسیع الظرفی کی انتہا یہ تھی کہ باایں ہمہ وفور علم اور عظمت شان آپ کی تحریر میں کوئی اگر صحیح طور پر اصلاح کردے تو اس کو بھی تسلیم کرنے کی گنجائش پائیں، بلکہ خوشی اور شکر گذاری کے ساتھ تسلیم کریں، مگر آپ کی ہر بات چونکہ نہایت مدلل ومبرہن اور محقق ہوتی اس لئے واقعی طور پر ایسا کبھی نہیں ہوا، قاضی اطہر صاحب مبارکپوری مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں، پورا خط تو میں کسی اور مقام پر نقل کروں گا، خط کی جو بات اس جگہ سے متعلق ہے اس کو ملاحظہ فرمالیں، لکھتے ہیں:

"آپ کے تصرفات کی نسبت گذارش ہے کہ اصلاح اگر موجہ ہو تو میں صرف خوش نہیں بلکہ شکر گذار بھی ہوتا ہوں۔"(۱)

دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے درمیان شروع سے جو نظریاتی اختلاف اور اس کے نتیجہ میں باہمی رسہ کشی جو رہی ہے، وہ کوئی نئی بات نہیں، لیکن آپ کے دل میں دونوں کے لئے برابر کی جگہ رہی، صرف یہی نہیں ندوہ میں ڈیڑھ پونے دو سال تک خالصۃ لوجہ اللہ محفل درس بھی گرم رکھی، سید سلیمان ندوی مرحوم کا ایک اہم کارنامہ یہ لکھا گیا ہے کہ دونوں اداروں کے اختلافات کو ختم کرانے میں ان کی شخصیت بہت مؤثر رہی ہے۔ چنانچہ ان کی نسبت ہمارے شہر کے شاعر ومصنف جناب اثر انصاری نے لکھا ہے:

"اس کے علاوہ سید صاحب کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ انھوں نے ندوہ لکھنؤ اور دارالعلوم دیوبند کے دیرینہ باہمی اختلافات کو بھی ختم کرادیا جس سے دونوں اداروں میں دوستی کی فضا پیدا ہوئی۔"(۲)

---

(۱) روزنامہ انقلاب بمبئی ۳۰ دسمبر ۱۹۵۳ء

(۲) دیکھئے، اثر انصاری فکر وفن کے آئینے میں ص ۱۷۲ بحوالہ دبستان شبلی کے نامور انشاء پرداز (۱)

اس بات کو اگر حقیقت واقعہ مان لیا جائے ،اس کے بعد ہم حقائق کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں، تو مجھے یقین ہے کہ اس "دوستی کی فضا پیدا" کرنے میں علامہ اعظمی کی شخصیت نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آئے گی۔ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ سید صاحب اکابر دیوبند سے اس کے بعد زیادہ قریب ہوئے ہوں گے جب وہ حضرت تھانویؒ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے، لیکن آستانۂ تھانوی تک ان کی راہنمائی کس نے کی؟ اس کو جاننے کے لئے دور حاضر کے مستند مورخ قاضی اطہر صاحب مرحوم کی تحریر پڑھئے وہ لکھتے ہیں:

"اس سلسلہ میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کے علم و تحقیق پر سید صاحب (علامہ سلیمان ندوی) کو بڑا فخر و اعتماد تھا، چنانچہ سید صاحب مرحوم کا آخر میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ہی کے اشارے اور مشورے سے تھا۔"(۱)

مذکورہ بالا حوالوں کی روشنی میں اگر منطقی طور پر نتیجہ بر آمد کیا جائے، تو کیا یہ حقیقت منکشف نہیں ہوتی کہ دونوں اداروں کے "باہمی اختلافات" کو ختم کرانے کا سید صاحب کا جو یادگار "کارنامہ" خیال کیا جاتا ہے، اگر یہ کارنامہ سید صاحب کا بلاواسطہ مان لیا جائے تو بالواسطہ علامہ اعظمی صاحب کا بھی کارنامہ ضرور مانا جائے گا۔

بات سے بات نکلتی ہے ،اور جب بات حضرت تھانوی اور سید صاحب کی آہی گئی، تو ان دونوں بزرگوں سے متعلق ایک اور اہم واقعے کا ذکر کر دینا بے موقع نہ ہوگا، اس سے قارئین کو اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوگی کہ اس چھوٹی سی کٹیا میں رہنے والے کی اکابر کے نزدیک کس قدر وقعت و عظمت تھی، اور اس نے پردۂ خفا میں رہ کر خاموشی کے ساتھ کیسا کیسا اہم کام کر ڈالا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب:

(۱) انقلاب بمبئی ۲۶ر نومبر ۱۹۵۳ء

"سید صاحب کو اب حضرت تھانوی سے دلی عقیدت پیدا ہو چکی تھی"(۱)

کہ سید صاحب کی بعض تحریروں پر گرفت کر کے ان کی شخصیت پر نہایت ناروا اور نا مناسب حملے کئے گئے، اس ضمن میں کسی دہلوی صاحب کی طرف سے ایک رسالہ بھی تصنیف کیا گیا جس پر بعض علماء دیوبند کی طرف سے تقریظیں لکھی گئیں، اور سب سے بڑھ کر غضب یہ ہوا کہ حضرت تھانوی کی طرف سے بھی تقریظ لکھی گئی، یہ بلائے ناگہانی سید صاحب کے لئے کس قدر تکلیف دہ اور صبر آزما رہی ہو گی بآسانی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اس وقت سید صاحب نے علامہ اعظمی کے پاس خط لکھ کر صورتحال سے آگاہ کیا، اور اس کی اطلاع مولانا عبدالماجد دریابادی کو ایک خط کے ذریعہ دی، ان کو لکھا:

"میں مولوی حبیب الرحمٰن صاحب (مئو) کے ذریعہ مولانا اشرف علی صاحب کو ۰۰۰ خط لکھوا رہا ہوں۔"(۲)

اس صورت حال سے علامہ اعظمی بھی بلاشبہہ بہت رنجیدہ اور غمگین ہوئے ہوں گے، اور انھوں نے خط لکھ کر:

"حضرت (تھانوی) کو ایک بڑے معقول پیرایہ میں توجہ دلائی۔"(۳)

حضرت تھانویؒ نے علامہ اعظمی کے پاس جواباً ایک طویل اور مفصل خط لکھا جس کو آپ نے سید صاحب کی طرف روانہ کر دیا، حضرت تھانوی کا یہ خط "مکتوبات سلیمانی ۲/ ۵۰" پر شائع ہو چکا ہے، اس میں حضرت تھانویؒ نے اپنے طرز عمل پر تاسف اور ندامت کا اظہار کر کے اظہار معذرت کی ہے۔ اور اس طرح ایک اٹھتا ہوا غبار علامہ اعظمیؒ کی وساطت سے دب گیا۔

---

(۱) مکتوبات سلیمانی ۲: ۴۹

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً

رواداری آپ کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی، تصلب فی الدین اور حمایت حق کے باب میں جس طرح آتش بجان اور قلم بدست رہا کرتے تھے، اپنی ذات کی حد تک اسی قدر بے غرض اور بے ضرر تھے، ذاتی طور پر وہ کسی سے عناد اور دشمنی نہیں رکھتے تھے، مذہبی، مسلکی اور شرعی معاملے سے ہٹ کر وہ حد درجہ غیر متعصب اور روادار انسان تھے۔ لیکن اس رواداری کی وجہ سے دین و شریعت اور مذہب و مسلک کو کوئی زد پہنچے، یہ بات ان کے لئے ہرگز قابل برداشت نہیں تھی، اس وقت حق کی حمایت میں جو سب سے پہلا قلم اٹھتا تھا وہ انھیں کا ہوتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کے شناساؤں میں دوسرے مسلک و مذہب کے افراد بھی نظر آتے ہیں، غیر مقلدین اہل علم میں مولانا عبدالمجید حریری بنارسی تو کہہ لیجئے آپ کے حلقۂ احباب میں آتے تھے۔ شیخ ناصرالدین البانی سے آپ کا جو شدید نظری اور فقہی اختلاف ہے وہ اہل علم پر مخفی نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود جب آپ نے دمشق کا سفر فرمایا تو ان سے ملاقات کی غرض سے خود ان کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔ جہاں تک آپ سے استفادہ کرنے والوں کا تعلق ہے، تو ان میں ایک خاصی تعداد ان لوگوں کی ہے جن سے نظریاتی طور پر آپ کا اتفاق ہرگز نہیں ہو سکتا، چنانچہ مستفیدین میں جماعت اسلامی کے بعض چوٹی کے رہنما اور اہل علم نیز بعض نیم بریلوی اور غیر مقلد حضرات ہیں۔

اسی طرح اجازت و سند حاصل کرنے والوں میں بڑی تعداد ان اصحاب علم و فضل کی ہے، جو شافعی حنبلی اور مالکی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، جن سے زندگی بھر نہایت گہرے اور خوشگوار تعلقات رہے۔

عزم و حوصلہ اور قوت ارادی ہم جب علامہ اعظمی کی زندگی اور ان کے حالات و واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان کی شخصیت، ہمت و حوصلہ اور عزم و ثبات کا ایک پیکر مجسم نظر آتی ہے۔ محنت و مشقت، جد و جہد اور جگر کاوی و جانفشانی ان کی سیرت و شخصیت کی نمایاں اور اہم ترین خصوصیات تھیں۔ تکاسل اور تساہل پسندی ان کی عمر طویل

کے کسی لمحے میں برائے نام بھی دیکھنے میں نہیں آتی۔ باوجودیکہ متعدد بار حالات و سانحات کے سبب یا اپنی افتاد طبع اور وارستہ مزاجی کی وجہ سے اکتاہٹ کا شکار بھی ہوئے، لیکن صبر و استقلال اور ثابت قدمی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹا، امراض و اسقام بھی ان کی زندگی میں برابر ساتھ ساتھ چلتے رہے، لیکن کبھی نہ ان سے شکست کھائی نہ مغلوب ہوئے بلکہ اپنی قوت ارادی اور پامردی کی بدولت ان پر غالب ہی رہے ۔ یہ ان کے اوپر خدا کا عظیم الشان انعام تھا۔

واقعات کی روشنی میں ان کی حیات کے مختلف جہات و ادوار کا جائزہ لیجئے پھر دیکھئے ان کی زندگی سعی و جہد اور نشاط سے کتنی لبریز نظر آتی ہے۔ ۲۲ برس کا سن ہے، طالب علمی کا زمانہ ابھی ابھی رخصت ہوا ہے، بساط درس و تدریس کے ابھی بالکل تازہ وارد ہیں، اس وقت مدرسہ دارالعلوم مئو کی روداد شائع ہوتی ہے، اس روداد میں شعبۂ تصنیف و تالیف کے خانے میں نہایت فخر و مباہات کے انداز اور بلند بانگ الفاظ میں آپ کی ۱۲ رعدد تصانیف کے نام ذکر کئے جاتے ہیں، ان میں سے تین کتابیں عربی زبان میں ہیں، موجودہ دور کی بات چھوڑ دیجئے، جو لوگ تاریخ سے واقف ہیں اور تاریخ کا مطالعہ رکھتے ہیں، اگر تاریخ کے صفحات پر نظر دوڑائیں تو اتنی بھرپور علمی ابتدا کی شاید اتنی ہی مثالیں ان کو ملیں جو انگلیوں پر گنی جا سکیں۔

ذرا اور آگے بڑھئے! صرف ۲۹ برس کی عمر ہے، کہنا چاہئے کہ ریعان شباب ہے، لیکن اسی مختصر سی عمر میں آپ کے قلم سے وہ شاہکار عالم وجود میں آتا ہے جسے آپ کے اساتذہ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسے عباقرۂ وقت اور جہابذۂ زمانہ تحسین و ستائش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، آپ کی اس تصنیف کا نام ہے " الحاوی لرجال الطحاوی"۔

گویا شروع ہی سے مختلف النوع مشاغل و مصروفیات کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے، اس دوران آپ کی گرمیٔ نفس سے نہ جانے کتنے اور کیسے قابل ذکر کارنامے وجود اور ظہور میں

آئے، جن میں بہت سے ایسے ہیں جو تاریخ کے صفحات پر محفوظ رہ گئے، اور کچھ ایسے بھی ہیں جن تک ہماری رسائی نہیں ہوسکی، لیکن خدا کے یہاں انشاءاللہ محسوب وماجور ہوں گے۔

آپ جب ساٹھ سال کی عمر کو پہنچتے ہیں، اس وقت آپ کی علمی زندگی کا دھارا ایک دوسری طرف مڑتا ہے، یہاں سے آپ کی تحقیقی زندگی کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس نے انھیں عالم اسلام کا محدث کبیر تسلیم کرایا، ہجوم اشغال کے ساتھ امراض و عوارض میں بھی ہر روز اضافہ ہوتا ہے۔ غم روزگار بھی بجائے کم ہونے کے بڑھتے ہی جاتے ہیں، لیکن ان سب کا استقلال وپامردی سے مقابلہ کرتے ہوئے وہ مہمات سرانجام دیتے ہیں جو حدیث و سنت کی تاریخ میں آپ کے نام کو لازوال بنادیتے ہیں۔ آپ نے تحقیق و تعلیق کے عظیم الشان کارنامے کن حالات وکیفیات میں انجام دئے، اس کی شہادت کے لئے آپ کے انتہائی مقرب اور مزاج شناس، مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے الفاظ پڑھئے، وہ لکھتے ہیں:

”۱۹۶۰ء میں جب کہ ان کی علمی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا ان کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ طرح طرح کے عوارض واسقام لاحق ہوگئے تھے، قوی میں اضمحلال پیدا ہوگیا، اس دور کے اکثر خطوط میں بخار، ضعف بصارت، دوران سر اور دوسرے امراض کا ذکر کیا کرتے تھے، مگر اللہ کی شان کہ اس دور میں ان کو علم حدیث کی عظیم الشان خدمت کی توفیق ملی اور بڑھاپے میں امراض واسقام کے ہجوم کے باوجود وہ کام کیا جو جوانی میں کرنے کا تھا وہ جو کسی نے کہا ہے۔

بڑھاپے میں جوانی سے بھی زیادہ جوش ہوتا ہے

اور کسی پر صادق آئے یا نہ آئے مولانا پر پورے طور سے صادق آتا ہے۔“(۱)

از اول تا آخر آپ کی کتاب زندگی کا ایک ایک ورق اور ایک ایک صفحہ سعی وعمل، جد وجہد، عزم وحوصلہ اور ثبات واستقلال سے عبارت ہے، شباب وکہولیت کی باتیں تو در کنار، آپ کی جس بے نظیر مصروفیت اور حوصلہ وہمت کا منظر راقم نے بچشم خود دیکھا ہے، اس کی بات کرتا

(۱) ترجمان الاسلام ۱۱۔۱۲ ص ۴۷

ہے، پچاسی سال سے زائد عمر ہو چکی ہے، مگر اس عمر میں بھی کن کن کارناموں کی انجام دہی پر کمربستہ ہیں، ہماری جماعت کو بخاری شریف دونوں جلد اور ترمذی شریف کے درس کے علاوہ ابتدائی جماعت کے بچوں کو بھی ایک آدھ سبق پڑھا رہے ہیں، اور اس فریضۂ تدریس کے علاوہ علمی مہمات میں مصنف ابن ابی شیبہ کی تحقیق کا کام زوروں پر ہے، المطالب العالیہ کے مسندہ نسخے کو اپنی زیر نگرانی نقل کرا رہے ہیں، حیاۃ الصحابہ پر نظر ثانی فرما رہے ہیں، ہند و بیرون ہند کے متوسلین اور اہل علم کی طرف سے آنے والے خطوط و رسائل کے جوابات بھی صادر فرما رہے ہیں، اور اسی میں عوام سے ملاقات اور تعویذ و دعا کے لئے بھی وقت نکالتے ہیں، اور صرف یہی نہیں اس ہماہمی کے عالم میں جب مصر پہنچتے ہیں تو وہاں کے بعض علمی اور تحقیقی اداروں سے طبقات ابن سعد کی تحقیق کی خواہش ظاہر فرماتے ہیں۔

تربیت اور مردم سازی کی فکر! علامہ اعظمی کی نسبت کچھ لوگوں کا یہ گمان ہے کہ ان کو اوروں کی شخصیت سازی کی کم فکر ہوتی تھی، یہ بات سر تا سر خلاف واقعہ اور ناواقفیت کا نتیجہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کے باب میں ہمہ وقت متفکر اور مضطرب رہا کرتے تھے۔ اہل و عیال اور تلامذہ کی فکر تو درکنار، عام طور پر مدارس کا گرتا ہوا علمی معیار، اساتذہ کے اندر بحث و تحقیق کا فقدان اور طلبائے مدارس کی بے شوقی و بد ذوقی آپ کو رنجیدہ خاطر کئے رہتی، اور وقتاً فوقتاً اپنی حسرت و افسوس کا اظہار خطوط و خطبات میں کرتے رہتے، مفتی ظفیر صاحب کو لکھے گئے متعدد خطوط میں یہ حسرت صاف طور سے پڑھی جا سکتی ہے، ۲۱/ فروری ۱۹۴۷ء مطابق ۲۸/ ربیع الثانی ۱۳۶۶ھ کے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"...مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ علم کی روشنی ہندوستان میں برابر کم ہوتی جا رہی ہے، مدرسہ کی تعداد بڑھ رہی ہے اور علم کم ہوتا جا رہا ہے علماء کو بھی احیاء علم کا خیال نہیں ہے، ایسے افراد شاذ و نادر دیکھنے میں آتے ہیں جن کو علمی ترقی کا خیال ہو"

بڑے سے بڑے مدرسہ میں بھی غوغا کے سوا کچھ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔"(۱)

اس فکر میں طلبہ اور اہل علم کی علمی ترقی اور تحقیقی ذوق کی تخلیق، اور نشو ونما کی آرزو اور دعا کرتے اور خود سے جو کچھ بن پڑتا اس سے دریغ نہ کرتے، اور اگر کوئی ذرا بھی جد وجہد اور کوشش وکاوش کا مظاہرہ کرتا، تو نہ صرف یہ کہ اس سے خوش ہوتے، بلکہ اس کی ہمت بندھاتے اور حوصلہ افزائی فرماتے، شاگرد رشید مفتی ظفیر الدین صاحب کو ۱۳ر صفر ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۴ر نومبر ۱۹۵۱ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میرے خیال میں آج کل ایسے مضامین کی سخت ضرورت ہے جس سے عربی خواں طلبہ میں دینی جوش اور علم و تحقیق کا ولولہ پیدا ہو، کچھ نہیں تو عربی زبان میں مہارت اور اس پر قدرت حاصل کرنے کا جذبہ ابھرے۔ غور سے دیکھو کہ ہمارے مدارس کی "پیداوار" اب کیا، اور کتنی رہ گئی ہے۔"(۲)

اپنے شاگردوں اور خوردوں کے علمی و تحقیقی کام سے کس قدر خوش ہوتے اور کس طرح ان کی ہمت افزائی فرما کر آگے بڑھنے پر اکساتے، اس کی مثال مفتی ظفیر ہی صاحب کو لکھے گئے ایک اور خط میں پڑھیے، یکم محرم ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۳ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو لکھا ہے:

"۔۔۔ دار العلوم میں تمہارا مضمون پڑھا، جی خوش ہوا۔ زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہو۔ کام میں لگے رہنا انشاء اللہ رائیگاں نہیں جائے گا۔"(۳)

اس سے پہلے ۲۸ر جنوری ۱۹۴۶ء مطابق ۲۳ر محرم ۱۳۶۵ھ کو اپنے ان ہی شاگرد کو لکھا ہے:

---

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۵۰

(۲) ایضاً ص ۱۶۲

(۳) ایضاً ص ۶۲

"یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تم یکسوئی کے ساتھ اپنا کام کر رہے ہو محنت کا یہی وقت ہے اور اس وقت کی محنت بہت کام آئے گی..."(۱)

صرف اسی پر بس نہیں، اپنے تلامذہ و متوسلین کو طلبہ و شاگردوں کے اندر علم و عمل کا جذبہ اور شوق پیدا کرنے اور اخلاص کی تلقین کی ترغیب و تحریک دلاتے رہتے، مولانا ظفیر صاحب ہی کو لکھتے ہیں:

"... محنت سے مطالعہ کر کے پڑھاؤ اور مولانا کے کتب خانہ سے فائدہ اٹھاؤ، طلبہ میں سچی مذہبیت اور دینداری کا جذبہ پیدا کراؤ، خود بھی استقلال اور اخلاص سے کام کرو۔ آج عالم اور مولوی کہلانے والے بہت ہیں، مگر صحیح معنوں میں عالم عنقا ہو رہے ہیں..."(۲)

یہ اقتباسات پڑھتے پڑھتے ناظرین شاید اکتا گئے ہوں، یہ چند مثالیں میں نے بطور "مشتے نمونہ از خروارے" ذکر کر دئے ہیں، مقصود اس سے احصاء واستقصاء نہیں ہے۔ مفتی ظفیر الدین صاحب کو آپ نے جو خطوط لکھے ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تلامذہ و طلبہ پر آپ کی عنایت و توجہ اس درجہ ہوتی تھی کہ ان کی وکالت میں بسا اوقات اراکین وانتظامیہ سے شکررنجی تک پیدا ہو جاتی تھی، اس میں ان کی صرف یہ خواہش و آرزو ہوتی تھی کہ جو ہونہار اور با استعداد طالب علم ہیں اور علم و تحقیق کا شوق اور ولولہ رکھتے ہیں ان کو کام کرنے کے مواقع میسر ہو جائیں۔

لوگوں کو کام کا بنانے اور کام کی لیاقت رکھنے والوں کو کام پر لگانے کی آرزو آپ کے اندر انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، بار بار اس کی طرف لوگوں کو توجہ دلاتے، شوق و ولولہ پیدا کرتے، یہ سودا آپ کے سر میں اس شدت سے سمایا ہوا تھا کہ ایک زمانے میں کسی علمی مجلس کے قیام نے آپ کو بہت دنوں تک فکر میں مبتلا رکھا، قاضی اطہر صاحب مرحوم کو،

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۴۸

(۲) ایضا

ان کے بمبئی قیام کے زمانے میں، آپ نے جو خطوط لکھے ہیں ان میں سے بہتوں میں اس کا تذکرہ بہت شد ومد کے ساتھ پایا جاتا ہے، مثال کے طور پر ۲۳؍ جون ۱۹۵۹ء کو لکھتے ہیں :

"تیسری بات یہ ہے کہ میں ابھی تک یہ "ہوس" رکھتا ہوں کہ کوئی علمی کام ضرور ہونا چاہئے ، مالیگاؤں کا تجربہ تو ہو چکا، اب کوئی دوسری صورت سوچئے اور برابر خیال میں رہئے، مایوس ہو کر بیٹھ نہ جانا چاہئے، میرے پیش نظر اپنا کوئی ذاتی مفاد نہیں، بس کام کا شوق ہے اور یہ خواہش کہ کچھ لوگ کام میں لگ جائیں۔

مالیگاؤں میں کام شروع ہوا ہوتا تو مولوی حبیب الرحمٰن خیر آبادی سے کچھ کام لیا جاتا جو رفتہ رفتہ کام کے لائق ہو جاتے۔"

رویت ہلال کی تصدیق علامہ اعظمی کی بے نظیر انفرادیت

علامہ اعظمی کی کتاب زندگی عجیب وغریب اور بے مثال کارناموں سے بھری پڑی ہے، ان کے سر پر علم و فضل کے ایک سے بڑھ کر ایک تاج رکھے گئے۔ ان کی استغنائیت، عزلت پسندی اور گوشہ نشینی کے باوجود ان کی ذات بندگان خدا کی توجہات کا مرکز بنی رہی، زندگی کے کسی بھی حصے میں انھوں نے مرجعیت کی خواہش نہیں کی، مگر اس کے باوجود پوری عمر مرجع خلائق بنے رہے، اور کچھ عجب نہیں کہ یہ بے پناہ افضال وانعام اسی استغنائیت اور بے نیازی کے صدقے میں عطا ہوا ہو۔ اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں ان کی ایسی محبت وعقیدت بسا دی تھی کہ جیتے جی دینی امور میں اگر کسی پر اعتماد تھا تو بس علامہ اعظمی کی ذات پر۔

میری یہ بات کسی مبالغہ آرائی یا رنگ آمیزی پر محمول نہ کی جائے۔ عوام کے نزدیک ان کی مقبولیت کا اندازہ صرف ایک رویت ہلال کے مسئلے سے لگایا جا سکتا ہے، وہ جب تک حیات رہے انھیں کی ذات کا نام رویت ہلال کمیٹی تھا، کیونکہ برسہا برس تک رویت ہلال کی تصدیق کا کام انھوں نے تنہا انجام دیا، شعبان ورمضان یا عید کے موقع پر اگر عام رویت نہیں ہوئی اور کہیں ایک آدھ آدمی نے چاند دیکھ لیا تو اس کا مرکز توجہ سیدھے علامہ اعظمی کی ذات ہوتی، باوجودیکہ یہ بات عیاں راچہ بیاں کے درجہ میں ہے، پھر بھی

میں تائید کے لئے مولانا نظام الدین اسیر ادروی کے حسب ذیل قول کو پیش کرتا ہوں:

"رویت ہلال کا مسئلہ اس علاقہ میں بڑی اہمیت اختیار کر چکا تھا، رمضان اور عید کے موقعہ پر اگر عام رویت نہیں ہوئی تو ضلع اعظم گڈھ، ضلع مئو اور ضلع غازیپور سے آنے والوں کا اژدحام مولانا موصوف کی رہائشگاہ پر ہو جاتا اور یہ مجمع اتنا بڑھ جاتا کہ لوگوں کو اس اژدحام کو سنبھالنے کے لئے بڑی دقتیں اٹھانی پڑتی تھیں، یہ اژدحام بلا وجہ نہیں تھا، رویت ہلال کے مسئلہ میں مولانا موصوف کا فیصلہ ہی ان اضلاع میں قابل قبول تھا، کسی دوسرے کی بات سننا بھی گوارا نہیں تھا۔ مولانا موصوف کے علم و فضل، زہد و تقوی اور فقہی بصیرت پر اعتماد کا یہ حال تھا کہ دوسرے مکتبۂ فکر کے اہل علم بھی مولانا ہی کے فیصلے کے منتظر رہتے تھے، اور جب آپ فیصلہ فرمادیتے تو اس کو بخوشی تسلیم کرتے اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے، جس آبادی میں چند لوگوں نے چاند دیکھا ہے تو وہاں کے اہل علم ان کو لے کر سیدھے حضرت مولانا کی قیامگاہ پر آجاتے، اسی طرح اطراف و جوانب میں جہاں بھی رویت کا ثبوت ملتا ان شاہدوں کو حضرت کے سامنے پیش کیا جاتا، آپ قانون شہادت کے جملہ شرائط کی روشنی میں شہادت لیتے، جرح فرماتے اور پھر فیصلہ فرماتے اور یہ فیصلہ فوراً مجمع عام میں سنادیا جاتا اور مذکورہ بالا تینوں ضلعوں میں اس فیصلہ کی خبر آناً فاناً پھیل جاتی اور اس پر عمل کیا جاتا اور اختلاف کا دروازہ بند ہو جاتا۔"(۱)

یہ علامہ اعظمی کا ایسا امتیازی شرف تھا، جس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی، اس معاملے میں آپ سے اختلاف کرنے کا کبھی کسی کو خیال نہیں پیدا ہوا، اور ایک آدھ بار کسی نے اپنا تفوق جتانے کے لئے یا از راہ عناد اختلاف کیا بھی تو ان کا یہ اختلاف نہ عند اللہ مقبول ہوا اور نہ عند الناس مسموع۔ چنانچہ شاید دو دفعہ اس قسم کے واقعے پیش آئے کہ چند

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔ ۱۲ ص ۱۰۔ ۹

لوگوں نے نیک نیتی یا بد نیتی سے آپ کی تحقیق کی مخالفت کرنی چاہی اور اختلاف وانشقاق کی دیوار کھڑی کی تو قدرت کا عجیب وغریب نظام کہ اگلے ہی مہینے جب چاند نظر آیا تو " من عادیٰ لی ولیا فقد آذنته بالحرب " کا کھلا کرشمہ دیکھ لیا، اور شرمندہ ہوکر ان کو اپنی اس حرکت سے تائب ہونا پڑا۔

☆☆☆

علامہ اعظمی نے فرمایا:

حضرات! تقلید اور مذاہب سلف کا تقید ہی ہے جس کی بدولت دین و مذہب مبطلین کی تحریفات سے آج تک محفوظ ہے، یہ اگر نہ ہو تو مذہب بازیچۂ اطفال بن جائے، آج جس قدر جہل مرکب کا شیوع ہے ظاہر ہے، کون نہیں جانتا کہ آج مشکوٰۃ کا ترجمہ کرنے والا اپنے کو مجتہد وقت سمجھتا ہے، ہر حرف شناس اپنے کو علامہ خیال کرتا ہے اور ہر خرنا شخص اپنے کو عیسیٰ قرار دیتا ہے، ایسی حالت میں ہر مولوی یا عالم کو اجتہاد کا حق دیدیا جائے اور تقلید ائمہ واتباع سلف کی پابندی اٹھالی جائے تو ان کے مجتہدات دین ومذہب کے مسائل وفتاویٰ ہوں گے یا جہل وغوایت کے کرشمے؟

المآثر ج۶ ش۲ ص ۳۳ و ۱۲

ہوں صابر مسکین و ولی کا میں جگر بند
دعویٰ نہیں ہوں شمس و قمر کا بیٹا
کیا ناز کروں اپنے فن پر اختر
فائق تھا کہیں مجھ سے حجر کا بیٹا

×××××××××

آٹھواں باب

علامہ اعظمی اور تصوف

آٹھواں باب

علامہ اعظمی اور تصوف

فہم و فراست، فکر و نظر، تفکر و تدبر اور عقل و دانش کے اعتبار سے وہ اپنے وقت کی نادر الوجود اور یگانۂ روزگار شخصیتوں میں سے ایک تھے، جس کی شہادت ان کے معاصرین اور اکابر نے دی ہے، اہم امور میں مشورہ کے لئے، پیچیدہ معلاملات میں رائے معلوم کرنے کے لئے، پر پیچ اور لانیحل گتھیوں کی عقدہ کشائی کے لئے اہل علم اور ارباب بصیرت آپ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے، اس کی کچھ مثالیں اوپر کے صفحات میں گذر چکی ہیں۔

لیکن دل کی دنیا ایک الگ دنیا ہوتی ہے، اس کے جلوے اور کرشمے عالم عقل و خرد سے مختلف اور جداگانہ ہوتے ہیں۔ اس کی حقیقت وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو احسان و سلوک کے رہرو اور سر طریقت کے رازداں ہوں، امام غزالی سے لے کر مولانا عبدالماجد دریابادی تک جب بھی کسی پر عقل و خرد کا غلبہ ہوا ہے، تو اسے خود کو سنبھالنے، تہافت سے بچانے اور تکمیل ذات کے لئے معرفت و سلوک کا سہارا لینا پڑا ہے:

فلسفی سر حقیقت نتوانست کشود گشت رازے دگر آں راز کہ افشاں کرد

علامہ اعظمی نے نوعمری سے ہی شریعت و طریقت دونوں کو لازم و ملزوم سمجھا، انھوں نے اپنی ذات سے کبھی ایک کو دوسرے سے جدا نہیں ہونے دیا، تکمیل ذات کیلئے ان کے نزدیک یہ دونوں ہی چیزیں جزو لازم کی حیثیت رکھتی تھیں، یہی اعتقاد و اذعان انھیں زمانہ طالب علمی میں دیوبند کے مرکز علم سے تھانہ بھون کے منبع عرفان کو لے گیا تھا، جہاں چند دنوں میں وہ اس نعمت کبریٰ سے سرفراز ہوئے تھے، جو انسان کو ایک مدت کی ریاضت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

تھانہ بھون حاضری اور حضرت تھانوی سے بیعت | علامہ اعظمیؒ کے والد ماجد

مولانا محمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے بیعت تھے، اور یہ کہ حضرت تھانوی کی نگاہ میں آپ کی کس قدر عزت اور قدر و منزلت تھی، کہ جب آپ کا ہدیہ خدمت والا میں پہنچا تو فرمایا کہ یہ ہدیہ نہیں تبرک ہے، اور یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ گھر کے ماحول پر طہارت و تقویٰ، دینداری اور راستبازی کا رنگ کس طرح غالب تھا، لہذا عجب نہیں کہ حضرت تھانویؒ کی محبت و عقیدت سے آپ کے دل و دماغ بچپن ہی سے معمور و معطر رہے ہوں، والد محترم کی زبان سے جب کبھی ان کے شیخ کا نام عقید تمندانہ انداز سے سنا ہوگا تو لوح دل پر عظمت کے نقوش ضرور مرتسم ہوئے ہوں گے، دیوبند جانے کے بعد تھانہ بھون حاضری کے لئے کسی موقع کے انتظار میں رہے ہوں گے، اور جیسے ہی عیدالاضحی کی تعطیل ہوئی، فرصت کو مغتنم سمجھا اور آستانۂ تھانوی کا قصد کیا، گئے تو محض زیارت و ملاقات کے لئے تھے، لیکن قسمت یاوری کر رہی تھی اور سعادت ہمرکاب تھی، وہاں پہونچ کر کس نعمت سے سرفراز ہوئے اس کے لئے خود آپ کا بیان پڑھئے، تذکرۂ مصلح الامت کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"وہ میری زندگی کے نہایت مسعود و مبارک لمحات ہیں، جو خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں گذرے، مجھے حاضری کی سعادت پہلی بار اس وقت حاصل ہوئی جب دارالعلوم دیوبند میں طالب علمانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ ۱۳۲۰ھ میں غالباً ذی الحجہ کی تعطیل میں حضرت تھانوی قدس سرہ کی زیارت کے مقصد سے حاضری ہوئی تھی، مگر خوش قسمتی سے بیعت کا شرف بھی حاصل ہو گیا، پہلے سے جانے پہچانے متوسلین میں اس وقت مولانا فتح پوری صاحب سوانح اور خواجہ صاحب (مجذوب تخلص) خانقاہ میں موجود تھے۔ مولانا فتح پوری حضرت اقدس کی نشست گاہ کے پیچھے ایک تنگ حجرہ میں سامنے ذرا اپنے کو ہٹ کر بیٹھنے پر مامور تھے اور وہیں حضرت کے ملفوظات قلمبند کرتے تھے، مولانا فتح پوری کو کئی دن

تک دیکھنے اور وقتاً فوقتاً اپنی اپنی قیامگاہ پر آنے جانے، ملنے اور بات کرنے کا موقع ملا۔ عصر کے بعد خانقاہ کے دروازے پر ایک چائے خانہ میں چائے پینے اور گفتگو کی بھی نوبت آئی۔ جس شب میں بعد نماز مغرب شرف بیعت سے مشرف ہوا تھا، اس کے بعد والے دن میں غالباً بعد عصر حضرت مولانا فتح پوری نے خواجہ صاحب سے فرمایا کہ خواجہ صاحب! مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سے مٹھائی وصول کرنی چاہئے، ان کو حضرت نے زمانۂ طالب علمی میں بیعت کر لیا، حالانکہ حضرت ایسا نہیں کیا کرتے، یہ ان کی خصوصیت ہے۔"(۱)

بیعت کے بعد آستانہ تھانوی سے تعلق آستانہ تھانوی سے تعلق برابر بڑھتا رہا، چنانچہ ۱۳۳۹ھ میں جب حصول علم کے لئے آپ دوبارہ دیوبند تشریف لے گئے، تو عید اضحیٰ کی چھٹی میں ایک بار پھر تھانہ بھون حاضر ہوئے، ۶/ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ مطابق اگست ۱۹۲۱ء کو اپنے ایک ہم درس مولانا عبدالمجید مئوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آج شام کی ٹرین سے تھانہ بھون حضرت مولانا اشرف علی صاحب سے ملنے جارہا ہوں، وہاں سے شاید دہلی جاؤں، کل جمعہ سے اس جمعہ تک تعطیل ہے..."

فراغت کے بعد ہی چونکہ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے تھے، اس لئے بھی اور بعض دوسرے موانع کی وجہ سے بھی کثرت کے ساتھ تھانہ بھون کا سفر نہیں کر سکتے تھے، مگر اس کے باوجود فرصت کی تلاش میں رہتے اور جب کبھی موقع ملتا حضرت تھانوی کی زیارت و ملاقات اور استفاضہ کے لئے سفر کی زحمت اٹھاتے، حضرت تھانویؒ کی خدمت میں لکھے ہوئے علامہ اعظمی کے جو خطوط ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تھانہ بھون کے علاوہ آپ کی مجالس میں شرکت کے لئے لکھنؤ کا سفر بھی فرمایا، مگر سفر کی فرصت چونکہ کم نصیب ہوتی تھی اس لئے گاہے ماہے خط لکھ کر اپنی حالت و کیفیت کی اطلاع دیتے اور

(۱) مقدمہ تذکرۂ مصلح الامت

روحانی معالج سے اپنے حسب حال نسخۂ علاج طلب کرتے رہتے، چنانچہ حضرت تھانویؒ کی خدمت میں لکھے ہوئے بیسیوں خطوط اس وقت ہمارے سامنے موجود ہیں، جن میں سے دو تین خط ذیل میں ذکر کئے جارہے ہیں، اس سلسلہ میں ایک بات اور عرض کردینا ضروری ہے کہ حضرت تھانویؒ کا طریقہ مسلوکہ یہ تھا کہ متوسلین ان کی خدمت میں خط لکھتے تو حضرت حسب ضرورت اور بقدر حاجت ان خطوط ہی کے بین السطور میں اپنے ملاحظات یا ہدایات تحریر فرمادیا کرتے، اور آپ کی یہی تحریریں ان خطوط کا جواب ہوتیں، ہم ذیل کے متن میں علامہ اعظمی کے خطوط اور ان پر حضرت تھانویؒ کے جو ملاحظات ہیں ان کو ترتیب وار حاشیہ میں نقل کریں گے، پہلا خط ۱۳۵۷ھ کا لکھنؤ میں حضرت تھانوی کی ملاقات اور آپ کی مجالس میں شرکت کے بعد کا ہے، اس میں فرماتے ہیں:

"مخدوم ومطاع ما حضرت حکیم الامت دامت برکاتھم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔(۱)

حضرت والا کے کانپور تشریف لے جانے کے بعد ناچیز وطن لوٹ آیا، جمعہ کو بعد عصر مجلس شریف میں حاضر ہونے کے باوجود کوئی موقع نہ پاسکا کہ حضرت سے مل کر رخصت ہولوں، اور سنیچر کو امین آباد آیا تو معلوم ہوا کہ حضرت والا کانپور روانہ ہوگئے، بے ملے چلے آنے کا رنج ہے(۲)۔

جب سے مکان پر آیا کسی ذریعہ سے حضرت والا کا حال معلوم نہیں ہوا، خیریت مزاج مبارک کی نسبت دو کلمے تحریر فرماکر رفع تشویش فرمائیں گے۔(۳)

حضرت والا! میں اپنی بد قسمتی پر جتنا روؤں کم ہے، حضور سے اتنا دور ہوں کہ برس دو برس میں چند قلیل ایام صحبت کے نصیب ہوتے ہیں، ملازمت کی مشغولی، نیز اخراجات کی کثرت اور آمدنی کی قلت سے مجبوری رہتی ہے، ورنہ

---

(۱) السلام علیکم (۲) رنج کی کیا بات ہے جب باطناً ہر وقت ملنا میسر ہے۔
(۳) بالکل صحت حاصل ہے، قدرے ضعف باقی ہے، اب وطن آگیا ہوں۔

سال میں کئی بار حاضر ہوتا، دل بہت چاہتا ہے مگر مجبور ہوں، حضور دعا فرمائیں کہ صحبت کا زیادہ موقع نصیب ہونے لگے۔(۱)

تجربہ سے یہ معلوم ہوا کہ بغیر صحبت کے کوئی کام بآسانی نہ ہوگا، جب تک صحبت میں رہتا ہوں، ہر چیز کا اہتمام اور ہر چیز کی طرف توجہ رہتی ہے، لیکن جب یہاں پہونچ کر دوسرے مشاغل میں پھنس جاتا ہوں تو غفلت چھا جاتی ہے، حضور سے دوام توجہ واہتمام کے لئے دعا اور علاج کا خواستگار ہوں۔(۲)

والد صاحب سلام مسنون عرض کرتے ہیں۔(۳)

خادم حقیر

محمد حبیب الرحمٰن مدرس مفتاح العلوم مئو۔ اعظم گڈھ"

ایک اور مکتوب جسے غالباً اس جوابی مکتوب کی وصولیابی کے بعد تحریر فرمایا تھا پیش خدمت ہے، اس کی تاریخ تحریر ۵؍رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ ہے۔

"سیدی! ادام اللہ ظلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔(۴)

حصول صحت کی اطلاع پاکر بڑی مسرت ہوئی(۵) خداوند تعالیٰ آپ کا سایہ بہت دنوں تک باقی رکھے، نیز حضرت والا کے کلمات تسلی سے بالکل تشفی ہوگئی۔(۶)

مواعظ شریفہ کا مطالعہ کرتا ہوں، اور کچھ شبہ نہیں کی صحبت حسی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

---

(۱) سب سے اول کا معروض قابل ملاحظہ ہے۔

(۲) دعا سے حاضر ہوں، باقی صحبت حسیہ ہے سوا اسکا بدل مطالعہ ہے مواعظ کا۔

(۳) میری طرف سے بھی سلام کہئے۔

(۴) السلام علیکم (۵) آپ کی محبت ہے۔

(۶) ھنیئاً لکم۔

نوافل واوراد کی طرف طبیعت کو بہت متوجہ کرتا ہوں مگر کتب بینی کے مقابلہ میں ادھر توجہ نہیں ہوتی، جو کچھ ہوتا ہے تھوڑی دیر بجبر وقہر ہوتا ہے(۱) یا ایسے وقت میں ہوتا ہے جس میں کسی وجہ سے کتب بینی نہیں ہوسکتی۔ یہ اہتمام مطلوب ہے یا نہیں اور مطلوب ہے تو اس کی تدبیر کیا ہے (۲) بعض اوقات مطالعہ میں اتنا انہماک ہوتا ہے کہ مسجد دیر میں پہونچتا ہوں، اور لوگوں کو منتظر پاکر نادم و متاسف ہوتا ہوں کہ ان لوگوں کو میری وجہ سے تکلیف ہوئی۔(۳)

لکھنؤ میں حضرت والا نے حکیم اجمیری صاحب مقیم بمبئی کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کی بڑی تعریف فرمائی تھی کہ انھوں نے اپنے والد کی زندگی میں جو کچھ کمایا سب اپنے والد کے حوالہ کیا وغیرہ وغیرہ۔ الحمد للہ و بنعمتہ تتم الصالحات کہ اب تک ناچیز کا بھی یہی دستور ہے، ۴۵ ماہوار پاتا ہوں اور کل والد کے حوالہ کردیتا ہوں، پھر اگر ایک پیسہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے تو ان سے مانگ کر ضرورت پوری کرتا ہوں، اور ان کے استرضاء کیلئے اتنا اہتمام کرتا ہوں کہ بعض اوقات یہ جانتے ہوئے کہ مشورہ نہ دینے میں نقصان ہے مشورہ نہیں دیتا اس لئے کہ میرا مشورہ ان کے رجحان کے خلاف ہوتا ہے جس کو وہ بطیب خاطر نہیں مان سکتے، بعض دفعہ ان کی رائے پر عمل کرنے سے میری سبکی بھی ہوتی ہے تاہم ان کے خلاف نہیں چلتا۔(۴) تحدثا بالنعمۃ یہ بات ذکر کردی، اور اس لئے بھی کہ شاید اس سلسلہ میں حضرت والا کوئی افادہ فرمائیں(۵)۔ والسلام، والد صاحب سلام مسنون عرض کرتے ہیں۔(۶)

حبیب الرحمٰن۔ مئو ضلع اعظم گڈھ

۵ر رمضان المبارک ۷۵ھ"

(۱) جبر وقہر ہی سے کام کیا جائے (۲) اختیاری کی تدبیر استعمال اختیار

(۳) گھڑی سامنے رکھنا چاہئے

(۴) زادکم اللہ البر بالوالدین

(۵) دعا کرتا ہوں (۶) میری طرف سے بھی سلام

مذکورہ بالا دونوں مکتوب بطور نمونہ میں نے نقل کر دیئے ہیں، تاکہ ان سے سلامت طبع اور استواریٔ مزاج کا اندازہ لگایا جا سکے، ان کے علاوہ اور جتنے بھی خطوط ہیں سب تربیت وتزکیہ کے امور پر مشتمل ہیں، جن میں علامہ اعظمی نے حضرت تھانوی سے اپنے روحانی امراض کا علاج دریافت فرمایا ہے، طوالت کا خوف اگر مانع نہیں ہوتا تو ان سب کو نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتا، لیکن ان صفحات کے اندر زیادہ کے تحمل کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے ان ہی دو پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ البتہ ۱۱ر محرم ۵۸ ۱۳ھ کو لکھے گئے ایک مکتوب کا ٹکڑا اور اس کے جواب کے بعد کی حالت کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے علامہ اعظمی لکھتے ہیں:

"اس سے پہلے مواعظ کا مطالعہ اور کسی قدر ذکر بھی ہوتا تھا، مگر آج کل مدرسہ میں چھ گھنٹے کام کرنے کے بعد بہت تھوڑا وقت دن میں کام کرنے کے لئے بچتا ہے، اور رات کو مطالعہ وکتب بینی سے کم فرصت ملتی ہے، اس لئے ذکر وغیرہ بھی چھوٹ گیا ہے(۱)

کچھ دنوں سے موت کا اکثر اوقات تصور وخیال رہتا ہے، اور سکرات و قبر کے تصور سے بعض اوقات نہایت گھبراہٹ ہوتی ہے، ایک دن سونے کے وقت یہ تصور اتنا قوی ہو گیا کہ کسی طرح نیند نہیں آتی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بدن سے جان نکل رہی ہے، لالٹین بجھا کر سونے کی کوشش کی تو معلوم ہوتا تھا کہ قبر میں پڑا ہوں، اس لئے پھر لالٹین جلائی، نزع کی تکلیف اور قبر کی تنہائی سے بہت زیادہ گھبراتا ہوں، اس باب میں حضور والا کے ارشاد کا محتاج ہوں، جو ارشاد ہو اس کے مطابق کروں۔"(۲)

---

(۱) وہ بھی طاعت ہے اور وقت کی ضرورت، لہذا اوراد کی کمی مضر نہیں۔

(۲) منشا اس کا خشیت حق ہے اس لئے مبارک حالت ہے، البتہ اس کی تعدیل کے لئے مراقبۂ صحت و تقویت رجاء ضروری ہے اس کے بعد بھی اگر پریشانی ہو، وہ طبی وطبعی مرض ہے، جس کے لئے طبیب سے رجوع کیا جاوے۔

مرشد کے ارشاد کے بعد کیفیت میں جو تغیر پیدا ہوا، اس کی نسبت ۱۸ر ذی قعدہ ۱۳۵۸ھ کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"پہلے ایک خط میں موت کے خوف کی وجہ سے بعض اوقات سخت پریشانی کا ذکر کیا تھا، اور حضرت والا نے اس کا علاج بتایا تھا، الحمد للہ اب وہ بات نہیں ہے، وقتاً فوقتاً شدائد موت کا تصور ہوتا ہے، لیکن پہلے جو پریشانی ہو جاتی تھی وہ نہیں ہوتی۔"(۱)

خلافت | حضرت تھانویؒ کے وصال کے بعد ان کے خلیفہ اجل حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری سے نسبت ارادت قائم ہوئی، جن سے آپ کے علائق وروابط زمانۂ طالب علمی سے ہی تھے، اور پھر شاہ صاحب ہی کے دست مبارک پر خلافت واجازت سے بھی سرفراز ہوئے، شاہ وصی اللہ صاحب کے علاوہ آپ کو اجازت سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلیفہ مولانا منیر الدین صاحب مہاجر مکی سے بھی حاصل ہوئی، ڈاکٹر عبدالمعید صاحب لکھتے ہیں:

"حضرت محدث اعظمی کو اجازت بیعت و خلافت حضرت مولانا منیر الدین صاحبؒ مہاجر مکی خلیفہ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی طرف سے بواسطہ حاجی عبدالحمید صاحب اورنگ آباد مئو (جبکہ وہ حج کو تشریف لے گئے تھے) حاصل ہے"(۲)

جہاں تک علامہ اعظمی کے خلفاء کا تعلق ہے، تو ہماری معلومات کے مطابق آپ نے تین حضرات کو اجازت و خلافت عطا فرمائی تھی، ایک مولانا غلام رسول صاحب مہاجر مکی، جو پہلے شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب سے بیعت تھے، بعد میں علامہ اعظمی کے

(۱) تو ضرر کیا ہے، پریشانی تو مقصود نہیں، بلکہ ذکر موت سے مقصود صرف کف عن المعاصی ہے، اگر اس کا ملکہ ہو جاوے تو پھر اس ذکر موت ہی کی ضرورت نہیں۔

(۲) المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۲۷

ہاتھ پر تجدید بیعت کی اور خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے ، ان کے علاوہ مولانا محمد عثمان صاحب سابق مدرس معہد ملت و موسس و رئیس جامعہ الصالحات مالیگاؤں اور ڈاکٹر ریاض احمد صاحب لیکچرر طبیہ کالج منصورہ مالیگاؤں بھی اجازت و خلافت کی نعمت سے سرفراز ہوئے۔

شریعت وطریقت کا امتزاج علامہ اعظمی نے شریعت و طریقت اور ظاہر و باطن کے رشتے کو کبھی اپنی ذات سے جدا نہیں ہونے دیا، لیکن ان کے ہاں ان دونوں کے باہمی رشتے میں بھی ایک خاص توازن پایا جاتا تھا، چنانچہ ان کے نزدیک تصوف کبھی علم پر غالب نہیں آنے پایا۔ علم اور علم کے راستے سے خدمت دین ہمیشہ اولیت اور فوقیت کی حامل رہی ، درس و مطالعہ ان کے نزدیک ہمیشہ پہلے مقام پر رہا، جیسا کہ ۱۸ر ذی قعدہ والے خط میں حضرت تھانویؒ کو لکھتے ہیں:

> "حضرت والا! پڑھنے پڑھانے، مطالعہ اور لکھنے کی وجہ سے وظائف کی پابندی احقر سے نہیں ہوتی..."

اسی وجہ سے بیعت و خلافت اور مجلس و حلقہ سازی سے عمر کے کسی بھی حصے میں آپ کو کوئی خاص مناسبت نہیں رہی، اور یہی وجہ ہے کہ اس ناحیہ سے آپ کو کچھ خاص شہرت نہیں ہوئی، باوجودیکہ آپ کے دست مبارک پر خاصی تعداد میں لوگوں نے بیعت کی، لیکن اس راہ کے سالک کی حیثیت سے آپ زیادہ معروف نہیں ہوئے۔

علامہ اعظمی کے نزدیک تصوف وہی معتبر تھا جو مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہو، یا شریعت سے موافقت رکھتا ہو، یا کم از کم اس سے متعارض اور متصادم نہ ہو، وہ تصوف جو قرآن و سنت یا شریعت مطہرہ سے تعارض رکھتا ہو ، ان کے نزدیک قطعاً نامعتبر تھا، اور ایسی صوفیت کی دعوت و تبلیغ کرنے والے ان کی نگاہ میں قطعاً ناقابل التفات تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ کی بارگاہ میں شطحیات وغیرہ کا بالکل گذر نہیں ہوتا تھا۔

آپ کے یہاں تصوف ذوقی کے ساتھ ساتھ کتابی بھی تھا، اس فن کی کتابوں کا آپ نے وسیع مطالعہ کیا تھا، اور ایک علم اور فن کی حیثیت سے آپ نے تصوف کی کتابوں

کی خوب شناوری کی تھی ،چنانچہ آپ کے ذاتی کتب خانے میں تصوف اور تزکیہ وتربیت نفس سے متعلق عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں خاصی تعداد میں کتابیں موجود ہیں۔

تصوف کی نسبت سے آپ نے دو حصوں میں ایک چھوٹی سی کتاب "اہل دل کی دلآویز باتیں" بھی تصنیف فرمائی ہے۔ جو صوفیہ اور بزرگوں کے دلچسپ واقعات پر مشتمل ہے، یہ کتاب "بقامت کہتر بقیمت بہتر" کا نمونہ ہے،اس کی نسبت حضرت تھانویؒ نے فرمایا تھا:

"رسالہ کی زیارت سے دل خوش ہوا، اللہ تعالیٰ طالبین علم وعمل کے لئے نافع فرمائے، و سیفعل ان شاء اللہ تعالیٰ۔ طالب علموں اور مبتدیان طریق کے لئے بہتر ہے۔"(۱)

علامہ اعظمی نے فرمایا:

عبادت اور نیکی وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق ہو، اور جو رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق نہیں تم ہزار دفعہ اس کو نیکی کہو وہ نیکی نہیں۔

المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۸۲

(۱) اہل دل کی دلآویز باتیں ص ۲ حصہ دوم

نواں باب

مبشرات وکرامات

نواں باب
مبشرات وکرامات

خواب کا تعلق بسا اوقات آدمی کی زندگی سے بڑا گہرا ہوتا ہے، اکثر وبیشتر ہوتا یہ ہے کہ جو خیال وتصور دن کے وقت یا عالم بیداری میں انسان کے ذہن ودماغ پر غالب اور مسلط رہتا ہے، رات کے وقت یا سونے کے بعد وہی خیال مصور ہو کر دماغ کے پردے پر گردش کرتا رہتا ہے، خواب زیادہ تر اضغاث احلام کی قبیل سے ہوتے ہیں اور ان کا تعلق حقیقت وواقعہ کی دنیا سے بہت کم ہوتا ہے۔

مگر کچھ خواب ایسے بھی ہوتے ہیں جو واقعی اور سچے ہوتے ہیں، اور رائی (خواب دیکھنے والے) کے لئے یا جس کو خواب میں دیکھا گیا ہے اس کے لئے بشارت وخوشخبری رکھتے ہیں، یہ رویائے صالحہ ہوتے ہیں، جس کی نسبت حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ حجۃ اللہ البالغۃ (۹۵/۲) میں فرماتے ہیں:

"وأعنى بالرؤيا الصالحة رؤية النبى صلى الله عليه وسلم فى المنام ، أو رؤية الجنة والنار، أو رؤية الصالحين والأنبياء عليهم السلام ، أو رؤية المشاهد المتبركة كبيت الله ، أو رؤية الوقائع الآتية فتقع كما يرى ، أو الماضية على ما هى عليه ، أو رؤية ما ينبهه على تقصيره بأن يرى غضبه فى صورة كلب يعضه ، أو رؤية الانوار والطيبات من الرزق كشرب اللبن والعسل والسمن ،أورؤية الملائكة والله اعلم ."

(رویائے صالحہ سے میری مراد خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنا ہے، یا جنت وجہنم کو دیکھنا ہے، یا صالحین اور انبیاء علیہم السلام کو دیکھنا ہے، یا

مقامات متبرکہ مثلا بیت اللہ کا دیکھنا، یا آنے والے واقعات کا دیکھنا کہ جس طرح دیکھا ہو اسی طرح وقوع پذیر ہو جائیں، یا گذرے ہوئے واقعات کو انھیں حالتوں پر دیکھنا، یا ایسی چیز کا دیکھنا جو اس کو اس کی کسی کوتاہی پر متنبہ کر سکے، جیسے اپنے غصے کو کسی کتے کی صورت میں اس کو کاٹتے ہوئے دیکھے، یا روشنی اور اچھا رزق دیکھنا مثلا دودھ، شہد اور گھی پینا یا فرشتوں کو دیکھنا، واللہ اعلم)

حضرت شاہ صاحب اسی مقام پر لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو اس کا اس قدر اہتمام تھا کہ فجر کی نماز کے بعد خواب کی تعبیر بتانے کیلئے مجلس فرماتے اور اگر کوئی اپنا خواب بیان کرتا تو آپ اس کی تعبیر بتاتے۔

علامہ اعظمیؒ نے پوری زندگی علم و دین کی خدمت میں صرف کی، پورے اخلاص و للٰہیت اور خاموشی کے ساتھ اس خدمت کی انجام دہی میں مصروف رہے، کوئی غلغلہ نہ ہنگامہ، مال و زر کی طلب نہ جاہ و شہرت کی خواہش، ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا، بس احادیث رسولؐ کی ترویج و اشاعت کی ایک دھن تھی، جس کے سامنے دنیا کی ہر چیز ان کے لئے ہیچ اور بے حقیقت تھی، علم و دین کی اس خدمت اور اخلاص و للٰہیت کا اس دار العمل میں اثر یہ ظاہر ہوا اور عند اللہ مقبولیت کی علامت یہ نظر آئی، کہ خوابوں میں آپ کی مقبولیت کی بشارت دی گئی، وفات سے پہلے بھی اور وفات کے بعد بھی، مختلف لوگوں نے مختلف حالت و ہیئت میں آپ کو دیکھا، جس کی تعبیر اس کے سوا اور کیا کی جاسکتی ہے کہ آپ کا عمل بارگاہ خداوندی میں (انشاء اللہ) حسن قبول سے شرفیاب ہوا۔ ذیل میں ہم اسی قسم کے چند خوابوں اور بشارتوں کا ذکر کر رہے ہیں۔

خواب میں رسول اللہ ﷺ کی ضیافت کرنا مولانا حکیم سعد اللہ صاحب مرحوم شہر کے مشہور حکیم اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد تھے(۱) ایک دفعہ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہوئے ہیں اور بہت سے

(۱) المآثر ج۲ ش۱ ص۵۸

لوگ آپ کی دودھ وبالائی سے ضیافت فرمارہے ہیں، لیکن ان کی ضیافت کرنے والوں میں علامہ اعظمی پیش پیش ہیں، بلکہ اس مجلس میں وہی آنحضرت ﷺ کے خادم خاص ہیں، حکیم صاحب نے اپنے خواب کی پوری تفصیل لکھ کر مصلح الامۃ مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے پاس بھیجی، شاہ صاحب نے اس کی تعبیر یہ لکھی:

"مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور آپ کے لئے اور دیگر مسلمانان کے لئے دین اور علم دین حقیقی ملنے کی بشارت ہے فطوبیٰ لکم وبشریٰ لکم"

حکیم سعد اللہ صاحب کا خط اور شاہ صاحب کا اس پر جواب خود حکیم صاحب کی تحریر میں علامہ اعظمی کے کاغذات میں محفوظ ہے اور اس پر تاریخ ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۷۷ھ مندرج ہے، اس خواب کا ذکر خود علامہ اعظمی نے بھی بطور تحدیث نعمت کے کبھی کسی موقع پر کیا تھا، چنانچہ ڈاکٹر عبدالمعید صاحب، مولانا انظر صاحب (استاذ مدرسہ مرقاۃ العلوم مئو) کے حوالہ سے اس کو ذکر کر کے لکھتے ہیں:

"حضرت محدث کبیر اس خواب کو بیان کر کے آبدیدہ ہوگئے اور فرمایا کہ خواب کی تعبیر ظاہر ہے کہ میں نے دنیا نہیں کمائی ہے اور یہ بھی فرمایا کہ اتنی عمر اس فن (حدیث شریف) میں لگانے کے بعد اتنا بھی نصیب نہ ہوتا تو میں یہ سمجھتا کہ میں نے سب کچھ گنوادیا اور کچھ نہ پایا۔"(۱)

رسول اللہ ﷺ کا خواب میں علامہ اعظمی کو سلام کہلوانا

مجھے یاد آتا ہے کہ انتقال سے تقریباً آٹھ دس سال قبل علامہ اعظمی ایک دفعہ گورکھپور تشریف لے گئے اور آنے کے بعد جمعہ کے دن نماز جمعہ کے بعد تقریر فرمائی، اور اس تقریر میں ایک بزرگ مولانا صوفی نصرت علی صاحب کا ایک خواب بیان فرمایا، کہ انھوں نے صوفی صاحب کے ساتھ ایک جگہ رات کا کھانا کھایا اور کھانے کے بعد دونوں اپنی اپنی قیامگاہ پر واپس تشریف

(۱) المآثر ج۲ش ۱ص ۵۸

لے گئے، اسی رات یکایک صوفی صاحب کی طبیعت خراب ہوئی اور آناً فاناً روح پرواز کر گئی صوفی صاحب نے انتقال سے پہلے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا، پھر اس خواب کو حاضرین سے بیان فرمایا، اس خواب کو بیان کرتے وقت علامہ اعظمی کی کیفیت کچھ ایسی ہوئی کہ ان پر گریہ طاری ہو گیا، اور دیر تک روتے رہے۔

اس دن کے خطاب میں علامہ اعظمی نے صوفی صاحب کا یہ خواب بیان فرمایا، لیکن اپنے غایت درجہ تواضع کی وجہ سے اس خواب کا ایک حصہ محذوف فرمادیا، جس کا تعلق خود ان کی اپنی ذات سے تھا، اس پورے خواب کا تذکرہ ڈاکٹر عبدالمعید صاحب نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے، لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا صوفی نصرت علی صاحبؒ جو سلسلۂ تھانوی کے ایک بزرگ تھے، ٹانڈہ میں رہتے تھے ایک بار وہ اور حضرت محدث کبیرؒ گورکھپور میں تشریف رکھتے تھے، صوفی صاحبؒ کے داماد کے یہاں حضرت محدث کبیرؒ کی دعوت تھی، بعد نماز عشاء کھانے سے فارغ ہونے کے بعد دونوں بزرگ اپنی اپنی قیام گاہ پر چلے گئے، رات میں اچانک مولانا نصرت علیؒ صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی، ڈاکٹر آئے دوا دی گئی، اسی اثناء میں آپ کو نیند آگئی، جب بیدار ہوئے تو حاضرین سے فرمایا کہ:

"ابھی میں نے خواب میں آنحضرت ﷺ کی زیارت کی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ: "حبیب الرحمٰن سے میرا سلام کہہ دیجئے اور کہہ دیجئے کہ وہ جس کام میں لگے ہیں لگے رہیں" اس کے بعد مولانا نصرت علی صاحب نے فرمایا کہ "اگر میرا انتقال ہو جائے تو مولانا اعظمی سے کہہ دیجئے گا کہ میری نماز جنازہ پڑھادیں گے۔"

چنانچہ اسی رات مولانا نصرت علی صاحب کا انتقال ہو گیا، صبح کو لوگ حضرت محدث کبیرؒ کے پاس آئے اور آپ سے رات کا پورا واقعہ بیان کیا، صوفی

صاحب کی آخری خواہش کے مطابق حضرت محدث کبیرؒ نے ہی آپ کی نماز جنازہ پڑھائی، اس واقعہ کے وقت مئو کے مولوی عبدالرزاق صاحب محلہ علاء الدین پورہ بھی وہاں موجود تھے۔

مندرجہ بالا واقعہ راقم السطور کا خود محدث کبیرؒ سے سنا اور تحقیق کیا ہوا ہے۔"(۱)

علامہ اعظمی ایک مشہور محدث کی مسند پر مالیگاؤں کے ایک مولوی سراج صاحب ہیں انھوں نے ایک خواب دیکھا جس کو تحریر کر کے ۸ر ربیع الاول ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۸ر ستمبر ۱۹۹۱ء کو ایک خط میں لکھا:

"ہم لوگ مولانا عبدالستار صاحب (سابق شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ) کے پاس بخاری شریف پڑھ رہے تھے، راویوں پر بحث کے دوران ابوالیمان حمصی کا تذکرہ آیا جو امام بخاری کے استاذ اور بڑے عالی مرتبت شخص ہیں، اسی دوران مولانا سراج صاحب نے خواب دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ حدثنا ابوالیمان اور مذکورہ راوی اپنے گھر کے دروازے پر نظر آنے لگے، ڈاڑھی ٹھڈی پر تھی، بھر کلہ نہیں تھی، سر کے بال آگے نہیں تھے، سر کے پچھلے حصہ میں نصف دائرہ میں تھے، جیسا کہ ذہین لوگوں کا ہوتا ہے، انھوں نے دیکھا کہ آپ تشریف فرما ہیں، معاً بعد دیکھا کہ ان کی جگہ محدث کبیر ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی تشریف فرما ہیں، تعبیر بتلانے والے مولوی صاحب نے کہا کہ ابوالیمان امام بخاری کے استاذ ہیں، اور فی زماننا وہی مرتبہ حضرت موصوف کا ہے، اس سے ان کی جلالت شان کا پتہ چلتا ہے۔"(۲)

(۱) المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۴۴

(۲) ایضاً ص ۵۹۔۵۸

×××××

کرامات اولیاء اللہ کی کرامات برحق ہوتی ہیں، اللہ کے بعض نیک بندوں کے ذریعہ کبھی کبھی ایسے خوارق عادات امور ظاہر ہوتے ہیں، جن کا ظاہری اسباب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، عہد صحابہ بلکہ اس سے پہلے سے لے کر آخر کے ادوار تک اس قسم کے خوارق عادات امور کی مثالیں بکثرت ملیں گی: حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بغیر موسم کے تروتازہ میوے ان کے حجرۂ مبارکہ میں آتے رہتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے ایک سپہ سالار حضرت ساریہؓ مدینہ سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر اپنی فوج کے ساتھ میدان جہاد میں صف بستہ تھے، حضرت فاروقؓ کے سامنے اسکرین کی طرح پورا میدان جہاد آگیا، انھوں نے مدینہ سے یہ ہدایت دی یاساریۃ الجبل الجبل! حضرت ساریہ نے آواز سنی اور حکم کی تعمیل کی۔ حضرت خالد بن ولیدؓ زہر کا پیالہ پی گئے، مگر زہر نے اثر نہیں کیا۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ قیروان پہنچے تو ان کے ایک حکم پر جانوروں نے پورا جنگل خالی کردیا۔ دو صحابی رسولؐ ایک تیرہ و تار رات میں ساتھ ساتھ جارہے تھے ایک کا عصا روشن ہو کر دونوں بزرگوں کے لئے اجالا بکھیر رہا تھا، ایک موڑ پر دونوں صحابیؓ ایک دوسرے سے جدا ہوئے، اب دونوں کے عصا الگ الگ روشن ہو کر مشعل راہ بن گئے۔ عہد صحابہ کے بعد تابعین، تبع تابعین اور اس کے بعد کے بزرگوں کے ہوا میں اڑنے، پانی پر چلنے، بے موسم کے رزق اور اس جیسے بہت سے واقعات کتابوں کے صفحات پر مذکور ملتے ہیں، اور ان باتوں سے صرف نظر، محدثین وفقہاء وعلماء وائمہ ہدیٰ وغیرہم نے جو زبردست علمی ودینی کارنامے انجام دیئے ہیں ان پر ہم غور کریں تو کیا وہ کسی کرامت سے کم ہیں۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ نہ ہر خارق عادت امر کرامت ہوتا ہے، اور نہ ہر وہ شخص جس کے ذریعہ اس قسم کے امور ظہور پذیر ہوں ولی ہوسکتا ہے۔ اگر کسی خارق عادت امر کا تعلق نبی کی ذات سے ہو اور نبی کے ہاتھوں ظہور میں آئے تو وہ معجزہ ہوگا، اور اگر کسی ایسے آدمی کے ہاتھوں ظہور میں آئے جو اللہ کا نیک بندہ ہو، پابند شریعت ہو، خدا ورسول کا فرمانبردار ہو تو وہ اس کی کرامت ہوگی، لیکن یہی امر کوئی ایسا شخص دکھاتا ہے،

جو احکام شریعت کا پابند نہیں، خدا اور سول کا مطیع و فرمانبردار نہیں، اسلام اور تعلیمات اسلام سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں تو وہ محض اس کی شعبدہ بازی اور شیطانی حرکت ہو گی۔

علامہ اعظمیؒ کی زندگی میں بہت سے ایسے امور ظاہر ہوئے جو ان کی ولایت کی شہادت دیتے ہیں، اور جن کو ان کی کرامت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ،ایک دور افتادہ بستی میں بہت سی ذہنی الجھنوں، گھریلو پریشانیوں، خانگی بکھیڑوں طرح طرح کے نفسیاتی دباؤ اور گوناگوں امراض کا شکار رہتے ہوئے جو بیش بہا اور عظیم الشان علمی و تحقیقی کارنامے انجام دیئے ہیں، میرے نزدیک ان کی سب سے بڑی کرامت یہی ہے ، تاہم کچھ ایسے واقعات بھی ان سے ظاہر ہوئے ہیں جو بے شبہ ان کی ولایت کے شاہد ہیں، کچھ واقعات زبانی روایتوں سے بھی ہم نے سنے ہیں، لیکن میں احتیاطاً ان کا ذکر نہیں کرتا، صرف انھیں واقعوں کو درج کرتا ہوں جو تحریری طور پر مذکور ہیں، اور یہ صرف تین واقعے ہیں جن کا ذکر مولانا عطاء الرحمٰن صاحب بھاگلپوری نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے، اور لکھا ہے کہ یہ واقعات خود ان کے مشاہدے میں آئے ہیں۔

سخت دھوپ اور گرمی میں بارش | مولانا عطاء الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

”غالباً ۸۱ء کا جون تھا، حضرت مخدوم (علامہ اعظمیؒ) اپنے اس خاک پا کی حقیر دعوت پر پورینی تشریف لائے، وہی چوہے اور اونٹ والی مثال تھی ، مگر اللہ رے شفقت، گرمی کی شدت کے باوجود خندہ جبینی لمحہ بھر کو رخصت نہ ہوئی ، ایک موقع پر برف طلب فرمایا، اس غلام نے ۱۲ر کلو میٹر دور ایک شخص کو برف کے لئے شہر بھیجا، ۹ر بجے کا گیا ہوا فرستادہ ایک بجے تک جب نہ لوٹا تو اس کمترین خادم کا ندامت سے وہ حال ہوا کہ نہ پوچھئے۔ حضرت فرمارہے تھے کاش بارش ہو جائے، موسم ٹھنڈا ہو جائے۔ زمین جل رہی تھی ، آسمان آگ برسا رہا تھا، بادل کا کوئی ٹکڑا دور دور تک ناپید تھا ۔ واللہ اعلم پھر کہاں سے گھٹا اٹھی اور

چند سو گز کے دائرے میں ژالہ باری کر کے دوبارہ آسمان صاف کر گئی، مصنوعی برف لانے والا ناکام لوٹا، قدرتی برف کے اولے ڈش میں بھرے گئے، تلووں پر ملے گئے، موسم یوں معتدل گویا فروری مارچ کا مہینہ ہو، سارے لوگ انگشت بدنداں، عقل توجیہ سے قاصر، کیسے ہو گیا؟"(۱)

کھانے میں برکت پورینی کے اسی سفر میں دوسری کرامت یہ ظاہر ہوئی:

"شام کو وعظ کا جلسہ تھا، لوگ توقع کے خلاف امنڈ آئے، بیرونی مہمانوں کی کثرت اور چاول صرف ۴۰؍ کلو، غلام نے حضرت سے صورتحال بیان کی، حکم ہوا کھانے پر چادر ڈال دو اور اللہ کا نام لے کر کھلانا شروع کر دو، میں نے متعلقہ افراد کو یہ پیغام دے کر لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کرادیا کہ بیرونی مہمان کھانا کھالیں، غلام تو یہ اعلان کر کے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور ذمہ داروں نے میزبانی کے فرائض سنبھال لئے، تقریباً دس بجے رات جب ذمہ داروں نے دوبارہ اعلان کی تاکید کی تو مجھے خیال آیا کہ چاول تو کم تھا، ذرا دیکھوں تو کیا حال ہے؟ تفتیش پر ایک ذمہ دار نے میرا ہاتھ پکڑا اور مطبخ لے گئے، وہاں ایک چٹائی پر نصف چٹائی بھر چاول ڈھکا ہوا تھا، اور تقریبا پندرہ کیلو چاول ابل رہا تھا، مجھے بتایا گیا کہ سات بجے شام سے ایک قطار میں ۶۰؍ افراد بیٹھ کر اب تک مسلسل تقریبا چار سو افراد کھا چکے ہیں، مزید دریافت پر میری حیرت یہ کہہ کر بڑھائی گئی کہ بچے ہوئے اور ابل رہے چاول انھیں چالیس کلو چاولوں کا بقیہ ہیں۔ بار بار کے اعلان پر جب کوئی کھانے والا نہ آیا تو ایک بجے رات کو کنڈیاں کھٹکھٹائی گئیں کہ بھائیو! یا تم چل کر کھالو، یا پھر کھانا لے آؤ، ورنہ گرمی سے پختہ چاول خراب ہو جائے گا، اس واقعے کے درجنوں شاہد یہاں موجود ہیں، جو اس کی شہادت دے سکتے ہیں۔"

---

(۱) اس سفر میں آپ کے پوتے مولوی ایمن سعید اعظمی ساتھ تھے، یہ واقعہ راقم السطور نے ان سے بھی سنا ہے۔

خلاف مرضی کام کی وجہ سے گاڑی کی خرابی تیسرا واقعہ مذکورہ بالا دونوں واقعوں کے تقریباً سات آٹھ سال بعد کا ہے، جس کو مولانا عطاء الرحمٰن بھاگلپوری نے درج ذیل الفاظ میں قلمبند فرمایا ہے:

”حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا سفر اس غلام کی دعوت پر تین سال پیشتر بھاگل پور کا ہوا، جہاں حضرت کا عظیم الشان بے مثال استقبال کیا گیا، تیسرے دن ایک مسجد کے افتتاح کیلئے تقریباً تیس کیلو میٹر دور جانا تھا، قریب کے ایک مدرسہ سے بھی دعوت آئی جسے حضرت نے قبول نہ فرمایا، مدرسے کے مہتمم نے بہت اصرار کیا تو اس غلام نے اپنی حماقت سے رائے دی کہ واپسی دوسرے راستے سے ہو، جس میں مذکورہ مدرسہ واقع ہے، اور رہبری کے لئے حضرت کے خادم سفر محمد قاسم صاحب کی جیپ آگے بڑھادی گئی۔ حضرت نے دیکھا، تبسم فرمایا اور فرمایا اچھا! تو قاسم میاں آگے چل رہے ہیں، واللہ العظیم دو تین منٹ ہوئے ہوں گے کہ قاسم بھائی کی جیپ کنارے ہو کر رک گئی، اور حضرت کی کار اپنے راستہ پر بڑھ گئی،۔ اس ناکارہ غلام کی بے چینی کا جو عالم تھا اسے خدا ہی بہتر جانتا ہے، آدھ گھنٹہ بعد جیپ آتی دکھائی دی، قاسم بھائی منزل پر پہونچتے ہی دست بستہ معافی مانگنے لگے، میں حیران کہ معاملہ کیا ہے، حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا، جاؤ معاف کیا۔ تب قاسم نے بتایا کہ اچانک گاڑی لڑکھڑانے لگی اور ایسا لگا کہ بس اب گیئر بکس ٹوٹ جائے گا، مجبوراً گاڑی کنارے کر دینی پڑی، اور جب حضرت کی کار آگے بڑھ گئی تو چند منٹوں میں گاڑی بالکل ٹھیک ہو گئی، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، قاسم بھائی سرگذشت سنا رہے تھے اور میں ندامت سے پسینے پسینے کہ یا اللہ میں نے یہ کیا حماقت کر ڈالی۔“

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دسواں باب

علامہ اعظمی اہل علم کی نظر میں

دسواں باب

علامہ اعظمی اہل علم کی نظر میں

علامہ اعظمی کی جلالت شان، علو مرتبت، رفعت قدر، فہم و فراست اور عظمت و عبقریت کی داد تقریباً تمام معاصر اہل علم اور بہت سے اکابر ملت نے دی ہے، اسی طرح ان کے زہد و تقویٰ اور علم و عمل کو ایک دنیا نے جانا، مانا اور تسلیم کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے معاصرین نے ان کی امامت و عبقریت کا جس طرح اعتراف کیا ہے شاید ہی کسی کا کیا گیا ہو، عجم کے لالہ زاروں سے لے کر عرب کے ریگ زاروں تک ان کے مداحوں اور ثناخوانوں کی ایک قطار نظر آتی ہے۔ جس کو بھی علم و فن سے کچھ تعلق یا لگاؤ ہے وہ ان کے کمال و تفوق کا بلا تامل و تردد اور سچے دل سے قائل ہے، جو ان سے ملا ہے ان کا گرویدہ ہے، اور جس نے ان کی تحریر، ان کی تحقیق اور ان کے علمی کام کو دیکھا ہے وہ ان کا شیفتہ و دلدادہ ہے، اللہ جل شانہ نے اپنے اس "حبیب" کو عجیب و غریب مقبولیت عطا فرمائی تھی، جس کی ایک مثال سردست مولانا افضال الحق جوہر قاسمی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں:

> "مکہ مکرمہ کا نوخیز عالم مجھ سے دہلی میں ملا اور حضرت مولانا کے بارے میں پوچھنے لگا، تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ تو اعظم گڈھ کے ہیں تم مکہ کے لوگ انھیں کیسے جانتے ہو؟ اس مکی عالم نے کہا کہ ہم ان کو اس طرح جانتے ہیں کہ جیسے اپنے باپ دادا کو جانتے ہیں۔ پھر اس نے کہا کہ میں مئو جا کر حضرت علامہ سے حدیث پڑھنا چاہتا ہوں، ضرور جاؤں گا۔" (۱)

عرب علماء کے نزدیک علامہ اعظمیؒ کی قدر و منزلت کتنی تھی؟ ان کے دلوں

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔ ۱۲ ص ۱۶۶

میں آپ کی کیسی عزت وحرمت تھی؟اس کو بیان کرنے کے لئے الفاظ کا قافیہ تنگ نظر آتا ہے، میں یہاں اپنی بات کی تائید کے لئے صرف دو عینی شاہدوں کے بیان نقل کروں گا، مولانا قاضی اطہر صاحب مرحوم فرماتے ہیں:

"ہم نے متعدد بار یہ منظر دیکھا کہ مولانا ایام حج میں حرم شریف کے سامنے مدرسہ فخریہ کے چھوٹے سے دفتر میں تشریف رکھتے تھے اور مصروشام، حجاز اور افریقہ وغیرہ کے اہل علم مولانا کی خدمت میں نیاز مندانہ انداز میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے تھے اور قدماء کے طریقہ پر ان سے حدیث کی روایت کی سند لیتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ مولانا ہندوستان میں علم حدیث کے آخری سالار قافلہ تھے۔"(۱)

اور پروفیسر محمد اجتباء ندوی سابق صدر شعبہ عربی الہ آباد یونیورسٹی تحریر فرماتے ہیں:

"عالم عربی میں جن علماء، محدثین اور محققین سے ملاقاتیں ہوئیں، انھوں نے حضرت اعظمی کا تذکرہ بڑے بلند الفاظ میں کیا۔"(۲)

حقیقت یہ ہے کہ ان کی شخصیت حیرت انگیز اوراعجوبۂ روزگار تھی، بلکہ بقول پروفیسر عبدالرحمٰن مومن "وہ اس دور میں اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے" اور اس نشانی کی تعریف وتوصیف میں ان کے اساتذہ وشیوخ اور اکابر واصاغر سبھی رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی۔ اُعلی اللہ منزلتہ۔ کے کمال علم کے ساتھ ان کے مرتبۂ رشد وہدایت سے کون واقف نہیں ہوگا، اس عہد میں اللہ تعالیٰ نے خدمت علم کے ساتھ اصلاح امت اور تجدید دین کا جو کام ان سے لیا ہے، وہ بے مثال اور رشک ملائک ہے، آپ کی نظر کرم اور نگاہ التفات سے نہ جانے کتنے تاریک سینوں میں ایمان اور صلاح وفلاح کا نور جاگا، آپ کے دربار فقیری میں پہنچ کر کتنے بے آبرو باآبرو ہوگئے، اور کتنے لوگ ثریٰ سے اٹھ کر ثریا پر پہنچ گئے، اور بہت

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۲۔۱۱ص ۴۷ (۲) ترجمان الاسلام ش ۱۳ص ۱۰۶

سے ایسے تھے جن کے فضل وکمال میں کوئی کمی نہیں تھی، جن کا دامن بے داغ تھا مگر ان کی توجہ اور عنایت سے تپ کر کندن اور در صدف بن گئے، ان کے انھیں اسیر ان محبت میں مولانا محمد صابر صاحبؒ اور ان کے فرزند دلبند علامہ اعظمیؒ تھے، چنانچہ حضرت تھانوی والد وولد دونوں کے پیر طریقت اور شیخ ومرشد تھے۔

مولانا تھانوی حد درجہ محتاط اور اپنے اصول کے نہایت پابند تھے، ان کی احتیاط میں یہ بات بھی تھی کہ کسی کتاب پر اس وقت تک تقریظ نہیں لکھتے تھے، جب تک اس کو پڑھ نہیں لیتے تھے، مگر اس احتیاط کے باوجود علامہ اعظمی کی جس طرح توصیف وستائش فرمائی ہے وہ علامہ اعظمی کی عظمت کے لئے طغرائے امتیاز ہے، ان ہی مواقع کیلئے کہا جاتا ہے "قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری"۔ چنانچہ جب خواجہ عبدالحی پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی کتاب "التفسیر الجدید" پر علامہ اعظمی کی ناقدانہ کتاب "التنقید السدید علی التفسیر الجدید" شائع ہوئی، تو اس کو ملاحظہ فرمانے کے بعد مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ نے ۲۴؍ صفر ۱۳۴۹ھ کو علامہ اعظمی کے پاس یہ خط لکھا:

"احقر اشرف علی عفی عنہ نے اس تنقیدی مضمون کو غایت شوق سے حرفاً حرفاً دیکھا اور اس حدیث کا مصداق پایا: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يحمل هذ العلم من كل خلف عدوله ، ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتاويل الجاهلين . (مشكوٰة عن البيهقى)
ماشاءاللہ قوت استدلال، حسن ادا، دفع شبہات۔ لین کلام غرض ہر پہلو سے بے تکلف اس شعر کا نمونہ ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

بارك الله تعالىٰ فى افادات المصنف وإفاضاته
۲۴؍ صفر ۱۳۴۹ھ تھانہ بھون، وقاه الله عن الفتن ."

اسی طرح انکار حدیث کے رد میں علامہ اعظمی کی شہرۂ آفاق تصنیف "نصرۃ الحدیث" کو انعام تحسین پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میں اپنے ضعف اور عذر سے خود شرمندہ ہوں اور ہدیہ بسر و چشم قبول کرتا ہوں اور دعائے نافعیت کرتا ہوں، جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا، بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محقق نہیں لکھ سکتا"(۱)

حضرت تھانویؒ کو علامہ اعظمی کے علم پر بہت وثوق واعتماد تھا، جس کی وجہ سے وہ ان کے حلقۂ مریدین اور زمرۂ خلفاء میں بھی حد درجہ مقبول و محترم تھے، مولانا تھانویؒ کے اعتماد کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ علامہ اعظمی تھانہ بھون میں مقیم تھے، دوران قیام ایک دن بعد نماز عصر مولانا حبیب اللہ صاحب مئوی خلیفۂ حضرت تھانوی کے ہمراہ بیٹھے کسی چائے خانے میں چائے پی رہے تھے، اسی اثناء میں خواجہ عزیز الحسن صاحب آگئے، اور مولانا حبیب اللہ صاحب کو مخاطب کر کے پوچھا کہ مولوی حبیب الرحمٰن کون ہیں؟ مولانا حبیب اللہ صاحب ہنسے اور کہا کہ یہی ہیں، تب خواجہ صاحب نے کہا کہ حضرت (تھانوی) سے طلاق کے بارے میں مسئلہ پوچھا تو حضرت نے فرمایا کہ اس مسئلہ میں آپ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سے رجوع کریں۔

اسی طرح ماسٹر قبول احمد صاحبؒ (وابستہ دامن حضرت تھانوی) ہیڈ ماسٹر سیتاپور گورنمنٹ کالج نے ایک دفعہ حضرت تھانوی سے طلاق کے متعلق مسئلہ دریافت کیا، تو حضرت مولانا تھانویؒ نے ان کو بھی مولانا اعظمی سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا، چنانچہ انھوں نے اس کے بعد خطوط کے ذریعہ استفسار واستفادہ کیا۔ (۲)

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ فخر المتاخرین امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی نسبت کچھ عرض کرنا، سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا، وہ چمنستان قاسمی کے وہ گل سر سبد تھے، جن کی عبقریت اور امامت کو اپنوں اور غیروں نے یکساں طور پر تسلیم کیا ہے، علامہ اعظمی اپنے اساتذہ میں ان سے بہت زیادہ متاثر تھے، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ علامہ اعظمی ان کے پرتو اور علم میں ان کے جانشین تھے، علامہ اعظمی کی شخصیت ایک ایسا آئینہ تھی جس میں شاہ صاحبؒ کا عکس واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا، اور خود شاہ صاحب بھی ان

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱، ۱۲، ص ۱۵۶ (۲) ڈاکٹر عبدالمعید صاحب نے اس کو خود حضرت علامہ اعظمیؒ کی زبان سے سنا ہے۔

کے علم کے قائل اور معترف تھے، چنانچہ علامہ اعظمی نے خود لکھا ہے کہ جب انھوں نے شاہ صاحبؒ کو اپنی تصنیف " الحاوی لرجال الطحاوی " دکھائی تو اس کے مصادر و مراجع اور حوالہ جات کے بارے میں دریافت فرماتے رہے، اور علامہ اعظمی کی درخواست پر نہایت خوشدلی کے ساتھ اس پر نظر ثانی کے لئے آمادہ ہو گئے، اور بالآخر فرمایا کہ جب میں ڈابھیل جاؤں تو کتاب میرے پاس بھیج دیجئے، مگر شاہ صاحب کے ڈابھیل پہنچنے سے پہلے ان کے پاس پیام اجل آپہنچا ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

یہ شاہ صاحبؒ کا آپ کے علم پر اعتماد اور آپ کے کمال کا اعتراف تھا کہ اس ملاقات میں شاہ صاحب نے آپ سے بہ تاکید فرمایا، بلکہ وصیت فرمائی کہ وہ حنفیت کا دفاع کرتے رہیں، شاہ صاحب کی بات کا اثر تھا، یا علامہ اعظمی کی دینی و مذہبی حمیت کہ عمر بھر نہ صرف حنفیت بلکہ مسلک اہل سنت کا پرزور دفاع فرماتے رہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ تحریک آزادی کے مردان احرار میں سے تھے، ہندوستان کی آزادی کے نام پر اٹھنے والی ہر تحریک میں پیش پیش رہے، ان کا شمار سرزمین ہند کے ان عظیم رہنماؤں میں ہوتا ہے جو اپنے زور خطابت، گرمیٔ نفس اور جوش و ولولہ کی وجہ سے انگریزوں کے حلق کی پھانس بنے رہے، تحریک خلافت ہو، جمعیۃ علماء ہند ہو یا مجلس احرار وہ ہر پلیٹ فارم پر انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو کر آزادی وطن کا نعرہ بلند کرتے رہے، دارالعلوم دیوبند کے فرزندوں میں تھے اور شاہ صاحبؒ کے شاگرد، علامہ اعظمیؒ سے کوئی بہت زیادہ ربط و تعلق نہیں تھا، لیکن ان کے مقام و مرتبہ سے بخوبی واقف تھے، شاہ صاحب کا ذکر آیا تو مناسب معلوم ہوا کہ ان کا ایک خط نقل کر دیا جائے جس میں انھوں نے نہایت فراخدلی سے اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا اور علامہ اعظمی کی عظمت و بلندی کو تسلیم کیا ہے، ۱۶؍جنوری ۱۹۵۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"... آپ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین ہیں، میرے دل

میں آپ کے تقویٰ، علم و پرہیز گاری کی وجہ سے بہت زیادہ عزت ہے ...''(۱)

ایک دوسرے مکتوب میں جو ۱۵ر فروری ۱۹۵۶ء کا تحریر کردہ ہے لکھتے ہیں:

''... حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے آپ سے ایک تعلق ہے، کیونکہ آپ اون کے علم کے وارث ہیں، اس لئے مجبور ہوں کہ آپ سے اپنا تعلق رکھوں۔''(۲)

مولانا محمد ایوب اعظمیؒ مفتاح العلوم کے واقعات میں آپ کا ذکر بار بار آچکا ہے، وہ اس کو ترقی دلانے والوں میں ثالث ثلثہ کی حیثیت رکھتے تھے، صاحب علم و فضل تھے اور منصب نظامت کے ساتھ دو ایک سبق بھی پڑھایا کرتے تھے۔ باوقار اور صاحب وجاہت بزرگ تھے، آپ کی ذات شریعت و طریقت کا بہترین امتزاج تھی، مفتاح العلوم میں نظامت اور صدارت کے علاوہ شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہ چکے تھے، دارالعلوم ندوہ اور مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل کی مسند حدیث کو رونق بخش چکے تھے، ڈابھیل میں تقریباً بیس سال تک بخاری و مسلم کا درس دیتے رہے، آپ علامہ اعظمی کے ہم درس و ہم عصر اور علامہ انور شاہ کشمیری کے شاگردوں میں تھے۔

آپ کے صاحبزادہ محترم مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب نے راقم سے فرمایا کہ والد صاحب فرمایا کرتے تھے:

''مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا ذوق حدیث کے سلسلے میں شاہ صاحب کی طرح ہے، جس حدیث کے بارے میں وہ کہدیں کہ اِس درجہ کی ہے وہ اُسی درجہ کی نکلتی ہے۔''

علامہ شبیر احمد عثمانی دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز فرزندوں میں تھے، بلکہ ان افراد میں سے ایک تھے جن کی ذات اس امت کے لئے سرمایۂ فخر و امتیاز ہے، علامہ اعظمی کے استاذ تھے اور ان کے اساتذہ کے باب میں بالتفصیل ان کا ذکر آچکا ہے، استاذ و شاگرد میں

(۱)(۲) المآثر جلد ۶ شمارہ ۴ ص ۹۶

برسوں خط و کتابت رہی ہے، ان کو بھی اپنے شاگرد کے علم و عمل پر اعتماد اور فضل و کمال کا اعتراف تھا، چنانچہ مسلم شریف کا درس دیتے وقت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی وہ حدیث آتی جسے حضرات غیر مقلدین ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاق ثابت کرنے کیلئے بطور دلیل پیش کرتے ہیں تو آپ اس وقت فرماتے:

> ''اس حدیث کی بہترین توضیح و تشریح کیلئے مولوی حبیب الرحمٰن اعظمی کی اعلام مرفوعہ دیکھو۔ اس سے بہتر توضیح کسی نے نہیں کی، یا یہ فرمایا کہ اس سے بہتر توضیح میں بھی نہیں کر سکتا۔''(۱)

یہ شاگرد کی ہمت افزائی تھی یا اسکے کمال کا اعتراف کہ جب علامہ اعظمی نے اپنی عظیم الشان تصنیف ''الحاوی لرجال الطحاوی'' مکمل فرمائی، اور مولانا عثمانیؒ کو اس کی نسبت پتہ چلا تو ایک خط میں لکھا:

> ''کاش (الحاوی) چھپ جاتی، تو ہم کو بھی اپنے کام میں مدد ملتی، حق تعالیٰ کوئی سامان فرمادیں، انشاء اللہ مناسب موقع پر کوئی کوشش ہو سکی تو دریغ نہ ہوگا''(۲)

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ حضرت مولانا مدنیؒ کی ذات ستودہ صفات کے متعلق اپنی معروضات پیش کرنا ''چھوٹا منہ بڑی بات'' کا مصداق ہوگا، امت مرحومہ کے اندر آپ کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل تھا، ایسا عظیم فرد جس کی پوری زندگی اور زندگی کا ہر نقش منہاج نبوت کی تعبیر پیش کرتا ہو، قرنوں اور صدیوں میں پیدا ہوتا ہے بقول شاعر:

مت سہل ہمیں جانو! پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے ذرے سے انسان نکلتے ہیں

مولانا مدنیؒ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، درس و تدریس، تصنیف و تالیف، تعلیم و تبلیغ، دعوت و ارشاد غرض متنوع اوصاف و محاسن نے ان کی شخصیت کو بے نظیر بنادیا تھا، ان کی نسبت علامہ اعظمی فرماتے ہیں:

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔ ۱۲۔ ص ۱۸۴، المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۵۲

(۲) المآثر ج ۷ ش ۱ ص ۸۸

"...لیکن شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے جملہ اوصاف کے لحاظ سے بدیع الزماں، نادرۃ العصر اور یکتائے روزگار تھے، وہ اپنے متنوع علمی کمالات و باطنی مقامات، بیشمار محاسن اعمال اور بے انتہا بلند اخلاق و کردار کے لحاظ سے بالکل منفرد اور بے مثال تھے۔"(۱)

مولانا مدنیؒ کی شخصیت عجیب و غریب اور گوناگوں فضائل و کمالات کا مرقع تھی، بزم میں ہوتے تو مسند صدارت پر جلوہ افروز ہوتے اور رزم میں ہوتے تو زمام قیادت ان کے ہاتھ میں ہوتی، انکسار و تواضع ایسا کہ بڑے سے بڑے گستاخ کا جواب بھی عفو و درگذر اور خندہ روئی سے دیتے، رعب و جلال کا یہ عالم کہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے تو جرأت حق سے برطانوی تاج و تخت لرزاٹھے، زاہد شب بیدار بھی تھے، مرد میدان بھی تھے اور مجاہد و شہ سوار بھی تھے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ اور علامہ اعظمیؒ میں نہایت قوی اور استوار روابط تھے جو مدت دراز پر محیط تھے، اور تادم واپسیں برقرار رہے، دونوں بزرگوں کے تعلق کا کچھ اندازہ مولانا عثمان صاحب معروفی کی حسب ذیل تحریر سے ہوتا ہے:

"۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۲ء کے لگ بھگ عید گاہ پورہ معروف کے پاس دو روزہ عظیم الشان اجلاس ہوا، جس میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی م ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء بھی تشریف لائے تھے، جن کے استقبال میں ایک عظیم مجمع تھا، حضرت مدنی نے نماز مغرب عید گاہ میں ادا فرمائی، پھر منبر پر بیٹھ کر دیر تک استقبال کرنے والوں سے مصافحہ کیا، وہیں استقبال کرنے والوں میں محدث کبیر بھی محراب میں کھڑے رہے، سب کے آخر میں سامنے آکر مصافحہ فرمایا، اس وقت حضرت مدنیؒ نے فرمایا:

مرا اک کھیل خلقت نے بنایا ۔۔۔ تماشے کو بھی لیکن تو نہ آیا

---

(۱) الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر ص ۳۹

مگر آپ تو حاضر ہیں، پھر دونوں دیر تک معانق رہے...."(۱)

حضرت مدنیؒ بھی علامہ اعظمی کے فضل و کمال کے بہت زیادہ قائل تھے، چنانچہ ایک واقعہ کا علامہ اعظمی نے خود اپنے مضمون میں حضرت مدنی کی بے نفسی کے تذکرے میں ضمناً ذکر فرمایا ہے، جس سے مولانا مدنیؒ کے نزدیک علامہ اعظمی کی قدر و منزلت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، فرماتے ہیں:

"ایک دفعہ بلتھر اروڈ سے واپسی میں شاہ گنج جانے والی ٹرین پکڑنے کیلئے حضرت کو مئو کے اسٹیشن پر سرشام سے اڑھائی بجے رات تک رکنا پڑا، مجھ کو کوئی اطلاع نہ تھی، اس لئے حضرت نے آدمی بھیج کر اطلاع کرائی، میں چلنے لگا تو خیال ہوا کہ کچھ ناشتہ اور چائے کا سامان بھی لے چلنا چاہئے، اس لئے اپنے لڑکے رشید احمد اور دو طالب علموں کو بھی ساتھ لے لیا، اسٹیشن پہنچ کر سلام و مصافحہ کے بعد حضرت کے سامنے میں نے یہ کہتے ہوئے رشید احمد کو پیش کیا کہ یہ خادم زادہ ہے، حضرت نے اس کو بھی مصافحہ کا شرف بخشا، پھر اس کی تعلیم کے بارے میں کچھ سوالات کئے، تھوڑی دیر میں حضرت کے صاحبزادہ میاں اسعد سلمہ اللہ باہر سے ویٹنگ روم میں داخل ہوئے تو حضرت نے میری طرف اشارہ کر کے ان کو مصافحہ کرنے کے لئے کہا، جب وہ میری طرف بڑھے تو حضرت نے فرمایا یہ بھی خادم زادہ ہے، ان الفاظ کا جو اثر میرے قلب پر ہوا، میں اس کو آج تک نہیں بھولا ہوں، یہ واقعہ جب بھی یاد آتا ہے حضرت سعدیؒ کا یہ شعر بھی ضرور یاد آتا ہے

بزرگاں نہ کردند بر خود نگاہ　　خدا بینی از خویشتن بیں نخواہ

اسی قبیل سے حضرت والا کا اس ظلوم و جہول کو بعض خطوط میں ایسے الفاظ سے یاد کرنا ہے جن کو نقل کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔"(۲)

اوپر گذر چکا ہے کہ مولانا مدنیؒ نے یہ تجویز پاس کی تھی کہ جمعیۃ کے اندر کسی بھی فقہی مسئلہ میں علامہ اعظمی سے استصواب کئے بغیر کوئی فیصلہ نہ کیا جائے۔

(۱) ترجمان دار العلوم اکتوبر ۱۹۹۶ء ص ۳۴-۳۳　(۲) الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص ۴۱

علامہ سید سلیمان ندویؒ سید صاحب کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں۔ علمی، ادبی اور تحقیقی حلقوں میں آپ کی ذات جس احترام و تکریم کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے وہ بیان سے بالاتر ہے، دینی اور ادبی دونوں حلقوں میں آپ کے طرز تحریر اور اسلوب نگارش کو نہایت پسندیدگی اور قبولیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، آپ کی تحریر میں قوت استدلال، زور بیان، سادگی و شستگی اور شوکت و قوت غرض انشاء پردازی کے جملہ اوصاف و خصائص بدرجۂ اتم موجود ہوتے ہیں، اس کے علاوہ تحقیق واستناد کے لحاظ سے اس پایہ کی ہوتی ہے کہ اپنے موضوع پر سند اور اتھارٹی سمجھی جاتی ہے، انشاء پردازی کے لحاظ سے اپنے معاصرین میں اعلیٰ اور بلند ترین مقام پر نظر آتے ہیں، اور جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اسے تشنہ نہیں چھوڑتے۔

سید سلیمان ندویؒ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کاروان اول اور اس کے مایہ ناز فرزندوں میں تھے، علامہ شبلی نعمانیؒ کے لائق ترین شاگرد، حقیقی جانشین اور ان کی تعلیم و تربیت کا سچا اور مکمل نمونہ تھے، زہد و تقویٰ قناعت و استغناء، سادگی و انکساری، عقل و بصیرت، فہم و فراست اور بہت سارے محاسن میں اپنی مثال آپ تھے، تصنیف و تالیف میں لاثانی اور زبان و قلم کے تو گویا بادشاہ تھے، ان کے استاذ علامہ شبلی نعمانیؒ نے سیرت نگاری کی جو نیو ڈالی تھی اس کی تکمیل جس شاندار طریقے پر کی وہ آپ ہی کا حصہ تھا، سید صاحب کے نمایاں ترین کاموں میں اہم کام یہ ہے کہ وہ دیوبند اور ندوہ کے درمیان فاصلہ کو کم کرنے اور ربط و تعلق پیدا کرنے کا بڑا وسیلہ بنے۔

سید صاحب اور علامہ اعظمی میں نہایت پر خلوص تعلقات تھے، بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں بزرگوں میں تعلقات کی ابتداء ۱۹۲۶ء کے آغاز اور ۱۳۴۴ھ کے وسط میں ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا کہ علامہ اعظمی کوچۂ تعلیم و تدریس اور میدان تصنیف و تالیف میں ابھی نووارد تھے، اور سید صاحب اس راہ کے پرانے رہرو، علامہ اعظمی نو آموز تھے اور سید صاحب آزمودہ کار و شہرت یافتہ، علامہ اعظمی کا ستارہ ابھی جھلمل کر رہا تھا جبکہ

سید صاحب شہرت کے نصف النہار پر تھے، لیکن سید صاحب جوہر شناس تھے اور جوہر شناسی کا بھرپور ملکہ رکھتے تھے، انھوں نے علامہ اعظمی کی پوشیدہ صلاحیتوں کا کچھ اس طرح مشاہدہ کیا کہ عمر بھر ان کے کمال و تفوق کا اعتراف کرتے رہے، یہاں تک کہ تقسیم وطن کے بعد جب سید صاحب پاکستان ہجرت فرماگئے تو وہاں سے مفتی ظفیر الدین صاحب کو ایک خط لکھا جس میں فرمایا:

"ہندوستان کے ان دوستوں میں سے جن کے جیتے جی چھوٹ جانے کا افسوس ہے، ایک مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں، اور دوسرے آپ کے استاد مکرم مولانا حبیب الرحمٰن (اعظمی) ہیں، اللہ تعالیٰ ان دونوں سے ہندوستان کے مسلمانوں کو مستفید فرمائے"۔(۱)

علامہ اعظمی کو جب سید صاحب کے اس خط کا علم ہوا، تو آپ نے بھی سید صاحب کے ہندوستان چھوڑنے پر اپنی جس انفعالی کیفیت کا اظہار فرمایا وہ قابل ملاحظہ ہے، ۲۰/اگست ۱۹۵۱ء کو مفتی ظفیر صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"... سید صاحب دام ظلہ کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ مجھ کو بھولے نہیں ہیں، مجھ کو بھی کسی کے پاکستان چلے جانے کا کوئی رنج نہیں، لیکن حضرت مولانا شبیر احمد (عثمانی) رحمۃ اللہ علیہ اور سید صاحب کے پاکستان منتقل ہو جانے کا صدمہ دل سے کبھی نہیں جا سکتا۔

پہلے جب کبھی جی گھبراتا تھا تو دن بھر کیلئے اعظم گڈھ چلا جاتا تھا، سید صاحب سے جی بھر کے باتیں ہوتی تھیں، اور سارا غم غلط ہو جاتا تھا، افسوس کہ اب یہ سہارا بھی نہیں رہا۔ شاید نومبر میں ایک آدھ گھنٹے کے لئے دارالمصنفین گیا تھا، پھر جب سے آج تک نوبت نہیں آئی..."(۲)

---

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۵۵

(۲) ایضاً ص ۱۶۰

سید صاحب کو علامہ اعظمی سے جو انس و تعلق تھا اس کا اظہار انھوں نے متعدد مواقع پر نہایت صاف دلی سے کیا ہے، انھوں نے مفتی ظفیر صاحب کو جو خطوط لکھے ہیں تو کئی ایک میں اس موانست کا ذکر ملتا ہے، ۱۶ر ستمبر ۷ ۱۹۴ء کو لکھتے ہیں:

"مولانا اعظمی کی خیریت سن کر خوشی ہوئی اور ان کی محبت سے دل کو متاثر پاتا ہوں۔"(۱)

۱۶ر ذی قعدہ ۱۳۶۷ھ کو لکھتے ہیں:

"محبی حبیب الرحمٰن (الاعظمی) کا تذکرہ تجدید محبت کا باعث ہوا، موصوف سے مجھے بڑی موانست اور محبت ہے"(۲)

۷ار مئی ۱۹۵۰ء کو کانپور سے لکھتے ہیں:

"میں آج شب کو اعظم گڈھ سے واپس آیا، تقریبا دس روز دارالمصنفین میں رہا، محبی مولوی حبیب الرحمٰن بھی اطلاع پاکر چند گھنٹوں کیلئے آگئے تھے مل کر دل خوش ہوا...."(۳)

ایک فقرہ سید صاحب کی نگاہ عنایت سے متعلق بھی ملاحظہ فرمالیں، انھوں نے مفتی ظفیر صاحب کو اس وقت خط لکھا جب علامہ اعظمی نے بعض وجوہات کی بنیاد پر ۱۳۶۴ھ میں مفتاح العلوم میں کار تدریس چھوڑنا چاہا تھا، یکم رجب ۱۳۶۴ھ کو لکھتے ہیں:

"حالات سن کر افسوس ہوا، مولانا سے کہہ دینا کہ وہ ہر فیصلہ سے پہلے مجھے ضرور مطلع فرماتے رہیں۔"(۴)

---

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۳۵

(۲) ایضا ص ۴۵

(۳) ایضا ص ۵۴

(۴) ایضا ص ۲۲

سید صاحب کے علامہ اعظمیؒ سے دیرینہ تعلقات کے بارے میں اگر تفصیل سے لکھا جائے تو ایک مستقل دفتر تیار کیا جا سکتا ہے، بطور مشتے نمونہ از خروارے چند باتیں ذکر کی جارہی ہیں، شاہ معین الدین ندوی سید صاحب کے تعلقات کی نسبت تحریر فرماتے ہیں:

"علمی دائرے میں سید مناظر احسن گیلانی، مولانا ابو بکر شیث جونپوری، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے زیادہ تعلقات تھے۔"(۱)

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

"مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اگرچہ سید صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے، لیکن حدیث اور فقہ پر گہری نظر تھی، اس لئے سید صاحب ان کی بڑی قدر کرتے تھے، اور فقہی مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔"(۲)

اوپر مولانا عبدالباری اثری کے کچھ خطوط ذکر کیے گئے ہیں، جن سے دونوں بزرگوں کے تعلق پر روشنی پڑتی ہے، یہاں ہم ان کے ایک مضمون کا اقتباس نقل کر رہے ہیں، جو ریاض الجنۃ (مارچ، اپریل ۱۹۸۹ء) کے شمارے میں ابو علی آصفی کے قلمی نام سے شائع ہوا ہے، اس میں رقم طراز ہیں:

"وہ (مولانا اعظمی) ایک زمانہ میں رجال پر عربی میں ایک کتاب بھی تالیف فرما رہے تھے، اسی سلسلہ میں مولانا سید سلیمان صاحب علیہ الرحمۃ کے زمانۂ قیام میں ان کا اکثر دارالمصنفین میں آنا جانا ہوتا تھا، وہ کتب خانہ میں رجال و طبقات و تراجم کی کتابوں کی الماریوں کے سامنے بیٹھ جاتے تھے، اور اپنے کام میں مشغول ہو جاتے تھے، معلوم نہیں وہ پایۂ تکمیل کو پہنچی یا نہیں، اس سلسلہ میں دارالمصنفین میں کئی کئی روز تک قیام ہو جاتا تھا اور اس ضمن میں دونوں باکمالوں میں خوب خوب راز و نیاز کی باتیں ہوتیں۔ رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے کے

(۱) حیات سلیمان ص ۶۳۷، المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۴۹

(۲) حیات سلیمان ص ۶۳۷، المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۴۹

لہجہ کے قدرداں، گرویدہ اور شیفتہ ہوگئے، دونوں صاحب ہمہ وقت ایک ساتھ رہتے تھے، ایک ساتھ فجر کے بعد میلوں ٹہلتے تھے، آخر عمر میں تو سید صاحب ان کے علم و فضل اور تفقہ کے بہت زیادہ قائل اور معترف ہوگئے تھے، اور اپنی ہر تحریر پر نظر ثانی کیلئے ان کے پاس مئو بھیجتے تھے، اور ان کی توثیق کے بعد پریس میں دیتے تھے، وہ ان کو دارالمصنفین میں اپنا جانشین اور رفقاء و مصنفین کا نگراں بھی بنانا چاہتے تھے، سید صاحب کے اعظم گڈھ کے پورے زمانۂ قیام میں ان کا کوئی دوست تھا تو یہی تھے، وہ جب اپنی ضرورت کے لئے دارالمصنفین آتے تھے تو ان کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے، اور لطف صحبت کے لئے ہفتوں ان کو روک لیتے تھے۔"(۱)

سید صاحب ۱۳؍رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ کو علامہ اعظمی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ ہوا کی طرح آتے ہیں اور بجلی کی طرح نکل جاتے ہیں، تو آپ کو سلطان بایزید کی طرح "یلدرم" کیوں نہ کہا جائے، اس کے معنی برق و باد کے ہیں، وہ آندھی کی طرح ملکوں میں فتح کے لئے آتا تھا اور فتح کے بعد بجلی کی طرح غائب ہو جاتا تھا۔"

مولانا ابوالوفاء افغانی (۲) مولانا ابوالوفاء افغانی کا شمار اس دور کے محقق اور جید و باکمال اہل علم میں تھا، اصلاً افغانی تھے اور ۱۳۱۰ھ میں عید اضحی کے دن قندھار میں پیدا ہوئے تھے، نام سید محمود شاہ قادری حنفی بن مبارک شاہ قادری حنفی تھا، مگر ابوالوفاء افغانی کے نام سے شہرت پائی۔ زمانۂ طالب علمی میں ہندوستان آئے اور رامپور و گجرات میں تحصیل علم کے بعد ۱۳۳۰ھ میں حیدر آباد پہنچے، مدرسہ نظامیہ میں داخلہ لیا اور وہیں سے فارغ ہوئے۔ اور پھر حیدر آباد ہی کے ہو رہے، فراغت کے بعد مدرسہ نظامیہ میں

(۱) ریاض الجنۃ ص ۳۷

(۲) مولانا افغانی کا تذکرہ شیخ ابو غدہؒ کی کتاب "العلماء العزاب" سے مختصراً ماخوذ ہے۔

درس دینا شروع کیا، پھر "لجنة احیاء المعارف النعمانیة" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس سے بہت سی بیش قیمت اور نادر کتابیں شائع ہوئیں۔

مولانا افغانی کی شخصیت بہت سے ظاہری و باطنی اور علمی و اخلاقی اوصاف و کمالات کا مجموعہ تھی، علم و فضل میں ان کا پایہ نہایت بلند تھا، ادب و تاریخ اور فقہ و حدیث میں سند کا درجہ حاصل تھا، بالخصوص فقہ حنفی کے ساتھ ان کا شغف مثالی تھا۔ علم کے لئے انھوں نے دنیا کو تج دیا تھا، عیش و آرام اور راحت و آسائش ان کے لئے متروکات سخن کے درجہ میں تھیں، شادی نہیں کی اور پوری عمر تجرد کی حالت میں گذار دی۔

متعدد بیش قیمت کتابیں ان کی تحقیق و تعلیق سے شائع ہوئیں، جن میں سے اکثر حنفی فقہ و مذہب سے تعلق اور نوادرات کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مولانا افغانی کا علامہ اعظمی سے خاص تعلق تھا، ان کے سینکڑوں خطوط علامہ اعظمی کے ذخیرۂ مکاتیب میں اب بھی محفوظ ہیں، یہ زیادہ تر علمی گفتگو پر مشتمل ہیں، اپنے خطوط میں وہ علامہ اعظمی کو جن القاب سے مخاطب کرتے ہیں انھیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، اس وقت ایک خط کا ٹکڑا یہیں نقل کروں گا، جو ربیع الاول ۱۳۸۲ھ کا مکتوب ہے لکھا ہے:

"۰۰۰ کرم نامہ نے عرصہ کے بعد اپنے ورود سے مسرور کیا، کاش بیماری کے وقت مطلع کیا جاتا تو بقیہ احباب کی دعاؤں کے ساتھ اس حقیر ناکارہ کی دعائیں بھی جاری رہتیں ۰۰۰ اللہ جل شانہ آپ کو تندرستی و صحت کاملہ عطا فرمائے آپ کی ہستی اس وقت اہل علم کیلئے رحمت ہے ۰۰۰"

کتاب الزہد والرقائق جب علامہ اعظمی کی تحقیق و تعلیق سے چھپنے کو ہوئی، تو اس پر مولانا افغانی نے اپنے تاثرات کا اس طرح اظہار فرمایا:

"فقد اطلعت على كتاب الزهد للإمام ابن المبارك رحمه الله، الذى رتب أصوله و صححها وعلق عليه العلامة اللبيب الحبيب مولانا الشيخ حبيب الرحمن الاعظمى . لا زال ناصراً للسنة وقد قرظه

فوجدته ماهراً للعلوم حاويا بها أمينا لرواياته ، حل في تعليقه مشكلات الكتاب و خرج أحاديثه وآثاره ، وقدمه بمقدمة ثمينة مفيدة تدل على سعة اطلاعه وطول باعه ، قل له نظير في علماء زماننا ۰۰۰(۱)

(میں نے امام ابن مبارک رحمہ اللہ کی "کتاب الزہد والرقائق" دیکھی، جس کے اصول کی ترتیب اور تصحیح وتعلیق علامہ لبیب وحبیب مولانا شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی مدفیوضہ نے کی ہے، پس میں نے ان کو علوم کا ماہر وجامع اور روایات کا امین پایا، انھوں نے اپنی تعلیقات میں کتاب کے مشکل مقامات کو حل کیا، اس کی احادیث وآثار کی تخریج کی اور اس پر ایک قیمتی اور مفید مقدمہ لکھا، جس سے ان کی وسعت معلومات اور ید طولیٰ کا پتہ چلتا ہے، ہمارے زمانے کے علماء میں ان کی نظیر کم ملے گی۔"

مولانا مناظر احسن گیلانی کرشماتی قلم کے مالک مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ ان منتخب علماء روزگار میں سے تھے جنھوں نے اپنے قیمتی شاہکاروں کی بدولت اسلامی علوم وفنون اور مذہبی لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا، اللہ رب العزت نے ان کے قلم میں حیرت انگیز قوت اور عجیب تاثیر بخشی تھی کہ انھوں نے متعدد موضوعات کو اپنے قلم کی جولانگاہ بنایا اور ہر ایک کے اندر قلم کی صناعی کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا۔ ان کی شخصیت بڑی جامع الفنون تھی، تدریس وتعلیم ہو یا تصنیف وتالیف دونوں میں یکتائے دہر تھے، علم وفن میں حدیث وفقہ ہو یا ادب وفلسفہ ہر ایک پر مہارت تامہ اور قدرت کاملہ رکھتے تھے، آپ کی تحریروں میں اسلامی غیرت، مذہبی جوش، فکر کی گہرائی، زبان کی حلاوت اور بلاغت کا حسن ہر ایک کا فیضان اور تلاطم ہوتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے نہایت باکمال فضلاء میں تھے اور تین ضخیم جلدوں میں "سوانح قاسمی" لکھ کر اپنی قاسمیت کا حق ادا کر دیا، معقول ومنقول کے علاوہ تقریر وخطابت

(۱) کتاب الزهد والرقائق ص ۶۴

اور سلوک و تصوف میں بھی نمایاں مقام حاصل تھا۔ بہار کی خاک سے اٹھے تھے، نشو و نما اور تعلیم و تربیت آبائی وطن گیلانی کے علاوہ ٹونک میں ہوئی، دار العلوم سے فراغت ہوئی اور وہیں سے فروغ بھی پایا، پھر حیدر آباد تشریف لے گئے جہاں تقریبا پچیس سال تک جامعہ عثمانیہ نظامیہ حیدر آباد میں تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے، اور بالآخر شعبہ دینیات کے صدر مقرر ہوئے اور اس طرح دین و دنیا دونوں کی وجاہت آپ کا مقدر بنی، تصانیف میں بیش قیمت کتاب "تدوین حدیث" ہے جس کو حجیت حدیث کے اثبات میں تصنیف فرمایا ہے۔

یہ نہایت عجیب بات ہے کہ علامہ اعظمی اور مولانا گیلانی کے درمیان ملاقات کی نوبت کبھی نہ آسکی، البتہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کے فضل و کمال کے قائل اور معترف تھے، جب مولانا مناظر احسن گیلانی نے علامہ اعظمی کی کتاب "نصرۃ الحدیث" ملاحظہ فرمائی تو ۵/اپریل ۱۹۴۲ء کو حیدر آباد سے ایک خط لکھا جس میں علامہ اعظمی کے علم و فضل کا اعتراف یوں فرمایا:

"میں نے آپ کی کتاب نصرۃ الحدیث اول سے آخر تک پڑھی، ماشاء اللہ آپ نے کافی محنت اور مطالعہ فرمایا ہے، نئی چیزیں اس سلسلہ میں آپ نے پیش کی ہیں، خدا آپ کو جزائے خیر دے ... اس موضوع پر خاکسار نے بھی کچھ لکھا ہے ... اس لئے آپ کی محنت اور تلاش کی داد جیسا کہ چاہیئے میں ہی دے سکتا ہوں۔ اگر حکم ہو ... تو آپ کی کتاب پر مفصل ریویو لکھنا اپنی سعادت خیال کروں گا ... آپ جیسے دین کے مخلص خدام کا سرمایہ عز و شرف فی الدنیا والآخرۃ ہے۔"

مولانا محمد یوسف بنوریؒ | امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ممتاز شاگرد اور ان کے علم کے شارح تھے، حدیث کے فہم و تفقہ میں کمال حاصل تھا، بلکہ وہ اس میدان میں نادرۂ روزگار اور نابغۂ عصر خیال کئے جاتے تھے، عربی زبان و ادب میں ید طولیٰ حاصل تھا، مزید برآں ایک بلند پایہ خطیب و مقرر بھی تھے، تقسیم وطن کے بعد پاکستان منتقل ہو گئے اور وہاں

کے مشہور شہر کراچی کے اندر ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا، پاکستان جانے کے بعد قادیانیوں کے خلاف زندگی بھر سرگرم عمل رہے، اور جب تک زندہ رہے ان کے لئے پیام مرگ بنے رہے ، وہ ایک عظیم مصنف بھی تھے ، ان کی تصانیف میں نمایاں ترین ترمذی شریف کی شرح "معارف السنن" (عربی) اور "نفحة العنبر فی هدی الشیخ انور" (عربی) علامہ انور شاہ کی سوانح حیات ہے، ان کا انتقال پاکستان ہی میں ۱۳۹۷ھ کے اواخر میں ہوا، ان کی وفات کے بعد علامہ اعظمی نے لکھا:

"اس دور قحط الرجال میں مولانا کا فقدان اتنا بڑا خسارہ ہے کہ اس کی تلافی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ، ایسا کامل مدتوں میں پیدا ہوتا ہے ، مولانا بہت سے کمالات علمی و عملی کا مجموعہ تھے اور بڑے عزم و ہمت کے آدمی تھے، ہمارے استاذ مرحوم کے شاگردوں میں ان کو ایک خاص امتیاز حاصل تھا، جو بات ان میں تھی وہ کسی دوسرے میں نہیں تھی۔"(۱)

کہتے ہیں کہ " بزرگاں را بزرگاں می شناسند" باوجودیکہ دونوں شخصیتوں میں معاصرت تھی، لیکن دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کی فضیلت و برتری کے اقرار میں بخل سے کام نہیں لیتا تھا، مولانا یوسف صاحب علامہ اعظمی سے حد درجہ محبت کا برتاؤ اور انس و تعلق کا اظہار فرماتے تھے ، کراچی کا مدرسہ قائم کرنے کے بعد انھوں نے بہت کوشش کی کہ علامہ اعظمی پاکستان منتقل ہو جائیں اور اس مدرسہ سے وابستہ ہو جائیں اور دونوں حضرات ساتھ مل کر علم اور دین کی خدمت انجام دیں۔ اوپر آپ مولانا بنوری کے متعلق علامہ اعظمی کی تحریر پڑھ چکے ہیں، مولانا بنوریؒ کی نظر میں علامہ اعظمی کا کیا مرتبہ و مقام تھا اس کو بھی ملاحظہ فرمالیں، ایک بار مکہ مکرمہ میں شیخ سلیمان صنیع کے ہاں ایک دعوت میں مولانا بنوری نے شیخ موصوف سے علامہ اعظمی کا تعارف کرتے ہوئے فرمایا:

" هو من أكابر أصحاب شيخنا "(۲) (وہ ہمارے استاد کے عظیم ترین شاگردوں میں سے ہیں)

(۱) المآثر ج ۷ ش ۳ ص ۸۸ (۲) ایضاً ص ۸۹

۱۰ر جنوری ۱۹۷۸ء کو مولانا طاسین صاحب نے علامہ اعظمی کے پاس ایک خط میں لکھا:

"غائبانہ آپ کا ذکر خیر جن تعریفی الفاظ کے ساتھ فرمایا کرتے تھے ہم لوگ سن کر حیران رہ جاتے، وہ (مولانا بنوری) آپ کو اپنے وقت کا عظیم محدث فرمایا کرتے تھے۔(۱)

مولانا عبدالماجد دریابادی مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی قدیم وجدید کا سنگم تھے، اردو زبان وادب کے صاحب طرز اور بے مثل ادیب وانشاپرداز، انگریزی زبان کے ماہر علوم عقلیہ اور ادب وفلسفہ کے عظیم شناور تھے، ایک مدت تک مغربی فلسفہ کے دام فریب کا شکار رہے، اس وقت قلب ودماغ پر مغربی افکار کا غلبہ تھا، اسی دھن میں یورپین فلاسفرز اور ادباء کی بے شمار کتابوں کا مطالعہ کر ڈالا، لیکن اس کی فریب کاری زیادہ دنوں تک پوشیدہ نہ رہ سکی اور اس کے بطلان کا جلد ہی ان کے اوپر انکشاف ہو گیا، یورپین فکر وفلسفہ کی طرف جس زور کا مد تھا، اس سے زیادہ تیزی اور شدت کیساتھ جزر ہوا، اب جو اس ظلمت کدے سے نکلے ہیں تو روشنی کی تلاش ہوئی، اور روحانیت ان کے اوپر اس طرح غالب آئی کہ خانقاہ امدادیہ اور آستانۂ مدنی دونوں سے ربط وتعلق پیدا ہوا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کو زبان وادب پر زبردست قدرت حاصل تھی، قلم میں بلا کا زور تھا، تصنیف وتالیف کے علاوہ میدان صحافت میں بھی نمایاں کارنامے انجام دیئے، اور ایک مدت تک "سچ" اور "صدق جدید" نکال کر اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، اس طرح اردو زبان اور اسلامی فکر کی بھرپور خدمات انجام دیں۔

مولانا دریابادی نے چونکہ انگریزی زبان کا وسیع مطالعہ کیا تھا اور یورپ میں ہونے والے جدید انداز بحث وتحقیق سے بخوبی واقف تھے، اس لئے علامہ اعظمی کی تحقیقی کاوشوں کی قدر وقیمت کا بھی انھیں خوب اندازہ تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے تحقیقی کارناموں کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، انھوں نے علامہ اعظمی کی علمی اور حدیثی خدمات کو

---

(۱) المآثر ج ۷ ش ۳ ص ۹۱

جن بلند آہنگ الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے وہ ان کی روشن دماغی، کشادہ دلی اور قدر دانی کا بین ثبوت ہے۔

علامہ اعظمی کی شبانہ روز کدو کاوش اور تحقیق و تعلیق سے مسند حمیدی جب شائع ہوئی ہے تو اس کی جلد ثانی پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا دریابادی رقم طراز ہیں:

"اس نایاب کتاب کا پتہ لگانا بجائے خود ایک کارنامہ تھا، چہ جائیکہ اس کی پوری ترتیب و تہذیب، تصحیح و مقابلہ، تحشیہ اور متعدد فہرستوں اور اشاریہ دیباچہ وغیرہ کا اضافہ، یہ سعادت و کرامت ایک ہندوستانی محقق مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے حصہ میں آئی، جس پر انھیں علمی و دینی طبقہ کی طرف سے جتنی بھی مبارکباد دی جائے کم ہے۔"(۱)

اسی موقع پر پھر فرماتے ہیں:

"علمی تحقیق و تدقیق اب تک مستشرقین ہی کا حصہ سمجھی جاتی رہی ہے، مولانا اعظمی سلمہ اللہ نے عین اسی رنگ میں ڈوب کر ہندوستان کا نام سارے عالم اسلام میں بلند کر دیا ہے۔"(۲)

اسی طرح علامہ اعظمی کے ایک اور تحقیقی شاہکار کتاب الزہد والرقائق پر تبصرہ کرتے ہوئے "صدق جدید" ۲/جون ۱۹۶۷ء میں محدث عصر کی خدمات حدیث کی یوں مدح سرائی کرتے ہیں:

"محدث وقت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی خدمات فن حدیث میں یوں بھی کچھ کم نہ تھیں، مستحق تہنیت و تبریک ہیں کہ اس نادر کتاب کی بھی تدوین کی سعادت انھیں کے حصہ میں آئی۔

کتاب اس قابل ہے کہ یورپ اور امریکہ جائے اور وہاں کے ماہرین

---

(۱) صدق جدید ۶/مارچ ۵۴ء بحوالہ المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۵۲

(۲) حوالہ بالا

اسلامیات دیکھیں کہ ہندوستان کے ایک قصبہ میں بیٹھ کر ایک گوشہ نشین نے وہ کام کر دیا، جو مستشرقین اپنے لامحدود ذرائع کے بعد ہی انجام دے پاتے ہیں۔"(۱)

علامہ اعظمی کے ایک اور قابل فخر علمی و تحقیقی کارنامے امام سعید بن منصور کی "کتاب السنن" کی تحقیق واشاعت پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے "صدق جدید" (ص ۴) پر فرماتے ہیں:

"ہندوستان کے خادمان حدیث اور ماہرین علم حدیث کی اگر مختصر ترین فہرست ہی تیار کی جائے تو اس میں چوٹی کا نام مولانا حبیب الرحمٰن (مئو۔ ضلع اعظم گڈھ) کا ہوگا، مرتب ومدون مسند الحمیدی وغیرہ۔"(۲)

پھر آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:

"کتاب کی تہذیب وتدوین اور تحشیہ وغیرہ کا کام مولانا عظمی کا کیا ہوا ہے، اور حیرت ہوتی ہے ان میں اس کام کی اتنی سلیقہ مندی اور مہارت بغیر یورپ گئے ہوئے اور مستشرقین کی صحبت اٹھائے کیسے پیدا ہو گئی ہے۔"(۳)

مولانا عامر عثمانی | دیوبند سے شائع ہونے والے مشہور ماہنامہ "تجلی" کے ایڈیٹر تھے، زبان و قلم پر بلا کی قدرت حاصل تھی، نہایت شستہ اور شگفتہ تحریر تھی، زبان میں روانی ایسی جیسے دریا کا بہاؤ، زبردست نقاد جس کی نوک قلم سے بہت کم لوگ بچے، طنز و مزاح ہو یا واقعہ نگاری، دونوں کے اندر بھرپور طباعی کا مظاہرہ کیا ہے، آپ کی زیرادارت شائع ہونے والا رسالہ "تجلی" ملک کے علمی وادبی حلقوں میں بھرپور شہرت کا حامل ہوا ہے۔

مولانا عثمانی مرحوم نے علامہ اعظمی کے وفور علم، دقت نظر، براعت ومہارت، اور فضل وکمال کا بھرپور طریقے سے اعتراف کیا ہے، اور ان کے علمی کارناموں کی کھلے دل

(۱) المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۵۳

(۲) صدق جدید ۲ر اگست ۱۹۶۸ء (۳) ایضاً

سے داد دی ہے، علامہ اعظمی کی عظیم الشان تصنیف "رکعات تراویح" پر اپنے تبصرہ میں فرماتے ہیں:

"مولانا اعظمی فن حدیث میں قابل رشک براعت و مہارت کے سرمایہ دار ہیں، اور صرف ہندوپاک ہی کے نہیں دنیائے عرب کے ارباب نظر بھی ان کے کمال تبحر کے معترف ہیں"(۱)

اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"مولانا اعظمی کا خداداد کمال یہ ہے کہ انتہائی دقیق و نازک نکات فن کو بھی اس سلاست و بلاغت کے ساتھ سپرد قلم فرماتے ہیں کہ ابہام اور ژولیدگی کے بغیر بات آئینہ ہو جاتی ہے، ان کی قوت حافظہ کا تو ہمیں علم نہیں، لیکن ان کے رشحات قلم میں فراست کا جو نور، جو گیرائی، جو عبور اور جو کامل دسترس پائی جاتی ہے اس سے خاتم المحدثین علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، وہی روشن دراست، وہی استحضار، وہی نگاہ کی جامعیت، وہی تبحر اور وہی شان نقد۔"(۲)

رکعات تراویح کو حسب ذیل الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

"امام عصر مولانا اعظمی کی تالیف "رکعات تراویح" ایک بیش بہا کتاب ہے ••• ٹھوس اور گہرا علم رکھنے والے بشرطیکہ علم کو سہارنے والا مضبوط دماغ بھی ان کے پاس ہو، انشاء اللہ یہی کہیں گے کہ مولانا اعظمی نے مسلک حنفی کے احقاق کا حق ادا کر دیا ہے۔"(۳)

مولانا عثانی مرحوم سلسلۂ علمی کے اس طلائی حلقہ کے بعد واقع ہونے والے فراغ و خلا کو گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، اپنے اس احساس و شعور کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

---

(۱) تجلی اکتوبر ۶۳ء ص ۵۵-۵۴ (۲) ایضاً ص ۵۵ (۳) ایضاً ص ۵۶

"کاش مولانا اعظمی قریب ہوتے تو ہم ان سے بہت کچھ سیکھتے، آس پاس اونچی دوکان والے تو بہت ہیں، مگر علم و تفقہ کی ایسی دُکانیں اب نایاب ہوتی جارہی ہیں جن کا پکوان پھیکا نہ ہو، ہمارا تو خیال یہ ہے کہ اب زمانہ ہم جیسے نام کے علامہ تو ضرور پیدا کرے گا، شمس العلماء، حکیم الاسلام، ارسطوئے دوراں اور مٹی کے بقراط بھی ضرور جنم لیتے ہی رہیں گے، لیکن انور شاہ، شبیر احمد عثمانی اور حبیب الرحمٰن الاعظمی ... جیسے لوگوں کی مسند نہ جانے کب تک خالی رہے گی۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا" ان کے بعد "(۱)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی | بڑے صاحب فضل و کمال اور محقق عالم تھے، علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، نہ صرف ہندوپاک، بلکہ عالم اسلام کے علمی حلقوں میں عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، دین کے ساتھ دنیوی وجاہت کے حامل، ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، طبقۂ علماء کے درمیان ان کا اپنا ایک مقام تو تھا ہی، ساتھ ساتھ ہندوستان کے مؤقر علمی اداروں اور تعلیمی مراکز کے اہم عہدوں اور باعزت مناصب پر بھی فائز رہ چکے تھے، ایک مدت تک مدرسہ عالیہ کلکتہ کے شعبۂ دینیات کے پرنسپل، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات (faculty of Theology) کے ڈین، اور شیخ الہند اکیڈمی دیوبند کے ڈائرکٹر رہ چکے تھے، ماہنامہ "برہان" کے اڈیٹر اور بے شمار علمی و تحقیقی کتابوں کے مصنف تھے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم علامہ اعظمی کے شیفتہ و شیدا تھے، بلکہ سچ یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے ان گنے چنے لوگوں میں ایک تھے جنھوں نے ان کا (علامہ اعظمی کا) مقام و مرتبہ پہچانا، یہاں تک کہ جب وہ اپنے ایک سفر پر مصر تشریف لے گئے تو وہاں کے ایک مشہور عالم و محقق ڈاکٹر رشاد عبدالمطلب کے سامنے نہایت فخر و ناز کے ساتھ

(۱) تجلی اکتوبر ۶۳ء ص ۵۷

علامہ اعظمی کی تحقیق سے شائع ہونے والی کتاب مسند حمیدی کا تذکرہ کیا، مولانا اکبر آبادی کی گرویدگی اور ان کا والہانہ پن اس وقت قابل دید ہوتا تھا جب مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند یا کسی دوسرے موقع پر ان کی ملاقات ہوتی تھی۔

علامہ اعظمی کے تئیں مولانا اکبر آبادی کے شدت جذبات اور ان کی توقیر و تعظیم کا اندازہ اس سے لگایئے جب انھوں اپنی مایہ ناز کتاب "صدیق اکبر" کے طبع اول کے بعد طبع دوم سے قبل اس پر نظر ثانی کرانی چاہی اور اس کے لئے ان کی نگاہ انڈوپاک میں صرف علامہ اعظمی پر پڑی، اس کا حال انھوں نے خود "صدیق اکبر" طبع دوم کے مقدمہ میں تحریر فرمایاہے لکھتے ہیں:

"پھر میں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کو جن سے بڑھ کر فن حدیث واسماء الرجال کا محقق و مبصر میرے نزدیک آج انڈوپاک میں کوئی عالم نہیں ہے، دیرینہ نیاز مندی کی بناء پر خط لکھا کہ:

"اگر آپ "صدیق اکبر" کو ایک مرتبہ ملاحظہ فرمالیں اور اس میں جو غلطیاں ہیں ان کی نشاندہی فرمادیں تو مجھے اطمنان ہو جائے"

مولانا نے از راہ شفقت بزرگانہ اس درخواست کو بڑی خوشی سے قبول فرمایا اور کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھ کر غلطیوں سے مطلع فرمایا، میں نے نظر ثانی میں مولانا کے خط سے مکمل استفادہ کیاہے اور اس غیر معمولی توجہ اور زحمت فرمائی کیلئے صمیم قلب سے شکر گذار ہوں۔"(۱)

علامہ اعظمی کی تحقیق سے جب" المطالب العالیہ " شائع ہوئی، تو اس پر اپنے مؤقر رسالے "برہان" میں تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

"الشیخ الاستاد مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ان محققین علماء میں سے ہیں

---

(۱) صدیق اکبر ص ۲۷

ہیں جو اگرچہ اپنے وطن میں "غریب شہر" ہیں، لیکن عرب ممالک میں ان کے علم و فضل اور شہرت و عظمت کا طوطی بولتا ہے اور اس شہرت و عظمت کی بنیاد حدیث کی وہ نادر اور اہم کتابیں ہیں جن کے مخطوطات کو آپ نے تحقیق و ترتیب کے موجودہ علمی اصول کے مطابق ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔"(۱)

علامہ اعظمی کے نام لکھے ہوئے مولانا اکبر آبادی کے بہت سے خطوط بحمد اللہ محفوظ ہیں، ان میں سے کچھ خطوط کی عبارتیں ذیل میں نقل کی جا رہی ہیں، ۲۸ر اگست ۱۹۵۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"آپ یقین مانئے ہند و پاک کے علمائے محققین میں آج کل میں صرف ایک تنہا آپ کی ذات کو مانتا ہوں جن سے علمی امور میں رجوع کرنا اپنا علمی فرض سمجھتا ہوں۔"

۲۴ر دسمبر ۱۹۶۷ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"میں نے کتاب الزھد والرقائق پوری پڑھ لی ہے، اگرچہ "چھوٹا منہ بڑی بات" ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ آپ کا علم و فضل، بصیرت و دقت نظر اور وسعت نظر کی داد نہیں دی جا سکتی، ۰۰۰ اس کا افسوس تھا کہ برصغیر ہند و پاک میں قاہرہ کے ساعاتی، احمد محمد شاکر اور کوثری جیسے محقق علماء نظر نہیں آتے؛ لیکن الحمد للہ آپ نے نہ صرف تلافی کر دی ہے، بلکہ ان حضرات سے بھی بعض چیزوں میں سبقت لے گئے ہیں، ابقاکم اللہ بالصحة والعافية لخدمة العلم والدين على هذا المنوال المتين"

۲۰ر مارچ ۱۹۶۸ء کو سنن سعید بن منصور ملاحظہ فرمانے کے بعد لکھتے ہیں:

"پرسوں کتاب السنن لسعید بن منصور کا ایک نسخہ ملا، اور کل کسی طرح وقت نکال کر بہت کچھ پڑھ گیا۔ سبحان اللہ، صل علی، آپ اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے

---

(۱) برہان اپریل ۱۹۷۴ء ص ۲۷۸

کیا عجیب و غریب کارنامہ انجام دیا ہے، دنیائے علم و تحقیق آپ دونوں حضرات کا جتنا بھی شکریہ ادا کرے اور احسانمند ہو کم ہے، آپ نے ادھر چند سالوں میں کیا کچھ کر دکھایا! جب اس کا خیال کرتا ہوں تو ہر بن مو سے آپ کے لئے دعائیں نکلتی ہیں"

۳ر اگست ۱۹۶۸ء کو لکھتے ہیں:

"والا نامہ شرف صدور لایا، اس حوصلہ افزائی اور کرم گستری کے لئے ممنون ہوں، ورنہ در حقیقت میں اس لائق کہاں کہ آپ کی علمی رفعتوں کا سراغ لگا سکوں"

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ | حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند دلبند اور خلف الرشید تھے۔ دین و سیاست دونوں میدانوں میں صف اول کے لوگوں میں رہے، مسند درس و افتاء پر فائز رہنے کے علاوہ قومی و ملی خدمات میں بھی پیش پیش رہا کرتے تھے، ان کا زندۂ جاوید کارنامہ دار الحکومت دہلی کے اندر "ندوۃ المصنفین" کا قیام تھا، جس کا خاکہ آپ کے ذہن کی اپج تھا، جس سے بعد میں مختلف موضوعات پر سیکڑوں کتابیں شائع ہوئیں، غرض آپ اپنے وقت میں بالغ نظر اور صائب الرائے اہل علم میں شمار کئے جاتے تھے۔

علامہ اعظمی کے علم و فضل کے بڑے معترف اور قائل تھے، اور آپ سے مکاتبت و مراسلت بھی رکھتے تھے، خطوط میں بڑے اکرام و احترام کے الفاظ سے مخاطب کرتے تھے، اپنے قیام کلکتہ کے دوران ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ سے ملاقات کے لئے اب سے نہیں کئی سال سے دل چاہتا ہے، آپ کی علمی خدمات ہم سب کے لئے باعث افتخار اور مایۂ عزت ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔"

مولانا محمد منظور نعمانی | رئیس المناظرین مولانا محمد منظور نعمانیؒ ہندوستان کے ان سر برآوردہ اہل علم میں تھے، جنھوں نے باطل کا عمر بھر ڈٹ کر مقابلہ کیا، زبان ہو یا قلم، تحریر

تقریر ہر ایک میں بے نظیر اور بے مثل قوت کے حامل تھے، ہندوستان میں اگنے اور نشو و نما پانے والے مختلف فرقوں کے لئے آپ کا وجود برق ورعد سے کم نہیں تھا، بلکہ بعض باطل فرقے تو ایسے تھے کہ آپ کا نام سن کر سہم جاتے تھے، میدان مناظرہ میں چلے جاتے تو مد مقابل پہ خوف اور مرعوبیت طاری ہو جاتی۔

بعد میں مناظروں میں شرکت ترک کر چکے تھے، لیکن جہاد بالقلم میں عمر بھر مصروف رہے، فرق باطلہ کے رد کے علاوہ مختلف علمی موضوعات پر نہایت بیش قیمت کتابیں تصنیف فرمائیں، جن میں معروف تر "معارف الحدیث" ہے، اور اس کتاب پر علامہ اعظمیؒ سے ایک مقدمہ بھی لکھوایا جو چالیس صفحات پر مشتمل ہے، آپ کے اہم ترین کارناموں میں ماہنامہ "الفرقان" کا اجراء بھی ہے، جو پہلے بریلی اور بعد میں لکھنؤ سے علی التواتر شائع ہو رہا ہے۔

مولانا نعمانیؒ علامہ اعظمیؒ کے شاگرد تھے، دونوں بزرگوں کی عمر میں بہت کم تفاوت تھا، مگر اس کے باوجود مولانا نعمانی تاحیات اپنی اس شاگردی پر فخر کرتے رہے، اور اس کا برملا اور بلا تأمل اظہار فرماتے رہے، چنانچہ شوال ۱۴۰۷ھ مطابق جون ۱۹۸۷ء کے آخر میں خود راقم الحروف مولانا مرحوم کی خدمت مبارکہ میں حاضر ہوا تو مولانا مرحوم نے چند کتابوں کا نام لے کر فخر و مباہات کے انداز میں فرمایا کہ یہ کتابیں میں نے مولانا (علامہ اعظمی) سے پڑھی ہیں، پھر فرمانے لگے کہ میں نے مولانا سے اس وقت بھی پڑھا ہے جب کہ ابھی وہ خود طالب علم تھے۔ اور فراغت نہیں ہوئی تھی، یہ فخر و اعتزاز آپ کی اس بات میں صاف طور پر نظر آتا ہے جو مفتی ظفیر الدین مفتاحی نے قلمبند فرمائی ہے کہ:

"ایک دن میرے کمرہ پر کسی ممبر کو ڈھونڈھتے ہوئے تشریف لے آئے اور داخل ہو کر دروازہ کھول کر کھڑے ہو گئے، اور فرمایا: مولوی ظفیر! میں مفتاحی تو نہیں ہوں مگر حبیبی تو ہوں، یعنی ہمارا رشتہ استاد بھائی ہونے کا ہے۔" (۱)

مفتی ظفیر الدین صاحب اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

(۱) المآثر ج۶ ش۳ ص۵۰

"یہ واقعہ ہے کہ مولانا کو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے والہانہ تعلق تھا، اور حضرت کشمیری کے بعد علم حدیث میں ان پر پورا اعتماد تھا، اور کوئی مسئلہ آتا تو آپ کی طرف رجوع فرماتے۔"(۱)

مفتی صاحب اپنے اسی مضمون میں ایک جگہ اور تحریر فرماتے ہیں:

"اپنی خاص مجلس میں کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ مولانا اعظمی اور مولانا عبداللطیف نعمانی اس دور کے جید الاستعداد علماء میں سے ہیں، حضرت الاستاذ مولانا کشمیری کے بعد ان ہی حضرات سے میں زیادہ متاثر رہا، یہ دونوں اساتذۂ کرام اپنے اپنے فن کے درس و تدریس میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔"(۲)

مولانا منظور نعمانیؒ کی نگاہ میں علامہ اعظمی کا کیا رتبہ و مقام تھا، اس کو جاننے کے لئے مولانا نعمانیؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط پڑھئے جسے انھوں نے ۱۹ر رجب ۱۳۵۸ھ کو بریلی سے تحریر فرمایا تھا، اس میں لکھتے ہیں:

"گذشتہ ہفتہ میں دہلی گیا تھا، وہاں مولوی عتیق الرحمٰن صاحب ناظم "ندوۃ المصنفین" اور مولوی سعید احمد اکبر آبادی ایم۔اے وغیرہ سے کچھ آنمحترم کا ذکر آگیا، اس سلسلہ میں انھوں نے کہا تھا کہ اگر مولانا وقت نکال کر ترمذی پر ایک مبسوط حاشیہ (بطرز شرح مسلم نووی) تیار فرما سکیں جس میں وہ قرض بھی ادا ہو جائے جو "تحفۃ الاحوذی" کی اشاعت کے بعد حنفیوں پر عائد ہو گیا ہے تو "ندوۃ المصنفین" تحشیہ کا معاوضہ ادا کر کے اس کو خاص اہتمام سے چھپوا سکتا ہے، اور اس بارہ میں انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تو مولانا کی مرضی دریافت کر کے لکھنا، میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر اس کے لئے وقت نکل سکے تو علم اور دین کی بڑی خدمت ہو گی، اور وقت کی ایک بڑی ضرورت انشاء اللہ پوری ہو جائے گی، جسکو پورا کرنے والے شاید آئندہ پیدا ہی نہ ہوں۔؟"

---

(۱) المآثر ج۶ ش ۳ ص ۵۱-۵۰ (۲) ایضاً ص ۴۷

مولانا عبداللطیف نعمانیؒ اس دور کے باکمال افراد میں تھے، میدان مناظرہ ہو یا مجلس وعظ و تذکیر، وادیٔ سیاست ہو یا مسند درس و تدریس، آپ کی بے پناہ استعداد و صلاحیت اور کمال و عظمت کا ہر جگہ یکساں طور پر ظہور ہوا، ذہانت و فطانت، بداہت و استحضار، زیرکی و ہوشیاری میں آپ کے پایہ و رتبہ کو بہت کم لوگ پہنچ سکے۔ آپ کی زندگی جہد مسلسل اور عمل پیہم سے عبارت تھی، سیاست میں رہے تو بلدیہ کی صدارت سے لے کر مجلس قانون ساز کی رکنیت تک آپ کے حصہ میں آئی، اور دوسری طرف منصب شیخ الحدیث پر فائز رہنے کے علاوہ صدارت تدریس اور انتظام و انصرام کا کام بھی سنبھالا، الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے اور لاینحل عقدوں کے حل میں آپ کو ملکہ تامہ حاصل تھا۔

علامہ اعظمیؒ کے ہم درس بھی تھے، ہمدم دیرینہ بھی اور مفتاح العلوم کی نشأۃ ثانیہ کے بعد آپ کے ہم سفر اور ہم نفس بھی رہے، یہاں تک کہ دونوں حضرات کا یہ باہمی تعلق زندگی کے آخری لمحات تک باقی رہا، اس یگانگت اور ہم آہنگی کے باوجود دونوں بزرگوں کے فکر میں کچھ اختلاف بھی تھا، لیکن اس سے مجال انکار نہیں کہ مولانا نعمانی نے علامہ اعظمی کی فکر کا ہمیشہ پاس رکھا۔

اس معاصرت اور ہم درسی و ہم عمری کے باوصف مولانا نعمانی مرحوم علامہ اعظمی کے حد درجہ قدردان تھے، اور غایت درجہ ان کا ادب و احترام کرتے تھے، وہ ان کے علمی مرتبہ و مقام سے واقف اور ان کی شخصیت کے سچے شناسا تھے اور قلمرو علم میں کسی کو ان کا مثیل و نظیر نہیں سمجھتے تھے، ترمذی کی شرح لکھنے کا ان کا بھی بہت اصرار تھا، جس کا اظہار انھوں نے ۱۹۶۳ء میں حج کے لئے جاتے وقت بمبئی سے لکھے ہوئے ایک خط میں کیا، جو ۱۲ اپریل کا تحریر کردہ ہے، اس میں لکھتے ہیں:

"حاشیہ ترمذی محدثین کے رنگ میں احناف پر قرض ہے اور میری نگاہ میں صرف آپ کی توجہ فرمائی سے یہ قرض اوتارا جاسکتا ہے۔"

اسی قسم کے ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"یہاں پہنچ کر یہ احساس پھر بشدت اختیار کر گیا ہے کہ ترمذی شریف پر آپ کا ایک مختصر حاشیہ ... بہت ضروری ہے ... آج اپنی جماعت کی علمی پوزیشن اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ اگر اب اور آپ کے ہاتھوں یہ کام نہ ہوا تو شاید پھر نہ ہو سکے۔"

مولانا عبدالمجید حریریؒ جماعت اہل حدیث کے نہایت مقتدر اور عالم و فاضل فرد تھے، بہت ہی زیرک اور ذہین و فطین تھے، عربی ادب میں کمال حاصل تھا، مجلسی آدمی تھے، جب کسی محفل میں ہوتے تو اپنی پر کیف اور دلچسپ گفتگو سے اس کو زعفران زار بنا دیتے تھے، قسام ازل کی طرف سے انھیں علم وادب کے ساتھ مال و زر اور دنیوی وجاہت سے بھی حصۂ وافر ملا تھا، وہ اہم سرکاری عہدوں اور مناصب پر بھی فائز رہ چکے تھے۔

بنارس کے ایک دولتمند گھرانے کے چشم و چراغ تھے، سیاست میں بھی جم کر حصہ لیا اور ایک زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس کے نہایت سرگرم رکن رہے، علامہ اعظمی سے ان کے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے اور ان کے نام ان کے متعدد خطوط موجود ہیں، جو بیشتر سیاسی امور پر مشتمل ہیں، ان خطوط کے خوبصورت انداز تحریر سے ان کی سلیقہ مندی اور نفاست پسندی کا صاف پتہ چلتا ہے۔

علامہ اعظمی جب اپنے دوسرے سفر حج پر تشریف لے گئے تو موصوف اس وقت ریاض کے شاہی کتب خانہ کے نگراں تھے اور مکہ و مدینہ میں ان دونوں بزرگوں میں بہت ساری ملاقاتیں ہوئیں، علامہ اعظمی کے علم و فضل کے کس درجہ قدرداں اور معترف تھے، اس کا اندازہ ایک خط سے لگایا جا سکتا ہے، جو انھوں نے اسی موقع پر ۳۰؍ محرم الحرام ۱۳۷۷ھ کو مدینہ منورہ سے مکہ میں سکونت پذیر اپنے کسی عزیز کو لکھا ہے:

"حامل شقۂ ھذا مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی میرے بھائی اور بزرگ ہیں۔ آج کل تو وہ مدینہ منورہ میں ہیں مگر جلد ہی ان شاء اللہ جدہ کو روانہ

ہوں گے۔ میں نے ان سے درخواست کی ہے کہ واپسی کے سفر میں اگر مکہ مکرمہ میں کچھ قیام ہو تو وہ آپ لوگوں کے یہاں قیام فرمائیں۔

مجھ کو یقین ہے وہ آپ سے اور آپ ان سے مل کر خوش ہوں گے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اجلۂ علماء ہند میں ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو باعمل علم اور ذوق سلیم و جمیل دونوں نعمتوں سے نوازا ہے۔"

ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی فرنساوی دنیائے علم و تحقیق کی نہایت مشہور و معروف اور نامور شخصیت ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آباد میں تولد ہوئے اور وہیں پرورش و پرداخت ہوئی، خانوادۂ علم وادب کے چشم و چراغ تھے، لہذا تعلیم و تربیت کا آغاز بھی گھر کے علمی وادبی اور حیدر آباد کے نستعلیق ماحول میں ہوا، اور بچپن ہی سے علم وادب کا ایسا چسکا لگا کہ عمر بھر نہیں چھوٹا، حصول علم اور تحصیل تعلیم کی خاصی مدت حیدر آباد میں گذری، یہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے اس وقت حیدر آباد کا نظامی نظام تعلیم تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے مرکز توجہ بنا ہوا تھا، لیکن ڈاکٹر حمید اللہ کی عنقاء صفت طبیعت کی پیاس وہاں نہ بجھنے والی تھی، لہذا انھوں نے تکمیل تعلیم کے لئے ایک ایسے ملک اور ایسی درسگاہ کا انتخاب کیا جو عصر حاضر کے صنعتی انقلاب کے بعد جدید تمدن اور تہذیب و ثقافت کا عالمی مرکز خیال کیا جاتا تھا، اور وہ جگہ تھی فرانس کی سون بورن یونیورسٹی، واضح رہے کہ جس زمانے کی ہم گفتگو کر رہے ہیں، اس وقت فرانس کی یہ درسگاہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کا کعبہ تھی یہی وہ جگہ ہے جہاں مصر کے مشہور ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنا تحقیقی مقالہ لکھا تھا اور "تاریخ الادب الجاھلی" نامی کتاب لکھ ادبی تاریخ میں تہلکہ برپا کر دیا تھا، تکمیل تعلیم کے لئے ڈاکٹر حمید اللہ کی نظر انتخاب بھی اس مشہور دانشگاہ پر پڑی اور اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کر وہیں سے انھوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد حیدر آباد واپس لوٹے اور جامعہ عثمانیہ میں تدریسی خدمت انجام دینا شروع کر دی، تاکہ طویل تجربات کے بعد جو کچھ حاصل ہوا تھا اسے اپنے ہم وطنوں کی نذر کریں، لیکن زیادہ مدت نہیں گذرنے پائی

کہ حیدر آباد میں معرکۂ دار و گیر بپا ہوا اور وہاں کی دنیا زیر و زبر ہو کر رہ گئی، اس وقت انھوں نے ہندوستان چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا، اور اپنی آئندہ کی علمی دینی اور تحقیقی سرگرمیوں کے لئے فرانس ہی کو جولانگاہ بنایا، پیرس میں سکونت اختیار کی، اور اس کو مستقر بنا کر سارے یورپ کے مستشرقین سے دست و گریبان ہیں اور ان سے مذہبی، علمی، تحقیقی اور ثقافتی جنگ کرتے رہتے ہیں، انھوں نے اسلام کی عظمت و برتری کو ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اور تہذیب نو کے اس صنم کدہ میں رہ کر اسلام کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کی وہ خدمت انجام دی جو بہت سے دینی اور اسلامی مراکز کے لئے باعث درس اور قابل رشک ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ شہیدِ جستجو اور بحث و تحقیق کے بڑے شہسوار ہیں، کثیر المطالعہ اور وسیع الافق عالم و محقق ہیں، دنیائے مغرب اور عالم اسلام میں پائے جانے والے مخطوطات کے تئیں انھیں وسیع معلومات حاصل ہیں، بیشمار علمی، ادبی، تاریخی اور تحقیقی کتابیں ان کے علم و تحقیق، ذوق جستجو اور کثرت مطالعہ کا بین ثبوت ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف بایں ہمہ علم و فضل علامہ اعظمی کے حد درجہ قدرداں اور ثناخواں ہیں، انھوں نے عملاً بھی اور قولاً بھی علامہ اعظمی کے کمال و تفوق کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے، اسی اعتراف و قدردانی کا نتیجہ تھا کہ جب انھیں سنن سعید بن منصور کا مخطوطہ ترکی کے ایک کتب خانے میں دستیاب ہوا تو انھوں نے اس کی تہذیب و ترتیب اور تحقیق و تعلیق کے لئے مجلس علمی کی معرفت علامہ اعظمی کے پاس بھیج دیا، اور علامہ اعظمی نے اس کتاب کی تحقیق و تعلیق کی خدمت انجام دی، اس وقت ڈاکٹر صاحب نے علامہ اعظمی کے فضل کا اظہار، مولانا ابراہیم میاں جوہانسبرگ کو ۳/ربیع الاول ۱۳۸۳ھ کو لکھے ہوئے اپنے ایک خط میں یوں کیا:

"مولانا اعظمی کے علم و فضل کے کیا کہنے، سنن سعید بن منصور کو تیار کیا فرما رہے ہیں کہ اس میں چار چاند لگا رہے ہیں۔"

اسی طرح علامہ اعظمی مصنف عبدالرزاق کی طباعت کی نگرانی کے لئے جب بیروت تشریف لے گئے، اس وقت ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان کے پاس ایک خط لکھا، جس میں تحریر فرمایا:

''شاہ ولی اللہ ثانی کی یہ خدمت حدیث عنداللہ ماجور، عندالناس مشکور ہوگی۔''

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہندوستان اور ہندوستان سے باہر عالم اسلام میں بھی، عوام و خواص ہر طبقے میں عزت و احترام اور تعظیم و تکریم کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ مولانا ندوی مدظلہ کو جو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی ہے، وہ کم کسی کے حصہ میں آئی ہے، اور اس تمام شہرت و ناموری کا سبب ہے آپ کا علم و فضل، وسعت مطالعہ، وفور علم، ادب و تاریخ پر دستگاہ کامل، عربی ادب میں بے نظیر مہارت، اور اصلاح و تبلیغ کے لئے سعی پیہم اور اس کے علاوہ دیگر بہت سے اوصاف و محاسن جن کا وصف وبیان مجھ جیسے ہیچمداں کے بس سے باہر ہے۔ متانت و سنجیدگی، سلیقہ مندی و سلیم الطبعی، سادگی و بے نفسی اور انکسار و تواضع ان کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی ہیں اور ان کی انھیں خوبیوں نے انھیں باکمال بنادیا ہے۔ دین کا درد اور اشاعت اسلام کی فکر انھیں ہر آن و ہر لمحہ بے قرار و بے تاب کیے رہتی ہے، مسلم معاشرے کا انتشار و افتراق، مسلمانوں کا دینی تعلیمات سے انحراف اور ان کا تہذیبی و ثقافتی انحطاط وارتداد ان کو ہر پل بے چین اور بے کل کیے رہتا ہے، اور یہی فکر ان کو ہمہ دم متحرک اور پا بر کاب رکھتی ہے اور وہ سارے عالم کے مسلمانوں کو ان کا مقصد حیات اور '' کنتم خیر اُمة'' ہونے کا احساس دلاتے پھرتے ہیں۔

مولانا ندوی مدظلہ نہایت دانشمند اور جہاندیدہ عالم ہیں، انھوں نے ایک دنیا دیکھی ہے اور تمام اطراف و اکناف کا چکر لگایا ہے، ایک سے بڑھ کر ایک جہابذۂ وقت اور عباقرۂ زمانہ سے ملاقات، مجالست اور ہم نشینی کا انھیں شرف حاصل رہا ہے اور ان تمام تجربات و مشاہدات کے بعد انھوں نے اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا کہ انھیں

علامہ اعظمی جیسی دوسری شخصیت نہیں نظر آئی، اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستانی اہل علم میں علامہ اعظمی کے حد درجہ قدردانوں میں رہے ہیں، وہ علامہ اعظمی کا اسی طرح ادب و احترام کرتے تھے جس طرح کوئی شاگرد اپنے استاذ کا کرتا ہے، ملاقات ہونے پر نشست و برخاست میں ان کا پاس و لحاظ کرتے، اور یہی نہیں بلکہ ایک دفعہ دارالعلوم ندوہ میں مولانا ندوی کی دست بوسی کی سعادت اس حقیر کو حاصل ہوئی تو اس وقت انھوں نے فرمایا کہ مولانا اگرچہ میرے استاد نہیں ہیں، لیکن میں ان کو استاد ہی کی طرح سمجھتا ہوں، اور میں نے ان سے بہت استفادہ کیا ہے۔

یہاں یہ بات ممکن ہے بہت سے قارئین کے لئے حیرت کا باعث ہو کہ مولانا ندوی مدظلہ ایک شاگرد کی طرح باقاعدہ علامہ اعظمی سے استفادہ کرنا چاہتے تھے، اور انھوں نے بارہا اپنی اس خواہش کا علامہ اعظمی کے سامنے اظہار بھی کیا تھا، یہاں تک کہ ۱۳۷۵ھ میں دمشق کا ان کا ایک طویل دورہ ہوا، اس وقت انھوں نے ۲۱ر رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ کو وہاں سے ایک خط لکھا جس میں علاوہ دیگر باتوں کے تحریر فرمایا:

”جو تمنا باصرار و تکرار ظاہر کی تھی اس کے متعلق ابھی تک کوئی واضح و قطعی جواب نہیں ملا، بڑی آرزو ہے کہ آپ سے استفادہ کی منظم و مستقل شکل پیدا ہو، اگر یہ خوش خبری میں سن لیتا تو بڑی مسرت کے ساتھ واپسی ہوتی، اگر کوئی رائے قائم ہو تو مطلع فرمایا جائے۔“

مولانا ندوی کی نظر میں علامہ اعظمی کا کیا مرتبہ و مقام تھا اس کا اظہار انھوں نے بیشمار خطوط میں کیا ہے، جن میں سے چند ایک کی خاص باتیں نمونہ کے طور پر نقل کی جارہی ہیں ، ۱۶ر رجب ۱۳۷۶ کو لکھنؤ سے لکھتے ہیں:

”اس وقت کے علماء میں میں نہیں سمجھتا کہ مجھے کسی سے اتنی مناسبت اور عقیدت ہے جتنی آپ سے، خصوصیت کے ساتھ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا

مناظر احسن گیلانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی وفات کے بعد مجھے اس جامعیت اور ذوق و "ثقافت" کا کوئی دوسرا عالم نظر نہیں آتا، یوں یکفنی علماء اور اپنے اپنے فن کے تبحر اور بھی ہوں گے، مگر میرے ذوق کی تشفی اور جگہ نہیں ہوتی۔"

یکم محرم ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۴ر مئی ۱۹۶۴ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"میری یہ عجب بد قسمتی اور عجیب سوء اتفاق، کہ میں ایک طرف تو آپ سے ایسا گہرا نیاز مندانہ تعلق رکھتا ہوں اور آپ سے ایسی علمی عقیدت ہے جو کسی دوسری معاصر شخصیت سے نہیں نہ ہندوستان میں نہ ہندوستان سے باہر مصر و شام میں، اگرچہ یہ ایک تحسین ناشناس ہے اور میرا اعتراف کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن بہر حال واقعہ ہے ..."

مولانا ندوی مدظلہ کو علامہ اعظمی سے کس قدر تعلق اور کتنا گہرا لگاؤ تھا، اس کو جاننے کے لیے حسب ذیل خط پڑھیے جو ۲۶ر جمادی الآخرۃ ۱۳۸۵ھ کا رائے بریلی سے تحریر کردہ ہے، اس میں فرماتے ہیں:

"مجھے آپ سے ملنے کا شوق بھی ہے اور ضرورت بھی، آج ہی رات خواب میں بہت دیر تک زیارت کرتا رہا..."

رائے بریلی ہی سے ایک خط میں لکھتے ہیں جس پر ۳ر شوال کی تاریخ پڑی ہے لیکن سنہ درج نہیں ہے:

"حدیث و سنت کی جیسی خدمت اللہ تعالیٰ آپ سے لے رہا ہے وہ موجب صد شکر و منت ہے، ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء ."

مولانا مفتی نسیم احمد فریدیؒ امروہہ کے باشندہ تھے، وہیں ۱۳۲۹ھ میں پیدا ہوئے، اور امروہہ کی ہی جامع مسجد میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، بعد ازاں دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ جہاں تکمیل علم و فن کی، اور مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا سید اصغر حسین

میاں دیوبندی اور مولانا اعزاز علی رحمھم اللہ کے ابلتے ہوئے علمی سرچشموں سے فیضیاب ہوئے۔

مفتی نسیم احمد فریدیؒ کا شمار ماضی قریب کی قد آور علمی شخصیتوں میں ہوتا ہے، عوام الناس میں ان کا چرچا زیادہ نہیں تھا کیونکہ وہ خالص علمی آدمی تھے، لیکن علمی حلقوں میں ان کی شخصیت تعریف وتعارف سے بالا تھی، بلکہ اعتبار واعتماد کا درجہ حاصل تھا، ان کی ذات گوناگوں صلاحیتوں اور مختلف الجہات حیثیتوں کی حامل تھی، کامیاب مدرس، دقیق النظر مفتی، زبردست صاحب قلم اور مقالہ نگار، اور عظیم مصنف تھے، آپ کی تحقیق وتدقیق اور دقت نظر کی یادگار بہت سی تصانیف ومقالات ہیں، ان تمام خوبیوں کے ساتھ وہ غایت درجہ خاکسار، متواضع اور خوش اخلاق تھے، اور مزید یہ کہ وہ صاحب نسبت بزرگ بھی تھے، پہلے مولانا مدنی کے دامن تربیت سے وابستہ ہوئے اور ان کے دست حق پرست پر بیعت وارادت سے مشرف ہوئے، بعد ازاں مولانا محمد زکریا صاحب کے ہاتھوں اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔

علامہ اعظمی سے خاص تعلق بلکہ عقیدت رکھتے تھے، تصنیف وتالیف کے لحاظ سے کسی قدر ہم مشرب بھی تھے، اس لئے ان کے مرتبہ ومقام سے بخوبی واقف تھے، اور وقتاً فوقتاً استفادہ اور مشکل مسائل میں رجوع بھی کرتے تھے، علامہ اعظمی کے نام ان کے خطوط تو متعدد ہیں لیکن اس وقت ہم ان کے ایک خط کا ٹکڑا نقل کر رہے ہیں جو ۱۱ر ذی الحجہ ۱۳۹۴ھ مطابق ۲۶ر دسمبر ۱۹۷۴ء بروز پنجشنبہ، یعنی اس وقت کا مکتوب ہے جب مکتوب الیہ کے درس حدیث سے مفتاح العلوم مئو کے در ودیوار گونجا کرتے تھے، اس خط میں مفتی صاحب نے منجملہ دیگر باتوں کے لکھا ہے:

> "حضرت والا دو سال سے مئو میں بخاری شریف پڑھا رہے ہیں، امسال بھی پڑھا رہے ہوں گے، جی چاہتا ہے کہ ہفتہ عشرہ کے لئے درس مبارک میں حاضری نصیب ہو۔"

مولانا عبدالحمید سواتی | مغربی پاکستان کے مشہور شہر گوجرانوالہ کے مدرسہ نصرۃ العلوم نے دفاع حنفیت کے سلسلے میں عظیم الشان اور قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، اس ادارے کے شعبہ نشرواشاعت سے متعدد قیمتی اور بیش بہا کتابیں شائع ہوکر مقبول خاص و عام ہوئیں اور اہل علم سے خراج تحسین وصول کرچکی ہیں، اس کے ناظم و مہتمم مولانا عبدالحمید سواتی ایک صاحب علم و تحقیق آدمی ہیں، انھوں نے شاہ رفیع الدین صاحب دہلویؒ (متوفی ۱۲۳۳ھ) کے رسائل کی نشرواشاعت کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ اہتمام برتا، چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ کے کئی ایک رسالے ان کی تحقیق اور توجہ سے زیور طبع سے آراستہ ہوکر ہندوپاک کے علمی حلقوں میں شیوع پذیر ہوئے۔

شاہ صاحب کے بعض رسائل کی دریافت اور اس کی نقل و تصحیح میں علامہ اعظمی نے بھی بڑی کدوکاوش کی تھی، انھیں میں ایک رسالہ "تکمیل الاذہان" بھی ہے، جس کی دریافت اور تصحیح کے بعد علامہ اعظمی نے مولانا محمد طاسین صاحب ناظم مجلس علمی کراچی کے پاس بھیج دیا، ان سے وہ نسخہ مولانا عبدالحمید صاحب سواتی نے حاصل کیا، اور اس کا دوسرے نسخوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کے بعد جب شائع کرنا چاہا تو اس پر ایک طویل اور مفصل مقدمہ لکھا جس میں علامہ اعظمی کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ بلند آہنگ الفاظ میں ان کے علم و فضل کا اعتراف بھی کیا، صفحہ ۱۶ پر لکھتے ہیں:

> "اس کے بعد تکمیل الاذہان کا نسبتاً ایک بہتر اور جامع قلمی نسخہ ہمیں مجلس علمی کراچی کے ناظم حضرت مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ سے حاصل ہوا، یہ بڑا صحیح اور مکمل نسخہ ہے۔ دراصل یہ نسخہ فخرالمحدثین، سید الفقہاء و تاج العلماء حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دیوبندی دامت برکاتہم کے توسط سے حاصل کیا گیا ہے۔ اور آپ نے اس کی تصحیح بھی کی ہے۔"

اسی طرح شاہ رفیع الدین صاحب کا ایک دوسرا رسالہ جس کا نام "اسرار المحبۃ" ہے، یہ رسالہ بھی) مولانا عبدالحمید صاحب سواتی کے تصحیح و تقدمہ سے مدرسہ نصرۃ العلوم

گوجرانوالہ کے ادارۂ نشرواشاعت سے شائع ہوا ہے، اسکے صفحہ ۲۰ پر لکھتے ہیں:

"اور جہاں حاشیہ میں "مولانا اعظمی" ہوگا اس سے مراد سید الفقہاء و تاج العلماء، رئیس المحدثین و شیخ الحدیث، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دامت برکاتھم (فاضل دارالعلوم دیوبند و مہتمم و شیخ الحدیث مدرسہ مفتاح العلوم مئو اعظم گڈھ یوپی انڈیا) کی ذات گرامی ہوگی۔"

علامہ زاہد کوثریؒ دفاعِ حنفیت میں عصر حاضر کے سرخیل، وسیع النظر عالم، دقیقہ رس فقیہ اور حدیث ورجال کے ماہر تھے، فقہ حنفی کے بہت بڑے مزاج شناس اور رمز آشنا تھے، مسلک حنفی کے دفاع میں تمام عمر قلمی وکلامی جنگ لڑتے رہے اور الحاد و دہریت اور اباحیت پسندی کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کرتے رہے۔

ترکی کے مشہور شہر استنبول کے باشندہ تھے، اسلامی علوم وفنون بالخصوص حدیث و فقہ اور ان سے متعلقہ علوم کے اندر زبردست مہارت پیدا کی، عثمانی دورِ حکومت میں ترکی کے اہم ترین علمی ودینی مناصب آپ کو تفویض کئے گئے، لیکن یہ وہ دور تھا کہ خلافت عثمانیہ ضعف واضمحلال کا شکار ہو چکی تھی، یہاں تک کہ خود ترک ناداں نے خلافت کی قبا چاک بھی کردی، مصطفیٰ کمال پاشا کی زیر قیادت ترکی میں اسلامی علوم وفنون کا گلا گھونٹا گیا اور اس کے نتیجہ میں دین اسلام اور علماء دین پر جو قہر ڈھائے گئے اور جوروستم کے جو بادل برسائے گئے وہ تاریخ کی ایک المناک داستان ہے، اسلامی علوم وفنون اور تہذیب و تمدن کی جگہ مصطفیٰ کمال کے لائے ہوئے علوم جدیدہ، تہذیب نو اور تمدن جدید کے خلاف جن علماء حق نے آواز بلند کی ان میں پیش پیش علامہ زاہد کوثری تھے، جس کی پاداش میں وہ مصطفیٰ کمال کے عتاب کا شکار ہوئے، اور بالآخر ترکی چھوڑ کر مصر چلے گئے، اور وہیں سکونت اختیار کرلی، مصر میں ایک جہان نے آپ کے کوثر علمی سے فیض اٹھایا، انھیں فیض یافتگان میں محدث شہیر شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ بھی تھے۔

علامہ کوثری کو علماء ہند بالخصوص علماء دیوبند سے بہت انس و تعلق تھا، اسی انس و

تعلق کا نتیجہ تھا کہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی "فتح الملہم" شرح صحیح مسلم جب شائع ہونے کو آئی تو اس پر بیش قیمت تقریظ تحریر فرمائی، علامہ کوثری جن علماء ہند سے بہت زیادہ متاثر تھے، ان میں علامہ اعظمی کی ذات گرامی بھی تھی، دونوں باکمالوں میں مکاتبت بھی تھی، شیخ زاہد اپنے خطوط میں علامہ اعظمیؒ کو نہایت تعظیم و تکریم کے الفاظ سے خطاب فرمایا کرتے تھے، کبھی لکھتے "حضرة مولانا العلامة الأوحد والنحرير المفرد" اور کبھی "الجهبذ الفريد" اور "العلامة الكبير" اور کبھی "العلامة النحرير الاستاذ الكبير" کے توقیر آمیز الفاظ سے یاد فرماتے۔

مجلس علمی ڈابھیل کی طرف سے جب "نصب الرایہ" شائع ہوئی تو اس کی چوتھی جلد کے شروع میں شیخ زاہد کوثریؒ نے علامہ قاسم بنؒ قطلوبغا کی تخریج ہدایہ "منیۃ الالمعی" کا اضافہ فرمایا، علامہ قاسم بن قطلوبغا کی تخریج کا کچھ حصہ حافظ ابن حجرؒ کی کتاب درایہ کے ایک قلمی نسخہ سے نوٹ کر کے علامہ اعظمی نے مئو سے روانہ کیا، جو اصل میں درایہ پر علامہ قاسم کا استدراک ہے، اس کو پانے کے بعد علامہ کوثری نے "منیۃ الالمعی" پر اپنے مقدمہ میں جو رمضان ۱۳۶۹ھ کا تحریر کردہ ہے علامہ اعظمی کا حسب ذیل الفاظ میں ذکر فرمایا:

"مولانا العلامة النحرير والجهبذ الخبير أبو المآثر حبيب الرحمن الأعظمي." (۱)

ایک اور مقام پر علامہ اعظمی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

"هذا وإني أشكر مولانا العلامة النحرير والجهبذ الخبير أبا المآثر حبيب الرحمن الأعظمي السالف الذكر على تفضله بكتابة التعليقات بخط يده المباركة ومبادرته بإرسالها إلى هذا العاجز مع ما له من الأشغال الكثيرة، فانه هو السبب الأوحد لنشر الاثنين معا". (۲)

(میں شکر گذار ہوں علامہ نحریر، جہبذ خبیر مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی کا، جن کا اوپر ذکر کیا گیا، ان کی اس کرمفرمائی کے لئے جو انھوں کثرت اشغال کے

(۱) منية الألمعي ص۵ (۲) ایضاً ص۸

باوجود ان تعلیقات کو اپنے مبارک ہاتھوں سے لکھ کر اور اس عاجز کے پاس ارسال فرما کر کیا ہے، دراصل دونوں کی ایک ساتھ اشاعت کا وہ تنہا ذریعہ بنے ہیں)

اور اسی عالم مسرت وانبساط میں علامہ اعظمی کو خوب دعا بھی دی ہے:

" فأدعو الله سبحانه أن يطيل بقاء الأستاذ الجليل المشار اليه في خير و عافية ويمتع المسلمين بعلومه النافعة ، و يكافئه مكافأة المحسنين إزاء هذا الفضل الجسيم ." (۱)

(میں اللہ پاک سے دعا گو ہوں کہ وہ استاذ جلیل کو خیر وعافیت کے ساتھ باقی رکھے اور مسلمانوں کو ان کے نفع بخش علوم سے فائدہ پہنچائے، اور اس کرم فرمائی کے لئے ان کو بہتر صلہ عطا فرمائے)

شیخ عبد الفتاح ابو غدہ علامہ شیخ ابو غدہؒ کی ذات محتاج تعارف اور ان کی علمی وحدیثی خدمات محتاج بیان نہیں، ایسی عبقری شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے، اسلامی علوم وفنون پر ان کو جو دسترس بالخصوص علم حدیث پر جو عبور وکمال حاصل تھا، اس کی مثال شاذ ونادر ہی ملے گی، وسعت علم وکثرت مطالعہ میں طاق اور بحث وتحقیق اور تلاش وجستجو میں فرد فرید تھے، اللہ جل شانہ نے ان کو تصنیف وتالیف کا جو سلیقہ وملکہ اور لطیف وپاکیزہ ذوق عطا فرمایا تھا، اس میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا۔

شام کے قدیم اور تاریخی شہر حلب میں ولادت اور نشو ونما ہوئی، مزید تعلیم کی غرض سے مصر تشریف لے گئے اور وہاں جامعہ ازہر میں داخل ہو گئے، لیکن اپنے ذوق وشوق کی آبیاری علامہ زاہد کوثری کے کوثر علمی سے کرتے رہے، علامہ کوثری کا وجود ان کیلئے پارس کا پتھر ثابت ہوا جس نے انھیں چمکا کر کندن بنادیا، علامہ کوثری کی چھاپ شیخ ابو غدہ کی شخصیت پر بہت گہری پڑی؛ اور وہ اپنے احساس وادراک، فکر وشعور اور مسلک ومشرب اور ذوق ومزاج ہر چیز میں اپنے استاذ سے حد درجہ متاثر ہوئے، اور یہی وہ چیز تھی جس نے شیخ ابو غدہؒ کو علماء ہند سے بہت زیادہ قریب کیا۔

(۱) منية الألمعي ص ٦

شیخ ابو غدہؒ یوں تو علی العموم علماء ہند کی علمی خدمات کے معترف و ثناخوان تھے، لیکن علامہ اعظمی کی ذات سے جو ان کو مودت و محبت اور شغف و شیفتگی تھی وہ نا قابل بیان ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ عرب فضلاء اور اہل علم میں علامہ اعظمیؒ کا کوئی اس درجہ شیفتہ اور گرویدہ نہیں تھا، جس قدر آپ تھے۔ شیخ ابو غدہ کا ایک وصف خاص یہ تھا کہ ان کے اندر انکسار و تواضع انتہا درجے کا تھا، اور یہی سبب تھا کہ وہ جب علامہ اعظمی کے سامنے ہوتے، ان سے ملاقات کرتے تو اپنی ذات کو فراموش کر دیتے تھے، اور علامہ اعظمی سے جی بھر کر استفادہ کرتے تھے، حتی کہ ایک دفعہ مئو آئے تو مولانا رشید احمد صاحب سے پوچھا کہ آپ لوگ کتنے بھائی ہیں، انھوں نے کہا ۲ ہیں، تو شیخ نے فرمایا کہ دو نہیں تین سمجھئے، تیسرا میں ہوں۔

شیخ ابو غدہؒ علامہ اعظمی کے پاس خطوط لکھتے تھے تو بڑے عظیم الشان القاب و آداب کے ساتھ ان کو خطاب فرماتے، کبھی لکھتے "العلامة المحقق الجليل" کبھی لکھتے: "سماحة شيخنا العلامه المحدث الجليل والناقد الفقيه النبيل" کبھی لکھتے: "الأستاذ الجليل والمحدث الفقيه النبيل شيخنا وبركتنا وبركة العصر العلامة الشيخ" اور کبھی "العلامة الأجل والمحدث الأنبل" جیسے الفاظ سے مخاطب فرماتے، غرض ان کی باتیں "وللناس فيما يعشقون مذاهب" کی آئینہ دار ہوتیں۔

شیخ ابو غدہؒ اپنی کتابوں اور مضامین میں بھی علامہ اعظمی کا ذکر بڑے اجلال و اکرام کے ساتھ کرتے، مسند حمیدی کی پہلی جلد جب علامہ اعظمی کی تحقیق سے شائع ہوئی تو شیخ ابو غدہ نے اس پر بڑا قیمتی تبصرہ تحریر فرمایا، جس میں علامہ اعظمی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"وقد صدر منه الجزء الاول محققاً عن أربع نسخ مخطوطة، في طباعة جيدة متقنة، و بتحقيق وتعليق العلامة الكبير المحقق المحدث مولانا الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي، الذى عرفه علماء بلاد الشام ومصر والمغرب وغيرها من تحقيقاته واستدراكاته النادرة الغالية على العلامة الشيخ أحمد محمد شاكر رحمه الله تعالىٰ في تحقيقه لكتاب "مسند أحمد" (١)

(١) مجلة المجمع العلمي العربي اكتوبر ١٩٦٣ جمادى الأولىٰ ١٣٨٣ ص ٦٨٨

(ان کی (مسند حمیدی کی) پہلی جلد چار قلمی نسخوں کے مقابلہ کے بعد محقق طور پر نہایت عمدہ چھپائی کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور جس کی تحقیق و تعلیق علامہ کبیر، محقق محدث مولانا شیخ حبیب الرحمن الاعظمی نے کی ہے، جن کو شام و مصر اور مغرب وغیرہ کے علماء مسند احمد پر علامہ شیخ احمد محمد شاکر رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق پر ان کے بیش قیمت اور نادر تحقیقات اور استدراکات کی وجہ سے جانتے ہیں)

مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کی علم حدیث پر مشہور کتاب "الرفع والتکمیل" کی شیخ ابو غدہؒ نے تحقیق فرمائی ہے، جس کے کئی شاندار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اس کی تحقیق میں ایک سبقت قلم پر علامہ اعظمی کی تصویب کے بعد شیخ ابو غدہؒ اس انداز میں ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں:

"صوبه لي من الهند شيخنا العلامة المحدث الجليل الناقد حبيب الرحمن الأعظمي جزاه الله خيراً ."(۱)

(میرے لئے اس کی تصویب ہندوستان سے ہمارے شیخ علامہ محدث جلیل وناقد حبیب الرحمن الاعظمی نے کی، اللہ ان کو جزائے خیر دیں)

اسی قسم کی ایک اور جگہ پر تحریر فرماتے ہیں:

"فنبهني اليه مشكورا شيخنا العلامة المحدث الكبير مولانا حبيب الرحمن الأعظمي من الهند ."(۲)

(اس پر مجھے ہمارے شیخ محدث کبیر علامہ مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے ہندوستان سے متنبہ کیا جن کا میں شکر گذار ہوں)

اور "فقه أهل العراق وحديثهم" میں شیخ ابو غدہؒ علامہ اعظمیؒ کا تذکرہ حسب ذیل طریقے پر فرماتے ہیں:

"العلامة المحدث البارع الفقيه الشيخ حبيب الرحمن الاعظمي

---

(۱) الرفع والتکمیل ص ۲۴۸، ط ۳ ـــ المآثر ج ۶ ش ۴ ص ۴۰

(۲) الرفع والتکمیل (ط ۲) ص ۲۱۴ و (ط ۳) ۱۳۵۰ المآثر ص ۴۴

صاحب التعليقات البديعة ، والتحقيقات النادرة، العالم بالرجال والعلل، و تعليقاته وتحقيقاته السنية على "سنن سعيد بن منصور"و" الزهد" لابن المبارك و " مسندالحميدی" و(استدراكاته) على الشيخ أحمد شاكر في تعليقه على " مسند أحمد"ثم (تعليقاته الحافلة) على " مصنف عبدالرزاق" الذي يطبع الآن بعون الله ، كلها تنطق بسمو فضله و بسطة يديه في هذاالعلم الشريف "(۱)

(محدث ماہر وفقیہ علامہ شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی، انوکھی تعلیقات اور عجیب وغریب تحقیقات کے مالک، علل اور علم اسماء الرجال کے عالم، سنن سعید بن منصور، مسند حمیدی اور (عبداللہ) ابن مبارک کی کتاب الزہد پر ان کی بیش قیمت تعلیقات اور مسند احمد پر شیخ احمد محمد شاکر کی تعلیقات پر ان کے استدراکات، پھر زیر طباعت مصنف عبدالرزاق پر ان کے بھرپور حواشی، سب کے سب ان کی بلندی، ان کے فضل اور اس پاکیزہ علم پر ان کی دستگاہ کی شہادت دیتے ہیں۔)

شیخ ابوغدہؒ کے ذکر پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چلتے چلاتے پروفیسر محمد اجتباء ندوی سابق صدر شعبۂ عربی وفارسی الہ آباد یونیورسٹی کا ایک بیان نقل کردوں، وہ فرماتے ہیں:

"مجھے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ صاحب سے ۱۹۵۶ء میں حلب (شام) میں نیاز حاصل ہوا۔۔۔ ریاض (سعودی عرب) میں کئی برس ایک ہی یونیورسٹی میں شرف رفاقت بھی حاصل ہوا، تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی اور مختلف مسائل وشخصیات کے بارے میں گفتگو ہوتی، علماء ہند کے تذکرہ کے وقت حضرت محدث اعظمیؒ کا ذکر ضرور آتا، ان کا نام آتے ہی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں، شیخ ابوغدہ مدظلہ حضرت اعظمیؒ کے بے حد مداح، فریفتہ اور گرویدہ وقدرداں ہیں۔"(۲)

(۱)فقه أهل العراق و حديثهم: ص ۸۲۔ المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۱۴ (۲) ترجمان الاسلام ش ۱۳ ص ۱۰۶

ڈاکٹر عبدالحلیم محمود سابق شیخ الازہر نہایت عالم و فاضل اور باکمال شخص تھے، جامع ازہر کی مشیخت پر فائز ہونا ہی آپ کی عظمت و تفرد کی دلیل ہے، علم و فضل اور نبوغ و کمال کے ساتھ ساتھ طریقت و معرفت کے لذت آشنا اور راہ سلوک کے سالک بھی تھے، جو شیوخ ازہر میں آپ کا طرۂ امتیاز تھا، طبیعت و مزاج میں حد درجہ تواضع اور بے نفسی تھی۔

علامہ اعظمی کے بڑے قائل اور معترف تھے، آپ کے علم و فضل کا اعتراف وہ کس طرح فرماتے تھے، اس کے لئے مولانا اقبال احمد اعظمی کے خط کی حسب ذیل عبارت پڑھئے، یہ خط ۲/۱اکتوبر ۱۹۸٦ء کا لندن سے مکتوب ہے، لکھتے ہیں:

> "میں نے شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود رحمۃ اللہ علیہ (یہ وہ شیخ الازہر گذرے ہیں، جن کے بارے میں اتفاق ہے کہ صدیوں میں ایسے بلند پایہ شخص مصر کے امام ہوئے ہیں) انھوں نے مکہ مکرمہ، فندق عرفات میں حضرت مولانا مدظلہ کے بارے میں فرمایا، حاضرین میں مولانا منظور نعمانی اور مولانا علی میاں بھی تھے، بلکہ غالباً انھیں کو خاص طور سے مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ "میں شہادت دیتا ہوں کہ اگر سارے عالم میں کوئی "محدث اعظم" کے خطاب کا مستحق ہے تو یہ شخص ہیں۔"(۱)

اوپر گذر چکا ہے کہ ڈابھیل کے جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے جب مصر کے وزیر اوقاف شیخ محمد حسین ذہبی نے علامہ اعظمی کی نسبت فرمایا کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے محدث ہیں تو شیخ الازہر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ٹوکتے ہوئے فرمایا: "بل إنه أكبر علماء العالم الإسلامي "(بلکہ وہ عالم اسلام کے سب سے بڑے عالم ہیں)

شیخ احمد محمد شاکر جلیل القدر محدث، مشہور محقق اور نامور ادیب تھے، مصر میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما، ساخت و پرداخت اور تعلیم و تربیت ہوئی، اہم علمی تعلیمی اور سرکاری مناصب پر فائز رہے، مصر کے عہدۂ قضا پر بھی مامور رہے، علوم اسلامیہ بالخصوص

(۱) اس واقعے کو مولانا اقبال احمد اعظمی نے The Sunnah in Islam کے مقدمہ میں بھی نقل کیا ہے۔

فن حدیث میں زبردست مہارت ودسترس حاصل تھی، اس میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیئے، اور اپنی بیش بہا تالیفات وتحقیقات کے ذریعہ عالم اسلام کے علمی حلقوں میں شہرت وناموری حاصل کی، اور بجاطور پر "محدث الدیار المصریة" کے لقب سے ملقب کئے گئے۔

شیخ احمد شاکر کا سب سے اہم اور قابل قدر کارنامہ "مسند امام احمد بن حنبل" کی تحقیق وتعلیق ہے، چنانچہ یہ کتاب نہایت اہتمام کیساتھ ۱۶/ اجزاء میں شائع ہوئی ہے، اس کتاب کی تحقیق واشاعت کے دوران اس کی تیسری جلد میں شوال ۱۳۶۶ھ میں ساری دنیا کے اہل علم کے نام ایک اعلان شائع کیا کہ اس میں اگر ان کا کوئی تعقیب واستدراک یا ان کے کوئی ملاحظات ہوں تو وہ ان کو ان کے پاس روانہ کردیں، وہ ان کی بحث وتمحیص کے بعد آئندہ اجزاء میں انھیں شائع کردیں گے۔

شیخ احمد محمد شاکر یہ اعلان شائع کرنے کے بعد ایک مدت تک اہل علم کی جانب سے ملاحظات کا انتظار کرتے رہے، لیکن آٹھ نو سال کا عرصہ گذر گیا اور ان کی سماعت تک کہیں سے کوئی آواز نہیں پہنچی، بالآخر ۹/ برس کے بعد مصر بلکہ عالم عرب سے سیکڑوں میل دور ایک دور دراز بستی سے ان کے پاس ایک خط پہنچا، جس کے ساتھ مسند احمد پر مکتوب نگار کے ملاحظات بھی تھے۔ شیخ احمد محمد شاکر اسے پاکر بہت خوش ہوئے، وہ خط اور اس سے منسلک وہ ملاحظات کس شخصیت کے تھے خود شیخ احمد شاکرؒ کی زبان سے سنئے:

"ثم جاء نی کتاب من أخ عالم کریم، ولم یکن لی شرف معرفته من قبل. وقد عرفت من کتابه فضله وعلمه وتحققه بالبحث الدقیق. وکتابه هذا مؤرخ ۲۶/ ذی القعدة ۱۳۷۵ھ وطواه علی استدراکات وتعقبات دقیقة، من الجزء الاول الی الجزء الثامن وهذا الأخ العلامة: هو الأستاذ حبیب الرحمن الأعظمی...." (۱)

(۱) مسند الإمام احمد بن حنبل ۱۵: ۲۵۱

(پھر میرے پاس ایک کریم عالم بھائی کا خط آیا، جن سے اب سے قبل مجھے شناسائی کا شرف نہیں حاصل تھا، میں ان کے مکتوب سے ان کے علم و فضل اور بارک بینی کے ساتھ بحث و تمحیص سے واقف ہوا، ان کا یہ مکتوب ۲۶/ ذی قعدہ ۱۳۷۵ھ کا نوشتہ ہے، جو پہلے حصے سے آٹھویں حصے تک وقت آمیز استدراکات و تعقبات پر مشتمل ہے، اور یہ عظیم عالم استاذ حبیب الرحمٰن الاعظمی ہیں)

شیخ احمد محمد شاکر نے علامہ اعظمی کے ان استدراکات کو مسند احمد کی پندرہویں جلد میں بعینہٖ شائع کیا، جو پچاس صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، اور اسی کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ یہ استدراکات مسند احمد کی صرف آٹھ جلدوں پر تھے، وہ علامہ اعظمی کی اس بحث و تحقیق اور علمی کارنامہ سے کس قدر متاثر ہوئے اس کا اندازہ ایک خط سے لگایا جاسکتا ہے، جسے شیخ احمد محمد شاکر نے علامہ اعظمی کے پاس ان کے استدراکات کو ملاحظہ فرمانے کے بعد لکھا:

"حضرة الأخ العلامة الكبير المحقق الأستاذ حبيب الرحمن الأعظمي ... جاء نى كتابكم الأول النفيس ... أما استدراكاتكم فكلها نفيسة عالية، ولا أقول هذا مجاملة ... وأشكركم خالص الشكر على هذه العناية الجيدة، وأرجو أن تزيدونى من إشاراتكم وإرشاداتكم خدمة للسنة النبوية المطهرة ، وأنتم ـ كما رأيت،من عملكم ـ من أعظم العلماء بها فى هذاالعصر فالحمدلله على توفيقكم ... ثم أكرر الرجاء أن لا تحرمونى من آرائكم النيرة و تحقيقاتكم النفيسة ، حفظكم الله و بارك فيكم ."

(آپ کا نفیس گرامی نامہ ملا، آپ کے تمام استدراکات نہایت عمدہ اور بلندرتبہ ہیں، میں یہ بات محض خوشامد کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں، اس عظیم توجہ فرمائی پر خلوص دل کے ساتھ آپ کا شکر گذار ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ

سنت نبویہ مطہرہ کی خدمت کے جذبہ سے مجھے مزید مشوروں اور رہنمائیوں سے نوازیں گے، اور جہاں تک میں نے آپ کے اس کام کو دیکھ کر سمجھا ہے، میرا خیال ہے کہ آپ اس زمانہ میں سنت نبویہ کے عظیم تر علماء میں سے ایک ہیں۔)(۱)

علامہ اعظمی کے حق میں شیخ احمد محمد شاکر کی یہ شہادت نہایت کھری اور معتبر شہادت ہے، وہ خود ایک بڑے ماہر فن اور عالم و محقق تھے، اور علم و فن کی قدر کرنا جانتے تھے، علم حدیث کے اندر ان کا پایہ کتنا بلند تھا، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ زرکلی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"لم یخلف بعدہ مثلہ" (انھوں نے اپنے بعد اپنا ہم مثل نہیں چھوڑا)

لیکن علامہ اعظمی کے یہ استدراکات اس قدر وقیع، ٹھوس اور جاندار تھے کہ شیخ احمد شاکر نے انھیں صمیم قلب سے قبول کیا اور وہ تمام عالم اسلام میں یکایک علامہ اعظمی کی شہرت کا سبب بن گئے۔

شیخ محمود محمد شاکرؒ: انھیں علامہ احمد شاکر کے، جن کے بارے میں زرکلی نے لم یخلف بعدہ مثلہ لکھا ہے، چھوٹے بھائی تھے، یہ بھی بڑے محقق وادیب اور فاضل و یگانہ تھے، بالخصوص ادب و تاریخ کی کتابوں کی تحقیق میں قابل قدر کارنامے انجام دیئے ہیں، اور متعدد بیش قیمت قدیم مخطوطات ان کی تحقیق و تعلیق سے شائع وذائع ہوئے ہیں، بڑے بھائی کی ان کی نگاہ میں کیا قدر و منزلت رہی ہوگی ظاہر ہے، لیکن ان کی نظر میں علامہ اعظمی کا کیا مرتبہ و مقام تھا، ان کے متعلق ڈاکٹر محمد اسمٰعیل مدراسی ندوی مصر سے ایک خط میں فرماتے ہیں:

"یہاں (مصر) کے مشہور فاضل محمود شاکر صاحب مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (مولانا اعظمی) بعض اعتبار سے ان کے بھائی مشہور محدث احمد شاکر مرحوم سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔"(۲)

(۱) المآثر ج ۲ ش ا ص ۳۸

(۲) المآثر ص ۳۸ بحوالہ صدق جدید ۔ مورخہ یکم جولائی ۱۹۶۰ء

مولانا عبداللہ زمزمی مکیؒ عالم باعمل اور خدامست بزرگ تھے، اصلاً لاہوری تھے، لیکن حرم مکی کے جوار میں سکونت پذیر تھے، اور خانۂ خدا کے زیر سایہ ساری عمر گذار دی۔ بہت ہی عجیب وغریب اور صاحب حال شخص تھے، علم وعمل کا پیکر تھے، ان کے بارے میں ڈاکٹر عبدالمعید صاحب لکھتے ہیں:

"ایک بار راقم سطور نے ان کے بارے میں حضرت محدث کبیرؒ سے دریافت کیا تو فرمایا کہ اصلاً یہ لوگ لاہور کے رہنے والے تھے، ان کے والد کا نام غلام محمد تھا، باب ام ہانی پر ان کا کمرہ تھا، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ حضرت ام ہانی ہی کا کمرہ تھا۔"(۱)

اور علامہ اعظمیؒ خود ان کی نسبت اپنی یادداشت میں ارقام فرماتے ہیں:

"الشيخ مولانا عبدالله بن غلام محمد الزمزمي ، أصله من لاهور فيما أعلم ، قدم أبوه مكة في صغره و تولاه بعض أهل مكة فأقام هناك ، وتأهل فأنجب صديقنا هذاالصالح العالم الزاهد الجواد المفضال عبدالله ."

(حضرت مولانا عبداللہ بن غلام محمد زمزمی، میرے علم کے مطابق اصلاً لاہور کے تھے، ان کے والد بچپن میں مکہ آئے اور مکہ کے کسی باشندہ نے ان کو اپنے پاس رکھ لیا تو وہ وہیں رہ پڑے اور شادی کرلی، جن سے ہمارے یہ نیک عالم و پارسا، سخی اور کرمفرما دوست عبداللہ پیدا ہوئے)

مولانا زمزمی صاحبِ معرفت اور خداشناس تو تھے ہی، جوہر شناس بھی تھے، علامہ اعظمی سے بڑی والہانہ محبت رکھتے تھے، جو عشق کی حد کو پہنچی ہوئی تھی، علامہ اعظمی اپنی یادداشت میں فرماتے ہیں:

"وكان رحمه الله يبالغ في إكرامي ، ولا أعلم أحداً من الغرباء أحبني مثل حبه ، يشهد بذلك كل من رآني معه "

---

(۱) المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۴۲

(مرحوم مبالغہ آمیز حد تک میرا اکرام کرتے تھے، پردیسیوں میں کوئی ایسا شخص میرے علم میں نہیں، جس نے ان کے جیسی مجھ سے محبت کی ہو، ان کی شہادت ہر وہ شخص دے سکتا ہے جس نے مجھے ان کے ساتھ دیکھا ہو)

مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۳ء میں جب حج کے لئے تشریف لے گئے اور سفر مبارک میں مولانا نازمزمی سے ان کی ملاقات ہوئی، تو علامہ اعظمی کو ایک خط میں لکھا جو ۷؍ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ مطابق یکم مئی ۱۹۶۳ء کا مکتوب ہے:

"مولانا نازمزمی آپ کا ذکر خیر بہت کرتے ہیں، دو روز ناچیز کی قیام گاہ پر تشریف لا چکے ہیں، بہت عجیب وغریب بزرگ ہیں۔"

علامہ اعظمی کی مولانا نازمزمی سے اول بار ملاقات ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۵۰ء کے موسم حج میں یعنی علامہ اعظمی کے پہلے سفر حج کے موقع پر ہوئی، لیکن دونوں بزرگوں میں خط وکتابت پہلے سے تھی۔ مولانا نازمزمی کو علامہ اعظمی سے جو عشق ومحبت تھی اور جو دلی لگاؤ تھا اس کا اظہار مختلف طریقوں اور مختلف انداز سے ہوتا رہتا تھا، جس کی شہادت ان کے مکاتیب دیتے ہیں، علامہ اعظمی کے نام خطوط کا جو انبار ہے اس میں مولانا نازمزمی کے خطوط کی بھی خاصی تعداد ہے، جن کا ایک ایک جملہ اور ایک ایک لفظ محبت وخلوص میں ڈوبا ہوا ہے، سنیچر ۲؍رمضان ۱۳۶۹ھ کے خط میں فرماتے ہیں:

" صاحب الفضيلة سيدى الجليل مولانا حبيب الرحمن الأعظمى أيده الله تعالىٰ آمين .

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته ، وصل كتابكم الكريم وفى شدة السرور وضعته على رأسى و عينى ، فلله الحمد والشكر والمنة والثناء الجميل ، ووفقك وأعانك ، إن يوما نجتمع بك فيه لهو يوم الحياة الخالد وجبينها وغرة أيامنا ، إن يوما نراك فيه لهو يوم السعادة والهناء .

(فضیلت مآب آقائے بزرگوار! مولانا حبیب الرحمن الاعظمی ایدہ اللہ تعالیٰ(۱)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ کا مکتوب مبارک پہنچا، شدت مسرت میں میں نے اس کو سر پر رکھا اور آنکھوں سے لگایا، اللہ کی حمد اور اس کا شکر و احسان اور بہترین تعریف ہے، آپ کو توفیق عطا فرمائے اور اعانت فرمائے، بلاشبہ وہ دن جس میں ہماری آپ سے ملاقات ہوگی، وہ زندگی کا یادگار اور شاندار دن ہوگا، وہ دن جب ہم آپ کو دیکھیں گے نہایت خوشی اور خوش بختی کا دن ہوگا)

جمعہ ۹/ جمادی الاولی ۱۳۹۷ھ کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

" وإني كلما تذكرتكم هاجت عاطفتي وثارت ذكريات الفرح الذى كان أيام اجتماعنا، وإني قد قصرت في خدمتكم تقصيراً عظيما لضعفي و مرضي ، ولكني تشرفت برؤياك التي طالما كنت أتمناها . "

(میں نے جب جب آپ کو یاد کیا میرے جذبات بھڑک اٹھے، اور ہماری ملاقات کے دنوں کی جو خوشی تھی اس کی یادیں موج مارنے لگیں، میں نے اپنی بیماری اور کمزوری کی وجہ سے آپ کی خدمت میں بڑی کوتاہی کی، لیکن میں آپ کی دید سے مشرف ہوا جس کی مجھے بڑی آرزو تھی)

جمعرات ۲۷/ ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

" وصل كتابكم الكريم فاغرورقت عيني بالدموع وتعجبت غاية التعجب لأننا نحن أيضا هنا في الخلوة في اليوم السادس من ذى الحجة كنا نذكركم ونتحدث بأن في هذااليوم كان اجتماعنا بمولانا حبيب الرحمن ومضى اليوم بأجمعه في ذكراكم وكلنا يشتعل اشتياقا لرؤياكم فجاء كتابكم الكريم وكأنه يصور حالة خلوتنا في اليوم السادس وحقيق أن القلوب على بعضها لشواهد، أسأله من بيده مقاليد السمٰوٰت والارض أن يجمعنا مرة ثانيه وأدعوه في الملتزم أن يشرفنا برؤياك مرة ثانيه إنه مجيب الدعاء . سيدى !إن ذكراك بلساني ومنظرك

بعيني، وجلالك بقلبي ، أسأله جلت قدرته وتعالت عظمته أن يحفظك ويرعاك ويديمك ويجمعنا بك . "

(آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا (خوشی کی وجہ سے) میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں. مجھے اس بات پر نہایت تعجب ہوا کہ ۶/ ذی الحجہ کو ہم لوگ بھی یہاں خلوہ کے اندر آپ کا ذکر کر رہے تھے، کہ اسی دن ہماری مولانا حبیب الرحمن سے ملاقات ہوئی تھی، اور سارا دن آپ کی یاد میں اس حالت میں گذر گیا کہ ہم سب آپ کی دید کے سراپا مشتاق تھے، کہ آپ کا مکتوب گرامی پہنچ گیا، گویا کہ ۶/ ذی الحجہ کے ہمارے خلوہ کی حالت کی تصویر تھا، اور صحیح یہ ہے کہ قلوب ایک دوسرے کی شہادت دیتے ہیں، اللہ جل شانہ سے میری التجا ہے کہ ہماری دوبارہ ملاقات ہو، اس سے میں ملتزم میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کی دوبارہ زیارت سے ہمیں شرفیاب فرمائے. بیشک وہ دعا کو قبول کرنے والا ہے، میرے آقا! آپ کا ذکر میری زبان پر، آپ کا سراپا میری نگاہوں میں اور آپ کی بزرگی میرے دل میں ہے، میں خدائے بزرگ و برتر سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کی حفاظت فرمائے، آپ کی نگہبانی فرمائے، آپ کے سائے کو تا دیر باقی رکھے، اور ہماری آپ سے ملاقات کرائے۔)

چند خطوط کے یہ اقتباسات میں نے بطور نمونہ نقل کر دیئے ہیں، ورنہ علامہ اعظمی کے ذخیرۂ علمی میں بہت سارے خطوط مولانا نزمیؒ کے ہیں اور وہ تمام کے تمام اسی والہانہ انداز اور محبت و عقیدت کے ان ہی جذبات کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ سب کا ذکر طوالت سے خالی نہیں ہوگا، تاہم جی چاہتا ہے کہ ایک اور خط کا کچھ حصہ ذکر کر دوں، جس میں مولانا نزمیؒ نے علامہ اعظمی کی کتاب "اعیان الحجاج" دیکھنے کے بعد اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا ہے، لکھا ہے:

" ياصاحب الفضيلة قال في كشف الظنون عن كتاب الفوائد لابن رجب : إنها من عجائب الدهر ، وإن كتابكم أيضا من عجائب

الدهر في بابه وأسلوبه ومحتوياته ، وابتداؤكم فيه بأشرف المخلوقات جعله من أعجب العجائب إلهاما من الله سبحانه و تعالىٰ

هذا أول كتاب من نوعه ، فجزاكم الله عن الأمة الاسلامية خير الجزاء ، وهو من الفنون التي يميل اليها قلبي ودائما أبحث فيها فكأنه صنف لي ، لقد اهتز قلبي له وفرح فؤادي به ، وانشرح صدري منه ، فجزاكم الله عني خيرالجزاء وأثابكم على عملكم وبارك لنا فيكم ونفعنا بعلومكم ، وكثيراً ما كنت أراجع كتب الطبقات لهذه الغايه فأغناني الله بكتابكم هذا. بارك الله في تصانيفكم ، وبارك الله في حياتكم ، وبارك الله في أعمالكم . "

(مولانا زمزمی فرماتے ہیں کہ کشف الظنون میں علامہ ابن رجب کی کتاب الفوائد کی نسبت لکھا ہے کہ وہ عجائبات زمانہ میں ہے۔ آپ کی یہ کتاب بھی اپنے موضوع ، اپنے اسلوب اور مضامین کے لحاظ سے عجائبات زمانہ میں سے ہے ، اور اشرف المخلوقات (ﷺ) کے ذریعہ اس کتاب کے آغاز نے اس کو اعجب العجائب بنادیا ہے، جو اللہ پاک کی طرف سے الہام ہے۔

یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو امت مسلمہ کی جانب سے بہتر جزاء عطا فرمائیں، وہ ان فنون میں سے ہے جس کی طرف میرا دل مائل رہتا ہے اور ہمیشہ میں جس کی تلاش میں رہتا ہوں، تو گویا کہ وہ میرے ہی لئے لکھی گئی ہے ، میرے دل و جان اس سے خوش ہو گئے اور طبیعت منشرح ہو گئی، پس اللہ تعالیٰ میری طرف سے آپ کو بہترین بدلہ عطا فرمائیں، آپ کو آپ کے عمل کا انعام اور عمر میں برکت عطا فرمائیں، اور آپ کے علوم سے نفع پہنچائیں، اکثر و بیشتر اس مقصد کے لئے میں طبقات کی کتابوں کا مراجعہ کیا کرتا تھا، لہذا اللہ نے آپ کی اس کتاب کے ذریعہ مجھے اس سے بے نیاز کر دیا، اللہ تعالیٰ آپ کی تصانیف میں

آپ کی عمر میں اور آپ کے کام میں برکت عطا فرمائیں۔)

مولانا زمزمی کے کمال گرویدگی کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے، جسے ڈاکٹر عبدالمعید صاحب نے قلمبند فرمایا ہے، لکھا ہے:

"بابا خلیل صاحب مئوی راوی ہیں کہ ایک بار میں مولانا زمزمیؒ صاحب کے پاس ملاقات کے لئے گیا، میرے ہاتھ میں مولانا (حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی) کی کتاب رہبر حجاج تھی، انھوں نے پوچھا کون سی کتاب ہے؟ میں نے کہا مولانا اعظمی کی رہبر حجاج ہے۔ کتاب لے کر کھڑے ہوگئے اور سر پر رکھ لیا اور کئی بار فرمایا کہ "مولانا تو رہبر عالم ہیں، مولانا تو رہبر عالم ہیں۔"(۱)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اعظمیؒ ہی کے ایک قول کو منقول کرکے آپ کے ذکر کو ختم کردیا جائے، تاکہ مسک الختام ہو جائے، علامہ اعظمی نے فرمایا:

"مجھ سے بے پناہ محبت فرماتے تھے، جب بھی حجاز جانا ہوتا تو کمرہ کی کنجی میرے حوالے کر دیتے تھے، اس زمانہ میں آج کل کی طرح آسانیاں نہیں تھیں، میں ان کا بہت ہی ممنون اور مشکور ہوں۔"(۲)

اور یہ بھی فرمایا کہ

"کوئی میرے بارے میں ان سے پوچھتا تو فرماتے کہ وہ میرے شیخ ہیں۔ ایک بار حجاز جانا ہوا تو ان سے کسی نے بتادیا کہ میں آیا ہوں تو ملاقات کے لئے دو بجے رات تک سڑک پر لیٹے رہے۔"(۳)

شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء شیخ مصطفیٰ الزرقاء حلب کے ایک علمی و دینی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، ان کے والد ماجد احمد الزرقاء اور ان کے جد امجد محمد الزرقاء اپنے وقت کے بڑے اہل علم و فضل میں شمار ہوتے تھے۔ شیخ مصطفیٰ زرقاء اس مبارک گھرانے میں ۱۹۰۷ء

(۱) المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۳۳ (۲) ایضاً ص ۲۲ (۳) ایضاً ص ۲۳

میں پیدا ہوئے، ان کے والد محترم چونکہ فقہ میں دستگاہ رکھتے تھے، اس لئے ان کو بھی فطری طور پر فقہ سے زیادہ مناسبت ہوئی، اپنے والد کی علمی و فقہی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے، ان سے فقہ کی متعدد کتابیں پڑھیں، اس کے علاوہ عربی ادب سے لگاؤ تھا، گھریلو تعلیم و تربیت کے علاوہ حلب اور دمشق کے مختلف مدرسوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد فرانس جاکر تکمیل کی اور قانون (Law) میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر لوٹے۔

شیخ مصطفیٰ زرقاء کا شمار موجودہ دور کے جید علماء اور باکمال شخصیات میں ہوتا تھا، وہ جدید و قدیم کا سنگم تھے، اور ان لوگوں میں تھے، جنھوں نے اپنی زندگی علم و دین کے لئے وقف کر رکھی تھی، فقہ ان کا میدان تھا، اور اس میں انھوں نے مہتم بالشان کارنامے انجام دیئے ہیں، وہ شام واردن وغیرہ کی یونیورسٹیوں میں لیکچرر و پروفیسر اور اہم مناصب پر فائز رہ چکے تھے، اور باایں ہمہ علم و فضل بہت سادگی پسند اور متواضع تھے۔ چند دنوں پہلے البعث الاسلامی نے ان کے انتقال کر جانے کی خبر دی ہے، سعودی دارالحکومت ریاض میں ۴؍ جولائی ۱۹۹۹ء کو ان کی وفات واقع ہوگئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

شیخ مصطفیٰ زرقاء علامہ اعظمی کے علم و فضل اور بالخصوص ان کے تفقہ کے بڑے قائل اور معترف تھے، چنانچہ جب حکومت کویت نے چھٹی دہائی کے اواخر میں فقہی انسائیکلوپیڈیا کی مہم ان کے سپرد کی، تو انھوں نے اس کی کمیٹی کے لئے علامہ اعظمی کا نام بھی تجویز کیا اور اس سلسلے میں انھوں نے آپ کو کویت میں قیام اور انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب کے لئے دعوت دی، اور اس کے لئے برابر اصرار کرتے رہے، مگر علامہ اعظمی اپنی تحقیقی مصروفیات کے پیش نظر اس دعوت کو قبول نہیں کر سکے اور زرقاء صاحب کے شدید اصرار کے بعد بالآخر ایک مقالہ لکھ کر گھر سے روانہ کر دیا۔

شیخ مصطفیٰ زرقاء کی ایک مشہور کتاب ہے "**المدخل الفقهي العام**" انھوں نے یہ کتاب علامہ اعظمی کو ہدیہ کی تو اس پر یہ عبارت تحریر فرمائی:

"هدية المؤلف إلى أخيه الكريم صاحب الفضيلة الأستاذ الجليل العلامة المحقق الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي حفظه الله تعالىٰ وأدام نفعه.

الكويت في ۲۰/ من شوال ۱۳۸۹ھ

۲۸/ ۱۲/ ۱۹۶۹م"

(مصنف کا ہدیہ اس کے برادر کریم، استاذ جلیل، علامہ محقق، فضیلت مآب شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی کی خدمت میں، اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائیں اور ان کے نفع کو باقی رکھیں۔)

کویت ۲۰/ شوال ۱۳۸۹ھ

۲۸/ ۱۲/ ۱۹۶۹ء

شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز: سعودی عرب کے مفتیٔ اعظم اور بڑے عالم دین ہیں (۱) حدیث و فقہ و فتاوی میں نہایت بلند مقام رکھتے ہیں، نابینا ہیں لیکن علم و فقہ میں بیناؤں کے لئے قابل رشک ہیں، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے اولین شیخ الجامعہ رہ چکے ہیں، سعودی حکومت کے نزدیک بہت معزز و مقرب ہیں، جس کی وجہ سے آپ کی ہر بات اور ہر قول حکومت کے نزدیک مقبول و مسموع ہوتا ہے، اسی طرح سعودی عوام کے نزدیک بھی آپ کی مقبولیت و مرجعیت مبالغہ آمیز حد تک ہے، طہارت و تقویٰ اور زہد و استغناء میں بھی بے مثل خیال کئے جاتے ہیں۔

علامہ اعظمی کے بڑے قدر شناس ہیں، سلفیت کا غلبہ ہونے کی وجہ سے ہر چند کہ بعض امور و مسائل میں نقطۂ نگاہ کا اختلاف ہے، لیکن اس کے باوجود کھلے دل سے ان کے علم و فضل کا اقرار و اعتراف کرتے ہیں، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ انھوں نے اپنی رئاست جامعہ کے زمانہ میں علامہ اعظمی کو جامعہ آنے کی دعوت بھی دی تھی، اسی طرح علامہ

(۱) یہ سطریں جس وقت لکھی گئی تھیں اس وقت شیخ باحیات تھے اب وہ وفات پا چکے ہیں۔

اعظمی بھی ان کے مرتبہ شناس تھے، اور سفر حج وغیرہ کے دوران موقع ملنے پر ان سے ملاقات کرتے اور ان کو اپنی کتابیں بھی ہدیۃً بھیجتے، چنانچہ ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۹۶۳ء میں مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی جب حج کے لئے جارہے تھے، تو ان کے ذریعے علامہ اعظمی نے شیخ ابن باز کے لئے مسند حمیدی کا ایک نسخہ بھیجا، کتاب کو دیکھ کر شیخ نے جس مسرت اور تاثر کا اظہار فرمایا، اس کو مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی نے اپنے ۷رذی الحجہ والے خط میں یوں تحریر فرمایا ہے:

"ابن باز صاحب نے مسند دیکھ کر بڑی مسرت ظاہر کی اور بار بار "کتاب غریب" کہتے رہے"

علامہ اعظمی کی شیخ ابن باز سے ایک ملاقات کا واقعہ مولانا افضال الحق جوہر قاسمی نے حسب ذیل تحریر فرمایا ہے:

"حضرت مولانا ایک مرتبہ حج کے لئے تشریف لے گئے، مولانا اسعد صاحب بھی وہاں موجود تھے، انھوں نے شیخ عرب علامہ ابن باز کی زیارت کا وقت مانگا اور وہ مقرر ہو گیا، جانے لگے تو حضرت مولانا کے پاس آئے اور علامہ کے پاس چلنے کے لئے کہا، حضرت مولانا تیار ہو گئے، وہاں پہونچے تو حسب معمول ہر شخص نے اپنا اپنا تعارف پیش کیا، کیونکہ ابن باز نابینا محدث ہیں، ان کے یہاں ہر شخص کو اپنا نام اور مختصر تعارف کرانا ہوتا ہے، جب کئی آدمی اپنا اپنا تعارف کرا چکے تو آخری نمبر حضرت مولانا کا تھا، مولانا نے فرمایا: " أنا حبيب الرحمن الأعظمي من الهند" تو شیخ عرب اٹھ کر کھڑے ہو گئے، حضرت مولانا سے معانقہ فرمایا اور معذرت کی کہ آپ نے یہاں آکر مجھے شرمندہ کیا، مجھے معلوم ہوتا تو میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، پھر اپنی مسند پر مولانا کو بٹھا کر انھوں نے سکون پایا"(۱)

(۱) ترجمان الاسلام مولانا اعظمی نمبر ص۱۶۶۔۱۶۷

شیخ ناصر الدین البانی ان کا شمار اس زمانہ کے ممتاز علماء اہلحدیث میں ہوتا ہے، بسیار نویس اور کثیر التصانیف عالم ہیں، جماعت اہل حدیث کے درمیان مشرق و مغرب ہر جگہ انھیں قبول عام حاصل ہے، کچھ عرصہ قبل تک عرب ممالک میں وہ حدیث دانی اور تفقہ میں لا ثانی تصور کئے جاتے تھے اور ان کے فقہی نظریات و افکار کو ناقابل تردید بلکہ "پتھر کی لکیر" سمجھ کر مانا اور تسلیم کیا جاتا تھا، لیکن البانی صاحب کے قلم کی کاٹ اس قدر تیز تھی کہ اس کی زد سے عام علماء و فقہاء اور اسلاف تو درکنار ائمہ متبوعین بلکہ بسا اوقات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تک محفوظ نہ رہے ع

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

چنانچہ البانی صاحب کے اس تشدد اور غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ذات جس طرح مقبول تھی اسی قدر مختلف فیہ اور متنازع بن گئی، اور اس وقت صورت حال یہ ہے کہ عالم عرب میں جہاں ان کی امامت کا سکہ چلتا تھا، ان کے ان ہی تفردات و تحکمات کی بنا پر بہت سے عرب اہل علم ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، اور ان کے فقہی مسلک اور حدیثی اصول و نظریات کے رد میں آئے دن کتابیں، مقالات اور مضامین شائع کئے جا رہے ہیں، وللہ فی عبادہ شئون!

انھیں علمی بنیادوں پر علامہ اعظمی اور شیخ البانی کے درمیان شدید نظریاتی اختلافات رہے ہیں، مگر اس کے باوجود البانی صاحب کو علامہ اعظمی کے علم و فضل اور علو مرتبت کے اعتراف پر مجبور ہونا پڑا ہے، "صحیح الترغیب والترهیب" کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

"واعلم أن مما شجعني على نشرهما أنني رأيت الكتاب المطبوع تحت عنوان ... وعلق عليه العالم الشهير الجليل الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي ... (۱)

(۱) المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۴۰ بحوالہ الترغیب والترهیب ص ۶۳

آگے مزید فرماتے ہیں:

"ومما زادني رغبة في الإقبال عليه أن محققه الفاضل الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي قد صرّح . . ."

نقطۂ نظر کے اختلاف کے باوجود آخر تک علامہ اعظمی کے فضل و کمال کے کس قدر معترف رہے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے، جسے ڈاکٹر عبدالمعید صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

"انتقال سے ایک ہفتہ قبل دو عرب شیخ حضرت محدث کبیر سے ملاقات کے لئے مئو تشریف لائے، حضرت محدث کبیر علالت کے باعث اس وقت بات چیت نہیں کے برابر کرتے تھے، پھر بھی ان لوگوں سے گفتگو فرمائی، ان عرب شیوخ نے علامہ بن باز، شیخ ناصر الدین البانی اور ایک بڑے سعودی عالم کا حضرت محدث کبیر کو سلام عرض کیا اور یہ فرمایا کہ وہ لوگ آپ کے حالات جاننے کے مشتاق ہیں، حضرت محدث کبیر نے فرمایا کہ ان لوگوں کو میرا بھی سلام عرض کر دیں اور دعا فرمائیں کہ پھر ملاقات ہو، اس پر ان عرب شیوخ نے فرمایا اب انشاءاللہ آخرت میں ملاقات ہو گی۔"(۱)

الشیخ السید یوسف ہاشم الرفاعی کویت کے جید عالم دین اور سابق وزیر مواصلات ہیں(۲)، ابھی البانی صاحب کا ذکر گذرا ہے، ان کے نظریات کے رد میں علامہ اعظمی نے چار اجزاء پر مشتمل ایک کتاب تالیف فرمائی تھی، جس کا نام " **الألباني شذوذه وأخطاؤه** "ہے، یہ کتاب علمی دنیا میں حد درجہ مقبولیت کی حامل ہوئی، شیخ یوسف ہاشم رفاعی نے اس کتاب کی خوبصورت اور شاندار کتابت و طباعت کے بعد بڑے پیمانے پر نشر و اشاعت کی خدمت انجام دی، اور اس پر ایک بیش قیمت مقدمہ لکھ کر کتاب اور اس کے مؤلف کا بلند آہنگ الفاظ میں تعارف کرایا، لکھتے ہیں:

(۱) المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۴۱-۴۰ (۲) ایضاً ص ۴۲

"إنه امام كبير ، ومحقق جليل ، ومحدث نبيل شهير ، وهو العلامة الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي الهندى خادم السنة النبوية بحق وعلم وأدب وورع وتقوى الله سبحانه ، وهو يقوم بتحقيق كتب السنة النبوية ونشرها ، دون جعجعة و طنطنة ، أو دعايات و ادعاءات فارغة خرقاء . . . " (١)

(وہ امام کبیر، محقق جلیل اور محدث نبیل وشہیر حضرت علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمی الھندی ہیں، علم وادب اور زہد وتقویٰ کے ساتھ حدیث نبوی کی حقیقی خدمت انجام دے رہے ہیں، اور کتب حدیث کی تحقیق واشاعت کا کام بغیر کسی شور وغوغا یا خالی اور احمقانہ پروپیگنڈوں اور دعووں کے انجام دے رہے ہیں۔)

اور آخر میں تمام عالم اسلام میں آپ کی مقبولیت وہر دلعزیزی کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فان اسم الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي مقرون عند كل عارفيه في المشرق والمغرب بالفضل والتقدير والإجلال والمحبة ، والخضوع لعلمه ومعرفته بالسنة النبوية، وكبير خدمته لها وعظيم أدبه مع العلماء و الأئمة الأجلاء " (٢)

(حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کا نام سارے عالم میں ان کے شناساؤں کے نزدیک عزت وعظمت اور اجلال ومحبت کے ساتھ لیا جاتا ہے، حدیث نبوی۔ علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام۔ کے ان کے علم ومعرفت اور ان کی اس سلسلے میں عظیم الشان خدمات، علماء کرام اور ائمہ اعلام کے حق میں ان کے غایت ادب کی وجہ سے ان کے سامنے گردنیں جھکی ہوتی ہیں۔)

(١) الالبانی شذوذه وأخطاؤه ص۶ مطبوعہ کویت
(٢) الالبانی شذوذه وأخطاؤه ص۸ مطبوعہ کویت

شیخ شعیب الارناؤط عصر حاضر کے بلند پایہ عالم اور نامور محقق ہیں، میدان تحقیق کے بہت ہی تیز رفتار شہسوار ہیں، آپ کی تحقیق سے حدیث ورجال اور تاریخ کی متعدد ضخیم اور کثیر المجلدات کتابیں شائع ہو کر مقبول خاص وعام ہو چکی ہیں، انھیں کتابوں میں علی بن بلبان (المتوفی ۷۳۹ھ) کی " الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان" ہے جو ۱۸ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

علم جرح وتعدیل کے اندر امام بخاریؒ ایک اصطلاح "فیه نظر" استعمال کرتے ہیں، اس لفظ کے بارے میں امام ذہبی، امام عراقی اور دوسرے علماء جرح وتعدیل یہ کہتے چلے آئے ہیں کہ امام بخاری یہ اصطلاح متہم اور متروک وغیرہ راویوں کے لئے استعمال کرتے ہیں، لیکن علامہ اعظمی نے نہایت ثاقب نظری اور باریک بینی سے رجال کی کتابوں کے تتبع واستقصاء کے بعد اس کا دوسرا محمل تلاش کیا ہے۔ جسے شیخ ابو غدہؒ نے اپنی کتاب " الرفع والتکمیل " اور "قواعد فی علوم الحدیث "وغیرہ کے اندر بالتفصیل نقل کیا ہے، شیخ شعیب ارناؤط نے علامہ اعظمی کی اس اجتہادی رائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اعظمی کی امامت اور وسعت مطالعہ کی پوری وسیع الظرفی اور کھلے دل سے داد دی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"قلت: وهذه فائدة نفيسة تنبئ عن إمامة هذا الشيخ۔ حفظه الله و نفع به ۔ بعلم الجرح والتعديل، ودراية واسعة بقضاياه "(۱)

(میں کہتا ہوں (کہنے والے شعیب ارناؤط ہیں) یہ ایک عمدہ فائدہ کی بات ہے، جس سے شیخ کی علم جرح وتعدیل کے اندر امامت اور اس کے مشکلات ومسائل کے مکمل ادراک کا پتہ چلتا ہے، اللہ ان کو اپنی حفاظت میں رکھے اور ان سے نفع پہنچائے)

---

(۱) الإحسان فی تقریب صحیح ابن حبان ۴: ۲۹۳۔ ۲۹۲

شیخ عابد الفاسی الفہری | فاس (مراکش) کی مشہور لائبریری خزانة جامعة القرويين کے محافظ و نگراں اور عالم و فاضل شخص ہیں، مصنف عبدالرزاق علامہ اعظمی کی تحقیق سے شائع ہونے کے بعد جب ان کے پاس پہنچی ہے، تو انھوں نے ۳۰/ جولائی ۱۹۷۳ء کو مکتب اسلامی بیروت کے پتہ پر ایک خط لکھا، جس کو بیروت والوں نے علامہ اعظمی کی خدمت میں روانہ کر دیا، اس خط کے آغاز میں شیخ عابد فاسی نے کتاب کی وصولیابی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے:

"فقد تشرفنا بوصول كتاب المصنف للحافظ الكبير أبى بكر عبدالرزاق بن همام الصنعانى الذى عنى بتحقيق نصوصه و تخريج أحاديثه الشيخ الإمام العلامة المحدث السيد حبيب الرحمن الأعظمى."

(ہم حافظ ابو بکر عبدالرزاق بن ہمام صنعانی کی کتاب المصنف سے شرفیاب ہوئے، جس کی احادیث کی تحقیق و تخریج امام و علامہ و محدث حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے کی ہے)

اسی خط میں آگے چند سطروں کے بعد علامہ اعظمی کے مرتبہ و مقام اور ان کی جلالت علمی کے متعلق فرماتے ہیں:

"إن الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي هذا أجدر الناس بتحقيق كتب السنة والتعليق عليها، فهو أحد أفراد هذاالعصر الذى هيأ نفسه وهيأه الله تعالىٰ لتجديد هذاالدين تصديقاً لقول النبى عليه السلام إن الله يبعث على رأس كل مائة من يجدد لهذه الأمة أمر دينها . . ."

(شیخ حبیب الرحمن اعظمی موصوف کتب حدیث کی تحقیق و تعلیق کے سب سے زیادہ حقدار ہیں، وہ ایسے یکتائے زمانہ ہیں جنھوں نے خود کو تیار کیا اور اللہ نے ان کو اس دین کی تجدید کے لئے مہیا فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے مصداق جس میں انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر سو سال پر ایک ایسا

شخص پیدا کرے گا جو اس امت کے لئے دین کی تجدید کرے گا)

شیخ عابد فاسی کے دل میں علامہ اعظمی کی قدر و منزلت کس قدر تھی، اس کا اندازہ ایک اور خط سے لگایا جا سکتا ہے جو غالبا کسی ایسے خط کے جواب میں ہے جس میں علامہ اعظمی نے مغرب کے سفر کے ارادہ کا اظہار فرمایا تھا، یہ خط ۹؍ رمضان ۱۳۹۳ھ مطابق ۷؍ اگست ۱۹۷۳ء کا تحریر کردہ ہے، خط طویل ہے، ہم اس کا ایک ٹکڑا نقل کر رہے ہیں:

" فضيلة الأستاذ العلامة المحدث الكبير مولانا حبيب الرحمن الأعظمي ... وإنه ليوم سعيد ذلك اليوم الذى تشرق فيه شمسكم المنيرة على هذه الأرجاء، وسيكون منزلى الخاص مركزاً لاقامتكم أثناء تجوالكم العلمى بهذه الديار فلتعزموا على بركة الله. "

(وہ دن نہایت مبارک ہوگا جس دن آپ کا مہر درخشاں ان اطراف میں طلوع ہوگا، اس وقت میرا اپنا مکان آپ کے اس دیار کے علمی سفر کے دوران آپ کی قیام گاہ ہوگا، لہذا آپ اللہ کی برکت کے بھروسے ارادہ فرمالیجئے۔)

شیخ علوی بن عباس مالکیؒ مکہ مکرمہ کے نہایت جید اور بلند پایہ عالم تھے، حرم شریف کے اندر حلقۂ درس قائم کیا کرتے تھے، حرم پاک میں جب آپ کی مجلس درس وافادہ سجتی تو اس وقت اطراف و آفاق سے آنے والے اہل علم بھی آپ کے چشمۂ علمی سے سیراب ہوتے، استدلال واحتجاج کی قوت، پرزور بیان، فصاحت و بلاغت، وفور علم اور وسعت مطالعہ آپ کے درس کی نمایاں خصوصیات ہوا کرتی تھیں، علم وفن میں مہارت کے ساتھ بڑے صاحب صلاح و تقویٰ بزرگ تھے، علامہ اعظمی نے ان کی نسبت اپنی یادداشت میں لکھا ہے:

"كان رحمه الله من المروءة والوفاء بمكان، بشوشا، دائم البشر، عالما مكينا، يحب العلم وأهله يتزيا بزى أهل الصلاح ويسلك مسلك أهل التقوىٰ. "

(مرحوم انسانیت اور وفا شعاری میں بلند مقام کے حامل تھے، بشاش بشاش، خندہ رو اور زبردست عالم تھے، علم اور اہل علم سے محبت رکھتے تھے، نیکو کاروں کا لباس پہنتے اور متقیوں کی راہ پر چلتے تھے۔)

شیخ علوی مالکی سے تعارف ان کے ساتھ ملاقات اور ربط و تعلق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

" استمعت لدرسه ولم أجلس فى الحلقة ، فوجدته ذا عارضة قوية ومنطق فصيح فى أول قدمة قدمتها مكة ثم زرته فى بيته فى سنة ١٩٦٥م فأكرمنى وأتحفنى ببعض تاليفاته، ثم زرته ثانيا فى سنة ١٩٧١م وزارنى فى تلك السنة فى بيت الشيخ النمنكانى بالمدينة المنورة مع الشيخ حسن المشاط وولده محمد فبالغ فى إكرامى وقبل جبينى وحثنى على إنجاز طبع المصنف لعبدالرزاق وكنت إذ ذاك أشرف على طبعه وأصحح ملازمه فى بيروت. "

(میں جب پہلی بار مکہ آیا تو حلقہ درس میں بیٹھے بغیر ان کا درس سنا تھا تو میں نے ان کو پر زور بیان اور فصیح گفتگو والا پایا تھا، پھر ۱۹۶۵ء میں ان کے مکان پر میں نے ان سے ملاقات کی تو انھوں نے میرا اکرام کیا اور اپنی کچھ کتابیں مجھے ہدیہ کیں، پھر میں نے ان سے دوبارہ ملاقات ۱۹۷۱ء میں کی اور اس سال انھوں نے بھی مجھ سے مدینہ منورہ میں شیخ نمنکانی کے گھر پر حسن مشاط اور اپنے صاحبزادے محمد علوی کے ساتھ ملاقات کی، اس وقت انھوں نے میرا مبالغہ آمیز حد تک اکرام کیا اور میری پیشانی کو بوسہ دیا اور مصنف عبدالرزاق کی طباعت کی تکمیل کے لئے میری حوصلہ افزائی فرمائی، حالانکہ اس وقت میں اس کی طباعت کی نگرانی اور بیروت میں اس کے فرموں کی تصحیح کا کام انجام دے رہا تھا۔)

حضرت علامہ اعظمیؒ نے شیخ علویؒ کے ساتھ اپنی آخری ملاقات اور اکرام واحترام

کا جو اشارہ کیا ہے، اس وقت علامہ اعظمی کے ہمراہ ان کے شاگرد مولانا اقبال احمد اعظمی مقیم لندن ملاقات کے وقت موجود تھے، انھوں نے اپنے مکتوب میں مزید وضاحت کی ہے لکھتے ہیں:

"شیخ علوی عباس مالکی رحمۃ اللہ علیہ کو بڑے علماء جانتے ہیں، وہ شیخ حسن مشاطؒ اور شیخ ابراہیم کردیؒ، کہنا چاہیئے کہ حرم پاک کے بلند پایہ علماء و محدثین کی آخری تین یادگاریں تھیں، ان تینوں کو حضرت مولانا (حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی) مدظلہ کی معیت میں ہی دیکھنے کی اس ناچیز کو بھی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ شیخ علوی جو "سید" بھی تھے مولانا سے لپٹے ہوئے ہیں اور بلک بلک کر رو رہے ہیں، اور کہتے جاتے ہیں:

"میں یقین دلاتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے راضی ہیں۔"

شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ برصغیر ہند و پاک میں کون ایسا ہوگا جو حضرت مولانا زکریا صاحب نور اللہ ضریحہ کی شخصیت ان کے نام اور کام سے واقف نہ ہوگا، آپ کے علم و فضل، فضائل و کمالات، زہد و پارسائی، تقویٰ و طہارت، مرتبۂ ارشاد و ہدایت سے ایک دنیا واقف ہے، مذکورہ بالا اوصاف میں سے حضرتؒ کا ہر وصف ایسا ہے جو پورے پورے باب کا موضوع ہے۔ شرح حدیث اور اس کی تصنیف و تالیف کے تو گویا آپ خاتمۃ الباب تھے۔

علامہ اعظمی کا آپ سے بڑا گہرا ربط و تعلق تھا، اور دونوں بزرگ ایک دوسرے کے قدرداں اور رتبہ شناس تھے، اوپر شیخ علوی مالکی کا جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے اسی سے مشابہ ایک واقعہ حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے، کہ مکہ مکرمہ میں علامہ اعظمی کی ان سے ملاقات ہوئی تو حضرت شیخ علامہ اعظمیؒ سے لپٹ کر رونے لگے اور دیر تک لپٹے ہوئے فرماتے رہے کہ آپ نے بہت بڑا کام انجام دیا اور اسلاف کا قرض اتار دیا۔

xxxxxxxxxx

گیارہواں باب

شاعری

گیارہواں باب

شاعری

انسان کی طبیعت کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، اور یہ رنگا رنگی ہر آدمی کے اندر کم وبیش پائی جاتی ہے، اس میں بڑے چھوٹے، عالم و جاہل اور شاہ و گدا کی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ زندگی کے مختلف مراحل وادوار ہوتے ہیں اور ہر دور کے الگ الگ تقاضے اور جداگانہ مطالبات، بڑے سے بڑا انسان ہو یا چھوٹے سے چھوٹا شخص اس کی زندگی کا رنگ ہمیشہ یکساں نہیں ہوتا، زمانے کی نیرنگی و بوقلمونی اس کی طبیعت و مزاج کو بہت کم ایک رنگ اور ڈھنگ پر رہنے دیتی ہے، گردش لیل و نہار کے ساتھ اس کے حالات و کیفیات میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، جذبات واحساسات میں انقلاب آتا رہتا ہے، زندگی کے معیار، زاویۂ نگاہ اور انداز فکر میں فرق آجاتا ہے۔ آج ایک چیز میں معنویت ہی معنویت نظر آتی ہے کل وہی چیز بے معنی بن جاتی ہے، ایک شے آج دلفریب نظر آتی ہے، وہی شے کل فریب نظر معلوم ہونے لگتی ہے، ایک فلسفہ آج سچا اور حقیقی قرار پاتا ہے، مگر کل وہی فلسفہ نقش بر آب ثابت ہوتا ہے ۔ غرض اس اتار چڑھاؤ، نشیب و فراز اور دھوپ چھاؤں کا سلسلہ صبح و شام جاری رہتا ہے، آدمی کا ذہن اس تغیر و تبدل اور کشاکش حیات سے متاثر ہوتا ہے، اور اس قبولیت اثر کے بعد اپنے جذبات واحساسات اور انفعالات کے اظہار کے لئے مختلف ذرائع اپناتا ہے، جن میں ایک بڑا ذریعہ شاعری ہوتی ہے۔

اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے کہ انسان زندگی کی یکسانیت اور یکرنگی سے اکتا جاتا ہے، زندگی کی یکساں رفتار اسے کھلنے لگتی ہے، ہمہ وقتی مشغولیت، اور ہجوم اشغال و

کثرت کار اس کے اوپر شاق گذرنے لگتی ہے، ایسے میں ترویح نفس کے لئے شاعری کا سہارا لیتا ہے، اس کی مثال اس مسافر کی سی ہوتی ہے جو چلچلاتی دھوپ میں راستہ چلتے کسی درخت کے سائے میں سانس لینے کے لئے تھوڑی دیر ٹھہر جاتا ہے، سانس برابر ہوئی نہیں کہ پھر اپنے راستہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔

علامہ اعظمی کی شاعری میں نہیں سمجھتا کہ محض شعر گوئی کے واسطے رہی ہو، میرا یقین ہے کہ انھوں نے اشعار کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہو کر کہے ہوں گے، مگر ساتھ ہی اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ طبیعت نہایت موزوں پائی تھی، کہ اگر سخن سنجی میں بھی کچھ زیادہ طبع آزمائی کی ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ اس میں بھی کمال پیدا کر کے نام آور ہوتے۔

علامہ اعظمی کا جو منظوم کلام دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گیا ہے، جب ہم اس پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں اشعار نظم کئے اور متعدد صنف سخن پر طبع آزمائی کی۔ اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ شاعری کا شوق ان کے اندر کم عمری ہی سے پلتا اور پروان چڑھتا نظر آتا ہے۔ سخن سنجی اور سخن فہمی دونوں آپ کے اندر بدرجۂ کمال موجود تھیں، چنانچہ مذکورہ بالا تینوں زبانوں کے بے شمار منتخب اور چیدہ اشعار حافظہ میں محفوظ تھے، کسی اور کا کیا ذکر! خود ہمارا مشاہدہ ہے کہ دیوان حماسہ پڑھاتے وقت جب کہ آپ کا سن پچاسی برس تھا، حماسہ کے اشعار یوں پڑھتے جیسے پوری کتاب حفظ ہو، اور شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ کوئی شعر پڑھتے وقت کسی حرف بلکہ زیر زبر کا فرق پڑا ہو۔

یوں تو شعر گوئی کا ذوق و ملکہ طبعی اور فطری تھا، مگر آپ نے اس صلاحیت سے نہ بہت زیادہ کام لیا اور نہ ہی اس کو فروغ دینے کی کوئی خاص کوشش کی، کبھی کسی موقع سے طبیعت کچھ ہموار اور موزوں ہوئی اور کچھ اشعار ذہن میں آگئے تو کاغذ کے کسی ٹکڑے پر نقل کر دیا، ورنہ وہ اہتمام بھی نہیں، اور نقل و تحریر کے بعد بھی حفاظت کی کچھ خاص فکر نہیں، رہ گیا تو رہ گیا ورنہ حوادث دہر کی نذر ہو گیا۔ بہر حال ان کے پریشان اوراق میں کچھ

بکھرے ہوئے ٹکڑے ہاتھ آگئے، جن کو مرتب کرنے کے بعد ایک مختصر سا مجموعہ کلام ترتیب پا جاتا ہے، جو اختصار کے باوجود ہمارے لئے نہایت بیش قیمت شے ہے، کہ اس سے علامہ اعظمی کی شخصیت ایک نئے انداز اور نئی سج دھج کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے، اور ان کے کمال و ہنر کے ایک اور اہم عنصر سے پردہ اٹھتا ہے۔ لیکن یہاں آپ کے کلام کا استقصا مقصود نہیں ہے، صرف نمونہ دکھلا دینا ضروری ہے۔

فن شاعری اور اس کے عیب و ہنر سے واقف اور ردیف و قوافی کے اسرار و رموز سے پوری طرح آگاہ تھے، اوزان و بحور کی پوری معرفت حاصل تھی، اور اپنے اشعار میں اس کی خصوصی رعایت برتتے تھے۔ سید سلیمان ندویؒ کے انتقال کے بعد اس حادثہ سے متاثر ہو کر چند اشعار نظم کئے، جسے اشاعت کے لئے قاضی اطہر صاحب مرحوم کے پاس بمبئی بھیجا، قاضی صاحب اس وقت انقلاب کے مدیر تھے، وہ نظم جب قاضی صاحب نے دیکھی تو غالباً اسے وزن سے ساقط سمجھ کر اس میں تصرف کر کے شائع کیا، علامہ اعظمی نے جب اس کو چھپی ہوئی صورت میں دیکھا ہو گا تو عجب نہیں کہ سخت دھچکا لگا ہو، چنانچہ انھوں نے قاضی صاحب کے پاس تحریر فرمایا:

"آپ کے "تصرفات" کی نسبت گذارش ہے کہ اصلاح اگر موجہ ہو تو میں صرف خوش نہیں بلکہ شکر گذار بھی ہوتا ہوں، مگر آپ نے اپنے تصرفات کی کوئی وجہ نہیں لکھی، میں نے یہ وجہ سمجھی ہے کہ آپ نے اس نظم کو مثنوی مولانا روم کے وزن پر بحر رمل مسدس محذوف میں خیال کیا، اس لئے جو مصرعے وزن سے گرتے تھے، آپ نے اس وزن پر بنا ڈالا، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، میری نظم قران السعدین، مخزن اسرار، مطلع الانوار اور سبحۃ الابرار کے وزن پر بحر سریع مطوی موقوف سے ہے، جس کا عروض و ضرب مختلف یعنی ایک مطوی مکسوف (فاعلن) اور دوسرا مطوی موقوف فاعلان ہو سکتا ہے، اس بحر میں یہ بات ہوئی ہے، اس کے بعض شعر یا مصرعے بحر رمل بھی پڑھے جا سکتے ہیں، جیسے

مولانا جامیؒ کے یہ اشعار

(۱) زفتن او جستن تیر از کماں — جستن او جحت طے مکاں

(۲) توبہ دہ از سرکشی ایام را — باز خراز ماخوشی اسلام را

(۳) دیدۂ عالم بتو روشن شود — گلخنِ گیتی بتو گلشن شود

(۴) ظلمت بدعت ہمہ عالم گرفت — بلکہ جہاں جامۂ ماتم گرفت

مصرعہ اولی بحر رمل میں پڑھا جا سکتا ہے۔

(۵) چوں نہ بزرگستِ وشر عش سخن — منبر او برسر او خورد کن

اس میں صرف مصرعہ ثانیہ بحر رمل مین پڑھا جا سکتا ہے ، حالانکہ سبحۃ الابرار جامی بحر سریع میں ہے اور اس کا پہلا مصرعہ "ہست صلائے بر خوان کریم" ہے اور اسی مثنوی کا یہ مشہور شعر ہے

اے مبرا پردۂ یثرب بخواب — خیز کہ شد مشرق ومغرب خراب"(۱)

اس بحث کے بعد اسی مکتوب میں قاضی اطہر صاحب کی ایک عربی نظم میں کچھ اصلاحات فرمائی ہیں، قاضی صاحب خود بھی سخن فہم و سخن سنج تھے، انھوں نے علامہ اعظمی کی اس اس خالص فنی تنقید کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور ۳۰ر دسمبر ۱۹۵۳ء کے "انقلاب" میں "ایک علمی اور ادبی مکتوب گرامی، بحر سریع اور بحر رمل کی ناقدانہ تشریح" کے عنوان سے شائع کیا، یہ نظم ناظرین صفحہ ۶۲۳ پر ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

اوپر عرض کر چکا ہوں کہ شاعری کا جوہر متعدد اصناف میں دکھایا ہے، لیکن غزل، مرثیہ اور نعت کو نمایاں حیثیت حاصل ہے، اسی طرح مادۂ تاریخ کے استخراج پر بھی قدرت حاصل تھی، اور بہت سی اہم شخصیات کی وفات اور بعض اہم واقعات کی تاریخ نکالی ہے، کلام کا کچھ حصہ ایسا بھی ملتا ہے جس میں دوسرے شعراء کی زمینوں کو استعمال کیا ہے، اور ان میں اپنی قوت تخئیل اور زور بیان سے خاصہ اضافہ کیا ہے۔

(۱) روزنامہ انقلاب ۳۰ر دسمبر ۱۹۵۳ء

شاعری کا سب سے بڑا اور اہم عنصر جذبات واحساسات ہوتے ہیں۔ شاعر کے جذبات میں جس قدر قوت، شدت اور تیزی ہوگی، اس کے اشعار اتنے ہی پر اثر، چست اور دل کو چھولینے والے ہوں گے۔ علامہ اعظمی کے جذبات واحساسات چونکہ ان کے عقل و ادارک سے مغلوب رہا کرتے تھے، اس لئے ممکن ہے کہ ان کی شاعری میں تاثیر کی وہ شدت نہ ہو جو تند و تیز جذبات کی پیداوار ہوتی ہے، اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کی شاعری فن کی بلندی کو چھولینے والی ہوگی، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض چیزیں انھوں نے لاجواب کہی ہیں۔

رہا سوال تخلص کا؟ تو انھوں نے مختلف اوقات میں متعدد تخلص استعمال کئے، ابتداءً انھوں نے اپنے تاریخی نام کا جزءاول "اختر" کا لفظ استعمال کیا۔ اس کے بعد اپنا تخلص "شوق" چنا، اور اس نام سے نہ صرف نظمیں اور غزلیں بلکہ متعدد مضامین بھی لکھے، اور آخر عمر میں جو چند نعتیں کہیں ان میں اپنے نام "حبیب" کا استعمال کیا۔

نعتیہ شاعری

جس طرح توحید کے ساتھ رسالت پر ایمان لائے بغیر آدمی مومن نہیں ہو سکتا اسی طرح کمال ایمان کے لئے حب نبیؐ بھی شرط ہے، اور یہ محبت ایسی ہو کہ تمام دنیوی علائق اور محبتوں پر فائق ہو، بحکم ارشاد نبوی " لا یؤمن أحدکم حتی أکون أحب الیه من والده وولده والناس أجمعین " (تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد، اس کے لڑکے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں)

حب نبی مومن کے لئے توشۂ آخرت ہے، بشرطیکہ یہ محبت شریعت کی قائم کردہ حدود تک محدود ہو، اور اس میں غلو اور افراط سے کام نہ لیا جائے کہ نبوت ورسالت کے درجہ سے اٹھا کر مقام الوہیت تک پہنچا دیا جائے، جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ ع

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

علامہ اعظمیؒ کو احادیث نبویہ کے ساتھ جو غیر معمولی شغف وشیفتگی اور ذات رسالتمآب علیہ الصلاۃ والسلام کے ساتھ جو والہانہ محبت تھی وہ نہ مخفی ہے نہ محتاج بیان۔ یہ وفور عشق اور کمال محبت تھا کہ تقریباً تین چوتھائی صدی حدیث نبوی کی خدمت، اس کی اشاعت اور اثبات حجیت میں گذار دیئے، اپنی اس محبت اور والہانہ پن کا اظہار متعدد نعتوں میں بھی کیا ہے، جن میں سے ایک جو زمانۂ آغاز کی ہے، درج ذیل ہے:

نعت میں رطب اللساں ہے احمد مختار کی — دھوم ہو کیونکر نہ میرے خامۂ دربار کی
ہو غلامی کا مجھے تمغہ عطا روحی فداک — عزت افزائی ہو اتنی شاعر دربار کی
کھاتی تھی موج ضلالت کے تھپیڑے دمبدم — آپ نے آکر سنبھالا اور کشتی پار کی
جس نے دیکھا ہو گیا وہ کشتۂ تیغ ادا — کیا ضرورت آپ کو خنجر کی اور تلوار کی
اک نگاہ لطف سے دیکھا جہاں سرکار نے — بھر گئی جیب مراد اس اختر نادار کی

ایک اور نعت پاک میں اپنی فداکاری اور جاں سپاری کا تذکرہ کیا ہے، جس کا پیرایۂ بیان بھی اوپر ذکر کی گئی نعت ہی کی طرح سادہ اور سہل ہے، وہ یہ ہے:

مرے ماں باپ مری جان رسول عربی ترے صدقہ ترے قربان رسول عربی

ہر ادا پر تری اور سنت بیضا پہ تری میں ہوں جان سے قربان رسول عربی

آرزوئے دل بیتاب ہے مدت سے یہی بنوں میں آپ کا مہمان رسول عربی

صرف اک تیری غلامی و محبت کے سوا مغفرت کا نہیں سامان رسول عربی

مدعا ہے کہ رہے آپ کا ذکر محمود ورد ہر لحظہ و ہر آن رسول عربی

شوقؔ پر اک نظر لطف و کرم ہو شاہا! آپ کا ہے یہ ثنا خوان رسول عربی

یہ دونوں بالکل ابتدائی دور کی ہیں جو نمونہ کے طور پر ذکر کر دی گئی ہیں، بعد میں آپ نے جو نعتیں کہیں ان میں درج ذیل نعت میں غزوۂ بدر و فتح کے آثار و نتائج میں فرق، سر تاج انبیاء اور دیگر انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے مقامات کے تفاوت اور حدیث نبوی کے جانفزا، روح پرور اور سکون بخش ہونے کو کس خوبی، صفائی اور بلیغ انداز میں ثابت کیا ہے:

وہ جہاں کا رمز وجود ہے، وہ مدارِ کارِ نظام ہے
وہ خدا کی شان جمال کا بخدا کہ مظہر تام ہے
کرو یاد معرکہ بدر کا، پڑھو فتح مکہ کا واقعہ
وہ خدا کا قہر و جلال تھا یہ نبی کی رحمت عام ہے
سبھی انبیاء کرام کا ہے مقام سب سے بلند تر
وہ ہلال چرخ کمال تھے مرا شاہ بدرِ تمام ہے
جو غذائے روح و سکونِ دل ہے انھیں کی پاک حدیث ہے
جو مریض دل کے لئے شفا ہے انھیں کا پاک کلام ہے
جو مجھے ملا وہ ملا انھیں کی نگاہِ لطف و کرم سے ہے
قلم و زبان حبیب کیا ہے انھیں کا فیض دوام ہے

علامہ اعظمی کی نعت گوئی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بعض تاریخی واقعات کا کہیں اشارے کنائے میں اور کہیں بتصریح نہایت صفائی اور عمدگی کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، اس کی ایک مثال اوپر غزوۂ بدر اور فتح مکہ کے ذکر میں دیکھ چکے ہیں، ایک اور نعت میں مشہور صحابیٔ رسولؐ حضرت عبداللہ بن سلامؓ جو ایک بڑے یہودی عالم تھے، کے قبول اسلام کے واقعے کو بہترین پیرایہ میں موزوں کیا ہے، اور عشق رسولؐ کے ساتھ خلفاء راشدین اور جملہ صحابۂ کرامؓ کی محبت و عقیدت پر ایمان و تصدیق کی مہر ثبت کی ہے، اور اہل بیت کے لفظ کے مصداق کو واضح کیا ہے، جس سے شیعوں کے عقائد پر تعریض اور ان کا بلیغ رد بھی ہے، اس کے اندر اپنے اسفار کے محرک اور مقصد پر بھی روشنی ڈالی ہے جو بہت بصیرت افروز ہے:

میں والہ و شیدا ہوں نبی عربیؐ کا — مکی، مدنی، ہاشمی و مطلبی کا
ایماں ہے میرا زمزمہ خواں صدر خلافت — صدیقؓ، عمرؓ، حضرت عثمانؓ و علیؓ کا
ہیں بیت کا مصداق نساء اقدم و اول — اور ثانوی ہے اہل عبائے نبوی کا
جو آنکھیں تھیں انوار نبوت سے منور — خاکِ کفِ پا ہوں میں ہر اک شیخ وصبی کا
بیروت و کویت اور حلب میں نہ کشش تھی — یہ جاذبہ تھا حبِ حدیثِ نبوی کا
ہے خُلق بنیٔ خاصۂ ختم رسالت — دنیا میں علم لے کے اٹھو خُلق نبیؐ کا
کتنی اثر انگیز تھی ہجرت کی وہ تاریخ — بس تین ہی فقرے کا تھا یہ خطبہ نبیؐ کا
تھے ابن سلامؓ اک بڑے ذی علم یہودی — موجب ہوا اسلام کا یہ خطبہ نبیؐ کا
آمد کی صدا کانوں میں اک نخل پہ آئی — بے خوف و خطر کو دے سنا کلمہ نبیؐ کا
کھلواؤ مساکین کو پھیلاؤ سلام آپ — اٹھ جاؤ کہ جب غلبہ ہو خواب سحری کا
چہرے پہ نظر پڑتے ہی بے ساختہ بولے — ممکن نہیں یہ چہرہ ہو کذاب شقی کا

اس انس و تعلق کی بنا پر ہوں پر امید
دیوانہ ہوں مدت سے حدیث نبوی کا

مذکورہ بالا نعت اس وقت کہی گئی تھی جب آپ پر دل کا شدید ترین دورہ پڑا تھا، اس وقت موت وزیست کی کیفیت سے دوچار اور سخت ترین اذیت میں مبتلا تھے، اس وجہ سے اس کا ہر شعر اور ہر مصرعہ ان کے دل کی آواز اور قلب کی گہرائیوں سے نکلا ہوا ہے۔

محرم ۱۴۰۰ھ میں آخری سفرِ حج کے موقع پر فرائضِ حج سے فراغت کے بعد آپ مدینہ منورہ پہنچے، وہاں سے جب روانگی کا وقت قریب آیا اور واپسی کے لئے سواری پر سوار ہوئے تو بے ساختہ آپ کی نگاہ روضۂ اطہر (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) کی طرف اٹھ گئی پھر اس طرح جمی کہ ٹکٹکی بندھ گئی، جدائی کی شدت غم سے آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا، آنکھوں سے وہ قطرے بکھر رہے تھے جو عقیق و مروارید سے زیادہ قیمتی تھے، اس کیفیت میں ایک قطعہ اور ایک فارسی نعت موزوں ہوئی، جس میں کسی فارسی شاعر کی زمین استعمال کی گئی ہے، وہ قطعہ اور نعت شریف دونوں حاضر ہیں:

قطعہ

شکرانۂ مولائے نعم پہلے ضروری تھا مقصود سفر ورنہ یہ بقعۂ نوری تھا
صد شکر کہ حاصل ہوا اب قربِ حضوری اب دل میں نہیں بالکل جو شکوۂ دوری تھا

نعت شریف

زاستانت باسر اشک غم بیادت می روم بادلِ صد چاک و باصد یاس و حسرت می روم
گر توانستم نمی بودم زپائے تو جدا می روم لیکن بقصد و عزم عودت می روم
می روم سوئے وطن وز دردِ دل بے اختیار نالۂ دارم کہ می گوئی بہ غربت می روم
یا رسول الله جئنا إذ ظلمنا فلنجد ربنا باہر دو وصف ختم آیت می روم
أنعِشَنْ إیاہ یا مولی الحبیب الاعظمی
خستہ افتادہ نماید چوں زکویت می روم

نعت گوئی کا ذکر چل پڑا، تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں علامہ اعظمی کی قادر الکلامی کا ایک اور نمونہ ذکر کر دیا جائے، جس کو آپ نے اقبال سہیل کی شہرۂ آفاق نعت "موجِ کوثر" سے متاثر ہو کر نظم فرمایا ہے، جو نعتیہ مضمون کے سوا اقبال سہیل کو ان

کے اس شاہکار پر خراج تحسین بھی ہے، اس میں وہی بحر اور ردیف و قافیہ استعمال ہوا ہے، جو "موج کوثر" کا ہے اور اسی جیسی صفائی و ستھرائی اور سلاست و روانی ہے، اس پر آپ نے ایک مختصر سا نوٹ بھی لکھا تھا جو بعینہ پیش خدمت ہے، لکھا ہے:

"مدرسہ مفتاح العلوم۔ مئو

۲۸/ فروری ۱۹۴۴ء

مکرم! السلام علیکم، آپ کی تازہ نعت نبوی اتفاقیہ ایک صاحب سے مل گئی، اس کو پڑھ کر میں اتنا محظوظ ہوا کہ بے ساختہ چند شعر موزوں ہو گئے، اب میں نہ شاعر ہوں نہ یہ شاعری ہے، بلکہ میرے تاثرات ہیں جو موزوں ہو گئے ہیں۔

اے اقبال! اے شاعر ملت! نازش قوم اور فخر جماعت!
مدح نگار مرسلِ خاتم، صلی اللہ علیہ وسلم

لکھی تو نے کتنی سچی، کتنی بلند اور کتنی پیاری
نعتِ حضرتِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

اس نے روحوں کو گرمایا، جوش عقیدت اس نے بڑھایا
سب کی زبانوں پر ہے پیہم صلی اللہ علیہ وسلم

تجھ کو مبارک مدح نگاری، تجھ پر سایۂ رحمت باری
تجھ سے راضی ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم

إنك إن تقرءه عليه يوم المحشر حين تراه
أرجو منه أن يتبسم صلى الله عليه وسلم

اس آخری شعر میں اقبال سہیل کو جس انداز سے داد تحسین دی گئی ہے، ان کی اس کاوش فکر کے لئے اس سے بہتر داد نہیں ہو سکتی، اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اس کو حشر کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھو گے، تو مجھے امید ہے کہ اس کو سن کر آپ بھی مسکرا دیں گے۔

غزلیات

علامہ اعظمی کے اندر شاعری کا ذوق وملکہ چونکہ فطری تھا، اور طبیعت بھی موزوں پائی تھی، اس لئے اس کا چسکا بھی آغاز شباب بلکہ کم سنی ہی سے لگ چکا تھا، اور مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کرنے لگ گئے تھے، ابتدائی دور کی آپ کی شاعری کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ اگر اپنی توجہ پوری طرح علمی کاموں کی طرف صرف نہ کر دی ہوتی، اور تھوڑا بہت تعلق شعر گوئی سے بھی رکھتے تو کچھ عجب نہ تھا کہ ایک بڑے اور استاد شاعر کی حیثیت سے نام پیدا کرتے، لیکن قدرت کو چونکہ اپنے دین اور علم حدیث کی عظیم الشان خدمت لینا مقصود تھا، اس لئے اس کی طرف سے آپ کی توجہ قدرتی طور سے دور ہوتی گئی، یہاں تک کہ ایک شاعر کی حیثیت سے آپ بالکل غیر معروف رہے، اور اس راہ سے آپ کا کچھ تعارف ہوا بھی تو صرف نعت گو کے طور پر جب کہ عہد شباب میں آپ نے بہت سی غزلیں بھی کہیں ہیں۔ یہ سب ابتدائی دور کی ہیں، جن کو ہم نمبروار اور جن کی تاریخ معلوم ہے ان کی تاریخ کے ذکر کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

(۱)

یہ غزل اس وقت کی ہے جب ابھی آپ طالب علمی کے عہد میں تھے، اور مظہر العلوم بنارس میں مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی کے دامن تربیت سے وابستہ تھے، جیسا کہ تاریخ خود آپ نے درج فرمائی ہے۔

بنارس یکم مئی ۱۹۱۹ء ۲۹/ ذی قعدہ ۱۳۳۶ھ

کسی کا چہرۂ تاباں ہے مطلع انوار — ہے بڑھ کے چرخ چہارم سے آستانۂ یار

کچھ ایسی چھیڑ رہی مجھ سے چرخ ظالم کو — کہ باغ حسن کی اک پل نہ دیکھنے دی بہار

ہوا اثر ہے یہ جادوئے چشم فتاں کا — رہے نہ قابو میں ہوش وحواس وصبر و قرار

کسی کی زلف کی پھیلی ہوئی ہے یہ خوشبو
کہ ہوگیا ہے بنارس بھی خطۂ تاتار
جو بت کہ ہوادب آموز ہندو کالج میں
بھلا وہ جام شرارت سے کیوں نہ ہو سرشار
جو وہ ہے شوخی میں یکتائے روزگار اختر
تو اس سے شوخی میں کچھ کم نہیں مرے اشعار

(۲)

بنارس یکم ستمبر ۱۹۱۹ء مطابق ۱۳۳۷ھ

کیسی اس نام میں واللہ درخشانی ہے
روشن اس سے ہی مسمّی کی بھی زیشانی ہے
لوگ تو کہتے ہیں وہ ثانی کنعانی ہے
پر میں کہتا ہوں کہ وہ یوسف لاثانی ہے
آپ کے گیسوئے شبگوں کا ہے سودا وہ شے
جس کے ہاتھوں ہوئی ایک خلق ہی دیوانی ہے
آب کیا چہرہ پہ ہے اس بت شعلہ رو کے
معجزہ ہے کہ جہاں آگ وہیں پانی ہے
دیکھ کر تابش دندان صفا خیز تری
غرق دریائے خجالت دُر عمانی ہے
قدرداں بول اٹھے سن کے کلام اختر
کوئی اعجاز ہے یا طرز سخن دانی ہے

(۳)

جمادی الاولیٰ ۱۳۳۸ھ
جنوری ۱۹۲۰ء

نہ دو رقیب کو بوسہ مجھے دکھا کرکے
ملے گا کیا کسی بے کس کا جی کڑھا کر کے
کئے کی اپنے سزا پائی دل لگا کر کے
جنوں نے مجھ کو پھرایا برہنہ پا کر کے
اڑائے اپنے گریباں کی دھجیاں گل بھی
جو نکلو سیر کو زیب بدن قبا کر کے
کلیجہ بلبل شیدا کا پھٹ پڑے نہ کہیں
چمن میں آؤ نہ بند قبا کو وا کر کے
گلے میں ڈال دیں باہیں جو شوق میں آکر
تو بولے دیکھنا صاحب ذرا بچا کر کے
مرید پیر مغاں خود بھی ہو گئے جا کر
گئے تھے شیخ جی کیا کرنے، آئے کیا کر کے

(۴)

۱۸ر دسمبر ۱۹۱۹ء

بزم طرب میں یکسو چھڑا تار ساز تھا — شمعوں پہ ایک عالم سوز و گداز تھا
موجوں کی زد سے ماہ عرب نے ہٹا لیا — جب معرض خطر میں ہمارا جہاز تھا
ہم کو بھی اک زمانے میں اے شیخ معتکف! — مسجد سے انس دل میں فراق نماز تھا
حوریں بھی سیر عالم بالا میں دیکھ لیں — نہ یہ ادا، نہ غمزہ، نہ عشوہ، نہ ناز تھا
ہم کیا دکھائیں جودت طبع رسا کی حیف — اب وہ دماغ ہی نہ رہا جس پہ ناز تھا
بہر جنازہ ٹوٹ پڑے ہیں ملائکہ — اختر بھی کوئی متقی پاکباز تھا

(۵)

راز دل کا نہیں رہ سکتا ہے پنہاں کوئی — رہے ہر وقت جب انگشت بدنداں کوئی
زلف کافر کے تطاول کا یہی حال ہے جب — کہیں ڈھونڈھے سے ملے گا نہ مسلماں کوئی
میں نے مانا کہ تو مردوں کو جلاتا ہے مسیح — ہے ترے پاس مرے درد کا درماں کوئی
حسن کو ان کے مرے عشق نے چمکایا ہے — بھولے ہرگز نہ میرے عشق کا احساں کوئی
قیس عامر ہو کہ فرہاد ہو یا اور کوئی — نہیں اختر کی طرح سوختہ ساماں کوئی

(۶)

ملتا نہیں تم سا حسیں یار ہمیشہ — ملتے نہیں ہم سے وفادار ہمیشہ
کرتا ہوں جو دندان صفا خیز کی تعریف — رہتا ہے قلم میرا گہر بار ہمیشہ
اے دل! نہ کہا تھا نہ اٹھانا غم الفت — آرام میں رہتے ہیں سبکسار ہمیشہ
دنیا میں ملال اور خوشی دونوں ہیں توأم — ہے باغ میں ہم پہلوئے گل خار ہمیشہ
واعظ نے کہا پی کے جب آیا وہ مزے میں — آباد رہے خانۂ خمار ہمیشہ
کہتا ہوں کہ کب تک یہ ستم ڈھاؤ گے صاحب — کہتا ہے خفا ہو کے جفاکار ہمیشہ

(۷)

بچائے حق ترے تیر نظر سے
کہ دل کو توڑ کر گذرا جگر سے

بچائے دل بت جادو نظر سے
ہے باہر حد امکان بشر سے

نہ کیوں خالی ہو آہ اپنی اثر سے
شروع عشق ہے ماہ صفر سے

جگادے مے کے چھینٹوں سے کہ ساقی
صبوحی کش پڑے ہیں بے خبر سے

اگر ساقی اٹھائے آنکھ مستو!
شراب ناب بھی گردوں سے برسے

نہیں معلوم کیا گذری الٰہی
ابھی لوٹا نہیں قاصد ادھر سے

یہاں رہتے ہو کیوں کر قبر والو!
نہیں ہوتی ہے وحشت اس کھنڈر سے

درِ میخانہ پر اے حضرت شیخ!
بتائیں آپ آتے ہیں کدھر سے

جمال یار دیکھا تم نے موسیٰ
پڑے ہو جلوہ گہہ میں بے خبر سے

نسیم صبح تنکے چن رہی ہے
کوئی آنے کو ہے اس رہ گذر سے

قضا کی تیغ ہے تیغ ادا بھی
نہیں رکتا ہے وار اس کا سپر سے

خلش نوک مژہ کی ہے قیامت
بہت بے چین ہوں دردِ جگر سے

قیامت ہے رہیں ہم سے کشیدہ
رقیبوں سے ملیں شیر و شکر سے

نمونہ حشر کا مقتل ہے اے ترک
صدائے الامان و الحذر سے

ہوئی شام جوانی زلف لیکن
گیا اس زلف کا سودا نہ سر سے

در مضموں پروئے تو نے اختر
ترے اشعار ہیں سلک گہر سے

(۸)

مصرح طرح :۔ بہت بے چین ہوں درد جگر سے

مجھے وحشت ہوئی دیوارودر سے
گیا صحرا کو میں دیوانہ گھر سے

نکل آیا ہے طفل اشک گھر سے
نہیں واقف ہے تکلیف سفر سے

میں صحرا میں ہوں گھر پر میری حسرت لپٹ کر روتی ہے دیوار و در سے
مری وحشت یہی کہتی ہے مجھ سے کہ جا کر توڑ سر اس سنگ در سے
چمن میں دامن گل پارہ پارہ ہے دست اندازیٔ باد سحر سے
پہونچ جائے گا اڑ کر نامۂ شوق وہاں پہلے ہی مرغ نامہ بر سے
ہے نخل بارور نخل قد یار نہ دو تشبیہ سروِ بے ثمر سے
بتوں کے رخ پہ آب و تاب ہے کیا یہ منہ دھوتے ہیں کیا آب گہر سے
گئی ہیں آتشیں آہیں فلک پر نہ کیوں پانی کے بدلے آگ برسے
فرنگن کافروں کی زلف گویا یدِ قدرت نے دھوئی آب زر سے
صدائے مرغ سن کر وصل کی شب جگر میں ٹیس اٹھی پچھلے پہر سے
وہ سن کر ہو گئے بیتاب اے دل! نہیں خالی ترے نالے اثر سے
حباب آسا ہیں بحر عشق میں ہم خدا ہی ہے جو بچ جائیں بھنور سے
ہیں اس میں کشتۂ ناز بتاں دفن یہ ظاہر ہے مری لوح حجر سے
جمال و حسن میں اختر وہ عارض کہیں بڑھ کر ہیں خورشید و قمر سے

(۹)

باقی نہیں نشاں بھی میرے جسم زار کا کیا خاک مجھ کو ڈر ہو لحد کے فشار کا
روشن ہے ایک داغ دل داغدار کا جلتا نہیں چراغ ہمارے مزار کا
اب آسمان ٹوٹے گا کس پر کہ اے بتو! باقی نہیں نشان ہمارے مزار کا
اتنی کڑی تھی ہو گئی مدت پئے ہوئے ساقی ہے آج تک وہی عالم خمار کا
کالی بلا کوئی کہ شب غم ہے اے خدا! یا ماتمی لباس کسی سوگوار کا
آتی ہے بو شراب کی خاک مزار سے بیشک مزار ہے یہ کسی مے گسار کا

یوں بھیڑ عاشقوں کی ہے در پر ترے صنم
میلا لگا ہو جیسے کوئی ہر دوار کا

ششدر ہوئے ہیں آ کے نکیرین قبر میں
ملتا نہیں نشان مرے جسم زار کا

اختر گنا کیا ہوں میں تاروں کو صبح تک
اچھا یہ مشغلہ تھا شب انتظار کا

(۱۰)

لا ادھر ساقی یہ کیوں رکھی ہے پیمانوں میں
چھا گیا ابر، بہار آئی گلستانوں میں

اس قدر جوش جنوں ہے ترے دیوانوں میں
گھر میں ایک پاؤں ہے، اک پاؤں بیابانوں میں

ہے مرے قصۂ درد میں جو سوز و گداز
وہ نہیں کوہ کن و قیس کے افسانوں میں

رنج و غم میں نہیں اب کوئی کسی کا پرساں
نام کو بھی نہیں انسانیت انسانوں میں

پاسدار ان کا ہے دل کہنے کو ہے پاس مرے
سمجھوں اپنوں میں کہ سمجھوں اسے بیگانوں میں

محو ہیں لذت آزار میں آزار پسند
وہ نہیں جانتے کیا لطف ہے احسانوں میں

کیا ترا وحشیوں نے چاک گریباں دیکھا
ایک دھجی نہیں اب ان کے گریبانوں میں

ہوں وہ محروم ازل سوختہ اختر یا رب
شمعیں داغوں کی جلاتا ہوں شبستانوں میں

کیا مئے تند ہے میخانۂ مینائی کی
میں ہوں اختر اسی خمخانے کے مستانوں میں

(۱۱)

مدتوں سے نہیں دیکھا رخ زیبا تیرا
مگر آنکھوں کے تلے پھرتا ہے نقشہ تیرا

گرچہ دنیا میں حسینوں کی ہے تعداد بہت
مگر ان سب میں مجھے حسن ہے بھایا تیرا

چاہے کچھ رحم مرے حال پر کھایا کہ سنا
اختر زار کو تو ہو چکا سودا تیرا

(۱۲)

انتہا ہو گئی تغافل کی
مر گئے ہم تجھے خبر نہ ہوئی

ہے تو لیکن نظر نہیں آتی
یہ معما ہوئی کمر نہ ہوئی

اب لگے دیکھنے بچا کے نظر
نہ ہوئی آہ بے اثر نہ ہوئی

متحمل تمہارے جلووں کی
نہ ہوئی اف میری نظر نہ ہوئی

(۱۳)

بنارس ۱۹۱۸ء مصرع طرح: "یہ دل شیدا ہے محبوب خدا کا"

میں قائل ہوں تعشق کے مزہ کا
پر اس میں سامنا بھی ہے قضا کا

شب وعدہ تھی لیکن وہ نہ آئے
بہانہ مل گیا ان کو حنا کا

اڑا لے جاتی گر مجھ کو وہاں تک
بہت احسان تھا باد صبا کا

جو آئے ہو تو کچھ منہ سے تو بولو
ہے کیا یہ بھی کوئی موقعہ حیا کا

خدا حافظ ہے اس ظلمت کدہ میں
گدائے کوچۂ زلف دوتا کا

وہ بالی عمر وہ بھولی سی صورت
غضب اس پر کھلی رہنا قبا کا

مری باتوں پہ اب آنے لگے وہ
اثر شاید ہوا آہ و بکا کا

بتوں کا عشق اوروں کو مبارک
"یہ دل شیدا ہے محبوب خدا کا"

وہ بیٹھے رہ گئے مہندی لگا کر
نکالا خوب حیلہ دست و پا کا

مصور نے ہزاروں کوششیں کیں
نہ نقشہ کھنچ سکا ناز وادا کا

وہ بجلی کے تڑپنے کی گھڑی تھی
کہ عالم خندۂ دنداں نما کا

ہوئے اشعار کیا پر نور اختر
پڑا تجھ پر بھی کیا پرتو ضیا کا

مذکورہ بالا غزلوں میں کئی ایک پر اس کے نظم کرنے کی تاریخ بھی مذکور ہے، اس سے قارئین اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کلام ابتدائے عہد شباب یا زیادہ سے زیادہ بیس پچیس برس کی عمر تک کا ہے، اور یہی زمانہ میرے خیال میں علامہ اعظمی کی غزل گوئی کا زمانہ بھی ہے، اور زیادہ تر غزلیں اسی سن کی کہی ہوئی ہیں۔ اوپر جو غزلیں ہم نے ذکر کی ہیں ان کے علاوہ بھی آپ کے کاغذات میں متعدد غزلیں اور کچھ متفرق اشعار ملتے ہیں، چنانچہ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ مطابق نومبر ۱۹۱۹ء میں دیوبند میں ایک غزل کہی تھی، جس کے چند قابل ذکر اشعار پیش خدمت ہیں:

(۱۴)

نہ بھولی ہے نہ کبھی دل سے آہ بھولے گی
ادا کسی کے دبے پاؤں چپکے آنے کی

بجھی نہ گرمیٔ شوق ان کی سرد مہری سے — ہزار کوششیں گو اس نے کیں بجھانے کی
صبا کی چھیڑ پہ جھلا کے بول اٹھا غنچہ — یہ بار بار بری لت ہے گدگدانے کی
سمجھ سکیگا وہی میرے دل کی حسرت کو — جو تکتا رہتا ہو راہیں قضا کے آنے کی
ہے عشق بھی کوئی کمبخت لاعلاج مرض — اثر دعا نے نہ تاثیر کچھ دوا نے کی
کہاں میں اور کہاں دیوبند اے اختر — کشش نے کھینچ کے پہنچایا آب ودانے کی

کئی ایک غزل میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی مصرع طرح پر تضمین کرکے غزل کہی ہے، اسی طرح کی کوئی غزل غازی آباد کے کسی مشاعرہ کے لئے دسمبر ۱۹۱۹ء میں کہی تھی جس کا مطلع تھا:

نہ ہوتا غیر، ہم، تم اور چمن کی گلز میں ہوتی — گھٹا چھائی ہوئی حاضر شراب آتشیں ہوتی

اس غزل کے بھی کچھ اشعار قارئین کے ملاحظہ کے لئے ذکر کردینا مناسب سمجھتا ہوں

کسی مسجد میں ہم بھی بیٹھ کر ذکر خدا کرتے — جو تیری بات زاہد درخور صدق ویقیں ہوتی
تپِ غم میں ترے بیمار کو ہے تشنگی از بس — پئے جاتا ہے خون دل مگر سیری نہیں ہوتی
مسیحا گر علاج درد دل کرنا ہے کر دیکھو — مگر تدبیر اس میں کارگر کوئی نہیں ہوتی
جو آجاتا بت عیار میرے دم دلاسے میں — تو پھر ساری خدائی اپنی ہی زیر نگیں ہوتی
اگر گلشن میں ہوتا جاکے میں نکتہ سرا اختر — گل سوسن سے پیدا اک صدائے آفریں ہوتی

درج ذیل غزل ۱۰ رجب ۱۳۴۰ھ کی کہی ہوئی ہے، یہ بھی ایک مصرع طرح پر تضمین ہے، مصرع تھا: "اپنا دامن گل مقصود سے بھر جاتے ہیں":

جانب قتل گہ ناز اگر جاتے ہیں — تیرے جانباز لئے ہاتھ میں سر جاتے ہیں
آتے ہی محفل عشرت سے نہ اٹھوا ہم کو — دیکھ لینے دے ہمیں ایک نظر جاتے ہیں
ہوش اڑا دیتے ہیں عشاق کے اے رشک پری — ترے گیسو جو کبھی رخ پہ بکھر جاتے ہیں
دیکھئے مدرسۂ عشق کا اعجاز اے شیخ! — جتنے بگڑے ہوئے آتے ہیں سنور جاتے ہیں
بے کئے وعدے وفا کرتے ہیں اکثر اے دل — بارہا کرکے وہ اقرار مکر جاتے ہیں

دل سے جاتے ہوئے کہتا ہے خیال جاناں — تجھ کو اے درد مبارک ہو یہ گھر جاتے ہیں
دیر کا قصد تھا وحشت میں چلے سوئے حرم — ہم کو جانا تھا کدھر اور کدھر جاتے ہیں
شیخ کعبہ کو چلے جب تو کسی نے پھبتی — یہ کہی خوب کہ اللہ کے گھر جاتے ہیں
یہ ادا دیکھ کے کیونکر نہ کوئی مر جائے — لاش پر غیر کی کھولے ہوئے سر جاتے ہیں
آپ قائل ہی نہ تھے تیر نظر کے اے شیخ! — ہاتھ سے تھامے ہوئے آپ جگر جاتے ہیں
کون آتا ہے تری آنکھ کا شیدا اے شوخ! — پیشوائی کے لئے تیر نظر جاتے ہیں
ساتھ ہو لیتی ہے باد سحری اے اختر — ٹھنڈے ٹھنڈے وہ مرے گھر سے اگر جاتے ہیں

اور حسب ذیل غزل پر ۸/ رمضان ۱۳۴۰ھ کی تاریخ پڑی ہوئی ہے، اس میں کہیں کہیں ایک لفظ چھوڑ کر وہاں نقطے دئے ہوئے ہیں، ہم بھی انھیں نقطوں کے ساتھ اس کو نقل کر رہے ہیں، جو باذوق ہوں گے ان کی جگہ کو پر کر کے ان اشعار سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں:

بیتاب ہوں بیحد میں یارب مجھے دکھلا دے — ...کا وہ چہرہ جو چاند کو شرما دے
بیتاب تمنا ہوں، مشتاق زیارت ہوں — معشوق کے قدموں تک یارب مجھے پہنچا دے
بیکار زرودولت بے قدر شہنشاہی — ...کی الفت دے، ہاں عشق کا سودا دے
...ہوں پہلو میں ارمان نکلتے ہوں — وہ روز مبارک بھی آقا مجھے دکھلا دے
دل شوق میں بے چیں ہے، آنکھیں بھی ترستی ہیں — اے کاش کوئی کانوں تک ان کے یہ پہنچا دے
ہے حسن دیا ان کو، اور نازو کرشمہ بھی — یہ دین اسی کی ہے چاہے جسے داتا دے

غزل اور نعت کے علاوہ اور بھی متعدد چیزوں کو آپ نے اپنی نظموں کا عنوان بنا کر اپنے جوہر کا مظاہرہ کیا، آپ کے اوراق میں ایک نظم "سہرا" کے عنوان سے ملی، جس پر تاریخ ۳/ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۸ھ مئودرج ہے۔

تازہ پھولوں کا مبارک رخ انور سہرا — رہے اقبال کا نوشہ ترے سر سہرا

رفتہ رفتہ ہے نوشہ کے چڑھا سر سہرا — ایسی قسمت تری یہ تیرا مقدر سہرا
ہوں مبارک مرے نوشہ کو یہ تینوں چیزیں — حبذا شادی، و دید رخ دلبر، سہرا
اللہ اللہ یہ شرف اور یہ اوج اقبال — آسماں کرتا ہے تاروں کا نچھاور سہرا
مارے خوشبو کے مہک اٹھی ہے ساری محفل — کہیں کیونکر نہ کہ ہے رشک عنبر سہرا
ہے یہ اختر کی دعا بارگہ باری میں — لطف و رحمت کا پنہائے تجھے داور سہرا

رقیمہ ۳؍ جمادی الاولیٰ ۳۸ھ مئو"

ایک نظم میں مسلمانوں کی پستی، ان کے تخلف وادبار، غفلت ولاپرواہی، علم و عمل سے دوری اور بہت ساری دینی واخلاقی خامیوں پر خون کے آنسو بہاتے ہیں اور ان کو خواب گراں سے بیدار ہونے اور سعی و عمل کی نصیحت کرتے ہیں:

ارے او ننگ ہستی تجھ پہ یہ خواب گراں کب تک
نگاہ صاعقاں کی زد میں تیرا آشیاں کب تک
نشاں ہوشیاریوں کے تجھ میں پائے کیوں نہیں جاتے
رہیں گی باعث تخریب تیری سستیاں کب تک
پسند اتنا کیا ہے کس لئے قعر مذلت کو
رہے گا اس طرح گم کردہ نام و نشاں کب تک
ترے ہر کام کو کیوں اختلاف اتنا ہے کوشش سے
بھلا یہ تیری جدوجہد سے نا چاقیاں کب تک
تری راہ عمل سے دوری و بیگانگی کتنی
ترقی کی تگ و دو میں پس ہر کاروان کب تک
جمود اتنا تری ہستی میں برف آسا بھلا کیوں ہے
خمود آمیز بالآخر تری سرگرمیاں کب تک
کرے گا عقل کو رہبر نہ کب تک اپنے کاموں میں
رہے گا طفل مکتب بن کے وقف این و آں کب تک

نہیں ہوتی تجھے کیوں فکر اپنے آشیانے کی
ترقی کے نئے گلشن میں تو بے خانماں کب تک
ترے اس ضعف قومیت کی آخر کوئی حد بھی ہے
رقیبوں کی نظر میں تو پس ہر کارواں کب تک
بھلا علم و عمل سے مشورہ تو کیوں نہیں کرتا
جہالت کو بنا رکھے گا اپنا رازداں کب تک
کہاں تک تجھ کو نفرت درسگاہ علم و حکمت سے
کریگا ہوٹلوں میں بیٹھ کر خوش گپیاں کب تک
سمجھ رکھا ہے تونے تھیٹروں کو وعظ کی محفل
تجھے دھوکے میں رکھیں گی تری کج فہمیاں کب تک
ذرا بیدار ہوجا اب بھی وقت کار باقی ہے
علاج درد کچھ کر تن میں جانِ زار باقی ہے

عربی غزلیں: اردو زبان تو خیر مادری زبان تھی، اس کے آغوش میں پلے بڑھے اور جوان ہوئے، لیکن حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسی زمانۂ طالب علمی میں عربی زبان میں شاعری شروع کردی، اور کئی ایک غزلیں اس زبان میں اسی عہد اور سن میں کہہ ڈالیں، جب پہلی دفعہ دیوبند تعلیم حاصل کرنے گئے، اس وقت ۷؍ محرم الحرام ۱۳۳۸ھ کو اپنے رفیق وہم درس مولانا فیض الحسن فیض مئوی کو، جو کہ خود بھی ایک اچھے شاعر تھے، ایک خط عربی میں لکھا اور اس میں یہ ۳؍ اشعار ذکر فرمائے:

فليت لأيام اللقاء معادة عليّ وألفيت الأحبة في جنبي

کاش ملاقات کے دن میرے اوپر پھر لوٹ کر آتے اور پیاروں کو میں اپنے پہلو میں پاتا

و لا سيّ أياما ألاقي بها حبا براءً سوى نقض العهود من الذنب

اور خاص کر وہ ایام جن میں میری ایسے محبوب سے ملاقات ہوتی جس کا عہد شکنی کے سوا کوئی گناہ نہیں۔

حديث حبيبي في الفوٴاده برد و رويته عن حلو عيشتنا تنبي

میرے محبوب کی گفتگو دل کی ٹھنڈک کا سامان ہوتی ہے۔اور اس کی دید بہتر زندگی کی خبر دیتی ہے۔

یہ اشعار اس وقت کے ہیں جب آپ کی عمر انیس سال تھی، اسی وقت ایک اور نظم لکھی تھی، جس کا عنوان" تهنئة العيد" ہے جو ممکن ہے کہ درج بالا اشعار سے بھی پہلے کے ہوں، اس نظم کے خاتمہ پر لکھا ہے" كتبته الى صديقي المولوى فيض الحسن وأنا إذ ذاك متعلم في دارلعلوم الديوبندية وسني تسع عشرة سنة. "یعنی یہ نظم میں نے اپنے دوست مولوی فیض الحسن کو اس وقت لکھی جب میں دارالعلوم دیوبند میں متعلم تھا اور میرا سن ۱۹ برس تھا۔"وہ تہنیتی نظم یہ ہے:

هنيئاً لكم عيد أظل عليكم هنيئا نجوم السعد إذ ذاك طلع

تم کو عید کی آمد مبارک ہو! تم کو سعد کے طلوع ہونے والے ستارے مبارک ہوں!

فجاء بأفراح و بهجة أنفس يفرج عن حبي الهموم ويقلع

عید اپنے ساتھ خوشی اور نفس کی تازگی لائی، جو میرے محبوب سے غموں کو دور کرتی ہے۔

وإني وإن وافاني العيد لم أزل كئيبا شجي البال والعين تدمع

عید اگرچہ میری بھی ہوئی لیکن میں برابر غمگین، متفکر اور گریاں رہا۔

يهيج فؤادي منزل و تشوقني ديار عهدت الخب فيها و أربع

میرے دل کو گھر کی یاد برانگیختہ کرتی ہے، اور وہ دیار و مقامات میری آتش شوق کو ہوا دیتے ہیں جن میں میں نے محبوب کے ساتھ عہد بتایا

ويلتاع قلبي حين أذكر رفقة أحبة صدق لي ، بهم أنا مولع

میرا دل جلتا ہے جب میں اپنے ان ساتھیوں اور سچے دوستوں کو یاد کرتا ہوں جن پر میں فریفتہ ہوں ۔

فدعني على حالي و عش أنت سالما و غيم هموم عن فؤادك مقشع

مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور تم سلامت رہو، اور غموں کا بادل تمہارے دل سے دور رہے

ودمت حبیبی فی نعیم و نعمة　　ولا زلت بالعیش الرغید تمتع

میرے دوست! تم ہمیشہ ناز و نعمت میں رہو اور خوشحالی کی زندگی سے لطف اندوز ہوتے رہو۔

ایک اور عربی غزل جس پہ تاریخ اگرچہ تحریر نہیں ہے، لیکن کاغذ کی بوسیدگی اور طرز تحریر سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ یہ بھی اسی زمانۂ طالب علمی کی کہی ہوئی ہے یہ چھ اشعار پر مشتمل ہے:

ألا یا لوعة الحب المبرح أقصری　　کانك قد أوقدت ناراً بمجمر

اے دریا محبت کی سوزش! تو رک جا گویا کہ تو نے انگیٹھی میں آگ جلا رکھی ہے۔

حریق بنار الهجر قلبی وأضلعی　　فیا عین رشیها بماء ك و اقرر

فراق کی آگ میں میرا دل اور پہلو جل رہا ہے، پس اے آنکھ! تو ان پر اپنے پانی کا چھینٹا ڈال کر اسے ٹھنڈا کر دے۔

غداة غدت لیلی تأهب ظعنها　　و شدت لها العیسا لأمر مقدر

جس صبح کو لیلی اپنے کجاوے کو تیار کر کے چلی اور اس چیز (جدائی) کے لئے جو مقدر ہو چکی اپنی سواری کسی

رمتنی بعینیها فخلت کأنما　　رمتنی بسهم فوق قوس موتز

میرے اوپر نگاہ ڈالی تو مجھے ایسا لگا کہ کمان سے میرے اوپر تیر چلایا ہے۔

بقلبی جروح من أسنة جفنها　　فما هی أنکی من أسنة سمهر

میرے دل میں اس کی آنکھوں کے نیزوں کے زخم ہیں، جو سمہر کے بنے ہوئے نیزوں سے زیادہ کاری ہیں۔

غدت بفؤادی ثم صبری بفجأة　　فما قول وعاظ یقولون لی اصبر

میرا دل چھینا پھر یکلخت میرا صبر و قرار چھینا، ایسے میں واعظوں کی صبر کی تلقین کیا فائدہ دے گی۔

مراثی و تواریخ

علامہ اعظمیؒ کی شاعری کا بہترین نمونہ ان کے وہ مرثیے ہیں جو انھوں نے اپنے اساتذہ اور دیگر اصحاب فضل و کمال کی وفات پر کہے ہیں، اس میدان میں انھوں نے خاصا زور طبع صرف کیا ہے، اور مختلف اہل علم و فضل کی وفات سے پہنچنے والے رنج و غم اور درد والم کا اظہار اکثر و بیشتر اسی شاعری کے ذریعہ کیا ہے، یہ مرثیے قلبی واردات اور دلی تاثرات ہیں جو تصنع اور تکلف سے پاک اور دل کی گہرائی سے نکل کر کاغذ کی سطح پر ابھر آئے ہیں۔ مذکورہ بالا دیگر اصناف سخن کی طرح اس پر بھی زمانۂ طالبعلمی سے ہی طباعی کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا، اور اس صنف میں بھی نہ صرف اردو بلکہ اس سے زیادہ عربی اور کچھ فارسی میں بھی اپنی قادر الکلامی کا جوہر دکھایا، اس لئے اس جگہ اردو اور عربی مرثیوں کو بجائے الگ الگ ذکر کرنے کے تاریخ وار ساتھ ساتھ ہم ذکر کریں گے، تاکہ واقعات کا ربط باقی رہے۔

جہاں تک میرا اندازہ ہے آپ کے کلام کا پورا مجموعہ ہمارے سامنے نہیں آیا، اور کچھ نہ کچھ زمانے کی دست درازیوں کا ضرور شکار ہوا ہے، اور کچھ ایسے بھی ہیں جو ہمارے سامنے موجود ہیں، لیکن کاغذ کی قدامت اور بوسیدگی اور روشنائی کے ہلکے پن کی وجہ سے صاف طور سے پڑھے نہیں جارہے ہیں، اس لئے مجبوراً انہیں ان کو قلم انداز کرنا پڑتا ہے، انھیں میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کا مرثیہ بھی ہے، جس کو کوشش بسیار کے باوجود میں پڑھنے سے قاصر رہا، جس میں بڑا دخل خود میری بے بضاعتی اور کوتاہ بینی کا ہے۔

اسی ضمن میں وہ قطعات بھی آتے ہیں جن میں آپ نے مادۂ تاریخ نکالا ہے، اس فن میں بھی آپ کو بڑا کمال حاصل تھا، اور اس کے متعدد نمونے آپ کے کلام میں

موجود ہیں۔

مولانا قادر بخش سہسرامی کا مرثیہ مولانا قادر بخش سہسرامی اپنے وقت کے متبحر اور باکمال عالم وفقیہ، بے مثل واعظ و مقرر، زاہد و متقی اور صاحب تصنیف بزرگ تھے، علامہ اعظمی نے ان کا تذکرہ دست کار اہل شرف میں کیا ہے، اور لکھا ہے کہ میں نے ان کے وعظ بنارس میں بہت سنے ہیں، ۱۲۷۳ھ میں سہسرام میں پیدا ہوئے تھے، اور رجب ۱۳۳۴ھ میں وفات پائی تھی۔ ان کی وفات پر علامہ اعظمی نے بڑا پر درد مرثیہ لکھا تھا جو پیش خدمت ہے:

کیسی حسرت برس رہی ہے آج — کبھی عالم کا یہ نہ تھا آئیں
جس کو دیکھو ہے آج خاک بسر — جس کو سنیے وہ آج ہے غمگیں
اس چمن کے ہیں غنچے مرجھائے — جس سے آتی تھی بوئے عطر آگیں
ہائے اب نغمۂ طرب انگیز — بلبل خستہ کی زباں پہ نہیں
رنگ پھیکا پڑا ہے ہر اک کا — خال مشکیں ہو یا لب لعلیں
چھوڑدی ہے عروس دہر نے بھی — اسی ماتم میں آج کل تزئیں
حافظ و حاج، عالم کامل — مرشد ومقتدائے اہل زمیں
فاضل بے مثال قادر بخش — چل دئے آہ سوئے خلد بریں
ایسے لوگوں کا ہائے اٹھ جانا — وقف جو ہوں پئے حمایت دیں
آج وہ صدمہ دین کو پہنچا — عرض کی جس کے مجھ کو تاب نہیں
ایسے ارکان منہدم ہو جائیں — پھر بھی محکم رہے اساس دیں
وہ قیامت بپا کی رحلت نے — ہل گیا سارا عالم زیریں
سنتے ہی یہ جگر شگاف خبر — ....
بادل زار و باسر حسرت — بول اٹھے گل ہوا چراغ دیں
اب یہی ہے دعائے اختر زار — ربنا اغفر لہ ولی آمین

قطعہ تاریخ وفات مولانا عبداللہ ٹونکی | مولانا مفتی عبداللہ ٹونکی نہایت عالم وفاضل اور فرزانہ شخص تھے، ٹونک میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی تھی، مختلف مقامات کا سفر کر کے علم کی تحصیل و تکمیل کی، اس کے بعد پوری زندگی درس وتدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ دلی، لاہور، لکھنؤ اور کلکتہ جیسے اہم مرکزی مقامات پر درس وافادہ کی مسند بچھائی، بالآخر جاذبہ توفیق نے بھوپال پہنچایا، جہاں ۱۳۳۹ھ میں وفات واقع ہوئی۔

ان کی وفات پر علامہ اعظمی نے فارسی میں ایک مرثیہ یا قطعہ تاریخ وفات کہا جو حسب ذیل ہے۔

بردہ گوئے سبق زہم عصراں — در علوم و حکم وعزت وجاہ
آں عدیم المثال علامہ — حیف کش آمدہ اجل ناگاہ
نذر تعلیم کردہ جانِ عزیز — بود صرفِ افاضہ شام وپگاہ
بود شمعے کہ کشتہ شد اینک — گمرہاں را چوں مشعلے در راہ
چوں رسیدم بگوش ایں آواز — نالہ سر کردم و کشیدم آہ!
گوئی ہنگامہ زحشر بپا — در مدارس شور وواویلاہ
شورے افتادہ در مجالسِ علم — چوں رسید ایں مصیبتِ جانکاہ

بے دل بشاد گفتمش تاریخ
فاضل دہر حیف عبداللہ

مولانا عبداللہ ٹونکی کا سن وفات ۱۳۳۹ھ ہے، لہذا اس قطعہ کے آخری مصرعہ سے اگر تاریخ نکالی جائے تو اس کے اعداد ۱۳۳۰ ہی ہوں گے، البتہ اگر لفظ "فاضل" کے آخر میں "ی" کا اضافہ کردیا جائے، جو نحوی لحاظ سے شاید گوارانہ ہو لیکن قواعد عروض کی رو سے غالباً روا ہو سکتا ہے، تو اس کے اعداد قریب قریب پہنچ جائیں گے، مگر پھر بھی ایک عدد کا فرق رہ جائے گا۔

مولانا اسد اللہ صاحب مرحوم کا قطعۂ تاریخ وفات مولانا اسد اللہ کوپا گنجی؟ کو فن طب میں مہارت و دستگاہ حاصل تھی، علوم دینیہ سے بھی بہرہ ور تھے، اور پیشہ طبابت کے ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھا تھا، مرزاپور وغیرہ میں اقامت گزیں رہ چکے تھے، ۱۳۴۰ھ میں وفات پائی تھی۔

ان کی وفات پر علامہ اعظمی کا ایک قطعہ "زجر المداہنین" مؤلفہ مولوی محمد شمس الدین صاحب نائب سکریٹری خلافت کوپاگنج میں مذکور ہے:

درجوار رحمت غفار چوں نازل بشد	خیر مقدم گفت رضوان و در جنت کشاد
غوطہا درلجۂ تاریخ چوں اختر نبرد	داد غواصی دُرِ تاریخ او مغفور باد

۱۳۴۰

استاذ الاساتذہ مولانا عبد الغفار عراقی مئوی کا مرثیہ مولانا عبد الغفار صاحب عراقی کی نسبت علامہ اعظمی کے اساتذہ کے ذکر میں لکھا جا چکا ہے، کہ ان کے دامن تربیت سے وابستہ ہونے کے بعد ان کے خرمن علم سے کس طرح جی بھر کے خوشہ چینی کی تھی، مولانا عراقی مرحوم کی رحلت ۱۳۴۱ھ میں ہوئی تھی، اپنے مشفق و محسن استاد کی رحلت پر علامہ اعظمی کے دل پر کیا گذری ہوگی، اس کو انھوں نے ہی سمجھا ہوگا، اپنے رنج و غم کا اظہار دو مرثیوں میں کیا، ایک اردو میں اور دوسرا عربی میں، بالترتیب دونوں پیش خدمت ہیں:

شیخ و استاذ مرے مولوی عبد الغفار	ناشر علم نبی ماحیٔ شرک و بدعت
ان کا ہر فعل تھا نقش قدم فعل سلف	ان کا ہر قول مؤید بکتاب و سنت
ہمہ دم مشغلۂ سیر کتب میں مصروف	درس و تصنیف تھی آٹھ پہر محویت
....	....

وسعت علم سے ان کی علماء تھے حیران
جودت ذہن وذکا سے فضلاء کو حیرت

ادبا کے تھے وہ سرتاج، محدث بھی فقیہ
ناظم و ناثر وہم شاعر عالی ہمت

آہ وہ ذات کہ مجموعۂ اوصاف تھی وہ!
آہ وہ دبدبۂ علم وہ شان و شوکت!

آہ وہ نکتہ رس فقہ وہ علامہ دہر!
آہ وہ ناقد اخبار نبی رحمت!

آہ وہ واقف اسرار ورموز قرآں!
آہ وہ جامع انواع فنون حکمت!

آہ وہ عالم ہر نکتۂ باریک بدیع!
تھے معانی وبیاں جن کے رہین قسمت!

ان کی ہی ذات سے رونق بازار علوم
ان کے ہی دم سے گروہ علماء کو عزت

جامعیت ہمہ گیری تھی انھیں پر بس ختم
حجۃ اللہ تھے وہ اور حکیم الامت

آہ کس منھ سے کہوں آج کہ خاکم بدہن
ان فضائل کا وہ مجموعہ ہے زیر تربت

فکر تھی از پئے تاریخ وفات اختر کو
غیب سے آئی ندا ان پہ خدا کی رحمت

۱۴۳۱

اور ایک پر درد مرثیہ عربی میں لکھا جو اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے:

علیك سلام الله یا ثاوی القبر ورحمته أعطیت من أوفر الأجر

اے قبر والے تجھ پر اللہ کی سلامتی اور رحمت ہو اور بھرپور تجھ کو اجر دیا جاوے

لقد کنت أیم الله سلوی لنا عن الـــغطارفة الماضین فی سالف العصر

قسم خدا کی تم اگلے زمانے کے اصحاب فضل وکمال کی طرف سے تسلی کا باعث تھے۔

فکنت وکانت حین غبت تغیبت فنحن إذا یا شیخنا فاقدوا الصبر

تیرے رہنے سے وہ لوگ تھے، جب تو غائب ہوا تو وہ لوگ بھی نگاہ سے اوجھل ہوگئے، پس اس وقت ہم بہت بے قرار ہیں۔

رزایا عظام فاجعات کثیرة مصاب أبی الأنوار علامة الدهر

علامہ دہر ابوالانوار (مولانا عبدالغفار) کی موت بڑے مصائب اور بہت سے سانحوں کا سبب ہے۔

محط رحال المستفيدين ملجا الـــــأماثل مأوى كل أشعث مغبر

ان کی ذات طالبین علم کا مرکز توجہ، فضلاء کا مرجع اور مسافر کی پناہ گاہ تھی۔

فقيه ديار الشرق مسند وقته ومرجع أعلام الهدى رحلة العصر

علاقہ پورب کے فقیہ، وقت کے مسند، ارباب ہدایت کا مرجع اور زمانے کے سیاح تھے۔

إليه جزاه الله خيرا قد انتهت رياسة أصحاب الإمام بذا القطر

اللہ ان کو جزائے خیر دے، اس خطے میں حنفیوں کی ریاست ان پر ختم ہوتی تھی۔

أديب أريب ينثر الدر نطقه وفي الشعر يأتي بالحلال من السحر

وہ ایسا ادیب واریب تھا جس کی بات سے موتی جھڑتے تھے، اور ان کی شاعری سحر حلال ہوتی تھی۔

وفيه خلال لو ذهبت أعدها وجدت نطاق القول ضاق عن الحصر

ان کے ایسے اخلاق وعادات تھے کہ اگر میں ان کو شمار کرنے لگوں تو گفتگو کا پیمانہ تنگ پڑ جائے گا۔

قد ابتلي أسقاماً فما زال حامداً لمولاه فيها واستقام الى القبر

وہ بیماریوں میں مبتلا رہا اور اپنے مالک کی حمد کرتا رہا، اور قبر تک استقامت پر رہا۔

ثوى في خيام الحمد أرّخت ملهما إذا رمت علم الفوت والألم بالصدر

"ثوی فی خیام الحمد" (خیام الحمد میں ان کا ٹھکانہ ہوا) میرے دل میں ان کی تاریخ وفات ڈالی گئی، جب میں نے تاریخ وفات معلوم کرنی چاہی اور حال یہ ہے کہ سینہ رنجیدہ و غمگین ہے۔

قطعہ تاریخ بروفات حافظ ضمیر احمد اعظمی حافظ ضمیر احمد اعظمی کی وفات ۱۴ر شعبان ۱۳۴۲ھ کو واقع ہوئی تھی، ان کی وفات پر حسب ذیل قطعہ لکھا تھا:

ضمیر احمد جوان نیک و حافظ — غنیمت دائم او قاتش شمردہ
بصبح چاردہ از ماہ شعباں — بخلاق جہاں جانش سپردہ
ملک چوں از تن او جاں بر آورد — شکیب از دل، دل از پہلو بردہ
تبہ حالم چناں از شدت وجد — کہ ہستم نیم مردہ دل فسردہ
سن تاریخ او ہاتف چنیں گفت — بمن اختر ضمیر ما بمردہ
۱۳۶۲ھ

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا مرثیہ حضرت شاہ صاحبؒ سے کسب فیض کی مدت علامہ اعظمیؒ کو اگرچہ بہت کم نصیب ہوئی، لیکن اس مختصر سی مدت میں جو نقش قائم ہوا وہ نقش کالحجر تھا، جس میں عمر کے کسی بھی حصے میں کبھی دھندلاپن نہیں آیا، حضرت شاہ صاحب کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، ان کی وفات صفر ۱۳۵۲ھ میں ہوئی تھی، وفات پر ان کے شاگرد اور مملکت علم کے ان کے جانشین علامہ اعظمی نے یہ مرثیہ لکھا:

وارث علم نبی، حضرت استاذ جلیل — وائے برما کہ ہوا آج جہاں سے رخصت
وہ کہ تھا اپنے زمانہ میں بخاری کا مثیل — وہ کہ تھا ابن معیں پایہ و سفیاں شوکت
وہ کہ تھا فقہ میں بویوسف قاضی کی نظیر — وہ کہ تفسیر میں اس وقت تھا حبر الامت
ماتریدیِ زماں، اشعری وقت تھا وہ — وہ کہ فارابیِ دوراں تھا بفن حکمت
جس سے تازہ ہوئی یاد ذہبی و مزی — ابن تیمیہ کی زندہ ہوئی جس سے سیرت
وہ کہ آئینہ پیکر میں تھے جس کے بخدا — جلوہ گر زیلعی و ابن حجر کی صورت
وہ کہ تھی منبر ارشاد کو جس پر نازش — وہ کہ تھی مسند تدریس کو جس سے زینت
جس پہ نازاں عرب و مصر و عجم شام و عراق — ہند کی خاک کو تھی جس کے قدم سے عزت
وہ کہ تھا لخت دل قاسم خیرات علوم — وہ کہ تھا مردمک چشم رشید الملت

آہ صد آہ ہوا نیر انور روپوش — حیف بر حیف کہ عالم میں ہے پھیلی ظلمت
قہر ہے بزم معارف ہوئی درہم برہم — اور سونی ہے پڑی مجلس درس حکمت

حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کی وفات پر علامہ اعظمی کا کہا ہوا ایک نامکمل مرثیہ عربی میں بھی ہے، چونکہ وہ نامکمل ہے اور صرف چند ہی اشعار اس کے محفوظ ہیں، اس لئے ہم اس کو نظرانداز کرتے ہیں۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا مرثیہ | آپ کا تذکرہ علامہ اعظمی کے اساتذہ کے ذکر میں آچکا ہے، علامہ اعظمیؒ کو ان سے غایت درجہ تعلق تھا، ۱۹۴۹ء میں جب انھوں نے وفات پائی تو شاگرد رشید (علامہ اعظمی) نے ۳۷ /اشعار پر مشتمل عربی زبان میں بڑا پر درد اور دلگداز مرثیہ لکھا تھا، جو برہان (مارچ ۱۹۵۰) میں ''البشر یا شبیر بلطف ربک'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، ہم اس کو برہان سے مستعار لے کر ذیل میں پیش کر رہے ہیں:

أراني و قلبي دائما يتوجع — ولست أرى دمعي عن العين يقلع

میں اپنے آپ کو اور اپنے دل کو برابر رنجیدہ دیکھتا ہوں، اور اپنے آنسو کو آنکھ سے رکتا ہوا نہیں دیکھتا۔

يفجعني دهري فلا يكتفي بوا — حدٍ بل بحبر بعد آخر يفجع

زمانہ مجھے غم دیتا ہے پس وہ کسی ایک پر بس نہیں کرتا، بلکہ ایک کے بعد دوسرے عالم کے صدمہ سے دوچار کرتا ہے۔

خليل(۱)، ومحمود(۲)، عزيز(۳)، وأنور(۴) — وأشرف(۵) كانوا بيننا ثم أقشعوا

(۱) حضرت مولانا خلیل احمد صاحب امیٹھوی سہارنپوریؒ متوفی ۱۳۴۶ھ مراد ہیں
(۲) شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ متوفی ۱۳۳۹ھ مراد ہیں
(۳) مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندیؒ متوفی ۱۳۴۷ھ مراد ہیں
(۴) امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ متوفی ۱۳۵۲ھ مراد ہیں
(۵) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ متوفی ۱۳۶۲ھ مراد ہیں

مولانا خلیل احمد ، مولانا محمود حسن ، مولانا عزیزالرحمٰن ، مولانا انور اور مولانا اشرف علی صاحب، ہمارے درمیان تھے پھر ہم سے جدا ہوگئے۔

ومن بعدهم مولای شبیر أحمد　　الإمام الهمام القرم أمسی یودع

اوران سب کے بعد بزرگ وسردار امام مولانا شبیر احمد (عثمانی) نے الوداع کہا۔

شیوخ تقضوا واحدا بعد واحد　　فأصبح علم الدین مغناه بلقع

یہ تمام شیوخ ایک ایک کر کے گذر گئے جس سے علم دین کی بزم سونی ہو گئی

وهذی رزایا فادحات وإننا　　الی یومنا هذا لها متفجع

یہ بڑے اندوہناک مصائب ہیں، جن کی وجہ سے ہم آج تک غم واندوہ کی حالت میں ہیں

ولکنما الرزء الأخیر رزیة　　لعمرك أنکی للقلوب وأوجع

لیکن آخری مصیبت ایسی مصیبت ہے جوان سب سے زیادہ دلگداز اور روح فرسا ہے۔

فقد کان سلوانا لنا و بقیة　　لأسلافنا کنا به نتمتع

ان کی ذات ہمارے لئے باعث تسلی اور ہمارے اسلاف کی نشانی تھی، جن سے ہم استفادہ کیا کرتے تھے۔

منار الهدی، طود العلی، قدوة الوری　　به یوتسیٰ شیخ له القوم خضع

آپ کی ذات ہدایت کا مینار، عظمت کا پہاڑ اور خلق خدا کے لئے اسوہ ونمونہ تھی، ان کے سامنے گردنیں جھکی رہتی تھیں۔

أفاد طلاب العلم درسا و خطبة　　وخطًا و تصنیفا له الفضل أجمع

طلبگاران علم کو درس و تقریر اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ فائدہ پہنچایا، آپ کی ذات فضائل وکمالات کا مجموعہ تھی۔

الیه انتهی فهم الکتاب فهذه　　فوائده تملی وُ یتلی و تسمع

آپ کی ذات پر فہم قرآن ختم ہوتا تھا، چنانچہ آپ کے افادات لکھے جاتے ہیں اور پڑھے اور سنے جاتے ہیں۔

ودرس احاديث النبي و شرحها بوجه لنا فيه شفاء و مقنع

احادیث نبوی کا درس اور ان کی شرح ہمارے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں جس سے تشفی اور اطمئنان حاصل ہوتا ہے۔

يخلد ذكراه لنا شرح مسلم كتاب جليل مستطاب ممتع

ان کی یاد کو ہمارے لئے شرح مسلم نے دائمی بنادیا، وہ ایک عظیم، پسندیدہ اور نفع بخش کتاب ہے۔

مناقبه جلت عن الحصر كثرة مآثره تروى مدى الدهر تسمع

ان کے مناقب کثرت کی وجہ سے شمار سے باہر ہیں، اور ان کے کارنامے قیامت تک بیان کئے اور سنے جائیں گے۔

فطين ذكى ثاقب الذهن نافذا البصيرة ذو رأى متين مروّع

فہیم وذکی، ذہین وژرف نگاہ، صاحب رائے اور باہیبت تھے۔

فقيه ونظار كذا متكلم يقوّم زيغ الزائغين فيقمع

فقیہ، مناظر اور متکلم تھے، گمراہوں کی کجی سیدھی اور دور کرتے تھے۔

مفسر تنزيل الكتاب محدث ورتبته في ذين أعلى و أرفع

مفسر قرآن اور محدث تھے، ان کا رتبہ ان دونوں میں نہایت بلند وبالا تھا۔

أديب بعيد الصيت والذكر، منشئ بليغ، خطيب، بالغ النطق مصقع

مشہور و معروف ادیب، بلیغ انشاء پرداز اور زبان آور خطیب و مقرر تھے۔

فمن كل نوع حظه متكامل وفي كل ضرب فضله ليس يدفع

ہر فن میں ان کو کمال حاصل تھا، اور ان کی برتری تمام امور میں ناقابل انکار تھی۔

نقي، تقي، ناسك ثم دين نموذج أخيار مضوا متورع

پاکدامن، پاکباز، عبادت گذار اور دین دار وخداترس تھے، ان نیکو کاروں کا نمونہ تھے جو گذر چکے۔

شبيه بهم في سمتهم ثم دلهم وقور، حليم، خاشع، متخشع

عادات واطوار میں ان سے مشابہ تھے، باوقار، بردبار، متواضع اور فروتن تھے۔

قضى العمر فی بث العلوم و نشرها خطاباً و تذكيراً يفيد و ينفع
تقریر و تذکیر کے ذریعہ علم کے نشر و اشاعت میں عمر گذار دی، اور ہمیشہ فیض و افادہ کرتے رہے۔

محط رحال المستفيدين بيته ومجلسه روض من العلم ممرع
ان کا گھر مستفیدین کا مرکز تھا، اور ان کی مجلس علم کا سرسبز باغ تھا

فأكرم به من عالم عامل بعلـــــــــمه جالباً نفعا إليه و ينفع
وہ کتنے صاحب کرم اور عالم باعمل تھے، جو علم حاصل کرتے اور اس سے نفع پہنچاتے تھے۔

يذب عن الاسلام طول حياته ويحمى عن الدين المتين و يمنع
عمر بھر اسلام کا دفاع کرتے رہے، اور دین متین کی حفاظت و حمایت کرتے رہے۔

ويدأب فی التصنيف والدرس يومه وليس من الأوقات شيئا يضيع
دن کی روشنی میں تصنیف و تدریس میں مصروف رہتے تھے، اور اپنے وقت کا کوئی حصہ ضائع نہیں کرتے تھے

و كان إذا ما الديك صاح بسحرة يقوم فيدعو الله والناس هجّع
سحر کے وقت جب مرغ بانگ دیتا تھا، آپ خدا کی عبادت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے حالانکہ لوگ ابھی سوئے رہتے تھے۔

رزئنا به علماً كبيراً وحكمة وهذ الرزء خرقه ليس يرقع
ان کی وفات سے ہمارے لئے بڑے علم و حکمت کو صدمہ پہنچا، اور یہ ایسا نقصان ہے جس کا خلاء پر نہیں ہو سکتا۔

فأفئدة الأصحاب كلمى لفقده وأكبادهم حرى و كادت تصدع
ان کی جدائی سے شاگردوں کے دل زخمی اور ان کے جگر پر سوز ہیں اور قریب تھا کہ وہ پھٹ جاتے۔

وأعينهم عبرى تسيل شئونها وأحشاء هم مما دهوا يتقطع

ان کی آنکھیں اشکبار ہیں، اوران کے دل غم والم سے ٹکڑے ہورہے ہیں۔

بكى فقده مصر، وشام وأعولت مدائن باكستان والهند أجمع

ان کی رحلت سے مصروشام روپڑے، اور ہندوستان وپاکستان کے تمام شہروں میں چیخ وپکار مچ گئی۔

بنفسك فارفق أيها المرء واستفق فحتى متى تبكى عليه و تجزع

اب اپنی ذات پر تو رحم کر اور رونے سے باز آ، کب تک تم ان کے لئے گریہ وماتم کرتے رہو گے۔

(فكل نعيم لا محالة زائل) وكلّ سبيلَ الهالكين سيتبع

ہر نعمت یقینی طور پر زائل ہونے والی ہے، اور سب کو مرنے والوں کی راہ پر چلنا ہے (موت کا سامنا کرنا ہے)

وفي الوارث الباقي عزاء من الذى مضى وإليه كل حي سيرجع

اور باقی رہنے والی ذات میں جانے والے کے عوض صبر وتسلی کا سامان ہے اور اسی کی طرف ہر ایک کو لوٹ کر جانا ہے۔

نرجّي له الحسنى و مرضاة ربه فما عنده خير لعبد مضيع

ہم ان کے لئے بھلائی اور رب کی خوشنودی کی امید کرتے ہیں، اس کے نزدیک کسی بندے کی نیکی رائگاں نہیں ہوتی۔

فأكرم إله الخلق فى الخلد نزله وأفضل وأجزل ان فضلك أوسع

الہ العالمین! جنت میں ان کا بہترین ٹھکانہ بنا، اور ان کے اوپر خوب خوب فضل فرما، بیشک تیرا فضل بے پایاں ہے۔

أقول ضريح فيه نور مؤرخا لقبر ثوى فيه الإمام السميدع

۱ ۳ ۶ ۹

"ضریح فیہ نور" (قبر جس میں روشنی ہے) میں نے تاریخ وفات نکالی، ایسی قبر کی جس میں سرداری کا حامل امام مدفون ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی وفات پر علامہ اعظمی کا علامہ سید سلیمان ندویؒ سے جو دیرینہ تعلق تھا، اس کے متعلق اوپر عرض کیا جاچکا ہے، اس دیرینہ تعلق اور قلبی لگاؤ کی وجہ سے سید صاحب کی وفات پر علامہ اعظمی کو جو صدمہ اور درد و کرب ہوا ہوگا اس کو کچھ ان کے دل ہی نے محسوس کیا ہوگا، چنانچہ آپ نے قاضی اطہر مبارکپوریؒ کو ایک خط میں تحریر فرمایا:

"علامہ سید سلیمان ندوی کے فراق سے آنکھیں پرنم ہیں اور دل پر غم، میرے ان کے درمیان ۲۰-۳۰ برس سے پر خلوص روابط مودت تھے، ان کی جدائی سے جو صدمہ مجھے ہوا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ یہ تو طبعی تاثر ہے اس سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی سید صاحب کا سانحہ وفات تمام عالم اسلام کے لئے ایک فاجعہ کبری، ہندوستان کے علاوہ حجاز، مصر، شام اور بلاد یورپ میں بھی ان کے فضل و کمال کا چرچا تھا، انھوں نے اپنی محققانہ تصنیفات کے ذریعے علم اور دین کی جو خدمتیں انجام دی ہیں ان کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا اور کچھ شبہہ نہیں کہ اس آخری دور میں دقت نظر، تبحر علمی اور جامعیت میں ان کی شخصیت ایک بے نظیر شخصیت تھی، افسوس ہے کہ ان کی وفات سے علمی دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کا پر ہونا بظاہر ناممکن ہے۔ اللہ ان پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے اور ان کے مراتب بلند کرے آمین۔ حبیب الرحمٰن الاعظمی"(۱)

سید صاحب کی وفات پر علامہ اعظمی نے ایک پرسوز قطعہ تاریخ وفات بھی قلمبند کیا تھا، جس کی طرف اس باب کے شروع میں اشارہ کیا جاچکا ہے اور جو بعینہ روزنامہ "انقلاب" بمبئی میں ۳۰/دسمبر ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، اور اسے ہم وہیں سے نقل کر رہے ہیں:

فاضل علامہ سلیمان آج ہو گئے افسوس کہ ہم سے جدا
آہ کہ اب ہند میں کوئی نہیں فاضل و علامہ سلیمان سا
ماہر تاریخ و حدیث و سیر واقف اسرار کتاب خدا

(۱) روزنامہ انقلاب ۱۵/دسمبر ۱۹۵۳ء

اردو تو اردو عربیت میں بھی ان کو بہت دخل بڑا درک تھا
کیا نظر آتا ہے کہیں وہ کمال ان کو جو انشاء و کتابت میں تھا
حیف یہ گنجینۂ علم وادب دفن تہ خاک کراچی ہوا
فقرۂ تاریخ کا جویا تھا میں دل نے کہا، فاضل یکتا گیا
۱۳۷۳

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا مرثیہ | علامہ اعظمی کے کاغذات میں ایک عربی مرثیہ ملتا ہے جو بظاہر نامکمل ہے، اور اس پر کوئی صراحت بھی نہیں ہے کہ یہ کس کی شان میں کہا گیا ہے، تاہم اس کے مضمون سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس سے مراد شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ ہیں، جن کی وفات ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء میں واقع ہوئی تھی۔

رزء عظیم دها الإسلام و أكربا شيخ الحديث و قطب العصر قد ذهبا

ایک بڑی مصیبت نے اسلام کو صدمہ پہنچایا اور بے چین کر دیا، کہ شیخ الحدیث اور قطب وقت اس دنیا سے چلا گیا۔

ولست أحسب إلا أن ناعيه نعى المكارم والأخلاق والأدبا

میں سمجھتا ہوں کہ ان کی موت کی خبر دینے والے نے شرافت، اخلاق اور ادب کی موت کی خبر سنائی۔

قد كان مجتمعا فيه الفضائل من علم وحلم وعرفان ولا عجبا

کچھ تعجب نہیں کہ ان کے اندر علم و معرفت اور بردباری جیسی بہت سی خوبیاں جمع ہوگئی تھیں۔

فانه قد تربى عند سيدنا رشيد أحمد يسعى عنده دأبا

انھوں نے مولانا رشید احمد (گنگوہی) کی خدمت میں مسلسل ریاضت کر کے ان کے سائے میں تربیت پائی۔

وعند مرشد أهل العصر قاطبة　　كانوا هم العجم أو كانوا هم العربا

شيخ المشائخ إمداد الاله وقد　　قضى سنين طوالاً حينما صحبا

اور انھوں نے تربیت پائی عرب و عجم کے مرشد شیخ المشائخ حضرت امداد اللہ (مہاجر مکی) کی خدمت میں، جن کے زیر سایہ انھوں نے لمبا عرصہ گذارا۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کا قطعہ تاریخ وفات | مولانا ابوالکلام آزاد اس دور کی نادر الوجود شخصیتوں میں سے ایک تھے، وہ ایک بڑے عالم، بلند پایہ ادیب، صاحب طرز انشا پرداز، قادر الکلام اور زبان آور خطیب و مقرر، مادر وطن کے جانثار مجاہد، اور عظیم رہنما و مفکر تھے، اپنی شخصیت کے لحاظ سے وہ نہ صرف باکمال اور منفرد تھے بلکہ اعجوبۂ روزگار تھے، جد وجہد آزادی کی ہر مہم میں نہ صرف شریک بلکہ اکثر سے بڑھ کر رہے، اور جب وطن آزاد ہوا تو آزاد ہند کے سب سے پہلے وزیر تعلیم ہوئے، ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۸ء میں وفات پائی۔

ان کی وفات پر علامہ اعظمی نے یہ قطعۂ تاریخ وفات کہا:

وزیر دولت جمہوریٔ ہند　　زعیمِ انقلاب ہند آزاد

نہ گفتارش کہ گوہرہائے تاباں　　نہ تحریرش کہ یاد از سحر می داد

دریغا زیں جہاں رخت سفر بست　　براو صد رحمت و رضوانِ حق باد

اگر تاریخ او خواہی نوشتن　　بگو سہ بار اختر موت آزاد

علامہ اعظمی نے دوسرے شعر کے پہلے مصرع کو "گوہرہائے تاباں" اور گوہرہائے شہوار" دونوں طریقوں پر لکھا ہے، اسی طرح آخری شعر کا پہلا مصرع اس طرح بھی لکھا ہے "اگر پرسد کسے سال وفاتش" "موت آزاد" کی گنتی ۴۵۹ آتی ہے اگر اس کو تین سے ضرب کریں "بگو سہ بار اختر" سے جس کی طرف اشارہ ہے، تو مجموعی اعداد ۱۳۷۷ آئیں گے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی وفات پر | مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ علم و عمل کا پیکر تھے، تصنیف و تالیف اور تقریر و تحریر پر بلا کی قدرت رکھتے تھے، جنگ آزادی کے عظیم مرد مجاہد تھے اپنی جرأت رندانہ اور حق گوئی و بے باکی میں اپنی مثال آپ تھے۔

زور خطابت اور شعلہ نفسی میں بہت کم لوگ ان کا مقابلہ کر سکتے تھے، دور غلامی میں انگریزوں کے خلاف ہر محاذ پر شجاعانہ لڑتے رہے، اور آزادی وطن کے بعد مسلمانوں پر نکبت وادبار کا نیا دور شروع ہوا تو ان کے حقوق کے لئے سینہ سپر ہو گئے، ایک طرف نہایت جرأت وبے باکی کے ساتھ پارلیمنٹ تک ان کی ہر آواز پہنچاتے رہے، تو دوسری طرف مسلمانوں کو بیدار کرنے اور قعر مذلت سے نکالنے کی انتھک کوشش کرتے رہے، اور اس وقت تک قرار نہیں پایا جب تک جان جان آفریں کے سپرد نہ کردی۔ ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں ان کی وفات سے ملت کا وہ خسارہ ہوا جس کی اب تک تلافی نہ ہو سکی۔

ان کی رحلت کا علامہ اعظمی کو شدید صدمہ ہوا، اور عربی زبان میں چند اشعار کا یہ پردرد مرثیہ لکھا:

کان الفقید أخونا حفظ رحمن شهما نبیلا عظیم القدر والشان

ہمارا گم شدہ بھائی حفظ الرحمٰن بہادر، شریف، بلند مرتبہ اور عظیم الشان شخص تھا۔

عاش الفقید نقی العرض عن دنس فما له عائب فینا و لا شانی

مرحوم پاکدامن، باآبرو تھے، ان کا کوئی عیب جو اور دشمن نہیں تھا۔

ولیس یوم رزئنا فیه صاحبنا بیوم حزن ولکن یوم أحزان

جس دن ہمارے ساتھی کی وفات کا صدمہ پہنچا، کسی ایک غم کا دن نہیں تھا، بلکہ بہت سارے غموں کا دن تھا۔

فمن لمجلس شوریٰ دیوبند ومن لمسلمی الهند من قاص ومن دان

دیوبند کی مجلس شوریٰ اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے دور نزدیک کہاں سے ایسا شخص آسکتا ہے؟

یحمی حقوقهم بالانتصار لهم فی البرلمان بتصریح و إعلان

کون ایسا شخص ہے جو پارلیمنٹ کے اندر کھلم کھلا اور علی الاعلان مسلمانوں کی حمایت کے ذریعہ ان کی حقوق کی حفاظت کرسکے۔

کاغذ کے جس ٹکڑے پر یہ اشعار مکتوب ہیں، اسی پر دوسری طرف دو شعر کا ایک قطعہ بھی لکھا ہوا ہے، جس کے انداز سے پتہ چلتا ہے کہ اسی موقع پر اس کو بھی کہا تھا، لکھا ہے:

لو انهمرت عيني دما، و تقطعت أسى كبدى، والقلب منى تفطرا
لكان حقيقا، إنّ رزءاً أصابني بدهلي غداة الأمس أعظم ما جرى

اگر میری آنکھ خون کے آنسو بہاتی، اور میرا جگر مارے غم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا، اور میرا دل پھٹ جاتا، تو یہ سب کچھ سزاوار تھا، اس لئے کہ دہلی کے حادثہ کا وہ صدمہ جو کل مجھے پیش آیا، سب سے بڑا حادثہ تھا۔

مولانا عبدالقادر رائے پوری کا قطعہ تاریخ وفات | مولانا عبدالقادر رائے پوری اپنے وقت کے مشہور شیخ طریقت اور عارف کامل تھے، علم و فضل میں باکمال اور رشد و ہدایت، بیعت و ارشاد میں مرجع خلائق تھے، ان کا وصال بھی ۱۹۶۲ء میں ہوا تھا، ان کے انتقال پر علامہ اعظمی نے مادۂ تاریخ اس قطعہ سے نکالا تھا۔

قضى الشيخ عبدالقادر اليوم نحبه • و كان أجلّ العارفين و أكرما
بكيت و ما يغني البكاء فقيل لي ومن ذا رزئتم، قلت شيخا معظما
۱۹۶۲ء

شیخ عبدالقادرؒ نے اپنی جان اس حال میں دی کہ وہ عارفوں میں سب سے بزرگ و برتر تھے، میں رو پڑا جب کہ رونا بے سود ہے، مجھ سے کہا گیا کہ تمہیں کس کی وفات کا صدمہ ہے، میں نے کہا: ایک بڑے شیخ کی۔

مولانا عبداللطیف نعمانی کا قطعہ تاریخ وفات | مولانا عبداللطیف نعمانیؒ اور علامہ اعظمیؒ زمانۂ طالب علمی سے لے کر تادم واپسیں ساتھ ساتھ رہے، دونوں ہم سبق، ہم عصر اور ہم مشرب تھے، ہر ایک نے دوسرے کو خوب سمجھا اور پرکھا تھا۔

مولانا نعمانیؒ بھی اپنی جگہ بڑے صاحب فضل اور باکمال تھے، اور بہت سے علوم و فنون میں استادانہ مہارت اور ماہرانہ دستگاہ رکھتے تھے، علامہ اعظمی کے بعد اس طرف کسی کا سکہ چلتا تھا تو انھیں کا۔ ساتھ ہی سیاسی بصیرت بھی حد درجہ رکھتے تھے، اور سیاسی رہنمائی

حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ ۱۳۹۲ھ میں وفات پائی تھی، علامہ اعظمی نے مادۂ تاریخ اس قطعہ سے نکالا تھا:

صاحبی عبداللطیف الألمعی　　نال فی الفردوس أعلی منزله
قال تلمیذ له أرّخ لنا　　موته، قلت: اکتب المغفور له
۱۳۹۲ھ

میرے ذہین دوست عبداللطیف جنۃ الفردوس میں اعلیٰ مقام پائیں، ان کے ایک شاگرد نے مجھ سے تاریخ وفات نکالنے کے لئے کہا، تو میں نے کہا المغفور له سے ان کی تاریخ نکالو۔

مولانا ابوبکر شیث جونپوریؒ کی تاریخ وفات مولانا ابوبکر شیث جونپوریؒ دینیات کے ماہر عالم و فاضل شخص تھے، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے صدر رہ چکے تھے، عزوجاہ کے حامل تھے، اور علمی و دینی حلقوں میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، ۱۳۵۹ھ میں ان کا انتقال ہوا، علامہ اعظمی نے اس قطعہ سے تاریخ وفات نکالی:

بوبکر شیث، کش ہمی دادیم جا بدل　　امروز بہر مدفن اوگور کاقتیم
می خواستیم سال وفاتش رقم زنیم　　بوبکر شیث رحمہ اللہ، یاقتیم
۱۳۵۹ھ

واقعہ نگاری علامہ اعظمی کا یہ کمال صرف اہل علم کی تاریخ وفات تک محدود نہیں تھا، بلکہ یہ ذوق اس حد تک تھا کہ اگر طبیعت موزوں اور ہموار ہوتی تو کبھی کبھی کسی خاص واقعے کو نظم کردیا کرتے۔ چنانچہ ایک نامکمل نظم آپ کے کاغذات میں دیکھنے کو ملی، یہ غالباً اس وقت کی ہے جب دارالعلوم مئو سے آپ کی فراغت کے ایک سال بعد مولانا عبداللطیف صاحب وغیرہ فارغ ہوئے، یہ لوگ شاید سات ساتھی تھے، میرا خیال ہے کہ یہ نظم اسی موقع کی کہی ہوئی ہے، جو اگرچہ نامکمل ہے۔ لیکن دلچسپی کی چیز ہے، اور ملاحظہ کے لئے پیش خدمت ہے:

کروں کیا شکر میں مولیٰ کے فضل بے نہایت کا
لکھوں کیا وصف اس کے لطف و احسان وعنایت کا

ہوئی دستار بندی آج ان کی فضل مولیٰ سے
بندھا ہے آج ان ساتوں کے سر سہرا فضیلت کا
لٹائے مال و زر اہل مئو نے اور دیئے چندے
دکھایا اپنی ہمت کا نمونہ اور سخاوت کا
خصوصا اہل ہمت ۔ بالعموم اہل مئو دیکھیں
ملا کیا بیش قیمت ان کو ثمرہ اپنی محنت کا
الٰہی سبعہ سیارہ ہوں یہ چرخ ملت کے
بنا اک اک کو سورج آسمان علم وحکمت کا
اسی صورت پھر ہر سال اعلام ہدیٰ نکلیں
چمک جائے ستارہ پھر دوبارہ اپنی قسمت کا

اسی طرح ایک عربی نظم دار العلوم یا مفتاح العلوم مئو کے کسی ایسے جلسے کے موقع پر کہی ہوئی ہے، جس میں مشاہیر اہل علم کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی وہ نظم یہ ہے:

لك الحمد اللهم رب البرية فإنك أهل الحمد من غير شركة

اے پروردگار! تیرے ہی لئے تمام تعریف ہے، بیشک تو تنہا تعریف کا مستحق ہے۔

فأنت الذی یقضی لنا کل حاجة وأنت الذی ندعوه عند المصيبة

تو ہی ہے جو ہماری ضرورت پوری فرماتا ہے، اور تو ہی ہے جس سے ہم مصیبت کے وقت فریاد کرتے ہیں۔

تتابعت النعماء حتی تجاوزت عن الحصر والإحصا وعمت وطمت

تیری نعمتیں پیہم ہیں، یہاں تک کہ وہ بے اندازہ، بے شمار اور بے حد وحساب ہو گئیں

فأعجزت الآلاء یا رب أن نفی بشکر لما قد دق منها وأعيت

خداوندا! تیری نعمتوں نے اس بات سے عاجز و درماندہ کر دیا ہے کہ ہم چھوٹی سی نعمت کا بھی شکریہ ادا کر سکیں۔

فكيف بما قد جل منها وإنما جلائلها مما عن الوصف جلت

توکیسے ہم ان نعمتوں کا شکریہ ادا کر سکتے ہیں جو بڑی ہیں اور بڑی نعمتیں تو بیان سے بالاتر ہیں

وصلّ على قطب الوجود محمد أبی القاسم المبعوث فی ارض مكة

خداوندا! تو رحمت نازل فرما، سرزمین مکہ میں پیدا ہونے والے مرکز کائنات ابوالقاسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر۔

أرانا الهدى بعدالضلالة والعمى و أخرجنا من ظلمة أىّ ظلمة

جس نے ہم کو ضلالت و گمراہی کے بعد ہدایت کا راستہ دکھایا اور گھٹاٹوپ تاریکی سے باہر نکالا۔

وأصحابه الغر الكرام و آله ذوى الهمة العليا كرام السجية

اور اس کے روشن جبین کریم ساتھیوں اور اہل بیت پر جو بلند ہمت اور شریف طبیعت والے تھے۔

و بعد فهذى حفلة سنوية دعونا لها الأعلام من كل وجهة

پس یہ ایک سالانہ جلسہ ہے جس کے لئے ہم نے ہر سمت سے بڑے بڑے لوگوں کو بلا رکھا ہے۔

فمنهم رئيس ٠٠٠ مرتضى حسن هو البطل المقدام ليث الزريبة

ان میں سردار مولانا مرتضی حسن ہیں جو آگے بڑھنے والے بہادر شیر ہیں۔

وعبدالشكور القرم قامع فتنة الـــــــرّوافض والبدعية الرضوية

اور شیعوں اور رضا خانی بدعتیوں کے فتنوں کا استیصال کرنے والے مولانا عبدالشکور ہیں۔

يذب عن القرآن ثم يذب عن صحابة خير الخلق هاد البرية

وہ قرآن اور صحابہؓ کرام کا جو خدا کی بہترین مخلوق اور مخلوق کے رہنما ہیں، دفاع کرتے ہیں۔

وآخر يدعى باسمه من بليدة　　تسمى بمرزافور قرب كنتت

اور ایک اور انھیں کے ہم نام جو کنتت کے قریب مرزاپور سے آئے ہیں۔

سليمان ملك العلم سيد أهله　　خليفة شبلى مؤلف سيرة

سید سلیمان (ندوی) ہیں جو دنیائے علم کے تاجدار اور اہل علم کے سرتاج ہیں، علامہ شبلی کے جانشین اور سیرت کے مصنف ہیں۔

وأستاذنا شبير أحمد حائز الـــمعالى وأنواع المزايا السنية

اور ہمارے استاد مولانا شبیر احمد ہیں، جو بلندیوں کے مالک اور بہت سی بلند خوبیوں کے حامل ہیں۔

وأحمد سعيد الدهلوى المقلدالنـــظامة للجمعية المركزية

اور مولانا احمد سعید دہلوی ہیں جو مرکزی جمعیۃ العلماء کی نظامت کے عہدہ دار ہیں۔

شیخ ابو غدہ کی آمد پر: مشہور عالم اور عالم اسلام کے نامور محدث شیخ عبدالفتاح ابو غدہؒ ۱۹۷۹ء میں مئو تشریف لائے تو اس مناسبت سے شیخ کی شان میں یہ قطعہ کہا:

أهلا بمقد مك الهنئى و مرحبا　　يا عالم الشهباء إمام الشام

لم يحو علم الفقه والآثار شـا　　ميٌّ كجمعك بعد ذاك الشامى

اے شام کے عالم اور امام تیرا آنا مبارک ہو علامہ شامی کے بعد حدیث اور فقہ کے علم کو تیری طرح کسی دوسرے شامی نے جمع نہیں کیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆☆

ہم نفسان رفتہ

وفیات الاعیان

وفیات الاعیان

اس باب میں ہم علامہ اعظمیؒ کی بیاض سے ان کی ان تحریروں کو نقل کریں گے جن کو انھوں نے بہت سے اہل علم، اعیان وافاضل اور متعلقین کی وفات پر قلمبند فرمایا ہے، اس کے ذریعہ بہت سے لوگوں کی نسبت ان کے خیالات، تاثرات اور ان کے ذاتی تعلقات کا پتہ لگایا جاسکے گا، مختلف افراد کی وفات پر مختلف قسم کے تاثرات ہیں، اگر متوفی سے ان کا کسی قسم کا ربط و تعلق رہا ہے، تو اس تعلق کی نوعیت کی طرف بھی اکثر وبیشتر اشارہ ہے، اس میں مرحومین کا مختصر سا خاکہ بھی ہے، اور دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے جذبات و تاثرات بھی، جس میں نہ کوئی تکلف و تصنع ہے، نہ کسی خارجی اثر کی آمیزش، بس جذبات و خیالات کو چند سطروں میں سمودیا گیا ہے، جس میں مخاطب بھی ان کی اپنی ذات ہے، باہر کی دنیا سے اس کا تعلق برائے نام ہے، اسی طرح ان "وفیات" کے ذریعہ علامہ اعظمی کی نگاہ میں بہت سے لوگوں کے مقام و مرتبہ سے بھی واقفیت ہوسکے گی۔

اس سلسلے میں ایک بات اور عرض کردینا مناسب ہوگا، کہ اس بیاض کو دیکھنے سے صاف طور پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا ان کو خاص اہتمام تھا، چنانچہ اس میں بہت سے ایسے لوگوں کی بابت بھی مرقوم ہے، جن سے ان کا دور ونزدیک کا کوئی تعلق نہیں تھا، ایسے مواقع پر صرف ان کی تاریخ وفات لکھی اور اپنے خیالات قلمبند فرمادیئے، لیکن اس کی ایسی سخت پابندی بھی نہ تھی کہ اس میں ذرا تخلف نہ ہو، اسی وجہ سے اس کے تتبع سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ متعدد ایسی شخصیتیں جن سے ان کا رابطہ نہایت قوی تھا، ان کے ذکر سے یہ بیاض بالکل خالی اور خاموش ہے۔

اسی طرح اس میں بہت زیادہ دخل طبیعت و مزاج کی موزونیت کا بھی ہے، کہ متعدد

ایسے حضرات جن سے آپ کی خاصی راہ ور سم تھی، لیکن ان کی نسبت چند کلمات سے زیادہ نہیں لکھے، اس موزونیت ہی کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ اس میں اردو، فارسی عربی تینوں زبانوں کا استعمال کیا گیا ہے، بلکہ بہت سے تذکرے ایسے بھی ہیں، جن میں عربی و فارسی کا بہترین امتزاج ہے۔

اس بیاض سے علامہ اعظمی کے کئی ایک محاسن و کمالات پر بیک وقت روشنی پڑتی ہے، ایجاز (اختصار) کے ساتھ کسی بات کو بیان کر دینا، بلاغت کے اہم ارکان اور انشاء پردازی کے اہم عناصر میں سے ایک ہے، اس میں آپ نے صرف ایجاز ہی سے کام نہیں لیا ہے، بلکہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے، اکثر لوگوں کا ذکر مختصر ہونے کے ساتھ اتنا جامع ہے کہ اس میں متوفی کی شخصیت کا پورا عکس آگیا ہے۔ دوسری بات اس میں جو خاص طور سے قابل توجہ ہے، وہ ہے آپ کی وسعت ظرفی اور کشادہ دلی، نہ صرف معاصرین بلکہ خوردوں کے وصف و کمال کو بھی آپ نے پوری فراخدلی سے قلمبند کیا ہے۔

جس بیاض کے متعلق ہم گفتگو کر رہے ہیں، یوں تو اس کے اندر بہت سے لوگوں کی تاریخ وفات ذکر کی ہے، لیکن اس وقت ہم صرف انھیں لوگوں کا ذکر کریں گے، جن سے کسی قسم کا تعلق ظاہر کیا ہے، یا ان کی ذات سے متعلق اپنے کسی تاثر کا اظہار کیا ہے۔

راقم الحروف نے کوشش یہ کی ہے کہ جن لوگوں کا تذکرہ عربی اور فارسی میں ہے اس کا ترجمہ اس طرح آجائے کہ آپ کی تحریر کی روح متاثر نہ ہو، اور جو صفتِ اختصار ہے وہ علی حالہ باقی رہے۔

☆☆☆☆

(الف)

انور شاہ | شيخي العلامة لم أر مثله ولا سمعت بنظير له في هذا العصر ، توفي في صفر ۱۳۵۲ھ بديوبند.

مرے استاد علامہ انور شاہ (کشمیری) میں نے اس دور میں ان کا مثل نہ دیکھا نہ سنا، صفر ۱۳۵۲ھ میں دیوبند میں وفات پائی۔

مولانا الیاس (بستی نظام الدین دہلی) | مصلح میوات ویکتا دلدادۂ تبلیغ، توفي ۱۳۶۳ھ في رجب ، تشرفت بزيارته في دهلي و تضيفت عنده .

مولانا الیاس (بستی نظام الدین دہلی) میوات کے مصلح، یکتا اور تبلیغ کے دلدادہ تھے، رجب ۱۳۶۳ھ میں وفات پائی، مجھے ان سے دہلی میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور میں ان کا مہمان رہا۔

مولانا اصغر حسین پرنسپل شمس الہدیٰ کالج پٹنہ | نہایت جید عالم اور دار العلوم دیوبند کے بہت ہی ممتاز فضلاء میں تھے، مولانا محمد سہول صاحب کے بعد ایک صاحب پرنسپل مقرر ہوئے، اس کے بعد مدرسہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل مولانا ہی تھے، میری ان کی ملاقات وہیں ہوئی تھی، انھوں نے اپنی تصنیفات ہدیۃً عنایت کیں، اور میرا بہت اکرام کیا، جزاہ اللہ تعالیٰ، ۱۳۶۷ھ میں بہار میں وفات پائی، خاص بہار کے رہنے والے تھے۔

مولوی امجد علی ساکن گھوسی | مصنف بہار شریعت، بریلویان اور اصدر الشریعہ می خوانند، بارے زیر صدارت ایں فقیر در بنارس تقریر کردہ بود، بارادۂ حج بمبئی رسیدہ بود کہ اجلش در رسید، و ذلك في سنة ۱۳۶۷ھ

مولوی امجد علی باشندہ گھوسی بہار شریعت کے مصنف، بریلوی لوگ ان کو صدر الشریعہ کے خطاب سے یاد کرتے ہیں، ایک دفعہ انھوں نے اس فقیر کی صدارت میں بنارس میں تقریر کی تھی، حج کے ارادہ سے بمبئی پہنچے تھے کہ داعیٔ اجل آپہنچا، اور یہ ۱۳۶۷ھ کی بات ہے۔

الشيخ ابو السمح عبد الظاهر إمام و خطيب المسجد الحرام توفى فى القاهرة ١٣٧٠ عن سبعين عاماً، قضى معظمها فى خدمة العلم والتدريس فى المسجد الحرام ودارالحديث (بمكة) مع قيامه بالامامة والخطابة فى الحرم المكى، رأيته فى سنة ١٣٦٩ و صليت خلفه.

شیخ ابوالسمح عبدالظاہر مسجد حرام کے امام و خطیب، قاہرہ میں ۱۳۷۰ھ میں ۷۰ سال کی عمر میں وفات پائی، زندگی کا بڑا حصہ خدمت علم اور مسجد حرام اور مکہ کے دارالحدیث میں درس دیتے ہوئے گذارا، ساتھ ہی حرم میں امامت و خطابت کے فرائض انجام دیتے تھے، میں نے ان کو ۱۳۶۹ھ میں دیکھا اور ان کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔

السلطان ابن سعود ملك الحجاز ونجد، توفى سنة ١٣٧٣ فى صفر، وكان ملك الحجاز سنة ١٣٢٥، حججت فى ولايته مرتين وخلفه ولده سعود بن عبدالعزيز وقد رأيته يطوف الكعبة سنة ١٣٧١.

سلطان ابن سعود، حجاز و نجد کے بادشاہ، صفر ۱۳۷۳ھ میں فوت ہوئے، اور ۱۳۲۵ھ میں حجاز کے حکمراں ہوئے تھے، ان کے عہد حکومت میں دو دفعہ میں نے حج کیا، ان کے جانشین ان کے لڑکے سعود بن عبدالعزیز ہوئے، ۱۳۷۱ھ میں میں نے ان کو طواف کعبہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

مولانا اعزاز علی مدرس دارالعلوم دیوبند يلقب بشيخ الأدب والفقه، شهرته تغني عن الاطناب، رأيته وشافهته مراراً، وسمعته يفسر للطلبة المقامات

للحريري، توفي في رجب سنة ١٣٧٤.

مولانا اعزاز علی مدرس دار العلوم دیوبند، شیخ الادب والفقہ سے ملقب تھے، ان کی شہرت تطویل سے بے نیاز ہے، میں نے ان کو بارہا دیکھا اور ان سے ملاقات کی ہے، اور ان کو طلبہ کے سامنے مقامات حریری کی تشریح کرتے ہوئے سنا ہے، رجب ۱۳۷۴ھ میں وفات پائی۔

ابوالکلام آزاد | منشئ مجلة الهلال والبلاغ و مصنف تذكره أولاً، ووزير معارف حكومت مركزيه هند آزاد آخراً، ولا شك أنه كان نابغة جيد الحافظة، قوى الفكر، ذا بلاغة رائعة، كاتبا قديرا! ابتدع اسلوباجديداً في الإنشاء الأردوى. رأيته مراراً وسمعت خطباته، وكان من أركان مجلس العمل لجمعية علماء الهند المركزية وأنا من أعضائه أيضاً. فجالسته في ذلك المجلس عدة مرات، أصيب بالفالج وتوفي في اوائل شوال سنة ١٣٧٧.

ابوالکلام آزاد اولا الہلال اور البلاغ کے بانی اور تذکرہ کے مصنف، اور آخر میں آزاد ہندوستان کی مرکزی حکومت کے وزیر تعلیم تھے، وہ بلا شبہ جودت حافظہ، قوت تفکیر اور حیرت انگیز زور بیان میں نابغۂ روزگار اور زور آور انشاء پرداز تھے، اردو انشاء پردازی میں انھوں نے نیا طرز ایجاد کیا، میں نے ان کو بارہا دیکھا اور ان کی تقریریں سنی ہیں، وہ مرکزی جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے رکن تھے اور اس وقت میں بھی اس کا ممبر تھا، لہذا مجلس میں بارہا میں ان کا ہم نشین رہا، فالج کا حملہ ہوا اور شوال ۱۳۷۷ھ کے اوائل میں رحلت فرما گئے۔

الشيخ أحمد محمد شاكر | عضوالمحكمة الشرعية العليا بمصر، وشارح الترمذی ومسند أحمدوكبير علماء مصر في عصره، خدم مسند

مسند أحمد شرحاً وتحقيقاً وتبويباً و غير ذلك أكثر من عشرين عاما ،وأعاد طبعه فابرزه في حلة قشيبة ، وجاء قدر ثلثه في خمسة عشر مجلداً ثم فاجأه الموت في ذى القعده سنة ۱۳۷۷ ووقف الطبع. وكان رحمه الله منصفا محبا للتحقيق ، علامة بحاثة ، أرسلت اليه ما تعقبته على شرح المسند ، فشكر لي ذلك و قبله مني إلا النزر اليسير ، وطبعه في آخر المجلد الخامس عشر، فرحمه الله . وله أخ يسمى محمود محمد شاكرعالم محقق لم يجر بيني وبينه مكاتبة ولكنه يعرفني وأعرفه .

شیخ احمد محمد شاکر، مصر کی اعلی شرعی عدالت کے ممبر، ترمذی اور مسند احمد کے شارح، اور اپنے وقت میں مصر کے بڑے عالم تھے، بیس سال سے زیادہ مسند احمد کی تشریح و تحقیق اور تبویب وغیرہ میں صرف کئے، اور نئے سرے سے اس کو زیور طبع سے آراستہ کیا، تقریباً ایک تہائی کتاب پندرہ جلدوں میں شائع ہوئی، پھر ذی قعدہ ۱۳۷۷ھ میں اچانک ان کی موت واقع ہو گئی اور اس کی طباعت موقوف ہو گئی، مرحوم انصاف پسند، تحقیق کے دلدادہ اور زبردست محقق عالم تھے، مسند کی شرح پر جو میں نے تعاقب کیا تھا، ان کے پاس بھیجا تو انھوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور تھوڑے سے حصہ کو چھوڑ کر اسے قبول کیا اور پندرہویں جلد کے آخر میں اس کو شائع کیا، اللہ ان پر رحم فرمائیں۔ ان کے ایک بھائی محمود محمد شاکر بھی محقق عالم ہیں، ہمارے درمیان کبھی خط و کتابت نہیں رہی، لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔(۱)

---

(۱) علامہ اعظمی جب قاہرہ سیرت کانفرنس میں تشریف لے گئے ، تو شیخ محمود شاکر نے اپنے دولتکدہ پر دعوت دی اور زبردست اکرام کیا اور اپنی لائبریری بڑے اہتمام سے دکھائی، چونکہ اس سے پہلے علامہ اعظمیؒ نے ان کی کتاب نسب قریش پر نقد فرمایا تھا، اس کی خلش تو تھی ہی اسلئے گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ آپ سے بھی ایک زبردست غلطی ہوئی ہے، علامہ اعظمی کے دریافت کرنے پر انھوں نے بتایا کہ آپ نے جامع معمر کو جامع عبدالرزاق سمجھ لیا ہے، جو خلاف واقعہ ہے، علامہ اعظمی نے فرمایا کہ آپ نے اس کے بارے میں میرا مقالہ جو البعث الاسلامی لکھنو میں شائع ہو چکا ہے، پڑھا ہے یا نہیں، تو انھوں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر فرمایا کہ پہلے آپ اس کو پڑھ لیجئے، میں ہندوستان پہونچ کر البعث کے اس مقالہ کی زیراکس کاپی بھجواؤں گا، چنانچہ یہاں سے رجسٹری کے ذریعہ ان کے پاس بھجا گیا، مگر کوئی جواب نہیں آیا

المفتي اسماعيل بسم الله | مدير جامعة ڈابھيل (سملك) في مديرية سورت ، كانت بيني وبينه مكاتبات ، ولم يتيسر لي لقاءه توفي سنة ١٣٧٨ھ

مفتی اسماعیل بسم اللہ جامعہ (اسلامیہ) ڈابھیل (سملک) ضلع سورت کے مدیر تھے، میری ان سے خط وکتابت تھی، لیکن ملاقات کبھی میسر نہ ہوئی، ۱۳۷۸ھ میں وفات پائی۔

الحافظ أحمد سعيد الدهلوى | ناظم جمعية علماء الهند المركزية سابقاً ورئيسها حالا ، نقل ترجمة القرآن للشاه عبدالقادر من الأردوية القديمة التي المستعملة في هذا العهد وألّف رسائل عديدة ، كان خطيبا بارعا عذب البيان ، تولىٰ رئاسة الجمعية بعد الشيخ حسين أحمد المدنى عامين ، وتوفى في جمادى الأخرى سنة ١٣٧٩ (ديسمبر سنة ١٩٥٩)

حافظ احمد سعید دہلوی مرکزی جمعیۃ علماء ہند کے سابق ناظم اور موجودہ صدر تھے، شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن کو قدیم اردو سے اس زمانے میں استعمال کی جانے والی اردو میں منتقل کیا اور متعدد رسائل تصنیف کئے، ماہر اور شیریں بیان مقرر تھے، شیخ حسین احمد مدنی کے (انتقال کے) بعد دو سال تک جمعیۃ کے صدر رہے، جمادی الاخری ۱۳۷۹ھ (دسمبر ۱۹۵۹ء) میں وفات پائی۔

مولانا احمد علی مفسر | امیر انجمن خدام الدین (لاہور) تلمیذ رشید مولانا عبیداللہ سندھی و داماد او بود، بسلسلۂ تحریر ہندوستان بارہا اسیر فرنگ شدہ، وازیں جہت مدتے در کابل اقامت کرد، بتفسیر قرآن پاک شغفے عظیم داشت، دائماً بایں کار اشتغال می داشت، یکبار اورا در جون پور زیارت کردہ ام، بتاریخ ۱۷ر رمضان ۱۳۸۱ یوم جمعہ (۲۳ر فروری ۱۹۶۲ء) در لاہور وفات یافت۔

مولانا احمد علی مفسر، امیر انجمن خدام الدین لاہور، مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگرد رشید اور داماد تھے، آزادیٔ ہندوستان کے سلسلہ میں بارہا انگریزوں کے اسیر ہوئے، اور اس حیثیت سے ایک مدت تک کابل میں مقیم رہے، قرآن پاک کی تفسیر کے ساتھ بڑا

شغف رکھتے تھے اور ہمیشہ اس خدمت میں مشغول رہتے، ایک بار میں نے ان کی جون پور میں زیارت کی ہے، ۱۷ر رمضان ۱۳۸۱ھ (۲۳ر فروری ۱۹۶۲ء) جمعہ کے دن لاہور میں وفات پائی۔

مولوی ابراہیم بنارسی تلمیذ مولانا امان اللہ مئوی مدرس مظہر العلوم (بنارس) مفتیٔ بنارس وامام جامع گیان باپی بود، حریر فروشی می کرد، وبغایت علم دوست بود، میان من واو سلسلۂ وداد وصداقت از زمان تدریس من بمظہر العلوم تا انقضائے حیات وے استوار بود، پسرش مولوی اسحاق نسبت تلمذ بمن دارد وبرادر اسحاق مولوی عبد السلام نیز۔ یقال اصابته السموم فكانت سبب موته وذلك في قيظ ١٣٨٦ھ.

مولوی ابراہیم بنارسی، مولانا امان اللہ مئوی مدرس مظہر العلوم بنارس کے شاگرد، مفتی بنارس اور جامع مسجد گیان باپی کے امام تھے، ریشم کی تجارت کرتے تھے اور نہایت علم دوست تھے، میرے اور ان کے درمیان محبت ودوستی کا تعلق مظہر العلوم میں میرے زمانۂ تدریس سے لے کر ان کی زندگی کے آخر تک قائم رہا، ان کے لڑکے مولوی اسحاق اور مولوی عبد السلام میرے شاگرد تھے، کہا جاتا ہے کہ ۱۳۸۶ھ میں شدید گرمی میں ان کو گرم ہوا لگی جو ان کی موت کا سبب بن گئی۔

مولوی اویس نگرامی پسر مولوی انیس بن مولانا ادریس نگرامی، در اوائل رفیقے بود از رفقائے دار المصنفین زیر تربیت علمی سید سلیمان ندوی، باز در دار العلوم (ندوۃ العلماء) مدرس تفسیر شد، در سالے کہ او حج کرد من نیز در حجاز بودم، من واو برائے زیارت مسجد قبا و مساجد دیگر، وجامعہ اسلامیہ مدینہ ہمراہ بودیم، توفی ۱۳(۱)

مولوی اویس بن مولوی انیس بن مولانا ادریس نگرامی، شروع میں سید سلیمان ندوی کی زیر تربیت دار المصنفین کے رفیق تھے، پھر دار العلوم (ندوۃ العلماء) میں تفسیر کے مدرس ہوئے، جس سال انھوں نے حج کیا میں بھی حجاز میں تھا، میں اور وہ مسجد قبا اور دیگر مساجد اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی زیارت کے لیے ساتھ گئے ۱۳ھ (۱) میں وفات پائی۔

(۱) بیاض میں بس اسی قدر مذکور ہے اور سال وفات کا ذکر نہیں ہے، آپ کی وفات ۲۹ر شعبان ۱۳۹۶ھ ۲۱ر اگست ۱۹۷۶ء کو واقع ہوئی۔

مولانا اسعد اللہ ناظم مظاہر علوم (سہارن پور) عالم مستعد وصوفی صافی بود،از مولانا اشرف علی تھانوی اجازت یاب بود،ازیں جہت کہ خواجہ تاش من بود در میان من واو رابطۂ استوار بود،توفی فی رجب ۱۳۹۹ھ۔

مولانا اسعد اللہ مظاہر علوم (سہارن پور) کے ناظم، صاحب استعداد عالم اور صوفی صافی آدمی تھے، مولانا اشرف علی تھانوی سے اجازت حاصل تھی، میرے خواجہ تاش ہونے کی حیثیت سے میرا اور ان کا اچھا تعلق تھا، رجب ۱۳۹۹ھ میں وفات پائی۔

مولوی انعام کریم دیوبندی ثم المدنی ناظم کتب خانۂ مدرسۂ علوم شرعیہ مدینہ منورہ، در میان من واو رشتۂ مودت وحب فی اللہ استوار بود، در زیارتہائے متعددہ شرف مہمانی اویافتہ ام، ودر ۱۳۹۸ھ در غرفۂ اقامت داشتم ودر غرفہ کہ بجنب او بود، مولانا اسعد مدنی صباحگاہ مجلس چائے نوشی برپامی کرد، وزیر آں حضرت مولانا زکریا کاندھلوی مقیم بود۔

بتاریخ ۲۱ر رجب ۱۳۹۹ھ اخبار الجمعیہ آگاہی داد کہ بواسطۂ تلفون خبر مرگ مولوی انعام کریم رسیدہ است، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولوی انعام کریم دیوبندی مدنی مدرسۂ علوم شرعیہ۔ مدینہ منورہ کے ناظم کتب خانہ، میرے اور ان کے درمیان دوستی اور حب فی اللہ کا تعلق قائم تھا، مجھے متعدد زیارتوں میں ان کی مہمانی کا شرف حاصل رہا ہے، ۱۳۹۸ھ (کے موسم حج) میں ایک کمرے میں میرا قیام تھا اور اس کے بغل میں جو کمرہ تھا اس میں مولانا اسعد مدنی۔ چائے کی مجلس رچاتے تھے، اور اس کے نیچے حضرت مولانا زکریا کاندھلوی مقیم تھے۔

۲۱ر رجب ۱۳۹۹ھ کو اخبار "الجمعیۃ" نے اطلاع دی کہ ٹیلیفون کے ذریعہ مولوی انعام کریم کی موت کی خبر موصول ہوئی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ابو الأعلى المودودی، كان كاتبا بليغا، وله اطلاع واسع وتفكير قوی، وله تصانيف كثيرة فی مختلف الموضوعات، أجاد فی بعضها وأصاب، وأخطأ فی بعضها فزاغ عن منهج الصواب،

ونجمت فتنة فى الاسلام لبعض آرائه الشاذة ، توفى فى سبتمبر سنة ١٩٧٩ فى أمريكا ، ونقلت جثته الى باكستان ودفن هناك ، ويا ليتهم لو استنوا بسنة الاسلام فى التجهيز والتكفين . (١)

ابوالاعلیٰ مودودی زور آور انشاء پرداز تھے، وسیع معلومات اور قوی تفکیر کے حامل تھے، مختلف موضوعات پر ان کی بہت سی تصنیفات ہیں جن میں سے بعض اچھی اور صحیح ہیں، لیکن بعض دیگر میں انھوں نے غلطیاں کیں اور صحیح راستے سے ہٹ گئے، ان کے چند شاذ خیالات کی وجہ سے اسلام میں ایک فتنہ پیدا ہو گیا، ستمبر ۱۹۷۹ء میں امریکا میں وفات پائی اور ان کی لاش پاکستان لائی گئی اور وہیں مدفون ہوئے، کاش کہ تجہیز و تدفین میں اسلام کے طریقے کی پابندی کی ہوتی۔ (۱)

(ب)

مولانا الشاه بدر عالم الميرتهى ثم المدنى خريج مظاهر علوم، بعد الفراغ منها حضر دروس شيخنا السيد أنور شاه الكشميرى فى ديوبند فى السنة التى كنت أسمع عليه الجامع للترمذى، وهو يسمع معنا، وقد خرج مع شيخنا الى ذابهيل ، ثم انتقل بعد تقسيم الهند الى باكستان الغربية، ثم هاجر منها الى المدينة المنورة ، وقد اجتمعت به فى المدينة ثلاث مرار، زرته فى داره المرة الخيرة فى أواخر ذى الحجة سنة أربع و ثمانين وثلاثمائةو ألف، فتحدث معى برهة طويلة، وأهدى لى الجزء الثالث من تاليفه ، وكان بى حفيا ،

(۱) یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ مولانا مودودی کی وفات پر علامہ اعظمی کا تاثر ہے، جہاں تک مولانا مودودی کے فکر یا ان کی تحریک کا تعلق ہے تو علامہ اعظمی ان سے کبھی متاثر نہیں ہوئے، جیسا کہ آپ نے خود ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ: "میں نے مودودی صاحب کو کبھی اتنی اہمیت نہیں دی کہ ان کو موضوع بحث بناؤں۔"

توفی الی رحمة الله فی رجب سنة ١٣٨٥ ودفن فی المدينة ، من تاليفاته ترجمان السنة فی أربع مجلدات ولم يكمل ، وهو الذی جمع أمالی شيخنا فی درس البخاری وسماه فيض الباری وقد طبع فی أربع مجلدات .

مولانا شاہ بدر عالم میرٹھی مدنی، مظاہر علوم کے فارغ التحصیل تھے ،وہاں سے فراغت پانے کے بعد دیوبند میں ہمارے استاد حضرت انور شاہ کشمیری کے درس میں اس سال شریک ہوئے جس سال میں جامع ترمذی کی سماعت کررہا تھا،اور ہمارے ساتھ وہ بھی سماعت کررہے تھے، پھر ہمارے شیخ (شاہ صاحب) کے ساتھ ہی ڈابھیل گئے، تقسیم ہند کے بعد مغربی پاکستان چلے گئے،اور وہاں سے مدینہ منورہ ہجرت کرگئے،مدینہ میں میری ان سے تین دفعہ ملاقات ہوئی ہے، آخری دفعہ میں ان کے گھر میں ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ کے اواخر میں ملا، وہ مجھ سے دیر تک گفتگو کرتے رہے،اور اپنی کتاب کی تیسری جلد مجھ کو ہدیۃً کی، وہ میرے اوپر بڑے مہربان تھے، رجب ۱۳۸۵ھ میں اپنے رب کے جوار رحمت میں پہنچ گئے اور مدینہ منورہ میں مدفون ہوئے، ان کی تصانیف میں ترجمان السنہ چار جلدوں میں ہے جو مکمل نہ ہو سکی، انھوں نے ہی بخاری پر ہمارے استاد کے امالی کو بھی جمع کیا، اور اس کا نام فیض الباری رکھا جو چار جلدوں میں چھپی ہے۔

الشيخ بهجة البيطار الدمشقی حملت الينا الجرائد العربية نعيه فی يوليه سنة ١٩٧٦ (رجب ١٣٩٦) وكان من أماثل العلماء وأصحاب التصنيف المبرزين ، زرته فی فندق شبرا (بمكة المكرمة) وأهديت له نسخة من مسند الحميدی ، ولم أتمكن من زيارته فی دمشق لقلة الوقت.

شیخ بہجۃ البیطار دمشقی، عربی اخبارات نے جولائی ۱۹۷۶ء (رجب ۱۳۹۶ھ) میں ان کی موت کی خبر سنائی، بڑے علماء اور ممتاز مصنفین میں تھے، مکہ مکرمہ کے شبرا ہوٹل میں ایک دفعہ میں نے ان سے ملاقات کی، اور مسند حمیدی کا ایک نسخہ ان کو ہدیہ کیا، وقت کی کمی کی وجہ سے دمشق میں میں ان کی زیارت نہ کر سکا۔

(ت)

الشیخ ترکی بن النجدی رأیته فی مدرسة العلوم الشرعیة بالمدینة المنورة یقرئ سنن أبی داؤد، وکانت له معرفة بالحدیث، وهذا فی سنة ۱۳۷۱، ثم لما قدمت المدینة فی سنة ۱۳۸۰ وجدته قد مات قبل مقدمی بسنتین أوسنوات.

شیخ ترکی بن نجدی، میں نے ان کو مدرسۃ العلوم الشرعیہ مدینہ منورہ میں ابوداؤد پڑھاتے ہوئے دیکھا تھا، اور ان کو حدیث کا علم رکھنے والا پایا تھا، یہ ۱۳۷۱ھ کی بات ہے، پھر جب ۱۳۸۰ھ میں، میں مدینہ منورہ پہنچا تو اس سے دو تین سال قبل وہ وفات پا چکے تھے۔

(ج)

جگر مراد آبادی سکندر علی جگر مراد آبادی اشہر و اشعر شعرائے عصر بود، بارہا مرا اتفاق صحبت و سماع غزلیات او افتادہ، در گونڈہ رخت اقامت انداخت، و مدتے دراز کہ بیش از سی سال باشد ہمانجا ماند، و بالآخر ہمانجا پیوند خاک شد، ۹ر ستمبر ۱۹۶۰ء (۱۶ر ربیع الاول ۱۳۸۰ھ) روز جمعہ بود کہ ازیں جہاں در گذشت، من ابیاتہ المستحسنہ قولہ:

مرگ عاشق تو کچھ نہیں لیکن — اک مسیحا نفس کی بات گئی

جگر مراد آبادی، سکندر علی جگر اپنے زمانے کے سب سے مشہور اور بڑے شاعر تھے، بارہا مجھے ان کی صحبت اور غزل سننے کا اتفاق ہوا ہے، گونڈہ میں رخت اقامت ڈالا، اور عرصۂ دراز یعنی ۳۰ر سال سے زیادہ وہاں فروکش رہے، اور بالآخر وہیں پیوند خاک ہوئے، ۹ر ستمبر ۱۹۶۰ء (۱۶ر ربیع الاول ۱۳۸۰ھ) جمعہ کے دن سفر آخرت اختیار کیا، ان کے پسندیدہ اشعار میں یہ شعر ہے:

مرگ عاشق تو کچھ نہیں لیکن — اک مسیحا نفس کی بات گئی

(ح)

شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی | صدر المدرسین دار العلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء، وجانشین شیخ الہند مولانا محمود حسن، دریغا کہ بتاریخ ۱۲۔ جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ بعارضۂ قلب در دیوبند وفات یافتند۔ وکان رحمه الله مسند وقته وشيخ عصره في الطريقة الجشتية ، وزعيما كبيرا من زعماء الانقلاب السياسي ، وبطلا من أبطال النهضة الهندية، الذين قاوموا الدولة الانكليزية في الهند ، حتى استخلصوها من أيديهم ، وهو رحمه الله وإن لم يكن من مشايخي كنت أجلّه إجلالهم ، وكانت بيني وبينه محبة اكيدة، وسافر مرة من ديوبند الى مئو لاغاية له سوى أن ياخذني معه ويذهب الى دارالعلوم (بديوبند) لكي أتولى الإفتاء بها ، وكان رحمه الله من العلم والتقوى والجهاد والعبادة ومكارم الأخلاق بمكان،

شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی، دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین، جمعیۃ علماء ہند کے صدر، اور شیخ الہند مولانا محمود حسن کے جانشین، افسوس کہ ۱۲/ جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ کو دل کی بیماری میں دیوبند میں وفات پاگئے، مرحوم مُسند وقت اور طریقۂ چشتیہ میں شیخ زمانہ تھے۔ وہ سیاسی انقلاب کے بڑے رہنماؤں اور ہندوستان کی آزادی کے ان بہادروں میں ایک تھے جنھوں نے ہندوستان میں قائم انگریزی حکومت کے خلاف جد وجہد کی تا آنکہ اس کو انگریزوں کے ہاتھ سے آزاد کرایا، مرحوم اگرچہ میرے اساتذہ میں نہیں تھے، لیکن میں ان کا اپنے اساتذہ ہی کی طرح اکرام کرتا تھا، ہمارے درمیان شدید محبت تھی، ایک دفعہ دیوبند سے مئو تک کا صرف اسی لئے سفر فرمایا کہ مجھے اپنے ساتھ دارالعلوم دیوبند لے جائیں تاکہ میرے سپرد افتاء کا منصب فرمائیں، مرحوم علم وتقویٰ، جہاد وعبادت اور خوش اخلاقی کے بلند مقام پر تھے۔

الشیخ حسن المشاط من أكابر علماء مكة وأفاضلهم ، لقيته اولاً في مجلسه بالحرم المكي ، وزارني ثانياً في بيت الشيخ النمنكاني بالمدينة المنورة كما ذكرته في ترجمة الشيخ علوی، كان عالماً قوى المشاركة في الحديث والفقه ، طالعت من تصانيفه رسالة له في المصطلح، وأخرى في مناسك الحج ، كان رحمه الله يحبني ، وكان بشوشا، متواضعاً عليه سيماء التقوى والخشية ، صوفيا صافيا ، إنتقل إلى رحمة الله في أحد شهور سنة ۱۳۷۹، قبل موسم الحج .

شیخ حسن مشاط اکابر وافاضل علماء مکہ میں تھے، میں ان سے پہلی بار حرم مکہ کی ان کی مجلس میں ملا، اور دوبارہ انھوں نے مدینہ منورہ میں شیخ نمنکانی کے گھر پر مجھ سے ملاقات کی جیساکہ میں شیخ علوی کے تذکرہ میں ذکر کر چکا ہوں، عالم تھے اور حدیث وفقہ میں دستگاہ رکھتے تھے، ان کی تصانیف میں ایک رسالہ اصطلاح پر اور دوسرا جو مناسک حج پر ہے، میں نے مطالعہ کیا ہے، مرحوم مجھ سے محبت کرتے تھے، ہنس مکھ اور متواضع تھے، ان کے اوپر تقوی اور خشیت الٰہی کی کیفیت طاری رہتی تھی، صوفی صافی تھے، ۱۳۷۹ھ کے کسی مہینے میں حج سے پہلے انتقال کیا۔

مولوی حبیب اللہ مئوی خلیفۂ مولانا تھانویؒ مدتے در الہ آباد و بنارس وغیرہ در مدرسہائے سرکاری تعلیم زبان فارسی می داد، ایں حقیر را بسیار عزیز میداشت، در ماہ ذی قعدہ ۱۳۷۹ھ ازیں جہاں درگذشت، در آخر با سکھر سندھ (پاکستان) منتقل شدہ بود، ہمانجا پیوند خاک شدہ۔

مولانا تھانویؒ کے خلیفہ مولوی حبیب اللہ مئوی نے ایک مدت تک الہ آباد و بنارس وغیرہ کے سرکاری اسکولوں میں فارسی زبان کی تعلیم دی، اس حقیر کو بہت عزیز رکھتے تھے ، بماہ ذی قعدہ ۱۳۷۹ میں اس دنیا سے سفر فرمایا ، آخر عمر میں سکھر سندھ (پاکستان) منتقل ہوگئے تھے، اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

المفتی محمد حسن الأمرتسری | أحد خلفاء الشیخ أشرف علی التهانوی ، کان عالماً جلیلا ، له مدرسة فی لاهور ، زرته مرة فی تهانه بهون ، بلغنی خبر وفاته فی ذی الحجة سنة ۱۳۸۰ ، وأنا بمکة ، وکان قد قدمها ولداه حاجین فی ذلك العام.

مفتی محمد حسن امرتسری مولانا اشرف علی تھانوی کے خلفاء میں سے ایک تھے، بڑے عالم تھے، لاہور میں ان کا مدرسہ تھا، تھانہ بھون میں ایک دفعہ میں نے ان سے ملاقات کی ہے، ان کی وفات کی خبر ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ میں مجھے مکہ میں ملی، اس سال ان کے دو لڑکے بھی حج کیلئے آئے تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی | ناظم جمعیۃ علماء ہند دہلی، وممبر پارلیمنٹ ہند، ومصنف قصص القرآن واسلام کا اقتصادی نظام وغیرہ، قوم و ملت کے بہترین خادم اور فرزندان دارالعلوم دیوبند میں ان کی شخصیت بہت اونچی تھی؛ وشهرته تغنى عن الاطناب فی وصفه ۱۳۸۲ھ میں دہلی میں وفات پائی، اور شاہ ولی اللہ صاحب کے جوار میں مدفون ہوئے، برہان، معارف اور دارالعلوم دیوبند کے شذرات سے مزید حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔

مولانا سید حمید الدین بن بشیر الدین الفیض آبادی | کان عالماجلیل القدر ، له مشارکة فی الفقه والحدیث وغیرهما ، من أرشد تلامذة الشیخ محمد أنور الکشمیری، رفیقا للشیخ محمد یوسف البنوری فی الطلب ، وکان فی الرعیل الأول من خریجی الجامعة الاسلامیة بڈابهیل ، بایع علی ید الشیخ حسین أحمد المدنی ، ودرس فی بیر جهنڈا(من السند) أیاماً، ثم فی نورالعلوم (ببهرائج) أعواماً وفی دارالعلوم التابعة لندوة العلماء یسیراً وانتقل الی کلکتا أخیراً وتولی درس الحدیث فی المدرسة العالیة مدة طویلة وکان من أعضاء مجلس شوری دارالعلوم الدیوبندیة ، خرج من دهلی یرید دیوبند

في سيارة ومعه أهله فاصطدمت سيارته بأخرى بقرب مظفر نگر ، فانتقل إلى رحمة الله لوقته ، وكان ذلك في شعبان من سنة ١٣٨٨ (١٥ـ من نوفمبر سنة ١٩٦٩) وكان رحمه الله يحبني حبا يفوق الوصف ، ويجلني إجلال شيوخه، و عهدته منذ عرفته ورعا دينا ، محبا للعلم وأهله .

مولانا سید حمید الدین بن بشیر الدین فیض آبادی جلیل القدر عالم تھے، فقہ و حدیث وغیرہ میں درک حاصل تھا، مولانا انور شاہ کشمیری کے ارشد تلامذہ میں تھے، مولانا محمد یوسف بنوری کے ہم درس اور جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل کے اولین فضلاء میں تھے، مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت تھے، پیر جھنڈا (سندھ) میں کچھ دنوں درس دیا، پھر نور العلوم بہرائچ میں کئی سال تک پڑھاتے رہے، تھوڑے دنوں تک دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھی پڑھایا، اور کلکتہ منتقل ہوگئے، وہاں مدرسہ عالیہ میں ایک مدت تک حدیث کا درس دیا، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری کے ممبر بھی تھے، اپنے اہل و عیال کے ساتھ دیوبند کے قصد سے دہلی سے ایک کار میں روانہ ہوئے، کہ مظفر نگر میں آپ کی کار ایک دوسری کار سے ٹکرا گئی، اور اسی وقت جوار رحمت میں پہنچ گئے، یہ واقعہ شعبان ۱۳۸۸ھ (۱۵/ نومبر ۱۹۶۹ء) کا ہے، مرحوم مجھ سے نا قابل بیان حد تک محبت کرتے تھے، اور اپنے اساتذہ کی طرح میرا اکرام کرتے تھے، میں نے جب سے ان کو جانا ہے پرہیزگار و دین دار اور علم و علماء سے محبت کرنے والا پایا ہے۔

(خ)

مولانا خليل احمد انبيٹھوی محدث | توفي في المدينة المنورة سنة ١٣٤٦، صاحب بذل المجهود في شرح أبي داؤد ، تلميذ رشيد حضرت گنگوهي وصدر مدرسين مظاهر علوم ، تشرفت برويته وزيارته في ديوبند.

مولانا خلیل احمد انبیٹھوی محدث نے ۱۳۴۶ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی ۔

بذل المجہود فی شرح ابی داؤد کے مصنف، حضرت گنگوہی کے شاگرد رشید اور مظاہر علوم کے صدر مدرس تھے، مجھے دیوبند میں ان کو دیکھنے اور ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

(ز)

الشیخ زاهد الكوثری صاحب التصانيف الكثيرة الطيبة، البحر الخضم علماً، ومن أكابر علماء عصره، وظنى أنه كان عند وفاته أوحد أوانه، لى معه مكاتبات ودية و أجاز باستدعائى ابنى رشيد أحمد، توفى فى ذى الحجة سنة ١٣٧١ وأنا إذ ذاك بمكة المكرمة، كتب الى بوفاته ابنى رشيد أحمد، وذاك فى حجتى الثانية، و كان الله قد من عليّ بالوصول الى بيته قبل ذلك بسنتين سنة ١٣٦٩ فالحمدلله، وأتحفنى الشيخ بكثير من رسائله التى ألفها، وذكرنى في مقدمة منية الألمعي.

شیخ زاہد کوثری، بہت سی عمدہ کتابوں کے مصنف، علم کے بڑے سمندر، اور اپنے زمانہ کے اکابر علماء میں تھے، میں سمجھتا ہوں کہ وفات کے وقت وہ یکتائے روزگار تھے، میری ان سے دوستانہ مراسلت تھی، اور میری درخواست پر میرے لڑکے رشید احمد کو انھوں نے اجازت بھی دی تھی، ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ میں جس وقت کہ میں مکہ مکرمہ میں تھا وفات واقع ہوئی، ان کی وفات کی خبر مجھے میرے لڑکے رشید احمد نے دی اور وہ میرا دوسرا حج تھا، اور اس سے دو سال پہلے ۱۳۶۹ھ میں بھی اللہ نے اپنے گھر تک رسائی کا میرے اوپر انعام فرمایا تھا، فالحمد للہ، شیخ نے اپنے تصنیف کردہ بہت سے رسائل مجھے ہدیہ کیے، اور منیۃ الالمعی کے مقدمہ میں میرا ذکر بھی کیا۔

ابو زهرة كان الشيخ من كبار علماء مصر وفقهائها، له تآليف جيدة منها: أبو حنيفة، ومالك، والشافعي، وأحمد وغير ذلك وكان خطيبا مصقعا، والأسف أنه لم يتفق لى زيارته، وافانا خبر وفاته ونحن بالهند في مايو سنة ١٩٧٤

شیخ ابوزہرہ مصر کے بڑے علماء وفقہاء میں تھے، ان کی بہت سی اچھی تصنیفات ہیں، جن میں ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور احمد وغیرہ ہیں، زبان آور مقرر تھے، افسوس کہ ان سے میری ملاقات نہ ہو سکی، ان کی وفات کی خبر ہمیں مئی ۱۹۷۴ء میں ہندوستان میں ملی۔

(س)

شاہ سلیمان پھلواروی | ولد سنة ١٢٧٦هـ، توفي سنة ١٣٥٤هـ زرته في فلواري.

شاہ سلیمان پھلواروی ۱۲۷۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۵۴ھ میں وفات پائی، میں نے پھلواری میں ان سے ملاقات کی ہے۔

السلطان سعود بن عبدالعزيز | ملك الحجاز ونجد وملحقاتها، تولى السلطنة عام ٠٠٠ ووسع الحرم المدني، وشرع في توسعة المسجد الحرام، ثم انسحب عن السلطنة في حق أخيه فيصل بن عبدالعزيز ، وقد رأيته حين كان ولي عهد أبيه زار الهند ،أقام بعد انعزاله في اليونان وتوفي هناك في اواخر سنة ١٣٨٨.

سلطان عبدالعزیز، حجاز ونجد اور اس کے ملحقات کے بادشاہ، سنہ ۰۰۰ میں حکومت سنبھالی، حرم مدنی کی توسیع کی، اور مسجد حرام کی توسیع شروع کی، پھر اپنے بھائی فیصل بن عبدالعزیز کے حق میں حکومت سے دستبردار ہو گئے، میں نے ان کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ اپنے والد کے ولی عہد تھے اور ہندوستان کا دورہ کیا تھا، حکومت سے اپنی کنارہ کشی کے بعد یونان میں مقیم ہو گئے تھے اور وہیں ۱۳۸۸ھ کے آخر میں وفات پائی۔

سعید انجینئر (بمبئی) | میرے محب مخلص اور بڑے کرم فرما تھے، بعارضۂ ذیابیطس ۲ر مئی ۱۹۶۹ء م ۱۴ر صفر ۱۳۸۹ھ کو جی ٹی ہسپتال بمبئی میں وفات پائی۔

الشیخ سعدی یاسین | خطیب مسجد أبی بکر فی بیروت، اجتمعت به مراراً، وصلیت خلفه، ورافقته الی قلمون فی عزاء الشیخ عبدالرحمٰن (أخی صاحب المنار)، حملت الینا نبأوفاته جریدة أخبار العالم الإسلامی (مکة) فی جمادی الأخری سنة ۱۳۹۶۔

شیخ سعدی یاسین، مسجد ابو بکر بیروت کے خطیب، ان سے بارہا میری ملاقات ہوئی، ان کے پیچھے میں نے نماز پڑھی اور شیخ عبدالرحمٰن (علامہ رشید رضا صاحب المنار کے بھائی) کی تعزیت کے لئے ان کے ساتھ قلمون گیا، مکہ کے اخبار العالم الاسلامی نے جمادی الاخریٰ ۱۳۹۶ھ میں ان کی وفات کی خبر سنائی۔

مولانا سراج الحق مچھلی شہری | کان سنیا قحا، کتب رسائل عدیدة یدافع عن أهل السنة ویدحض کید الشیعة، کان یجلنی ویتودد الی، ویعتقد فیَّ ویعتمد علیَّ فی العلم، توفی سنة ۱۳۹۷ھ، کتب الی بذلك ولده۔

مولانا سراج الحق مچھلی شہری خالص سنی تھے، اہل سنت کے دفاع اور شیعوں کے فریب کے ابطال میں متعدد رسائل لکھے، وہ میری عزت اور مجھ سے محبت کرتے تھے، میرے اوپر یقین اور میرے علم پر اعتماد کرتے تھے، ۱۳۹۷ھ میں وفات پائی، اس کی اطلاع مجھے ان کے لڑکے نے خط لکھ کر دی۔

(ش)

مولانا شکر اللہ مبارکپوری | أخی فی الله عالم جید توفی سنة ۱۳۶۱۔

مولانا شکر اللہ مبارکپوری میرے اللہ واسطے بھائی تھے، جید عالم تھے ۱۳۶۱ھ میں وفات پائی۔

مولانا شکر اللہ صاحب کی نسبت علامہ اعظمی ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:

مولانا شکر اللہ صاحب مبارکپوری، مبارکپور ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے تھے،

جید عالم تھے، مدرسہ احیاء العلوم نے انھیں کے زمانے میں ترقی کی، مقرر بھی تھے، درس بھی دیتے تھے، مذہبی، سیاسی اور جماعتی خدمتیں خوب انجام دیں ۱۳۶۱ھ میں وفات ہوئی۔

علامہ شبیر احمد دیوبندی شارح مسلم وصاحب فوائد قرآنیہ، قرأت علیه نبذاً من صحیح مسلم توفی ۱۳۶۹ھ ودفن فی کراچی، رثیته بقصیدة طبعت فی برہان (مارچ ۵۰ء)

علامہ شبیر احمد دیوبندی صحیح مسلم کے شارح اور فوائد قرآنیہ کے مصنف، میں نے ان کے پاس صحیح مسلم کا کچھ حصہ پڑھا ہے، ۱۳۶۹ھ میں وفات پائی اور کراچی میں مدفون ہوئے، ایک قصیدہ میں ان کا میں نے مرثیہ لکھا ہے، جو مارچ ۱۹۵۰ء کے برہان میں چھپا ہے۔

مولوی شمس الدین (کیاری ٹولہ) در بعض کتب ہم سبق من بود، وبعد فراغ من بیک سال از دار العلوم مئو فراغ یافت، چندے در جیون رام ہائی اسکول بہ تعلیم زبان پارسی پرداخت، پس ازاں در ادارۂ مفتاح العلوم رفاقت ایں حقیر اختیار کرد، از سالہائے دراز مبتلائے ضیق النفس بود، در اواخر جمادی الاولی ۱۳۹۲ھ ازیں جہاں در گذشت، غفر اللہ لہ۔

مولوی شمس الدین کیاری ٹولہ، بعض کتابوں میں میرے ہم سبق تھے، میری فراغت کے ایک سال بعد دار العلوم مئو سے فراغت پائی، جیون رام ہائی اسکول میں کچھ دنوں فارسی زبان کی تعلیم دی، اس کے بعد مفتاح العلوم کی ادارت میں اس حقیر کی رفاقت اختیار کی، کئی سال سے ضیق النفس کی بیماری میں مبتلا تھے، جمادی الاولی ۱۳۹۲ھ کے آخر میں اس دنیا سے سفر کیا، اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

المفتی شفیع الدیوبندی خریج دارالعلوم الدیوبندیة ثم مفتیها، وقد انتقل بعد التقسیم الی کراتشی وأسس هناك مدرسة قام بادارتها، والتدریس والإفتاء فیها، له تصانیف، وکان ممن أجاز له شیخنا التهانوی، کنت أعرفه و یعرفنی من حین اقامتی بدارالعلوم متعلما، ثم لقیته بالحرم المکی فی إحدی

حجاتی، وبالحرم المدنی فی أخری،ورأیته ثالثة فی دیوبند کان قدّمها فی زیارة من الباکستان، توفی فی سنة ۱۳۸٦.

مفتی شفیع دیوبندی، دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور مفتی، تقسیم ہند کے بعد کراچی منتقل ہو گئے اور وہاں ایک مدرسہ قائم کیا جس کے وہ ناظم تھے، اور درس وافتاء کا کام دیکھتے تھے، صاحب تصنیف تھے، اور ان کو ہمارے حضرت تھانوی سے اجازت بھی حاصل تھی، دارالعلوم دیوبند میں طالب علمی کے میرے زمانۂ قیام سے ہم ایک دوسرے کو پہچانتے تھے، پھر میری ان سے ملاقات ایک حج میں حرم مکہ میں ہوئی، پھر ایک دوسرے حج میں حرم مدینہ میں ہوئی، تیسری دفعہ میں نے ان کو دیوبند میں دیکھا جب وہ پاکستان سے سفر کر کے آئے ہوئے تھے، ۱۳۸٦ھ میں وفات پائی۔

علامہ اعظمی کو جب یہ خبر موصول ہوئی تو انھوں نے مذکورہ بالا سطریں تحریر فرما دیں، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی، بلکہ مفتی شفیع صاحب ہی کے ایک دوسرے ہم نام بزرگ مفتی محمد شفیع سرگودھوی کا انتقال اس وقت ہوا تھا، چنانچہ آپ نے اسی جگہ اس کے بعد لکھا ہے:

"کسی نے غلط خبر دی اور میں نے یہ نوٹ لکھدیا، مفتی صاحب ابھی زندہ ہیں، ۱۱ر ج۲/ ۱۳۸٦ھ۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس سال مفتی محمد شفیع سرگودھوی کا انتقال ہوا۔"

پھر اس کے دس برس بعد ۱۳۹٦ھ میں مفتی شفیع صاحب کا انتقال ہوا تو آپ نے مذکورہ جملہ کے فوراً بعد لکھا:

"اور مفتی شفیع دیوبندی کی وفات ۱۳۹٦ میں ہوئی۔ معارف وبرہان ودارالعلوم میں ان کی وفات وحالات کا ذکر ہے۔"

مذکورہ بالا سطروں کے علاوہ ایک چھوٹے سے کاغذ پر مفتی صاحب کی وفات پر اپنا تاثر یوں لکھا ہے:

"مفتی صاحب کی وفات کے وقت سے اب تک کا زمانہ میرے لئے عام الحزن

ہے، اس مدت میں کئی ایک عالم و فاضل اور مصلح و مربی شخصیتوں کی جدائی کا غم مجھے برداشت کرنا پڑا ہے، مثلاً مولانا محمد اویس نگرامی، اور مولانا عبدالماجد دریابادی، مگر مفتی صاحب کا فقدان بہت بڑا سانحہ ہے، ان کے اٹھ جانے سے علم و فضل کی بزم سونی ہو گئی ہے، ان کے نہ ہونے سے فقہاء کی مجلس میں جو خلا پیدا ہوا ہے، اس کا پر ہونا مشکل ہے، وہ اپنے وقت کے نابغہ اور عبقری تھے۔"

المولوی شریف الحسن الدیوبندی و توفی فی تلک السنة (۱) (سنة ۱۳۹۷) المولوی شریف الحسن الدیوبندی، کان یتولی التدریس بدارالعلوم (دیوبند)، فوض الیه باشارتی، و درّس البخاری أخیراً.

اور اسی سال (۱۳۹۷ھ میں) مولوی شرف الحسن دیوبندی نے وفات پائی، دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمت انجام دیتے تھے، ان کو میرے ہی مشورہ پر رکھا گیا تھا، آخر میں بخاری بھی پڑھائی۔

(ص)

مولوی حکیم محمد صابر (۲) پسر حافظ عثمان تلمیذ استاذی مولانا عبدالغفار ساکن الہ داد پورہ مئو۔ کان یحبنی ویجلنی، توفی ۶۔ج ۲/ ۱۳۶۳۔

مولوی حکیم محمد صابر، حافظ عثمان کے لڑکے، میرے استاد مولانا عبدالغفار کے شاگرد الہ داد پورہ کے رہنے والے تھے، مجھ سے محبت اور میرا اکرام کرتے تھے، ۶/ جمادی الثانیہ ۱۳۶۳ھ کو فوت ہوئے۔

حضرت مولوی محمد صابر بن عنایۃ اللہ پدر بزرگوار و ولی نعمت ایں فقیر، عالم

(۱) علامہ اعظمی کی بیاض میں ان کا ذکر مولانا سراج الحق مچھلی شہری کے ذکر کے بعد ہے، اس لئے تعبیر فی تلک السنة سے کی ہے۔

(۲) مفتاح العلوم کے ابتدائی دور میں جن حکیم محمد صابر الہ داد پورہ کا ذکر ہے وہ یہی ہیں۔

باسند و تلمیذ مولانا عبد الغفار و اُخویہ و در طریق چشتیہ مرید مولانا اشرف علی تھانوی، بغایت متشرع و متقی و زاہد و تہجد گذار و مہمان نواز و بے نفس و خوش اخلاق بود، و کان أواها تلاء اً للقرآن، توفی بذات الرية فی الساعة الثانية نهاراً یوم السبت فی إحدى و عشرين من ذی الحجة سنة ۱۳۶۵، وكان ابن خمس وسبعین أو ثلث و سبعین۔ از وفات او آنچہ بر من گذشت از حد بیان بیرون است۔

حضرت مولوی محمد صابر بن عنایۃ اللہ، اس فقیر کے والد بزرگوار اور ولی نعمت، سند یافتہ عالم اور مولانا عبد الغفار اور ان کے دونوں بھائیوں کے شاگرد اور چشتی سلسلے میں مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید، نہایت پابند شریعت، صاحب زہد و تقویٰ اور تہجد گذار و مہمان نواز و بے نفس و خوش اخلاق تھے، بہت زیادہ گریہ وزاری اور قرآن کی تلاوت کرنے والے تھے، ۲۱ر ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو سنیچر کے دن دو بجے دن میں پھیپھڑے کی بیماری میں انتقال فرمایا، وفات کے وقت عمر ۷۵ یا ۷۳ برس تھی، ان کی وفات سے مجھ پر جو گذری ہے وہ بیان سے باہر ہے۔

مولوی محمد صابر بن حافظ اسمٰعیل (بلاقی پورہ مئو) شاگرد مولانا احمد حسن کانپوری و مرید شاہ وارث حسن، واستاد ایں فقیر بود، بدار العلوم مئو و مظہر العلوم بنارس درس داد ،بعارضہ وجع قلب در اواخر ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ وفات یافت۔ اولئك لهم الخيرات .

مولوی محمد صابر بن حافظ اسمٰعیل (بلاقی پورہ مئو) مولانا احمد حسن کانپوری کے شاگرد، شاہ وارث حسن کے مرید اور اس فقیر کے استاد تھے، دار العلوم مئو اور مظہر العلوم بنارس میں درس دیا، دل کی بیماری میں ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ کے آخر میں وفات پائی، اولئك لهم الخيرات سے تاریخ نکلتی ہے۔

المولوی صبغۃ اللہ الفرنجی محلی الملقب بشہید کان واعظا عذب البيان يتكلم على السيرة النبوية ، كان زميلا لی فی احدی رحلاتی الی مكة المكرمة، كان يتردد الی ، وقد دعانی مرة الی بيته فی حين اقامتی بلكهنؤ، توفی فی كلكتة

لسبع عشرة من شعبان سنة ١٣٨٤ ودفن في لكهنؤ.

مولوی صبغۃ اللہ فرنگی محلی ملقب بہ شہید شیریں بیان واعظ تھے، سیرت نبوی پر تقریر کرتے تھے، مکہ مکرمہ کے ایک سفر میں میرے ہم سفر تھے، مجھ سے محبت کا برتاؤ کرتے تھے، لکھنؤ کے میرے زمانۂ قیام میں ایک دفعہ مجھے اپنے گھر دعوت بھی دی، ۱۷ شعبان ۱۳۸۴ھ کو کلکتہ میں وفات پائی، اور لکھنؤ میں دفن کئے گئے۔

قاری محمد صدیق لکھنوی از مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ سند فراغ حاصل کرد، ودر صحبت حضرت مولانا عبدالشکور کاکوروی مدیر النجم مدتہا ماند وفیوض فراواں درربود، واکتساب علم ظاہر واستفاضہ فیض باطن کرد، مقرر بلیغ ومدرس جید الاستعداد بود، در مناظرہ با اہل تشیع و اہل بدعت مہارت عظیم داشت، بایں فقیر اخلاص ومودت بے پایاں داشت، توفی في اوائل جمادى الثانيه من سنة ١٣٩٢

قاری محمد صدیق لکھنوی، مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ سے سند فراغ حاصل کی، اور مدتوں (امام اہلسنت) حضرت مولانا عبدالشکور کاکوروی مدیر النجم کی صحبت میں رہے اور خوب فیض حاصل کیا، اور علم ظاہر اور فیض باطن سے بہرہ مند ہوئے، بلیغ مقرر اور جید الاستعداد مدرس تھے، شیعوں اور بدعتیوں سے مناظرہ میں بڑی مہارت حاصل تھی، اس فقیر کے ساتھ بے پناہ اخلاص ومحبت رکھتے تھے، ۱۳۹۲ھ میں جمادی الثانیہ کے شروع میں وفات پائی۔

(ظ)

مولانا ظفر احمد التهانوى توفي في ذى قعده من سنة ١٣٩٤ (ديسمبر ١٩٧٤) في الباكستان، وهو ابن اخت شيخنا العالم الكبير حكيم الأمة الشيخ أشرف على التهانوى، تخرج من مظاهر علوم وتدرب عند خاله وتسلك، درس في رنگون مدة، وألف إعلاء السنن وكان له اليد الطولى في علوم الحديث وفقهه، آثر القيام بالباكستان عند تقسيم الهند، وأسس هناك

مدرسة في (بھول پور) ولزمها الى آخر حياته وكان قبل ذلك في ڈھاكه يدرس ويفيد ، كانت بيني و بينه معرفة، وكان يثني على تاليفي نصرة الحديث رحمه الله رحمة واسعة .

مولانا ظفر احمد تھانوی نے ذی قعدہ ۱۳۹۴ھ (دسمبر ۱۹۷۴) میں پاکستان میں وفات پائی، وہ ہمارے شیخ عالم کبیر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے بھانجے تھے، مظاہر علوم سے فارغ ہوئے اور اپنے ماموں کے پاس مشق کی اور سلوک سیکھا، ایک مدت تک رنگون میں درس دیا، اور اعلاء السنن تصنیف کی، حدیث کے علم اور اس کے فقہ میں ید طولی حاصل تھا، تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں قیام کو ترجیح دی اور وہاں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی اور اخیر عمر تک اس سے وابستہ رہے، اس سے پہلے ڈھاکہ میں بھی درس و تدریس کی خدمت انجام دے چکے تھے، ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے، اور وہ میری کتاب نصرۃ الحدیث کی تعریف کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کے اوپر اپنی بے پایاں رحمت فرمائے۔

ظهير أحسن (شوق) النيموي المحدث الحنفي مصنف آثار السنن ،

كان طويل الباع في العلوم النقلية ، كثير الاطلاع في فنون الحديث، دافع عن مذهب أبي حنيفة أحسن مدافعة ، تلمذ على مولانا عبدالحي اللكنوي، وأجاز له مولانا عبدالحق الاله آبادي المهاجر المكي بجميع مروياته سنة ۱۳۱۸ مكاتبة، وأجاز له أيضا الشاه فضل رحمن المرادآبادي بالرواية وأخذ البيعة، مدحه شيخنا العلامة انور الكشميري بقصيدة ، وكان مشاركا له في تصنيف آثار السنن توفي المترجم له سنة ۱۳۲۲ كما في أحسن الكلام.

ظہیر احسن (شوق) نیموی، محدث حنفی، آثار السنن کے مصنف، علوم نقلیہ میں دسترس اور فنون حدیث میں بڑی مہارت حاصل تھی، امام ابو حنیفہ کے مذہب کی بہترین مدافعت کی، مولانا عبدالحی لکھنوی کے شاگرد تھے، اوران کو مولانا عبدالحق الہ آبادی مہاجر مکی نے ۱۳۱۸ھ میں بذریعہ خط اپنی تمام مرویات کی اجازت دی، اور ان کو شاہ فضل رحمن

مراد آبادی نے روایت اور بیعت لینے کی اجازت دی، ہمارے استاذ علامہ انور کشمیری نے ایک قصیدہ میں ان کی مدح کی، اور آثار السنن کی تصنیف میں وہ ان کے شریک کار بھی رہے، مولانا نیموی نے ۱۳۲۲ھ میں وفات پائی، جیسا کہ احسن الکلام میں مذکور ہے۔

(ع)

مولانا عبدالرحمٰن البوفالی | حافظ قرآن وعالم جید، وواعظ خوش بیان بود، در سلسلہ قادریہ از بعض مشائخ بغداد اجازت داشت، له مریدون کثیرون فی مئو، وأجاز لی بروایة جمیع ما تصح له روایته عن الشیخ عبدالقیوم البوفالی عن الشاه اسحاق رحمهم الله تعالیٰ، توفی فی سنة ۱۳۵۷۔

مولانا عبدالرحمٰن بھوپالی، حافظ قرآن، جید عالم اور خوش بیان واعظ تھے، سلسلۂ قادریہ میں بغداد کے بعض مشائخ سے ان کو اجازت حاصل تھی، مئو میں ان کے بہت سے مریدین ہیں، اور مجھے ان تمام روایتوں کی اجازت دی جن کی ان کے شیخ عبدالقیوم بھوپالی اوران کو شاہ اسحٰق صاحب رحمہم اللہ سے اجازت حاصل ہے، ۱۳۵۷ھ میں وفات پائی۔

مولانا شاه محمد عمر بن | کان ممن رأى و بایع الشاه فضل رحمن الگنج مرادآبادی، کان یحبنی محبة الولد، و یشکرنی إذا حضرته، و یدعو لی من صمیم القلب، کان سنه فی ۱۳۵۷ھ ۷۳ عاماً، ولد سنة ۱۲۸۵، وتوفی سنة ۱۳۵۸ فی ربیع الاول.

مولانا شاہ محمد عمر بن ۰۰۰ ، شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی کو دیکھا اور ان سے بیعت کی تھی، مجھ سے اولاد کی طرح محبت کرتے تھے، اور جب میں ان کے پاس حاضر ہوتا تو میرے شکر گذار ہوتے تھے، اور صدق دل سے مجھے دعا دیتے تھے، ۱۳۵۷ھ میں ان کی عمر ۷۳ برس تھی، ۱۲۸۵ھ میں پیدا ہوئے اور ربیع الاول ۱۳۵۸ھ میں وفات پائی۔

مولانا عبدالحق مدنی | کان رفیقی فی حجتی الاولی، وکانت بینی و

بينه صداقة، كان أديبا وواعظا ، توفى سنة ١٣٧٤

مولانا عبدالحق مدنی میرے پہلے حج میں میرے ساتھ تھے، میرے اور ان کے درمیان دوستی تھی، ادیب اور واعظ تھے، ۱۳۷۴ھ میں وفات پائی۔

مولوی عبدالرحیم لکھنوی | برادر خورد مولانا عبدالشکور مدیر النجم ابن مولوی ناظر علی، كان صديقا لي ، وهو من تلامذة المولوى عبدالوحيد السنبلي والمولوى حفيظ الله البندوى، وكان من طلبة مظاهر علوم وخريجيها ، وكان الشيخ خليل احمد يحبه محبة الوالد لولده ، وكان يحفظ ألوفا من الاشعار الفارسية والاردوية، وله معرفة بالعلوم العقلية والنحو، وكان لوعظه تاثير فى القلوب ، توفى سنة ١٣٧٦ فى لكهنؤ ، صليت عليه و حضرت دفنه .

مولوی عبدالرحیم ، مولانا عبدالشکور مدیر النجم کے چھوٹے بھائی اور مولوی ناظر علی کے لڑکے، میرے دوست تھے، وہ مولوی عبدالوحید سنبھلی اور مولوی حفیظ اللہ بندوی کے شاگردوں میں تھے۔ اور مظاہر علوم (سہارنپور) کے طلباء اور فضلاء میں تھے، مولانا خلیل احمد ان سے بیٹے کی طرح محبت کرتے تھے، اردو اور فارسی کے ہزاروں اشعار ان کو زبانی یاد تھے ، معقولات اور نحو میں دستگاہ حاصل تھی ، ان کے وعظ دل میں تاثیر پیدا کرتے تھے، ۱۳۷۶ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی، میں نے ان کی نماز جنازہ پڑھی اور تدفین میں شریک ہوا۔

عبدالرزاق المليح آبادى | منشئ مجلات عديدة فى كلكته ، وصديق أبى الكلام آزاد ، ومنشئ ثقافة الهند فى دهلى أخيراً، زار مصر وصحب الاستاذ رشيد رضا المصرى منشئ المنار، وترجم كتبا عديدة ، منها : العلم والعلماء، صادفته فى دهلى وغيرها مرات، فلم يعجبنى حبه للتجدد وانحرافه عن مسلك الصالحين من العلماء ، كان يحلق لحيته وشاربه ، توفى فى ٢٣/ جون (يونيه) سنة ١٩٥٩ ، ١٥/ ذى الحجة سنة ١٣٧٨ فى بومباى، وكان

مقیما هناك یتداوی من مرض السرطان .

عبدالرزاق ملیح آبادی، کلکتہ میں مختلف پرچوں کے بانی، ابوالکلام آزاد کے دوست، اور آخر میں دہلی میں ثقافۃ الہند کے بانی، مصر کا سفر کیا اور المنار کے بانی استاذ رشید رضا مصری کی صحبت پائی، متعدد کتابوں کا ترجمہ کیا، جن میں سے ایک "العلم والعلماء" ہے، دہلی وغیرہ میں بارہا مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہوا، مگر ان کی تجدد پسندی اور علماء صالحین کے مسلک سے ان کا انحراف مجھے پسند نہیں آیا، وہ ڈاڑھی مونچھ منڈواتے تھے۔ ۲۳/ جون ۱۹۵۹ء ۱۵/ ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ کو بمبئی میں وفات پائی، وہاں وہ کینسر کے علاج کے لئے مقیم تھے۔

المفتی عبدالقادر الفرنجی محلی العالم الفاضل الورع، بقیة علماء فرنجی محل ، كانت الیه الفتوی في عهده ، وكان یدرس ایضا فی المدرسة النظامیة بفرنجی محل، وكان من معارفی ، حضرت عنده مرات لمطالعة بعض الكتب الخطیة الموجودة فی مكتبة النظامیة ، توفی رحمه الله فی صفر سنة ۱۳۷۹ .

مفتی عبدالقادر فرنگی محلی، عالم و فاضل و پرہیز گار، فرنگی محل کے علماء کا بقیہ، ان کے عہد میں فتویٰ کا کام ان ہی کے ذمہ تھا، فرنگی محل کے مدرسہ نظامیہ میں درس بھی دیتے تھے، میرے جاننے والوں میں تھے، نظامیہ کے کتب خانہ میں موجود بعض مخطوطات کے مطالعہ کے لئے بارہا میں ان کے پاس حاضر ہوا، مرحوم نے صفر ۱۳۷۹ھ میں وفات پائی۔

الشیخ عمر البوی المدرس بمدرسة العلوم الشرعية بالمدینة المنورة ، لقیته هناك فی سنة ۱۳۷۲ھ وسمعته یقرئ صحیح البخاری، وتحدثت معه فی بیت الشیخ محمود أخی مولانا حسین أحمد، ثم لما قدمت المدینة سنة ۱۳۸۰ أخبرونی أنه قد مات .

شیخ عمر البوی، مدرسۃ العلوم الشرعیہ مدینہ منورہ کے مدرس، میں نے ان سے وہیں ۱۳۷۲ھ میں ملاقات کی اور ان کو صحیح بخاری پڑھاتے ہوئے سنا، اور مولانا حسین احمد (مدنی)

کے بھائی شیخ محمود کے گھر میں ان سے گفتگو کی، پھر ۱۳۸۰ھ میں جب میں مدینہ پہنچا تو لوگوں نے بتایا کہ وہ انتقال کر چکے ہیں۔

مولانا عبدالرحیم در بھنگوی مہتمم مدرسہ امدادیہ حالاً و صدر المدرسین سابقاً، از ارشد تلامذۂ شیخ الہند بود، قدم مئو مرات وکان یحبنی و أحبه، مدتہا در امدادیہ درس داد، بسا فاضل بود، توفی فی ۱۳۸۰ھ۔

مولانا عبدالرحیم در بھنگوی مدرسہ امدادیہ کے موجودہ مہتمم اور سابق صدر مدرس، شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں تھے، مئو بارہا آئے، وہ مجھ سے اور میں ان سے محبت کرتا تھا، مدتوں مدرسہ امدادیہ میں درس دیا، بہت فاضل آدمی تھے، ۱۳۸۰ھ میں وفات پائی۔

مولانا الدكتور عبدالعلى بن عبدالحى ناظم ندوة العلماء بلكهنؤ كان هو ناظمها (مديرها) بعد أبيه، وهو أخو العالم الصالح ابى الحسن على الندوى ، كان رحمه الله من الأتقياء الأبرار ، قرأ الحديث فى ديوبند على الشيخ محمود الحسن ، ثم تمهر فى الانكليزية وحصل شهادة الدكتوراه فى الطب ، كانت بينى و بينه مودة ، بلغنى خبر وفاته وأنا بمكة فى ذى الحجة سنة ۱۳۸۰

مولانا ڈاکٹر عبدالعلی بن عبدالحی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ، اپنے والد کے بعد ندوہ کے ناظم ہوئے، اور وہ عالم صالح ابوالحسن علی ندوی کے بھائی ہیں، مرحوم نیک و متقی لوگوں میں تھے، دیوبند میں مولانا محمود الحسن کے پاس حدیث پڑھی، پھر انگریزی میں مہارت پیدا کی اور ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی، ہم دونوں کے درمیان محبت کا تعلق تھا، ان کی وفات کی خبر مجھے ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ میں اس حال میں ملی کہ میں مکہ میں تھا۔

عطاء الله شاه البخارى كان خطيبا مصقعا، رئيسا لمجلس الاحرار، سمعت خطبته وتحدثت معه، توفى بملتان (من الباكستان) فى ربيع الاول سنة ۱۳۸۱، وله اثنتان وسبعون سنة.

عطاء اللہ شاہ بخاری، زبان آور خطیب اور مجلس احرار کے صدر تھے، میں نے ان کی تقریر سنی اور ان سے گفتگو کی ہے، ملتان (پاکستان) میں ربیع الاول ۱۳۸۱ھ میں وفات پائی، وفات کے وقت ان کی عمر ۷۲ برس تھی۔

العلامة العارف بالله الشيخ عبدالشكور ابن ناظر على الكاكوروى ثم اللكنوى منشئى مجلة النجم الشهيرة، غيظ الروافض ومبتدعة الهند كان فى عصره حجةالاسلام حقا،الذى قام فى وجوه كفار الهنود، والقاديانية، والروافض وأهل البدعة من البريلويين بكفاح مجيد، وفاق فى ذلك أهل عصره، خليفة الشيخ أبى أحمد البوفالى فى الطريقة الأحمدية المجددية. (۱)

عارف باللہ حضرت علامہ عبدالشکور بن ناظر علی کاکوروی لکھنوی، مشہور رسالہ النجم کے بانی، ہندوستان کے شیعوں اور بدعتیوں کے لئے سراپا غیظ و غضب، اپنے وقت میں در حقیقت حجۃ الاسلام تھے، جنھوں نے ہندوستان کے کافروں، قادیانیوں، شیعوں اور بدعتیوں کے مقابلہ میں شاندار کارنامے انجام دیئے، اور اس میدان میں اپنے تمام معاصرین پر فائق رہے، مجددی احمدی سلسلے میں شیخ ابو احمد بھوپالی کے خلیفہ تھے۔

الشيخ العارف بالله الزاهد المنقطع الى الآخرة بالكلية الشاه عبدالقادر الرائفورى خليفة الشاه عبدالرحيم من أجل خلفاء الشيخ رشيد أحمد ، تشرفت بصحبته اول مرة فى المدينة المنورة سنة ۱۳۷۰، ثم حضرت مجلسه فى سهارن فور مراراً . كان مرجعا لأهل العلم و الفضل فى عصره ، لم يخلف بعده مثله ، توفى فى ربيع الاول سنة ۱۳۸۲ .

حضرت عارف باللہ، آخرت کی طرف پورے طور پر متوجہ، دنیا بیزار، شاہ عبد القادر رائے پوری، شاہ عبدالرحیم، جو مولانا رشید احمد گنگوہی کے اجل خلفاء میں تھے، کے خلیفہ، ان کی

(۱) حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی کی تاریخ وفات ۱۷ر ذی قعدہ ۱۳۸۱ھ (مطابق ۲۳ر اپریل ۱۹۶۲ء) ہے، (دیکھئے پرانے چراغ ۲ر ۲۲۴)

صحبت سے میں پہلی دفعہ مدینہ منورہ میں ١٣٧٠ھ میں مشرف ہوا، پھر سہارن پور میں بارہا ان کی مجلس میں حاضر ہوا، اپنے زمانہ میں علماء وفضلاء کا مرجع تھے، اپنے بعد اپنا ہم مثل نہیں چھوڑا، ربیع الاول ١٣٨٢ھ میں وفات پائی۔

الشیخ المسلّك الزاهد مولانا الشاه عبدالغنی الأعظمی من کبار خلفاء الشیخ الکبیر مولانا أشرف علی التهانوی، مؤسس مدرسة بیت العلوم بسرائے میر، انتقل فی آخر أمره إلى کراتشی وهناك توفی فی اواخر ربیع الاول سنة ١٣٨٣، کانت بینی و بینه معرفة و إخاء.

راہ سلوک دکھانے والے زاہد حضرت مولانا شاہ عبدالغنی اعظمی، شیخ کبیر مولانا اشرف علی تھانوی کے بڑے خلفاء میں سے تھے، مدرسہ بیت العلوم سرائے میر کے بانی تھے، آخر میں کراچی منتقل ہو گئے تھے، اور وہیں ربیع الاول ١٣٨٣ھ کے آخر میں وفات پائی، میرے اوران کے درمیان شناسائی اور بھائی چارہ تھا۔

الشیخ عبدالرحمن بن یحیی المُعلمی الیمانی أمین مکتبة الحرم المکی حالاً، والمصحح بدائرة المعارف العثمانیة (بحیدر آباد) سابقاً، کان أوحد عصره فی أسماء الرجال، وسیع المعرفة بالمخطوطات فی ذلك الفن وما یناسبه، جالسته بمکة مراراً فی حجتین، وکان یرحب بی و یکرمنی ویتحفنی ببعض الکتب التی طبعت بتحقیقه، وقد قرظ لی علی مسندالحمیدی، کتب الیّ بوفاته صدیقی الدکتور عبدالمعید خان ناظم الدائرة فی ربیع الثانی سنة ١٣٨٦، ولم أملك عینی حین وصلنی ذلك الخبر المحزن.

شیخ عبدالرحمن بن یحیی معلمی یمانی، حرم مکہ کے کتب خانہ کے موجودہ امین، اور دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد کے سابق مصحح، علم اسماء الرجال میں یکتائے زمانہ تھے، فن

رجال اور اس سے متعلق مخطوطات کا وسیع علم رکھتے تھے، میرے دو حج میں مکہ میں بارہا میری ان سے ہم نشینی رہی، مجھے خوش آمدید کہتے، میرا اکرام کرتے اور اپنی تحقیق سے چھپی ہوئی کچھ کتابیں ہدیہ کرتے، مسند حمیدی کی میری تحقیق پر انھوں نے تقریظ بھی لکھی، ان کی وفات کے بارے میں میرے دوست ڈاکٹر عبدالمعید خان ناظم دائرۃ المعارف نے ربیع الثانی ۱۳۶۸ھ میں خط لکھا، جب مجھے یہ رنج دہ خبر ملی تو میں اپنے آنسو نہ روک سکا۔

مولانا عبدالرحمن کاملپوری (کیمل پوری) تولى صدارة التدريس في مظاهر علوم سنين ، و بايع على يد شيخنا الشيخ أشرف علي التهانوي وأجاز له الشيخ ، وأقام بعد التقسيم في الباكستان و توفي هناك في سنة ١٣٨٦ ، وكان رحمه الله شيخا نير الشيبة، وضيئا وعالما متواضعا ، أطبق الناس على صلاحه و تقواه ، زرته مرة في سهارن فور.

مولانا عبدالرحمن کاملپوری (کیمل پوری) کئی سال مظاہر علوم (سہارنپور) میں صدارت تدریس کے منصب پر فائز رہے، ہمارے شیخ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے مجاز بیعت تھے، تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں مقیم ہو گئے تھے، اور وہیں ۱۳۸۶ھ میں وفات پائی، مرحوم روشن چہرہ، خوبصورت اور متواضع عالم تھے، ان کی نیکی اور پرہیزگاری پر لوگوں کا اتفاق ہے، سہارن پور میں ایک دفعہ میری ان سے ملاقات ہوئی ہے۔

الشيخ مولانا عبدالله بن غلام محمد الزمزمي أصله من لاهور فيما أعلم ، قدم ابوه مكة في صغر سنه وتولاه بعض اهل مكة فاقام هناك، وتأهل فأنجب صديقنا هذاالصالح العالم الزاهد الجواد المفضال عبدالله ، أول زيارتي له في موسم سنة ١٣٦٩ ، وآخرها في موسم ١٣٨٤ ، كان يسكن أولا في خلوة من رباط أبي نمي بالقرب من باب إبراهيم ، وكان يدخل المسجد الحرام من باب العمرة ، وكانت خلوته الصغيرة مرجعاً للحجاج من أهل منو وماليگاؤں وغيرهما، وكان العلماء الكبار من أمثال مولانامحمد طيب الديوبندي ، ومولانا

محمد يوسف البنوري ونحوهما يعتقدون فيه الصلاح و يزورونه في خلوته، وكان كل من رآه أحبه و لازمه، واعتقد فيه الخير، وكان رحمه الله يبالغ في إكرامي ولا أعلم أحداً من الغرباء أحبني مثل حبه، يشهد بذلك كل من رآني معه، ولما بدئ بتوسيع المسجد الحرام في زمن الملك سعود بن عبدالعزيز وهدم رباط أبي نمي انتقل إلى شارع المنصور ، وبنى له محبوه هناك بيتين من الخشب، ذهب بي هناك مرة، وأضافني وأصحابالي في سنة ١٣٨٤. وقد كان رحمه الله أمر بعض أصحابه أن يكتب اليّ يستدعي مني أن أحج في موسم سنة ١٣٨٦، فلم يمكنني حتى كتب اليّ السيد حبيب الرحمن الغزنوي من أحمد آباد أنه توفي في ثامن شوال (بروية اهل الهند) وعاشر شوال بحساب اهل الحجاز يوم الجمعة سنة ١٣٨٦، طيب الله ثراه وجعل الجنة مثواه۔

حضرت مولانا عبداللہ بن غلام محمد زمزمی، میرے علم کے مطابق ان کا وطن اصلی لاہور تھا، ان کے والد اپنے بچپن میں مکہ چلے گئے تھے، جہاں مکہ کے کسی شخص نے ان کو اپنی نگرانی میں رکھ لیا اور وہ وہیں رہ پڑے اور شادی کرلی، جن سے ہمارے یہ نیکوکار و عالم و زاہد اور سخی و سیر چشم دوست عبداللہ پیدا ہوئے، میری ان سے پہلی ملاقات ۱۳۶۹ھ میں موسم حج میں ہوئی، اور آخری ملاقات ۱۳۸۴ھ کے موسم حج میں ہوئی، پہلے وہ باب ابراہیم کے قریب خانقاہ ابی نمی کے ایک خلوہ میں رہا کرتے تھے، اور مسجد حرام میں باب العمرۃ سے داخل ہوتے تھے، ان کا چھوٹا سا خلوہ مئو اور مالیگاؤں وغیرہ کے حاجیوں کا مرجع تھا، مولانا محمد طیب دیوبندی اور مولانا یوسف بنوری جیسے ہندوستان کے بڑے علماء ان کی پارسائی کے معتقد تھے، اور زیارت کے لئے ان کے خلوہ میں جایا کرتے تھے، جو شخص ان کو دیکھتا ان سے محبت کرتا، ان سے وابستہ ہو جاتا اور ان کی نیکی کا یقین کرتا، مرحوم ۔ میرا اکرام مبالغہ آمیز حد تک کرتے تھے، وطن سے باہر کے لوگوں میں میں نہیں سمجھتا کہ ان کے جیسی کسی نے مجھ سے محبت کی ہوگی، جس کی گواہی ہر وہ شخص دے گا جس نے مجھے ان کے ساتھ دیکھا ہوگا۔

شاہ سعود کے زمانے میں جب مسجد حرام کی توسیع شروع ہوئی اور خانقاہ ابی نمی کو منہدم کردیا گیا، تو مولانا ازمری شارع المنصور منتقل ہو گئے، جہاں ان کے عقید تمندوں نے لکڑی کے دو مکان تعمیر کئے، مجھے ایک دفعہ ۱۳۸۴ھ میں وہاں لے گئے اور میری اور میرے ساتھیوں کی ضیافت کی، مرحوم نے اپنے ایک ساتھی کو حکم دیا کہ وہ میرے پاس ۱۳۸۶ھ میں حج کرنے کے لئے خط لکھیں، لیکن یہ سفر میرے لئے ممکن نہ ہو سکا، یہاں تک کہ سید حبیب الرحمٰن غزنوی نے احمد آباد سے مجھے یہ خط لکھا کہ اہل ہند کی رویت سے آٹھ شوال اور اہل حجاز کی رویت سے ۱۰؍ شوال ۱۳۸۶ھ کو جمعہ کے دن مولانا ازمری انتقال فرماگئے، اللہ ان کی قبر کو معطر فرمائے اور جنت کو ان کا ٹھکانہ بنائے۔

مولانا عبدالحليم الصديقي البوفالي ثم المليح آبادي | من أعيان أعضاء جمعية العلماء المركزية، ومن الذين تفانوا فى سبيل تحرير الهند، كان خطيبا مصقعا، وشاعراً مجيدا فى العربية والأردوية، حافظا لكلام الله جيد الحفظ كأن القرآن على طرف لسانه، تولى التدريس فى دارالعلوم (ندوة العلماء) والمدرسة العالية بكلكتا ، كان بيني و بينه صداقة أكيدة، توفى بمليح آباد مصابا بالفالج فى ذى القعده سنة ۱۳۸۸

مولانا عبدالحلیم صدیقی بھوپالی ملیح آبادی، مرکزی جمعیۃ علماء کے بڑے ممبروں اور ان لوگوں میں تھے جو ہندوستان کی آزادی کی راہ میں فنا ہو گئے، فصیح و بلیغ مقرر اور عربی و اردو کے بہترین شاعر تھے، کلام اللہ کے اچھے حافظ تھے، قرآن کریم گویا ان کی نوک زبان پر رہتا تھا، دارالعلوم (ندوۃ العلماء) اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تدریسی خدمت انجام دی، میرے اور ان کے درمیان گہری دوستی تھی، ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ میں ملیح آباد میں فالج لگنے سے انتقال فرماگئے۔

مولانا عبدالحفیظ بن مولوی عبدالرحمٰن رسڑاوی | از فضلائے دارالعلوم دیوبند بود، بایں حقیر اخلاص تمام داشت، مدتے در مصباح العلوم (بریلی) وزائد از بست سال در

دارالعلوم (ندوه) خدمت تدریس ادب عربی و صحیح مسلم وغیره انجام داد، از تصنیفات او مصباح اللغات (ترجمۂ المنجد) در طلباء و مدرسین شهرت تمام دارد، بتاریخ ۳ر جمادی الآخرة ۱۳۹۱ بعارضۂ فالج ازیں جهاں در گذشت در رسڑا سپرد خاک شده، من برائے تعزیت وزیارت قبر او رفته بودم، یکبار در حج رفیق من بود۔

مولانا عبدالحفیظ بن مولوی عبدالرحمٰن رسڑاوی (بلیاوی) دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے، اس حقیر سے پورا اخلاص رکھتے تھے، ایک مدت تک مصباح العلوم (بریلی) اور بیس سال سے زیادہ دارالعلوم ندوہ میں ادب عربی اور صحیح مسلم وغیرہ کی تدریس کی خدمت انجام دی، ان کی تصنیفات میں مصباح اللغات (ترجمہ المنجد) طلباء و مدرسین میں بڑی شہرت رکھتی ہے، ۳ر جمادی الآخرہ ۱۳۹۱ھ کو فالج کے مرض میں اس دنیا سے رخصت ہوئے، اور رسڑا میں سپرد خاک ہوئے، میں ان کی تعزیت اور قبر کی زیارت کے ملنے گیا تھا، ایک بار حج میں میرے رفیق سفر تھے۔

الشيخ علوى بن عباس المالكى المدرس بالحرم الشريف المكى ،

استمعت لدرسه ولم أجلس فى الحلقة، فوجدته ذا عارضة قوية، ومنطق فصيح فى أول قدمة قدمتها مكة، ثم زرته فى بيته فى سنة ١٩٦٥م فأكرمني وأتحفني ببعض تاليفاته، ثم زرته ثانيا فى سنة ١٩٧١م وزارني فى تلك السنة فى بيت الشيخ النمنكاني بالمدينة المنورة مع الشيخ حسن المشاط وولده محمد، فبالغ فى إكرامى و قبّل جبينى و حثنى على إنجاز طبع المصنف لعبدالرزاق، وكنت اذ ذاك أشرف على طبعه، وأصحح ملازمه فى بيروت.

وبينما كنت أتهيأ للخروج إلى بيروت ثانيا إذ وصل اليّ عن طريق الجرائد نبأ وفاته فى أحد شهور سنة ١٣٩١ﻫ فرحمه الله وغفر له.

وكان رحمه الله من المروءة والوفاء بمكان، بشوشا، دائم البشر، عالماً مكينا، يحب العلم و أهله، يتزيا بزى أهل الصلاح ويسلك مسلك أهل

التقوی ، خلفه ولده محمد فی التدریس بالحرم، وقد استجاز منی فأجزته حین اجتمع بی فی بومبای.

شیخ علوی بن عباس مالکی، حرم مکہ میں مدرس، پہلی بار جب میں مکہ حاضر ہوا تو ان کے حلقۂ درس میں بیٹھے بغیر ان کا درس سنا، تو میں نے ان کو قوت بیان اور فصیح گفتگو والا پایا، پھر ۱۹۶۵ء میں ان کے گھر پر میں نے ان سے ملاقات کی تو انھوں نے میرا اکرام کیا اور اپنی بعض کتابیں مجھے ہدیہ کیں، پھر ۱۹۷۱ء میں دوبارہ ان سے ملا، اور اسی سال مدینہ منورہ میں شیخ نمنکانی کے گھر پر شیخ حسن مشاط اور اپنے صاحبزادہ محمد کے ساتھ انھوں نے مجھ سے ملاقات کی، اس وقت انھوں نے مبالغہ آمیز حد تک میرا اکرام کیا اور میری پیشانی کو بوسہ دیا، اور مصنف عبدالرزاق کی طباعت کی تکمیل پر مجھے ابھارا، حالانکہ اس وقت میں بیروت میں اس کی طباعت کی نگرانی اور اس کے فرسوں کی تصحیح کر رہا تھا۔

جس وقت میں بیروت کے دوسرے سفر کی تیاری کر رہا تھا کہ اخبارات کے ذریعہ ۱۳۹۱ھ کے کسی مہینہ میں ان کی وفات کی مجھے خبر ملی، اللہ ان کے اوپر اپنی رحمت و مغفرت فرمائے۔

مرحوم مروءت ووفاداری کے بلند مقام پر فائز تھے۔ ہنس مکھ، کشادہ رو اور ٹھوس علم کے حامل تھے، علم و اہل علم سے محبت کرتے تھے، اہل صلاح کا لباس زیب تن کرتے اور اہل تقویٰ کے راستے پر گامزن تھے۔ حرم میں تدریس کے اندر ان کے لڑکے محمد ان کے جانشین ہوئے، جس وقت وہ بمبئی میں مجھ سے ملے تو انھوں نے مجھ سے اجازت طلب کی تو میں نے ان کو اجازت دے دی۔

مولانا عبداللطیف نعمانی امام گنجی | كان رفيقی فی أيام الطلب، و زميلی فی تدريس العلوم ،وصاحبی فی السفر والحضر، و عضدی فی الذب عن الحنفية، و شريكی فی الرد علی أهل البدعة، وكان مجدا فی الإفادة جامعا للمعقول والمنقول، له مشاركة حسنة فی عدة فنون ، وقد تدخل فی السياسة العصرية،

وانتخب ركنا لمجلس التشريع النيابي، وتصدر في بلدية مئو مرتين ، درس في سنبل شهرين ، وقضى سائر أيامه في مئو، درس أولا في دارالعلوم ، ثم درس الى آخر حياته في مفتاح العلوم ، وجمع له الصدارة والنظامة حين لم يبق في المدرسة إلا هو ، ومات فجأة في آخر ذى القعدة من سنة ۱۳۹۲ھ في غرفته التى كان يبيت بها في المدرسة، ودفن من الغد في ناحية منها ، وقد صلى عليه الجم الغفير، قلما يتفق مثله إلا للواحد بعدالواحد ، وكنت إذ ذاك في كلكتا ، فتلفنوا اليّ ، وقد انقضى ميعاد الطائرة المسافرة الى بنارس ، فلم أصل إلا في ثاني يوم من دفنه.

مولانا عبداللطیف نعمانی امام گنجی، زمانہ طالب علمی میں میرے دوست، درس وتدریس میں میرے ہمدم، سفر وحضر میں میرے ساتھی، حنفیت کے دفاع میں میرے دست وبازو اور اہل بدعت کے رد میں میرے ساتھ شریک رہے ہیں، نفع رسانی میں کوشاں اور معقولات ومنقولات کے جامع تھے، مختلف فنون میں انھیں دستگاہ حاصل تھی، سیاست میں بھی دخیل تھے ۔اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور دو دفعہ مئو میونسپلٹی کے چیئرمین ہوئے، سنبھل میں دو مہینے خدمت تدریس انجام دی، اور اس کے علاوہ باقی پوری زندگی مئو میں گذاری، آغاز میں دارالعلوم مئو میں پڑھایا، پھر آخر عمر تک مفتاح العلوم میں درس دیتے رہے ،ان کے حصے میں مدرسہ کی صدارت ونظامت دونوں عہدے اس وقت جمع ہوئے جب اس کے اندر ان کے علاوہ اور کوئی نہیں رہ گیا تھا، ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ کی آخری تاریخ کو اچانک مدرسہ کے اپنے اس کمرہ میں انتقال کر گئے جس میں وہ رات کو رہا کرتے تھے، اور اگلے دن اسی کے ایک گوشے میں دفن کیے گئے، ان کے جنازہ کی نماز اتنے بڑے مجمع نے ادا کی جو خال خال ہی کسی کی نماز جنازہ میں ہوتا ہے، اس وقت میں کلکتہ میں تھا، لوگوں نے مجھے ٹیلیفون کیا، لیکن بنارس جانے والے جہاز کا وقت گذر چکا تھا اس لئے ان کے دفن کے دوسرے دن سے پہلے میں مئو نہ پہنچ سکا۔

مولانا عبدالصمد رحمانی خلیفہ مولانا محمد علی مونگیری، و تلمیذ مولانا محمد سجاد امیر شریعت بہار، بماہ ربیع الآخر ۱۳۹۳ھ رہگرائے عالم جاودانی شد، درمیان ما و او رابطۂ مودت قوی بود۔

مولانا عبدالصمد رحمانی، مولانا محمد علی مونگیری کے خلیفہ اور مولانا محمد سجاد امیر شریعت بہار کے شاگرد ماہ ربیع الآخر ۱۳۹۳ھ میں عالم جاودانی کو سدھارے، میرے اور ان کے درمیان دوستی کا تعلق مضبوط تھا۔

مولانا عبدالسلام لکھنوی خلف ارشد مولانا عبدالشکور فاروقی مدیر النجم، نخستین بار کہ من او را دیدہ بودم در امروہہ پیش والد بزرگوار خود (غالباً) قطبی میخواند، باز چوں نسبت اخلاص و عقیدت با پدر او استوار کردم، و او از مدرسہ دیوبند فارغ التحصیل شد، اکثر در مسائل علمیہ با من مذاکرہ می کرد، و بغایت اکرام می نمود، و قتیکہ من رکن مجلس قانون ساز بودم، در دار المبلغین طرح اقامت انداختہ بودم لاجرم ہر صبح و شام اتفاق صحبت می افتاد، بر مسائل اختلافیہ شیعہ و سنت او را عبور تام حاصل بود، چندے در گورکھپور باز تا دم آخر در دار المبلغین بہ درس و تدریس پرداخت، او و قاری محمد صدیق مرحوم در نصرۃ اہل سنت کفر سی رہان بودند، در شب پانزدہم رجب (۱۳۹۳ھ) ازین جہاں در گذشت، مولوی منظور نعمانی غسل داد، در لکھنؤ بہ پہلوئے والد بزرگوار خود جا یافت، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

مولانا عبدالسلام لکھنوی، مولانا عبدالشکور فاروقی مدیر النجم کے خلف ارشد، پہلی بار جب میں نے ان کو دیکھا تھا تو وہ امروہہ میں اپنے والد بزرگوار کے پاس (غالباً) قطبی پڑھ رہے تھے، پھر جب ان کے والد بزرگوار کے ساتھ میں نے اخلاص و عقیدت کی نسبت قائم کی، اور وہ دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے، تو اکثر علمی مسائل میں میرے ساتھ مذاکرہ کرتے رہتے، اور حد درجہ اکرام کرتے تھے، جس وقت میں مجلس قانون ساز کا رکن تھا، اور دار المبلغین میں طرح اقامت ڈالے ہوئے تھا، تو بے شبہہ ہر صبح و شام ملاقات کا اتفاق ہوتا، شیعہ و سنت کے اختلافی مسائل پر ان کو پورا عبور حاصل تھا، کچھ دنوں گورکھپور میں

پھر آخر وقت تک دارالمبلغین میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی، وہ اور قاری محمد صدیق مرحوم اہل سنت کی نصرت وحمایت کے میدان کے شہسوار تھے پندرہ رجب (۱۳۹۳ھ) کی شب میں اس جہاں سے رخصت ہوئے، مولوی منظور نعمانی نے غسل دیا اور لکھنؤ میں اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں جگہ پائی، اللہ تعالیٰ ان پر اپنی بے پایاں رحمت نازل فرمائے۔

علال فاسی | نعت لنا الجرائد المحلية نبأ وفاة العالم الكبير الشيخ علال الفاسي، وكان من أعضاء المجلس التاسيسي لرابطة العالم الاسلامي، وقد استمعت الى محاضرته في مقر الرابطة في موسم الحج عام ۱۳۹۳، ووافانا نعيه في جمادى الاولىٰ سنة ۱۳۹٤.

علال فاسی، مقامی اخبارات نے عالم کبیر شیخ علال فاسی کی موت کی خبر سنائی، مرحوم رابطہ عالم اسلامی کی فاؤنڈیشن کمیٹی کے ارکان میں سے تھے، ۱۳۹۳ھ کے موسم حج میں رابطہ کے دفتر میں میں نے ان کا لیکچر سنا تھا، اور جمادی الاولیٰ ۱۳۹۴ھ میں ہمیں ان کی وفات کی خبر ملی۔

مولوی عبداللہ شائق پسر اسماعیل (میر صاحب) ساکن قاسم پورہ مئو | تلمیذ مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، و مولانا احمد پسر مولانا حسام الدین مئوی بود، مدتے در مدرسہ فیض عام مئو خدمت تدریس انجام داد، باز بسبب اختلاف فیما بین او و مولوی احمد بن عبدالغنی ناظم مدرسہ علاحدگی اختیار نمود، ومدرسۂ دیگر بنام دارالحدیث در محلہ باغیچہ بنیاد نہاد، در آخرہا بسبب امراض ترک اشتغال نمود، از مدت دو سال صاحب فراش بود، بروز جمعہ ۱۳/ دسمبر ۱۹۷۴ء (۲۸/ ذی قعدہ ۱۳۹۴ء) ازیں جہاں در گذشت، من بسفر بودم، چوں بوطن مالوف باز آمدم ایں خبر وحشت اثر شنیدم، او رد رسالہ اعلام مرفوعہ (تالیف حقیر) نوشتہ بنام آثار متبوعہ موسوم کردہ بود، من بجواب او ازہار مربوعہ نوشتہ شائع کردم۔

مولوی عبداللہ پسر اسماعیل (میر صاحب) ساکن قاسم پورہ مئو، مولانا حافظ

عبد اللہ غازی پوری اور مولانا احمد پسر مولانا حسام الدین مئوی کے شاگرد، ایک مدت تک مدرسہ فیض عام مئو میں تدریسی خدمت انجام دی، پھر ان کے اور ناظم مدرسہ مولوی احمد بن عبد الغنی کے درمیان اختلاف کی وجہ سے علیحدگی اختیار کرلی، اور دار الحدیث کے نام سے محلہ باغیچہ میں ایک دوسرے مدرسہ کی بنیاد رکھی، آخر عمر میں امراض کے سبب تدریسی مشغلہ چھوڑ دیا تھا، دو سال سے صاحب فراش تھے، ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۴ء (۲۸رذی قعدہ ۱۳۹۴ھ) کو جمعہ کے دن اس جہاں سے کوچ کیا، میں سفر میں تھا، جب واپس وطن پہنچا تو یہ وحشت اثر خبر سننے میں آئی، انھوں نے میرے رسالہ اعلام مرفوعہ کا رد آثار متبوعہ کے نام سے لکھا تھا، میں نے اس کا جواب ازہار مربوعہ کے نام سے لکھ کر شائع کیا۔

(ف)

مولانا فخر الدین احمد مراد آبادی شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند، وصدر جمعیۃ علمائے ہند، از مشاہیر علماء ہندوستان بود، نسبت تلمذ با شیخ الہند مولانا محمود حسن و حضرت شاہ انور کشمیری می داشت، مدتہا در مراد آباد و باز در دیوبند درس حدیث داد، بار اول کہ حج کردم ما وا و در باخرہ ہم سفر بودیم، در ۱۳۹۲ھ بمراد آباد ازیں جہاں در گذشت، رحمہ اللہ۔

مولانا فخر الدین احمد مراد آبادی دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر ہندوستان کے مشہور علماء میں تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسن اور حضرت شاہ انور کشمیری کے شاگرد تھے، مدتوں مراد آباد میں اور پھر دیوبند میں حدیث کا درس دیا، پہلی بار میں نے حج کیا تو میں اور وہ جہاز میں ساتھ تھے، ۱۳۹۲ھ میں مراد آباد میں سفر آخرت فرمایا، اللہ ان پر رحمت کا سایہ فرمائے۔

مولانا محمد تقی بن مولانا ناظر حسن الدیوبندی تخرج من دار العلوم (بدیوبند) واشتغل بالتدریس فی بیت العلوم بمالیگاؤں زماناً، وفی مدرسة ڈابھیل یسیراً، وفی آخر عمره شغل منصب الإدارة (النظامة) فی مدرسة شاهی بمرادآباد،

وفی اثناء ذلك انتقل الی رحمة الله ، وكان جيدالاستعداد، وجيها، ملازما للتقوی، وكان من زملائی فی الحج سنة ۱۳۷۱، توفی فی ربیع الآخر سنة ۱۳۶۱ (۱) ودفن فی دیوبند.

مولانا محمد نقی بن مولانا ناظر حسن دیوبندی، دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے اور ایک زمانہ تک مالیگاؤں میں اور کچھ عرصہ تک ڈابھیل میں تدریسی خدمت انجام دی، آخر عمر میں مدرسہ شاہی مراد آباد کا عہدۂ نظامت سنبھالا، اور اسی منصب پر برقرار رہتے ہوئے انتقال بھی کیا، جید الاستعداد، صاحب وجاہت اور پرہیزگار تھے، ۱۳۷۱ھ کے حج میں میرے ساتھ تھے، ربیع الآخر ۱۳۶۱ھ (۱) میں وفات پائی، اور دیوبند میں مدفون ہوئے۔

مولانا مناظر احسن الگيلانی (گیلانی من قری بهار) كان من افاضل خريجی دارالعلوم (بديوبند) ومن مشاهير الكتاب والمصنفين ، آخر تصانيفه " سوانح قاسمی " أقام أكثر من عشرين عاماً أستاذا فی الجامعة العثمانية (بحيدر آباد الدكن) ثم غادر إلى وطنه ولم يلبث أن مرض ، ودام مرضه أعواماً حتی توفی سنة ۱۳۷۵ فی ۲۵ شوال . كنت أعرفه وكان يعرفنی ولكن لم يتفق لی زيارته.

مولانا مناظر احسن گیلانی (گیلانی بہار کا ایک گاؤں ہے) دارالعلوم دیوبند کے بڑے صاحب فضل فضلاء اور مشہور انشاء پردازوں اور مصنفوں میں تھے، ان کی آخری کتاب "سوانح قاسمی" ہے، بیس برس سے زیادہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں استاد کی حیثیت سے رہے ، پھر اپنے وطن چلے گئے، اور جلد ہی بیمار پڑ گئے، بیماری کا سلسلہ کئی سال تک رہا، یہاں تک کہ ۲۵ر شوال ۱۳۷۵ھ کو وفات پاگئے، ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے، لیکن میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔

---

(۱) بیاض میں اسی طرح ہے، سبقت قلم ہونا ظاہر ہے۔ آپ کی وفات ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۸ ستمبر ۱۹۶۱ء کو ہوئی۔

مولانا الحاج محمد بن موسی میاں السملکی الإفریقی تلمذ على الشيخ أنور الكشميرى وتخرج عنده ولازمه مدة، واهتدى بهديه، أسس المجلس العلمي بڈابھیل ، الذى انتقل بعد التقسيم الى كراتشي، وأنفق أموالا طائلة لطبع نصب الراية، وفيض البارى، ورسائل شيخه الكشميرى، ومسند الحميدى، وعزم على نشر مصنف عبدالرزاق ، والمجلد الثالث من سنن سعيد بن منصور، وكان يبر كثيراً من العلماء ،وله صدقات جارية.

توفى في جوهانسبرك من افريقيا الجنوبية، في ٢١/ ذى القعده سنة ١٣٨٢ (١٦- ابريل سنة ١٩٦٤) (١) كانت بيني و بينه مودة أكيدة

مولانا الحاج محمد بن موسیٰ میاں سملکی افریقی، حضرت انور شاہ کشمیری کے شاگرد تھے، انھیں کے پاس فراغت پائی اور مدت تک ان سے وابستہ رہے، اور ان کے نقش قدم پر چلتے رہے، ڈابھیل میں مجلس علمی قائم کی، جو تقسیم کے بعد کراچی منتقل ہو گئی، نصب الرایہ فیض الباری، اپنے شیخ علامہ کشمیری کے رسائل اور مسند حمیدی کی طباعت میں کافی دولت خرچ کی، مصنف عبدالرزاق اور سنن سعید بن منصور کی تیسری جلد کی طباعت کا عزم کیا، بہت سے علماء کے ساتھ بھلائی کا برتاؤ کرتے تھے، یہ چیزیں ان کے لئے صدقۂ جاریہ ہیں۔

جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں ۲۱/ ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ (۱۶/ اپریل ۱۹۶۴) کو وفات پائی،(۱) ہمارے درمیان بڑی گہری دوستی تھی۔

مولانا محفوظ الرحمن نامی الرسراوی ثم البهرائچی مكث عندى في مئو يتعلم اعواما ، وتخرج من دارالعلوم (بديوبند)،أسس مدرسة ببهرائچ سماها نور العلوم، وألف مؤلفات وبذل مجهوده في نشر اللغة العربية و تيسير فهم القرآن ، أصيب بالفالج فلزم الفراش قريباً من ستة أعوام ،

(۱) ۱۹۶۴ء سبقت قلم ہے، صحیح ۱۹۶۳ء ہے، جیسا کہ علامہ اعظمیؒ کے خطوط سے پتہ چلتا ہے۔

ثم توفی فی رجب سنة ١٣٨٣ .

مولانا محفوظ الرحمٰن نامی رسڑاوی بہرائچی، میرے پاس مئو میں کئی سال رہ کر تعلیم حاصل کرتے رہے، اور دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔ بہرائچ میں نورالعلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، کئی ایک کتابیں لکھیں اور عربی زبان کی اشاعت اور فہم قرآن کو آسان بنانے کے لئے کوشش صرف کی، ان کو فالج لگ گیا تھا جس کی وجہ سے ٦؍ سال کے قریب صاحب فراش رہے، پھر رجب ١٣٨٣ھ میں وفات پا گئے۔

الشیخ محب الدین الخطیب المصری صاحب جریدة الفتح وناشرالعواصم و القواصم ومختصر منهاج السنة، وصاحب التعلیقات النفیسة علیها ، وکان سنیا قحا لم یتاثر بدسائس الروافض، توفی الی رحمة الله فی اوائل ذی القعده سنة ١٣٨٩ .

شیخ محب الدین خطیب مصری، اخبار "الفتح" کے مالک، العواصم من القواصم اور مختصر منهاج السنة کے ناشر جن پر ان کی عمدہ تعلیقات بھی ہیں، خالص سنی تھے اور روافض کی دسیسہ کاریوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ ذی قعدہ ١٣٨٩ھ کے شروع میں اپنے رب کے حضور پہنچ گئے۔

محمد الحسنی بن الدکتور عبدالعلی صنو الشیخ ابی الحسن علی الندوی کان وحید أبیه ، وکان فیه خلف عن الشیخ ابی الحسن کاتب بلیغ ، غیور علی الاسلام ، ینبض بدم کله غیرة علی الاسلام ، وقلمه السیال یفیض بما فی قلبه، کان رحمه الله من خیرة الشباب، وکان یحبنی فی الله، توفی فی ٠٠٠ سنة ١٣٧٩ (١) فی لکھنؤ، ودفن بجوار آبائه فی رائے بریلی .

محمد حسنی مولانا ابوالحسن علی ندوی کے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی کے لڑکے، اپنے باپ کے اکلوتے تھے، ان کے اندر مولانا ابوالحسن (علی میاں) کی جانشینی کی صلاحیت تھی، فصیح و

(١) یہ سبقت قلم ہے، ان کا سال وفات ١٩٧٩ء ١٣ جون، مطابق ١٣٩٩ھ ہے۔

بلیغ انشاء پرداز، اسلام کے تئیں غیرت مند، ان کا دل اسلام کے لئے سراپا غیرت تھا، اوران کا رواں دواں قلم ان کے دل کی ترجمانی کرتا تھا، مرحوم بہترین نوجوانوں میں تھے، اور مجھ سے اللہ کے لئے محبت کرتے تھے۔ ۱۹۷۹ء میں لکھنؤ میں وفات پائی، اور رائے بریلی میں اپنے آباء واجداد کے جوار میں دفن کئے گئے۔

(ن)

الشیخ محمد نصیف أحد العلماء المشهورين من أهل جدة ، كان بيته محط رحال الأفاضل، وكان مولعا بكتب السنة ونشرها، لا ينتمي الى أحد من الأئمة ويتدين بذلك ، وكان يغلو في ذلك غلو أشباهه من العصريين، عفا الله عنه وعنا، وكان يصطنع المعروف الى من يسلك مسلكه من السلفيين ، وقد زرته في بيته في شوال سنة ١٣٩٠، وأتحفني بعدة كتب، وبالغ في إكرامي، انتقل الى رحمة الله في جمادى الآخرة سنة ١٣٩١، كتب اليّ بذلك ولدي من بومباي.

شیخ محمد نصیف جدہ کے مشہور علماء میں سے ایک تھے، ان کا گھر ارباب فضل کے لئے جائے قیام تھا، وہ کتب حدیث اوران کی نشرواشاعت کے دلدادہ تھے، کسی ایک امام کی طرف منسوب نہیں تھے اور نہ ہی کسی امام کے مسلک کے پیروکار تھے، اوراس سلسلے میں اپنے ہم مثل معاصرین کی طرح غلو برتتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو اور ہم سب کو معاف فرمائیں۔ سلفیوں میں جو ان کے مسلک پر چلتا تھا اس کے ساتھ بھلائی کا برتاؤ کرتے تھے، شوال ۱۳۹۰ھ میں میں نے ان کے دولت کدہ پر ان سے ملاقات کی، انھوں نے مجھے کئی کتابیں تحفہ میں دیں، اور میرا مبالغہ آمیز حد تک اکرام کیا، جمادی الآخرۃ ۱۳۹۱ھ میں انتقال فرماگئے، اس کی خبر مجھے میرے لڑکے نے بمبئی سے دی۔

☆☆☆☆

(و)

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری از خلفائے حضرت مرشدنا حکیم الامت تھانوی بود، زاد بوم او فتحپور تال نرجا کہ از مئو ہشت یا نہ میل دوز جانب شمال واقع است، در ۱۳۳۷ھ از دارالعلوم دیوبند سند فراغ یافت، وبعد فراغ بدامن دولت پیر مرشد ناوابستہ گردید، مدتہا در خانقاہ امدادیہ اقامت کردو فیضہائے فراواں برد، باز بفتحپور آمدہ پائے عزلت شکست، ابتداءً بغایت عسرت زندگی بسر می برد، چندے در مبارک پور وسالہا در کانپور بتدریس قیام نمود، وآخرہا باز بخانہ خود منزوی شدہ بارشاد طالبین واصلاح او شاں مشغول گشت، در چند سال چناں حسن قبول یافت کہ طالبین اصلاح از مسافتہائے دور دراز رخت سفر بسوئے فتحپور بستند وداخل حلقۂ او شدند، وازانجا کہ در مزاج شریف وے حدت بود بارے از اہل فتحپور چناں رنجید کہ تاب اقامت نداشت ودر کوپا گنج منتقل گردید، بارے دیگر در گورکھپور بخانۂ مولوی نثار اللہ اقامت گزید، وبعد چندے ازانجا بالہ آباد منتقل شدہ، وہمانجا مستقلا طرح اقامت انداخت، حویلی بزرگ ویک قطعہ زمین خرید کرد۔

باز برائے تبدیل آب وہوا بہ بمبئی رفت، وایں سفر او بسیار مبارک وسودمند افتاد، بسیارے از تجار بمبئی راہ ہدایت یافتند، در کرلا بخانۂ یکے از متمولان بمبئی اقامت می کرد، وہمانجا نیز یک قطعہ زمین خریدہ بود کہ دراں عمارت خانقاہ ومسجد خواہد کرد، در ۱۳۸۷ھ شوق زیارت حرمین غالب آمد، وبتاریخ نوزدہم شعبان ۱۳۸۷ھ باخرۂ مظفری روانۂ حجاز شد، ایں فقیر بہ تقریب مشایعت وتودیع او در جہاز باو ملاقات کرد ودو ساعت ہمانجا ماند ووقت رخصت تادیر معانقہ کرد، وحضرت شیخ از غایت محبت وشفقت سر ودست فقیر را بوسہ دادند، ویک شیشی عطر عود ہدیہ نمودند، فقیر ہماں روز از بمبئی روانہ شد وبروز جمعہ وارد مئو گردید، وبروز شنبہ بساعت ہشتم بعد مغرب ایں خبر رسید کہ مولانا در جہاز جان بجان آفریں سپردند، ایں خبر بذریعۂ ٹیلیگرام از بمبئی آمدہ بود، مپرس کہ ازیں خبر بر من چہ گذشت، بعد ازیں بذریعہ اخبارات معلوم شد کہ بسحر ۲۵ر شعبان بعد از نماز تہجد بحق واصل شدند،

دوراں لحہ کسے دیگر حاضر نبود، چوں خادم چائے آورد، دید کہ روح از قفس عنصر پرواز کردہ است، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

پس بہ تحقیق رسید کہ بتاریخ ۲۴؍ شعبان بعد نماز مغرب بمرض فالج مبتلا شدند، ہیچ تدبیر وعلاج سود مند نیفتاد، ہماں شب بوقت ساعت دوازدہم روح از قفس عنصری پرواز نمود، خواستہ شدہ بود کہ در مکہ یا مدینہ تدفین سرانجام پذیرد لیکن نزدیک جدہ رسیدہ جثۂ مبارکہ وے سپرد آب دریائے شور کردہ شد۔

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری، مرشدنا حکیم الامت حضرت تھانوی کے خلفاء میں سے تھے، ان کی جائے پیدائش فتحپور تال نرجا ہے جو کہ مئو سے آٹھ نو میل دور شمال کی طرف واقع ہے، ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم دیوبند سے سند فراغ پائی، فراغت کے بعد ہمارے پیرو مرشد (حضرت تھانوی) کے دامن دولت سے وابستہ ہو گئے، مدتوں خانقاہ امدادیہ میں مقیم رہے اور خوب خوب فیض اٹھایا، پھر فتح پور آکر عزلت گزیں ہو گئے، شروع میں نہایت تنگی کی زندگی بسر کرتے تھے، کچھ عرصہ مبارکپور میں اور برسوں کانپور میں درس وتدریس کا کام کیا، اور بالآخر پھر اپنے گھر پر گوشہ نشین ہو کر طالبین ومریدین کے ارشاد واصلاح میں مشغول ہو گئے، چند سال میں اس قدر حسن قبول حاصل ہوا کہ اصلاح کے طالبوں نے دور دراز علاقوں سے فتحپور کے لیے رخت سفر باندھا، اور ان کے حلقے میں داخل ہوئے، چونکہ آپ کے مزاج شریف میں حدت تھی اس لئے ایک بار اہل فتحپور سے اس قدر رنجیدہ ہوئے کہ وہاں اقامت کی تاب نہ رہی اور کوپا گنج منتقل ہو گئے، دوسری بار گورکھپور میں مولوی نثار اللہ کے گھر پر اقامت گزیں ہوئے، اور کچھ ہی مدت بعد وہاں سے الہ آباد منتقل ہو گئے اور وہاں مستقل طرح اقامت ڈالی اور ایک بڑی حویلی اور ایک قطعہ زمین خریدا۔

پھر آب وہوا کی تبدیلی کے لئے بمبئی گئے، آپ کا یہ سفر بہت مبارک اور سود مند ثابت ہوا، اور بمبئی کے بہت سے تاجروں نے راہ ہدایت پائی، کرلا میں بمبئی کے ایک

مالدار آدمی کے گھر قیام فرمایا، اور وہیں ایک قطعہ زمین خرید لیا کہ اس میں خانقاہ اور مسجد کی عمارت تعمیر کرنا چاہتے تھے، ۱۳۸۷ھ میں حرمین کی زیارت کا شوق غالب آیا، اور ۱۹ر شعبان ۱۳۸۷ھ کو مظفری جہاز سے حجاز کے لئے روانہ ہوئے، یہ ناچیز ان کی مشایعت اور رخصت کرنے کی غرض سے جہاز میں ان سے ملاقات کرنے گیا، اور دو گھنٹے وہاں رہا، اور رخصت کے وقت دیر تک معانقہ کیا، حضرت شیخ نے اپنی حد درجہ محبت و شفقت کی وجہ سے ناچیز کے سر اور ہاتھ کا بوسہ دیا، اور عطر عود کی ایک شیشی ہدیہ کی، ناچیز اسی دن بمبئی سے روانہ ہوا، اور جمعہ کے دن مئو وارد ہوا، سنیچر کے دن مغرب کے بعد آٹھ بجے یہ خبر پہنچی کہ مولانا نے جہاز میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی، یہ خبر بمبئی سے بذریعہ ٹیلی گرام موصول ہوئی تھی، مت پوچھو کہ اس خبر سے مجھ پر کیا گذری، اس کے بعد اخبارات سے معلوم ہوا کہ ۲۵ر شعبان کو سحر کے وقت نماز تہجد سے فراغت کے بعد واصل بحق ہوئے، اس وقت کوئی دوسرا شخص حاضر خدمت نہیں تھا، جب خادم چائے لایا تو دیکھا کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ہے اللہ تعالیٰ ان پر اپنی بے پایاں رحمت کا سایہ فرمائیں۔

پھر تحقیق سے یہ خبر ملی کہ ۲۴ر شعبان کو نماز مغرب کے بعد فالج کے مرض میں مبتلا ہوئے، کوئی تدبیر و علاج سود مند نہیں ہوا، اور اسی رات بارہ بجے روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، یہ چاہا گیا کہ مکہ یا مدینہ میں تدفین انجام پائے، لیکن جدہ کے قریب پہنچ کر جسد مبارک سمندر کے سپرد کر دیا گیا۔

(ی)

العالم الكبير الشيخ محمد يوسف البنوري من أرشد تلامذة شيخنا محمد أنور الكشميري، صاحب معارف السنن في ستة أجزاء، ونفحة العنبر في هدى الشيخ أنور، وغير ذلك، كان نابغة عصره في فقه الحديث، ولما انتقل من الهند (بھارت) الى باكستان الغربي أسس في كراتشي مدرسة

هائلة ، كان يكثر من الحج والزيارة لا يفوته ذلك إلا نادراً ،و لا تفوته زيارتي إذا شهدت الموسم ، إما في مكة ، وإما في المدينة، وقد رافقته مرة من المدينة الى مكة ، و كان يحبني من صميم قلبه ويلحّ عليّ أن أنتقل في مدرسته ، كتب اليّ طالب من ديوبند في أول ذي قعده سنة ١٣٩٧ أن الشيخ يوسف جاء نعيه في ديوبند اليوم .

عالم کبیر شیخ محمد یوسف بنوری، ہمارے استاذ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری کے ارشد شاگردوں میں سے ایک، معارف السنن ۶؍ جلد اور نفحۃ العنبر فی ہدی الشیخ انور وغیرہ کتابوں کے مصنف، فقہ حدیث میں یکتائے زمانہ تھے۔ جب ہندوستان سے مغربی پاکستان ہجرت کر گئے تو کراچی میں ایک زبردست مدرسہ قائم کیا، حج وزیارت کثرت سے کرتے تھے،اور شاذونادر ہی کبھی فوت ہوتا تھا،اور جب میں حج میں حاضر ہوتا تو ایسا نہ ہوتا کہ مکہ یا مدینہ میں کہیں مجھ سے ملاقات نہ ہو،ایک دفعہ مدینہ سے مکہ تک میرا ان کا ساتھ بھی رہا، مجھ سے دل کی گہرائی سے محبت کرتے تھے،اور اپنے مدرسے میں منتقل ہو جانے کے لئے مجھ سے اصرار کرتے، دیوبند سے ایک طالب علم نے یکم ذی قعدہ ۱۳۹۷ھ کو میرے پاس ایک خط لکھا کہ شیخ یوسف کی موت کی خبر آج دیوبند پہنچی۔

علامہ اعظمی نے فرمایا:

تعلیمات اسلام سے مسلمانوں کی بے خبری کا یہ منظر بھی کس قدر روح فرسا ہے، کہ ان کے سامنے جو کوئی بھی اہل علم کا بھیس بدل کر آجائے،اور تعلیمات اسلام کو وہ جتنا بھی بد نما بنا کر مسخ شدہ صورت میں چاہے پیش کرے،ان کو خبر نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔

المآثر ج ۱ ش ۲ ص ۱۴

آثارِ قلم

مضامین و مقالات، کتب و رسائل اور تحقیقات و تعلیقات

آثار قلم

کسی صاحب علم و تصنیف کے لئے بہت بڑا سانحہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا علمی یا تصنیفی سرمایہ کسی حادثہ کا شکار اور اس کا بیش قیمت اثاثہ ضائع ہو جائے۔ علامہ اعظمیؒ کو اپنی زندگی میں اس قسم کے دو شدید حادثوں سے دوچار ہونا پڑا تھا، آپ اپنے علمی ذخیرے، کتابوں اور مسودات و مخطوطات کی اپنے محدود وسائل کے لحاظ سے حفاظت کی بھرپور کوشش کیا کرتے تھے، لیکن کبھی یہ وسائل ان کی حفاظت کے لئے ناکافی ثابت ہوتے، چنانچہ محفوظ رکھنے کے لئے لکڑی کے ایک صندوق میں آپ نے بہت سی چیزیں اٹھا رکھی تھیں، مگر اس کے بعد بہت دنوں تک ان کی دیکھ بھال کی نوبت نہیں آئی، ایک مدت کے بعد جب اس کو کھول کر دیکھا تو اس میں جو کچھ تھا سب دیمک کی خوراک بن چکا تھا۔ دوسرا حادثہ یہ ہوا کہ ایک الماری میں کسی طرح چنگاری لگ گئی، جس سے بہت ساری چیزیں سلگ کر ختم ہو گئیں، انا للہ وانا الیہ راجعون! یہ دونوں حادثے آپ کے لئے نہایت تکلیف دہ تھے، اور اس کی وجہ سے کئی دنوں تک شدید درد و کرب میں مبتلا رہے۔ اس میں خدا جانے کیا کچھ ضائع ہوا ہوگا، قیاس یہ ہے کہ اس میں مسودات و مخطوطات کے علاوہ آپ کے فتووں کا ذخیرہ بھی تھا۔

دستبرد زمانہ کے ہاتھوں سے جو چیزیں محفوظ رہ گئیں، اپنی بساط کے بقدر ہم نے ان کی تلاش و جستجو کی تاکہ قارئین کے سامنے ان کی ایک فہرست پیش کر دی جائے، چنانچہ آپ کے مسودات اور مختلف رسائل و مجلات میں تلاش و تفتیش کے بعد آپ کے مضامین اور تصانیف و تحقیقات کی جو فہرست تیار ہوئی وہ الگ الگ ہدیۂ ناظرین ہے۔ ان میں سے جو مضامین یا کتابیں کسی رسالہ اور مجلہ میں ملیں، ان کے سامنے ان کا نام اور سن اشاعت ذکر کر دیا گیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کا افسوس بھی ہے کہ ان رسالوں اور مجلوں کے دیگر

بہت سے شمارے ہمیں مل نہیں سکے، ورنہ ممکن ہے درج فہرست مضامین کے علاوہ بھی بہت کچھ ملا ہوتا۔

اس فہرست میں بہت سے مضامین ورسائل ایسے ہیں جن کا صرف نام ذکر ہے، اس کے علاوہ اور کچھ مذکور نہیں، ان میں کچھ تو ایسے ہیں جو آپ کے باقیات صالحات میں آج بھی موجود ہیں، لیکن ان کی اشاعت کے بارے میں ہم کو علم نہیں کہ کبھی وہ شائع ہوئے ہیں یا نہیں، اور دیگر وہ ہیں جن کا مسودہ موجود نہیں، لیکن آپ کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کچھ تصنیفات یا مضامین کی فہرست میں ان کا نام مذکور ہے، جس کی بنیاد پر ان کو اس فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور ضروری عرض یہ ہے کہ مقالات ومضامین کبھی تو آپ اپنے مشہور نام (حبیب الرحمٰن الاعظمی) سے لکھتے، کبھی کسی دوسرے قلمی نام سے شائع کراتے مثلاً شوق اعظمی اور ابوالمآثر الاعظمی وغیرہ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مقالات و مضامین

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔

۲۔ ابراہیم بن ادہم (الفرقان اپریل ۱۹۷۹ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۹۹ھ میں "سیرت ابراہیم ابن ادہم اوران کے مدفن کی تحقیق" کے عنوان سے شائع ہوا ہے)

۳۔ ابو عبید کی غریب الحدیث (معارف اکتوبر ۱۹۶۷ء)

۴۔ احمدیوں کی ذلت وخواری پر محمدیوں کی بیقراری (العدل ۲۹/اپریل و ۱۷/مئی ۱۹۲۷ء)

۵۔ اخبار محمدی کے بعض مضامین پر ریویو (الفقیہ ۲۸/اپریل ۱۹۲۵)

۶۔ ارسال الصحیفہ کارد

۷۔ استدراک بر فضل اللہ الصمد

۸۔ اسلام اور صنف نازک (المومن کلکتہ میں صفر، ربیع الثانی اور جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ میں شائع ہوا)

۹۔ اسلامی پرسنل لاء میں باب کفو (المآثر ج ۸ ش ا۔ محرم، صفر، ربیع الاول ۱۴۲۰ھ)

۱۰۔ امام اعظم اور خطیب بغدادی

۱۱۔ امام شافعی کے دو سفر نامے

۱۲۔ انتشارات انجمن ادبی سندھی

۱۳۔ انتقاد صحیح پر تجلی کا تبصرہ پڑھ کر

۱۴۔ اوزان ومثاقیل

۱۵۔ "اہل حدیث" اور اس کے ہمنواؤں کی خوش فہمی

۱۶۔ "اہل حدیث" کی چیرہ دستیاں

۱۷۔ ایڈیٹر اخبار "محمدی" کا شر انگیز مشغلہ، مذہب حنفی پر ناپاک حملہ (القاسم امرتسر میں ۳۱/جنوری و ۲۸/فروری ۱۹۲۵ء کو شائع ہوا)

۱۸۔ ایڈیٹر "اہل حدیث" کی منطق دانی

۱۹۔ بحث اجماع

۲۰۔ بحث نسخ

۲۱۔ بحر رمل اور بحر سریع

۲۲۔ بسلسلہ "قافلۂ اہل دل" (الفرقان دسمبر ۱۹۷۴ء)

۲۳۔ (بیمہ) مولوی تقی امینی کے مضمون پر تبصرہ (المآثر ج۳ ش ۲۔ ربیع الاول، جمادی الاولیٰ، جمادی الاخریٰ ۱۴۱۵ھ بعنوان "لائف انشورنس")

۲۴۔ پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں (معارف اکتوبر و نومبر ۱۹۵۴ء)

۲۵۔ پیٹ پر پتھر باندھنے کی حدیث

۲۶۔ تاج التراجم فی تفسیر القرآن للاعاجم

۲۷۔ تاریخ اہل حدیث پر ایک نظر

۲۸۔ تبصرہ بر تصحیح الاغلاط الکتابیہ (الفرقان شعبان ۱۳۷۱ھ)

۲۹۔ تبصرہ بر حقیقت الفقہ

۳۰۔ تبصرہ بر زجاجۃ المصابیح (الفرقان محرم ۱۳۷۰ھ)

۳۱۔ تحقیق حکم الطلقات الثلاث

۳۲۔ تحقیقات مفیدہ (الفرقان سالنامہ ۱۳۵۵ھ)

۳۳۔ تخریج زیلعی (معارف جولائی ۱۹۴۰ء، الفرقان رجب ۱۳۵۹ھ، المآثر ج ا ش ا محرم، صفر، ربیع الاول ۱۴۱۳ھ)

۳۴۔ تردید اہل قرآن

۳۵۔ تردید سرسید

۳۶۔ تشبہ بالکفار سے نہی کی حکمت

۳۷۔ تصحیح واستدراک بسلسلۂ پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں (معارف جنوری ۱۹۵۵ء، دارالعلوم مئی جون ۱۹۶۲ء)

۳۸۔ تطہیر المتجسین بجواب "تکفیر المبتدعین"

۳۹۔ تعاقب بر فتویٰ مفتی محمود حسن

۴۰۔ تقبیل ابہامین (المآثر ج ۳ ش ۴۔ شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۴۱۵ء)
۴۱۔ تقلید اور غیر مقلدیت، ایک اہم بحث (المآثر ج ۶ ش ۲۔ ربیع الآخر، جمادی الاولیٰ، جمادی الاخریٰ ۱۴۱۸ھ)
۴۲۔ جمع قرآن
۴۳۔ جواد ساباط (معارف اپریل ۱۹۲۸ء)
۴۴۔ چند مسائل فقہیہ پر شبہات اور ان کا ازالہ
۴۵۔ چہ دلاور ست وزدیکہ بکف چراغ دارد
۴۶۔ حجیت حدیث (القاسم ۱۱/ اپریل و ۱۰/ مئی ۱۹۲۴ء)
۴۷۔ حسن ادب اور اسکی اہمیت یا الہدیۃ السنیۃ لطلاب المدرسۃ الدینیۃ (دارالعلوم شعبان ۱۳۷۱ھ، ذیقعدہ وذی الحجہ ۱۴۱۰ھ، المآثر ج ۳ ش ۱۔ محرم، صفر، ربیع الاول ۱۴۱۵ھ)
۴۸۔ حضرت امام اہلسنت رحمۃ اللہ علیہ (المآثر ج ۷ ش ۳۔ رجب، شعبان، رمضان ۱۴۱۹ھ)
۴۹۔ حضرت معاویہ کی شان میں سوء ادبی اور اس کا جواب (النجم جمادی الاولیٰ والآخرۃ ۱۳۴۹ھ۔ المآثر ا ش ۲ و ۴ بعنوان حضرت امیر معاویہؓ کا مرتبہ ومقام)
۵۰۔ حضرت معاویہ کے متعلق ایک سوال کا جواب
۵۱۔ حقیقۃ الفقہ کی ایک فصل
۵۲۔ حنفیہ کرام اور اتباع حدیث (القاسم ۱۰/ فروری و ۲۵/ فروری ۱۹۲۴ء)
۵۳۔ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی (برہان مارچ و اپریل ۱۹۵۴ء)
۵۴۔ حیات مبارکہ کے تین دور (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر)
۵۵۔ خدا نور ہے۔
۵۶۔ خطیب بغدادی کی شرف اصحاب الحدیث اور محمد جونا گڈھی
۵۷۔ الدرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ کا نادر نسخہ (معارف اگست ۱۹۵۰ء)
۵۸۔ دفاع حنفیت

۵۹۔ دلائل فرضیت جمعہ

۶۰۔ دو متبرک اجازت نامے (معارف دسمبر ۱۹۴۳ء)

۶۱۔ دینور اور مشائخ دینور (معارف اکتوبر ۱۹۶۵ء)

۶۲۔ الذخائر ذالتحف کس کی تصنیف ہے؟ (معارف فروری ۱۹۶۱ء)

۶۳۔ "رجال بخاری" کا دندان شکن جواب (الداعی رجب وشعبان ۱۳۶۰ھ)

۶۴۔ رسالہ اثبات تقلید

۶۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغی زندگی

۶۶۔ رکعات التراویح

۶۷۔ رمضان میں تہجد باجماعت

۶۸۔ رویت ہلال

۶۹۔ زراعت وجاگیرداری

۷۰۔ سید الشہداء کی تحقیق (المآثر ج ۴ ش ۲۔ ربیع الآخر، جمادی الاولیٰ، جمادی الاخریٰ ۱۴۱۶ھ)

۷۱۔ سیرۃ النبی شبلی پر ایک نظر

۷۲۔ السیف الباتر

۷۳۔ سیف وقلم (دارالعلوم اپریل ۱۹۵۷ء)

۷۴۔ صحابہ کے مختصر تذکرے

۷۵۔ عباسی کارد قاضی اطہر کے قلم سے

۷۶۔ عدد رکعات تراویح (القاسم ۲۵ مئی و ۱۰ جون ۱۹۲۴ء)

۷۷۔ عظمت صحابہ، خواجہ حسن نظامی کے باطل خیالات کی تردید (العدل ۸ / اکتوبر ۱۹۲۸)

۷۸۔ علم رجال کی اہمیت

۷۹۔ علم وفضل میں خواتین کا حصہ

۸۰۔ "عہد زریں" پر تبصرہ
۸۱۔ غریب الحدیث (معارف فروری ۱۹۶۸ء)
۸۲۔ غیر مقلدوں کے اشتہار کا جواب
۸۳۔ فتوحات حضرت معاویہ تاریخ کی روشنی میں (دارالعلوم اپریل ۱۹۶۵ء)
۸۴۔ فقہ نبوی کے نوٹ
۸۵۔ فہرست مخطوطات عربیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور (معارف اپریل ۱۹۷۹ء)
۸۶۔ فی التنفل بعد الوتر
۸۷۔ قادیانی مرتد کی سنگساری مولوی ثناء اللہ کی غمگساری (القاسم ۱۰ر نومبر ۱۹۲۴ء)
۸۸۔ قاضی اطہر مبارکپوری کی کتاب رجال السند والہند پر ایک نظر
۸۹۔ قتل مرتد
۹۰۔ قرون اولیٰ میں حفظ حدیث کا اہتمام (البلاغ جون ۱۹۵۴ء، دارالعلوم مارچ ۱۹۵۹ء)
۹۱۔ قیامت کے دن پہلا سوال
۹۲۔ کھلی چٹھی بنام ایڈیٹر محمدی (ارشاد ۱۵ر اکتوبر ۱۹۲۷ء)
۹۳۔ مبارق الازھار کس کی تصنیف ہے؟ (معارف جنوری ۱۹۵۴ء)
۹۴۔ مثالب ابی حنیفہ کی تنقید
۹۵۔ محدثین پر سلطنت کی ہواخواہی کا الزام (دارالعلوم محرم وصفر ۱۳۶۱ھ)
۹۶۔ مذہب حنفی کی عالمگیر مقبولیت (ارشاد یکم مئی ۱۹۲۷ء)
۹۷۔ مسافت قصر
۹۸۔ مسئلہ اطاعت امیر اسوۂ حسین کی روشنی میں (ضیاء الاسلام ۲۲ر فروری ۱۹۳۹ء)
۹۹۔ مسئلہ تفویض اور ایک وکیل کا دخل در معقولات (ضیاء الاسلام ۱۹۳۹ء ۶ قسطوں میں)
۱۰۰۔ مسئلہ طلاق پر شبہات اور ان کا ازالہ (القاسم ۲۵ر اپریل ۱۹۲۴ء)
۱۰۱۔ مسلم پرسنل لاء یا اسلامی شریعت (البلاغ مئی ۱۹۷۲ء)

۱۰۲۔ مصنف عبدالرزاق کی کتاب الجامع؟ یا جامع معمر؟ (الفرقان جون وجولائی ۱۹۸۳ء)

۱۰۳۔ مضمون خلفاء شاہ غلام علی پر کچھ اضافہ

۱۰۴۔ مقامات تصوف پر تبصرہ و تنقید

۱۰۵۔ مناقب اعظمیہ

۱۰۶۔ موضوعات القصاص (دارالعلوم ربیع الاول ۱۳۶۱ھ)

۱۰۷۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی اور ان کا سفر حج (الفرقان اکتوبر و نومبر ۱۹۷۷ء، البلاغ جنوری ۱۹۷۸ء)

۱۰۸۔ مولوی سامرودی کے سوالات کا مسکت جواب

۱۰۹۔ نسخ کوئی معیوب چیز نہیں

۱۱۰۔ واعتصموا بحبل اللہ (القاسم ۲۵/اگست و ۱۰/ستمبر ۱۹۲۴ء)

۱۱۱۔ واقعہ قفال کی تردید

۱۱۲۔ وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين یا شان رحمۃ للعالمین (ارشاد یکم مئی ۱۹۲۷ء، المآثر ج ۸ ش ۱۔ محرم، صفر، ربیع الاول ۱۴۲۰ھ)

۱۱۳۔ ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات (برہان فروری ۱۹۵۴ء)

۱۱۴۔ ہندوستان میں علم حدیث اور قاضی اطہر

۱۱۵۔ تذکرہ مشاہیر قوم (المومن شوال، ذیقعدہ اور ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ میں شائع ہوا)

۱۱۶۔ رمضان کا چاند

۱۱۷۔ علمائے اہل کمال (المومن جمادی الاولیٰ والاخریٰ اور رجب ۱۳۴۳ھ میں شائع ہوا)

۱۱۸۔ معجزات و کرامات (الفیض امرتسر میں ربیع الاول، جمادی الاولیٰ، جمادی الثانیہ اور رجب ۱۳۴۳ھ میں شامل ہوا)

علامہ اعظمی نے فرمایا:

کیونزم ہو یا کوئی دوسرا ازم اسلامی زندگی سے آنکھ ملانے کی تاب تو لا ہی نہیں سکتا اس کا تار و پود کیا بکھیرے گا۔
المآثر ج ۳ ش ۲ ص ۱۳

کتب ورسائل

۱۔ ابطال عزاداری (الداعی۔ جمادی الآخرہ، رجب، شعبان ورمضان ۱۳۶۱ھ)
۲۔ احکام النذر لاولیاء اللہ و تفسیر ما اھل بہ لغیر اللہ (الفرقان۔ شوال وذیقعدہ ۱۳۵۸ھ)
۳۔ ارشاد الثقلین (الداعی۔ رمضان، شوال، ذیقعدہ وذی الحجہ ۱۳۵۹ھ)
۴۔ الازہار المربوعۃ (دو حصوں میں ہے، ایک حصہ بہت پہلے چھپا تھا)
۵۔ الاعلام المرفوعۃ فی حکم الطلقات المجموعہ (اس کا کچھ حصہ العدل جون وجولائی ۱۹۳۴ء کے چار شماروں میں بھی شائع ہوا)
۶۔ اعیان الحجاج۔ حصہ اول ۱۹۵۸ء، حصہ دوم ۱۳۹۶ھ
۷۔ انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت۔ طبع اول ۱۹۹۹ء
۸۔ اہل دل کی دلآویز باتیں۔ ۱۳۶۰ھ معارف پریس اعظم گڈھ
۹۔ بناء عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا
۱۰۔ تحقیق اہل حدیث۔ طبع اول اکبر پریس الہ آباد ۱۹۴۳ء، طبع دوم ۱۹۹۹ء
۱۱۔ تذکرۂ علماء (ناتمام)
۱۲۔ ترجمہ کتاب الترغیب والترھیب
۱۳۔ تعزیہ داری ودیگر مراسم عزاداری سنی نقطۂ نظر سے (الفرقان۔ ربیع الاول والآخر وجمادی الاولی ۱۳۶۱ھ)
۱۴۔ التنقید السدید علی التفسیر الجدید یا ابراز الغی من تفسیر عبد الحی (النجم ذی قعدہ ۱۳۴۹ھ)
۱۵۔ تنبیہ الکاذبین بجواب تنبیہ الناصبین (النجم ج ۱۱ ش ۱، ۵و۶۔ ۱۳۵۲ھ)

۱۶۔ الحج القویہ علی حرمۃ سجدۃ التحیہ

۱۷۔ دارالاسلام ودارالحرب

۱۸۔ دست کار اہل شرف۔ ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹۸۵ء حسن پریس مئو اعظم گڈھ

۱۹۔ دفع الجادلہ۔ عمدۃ المطابع لکھنؤ

۲۰۔ دنیا میں پارچہ بافی کے مراکز

۲۱۔ دیوبندیوں سے چند سوالات کا جواب (العدل۔ ۲۴ اگست، ۲۸ راگست و ۷ ر ستمبر ۱۹۳۲ء)

۲۲۔ ردّ "رجال بخاری" (یہ کتاب المآثر میں قسط وار شائع ہوئی ہے)

۲۳۔ رکعات تراویح۔ طبع اول ۷ ۱۳۷ھ م ۱۹۵۷ء، طبع دوم ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۳ء، طبع سوم ۱۳۸۳ھ م ۱۹۶۳ء، طبع چہارم ۱۴۰۸ھ م ۱۹۸۸ء

۲۴۔ رکعات تراویح مذیل ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۹۶۰ء مطبوعہ تنویر پریس لکھنؤ

۲۵۔ الروض المجود فی تقدیم الرکبتین عند السجود

۲۶۔ رہبر حجاج۔ اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے،

۲۷۔ السیر الحثیث الی تنقید تاریخ اہل الحدیث

۲۸۔ سیرۃ طحاوی

۲۹۔ شارع حقیقی (الفرقان۔ جمادی الاولیٰ والثانیہ، رجب، ذیقعدہ وذی الحجہ ۱۳۵۷ھ)

۳۰۔ شہید کربلا کارد

۳۱۔ عظمت صحابہ (المآثر میں قسط وار شائع ہو رہی ہے)

۳۲۔ قاضی نامہ بجواب جولاہہ نامہ

۳۳۔ کشف المعضلات (الفقیہ۔ ۲۰ فروری، ۵ مارچ، ۱۵ اپریل و ۲۰ اپریل ۱۹۲۴ء)

۳۴۔ لغات حدیث۔ اردو (ناتمام)

۳۵۔ مسئلہ تقلید

۳۶۔ مفتاح النحو

۳۷۔ مقدمہ معارف الحدیث۔ ۱۳۷۳ھ ۱۹۵۴ء

۳۸۔ مولوی ثناء اللہ اور بحث تقلید

۳۹۔ نصرۃ الحدیث۔ طبع اول ۱۳۵۳ھ م ۱۹۳۴ھ، طبع دوم ۱۳۶۰ھ ۱۹۴۰ء، طبع سوم
(اس کی تین قسطیں العدل اگست و ستمبر ۱۹۳۴ء کے شماروں میں بھی شائع ہوئیں)

۴۰۔ ترجمہ موطا امام مالک

عربی تصنیفات

۱۔ الإتحافات السنية بذكر محدثي الحنفية

۲۔ الألباني شذوذه وأخطاؤه

پہلی بار مالیگاؤں اور دوبارہ کویت سے ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔

۳۔ تجريد شواهد أوضح المسالك (عربی)

۴۔ تذكرة ادباء الهند

۵۔ التوصية بأسرار التسمية

۶۔ الجنائز (الموسوعة الفقهية)

۷۔ الحاوی لرجال الطحاوی

عربی

١. الامام الربانی عبدالله بن المبارک (البعث الإسلامی شعبان رمضان شوال١٣٨٦ديسمبر ١٩٦٦)

٢. كتاب الجامع لعبدالرزاق الصنعانی (البعث رجب ١٤٠٥ھ مارس ابریل١٩٨٥)

٣. حجة لاينساها التاريخ (البعث رجب ١٣٧٥ مارچ ١٩٥٦)

٤. حول السنن الرواتب (دعوة الحق محرم ١٣٨٧ مُایو سنة ١٩٦٧)

٥. الربانية : اصل الدين و سيمة المسلمين (البعث ذوالحجة ١٣٨٦محرم ١٣٨٧ھ ابریل مایو ١٩٦٧م

٦. السيد مرتضى الزبيدی هندی لا يحوم حوله شك (البعث ربیع الثانی١٣٩٦،ابریل ١٩٧٦

٧. فی الميزان (ما تمس اليه الحاجة) (البعث ذو الحجة ١٣٧٥ء اغسطس ١٩٥٦)

٨. مسندالإمام أحمد (البعث رجب ١٣٧٨ینایر ١٩٥٩)

٩. مسندالإمام الحمیدی (البعث رمضان ،شول ذوالقعده ١٣٧٩ مارچ ، ابریل مایو ١٩٦٠)

١٠. كتاب نسب قريش للزبير بن بكار (الحج جمادی الاولی ١٣٨٣ھ اكتوبر ١٩٦٣ البعث جمادی الاولیٰ ١٣٨٣ھ اكتوبر ١٩٦٣م)

تحقیقات و تعلیقات

	کتاب	مصنف	طابع	ناشر
۱۔	انتقاء الترغیب والترھیب	ابن حجر العسقلانی متوفی ۸۵۲ھ	علمی پریس مالیگاؤں	مجلس احیاء المعارف مالیگاؤں ۱۳۸۰ھ ۱۹۶۰ء
۲۔	تلخیص خواتم جامع الأصول	محمد طاہر پٹنی	رر	محمد نورولی
۳۔	کتاب الثقات	عمر بن أحمد بن شاھین	غیر مطبوع	
۴۔	کتاب الزھد والرقائق	عبداللہ بن المبارک متوفی ۱۸۱ھ	علمی پریس مالیگاؤں	مجلس احیاء المعارف ۱۳۸۵ھ ۱۹۶۶ء
۵۔	کتاب السنن۔ ۲ جلدیں	سعید بن منصور متوفی ۲۲۷ھ	رر	مجلس علمی ڈابھیل ۱۳۸۷ھ ۱۹۶۷ء
۶۔	فتح المغیث	شمس الدین سخاوی متوفی ۹۰۲ھ	اعظمی پریس مئو	محمد سلطان النمنکانی (مدینہ منورہ)
۷۔	کشف الأستار عن زوائد مسند البزار۔ ۴ جلدیں	نورالدین ہیثمی متوفی ۸۰۷ھ	موسسۃ الرسالۃ دمشق	۱۳۹۹ھ ۱۹۷۹ء
۸۔	مجمع بحار الأنوار۔ ۵ جلدیں	محمد طاہر پٹنی	مطبعۃ مجلس دائرۃ المعارف النعمانیۃ	۱۳۸۶ھ تا ۱۳۹۵ھ
۹۔	مسند الحمیدی۔ ۲ جلدیں	ابو بکر عبداللہ بن الزبیر الحمیدی متوفی ۲۱۹ھ	مطبعۃ لجنۃ نشر العلوم الاسلامیۃ۔ حیدرآباد	مجلس علمی ڈابھیل ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۳ء
۱۰۔	المصنف۔ ۱۱ جلدیں	عبدالرزاق الصنعانی متوفی ۲۱۱ھ	دارالقلم۔ بیروت	مجلس علمی ڈابھیل ۱۳۹۰ھ ۱۹۷۰ء
۱۱۔	المصنف [1] ۱۵ جلدیں	ابو بکر بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ	مطابع الرشید مدینہ منورہ	المکتبۃ الإمدادیۃ مکۃ المکرمۃ ۱۴۰۳ھ ۱۹۸۳ء

(۱) علامہ اعظمی نے اس کتاب کی تقریباً بارہ جلدوں پر کام کیا ہے، لیکن ابھی تک چار ہی جلدیں چھپ سکی ہیں۔

۱۲۔	المطالب العالیة بزوائد المسانید الثمانیة ۔ ۴ جلدیں	ابن حجر العسقلانی متوفی ۸۵۲ھ	المطبعة العصریة کویت ۱۳۹۰ھ ۱۹۷۰ء	وزارة الاوقاف و الشئون الاسلامیة. کویت
۱۳۔	التذئیل العجیب علی نهایة الغریب	جلال الدین السیوطی	غیر مطبوع	
۱۴۔	مسند اسحاق بن راهویه	اسحاق بن راہویہ	غیر مطبوع	
۱۵۔	مسند الامام ابی محمد الحارث بن ابی اسامة	حارث بن ابی اسامہ	غیر مطبوع	
۱۶۔	نزهة الالباب فی الالقاب	ابن حجر عسقلانی	غیر مطبوع	

مندرجہ بالا تحقیقات کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابوں کی تحقیق و اشاعت آپ کی کاوشوں کی مرہون منت رہی ہے، جن کی ایک اجمالی فہرست یہ ہے:

۱۷۔ استدراک بر شرح مسند احمد

مسند امام احمد بن حنبل کی پندرہویں جلد میں پچاس صفحات میں بکھرے ہوئے ہیں۔

۱۸۔ اسرار المحبة　شاہ رفیع الدین دہلوی متوفی ۱۲۳۳ھ　اشرف پریس لاہور۔ ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرة العلوم گوجرانوالہ ۱۳۸۸ھ

۱۹۔ تکمیل الاذہان　〃　〃　〃

۲۰۔ تعلیقات الحافظ قاسم بن قطلوبغا علی الدرایة۔

منیة الالمعی کے ساتھ ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۵۰ء میں مصر سے شائع ہوئی۔

۲۱۔ جزء عمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کی تصنیف "حجة الوداع و عمرات النبی ﷺ" چھپی تو اس میں حجة الوداع کا خطبہ شامل نہیں تھا، علامہ اعظمی کی توجہ سے یہ بعد کے ایڈیشن میں شائع ہوا۔

۲۲۔ حواشی بر مقدمہ ابن الصلاح (۱)

۲۳۔ حیاۃ الصحابہ (عربی) حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی۔

مولانا محمد الیاس بارہ بنکوی نے اس کی تحقیق کی ہے، اور علامہ اعظمی نے اس پر نظر ثانی فرمائی ہے، لیکن آپ کی تصحیحات و تحقیقات اس کثرت سے ہیں کہ وہ مستقل تحقیق کا درجہ رکھتی ہے۔ مطبعۃ ملت دودھ پور علی گڈھ سے چھپ چکی ہے۔

۲۴۔ دمغ الباطل شاہ رفیع الدین دہلوی نفیس پرنٹرز لاہور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ ۱۹۷۶ء

۲۵۔ رسالۃ الاوائل شیخ محمد سعید بن سنبل

علامہ اعظمی کی نظر ثانی اور تصحیح کے بعد اعظمی پریس مئو سے شائع ہوا۔

---

(۱) مقدمہ ابن الصلاح پر انتہائی مختصر حواشی شیخ عبد الشکور عبد الفتاح فدا کی طلب پر تحریر فرمائے تھے، لیکن افسوس کہ وہ اب تک شائع نہ ہو سکے۔

☆☆☆

علامہ اعظمی نے فرمایا:

مولانا! تقلیداً نہیں، بلکہ اپنی بساط کے مطابق از روئے تحقیق میرا یہ عقیدہ ہے کہ پہلی اور دوسری صدی سے لے کر گیارہویں اور بارہویں صدی تک کے فقہائے اسلام نے اسلامی تعلیمات و مسائل کے جو مقاصد و مناحی سمجھے ہیں، وہی صحیح ہیں، ظاہر ہے کہ میں اسی تحقیق کی روشنی میں مشورے دے سکتا ہوں، اس کے خلاف جو کوئی مجھے کچھ سمجھانا چاہے، تو حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ بزرگوں کی دعا سے اس ہیچمداں کے پاس ایسے مواد موجود ہیں، کہ میں ان حضرات کا بہت مبسوط رد کر سکتا ہوں، والحمد للہ...

(مکتوب علامہ اعظمی بنام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مورخہ ۱۹ر مئی ۱۹۶۴ء)

اشکِ غم

ماتم یہ زمانے میں بپا تیرے لئے ہے

بہ یاد عالم بے بدل، محدث جلیل

علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ

پروفیسر حفیظ بنارسی

علم حدیث پاک کا دیوانہ چل بسا | جس کا ہر اک سخن تھا حکیمانہ چل بسا
محفل میں اب وہ گرمیٔ محفل نہیں رہی | نازاں تھی جس پہ شمع وہ پروانہ چل بسا
دشت عجم سے تابہ عرب جس کی دھوم تھی | وہ اعتبار گلشن و ویرانہ چل بسا
عرفان و آگہی کا پیاسی نہیں رہا | رقصاں تھا جس سے علم کا پیمانہ چل بسا
جس کی ہر اک نظر میں بھری تھی مئے طہور | واحسرتا! وہ پیر قدح خانہ چل بسا
شاہنشہ علوم، فقیہ گہر فشاں | دنیا کی انجمن سے فقیرانہ چل بسا
ساغر اداس اداس ہیں پیمانے سرنگوں | وجہِ فروغِ محفل رندانہ چل بسا

تھا افتخارِ عالم اسلام جو حفیظ
سوئے جناں وہ دین کا دیوانہ چل بسا

سرشک غم

بیاد مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ

مولانا مجیب الغفار صاحب اسعد اعظمی
شیخ الحدیث مدرسہ مظہر العلوم بنارس

بزم آثار و سنن کے آہ صدر الصدور
حضرت اقدس، محدث، صاحب طبع غیور

آہ استاذی حبیب الاعظمی بالغ نظر
بوالمآثر وہ امام ناقدان ذی شعور

ان کی رحلت سے ہوئے ہیں سب یتیم و بے نوا
ہے سبھی کا شیشۂ دل صدمۂ فرقت سے چور

صدمۂ جانکاہ سے ہے سارا عالم سوگوار
مکتبے گریاں، کتابیں، حاشیے، بین السطور

غم کی تاریکی میں ہے سارا جہاں ڈوبا ہوا
ہر نظر کے سامنے ہے ظلمتِ غم کا وفور

ماہر علم حدیثِ مصطفیٰ رخصت ہوئے
تشنگان علم جائیں یاخدا کس کے حضور

یوں ہزاروں میکدے ہیں پر کہاں پائیں گے ہم
ساقیا تیری شراب کہنہ کا کیف وسرور

مل سکا ان کا کوئی ثانی نہ شان علم میں
لوگ دوڑاتے رہے اپنی نگاہیں دور دور

وہ بخاریٔ زمن تھے، وقت کے ابنِ حجر
فن اسماء پر انھیں لاریب تھا کامل عبور

اللہ اللہ ان کے رخ کی تازگی مرنے کے بعد
زندگی سے بھی فزوں تھا ان کی پیشانی کا نور

زندۂ جاوید ہیں وہ اپنی تصنیفات میں
گرچہ ظاہر میں ہوئے ہیں آج من اھل القبور

اے خدا ٹھنڈی رہے تربت ہمارے شیخ کی
جنت الفردوس میں ان کو ملیں حور و قصور

عمر اقدس ہے "مجاہد" اسعد محزوں لکھ
۹۳

ابتدا "اختر حسن" ہے خاتمہ "وصل غفور"
۱۳۱۹ ۱۴۱۲

پایگاہ شیخ حبیب اعظمی

مولانا مجیب الغفار اسعد اعظمی

وہ مصروشام و ہند کے محدث جلیل تھے
علوم مصطفیٰ کی وہ جہاں میں سلسبیل تھے
وہ "مظہر العلوم" کی نظر کے نور، لخت دل
بجائے خود تھے اک سند، بذات خود دلیل تھے

وہ گلستان فقہ کی بہار بے نظیر تھے
جہان۔ رنگ و بو کے وہ مؤرخ شہیر تھے
یہ ان کا وصف خاص تھا، یہ ان کا امتیاز تھا
جواہرات علم کے وہ ناقد بصیر تھے

جو خدمت حدیث کا ہے قافلہ رواں دواں
تھے اس کے قائد عظیم، اس کے میر کارواں
سنہری ان کی زندگی سنہری کارکردگی
نہ کیوں ہم آج آب زر سے لکھیں ان کی داستاں

وہ آسمان علم کے تھے ماہتاب ضو فشاں
ادب سے ان کے سامنے تھی فرش راہ کہکشاں
"مصنف یمانی" پر محققانہ کاوشیں
رہیں گی ان کی عظمتوں کا تا ابد حسیں نشان

وہ منکر حدیث کے لئے تھے سیف بے نیام
وہ اس جہاد پاک کے مجاہدوں کے تھے امام
حمایت حدیث میں لکھی ہے "نصرۃ الحدیث"
ملا ہے اہل علم میں جسے بلند تر مقام

خود ایک انجمن تھے وہ، بلند ان کی ہمتیں
نظر پہ واشگاف تھیں نہفتہ تر حقیقتیں
سجی ہوئی تھیں ان کے ذہن و فکر کی بساط پر
نصوص کی عبارتیں ،بلاغتیں ،صراحتیں

اک آسمان تھا کہ جسے کھا گئی زمیں

امیر الاعظمی

وہ امیر ہند ،علم دین کا روشن چراغ
وہ چراغ راہ ہستی، وہ فقیہ روزگار
کشورِ دانش، دیارِ آگہی کا شہریار
وہ خطیب عصر، اقلیم سخن کا تاجدار
قبر کی آغوش میں وہ کون محو خواب ہے
آسمان علم کا اک مہر عالمتاب ہے
اس کے قدموں پر نچھاور وقت کے شاہوں کا تاج
اس نے پایا دشمنوں سے بھی عقیدت کا خراج
شان و شوکت کا ہے اس کی معترف سارا جہاں
کیا مسلماں اور ہندو، رو کے سب کہتے ہیں آج
تاجدار علم و فن بے سیم وزر رخصت ہوا
آہ وہ عیسیٰ نفس، وہ چارہ گر رخصت ہوا
ساقی دیرینہ میخانۂ قال الرسول
زمزمہ سنج حدیث و نکتہ آرائے اصول
گلشن اسلام کا وہ عندلیب خوش نوا
جس کے منہ سے موعظت کے ہر نفس جھڑتے تھے پھول

کھو گیا وہ گوہر نایاب، مردِ بے مثال
ختم جس کی ذات پر ہے فن اسماء الرجال

ہمدمِ سینہ فگاراں ، ہمنوائے بسملاں
چارہ ساز دردمنداں، مرہم خستہ دلاں

ہادم ایوان باطل، پاسبان قصر حق
سربراہ اہلِ عرفاں، سرگروہ عاقلاں

اسوۂ اسلاف، فقہِ بوحنیفہ کا امیں
حق تو ہے کہیے اسے احناف کا حصن حصیں

تھا وہ یکتائے جہاں تاریخ میں تفسیر میں
اس کا ثانی تھا نہ کوئی وعظ میں تقریر میں

قابل صد آفریں تھا اس کا کلکِ زرنگار
تھا وہ مشہور زمانہ خوبیٔ تحریر میں

برگِ آوارہ کو چن چن کے گلستاں کردیا
گوہر الفاظ سے کاغذ کا دامن بھر گیا

اس کی تالیفات ہیں موسوم کتنے نام سے
کر چکیں حاصل خراج داد خاص وعام سے

عبدرزاق، المطالب اور شیبہ درکنار
حق کو واضح کردیا رکعات اور اعلام سے

اس نے جو کچھ لکھ دیا وہ حرفِ آخر ہو گیا
زندۂ جاوید نامِ بوالمآثر ہو گیا

ذات سے اس کی دوبالا ہوگئی شان عجم
اس کی عظمت کے عرب والوں نے چومے ہیں قدم

اپنی آنکھوں میں جگہ دی ہے سلیماں نے جسے
تھا نگاہ تھانوی میں جو عزیز و محترم

ہے دعاگو اس کے حق میں یہ امیرؔ خاکسار
اس کے مرقد پر ہو نازل رحمت پروردگار

صاحب فضل وکمال

بروفات

محدث جلیل حضرت مولانا اعظمی نوراللہ مرقدہٗ

قاضی کوثرؔ اعظمی

کیوں نہ ہوں ارباب عالم اس کے غم میں سوگوار
وہ فقیہِ عصر وہ فخر زماں جاتا رہا

کارواں والے بحسرت دیکھتے ہی رہ گئے
کارواں سے اٹھ کے میرکارواں جاتا رہا

وہ محدث وہ مفکر وہ امیر الہند آہ!
دارفانی چھوڑ کر سوئے جناں جاتا رہا

جس کی پرواز تخیل چھو رہی تھی آسماں
وہ شہیر صاحب طرز بیاں جاتا رہا

مطلع علم نبوت، واقف اسرار دیں
قصر علم و معرفت کا رازداں جاتا رہا

اے فقیہ بے بدل اے صاحب فضل و کمال
اے کلیم طور ملت تو کہاں جاتا رہا

گونج اٹھی تھی جس کے نغمات حقائق سے فضا
باغ سے وہ عندلیبِ گلستاں جاتا رہا

مخزنِ علم نبوت، ماہر علم حدیث
ایک مرد باصفا اک حق نشاں جاتا رہا

کون سلجھائے گا گتھی اب حدیثِ پاک کی
اس زمینِ علم کا اُف آسماں جاتا رہا

یا خدا کردے عطا اس کا کوئی نعم البدل
آبروئے علم دیں کا پاسباں جاتا رہا

اک زمانہ ہورہا تھا جس سے کل تک فیضیاب
آج کوثر بزم سے وہ ضو فشاں جاتا رہا

مولانا عطاء الرحمٰن عطاء بھاگلپوری

نبی کے پیارے حبیب داور، حبیب رحمٰن اعظمی تھے
حقیقتاً وارث پیمبر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

امام فن حدیث و قرآں حدیقہ مصطفیٰ کے نگراں
سراپا حقانیت کے پیکر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

حدیث رگ رگ میں جن کی پنہاں، حدیث ہی جن کا دین وایماں
حدیث ہی جن کا تکیہ بستر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

درود ہر دم لبوں پہ جاری، اسی میں گذری ہے عمر ساری
فدائے ذات رسول انورؐ، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

غزالی وبیہقی دوراں، تھے باغ نعمان کے نگہباں
کہ بحر تحقیق کے شناور، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

عقیدتوں کا خراج دے کر گئے ہیں خود جن کو شیخ ازہر
ائمہ فن کے ایسے محور حبیب رحمٰن اعظمی تھے

یہ شیخ بو غدہ شیخ ایمن یہ بادہ نوشان حکمت وفن
گئے ہیں جن کے یہاں سے پی کر حبیب رحمٰن اعظمی تھے

وہ ساقیٔ جام مصطفیٰ تھے، وہ چشمۂ فیض باخدا تھے
ہجوم پیاسوں کا جن کے در پر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

وہ بزم رشد وہدیٰ کی زینت، وہ شیخ کامل شہ طریقت
کہ رہبرانِ ہدیٰ کے رہبر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

کتاب زہد ومصنفین ومطالب ومسند حمیدی
ہے جن کی تعلیق ان کتب پر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

سعید منصور کی سنن ہو، یا کشف استار علم و فن ہو
بکھیرے ہیں جس نے ان پہ گوہر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

لکھی گئیں شرحیں بر طحاوی، ہے آپ کی شرح سب پہ حاوی
نگار علمی کے آئینہ گر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

ادائے فقر ان کو ایسی بھائی، نہ سوئے دولت نظر اٹھائی
غنا وصبر ورضا کے خوگر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

محقق بے مثال کہیے، محدث باکمال کہیے
مفسر وحی رب اکبر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

نہ پوچھیے بس مقام ان کا، عطا ہے ادنیٰ غلام ان کا
سپہر عظمت کے مہر انور، حبیب رحمٰن اعظمی تھے۔

برمزار شیخ الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

گمان انصاری

علم و عمل کی شمع فروزاں کہیں جسے
حسن یقیں کا نیر تاباں کہیں جسے
اقبال والا مردِ مسلماں کہیں جسے
یعنی نشانِ عالم امکاں کہیں جسے

تہذیبی ارتقاء تیرے قدموں کی دھول ہے
ہر داستانِ خدمتِ دیں کتنی طول ہے
اس دور میں تو سب سے بڑا با اصول ہے
ہاں فخر امتیازِ امام الرسول ہے

نا آشنائے شہرت بے جا تھی تیری ذات
نا واقفِ فریب تمنا تھی تیری ذات
نا سازگار دہر میں تنہا تھی تیری ذات
کیا لکھوں کوئی کھیل تماشا تھی تیری ذات؟

اک پیکر خلوص و مروّت کہوں گا میں
آئینۂ عروسِ صداقت کہوں گا میں
عقدہ کشائے گیسوئے ملت کہوں گا میں
تجھ کو امینِ راز شریعت کہوں گا میں

اک بار دیکھ لے نگہِ التفات سے
آسودہ کردے مجھ کو شعورِ حیات سے
خلوت میں جا نماز سے جلوت میں نعت سے
نسبت ہے تجھ کو سید مدنیؒ کی ذات سے

رونق فروزِ مسندِ بزمِ مناظرہ
اے موجبِ ظہورِ کرامت تجھے سلام
رسوا نہ ہو سکا کبھی تیرا شعورِ عشق
اے پیرِ خانقاہِ طریقت تجھے سلام
تو زندگی کی قید سے آزاد ہو گیا
اے طائرِ دریچہ رحمت تجھے سلام
ہر ہر نفس ہے سلسلۂ فاتحہ گمان
ہر ہر قدم بہ نازِ عقیدت تجھے سلام

خراجِ عقیدت

صابر حبیب الاعظمی

وجہِ توقیرِ عجم، فخرِ عرب تھی تیری ذات
عصرِ حاضر میں یقیناً منتخب تھی تیری ذات
اس خراب آباد میں، محبوبِ رب تھی تیری ذات

تیری رحلت کی خبر سے کانپ اٹھا سارا جہاں
دم بخود ہے یہ زمیں، گریہ کناں ہے آسماں

اے جبالِ علم و دانش، دین کے روشن منار
یعنی دنیائے حدیث و فقہ کے اے شہریار
ذرہ ذرہ آپ کے غم میں ہے پیہم اشکبار

ذات تیری کس قدر مقبولِ خاص و عام تھی
سرنگوں قدموں میں تیرے، گردشِ ایام تھی

تھا ازل سے واقفِ سرچشمۂ رشد وہدیٰ
گلشن علمی کا بے شک تو گل سر سبد تھا
آج تو رو پوش ہم سے ہو گیا وا حسرتا
علمی اشکالات لیکر اب کہاں جائیں گے ہم
تشنگیٔ علم دیں کیسے بجھا پائیں گے ہم

تیرے اطراف و جوانب تھا ہجوم قدسیاں
سر بہ خم ہوتے تھے تیری بزم میں ہر انس وجاں
تیری عظمت کا قصیدہ پڑھتے تھے کر وبیاں
تو نے کب کی آرزوئے جاہ و حشمت سیدی
فقر پر تیرے تصدق تھا مقام خسروی

اے "محدث اعظمیؒ" اے علم و فن کے تاجور
اے "غزالیؒ" زماں، اے وقت کے " ابن حجرؒ"
یعنی اے نکتہ رسِ آیات، اے بالغ نظر
تیرے دم سے علم و فن کا میکدہ آباد تھا
"بے ستونِ" علم کا لاریب تو فرہاد تھا

"اے حبیبِ باصفا" اے عاشقِ خیر الوریٰ
گنج علم و فن سے تجھ کو حصہ وافر ملا
تجھ کو قدرت نے " ہمالہ" کی بلندی کی عطا
عمر بھر کرتے رہے تم آبیاری علم کی
زلف سو انداز سے تم نے سنواری علم کی

اے "محدث اعظمیؒ" شاہنشہِ لوح و قلم
رو برو تیرے لرز جاتے تھے علماء کے قدم
کیوں نہ چومیں اہل علم و فن ، ترا زریں قلم

تیرے علم و فضل کا ہے معترف سارا جہاں
صرف اہل "ہند" ہی کیا ہیں "عرب" بھی مدح خواں

اے خدائے لم یزل، اے خالق ارض و سما
صابر نمناک کی اتنی سی ہے بس التجا
درگزر کر، حضرت مرحوم کی اک اک خطا

اے خدا "شیخ الحدیث الاعظمی" کی قبر پر
بارش انوار و رحمت، روز و شب، شام و سحر

صابر حبیب الاعظمی

الوداع! اے حضرت شیخ الحدیثؒ الاعظمی
الوداع! اے عصر حاضر کے "امام بیہقیؒ"

الوداع! اے پیکر رشد وہدایت، الوداع!
الوداع! اے شہریار علم وحکمت، الوداع!

الوداع! اے عہد حاضر کے اماموں کے امام
الوداع! اے اسوۂ حسنہ کے مصداق تمام

الوداع! اے حکمت و دانش کے بحر بیکراں
الوداع! اے علم و فن کے آفتاب ضو فشاں

وائے حسرت! تیری رحلت سے "اے شیخ الاعظمیؒ"
مسند "علم حدیث وفقہ" سونی ہو گئی

آپ کی ذات گرامی، انجمن در انجمن
ناز فرما تجھ پہ خود تھا علم دیں کا بانکپن

تشنہ کامانِ علومِ دین کی ساقی گری
تا دم آخر رہا ، ملحوظ فرضِ منصبی

بزمِ " آثار و سنن" میں شورِ ماتم ہے بپا
آرہی ہے دمبدم کانوں میں آواز بکاء

اے علوم عقلی و نقلی کے دُرّآب دار
تیری فرقت میں "کتاب و حاشئے" ہیں بیقرار

آہ! اے علمِ حدیث و فقہ کے رمز آشنا
بزمِ امکاں کو جگا کر، تو اکیلا سو گیا

اے علمبردارِ قومی، اے نقیب اتحاد
ذات تھی تیری یقیناً نامرادوں کی مراد

بادشاہِ وقت ہو یا بے سروساماں گدا
ہر کس وناکس کے حق میں تو سراپا عجز تھا

اے روایات کہن کے پاسدارو پاسباں
رہنمائے قوم و ملت، اے " امیر کارواں"

نیم جاں ہے ہر کوئی اس صدمہ ٔ جانکاہ سے
یہ دعائے صابر محزون ہے اللہ سے
تیری تربت نور سے بھردے الہ العٰلمین
دوڑ کر آئے قدم بوسی کو فردوس بریں

☆☆☆☆☆☆☆☆

شاهنامه نذرانه عقیدت

۱۹۹۲ء

فردوس مکان مولانا حبیب الرحمن الاعظمی

۱۹۹۲ء

حبیب رحمٰں ادیب ذیشاں خطیب دوراں نقیب خوباں ۔ عظیم اک انجمن تھا تنہا عجیب اک دیدہ ور تھا انساں
امیر ہند اور رکن دارالعلوم و رکن جمعیۃ علماء ۔ جلالت علم کا تھا دارالعلوم خود آپ کا ثنا خواں
بہت سے گذرے جہاں میں خوباں بہت سے پیدا ہوئے ہیں تاباں ۔ مگر ادا تھی تری نرالی ہر ایک سے تھی دگر تری شاں
اویس قرنی حسن زبصرہ کبھی ہوئے بایزید پیدا ۔ بہت سے قرنوں کے بعد ہوتا ہے کوئی پیدا حبیب رحمٰں
تو اک امیر المفسریں تھا تو اک رئیس المحدثیں تھا ۔ امیر ہند اور تاج علما تو ایک تھا نکتہ سنج عرفاں
مصنف اور اک عظیم ناقد رجال کے فن کا ایک ماہر ۔ معلم وواعظ ومناظر عظیم مفتی فقیہِ دوراں
کوئی مفسر کوئی محدث کوئی مصنف، کوئی مناظر ۔ کوئی ہے مفتی کوئی ہے واعظ تو جامع کل ہے شاہ خوباں
مصنف ومسند حمیدی کتاب زہد ورقائق ایسی ۔ حدیث کی اور بھی کتابیں ہیں تیری تعلیق سے درخشاں
تری تصانیف اور تعلیق اور تحقیق سب بلند ہیں ۔ ہیں تین درجن سے بھی زیادہ تری تصانیف گوہر افشاں
فقط تعلم تھا اور تعلیم اور تصنیف شغل تیرا ۔ رواں تھا ستر برس سے تیرا عظیم درس حدیث و قرآں
تری چٹائی کی ہے وہ رفعت کہ تخت طاؤس بھی خجل ہے ۔ بکھیرے جس پر حدیث و قرآن کے جواہر بحد امکاں
ترے تفقہ ترے تعمق پہ خود ہیں شاہد تری کتابیں ۔ تو ایسا علامۂ زماں تھا عرب ثناخواں عجم ہے نازاں
حریم قدسیاں کے رونق فزا کبھی دیکھ ادھر پلٹ کر ۔ فراق میں تیرے قلب گریاں نگاہیں کتنی ہیں خون افشاں
خلا ہوا تجھ سے ایسا پیدا جو پُر بظاہر نہ ہوسکے گا ۔ کہ رفع علماء نے حق تعالیٰ کرے گا یوں رفع علم و عرفاں
نہیں اترتا ہے کوئی دل میں نگاہ جمتی نہیں کسی پر ۔ کہیں بھی ثانی ترا ہے کوئی بتا ذرا تو ہی چرخ دوراں
یقین آیا یہ تیری رحلت سے موت عالم ہے موت عالم ۔ لحد منور تری ہو جس پر ہو رحمت حق مدام باراں
ہے مارچ سولہ، سنہ ہے انیس سو بانوے عیسوی میں رحلت ۔ سنہ وہ ہجری ہے چودہ سو بارہ وقت مغرب ہے دسویں رمضاں
ولادت "اختر حسن" تراشد، وفات "نعمان اختر" آمد ۔ گذشت عمر تو در "محامد" بیاں محاسن کند چہ عثماں

۱۳۱۹ھ ۔ ۱۴۱۲ھ ۔ ۹۲

بقلم عاجز محمد عثمان معروفی

۱۴۱۲ھ

قطعہ تواریخی

۱۴۱۲ھ

مولانا محمد عثمان معروفی

امیر الہند ہم کو چھوڑ کر خلد بریں پہونچا
مسائل اپنے ہم پیچیدہ حل کرنے کہاں جائیں
حدیث و فقہ کا اک وہ امام عصر تھا بیشک
ہم اسرار و رموز دیں سمجھنے اب کہاں جائیں
امام فن اسماء الرجال اک تھا زمانہ میں
روایات و سند کی گتھی سلجھانے کہاں جائیں
حبیب ما نقیب ما ادیب ما خطیب ما
ترا ثانی بتادے ڈھونڈھنے اب ہم کہاں جائیں
یقیناً ذات اقدس تیری ایک شمع فروزاں تھی
بتادے اب اندھیرے میں یہ پروانے کہاں جائیں
غم و رنج والم کی چھاگئیں تاریکیاں ہر سو
جگر کے داغ دل کے زخم دکھلانے کہاں جائیں
تری رحلت یقیناً موت عالم موت عالم ہے
بہر سو قلب گریاں چشم پر نم ہیں کہاں جائیں
شروع جوں ہی ہوا ہے مغفرت کا عشرۂ رمضاں
تری روح مبارک نے کہا خلد مکاں جائیں
گیارہ ماہ رمضان المبارک چودہ سو بارہ
جنازہ زیب دوش عشق ہے، عاشق کہاں جائیں
سنہ انیس سو اور بانوے ہے مارچ سترہ کو
سپرد خاک تجھ کو کرکے حیراں ہیں کہاں جائیں
جنازہ میں مئو دولاکھ روزہ دار امنڈ آئے
وہ نورانی مناظر دیکھنے عثماں کہاں جائیں
امیر الہند جنت میں، عجب اعزاز روز افزوں
فرشتے ڈھونڈھنے حسن عمل تجھ سا کہاں جائیں

۱۴۱۲ھ — ۱۹۹۲ء

ولادت ہے تری اختر حسن (۱۳۱۹)، رحلت ظفر پیکر (۱۴۱۲)
محامد (۹۳) میں تری کل عمر تابندہ عیاں پائیں

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
چمن میں دیدہ ور تجھ سا کوئی پانے کہاں جائیں
مواعظ دل نشیں کانوں میں اب تک گونجتے ہیں وہ
تری تقریر پر تاثیر سننے اب کہاں جائیں
مؤلف اور مدرس تو، مبلغ اور واعظ تو
بتادے تجھ سا شیخ عصر ہے کوئی کہاں جائیں
محدث اور مفسر تو، مصنف اور مناظر تو
ترے اوصاف اعلی دیکھنے اب ہم کہاں جائیں
ہماری عید کا بھی خون رحلت نے کیا تیری
ہلال عید کی تصدیق کرنے اب کہاں جائیں

صنعت مربع باامیر الہند امام دیں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب

۱ ۹ ۹ ۲ء

	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	
۱۹۹۲	رہبر	لائق	سرور	فائق	سلطاں	صادق	عارف	کامل	۱۹۹۲
۱۹۹۲	لائق	سرور	فائق	سلطاں	صادق	عارف	کامل	رہبر	۱۹۹۲
۱۹۹۲	سرور	فائق	سلطاں	صادق	عارف	کامل	رہبر	لائق	۱۹۹۲
۱۹۹۲	فائق	سلطاں	صادق	عارف	کامل	رہبر	لائق	سرور	۱۹۹۲
۱۹۹۲	سلطاں	صادق	عارف	کامل	رہبر	لائق	سرور	فائق	۱۹۹۲
۱۹۹۲	صادق	عارف	کامل	رہبر	لائق	سرور	فائق	سلطاں	۱۹۹۲
۱۹۹۲	عارف	کامل	رہبر	لائق	سرور	فائق	سلطاں	صادق	۱۹۹۲
۱۹۹۲	کامل	رہبر	لائق	سرور	فائق	سلطاں	صادق	عارف	۱۹۹۲
	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	

بقلم راست محمد عثمان معروفی

۱۹۹۲ء

یہ مصرعہ چاروں طرف سے پڑھا جاسکتا ہے، اور ہر طرف سے سال رحلت ۱۹۹۲ء برآمد کیا جاسکتا ہے۔

نمونہ لوح تواریخ

۱۴۱۲ھ

نحمد الواحد الجلیل العظیم و نصلی علی النبی الکریم

۱۹۹۲ء

بیادگار عزیز جہاں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی

۱۹۹۲ء

تذکرہ ایزد آگاہ حقائق و معارف
۱۹۹۲ء

ادب آگاہ فکر و نظر عالی معارف
۱۹۹۲ء

مدیح ابو المآثر مولانا اعظمی
۱۹۹۲ء

آہ محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن رحمہ الحی
۱۴۱۲ھ

آہ مرجع علما مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی
۱۹۹۲ء

امیر الہند محدث کبیر حبیب دارین مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
۱۹۹۲ء

ایزد آگاہ امیر الہند مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی
۱۹۹۲ء

رکن بے باک مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند
۱۴۱۲ھ

عالی نگاہ امیر الہند ورکن رکین جمعیۃ علماء ہند
۱۴۱۲ھ

حق گو مہتمم وصدر المدرسین و بانی مرقاۃ العلوم مئو
۱۹۹۲ء

واحد سلطان عصر شیخ الحدیث
۱۹۹۲ء

زیبا معلم غریب
۱۴۱۲ھ

نور مرقدہ القادر العظیم
۱۹۹۲ء

غفر لہ الوکیل
۱۴۱۲ھ

برد مضجعہ المحصی الحکیم
۱۴۱۲ھ

اعوذ باللہ السمیع المنان من الشیطٰن الرجیم
۱۹۹۲ء

بسم اللہ الوھاب المقیت الرحمٰن الرحیم
۱۴۱۲ھ

قال القدوس الوالی، فھو فی عیشۃ راضیۃ
۱۹۹۲ء

ھو اھل التقویٰ واھل المغفرۃ
۱۹۹۲ء

قال الباسط، سقاھم ربھم شرابا طھورا
۱۴۱۲ھ

قال الجلیل الجامع، سلام علیکم ادخلوا الجنۃ
۱۴۱۲ھ

آوازۂ، ادخلوا الجنۃ انتم وازواجکم تحبرون

۱۹۹۲ء

المطلوب، ان المتقین فی ظلل وعیون

۱۹۹۲ء

قال حبیب اللہ الولی الحمید، الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب

۱۴۱۲ھ

ان العزیز العلیم یرفع العلم برفع العلماء

۱۴۱۲ھ

موت عالم المسکون موت العالم

۱۴۱۲ھ

لما کان قیس ھلکہ ھلک واحد ولکنہ جدران قوم تھدما

۱۴۱۲ھ

آہ بزم علم وفضل کی شمع فروزاں سوگئی

۱۹۹۲ء

ہائے غم بحر علوم، مشغول الہ، ظفر پیکر

۱۴۱۲ھ ۱۴۱۲ھ ۱۴۱۲ھ

آہ راہ حق کا سابق راہنما جاتا رہا

۱۹۹۲ء

کارواں بیدم، امیر قافلہ جاتا رہا

۱۹۹۲ء

روئے گل سیر ندیدیم کہ آخر بہار شد

۱۹۹۲ء

برخاک پاک اومدام ابر سلامتی شود

۱۹۹۲ء

از فکر پاکیزہ محمد عثمان معروفی

۱۴۱۲ھ

باراد محمد عثمان اعظمی

۱۹۹۲ء

فہرستِ مراجع

فہرست مراجع

	کتاب	مصنف	طابع وناشر
۱۔	ابطال عزاداری	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ	ماہنامہ الداعی۔ جمادی الآخرہ تا رمضان ۱۳۶۱ھ
۲۔	اثر انصاری فکر وفن کے آئینے میں	ایم نسیم اعظمی	نکھار پبلیکیشنز مئو ۱۹۸۸ء
۳۔	أثر الحديث فى اختلاف الفقهاء والمحدثين	الشیخ محمد عوامہ	دار السلام، القاهرة ۔ ۱۴۰۷ھ ۱۹۸۷ء طبع دوم
۴۔	الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان	علی بن بلبان الفارسی، تحقیق: شعیب الارنؤوط	موسسۃ الرسالہ ۱۴۱۸ھ ۱۹۹۷ء طبع سوم
۵۔	احکام النذر لاولیاء اللہ	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ	ماہنامہ الفرقان شوال وذیقعدہ ۱۳۵۸ھ
۶۔	ارشاد الثقلین	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ	الداعی ۔ رمضان تا ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ
۷۔	الازہار المربوعہ	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ	
۸۔	اسرار المحبۃ	شاہ رفیع الدین دہلوی تقدیم: مولانا عبدالحمید سواتی	مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ، طبع اول
۹۔	الاصابۃ	حافظ ابن حجر عسقلانی	مطبعۃ السعادۃ، مصر۔ ۱۳۲۸ھ طبع اول
۱۰۔	الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعہ	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ	
۱۱۔	اعیان الحجاج	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	مکتبۂ اعظمی مئو (اعظم گڈھ)
۱۲۔	أغاليط المؤرخين	الدکتور محمد ابوالیسر عابدین	دمشق ۱۳۹۱ھ م ۱۹۷۲ء
۱۳۔	اقبال سہیل، حیات اور شاعری	ڈاکٹر منور انجم	۱۹۹۵ء

۱۴۔	الالبانی شذوذه واخطاوه	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	دار العروبة، کویت۔ ۱۴۰۴ھ م ۱۹۸۴ء
۱۵۔	الامام الربانی الزاهد عبد الله بن المبارک	الدکتور عبد الحلیم محمود	دار التراث العربی، القاہرہ
۱۶۔	امداد الفتاح باسانید ومرویات الشیخ عبد الفتاح	محمد بن عبد الله آل رشید	مکتبة الامام الشافعی، الریاض۔ ۱۴۱۹ھ ۱۹۹۹ء
۱۷۔	انتقاء الترغیب والترهیب	حافظ ابن حجر عسقلانی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	احیاء المعارف، مالیگاؤں ۱۳۸۰ھ ۱۹۶۰ء
۱۸۔	اہل دل کی دلآویز باتیں	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	معارف پریس، اعظم گڈھ ۱۳۶۰ھ
۱۹۔	پرانے چراغ	مولانا ابوالحسن علی ندوی	مکتبۂ فردوس لکھنؤ
۲۰۔	تاریخ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل	مولانا فضل الرحمٰن اعظمی	جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ۱۴۰۵ھ
۲۱۔	تاریخ دار العلوم دیوبند	سید محبوب رضوی	دار العلوم دیوبند ۱۴۱۴ھ ۱۹۹۳ء طبع دوم
۲۲۔	تاریخ ندوۃ العلماء	مولوی اسحاق جلیس ندوی، مولوی شمس تبریز خان	ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔ ۱۴۰۳ھ ۱۹۸۳ء طبع اول
۲۳۔	تحقیق اہل حدیث	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	
۲۴۔	تذکرۂ علماء اعظم گڈھ	مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی	جامعہ اسلامیہ بنارس ۱۳۹۶ھ ۱۹۷۶ء
۲۵۔	تذکرۂ علماء حال	مولانا محمد ادریس نگرامی	منشی نولکشور، لکھنؤ۔ ۱۸۹۷ء
۲۶۔	تذکرۂ مصلح الامت	مولانا محمد قمر الزماں	دائرۃ المعارف، الہ آباد۔ ۱۹۸۴ء طبع اول
۲۷۔	تذکرۂ مولانا عبد اللطیف نعمانی	ترتیب: مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی	مفتاح العلوم مئو (اعظم گڈھ) ۱۳۹۳ھ ۱۹۷۴ء

۲۸۔	تعزیہ داری و دیگر مراسم عزاداری سنی نقطۂ نظر سے	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	الفرقان۔ ربیع الاول تا جمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ
۲۹۔	تکمیل الاذہان	شاہ رفیع الدین دہلوی تقدیم: مولانا عبدالحمید سواتی	مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ
۳۰۔	تلخیص خواتم جامع الاصول	شیخ محمد طاہر پٹنی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ	علمی پریس مالیگاؤں
۳۱۔	تنبیہ الکاذبین	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	النجم ۱۳۵۲ھ
۳۲۔	التنقید السدید علی التفسیر الجدید	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	النجم ۱۳۴۹ھ
۳۳۔	الحاوی لرجال الطحاوی	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	غیر مطبوعہ
۳۴۔	حجۃ اللہ البالغۃ	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	کتب خانہ رشیدیہ۔ دہلی
۳۵۔	الحماسۃ البصریۃ	احمد بن عبدالسلام الجراوی۔ تحقیق: الدکتور محمد رضوان الدایۃ	دار الفکر المعاصر، بیروت۔ ۱۴۲۱ھ ۱۹۹۱ء طبع اول
۳۶۔	حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	دار المصنفین اعظم گڈھ ۱۳۹۳ھ ۱۹۷۳ء
۳۷۔	حیات شبلی	سید سلیمان ندوی	دار المصنفین اعظم گڈھ
۳۸۔	دستکار اہل شرف	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ	مکتبۂ اعظمی، مئو۔ ۱۴۰۶ھ ۱۹۸۵ء
۳۹۔	دفع المجادلہ	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	عمدۃ المطابع، لکھنؤ
۴۰۔	دمغ الباطل	شاہ رفیع الدین دہلوی	مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ۱۹۷۶ء
۴۱۔	ذکریات	شیخ علی طنطاوی	دار المنارۃ، جدہ۔ ۱۴۰۵ھ ۱۹۸۵ء طبع اول
۴۲۔	رحلۃ ابن بطوطہ	ابن بطوطہ	المطبعۃ الازہریۃ، مصر ۱۳۴۶ھ ۱۹۲۸ء طبع اول
۴۳۔	رکعات تراویح	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	

۴۴۔	الرفع والتکمیل	مولانا عبد الحی فرنگی محلی، تحقیق: الشیخ عبدالفتاح ابو غدہ	بیروت طبع دوم ۱۳۸۸ھ ۱۹۶۸ء طبع سوم ۱۴۰۷ھ ۱۹۸۷ء
۴۵۔	رکعات تراویح مذیل برد انوار مصابیح	مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی	تنویر پریس لکھنؤ ۱۳۷۹ء م ۱۹۶۰ء
۴۶۔	روداد مدرسہ دار العلوم مئو		
۴۷۔	روداد مدرسہ مفتاح العلوم مئو		
۴۸۔	رہبر حجاج	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	
۴۹۔	کتاب الزھد والرقائق	عبداللہ بن المبارک، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	مجلس احیاء المعارف، مالیگاؤں ۱۳۸۵ھ ۱۹۶۶ء
۵۰	کتاب السنن	سعید بن منصور، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	مجلس علمی، ڈابھیل۔ ۱۳۸۷ھ ۱۹۶۷ء
۵۱	شارع حقیقی	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ	الفرقان، جمادی الاولی تا ذی الحجہ ۱۳۵۷ء
۵۲۔	الشہید فی الاسلام	شیخ حسن خالد	دار العلم، بیروت ۱۹۷۱ء طبع اول
۵۳۔	صدیق اکبر	مولانا سعید احمد اکبر آبادی	ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۳۸۱ھ ۱۹۶۱ء طبع دوم
۵۴۔	عثمان ذوالنورین	مولانا سعید احمد اکبر آبادی	ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۴۰۴ھ ۱۹۸۳ء طبع اول
۵۵۔	العلماء العزاب	الشیخ عبدالفتاح ابو غدہ	حلب ۱۴۰۲ھ، ۱۹۸۲ء طبع اول
۵۶۔	فتح المغیث	شمس الدین سخاوی: تحقیق مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	مکتبۃ الاعظمی، مئو (اعظم گڈھ)
۵۷۔	فقہ اھل العراق وحدیثھم	العلامہ محمد زاہد الکوثری۔ تحقیق: الشیخ عبدالفتاح ابو غدہ	بیروت ۱۳۹۰ھ ۱۹۷۰ء طبع اول

۵۸۔	کاروان رفتہ	مولانا نظام الدین اسیر ادروی	دارالعلوم، حیدر آباد ۱۴۱۵ھ ۱۹۹۴ء
۵۹۔	کشف الاستار	نور الدین الھیثمی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	موسسۃ الرسالۃ، دمشق۔ ۱۳۹۹ھ ۱۹۷۹ء
۶۰	مجمع بحار الانوار	علامہ محمد طاہر پٹنی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	مجلس دائرۃ المعارف النعمانیہ، حیدر آباد
۶۱۔	مسند الامام أحمد بن حنبل	شرح احمد محمد شاکر	دار المعارف، مصر۔ ۱۹۷۴ء
۶۲۔	مسند الحمیدی	عبداللہ بن الزبیر الحمیدی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	مجلس علمی ڈابھیل۔ ۱۳۸۲ھ، ۱۹۶۳ء
۶۳۔	مشاہیر پورہ معروف	مولانا محمد عثمان معروفی	نیشنل آرٹ پریس۔ الہ آباد
۶۴۔	مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے	مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی	قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی۔ ۱۹۹۷ء
۶۵۔	المصنف	ابو بکر بن ابی شیبہ، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	المکتبۃ الامدادیہ، مکہ مکرمہ ۱۴۰۳ھ ۱۹۸۳ء
۶۶۔	المطالب العالیہ	حافظ ابن حجر عسقلانی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	وزارۃ الاوقاف، کویت۔ ۱۳۹۰ھ ۱۹۷۰ء
۶۷۔	معرفۃ الصحابۃ	ابو نعیم الاصبہانی، تحقیق: عادل بن یوسف العزازی	دار الوطن، الریاض۔ ۱۴۱۹ھ ۱۹۹۸ء طبع اول
۶۸۔	مفتاحی ڈائری		
۶۹	مکتوبات سلیمانی	عبدالماجد دریابادی	صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ ۱۹۶۲ء
۷۰۔	منیۃ الالمعی	علامہ قاسم بن قطلوبغا، تحقیق: محمد زاہد الکوثری	مطبعۃ السعادۃ، مصر۔ ۱۳۵۹ھ م ۱۹۵۰ء
۷۱۔	مولانا رشید احمد گنگوہی، حیات اور کارنامے	مولانا نظام الدین اسیر ادروی	شیخ الہند اکیڈمی، دیوبند۔ ۱۴۱۸ھ ۱۹۹۷ء طبع اول
۷۲	مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے	مولانا نظام الدین اسیر ادروی	// // // // ۱۴۱۶ھ ۱۹۹۵ء // //

رسائل و مجلات

۱۔ ارشاد	(پندرہ روزہ)	امرتسر
۲۔ الاضواء		مالیگاؤں
۳۔ انقلاب	(روزنامہ)	بمبئی
۴۔ برہان	(ماہنامہ)	دہلی
۵۔ البعث الاسلامی	(ماہنامہ)	لکھنؤ
۶۔ البلاغ	(ماہنامہ)	بمبئی
۷۔ ترجمان الاسلام	(سہ ماہی)	بنارس
۸۔ ترجمان دار العلوم	(ماہنامہ)	دہلی
۹۔ تجلی	(ماہنامہ)	دیوبند
۱۰۔ الجمعیۃ		دہلی
۱۱۔ جمہوریت	(روزنامہ)	بمبئی
۱۲۔ الحج	(ماہنامہ)	مکہ مکرمہ
۱۳۔ دار العلوم	(ماہنامہ)	دیوبند
۱۴۔ الداعی	(ماہنامہ)	لکھنؤ
۱۵۔ دعوۃ الحق	(سہ ماہی)	دیوبند
۱۶۔ ریاض الجنۃ	(ماہنامہ)	جونپور
۱۷۔ صدق جدید	(ہفت روزہ)	لکھنؤ
۱۸۔ ضیاء الاسلام	(پندرہ روزہ)	امرتسر
۱۹۔ العدل	(ہفت روزہ)	گوجرانوالہ

۲۰۔ الفرقان	(ماہنامہ)	بریلی۔ لکھنؤ
۲۱۔ الفقیہ	(ہفت روزہ)	امرتسر
۲۲۔ الفیض	(•)	امرتسر
۲۳۔ القاسم	(پندرہ روزہ)	امرتسر
۲۴۔ المآثر	(سہ ماہی)	مئو
۲۵۔ مجلۃ المجمع العلمی العربی	(سہ ماہی)	دمشق
۲۶۔ المسلمون	(ماہنامہ)	جنیوا (سوئٹزرلینڈ)
۲۷۔ معارف	(ماہنامہ)	اعظم گڈھ
۲۸۔ المومن	(ماہنامہ)	کلکتہ
۲۹۔ النجم	(ماہنامہ)	لکھنؤ

علامہ اعظمی نے فرمایا

مولانا! اگر یہ صحیح ہے کہ "فوری طور پر کوئی اجتماعی قدم نہ اٹھایا گیا تو سمجھ دار (ہر نئی رو میں بہنے والا؟) طبقہ مذہب سے مایوس ہو جائے گا" تو اسی کے ساتھ اس کا خطرہ بھی کچھ کم نہیں ہے کہ اجتماعی قدم اٹھانے کے جو نمونے سامنے آرہے ہیں، وہ یقین دلا رہے ہیں کہ شریعت حقہ کا کوئی جز بھی اپنی اصلی حالت پر باقی نہ رہے گا، حتی کہ محرمات قطعیہ کو بھی الضرورات تبیح المحظورات کے اصول پر مباح بنانے کی گنجائش نکالی جائے گی، کیا آپ کو اس کا اندیشہ نہیں ہے؟

المآثر ج ۳ ش ۲ ص ۱۲۔۱۱

تاثرات

کلمات تشکر وامتنان

<u>از: جگر گوشۂ محدث کبیرؒ حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی دامت برکاتھم</u>

الحمد للہ و کفی، و سلام علی عبادہ الذین اصطفی، و بعد!

اب سے تقریباً دس سال پہلے والد مرحوم محدث جلیل حضرت مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی نوّر اللہ مرقدہ کی سوانح عمری ''حیات ابوالمآثر'' شائع ہوئی تھی، وہ حضرت کی سوانح کا پہلا حصہ تھا، جو صرف زندگی کے حالات وواقعات پر مشتمل تھا، علمی کارناموں کا تذکرہ یا تعارف اس قدر مختصر یا اجمالی تھا کہ نہ ہونے کے برابر تھا، جبکہ حضرت کی زندگی کا یہی پہلو سب سے اہم اور روشن وتابناک تھا؛ اس کی وجہ یہ تھی کہ کتاب کے مرتّب عزیزی ڈاکٹر مسعود احمد سلّمہ کا ارادہ حضرت والد مرحوم کے علمی کارناموں کے تعارف وتلخیص پر مشتمل ایک مستقل جلد مرتّب کرنے کا تھا۔ انھوں نے اس کام کا آغاز تو پہلے حصے سے فراغت اور اس کی اشاعت کے بعد ہی کر دیا تھا، لیکن کام چونکہ غیر معمولی طویل تھا، اور طویل ہونے سے زیادہ مشکل تھا، اس لیے اس کو انجام دینے اور پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں پوری ایک دہائی صرف ہوگئی، اس دوران بعض احباب اور علم دوست حضرات کی طرف سے اس دوسری جلد کے لیے ہم کو تقاضے بھی سننے پڑے۔ اس کے لیے تشنگان علم کو جو کلفت برداشت کرنی پڑی اس کا ہم کو شدت سے احساس ہے۔

اب جب کہ یہ جلد بھی تیار ہوگئی، تو اس کے مرتب نے مجھ سے اس کا ابتدائیہ لکھنے کی تمنا ظاہر کی، ان کی اس طلب پر میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ ایک ضروری چیز بھی ہے، لیکن اپنے قلب ودماغ کو ٹٹولا تو سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا لکھوں، اور سب سے مشکل یہ کہ اب کچھ لکھنے لکھانے کی عادت نہیں رہی۔ میں اسی حیص بیص میں تھا کہ اچانک اُس تحریر کا خیال آیا جو ہمارے فاضل دوست اور حضرت والد مرحوم کے والہ وشیدا محبّ مکرم مولانا محمد یحییٰ صاحب ندوی نے اسی جلد کے لیے سپرد قلم کی ہے، مولانا موصوف کی اس تحریر نے دل میں تحریک پیدا کی اور سوچا کہ اسی کو مزید توسیع دے کر ناظرین کے لیے کچھ اور واقعات کا اضافہ کردوں، باوجودیکہ احقر کی یادداشت اب بہت کم زور ہوگئی ہے، پھر بھی اس میں دبی ہوئی چنگاریوں کو کریدنے کی کوشش کی، تو کچھ واقعات دل ودماغ کی سطح پر ابھرنے لگے، جن کو ذیل میں قلم بند کیا جارہا ہے، یہ تو صرف چند واقعات ہیں جو اس فرصت میں یاد آگئے ہیں، ورنہ والد مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ اتنا بیش قیمت اور باعث درس ونصیحت تھا کہ اس کو قلم بند کرکے رہروان علم ومعرفت کے لیے نمونہ بنایا جاتا۔

....

ہم نے جس گھر میں آنکھیں کھولی ہیں اور نشو ونما پائی ہے، اس کا ماحول الحمد للہ خالص علمی اور دینی تھا۔

دادا مرحوم حضرت مولانا محمد صابر صاحب ایک عالم وفاضل اور صاحب نسبت بزرگ تھے، خالص علمی ودینی مزاج رکھتے تھے، دینی امور میں بہت سخت تھے، نہ صرف عبادات بلکہ معاملات میں بھی شرعی احکام سے سر مو تجاوز کرنا پسند نہیں کرتے تھے، اپنی دینداری اور تقوی وپرہیزگاری کے ساتھ صاف ستھرا علمی وادبی ذوق بھی رکھتے تھے، چنانچہ ہمارے ہوش کی بات ہے کہ ایک مرتبہ ہندوستان کے مشہور اور صاحب طرز شاعر علامہ انور صابری مئو آئے، تو دادا مرحوم نے ان کے اعزاز میں ایک شعری نشست رکھی، جو ہمارے مکان سے تھوڑے فاصلے پر جنوب میں واقع ایک چھوٹے سے صحن میں منعقد ہوئی، اور دیر رات تک لوگ صابری صاحب کے کلام سے محظوظ ہوتے رہے۔ دادا مرحوم نے حضرت والد صاحب علیہ الرحمہ کی جو تعلیم وتربیت کی ہے، اس میں دینداری وپرہیزگاری، تقویٰ وطہارت، قناعت واستغنا، علم دوستی اور ادب نوازی جیسے تمام عناصر کی آمیزش ہے۔

....

والد صاحب کی تقریباً تمام عمر عسرت اور تنگ دستی میں گذری، جس کی وجہ سے اکثر وبیشتر سخت آزمائشوں سے دوچار رہے، اور زندگی میں بہت سے مواقع ایسے آئے کہ بس ایک قدم بڑھانے بلکہ ایک ''ہاں'' کردینے سے آپ کی حالت کچھ سے کچھ ہوجاتی، لیکن کبھی آپ نے علم کی دوکان کے ذریعے قناعت واستغنا کا سودا کرنا گوارا نہیں کیا: ع

ما آبروئے فقر وقناعت نمی بریم

اس سلسلے میں ایک واقعہ ذکر کردینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور شاگرد حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی ندوۃ المصنفین کی طرف سے 'ترجمان السنۃ' کی تصنیف وتالیف کا کام کررہے تھے، لیکن اس کام کی رفتار اتنی سست تھی کہ ارباب ندوۃ المصنفین کو اس کی تکمیل کے سلسلے میں برابر فکر لاحق تھی، اس صورتحال کے پیش نظر ندوۃ المصنفین کے اس وقت کے ناظم حضرت مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم نے حضرت والد صاحب سے درخواست کی کہ آپ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچادیں، اور اس کے لیے انھوں نے اس زمانے کے لحاظ سے ایک معقول حق الخدمت کی پیشکش کی، لیکن والد صاحب اپنے مشاغل اور خاص مزاج کی وجہ سے اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اسی اثنا میں والد مرحوم کے رفیق اور دوست حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمیؒ کسی کام کے لیے دہلی گئے، وہاں مولانا عثمانی صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی، تو مولانا عثمانی کہنے لگے کہ مولانا — یعنی حضرت والد مرحوم — کے پاس کھیت اور زمین جائداد وغیرہ بہت زیادہ ہے کیا؟! مولانا ایوب صاحب یہ سن کر مسکرائے اور دریافت کیا کہ بات کیا ہے؟ تو مولانا عثمانی نے 'ترجمان السنۃ' کے سلسلے کی پیشکش اور والد صاحب کی عدم آمادگی اور بے نیازی کا قصہ سنایا۔ اس پر مولانا محمد ایوب صاحبؒ نے فرمایا کہ رہائشی مکان کے علاوہ مولانا کے پاس کھیت اور جائداد کے نام پر ایک انچ زمین بھی نہیں ہے۔ یہ جواب سن کر مولانا عثمانی ورطۂ حیرت میں پڑ گئے کہ اس کے باوجود اتنی بڑی پیشکش کو رد کردیا! مولانا ایوب صاحب نے فرمایا کہ مولانا کا بس یہی

خاص مزاج ہے۔

....

دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور کا ایک بڑا دینی وتعلیمی ادارہ ہے۔۱۳۹۵ھ = ۱۹۷۵ء کی بات ہے کہ اس کا ختم بخاری اور دستار بندی کا جلسہ ہوا، اس کے منتظم سبیل الرشاد کے روح رواں، جنوبی ہند کے معروف عالم اور دارالعلوم دیوبند کی شوری کے رکن حضرت مولانا ابوالسعو د صاحب علیہ الرحمہ تھے۔ یہ ان کے مدرسے کا بہت بڑا اور تاریخی جلسۂ دستار بندی تھا، جس کے لیے انھوں نے بڑے پیمانے پر انتظامات کیے تھے، اور حضرت والد مرحوم کو بطور خاص مدعو کیا تھا، اس سفر میں یہ راقم بھی حضرت والد صاحب کے ساتھ تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ جیسے ہی جلسے کی کارروائی شروع ہونے کا وقت ہوا، سیاہ گھٹائیں اُمڈ کر آنے لگیں اور بارش شروع ہوگئی، اس صورتحال سے ارباب انتظام کے ہوش اڑ گئے، جس قدر گھنی اور کالی گھٹائیں تھیں ان کو دیکھ کر اندیشہ اور خوف تھا کہ جلسہ ناکام ہو کر رہ جائے گا۔ مولانا ابوالسعود صاحب نے حضرت والد صاحب سے لجاجت کے ساتھ اور گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا کہ حضرت! دعا فرما دیجئے کہ بارش کا سلسلہ رک جائے اور جلسہ کامیاب ہو جائے۔ والد صاحب نے فرمایا کہ آپ دعا کیجئے میں آمین کہتا ہوں۔ مولانا ابوالسعود صاحب نے **اللھم حوالینا ولا علینا** والی حدیث پڑھ کر دعا کی، والد صاحب اور ہم لوگوں نے آمین کہی، ہلکی پھلکی جو بارش ہو رہی تھی وہ رک گئی، بادل چھٹ گیا، اور شہریوں کی بڑی تعداد ٹوٹ کر جلسے میں شریک ہوئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے بعد شہر میں اس قدر بارش ہوئی تھی کہ پورا شہر جل تھل ہو گیا تھا۔

....

ایک دفعہ بنارس میں سیرت کا جلسہ ہوا، اس میں والد صاحب کے علاوہ حضرت مولانا ابوالوفا شاہجہاں پوری بھی بحیثیت مقرر شریک تھے، پہلے والد صاحب نے قرآن وحدیث کی روشنی میں سیرت نبوی پر ایک مختصر اور جامع تقریر کی، اس کے بعد مولانا ابوالوفا صاحب کا خطاب ہوا، پروگرام کے بعد مولانا ابوالوفا صاحب نے حضرت والد صاحب سے کہا کہ حضرت! آپ اپنی تقریر قلم بند کر کے مجھے دے دیجئے، وہ ایسا متن ہے کہ اس کی شرح میں کئی گھنٹے میں تقریر کروں گا، والد صاحب مسکرا کر رہ گئے، پھر مولانا شاہجہاں پوری نے مجھ سے فرمایا کہ حضرت کے پاس تو وقت نہیں رہتا، آپ ان سے کچھ خاص خاص باتیں لکھ کر میرے پاس روانہ کر دیجئے گا۔

....

۱۹۴۳ء میں مئو آئمہ الہ آباد کی جو مشہور احناف کانفرنس ہوئی تھی، اس میں احناف کے اس وقت کے بڑے بڑے جید علما شریک تھے۔ اس میں شرکت کے لیے مئو سے بھی کچھ لوگ گئے تھے، یہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا، اور میں بھی اس میں شریک ہوا تھا۔ اس کانفرنس میں جب والد صاحب اپنی اُس تقریر سے فارغ ہوئے، جس میں مولوی ابوالقاسم بنارسی کے خطبۂ صدارت کا تنقیدی جائزہ لیا گیا تھا — اور جو بعد میں 'تحقیق اہل حدیث' کے نام

سے شائع ہوتی رہی ہے- تو مولانا ابوالوفا صاحب نے والد صاحب کو گلے لگالیا اور کہا کہ مولانا! آپ نے احناف کی لاج رکھ لی ہے۔

....

حضرت والد صاحب سے ملاقات یا علمی تحقیق کے لیے ہندوستان کے بڑے بڑے باکمال اہل علم وفضل کی آمد ورفت رہا کرتی تھی، اور والد صاحب بقدر استطاعت ان کی خاطر مدارات کیا کرتے تھے۔ امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی علیہ الرحمہ اور علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ سے تو دیرینہ تعلقات تھے، ان میں سے موخر الذکر بزرگ تو بہ کثرت تشریف لایا کرتے تھے، ان کے علاوہ ہندوستان کے اور بھی بہت سے دیگر علما اور بزرگان دین خاص خاص موقعوں پر یا علمی اشکالات کو حل کرنے کے لیے تشریف لایا کرتے تھے، کبھی کبھی علماء عرب بھی اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کے لیے اس دورافتادہ مقام کا سفر کرتے، جن میں قابل ذکر شخصیت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ علیہ الرحمہ کی ہے، جنھوں نے تین مرتبہ مئو کی سرزمین کو اپنی تشریف آوری سے مشرف فرمایا ہے۔

ہندوستانی اہل علم میں ایک حضرت مولانا محمد تقی امینی مرحوم تھے، پہلے ندوۃ العلما لکھنؤ کی مجلس تحقیقات شرعیہ میں تھے، جہاں وہ فقہی مسائل کی تحقیق کے لیے رکھے گئے تھے، بعد میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے اہم عہدے پر فائز ہو گئے تھے۔ انھوں نے ندوہ میں قیام کے زمانے میں بیمہ پر اپنا مقالہ لکھا تھا، اس پر والد صاحب سے نظر ثانی کرانے کے لیے مئو آئے، اور رات کو یہیں قیام کیا۔ اس وقت حضرت والد صاحب نے تھوڑا سا قطعۂ اراضی خرید کر چند کمروں کا ایک مکان تعمیر کروالیا تھا- جس میں اب میرے چھوٹے بھائی حاجی سعید احمد سلمہ رہتے ہیں- والد صاحب اس وقت اسی مکان میں منتقل ہو چکے تھے۔ جب رات ہوئی تو مجھ سے فرمایا کہ لے جاؤ مولانا تقی امینی کو کھانا کھلا کر ان کے سونے کا انتظام کردو۔ میں ان کو لے کر پرانے مکان پر چلا آیا، مولانا امینی جب کھانے سے فارغ ہو چکے تو مجھ سے فرمایا کہ یہ بتلاؤ کہ مولانا کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟ یہ تو جانتا ہوں کہ شیخ الحدیث ہیں اور حدیث میں مہارت حاصل ہے، مگر خاص امتیاز کیا ہے؟ یہ میں جاننا چاہتا ہوں۔ ان کا یہ سوال اتنا اچانک تھا کہ مجھے کوئی جواب نہیں سمجھ میں آرہا تھا، اتفاق کی بات کہ اس وقت میرے پاس مشہور محدث علی ابن المدینی کی کتاب 'العلل' رکھی ہوئی تھی، جو ہمارے شہر کے معروف عالم ومحقق ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی کی تحقیق سے شائع ہوئی تھی، اس پر والد صاحب کے بہت سے استدراکات وحواشی ہیں۔ میں نے مولانا امینی سے عرض کیا کہ اگر آپ والد صاحب کی خصوصیات معلوم کرنا چاہتے ہیں، تو یہ ایک پتلی سی کتاب ہے، پہلے آپ اس کو والد صاحب کے استدراکات پر نگاہ ڈالے بغیر پڑھ جایئے، پھر والد صاحب کے استدراکات پڑھیے، خصوصیات خود ہی سمجھ جائیں گے، چنانچہ اس کو مولانا نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا، اور پڑھنے کے بعد دم بخود رہ گئے، جب اگلی صبح والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں تو عرض کیا کہ حضرت! مولوی رشید احمد نے رات مجھے ایسی چیز دکھلائی کہ میں رات بھر تعجب کرتا رہا۔

فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی علیہ الرحمہ کا جب بھی مئو کے قرب وجوار سے گذر ہوتا، تو تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی حضرت والد صاحب کی خدمت میں مئو ضرور حاضری دیتے۔ ایک دفعہ کسی ٹرین سے مئو اسٹیشن پر تن تنہا اترے، اور رکشہ کر کے بالکل تنہا والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، کچھ دیر تک بعض اہم مسائل پر ضروری گفتگو کی، اس کے بعد والد صاحب نے مجھے ان کو ناشتہ وغیرہ کرانے کا حکم دیا، مولانا جب ملاقات سے فارغ ہو کر واپس جانے لگے، تو میں نے کہا کہ ساتھ چل کر اسٹیشن چھوڑ دوں، مگر وہ اس کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہوئے اور کہا کہ میں تنہا جاؤں گا تو یہاں کے عام لوگ پہچان نہ سکیں گے، اور جب آپ ساتھ ہوں گے تو لوگوں کی نگاہ پڑے گی۔ پھر مولانا رکشے سے تنہا اسٹیشن گئے، اور میری طبیعت نہیں مانی تو دوسرے رکشے سے پیچھے سے اسٹیشن پہنچا اور ان کو گاڑی پر سوار کر کے واپس آیا۔

کچھ باتیں درس ومطالعہ کے متعلق:

کتابیں حضرت والد صاحب کی سب سے قیمتی اور متاع تھیں، آپ نے اپنی پوری زندگی مطالعہ اور کتب بینی میں صرف کر دی، اس کے باوجود آپ کی علمی تشنگی دور نہیں ہوئی، کئی کئی جلدوں پر مشتمل ضخیم کتابیں بالاستیعاب پڑھ جاتے تھے، بلکہ کبھی ایسا ہوتا کہ ایک کتاب جو متعدد جلدوں میں ہوتی کئی کئی بار پڑھ جاتے تھے، حدیث وفقہ اور تذکرہ وتراجم کے ساتھ اگرچہ آپ کو خاص اشتغال تھا، لیکن مناسبت جملہ اسلامی علوم وفنون سے تھی، اور ہر فن کی کتابیں آپ کے زیر مطالعہ رہا کرتی تھیں، مگر آپ کا یہ شوق کبھی پورا ہوتا نہیں دکھائی دیتا تھا، بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مطالعہ کی کثرت کے ساتھ اس کی تڑپ بڑھتی جاتی تھی، اور عمر کے آخری حصے تک مطالعہ کی یہ لگن برقرار رہی۔

شوق مطالعہ اور ذوق تحقیق وجستجو ہی نے آپ کے مزاج کو یکسو اور عزلت نشین وخلوت پسند بنا دیا تھا۔ آپ دو زانو بیٹھ کر دونوں ہاتھوں کی کہنیوں کو زمین پر رکھ لیتے، اور دونوں ہتھیلیوں پر کتاب کو رکھ کر دیر دیر تک کتاب میں غرق رہتے، کتاب میں اس طرح گم اور کھوئے رہتے کہ معلوم ہوتا کہ دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوں۔ اس انداز سے بیٹھ کر مطالعہ کرنے کی وجہ سے دونوں کہنیاں دور تک ایک دم سیاہ اور کہنیوں کی کھال موٹی ہو گئی تھیں۔

مسند حمیدی کی تحقیق کے دوران مجھے جب تعلیقات کا املا کراتے، تو حدیث پڑھتے ہی فرماتے کہ فلاں کتاب کا فلاں باب کھول کر نکالو، یعنی ایسا کم ہوتا کہ مراجع کی کتابوں کو کھول کر پھر ان کے ابواب میں وہ حدیث تلاش کرنی پڑتی، اس سے اندازہ لگانا چاہئے کہ اس کی تحقیق والد صاحب نے زیادہ تر اپنی یادداشت کے بھروسے پر کیا ہے، اس وقت تک ابھی اطراف اور احادیث کی فہرست کی کتابیں شائع نہیں ہوئی تھیں۔

مخطوطات اور قلمی نسخوں کے مقابلہ اور تصحیح نصوص کا کام بہت مشکل ہوتا ہے، بسا اوقات ان نسخوں میں بہت سنگین قسم کی غلطیاں ہوتی ہیں، کہ اس میں صحیح لفظ تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے، کبھی ایسا ہوتا کہ جب مخطوطے میں کوئی ایسی غلطی ہوتی کہ صحیح لفظ تک رسائی نہ ہوتی اور مراجع سے بھی اس کی طرف رہنمائی نہ ہوتی، تو والد صاحب لیٹ

جاتے، اور ذہن پر زور دیتے، چند لمحے گزرتے کہ اٹھ کر بیٹھ جاتے اور فرماتے کہ یہاں صحیح لفظ یہ ہونا چاہئے۔

....

کتابی دنیا کے علاوہ ملکی وغیر ملکی نیز مقامی حالات پر بھی والد صاحب بھرپور نظر رکھتے تھے، اور آنے جانے والوں سے ان کے اور ان کے قصبے اور شہر کے حالات دریافت کرتے، روزانہ اخبار دیکھنے کی بھی آپ کی عادت تھی، جمعیۃ علماء ہند کا آرگن 'الجمعیۃ' تو آپ کے پاس پابندی سے آتا ہی تھا، اس کے علاوہ 'زمیندار' لاہور، 'مدینہ' بجنور- جو جنگ آزادی کے زمانے کے اہم اردو اخبارات تھے- آپ کے پاس آیا کرتے تھے، ملک کی آزادی کے بعد 'قومی مورچہ' بنارس، 'سیاست' کانپور، اور قومی آواز لکھنؤ وغیرہ بھی دیکھا کرتے تھے، صرف یہی نہیں آپ کے پاس ایک ریڈیو بھی ہمیشہ رہا کرتا تھا، جس پر دن میں ایک دو دفعہ ملکی وغیر ملکی خبر سن کر حالات کی واقفیت حاصل کرتے۔

عرض کرنے کا منشا یہ ہے کہ خالص علمی و دینی مزاج رکھنے اور علم وتحقیق کی دنیا کے عظیم ترین شناور اور شیدائی ہونے کے باوجود آپ نے دنیا کے حالات سے کبھی بھی بے اعتنائی اور چشم پوشی نہیں برتی، اور زہد وقناعت اور دنیا سے بے رغبتی کے باوجود دنیا کے حالات پر پوری طرح نظر رکھتے ہوئے اور آنکھ کھول کر زندگی گزاری۔

....

والد صاحب نے الحمد للہ بہت بڑا علمی وتحقیقی سرمایہ یادگار چھوڑا ہے، آپ کی تصانیف وتالیفات میں بہت سی ایسی ہیں جو طبع ہو کر علمی حلقوں سے داد تحسین وصول کر چکی ہیں، لیکن جتنی طبع ہو چکی ہیں ان سے زیادہ آپ کی تحقیقات وہ ہیں، جو زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکی ہیں، نیز کچھ ایسی تحریریں بھی تھیں جو حوادث زمانہ کا شکار ہو گئی ہیں۔ خواہر زادۂ عزیز ڈاکٹر مسعود احمد سلمہ نے اس جلد میں آپ کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں میں سے جو محفوظ ہیں، ان کا تعارف اور تلخیص کرنے کی ایک سعی بلیغ اور مسعود ومبارک کوشش کی ہے، یہ کام نہایت محنت طلب اور ہفت خوان طے کرنے کی طرح تھا، جو محض خدا کی توفیق اور اس کے فضل وکرم سے پورا ہوا ہے۔ خداوند کریم عزیز موصوف کو ان کی اس غیر معمولی محنت وکاوش اور عرق ریزی کا اجر جزیل عطا فرمائے، اور کتاب کو مقبول خاص وعام بنائے، آمین۔

(مولانا) رشید احمد الاعظمی

ہدیۂ تبریک وتہنئت

از:-حضرت مولانا سید محمد یحییٰ صاحب ندوی، سانہہ، بیگوسرائے، بہار

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

الحمد للہ و کفی، وسلام علی عبادہ الذین اصطفی.

عزیزم مولانا ڈاکٹر مسعود سلمہ الودود 'حیات ابوالمآثر' کی دوسری جلد کی تیاری میں ہیں، کتاب تقریباً تیار ہے، اور طباعت کا مرحلہ باقی ہے۔ ان کا اصرار ہے کہ حضرت مولانا الاعظمی پر تم اپنے تاثرات قلم بند کرو، میں انکار کرتا رہا کہ میری یہ بساط اور اوقات نہیں، مگر ان کا اصرار بڑھتا رہا، بالآخر ان کے شدید اصرار نے اس ناکارہ کو قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ سطور ذیل میں حضرت مولانا اعظمیؒ کی زندگی کے بعض ایسے گوشوں کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں، جو میرے مشاہدے میں آئے ہیں، اور اس وقت ذہن میں حاضر ہیں، ورنہ حضرت کے واسطے سے اتنی یادیں میرے حافظے میں موجود ومحفوظ ہیں، کہ ان سب کو قلم بند کرنا میرے لیے مشکل بھی ہے، اور طوالت کا باعث بھی۔

حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے میری نیازمندی کی ابتدا تقریباً ۵۵/ برس پیشتر ۱۹۵۵ء میں ہوئی، حضرت محدث الاعظمی کے عزیز اور وفادار شاگرد مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی فراغت کے بعد میرے گاؤں -سانہہ- میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے، مفتی صاحب حضرت محدث اعظمی کے گرویدہ اور شیفتہ ووارفتہ تھے، اور غایت عقیدت واحترام کے ساتھ اپنے مشفق اور عظیم استاذ حضرت اعظمی اور ان کے فضائل وکمالات کا اکثر وبیشتر ذکر کیا کرتے تھے، ان کی زبان سے حضرت اعظمی کے والہانہ تذکرے نے میرے دل میں غائبانہ عقیدت واحترام کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔

دریں اثنا ۱۹۵۵ء میں کلکتہ میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس عام منعقد ہوا، حضرت اعظمیؒ اس کی عاملہ کے رکن رکین اور میں مجلس منتظمہ کا ممبر تھا، اجلاس میں شرکت کے لیے مفتی صاحب کے ہمراہ میں بھی کلکتہ پہنچا، اس وقت تک مجھے حضرت اعظمی سے ملاقات وزیارت کا شرف نہیں حاصل ہوا تھا، حضرت اعظمی اجلاس میں شرکت کے لیے مئو سے اپنے دیرینہ رفیق مولانا عبداللطیف نعمانی مرحوم کے ہمراہ تشریف لے گئے تھے، وہیں پہلی دفعہ آپ کی زیارت سے بہرہ مند ہوا، مفتی ظفیر الدین صاحب نے میرا تعارف کرایا کہ حضرت مولانا گیلانی کے قریبی رشتہ دار اور ہمارے مدرسہ کے سکریٹری کے صاحبزادے ہیں۔

اسی دوران ایک روز حضرت کے ساتھ مولانا عبداللطیف، مفتی ظفیر الدین اور یہ خاکسار مولانا سعید احمد اکبرآبادی سے ملنے گئے، مولانا اکبرآبادی حضرت کے بے حد قدرداں تھے، اور حضرت اعظمی بھی ان سے بہت

بےتکلف تھے، مولانا اکبرآبادی نے آپ سے عرض کیا کہ مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقیؒ مدرسہ عالیہ کے صدر مدرس کے عہدے سے سبکدوش ہورہے ہیں، آپ اس منصب کو قبول فرمالیں، یہاں آپ کے ذوق کے مطابق ایشیاٹک سوسائٹی کا کتب خانہ ہے، جس میں بہت سے مخطوطات ونوادرات کا ذخیرہ ہے۔حضرت اعظمیؒ نے فرمایا کہ مولوی سعید! میں ملازمت نہ کرنے کا عہد کرچکا ہوں۔

مدرسہ عالیہ کی صدر مدرسی کوئی معمولی عہدہ نہیں تھا، منصب وجاہ اور دنیا سے حضرت مولانا اعظمی کی بے رغبتی وبے نیازی کا یہ پہلا نقش تھا، جو میرے لوحِ قلب پر مرتسم ہوگیا، اس کے بعد کا ہر نقش گہرا اور انمٹ ہوتا گیا، وہیں سے آپ کے ساتھ میرا ربط وتعلق قوی اور مضبوط ہوتا گیا، میری عقیدت اور ان کی شفقت ومحبت روز افزوں رہی، میں علمی مسائل ومشکلات میں ان کی طرف رجوع کرتا، وہ نہایت شفقت ومہربانی کے ساتھ جواب دیتے، میں ان کے فضیلت کدے پر حاضر ہوتا تو وہ اپنا مہمان بناتے اور باصرار ہفتوں روک لیتے، اور میں آپ کی مہمان نوازی، فیاضی اور منبع علمی وچشمہ صافی سے خوب فیض یاب ہوتا، حتی کہ آپ نے میرے غریب خانے پر تشریف آوری سے بھی مجھے عزت بخشی، اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کی شفقت ومحبت ہی نے مجھے قدرے جری اور بے باک بنادیا تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت کی شخصیت میں بے پناہ رعب ودبدبہ تھا، یہاں تک کہ آپ کے محبوب تلامذہ اور مقربین کے لیے بھی آپ سے کھل کر بات کرنا مشکل تھا، لیکن میرے لیے ان کی شخصیت میں بلا کی محبوبیت اور دلآویزی تھی۔

میں نے آپ کے بہت سے حالات وواقعات کا نہایت قریب سے مشاہدہ کیا ہے، بہت سی مجلسوں میں شریک رہا ہوں، آپ کے حضور میں اہل علم اور اصحاب تقویٰ کی نیازمندانہ حاضری دیکھی ہے، اور ان سب کو قلم بند کرنا چاہوں تو گفتگو بہت طویل ہوجائے گی۔

....

☆......: ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنا پچاسی سالہ جشن منعقد کیا، جس میں ہندوستانی اہل علم کے علاوہ عالم عرب کی بڑی بڑی باکمال اور مقتدر شخصیتیں بھی رونق افروز تھیں، اور ندوے کے وسیع وعریض کیمپس میں آسمانِ علم وفضل کے ایک سے بڑھ کر ایک درخشاں ستاروں کی موجودگی کہکشاں کا منظر پیش کررہی تھی، نمایاں علماءِ عرب میں شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود تھے، اپنے عہدے اور منصب کے لحاظ سے شیخ الازہر تمام مندوبین کے سالار تھے، ایک نشست میں شیخ ازہر کو دیکھا کہ انھوں نے حضرت اعظمی کی تحقیق سے شائع ہونے والی کتاب 'المطالب العالیة' کی بڑی تعریف کی، اور فرمایا کہ آپ نے بڑا علمی کام کیا ہے، اس نشست میں ڈاکٹر مصطفیٰ صاحب علوی بھی تھے، مگر شیخ ازہر شیخ اعظمی ہی سے محو گفتگو رہے، اور 'المطالب العالیة' – مسندہ-' کے شائع کرنے کا مشورہ دیا، شیخ اعظمی نے پیر جھنڈا- پاکستان- کے کتب خانے کا نام لیا کہ وہاں اس کا ایک صحیح نسخہ باریک خط میں موجود ہے، لیکن میرے لیے اس کا حصول بہت دشوار ہے۔ شیخ ازہر نے حضرت عبداللہ ابن مبارک کی

سیرت وشخصیت پر ایک کتاب تصنیف کی تھی، انھوں نے فرمایا کہ میں نے اس میں **کتاب الزهد والرقائق** سے بہت مدد لی ہے۔

☆......: پٹنہ کی خدا بخش لائبریری حضرت اعظمی کی علمی چرا گاہوں میں سے ایک تھی، مجھے بیگوسرائے میں پتہ چلتا کہ حضرت پٹنہ آئے ہیں، تو آپ سے استفادے کے لیے پٹنہ آجاتا، ایک دفعہ میں پٹنے میں مقیم تھا کہ خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اطلاع دی کہ کل مولانا اعظمی تشریف لا رہے ہیں، مجھے اسی دن گھر جانا تھا، لیکن حضرت اعظمیؒ کی تشریف آوری کی اطلاع پا کر رک گیا، آپ نے پٹنہ لوجنگ (Lodjing) میں قیام فرمایا، وہاں سے ہم آپ کے ساتھ لائبریری پہنچے، جمعہ کا دن تھا اور اس دن لائبریری قانوناً بند رہتی ہے، بیدار صاحب نے حضرت کی وجہ سے چند گھنٹوں کے لیے کھلوا دی، میں نے حضرت سے تشریف آوری کی وجہ دریافت کی؟ تو فرمانے لگے کہ مکہ مکرمہ میں شیخ ازہر سے ملاقات ہوئی تھی، انھوں نے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ مصر چلیں، سفر کی جو بھی دقتیں اور قانونی اڑچنیں ہوں گی، وہ دور ہو جائیں گی، ازہر سے **الجامع الکبیر (جمع الجوامع) للسیوطی** شائع ہو رہی ہے، جن جن شخصیتوں نے کام کیا ہے، میں ان کے کام سے مطمئن نہیں ہوں، میں چاہتا ہوں کہ یہ کتاب آپ کی نگرانی میں شائع ہو جائے۔ شیخ ازہر کی اس پیشکش پر حضرت نے ان کو جواب دیا کہ میں حج کی نیت سے آیا ہوں، ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا، وطن پہنچنے کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔ شیخ ازہر نے کہا کہ الجامع الکبیر کا ایک نسخہ پٹنہ لائبریری میں موجود ہے، کم از کم اس نسخے ہی کے بارے میں تحریر فرما دیں۔ اسی کو دیکھنے کے لیے آیا ہوں۔ آپ نے چند گھنٹوں میں کتاب پر نظر ڈال کر فرمایا کہ بیدار صاحب اس کے اوراق بے ترتیب ہیں، یحییٰ اس کو ٹھیک کر دے گا۔

☆......: حضرت مولانا اعظمی کی عبقریت کا سب سے اہم اور قابلِ توجہ پہلو یہ ہے کہ آپ نے تمام تر علمی وتحقیقی خدمات نہایت نامساعد حالات میں انجام دیے ہیں، جس کا بہت اچھا خاصا علم راقم الحروف کو ہے۔ آپ کی عمر عزیز کا بیشتر حصہ عسرت اور تنگ دستی میں گزرا، محبِّ مخلص وصادق ہونے کی وجہ سے اس صورت حال پر مجھے فطری طور پر فکر رہا کرتی تھی، بلکہ ایک دفعہ مشکلات نے اس طرح چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا کہ صرف آپ کے مقربین ومخصوصین ہی کو اس کا علم تھا، اس وقت مفتی ظفیر الدین صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ مولوی یحییٰ یہ میرے استاذ ہی کا دل وجگر ہے کہ صبر وشکر اور استغنا کے ساتھ اس کا تحمل کر رہے ہیں۔ ان ہی حالات اور شیخ الازہر کی پیشکش ہی کے زمانے میں کویت کی طرف سے موسوعہ فقہیہ کی ترتیب کے لیے وہاں سے آپ کے پاس نہایت اونچی تنخواہ اور رہائشی سہولیات کے ساتھ کویت میں قیام کے لیے دعوت آئی، تو ملاقات ہونے پر احقر نے عرض کیا کہ حضرت آپ کویت والی دعوت قبول کیوں نہیں فرما لیتے؟! تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ تمھاری ہی طرح دو اور دنیا داروں نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا تھا، پھر فرمایا کہ مولوی یحییٰ! یہ صحیح ہے کہ اگر میں وہاں چلا جاؤں تو تمھاری خانقاہ کے احاطے سے بڑا میرا احاطہ ہو جائے گا۔ مصر کے لیے شیخ الازہر کی پیشکش پر بھی میں نے وہاں جانے کی

ترغیب دینا چاہی، تو اس وقت بھی اسی طرح کا بے نیازانہ جواب دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت اعظمی نہ صرف قناعت و استغنا بلکہ غیرت و خودداری کے بھی نہایت بلند مقام پر فائز تھے۔

☆...... ۱۹۸۷ء میں جب آپ کا آخری سفر حجاز ہوا، تو اس حقیر نے بھی ساتھ جانے کی تمنا ظاہر کی، آپ کا یہ سفر ایک شامی فاضل شیخ ایمن رشدی سوید کی دعوت پر ہوا تھا، حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے ساتھ آپ کے خلف الرشید حضرت مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ مجاز حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی بھی تھے۔ اس سفر کے دوران عرب فضلا کے ہاں حضرت محدث اعظمی کی پذیرائی اور ان کی عقیدت و محبت کے خوب نمونے دیکھنے میں آئے، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ علیہ الرحمہ ریاض ایر پورٹ پر ملنے آئے اور ان کی وجہ سے بہت سہولت رہی۔ شیخ ایمن جدہ میں ابوبکر بن لادن کی موسسہ میں تھے، حضرت کے اس سفر سے پہلے وہ دو مرتبہ مئو حضرت کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے، اور آپ سے سبقاً سبقاً صحیح بخاری پڑھی تھی، اس کا کچھ حصہ باقی رہ گیا تھا، تو اسی کی تکمیل کے لیے حضرت کو حجاز کی دعوت دی تھی، اس سفر کا پروگرام کئی مرتبہ مرتب ہونے اور پھر ملتوی ہونے کے بعد پیش آیا تھا، جدہ میں آپ کے قیام کے دوران ریاض سے شیخ ابوغدہ اور مدینہ منورہ سے شیخ محمد عوامہ وقتاً فوقتاً ملاقات و زیارت اور استفادہ کے لیے تشریف لایا کرتے۔ ایک دن شیخ عوامہ بعض مخطوطات کے زیروکس لے کر حاضر خدمت ہوئے، جس کے کچھ الفاظ پڑھنے میں ان کو دقت پیش آ رہی تھی، حضرت سے ان کے بارے میں استفسار کیا، آپ نے جب ان کو صحیح پڑھ کر بتایا، تو شیخ عوامہ نے بے ساختہ آپ کی پیشانی چوم لی۔ چند دنوں کے بعد حضرت اعظمیؒ نے عمرہ کا ارادہ کیا، تو فرمایا کہ ہم جعرانہ سے احرام باندھیں گے، چنانچہ ہم لوگوں نے جعرانہ جا کر وہاں سے احرام باندھ کر عمرہ کیا۔

☆...... حجاز کے اس سفر میں اپنے میزبان، خاندان بنی عباس کے چشم و چراغ شیخ ایمن کو دیکھا کہ حضرت کی بے حد اور انتھک خدمت کر رہے ہیں، وھیل چیئر Wheel chair پر آپ کو طواف اور سعی کراتے ہیں، محنت و مشقت کی وجہ سے پسینے میں شرابور ہو جاتے ہیں، لیکن مجھ کو یا مخدوم زادے مولانا رشید احمد صاحب کو خدمت کا موقع نہیں دیتے ہیں، علم و معرفت کی ایسی قدر دانی کم دیکھنے میں آتی ہے، شیخ ایمن حضرت اعظمی سے صحیح بخاری پڑھتے، اور جدہ یا حرمین محترمین میں قیام کے دوران حجاز کے بہت سے علما و فضلا آ آ کر حدیث پاک کی سند واجازت لیتے، مکہ مکرمہ میں شیخ یاسین فادانی کی آمد و رفت زیادہ رہتی، ایک دن وہ اپنے شاگردوں کی بڑی جماعت کو جو تقریباً بیس پچیس کی تعداد میں تھے، حضرت اعظمی کے پاس مسلسل بالاولیت کی سند دلانے کے لیے لے آئے، اتنی بڑی تعداد کو دیکھ کر حضرت نے فرمایا کہ اے فادانی! آپ دن میں کئی مرتبہ لایئے، مگر چار پانچ کی تعداد میں طلبہ کو لایئے، مجھے بھیڑ سے وحشت ہوتی ہے۔ یہ حضرت کا مزاج تھا کہ آپ تنہائی اور یکسوئی کو پسند فرماتے تھے، اور بھیڑ بھاڑ سے متوحش رہتے تھے۔

☆...... مکہ مکرمہ میں ایک بزرگ شخص شیخ عبدالشکور فدا تھے، حرم شریف کے قریب ہی ان کا ایک

تجارتی مکتبہ تھا، عبدالشکور صاحب کومخطوطہ اور مطبوعہ کتابوں کا بڑا وسیع علم تھا، جس کی وجہ سے ہمارے حضرت محدث اعظمی کوان سے یک گونہ مناسبت تھی، اوران سے خوب علمی مذاکرے ہوتے رہتے۔

☆......: میں ابن بحشل کی 'تاریخ واسط' خریدنے جا رہا تھا، حضرت نے پوچھا مولوی یحییٰ کہاں جا رہے ہو؟ میں نے کتاب کا نام لیا، فرمایا کہ جس مقصد سے خریدنا چاہتے ہو وہ اس میں نہیں ہے، 'تاریخ واسط' میں محدثین وعلما کے حالات ہیں، تمھارے آبا واجداد واسطی ہیں، ان کے حالات اس کتاب میں نہیں ملیں گے۔ یہ حضرت کی غیر معمولی ذکاوت اور ذہانت وفطانت تھی کہ محض کتاب کا نام لینے پر تاڑ گئے، کہ اس کو خریدنے کا اصل مقصد کیا ہے۔

☆......: اسی سفر میں کتابوں کے ساتھ حضرت کا شغف اور شوق مطالعہ کا ایک نمونہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا، اور آج تک میری حیرت کم نہیں ہو رہی ہے، واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ حافظ عراقی نے علامہ ذہبی کی 'میزان الاعتدال' کا ایک ذیل لکھا ہے، جدہ میں حضرت اعظمی کو یہ کتاب دستیاب ہوگئی، صبح کو فجر کی نماز کے بعد آپ نے کتاب دی کو اس کو رکھ دو، دریافت کرنے پر فرمایا کہ میں نے اس کو رات بھر میں دیکھ لیا ہے۔ یہ سن کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ اس عمر اور ضعیفی میں آپ نے رات بھر میں اس ضخیم کتاب کی ورق گردانی کر لی، نہ معلوم کتنی دیر سوئے اور سوئے بھی یا نہیں۔

☆......: مکہ مکرمہ میں کئی بار پروفیسر احمد محمد نور سیف صاحب ملنے کو آئے اور اپنی تالیفات خدمت اقدس میں پیش کیں، ایک دفعہ انھوں نے کچھ علمی سوالات کیے، حضرت کے جواب سے بے حد متاثر اور مسرور ہوئے، اور فرط مسرت کے عالم میں کہا **أنت العالم الكبير**.

☆......: مدینہ منورہ میں حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی بلندشہری اور شیخ عوامہ کی آمد ورفت کثرت سے رہتی تھی، شام کو شیخ عوامہ اپنی گاڑی سے اطراف کی سیر کراتے۔ حضرت، شیخ ایمن اور مولانا رشید صاحب کے سہارے روضۂ اطہر پر سلام پڑھنے جاتے، میں نے دیکھا کہ روضۂ اقدس کی حاضری کے وقت آپ کے پورے وجود پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، تھر تھر کانپ رہے ہیں، اور ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کوئی فریادی یا کوئی قصور وار کسی بڑے بادشاہ کے دربار میں کھڑا ہے۔

....

احقر نے الحمدللہ آپ کی تالیفات وتصنیفات اور تعلیقات کا بہت کثرت کے ساتھ اور بنظر غائر مطالعہ کیا ہے، اثنائے مطالعہ میں مجھ کو اگر کہیں کوئی اشکال ہوتا، تو آپ اس کی تشریح فرماتے، اور کبھی کتابوں کی نشان دہی فرما دیتے کہ فلاں کتاب دیکھ لو تشریح وتوضیح مل جائے گی۔

☆......: حضرت اعظمی کو جملہ علوم وفنون میں جو کمال حاصل تھا، اس کی مثال کم ملے گی، حدیث وفقہ وتفسیر میں منصب امامت پر فائز ہونے کے علاوہ نحو وصرف، لغت وبلاغت، منطق وفلسفہ اور علم عروض وہیئت بھی

آپ کے کمال علمی کے شعبے تھے، ایک دفعہ میں نے آپ سے علم ہیئت کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا کہ میں نے اس فن کو اپنی محنت سے حاصل کیا ہے۔

☆......: حضرت نے ایک دفعہ میرے غریب خانے کو اپنی تشریف آوری سے مشرف فرمایا، جس کمرے میں آپ مقیم تھے، اس میں فجر کی نماز کے بعد تنہا بیٹھے تھے، میں جب دروازے کے قریب پہنچا تو محسوس ہوا کہ آپ قرآن کریم کی تلاوت فرما رہے ہیں، نہایت خوش الحانی کے ساتھ اور تجوید کی رعایت کرتے ہوئے آپ تلاوت کر رہے تھے، آپ کی تلاوت بڑی پُرسوز اور پُرکیف تھی، ہم وہیں دروازے پر کھڑے کھڑے سننے لگے کہ ہمارے قریب جانے پر کہیں تلاوت بند نہ کردیں۔

☆......: ایک مرتبہ اپنے زمانۂ طالب علمی کا واقعہ بیان کیا کہ وہ اپنے استاذ حضرت مولانا عبدالغفار صاحب سے ایک کتاب پڑھنا چاہتے تھے، مولانا عبدالغفار صاحب نے فرمایا کہ تم میرے لڑکے کو 'ضریری' -علم بلاغت کی ایک منظوم اور بہت اہم کتاب- پڑھا دو، میرا اس کو 'ضریری' پڑھانے کا جو وقت ہے، اس میں تم کو میں پڑھا دیا کروں گا۔ احقر نے حضرت اعظمی سے جھٹ سوال کردیا کہ حضرت آپ نے اس سے پہلے 'ضریری' پڑھی تھی، فرمایا نہیں پڑھی تھی۔ پھر حضرت نے مولانا کے صاحبزادے کو 'ضریری' پڑھائی اور مولانا ان کے پڑھانے سے مطمئن بھی تھے۔

☆......: ایک مرتبہ میں نے 'الافق المبین' کے بارے میں سوال کیا؟ تو آپ نے فرمایا کہ مولوی یحییٰ! میں نے ہر فن کی کتاب پڑھائی ہے۔

☆......: الفاظ غریبہ کی تشریح وتوضیح میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا، جو آپ کی تعلیقات میں عیاں ہیں، دفع تعارض میں کمال تھا، اور ایجاز واختصار کے ساتھ اپنے مدعا ومافی الضمیر کی ادائیگی کا ملکۂ تامہ حاصل تھا، شد رحال پر حضرت مولانا ابوالوفا افغانی نے بہت بسط کے ساتھ لکھا ہے، لیکن اسی بحث کو حضرت اعظمی نے الأ لبانی میں بہت کم الفاظ میں سمیٹ کر پیش کردیا ہے، جس سے زبان وبیان پر آپ کی قدرت کاملہ کا پتہ چلتا ہے۔

☆......: ایک حدیث کے بارے میں علامہ ابن القیم نے لکھا ہے کہ اس کو بیہقی نے روایت کیا ہے، علامہ احمد محمد شاکر نے اس کی نسبت مسند احمد کے حاشیے میں لکھا کہ یہ روایت مجھے سنن کبریٰ میں نہیں ملی۔ حضرت اعظمی نے مسند حمیدی کی تعلیق میں لکھا کہ بیہقی نے اس کو 'معرفة السنن والآثار' میں روایت کیا ہے، اور اس کے لیے آپ نے 'معرفۃ السنن' کے قلمی نسخے کا حوالہ دیا ہے۔ میں نے ایک موقع پر عرض کیا کہ حضرت! آپ نے اس کا -معرفۃ السنن کا- نسخہ دیکھا ہے؟ فرمایا کہ جی ہاں میں نے اس کے مخطوطے کا مطالعہ کیا ہے۔

☆......: میں نے ایک دفعہ عرض کیا کہ حمیدی کی بعض احادیث 'فتح الباری' اور 'اخبار القضاۃ' للوکیع میں ہیں، جو مسند حمیدی میں نہیں ہیں؟۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے مسند حمیدی پر جو کام کیا ہے، وہ نسخہ بشر بن موسیٰ کا روایت کردہ ہے، اس کے علاوہ بہت ساری روایتیں ہماری نظر سے گزر چکی ہیں، جن کا تعلق ہمارے کام

سے نہیں ہے۔

باوجودیکہ بہت سارے راویوں کے حالات آپ کے ذہن ودماغ میں حاضر اور محفوظ ہوتے، لیکن تعلیقات لکھتے وقت ان کے حالات کی اگر ضرورت پڑتی، تو کتب رجال یا حوالے کی دوسری کتابوں سے مراجعت کے بعد لکھتے۔ ایک دفعہ دریافت کرنے پر فرمایا کہ میں جب تک اطمینان نہیں کر لیتا، لکھتا نہیں ہوں۔

....

☆......: علامہ ابراہیم بلیاویؒ کی وفات کے بعد دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری میں شرکت کے لیے دیوبند تشریف لے جارہے تھے، راستے میں لکھنؤ میں قیام فرمایا، میں اُس وقت ندوے میں بحیثیت مہمان مقیم تھا، حضرت اعظمی کا قیام اپنے عزیز شاگرد مولانا محمد منظور نعمانی کے یہاں تھا، میں اور مولانا سعید الرحمٰن حضرت اعظمی سے ملنے کے لیے رکشے سے کچہری روڈ گئے، آپ کا یہ سفر تنہا تھا، کوئی رفیق نہیں تھا، حضرت اعظمی ہم لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوئے، اس وقت آپ کے پاس مولانا نسیم احمد فریدی بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کچھ کتابوں اور تحریروں کے بارے میں دریافت کیا، تو آپ نے فرمایا کہ اس مسئلے پر شاہ صاحب سے پہلے فلاں عالم نے بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس وقت میں نے یہ منظر دیکھا کہ مولانا منظور صاحب نعمانیؒ اپنے استاذ گرامی حضرت اعظمیؒ کا بستر لگارہے ہیں۔

اس واقعے کے کچھ دنوں بعد حضرت پٹنہ تشریف لائے، تو میں نے پوچھا کہ حضرت مولانا ابراہیم بلیاویؒ کے بعد صدر مدرسی کا عہدہ کن کے سپرد ہوا، فرمانے لگے کہ مولانا عبدالصمد اور مولانا منت اللہ میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ صدر مدرسی کا عہدہ قبول کرلیں، آپ کے علاوہ کوئی اور اس کا حق دار نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ یہ عہدہ میرے سپرد کر رہے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ میری اہلیت اور صلاحیت کے معترف ہیں، تو آپ لوگوں کے اس اعتماد کی بنیاد پر میں کہتا ہوں کہ اس کے مجھ سے زیادہ حق دار مولانا فخر الدین ہیں، اس لیے ان ہی کے سپرد کردیا جائے، اور پھر اسی پر مجلس شوری نے فیصلہ کردیا۔

اس طرح ایک بار پھر حضرت اعظمیؒ نے دارالعلوم دیوبند کے ایک اہم منصب کو خوش اسلوبی سے ٹال دیا اور اس اہم معاملے میں آپ کی تجویز پر مجلس شوری کا فیصلہ ہوا۔

☆......: حضرت اعظمی اپنے اساتذہ میں حضرت مولانا عبدالغفار صاحب اور حضرت مولانا شاہ انور صاحب سے بہت متاثر تھے، بالخصوص حضرت شاہ صاحب کا ثانی نہیں سمجھتے تھے۔ اپنے معاصرین اور دیگر اہل علم میں علامہ سید سلیمان ندوی کے بہت معترف، مداح اور قدرداں تھے، سید صاحب ہی کی وجہ سے حضرت اعظمی کا اعظم گڈھ میں کئی کئی دن قیام ہوجاتا، دوسری طرف سید صاحب بھی بغیر کسی اطلاع کے آپ کے پاس مفتاح العلوم آجاتے، اور شام کو واپس دارالمصنفین چلے جاتے، اسی طرح سید صاحب کے اعتراف وقدردانی کا یہ حال تھا کہ 'سیرۃ النبی' کی جلدوں پر آپ سے باقاعدہ نظر ثانی کراتے۔

☆......: مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مولانا سید شاہ فضل اللہ جیلانی کو میں نے آپ کے فضل وکمال کا بے حد مداح پایا، مولانا اکبرآبادی نے 'صدیق اکبر' اور 'عثمان ذوالنورین' کے مقدمے میں اور اپنے خطوط میں حضرت اعظمی کے علم وفضل کا بھرپور اعتراف اور تعریف وتوصیف کی ہے، ورنہ مولانا اکبرآبادی کا یہ حال تھا کہ کم کسی کی تعریف کرتے تھے۔ مولانا فضل اللہ صاحب نے صرف '**الحاوی لرجال الطحاوی**' کی زیارت کے لیے مئو کا سفر کیا، اور خود مجھ سے فرمایا کہ میرے علم کے مطابق اسماء الرجال میں آپ کے رتبے کا کوئی دوسرا عالم نہیں ہے۔

حضرت مولانا یکتائے زمانہ اور نادرۂ روزگار تھے، آپ تاریخ اسلام کی ان بے نظیر ہستیوں میں تھے، جن کی مثالیں خال خال ملتی ہیں، مگر باوجود اپنی عبقریت، جلالت قدر ومنزلت، عظمت وبلندی، وسعت مطالعہ، اور تبحر علمی کے نہایت خاموش طبع اور کم گو تھے، جس کی وجہ سے آپ کے علم ومعرفت اور فضل وکمال کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا، اِخفاء حال کا حد درجہ اہتمام تھا، اپنی شخصیت اور کمالات کے اظہار کے جذبے سے قلب وجگر پاک تھا، حالانکہ آپ کے علم کی گہرائی وگیرائی کو دیکھنا ہو تو کوئی حدیث کی کتابوں پر آپ کی تعلیقات کو دیکھے کہ امام بیہقی، دارقطنی، حافظ ابن حجر اور ہیثمی جیسے اجلہ محدثین وحفاظ حدیث سے کتنی باتوں کی تحقیق میں اختلاف کیا ہے، اور اپنے دعووں کو بدلائل ثابت کیا ہے، اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مبارک فن میں ہمارے حضرت کا قد متقدمین کے برابر تھا۔

....

حضرت اعظمی کی سیرت وشخصیت اور علم وفضل کے شعبوں کو منظر عام پر لانے کے لیے مفتی محمد ظفیر الدین صاحب اور ان جیسے دیگر شاگردوں اور وابستگان دامن ابوالمآثر پر ایک قرض بلکہ فرض تھا، جس کا کچھ حصہ ان کے قریب عزیز اور دور آخر کے شاگرد عزیزم ڈاکٹر مسعود احمد سلمہ نے ''حیات ابوالمآثر'' جلد اول لکھ کر ادا کیا، اور اب انھوں نے حضرت کے علمی کارناموں پر مشتمل دوسری جلد لکھ کر تیار کر دی ہے، عزیز موصوف نے حضرت کی تحریروں، آپ کی نگارشات اور تعلیقات کا جس خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ تجزیہ اور تعارف کیا ہے، وہ بہت قدر وقیمت کا حامل ہے، ان کے تجزیہ وتعارف سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حضرت کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں کا بھرپور اور بنظر غائر مطالعہ کیا ہے، اور جس طرح تعارف کیا ہے، اس میں کوئی تشنگی نہیں رہ گئی ہے، اللہ ان کی عمر کو دراز فرمائے اور وہ اسی طرح حضرت کی تحریروں کو اہل علم کے حلقوں میں پیش کرتے رہیں، عزیز موصوف کے قلم میں جو پختگی اور درستگی ہے، اس کا اعتراف علمی حلقوں میں بھی ہے، اور اِس کی شہادت ان کی دوسری تحریریں اور خود یہ کتاب دے گی۔

میری ان سے عزیزانہ گزارش ہے کہ وہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ان مکتوبات ورسائل کو بھی جمع کر کے قابلِ اشاعت بنا دیں، جو آپ نے اہل علم کے سوالات کے جواب میں تحریر فرمائے ہیں، تو علمی دنیا کے لیے ایک

بیش قیمت علمی تحفہ اور قابل قدر چیز ہوگی، اسی طرح ان کے عربی مقالات کا مجموعہ بھی شائع ہونا چاہئے۔حضرت نے مصنف عبدالرزاق وغیرہ کے حواشی میں جہاں رواۃ حدیث کا ذکر بہت اختصار کے ساتھ کیا ہے، ان کے پھیلاؤ کی بھی ضرورت ہے۔

....

محبّ مکرم اور میرے مخلص کرم فرما حضرت مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی مجددی نقشبندی مدظلہ العالی بہت زیادہ تبریک وتہنئت کے مستحق ہیں کہ اپنے عظیم والد علیہ الرحمہ کے علمی کاموں کو نہایت کامیابی کے ساتھ ایک ایک کر کے اہل علم و دانش کے سامنے لا رہے ہیں، اور جو گمنام ہیں ان کو گمنامی سے نکال کر عیاں فرما رہے ہیں، ایک موقع پر حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب نے یہ بات بالکل برملا اور بجا فرمائی تھی کہ ہمارے علما میں اور کسی عالم کی اولاد نے اپنے والد کے علمی کاموں کی حفاظت اور ان کو منظر عام پر لانے کا وہ کارنامہ نہیں انجام دیا، جو مولانا رشید احمد صاحب نے کر دکھایا ہے، اور مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مدظلہ کے اس خیال سے میں پوری طرح متفق ہوں۔اہل علم کو مولانا مدظلہ کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ان کے اہتمام سے ایک سے بڑھ کر ایک گوہر نایاب عمدہ کتابت وطباعت سے آراستہ ہو کر تشنگانِ علم کو شاد کام کر رہے ہیں۔مولانا مدظلہ خود بھی باذوق اور صاحب نظر ہیں، اپنے والد گرامی حضرت اعظمیؒ علیہ الرحمہ کے مسودات ومخطوطات کی انھوں نے پوری زندگی تبییض کی ہے، اُن کو علامہ ومحقق ومحدث حضرت شیخ زاہد کوثری سے علم حدیث کی تحریری اجازت حاصل ہے۔اللہ تعالی ان کی عمر کو دراز فرمائے اور ہم سب کے مخدوم گرامی حضرت محدث الاعظمی علیہ الرحمہ کے علمی کارناموں کے مزید اشاعت کی توفیق مرحمت فرمائے، آمین۔

حضرت محدث الاعظمیؒ کو میں نہ صرف اپنا محسن بلکہ پدر مجازی سمجھتا ہوں، اور اسی نسبت اور تعلق سے میں عزیزم ڈاکٹر مسعود احمد سلمہ کو اپنے بھانجے کی طرح سمجھتا ہوں، میں ان کی اس کاوش کے حق میں - جو ان کی سالہا سال کی عرق ریزی کا ثمرہ ہے - خداوند قدوس کی بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ اپنے فضل وکرم سے اس کو قبول عام عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

پیش لفظ

پروفیسر ڈاکٹر عبدالرحمٰن مومن، سابق صدر شعبۂ سماجیات، بمبئی یونیورسٹی

اکتوبر ۲۰۰۹ء میں امریکہ کے ایک علمی وتحقیقی ادارہ نے مسلمانوں کی عالمی آبادی کا تفصیلی جائزہ پیش کیا تھا، جس کی رو سے فی الوقت دنیا کے مختلف ممالک میں تقریباً ایک ارب ۷۵ کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ اس وقت دنیا کی کل آبادی کم وبیش چھ ارب اسی کروڑ ہے، اس لحاظ سے دنیا کا ہر چوتھا شخص مسلمان ہے، اس رپورٹ میں یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ غیر اسلامی ملکوں میں اقلیت کی حیثیت سے رہنے والے مسلمانوں کا تناسب ان کی عالمی آبادی میں تقریباً ۲۰ فیصد ہے، یہ تخمینہ زیادہ صحیح نہیں ہے، راقم السطور کے اندازہ کے مطابق (جس کی تفصیل عاجز کی تحریر بابت اکتوبر ۲۰۰۹ء میں www.iosminaret.org دیکھی جاسکتی ہے) مسلمانوں کی کل آبادی کا ایک چوتھائی حصہ یعنی ۲۵ فیصد (تقریباً ۴۰ کروڑ) غیر اسلامی ملکوں میں اقلیت کی حیثیت سے آباد ہے۔ مسلم اقلیتوں کی سب سے بڑی تعداد (تقریباً ۱۵ کروڑ) ہندوستان میں رہتی ہے، اس ملک میں مسلمان ایک ہزار برس سے زائد عرصہ سے آباد ہیں۔ تین وجوہ کی بنا پر ہندوستانی مسلمان دنیا کی دوسری مسلمان اقلیتوں پر فوقیت رکھتے ہیں اور ان کے لیے ایک نمونہ اور مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے نامساعد حالات کے باوجود عزیمت واستقامت کے ساتھ اپنے عقائد، مذہبی شعار، تہذیبی شناخت اور دینی اداروں کا تحفظ کیا ہے؛ دوسرے یہ کہ بے سروسامانی کے عالم میں رہتے ہوئے بھی انھوں نے علوم اسلامیہ کے فروغ اور نشر واشاعت میں نمایاں حصہ لیا ہے؛ تیسرے یہ کہ وہ اپنے ملک ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی تشکیل اور اس کی آبیاری میں شریک وسہیم رہے ہیں۔

علوم اسلامیہ کے تمام شعبوں یعنی تفسیر واصول تفسیر، علوم الحدیث، فقہ وافتا، سیرت، عربی زبان وادب، تصوف، فلسفہ وکلام اور تاریخ وتذکرہ نگاری میں ہندوستانی علماء نے اپنے تبحر اور عبقریت کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں، علوم الحدیث میں جو بلند پایہ خدمات ہمارے ملک کے علماء اور محدثین نے انجام دی ہیں، اس کی نظیر گذشتہ تین چار صدیوں میں سارے عالم اسلام میں نہیں ملتی۔ ابومعشر سندھی، رضی الدین حسن صغانی، شیخ طاہر سندھی، شیخ علی متقی، عبدالوہاب متقی، شیخ محمد طاہر پٹنی، ابوالحسن سندھی، شاہ عبدالحق محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا عبدالحی فرنگی محلی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا انور شاہ کشمیری علیہم الرحمۃ والرضوان نے علوم الحدیث کی جوگراں قدر خدمات انجام دیں، ان کی ضیا پاشیوں نے نہ صرف برصغیر ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلام کو منور کیا۔ معروف مصری فاضل علامہ سید رشید رضا (متوفی ۱۹۳۵ء) نے ۱۹۱۲ء میں اپنے دورۂ ہند کے موقع پر ہندوستانی علماء ومحدثین کی جلیل القدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا:

”اگر ہمارے دینی بھائی ہندوستانی علماء علوم الحدیث کی خدمت واشاعت کی طرف متوجہ نہ

ہوتے، تو یہ علم دنیا سے رخصت ہو گیا ہوتا، کیونکہ اس علم کے جو اصل مراکز تھے یعنی مصر، شام، عراق اور حجاز، وہاں یہ علم ضعف کے آخری درجہ تک پہنچ گیا تھا''۔

محدثین عظام کے اس عالی مرتبت قافلہ کے آخری سالار بقیۃ السلف، راس المحدثین فی الھند حضرت الاستاذ ابوالمآثر علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ تھے، بلاشبہہ وہ اللہ تعالی کی نشانیوں میں ایک نشانی تھے، ایسی نابغہ روزگار ہستیاں صدیوں میں پردۂ ہستی پر نمودار ہوتی ہیں۔ حضرت ابوالمآثر کی سیرت وشخصیت جامع الصفات اور ہمہ جہتی تھی، آپ کی شخصیت کا غالب عنصر آپ کے علم وفضل کی گہرائی وگیرائی تھا، ایک تابعی بزرگ حضرت قتادہ بن دعامہ کا قول ہے کہ اللہ تعالی نے امت مسلمہ کو بے مثل قوت حافظہ سے نوازا ہے، جس کی مثال دنیا کی دوسری قوموں میں ناپید ہے۔ اگلے وقتوں کے محدثین عظام کے محیر العقول حافظہ کے متعدد واقعات تاریخ وتذکرہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ حضرت ابوالمآثر کی یادداشت اور استحضار اس غضب کا تھا کہ اس کی مثال حالیہ وقتوں میں نہیں ملتی۔ آپ کی وسعت مطالعہ، دقت نظر، ژرف نگاہی، قوت استنباط واستدلال اور نکتہ رسی حافظ ابن حجر اور علامہ شمس الدین ذہبی جیسے کبار محدثین کی یاد دلاتی تھی۔ آپ میں ادق سے ادق علمی مسائل کو وضاحت وصراحت کے ساتھ اور شگفتہ انداز میں بیان کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ حضرت ابوالمآثر کی شخصیت کا ایک نمایاں وصف آپ کی عدیم النظیر علمی جامعیت تھا، علوم الحدیث میں آپ کی مہارت تامہ کا ایک زمانہ معترف ہے، اس کے علاوہ تفسیر واصول تفسیر، فقہ وافتا، سیرت، عربی زبان وادب، فلسفہ وکلام اور تاریخ وتذکرہ نگاری میں بھی آپ کو ید طولی حاصل تھا۔

حضرت ابوالمآثر کو اسلامی مخطوطات سے جو والہانہ شغف تھا اور مخطوطات سے متعلق جو حیرت انگیز معلومات آپ کو مستحضر تھیں، اس کی مثال ہمارے زمانہ کے معدودے چند علماء ومحققین میں نظر آتی ہے، آپ کے اور حضرت مولانا ابوالوفا افغانی علیہ الرحمہ کے مابین جو مراسلت رہی ہے، اس سے ان دونوں بزرگوں کی مخطوطات سے گہری وابستگی اور اشتغال کا اندازہ ہوتا ہے۔ دنیا کے مختلف شہروں کے کتب خانوں میں موجود ہزارہا مخطوطات سے آپ نہ صرف واقف تھے، بلکہ یہ بات بھی آپ کے علم میں تھی کہ کن مخطوطات کی مائیکروفلم کہاں کہاں موجود ہے، آپ کوشش کر کے مخطوطات کی نقول اور مائیکروفلم حاصل کرتے، جن شہروں میں آپ کا سفر یا قیام ہوتا، وہاں کے کتب خانوں میں تشریف لے جاتے اور مخطوطات کو ملاحظہ فرماتے۔

حضرت ابوالمآثر کا سب سے اہم بالشان علمی وتحقیقی کارنامہ حدیث کے ان نادر ونایاب مخطوطات کی تحقیق وتعلیق اور اشاعت ہے جو صدیوں سے علماء ومحدثین کی دسترس سے باہر تھیں۔ مصنف عبد الرزاق، مسند حمیدی، سنن سعید بن منصور خراسانی، کتاب الزہد والرقائق، مصنف ابن ابی شیبہ، حافظ ہیثمی کی کشف الاستار عن زوائد البزار اور حافظ ابن حجر کی المطالب العالیہ جیسی نادر ونایاب کتابیں حضرت ابوالمآثر کی تحقیق وتعلیق سے آراستہ ہو کر طبع ہوئیں، احادیث کی بے مثال تخریج اور اسماء الرجال کی تحقیق ان کتابوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔ آپ

نے متداول کتب حدیث کے حوالہ سے جس انداز میں مسند حمیدی کی ۱۳۰۰/احادیث کی تخریج کی ہے، وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ کیفیت وکمیت کے لحاظ سے حضرت کے علمی کمالات کا جائزہ لیا جائے، تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وافر مالی وسائل مہیا ہونے کے باوجود ہمارے زمانہ کی علمی انجمنیں اور جامعات بھی اس پایہ کی علمی خدمات انجام دینے سے قاصر ہیں جو ہمارے حضرت نے تن تنہا اور مادی بے بضاعتی کے باوجود انجام دیں۔

جس ہستی کو علامہ زاہد الکوثری جیسے جلیل القدر عالم ومحقق **العلامة النحرير والجهبذ الخبير** اور **الاستاذ الجليل** جیسے القاب سے یاد کریں، جس کو معروف مصری فاضل ومحقق شیخ احمد محمد شاکر **العلامة الكبير المحقق** کہ کر پکاریں، جس کی تعریف وتحسین میں شیخ الازہر رطب اللسان ہوں، اور جس کے شاگردوں اور ارادت مندوں میں شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، شیخ الازہر عبدالحلیم محمود، شیخ اسماعیل الانصاری، شیخ حماد الانصاری، شیخ بہجہ البیطار اور شیخ عبدالعزیز بن باز جیسے نامور علماء وفاضلین ہوں، اس کی جلالت شان کے کیا کہنے۔

اسلامی تاریخ میں جو علماء ومحققین اعلی ترین علمی صلاحیتوں کے حامل ہوئے ہیں، اور جنھوں نے اپنی علمی وتحقیقی خدمات سے علوم اسلامیہ کو چار چاند لگائے، ان کے بارہ میں عموماً یہ شعر نقل کیا جاتا ہے:

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ توفیق الٰہی کے بغیر کوئی علمی کاوش یا کار خیر بارآور نہیں ہوسکتا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ علمی ودینی کارہائے نمایاں انجام دینے میں توفیق ایزدی کے ساتھ ساتھ اخلاص نیت، انہماک، اور یکسوئی اور کدوکاوش کو بھی بڑا دخل ہے۔ **لَيْسَ لِلإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى**، اور **وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا** اور دیگر قرآنی آیات اس کی شہادت دیتی ہیں، حضرت ابوالمآثر کے علمی کمالات اور ان کی دینی خدمات کے بارآور ہونے میں توفیق الٰہی کے ساتھ ساتھ آپ کے اخلاص نیت، ذوق تحقیق وجستجو، وسعت مطالعہ اور غیر معمولی انہماک کو بھی دخل تھا۔

حضرت ابوالمآثر کی سیرت وشخصیت اور علمی مزاج کا ایک اہم پہلو آپ کی اصابت رائے اور فکری توازن واعتدال تھا۔ آپ کا فکری توازن آپ کی تحریروں، فتاوی اور تقریروں اور آپ کے سیاسی نظریات میں جھلکتا ہے۔ آپ نے اپنے رسالہ دارالاسلام اور دارالحرب میں فقہاء متقدمین ومتاخرین کی آراء کی روشنی میں اور مستحکم دلائل وبراہین سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان دارالاسلام کے حکم میں ہے۔ یہ مختصر رسالہ علم وتحقیق کا شاہ کار ہے اور آپ کی اصابت رائے کا مظہر ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک کی تصنیف کتاب الزھد والرقائق پر آپ کا دیباچہ تصوف سے متعلق آپ کے فکری توازن اور اعتدال پر مبنی نقطہ نظر کا عمدہ نمونہ ہے۔

استشراق اور مغربی مستشرقین کی کتابوں کے بارہ میں مسلمان اہل علم کے تاثرات اور نظریات افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ ایک طرف مغربی جامعات کے فاضلین اور دانشور مستشرقین کی علمی خدمات اور ان کی تحقیقات

کے دلدادہ نظر آتے ہیں، تو دوسری طرف علماء کا طبقہ ان کی تحریروں کو شک وشبہہ کی نظر سے دیکھتا ہے اور ان کے نظریات کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے سم قاتل سمجھتا ہے۔ یہ دونوں نظریات ناواقفیت، بدگمانی اور افراط وتفریط پر مبنی ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور دانشوروں کی غالب اکثریت نہ عربی زبان وادب اور نہ ہی علوم اسلامیہ سے خاطر خواہ واقفیت رکھتی ہے۔ لہذا مستشرقین کی تحقیقات اور نظریات کا اسلامی مآخذ ومصادر کی روشنی میں جائزہ لینا اور ان کو حق وانصاف کی کسوٹی پر پرکھنا ان کی بساط کے باہر ہے۔ طبقۂ علماء میں جو اشخاص جدید یورپی زبانوں سے کما حقہ واقف ہیں اور جنھوں نے مستشرقین کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ لہذا یہ توقع کرنا فضول ہے کہ مستشرقین سے متعلق ان کی رائے حق وانصاف پر مبنی ہوگی۔

مستشرقین کی علمی وتحقیقی خدمات کے دو پہلو ہیں، ایک مثبت اور دوسرا منفی۔ دیانت داری اور انصاف کا تقاضا ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جائے، مستشرقین نے بڑی کدوکاوش سے یورپ کے کتب خانوں میں موجود علوم اسلامیہ کے سیکڑوں اہم مخطوطات کا پتہ لگایا، ان کو تحقیق وتعلیق سے آراستہ کیا، اور ہر کتاب کے متعدد نسخوں کا باہمی مقابلہ کر کے انھیں اہتمام سے شائع کیا۔ ان کی کوششوں اور عرق ریزی کی بدولت علوم اسلامیہ کے بیسیوں شہ پارے پہلی بار زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔ ونسنک (A.J.Wensinck) ہالینڈ کا ایک مشہور مستشرق تھا، جو لائڈن یونیورسٹی میں علوم شرقیہ کا استاد تھا، اس نے ۱۹۲۷ء میں کتب حدیث کا ایک تفصیلی اشاریہ ''حدیث نبوی کی ایک اہم رہنما کتاب'' A Handbook of Muhammaden Tradition کے نام سے شائع کیا۔ اس کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت صحاح ستہ کے علاوہ موطا امام مالک اور مسند دارمی کی روایات کا تفصیلی اشاریہ دیا گیا ہے۔ ایک مصری عالم محمد فواد عبدالباقی نے اس کتاب کا عربی ترجمہ مفتاح کنوز السنہ کے نام سے شائع کیا۔ اس عربی ترجمہ کے دیباچہ میں سید رشید رضا نے لکھا کہ مجھے ابتدا ہی سے کتب حدیث سے شغف رہا ہے۔ اگر مجھے شروع ہی میں یہ اشاریہ میسر آجاتا تو میری عمر کا تین چوتھائی حصہ بچ جاتا جو میں نے کتب حدیث کی ورق گردانی میں صرف کیا۔ بعد میں ونسنک نے اس اشاریہ کو مزید وسعت دے کر **المعجم المفهرس لألفاظ الحديث النبوی** کے نام سے مرتب کیا۔ یہ اس کی زندگی میں مکمل نہ ہوسکا اور اس کی وفات کے بعد بروہمن نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

مستشرقین کے بارہ میں حضرت ابوالمآثر کا نظریہ توازن واعتدال پر مبنی تھا، طبقات ابن سعد صحابہ کرام اور تابعین عظام کی سوانح اور حالات زندگی پر نہایت جامع اور مستند کتاب ہے۔ جرمنی کے معروف مستشرق ایڈورڈ زخاؤ (Edvard sachau) نے کئی نامور ماہرین فن کے تعاون اور اشتراک سے اس کتاب کے مخطوطات کو جمع کیا اور باہم مقابلہ کر کے تحقیق وتعلیق کی۔ یہ کتاب ۳۵ برس (۱۹۰۴-۱۹۴۰) کے عرصہ میں لائڈن سے ۹ رجلدوں میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے بارہ میں مولانا ابوالبرکات داناپوری نے اپنی کتاب 'اصح السیر' میں لکھا کہ چونکہ طبقات کو ایک غیر مسلم مستشرق نے شائع کیا ہے، اس لیے یہ معتبر ومستند نہیں ہے، کیونکہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ زخاؤ نے اس کی عبارتوں میں تحریف کی ہوگی۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم نے اس سلسلہ میں حضرت

ابوالمآثر سے استصواب کیا تو آپ نے فرمایا:

''پروفیسر زخاؤ پر شبہہ اور بدگمانی بالکل بے جا ہے، میں نے خود طبقات کے مطبوعہ نسخہ کا مقابلہ اس کے اصل مخطوطہ کے ساتھ حرفاً حرفاً کیا ہے اور کہیں میں نے عدم مطابقت نہیں پائی''۔

پروفیسر زخاؤ نے **الطبقات الکبیر** کی تحقیق وتعلیق کے علاوہ جوالیقی کی کتاب **المعرب من الکلام العجمی** اور البیرونی کی **کتاب الہند** اور **الآثار الباقیۃ فی القرون الخالیۃ** کی بھی تحقیق وتعلیق کی اور انھیں زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔ زخاؤ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق کی شخصیت اور ان کی غیر معمولی سیرت وکردار سے از حد متاثر تھا۔ اس نے ایک مقالہ میں لکھا کہ شیخین بلند پایہ اوصاف اور غیر معمولی عظمت کے مالک تھے اور ان کی عظمت سے خود بانی اسلام کی عظمت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جن کے فیض صحبت سے ایسے پاکیزہ کردار کے حامل اشخاص پیدا ہوئے۔

آنحضورﷺ کا ارشاد گرامی ہے: **الحکمۃُ ضالّۃُ المومنِ حیثُ وَجدَھا فھُوَ اَحقُّ بھا.** اسلام نے اکتساب علم کے بارہ میں ایک انقلاب آفریں نظریہ پیش کیا۔ جنگ بدر میں جب متعدد اہل مکہ گرفتار ہوئے، تو ان کی رہائی کے لیے یہ فدیہ مقرر کیا گیا کہ ان میں سے جو قیدی پڑھے لکھے تھے ان میں سے ہر ایک دس مسلمان بچوں کو لکھنا سکھا دے۔ امام بخاری نے اپنی جامع میں اس واقعہ کو اس عنوان کے تحت درج کیا: **جواز المعلم المشرک.**

حضرت ابوالمآثر نے مخطوطات کی تحقیق وتعلیق میں مستشرقین کے منہج تحقیق وترتیب سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ فہرس الاعلام اور فہرس البلاد والامکنہ فراہم کرنے کا جو مفید طریقہ مستشرقین نے اختیار کیا تھا، اسے اپنانے میں آپ نے کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نوع کی فہارس سے کتابوں سے استفادہ کرنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔ اسی طرح آپ نے اہم مخطوطات کے مائیکروفلم حاصل کیے اور ان سے استفادہ کیا۔ ان باتوں سے حضرت ابوالمآثر کی وسیع النظری، فکری توازن اور اصابت رائے کا اندازہ ہوتا ہے۔

گذشتہ صدی میں عالم اسلام اور ہمارے ملک ہندوستان میں متعدد جلیل القدر علماء گذرے ہیں، جنھوں نے اپنی مہتم بالشان علمی ودینی خدمات کے ذریعہ علوم اسلامیہ کے گراں قدر سرمایہ میں اضافہ کیا۔ بایں ہمہ ان علماء میں بہت کم ایسے تھے، جن میں تبحر علم کے ساتھ ساتھ اجتہادی بصیرت تھی۔ حضرت ابوالمآثر بیسویں صدی کے ان معدودے چند علماء راسخین میں سے تھے، جن کی تحریروں میں اجتہادی بصیرت کارچاؤ نظر آتا ہے۔ اس اجتہادی بصیرت کی آبیاری میں آپ کے وفور علم، وسعت مطالعہ، دقت نظر، حق پسندی وحق گوئی اور جرأت ایمانی کو بڑا دخل تھا۔ اس اجتہادی بصیرت کی جھلکیاں ہمیں آپ کی کتاب 'تذکرۃ النساجین' آپ کے رسالہ 'انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت' اور آپ کے رسالہ 'دارالاسلام اور دارالحرب' میں نظر آتی ہیں۔

حضرت ابوالمآثر علیہ الرحمہ بلا خوف لومۃ لائم حق گوئی کے قائل تھے، اور اس معاملہ میں وہ نہ کسی سے مرعوب ہوتے تھے اور نہ ہی مداہنت، مصلحت کوشی اور رورعایت سے کام لینا پسند فرماتے تھے۔ فتنۂ انکار حدیث کے

سد باب میں آپ نے اپنی علمی وتحقیقی صلاحیتوں اورقوت استنباط واستدلال سے خوب کام لیا۔ ہمارے زمانہ میں ایک فرقہ مسلمانوں کے سواداعظم سے الگ تھلگ رہنے کو ترجیح دیتا ہے اوراپنے کوتمام مسالک اور جماعتوں سے فائق سمجھتا ہےاوراس سے بڑھ کر بدبختی کی بات یہ ہے کہ ائمہ اربعہ بالخصوص امام اعظم کی مساعی جمیلہ کا استخفاف کرتا ہے۔حضرت ابوالمآثر نے سلفیت کے نام نہادعلم برداروں کےتفردات وشذوذات پر گرفت کی اوران کے افکار ونظریات کامدلل ومسکت انداز میں ردکیا۔آپ نے متعدداہل علم وقلم کےتسامحات پرنقدوجرح فرمائی۔**الألبـانـي: شـذوزه وأخـطاؤه** میں آپ نے شیخ ناصرالدین البانی کےتفردات وہفوات کی محققانہ اورمدلل انداز میں تردید کی۔کفاءت کے مسئلہ میں آپ نے مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی کے دلائل وشواہد کی کمزوری کواجاگر کیا۔ ہندوستان کی شرعی وفقہی حیثیت کے مسئلہ میں آپ نے مولانا سعیداحمد اکبرآبادی کےنظریات کومدلل انداز میں ردکیا۔

غیر معمولی ذکاوت، ذہانت وفطانت، قابل رشک حافظہ اورعلم وفضل کی فراوانی اکثر اوقات انسان میں عجب اورخود بینی پیدا کرتی ہے۔معروف صوفی بزرگ حضرت حمدون قصار(متوفی ۲۷۱ھ) کاارشاد ہے:**الكياسة تـورث العجب** (ذہانت وفطانت خودبینی پیدا کرتی ہے)۔اس عجب اورخودبینی کےنتیجہ میں اپنے معاصرین پر تفوق حاصل کرنے اورنام ونمود کی خواہش قوی تر ہوجاتی ہے،اہل علم کے لیے یہ بڑی آفتوں میں سے ایک آفت ہے۔حضرت شیخ بہاؤالدین گنج شکر کے برادراصغر شیخ نجیب الدین متوکل فرمایا کرتے تھے: **العـلم حجاب الله الاكبـــــر**. خودبینی، جاہ طلبی اوررعونت وپندار کےاس بت کوتوڑنے کے لیے ہمارےسلف صالحین نے وہ راستہ اختیار کیا جسےقرآن کریم اورحدیث نبوی میں تزکیہ واحسان کہا گیا ہے،اور جسے بعد کے زمانہ میں تصوف وسلوک سے موسوم کیا گیا۔احسان وتصوف کے دشوار گذار مراحل طےکرنے کے بعدانسان کےسر سے رعونت اورخودبینی کا سودانکل جاتا ہے۔

حضرت ابوالمآثر ان علماء راسخین میں سے تھےجن کواللہ تعالی نے اعلیٰ ترین ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ''قلب'' کی دولت سے بھی سرفرازفرمایا تھا۔آپ نے زمانہ طالب علمی ہی میں حضرت تھانوی کے دست حق پرست پر بیعت کر لی تھی،اور بعد کے زمانہ میں مولانا وصی اللہ فتح پوری سے خرقۂ خلافت عطا ہوا۔آپ کوادبیات تصوف سے گہرا شغف تھا،آپ کےمختصر رسالہ''اہل دل کی دلآویز باتیں'' میں آپ کے جذب باطن کےنہاں خانوں کی جھلکیاں نظرآتی ہیں۔کتاب الزہد والرقائق کے دیباچہ سے آپ کےاحسانی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ نے مناقب العارفین کا خلاصہ''پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں''کے نام سے تیارکیا تھا۔

حضرت ابوالمآثر علیہ الرحمہ ان علماء میں سےنہیں تھے جواپنےعلمی وتحقیقی مشاغل میں اس حدتک مستغرق رہتے ہیں کہ ان کواپنے گردوپیش کے ماحول کی بھی خبرنہیں ہونے پاتی۔اگرچہ حضرت کا زیادہ تر وقت تحقیقی وتصنیفی مشاغل میں صرف ہوتا تھا،لیکن آپ دینی وملی ذمہ داریاں بھی بحسن وخوبی انجام دیا کرتے تھے۔درس وتدریس اوروعظ وارشاد کے ذریعہ آپ علماء وطلبہ اورعوام الناس کےساتھ ربط ضبط رکھتے تھے۔آپ اپنے شاگردوں کے

بارہ میں فکرمند رہا کرتے تھے اور ان کی ہر طرح سے مدد فرمایا کرتے تھے، مساجد و مدارس کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے، بخاری شریف کے ختم کی تقریب میں اور دیگر دینی و تبلیغی اجتماعات میں شرکت کے لیے دور دراز کے علاقوں سے لوگ آپ کو مدعو کیا کرتے اور آپ وقت نکال کر اور سفر کی صعوبت برداشت کر کے شرکت فرماتے۔ عید کے موقع پر اگر عام رویت نہ ہوتی اور عوام میں اضطراب پیدا ہوتا، تو مئو اور اطراف و جوار کے علاقوں کے مسلمانوں کی کثیر تعداد آپ کی رہائش گاہ کا رخ کرتی اور رویت ہلال کے معاملہ میں آپ کے فیصلہ کا انتظار کرتی۔

علم و فضل اور اخلاق و کردار میں لازمی ارتباط ہے، قرون اولیٰ سے لے کر آج تک علماء راسخین اعلیٰ ترین اخلاقی اوصاف کا نمونہ رہے ہیں۔ حضرت ابوالمآثر علیہ الرحمہ کی ذات گرامی اقدار عالیہ اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف سے معمور تھی۔ آپ کی طرزِ معاشرت، نشست و برخاست، خورد و طعام اور گفتگو میں سادگی اور تکلفات سے اجتناب کا پہلو نمایاں تھا۔ بے نفسی، انکسار، اور تواضع آپ کی شخصیت کی دلآویزی میں اضافہ کرتے تھے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اپنے مرید و خلیفہ شیخ سعدی کو نصیحت فرمائی تھی:

مرا پیر دانائے فرخ شہاب : دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آنکہ بر خویش خود بیں مباش : دوم آنکہ بر غیر بد بیں مباش

حضرت ابوالمآثر خود بینی اور عجب اور دوسروں کے بارہ میں بدگمانی اور بدگوئی سے محفوظ تھے۔ آپ شہرت طلبی، مداہنت اور زمانہ سازی سے ہمیشہ کنارہ کش رہے، آپ کے مزاج میں درویشانہ استغنا، بے نیازی اور قناعت پسندی تھی۔ آپ کو بھاری مشاہرہ پر مدینہ یونیورسٹی کی صدارت کی پیش کش کی گئی، لیکن آپ نے قبول نہ فرمایا اور اپنے سفالہ پوش مکان میں رہتے ہوئے علمی و تحقیقی مشاغل میں منہمک رہنے کو ترجیح دی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اپنی کتاب 'عجالہ نافعہ' میں لکھتے ہیں کہ علم حدیث سے وابستگی اور مزاولت انسان میں صحابیت کی شان پیدا کر دیتی ہے۔ جن لوگوں کو حضرت ابوالمآثر کو قریب سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے، وہ محدث دہلوی کے اس بصیرت افروز مشاہدہ کی صداقت کی گواہی دیں گے۔

تذکرہ و سوانح نگاری اسلامی ادبیات کا ایک اہم موضوع رہی ہے۔ اس موضوع پر گذشتہ تیرہ-چودہ سو برسوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی مثال کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے دنیا کی دوسری قوموں میں نہیں ملتی۔ سلف صالحین کا ان کی بعد کی نسلوں پر حق ہے کہ وہ ان کی جلیل القدر دینی و علمی خدمات کو منت و ستائش کے ساتھ یاد رکھیں اور یہ سلسلۃ الذہب تا قیامت جاری و ساری رہے۔ عزیزم مولوی مسعود احمد سلمہ نے حضرت ابوالمآثر کی سوانح اور ان کی بلند پایہ دینی و علمی خدمات پر دو ضخیم جلدیں لکھ کر اس قرض کو اتارنے کی کوشش کی ہے، جو حضرت کے وصال کے بعد ہمارے ملک کے علماء پر رہا ہے۔ کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں حضرت ابوالمآثر کی غیر مطبوعہ تحریروں اور مکاتیب وغیرہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو قبولیت عطا فرمائے اور مولف کو جزائے خیر دے۔

تمہید

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

شیدائے علم ومعرفت اور پیکر فضل وکمال

جام پر جام پیا بادۂ الفت کا مگر : نہ ہوئی مے میں کمی اور نہ ہوا دل سیراب

تاریخ نے علم کے ایک سے بڑھ کر ایک شیدائی اور دیوانے پیدا کیے ہیں، جن کی زندگیاں علم وفن کی خدمت کے لیے وقف تھیں، جو زندہ رہے تو علم کی خدمت اور نشر واشاعت کے لیے، اور مرے تو علم ودانش کے نام پر مرے۔ تاریخ کے صفحات پر ایسے بے شمار انسانوں کے حالات و واقعات ملیں گے، جنھوں نے اپنی زندگی کی متاعِ بیش بہا عروس علمی کی آرائش گیسو اور اس کی حنابندی کی نذر کردی۔

اُن پاکیزہ اور قدسی صفات نفوس میں نہایت روشن اور تابناک نام خلاصۂ اصحابِ فضل وکمال علامۂ کبیر محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کا ہے۔ علم کا ایسا والہ وشیدا، ایسا شیفتہ ووارفتہ، اور ایسا عاشق وفرزانہ چشم فلک نے دیکھا ہوگا، مگر کم اور خال خال دیکھا ہوگا۔ آپ کی زندگی کی ایک ایک سانس میں علم کی خوشبو رچی بسی تھی؛ علم ہی آپ کی غذا، وہی دوا اور وہی شفا تھی؛ آپ کا سونا، جاگنا اسی کے نام پر تھا، چلنا پھرنا اسی کے واسطے تھا، قدم اٹھتا تو اسی کے لیے اٹھتا، اور سفر ہوتا تو اسی کی اشاعت وفروغ کے لیے ہوتا؛ اور وہ بھی بالکل بے لوث، بے غرض، تعریف وتحسین کی خواہش، جاہ ومنصب اور دولت وعزت کی تمنا وطلب سے صاف اور پاک، نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا، حسبۃً للہ اور خالصۃً لوجہ اللہ۔

پیغمبر آخر الزماں، نبی امی، اور معلّم انسانیت ﷺ - کا پاک ارشاد ہے: الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ أَنَّى وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا (دانائی کی بات مومن کی گم شدہ متاع ہے، وہ جہاں کہیں اس کو پائے تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہے)۔ علامہ اعظمیؒ نے اس متاع گم شدہ کی تلاش وجستجو کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا، اور جہاں کہیں بھی کسی حکمت کا سراغ لگا، آپ کے قلب مضطر اور دل وجگر میں اس کے لیے تڑپ اور کسک پیدا ہوئی، معلوم ہوجاتا کہ فلاں جگہ سے فلاں کتاب چھپی ہے، یا فلاں کتاب کا قلمی نسخہ فلاں مقام پر پایا جاتا ہے، آپ کا دل اس کے حصول یا دید وزیارت کے لیے بے چین وبے قرار ہوجاتا۔ کتاب، کتب خانہ، قرطاس وقلم، مخطوطات کی تلاش، مطبوعات کی جستجو، آپ کے صحیفۂ حیات کے خاص اور نمایاں ابواب وعنوانات اور آپ کی حیات مستعار کا محور تھے، ۹۳ رسالہ زندگی میں شعور وآگہی کے کم از کم ۷۵ برسوں کے بارے میں بے تامل کہا جاسکتا ہے کہ: ع

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

علم وحکمت کے اس قیس وفرہاد نے اپنی متاع گم شدہ کی تحصیل وطلب اور اس کی اشاعت کے لیے کس طرح کوہ کنی، آبلہ پائی اور بادیہ پیمائی کی ہے، اس کی مثال قرون اولی کے محدثین اور شیفتگان علم اور علماء متقدمین میں تو مل سکتی ہے، بعد کے دور میں اس کی مثال عنقا ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم جس شخصیت کی کتابِ زندگی کے اوراق کو الٹنے جارہے ہیں، اس کی نسبت بے ساختہ کہا جاسکتا ہے کہ: ع

سمندر پاٹتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

مجلس علمی کے بانی وسرپرست مولانا محمد موسی میاں (۱) اور ان کی رحلت کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا ابراہیم میاں کے نام لکھے ہوئے سیکڑوں خطوط کی نقلیں ہمارے سامنے موجود ہیں، جو خالص علمی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ لیلائے علم کے جنون وشوق میں کس طرح حیران وسرگرداں تھے، اس سے پردہ اٹھانے کے لیے مولانا محمد موسی میاں کے نام لکھے ہوئے کچھ ابتدائی خطوط کے اقتباسات ناظرین کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ۷ار دسمبر ۱۹۵۸ء کو غالباً سب سے پہلا خط مولانا محمد موسی میاں کی طرف سے وارد ایک خط کے جواب میں لکھا ہے، اس میں مذکور ہے:

''میں ابھی ڈیڑھ ماہ کے بعد بمبئی اور حیدرآباد کے سفر سے واپس آیا ہوں، اس سفر میں بکثرت قلمی نوادر کا میں نے سرسری مطالعہ کیا ہے۔ حیدرآباد کا یہ سفر محض نوادر کتب کے تجسس کے لیے تھا، اس کی حیثیت ذاتی سفر کی تھی، اس سفر میں مجلس احیاء المعارف النعمانیہ کو بھی اچھی طرح دیکھا''۔

۱۱ر شعبان ۱۳۷۸ھ کو مولانا موسیٰ میاں کے نام چار صفحے پر مشتمل ایک طویل خط لکھا ہے، اس میں منجملہ دیگر باتوں کے تحریر ہے:

''مشکل الآثار کا کام بھی بہت اہم ہے، .... (اِلی) اس کو صحیح کر کے چھاپنے کی ضرورت ہے۔''

۱۰ر ذی قعدہ ۱۳۷۸ھ = ۱۹ر مئی ۱۹۵۹ء کے خط میں صاحبزادی کے انتقال اور پھر اپنی بیماری کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے:

''دو ہفتے تک بالکل تعطل رہا، اس کے بعد کام کی طرف توجہ ہوئی، تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اِس ضلع میں ایک پرانا علمی خاندان ہے، اسی خاندان کے کتب خانہ میں 'الخیر الکثیر' کا نسخہ تھا، جس سے مجلس علمی کے نسخہ کا مقابلہ کرنے کے لیے مولانا احمد رضا صاحب (۲) آئے تھے، گھوسی جاکر اس خاندان کے موجودہ ذی علم وارث سے ملا اور صبح سے شام تک بوسیدہ کتابوں کو الٹتا پلٹتا رہا، آخر میں الحمد للہ کہ ایک نسخہ 'تکمیل الاذہان' کا وہاں بھی نکل آیا، دوسرے دن متولی کتب خانہ سے اجازت لے کر میں اس کو

(۱) مولانا محمد بن موسیٰ میاں اصلاً سملک - گجرات - کے تھے، لیکن جوہانسبرگ ساؤتھ افریقہ میں ان کا خاندان متوطن تھا، دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلا اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ارشد تلامذہ میں، اور مجلس علمی کے بانی تھے۔ ۲۱ر ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ = ۱۶ر اپریل ۱۹۶۳ء کو جنوبی افریقہ میں وفات پائی۔

(۲) مولانا احمد رضا بجنوری مراد ہیں۔

اپنے ساتھ لیتا آیا، اور آج میں نے اس کو اپنے لڑکے مولوی رشید احمد کے حوالہ کر دیا ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو اس کو صاف نقل کر دو، نقل ہو جانے کے بعد آپ فرمائیں گے اور میری صحت درست رہے گی، تو ان شاء اللہ اس کو رام پور لے جا کر وہاں کے بہترین نسخہ سے اس کا مقابلہ کراؤں گا، پھر جہاں آپ فرمائیں گے وہاں بھیج دوں گا۔ یہ نسخہ 'اعیان الحجاج' کی تقطیع پر ایک سو چھبیس صفحات میں ہے''۔

۲۱رذی قعدہ ۱۳۷۸ھ = ۳۰رمئی ۱۹۵۹ کے خط کے شروع میں رقم طراز ہیں:

''۱-'تکمیل الاذہان' کی نقل ہو رہی ہے۔

۲-'سطعات' (شاہ ولی اللہؒ) کے مطبوعہ نسخہ کا مقابلہ قلمی نسخہ سے میں نے کر لیا ہے۔

۳-شرح 'الاعتصام' کی تصحیح بھی ہوگئی ہے''۔

۴رذی الحجہ ۱۳۷۸ھ = ۱۲رجون ۱۹۵۹ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''تکمیل الاذہان کے اب صرف دس ورق رہ گئے ہیں، وہ بھی نقل ہو لیں، تو 'تفسیر آیۃ النور' کی نقل شروع کراؤں''۔

مولانا محمد موسی میاں کو آپ نے جو خطوط لکھے ہیں، وہ عموماً بہت طویل اور کئی کئی صفحات پر مشتمل ہوا کرتے تھے، اور ہر خط تقریباً پورا کا پورا علمی امور اور کتابوں کے تذکرے پر متضمن ہوتا تھا، ۴رذی الحجہ ہی والے خط میں آگے تحریر فرماتے ہیں:

''میں نے 'سطعات' 'ہمعات' کے مطبوعہ نسخے مدرسہ مفتاح العلوم سے عاریت لے کر دونوں کا اپنے قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے تصحیح کر دی ہے، اور بوقتِ ضرورت دونوں کے مطبوعہ نسخے کراچی بھیجے جا سکتے ہیں''۔

۲۷رستمبر ۱۹۵۹ء = ربیع الاول ۱۳۷۹ھ کے مکتوب سے کتابوں کے واسطے آبلہ پائی اور بادیہ پیمائی کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے، اس میں لکھا ہے:

۲رستمبر کو میرا سفر شروع ہوا، مالیگاؤں میں میرے کئی شاگرد مدرس ہیں، ان کو اطلاع کر دی تھی، وہ منماڈ اسٹیشن پر ملنے آئے، اور باصرار مالیگاؤں لے گئے، پھر وہاں سے اہلِ علم کی ایک پارٹی نے طے کیا کہ برہان پور بھی کبھی علم کا مرکز رہا ہے، اور وہاں شیخ طاہر سندی[(۱)] اور شیخ فتح محمد محدث[(۲)] پیدا ہوئے ہیں، لہذا وہاں بھی کتابوں کی جستجو کرنی چاہئے، چنانچہ احقر نے برہان پور کا سفر کیا، وہ حضرات بھی ساتھ

(۱) غالباً شیخ طاہر بن یوسف سندی مراد ہیں، جو سندھ میں پیدا ہوئے تھے اور تحصیلِ علم کے لیے مختلف مقامات کا سفر کرتے ہوئے آخر میں برہان پور پہنچ کر متوطن ہو گئے تھے، آپ کا سن وفات ۱۰۰۴ھ ہے (دیکھئے نزھۃ الخواطر ۵: ۱۸۵)۔

(۲) حضرت عیسی جنداللہ کے فرزند ارجمند و خلیفۂ خاص اور گیارہویں صدی ہجری کے نامور علما و مصنفین میں تھے، ۱۰۶۰ھ میں بقید حیات تھے، تاریخ وفات نامعلوم ہے، زیارت حرمین کے لیے گئے ہوئے تھے کہ وہیں سے بارگاہ احدیت میں پہنچ گئے (تاریخ برہان پور: ۱۸۰، تذکرۂ علماء ہند: ۱۶۰، نزھۃ الخواطر ۵: ۳۰۴)۔

تھے، وہاں مولوی سید احکام اللہ بخاری کا کتب خانہ دیکھا، کچھ قلمی کتابیں ان کے پاس ہیں، مگر حدیث وفقہ کی کوئی خاص چیز وہاں نہیں ہے؛ پھر شیخ برہان الدین راز الٰہ[۱] کی درگاہ کے سجادہ نشیں سید حبیب الدین کا کتب خانہ دیکھا، وہاں بھی اب کچھ نہیں ہے، یا ہے مگر انھوں نے سب چیزیں نہیں دکھائیں۔

برہان پور سے پھر مالیگاؤں آیا اور چار پانچ دن ٹھہر کر حیدرآباد کا قصد کیا، حیدرآباد پہنچا تو آپ کا والا نامہ ملا، یہاں ڈاکٹر یوسف الدین صاحب سے ملاقات کی، ان کے پاس ترجمہ 'عبقات' موجود ہے، مگر وہ اس کو خود شائع کرنے والے ہیں، اور اس کو اسلامک پبلیکشنز سوسائٹی کے پروگرام میں انھوں نے شامل کر لیا ہے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مولانا مناظر احسن صاحب[۲] کی دوسری تحریریں بھی کچھ لوگوں کے پاس موجود ہیں اور ڈاکٹر صاحب خود ان کو وقتاً فوقتاً شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

طباعت کے باب میں گفتگو ہوئی، وہ کتاب چھاپنے کو آمادہ ہیں، مگر ان کا نرخ رام پور سے اونچا معلوم ہوتا ہے، میں ان سے تخمینہ لکھوا کر اندازہ کروں گا، پھر جناب کو صحیح بات لکھ سکوں گا۔

سعیدیہ کے منتظم حافظ عبدالعظیم کا انتقال ہوگیا، وہاں سے 'مسند حمیدی' کا نسخہ اب تک برآمد نہیں ہو سکا، جب سے آیا ہوں ڈاکٹر یوسف الدین کے ذریعہ کوشش کر رہا ہوں، اور روزانہ کسی نہ کسی کتب خانہ میں ۹ ر بجے سے چار بجے تک وقت صرف کرتا ہوں، شام تک تھک کر چور ہو جاتا ہوں۔ کل جامعہ عثمانیہ کا کتب خانہ دیکھا، وہاں ایک نسخہ 'مسند حمیدی' کا ملا، مگر روزانہ وہاں جا کر مقابلہ کرنا پڑے گا، جو میری قیامگاہ سے ۷ر میل دور ہے، پرسوں جمعہ کے بعد سے آصفیہ میں مصروف رہا، اپنے نوٹوں سے جو فہرست مرتب کروں گا اس کی ایک نقل آپ کو بھیجوں گا، یا اصل ہی بھیج دوں گا آپ کے پاس سے فوٹو آجائے گا''۔

سفر کی جس منزل پر بھی ہوتے اپنی ''سراغ رسانی'' کے نتائج سے آگاہ اور مطلع کرتے رہتے، اور جو بھی دریافت اور اطلاع ہوتی تھی، اس کی تفصیل مولانا محمد موسیٰ میاں کو لکھ کر روانہ کرتے تھے، چنانچہ ۱۰ را کتوبر ۱۹۵۹ء کو بمبئی سے لکھے ہوئے ایک خط میں رقم طراز ہیں:

''حیدرآباد سے ایک عریضہ روانہ کر چکا ہوں، اب میں کل سے بمبئی آ گیا ہوں۔

۱- یہاں 'اسرار المحبۃ' للشاہ رفیع الدین کا نسخہ دستیاب ہوگیا اور اس کو نقل کے لیے دے دیا ہے۔

۲- یہاں سامرود کے باب میں حافظ محمد شفیع اور مولوی سعید صاحب[۳] کے خطوط ملے کہ سامرود میں مصنَّف کا نسخہ نہیں ہے اور اس کی اطلاع آپ کو بھی ان لوگوں نے دے دی ہے۔

۳- حیدرآباد میں 'مسند حمیدی' کا ایک نسخہ جامعہ عثمانیہ میں دستیاب ہوا، جو ۱۱۵۹ھ سے بہت پہلے کا

---

(۱) شیخ برہان الدین راز الٰہ، حضرت عیسیٰ جند اللہ کے خلیفۂ خاص اور ایک تارک الدنیا بزرگ تھے، شعبان ۱۰۸۳ھ میں اسی (۸۰) برس کے سن میں برہان پور میں وفات پائی (تاریخِ برہان پور: ۱۸۴، نزہۃ الخواطر ۵: ۹۱)۔

(۲) مولانا مناظر احسن گیلانی - متوفی ۱۳۷۵ھ = ۱۹۵۶ء - مراد ہیں۔

(۳) غالباً مولانا محمد سعید بزرگ - متوفی ۱۴۱۱ھ = ۱۹۹۰ء - مراد ہیں۔

مکتوبہ ہے، اس نسخہ سے حرفاً حرفاً اپنے نسخہ کا مقابلہ کرلیا، روزانہ بس سے ۶-۷ میل جامعہ جاتا تھا اور کتب خانہ بند ہونے تک وہاں رہتا تھا، چار بجے کے بعد واپس ہوتا تھا''۔

اسی خط میں چند سطروں کے بعد لکھا ہے:

''ڈاکٹر عبدالمعید خاں صاحب سے ملاقات کی، انھوں نے 'غریب الحدیث' پر اب تک مطلقاً کوئی کام نہیں کیا ہے، وہ منتظر ہیں کہ کاکوری کا نسخہ یا اس کی نقل مل جائے، تو کام شروع کریں، اور کاکوری سے خط وکتابت کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ نسخہ یا اس کی نقل نہیں مل سکتی۔ 'غریب الحدیث' کا ایک نسخہ مدرسہ محمدی مدراس میں ہے، جو اس وقت حیدرآباد آیا ہوا ہے اور میں نے اس کو دیکھا ہے، ڈاکٹر صاحب اسی کا فوٹو حاصل کرنا چاہتے ہیں، مگر ابھی تک یہ کام بھی نہیں ہوا ہے، مجھ کو تو امید نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ کام کرسکیں گے، اس لیے کہ اولاً تو ان کی صحت قابلِ اطمینان نہیں ہے، پھر متعدد کام انھوں نے لگا رکھے ہیں، بہر حال اگر وہ فوٹو حاصل کرلیں گے، تو اس کے بعد وہ جو امداد چاہیں گے، میں ان کو امداد دوں گا۔ کاکوری کے باب میں بھی میں لکھنؤ پہنچ کر کوشش کروں گا کہ کوئی صورت نکل سکے، مگر امید کم ہے''۔

اس قسم کے علمی وتحقیقی احوال واخبار پر مشتمل بے شمار خطوط محفوظ ہیں، لیکن زیادہ کا ذکر کرکے ہم اس تمہید کو طول دینا مناسب نہیں سمجھتے، ان اقتباسات کو نقل کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ جس شخصیت کی علمی وتحقیقی خدمات آئندہ صفحات میں پیش کی جائیں گی، اس کے علمی شغف اور شیفتگی کا کیا حال تھا، ہر مشکل اور ہر پریشانی سے بے پروا ہوکر دل ودماغ میں صرف ایک ہی لگن اور دھن سمائی ہوئی تھی، علم وحکمت کے سفینوں اور گنجینوں کی دریافت اوران کی نشر واشاعت، حتی کہ اس کے لیے دوسرے اہل علم وتحقیق کے ساتھ کسی بھی طرح کا تعاون کرنے سے بھی کوئی دریغ نہ تھا۔ حیدرآباد کے ڈاکٹر عبدالمعید صاحب سے آپ کی کوئی رسم وراہ بھی نہیں تھی، اور سابقہ مراسم نہ ہونے کے باوجود یہاں تک تیار تھے کہ وہ جو امداد چاہیں گے ان کو دیں گے۔ اہل علم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ پیشکش جس طرح اعلیٰ درجے کی وسیع الظرفی اور کشادہ دلی ہے، وہیں ولولۂ علمی کا بھی رتبۂ کمال ہے۔

اشاعتی ادارے کے قیام کی فکر:

علم اور علمی وراثت کی اشاعت کا ایسا شوق وولولہ تھا کہ آپ کو کسی لمحے قرار نہیں حاصل ہوتا تھا، اسی مقصد کے پیش نظر ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۰ء کے عرصے میں ایک اشاعتی ادارے کے قیام کی ضرورت کا شدت سے احساس ہوا، اور مالیگاؤں کے مولانا عبدالحمد نعمانی ومولانا محمد عثمان کو لے کر اس قسم کے ایک ادارے کے قیام کی منصوبہ بندی کی، اس طرح کے ادارے سے آپ کا مقصد علمی نوادر کی اشاعت کے ساتھ باصلاحیت فضلا کو اس سے وابستہ کرکے ان کی علمی وتحقیقی استعداد وصلاحیت کو پروان چڑھانا اور ان کے اندر بحث وتحقیق کی لیاقت پیدا کرنا تھا؛ لیکن

اس راہ میں جو رکاوٹیں تھیں ان پر قابو پانا آسان نہیں تھا۔ اس کے باوجود آپ نے کوشش کر کے مذکورہ بالا دونوں حضرات کے تعاون سے ''احیاء المعارف'' کے نام سے ایک اشاعتی ادارے کی داغ بیل ڈال دی، اور یہیں سے پہلی دفعہ ۱۳۸۰ھ = ۱۹۶۰ء میں مختصر الترغیب والترھیب، اور ۱۳۸۵ھ = ۱۹۶۶ء میں کتاب الزھد والرقائق شائع ہوئی۔ اسی طرح مجلس علمی ڈابھیل آپ کی علمی و تحقیقی خدمات کی اشاعت کا اہم مرکز رہا ہے، اور اس ادارے سے آپ کا نہایت گہرا تعلق رہا ہے، اس کا تذکرہ اس کتاب میں بار بار آئے گا، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق اختصار کے ساتھ کچھ عرض کر دیا جائے۔

علامہ اعظمیؒ اور مجلس علمی:

''احیاء المعارف'' کی سرگرمیوں کے دوران ہی یکم ربیع الآخر ۱۳۷۸ھ = ۱۵/اکتوبر ۱۹۵۸ء کا لکھا ہوا مجلس علمی کے بانی مولانا محمد بن موسیٰ میاں کا ایک خط آپ کو وصول ہوا، جس میں لکھا تھا:

> ''گزشتہ ماہ محترم جناب حافظ محمد ازہر شاہ سلمہ[1] کے کرم نامہ سے آپ کی تشریف آوریٔ دیوبند کی اطلاع بھی ملی، آپ کے علمی مشاغل کا حال تو پہلے ہی سے معلوم ہوتے رہتے تھے اور جی چاہتا تھا کہ شکر گذاری کے لیے عریضہ لکھوں، اور فی الحال آپ کی توجہات کن کاموں کی طرف لگے ہوئے ہیں، ان کو بھی دریافت کرسکوں کہ شاید مجلس علمی آپ کی تصنیفی کوششوں میں کوئی معاونت وخدمت کر سکے اور آپ مجلس کو خدمت کا موقع دیں، واللہ الموفق''۔

اس خط نے آپ کے نخلِ آرزو کے لیے ابر نیساں کا کام کیا، اور شہبازِ ہمت کو پرواز کے لیے ایک نئی اور وسیع وعریض فضا نظر آنے لگی۔ مولانا محمد موسیٰ میاں کی پیشکش کے بعد آپ کو ایک ایسے ادارے کی خدمات فراہم ہو گئیں، جس کے واسطے سے ان خواہشات کی تکمیل کی راہ ہموار نظر آنے لگی، جو علم و تحقیق کے تعلق سے برسوں سے آپ کے ذہن ودماغ میں بسی ہوئی تھیں؛ چنانچہ مولانا محمد میاں کے اس خط کے بعد آپ نے بے لیت ولعل اپنی علمی و تحقیقی فتوحات کو مجلس علمی کے نام وقف کرنے کا ارادہ کرلیا، اور ان کے خط کے جواب میں ان کی پیشکش کو قبول کرتے ہوئے بغیر کسی شرط کے ہر قسم کی علمی وقلمی امداد واعانت کے لیے آمادگی ظاہر کر دی۔

مولانا محمد بن موسیٰ میاں- مقیم جوہانسبرگ- گجرات کے ضلع سورت کے قصبہ ڈابھیل کے ایک ایسے مایہ ناز فرزند تھے، جن کی خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں، دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور حضرت علامہ کشمیری کے فیض یافتہ تھے، ۱۳۵۰ھ = ۱۹۳۱ء میں مجلس علمی کے نام سے ایک عظیم الشان اشاعتی ادارہ قائم کیا[2] یہ ادارہ

---

(۱) علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے بڑے صاحبزادے اور دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلا میں تھے، رسالہ 'دارالعلوم' کے آخر عمر تک اڈیٹر رہے، ۱۴۰۶ھ = ۱۹۸۵ء میں وفات پائی (کاروانِ رفتہ: ۲۹)۔

(۲) تعمیر افکار- مولانا محمد طاسین نمبر- ص: ۳۳

خالص علم دین کی خدمت کے لیے قائم ہوا تھا، جس کے دفاتر ڈابھیل، کراچی اور جوہانسبرگ - ساؤتھ افریقہ - میں تھے، اس ادارے سے حدیث وفقہ اور دیگر فنون سے متعلق بیسیوں کتابیں اشاعت پذیر ہوئیں، اس ادارے کی اولین ترجیح حدیث نبوی اور فقہ حنفی کی خدمت تھی، اس کا قیام دراصل امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ - متوفی ۱۳۵۲ھ = ۱۹۳۳ء - کی تحریک کا نتیجہ اور ثمرہ تھا، اور حضرت شاہ صاحب ہی اس کے اولین سرپرست اعلیٰ تھے، حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بعد علامہ شبیر احمد عثمانیؒ - متوفی ۱۳۶۹ھ = ۱۹۴۹ء - کی زیر سرپرستی اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔

مولانا محمد موسی میاں کا مذکورہ بالا خط مجلس علمی کے ساتھ علامہ اعظمیؒ کے ربط وتعلق کا نقطۂ آغاز تھا، جو رفتہ رفتہ قوی سے قوی تر ہوتا گیا، اور بہت کم عرصہ گزرا کہ آپ مجلس کے رکن رکین شمار کیے جانے لگے، بلکہ آپ کی شخصیت نے اس کے بورڈ میں مرکزی حیثیت اختیار کر لی۔ اس کے اراکین کے بارے میں ایک پاکستانی قلم کار ڈاکٹر نثار احمد صاحب نے لکھا ہے:

> ''کراچی میں مجلس علمی کے سرپرست وسربراہ حضرت مولانا یوسف بنوریؒ اور اس کے ناظم مولانا محمد طاسینؒ تھے، مجلس کے تاسیسی اراکین میں یوسف میاں، محمد موسی میاں، اور احمد موسی میاں تھے، اور ادارہ کے تحقیقی وتصنیفی کام کو آگے بڑھانے کے لیے مندرجہ ذیل حضرات کو ارکان وافاضل کی حیثیت حاصل تھی:
>
> ۱- حضرت علامہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی۔
> ۲- علامہ مولانا ابوالوفا افغانی۔
> ۳- مولانا مفتی مہدی حسن شاہ جہاں پوری۔
> ۴- مولانا محمد ادریس میرٹھی۔
> ۵- ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب۔
> ۶- ڈاکٹر غلام محمد صاحب۔''(۱)

کتابوں کی حیرت انگیز معلومات:

کتابوں کی وسعتِ معلومات کے باب میں آپ اعجوبۂ روزگار تھے، اس میں آپ کا ثانی اور نظیر ملنا مشکل ہے، آپ کا سینہ کتابوں کا گنجینہ اور دماغ ان کا مخزن تھا۔ کتابوں کے نام، ان کے مصنفین کے اسماء، سنہ طباعت، مقام اشاعت اور اس جیسی دیگر اطلاعات کمپیوٹر کی طرح آپ کے ذہن میں محفوظ (Feed) تھیں، اور جس وقت چاہتے تھے، اس کو کھول کر اس سے کام لیتے تھے، کتابوں کے معاملہ میں آپ کے حافظہ نے کم ہی دغا دیا

(۱) تعمیر افکار - مولانا محمد طاسین نمبر - ص: ۱۴۵-۱۴۴

ہوگا۔اس کی شہادت ہر وہ شخص بلاتامل دے سکتا ہے، جس کو آپ سے کبھی اس باب میں گفتگو یا مراسلت کا اتفاق ہوا ہو، کتابوں کی معلومات مطبوعات اور مخطوطات دونوں میدانوں میں یکساں تھیں، مشہور فاضل ومحقق مولانا ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی صاحب نے اس کی شہادت دیتے ہوئے لکھا ہے:

''نادر اور کم یاب کتابوں کے بارے میں حضرت کی معلومات غیر معمولی طور پر وسیع تھیں''۔[1]

اور اسی مضمون میں چند سطروں کے بعد لکھا ہے:

''بلاشبہہ حضرت محدث اعظمی ایک نادرۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے، ان کا وسیع مطالعہ، غیر معمولی حافظہ، علم حدیث میں تخصص وامتیاز، اور تفقہ اپنی مثال آپ تھا''۔[2]

اور علامہ اعظمیؒ نے خود ۵؍شوال مکرم ۱۳۷۸ھ=۱۴؍اپریل ۱۹۵۹ء کے ایک خط میں مولانا محمد موسی میاں کو ایک بات کے ضمن میں لکھا ہے:

''میری اپنی یادداشت بہت طویل ہے، اس میں فقہ وحدیث ورجال وغیرہ کی دوسو سے زائد کتابوں کے نام ہیں، جن کو میں نے پڑھا ہے، یا سرسری طور پر دیکھا ہے''۔

☆......: کتابوں کی حیرت انگیز معلومات سے متعلق ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

''حضرت کا حافظہ متقدمین محدثین کے انداز کا تھا، اس سلسلے میں ایک واقعے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، میں دارالمصنفین اعظم گڈھ میں وہاں کی قلمی کتابوں کی فہرست دیکھ رہا تھا، اس میں ایک کتاب کا نام سامنے آیا 'القول الصواب فی مسئلة الخضاب'. آگے مصنف کے نام کے تحت درج تھا ''مولوی تراب علی''، پھر بین القوسین لکھا تھا (گھوسی اعظم گڈھ)۔ گھوسی کے محلّہ قاضی پورہ میں عثمانی شیوخ کے خانوادے میں ایک صاحب مولوی تراب علی گذرے ہیں، انھوں نے اپنے خاندان کا نسب نامہ بھی لکھا ہے، میرا ذہن ان کی طرف منتقل ہوا، اور پھر اس کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں تحقیق کا اشتیاق پیدا ہوا، سوء اتفاق کہ کتاب لاپتہ تھی، یعنی الماری میں اپنی متعینہ جگہ پر موجود نہ تھی، اس لیے اس کتاب کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد لکھنؤ جانا ہوا، وہاں الماری میں ندوۃ العلما کے کتب خانے میں بھی 'القول الصواب فی مسئلة الخضاب' نام کی ایک کتاب نظر آئی۔ یہ مطبوعہ تھی اور اس پر سنہ طباعت ۱۲۸۰ھ لکھا ہوا تھا، لیکن اس کے مصنف مولوی تراب علی لکھنوی تھے۔ اب الجھن یہ پیش آئی کہ اصل مصنف کون ہے؟ تراب علی گھوسوی یا تراب علی لکھنوی؟ میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، ابھی صرف اتنا ہی عرض کیا تھا کہ دارالمصنفین کی فہرست میں فلاں کتاب کے مصنف کا نام تراب علی گھوسی درج ہے، یہ کون صاحب ہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ دارالمصنفین کے فہرست نگار کو غلط فہمی ہوئی، یہ مولوی تراب علی لکھنوی کی تصنیف ہے، ۱۲۸۰ھ میں چھپ

(۱) مجلّہ المآثر ج۲ ش۳ ص:۸۲ (۲) ایضاً

چکی ہے، اپنے موضوع پر معتبر و مستند اور جامع کتاب ہے، اس کا حجم ایک متوسط رسالے کا ہے''(۱)

اس واقعے کو لکھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت نے اس کتاب کو نہ معلوم کب دیکھا ہوگا، لیکن انھیں اس کا موضوع، اس کی قدر و قیمت اور سال اشاعت وغیرہ سب کچھ بالکل مستحضر تھا۔ میں نے عرض کیا کہ دار المصنفین ہی میں ایک اور کتاب بھی نظر آئی تھی 'القول الصواب في مسئلة الخطاب'؟ فرمایا کہ ہاں یہ حضرت تھانوی کا رسالہ ہے اور اس کا موضوع انگریزوں کے زمانے میں ملنے والے خطابات ہیں، مثلاً شمس العلماء وغیرہ''(۲)۔

آگے ڈاکٹر صاحب ایک اور کتاب کی نسبت لکھتے ہیں:

''نادر اور کم یاب کتابوں کے بارے میں حضرت کی معلومات غیر معمولی طور پر وسیع تھیں، ایک مرتبہ مجھے علامہ ذہبی کا ایک قلمی رسالہ موسوم بہ 'ذِكرُ أسماءِ مَن تُكُلِّم فيه وهو مُوَثَّق' ایک جگہ نظر آیا۔ حضرت کے صاحبزادے مولانا رشید احمد صاحب کے واسطے سے دریافت کیا کہ یہ رسالہ چھپ چکا ہے یا نہیں؟ جواب میں مولانا رشید احمد صاحب نے لکھا کہ حضرت فرماتے ہیں کہ:

یہ مصر میں ایک دوسری کتاب کے ساتھ ضمناً طبع ہو چکا ہے''(۳)۔

☆......: یہاں علامہ اعظمیؒ کے بعض مضامین اور خطوط سے کتابوں کے سلسلے میں کچھ اقتباسات انتخاب کر کے نقل کیے جا رہے ہیں، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ -متوفی ۱۳۹۹ھ = ۱۹۷۸ء- نے اپنے رسالہ 'اوزان شرعیہ' میں ایک کتاب کے بارے میں تحریر فرمایا:

''یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ شرح کنز کون سی اور کس زمانہ کی تصنیف ہے''(۴)۔

علامہ اعظمیؒ کے رسالہ 'اوزان ومثاقیل' میں جب مولانا معین الدین عمرانی کی 'شرح کنز الدقائق' کا حوالہ آیا تو آپ نے اس کے بارے میں حسب ذیل معلومات ذکر فرمائیں:

''حالانکہ مولانا معین الدین اور ان کی شرح کنز کا ذکر شیخ عبدالحق اور غلام علی آزاد بلگرامی کے علاوہ صاحب نزہۃ الخواطر نے بھی کیا ہے، اور چونکہ وہ محمد تغلق کے عہد میں تھے، اس لیے ان کی کتاب آٹھویں صدی کی تصنیف ہے''۔

☆............: کتاب 'الذخائر والتحف' کے تعارف کے آخر میں 'زينة الدهر' پر سلسلۂ کلام میں لکھا ہے:

''ابوالمعالی سعد بن علی بغدادی خطیری کی کتاب کا نام معارف (دسمبر ۱۹۶۰ء) میں غلط چھپ گیا ہے، اس کا صحیح اور پورا نام زينة الدهر وعصرة أهل العصر ہے، اور وہ باخرزی کی کتاب دمية القصر کا ذیل ہے، اور باخرزی کی یہ کتاب ثعالبی کی 'يتيمة الدهر' کا ذیل ہے، اور ابن العماد کاتب نے خطیری کی کتاب زينة الدهر کا ذیل خريدة العصر کے نام سے لکھا ہے، پھر خود ہی اپنی کتاب

(۱) المآثر ج ۲ ش ۳ ص: ۸۲-۸۱ (۲) ایضاً ص: ۸۲ (۳) ایضاً ص: ۸۲ (۴) جواہر الفقہ ۱/۴۱۵

خريدة کا ایک ذیل لکھا ہے، اسی کا نام کتاب السيل على الذيل ہے، ابن العماد نے قاضی رشید کا ذکر کتاب السيل اور ذیل یعنی خريدة العصر دونوں میں کیا ہے، یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ کتاب السيل اور خريدة کے ذیل میں ذکر کیا ہے، اس لیے کہ خريدة کا ذیل تو خود کتاب السيل ہے''[1]۔

☆............: 'فہرست مخطوطات عربیہ پنجاب یونیورسٹی' کے عنوان سے شائع شدہ مضمون میں شیخ رحمۃ اللہ سندی اوران کی کتاب کا تذکرہ آجانے پر یہ بیش قیمت معلومات قلم بند فرمائی ہیں:

''محض غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ عبدالقادر عیدروس نے 'النور السافر' میں 'جمع المناسک ونفع الناسک' کو عبداللہ بن سعد اللہ کی تصنیف قرار دیا ہے، نزہۃ الخواطر میں اسی کو جوں کا توں نقل کر دیا گیا ہے، حالانکہ یہ کتاب ۱۲۸۹ھ میں ٹرکی کے مطبع محمودیہ میں طبع ہو چکی ہے، اس کے سرورق پر یہ لکھا ہوا ہے:

انتقل إلى رحمة الله تعالى مولف هذا الكتاب الشيخ رحمة الله في الضحوة الكبرى من يوم الجمعة ثامن عشر محرم الحرام سنة أربع وتسعين وتسع مائة ودُفِن بالمعلا.

اس کتاب کے مولف شیخ رحمۃ اللہ نے بوقت ضحوۂ کبریٰ جمعہ کے دن ۱۸/محرم الحرام ۹۹۴ھ کو انتقال کیا، اور معلا میں مدفون ہوئے۔

یہاں یہ خیال ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ کتاب کے طابع وناشر سے اس کے مصنف کے نام کے بارے میں غلطی ہوگئی ہو، اس لیے اس کے ازالہ کے لیے اور اس کتاب کے شیخ رحمۃ اللہ ہی کی تصنیف ہونے پر مزید دلائل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اور ملاعلی قاری جو خود شیخ عبداللہ سندھی کے شاگرد ہیں، لباب المناسک کی شرح میں لکھتے ہیں:

إني لما رأيت لباب المناسک مختصر نفع الناسک للعالم العلامة والفاضل الفهامة مرشد السالكين ومفيد الناسكين الشيخ رحمة الله السندي.

اور شرح لباب کا محشی لکھتا ہے کہ **نفع الناسک اسم للمنسک الكبير للماتن رحمه الله.** بمبئی میں اس کتاب کا ایک نسخہ جس کا سن کتابت ۱۰۶۸ھ ہے، میری نظر سے گذرا ہے، اس کے سرورق پر **المنسک الكبير للشيخ رحمة الله السندي المكي استكتبه الفقير عبدالرحيم اللاهوري ثم المدني الحنفي** ۱۰۶۸ء لکھا ہوا ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں مولف نے لکھا ہے:

وسميته بجمع المناسک ونفع الناسک.

(۱) معارف، ج ۷۸ ش ۲ ص: ۱۴۶

شیخ علی متقی نے 'نفع الناسک' کے مختصر لباب المناسک کا خلاصہ فارسی میں 'عجالۃ الناسک' کے نام سے لکھا ہے، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے''[۱]۔

کتاب کے بارے میں یہ اہم معلومات اور اس کے مصنف کے بارے میں ان پختہ ثبوتوں کو ذکر کرنے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''کوکب صاحب نے معجم المخطوطات کے حوالہ سے جمع المناسک کے جس مطبوعہ ایڈیشن کا ذکر کیا ہے، ہمارے پاس وہی ایڈیشن ہے، مگر بروکلمن کے حوالہ سے یہ جو لکھا ہے کہ ''کتاب کی فقط تلخیص طبع ہوئی ہے''۔ یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ پوری کتاب طبع ہوئی ہے، ہاں اس کے ساتھ شیخ احمد کمشخانوی مرشد طریقہ نقشبندیہ نے اپنی ایک کتاب 'جامع المناسک' بھی چھاپ دی ہے، جو 'جمع المناسک' کی تلخیص ہی کی طرح ہے، شاید اسی کو دیکھ کر بروکلمن نے یہ لکھ دیا ہو کہ جمع المناسک کی صرف تلخیص طبع ہوئی ہے''[۲]۔

☆......: مولانا نسیم احمد فریدی مرحوم-متوفی ۱۴۰۹ھ=۱۹۸۸ء- نے اپنے مضمون میں شاہ ابوسعید مجددی-متوفی ۱۲۵۰ھ=۱۸۳۴ء- کے رسالہ 'ہدایۃ الطالبین' کے بارے میں جب تحریر فرمایا کہ: ''معلوم نہیں کہ یہ رسالہ طبع ہو کر شائع ہوا یا نہیں''۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کی بابت اپنے استدراک میں ارقام فرمایا:

''حضرت شاہ ابوسعید مجددی کا رسالہ 'ہدایۃ الطالبین' مدت ہوئی مطبع مجتبائی دہلی میں طبع ہوا تھا، رسالہ کے اول یا آخر میں سنہ طباعت مذکور نہیں ہے''[۳]۔

☆......: 'اوزان ومثاقیل' میں ایک رسالہ 'مفتاح الصلوۃ' کا حوالہ دیتے وقت اس کے بارے میں یہ قیمتی معلومات زیب قرطاس فرمائیں:

''مفتی محمد شفیع صاحب نے 'مصباح منیر' کے حوالہ سے اس کو شیخ عیسیٰ سندھی برہان پوری-المتوفی ۱۰۳۱ھ- کی طرف منسوب کیا ہے، اور 'مفتاح الصلوۃ' کو انھیں کا رسالہ بتایا ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے، 'مفتاح الصلوۃ' مطبوعہ رسالہ ہے، اس کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے، اور 'تاریخ برہان پور' 'نزہۃ الخواطر' وغیرہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ 'مفتاح الصلوۃ' شیخ فتح محمد کی تصنیف ہے''[۴]۔

☆......: کسی کتاب کا ذکر آجاتا تو اس کے بارے میں غیر معمولی معلومات کا دروازہ کھل جاتا تھا، مثلاً حضرت مولانا ابولوفا افغانی-متوفی ۱۳۹۵ھ- نے ایک دفعہ ایک خط میں 'صحیح البھاری' کے بارے میں معلوم کرنا چاہا، تو اس کی نسبت ۱۵رشعبان ۱۳۶۹ھ کے خط میں یہ تفصیلات تحریر فرمادیں:

''صحیح البہاری مولوی ظفر الدین شاگرد رشید مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کی تصنیف ہے،

(۱) معارف، ج ۱۲۳ ش ۴ ص: ۳۱۰ (۲) ایضاً: ۳۱۱ (۳) الفرقان، ج ۴۲ ش ۱۲ ص: ۳۲ (۴) اوزان ومثاقیل (قلمی)

اس کی چار جلدیں سرسری طور پر میں نے دیکھی ہیں، چھپی غالبًا اس سے زیادہ ہیں، مطبوعہ جلدیں طہارت سے شروع ہوتی ہیں، مگر حقیقۃً ابتدا کتاب العقائد سے ہوتی ہے، جواب تک طبع نہیں ہوئی، مگر میں نے اس کے چند اوراق خود مصنف کے پاس دیکھے تھے، اس میں ایک باب تھا: **باب أن النبي ﷺ کان شارعاً.** اس طرح کے اور ابواب تھے، مطبوعہ جلدوں میں فقہیات ہیں، احادیث پر کوئی کلام نہیں کیا ہے، غیر مطبوعہ کتابوں کے حوالوں کو ظاہر نہیں کیا ہے کہ کہاں سے لیا ہے۔ ان باتوں سے قطع نظر کے بعد جامعیت وغیرہ کے لحاظ سے اچھی کتاب ہے، چوتھا حصہ جو میں نے دیکھا ہے **باب الصلوۃ عندقبر النبي** ﷺ پر ختم ہوتا ہے''۔

☆......: پنجاب یونیورسٹی لاہور- پاکستان- کے شیخ نذیر حسین صاحب مرحوم -متوفی ۲۰۰۶ء- نے ایک دفعہ مدینہ منورہ کی تاریخ سے متعلق کتابوں کی نسبت خط لکھ کر دریافت کیا، تو ان کو جواب میں کئی ایک کتابوں کے نام بتلا دیے، جو حسب ذیل ہیں:

''غالبًا سب سے قدیم تاریخ مدینہ طیبہ کی **تاریخ المدینة لابن شبه** ہے، جس کا قلمی نسخہ نامکمل مدینہ منورہ میں ہے، بعض اعیانِ مدینہ اس کو ایڈٹ کرا رہے ہیں، تحقیق کے لیے اس کو میرے پاس بھی بھیجنے والے ہیں؛ اس کے علاوہ حافظ سخاوی کی 'تاریخ مدینہ' طبع ہوئی ہے، اس کی ایک آدھ جلدیں میری نظر سے گزری ہیں، جن میں علماء واعیان کے تراجم ہیں؛ '**وفاء الوفا**' کے مصنف کی ایک کتاب '**خلاصة الوفا**' بھی ہے، 'خلاصہ' کا فارسی ترجمہ بھی قلمی میں نے دیکھا ہے؛ 'جذب القلوب الی دیار المحبوب' للشیخ عبدالحق الدہلوی فارسی میں ہے؛ نیز ابن النجار کی '**الدرة الثمینة في تاریخ المدینة**' ہے، اس کی تہذیب وتذییل وتکمیل مراغی نے کی ہے، اس کا نام '**تحقیق النضرة بتلخیص معالم دار الهجرة**' ہے، وہ مصر میں طبع ہوچکی ہے، صفحات کی تعداد ۲۷۶ ہے؛ مجد الدین فیروزآبادی صاحبِ قاموس نے '**المغانم المطابة في معالم طابة**' لکھی ہے، جس کا پانچواں باب ایک جلد میں ریاض سے شائع ہوا ہے؛ سید محمد کبریت مدنی المتوفی ۱۰۷۰ھ کی کتاب '**الجواهر الثمینة في محاسن المدینة**' ہے؛ اور '**عمدة الاخبار في مدینة المختار**' گویا خلاصۃ الوفا کا خلاصہ ہے، مولف ۱۰۳۵ھ میں موجود تھے، یہ کتاب بھی طبع ہوچکی ہے؛ سب سے آخر میں عبدالقدوس انصاری رسالۃ المنہل کے اڈیٹر کی کتاب '**آثار المدینة**' قابلِ ذکر ہے، یہ کتاب بہت قیمتی ہے، طبع ہوچکی ہے''[1]۔

....

یہ مطبوعات کے سلسلے کے صرف چند نمونے تھے، اب مخطوطات کی معرفت کے سلسلے میں بھی کچھ معروضات پیش خدمت ہیں۔

(۱) المآثر ج ۴، ش ۲، ص: ۹۵

مخطوطات کا بحرِ زخّار:

مخطوطات اور کتابوں کے قلمی نسخوں کی معرفت کا حال تو مطبوعات سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے، آپ کی تحریروں اور مکتوبات وخطوط وغیرہ کو دیکھنے کے بعد یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ دنیا بھر کے کتب خانوں اور ان کے قلمی نسخوں کے بارے میں معلومات آپ کے ذہن ودماغ میں محفوظ ہوں۔ ڈاکٹر سید عبدالرحیم صاحب- ناگپور- نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''ایک روز ڈاکٹر صاحب- ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی[1] مراد ہیں- نے مجھ سے کہا کہ کل شام ہم لوگ ایک بہت بڑے عالم دین مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی صاحب سے ملنے جائیں گے، جو مئو ناتھ بھنجن سے ناگپور تشریف لائے ہیں اور جن کا قیام دارالعلوم مومن پورہ میں ہے، میں ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ دارالعلوم پہنچا، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی ڈیسائی صاحب سے مل کر بہت خوش ہوئے، حدیث کی نادر کتب اور مخطوطات کا تذکرہ نکل آیا، عصر کی نماز سے مغرب اور مغرب کی نماز سے عشا کی نماز تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مولانا سے ملنے والے حیران تھے کہ یہ شخص کون ہے جو عالم اسلامی کے کتب خانوں کے مخطوطات کی اتنی خبر رکھتا ہے اور ہر جگہ کے احادیث کے ذخیرے سے واقف ہے، مولانا سے میرا بھی تعارف ہو گیا۔ پھر ایک موقع پر میں نے مولانا کے ساتھ بالا پور کا سفر کیا، مولانا نے وہاں کا کتب خانہ دیکھا''[2]۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ مخطوطات کی یہ وسیع معلومات فن حدیث تک محدود نہیں تھیں، فقہ وتاریخ اور دیگر علوم اسلامیہ کے قلمی نسخوں کی معرفت بھی اسی طرح تھی، بلکہ تاریخ وتذکرہ کی اطلاعات کے سلسلے میں تو آپ کی ذات ایک مکمل انسائیکلو پیڈیا تھی۔ ان حیرت انگیز معلومات کے چند نمونے یہاں پیش کیے جا رہے ہیں، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں:

''ایک ملاقات کے دوران مجھ سے فرمایا کہ تمھارے یہاں کے کتب خانے میں 'الذخیرۃ' نام کی فقہ حنفی کی قلمی کتاب تھی، یہ نادر وکم یاب ہے اور ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ دوبارہ حاضری کا موقع ملا تو میں نے دریافت کیا کہ کیا اس سے مراد 'ذخیرۃ العقبیٰ' ہے؟۔ فرمایا کہ نہیں، یہ دونوں دو الگ الگ کتابیں ہیں''[3]۔

ایک دوسرے موقع کی ملاقات کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے:

''میں نے عرض کیا کہ حسن الصغانی کی 'العباب الزاخر' کا بھی کہیں پتہ چلتا ہے؟ فرمایا کہ ہاں

(۱) ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی آثار قدیمہ Archaeology کے بہت بڑے ماہر تھے، اور متعدد مقامات پر محکمہ آثار قدیمہ میں افسر رہ چکے تھے، اس فن میں ان کی متعدد تصانیف بھی ہیں، علامہ اعظمیؒ کے فضل وکمال کے بہت قدرداں تھے، ۱۹۲۵ء میں احمد آباد کے ایک مضافاتی قصبے دھندوکا میں پیدا ہوئے اور ۲۴/ مارچ ۲۰۰۲ء کو احمد آباد ہی میں وفات پائی۔

(۲) گجرات کی علمی، ادبی اور ثقافتی وراثت: ۳۴۱ (۳) المآثر: ج ۲ ش ۳ ص: ۷۷

مصر کے کتب خانوں میں دستیاب ہے، البتہ ہندوستان میں نہیں ہے۔ مصر ہی سے کویت وغیرہ میں مائیکروفلم منگالیا گیا ہے''(۱)۔

حیرت کی بات ہے کہ صرف اسی کا علم نہیں ہے کہ مصر میں اس کا مخطوطہ موجود ہے، اس کی بھی خبر ہے کہ اس کا مائیکروفلم فلاں جگہ موجود ہے۔ ڈاکٹر ظفر احمد صاحب نے اپنے مضمون میں آگے لکھا ہے:

''مرزا محمد حارثی بدخشی کی کتاب 'تاریخ محمدی' نادر وکم یاب کتاب ہے، ہندوستان میں اس کا صرف ایک ہی نسخہ دستیاب تھا، اور وہ رضا لائبریری رام پور میں تھا، نامور محقق مولانا امتیاز علی خاں عرشی(۲) نے شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی کے لیے ہندوستان پرنٹنگ ورکس رام پور سے ۱۹۶۰ء میں اس کتاب کا آخری جز شائع کر دیا تھا، میں نے مولانا رشید احمد کے ذریعہ مطبوعہ حصہ حضرت کی خدمت میں بھیجا، مئو پہنچ کر مولانا رشید احمد صاحب نے لکھا کہ حضرت نے اسے دیکھ کر فرمایا:

''اچھا یہ کتاب چھپ گئی، میں تو رام پور کے کتب خانے میں اس کا مطالعہ کر چکا ہوں''(۳)۔

☆......: مخطوطات کے ذکر پر کس طرح معلومات کا دفتر کھول کر رکھ دیتے تھے، اس کے لیے آپ کی تحریروں سے کچھ اور اقتباسات ہدیۂ ناظرین کیے جارہے ہیں، 'فہرست مفصل' میں ایک کتاب کے تذکرے پر اپنے ریویو 'فہرست مخطوطات عربیہ......' میں لکھتے ہیں:

''ص ۱۲۹ پر حاجی خلیفہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ''ابن الضیاء...... نے اس تالیف کی شرح ضیاء المعنویہ علی المقدمۃ الغزنویۃ کے نام سے لکھی''۔ شرح کا نام 'کشف الظنون' میں بے شبہہ ایک جگہ یوں ہی لکھا ہے، اور دوسری جگہ ضیاء معنویہ لکھا ہے، مگر اس کا صحیح نام 'الضیاء المعنوی شرح مقدمۃ الغزنوی' ہے، اور اس کا ایک قلمی نسخہ فرنگی محل-لکھنؤ- میں مفتی عبدالقادر صاحب کے پاس میں نے دیکھا تھا، مگر افسوس ہے کہ وہاں اس کتاب کا صرف نصف اول ہے''(۴)۔

☆......: ایک اور کتاب 'احکام الصغار' کے تذکرے پر اس کے مخطوطات کے بارے میں یوں انکشافات کر رہے ہیں:

''ص ۱۳۷ پر 'احکام الصغار' مولفہ اسروشنی کا تعارف ختم کرنے سے پہلے فہرست نگار نے یہ نہیں بتایا کہ اس کے قلمی نسخے دوسرے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں یا نہیں؟ اس لیے ایک مختصر سی نشان دہی کی جاتی ہے: اس کا ایک نسخہ کتب خانہ بلدیہ اسکندریہ میں ہے؛ اور ہندوستان میں کتب خانہ شاہ پیر محمد -احمد آباد- میں ایک نسخہ میں نے دیکھا ہے؛ دوسرا دارالعلوم امدادیہ -بمبئی- کے کتب خانہ میں ہے، اس کو بھی احقر نے دیکھا ہے''(۵)۔

---

(۱) المآثر ج ۲ ش ۳ ص: ۷۷

(۲) مشہور فاضل ومحقق اور رضا لائبریری رام پور کے ڈائرکٹر تھے ۱۴۰۲ھ = ۱۹۸۱ء میں وفات پائی (کاروان رفتہ: ۴۷)۔

(۳) المآثر ج ۲ ش ۳ ص: ۸۳-۸۲ (۴) معارف، ج ۱۲۳ ش ۴ ص: ۳۱۵-۳۱۴ (۵) ایضاً ص: ۳۱۵

جعفر بوبکانی کی ایک کتاب 'عجالۃ الطالبین' کے ذکر پر اس کے قلمی نسخے کی نشان دہی کے ساتھ ان کی حیات سے متعلق بھی مفید باتیں بیان فرمائیں، مذکورہ بالا مضمون ہی میں اس کے آگے رقم طراز ہیں:

''جعفر بوبکانی کی تالیفات میں فہرست نگار نے 'عجالۃ الطالبین' کا ذکر کیا ہے، مگر یہ کتاب فہرست نگار کی نظر سے نہیں گذری ہے۔ میں نے اس کا ایک نسخہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد میں دیکھا ہے، اس میں مولف نے تصریح کی ہے کہ ۹۹۲ھ میں 'عجالۃ الطالبین' کی تالیف سے فارغ ہوا۔

فہرست نگار کے پاس جعفر کے ۹۷۹ھ ہی تک زندہ رہنے کا تحریری ثبوت تھا، اس نئے حوالے سے اس کی زندگی میں تیرہ سال کا مزید اضافہ ہوا''[1]۔

اور طائرِ قلم یہیں نہیں رک جاتا، اس کتاب کی نسبت مزید معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں، جو پڑھنے اور یاد رکھنے کے لائق ہے:

''یہاں یہ بتا دینا بھی خالی از فائدہ نہیں ہے کہ 'عجالۃ الطالبین' شیخ محمد طاہر پٹنی کی 'تذکرۃ الموضوعات' کا مختصر ہے، میں نے سرسری طور پر اس کا مطالعہ کیا ہے''[2]۔

☆......: مولانا محمد بن موسی میاں کو جو خطوط لکھے ہیں، ان میں بہت سی کتابوں کے قلمی نسخوں کے بارے میں نہایت مفید اطلاعات اور معلومات ہیں، مثلاً: ۲۷ دسمبر ۱۹۵۸ء کے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

۲۔'مشکل الآثار' کا کامل نسخہ مکتبہ فیض اللہ آفندی استنبول میں ہے، اور جس تقطیع پر وہ چھپی ہے یعنی ....اس سائز کے ....صفحات تقریباً غیر مطبوع ہیں یعنی تین جلدیں، ایک مختصر سا غیر مطبوع حصہ دیوبند میں بھی ہے، تلاش کرنے سے ہندوستان میں اور حصے بھی ان شاء اللہ ملیں گے، مگر اس کے لیے جہاں جہاں نوادر محفوظ ہیں، وہاں کا سفر کرنا پڑے گا''۔

☆......: ۱۱ر شعبان ۱۳۷۸ھ کے خط میں ایک طویل فہرست ان مخطوطات کی ذکر کی ہے، جو حیدرآباد کے سفر کے دوران آپ کے علم یا مطالعہ میں آئے، وہ فہرست یہ ہے:

''حیدرآباد میں بہت سے علمی نوادر دیکھنے میں آئے، ان میں سے چند کا ذکر کرتا ہوں:

۱) کتاب **الجمع بين الصحيحين للحميدي** کا بہت اچھا نسخہ وہاں ہے، اس کا نصف اول رام پور میں بھی ہے، اس کتاب میں حمیدی نے صحیحین کی احادیث کو مسانیدِ صحابہ کی ترتیب پر نہایت عمدگی سے یکجا کر دیا ہے۔

۲) علامہ سیوطی کی جمع الجوامع کا قدیم نسخہ ۹۵۱ کا لکھا ہوا۔ اس کا ایک حصہ گلبرگہ میں بھی میں نے دیکھا ہے۔

۳) **معاني الآثار للطحاوي** کی **شرح مباني الأخبار للشيخ بدر الدين العيني** کی

(۱) معارف ج ۱۲۳ ش ۴ ص: ۳۱۶ (۲) ایضاً ص: ۳۱۶

بعض جلدیں بخط مولف۔

۴)مسند ابویعلی۔

۵) تسديد القوس في ترتيب مسند الفردوس للحافظ ابن حجر.

۶) تحفة الاشراف یعنی اطراف مزی کے دو ناقص نسخے، جن کو یکجا کرنے سے ایک کامل نسخہ مہیا ہوسکتا ہے۔

۷)زوائد مسند بزار للحافظ ابن حجر۔

۸) أعلام السنن في شرح معاني الجامع الصحيح للبخاري وتفسير غريبه وإيضاح مشكله للامام الخطابي ۲۹۷ورق۔

۹) مشارق الأنوار للقاضي عياض وحل مشكلات الفاظ وأسماء بخاري ومسلم وموطا.

۱۰) كتاب الثقات لابن حبان ۴ جلدوں میں۔

۱۱) تهذيب الكمال للحافظ المزي.

۱۲) منية المصلي کی بہترین شرح جس کا حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ذکر فرمایا کرتے تھے، یعنی ابن امیر الحاج کی حلبة المجلي کا بہترین نسخہ، یہ کتاب بہت کم یاب ہے۔

۱۳)لمعات شرح مشکوۃ از شیخ عبدالحق محدث دہلوی متعدد کتب خانوں میں ہے، مگر حیدرآباد کا نسخہ بہت عمدہ اور قدیم ہے۔

فقہ حنفی کی بہت سی قدیم اور نایاب کتابوں کے نسخے بھی یہاں دیکھنے میں آئے؛ الغرض یہ فہرست بہت لمبی ہے، جس کی اس خط میں گنجائش نہیں ہے''۔

اسی خط میں حیدرآباد کی ان کتابوں کی فہرست کے بعد 'تکمیل الاذہان' کے کچھ نسخوں کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''تکمیل الاذہان' کا ایک نسخہ دیوبند میں تھا، مگر میں نے اس دفعہ تین دن تک اس کو تلاش کیا اور کرایا، مگر نہیں مل سکا، معلوم نہیں کہاں رُل گیا۔ دوسرا نسخہ اس کا رام پور کے کتب خانہ میں ہے، مزید تفتیش کررہا ہوں، یہ کتاب میں نے دیکھی ہے، بہت لطیف الحجم ہے، اس کا چھپنا آسان ہے، ۷۰-۸۰ صفحات ہوں گے''۔

☆......: ۱۴رمضان المبارک ۱۳۷۸ھ کے خط میں لکھتے ہیں:

''دوسری اطلاع یہ ہے کہ 'فتح المنان فی تائید مذهب النعمان' از شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ایک نسخہ جامعہ ملیہ دہلی میں موجود ہے، میں نے خود دیکھا ہے، آپ کے علم میں بھی یہ بات ہوگی

کہ حنفی نقطۂ نظر سے اس کتاب کو اہمیت حاصل ہے، اس کی اشاعت بھی علماء وطلبۂ مدارس کے لیے مفید ونافع ہوگی، کتاب کی زبان عربی ہے، ارکان خمسۂ اسلام سے متعلق احادیث پر مشتمل ہے، جمع احادیث مشکوۃ کے نہج پر ہے، ہر باب میں سرد احادیث کے بعد اختلافی مسائل پر بحث بھی ہے، اندازاً متوسط تقطیع کے ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہوگی، اس سے میرا مقصد محض یہ ہے کہ یہ کتاب بھی آپ کے پیشِ نظر رہے، تاکہ اگر کبھی موقع ہو اور آپ مناسب سمجھیں تو اس کی اشاعت کی سعادت بھی خدا کرے آپ ہی کو حاصل ہو۔ معلوم ہوا ہے کہ اس کا دوسرا نسخہ حیدرآباد میں بھی ہے۔''

☆...... ۲۱/ذی قعدہ ۱۳۷۸ھ=۳۰/مئی ۱۹۵۹ء کے خط میں حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کی عجیب وغریب کتاب 'اسرار المحبۃ' کی اطلاع دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''شاہ رفیع الدین دہلوی کا ایک رسالہ 'اسرار المحبۃ' قلمی بمبئی میں دیکھا تھا، اور ایک رسالہ ان کا سیرت میں بہرائچ میں ہے''۔

۲۱/ذی قعدہ کا یہ خط بہت طویل اور کئی صفحات پر مشتمل ہے، اس میں ان ۱۳/کتابوں کو جو حیدرآباد کے حوالے سے اوپر ذکر جا چکی ہیں، دوبارہ نقل کرتے ہیں، اور اسی کے ساتھ کچھ اور کتابوں کی بھی نشان دہی کرتے ہیں، جو کتابیں اوپر ذکر نہیں کی گئی ہیں اور اس خط میں ان کی نسبت لکھا ہے، وہ حسبِ ذیل ہیں:

☆......: ''معانی الاخبار للکلاباذی جلد اول: اس کتاب سے ابن حجر نے القول المسدد وغیرہ میں استفادہ کیا ہے، اور حضرۃ الاستاذ الکشمیری رحمہ اللہ بھی اس کے مداح تھے۔ (احمدآباد)

☆......: کتاب الثقات لابن شاہین تو ان شاء اللہ اب طبع ہی ہوجائے گی۔

☆......: نخب الافکار فی شرح معانی الآثار للشیخ بدرالدین العینی کی ۷/جلدوں کا عکس جو مصر سے حاصل کیا گیا ہے، سہارن پور میں موجود ہے۔

☆......: المختصر الکافی للحاکم الشہید - فقہ حنفی کی قدیم ومستند کتاب - مکتوبہ ۷۱۴ھ، نیز اس کا عکس دونوں حیدرآباد میں ہیں۔

☆......: کتاب الاعتقاد للبیہقی ۳۲۱ صفحات، تقطیع متوسط، اس کتاب کی حضرت شاہ عبدالعزیز محدث نے بستان المحدثین میں تعریف کی۔ حیدرآباد میں ہے۔

☆......: شرح عقیدۂ طحاوی للمولی محمد الحنفی ۱۰۳ صفحات (حیدرآباد)۔

☆......: الذخیرۃ البرہانیہ للامام برہان الائمہ، فقہ حنفی، (حیدرآباد)۔

☆......: تنزیہ الشریعۃ فی بیان الاحادیث الموضوعہ لابن عراق (حیدرآباد)۔''

۱۹/صفر ۱۳۷۹ھ= ۲۵/اگست ۱۹۵۹ء کے ایک خط میں - جو تین سے زائد صفحات میں ہے - رضا لائبریری رام پور کے بہت سے مخطوطات کے بارے میں بہت ہی اہم اور بیش قیمت معلومات رقم فرمائی ہیں،

یہاں خاص طور سے دو کتابوں کے نسخوں کے بارے میں آپ کے الفاظ نقل کیے جار ہے ہیں:

☆......: ''علامہ سبکی کی 'طبقات الشافعیۃ الکبریٰ' چھپ گئی ہے، رام پور میں ان کی طبقات وسطیٰ کا بہت عمدہ نسخہ موجود ہے اور یکتا نسخہ ہے، ۸۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

☆......: 'تہذیب الکمال' للمزی کا اختصار جونہایت مستند وعمدہ ہے اور اس کا نام 'نهاية السول في رواة الستة الأصول' ہے، حافظ سبط ابن العجمی کی تصنیف ہے، بہت ضخیم اور نہایت باریک خط ہے، اور اس قابل ہے کہ اس کو طبع کرا دیا جائے، خوبی یہ ہے کہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے''۔

مولانا محمد موسیٰ میاں کے نام کے مکاتیب کی تعداد بہت ہے، اور ان میں کتابوں کے بارے میں معلومات واطلاعات بھی خوب ہیں، لیکن ان ہی چند خطوط پر اکتفا کرتے ہوئے بعض اور کتابوں کی نسبت بھی کچھ افادات نقل کرنا چاہتے ہیں، حضرت مولانا ابوالوفا افغانیؒ کو ۳؍ ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ کے ایک خط میں لکھا ہے:

''اسکندریہ کے دو کتب خانوں - جامع الشیخ وبلدیہ - میں متعدد نوادر کتب حنفیہ کا پتہ چلتا ہے، مثلاً تحفۃ الفقہا للسمرقندی، حاوی الحصیری، شرح الزیادات للعتابی، شرح ادب القاضی لعمر بن عبد العزیز، اور الوجیز لبرہان الدین البخاری وغیرہ۔ قاہرہ کے معہد المخطوطات المصورۃ میں مذکورہ بالا کتب کے عکوس اسکندریہ سے حاصل کیے گئے ہیں، معہد مذکور میں لباب کا عکس بھی اسکندریہ ہی سے حاصل کیا گیا ہے، میں نے معہد کی فہرست (الفہرس التمہیدی) جس کو زرکلی صاحب الاعلام لائے تھے، جدہ میں عبد المجید حریری کے یہاں دیکھی تھی''۔

اور ۳۰؍ دسمبر ۱۹۵۳ء کو مولانا افغانی ہی کے نام کے ایک خط میں لکھا ہے:

''رسالہ فی الرد علی صلاۃ القفال کا قلمی نسخہ اس دفعہ میں نے لکھنؤ میں دیکھا ہے، شرح سیر صغیر للسرخسی کا نسخہ بھی مطالعہ میں آیا، کیا اس کا نسخہ حیدرآباد میں نہیں ہے؟ الکافی شرح الوافی کی پہلی جلد بھی لکھنؤ میں ہے''۔

☆......: پاکستان کے شیخ نذیر حسین نے ۱۴؍ جنوری ۱۹۷۹ء کے ایک خط کے ذریعے بہت سے سوالات کیے تھے، ان میں ایک سوال یہ بھی تھا:

''مشکوٰۃ کے شارحین میں ایک شارح تورپشتی ہیں، جن کا پورا نام شہاب الدین فضل اللہ بن حسین التورپشتی الحنفی - متوفی ۷۰۰ھ - ہے، ان کے حالات کس کتاب میں ملیں گے؟ ان کی یہ شرح کیسی ہے؟ اور آج تک چھپی بھی ہے یا نہیں؟''

ان کے خط کا جواب علامہ اعظمیؒ نے جو دیا ہے، اس میں اس سوال کے متعلق یہ تحریر فرمایا ہے:

''تورپشتی کا مفصل حال کہیں نہیں ملتا، ان کی کتاب 'مشکوٰۃ' کی نہیں، بلکہ 'مصابیح' کی شرح ہے، اس کا نام 'المیسر' ہے، اب تک طبع نہیں ہوئی ہے، میں نے اس کو دیکھا ہے، کہیں کہیں خود اپنی سند سے

روایت کرتے ہیں، یہ 'مصابیح' کی بہترین شرح ہے، 'الـمُیَسَّـر' کے قلمی نسخے ہندوستان میں پائے جاتے ہیں''(۱)۔

☆......: ایک خط میں جس کے مکتوب الیہ کا نام معلوم نہیں ہوسکا، ابن عدی کی 'کامل' کے نسخوں کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے:

''کامل ابن عدی کے پانچ قلمی نسخوں کا پتہ چل سکا ہے، ایک نسخہ مکتبۃ السلطان الثالث استنبول میں ہے، دوسرا مکتبہ ظاہر یہ دمشق، اور تین نسخے دارالکتب المصریہ-مصر- میں موجود ہیں''۔

☆......: ۱۸/مئی ۱۹۷۱ء کے ایک خط میں مولانا عبداللہ طارق دہلوی نے ترغیب وترہیب سے متعلق کتابوں کے سلسلے میں سوال کیا، تو اس کے جواب میں ان کو لکھا:

''ترغیب وترہیب کے مزید مجموعوں کا ذکر بھی نظر سے گذرا ہے، مگر اس کی کوئی یادداشت تیار نہیں کی، اس وقت صرف یہ لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ابن شاہین کی کتاب 'الترغیب فی فضائل الاعمال' کا قلمی نسخہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد میں، اور ابوالقاسم اصبہانی کی کتاب کا آخر سے ناقص نسخہ کتب خانہ شیخ الاسلام عارف حکمت بے- مدینہ منورہ- میں موجود ہے''۔

مخطوطات پر عقابی نگاہ اور ان کی حیرت انگیز شناخت اور پرکھ کا اندازہ اس خط سے بھی لگایا جاسکے گا، جسے معہد المخطوطات العربیہ کی کتاب پڑھ کر مشہور مصری محقق شیخ صلاح الدین المنجد کے نام تحریر فرمایا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆......☆

ہمہ جہت اور نادرۂ روزگار شخصیت

علامہ اعظمیؒ کا علم ومعرفت ہمہ جہت اور علمی وفکری میدان بہت وسیع وعریض تھا، آپ کا شہباز فکر اور طائر ہمت شاعر مشرق کے اس شاہین کی طرح تھا، جو اپنا بسیرا پہاڑوں کی چٹانوں میں کرتا ہے، اور وسیع وعریض صحرا کی لامحدود فضاؤں میں اڑان بھرتا ہے، اور اس عنقا کی طرح تھا جس کا آشیانہ آسمان کی بلندیوں پر ہوتا ہے:

کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اس موقع پر ان علوم وفنون کا تذکرہ کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے، جو آپ کے مجال درس وتدریس اور مضمار بحث وتحقیق رہے ہیں، اور جن میں آپ کے خامۂ گہربار نے حیرت انگیز جولانی دکھائی ہے، اس میں سب سے پہلے ''تفسیر'' کے فن کو لیا جارہا ہے، کہ اس کو کلام الٰہی کے ساتھ ربط وتعلق ہوتا ہے۔

تفسیر واصول تفسیر:

قرآن کریم اپنے دامن میں اس قدر وسعت وتبحر لیے ہوئے ہے، کہ اس کے ایک ایک لفظ میں سمندر

(۱) المآثر ج۴ش۲ص:۹۵۔ علامہ تورپشتی کی کتاب 'المیسر' اب مکہ مکرمہ کے دارالباز سے چھپ گئی ہے۔

کی گہرائی پنہاں ہے، اور جس قدر اس میں غور وفکر سے کام لیا جائے، معانی ومفاہیم کے نئے نئے آفاق ظاہر ہوتے رہتے ہیں، اور اس کے بعد بھی **لا ینقضی عجائبہ** کا منظر رہتا ہے، قرآن خود جگہ جگہ اپنے اندر تدبر وتفکر کی دعوت دیتا ہے۔

قرآن کریم میں اگر حامل قرآن اور مہبط انوار وحی ورسالت ﷺ کے فرمودات وتعلیمات، اور آپ سے فیض یافتہ صحابہ وتلامذہ اور ان کے بعد ان کے متبعین اور پیروکاروں کی تفسیر وتشریح اور تعلیم وتفہیم کی روشنی میں غور وتدبر کیا جائے اور اس کے مطالب ومعانی سمجھنے کی کوشش کی جائے، تو سراپا سعادت اور عین فضل خداوندی اور ذریعۂ عزت وسربلندی ہے؛ لیکن اگر دماغی رو ذرا بھی بہکی، اور اپنے فہم اور سمجھ پر انحصار کیا گیا، اور خدا اور رسول کی تعلیمات سے سرموانحراف اور صرف نظر کیا گیا، تو بجائے ہدایت وسعادت کے ذلت ورسوائی مقدر ہو جاتی ہے، اور ’’ایں رہ کہ می روی بہ ترکستان است‘‘ کا مصداق ہو جاتا ہے۔

تفسیر قرآن کے تعلق سے دو رسالے علامہ اعظمیؒ کے اشہبِ قلم کی یادگار ہیں، پہلا رسالہ ’التنقید السدید‘ کے نام سے ہے، جس کی وجہ تالیف اور دیگر تفصیلات پیش نظر کتاب کے حصہ تفسیر میں بیان کی جائیں گی۔ اور دوسرا رسالہ ’نسخ کوئی معیوب چیز نہیں ہے‘ جو اپنے موضوع ومواد اور محتویات کے لحاظ سے اردو زبان کا ایک منفرد رسالہ ہے، اور جس میں ہندوستان کے ایک بڑے عالم کے ’’نسخ‘‘ کے سلسلے میں معتزلہ کے افکار وخیالات سے مشابہ بعض نظریات کا رد کیا گیا ہے۔

تفاسیر قرآن کا مطالعہ کتنا وسیع تھا، اور تفسیر پر آپ کی کس قدر گہری نگاہ تھی، اس کا اندازہ ان اقتباسات اور حوالہ جات سے کیا جا سکتا ہے، جو ’انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت‘ میں ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ﴾ کی تفسیر میں حوالۂ قلم کیے گئے ہیں۔ اسی طرح دوسرے کتب ورسائل میں جہاں کہیں کسی مسئلے یا حکم کے ثبوت کے لیے آیات قرآنیہ سے استدلال کا موقع آتا ہے، وہاں علم ومعرفت کا ایسا سرچشمہ جاری ہوتا ہے کہ رازی وغزالی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

مقدمہ معارف الحدیث میں حجیتِ حدیث پر قرآن کریم کی بیسیوں آیتوں سے جو استدلال واستشہاد کیا ہے، اور ’شارع حقیقی‘ میں آنحضرت ﷺ کے منصب ومقام کے متعلق جو آیتیں استدلال میں پیش کی ہیں، ان سب سے قرآن کریم کے فہم وتدبر اور اس سے استنتاج اور اخذ معانی کی غیر معمولی استعداد وصلاحیت اور ذہن وفکر کی رسائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

علم حدیث:

علم حدیث میں علامہ اعظمیؒ کو جو فضیلت اور امامت حاصل تھی، اس کا اعتراف ادانی واقاصی سب کو ہے، اس علم میں آپ کے ید طولی، راسخ قدمی، ثاقب نظری اور ژرف نگاہی کو عرب وعجم سب نے تسلیم کیا ہے۔ اور اس

میں آپ کو نہ صرف برصغیر، عالم اسلام بلکہ پوری دنیائے علم میں مرجعیت کی شان حاصل تھی، فن حدیث میں آپ کے غیر معمولی تفوق ہی کا نتیجہ تھا کہ علامہ زاہد الکوثری جیسے بلند پایہ عالم و محقق ''العلامة النحرير والجهبذ الخبير''، شیخ احمد محمد شاکر جیسے حدیث کے عظیم اسکالر ''العلامة الكبير المحقق'' اور ''من أعظم العلماء بها في هذا العصر''، شیخ الازہر شیخ عبدالحلیم محمود جیسے بلند رتبہ عالم ''أكبر علماء العالم الإسلامي'' اور شیخ عبدالفتاح ابوغدہ جیسے ماہر اصول حدیث ''العلامة المحدث البارع الفقيه''، ''العلامة المحقق الجليل''، ''سماحة شيخنا العلامة المحدث الجليل والناقد الفقيه النبيل''، ''الأستاذ الجليل والمحدث الفقيه النبيل شيخنا وبركتنا وبركة العصر العلامة الشيخ'' اور ''العلامة الأجل والمحدث الأنبل'' کہتے اور لکھتے تھے۔ یہ ان علماء عرب کے اعترافات ہیں، جن کا اپنے اپنے زمانے میں عرب کے دشت و صحرا میں طوطی بولتا تھا، مصر و شام اور حجاز و عراق کے بازار علم میں جن کے فضل و کمال کا سکہ چلتا تھا، اور پوری علمی دنیا میں جن کے علم و دانش کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ یہاں بطور مثال صرف چند اہل علم کا نام لکھ دیا گیا ہے، عرب و عجم کے بیسیوں اہل علم کے اعترافات اور تعریفی و توصیفی کلمات اگر دیکھنا ہوں تو اس کتاب کی جلد اول 'حیات ابوالمآثر' از صفحہ ۵۳۴ تا صفحہ ۵۹۶ کا مطالعہ کیا جائے۔

علم حدیث ایک ایسا فن ہے جس کی دسیوں فروع و انواع ہیں، اور علامہ اعظمیؒ کو ہر نوع میں رتبۂ امامت حاصل تھا، روایت و درایت ہو، متن و اسناد ہو، ناسخ و منسوخ ہو، یا معرفت رجال و علل اور دوسرے فنون و مباحث، ترجیحی پہلو کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ ناظرین کو ہلکا سا اندازہ پیش نظر کتاب کے اُس حصے سے ہوگا، جو علم حدیث کی خدمات اور تحقیقات کے ضمن میں آئے گا۔ علاوہ ازیں اس کتاب کے آخر میں کچھ مکاتیب درج ہیں، ان سے بھی اس میں آپ کے علوم رتبہ اور مرجعیت کا اندازہ ہو سکے گا، نیز 'الألباني: شذوذه وأخطاؤه'' کے ذریعے علوم حدیث پر آپ کے ید طولی اور قدرت کاملہ کو دیکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ یہاں آپ کی بعض کتابوں کے حوالے سے علم حدیث کے مختلف شعبوں پر آپ کی دقت نظر اور باریک بینی کی چند مثالیں پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اصولِ حدیث:

اصول حدیث پر علامہ اعظمیؒ کی امامت و مہارت کا اندازہ ان کتب و رسائل سے ہوتا ہے، جو رد غیر مقلدیت یا دفاعِ حنفیت میں آپ نے تحریر فرمائے ہیں، اس جماعت کے رد میں آپ کی تحریریں زیادہ تر اصول حدیث کے گرد گھومتی ہیں، ان کی گرفت اور ان کا جواب عموماً حدیث شریف کے اصول و قواعد ہی کی روشنی میں سپرد قلم فرماتے ہیں۔ 'فتح المغیث' کی تحقیق کے علاوہ اصولِ حدیث کی بہت سی کتابوں پر آپ کے استدراکات و حواشی سے بھی میں مہارت تامہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

متون احادیث پر مہارت:

احادیث کے متون پر غیر معمولی بصیرت اور ژرف نگاہی کے لیے وہ تعلیقات کافی ہیں، جو آپ کے کلک

گہر بار نے حدیث شریف کے نادر اور قدیم مخطوطات پر موتیوں کی طرح بکھیرے ہیں، اور نہ صرف نسخوں کے مقابلہ سے بلکہ اپنے راسخ علم و آگہی اور ذوق سلیم وصحیح سے کام لیتے ہوئے متون کی تصحیح کی ہے، تصحیح متون سے آپ کی تحقیق سے شائع ہونے والی کتابوں کے صفحات معمور ہیں۔

رجال حدیث:

اس فن میں علامہ اعظمیؒ کا پایہ مسلَّم اور امامت تسلیم شدہ تھی جس کا بہت حد تک اندازہ 'الحاوی' اور کتاب 'الثقات' کے تعارف میں ہوسکتا ہے۔ نیز کتب حدیث پر آپ کے جو حواشی ہیں، اور ان میں راویوں کی جو تحقیق ہے، اسی طرح مختلف کتابوں پر آپ کے جو استدراکات ہیں، ان سے بھی اس فن کی حیرت انگیز حد تک غواصی، راویوں کی معرفت، ایک ایک راوی کی شخصیت کا استحضار، اور اس کے نام ومقام کی واقفیت، اور اس فن کی کتابوں کا ایسا مطالعہ واحاطہ گویا ہر راوی اور اس کا رتبہ ذہن میں محفوظ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس فن میں جو کمال حاصل تھا، اس کی مثال تاریخ میں کم ملے گی۔

فقہ وافتا:

مبدأ فیاض سے آپ کو جامعیت کی عجیب شان عطا فرمائی گئی تھی، آپ کے علم ومعرفت کا ہر پہلو دوسرے سے زیادہ روشن اور تابناک تھا، علوم اسلامیہ کا اہم ترین شعبہ اور حصہ علم فقہ کا ہے، بلکہ اس کو اسلامی احکام وتعلیمات کا خلاصہ اور لب لباب کہنا چاہئے، تفقُّہ فی الدین کی فضیلت کو اس سے سمجھنا چاہئے کہ قرآن میں اس کو نہایت اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور اس کے متعلق یہ آیت وارد ہوئی ہے: ﴿فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ [التوبة]، اور حدیث کی رُو سے معلوم ہوتا ہے کہ فقیہ خیر جیسی لازوال نعمت کا حامل اور اس سے بہرہ مند ہوتا ہے، فرمایا گیا ہے: مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْراً يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ. فقہ علم کے شعبوں میں بہت اہم شعبہ، نہایت عظیم دولت اور قدرت کا بہت بڑا عطیہ وفیضان ہوتا ہے، لیکن یہ جنس بازارِ علم وحکمت میں نہایت نایاب ہوتی ہے، اور اس جنس نایاب سے بھی علامہ اعظمیؒ کو ایسا حظ وافر ملا تھا کہ آپ اجلۂ فقہا کی صفوں میں کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ اس دور کے بہت بڑے فقیہ النفس تھے، صرف فقہی کتابوں اور متون وعبارات ہی پر نگاہ رسا نہیں رکھتے تھے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دلائل کی تمحیص، اور استخراج واستنباطِ مسائل کی غیر معمولی استعداد وصلاحیت بھی قدرت نے نہایت فیاضی کے ساتھ ودیعت کی تھی، بہت سے سنگین اور پیچیدہ مسائل جن میں ماہر اور کامل علما وفقہا کا ذہن الجھا رہتا، آپ کے قلم کی ایک جنبش تمام الجھنوں کو دور کر کے مسئلے کو بے غبار کر دیتی؛ کتنے ایسے مسائل ہیں جو صف اول کے اہل علم کے درمیان مختلف فیہ رہے ہیں، آپ نے ان میں فیصلہ کن اور حاکمانہ رول ادا کیا ہے؛ ایک دو نہیں نہ جانے کتنے فقہی مباحث اور مسائل ہیں، جن میں آپ نے وہ دادِ تحقیق دی ہے، وہ نکتہ آفرینی کی ہے، اور علم وحکمت کے وہ جواہر ریزے اور شہ پارے بکھیرے ہیں، جن کو دیکھ کر اہل علم کی

نگاہیں خیرہ اور قلب و دماغ محوِ حیرت ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کے کلک گہر بار اور اصابتِ فکر ورائے نے بہت سے مشکل اور نازک لمحات میں اہل علم کی رہنمائی کے فرائض انجام دیے ہیں، اور حاملین فقہ وفتاوی کے سامنے علم وعمل کی راہیں روشن کی ہیں۔

''دارالاسلام دارالحرب''، ''بیمہ''، ''انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت''، ''رہبر حجاج''، ''زراعت وجاگیرداری''، اور الموسوعة الفقهية کے لیے لکھا ہوا کتاب الجنائز جیسے مستقل کتب ورسائل کے علاوہ بڑی تعداد میں آپ کے تحریر فرمودہ فتاوی آپ کی فقہی مہارت، اور اس دقیق فن میں آپ کی دقت نظر کی شہادت دیتے ہیں۔ آپ کی فقہی بصیرت کا اعتراف آپ کے عہد شباب میں اس زمانے کے کبار علما نے کیا تھا، اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ ۱۳۶۴ھ = ۱۹۴۵ء میں جبکہ آپ کی عمر محض ۴۵ برس تھی، دارالعلوم دیوبند کی صدارتِ افتا کے لیے- جو مذہبی لحاظ سے ہندوستان کا معزز ترین منصب ہوتا ہے- اس کی مجلس شوریٰ کی نظرِ انتخاب آپ پر پڑی، حالانکہ یہ وہ دور تھا جبکہ ابھی ملک کے ٹکڑے نہیں ہوئے تھے، اور ہندوستان کے طول وعرض میں بڑے بڑے خداوندانِ علم مسندآرائے درس وافادہ تھے، لیکن اِس منصب جلیل کے لیے اُس وقت کے ارکانِ شوریٰ کی عقابی نگاہ اگر کہیں ٹکتی ہے، تو اُس بوریہ نشین پر جو ایک دورافتادہ مقام کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا ''اس مقدس سازش'' سے بے خبر خاموشی کے ساتھ عروس علمی کی مشاطگی اور حنابندی کررہا ہے، اور یہی نہیں اس منصب صدارت پر لے جاکر ممکن کرنے کے لیے دارالعلوم کے شیخ الحدیث شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی -متوفی ۱۳۷۷ھ = ۱۹۵۷ء- اور اس کے باوقار مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی -متوفی ۱۴۰۳ھ = ۱۹۸۳ء- سفر کی صعوبت ومشقت اٹھا کر مئو تشریف لاتے ہیں، مگر اہل شہر دامن تھام کر کھڑے ہوجاتے ہیں، اور اپنے آپ سے جدا کرنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے۔

۱۹۴۵ء ہی کی بات ہے کہ اہل علم کے درمیان ایک فقہی مسئلے پر اختلاف رائے پیدا ہوتا ہے، اور یہ اختلاف اس قدر وسیع ہوجاتا ہے کہ اتفاق کی کوئی صورت نہیں نظر آتی، اور ہر فریق اپنے موقف کو فقہی نقطۂ نظر سے مویَّد اور مدلَّل سمجھتا ہے، اس سنگین وقت میں ہندوستان کی سب سے قدآور شخصیت کی طرف سے جو تجویز آتی ہے، اس کو مولانا نظام الدین اسیر ادروی نے اس کے پس منظر کی عکاسی کے ساتھ اس طرح قلم بند کیا ہے:

> ''۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علماء ہند کا کل ہند سالانہ اجلاس سہارن پور میں ہوا، اس میں دوسرے مسائل کے ساتھ امارت شرعیہ کا نظام قائم کرنے کا مسئلہ درپیش ہوا، ورکنگ کمیٹی ایک مسئلہ پر متفق ہوگئی، مگر علماء سہارن پور کو دلائل کی بنیاد پر اس سے اختلاف تھا، اور یہ اختلاف تحریری طور پر ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش بھی کردیا گیا، ارکانِ عاملہ میں برہمی پیدا ہوگئی، علماء سہارن پور اور مجلس عاملہ دونوں کو اپنے اپنے نقطۂ نگاہ پر اصرار تھا، اور محاذ آرائی کی شکل اختیار کرتا جارہا تھا، جلسہ کی صدارت دنیائے اسلام کی ایک مقتدر شخصیت انجام دے رہی تھی، وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی ذات گرامی تھی،

صدر نے اپنے اختیارات خصوصی سے اس فیصلہ کو کالعدم قرار دے کر آئندہ کے لیے ملتوی کرنے کا حکم دیا اور یہ تجویز متفقہ طور پر منظور کرائی کہ جمعیۃ علما کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے جب بھی کوئی فقہی مسئلہ پیش ہو تو محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی سے استصواب کیے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ تجویز پوری مجلس عاملہ نے متفقہ طور پر منظور کی، جب کہ مولانا اعظمی اجلاس میں موجود بھی نہیں تھے۔ یہ مولانا اعظمی کی فقہی بصیرت پر کلی اعتماد اور ان کے فضل وکمال کا اعتراف کئی درجن عظیم المرتبت علما ومشائخ کی مجلس میں کیا جارہا ہے اور کسی کو مجال اختلاف نہیں تھا''[۱]۔

اسیر صاحب کے اس بیان کی تائید مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی کی تحریر سے بھی ہوتی ہے، جو انھوں نے خلیفۂ شیخ الاسلام حضرت مولانا عبدالحی چشتی علیہ الرحمہ-متوفی ۱۳۹۵ھ=۱۹۷۵ء- کے حوالے سے لکھی ہے، ان کی تحریر کا متن یہ ہے:

''حضرت مولانا عبدالحی چشتی خلیفہ حضرت شیخ الاسلام فرماتے تھے کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کی تجویز پر مجلس شوریٰ میں یہ طے ہوگیا تھا، ہر وہ تجویز جس کا تعلق انتظام وانصرام کے بجائے دین وشریعت اور فقہی احکام سے ہو، اس کی تصدیق وتصویب جب تک محدث اعظمی نہ فرمادیں، نافذ العمل نہیں ہوگی''[۲]۔

فقہی مرجعیت:

سطور بالا سے واضح اور ثابت ہوگیا کہ فقہی مسائل میں آپ چوٹی کے اہل علم کا مرجع تھے، اور محقق علما فقہی معاملات میں آپ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے، دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا فیصلہ اور جمعیۃ علما کی ورکنگ کمیٹی کی تجویز معلوم ہوچکی، ہندوستان کے ایک بہت نامور اور صاحب فضل وکمال عالم مولانا سید سلیمان ندویؒ-متوفی ۱۳۷۲ھ=۱۹۵۳ء- تھے، علامہ اعظمیؒ کی ذات پر آپ کے اعتماد کا حال 'حیات سلیمان' کے مصنف مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ نے یوں لکھا ہے:

''مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اگرچہ سید صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے، لیکن حدیث اور فقہ پر گہری نظر تھی، اس لیے سید صاحب ان کی بڑی قدر کرتے تھے، اور فقہی مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے''[۳]۔

تاریخ وتذکرہ:

اسلام نے دیگر علوم وفنون کی طرح فن تاریخ کو بھی بہت عظمت وبلندی عطا کی ہے۔ تاریخ دو قسم کی ہوتی ہے، ایک وہ جو ملوک وسلاطین کی زندگیوں کی حرکت کے ساتھ متحرک رہتی ہے، اور حکمرانوں کی کشور کشائی،

(۱) ترجمان الاسلام، جنوری-مارچ ۱۹۹۳ء:۶-۵ (۲) ماہنامہ 'دارالعلوم'-وفیات نمبر-ص:۱۵۶ (۳) حیات سلیمان:۶۳۷

ان کی تخت نشینی اور معزولی، ملک گیری، فتح وشکست، اور باہمی آویزش و یورش کے گرد گردش کرتی رہتی ہے، اس تاریخ میں سطح زمین پر پیش آنے والے واقعات وحوادث کو حکمرانوں اور فرمانرواؤں کی شاہانہ سرگرمیوں کے ساتھ مربوط اور وابستہ کر کے دیکھا اور لکھا جاتا ہے، جس میں شاہانہ کروفر کے سامنے دوسرے واقعات ومضامین گم ہو کر رہ جاتے ہیں، اس تاریخ میں انسان کو بحیثیت انسان کم اور بحیثیت صاحب تخت وتاج زیادہ دیکھا جاتا ہے۔

تاریخ کی دوسری قسم وہ ہے جس میں انسان کو بحیثیت انسان جانچا اور پرکھا جاتا ہے، جس میں بنی آدم کی سیرت وکردار اور اوصاف وکمالات کو اخلاق وکردار کے آئینے میں دیکھا جاتا ہے، اور فضل وکمال اور اخلاق وعادات کے اس پہلو کو آشکارا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو بنی نوع انسان کے لیے مشعل راہ ہدایت بن سکے۔

افراد وشخصیات کی تاریخ یعنی سوانح اور تذکرہ وتراجم علامہ اعظمیؒ کے علم وقلم کی وسیع ترین جولان گاہ تھے، اس فن میں آپ کی معلومات کی وسعت کا یہ حال تھا کہ اگر کہا جائے کہ چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ آپ کے لوح قلب پر نقش اور ذہن پر ثبت تھی، تو اس میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں ہوگا۔ نہ صرف راویان حدیث کی تاریخ اور احوال، بلکہ اہل علم ودانش اور ارباب فن کے ہر طبقے کے افراد اور اصحاب کمال کے حالات زندگی آپ کے دل ودماغ میں مرتسم تھے، اس فن میں آپ کے رشحات قلم کو دیکھ کر احقر کو کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی شخصیت کی یہ جہت دوسری جہات پر بھاری اور ان سے بڑھ کر تھی، اور آپ کے کمال علم وفن کا اہم ترین پہلو تاریخ وتذکرہ کا فن تھا۔ تاریخ وتذکرہ کے فن میں آپ کے عظمت وکمال کا اندازہ 'اعیان الحجاج'، 'دست کار اہل شرف'، 'تعدیل رجال بخاری'، 'حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی'، 'پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں'، 'جواد ساباط'، 'کتاب الذخائر والتحف کس کی تصنیف ہے؟'، 'مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے؟'، 'دینور اور مشائخ دینور'، **'الإتحافات السنية'، 'تحقيق: كتاب الثقات'، 'تحقيق: تلخيص خواتم جامع الاصول'** اور سب سے بڑھ کر **'الحاوي لرجال الطحاوي'** سے کیا جاسکتا ہے، لیکن تاریخ وتذکرہ میں آپ کی وسعت معلومات کی اصل شان ان استدراکات میں جلوہ گر ہے، جو تاریخ کی اہم کتابوں پر مرقوم ہیں۔

اسلامی تاریخ کے ایک باب سے تعلق رکھنے والی آپ کی معرکۃ الآرا تصنیف 'تبصرہ بر شہید کربلا ویزید' ہے، جو اگرچہ ایک کتاب کا جواب اور رد ہے، لیکن اس میں واقعۂ کربلا کے تمام پہلوؤں پر مورخانہ اور ناقدانہ انداز میں بحث کر کے ان کا تجزیہ کیا گیا ہے، جو اس واقعے سے متعلق افراط وتفریط سے الگ ہو کر علمی وتاریخی تحقیق کی روشنی میں جادۂ اعتدال کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

زبان وادب–عربی–:

خواہ عربی ہو، یا اردو وفارسی: تینوں پر بدرجۂ کمال دستگاہ حاصل تھی، عربی زبان پر عبور اور قدرت کا مظہر کتب حدیث پر آپ کے جامع اور پُرمغز مقدموں کے علاوہ وہ تعلیقات ہیں، جو بلحاظ ایجاز واختصار کے دریا بکوزہ

کا مصداق ہیں۔عربی زبان وادب پر تفوق کی شہادت خود اس زبان کے فرزندوں اور اس کی آغوش میں پروردہ اہل بصیرت نے دی ہے، شیخ نور الدین عتر دنیائے عرب کے ایک بڑے عالم ومحقق اور مشہور شامی فاضل ہیں، انھوں نے اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

أما اللغة والأسلوب: فالشيخ الجليل حبيب الرحمن يَبُزُّ أبناءَ البلاغة العربية في فصاحة اللغة، وعُلوِّ البيان العلمي الرصين[1].

رہا سوال زبان واسلوب کا: تو بزرگوار شیخ حبیب الرحمٰن زبان کی فصاحت اور مضبوط علمی نگارش کی بلند آہنگی میں بلاغت عربی کے فرزندوں پر فائق ہیں۔

پھر عربی زبان میں مہارت ہی کا تذکرہ اور دوسرے مدعیان علم ومعرفت سے آپ کا موازنہ کرتے ہوئے چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

بينما تجدک مع الشيخ العلامة الأعظمي أمام رسوخ في اللغة وفي الأدب في كلِّ ما قدَّمه من تحقيقٍ أو تأليفٍ، بل أمام سبقٍ في الأدب العربي بأشعاره اللطيفةِ وقصائده البليغةِ[2].

درانحالیکہ شیخ علامہ اعظمیؒ کے حضور میں ان کے قلم سے نکلی ہوئی ہر تحقیق وتصنیف میں زبان وادب کی پختگی محسوس کروگے، بلکہ ان کے لطیف اشعار اور بلیغ قصائد کو دیکھ کر ادب عربی میں فائق پاؤگے۔

عربی ادب وانشا میں ید طولی، بقول شیخ نور الدین عتر اہل زبان پر تفوق، اور تحریر وکتابت میں فصاحت وبلاغت کے بادلے ٹانکنے کے، بہترین نمونے ان رسائل ومکاتیب میں موجود ہیں، جو آپ نے عرب فضلا کے نام تحریر فرمائے ہیں، اسی طرح اس کا اچھا خاصا نمونہ مشاہیر کی وفات پر آپ کے تحریر کردہ ان تاثرات میں بھی دیکھنے کو مل سکتا ہے، جن میں سے معاصرین سے تعلق رکھنے والے تاثرات کو حیات ابوالمآثر (جلد اول) کے آخر میں شائع کیا جا چکا ہے؛ جو برجستہ، قلم برداشتہ اور فی البدیہہ ہونے کے ساتھ قلب کی گہرائی سے نکل کر آنکھوں کے راستے ٹپکے ہوئے اشک کے قطرے ہیں، اور موتی بن کر صفحۂ قرطاس پر جگمگا رہے ہیں۔

عرب فضلا وعلما کے نام لکھے ہوئے سیکڑوں خطوط ورسائل آپ کے اوراق میں محفوظ ہیں، جو اگر شائع ہو جائیں تو رسائل ومکاتیب- بلکہ اصطلاحی زبان میں ترسُّل- کی دنیا میں بہترین اضافہ ہوں گے۔

اردو زبان وادب:

آپ کی اردو تحریروں کو اگر زبان وادب کی مِکیال میں تولا جائے، تو اس زبان کے بہترین ادب کے خانوں میں رکھی جانے کے قابل ہوں گی، آپ نے اپنی تمام تحریروں کو زبان وادب کے اعلی معیاری سانچوں میں

(۱) مقدمہ محدث الهند الكبير العلامة حبيب الرحمن الاعظمي: ۷ (۲) ایضاً

ڈھال کر پیش کیا ہے۔ زبان کی صفائی وستھرائی، روانی، برجستگی، الفاظ کے دروبست، اور خالص علمی وتحقیقی مضامین کو سہل ممتنع انداز میں پیش کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے، آپ کی تحریروں میں زبان وبیان کا سقم تلاش کرنے سے بھی نہیں مل سکتا۔ اس کی شہادت مشہور فاضل ومصنف مولانا نور عالم خلیل امینی نے آپ کی کتاب 'تعدیل رجال بخاری' پر تبصرہ کرتے ہوئے یوں دی ہے:

والكتابُ –مثلَ تاليفاتِ وكتاباتِ المُحدِّثِ الأعظمي الأخرى– يَنِمُّ عن سعةِ علمِه، ودِقَّةِ نظرِه، وقوَّةِ مُلاحظِته، وإحاطَتِه برجالِ الحديثِ، وأخبارِهم، وأحوالِهم، كما يدلُّ على قدرتِه الفَذَّة بالكتابةِ باللُّغةِ الأرديَّةِ السَّهْلةِ العَذْبةِ المُحكَمةِ النَّسج، وهي مَزِيَّةٌ قَلَّما يُماثِلُه العُلماءُ الهُنودُ من فارِعي الأقدامِ في العِلْمِ والفَضْلِ.[۱]

حضرت محدث الاعظمی کی دوسری تصانیف کی طرح یہ کتاب بھی آپ کے وسعت علم، دقت نظر، قوت گرفت، اور حدیث کے رجال اور ان کے اخبار واحوال کے احاطہ کا پتہ دیتی ہے؛ جس طرح شستہ وشگفتہ اور پُرشوکت اردو زبان میں تحریر وانشا پر ان کی قدرت کا ثبوت فراہم کرتی ہے، جو حضرت محدث الاعظمیؒ کا ایک ایسا امتیاز ہے کہ بلند پایہ اہل علم وفضل میں بھی بہت کم ایسے عالم ہوں گے، جو ان کی ہمسری اور برابری کر سکیں۔

اور مولانا نور عالم امینی سے بہت پہلے ہندوستان کے مشہور ومعروف ماہنامہ 'تجلی' کے مدیر مولانا عامر عثمانیؒ -متوفی ۱۳۹۵ھ=۱۹۷۵ء- نے آپ کی بلاغت اور زور قلم کا یوں اعتراف کیا ہے:

''مولانا اعظمی کا خداداد کمال یہ ہے کہ انتہائی دقیق ونازک نکاتِ فن کو بھی اس سلاست وبلاغت کے ساتھ سپرد قلم فرماتے ہیں کہ ابہام اور ژولیدگی کے بغیر بات آئینہ ہو جاتی ہے..................، ان کے رشحاتِ قلم میں فراست کا جو نور، جو گیرائی، جو عبور اور جو کامل دسترس پائی جاتی ہے، اس سے خاتم المحدثین علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، وہی روشن دراست، وہی استحضار، وہی نگاہ کی جامعیت، وہی تبحر اور وہی شانِ نقد''[۲]۔

ماہر القادری اردو دنیا کے سب سے بڑے تبصرہ نگار اور بے باک نقاد تسلیم کیے گئے ہیں، اردو کے بہت کم مصنف ہوں گے، جو ان کے نقد وجرح کے نشتر سے بچے ہوں گے، اور ماہر صاحب نے زبان اور اس کے قواعد واصول کی روشنی میں ان کی گرفت نہ کی ہوگی، ماہر القادری صاحب کے تبصروں کو دیکھ کر بے ساختہ زبان پر یہ شعر آجاتا ہے:

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں : تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

علامہ اعظمیؒ کے زبان وبیان کی خوبی وصفائی، تعبیر کی پختگی، اور لسانی سقم سے پاک ہونے کی یہ واضح دلیل ہے کہ

(۱) الداعی: ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ = جون ۲۰۰۳ء جلد ۲۷ شمارہ ۴، ص: ۹۲ (۲) تجلی: اکتوبر: ۱۹۶۳ء ص: ۵۵

انھوں نے علامہ اعظمیؒ کی کئی کتابوں پر تبصرے کیے ہیں، لیکن ایک جگہ بھی زبان و بیان کی غلطی یا لغزش کی نشان دہی نہیں کی ہے۔

ان سارے اعترافات سے قطع نظر آپ کے مضامین اور تصنیفات کے مطالعہ کے بعد یہ بات مہر نیم روز کی طرح واضح اور روشن ہو جاتی ہے کہ مشکل سے مشکل مباحث کو کس قدر شگفتہ پیرائے اور سہل اور آسان زبان میں زیب قرطاس فرماتے ہیں۔ برجستہ اور قلم برداشتہ لکھنا کوئی معمولی اور آسان کام نہیں ہے، اور وہ بھی خالص علمی وتحقیقی مضامین کو سلیس اور رواں زبان میں سپرد قلم کر دینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے، اور علامہ اعظمیؒ کی تحریر کا کمال یہی ہے کہ بڑی عمیق اور ادق بحثوں کو نہایت خوبی وخوش اسلوبی کے ساتھ بے تکلف قرطاس وقلم کے حوالے کرتے ہیں، آپ کی تحریریں سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ پُرکاری کا بہترین نمونہ ہوتی ہیں، مافی الضمیر کی ادائیگی میں تکلف اور تصنّع کا ذرا بھی شائبہ نہیں نظر آتا، اس سے بڑھ کر کسی تحریر کی خوبی کیا ہو سکتی ہے کہ علم و دانش میں اضافے کے ساتھ زبان وادب کی لذت وحلاوت اور چاشنی بھی حاصل ہو، یہ کسی بھی تحریر کا منتہائے کمال ہے۔

نثر سے قطع نظر آپ کی نظموں اور غزلوں کو بھی پڑھیے، اس سے بھی آپ کی سخن سنجی اور قادرالکلامی کا پتہ چلتا ہے، شاعری کا کمال یہ ہے کہ قلبی واردات اور جذبات واحساسات کے اظہار میں تکلف اور آورد نہ ہو، اور یہ وصف آپ کی شاعری میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے، جو آورد سے پاک اور آمد کا بہترین نمونہ ہے۔

فارسی زبان:

علامہ اعظمیؒ کے ذاتی ذخیرۂ کتب میں تقریباً دوسو کتابیں فارسی زبان کی ہوں گی، جو تفسیر، فقہ وفتاویٰ، ادب وتاریخ وتذکرہ اور تصوف ہر فن پر مشتمل ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے ذوق کا بھی کس قدر حظ وافر ملا تھا، خاص طور سے فارسی زبان میں لکھے ہوئے تذکروں اور سوانح عمریوں سے آپ کو بہت دلچسپی تھی، اور اس زبان کی کتابوں کا بہت وسیع مطالعہ تھا، اپنی ذاتی مملوکہ کتابوں کے علاوہ دوسرے کتب خانوں اور لائبریریوں سے استفادہ میں فارسی کا عنصر بھی شامل رہتا تھا، اور اس زبان کی کتابوں سے اپنی تصانیف میں استدلال واستشہاد یا اقتباس کے مواقع پر مدد لیا کرتے تھے۔

جہاں تک فارسی تحریر وانشا کا تعلق ہے، اس پر دسترس کی شہادت وہ نگارشات دیتی ہیں، جن میں اہل علم اور مشاہیر ومعاصرین کی وفات پر آپ نے اپنے تاثرات تحریر فرمائے ہیں، نمونہ کے طور پر کچھ تاثرات ہدیۂ ناظرین ہیں:

مولانا احمد علی مفسر: -امیر انجمن خدام الدین-لاہور-تلمیذ رشید مولانا عبیداللہ سندھی وداماد او بود، بسلسلۂ تحریر ہندوستان بارہا اسیر فرنگ شدہ، وازیں جہت مدتے در کابل اقامت کرد، بتفسیر قرآن پاک شغفے عظیم داشت، دائماً بایں کار اشتغال می داشت، یکبار اورا در جون پور زیارت کردہ ام۔ بتاریخ

۱۷؍رمضان ۱۳۸۱ھ یوم جمعہ -۲۳ فروری ۱۹۶۲ء درلاہور وفات یافت۔

جگر مرادآبادی: -سکندر علی جگر مرادآبادی اشہر واشعر شعرائے عصر بود، بارہا مرا اتفاقِ صحبت وسماعِ غزلیات او افتادہ، در گونڈہ رخت اقامت انداخت، ومدتے دراز کہ بیش از سی سال باشد ہمانجا ماند، وبالآخر ہمانجا پیوند خاک شد۔ ۹؍ستمبر ۱۹۶۰ء -۱۶؍ربیع الاول ۱۳۸۰ھ -روز جمعہ بود کہ ازیں جہاں درگذشت، من ابیاتہ المستحسنۃ قولہ:

مرگ عاشق تو کچھ نہیں لیکن اک مسیحا نفس کی بات گئی

مولانا عبدالسلام لکھنوی: -خلف ارشد مولانا عبدالشکور فاروقی مدیر النجم، نخستیں بار کہ من اورا دیدہ بودم درامروہہ پیش والد بزرگوارِ خود -غالباً- قطبی می خواند، باز چوں نسبتِ اخلاص وعقیدت با پدر او استوار کردم، واو از مدرسہ دیوبند فارغ التحصیل شد، اکثر در مسائل علمیہ با من مذاکرہ می کرد، وبغایت اکرام می نمود؛ وقتیکہ من رکن مجلس قانون ساز بودم، در دار المبلغین طرح اقامت انداختہ بودم، لاجرم ہر صبح وشام اتفاق صحبت می افتاد، بر مسائل اختلافیہ شیعہ وسنت اورا عبور تام حاصل بود، چندے در گورکھپور، باز تا دم آخر در دار المبلغین بہ درس وتدریس پرداخت، او وقاری محمد صدیق مرحوم در نصرۃ اہل سنت کفرَسَی رِہان بودند، در شب پانزدہم رجب ۱۳۹۳ھ ازیں جہاں درگذشت، مولوی منظور نعمانی غسل داد، در لکھنؤ بہ پہلوئے والد بزرگوار خود جا یافت، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

یہ چند مثالیں فارسی نویسی کی ہیں، متعلقین اور معاصرین سے متعلق جو وفیات آپ نے تحریر فرمائے ہیں، ان کو'حیات ابوالمآثر' (جلد اول) میں نقل کردیا گیا ہے، جس میں تقریباً ڈیڑھ صفحے پر مشتمل حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوری کا جامع اور پُر مغز تذکرہ بھی ہے، لیکن طوالت کے پیش نظر یہاں اس سے اغماض کیا گیا ہے۔ فارسی میں صرف نثر نگاری ہی نہیں کی ہے، بلکہ فارسی شاعری میں بھی قادر الکلامی کے جوہر دکھائے ہیں، جن میں نعت پاک کے علاوہ تاریخ وفات کے قطعات بھی ہیں۔

علوم عربیت:

علوم عربیت یعنی نحو وصرف اور لغت وغیرہ میں بھی خداداد کمال حاصل تھا، اور یہ فنون نہ صرف آپ کے زیر درس رہے ہیں، بلکہ آپ کی تصانیف وتعلیقات میں بھی جگہ جگہ ان میں مہارت کے نمونے نظر آتے ہیں، اپنی تعلیقات میں بکثرت مفرد الفاظ کی تحلیل وتجزیہ کرتے ہیں، جس میں صرفی مباحث بھی آتے ہیں، صرفی مباحث کے کچھ نمونے پیش نظر کتاب میں بھی دیکھنے کو ملیں گے۔ ذیل میں نحو وصرف کے تعلق سے خاص طور پر گفتگو کی جا رہی ہے۔

علم نحو:

عربی زبان میں آپ کے رشحات قلم اور اسلوب تحریر نحوی مہارت کے آئینہ دار ہیں، تعلیقات وحواشی اور دیگر تصانیف وتالیفات اور مضامین ومقالات کو شامل کر کے ہزاروں ہزار صفحات آپ کے نوک قلم سے نکلے ہیں، لیکن شاید کوئی ایسی مثال پیش کی جاسکے، جس میں نحوی یا صرفی غلطی ہوئی ہو، یا زبان کے لحاظ سے کوئی خامی اور سقم ہو، سبقت قلم کی اور بات ہے کہ اس سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ اور صرف یہی نہیں، علم نحو کے ساتھ آپ کی خصوصی دلچسپی کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے، کہ اس فن میں آپ کی ایک تصنیف بھی پائی جاتی ہے، اگرچہ نامکمل ہی سہی۔ 'مفتاح النحو' کے نام سے اردو زبان میں آپ نے ایک تصنیف شروع کی تھی، اور اس کا معتد بہ حصہ لکھ بھی لیا تھا، جو آج تک محفوظ ہے، لیکن افسوس کہ تشنۂ تکمیل رہ گیا!۔ علاوہ بریں علامہ اعظمیؒ نے مشہور نحوی امام ابن ہشام کی شہرت یافتہ کتاب 'أوضح المسالک' کے ان اشعار کو جو بطور شواہد کتاب میں مذکور ہیں، چھانٹ کر یکجا اور مرتب کیا ہے، اور ان کے حل طلب الفاظ کی تشریح کی ہے، جو ایک طرح سے نحو اور لغت دونوں کی خدمت ہے۔

علم لغت:

لغت کے اہتمام کا یہ حال تھا، کہ جن مخطوطات کی تحقیق کی ہے، ان میں شاید ہی آپ کی نگاہ سے کوئی ایسا لفظ گزرتا ہو، جس میں غرابت یا اجنبیت ہو، یا اس کو غیر مانوس محسوس کرتے ہوں، اور اس کی تفسیر یا تشریح نہ کرتے ہوں۔ اس فن کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی کا سب سے بڑا اور بین ثبوت حدیث کے سب سے عظیم الشان لغت 'مجمع بحار الانوار' کی تصحیح وتحشیہ ہے، اس کے علاوہ اردو زبان میں 'لغات حدیث' کے نام سے الفاظ وکلمات حدیث کا لغت ہے، حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ وتعبیرات کی تفسیر یا تشریح وتوضیح میں آپ کو بے نظیر مہارت حاصل تھی، لغت پر آپ کے کمانڈ کا بہترین نمونہ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی کے جواب میں تحریر کردہ بیش قیمت اور خالص علمی وادبی رسالہ 'بناء عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا' ہے، جس کا تعارف ''دفاع حنفیت'' کے باب کے آخر میں آرہا ہے۔

علم عَروض:

عہد شباب میں شاعری بھی خوب کی ہے، اور اس وقت کا بہت سا کلام اب بھی محفوظ ہے، ان کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کا ذوق فطری اور طبعی تھا۔ اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں سخن وری اور قادر الکلامی کے جوہر دکھائے ہیں۔ لیکن صرف ذوق ووجدان کے اعتبار سے آپ شاعر نہیں تھے، بلکہ اس فن کی بھی بھرپور معرفت حاصل تھی، اور علم عَروض وقوافی پر عقابی نگاہ رکھتے تھے۔ پیش نظر کتاب میں آپ کا تحریر کردہ ایک اہم اور معلومات افزا مضمون شامل کیا گیا ہے، جس سے اس فن کے نکات اور باریکیوں پر آپ کی دسترس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس مضمون میں ''بحر رمل اور بحر سریع'' پر جس طرح بحث کی ہے، اس کو پڑھنے کے بعد یہ باور کرنا مشکل

ہو جاتا ہے کہ یہ اسی قلم کی کرشمہ سازی ہے، جو برسہا برس تک حدیث وسنت کے مخطوطوں کی تحقیق وتعلیق اور باطل فرقوں کے رد میں منہمک اور رواں دواں رہا ہے، اور جس نے مصنف عبدالرزاق، کتاب الزہد والرقائق، مسند حمیدی اور سنن سعید بن منصور جیسی کتابوں پر درصدف بکھیرے ہیں۔

فن شاعری اور عروض پر علامہ اعظمیؒ کی تحریروں سے پہلے قاضی اطہر مبارک پوریؒ نے - جو خود بھی ایک اچھے اور کہنہ مشق شاعر تھے - جو تمہید لکھی ہے، اس سے اس فن میں آپ کے مقام ومرتبے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، پوری تمہید تو کتاب کے اندر ملاحظہ کی جا سکتی ہے، ذیل میں اس کا ایک ٹکڑا پیش خدمت ہے:

> ''علم الحدیث، علم رجال الحدیث، علم معانی وبیان، علم تاریخ وادب، اور تفسیر وفقہ میں آپ کی ذات جامع وکمل ہے، ....ساتھ ہی عربی، فارسی اور اردو شاعری اور ادب میں بھی اللہ تعالیٰ نے کمال عطا فرمایا ہے، ان تمام زبانوں میں آپ استاذانہ مقام رکھتے ہیں''۔

اس کے بعد عروض پر لکھی ہوئی اس تحریر کی افادیت اور اچھوتے پن کا برملا اعلان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شعر وادب کے بعض مخفی گوشوں پر روشنی ڈالی ہے، نیز ہماری عربی نظم پر بھی استاذانہ نظر فرمائی ہے''۔

علم تصوف:

تصوف کا ذوق ومیلان آپ کی خمیر میں گندھا ہوا تھا، آپ کی پرورش وپرداخت جس ماحول میں ہوئی تھی، وہ دنیاداری کی آلائشوں سے پاک، دین داری اور خدا ترسی کا ماحول تھا، اساتذہ کی تعلیم وتربیت نے اس رنگ کو مزید گہرا اور پختہ کر دیا تھا، زمانۂ طالب علمی میں حضرت مولانا تھانوی کے ہاتھوں پر بیعت کر لی، جو خود حضرت تھانویؒ کے معمول کے خلاف تھا، کہ کسی طالب علم کو اپنے حلقۂ ارادت میں نہیں لیا کرتے تھے، لیکن طلب صادق اور استعداد وصلاحیت کی فراوانی کو اُس بزرگ کی نگاہ کیمیا اثر نے دیکھ لیا ہوگا، اور معمول کے برعکس وہ فیصلہ کیا ہوگا، جو عام طور پر طالب علموں کے حق میں نہیں ہوتا تھا۔

بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

تصوف کا ذوق صرف وظائف واوراد تک نہیں تھا، بلکہ اس علم کی کتابوں کو آپ نے پی رکھا تھا، آپ کی ذاتی لائبریری کی کتابوں کا جو ذخیرہ ہے، اس میں بہت بڑا حصہ فن تصوف کی تصانیف پر مشتمل ہے، اور ان میں سے اکثر کتابوں پر اس قسم کی یادداشتیں تحریر ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کے زیر مطالعہ رہ چکی ہیں، اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کے ساتھ بھی آپ کو خاص مناسبت تھی، اور اس کی مولفات کا آپ نے وسیع مطالعہ کر رکھا تھا، خاص طور سے وہ کتابیں جو ارباب زہد وتقویٰ اور صوفیاء کرام کے تذکروں اور حالات پر مشتمل ہوتی ہیں، ان کی دلچسپی اور تلاش زیادہ رہا کرتی تھی، چنانچہ 'مناقب العارفین' کا خلاصہ ''پورب کی چند برگزیدہ

ہستیاں'' کی شکل میں تیار کرلیا، ''بسلسلۂ قافلہ اہل دل'' بھی ان ہی خاصان خدا کے طلائی سلسلوں کی ایک کڑی ہے۔ آپ کے غیر معمولی اہتمام اور دلچسپی کا حال یہ تھا کہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ - متوفی ۱۰۵۱ھ = ۱۶۴۲ء - کی کتاب 'زادالمتقین' کی پوری نقل اپنے جگر گوشے حضرت مولانا رشید احمد صاحب سے کرائی۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے وہ رسائل جو تصوف وطریقت کے موضوع پر ہیں، نہ صرف زیر مطالعہ رہے ہیں، بلکہ ان میں سے بعض کی تصحیح وتصویب بھی کی ہے، مثلاً 'سطعات' پر جگہ جگہ آپ کے قلم سے کی گئی تصحیحات پائی جاتی ہیں، اور مولانا محمد میاں کو ۲۱/ذی قعدہ ۱۳۷۸ھ = ۳۰/مئی ۱۹۵۹ء کے ایک مکتوب میں لکھا بھی ہے کہ:

''سطعات' (شاہ ولی اللہؒ) کے مطبوعہ نسخہ کا مقابلہ قلمی نسخہ سے میں نے کرلیا ہے''۔

اسی طرح 'دمغ الباطل' جو وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود جیسے پیچیدہ موضوع پر ہے، اس کی دریافت اور تصحیح بھی تصوف کے ساتھ خصوصی مناسبت کی غمازی کرتی ہے۔

ان سب سے قطع نظر اس دور کے ابن المبارک، اُس زاہد مرتاض، متوکل علی اللہ اور فنا فی العلم کے علمی وقلمی کارناموں میں سے 'مختصر الترغیب والترھیب' اور 'کتاب الزہد' کی تحقیق، اور پھر مختصر کا ترجمہ، 'اہل دل کی دلآویز باتیں' اور 'سیرت ابراہیم بن ادہم' نہ صرف علم تصوف کے ساتھ شغف بلکہ آپ کی زاہدانہ اور متوکلانہ ومتصوفانہ زندگی کے آئینہ دار ہیں، لیکن علم وتحقیق کا آپ کے اوپر ایسا غلبہ تھا کہ آپ کی زندگی کا یہ اہم ترین پہلو اور یہ تمام فضائل وخصوصیات اس کے سامنے مخفی اور پوشیدہ ہوکر رہ گئیں۔

فلسفہ وکلام:

علامہ اعظمیؒ نے ۲۵/شعبان ۱۳۶۹ہجری کو مشہور عالم ومحقق مولانا ابوالوفا افغانی علیہ الرحمہ کو ایک خط میں لکھا ہے:

''پہلے درسِ حدیث کے ساتھ فقہ وادب ومعقولات کا بھی درس دیتا تھا، اب درس حدیث پر مقتصر ہوں، گاہے گاہے ادب کی کوئی کتاب بھی پڑھا دیتا ہوں''۔

معقولات پر بھی منقولات ہی کی طرح حاوی تھے، اور اس فن کی نہ صرف ابتدائی کتابیں زیر درس رہیں، بلکہ اونچی کتابوں کا بھی درس دیا کرتے تھے، مولانا محمد یحییٰ صاحب ندوی - سانہہ، بہار - حضرت مولانا عبدالجبار صاحب علیہ الرحمہ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں، کہ وہ فرماتے تھے کہ حضرت مولانا سے میں نے میر باقر داماد کی 'الافق المبین' پڑھی ہے، پڑھانے سے پہلے سرسری طور سے کتاب دیکھتے تھے، اس کے بعد اس کا نہایت جامع اور تشفی بخش درس دیتے تھے۔

فلسفہ وکلام پر دسترس کا اس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاہ رفیع الدین صاحب کے جن کتب ورسائل کی تحقیق کی ہے، ان میں نہ صرف فلسفہ کی آمیزش ہے، بلکہ فلسفہ ان کا عنصرِ غالب ہے، اور فلسفیانہ مباحث

اور اصطلاحات پر عبور کے بغیر ان کو سمجھنا ناممکن ہے، چہ جائیکہ ان کی تصحیح وتحشیہ کا کام انجام دیا جا سکے۔ 'اسرار المحبۃ'، 'تکمیل الاذہان' اور 'دمغ الباطل' تینوں کتابیں فلسفہ وکلام میں ڈوبی ہوئی ہیں، مگر آپ نے ان کو دریافت اور خدمت کر کے طباعت کے قابل بنا کر ان کی اشاعت میں اہم اور کلیدی رول ادا کیا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ علامہ اعظمیؒ کی شخصیت کیسی ہمہ جہت اور جامع کمالات تھی، اس کے ثبوت کے لیے ذیل میں مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی مدیر ماہنامہ دار العلوم دیو بند کا ایک اقتباس نقل کر دینا چاہتا ہوں، وفیات دار العلوم میں لکھتے ہیں:

''حضرت محدث اعظمی نہ صرف علوم دینیہ، حدیث، تفسیر، فقہ، عقائد، احسان وسلوک کے بحر ذخار تھے؛ بلکہ علوم آلیہ، صَرف ونحو، ادب وبلاغت، سیر وتاریخ، منطق وفلسفہ اور علم الاسرار میں بھی نابغۂ روزگار تھے، اور زہد وورع، قناعت واستغنا، صبر واستقلال، اناۃ ووقار میں سلف صالحین کی یادگار تھے۔ فطری ذہانت وذکاوت، اخاذ طبیعت، دقیقہ شناسی، نکتہ رسی، سرعت فہم، حیرت افزا استحضار اور غیر معمولی قوت حافظہ نے آپ کے وجود کو مجسمہ علم اور ذہن کو ایک کتب خانہ بنا دیا تھا، کتابیں ہی آپ کی جلیس ورفیق اور زندگی کی ساتھی تھیں، دنیا کے سارے جھمیلوں سے دست کش ہو کر ہمہ وقت علمی تحقیقات واکتشافات میں مستغرق رہتے، کتابوں کا ایسا شیدائی اس زمانہ میں تلاش وجستجو کے باوجود بھی نہیں مل سکتا''[1]۔

علم ہیئت:

جن علوم وفنون میں علامہ اعظمیؒ کو دسترس حاصل تھی، ان میں سے ایک علم ہیئت بھی تھا، اس فن کی اہم کتابوں کا آپ نے باقاعدہ مطالعہ کیا تھا۔ اس فن کے ساتھ تعلق کا سراغ ایک تحریر سے بھی ملتا ہے، جو **المجمع العلمي العراقي** کی رکنیت کے وقت اس کی طرف سے طلب کرنے پر اپنے صاحبزادۂ محترم حضرت مولانا رشید احمد صاحب کو املا کرا کر لکھوائی تھی، علمی اختصاصات سے متعلق اس کا متن حسب ذیل ہے:

الاختصاص الدقيق بفن الحديث، فله تحقيقات وتعليقات على الدواوين الحديثية القديمة.

والاختصاص العام بفنون عديدة كالفقه، والتفسير، واللغة، والأدب، وعلم الهيئة.

یہی نہیں آپ نے سایۂ اصلی وغیرہ دیکھنے کے لیے باقاعدہ ایک گھڑی بھی بنوائی تھی، جس سے میقات صلوٰۃ کی ترتیب کا کام لیتے تھے، اور برسوں کی محنت کے بعد علم ہیئت کے ماہر مولانا ابوبکر شیث جون پوری کی تقویم کو سامنے رکھ کر اپنے شہر اور علاقے کے لیے ایک ''دائمی تقویم'' بھی مرتب کی۔ جو آج پورے علاقے میں رائج ہے

(۱) دار العلوم - وفیات نمبر - ص: ۱۵۰-۱۴۹

اور اوقاتِ صلوٰۃ، سحور وافطار وغیرہ میں اس پر لوگوں کا عمل درآمد ہے۔ اس فن کے ساتھ شغف کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ آپ کے ذاتی کتب خانے میں اس پر تصنیف کی گئی متعدد کتابیں موجود ہیں۔

علامہ اعظمیؒ فتنوں کے تعاقب میں

آپ کی ولادت بیسویں صدی کے بالکل آغاز میں ہوئی تھی، سال ولادت ۱۳۱۹ ہجری ہے، جو ۱۹۰۱ء سے مطابقت رکھتا ہے، جس وقت آپ نے ہوش سنبھالا اور شعور وآگہی کی آنکھیں کھولیں، وہ ہندوستانی تاریخ کا نہایت پُر آشوب دور تھا، نہ صرف بساط سیاست پر الٹ پھیر ہو رہی تھی، بلکہ علمی ودینی وفکری دنیا بھی عجیب وغریب اور ہنگامہ خیز طوفانوں سے گزر رہی تھی، دین ومذہب کے نام پر نئے نئے نظریات وخیالات وجود میں آرہے تھے، اور بہت سی پرانی ضلالتیں اور گمراہیاں جو خاکستر میں دبی ہوئی تھیں، ان کی چنگاریاں بھی شعلہ بن کر بھڑک اٹھی تھیں۔ خدا تعالی نے اپنے دین کی حفاظت اور ضلالت وگمراہی کے ان طوفانوں کے سد باب کے لیے اس دور کی ضرورت کے لحاظ سے ایک سے بڑھ کر ایک اصحاب ہمت اور ارباب کمال پیدا کیے، جو گمراہ کن خیالات کے اٹھتے ہوئے سیلاب کے سامنے سدسکندری بن کر کھڑے ہو گئے، اور جنھوں نے اپنی جہد مسلسل، سوجھ بوجھ اور علمی وفکری صلاحیتوں سے ضلالت کی اٹھتی ہوئی موجوں اور بڑھتے ہوئے طوفانوں کا راستہ روک دیا۔

بارہویں صدی ہجری یا اٹھارہویں صدی عیسوی میں سرزمین ہند کے گل سرسبد امام انقلاب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ -متوفی ۱۱۷۶ھ=۱۷۶۲ء- نے جو انقلاب آفریں نظریہ ونظام قائم کیا تھا، اور علمی وفکری وتدریسی قالب میں جونئی روح پھونکی تھی، وہ ایک طلائی سلسلہ بن کر آگے بڑھتی رہی، شاہ صاحب کے بعد اس فکر کے وارث وامین ان کے اخلاف خصوصاً حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب علیہ الرحمہ -متوفی ۱۲۳۹ھ=۱۸۲۳ء- ہوئے، ان سے اس کو حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب علیہ الرحمہ -متوفی ۱۲۶۲ھ=۱۸۴۶ء- نے حاصل کیا، حضرت شاہ اسحاق صاحب کے بعد اس امانت کو حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ -متوفی ۱۲۹۶ھ=۱۸۷۹ء- نے سنبھالا، ان کے تلامذہ اور وابستگان دامن میں سب سے بڑھ کر اس امانت کے حامل حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتویؒ -متوفی ۱۲۹۷ھ=۱۸۸۰ء- اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ -متوفی ۱۳۲۳ھ=۱۹۰۵ء- ہوئے، ان حضرات کے تلامذہ اور مستفیضین نے مسلم دور حکومت کے بعد آنے والے ہندوستان کا نقشہ ہی بدل ڈالا، اور ان کی درس گاہوں اور حلقہ ہائے بیعت وارشاد کے فیض یافتوں نے ابر باراں کی طرح اٹھ اٹھ کر اور امڈ امڈ کر وطن کے ایک ایک خطے کو سیراب کیا۔

علماء اسلام نے بلا قید عصر ومصر عام طور پر، اور ہندوستان میں وابستگان سلسلۂ ولی اللّٰہی نے خاص طور پر، دین ومذہب اور علم وفن کی ہمہ جہت خدمات انجام دی ہیں؛ اگر حالات موافق اور سازگار رہے ہیں، تو ان بزرگانِ دین نے خاموشی کے ساتھ مسندِ درس وتدریس پر بیٹھ کر اور گوشہ ہائے عزلت میں خلوت نشیں ہو کر درس وتدریس اور تعلیم

وتزکیہ کا کام کیا ہے؛ لیکن یہی خاموش طبع، خدامست، فکر فردا سے آزاد بندگان خدا نے اگر سطح زمین پر ہلکا سا تموج دیکھا، اور بدعت وضلالت یا فتنے کی بو بھی محسوس کی، تو اس کے لیے صاعقۂ آسمانی بن گئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد علمی ودینی وفکری جہاد کی ایک مستقل تاریخ ہے، جس میں علماء اسلام کے کارنامے نہایت روشن اور تابناک اور تاریخ اسلام کا زرّیں باب ہیں۔

ہندوستان میں اورنگ زیب عالم گیر کا عہد میمون رخصت کیا ہوا، مسلمانوں پر مصائب وآفات کی مہیب گھٹائیں ہر طرف سے سایہ فگن ہونے لگیں، عالم گیری عہد کے خاتمے کے ساتھ ہی مسلمانوں کی تقریباً پانچ سو سالہ عروج واقبال کی تاریخ پر نکبت وادبار کی مہر لگ گئی، ان کی حکمرانی کا آفتاب لب بام پہنچ گیا، اور تخت وتاج ہی خطرے میں نہیں پڑا، دین ومذہب بھی خطرناک اور مہیب موجوں کی زد میں آ گیا، بدعت وضلالت، گمراہی اور نت نئے فتنوں نے ہر سمت سے یلغار کر دی، لیکن خدا سرسبز وشاداب رکھے بادۂ علم وعرفان سے سرمست ان متوالوں کی قبروں کو جنھوں ایک بھی فتنے کا زور نہیں چلنے دیا، جو فتنہ جہاں سے اٹھا وہیں اس کا سر کچل دیا، ہر قسم کی اور بے دریغ قربانی دے کر گلشن دین ومذہب کو پُر بہار اور شاداب رکھا، اپنا نشیمن اور مسکن چاہے نہ تعمیر کر سکے ہوں، لیکن دین وعلم کے چمن کو سُونا اور اداس ہونا ہرگز منظور نہیں کیا۔

ردّ سلفیت:

علامہ اعظمیؒ نے جس وقت شعور کی آنکھ کھولی، تو ان کا اپنا شہر انکار تقلید کی زد میں تھا، اور غیر مقلدیت کی ترویج واشاعت کے لیے پورا پورا زور صرف کیا جا رہا تھا، حافظ عبداللہ غازی پوریؒ - متوفی ۱۳۲۷ھ = ۱۹۰۹ء - جو اصلاً مئو کے باشندہ تھے، وہ شیخ الکل فی الکل مولانا سید نذیر حسینؒ - متوفی ۱۳۲۰ھ = ۱۹۰۲ء - سے اکتساب فیض کر کے آئے تھے، اور جس فکر ونظر کا بیج وہاں سے لائے تھے، پوری سرگرمی کے ساتھ مئو اور اس کے مضافات میں اس کی تخم ریزی کر رہے تھے۔ ان کے لائے ہوئے فتنے کے سد باب کے لیے علامہ اعظمیؒ کے استاذ حضرت مولانا عبدالغفار صاحب عراقیؒ - متوفی ۱۳۴۱ھ = ۱۹۲۲ء - برسر پیکار تھے، مولانا عبدالغفار صاحب کو امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے شرف تلمذ حاصل تھا، اور دین ومذہب کے دفاع کا غیر معمولی جذبہ بھی گویا حضرت گنگوہی کے فیضان کا اثر تھا، اور یہی حمیت وغیرت اور مذہبی دفاع کا غیر معمولی جذبہ علامہ اعظمیؒ کے حصے میں بھی آیا، اور سن رشد کو پہنچتے ہی آپ اس فتنۂ بلاخیز کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔

اس میں شک نہیں کہ علامہ اعظمیؒ کا ابتدائی دور اور عہد شباب زیادہ تر حنفیت کے دفاع اور سلفیت کے تعاقب میں گزرا ہے، اس دور کے مضامین ومقالات اور تصانیف وتالیفات آپ کی دینی ومذہبی غیرت وحمیت پر شاہد عدل ہیں، محکوم ہندوستان میں دہلی سے 'محمدی' اور امرتسر سے 'اہلحدیث' جماعت اہل حدیث کے دو اہم پرچے نکلتے تھے، اور دونوں حنفیت کی عداوت اور عدم تقلید کی دعوت میں پیش پیش تھے، مولانا اعظمیؒ نے اپنے مضامین

ومقالات میں ان دونوں کا بھرپور تعاقب کیا، اس نوعیت کے آپ کے مضامین 'الفقیہ'، 'القاسم' امرتسر اور 'العدل' گوجرانوالہ میں زیادہ تر اشاعت پذیر ہوئے۔ اس وقت مختلف موضوعات پر بیسیوں مضامین آپ کے قلم سے نکلے اور مقبول خاص وعام ہوئے، اس قسم کے مضامین کا سلسلہ زیادہ تر ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء کے درمیان رہا، لیکن اس کے بعد بھی اس کی طرف سے ذرا بھی غافل نہیں رہے، اور جب جب ضرورت پیش آئی اس کے تعاقب کے لیے تیار رہے؛ چنانچہ مضامین کے علاوہ مستقل تصانیف میں 'رکعات تراویح'، 'رکعات تراویح مذیّل'، 'اعلام مرفوعہ'، 'ازہار مربوعہ'، 'تحقیق اہل حدیث'، 'حدر اللثام'، 'الألباني: شذوذه وأخطاؤه' جیسی تصانیف علماء احناف کے لیے سرمۂ چشم بصیرت اور مخالفین کے لیے تازیانۂ عبرت ہیں۔ رکعات تراویح اور ایک مجلس کی تین طلاق پر آپ کی کئی کئی تحریریں یادگار ہیں، جو آج تک انصاف پسند اہل علم کو دعوت فکر وعمل دیتی ہیں۔

اس موقع پر ایک بہت اہم اور ضروری بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ علامہ اعظمیؒ کا مزاج خالص علمی وتحقیقی تھا، مجادلانہ ومناظرانہ ہرگز نہ تھا، اور بحث وجدال سے طبعی طور پر اباء کرتے تھے، لیکن جب حالات مجبور کرتے تو تحریر وتقریر کے ذریعے دفاع پر مجبور ہو جاتے، اور اس کو ضروری فریضہ سمجھ کر انجام دیتے۔ مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی جو آپ کے ابتدائی دور کے شاگردوں، فیض یافتوں اور مزاج شناسوں میں ہیں، لکھتے ہیں:

''مخالف مذہب والوں سے جنگ کا جذبہ قطعاً نہیں تھا، لیکن جب کوئی مسلک حق پر حملہ آور ہوتا، تو پھر اس وقت خاموش بھی نہیں رہ سکتے تھے، شیعوں اور رافضیوں کا منھ توڑ جواب دیا، بدعتیوں کو دندان شکن جواب دیا، اور غیر مقلدوں کو ان کے گھر تک پہنچایا، یہ سب دفاعی تھا، اقدامی نہ تھا۔

درس حدیث میں فرماتے تھے کہ مجھے کسی سے عناد نہیں ہے، حدیث میں نماز کے سلسلے میں متعدد روایتیں آئی ہیں، ایک پر اگر غیر مقلد عمل کرتے ہیں تو ان سے کیوں لڑا جائے، جب کہ وہ بھی حدیث سے ثابت ہے، لیکن جب وہ حنفیوں کو طعنہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث پر عمل نہیں کرتے قیاس پر عمل پیرا ہیں، تو اس وقت سوچو کیسے خاموش رہا جائے، اور یہ کیوں نہ بتایا جائے کہ حدیث پر تم سے زیادہ عمل کرنے والے ہم ہیں، اور تم سے زیادہ حدیث جاننے والے ہم ہیں''(۱)۔

ردشیعیت:

شیعیت یا رافضیت جب سے وجود میں آئی ہے، اسلام کے لیے ایک آفت بنی ہوئی ہے، شیعیت سے اسلام کو کتنا نقصان پہنچا ہے، اس کا صحیح تخمینہ اور اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ امت کی صفوں میں واقع ہونے والے بیشتر اختلاف وانتشار، بڑے بڑے سنگین حوادث وواقعات، شکست وریخت اور سیاسی انقلابات کے پس پردہ عوامل کا اگر سراغ لگانے کی کوشش کی جائے، تو شیعیت کا خفیہ ہاتھ ضرور نظر آئے گا۔ ہندوستان کی بیشتر ریاستیں جو

(۱) ترجمان الاسلام – مولانا اعظمی نمبر – ص: ۱۶۱

نوابوں کے زیر اثر تھیں ان میں شیعیت کو کافی فروغ اور رسوخ حاصل تھا، اور ان میں صوبۂ اودھ کو جو نوابین لکھنؤ کے زیر اقتدار تھا سب پر فوقیت حاصل تھی، ان نوابوں کی حکمرانی اور قوت وسطوت کی وجہ سے صوبۂ اودھ پر شیعیت کی زبردست چھاپ تھی۔

جن اہل علم نے شیعیت کی اس چھاپ اور اس کے اثر کو مٹانے کی جی توڑ کوشش کی، ان میں سب نمایاں اور ممتاز نام امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی علیہ الرحمۃ -متوفی ۱۳۸۰ھ=۱۹۶۲ء- کا ہے۔ امام اہل سنت نے شیعوں کی سرکوبی میں کوئی دقیقہ نہیں فروگزاشت کیا، اور کسی بھی کوشش اور قربانی سے دریغ نہیں کیا، شیعیت اگرچہ آج بھی زندہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ امام اہل سنت نے اپنی جہد مسلسل اور لگاتار ضربوں سے کم از کم خطۂ اودھ کی حد تک اس کی کمر توڑ کر رکھ دی۔

مقابلۂ شیعیت کے محاذ پر علامہ اعظمیؒ امام اہل سنت کے مخلص معاون، ہم مشرب، ہم خیال اور اس کی بیخ کنی میں دست راست رہے[1]، اور جب جب ضرورت پڑی شیعوں کی اسلام دشمنی کو بے نقاب کرتے رہے۔ ردّ شیعیت میں آپ کے قلم سے نکلے ہوئے کتب ورسائل میں 'دفع الجادلہ'، 'ارشاد الثقلین'، 'ابطال عزاداری'، 'تعزیہ داری اور دیگر مراسم عزداری سنی نقطۂ نظر سے'، 'تنبیہ الکاذبین' اور 'تعدیلِ رجالِ بخاری' وغیرہ آپ کی مذہبی ودینی غیرت وحمیت، بدعت وگمراہی سے نفرت، اور حق کی نصرت وحمایت کی سچی شہادت پیش کرتی ہیں۔ ردّ شیعیت اور دفاع صحابہ -رضی اللہ عنہم- کی روح اور اسپرٹ بعض دوسری کتابوں مثلاً 'عظمت صحابہؓ' اور 'حضرت معاویہؓ کی شان میں سوء ادبی اور اس کا جواب' میں نمایاں طور پر نظر آ رہی ہے۔ شیعوں سے اسلام کو جو نقصان پہنچا ہے، اس کی وجہ سے آپ اس فرقے کے لیے سراپا غیظ وغضب اور برق سماوی تھے، اور ان کے حق میں کسی قسم کی مداہنت

(۱) اس ہم آہنگی کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ علامہ اعظمیؒ کی خدمت میں کسی نے یہ خط لکھا کہ: ''گذشتہ شب احقر حضرت اقدس لکھنوی قدس سرہ کی خواب میں زیارت سے مشرّف ہوا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہرے رنگ کا عمامہ زیب تن کیے ہوئے ہیں اور ایک بڑی مسجد میں تشریف لائے ہیں، احقر پہلے سے وہاں موجود تھا، جیسے ہی زیارت ہوئی، ویسے ہی احقر دوڑا کہ مصافحہ کرے، لیکن قبل اس کے کہ احقر وہاں پہنچتا حضرت نے نماز کی نیت باندھ لی، تھوڑی دیر کے بعد آنجناب کو بھی بائیں جانب سے مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا، حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ اور آنجناب کا حلیہ ایسا ہم رنگ تھا کہ امتیاز کرنا مشکل ہو رہا تھا، احقر کو اس خواب سے بے حد مسرت ہوئی اور خیال ہوا کہ آنجناب کو عریضہ لکھا جائے۔ اس ناکارہ کے لیے دعا فرمائیں''۔

ہم کو اس تحریر کی جو نقل دستیاب ہوئی ہے اس میں خط لکھنے والے کا نام تحریر نہیں ہے، البتہ علامہ اعظمیؒ نے اس کے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا وہ حسب ذیل ہے:

''خواب مبارک ہو اور مبارک ہے۔

میں تھوڑی دیر بعد ہی -پندرہ بیس سال تھوڑے ہی ہیں- دنیا میں آیا اور الحمد للہ کہ میرے مسلک، مذہبی رجحانات، تصوف سے شغف، اور قرآن فہمی وحدیث فہمی میں حضرت مرحوم کے اور میرے درمیان بڑی حد تک یکسانیت، مدحِ صحابہؓ، ان کی طرف سے مدافعت، اور قائلینِ تحریفِ قرآن کی تکفیر میں، میں ان کا ہم خیال اور ہم رنگ تھا، فالحمد للہ''۔

کے روادار نہ تھے؛ چنانچہ مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمۃ -متوفی ۱۴۱۷ھ = ۱۹۹۷ء- نے ایک دفعہ آپ کی خدمت میں ایک استفتا بھیج کر شیعوں کے فرقہ اثناعشری کے بارے میں آپ کی رائے معلوم کرنی چاہی، تو آپ نے اس کا مدلّل جواب لکھ کر ان کے بعض عقائد ونظریات کی روشنی میں بے لیت ولعل ان کو خارج از اسلام قرار دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ شیعہ وروافض کے حق میں آپ شمشیر برہنہ تھے، اور ان کے عقائد وافکار کے رد وابطال میں کسی بھی کوشش سے دریغ نہیں کیا۔

ردرضاخانیت:

حدیث پاک میں ہے: كُلُّ مُحْدَثٍ بِدْعَةٌ، وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلالَةٍ، دین کے اندر ہر نئی بنائی ہوئی چیز بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ اسلامی تاریخ میں بدعت گری کا عمل شروع ہوتے دیر نہیں لگی، خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ذوالنورین -رضی اللہ عنہ- کی شہادت کے بعد امت مسلمہ میں اختلاف کا جو دور شروع ہوا، وہیں سے بدعت کا آغاز بھی ہوا۔ معتزلہ، خوارج اور شیعہ تین بڑے فرقے پیدا ہوئے، جو بہت سے افکار ونظریات میں اہل سنت اور سلف صالح کی روش اور طریقے سے ہٹے ہوئے تھے، پھر ان میں سے ہر ایک کی ذرا ذرا سے فرق کے ساتھ دسیوں بیسیوں شاخیں پھوٹیں، جو اپنی جداگانہ اور الگ شناخت رکھتی تھیں۔ باب فاروقی کا ٹوٹنا تھا کہ فتنوں کا سیلاب بلاخیز امڈ پڑا، اور اعتقادی وعملی گمراہی کا وہ طوفان اٹھا کہ ہزار کوششوں اور مدافعتوں کے باوجود تھم نہیں سکا۔ پھر یہ بدعت وضلالت ہر دور میں بڑھتی رہی، اس کی نت نئی شاخیں پھوٹتی اور نکلتی رہیں، یہاں تک کہ انیسویں صدی عیسوی میں بدعت کے سب سے بڑے علم بردار اور مجدد احمد رضا خاں بریلوی کا ظہور ہوا، احمد رضا خاں نے نہ صرف بدعت کو فروغ دینے اور اس کی انواع واقسام میں اضافے کا کام کیا، بلکہ بہت سی منتشر اور متفرق بدعتوں کی تدوین وترتیب کا بھی بے نظیر کارنامہ انجام دیا۔ اکابرِ دیوبند نے رضاخانی فتنے کے خطرے کو بروقت بھانپ لیا، اور اس کی سرکوبی میں کسی قسم کی نرمی کو راہ نہیں دی، تحریر وتقریر اور مناظرہ ہر سطح پر رضاخانیت کا بھرپور تعاقب کیا، اور رضاخانیت کے چہرے پہ پڑی ہوئی نقاب کو تار تار کر کے اس کی کریہ اور بدنما صورت کو آشکار کر دیا، یہ اس امت پر دیوبندی علما کا وہ احسان عظیم ہے کہ امت اس کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہے۔

ردّ رضاخانیت میں چونکہ علماء دیوبند کی پوری جماعت سرگرم عمل تھی، اس لیے علامہ اعظمیؒ کا عنان قلم اس سمت میں نسبتاً کم گامزن رہا، لیکن جب کوئی موقع اور موڑ آیا تو اس پر بھی اپنے قلم کی آب وتاب دکھادی؛ چنانچہ کچھوچھہ کے ایک رضاخانی مولوی سید محمد کچھوچھوی نے آنحضرت ﷺ کو مقام عبدیت سے اٹھا کر مرتبۂ تشریع یا بلفظ دیگر مقام الوہیت تک پہنچانے کی کوشش کی، تو اپنے عزیز اور فاضل شاگرد مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی درخواست پر 'شارع حقیقی' لکھ کر کچھوچھوی صاحب کے گمراہ کن رسالے کے پرزے پرزے کرتے ہوئے ہواؤں میں اس کے پرخچے اڑادیے۔

اسی طرح ایک استفتا کے جواب میں 'النذر لاولیاء اللہ' کے نام سے نہایت جامع اور مدلّل رسالہ لکھ کر حرام وحلال نذور کا فرق اور نذر ونیاز کے نام پر پائی جانے والی مروجہ بدعات وخرافات اور اس میں ارتکاب کی جانے والی محرمات کونہایت واضح طور پر بیان کیا۔

ایک اور استفتا کے جواب میں 'تقبیل ابہامین' - اقامت کے وقت کلمۂ شہادت پر انگوٹھا چومنے کے حکم - کونہایت بسط وتفصیل اور مستحکم دلائل کے ساتھ بیان کیا، اور اس مسئلے کی توضیح کے لیے کتب حدیث وفقہ کے حوالوں کا انبار لگادیا، اگر چہ یہ بصورت مضمون ہے، مگر ایک جامع اور پُرمغز رسالہ کا درجہ رکھتا ہے۔

فتنۂ انکار حدیث اور اس کا رد وابطال:

بیسویں صدی عیسوی کے نہایت گمراہ کن اور ملحدانہ افکار ونظریات میں انکارِ حدیث کا فتنہ تھا، یہ فتنہ بہت شدومد کے ساتھ اٹھا، اور مختلف ممالک میں بہت جلد برگ وبار لایا۔ ہندوستان میں عبداللہ چکڑالوی، اسلم جیراج پوری اور عظیم بیگ چغتائی وغیرہ نے اس شجرۂ ملعونہ کی آبیاری کی۔ اس فتنے کا مقصد اسلامی تعلیم اور اسلامی شریعت کو بے اثر اور معطل کرنا تھا، لیکن علماء حق نے اس کے خلاف اتنا شدید اقدام کیا کہ سر اٹھاتے ہی بے جان اور نیم مردہ ہوکر رہ گیا، اور اس کی حقیقت ریت کی اس دیوار سے زیادہ نہیں رہی، جو بالشت بھر نہیں اٹھتی کہ زمیں بوس ہو جاتی ہے۔

یہ معلوم اور مسلّم ہے کہ قرآن کریم کے بعد احادیث نبویہ مبارکہ اسلامی شریعت کا سب سے بڑا ماخذ اور سرچشمہ ہیں، اور یہ حدیثیں اسنادی سلسلوں کے ساتھ صحابۂ کرام اور تابعین عظام کے واسطوں سے بعد کے لوگوں تک پہنچی ہیں، اور امت نے اس ذخیرے کی حفاظت وصیانت کے لیے جس غیر معمولی استعداد وصلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے، وہ تاریخ کا ایک حیرت ناک باب ہے، اور یہ اس امت کی ایسی خصوصیت ہے جس کا اعتراف اس کے دشمنوں اور معاندوں نے بھی کیا ہے۔ محدثین اور رواۃ حدیث نے نہ صرف آنحضرت ﷺ کے اقوال وافعال اور آپ کے عہد میمون میں پیش آنے والے واقعات، بلکہ صحابہؓ وتابعین کے اقوال وافعال کو بھی جس دقیقہ رسی، بالغ نظری اور بیدار مغزی سے پہلے سینوں میں پھر سفینوں میں محفوظ رکھا، اور زیر زبر اور نقطے کے فرق کے ساتھ اپنے شاگردوں یا کتابوں کے حوالے کردیا، وہ علم وفن اور ثقافت کی تاریخ میں کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ یہ اس امت کا نمایاں امتیاز، اور اس کے مَفْرَق فضل وکمال کا نہایت درخشاں تاج ہے؛ ورنہ دوسرے مذاہب کے ماننے والے آسمانی صحیفوں اور خداوند قدوس کے پاس سے نازل شدہ کتابوں اور تختیوں کی بھی حفاظت نہیں کرسکے، بلکہ اپنی شومیٔ قسمت سے ان آسمانی اور الٰہی صحائف میں تحریف وتلبیس، قطع وبرید، اور کتر بیونت کی لعنت کے مجرم بن گئے، مگر اس امت کے امینوں نے کتاب الٰہی تو بڑی بات ہے، اپنے پیغمبر ﷺ کے فرمان، اس کے احکام، افعال واقوال، عادات وخصائل، اوصاف واخلاق، نشست وبرخاست، حرکات وسکنات، اور خلوت وجلوت کے

واقعات ومعاملات کو اس طرح محفوظ رکھا کہ چودہ سو سال بعد بھی ان کو پڑھیے، تو پیغمر اسلام ﷺ کی چلتی پھرتی اور متحرک تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے، اور صرف رسول نہیں، بلکہ شمع رسالت کے پروانوں، اس کے جاں نثاروں اور نام لیواؤں کے اقوال وافعال اور حالات وواقعات اس طرح محفوظ کیے، جس کو دیکھ کر دنیا محوحیرت اور انگشت بدنداں ہیں۔

منکرین حدیث نے مسلمانوں کے اس شرف کو- جس میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں- خاک میں ملانا چاہا، اور احادیث شریفہ کی عظیم الشان اور بلندو بالا عمارت پر تیشہ زنی کرنی چاہی، محدثین پر حدیثوں کے وضع وافترا کی تہمت لگا کر مسلمانوں کے قلوب کو احادیث کی طرف سے بیزار اور منحرف کرنا چاہا، لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان کا وار کامیاب نہیں ہوسکا، اور ان کی تمام تر مساعی ذمیمہ ورذیلہ راکھ تلے دب کر رہ گئیں۔

علامہ اعظمیؒ نے اس فتنے کا زبردست تعاقب کیا، اور 'نصرۃ الحدیث' جیسی بے نظیر کتاب لکھ کر منکرین حدیث کے نخل آرزو کی جڑ ہی کاٹ دی، اور ضلالت وگمراہی کو رواج دینے کی ان کی تمام امیدوں اور حوصلوں پر پانی پھیر دیا۔ 'نصرۃ الحدیث' کے علاوہ حجیت حدیث کے اثبات پر آپ کی نہایت پُر مغز اور جامع تحریر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمۃ کی 'معارف الحدیث' کا طویل اور مبسوط مقدمہ ہے، جس میں حدیث کے حجت ہونے پر قرآن کریم کی بے شمار آیتوں سے استدلال کیا گیا ہے، یہ مقدمہ اتنا مبسوط اور سیر حاصل ہے، جو مقدمہ سے زیادہ مستقل رسالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے بعد کے دور میں حدیث شریف کے مخطوطات اور قلمی نسخوں کی دریافت اور ان کی تحقیق وتعلیق کی جو غیر معمولی اور بے مثال خدمت انجام دی ہے، اس میں جہاں حدیث وسنت کی خدمت کا جذبہ کارفرما تھا، وہیں حدیث کے دفاع، اس کی حجیت کا اثبات اور منکرین حدیث کے باطل افکار وخیالات اور ملحدانہ نظریات کی بیخ کنی کی اسپرٹ بھی کام کرتی رہی ہے۔

علامہ اعظمیؒ کے جواب کی خصوصیات:

آپ نے مخالفین کی تحریروں، رسالوں اور ان کے افکار ونظریات کے رد میں جو رسائل اور کتابیں لکھی ہیں، وہ متنوع اور گوناگوں خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں، وہ ایسی مدلل اور مبرہن ہوتی ہیں کہ قاری کے ذہن کو مطمئن اور قائل کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں، بشرطیکہ اس کا قلب انصاف ودیانت کے جوہر سے آراستہ اور اس کی قدر وقیمت سے آشنا ہو۔ آپ کی اختلافی تحریروں کی کچھ اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱- اپنی اکثر تحریروں میں تحقیقی اور الزامی دونوں نوعیت کے جواب کا اہتمام کرتے ہیں، یعنی فریق مخالف کا جو اعتراض ہوتا ہے، علم وتحقیق کی روشنی میں اس کا مدلل جواب دیتے ہیں، پھر اس کے اعتراضات پر اسی کی تحریروں یا مفروضوں سے اس کے اوپر حجت قائم کرتے ہیں۔

۲-اکثر جوابی تحریروں میں فریق مخالف کا رد اسی کے اصول ومسلمات سے دے کر اس کو متحیر اور لاجواب کر دیتے ہیں، مثلاً شیعوں کا رد کتب شیعہ سے، اہل حدیث کا رد علماء اہل حدیث مثلاً حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری، نواب صدیق حسن خاں، مولانا وحید الزماں حیدرآبادی، حافظ ابن القیم، علامہ ابن تیمیہ، یا ان محدثین کی تحریروں سے دیتے ہیں، جن کو اہل حدیث بھی اپنا پیشوا مانتے ہیں۔

۳-جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، نہایت توازن اور اعتدال کے ساتھ ناپ تول کر لکھتے ہیں، اور اپنی توجہ اسی بحث پر مرکوز رکھتے ہیں، جس کے رد کے درپے ہوتے ہیں۔

۴-مجادلانہ ومخاصمانہ تحریروں میں طنز وتعریض کی چاشنی اور ظرافت کی شوخی بھی بدرجۂ کمال پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے خشک سے خشک موضوع بھی پڑھنے والے کے لیے دلچسپ اور زعفران زار بن جاتا ہے۔

۵-فریق مخالف کے عزت واحترام کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھتے ہیں، اس کی ذات کے لیے کوئی ایسا لفظ یا کلمہ نہیں استعمال کرتے، جس سے ان کی توہین یا ذاتی اور شخصی عداوت کی بو محسوس ہوتی ہو، مدمقابل کے لیے ''مولانا''، ''مولوی'' اور ''صاحب'' جیسے الفاظ اور تعظیمی کلمات کا بالالتزام استعمال کرتے ہیں، جس سے بآسانی یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ مدمقابل کی شخصیت کو مجروح کرنا آپ کے پیش نظر نہیں ہوتا، اصل مقصد اس کے فکر وخیال کا توڑ اور کاٹ ہوتا ہے۔

کچھ اور معروضات:

باطل فرقوں کے رد وابطال اور تعاقب کے علاوہ علامہ اعظمیؒ نے بہت سے ایسے اہل علم پر بھی نقد کیا ہے، جو آپ کے ہم مسلک بلکہ ہم مشرب تھے، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ آپ کا مزاج خالص علمی اور تحقیقی تھا، اور جب کسی ذی علم کے مضمون یا کتاب میں کوئی خلاف واقعہ بات یا غلط تحقیق آپ کی نظر سے گزرتی، تو آپ کے لیے اپنے قلم کو روکنا مشکل ہو جاتا تھا، چاہے اس کا تعلق تاریخ وتذکرہ سے ہو، لغت وادب سے ہو، یا فقہ وحدیث سے، اہل علم کے سامنے صحیح تحقیق پیش کرنا آپ کا اولین مقصد تھا۔ علم ایک امانت ہے، اور اس امانت کی عزت وآبرو کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ذاتی اور شخصی مفادات سے بلند ہو۔ اگر کسی کتاب میں غلطی ہو، تو اس غلطی کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتے تھے، اگر کسی محقق کی تحقیق غلط رخ پر ہو، تو اس پر متنبہ کرنا گویا اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ اگر اختلاف رائے کی گنجائش ہوتی تھی، تو اس کے اظہار میں کوئی قباحت اور عیب نہیں خیال کرتے تھے۔ کسی عالم کی فروگزاشت کو ظاہر کرنا معاصرانہ چشمک یا حسد وعناد کی وجہ سے نہیں تھا، اگر ایسا ہوتا تو بعض ایسی علمی شخصیتیں جن کا اپنے بعض رسائل یا کتابوں میں زوردار رد کیا ہے، انتقال کے بعد یا کسی دوسرے موقع پر دل کھول کر ان کی عظمت وبڑائی کا اظہار نہ کرتے۔

بہت سے ایسے حضرات اہل علم جن کے کسی مضمون یا کتاب کے جواب میں علامہ اعظمیؒ کی کوئی تحریر قاری

کی نظر سے اس کتاب میں گزرے گی، جو ہمارے نزدیک نہایت مکرم اور معظم ہیں، اور ہمارا قلب آج بھی ان کے احترام وعقیدت سے اسی طرح مغمور ومعمور ہے، جس طرح پہلے تھا، لیکن علمی امانت سمجھ کر ہم نے ان تحریروں کے تعارف کا فرض انجام دیا ہے، ان کی تنقیص یا عیب جوئی کا ذرہ برابر دل میں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہیں آیا، حاشا وکلا!۔

آخر میں اپنی برسوں کی محنت اور جگر کاوی کو یہ کہتے ہوئے اہل علم کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں کہ:

اے اہل ہنر آؤ یہ جاگیر سنبھالو
ہم مملکتِ لوح وقلم بانٹ رہے ہیں

مسعود احمد الاعظمی

۱۵؍ جمادی الاولی ۱۴۳۱ھ

یکم مئی ۲۰۱۰ء

یوم السبت

مخطوطات و مسوّدات

کی

چند عکسی تصاویر

الحاوی لرجال الطحاوی کا پہلا صفحہ

الحاوی
لرجال الطحاوی

١ ابراهيم بن ابي داود شيخ الطحاوي ... الحافظ ...

٢ احمد بن خالد الوهبي من رجال التقريب صدوق ... روى له البخاري ...

٣ اصبغ بن الفرج من رجال التقريب ثقة روى له البخاري وابو داود والنسائي وغيرهم

٤ اسحق بن عبد الله ... من رجال التقريب ثقة حجة ...

٥ احمد بن ابي عمران شيخ الطحاوي ... ثقة

انس بن مالك صحابي ...

ابراهيم بن ... من رجال التقريب ...

انس بن عياض الليثي ابو ضمرة المدني ثقة من رجال التقريب ... الجماعة

احمد بن داود شيخ الطحاوي ...

ابراهيم بن منقذ العصفري شيخ الطحاوي ...

احمد بن يحيى ...

١٠ اسد بن موسى ... صدوق ... روى البخاري تعليقا وابو داود والنسائي

١١ الاحوص بن حكيم ... روى ابن ماجه

١٢ ابراهيم بن يزيد النخعي الكوفي الفقيه ثقة ... الجماعة

١٣ ابراهيم بن مرزوق شيخ الطحاوي ... ثقة ...

احمد بن عبد الله بن يونس الكوفي التميمي ... ثقة حافظ ... الجماعة

اسمعيل بن اسحق شيخ الطحاوي ...

احمد بن داود بن موسى ... شيخ الطحاوي ...

ابو حميد بن عبد الرحمن الحميري هو مصعب بن [illegible] [illegible] حميد بن عبد الرحمن

ابو قيس ٣٢٧ عن هذيل بن شرحبيل وعنه شعبة وسفيان هو عبد الرحمن بن ثروان الاودي تقدم

ابو يحيى [illegible] بن احمد بن زكريا بن الحارث بن ابي ميسرة المكي شيخ الطحاوي [illegible] تقدم

ابو فزارة ٣٣٠ راشد بن كيسان العبسي الكوفي ثقة من الخامسة [illegible]

ابو جعفر ٣٣١ هو محمد الباقر تقدم

ابن ابي ميسرة [illegible] شيخ الطحاوي [illegible] احمد بن زكريا بن الحارث بن ابي ميسرة المكي [illegible] ثقة

ابو بكر بن احمد [illegible] عن ابن بريدة وعنه شريك [illegible] ابن احمد [illegible]

ابو بكر بن ابي مريم [illegible] جبريل بن احمد تقدم

وهذا آخر [illegible] والحمد لله على ان وفقنا الله تعالى وكان ذلك يوم الجمعة [illegible]

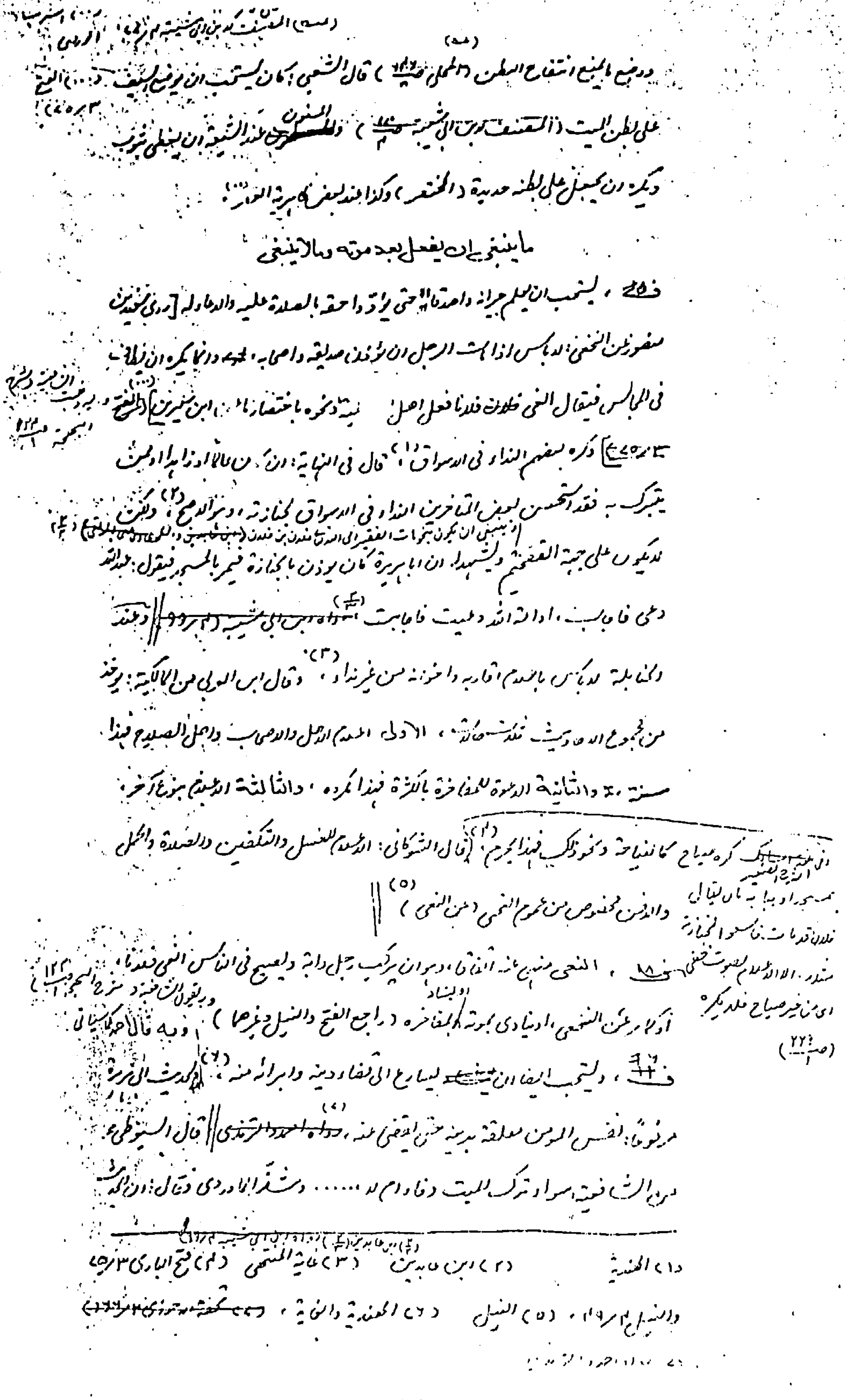
[illegible] ١٢٣٣ [illegible] الف [illegible]

انار الله تصنيف شريف
سنة ١٣٣٩

ابو تراب [illegible] عفي عنه
[illegible]

ابو كثير المخزومي مولى ام سلمة [illegible] حفصة روى [illegible] [illegible] عبد الرحمن [illegible] قال الترمذي [illegible] قال ابن حجر [illegible] [illegible]

الحاوی لرجال الطحاوی کا آخری صفحہ



(المصنف لابن ابي شيبة ٣/٣٤٣) (الزيلعي)

(٥٥)

ووضع ما يمنع انتفاخ البطن (المحلى ٥/١٧٤) قال الشعبي: كان يستحب ان يوضع السيف ... على بطن الميت (المصنف لابن ابي شيبة ٣/٢٤٩) والمستحب عند الشيعة ان يجعل ثوب ويكره ان يجعل على البطن حديدة (المختصر) وكذا عند بعض الحنفية ...

ما ينبغي ان يفعل بعد موته وما لا ينبغي

ف٦٢ ، يستحب ان يعلم جيرانه واصدقاؤه حتى يؤدوا حقه بالصلاة عليه والدعاء له [روى عن مغيرة عن ابراهيم النخعي: لا بأس اذا مات الرجل ان يؤذن صديقه واصحابه ... وانما يكره ان يطاف في المجالس فيقال انعى فلانا فلانا فعل اهل الجاهلية ... ذكره باختصار ... ابن ابي شيبة (٣/٢٧٥)] وكره بعضهم النداء في الاسواق[1] قال في النهاية: ان كان عالما او زاهدا او ممن يتبرك به فقد استحسن بعض المتأخرين النداء في الاسواق لجنازته ، وهو الاصح[2] ولكن لا يكون على جهة التفخيم والتسهيل ان ابا هريرة كان يؤذن بالجنازة فيمر بالمسجد فيقول: عبد الله دعي فاجاب ، او امة الله دعيت فاجابت ~~رواه ابن ابي شيبة (٣/٢٧٥)~~ وعند الحنابلة لا بأس باعلام اقاربه واخوانه من غير نداء[3] وقال ابن العربي من المالكية: يؤخذ من مجموع الاحاديث ثلاث حالات ، الاولى اعلام الاهل والاصحاب واهل الصلاح فهذا سنة ، والثانية الدعوة للمفاخرة بالكثرة فهذا مكروه ، والثالثة الاعلام بنوع آخر كالنياحة ونحو ذلك فهذا محرم[4] قال الشوكاني: الاعلام للغسل والتكفين والصلاة والحمل والدفن مخصوص من عموم النهي (عن النعي)[5]

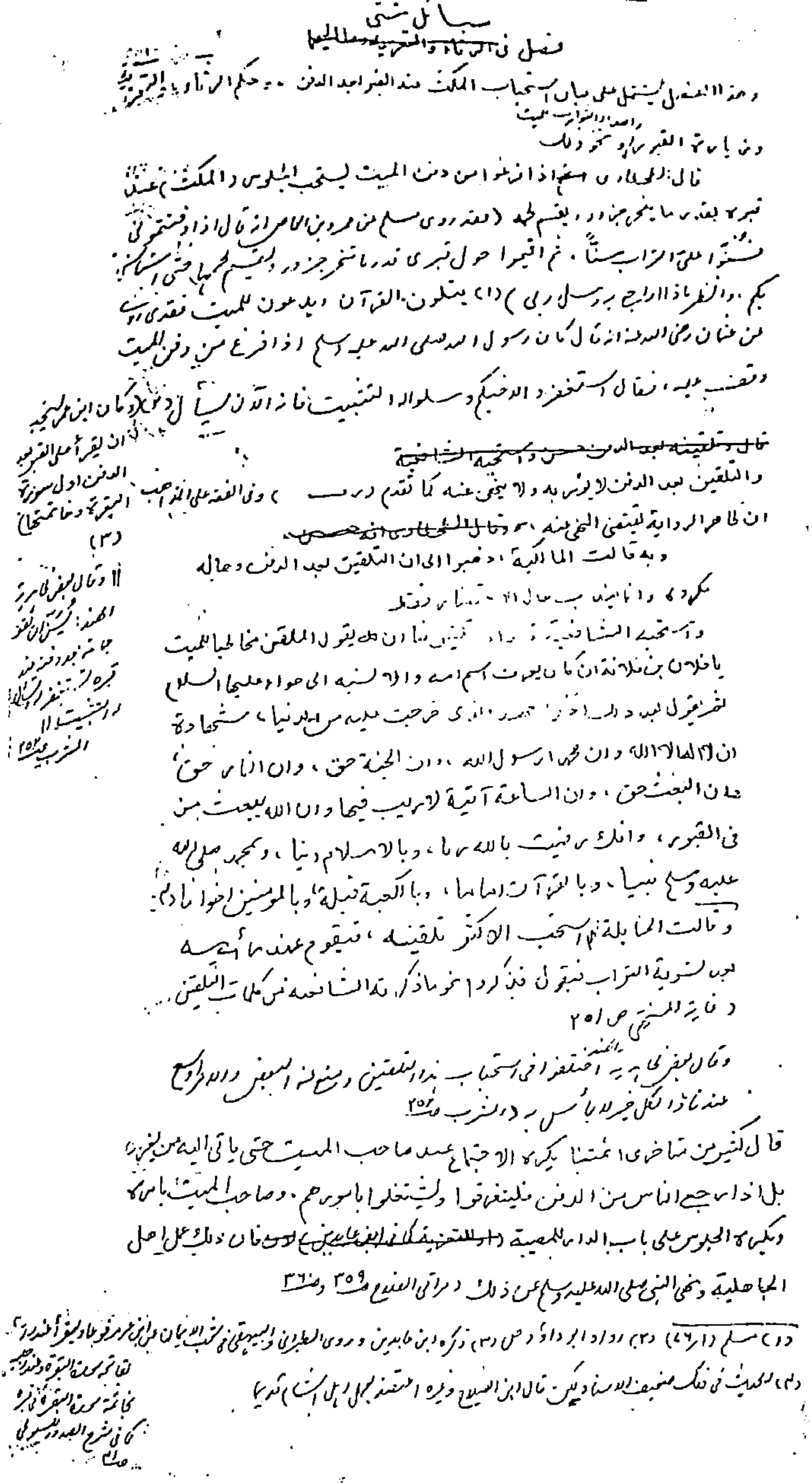
ف٦٣ ، النعي منهي عنه اتفاقا ، وهو ان يركب رجل دابة ويصيح في الناس انعى فلانا ، او كما رأى النعي ، او ينادي بموته للمفاخرة (راجع الفتح والنيل وغيرهما)

ف٦٤ ، ويستحب ايضا ان يسارع الى قضاء دينه وابرائه منه[6] لحديث ابي هريرة مرفوعا: نفس المؤمن معلقة بدينه حتى يقضى عنه ، ~~رواه احمد والترمذي~~ قال السيوطي: ... فهي ... ترك الميت ... ما دام له ...

---

(١) الهندية (٢) ابن عابدين (٣) غاية المنتهى (٤) فتح الباري ٣/٢٧٥ والنيل ٤/١٩ ، (٥) النيل (٦) الهندية والفتاوى ~~(٧) المصنف ...~~

علامہ اعظمی کے مسودے کا ایک صفحہ



مسائل شتى

فصل في القراءة والتعزية

وهذا الفصل يشتمل على بيان استحباب المكث عند القبر بعد الدفن وحكم القراءة والتعزية واهداء الثواب للميت ومن اتى القبر سؤاله ونحو ذلك

قال العلماء رحمهم الله: إذا فرغوا من دفن الميت يستحب الجلوس والمكث عند قبره بقدر ما ينحر جزور ويقسم لحمه (فقد روى مسلم عن عمرو بن العاص أنه قال إذا دفنتموني فشنوا علي التراب شنا، ثم أقيموا حول قبري قدر ما تنحر جزور ويقسم لحمها حتى أستأنس بكم، وأنظر ماذا أراجع به رسل ربي) (1) يتلون القرآن ويدعون للميت فقد روي عن عثمان رضي الله عنه أنه قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا فرغ من دفن الميت وقف عليه، فقال استغفروا لأخيكم وسلوا له التثبيت فإنه الآن يسأل (2) وكان ابن عمر يحب أن يقرأ على القبر بعد الدفن أول سورة البقرة وخاتمتها (3)

والتلقين بعد الدفن لا بأس به ولا ينهى عنه كما تقدم [illegible] وفي الفقه على المذاهب أن ظاهر الرواية يقتضي النهي عنه

وبه قالت المالكية إذ ذهبوا إلى أن التلقين بعد الدفن وحاله مكروه، وإنما يندب حال الاحتضار فقط

واستحب الشافعية [illegible] تلقينه بأن يقول الملقن مخاطبا الميت يا فلان بن فلانة إن كان يعرف اسم أمه وإلا نسبه إلى حواء عليها السلام ثم يقول له اذكر العهد الذي خرجت عليه من الدنيا، شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله، وأن الجنة حق، وأن النار حق، وأن البعث حق، وأن الساعة آتية لا ريب فيها وأن الله يبعث من في القبور، وأنك رضيت بالله ربا، وبالإسلام دينا، وبمحمد صلى الله عليه وسلم نبيا، وبالقرآن إماما، وبالكعبة قبلة، وبالمؤمنين إخوانا [illegible]

وقالت الحنابلة ثم يستحب الأكثر تلقينه، فيقوم عند رأسه بعد تسوية التراب فيقول نحو ما ذكره الشافعية من كلمات التلقين (فقه المذاهب ص 251)

وقال العيني في [illegible] اختلفوا في استحباب هذا التلقين ومنع منه البعض والأصح عندنا أنه لكل خير لا بأس به (شرح [illegible] 255)

وقال العيني في شرح الهداية: [illegible] بعد الدفن [illegible] قبره [illegible] والتثبيت [illegible] (شرح [illegible] 255)

قال كثير من متأخري أئمتنا يكره الاجتماع عند صاحب الميت حتى يأتي إليه من يعزي بل إذا رجع الناس من الدفن فليتفرقوا وليشتغلوا بأمورهم، وصاحب الميت بأموره ويكره الجلوس على باب الدار للمصيبة فإن ذلك عمل أهل الجاهلية ونهى النبي صلى الله عليه وسلم عن ذلك (مراقي الفلاح ص 359 و 360)

(1) مسلم (1/76) (2) رواه أبو داود (ص) (3) ذكره ابن عابدين وروى الطبراني والبيهقي في شعب الإيمان عن ابن عمر مرفوعا [illegible] فاتحة سورة البقرة وعند رجليه بخاتمة سورة البقرة في قبره كما في شرح الصدور للسيوطي

(4) الحديث في ذلك ضعيف الإسناد [illegible] قال ابن الصلاح وغيره [illegible] قديما

علامہ اعظمی کے مسودے کا ایک صفحہ

موسوعہ فقہیہ کے کتاب الجنائز کا دوسرا صفحہ

ويستحب أن ينزع عنه ثيابه التي مات فيها، ويسجى جميع بدنه بثوب «فعن عائشة رضي الله تعالى عنها أن رسول الله ﷺ حين توفي سجي ببرد حبرة»[1] ويترك على شيء مرتفع من لوح أو سرير، لئلا تصيبه نداوة الأرض فيتغير ريحه. ويجعل على بطنه حديد، أو طين يابس، لئلا ينتفخ، وهذا متفق عليه في الجملة.[2]

الإعلام بالموت:

٤ - يستحب أن يعلم جيران الميت وأصدقاؤه حتى يؤدوا حقه بالصلاة عليه والدعاء له، روى سعيد بن منصور عن النخعي: لا بأس إذا مات الرجل أن يؤذن صديقه وأصحابه، إنما يكره أن يطاف في المجلس فيقال: أنعي (فلانا) لأن ذلك من فعل أهل الجاهلية، وروي نحوه باختصار عن ابن سيرين، وإليه ذهب الحنفية والشافعية.[3]

وكره بعض الحنفية النداء في الأسواق قال في النهاية: إن كان عالما، أو زاهدا، أو ممن يتبرك به، فقد استحسن بعض المتأخرين النداء في

= ١/ ٦٩ والغاية ١/ ٢٢٨ ولفظها: «سن تليين مفاصله وخلع ثيابه وستره بثوب ووضع حديدة ونحوها على بطنه.

(١) حديث: «أن رسول الله ﷺ حين توفي سجي...» أخرجه البخاري (فتح الباري ١٠/ ٢٧٦ - ط السلفية). ومسلم (٢/ ٦٥١ - ط عيسى الحلبي). من حديث عائشة.

(٢) المراجع السابقة.

(٣) فتح الباري ٣/ ٧٥، وشرح البهجة ١/ ١٢٤

الأسواق لجنازته وهو الأصح، ولكن لا يكون على هيئة التفخيم، وينبغي أن يكون بنحو، مات الفقير إلى الله تعالى فلان ابن فلان،[1] ويشهد له أن أبا هريرة كان يؤذن بالجنازة فيمر بالمسجد فيقول: عبدالله دعي فأجاب، أو أمة الله دعيت فأجابت.[2] وعند الحنابلة لا بأس بإعلام أقاربه وإخوانه من غير نداء.[3]

وقال ابن العربي من المالكية: يؤخذ من مجموع الأحاديث ثلاث حالات:

الأولى: إعلام الأهل والأصحاب وأهل الصلاح فهذا سنة.

والثانية: الدعوة للمفاخرة بالكثرة فهذا مكروه.

والثالثة: الإعلام بنوع آخر كالنياحة ونحو ذلك فهذا محرم.[4]

وفي الشرح الصغير كره صياح بمسجد أو ببابه بأن يقال: فلان قد مات فاسعوا إلى جنازته مثلا، إلا الإعلام بصوت خفي أي من غير صياح فلا يكره.

فالنعي منهي عنه اتفاقا، وهو أن يركب رجل دابة ويصيح في الناس أنعي فلانا، أو كما مر عن

(١) الهندية ١/ ١٥٥، وابن عابدين ١/ ٥٩٧، ٦٢٩

(٢) رواه ابن أبي شيبة ٤/ ٩٩

(٣) غاية المنتهى ١/ ٢٢٨

(٤) فتح الباري ٣/ ٧٥

موسوعہ فقہیہ کے الجنائز کے آخر سے پہلے کا ایک صفحہ

نقبر فيها موتانا، يعني الصلاة على الجنازة، وكرهها ابن المبارك عند طلوع الشمس وعند غروبها، وإذا انتصف النهار حتى تزول الشمس (كما قال أبوحنيفة) وهو قول أحمد وإسحاق وهو قول مالك والأوزاعي وهو قول ابن عمر.

وقال الشافعية: إذا وقع الدفن في هذه الأوقات بلا تعمد فلا يكره.

والنهي عند الشافعي محمول على الصلوات التي لا سبب لها.[1]

التعزية، والرثاء، وزيارة القبور ونحو ذلك:

٤٥ - قال الطحطاوي: إذا فرغوا من دفن الميت يستحب الجلوس (المكث) عند قبره بقدر ما ينحر جزور ويقسم لحمه، (فقد روى مسلم عن عمرو بن العاص أنه قال: إذا دفنتموني فشنوا علي التراب شنا، ثم أقيموا حول قبري قدر ما تنحر جزور ويقسم لحمها حتى استأنس بكم، وأنظر ماذا أراجع به رسل ربي)[2] يتلون القرآن ويدعون للميت. فقد روي عن عثمان رضي الله عنه أنه قال: كان رسول الله ﷺ إذا فرغ من دفن الميت وقف عليه، فقال: «استغفروا لأخيكم وسلوا له التثبيت فإنه الآن يسأل».[1]

وكان ابن عمر يستحب أن يقرأ على القبر بعد الدفن أول سورة البقرة وخاتمتها.[2]

والتلقين بعد الدفن لا يؤمر به وينهى عنه.

وظاهر الرواية عند الحنفية يقتضي النهي عنه، وبه قالت المالكية فقد ذهبوا إلى أن التلقين بعد الدفن وحاله مكروه، وإنما يندب حال الاحتضار فقط. واستحبه الشافعية فقالوا: والتلقين هنا أن يقول الملقن مخاطبا للميت: يا فلان بن فلانة، إن كان يعرف اسم أمه وإلا نسبه إلى حواء عليها السلام، ثم يقول بعد ذلك اذكر العهد الذي خرجت عليه من الدنيا، شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله، وأن الجنة حق، والنار حق، وأن البعث حق، وأن الساعة آتية لا ريب فيها، وأن الله يبعث من في القبور، وأنك رضيت بالله ربا، وبالإسلام دينا، وبمحمد ﷺ نبيا، وبالقرآن إماما،

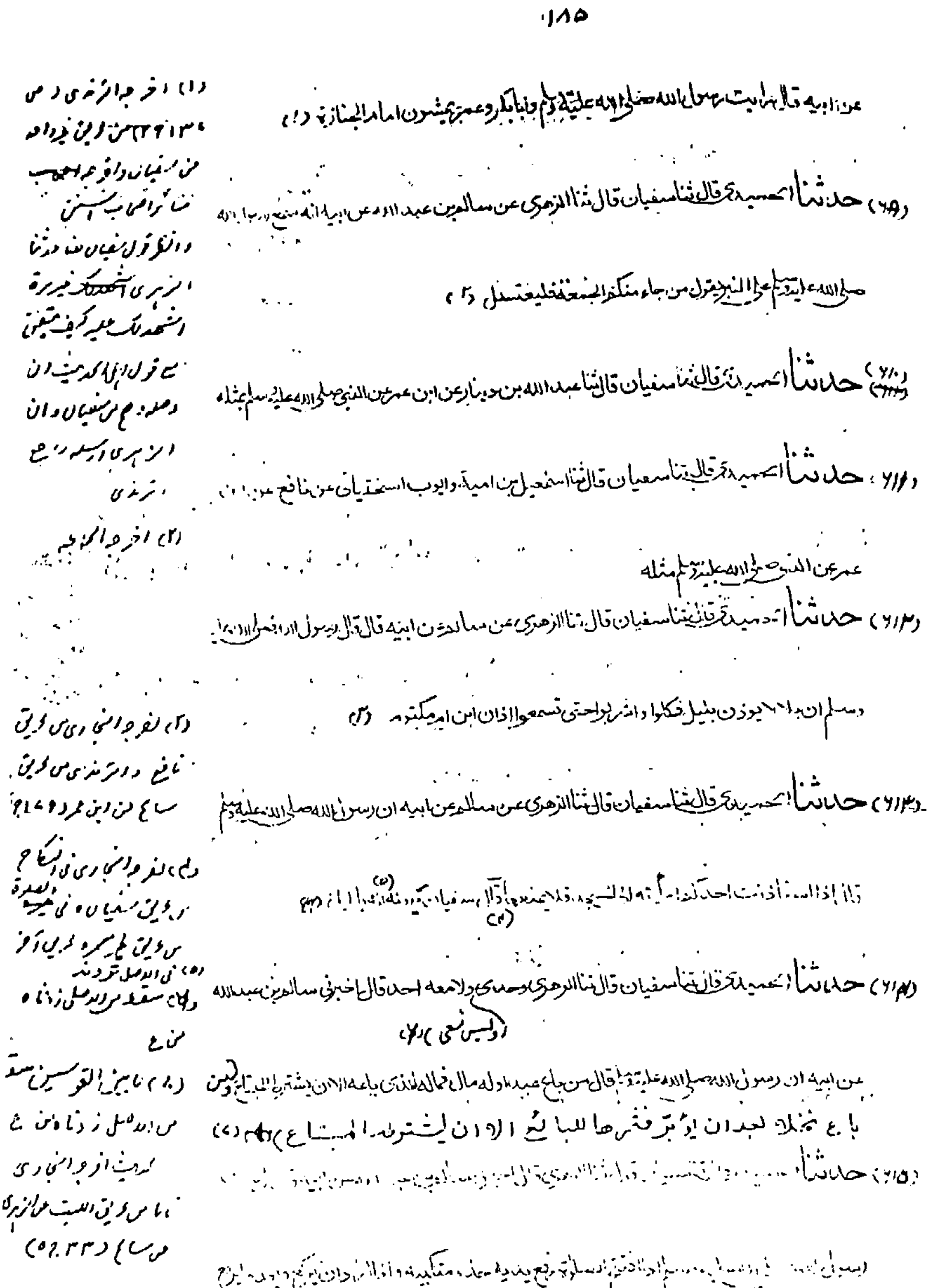
---

(١) شرح مسلم ١/ ٢٧٦. وسنن الترمذي ٢/ ١٤٤، والموطأ بشرح الزرقاني ٢/ ٦٣. وتحفة الأحوذي ٢/ ١٤٤

(٢) أثر: «إذا دفنتموني فشنوا علي التراب شنا، ثم أقيموا ....» أخرجه مسلم (١/ ١١٢ - ط عيسى الحلبي).

(١) حديث: «استغفروا لأخيكم وسلوا له التثبيت فإنه الآن يسأل» أخرجه أبوداود (٣/ ٥٥٠ - ط عزت عبيد الدعاس) والحاكم (١/ ٣٧٠ - ط دار الكتاب العربي) من حديث عثمان بن عفان. وقال الحاكم: (إسناده صحيح) ووافقه الذهبي.

(٢) ذكره ابن عابدين وروى الطبراني والبيهقي في شعب الإيمان عن ابن عمر مرفوعا وليقرأ عند رأسه أول سورة البقرة، وعند رجليه بخاتمة سورة البقرة في قبره. كما في شرح الصدور للسيوطي ص٤١



١٨٥

عن ابيه قال رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم وابا بكر وعمر يمشون امام الجنازة (١)

(٦٠٩) حدثنا الحميدي قال ثنا سفيان قال ثنا الزهري عن سالم بن عبد الله عن ابيه انه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم على المنبر يقول من جاء منكم الجمعة فليغتسل (٢)

(٦١٠) حدثنا الحميدي قال ثنا سفيان قال ثنا عبد الله بن دينار عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم مثله

(٦١١) حدثنا الحميدي قال ثنا سفيان قال ثنا اسمعيل بن امية وايوب السختياني عن نافع عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم مثله

(٦١٢) حدثنا الحميدي قال ثنا سفيان قال ثنا الزهري عن سالم عن ابيه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان بلالا يؤذن بليل فكلوا واشربوا حتى تسمعوا اذان ابن ام مكتوم (٣)

(٦١٣) حدثنا الحميدي قال ثنا سفيان قال ثنا الزهري عن سالم عن ابيه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال اذا استأذنت احدكم امرأته الى المسجد فلا يمنعها (٥) قال سفيان [illegible] (٤)

(٦١٤) حدثنا الحميدي قال ثنا سفيان قال ثنا الزهري وحفظي ولا معه احد قال اخبرني سالم بن عبد الله (وليس نعم) (٦) عن ابيه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال من باع عبدا وله مال فماله للذي باعه الا ان يشترط المبتاع ومن باع نخلا بعد ان يؤبر فثمرها للبائع الا ان يشترط المبتاع (٧)

(٦١٥) حدثنا الحميدي [illegible]
رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا افتتح الصلاة رفع يديه حذو منكبيه واذا اراد ان يركع [illegible]

(١) اخرجه الترمذي رقم ١٣٠٦٢ من ابن عيينة من سفيان واخرجه [illegible] واصحاب السنن والنكر قول سفيان هذا حدثنا الزهري اشهدك غير مرة اشهد انك عليه كيف يتقى مع قول اهل الحديث ان وصله وهم من سفيان وان الزهري ارسله راجع الترمذي

(٢) اخرجه الجماعة

(٣) اخرجه البخاري من طريق نافع والترمذي من طريق سالم عن ابن عمر ٢٠٩٦

(٤) اخرجه البخاري في النكاح من طريق سفيان وفي الصلوة من طريق [illegible]

(٥) في الاصل تكرر هنا

(٦) سقط من الاصل زدناه من ع

(٧) ما بين القوسين سقط من الاصل زدناه من ع والحديث اخرجه البخاري اما من طريق الليث عن الزهري عن سالم (٥٢.٣٣)

علامہ اعظمی کے مسودۂ حمیدی کا وہ صفحہ جس پر حضرت ابن عمر کی حدیث ہے

احاديث عبد الله بن عمر بن الخطاب حدثنا الحميدي قال ثنا سفيان قال ثنا الزهري غير مرة يشهد
عليه قال اخبرني سالم بن عبد الله عن ابيه قال رايت رسول الله صلى الله عليه وسلم وابا بكر وعمر يمشون امام الجنازة حدثنا الحميدي
قال ثنا سفيان قال ثنا الزهري عن سالم بن عبد الله عن ابيه انه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم على المنبر يقول من جاء منكم الجمعة فليغتسل
الحميدي قال ثنا سفيان قال ثنا عبد الله بن دينار عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم بمثله حدثنا الحميدي قال ثنا سفيان قال ثنا
اسمعيل بن امية وايوب السختياني عن نافع عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم مثله حدثنا الحميدي قال ثنا سفيان قال ثنا الزهري عن
سالم عن ابيه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان بلالا يؤذن بليل فكلوا واشربوا حتى تسمعوا اذان ابن ام مكتوم حدثنا الحميدي
قال ثنا سفيان قال ثنا الزهري عن سالم عن ابيه ان النبي صلى الله عليه وسلم قال اذا استاذنت احدكم امراته الى المسجد فلا يمنعها
قال سفيان يرونه بالليل حدثنا الحميدي قال ثنا سفيان قال ثنا الزهري وحفظته كما احفظ قال اخبرني سالم بن عبد الله عن
ابيه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال من باع عبدا وله مال فماله للبائع الا ان يشترط المبتاع حدثنا الحميدي قال ثنا سفيان
ثنا الزهري قال اخبرني سالم بن عبد الله عن ابيه قال رايت رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا افتتح الصلاة رفع يديه حذو منكبيه واذا اراد ان
يركع وبعد ما يرفع راسه من الركوع فلا يرفع ولا بين السجدتين حدثنا الحميدي قال ثنا الوليد بن مسلم قال سمعت زيد بن واقد يحدث عن نافع
ان عبد الله بن عمر كان اذا ابصر رجلا يصلي لا يرفع يديه كلما خفض ورفع حصبه حتى يرفع يديه حدثنا الحميدي قال ثنا سفيان قال
الزهري قال ثني سالم عن ابيه قال رايت رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا جد به السير جمع بين المغرب والعشاء حدثنا الحميدي قال
قال ثنا الزهري عن سالم عن ابيه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا حسد الا في اثنتين رجل اتاه الله القرآن فهو يقوم به اناء الليل و
ورجل اتاه الله مالا فهو ينفق منه اناء الليل واناء النهار حدثنا الحميدي قال ثنا سفيان قال ثنا الزهري عن سالم عن ابيه

مسند حمیدی کے دیوبندی نسخے کی تصویر جس میں حضرت ابن عمر کی حدیث ہے

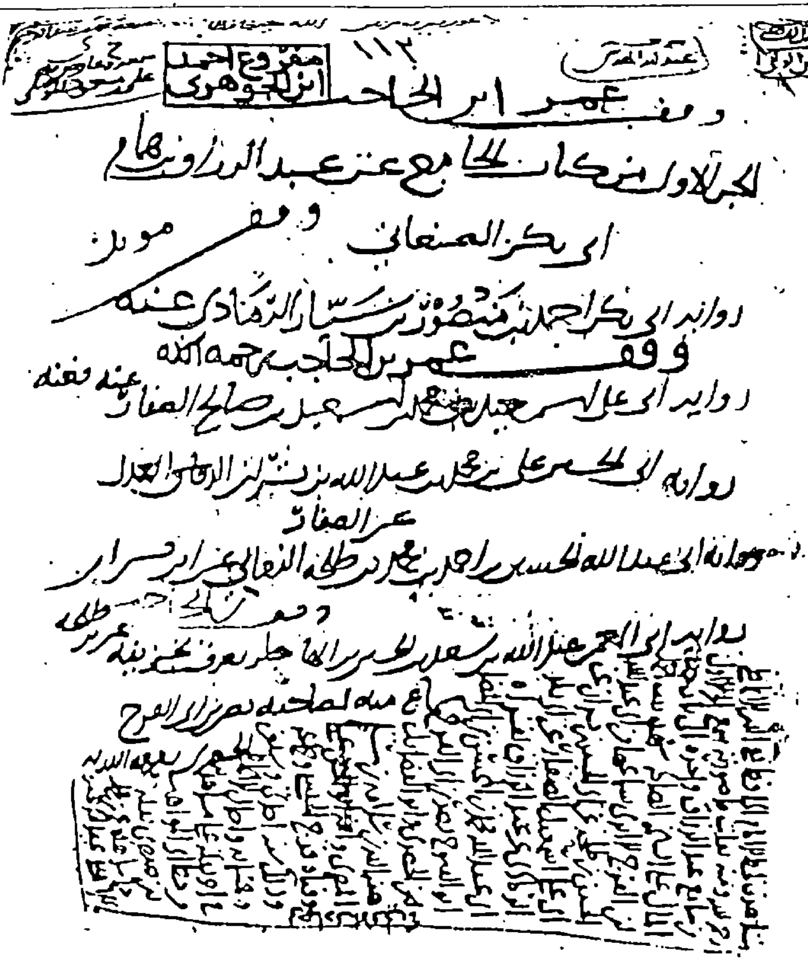
عالم ان لم يعلم ان لله تعالى والصبر من الايمان ...
من ... اذا انقطع الرأس تبين ذلك في الجسد ولا ايمان لمن لا صبر له
اخبرنا عبد الرزاق قال سمعت النعمان بن الزبير الصنعاني يحدث
ان محمد بن يوسف او ايوب بن يحيى بعث الى طاوس بسبع مائة دينار
او خمس مائة وقيل للرسول ان اخذها منك فان الامير سيكسوك
ويحسن اليك قال فخرج بها حتى قدم على طاوس الجند فقال يا
عبد الرحمن نفقة بعث بها الامير اليك قال ما لي بها حاجة فاراد
اخذها بغفلة طاوس فرمى بها في كوة البيت ثم ذهب فقال
اخذها فلبثوا احيانا ثم بلغهم عن طاوس شيء يكرهونه فقال
ابعثوا اليه فليبعث الينا بما لنا فجاءه الرسول فقال المال الذي
بعث به اليك الامير قال ما قبضت منه شيئا فرجع الرسول فاخبرهم
فعرفوا انه صادق فقال انظروا الرجل الذي ذهب بها فابعثوه اليه
فقال المال الذي جئتك به يا ابا عبد الرحمن فقال هل قبضت
قال لا فقيل له تدري حيث وضعته قال نعم في تلك الكوة
حيث وضعته قال فمد يده فاذا هو بالصرة قد ...
قال فاخذها فذهب بها اليهم واخبرنا عبد الرزاق ...
معمر عن ثابت عن انس قال كان شعر النبي صلى الله عليه وسلم
الى انصاف اذنيه

تم كتاب الجامع والحمد لله وعونه ... وبتمامه تم جميع
كتاب المصنف لابي بكر عبد الرزاق بن همام بن نافع
الصنعاني اليماني والحمد لله رب العالمين كما هو اهله وصلى الله
على محمد نبيه والرسل تسليما ... في الثالث والعشرين ...
الاول سنة ست وستمائة

مكتبہ فیض اللہ آفندی کے نسخے کا آخری صفحہ



کتاب الجامع کے نصر بن ابی الفرج کے نسخے کا آخری صفحہ



کتاب الجامع کے نصر بن ابی الفرج۔ کے نسخے کا سرورق

خمس احفظوهن لو ركبتم الابل لانضيتموها قبل ان تدركوهن لا يخاف العبد الا ذنبه ولا يرجو الا الله ولا يستحيي جاهل ان يسأل ولا يستحيي عالم
ان يقول الله اعلم والصبر من الايمان بمنزلة الرأس من الجسد اذا قطع الرأس يبس ما في الجسد وقال الا ايمان لمن لا صبر له اخبرنا عبد الرزاق
قال سمعت النعمان بن الزبير الصنعاني يحدث ان محمد بن يوسف او ايوب بن يحيى بعث الى طاوس بسبعمائة دينار او خمسمائة وقيل للرسول
ان اخذها منك فان الامير سيكسوك ويحسن اليك قال فخرج بها حتى قدم على طاوس الجند فقال يا ابا عبد الرحمن نفقة بعث بها
الامير اليك قال ما لي بها حاجة فأراده على اخذها فغفل طاوس فرمى بها في كوة البيت ثم ذهب فقال لهم اخذها فلبثوا حينا ثم بلغهم عن
طاوس شيء يكرهونه فقال ابعثوا اليه فليبعث الينا بمالنا فجاءه الرسول فقال المال الذي بعث به اليك الامير قال ما قبضت منه شيئا فرجع
الرسول فاخبرهم فعرفوا انه صادق فقال انظروا الرجل الذي ذهب بها فابعثوه اليه فقال المال الذي جئتك به يا ابا عبد الرحمن فقال هل قبضت
منك شيئا قال لا قيل له تدري حيث وضعته قال نعم في تلك الكوة قال فانظره حيث وضعته قال فمد يده فاذا هو بالصرة قد بنت عليها العنكبوت
قال فاخذها فذهب بها اليهم اخبرنا عبد الرزاق قال اخبرنا معمر عن ثابت قال كان شعر النبي صلى الله عليه
وآله وسلم الى انصاف اذنيه

تمت

بعضا الصحف

الحمد لله سبحانه تم كتابة هذه النسخة الشريفة على يد الراجي الى الله ابي محمد خليل الله بن محمد صبغة الله قاضي الملك امام العلماء وفي اثنائه
على يد ابني وقرة عيني محمد حميد الله اللهم وفقهما بالخيور الكاملة بجاه نبيك المصطفى سيدنا وحبيبنا محمد صلى الله عليه وعلى آله واصحابه وسلم
وذلك في احدى عشر خلون من شهر المبارك ربيع الاول سنة ثمان واربعين بعد الالف وثلثمائة
من هجرة النبي الامين صلى الله عليه وآله وسلم في بلدة حيدرآباد صانها الله تعالى
من شرور الزمان واهله والفتن

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے والد کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے کا آخری صفحہ

الجزء الاول من كتاب الجامع

تأليف الامام عبد الرزاق بن همام الصنعاني

رواية ابي بكر احمد بن منصور بن سيار الرمادي عنه

رواية ابي علي اسمعيل بن محمد بن اسمعيل الصفار عنه

رواية ابي الحسين علي بن محمد بن عبد الله بن بشران المعدل عنه

رواية ابي عبد الله الحسين بن احمد بن محمد بن طلحة النعالي عنه

رواية شهدة بنت احمد بن الفرج بن عمر الابري الكاتبة عنه

رواية ابي الحسن علي بن هبة الله بن سلامة بن المسلم اللخمي بن الجميزي

رواية ابي زكريا يحيى بن يوسف بن المصري عنه اجازة

رواية ابي العباس احمد بن الحسن بن محمد العدس السويداوي اجازة عنه

رواية الحافظ ابي الفضل احمد بن علي بن محمد بن حجر العسقلاني عنه

رواية ابي الفضل عبد الرحمن بن احمد بن اسمعيل القلقشندي عنه

[illegible]

کتاب الجامع شیخ تقی الدین قلقشندی کے نسخے کا سرورق

اسمعيل بن سميع كوفي ثقة، وقال مرة اخرى ثقة مامون — اسمعيل بن سميع (٦)

نا محمد بن بيان نا صالح بن احمد بن حنبل نا علي بن المديني قيل ليحيى بن سعيد — اسمعيل بن عبد الرحمن السدي (٧)

قال السدي، فقال اسمعيل بن عبد الرحمن قال السدي ما سمعت احدا الا بخير

نا يحيى بن محمد بن صاعد نا محمد بن هارون الحضرمي نا الانا ابو هشام الرفاعي

نا اسمعيل بن شعيب السمان وكان ثقة — اسمعيل بن شعيب السمان (٨)

وقال احمد بن صالح المصري اسمعيل بن ابي حكيم عن عبيدة بن سفيان هذا من [illegible] — اسمعيل بن ابي حكيم (٩)

اثبت اسنادا اهل المدينة، اسمعيل له شان وقال يحيى بن معين اسمعيل بن

ابي حكيم صالح،

نا عبد الله بن محمد البغوي قال نا محمود بن غيلان نا ابن معين اسمعيل بن / ٢

عياش ثقة، وفي رواية اخرى ليس به باس، وقال احمد بن حنبل كان اسمعيل — اسمعيل بن عياش (١٠)

ابن عياش صاحب حديث،

وقال علي بن المديني اسمعيل بن شروس ثقة من اهل اليمن، — اسمعيل بن شروس (١١)

وقال ابن معين قد سمعت من اسمعيل بن محمد بن جحادة وكان اعمى ولم يكن — اسمعيل بن محمد بن جحادة (١٢)

به باس،

وقال احمد بن حنبل اسمعيل بن ابان الوراق ثقة، وقال فيه عثمان بن ابي شيبة — اسمعيل بن ابان الوراق (١٣)

اسمعيل بن ابان الوراق ثقة صحيح الحديث ... مسلم ...

قال اسمعيل بن ابان الوراق عندنا غير محمود فقال كان هو ...

... قال له ابن ابان، وكان كذابا الذي كان ...

وسئل يحيى بن معين عن اسمعيل بن زكريا الخلقاني، الوزريا فقال — اسمعيل بن زكريا (١٤)

ثقة، — الوزريا الخلقاني

واسمعيل بن محمد بن سحادة ثقة، — اسمعيل بن محمد بن سحادة (١٥)

واسمعيل بن مجالد صالح، وقال عثمان بن ابي شيبة كان اسمعيل بن مجالد — اسمعيل بن مجالد (١٦)

صدوقا وليتني كنت كتبت عنه كان يحدث عن ابي اسحاق، وسماك / ٣

وبيان ... ليس به باس، وقال احمد بن حنبل ما اراه الا صدوقا، / —

---

٤ اسمعيل بن زكريا بن مرة الخلقاني بضم المعجمة وسكون اللام بعدها قاف، الوزريا الكوفي

لقبه شقوصا بفتح المعجمة وضم القاف المخففة وبالمهملة صدوق يخطئ قليلا

من الثامنة مات سنة اربع وسبعين وقيل قبلها، تقريب، (حاشية الاصل)

له وقال ابن معين كوفي التهذيب ١٢ له لم يكن هذه الرواية عن ابن معين في تهذيب التهذيب وكان ينبغي ... ١٢

له حكى ابن حجر هذا الكلام في التهذيب بعزوه الى ثقات ابن شاهين له ... ابن حجر ... في اختصار ترجمة في الميزان وقال

ذكره ابن حبان وابن شاهين في الثقات له نقل هذا الكلام ابن حجر في التهذيب عن ثقات ابن شاهين مختصرا له هكذا

في الاصل والظاهر ... له نقله ابن حجر في التهذيب عن ثقات ابن شاهين

ابن شاہین کی کتاب الثقات اور اس پر علامہ اعظمی کی تعلیقات کی تصویر

وزاں پس آں حبیبِ ما، ادیبِ ما، خطیبِ ما
کہ ذاتش در مئو احناف را حصن حصیں آمد
اقبال سہیلؔ

دفاعِ حنفیت

مذہب حنفی کی عالم گیر مقبولیت

یہ ۴ رصفحے کا ایک مختصر مضمون ہے، جس میں متعدد عنوانات کے تحت امام ابوحنیفہؒ کی خداداد مقبولیت، آپ کے تلامذہ کی کثرت تعداد، وہ ممالک جہاں امام صاحبؒ کا مذہب مقبول ہوا، نیز مقبولیت کے اسباب کا نہایت اجمال واختصار کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔

امام صاحب کی عظمت وجلالت اور مقبولیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ان کے زمانے کے اکثر اجلۂ محدثین نے ان کی تعریف وتوصیف کی ہے، چنانچہ امام سفیان ثوریؒ، حضرت عبداللہ بن مبارکؒ، امام اوزاعیؒ، یحییٰ ابن سعید قطانؒ، لیث بن سعد مصریؒ، امام مالک بن انسؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، اور امام یحییٰ بن معین کی نسبت لکھا ہے کہ امام صاحب کے کمال تفقہ اور علم واجتہاد کا اعتراف کیا کرتے تھے، بلکہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ تو آپ کی فقہ پر عمل پیرا تھے، اور یحییٰ بن سعید قطان آپ کے قول پر فتوی دیتے تھے۔

علامہ اعظمیؒ کا یہ مضمون ۱۲ رشوال ۱۳۴۵ھ کا تحریر فرمودہ ہے، اس وقت آپ مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں مدرس اول (صدر المدرسین) تھے۔

☆......☆......☆

مثالب ابی حنیفہ کی تنقید

اخبار 'محمدی' کے اڈیٹر(۱) نے یکم مئی و۱۵ رمئی ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں تاریخ خطیب کے حوالے سے چند اقوال امام اعظم کے نقل کر کے اوران کو واقعی امام صاحب کے اقوال جان کر علماء احناف سے مطالبہ کیا تھا کہ ان کا جواب دیں، ورنہ وہ ان کو لا جواب سمجھنے پر مجبور ہوگا۔

اس کے جواب میں علامہ اعظمیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ:

''تاریخ خطیب کی روایات منقولہ اب سے پہلے علماء اعلام کی مشق تنقید کا تختہ بن چکی ہیں، اور بہت اچھی طرح ان کے تار و پود بکھیرے جا چکے ہیں، ان کی سند ومتن پر کافی جرحیں کی جا چکی ہیں، ان کا پایۂ اعتبار سے ساقط ہونا، افترا و کذب ہونا، باطل وموضوع ہونا، عقلی ونقلی دلائل سے ثابت ہو چکا ہے''(۲)۔

اس مضمون میں علامہ اعظمی نے عالم وفاضل بادشاہ ملک معظم ابوعیسی کی کتاب '**السهم المصيب في كبد الخطيب**' کا ذکر کیا ہے کہ انھوں نے اپنی اس تصنیف میں روایات خطیب کا نہایت تفصیل وتحقیق سے

(۱) اخبار 'محمدی' دہلی سے نکلنے والا پندرہ روزہ اخبار تھا، یہ اس زمانے میں اہل حدیث کا ایک اہم آرگن تھا، مولانا محمد جونا گڑھی اس کے اڈیٹر تھے۔ اس کے زیر بحث مضمون کا عنوان تھا ''حنفی علماء جواب دیں''۔

(۲) مقالات ابوالمآثر: ۳۶/۱-۳۵

جواب دیا ہے۔

اس کے بعد علامہ ابن حجر مکی کی کتاب 'الخیرات الحسان'، قاضی ابن خلکان شافعی، علامہ جلال الدین سیوطی شافعی کی کتابوں سے، سبط ابن الجوزی کی 'مرآۃ الزمان'، علامہ محمد طاہر پٹنی کی 'المغنی'، امام شعرانی کی 'المیزان الکبری' اور ملا معین کی 'دراسات اللبیب' وغیرہ کی عبارتیں نقل کر کے خطیب بغدادی کی روایتوں کا پایۂ اعتبار سے ساقط ہونا ثابت کیا ہے۔

ایک عنوان ''تنقید روایاتِ خطیب'' قائم کر کے اس کے ماتحت تحریر فرماتے ہیں:

> ''اصل مقصد سے پیشتر یہ بتا دینا مفید ہوگا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہر کلمہ گو کی عیب جوئی و نکتہ چینی بلا ضرورت دینیہ حرام ہے، خصوصاً کسی ولی، کسی بزرگ کی اہانت کو خدا سے اعلانِ جنگ کا مرادف قرار دیا گیا ہے، اس لیے اولاً تو اس کام کے نزدیک نہ جانا چاہیے، لیکن اگر کوئی ضرورت شرعی اس کے لیے مجبور کرے، تو آیۂ کریمہ ﴿اِنْ جَاءَ كُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا﴾ کے حکم کے ماتحت اصولاً ضروری ہے کہ جو الزام کسی کو دیا گیا ہے، اس کی کامل تحقیق کر لی جائے؛ اس لیے بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے اڈیٹر 'محمدی' کا فرض تھا کہ جب اس نے تاریخ خطیب سے معائبِ ابی حنیفہ نقل کیے تھے، تو پہلے یہ دیکھ لیتا کہ ان کا اسناد کی حیثیت سے کیا پایہ ہے، ان معائب کے ناقلین کا کیا درجہ ہے، کہیں ان کی عدالت و ثقاہت تو مشکوک نہیں، یا ان کو امام صاحب سے بغض و عناد تو نہیں تھا؟ لیکن اس نے اس کی کچھ پروانہ کی کہ اس کی یہ حرکت قرآنی حکم کے خلاف ہوگی، یا یہ کام خدا سے اعلانِ جنگ کے مرادف ہوگا''۔(۱)

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کی اہانت کرنے والی تاریخ بغداد کی تین روایتوں کو لے کر ان کے متکلَّم فیہ راویوں پر ائمۂ جرح و تعدیل کی جرحوں کو نقل کر کے ان کی روایتوں کا مجروح اور نا قابلِ اعتبار ہونا ثابت کیا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

حنفیہ کرام اور اتباعِ حدیث

یہ مضمون ۱۵ر صفحات پر مشتمل ہے، اس کے عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ مذہب احناف پر حدیث سے بے توجہی کی جو تہمت لگائی جاتی ہے اس کا دفاع کیا گیا ہے، چنانچہ اس مضمون میں علامہ اعظمیؒ نے مخالفینِ احناف کا یہ اعتراض وارد کر کے کہ:

> ''حنفی مذہب آراء و قیاسات کا مجموعہ ہے، اس میں حدیث صحیح و مرفوع بھی رائے و قیاس کے سامنے بے وقعت اور نا قابل عمل ہے۔''

(۱) مقالات ابوالمآثر: ۱/۴۳

اس کا نہایت قوت کے ساتھ رد وابطال کیا ہے، اور نہ صرف اس اعتراض کو لغو اور بے حقیقت ثابت کیا ہے، بلکہ حنفیہ کا حدیث پر عمل اور اس سے سرمو انحراف نہ کرنے کو امام صاحب کے قول: **إذا صَحَّ الحديثُ فهو مذهبي**، علماء حنفیہ کے اقوال، ان کی کتابوں اور بہت سی مثالوں اور فقہی مسائل و جزئیات سے ثابت کیا ہے۔ آپ نے اپنی تمہید میں لکھا ہے:

''اسلامی دنیا اس پر متفق ہے کہ امام الحنفیہ اور حنفیت کا بانی اول دنیا کی ان برگزیدہ ہستیوں میں ہے، جنھیں اللہ نے اپنی زمین میں مقبولیت تامہ سے سرفراز فرمایا ہے، اور وہ مبارک وجود ہے جسے زہد وتقویٰ کی تصویر، خوف خدا وخشیت الٰہی کا مجسمہ کہنا مبالغہ نہیں، اور ان باتوں کو ہمارے بھائی -یعنی غیر مقلدین- بھی تسلیم کرتے ہیں، تو ایسی صورت میں ایسے اللہ والے اور پاک باز کی نسبت یہ خیال کرنا کہ وہ اپنی رائے وقیاس کے سامنے احادیث نبویہ کو وقعت نہیں دیتا، اور اس کا قائل ہونا صریح تناقض ہے''[1]۔

یہ مضمون 'القاسم' امرتسر کے دو شماروں ۴/ و ۱۹/ رجب ۱۳۴۲ھ = ۱۰/ و ۲۵ فروری ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا تھا، اور اب 'مقالات ابوالمآثر' (جلد اول) میں صفحہ ۴۹-۶۳ پر مشتمل ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

تقلید اور غیر مقلدیت

آگے آئے گا کہ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں مئو آئمہ الہ آباد میں احناف کانفرنس منعقد ہوئی، اس کے بعد دوسری کانفرنس کا انعقاد پنجاب کے شہر امرتسر میں ہونا طے ہوا تھا، لیکن غالباً اس وقت کے سیاسی اور قومی وملی حالات کی وجہ سے یہ کانفرنس نہ ہوسکی۔ امرتسر میں ہونے والی اس کانفرنس کی صدارت علامہ اعظمیؒ کو کرنی تھی، اور اس کے لیے آپ نے خطبۂ صدارت بھی قلم بند فرما لیا تھا، جو بعد میں المآثر - ربیع الآخر، جمادی الاولی، جمادی الآخرہ ۱۴۱۸ھ- میں شائع کیا گیا۔ اب یہ خطبہ 'مقالات' میں صفحہ ۹۵ تا صفحہ ۱۱۱ پر مشتمل ہے۔

یہ سولہ صفحات پر مشتمل نہایت پُر مغز اور جامع تحریر ہے، جس میں تقلید کی اہمیت اور اس پر کیے جانے والے اعتراضات اور عدم تقلید کے مفاسد اور مضرات پر نہایت عالمانہ اور محققانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ خطبہ مسنونہ اور تمہید کے بعد فرماتے ہیں:

''حضرات! ایک زمانہ تھا جب دنیا میں مذہب کی حکومت تھی، حکومتیں چاہے اسلامی ہوں یا غیر اسلامی، کم از کم اپنے مذہب کا پورا احترام کرتی تھیں، اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ حکومت جس مذہب کو مانتی ہو، اس مذہب میں کوئی شخص بآسانی کوئی بدعت ایجاد کرکے یا کوئی فتنہ برپا کرکے چین سے بیٹھ سکے،

(۱) مقالات ابوالمآثر: ۱/ ۵۰

حکومت فوراً دارو گیر کرنا شروع کر دیتی تھی اور بزوراس بدعت کا خاتمہ اور فتنہ کا سد باب کر دیتی تھی؛ الّا یہ کہ خفیہ ریشہ دوانیوں کے ذریعہ کوئی ایسی طاقتور جماعت پیدا کر لی جائے، جس سے حکومت ٹکر نہ لے سکے، یا ٹکر لینے سے قصداً اغماض کرے''[۱]۔

اس کے بعد ایک شخص کے بدعت پسندانہ سوالات کرنے پر حضرت فاروق اعظمؓ کے سزا دینے کی روایت نقل کی ہے، اور اکبر جیسے بے دین بادشاہ سے مہدوی فرقے کے قلع قمع اور استیصال کرنے میں جس دلچسپی کا ظہور ہوا اس کو بھی ذکر کیا ہے۔

آگے ایک عنوان ''تمام فتنوں کی جڑ خودرائی ہے'' کے تحت لکھا ہے:

''ہندوستان سے اسلامی حکومت کا قدم اٹھ جانے کے بعد جن مذہبی فتنوں نے یہاں اپنا قدم جمایا اور سر اٹھایا، ان میں نیچریت، چکڑالویت اور خاکساریت نے بہت زیادہ اسلامی تعلیمات کو مسخ اور اسلامی وحدت کو پارہ پارہ اور جماعتی شوکت کو برباد کیا۔ بظاہر ان تمام فتنوں میں کوئی رشتہ اور باہمی ربط معلوم نہیں ہوتا؛ لیکن درحقیقت یہ سب ایک فتنہ کے مختلف الاشکال انڈے بچے ہیں، اور اس فتنہ کا نام اتباعِ ہویٰ اور خودرائی ہے۔ یہی خودرائی کبھی نیچریت کی شکل میں ظاہر ہوئی، کبھی قادیانیت کا بہروپ بھر کر سامنے آئی، کبھی چکڑالویت کے چولے میں نمودار ہوئی، اور کبھی خاکساریت کے جامہ میں دکھائی دی، اور ہاں یہی خودرائی ہے جو کبھی اتباع سلف سے اعراض یا ائمۂ متبوعین کی پیروی سے انحراف کے روپ میں نمایاں ہوئی۔ حاصل یہ کہ ان تمام فتن کی اصل ایک ہے اور یہ سب فتنے اسی ایک اصل کے مختلف برگ و بار ہیں''[۲]۔

اس کے بعد اپنے اس کلام کو مزید قوت فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں، جو اپنی جگہ بہت ہی اہم اور قابل غور وفکر بات ہے:

''حضرات! یہ کس کو معلوم نہیں کہ جن فتنوں کا تذکرہ آگے آئے گا، ان کی پیدائش سے پہلے تقریباً پورے ہندوستان میں صرف ایک مسلک کے مسلمان آباد تھے، اور وہ حنفی مسلک تھا۔ جب ان فتنوں کا حدوث ہوا، تو فتنہ پردازوں نے حنفی ہی جماعت کو توڑ پھوڑ کر الگ الگ اپنی اپنی ٹولی بنائی اور آج بھی ان فتنوں کے علم بردار اسی جماعت کو اپنے اندر جذب کرنے کے لیے ادھار کھائے ہوئے ہیں''[۳]۔

اس کے بعد غیر مقلدین کی ستم رانیوں اور ان کی ہفوات کا قدرے تفصیل سے تذکرہ کیا ہے، اور ان سب کی جڑ اور اصل خودرائی اور اتباع ہویٰ کو قرار دیا ہے۔ پھر ان رٹے رٹائے اعتراضات کا جواب دیا ہے جو غیر مقلدین تقلید پر کیا کرتے ہیں، بعد ازاں اجتہاد اور تقلید کا فرق بتایا ہے، اور پھر تقلید کی ضرورت اور اس کے ناگزیر ہونے کو بیان کیا ہے، اور آخر میں حسبِ ذیل سطروں پر اپنی اس بحث کو ختم کیا ہے:

(۱) مقالات: ۹۷/۱ (۲) ایضاً: ۱۰۰/۱-۹۹ (۳) ایضاً: ۱۰۰/۱

''حضرات! تقلید اور مذاہب سلف کا تقید ہی ہے، جس کی بدولت دین و مذہب مبطلین کی تحریفات سے آج تک محفوظ ہے، یہ اگر نہ ہوتو مذہب بازیچۂ اطفال بن جائے، آج جس قدر جہل مرکّب کا شیوع ہے، ظاہر ہے؛ کون نہیں جانتا کہ آج مشکوٰۃ کا ترجمہ کر لینے والا اپنے کو مجتہد وقت سمجھتا ہے، ہر حرف شناس اپنے کو علامہ خیال کرتا ہے، اور ہر خرنا شخص اپنے کو عیسیٰ قرار دیتا ہے۔ایسی حالت میں ہر مولوی یا عالم کو اجتہاد کا حق دے دیا جائے، اور تقلید ائمہ واتباع سلف کی پابندی اٹھالی جائے، تو ان کے مجتہدات دین و مذہب کے مسائل وفتاویٰ ہوں گے، یا جہل وغوایت کے کرشمے؟''[1]۔

☆......☆......☆

مسئلۂ تقلید

۱۸ر صفحات پر مشتمل یہ ایک ناتمام مضمون ہے، جس میں تقلید کے معنی، اس کی قسموں اور منکرینِ تقلید کی غلط فہمیوں اور لغزشوں سے بحث کی گئی ہے، اس تحریر میں مسئلۂ تقلید پر غیر مقلد علماء کے اعتراضات کے جواب کے ساتھ ساتھ، اس کے بارے میں ان کے فکر وفہم اور تحریروں میں جو اضطراب وانتشار ہے، اس کا بھی تحقیقی اور علمی انداز میں تحلیل و تجزیہ کیا گیا ہے؛ تقلیدِ عوام اور تقلید خواص وغیرہ جو مختلف قسمیں ہیں، ان پر علماء حنفیہ وشافعیہ کی کتابوں سے دلیل کے ساتھ کلام کیا گیا ہے، علامہ اعظمیؒ اس کے سرآغاز میں فرماتے ہیں:

''منکرینِ تقلید کے اس شاہراہ سے الگ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے تقلید کے معنی، اس کی قسمیں، اس کا حکم، اس کی وجہ، اس کا محمل معلوم کرنے کی بالکل کوشش نہیں کی، مسئلہ تقلید پر انھوں نے جو کچھ لکھا اور کہا، وہ بہت منتشر اور بے حد مضطرب صرف اس لیے ہے کہ منکرین نے حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کی کوشش کبھی نہیں کی، اور ان کو واقعہ کی جستجو کبھی نہیں ہوئی، اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس مقام کو کچھ بسط اور تفصیل سے لکھا جائے''۔

اس کے بعد تقلید کے اقسام واحکام سے تعرض کیا ہے، لیکن اس سے قبل اجمالی طور پر فرماتے ہیں:

''انسانوں کے طبقات (درجوں) کے اختلاف کے ساتھ تقلید کے بھی مختلف مرتبے اس کی کئی قسمیں ہوگئی ہیں؛ آدمیوں میں کچھ وہ ہیں جو قرآن وحدیث خود سمجھ سکتے ہیں، کچھ وہ ہیں جو خود نہیں سمجھ سکتے ہیں؛ پہلی قسم کے لوگوں کو میں خواص کے نام سے اور دوسری قسم کے افراد کو عوام کے نام سے یاد کروں گا، چونکہ دونوں قسم کے لوگ تقلید کرتے ہیں، اس لحاظ سے تقلید کی بھی دو قسمیں ہوئیں: تقلیدِ خواص، تقلید عوام؛ پھر چونکہ خواص کے بھی مختلف طبقات (درجے) ہیں، اس لیے تقلید خواص میں بھی کئی قسمیں نکلیں گی''۔

(۱) مقالات: ۱/۱۱۱

آگے تقلید کے معنی ومفہوم پر بحث کرنے کے بعد ابن کمال پاشا، عمر بن عمر ازہری، ملا علی قاری، فاضل مرجانی حنفی، اور مولانا عبدالحی لکھنوی وغیرہ نے تقلید کے جو چھ طبقات (درجے) قائم کیے ہیں، ان کی تفصیلاً تشریح وتوضیح ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

السیر الحثیث الی تنقید تاریخ أھل الحدیث

یہ رسالہ علامہ اعظمیؒ کے زمانۂ طالب علمی کی علمی وقلمی کاوشوں کی ایک اہم یادگار ہے، جیسا کہ مسودہ کے سرورق سے ظاہر ہوتا ہے، اس پر آپ کے قلم سے یہ عبارت مرقوم ہے:

قد فرغت من تأليفه بعون الله لخمس وعشرين مضت من ربيع الأول سنة ٤٠ هـ عام قراء تي الصحاح الست.

توفیق ایزدی سے میں اس کی تالیف سے ۲۵ / ربیع الاول ۱۳۴۰ھ کو صحاح ستہ پڑھنے کے سال میں فارغ ہوا۔

علامہ اعظمیؒ کا یہ رسالہ 'تاریخ اہل حدیث' کے جواب میں ہے، جو مشہور اہل حدیث عالم مولانا ابراہیم سیالکوٹی کے قلم سے، امرتسر سے شائع ہونے والے اخبار 'اہلحدیث' میں قسط وار شائع ہوتا تھا، اور حنفیہ سے اس کے جواب کا تقاضا ہوا کرتا تھا۔

جماعتِ اہل حدیث اپنا مسلکی رشتہ اور نسب ان محدثین سے جوڑنے کی کوشش کرتی ہے، جن کا صبح وشام کا مشغلہ حدیث وسنت کی روایت وسماع، اس کی جمع وتدوین، تصنیف وتالیف اور نشر واشاعت تھا، چنانچہ اس جماعت کے لوگ محدثین کی کتابوں اور عبارتوں میں جہاں کہیں **أھل الحدیث** یا **أصحاب الحدیث** جیسے الفاظ دیکھتے ہیں، بلا تامل اپنے اوپر چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس رسالے میں علامہ اعظمیؒ نے اہل حدیث یا غیر مقلدین کی اسی خام خیالی کا علمی وتحقیقی انداز سے تحلیل وتجزیہ کرکے ان کے مزعومات کا رد کیا ہے۔

مولانا سیالکوٹی نے اپنی تاریخ میں لکھا تھا کہ احناف کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ ۱۸۹۱ء سے پہلے فرقۂ اہل حدیث کا وجود نہ تھا، بلکہ اس مذہب کے لوگ آج سے کئی سو سال پیشتر بھی موجود تھے، اس کی دلیل یہ ہے کہ **أھل الحدیث** یا **أصحاب الحدیث** جیسے الفاظ ان کتابوں میں بھی ملتے ہیں، جو آج سے صدیوں پہلے لکھی گئی ہیں۔

علامہ اعظمیؒ نے ان کے اس دعوے کے رد کے لیے سب سے پہلے **''تاریخ اہل حدیث کا ماخذ''** کا عنوان قائم کیا ہے، اور اس میں ان کے اس دعوے کی حقیقت کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا ہے، اور اس کا باطل اور برخود غلط ہونا ثابت کیا ہے، اس کے آخر میں لکھا ہے:

''جو دلیل آپ نے اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے قائم کی ہے، وہ آپ کے دعویٰ کو مستلزم نہیں،

اس لیے کہ آپ تاریخ تو لکھنا چاہتے ہیں ان اہل حدیث کی جن کا تذکرہ میں نے ابھی کیا ہے-یعنی جو مذاہب اربعہ کے مقابل میں ''ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں'' کا مصداق ہو رہا ہے، جو ائمۂ اربعہ میں سے کسی کا مقلد نہیں، اجماع و قیاس جس کے نزدیک قابلِ احتجاج نہیں-، اور کتابوں کے حوالوں میں لفظ اہل حدیث و ما فی معناہ کے مصداق دوسرے لوگ ہیں''[۱]۔

ایک دوسرا عنوان ''مواقع استعمال لفظ اہل حدیث و ما فی معناہ'' قائم کر کے علامہ اعظمیؒ نے بہت تحقیق اور تفصیل کے ساتھ اس بات کی وضاحت کی ہے کہ لفظ اہل حدیث کا اطلاق دو قسم کے لوگوں پر ہوتا ہے، کبھی تو اس لفظ سے محدثین مراد ہوتے ہیں، جس کے ثبوت کے لیے علامہ اعظمیؒ نے متعدد اہل علم و تصنیف اور اصحاب تحقیق کی کتابوں کے حوالے دیے ہیں، اور ان کی عبارتیں پیش کی ہیں، اسی ضمن میں یہ شعر بھی نقل کیا ہے:

أهلُ الحديثِ هُمُ أهلُ النبيِّ وإنْ لَمْ يَصْحَبُوا نَفْسَهُ أنفاسَهُ صَحِبُوا

اور اس بات کی تائید کے لیے کہ اس کا مصداق محدثین ہیں نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ-متوفی ۱۳۰۷ھ=۱۸۹۰ء- کی کتاب 'مسک الختام' کی بھی ایک عبارت پیش کی ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنے اس دعوے کی دلیل کے لیے جن کتابوں کی عبارتیں نقل کی ہیں، ان میں ابن خلدون کا مقدمہ، مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی فوائد بہیہ، حافظ ابن حجر کا مقدمہ فتح الباری، مولانا احمد علی سہارن پوری کا مقدمۂ حاشیہ بخاری، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ، حضرت شاہ عبدالعزیز کی بستان المحدثین، سیوطی کی تاریخ الخلفاء، اور خود مذہب اہل حدیث کے ترجمان 'اہلحدیث' وغیرہ کے حوالے ہیں، ان سب حوالوں کے بعد یہ بات بخوبی واضح اور پوری طرح صاف ہوگئی ہے کہ محدثین کی کتابوں میں ''اھل حدیث'' سے مراد محدثین ہوتے ہیں۔

لفظ اہل حدیث کے دوسرے اطلاق کی نسبت فرماتے ہیں کہ:

''کبھی اہل حدیث کا اطلاق اہل الرائے کے مقابل میں ہوتا ہے''۔

اور اس کو ثابت کرنے کے لیے علامہ ابن خلدون کی ایک طویل عبارت نقل کی ہے، اس عبارت کا آخری ٹکڑا یہ ہے: ''**ولم يبق إلا مذهب أهل الرأي من أهل العراق وأهل الحديث من أهل الحجاز**''.

اس سے آپ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''خاکسار کا منشا اس سے یہ ہے کہ ابن خلدون نے بالتوضیح بیان کر دیا کہ فقہ کے دو ہی طریقے تھے:

۱-طریقۂ اہل حدیث جو اہل حجاز میں رائج تھا اور اس کے امام، مالک و شافعی تھے۔

۲-طریقۂ اہل رائے جو اہل عراق میں مروّج تھا اور اس کے امام، ابوحنیفہ تھے''[۲]۔

ابن خلدون کے قول کے علاوہ ایک دوسری دلیل خود غیر مقلدوں کے امام نواب صدیق حسن خان کی

(۱) مقالات: ۶۸/۱ (۲) ایضاً: ۸۱/۱

کتاب 'دلیل الطالب' کی ایک عبارت سے پیش کی ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے کئی صفحات پر مشتمل ''خلاصۂ بحث'' سپرد قلم فرمایا ہے، اس خلاصے کا خلاصہ یہ ہے کہ لفظ اہل حدیث سے محدثین کا مراد ہونا تو روز روشن کی طرح واضح ہے، اور اہل رائے کے مقابل میں جو لوگ اس سے مراد ہیں، وہ اجماع وقیاس کی حجیت کی قائل، ایک خاص مجتہد کے اقوال پر جمود کے ساتھ کار بند اور اس کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں، اس فرقۂ اہل حدیث کی طرح مطلق العنان اور آزاد رو نہیں ہیں۔

چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، علامہ ابن القیم اور شیخ عبدالقادر جیلانی کا حنبلی المذہب -مقلد- ہونا نواب صدیق حسن خاں کی کتاب 'مسک الختام' سے ثابت کیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس میں شاہ ولی اللہ کی **'الإنصاف'** سے ایک عبارت نقل کر کے حنفیہ کے لیے استعمال کیے جانے والے لفظ ''اہل الرائے'' کا یہ مفہوم بیان کیا ہے:

''شاہ صاحب کی اِس عبارت سے اُس خیال کی صاف تردید نکلتی ہے، جو عام طور پر حنفیہ پر اہل الرائے کا اطلاق دیکھ کر دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے، اور جس کا اظہار بار بار غیر مقلدین اپنی تحریروں میں کرتے ہیں، اس سے ان کا مقصد محض تنقیصِ شانِ امام ہمام وفریب دہی عوام ہے، مگر استاذ اساتذۃ الھند -شاہ ولی اللہ- کی تحریر سے آپ نے معلوم کر لیا ہوگا کہ ان کا خیال محض باطل ہے، اور حنفیہ کو اہل الرائے کہنے کی یہ وجہ ہرگز نہیں کہ وہ رائے محض سے مسائل کا اختراع کرتے تھے، بلکہ ان کو اہل الرئے کہنے کی یہ وجہ ہے کہ مسائل مجمع علیہا کے بعد بجائے اس کے کہ آثار واحادیث کا تتبع کیا جائے، انھوں نے متقدمین میں سے کسی کے قواعد واصول پر -جو خود احادیث سے مستخرج ہیں- تخریج کی طرف توجہ کی، بس محض تخریج کی وجہ سے انھیں اہل الرائے کہنے لگے۔ الغرض اہل الرائے میں رائے سے مراد تخریج ہے، نہ وہ رائے جو کتاب وسنت کے معارض ہو، یا کتاب وسنت سے مؤید نہ ہو، کیونکہ ایسی رائے کو دین سمجھنے والا کوئی ادنی مسلمان بھی نہ ہوگا، چہ جائیکہ یہ ائمہ؛ اور وہ رائے یعنی تخریج معیوب نہیں، بلکہ اس کا ترک اور اس کو نظر انداز کرنا معیوب ہے''[1]۔

☆......☆......☆......☆......☆......☆......☆

شرف اصحاب الحدیث اور محمد جونا گڈھی[2]

مولانا محمد جونا گڈھی نے خطیب بغدادی کی کتاب 'شرف اُصحاب الحدیث' کا اردو ترجمہ کیا ہے، اور

---

(۱) مقالات: ۱/۸۷

(۲) اس مضمون کے مسودے میں کوئی عنوان نہیں ہے، مضمون کی مناسبت سے یہ عنوان راقم الحروف نے لگایا ہے۔

'اصحاب الحدیث' یا 'اھل الحدیث' یا اس قسم کے دیگر الفاظ کو- جن سے محدثین کی جماعت مراد ہوتی ہے- موجودہ زمانے کی جماعت اہل حدیث پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے، علامہ اعظمیؒ نے اس مختصر مضمون میں یہ دکھایا ہے کہ مترجم موصوف نے کس طرح مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے، اوران کے مغالطوں کی کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں، مثلاً: خطیب کی جن عبارتوں میں تعریف وستائش کا پہلو ہوتا ہے، وہاں 'اصحاب الحدیث' کا ترجمہ 'جماعت اہل حدیث' کرتے ہیں، اور جس عبارت سے کوئی عیب یا نقص ظاہر ہوتا ہے، وہاں 'وہ لوگ' یا 'ان لوگوں نے' جیسا مبہم ترجمہ کرتے ہیں۔ اوراس مغالطہ آمیز ترجمہ کی ایک دو نہیں کئی مثالیں پیش کی ہیں۔

علامہ اعظمیؒ نے ایک عنوان ''اصحاب الحدیث کی صحیح مراد'' قائم کرکے اس کے ماتحت لکھا ہے:

''لغت کی رو سے 'اصحاب الحدیث' اور 'اہل حدیث' کے معنی 'حدیث والے' ہیں، مگر علماء ومصنفین کی اصطلاح میں اس سے وہ جماعت مراد ہوتی ہے، جس کا مشغلہ احادیث نبویہ کی خدمت ہو، یعنی سننا، یا پڑھنا، یاد کرنا، دوسروں کو پڑھانا سنانا؛ اس میں سے صحیح وضعیف کی چھان بین کرنا؛ اس کی اسانید پر نقد وتبصرہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔ حاصل یہ ہے کہ 'اصحاب الحدیث'، 'اہل الحدیث'، 'محدثین' تینوں ہم معنی ہیں؛ پس جو جماعت بھی علم حدیث کی خدمت کرے، وہ اصحاب الحدیث کہلائے گی، چاہے وہ حنفی ہو، یا شافعی، مالکی ہو، یا حنبلی؛ برخلاف اس کے موجودہ اہل حدیث صرف اس جماعت کو اصحاب الحدیث کہتے ہیں، جو کسی امام کی تقلید نہ کرے، چاہے وہ فن حدیث سے جاہل مطلق ہی کیوں نہ ہو، فشتان ما بینھما''۔

☆......☆......☆......☆

تحقیق اہل حدیث

یہ تحریر ایک مستقل رسالے کی حیثیت سے شائع ہوتی رہی ہے، اس کا مضمون 'السیر الحثیث' سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے، اوراس کے کچھ مضامین 'شرف اصحاب الحدیث' میں بھی شامل ہیں۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ۲-۳-۴/اپریل ۱۹۴۳ء کو مئو آئمہ- الہ آباد- میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کے جواب میں مئو آئمہ ہی میں ۱۵-۱۶-۱۷/اکتوبر ۱۹۴۳ء میں احناف کانفرنس ہوئی، جس میں حنفیہ کے بڑے بڑے علما اور مقررین ومناظرین شریک ہوئے، مثلاً امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ، حضرت مولانا ابوالوفا شاہجہاں پوریؒ- متوفی ۱۴۰۰ھ = ۱۹۷۹ء-، اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند وغیرہ۔ اس کانفرنس میں علامہ اعظمیؒ کا خطاب بطور خاص بہت مقبول ہوا تھا، اور عوام وخواص میں پسند کیا گیا تھا، علامہ اعظمیؒ نے اہل حدیث کانفرنس کے خطبۂ صدارت مصنفہ مولوی ابوالقاسم بنارسی- متوفی ۱۳۶۹ = ۱۹۴۹ء- کے مندرجات ومشمولات کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے تار وپود بکھیرے تھے، علامہ اعظمیؒ کی یہی تقریر لوگوں کے تقاضے کے بعد

'تحقیق اہل حدیث' کے نام سے شائع ہوئی۔
خطبہ اور تمہیدی کلمات کے بعد علامہ اعظمیؒ نے ایک عنوان ''حدیث کی نئی تعریف'' کے تحت لکھا ہے کہ مولانا ابوالقاسم صاحب نے 'خطبۂ صدارت' (ص:۴) میں اہل حدیث کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے حدیث کی یہ تعریف لکھی ہے:
''حدیث نام ہے کلام اللہ اور کلام الرسول کا''۔
اس تعریف پر نقد وتبصرہ کرتے ہوئے علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ:
''حدیث کی یہ تعریف غیر مقلدیت کا ایک تازہ کرشمہ ہے، ورنہ اس دور سے پہلے کے حضرات غیر مقلدین بھی یہی لکھتے آئے ہیں کہ حدیث نام ہے رسول علیہ السلام کے قول وفعل وتقریر کا''[۱]۔
پھر اس کی تائید میں نواب صدیق حسن خاں صاحب کی 'مسک الختام' اور مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ -متوفی ۱۳۶۷ھ = ۱۹۴۸ء- کی کتاب 'اہل حدیث کا مذہب' کی عبارتیں نقل کی ہیں۔
مولانا ابوالقاسم صاحب کا دعویٰ تھا کہ اہل حدیث نام پیغمبر علیہ السلام کا مقرر کیا ہوا ہے، اور اس کی سند میں یہ حدیث لکھی ہے کہ:
''قیامت میں اہل حدیث سیاہی دانوں سمیت آئیں گے، اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا تم اہل حدیث ہو جنت میں جاؤ''[۲]۔
علامہ اعظمیؒ نے مولانا ابوالقاسم بنارسی کی پیش کردہ اس روایت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:
''ناظرین یہ معلوم کر کے محو حیرت ہو جائیں گے کہ یہ حدیث جعلی ہے، اور جعلی حدیث سے سند پکڑنا باتفاق حرام ہے؛ مگر مولوی ابوالقاسم صاحب نے لاعلمی کی وجہ سے اس حدیث کو سند قرار دے لیا۔ اگر مولوی صاحب ٹھنڈے دل سے غور کریں، تو اسی ایک بات سے ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ جب آج کل کے تارک تقلید علماء جعلی اور غیر جعلی حدیث میں تمیز نہیں کر سکتے، تو ان کو براہ راست حدیث سے مسائل اخذ کرنے کا حق کہاں تک حاصل ہو سکتا ہے''[۳]۔
اس کے بعد علامہ ذہبی، خطیب بغدادی، سیوطی، نیز شوکانی وغیرہ کا قول اس روایت کے موضوع ہونے کے متعلق نقل کیا ہے۔
علامہ اعظمیؒ نے ایک عنوان ''اصحاب الحدیث کی صحیح مراد'' کے تحت لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہو تب بھی اس سے مولوی ابوالقاسم صاحب کا مدعا ثابت نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس میں اصحاب الحدیث سے وہ جماعت مراد نہیں ہو سکتی جو تارک تقلید ہو کر عمل بالحدیث کی مدعی ہو، بلکہ وہ جماعت مراد ہوگی، جو کتابت ودرسِ حدیث کا مشغلہ رکھتی ہو، اور اس کی دلیل ''بأيديهم المحابر'' کا لفظ ہے۔

(۱) تحقیق اہل حدیث:۹ (۲) خطبۂ صدارت:۵ (۳) تحقیق اہل حدیث:۱۰

مولوی ابوالقاسم صاحب نے اپنی کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ اہل حدیث صحابہ کا قبول کردہ نام ہے، اور اس کے ثبوت کے لیے انھوں نے متعدد حوالے دیے تھے۔ علامہ اعظمیؒ نے اس کے جواب میں فرمایا ہے کہ ان تمام حوالوں میں اصحاب الحدیث یا اہل الحدیث سے حدیثوں کو روایت کرنے والے یا ان کو یاد کرنے والے، درس دینے والے اور لکھنے والے مراد ہیں۔ علامہ اعظمیؒ نے اپنی بات کو نہایت وضاحت کے ساتھ ثابت کیا ہے، اور مولانا ابوالقاسم صاحب کے استناد کی کمزوری کو ظاہر و باہر کر کے رکھ دیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے آگے اہل حدیث علما کی کرشمہ سازیوں کو بھی دکھایا ہے اور مولانا محمد جونا گڈھی کی شرف اُصحاب الحدیث کے ترجمے سے بہت سے نمونے نقل کر کے دکھائے ہیں کہ اس کتاب میں جب اصحاب الحدیث کی بابت کوئی بزرگی یا منقبت مذکور ہوتی ہے، تو اس کا ترجمہ جماعت اہل حدیث یا اہل حدیث کرتے ہیں، اور جہاں کہیں کوئی نازیبا بات یا برائی ان کی جانب منسوب ہوتی ہے، تو اس کا ترجمہ ''وہ لوگ'' یا ''وہ قوم'' یا اس جیسے گول مول الفاظ کے ساتھ اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔

مولوی ابوالقاسم صاحب بنارسی نے اہل حدیث کی بے سروپا مدح سرائی کے علاوہ مقلدین اور خاص طور سے حنفیہ پر اپنے اس خطبے میں بہت سے اعتراضات واتہامات وارد کیے تھے۔ علامہ اعظمیؒ نے ان سب کا ایک ایک کر کے رد کیا ہے، اور ان کے نہ صرف دفاعی بلکہ الزامی جوابات دے کر مولوی ابوالقاسم صاحب کے خطبۂ صدارت کا بخیہ ادھیڑ کر اور حقیقت کو منکشف اور واشگاف کر کے رکھ دیا ہے۔

'تحقیق اہل حدیث' کے آخر میں ۹؍ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ کی تاریخ درج ہے۔ یہ رسالہ ۴۸؍صفحات پر مشتمل ہے، اور آخر میں تین صفحے سے کچھ زائد کا ایک تتمہ ہے، جس میں مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی علیہ الرحمہ کی تقریر کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۴۳ء ہی میں احناف دارالاشاعت والتبلیغ مئوآئمہ کی طرف سے شائع ہوا تھا، دوسرا اڈیشن ۱۴۲۰ھ = ۱۹۹۹ء میں، اور تیسرا ۱۴۲۵ھ = ۲۰۰۴ء میں مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو کی طرف سے شائع ہو کر عوام وخواص میں مقبول ہوا۔

☆......☆......☆......☆......☆

حقیقۃ الفقہ کی ایک فصل

''احادیث مندرجہ کتب فقہ اعتبار کے قابل نہیں''

آٹھ صفحات پر مشتمل اس مضمون میں علامہ اعظمیؒ نے مولوی یوسف جے پوری کی کتاب 'حقیقۃ الفقہ' کے ایک باب -احادیث مندرجۂ کتب فقہ اعتبار کے قابل نہیں- کا جواب دیا ہے، علامہ اعظمیؒ نے مضمون کی ابتدا میں

لکھا ہے:

''اس فصل میں اس نے چند عبارتیں اس مضمون کی نقل کی ہیں: 'فتاوی کی بہت سی کتابوں میں موضوع حدیثیں مذکور ہیں، لہذا جب تک ان کی سند نہ ظاہر ہو، یا علماء محدثین کا اس پر اعتماد نہ ظاہر ہو، اس وقت تک ان پر پورا بھروسہ نہ کرنا چاہئے'۔ عبارات مذکورہ اپنے مفہوم کے لحاظ سے کسی تشریح کی محتاج نہیں ہیں، گفتگو صرف اتنی ہے کہ مصنف حقیقۃ الفقہ کا اس سے کیا منشا ہے؟ ہمارے خیال میں اس کا دو ہی مقصد ہوسکتا ہے: ایک تو یہ جب احادیث مندرجۂ فقہ قابل اعتبار نہیں، تو مسائل فقہ بھی درخور قبول نہیں ہیں؛ دوسرے مصنفین کتب فقہ کی عیب گیری ونکتہ چینی''(۱)۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

''اگر پہلی بات ہے، تو ہم عرض کریں گے کہ احادیث مندرجہ فقہ کے نا قابل اعتبار ہونے سے یہ نتیجہ نکالنا محض غلط ہے، کسی کتاب میں کوئی ایک بات غلط لکھ گئی ہو، تو اس کی ساری باتوں کا غلط ہونا لازم نہیں آتا''(۲)۔

پھر کئی کتابوں کا نام لے کر بتایا ہے کہ ان میں موضوع روایات پائی جاتی ہیں، لیکن وہ اہلِ علم کے نزدیک بالکلیہ نا قابلِ اعتبار نہیں ہیں، اس ضمن میں پہلا نام امام غزالی کی 'احیاء العلوم' کا لیا ہے، اور علامہ عراقیؒ شافعی کی تخریج کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس میں بکثرت موضوع حدیثیں ہیں، لیکن اس کے باوجود کتاب درجۂ اعتبار سے ساقط نہیں ہوگئی، اور اس کے دوسرے مضامین اہل علم کے نزدیک پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں؛ دوسرا نام آپ نے امام رازی کی 'تفسیر کبیر' کا لیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''اسی طرح 'تفسیر کبیر' امام رازی میں بعض حدیثیں نا قابل اعتبار ہیں اور ان کے موضوع ہونے کی علماء نے تصریح کی ہے، لیکن اس کی وجہ سے کتاب کے بقیہ مضامین بے اعتبار نہیں ہوگئے، چنانچہ اب علماء اہل حدیث اس کے مضامین سے استناد کرتے ہیں (دیکھو رسالہ قرأت خلف الامام مصنفہ مولوی ابراہیم صاحب سیالکوٹی، وتحقیق الکلام مصنفہ مولوی عبد الرحمٰن صاحب مبارک پوری وغیرہ)''(۳)۔

پھر سنن ابن ماجہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بھی اس سے محفوظ نہیں رہ گئی ہے، اور علماء محققین ومحدثین کی تصریح کے مطابق اس میں بھی کچھ موضوع حدیثیں راہ پا گئی ہیں، اس کے بعد رقم طراز ہیں:

''بات اصل یہ ہے کہ جس فن میں جو کتاب ہو، اس کو اسی فن کے لحاظ سے دیکھنا چاہئے، احیاء العلوم کا جو موضوع ہے، اس کے ہی لحاظ سے دیکھنا چاہئے کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہیں، اگر موضوعِ فن کے لحاظ سے اس میں کوئی نقص نہیں ہے تو کافی ہے، اب اگر دسرے لحاظ سے بھی اس میں کوئی نقص نہ ہو

(۱) مقالات: ۱/۱۱۵ (۲) ایضاً (۳) ایضاً: ۱/۱۱۶

تو نورٌ علی نور؛ اور اگر دوسرے لحاظ سے کوئی تقصیر یا نقص پایا جاتا ہو، تو بھی فنی حیثیت سے کتاب پر کوئی حرف نہیں آ سکتا۔ اسی طرح فقہ کی بعض کتابوں میں اگر کوئی یا چند حدیثیں نا قابل اعتبار درج ہو گئیں، تو اس کے مسائل پر کیا اثر پڑا، زیادہ سے زیادہ یہ کہ مصنف نے مسئلہ کی جو دلیل بیان کی وہ غلط ہو گئی، ہم سے آپ دوسری صحیح دلیل لیجئے، ایک دلیل کے غلط ہو جانے سے مسئلہ غلط نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ ایک ایک مسئلہ کے متعدد دلائل ہوا کرتے ہیں، وجود باری ہمارا اور آپ کا ایک مسلمہ مسئلہ ہے، فرض کیجئے ایک شخص اس کی ایک دلیل بیان کرے اور وہ غلط ثابت ہو، تو کیا وجود باری کا مسئلہ غلط ہو گیا؟ میں سمجھتا ہوں کہ ہر عقل مند یہی کہے گا کہ ایک شخص کی بیان کی ہوئی ایک دلیل کے غلط ہو جانے سے مسئلہ غلط نہیں ہو سکتا، تاوقتیکہ تمام دلائل غلط اور بے بنیاد نہ ہو جائیں"(۱)۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے مصنف 'حقیقۃ الفقہ' کے دوسرے مقصد کے بارے میں نسبتاً تفصیلی کلام کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اور اگر مصنف کا منشا اس سے مصنفینِ کتبِ فقہ کی عیب گیری ہے، تو میں عرض کروں گا کہ یہ پہلی صورت سے بھی زیادہ بیہودہ صورت ہے۔

اولاً: تو بھول چُوک اور سہو ونسیان کس انسان سے نہیں ہوتا، نَسِيَ آدمُ فَنَسِيَتْ ذُرِّيَّتُهُ (بخاری)۔

ثانیاً: اہل علم خوب جانتے ہیں کہ بڑے بڑے ماہرین فن سے خود اُس فن میں بھول چوک ہو جاتی ہے، جس کے وہ ماہر ہوتے ہیں؛ پس اگر کوئی ایسا عالم جس کا ایک خاص فن ہے، کسی دوسرے فن میں سہو کر جائے، تو کیا تعجب ہے!؟ بہت سے محدثین جن کی ساری عمر خدمتِ حدیث میں بسر ہوئی ہے، ایک صحیح حدیث کو موضوع اور موضوع کو صحیح لکھ جاتے ہیں، اور اس کی وجہ سے ان کی عیب گیری روا نہیں رکھی جاتی؛ تو اگر کوئی فقیہ۔جس کا مطمحِ نظر صرف فقہ ہے۔کسی موضوع حدیث کو صحیح سمجھ کر درج کتاب کر دے، تو اس کی عیب گیری بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہوگی۔ کیا مصنفِ حقیقۃ الفقہ کو معلوم نہیں ہے کہ بڑے بڑے محدثین وحفاظِ حدیث نے بہتیری موضوع حدیثوں کو اپنی کتابوں میں درج کیا اور بہت بلند آہنگی کے ساتھ اس کی صحت کا اعلان بھی کر دیا، اسی طرح بہت سے "ائمہ" اور "شیخ الاسلاموں" نے کتنی صحیح حدیثوں کو بے دھڑک موضوع کہہ دیا۔ آپ کو یہ ضرور معلوم ہوگا، پھر آپ نے ان کی عیب گیری کیوں نہیں کی؟ حالانکہ ان کی عیب گیری زیادہ ضروری تھی، اس لیے کہ ان لوگوں نے اس فن میں ماہر اور با کمال ہوتے ہوئے ایسی صریح غلطی کیسے کی؟ اس سے ان کی مہارتِ فن پر حرف آتا ہے، اور اگر دیدہ ودانستہ کیا تو اس سے بھی بدتر ہے"(۲)۔

اس تمہید کے بعد علامہ اعظمیؒ نے ابن ماجہ، امام حاکم، دار قطنی اور بیہقی کی نسبت قدرے تفصیل سے اور

(۱) مقالات: ۱/۱۱۶ (۲) ایضاً: ۱۱۷

خطیب بغدادی، ابونعیم اصفہانی اور دیلمی وغیرہ کی طرف صرف اشارہ کر دیا کہ ان حفاظ ومحدثین اور ماہرینِ فن نے کس طرح بھول چوک یا کسی اور وجہ سے اپنی کتابوں میں موضوع حدیثوں کو شامل کر دیا ہے۔

اسی طرح اس کے برعکس علامہ ابن الجوزیؒ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وغیرہ نے تشدد سے کام لیا اور متعدد صحیح اور بہت سی ضعیف حدیثوں کو موضوع قرار دے دیا۔

☆......☆......☆......☆......☆

تبصرہ بر 'حقیقۃ الفقہ'

حنفیہ کی ایذا رسانی میں 'حقیقۃ الفقہ' نامی کتاب کو ایک خاص مقام حاصل ہے، اس کتاب میں اس کے مصنف نے فقہ حنفی کے خلاف اپنے دل کے پھپھولے خوب خوب پھوڑے ہیں، امام ابوحنیفہؒ، ائمہ وعلماء احناف اور فقہ حنفی کے بارے میں بے سرو پا باتیں اور بے جا الزامات سے اس کتاب کے صفحات کو پوری طرح سیاہ کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ علامہ اعظمیؒ کو اپنے اس مضمون -تبصرہ بر حقیقۃ الفقہ- میں یہ لکھنا پڑا کہ:

''اس کتاب کو حقیقۃ الفقہ کے بجائے حقیقۃ السَّفہ کہنا زیادہ مناسب ہے''۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنے اس مضمون میں امام اعظم ابوحنیفہؒ اور فقہ حنفی پر لگائے گئے متعدد اعتراضات کے نہایت مدلّل ومبرہن جوابات دیے ہیں، سب سے پہلے جس اعتراض کو نقل کر کے اس کا جواب دیا ہے وہ یہ ہے کہ مُرجیہ کے شعبوں میں حنفیہ کو بھی ذکر کیا ہے اور اس کا امام حضرت ابوحنیفہ کو بتلایا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے متعدد اہل علم کے اقوال وعبارات کو نقل کر کے اجمال مگر تحقیق کے ساتھ اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ مصنف 'حقیقۃ الفقہ' نے خود مرجیہ کے عقائد یہ بیان کیے ہیں کہ:

> ''ایمان صرف معرفتِ الٰہی اور اقرار کرنا ہے خدا اور رسول کا اور جو کچھ وہ خدا کے پاس سے لاتے ہیں اجمالی طور پر'' (ص:۲۱)۔ جب کہ ''امام ابوحنیفہ کے نزدیک صرف معرفت کافی نہیں ہے، بلکہ تصدیق بھی ضروری ہے، فقہ اکبر میں فرماتے ہیں: **الإیمان هو الإقرار والتصدیق** (ص:۹۶). یعنی ایمان زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کا نام ہے''۔

اس کے بعد علامہ اعظمی نے حنفیہ اور مرجیہ کے عقائد میں موازنہ کر کے کچھ اور فرق بتایا ہے، اور اسی ضمن میں یہ بھی فرمایا ہے کہ امام بخاریؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے مابین جو ایمان کی کمی زیادتی سے متعلق اختلاف ہے وہ لفظی ہے، امام رازی شافعی اور بہت سے متکلمین نے اس کی تصریح کی ہے۔ اس کے بعد آگے فرماتے ہیں:

> ''ارجاء کی دو قسمیں ہیں: ۱- ارجاء السنۃ، ۲- ارجاء الضلال۔ ارجاء السنۃ عصاۃ مؤمنین کے معاملہ کو مشیت الٰہی پر موقوف رکھنے کو کہتے ہیں، چونکہ امام صاحب مرتکب کبیرہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہے، چاہے عذاب دے چاہے بخش دے، اس لیے بعض لوگوں نے اس معنی

میں امام صاحب کو مُرجی کہہ دیا یعنی مرجی السنۃ''۔

پھر 'تمہید ابوالشکور سالمی' اور 'شرح مقاصد' کی کچھ عبارتیں نقل کرنے کے بعد ارقام فرماتے ہیں:

''اور بعض محدثین جو مُرجی کہہ دیتے ہیں، تو وہ بھی حقیقی معنوں میں مرجی نہیں، بلکہ صرف اس وجہ سے کہ امام صاحب ایمان کی حقیقت میں اعمال کو داخل نہیں مانتے، بایں معنی کہ اگر اعمال نہ ہوں تو حقیقتِ ایمان منتفی ہو جائے، اور یہ بھی کہ نفس ایمان کم وبیش نہیں ہوتا، تو گویا امام صاحب نے عمل کو ایمان سے مؤخر کر دیا، اور ارجاء لغۃً تاخیر کو کہتے ہیں''۔

بالآخر اس اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں:

''الغرض امام ابوحنیفہؒ کو اصطلاحی معنی میں مرجۂ کہنے والے معتزلی یا خارجی یا قدری ہیں، اور بعض محدثین نے جو مرجی کا اطلاق کیا ہے، وہ لغوی معنی کے اعتبار سے ہے اور وہ طعن نہیں ہے، تاخیرِ امرِ صاحبِ کبیرہ تمام اہل سنت کا مسلک ہے، اس معنی میں سب مرجی ہیں، امام صاحب کو طعن سے مرجی کہنے والے غیر مقلدین قدریہ وخوارج کی سنت تازہ کرتے ہیں''۔

علامہ اعظمیؒ نے اس مضمون میں 'حقیقۃ الفقہ' کے اور بھی کئی ایک ابواب وفصول کا جواب دیا ہے۔

☆......☆......☆......☆

عدد رکعات التراویح

رکعات تراویح کے سلسلے میں علامہ اعظمیؒ کی چھوٹی بڑی کئی تحریریں پائی جاتی ہیں، آپ نے اس مسئلے میں مخالفین کے تعاقب میں کوئی دقیقہ نہیں فروگزاشت کیا ہے، اور جب جب ضرورت پیش آئی ہے، اس مسئلے پر فریق مخالف کا پوری قوت کے ساتھ رد کرنے کی کوشش کی ہے، پیش نظر تحریر ۶ رصفحات پر مشتمل ہے، اس تحریر کا پس منظر کیا ہے، اس کے بارے میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:

''گزشتہ سال ۳ ررمضان کے 'اہل حدیث' میں ایڈیٹر نے تحدّی کی تھی اور لکھا تھا کہ: ''حضرت عمر خود تراویح کی گیارہ رکعتوں کا حکم کرتے تھے، پھر خواہ مخواہ یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بیس کا حکم کیا ہے۔ اگر کوئی صاحب بیس کی بابت حضرت عمر کا حکم ثابت کر دیں، تو ہم اخبار 'اہل حدیث' میں اس کی اشاعت کے لیے تیار ہیں''[1]۔

یہ غالباً ۱۹۲۳ء یا اس کے ایک آدھ سال پہلے کا واقعہ ہے، علامہ اعظمیؒ کی نظر سے جب اہل حدیث کا یہ چیلنج گزرا، تو آپ نے فوراً ہی اس سلسلے میں ایک مختصر تحریر سپرد قلم کر کے دفتر اہل حدیث میں روانہ کر دی، لیکن باوجود وعدہ کے اس تحریر کو اشاعت کے لیے 'اہل حدیث' میں پذیرائی نہ حاصل ہوسکی، تو آپ نے کچھ ترمیم کے

(۱) مقالات: ۲۰۹/۱

ساتھ وہی تحریر دفتر 'الفقیہ' میں بھیجی، جس میں ۲؍مئی ۱۹۲۳ء کی اشاعت میں بعنوان 'المفاتیح لمغالیق التراویح' شائع ہوئی۔'الفقیہ' کی اس تحریر کی اشاعت کے بعد جب ان کی جماعت کی طرف سے بہت دباؤ پڑا، تو ۱۹۲۴ء کو ۲۰؍رمضان کی اشاعت میں یہ لکھا کہ آنحضرت ﷺ یا حضرت عمرؓ سے ۲۰؍رکعت کا بار بار ثبوت مانگنے کے باوجود ثبوت نہیں دکھایا جاتا۔ اس اشاعت میں اڈیٹر اہل حدیث نے اپنے مذہب کی دو دلیلیں ذکر کی تھیں، ایک تو سائب بن یزید کا گیارہ والا اثر، جو 'رکعات تراویح' کے تعارف میں آئے گا، دوسرے حضرت جابر بن عبداللہ والی غیر محفوظ وضعیف و ناقابلِ احتجاج روایت۔ علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''مجھے حیرت ہے کہ ان دونوں کو نقل کر کے اڈیٹر نے کچھ کلام نہیں کیا ہے۔ اس سکوت کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ غریب کو فن حدیث سے کوئی واسطہ نہیں، یا جان بوجھ کر عوام کو گمراہ کرنے کے لیے ایسا کیا ہے''(۱)۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے اصول حدیث اور فن جرح و تعدیل کی روشنی میں دونوں روایتوں پر کلام کرتے ہوئے ان کو ناقابل احتجاج و استدلال قرار دیا ہے۔ اس کے بعد 'انعامی اعلان' کے عنوان کے تحت دنیائے غیر مقلدیت کو یہ چیلنج کیا ہے:

''میں نے گذشتہ سال تمام غیر مقلدوں سے دو سوال کیے تھے، آج ایک برس گذر گیا، مگر کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔ آج میں پھر اعلان کرتا ہوں کہ کوئی غیر مقلد بھی امور ذیل کے کافی جواب دیدے، تو ایک سال تک 'القاسم' اس کے نام جاری کرا دیا جائے گا۔

۱- کسی ایک صریح حدیث سے رسول اللہ ﷺ کا آٹھ رکعت تراویح پڑھنا ثابت کر دیں۔

۲- اگر آپؐ سے تعین رکعات ثابت ہے، تو کیا وجہ کہ صحابہ نے، پھر ان کے بعد تابعین واتباع تابعین نے اس پر عمل نہیں کیا، اور خواہ مخواہ کوئی بیس کوئی اٹھائیس اور کوئی چالیس کا قائل ہوا''۔

۳- اس کی کیا وجہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے اُبی بن کعبؓ کو آٹھ رکعت پڑھانے کا حکم دیا، تو خود ابی نے اس حکم کو توڑ دیا اور بیس پڑھائی، اور صحابہؓ نے اُبی کی موافقت کرتے ہوئے بیس پڑھی، اور حضرت کا حکم نہیں مانا، حالانکہ تمھارے خیال میں حضرت عمرؓ کا حکم آنحضرت ﷺ کے فعل کے موافق بھی تھا''۔

علامہ اعظمیؒ کا یہ مضمون ۶؍ذوالقعدہ ۱۳۴۲ھ مطابق ۲۵ مئی-۱۰؍جون ۱۹۲۴ء کے 'القاسم'-امرتسر- میں شائع ہوا۔ 'مقالات' میں از صفحہ ۲۰۹ تا صفحہ ۲۱۴ پر مشتمل ہے۔

☆......☆......☆......☆

☆......☆......☆

(۱) مقالات: ۲۱۰/۱

رکعات التراویح

یہ حضرت علامہ اعظمی علیہ الرحمۃ کا ۲۱ر صفحات پر مشتمل مضمون ہے، جو اہل حدیث میں شائع شدہ دو مضمونوں کا جواب ہے، ایک مضمون نور الٰہی گھر جاکھی[1] کا اور دوسرا فضل الرحمٰن مبارک پوری کا بعنوان ''المصابیح فی رکعات التراویح'' تھا، یہ دونوں مضمون اخبار 'اہل حدیث' کے ۱۳ر فروری ۱۹۳۱ء کے شمارے میں شائع ہوئے تھے، جیسا کہ علامہ اعظمیؒ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے، آپ نے طبیعت پر جبر کر کے ان دونوں مضمونوں کا جواب لکھا تھا، ورنہ یہ اس قابل نہیں تھے کہ ان سے تعرض کیا جاتا، چنانچہ لکھا ہے:

''دل تو چاہتا تھا کہ ان میں سے کسی کا جواب نہ لکھا جائے، لیکن بعض مخلص احباب کے بے حد اصرار کی وجہ سے مجبور ہونا پڑا''[2]۔

علامہ اعظمی نے اپنے مضمون میں علی الترتیب پہلے گھر جاکھی اس کے بعد مبارک پوری صاحب کے مضمونوں کا جواب دیا ہے۔ گھر جاکھی صاحب نے اپنے مضمون میں حدیث **ما كان يزيد في رمضان ولا غيره على إحدى عشرة ركعةً** کے سلسلے میں لکھا تھا کہ:

''میرا دعویٰ ہے کہ یہ حدیث نماز تراویح سے متعلق ہے۔''

علامہ اعظمیؒ نے جواب میں لکھا ہے کہ:

''گیارہ پر مواظبت ثابت کرنے کی دھن میں آپ یہ بھول گئے کہ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت زیدؓ بن خالد بلکہ خود حضرت عائشہؓ کی روایات میں گیارہ رکعت سے زیادہ پڑھنا ثابت ہے، اور یہ روایات موطا امام مالک میں گیارہ والی روایت کے متصل ہی مسلسل مذکور ہیں''[3]۔

پھر تینوں صحابۂ کرامؓ کی حدیثوں کو نقل کر کے ارقام فرماتے ہیں:

''المختصر گیارہ سے زیادہ پڑھنا بہت سی روایتوں سے ثابت ہے، اور کوئی صاحب عقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ سوائے حضرت عائشہ کی گیارہ رکعت والی روایت کے اور سب روایتیں غلط یا مردود ہیں، بلکہ اگر کسی روایت کو ساقط ہی کرنے کی نوبت آئے گی، تو گیارہ والی ساقط ہوگی، اس لیے کہ گیارہ سے زیادہ [روایت کرنے والے] خود حضرت عائشہؓ اور ان کے علاوہ دو صحابی اور بھی ہیں؛ پس گیارہ سے زیادہ والی کو ترجیح ہونی چاہئے، ورنہ کم از کم دونوں کے درمیان ایسی تطبیق سے چارہ نہیں جس سے کسی کا رد نہ لازم آوے، اور اس کی بہترین صورت وہ ہے، جو باجی شارح موطا اور علامہ سیوطی اور مولانا عبد الحی وغیرہم نے ذکر کیا ہے کہ گیارہ اور گیارہ سے زائد دونوں صحیح ہے، اور مختلف اوقات میں رسول اللہ ﷺ

(۱) اہل حدیث کے مضمون نگار کا نام ہے ''مولوی نور الٰہی خطیب جامع شیخو پورہ پنجاب'' اور ان کے مضمون کا عنوان تھا: ''نماز تراویح آٹھ رکعت ہے''۔ (۲) مقالات: ۱/۲۱۷ (۳) ایضاً: ۱/۲۲۱

[نے] مختلف طرح پڑھا ہے: کبھی گیارہ، کبھی اس سے کم، اور کبھی اس سے زیادہ"(۱)۔

معلوم ہوتا ہے کہ گھر جاکھی صاحب علم سے بالکل ہی کورے تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے مضمون میں 'مجمع الزوائد' کو علامہ محمد بن اثیر جزری کی اور 'جمع الفوائد' کو حافظ نورالدین ہیثمی کی کتاب لکھا تھا۔

علامہ اعظمیؒ نے لکھا کہ یہ ساری باتیں غلط ہیں، علماء میں محمد بن اثیر جزری نام کے کوئی صاحب نہیں گزرے ہیں؛ ابن اثیر کے نام سے جو لوگ مشہور ہیں، ان میں ایک مبارک ابن الاثیر ہیں، دوسرے علی ابن الاثیر اور تیسرے نصر اللہ ابن الاثیر، اور ان میں سے کسی کا نام بھی محمد نہیں ہے، اور ان میں سے کسی کی کتاب مجمع الزوائد نامی نہیں ہے، بلکہ 'مجمع الزوائد' حافظ نورالدین ہیثمی کی تصنیف ہے؛ اسی طرح علامہ حافظ نورالدین ہیثمی کی کوئی تصنیف جمع الفوائد نہیں ہے، 'جمع الفوائد' محمد بن طاہر الرودانی المتوفی ۱۰۹۴ھ کی تصنیف ہے۔ اس مضمون میں گھر جاکھی صاحب کے اور بھی بہت سے مغالطوں اور لغزشوں سے پردہ اٹھایا ہے، جس سے گھر جاکھی صاحب کے مبلغ علم اور مقام اجتہاد کا پتہ چلتا ہے۔

علامہ اعظمیؒ فرماتے ہیں کہ حافظ ابن حجرؒ اور علامہ سیوطیؒ جیسے محدثین قیام رمضان وصلاۃ رمضان کو تراویح سے عام مانتے ہیں اور تراویح کو ان سے خاص، اور ان حضرات کی عبارتیں نقل کر کے یہ نتیجہ پیش کیا ہے کہ ان دونوں میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے، لکھتے ہیں:

"بات بس اتنی ہے کہ قیام رمضان تراویح وتہجد دونوں پر صادق ہے، یعنی ان میں سے جس کو کرلیا تو قیام رمضان متحقق ہو جائے گا، اس لیے کبھی قیام رمضان بول کر تراویح مراد لے لیتے ہیں، اور کبھی تہجد"(۲)۔

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"پس جب یہ معلوم ہو گیا، تو میں کہتا ہوں کہ جب ابوسلمہ راوی نے حضرت عائشہؓ سے رسول اللہ ﷺ کے قیام رمضان کی بابت سوال کیا، تو انھوں نے سمجھا کہ یہ سائل رسول اللہ ﷺ کی نماز تہجد کی بابت پوچھنا چاہتا ہے کہ وہ تعداد میں عام مہینوں کے موافق ہوتی تھی، یا چونکہ رمضان میں عبادت کا زیادہ اہتمام ہوتا ہے، اس لیے اس کی تعداد بڑھ جاتی تھی؛ تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ نہیں سال کے اور مہینوں کی طرح اس ماہ میں بھی گیارہ سے زیادہ تہجد نہیں پڑھتے تھے۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ تہجد ہی وہ نماز ہے جس کو رمضان وغیر رمضان دونوں میں پڑھا جاتا ہے، برخلاف تراویح کے کہ وہ مخصوص برمضان ہی ہے"(۳)۔

اہل حدیث کے مضمون نگار نے بیس رکعت تراویح والی روایت کی جو تضعیف کی ہے، اس کی بابت علامہ اعظمیؒ فرماتے ہیں:

(۱) مقالات: ۲۲۳/۱ (۲) ایضاً: ۲۳۰/۱ (۳) ایضاً: ۲۳۰/۱

''بیس رکعت والی حدیث حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں: **كان يصلي في رمضان عشرين ركعةً والوتر.** یعنی رسول اللہ ﷺ رمضان میں بیس رکعتیں وتر کے ماسوا پڑھتے تھے۔ اس حدیث کی لوگوں نے تضعیف کر دی ہے، اور اس کے ضعف کو فی الجملہ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں، لیکن ہم کو اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ ضعف کی وجہ سے اس پر عمل بھی نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ کسی ضعیف حدیث پر عمل کرنا اس وقت قابل اعتراض ہوتا ہے، جب وہ کسی صحیح حدیث سے اس طرح ٹکرائے کہ اس ضعیف پر عمل کرنے سے صحیح کا رد اور ترک لازم آوے، اور یہاں پر یہ بات مفقود ہے، اس لیے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی ایسی حدیث نہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ بلا ناغہ گیارہ رکعت تراویح پڑھی ہے، بلکہ ہر حدیث میں صرف بعض اوقات کا حال بیان ہوا ہے، پس ممکن ہے کہ اس حدیث میں ان بعض اوقات کا حال مذکور ہو، جو گیارہ والی کے اوقات کے علاوہ ہیں''(۱)۔

....

اہل حدیث کے مذکورہ بالا شمارے کا دوسرا مضمون جو فضل الرحمٰن صاحب مبارک پوری کا تھا، اس کے متعلق علامہ اعظمی نے لکھا ہے کہ اس میں تمام تر آثار سے بحث کی گئی ہے، اس میں آپ نے مضمون نگار کا یہ دعویٰ نقل کیا ہے کہ: ''تراویح مع وتر کے گیارہ رکعت مسنون ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں صحابہ کرام بحکم امیر المؤمنین گیارہ ہی رکعت پڑھتے تھے۔''

اس کے بعد یہ اثر نقل کیا ہے کہ: **''عن السائب أنه قال: أمر عمر بن الخطاب أبي بن كعب وتميم الداري أن يقوما للناس بإحدى عشرة ركعة.''**

علامہ اعظمیؒ نے اس حدیث پر یہ بحث کی ہے کہ اس کے متن میں اضطراب ہے، اور اس اضطراب کی قدرے تفصیل سے وضاحت کی ہے۔

مضمون نگار نے بیس رکعت کے متعلق ایک اثر نقل کر کے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ منقطع ہے۔

اس کے جواب میں علامہ اعظمیؒ نے فرمایا ہے کہ منقطع کی عدم حجیت کا علی الاطلاق حکم صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ اس وقت ہے جب وہ کسی دوسرے منقطع یا متصل سے معتضد نہ ہو، اور اس اثر کی تائید دوسرے آثار سے ہوتی ہے، منجملہ ان کے ایک اثر یزید بن رومان کا ہے جو موطا امام مالک میں ہے؛ دوسرا عبدالعزیز بن رفیع کا ہے جو مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے، پس اصول حدیث کی رو سے یہ اثر باتفاق حجت ہے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ سوائے بعض غیر مقلدین کے کسی اور محدث نے اس کو ساقط الاحتجاج نہیں کہا ہے۔

فضل الرحمان مبارک پوری صاحب نے ایک دوسرا اثر نقل کر کے دو وجہ سے اس کی تضعیف کی ہے: ۱-ابوعثمان بصری کا مجہول ہونا، ۲-ابوطاہر کی نسبت کسی محدث کی توثیق کا نہ ہونا۔

(۱) مقالات: ۲۳۵/۱

غیر مقلدین کے ان دونوں وجہ تضعیف پر گفتگو رسالہ 'رکعات تراویح' کے تعارف کے وقت آئے گی، اس لیے اس کو یہاں قلم انداز کیا جاتا ہے، یہاں پر صرف ایک دو اصول علامہ اعظمیؒ کے الفاظ میں ذکر کیے جاتے ہیں، ابوطاہر کے باب میں فرماتے ہیں:

''ابوطاہر الفقیہ کی نسبت یہ کہنا کہ مجھے خبر نہیں کس نے ان کی توثیق کی ہے اور اس بنا پر اس اثر کی صحت میں کلام کر دینا بہت زیادہ حیرت انگیز بات ہے، اگر یہ قول محدث مبارک پوری کی طرف منسوب نہ ہوتا تو چنداں تعجب نہ ہوتا، حیرت ہے کہ محدث مذکور نے اپنی ساری عمر اسی وادی میں گزار دی اور ابھی تک اس نکتے سے نا آشنا ہیں کہ جس شیخ سے ایک جماعت روایت کرے اور اس کی روایت منکر نہ ہو تو اس کی حدیث صحیح ہے۔ مالک بن الخیر زیادی کی نسبت ابن القطان فاسی نے یہی اعتراض کیا تھا، اس کا حافظ ذہبی نے یہ جواب دیا کہ صحیحین میں بھی بکثرت ایسے راوی ہیں جن سے کئی کئی شخص روایت کرتے ہیں اور کسی ایک آدمی نے بھی ان کی ثقاہت کی تصریح نہیں کی''(۱)۔

یہ مضمون 'مقالات' میں ۲۱۷ سے ۲۴۷ تک تیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس کے آخر میں تاریخ تحریر ۳۰ رمضان ۱۳۴۹ھ لکھی ہوئی ہے۔

☆......☆......☆

رکعات تراویح

رکعات تراویح کے عنوان سے علامہ اعظمیؒ نے متعدد مضامین اور رسائل تحریر فرمائے ہیں، اور اس موضوع پر بحث وتحقیق کا حق ادا کر دیا ہے؛ زیر بحث رسالہ نہایت پر مغز، مدلل ومبرہن اور جامع ہے، آپ نے اس میں مسئلے کے تمام پہلوؤں کا نہایت عدل وانصاف کے ساتھ تجزیہ کر کے، دونوں فریق کے دلائل پر محدثانہ اور ماہرانہ وناقدانہ انداز میں گفتگو کرتے ہوئے اس اہم مسئلے کو پوری طرح واضح اور روشن کر دیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ کی تحریر کی نمایاں خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی تحقیق سے کسی نتیجے تک پہنچتے ہیں، تو اس کو پورے جزم ویقین کے ساتھ بڑے ہی ٹھوس لہجے میں بیان فرماتے ہیں، چنانچہ 'رکعات تراویح' کی بحث کا آغاز ہی خطبۂ کتاب کے بعد اس عبارت سے کرتے ہیں:

''ہندوستان کے فرقۂ اہل حدیث نے رکعات تراویح کے باب میں تقریباً سو برس سے جو شور وغوغا مچا رکھا ہے، اس کا وجود پہلے کبھی نہیں تھا، تمام دنیائے اسلام میں بیس یا بیس سے زیادہ رکعتیں پڑھی جاتی تھیں، اور باہم کوئی رسالہ بازی یا اشتہار بازی نہیں ہوتی تھی، نیز حضرت عمرؓ کے زمانہ سے لے کر اس غوغا سے پہلے تک دنیا کی کسی مسجد میں تراویح کی صرف آٹھ رکعتیں نہیں پڑھی جاتی تھیں،

(۱) مقالات: ۱/۲۴۲-۲۴۱

یعنی تقریباً ساڑھے بارہ سو برس کے بعد فرقۂ اہل حدیث نے یہ جدید انکشاف کیا کہ اب تک جو مسلمان کرتے یا سمجھتے رہے ہیں، وہ صحیح نہیں ہے، صحیح یہ ہے کہ صرف آٹھ رکعتیں سنت اور قابل عمل ہیں‘‘۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کے بعد کئی صفحے میں عہد فاروقی سے لے کر تقریباً تیسری صدی کے اوسط تک کے علما وائمہ کے مذاہب اور مسلمانوں کے معمول کا ذکر کیا ہے، جس سے روز روشن کی طرح واضح ہوتا ہے کہ پورے عالم اسلام میں کسی ایک جگہ بھی کوئی آٹھ رکعت کا نہ قائل تھا اور نہ اس پر کہیں عمل تھا، بلکہ بیس یا بیس سے زیادہ کا معمول تھا، حتی کہ تحریر فرماتے ہیں:

’’بیس اور بیس سے زائد پر امت محمدیہ کے اس قدیم عمل درآمد اور ائمہ وعلماء سلف وخلف کے اس کو پسند اور اختیار کرنے کے مقابل میں آٹھ رکعت پر عمل کرنے کو سامنے رکھئے اور کتابوں کی ورق گردانی کیجئے، تو حضرت عمرؓ کے بعد سے تیرہویں صدی کے اواخر تک دنیائے اسلام میں کسی ایک جگہ بھی اس پر عمل ہونے کا ذکر آپ کو نہیں مل سکتا، اور پوری قوت صرف کرنے کے بعد بھی اس طویل مدت میں آٹھ پر عمل درآمد کی تصریح کہیں بھی نہیں دکھائی جا سکتی، اور اس کا کوئی گھٹیا سے گھٹیا ثبوت بھی پیش نہیں کیا جا سکتا‘‘(۱)۔

آگے تحریر ہے کہ اس سلسلے میں اگر کوئی روایت پیش کی جا سکتی ہے، تو وہ سنن سعید بن منصور میں سائب ابن یزید کا وہ اثر ہے جس میں مذکور ہے کہ ہم حضرت عمرؓ کے زمانے میں گیارہ رکعت پڑھا کرتے تھے۔

مگر یہ روایت اس وجہ سے ناقابلِ وثوق ہے کہ اس اثر کو سائب بن یزید سے روایت کرنے والے محمد بن یوسف ہیں، اور محمد بن یوسف سے ان کے پانچ شاگرد پانچ طرح روایت کرتے ہیں، ان پانچوں روایتوں کو نقل کرنے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

’’پس اصول حدیث کی رُو سے یہ روایت مضطرب ہے، اور اس حالت میں جب تک کہ کسی ایک طریق کو اصول کے مطابق ترجیح نہ دی جائے، یا تمام طرق میں تطبیق نہ دی جائے، اس وقت تک اس روایت کو کسی مدعا کے ثبوت میں پیش کرنا درست نہیں ہے‘‘(۲)۔

اس کے بعد یہ تحریر فرما کر کہ قدماء محققین نے ترجیح اور تطبیق دونوں صورتیں اختیار کی ہیں، اور پھر ان اہل علم کی اس ترجیح وتطبیق کی صورتوں کو نقل کر کے لکھا ہے:

’’بہر حال سنن سعید بن منصور کی یہ روایت ترجیح یا تطبیق کے بغیر قابلِ اعتماد نہیں ہے، اور ترجیح وتطبیق کے بعد ہمارے دعویٰ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، اس لیے کہ ترجیح کے بعد گیارہ کا ثبوت ہی نہیں ہوگا، اور تطبیق کے بعد یہ ثابت ہوگا کہ عہد فاروقی میں ابتداء چند روز اس پر عمل ہوا، اس کے بعد عہدِ فاروقی ہی میں اس پر عمل موقوف ہو گیا، اور جب سے موقوف ہوا، اس وقت سے تیرہویں صدی کے اواخر تک

(۱) رکعات تراویح: ۱۲ (۲) ایضاً: ۱۴-۱۳

پھر کبھی اس پر عمل درآمد نہیں ہوا"[۱]۔

اور پھر ثبوت کے طور پر یہ لکھنے کے بعد کہ علامہ ابن تیمیہ نے حضرت عمرؓ کے تراویح قائم کرنے کے ذکر میں گیارہ کا ذکر بھولے سے بھی نہیں کیا ہے، اور ابن تیمیہ کی ایک عبارت نقل کر کے لکھتے ہیں:

"عہد فاروقی سے لے کر ہزار بارہ سو سال تک امت کے علماء وفقہاء اور عامۂ مسلمین کے ایسے وسیع پیمانہ پر عمل درآمد کو اہل حدیث کوئی اہمیت نہ دیں تو ان کی ناواقفیت ہے، ورنہ حقیقت میں وہ کسی کھری اور بالکل صحیح السند روایت سے کہیں بڑھ کر مستحکم اور قابلِ وثوق دلیل ہے"[۲]۔

مولانا مبارک پوری کا آٹھ رکعت کا دعویٰ:

مولانا عبدالرحمان مبارک پوری نے اپنی کتاب 'تحفۃ الاحوذی' (۷۳/۲) میں لکھا ہے: **وهو الثابت عن رسول الله ﷺ بالسند الصحيح، وبها أمر عمر بن الخطاب رضي الله عنه، وأما الأقوال الباقية فلم يثبت واحد منها عن رسول الله ﷺ بسند صحيح، ولا ثبت الأمر به عن أحد الخلفاء الراشدين بسند صحيح خال عن الكلام.** یعنی وہی (تراویح کی آٹھ رکعتیں ہی) آنحضرت ﷺ سے بسند صحیح ثابت ہیں، حضرت عمرؓ نے آٹھ ہی کا حکم دیا، باقی جو اقوال ہیں، تو ان میں سے کوئی بھی نہ آنحضرت ﷺ سے صحیح سند سے ثابت ہے، اور نہ خلفاء راشدین میں سے کسی کا اس کا حکم دینا صحیح سند سے ثابت ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے مولانا مبارک پوریؒ کی اس عبارت پر مفصل اور سیر حاصل گفتگو کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ ان کے دعوے کی حیثیت تارِ عنکبوت سے زیادہ نہیں ہے، چنانچہ پہلے تو یہ عنوان قائم کیا ہے کہ: "قول وفعل نبوی (ﷺ) سے تراویح کا کوئی عدد معیَّن ثابت نہیں ہے" اور اس کے ماتحت لکھا ہے:

"اس مسئلے میں علماء اسلام کے دو گروہ ہیں: ایک گروہ جن میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ، علامہ سبکی اور سیوطی وغیرہم شامل ہیں، ان کی تحقیق یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے قول وفعل سے تراویح کا کوئی عدد معیَّن ثابت نہیں"[۳]۔

مگر اس جگہ یہ اشکال ہوتا ہے کہ پھر ان روایتوں کو جن میں رکعات کا بیان ہے، یہ حضرات کس امر پر محمول کرتے ہیں، علامہ اعظمیؒ نے اس کی نسبت تحریر فرمایا ہے:

"اس جماعت کی تحقیق میں وہ تمام روایات جو آنحضرت ﷺ کی تراویح کا عدد معیَّن بتانے کے لیے پیش کی جاتی ہیں، خواہ آٹھ ہوں یا بیس، وہ سب روایتیں یا تو صحیح نہیں ہیں، یا غیر متعلق ہیں؛ یعنی ان میں تراویح کا نہیں بلکہ کسی دوسری نماز کا عدد بتایا گیا ہے"[۴]۔

اور علماء اسلام کا دوسرا گروہ وہ ہے، جو مانتا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے عدد معین ثابت ہے، جیسے فقہاء

(۱) رکعات تراویح: ۱۵ (۲) ایضاً: ۱۶-۱۵ (۳) ایضاً: ۲۲ (۴) ایضاً: ۲۳

احناف میں قاضی خان وطحاوی وغیرہ، اور شوافع میں رافعی وغیرہ کہ یہ لوگ آنحضرت ﷺ سے بیس کا عدد ثابت مانتے ہیں۔

اہل حدیث کا پہلا دعوی اور اس کا رد:

اہل حدیث کا پہلا دعویٰ یہ ہے کہ:

''تراویح کی آٹھ ہی رکعتیں آنحضرت ﷺ سے بسند صحیح ثابت ہیں''۔

اہل حدیث اپنے اس دعوے کی پہلی دلیل بخاری شریف میں مذکور حضرت عائشہؓ کی اس حدیث کو پیش کرتے ہیں کہ: **ما كان يزيد في رمضان ولا في غيره على إحدى عشرة ركعة.** یعنی آنحضرت ﷺ رمضان وغیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔

علامہ اعظمیؒ نے ان کے اس استدلال پر آٹھ صفحات میں مفصل کلام کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اس حدیث کا تعلق تراویح سے نہیں بلکہ تہجد سے ہے، اور یہ بات محقق ہے کہ تراویح اور تہجد دونوں دو نمازیں ہیں؛ اور بالفرض اگر اس حدیث کو تراویح سے بھی متعلق مانا جائے، تو اس میں جو تفصیل بیان کی گئی ہے، اس پر خود اہل حدیث کا بھی عمل نہیں ہے۔

اہل حدیث کی دوسری دلیل یہ ہے کہ صحیح ابن حبان، صحیح ابن خزیمہ، قیام اللیل اور معجم صغیر میں حضرت جابرؓ کی یہ روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے رمضان میں ہمارے ساتھ آٹھ رکعتیں اور وتر پڑھیں۔

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے تراویح پڑھنے کے واقعے کو متعدد صحابۂ کرامؓ نے روایت کیا ہے، اور اُن میں سے کسی نے بھی رکعات کی تعداد کا ذکر نہیں کیا ہے، رکعات کی تعداد صرف حضرت جابرؓ کی حدیث میں بیان کی گئی ہے، اور حضرت جابرؓ سے اس کو صرف ایک شخص عیسیٰ بن جار یہ روایت کرتا ہے، لہذا دیکھنا چاہئے کہ از روئے فنِ حدیث یہ روایت قابلِ قبول بھی ہے یا نہیں؟

پھر علمِ رجال کی کتابوں کے حوالے سے عیسیٰ کے حال پر مفصل گفتگو کی ہے، اور لکھا ہے کہ ائمۂ جرح وتعدیل میں سے یحییٰ بن معین، امام نسائی، امام ابوداود، ساجی، عُقیلی اور ابن عدی وغیرہ نے اس کی تضعیف کی ہے، خصوصاً امام نسائی وابوداود کی جرح تو بہت سخت ہے، ان حضرات نے اس کو ''**منکر الحدیث**'' کہا ہے، ان کے بالمقابل دو حضرات ایک ابوزرعہ اور دوسرے ابن حبان نے اس کی تعدیل کی ہے، مگر چونکہ ''**منکر الحدیث**'' کا شمار جرح مفسر میں ہوتا ہے، اور جرح مفسر تعدیل پر مقدم ہوتی ہے، اس لیے عیسیٰ مجروح قرار پائے گا، اس تفصیل کے بعد عیسیٰ کی اس روایت کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے:

''اس تصریح کے بموجب از روئے اصل عیسیٰ کی یہ روایت قابلِ قبول نہیں ہوسکتی، بالخصوص جبکہ حضرت جابرؓ سے اس بات کو نقل کرنے میں وہ منفرد ہے، دوسرا کوئی اس کا مؤید ومتابع موجود نہیں ہے،

نہ کسی دوسرے صحابی کی حدیث اس کی شاہد ہے"[۱]۔

اہل حدیث کا دوسرا دعویٰ:

یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے بھی گیارہ ہی کا حکم دیا تھا۔

اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس کی دلیل اہل حدیث کے پاس حضرت سائب بن یزید کے ایک اثر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، اور سائب کے اس اثر کو ان سے محمد بن یوسف نے نقل کیا ہے، اور محمد بن یوسف کے پانچ شاگرد ہیں، اور یہ پانچوں اس کو پانچ طرح نقل کرتے ہیں، محمد بن یوسف کے ان شاگردوں میں داود بن قیس تو گیارہ کے بجائے اکیس کا عدد ذکر کرتے ہیں، ان کے دوسرے شاگرد محمد بن اسحاق تیرہ کا عدد ذکر کرتے ہیں، تین اور شاگرد -امام مالک، یحییٰ قطان اور عبدالعزیز بن محمد- گیارہ کا عدد تو ذکر کرتے ہیں، مگر ان کے بیانات باہم مختلف ہیں۔

علامہ اعظمیؒ نے اس اختلاف روایت پر تفصیل سے کلام کر کے لکھا ہے:

"اگلے محدثین میں کسی ایک محدث سے ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے تیرہ اور اکیس کے مقابل میں گیارہ کو ترجیح دی ہے، محدثین نے ترجیح اگر دی ہے تو تیرہ یا اکیس کو، ورنہ یوں تطبیق دی ہے کہ پہلے گیارہ رکعتیں تھیں، بعد میں اضافہ کر دیا گیا"[۲]۔

اس کے برعکس سائب بن یزید کے ایک دوسرے شاگرد یزید بن خصیفہ ہیں، ان کے دو شاگردوں نے ان کے واسطے سے سائب کا یہ اثر بلا اختلاف نقل کیا ہے کہ عہدِ فاروقی میں ان کے زمانے کے لوگ رمضان میں بیس رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔

پھر یزید بن خصیفہ کی اس روایت پر کلام کرنے کے بعد لکھا ہے:

"ایسی حالت میں اصول و انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ یزید کی روایت پر اعتماد کیا جاتا، اور اہل حدیث کے وجود سے قبل اسی پر اعتماد کیا گیا، مگر حضرات اہل حدیث نے محمد بن یوسف کی مختلف فیہ اور مشکوک روایت پر اعتماد کر کے انصاف کا جنازہ نکال دیا"[۳]۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ مولانا عبدالرحمان مبارک پوریؒ نے یزید بن خصیفہ کی روایت کو تحفۃ الاحوذی (۷۵/۲) میں ناقابلِ استدلال قرار دیا ہے، اور اس کے ایک راوی ابوعبداللہ بن فنجویہ دینوری کی نسبت لکھا ہے کہ میں اس کے حال سے آگاہ نہیں ہوں۔

علامہ اعظمیؒ نے مولانا مبارک پوری کے اس نقد کا جواب حسبِ ذیل الفاظ میں دیا ہے:

"جو لوگ علمی حلقہ میں معلوم و متعارف ہوں، اہل علم کی مجلسوں میں انھوں نے طلبِ علم و استفادہ کیا ہو، اور اس کے بعد لوگ عام طور پر ان سے استفادہ اور اخذِ روایت کرتے ہوں، اور لوگوں میں ان

---

(۱) رکعات تراویح: ۳۵-۳۴ (۲) ایضاً: ۴۶ (۳) ایضاً: ۴۷

کی عدالت وثقاہت شہرتِ عام رکھتی ہو؛ ایسے حضرات کی نسبت یہ سوال جائز نہیں ہے کہ وہ ثقہ بھی ہیں، یا نہیں؛ بلکہ ان کی ثقاہت وعدالت کی شہرت یا دوسرے لفظوں میں اہلِ علم کے درمیان اُن کی مقبولیت اُن کے ثقہ ہونے کی ایسی دستاویز ہے، جس کے مقابلہ میں ایک یا دو ماہروں کی یہ شہادت کہ وہ ثقہ ہیں، کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ اصول حدیث کا یہ ایسا مشہور مسئلہ ہے کہ کسی طرح یقین نہیں آتا کہ مولانا اس سے بے خبر ہوں گے''[۱]۔

پھر اپنی اس بات کے اثبات کے لیے 'مقدمہ ابن الصلاح' اور خطیب بغدادی کی 'کفایہ' سے متعدد عبارتیں پیش کی ہیں، اس کے بعد ابن فنجویہ کی مقبولیت وعلمی شہرت کی پانچ دلیلیں دی ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱- ابن فنجویہ سنن نسائی کے اس نسخے کے جو ہندوستان میں متداول ہے، ایک راوی ہیں، جس کو انھوں نے ابن السنی سے سنا ہے۔

۲- ذہبی نے ۴۱۴ھ میں مرنے والے مشاہیر کے ضمن میں ان کا ذکر کیا ہے، اور ان کو ''المحدث''[۲] کے لفظ سے خطاب کیا ہے۔

۳- ابن اثیر جزری نے ان کو ''الحافظ'' کے لقب سے خطاب کیا ہے۔[۳]

۴- سمعانی نے برہان دینوری کے شاگردوں میں ان کا نام لیا ہے۔[۴]

۵- امام بیہقی نے سنن میں ان سے بہ کثرت روایت کیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ اگر مولانا مبارک پوری کے اصول پر عمل شروع کر دیا جائے، تو صحیحین کی بہت سی حدیثوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا، اور ان کو اس وجہ سے ناقابلِ استدلال قرار دینا پڑے گا کہ ان کے راویوں کی تعدیل وتوثیق صراحۃً ثابت نہیں ہے، اور آخر میں مولانا مبارک پوری کی اس جرح کا یہ فیصلہ کن جواب تحریر فرمایا ہے:

''ابن الاثیر نے ابن فنجویہ کے تذکرے میں ان کو حافظ کہا ہے، اور سخاوی کی تصریح کے بموجب یہ الفاظِ توثیق میں سے ہے، لہٰذا صراحۃً بھی ابن فنجویہ کی توثیق ثابت ہوگئی''[۵]۔

مولانا مبارک پوری نے 'معرفۃ السنن' کی روایت پر- جس کو یزید بن خصیفہ سے ان کے دوسرے شاگرد محمد بن جعفر روایت کرتے ہیں- یہ کلام کیا ہے:

''اس میں ایک راوی ابو طاہر ہیں، جن کی نسبت ہم کو علم نہیں ہے کہ کسی نے ان کی توثیق کی ہے؛ دوسرے ابو عثمان ہیں، جن کا تذکرہ ہم کو کسی کتاب میں نہیں ملا''۔

---

(۱) رکعات تراویح: ۴۸

(۲) ذہبی نے ان کے لیے ''المحدث'' کا لفظ 'سیر اعلام النبلا' (۳۸۳/۱۷) میں استعمال کیا ہے، اور العبر (۱۱۶/۳) میں وكان ثقةً مصنفاً لکھ کر ان کے ثقہ ہونے کی تصریح کر دی ہے۔

(۳) دیکھئے لباب: ۲۲۳/۳ (۴) دیکھئے انساب: ۴۵۶/۵ (۵) ایضاً: ۵۳

اس کے جواب میں یہ لکھ کر کہ ان راویوں پر مولانا کا اعتراض بعینہ وہی ہے جو ابن فنجویہ پر تھا، لہٰذا اس کا جواب بھی وہی ہے، جو ابن فنجویہ کی طرف سے دیا جا چکا ہے، علامہ اعظمیؒ نے تحریر فرمایا ہے:

''ہم مولانا کے اس جمود یا تعصب پر اظہار افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ جانتے اور تسلیم کرتے ہوئے کہ ابوطاہر کو عبدالغافر اور سبکی وغیرہ نے ''امام أصحاب الحدیث'' اور ''إمام المحدثین والفقهاء'' کہا ہے، کس دیدہ دلیری سے کہتے ہیں کہ اس سے اس کا ثقہ ہونا لازم نہیں آتا! کاش کوئی بتائے کہ محدثین نے ان کو اپنا امام تسلیم کیا، اور اہلِ نیشاپور نے ان کو منصبِ اِفتا و مشیخت تفویض کیا، تو کیا یہ اُن کی عدالت وثقاہت اور فقہا و محدثین کے اُن پر کلی اعتماد کی دلیل نہیں ہے؟''(۱)

علامہ اعظمیؒ نے آگے فرمایا ہے کہ کسی راوی کی توثیق ثقہ، ثبت اور حجت جیسے الفاظ ہی میں منحصر نہیں ہے، بلکہ حافظ سخاوی اور علامہ سندی نے إمام اور حافظ کے لفظ کو بھی الفاظِ توثیق میں شمار کیا ہے۔

اس کے بعد ابوطاہر کی نسبت تاج الدین سبکی اور عبدالغافر کی عبارتیں نقل کر کے لکھا ہے:

''حیرت کی بات ہے کہ ایک شخص کسی راوی کو امام کہہ دے، تو از روئے اصول حدیث اس کی توثیق ہو جاتی ہے، لیکن پورا خراسان ابوطاہر کو صرف امام نہیں، إمام أصحاب الحدیث بالاتفاق تسلیم کرے، تو مولانا کے نزدیک ان کا ثقہ ہونا لازم نہیں آتا!''(۲)

اس کے بعد ابوعثمان بصری کی نسبت لکھا ہے کہ ان کا نام عمرو بن عبداللہ ہے، اور امام ابوطاہر کے علاوہ ان سے حسن بن علی مؤمل بھی روایت کرتے ہیں، ان کی متعدد روایتیں سنن کبریٰ میں موجود ہیں، کسی محدث نے ان کی تضعیف نہیں کی ہے، پھر لکھا ہے کہ 'معرفۃ السنن' کی یہ روایت ضعیف بھی ہو، تو چونکہ وہ سنن کبریٰ میں دوسرے طریق سے مروی ہے، اس لیے خود مولانا مبارک پوری کی تصریح کے بموجب اس کا ضعف رفع ہو جائے گا۔

روایتِ مذکورہ بالا پر اہل حدیث کے کچھ اور اعتراضات پر رد و کد کے بعد ایک عنوان ''جمہور امت کے دلائل'' قائم کر کے اس میں پہلی دلیل کے تحت حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت ذکر کی ہے کہ آنحضرت ﷺ رمضان میں بیس رکعت اور وتر پڑھتے تھے۔ پھر اس روایت پر اہل حدیث کے اعتراضات پر تفصیل سے کلام کیا ہے، جو سات صفحات پر محیط ہے۔

دوسری دلیل کے تحت حضرت عمرؓ کے زمانے میں بیس رکعت تراویح پڑھنے کے چھ آثار ذکر کیے ہیں، اور ہر اثر پر محدثانہ اور ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔

تیسری دلیل کے تحت حضرت علی مرتضیٰؓ کے زمانے میں بیس رکعت پڑھنے کی روایتیں نقل کی ہیں، اور ان روایات پر حافظ عبداللہ غازی پوری اور مولانا عبدالرحمان مبارک پوری کے اعتراضات کے مسکت اور تشفی بخش جوابات دیے ہیں۔

---

(۱) رکعات تراویح: ۵۳ (۲) ایضاً: ۵۵

علامہ اعظمیؒ نے کتاب ختم کرنے سے پہلے ''بیس رکعت پر اجماع کی بحث'' اٹھائی ہے، اور اس میں اہل علم اور ائمہ اربعہ کا مسلک اور طرزِ عمل نقل کر کے شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور نواب صدیق حسن خانؒ کی کتابوں سے بیس رکعت کا ثبوت، بلکہ علامہ ابن تیمیہؒ کے نزدیک اس کا افضل ہونا ثابت کیا ہے۔

آخر میں ''خاتمہ'' کا عنوان قائم کر کے کتاب کی پوری بحث کا خلاصہ حسب ذیل چار نکات میں پیش کیا ہے:

۱-عہد فاروقی سے لے کر اب سے کچھ پہلے تک تمام مسلمانانِ عالم بیس یا بیس سے زائد رکعتوں کے قائل تھے، اور اسی پر عمل درآمد تھا؛ اس پوری مدت میں اگر ایک آدھ آدمی بیس سے کم کے قائل بھی ہوئے، تو اس پر کسی مسجد میں عمل ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

۲-حضرت عمرؓ کے حکم یا اُن کی رضامندی سے بیس رکعت کا ثبوت ایسا پختہ ہے کہ کسی منصف کو انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

۳-آنحضرت ﷺ کی طرف بیس رکعت پڑھنے کی نسبت بھی بے اصل نہیں ہے، نواب صدیق حسن خاں صاحب کی تحقیق میں حدیثِ صحیح سے ثابت ہے کہ آپ رمضان میں آٹھ رکعتوں سے زیادہ پڑھتے تھے۔

۴-بیس کی روایات پر اہل حدیث حضرات جو جرح وقدح کرتے ہیں، اصولِ حدیث بلکہ خود ان کے مسلّمات کے رُو سے ایک بھی صحیح نہیں ہے۔

اس رسالے کی تصنیف کا محرک بتاتے ہوئے ان سطروں پر اپنے رسالے کو ختم کرتے ہیں:

''تراویح کی بیس رکعتوں کے مخالف حضرات وقتاً فوقتاً جو اشتہارات شائع کیا کرتے تھے، اور اس عمل کو خلاف سنت ظاہر کرنے کے لیے جو کوششیں بروئے کار لاتے تھے، ان کے پیشِ نظر مذکورہ بالا امور کو صاف کرنا نہایت ضروری تھا، جو بحمد اللہ اس رسالے کے ذریعے خوش اسلوبی سے انجام پذیر ہوا، **فالحمد لله كثيراً والصلاة والسلام على نبيه الذي أرسله بشيراً ونذيراً**''۔

اس رسالے کی تصنیف سے ۱۵/ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ کو فراغت ہوئی۔

اس کا پہلا اڈیشن ۱۳۷۷ھ=۱۹۵۷ء میں چھپ کر شائع ہوا، دوسرا اڈیشن ۱۳۷۹ھ=۱۹۶۰ء میں تنویر پریس، امین آباد، لکھنؤ سے حفیظ نعمانی کے زیر اہتمام، اور تیسرا اڈیشن بھی ۱۳۸۲ھ=۱۹۶۳ء میں تنویر پریس لکھنؤ ہی سے شائع ہوا۔ چوتھا اڈیشن ۱۴۰۸ھ=۱۹۸۸ میں حسن پریس مئو سے، پانچواں اور اب تک کا آخری اڈیشن ۱۴۲۴ھ=۲۰۰۳ء میں مولانا رشید احمد الاعظمی کے زیر اہتمام مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ-مرقاۃ العلوم، مئو- سے شائع ہو کر مقبول خاص وعام ہوا۔

☆......☆......☆

رکعات تراویح

مذیّل

بردِّ انوارِ مصابیح

یہ رکعات تراویح کا دوسرا اڈیشن ہے، جو ۱۳۷۹ھ = ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا، اس اڈیشن سے دو سال قبل جب ۱۳۷۷ھ میں 'رکعات تراویح' کا پہلا اڈیشن چھپا ہے، تو مولانا عبدالرحمان مبارک پوریؒ کے ایک شاگرد مولانا نذیر احمد املوی نے اس کا جواب لکھا، جو'انوار مصابیح' کے نام سے شائع ہوا، پیش نظر کتاب یا بلفظ دیگر 'رکعات تراویح' کا دوسرا اڈیشن مولانا نذیر احمد املوی کے جواب میں شائع ہوا، اس میں اوپر'رکعات تراویح' ہے، اور ذیل میں'انوار مصابیح' کا جواب ہے۔

'انوارِ مصابیح' کا یہ جواب درحقیقت علامہ اعظمیؒ کے رشحاتِ قلم ہیں، لیکن کسی مصلحت کی وجہ سے یہ کتاب علامہ اعظمیؒ کے نام سے نہ چھپ کر اس وقت کے مدرسہ مفتاح العلوم کے ایک استاذ مولانا مفتی عبدالباری صاحب علیہ الرحمہ -متوفی ۱۹۸۵ء- کے نام سے چھپی تھی۔

اس کے شروع میں ۶ رصفحات پر مشتمل ''پیش لفظ'' اُس وقت کے مفتاح العلوم کے ناظم مولانا محمد ایوب صاحب علیہ الرحمہ کے نام سے ہے، جس میں 'رکعات تراویح' کی وجہِ تالیف، اور مسئلۂ تراویح میں اہلِ حدیث کے پروپیگنڈوں، ان کی اشتہار بازیوں اور احناف کو دیے جانے والے چیلنجوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

مولانا محمد ایوب صاحب کے ''پیش لفظ'' کے بعد ۲۴ رصفحات پر حاوی ایک مبسوط تمہید ہے، جس میں انوارِ مصابیح کے مصنف کے ذریعہ عبارتوں کے اندر الٹ پھیر اور کتر بیونت کے متعدد نمونے پیش کیے گئے ہیں، اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ مصنفِ'انوار' نے کتابوں کی عبارتوں میں کہیں اپنی طرف سے کچھ بڑھا دیا ہے، اور کہیں مطلب برآری کے لیے کچھ کم کر کے پیش کیا ہے، جو علمی دیانت وامانت کے سراسر منافی ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے 'انوار مصابیح' کا جو رد کیا ہے، اس کے کچھ نمونے جستہ جستہ یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں تراویح کا جو اثر سائب بن یزید سے محمد بن یوسف نے روایت کیا ہے، اس کو محمد بن یوسف کے پانچ شاگرد پانچ طرح روایت کرتے ہیں، روایات کے اس فرق کو دیکھتے ہوئے علامہ اعظمیؒ نے فرمایا تھا کہ:

''اصول حدیث کی رُو سے یہ روایت مضطرب ہے''۔

علامہ اعظمیؒ کے اس فیصلے کی نسبت املوی صاحب نے لکھا ہے:

''ایسی روایت کو مضطرب کہنا جس میں ترجیح یا تطبیق ممکن ہو، اصولِ حدیث سے بے خبری کی دلیل ہے''۔

املوی صاحب کا جواب علامہ اعظمیؒ نے ان الفاظ میں دیا ہے:

''جن عبارتوں کو دلیل میں پیش کیا ہے، ان میں سے کوئی بھی ان کے مدعا پر دلالت نہیں کرتی، بلکہ ابن صلاح کا یہ قول کہ ترجیح یا تطبیق کے امکان کی صورت میں کسی روایت پر وصفِ مضطرب کا اطلاق نہیں ہوتا، اس بات کی صاف دلیل ہے کہ صورتِ اضطراب پائے جانے کی وجہ سے اسمِ اضطراب کا اطلاق ہوسکتا ہے، اور یہی واقعہ بھی ہے، اس لیے کہ ابن صلاح سے کہیں افضل اور اعلیٰ ائمۂ حدیث ترجیح یا تطبیق کے امکان کے باوجود بھی صورتِ اضطراب پائے جانے کی وجہ سے اضطراب کا اطلاق کرتے ہیں''(۱)۔

اس کے بعد یہ دلیل پیش کی ہے کہ امام ترمذی نے زید بن ارقمؓ کی ایک حدیث کی نسبت فرمایا ہے کہ اس کی سند میں اضطراب ہے، حالانکہ امام ترمذی نے خود ہی تطبیق کی یہ صورت بھی ذکر کی ہے کہ میں نے امام بخاری سے اس کے بارے میں دریافت کیا، تو انھوں نے فرمایا کہ ہوسکتا ہے کہ قتادہ نے ان دونوں سے روایت کیا ہو۔

اور ایک ہی دلیل پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ دو تین دلیلیں اور بھی ایسی پیش کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ امکانِ تطبیق وترجیح کے باوجود بخاری وترمذی جیسے ائمۂ حدیث نے ان پر اضطراب کا اطلاق کیا ہے۔

محمد بن یوسف کے پانچ شاگردوں کے نام یہ ہیں: امام مالک، یحییٰ قطان، عبدالعزیز بن محمد، ابن اسحاق، داود بن قیس۔ ان لوگوں میں پہلے تین حضرات گیارہ کا لفظ بولنے میں تو ضرور متفق ہیں، مگر تینوں تین بات کہتے ہیں، امام مالک کی روایت میں ہے کہ گیارہ کا حکم دیا؛ یحییٰ قطان کی روایت میں ہے کہ اُبی اور تمیم گیارہ پڑھتے تھے؛ اور عبدالعزیز بن محمد کی روایت میں ہے کہ ہم گیارہ پڑھتے تھے؛ مگر اس کے برخلاف ابن اسحاق تیرہ رکعت پڑھنے اور داود بن قیس اکیس رکعت پڑھنے کی بات کہتے تھے۔

اس اختلاف کے اندر املوی صاحب نے تطبیق کی یہ صورت نکالی ہے کہ:

''سائب نے محمد بن یوسف سے یہ تینوں باتیں کہی تھیں، اور گویا اس طرح کہی تھیں کہ حضرت عمرؓ نے اُبی بن کعبؓ اور تمیم داریؓ کو امام بنایا اور ان دونوں کو حکم دیا کہ لوگوں کو گیارہ رکعتیں پڑھائیں (ان کے حکم کے مطابق) یہ دونوں گیارہ رکعتیں پڑھاتے تھے، اور ہم ان کے پیچھے گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے''۔

علامہ اعظمیؒ نے املوی صاحب کی اس توجیہ کے جواب میں لکھا ہے کہ جب آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ سائب نے محمد بن یوسف سے اور پھر محمد بن یوسف نے اپنے شاگردوں سے یہ تینوں باتیں کہی تھیں، تو پھر یہ بھی

(۱) رکعاتِ تراویح مذیل: ۳۸

کیوں نہیں کہتے کہ محمد بن یوسف نے چاروں باتیں کہی تھیں، اوراس طرح کہی تھیں:

''حضرت عمرؓ نے ابی بن کعبؓ اور تمیم داریؓ کو امام بنایا اور ان دونوں کو حکم دیا کہ لوگوں کو گیارہ رکعتیں پڑھائیں، (ان کے حکم کے مطابق) یہ دونوں گیارہ پڑھاتے تھے، اور ہم (ان کے پیچھے) گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے، پھر حضرت عمرؓ نے ان کو بیس رکعات پڑھانے کا حکم دیا، اس کے بعد ہم اور سب لوگ بیس رکعت پڑھتے رہے۔........... اس طرح سے نہ صرف محمد بن یوسف کے چاروں شاگردوں کے بیانات میں، بلکہ سائب کے دونوں شاگردوں (محمد بن یوسف اور یزید بن خصیفہ) اور یزید کے دونوں شاگردوں ابن ابی ذئب اور محمد بن جعفر کے بیانات میں بھی تطبیق ہو جاتی ہے، اور سب بقول آپ کے باہم بالکل مربوط ہو جاتے ہیں''(۱)۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ نے اکیس رکعت کی روایت کو اس وجہ سے مرجوح قرار دیا تھا کہ اس کو تنہا عبدالرزاق اپنی کتاب میں لائے ہیں، اور آخر میں وہ نابینا ہو گئے تھے، اور ان کی یادداشت میں فرق پڑ گیا تھا۔

اس کا جواب 'رکعات تراویح' میں علامہ اعظمیؒ نے یہ دیا تھا کہ:

''عبدالرزاق نے کتاب نابینا ہونے سے پہلے لکھی تھی، لہذا نابینائی کے بعد حافظہ خراب ہو جانے سے کتاب کی روایتوں پر کیا اثر پڑے گا''؟۔

اس پر املوی صاحب نے اپنے استاد کی طرف سے یہ صفائی پیش کی کہ:

''ان کا منشا یہ ہے کہ یہ روایت تغیرِ حافظہ سے قبل کی سہی، لیکن ہے ایسے راوی کی جس کے حافظہ پر جرح ہوئی ہے''۔

اس پر علامہ اعظمیؒ نے مذیل میں یہ کلام کیا کہ:

''تغیرِ حافظہ کا جو کچھ اثر ہوتا ہے، وہ زبانی روایت پر ہوتا ہے، کتاب کی روایتوں پر، یا کتاب سے روایت کرنے پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا؛ اور عبدالرزاق کی روایت زیر بحث کتاب کی روایت ہے، پس اگر یہ روایت تغیر حافظہ کے بعد کی ہوتی، تو بھی یہ چونکہ کتاب کی روایت ہے، اس لیے تغیر حافظہ کی بنا پر اس میں کوئی قدح ممکن نہیں تھی اور تغیر حافظہ کو اصولاً کالعدم کہنا پڑتا، چہ جائے کہ یہ روایت اس وقت کی ہے جب تغیر حافظہ کا وجود بھی نہیں تھا، اور زبانی بھی نہیں بلکہ کتاب کی ہے، لہذا کتاب کی روایت کو بعد میں پیدا ہونے والے تغیر حافظہ کی بنا پر مرجوح قرار دینا سراسر بے انصافی اور اصول سے بے خبری کی دلیل ہے''(۲)۔

علامہ اعظمیؒ نے رکعات میں ایک عنوان **''قول و فعل نبوی (ﷺ) سے تراویح کا کوئی معین عدد ثابت ہے یا نہیں''**؟ کے ماتحت لکھا تھا کہ اس میں علماء اسلام کے دو گروہ ہیں، ایک گروہ جس میں شیخ الاسلام

(۱) رکعات تراویح مذیل: ۴۸ (۲) ایضاً: ۵۰-۴۹

ابن تیمیہ، علامہ سبکی اور سیوطی وغیرہ ہیں، اس کی تحقیق یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے قول و فعل سے تراویح کا کوئی معین عدد ثابت نہیں۔

اس کا انکار کرتے ہوئے املوی صاحب نے لکھا ہے:

''جی نہیں! اس مسئلہ میں علماء اسلام کے مابین کوئی گروہ بندی نہیں ہے''۔

مذیل میں املوی صاحب کے انکار کا جواب یہ دیا گیا ہے:

''صاحبِ رکعات نے غنیمت ہے کہ دو ہی گروہوں کا ذکر کیا ہے، ورنہ حقیقت میں ایک تیسرا گروہ بھی ہے، جو یہ کہتا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے سرے سے تراویح ہی کا ثبوت نہیں ہے، چہ جائیکہ رکعاتِ تراویح، اس گروہ کے علم بردار امام شافعی ہیں''[1]۔

پھر اپنے اس دعوے کو دلائل کی روشنی میں بتفصیل ثابت کیا ہے، اور دلیل میں ابن تیمیہ، سیوطی اور نواب صدیق حسن خاں صاحب اور خود مولانا مبارک پوری وغیرہ کی عبارتیں اور حوالے پیش کیے ہیں۔

اس کتاب کی نہایت عمدہ اور نفیس مباحث میں حدیث عائشہؓ: **ما كان يزيد في رمضان ولا في غيره على إحدى عشرة ركعةً** کے تہجد کے باب میں ہونے کی بحث ہے، جو کئی صفحات پر مشتمل ہے، اور جس میں املوی صاحب کے ایک ایک اعتراض کا ناقدانہ اور محققانہ جواب دیا گیا ہے۔

اس بحث میں ایک مقام پر-صفحہ ۸۹ پر- گیارہ اور تیرہ کی روایتوں پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اور آپ (املوی صاحب) سے زیادہ افسوس مولانا مبارک پوری پر ہے کہ گیارہ رکعت تراویح کے ثبوت میں اسی حدیث عائشہؓ کو نقل کرتے ہیں، اس کے بعد تیرہ والی روایت سے اس روایت پر جو اعتراض ہوتا ہے، اس اعتراض کا ایک جواب عینی سے نقل کر کے عینی کے جواب پر اعتراض کرتے ہوئے صاف صاف لکھتے ہیں: **قد ثبت أن رسول الله ﷺ كان قد يصلي ثلاث عشرة ركعة** (یہ بہ تحقیق ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ کبھی کبھی تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے) مگر افسوس ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اس فعل سے تیرہ کی تعداد کو ثابت مانتے ہوئے بھی رکعات تراویح کے باب میں گیارہ ہی رکعات کے قول کو راجح، مختار اور اقویٰ من حیث الدلیل تو کہتے ہی ہیں، حصر کے ساتھ اسی کو آنحضرت ﷺ سے ثابت بھی کہتے ہیں، فرماتے ہیں: **وهو الثابت عن رسول الله ﷺ بالسند الصحيح** (سند صحیح سے بس یہی آنحضرتؐ سے ثابت ہے) خدارا انصاف! کہ تیرہ کے حقیقی ثبوت کے بعد بھی یہی کہے جانا کہ بس گیارہ ہی ثابت ہے! اپنے اگلوں اور بڑوں کی کہی ہوئی بات کی بے جا حمایت اور پیچ اور حدیث کے مقابل میں اقوال الرجال کو ترجیح دینا نہیں ہے تو اور کیا ہے''؟

پھر ایک پیرا کے بعد صفحہ ۹۰ پر لکھتے ہیں:

(۱) رکعات تراویح مذیل: ۵۹

''اچھا ایک دوسری بات سنئے کہ تحفۃ الاحوذی ص۳۷ ج۲ میں **وھو الثابت عن رسول الله ﷺ بالسند الصحیح** حضرت عائشہؓ کا قول ہے یا مولانا مبارک پوری کا؟ اسی طرح 'رکعات تراویح'[(۱)] ص۳ میں جو لکھا ہے کہ: ''صحیح حدیث سے رسول اللہ ﷺ کا مع وتر گیارہ رکعت سے زیادہ تراویح پڑھنا ثابت نہیں''۔ یہ حافظ صاحب کے الفاظ ہیں یا حضرت عائشہؓ کے؟ اگر یہ حافظ صاحب کے الفاظ ہیں اور وہ مولانا مبارک پوری کا قول ہے، اور یقیناً ہے، تو پھر آپ کو ص ۶۱ میں یہ لکھنے کی جرأت کیوں کر ہوئی کہ ''حصر کا دعویٰ اہل حدیث کا نہیں بلکہ خود حضرت عائشہؓ کا ہے''۔ آخر ایسی صریح غلط بیانی کی ہمت آپ نے کیسے کی؟ کیا حافظ صاحب اور آپ کے استاد اہل حدیث نہیں تھے؟ یا **وھو الثابت** اور ''زیادہ ثابت نہیں'' حصر کے عنوان نہیں ہیں''۔

مذیّل کے نہایت عمدہ اور نفیس مباحث میں تراویح اور تہجد کے دو الگ الگ نماز ہونے کی بحث ہے، جو تقریباً بیس صفحات - از ۱۰۴ تا ۱۲۴ - میں پھیلی ہوئی ہے، یہ بحث املوی صاحب کے اس دعوے کے جواب میں ہے کہ ''تہجد فی رمضان اور تراویح البتہ دونوں ایک ہیں''۔ علامہ اعظمیؒ نے ان دونوں نمازوں کی مغایرت پر منجملہ دیگر دلائل کے مشہور غیر مقلد عالم اور مولانا عبدالرحمان مبارک پوری کے استاد حافظ عبداللہ غازی پوری کی عبارتوں سے بھی ان کے خلاف حجت قائم کی ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے 'رکعات تراویح' میں لکھا تھا کہ:

''اس حالت میں کہ نماز تراویح با جماعت کے واقعہ یا واقعات کے ناقل کئی صحابیوں کے شاگرد ہیں، اور ان میں کوئی بھی رکعات کا ذکر نہیں کرتا، از بس ضروری ہو جاتا ہے کہ حضرت جابرؓ کے راوی کا حال معلوم کیا جائے، جو تنہا رکعات کا ذکر کرتا ہے''۔

اس عبارت پر املوی صاحب نے ان الفاظ میں چوٹ کی ہے:

''چونکہ عیسیٰ بن جاریہ جو تعداد رکعات بیان کرتا ہے، وہ آپ کے آباء واجداد کے معمول کے خلاف ہے، اس لیے اس کا حال بیان کرنے کی ضرورت آپ بہت شدت سے محسوس کرتے ہیں''۔

علامہ اعظمیؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

''آبا واجداد کے معمول کی حمایت میں کسی راوی پر جرح کرنے کا الزام اس شخص پر صحیح ہے، جس نے 'تحفۃ الاحوذی' (۱/۳۲۵) میں اسد بن موسیٰ کی توثیق نہایت دھوم دھام سے کی ہے، اس لیے کہ اس نے یہاں پر فرضِ فجر کے بعد معاً سنتِ فجر ادا کرنے کی حدیث روایت کی ہے، جو آپ کے آبا واجداد کے معمول کے مطابق ہے؛ لیکن وہی غریب جب ترک قرأت فاتحہ خلف الامام کی ایک حدیث روایت کرتا ہے، جو آبا واجداد کے معمول کے خلاف ہے، تو وہی صاحبِ 'تحفۃ الاحوذی' اس کی ساری

(۱) یہاں رکعات تراویح سے مراد مولانا مبارک پوری کے استاد اہل حدیث عالم حافظ عبداللہ غازی پوری کا رسالہ ہے۔

توثیقات جو تحفہ ص ۳۲۵ میں نقل کرتے ہیں، بالکل بھول جاتے ہیں، اور یہاں اس کی نسبت اس کے سوا کچھ نہیں جانتے کہ تقریب میں اس کو **صدوق یُغرِب** لکھا ہے، اور نسائی نے **لو لم یُصنِّف لکان خیراً له** کہا ہے؛ مگر لطف کی بات یہ ہے کہ یہاں اس کا جو اِغراب مبارک پوری صاحب کی آنکھوں میں بری طرح کھٹکتا ہے، وہی اِغراب تحفہ میں آنکھوں کی ٹھنڈک بن جاتا ہے، فرماتے ہیں: **تفرُّده لا يقدح في صحة الحديث لأنه ثقة**''(۱)۔

علامہ اعظمیؒ نے 'رکعات' میں عیسی بن جاریہ کے حال کے بیان میں عیسیٰ پر جو جرحیں نقل کی ہیں، املوی صاحب نے ان کا ایک جواب یہ دیا ہے:

''عیسیٰ پر جو جرحیں کی گئی ہیں وہ سب مبہم اور غیر مضر ہیں، اور ایسی جرح جس راوی پر کی گئی ہو، اگر کسی ایک معتبر اور مستند محدث نے اس کی توثیق کی ہوگی تو وہ جرح نامقبول ومردود ہوگی، اور عیسیٰ کی ایک نے نہیں بلکہ دو ماہرین فن نے توثیق وتعدیل کی ہے، لہذا اس کو اصولاً مجروح قرار دینا نادانی یا تجاہل نہیں تو اور کیا ہے''؟(۲)

علامہ اعظمیؒ نے اس کے تین الزامی جواب دیے ہیں، پہلا جواب یہ ہے کہ مولانا مبارک پوری نے 'القول السدید' صفحہ ۲۵ میں عبدالرحمان بن ثوبان کی نسبت ابن معین، امام احمد اور نسائی وغیرہ کی جرحیں نقل کی ہیں، اور ان کی وجہ سے عبدالرحمان کی حدیث کو غیر صحیح قرار دیا ہے، حالانکہ یہ ساری جرحیں مبہم ہیں، اور اس کے بالمقابل عبدالرحمان کی سات ماہرین فن - ابن المدینی، فلاس، دُحیم، ابوحاتم، ابوداود، صالح بن محمد اور ابن حبان - نے توثیق کی ہے۔

دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ مولانا مبارک پوری نے 'القول السدید' ہی کے صفحہ ۳۰ پر وضین بن عطا کو ضعیف وناقابلِ احتجاج قرار دیا ہے، حالانکہ ان کے بارے میں جو جرحیں نقل کی ہیں وہ سب مبہم ہیں، اور امام احمد، ابن معین، دُحیم، ابن حبان، ابوداود اور ابن عدی جیسے چھ ماہرین فن نے وضین کی توثیق کی ہے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ مولانا مبارک پوری نے تحقیق الکلام (۱/۳۳) میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث **لا صلاة إلا بقراء ة فاتحة الكتاب وما زاد** کو جعفر بن میمون کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے، حالانکہ جعفر پر کی گئی تمام جرحیں مبہم ہیں؛ اور دار قطنی، ابن عدی، حاکم، ابن حبان، ابن شاہین، اور ایک روایت کے مطابق ابن معین نے جعفر کی توثیق کی ہے، ان چھ ائمۂ فن کے علاوہ ابن حجر نے بھی ان کی توثیق کی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ذہبی نے صراحۃً حدیث ابو ہریرہؓ کو صحیح اور جعفر کو ثقہ کہا ہے(۳)۔

املوی صاحب نے عیسیٰ پر کی گئی جرحوں کا دوسرا جواب یہ دیا ہے:

''عیسیٰ بن جاریہ پر اکثر جرح کرنے والے متشدد اور متعنت ہیں، اور متعنت کی جرح کی بابت

(۱) رکعات تراویح مذیل: ۱۳۱-۱۳۰ (۲) ایضاً: ۱۳۲ (۳) ایضاً: ۱۳۳-۱۳۲

سخاوی نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ اگر کوئی دوسرا غیر متعنت محدث بھی اس کی موافقت کرے اور کسی ماہر نے اس راوی کی توثیق نہ کی ہو، تو بے شک ضعیف قرار پائے گا؛ لیکن اگر کسی ماہر نے اس کی توثیق کی ہو، تو جرح مفسَّر مقبول اور غیر مفسَّر نا مقبول؛ لہٰذا اس قاعدہ سے بھی عیسیٰ مجروح قرار نہیں پاتا، اس لیے کہ اس کے متعنت جارحوں کی موافقت اگرچہ بعض غیر متعنت نے بھی کی ہے، مگر اس کی توثیق بھی دو ماہروں نے کی ہے"(۱)۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کا پہلا الزامی جواب یہ دیا ہے کہ املوی صاحب کو یہ قاعدہ پہلے اپنے استاد مولانا مبارک پوری صاحب کو بتانا چاہئے تھا، جنھوں نے 'القول السدید' (ص۳۰) میں قاسم ابوعبدالرحمان کی حدیث کو صرف اس وجہ سے ضعیف کہہ دیا ہے کہ امام احمد نے قاسم کی نسبت کہا ہے: **یروي عنه علي بن زید أعاجیب ما أُراها إلا من قبل القاسم،** اور ابن حبان نے بھی اس پر سخت جرح کی ہے، حالانکہ ابن حبان متعنّت ہیں، اور احمد نے اگرچہ ابن حبان کی موافقت کی ہے، مگر دیگر ماہرِ فن محدثین نے قاسم کی توثیق کی ہے، جن کے نام یہ ہیں: ابن معین، بخاری، عجلی، یعقوب بن سفیان، ترمذی، جوزجانی، ابوحاتم، یعقوب بن شیبہ، ابواسحاق حربی، ابن شاہین اور ابن حجر (مذیل ص۱۳۴ ملخصاً)۔

اسی طرح کئی اور مثالیں نقل کر کے علامہ اعظمیؒ نے یہ دکھایا ہے کہ مولانا مبارک پوری نے کئی راویوں کو متعنت کی جرحوں کی بنیاد پر ضعیف قرار دیا ہے، حالانکہ کئی کئی محدثین نے ان کی توثیق کی ہے۔

عیسیٰ پر جو جرحیں کی گئی ہیں، ان میں ایک بہت سخت جرح **منکر الحدیث** کے صیغے کے ساتھ ہے، املوی صاحب نے اس جرح کا جواب دینے میں بڑی قوت صرف کی ہے، ان کا ایک جواب اس طرح ہے کہ "بسا اوقات کسی راوی پر منکر کا اطلاق اس لیے کر دیتے ہیں کہ اس نے صرف ایک حدیث روایت کی ہے"۔ مگر املوی صاحب کا یہ کہنا درست نہیں ہے، کیونکہ یہ تشریح لفظ منکر کی ہے، جب کہ عیسیٰ کے لیے منکر الحدیث کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور منکر اور منکر الحدیث میں بڑا فرق ہے۔

پھر آپ نے **منکر** اور **منکر الحدیث** کے فرق کی وضاحت کے لیے مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی کتاب '**الرفع والتکمیل**' کے حوالے سے علامہ ابن دقیق العید کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب تک کسی راوی کی مرویات میں مناکیر کی کثرت نہیں ہوتی، اس وقت تک اس (راوی) پر **منکر الحدیث** کا اطلاق نہیں کرتے، بلکہ خود مولانا عبدالحی نے فرمایا ہے کہ منکر الحدیث جس راوی کو کہا گیا ہو، وہ کافی مجروح ہوتا ہے۔

عیسیٰ پر کی گئی جرحوں کا جواب دیتے ہوئے املوی صاحب نے ایک بات یہ لکھی ہے کہ سخاوی نے جو لکھا ہے کہ **منکر الحدیث وصف في الرجل یستحق به الترک لحدیثه،** تو یہ ایسے شخص کے متعلق ہے جس کی توثیق کسی دوسرے ماہرِ فن نے نہ کی ہو۔

(۱) رکعات تراویح مذیل: ۱۳۴-۱۳۳ (۲) ص: ۱۳۴ ملخصاً

علامہ اعظمیؒ نے املوی صاحب کی اس بات کا جواب بہت تفصیل سے دیا ہے، جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

''یہ بات ایسی بدیہی البطلان ہے کہ اس کا دعویٰ وہی شخص کرسکتا ہے جوفن سے بالکل نابلد ہو۔ سخاوی نے یہ بات روی یا یروي مناکیر اورمنکر الحدیث کا فرق بتانے کے موقع پر لکھی ہے، اور فرمایا ہے کہ روی مناکیر یا یروي مناکیر کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ راوی کی حدیث متروک ہوجائے، جب تک کہ اس کی مرویات میں مناکیر کی کثرت نہ ہو، اور وہ راوی اس قابل نہ ہو جائے کہ اس کو منکرالحدیث کہا جانے لگے، جب منکرالحدیث کہا جانے لگے گا، تو ایسا وصف ہے کہ اس کی وجہ سے وہ متروک الحدیث ہوجائے گا''[1]۔

املوی صاحب نے عیسیٰ پر کی گئی جرحوں کے جواب کی کوشش کے بعد اس کے تفرُّد کا جواب دینے کی سعی کی ہے، اور اس سلسلے میں لکھا ہے:

''گویا عیسیٰ کے تفرد کی صورت یہ ہے کہ اس نے ایک ایسی بات بیان کی ہے، جس کے بیان سے دوسرے راوی ساکت ہیں، ظاہر ہے کہ سکوت اور بیان میں کوئی مخالفت اور معارضہ نہیں ہے''۔

اس کے بعد علامہ ابن الصلاح کی ایک عبارت نقل کرکے لکھا ہے:

''عیسیٰ کی یہ زیادۃ راجح اور مرجوح کا مقابلہ کیے بغیر مقبول ہوگی''۔

علامہ اعظمیؒ نے املوی صاحب کے جواب پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''املوی صاحب نے یہاں جو قاعدہ ابن الصلاح کے حوالے سے بیان کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر راوی حافظ، ضابط، مقبول التفرد راوی کے درجے سے دور نہ ہو، اور وہ کوئی ایسی بات روایت کرے، جس کو دوسرا کوئی روایت نہ کرتا ہو، تو اس کی روایت حسن ہوگی۔ اس بات کو حافظ ابن حجر نے اس عنوان سے بیان کیا ہے کہ حسن اور صحیح کا راوی جو زیادتی روایت کرے وہ مقبول ہے، بشرطیکہ اس سے اوثق راوی کی روایت کے منافی وہ زیادتی نہ ہو''۔

پھر عیسیٰ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ:

''حافظ ضابط مقبول التفرد راوی کے درجے سے بہت گرا ہوا ہے''[2]۔

علامہ اعظمیؒ نے املوی صاحب کے مذکورہ بالا کلام پر گرفت کرتے ہوئے مزید لکھا ہے کہ اگر یہ قاعدہ صحیح ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس قاعدے سے صرف اپنے آبائی معمول کی تصحیح کے موقع پر کام لیا جاتا ہے، اور جو بات آبائی معمول کے خلاف ہو، اس میں اس قاعدے کو نہایت بے دردی سے ٹھکرا دیا جاتا ہے، مثلاً:

۱-إذا قرأ فأنصِتوا کی زیادتی۔ یہ سلیمان تیمی کی زیادتی ہے، جو بلاشبہہ صحیح کا راوی ہے۔

۲-حدیث ابوہریرہؓ میں یہی زیادتی۔ یہ ابن عجلان کی زیادتی ہے، جو بلاشبہہ حسن کا راوی ہے۔

(۱) رکعات تراویح مذیل: ۱۳۹ (۲) ایضاً: ۱۴۱

۳-حدیث ابن مسعود میں ثم لا یعود کی زیادتی۔

۴-اور حدیث عبادہؓ میں فصاعداً کی زیادتی کے باب میں اس قاعدے کو کیوں ٹھکرادیا گیا؟ درانحالیکہ ان میں سے ہر زیادتی کو یا تو محدثین نے صحیح قرار دیا ہے، یا حسن۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے مولانا مبارک پوری کی کتاب 'ابکار المنن' اور 'القول السدید' وغیرہ سے متعدد مثالیں نقل کر کے اس قاعدے کی مخالفت اور اپنے آبائی معمول پر سختی سے جمے رہنے کو دکھایا ہے۔

املوی صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ:

''تحفہ جلد ثانی جس میں تراویح کی بحث ہے ۱۳۴۹ھ میں اور ابکار المنن ۱۳۳۸ھ میں شائع ہو چکی ہے، اور ان دونوں کے مؤلف کی وفات ۱۳۵۳ھ میں ہوئی، تو کیا ابکار کے پندرہویں سال اور تحفہ کے چوتھے سال تک آپ کو اپنی حسرت پوری کرنے کا موقع نہیں ملا''۔

اس کے جواب میں علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''املوی صاحب کی یہ برہمی بے جا ہے، صاحبِ رکعات نے مولانا مبارک پوری کی زندگی ہی میں ان کے تحفہ کی خبر لی تھی، مگر مولانا مرحوم حیادار تھے، انھوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ ان مواخذات کا چرچا نہ کیا جائے، چنانچہ انھوں نے ایسی خاموشی اختیار کی کہ اتنے بڑے حادثے کا ذکر آپ لوگوں تک سے نہیں کیا۔ ....'العدل' کے فائل نکلوا کر ذی الحجہ ۱۳۴۹ھ کا پرچہ ملاحظہ فرمایئے، اس میں تحفہ پر دو سخت مواخذے مولانا مبارک پوری کا نام لے کر کیے گئے ہیں، اور مولانا ان مواخذات کی اشاعت کے بعد چار برس تک زندہ رہے، مگر صدائے برنخاست۔ مولانا کے اس طرح لاجواب ہو جانے کے بعد کوئی کیا لکھتا''[(۲)]۔

اس کتاب کا بیشتر حصہ مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ کے تعاقب اور ان کے مواخذے پر مشتمل ہے، اور زیادہ تر الزامی جواب سے کام لیا گیا ہے۔ جس سے راویوں اور روایات کے باب میں جماعتِ اہل حدیث کے علماء اعلام کی غیر منصفانہ ذہنیت بھی اجاگر ہو جاتی ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

الروض المجود فی تقدیم الرکبتین عند السجود

۱۶ر صفحات پر حاوی یہ مقالہ اس بحث سے متعلق ہے کہ سجدہ میں جاتے وقت زمین پر پہلے ہاتھ رکھنا چاہئے، یا گھٹنا؛ اس باب میں غیر مقلدین کا یہ کہنا ہے کہ پہلے ہاتھ رکھنا چاہئے، جبکہ حنفیہ پہلے گھٹنا رکھنے کے قائل ہیں۔ حضرت علامہ اعظمیؒ نے اس مسئلے کے تمام موافق اور مخالف دلائل و روایات ذکر کر کے، ان کی اسانید اور رواۃ

(۱) رکعات تراویح مذیل: ۱۴۲ (۲) ایضاً: ۱۵۷

ورجال پر محدثانہ انداز میں بحث کرتے ہوئے مسلک حنفی کا راجح اور سنت نبویہ-علی صاحبہا الصلاۃ والسلام- کے موافق ہونا ثابت کیا ہے، چنانچہ اصل بحث کا آغاز کرنے سے پہلے فرماتے ہیں:

''حدیث وضع الرکبتین قبل الیدین کا رجحان اس کے معارض پر اس درجہ واضح ہے کہ شک وشبہہ کی گنجائش نہیں''[۱]۔

علامہ اعظمیؒ نے اولاً حضرت وائل بن حُجر کی وہ حدیث نقل کی ہے جس کی نسبت آپ نے لکھا ہے کہ یہ سنن اربعہ، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان وصحیح ابن السکن میں مروی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: **عن وائل بن حُجر قال: رأیت رسول الله ﷺ إذا سجد وضع رکبتیه قبل یدیه، وإذا نهض رفع یدیه قبل رکبتیه** (حضرت وائل کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ جب سجدہ میں جاتے تو اپنے گھٹنوں کو اپنے ہاتھوں سے پہلے رکھتے، اور جب سجدہ سے اٹھتے تو اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے اٹھاتے)۔

سنن اربعہ میں اس کی مشترک سند یہ ہے کہ اس کو شریک نے عاصم بن کلیب سے روایت کیا ہے، عاصم نے اپنے باپ کلیب سے، اور کلیب نے وائل بن حجر سے، اس سند کے تمام راوی ثقہ ہیں، صرف ایک شریک بن عبداللہ ایسے راوی ہیں جن پر لوگوں نے کلام کیا ہے، مگر حق یہ ہے کہ وہ ساقط الاحتجاج نہیں ہیں، چنانچہ امام ترمذی اور حازمی نے ان کی اس حدیث کی تحسین کی ہے، اور ابوداود نے اس پر سکوت کیا ہے، جو ان کے نزدیک صالح ہونے کی دلیل ہے، اور ابن معین ونسائی نے شریک کی توثیق وتعدیل کی ہے، اور ان کی روایت امام مسلم نے لی ہے۔

شریک کی یہ حدیث خود بھی حسن سے کم نہیں، چہ جائے کہ اس کے متابع اور شاہد بھی موجود ہیں، شریک کے متابع تو ہمام ہیں، لیکن ہمام کی روایت مرسل ہے، پھر یہ کہ ہمام اس کو عاصم بن کلیب سے بھی روایت کرتے ہیں اور شقیق کے واسطے سے بھی، لہٰذا اگر عاصم سے روایت کرنے والے ہمام اور شقیق دونوں ہیں، تو حدیث شریک کے دو متابع ہو گئے۔

ہمام نے اس مضمون کی حدیث کو دوسری سند سے بھی روایت کیا ہے، جو سنن ابوداود میں ہے، اس میں ہمام نے محمد بن جحادہ سے روایت کیا ہے، انھوں نے عبدالجبار بن وائل سے، اور عبدالجبار نے اپنے والد سے، اس سند اور روایت کو نقل کرنے کے بعد علامہ اعظمی تحریر فرماتے ہیں:

''اس روایت میں صرف اتنی بات ہے کہ اس حدیث کو عبدالجبار بن وائل اپنے باپ سے بلاواسطہ روایت کرتا ہے، اور اکثر محدثین کے نزدیک اس کا اپنے باپ سے سماع ثابت نہیں ہے، لہٰذا یہ روایت مرسل ہوگی، لیکن اولاً تو مرسل حنفیہ کے نزدیک حجت ہے، اس لیے اس سے ہمارے ہاں احتجاج درست ہے، اور ثانیاً یہ متابع ہے اور متابعات میں اتنی بات چنداں مضر نہیں''[۲]۔

اس کے بعد مخالفین پر حجت قائم کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

(۱) مقالات ابوالمآثر: ۱/۱۵۰ (۲) ایضاً: ۱/۱۵۲

''ہمارے ہاں ان دونوں وجہوں سے یہ روایت مقبول ہوگی، اور غیر مقلدین کو اس وجہ سے اس کے قبول سے چارہ نہیں ہے کہ ان کے یہاں عبدالجبار کا سماع اپنے باپ سے ثابت ہے (دیکھو تحریرات غیر مقلدین بابت آمین بالجہر)، لہٰذا یہ روایت مرسل نہ رہے گی اور اچھی خاصی حدیثِ شریک کی موید ہوگی، بلکہ حق تو یہ ہے کہ بانفرادہ اور تنہا قابل احتجاج ہوگی، اور چونکہ اس کے اسناد کے تمام رجال ثقات ہیں، اس لیے ضعف اسناد کا دعویٰ بھی ممکن نہیں ہے''[۱]۔

اس کے بعد مذکورہ بالا حدیث کے دو شاہد پیش کیے ہیں، ایک تو 'زادالمعاد' کے حوالے سے مصنف ابن ابی شیبہ میں مذکور حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث ذکر کی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: **عن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال: إذا سجد أحدكم فليبدأ بركبتيه قبل يديه الحديث.** اور 'زادالمعاد' نیز 'تلخیص الحبیر' کے حوالے سے دار قطنی، حاکم اور بیہقی کی روایت کردہ حضرت انسؓ کی یہ حدیث ذکر کی ہے کہ: **رأيت رسول الله ﷺ انحط بالتكبير حتى سبقت ركبتاه يديه.** یہ دونوں اگرچہ ضعیف ہیں لیکن بطور شاہد قابل قبول ہیں۔

ان روایات کو پیش کرنے کے بعد ان کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''وضع رکبتین قبل الیدین کے باب میں وائل بن حجر کی حدیث بطریق شریک اولاً تو بانفرادہ حسن ہے، ثانیاً: اس کے دو متابع - ایک غیر مقلدین کے خیال کی بنا پر صحیح اور ایک مرسل - اور دو شواہد موجود ہیں، اور ان کی موجودگی میں حدیث شریک بلاشک وشبہہ قابلِ احتجاج ہے''[۲]۔

اس کے بعد امام ترمذیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: **والعمل عليه عند أكثر أهل العلم** الخ۔ پھر فرمایا ہے:

''اور ائمۂ اربعہ میں سے امام ابوحنیفہ، امام احمد، امام شافعی اور ان کے علاوہ ابراہیم نخعی، مسلم بن یسار، سفیان ثوری، اسحاق بن راہویہ، اور امام ابوحنیفہ کے تمام اصحاب اور اہلِ کوفہ اسی کے قائل ہیں (زادالمعاد ۱/۵۹) اور صحابہ کرامؓ میں سے حضرت خلیفہ ثانی عمر بن الخطاب اور حضرت عبداللہ بن مسعود بھی اسی کے قائل وفاعل تھے (زادالمعاد وشرح معانی الآثار للطحاوی) اور ایک روایت میں مالک بھی اس کے قائل ہیں (مسک الختام)''[۳]۔

ان دلائل کے بعد حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ حدیث جو سنن ابوداود میں ہے اور غیر مقلدین کا مُستدَل ہے کہ **إذا سجد أحدكم فلا يبرك كما يبرك البعير، وليضع يديه قبل ركبتيه** نقل کر کے محدثانہ انداز میں اس کا جواب دیا ہے، اس کی سند کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں دو - دو مجروح راوی ہیں، ایک عبدالعزیز بن محمد اور دوسرے محمد بن عبداللہ بن حسن یہ دونوں راوی مجروح ہیں۔

اس کے بعد دوسرے وجوہِ ترجیح سے بھی وضع رکبتین قبل الیدین کا راجح اور اولیٰ ہونا ثابت کیا ہے، جو بارہ صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ پوری بحث بلکہ درحقیقت پورا مضمون نہایت محدثانہ رنگ میں ڈوب کر لکھا گیا ہے۔

(۱) مقالات: ۱/۱۵۲ (۲) ایضاً: ۱/۱۵۳ (۳) ایضاً: ۱۵۴

اس تحریر کا پس منظر یہ ہے کہ ۲۸/ جمادی الاولی ۱۳۴۳ھ کے اہل حدیث میں ''سجدہ میں جاتے وقت ہاتھوں کو پہلے رکھنے کی سنیت''[۱] کے عنوان سے ایک مضمون چھپا تھا، اسی کے جواب میں یہ مضمون زیب قرطاس کیا گیا تھا۔

☆......☆......☆......☆

واقعۂ قفال کی تردید

یکم اکتوبر ۱۹۲۴ء مطابق ۱۳۴۳ھ کے اخبار 'محمدی' میں ''حنفی مذہب کی نماز'' کے عنوان سے ایک مضمون چھپا تھا، اس میں مضمون نگار نے مذہب حنفی کے طریقۂ نماز کا مضحکہ اڑایا تھا۔ امام قفال مروزی ایک عظیم المرتبت شافعی عالم تھے، ان کی طرف ایک واقعہ منسوب کیا گیا ہے کہ سلطان محمود غزنویؒ نے ان سے کہا کہ وہ حنفی وشافعی مذہب کے مطابق ادنی درجہ کی نمازیں پڑھ کر دکھائیں۔ امام قفال نے نماز پڑھی، تو مذہب شافعی کی اعلیٰ درجہ کی، اور مذہب حنفی کی ایسی جو حرام اور قابلِ اعادہ تھی۔ مضمون نگار 'محمدی' نے اس واقعے کے لیے امام الحرمین کی کسی کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے محدثانہ اور مؤرخانہ طرز پر نہایت بسط وتفصیل کے ساتھ اس واقعہ کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کو باطل اور تراشیدہ قرار دیا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ جس انداز سے یہ واقعہ نقل کیا جاتا ہے، امام قفال کی شان اس سے بہت بلند وبالا وبرتر تھی؛ اسی طرح اس میں بھی شک ظاہر کیا ہے کہ امام الحرمین نے اس کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہو، بلکہ بہت ممکن ہے کہ یہ واقعہ الحاقی ہو اور بعد میں کسی نے اس کو ان کی کتاب میں داخل کر دیا ہو۔

علامہ اعظمیؒ نے اس واقعے کے ایک ایک ٹکڑے کو لے کر اس کا جعلی اور من گھڑت ہونا ثابت کر کے اس کے تارو پود بکھیر کر رکھ دیے ہیں، چنانچہ اس پر ردوقدح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس پر نظر کرتے ہوئے ہر ہوش والا یہی فیصلہ کرے گا کہ ان امور کی نسبت قفال وامام الحرمین کی طرف بہتان وافترا ہے، اور یہ قصہ طلسم ہوش ربا کی داستان اور گل بکاولی کے قصہ سے زیادہ وقیع نہیں ہے۔ غور تو کرو آخر یہ کتنی بڑی ناانصافی ہے کہ شافعی مذہب کی جائز نماز دکھاتے وقت تو کوئی مستحب بھی نہیں چھوڑا، اور حنفی مذہب کی جائز نماز پڑھی، تو واجبات بلکہ فرائض تک کا ناس مار دیا۔ حنفی مذہب میں یہ کہاں ہے کہ فرائض کے ترک سے نماز ہو جاتی ہے، حنفی مذہب میں تو واجب کے قصداً ترک سے بھی نماز لوٹانا واجب ہے جیسا کہ بار ہا بتایا جا چکا ہے''[۲]۔

یہ ایک مستقل رسالہ ہے، اور پوری طرح مدلّل ومستحکم، منطقی انداز سے بھرپور اور دلچسپ اور پُر لطف

(۱) ۲۸/ جمادی الاولی ۱۳۴۳ھ = ۲۶/ دسمبر ۱۹۲۴ء کے اخبار 'اہلحدیث' میں صفحہ ۸-۹ پر یہ مضمون چھپا تھا، اس میں مضمون نگار کا نام مذکور نہیں ہے، جس کی وجہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود ایڈیٹر 'اہلحدیث' مولانا ثناء اللہ امرتسری کا تحریر کردہ رہا ہوگا۔

(۲) مقالات: ۱/ ۲۰۱-۲۰۰

ہونے کے ساتھ علامہ اعظمیؒ کی ظرافتِ طبع کا کسی قدر آئینہ دار بھی ہے، مثلاً ایک جگہ لکھا ہے:

''اگر قفال کو ادنیٰ درجہ کی نماز پڑھنی تھی تو جس طرح حنفی نماز جلد کلب مدبوغ سے پڑھی تھی، کم از کم شافعی نماز گدھے کی کھال پہن کر پڑھتے، کیونکہ اس میں بھی تو شافعی مذہب کی نماز ہو جاتی ہے؛ پھر معلوم نہیں کیا ضرورت پیش آئی تھی جو قفال نے کتے کی کھال دباغت دے کر اپنے پاس رکھی تھی، اور معلوم ہوتا ہے کہ ہر وقت ان کے پاس ہی رہتی تھی، اسی لیے تو اس موقع پر بھی بغچی سے نکال کر جھٹ زیب تن کر لی۔ واللہ یاروں نے بھی کیا گپ ہانکی ہے''[1]۔

اور آخر میں ختم کرنے سے پہلے یہ لکھا ہے:

''اخیر میں یہ بتا دینا بھی مناسب ہے کہ یہ قصہ صلاۃ القفال کے نام سے مشہور ہے، اور حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اس کا پُر زور رد لکھا ہے، اس رسالہ کا نام 'تشییع الفقهاء الشافعية' ہے۔ افسوس ہے کہ میں اب تک اس کی زیارت سے محروم ہوں، اگر یہ رسالہ دستیاب ہو گیا، اور کچھ نئی باتیں اس میں ملیں گی، تو انتخاب کر کے ہدیۂ ناظرین کروں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ''[2]۔

اس کے بعد ''تنبیہ'' کے ایک ذیلی عنوان کے تحت لکھا ہے:

''اس قصہ کو دمیری شافعی نے بھی اس کے حوالے سے نقل کیا ہے، اور آخر میں یہ کلام کر دیا ہے کہ اس میں یہ جو مذکور کہ امام شافعی ہیئت، ادب، سنت کے ترک سے نماز کو جائز نہیں کہتے یہ مستقیم (صحیح) نہیں ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں: **قلت وقد ذكر أنه أتى بالسنن والأبعاض والآداب والهيئات، وقوله يجوز الشافعي دونها غير مستقيم** (حیاۃ الحیوان الکبریٰ ۴۴۸/۲)، اس کے بعد اشارۃً یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ قصہ کا یہ عنوان صحیح نہیں، مشہور یہ ہے کہ انھوں نے ویسی ہی نماز پڑھی جس سے کم جائز نہیں ہے''[3]۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''میں کہتا ہوں کہ وہ ذرا اور غور کرتے اور قصہ کے ہر جزو پر نظر کرتے، تو صاف اقرار کر لیتے کہ یہ قصہ ہی بالکل غلط ہے۔

تعجب ہے کہ مولوی یوسف جے پوری نے بھی 'حقیقۃ الفقہ' میں اس کو لکھا ہے اور حیاۃ الحیوان سے ہی نقل کیا ہے؛ مگر دمیری کی وہ عبارت نقل نہیں کی، جس میں قصہ کے بعض اجزا کی انھوں تغلیط کی ہے اور چالاکی کا اقتضا بھی یہی تھا، اس لیے کہ اگر وہ عبارت نقل کر دیتا تو پورے قصہ میں اشتباہ ہو جاتا اور ناواقفوں کو بہکانا جو مقصود تھا حاصل نہ ہوتا''[4]۔

آخر میں اس سے فراغت کی تاریخ یوں نقل کی ہے:

---

(۱) مقالات: ۱۸۴/۱ (۲) ایضاً: ۲۰۵/۱ (۳) ایضاً: ۲۰۶/۱ (۴) ایضاً: ۲۰۶

وفقني الله لإتمامه يوم الجمعة لليلة مضت من شعبان سنة خمس وأربعين وثلاث مأة وألف من الهجرة النبوية على صاحبها ألف سلام وتحية. والحمد لله في الآخرة والأولى وصلى الله على سيد البرايا وعلى آله وصحبه وسلم وبارک وکرم.

وأنا عبده المُذنب أبو المآثر حبيب الرحمن الأعظمی وکنت إذ ذاک مدرساً بمظهر العلوم (بنارس).

☆......☆......☆

حدر اللثام

قرأت فاتحہ خلف الامام - امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے - کا مسئلہ ایک قدیم مختلف فیہ مسئلہ ہے، علماء اسلام کا اس مسئلے میں بہت سخت اختلاف چلا آرہا ہے، اور خاص اس مسئلے پر بہت سی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں، امام بخاری اور امام بیہقی جیسے محدثین عظام نے اس کو مستقل کتابوں کا موضوع بنایا ہے۔

فاتحہ کے تعلق سے دو طرح کا اختلاف پایا جاتا ہے:

۱- پہلا اختلاف نماز میں سورۂ فاتحہ کی فرضیت کا ہے۔

۲- دوسرا اختلاف یہ ہے کہ کیا مقتدی کے لیے بھی سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب اور ضروری ہے؟

حنفیہ پہلے مسئلے میں سورۂ فاتحہ کی فرضیت کے قائل نہیں ہیں، بلکہ وہ اس کو واجب مانتے ہیں، اگر وہ چھوٹ جائے تو نماز تو ہو جاتی ہے، مگر کامل درجے کی نہیں ہوتی، اور سجدۂ سہو کرلیا جائے تو وہ نقص جو اس کے چھوٹنے سے نماز میں پیدا ہوتا ہے، دور ہو جاتا ہے، اور نماز صحیح اور مکمل ہو جاتی ہے۔

اور دوسرے مسئلے میں حنفیہ اس کے عدمِ جواز کے قائل ہیں، یعنی سورۂ فاتحہ کا وجوب صرف امام اور منفرد کے حق میں ہے، اگر کوئی شخص مقتدی ہے اور امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہے، تو اس کے لیے فاتحہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ مگر اہلِ علم وفقہ کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ مقتدی کے لیے بھی اس سورہ کا پڑھنا واجب اور ضروری ہے، یہی مسلک حضرت امام شافعی کا ہے۔

دلائل دونوں طرف سے دیے گئے ہیں، اور ہر فریق نے اپنے دلائل کی تائید وتقویت کے ساتھ فریق ثانی کے دلائل کا رد بھی کیا ہے۔

عصر حاضر میں اس مسئلے پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں مشہور اہل حدیث عالم مولانا عبدالرحمان مبارک پوری علیہ الرحمہ - متوفی ۱۳۵۳ھ = ۱۹۳۴ء - کی کتاب 'تحقیق الکلام' ہے، مولانا مبارک پوری کی یہ کتاب جماعت اہل حدیث میں کافی شہرت رکھتی ہے، اور ان کے مایہ ناز کارناموں میں خیال کی جاتی ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے فراغت کے ایک سال بعد ۱۳۴۱ھ میں اس کا جواب لکھنا شروع کیا، علامہ اعظمیؒ کی یہ

کتاب اگرچہ مکمل نہیں ہے، لیکن جتنا حصہ ہے وہ 'تحقیق الکلام' کے تار و پود بکھیرنے کے لیے کافی ہے، اور یہ ثابت کر دیتا ہے کہ جماعت حنفیہ کا ایک نوخیز عالم -یاد رہے کہ علامہ اعظمیؒ کی عمر اس وقت صرف بائیس برس تھی- بھی مولانا مبارک پوری جیسے کہنہ مشق اور معمّر عالم کی کتاب کا جواب کس تحقیق کے ساتھ اور کس پُر اعتماد طریقے سے دے سکتا ہے، جس کو مناظرے کی زبان میں ''دندان شکن'' جواب کہا جا سکتا ہے۔

'تحقیق الکلام' کے مصنف نے اپنی کتاب کے دو حصے کیے ہیں، پہلے حصے میں اپنے دلائل بیان کر کے ان پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دیا ہے، اور دوسرے حصے میں حنفیہ کے دلائل ذکر کر کے ان کے جوابات دیے ہیں۔

'حدر اللثام' میں بھی یہی ترتیب معکوس طریقے سے ملحوظ رکھی گئی ہے، یا یوں کہا جائے کہ مولانا مبارک پوری کی کتاب کو الٹ دیا گیا ہے، یعنی 'حدر اللثام' کے مصنف کا ارادہ بھی کتاب کے دو حصے کرنے کا تھا، پہلے حصے میں اپنے دلائل ذکر کر کے مخالفین کا جواب دینا، اور دوسرے میں ان کے دلائل کا رد کرنا۔ لیکن افسوس کہ اس کا پہلا حصہ بھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا، اور اس کا تصنیفی عمل موقوف ہو گیا، اور پھر آخر تک یہ کام پورا نہ ہو سکا، جو جدل و مناظرہ سے قطع نظر دنیائے علم و تحقیق کا ایک بڑا خسارہ ہے۔

امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے کی پہلی دلیل:

یہ عنوان قائم کر کے علامہ اعظمیؒ نے آنحضرت ﷺ کے آخری عمل کو پہلی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، یہ ابن ماجہ، مسند احمد اور طحاوی وغیرہ میں آنحضرت ﷺ کے مرض وفات میں حضرت صدیق اکبرؓ کی امامت اور درمیانِ نماز میں حضرت رسول اکرم ﷺ کی تشریف آوری اور نماز میں شرکت و امامت کا واقعہ ہے، اس واقعے میں حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں یہ ہے کہ ''آنحضرت ﷺ نے قرأت وہاں سے شروع کی، جہاں سے ابوبکرؓ نے چھوڑی تھی''۔

حضرت ابوبکرؓ کی چھوڑی ہوئی جگہ سے آنحضرت ﷺ کے قرأت کرنے سے کم از کم اتنا ثابت ہوتا ہے کہ قرأت کچھ چھوٹی تھی، اس چھوٹے ہوئے حصے میں پوری سورۂ فاتحہ بھی ہو سکتی ہے، اور اس کا کچھ حصہ بھی ہو سکتا ہے؛ لہٰذا معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ واجب نہیں ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ کا شمول خواہ ابتداءً بحیثیت مقتدی ہوا ہو، یا بحیثیت امام، فاتحہ کا ترک بہر حال لازم آتا ہے، اور اس ترک سے فاتحہ نہ پڑھنے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا الفاظ کی حدیث حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ دونوں سے مروی ہے۔ حضرت عائشہؓ کی حدیث عمدۃ القاری (۲/۱۴۷) میں مذکور ہے، اس کی سند یہ ہے: **أبو المعاوية، عن عبدالرحمان بن أبي بكر، عن ابن أبي مليكة، عن عائشة.**

حنفیہ کی پہلی دلیل پر مولانا مبارک پوری کے اعتراضات اور ان کا ردّ:

اس سند پر مولانا مبارک پوری نے کئی اعتراضات کیے ہیں: پہلا اعتراض یہ ہے کہ ابو معاویہ نام کے کئی

راوی ہیں، اور معلوم نہیں کہ یہ کون سے ہیں؛ دوسرا اعتراض یہ کہ عبدالرحمان ضعیف ہے؛ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اس کی تخریج اسد بن موسیٰ نے فضائل الصحابہ میں کی ہے، اور اسد ''مُغْرِب'' ہیں۔

علامہ اعظمیؒ نے پہلے اعتراض کو یوں رد کیا ہے کہ شواہد وقرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سند میں جو ابومعاویہ ہیں، وہ محمد بن خازم ہیں، اور یہ بخاری ومسلم کے راوی ہیں۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ عبدالرحمان کے اندر ایسا ضعف نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ان کی روایت سے استناد جائز نہ ہو۔

اور اسد بن موسیٰ پر جو اعتراض ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ متعدد محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، حتی کہ خود مبارک پوری صاحب نے 'تحفۃ الاحوذی' میں ان کی ایک حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

اسی طرح مولانا مبارک پوری نے حدیث ابن عباسؓ کو بھی کئی وجھوں سے ضعیف قرار دیا ہے، مبارک پوری صاحب کے بتائے ہوئے وجوہِ ضعف اور علامہ اعظمیؒ کا ان پر ردّ ونقد اختصار کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے:

۱- پہلی وجہ مبارک پوری صاحب نے یہ لکھی ہے کہ ان کا مدار ابواسحاق سبیعی پر ہے، جو آخر میں مختلط ہو گئے تھے، اور ان روایات کو اس سے اسرائیل یا زکریا نے روایت کیا ہے، اور ان دونوں نے ابواسحاق سے بعد الاختلاط روایت کیا ہے۔

اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ علماء جرح وتعدیل کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مختلط ہونا یقینی نہیں ہے، بلکہ حافظ ابن حجر کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑھاپے کی وجہ سے بھول جاتے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اختلاط کو تسلیم کرنے کی صورت میں بھی اسرائیل کا ان سے سماع اختلاط کے بعد کا نہیں ہے، بلکہ اس سے پہلے کا ہے؛ اسی وجہ سے بخاری ومسلم نے ابواسحاق سے اسرائیل کی روایت کو اصول میں نقل کیا ہے، اس کے علاوہ ابواسحاق سے روایت کے باب میں اسرائیل کے ثقہ اور پختہ ہونے کو متعدد ائمہ فن کے کلام سے ثابت کیا ہے۔

اسی طرح زکریا کی روایات بھی اسرائیل سے صحیح بخاری میں موجود ہیں، لہٰذا ان کا بھی قدیم السماع ہونا ثابت ہوتا ہے، ورنہ وہ ساری روایات معلول قرار پاجائیں گی جو صحیح بخاری وغیرہ میں مروی ہیں۔

۲- مولانا مبارک پوری نے اس روایت پر دوسری جرح یہ کی ہے کہ ابواسحاق مُدلِّس ہیں، اور انھوں نے ارقم بن شرحبیل سے معنعناً روایت کیا ہے، اور مدلّس کا عنعنہ مقبول نہیں ہوتا۔

علامہ اعظمیؒ کی طرف سے اس جرح کا جواب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے اس حدیث کو حسن کہا ہے، اور جب ناقدینِ فن کسی ایسی حدیث کی تصحیح یا تحسین کریں، جس میں کوئی مدلس یا اور طرح کا ضعیف راوی ہو، تو اس کی تدلیس کے تحمل یا اور کسی روایت سے شبہۂ تدلیس کے ارتفاع اور ضعف کے مندفع ہوجانے کا یہ قرینہ ہوتا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری ومسلم میں بہت سے مدلسین کی معنعن روایتیں ہیں، امام نوویؒ ان سب کے جواب میں صرف اتنا

کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ: **وما كان في الصحيحين من مدلس فهو محمول على السماع.** علیٰ ہذا جب حافظ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے تو یہ حدیث سماع پر محمول ہوگی۔

۳- مبارک پوری صاحب کا تیسرا اعتراض یہ ہے کہ ان روایات کی سند میں اضطراب ہے، کیونکہ ارقم ابن شرحبیل نے ان روایات کو کبھی مسانید ابن عباسؓ سے ٹھہرایا ہے، جیسا کہ روایات مذکورہ میں ہے، اور کبھی حضرت عباسؓ سے جیسا کہ قیس بن ربیع کی روایت میں ہے، اور جس طرح ابن عباسؓ کی روایات مذکورہ ضعیف ہیں، اسی طرح قیس بن ربیع کی یہ روایت بھی ضعیف ہے، اس لیے کہ قیس بن ربیع ضعیف ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اضطراب کا دعویٰ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ جب دو ایسی روایتوں میں- جن میں بظاہر اضطراب معلوم ہوتا ہو- جمع یا ترجیح ممکن ہو، تو اضطراب کا دعویٰ صحیح نہیں، اور یہاں جمع و ترجیح دونوں ممکن ہیں۔

جمع کی یہ صورت ہے کہ واقعہ کے وقت حضرت عباسؓ و ابن عباسؓ دونوں شریک تھے، لہٰذا ابن عباسؓ نے کبھی اپنا دیکھا ہوا واقعہ بیان کر دیا، اور کبھی اپنے باپ سے روایت کر دی؛ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے باپ سے سنا ہو، لیکن روایت کرتے وقت کبھی مرسل روایت کرتے ہوں اور کبھی مسند، یعنی کبھی اپنے باپ کا نام نہ لیتے ہوں اور کبھی لیتے ہوں۔

اور ترجیح کی صورت یہ ہے کہ جب آپ نے قیس کو ضعیف کہہ دیا ہے، تو یہ ابن عباسؓ کی روایت کے مقابلہ میں مرجوح ہو جائے گی۔

اس کے بعد یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حافظ ابن حجر نے درایہ میں دونوں کی تخریج کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں حضرات سے یہ حدیث روایت کی گئی ہے۔

پھر مولانا مبارک پوری نے قیس کو جو ضعیف کہا ہے، تو اس کے جواب میں علامہ اعظمیؒ نے قیس کی توثیق کی بابت متعدد اہل علم کے اقوال پیش کیے ہیں۔[1]

پہلی دلیل کا دوسرا جواب:

اس عنوان کے تحت علامہ اعظمیؒ نے حدیث ابن عباسؓ پر مولانا مبارک کے دوسرے جواب کو نقل کیا ہے، ان کا دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایات صحیحین کی اُس روایت کے خلاف ہیں، جس میں اس کو نماز ظہر کا واقعہ بتلایا گیا ہے، اور ابن عباسؓ کی روایات مذکورہ سے ظاہر ہے کہ وہ نماز کوئی جہری نماز تھی۔

اس جواب کا رد:

علامہ اعظمیؒ نے اس طرح کیا ہے کہ صحیحین میں حدیث عائشہ کے دو طریق ہیں، ایک طریق میں بے شک یہی ہے کہ آپ نے نماز ظہر میں شرکت فرمائی ہے، مگر دوسرے طریق میں جو اسود عن عائشہ کا طریق ہے،

(۱) اس بحث کے لیے دیکھئے رسالہ 'المآثر' جلد ۱۲ شمارہ ۴، از صفحہ ۲۱ تا صفحہ ۳۰

حافظ ابن حجر نے اس کو نماز عشا کا واقعہ قرار دیا ہے، اس لیے کہنا صحیح ہے کہ یہ کسی جہری نماز کا واقعہ ہے۔

حافظ ابن حجر کی تشریح کے بعد حدیثِ عائشہؓ کے دونوں طریقوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، لہذا تین صورتیں ہوسکتی ہیں: جمع، ترجیح، دعوی تساقط۔

جمع کی صورت یہ ہے کہ تعدد واقعہ کا دعویٰ کیا جائے، یعنی آنحضرت ﷺ نے مرض الموت میں دونمازیں مسجد میں پڑھیں، ایک نماز میں آپ نے امامت فرمائی اور دوسری میں آپ مقتدی تھے اور حضرت ابوبکرؓ امام۔ اور پھر علامہ اعظمیؒ نے پانچ وجہیں بیان فرمائی ہیں، جن کی بنا پر اس تعارض کو تعدد واقعہ پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

ترجیح کی صورت یہ ہے کہ اسود والی روایت کے ظاہر الفاظ کی تائید ابن ابی ملیکہ عن عائشہ کے طریق سے ہوتی ہے، نیز ابن عباسؓ کی حدیث بھی اس کی تائید میں ہے؛ لہذا طریقِ اسود عن عائشہ، عبید اللہ بن عبد اللہ عن عائشہ کے طریق سے راجح معلوم ہوتا ہے۔

اور رہا تساقُط تو اس کی صورت یہ ہے کہ چونکہ حدیثِ عائشہ کے دونوں طریقوں میں تعارض ہے، لہذا بقاعدہ **إذا تعارضا تساقطا** دونوں نظر انداز ہوں، پس ابن عباسؓ والی روایت سالم رہے گی اور اسی پر اعتماد ہوگا۔ (۱)

مولانا مبارک پوری کا تیسرا جواب:

مولانا مبارک پوری نے حنفیہ کی زیر بحث دلیل کا تیسرا جواب یہ دیا ہے کہ روایات ابن عباسؓ میں جو الفاظ محل استدلال ہیں، ان سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قرأت باآواز بلند وہیں سے شروع کی، جہاں سے ابوبکرؓ نے چھوڑی تھی، باقی یہ کسی لفظ سے ثابت نہیں کہ آپ نے کل سورہ یا بعض بالکلیہ ترک کر دیا، یعنی آہستہ بھی نہیں پڑھا، نہ پہلے نہ پیچھے۔

اس جواب کا رد:

علامہ اعظمیؒ نے اس جواب کا رد اس طرح کیا ہے کہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: **أخذ رسول الله ﷺ من القرأة من حيث انتهى أبو بكر**، اور بعض روایات میں **استفتح**، اور بعض میں **ابتدأ** ہے، اور ان سب کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ آپ نے قرأت وہیں سے شروع کی جہاں سے حضرت ابوبکر نے چھوڑی تھی۔ اور ان سب سے زیادہ صریح ابویعلی کا یہ لفظ **فقرأ رسول الله الخ**، یعنی آپ نے قرأت ہی وہاں سے شروع کی جہاں سے حضرت ابوبکرؓ نے چھوڑی تھی۔ (۲)

مبارک پوری صاحب کا چوتھا جواب:

یہ ہے کہ چونکہ آنحضرت ﷺ اس نماز میں امام تھے، اس لیے اس حدیث کو قرأت مقتدی سے کچھ تعلق

(۱) دیکھئے 'المآثر' جلد ۱۳ شمارہ ۱، از صفحہ ۲۴ تا صفحہ ۲۸ (۲) ایضاً از صفحہ ۲۸ تا صفحہ ۳۰

نہیں۔

اس جواب کا رد:

علامہ اعظمیؒ نے اس کا رد ان الفاظ میں کیا ہے:

''افسوس ہے کہ مولانا مبارک پوری بات کی تہ کو نہیں پہنچے، انھوں نے یہ تو بتایا کہ آنحضرت ﷺ نے جب سے نماز میں شرکت کی اس وقت سے امام تھے، لیکن یہ نہ فرمایا کہ جو حصہ نماز کا آپ سے فوت ہوا، اس میں آپ کی کیا حیثیت تھی؟ یہ تو بالکل بدیہی ہے کہ آپ اس حصہ نماز میں نہ حقیقتاً امام تھے، نہ حقیقتاً مقتدی تھے، بلکہ مسبوق تھے، اور مسبوق حکماً مقتدی ہوتا ہے، بدلیل اس بات کے کہ اگر وہ مقتدی نہ ہو تو امام ہوگا، لہذا ایک نماز کے دو امام –ایک حقیقی دوسرا حکمی– ہو جائیں گے، اور شریعت میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہے؛ اور بدلیل اس بات کے کہ مسبوق کے امام حکمی ہونے کی احادیث میں کوئی نظیر نہیں ہے، اور اس کے برخلاف مقتدی حکمی ہونے کے بہت سے نظائر موجود ہیں، پس جب آپ فوت شدہ حصے میں حکماً مقتدی تھے، اور جب سے آپ شریکِ نماز ہوئے، اس وقت سے امام تھے، تو اب سنئے! کہ حضرت عائشہ وابن عباس ؓ کی حدیث کا یہ فقرہ کہ ''آنحضرت ﷺ نے وہاں سے قرأت شروع کی جہاں سے حضرت ابوبکرؓ نے چھوڑی تھی'' غیر مقلدوں کے مذہب پر کسی طرح موجَّہ نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ ان کے نزدیک مقتدی وامام دونوں کو فاتحہ پڑھنا واجب ہے، اور آنحضرت ﷺ نے اس رکعت میں مطلقاً سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی، لہذا چاہے پوری رکعت میں امام مانے جائیں، یا پوری رکعت میں مقتدی، یا رکعت کے کچھ حصے میں مقتدی کچھ حصے میں امام، بہرصورت بنا بر مذہب غیر مقلدین یہ رکعت صحیح نہیں ہوئی؛ لیکن مذہبِ حنفیہ کی رو سے یہ فقرہ بے تکلف موجہ ہے، اس طرح کہ فوت شدہ حصے میں آپ مقتدی تھے، اور حضرت ابوبکرؓ جو اس حصے میں امام تھے فاتحہ پڑھ چکے تھے، لہذا یہی فاتحہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے بھی کافی ہوگئی، اس کے بعد آنحضرت ﷺ تشریف لاکر امام ہوئے تو آپ کا فاتحہ پڑھنا واجب نہیں تھا، اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے جہاں سے قرأت چھوڑی تھی، وہیں سے آنحضرت ﷺ نے قرأت شروع کی''(۱)۔

مبارک پوری صاحب کا پانچواں جواب:

یہ ہے کہ اس مرض الموت کی نماز میں کئی امر ایسے پائے گئے جو آپ کے ساتھ مخصوص تھے، تو ہم کہتے ہیں کہ اس نماز میں اس رکعت .... کا بلا سورہ فاتحہ کے صحیح ودرست ہوجانا بھی آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص تھا۔

(۱) المآثر جلد ۱۳ شمارہ ۱، ص: ۳۱-۳۰

پانچویں جواب کا ردّ:

علامہ اعظمیؒ نے اس جواب کے رد میں صرف علامہ ابن حزم ظاہری کی ایک عبارت نقل کر دینے کو کافی سمجھا ہے، وہ عبارت یہ ہے: **فلا یحل لأحد بعد هذا أن يقول في شيء فعله عليه السلام أنه مخصوص له إلا بنص مثل النص الوارد في الموهبة.** یعنی اس کے بعد کسی کے لیے حلال نہیں (حرام ہے) کہ آنحضرت ﷺ کے کسی فعل کے متعلق یہ کہہ بیٹھے کہ وہ حضرت کے ساتھ مخصوص تھا، جب تک کہ قرآن یا حدیث میں صاف تصریح نہ ہو، جیسے خالصۃً من دون المؤمنین میں تصریح ہے۔ (۱)

مبارک پوری صاحب کا چھٹا جواب:

اس میں درمختار سے مسئلہ استخلاف میں ایک استدلال نقل کر کے اس حدیث کا ایک محمل پیش کرنا چاہا ہے۔

اس کا رد:

علامہ اعظمیؒ نے اس کا تفصیلی جواب دیا ہے اور اس کے شروع میں یہ لکھا ہے کہ ان کے نزدیک اگر کوئی صحابی بھی کسی حدیث کا کوئی محمل متعین کرے یا اس کی مراد بتائے تو واجب القبول نہیں ہے، تو کسی متاخر فقیہ کے فہم کی ان کے نزدیک کیا قیمت ہو سکتی ہے۔ (۲)

مقتدی کے فاتحہ نہ پڑھنے کی دوسری دلیل:

یہ دلیل قرآن کریم کی آیت ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا﴾ ہے، اس میں علامہ ابن ہمام کی یہ تحقیق نقل کی ہے کہ اس آیت میں دو باتوں کا حکم ہے: ایک استماع (یعنی سننا)، دوسرے انصات (یعنی چپ رہنا) پس دونوں پر عمل ضروری ہے۔

مولانا مبارک پوری نے حنفیہ کے استدلال کے جواب میں پہلے امام بیہقی کا یہ کلام نقل کیا ہے: ''آیت کا نزول اس وقت ہوا، جب لوگ نماز میں بات چیت کرتے تھے، یا آواز بلند کرتے تھے''۔ پھر لکھا ہے کہ: ''آیت میں بحالتِ نماز بات چیت کرنے اور آواز بلند کرنے ہی سے ممانعت کی گئی ہے، قرأت فاتحہ سے نہیں''۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کے جواب میں لکھا ہے کہ آیت کے مختلف اسباب نزول مروی ہیں اور ان میں کوئی تنافی نہیں ہے، لہذا یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ سب صحیح ہوں اور یکے بعد دیگرے وہ سب اسباب پیش آئے ہوں۔

دوسرے یہ کہ اسی سبب نزول کو صحیح قرار دینا اور باقی کو غیر صحیح، ترجیح بلا مرجح ہے۔

تیسرے یہ کہ انصات جس طرح بات چیت سے خاموش رہنے پر صادق ہے، پڑھنے سے خاموش رہنے پر بھی صادق ہے، لہذا حکم أنصتوا کو بات چیت سے خاموش رہنے کے ساتھ مخصوص کرنا تخصیص بالرائے ہے۔

(۱) المآثر جلد ۱۳ شمارہ ۱، ص: ۳۲-۳۱ (۲) ایضا: ۳۳-۳۲

علامہ اعظمیؒ نے امام بیہقی کی اس تخصیص کا رد بہت تفصیل سے کیا ہے، اور اصول وقواعد کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ تخصیص صحیح نہیں ہے۔(۱)

اس کے بعد ''روایاتِ شانِ نزول'' کا عنوان قائم کر کے ایک ایک روایت ذکر کی ہے، اور اصولِ روایت ودرایت کی روشنی میں اس پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

اس سلسلے میں آپ نے نو (۹) روایتیں ذکر کی ہیں: پہلی روایت محمد بن کعب قرظی کی ہے، دوسری حضرت عبداللہ بن مغفل کی، تیسری حضرت عبداللہ بن مسعود کی، چوتھی روایت حضرت ابوالعالیہ کی مرسل ہے، پانچویں روایت حضرت ابن عمرؓ کی ہے، چھٹی حضرت ابن عباسؓ کی، ساتویں زہری کی مرسل، آٹھویں مجاہد کی مرسل، نویں حضرت ابن عباسؓ کی ایک دوسری روایت۔ ان روایتوں کے لیے علامہ اعظمیؒ نے امام بیہقی کی کتاب القرأۃ صفحہ ۲۷ تا صفحہ ۴۷ اور امام سیوطی کی درمنثور جلد ۳ صفحہ ۱۵۵ و ۱۵۶ کا حوالہ دیا ہے، اور یہ سب اس مضمون کی ہیں کہ یہ آیت کریمہ نماز میں بعض صحابہ کے قرأت کرنے کے بعد نازل ہوئی۔

مولانا مبارک پوری نے حنفیہ کی ان ساری روایتوں کو ضعیف قرار دے کر رد کر دیا تھا، اور علامہ اعظمیؒ نے مولانا مبارک پوری کے ایک ایک اعتراض کا جواب دے کر یہ ثابت کر دیا کہ اگر ان روایتوں کو الگ الگ کر کے ضعیف قرار دے دیا جائے، تب بھی سب مل کر قوی اور قابلِ احتجاج واستشہاد ہو جائیں گی۔(۲)

آگے ایک عنوان ''امام رازی کے جواب کی تنقید'' قائم کر کے لکھا ہے:

''کتبِ تفسیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ وصحابہ وتابعین میں سے اٹھارہ اشخاص کا بیان ہے کہ یہ آیت یا تو نماز میں بولنے، یا آواز بلند کرنے، یا قرأت کرنے والے، یا خطبۂ جمعہ سننے والے مسلمان کے حق میں نازل ہوئی ہے، یعنی ان حضرات کا دوسری باتوں میں چاہے جو اختلاف ہو، لیکن اس میں سب متفق ہیں کہ آیت میں مسلمانوں سے خطاب ہے؛ لیکن امام رازی ان سب کے خلاف محض اپنی رائے سے -جس کی تائید کسی روایت سے نہیں ہوتی- یہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں کافروں سے خطاب ہے، ظاہر ہے کہ صحابہ وتابعین کے بیانات کے مقابلہ میں امام رازی کی ذاتی رائے کی کیا وقعت ہو سکتی ہے؟

شاید کسی کو تعجب ہو کہ حضرات ''اہل حدیث'' جو صحابہ تک کی رائے کو بھی پرِ پشہ کے برابر وقعت نہیں دیتے، انھوں نے امام رازی کی اس رائے محض کو احادیث مرفوعہ کے مقابلے میں کیسے ترجیح دے دی، لیکن ہم کو کوئی تعجب نہیں ہے، ما هي بأول قارورة كسرت في الإسلام''(۳)۔

(۱) اس بحث کے لیے دیکھئے 'المآثر' جلد ۱۳ شمارہ ۲، از صفحہ ۳۰ تا صفحہ ۳۵

(۲) دیکھئے 'المآثر' جلد ۱۳ شمارہ ۲، از صفحہ ۳۵ تا صفحہ ۴۶ و جلد ۱۳ شمارہ ۳، از صفحہ ۲۶ تا صفحہ ۳۵

(۳) ایضاً: ۳۶-۳۵

بعدازاں ''روایات اسباب نزول کی حیثیت'' کے عنوان سے امام رازی کی اس تفسیر پر تفصیل کے ساتھ بحث وتمحیص کی ہے، جس کا آغاز اس سے کیا ہے کہ صحابۂ کرام سے جو اسباب نزول منقول ومروی ہیں، ان کی بابت محدثین کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ احادیث مرفوعہ ہیں، اور اس امر کے ثبوت کے لیے اتقان کے حوالے سے امام حاکم اور علامہ ابن تیمیہ کے اقوال نقل کیے ہیں، اور مقدمہ ابن الصلاح کے حوالے سے ان کا بھی اسی کا قائل ہونا ظاہر کیا ہے، اور مولانا مبارک پوری نے اتقان ہی کے حوالے سے اپنی شرح ترمذی (۶۵/۴) میں تابعین کی تفسیروں کو بھی مرفوع کے درجے میں قرار دیا ہے۔

اس اصولی امر کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ امام رازی نے آیت إذا قُـرِئَ کا جو معنی بتایا ہے، وہ ان احادیث مرفوعہ کے ساتھ کسی طرح جمع نہیں ہوسکتا، لہٰذا اہل حدیث نے امام رازی کے اس قول کو اختیار کرکے ان احادیث مرفوعہ کو ٹھکرا دیا ہے۔ (۱)

اس کے بعد ''تنبیہ'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ حنفیہ کا اصل دعویٰ یہ ہے کہ مقتدی قرأت فاتحہ کا مامور ومکلّف نہیں ہے، بلکہ وہ استماع وانصات کا مکلّف ہے؛ رہا یہ دعویٰ کہ آیت إذا قـرئ سے قرأت مقتدی منسوخ ہوگئی ہے، تو یہ حنفیہ کا دعویٰ نہیں، نہ ان کے اصل دعویٰ کا ثبوت اس پر موقوف ہے۔

لیکن مولانا عبدالرحمان مبارک پوری نے اس بات پر بہت زور صرف کیا ہے کہ آیت مذکورہ مکہ میں نازل ہوئی، اور قرأت فاتحہ کا حکم مقتدی وغیرہ کے لیے آپؐ نے مدینہ منورہ میں صادر فرمایا، لہٰذا یہ آیت حدیث کے لیے ناسخ کیوں کر ہوسکتی ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کے جواب میں لکھا ہے کہ حنفیہ اس آیت سے قرأت مقتدی کے حکم کو منسوخ نہیں مانتے، بلکہ اس آیت کے ذریعے وہ استماع وانصات کے حکم کو ثابت کرتے ہیں، اور مولانا مبارک پوری وغیرہ اس پر جو اعتراض کرتے ہیں، وہ لغو اور باطل ہے، چنانچہ علامہ اعظمیؒ نے اس بحث کو بہت تفصیل سے اپنی کتاب میں لکھا ہے، اور نہایت حسن وخوبی کے ساتھ حنفیہ کے مذہب کی توضیح کی ہے، نیز حضرت ابو ہریرہؓ، زہری اور مجاہد کی تین روایتیں ذکر کی ہیں، جن سے آیت کا مدنی ہونا معلوم ہوتا ہے، اور ان روایتوں کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

> ''یہ روایتیں آیت إذا قرئ کے مدنی ہونے پر اس طرح دلالت کرتی ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے قول کے بموجب اس آیت سے نماز میں کلام کرنے کی ممانعت ہوئی ہے، اور نماز میں کلام کی ممانعت بالاتفاق مدینہ میں ہوئی ہے، اور زہری ومجاہد کے اثر سے اس آیت کا نزول انصاری جوان کے بارے میں ثابت ہوتا ہے، اور یہ مدنی ہونے کی کھلی دلیل ہے''(۲)۔

مولانا مبارک پوری کے اعتراض کا دوسرا جواب یہ دیا ہے:

''حضرت ابن عباسؓ کی روایت (منقولہ تحقیق الکلام ص ۴۳۷) اور ابوالعالیہ کی روایت (منقولہ

(۱) اس بحث کے لیے دیکھئے 'المآثر' جلد ۱۳ شمارہ ۳، از صفحہ ۳۶ تا صفحہ ۴۰ (۲) المآثر جلد ۱۳ شمارہ ۴، ص: ۲۴

تحقیق ص ۶۹) اور محمد بن کعب کی روایت (منقولہ تحقیق الکلام ص ۶۷) میں مصرح ہے کہ لوگ نماز میں آنحضرت ﷺ کے پیچھے قرأت کرتے تھے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور مولوی عبدالرحمان صاحب کی تحقیق میں مقتدی کو قرأت کا حکم مدینے میں ہوا ہے، پس ظاہر ہے کہ لوگوں نے آنحضرت ﷺ کے پیچھے اس حکم کے بعد ہی قرأت کی ہے، اور اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی ہے، لہذا یہ آیت اس حکم سے مؤخر ہوئی‘‘[1]۔

اس موقع پر علامہ اعظمیؒ نے اہل حدیث کے مقتدا علامہ ابن حزم ظاہری وغیرہ کی تحریروں سے نسخ کے مسئلے پر بھی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

اس آیت کے ناسخ نہ ہونے کے وجوہ بیان کرتے ہوئے مولانا مبارک پوری نے تیسری وجہ یہ قرار دی ہے کہ یہ آیت **فاقرأوا ما تیسر من القرآن** سے منسوخ ہونے کا احتمال رکھتی ہے، اور اس کا سبب یہ قرار دیا ہے کہ **فاقرأوا** مدنی ہے، اور **إذا قرئ** احناف کے نزدیک مکی ہے۔

مولانا مبارک پوری نے آیت **فاقرأوا** کے مدنی ہونے کے دو ثبوت پیش کیے ہیں، پہلے ثبوت کے طور پر حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت پیش کی ہے، جس کو علامہ سیوطی نے ’اتقان‘ میں نقل کر کے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کا رد اس طرح کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت صحیح نہیں ہے، کسی روایت کی محض سند کے صحیح ہونے سے روایت کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا، جیسا کہ خود مبارک پوری صاحب نے ’ابکار المنن‘ صفحہ ۴۹ میں لکھا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے صحیح نہ ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ خود سیوطی نے ’درمنثور‘ میں حضرت علیؓ کی ایک روایت اس کے خلاف ذکر کی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ خود حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت اس کے خلاف مروی ہے، جس کی حاکم نے تصحیح کی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت سیوطی نے بھی درمنثور میں بیہقی کے حوالے سے نقل کی ہے، جس سے اس کا مکے میں نازل ہونا معلوم ہوتا ہے، اور جس کی تائید حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث - جو مسلم وابوداود وغیرہ میں ہے - کرتی ہے۔

مولانا مبارک پوری نے اس کے مدنی ہونے کا دوسرا ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ یہ آیت **أقیموا الصلوۃ وآتوا الزکوۃ** کے ساتھ ساتھ مذکور ہے، اور زکوۃ کی فرضیت مکہ میں ہوئی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ لقمان اور سورۂ مومنون کی ابتدائی آیات میں بھی نماز کے ساتھ زکاۃ کا ذکر آیا ہے، حالانکہ یہ آیات بلا اختلاف مکی ہیں۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں: پہلی یہ کہ ان آیات میں زکاۃ سے زکاۃ

---
(۱) المآثر جلد ۱۳ شمارہ ۴، ص: ۲۴

مفروضہ نہ مراد ہو، جیسا کہ بعض مفسرین کی رائے ہے، یا یہ کہ زکاۃ کی فرضیت مدینہ منورہ میں نہ ہوئی ہو، جس کی طرف ابن کثیر اور اکثر مفسرین کا رجحان ہے۔

اور رہا آیت إذا قرئ کا سوال، تو اس کا مدنی ہونا تفصیل سے گزر چکا ہے۔

مولانا مبارک پوری نے حنفیہ کے استدلال کا چوتھا جواب یہ دیا ہے کہ آیت إذا قرئ آیت فاقرأوا کی معارض ہے، اور حنفیہ کا اصول ہے کہ جب دو آیتیں متعارض ہوں تو دونوں ساقط ہو جاتی ہیں۔ پھر نورالانوار اور تلویح کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان میں دونوں آیتوں کو تعارض کی وجہ سے متساقط کیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس مسئلے کو بھی تفصیل کے ساتھ لکھتے ہوئے مولانا مبارک پوری کی غلط فہمی کا تشفی بخش جواب تحریر فرمایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ 'نورالانوار' کی عبارت سے تساقط کا نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ صاحب نورالانوار نے 'تفسیر احمدی' میں آیت إذا قرئ سے استدلال کیا ہے، اور اسی طرح ان سے پہلے علماء حنفیہ کی ایک بڑی تعداد نے اس آیت سے استدلال کیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان کے نزدیک ساقط الاحتجاج نہیں ہے، علامہ اعظمیؒ نے اس سلسلے میں شرح تحریر کے حوالے سے حنفیہ کا اصول بتایا ہے کہ دو متعارض دلیلوں میں اگر تاریخ معلوم ہو، تو دعوائے نسخ، ورنہ ترجیح سے کام لیا جائے گا اگر ممکن ہو، ورنہ جمع کیا جائے گا، اور اگر جمع بھی ممکن نہ ہو تب تساقط ہوگا۔ اس کے بعد تفصیل سے ان دونوں آیتوں کے درمیان جمع کا ممکن ہونا ثابت کیا ہے۔

حنفیہ کے اس آیت سے استدلال پر مولانا مبارک پوریؒ نے اسی طرح کے کچھ اور بھی اعتراض کر کے اس کے رد کی کوشش کی ہے، اور علامہ اعظمیؒ نے اصول وقواعد اور دلائل ومسائل کی روشنی میں ان سب کو لغو اور باطل ثابت کرتے ہوئے حنفیہ کے استدلال کی قوت واستحکام کا ثبوت پیش کیا ہے۔

عدم وجوب قرأت کی تیسری دلیل:

جو علامہ اعظمیؒ نے پیش کی ہے، وہ صحیح مسلم میں مروی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی یہ حدیث ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: إذا صَلَّيْتُمْ فَأَقِيمُوا صُفُوفَكُمْ ثُمَّ لِيَؤُمَّكُمْ أَحَدُكُمْ، فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا، وَإِذا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا یعنی جب تم لوگ نماز پڑھو تو صفیں سیدھی کرلو، پھر تم میں سے ایک آدمی کو امام بننا چاہئے، پس جب وہ (امام) تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو، اور جب وہ قرأت کرے، تم چپ رہو۔

اسی مفہوم کی ایک حدیث سنن ابوداود اور نسائی وغیرہ میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی آئی ہے۔
مولانا مبارک پوریؒ نے ان دونوں حدیثوں پر بھی متعدد اعتراضات کیے ہیں، اور علامہ اعظمیؒ نے پوری علمی تحقیق اور دیانت ومتانت کے ساتھ محدثانہ اور ناقدانہ طریقے سے ان کے تمام اعتراضات کا جواب دیا ہے۔[1]

---

(۱) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی حدیث پر بحث المآثر جلد ۱۴ شمارہ ۲، از صفحہ ۱۲ تا صفحہ ۳۵، اور حدیث ابوہریرہؓ پر بحث جلد ۱۴ شمارہ ۳ از صفحہ ۲۱ تا صفحہ ۳۲ ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

چوتھی دلیل:

موطا امام مالک صفحہ ۹۰، ابوداود صفحہ ۸۳، ترمذی ص ۷۲، اور نسائی ۱/۱۴۶ پر حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک جہری نماز سے فارغ ہو کر پوچھا کہ کیا تم میں سے کسی نے میرے ساتھ قرأت کی ہے؟ ایک شخص نے جواب دیا کہ ہاں یا رسول اللہ میں نے، پس آپ نے فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ کیا بات ہے کہ مجھ سے قرآن میں منازعت کی جاتی ہے، پس جس وقت لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے یہ بات سنی، تو حضرتؐ کے ساتھ جہری نماز میں قرأت سے باز آ گئے۔

اسی جیسی حدیث حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت عمران بن حصین سے بھی مروی ہے، جو چوتھی کے علاوہ ترکِ قرأت کی مستقل دلیلیں ہیں، ان حدیثوں سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے، وہ حسبِ ذیل ہے:

۱- آنحضرت (ﷺ) نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کو امام سے منازعت قرار دیا۔

۲- صحابہؓ نے حضرت (ﷺ) کے اس ارشاد سے امام کے پیچھے کم از کم جہری نماز میں قرأت کی ممانعت سمجھی، اس لیے ان لوگوں نے جہری نماز میں قرأت ترک کر دی۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ اس سے حنفیہ کے مدعا کا ایک جز -یعنی جہری نماز میں مقتدی کو قرأت کی ممانعت- بے تأمل ثابت ہے؛ اب رہا دوسرا جز -یعنی سری نماز میں ممانعت- وہ دلائل سابقہ ولاحقہ سے ثابت ہے۔

مولانا مبارک پوری نے حنفیہ کی اس دلیل پر پانچ اعتراضات وارد کیے ہیں، اور علامہ اعظمیؒ نے نہایت شرح وبسط کے ساتھ خالص علمی اور تحقیقی انداز میں اس کا جواب سپرد قلم فرمایا ہے، علامہ اعظمیؒ کا جواب ۲۳ صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''سری قرأت کے باعث منازعت وتخلیط ہونے کے بار بار انکار واستبعاد پر ہم کو افسوس ہوتا ہے کہ اگر مولوی صاحب کی نظر احادیث پر ہوتی اور وہ نرے ظاہر پرست نہ ہوتے، تو ان کو معلوم ہوتا کہ قرأت بالسر تو درکنار، احادیث سے تو ثابت ہوتا ہے کہ مقتدی کے بے ڈھنگے وضو کا اثر بھی امام پر پڑتا ہے، اور وہ باعث التباس وتخلیط قرأت ہو جاتا ہے، سنن نسائی اور مسند امام احمد میں ہے: إنَّ رسولَ اللّٰهِ ﷺ صَلَّى بِهِمُ الصُّبْحَ، فَقَرَأَ الرُّوْمَ، فَالْتَبَسَ عَلَيْهِ، فَلَمَّا صلَّى، قَالَ: مَا بالُ أَقْوامٍ يُصَلُّوْنَ مَعَنَا لَا يُحْسِنُوْنَ الطُّهُوْرَ -وَفي رِوايةِ أحمد الْوُضوْءَ- فَإِنَّمَا يَلْبِسُ عَلَيْنَا الْقُرْآنَ أُوْلٰئِكَ (نسائی ۱/۱۵۱)۔ یعنی آنحضرت ﷺ نے صبح کی نماز پڑھائی، اس میں سورۂ روم پڑھی، تو اس میں آپ کو التباس ہو گیا، نماز سے فارغ ہو کر آپ نے فرمایا: کیا حال ہے ان لوگوں کا کہ ہمارے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور اچھی طرح وضو کر کے نہیں آتے، تو بس وہی لوگ ہم پر قرآن ملتبس کرتے ہیں۔

پس جب مقتدیوں کا بے ڈھنگا وضو-جس کا حاسۂ سمع سے کوئی تعلق نہیں ہے، امام کی قرأت کو ملتبس کر دیتا ہے-تو مقتدیوں کی سری قرأت کا جو بہرحال حاسۂ سمع سے تعلق رکھتی ہے، باعث التباس ہونا تو اور زیادہ قرین قیاس ہے۔

حافظ ابن کثیر نے اس حدیث کو نقل کر کے کتنا عمدہ نکتہ لکھا ہے: **وھذا إسناد حسن، ومتن حسن، وفیه سر عجیب، ونبأ غریب، وھو أنه ﷺ تاثر بنقصان وضوء من ائتمَّ به، فدلَّ ذلک علی أنَّ صلاۃ المأموم متعلقة بصلاۃ الإمام** (تفسیر ابن کثیر ۴۴۱/۳)۔ یعنی اس حدیث کی اسناد و متن دونوں حسن ہیں، اور اس حدیث میں ایک عجیب راز ہے، وہ یہ کہ آنحضرت (ﷺ) مقتدیوں کے نقصانِ وضو سے متاثر ہوئے، تو اس سے ثابت ہوا کہ مقتدی کی نماز امام کی نماز سے متعلق اور اس کے ساتھ پیوستہ ہے۔

دیکھئے یہ نکتہ کتنا ظاہر یت کُش ہے!''(۱)۔

حنفیہ کی پانچویں دلیل:

اس عنوان کے تحت سنن ابن ماجہ ص ۶۱، مسند احمد ۳۳۹/۳ اور شرح معانی الآثار ۱۲۸/۱ سے حضرت جابر کی یہ حدیث نقل کی ہے: **قال رسول الله ﷺ: من کان له إمام فقرأۃ الإمام له قرأۃ.** یعنی آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کے لیے امام ہو تو امام کی قرأت اس کے لیے قرأت ہے۔

اس دلیل پر بہت تفصیل کے ساتھ کلام کرتے ہوئے علامہ اعظمیؒ نے حنفیہ کے موقف کو ثابت کیا ہے، اور مولانا مبارک پوری صاحب کی طرف سے اس پر کیے جانے والے ایک ایک اعتراض اور توجیہ اور تمام جوابات کا تحلیل و تجزیہ کیا ہے۔ پانچویں دلیل کی یہ بحث تقریباً ۲۴ رصفحات پر پھیلی ہوئی ہے، جس میں اصول حدیث اور روایات وغیرہ پر بحث و گفتگو کے علاوہ امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کی توثیق کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہے، جس کو صاحبِ تحقیق الکلامؒ نے اپنی کتاب میں چھیڑا تھا، اور اس مسئلے پر نہایت محققانہ اور جامع ترین گفتگو کی ہے۔

جیسا کہ اوپر بتلایا جا چکا ہے، یہ رسالہ نامکمل ہے، چنانچہ اسی پانچویں دلیل پر کلام کے ساتھ یہ رسالہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ رسالہ سہ ماہی 'المآثر' میں جلد نمبر ۱۲ شمارہ نمبر ۱ سے جلد نمبر ۱۵ شمارہ نمبر ۳ تک ۱۲ قسطوں میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔

---

(۱) المآثر جلد نمبر ۱۵ شمارہ ۲، ص: ۲۸۔ اور چوتھی دلیل کی پوری بحث کے لیے دیکھئے 'المآثر' جلد ۱۵ شمارہ ۴، از صفحہ ۲۱ تا صفحہ ۲۷، وجلد ۱۵ شمارہ ۱، صفحہ ۱۹ تا صفحہ ۳۰، وجلد ۱۵ شمارہ ۲، از صفحہ ۲۴ تا صفحہ ۲۹۔

☆......☆......☆......☆......☆

تحقیق حکم الطلقات الثلاث

علامہ اعظمیؒ کی خدمت میں ایک استفتا آیا، جس میں سوال کیا گیا تھا کہ زید نے اپنی عورت کو تین طلاق بائن مغلظہ ایک مجلس میں دیا، زید کی عورت دوبارہ زید کے یہاں آ کر اس کے نکاح میں رہنا چاہتی ہے، اور زید بھی اس کو رکھنا چاہتا ہے، کیا یہ عندالشرع جائز ہے یا نہیں؟

یہ استفتا علامہ اعظمیؒ سے پہلے مئو کے ایک اہل حدیث عالم مولانا ابوالنعمان محمد عبدالرحمٰن -مولود ۱۲۹۵ھ=متوفی ۱۳۵۷ھ- کے پاس بھی گیا، انھوں نے لکھ کر دے دیا کہ چونکہ زید نے اپنی عورت کو ایک ہی جلسہ میں تینوں طلاقیں دی ہیں، اس لیے وہ ایک طلاق کے شمار میں ہے، پس رجعت جائز ہے اور اس کے لیے انھوں حضرت ابوالصہبا والی اس روایت کو بطور دلیل نقل کیا، جو اس کے بعد والے مضمون میں آئے گی۔ اور ایک دوسرے اہل حدیث عالم نے اس جواب کو صحیح قرار دیا۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کا قدرے مبسوط اور مفصل جواب تحریر فرمایا ہے، اس کے آغاز میں لکھا ہے:

”أقول بعون اللہ الفتاح العلیم: جواب مذکور دو وجہ سے صحیح نہیں، اولاً تو زید نے تین بائن طلاقیں دی ہیں، اگر تینوں ایک ہی طلاق کے شمار میں ہوں، تو بھی رجعت نہیں کرسکتا، کیونکہ ایک بھی بائن ہوگی اور طلاق بائن کے بعد اختیار رجعت نہیں رہتا؛ ثانیاً ائمہ اربعہ بلکہ جمہور ائمہ مسلمین کا اجماع ہے کہ تین طلاقیں اگر دفعۃً واقع کردی جائیں، تو تینوں واقع ہوجاتی ہیں“(۱)۔

بعد ازاں علامہ نوویؒ کی 'شرح مسلم' اور علامہ ابن الہمامؒ کی 'فتح القدیر' سے ائمہ اربعہ اور جمہور کے اجماع کی تصریح نقل کی ہے، پھر لکھا ہے کہ امام بخاری ومسلم کا بھی یہی مذہب ہے جیسا کہ ان کی تبویب سے ظاہر ہے۔ اس کے بعد رقم طراز ہیں:

”صحابہؓ میں سے حضرت عمر بن الخطاب وعثمان ذی النورین، امیر المومنین علی کرّم اللہ وجہہ، اور حبر الامۃ ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس، اور حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو ابن عاص، ابوہریرہ وغیرہ -رضی اللہ عنہم- اسی کے قائل ہیں، اور سب سے بڑھ کر تو یہ کہ خلیفہ ثانی حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانۂ خلافت میں تمام صحابہ -رضی اللہ عنہم- کا اس پر اجماع ہوچکا ہے“(۲)۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ اپنے فتوے کے استدلال میں سات مرفوع روایتیں ذکر کر کے لکھتے ہیں:

”ان تمام حدیثوں میں اگرچہ سب کی سب صحیح نہیں ہیں، بلکہ بعض ضعیف بھی ہیں، مگر تعدد طُرق کی وجہ سے ان کا ضعف منجبر ہوجائے گا اور حسن لغیرہ ہو کر قابل احتجاج واستشہاد ہوں گی، ورنہ متفق علیہ حدیث عائشہؓ استدلال کے لیے کافی ہے“(۳)۔

(۱) مقالات ابوالمآثر: ۱/۲۵۲ (۲) ایضاً: ۱/۲۵۳ (۳) ایضاً: ۱/۲۵۷

پھر کچھ آثار صحابہؓ کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اس کے بعد فرماتے ہیں:

''یہ حدیثیں اور یہ آثار وقوعِ ثلاث کے مُثبِت ہیں، اور اگر یہ نہ بھی ہوتے، تو ہمارے لیے کافی دلیل صحابہ کرامؓ کا اجماع تھا''[۱]۔

اور اپنے اس قول کی تائید میں 'فتح الباری' سے حافظ ابن حجر کی ایک طویل عبارت نقل کرتے ہیں۔

اس کے بعد مولانا عبدالرحمٰن ابوالنعمان نے ابوالصہباء کی جس روایت سے استدلال کیا ہے، اس پر محدثانہ اور ناقدانہ انداز سے نقد وجرح کرکے اس کو ناقابل احتجاج قرار دیا ہے۔ آگے اپنے موقف کی تائید میں کچھ اور دلیلیں بھی پیش کی ہیں۔

یہ جامع اور پُر مغز تحریر ۹ رصفحات پر مشتمل ہے، اور 'مقالات ابوالمآثر' میں بشمول استفتا وجوابِ مولانا ابوالنعمان عبدالرحمٰن صفحہ ۲۵۱ تا ۲۶۰ شائع ہوچکی ہے، اس کے آخر میں مرقوم ہے:

''کتبہٗ ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی غفرلہ، مدرس دارالعلوم مئو، ۲۲ر جمادی الثانیہ ۴۱ھ''۔

یہ فتویٰ غالباً 'الفقیہ' -امرتسر- کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا، جس کا جواب ''ابوالحسن محمد نعمان مئوی اعظمی'' کے نام سے 'اہل حدیث' کے شماروں میں شائع ہوا۔

☆......☆......☆......☆

کشف المعضلات

اہل حدیث میں شائع ہونے والے اسی مضمون کا جواب آپ نے 'کشف المعضلات' کے نام سے لکھا، جو 'الفقیہ' ۱۹۲۴ء کے چار شماروں: ۲۰ر فروری، ۵ر مارچ، ۵ر اپریل اور ۲۰ر اپریل میں شائع ہوا۔ علامہ اعظمیؒ نے اپنی اس تحریر میں 'اہل حدیث' کے مضمون نگار کی عبارتوں کا ایک ایک ٹکڑا نقل کرکے نہایت علمی وتحقیقی انداز میں اس کا جواب دیا ہے۔ اس کے آغاز میں فرماتے ہیں:

''اہل حدیث مورخہ ۵ر جمادی الاولی ۴۲ھ سے میری 'تحقیق حکم الطلقات الثلاث' کے رد کا سلسلہ شروع ہوا ہے[۲]، مجیب صاحب یہیں مئو ہی کے ایک کرم فرما ہیں، جنھوں نے اپنے کو ''ابوالحسن محمد نعمان مئوی اعظمی'' ظاہر فرمایا ہے''[۳]۔

علامہ اعظمیؒ نے 'تحقیق حکم الطلقات الثلاث' میں فرمایا تھا:

''جواب مذکور دو وجہوں سے صحیح نہیں: اولاً تو یہ کہ زید نے تین بائن طلاقیں دی ہیں، لہٰذا اگر تینوں

---

(۱) مقالات: ۲۵۷/۱

(۱) اہل حدیث کا یہ مضمون 'حل المغلقات فی بیان الطلقات' کے عنوان سے چھپا تھا۔

(۲) مقالات: ۲۶۳/۱

ایک ہی طلاق کے شمار میں ہوں تو بھی رجعت نہیں کرسکتا، کیونکہ یہ ایک بھی بائن ہوگی اور طلاق بائن کے بعد اختیار رجعت نہیں رہتا۔''

اس کے جواب میں اہل حدیث میں لکھا تھا:

''مولوی صاحب نے اس کی کوئی وجہ بیان نہیں فرمائی کہ یہ ایک کیوں بائن ہوگی؟ لہٰذا ان پر لازم ہے کہ قرآن یا حدیث سے اس امر کو ثابت کریں (الی قولہ) ورنہ کم از کم ائمہ اربعہ کے مذہب کو دیکھ لینا تو ضرور چاہئے تھا''۔

اس کے بعد ۱۲ر جمادی الاولی کے شمارے میں یہ لکھا ہے کہ:

''احادیث سے استدلال ایک مقلد کی شان سے بالاتر ہے''۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ: ''اگر معترض یہ لکھ دیتے کہ وقوع ثلاث پر حنفیہ کا اجماع ہے تو ہم بھی تسلیم کر لیتے۔''

علامہ اعظمیؒ نے اس کا جواب یہ دیا:

''ان دونوں باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے خدا جانے عقلاً آپ کے اس مطالبۂ دلیل کو کس نام سے یاد کریں گے، مولانا! جو چیز ہماری شان سے بالاتر ہے، وہ ہم پر لازم کیوں ہونے لگی؟ اور جب آپ جانتے ہیں کہ وصف طلاق بالبینونۃ باتفاق حنفیہ ہدر نہیں، تو اب آپ کو تسلیم کر لینے میں چون و چرا کیوں ہے؟ ہاں آپ نے یہ نہیں بیان فرمایا کہ ائمۂ اربعہ کا مذہب دیکھ لینا کیوں ضروری تھا؟ کیا ان کا مطالعہ استدلال کے قائم مقام ہو جاتا؟''[۱]

اس کے چند سطر بعد تحریر فرماتے ہیں:

''تعجب ہے کہ مجیب صاحب اہل حدیث ہوتے ہوئے بھی اقوال الرجال کے سوا کوئی آیت قرآنی یا سنت نبوی نہیں پیش کر سکے، حالانکہ یہ آپ کی شان سے بالاتر بھی نہ تھا! یعنی جس طرح آپ نے میرے بیان کردہ مسئلہ کے خلاف اقوال ائمہ نقل کیے، اس کے بجائے کوئی آیت یا حدیث نقل کرتے، مگر آپ نے بھی تقلید ہی کی شان دکھلائی!!''[۲]

ذیل میں اس رسالے کے اہم اور خاص خاص مباحث کو اس کتاب کے قارئین کے سامنے پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

صحابۂ کرام کا اجماع:

اہل حدیث کے مضمون نگار نے لکھا تھا:

''جمہور صحابہ بھی وقوع ثلاث کے قائل ہرگز نہ تھے، بلکہ جمہور صحابہ طلاق ثلاثہ ایک مجلس کو ایک ہی

(۱) مقالات: ۱/۲۶۴ (۲) ایضاً: ۱/۲۶۵

طلاق سمجھتے تھے، حافظ ابن القیم زاد المعاد (۲۶۲/۲) میں تحریر فرماتے ہیں: **ولو كاثرنا كم بالصحابة الذين كان الثلاث على عهدهم واحدة لكانوا أضعاف من نقل عنهم خلاف ذلک......**''

علامہ اعظمیؒ نے اس تحریر کا جواب یہ دیا ہے کہ:

''حافظ صاحب -یعنی علامہ ابن القیم- اور آپ اقوال صحابہ کا موازنہ اقوال صحابہ سے کرنا چاہتے ہیں، یا اجماع سکوتی صحابہ کا اجماع سکوتی صحابہ سے، یا اقوال کا اجماع سکوتی سے؛ پہلی دونوں صورتیں قطعاً نہیں: اول تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ اور آپ اپنی طرف ان صحابہ کا ذکر کرتے ہیں، جن کے عہد میں طلاق ثلاث ایک تھی، نہ یہ کہ قول بعدم وقوع الثلاث ان سے منقول ہے، اور دوسری -یعنی اجماعِ سکوتی صحابہ کا اجماع سکوتی صحابہ سے- اس لیے نہیں کہ ہماری طرف صرف ان صحابہ کا نام لیا جاتا ہے جن سے قول بوقوع الثلاث منقول ہے، تو جزماً تیسری صورت -اقوال کا اجماع سکوتی سے- متعین ہے، اور یہ سراسر ناحق رسی اور اس طرح کی تحقیق مغالطہ ہے، کیونکہ ان کا مخالف اور آپ کا خصم بھی کہہ سکتا ہے کہ ہمارے ہم خیال صرف وہی صحابہ نہیں جن سے قول بوقوع الثلاث منقول ہے، بلکہ عہد فاروقی کے تمام وہ صحابہ بھی ہیں جنھوں نے حضرت عمرؓ کے الزام ثلاث پر سکوت کیا ہے، پھر اِن صحابہ کا اُن صحابہ سے موازنہ کیجئے تو اِن صحابہ کی تعداد اُن سے قطعاً زائد ہوگی''(۱)۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب میں اجماع کی ایک شرط انقراضِ عصرِ مجمعین ہے، اور اہل حدیث کے مضمون نگار نے ۱۲/ جمادی الاولی کی اشاعت میں یہ لکھا تھا کہ حضرت ابوبکر کے زمانے میں عدم وقوع پر اجماع تھا، اس پر علامہ اعظمیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''آگے چل کر حافظ صاحب نے عدم وقوع پر اجماع قدیم کا دعویٰ کرنا چاہا ہے، اگر اجماع کا دعویٰ صحیح بھی ہو تو قدیم اجماع جدید اجماع سے منقوض ہو چکا ہے، لہذا اجماع کا دعویٰ آپ کو کیا مفید ہوگا، چہ جائیکہ یہ دعویٰ ہی صحیح نہیں، اس لیے کہ امام احمد کے مذہب میں صحتِ اجماع کی ایک شرط انقراض عصر مجمعین بھی ہے اور وہ یہاں مفقود ہے، **وإذا فات الشرط فات المشروط**، حافظ صاحب خود بھی اس شرط کے فوات سے غافل نہیں ہیں، چنانچہ مجیب کی منقولہ بالا عبارت کے متصل ہی فرماتے ہیں: **ولكن لم ينقرض عصر المجمعين حتى حدث الاختلاف فلم يستقر الإجماع الأول حتى صار الصحابة على قولين واستمرَّ الخلاف بين الأئمة إلى اليوم اهـ.**
دیکھئے حافظ صاحب نے اپنے دعویٰ کو واپس لے لیا اور خود ہی اس کی نفی کر دی''(۲)۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے حافظ ابن القیم کی مذکورہ بالا عبارت کی نسبت اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے:

(۱) مقالات: ۲۶۷/۱ (۲) ایضا: ۲۶۸/۱

''ہاں حافظ صاحب نے **حتی حدث الاختلاف** تک تو یک گونہ ٹھیک لکھا ہے، مگر آگے چل کر **فلم یستقر الإجماع الأول** میں سوءِ تعبیر ہے، **فبطل الإجماع الأول** ہونا چاہئے؛ پھر **حتی صار الصحابة علی قولین** میں اگر صحابہ سے تمام صحابہ مراد ہیں تو صحیح ہے، مگر اجماع عہد فاروقی کے مقابلہ میں قائلین بعدم الوقوع کا قول کیا وقعت رکھتا ہے؟ اور یہ آپ پہلے معلوم کر چکے کہ پہلا اجماع درست نہیں ہوا، اور اگر عہد فاروقی کے صحابہ مراد ہیں تو محض غلط ہے، مدعی صحت اس اجماع کے بعد ایک صحابی کا خلاف بھی بسند صحیح ثابت کر دیں تو جانیں''[1]۔

قول اور روایت میں فرق:

اہل حدیث کے مضمون نگار نے لکھا تھا:

''الغرض ائمہ اربعہ میں سے امام مالک کا ایک قول اور بعض جلیل القدر علماء احناف کا قول بھی ایسا ہی ہے، لہٰذا حنفی اور مالکی مذہب میں دو قول ہوئے۔''

علامہ اعظمیؒ اس عبارت کا ان الفاظ میں تجزیہ کرتے ہیں:

''مولانا! جس کو قول و روایت میں فرق نہ معلوم ہو اس کو ایسے معرکہ میں کود پڑنا کیا ضرور؟ غور سے سنئے! اصطلاحاً قول کا اطلاق مشائخ مذہب کے خیال پر ہوتا ہے اور روایت کا ائمہ کی رائے پر، چنانچہ 'اغاثہ' کی عبارت منقولہ خود اس فرق کی مشعر ہے: **وحکاه التلمساني في شرح التفریع في مذهب مالک قولاً في مذهبه بل روایةً عن مالک، وحکاه غیره قولاً في المذهب اهـ.** انصاف سے کہئے کہ روایت کی طرف ترقی کیا معنی رکھتا ہے، اور دونوں ایک ہوتے تو **حکاه غیره** کے بعد **قولاً في المذهب** کی کوئی ضرورت نہ تھی صرف ایضاً کہنا کافی تھا''[2]۔

سلف کا اطلاق:

علامہ اعظمیؒ نے اہل حدیث کے مضمون نگار کے ایک اعتراض کے جواب میں شامی (۳۴۲/۲) سے سلف کا یہ اطلاق نقل کیا ہے کہ:

''سلف کا اطلاق یا تو صرف صحابہؓ پر، یا صحابہ و تابعین پر، یا صحابہ و تابعین و اتباع تابعین پر ہوتا ہے''[3]۔

بخاری شریف کی حدیث سے استدلال پر اعتراض اور اس کا جواب:

علامہ اعظمیؒ نے اپنے فتوے میں حدیث بخاری **إن رجلاً طلق امرأته ثلاثاً** کے ثلاث مجموع ہونے

---

(۱) مقالات: ۲۶۸/۱ (۲) ایضا: ۲۶۹/۱ (۳) مقالات: ۲۷۰/۱

پر استدلال کیا تھا اور لکھا تھا کہ اس میں ثلاث مفرقہ کا احتمال نہیں ہے۔اس پر اہل حدیث کے مضمون نگار نے لکھا کہ:

''بحیثیت مدعی ہونے کے آپ کے اوپر لازم ہے کہ آپ ثلاث مفرّ قہ کے احتمال کا بطلان ثابت کریں، اتنا کہنے سے آپ کا کام نہ چلے گا کہ اس پر کوئی قرینہ نہیں ہے۔''

اس کے جواب میں علامہ اعظمیؒ ارشاد فرماتے ہیں:

''**طلقها ثلاثاً** کا ظاہر اور کھلا ہوا مطلب یہی ہے کہ تینوں طلاقیں دفعۃً دی ہیں، اور اسی ظاہر معنی سے میں استدلال کرتا ہوں، اور اس ظاہر کے ارادہ سے جب کوئی مانع نہیں ہے، تو خواہ مخواہ ایک خلافِ ظاہر احتمال قابل التفات کیوں ہوسکتا ہے، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: **وإن كــان في قصة أخرى فالتمسک بظاهر قوله طلقها ثلاثاً فإنه ظاهر في كونها مجموعة، وسيأتي في قصة رفاعة أن غيره وقع له مع امرأته نظير ما وقع لرفاعة، فليس التعدد في ذلک ببعيد اهـ.** مولانا! ظاہر سے استدلال کرنے والے سے وجہ نہیں پوچھی جاتی اور نہ خلاف ظاہر احتمال کی نفی کا وہ ذمہ دار ہوتا ہے؛ افسوس ہے کہ آپ کو اتنی بھی خبر نہیں! ہاں جو شخص خلاف ظاہر کا مدعی ہوتا ہے، وہ البتہ ظاہر کی نفی کرتا ہے **كما لا يخفى على من مارس الكتب الشرعية**''[1].

اس کے بعد متصلاً تحریر فرماتے ہیں:

''آپ کس عالم میں ہیں! بتلایئے تو سہی کہ میں مدعی کیسے ہوں؟ جب میں ثلاث مفرق کے احتمال کا انکار کرتا ہوں تو مدعی کیسے ہوا، شاید آپ کی اصطلاح میں منکر ہی کو مدعی کہتے ہیں۔''

اہل حدیث کے مضمون نگار لکھتے ہیں:

''صحابہ کرام کی عادت نہ تھی کہ طلاق ثلثہ علی سبیل الارسال بفم واحد (ایک ہی دفعہ) دیتے، کیونکہ ممنوع ومعصیۃ وبدعی ہے......، پس صحابہ کے فعل کو ان کی عادت جاریہ کے خلاف ممنوع اور ناجائز اور حرام صورت پر محمول کرنا خلاف عقل وخلافِ تعظیم ہے۔''

علامہ اعظمیؒ نے اس کا جواب یوں دیا:

''ہم کیا کریں حافظ ابن القیم صاحب خفا ہوتے ہیں اور خواہ مخواہ یہی کہتے ہیں کہ اسی حرام صورت پر حمل کرو۔اس کی تفسیر یہ ہے کہ جب قائلین بوقوع الثلاث نے حدیث ابوالصہباء کا یہ مطلب بیان کیا کہ یہی طلاق جو آج تین دی جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک دی جاتی تھی، یعنی صحابہ صرف ایک طلاق دیتے تھے اور اب تین دینے لگے؛ تو حافظ صاحب نے نہایت تیز لہجے میں جواب دیا اور اس کو تحریف سے تعبیر کر کے صحابہ کا تین طلاق نہ دینا غلط قرار دیا، فرماتے ہیں: **وأما قول من قال: إن معناه كان وقوع الطلاق الثلاث الآن على عهد رسول الله ﷺ واحدة، فإنَّ**

(۱) مقالات: ۲۸۰/۱

حقيقةَ هذا التاويلِ كان الناس على عهد رسول الله يُطلّقون واحدةً وعلى عهد عمر صاروا يُطلّقون ثلاثاً. والتاويل إذا وصل إلى هذا الحد كان من باب الإلغاز والتحريف، لا من باب بيان المراد، ولا يصح ذلك بوجه فإن الناس ما زالوا يطلقون واحدة وثلاثاً، وقد طلق رجال نساء هم على عهد رسول الله ﷺ ثلاثاً (زاد المعاد ٢٦٢/٢)[1]۔

صحیح بخاری میں باب من أجاز الطلاق الثلاث کے تحت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دو حدیثیں ذکر ہوئی ہیں، ایک میں رفاعہ قرظی کا واقعہ مذکور ہے کہ انھوں نے طلاق بتہ دی، اور دوسری کے الفاظ یہ ہیں کہ: أن رجلاً طلق امرأته ثلاثاً. مضمون نگار نے اس امر پر بہت زور دیا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی دوسری حدیث میں بھی رفاعہ قرظی ہی کا بیان ہے، اس کی نسبت علامہ اعظمیؒ فرماتے ہیں کہ حافظ ابن حجر کی تحقیق سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ رفاعہ کی بی بی کے واقعہ کے مثل دوسری عورتوں کو بھی پیش آیا ہے:

ایک غُمیصاء کا واقعہ ہے جس کا ذکر نسائی اور طبرانی اور ابومسلم کجی اور ابونعیم نے کیا ہے۔

دوسرا عائشہ بنت عبدالرحمان نضریہ کا ہے جس کو مقاتل اور ابن شاہین وغیرہما نے فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجاً غَيْرَهُ کی تفسیر میں روایت کیا ہے۔

جب یہ دو دوسرے واقعے ہیں تو خواہ مخواہ حدیث عائشہ کو صرف رفاعہ کے قصے ہی پر کیوں محمول کیا جاتا ہے، یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ یہ غمیصاء یا عائشہ نضریہ کا واقعہ ہے؟ حدیث عائشہؓ میں کسی شخص کی تعیین نہیں، اور شاہد کا لفظ فطلقها ثلاثاً ہے، اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ یہ تینوں طلاقیں مجموع تھیں، اور رفاعہ نے بقول آپ کے بدفعات طلاقیں دی تھیں، تو یہ رفاعہ کا قصہ کیوں کر ہوسکتا ہے؟ اگر اس حدیث کو رفاعہ کے قصے پر حمل کریں تو خلاف ظاہر کے ارادہ کا - بلاضرورت - ارتکاب کرنا پڑے گا، اس سے اچھا بلکہ یہی متعین ہے کہ غمیصاء یا عائشہ نضریہ کا واقعہ کہا جائے، تا کہ یہ اپنے ظاہر پر رہ جائے۔

نیز حدیث عائشہؓ کے کسی طریق اور لفظ سے اس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ رفاعہ کا واقعہ ہے، پھر بلا وجہ ہم اسی پر کیوں حمل کریں، جو مدعی اتحاد حدیثین ہو وہ دلیل پیش کرے، ہمیں اتنا کہنا کافی ہے کہ اس کے کسی طریق کا کوئی لفظ نہیں بتلاتا کہ یہ رفاعہ کا قصہ ہے۔

اہل حدیث مضمون نگار نے لکھا تھا کہ:

''ظاہر حدیث سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ طلاق ثلاثہ ایک ہی طلاق کے حکم میں ہے، کیونکہ زوج ثانی سے خلوت ہوگئی تھی، جیسا کہ نسائی میں ہے: فدخل بها فطلقها قبل أن يواقعها، اور زوج ثانی نے تین طلاقیں دی تھیں، کیونکہ اگر ایک ہی طلاق دی ہوتی تو وہ عورت آپ ﷺ کی خدمت میں اس غرض

---

[1] مقالات: ٢٨٤/١-٢٨٣

سے ہرگز نہ آتی کہ میں زوج اول کی طرف مراجعت چاہتی ہوں، ونیز بعض روایات میں **ففارقها** کا لفظ موجود ہے، جو بشرط انصاف اسی معنی پر دال ہے، اور طلاق ثلاثہ کے بعد آپ کا حکم رجعت بایں الفاظ **لا حتى يذوق عسيلتها كما ذاق الأول** فرمانا صاف اس امر پر دال ہے کہ طلاق ثلاثہ ایک ہی طلاق کے حکم میں ہے۔''

علامہ اعظمیؒ نے اس عبارت کے چار جواب دیے ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

پہلا جواب یہ ہے کہ اہل حدیث صاحب کا دعویٰ ہے کہ زوج ثانی سے خلوت ہوگئی تھی؛ اگر اس سے مراد خلوت صحیحہ ہے تو غلط ہے، اس لیے کہ حدیث کا آخری حصہ (**لا حتى يذوق عسيلتها كما ذاق الأول**) اور خود نسائی کے یہ الفاظ **قبل أن يو اقعها** صاف دلالت کر رہے ہیں کہ وطی نہیں ہوئی تھی، اور اگر خلوت غیر صحیحہ مراد ہے تو غیر مفید ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ موصوف حدیث بخاری کے الفاظ **طلقها ثلاثاً** میں جمع ثلاث مراد لینے پر چراغ پا ہو چکے ہیں، اور اب صرف **طلقها** سے-نہ کہ **طلقها ثلاثاً** سے-طلاق ثلاث مراد لینے لگے ہیں۔

تیسری بات علامہ اعظمیؒ نے یہ فرمائی ہے کہ موصوف نے اس کی کوئی وجہ نہیں بیان کی کہ اگر زوج ثانی نے ایک ہی طلاق دی ہوتی تو وہ عورت ہرگز آپ کی خدمت میں اس غرض سے نہ آتی کہ میں زوج اول کی طرف مراجعت چاہتی ہوں، کیوں جناب کیا ایک طلاق کے بعد درخواست مراجعت ناجائز تھی؟ اور اگر شرعاً ناجائز بھی ہو تو ناممکن ہے؟۔

چوتھا جواب یہ تحریر فرمایا کہ **لا حتى يذوق عسيلتها كما ذاق الأول** کو حکم رجعت قرار دینا اضحوکہ ہے، اگر آپ کو اپنی غلطی خود ان الفاظ سے سمجھ میں نہ آوے، تو اس جواب کا سوال سامنے رکھ لیجئے۔ مولانا! یہ الفاظ **أ تحِلُّ للأول** کے جواب میں ہیں، ان کو حکم رجعت سے کیا علاقہ؟۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنے فتوے میں دارقطنی وغیرہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث نقل کی تھی کہ انھوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ: **يا رسول الله! أ رأيت لو أني طلقتها ثلاثاً أ كان يحل لي أن أراجعها؟ قال: لا، كانت تبين منك وتكون معصية.**

اہل حدیث کا اعتراض:

اس روایت پر اہل حدیث صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ:

''طلاق ابن عمر کے قصہ کو ایک جماعت نے روایت کیا ہے اور کسی میں یہ الفاظ نہیں، صرف اسی ایک روایت میں زیادتی ہے۔''

اعتراض کا جواب:

علامہ اعظمیؒ کے جواب کا اختصار یہ ہے کہ مجیب صاحب کو پہلے یہ دیکھنا چاہئے تھا کہ یہ زیادتی کس کی ہے ثقہ کی یا غیر ثقہ کی؟ اور یہ زیادتی بھی دوسرے ثقات کے مخالف ہے یا غیر مخالف؟ یہ زیادتی حضرت حسن بصریؒ کی ہے، اور حسن بصری بلا شبہہ ثقہ ہیں، لہذا یہ ثقہ کی زیادتی ہوئی، اور ثقہ کی زیادت کے متعلق اختلاف ہے، بعض محدثین تو مطلقاً قبول کرتے ہیں، اور دوسرے محدثین یہ کہتے ہیں کہ زیادت ثقہ اگر اور ثقات کی روایت کے مخالف ہوتو نامقبول، ورنہ مقبول ہے۔

روایت کی مخالفت کا مطلب:

''یہ ہے کہ اس زیادت والی روایت پر عمل کرنے سے ان دوسرے ثقات کی روایت کا رد کرنا لازم آئے۔''

اس کے بعد اہل حدیث مضمون نگار نے اس حدیث کے دو راوی شعیب بن رزیق اور عطاء خراسانی کی وجہ سے اس کا ضعیف ہونا بیان کیا ہے۔ شعیب اور عطاء کی نسبت علامہ اعظمیؒ کی گفتگو کو ہم انشاء اللہ ''الاعلام المرفوعہ'' کے تذکرے میں پیش کریں گے۔

☆......☆......☆......☆......☆

الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعہ

ایک مجلس کی تین طلاق کے وقوع پر حضرت علامہ اعظمیؒ کی یہ نہایت بیش قیمت اور عظیم الشان تصنیف ہے، اس میں آپ نے وقوع ثلاث کے قول کی پختگی کو نہایت مستحکم اور نا قابلِ تردید دلائل سے ثابت کیا ہے، اس کی شہادت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی علیہ الرحمۃ نے 'تاریخ دعوت وعزیمت' حصہ دوم صفحہ ۴ کے حاشیے پر ان الفاظ میں دی ہے:

> ''اردو خواں حضرات کے لیے آسانی ہوگی کہ اس مسئلہ پر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کا رسالہ 'الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعہ' ملاحظہ فرمائیں، جو اس موضوع پر سلجھا ہوا اور پُر مغز رسالہ ہے''۔ (تمہید 'الاعلام المرفوعہ' طبع سوم ص ۵، بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت حصہ دوم، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ، طبع اول ۱۹۵۷ء)۔

اس رسالے کی وجہِ تصنیف کی نسبت خود علامہ اعظمیؒ نے اپنے مقدمے میں یہ تحریر فرمایا ہے:

> ''احناف نے جب ان اہل حدیث صاحب سے گفتگو کی، تو ان سے کچھ جواب نہ بن پڑا اور کہا کہ ہمارے علماء ایسا ہی کہتے ہیں، اس کے بعد انھوں نے بنارس ہی کے ایک اہل حدیث مولوی صاحب سے ایک فتوی لکھوا کر احناف کو دکھایا، احناف نے اس فتوے کو میرے پاس بھیج کر نفس مسئلہ اور

اس فتوے کی حقیقت حال دریافت کی۔ احباب بنارس کی اس استدعا پر یہ رسالہ لکھا گیا ہے، اوراس میں نفس مسئلہ کی ضروری تحقیق کے علاوہ اہل حدیث مولوی صاحب کی تقریباً ہر بات کا جواب اور دیگر مخالفین کی بھی قابل اعتنا باتوں کا جواب دیا گیا ہے۔''

علامہ اعظمیؒ نے اپنے اس رسالے کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے، باب اول میں قائلین وقوع ثلاث کے دلائل ذکر کیے ہیں، جس میں آٹھ مرفوع حدیثیں، سات آثار صحابہ اور آخر میں اجماع صحابہ کو پیش کر کے ان سب سے وقوع ثلاث پر استدلال کیا ہے۔

باب دوم میں مخالفین کی دلیلیں ذکر کی ہیں، اور واضح کیا ہے کہ ان کے پاس استدلال کے لیے دو حدیثوں سے زائد اور کچھ نہیں ہے۔

باب سوم میں اس مسئلے سے متعلق مخالفین کی طرف سے پھیلائی جانے والی غلط بیانیوں کو ایک ایک کر کے دفع کیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اصل رسالے کا آغاز اس یقین واذعان کے ساتھ کیا ہے کہ:

''ایک مجلس کی تین طلاقیں - چاہے بیک لفظ دی جائیں یا بالفاظ متعددہ - واقع ہو جاتی ہیں، اور تین طلاقوں کے بعد - چاہے وہ جس طرح دی گئی ہوں - رجعت کرنا شرعاً ممکن نہیں ہے۔ شریعت کا یہ وہ مسئلہ ہے، جس پر اہل سنت والجماعت کے ہر چہار امام: امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ کا اتفاق ہے، اور نہ صرف یہی بلکہ دیگر اکابر ائمۂ فقہ وحدیث مثلاً امام اوزاعی (امام شام)، امام نخعی، امام ثوری، امام اسحاق، امام ابوثور، امام بخاری کا بھی یہی قول ہے، بلکہ جمہور ائمۂ سلف وخلف اسی کے قائل ہیں''[1]۔

اس کے بعد بطور ثبوت 'شرح صحیح مسلم' سے امام نووی، 'فتح القدیر' سے شیخ ابن ہمام، 'عمدۃ القاری' سے علامہ عینی، 'بدایۃ المجتہد' سے علامہ ابن رشد اور 'زاد المعاد' سے علامہ ابن القیم کی عبارتیں نقل کی ہیں۔

مذاہب اربعہ کی مستند کتابوں سے ان عبارات کو نقل کرنے کے بعد آپ نے ایک ایک کر کے وہ تمام حدیثیں ذکر کی ہیں جن سے وقوع ثلاث پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔

حدیث اول:

صحیحین کی یہ حدیث ہے کہ: **أن رجلاً طلَّق امرأته ثلاثاً، فتزوَّجتْ، فطلق، فسُئِلَ النبي ﷺ: أ تَحِلُّ للأول؟ قال: لا، حتى يذوق عُسَيلتها كما ذاق الأول.**

حدیث دوم:

مصنف ابن ابی شیبہ، بیہقی کی سنن کبری، اور سنن دار قطنی وغیرہ میں حضرت ابن عمرؓ کا یہ واقعہ طلاق مروی

(۱) اعلام مرفوعہ: ۷ (۲) ایضاً ۱۲-۱۱

ہے کہ: **فقلت –القائل ابن عمر–: یا رسولَ الله! أ رأیت لو أني طلقتها ثلاثاً، أ کان یحلُّ لي أن أراجعَها؟ قال: لا، کانت تبین منک و تکون معصیة.**

سنن دارقطنی میں اس کی جو سند ہے، اس کے ایک راوی شعیب بن رزیق ہیں، ان کی نسبت علامہ اعظمیؒ نے تحریر فرمایا ہے:

''ان کو حافظ ابن القیم نے ضعیف کہا ہے، اور انھیں کی وجہ سے اس حدیث کی تضعیف کی ہے، لیکن انصاف یہ ہے کہ حافظ ابن القیم کا شعیب کو ضعیف قرار دینا بالکل بے جا ہے، اس لیے کہ ائمۂ جرح وتعدیل میں سے کسی نے ان کی تضعیف نہیں کی، ہاں ابوالفتح ازدی نے بے شک ان کو لین کہا ہے، مگر یہ بہت نرم اور کمزور جرح ہے؛ علاوہ بریں ابوالفتح کی جرحیں بالکل ناقابل اعتبار ہیں، اولاً: اس لیے کہ وہ خود ضعیف وصاحب مناکیر وغیر مرضی ہیں؛ ثانیاً: وہ بے سند و بے وجہ جرح کیا کرتے ہیں، جیسا کہ حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال ص۴ ج۱، اور ص۴۶ ج۳ میں، اور حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب جلد اول ترجمہ احمد بن شبیب میں لکھا ہے''(۱)۔

علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ بعض لوگ ابن حزم کی جرح کا ذکر کرتے ہیں، اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

''ابن حزم ائمۂ جرح وتعدیل میں سے نہیں ہیں، اس کے علاوہ ان کی زبان درازی کی بڑے بڑے محدثین نے شکایت کی ہے اور ان کی جرحوں کو ناقابل التفات قرار دیا ہے''(۲)۔

اور چند سطروں کے بعد لکھا ہے:

''ازدی وابن حزم دونوں کی جرحیں مبہم ہیں، اور جرح مبہم اصول حدیث کے رو سے ساقط الاعتبار ہوتی ہے''(۳)۔

اور بالآخر یہ فیصلہ تحریر فرمایا ہے کہ:

''شعیب ضعیف نہیں بلکہ وہ **لا بأس به** ہیں جیسا کہ دحیم نے کہا ہے، بلکہ وہ **ثقه** ہیں جیسا کہ دارقطنی نے فرمایا''(۴)۔

اس سند کے ایک دوسرے راوی عطا خراسانی ہیں، جو کہ شعیب کے شیخ ہیں، ان پر بھی چند لوگوں نے کلام کیا ہے، اور علامہ اعظمیؒ نے نہایت محدثانہ اور ناقدانہ ومحققانہ طریقے سے ان پر کی جانے والی جرحوں کا رد کیا ہے، یہ رد وقدح تقریباً پانچ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''عطا کے بارے میں کوئی جرح ایسی نہیں ہے، جو ان کی ثقاہت وعدالت میں قادح ہو، اور یہی وجہ ہے کہ اکابر حدیث و ماہرین رجال وائمۂ مسلمین نے ان سے روایت کی ہے، بلکہ ان کے شاگردوں

(۱) اعلام مرفوعہ: ۱۲-۱۱ (۲) ایضاً: ۱۲ (۳) ایضاً: ۱۲ (۴) ایضاً: ۱۲

میں ایسے حضرات بھی ہیں، جن کا کسی سے روایت کرلینا، اس کی ثقاہت کی کافی سند ہے، جیسے شعبہ و مالک اوران کے علاوہ امام ابوحنیفہ، معمر، سفیان ثوری، امام اوزاعی نے بھی ان سے روایت کی ہے"(۱)۔

اور آخر میں بغیر کسی پس وپیش اور حیص بیص کے فیصلہ کن انداز میں لکھا ہے:

"حاصل کلام یہ ہے کہ حدیث مذکور کی اسناد قوی ہے، اوراس حدیث سے احتجاج صحیح ہے"(۲)۔

حدیث سوم:

حضرت رُکانہ کا وہ واقعہ ہے جس کو امام شافعی، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم اور دارقطنی وغیرہ نے اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے کہ: **أنـه طـلَّـق امـرأتـه البتة، فـأتى رسول الله ﷺ، فقال: ما أردتَ؟ قال: واحدةً، قال: آلله؟ قال: آلله، قال: هو على ما أردتَ.**

علامہ اعظمیؒ نے اس حدیث کو مع ترجمہ نقل کرنے کے بعد جو تقریر استدلال تحریر فرمائی ہے وہ یہ ہے:

"اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں بھی واقع ہو جاتی ہیں، ورنہ رکانہ سے بار بار قسم دے کر یہ پوچھنے کی کیا ضرورت تھی کہ **آلله ما أردتَ إلا واحدة** (خدا کی قسم کھا کر کہو کہ ایک کے سوا کچھ ارادہ نہیں کیا ہے)، یہ سوال تو جب ہی درست ہوسکتا ہے جب ایک کا ارادہ کرنے سے ایک اور تین کا ارادہ کرنے سے تین واقع ہوں، اور اگر دونوں صورتوں میں ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہو، تو ایک اور تین میں سے ایک کی تعیین کرانا بے معنی بات ہوگی، **وحاشا جنابه ﷺ عن ذلك**"(۳)۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ امام ابوداود، ابوالحسن علی بن محمد طنافسی، ابن حبان اور حاکم ودارقطنی جیسے ائمۂ حدیث نے اس حدیث کی تصحیح کی ہے، ہاں اس کی سند کے بعض راویوں پر امام نسائی نے کلام کیا ہے، مگر امام نسائی کے تعنت اوران کی جرح کے مبہم ہونے کی وجہ سے وہ جرح غیر معتبر ہے۔

حدیث چہارم:

سنن دارقطنی میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی یہ حدیث ہے: **قال رسول الله ﷺ: إذا طلَّق الرجل امرأته ثلاثاً، فلا تحل له حتى تنكح زوجاً غيره، ويذوق كل واحد منهما عسيلة الآخر.**

اس کی سند میں ایک راوی علی بن زید ہیں، ان کی نسبت علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

"بعض لوگوں نے علی بن زید میں کلام کیا ہے، مگر وہ مسلم وسنن اربعہ کے رجال میں سے ہیں، اور ترمذی نے ان کو صَدوق - بہت راست گو - کہا ہے، اوران کی حدیث کی ایک جگہ تصحیح اور دوسری جگہ تحسین کی ہے، حافظ ذہبی نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے، اور دارقطنی نے کہا ہے کہ وہ متروک نہیں ہیں، ہاں کچھ نرمی ان میں ہے"(۴)۔

(۱) اعلام مرفوعہ: ۱۶ (۲) ایضاً: ۱۷ (۳) ایضاً: ۱۸ (۴) ایضاً: ۲۰

اس کے بعد یہ فیصلہ تحریر فرمایا ہے:

''بہر حال ان کی حدیث اگر صحیح نہیں تو حسن ضرور ہے، اور حدیث حسن بھی حجت ہو سکتی ہے''[۱]۔

حدیث پنجم:

دارقطنی نے روایت کیا ہے کہ حضرت حسن بن علیؓ نے اپنی بی بی عائشہ خثعمیہ کو اس لفظ سے طلاق دی: **اذهبي فأنت طالق ثلاثاً** (یعنی تو چلی جا تجھ کو تین طلاق ہے)۔ عائشہ چلی گئیں، بعد میں جب حضرت حسنؓ کو معلوم ہوا کہ عائشہ کو جدائی کا بڑا رنج ہے تو روئے اور فرمایا: **لولا أني سمعت أو حدثني أبي أنه سمع جدي يقول: أيما رجل طلق امرأته ثلاثاً مبهمة أو ثلاثاً عند الأقراء، لم تحل حتى تنكح زوجاً غيره، لراجعتها.**

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''اس حدیث کی اسناد کے دو راویوں پر بعض حضرات نے کلام کیا ہے......، لیکن انصاف یہ ہے کہ ان دونوں راویوں پر کوئی ایسی جرح نہیں کی گئی ہے جس کی وجہ سے ان کو متروک قرار دیا جائے''[۲]۔

پھر ان جرحوں پر محدثانہ اور منصفانہ طریقے پر بحث کر کے بطور خلاصہ تحریر فرماتے ہیں:

''غایۃ ما فی الباب یہ کہ یہ حدیث بھی حسن سے کم نہیں ہے، لہذا یہ بھی حجت ہو سکتی ہے، خصوصاً جبکہ سنن دارقطنی میں یہ حدیث ایک دوسری اسناد سے بھی مروی ہے، جس سے اس کی تائید و متابعت حاصل ہوتی ہے''[۳]۔

حدیث ششم:

دارقطنی میں حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے: **قال رسول الله ﷺ: من طلّق في بدعة واحدةً أو ثنتين أو ثلاثاً، ألزمناه بدعته.**

اس کی سند پر مختصر گفتگو کر کے یہ فیصلہ تحریر فرمایا ہے:

''بہر حال یہ حدیث بھی قابل احتجاج ہے، اور اس کی موید ایک دوسری حدیث ہے، جو سنن دارقطنی میں بروایت علی رضی اللہ عنہ مروی ہے، اس کی اسناد ضعیف ہے، لیکن مولوی عبد الرحمٰن صاحب مبارک پوری نے 'القول السدید' میں لکھا ہے کہ جو حدیث کسی دوسری حدیث کی تائید کے لیے پیش کی جائے، وہ اگر ضعیف بھی ہو تو کچھ حرج نہیں''[۴]۔

حدیث ہفتم:

دارقطنی و مصنف عبد الرزاق وغیرہ میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے اپنی بی بی کو ہزار طلاقیں دے ڈالیں، اس

(۱) اعلام مرفوعہ: ۲۰ (۲) ایضاً: ۲۱ (۳) ایضاً: ۲۱ (۴) ایضاً: ۲۲

کے لڑکوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا اور پوچھا کہ اب کوئی مخلص ہے یا نہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تمھارا باپ اللہ سے ڈرتا ہوتا تو اللہ اس کے لیے کوئی مخلص نکالتا، (جاؤ) اس کی بی بی تین طلاقوں سے بائن ہوگئی، اور نوسو ستانوے طلاقوں کا گناہ تمھارے باپ کے گردن پر رہا۔

اس حدیث کی سند پر علامہ اعظمیؒ کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث دو سندوں سے روایت کی گئی ہے، پہلی سند پر معارضین کی جانب سے کچھ کلام کیا گیا ہے، وہ سب اصول حدیث کی رُو سے غیر مقبول ہیں؛ دوسری سند میں البتہ ضعف ہے، مگر خود مولانا عبدالرحمان مبارک پوری کے اعتراف کے مطابق شواہد کا ضعیف ہونا مضر نہیں ہے، اور حدیث ضعیف اپنے شواہد ومؤیدات سے مل کر مقبول وقابل احتجاج ہوسکتی ہے۔

حدیث ہشتم:

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ عامر شعبی نے فاطمہ بنت قیس سے کہا کہ: **حدثيني عن طلاقك، قالت: طلقني زوجي ثلاثاً وهو خارج إلى اليمن فأجاز ذلك رسول الله ﷺ** [ابن ماجہ ص: ۱۴۷] (فاطمہ نے کہا کہ میرے شوہر یمن گئے ہوئے تھے، وہیں سے انھوں نے مجھ کو تین طلاقیں بھیج دیں، آنحضرت ﷺ نے ان تینوں طلاقوں کے واقع ہوجانے کا فتویٰ دیا) اس حدیث سے ابن ماجہ نے خود وقوع ثلاث فی مجلس واحد پر استدلال کیا ہے۔

آثارِ صحابہؓ:

ان آٹھ مرفوع احادیث کے بعد علامہ اعظمیؒ نے آثار صحابہ یعنی حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو، حضرت عمر فاروق اعظم، حضرت انس، اور حضرت ابو ہریرہ - رضی اللہ عنہم - کے فتوے بطور شہادت پیش کیے ہیں، پھر لکھا ہے:

> ''ان کے علاوہ اور دلائل بھی پیش کیے جا سکتے ہیں، چنانچہ حضرت عثمانؓ وحضرت علیؓ وحضرت عائشہؓ نے بھی وقوع ثلاث کا فتویٰ دیا ہے''[1]۔

وقوع ثلاث پر صحابہ کرامؓ کا اجماع:

آثار صحابہؓ کے بعد ''وقوع ثلاث پر صحابۂ کرام کا اجماع'' کا عنوان قائم کر کے 'شرح معانی الآثار'، 'فتح الباری'، 'اعلام الموقعین' اور علامہ ابن تیمیہ کے جد امجد کی کتاب 'منتقی الاخبار' کی عبارتیں نقل کر کے وقوع ثلاث پر اجماع صحابہؓ کا ٹھوس ثبوت پیش کیا ہے۔

مخالفین کے دلائل:

دوسرے باب میں معارضین کی دلیلیں ذکر کی ہیں، یہ کل دو حدیثیں ہیں، اور دونوں حضرت عبداللہ ابن

(۱) اعلام مرفوعہ: ۲۹

عباسؓ کی روایت سے مروی ہیں: پہلی حدیث مسلم شریف کے حوالے سے نقل کی جاتی ہے، اس حدیث کا پورا مضمون یہ ہے کہ ابوالصہباء نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں اور عہد فاروقی کے ابتدا میں تین طلاق ایک تھی؟ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ہاں، لیکن جب لوگوں نے بکثرت طلاق دینا شروع کی، تو حضرتؓ نے تینوں کو نافذ کر دیا۔

علامہ اعظمیؒ نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ یہ حدیث قابل استدلال نہیں ہے، پھر ائمۂ حدیث کی تصریحات سے اس کے نا قابلِ استدلال ہونے کی سات علتیں ذکر کی ہیں، جن کی وجہ سے اس حدیث سے استدلال درست نہیں ہوسکتا، پھر ان تمام وجوہ کے بعد اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس کے خلاف فتوے دیے ہیں۔

معارضین کی دلیل ثانی کے بارے میں علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ دوسری حدیث مسند احمد کے حوالے سے ذکر کی جاتی ہے، اس حدیث کا مضمون یہ ہے کہ حضرت رکانہؓ اپنی بی بی کو تین طلاق دے کر بہت پچھتائے، آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ تم نے کیسی طلاق دی ہے؟ انھوں نے کہا: تین، آپ نے پوچھا کہ ایک جلسے میں؟ کہا: ہاں، آپؐ نے فرمایا کہ وہ ایک ہی ہے، اگر تمھارا جی چاہے تو رجعت کرلو۔

فریق مخالف کی اس دلیل کو نقل کر کے علامہ اعظمیؒ نے اس کے رتبے کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:

> ”کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث حسن وصحیح دونوں طریق سے مروی ہے؛ مگر درحقیقت یہ مغالطہ ہے، آپ کو یاد ہوگا میں حضرت رکانہ کا واقعۂ طلاق نہایت صحیح طریقے سے بیان کر چکا ہوں، اور یاد ہوگا کہ حضرت رکانہؓ نے تین طلاق نہیں دی تھی، بلکہ لفظ بتہ کے ساتھ طلاق دی تھی، اور ذکر کر چکا ہوں کہ پانچ زبردست محدثوں نے میری ذکر کی ہوئی حدیث کی تصحیح کی ہے؛ پس آپ خود سمجھئے کہ مسند احمد والی حدیث کیسے صحیح یا حسن ہوسکتی ہے، جب رکانہؓ کا لفظ بتہ کے ساتھ طلاق دینا محدثین کے نزدیک صحیح واقعہ ہے، تو پھر اسی واقعہ میں تین طلاق کا ہونا کون صحیح کہہ سکتا ہے!، یہی وجہ ہے کہ کسی محدث نے مسند احمد والی حدیث کی تصحیح یا تحسین نہیں کی ہے، بلکہ محدثین نے اس کو حد درجہ کمزور بتایا ہے“(۱)۔

آگے علامہ اعظمیؒ نے قدرے تفصیل سے توضیح فرمائی ہے کہ اگر اس حدیث کی اسناد صحیح تسلیم کر لی جائے، تو متن کے اندر ایسی علت خفیہ ہے، جس کے ہوتے ہوئے یہ حدیث قابل استدلال نہیں ہوسکتی، پھر اپنی بات کی تائید میں غیر مقلد عالم مولانا عبدالرحمان مبارک پوری کی کتاب 'ابکار المنن' سے متعدد عبارتیں نقل کر کے لکھا ہے:

> ”ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ صرف اسناد کی صحت استدلال کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ متن کا بھی علت سے خالی ہونا ضروری ہے؛ پس اگر اس حدیث کی اسناد صحیح بھی ہو تو چونکہ حافظ ابن حجر نے اس

(۱) اعلام: ۳۶-۳۵

کو معلول کہا ہے، اس لیے اس سے استدلال جائز نہیں ہوسکتا''[۱]۔

کتاب کا تیسرا باب تقریباً بیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اس باب میں آپ نے مخالفین کی جانب سے کی جانے والی غلط بیانیوں کو واشگاف کیا ہے، اور ایک ایک غلط بیانی کی حقیقت کو اچھی طرح واضح کیا ہے، نمونہ کے طور پر کچھ تحقیقات ذکر کی جارہی ہیں:

مثلاً: پہلی غلط بیانی یہ ہے کہ غیر مقلدین اپنے مسلک کی قوت ظاہر کرنے کے لیے کہہ دیا کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ، وابن مسعودؓ، وعبدالرحمانؓ بن عوف، وابوموسیٰ اشعریؓ، وزبیرؓ و جابرؓ جیسے کبار صحابہ ایک مجلس کی تین طلاق کو ایک کہتے ہیں۔ علامہ اعظمیؒ نے خود علامہ ابن القیمؒ کے حوالے سے ان کے اس قول کا غلط اور باطل ہونا ثابت کیا ہے، اور لکھا ہے کہ ان کے پاس اپنی بات کے ثبوت کے لیے کوئی سند اور دلیل نہیں ہے۔

اور مثلاً دوسری غلط بیانی یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کا یہی مذہب بیان کیا جاتا ہے، جب کہ حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی نسبت غلط ہے، اور خود علامہ ابن القیم نے ایک مجلس کی تین طلاق کے تین ہونے کے ابن عباسؓ کے فتوے کا اقرار کیا ہے، اس ضمن میں علامہ ابن القیم کی 'اغاثہ' اور 'اِعلام' کی کئی عبارتوں پر ردوقدح کے بعد لکھتے ہیں:

> ''لیکن انصاف یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے ایقاع ثلاث کے خلاف کوئی فتوی ثابت نہیں ہے''[۲]۔

ایک صفحے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''تیسری غلط بیانی یہ ہے کہ کہا جاتا ہے امام ابوحنیفہ سے اس مسئلہ میں دو روایتیں ہیں، ایک وہی جو مشہور ہے، دوسری یہ کہ جلسۂ واحد کی تین طلاق ایک رجعی ہوتی ہے۔ حالانکہ فقہ حنفی کی کسی کتاب میں اس دوسری روایت کا کوئی نشان نہیں ہے، اور نہ صرف امام اعظمؒ بلکہ ان کے تلامذہ میں سے بھی کسی کا یہ مسلک نہیں ہے''[۳]۔

اس طرح امت کے اس اجماعی مسئلے میں جہاں جہاں سے رخنہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، آپ نے ایک ایک کو تلاش کر کے اور ٹٹول ٹٹول کر اس کا سد باب کر دیا ہے، اور تحقیق اور حق وانصاف کا حق ادا کر دیا ہے۔

اس رسالے کے اب تک تین اڈیشن شائع ہو چکے ہیں، پہلا اڈیشن عمدۃ المطابع برقی پریس لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہوا تھا، جس پر تاریخ اور سن طباعت مذکور نہیں ہے۔

دوسرا اڈیشن ۱۳۸۳=۱۹۶۳ میں تنویر پریس لکھنؤ سے طبع ہو کر مجلس علمی جامعہ مفتاح العلوم کی طرف سے شائع ہوا۔

اور تیسرا اڈیشن ۱۴۲۰ھ=۱۹۹۹ء میں دارالمآثر الاسلامیہ کی طرف سے شائع ہوا۔

---

(۱) اعلام: ۳۸-۳۷ (۲) اعلام: ۴۳ (۳) ایضاً: ۴۶-۴۵

اعلام مرفوعہ کے بعد کی کاوشیں:

اس رسالے کی تصنیف کے بعد بھی اس کے مصنف علام کو جہاں کہیں کوئی قول یا اثر ملتا، اس کو نوٹ کر لیتے، یہاں تک کہ اس کے دلائل میں آثار صحابہؓ وتابعین کی ایک بڑی تعداد مرتب ہوگئی، چنانچہ اس تیسرے اڈیشن میں اصل رسالے کے اختتام کے بعد تقریباً بیس صحابۂ کرامؓ اور اس سے زیادہ تقریباً پچیس تابعین عظام کے فتوے مذکور ہیں، یعنی اگر اعداد وشمار لگائے جائیں تو احادیث مرفوعہ اور آثار صحابہ وتابعین پر مشتمل پچاس سے زائد دلائل وشواہد سے وقوع ثلاث فی مجلس واحد کا مسئلہ ثابت ہوتا ہے، اور اس کے مقابلے میں مخالفین کے پاس استدلال کے لیے صرف دو حدیثیں ہیں، اور وہ بھی متن واسناد کے اعتبار سے ساقط الاعتبار۔

☆......☆......☆......☆......☆......☆......☆

الازھار المربوعہ فی رد الآثار المتبوعہ

اس کتاب کے سرورق پر نام کے بعد اس کے موضوع کے بارے میں لکھا ہوا ہے:

''جس میں ایک مجلس کی تین طلاقوں کے واقع ہوجانے کا تشفی بخش ثبوت اور فریق مخالف کے مایۂ ناز رسالہ 'آثار متبوعہ' کی تمام باتوں کا نہایت مسکت جواب پیش کیا گیا ہے''

'اعلام مرفوعہ' کی اشاعت کے بعد فریق مخالف کے خیمے میں کھلبلی مچنا کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی، اس کھلبلی کے نتیجے میں 'آثار متبوعہ' کا ظہور ہوا، جو مئو ہی ایک اہل حدیث عالم مولانا عبداللہ شائق مرحوم-متوفی ۲۸/ ذی قعدہ ۱۳۹۴ھ=۱۳/دسمبر ۱۹۷۴ء- کے کاوش قلم کا نتیجہ تھا، اس کا پورا نام 'الآثار المتبوعہ والاحکام المشروعہ لرد الاعلام المرفوعہ' تھا، جو 'اعلام مرفوعہ' کی اشاعت کے ایک سال کے بعد منصۂ شہود پر آیا تھا۔ علامہ اعظمیؒ نے 'ازہار مربوعہ' کی تمہید میں لکھا ہے کہ:

''اور ۱۶/صفر ۱۳۵۴ھ کو خود اس کے مولف نے اس کی ایک کاپی میرے پاس بھیجی''

علامہ اعظمیؒ نے اپنے اس رسالے میں مولانا شائق مرحوم کے 'آثار متبوعہ' کا بہت تفصیل سے رد کیا ہے، اور ان کے جواب کی حقیقت کو پوری طرح آشکار اور واشگاف کر کے رکھ دیا ہے۔ 'اعلام مرفوعہ' کے تعارف میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ بنارس سے آئے ہوئے ایک استفسار کے جواب میں زیب قرطاس کیا گیا تھا، اور اس کو اس وقت بنارس ہی کے لوگوں نے رسالہ کی شکل میں شائع کرایا تھا، رسالہ 'اعلام مرفوعہ' کتنا سلجھا ہوا اور سنجیدہ تھا، اس کا اندازہ مولانا علی میاں صاحب کے ان الفاظ سے لگانا چاہئے جو اس کے تعارف کی ابتدا میں نقل کیے گئے ہیں، اور اس میں یہاں تک احتیاط سے کام لیا گیا تھا کہ جماعت اہل حدیث کا نام تک نہیں لیا گیا تھا، صرف نفس مسئلہ کو توضیح وتشریح سے ثابت کیا گیا تھا، لیکن اس کو فتنہ انگیزی اور انتشار کا سبب قرار دے دیا گیا، علامہ اعظمیؒ نے رسالہ 'اعلام

کے شائع ہونے کے بعد کی تصویر یوں کھینچی ہے:

''جس وقت یہ رسالہ حضرات اہل حدیث مئو کے ہاتھوں میں پڑا، تو جو لوگ اُن میں نیک نفس اور سمجھ دار واقع ہوئے ہیں، انھوں نے تو اس کو نہایت ٹھنڈے دل سے پڑھا اور باوجود اختلافِ مسلک کے بہت زیادہ تحسین وآفریں کی، اور یہ کہا کہ اس رسالہ میں جتنی باتیں لکھی گئی ہیں، وہ بہت ٹھوس ہیں اور بے حد سنجیدگی وشائستگی کے ساتھ لکھی گئی ہیں، اب دیکھئے ہماری طرف سے اس کا کیا جواب دیا جاتا ہے؛ لیکن جو لوگ اس وسعت ظرف سے محروم ہیں، انھوں نے رسالہ کو پڑھنے سے پہلے ہی نکتہ چینی وبدگوئی شروع کردی اور احناف وغیر احناف کو اپنے مخصوص ''سیاسی'' رنگ میں یہ ذہن نشین کرانا شروع کیا کہ مصنّفِ اَعلام نے یہ رسالہ لکھ کر اتحاد باہمی کو ناقابلِ تلافی صدمہ پہنچایا ہے، اور یہ کہ بنارس کا جھگڑا خواہ مخواہ مئو میں لایا گیا۔

کوئی ان سیاسی دماغ والوں سے پوچھے کہ مصنف اعلام نے خود رسالہ کو طبع نہیں کرایا، اور تحقیقِ مسئلہ کے دوران میں جماعت اہل حدیث کے حق میں کوئی سخت کلمہ کیا معنی اس کا نام تک نہیں لیا، پھر اس رسالہ سے اتحاد باہمی میں خلل پڑنے کی کیا وجہ؟ اور مصنف رسالہ کو اتحاد شکنی کا الزام دینا کیا معنی؟ اگر یہ خیال ہو کہ اِس رسالہ میں جماعت اہل حدیث کو برا بھلا تو نہیں کہا گیا، لیکن چونکہ مسئلہ مذکورۂ بالا میں احناف کی مخالف یہی جماعت ہے اور اس رسالہ میں مخالفینِ احناف کے مسلک کو کمزور اور بے دلیل ثابت کیا گیا ہے، جس سے جماعت کو صدمہ پہنچا۔ تو میں کہوں گا کہ اتحاد کے یہ معنی کسی صاحبِ عقل کے نزدیک نہیں ہیں کہ فریقین اپنے اپنے مسلک ومذہب کو حق وصواب کہنا اور بوقتِ ضرورت حق وصواب ثابت کرنا چھوڑ دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی ایسا دقیق نظریہ نہیں ہے کہ ''سیاسی'' دماغ رکھنے والے اس کو نہ سمجھتے ہوں، لیکن کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ موقع بے موقع اتحاد واتفاق کا راگ الاپنے کے باوجود اس کو اپنے ذاتی اغراض کے لیے مضر سمجھ کر رات دن اس کو مٹانے کی خفیہ تدبیریں کیا کرتے ہیں؛ مگر اپنا عیب چھپانے کے لیے جس سے کوئی مخالفت ہوتی ہے اس کو اتحاد شکنی کی تہمت لگانے کی اور اپنا الزام اس کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کے ہر فعل کو باعث اختلاف قرار دینا چاہتے ہیں، ایسے وقت میں یا تو یہ تمیز ہی باقی نہیں رہتی کہ جس فعل کو مورد الزام بنایا جاتا ہے، وہ اس کی صلاحیت بھی رکھتا ہے یا نہیں، یا جان بوجھ کر اس سے آنکھیں بند کرلی جاتی ہیں۔

یہ بھی کتنا عجیب ماجرا ہے کہ وہی صاحب جو آج سے چند دن پہلے خود اپنی جماعت کے قابل رشک اتحاد واتفاق کو درہم برہم کرچکے ہیں، اور 'دلائل مرضیہ' 'دشنۂ حق' وغیرہ کی اشاعت کرکے اپنی اتحاد دشمنی کا ثبوت دے چکے ہیں، آج جماعت اہل حدیث کے باہمی اتحاد کا نہیں، بلکہ اہل حدیث واحناف کے اتحاد واتفاق کا ایسا حامی اپنے کو ظاہر کرتے ہیں گویا: ع

سارے جہاں کا درد انھیں کے جگر میں ہے''

مولف 'آثار متبوعۂ' نے اپنی کتاب میں جن بدگمانیوں اور غلط بیانیوں کو جگہ دی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے:

''ہر شخص کو اپنے مسائل کی چھان بنان اور اس کی اشاعت کا حق ہے، لیکن یہ اسی وقت تک محمود ہے جب تک مسئلہ مسئلہ ہی کی صورت میں رہے، اور اگر اس سے مقصود نام ونمود اور ہنگامہ آرائی ہو، تو یہی فعل انتہائی مذموم ہو جاتا ہے، مولف نے اسی دوسری صورت کو اختیار کر کے بلا وجہ فتنۂ خوابیدہ کو بیدار کیا''۔

اس کے جواب میں علامہ اعظمیؒ نے 'ازہار' کے صفحہ ۸ پر لکھا ہے:

''یہ دونوں باتیں غلط ہیں، پہلی بات کی نسبت عرض ہے کہ **إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ** (بدگمانی سے بچو، بدگمانی بڑی جھوٹی بات ہے)۔ اور دوسری کی نسبت گذارش ہے کہ احناف واہل حدیث کے تعلقات جس قسم کے پہلے تھے، ویسے ہی رسالہ کی اشاعت کے بعد بھی ہیں، اس تنگ نظری وکم حوصلگی کا کوئی علاج نہیں کہ کوئی اپنے مسلک کی تائید میں کچھ لکھے پڑھے تو اس کے مخالفین خواہ مخواہ نعل در آتش ہو جائیں''۔

علامہ اعظمیؒ نے اصل کتاب سے پہلے شروع کے بارہ (۱۲) صفحات میں مولف 'آثار' کی غلط بیانیوں سے پردہ اٹھا کر ان کا جواب دیا ہے، اسی سلسلے میں صفحہ ۸ پر لکھتے ہیں:

''یہ گیارہ غلط بیانیاں آثار متبوعہ کے صرف تین صفحوں سے میں نے پیش کی ہیں۔ اب خود سمجھ لیں کہ اس حساب سے ایک سو باون صفحوں میں کتنی غلط بیانیاں ہوں گی''[1]۔

اصل کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے، جس کی تفصیل یوں ہے:

باب اول: اس میں وقوع ثلاث مجموع کے دلائل پر مجیب صاحب -مولف آثار متبوعہ- کے واہی اعتراضات کا جواب ہے، یعنی 'اعلام مرفوعۂ' کے پہلے باب کی تائید اور 'آثار متبوعۂ' کے دوسرے باب کی تنقید۔

باب دوم: اس میں مخالفین کے دلائل پر بحث، اور 'اعلام مرفوعۂ' کے باب دوم کے متعلق مجیب صاحب نے جو گفتگو کی ہے، اس کا تحلیل وتجزیہ۔

باب سوم: اس میں آثار متبوعہ کے تیسرے باب کا جواب ہے۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، اس کا پہلا حصہ عمدۃ المطابع لکھنؤ سے ۱۳۵۵ھ میں چھپا تھا، دوسرا حصہ بھی مکمل ہو گیا تھا لیکن اس کے طباعت کی نوبت نہ آسکی تھی۔

کتاب شروع کرنے سے پہلے علامہ اعظمیؒ نے کچھ ضروری امور کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے، جو سات (۷) نکات میں منقسم ہیں، ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:

نمبر ۲ کے تحت لکھا ہے:

(۱) ازہار مربوعہ: ۸

''جن حضرات کے ہاتھ میں یہ کتاب پڑے ان سے گزارش ہے کہ اگر پوری کتاب نہیں، تو کم از کم جس مبحث کو شروع کریں، اس کو بتمامہ پڑھیں، اور 'آثار متبوعہ' کو بھی سامنے رکھ لیں، اس کے بعد کوئی رائے قائم کریں''۔

نمبر۳ کے تحت مذکور ہے:

''چونکہ صاحب آثار نے بزعم خویش ہم کو ہمارے مسلّمات سے جواب دینے کی کوشش کی ہے، اس لیے ہم نے بھی اس کا التزام کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سی باتوں کے لیے صرف مصنّفات اہل حدیث کے حوالے دیے گئے ہیں، حالانکہ ان کے لیے دوسرے مستندترین حوالے دیے جاسکتے تھے''۔

نمبر۵ کے تحت فرمایا ہے:

''مجیب نے جن مباحث کو لیا ہے، میں نے بھی انھیں پر اقتصار کیا ہے اور اپنے قلم کو بہت روک کر لکھا ہے، ورنہ اس کتاب کا حجم موجودہ ضخامت سے چند گونہ زائد ہوتا''۔

نمبر۶ کے تحت ارقام فرمایا ہے:

''مجھے افسوس ہے کہ بعض بعض مقامات میں ''تلخ نوائی'' کا اثر بھی آپ چاٹیں گے، مگر آثار متبوعہ کو سامنے رکھ کر آپ خود بخود مجھے معذور تصور فرمائیں گے''۔

نمبر۷ کے تحت رقم طراز ہیں:

''چونکہ کتاب کی ضخامت بہت بڑھ گئی ہے، اس لیے اس کو دو حصوں میں شائع کرنا مناسب معلوم ہوا، پہلا حصہ آپ کے پیش نظر ہے؛ اور دوسرا امید ہے کہ مہینے دو مہینے میں شائع ہو جائے گا، انشاءاللہ تعالیٰ''۔

'ازہار مربوعہ' پر سید سلیمان ندوی کا تبصرہ:

علامہ سید سلیمان ندوی جیسے معتدل مزاج وانصاف پسند اور بحث وتحقیق کے شیدا اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے معارف-صفر۱۳۵۶ھ=مئی۱۹۳۷ء ص:۳۹۶- میں لکھتے ہیں:

''اس بحث میں ہمارے ہندی دوست مصر کے مشہور حنفی مصری عالم شیخ نجیب سابق شیخ ازہر سے بہت آگے نکل گئے ہیں، جنھوں نے اسی بحث پر ایک رسالہ **الأبحاث في التطليقات الثلاث** لکھا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عقلیات کے علاوہ نقلیات میں بھی ہندوستان کا علم بحمداللہ مصر سے زیادہ ہے''۔

☆......☆......☆

☆......☆

'نکاح محمدی' پر ایک نظر

یہ تحریر بظاہر نامکمل ہے، جو اخبار 'محمدی' کے ایڈیٹر مولانا محمد جونا گڈھی کی کی کتاب 'نکاح محمدی' کا جواب ہے۔ 'نکاح محمدی' میں اس کے مصنف نے ایک مجلس کی تین طلاقوں کے ایک ہونے پر بزعم خویش نا قابل تردید دلیلیں پیش کی تھیں۔ علامہ اعظمیؒ نے ان دلائل کا نہایت دلچسپ، پُر زور اور بلیغ انداز میں احتساب کیا ہے، اور ثابت کر دکھایا ہے کہ ان کے دعاوی و دلائل کی حیثیت تو دۂ ریگ سے زیادہ نہیں ہے، اور پورے ذخیرۂ احادیث میں ایک بھی ایسی دلیل نہیں ہے، جس سے تین کے ایک ہونے پر استدلال کیا جا سکے۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنے مضمون میں شروع کے کئی صفحوں میں 'نکاح محمدی' کے مصنف کی زبان درازی اور بدگوئی کا شکوہ کیا ہے، نیز ان کے علمی مقام و مبلغ اور ان کے پندار کا بھی جائزہ لیا ہے، اس سلسلے میں علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''کیا آمین بالجہر، رفع یدین اور اسی طرح کے چند اور مسائل میں غیر مقلدین کے ہم خیال ہو جانے سے آدمی عامل بالحدیث اور متبع سنت ہو جاتا ہے، چاہے اس کے بعد دنیا بھر کے جھوٹ بولے، جاہلوں کو دھوکا دے، فریب کاری و خیانت کرے، علماء و صلحاء کی پگڑیاں اچھالے، حدیثوں میں کمی بیشی کرے، مسلمانوں میں فساد ڈلوائے اور صدہا قول و فعل رسول کو نہایت بے دردی سے پامال کرے؟

اور جو مسائل مذکورہ بالا میں غیر مقلدین کا ہم مسلک نہ ہو، لیکن اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں سنت کا پابند ہو اور احادیث پر عامل ہو، وہ اتباع سنت سے محروم، مخالفِ حدیث، اور نافرمانِ رسول ہے۔ یہ کہاں کا انصاف اور کیسا اندھیر ہے؟''[(۱)]۔

اس کے بعد نہایت دردمندی اور ہمدردی کے ساتھ ایڈیٹر صاحب کو اعتدال و توازن، اور تحریروں میں سنجیدگی اور شائستگی کی راہ اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جونا گڈھی صاحب! مسائل دین میں اگر آپ کی کچھ خاص ''تحقیقات'' ہیں اور آپ کے خیال میں انھیں تحقیقات کے مطابق عمل کرنے میں سنت کی پیروی ہے، تو آپ شوق سے ان کی اشاعت کیجئے، لکھئے اور چھاپئے؛ لیکن اگر کوئی آپ سے اتفاق نہیں کرتا، اور آپ کی تحقیقات میں اس کو غلطیاں نظر آتی ہیں، جنھیں وہ ظاہر کرتا ہے، تو آپے سے باہر نہ ہو جایئے، اور اول فول نہ بکنے لگئے، اور اس کی دیانت پر حملے نہ کیجئے، بلکہ اگر آپ کے پاس کوئی جواب ہے، تو اس کو سنجیدگی کے ساتھ پیش کیجئے۔

ایک مجلس کی تین طلاقوں کے باب میں اگر آپ کی تحقیق کے خلاف مولوی محمد شفیع صاحب دیوبندی نے کچھ لکھا، تو یہ بگڑنے کی کیا بات تھی؟ آپ اگر اس کا جواب لکھنے کی ضرورت محسوس کرتے

(۱) مقالات: ۱/۳۰۹-۳۰۸

تھے، تو آدمیت کے ساتھ جواب دیجئے، تہذیب کے ساتھ بات کیجئے، اور بدزبانی کے بجائے دلائل پیش کیجئے''۔[(۱)]

مولانا محمد جوناگڈھی کے استدلالات میں حدیث واقوال وآثار صحابہ تو کجا، انھوں نے بعض فقہی عبارتوں، فتاویٰ کی کتابوں اور اوٹ پٹانگ باتوں کو دلیل قرار دیا ہے، اور علامہ اعظمیؒ نے ان سب کے چیتھڑے بکھیر کر رکھ دیے ہیں، چنانچہ ان کی سب سے مضبوط دلیل پر چیلنج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں ایڈیٹر صاحب اور ان کے تمام ہم خیالوں کو چیلنج کرتا ہوں، چوری چھپے نہیں، ڈنکے کی چوٹ پکار کر کہتا ہوں کہ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو کہ تمھارے نزدیک کتاب وسنت کے سوا کوئی چیز دلیل نہیں ہے، تو سب چھوٹے بڑے مل کر اس روایت میں آنحضرت ﷺ کا قول یا آپ کا فعل یا اطلاع پا کر کم از کم خاموش رہنا کسی حدیث کی کتاب سے ثابت کرو، اور اگر نہ کر سکو- اور قیامت تک نہ کر سکو گے- تو اپنے اس دعوے سے دستبردار ہو جاؤ، اور اقرار کرو کہ امتیوں کے قول وفعل کو ہم اہل حدیث دلیل وحجت بناتے ہیں، پھر بتقاضائے غیرت اس روایت کو اپنے دلائل میں سے نکال ڈالو''[(۲)]۔

اسی کی نسبت علامہ اعظمیؒ نے آگے لکھا ہے:

''حضرات غیر مقلدین غور کریں کہ جب تک اپنی طرف سے بلا دلیل ''ایک ساتھ دی ہوئی'' اور ''ایک شمار ہوتی تھیں'' کا اضافہ نہیں کیا جاتا ہے، اس وقت تک بات نہیں بنتی، تو یہ حدیث سے استدلال ہوا یا من گھڑت اضافہ ہے؟''[(۳)]۔

علامہ اعظمیؒ نے اس میں ان کے بعض دلائل کے ساتھ ساتھ علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن القیم کی عبارتوں کا بھی تحلیل وتجزیہ کیا ہے، نیز مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی طرف سے دفاع بھی کیا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

دیوبندیوں سے چند سوالات کا جواب

یہ تحریر ۱۳۴۷ھ یا اس کے بعد کی ہے، کیونکہ اس کے خاتمہ پر علامہ اعظمیؒ کے نام کے ساتھ ''صدر مدرس مدرسہ مفتاح العلوم، مئو'' لکھا ہوا ہے، اور مفتاح العلوم کا عہدۂ صدارت آپ نے ۱۳۴۷ھ میں سنبھالا تھا۔ یہ مولوی یوسف فیض آبادی کے سوالات کا جواب ہے، جس میں مولوی صاحب نے علماء دیوبند کے سامنے تقریباً وہ سوالات رکھے تھے، جن کے ذریعے رضاخانی لوگ دیوبندیوں پر اعتراض کیا کرتے ہیں۔ علامہ اعظمیؒ نے ان کے سوالات کا جواب اختصار کے ساتھ مگر نہایت مدلّل دیا ہے، جو حد درجہ بصیرت افروز اور چشم کشا ہے، اور ان جوابات کے بعد مولوی یوسف صاحب کے سوالات کی حیثیت پر کاہ سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔

(۱) مقالات: ۳۰۹/۱ (۲) ایضاً: ۳۱۶/۱ (۳) ایضاً: ۳۱۸

یہ جواب کتابچہ یا رسالہ کی شکل میں عمدۃ المطابع برقی پریس لکھنؤ سے بھی چھپا ہے، اور پھر 'مقالات ابوالمآثر' میں بھی - از صفحہ ۱۲۷/ تا صفحہ ۱۴۵ - شامل کیا گیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنی اس تحریر کا آغاز ان جملوں سے کیا ہے:

''حال میں مولوی یوسف صاحب فیض آبادی نے ایک اشتہار شائع کیا ہے، جس کا عنوان ہے ''دیوبندیوں سے چند سوالات''۔ ایک دوست کی معرفت مجھ کو بھی اس اشتہار کے دیکھنے کا موقع ملا، اشتہار دیکھنے سے پہلے یہ خیال تھا کہ شاید مولوی صاحب نے کچھ نئے سوالات کیے ہوں گے؛ لیکن اشتہار پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ آپ نے انھیں سوالات کا اعادہ کیا ہے، جس کا ہماری طرف سے بار بار جواب دیا جا چکا ہے۔ اس لیے ان سوالات کے جواب کی کوئی ضرورت نہ تھی، لیکن صرف اس خیال سے کہ ممکن ہے کہ مولوی صاحب اپنی کوتاہ نظری کے سبب ان سوالات کو لاجواب سمجھ رہے ہوں، اور ان کے جوابات سے واقف نہ ہوں، یہ سطریں حوالۂ قلم کی جاتی ہیں''(۱)۔

یہ کل بارہ سوالات تھے، پہلا سوال امام ابوحنیفہؒ کے اقوال کی تنقید کے متعلق تھا، دوسرا سوال تقلید شخصی کے متعلق، تیسرا سوال امکان کذب باری کے متعلق، چوتھا سوال علم غیب نبی کے متعلق، پانچواں سوال براہین قاطعہ -مصنّفہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری- کی ایک عبارت کے متعلق، چھٹا سوال ایمان کے گھٹنے اور بڑھنے کے متعلق، ساتواں سوال حنفیہ کے نزدیک صحابی کو گالی دینے والے کا ہے، آٹھواں سوال محارم سے نکاح کر کے صحبت کرنے والے کی سزا کے متعلق ہے، نواں سوال کتے کے نجس العین ہونے اور نہ ہونے کا ہے، دسواں خنزیر کے نجس العین ہونے سے متعلق ہے، گیارہواں سوال خوف زنا کے وقت جلق کے حکم کے متعلق ہے، بارہواں اور آخری سوال متاجرہ سے زنا کی سزا کا ہے۔ اور علامہ اعظمیؒ نے تمام سوالات کے جوابات نہایت مستند اور ٹھوس حوالوں سے دیے ہیں، اگرچہ ان جوابات میں اختصار کو بطور خاص ملحوظ رکھا گیا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

مولوی ثناء اللہ صاحب اور بحث تقلید

یہ مضمون جماعت اہل حدیث کے شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کے ایک اشتہار کا جواب ہے، جس میں مولانا امرتسری کے تقلید و عدم تقلید سے متعلق متعدد دعووں اور مزعومات کو نقل کر کے ان کا علم و تحقیق کی روشنی میں تحلیل و تجزیہ کیا گیا ہے، مولانا امرتسری 'اہل حدیث' کے ایڈیٹر تھے، اور اس میں احناف کے خلاف ہمیشہ گل افشانی کیا کرتے تھے۔ احناف پر ان کے اعتراضات کا علامہ اعظمیؒ برابر تعاقب کرتے رہے، علامہ اعظمیؒ کی ان ہی جوابی تحریروں میں پیش نظر رسالہ بھی ہے۔ اس تحریر کا آغاز درج ذیل عبارت سے ہوتا ہے:

(۱) مقالات: ۱/ ۱۲۷

''ہمارے فاضل مخاطب مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری کی عجیب وغریب عادتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ خود کوئی اختلافی بحث چھیڑ کر مسلمانوں کی خاموش مذہبی فضا میں ہنگامہ پیدا کرتے ہیں، لیکن جب ان کی بحثوں کی قلعی کھلنی شروع ہوتی ہے، تو شور مچانے لگتے ہیں کہ 'اشتہار پر اشتہار نکلنے شروع ہوئے' (اہل حدیث مورخہ ۴؍ اگست ۴۴ء)''[۱]۔

علامہ اعظمیؒ نے مولانا امرتسری کی دوسری اس عادت کی شکایت کی ہے کہ جب ان کے اعتراضات کا جواب دیا جاتا ہے، تو سخت زبانی کی شکایت کرتے ہیں، حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

اور تیسری عادت یہ ذکر کی ہے کہ ان سے جب کسی بات کا جواب نہیں بنتا، تو اِدھر اُدھر کی دوسری باتوں سے کاغذ کے صفحات کو پُر کر کے عوام پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم نے جواب دے دیا۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنی اس تحریر میں تقلید وغیرہ کے متعلق متعدد ایسے سوالات کا ذکر کیا ہے، جن کو مولانا امرتسری کی خدمت میں انھوں نے بار بار پیش کیا تھا، لیکن مولانا کی طرف سے ان کا کوئی جواب نہیں دیا گیا، اور وہ ان کے جواب سے ہمیشہ پہلو بچاتے رہے، چنانچہ علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''یہاں پہنچ کر ان باتوں کی فہرست پیش کر دینا بھی دلچسپی سے خالی نہیں، جن کا جواب دینے سے مولوی صاحب برابر دامن بچاتے چلے آرہے ہیں''[۲]۔

اس کے بعد دس سوالات کی فہرست پیش کی ہے، جن کا بار بار تقاضے کے باوجود مولانا ثناء اللہ صاحب کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا، ان میں پہلا سوال یہ ہے:

''میں نے مولوی صاحب سے سوال کیا تھا کہ آج کل جو لوگ علل ورجالِ حدیث پر عالمانہ بحث کرتے ہیں، ان پر امام بخاری وغیرہ کی تقلید کسی حدیث کی تصحیح وتضعیف یا اثباتِ شذوذ ونکارت میں واجب ہے یا نہیں......، مولوی صاحب نے یاد دلانے کے باوجود اس کا آج تک جواب نہیں دیا''[۳]۔

اور سب سے آخر میں دسویں نمبر پر لکھا ہے:

''ہم نے لکھا تھا کہ مولوی صاحب نے اپنے رسالہ 'تقلید شخصی وسلفی' میں امام زُفر کو بمقابلہ امام ابو یوسف وامام محمد سب سے چھوٹا نوجوان لکھا ہے، جو بالکل غلط ہے اور مورخین کی تصریحات کے خلاف ہے۔ اس کا بھی کوئی جواب وہ نہ دے سکے''[۴]۔

مولانا امرتسری نے چونکہ حضرت شیخ الہند کے خرمن علم ومعرفت سے خوشہ چینی کی تھی، اور وہ ان کے اولین تلامذہ میں ہونے کی وجہ سے خود کو حضرت امام ابوحنیفہ کے اجلّہ تلامذہ سے تشبیہ دیتے ہوئے بمنزلہ امام ابو یوسف وامام محمد کے اور حضرت شیخ الہند کے دوسرے تلامذۂ دیوبند کو بمنزلہ امام زُفر کے قرار دیتے ہیں، علامہ اعظمیؒ نے ان کے اس دعوے کا منطقی وتحقیقی رد کرتے ہوئے اس کی حقیقت کو واضح کیا ہے، آپ نے ان کے اس

(۱) مقالات: ۱؍۳۵۷ (۲) ایضاً: ۱؍۳۵۸ (۳) ایضاً: ۳۵۹-۳۵۸ (۴) ایضاً: ۳۶۰

دعوے کا جواب بہت تفصیل سے کئی صفحے میں دیا ہے، جس کا ایک فقرہ یہ ہے:

''مولوی ثناء اللہ صاحب کا عمر کی بڑائی کے لحاظ سے اپنے کو امام ابو یوسف سے تشبیہ دینا اور ان کو عمر میں سب سے بڑا سمجھنا اس بات کی دلیل ہے کہ شاگردانِ شیخ الہند میں مولوی صاحب بلحاظ علم سب سے کمتر ہیں، اس لیے کہ امام ابو یوسف شاگردانِ امام میں بلحاظ عمر سب سے بڑے نہ تھے، بلکہ وہ امام زفر سے سات یا دس سال چھوٹے تھے''[۱]۔

اس کے بعد مولانا امرتسری کی بہت سی علمی و تاریخی غلطیوں کو واشگاف کیا ہے۔ مولانا امرتسری نے تقلید پر تعریض کرتے ہوئے بطور تمثیل کے مثنوی سے مولانا روم کا ایک شعر نقل کیا تھا۔ علامہ اعظمیؒ نے اس کا بھی نہایت شاندار جواب دیا ہے، اور مثنوی کے دسیوں اشعار نقل کر کے ان کے استدلال کا کاٹ کیا ہے۔

یہ ۱۹۴۴ء یا اس کے بعد کا تحریر فرمودہ ہے، اور اسی زمانے میں سلیمانی پریس بنارس سے ایک مستقل رسالے کی شکل میں شائع ہوا تھا۔ مقالات ابوالمآثر - جلد اول - میں از صفحہ ۳۵۷ تا صفحہ ۳۶۸ بھی شائع ہو چکا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

قادیانی مرتد کی سنگساری

مولوی ثناء اللہ کی غم گساری

افغانستان کے دارالسلطنت کابل میں ایک قادیانی کو ارتداد کی پاداش میں سنگسار کیا گیا تھا۔ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری نے اس سزا پر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے 'اہلحدیث' ۳ / ربیع الاول ۱۳۴۳ھ کی اشاعت میں ایک مضمون لکھ کر اس میں قتل مرتد کو خلاف شریعت قرار دیا۔ علامہ اعظمیؒ نے مولانا امرتسری کے مضمون کا تعاقب کیا، اور ان کے جواب میں یہ تحریر سپردِ قلم فرمائی۔ اس میں آپ نے حدیث و فقہ کے نہایت مستند اور معتبر حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہوتی ہے۔

اس میں علامہ اعظمیؒ نے اپنی تمہید کے بعد فقہ حنفی کی کتاب 'درمختار' سے ارتداد کی یہ تعریف نقل کی ہے: **إجراءُ كلمةِ الكفرِ على اللسانِ بعد الإيمانِ** (یعنی ایمان لانے کے بعد کلمۂ کفر زبان پر جاری کرنا ارتداد ہے)۔ اس کے بعد مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری نے ''مرتد عن الاسلام'' کا جو معنی بیان کیا ہے، اور اس معنی و مفہوم کی روشنی میں قادیانی کے قتل پر احتجاج کیا ہے، علامہ اعظمیؒ نے اس کو نقل کر کے ان کے بیان کردہ معنی و مفہوم کا رد کیا ہے، اور 'درمختار' سے جو مفہوم نقل کیا ہے، اس کے استناد کے لیے علامہ ابن القیم کی عبارت بطور خاص نقل کی ہے۔ پھر مرتد کے گردن زدنی ہونے پر متعدد مرفوع احادیث سے استدلال کیا ہے۔ احادیث و آثار اور فقہی

(۱) مقالات: ۱/ ۳۶۱

عبارات سے مدلّل ۹ رصفحات پر مشتمل یہ نہایت اہم اور پُر مغز مضمون ہے۔

علامہ اعظمیؒ کا یہ مضمون 'القاسم' - امرتسر - میں ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ = ۱۰ رنومبر ۱۹۲۴ء کے شمارے میں اشاعت پذیر ہوا تھا، 'مقالات' میں صفحہ ۳۷۱ تا صفحہ ۳۸۰ شائع ہوا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد

اکتوبر ۱۹۲۷ء کے کسی شمارے میں اخبار 'محمدی' کے اڈیٹر نے درمختار کی ایک عبارت نقل کر کے اس کی بنیاد پر فقہ حنفی کو ہدف ملامت بنانے کی مذموم کوشش کی تھی، درمختار کی عبارت یہ ہے:

وفي المجتبى: تزوج بمحرمة، أو منكوحة الغير، أو معتدته، ووطئها ظاناً الحل، لا يُحدُّ، ويُعزَّرُ.	یعنی مجتبی میں مذکور ہے کہ کسی نے اپنی ماں بہن سے نکاح کرلیا، یا دوسرے کی بی بی، یا دوسرے کی عدت میں بیٹھی ہوئی عورت سے نکاح کرلیا اور ہم بستری کی، اور یہ جان کر ایسا کیا کہ ان عورتوں سے ایسا کرنا جائز ہے اور حلال؛ ایسی صورت میں اس شخص پر حد نہ لگائی جائے گی، بلکہ تعزیر کی جائے گی۔

'درمختار' کی مذکورہ بالا عبارت میں اڈیٹر 'محمدی' نے یہ کارستانی کی کہ ''**وطئها ظاناً الحل**'' اور ''**يعزر**'' کو حذف کر کے نامکمل نقل کیا، جس سے مسئلے کی نوعیت بالکل بدل کر رہ گئی، علامہ اعظمیؒ نے ان کی اس کارروائی پر ''کھلی چٹھی بنام اڈیٹر محمدی''، لکھی، جو ۲۹ راکتوبر ۱۹۲۷ء کے 'العدل' میں شائع ہوئی؛ اس چٹھی کے جواب میں اڈیٹر 'محمدی' نے لکھا کہ میں نے جو لکھا ہے وہ فقہ حنفی میں موجود ہے۔ اس کے بعد ہی علامہ اعظمیؒ نے پیش نظر مضمون تحریر فرمایا۔

علامہ اعظمیؒ اپنے مضمون میں ارقام فرماتے ہیں:

''درحقیقت صرف دو لفظوں کا مطلب سمجھ لینے کے بعد مسئلہ کی تشریح کی بھی ضرورت نہ رہ جائے گی؛ مسئلہ میں ایک ''حد'' کا لفظ ہے، جس کے معنی اصطلاحِ فقہ میں اس سزا کے ہیں، جو کسی مذہبی جرم کے لیے قرآن یا حدیث میں ایک خاص نوعیت کے ساتھ وارد ہوئی، مثلاً: چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا، شرابخواری کی سزا اسی (۸۰) کوڑے لگانا وغیرہ، یہ سزائیں کم وبیش ادل بدل نہیں ہوسکتیں؛ دوسرا لفظ تعزیر ہے، اس سے فقہ میں وہ سزا مراد ہوتی ہے، جو مقرر نہیں ہے اور نہ جس کی کوئی خاص حد معین ہے، یہ جرائم کے معمولی وغیر معمولی ہونے کے لحاظ سے کم وبیش ہوتی ہے، اور نوعیتیں بھی مختلف ہوتی ہیں، کوڑے لگانے ہوں تو تعزیر میں ۳-۳۷ کوڑے تک لگائے جاسکتے ہیں، اس سے زیادہ نہیں؛ اگر اس سے زیادہ ضرورت ہو تو قید وبند سے قتل تک جائز ہے''۔

چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں:

''اس کے بعد اب درمختار کی عبارت پھر ایک بار پڑھئے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کا صاف اور کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ جس نے اپنی ماں، بہن، یا غیر کی بی بی، یا دوسرے کی مطلقہ سے عدت میں نکاح کیا، اوران سے وطی کرنے کو حلال سمجھ کر-غلطی سے-صحبت کر لی، تو اس شخص کو زنا کار کی مقررہ سزا نہ دی جائے گی، بلکہ حاکمِ اسلام اس کے علاوہ اور جو سزا مناسب سمجھے، دے؛ اس کے بعد مذکور ہے کہ اگر اس شخص نے اس کو حرام جانتے ہوئے کیا، تو بھی امام صاحب کے نزدیک اس کو مذکورہ بالا طریق ہی سے سزا دی جائے گی''۔

اس کے بعد علامہ ابن الہمام کی ایک عربی عبارت نقل کر کے فرماتے ہیں:

''یعنی امام صاحب اور سفیان اور زفر کے نزدیک عام زانیوں کی مقررہ سزا واجب نہیں ہوتی، چاہے وہ کرنے والا یہی کیوں نہ کہے کہ میں نے حرام جان کر کیا ہے، لیکن اس کو ایسی عبرتناک سزا دینا ان بزرگوں کے نزدیک واجب ہے، جو انواعِ تعزیر میں سب سے سخت و ناقابلِ برداشت ہو''۔

آگے یہ اشکال وارد کر کے کہ جب ہمارے ہاں کوئی نہ کوئی سزا واجب ہے، تو وہی عام سزا کیوں نہیں دی جاتی؟ اس کا یہ جواب تحریر فرمایا ہے:

''یہ مسئلہ فقہاءِ اسلام میں اجماعی ہے کہ حتی الوسع حدود کو دفع کرنا اولیٰ ہے، چنانچہ ہر امام نے کسی نہ کسی صورت میں اس کا لحاظ کیا ہے، یہ اور بات ہے کہ کسی خاص بات کے وجہِ اندفاعِ حد ہونے پر سب کا اتفاق نہ ہو، لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہر امام کسی نہ کسی بات کو شبہہ (وجہِ اندفاع) قرار دے کر بہت سی صورتوں میں حد کو واجب نہیں قرار دیتا''۔

اس کے بعد **ادرؤوا الحُدودَ بالشُّبُهات** کے مضمون کی سات آٹھ احادیث وآثار، نیز حضرت ماعز اسلمیؓ اور غامدی عورت کے اعترافِ زنا، اور آپ ﷺ کے ان کو بار بار ٹالنے کے واقعے کو ذکر کر کے لکھا ہے:

''جب یہ معلوم ہو گیا کہ کمزور سے کمزور شبہہ کی وجہ سے بھی حد اٹھا دی جاتی ہے، تو معلوم ہونا چاہئے کہ ان صورتوں میں بھی ایک شبہہ موجود ہے، جس کی وجہ سے امام صاحب نے ایجاب حد میں احتیاط کیا ہے، اور وہ صورت نکاح کا پایا جانا ہے، اگرچہ وہ صحیح نہیں ہوا، تاہم صورت تو ایجاب وقبول کی پائی گئی، اس شبہہ کا نام فقہ میں شِبہ عقد ہے، جس کی نسبت شامی میں مذکور ہے: **ما وُجد فيه العقد صورةً لا حقيقةً، لأن الشبهة –كما مر– ما يشبه الثابت وليس بثابت**''.

اور درج ذیل عبارت پر مضمون کو ختم فرماتے ہیں:

''حدیث سے بھی یہی ثابت ہے کہ اس صورت میں حد نہیں ہے، اس لیے کہ یہ تو ایک معمولی لیاقت کا آدمی بھی جانتا ہوگا کہ شریعتِ اسلامی میں حدِّ زنا، یا سو کوڑے لگانا یا سنگسار کرنا ہے، اس کے

علاوہ کوئی تیسری حد نہیں ہے، اور حدیث بھی وارد ہے کہ جو شخص اپنے محارم سے وطی کرے، اس کو قتل کردو۔ یہ ظاہر ہے قتل زنا کی ان دونوں حدوں سے ایک بھی نہیں ہے، لہذا یہ سزائے قتل تعزیر کے نام سے پکاری جائے گی، حد نہ کہلائے گی۔

پس معلوم ہوا کہ اپنی ماں بہن سے نکاح کرنے والے اور ان سے وطی کرنے والے پر حد نہ لگائی جائے گی، بلکہ وہ تعزیر کا مستحق ہے۔''

☆......☆......☆......☆......☆

احمدیوں کی ذلت وخواری پر محمدیوں کی بے قراری

علامہ اعظمیؒ نے اس مضمون کا سبب نگارش یہ بیان فرمایا ہے کہ:

''یکم مارچ ۱۹۲۷ء کے اخبار 'محمدی' میں ابومحمد عبدالجبار کے نام سے ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس کا عنوان یہ قائم کیا گیا ہے (حنفیت اور مرزائیت کا بعض خصوصی عقائد میں اتحاد واتفاق)''[۱]۔

حضرت مولانا مرتضی حسن صاحب چاند پوریؒ -متوفی ۱۳۷۱ھ = ۱۹۵۱ء- دار العلوم دیوبند کے ناظم تعلیمات تھے، آپ کی ذات فرق ضالہ کے لیے بالعموم اور قادیانیوں کے لیے بالخصوص شمشیر بُرّاں تھی، ان کے مناظرے اور کتب ورسائل باطل فرقوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے لیے سد سکندری تھے، اور قادیانیوں کی بابت تو علامہ اعظمیؒ نے فرمایا ہے کہ:

''اور باخبر حضرات جانتے ہیں کہ مولانا -مرتضی حسن چاند پوری- کی ان تالیفات نے مرزائیوں کی کمر توڑ دی ہے''[۲]۔

لیکن مولانا مرتضی حسن کا یہ جہاد اور ان کی یہ معرکہ آرائی بعض جماعتوں کے قلب وجگر پر بہت شاق گزری، اور انھوں نے مولانا کی ذات کو نشانہ بنایا، جیسا کہ علامہ اعظمیؒ اپنے اسی مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

''احمدیوں سے تو کچھ ہو نہ سکا، لیکن ان کے بھائی محمدیوں نے ان کی اس حالتِ بے کسی اور عالمِ مجبوری پر برادرانہ غم خواری کی، اور علم حمایت بلند کیا۔ 'تحقیق الکفر والایمان بآیات الفرقان' اور 'اشد العذاب علی مسیلمۃ الپنجاب' کی عبارتیں نقل کر کر کے اخبار محمدی دہلی اور اخبار اہل حدیث امرتسر میں ان پر بحث کرنا شروع کردیا گیا''[۳]۔

اسی قبیل سے اخبار محمدی کا مذکور الصدر مضمون بھی ہے، جو ابومحمد عبدالجبار کے نام سے شائع ہوا ہے، اس میں مضمون نگار نے نہایت ستم ظریفی اور ناروا جسارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مولانا مرتضی مرحوم کی ذکر کردہ دونوں کتابوں سے متعدد عبارتیں نقل کرکے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ان میں حنفی بھی مرزائیوں کے شریک ہیں۔

(۱) مقالات: ۳۸۳/۱ (۲) ایضاً: ۳۸۴/۱ (۳) ایضاً: ۳۸۴/۱

علامہ اعظمیؒ نے اخبار ’محمدی‘ میں شائع ہونے والے اس مضمون کا نہایت دندان شکن جواب دیا اور یہ ثابت کیا کہ مضمون نگار کی تحریر اتہام و بہتان کے سوا کچھ نہیں ہے، بطور نمونہ کے صرف ایک الزام اور اس کے جواب کا ایک حصہ درج ذیل ہے:

مولانا مرتضی حسن صاحب نے ’اشد العذاب‘ میں تحریر فرمایا ہے:

”نمبر ۱۱: قرآنی حکم ہے کہ اگر تم میں جھگڑا ہو، تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرنا چاہئے؛ لیکن شریعت مرزائیہ میں یہ حکم منسوخ ہوگیا اور حکم یہ ہے کہ ہر امر میں مرزا صاحب کو حَکَم قرار دینا چاہئے (ص ۱۷)“۔

مولانا چاند پوری کی اس تحریر پر ریمارک کرتے ہوئے اخبار محمدی کے مضمون نگار نے لکھا کہ تھوڑی ترمیم کے ساتھ یہی عقیدہ حنفیہ کا بھی ہے، اور ترمیم میں اس نے ’شریعت مرزائیہ‘ کے بجائے ’شریعت حنفیہ‘ اور ’مرزا صاحب‘ کے بجائے ’امام ابوحنیفہ‘ رکھ کر لکھا ہے کہ احناف میں کوئی تو منھ سے بھی ایسا کہتا ہے اور کوئی صرف عملاً ثبوت دیتا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس دریدہ ذہنی کے جواب میں تحریر فرمایا کہ جب حنفیت و مرزائیت کے بعض عقائد میں اتحاد کا دعوی کیا ہے تو مضمون نگار کو چاہئے تھا کہ بانی مذہب حنفیہ یا اصول حنفیہ سے اس عقیدہ کو ثابت کرتا جس میں اس نے اشتراک کا دعوی کیا تھا، پھر لکھا ہے کہ:

”تم کو معلوم نہیں کہ تمھارے دعوی کی تکذیب کتب حنفیہ میں موجود ہے، غور سے سنو! ہمارے امام عالی مقام فرماتے ہیں: **ليس لأحد أن يقول برأيه مع نص عن كتاب الله، أو سنة عن رسول الله، أو إجماع عن الأمة.** یعنی کسی کو یہ اختیار نہیں کہ خدا اور سول کے فرمان یا اجماع امت کے ہوتے ہوئے کچھ اپنی رائے سے کہہ سکے۔

اسی پیکرِ تقدس کا یہ ارشاد بھی ہے: **ما جاء عن الله ورسوله لا نتجاوز عنه.** یعنی خدا اور سول کے فرمان سے ہم ذراہٹ نہیں سکتے ٹل نہیں سکتے۔ قرآن وحدیث تو قرآن وحدیث ہی ہیں، حضرت امام علیہ الرحمہ صحابۂ کرام -رضی اللہ عنہم- کے اقوال مبارکہ کو بھی اپنے قول پر ترجیح دیتے تھے، اور جس بارہ میں کسی صحابیؓ کا کوئی فتوی موجود ہوتا تھا، اس میں اس فتوے ہی کو اختیار کرتے تھے۔

امام اعظم کے یہ ارشادات گرامی معلوم ہونے کے بعد اس عقیدہ کی نسبت ہماری طرف سراسر تہمت اور افترا ہے، یہ معلوم ہے کہ ہم امام اعظم کی فقہ پر کاربند ہیں اور امام اعظم کا طریقِ استخراجِ مسائل معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن وحدیث تو بڑی چیزیں ہیں، صحابۂ کرامؓ کے اقوال کے مقابلہ میں بھی اپنی رائے و قیاس کو معطل کر دیتے تھے؛ پس جب امام اور متبوع اس الزام سے بری ہے، تو واقعی مقلد اور سچا تابع بھی اس سے یقیناً پاک ہے“[1]۔

---

(۱) مقالات: ۱/۳۸۶-۳۸۵

بناء عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

اخبار 'اہل حدیث' کی کئی قسطوں میں مولانا ابراہیم سیالکوٹی کا ایک مضمون بعنوان ''مذاکرۂ علمیہ بابت بناء عائشہ صدیقہ'' شائع ہوا تھا[1]، مولانا سیالکوٹی نے اپنے اس مضمون میں ''بناء'' کے اُس عام مفہوم سے ہٹ کر جو محاورۂ عرب میں رائج ہے-یعنی زفاف اور صحبت مخصوصہ- ایک دوسرا مطلب اور مفہوم بیان کرنے کی کوشش کی تھی، یعنی انھوں نے ''بناء'' کو رخصتی کے معنی پر محمول کیا تھا۔ علامہ اعظمیؒ نے مولانا مرحوم کے بیان کردہ اس مفہوم پر نہایت تفصیل سے نقد کیا ہے، اور کتب حدیث ولغت سے ثابت کیا ہے کہ ''بناء'' محاورۂ عرب میں ''صحبت مخصوصہ'' کے معنی ومفہوم کے لیے بولا جاتا ہے، چنانچہ اپنے مضمون کی ابتدائی سطروں میں تحریر فرماتے ہیں:

''میں نے جہاں تک غور کیا اور اسفار احادیث وکتب لغت کی ورق گردانی کی، اسی نتیجہ پر پہنچا کہ ''بناء عائشہ'' کا صحیح مطلب وہی ہے، جو عام طور پر علماء سمجھتے ہیں، یعنی صحبت مخصوصہ اور زفاف متعارف؛ اگر بالفرض رخصتی کے معنی میں لفظ ''بناء'' محاورۂ عرب میں مستعمل ہی ہوتا ہو، تو بھی میرے نزدیک اس واقعہ میں متعدد قرائن اور کئی وجہوں سے اس کا مشہور ہی معنی مراد لینا متعین ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا ممدوح نے بنا کا جو مطلب بیان کیا ہے، اس کا کتب لغت میں نشان تک نہیں ہے۔''

اس کے بعد فرماتے ہیں:

''(بنا) کے اصل معنی تو لغت میں مکان بنانے کے ہیں، لیکن جب وہ ''علی'' یا ''ب'' کے ساتھ اہل یا اس کے ہم معنی کسی لفظ کی طرف متعدی ہوتا ہے، تو اس وقت اس کے معنی دخول بالزوجۃ وصحبت مخصوصہ یا زفاف متعارف کے ہوتے ہیں۔''

اس محاورہ کی اصل اور اس کی بنیاد کیا ہے؟ اس پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:

''اس محاورہ کی اصلیت یہ ہے کہ رسم تھی کہ جب کوئی پہلے پہل اپنی بیوی سے ملتا، تو زفافِ متعارف کی شب ایک خیمہ ڈالتا یا قبہ بناتا، اور اسی میں بیوی سے ہم بستر ہوتا، اس کی حکایت اہل عرب کرتے، تو کہتے: بنى فلان على أهله، يا بأهله؛ چونکہ اس فعل مخصوص کی تصریح تقریباً ہر جگہ مستنکر ومستقبح ہے، اس لیے اس کی تصریح کے بجائے یہی کہتے تھے: ''فلاں نے اپنی بیوی پر خیمہ ڈالا''، مگر مقصود وہی ہوتا تھا۔ ہوتے ہوتے اس میں توسع ہوا اور ہر زفاف کے موقع پر یہی محاورہ استعمال ہونے لگا، اور جو

(۱) مولانا سیالکوٹی کا یہ مضمون ۱۳۴۳ھ=۱۹۲۴ء کے ربیع الثانی وجمادی الاولی وغیرہ کے کئی نمبروں میں ۵؍قسطوں میں شائع ہوا تھا، اس کی پہلی قسط ۷؍نومبر ۱۹۲۴ء کے شمارے میں، اور آخری قسط ۷؍جمادی الاولی ۱۳۴۳ھ = ۵ دسمبر ۱۹۲۴ء کے 'اہل حدیث' میں شائع ہوئی تھی۔ مولانا سیالکوٹی کے اس مضمون کے بعد اس پر ایک بحث چل پڑی تھی، جس کی تائید اور مخالفت میں کئی مضامین اُس وقت کے 'اہل حدیث' میں شائع ہوئے تھے۔

اپنی بی بی سے پہلی مرتبہ ہم صحبت ہو، خیمہ ڈالے یا نہ ڈالے، اس کو **بانٍ، یا بـانٍ بأهله، یا علی أهله** کہنے لگے۔''

اس کے بعد عینی، مجمع البحار، لسان العرب، نہایہ، الدر النثیر، المصباح المنیر اور اساس البلاغۃ جیسی کتب لغت سے اس لفظ کے متعلق عبارتوں کو نقل کر کے ارقام فرمایا ہے:

''اب بغور سنئے! کہ **بنی الرجل علي أهله** کا ایک لفظی ترجمہ ہے، یعنی مرد نے اپنی بیوی پر گھر بنایا، یا خیمہ ڈالا، اور اس کے دونوں مواقع استعمال - زفاف بصورت مخصوص یعنی خیمہ ڈال کر اور عام زفاف - کے لحاظ سے اس کا ایک کنائی معنی ہے، یعنی صحبت مخصوصہ۔ ان کے علاوہ کسی تیسرے معنی کا سراغ کتب لغت میں نہیں لگتا، اور ظاہر ہے کہ قصۂ عائشہ صدیقہؓ یا اس کے مثل اور مقامات میں لفظی معنی کسی طرح مراد نہیں ہوسکتا؛ پس جب اس کا احتمال ہی نہیں ہے، تو دوسرے کنائی معنی کے تعین میں کیا شک ہے، اس لیے کسی تیسرے معنی کا وجود ہی نہیں۔''

ان تمام باتوں سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ جن روایتوں میں زواج حضرت عائشہؓ کے واقعہ میں **بنی بـي وأنا بنت تسع سنین، یا بـنـی بها و هي بنت تسع سنین** مذکور ہے، اس سے صرف رخصتی نہیں بلکہ زفاف متعارف مراد ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''الحاصل ان تحقیقات سے بخوبی واضح ہوگیا کہ **بـنـی بها یا بـنـی علیها** کے معنی معتبراتِ لغت سے صرف زفاف متعارف ثابت ہوتے ہیں، اور اس محاورہ کے کسی دوسرے معنی کا سراغ معتبراتِ لغت سے نہیں لگتا، اس لیے ذیل کی حدیثوں میں جو **بـنـی بي یا بـنـی بهـا** وارد ہوا ہے، اس سے زفاف متعارف ہی مراد ہے۔ وہ حدیثیں یہ ہیں:

عـن عـائشة قالت: تزوجني رسول الله ﷺ في شوال، وبنى بي في شوال، فأي نسـاء رسـول الله ﷺ أحـظـى عـنـده مني! قال: وكانت عائشة تستحب أن تُدخِلَ نساءَ ها في شوال (مسلم وغیرہ)۔

عـن عـائشة أن الـنبـي ﷺ تـزوجها وهي بنت ست سنين، وبنى بها وهي بنت تسع سنين. قال هشام: وأنبئت أنها كانت عنده تسع سنين (بخاری ۲/۷۷۱)۔

جب معتبرات لغت سے اس محاورہ کے معنی زفاف متعارف کے سوا اور کچھ ثابت نہیں ہیں، تو ضرورت نہیں کہ ان حدیثوں میں زفاف متعارف مراد لینے کے لیے قرائن ذکر کیے جائیں، پھر بھی ہم صرف تبرعاً وتائیداً اس معنی کے قرائن ذکر کرتے ہیں۔''

اس کے بعد اس معنی کے قرائن ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''**بنی بها یا بنی بي** سے زفاف متعارف مراد ہونے کا سب سے زبردست قرینہ یہ ہے کہ خود

اسی حدیث کے دوسرے دوطریقوں میں بنی بي کے بجائے دخل بي واقع ہوا ہے:

ایک حماد بن زید عن ھشام کا طریق ہے، جوسنن ابوداود میں ہے، اس کا متن یہ ہے: قالت: **تزوجني رسول الله ﷺ وأنا بنت سبع، قال سليمان: أو ست، ودخل بي وأنا بنت تسع (۱/۲۱۰)۔**

دوسرا عبدالرحمٰن عن ھشام والا طریق ہے، وہ مسند احمد میں ہے اور اس کا متن یوں ہے: **قالت عائشة: تزوجني رسول الله ﷺ وأنا بنت ست سنين بمكة متوفى خديجة، ودخل بي وأنا بنت تسع سنين بالمدينة (۶/۱۱۸)۔**

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ **دخل بي** زفاف متعارف کے معنی میں اتنا صاف اور شہرت پذیر ہے کہ محتاج بیان نہیں، مصباح میں صاف لکھا ہے: **كناية عن الجماع أول مرة**، یعنی **دخل بها** اول بار جماع سے کنایہ ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے کتبِ حدیث ولغت سے اور بھی متعدد روایتیں اور حوالے ذکر کیے ہیں، جو اس بات پر صراحۃً دلالت کرتے ہیں کہ بنا رخصتی کے معنی میں نہیں، بلکہ دخول اور زفاف متعارف کے معنی میں مستعمل ہے، اور اس معنی کے خلاف کسی متقدم یا متاخر عالم سے کوئی قول منقول نہیں ہے۔ مثلاً حضرت امام احمد بن حنبل، ابوعبید قاسم بن سلام، امام نووی، علامہ عینی، ان سب حضرات کے نزدیک بناء سے مراد زفاف متعارف ہی ہے۔

علامہ اعظمیؒ کی یہ تحریر نہایت مفصل اور مبسوط ہے، جو متوسط سائز کے ۳۰ صفحات پر مشتمل ہے، آپ نے اس میں لغوی تحقیق کے علاوہ اس سے متفرع ہونے والے بہت سے مسائل بھی ذکر کیے ہیں، اور نکاح وشادی وغیرہ کے سلسلے میں رواج پذیر بہت سی رسوم وروایات پر بھی اس میں ضمناً نکیر فرمائی ہے۔

آخر میں تاریخ تحریر یوں درج ہے:

''ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی، مدرس دارالعلوم (مئو)، ۲۱/ جمادی الاولی ۴۳ھ یوم جمعۃ المبارک''

یعنی اس رسالے کی تالیف کے وقت آپ کی عمر محض ۲۴/ برس تھی، لیکن علمی گہرائی وگیرائی، قوت اخذ وادراک، اور زبان کی سلاست وروانی کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ رسالہ عنفوان شباب کا لکھا ہوا ہوگا، اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کا علم شروع ہی سے بہت پختہ اور زبان صاف ستھری تھی۔

☆......☆......☆

☆......☆

☆

ردّ شیعیت

و

دفاعِ صحابہ رضی اللہ عنہم

دفع المجادلہ عن آیۃ المباہلہ

ردشیعیت پر حضرت محدث الاعظمیؒ کی غالباً پہلی باقاعدہ کتاب ہے، اس کی وجہِ تصنیف یہ ہے کہ امامِ اہلسنت والجماعت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ نے ایک کتاب 'تفسیر آیتِ مباہلہ' کے نام سے لکھی تھی، مولانا عبدالشکور صاحب کی اس کتاب کی تصنیف کا محرک یہ تھا کہ اُس زمانے میں بمبئی کے روافض ہر سال ''عیدِ مباہلہ'' کے نام سے ایک مجلس منعقد کرتے تھے، اور بھولے بھالے سنیوں کو اس میں شریک کر کے حضرت علیؓ کا افضل الصحابہؓ اور خلیفہ بلا فصل ہونا سمجھاتے تھے۔ اسی زمانے میں امامِ اہلِ سنت کا بمبئی کا سفر ہوا، آپ نے وہاں جب یہ صورتحال دیکھی، تو 'تفسیرِ آیتِ مباہلہ' نامی کتاب لکھ کر اس کا غلط اور باطل ہونا واضح کر کے اس نوخیز فتنے کا سدباب کر دیا۔

حضرت امام اہلسنت کے بروقت اقدام اور آیتِ مباہلہ یعنی ﴿فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاءَ نَا وَ اَبْنَاءَ كُمْ وَ نِسَاءَ نَا وَ نِسَاءَ كُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ﴾ کی تفسیر کی اشاعت سے نہ صرف شیعوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا، بلکہ اس سے ایوانِ شیعیت میں لرزہ طاری ہو گیا، اس کے جواب میں شیعوں کے قبلہ ''خادم الملۃ قامع البدعۃ الحاج محمد اعجاز حسن اثناعشری صدیقی محمدی بدایونی'' نے 'برہانِ مجادلہ' کے نام سے کتاب لکھی، جو ۸۰ صفحات میں سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے طبع ہوئی۔ رسالہ کے اختتام پر اس کی تاریخ ۱۱/ ذی حجہ ۱۳۴۸ھ درج ہے۔

حضرت مولانا اعظمیؒ کی 'دفع المجادلہ' امامِ اہلِ سنت کا دفاع اور برہانِ مجادلہ کا رد ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے نام نے کتاب کے موضوع کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے، جس کے اندر امامِ اہلِ سنت اور شیعہ مصنف دونوں کی کتابوں کا ذکر نہایت مناسب طریقے سے آ گیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنی کتاب میں حضرت امام اہلِ سنت کی کتاب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''چونکہ اس سلسلے میں شیعوں نے واقعۂ مباہلہ کی بہت زیادہ غیر معمولی اہمیت بیان کی، اور آیتِ مباہلہ کا صحیح مفہوم مسخ کر کے اپنی باطل آراتقریروں سے بہت سے غلط اور بے بنیاد مفاہیم کو اس کا مفاد قرار دیا، اس لیے ناصرِ ملتِ حنفیہ، حامیٔ سنت سنیہ، شجو الحُسّاد وغیظ اہل العناد حضرت مولانا مولوی عبدالشکور صاحب مدیر 'النجم' نے آیتِ مباہلہ کی صحیح تفسیر لکھ کر شیعوں کی تمویہات کا پردہ چاک کر دیا، اور وہ قصرِ خلافتِ بلافصل جس کی بنیاد شیعوں نے اس آیت کے غلط مفہوم پر رکھی تھی، خاک کے برابر نظر آنے لگا''۔(۱)

آگے 'برہانِ مجادلہ' کے بارے میں لکھا ہے:

> ''رسالہ کیا ہے، خرافات کی ایک پوٹ، مُفتریات کا ایک مجموعہ، اور مذہبِ شیعہ کی خصوصیات کا

(۱) دفع المجادلہ ص ۳-۲

ایک مظہرِ اتم، اور مصنف کی علمی قابلیتوں کا آئینہ ہے، اس لحاظ سے یہ رسالہ ہرگز اس قابل نہ تھا کہ وقتِ عزیز کا کوئی حصہ اس کا جواب لکھنے میں صرف کیا جائے؛ لیکن محض اس خیال سے کہ کہیں برخود غلط مصنف اس سکوت کو عجز پر محمول نہ کرے، لہذا اس کے رسالہ کا دندان شکن جواب لکھتا ہوں، اور اپنے رسالہ کو 'دفع المجادلہ عن آیۃ المباہلہ' کے نام سے موسوم کرتا ہوں، واللہ ولی التوفیق ومنہ الہدایۃ الی سواء الطریق''[۱]۔

برہان مجادلہ کے مصنف نے شروع میں کئی صفحات اپنی اتحادی کوششوں اور اہلِ سنت کے بعض فضلاء کے ان کے ساتھ جلسوں میں شرکت کے بیان میں سیاہ کیے ہیں[۲]، ان کی اس داستان سرائی پر علامہ اعظمیؒ نے جو تبصرہ کیا ہے، وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے، فرمایا ہے:

''ہمارے نزدیک تو اس منافقانہ اتحاد سے وہ اختلاف ہزار درجے بہتر ہے، جس کی بنیاد نیک نیتی پر ہو''۔

اور پھر اہلِ سنت کے ان فضلا کی رواداری پر کفِ افسوس ملتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اور آپ سے زیادہ مجھے ان علماء اہلِ سنت پر افسوس آتا ہے، جنھوں نے آپ کی جبلّی خصوصیات کے جاننے اور اس دعوتِ اتحاد کی حقیقت سمجھنے سے پہلے آپ کی آواز پر لبیک کہنے کو آمادہ ہوئے، .... یہ ان بے چاروں کی سادہ لوحی ہے؛ اور اگر جان بوجھ کر اغماض کیا ہے، تو مداہنت فی الدین ہے؛ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اہلِ سنت کی اسی غفلت و بے پروائی، آپ کے مذہب کے شیوع وترقی کا باعث ہے؛ ورنہ اگر علماء اہلِ سنت نے آپ کی تلبیسات وتمویہات اور آپ کے مکاید سے واقف ہونے کی کوشش کی ہوتی، اور عوام کو بھی اس سے آگاہ وخبردار کرتے، تو مذہبِ شیعہ اب سے بہت پہلے زَھَقَ الباطل إنَّ الباطلَ کانَ زَھوقاً کا مصداق بن چکا ہوتا''[۳]۔

مصنفِ برہان نے صفحہ ۸ میں اہلِ سنت کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے:

''ان لوگوں نے یہ الزام لگایا تھا کہ صحابۂ کرام کو شیعہ گالیاں دیتے ہیں، لہذا یہ لوگ کافر ہیں''۔

اس پر علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کس مفتی نے یہ لکھا ہے کہ صحابۂ کرامؓ کو شیعہ گالیاں دیتے ہیں، لہذا یہ لوگ کافر ہیں؟ علماء اسلام تو قدیماً وحدیثاً یہ تصریح کرتے چلے آئے ہیں کہ سبِّ صحابہ کی وجہ سے شیعہ

(۱) دفع المجادلہ: ۳

(۲) 'برہان مجادلہ' میں اتحادی کوششوں کے سلسلے میں مولوی اعجاز حسن صاحب کی کتاب کے کچھ عنوانات یہ ہیں: ''حامیانِ اتحاد کے اسامی جلیلہ'' (ص ۳)، ''وہ مقامات جہاں اسلامی اتحاد پر میرے مواعظ ہوئے'' (ص ۳)، ''جلالی ضلع علی گڈھ میں اسلامی جلسۂ اتحاد'' (ص ۳)، ''پارہ اور نونہرہ ضلع غازی پور میں اتحادی جلسے'' (ص ۵)، ''مومنین نونہرہ کی ثبات قدمی'' (ص ۶)۔

(۳) دفع المجادلہ: ۴

کافر نہیں ہیں، بلکہ فاسق ہیں''۔(۱)

مصنفِ برہان نے اسی صفحے پر لکھا ہے:

''ہمارے مذہب میں گالی بکنا قطعاً حرام ہے''۔

علامہ اعظمیؒ نے اس جملے کی صداقت کو ان الفاظ میں چیلنج کیا ہے:

''آپ کی مذہبی کتابیں تو بتاتی ہیں کہ گالی بکنا خدا کے ذکر سے بھی زیادہ موجبِ ثواب ہے، کیا آپ کی کتابوں میں یہ نہیں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ پر لعنت ہر صبح بھیجنا ستر نیکیوں کے برابر ہے؟ اور کیا آپ کے مذہب میں لعنِ عمر رضی اللہ عنہ کو ذکر الٰہی وتلاوتِ قرآن مجید پر ترجیح نہیں ہے؟''۔(۲)

اس کے بعد نمونہ کے طور پر شیخین پر لعنت بھیجنے اور اس لعنت ملامت کو ذکر الٰہی اور عبادتِ خداوندی سے زیادہ باعثِ اجر وثواب سمجھنے پر شیعوں کی معتبر کتاب 'منتہی الکلام' سے کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

آگے چل کر یہ وضاحت کی ہے کہ شیعوں کی تکفیر کی وجہ ان کا عقیدۂ تحریف قرآن ہے، اور قرآنِ کریم سے اس پر دلیل قائم کی ہے، اور بغیر کسی لیت ولعل کے پورے جزم کے ساتھ قرآن کی تعلیم کی رو سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

''قائلِ تحریفِ قرآن کے کفر پر یہ آیت دلالت کرتی ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾، اس لیے کہ ما أنزل اللہ میں ایک چیز یہ بھی ہے ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ اور معتقدِ تحریف اس ما أنزل اللہ کا حکم نہیں کرتا، لہٰذا وہ کافر ہے''۔(۳)

آیتِ مباہلہ کے سلسلے میں شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ:

''اس آیت سے حضرت علی کی خلافت بلافصل ثابت ہوتی ہے، کیونکہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول خدا نے حضرت علیؓ وفاطمہؓ اور حسنین کو مباہلہ میں شریک کرنے کے لیے اپنے ساتھ لیا اور کسی کو ساتھ نہ لیا، جس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کو جو کچھ تعلق تھا، وہ صرف انھیں حضرات سے تھا، پھر تمام مفسرین کا اجماع ہے کہ آیت میں لفظ أنفسنا سے حضرت علی اور أبنائنا سے حسنین اور نسائنا سے حضرت فاطمہ مراد ہیں، پس معلوم ہوا کہ حضرت علی نفسِ رسول تھے، اور ظاہر ہے کہ نفس رسول اللہ کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو خلیفہ بنانا کیسے جائز ہوسکتا ہے''۔(۴)

ناظرین اس اقتباس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شیعوں کا یہ عقیدہ کس قدر خطرناک اور ایمان سوز ہے، شیعوں کی اس بکواس اور ہفوات کو ذرا دیر کے لیے بھی تسلیم کرلیا جائے، تو صدیق وفاروق وعثمان -رضی اللہ عنہم- کی خلافتِ راشدہ خلافِ شرع ہوکر رہ جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس تفسیر کی خرابی اور ہولناکی کو ثابت کرنے کے لیے حضرت امامِ اہلِ سنت کو 'تفسیرِ آیتِ مباہلہ' تحریر فرمانی پڑی، چنانچہ اس تفسیر کے سرِ ورق پر یہ عبارت تحریر ہے:

(۱) دفع المجادلہ: ۵-۴ (۲) ایضاً: ۵ (۳) ایضاً: ۸ (۴) ایضاً: ۱۶-۱۵

''سورۂ آل عمران کی آیۂ کریمہ ﴿فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاءَ نَا وَاَبْنَاءَ کُمْ﴾ الآیة. کی صحیح تفسیر بیان کر کے روزِ روشن کی طرح دکھایا گیا ہے کہ اس آیۂ کریمہ سے حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل یا ان کی افضلیت تمام صحابہؓ پر ثابت کرنا قرآن شریف کی تحریف ہے''(۱)۔

حضرت امام اہلِ سنت نے شیعوں کی تفسیر کی غلطی اور ان کے عقیدے کی خرابی کو اس مدلّل انداز میں تحریر فرمایا تھا کہ اس سے شیعوں کی تعمیر کردہ پوری عمارت زمیں بوس ہوگئی، اس کے تدارک کے لیے مولوی اعجاز حسن بدایونی نے 'برہان مجادلہ' لکھا، جس میں واقعات کو توڑ مروڑ کر اور تحریف کر کے بیان کرنے کی مذہبِ شیعہ کی ساری خصوصیات موجود ہیں۔ دفع المجادلہ میں علامہ اعظمیؒ نے شیعوں کی ان ہفوات کو ایک ایک کر کے توڑا اور رد کیا ہے۔

اس پوری کتاب کی مرکزی بحث یہی ہے کہ اس آیتِ کریمہ سے مخصوص افراد کو مراد لینا سخت غلطی اور فسادِ عقیدہ کا سبب ہے؛ بلکہ امام اہلِ سنت نے اس کی یہ صورت تحریر فرمائی ہے کہ:

''رسول خود مع اپنی ساری جماعت کے اور لڑکوں اور عورتوں کے ایک مقام میں جمع ہوں اور یہ عیسائی بھی مع اپنی عورات اور لڑکیوں کے وہاں آجائیں''(۲)۔

شیعوں کا ایک بڑا سخت مغالطہ یہ باور کرانا ہے کہ:

''اس آیت کے نزول کے بعد رسولِ خدا نے حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور حسنینؓ کو مباہلہ میں شریک کرنے کے لیے اپنے ساتھ لیا''(۳)۔

حالانکہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ مباہلہ ہوا ہی نہیں، اس لیے کہ عیسائی اس کے لیے آمادہ ہی نہیں ہوئے، اور جب وقوعِ مباہلہ ہی کا ثبوت نہ ہوسکا، تو اس میں شرکت کے لیے علیؓ و آل علیؓ کو ساتھ لینا بھی ثابت نہ ہوسکے گا۔

اس میں ہم پوری کتاب پر نظر نہ ڈال کر آخرِ کتاب سے علامہ اعظمیؒ کی ایک عبارت نقل کر رہے ہیں، جس سے اہلِ سنت کا موقف بآسانی سمجھا جاسکتا ہے، لکھا ہے:

''اہلِ سنت کا مسلک یہ ہے کہ آیتِ مباہلہ میں الفاظ أنفسنا، أبناء نا، نساء نا سے ذوات مخصوصہ اور اشخاص متعینہ مراد نہیں ہیں، برخلاف شیعوں کے کہ وہ ان الفاظ سے متعین اشخاص کو مراد لیتے ہیں، اہلِ سنت کے مسلک کی بنیاد یہ ہے کہ الفاظِ مذکورہ میں ضمیرِ متکلم مع الغیر کی طرف انفس و ابناء و نساء کی اضافت ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ ضمیر متکلم مع الغیر سے متکلم کے سوا اور لوگ بھی مراد ہوتے ہیں، پس الفاظ مذکورہ میں رسول اللہ ﷺ کے علاوہ اور مومنین کے انفس و ابناء و نساء بھی مراد ہوں گے''(۴)۔

'دفع المجادلہ' ۶۲ صفحات میں عمدۃ المطابع لکھنؤ سے چھپ کر اشاعت پذیر ہوا، اس کا سالِ تصنیف غالبًا ۱۳۴۹ھ ہے۔ ☆......☆......☆

(۱) دفع المجادلہ: ۱۰ (۲) ایضاً: ۱۰ (۳) برہان مجادلہ: ۲۴ (۴) دفع المجادلہ: ۶۲

ارشاد الثقلین

اس رسالے کا پورا نام 'ارشاد الثقلین بجواب اتحاد الفریقین' ہے، یہ بھی ردشیعیت پر علامہ اعظمیؒ کے سلسلۂ رسائل کی ایک کڑی ہے، اس کی تصنیف کا پسِ منظر یہ ہے کہ حضرت امام اہلِ سنت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی نے ایک رسالہ 'ابوالائمہ کی تعلیم' تحریر فرمایا تھا، جو چھوٹی تقطیع کے ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل ہے، اور ۱۳۵۲ھ میں عمدۃ المطابع پریس لکھنؤ سے چھپا ہے۔

'ابوالائمہ' سے مراد حضرت علیؓ کی ذات بابرکات ہے، کیونکہ شیعوں کے جو دوازدہ امام ہیں، ان سب کے جدامجد حضرت علیؓ ہی ہیں، حضرت امام اہل سنت نے 'ابوالائمہ کی تعلیم' میں حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ سے منقول ان اقوال وآثار اور ملفوظات کو جمع کر دیا ہے، جن میں حضرت علیؓ کا ائمۂ ثلاثہ کی تعریف اور ان کے لیے خیر خواہی کی بات کرنا مذکور ہے، دس روایتیں اہل سنت کی معتبر ومستند کتابوں سے، اور ۱۲؍ روایتیں شیعوں کی مسلمہ کتابوں سے نقل کی ہیں، اور ان روایتوں پر نہایت عمدہ طریقے سے ردوقدح کی ہے۔

خلفاء ثلاثہ -رضی اللہ عنہم- کی تعریف حضرت علیؓ کی زبانی ثابت کر دینے سے شیعوں میں برہمی پیدا ہوئی اور ان کے دلوں میں اُبال آ گیا، اس کے جواب میں امامیہ مشن لکھنؤ کی طرف سے ایک کتاب 'اتحاد الفریقین' کے نام سے شائع ہوئی، تاکہ اس کے ذریعے شیعوں کے اندر پائی جانے والی بے چینی کو دور کیا جا سکے۔

'اتحاد الفریقین' کی اشاعت کے بعد اس کی ''خبر گیری'' علامہ اعظمیؒ کے حصے میں آئی، اور 'ارشاد الثقلین' کے نام سے متوسط سائز کے ۲۷؍صفحات کا رسالہ آپ نے تحریر فرمایا، یہ رسالہ دارالمبلغین لکھنؤ سے شائع ہونے والے اس وقت کے رسالے ''الداعی'' کے شوال-ذی قعدہ-ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ کے شماروں میں اشاعت پذیر ہوا، علامہ اعظمیؒ نے خطبۂ کتاب کے بعد اس کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے:

> ''قرآن کریم میں صحابہ کرامؓ خصوصاً حضرات خلفاء راشدین کے مناقب وفضائل، اور ان کی بزرگی اور عظمت کا بیان جس کثرت وتکرار سے ہوا ہے، اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے، اور چونکہ قرآن کریم اصل اصول دین اور اساسِ اسلام وایمان ہے، اس لیے کسی مومن بالقرآن کو صحابہ وخلفاء کے تقدس وبزرگی کے معتقد وقائل ہونے سے چارہ نہیں ہے، اسی لیے اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ صحابہؓ وخلفاء کی بزرگی کا قائل نہ ہونا اور ان کی دینداری وتقدس میں قدح کرنا، قرآن واسلام کی تکذیب کے مرادف ہے''۔

پھر شیعوں پر تعریض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مگر دنیا میں اللہ کی ایک ایسی مخلوق بھی آباد ہے، جو باوجود ادعاءِ اسلام، صحابۂ کرامؓ سے بغض وعداوت رکھنے اور ان کے حق میں بدگوئی اور گستاخی کرنے، اور ان کی تکفیر وتضلیل کو عبادتِ عظمیٰ، بلکہ

لازمۂ دین وایمان تصور کرتی ہے، اوراس کی اصلاً پروانہیں کرتی کہ اس عقیدے سے قرآن کریم کی کتنی آیات کی تکذیب لازم آتی ہے''(۱)۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنے رسالے میں بسط وتفصیل کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ شیعہ مصنف نے اپنے ہم مذہب لوگوں کی عام عادت کے مطابق کیسے کیسے جھوٹ، فریب، خیانت اور کتر بیونت سے کام لیا ہے، اور کس کس قسم کی جھوٹی تاویلات کی ہیں۔

آپ نے اس میں شیعوں کی اس فریب کاری کا شکوہ بھی کیا ہے کہ وہ اہلِ سنت کے خلاف حجت ان کتابوں سے قائم کرتے ہیں جو شیعوں کی تصنیف کردہ ہیں، مثلاً: احمد بن اعثم کوفی، ابن ابی الحدید اور مسعودی وغیرہ کا شمار شیعوں میں ہوتا ہے اوران کے اقوال اہلِ سنت کے خلاف حجت نہیں ہوسکتے، چنانچہ صفحہ ۶ ر پر لکھا ہے:

''اس مقام پر شیعہ مصنف کو یہ نکتہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ اہلِ سنت حضرت علیؓ کے جن اقوال وافعال سے حضرات خلفاء ثلاثہ کی خلافت کی صحت اوران کی جلالتِ قدر وعظمتِ شان ثابت کرتے ہیں، وہ اقوال وافعال معصومین کے ہیں، اور ایسی کتابوں میں مذکور ہیں، جو شیعوں کے نزدیک متواتر ہیں (جیسے نہج البلاغہ)، یا امام معصوم کی مصدقہ ہیں (جیسے کافی)، یا جن کی صحت میں علماء شیعہ کو کلام نہیں ہے (جیسے احتجاج وغیرہ)۔ اس کے برخلاف شیعہ صاحبان اپنے دعاوی کو عموماً ایسی کتابوں سے ثابت کرتے ہیں، جن کے مصنفین غیر سنی، یعنی شیعہ یا زیدی یا معتزلی ہوتے ہیں، اور سنیوں کی کتابوں میں سے عموماً ان کتابوں سے استدلال کرتے ہیں، جن میں ہر قسم کی رطب ویابس باتیں مذکور ہوتی ہیں؛ اور اگر کہیں بھولے سے کسی معتبر کتاب کی کوئی بات نقل کرتے ہیں، تو اس میں قطع وبرید اور معنوی تحریف سے کام لیتے ہیں؛ اوراس کا تو ان کے دل میں شاید خطرہ بھی نہیں گزرتا کہ سنی کتاب سے جو قول ہم نقل کررہے ہیں، وہ کسی معصوم کا قول نہیں ہے۔ پس جو باتیں اہلِ سنت نے معصومینِ شیعہ کے اقوال سے ثابت کی ہیں، ان کا ابطال غیر معصوموں کے قول سے نہیں ہوسکتا، اور نہ اہلِ سنت کے اعتراضات کی برابری شیعوں کے ایرادات کرسکتے ہیں''(۲)۔

حضرت علیؓ کا خلفاؓ کے پیچھے نماز پڑھنا:

حضرت امام اہلِ سنت نے حضرت علیؓ کے خلفاء ثلاثہ کی بزرگی اوران کی خلافت کو تسلیم کرنے کے ثبوتوں اور واقعات میں لکھا ہے کہ حضرت علیؓ ان کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے۔

شیعہ مصنف نے اس کی دو تاویلیں کی ہیں، پہلی تاویل یہ ہے کہ:

''اہلِ سنت کی صحاح سے ثابت ہے کہ فاجر کے پیچھے بھی نماز ہوجاتی ہے''۔

(۱) ارشاد الثقلین: ۲ (۲) ایضاً: ۷-۶

علامہ اعظمیؒ نے اس کے جواب میں لکھا ہے:

''اہلِ سنت کی کتابوں سے اگر یہ ثابت ہے تو آپ کو کیا فائدہ؟ آپ کے مذہب میں تو اس کے خلاف تصریح موجود ہے: **فلا تجوز الصلاۃ خلف الفاسق ولا خلف مجھول الحال** (نعم الزاد وغیرہ فقہ شیعہ) یعنی فاسق کے پیچھے، اور جس کا حال معلوم نہ ہو اس کے پیچھے، نماز جائز نہیں ہے''(۱)۔

دوسری تاویل یہ کی ہے کہ:

''کسی کے پیچھے نماز کے لیے کھڑے ہو جانے سے اقتدا نہیں ثابت ہوتی، جب تک کہ پیچھے کھڑا ہونے والا اقتدا کی نیت نہ کرے''۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کا رد اس طرح کیا ہے:

''حضرت علیؓ خلفاء کے پیچھے صرف کھڑے ہی ہوتے تھے، یا ان کے ساتھ ساتھ مقتدیوں کی طرح رکوع وسجدہ اور قومہ وقعدہ بھی کرتے تھے، اگر یہ سب افعال بھی کرتے تھے- اور یقیناً کرتے تھے- تو بتائیے بلا نیتِ اقتدا ایسا کرنا صریح فریب کاری اور سخت گمراہ کن حرکت تھی یا نہیں؟''

واقعۂ نکاحِ ام کلثوم:

حضرت امام اہلِ سنت نے حضرت علیؓ کی خلفاء ثلاثہ کے ساتھ اخوت ومحبت، انس ومودت اور خیر خواہی وبھائی چارگی جن واقعات سے ثابت کی تھی، ان میں سے ایک حضرت علیؓ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر فاروقؓ کے ساتھ ہے، لیکن شیعوں سے اس کی کوئی تاویل نہ بن پڑی۔

مذکورہ بالا امور کے علاوہ جو واقعات ذکر کیے گئے ہیں، ان کا اندازہ درجِ ذیل عنوانات سے لگایا جا سکتا ہے:

جنگِ فارس کے موقع پر حضرت علیؓ کا حضرت عمرؓ کو مشورہ دینا، غزوۂ روم کے موقع پر مشورہ دینا، اہلِ حل وعقد کی بیعت سے خلیفہ وامام کا تقرر، افضلیتِ شیخین باعتراف حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ کے حق میں دریدہ دہنی، تقیہ کا جواز۔

یہ اور اس جیسے اور بھی عنوانات ہیں، جن کے تحت حضرت علیؓ کی خلفاء ثلاثہؓ کے ساتھ اخوت ومحبت کو ثابت کیا گیا ہے، لیکن شیعوں نے اپنی مذہبی خصوصیات سے کام لیتے ہوئے ان واقعات کی دور از کار اور فاسد تاویلات کی ہیں، علامہ اعظمیؒ نے ان کی تمام تاویلات کا نہایت بسط وتفصیل کے ساتھ محققانہ جواب دیا ہے۔

اس کا تعارف ختم کرنے سے پہلے اس کے کچھ اقتباسات بطور نمونہ کے قارئین کے سامنے پیش کر دینا چاہتا ہوں، صفحہ ۳۷ پر ایک عنوان ''حضرت معاویہؓ کے حق میں دریدہ دہنی'' کے تحت لکھا ہے:

---

(۱) ارشاد الثقلین: ۷

’’اس کے بعد مصنف ’اتحاد الفریقین‘ نے خواہ مخواہ حضرت معاویہ پر بے حد کمینہ حملے کیے ہیں، اور غایت دناءت سے ان کی صحتِ نسب اور حضرت ہند والدۂ حضرت معاویہؓ کی پاک دامنی میں کلام کیا ہے، اور لطف یہ ہے کہ اس کے لیے اہلِ سنت کی کسی معتبر کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے، بلکہ سبط ابن الجوزی اور جاحظ وغیرہ کا حوالہ دیا ہے، اور اس کا کچھ خیال نہیں کیا کہ اول الذکر کے تشیع بلکہ ترفض کی شکایت اجلۂ علماء اہلِ سنت نے کی ہے (دیکھو لسان المیزان)، اور جاحظ کی لا مذہبیت ساری علمی دنیا میں مشہور ہے، اور نہج البلاغہ میں سید رضی (شیعہ) کے تصرفات بے جا کے خود شیعہ شارحین بھی شاکی ہیں؛ پس ایسے حوالہ جات سے اہلِ سنت کے مقابلے میں استدلال کرنا سخت جہالت ہے‘‘(۱)۔

آگے لکھا ہے کہ اہلِ سنت کی صدہا مستند و معتبر کتابوں میں حضرت معاویہؓ و حضرت ہندؓ کے حالات مذکور ہیں، لیکن ان جملوں کا کوئی اشارہ بھی ان میں نہیں ہے، پھر فرمایا ہے:

’’متعدد کتبِ احادیث میں یہ حدیث مذکور ہے کہ ہند سے جب بیعت لی گئی ہے، تو جیسا کہ تمام عورتوں سے یہ عہد لیا جاتا تھا کہ ’زنا نہ کرنا‘، ان سے بھی آنحضرت ﷺ نے فرمایا، تو انھوں نے فوراً کہا کہ یا رسول اللہ! کیا کسی شریف عورت سے اس بے حیائی کا ارتکاب ممکن بھی ہے؟

بیعت کا واقعہ ائمۂ شیعہ کی مخصوص تعلیم کی طرح کوئی مخفی کارروائی نہ تھی، اگر حضرت ہندؓ کا دامن مذکورۂ بالا الزام سے ملوّث ہوتا، تو کہنے والے فوراً یہ کہہ دیتے کہ کم از کم آپ کو یہ سوال زیب نہیں دیتا، مگر ایسا نہیں ہوا؛ اس لیے یہ ایک زبردست شہادت ہے کہ حضرت ہندؓ نے حالتِ کفر میں اسلام کی چاہے جتنی مخالفت بھی کی ہے، لیکن عصمت وعفاف کے خلاف کوئی حرکت ان سے سرزد نہیں ہوئی تھی‘‘(۲)۔

صفحہ ۵۰-۵۱ پر شیعوں کے تقیہ کے بارے میں لکھا ہے:

’’مذہبِ شیعہ کے رازہائے سربستہ سے جو لوگ واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ تقیہ کا مفہوم اپنے اندر اس سے بہت زیادہ وسعت رکھتا ہے، یعنی مذہبِ شیعہ کی رُو سے تقیہ صرف افعال و اعمال میں نہیں، بلکہ اقوال میں بھی ہوتا ہے، اور امراء و حکام کے ڈر سے یا ان کے مجبور کرنے ہی سے نہیں، بلکہ بغیر کسی خوف کے اور بلا مجبوری کے بھی جائز ہے۔ حد ہوگئی کہ شیعہ حضرات نے اس کی بھی تشریح کی ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں جبکہ خود حاکم تھے، صدہا خلافِ شریعت امور کیے، اور ان کے بجالانے کا حکم دیا، اور شیعوں نے اس کی بھی تشریح کر دی ہے کہ اگر حاکم شیعوں کو مذہبی آزادی بھی دیدے، تو بھی وہ تقیہ کر سکتے ہیں (یعنی خلافِ شرع کام کر سکتے ہیں اور خلافِ واقع یعنی جھوٹ بول سکتے ہیں) شیعوں کی سب سے زیادہ مستند کتاب کافی وغیرہ میں اس کی صدہا مثالیں موجود ہیں، پس

(۱) ارشاد الثقلین: ۳۷ (۲) ایضاً: ۳۸

تقیہ ایسے وسیع مفہوم کو اتنا محدود یعنی یہ کہ کسی ظالم بادشاہ کے خلافِ شرع جابرانہ احکام کو ماننا، بتانا کھلا ہوا فریب ہے، اوراس سے مذہبِ شیعہ کی عیوب کی پردہ پوشی کے سوااور کوئی غرض نہیں ہے''[۱]۔

صفحہ ۴۵ پر علامہ اعظمیؒ نے ایک عنوان ''جناب امیر کا تلوار نہ اٹھانا'' ذکر کیا ہے، شیعوں نے حضرت علیؓ کے خلفاء ثلاثہ کے ساتھ بغض وعداوت کے باوجود تلوار نہ اٹھانے کی متعدد وجہیں ذکر کی ہیں، علامہ اعظمیؒ نے ان کی تمام توجیہات کے پرخچے اڑاتے ہوئے حقیقت کو آشکار کر دیا ہے، ان ہی وجوہ میں صفحہ ۵۶ پر وجہ چہارم یہ لکھی ہے:

''مدینہ میں جنگ کرنا بنص حدیث ناجائز ہے، اس لیے حضرت علی نے مدینہ میں تلوار نہیں اٹھائی''۔

علامہ اعظمیؒ نے اس توجیہ کا جواب یہ لکھا ہے:

''یہ وجہ بھی بھونڈی ہے، اس لیے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ لازم آتا ہے کہ حضرت علیؓ خلفاء ثلاثہؓ سے مدینے میں جنگ نہ کرتے، لیکن مدینے سے باہر نکل کر جنگ کرنے سے کیا مانع تھا، یہ تو کچھ ضروری نہیں کہ جنگ جس سے کرنا ہو، اس کے مرکزی مقام کو میدان کارزار بنایا جائے، آنحضرتﷺ نے کفارِ مکہ سے متعدد بار مکہ سے باہر جنگ کی ہے، اسی طرح حضرت علیؓ نے بھی اپنے مخالفین سے مدینہ وشام سے باہر ہی جنگ کی ہے، پس اسی طرح خلفاء ثلاثہ سے بھی مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرتے''[۲]۔

آگے لکھا ہے:

''اس سلسلے میں مصنف 'اتحاد الفریقین' نے وہ حدیث بھی نقل کی ہے، جس میں مدینے کی سختیوں پر صبر کرنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے؛ لیکن افسوس ہے کہ یہ حدیث بالکل بے محل نقل کی گئی ہے، اس لیے کہ اولاً تو سختی پر صبر کرنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ کوئی خلافِ شرع امور کا ارتکاب کرے، یا مرتد ہو جائے تو کچھ نہ کیا جائے، بلکہ مراد یہ ہے کہ تنگ حالی وفاقہ کشی کی نوبت آجائے تو مدینہ چھوڑنے کا قصد نہ کرے؛ ثانیاً: صبر کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مستحقینِ جنگ سے جنگ نہ کی جائے، بلکہ یہ مطلب ہے کہ مدینہ چھوڑ کر دوسری جگہ سکونت اختیار نہ کی جائے''[۳]۔

یہ کتاب شوال-ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ میں لکھنؤ سے شائع ہونے والے رسالے 'الداعی' میں شائع ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

☆......☆

☆

(۱) ارشاد الثقلین: ۵۱-۵۰ (۲) ایضاً: ۵۶ (۳) ایضاً: ۵۶

اِبطال اعزادری

ایک شیعہ سید سبط الحسن فاضل ہنسوی نے ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام ہے: 'عزاداری کی تاریخ اور اس کا اثبات سنی نقطۂ نظر سے'۔ یہ کتاب متوسط تقطیع کے ۱۶۸ صفحات پر نظامی پریس لکھنؤ سے ۱۹۴۱ء میں طبع ہوئی تھی، اس کے مصنف نے دعویٰ کیا تھا کہ:

''اس میں علماء اہل سنت کی کتابوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ عزائے حسین کرنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے، اس کے مطالعہ سے مسئلۂ عزاداری کے بارے میں برادرانِ اہلِ سنت کے عقیدے کی وضاحت ہو جاتی ہے، اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک سنی کا محبِّ اہلِ بیت ہونے کی حیثیت سے تعزیہ دار ہونا ضروری ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کی توضیح بھی ہو جاتی ہے کہ اس زمانے میں عموماً جو رواسم عزا رائج ہیں، وہ درحقیقت صرف شیعہ فرقہ ہی سے مخصوص نہیں ہیں، یہ رسوم فرقۂ اہلِ سنت سے زیادہ تر وابستہ ہیں''(۱)۔

اہلِ علم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شیعہ مصنف کی یہ تحریر کس قدر جھوٹ اور فریب پر مبنی ہے، اس کے مصنف نے اپنے رسالے کے دو حصے کیے تھے، اور یہ تحریر دوسرے حصے کے متعلق ہے، اس کے پہلے حصے میں عزاداری کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے خود اس مصنف کی کتاب سے ہندو بیرونِ ہند کی تاریخِ عزاداری کا جائزہ لے کر اور اس کا اچھی طرح تحلیل و تجزیہ کر کے لکھا ہے:

''ناظرین غور فرمائیں کہ شیعہ مؤلف نے ماتم و تعزیہ کی جو تاریخ بیان کی ہے، اس میں شیعوں کے سوا کسی دوسرے کا نام نہیں آتا، لیکن رسالہ کی تمہید میں لکھتا ہے کہ: ''یہ رسوم فرقۂ اہلِ سنت سے زیادہ وابستہ ہیں''۔ یہیں سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شیعوں کے مذہب میں سچائی کی کتنی قدر و قیمت ہے''(۲)۔

آپ نے سید سبط الحسن کے ان ہفوات کا جواب 'ابطال عزاداری' کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے، اور اپنے اس رسالے کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے:

''اہلِ سنت کی مذہبی بے حسی و غفلت، اور شیعوں کا مذہبی احساس و بیداری، دونوں اپنی اپنی جگہ پر بے انتہا حیرت خیز و عبرت انگیز ہیں''۔

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''دوسری طرف شیعوں کا یہ ''شریفانہ'' رویہ کہ اپنی جن مجلسوں میں سنیوں کے مذہبی روایات، مذہبی پیشواؤں اور مذہبی کتابوں پر ناپاک سے ناپاک حملے کرتے ہیں، ان میں زبردستی سنیوں کو شریک کرنا چاہتے ہیں، اور جو سنی اپنے سنی بھائیوں کو منع کرتا ہے، اس پر وہابیت، غیر مقلدیت اور دشمنیٔ اہلِ

(۱) عزاداری کی تاریخ: ۲ (۲) ابطال عزاداری: ۱۳

بیت کا آوازہ کستے ہیں''۔

اس کے بعد ہی اگلے پیراگراف میں لکھا ہے:

''تعزیہ ہندوستان میں رافضیت کا شعار اور شیعہ مذہب کی اشاعت کا آلۂ کار ہے، اور تعزیہ داری مشرکانہ مراسم اور بدترین بدعات کا معجون مرکّب ہے، مگر سنیوں کی بے حسی و بے تعصبی دیکھئے کہ کتنے شوق سے تعزیے بناتے اور اس کی ساری رسمیں بجالاتے ہیں؛ لیکن اگر سنی صرف اتنا چاہتا ہے کہ حضرت علیؓ وحضرات حسنینؓ و دیگر بزرگانِ دین- مثلاً حضرت جعفر صادق، محمد باقر، موسیٰ کاظم، علی رضا وغیرہم- کی تعریف وتوصیف کے ساتھ ساتھ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور دیگر صحابۂ کرام- رضی اللہ عنہم- کی بھی مدح وثنا کریں، تو شیعہ انسانیت کے جامے سے باہر ہو جاتا ہے، اور ہماری شرکت تو درکنار، خاموشی سے الگ رہنا بھی گوارا نہیں کرتا، بلکہ اس پر تُل جاتا ہے کہ کسی ایک سنی کو بھی کسی جگہ ہم یہ کام کرنے نہ دیں گے''۔

علامہ اعظمیؒ نے شیعہ مصنف کے اُن ہی مزعومات سے جن کو اس نے اپنے رسالے میں درج کیا ہے، یہ ثابت کیا ہے کہ تعزیہ داری تو دور کی بات ہے، نوحہ و ماتم کا سراغ بھی کئی صدیوں تک نہیں ملتا، لکھا ہے:

''ہمایوں کے زمانے میں بھی ماتم کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں، لیکن اگر ہوتا رہا ہو، تو اس کی وجہ بھی صرف یہی ہے کہ اس وقت ایرانی شیعہ ہندوستان میں آ کر آباد ہو گئے تھے، اور ایرانیوں کی امداد کی وجہ سے ہمایوں بھی ان شیعوں کی دل دہی کرتا تھا، چنانچہ شیعی مؤلف کے رسالے میں بھی اس کے اشارات پائے جاتے ہیں (دیکھو ص ۳۴)۔ اسی طرح جہانگیر کے زمانے میں بھی اگر عزاداری ہوئی تو یہ صرف نور جہاں کا اثر تھا، جو عقیدتاً شیعہ تھی، جیسا کہ مؤلف کو بھی تسلیم ہے''[1]۔

آگے چند سطروں کے بعد لکھا ہے:

''یہ تو ابھی صرف گریہ و ماتم اور نوحہ وزاری کی تاریخ ہے، اب تعزیہ داری کو لیجئے، تو یہ ایک ایسی بدعت ہے کہ ہندوستان کے سوا کسی جگہ کسی عہد میں اس کا نام ونشان نہیں پایا جاتا''[2]۔

پھر دو سطر کے بعد لکھا ہے:

''تیمور لنگ کو اس کا موجد قرار دینا عامیانہ روایت پر مبنی ہے، مؤلف خود تسلیم کرتا ہے کہ اس کا تاریخی ثبوت اب تک فراہم نہیں کیا جا سکا ہے''[3]۔

آگے چل کر یہ تحریر فرمایا ہے:

''بہر حال عالمگیر کے زمانے سے پہلے تعزیہ کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا اور عالمگیر کے عہد میں صرف ایک تابوت بنانے کا ذکر جن صاحب نے کیا ہے، وہ غالی شیعہ تھے، جیسا کہ مؤلف نے خود ہی لکھا ہے، اور لطف یہ ہے کہ ان شیعہ صاحب نے بھی تابوت بنانے کو اوباشوں کا کام بتایا ہے، اور یہ بھی تصریح کی

(۱) ابطال عزاداری: ۱۲ (۲) ایضاً: ۱۲ (۳) ایضاً: ۱۲

ہے کہ عالم گیر نے ان سب لغویتوں کو بند کر دیا؛ لہٰذا خود مؤلف کے بیانات وتحقیقات کی ترتیب سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے- اور کچھ شبہہ نہیں کہ یہی قطعی ویقینی بات ہے- کہ تعزیہ بھی اسی منحوس دور کی ایک نامسعود یادگار ہے، جس دور میں کہ بقول مؤلف تمام اطراف ہند میں شیعہ حکم راں تھے"[۱]۔

بہر حال اس رسالے کے پہلے حصے میں علامہ اعظمیؒ نے خود شیعہ مؤلف کے رسالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ تعزیہ داری کی رسم بہت قدیم نہیں ہے، اور سنیوں کی طرف اس کی جو نسبت کی گئی ہے، وہ فریب اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

تاریخ عزداری کی تحقیق کے بعد علامہ اعظمیؒ نے "حصہ دوم پر بحث" کا مرکزی عنوان قائم کر کے شیعہ مصنف کی کتاب کے دوسرے حصے کا رد کیا ہے، علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ شیعہ مؤلف نے دوسرے حصے کو ان عنوانات سے شروع کیا ہے:

"عاشوراء محرم کو خوشی منانے کے متعلق تمام روایتیں موضوع ہیں"، "سوائے یوم غم ہونے کے اس دن کی اور کوئی فضیلت نہیں ہے"

شیعہ مولف کے ان دونوں عنوانوں پر علامہ اعظمیؒ نے یہ اجمالی تبصرہ کیا ہے:

"پہلا عنوان تو خیر ایک حد تک درست ہے، لیکن دوسرا عنوان سراسر مغالطہ اور فریب ہے، اس لیے کہ سنی کتابوں کی جو عبارتیں آگے نقل کی ہیں، ان میں اس مضمون کا اشارہ تک نہیں ہے؛ اسی طرح دوسری کتابوں میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے، بلکہ اس کے خلاف مذکور ہے، چنانچہ 'ما ثبت بالسنۃ' ص ۷/ اور مشکوٰۃ ص ۱۷۳، بخاری، مسلم وغیرہ میں عاشوراء محرم کی یہ فضیلت مذکور ہے کہ اسی دن اللہ نے حضرت موسیٰ کو فرعون سے نجات بخشی، اور اسی دن فرعون کو غرقِ آب کیا، اس لیے حضرت موسیٰ نے اس دن روزہ رکھا، اور آنحضرت ﷺ بھی اس دن روزہ رکھنے کی بڑی تاکید فرمایا کرتے تھے، اور خود بھی کبھی اس دن کا روزہ ترک نہیں فرماتے (نسائی)، بلکہ ابوداود میں آنحضرتؐ کی یہ تصریح بھی موجود ہے: **فنحن نصومه تعظیماً له**، یعنی ہم اس دن کی عظمت کی وجہ سے اس کا روزہ رکھتے ہیں، مسلم وغیرہ میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ عاشوراء کے روزے سے ایک سال گزشتہ کے گناہ معاف ہوتے ہیں، بخاری کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اسی دن کعبہ کو غلاف بھی پہنایا جاتا تھا، حافظ ابن حجر نے اس مقام پر حضرت باقر رحمہ اللہ ورضی عنہ -جن کو شیعہ امام معصوم کہتے ہیں- کا بیان نقل کیا ہے کہ ہمارے زمانے تک یہ دستور موجود تھا (دیکھو فتح الباری ۲۹۲/۳)۔

سنی کتابوں میں جس طرح یوم عاشوراء کے فضائل مذکور ہیں، اسی طرح یہ بھی مصرَّح ہے کہ اس کو یوم غم بنانا جائز نہیں ہے، اور یہ کہ اس کو یومِ غم مقرر کرنا رافضیوں کی بدعت ہے"[۲]۔

(۱) ابطال عزاداری: ۱۳ (۲) ایضاً: ۲۴-۲۳

علامہ اعظمیؒ نے اپنی اس تصنیف میں نوحہ وغم، گریہ وماتم، سینہ کوبی، جامہ دری، ترکِ زینت اور سوگ وغیرہ عنوانات پر احادیثِ نبوی اور معتبر کتابوں کی روشنی میں ان کی حرمت اور سراسران کے غیر اسلامی اور غیر شرعی ہونے کو ثابت کیا ہے، اور ادلۂ شرعیہ کی روشنی میں ان کی شناعت وقباحت کو واضح کیا ہے، اور عاشورۂ محرم کے روز جو امور بلکہ خرافات روافض وشیعہ بجالاتے ہیں، اوران کی دیکھا دیکھی سُنّی بھی بہت سے مراسم میں شریک ہوتے ہیں، وہ بالکل غلط، بے بنیاد، بلکہ خلافِ شرع اور اسلام کے لیے اہانت آمیز ہیں۔ علامہ اعظمیؒ نے اپنے اس رسالے میں علامہ ابن حجر ہیتمی مکی سے لے کر احمد رضا خان بریلوی تک تقریباً ۲۴ فتوے نقل کیے ہیں، جن میں تعزیہ داری اور رسومِ عزاداری کو بدعت غیر دینی، بلکہ بعض حضرات کے نزدیک کفر وشرک کے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ کا یہ رسالہ ۶۴ رصفحات پر مشتمل ہے، جو لکھنؤ سے شائع ہونے والے رسالہ 'الداعی' کے جمادی الآخرہ سے لے کر ذی قعدہ ۱۳۶۱ھ میں شائع ہوا تھا۔ پھر ۱۴۲۶ھ = ۲۰۰۵ء میں مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ-مرقاۃ العلوم، مئو-کی طرف سے دوبارہ اشاعت پذیر ہوا۔

☆......☆......☆

تعزیہ داری اور دیگر مراسمِ عزاداری سنی نقطۂ نظر سے
یعنی
جملہ مراسمِ عزاداری کے متعلق اکابر ومشاہیر علماء اہل سنت کے فتوے

رسالۂ 'ابطال عزاداری' کے اندر تعزیہ داری اور مراسمِ عزاداری سے متعلق جو اہلِ علم کے فتاویٰ تھے، ان ہی کو ترتیب جدید اور اڑھائی صفحات پر مشتمل ایک تمہید کے ساتھ مکتبہ الفرقان بریلی کی طرف سے ''بریلی الیکٹرک پریس-بریلی'' سے چھاپ کر شائع کیا گیا تھا، اس کتاب میں جن علماء ومشاہیر کی تحریرات شامل کی گئی ہیں، ان کے اسماء گرامی یہ ہیں: علامہ شیخ شہاب الدین ابن حجر ہیتمی مکی، سید شریف سمہودی بحوالہ علامہ حیات سندی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، علامہ محمد طاہر پٹنی، برہان الدین بخاری، ملا احمد رومی، علامہ حیات سندی، علامہ مقریزی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، حضرت سید احمد شہید بریلوی، حضرت مولانا اسماعیل شہید، حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش، مولانا خرم علی، مولانا شاہ ابوالحسن نصیر آبادی، مولانا سخاوت علی جون پوری، مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی، مولانا حکیم لطف اللہ مفسر لکھنوی، مولانا نواب قطب الدین خاں صاحب دہلوی، مولانا شہود الحق بہاری، مفتی سعد اللہ، مولانا ارشاد حسین رام پوری، مولانا عبدالحی فرنگی محلی، مولوی احمد رضا خان بریلوی کے فتاویٰ کے بعد مولانا روم علیہ الرحمۃ کی ایک مثنوی پر اس رسالے کو ختم کیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس رسالے کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے:

''آپ جس وقت پتھر کی ترشی ہوئی، یا گچ چونے سے بنی ہوئی، کسی مورتی (بت) کے سامنے ڈنڈوت کرتے ہوئے اور اس کی پوجا کرتے ہوئے، کسی پڑھے لکھے ہندو کو دیکھتے ہوں گے، یا گنگا جمنا کے کنارے اس کے بہتے ہوئے پانی سے مرادیں مانگتے ہوئے اور اُس پر روپیہ پیسہ کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے اگر کسی ''بابو جی'' کو آپ نے دیکھا ہوگا، یا اگر آپ کی آنکھوں نے کبھی یہ سماں دیکھا ہوگا کہ صبح کا سہانا وقت ہے، اور درختوں پر بیٹھنے والی چڑیاں بھی اپنی زبان میں اللہ کی تسبیح وتقدیس کر رہی ہیں، اور اُسی کی حمد وثنا کے گیت گا رہی ہیں، لیکن سناتنی خیال کے ایک ہندو پروفیسر یا ہندو وکیل یا بیرسٹر ایک پیپل کے درخت کے سامنے سرِ نیاز خم کیے اور ہاتھ جوڑے مصروفِ ''پوجا'' ہیں، تو آپ کو یقیناً بڑی حیرت ہوئی ہوگی اور آپ نے رنج وافسوس کے ساتھ سوچا ہوگا کہ لکھ پڑھ جانے اور پروفیسر یا بیرسٹر ہو جانے کے باوجود یہ بے چارے کیسی جہالت اور کیسی توہم پرستی میں مبتلا ہیں''۔

پھر اسی جیسی دس سطروں کے بعد لکھا ہے:

''محرم میں عوام شیعہ صاحبان - اور بہت سی جگہ کے سنی کہلانے والے جاہل عوام بھی - جس طرح تعزیہ داری کرتے اور دیگر مراسمِ عزاداری پر عمل کرتے ہیں، اس میں مشرکانہ حرکات اور بدعات وخرافات کا جو طوفان برپا ہوتا ہے، کون صاحبِ علم ونظر ہے، جس کو اس میں شک ہو کہ یہ سب روحِ اسلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کے تعلیم کیے ہوئے مقدس دین کے خلاف ہے، اور اسلامی نقطۂ نظر سے تعزیہ داری کے اس سوانگ اور اس سے متعلقہ خرافات کی حیثیت نصاریٰ کی صلیب پرستی، ہندوؤں کی بت پرستی اور ان کے رام لیلا وغیرہ کے سوانگوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے''۔

ردِ شیعیت میں یہ نہایت بیش قیمت رسالہ ۳۹ صفحات پر مشتمل ہے، اور اس طرح یہ رسالہ بھی شیعہ رسالے 'عزاداری اور اس کا اثبات سنی نقطۂ نظر سے' کا ایک مدلّل ومبرہن جواب ہے، جس کو پڑھنے کے بعد یومِ عاشورہ کی خرافات اور تعزیہ داری کی رسوم وجہالات کی شناعت وقباحت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

☆......☆......☆

تنبیہ الکاذبین

یہ کتاب مولوی اعجاز حسن بدایونی کے رسالہ 'تنبیہ الناصبین' کا جواب ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامہ 'النجم' میں سالہا سال تک شیعوں کو یہ چیلنج کیا جاتا رہا کہ ان کا ایمان قرآن پر نہیں ہے، اور مجتہدین شیعہ کی غیرت کو ابھارا جاتا رہا کہ اگر قرآن پر ان کا ایمان ہو تو اس کو ثابت کریں۔ مسلسل چیلنج کرنے کے بعد ۱۳۴۲ھ میں شیعوں کے لاہوری مجتہد جناب حائری

صاحب کا 'موعظۂ تحریف قرآن' شائع ہوا۔ حائری صاحب اس کتاب میں اصل چیلنج کا کوئی جواب تو دے نہیں سکے، انھوں نے سارا زور اس بات پر صرف کیا کہ اہل سنت والجماعت کا بھی قرآن پر ایمان نہیں ہے۔

شیعوں کا یہ رسالہ جب امام اہل سنت کے ہاتھ لگا، تو آپ نے 'تنبیہ الحائرین' کے نام سے اس کا نہایت زلزلہ افگن جواب تحریر فرمایا، کئی سال کے بعد جواب کا نام کرنے کے لیے مولوی اعجاز حسن بدایونی نے 'تنبیہ الناصبین بجواب تنبیہ الحائرین' کے نام سے ایک کتاب لکھ کر پوشیدہ طریقے سے اپنی جماعت میں اس کی اشاعت کی، جو ۱۳۴۸ھ = ۱۹۲۹ء میں خواجہ بک ایجنسی لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ مولوی اعجاز حسن کی اسی کتاب کا جواب اور امام اہل سنت کا دفاع 'تنبیہ الکاذبین' نامی علامہ اعظمیؒ کی اس کتاب میں دیا گیا ہے۔ (۱)

'تنبیہ الناصبین' پر اجمالی تبصرہ کرتے ہوئے علامہ اعظمیؒ نے اپنی تمہیدی تحریر میں مولوی اعجاز حسن صاحب کی کتاب 'تنبیہ الناصبین' کی حقیقت سے یوں پردہ اٹھایا ہے:

''کتاب دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ مولوی اعجاز حسن صاحب نے 'تنبیہ الحائرین' کے اس حصے کا جس میں شیعوں کی مذہبی کتابوں سے عقیدۂ تحریفِ قرآن کا ثبوت اور ان کے علما کے اقرارات پیش کیے گئے ہیں، اس کے ایک لفظ کا بھی جواب نہیں دیا ہے، بلکہ درحقیقت انھوں نے 'تنبیہ الحائرین' کا جواب ہی نہیں لکھا ہے، دفتر 'النجم' سے ایک رسالہ مولوی اعجاز حسن بدایونی کا جواب کے نام سے شائع ہوا تھا، اس کا جواب لکھا ہے، لیکن نام کرنے کے لیے 'تنبیہ الحائرین' کی عبارت بھی کہیں کہیں سے لے لی ہے، اور یہ ظاہر کر دیا ہے کہ اس کتاب کی بحث دوم کا جواب ہو گیا، اور بحث اول جس کا جواب دینا نہایت ضروری تھا، اس کو 'تنبیہ الناصبین' کے دوسرے حصے پر اٹھا رکھا، جس کو بعد میں شائع کرنے کا وعدہ کیا۔ ہم تو پہلے ہی سے جانتے تھے کہ 'تنبیہ الحائرین' کی بحث اول کا جواب کسی شیعہ کے امکان میں نہیں ہے، مولوی اعجاز حسن نے شیعوں کے بہلانے کے لیے یہ لکھ دیا کہ بحث اول کا جواب بعد میں شائع ہوگا، لیکن اب شیعوں نے بھی دیکھ لیا کہ مولوی اعجاز حسن صاحب مر گئے اور بحث اول کا جواب نہ دے سکے''(۲)۔

پھر چند صفحوں کے بعد اسی بات کو اور وضاحت کے ساتھ لکھا ہے، فرماتے ہیں:

''تفصیلی بحث شروع کرنے سے پہلے یہ بتا دینا مناسب ہے کہ ۲۶ء میں مولوی اعجاز حسن بدایونی نے اخبار 'درنجف' میں تحریف قرآن کے متعلق ایک مضمون شائع کیا تھا، ۴۴ھ میں اس مضمون کا جواب بعنوان ''مولوی اعجاز حسن بدایونی کا جواب'' النجم میں شائع ہوا، پھر ۴۶ھ میں النجم کا یہ مضمون علاحدہ کتابی صورت میں شایع ہوا۔ مولوی اعجاز حسن بدایونی نے 'تنبیہ الناصبین' میں صفحہ ۲۳۷ تک اسی رسالہ -مولوی اعجاز حسن بدایونی کا جواب- کا جواب لکھا ہے، پھر صفحہ ۲۳۸ سے صفحہ ۲۷۹ تک یعنی صرف ۲۱ ورق میں 'تنبیہ الحائرین' کا جواب لکھا ہے، اور اس میں بھی 'تنبیہ الحائرین' کے درمیانی صرف ۱۲ ورق کی

(۱) تمہید رسالہ تنبیہ الکاذبین (۲) النجم-محرم ۱۳۵۲ھ-:۵۳-۵۲

کوئی کوئی عبارت نقل کی ہے۔ بس یہ کل حقیقت ہے اُس بانگ بے ہنگام کی جو مدتوں سے فضا میں گونج رہی تھی کہ 'تنبیہ الحائرین' کا جواب اب لکھا جارہا ہے، اور اب تیار ہو گیا"(۱)۔

ان دونوں اقتباسات کو پڑھنے کے بعد ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں، کہ شیعہ عقیدۂ تحریفِ قرآن کی دلدل میں کس طرح پھنسے ہوئے ہیں، اور ان کی پیشانی پر یہ ایک ایسا بدنما داغ ہے، جس کو دھلنے سے وہ بے بس ہیں۔ علامہ اعظمیؒ نے اپنے اصل موضوع یعنی 'تنبیہ الناصبین' کے جواب سے پہلے کتب شیعہ کی روایتیں، اور ان کی معتبر کتابوں سے متعدد عبارتیں نقل کر کے ان کے سامنے آئینہ رکھ دیا ہے کہ اُن کے اقرار کے رُو سے ان کا ایمان قرآن پر نہیں ہے۔ یہ اہل سنت کا دعویٰ ہے، اب اگر شیعوں کے اندر ذرا بھی ہمت اور حیا وحمیت ہو تو اس کا جواب دے کر قرآن پر اپنے ایمان کو ثابت کریں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ شیعہ اس الزام کے دفعیہ سے عاجز وقاصر ہیں۔ ائمۂ شیعہ کی کئی روایتیں نقل کر کے علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

"ان روایتوں میں تصریح ہے کہ قرآن بڑھایا گیا، گھٹایا گیا، اس میں سے آیتیں نکال ڈالی گئیں، اور اس میں تحریف وتبدیل واقع ہوئی"(۲)۔

اور شیعوں نے اہل سنت پر عقیدۂ تحریف کا جو الزام لگایا ہے، اس کی نسبت لکھا ہے:

"شیعوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ سنیوں کی کتابوں میں ایک کمزور روایت بھی تحریف قرآن کی نہیں مل سکتی، نہ کسی عالم کا قول مل سکتا ہے، نہ صحابیؓ کا۔ تمام اہل سنت کا اجماعی عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں کسی قسم کی تحریف نہ ہوئی ہے، نہ ہونا ممکن ہے؛ اور اہل سنت اپنے اس عقیدے کو قرآن کریم اور احادیث متواترہ اور اجماع متواتر اور دلائل عقلیہ سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ عقیدہ اہل سنت کے نزدیک ان ضروریاتِ دین سے ہے، جن کا منکر بلا تردد خارج از اسلام ہے۔ اگر میں اس باب میں اہل سنت کی تصریحات نقل کرنا شروع کروں، تو ایک مجلدِ ضخیم تیار ہو سکتی ہے" (۳)۔

اور اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ اہل سنت کے مستند اہل علم کی کئی ایک معتبر کتابوں سے قرآن کریم کے ناقابل ترمیم وتبدیل ہونے کی صریح اور صاف عبارتیں نقل کی ہیں، جن سے قرآن کریم کی نسبت سنیوں کے عقیدے کا پتہ چلتا ہے۔

اپنی کتاب 'تنبیہ الکاذبین' میں علامہ اعظمیؒ کے جواب کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے وہ 'درنجف' سے مولوی اعجاز حسن کا کلام نقل کرتے ہیں؛ پھر اس پر 'النجم' میں جو لکھا گیا، اس کو نقل کرتے ہیں؛ اس کے بعد مولوی اعجاز حسن نے 'تنبیہ الناصبین' میں جواب کے نام پر جو لکھا ہے، اس کو ذکر کرتے ہیں؛ اور اس کے بعد خود اس کا رد کرتے ہیں۔

علامہ اعظمیؒ کا یہ رسالہ ۱۳۵۲ھ میں محرم اور اس کے بعد کے 'النجم' کے کئی شماروں میں شائع ہوا تھا۔

(۱) النجم: ۶۲-۶۱ (۲) ایضاً: ۵۶ (۳) ایضاً: ۵۷

فتوی بابت شیعہ اثناعشریہ

رئیس المناظرین حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ نے ۱۴۰۷ھ میں علامہ اعظمیؒ کے پاس ایک طویل استفتا روانہ کیا تھا، جس میں انھوں نے اثناعشری شیعہ کے عقائد ونظریات تفصیل کے ساتھ نہایت مستند دلائل اور حوالوں کی مدد سے قلم بند کرکے شیعوں کے اس فرقے کے بارے میں شریعت کا حکم معلوم کیا تھا۔ علامہ اعظمیؒ نے مولانا نعمانیؒ کے اس استفتا کے- جو پہلے ہی سے بہت مُدلّل اور مُبرہَن تھا- مشمولات کو اپنی تحقیقات سے مزید تقویت پہنچائی، اوران کے عقائد کی روشنی میں ان کو خارج از اسلام قرار دیا۔ اس کے بعد مولانا نعمانیؒ نے اس استفتا اوراس کے جواب کو پورے ملک کے موقر اہل علم اور مدارس ودارالافتا میں بھیج کران کی تائید حاصل کی۔

علامہ اعظمیؒ کی یہ تحریر شیعوں کی حقیقت کے بارے میں نہایت چشم کُشا ہے، اس کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے:

> ''اثناعشری شیعہ بلاشک وشبہہ کافر ومرتد ہیں، کیونکہ وہ تحریفِ قرآن کے برملا قائل اور معتقد ہیں، اوراس کا خود شیعوں کو اعتراف ہے۔ ان دونوں باتوں کا ناقابلِ تردید ثبوت خود مستفتی نے پیش کردیا ہے''(۱)۔

اس کے بعد شیعوں کی متعدد مستند کتابوں سے تحریف قرآن سے متعلق ان کی عبارتیں نقل کرکے مولانا نعمانی کے استفتا میں تحریر کردہ ثبوتوں کو تقویت فراہم کی ہے۔

عقیدۂ تحریف قرآن کی بحث کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

> ''اثناعشری شیعوں کے خبیث اور کفریہ عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ رسول خدا ﷺ کی وفات کے بعد چار شخصوں کے سوا سارے صحابہ، تمام مہاجرین وانصار مرتد ہوگئے تھے، یعنی کفر کی طرف پلٹ گئے تھے، اور کفار کی بدترین قسم میں شامل ہوگئے تھے، اوراس ارتداد میں سب سے زیادہ اور بھرپور حصہ حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ نے لیا تھا، اوراسی کفر وارتداد کی حالت میں ان کی وفات ہوئی، توبہ کی توفیق نصیب نہ ہوئی''(۲)۔

پھر شیعوں کے اس عقیدے کو ان کی مستند کتابوں - رجال کشی، حیات القلوب، اور صافی وغیرہ- کی عبارتیں نقل کرکے ثابت کیا ہے۔

شیعہ کا تیسرا عقیدہ جو موجب تکفیر ہے، وہ ختم نبوت کا انکار ہے، اس کے متعلق علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

> ''اثناعشری کے وجوہ کفر میں سے ایک وجہ انکارختم نبوت بھی ہے، اہل اسلام کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کے سوا نبیوں رسولوں کی طرح کوئی معصوم اور مفترض الطاعۃ -جس کی اطاعت فرض ہو- نہیں ہے، لیکن شیعوں کے عقیدہ میں امام بھی معصوم اور مفترض الطاعۃ ہوتا ہے، اس پر وحی باطنی آتی ہے،

(۱) الفرقان-خصوصی اشاعت-:۹۹ (۲) ایضاً:۱۰۴

اس کو حلال وحرام کرنے کا اختیار ہوتا ہے، وہ تمام کمالات وشرائط اور صفات میں انبیا کا ہم پلہ ہوتا ہے، اس میں اور پیغمبر میں کوئی فرق نہیں ہوتا، بلکہ امامت کا مرتبہ پیغمبری سے بھی بالاتر ہے''(۱)۔

اس کے بعد اپنے اس مدعا کے ثبوت میں 'حیات القلوب' اور 'کافی' 'صافی' وغیرہ کی متعدد عبارتیں نقل کر کے ان کے عقائد کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کر دیا ہے، اور ان تمام عقائد کی روشنی میں پھر یہ لکھا ہے:

''ان عبارتوں کے مطالعہ کے بعد اس میں شک شبہہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ اثناعشری شیعہ ''ختم نبوت'' اور ''خاتم النبیین'' کے الفاظ کے تو قائل ہیں، لیکن اس کی حقیقت کے قطعی منکر ہیں، اسی بنا پر حضرت شاہ ولی اللہؒ نے موطا امام مالک کی عربی شرح 'مُسوّیٰ' میں ان کو دائرۂ اسلام سے خارج اور زندیق قرار دیا ہے''(۲)۔

پھر ان شیعوں کی تکفیر کی مزید تائید وتقویت کے لیے ملاعلی قاری کی متعدد عبارتیں نقل کر کے مزید سند فراہم کر دی ہے۔

علامہ اعظمیؒ کا یہ فتویٰ ۷؍صفر ۱۴۰۷ھ کا تحریر فرمودہ ہے۔ یہ فتوی، مع استفتا اور علما کی تصدیقات کے ماہنامہ 'الفرقان' کی خصوصی اشاعت میں اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۷ء=صفر تا ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ میں شائع ہو چکا ہے، جو درحقیقت شیعوں کے کفریہ عقائد کے سلسلے میں کسی قیمتی دستاویز سے کم نہیں ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

حضرت امیر معاویہؓ کا مرتبہ ومقام

پیشِ نظر تحریر صرف ایک مضمون نہیں، بلکہ ایک مستقل رسالہ کی حیثیت رکھتی ہے، یہ تحریر دراصل اردو زبان کے مشہور ادیب ومصنف اور مضمون نگار خواجہ حسن نظامی کی کتاب ''طمانچہ بر رخسار یزید'' کا تعاقب ہے، نظامی صاحب نے اپنی کتاب میں حضرت امیر معاویہ-رضی اللہ عنہ- کی شان میں گستاخانہ الفاظ وکلمات کا استعمال کیا تھا اور حضرت امیر معاویہؓ کے تقدس کو پامال کرنے کی سعی غیر محمود کی تھی۔

حضرت محدث کبیر نے اپنی دو صفحے کی تمہید کے بعد ''تحریر مضمون کی ضرورت'' کے عنوان سے مقصدِ تالیف پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

''چونکہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کے جاہل طبقہ میں ایک بہت بڑی گمراہی پھیل جانے کا اندیشہ تھا، اس لیے قرآن کریم اور حدیث رسولِ پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) اور عقائد اہلِ سنت کی روشنی میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی نسبت صحیح خیالات پیش کیے جاتے ہیں، امید ہے کہ یہ سطریں ناواقف مسلمانوں کی سچی رہنمائی کریں گی، اور مسلمان بداعتقادی کے اس دلدل سے، جس میں انھیں خواجہ صاحب نے پھنسانا

(۱) الفرقان: ۱۰۸　　(۲) ایضاً: ۱۱۰

چاہا ہے، نکلنے کی کوشش کریں گے، اور اسی سلسلے میں دفاع عن الصحابہؓ کی جلیل ترین خدمت بھی انجام پذیر ہوجائے گی، جس کو میں اپنے لیے ذریعۂ بخشش تصور کروں گا''۔(۱)

اس تمہید کے بعد آپ نے حدیث کی متعدد مستند کتابوں سے صحابہ کرام -رضی اللہ عنہم- کی عظمت وفضیلت کی روایات نقل فرمائی ہیں، یہ اٹھارہ حدیثیں ہیں، جو عام صحابہ کرامؓ کی تعظیم وتوقیر اور ان کی محبت وعقیدت کے متعلق وارد ہوئی ہیں۔

صحابۂ کرامؓ کی فضیلت میں وارد احادیث کو نقل کرنے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے ''حضرت معاویہ -رضی اللہ عنہ- کے مخصوص فضائل'' کے عنوان سے بہت ساری حدیثیں ذکر کی ہیں، اور ان کے مناقب شمار کرائے ہیں، ان مناقب کو نقل کرنے سے پہلے لکھا ہے:

''حضرت معاویہؓ کے صحابی ہونے کا کوئی انکار نہیں کرسکتا، اور رسول پاک -صلی اللہ علیہ وسلم- کی صحبت تنہا اتنا بڑا اشرف، اتنی عظیم الشان فضیلت ہے، جس کی برابری اور کوئی فضیلت نہیں کرسکتی، اہل سنت کثّـرھمُ اللہ کا مشہور مسئلہ ہے کہ کوئی کیسا ہی بڑا ولی ہو، ایک ادنی صحابی کے مرتبہ کو بھی نہیں پہنچ سکتا، پھر اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسری فضیلت کی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تاہم واقعہ یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کا دامن اور فضائل وکمالات سے بھی پُر ہے، ان کے کثیر التعداد مناقب میں چند باتیں ذکر کی جاتی ہیں''۔(۲)

اس تمہید کے بعد لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ کا جنتی ہونا نص قرآنی سے ثابت ہے، اور اس کی دلیل میں سورۂ حدید کی یہ آیت پیش کی ہے: ﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ أَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ (جن لوگوں نے فتح مکہ سے پیشتر اسلام کی جانی ومالی خدمتیں انجام دیں، وہ اور جن لوگوں نے فتح مکہ کے بعد مالی وجانی جہاد کیا، دونوں برابر نہیں ہوسکتے، اگلے لوگوں کا درجہ بعد والوں سے بڑھا ہوا ہے، اور اللہ نے دونوں کے لیے جنت کا وعدہ فرمایا ہے)۔

اس آیت کو نقل کرکے لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ دوسرے گروہ میں شامل ہیں، اس لیے کہ وہ فتح مکہ کے تقریباً ایک سال پہلے مشرف باسلام ہوئے ہیں، اور فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین میں شریک ہوئے ہیں۔

حضرت معاویہؓ کے فضائل میں وارد متعدد احادیث مرفوعہ کے علاوہ ان کا کاتبِ وحی ہونا، رسول اللہ -صلی اللہ علیہ وسلم- کی خدمت گزاری کرنا، ان کا فقیہ ومجتہد نیز بارہ خلفاء میں ہونا بھی شمار کیا ہے۔

اس مضمون کا ایک عنوان ہے ''حضرت معاویہؓ صحابہؓ وتابعینؒ کی نظر میں''۔ اس کے تحت حضرات شیخین -ابوبکرؓ وعمرؓ- نیز حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور دوسرے بہت سے صحابہؓ وتابعین کے اقوال وآراء جمع کیے ہیں، اور آخر میں خواجہ حسن نظامی کی طرف سے کیے جانے والے دلآزار اور جگر خراش مطاعن اور ان کے الزامات

(۱) المآثر جلد ا شمارہ ۲، ص: ۱۵-۱۴ (۲) ایضاً: ۲۰

واتہامات کا جواب دیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ کی یہ تحریر جمادی الاولی و جمادی الاخری ۱۳۴۹ھ کے 'النجم' میں شائع ہوئی تھی، دوبارہ سہ ماہی مجلّہ 'المآثر' کے شمارے بابت ربیع الآخر- جمادی الاخری، اور شوال- ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ کے دوشماروں میں اشاعت پذیر ہوئی۔

☆......☆......☆

عظمتِ صحابہ

بہت پہلے ''علمی الیکٹرک پریس، تلیانالہ بنارس'' سے ایک کتاب 'اصحاب رسول اللہ اور معایہ کی صحابیت' کے نام سے ایک سو گیارہ (۱۱۱) صفحات میں چھپی تھی، کتاب کے سرورق پر اس کے مصنف کا نام ''سید بابا خلیل احمد صاحب چشتی صابری امجدی فاضل علوم مشرقی ومغربی بنارس'' لکھا ہوا ہے۔ بابا خلیل احمد نے اس کتاب میں حضرات صحابہؓ کی شان میں گستاخانہ حملے کیے، اور شیعوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے انھوں نے نہ صرف حضرت معاویہؓ کی ذات پر بہتان طرازی اور افترا پردازی کی، بلکہ حضرت معاویہؓ کی صحابیت تک سے انکار کردیا۔

باوجودیکہ یہ کتاب اپنے مضمون کے لحاظ سے اس قابل نہیں تھی کہ علامہ اعظمیؒ کی بلند پروازی اس کی طرف اپنی توجہ صرف کرتی، مگر دینی غیرت وحمیت اور اصحاب رسول ﷺ کی محبت نے گوارا نہ کیا کہ اس کا رد کیے بغیر آپ اطمینان کا سانس لیں، چنانچہ آپ نے قلم اٹھایا اور اس کا دنداں شکن جواب تیار کرکے رکھ دیا۔

علامہ اعظمیؒ نے 'عظمتِ صحابہ' میں اپنی مختصر تمہید کے بعد ساڑھے چار سطر میں پوری کتاب کا خلاصہ بیان کردیا ہے، لکھا ہے:

''حضرت معاویہؓ ایک سچے مومن ومسلم اور رسول خدا ﷺ کے قابلِ عزت صحابی تھے، اور جو غلطیاں ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، ان میں سے اکثر وبیشتر تو جھوٹ اور ان پر بہتان ہیں، اور بعض جو صحیح ہیں، جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کا جنگ کرنا، تو وہ از قبیلِ خطائے اجتہادی یا بِنا بر غلط فہمی تھیں، اس لیے ان پر لعن وطعن بلکہ ملامت بھی ناجائز ہے۔ یہ ہے اہلِ سنت وجماعت کا تحقیقی واجماعی مسلک''۔

اس کے بعد آپ نے صحیح بخاری اور اصابہ وغیرہ سے صحابی کی تعریف میں متعدد عبارتیں نقل کی ہیں، جن کا حاصل یہ ہے:

''صحابی وہ ہے جو آنحضرت ﷺ سے ایمان کی حالت میں ملاقات کرے اور اسلام پر مرے''۔

اور اس تعریف کے معتبر ہونے پر متعدد اہل علم کی تصریحات نقل کی ہیں، جن میں حافظ ابن حجر عسقلانی، علامہ قسطلانی اور زرقانی ونووی وغیرہ ہیں۔

بابا خلیل احمد نے ایک رافضی مصنف کی کتاب 'نصائح کافیہ' سے نقل کیا ہے کہ صاحب یا صحابی کا اطلاق کافر یا منافق پر بھی ہوتا ہے، علامہ اعظمیؒ نے اس کا پُر زور رد کیا ہے، اور اس میں لکھا ہے:

''صاحبِ نصائح اور اس کا مقلد دونوں حد درجہ جاہل ہیں، ان کو یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ کی صحبت کا شرف اسلام میں ایک اعلیٰ درجہ کا شرف ہے، اور جس طرح صدیق، شہید، ولی اور قطب وغیرہ کوئی غیر مسلم نہیں ہوسکتا، اسی طرح صحابی بھی کوئی غیر مسلم نہیں ہوسکتا، اور یہ کہ صحابیت کا شرف، ولایت، قطبیت اور غوثیت ہر چیز سے بڑھا ہوا ہے''(۱)۔

پھر چند سطروں کے بعد لکھا ہے:

''نیز علم وایمان والوں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ صحبتِ رسول- یعنی ایمان کے ساتھ حاضری وزیارت- اتنا بڑا شرف، اتنی بڑی بزرگی اور ایسی منقبت ہے، جس میں کوئی غوث، کوئی قطب اور کوئی ولی ان کا شریک وحصہ دار نہیں ہے، اور نہ ان میں سے کوئی کسی صحابی کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے''(۲)۔

اسی بحث میں دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد جو لوگ مرتد ہوئے، ان میں کوئی صحابی نہیں تھا، چنانچہ امام خطابیؒ نے فرمایا ہے: **لم يرتدَّ منَ الصحابةِ أحدٌ، إنَّما ارتدَّ قومٌ منْ جُفاةِ الأعرابِ مِمن لا نصرةَ له في الدين، وذلک لا يُوجِبُ قدحاً في الصحابة.** یعنی صحابہ میں سے کوئی مرتد نہیں ہوا، بلکہ دیہاتیوں کی ایک اجڈ جماعت جن کی دین میں کوئی مدد نہیں تھی، مرتد ہوگئی تھی، اور اس سے صحابہ پر کوئی قدح لازم نہیں آسکتی۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے عدالتِ صحابہ کے موضوع پر گفتگو فرمائی ہے، اور ''تمام صحابہ عدل ہیں'' کے زیر عنوان تحریر فرمایا ہے:

''اہلِ سنت والجماعت کا اجماعی مسلک- جس میں کسی سنی کا کوئی اختلاف نہیں ہے- یہ ہے کہ صحابہ کل کے کل عدل ہیں، ان میں کوئی بھی فاسق وفاجر نہیں ہے''(۳)۔

پھر اپنی اس بات کی تائید میں ائمۂ اہلِ علم کے بہت سے اقوال نقل کیے ہیں، ان میں ابن عبدالبر کی 'استیعاب'، علامہ ابن الاثیر جزری کی 'جامع الاصول'، امام نووی کی 'شرح مسلم'، امام غزالی کی 'احیاء العلوم' اور علامہ سید مرتضیٰ زبیدی کی 'شرح احیاء'، حافظ ابن حجر کی 'اصابہ'، محقق کمال الدین ابن الہمام حنفی کی 'مسامرہ'، ان کے شاگرد ابن ابی شریف کی 'مسایرہ'، اور ملا علی قاری کی 'شرح فقہ اکبر' کی عبارتیں منقول ہیں، جن سے عدالتِ صحابہ کا مسئلہ روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتا ہے۔

عدالتِ صحابہ کے مسئلے سے فراغت کے بعد ایک عنوان ''صاحبِ نصائح کی بکواس'' قائم کیا ہے، اس کے ضمن میں صاحبِ 'نصائح' کی شخصیت اور اس کی حیثیت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

(۱) عظمتِ صحابہ: ۱۲-۱۱ (۲) ایضاً: ۱۳ (۳) ایضاً: ۱۷

''صاحبِ نصائح نہ کوئی دیندار آدمی تھا، نہ محقق عالم، نہ سنی المذہب، وہ ایک سنی نما رافضی اور بدعقیدہ شخص تھا، اس کی مادری زبان عربی تھی، اس نے عربی میں ایک کتاب 'النصائح الکافیۃ' کے نام سے تصنیف کی، جس میں سنی بن کر اس نے اپنے رافضیانہ عقائد وخیالات پیش کیے، مگر اُس زمانہ میں اُس کو ایک سنی بھی ایسا نہ ملا جو اُس کی تائید کرتا، یا اس کی کتاب کی اشاعت میں حصہ لیتا، چنانچہ دیارِ عرب اور بلادِ ہند میں کہیں بھی اُس کو سنی پریس نہیں مل سکا، جہاں وہ اپنی ملعون کتاب چھپواتا، آخر بمبئی کے معروف ومشہور ایرانی رافضی تاجرِ کتب آقا شیرازی کی سرپرستی میں اور اس کے مطبع مظفری میں وہ کتاب چھپی''[1]۔

اس کے دو سطر بعد بابا خلیل احمد کی کتاب سے اس طرح پردہ اٹھایا ہے:

''پھر کتاب کی عبارتیں مع ترجمہ نقل کر کے اسی شیعہ نے ایک کتاب ترتیب دی اور از راہِ فریب اس کو خلیل داس کی تصنیف قرار دیا، اور اسی کے ساتھ خلیل داس کو فاضلِ علوم شرعی کا ڈپلومہ بھی عطا کر دیا، خلیل داس کو اس سے بڑی علمی معراج اور کیا حاصل ہو سکتی تھی، جھٹ آپ نے اس کو اپنے نام سے شائع کرا دیا''[2]۔

صاحبِ نصائح نے عدالتِ صحابہ کے مسئلے پر جو بدگوئی کی ہے، علامہ اعظمیؒ نے اس کے رد وابطال میں کئی صفحات تحریر فرمائے ہیں، اور اس کے ایک ایک اعتراض کو ہباءً منثوراً کر کے رکھ دیا ہے، اور ثابت کر دیا ہے کہ ان کی حیثیت تارِ عنکبوت سے زیادہ نہیں ہے۔ آپ کی اس بحث سے شیعوں کی اسلام دشمنی اور شریعت واحکامِ شریعت سے بیزاری بھی اچھی طرح آشکار ہو جاتی ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے صاحبِ نصائح اور اس کے مقلد بابا خلیل کی ایک اصولی غلطی کی نشاندہی کی ہے کہ وہ قرآن کریم کے مقابلے میں تاریخی روایات کو ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم صحابہؓ کی عدالت اور رضاء الٰہی سے ان کی سرفرازی کا ببانگِ دہل اعلان کر رہا ہے، مگر یہ لوگ اس کے بالمقابل تاریخ کے رطب ویابس اندراجات پر بھروسہ کر کے صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کو ہدفِ طعن وملامت بناتے ہیں، علامہ اعظمیؒ نے اس کی نسبت لکھا ہے:

''اہلِ علم واہلِ ایمان کا ایک متفق علیہ اصولی عقیدہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی شہادت قطعی وحتمی ہے، اور تاریخ کی کتابوں کا کوئی بیان خواہ اس کی سند کتنی ہی ٹھوس ہو، قرآن کی شہادت کے مقابلہ میں قابلِ سماعت اور لائق التفات نہیں ہے۔ لہٰذا جب کبھی تاریخ کی کتابوں کا بیان قرآن سے ٹکراتا ہو، تو ہمیشہ یہی کرنا لازم وواجب ہے کہ قرآن کی تصدیق کی جائے، اور تاریخ کا بیان ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے، یا تاویل ممکن ہو تو تاویل کر لی جائے، مگر صاحبِ نصائح ایسا غلط کار اور قرآن پر اس کا ایمان اتنا کمزور ہے کہ وہ اس کے برعکس تاریخ کے بیان کو متواتر، قطعی اور حتمی مان کر قرآنی شہادتوں میں تاویل

(۱) عظمتِ صحابہ: ۲۳ (۲) ایضاً: ۲۴-۲۳

اور تحریف کی کوشش کرتا ہے"[۱]۔

پھر اپنے اس بیان کی تائید میں ملاعلی قاری کی 'شرح شفا'، شیخ عبدالحق دہلوی کی 'مدارج النبوۃ' 'تکمیل الایمان' کی عبارتیں نقل کی ہیں، ان حضرات نے جاہل راویوں، گمراہ اور غالی شیعوں اور بدعتیوں کی اس قسم کی روایات سے اعراض اور صرفِ نظر کی سخت تاکید کی ہے، اور ملاعلی قاری نے 'شرح شفا' میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اس باب میں مورخوں کا اکثر بیان غلط اور صریح جھوٹ ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس بحث کے آخر میں مشائخِ صوفیہ میں سے ایک جلیل القدر بزرگ حضرت سہل بن عبداللہ تُستَری کا یہ سبق آموز قول نقل کیا ہے کہ:

"لم يؤمِنْ بالرَّسولِ مَنْ لَمْ يُوَقِّرْ أصحابَه ولَمْ يُعزِّزْ أوامرَه (شرح شفا شریف ۲/۹۷)
یعنی جو صحابہ کی توقیر نہ کرے اور آنحضرت ﷺ کے احکام کا احترام نہ کرے، اس کا رسول پر ایمان نہیں ہے"[۲]۔

کتاب کے آخری حصے میں علامہ اعظمیؒ نے "حضرت معاویہؓ کی صحابیت" کے عنوان سے بیس معتبر کتابوں کے حوالے ذکر کیے ہیں، جن میں حضرت معاویہؓ کے صحابی ہونے کی تصریح کی گئی ہے۔

اور پھر "حضرت معاویہؓ کی غلطی اجتہادی غلطی تھی" کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ:

"جملہ محققینِ اہلِ سنت نے حضرت معاویہؓ کی غلطی کو اجتہادی غلطی اور حضرت علیؓ سے ان کی مخالفت کو شبہہ پر مبنی قرار دیا ہے"[۳]۔

اور اپنے اس مدعا کے ثبوت میں عربی وفارسی عبارتوں کا انبار لگا دیا ہے، اور نہایت مستند حوالوں سے تقریباً ۳۵ عبارتیں نقل کی ہیں، جن میں سے بہت سی عبارتوں میں حضرت امیر معاویہؓ کی غلطی کے اجتہادی ہونے اور اجتہاد پر ان کے ماجور ہونے کو بصراحت بیان کیا گیا ہے۔

یہ کتاب یا رسالہ ۸۹/صفحات پر مشتمل ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۱۴۲۵ھ = ۲۰۰۵ء میں مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ - مرقاۃ العلوم، مئو - سے شائع ہوا ہے۔

☆......☆......☆......☆

تعدیلِ رجالِ بخاری

شیعوں کی اسلام دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، جب سے شیعیت عالم وجود میں آئی ہے، اس وقت سے کوئی دور اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا ہے، جس میں شیعوں نے اسلام کی عمارت اور اس کے قلعے پر ضرب لگانے کی کوشش نہ کی ہو؛ کتاب اللہ، حدیثِ رسول اللہ ﷺ - اسلامی احکام وتعلیمات غرض دینِ اسلام سے تعلق

(۱) عظمتِ صحابہ: ۴۶ (۲) ایضاً: ۵۱ (۳) ایضاً: ۶۰-۵۹

رکھنے والی کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جو شیعوں کے ناپاک عزائم سے محفوظ رہی ہو۔

اسلام اور تعلیماتِ اسلام سے متعلق شیعوں کی کارروائیوں کی بدترین مثال مرزا عبدالحسین لکھنوی کا رسالہ 'رجالِ بخاری' تھا، مصنفِ رسالہ نے اس میں صحیح بخاری کے راویوں بشمول صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نفوس مقدسہ پر تہمت تراشی وافترا پردازی کی تھی، یہ رسالہ کس قدر تکلیف دہ اور اذیت ناک تھا اس کا اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے، جسے علامہ اعظمیؒ نے ۱۱رمحرم ۱۳۵۸ھ کو اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا تھانویؒ کی خدمت میں لکھا تھا، اس میں تحریر ہے:

''آج کل ایک شیعی رسالہ - رجالِ بخاری - کے رد میں منہمک ہوں، حضرات صحابہ کی شان میں سخت گستاخی کی گئی ہے، دیکھ کر خون کھولنے لگتا ہے''

ایسا اذیت ناک رسالہ علامہ اعظمیؒ کی نظر سے گزر جائے، اور آپ کی مذہبی حمیت جوش میں نہ آئے، یہ ممکن نہ تھا، اس سے پہلے یہ رسالہ مشہور عالمِ دین علامہ سید سلیمان ندویؒ کی نظر سے بھی گزرا تھا، اور انھوں نے بھی علامہ اعظمیؒ سے اس کا جواب لکھنے کی تحریک کی تھی، آپ نے اس کا رد کرنا شروع کیا اور نہایت مبسوط ومفصل جواب تیار کر دیا، جس وقت آپ یہ جواب تحریر فرما رہے تھے، اس وقت آپ کو کس قدر انہماک تھا، اس کا اندازہ مذکورہ بالا خط کے حسبِ ذیل فقرے سے ہوتا ہے:

''اس کے رد میں اتنا انہماک ہے کہ بجز درس وفرائض شرعی وضروریات کے اور کوئی کام نہیں ہوتا، سارا وقت اسی میں صرف ہوتا ہے''۔

مرزا عبدالحسین نے اپنے رسالے کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا، جس میں کبارِ تابعین اور عظماء محدثین کے علاوہ تقریباً اٹھائیس صحابۂ کرامؓ کو ہدفِ طعن بنایا تھا، اور ان کے بارے میں بدکلامی وبدزبانی کی رافضیانہ خصوصیات کا مظاہرہ کیا تھا۔ علامہ اعظمیؒ نے اس رسالے کی ایک ایک افترا پردازی کا نہایت مدلّل اور محققانہ جواب تحریر فرمایا، اور یہ ثابت کر دیا کہ مرزا صاحب کا رسالہ ہفوات وخرافات کی پوٹ ہے اور بس۔

علامہ اعظمیؒ نے بھی جواب کے دو حصے کیے، دونوں حصوں کو ملا کر اس کتاب کے کل ۲۳۷ر صفحات ہوتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ مصنف نے اپنا رسالہ حروف تہجی کے اعتبار سے لکھا تھا، جس کی وجہ سے علامہ اعظمیؒ نے بھی وہی ترتیب ملحوظ رکھی ہے، سب سے پہلے حضرت ابو ہریرہؓ کا تذکرہ ہے، اور کتاب کا اختتام حرف ''ع'' پر ہوتا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے خطبے کے بعد اپنی کتاب کا آغاز ان الفاظ سے فرمایا ہے:

''ماضی قریب میں شیعوں کی جارحانہ ذہنیت کے جو شرمناک نمونے نگاہ کے سامنے آئے ہیں، ان میں بدترین وہ رسوائے عالم رسالہ ہے، جس کا نام 'رجالِ بخاری' ہے۔ ملک کے مؤقر اخبارات ورسائل میں اس پر جو اجمالی تبصرے شائع ہوئے ہیں، اُن سے اخبار بیں طبقہ کو کچھ اندازہ لگا ہوگا کہ اس رسالے

میں صحابۂ کرامؓ اور اجلۂ علماء اہل سنت پر کتنی گندگی اچھالی گئی ہے، کیسے کیسے ناپاک حملے کیے گئے ہیں، اور کس کس طرح اُن پر تبرا بازی کر کے اسلام دشمنی کا ثبوت دیا گیا ہے''۔

اس کے بعد مرزا عبدالحسین کے رسالے کی دو عبارتیں نقل کر کے تحریر فرمایا ہے:

''لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکابرِ اہلِ سنت پر ناجائز حملہ اور اہلِ سنت کی دل آزاری کے سوا مصنف رسالہ کا اور کوئی منشا نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ ان رواۃ پر مصنفِ رسالہ نے کوئی جرح نقل نہیں کی ہے، جن کو شیعہ اپنا امام یا اپنا موافق خیال کرتے ہیں، حالانکہ جن کتابوں کے حوالوں سے مصنف نے اپنا اعمال نامہ سیاہ کیا ہے، انھیں میں ائمۂ مقبولینِ شیعہ کی نسبت بھی کافی مصالحہ موجود ہے''۔

علامہ اعظمیؒ نے اصل کتاب شروع کرنے سے پہلے تیرہ (۱۳) صفحات میں اس کی تمہید تحریر فرمائی ہے، اور اس میں شیعہ مصنف کی جعل سازی اور فریب کاری کی بارہ مثالیں پیش کی ہیں۔ بارہویں مثال میں لکھا ہے:

''مصنف کا بہت بڑا فریب ایک یہ ہے کہ اس نے بکثرت جرحیں ایسی کتابوں سے نقل کی ہیں، جو مخالفینِ اہلِ سنت وجماعت کی لکھی ہوئی ہیں؛ حالانکہ ایک معمولی سمجھ والا انسان بھی فیصلہ کر سکتا ہے کہ اہلِ سنت پر اہلِ سنت ہی کے اقوال حجت ہو سکتے ہیں، مخالفینِ اہلِ سنت ہمارے رواۃ پر جرح کریں تو اس کا کیا اعتبار؟ کیا کوئی شیعہ اپنے راویوں کی ان جرحوں کو ایک لمحے کے لیے بھی قابلِ التفات قرار دے سکتا ہے، جو مخالفینِ شیعہ کی کتابوں میں مندرج ہیں؟''[۱]۔

اس کے بعد تحریر فرمایا ہے:

''پھر یہ کیا اندھیر اور کیسا زبردست فریب ہے کہ جس شیعہ مصنف کو دیکھئے ابن ابی الحدید کے اقوال، یا کتاب 'الامامۃ والسیاسۃ' اور 'مقاتل الطالبین' کے حوالوں یا 'تذکرۂ خواص الامۃ' کے اقتباسات سے ہمارے مقابلہ میں حجت پکڑتا ہے اور ان کی سند لاتا ہے؛ حالانکہ ان میں ایک بھی اہلِ سنت کے نزدیک مستند ومعتبر نہیں ہے، نہ ان کے مصنفوں کا سنی ہی ہونا ثابت ہے''[۲]۔

رجالِ بخاری کے مصنف نے سب سے پہلے حضرت ابوہریرۃؓ کو ہدف طعن بنایا ہے، اس لیے علامہ اعظمیؒ نے بھی تمہید سے فراغت کے بعد پہلے حضرت ابوہریرۃؓ ہی کا دفاع کیا ہے، اور ان کی ذات پر کیے جانے والے ایک ایک اعتراض کا نہایت تحقیقی اور تشفی بخش جواب دیا ہے، حضرت ابوہریرۃؓ کے متعلق علامہ اعظمیؒ کی تحریر تیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، جس کی ایک ایک سطر علم وآگہی سے عبارت ہے، یہاں میں نمونہ کے طور پر اس ضمن کا آخری جواب نقل کر رہا ہوں، صفحہ ۴۳ پر ((ابوہریرۃؓ کی وجہ تسمیہ)) کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

''شیعہ مصنف نے اس کنیت کا مذاق اڑایا ہے، لیکن نام وکنیت کا مذاق اڑانا جہالت ہے، حضرت ابوہریرۃؓ کا یہ قصہ بچپن کا ہے کہ ایک بلی لیے پھرتے تھے، اس لیے از راہِ ظرافت وبذلہ سنجی کسی نے اس

---

(۱) تعدیل رجال بخاری: ۱۲-۱۱ (۲) ایضاً: ۱۲

کنیت سے ان کو پکارا، اور اتفاق کہ اسی نام سے وہ مشہور ہو گئے، لہذا اس سے کوئی نتیجہ نکالنا یا مذاق کرنا ایک بیہودہ حرکت ہے؛ شیعوں کے ایک بزرگ اور حضرت علیؓ کے مخلص نُعیم بن دَجاجہ ہیں (کشی ص ۶۰)، مرزا صاحب کی طرح کوئی اس نام کا ترجمہ ''نعیم مرغی کے بچے'' کر دے، تو مرزا صاحب کیا فرمائیں گے۔ شیعوں کے ایک راوی ہیں ''ابوالجارود سرحوب''، رجال کشی ص ۱۵۰ میں لکھا ہے کہ سرحوب ایک اندھے شیطان کا نام ہے جو دریا میں رہتا ہے، اسی طرح شیعوں کے ایک بڑے عالم ومتکلم اور امام صادق کے صحابی ہیں، جو ''شیطان الطاق'' ہیں، جو شیطان سے بھی زیادہ مشہور ہیں''[1]۔

مذکورہ بالا اقتباس سے ناظرین کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ علامہ اعظمیؒ کی دوسری کتابوں اور رسالوں کی طرح اس کتاب کی بھی یہ خصوصیت ہے کہ تحقیقی اور الزامی جواب دونوں ساتھ ساتھ ہیں، اس کتاب میں علمی اور حدیثی اصطلاحات کی اس کثرت سے توضیح وتشریح کی گئی ہے کہ علمِ حدیث سے شغل اور شغف رکھنے والوں کے لیے بھی حد درجہ مفید اور معلومات افزا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نسبت اس کتاب میں جو مباحث ہیں، وہ اکثر وبیشتر دوسرے حضرات کے تذکروں کی بہ نسبت زیادہ طویل اور مفصل ہیں، اور ان میں بھی خاص طور سے حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت زبیرؓ، سیدنا حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت ابوسفیان وحضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم پر علامہ اعظمیؒ نے جس طرح لکھا ہے، وہ صحابۂ کرامؓ کے ساتھ محبت وعقیدت اور وارفتگی کا آئینہ دار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کی ایک ایک سطر دینی ومذہبی غیرت وحمیت اور علمی دیانت کی حقیقی اور سچی تصویر پیش کرتی ہے۔

'تعدیلِ رجالِ بخاری' ۱۳۵۸ھ میں تحریر فرمائی گئی تھی، مگر اُس وقت اِس کی طباعت واشاعت کی نوبت نہیں آسکی تھی، علامہ اعظمیؒ کے انتقال کے بعد جب مجلّہ 'المآثر' کا اجرا عمل میں آیا، تو اُس کے صفحات پر شوال - ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ تا شوال - ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ مسلسل یہ کتاب ''ردّ رجالِ بخاری'' کے نام سے شائع ہوتی رہی، اس کے بعد ۱۴۲۳ھ = ۲۰۰۲ء میں پہلی دفعہ کتابی شکل میں 'تعدیل رجال بخاری' کے نام سے اشاعت پذیر ہوئی۔

اس کتاب پر دو مقتدر علمی شخصیتوں نے تقریظیں بھی لکھی تھیں، ایک تقریظ امام اہلِ سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی علیہ الرحمہ کی تھی، یہ ۲۰/ ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ کی تحریر فرمودہ ہے، حضرت امام اہلِ سنت نے اپنی تقریظ میں حمد وصلوٰۃ کے بعد لکھا ہے:

''اس حقیر نے مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمیؒ کا رسالہ - جو روافض کے رسالہ 'رجالِ بخاری' کے جواب میں ہے - مطالعہ کیا، جواب بحمد اللہ شافی وکافی ہے، اور حق یہ ہے کہ اہلِ سنت کے ذمہ ایک قرض تھا جس کو مولانا ممدوح نے ادا کیا۔ مولف 'رجالِ بخاری' کی خیانت اور جہالت کی کارروائیاں جو گرفت کی ہیں وہ ہر شخص نہیں کر سکتا تھا۔

مولانا ممدوح کی دوسری تالیفات جس نے دیکھی ہیں، اس کو کسی تصدیق کی حاجت نہیں، سلامتِ

(۱) تعدیل رجال بخاری: ۴۳

فہم اور متانتِ استدلال کی ایک خاص شان اُن میں ہے کَثَّرَ اللّٰہُ تعالیٰ أمثالہ. علمی قابلیت کے ساتھ سلیس اور شگفتہ اردو عبارت میں اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرنے کا سلیقہ بھی اللہ تعالیٰ نے مولانا کو عطا فرمایا ہے۔ المختصر جواب بہ ہمہ صفت موصوف ہے"(۱)۔

دوسری تقریظ مشہور عالم ومحقق حضرت علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ کے خامۂ گہر بار سے ہے، ان کی تقریظ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"میں نے مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی صدر مدرس مدرسہ مفتاح العلوم مئو ضلع اعظم گڈھ کا رسالہ رجالِ بخاری بجواب بعض مولفینِ شیعہ دیکھا ہے، بلکہ مولانا نے میری تحریک سے اس کو لکھنا شروع کیا، جواب بے حد متین، سنجیدہ، مدلّل اور فن وتحقیق کے اعتبار سے کافی وشافی ہے، اللہ تعالیٰ مؤلف کو جزائے خیر دے"(۲)۔

(۱) تعدیل رجال بخاری:۱۲ (۲) ایضاً:۱۳

☆......☆......☆......☆......☆

ردِّ بدعت

شارع حقیقی

رد بریلویت میں یہ علامہ اعظمیؒ کی ایک اہم اور بیش قیمت تصنیف ہے، اس کتاب کا پسِ منظر یہ ہے کہ ایک رضا خانی مولوی سید محمد کچھوچھوی نے ایک رسالہ 'التحقیق البارع فی حقوق الشارع' کے نام سے لکھا تھا، یہ رسالہ بڑی تقطیع کے ۱۲؍صفحات پر مشتمل ہے، اور برق پریس لکھنؤ کا طبع شدہ ہے، سرورق پر مصنف کا نام یوں مرقوم ہے: ''سید العلماء حضرت مولانا مفتی ابوالمحامد سید محمد صاحب اشرفی جیلانی محدث''۔ سید محمد کچھوچھوی نے - جو اپنے فرقے میں ''محدث'' کے نام سے جانے جاتے تھے - اپنے رسالے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال فرما دیں اور جس کو چاہیں حرام فرما دیں۔ علامہ اعظمیؒ نے اسی نظریے کے رد و ابطال کے لیے یہ رسالہ تحریر فرمایا تھا۔

علامہ اعظمیؒ نے حمد و صلوٰۃ کے بعد اپنے رسالے کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے:

''آنحضرت ﷺ کی عظمت و جلالت، آپؐ کی فضیلت و اکرمیت، بارگاہِ احدیت میں آپ کی بے مثال مقبولیت و محبوبیت، سارے انبیاء و رسل - صلوات اللہ علیہم وسلامہ - کی نسبت سے آپ کی امامت و سیادت، اور آپ کے اعلاء شان و اظہارِ شرف کے لیے بہتیرے امور میں من جانب اللہ آپ کے امتیاز و خصوصیت کا اعتقاد جانِ ایمان ہے؛ لیکن یہ اعتقاد ہو، یا کوئی دوسرا عقیدہ، اس میں غلو کرنا اور دائرۂ کتاب و سنت سے باہر نکل جانا، ایمان و محبت کی علامت نہیں، بے دینی و گمراہی کا نشان ہے''(۱)۔

پھر اپنے رسالے کی تصنیف کا پسِ منظر ذکر کرنے کے بعد ''مسلکِ حق کی توضیح'' کے عنوان سے شیخ محقق کمال الدین ابن الہمام حنفی کی 'تحریر'، ابن امیر الحاج کی 'شرح تحریر'، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی 'حجۃ اللہ البالغۃ'، علامہ ابوجعفر نحاس کی 'الناسخ والمنسوخ'، اور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی 'تحفۂ اثنا عشریہ' نیز دیگر اہلِ علم کی تصانیف سے اہلِ سنت والجماعت کے موقف کی وضاحت کی ہے، جس کا خلاصہ حضرت علامہ اعظمیؒ کے الفاظ میں یہ ہے:

''تحلیل و تحریم اشیاء کے باب میں تحقیقی مسلک یہ ہے کہ یہ تنہا خدائے تعالیٰ کے اختیار کی چیز ہے، کسی چیز کو حلال یا حرام کرنا صرف اسی کا کام ہے، وہ اس میں منفرد ہے اور یہ خالص اسی کا حق ہے، کسی دوسرے کو اس میں کسی نوع سے دخل نہیں ہے، نہ بالذات کسی کو اختیار حاصل ہے نہ بہ تفویضِ الٰہی''(۲)۔

اور اپنے اس دعوے کی تائید کے لیے مذکورہ بالا اہلِ علم کی عبارتیں نقل کی ہیں، اور اس پر استدلال کے لیے قرآن کریم کی ۶؍آیتیں اور گیارہ احادیث شریفہ ذکر کی ہیں۔

قرآنی آیات میں سب سے پہلے یہ آیت ذکر کی ہے:

---

(۱) شارع حقیقی: ۶ (۲) ایضاً: ۷

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنهَاجاً﴾ [مائدہ] یعنی اے مومنو! ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک ایک شریعت اور کھلا ہوا راستہ بنایا ہے۔

اس آیت کو ذکر کر کے لکھا ہے:

''اس آیت سے بلا تکلف یہ بات ثابت ہے کہ شریعتیں اور احکام سب اللہ کے بنائے ہوئے ہیں''(۱)۔

دوسری دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

﴿ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِيعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فاتَّبِعْهَا﴾ [جاثیہ]

اس آیت کو نقل کر کے لکھا ہے:

''دیکھئے کتنا صاف مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک شریعت بنا کر آنحضرت ﷺ کو اس پر لگا دیا ہے اور آپ کو اسی کی پیروی کا حکم دیا ہے، خود شریعت بنانے اور حلال وحرام کرنے کا اختیار نہیں دیا ہے''(۲)۔

تیسری دلیل کے طور پر قرآن کریم کی یہ آیت ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰه﴾ [انعام] اور چوتھی دلیل کے طور پر ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوحىٰ﴾ [النجم] نقل کر کے لکھا ہے:

''اس آیت کریمہ کو سامنے رکھ کر میں ان لوگوں سے جو یہ کہتے ہیں کہ 'احکامِ شرعیہ حضرت محمد ﷺ کے سپرد ہیں، جو کچھ چاہیں واجب کریں اور جو کچھ چاہیں ناجائز کر دیں' پوچھتا ہوں کہ ان کی مراد کیا ہے؟ اگر وحی الٰہی کے ذریعہ سے واجب کرنا یا ناجائز کرنا مراد ہے، تو یہ غلط ہو گیا کہ احکامِ شریعت آپ کے سپرد ہیں، اور اگر اپنے جی سے واجب کرنا یا ناجائز کرنا مراد ہے، تو یہ آیتِ مذکورہ کے خلاف ہے''(۳)۔

احادیث شریفہ زیادہ تر اس مضمون کی نقل کی ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے مختلف مواقع پر مختلف مسائل کا حکم معلوم کرنا چاہا، تو آپ نے توقف فرمایا اور فوراً کوئی جواب نہ دیا تا آنکہ اللہ جل شانہ کی طرف سے بذریعہ وحی آپ کو اس کا حکم نہ بتا دیا گیا۔ احادیث میں پہلی حدیث جو ذکر کی ہے میں صرف اسی کے نقل کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں، اس کو مسلک حق کے دلائل میں ساتویں دلیل کے طور پر۔ کیونکہ چھ دلیلیں اس سے پہلے آیات قرآنیہ سے دی جا چکی ہیں۔ آپ نے ذکر کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ صحیح بخاری میں حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ ایک بار میں بیمار ہوا تو آنحضرت ﷺ پیدل میری عیادت کو تشریف لائے، میں نے پوچھا: يا رسولَ الله كيفَ أقضي في مالي؟ یعنی یا رسول اللہ! میں اپنے مال کا کیا فیصلہ کروں؟ کس کس کو کتنا کتنا دوں؟ فما أجَابَني بِشيءٍ حتى نزلتْ آيةُ الميراثِ. تو آپ ﷺ نے مجھے کچھ جواب نہ دیا تا آنکہ وراثت والی آیت۔ یعنی آیت کلالہ۔ نازل ہوئی۔

اس حدیث کو نقل کر کے علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''اس حدیث سے بلا کلفت واضح ہے کہ آپ احکام شرع میں وحی الٰہی کا انتظار کرتے تھے اور

(۱) شارع حقیقی: ۱۱ (۲) ایضاً: ۱۱ (۳) ایضاً: ۱۱

بلا نزول وحی اپنی طرف سے جواب نہ دیتے تھے، جس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ آپ کو تحلیل وتحریم کا کامل اختیار تھا''(۱)۔

اس طرح کی دسیوں حدیثیں نقل کی ہیں، جن میں آپ ﷺ کا توقف اور وحی کا انتظار کرنا ثابت ہے؛ البتہ جن امور میں کوئی وحی نہیں نازل ہوتی تھی، ان میں آپ ﷺ کو اجتہاد کرنے کا اختیار حاصل تھا، لیکن یہ شریعت میں بااختیار ہونا نہیں ہے، بلکہ یہ تو شریعت میں وحی الٰہی کا تابع محض ہونا ہے۔

پھر لکھتے ہیں:

''اس کے رو سے یہ کہنا غلط ہے کہ آپ جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس کو چاہیں حلال کر دیں، یوں کہنا چاہئے کہ جس چیز کی حرمت کو وحی الٰہی مقتضی ہو اس کو حرام، اور جس کی حلت کو مقتضی ہو اس کو حلال کر دیں''(۲)۔

آگے علامہ اعظمیؒ نے شیخ ابن الہمام کی تحریر اور علامہ ابن امیر الحاج کی اس کی شرح (۲۹۵/۳) سے یہ عبارت نقل کی ہے: **المختار عند الحنفية المتأخرين ما عن اكثرهم أنه عليه الصلاة والسلام مأمورٌ في حادثةٍ لا وحيَ فيها بانتظارِ الوحيِ أوَّلاً ما كان راجيه أي الوحي إلى خوف فوت الحادثة بلا حكمٍ، ثم بالاجتهادِ ثانياً إذا مضى وقتُ الانتظار ولم يُوحَ إليه، لأنَّ عدمَ الوحْيِ إليه فيها إذنٌ في الاجتهادِ حينئذٍ.**

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ بعد کے اکثر حنفیہ کا مختار یہ ہے کہ جس حادثہ میں کوئی وحی نہ ہو، اس میں آنحضرت ﷺ کو اولاً وحی کے انتظار کا حکم تھا جب تک وحی کی امید ہوتی تا آنکہ حادثہ کے بلا حکم کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو جاتا؛ دوسرے نمبر پر آپ کو اجتہاد کا حکم تھا، جب کہ انتظار کا وقت نکل جاتا اور کوئی وحی نازل نہ ہوتی، کیونکہ وحی کے نہ ہونے کی صورت میں اجتہاد کی اجازت ہے۔

آگے ''فائدہ'' کے عنوان پر ''مسلکِ حق کے دلائل'' کی بحث کو ختم کرتے ہیں، ''فائدہ'' میں لکھا ہے:

''نبی اور غیر نبی کے اجتہاد میں فرق یہ ہوتا ہے کہ غیر نبی کے اجتہاد میں خطا کا واقع ہونا اور اس کا باقی رہ جانا ممکن ہے، اور نبی کے اجتہاد میں یا تو خطا واقع نہیں ہوتی، یا ہوتی ہے تو وہ برقرار نہیں رہتی ہے، بلکہ من جانب اللہ اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ غیر نبی کا اجتہاد صواب بھی ہو تو وہ بمنزلہ وحی کے نہیں ہوتا، برخلاف اجتہادِ نبی کے کہ جب وہ برقرار رکھا جائے اور بذریعہ وحی کے اس میں خطا واقع ہونے کو بیان نہ کیا جائے، تو وہ وحی باطن یا وحی غیر متلو کی ایک قسم ہو جاتا ہے''(۳)۔

اس کے بعد ایک باب ''مخالفین کے دلائل'' کے نام سے ہے، اس میں آپ نے مخالفین کی ایک ایک دلیل نقل کر کے اس کا علمی وتحقیقی رد کیا ہے۔ مخالف کا پہلا استدلال ایک حدیث سے ہے، جس میں مذکور ہے کہ

(۱) شارعِ حقیقی: ۱۳ (۲) ایضاً: ۱۸ (۳) ایضاً: ۲۱-۲۰

ایک شخص نبی ﷺ کے پاس حاضر ہوکر اس شرط پر اسلام لایا کہ میں صرف دو نمازیں پڑھا کروں گا، حضور ﷺ نے اس کو قبول فرمالیا۔

اس حدیث سے کچھوچھوی صاحب یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ:

''نبی کریم ﷺ کو اختیار تھا کہ جس کو چاہیں اور جس حکم سے چاہیں مستثنیٰ فرمادیں''۔

علامہ اعظمیؒ نے اس استدلال کا پہلا جواب یہ تحریر فرمایا ہے کہ:

''اولاً: تو حدیث میں اس کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان صحابی کو مستثنیٰ فرمادیا، دو نمازوں کو قبول کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کو تین سے مستثنیٰ کردیا؛ بلکہ ممکن ہے کہ آپ نے ان سے صرف دو نمازوں کو بایں خیال قبول فرمالیا ہو کہ اسلام لانے کے بعد اس کی برکت سے یہ خود بخود پنج وقتہ پڑھنے لگیں گے؛ اس لیے پہلے ہی سے پنج وقتہ نمازوں کا اقرار لینے کی ضرورت نہیں سمجھی اور بر سبیل ارخاء عنان ان کی شرط تسلیم کرلی''(۱)۔

اور جواب کی دوسری صورت یہ لکھی ہے کہ:

''ممکن ہے کہ آپ نے اس لیے اس کو قبول کرلیا ہو کہ کافر رہنے سے تو بہرحال یہ اچھا ہی ہے کہ آدمی مسلمان ہو جائے، چاہے تمام فرائض نہ بجا لائے؛ کیونکہ اس صورت میں ایک بے عمل اور ایسا قصوروار انسان ہوگا جس کے گناہوں اور قصوروں کی معافی توبہ وغیرہ کے ذریعے ہو سکے گی؛ برخلاف کافر کے کہ وہ جب تک ایمان نہ لائے، اس کی مغفرت ونجات کی کوئی صورت نہیں''(۲)۔

اس کے بعد اس جواب کی تائید میں قرآن کریم کی کئی آیتیں نقل کی ہیں، آنحضرت ﷺ کو بنی نوع انسان کو اسلام کے دائرے میں داخل کرنے اور عذابِ جہنم سے بچانے کی جو فکر رہا کرتی تھی، اس کو بھی اس کی تائید میں پیش کیا ہے۔

اپنی دوسری دلیل میں کچھوچھوی صاحب نے قرآن کریم کی یہ آیت پیش کی ہے ﴿مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا﴾۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کے جواب میں لکھا ہے:

''اہل حق کی دلیل نمبر ۱۶ کے ذیل میں خود آنحضرت ﷺ کی حدیث سے ثابت کردیا گیا ہے کہ آپ ازخود کوئی حکم نہیں دیتے، بلکہ اوپر سے جو ملتا ہے، اسی کو پہنچا دیتے ہیں......لہذا اس آیت سے صاحبِ اختیار ہونے کے بجائے شریعت کی ہر ہر بات میں آپ کا متبعِ وحی ہونا ثابت ہوتا ہے''(۳)۔

کچھوچھوی صاحب نے اپنے استدلال میں قرآن کریم کی اسی طرح کی اور بھی دو تین آیتیں، متعدد احادیث شریفہ اور اقوال علما نقل کیے ہیں؛ لیکن علامہ اعظمیؒ نے ان کے ہر استدلال کو پارہ پارہ کردیا ہے، اور یہ

(۱) شارع حقیقی: ۲۳-۲۲ (۲) ایضاً: ۲۳ (۳) ایضاً: ۲۹-۲۸

ثابت کر دکھایا ہے کہ کسی بھی دلیل سے تحلیل وتحریم میں آپ کا بااختیار ہونا ثابت نہیں ہوتا؛ اگر کسی آیت یا حدیث کے ظاہر میں تحلیل وتحریم کی نسبت آپ کی طرف کی گئی ہے، تو وہ حکم شرعی میں بااختیار ہونے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ وحی خداوندی کے ذریعے آپ پر حکم نازل ہوتا ہے، پھر آپ اس کی تبلیغ کرتے ہیں، جس کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحَىٰ﴾ چنانچہ نہ جانے کتنے ایسے مواقع آئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپؐ سے کسی شے کا حکم دریافت فرمایا، تو آپؐ نے اس کی بابت کچھ ارشاد فرمانے سے توقف فرمایا، تا آنکہ اللہ رب العزت کی جانب سے اس کے متعلق وحی نہ نازل ہوگئی۔

شریعت میں بااختیار ہونے کی نفی قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے، جس میں اللہ جل شانہ نے آپ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ﴾ (اے نبی آپ کیوں حرام کرتے ہیں اس شے کو جسے اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے)۔ اس آیت کو نقل کر کے علامہ اعظمیؒ نے یہ سوالات اٹھائے ہیں:

”اپنی طرف سے شریعت مقرر کرنے، اور حلال وحرام کرنے کا حق واختیار دینے کے بعد کیا ایسا سوال ممکن ہے؟

کیا خود اپنے عطا کیے ہوئے حق کو استعمال کرنے پر بھی خدا باز پُرس وعتاب کرسکتا ہے؟

حاشا وکلا! ہمارے نزدیک تو اللہ کی ذات اس سے ارفع واعلیٰ ہے کہ وہ کسی کو خصوصاً اپنے حبیب ﷺ کو کوئی حق دینے کے بعد اس حق کے استعمال کرنے پر نکیر فرمائے“(۱)۔

الغرض علامہ اعظمیؒ نے اپنی اس تصنیف میں اہل حق کے مدعا کو مضبوط اور نا قابلِ تردید دلائل سے ثابت کیا ہے، اور اہل بدعت کے ایک ایک استدلال کا بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیا ہے، جس سے یہ مسئلہ پوری طرح واضح اور روشن ہوگیا ہے۔

یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۳۵۷ھ میں رسالہ ’الفرقان‘ میں - جو اس وقت بریلی سے نکلتا تھا - شائع ہوئی تھی، پھر اس کا کتابی اڈیشن بھی مکتبہ الفرقان ہی سے اشاعت پذیر ہوا۔ سہ بارہ ۱۴۲۲ھ = ۲۰۰۱ء میں مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ - مرقاۃ العلوم، مئو- سے شائع ہوا۔ اس کتاب کے مجموعی صفحات ۸۰ ہیں۔ جمادی الاخری ۱۳۵۷ھ میں علامہ اعظمیؒ اس کی تحریر سے فارغ ہوئے، آپ کے مسودے کے سرورق پر تحریر ہے: **قد تم هذه الرسالة بيد مصنفها الفقير إلى رحمة ربه الغني أبي المآثر حبيب الرحمن الأعظمي سلخ جمادى الأخرى سنة ١٣٥٧ الهجرية۔**

(۱) شارع حقیقی: ۳۳

☆......☆......☆......☆......☆

احکام النذر للاولیاء اللہ

وتفسیر ما اھل بہ لغیر اللہ

علامہ اعظمیؒ کی خدمت میں کسی سائل یا مستفتی کی طرف سے دوسوال پیش کیے گئے تھے، پہلا سوال یہ تھا کہ **ما اُھِلَّ بِہٖ لغیر اللہ** کی صحیح تفسیر کیا ہے؟

اور دوسرا سوال یہ تھا کہ ''اولیاء کرام کے نام پر نذروں کا کیا حکم ہے''؟

آپ نے علماء محققین کی تحریروں کی روشنی میں ان دونوں سوالوں کا نہایت تفصیل کے ساتھ علمی و تحقیقی جواب تحریر فرمایا، جو اپنے موضوع پر ایک منفرد اور بیش قیمت رسالہ کی شکل اختیار کر کے ''بریلی الیکٹرک پریس-بریلی'' سے طبع ہوکر ''مکتبہ الفرقان-بریلی'' سے شائع ہوا تھا۔

سوال اول کے جواب کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے:

''اِھلال کے معنی لغت میں چاند دیکھنے کے ہیں، لیکن چونکہ چاند دیکھنے کے بعد بآوازِ بلند اللہ اکبر کہنے کی عادت تھی، اس مناسبت سے اِھلال کا لفظ آواز بلند کرنے کے معنی میں مستعمل و مشہور ہوگیا، لہٰذا **ما أھل به لغیر الله** کے معنی یہ ہوئے کہ جس پر غیر خدا کے لیے آواز بلند کی گئی ہو''۔

پھر متعدد تفسیروں کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد و مقصود غیر اللہ کے لیے ذبح کرنا ہے، یا غیر خدا کے تقرب کے لیے ذبح کرنا ہے، اور اکلیل سے حاشیہ شیخ زادہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''جو مسلمان بہ نیتِ تقربِ غیر خدا کوئی جانور ذبح کرے تو وہ مرتد ہوجاتا ہے، اور اس کا ذبیحہ مردار کے حکم میں ہے''[1]۔

آگے علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ ابن کثیر، نیشاپوری، صاحب روح البیان اور فخر الدین رازی وغیرہم نے بھی لکھا ہے کہ کوئی مسلمان بقصد تقرب غیر خدا کوئی جانور ذبح کرے تو مرتد ہوجاتا ہے۔

پھر اپنے موقف کے استدلال میں پانچ دلیلیں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''ان دلائل سے یہ بات خوب اچھی طرح ثابت ہوگئی کہ **ما أھل به لغیر الله** کی علتِ حرمت تمام مفسرین کے نزدیک قصدِ تقرب الی غیر اللہ ہے، یا یوں کہہ لیجئے کہ اس عبارت کا مُؤدّی اور اس عنوان کا مُعَنوَن سب کے نزدیک **ما قُصِدَ به التَّقَرُّبُ إلى غير الله** (جس کے ذریعے غیر خدا کے ساتھ تقرب کا قصد کیا جائے) ہے، اور یہ کہ جس جانور کو بقصدِ تقربِ غیر خدا ذبح کیا جائے- چاہے ذبح کے وقت خدا ہی کا نام لے کر ذبح کیا جائے- وہ **ما أھل به لغیر الله** میں داخل ہے''[2]۔

---

(۱) المآثر: ج ۱۲ ش ۲، ص: ۲۱ (۲) ایضاً: ۲۳-۲۲

دوسرے سوال کا جواب ان الفاظ سے شروع کیا ہے:

''اس سوال کا تفصیلی جواب سننے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ کسی مخلوق کے نام کی نذر ماننا حرام ہے''۔[۱]

اس مسئلے کی تائید میں شامی کی عبارت نقل کر کے لکھا ہے:

''لہذا اولیا کے نام کی نذریں اگر اولیا کے لیے یا ان کے تقرب و تعظیم کے قصد سے مانی جاتی ہیں، تو ان کی حرمت میں شک وشبہہ کی گنجائش نہیں ہے''۔[۲]

اور اس کے ثبوت کے لیے 'درمختار'، 'عالم گیری' اور 'بحر رائق' وغیرہ کی عبارتیں نقل کی ہیں، نیز 'مالا بد منہ' سے قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا بھی یہ قول نقل کیا ہے کہ ''ونذر برائے ایشاں کردن حرام است''۔

'درمختار' اور 'بحر رائق' کی ایک عبارت نقل کر کے اس کا ترجمہ یہ لکھا ہے:

''وہ نذر جو اکثر عوام سے مُردوں کے واسطے واقع ہوتی ہے، اور وہ روپے پیسے، موم بتی اور تیل وغیرہ جو اولیا کے مزارات پر اولیا کے تقرب کے لیے لے جائے جاتے ہیں، وہ سب حرام و باطل ہیں، مسلمانوں کا اس پر اجماع و اتفاق ہے''۔[۳]

اس کے بعد عالم گیری اور بحر رائق کی ایک اور عبارت نقل کر کے اس کو اردو کے قالب میں ان الفاظ میں منتقل کیا ہے:

''اکثر عوام سے اس طرح جو نذر واقع ہوتی ہے کہ کسی نیک یا بزرگ کی قبر کے پاس آئے اور چادر اٹھا کر کہا کہ اے فلاں بزرگ! میرا فلاں کام ہو جائے، تو آپ کے لیے میری طرف سے مثلاً سونے کی اتنی مقدار ہے (یعنی اتنا سونا دوں گا) تو یہ نذر باطل ہے''۔[۴]

ان عبارتوں کو نقل کرنے کے بعد کئی صفحے میں ان کی تشریح کی ہے، اور اس تشریح کے ضمن میں اہل بدعت کی بعض تحریرات و تشکیکات کا نہایت زوردار طریقے سے رد کیا ہے، نیز حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید علیہ الرحمۃ کی ذات پر کیے جانے والے بعض اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے۔

آگے ''نذر اولیا کی دوسری صورت'' کے عنوان کے ماتحت لکھا ہے:

''اگر اس طرح نذر نہ مانے بلکہ یوں کہے کہ میرا فلاں کام ہو جائے، تو اے اللہ تیرے لیے یہ نذر مانتا ہوں کہ فلاں بزرگ کی درگاہ کے فقیروں اور محتاجوں کو کھانا کھلاؤں گا، یا ان کی مسجدوں کے لیے چٹائی خرید کر وقف کر دوں گا، یا ان کی مسجدوں میں روشنی کے لیے تیل خرید کر دوں گا، یا اسی قسم کی دوسری کوئی اور نذر جس میں محتاجوں کا نفع ہو، اور نذر اللہ تعالیٰ کے لیے ہو، باقی بزرگ کا ذکر صرف اشیاء نذر کا مصرف بتانے کے لیے ہو کہ ان بزرگ کی خانقاہ یا مسجد یا درگاہ میں جو مستحقِ نذر ہیں، ان پر صرف

---

(۱) المآثر: ج ۱۲ ش، ص: ۲۳ (۲) ایضاً: ۲۴ (۳) ایضاً: ۲۵ (۴) ایضاً: ۲۴

کروں، تو اس قسم کی نذر جائز ہے''[۱]۔

اس مسئلے کے ثبوت میں 'بحرائق'، 'عالم گیری' اور 'شامی' کے حوالے دیے ہیں، اس کے بعد تحریر فرمایا ہے:

''لیکن مسجد کے لیے چٹائی اور تیل کی نذر کا پورا کرنا واجب نہیں؛ اس لیے کہ نذر وہی واجب الایفا ہوتی ہے، جس کی جنس سے کوئی واجب شرعی ہو، اور ان دونوں کی جنس سے کوئی واجب شرعی نہیں ہے''[۲]۔

''نذر اولیاء کی تیسری شکل'' کے زیر عنوان لکھا ہے:

''اور اگر ناذر - نذر ماننے والے - نے تصریح نہیں کی کہ فلاں بزرگ کی یا فلاں بزرگ کے لیے نذر مانتا ہوں، اور یہ بھی تصریح نہیں کی کہ خدا کے لیے نذر مانتا ہوں، بلکہ مثلاً یوں کہا کہ میں فلاں بزرگ کی درگاہ کے لیے پانچ روپے یا مثلاً دس روپے مانتا ہوں؛ تو اس صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر اس نے صاحبِ درگاہ بزرگ کے تقرب و تعظیم کی نیت سے یہ کہا ہے، تو حرام ہے؛ اور اگر تقرب و تعظیم اس نذر سے باری تعالیٰ کی مقصود ہے اور یہی نیت اس نے کی ہے، اور ان بزرگ کی درگاہ وغیرہ کی طرف اضافت اس لیے کی ہے کہ اشیاء نذر کا ثواب ان کی روح کو پہنچائے گا، تو فتاویٰ ابی اللیث کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت بھی جواز میں آتی ہے، لیکن سید شامی کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بھی جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں اللہ کے لیے نذر کا لفظ نہیں ہے، اور نذر اولیا کے جواز کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے لیے نذر کا صیغہ استعمال کیا جائے''[۳]۔

''نذر اولیا کی چوتھی شکل'' کے زیر عنوان تحریر فرمایا ہے:

''اگر ناذر نے یوں کہا کہ اے اللہ! میری فلاں حاجت پوری ہو جائے، یا میرا فلاں کام ہو جائے، تو میں فلاں بزرگ کو ایک گائے یا مرغا یا بکرا نذر کروں گا؛ تو دیکھنا چاہئے کہ جن بزرگ کا نام لیا ہے، وہ زندہ ہیں یا وفات پا چکے ہیں؛ اگر زندہ ہیں اور فقہی اصطلاح میں غنی نہیں ہیں، اور ناذر نے ان کے تقرب و تعظیم کے قصد سے نذر نہیں مانی ہے، بلکہ تقرب خداوندی کی نیت کی ہے، اور ان بزرگ کی نذر کرنے سے مقصد ان پر تصدق کرنا ہے، تو یہ نذر صحیح ہے؛ اور اگر فقہی اصطلاح میں وہ غنی ہیں اور ان پر تصدق کی نیت کی ہے، تو یہ نذر صحیح نہیں ہے، نہ اس کا ایفا واجب ہے؛ اور اگر غنی ہوں اور ان کو ہدیہ کی نیت کی ہے اور نذر کا لفظ ادب کی وجہ سے بجائے ہدیہ کے استعمال کیا ہے، تو یہ بھی فقہی نذر نہیں ہے؛ لیکن یہ دونوں صورتیں ناجائز و حرام بھی نہیں ہیں''[۴]۔

آگے ''اشیاء نذر کا حکم'' کے عنوان سے نذر کا مصرف اور نذر کی ہوئی چیز کا حکم، اور پھر ''متفرقات'' کے تحت نذر کے متفرق مسائل تحریر فرمائے ہیں، اشیاء نذر کے حکم میں لکھا ہے:

(۱) المآثر: ج۱۲ش۳، ص:۲۵ (۲) ایضاً:۲۶ (۳) ایضاً:۲۶ (۴) ایضاً:۲۷-۲۶

''جاننا چاہئے کہ ناذر نے جس چیز کی نذر مانی ہے، وہ اگر کوئی جانور ہے اور ناذر نے اس کے ذبح کی نذر مانی ہے، اور یہ نذر ولی کے لیے اور اس کے تقرب کے واسطے ہے، یا نذر خدا کے لیے مانی ہے اور ذبح سے تقرب ولی کا مقصود ہے، تو دونوں صورتوں میں ذبیحہ مردار وحرام ہے (فتاویٰ ابی اللیث)؛ اور اگر ذبح کر کے اس کا گوشت للہ خیرات کرنے کی نذر مانی ہے اور ذبح بہ نیتِ تقرب الی اللہ کیا ہے، تو ذبیحہ حلال ہے؛ اسی طرح جانور کو خدا کے تقرب کے لیے ذبح کرنے کی نذر کی ہے، اور اسی کے تقرب کے لیے ذبح کیا ہے، جب بھی حلال ہے''[۱]۔

''**متفرقات**'' کے تحت پہلا مسئلہ شامی کے حوالے سے یہ لکھا ہے:

''کسی بزرگ کی درگاہ کے فقراء پر صدقہ کرنے کی نذر مانی، تو ضروری نہیں کہ انھیں پر صدقہ کرے، دوسرے فقرا کو بھی دے سکتا ہے''[۲]۔

دوسرا مسئلہ یہ لکھا ہے:

''کسی بزرگ کے مزار پر چراغ جلانے کی نذر ماننا باطل ہے''۔

اس کے بعد خود احمد رضا خاں فاضل بریلی کی کتابوں سے نذر کی متعدد صورتیں نقل کی ہیں، جن کو خاں صاحب نے باطل اور ممنوع قرار دیا ہے۔

اوائل شعبان ۱۳۵۸ھ میں علامہ اعظمیؒ نے یہ رسالہ تحریر فرمایا، اور شوال وذی قعدہ ۱۳۵۸ھ کے 'الفرقان' میں شائع ہوا، پھر 'المآثر' جلد نمبر ۱۲، شمارہ نمبر ۲ و ۳ میں دوبارہ شائع کیا گیا۔

☆......☆......☆

تقبیل ابہامین

(انگوٹھا چومنے کا حکم)

اذان واقامت میں موذن کے أشهد أن محمداً رسولُ الله کہنے پر سننے والے کا انگوٹھا چومنا۔ اس کے متعلق حضرت علامہ اعظمیؒ کے پاس کسی کا ایک سوال نامہ آیا، اس میں چار شقیں تھیں، جن کی نسبت استفسار کیا گیا تھا، وہ حسب ذیل ہیں:

۱- بوقتِ سماعِ أشهد أنَّ محمداً رسولُ الله مؤذن سے، دونوں انگوٹھوں کا چومنا مستحب ہے، یا بدعت؟

۲- کیا فعل مذکور کے استحباب پر بعض احادیث مرفوعہ وآثار صحابہؓ واقوالِ فقہا کتبِ احادیث وفقہ میں پائے

(۱) المآثر: ج ۱۲ ش ۳، ص: ۳۰ (۲) ایضاً: ۳۱

جاتے ہیں؟ اگر پائے جاتے ہیں، تو بدعت کیسے کہا جائے گا؟ فضائلِ اعمال میں تو ضعیف حدیث بھی کافی ہے۔

۳- باعتبار اصول مقرّ محدثین، حدیث مثبت تقبیل الابہامین، وآثار صحابہ، واقوال فقہا، بحیثیت مدارجِ فقہاء کس کس پایہ ودرجہ کے ہیں؟

۴- کیا تقبیل ابہامین حضرت صدیق اکبرؓ وحضرت امام حسنؓ سے ثابت ہے؟

علامہ اعظمیؒ نے مذکورہ بالا تمام سوالات کا نہایت شرح وبسط کے ساتھ جواب تحریر فرمایا، اور فقہی کتابوں کے ذخیرے کو کھنگال کر ان کے حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ شرعی اور فقہی طور پر اس مسئلے کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے، اور یہ بات بالکل بے اصل اور خلاف شرع ہے، اس کی تحقیق کے لیے آپ نے جن کتابوں سے مراجعت کی اور ان کے حوالے دیے، ان کی فہرست یہ ہے: مبسوطِ سرخسی، ہدایہ، فتح القدیر، بنایہ، عنایہ، کفایہ، کنز الدقائق، بحر رائق، تبیین الحقائق، شرح کنز للعینی، بدائع الصنائع، قدوری، جوہرہ نیرہ، اللباب، منیۃ المصلی، صغیری، کبیری، درمختار، حاشیہ طحطاوی بر درمختار، شامی، مراقی الفلاح، حاشیہ طحطاوی بر مراقی الفلاح، عالمگیری، قاضی خان، سراجیہ، خلاصۃ الفتاویٰ، شرح وقایہ، عمدۃ الرعایہ۔ جامع الرموز۔ یہ کل ستائیس کتابیں صرف فقہ سے تعلق رکھتی ہیں، جن کی طرف اس مسئلے کی تحقیق کے سلسلے میں مراجعت کی گئی ہے، ان کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''اتنی کتابوں میں سے بجز جامع الرموز اور شامی اور حاشیہ طحطاوی بر مراقی الفلاح کے اور کسی کتاب میں تقبیلِ ابہامین کا کوئی ذکر نہیں ہے، اور ان دونوں مؤخر الذکر کتابوں میں بھی علامہ شامی اور طحطاوی نے نہ اپنی تحقیق ذکر کی ہے، نہ کسی مستند ومعتبر کتاب سے اس کو نقل کیا ہے؛ بلکہ دونوں نے یہ لکھا ہے کہ قہستانی نے کنز العباد سے نقل کیا ہے، علامہ شامی نے اتنا اور لکھا ہے کہ فتاویٰ صوفیہ میں بھی ایسا ہی مذکور ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ کے لیے دراصل بنیادی چیز صرف کنز العباد اور فتاویٰ صوفیہ ہیں؛ رہے قہستانی تو وہ صرف ناقل ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ صاحبِ کنز العباد اور صاحبِ فتاویٰ صوفیہ کے زمانہ سے پہلے کی تصنیفات میں اس مسئلہ کا کوئی ذکر نہیں ہے، یعنی یہ مسئلہ نہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، نہ ان کے جلیل القدر شاگردوں سے، نہ ان کے اصحاب سے، نہ مشائخ مذہب سے''(۱)۔

یعنی اس مسئلے کی بنیاد 'کنز العباد'، 'فتاویٰ صوفیہ' اور ان دونوں سے قہستانی کی نقل پر ہے۔ آگے علامہ اعظمیؒ نے کنز العباد وفتاویٰ صوفیہ نیز قہستانی کی تصنیفات کا بے بنیاد مسائل، مکروہاتِ مذہب اور موضوع احادیث سے پُر ہونا، اور اُن کا غیر مستند وغیر معتبر ہونا متعدد حوالوں سے ثابت کیا ہے۔ اور تقبیلِ ابہامین کا حکم ان کتابوں کے علاوہ اور کسی معتبر ومستند کتاب میں مذکور نہیں ہے، لہٰذا ان نامعتبر کتابوں کی بنیاد پر اس کے استحباب کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا۔

مگر ایک سوال یا اشکال یہ ہوسکتا ہے کہ اس مسئلے کو علامہ شامی اور طحطاوی نے بھی تو نقل کیا ہے، تو اس کی

(۱) المآثر: ج ۳ ش ۴، ص: ۶۷

بابت یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے اس مسئلے کو قہستانی کے حوالے سے نقل کیا ہے، لہذا پھر دارومدار قہستانی ہی پر رہا، اور قہستانی کا نامعتبر ہونا خود علامہ شامی نے اپنی متعدد تصنیفات میں ظاہر کیا ہے، اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ خود ’ردالمحتار‘ میں اس کو لکھا ہے، پس قہستانی کو نامعتبر لکھنے کے بعد مسئلہ لکھ کر قہستانی کا حوالہ دینا اور کسی معتبر کتاب سے اس کی تائید نہ لانا، اس بات کی دلیل ہے کہ علامہ کے نزدیک یہ قول قوی نہیں ہے۔

فقہی تحقیق سے فارغ ہو کر علامہ اعظمیؒ نے اُن روایات پر نہایت تفصیل سے محدثانہ گفتگو کی ہے، جو تقبیلِ ابہامین کے باب میں نقل کی جاتی ہیں، اور یہ واضح وثابت کر دیا ہے کہ یہ روایات یا تو موضوعات کے قبیل سے ہیں، یا اس قدر ضعیف ہیں کہ ان پر عمل کرنا درست نہیں ہے، اور اسی ضمن میں سیوطی کی **تدریب الراوی** اور مولانا عبدالحی لکھنوی کی ’**الأجوبة الفاضلة**‘ کے حوالوں سے ضعیف حدیث پر عمل کرنے کی یہ شرائط نقل کی ہیں:

أحدها أن يكون الضعيف غير شديد الضعف، فيُحترز من الكذابين والمتَّهَمين بالكذب ومن فَحُشَ غلطُه؛ والثاني أن يندرجَ تحت أصل معمول به؛ والثالث أن لا يُقصدَ عند العمل به ثبوتهُ بل يُعتقَدُ الاحتياط. یعنی اول یہ کہ وہ حدیث ضعیف بہت زیادہ ضعیف نہ ہو، جیسے جھوٹے راویوں کی حدیث، یا ان راویوں کی حدیث جن پر جھوٹ کی تہمت لگائی گئی ہو، یا ان راویوں کی روایت جن کی غلطی بہت ظاہر ہوگئی ہو؛ دوم یہ کہ جو مضمون اس حدیث ضعیف سے ثابت ہوتا ہے وہ کسی دوسرے معمول بہ اصل شرعی کے ماتحت داخل ہو جائے؛ سوم یہ کہ اس حدیث ضعیف پر عمل کرنے سے اس کے ثبوت کا اعتقاد نہ کیا جائے، بلکہ احتیاط کا قصد کیا جائے۔

اور تقبیلِ ابہامین سے متعلق جو روایات نقل کی جاتی ہیں، وہ ائمہ حدیث کی تصریحات کے مطابق اگر موضوع نہ بھی ہوں تو شدید الضعف ضرور ہیں۔ چنانچہ اس باب میں جو روایات نقل کی جاتی ہیں، ان میں حضرت صدیق اکبرؓ کی ایک مرفوع حدیث اور ان کا ایک اثر ہے، اسی طرح حضرت حسنؓ کا بھی اثر ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے ان کی نسبت فرمایا ہے کہ ان تینوں میں سے کوئی بھی میرے نزدیک ثابت نہیں ہے، اور اپنے اس دعویٰ کو دلائل سے ثابت کیا ہے۔

لیکن اگر یہ ثابت بھی ہو جائے، تو پھر یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ تقبیلِ ابہامین فلاں اصل شرعی کے ماتحت داخل ہے۔

ان دونوں کو ثابت کرنے کے بعد بھی اس پر عمل کرنے سے مقصود یہ نہ ہو کہ تقبیلِ ابہامین حدیث سے ثابت ہے، بلکہ محض بنا بر احتیاط اس پر عمل ہے۔

تیسرے سوال کا جواب بھی دلائل کی روشنی میں قدرے تفصیل سے تحریر فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ حدیث تقبیل بے سند و ناقابلِ اعتبار ہے، اسی طرح اثرِ صدیق بھی بے سند و نامعتبر ہے۔

چوتھے سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما سے تقبیل ابہامین کسی معتبر

سند سے ثابت نہیں، حضرت صدیقؓ کے اثر کی تو اسناد ہی مذکور نہیں ہے، اور حضرت حسنؓ کے اثر کی اسناد بھی کالعدم ہے، اس لیے کہ وہ مجہول راویوں سے مرکب ہونے کے علاوہ منقطع یا مُعضَل بھی ہے، نیز وہ مُعلَّق بھی ہے۔

علامہ اعظمیؒ کا یہ مضمون بیس صفحات پر مشتمل ہے، اور 'المآثر' جلد نمبر ۳ شمارہ نمبر ۴ بابت شوال-ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ = مارچ-مئی ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔

☆......☆......☆......☆......☆

☆......☆......☆......☆

☆......☆......☆

☆......☆

☆

ردِّ انکارِ حدیث

نصرۃ الحدیث

یہ علامہ اعظمیؒ کی مایۂ ناز تصنیف ہے، اور دنیائے علم سے خوب خوب خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ بیسویں صدی میں مسلمانوں کو دین ومذہب کی راہ سے ہٹا کر بے دینی کی راہ پر لگانے کے لیے اسلامی دنیا اور اہلِ اسلام کے قلب ودماغ پر جن باطل خیالات وافکار نے یلغار کی، ان میں ایک انکارِ حدیث کا فتنہ بھی تھا، یہ ایک نہایت خطرناک اور ایمان سوز فتنہ تھا، جو ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی اٹھا، لیکن اس کی سرکوبی کے لیے ہمارے اہل علم بزرگوں نے بروقت قدم اٹھایا، اور اس کے رد وابطال میں کسی قسم کی مداہنت سے کام نہیں لیا، جس کی وجہ سے 'حجیت حدیث' کے موضوع پر ایک معتد بہ لٹریچر کا اسلامی ثقافت کے خزانے میں اضافہ ہوا۔

'نصرۃ الحدیث' بھی اسی مقصد کے لیے تصنیف کی گئی ہے، اور 'حجیت حدیث' کے سلسلے میں پائے جانے والے شکوک وشبہات کے ازالے میں اس کتاب کا نمایاں کردار رہا ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے اگر چہ اس کتاب کو ایک خاص کتاب کے رد میں لکھا ہے، لیکن انکار حدیث کی پوری فکر کو سامنے رکھ کر اس کتاب میں بحث کی ہے، اور انکار حدیث کے جو جو محرکات ہو سکتے ہیں، اور شک وشبہہ کے جو جو دروازے اور سوراخ ہو سکتے ہیں، ایک ایک پر پوری تفصیل سے گفتگو کر کے اس کا سد باب کیا ہے۔

تالیف کتاب کا محرک:

اس کتاب کی تصنیف کا اصلی محرک یہ تھا کہ ''حق گو'' کے نام سے کسی شخص نے ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام تھا 'میں منکر حدیث کیوں ہوا؟'۔ اس کتاب میں بیہودہ اور سوقیانہ انداز میں سلف صالحین، ائمہ ومحدثین حتی کہ صحابہ کرام -رضی اللہ عنہم- تک پر بہتان طرازی اور افترا پردازی کی گئی تھی، اور انکار حدیث کے نہایت بھونڈے اور مضحکانہ اسباب پیش کیے گئے تھے، غالباً ۱۳۵۲ھ کے اواخر اور ۱۹۳۴ء کے اوائل میں یہ رسالہ طبع ہو کر شائع ہوا تھا، جوں ہی حق گو کا یہ رسالہ منظرِ عام پر آیا، مولانا محمد بہاء الحق قاسمی امرتسری نے اس کو علامہ اعظمیؒ کی خدمت میں ارسال کر کے اس کا جواب لکھنے کی درخواست کی، علامہ اعظمیؒ نے اس کا نہایت عالمانہ وفاضلانہ اور محققانہ جواب لکھ کر مولانا بہاء الحق صاحب کی تحریر کے مطابق دو مہینے میں ان کے پاس بھیج دیا، علامہ اعظمیؒ نے خود اس کی تصنیف کا محرک ایک مختصر سی تمہید میں یہ بیان فرمایا ہے:

> ''مجھے اپنے ایک فاضل دوست کے توسط سے منکرین حدیث کے ایک رسالہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا، جس کا عنوان ہے: 'میں منکر حدیث کیوں ہوا'۔ اس رسالہ میں کسی ''حق گو'' صاحب نے انکار حدیث کے وجوہ بیان فرمائے ہیں، اور رواۃ حدیث اور مصنفین کتب حدیث پر نکتہ چینی کرتے ہوئے بہت زیادہ غلط بیانی سے کام لیا ہے، اور نہایت نامعقول اور گمراہ کن طریقہ سے عوام کو حدیثوں سے

بدظن کرنے کی کوشش کی ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ رسالہ مذکورہ پر ایک تبصرہ لکھ کر ''حق گو'' صاحب کی غلط بیانیوں اور فریب کاریوں کا پردہ چاک کر دیا جاتا، میں خدائے علیم وقدیر کا شکر گزار ہوں کہ اس نے اپنے اس ناتواں بندہ کو اس خدمت کی توفیق بخشی، فتقبلها الله مني كما وفقني لها''.

اس کے پہلے اڈیشن میں آغاز کلام میں قرآن کریم کی آیات سے حجیت حدیث پر روشنی ڈالی گئی تھی، اور انکارحدیث کے جو وساوس ہو سکتے ہیں ان کا توڑ کیا گیا تھا، پھر حق گو کے رسالہ کے رد پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے اس کے باطل اوہام وافکار کے پرخچے فضائے آسمانی میں بکھیرے گئے تھے۔

پہلا اڈیشن مختصر سی مدت میں ختم ہو گیا، تو دوسرے اڈیشن کی اشاعت سے پہلے مولانا محمد ایوب صاحب علیہ الرحمہ- جو اُس وقت کے مدرسہ مفتاح العلوم کے ناظم تھے- کی طرف سے اس پر ایک ایسا مبسوط مقدمہ لکھنے کا تقاضا ہوا جس میں محدثین کے حافظہ وغیرہ پر سیر حاصل تبصرہ ہوتا، جس سے اس کتاب کی افادیت میں چار چاند لگ جاتا۔ چنانچہ علامہ اعظمیؒ نے اپنے قیمتی اوقات سے فرصت کے چند لمحات نکال کر اس پر ایک نہایت مبسوط اور مفصل مقدمہ زیب قرطاس فرمایا، جو تقریباً پچاس صفحات پر مشتمل ہے، اور اس میں عہد نبوی سے لے کر دو صدیوں تک کے رواۃ ومحدثین کے قوت حافظہ، امانت ودیانت اور تدوین وکتابتِ حدیث کی ایک جامع تاریخ سمو دی گئی ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنے مقدمے کے آغاز میں سب سے پہلے ''فتنۂ انکار حدیث'' کے عنوان کے تحت اس کے نشو ونما پر مختصر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ہندوستان میں انکارِ حدیث کی بدعت بظاہر تو عبداللہ چکڑالوی نے (پنجاب میں) ایجاد کی؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ چکڑالوی سے بہت پہلے اس فتنے کا بیج نیچری فرقہ نے بویا تھا، عبداللہ چکڑالوی نے آکر اس شجرۂ ملعونہ کی آبیاری کی اور اسی کے ہاتھوں وہ بڑھا اور پھلا پھولا''(۱)۔

اس کے بعد ''انکارِ حدیث کا محرک وسبب'' کے عنوان کے ماتحت علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ اس کا اصلی محرک لادینی اور آزادہ روی ہے۔

پھر ان منکرین نے انکار کی جو وجہ بیان کی ہے، اس کو نقل کیا ہے، اور مقدمے میں اسی کا رد کیا ہے، ان کے انکار کی بنیاد دو دعووں پر ہے، جس کی نسبت علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''چغتائی صاحب نے مذکورہ بالا تخیل میں گویا دو دعویٰ کیے ہیں:

۱:- آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد دوسو برس تک حدیثوں کا قید کتابت میں نہ آنا۔

۲:- صرف یادداشت پر دارومدار رہنے کی وجہ سے حدیثوں کا کچھ سے کچھ ہو جانا''۔

اس کے بعد مقدمے میں ان ہی دونوں دعووں کا تفصیل سے رد کیا ہے، جو صفحہ ۱۵ سے شروع ہو کر صفحہ ۵۷ تک پھیلا ہوا ہے، پہلے دعوے کے جواب میں ''کتابتِ حدیث کی تاریخ'' بیان کی ہے، جس کو نہایت

(۱) نصرۃ الحدیث: ۱۲

اختصار اور جامعیت کے ساتھ ۱۵ صفحات میں سمیٹا ہے، اس میں عہد نبوی، عہد صحابہؓ، عہد تابعین اور تبع تابعین کے عہد میں کتابت حدیث کے سیکڑوں واقعات حدیث اور تاریخ وسیر کی معتبر کتابوں سے نقل کر کے ثابت کر دیا ہے کہ منکرین کے اس دعوے کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اور جہاں تک کتابتِ حدیث کا تعلق ہے، اس کا آغاز عہد نبوی میں ہو چکا تھا، اور امتداد زمانہ کے ساتھ کتابت میں اور وسعت وترقی ہوتی گئی، اور یہ دعویٰ کرنا سراسر غلط ہے کہ حدیثیں دوسو سال کے بعد قید کتابت میں آئی ہیں۔

دوسرے دعوے کے رد میں محدثین ورواۃ کے حفظ حدیث کے غیر معمولی اور حیرت انگیز واقعات پر روشنی ڈالی ہے، اس میں بطور تمہید کے لکھا ہے:

''اگر چہ پہلے دعویٰ کا غلط اور بے سروپا ہونا ثابت کر دینے کے بعد اس دوسرے دعویٰ پر کچھ لکھنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، اس لیے کہ یہ دعویٰ تمام تر پہلے ہی دعویٰ پر مبنی ہے، اور اس کا غلط ہونا ثابت ہو چکا، تو اب اِس کے غلط ہونے میں کیا شبہہ باقی رہ جاتا ہے، تاہم تبرعاً اس پر کلام کرتا ہوں، اور کہتا ہوں کہ اگر چہ اوپر تاریخی شواہد سے ثابت ہو چکا ہے کہ صرف زبانی روایت پر کسی زمانے میں بھی دارومدار نہیں رہا ہے؛ بلکہ عہد نبوی ہی سے کتابت حدیث کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے، لیکن اگر بالفرض یہ سلسلہ نہ رہا ہوتا، تو بھی عہد نبوی سے لے کر پچھلے ہر دور میں حدیثوں کو سینے میں محفوظ رکھنے کا جو بلیغ اہتمام تھا اور اس کے اداو بیان میں جو کامل احتیاط مد نظر تھا، اس کے پیش نظر یہ دعویٰ کرنا ممکن ہی نہیں کہ ''زبانی روایت پر دارومدار رہنے کی وجہ سے حدیثیں کچھ سے کچھ ہو گئیں''[1]۔

اس کے بعد ہر دور اور ہر طبقے کے حفظ حدیث کے بہت سے واقعات کو مستند کتابوں سے نقل کر کے اس پہلو کو بھی خوب اچھی طرح واضح کر دیا ہے، اور ثابت کر دکھایا ہے کہ ان حاملین حدیث کو حدیثیں یاد کرنے اور ان کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھنے کا کس قدر غیر معمولی اہتمام تھا، صحابہ وتابعین کے حفظ حدیث کے واقعات بیان کرنے کے بعد ''تابعین کے بعد کے طبقے'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

''صحابہ وتابعین کے بعد کے طبقوں میں بھی قوت یادداشت کی یہی فراوانی تھی، بلکہ ان طبقوں میں حافظہ کی بعض مثالیں پہلے سے بھی زیادہ حیرت انگیز ملتی ہیں''[2]۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے ''روایت میں محدثین کی بے نظیر احتیاط'' کے عنوان کے ماتحت دکھایا ہے کہ محدثین نے ابتدا ہی سے حدیثوں کی روایت میں کس قدر احتیاط سے کام لیا ہے، حتی کہ بعض صحابہؓ صرف اس ڈر سے کہ بیان کرنے میں کچھ کمی بیشی نہ ہو جائے، بہت کم حدیثیں بیان کرتے تھے۔ علامہ اعظمیؒ نے متعدد واقعات کو نقل کر کے ثابت کیا ہے کہ محدثین کس طرح ایک ایک لفظ اور حرف کی ادائیگی میں احتیاط سے کام لیتے تھے، اور یہی نہیں یہاں تک اہتمام تھا کہ ایک شخص کوئی حدیث بیان کرتا تھا، تو مزید اطمینان کے لیے دوسرا اس کا

(۱) نصرۃ الحدیث: ۳۱ (۲) ایضاً: ۳۹

موید تلاشش کیا جاتا تھا۔

مقدمے میں علامہ اعظمیؒ نے ایک عنوان یہ قائم کیا ہے ''محدثین پر سلطنت کی ہوا خواہی کا الزام''۔اوراس عنوان کے ماتحت اولاً ''حق گو'' کا یہ الزام نقل کیا ہے:

''حدیث کی بے اعتباری کی ایک وجہ ''حق گو'' صاحب نے یہ بھی تراشی اور گڑھی ہے کہ محدثین نے حدیثوں میں سلطنت کے جذبات وعواطف کی رعایت کی ہے''۔

اوراس دعوے کا مفصل جواب درج کرنے سے پہلے ان کے دعوے پر یوں نقد کیا ہے:

''محدثین کے اعلیٰ کیرکٹر، ان کی نہایت بلند اخلاقی جرأت اوران کی بے مثل صداقت وامانت پر ''حق گو'' صاحب کا یہ نہایت سخت حملہ ہے، ''حق گو'' صاحب کواس لحاظ سے تو ہم معذور سمجھتے ہیں کہ غلام قوم کا ایک غلام فرد، اور وہ بھی حکومت کا تنخواہ دار نوکر اس اخلاقی جرأت کا تصور بھی نہیں کرسکتا، جو محدثین کا طرۂ امتیاز تھی''[1]۔

پھر محدثین کی جرأت وبے باکی اور بڑے بڑے اصحاب سطوت حکام وسلاطین کے درباروں میں ان کی حق گوئی اور ثابت قدمی کے کئی واقعات تاریخ وتذکرہ کی کتابوں سے نقل کیے ہیں۔

اس کے بعد ''حق گو'' کے رسالہ پر اجمالی تبصرہ کرتے ہوئے پہلے قرآن کریم کی متعدد آیات سے حدیث کا حجت ہونا ثابت کیا ہے، پھر تحریر فرمایا ہے کہ حدیثوں کی حفاظت مسلمانوں کا کتنا عظیم الشان اور امتیازی کارنامہ ہے، جس کا اعتراف دوسری قوموں نے بھی کیا ہے، اوراس سلسلے میں بعض غیر مسلموں کے اعتراف کی شہادت بھی پیش کی ہے، اس میں منکرین کے بعض وسوسوں کا بھی ذکر کیا ہے، علامہ اعظمیؒ نے بہت صاف لکھا ہے کہ ''انکار حدیث کا لازمی نتیجہ انکار قرآن ہے''۔

اس کے بعد ''حق گو'' کے رسالہ پر تفصیلی تبصرہ ہے، جو صفحہ ۸۵ سے شروع ہوکر صفحہ ۲۱۴ پر ختم ہوتا ہے، جس میں اس مصنف کی ایک ایک ہفوات وخرافات کا پوری قوت سے جواب دیا ہے۔اس کے کچھ خاص خاص عناوین یہ ہیں:

''روافض کا عقیدۂ تحریف قرآن''، ''انبیاء کے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا''، ''حضور ﷺ کے بعد کون لوگ مرتد ہوئے''، ''عذاب قبر کا ثبوت قرآن مجید سے''، ''مغازی پر حملہ''، اسلامی قوانین کی اکملیت''، ''یہود ونصاریٰ سے مسائل اخذ کرنے کی ممانعت حدیث میں''، ''تصویر کی حرمت وحلت کا مسئلہ''، ''ماکول اللحم جانوروں کی بحث''، ''حق گو صاحب کا انکارِ حدیث کے باوجود حدیثوں سے استدلال''، ''پانچ نمازوں کا قرآنی حکم''، ''حق گو صاحب کی بے باکانہ غلط بیانیاں''، ''موضوعات کی اشاعت کے خلاف حضرات محدثین اور خلفا کی مساعی جمیلہ''۔

یہ بعض وہ مرکزی عناوین ہیں، جن کے تحت علامہ اعظمیؒ نے ''حق گو'' صاحب کی باتوں کا عقل ونقل کی

(۱) نصرۃ الحدیث:۵۱

روشنی میں جواب دیا ہے، اوران کے یا کسی اور کے دل میں جوشکوک وشبہات سر اٹھا سکتے ہیں، ان کا دفعیہ کیا ہے۔

''حق گو'' صاحب کے رسالے کی اشاعت میں سب سے زیادہ حیرت انگیز اور افسوسناک پہلو یہ تھا کہ اس قدر باعث ننگ وعار رسالہ عمل بالحدیث کے علم بردار اور جماعت اہل حدیث کے سرخیل مولانا ثناء اللہ امرتسری کے پریس ''ثنائی برقی پریس'' سے چھپ کر شائع ہوا تھا، چنانچہ علامہ اعظمیؒ نے اس کے آخر میں ''ایڈیٹر اہل حدیث امرتسر سے ایک شکایت'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

''مجھ کو نہایت تعجب ہوا، جب میں نے دیکھا کہ منکرین حدیث کا یہ رسالہ ''ثنائی برقی پریس'' میں طبع ہوا ہے، اور میں نہیں سمجھ سکا کہ مولوی ثناء اللہ صاحب نے باایں ہمہ ادعاءِ عشقِ حدیث دشمنانِ حدیث کے اس الحاد پرور رسالہ کو جس میں حدیث اور محدثین کی تنقیص وتکذیب اور توہین وتحقیر کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا ہے، کیوں اپنے پریس میں طبع کرایا؟ اور ان کی مذہبی حمیت وغیرت نے اس کو کس طرح گوارا کرلیا؟ کیا مولوی صاحب مجھے بتائیں گے کہ یہ تعاون علی الاثم والعدوان میں داخل ہے یا نہیں؟ اور کیا حدیث میں دشمنوں کے ہاتھ اسلحہ بیچنے کی ممانعت آئی ہے یا نہیں؟ اگر آئی ہے تو اس میں کیا راز ہے؟ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اس رسالہ کو چھاپ کر آپ خاموش ہوگئے، جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ نے مستقل جواب تو درکنار اپنے اخبار میں بھی شاید اس کی خبر نہیں لی۔

مولوی صاحب! گستاخی معاف! اہل حدیث کہلانے کے لیے تو آپ ہیں، اور حدیثوں سے مدافعت کرنے کے لیے حنفی؟

فإذا تكونُ كريهةٌ أُدعَى لها وإذا يُحاسُ الحَيسُ يُدعَى جُندبُ

(مطلب یہ ہے) جب کوئی سختی پیش آتی ہے، تو اس کے لیے میں بلایا جاتا ہوں اور جب حلوہ پکتا ہے تو جندب (ایک شخص کا نام ہے) کو بلایا جاتا ہے''[۱]۔

نصرۃ الحدیث پر اہل علم کے تاثرات:

آخر میں اس کتاب کے متعلق اہل علم وقلم کے کچھ تاثرات نقل کردینا مناسب سمجھتا ہوں، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں اس کتاب کے متعلق لکھا ہے:

''میں اپنے ضعف وعذر سے خود شرمندہ ہوں، اور ہدیہ بسر وچشم قبول کرتا ہوں، اور دعائے نافعیت کرتا ہوں، جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا، بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محقق نہ لکھ سکتا''[۲]۔

ہندوستان کے مشہور عالم ومصنف اور 'تدوین حدیث' کے مولف مولانا مناظر احسن گیلانی نے ۵؍اپریل ۱۹۴۲ء کے تحریر کردہ ایک خط میں علامہ اعظمیؒ کو لکھا ہے:

''میں نے آپ کی کتاب '**نصرۃ الحدیث**' اول سے آخر تک پڑھی، ماشاء اللہ آپ نے کافی محنت اور

(۱) نصرۃ الحدیث: ۲۱۴ (۲) ایضاً: ۲۱۵

مطالعہ فرمایا ہے، نئی چیزیں اس سلسلہ میں آپ نے پیش کی ہیں، خدا آپ کو جزائے خیر دے،......اس موضوع پر خاکسار نے بھی کچھ لکھا ہے......اس لیے آپ کی محنت اور تلاش کی داد جیسا کہ چاہئے میں ہی دے سکتا ہوں۔ اگر حکم ہو......تو آپ کی کتاب پر مفصل ریویو لکھنا اپنی سعادت خیال کروں گا......، آپ جیسے دین کے مخلص خدام کا سرمایہ عزوشرف فی الدنیاوالآخرہ ہے"(۱)۔

اور اردو زبان کے مشہور صاحب قلم اور فاضل ادیب اردو کے سب سے بڑے اور بے لاگ تبصرہ نگار جناب ماہر القادری مرحوم نے 'فاران' میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"احادیث نبوی کو مجروح کرنے اور انھیں (معاذ اللہ) نا قابلِ اعتبار ٹھہرانے کے لیے منکرینِ رسالت جو وسوسے مسلمانوں کے دلوں میں ڈال رہے ہیں اور جو نکتے تراش رہے ہیں، اس کتاب نے نہ صرف اس کا ازالہ کیا ہے، بلکہ اس قسم کے تمام شیطانی وساوس اور منافقانہ الزامات کی جڑیں کاٹ کر رکھ دی ہیں، اسی دور کا ایک منافق جو ادب وصحافت کی دنیا میں "حق گو" کے نام سے مشہور ہے، اس کے ایک ایک الزام کے فاضل مولف نے پرخچے اڑا دیے ہیں۔

نصرۃ الحدیث کے مطالعہ سے احادیث رسول کی اہمیت، افادیت، ضرورت، بلکہ اس کے منصوص ہونے پر دل مطمئن ہو جاتا ہے، اس کتاب کا ایک ایک ورق ایمان افروز ہے۔

نصرۃ الحدیث کے فاضلانہ مقدمہ نے علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے 'خطبات مدراس' کی یاد تازہ کر دی ہے"(۲)۔

ماہنامہ 'معارف'- جمادی الثانیہ ۱۳۵۳ھ = اکتوبر ۱۹۳۴ء- میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

"اس رسالہ میں رسالۂ سابق (۳) کے تمام تدلیسات کا پردہ بدلائل چاک کیا گیا ہے، اور تمام دلائل اور بیانات کے تار پود بکھیر کر رکھ دیے گئے ہیں"(۴)۔

اس کتاب کا پہلا اڈیشن آفتاب برقی پریس امرتسر سے مولانا بہاء الحق قاسمی امرتسری کے اہتمام سے شائع ہوا تھا، اس اڈیشن پر تاریخ تکمیل کتابت ۲۲ر ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ مطابق ۴ر اگست ۱۹۳۴ء درج ہے۔

دوسرا اڈیشن مطبع معارف اعظم گڈھ سے ۱۳۶۰ھ = ۱۹۴۱ء میں طبع ہوکر مدرسہ مفتاح العلوم کے شعبۂ تالیف سے باہتمام مولانا محمد ایوب صاحب اعظمیؒ اشاعت پذیر ہوا۔

تیسرا اڈیشن ۱۴۱۲ھ = ۱۹۹۲ء میں آفسیٹ پریس گورکھپور سے طبع ہوکر دار المآثر الاسلامیہ مئو سے شائع ہوا تھا۔

چوتھا اڈیشن ۱۴۲۵ھ = ۲۰۰۴ء میں دار المآثر الاسلامیہ مئو سے باہتمام مولانا رشید احمد الاعظمی طبع ہوکر شائع ہوا۔

(۱) حیات ابوالمآثر - اول -: ۵۴۹ (۲) نصرۃ الحدیث: ۲۱۵

(۳) رسالۂ سابق سے "حق گو" کی کتاب کی طرف اشارہ ہے، جس پر معارف کے اسی شمارے میں نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔

(۴) معارف جلد ۳۴ شمارہ ۴، ص: ۳۱۷

مقدمہ معارف الحدیث

'نصرۃ الحدیث' ہی کا پرتو معارف الحدیث – تالیف: حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ – کا وہ طویل اور وقیع مقدمہ ہے، جو علامہ اعظمیؒ کا تحریر فرمودہ ہے، اور 'معارف الحدیث' کے ساتھ شائع ہوا ہے، یہ مقدمہ ۳۶/ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں حدیث کے ''منصوص'' ہونے کو تفصیل کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ اس تحریر میں علامہ اعظمیؒ نے حدیث شریف کے حجت ہونے کو بہت سی قرآنی آیات سے ثابت کیا ہے، اور قرآن سے اس کی حجیت کے اثبات پر ہی سارا زور صرف فرمایا ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے اپنی تحریر کا آغاز ان الفاظ سے فرمایا ہے:

''بلاشبہ قرآن پاک دین وشریعت کی اصل واساس ہے، اور ادلۂ شرع میں وہی سب سے مقدم اور سب سے محکم ہے، مگر اس کا کام صرف اصول بتانا ہے، تفریع وتفصیل اور توضیح وتشریح حدیث وسنت کا وظیفہ ہے''(۱)۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور آپ کے قرآن کریم کی تشریح وتوضیح کو ان الفاظ میں ارقام فرمایا ہے:

''ہر باخبر جانتا ہے کہ قرآن کریم امت کو بلا واسطۂ رسول نہیں دیا گیا تھا کہ لو تم بذات خود یا اپنے ہی جیسے غیر نبی لوگوں کی مدد سے پڑھو اور سمجھو اور اس پر عمل کرو، بلکہ اس کے نزول سے پہلے ایک برگزیدہ رسول کو دنیا میں بھیج کر ان پر قرآن نازل کیا گیا، اور یہ صرف اس لیے کیا گیا تا کہ لوگ اپنے اپنے طور پر نہیں بلکہ صرف رسول کے بیان اور تشریح کی روشنی میں اللہ کی اُس کتاب کو سمجھیں، چنانچہ قرآن پاک ہی میں ارشاد ہوا: ﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ اور نازل کیا ہم نے آپ کے پاس ذکر (کتاب) کو تا کہ آپ کھول کھول کر بیان کریں لوگوں کے واسطے اس چیز کو جو نازل کی گئی ان کی طرف، اور تا کہ وہ غور وفکر کریں''(۲)۔

اس کے بعد سورۂ بقرہ، آل عمران اور سورۂ جمعہ کی وہ آیات جن میں آنحضرت ﷺ کے فرائض میں ''تلاوتِ آیات'' اور ''تعلیم کتاب'' کو بتایا گیا ہے، نقل کر کے لکھتے ہیں:

''پہلی چیز یعنی تلاوتِ آیات کا مطلب تو ظاہر ہے، ہاں تعلیم کتاب کی نسبت غور کرنا ہے کہ اس کی کیا مراد ہے؟ اگر اس کی مراد بھی قرآن پاک کے مربوط ومرتب کلمات کو پڑھ کر سنانا اور یاد کرانا ہی ہے، تو یہ تلاوتِ آیات سے الگ کوئی چیز نہیں ہوئی، حالانکہ وہ اس سے الگ ذکر کی گئی ہے، پس یقیناً اس سے مراد آیات کی تشریح، اس کے معانی ومطالب کی توضیح اور آیات کے حِکَم اور احکام کا بیان ہے''(۳)۔

بعد ازاں بطور نتیجہ کے تحریر فرماتے ہیں:

(۱) مقدمہ معارف الحدیث: ۱۵ (۲) ایضاً: ۱۵ (۳) ایضاً: ۱۶

''پس جب قرآن ہی سے یہ معلوم ہو چکا کہ آنحضرت ﷺ کے فرائض رسالت میں جس طرح الفاظ وکلماتِ قرآن کی تلاوت وتبلیغ ہے، اسی طرح اُس کے معانی ومطالب کا بیان بھی فرائضِ رسالت میں داخل ہے؛ تو لازمی طور پر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جس طرح قرآن حجت ہے اسی طرح اس کی نبوی تشریحات بھی حجت اور واجب القبول ہیں، ورنہ آپ کو تعلیم کتاب کا مکلّف بنانا اور تعلیم کتاب کو آپ کا منصبی وظیفہ بتلانا بالکل بے معنی ہوگا۔ الغرض ان قرآنی نصوص کی رُو سے رسول اللہ ﷺ اللہ تعالی کے ''پیغام رساں'' ہونے کے ساتھ اُس پیغام کے معلّم اور مبیّن بھی ہیں''(۱)۔

پھر تین نکات یا امور میں اپنے تمام معروضات کا خلاصہ تحریر فرماتے ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

''۱-قرآنی نصوص کی رُو سے رسول خدا ﷺ قرآن کے معلّم وشارح ومبیّن ہیں۔

۲-آپ نے جس طرح متن قرآن کی تبلیغ کی، اسی طرح اس کی شرح وتبیین بھی فرمائی۔

۳-آپ کی تشریحات وبیانِ قرآن کا قرآن کے ساتھ ساتھ باقی رہنا ضروری ہے''۔

اس کے بعد آپ نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قرآن کی تعلیم دو طرح فرمائی ہے: ایک عملی؛ دوسرے قولی۔ عملی تعلیم میں آپؐ نے مثلاً نماز پڑھ کر اس کی ترکیب اور طریقہ دکھا اور سکھا دیا، اور ﴿اَقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ﴾ کی تشریح آپؐ نے صَلُّوْا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِيْ اُصَلِّي کی عملی تعلیم سے کی، اسی طرح حج اور دوسرے اسلامی احکام کا بھی حال ہے۔

پھر علامہ اعظمیؒ نے قولی تشریح کی دو صورتیں ذکر کی ہیں، اور وہ یہ ہیں:

''ایک یہ کہ قرآن پاک کی کسی آیت کا ذکر یا اس کی طرف اشارہ کر کے اس کی تفسیر، یا اُس سے جو حکم مستنبط ہوتا ہے، اس کو بیان فرماتے تھے؛ اور دوسری صورت یہ تھی کہ اپنے وہبی علم اور فہم مخصوص کی بنا پر جو استنباط واستفادہ آپ نے قرآن کریم سے کیا، اس کو آیت کا حوالہ دیے اور اس کی طرف اشارہ کیے بغیر بیان کر دیتے تھے''(۲)۔

اس کے بعد حدیث شریف کی متعدد مثالیں دے کر ان دونوں صورتوں کو واضح کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ احادیث نبویہ کا اکثر حصہ قرآن پاک کی تشریح وتفصیل یا اس سے استنباط ہے، لہذا نصوص قرآن ہی سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ تشریحات وتفریعات اور استنباطات بھی واجب القبول اور واجب الاتباع ہیں۔

اس کے بعد ''تعلیم حکمت'' کے عنوان کے تحت قرآن پاک کی تین ایسی آیتیں نقل کر کے جن میں ''حکمت'' کی تنزیل اور اس کی تلاوت کا بیان ہے، فرمایا ہے:

''سوال یہ ہے کہ ازواج مطہرات کے گھروں میں قرآن کی آیتوں کے علاوہ دوسری کیا چیز پڑھی جاتی تھی؟ اور آنحضرت ﷺ ان کو قرآن کے علاوہ کیا سناتے تھے؟

(۱) مقدمہ معارف الحدیث: ۱۷-۱۶ (۲) ایضاً: ۱۸

اس سوال کا صرف یہی ایک جواب ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کی حدیث اور آپ کی سنت تھی -یعنی آپ کے عام دینی نصائح اور دینی افادات وارشادات -، اور چونکہ اس آیت میں حکمت کے ذکر کا -یعنی اس کو یاد رکھنے کا- حکم ہے، اس لیے اسی آیت سے حدیث وسنت کے یاد کرنے اور یاد رکھنے کا وجوب بھی معلوم ہوگیا، اور یہ بات بھی تقریباً بدیہی اور مسلَّم ہے کہ علم وذکر وحفظ مقصود بالذات نہیں ہیں، بلکہ عمل کے لیے مقصود ہیں، اس لیے اسی آیت سے حدیث وسنت پر عمل کا واجب اور مامور بہ ہونا بھی معلوم ہو گیا۔

اور جب سنت ہی کا دوسرا نام حکمت ہے، تو اس سے پہلی آیتوں سے -جن میں کتاب کی طرح حکمت کو بھی منزَّل من اللہ فرمایا گیا ہے- یہ ثابت ہوا کہ سنت بھی منزَّل من اللہ اور وحی خداوندی ہے''(۱)۔

بعد ازاں ''اسوۂ رسول'' کا ایک عنوان قائم کیا ہے اور اس کے تحت لکھا ہے:

''ان دونوں -قرآن پاک کی تبیین اور حکمت- کے علاوہ ایک تیسری چیز جس کی پیروی ہر مومن پر قرآن نے لازمی قرار دی ہے، وہ ہے پوری اسلامی ومذہبی زندگی کا وہ نمونہ جو آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس میں جلوہ گر تھا''(۲)۔

پھر قرآن کریم سے اس چیز کو ثابت کرنے کے بعد اب تک کے معروضات کے خلاصہ کے طور پر یوں ارشاد فرماتے ہیں:

''جب یہ بات ذہن نشین ہوچکی، تو اب سنئے کہ آنحضرت ﷺ نے قرآن پاک کی جو تبیین فرمائی اور تعلیم دی، اور وہ حکمت جو آپ پر اتاری گئی، نیز آپ کی پوری زندگی جس کا مکمل نقشہ ان خوش قسمتوں نے ہمارے سامنے کھینچ کر رکھ دیا ہے، جنھوں نے اس زندگی کا مشاہدہ کیا تھا۔ انھیں تینوں چیزوں کا نام حدیث وسنت ہے، اور نصوص کتاب اللہ کی رُو سے ان تینوں کے واجب القبول ہونے کا مطلب بالفاظ دیگر یہ ہے کہ قرآن، حدیث وسنت کو واجب القبول اور واجب الاتباع قرار دیتا ہے''(۳)۔

صفحہ ۲۶ پر ایک عنوان یہ ہے: ''حدیث کے حجت ہونے کی ایک اور قرآنی دلیل''۔ اس میں علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن پاک نے اتباع سبیل المومنین -مومنین اولین کے طریقے پر چلنے- کو ضروری بتایا ہے، اور اس کے لیے قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ: ﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيْرًا﴾ ترجمہ: اور جو کوئی خلاف کرے رسول کے، بعد اس کے کہ واضح ہوگئی اس کے لیے ہدایت اور راہ پکڑے مومنین کے راستہ سے الگ، ہم حوالہ کریں گے اس کو اس راہ کے جس کی طرف اُس نے رُخ کیا ہے اور انجام کار ہم اُس کو داخل کریں گے دوزخ میں اور بُرا ہے وہ ٹھکانا۔

(۱) مقدمہ: ۲۳-۲۲ (۲) ایضاً: (۳) ایضاً: ۲۶-۲۵

علامہ اعظمیؒ نے اس آیت کی روشنی میں لکھا ہے:

''اس آیت میں حق تعالیٰ نے مومنین کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرا اختیار کرنے والوں کو سخت وعید سنائی ہے، اور اس کو مستحق دوزخ قرار دیا ہے، پس ضروری ہے کہ اس مسئلہ میں بھی یہ معلوم کیا جائے کہ مومنین اولین کا راستہ کیا تھا؟ وہ آنحضرت ﷺ کے اقوال وافعال کو یا بلفظ دیگر حدیث وسنت کو حجت مانتے اور اس کو مشعل راہ قرار دیتے تھے یا نہیں؟''(۱)۔

پھر آنحضرت ﷺ کی سنت وسیرت سے صحابہ کرامؓ کے استدلال واستنباط کی دس مثالیں نقل کر کے لکھتے ہیں:

''یہ دس مثالیں بلا مبالغہ مشتے نمونہ از خروارے ہیں، اس سے زیادہ کی ہم اس لیے ضرورت نہیں سمجھتے کہ ایک منصف مزاج کے لیے یہی کافی سے زیادہ ہیں، اور ان کو سامنے رکھنے کے بعد کوئی بھی منصف اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ مومنین اولین کا راستہ حدیث وسنت کے ساتھ احتجاج اور ہر باب میں اُس کو مشعلِ راہ قرار دینا تھا''(۲)۔

اس کے بعد منکرین حدیث کے طرز عمل کو نامعقول اور ناقابلِ فہم قرار دیتے ہوئے علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ ذخیرۂ احادیث کو جعلی، بے بنیاد اور بے اعتبار کہنا درحقیقت قرآن پاک پر عمل کا دروازہ بند کرنا ہے، اور صرف یہی نہیں بلکہ:

''اس کے علاوہ اسلام اور مسلم قوم کو دوسرے مذاہب واقوام عالم پر جو مخصوص تفوق وامتیاز حاصل ہے، اس کو بھی برباد کرنا ہے، اس لیے کہ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ مسلم قوم کی نہ کوئی تاریخ ہے، نہ اس کے علمی وعملی کارنامے ہیں، اور نہ ان کارناموں کا کوئی ذریعۂ علم دنیا میں موجود ہے، کیا ایسی بات کوئی مسلمان کہہ سکتا ہے؟''(۳)۔

آگے حدیث کا انکار کرنے والوں کو دعوتِ غور وفکر دیتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

''علاوہ ازیں پختہ اور کھری سندوں کے ساتھ بھی حدیثوں کو نہ ماننے اور ان کو بے اعتبار کہنے کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہی تو ہے کہ کتب احادیث کے مصنفوں نے محض بے بنیاد باتوں کو بالکل جعلی اور فرضی سندوں کے ساتھ کتابوں میں درج کر دیا ہے۔

ان حضرات کو خالص علمی طور پر کبھی تو سوچنا چاہئے کہ ایسا ممکن کیونکر ہے؟ کیا جب احادیث کے یہ مجموعے لکھے گئے، اُس وقت دنیا میں ایک بھی ''صحیح قسم'' کا مسلمان نہیں تھا، جو اس ساری جعل سازی اور افترا پردازی کا مقابلہ کرتا؟ یا کم از کم اُس پر نکیر ہی کرتا''(۴)۔

اس کے بعد مثال میں امام مالک کی کتاب 'موطا' اور اس کے نسخوں اور راویوں کا ذکر کر کے نہایت بلند

(۱) مقدمہ: ۲۶ (۲) ایضاً: ۳۲ (۳) ایضاً: ۳۲ (۴) ایضاً: ۳۳

آہنگ انداز میں لکھتے ہیں:

''اب غور کیجئے کہ ایسے عہد اور ایسی حالت میں، اور ایسے لوگوں کی موجودگی میں، پھر ایسی جگہ پر جہاں آنحضرت ﷺ کی زندگی کے آخری دس سال گذرے ہیں، اور جہاں کا کوئی گھر اور کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس کو آنحضرتؐ سے وابستگی اور آپ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل نہ ہو، اس سرزمین میں ایک شخص- امام مالک- آپ کی حدیثوں اور سنتوں کے بیان میں ایک مجموعہ تیار کر کے اسی سرزمین میں اس کو علی الاعلان سناتا ہے، اور ہزاروں آدمی تمام بلادِ اسلامیہ سے رختِ سفر باندھ کر مدینہ آتے اور اس مجموعہ کو سن کر اور بہت سے لوگ اس کی نقلیں لے کر اپنے اپنے وطن واپس جاتے ہیں، اور وہاں پہنچ کر ان میں کا ہر آدمی اس کو سیکڑوں اور ہزاروں مسلمانوں میں پھیلاتا ہے، مگر مدینہ مقدسہ یا کسی جگہ کا ایک متنفس بھی یہ نہیں کہتا کہ یہ ساری حدیثیں، یا ان میں سے بہت سی جعلی ہیں۔ کوئی صاحبِ عقل بتائے کہ اولاً تو ایسی حالت میں امام مالک کو- اگر معاذ اللہ وہ مفتری ہوتے- اس کی ہمت ہی کیسے ہوتی، اور اگر بالفرض ہوتی بھی تو سارے اہل مدینہ اس ''افترا پردازی'' اور دین میں ''جعلی چیز کے اضافہ'' اور اس کی اشاعت کا خاموشی سے تماشہ دیکھتے رہ جاتے! ما لکم کیف تحکمون''[(۱)]۔

آگے صفحہ ۳۶ پر علامہ اعظمیؒ نے ایک عنوان یہ قائم کیا ہے: **''قرآن مجید کی بہت سی آیات کا مطلب بھی روایات کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا''**۔ اور اس کے تحت آیاتِ قرآنیہ سے متعدد مثالیں پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ احادیث و آثار کو اگر قابلِ اعتبار نہ سمجھا جائے ''تو خود قرآن پاک کی بہت سی آیات کا مفہوم و مطلب مبہم اور بڑی حد تک تشنہ رہ جائے گا''۔ کئی ایک مثالوں کے بعد اس عنوان کے ختم پر لکھا ہے:

''الغرض جو شخص قرآن پاک کو اللہ کی کتاب مانے، اور اُس کا سمجھنا اور اُس پر عمل کرنا ہر زمانہ کے اہل ایمان کے لیے ضروری سمجھے، اُس کو احادیث و سیر کے اُس ذخیرہ کو بھی ماننا پڑے گا، جس کو پوری طرح جانچ پرکھ کے ائمہ محدثین واہل سیر نے محفوظ کیا ہے، اور جس کے بہت بڑے حصے کی حیثیت یقیناً قرآن کے ضروری توضیحی ضمیمہ کی ہے''[(۲)]۔

اس طرح حجیت حدیث کے مسئلے پر قرآن کریم کی بے شمار آیات بینات سے اور متعدد جہات سے حجت قائم کر کے حدیث و سنت کے حجت دینی اور واجب القبول والا تباع ہونے کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کرتے ہیں، اور اس پوری بحث کے آخر میں ایک نہایت اہم عنوان یہ قائم کرتے ہیں: **''رسول کا صحیح مقام''**، اور اس کے ماتحت یہ چند سطریں بطور تمہید کے لکھتے ہیں:

''ہمارے خیال میں حدیث و سنت کے منکرین کی اصل غلطی یہ ہے کہ انھوں نے رسول کی اصل حیثیت اور اُس کے صحیح مقام کو نہیں سمجھا ہے؛ اگر وہ مقامِ نبوت کو سمجھنے اور نبی و رسول کی معرفت حاصل

(۱) مقدمہ: ۳۵-۳۴   (۲) ایضاً: ۳۹

کرنے کے لیے صرف قرآن ہی میں تدبر کریں، تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی حیثیت صرف ایک پیغامبر اور پیام رساں ہی کی نہیں ہے، بلکہ آپ مطاع، متبوع، امام، ہادی، قاضی، حاکم، حَکَم وغیرہ وغیرہ بھی ہیں، اور قرآن ہی نے آپ کی ان حیثیتوں کو بھی بیان کیا ہے"(۱)۔

پھر آنحضرت ﷺ کی اطاعت کے حکم سے متعلق قرآن کریم کی دسیوں آیتیں بطور مثال پیش کر کے اس کے آخر میں تحریر فرمایا ہے:

''رسول کے مقام و منصب کا بیان ایک مستقل موضوع ہے، اور اگر اس پر شرح وبسط سے لکھا جائے، تو جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے، اس سے بہت زیادہ لکھا جا سکتا ہے، اور بلا مبالغہ سیکڑوں آیتیں اس سلسلہ میں پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن یہاں اس وقت ان ہی اشارات پر اکتفا کر کے میں کہنا چاہتا ہوں کہ جب قرآن مجید سے آپ کا مطاع، متبوع، امام، ہادی، آمر وناہی، حاکم وحَکَم وغیرہ وغیرہ ہونا ثابت ہو گیا، تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دین کے سلسلہ کا آپ کا ہر امر ونہی، ہر حکم وفیصلہ اور ہر قول وعمل واجب التسلیم اور لازم القبول ہے"(۲)۔

اور آخر میں اس مقدمے کو ختم کرنے سے پہلے کس قدر مستحکم، ایمان وایقان سے بھرپور، ٹھوس، اٹل اور غیر متزلزل لہجے میں حسب ذیل سطریں ارقام فرماتے ہیں:

''آنحضرت ﷺ جب تک اس دنیا میں رونق افروز رہے، امت نے آپ کی اور آپ کے ارشادات اور اسوۂ حسنہ کی یہی حیثیت سمجھی، اور آپ کے ارشادات کو بلا واسطہ سننے والے اور آپ کے اعمال وافعال کو بچشم خود دیکھنے والے صحابہ کرامؓ نے علم وہدایت کے اس پورے خزانہ کی غیر معمولی اہتمام اور شغف کے ساتھ حفاظت کی، اور پوری امانت کے ساتھ بعد والوں کو پہنچایا، پھر بعد کے قرنوں میں اللہ تعالی نے آپ کی امت کے بہترین افراد کو احادیث وسنن کے اس بے پایاں دفتر کی تدوین وترتیب، تحقیق وتنقید، تعلیم وتعلُّم، ترجمہ وتشریح، حفظ واشاعت اور اُس سے متعلق بہت سے مستقل علوم وفنون کی ایجاد، اور پھر ہر فن میں بہتر سے بہتر تالیف وتصنیف وغیرہ وغیرہ سیکڑوں قسم کی خدمات کی ایسی توفیق دی، جو کبھی کسی قوم اور امت کو نہیں ملی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر چہ خاتم الانبیا ﷺ کو اس دنیا سے گئے ساڑھے تیرہ سو سال سے زیادہ کی مدت گزر چکی ہے، لیکن آپ کے ارشادات اور اسوۂ حسنہ کی روشنی ہر راہ رَو کے لیے آج بھی ایسی ہی موجود ہے، جیسی کہ قرن اول میں تھی"(۳)۔

آخر میں مولف کتاب حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی اس بیش قیمت اور ان کی اس مایہ ناز تصنیف پر ان کے حق میں یوں دعائے خیر کرتے ہوئے اپنے مقدمے کو ختم کر دیتے ہیں:

''معارف الحدیث کی تالیف، جس کی توفیق عزیز گرامی مولانا محمد منظور نعمانی سلمہ اللہ تعالی وابقاہ کو

(۱) مقدمہ: ۴۱ (۲) ایضاً: ۴۷ (۳) ایضاً: ۴۸-۴۷

ملی ہے، اسی سلسلہ کی ایک تازہ خدمت اور محنت ہے۔

مقدمہ کو ختم کرتے ہوئے کتاب پر کسی رسمی تبصرہ کے بجائے میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی اس کو قبول فرمائے، اور اپنے بندوں کو اس سے نفع پہنچائے، اور جو حصے ابھی باقی ہیں، ان کی تکمیل کی مؤلف کو جلد توفیق عطا فرمائے''[1]۔

آخر میں آپ کے نام کے ساتھ یہ تاریخ اور مقام درج ہے: ''۱۶؍ جمادی الاخری ۱۳۷۳ھ، لکھنؤ''

علامہ اعظمیؒ کے مقدمہ سے پہلے مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی، مقدمے سے متعلق تمہید ہے، اس تمہید کے آخر میں مولانا نعمانی مرحوم نے لکھا ہے:

''اس فتنہ کو- فتنہ انکار حدیث کو- اپنی غیر معقولیت کی وجہ سے آپ اپنی موت مر جانا چاہئے تھا، لیکن چونکہ اقوام مغرب کی سیادت وقیادت کی وجہ سے ہمارے اس زمانہ کی ہوا آزادی پسندی اور آوارہ مزاجی کے لیے ہمیشہ سے زیادہ سازگار بنی ہوئی ہے، اس لیے یہ فتنہ نہ صرف زندہ ہے، بلکہ کسی نہ کسی رفتار سے کچھ بڑھ ہی رہا ہے،''معارف الحدیث'' جو ذخیرۂ احادیث نبوی کا ایک انتخاب ہے- جس کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث اور تعلیمات وہدایات کو اردو ترجمہ وتشریح کے ساتھ اردو خواں طبقہ تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے- مناسب سمجھا گیا کہ اس کے مقدمہ میں اس مسئلہ پر بھی کچھ روشنی ڈال دی جائے، اس کے لیے ناچیز مولف نے اپنے علمی محسن اور استاذ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی سے استدعا کی، ممدوح نے اس کو قبول فرمایا اور یہ مقدمہ تحریر فرمایا''۔

یہ مقدمہ پہلی دفعہ 'معارف الحدیث' کے ساتھ نامی پریس لکھنؤ سے ۱۳۷۳ھ=۱۹۵۴ء میں طبع ہو کر شائع ہوا تھا۔

'معارف الحدیث' کا یہ مقدمہ ''حدیث دین میں حجت ہے'' کے عنوان سے ماہنامہ 'فاران' -کراچی، پاکستان- میں اگست ۱۹۵۴ء کے شمارے میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اور The Sunnah in Islam کے نام سے انگریزی میں ترجمہ کر کے U. K. Islamic Academy کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔

☆......☆......☆

حجیت حدیث

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اس مضمون میں حدیث پاک کے حجت ہونے کو ثابت کیا گیا ہے، شروع میں قدرے طویل تمہید ہے، جس میں آزادی کی اہمیت اور اس کے حصول کے لیے انسان کی جدوجہد کو بیان کیا گیا

(۱) مقدمہ: ۴۸

ہے، لیکن ہر آزادی محمود نہیں ہے، جو سر خدا کی حاکمیت کے سامنے نہ جھکے، وہ سخت مبغوض ہے، علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''چنانچہ ہر شخص حتی کہ ایک بادشاہ کی بھی شرافت کا معیار یہ ہے کہ وہ احکم الحاکمین کے سامنے سرِ بندگی خم کرے؛ اگر وہ اس قید سے آزاد رہنا پسند کرتا ہے، تو یہ خواہشِ آزادی دناءت ہے، جس کو قرآن کریم کی اصطلاح میں ''طغیان'' سے موسوم کیا گیا ہے''۔

احکام خداوندی کے واجب الاطاعت ہونے، اور خدا کی حاکمیت کو تسلیم کرنے پر گفتگو کرنے کے بعد، اس کے قاصد اور پیغامبر کی اطاعت کی ضرورت کو بیان کیا ہے، اور لکھا ہے کہ رسول کی اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت ہے، اور اس کی نافرمانی فی الواقع خدا کی نافرمانی اور معصیت ہے، وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰه.

اس ضروری تمہید کی بعد منکرین حدیث کے نظریہ اور ان کے فاسد خیالات کو ذکر کیا ہے، اور ان کے انکار کا ظاہری سبب اور منشا دو باتوں کو قرار دیا ہے، اور وہ یہ ہیں:

۱- حدیث اور فعل وقول رسول ﷺ کسی طرح قابل تمسک واحتجاج نہیں، اس لیے کہ وہ رسول کی رائے ہے، اور قرآن کے سوا رسول کی رائے ماننے پر ہم مجبور نہیں۔

۲- حدیث قابلِ احتجاج تو ہے، مگر بُعدِ زمانہ کی وجہ سے اب صحیح اور جعلی حدیثوں میں تمیز نہیں ہوسکتی۔

علامہ اعظمیؒ نے ان دونوں اسباب کا نہایت مستحکم طریقے سے رد کیا ہے، اور پہلی وجہ کے جواب میں اطاعتِ رسول کے خود قرآن کریم کے حکم سے واجب ہونے پر سات آیتیں نقل کی ہیں، اور ان کے مفہوم کی روشنی میں اطاعتِ رسول کو واضح کیا ہے۔

دوسری وجہ کے جواب میں محدثین کی کاوشوں اور صحیح وغیر صحیح، موضوع وغیر موضوع روایات میں فرق وتمییز کے لیے ان کی انتھک کوشش اور جد وجہد کو بیان کیا ہے، اور آخر میں منکرین حدیث کی بابت لکھا ہے:

''یہ جماعت دعوی کرتی ہے کہ ہم متبع قرآن ہیں، مگر حقیقت میں وہ قرآن کی بھی مطیع نہیں؛ اگر وہ قرآن کی مطیع ہوتی، تو احادیث کی بھی ضرور متبع ہوتی، اس لیے کہ قرآن خود اطاعت واتباعِ حدیث کو ضروری قرار دیتا ہے''۔

علامہ اعظمیؒ کا یہ مضمون 'القاسم' امرتسر کے ۵؍رمضان ۱۳۴۲ھ = ۱۰؍اپریل ۱۹۲۴ء اور ۵؍شوال ۱۳۴۲ھ = ۱۰؍مئی ۱۹۲۴ء کے دو نمبروں میں شائع ہوا تھا۔

☆......☆......☆

تفسیر

التنقید السدید علی التفسیر الجدید

مولوی عبدالحی پروفیسر جامعہ ملیہ[۱] کی ایک کتاب 'التفسیر الجدید' شائع ہوئی تھی، معلوم یہ ہوتا ہے کہ موصوف نے اپنی اس کتاب میں تفسیری اصول وضوابط اور مسلّمات تفسیر سے بہت زیادہ انحراف اور روگردانی کی تھی، اوران کی کتاب شکوک وشبہات، فساداور بگاڑ کا سبب بن سکتی تھی۔ یہ کتاب جب علامہ اعظمیؒ کے سامنے آئی، تو ان کی غیرت وحمیت اس کی تاب نہ لاسکی، اس تفسیر کو دیکھ کر آپ کی طبیعت پر اس کا کیا اثر ہوا، اس کا معمولی سا اندازہ آپ کے اِن الفاظ سے ہوسکتا ہے:

''ان مخرّب العقائد اور مُستوجبِ عذاب تفاسیر کے سلسلے میں اس وقت مولوی عبدالحی صاحب پروفیسر جامعہ ملیہ کی تفسیر میرے سامنے ہے، میں نہیں چاہتا تھا کہ اس تفسیر یا اس کے مصنّف کا نام لے کر دنیا کے گوشے گوشے سے وعید **من فسّر القرآن برأیہ** کی صدائے ہولناک بلند کرادوں، لیکن عوام کی جہالت اور نادانی کی وجہ سے میں مجبور ہوا کہ آپ حضرات کے سامنے اس کے چند اقتباس اور بقدرِضرورت مصنف کی واگزاریوں اوران کی آزادانہ روش کے غیر محمود نتائج آشکارا کردوں''[۲]۔

۱-'التنقید السدید' میں سب سے پہلے جس چیز سے تعرُّض کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ مولوی عبدالحی صاحب نے ''آدم کی جنت'' کے عنوان سے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ آدم کو جس جنت میں رہنے کا حکم دیا گیا تھا، وہ حقیقی جنت نہیں ہوسکتی، بلکہ زمین ہی کا کوئی ٹکڑا مخصوص کردیا گیا تھا۔

علامہ اعظمیؒ نے نہایت ٹھوس اور مستحکم دلائل سے ان کے اس خیال کا غلط ہونا، اوراُس جنت کا حقیقی جنت ہونا ثابت کیا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں اس کی تصریح ہے کہ زمین مستقرِ آدم حکمِ ہبوط کے بعد بنائی گئی ہے، پس اگر ہبوط سے پہلے بھی وہ زمین ہی پر تھی، تو **اھبطوا بعضکم لبعض عدو ولکم فی الارض مستقر** الخ کا کیا مطلب ہے؟

۲-مولوی صاحب نے آیت ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِکُمْ﴾ کی تفسیر میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ''موت سے مراد بے ہوشی ہے، اور بعث سے مراد موت سے نجات دینا ہے''۔

(۱) موصوف غالبًا وہی خواجہ عبدالحی فاروقی ہیں، جن کا تذکرہ 'تاریخ دارالعلوم دیوبند' (۲/۱۰۱پر) اور 'نقوش عظمت رفتہ' میں صفحہ ۴۴۶ سے صفحہ ۴۵۷ تک ہے، ۱۸۸۷ء = ۱۳۰۵ھ میں پنجاب کے ضلع گورداس پور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، میٹرک پاس کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں جا کر تعلیم حاصل کی، اور ۱۳۲۹ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ مختلف مقامات پر علمی وتعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۲۵ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ ہوگئے، جہاں ان کو مولانا محمد سورتی اور حافظ محمد اسلم جیراج پوری وغیرہ کی رفاقت حاصل رہی۔ اس زمانے میں انھوں نے تفسیر پر متعدد کتابیں اور رسائل لکھے، تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے، اور اسلامیہ کالج لاہور میں اسلامیات کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۸/جنوری ۱۹۶۵ء = ۴/رمضان ۱۳۸۴ھ کو جمعہ کے روز وفات ہوئی۔

(۲) التنقید السدید: ۱۰

علامہ اعظمیؒ نے امام راغب اصفہانی کی 'مفردات'، 'السراج المنیر'، 'تفسیر خازن' 'تفسیر کبیر' اور 'تفسیر عزیزی' وغیرہ کی عبارتوں سے ثابت کیا ہے کہ:

''موت سے موت حقیقی، اور بعث سے دوبارہ حیات بخشنا مراد لیا گیا ہے''(۱)۔

مولوی عبدالحی نے اپنی اس رائے کی بنیاد اس پر رکھی تھی کہ ''صاعقہ سے موت نہیں ہوتی، اس سے انسان بے ہوش ہوجاتا ہے، البتہ اگر وقت پر خبر نہ لی جائے، تو اس کی موت کا باعث ہوجائے گا''۔

علامہ اعظمیؒ نے لفظ 'صاعقہ' کی تحقیق کرتے ہوئے اس کے مختلف معانی بتائے ہیں، اور آخر میں لکھا ہے:

''قرآن حکیم کی تصریحات سے ثابت ہے کہ صاعقہ چند افراد ہی نہیں، بلکہ پوری قوم کی موت وتباہی کا سبب بن چکا ہے''(۲)۔

۳-مولوی عبدالحی نے آیت کریمہ ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ کی تفسیر میں لکھا ہے: ''اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہاڑ ان کے سر پر بلند کر دیا گیا تھا، بلکہ اپنے سامنے اس کو دیکھ رہے تھے''۔

مصنف نے اپنے اس خیال کے لیے جو دلیل پیش کی ہے، علامہ اعظمیؒ نے کلامِ عرب کی روشنی میں اس کو رد کیا ہے، پھر حدیث نبوی اور قرآن پاک کی بعض دوسری آیات سے یہ ثابت کیا ہے کہ پہاڑ ان کے سروں پر بلند تھا، اس کی بالکل واضح اور روشن دلیل آیتِ کریمہ ﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ فَظَنُّوْا اَنَّهٗ وَاقِعٌ بِهِمْ﴾ ہے۔

۴-اصحابِ سبت پر نزول عذاب کے سبب میں مصنفِ 'تفسیر جدید' نے لکھا ہے: ''علماء سوء نے انھیں یہ حیلہ سکھا دیا کہ شنبہ کے روز دریا سے فاصلہ پر گہرے گڑھے کھود لیں تا کہ پانی آسکے، مچھلی بھی خود بخود آجائے گی، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، دن بھر مچھلی گڑھوں میں آتی رہتی اور شام کو جا کر شکار کر لیتے''۔ اس کے بعد لکھتے ہیں: ''یہ اربابِ حیل کی فریب کاری تھی''۔

علامہ اعظمیؒ نے پہلے تو قرآن کی دو آیتیں نقل کر کے لکھا ہے:

''ان ہر دو مقام میں اصحاب سبت کی صرف اس شرارت کا ذکر ہے کہ وہ ہفتے کے دن زیادتی کرتے تھے، یا ہفتہ میں حد سے بڑھ جاتے تھے، اس سے زیادہ اور کوئی تفصیل ان کے اعتداء اور شرارت کی قرآن کریم میں مذکور نہیں ہے''(۳)۔

مصنفِ 'تفسیر جدید' نے علماء سوء کی حیلہ آموزی کا جو ذکر کیا ہے، اس کے متعلق علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''میرے سامنے اس وقت دس بارہ تفاسیر کے علاوہ متعدد جوامع حدیث بھی ہیں، مجھ کو ان میں سے کسی میں حیلہ آموزیٔ علماءِ سوء کا اشارہ تک نہیں ملتا''(۴)۔

پھر کتبِ تفسیر کی متعدد عبارتیں نقل کر کے رقم طراز ہیں:

(۱) التنقید السدید: ۱۶ (۲) ایضاً: ۱۸ (۳) ایضاً: ۲۲ (۴) ایضاً: ۲۲

''الحاصل کسی میں تعلیمِ حیلہ کا ذکر نہیں، بلکہ بطور خود کرنے کا ذکر ہے، اور خازن ومعالم میں اس کو شیطان کا وسوسہ قرار دیا ہے، اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ابن جریر کی محولہ بالا روایت میں یہ بھی ذکر ہے کہ علما وفقہا نے ان کے اس حیلے کی تردید کی اور منع کیا''(۱)۔

اور چند سطروں کے بعد لکھا ہے:

''بہر حال مولانا کا یہ فرمانا کہ علماء سوء نے یہ حیلہ سکھایا تھا محض غلط ہے، اور علماء بنی اسرائیل پر افترا ہے''(۲)۔

'التنقید السدید' کی ایک بہت اہم اور معرکۃ الآراء بحث حیلہ کے متعلق ہے، جو تقریباً ۱۲ر صفحات پر مشتمل ہے، مصنفِ 'تفسیر' پروفیسر عبدالحی نے اپنی کتاب میں لکھا تھا:

''دوسری صدی کے شروع ہی میں بعض علماء سوء اور فقہاء دنیا نے حیلہ تراشیاں شروع کر دی تھیں، اور تیسری صدی میں کتاب الحیل کی باقاعدہ تدوین وترتیب عمل میں آ گئی تھی، اس میں انھوں نے اپنے پیش رو یہودیوں کو بھی مات کر دیا''۔

علامہ اعظمیؒ نے مولوی عبدالحی کی اس ہرزہ سرائی کی بابت لکھا ہے:

''شوخی وبے باکی کی انتہا ہو گئی کہ چودہویں صدی کا ایک طفلِ مکتب زمانۂ کبار تابعین اور دوسرے نمبر کے خیر القرون کے علما وفقہا کو علماء سوء وفقہاء دنیا کہہ کر پکارتا ہے اور آوازے کستا ہے؛ قاضی شریح، امام ابن سیرین، سفیان ثوری، ابراہیم نخعی وامام شافعی وابن سریج وغیرہم کی شان میں گستاخانہ تعریضیں کرتا ہے، فاللہ حسبہ''(۳)۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے علامہ ابن القیم اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ کی تحریروں کی روشنی میں حیلہ کی حقیقت، اس کی اقسام اور ان کے احکام پر نہایت پُر مغز اور نفیس بحث کی ہے، جس سے اس مسئلے کے تعلق سے پیدا ہونے والا ہر قسم کا اشکال اور خلجان رفع ہو جاتا ہے۔

حیلہ کی حقیقت:

اس عنوان کے تحت سب سے پہلے آپ نے حیلہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''حیلہ سے مراد ہر وہ مخفی طریق ہے، جس سے کسی مقصود کے تحصیل میں کام لیا جائے''(۴)۔

اس کے بعد حیلہ کی جو صورتیں تحریر فرمائی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱-طریق مباح، مقصود حرام؛ ۲-طریق حرام، مقصود مباح؛ ۳-طریق مباح، مقصود مباح؛ ۴-طریق ومقصود ہر دو حرام۔

(۱) التنقید السدید:۲۳ (۲) ایضاً:۲۴ (۳) ایضاً:۲۹ (۴) ایضاً:۳۰

اس کے بعد علامہ ابن القیم کی اعلام الموقعین کے حوالے سے دوسری، تیسری اور چوتھی صورت کے احکام تحریر فرماتے ہیں کہ:

''ان چار صورتوں میں چوتھی صورت کے حرام ہونے، اور تیسری صورت کے مباح بلکہ بسا اوقات واجب وفرض ہونے میں بھی کوئی شک وتردد نہیں؛ اور دوسری صورت میں یہ ضروری ہے کہ اس طریق کو اختیار کرنے کا گناہ ہوگا، گو مقصود بھی حاصل ہو جائے گا''[1]۔

اور پہلی صورت کے بارے میں یہ ارقام فرمایا ہے کہ:

''کوئی اس کو مطلقاً جائز ومباح مانتا ہے اور کوئی مطلقاً باطل کہتا ہے، اور کوئی یہ کہتا ہے کہ نافذ ہے، مگر مباح نہیں ہے، یعنی حصولِ مقصود تو ہو جائے گا، مگر گناہ گار بھی ہوگا، اور غالباً اکثریت تیسرے قول کی طرف ہے''[2]۔

پھر حلالہ سے متعلق ایک جزئیہ نقل کر کے لکھا ہے:

''اس تقریر سے یہ صاف طور پر واضح ہو گیا کہ حیلہ کو مطلقاً کوئی شخص بھی حرام نہیں کہتا، بلکہ تمام ائمۂ اسلام اس کی تقسیم کرتے ہیں اور کسی قسم کو حلال اور کسی کو حرام بتاتے ہیں، اس لیے مطلق حیلہ کی مذمت کرنا، یا اس کے قائل وفاعل کو موردِ طعن ونشانۂ ملامت بنانا، قلتِ علم یا قلتِ دیانت ہے، اور سلف سے جو حیل منقول ہیں، وہ مباح یا واجب کی جنس سے ہیں، اور اگر کوئی حیلہ از قسمِ حرام ان کی طرف کسی نے منسوب کر دیا ہو، تو یہ ناقل کا افترا ہے؛ اس لیے مذموم حیل کے سلسلے میں دوسری صدی کی ابتدا کا نام لینا نفرین جرأت ہے''[3]۔

اس کے بعد علامہ ابن قیم کی ایک عبارت نقل کر کے حضرت محدث کبیرؒ نے چند جملوں میں اس کا خلاصہ تحریر فرمایا ہے، جو حسبِ ذیل ہے:

''۱- حیلے بعض مذموم ہیں، بعض محمود، ۲- سلف کے حیلے از قسمِ محمود ہیں، لہٰذا ان پر طعن کرنا ناجائز ہے، ۳- سلف کی طرف مذموم حیلوں کا انتساب غلط اور افترا ہے، ۴- اگر بالفرض کوئی لغزش کسی جلیل القدر امام سے ہو بھی گئی، تو وہ اس میں معذور ہے؛ بلکہ چونکہ وہ مجتہد ہے، لہٰذا خطا میں بھی ماجور ہے اور اس کی وجہ سے اس کی تنقیص واہانت حرام وناجائز ہے''[4]۔

اس کتاب کی یہ نہایت اہم اور شاندار بحث ہے، اور اس کو بہت سی مثالوں اور جزئیات کی روشنی میں نہایت واضح اور منقح کر کے رکھ دیا ہے، جس سے حیلہ کے متعلق کسی کے ذہن میں پیدا ہونے والے تمام شکوک وشبہات کا دفعیہ ہو جاتا ہے۔

---

(۱) التنقید السدید: ۳۰ (۲) ایضاً: ۳۰ (۳) ایضاً: ۳۱ (۴) ایضاً: ۳۲

تقلید:

اسی طرح اس کتاب کی ایک اہم بحث ''تقلید'' کے عنوان سے ہے، علامہ اعظمیؒ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحی نے اپنی 'تفسیر' کے متعدد مقامات پر ''تقلید'' کو اپنے طنز وتعریض کا نشانہ بنایا تھا، علامہ اعظمیؒ نے تقلید کی حقیقت اور اس کی اقسام پر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تحریروں کی روشنی میں نہایت نفیس اور سیر حاصل بحث کی ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ ''تقلید'' کی دو قسمیں ہیں: ایک مذموم، دوسرے محمود۔ ''تقلید مذموم کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی عالم کسی مسئلے میں اجتہاد کرے، اور اس کے متبعین کو اس کی صحت کا ایسا یقین یا ظن غالب ہو کہ اس کے مقابلے میں کوئی صحیح حدیث بھی پائیں، تو اس کو رد کردیں، اور یہ تقلید وہ نہیں ہے جس پر امت مرحومہ کا اجماع ہے، اس لیے کہ اجماعِ امت اُس تقلید کے جواز پر ہے، جس کے ساتھ یہ اعتقاد بھی ہو کہ مجتہد سے خطا وصواب دونوں ممکن ہیں، اور جس کے ساتھ یہ عزم بھی ہو کہ اگر کوئی صحیح حدیث اس کے خلاف ظاہر ہوگی تو حدیث ہی کا اتباع کیا جائے گا''[1]۔

پھر حجۃ اللہ البالغہ کی ایک عبارت نقل کرکے لکھتے ہیں:

''اس عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ کسی مسئلے میں تقلید چھوڑنے کے لیے حسبِ ذیل شرائط ضروری ہیں:

۱- تارک کم از کم اس ایک ہی مسئلے میں مرتبۂ اجتہاد کو پہنچ گیا ہو، یا بے شک وریب اس کے نزدیک محقق ہوجائے کہ اس کے خلاف رسول خدا ﷺ کا فلاں فرمان موجود ہے۔

۲- اس کا علم ضروری ہے کہ وہ فرمان منسوخ نہیں ہے، اور عدمِ منسوخیت معلوم کرنے کے دو طریقے ہیں:

(الف) خواہ احادیث کا کامل تتبع وتفحص کرے اور مخالف وموافق کلام پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچے کہ فرمان مذکور منسوخ نہیں ہے۔

(ب) متبحر علماء کی بہت بڑی جماعت کو اس کا قائل وفاعل پائے، اور جو اس کی مخالفت کرتا ہو اس کے پاس سوائے قیاس کے اور کچھ نہ ملے''[2]۔

آگے تقلید محمود کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''ایسی تقلید کو حرام نہیں کہا جاسکتا، بلکہ اس تقلید کی اصل خود عہدِ رسالت میں موجود تھی''۔

اور تقلید محمود یہ ہے کہ:

---

(۱) التنقید السدید: ۴۷-۴۶ (۲) ایضاً: ۴۸

''یہ اعتقاد ہو کہ حلال وحرام وہی ہے، جس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حلال یا حرام فرمایا ہے، لیکن چونکہ وہ بے علم ہے، یا مختلف احادیث میں جمع وتطبیق کے طریق سے ناآشنا ہے، اور استخراج واستنباط کا بھی اس کو سلیقہ نہیں ہے، اس لیے کسی عالمِ ربانی کا محض اس اعتماد پر اتباع کرتا ہے کہ وہ غلط نہ کہے گا اور احادیث کے ماتحت ہی فتویٰ دے گا''(۱)۔

آگے 'عقد الجید' سے حضرت شاہ صاحبؒ کی ایک عبارت اس مفہوم کی نقل کی ہے:

''ان مذاہب اربعہ کی پابندی میں بڑی زبردست مصلحت ہے، اور اس سے روگردانی فسادِ عظیم ہے''(۲)۔

پھر دورِ حاضر کی آزاد خیالی اور بے راہ روی پر ان الفاظ میں ماتم کیا ہے:

''خدا غریقِ رحمت کرے حضرت شاہ صاحب کو، گویا وہ اس دورِ مُظلِم کا جس سے آج ہندوستان گزر رہا ہے، اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے تھے، حقیقت شناس حضرات جانتے ہیں کہ جب سے یہ گرفت ڈھیلی کردی گئی ہے، اس وقت سے کن کن تقیدات سے مذاہب کو آزاد کرانے کے لیے، یا خود کو مذہب سے آزاد کرانے کے لیے، تگ ودَو ہو رہی ہے۔ اس موجودہ دور میں ہندوستان کی مذہبی فضا جس قدر مسموم ہو چکی ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے''(۳)۔

علامہ اعظمیؒ نے اس بحث میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ہماری تقلید کے تقلیدِ محمود ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ بہت سے ایسے مسائل ہیں جن میں ائمہ کا اختلاف ہے، ان مسائل میں سے کسی میں اگر امام صاحبؒ کا مسلک ضعیف اور کمزور معلوم ہوا، تو دلیل کی قوت کے مقابلے میں اس کو چھوڑ دیا گیا، اور مخالف قول پر فتویٰ دیا گیا۔

یہ رسالہ ۴۶ صفحات پر مشتمل ہے، ۷-۲۱ ذی قعدہ ۱۳۴۹ھ میں لکھنؤ سے شائع ہونے والے صحیفہ 'النجم' کے صفحات پر شائع ہوا تھا۔ دوبارہ مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ، مئو نے ۱۴۲۶ھ=۲۰۰۶ء میں اس کو شائع کیا۔

حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کی تقریظ سے اس کتاب کی اہمیت ونافعیت کا پتہ چلتا ہے، آپ نے ۲۴ صفر ۱۳۴۹ھ کو لکھا تھا:

''احقر اشرف علی عفی عنہ نے اس تنقیدی مضمون کو غایت شوق سے حرفاً حرفاً دیکھا، اس حدیث کا مصداق پایا: قال رسول اللہ ﷺ: **یَحْمِلُ هذا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ، يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ، وانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ، وَتَاوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ (مشكاة عن البيهقي)**۔ ماشاء اللہ قوتِ استدلال، حُسنِ ادا، دفعِ شبہات، لینِ کلام غرض ہر پہلو سے بے تکلف اس شعر کا نمونہ ہے:

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم : کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

بارک اللہ فی اِفادات المصنف و اِفاضاتہ'

(۱) التنقید السدید: ۴۹ (۲) ایضاً: ۵۰ (۳) ایضاً: ۵۱-۵۰

نسخ کوئی معیوب چیز نہیں ہے

ہندوستان کے ایک مشہور و معروف عالمِ دین نے ایک کتاب 'قرآن محکم' کے نام سے تصنیف کی تھی، یہ کتاب ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۹۶۶ء میں نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند سے طبع ہوئی تھی۔ اس میں اس کے مصنف سے ایک سخت فروگزاشت اور لغزش یہ ہوئی تھی کہ انھوں نے قرآن کریم میں نسخ کے ثبوت کا انکار کر دیا تھا، اور یہاں تک لکھ دیا تھا کہ: ''جن آیتوں کو ناسخ و منسوخ سمجھا جاتا ہے، محض غلط فہمی پر مبنی ہے، ورنہ قرآن پاک کا چہرہ اس بدنما داغ سے پاک ہے'' (قرآن محکم)۔

علامہ اعظمیؒ کی نگاہ سے یہ کتاب گزری تو آپ نے اس کے مصنف کے تسامحات کا تعاقب کیا، اور نسخ کے سلسلے میں علماء اہل سنت کی جو تحقیقات ہیں، ان کو قرآن وسنت اور تعلیمات اسلام کی روشنی میں تحریر فرمایا، اور اس طرح نسخ کے موضوع پر ایک نہایت جامع اور بیش قیمت رسالہ تیار ہو گیا۔ علامہ اعظمیؒ نے اپنے رسالے میں مختصر سی تمہید کے بعد لکھا ہے:

> ''یہ کس عالم کو معلوم نہیں ہے کہ ائمہ وعلماء اسلام - متقدم ہوں خواہ متاخر، سُنّی ہوں یا معتزلی - سب کے سب اس بات کے قائل ہیں کہ خدا نے قرآن پاک کے بعض احکام، قدرتی اور فطری مصالح کی بنا پر اپنے ازلی قدیم علم کے مطابق منسوخ فرما دیے ہیں۔ اس مسلّمہ حقیقت کا انکار مسلمانوں میں صرف ابومسلم اصفہانی معتزلی نے کیا ہے............ابومسلم کے علاوہ باقی معتزلہ بھی قرآن میں نسخ کے قائل ہیں''[1]۔

اور اس کے لیے ابن الہمام کی کتاب 'التحریر'، ابن امیر الحاج کی 'شرح تحریر'، اسنوی کی 'نہایۃ السول شرح منہاج الاصول' اور ابوالحسین بصری معتزلی کی 'المعتمد' کا حوالہ دیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے وقوعِ نسخ پر جن امور سے استدلال کیا ہے، ان میں یہ حدیثیں بھی ہیں: **كَلامُ اللهِ يَنْسَخُ بعضُهُ بَعضاً**، یعنی اللہ کا کلام اس کا بعض، بعض کو نسخ کر سکتا ہے۔ اسی طرح یہ حدیث بھی نسخ کے وقوع پر دلالت کرتی ہے: **إنَّ أحادِيثَنا يَنسَخُ بَعْضُها بَعْضاً كَنَسْخِ القُرآنِ** یعنی قرآن ہی کی طرح ہماری حدیثیں ایک دوسری کو منسوخ کر سکتی ہیں۔

آیت ﴿مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ اَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا﴾ کے ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''لہذا نسخ اگر تخیل ہے - جیسا کہ مصنف مذکور کا خیال ہے - تو یہ تخیل خود قرآن کا بخشا ہوا ہے، اصولیین کی ایجاد نہیں ہے''[2]۔

اور آگے اسی کے ضمن میں تحریر فرمایا ہے:

(۱) المآثر: ج ۱۱ ش ۲، ص: ۲۶-۲۵ (۲) ایضاً: ۳۱

’’مصنف مذکور اگر غور فرماتے، تو آیتِ کریمہ مـا نـنسـخ الخ صرف یہی نہیں بتاتی کہ نسخ بھی ایک چیز ہے؛ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ بتاتی ہے کہ نسخ کوئی قابلِ اعتراض اور معیوب چیز نہیں ہے، اس لیے کہ خدا فرماتا ہے: ’ہم جس آیت کو بھی منسوخ کریں گے، تو اس سے بہتر یا اس کے مثل لائیں گے‘۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ نسخ آیت جائز وممکن ہے؛ بلکہ یہ بات بھی ہے کہ اگر وہ واقع ہوگا، تو کبھی ناسخ منسوخ کے مثل ہوگا، اور کبھی منسوخ سے بھی بہتر ہوگا‘‘(۱)۔

اور اسی کے بعد یہ بھی تحریر فرمایا ہے:

’’جو لوگ اسالیبِ کلام سے واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ عنوانِ بیان کسی ناممکن ناجائز الوقوع چیز کے لیے ہرگز نہیں اختیار کیا جا سکتا؛ لہٰذا آیت سے نسخ کا ممکن ہونا، بلکہ اس کا حسن ہونا تو بے شبہہ ثابت ہے‘‘(۲)۔

وقوعِ نسخ کے دلائل میں ایک دلیل صحیح بخاری کی یہ روایت بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اُبی بن کعبؓ اگرچہ ہم سب سے بڑھ کر عالمِ قرأت ہیں، پھر بھی ہم ان کی بہت سی قرأتوں کو اختیار نہ کرنے اور چھوڑ دینے پر مجبور ہیں، اس لیے کہ اُن کا قول یہ ہے کہ حضرت ﷺ کی زبان سے میں نے جو بھی سنا ہے، میں اس کو چھوڑ نہیں سکتا، اور حق تعالیٰ کا قول ہے کہ ما ننسخ من آية أو ننسها الخ۔ اس حدیث کو نقل کر کے علامہ اعظمیؒ تحریر فرماتے ہیں:

’’حضرت عمرؓ کا مطلب یہ ہے کہ اُبی بن کعبؓ نے حضرت سے جو سنا ہے، ہوسکتا ہے کہ اس میں وہ آیات وقراآت بھی ہوں جو منسوخ التلاوۃ ہوچکی ہوں، جیسا کہ خدا نے فرمایا مـا نـنسـخ الخ، اور حضرت اُبیؓ کو اس کی خبر نہ ہوئی ہو، اس بے خبری کی وجہ سے وہ ان کو بھی چھوڑ نہیں سکتے، مگر جس کو معلوم ہے کہ وہ منسوخ ہوچکیں، وہ ان کو کس طرح اختیار کرسکتا ہے............ اب آپ غور کیجئے کہ اگر حضرت عمرؓ اس آیت سے نسخ کا واقع ہونا نہ سمجھتے، تو وہ حضرت اُبیؓ کی بہت سی قرأتوں کو چھوڑ دینے کی وجہ اس آیت کو کیوں قرار دے سکتے تھے، اور اس آیت کی بنیاد پر ان کا یہ فرمانا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے کہ وإنا نترک کثیراً من قرأة أبي (ہم ابی کی بہت سی قرأتوں کو چھوڑ دیتے ہیں)‘‘(۳)۔

’قرآن محکم‘ کے مصنف نے ما ننسخ من آية کی نسبت لکھا تھا کہ یہ جملہ شرطیہ ہے، اور جملہ شرطیہ سے ممتنع اور محال چیزوں کو فرضی طور پر بیان کیا جاتا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کا ایک جواب تو یہ لکھا ہے کہ یہ بات ’’إن‘‘ اور ’’لـو‘‘ والے شرطیہ جملوں میں بے شک صحیح ہے، مگر ہر جملہ شرطیہ کے حق میں قطعاً صحیح نہیں ہے، اور آیت مذکورہ میں کلمہ شرط ’’ما‘‘ ہے، ’’إن‘‘ یا ’’لـو‘‘ نہیں ہے۔

اور دوسرا جواب قرآن پاک کی آیت ﴿وَاِذَا بَـدَّلْنَا آيَةً مَكَانَ آيَةٍ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْا

(۱) المآثر: ج۱۱ش۲،ص:۳۱ (۲) ایضاً:۳۱ (۳) المآثر: ج۱۱ش۳،ص:۱۸

اِنَّمَا اَنۡتَ مُفۡتَرٍ﴾ (اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدلتے ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ نازل فرماتا ہے، تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم افترا کرنے والے ہو) کے حوالے سے دیا ہے کہ اس کو جملۂ شرطیہ کہہ کر -باوجودیکہ وہ بھی جملۂ شرطیہ ہے- نہیں ٹال سکتے، اس لیے کہ ''إذا'' سے اُس شرط کا بیان ہوتا ہے، جو متکلم کے اعتقاد میں قطعی الوقوع ہوتی ہے۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے اس آیت کی نہایت نفیس اور پُر مغز تشریح کی ہے، اور اس کے تعلق سے مصنف مرحوم نے جو تاویلات کی ہیں، ان کا تفصیلی اور تحقیقی جواب سپردِ قلم فرمایا ہے۔

مصنف مرحوم نے اپنے خیال کی بنیاد اس شبہہ پر بھی نہاد کی تھی کہ ناسخ ومنسوخ ماننے کی صورت میں اختلاف اور تضادِ حقیقی تسلیم کرنا ہوگا، جو قرآن کی نص صریح لَوۡ كَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَيۡرِ اللّٰهِ کے خلاف ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کا مفصل جواب تحریر فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ مصنف کا یہ خیال ہی فاسد وغلط ہے کہ نسخ کی بنا تعارض بین الآیتین پر ہے، جب تک تعارض نہ ہو، نسخ کی ضرورت نہیں، یا نسخ کا تحقق نہ ہوگا۔ یہ خیال فاسد اس لیے ہے کہ فرضیتِ تہجد اور فرضیتِ صلوات خمسہ میں کوئی تعارض نہیں ہے، پھر بھی تمام علماء امت نے تہجد کی فرضیت کو منسوخ اور فرضیتِ نمازِ پنج گانہ کو ناسخ قرار دیا ہے۔

آگے چل کر علامہ اعظمی مرحوم نے وقوعِ نسخ کے ثبوت کے لیے کئی ایک مثالیں دے کر ان کی مفصل توضیح کی ہے، اور یہ بات بالکل واضح اور بے غبار کر دی ہے کہ نسخ نہ صرف یہ کہ قرآن کریم میں ممکن ہے، بلکہ نسخ واقع بھی ہوا ہے، اور نہ یہ کہ نسخ قرآن کی عظمت میں کوئی نقص یا عیب نہیں لگاتا، بلکہ اس کا بہتر اور حسن اور انسانی فطرت کے مطابق ہونا ثابت کیا ہے۔

یہ رسالہ ۱۴۲۳ھ=۳-۲۰۰۲ء میں 'المآثر' جلد ۱۱ کے تین شماروں -۲، ۳، ۴- میں شائع ہوا ہے۔

☆......☆......☆

فقہیات

رہبرِ حُجَّاج

یہ چھوٹی تقطیع کے ۴۷ صفحات پر مشتمل ایک مختصر سا رسالہ ہے، جو حج و زیارت کا قصد رکھنے والے عوام کے لیے ان کے حالات اور دینی معلومات کو پیشِ نظر رکھ کر تالیف کیا گیا ہے، اگر چہ یہ رسالہ عوام کے ذہن اور ان کی معلومات کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے، لیکن اپنی جامعیت اور بعض علمی مباحث اور تحقیقات کے لحاظ سے اتنا پُر مغز اور مدلَّل ہے کہ اہلِ علم اور خواص کے لیے بھی فائدے سے خالی نہیں ہے، خاص طور سے عصر اور فجر کی نماز کے بعد طواف کی دو رکعتوں کے بارے میں اتنی جامع اور مدلل گفتگو ہے، اور کتبِ حدیث کے حوالوں سے اس قدر وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد اس مسئلے میں حنفیہ پر کیے جانے والے تمام اعتراضات کافور ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس مختصر سی کتاب میں حاجی کے گھر سے نکلنے سے لے کر، بلکہ اس کے ارادۂ حج سے لے کر زیارتِ مدینہ تک کے اہم مسائل نہایت اختصار کے ساتھ اور عام فہم زبان میں سپردِ قلم فرمائے گئے ہیں، اس اختصار اور تسہیل کی وجہ سے ایک عام آدمی کے لیے اس کا پڑھنا اور سمجھنا بھی آسان ہے، اور یاد رکھنا بھی سہل ہے، اور اسی کے ساتھ بیشتر مسائل میں حوالے بھی درج کیے ہیں۔

اس کی تمہید میں تسمیہ وتحمید کے بعد لکھا ہے:

''اردو زبان میں حج کے مسائل واحکام سے متعلق بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، پھر بھی ہر سال کچھ لوگ تقاضا کرتے ہیں کہ جن مسائل کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے، ان پر مشتمل ایک مختصر رسالہ آسان زبان میں ترتیب دیا جائے، اس خواہش کی بنا پر یہ رسالہ شائع کیا جا رہا ہے''۔

اس چند سطری تمہید کے بعد ''حج کی فرضیت و وجوب ادا کے چند مسائل'' کے تحت جن لوگوں پر حج فرض ہے، اور جن شرائط کے ساتھ فرض ہے، ان کو نہایت اختصار کے ساتھ ایک صفحہ سے کچھ زائد میں سپردِ قلم کیا ہے۔

اس کے بعد ''حج کا مسنون طریقہ'' کے عنوان کے تحت سفرِ حج کے لیے نکلنے سے پہلے اور سفرِ حج پر روانہ ہونے کے بعد سواری اور راستے کے اہم اور ضروری مسائل تحریر فرمائے ہیں۔

پھر ''اِحرام'' کے عنوان کے تحت اِفراد، تمتُّع اور قِران تینوں کی تعریف لکھنے کے بعد تمتع کے احکام و مسائل تحریر فرمائے ہیں، تمتع کے احکام و مسائل کو بطور خاص بیان کرنے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ اس میں آسانی ہے، اور عموماً حجاج تمتع ہی کا احرام باندھتے ہیں۔

اس کے بعد ان چیزوں کو تحریر فرمایا ہے جو حالتِ احرام میں منع ہیں، اور جو منع نہیں ہیں۔

احرام اور حالتِ احرام میں راستے میں جو مسائل پیش آتے ہیں، ان کو قلم بند فرمانے کے بعد عمرہ اور حج کا بیان شروع کیا ہے، اور احکامِ عمرہ کے بعد ایامِ حج میں ادا کیے جانے والے تمام اعمال و افعال کو نہایت جامعیت

کے ساتھ سپرد قلم فرمایا ہے۔

''متفرق مسائل'' کے عنوان سے متعدد ایسے مسائل ذکر فرمائے ہیں، جن کا تعلق احکام حج وعمرہ سے نہیں ہے، لیکن اس سفر میں یا حرمین میں حاجیوں کو پیش آتے ہیں، اور وہ ان کے صحیح حکم سے بے خبر ہونے کی وجہ سے بسا اوقات ناجائز امر کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔

آگے ''مدینہ طیبہ کی حاضری'' کے عنوان سے مدینہ کے ارادے سے نکلنے سے لے کر وہاں قیام اور پھر واپسی تک کے احکام اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان فرمائے ہیں، مسجد نبوی کی حاضری اور زیارتِ قبر اطہر کے علاوہ مدینہ کی دیگر مساجد، کنویں، اور متبرک اور تاریخی مقامات کا تعارف و تذکرہ کر کے وہاں حاضری اور زیارت کی ترغیب دی ہے۔

☆......☆......☆......☆

مسئلۂ رویتِ ہلال

مجلسِ تحقیقاتِ شرعیہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرے

رویتِ ہلال کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے، از روئے شریعت رویتِ ہلال کی تصدیق ایک اہم ذمہ داری ہے، جو نہایت دقتِ نظر، وسعتِ علم اور تحقیق و تتبع کی متقاضی ہوتی ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ رویتِ ہلال کی تصدیق کرنے والے اس کے مسائل اور دقائق سے پوری طرح باخبر اور شرائط شہادت سے بخوبی واقف ہوں۔

اِدھر کچھ عرصہ سے جب رفتارِ زمانہ میں تیز گامی اور برق رفتاری آئی، شرعی مسائل کو بھی وقت اور حالات کے قالب میں ڈھالنے اور ان کو عصر حاضر سے ہم آہنگ کرنے اور ان کے رنگ میں رنگنے کا ذہن پیدا ہوا، یہ ذہنیت اصولِ شریعت کے منافی اور علماء راسخین وفقہاء محققین کے مناہج ومناحی سے مختلف ہے۔ اس ذہن ومزاج کا اثر مجلسِ تحقیقاتِ شرعیہ لکھنؤ میں پاس ہونے والے ایک فیصلے میں بھی نظر آیا، یہ رویتِ ہلال کے متعلق ایک ایسا فیصلہ تھا، جو مجلس کے ۱۹۶۷ء کے اجلاس میں پاس ہوا تھا، اور لکھنؤ سے شائع ہونے والے روز نامہ 'قومی آواز' میں ۱۱رمئی ۱۹۶۷ء کو طبع ہوا تھا۔ یہ فیصلہ جب علامہ اعظمیؒ کی نظر سے گزرا تو اس میں بعض باتیں ایسی نظر آئیں جو اسلام کے فقہی اصول وقواعد کے خلاف تھیں، آپ نے ایک مضمون سپرد قلم فرمایا اور اس میں مجلس کے غلط فیصلے پر اس کو متنبہ کیا، مجلس نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ:

''ریڈیو کا غیر مسلم ملازم بھی اگر کسی ذمہ دار ہلال کمیٹی، یا جماعت علماء، یا قاضی شریعت - بتصریح نام - کے فیصلہ کا اعلان کرے، تو یہ خبر بھی قابلِ تسلیم ہوگی، اور صوم وافطارِ صوم کا حکم درست ہوگا''۔

علامہ اعظمیؒ نے اس فیصلے کے بارے میں فرمایا کہ یہ مجلس کی عظیم الشان غلطی ہے، جبکہ مجلس یہ تسلیم کرتی

ہے کہ رویت ہلال کا یہ اعلان شہادت اصطلاحی نہیں ہے، بلکہ ''خبر'' ہے۔

اس کے بعد آپ نے لکھا ہے کہ فقہاء احناف کی تصریحات کے بموجب ایسی خبر قطعاً قابل قبول نہیں ہے۔ پھر اپنے دعوے کی دلیلیں پیش کیں، اور احادیث نبویہ وعبارات فقہیہ پیش کر کے اس کی روشنی میں مجلس کے فیصلے کا غلط ہونا ثابت کیا۔ آپ نے اپنے اس مضمون میں حدیث نبوی اور کتب فقہ سے رویتِ ہلال کی شہادت کے صحیح اصول وضوابط تحریر فرمائے۔

یہ تحریر ''مسئلۂ رویتِ ہلال'' کے عنوان سے 'المآثر' جلد نمبر ۱۲ شمارہ نمبر ا محرم- ربیع الاول ۱۴۲۴ھ میں شائع ہوئی۔

☆......☆......☆......☆......☆

اوزان ومثاقیل

یہ ۱۶ ر صفحات پر مشتمل ایک اہم مضمون یا بلفظ دیگر ایک مختصر رسالہ ہے، جس میں سونے چاندی کی زکوٰۃ کے نصاب پر گفتگو کی گئی ہے، اور ہندوستانی پیمانوں کے اعتبار سے نصاب کی تحدید وتعیین کے سلسلے میں علماء ہند کے درمیان جو اختلافات ہیں ان پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس مضمون کی ضرورت اور اس کی تحریر کے محرکات کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

''ہندوستان میں مروّج سکوں یا تولوں سے چاندی سونے کی زکوٰۃ کے لیے نصاب کی تحدید، اسی طرح ہندوستان میں مستعمل سیروں کے حساب سے صدقۂ فطر دینے کے لیے صاع اور نصف صاع کی تقدیر میں مدتوں سے بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے طلبہ کے دلوں میں بڑا اخلجان پایا جاتا ہے۔ ہمارے معاصر علماء میں سے جن حضرات نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، انھوں نے کچھ شبہہ نہیں کہ درہم ومثقال وغیرہ کی تحدید اور ہندوستانی اوزان کی طرف ان کی تحویل میں بڑی دیدہ ریزی اور دماغ سوزی سے کام لیا، اور وہ اس کے لیے ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں، لیکن اتنے زبردست اختلاف کا سبب واضح کر کے ذہنوں کی الجھن دور کرنے کی طرف توجہ نہیں کی گئی، حالانکہ یہ بڑا ضروری کام تھا، اس مضمون میں یہی کمی پوری کرنے کی کوشش کی گئی ہے، خدا کرے یہ کوشش بارآور ہو''۔

شریعت میں چاندی کا نصاب دراہم کے حساب سے متعین کیا گیا ہے، چاندی اگر پانچ اوقیہ یعنی دوسو درہم سے کم ہو، تو اس میں زکوٰۃ نہیں ہے، اتنا تو حدیث سے ثابت ہے، لیکن جب ہندوستانی علماء نے تولہ اور ماشہ کے حساب سے اس کا اندازہ لگایا، تو ان کی تحدیدات میں بڑا اختلاف واقع ہوا، علامہ اعظمیؒ فرماتے ہیں:

''اختلاف اس وقت شروع ہوتا ہے جب ان اوزان میں تبدیل کرنے اور ان کی رتیاں اور ماشے بنانے کا وقت آتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر ہندوستانی سکے یا تولے سے نصاب کی تحدید ممکن نہیں ہے''۔

اس مضمون میں ساتویں صدی ہجری سے لے کر دور حاضر تک کے ہندوستانی اہل علم وفقہ نے رتی اور ماشے کے حساب سے جو تحدیدکے ہے، ان کو ذکر کر کے ان کی تشریح اور ان پر ردوقدح کی ہے۔ اس سلسلے میں جو تعدیلات ہوئی ہیں، ان کا عہد بعہد جائزہ لیا ہے۔ یہ پوری بحث نادرو نایاب کتب فقہیہ کے حوالوں اور ان کے مصنفین کے تذکروں سے مزین ہے۔ نیز بعض اہل علم کی فروگزاشتوں پر نقد وتصحیح بھی ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون ناتمام ہے، اور کسی وجہ سے مکمل نہیں ہوسکا ہے، نیز ابھی تک یہ تحریر غیر مطبوعہ ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

زراعت وجاگیرداری

ماہنامہ 'معارف' اعظم گڈھ کے جلد نمبر ۷۰ وا۷ کے متعدد شماروں میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور مولانا ظفر احمد تھانویؒ کے درمیان اس بات پر بحث کا سلسلہ چلا کہ زمین نقدی لگان یا بٹائی پر دی جاسکتی ہے یا نہیں[۱]۔ اس میں مولانا گیلانی کا رجحان یہ تھا کہ دونوں صورتیں -نقدی لگان اور بٹائی- ناجائز ہیں، اور اس کے برعکس مولانا ظفر احمد تھانویؒ دونوں کو جائز سمجھتے تھے۔

علامہ اعظمیؒ نے ان دونوں حضرات کی نگارشات پڑھنے کے بعد محاکمہ تحریر فرمایا، آپ کی تحریر کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

''اس سلسلۂ بحث میں اصل بنیادی سوال اگرچہ یہ ہے کہ اسلام میں نظامِ جاگیرداری وزمین داری کی گنجائش ہے یا نہیں؟

مگر اس کے جواب میں خواہ اثبات کا پہلو اختیار کیا جائے، خواہ نفی کا؛ بہرصورت اسلام میں مزارعت کے جواز وعدمِ جواز کی تحقیق ضروری معلوم ہوتی ہے، اور بڑی حد تک اس سوال کا جواب اسی تحقیق پر موقوف نظر آتا ہے، اسی لیے ہر دو سابق بزرگوں کے اتباع میں سب سے پہلے میں بھی اسی مسئلہ پر اپنے معلومات پیش کرنا چاہتا ہوں''[۲]۔

اس کے بعد آپ نے لکھا ہے کہ بٹائی پر دینے کا عدم جواز اور نقدی لگان پر دینے کا جواز راجح معلوم ہوتا ہے، نقدی لگان پر مزارعت کے جواز کے لیے آپ نے دو حدیثیں ذکر کی ہیں، پہلی حدیث بیہقی کے حوالے سے

---

(۱) مولانا گیلانیؒ کا مضمون دسمبر ۱۹۵۲ء اور جنوری ۱۹۵۳ء میں بعنوان ''نظام جاگیرداری وزمینداری کی اسلام میں کیا گنجائش ہے؟'' کے عنوان سے چھپا تھا، اور اس کے جواب میں مولانا ظفر احمد تھانویؒ کا مضمون اپریل ومئی ۱۹۵۳ء میں ''اسلام میں جاگیرداری وزمینداری کا نظام'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

(۲) زراعت وجاگیرداری-قلمی-:۱

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ہے کہ أمرهم أن يكروا بالذهب والورق (رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو سونے اور چاندی کے عوض زمین کرایہ پر دینے کا حکم دیا)۔

دوسری حدیث حضرت ثابت بن ضحاک کی ہے، جو صحیح مسلم (۱۴/۲) میں مروی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: **أنَّ رسولَ الله صلی اللہ علیہ وسلم نهى عن المزارعةِ، وأمرنا بالمؤاجرة، وقال: لا بأس بها** (رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت سے منع کیا، اور مؤاجرت (سونے چاندی کے عوض زمین کرایہ پر دینے) کا حکم فرمایا کہ اس میں کوئی ڈر نہیں ہے۔

اس کے بعد ان حدیثوں کو نقل کیا ہے، جن سے بٹائی پر کھیت دینے کا عدمِ جواز معلوم ہوتا ہے، پہلی حدیث کے الفاظ یہ ہیں: **نهى رسولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم عنِ المُخابَرةِ** (رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مخابرہ سے منع کیا)۔ یہ حدیث صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ، اور سنن ابوداود و بیہقی میں حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت سے مذکور ہے۔

پھر حضرت جابرؓ کی ایک اور حدیث ذکر کر کے جو سنن ابوداود و بیہقی اور مستدرک حاکم وغیرہ میں ہے، مخابرہ کی تفسیر کے سلسلے میں حضرت جابرؓ ہی کے الفاظ نقل کیے ہیں، جس کا مفہوم یہ بیان فرمایا ہے کہ مخابرہ یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو کھیت دے، وہ اس میں پیسہ لگائے، پھر دینے والا پیداوار کا کچھ حصہ لے۔

پھر طحاوی کے حوالے سے اس تفسیر کے الفاظ نقل کر کے اس کا ترجمہ یہ فرمایا ہے: ''مُخابرہ: تہائی، چوتھائی اور نصف پیداوار پر معاملہ کا نام ہے۔

بعد ازاں اسی مفہوم کی تفسیر حضرت زید بن ثابتؓ سے بحوالہ ابوداود و بیہقی نقل کی ہے۔

مخابرہ سے ممانعت کے راوی صرف حضرت جابرؓ و زیدؓ بن ثابت ہی نہیں ہیں، بلکہ اس مفہوم کی حدیث حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت رافعؓ سے بھی مروی ہے۔

مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ نے معارف میں مخابرہ کی یہ تفسیر لکھی تھی کہ: ''ایک شخص دوسرے شخص کو دس بیس من غلہ دے کر اس کا کھڑا کھیت خریدے''(۱)۔

علامہ اعظمیؒ نے اس تفسیر کا رد کیا ہے اور لکھا ہے کہ حدیث، یا غریب الحدیث یا عام کتبِ لغت میں اس تفسیر کا کوئی وجود نہیں ہے۔

بٹائی پر کھیت دینے کے عدمِ جواز کے سلسلے میں حدیثیں مختلف عنوان- پیرایۂ بیان- سے وارد ہوئی ہیں، علامہ اعظمیؒ نے دوسرا عنوان- پیرایۂ بیان- وہی ذکر کیا ہے جو حضرت ثابت بن ضحاک کی روایت سے صحیح مسلم کے حوالے سے اوپر گزر چکا ہے۔

تیسرا عنوان طحاوی شریف (۲۵۸/۲) کے حوالے سے نقل کیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: **من كانت له أرض فليَزرَعْها أو ليُزرِعها أخاه، ولا يكريها بالثلث ولا بالربع ولا بطعام مسمى** (جس کے

(۱) معارف: ج ۱۷ ش ۵، ص: ۳۳۸

پاس زمین ہوتو وہ خود بوئے، یا اپنے بھائی کو بونے کے لیے دیدے، اور تہائی یا چوتھائی پیداوار پر یا غلہ کی کسی معین مقدار پر نہ دے)۔

اس عنوانِ بیان کو نقل کر کے علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''اس عنوان میں تہائی اور چوتھائی پر زمین کو دینے کی صاف صاف ممانعت ہے، اور اس میں اس معاملہ کی کسی شرط مفسد کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے کہ اس کی بنا پر یہ کہنا ممکن ہو کہ اسی شرط کی وجہ سے ممانعت کی گئی ہے''(۱)۔

بٹائی کی ممانعت کا چوتھا عنوان بھی طحاوی میں ہے اور وہ یہ ہے کہ **أن النبي ﷺ نهى عن الحقل، قال شعبة: فقلت للحكم: ماالحقل؟ قال: أن تكري الأرض، قال أبو جعفر: أراه أنا قال بالثلث والربع** (آنحضرت ﷺ نے حقل سے منع کیا، شعبہ کہتے ہیں میں نے حکم سے پوچھا کہ حقل کیا ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ زمین کرایہ پر دینا۔ طحاوی کہتے ہیں میرا گمان یہ ہے کہ ثلث اور ربع کے عوض کرایہ پر دینا کہا تھا)۔

اور پانچویں عنوان کی حدیث طحاوی (۲۵۶/۲)، ابوداود (۵۷/۲) اور سنن بیہقی (۱۳۶/۶) وغیرہ میں اس مفہوم کی ہے کہ حضرت رافع نے ایک زمین کاشت کی تھی، ایک دن وہ اس میں پانی دے رہے تھے کہ ادھر سے رسول اللہ ﷺ کا گزر ہوا، آپ نے پوچھا کہ کھیتی کس کی ہے، اور زمین کس کی؟ رافع نے جواب دیا کہ کھیتی تو میرے بیج اور میری محنت کی بنا پر میری ہے، لیکن زمین دوسرے کی ہے، اس لیے اس میں آدھا میرا اور آدھا اس کا ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا: **أربيت، فرُدَّ الأرض على أهلها، وخُذْ نفقَتك** (تم نے ربا کا کام کیا، زمین جس کی ہے اس کو لوٹا دو اور اپنے مصارف لے لو)۔

پھر اسی جیسے مضمون کی ایک اور حدیث سنن ابوداود اور امام طحاوی کی شرح مشکل الآثار سے نقل کی ہے، اس کے بعد تحریر فرمایا ہے:

''حاصل کلام یہ ہے کہ احادیث میں متنوع عنوانوں سے مزارعت کی ممانعت وارد ہوئی ہے اور بہت سے لوگ اس کو روایت کرتے ہیں، اور ان احادیث میں بہت سی ایسی حدیثیں ہیں، جن میں بٹائی پر زمین دینے کو مطلقاً منع کیا گیا ہے، اس لیے ممانعت کو کسی شرط مفسد کی وجہ سے قرار دینا، بعید از قیاس ہے''(۲)۔

اس کے بعد فرمایا ہے کہ یہ تسلیم ہے کہ بعض حدیثوں میں شرط مفسد کے ذکر کے ساتھ مزارعت کی ممانعت ہے، لیکن اس کی کیا ضرورت ہے کہ جن میں کسی شرط کا ذکر نہیں ہے، ان میں بھی اس شرط کو مان کر اس شرط ہی کی بنا پر ممانعت کو تسلیم کیا جائے؟ یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ جو احادیث شرط کے ذکر سے خالی ہیں، ان میں مزارعت کی ممانعت خود اس کی ذات کی وجہ سے ہو، اور جن میں شرط مفسد کا ذکر ہے، ان میں اس کی ذات کی خرابی کے

(۱) زراعت و جاگیرداری-قلمی-:۷ (۲) ایضاً:۸

ساتھ شرط مفسد کو بھی ممانعت میں دخل ہو، اور اس شرط مفسد کی وجہ سے اور زیادہ قابلِ احتساب اس کو قرار دیا گیا ہو، یہ نہیں کہ صرف اسی شرط کی وجہ سے وہ ممنوع ہے۔

اس کے بعد بطور مثال کے یہ آیتِ کریمہ پیش کی ہے کہ ﴿لَا تُكْرِهُوْا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّناً﴾ [النور:] (اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاک دامنی کا ارادہ کریں) اور لکھا ہے:

''ہر عاقل سمجھتا ہے کہ لونڈیاں پاک دامنی کا ارادہ کریں یا نہ کریں، ہر حال میں اکراہ علی الزنا حرام ہے، اور اس شرط کا ذکر اس لیے نہیں ہے کہ اسی شرط کے ساتھ اکراہ ممنوع ہے، بلکہ اس شرط کا ذکر اس لیے ہے کہ اس کی وجہ سے اکراہ اور بھی زیادہ شرم ناک فعل اور لائق پرہیز ہو جاتا ہے''[1]۔

آگے شرح معانی الآثار (۲/۲۵۸) اور شرح مشکل الآثار (۳/۲۸۷) سے حضرت جابرؓ کی یہ حدیث نقل کی ہے: **إنَّ رسولَ الله ﷺ بَلَغَهُ أنَّ رجالاً يكرونَ مَزارِعَهم بنصفِ مَا يَخرُجُ منها وبثُلُثِهِ وبالماذياناتِ، فقال في ذلك: منْ كانتْ لهُ أرضٌ فَلْيَزْرَعُها فإنْ لَمْ يَزرَعها، فَلْيَمنَحْها أخاه، فإنْ لم يَفعَلْ فَلْيُمْسِكْها** (آنحضرت ﷺ کو خبر پہنچی کہ کچھ لوگ اپنے کھیت پیداوار کے نصف وثلث پر دیتے ہیں، اور نہر کے کنارے اگنے والے حصہ کے عوض میں دیتے ہیں، تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس کے پاس زمین ہو وہ خود کاشت کرے، ورنہ اپنے بھائی کو مفت دیدے، یہ بھی نہیں تو روک رکھے)۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے تحریر فرمایا ہے:

''اس روایت میں **وبالماذیانات** واو عطف کے ساتھ مذکور ہے، جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دو طریقے مروج تھے، ایک طریقہ زمین کو تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض دینا؛ دوسرا طریقہ زمین کو کھیت کی اس پیداوار کے عوض دینا جو نہروں کے کنارے یا جس کی شادابی زیادہ متوقع ہو، خواہ وہ پیداوار کسی مقدار میں ہو؛ تو آنحضرت ﷺ نے ان دونوں صورتوں سے منع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض احادیث میں بلا کسی زائد شرط کے صرف نصف وثلث پر زمین دینے کا ذکر اور اس کی ممانعت ہے، جیسے وہ حدیثیں جن کو ہم نے پہلے ذکر کیا، اور بعض میں نصف وثلث کا قطعاً ذکر نہیں ہے، بلکہ نہروں کے کنارے کی پیداوار کا - خواہ وہ کتنی ہو - ذکر ہے''[2]۔

اس کے بعد شرح معانی الآثار، سنن ابی داود، اور سنن بیہقی سے متعدد ایسی حدیثیں ذکر کی ہیں، جن کے اندر نہر کے کنارے کی پیداوار کے عوض زمین دینے کی ممانعت کا ذکر ہے۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ تین قسم کی روایتیں وارد ہوئی ہیں، ایک قسم وہ جس میں ثلث اور ربع پر زمین دینے کی ممانعت کا ذکر ہے؛ دوسری قسم وہ جس میں ثلث وربع کا ذکر نہیں ہے، بلکہ کھیت کے کسی حصے کی متعین پیداوار پر زمین دینے کی ممانعت وارد ہوئی ہے؛ اور تیسری قسم وہ ہے جس میں دونوں باتوں کا ذکر ہے۔ اس تیسری

(۱) زراعت وجاگیرداری - قلمی -: ۹　　(۲) ایضاً: ۱۰

قسم کی حدیثوں سے یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید ثلث وربع پر زمین کی ممانعت انھیں شرطوں کی وجہ سے ہے، تو یہ شبہہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ان دونوں باتوں کی الگ الگ ممانعت بھی وارد ہوچکی ہے۔

مزارعت کی ممانعت کے سلسلے میں متعدد صحابہ کرامؓ کی حدیثیں کتبِ حدیث میں وارد ہوئی ہیں، ان میں حضرت رافعؓ کے علاوہ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت جابرؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ بھی ہیں، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ صاحب ان تمام حدیثوں کو تسلیم کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ ان حضرات کی حدیثوں کا مدار بھی حضرت رافع ہی کی حدیث ہے۔[1]

مولانا عثمانیؒ کے اس خیال سے اختلاف کرتے ہوئے علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''ہم کو مولانا کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے، اس لیے کہ جب یہ حضرات رافع کے واسطہ کے بغیر حدیث بیان کرتے ہیں، تو ظاہر یہی ہے کہ ان حضرات نے بلا واسطہ خود آنحضرت ﷺ سے وہ حدیث سنی ہے؛ اگر واقعہ یہی ہوتا کہ انھوں نے رافع کے واسطہ سے حدیث سنی تھی، تو ہمیشہ نہ سہی کبھی تو ان کے واسطہ سے روایت کرتے، جس طرح کہ حضرت ابن عمرؓ نے بے شبہہ رافع ہی سے اس حدیث کو سنا تھا اور وہ ان کا حوالہ دیا کرتے تھے''[2]۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ خاص طور سے حضرت جابرؓ کی حدیث کا پیرایۂ بیان صاف بتلا رہا ہے کہ انھوں نے آنحضرت ﷺ سے بلا واسطہ اس حدیث کو سنا تھا، ان حضرات کے علاوہ ممانعت کی حدیث کو روایت کرنے والے چھ صحابی ہوتے ہیں۔ ان روایات کی تحقیق کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ جس روایت کو چھ صحابی روایت کریں، اس کو شاذ نہیں کہا جاسکتا، لہٰذا مولانا عثمانیؒ کا حدیث رافع کو شاذ **فیما تعم به البلوی** کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔

مولانا عثمانیؒ نے حضرت رافعؓ کی حدیث میں ایک علت یہ بتائی تھی کہ وہ مضطرب ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کے جواب میں فتح الباری (۱۶/۵) کی ایک عبارت نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے، وہ عبارت یہ ہے: **وقد استظهر البخاري لحديث أبي رافع بحديث جابر وأبي هريرة راداً على من زعم أن حديث رافع فرد وأنه مضطرب، وأشار إلى صحة الطريقين عنه** (امام بخاری نے رافع کی حدیث کے لیے حدیث جابرؓ وحدیث ابی ہریرہؓ سے تائید حاصل کی، اس شخص پر رد کرنے کے لیے جو یہ کہتا ہے کہ رافع کی حدیث شاذ اور مضطرب ہے، اور رافعؓ کی حدیث کے دونوں طریقوں کی صحت کی طرف اشارہ کیا)۔

ممانعت والی ان احادیث کی تحقیق سے فارغ ہوکر علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''اب ایک بات رہی جاتی ہے، جس کو جوازِ مزارعت کے حامی بہت زیادہ مضبوط سمجھ کر بڑے زور شور سے پیش کرتے ہیں، اور وہ خیبر کا معاملہ ہے۔ جوازِ مزارعت کے حامی کہتے ہیں کہ چونکہ خیبر کو آنحضرت ﷺ نے خود بٹائی پر دیا ہے، اس لیے مزارعت کی ممانعت والی حدیث یا تو منسوخ ہے-جیسا

(۱) معارف: ج ۷۱ ش ۴، ص: ۲۶۴-۲۶۵ (۲) زراعت وجاگیرداری: ۱۶-۱۵

کہ ابن حزم کہتے ہیں - یا وہ اس صورت پر محمول ہے، جس میں کوئی شرط فاسد شامل ہو"[1]۔

اس کے بعد متصلاً لکھا ہے:

"مولانا گیلانی نے مبسوط سرخسی کے حوالے سے اس کا یہ جواب دیا کہ خیبر کے معاملہ کا مزارعت سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ معاملہ خراج مقاسمت کا ہے۔ مولانا گیلانی کا یہ جواب مولانا عثمانیؒ کو کسی طرح قابلِ تسلیم نظر نہیں آیا اور انھوں نے اس کی تردید میں پورا زورِ قلم صرف فرمادیا"[2]۔

مگر مولانا عثمانیؒ کے پاس اس کے رد کے لیے دلیل اور بنیاد کیا ہے؟ اس کا خلاصہ علامہ اعظمیؒ نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"۱- حضرت ابن عمرؓ نے حضرت رافعؓ کے مقابلہ میں اسی معاملۂ خیبر کو جوازِ مزارعت کی دلیل بنایا اور ایک صحابیؓ کو حضور کے فعل کی نوعیت کا علم دوسروں سے یقیناً زیادہ ہوسکتا ہے، تو یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ حضور کا یہ معاملہ خراج مقاسمہ کی قسم کا تھا۔

۲- جو لوگ - یعنی فقہاء احناف - امام ابوحنیفہ کی طرف سے بابِ مزارعت میں خیبر کے معاملہ کو خراجِ مقاسمت کہتے ہیں، وہی لوگ بابِ اسیر میں یہ بھی کہتے ہیں کہ خیبر جنگ سے فتح ہوا تھا، اور اس کو غانمین کے درمیان تقسیم کردیا گیا تھا۔ جب یہ تسلیم کرلیا گیا، تو اس کی اراضی غانمین کی ملک ہوگئیں، بیت المال کی نہ رہیں، تو اب نصف پیداوار کے عوض یہود کو دینا مزارعت ہی ہوسکتا ہے، خراج مقاسمت نہیں ہوسکتا"[3]۔

علامہ اعظمیؒ نے مولانا عثمانیؒ کی پہلی دلیل کا جواب یہ دیا ہے کہ حضرت رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث سن کر ان کے پاس حضرت ابن عمرؓ کے جانے کو، یا ان کے باہمی مکالمہ کو، یا سن کر متاثر ہونے کو حضرت ابن عمرؓ سے ان کے شاگردوں میں عمرو بن دینار، مجاہد، سالم اور نافع روایت کرتے ہیں، پھر نافع سے ان کے ثقہ شاگردوں میں ابن عون، ایوب، عبیداللہ بن عمر، حکم اور موسی بن عقبہ روایت کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی یہ بیان نہیں کرتا کہ حضرت ابن عمرؓ نے معاملۂ خیبر کو دلیل جواز بنا کر رافع کے سامنے پیش کیا تھا، نافع کے شاگردوں میں صرف ایک شخص ان کا بیٹا عبداللہ بن نافع ہے، جو یہ کہتا ہے کہ انھوں نے معاملۂ خیبر کو دلیلِ جواز بنایا تھا۔ اور عبداللہ بن نافع بالاتفاق مجروح اور ناقابلِ اعتبار راوی ہے، لہذا اس کی جو روایت دوسرے ثقہ راویوں کی روایت کے موافق نہ ہو قابلِ حجت نہیں ہوسکتی۔

اور دوسری دلیل کا جواب یہ دیا ہے کہ فقہاء احناف کی دونوں باتیں صحیح اور مطابقِ واقعہ ہیں، کیونکہ خیبر کا کچھ حصہ مقسوم بین الغانمین تھا، اور کچھ غیر مقسوم تھا۔ اس کی تصریح امام طحاوی نے شرح معانی الآثار (۱۴۴/۲) اور علامہ عینی نے شرح بخاری (۱۴۸/۷) میں کی ہے، علامہ اعظمیؒ نے شرح معانی الآثار کا متن ذکر کر کے اور عینی کی

(۱) زراعت و جاگیرداری: ۱۷ (۲) ایضاً: ۱۸-۱۷ (۳) ایضاً: ۱۸

عبارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پس ہم کہتے ہیں کہ خیبر کا جو حصہ غانمین میں تقسیم نہیں کیا گیا تھا، اور تقسیم ہو کر اس کی اراضی غانمین کی ملک نہیں ہو گئی تھیں، اسی کی نسبت فقہاء کا یہ کہنا ہے کہ یہود خیبر سے اس کا معاملہ خراج مقاسمہ پر طے ہوا تھا۔ اور جو حصہ تقسیم کر کے غانمین کو دے دیا گیا، اسی میں حضرت عمرؓ کی ثمغ نامی اراضی تھی، جس کو انھوں نے وقف کر دیا تھا، لہٰذا اخراجِ مقاسمہ کے احتمال کی نفی کے لیے مولانا عثمانیؒ نے جو جو سندیں پیش کی تھیں، ان میں سے کوئی بھی کارآمد ثابت نہ ہوئی''[1]۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے فتح خیبر کے سلسلے میں اپنی تحقیق پیش کی ہے، جو تقریباً دس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اس میں پہلے یہ سوال اٹھا کر کہ خیبر جنگ سے فتح ہوا تھا، یا صلح سے؟ اس کا جواب دیا ہے، پھر اس سے متعلق کئی ایک اشکالات کو ذکر کر کے مستند روایات کی روشنی میں ان کو دفع کیا ہے۔

خیبر کے سلسلے میں آپ کی تحریر یا تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ علماء کی ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ پورا خیبر عنوۃً -جنگ سے- فتح ہوا تھا، اس خیال کے سرگرم حامی حافظ ابوعمر ابن عبد البر ہیں، اور حضرت انسؓ کی ایک روایت سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے۔

لیکن ایک دوسرے گروہ کی تحقیق یہ ہے کہ خیبر کا کچھ حصہ جنگ سے کچھ حصہ صلح سے حاصل ہوا تھا، اس تحقیق کو حافظ ابن حجرؒ نے طحاویؒ کی طرف منسوب کیا ہے، اور ابوالفتح ابن سید الناس نے عیون الاثر میں اسی کو قوی قرار دیا ہے، اور حضرت سہل بن ابی حثمہؓ وغیرہ کی روایتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے، پھر اس کی تائید میں ابوداود سے سعید بن مسیّب اور زہری کی روایت ذکر کر کے لکھا ہے:

''پھر جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ خیبر کا کچھ حصہ جنگ سے کچھ صلح سے حاصل ہوا تھا، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرتؐ نے غانمین میں وہی حصہ تقسیم فرمایا جو جنگ سے قبضہ میں آیا تھا''[2]۔

اور اس کی تائید میں فتح الباری (۱۳۹/۶) کی ایک عبارت نقل کی ہے۔

بہر حال مختلف روایات میں جمع و تطبیق سے کام لیتے ہوئے آپ نے لکھا ہے کہ یہ ماننا پڑے گا کہ خیبر کا کچھ حصہ غانمین کے درمیان تقسیم کر دیا گیا تھا، اور کچھ کو خراجی زمین قرار دے کر مفاد عامہ کے لیے تقسیم سے علاحدہ رکھا گیا تھا، چاہے اس کی وجہ یہ ہو کہ جو حصہ تقسیم سے الگ رکھا گیا وہ صلح سے حاصل ہوا تھا، اس میں غانمین کا حق ہی نہیں ہے، یا یہ وجہ ہو کہ جو سرزمین جنگ سے فتح کی جائے، امام کو اختیار ہے کہ اس کو غانمین پر تقسیم کر دے، یا اس کو خراجی زمین قرار دے کر تقسیم نہ کرے، بلکہ تمام مسلمانوں کے مفاد کے لیے باقی رکھے۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''پس اگر خیبر کا وہی حصہ جو تقسیم سے الگ رکھا گیا تھا، یہود کو دیا گیا، جیسا کہ امام طحاوی نے اس کو

---

(۱) زراعت و جاگیرداری: ۱۹ (۲) ایضاً: ۲۰

بصراحت لکھا ہے، اور نصف پیداوار کو -جس کی ادائیگی یہود پر لازم کی گئی تھی- اس کو خراج مقاسمہ قرار دیا جائے، تو واقعہ کی تمام کڑیاں مل جاتی ہیں، اور جو جو باتیں روایات میں کہی گئی ہیں، ان میں باہم کوئی تضاد باقی نہیں رہتا اور سب اپنی اپنی جگہ صحیح و درست ہو جاتی ہیں، اور فقہا کے کلام میں بھی کوئی تعارض نہیں رہ جاتا، نیز اس صورت میں ثمغ کے وقف کے واقعہ سے بھی کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ اس کا تعلق اس حصہ سے نہیں ہے، بلکہ تقسیم شدہ حصہ ہے، اور اسی طرح معاملہ کی تصحیح کے لیے اس بات کو بھی ''مقدر'' ماننے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ آنحضرتؐ نے غانمین کی اجازت و رضامندی حاصل کر کے یہود سے معاملہ کیا تھا، جس کا کسی روایت میں کوئی ذکر نہیں ملتا''[1]۔

پھر اپنی اس تحقیق و تطبیق کی تائید میں کتب حدیث سے متعدد روایتیں، اور کتبِ فقہ نیز کتبِ تاریخ کی متعدد عبارتیں پیش کی ہیں، نیز اس کی تائید میں عراق کی زمین کے مسئلے کو بھی ذکر کیا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

انساب و کفاءت کی شرعی حیثیت

آنحضورﷺ جس وقت اس دنیا میں مبعوث فرمائے گئے، اس وقت ساری دنیا میں خواہ -عرب ہو یا عجم- بہت ساری برائیوں اور خرابیوں کے ساتھ طبقاتی اونچ نیچ اور قبائلی عصبیت کی لعنت پھیلی ہوئی تھی، عرب کی تو پوری سرزمین قبائلی عصبیت میں بدترین طریقے سے گرفتار تھی، نسبی تفاخر و تفاضل اور قبائلی امتیازات سے عربوں کی پوری زندگی عبارت تھی، اپنے نسب پر فخر کرنا، اپنے قبیلے کو عزیز اور برتر، دوسرے قبیلے کے افراد کو حقیر اور فروتر سمجھنا، اپنے قبیلے کی تعریف و توصیف اور قصیدہ خوانی، اور دوسرے قبیلے کی ہجو میں قصائد اور اشعار کہنا، جنگ و جدال، قتل و غارت وغیرہ سے دور جاہلی کا پورا عربی ادب بھرا پڑا ہے۔

لیکن اسلام آیا تو اس نے جاہلی عصبیت اور نسبی تفاخر کی جڑ ہی کاٹ دی، خود قرآن کریم نے اس شجر ملعون کی بیخ کنی کر دی، آنحضرتﷺ نے نہ صرف قولاً بلکہ عملاً یہ ثابت کر دکھایا کہ تفاضل انساب کوئی چیز نہیں ہے، اصل چیز عمل اور پرہیزگاری ہے، جو اپنے عمل سے بلند نہ ہوا، اس کو اس کا نسب بلندی نہیں عطا کر سکتا، ہر آدمی آدم کی اولاد سے ہے، اور آدم علیہ السلام مٹی کے بنے تھے، فضیلت اور برتری کا سبب صرف تقویٰ ہو سکتا ہے، نسبی برتری فضیلت اور شرافت کی بنیاد نہیں ہو سکتی۔ علامہ اعظمیؒ کی معرکۃ الآرا تصنیف 'انساب و کفاءت کی شرعی حیثیت' کا اصل مقصد دنیا کو یہی باور کرانا اور اسی کا پیغام دینا ہے، ذیل میں اس کتاب کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔

اسلام کے اندر نسبی تفاخر کی گنجائش نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت شریفہ ہے:

يـٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ

(۱) زراعت و جاگیرداری:۲۱

اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ [الحجرات: ۱۳] یعنی اے لوگو! بیشک پیدا کیا ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے، اور بنایا تم کو مختلف خاندان اور مختلف قبیلہ تا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے، جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہو۔

آیت کریمہ کا پہلا فقرہ نسبی مساوات پر یوں دلالت کرتا ہے کہ جب تم سب لوگ ایک ہی باپ (آدم علیہ السلام) اور ایک ہی ماں (حضرت حوا) سے پیدا کیے گئے ہو، تو تم میں سے کسی کو کسی پر نسب کے لحاظ سے کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، بلکہ تم سب لوگ اس بات میں برابر ہو۔ اس فقرہ کا یہ مدلول مفسرین میں امام بغوی نے 'معالم التنزیل' میں، علامہ خازن نے 'تفسیر خازن' میں، خطیب شربینی نے 'السراج المنیر' میں بایں الفاظ بیان کیا ہے:

والمعنى أنكم متساوون في النسب (مطلب یہ ہے کہ تم سب لوگ نسب میں یکساں اور برابر ہو)

اور بیضاوی کے الفاظ یہ ہیں:

فالكل فيذلك سواء فلا وجه للتفاخر في النسب (یعنی سب لوگ اس بات میں برابر ہیں، پس نسب کی بنا پر ایک دوسرے کے مقابلہ میں تعلّی کی کوئی وجہ نہیں ہے)۔

پھر تھوڑے فرق کے ساتھ اسی مفہوم کی عبارتیں امام نسفی، علامہ زمخشری، عینی، حافظ ابن کثیر، امام ابوبکر جصاص اور امام مہلب شارح بخاری وغیرہ کی نقل کرنے کے بعد ایک طویل عبارت امام غزالی کی احیاء العلوم سے نقل کی ہے۔

اس کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ آیت کے دوسرے فقرہ میں اس عام خیال کی صاف صاف تردید کی گئی ہے کہ کسی معزز خاندان میں پیدا ہونا شرف کی بات ہے، خدا فرماتا ہے کہ یہ خاندان وقبائل کی تقسیم ہم نے اس لیے نہیں بنائی ہے کہ تم اس کو شرافت کا معیار قرار دے لو، بلکہ اس لیے یہ تقسیم جاری کی ہے کہ اس کے ذریعے سے شناخت اور پہچان حاصل ہو سکے۔ مثلاً دو شخص ایک ہی جگہ کے اور ایک ہی نام کے ہوں، پھر ان دونوں کے باپ کا نام بھی ایک ہو، تو ایک کو اموی اور دوسرے کو قرشی کہہ کر دونوں میں فرق وامتیاز پیدا کیا جا سکے۔

تیسرے فقرے میں شرافت کا معیار بتایا گیا کہ اللہ کے نزدیک شرافت وعزت صرف اس کو حاصل ہے، جو پرہیز گار ہے، اور جو متقی نہیں ہے وہ اللہ کے نزدیک غیر شریف اور ذلیل اور رذیل ہے۔

۱۹۳۲ء کے قریب ہندوستان کے ایک مشہور عالم کی ایک کتاب شائع ہوئی تھی، اس کتاب میں سورۂ حجرات کی اسی آیت کی تفسیر کی گئی تھی، علامہ اعظمیؒ نے اس کتاب کی فروگزاشتوں پر گرفت کرتے ہوئے اس کا تفصیلی رد کیا ہے، اور اس کا تجزیہ کرنے سے پہلے لکھا ہے:

> ''میں یہاں یہ بتا دینا نہایت ضروری سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے ایک نو خیز مشہور عالم نے اس آیت کی تفسیر میں ایک مستقل رسالہ تصنیف فرمایا ہے، میں نے اس کو بہت غور سے بار بار پڑھا اور ہر

بارانتہائی رنج اور دکھ کے ساتھ کتاب ہاتھ سے رکھ دینی پڑی، میں نہایت افسوس سے کہنا چاہتا ہوں کہ یہ تفسیر تفسیر نہیں، بلکہ آیت کی معنوی تحریف ہے، مصنف نے اندازِ بیان میں بعض اجلہ کی نقالی کی انتہائی کوشش کی ہے، لیکن جوشِ تفلسف میں اس کی کچھ پروانہیں کی ہے کہ اس کا خانہ ساز فلسفہ اور اس کا مخترَع نظریہ کتنے نصوص سے ٹکراتا ہے''(۱)۔

مصنف رسالہ نے انساب کے سلسلے میں اعلیٰ وادنی برادریوں کا، پھر ایک برادری میں اعلیٰ وادنیٰ خاندانوں کا تصور پیش کیا تھا۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ نص قرآنی کا صریح معارضہ ہے، قرآن تو یہ تصور پیش کرتا ہے کہ نسب کے لحاظ سے ان میں کوئی فرد یا جماعت اعلیٰ وادنیٰ نہیں ہے، اور مصنف رسالہ اس کے برعکس اعلیٰ وادنیٰ برادریوں کا تصور پیش کرتے ہیں۔

مصنف نے لکھا تھا کہ اخلاق نسلوں میں بھی منتقل ہوتے ہیں، اور اس کے لیے حوالہ دیا تھا کہ حدیث میں ہے: **الولد ثمرة الفواد، یا الولد سِرٌّ لأبيه۔**

علامہ اعظمیؒ نے اس کا جواب یہ لکھا کہ **الولد سر لأبيه** کی حدیثوں میں کوئی اصل نہیں، ہاں! **الولد ثمرة القلب** حدیث ضرور ہے، مگر اس کے وہ معنی نہیں ہیں، جو مصنف نے بیان کیے ہیں، بلکہ اولاد کو محض اتنی مشابہت کی بنا پر پھل کہہ دیا گیا کہ جس طرح پھل درخت سے پیدا ہوتا ہے، اسی طرح اولاد ماں باپ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کے لیے ابن اثیر کی 'نہایہ' اور سیوطی کی 'درنثیر' کا حوالہ دیا ہے۔ پھر ثعالبی کی 'ثمار القلوب' کے حوالے سے لکھا ہے کہ جو چیز انسان کو پیاری ہوتی ہے، اس کو بطریق استعارہ ثمرة القلب کہتے ہیں، اسی بنا پر اولاد کو حدیث میں ثمرة القلب کہہ دیا گیا ہے۔

اس کے بعد ترمذی شریف (۱۱۸/۲) سے حدیث **مَنْ أبطَأ به عملُه لَمْ يُسرِعْ به نَسَبُه** (جس کو اس کا عمل پیچھے ہٹائے، اس کو اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا) ذکر کر کے لکھا ہے کہ مصنف رسالہ کا تخیل اس کے بھی سراسر خلاف ہے، اس لیے کہ خدا کا تقرب نسب سے نہیں اعمال صالحہ سے ہے، **إن أكرمكم عند الله أتقاكم**۔ پھر لکھا ہے:

> ''اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ سلف وخلف کے اکثر وبیشتر علماء ایسے خاندانوں سے نہیں ہوئے، جن پر فخر کیا جا سکے، بلکہ زیادہ تر تو عجمی غلام تھے، بایں ہمہ وہی امت کے سادات اور علم کے سرچشمے تھے''(۲)۔

مصنف نے لاتبدیلیٔ اخلاق کے تخیل کی تائید میں متعدد آیتیں نقل کی تھیں، علامہ اعظمیؒ نے ان کے ہر استشہاد کا نہایت معقول طریقے سے جواب دیا ہے۔ جو باتیں انھوں نے اپنے خیال کی تائید کے لیے پیش کی تھیں،

(۱) انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت: ۲۱ (۲) حاشیہ انساب وکفاءت: ۲۸

ان میں سے ایک یہ ہے:

''خود جناب رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنی خلافتِ نبوت کو اپنے ہی قبیلہ اور خاندان کے لیے مخصوص فرمادیا''۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کے جواب میں لکھا ہے:

''لیکن میں کہتا ہوں کہ اس سے تو مصنف کے مقدمہ کی تائید کے بجائے اس کا ابطال ہوتا ہے، اس لیے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی خلافتِ نبوت کو اپنی نسل وذریت کے ساتھ مخصوص نہیں فرمایا، حالانکہ مصنف کا نظریہ صحیح ہو، تو یہی ہونا ضروری تھا''(۱)۔

مصنف نے لکھا تھا:

''ان کے -خلفاء اربعہ کے- مراتبِ خلافت کی ترتیب ہی ان کے مراتبِ اخلاق پر دائر ہے''۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کا نہایت نفیس پیرائے میں رد کیا ہے، لکھا ہے:

''یہ غلط اس لیے ہے کہ اگر ترتیبِ خلافت مراتبِ اخلاق پر دائر ہوتی، تو چونکہ مصنف کے نزدیک ماں باپ کے اخلاق لڑکوں میں منتقل ہوتے ہیں، اس لیے آنحضرت ﷺ کے اخلاق حضرت حسنؓ وحضرت حسینؓ میں بواسطہ فاطمہ زہراؓ منتقل ہوں گے، تو ان کے اخلاق کا مقابلہ حضرت ابوبکرؓ کے اخلاق ہرگز نہیں کرسکتے، اس لیے کہ حضرت ابوبکرؓ کے اخلاق تو وہ ہیں، جو حضرت ابوقحافہ سے ان میں منتقل ہوئے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ایک اولوالعزم نبی بلکہ افضل الانبیا کے اخلاق جس میں منتقل ہوئے، اس کے اخلاق کا مقابلہ وہ نہیں کرسکتا، جس میں غیر نبی کے اخلاق منتقل ہوئے ہوں؛ بلکہ حضرت ابوبکر کے اخلاق تو بزعمِ مصنف حضرت عثمانؓ، یا حضرت علیؓ، یا حضرت ابن عباسؓ، یا حضرت عباسؓ کے اخلاق کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتے، اس لیے کہ یہ تمام حضرات رسول اللہ ﷺ کے نسبِ اطہر میں حضرت ابوبکرؓ سے بہت زیادہ قریب اور حصہ دار ہیں؛ پس اگر ترتیبِ خلافت ان اخلاق کے مراتب پر دائر ہوتی جو آباء سے ابناء کی طرف منتقل ہوتے ہیں، تو خلیفہ اول حضرت حسنؓ ہوتے، یا پھر حضرت علیؓ، یا حضرت ابن عباسؓ، یا پھر حضرت عثمانؓ''(۲)۔

علامہ اعظمیؒ نے تفاضل بالانساب کے رد وابطال اور تقویٰ کی بنیاد پر فضیلت کے تحقیق واثبات کے لیے ایک عنوان ''نسباً کمتر وبرتر کی تفریق کا ابطال نصوص سے'' قائم کرکے اس کے ماتحت متعدد احادیث نقل کی ہیں، جو حسبِ ذیل ہیں:

۱-المسلمون إخوةٌ لا فضلَ لأحدٍ علىٰ أحدٍ إلّا بالتقوىٰ [درمنثور بحوالہ طبرانی] (تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، کسی کو کسی پر فضیلت نہیں ہے مگر تقویٰ کے ذریعے۔

(۱) انساب: ۳۳ (۲) ایضاً: ۳۴

۲-الناس كلُّهُم بَنُو آدمَ، و آدمُ خُلِقَ مِنَ التُّراب، ولا فضلَ لِعَرَبي على عَجَمي (إلى) إلاَّ بالتقوىٰ [درمنثور بحوالہ ابن مردویہ] (تمام انسان آدم کی اولاد ہیں، اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں، اور کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں ہے .... مگر تقویٰ کے ذریعے۔

۳-يقولُ اللّٰهُ يومَ القِيامَةِ: أيُّها النَّاسُ! إنّي جَعَلْتُ نَسباً، و جَعَلْتُم نَسَباً، فَجَعَلتُ أكرمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أتقاكُمْ، فَأبَيْتُمْ إلاَّ أنْ تَقُوْلُوْا فُلانٌ أكرمُ مِنْ فلانٍ، وفلانٌ أكرمُ مِنْ فلانٍ، وَإني اليومَ أرفعُ نسبي وأضَعُ نَسَبَكُمْ، ألاَ إنَّ أوْلِيائي المُتَّقُوْنَ [درمنثور بحوالہ طبرانی وغیرہ] (یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا کہ اے لوگو! ایک نسب میں نے قرار دیا اور ایک نسب تم لوگوں نے قرار دیا، میں نے اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ شریف سب سے زیادہ پرہیزگار کو قرار دیا، لیکن تم لوگ یہ کہنے سے نہیں مانے کہ فلاں شخص فلاں سے زیادہ شریف ہے، اور فلاں شخص فلاں سے زیادہ شریف ہے، آج میں اپنے نسب کو سربلند کروں گا، اور تمھارے نسب کو سرنگوں کروں گا، سن لو کہ میرے دوست متقی لوگ ہیں۔

علامہ اعظمیؒ نے ان کے علاوہ اور بھی متعدد احادیث اپنے مدعا کے اثبات کے لیے ذکر کی ہیں، لیکن ہم نے بنظر اختصار صرف تین ہی پر اکتفا کیا ہے۔

آگے صفحہ ۴۵ پر ''ایک غلط فہمی'' کے عنوان سے حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ احادیث میں بنو ہاشم کو زکوٰۃ لینے کی جو ممانعت آئی ہے، اس سے یہ سمجھ لیا گیا کہ اس کا مبنیٰ فضیلتِ نسبی ہے، حالانکہ یہ غلط ہے، یہ بات ہوتی تو عبدالمطلب کی کل اولاد اس حکم میں برابر ہوتی، لیکن کیا وجہ ہے کہ عبدالمطلب کی صرف تین اولاد- عباس، حارث اور ابوطالب ہی کی اولاد- پر زکوٰۃ حرام ہے، اور عبدالمطلب کے باقی نولڑکوں کی اولاد پر حلال ہے، نیز نسبی فضیلت اس حکم کا مبنیٰ ہوتی تو بنی ہاشم کے موالی (غلام اور آزاد شدہ غلام) پر زکوٰۃ کیوں حرام ہوتی۔ اصل یہ ہے کہ اس حکم کا مبنیٰ ہی غلط سمجھا گیا، صحیح مبنیٰ یہ ہے کہ یہ لوگ آنحضرت ﷺ سے ایسا تعلق رکھتے تھے کہ ان کا نفع حضرت کا نفع ہے، اس لیے اگر آپ ان کے لیے زکوٰۃ لینا جائز قرار دیدیتے، تو کفار کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ محمد (ﷺ) اسلام کی دعوت روپیہ جمع کرنے کے لیے دیتے ہیں، نیز ایسا کرنا ﴿مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْراً اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبىٰ﴾ کے اعلان کے خلاف ہوتا، جیسا کہ حافظ ابن حجر اور علامہ عینی نے شرح بخاری میں لکھا ہے۔

پہلے باب کے خاتمے پر ''ایک حنفی فقیہ کی شہادت'' کا عنوان قائم کر کے اس کے تحت لکھا ہے:

''علامہ خیر الدین رملی نے فتاویٰ خیریہ میں ایک مقام پر پیشہ ور کی شہادت کے مقبول ہونے پر ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ﴾ سے استدلال کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ بہت سے پیشہ وروں میں ہم وہ دین داری و تقویٰ پاتے ہیں، جو عزت و جائداد والوں میں نہیں پاتے (ص ۲۶ ج ۲)''[1]۔

(۱) انساب: ۴۶

مسئلۂ کفاءت:

اس کتاب کے باب دوم میں مسئلہ کفاءت پر گفتگو کی گئی ہے، علامہ اعظمیؒ نے اس مسئلے کی تمام جزئیات پر فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں نہایت منصفانہ اور محققانہ بحث کر کے اس کے ایک ایک جزئیہ کو روشن اور صاف کر دیا ہے، جس کی وجہ سے مسئلۂ کفاءت پوری طرح واضح اور محقق ہو کر سامنے آ گیا ہے۔

آپ نے اس مسئلے کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے کہ بہت سے لوگ دین کے علاوہ کسی اور بات میں کفاءت کا بالکل اعتبار نہیں کرتے، جن میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابن عمرؓ، عمر بن عبدالعزیزؒ، ابن سیرینؒ اور امام مالکؒ ہیں، بدائع میں یہی مذہب حضرت حسن بصریؒ اور سفیان ثوریؒ کا بھی نقل کیا گیا ہے۔

اس جگہ علامہ اعظمیؒ نے حاشیہ میں شامی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ائمۂ حنفیہ میں سے امام کرخیؒ اور ابوبکر جصاصؒ کا یہی مختار ہے، اور علامہ نوح آفندی نے لکھا ہے کہ اگر امام ابوحنیفہؒ کی کوئی روایت نہ ہوتی تو یہ دونوں بزرگ ہرگز عدم کفاءت کو اختیار نہ کرتے۔

آگے اعتبار کفاءت کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ جمہور علماء اسلام کے نزدیک دین کے ساتھ نسب میں بھی کفاءت کا اعتبار ہے، لیکن نسباً کفاءت کا اعتبار عرب یعنی اولاد قحطان اور اولادِ اسماعیل کے ساتھ مخصوص ہے، عجمی نسل کے لوگوں میں اس کفاءت کا مطلقاً اعتبار نہیں ہے۔

اس کے بعد امام اعظم کے قول کی بنیاد پر جو صورتیں نکلتی ہیں، ان کو حسب ذیل طور پر بیان کیا ہے:

۱- قریش کے مختلف خاندان باہم کفو ہیں۔
۲- کوئی غیر قریشی عرب، قریش کا کفو نہیں۔
۳- تمام غیر قریشی عرب ایک دوسرے کے کفو ہیں۔
۴- کوئی عجمی کسی غیر قریشی عرب کا بھی کفو نہیں ہے۔

ان چار صورتوں کو ذکر کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے:

> ''لیکن یہ حکم اسی وقت تک ہے، جب تک صرف عربیت و عجمیت کا مقابلہ ہو، اور اگر عجمیت کے ساتھ علم بھی ہو، تو عجمی کا پلہ بھاری ہو جائے گا''(۱)۔

پھر بہت سے جلیل القدر فقہاء کرام کے اقوال مع اصل عربی عبارتوں کے نقل کیے ہیں، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عجمی عالم عربی اور علوی عورت کا کفو ہو سکتا ہے، اور یہ کہ علم کا شرف اور فضیلت نسبی شرافت سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ ان سب اقوال کے آخر میں بطور نتیجہ کے تحریر فرمایا ہے:

> ''فقہ حنفی کے مسئلۂ کفاءت کی رُو سے ہر عجمی - جو کسی عربی قبیلہ کی طرف منسوب نہ ہو - دوسرے عجمی

---

(۱) انساب: ۴۸

کا کفو ہے، لہذا راجپوت مسلمان، رائیں قوم، کنبوہ، رانگی - جو اپنے کو عراقی کہتے ہیں - پٹھانوں کی مختلف قسمیں، نعمانی برادری، قدوائی، روتارے، مغل قوم اور ہر نومسلم جس کا باپ اور دادا بھی مسلمان ہو، سب آپس میں کفو ہیں، اس لیے کہ فقہاء حنفیہ نے تصریح کی ہے کہ غیر عربی برادریوں میں نسبی کفاءت کا اعتبار نہیں ہے''(۱)۔

پیشے کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ پیشہ ور وہ ہے جو خود یہ پیشے کرتا ہو، جیسے کپڑا ابننا، روئی دھننا، ترکاری، ساگ اور گوشت بیچنا وغیرہ، اور جو شخص یہ پیشے نہ کرتا ہو، اور نہ اس کے گھر میں ہوتے ہوں، تو وہ فقہی اصطلاح میں پیشہ ور نہیں کہلائے گا، پھر مبسوط کی ایک عبارت نقل کر کے ان الفاظ میں اس کا خلاصہ تحریر فرمایا ہے:

۱- اولاً تو امام اعظم کے نزدیک پیشہ کے لحاظ سے کفاءت معتبر ہی نہیں، لہذا ان کے قول کے بموجب تو ایک جولاہہ جولاہگی کرتے ہوئے بھی بے تکلف ایک کنبوہ یا ایک پٹھان کا کفو ہے۔

۲- پیشہ نسب کی طرح لازم نہیں ہے، یعنی یہ کہ کوئی آدمی ایک پیشہ کرتا رہا ہو، پھر اس کو چھوڑ دے، تو وہ اس پیشہ والا نہیں رہا، مثلاً کوئی کپڑا ابننا چھوڑ دے، تو اب وہ جولاہہ نہیں رہا، پیشہ کا تو یہ حال ہے کہ خسیس پیشہ کرے گا، تو آدمی خسیس سمجھا جانے لگے گا، لیکن اس کو چھوڑ کر نفیس پیشہ اختیار کر لے، تو خست و دناءت معدوم ہو جائے گی، برخلاف نسب کے کہ وہ جو ہے وہی رہے گا (ص ۵۷)۔

بعض حضرات مسئلۂ کفاءت کے سلسلے میں یہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ: **الناس أكفاء إلا الحائك والحجام** (سارے لوگ آپس میں کفو ہیں بجز جولاہے اور حجام کے)۔

حضرت محدث الاعظمیؒ نے اس کے متعلق یہ تحقیق فرمائی ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اس کو شاذ اور ناقابلِ اعتبار و استدلال قرار دیا ہے، اسی طرح حافظ ابوحاتم نے بھی منکر کہا ہے، بلکہ حافظ ابوعمر ابن عبدالبر نے تو اس کو منکر کے ساتھ موضوع بھی کہا ہے، اور ابن حبان کا رجحان بھی اسی طرف ہے (ص ۵۸)۔

مفتی شفیع صاحب نے اپنے رسالے میں اس حدیث کے متعلق لکھا تھا کہ ''تعدُّدِ طُرُق سے اس کا ضُعف رفع ہو جاتا ہے''۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تعدد طرق سے صرف ضعف یسیر رفع ہوتا ہے، موضوع حدیث تعدد طرق واہیہ سے غیر موضوع نہیں ہو سکتی، نہ ایک وضاع یا منکر الحدیث راوی کی تائید و متابعت کوئی ویسا ہی دوسرا راوی کر دے تو ضعف رفع ہو سکتا ہے۔

مذکورہ بالا حدیث کے علاوہ 'نہایات الارب' میں پیشہ وروں کی مذمت میں جو حدیثیں نقل کی گئی ہیں، ان کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ وہ ضعیف، غیر مستند اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔

آگے علامہ ابن القیم کی عظیم الشان کتاب 'زاد المعاد' کے حوالے سے اعتبار کفاءت کی شرعی حیثیت کو

(۱) انساب و کفاءت کی شرعی حیثیت: ۵۵

بیان کیا ہے، اور اس کی نسبت لکھا ہے:

''یہ تو متفق علیہ ہے کہ وہ از قبیل حقوق العباد ہے، اور وہ بالکل حق شفعہ کی نظیر ہے، کہ جس کو شفعہ کا حق حاصل ہو اور وہ اپنے حق سے دست بردار ہو جائے، تو خدا کے یہاں اس کی کوئی باز پُرس نہیں ہو سکتی، بلکہ ماجور ہونے کی امید ہے، اسی طرح اگر اولیاء اور عورت نسبی کفاءت کے باب میں اپنے حق کو استعمال نہ کریں، تو کوئی مواخذہ نہیں ہو سکتا، اس میں چاروں اماموں کا کوئی اختلاف نہیں''(۱)۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ مشائخ حنفیہ کی تصریح کے مطابق متعدد احادیث کی بنا پر نسبی کفاءت کا لحاظ نہ کرنا اور اس حق سے دست بردار ہونا ہی افضل ہے، اور مبسوط اور بدائع وصنائع کی عبارتوں سے اس کی تائید نقل کی ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نسبی کفاءت صرف درجۂ جواز میں معتبر ہے۔

کفاءت کا اعتبار کیے بغیر اگر نکاح ہو جائے، تو اس صورت میں جو تفصیلات کتب فقہ میں مذکور ہیں، اس پر علامہ اعظمیؒ نے اختصار کے ساتھ نہایت جامع گفتگو کی ہے، لکھا ہے:

''بہر حال دو باتیں تو بالکل صاف ہو چکیں کہ ۱- کفاءت بحیثیت حق اللہ نہیں بحیثیت حق العبد معتبر ہے، ۲- اور وہ حق بھی جوازی ہے نہ وجوبی۔ اب رہی یہ بات کہ کفاءت صحتِ نکاح کے لیے معتبر ہے یا لزوم نکاح کے لیے؟ تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ:

۱- منکوحہ اگر نابالغہ ہے، اور ولی باپ یا دادا ہے، تو کفاءت نہ صحت کے لیے شرط ہے نہ لزوم کے لیے، یعنی یہ کہ اگر باپ یا دادا نے اپنی نابالغ لڑکی یا پوتی کا غیر کفو سے نکاح کر دیا، تو یہ نکاح صحیح ہے اور لازم بھی، فسخ نہیں ہو سکتا۔

۲- اور اگر منکوحہ بالغہ ہے اور اس کا کوئی ولی نہیں ہے اور اس نے اپنا نکاح غیر کفو میں کر لیا، تو یہ نکاح بھی صحیح ولازم ہے، فسخ نہیں ہو سکتا۔

۳- اسی طرح اگر ولی موجود ہو اور لڑکی کے ساتھ اس کا ولی بھی غیر کفو میں شادی ہونے پر رضامند ہو جائے، تو یہ نکاح بھی صحیح ولازم ہے، فسخ نہیں ہو سکتا۔

۴- لڑکی بالغ ہو اور اس کے متعدد ولی ہوں، مثلاً باپ، چچا اور بھائی، تو صرف ولی اقرب کی رضامندی سے غیر کفو میں نکاح صحیح ولازم ہو جائے گا۔...... اور اگر سب اولیاء ایک درجہ کے ہوں مثلاً چار بھائی، تو صرف ایک کی رضامندی سے غیر کفو میں نکاح صحیح ولازم ہو جائے گا''(۲)۔

ان تمام تفصیلات کے بعد لکھا ہے:

''اب صرف دو صورتیں رہ جاتی ہیں:

ایک یہ کہ لڑکی نابالغ ہو اور باپ دادا کے علاوہ کوئی دوسرا ولی مثلاً چچا یا بھائی اس کا نکاح غیر کفو میں

(۱) انساب وکفاءت: ۶۱ (۲) ایضاً: ۶۳

کر دے، تو یہ نکاح صحیح نہیں ہوگا؛ اس لیے کہ چچا وغیرہ کی ولایت کم زور ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ لڑکی بالغہ ہو اور اس کا ولی موجود ہو اور لڑکی بلا رضامندی ولی اپنا نکاح غیر کفو سے کر لے، تو حسن بن زیاد کی شاذ روایت کی بنا پر اس صورت میں بھی نکاح صحیح نہیں ہوگا، لیکن ظاہر الروایۃ کی بنا پر صحیح ہے، ہاں ولی کو حقِ اعتراض حاصل ہے۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں روایتوں میں مفتیٰ بہ کون ہے؟ تو عموماً یہی ظاہر کیا جاتا ہے کہ حسن کی روایت مفتیٰ بہ ہے۔............مگر تحقیقی بات یہ ہے کہ مشائخ نے دونوں روایتوں پر فتوے دیے ہیں، لہذا دونوں مفتیٰ بہ ہیں''[1]۔

ان جزئیات کو لکھنے کے بعد آپ نے چھ وجوہ سے ظاہر الروایۃ کے راجح ہونے کو ثابت کیا ہے۔

آگے اس تسامُع اور تواتُر پر بحث کی ہے، جس پر نسب کی بنیاد رکھی جاتی ہے، یہ پوری بحث نہایت عمدہ اور نفیس ہے، جس میں آپ نے دعوائے تواتر کی حقیقت کو اصولی طور پر بحث کرتے ہوئے رد کیا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ ان نسبی سلسلوں کو تواتر کہنا غلط اور تواتر کی توہین ہے۔

بعد ازاں ایک عنوان یہ قائم کیا ہے: ''غلط فہمی یا کسی اور سبب سے ادعاء شرافت کی چند مثالیں''۔ اور اس کے ماتحت تاریخ کی کتابوں سے ایسے بیس (۲۰) لوگوں کا تذکرہ کیا ہے، جنھوں نے اپنے آپ کو کسی مشہور خاندان یا قبیلے کی طرف منسوب کر لیا تھا۔

آگے ''تبدیلِ نسب کی حرمت''، ''کسی قوم کی تنقیص'' وغیرہ کے عنوان پر نہایت پُر مغز اور مفصل کلام کیا گیا ہے، اور بہت سی غلط فہمیوں کو رفع کرنے اور الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے، جن میں بہت سے اہم مباحث زیرِ بحث آئے ہیں۔

ان مباحث کے بعد ایک عنوان ہے ''سارے پیشے اباحت میں یکساں ہیں''، اس میں 'مبسوط'، 'فتح الباری' اور 'عمدۃ القاری' وغیرہ کے حوالے سے نہایت اہم اور معلومات افزا مواد نقل کیے گئے ہیں۔

آخر میں ''ہندوستانی شرفا کے شجر ہائے نسب'' کے عنوان پر اس کتاب کو ختم کیا ہے، اور ہندوستان کے بہت سے نسب ناموں اور شجروں میں جو غلطیاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں، ان سے پردہ اٹھایا ہے، جس سے ان نسب ناموں کی اصلیت مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے۔

---

(۱) انساب: ۶۴-۶۳

☆......☆......☆......☆......☆

☆......☆......☆......☆

☆......☆......☆

اسلامی پرسنل لا میں باب کفو

مسئلۂ کفاءت پر علامہ اعظمیؒ کا یہ مختصر مگر نہایت جامع اور پُر مغز مضمون ہے، فقہ حنفی کے مسئلۂ کفاءت کا حوالہ دینے کے بعد اصحاب اِفتاء حضرات کی تحریروں میں جو بے احتیاطی اور افراط وتفریط پائی جاتی ہے، اُن پر آپ نے نہایت شدید نقد کیا ہے، چنانچہ اپنی تحریر کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے:

''مسلم پرسنل لا کی بنیادی کتابوں میں ہم کو ایک کفاءت کا باب (**باب الأكفاء**) بھی ملتا ہے، جس میں دین ومذہب کے علاوہ زوجین کا نسب اور پیشہ کی یکسانیت یا مماثلت کو بھی صحتِ نکاح کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے، اوراس میں اس حد تک شدت اختیار کی گئی ہے کہ اگر کسی عورت نے غیر کفو سے نکاح کرلیا، تو بعض فقہا اس نکاح کو باطل اور کالعدم قرار دیتے ہیں''[۱]۔

پھر فتاویٰ دارالعلوم سے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحب دیو بندی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

''نکاحِ مذکور جو کہ غیر کفو سے ہوا، موافق روایت مفتیٰ بہا صحیح نہیں ہوا، بلکہ باطل اور ناجائز ہوا (۲۱۴/۸)''۔

حضرت مفتی عزیز الرحمان صاحب کے اس فتوے کی بابت آپ نے لکھا ہے:

''اس روایت کی نسبت گزارش یہ ہے کہ یہ امام ابوحنیفہ کا قول نہیں ہے، بلکہ متاخر فقہا کا قول ہے، جو دلائل کے خلاف ہونے کی وجہ سے نا قابلِ قبول ہے''[۲]۔

پھر رسالہ 'برہان' بابت فروری ۱۹۷۳ء میں شائع ہونے والے ایک مضمون کا حوالہ دے کر کفاءت کی شرعی حیثیت یہ متعین کی ہے کہ وہ انعقاد نکاح یا بقاء نکاح کے لیے بنیادی شرط نہیں ہے، بلکہ اس کا اعتبار صرف جذبات کی رعایت کے لیے کیا گیا ہے۔

پھر فتاویٰ دارالعلوم سے متعدد ایسی مثالیں نقل کی ہیں جن کے اندر اگر کوئی بالغہ جو نسباً صدیقی یا فاروقی ہو اور وہ کسی نعمانی یا افغانی یا قدوائی یا کمبوہ سے نکاح کرلے، تو اس کا نکاح باطل قرار دیا گیا ہے۔

اوران سب اقوال پر اس جامع انداز سے ردوقدح کی ہے:

''یہ بات صحیح حدیثوں کے سراسر خلاف ہے: **لا فضلَ لِعربيٍ علىٰ عَجَميٍ، ولا لِعَجَميٍ علىٰ عَرَبيٍ إلا بالتقوى** (مسند احمد وطبرانی)۔ دوسری بات یہ ہے کہ عربی ہونے کے لیے صرف انتساب کا جوذکر کیا گیا ہے، یعنی جو صدیقی یا فاروقی ہونے کا دعویٰ کردے، وہ صدیقی اور فاروقی ہے، یہ سراسر تحکّم اور بے انصافی ہے''[۳]۔

(۱) المآثر جلد ۸ شمارہ ۱، ص: ۴۰ (۲) ایضاً: ۴۰ (۳) ایضاً: ۴۲

ہندوستان کے نام نہاد نسب ناموں میں جو جعل وانتحال اور ان کے اندر جو انقطاع پایا جاتا ہے، اس پر بھی تحقیقی کلام کیا ہے، اور ان میں سے بہت سے نسب ناموں کا تاریخ وانساب کی کتابوں سے جعلی اور غیر یقینی ہونا ثابت کیا ہے، پھر لکھا ہے:

> ''حیرت ہے کہ ایک آدمی جھوٹ بول کر اپنے کو صدیقی کہلائے تو وہ شریف ہو گیا، اور دوسرا جھوٹ سے پرہیز کر کے یہ کہے کہ میں پشتہا پشت سے مسلمان ہوں، مجھے معلوم نہیں کہ میرے باپ دادا عرب سے آئے تھے، یا یہیں مسلمان ہوئے، تو وہ شرافت سے گر گیا، وہ صدیقیت کا باطل دعویٰ کرنے والے کا کفو نہیں ہوسکتا''[۱]۔

آگے لکھا ہے:

> ''لہذا مسلم پرسنل لا کا جائزہ لینے والے محقق علما مسئلۂ کفاءت پر قرآن وحدیث وفقہ کی روشنی میں از سر نو غور کریں، اور ان غلطیوں کی اصلاح کریں، جو ہمارے ہندوستانی مفتیوں نے پھیلا رکھی ہیں''[۲]۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے فقہ حنفی کی تصریحات اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں متعدد نکات تحریر فرمائے ہیں، جن میں سے چند ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں:

۱- جب کفاءت کا اعتبار اس لیے کیا جاتا ہے کہ............''گھریلو مصالح کا منظّم ہونا برابری کے جوڑوں میں عادۃً ممکن ہے''۔ تو عورت کی جانب سے بھی کفاءت کا اعتبار ہونا چاہئے کہ تکافُؤ -یعنی دونوں جانب سے برابری- کا تحقُّق اسی وقت ہوگا؛ نیز جب یہ بات ایک حقیقت تسلیم کر لی جائے گی کہ شوہر شریف اور عورت رذیل ہے، تو عورت ہمیشہ اس رنج وکوفت میں مبتلا رہے گی کہ شوہر مجھ کو رذیل اور کمین تصور کرتا ہے، اور وہ میری عزت نہیں کرتا، اور بیوی کی حیثیت سے میں جس احترام کی مستحق ہوں، اس میں کوتاہی کرتا ہے، تو ایسی حالت میں مصالح کا انتظام کیوں کر ممکن ہے؟

۲- جب یہ حقیقت ہے کہ دین وتقویٰ کے علاوہ شرافت ورذالت کا ہر معیار خیالی اور عرفی ہے، تو جس صورت میں مرد وعورت دونوں اس خیالی معیار کو غلط سمجھتے ہوں، اور اُس کو نظر انداز کر کے نکاح پر آمادہ ہوں، اور نکاح کر لیں، تو اس کو صحیح ومنعقد قرار دیا جائے، ولی کی رضا مندی کی شرط نہ لگانی چاہئے؛ بلکہ ولی کو حکم دینا چاہئے کہ وہ عورت کی خواہش کی موافقت کرے، کیونکہ وہ ایک غلط ذہنیت کو عملاً مٹانے کے لیے آمادہ ہوئی ہے۔

۳- جب یہ واقعہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا اصل مذہب یہ ہے کہ غیر کفو میں نکاح صحیح ومنعقد ہو جاتا ہے، لیکن ولی کو فسخ کرانے کا اختیار باقی رہتا ہے، اور یہی روحِ شریعت کے مطابق بھی ہے- **لا فضل لعربي على عجمي، ولا لعجمي على عربي إلا بالتقوى**-، تو متاخرین کی رائے پر فتویٰ دینا صحیح نہیں ہے، اس لیے

(۱) المآثر جلد ۸ شمارہ ۱، ص: ۴۴ (۲) ایضاً: ۴۴

کہ وہ رائے اسی خیالی اونچ نیچ کے تصور پر مبنی ہے، جو شریعت کے منافی ہے۔

۴- جب فقہاءِ محققین نے بہت شد و مد کے ساتھ لکھا ہے کہ شرفِ علم شرفِ نسب پر فوقیت رکھتا ہے، اور ایک عالمِ دین سیدہ کا کفو ہو سکتا ہے، تو اس [پر] فتویٰ دینے میں پس و پیش کیوں ہے؟ حالانکہ اس پس و پیش سے سنت مطہرہ کی صریح خلاف ورزی ہوتی ہے۔

اس کے بعد آنحضرت ﷺ کا اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ سے کر دینا، اور عہدِ صحابہ کی غیر کفو میں متعدد شادیاں بطور مثال ذکر کی ہیں۔

اور آخر میں نمبر چھ (۶) کے تحت لکھا ہے:

> اسی طرح یہ جو مشہور ہے کہ عجمی اگر عالم بھی ہو تو عربیہ کا کفو نہیں ہوگا، یہی ظاہر الروایۃ ہے۔ تو یہ بالکل غلط ہے، اور ظاہر الروایۃ ہونے کا دعویٰ بالکل بے دلیل ہے، اور 'محیط' و 'بزازیہ' و 'فیض' و 'جامع الفتاویٰ' وغیرہ میں جزم و یقین کے ساتھ مذکور ہے کہ شرفِ علم شرفِ نسب سے بڑھ کر ہے۔ ایسا ہی صاحبِ 'نہر فائق' نے بھی لکھا ہے، اور اسی کو کمال ابن الہمام نے پسند کیا ہے، لہذا کوئی عجمی عالم- خواہ وہ خیاط ہو، یا بزاز، یا تاجر، یا بافندہ- ایک سیدانی کا بلا شبہ کفو ہے، اور سید اولادِ آدم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا عمل اس کی دلیل ہے''۔

علامہ اعظمیؒ کا یہ مضمون المآثر جلد نمبر ۸ شمارہ نمبر ا محرم، صفر، ربیع الاول ۱۴۲۰ھ میں شائع ہو چکا ہے۔

☆......☆......☆......☆

تحقیقِ دعوتِ نکاح

دو ماہی رسالہ 'الریاض' گورینی کے شمارہ نمبر ا جلد نمبر ۲ محرم- صفر ۱۴۰۶ھ میں دار العلوم دیوبند کے صدر مفتی حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب قدس سرہ العزیز کا ایک فتویٰ لڑکی کے نکاح میں لڑکی والوں کی طرف سے دعوتِ طعام کے مسنون ہونے کے بارے میں شائع ہوا تھا، اس کے لیے انھوں نے مصنف عبد الرزاق (۴۸۷/۵) کا حوالہ دیا تھا، پھر انھوں نے اپنے اس فتوے سے رجوع کر لیا، آپ کا رجوع 'الریاض' ہی میں شمارہ نمبر ۳ جلد نمبر ۲ جمادی الاولی والثانیہ میں شائع ہوا، رجوع سے متعلق حضرت مفتی صاحب کی تحریر ۱۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۰۶ھ کی نوشتہ ہے، اس کا متن یہ ہے:

> ''میں نے مصنف میں تلاش کر کے دیکھا تو اس کے حاشیے پر محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی- ادام اللہ النفع بعلومہ و برکاتہ- نے ابن حجر رحمہ اللہ سے ایسی جرح نقل فرمائی ہے کہ جس سے وہ روایت قابلِ احتجاج نہیں رہی، اس لیے میں اپنی اس تحریر سے، جس میں بحوالہ مصنف عبد الرزاق لڑکی کے تقریبِ نکاح کے وقت دعوت کا ذکر ہے، اور حضور اکرم (ﷺ) سے حضرت

فاطمہؓ کی تقریبِ نکاح میں دعوت کرنا منقول ہے، میں اس سے رجوع کرتا ہوں، بلکہ اعلان کرتا ہوں''۔(۱)

اس کے بعد کسی شخص نے دارالعلوم دیوبند سے اس مسئلہ کے متعلق استفتاء کیا، تو وہاں سے حضرت مفتی صاحب کے اس فتوے کا حوالہ دے کر لکھا گیا کہ:

''شادی کے وقت لڑکی والے کا دعوتِ نکاح کرنا کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں، اس لیے یہ طریقہ قابلِ ترک ہے''۔(۲)

اس سلسلے میں حضرت علامہ اعظمیؒ سے بھی استفسار کیا گیا، تو آپ نے تحریر فرمایا:

''مفتی صاحب کا رجوع اور دیوبند کا فتویٰ میری سمجھ میں نہیں آیا، مفتی صاحب نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے، اگر وہ صحیح نہیں ہے، تو زیادہ سے زیادہ مدعا کا ثبوت اس سے نہ ہوگا، یعنی مسنون ہونا ثابت نہ ہوگا، اس سے اس کے جواز واباحت کی نفی کیونکر ہوگی؟ اور اس کا قابلِ ترک ہونا کس دلیل سے لازم ہوگا''؟۔

اس کے بعد آپ نے حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب علیہ الرحمہ کی کتاب 'اربعین فی بیان سنۃ سید المرسلین' سے متعدد عبارتیں نقل کر کے اس کا جائز اور مباح ہونا ثابت کیا ہے، اس تحریر کے ساتھ علامہ اعظمیؒ نے مستفتی کو ایک خط بھی لکھا تھا، اس کا مضمون یہ ہے:

''نکاح کے موقع پر لڑکی والوں کا کچھ لوگوں کو مدعو کر لینا اور ان کو کھانا کھلانا مصنف عبدالرزاق ۵/۴۸۹ والی حدیث کی بنا پر آنحضرت ﷺ کا پسند کیا ہوا ایک طریقہ ضرور ہے، چاہے اصطلاح فقہی کی بنا پر وہ سنت ہو یا نہ ہو، اور اس چیز کا مروجہ بارات سے کوئی تعلق نہیں ہے، آنحضرت ﷺ کے عمل کی صورت یہ تھی کہ جس کا نکاح ہوتا تھا، وہ لڑکی کے گھر گیا، چاہے اکیلا گیا ہو، یا دو ایک آدمیوں کے ساتھ، اس کا وہاں نکاح ہوا، اور لڑکی والوں نے دعوت کا انتظام کر کے خود جس کو چاہا اور جتنے لوگوں کو چاہا بلا کر ان کو کھانا کھلا دیا، بتایئے اس صورت کا بارات سے کیا تعلق ہے، اور اس سے مروَّجہ بارات کے جواز یا استحسان پر کیسے روشنی پڑتی ہے''۔

یہ مضمون المآثر جلد نمبر ۵ شمارہ نمبر ۳ میں شائع ہو چکا ہے۔

(۱) الریاض: ج ۲ ش ۳، ص: ۲۴ (۲) المآثر: ج ۵ ش ۳، ص: ۹۱

☆......☆......☆......☆......☆

☆......☆......☆

☆......☆

بیمہ کی حقیقت اور اس کا حکم

گزشتہ صدی عیسوی کی ساتویں دہائی میں-تقریباً ۱۹۶۴ء میں- بیمہ Insurance کا مسئلہ بہت ہی شدومد کے ساتھ اٹھایا گیا تھا، اور یہ اُس وقت کا ایک اہم مسئلہ بن گیا تھا، ہندوستان بلکہ برصغیر ہندوپاک کے بیشتر اہل علم نے اس مسئلے کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اس پر رائے زنی اور نکتہ آفرینی کی کوشش کی تھی، علماء ہند کی ایک بڑی جماعت اور معتد بہ تعداد کا رجحان یہ تھا کہ ہندوستان کے حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ ان کے تناظُر میں زندگی کا بیمہ-Life Insurance- جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس تحقیقات شرعیہ کی طرف سے اس مسئلے پر غور کرنے اور اس کا شرعی حل معلوم کرنے کے لیے اہل علم کو دعوت دی گئی تھی، جن حضرات نے اس میں حصہ لیا ان میں سے اکثر لوگ اس کے جواز کے حق میں تھے، مولانا محمد تقی امینی مرحوم کو مجلس تحقیقات شرعیہ کی طرف سے اس کا مسودہ تیار کرنے اور فیصلے کے لیے اس کو مجلس میں پیش کرنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی تھی، لیکن مجلس میں اس کو پیش کرنے اور اس کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنے سے قبل مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مناسب سمجھا کہ اس کا مسودہ علامہ اعظمیؒ کی خدمت میں بھیج کر ان سے نظر ثانی کی درخواست کی جائے، چنانچہ مولانا تقی امینی اس کا مسودہ لے کر بذات خود مئو حاضر ہوئے۔

حضرت مولانا اعظمیؒ نے اس مقالے کو دیکھا اور جس فقیہانہ انداز میں اس کا تحلیل وتجزیہ کیا، اور جس جزم ویقین کے ساتھ اور ٹھوس لب ولہجے میں بیمہ کی حقیقت اور اس کے مضمرات کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے عدمِ جواز کو بیان کیا، اس سے نہ صرف آپ کی فقہی بصیرت اور ژرف نگاہی، بلکہ آپ کی مسلکی پختگی اور یقین واعتماد کی قوت بھی آشکارا ہوتی ہے۔

بیمہ سے متعلق اپنی تجزیاتی تحریر کے ساتھ علامہ اعظمیؒ نے مولانا علی میاں صاحبؒ کو ایک خط بھی لکھا تھا، وہ خط بذات خود ایک بیش قیمت دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، اس خط کا ایک اقتباس درج ذیل ہے، آپ کے خط کے متن سے اسلامی فقہ وشریعت کی ابدیت اور آفاقیت کے متعلق آپ کی سوچ کا بھی اندازہ ہوتا ہے، لکھا ہے:

> ”مولانا اگر یہ صحیح ہے کہ 'فوری طور پر کوئی اجتماعی قدم نہ اٹھایا گیا تو سمجھ دار (ہرنئی رو میں بہنے والا؟) طبقہ مذہب سے مایوس ہوجائے گا'، تو اسی کے ساتھ اس کا خطرہ بھی کچھ کم نہیں ہے کہ اجتماعی قدم اٹھانے کے جو نمونے سامنے آرہے ہیں، وہ یقین دلا رہے ہیں کہ شریعتِ حقہ کا کوئی جز بھی اپنی اصلی حالت پر باقی نہ رہے گا، حتی کہ محرمات قطعیہ کو بھی ”الضرورات تبیح المحظورات“ کے اصول پر مباح بنانے کی گنجائش نکالی جائے گی۔ کیا آپ کو اس کا اندیشہ نہیں ہے“؟

بیمہ سے متعلق آپ کی یہ تحریر ۲۱ رنکات ودفعات پر مشتمل اور چوبیس صفحات پر محیط ہے، بیمہ کو جائز قرار دینے کے لیے جتنے وجوہ اور دلائل قائلینِ جواز کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں، ان میں سے ایک ایک دلیل پر

نہایت ناقدانہ انداز میں جرح کر کے اس کو توڑا ہے، اور یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ بیمہ قطعی حرام ہے، اور یہ ربا اور قمار کا مصداق ہے، اس کے جواز کے لیے جتنی بھی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں، وہ یکسر غلط، بے محل اور بودی ہیں۔

اسلامی شریعت کی حقانیت وابدیت اور تعلیمات نبویہ کی صداقت پر آپ کے ایمانِ راسخ کے لیے نمونہ کے طور پر اس تحریر کے دو اقتباس پیش کیے جا رہے ہیں، دوسرے نمبر کے تحت لکھا ہے:

''پس اندازی کے رجحان کو فطری کہہ کر ظاہر کرنا کہ وہ تمام تر محمود رجحان ہے، میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ فطرت سلیمہ کا تقاضا وہ چیز ہے جو محمد رسول اللہ (ﷺ) کی قولی و عملی تعلیمات سے ثابت ہوتی ہے، جو حریصانہ پس اندازی اور مسرفانہ انفاق کے درمیان ایک نہایت معتدل رجحان ہے، اور جس میں پس اندازی سے زیادہ اِنفاق کا عنصر نمایاں ہے''(۱)۔

اور نمبر ٦ کے تحت لکھا ہے:

''کمیونزم ہو یا کوئی دوسرا ازم، اسلامی زندگی سے آنکھ ملانے کی تاب تو لا ہی نہیں سکتا، اس کا تار و پود کیا بکھیرے گا! یہ صحیح ہے کہ ایک طرف کمیونزم دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام، دونوں وقت کے بہت بڑے فتنے ہیں۔ کیا ان فتنوں کی وجہ سے دارالاسلام اور دارالحرب کی بحث طاق نسیاں کا نقش و نگار بن جائے گی؟ کیا ان فتنوں کے وقت میں کسی ملک پر دارالاسلام کی تعریف صادق آتی ہے، اور کسی پر دارالحرب کی، تو ایک میں دارالاسلام اور دوسری میں دارالحرب کے احکام جاری نہ ہوں گے؟ کیا اسلامی نقطۂ نظر سے یہ تقسیم صحیح اور دونوں کے احکام مختلف نہیں ہیں؟ میرے نزدیک تو اس بحث سے اِغماض اور گریز محض اُس مرعوبیت کا نتیجہ ہے، جو موجودہ دور کے غلط پروپیگنڈے اور تمام نظاموں اور جمہوریتوں کی مساوات کے اعتقاد سے پیدا ہو گئی ہے۔ موجودہ دور میں اس کا فیصلہ تو دشوار ہو سکتا ہے کہ کون ملک دارالاسلام اور کون سا دارالحرب ہے، لیکن اس کا فیصلہ ہو جانے پر کسی مسئلہ کا فیصلہ بالکل دشوار نہیں ہے''(۲)۔

☆......☆......☆......☆......☆

دارالاسلام اور دارالحرب

اُس دور میں انشورنس کے ساتھ جو مسائل اٹھے تھے، ان میں دارالاسلام اور دارالحرب کا مسئلہ بھی بہت زور و قوت سے اٹھایا گیا تھا، اس بحث کا اصل مقصد ہندوستان کی پوزیشن کو واضح اور صاف کرنا تھا کہ اس کی حیثیت دارالحرب کی ہے، یا دارالاسلام کی۔ اس مسئلے پر متعدد حضرات نے اپنے اپنے علم و تحقیق کی روشنی میں خامہ فرسائی اور خیال آرائی کے جوہر دکھائے تھے، کئی ایک اہلِ علم کی تحریروں کے سامنے آنے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے قلم اٹھایا، اور اس موضوع پر یہ معرکۃ الآرا کتاب تصنیف فرمائی۔

(۱) بیمہ اور اس کا شرعی حکم: ۱۳ (۲) ایضاً: ۱۴

یہ کتاب علامہ اعظمیؒ کے تفقُّہ، وسعتِ مطالعہ، تبحُّرِ علم، قوتِ استدلال اور دقتِ نظر کا شاہکار اور ان کی تحقیق، ژرف نگاہی اور فقہی بصیرت کا مستحکم ثبوت ہے۔ اس کتاب میں علامہ اعظمیؒ نے اپنے موقف کی تائید میں زیادہ تر فقہاء احناف کی عبارتوں کا سہارا لیا ہے، لیکن حسبِ موقع آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ سے بھی استدلال کیا ہے، اور جو بات بھی کہی ہے، ائمۂ علم وفقہ کی عبارتوں کے حوالے سے کہی ہے، اور کسی معاصر یا پیش رو عالم کی فروگزاشت پر انگلی رکھی ہے، تو علم وتحقیق کی روشنی میں رکھی ہے۔

مصنفِ علام نے کتاب کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے:

''یہ ایک حقیقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں ہے کہ بعض بلاد ایسے ہیں، جو کبھی اسلامی قلم رو میں داخل نہیں ہوئے؛ اور کچھ ایسے ہیں جو مسلمانوں کے قبضہ میں آئے اور آج تک انھیں کے قبضہ میں ہیں؛ اور بعض ایسے بھی ہیں جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے، لیکن جلد یا بدیر اُن کے ہاتھ سے نکل گئے۔ پہلی قسم کے بلاد اصلی یا حقیقی دارالحرب ہیں؛ اور دوسری قسم کے بلاد اصلی یا حقیقی دارالاسلام ہیں؛ اور تیسری قسم کے بلاد یا تو دارالاسلام حکمی ہیں یا دارالحرب حکمی''۔

اس کے ایک صفحے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''اس تمہید کے ضمن میں دارالاسلام حقیقی ودارالحرب حقیقی کو تو آپ بخوبی سمجھ چکے، اب حکمی کی نسبت سنئے کہ جو بلاد مسلمانوں کے قبضے میں آنے کے بعد ان کے قبضہ سے نکل گئے، ان کی پوزیشن ایسی بھی ہوسکتی ہے کہ حکماً دارالاسلام قرار دیے جائیں، اور ایسی بھی ہوسکتی ہے کہ ان کو حکماً دارالحرب کہا جائے''۔

آگے دارالاسلام کے دارالحرب بننے کی شرائط کے متعلق امام محمد کی کتاب 'الزیادات' کی ایک عبارت نقل کر کے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے:

''دارالاسلام امام ابوحنیفہ کے نزدیک تین شرطوں کے پائے جانے ہی سے دارالحرب ہوسکتا ہے: پہلی شرط یہ ہے کہ اشتہار واعلان کے طور پر احکامِ کفار کا اجرا ہو، اور اسلام کا حکم بالکل نہ چلے؛ دوسری یہ کہ وہ ملک دارالحرب سے اس طرح متصل ہو کہ ان دونوں کے بیچ میں کوئی شہر دارالاسلام کا نہ ہو؛ تیسری یہ کہ اس میں کافروں کے تسلُّط سے پہلے جو امان مسلمانوں کو بنا بر اسلام، اور ذمی کو بنا بر عقد ذمہ حاصل تھا، اس پر کوئی مسلم وذمی باقی نہ رہے (بلکہ از سرِ نو امان حاصل کرنے پر وہاں رہ سکے)''[(۱)]۔

پھر متعدد کتبِ فقہ وفتاویٰ کے حوالے سے لکھا ہے:

''ان تمام عبارتوں کا حاصل یہ ہے کہ جو ملک دارالاسلام رہ چکا ہے، اس میں جب تک مذکورہ بالا تینوں شرطیں بیک وقت موجود نہ ہوں گی، وہ دارالحرب نہیں بن سکتا، بلکہ وہ دارالاسلام رہے گا''[(۲)]۔

(۱) دارالاسلام اور دارالحرب: ۱۲-۱۱ (۲) ایضاً: ۱۲

اس کے بعد ان کتابوں کی اصل عبارتیں نقل کی ہیں، پھر تحریر فرمایا ہے:

''جس فقیہ حنفی نے دارالاسلام کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے کہ: ''جہاں دارالاسلام کا حکم جاری ہو، اور وہاں اس کا قہر وغلبہ ہو، اس سے اس کی مراد دارالاسلام حقیقی ہے، اس لیے کہ دارالاسلام حکمی کی نسبت تو آپ متعدد اجلۂ فقہا کی تصریح پڑھ چکے کہ وہ کفار کے قہر وغلبہ کے باوجود دارالاسلام رہتا ہے''(۱)۔

اس کے بعد ضمناً آپ نے مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوری کی ایک عبارت کا رد کیا ہے، جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ جن بلاد میں اقتدار اعلیٰ کفار کے ہاتھ میں ہو، وہ بلاد دارالحرب ہیں۔

آگے بزازیہ کی ایک عبارت نقل کر کے لکھا ہے:

''پس یہ خیال کرنا کہ جب حکمرانی، بندوبستِ رعایا، اور خراج وعشورِ اموالِ تجارت کی وصولی، اور چوروں یا ڈاکوؤں کو سزا دینے کا اختیار مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ ہو، اس وقت تک یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ حکمِ اسلام جاری ہے، اور اسی خیال کو مذہبِ احناف ظاہر کرنا - جیسا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے - ان تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اگر مذکورہ بالا امور مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ ہوں، مگر اعلان کے ساتھ جمعہ وجماعت کی اقامت، شریعت کے احکام کے مطابق فیصلہ - پنچائتی سہی - اور افتا وتدریس بلانکیر شائع ہو، تو از روئے مذہبِ احناف یہ بھی دارالاسلام ہونے کے لیے کافی ہے، اور یہ کہنا صحیح ہے کہ احکامِ اسلام جاری ہیں''(۲)۔

اس کے بعد بقائے امن سابق اور استیمانِ جدید وغیرہ پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''اس اسلامی ملک میں غیر مسلموں کے تسلُّط سے پہلے مسلمانوں کو اسلام کی بنا پر اور ذمیوں کو عہد وپیمان کی بنا پر جو امان حاصل تھا، اُس امان کی بنیاد پر کوئی مسلم وذمی اس ملک میں رہنے نہ پائے؛ بلکہ از سرِنو موجودہ حکام سے امان حاصل کرنے کے بعد رہ سکے''(۳)۔

اور اسی ضمن میں بعض اہلِ علم کی تحریروں سے ظاہر ہونے والی اس غلط فہمی کا ازالہ بھی کیا ہے کہ ''جس ملک میں کوئی مسلمان یا ذمی بلا استیمان کے داخل نہ ہو سکے، وہاں امان سابق باقی نہیں رہا''، یعنی استیمان جدید سے مراد باہر سے آنے والے مسلمان یا ذمی نہیں ہیں، بلکہ خود اس ملک کے پرانے بسنے والے مسلمان اور ذمی ہیں۔

آگے 'بدائع الصنائع' کی ایک عبارت نقل کر کے اس کی تشریح میں موجودہ ہندوستان کی پوزیشن پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''اس عبارت میں جس امان وخوف کا ذکر ہے، اس کی نسبت یہ سمجھنا یا سمجھانا کہ وہ وہی خوف وامان ہے، جو آج ہندوستان میں پایا جاتا ہے، فقہا کی تصریحات کے خلاف ہے۔ فقہا کی تصریحات کی رُو سے امان وخوف سے وہ امان وخوف مراد ہے، جو خود حکومت کی طرف سے ملک کے باشندوں کو

(۱) دارالاسلام اور دارالحرب: ۱۴ (۲) ایضاً: ۱۵ (۳) ایضاً: ۱۷

حاصل ہوتا ہے، مثلاً دارالاسلام میں مسلمانوں کو قانونی طور پر خود حکومت کی جانب سے بلا کسی قید و شرط کے امان حاصل ہوتا ہے اور غیر مسلم باشندوں کو عقدِ ذمہ کی شرط کے ساتھ حاصل ہوتا ہے، اور دارالحرب میں اس کا عکس ہوتا ہے کہ غیر مسلم بلا شرط وقید مامون ہے اور مسلم بشرط استیمان۔ امان وخوف سے ملک کے شہریوں کے باہمی لڑائی دنگے، اور فرقہ وارانہ فسادات میں اتلافِ نفس وعرض ومال کا خوف اور بےخوفی مراد نہیں ہے''[1]۔

استیمان جدید کے موضوع پر کئی صفحات میں بحث وگفتگو کرنے کے بعد صفحہ ۲۲-۲۳ پر ۶/نکات میں اب تک کی بحث کا خلاصہ درج ذیل الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:

۱- جو بلاد کبھی اہلِ اسلام کے قبضہ میں نہیں آئے، وہ دارالحرب اصلی ہیں، جیسے ساؤتھ افریقہ۔

۲- جو بلاد غیر مسلموں کے ہاتھ سے نکل کر مسلمانوں کے قبضہ میں آئے اور آج تک انھیں کے قبضہ میں ہیں، وہ دارالاسلام اصلی ہیں، جیسے حجاز وشام ویمن ومصر وبغداد۔

۳- جن بلاد پر دوبارہ غیر مسلموں کا تسلط ہو گیا، اگر ان میں احکامِ اسلام- اعلانِ اذان واقامتِ جمعہ وعیدین، نکاح وطلاق بطریقۂ اسلام وغیرہ وغیرہ- جاری ہیں، اور ان کا کسی دارالحرب سے سرحدی اتصال نہیں ہے، اور اس میں مسلمانوں کو تجدید استیمان کی ضرورت نہیں پڑی، بلکہ وہ امان سابق کے ساتھ رہ رہے ہیں، تو وہ دارالاسلام حکمی ہیں، جیسے ہندوستان۔

۴- جن بلاد پر غیر مسلموں کا دوبارہ غلبہ ہو گیا اور ان میں احکامِ اسلام بالکل جاری نہیں ہیں، اور ان کا دوسرے دارالحرب سے سرحدی اتصال ہے، اور ان میں مسلمان بلا تجدید استیمان نہیں رہ سکتے، تو وہ دارالحرب حکمی ہیں، جیسے اسپین کہ وہاں تجدید استیمان کا کیا سوال؟ مسلمانوں کا وجود ہی ختم کر دیا گیا۔

۵- وہ بلاد جن پر غیر مسلموں کا دوبارہ تسلط ہوا، ان میں اگر احکامِ اسلام واحکامِ شرک دونوں جاری ہیں، تو وہ بھی دارالاسلام حکمی ہیں۔

۶- جو ملک مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر کفار کے ہاتھ میں چلا گیا، اگر وہ کسی دارالحرب کا ہم سرحد بھی ہو، اس میں مسلمان بلا استیمانِ جدید نہ رہ سکتے ہوں، تب بھی جب تک اس میں احکامِ اسلام جاری ہوں گے، وہ دارالاسلام رہے گا، دارالحرب نہ بنے گا۔

پھر اپنی بات کی تائید میں دس مشہور فقہاء احناف کے اقوال نقل کیے ہیں، اور ان کی روشنی میں ہندوستان کی نوعیت کے بارے میں پورے جزم ویقین کے ساتھ یہ فیصلہ کیا ہے:

''ان سب باتوں کو نگاہ میں رکھئے تو اس بات کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا کہ فقہا کے مذکورہ بالا ارشادات کے رُو سے ہندوستان کا دارالحرب ثابت ہونا ناممکن ہے، اور ان کی رُو سے وہ

(۱) دارالاسلام اور دارالحرب: ۱۹

بلا شک وشبہہ دارالاسلام ہے"۔(۱)

پھر اپنے فیصلے کی تائید میں متعدد اہل علم کے فتوے نقل کیے ہیں، جن میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالحی فرنگی محلی، مولانا کرامت علی جون پوری، علامہ انور شاہ کشمیری اور مولانا محمد حسین بٹالوی کے نام ہیں۔

اس کے برعکس کچھ نمایاں حضرات نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا، علامہ اعظمیؒ نے ان کے مقام ومرتبہ کا پوری طرح لحاظ کرتے ہوئے ان کی تحریروں کا ناقدانہ ومنصفانہ جائزہ لیا ہے، اور تاتاریوں کے زمانے کے اسلامی علاقوں، حتی کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے کے مدینے کے اطراف کی آبادیوں کی فقہی اور جغرافیائی تحقیق کر کے ان کی حیثیت متعین کی ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے ایک عنوان "دار کی قسمیں" قائم کر کے اس پر تقریباً پچیس صفحات پر مشتمل طویل بحث کی ہے، اور اس میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی متعدد تحریروں پر بطور خاص نقد کیا ہے، مولانا اکبرآبادی نے دار کی چار قسمیں کی ہیں: دارالاسلام، دارالحرب، دارالامن، دارالعہد۔ علامہ اعظمیؒ نے ان کے اس خیال کی تردید فرمائی اور لکھا کہ دار کی درحقیقت دو ہی قسمیں ہیں، دارالاسلام حقیقۃً یا حکماً، اور دارالحرب حقیقۃً یا حکماً، اور فقہا کی عبارتوں سے ثابت کیا ہے کہ دارالامن اور دارالعہد کوئی الگ قسم نہیں ہے، بلکہ دارالاسلام ہی میں اگر کوئی غیر مسلم یا کافر امان حاصل کر کے یا عہد وپیمان کے ذریعے داخل ہوتا ہے، تو اس کے حق میں دارالامن ہے، اور اسی طرح کوئی مسلم اگر عہد وپیمان کے ذریعے دارالحرب میں جاتا ہے، تو اس کے لیے وہ دارالامن ہوگا۔

مولانا اکبرآبادی نے لکھا تھا کہ دارالحرب اور دارالامن کا سراغ عہد صحابہ تک نہیں ملتا، علامہ اعظمیؒ نے ذخیرۂ احادیث سے دس مثالیں نقل کر کے ثابت کر دکھایا ہے کہ یہ اصطلاحیں عہدِ نبوی کے وقت موجود تھیں، اور ان کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

> "یہ دس حوالے بلا کسی خاص کاوش کے نظر کے سامنے آ گئے، جو ہم نے پیش کر دیے ہیں، ان کو دیکھنے کے بعد کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ دارالاسلام ودارالحرب کی اصطلاح عہد نبوی میں موجود ہو گئی تھی، اس کے بعد عہد صحابہ وعہد تابعین میں وہ برابر معروف ومستعمل رہی، ہاں یہ ضرور ہے کہ دارالاسلام کو ابتدا میں زیادہ تر دارالہجرۃ یا دارالمہاجرین کہا جاتا تھا، اور دارالحرب پر ارض الحرب یا ارض العدو کا اطلاق زیادہ ہوتا تھا، اس کے علاوہ اس پر دارالکفر اور ارض الکفر، بلدۃ الکفر کا اطلاق بھی ہوا ہے"۔(۲)

کتاب کا ایک عنوان "دارالحرب سے ہجرت کا حکم" ہے، اس موضوع پر تقریباً دس صفحات میں نہایت نفیس اور عمدہ بحث کرنے کے بعد بطور خلاصہ تحریر فرمایا ہے:

> "۱- فتح مکہ کے بعد ہر دارالحرب سے ہجرت واجب نہیں، بلکہ بعض سے واجب ہے، اور بعض

(۱) دارالاسلام اور دارالحرب: ۲۸ (۲) ایضاً: ۶۳-۶۲

سے واجب نہیں ہے۔

۲-جس دارالحرب سے ہجرت واجب نہیں ہے، اس کے باب میں علما کے دوقول ہیں: ایک یہ کہ مستحب ہے، دوسرا یہ کہ وہاں قیام ہی افضل ہے''[۱]۔

کتاب کا ایک اہم باب ''دارالحرب میں سود'' ہے، اس بحث میں طویل اور مفصل گفتگو فرمائی ہے، اور اس کے ضمن میں متعدد اہل علم کی تحریروں پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے، اوران کی فروگزاشتوں کو نہایت متین اسلوب اور بہترین پیرائے میں بیان کیا ہے، اور جو بات بھی لکھی ہے، عبارات فقہا کی روشنی میں مدلّل ومبرہَن لکھی ہے، اس میں علامہ اعظمیؒ نے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا ظفر احمد تھانویؒ اور مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ کی تحریروں سے اختلاف کیا ہے، اوران پر نہایت محققانہ انداز میں اور پوری دیدہ وری کے ساتھ نقد وتبصرہ کیا ہے۔

اس کتاب میں ضمناً اور بھی کئی ایک اہم بحثیں آ گئی ہیں، مثلاً اعفاء لحیہ-ڈاڑھی بڑھانا-، تصویر کھنچوانا، بے پردگی اور عریانی وغیرہ، ان سب موضوعات پر بھی اس کتاب کے آخر میں نہایت بصیرت افروز اور چشم کشا گفتگو کی گئی ہے، اور ہر مسئلے کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ واضح اور روشن کیا گیا ہے، مثلاً اعفاء لحیہ کی بحث میں رقم طراز ہیں:

''اسلام بعض دوسرے مذاہب کی طرح چند عبادات یا رسوم کے مجموعہ کا نام نہیں ہے، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، جو مسلمان ایسا نہیں سمجھتا، وہ متعدد آیات اور ہزاروں حدیثوں کا منکر ہے، قرآن پاک اور نبوی تعلیمات کی رُو سے جس طرح نماز، روزہ، حج اور زکوۃ دین ہیں، اسی طرح بیع وشرا، نکاح وطلاق، اکل وشرب، زِیّ ولباس اورنشست وبرخاست سے متعلق قرآن وحدیث کے بتائے ہوئے طریقے بھی دین ہیں، اور یہ سب امور داخلِ دین ہیں، یہ الگ بات ہے کہ تمام امور دین، اور سب اجزاء اسلام اور سارے شُعبِ ایمان بدرجۂ مساوی نہیں ہیں، کچھ فرائض وواجبات ہیں، کچھ سنن ہیں، کچھ مستحبات ومندوبات ہیں، اور کچھ آداب ہیں، لیکن فرقِ مراتب کے ساتھ ہیں سب کے سب دین کے اجزا اور ایمان کے شعبے''[۲]۔

آگے تحریر ہے:

''اعفاء لحیہ کا امورِ دین سے ہونا تو دینی وفقہی نقطۂ نظر سے ایسا واضح وبیِّن ہے کہ اگر آدمی کی دینی وایمانی بصیرت بالکل مسلوب نہ ہوگئی ہو، تو اس کو دین ماننے میں ایک لمحہ بھی توقف نہیں کرسکتا، اس لیے کہ صحیح حدیث میں خود رسول اللہ ﷺ نے اس کو ''**من الفطرة**'' فرمایا ہے، اور علماء جانتے ہیں کہ **من الفطرة** کے معنی **من الدين** ہیں، یعنی وہ دین کی بات ہے، اور اگر **من الفطرة** کا ترجمہ **من سنن الأنبياء** -انبیا کی سنت- کیا جائے، تو وہ بھی ہمارے مدعا کے منافی نہیں ہے، اس لیے کہ جو چیز تمام انبیاء کی سنت ہوگی، وہ امور عادیہ میں نہیں، بلکہ امورِ دین ہی سے قرار پائے گی''[۳]۔

---

(۱) دارالاسلام اور دارالحرب: ۷۵ (۲) ایضاً: ۱۰۵ (۳) ایضاً: ۱۰۶

اور تصویر کھنچوانے یا رکھنے کی بحث میں جو تحریر فرمایا ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''کتاب وسنت کے شیدائی، خلیلیت کے علم بردار، اور ہر ہر بات میں کتاب وسنت سے دلیل مانگنے والے ان علماء پر حیرت ہے، کہ زیارتِ قبرِ نبوی کے لیے سفر تو ہزاروں بلکہ لاکھوں الراسخون فی العلم کی تحقیق میں مندوب ہونے کے بعد بھی ان کے نزدیک مباح نہیں ہو سکا؛ اور تصویر کشی جو از روئے احادیثِ صحیحہ ومشہورہ علی الاطلاق حرام تھی، وہ بعض علماء کی تجویز سے جائز ہوگئی، کیا دستی تصویر اور فوٹو میں تفریق کسی حدیث میں آئی ہے، یا آثارِ صحابہ وتابعین میں؟ اگر کہئے کہ نزولِ حکم کے زمانے میں ہاتھ ہی سے تصویر کھینچی جاتی تھی، لہذا وہی ممنوع ہوگی، فوٹو کا وجود ہی کہاں تھا کہ وہ ممنوع ہوگا۔ تو گزارش ہے کہ اس منطق کی رو سے زیارتِ قبر نبوی کے لیے سفر کجاووں میں منع ہوگا؛ موٹروں اور کاروں میں، یا ہوائی جہازوں میں ہرگز منع نہ ہوگا، اس لیے کہ یہ چیزیں اُس وقت تھیں کہاں کہ ان میں سفر کی ممانعت کا حکم دیا جاتا''(۱)۔

اس کے ایک پیرگراف کے بعد لکھا ہے:

''ہماری نظر میں جس مقصد سے شریعتِ مطہرہ نے دستی تصویر کو ممنوع قرار دیا ہے، بعینہ اسی مقصد کے لیے فوٹو کھنچوانا اور کھینچنا بھی ممنوع ہے، اور وہ مقصد ہے ان تمام راستوں کو بالکلیہ بند کرنا جن راستوں سے سوسائٹی میں شرک کے گھسنے کا امکان ہو، اور یہی وجہ ہے کہ ایک آدھ کے سوا کسی متدین فقیہ اور متبحر عالم نے فوٹو کھنچوانے کی عام اجازت نہیں دی ہے، بالخصوص علماء ہند وپاک جو علمی تبحر میں کسی دوسرے ملک کے علماء سے کم نہیں ہیں، اور تدین میں تو عالمِ اسلامی کے علماء سے بدر جہا بہتر ہیں''(۲)۔

یہ رسالہ اولاً بمبئی سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'البلاغ' میں -جنوری تا نومبر ۱۹۶۷ء- بالاقساط چھپا تھا، اور دس قسطوں میں مکمل ہوا تھا، دوبارہ اس کی اشاعت المآثر میں جلد نمبر ۹ شمارہ نمبر ۳ تا جلد نمبر ۱۰ شمارہ نمبر ۴ تک چھ قسطوں میں ہوئی۔ اس کے بعد کتابی شکل میں ۱۴۲۳ھ=۲۰۰۲ء میں اس کا پہلا اڈیشن مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو سے شائع کیا گیا۔

(۱) دارالاسلام اور دارالحرب: ۱۰۸ (۲) ایضاً: ۱۰۹

☆......☆......☆......☆......☆

☆......☆......☆......☆

☆......☆......☆

☆......☆

☆

سیرت

تاریخ و تذکرہ

آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا

تقریباً پانچ صفحات پر مشتمل یہ حضرت محدث الاعظمیؒ کا ایک مختصر مگر جامع مضمون ہے، اس میں مغز ہی مغز ہے، اس کا آغاز اس مستحکم اور غیر متزلزل لب و لہجے میں ہوتا ہے:

''مسئلۂ ختم نبوت اسلام کا وہ بدیہی مسئلہ ہے، جس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو مسئلہ قرآن کریم میں بصراحت مذکور ہو، اور جو صدہا احادیث صحیحہ میں بالفاظ غیر مشتبہ بیان کردیا گیا ہو، اس کے خلاف منھ سے کوئی لفظ نکالنے کی جرأت کوئی مسلمان کیونکر کرسکتا ہے؟! اور اگر کوئی نام نہاد مسلمان اس مسئلہ سے اختلاف بھی کرے، تو مسلمان اس کی آواز کو کیا وقعت دے سکتے ہیں؟!''(۱)

اس مختصر اور چند سطری تمہید کے بعد حضرت علامہ اعظمیؒ نے مسئلۂ ختم نبوت سے متعلق اپنے دلائل پیش کیے ہیں، آپ کا سب سے پہلا استدلال آیت کریمہ ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ سے ہے، پھر اس آیت اور بالخصوص خاتم النبیین کی تفسیر میں بشمول حضرت شاہ ولی اللہ، و شاہ رفیع الدین، و شاہ عبدالقادر، پندرہ مفسرین کے اقوال پیش کیے ہیں، ان تمام اقوال کا خلاصہ یہی ہے کہ سلسلۂ نبوت آپ کی ذات اقدسؐ پر ختم ہوتا ہے، اور آپ کے بعد کوئی نبی اور پیغمبر نہ ہوگا۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ یہ پندرہ نام بطور نمونہ کے لکھے گئے ہیں، ورنہ خاتم النبیین سے آخری نبی مراد ہونے پر علماء کے اقوال جمع کیے جائیں، تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔

پھر احادیث شریفہ کے ذخیرے سے ۲۲؍ایسی حدیثیں نقل کی ہیں، جو سلسلۂ نبوت کے آپ کی ذات شریف پر ختم ہونے اور آپ کے آخری نبی ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

آپ کا یہ مضمون پہلی دفعہ 'الصدیق' ملتان کے جمادی الاولی ۱۳۷۳ھ = فروری ۱۹۵۴ء میں اور دوبارہ 'المآثر' جلد ۹، شمارہ ۱، محرم - ربیع الاول ۱۴۲۱ھ = مئی - جولائی ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔

☆......☆......☆

شان رحمۃ للعالمین

سیرت نبوی پر یہ ایک مختصر مگر جامع اور پرمغز تحریر ہے، اس میں آپ نے آنحضرت ﷺ کا رحمۃ للعالمین ہونا احادیث طیبہ مبارکہ کی روشنی میں نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا ہے، ان احادیث و تعلیمات سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ذات گرامی ﷺ صرف بنی نوع انسان کے لیے رحمت بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے، بلکہ آپؐ کی تعلیمات جانوروں اور چوپایوں کے لیے بھی باعثِ رحمت تھیں۔

(۱) المآثر جلد ۹ شمارہ ۱، ص: ۹

علامہ اعظمیؒ نے مضمون کے آغاز میں بعثتِ نبویؐ سے پہلے ملک عرب بلکہ عالم انسانیت کا نہایت بلیغ انداز سے نقشہ پیش کیا ہے، لکھا ہے:

''حضرت مسیح علیہ السلام کو دنیا میں آئے ہوئے تقریباً چھ سو برس گزر چکے ہیں، روئے زمین بعینہ وہی نقشہ پیش کر رہا ہے، جو عموماً انبیاء و مرسلین اور مصلحین امت کے برکاتِ وجود اور آثارِ فیض سے ایک مدت دراز تک محروم رہنے کے بعد ہوا کرتا ہے۔ دنیا کا گوشہ گوشہ تاریک، روئے زمین کا چپہ چپہ تیرہ و تار ہے، اِس سرے سے اُس سرے تک حق و صداقت کی دھندلی سی روشنی بھی نظر نہیں آتی، رشد و ہدایت کے کسی ٹمٹاتے ہوئے چراغ، یا جھلملاتے ستارے کا سہارا بھی نہیں ہے، تہذیب و تمدن کا چراغ گل ہے، فلسفہ و حکمت کا بازار سرد ہے، سارے عالم میں ایک گمراہی اور ضلالت پھیلی ہوئی ہے، دنیا حق پرستی کے نام سے ناآشنا ہو چکی ہے، باطل پرستی کا زور ہے، کفر و شرک، فسق و فجور، ظلم و عدوان کی گرم بازاری ہے، افرادِ انسان توحید کا سبق بھلا بیٹھے ہیں، آخرت کی یاد دلوں سے محو ہو چکی ہے، زمین کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں صرف ایک خدا کی عبادت کی جاتی ہو''(۱)۔

آفتاب نبوت کے طلوع ہونے کے بعد اس تیرہ و تار دنیا کی حالت یکلخت بدل کر کیا سے کیا ہو گئی، اس کے متعلق لکھا ہے:

''وہ مہر جہاں تاب رسالت افقِ عرب سے طلوع ہو کر اس ادا سے تجلی ریز ہوا کہ اس کی ضیا پاش کرنوں سے عالم کون کا ذرہ ذرہ جگمگا اٹھا، زمین کا گوشہ گوشہ اس کی تجلیات سے بقعۂ نور بن گیا''(۲)۔

علامہ اعظمیؒ نے پیغمبر اسلام نبی آخر الزماں ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کے صدقے میں اسلامی احکام اور اسلامی شریعت کے اعتدال و توازن کو ذکر کرنے سے پہلے اگلی شریعتوں بالخصوص حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں جو سخت احکام و قوانین پائے جاتے تھے، ان کو ذکر کیا ہے، پھر انسانوں کے جو باہمی حقوق ہیں ان کو ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ''اولاد اور والدین کے حقوق'' سے متعلق صحاح ستہ وغیرہ سے متعدد حدیثیں ذکر کی ہیں، پھر ''پڑوسی کے ساتھ ہمدردی''، عامہ مسلمین کی خیر خواہی، تمام اہل زمین کے ساتھ رحم دلی، خادموں اور غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک، عورتوں کی دادرسی، جانوروں کے ساتھ رحم دلی، جیسے عناوین پر آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ مبارکہ کو ذکر کر کے دکھایا ہے کہ حضرت سرکار رسالت مآب ﷺ کی مقدس ذات اور پاکیزہ تعلیمات اس جہان رنگ و بو کے لیے سراپا رحمت تھیں۔

یہ مضمون ۲۹ر اگست ۱۳۲۷ھ کا تحریر فرمودہ ہے، اس وقت آپ بنارس میں اقامت گزیں تھے۔ یہ پہلی دفعہ ۴ر ربیع الاول ۱۳۴۶ھ = یکم ستمبر ۱۹۲۷ء کو پندرہ روزہ 'ارشاد' میں طبع ہوا تھا، دوبارہ سہ ماہی المآثر جلد ۸ شمارہ ۱، محرم- ربیع الاول ۱۴۲۰ھ = مئی- جولائی ۱۹۹۹ میں شائع ہوا۔ ☆......☆......☆

---

(۱) المآثر: ج ۸ ش ۱، ص: ۱۰-۹ (۲) ایضاً: ۱۱

سیرۃ طحاوی

یہ علامہ اعظمیؒ کا ایک نامکمل رسالہ ہے، آپ کو امام طحاوی کی کتابوں کے ساتھ خاص دلچسپی تھی، جس کا اثر تھا کہ آپ نے 'شرح معاني الآثار' اور 'شرح مشكل الآثار' کے رجال و رواۃ اور ان کے حالات کی تلاش و جستجو اور ان کے جمع و ترتیب کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ درحقیقت امام طحاوی کی تصانیف کو حنفی نقطۂ نظر سے ایک نمایاں اور امتیازی مقام حاصل ہے، اور انھوں نے اپنی بیش بہا تالیفات کے ذریعے مذہب احناف کو جو قوت پہنچائی ہے، وہ ناقابل فراموش ہے۔ اس لیے منت شناسی کا یہ تقاضا تھا کہ تفصیل کے ساتھ ان کی حیات اور سیرت قلم بند کی جاتی، اور علامہ اعظمیؒ نے اسی کے لیے اپنی اس تصنیف – سیرت طحاوی – کا آغاز کیا تھا، اور غالباً آپ کا ارادہ امام طحاویؒ پر ایک مبسوط اور مفصل کتاب لکھنے کا تھا، لیکن افسوس کہ دوسری بہت سی تصانیف کی طرح یہ بھی تشنۂ تکمیل رہ گئی، اس وقت چند صفحات پر مشتمل آپ کا جو مسودہ موجود ہے، اس میں بھی بہت سی جگہوں پر بیاض ہے، جو کہیں چند الفاظ اور جملوں کا ہے، کہیں چند سطروں اور کہیں کئی کئی صفحوں کا ہے۔

امام طحاوی کی جائے پیدائش کا نام ''طحا'' ہے، جو مصر کے زرخیز علاقے ''صعید مصر'' کا ایک اہم مقام ہے، علامہ اعظمیؒ نے اپنی کتاب کا آغاز اسی صعید مصر کے تعارف سے کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''صعید مصر زمین کے اس رقبہ کا نام ہے، جو قاہرہ کے جنوب مشرق میں ارض نوبہ تک، اور مشرق میں بحر احمر (ریڈسی) تک، مغرب میں .... پھیلتا چلا گیا ہے۔
>
> طول میں شتر کی رفتار سے بارہ دن کی مسافت، اور عرض میں ۳-۴ گھنٹے کا راستہ ہے، مصر میں یہ زمین نہایت شاداب و زرخیز ہے، کبھی اس میں ۹۵۷ شہری اور دیہاتی آبادیاں موجود تھیں، صعید کے تین حصے ہیں: صعید اعلی، صعید اوسط، صعید ادنی۔ اسوان سے اخمیم تک کی آبادیاں صعید اعلی میں داخل ہیں، اور صعید اوسط اخمیم سے بہنسا تک پر بولا جاتا ہے، اور بہنسا سے قاہرہ تک صعید اعلی کہلاتا ہے''[1]۔

اس کے بعد چند سطروں میں حضرت فاروق اعظم کے زمانے میں صعید مصر کی فتح یابی اور اسلام کے مفتوحہ ممالک میں داخل ہونے کی تاریخ ذکر کی ہے۔ پھر صعید کی مردم خیزی اور اس کی علمی و ثقافتی تاریخ پر مرتب ہونے والی کتابوں کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''سرزمین صعید جیسی زرخیز ہے ویسی ہی مردم خیز بھی واقع ہوئی ہے، تعلیم کا یہاں بہت خاصہ اہتمام [تھا]، چنانچہ صرف اقلیم قوص میں – جو صعید اعلی کا ایک حصہ ہے – کسی زمانے میں ۲۸ مدرسے تھے۔ کئی ہزار علما و فضلا کے نام آج بھی بتائے جا سکتے ہیں، جن کا انتساب اسی سرزمین کی طرف ہے، صرف صعیدِ اعلی کے فضلا و رواۃ کے حالات میں کمال الدین ادفوی – المتوفی ۷۴۸ – نے '**الطالع السعيد**'

(۱) سیرت طحاوی (قلمی)۔

لکھی ہے، اس میں صعید کے ایک حصہ کے بلکہ اس کے صرف ایک شہر قوص کے تقریباً چھ سو فضلا کے حالات جمع کیے ہیں، بقیہ حصوں کے علما و فضلا کی صحیح تعداد کون بتا سکتا ہے، تاہم ابن یونس کی تاریخ اگر دستیاب ہوجائے تو چوتھی صدی تک کے اہل علم کی ایک کثیر تعداد سے پردہ اٹھ سکتا ہے، چوتھی صدی کے بعد کے لیے 'تاریخ مصر' للقطب الحلبی وغیرہ کی کتابوں کی ورق گردانی ضروری ہے، علماء صعید کے حالات میں ابوجعفر ادریسی کی ایک نادر تصنیف '**المفيد في ذكر من كان بالصعيد**' ہے''(۱)۔

آگے رقم طراز ہیں:

''صعید کے ایک شہر فیوم اور اس کے مضافات کے حالات صفدی نے لکھے ہیں، یہ کتاب مصر سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے''(۲)۔

پھر صعید کے متعدد بڑے شہروں اور اس خطے کے عہد جدید کے فضلا میں طنطاوی جوہری (مفسر) اور 'عبرات' و 'نظرات' کے مصنف منفلوطی کا ذکر کر کے ''طحا'' کی نسبت لکھا ہے:

''طحا اسی صعید مصر میں بہنسا اور اشمونین کے مابین نیل کے غربی ساحل سے تھوڑے فاصلے پر آباد تھا، یہاں سرخ مٹی کے نہایت خوش نما پیالے بنتے تھے، اس صنعت کی وجہ سے نزدیک و دور اس کی خاصی شہرت تھی''(۳)۔

اس کے بعد عہد عباسی میں ''طحا'' میں رونما ہونے والی بعض شورشوں اور جنگوں اور ان میں امام طحاوی کے دادا اسلامہ بن عبدالملک کے کردار، نیز ''طحا'' کے بعض دوسرے فضلا کا نام لکھ کر فرماتے ہیں:

''شہرت کے ان تمام وسائل وذرائع کے باوجود بھی ابھی بہت سے کان ''طحا'' کے نام سے ناآشنا تھے، لیکن امام ابوجعفر احمد بن محمد کے انتساب نے ''طحا'' کو شہرت کے پر لگا دیے، دنیا کا کوئی گوشہ، زمین کا کوئی چپہ نہ ہوگا، جہاں ''طحا'' کے جاننے والے نہ ہوں۔

ابوجعفر کے آبائی وطن اور مقام پیدائش ہونے کا فخر وامتیاز اسی ''طحا'' کو حاصل ہے''(۴)۔

ولادت و نام ونسب:

اس عنوان کے تحت علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ ربیع الاول کی گیارہویں تاریخ یکشنبہ کو امام موصوف ''طحا'' میں زینت افزائے بزم ایجاد ہوئے۔ آپ کی ولادت کے سنہ میں پائے جانے والے متعدد اختلافات کو ذکر کر کے متعدد شواہد کی روشنی میں ۲۳۹ھ کو صحیح اور راجح قرار دیا ہے۔ اس کے بعد امام طحاوی کا نام ونسب یوں لکھا ہے:

''احمد بن محمد بن سلامہ بن سلمہ (یا مسلمہ) بن عبدالملک بن سلمہ بن سلیم بن سلیمان بن حباب (یا خالد)، قبیلہ ازد کی ایک شاخ حجر ہے، چونکہ امام موصوف اسی شاخ سے نسبی تعلق رکھتے تھے، اس لیے ازدی حجری کہلائے''(۵)۔

(۱) سیرت طحاوی (۲) ایضاً (۳) ایضاً (۴) ایضاً (۵) ایضاً

خاندانی حالات:

اس کے ماتحت لکھا ہے کہ ان کے خاندانی حالات تفصیل سے معلوم نہ ہو سکے، بجز اس کے کہ ان کے دادا سلامہ کا نام بعض واقعات کے ضمن میں ملتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

''امام موصوف کا خاندان بہت باعزت اور اونچا خاندان تھا، اور سلامہ کو طحا میں ایک رئیس کی حیثیت حاصل تھی''(۱)۔

امام موصوف کے والدین:

اس عنوان کے تحت ایک صفحے میں ان کے والدین کے حالات قلم بند فرمائے ہیں، اس کی ابتدا میں لکھا ہے:

''امام کے والد محمد بن سلامہ ایک ذی علم و تعلیم یافتہ شخص تھے، خصوصاً حفظ و روایتِ اشعارِ عرب، وعربیت میں خاصہ دخل تھا، چنانچہ امام موصوف نے 'مشکل الآثار' میں ایک شعر کی تصحیح اپنے والد سے نقل کی ہے''(۲)۔

پھر 'سنن شافعی' اور بعض تاریخی حوالوں سے سخن فہمی اور علم دوستی و زبان دانی کے بعض واقعات نقل کر کے مذکورہ بالا دعوے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ محمد کی وفات ۲۶۴ھ میں ہوئی، اس وقت امام طحاوی کی عمر ۲۵ برس تھی۔ محمد کے ایک بھائی ابراہیم نام کے تھے، جو جنگ ''طحا'' میں اپنے والد کے ساتھ قتل کیے گئے تھے۔

اس کے بعد امام طحاوی کی والدہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا نام معلوم نہیں ہو سکا، وہ امام اسماعیل مُزَنی کی بہن تھیں، مزنی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے وہ شاگرد تھے، جنھوں نے شافعیت کی بنیادیں استوار کیں، اور مذہب شافعی کی تائید و اشاعت میں غیر معمولی خدمات انجام دیں، خود بہن - مادر امام طحاوی - کا حال یہ لکھا ہے:

''طحاوی کی والدہ محترمہ بھی بھائی کی طرح امام شافعی کی شاگرد اور ان کی صحبت یافتہ تھیں، اور امام شافعیؒ کے فیوض و برکات حاصل کرنے میں مردوں کے دوش بدوش تھیں، چنانچہ رافعی نے 'شرح وجیز' میں ایک مسئلہ میں ان کا بھی قول نقل کیا ہے؛ اور علامہ سیوطی نے 'حسن المحاضرۃ' میں ان کا ذکر ان لوگوں کے سلسلے میں کیا ہے، جو بلا واسطہ امام شافعی سے نسبت تلمذ رکھتے ہیں، سیوطی [نے] یہ بھی تصریح کی کہ ابن السبکی اور .... نے 'طبقات الشافعیۃ' میں ان کا ذکر کیا ہے۔ موصوفہ کا سن وفات معلوم نہ ہو سکا''(۳)۔

بعد ازاں مسودے میں پانچ ورق - دس صفحات - کے بقدر بیاض ہے، اس کے بعد یہ عنوان ہے:

(۱) سیرت طحاوی (۲) ایضاً (۳) ایضاً

سن رشد، تعلیم وتربیت، شیوخ واساتذہ:

اس عنوان کے بعد مضمون کی ابتدا ان الفاظ میں کی ہے:

''یہ معلوم ہونے کے بعد کہ امام طحاوی کے والد خود اہل علم، اور کبار اہل علم کے صحبت یافتہ تھے، امام کی والدہ امام شافعی کے مایۂ ناز شاگرد اسماعیل مزنی کی حقیقی بہن تھیں، یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ امام نے کس ماحول میں نشو ونما پائی ہوگی، اور ان کی تعلیم وتربیت میں کیا کچھ اہتمام کیا گیا ہوگا''(۱)۔

علامہ اعظمیؒ نے ثبوتوں کی روشنی میں اور حوالوں کے ساتھ لکھا ہے کہ امام طحاوی نے ۱۳ ؍برس کی عمر سے پہلے ہی حدیث کا سماع وحفظ شروع کر دیا تھا، شیوخ مصر سے تحصیل علم کے بعد ۲۶۸ھ میں عازمِ شام ہوئے، اور وہاں کے علما ومحدثین سے فیض یاب ہو کر پورے ایک برس بعد مصر واپس ہوئے، ان کے شیوخ واساتذہ کی نسبت علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ:

''امام طحاوی کے شیوخ کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اکثر شیوخ ۲۷۰ھ کے اندر ہی اندر دنیا سے کوچ کر چکے تھے''(۲)۔

علامہ اعظمیؒ نے ایک نقشہ بنا کر ان کے تیئیس (۲۳) شیوخ کے اسما، ان کے سنین وفات، اور اس وقت امام طحاوی کی عمر کو دکھایا ہے، جن کی وفات کے وقت امام کی عمر ۱۴ سے ۳۰ سال کے درمیان تھی۔ پھر لکھا ہے کہ انھوں نے یونس بن عبدالاعلی سے 'موطا ابن وہب' کی سماعت کی تھی، مزنی سے 'سنن شافعی' اور 'مختصر مزنی' کی روایت کرتے ہیں، اور ولاد نحوی - متوفی ۲۶۳ھ - سے عربیت کی تحصیل کی۔ اس کے بعد لکھا ہے:

''امام طحاوی نے جس وقت ہوش سنبھالا ہے، اس وقت مصر تمام علوم وفنون کا گہوارہ بن چکا تھا، اور احمد بن طولون کی داد گستری، ومعارف پروری کے شہرہ نے تمام عالم اسلام کے باکمالوں کو مصر میں جمع کر دیا تھا؛ کوفہ، بصرہ، بغداد کی علمی مجلسیں ٹوٹ کر مصر میں از سر نو قائم ہو رہی تھیں''(۳)۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے امام طحاویؒ کے متعدد ایسے اساتذہ وشیوخ حدیث کا ذکر کیا ہے، جو بلادِ اسلام کے مختلف مراکز کے اصحابِ فضل وکمال اور مشائخِ حدیث تھے، مگر مصر جا کر طرح اقامت ڈال دی تھی، اور روایت واشاعتِ حدیث کی مسندیں آراستہ کی تھیں۔

رحلت:

اس عنوان کے تحت علامہ اعظمیؒ نے امام طحاویؒ کے اسفار کو بیان کیا ہے، جس میں ۲۶۸ھ میں سفر شام کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ امام نے اس سفر میں بیت المقدس، غزہ، عسقلان، طبریہ، طرسوس، رملہ، شیزر وغیرہ میں حدیثوں کی تحصیل کی ہے۔ علامہ اعظمیؒ اس کے ضمن میں لکھتے ہیں:

---

(۱) سیرت طحاوی (۲) ایضاً (۳) ایضاً

''مورخین نے اسی ایک رحلت کا ذکر کیا ہے، لیکن یہ یقینی ہے کہ طحاوی نے حجاز کا سفر بھی کیا ہے، محدثینِ مکہ -مثلاً: ابویحیی بن ابی مسرۃ، محمد بن علی مکی صائغ، محمد بن اسماعیل صائغ، محمد بن ربیعہ مکی، ابراہیم ابن عمر خلال وغیرہم- اور شیوخِ مدینہ -جیسے مصعب بن ابراہیم، عبدالعزیز زبالی وغیرہ- سے اپنی تصانیف میں وہ بکثرت روایت کرتے ہیں، اوران میں سے کسی ایک کا مصر آنا معلوم نہیں ہے، اس لیے بلاشبہہ مکہ ومدینہ میں وہ ان سے ملے ہیں''(۱)۔

شیوخِ طحاوی:

اس عنوان کے تحت ابوابراہیم اسماعیل بن یحییٰ مزنی، احمد بن ابی عمران اور بکار بن قتیبہ کا تذکرہ ذرا تفصیل سے ہے، اور سرسری طور پر مشہور اساتذہ میں یونس بن عبدالاعلی، محمد بن خزیمہ بصری، ابراہیم بن ابی داود، یزید بن سنان بصری، ابوامیہ طرسوسی، علی بن شیبہ، ابراہیم بن مرزوق، امام نسائی اور سب سے قدیم الوفاۃ استاذ ہارون بن سعید ایلی کا نام لکھا ہے، اس باب کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے:

''وہ اساتذہ جن سے امام نے علوم حاصل کیے، ان کا صحیح شمار نہیں بتایا جاسکتا، 'شرح معانی الآثار' و'مشکل الآثار' میں جن شیوخ سے روایت کی ہے، ان کی تعداد پونے دوسو کے قریب ہے (تفصیل ہماری کتاب 'مشیخۃ الطحاوی'(۲) میں ملاحظہ کیجئے) اور ظاہر ہے کہ اساتذۂ طحاوی کی یہ مجموعی تعداد نہیں ہے، بہت سے ایسے اساتذہ ہوں گے، جن سے دوسری تصنیفات میں روایت کی ہوگی، کتنے ایسے ہوں گے، جن سے روایت کا اتفاق نہ پڑا ہوگا۔ ہم کو ایسے چند نام بھی دستیاب ہوئے ہیں، جن سے مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ کسی کتاب میں روایت کی ہے، یہ نام ہم نے 'مشیخۃ الطحاوی' میں درج کر دیے ہیں''(۳)۔

اسماعیل مزنی کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ اعظمیؒ نے ارقام فرمایا ہے کہ ابتداءً ان ہی کی خدمت میں امام طحاوی نے زانوئے ادب تہہ کیا ہے، اور ان ہی سے امام طحاوی نے 'سنن شافعی' اور 'مختصر شافعی' جس کو 'مختصر مزنی' بھی کہتے ہیں، روایت کیا ہے، امام طحاوی کا روایت کردہ مجموعہ 'سنن شافعی' مصر سے چھپ بھی گیا ہے۔ لیکن ایک دفعہ ایک بات ایسی پیش آئی جو امام طحاوی کی زندگی میں نقطۂ انقلاب بن گئی، علامہ اعظمیؒ نے اس واقعے کو یوں قلم بند کیا ہے:

''امام طحاوی اپنے ماموں کے پاس پڑھتے تھے، ایک روز کسی بات پر مزنی بہت خفا ہو گئے، اور

---

(۱) سیرت طحاوی

(۲) 'مشیخۃ الطحاوی' نامی اپنی تصنیف کا علامہ اعظمیؒ نے اس کتاب میں کئی جگہ تذکرہ کیا ہے، لیکن افسوس کہ ہم کو آپ کی باقیات میں یہ کتاب دستیاب نہ ہوسکی، بظاہر دستبرد زمانہ کی نذر ہوگئی۔

(۳) سیرت طحاوی

فرمایا کہ ''بخدا تم کو کچھ نہ آئے گا''۔ ان کا یہ جملہ تیر ونشتر کا کام کر گیا، بھانجے نے ماموں کی مجلس میں جانا ترک کر دیا، اس وقت احمد بن ابی عمران حنفی کے فضل وکمال کی مصر میں دھوم مچی ہوئی تھی، امام طحاوی بھی ان کی مجلس درس میں شریک ہوئے، فقہ شافعی کی تکمیل تو ہو ہی چکی تھی، ابن ابی عمران کی مجلس میں فقہ حنفی کی تحصیل کے لیے اپنی تمام تر توجہ وقف کر دی۔ ابن ابی عمران کو فن حدیث کے علاوہ فقہ میں بڑا کمال حاصل تھا، فقہ کی تحصیل کے لیے ان سے بہتر آدمی ملنا دشوار تھا، امام طحاوی نے ان کے وجود کو غنیمت سمجھ کر جب تک امامت کے منصب پر فائز نہیں ہو چکے، استفادہ میں کمی نہیں کی''[۱]۔

علامہ اعظمیؒ نے اس باب کے آخر میں ایک نقشہ دیا ہے، جس میں امام طحاویؒ کے ان اساتذہ کا نام مذکور ہے، جن سے صحاح ستہ کے مصنفین بھی روایت کرتے ہیں، اور کالم بنا کر ہر ایک استاذ کے نام کے سامنے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ان کی روایت صحاح ستہ کی کس کتاب میں ہے، اس نقشے میں کل ۳۵ شیوخِ حدیث کے نام ہیں۔

امام طحاویؒ کے ممتاز تلامذہ:

اساتذہ کے بعد ایک باب ''امام طحاوی کے ممتاز تلامذہ'' کا ہے، اس باب کا ابتدائیہ یہ ہے:

''میرا خیال ہے کہ امام نے پچاس سال سے زائد تک احادیث کی نشر و اشاعت کی ہے، اتنی طویل مدت میں جتنے افراد نے آپ سے استفادہ کیا ہوگا، کوئی اس کی صحیح تعداد نہیں بتا سکتا، تذکرہ نویسوں نے معدودے چند مشاہیر کے نام لکھے ہیں، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس تعداد کو شاگردوں کی مجموعی تعداد سے وہی نسبت ہو سکتی ہے جو قطرہ کو دریا سے ہے''[۲]۔

امام طبرانی:

زمرۂ تلامذہ میں سب سے اول مسند الدنیا ابو القاسم سلیمان بن احمد بن ایوب -مولود ۲۶۰ھ متوفی ۳۶۰ھ- کا تذکرہ کیا ہے، جو تقریباً ایک صفحے پر مشتمل ہے، اس میں لکھا ہے:

''آپ کو امام طحاوی سے شرف تلمذ حاصل ہے، چنانچہ 'معجم طبرانی صغیر'- جو چھپ کر شائع ہو چکی- اس میں ایک حدیث بروایت طحاوی ذکر کی ہے، اس معجم میں طبرانی نے اپنے ہر استاذ کی روایت سے ایک ایک حدیث ذکر کرنے کا التزام کیا ہے''[۳]۔

آگے لکھا ہے:

''لیلائے علم کے شوقِ طلب میں شام کے مختلف شہروں کے علاوہ حرمین، یمن، مصر، بغداد، کوفہ، بصرہ، اصفہان، جزیرہ وغیرہ کی خاک چھانی، اور اس تگ و دو میں ایک ہزار سے زائد علما وفضلا سے استفادہ کیا''[۴]۔

علاوہ بریں اختصار کے ساتھ ان کے مناقب، نام ونسب، تحصیل علم اور ولادت ووفات کا ذکر کیا ہے۔

(۱) سیرت طحاوی (۲) ایضاً (۳) ایضاً (۴) ایضاً

حافظ ابوبکر ابن المقریٔ:

دوسرے شاگرد حافظ ابوبکر ابن المقریٔ -مولود ۲۸۵ھ متوفی ۳۸۱ھ- کے حالات میں علم حدیث کی طلب میں دور دراز کا سفر، مصائب وتکالیف کا مردانہ وار مقابلہ، شدائد کی برداشت اور بشارت نبوی وغیرہ ذکر کیے ہیں، اور آخر میں رقم طراز ہیں:

''حافظ موصوف بھی امام طحاوی کے خوان کمال کے زلہ ربا تھے، اور طحاوی کے مخصوص شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں، اور صرف شاگرد ہی نہیں بلکہ طحاوی کی نہایت بیش بہا تصنیف 'معانی الآثار' کے راوی بھی ہیں، اور اکثر فضلاء محدثین کی اسانیدِ معانی الآثار کے مدار یہی ہیں، حافظ موصوف نے 'سنن شافعی' کو بھی امام طحاوی سے سنا ہے، اور اس کے راوی ہیں۔ (دیکھو سنن شافعی مطبوعہ مصر ص ۳)''[۱]۔

حافظ ابوبکر غندر:

حافظ ابوبکر محمد بن جعفر بن الحسین بغدادی معروف بہ غندر -متوفی ۳۷۰ھ- بھی شاگردِ امام طحاویؒ تھے، علامہ اعظمیؒ نے علم حدیث کے لیے ان کی آبلہ پائی اور صحرا نوردی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''بقول حاکم صاحبِ مستدرک اتنی کثیر مقدار میں حدیثیں لکھیں کہ ان سے پہلے کوئی اتنی نہ لکھ سکا''۔ آخر میں فرماتے ہیں:

''اخیر عمر میں مرو میں سکونت پذیر تھے، بخارا سے درخواست پہنچی کہ یہاں تشریف لا کر حدیث کی تعلیم دیجئے، اس درخواست پر آپ بخارا روانہ ہو گئے، راستہ ہی میں تھے کہ شہنشاہ زمین وزماں کے ہاں سے پیغام اجل پہنچا، آپ نے پہلا عزم فسخ کر کے دوسری دعوت پر لبیک کہا إنا لله وإنا اليه راجعون۔ یہ ۳۷۰ھ ہجری کا واقعہ ہے''[۲]۔

مورخ مصر ابوسعید بن یونس:

مؤرخ مصر ابوسعید بن یونس -مولود ۲۸۱ھ- کا تذکرہ کسی قدر سیر حاصل کیا ہے۔ 'تاریخ مصر' ان کی مشہور وممتاز تصنیف ہے، ان کا نام ونسب عبدالرحمٰن بن احمد بن یونس بن عبدالاعلی ہے۔ ان کے تذکرے میں علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''میں نے جب 'رجال طحاوی' لکھنا شروع کیے، تو سب سے پہلے مجھے اسی کتاب کی -یعنی تاریخ مصر کی- تلاش ہوئی، چنانچہ میں نے ہند وبیرون ہند کے متعدد فضلا کے پاس خطوط لکھے، قلمی کتب خانوں [میں] تلاش کرائی، مگر افسوس ہے کہ اب تک اس کتاب کا یا اس کے کسی مختصر کا کوئی نشان نہ مل سکا، اور شاید یہ حسرت قبر تک میرے ساتھ جائے گی''[۳]۔

---

(۱) سیرت طحاوی (۲) ایضاً (۳) ایضاً

اس عالم وفاضل شخصیت کے واقعۂ رحلت کا تذکرہ یوں کیا ہے:

''افسوس ہے کہ اس باکمال مورخ کو اپنے کمالات کی نمائش کے لیے کافی وقت نہیں ملا، حیات کی ابھی ٦٦ رمنزلیں طے کی تھیں کہ داعی اجل کو لبیک کہنا پڑا، اور ٣٤٦ھ میں یہ یکتائے روزگار فاضل سپرد خاک کردیا گیا''(۱)۔

ابوسعید کے تذکرے کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے:

''ابوسعید کو امام طحاوی سے دو نہایت گہرے تعلق ہیں: ۱- امام طحاوی ان کے جد امجد یونس بن عبدالاعلی کے ممتاز ومایۂ ناز شاگرد ہیں، اور ان کے باپ احمد کے خواجہ تاش، اس لحاظ سے طحاوی ان کے عم روحانی ہیں، ۲- وہ خود طحاوی کے عزیز تلمیذ اور روحانی فرزند ہیں، انھوں نے خود اپنے تلمذ کا ذکر نہایت فخریہ لہجے میں کیا ہے، اپنی تاریخ میں امام طحاوی کا نہایت شاندار لفظوں میں ذکر کیا ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان سے زیادہ امام موصوف کی قدر ومنزلت اور کس کو معلوم ہوسکتی ہے، امام موصوف کے علمی وعملی کارنامۂ حیات کا انھوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے''(۲)۔

حافظ محمد بن المظفر :

حافظ محمد بن المظفر -مولود ۲۸۲ھ متوفی ۳۷۹ھ- کا تذکرہ بھی کسی قدر تفصیلی ہے، تذکرۃ الحفاظ، تہذیب، لسان اور انساب سمعانی وغیرہ سے تقریباً ڈیڑھ صفحے میں ان کے احوال لکھے ہیں، ان کے حفظ حدیث کا یہ حال تھا کہ:

''ان کا خود بیان ہے کہ صرف ایک باغندی کی ایک لاکھ احادیث میرے پاس ہیں''۔

ان کے حفظ وروایت اور اسی کے ساتھ ادب وتواضع کا اندازہ علامہ اعظمیؒ کی نقل کی ہوئی اس حکایت سے کرنا چاہئے:

''ایک دن ابن معروف قاضی کی مجلس میں تشریف فرما تھے، اتفاقاً ابوالفضل زہری آپہنچے، ابن المظفر فوراً کھڑے ہوگئے اور اپنی جگہ زہری کے لیے خالی کردی، پھر قاضی سے خطاب کرکے فرمایا کہ جناب! یہ بزرگ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہیں، اور ان سے لے کر عبدالرحمٰنؓ تک پورا سلسلۂ نسب محدثین کا سلسلہ ہے۔ یہ کہہ کر اس سلسلہ میں سے ہر شخص کی روایت سے ایک ایک حدیث سنادی''(۳)۔

حافظ ابن المظفر علم وفضل کے اس بلند مقام پر فائز تھے کہ:

''حافظ دارقطنی، ابونعیم، ابن شاہین، برقانی جیسے اکابر محدثین کو ان کی شاگردی پر ناز ہے۔ دارقطنی

(۱) سیرت طحاوی (۲) ایضاً (۳) ایضاً

باایں ہمہ فضل وکمال ابن المظفر کے سامنے ادب کی وجہ سے ٹیک لگا کر نہیں بیٹھتے تھے۔ برقانی کا بیان ہے کہ دارقطنی نے ابن المظفر کی روایت سے کئی ہزار حدیثیں قلم بند کیں، خطیب نے کہا کہ ابن المظفر حافظ ہونے کے ساتھ ذہین اور راست گو بھی ہیں''(۱)۔

علم حدیث میں ایسے ثقہ تھے کہ حافظ ذہبی نے ان کو''**الحافظ الإمام الثقة محدث العراق**'' لکھا ہے، اوران کی قدر ومنزلت کا حال یہ تھا کہ:

''قاضی ابوالولید باجی نے ان پر تشیُّع کا الزام لگایا ہے، ابن حجر نے اس پر بڑی برہمی کا اظہار کیا ہے''(۲)۔

طحاویؒ سے شرف تلمذ کی نسبت علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''حافظ موصوف کو امام طحاوی سے بھی تلمذ تھا، ابن حجر وغیرہ نے اس کو ذکر کیا ہے، اور تذکرہ میں ذہبی نے طحاوی کی ایک حدیث بروایت ابن المظفر ذکر کی ہے''(۳)۔

اس کے بعد متصلاً رقم طراز ہیں:

''یہ نہ سمجھنا کہ ابن المظفر [کو] طحاوی سے صرف دو چار حدیثوں کا سماع حاصل تھا، بلکہ ان سے بکثرت حدیثیں لی تھیں، چنانچہ ابن المظفر پورا 'مسند شافعی' طحاوی کے واسطہ سے روایت کرتے تھے''(۴)۔

ابن زبر قاضی:

ابو محمد عبداللہ بن احمد قاضی مصر-متوفی ۳۲۹ھ- کے تذکرے میں علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ:''ان کے لڑکے ابوسلیمان محمد حفاظ حدیث میں شمار کیے جاتے ہیں، اور خود عبداللہ تو محدثین میں کچھ زیادہ اعتماد پیدا نہ کر سکے، لیکن محمد بہت مستند ہیں''۔اس کے بعد تحریر فرمایا ہے:

''ابن زبر جب مصر میں قاضی ہو کر آئے ہیں، تو طحاوی ان کی ملاقات کو گئے، یا کسی شہادت کے سلسلہ میں جانا پڑا، ابن زبر نے طحاوی کا نہایت احترام کیا، اور کہا کہ ایک حدیث آج سے تیس برس پہلے آپ کے ایک شاگرد کے واسطے سے قلم بند کی ہے، چاہتا ہوں کہ آج بلا واسطہ اس کو آپ کی زبان سے سنوں، طحاوی نے ان کی درخواست منظور کر لی اور حدیث سنادی۔''زبر'' ان کے اجداد میں ایک شخص کا نام ہے''(۵)۔

ابوجعفر نحاس:

ان کا تذکرہ تقریباً ڈیڑھ صفحے پر مشتمل ہے، اور آغاز یوں کیا ہے:

(۱) سیرت طحاوی (۲) ایضاً (۳) ایضاً (۴) ایضاً (۵) ایضاً

''بہت مشہور مصنف ہیں، فن حدیث کے علاوہ نحو وقرأت میں بھی کمال حاصل تھا، اوران فنون میں متعدد تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں، موصوف کی ایک بہترین تصنیف الناسخ والمنسوخ (فی القرآن) پچیس برس ہوئے مصر کے مطبعۃ السعادۃ سے چھپ کر شایع بھی ہوچکی ہے، اوراس وقت میرے پیش نظر ہے، یہ کتاب مصنف کی وسعتِ نظر وکمالِ علمی کا آئینہ ہے، مصنف نے اس کتاب میں امام طحاوی سے بکثرت حدیثیں روایت کی ہیں''(۱)۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ ان کا نام احمد بن محمد بن اسماعیل بن یونس، اور ابوجعفر کنیت ہے، قبیلۂ مراد کی طرف منسوب ہیں، سرزمینِ مصر کوان کے مرزبوم ہونے کا فخر حاصل ہے، وہ خود پیتل کے برتن بنایا کرتے تھے، یا ان کے خاندان میں یہ پیشہ تھا، اس لیے ''نحاس'' کہلائے۔ پھر لکھا ہے:

''سیوطی نے 'بغیہ' میں، ابن خلکان نے 'وفیات' میں، ذہبی نے 'مشتبہ النسبۃ' میں، یاقوت حموی نے 'معجم الادباء' میں، دانی نے 'طبقات القراء' میں ان کا ذکر کیا ہے، مگر کسی نے سن ولادت نہیں لکھا''(۲)۔

آگے چند سطروں کے بعد لکھا ہے:

''ناسخ ومنسوخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابن خلکان مذہباً شافعی تھے،............ان کی ایک تصنیف اعراب القرآن مصر کے کتب خانہ خدیویہ میں موجود ہے''(۳)۔

ان کے تذکرے کے آخر میں ان کی وفات کا واقعہ یوں تحریر فرمایا ہے:

''ان کی وفات کا واقعہ نہایت عجیب ہے، ایک دن مقیاس نیل کے زینے پر لب دریا بیٹھے ہوئے کسی شعر کی تقطیع کررہے تھے، یہ نیل کی طغیانی کا زمانہ تھا، ایک جاہل شخص نے تقطیع کرتے ہوئے سنا تو سمجھا کہ دریا پر جادو کررہے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سیلاب نہ آنے کی وجہ سے پیداوار کچھ نہ ہوگی، اور غلہ کا نرخ بہت بڑھ جائے گا، یہ خیال کرکے اس کو ضبط کی تاب نہ رہی اور پیچھے سے آکے جو پاؤں سے ان کو دھکا دیا ہے تو یہ نیل میں تھے، اس کے بعد ان کا کوئی نشان نہ مل سکا۔ یہ شنبہ ۵/ذی الحجہ ۳۳۸ھ کا واقعہ ہے''(۴)۔

حافظ ابوسلیمان محمد دمشقی:

علامہ اعظمیؒ نے ایک صفحے سے کم میں ان کے تذکرے کو سمیٹا ہے، اور لکھا ہے کہ عبداللہ بن زبر قاضی مصر کے فرزند رشید ہیں، ذہبی نے 'تذکرۃ الحفاظ' میں ان الفاظ میں ان کے کمالات کی ترجمانی کی ہے: **الحافظ، المفید، المصنف، محدث دمشق.**

ان کے تحصیل علم، مخصوص اساتذہ وتلامذہ اور طحاوی کے ساتھ تلمذ کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

(۱) سیرت طحاوی (۲) ایضاً (۳) ایضاً (۴) ایضاً

''ابوسلیمان کی تصنیفات میں صرف ایک کتاب کا نام ہم کو معلوم ہوسکا ہے، اور وہ 'کتاب الوفیات' یا 'وفیات النقلۃ' ہے، حافظ ذکی الدین منذری نے اس پر ایک ذیل لکھا ہے، اس کا نام 'التکملۃ لوفیات النقلۃ' ہے، اور حافظ عزالدین حسینی نے 'صلۃ التکملۃ' لکھا ہے۔

جمادی الاولی ۳۷۹ھ میں عالم فانی سے رحلت کی''(۱)۔

مسلمہ بن قاسم:

ان کا تذکرہ علامہ اعظمیؒ نے ڈیڑھ صفحے میں کیا ہے، اور ان الفاظ کے ساتھ شروع کیا ہے:

''قرطبہ-کارڈا-اندلس کی مردم خیز سرزمین کو اپنے جن فرزندوں پر ناز تھا، ان میں ایک مسلمہ بھی تھے، کنیت ابوالقاسم تھی، ۲۹۳ھ میں پیدا ہوئے، اور پہلے وطن میں بہت کچھ حاصل کیا، پھر ۳۲۰ھ سے پہلے ہی مشرق کا سفر کیا، اور مشرق میں شاید ہی کوئی علمی مرکز ہوگا جہاں پہنچ کر سماعت حدیث نہ کی ہو''(۲)۔

پھر ان کے تحصیل علم، علمی رحلات اور ذاتی حالات لکھنے کے بعد رقم طراز ہیں:

''فن رجال میں ان کو بڑا دخل اور بڑی واقفیت تھی، اس فن میں ایک بے نظیر تاریخ ان کی یادگار ہے، بخاری نے جن لوگوں کا ذکر اپنی تاریخ میں نہیں کیا ہے، صرف اُن رواۃ کے ذکر کا اس تاریخ میں التزام کیا ہے، ابن حجر نے 'لسان' میں اس تاریخ کی بابت لکھا ہے: ''هو كثير الفوائد'' یعنی یہ تاریخ بغایت مفید ہے''(۳)۔

پھر ان کی شہرۂ آفاق کتاب 'الصلۃ' کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے:

''ان کی ایک تصنیف 'ما روى الكبار عن الصغار' بھی ہے، علم رمل میں کچھ دخل تھا، اس فن میں بھی ایک تصنیف چھوڑی ہے۔

دوشنبہ ۲۲/ جمادی الاولی ۳۵۳ھ کو یہ آفتاب کمال دنیا والوں کی آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہوگیا۔ یہ بے نظیر فاضل بھی بتصریح ابن حجر امام طحاوی کے ممتاز شاگرد تھے، 'صلۃ' میں امام کا ذکر کیا ہے، اور امام کی جلالت قدر، فقاہت وثقاہت کا نہایت فراخدلی سے اعتراف کیا ہے''(۴)۔

علم حدیث کے ان پروانوں اور امام طحاویؒ کے خوان علم وکمال سے زلہ ربائی کرنے والے ان یگانوں کا تذکرہ طویل ہوتا جارہا ہے، سطور بالا میں یہ اقتباسات اس وجہ سے پیش کردیے گئے ہیں، کہ ناظرین کو یہ اندازہ ہو سکے کہ یہ ناقص کتاب اگر مکمل ہوگئی ہوتی، تو تذکرہ وسوانح کے سرمائے میں ایک بہترین اور بیش بہا کتاب کا اضافہ ہوا ہوتا؛ سوانحی واقعات وحقائق کے ساتھ ادب کی جولذت وچاشنی، زبان کی حلاوت وشیرینی، ادائیگی مفہوم میں

(۱) سیرت طحاوی (۲) ایضاً (۳) ایضاً (۴) ایضاً

جوسلاست وروانی، اور انداز واسلوب میں جو دل کشی اور برجستگی پائی جاتی ہے، اس سے یہ کتاب اردو ادب کے بہترین اور معیاری تذکروں میں جگہ دینے کے قابل ہوتی، مگر علمی دنیا کی یہ محرومی ہے کہ یہ تصنیف تشنۂ تکمیل رہ گئی، اور اب اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ:

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اس اندیشہ کے پیش نظر کہ اختصار کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے، امام طحاوی کے اور جن شاگردوں کا علامہ اعظمیؒ نے تذکرہ کیا ہے، ہم ان کا صرف نام اور سن وفات ذکر کرنے پر اکتفا کررہے ہیں:

قاضی عبید اللہ بن علی نخعی ابوالقاسم داودی - وفات ۳۷۶ھ -، ابوبکر مکی بن احمد بن سعدویہ بردعی - وفات ۳۵۴ھ -، احمد بن منصور دامغانی تاریخ وفات نامعلوم، علامہ اعظمیؒ نے ان کی نسبت لکھا ہے:

''عقیدۂ طحاوی کے بھی یہ راوی ہیں''۔

ابوبکر محمد بن بدر بن عبدالعزیز قاضی مصر - ولادت ۲۶۴ھ وفات .... -، ابوبکر یا ابوعمران محمد بن موسیٰ مصری - وفات ۳۵۸ھ -، ابوالحسن علی بن احمد فرزندار جمند امام طحاوی - وفات ۳۵۱ھ -۔

علامہ اعظمیؒ نے امام طحاویؒ کے مذکورہ بالا ان شاگردوں کا تذکرہ لکھنے کے بعد تحریر فرمایا ہے:

''طحاوی کے صرف پندرہ شاگردوں کے حالات ہم نے بہت اختصار واجمال کے ساتھ لکھے ہیں، ان کے علاوہ اور بہت سے ائمہ فن کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے، جن کے استقصا کی یہاں گنجائش نہیں ہے''[1]۔

پھر دس اور شاگردوں کے نام اور تاریخ وفات یا ان کے ایک دو مشہور اساتذہ یا تلامذہ کے نام لکھے ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

قاضی ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن العوام السعدی قاضی مصر، ابوجعفر احمد بن محمد بن عبدالوارث رمّاح مصری - وفات ۳۸۵ھ -، ابوبکر یوسف بن قاسم المیانجی - وفات ۳۷۵ھ -، ابوالقاسم ہشام بن ابی خلیفہ محمد بن قرۃ بن محمد ابن حمید بن ہشام الرعینی، احمد بن ابراہیم بن حماد قاضی مصر - وفات ۳۲۹ھ -، حسن بن عبدالرحمٰن جوہری قاضی مصر - وفات ۳۳۳ھ -، حسین بن احمد بن محمد بن عبدالرحمٰن ابوعبداللہ ہروی - وفات ۳۷۲ھ -، ابوعمر محمد بن یوسف کندی مصری - ولادت ۲۸۳ھ وفات ۳۵۰ھ -، علامہ اعظمیؒ نے ان کی بابت لکھا ہے:

''اخبار قضاۃ مصر ان کی نہایت مقبول ومعتبر تصنیف ہے، جو گب میموریل میں طبع ہوکر شائع ہوچکی ہے، اس کتاب میں ۲۴۶ھ تک کے ان تمام اشخاص کے حالات جمع کیے ہیں، جو مصر میں سریر آرائے حکومت یا منصب قضا پر فائز تھے''[2]۔

اور آخر میں لکھا ہے:

---

(۱) سیرت طحاوی (۲) ایضاً

''موصوف حنفی المذہب تھے، اور تاریخ کے علاوہ فن حدیث میں بھی کمال حاصل تھا''[۱]۔

مشہور مورخ ابن زولاق مصری اصل نام الحسن بن ابراہیم تھا- ولادت ۳۰۶ھ وفات ۳۸۶ھ-، علامہ اعظمیؒ نے ابن زولاق کی مشہور کتاب 'قضاۃ مصر' کی نسبت لکھا ہے:

''ان کی 'قضاۃ مصر' درحقیقت کندی کی 'تاریخ مصر' کا تتمہ ہے۔ انھوں نے ۲۴۶ھ سے ۳۸۶ھ تک کے قاضیوں کے حالات لکھے ہیں''[۲]۔

ابوالقاسم میمون بن حمزہ بن الحسین حسینی، یہ عقیدہ طحاوی کے بھی راوی ہیں۔

یہ بیش بہا اور معلومات افزا کتاب یہیں پر ختم ہو جاتی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تصنیف پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی، ورنہ اختصار و جامعیت کے ساتھ بھی یہ تالیف اگر مکمل ہوگئی ہوتی، تو امام کے حالات پر اردو میں ایک پُرمغز اور مستند مرجع ہوتی۔

ایک مفید حاشیہ:

اس کو ختم کرنے سے پہلے علامہ اعظمیؒ کا ایک نہایت مفید حاشیہ نقل کر دینا چاہتا ہوں، جو انھوں نے قاضی ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن العوام السعدی قاضی مصر کے تذکرہ میں لکھا ہے، جس سے آپ کی دیدہ وری، ثاقب نظری، اور ژرف نگاہی کا پتہ چلتا ہے، وہ حاشیہ یہ ہے:

''ان کے-یعنی ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن عوام سعدی کے- حالات 'اخبار قضاۃ مصر' میں بھی مذکور ہیں، مگر غلطی سے ان کے بجائے ان کے پوتے احمد بن محمد کا نام درج ہو گیا ہے، تحقیق یہ ہے کہ اس نام کے ماتحت جو حالات لکھے ہیں، وہ ابوالقاسم عبداللہ کے ہیں، حالات یہ ہیں:

''ابوبکر محمد بن جعفر بن اعین، ابوبشر دولابی، ابوجعفر طحاوی، ابراہیم بن احمد بن سہل ترمذی، محمد بن الحسین بخاری وغیرہم سے روایت حدیث کی، امام اعظم اور ان کے اصحاب کے مناقب میں ان کی ایک جامع تصنیف ہے، جس کو قضاعی نے مصنف سے، اور حافظ سلفی نے رازی سے، رازی نے قضاعی سے روایت کیا ہے''۔

یہ حالات احمد کے نہیں ہو سکتے، احمد کی پیدائش ۳۴۹ھ میں ہوئی ہے، اور دولابی ۳۱۵ھ میں، ابن اعین ۲۹۳ھ میں اور طحاوی ۳۲۱ھ میں وفات پا چکے ہیں''۔

اور اس حاشیے میں جہاں ''قضاعی نے مصنف سے'' کا جملہ آیا ہے، وہاں علامت لگا کر اس پر ایک اور حاشیہ لکھا ہے، جو یہ ہے:

''الصواب أن القضاعي رواه عن أحمد بن محمد بن عبد الله عن أبيه محمد، عن جده أبي القاسم عبد [الله] كما يظهر من إسناد الخوارزمي إلى المسند''.

(۱) سیرت طحاوی (۲) ایضاً

سیرتِ ابراہیم بن ادہم اوران کے مدفن کی تحقیق

حضرت محدث کبیرؒ کا یہ ایک نہایت اہم اور بیش قیمت مضمون ہے، اس کے تحریر کا محرک علم وتحقیق کے ساتھ جذبۂ اصلاح بھی ہے، اصحابِ سلوک وتصوف کے لیے اس میں بطور خاص درس ونصیحت ہے، اس مضمون کے اندازِ تحریر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علامہ اعظمیؒ نے آج کل کے اربابِ سلوک وطریقت کے طرزِ حیات اوران کے عادات واطوار کوسامنے رکھ کر یہ مضمون حوالۂ قلم کیا ہے۔

اس کی ابتدا میں حضرت ابراہیم بن ادہم کی عظمت وبلندئ رتبہ کا بہت ہی جامع انداز میں تذکرہ کرکے ان کا تعارف کرایا ہے،لکھا ہے:

''حضرت ابراہیم بن ادہم تعارف سے مستثنیٰ ہیں، وہ باتفاقِ امت سرحلقۂ اصفیاء کرام وسرخیلِ مشائخِ طریقت، زہدوتقویٰ میں منفرداورتورُّع وعبادت میں یگانۂ روزگار تھے،متقدمین میں یعقوب بن سفیان فسوی، ابن حبان، ابونعیم اصبہانی اور پیرِ ہرات شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری وغیرہ نے بہت بلندالفاظ میں ان کا ذکرکیاہے،فسوی کہتے ہیں: هو مِن خيارِ الأفاضل، اورابن حبان کہتے ہیں: كان صابراً على الجهادِ والفقهِ والورعِ الدائم والسخاءِ الوافرِ، اورابونعیم نے پچاسی صفحے میں ان کا ذکرِخیر کیا ہے، حافظ ذہبی نے ابراہیم کوصرف زاہد کہہ کرذکرکیا تو امام یافعی نے سخت برہمی کا اظہارفرمایا، اورلکھا کہ یہ ان کی توہین اوران کے مرتبہ کوگھٹانا، اوران کی عظمت ورفعت کوکم کرکے دکھانا ہے''[1]۔

پھر بہت ہی جامعیت کے ساتھ ان کے حالاتِ زندگی، بالخصوص امیری اورتونگری چھوڑکرفقیری اور دُرویشی اختیارکرنے، اورطلبِ معاش ورزقِ حلال کی تلاش میں اپنے وطن اصلی بلخ کوچھوڑکرشام ہجرت کرجانے اوروہاں کسبِ معاش کے واسطےمحنت مزدوری کرنے، باغبانی، رکھوالی اورحمالی کرنے کےمختلف واقعات کتبِ سیر وتاریخ سےنقل فرمائے ہیں،اس کے بعدلکھا ہے:

''میں نے ابراہیم کےکسبِ معاش کے ان حالات کا ذکراس لیے کیا کہ اس میں ہمارے لیے بہت بڑا درسِ عبرت ہے، آج ہم جن بزرگوں کے سلسلے میں داخل ہوکر، اورجن کی روحانیت سے مستفید ہوکراپنی بزرگی کا سکہ جمائے ہوئے ہیں،ان کی زندگی کا نقشہ یہ تھا،ان کے یہاں کسبِ حلال کا یہ اہتمام تھا،اور ہمارے یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے، ہماراطرزِعمل یہ ہے کہ ہم کسبِ معاش کے لیے بہت معقول ماہانہ پرکسی کام کی ذمہ داری لے لیتے ہیں،مگر پورے طور پرکام کرکےاس کسب کوحلال طیب بنانے کا بالکل اہتمام نہیں کرتے؛ بلکہ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ بہت سے مشائخ کسبِ معاش کا کوئی

(۱) المآثر جلد۸ شمارہ۴،ص:۲۱-۲۰

ذریعہ اختیار نہیں کرتے، ان کی گذر اوقات صرف مریدوں کے عطایا اور نذرانوں پر موقوف ہے، جس کے لیے سال میں ایک دو بار وہ دورہ کر لیتے ہیں، اگر کوئی بزرگ متوکلانہ زندگی بسر کرنے کے خیال سے ترکِ اسباب کا ارادہ کر لیں، تو یہ قابلِ اعتراض بات نہیں ہے، لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ کسی شرعی ضرورت کے سوا گھر سے نہ نکلیں، مریدوں کے یہاں دورہ نہ کریں، بلکہ ہر اس صورت حال سے کنارہ کشی اختیار کریں، جس سے تعرُّض للسوال یا حسن طلب کی صورت پیدا ہو"[1]۔

آج کل کے مشائخ تصوف اور پیرانِ طریقت کی حالتِ زار دیکھ کر آنسو بہاتے ہیں، اور اس پر نکیر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بعض حضرات کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ مسترشدین کی درخواست پر سہی، کسی مقام پر رمضان گزارنے کے لیے چلے جاتے ہیں، اس صورت میں ہر چند کہ ان کی اور مریدین کی نیت صالح ہو، پھر بھی حضرت ابراہیم بن ادہم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ضروری ہے، اس لیے کہ صحیح معنوں میں جو حضرات رتبۂ مشیخت کو پہنچے ہوئے ہیں، ان کی دیکھا دیکھی دوسرے نا اہل اور غیر عالم پیرزادے رمضان کے علاوہ بھی مہینہ دو مہینہ بلکہ اس بھی زیادہ مدت تک مریدوں کی بستیوں کا دورہ کرتے رہتے ہیں، حالانکہ ان کے لیے تو سرے سے مرید کرنا اور مسندِ ارشاد پر بیٹھنا ہی جائز نہیں ہے، نہ بیعت ہونے والوں کو ایسے پیروں سے بیعت ہونا جائز ہے"[2]۔

اس کے بعد مولانا کرامت علی جون پوری علیہ الرحمۃ کی کتاب 'القول الثابت' سے اس مضمون کی عبارت نقل کی ہے کہ شیخ و مرشد کے لیے احکام شرعیہ اور علم اسرار یعنی تصوف دونوں کا حامل ہونا ضروری ہے، اور جو شخص دونوں علم کا حامل نہیں، اس سے بیعت کرنا اور اس کو خلافت نامہ دینا درست نہیں ہے، بلکہ جس شخص نے ایسے جاہل سے بیعت کیا ہے، اس پر واجب ہے کہ اس کی بیعت سے توبہ کرے، اور اس شخص سے کنارہ کشی اختیار کرے۔

آگے چل کر اس مضمون میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ کی 'القول الجمیل' سے پیر و مرشد کے اندر جو ضروری شرطیں ہونی چاہئیں، ان کو نقل کیا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کا علم رکھتا ہو، اسی طرح ایک شرط بیعت لینے والے کے لیے یہ ہے کہ دنیا کا تارک ہو، اور یہ بھی شرط ہے کہ بیعت لینے والا کامل مرشدوں کی صحبت میں رہا ہو، اور ان سے ادب سیکھا ہو اور ان سے باطن کا نور اور اطمینان حاصل کیا ہو۔

تصوف و طریقت سے متعلق یہ رہنما اور بنیادی اصول سپردِ قلم فرمانے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے آخری صفحات میں حضرت ابراہیم بن ادہم کی وفات کا تذکرہ کیا ہے، اور ان کے مدفن کے بارے میں تاریخ و تذکرہ کی کتابوں سے متعدد اقوال نقل کیے ہیں، اور پھر اُس قول کو ترجیح دی ہے جس میں اُن کے مدفن کا جبلۂ شام میں ہونا

(۱) المآثر جلد ۸ شمارہ ۴، ص: ۲۳-۲۲ (۲) ایضاً: ۲۳

مذکور ہے، اور اس کی تائید میں متعدد اقوال نقل کیے ہیں، اور پھر جبلہ کے متعلق صاحب منجد کا یہ قول نقل کیا ہے:

''جبلہ: لاذقیہ کے جنوب میں شام کی ایک بندرگاہ ہے، ۶۳۶ء میں اس کو عربوں نے فتح کیا، ۱۰۹۸ء میں اس پر صلیبیوں کا قبضہ ہوا، پھر ۱۲۸۵ء میں سلطان قلاوون نے اس کو واپس لیا، اس میں رومانی مسرح کے آثار کے علاوہ ابراہیم بن ادہم امیر بلخ اور عابد وصوفی کی قبر ہے''(۱)۔

اور پھر اس کے جائے وقوع کی نسبت اپنی یہ تحقیق پیش کی ہے:

''صوریہ کے نقشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جبلہ شام کے ضلع لاذقیہ کا ایک شہر ہے، اس کے شمال میں لاذقیہ، جنوب میں بابناس اور طرسوس، مشرق میں جبال نصریہ یا حصون فداویہ، اور مغرب میں بحر ابیض متوسط (میڈیٹرینین سی Mediterranean Sea) ہے''(۲)۔

مضمون کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے:

''ابن بطوطہ نے جو شہر جبلہ کو سمندر سے ایک میل دور بتایا ہے، وہ ان کے زمانے کی بات ہوگی، اب تو شہر جبلہ اس شاہراہ کے کنارہ تک آباد ہو گیا ہے، جو صور، صیدا، بیروت اور طرابلس سے سمندر کے کنارے کنارے جبلہ سے آگے تک چلی گئی ہے، اور سلطان ابراہیم بن ادہم کا مزار جس سے متصل ایک عظیم الشان مسجد بھی ہے، سمندر سے دو یا تین فرلانگ کے فاصلہ پر پورب جانب ہے، میں نے ذی القعدہ ۱۳۹۸ھ میں زیارت کی سعادت حاصل کی ہے''(۳)۔

علامہ اعظمیؒ کا یہ مضمون پہلی دفعہ ماہنامہ 'الفرقان' جلد ۴۷ شمارہ ۴، اپریل ۱۹۷۹ء = جمادی الاولی ۱۳۹۹ھ میں، اور دوبارہ سہ ماہی 'المآثر' جلد ۸ شمارہ ۴، شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ = فروری، مارچ، اپریل ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔

☆......☆......☆

جواد ساباط

ہندوستان میں تیرہویں صدی ہجری میں عیسائی مشن کا ایک عرب حریف

یہ بارہ صفحات پر مشتمل ایک معلومات افزا اور سبق آموز مضمون ہے، اس میں اسلام کے ایک نہایت جری، بہادر اور جاں نثار فرزند کی دلچسپ داستانِ حیات، اور ان کی زندگی کے محیر العقول کارنامے سپرد قلم کیے گئے ہیں۔ دین و مذہب کی آبرو کے لیے متاعِ حیات کو خطرات کے حوالے کر دینے کی ایک عجیب وغریب کہانی اور ایمان افروز داستان اس مضمون میں قلم بند کی گئی ہے، اس کی تمہید میں علامہ اعظمیؒ نے جواد ساباط کی سرگرمیوں کے

(۱) المآثر جلد ۸ شمارہ ۴، ص: ۲۹ (۳) ایضاً: ۲۹ (۳) ایضاً: ۳۰

پسِ منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تیرہویں صدی ہجری کے ربع اول میں جبکہ انگریزوں کا قدم ہندوستان میں جم چکا تھا، عیسائیت کی تبلیغ ہندو بیرونِ ہند میں بڑے اعلیٰ پیمانے پر جاری تھی، ''برٹش اینڈ فارنر بائبل سوسائٹی'' کے مبلغین اطراف واکناف عالم میں پھیل چکے تھے، اور مسیحیت کا جال ہر چہار طرف پھیلا رہے تھے، مسلمان علی العموم اور مسلمانانِ ہند علی الخصوص ان مکائد اور خفیہ تدابیر سے یکسر ناواقف تھے، جو تبلیغِ مسیحیت کے سلسلے میں استعمال کی جارہی تھیں، علماء اکثر وبیشتر طبیعت کی سادگی اور علم کے وسائل وذرائع کی قلّت کی وجہ سے ان حالات سے بے خبر تھے، اس لیے درس وتدریس کے علاوہ اور کسی چیز سے ان کو مطلب نہ تھا، ان حالات میں مسیحیت کو جو ترقی نصیب ہوسکتی تھی، ظاہر ہے؛ میدان بالکل صاف تھا، زمین نہایت ہموار تھی، مسیحی مبلغین تمام خطرات سے بےفکر ہوکر اپنے کام میں مصروف تھے، ان کو یقین تھا کہ اب فرزندانِ اسلام کو حلقہ بگوشِ مسیحیت بنانے میں ان کو کوئی دقت پیش نہیں آسکتی۔ وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ یکا یک خدائے اسلام نے اسلام اور مسلمانوں کی دستگیری کے لیے اپنا غالب اور قہار ہاتھ بڑھایا، اور مسیحیوں کی تمام ملمّع کاریوں کا پردہ چاک کر دیا، اور ان کے منصوبے خاک میں ملا دیے؛ اس نے اپنے ایک بندے کے دل میں اسلام کا سچا درد اور اس کی حمایت کا حقیقی اور غیر فانی جوش پیدا کر دیا، جو اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں کود پڑا اور مقابلہ پر ڈٹ گیا، اور جب تک صفِ اعدا کائی کی طرح پھٹ نہ گئی، نہایت بےجگری سے دادِ شجاعت دیتا رہا۔ اس بلند حوصلہ شیر دل بہادر کو دنیا جواد ساباط کے نام سے پکارتی تھی، اور یہ مختصر تحریر اسی بہادر کے قلمی کارناموں کا ایک دھندھلا سا خاکہ اور اس کے مختلف ادوارِ حیات کا نامکمل نقشہ ہے''[1]۔

جواد ساباط نے جو اہم اور عظیم الشان دینی خدمات انجام دی ہیں، اور دینِ اسلام کے تحفظ کے لیے اپنے نفس نفیس کو جس طرح خطرات کے طوفانِ بلاخیز کے حوالے کیا ہے، اس کے تعلق سے ان کو کوئی شہرت نہیں حاصل ہوسکی، یہ تاریخ کی بہت بڑی ستم ظریفی ہے، یہی وجہ ہے کہ علامہ اعظمیؒ نے ان کے نقوشِ حیات ان کی کتاب 'البراہین الساباطیہ' اور بعض دیگر کتابوں کی مدد سے مرتب کیے ہیں۔

جواد ساباط کا سلسلۂ نسب ماں کی طرف سے حضرت حسین -رضی اللہ عنہ- تک، اور باپ کی جانب سے حضرت حسن -رضی اللہ عنہ- تک پہنچتا ہے، ان کے والد ابراہیم ساباط ۱۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے تھے، اور ترکی حکومت کے زمانے میں جزیرۂ عرب کے مختلف مقامات پر مختلف اہم مناصب پر فائز رہے، مگر عمر زیادہ نہیں پائی اور ۱۱۹۳ھ میں ایک لڑائی میں لقمۂ اجل بن گئے۔

جواد ساباط کی ولادت ۱۱۸۸ھ میں بمقام ماریہ ہوئی، ان کی والدہ شہربانو سید محمد حکیم باشی کی صاحبزادی

(۱) معارف جلد ۲۱ شمارہ ۴، ص: ۲۷۱

تھیں، سید محمد حکیم باشی ایک بلند پایہ طبیب تھے، وہ شاہِ طہماسپ صفوی - شہنشاہِ ایران - اور حکومتِ ترکی میں رئیس الاطباء اور شاہی اطباء کی افسری پر بھی مقرر رہ چکے تھے، ۱۲۰۹ھ میں جواد کی ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔

جواد نے مختلف اساتذۂ فن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے علومِ اسلامیہ میں دسترس حاصل کی، اور مختلف فنون میں دستگاہ بہم پہنچائی۔

جواد کو سیاحت کا شوق بھی دامن گیر تھا، اور انھوں نے مختلف بلاد و امصار کی سیاحی کی؛ حرمین، حجاز، مصر، نجد، یمن وغیرہ کی سیر کرتے ہوئے وہ ۱۲۱۳ھ میں ڈھاکہ پہنچے، اس سیاحت کے دوران جو تجربات ومشاہدات ان کو حاصل ہوئے، اور اقوام وملل کا انھوں نے جو مطالعہ کیا، ان سے فائدہ اٹھایا، اور مذہبِ اسلام کی خدمت اور اس کی حمایت کے وقت وہ ان کے کام آئے۔

جواد کو چونکہ مسیحیت کے قلعے پر حملہ کرنا تھا، اس لیے انھوں نے اس کے لیے جن اسباب ووسائل کی ضرورت تھی، ان کو مہیا کیا، تاکہ مقصد تک رسائی میں آسانی ہو سکے، اور حق و باطل کی یہ جنگ علم وتحقیق کی روشنی میں انجام پا سکے۔ مسیحی عقائد وخیالات کی تہ تک پہنچنے اور مسیحی نظریات کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کے لیے انھوں نے انگریزوں کے ہاں ملازمت کی، انگریزی زبان کی تحصیل کر کے اس میں مہارت بہم پہنچائی، مسیحیوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ان کے سامنے جواد کو اسلام سے اپنا انحراف بھی ظاہر کرنا پڑا۔

جواد ساباط ۱۲۱۵ھ میں مدراس پہنچے، وہاں مجمع مقدس سے درخواست کر کے انجیل کے عربی ترجمہ کی ذمہ داری لی، اور اس کے پسِ پردہ وہ اپنے مقصد کے حصول میں لگے رہے، عیسائیت کے خلاف خفیہ طریقے سے مواد فراہم کرتے، اور اس کی عمارت میں شگاف ڈالتے رہے، تقریباً بارہ سال تک انھوں نے اس کام کو انجام دیا، لیکن ایک دین فروش مسلمان کی بدعہدی سے مسیحیوں کو ان کی اصلیت کا پتہ چل گیا، اور ان کو اپنی جان بچا کر وہاں سے فرار ہونا پڑا۔

جواد نے متعدد بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں، مسیحیت کے ردّ وابطال اور اسلام کی حقانیت کے اِثبات کے لیے انھوں نے 'الصراصر الساباطیہ' اور 'البراہین الساباطیہ' نامی دو اہم کتابیں لکھیں، ان میں انھوں نے اسلام کی حقانیت وصداقت کو خود مسیحیوں کی مسلمہ کتابوں سے پیش کیا۔

جواد کا یہ کارنامہ اسلامی تاریخ میں زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے کہ انھوں نے اپنی تنخواہ سے پس انداز کر کے اتنی رقم جمع کی کہ اس سے پریس لگایا، اور اس میں 'براہین' کو خود ہی طبع کیا، اور چھ سو نسخے چھاپ کر عالمِ اسلام کے مختلف بلاد وامصار میں ان کو ارسال کیا، اور اس کے سارے نسخے وقف کر دیے، اور اس پر یہ عبارت تحریر فرما دی: ''**وقفها عفا الله عنه كلها تقرباً إلى الله ورسوله، لا تباع ولا تشرى، ولا تمنع عن ناقل ولا مطالع**''۔

ان کے علاوہ جواد نے اور کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں بعض کے نام یہ ہیں: ۱-ترجمہ انجیل بزبان

فارسی، ۲-ترجمۂ انجیل بزبان عربی، ۳-الجنن الساباطیہ، ۴-النفحات الساباطیہ، ۵-خیالات ساباطیہ، ۶-الخلاصۃ الساباطیہ فی عبادات الحنفیہ، ۷-شراب الصوفیہ، ۸-دھماکۂ ساباطیہ۔

یہ مضمون ماہنامہ 'معارف' شوال ۱۳۴۶ھ=اپریل ۱۹۲۸ء کے شمارے میں اشاعت پذیر ہوا، دوبارہ سہ ماہی 'المآثر' جلد نمبر ۱۱، شمارہ ۱، محرم-ربیع الاول ۱۴۲۳ھ=مئی-جولائی ۲۰۰۲ء میں شائع کیا گیا۔

☆......☆......☆......☆......☆

حیات شیخ عبدالحق محدث

یہ مضمون ایک کتابچہ یا رسالہ کی حیثیت رکھتا ہے، 'حیاتِ شیخ عبدالحق' پروفیسر خلیق احمد نظامی کے قلم سے نکل کر شائع ہوئی، علامہ اعظمیؒ کا پیش نظر مقالہ یا رسالہ اسی پر گویا مفصّل ریویو ہے۔

آغاز میں نظامی صاحب کو ان کی تصنیف پر مبارک باد دی ہے کہ انھوں نے 'حیاتِ شیخ عبدالحق' لکھ کر اردو لٹریچر میں بہت اہم اضافہ کیا ہے، اس پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کوئی شخص بھی ان کی کتاب پڑھ کر ان کی تلاش وجستجو اور محنت وکاوش کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کے بعد لکھا ہے:

> ''اس اعتراف کے ساتھ ساتھ فاضل مصنف سے معافی چاہتے ہوئے اتنا اور بھی عرض کروں گا کہ ان تمام خوبیوں کے باوجود کسی کسی موقع پر توجہ نہ ہونے یا مواد نہ ملنے کی وجہ سے کچھ فروگزاشتیں بھی ہوگئی ہیں، جن کی نسبت میں امید کرتا ہوں کہ دوسرے اڈیشن میں باقی نہ رہیں گی''[1]۔

پھر پورے مضمون میں جو کہ تیس صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے، ان ہی فروگزاشتوں کی تفصیل اور ان کی توضیح ہے۔

تلامذۂ شیخ محدث:

ان میں پہلے جس فروگزاشت یا کتاب کی جس کمی کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں شیخ محدث کے تلامذہ ومسترشدین کا کوئی باب یا عنوان نہیں ہے، حالانکہ حیات شیخ کا یہ ایک نہایت سنہرا ورق ہے، جس کا اس لاجواب تصنیف میں موجود ہونا اس کے زیب وزینت کے لیے بھی ضروری تھا، نیز اس کے بغیر کتاب کا موضوع بھی تشنہ نظر آتا ہے۔

اس کے بعد آپ نے شیخ کے تلامذہ اور مسترشدین کے سلسلے پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

۱-ان کے تلامذہ میں سرفہرست ان کے صاحبزادے شیخ نورالحق کا نام ہے، علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث (قلمی)

اولادِ شیخ کے ماتحت ان کا ذکر آچکا ہے، اس لیے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

شیخ نورالحق سے استفادہ کرنے والوں میں علامہ اعظمیؒ نے 'مآثر الکرام' اور 'تقصار' کے حوالے سے میر سید مبارک محدث متوفی ۱۱۱۵ھ کا ذکر کیا ہے، جن کو آزاد بلگرامی نے 'مآثر الکرام' میں ''قطب المحد ثین'' کے لقب سے یاد کیا ہے۔

'سبحۃ المرجان' کے حوالے سے لکھا ہے کہ سید مبارک سے علم کی تحصیل سید عبدالجلیل بلگرامی متوفی ۱۱۳۸ھ اور شاہ طیب بلگرامی متوفی ۱۱۵۲ھ نے کی۔

مولانا عبدالباری کی 'باقیات صالحات' کے حوالے سے لکھا ہے کہ شیخ نورالحق سے سند فضیلت حاصل کرنے والوں میں حضرت شاہ پیر محمد لکھنوی متوفی ۱۰۸۰ھ کو خاص امتیاز حاصل ہے، جن کا سلسلۂ تلمذ علماء فرنگی محل کے ذریعے پورے ہندوستان میں پھیلا ہے۔

اس کے بعد **ثبت الشیخ عبدالحق الدهلوی** کے حوالے سے شیخ دہلوی سے سند واجازت حاصل کرنے والے حسب ذیل حضرات کے نام لکھے ہیں:

۲-شیخ ہاشم فرزند شیخ، ۳-رضی الدین ابوالمناقب شیخ علی محمد فرزند شیخ دہلوی، ۴-شیخ ابوالبرکات ولی الدین عبدالنبی، ۵-شیخ ابوالسعادات کمال الدین ابوالرضا بابا رتن شیخ دہلوی کے نواسے یا پوتے، ۶-مولانا محمد حیدر بن محمد صادق دہلوی، ۷-شیخ محمد حسین نقش بندی، ۸-استاذ علماء کشمیر خواجہ حیدر بن خواجہ فیروز کشمیری متوفی ۱۰۵۶ھ (بحوالہ اسرار الابرار قلمی)، ۹-مولانا سلیمان احمد آبادی (بحوالہ تذکرہ علماء ہند)۔

مولانا سلیمان سے ان کے صاحبزادے مولانا احمد احمد آبادی متوفی ۱۱۱۲ھ نے علم حدیث کی اجازت لی۔ مولانا احمد یکتائے روزگار عالم تھے، تمام علوم میں ان کو دسترس حاصل تھی، اور اکثر علوم میں ان کی تصنیفات پائی جاتی ہیں (بحوالہ تذکرہ علماء ہند)۔

۱۰-ملا عبدالحکیم سیالکوٹی متوفی ۱۰۶۷ھ: ان سے ان کے لڑکے عبداللہ لبیب نے ان کی کتابوں کی روایت کی، عبداللہ لبیب سے عبداللہ بن سعداللہ لاہوری نے، اور ان سے شاہ ولی اللہ کے شیخ الحدیث ابوطاہر کردی نے (بحوالہ انسان العین)۔

۱۱-سید شاہ طیب ظفر آبادی: حضرت شیخ عبدالحق کی خدمت میں علوم دینیہ کی تحصیل کی، بہت معمّر اور اجلۂ مشائخ میں سے تھے، ان کو بہت سے اہل اللہ کی زیارت کا شرف حاصل تھا، ظفر آباد-ضلع جونپور- میں مزار ہے (بحوالہ تجلی نور، وتحفۃ الابرار قلمی)۔

۱۲-مخدوم دیوان عبدالرشید جون پوری مصنف مناظرہ رشیدیہ متوفی ۱۰۸۳ (بحوالہ سبحۃ المرجان، تذکرۂ علماء ہند، مناقب العارفین، گنج رشیدی، ونفحات العنبر یہ)۔

۱۳-مخدوم شاہ طیب بنارسی متوفی ۱۰۴۲ھ (بحوالہ مناقب العارفین)۔

مذکورہ بالا حضرات کا تذکرہ کرنے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''اس وقت جو نام میری یاد میں تھے، ان کو میں نے پیش کر دیا، مجھے امید ہے کہ کافی جستجو سے مزید نام بھی مل سکتے ہیں''۔

اولاد شیخ محدث:

اس کے بعد ''اولاد شیخ محدث'' کا عنوان قائم کیا ہے، اس کے ماتحت مضمون کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے:

''یہ عنوان حیات شیخ عبدالحق میں موجود ہے، مگر اس میں اضافہ کی ابھی بہت گنجائش ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ مصنف نے استیعاب کا ارادہ نہیں کیا ہے، ورنہ وہ خود اس میں اضافہ کر سکتے تھے''(۱)۔

اس کے بعد پہلا نام ''حافظ محمد محسن'' کا لیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کی تو تحقیق نہیں ہو سکی کہ حضرت حافظ محمد محسن اور شیخ کے درمیان کتنے واسطے تھے، لیکن وہ بالاجماع حضرت شیخ کی اولاد میں تھے، اور کم از کم درمیانی واسطے تین ہوں گے۔ اس کے بعد ان کی نسبت 'حدائق الحنفیہ' کے حوالے سے لکھا ہے:

''جامع علوم عقلیہ ونقلیہ تھے، اور دہلی میں آپ کے وقت میں علماء وفضلاء شہر میں سے کسی کو آپ کے ساتھ برابری کی جرأت نہ تھی''(۲)۔

باطنی سلسلے میں عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم - متوفی ۱۰۷۰ھ - کے خلیفہ ارشد تھے۔ علامہ اعظمیؒ نے 'مقامات مظہری' اور 'حدائق الحنفیہ' وغیرہ کے حوالے سے ان کے علم وفضل، ورع وتقویٰ اور زہد وریاضت کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے:

''ان مختصر حالات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت شیخ محدث کی اولاد میں حضرت حافظ محمد محسن کی شخصیت بڑی اہم شخصیت ہے، حضرت مرزا مظہر جان جاناں اور حضرت شاہ غلام علی قدس سرہما کے سلسلہ سے ہند وبیرونِ ہند میں جتنے حضرات صوفیہ وابستہ ہیں، حافظ صاحب ان سب کے شیخ الشیوخ ہیں، اور اس لحاظ سے اولادِ شیخ عبدالحق میں ان کا نام کسی طرح نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں ہے''(۳)۔

پھر 'حدائق' اور 'تذکرہ' کے حوالے سے لکھا ہے کہ حافظ صاحب کی وفات ۱۱۴۷ھ میں ہوئی، اور 'مزارات اولیاء' دہلی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کا مزار شیخ محدث کے قبرستان میں ہے۔

اس کے بعد حضرت شیخ محمد احسان و شیخ غلام حسن کا 'مقامات مظہری' کے حوالے سے حافظ محمد محسن کی اولاد اور حضرت شیخ عبدالحق کے سلسلۂ نسب میں ہونا ثابت کیا ہے۔

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث (قلمی) (۲) ایضاً (۳) ایضاً

پھر شیخ مقرب اللہ-وفات رمضان ۱۱۱۳ھ- کا نسب 'تاریخ محمدی' کے حوالے سے یہ لکھا ہے: ''شیخ مقرب اللہ بن جار اللہ بن نور اللہ بن نور الحق بن شیخ عبد الحق''، اور لکھا ہے کہ مرزا بدخشی نے ان کو **العَلاَّمۃُ المُتَفَنِّن** کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

مفتی اکرام الدین المتخلص بہ حیران: تذکرۂ صبح گلشن کے حوالے سے لکھا ہے کہ پانی پت کے عہدۂ قضا اور دہلی کی مسند افتاء پر متمکن تھے، شاعری کا بھی شوق رکھتے تھے، حیران تخلص کرتے تھے، ایک ہزار اشعار سے زیادہ پر مشتمل ان کا ایک دیوان بھی یادگار رہے۔

اساتذۂ شیخ محدث:

آگے ''اساتذۂ شیخ محدث'' کا عنوان قائم کر کے علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''اس عنوان کے تحت ہم کو یہ گزارش کرنا ہے کہ ہندوستان میں حضرت شیخ نے جن دانشمندوں سے علم حاصل کیا ہے، ان کے نام تو معلوم نہیں ہو سکے، مجبوری ہے؛ لیکن حجاز میں شیخ عبد الوہاب متقی کے سوا دیگر علماء وقت کے سامنے بھی شیخ نے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے، اور ان سے حدیث کی سند لی ہے''[1]۔

اپنے اس دعوے کی دلیل میں علامہ اعظمیؒ نے خود حضرت محدث دہلوی کی عبارت پیش کی ہے، پھر 'حدائق الحنفیہ' کے حوالے سے سب سے پہلا نام شیخ علی بن جار اللہ قرشی خالدی مخزومی مکی کا لکھا ہے، جو اپنے وقت کے فقیہ فاضل، محدث کامل اور مفتی وخطیب مکہ تھے۔

ان کے ایک تیسرے شیخ ابوالحرم احمد بن محمد بن محمد مدنی کا بھی تذکرہ کیا ہے، جن کے متعلق شیخ نے **أکبر فقهاء مدینة الرسول علماً وسناً وبركةً** لکھا ہے۔

چوتھے شیخ حمید الدین سندھی: قاضی عبد اللہ سندھی کے لڑکے اور شیخ رحمۃ اللہ سندھی-متوفی **۹۹۳**ھ- کے بھائی ہیں۔ علامہ اعظمیؒ نے شیخ حمید الدین کا تذکرہ 'ثبت الشيخ' کے علاوہ 'تذکرۂ علماء ہند' سے بھی لیا ہے۔

''اساتذۂ شیخ'' کے بعد علامہ اعظمیؒ نے کچھ اور معروضات بھی پیش کیے ہیں، نظامی صاحب نے لکھا تھا کہ:

''دسویں صدی ہجری میں یوپی، دہلی، پنجاب کے سارے علاقہ میں صرف دو محدثین کے نام نظر آتے ہیں: حاجی ابراہیم قادری اور مولانا اسماعیل لاہوری'' (حیات شیخ عبد الحق ص ۴۰)۔

علامہ اعظمیؒ نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے جو معلومات پیش کی ہیں، وہ بہت بیش قیمت اور کارآمد ہیں، آپ نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

'ہم نے خاص اس نقطۂ نظر سے تاریخ وکتبِ تذکرہ کا پورا جائزہ تو نہیں لیا ہے، پھر بھی ہم کہہ سکتے

(۱) حیات شیخ عبد الحق محدث (قلمی)

ہیں کہ دسویں صدی میں اس پورے علاقہ کے اندر محدثین کی تعداد اس سے بہت زیادہ تھی، جتنی فاضل مصنف بیان کر رہے ہیں، مجھے اس وقت تلاش اور جستجو کی فرصت نہیں ہے، تاہم چند نام جو پہلے سے میرے ذہن میں ہیں، ان کو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کر رہا ہوں"[۱]۔

اس کے بعد ایجاز و اختصار کے ساتھ مگر بقدر ضرورت جن حضرات کا تذکرہ کیا ہے، وہ یہ ہیں:

ا) سید رفیع الدین محدث آگرہ -متوفی ۹۵۴ھ-: بحوالہ تذکرہ وحدائق وتقصار۔

ب) مولانا میر کلاں محدث اکبرآبادی -متوفی ۹۸۳ھ-: بحوالہ تذکرہ وحدائق وسبحۃ المرجان۔

ج) قاضی شیخ بہلول بدخشانی استاذ وشیخ حضرت مجدد الف ثانی: علامہ اعظمیؒ نے 'سبحۃ المرجان' کے حوالے سے ان کا تذکرہ کیا ہے، اور ان کی نسبت مولانا آزاد بلگرامی کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: **کان من صنادید العلماء بها** [سبحہ:٦٧] (لاہور کے اکابر علماء سے تھے) اور دوسری جگہ لکھا ہے: **کان من کبراء المحدثین بالهند** [سبحہ:٤٧] (وہ ہند کے بڑے محدثوں میں تھے)۔

د) شیخ بہلول بن کبیر کنبو دہلوی -متوفی ۱۰۶۱ھ-: ان کا اصل نام عبدالرزاق تھا، علامہ اعظمیؒ نے 'اخبار الاخیار' اور 'اخبار الاصفیاء' -قلمی- سے ان کے حالات نقل کر کے لکھا ہے:

''میرا خیال ہے کہ یہ شیخ بہلول قاضی بہلول بدخشانی کے علاوہ ہیں، وہ لاہور میں تھے اور یہ دہلی میں، وہ عبدالرحمان بن فہد کے شاگرد تھے، یہ شیخ عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کے؛ اور تذکرۂ علماء ہند میں جن شیخ بہلول دہلوی کا ذکر ہے، وہ یہی کنبو بزرگ ہیں''۔

اس کے بعد 'تذکرہ' کی ایک عبارت -شیخ بہلول دہلوی علم حدیث را خوب ورزیدہ، درصحبتِ اہل فقر وفنا رسیدہ، با اہل دنیا کارے نداشت، درعہدِ اکبر بادشاہ بافادہ وافاضہ طلاب مشغول بودہ- نقل کر کے لکھا ہے:

''صاحب 'تذکرہ' نے اگرچہ حوالہ نہیں دیا ہے، مگر یہ الفاظ عبدالقادر بدایونی صاحب 'منتخب التواریخ' کے ہیں، اور یہی شیخ بہلول ہیں، جن کو فیضی اپنے خطوط بنام حضرت شیخ عبدالحق میں ''اسکندرِ مسند فقر میاں بہلول'' لکھا کرتا تھا، اور شیخ کے واسطہ سے ان کو سلام بھجوایا کرتا تھا''۔

ہ) شیخ یعقوب صرفی کشمیری -متوفی ۱۰۰۳ھ-: ان کا مختصر تذکرہ 'حدائق'، 'زبدۃ المقامات'، 'اسرار الابرار' اور 'تذکرہ علماء ہند' کے حوالے سے لکھا ہے، 'حدائق' اور 'زبدۃ' کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی نے ان سے حدیث پڑھی ہے۔

و) خواجہ مبارک بن شیخ ارزانی فاروقی -متوفی ۹۸۰ یا ۹۸۱ھ-: مناقب العارفین -قلمی- کے حوالے سے ان کا تذکرہ لکھا ہے، 'ریحانی' شرح مشکوٰۃ، 'مدارج الاخبار'، 'معدن الاسرار شرح مدارج الاخبار' وغیرہ ان کی تصانیف ہیں، بنارس میں آسودۂ خاک ہیں۔

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث (قلمی)

ز) تاج المحدثین شیخ طاہر بن یوسف سندی، مصنف فوائد محمدیہ مختصر مواہب لدنیہ-: ۹۱۰ھ کے بعد پیدا ہوئے تھے، علامہ اعظمیؒ نے 'گلزار ابرار' سے ان کے حالات قلم بند کیے ہیں۔

ح) ملا شنگرف گنائی کشمیری: شیخ ابن حجر مکی سے حدیث کی سند لی تھی، 'حدائق' اور 'تذکرہ' کے حوالے سے ان کی نسبت تین سطریں تحریر فرمائی ہیں۔

ط) شیخ عبد النبی صدر الصدور گنگوہی -متوفی ۹۹۱ھ-: شیخ عبد القدوس گنگوہی کے پڑپوتے اور اکبر کے عہدِ حکومت میں پندرہ برس تک ہندوستان کے صدر الصدور تھے، گلزار ابرار (۲۴۱) میں ہے کہ ''استادانِ عرب سے سند حدیث حاصل کی تھی''، اور اخبار الاصفیاء (قلمی) اور تحفۃ الابرار (قلمی) میں ہے کہ ''شیخ ابن حجر مکی سے حدیث کی سند لی''۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ ان کا ایک رسالہ '**الرد علی صلاۃ القفال**' اور ایک دوسری تصنیف '**سنن الهدی فی متابعة المصطفی**' -جس کا ذکر حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی کیا ہے- ان کی نگاہ سے گزری ہے، جو چھ سو بیاسی صفحات پر مشتمل ہے، مگر ناقص ہے۔ پھر فرمایا ہے کہ ان کے حالات کے لیے 'منتخب التواریخ'، 'اخبار الاصفیا'، 'تحفۃ الابرار'، 'گلزار ابرار'، 'تذکرۂ علماء ہند'، 'طرب الاماثل' اور 'حدائق الحنفیہ' کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

اس کے بعد ان کے تذکرے میں متعدد کتابوں میں پائی جانے والی غلطیوں پر یوں متنبہ کیا ہے:

> ''اخبار الاخیار مطبوعہ مجتبائی دہلی ۱۳۰۹ھ میں ان کو شیخ رکن الدین کا بیٹا لکھا ہے، یہ صحیح نہیں ہے، وہ شیخ رکن الدین المتوفی ۹۸۴ھ کے لڑکے نہیں تھے، بلکہ ان کے بھائی شیخ احمد کے لڑکے تھے، جیسا کہ 'زبدۃ المقامات' وغیرہ میں مذکور ہے؛ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ شیخ احمد شیخ رکن الدین کے لڑکے تھے جیسا کہ ترجمہ 'گلزار ابرار' میں ہے، شیخ احمد حضرت شیخ عبد القدوس کے لڑکے اور شیخ رکن الدین کے بھائی تھے''(۱)۔

ی) حاجی ابراہیم سرہندی: علامہ ابن حجر ہیتمی کی خدمت میں احادیث کی تصحیح کی تھی، اور حدیث وتفسیر کی سند میں نسبت عالی حاصل کی تھی۔ گلزار ابرار کے حوالے سے تین چوتھائی صفحے پر مشتمل ان کا تذکرہ لکھا ہے۔

یا) مخدوم مٹھوٹھٹوی -متوفی ۹۴۹ھ-: ان کے حالات تذکرۂ علماء ہند میں ہیں، ان کی تصنیفات میں شرح اربعین اور شرح گیلانی وغیرہ ہیں۔

یب) سید صدر جہاں رئیس قصبہ پہانی -ضلع ہردوئی- (ت ۱۰۲۷): ایک سو بیس سال کی عمر پائی۔ صبح گلشن کے حوالے سے ان کا تذکرہ لکھا ہے۔

یج) شیخ ابوالفتح تھانیسری: تذکرہ علماء ہند کے حوالے سے ان کی نسبت چند سطریں تحریر فرمائی ہیں، اور

(۱) حیات شیخ عبد الحق محدث (قلمی)

فرمایا ہے کہ ''دسویں صدی کے نہایت متبحر عالم تھے''۔

ید) میر سید ابراہیم ایرجی ثم الدہلوی - ت ۹۵۳ھ -: حضرت شیخ عبدالحق فرماتے ہیں کہ ''دہلی میں ان کے جیسا کوئی دوسرا عالم ان کے زمانہ میں نہ تھا''۔

یو) ملا عبداللہ بن شمس الدین: عہد اکبری کے نامور اہل علم وصاحب جاہ لوگوں میں تھے، صاحب 'تذکرہ علماء ہند' نے ان کی تصنیفات میں شمائل النبی کا نام لیا ہے، اور 'اخبار الاصفیاء' مصنفہ عبدالصمد بن افضل محمد میں ہے کہ سید ابراہیم ایرجی کے پاس حدیث کی سماعت کی، ۹۹۰ھ میں احمد آباد میں وفات پائی۔

ان عنوانات کے بعد علامہ اعظمیؒ نے نظامی صاحب کے کئی اور تسامحات پر متنبہ کیا ہے، میں ان بیش قیمت معلومات کو اختصار کے ساتھ نذر قارئین کر دینا چاہتا ہوں۔

نظامی صاحب نے صفحہ ۷۸ پر لکھا ہے:

''شیخ محدث نے ابتدائی زمانہ میں ہی قرآن پاک حفظ کر لیا تھا''۔

علامہ اعظمیؒ نے اس پر یوں نقد کیا ہے:

''یہ صحیح نہیں ہے، شیخ [نے] فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس وتدریس میں منہمک ہونے کے زمانہ میں قرآن پاک [حفظ] کیا تھا''[1]۔

علامہ اعظمی کا یہ دعوی بے دلیل نہیں ہے، بلکہ انھوں نے اس کے لیے خود شیخ کی دو عبارتیں ان کی کتابوں سے بطور دلیل پیش کی ہیں۔

نظامی صاحب کے تسامحات میں علامہ اعظمیؒ نے ایک یہ بھی لکھا ہے:

'شیخ عبدالوہاب استاذ ومربی حضرت شیخ کا سن وفات لکھنا شاید مصنف بھول گئے، شیخ عبدالوہاب متقی کی وفات ۱۰۰۱ھ میں ہوئی ہے، (حدائق وتذکرہ)''[2]۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

''ص ۱۵۱ میں حضرت شیخ عبدالحق کے لوحِ مزار کی جو عبارت نقل کی ہے، اس میں معلوم نہیں کس طرح شیخ کا سالِ وفات ۱۰۲۱ھ لکھ گیا ہے، اسی طرح تاریخ رحلت فخرِ عالم اور اس کے نیچے دوبارہ ۱۰۲۱ لکھا ہوا ہے، حالانکہ مصنف خود ہی باب کی ابتدائی سطر میں ۱۰۵۲ سال وفات تحریر فرما چکے ہیں، اور یہی صحیح بھی ہے۔ فخر عالم تاریخِ رحلت غلط ہے، فخرِ العالم صحیح ہے''[3]۔

تصانیفِ شیخ:

''تصانیف شیخ'' کے عنوان کے تحت علامہ اعظمیؒ نے شیخ محدث کی دو غیر مطبوعہ کتابوں کا تفصیلی

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث (قلمی) (۲) ایضاً (۳) ایضاً

تعارف پیش کیا ہے، جو فاضل مصنف کی نگاہ سے نہیں گزر سکی تھیں، ان میں ایک کتاب 'إجازة الحديث في القديم و الحديث' ہے، اس کے ضمن میں لکھا ہے کہ:

> ''اس کے قلمی نسخے لکھنؤ میں موجود ہیں، مگر سرورق پر بجائے مذکورہ بالا نام کے 'ثبت الشيخ عبد الحق المحدث الدهلوي' لکھا ہوا ہے، اور ندوہ کے نسخہ میں 'أسانيد الشيخ عبدالحق' لکھا ہوا ہے''(۱)۔

دوسری کتاب جس کا تعارف علامہ اعظمیؒ نے کرایا ہے، وہ 'فتح المنان في تائيد مذهب النعمان' ہے، اور اس کے ایک قلمی نسخہ - مکتوبہ بدست مولانا محمد طاہر معروفی، وفات ۱۲۹۶ھ - کی مدد سے چار صفحے میں اس کا تعارف تحریر فرمایا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنے مضمون کے آخر میں 'فتح المنان' کی فہرست مضامین بھی نقل کر کے ملحق کر دی ہے۔

شیخ محدث کا طرزِ نگارش:

اس کے بعد ایک عنوان ''حضرت محدث کا طرز نگارش'' ہے، جس کے واسطے نواب صدیق حسن خاں صاحب کے دو اقتباس پیش کیے ہیں۔

معاصرین شیخ:

نظامی صاحب کی کتاب کا ایک عنوان ''معاصرین شیخ محدث'' بھی ہے، اس میں علامہ اعظمیؒ نے ایک بزرگ میاں میر لاہوری - متوفی ۱۰۴۵ھ - کا اضافہ فرمایا ہے، اور نصف صفحہ میں ان کا تذکرہ بھی کیا ہے، ان کے نام کا اضافہ اور تعارف کی وجہ بھی ذکر فرمائی ہے، اور لکھا ہے:

> ''اس لیے کہ حیات شیخ عبدالحق میں ان کا اور شیخ سے ان کی ملاقات و گفتگو کا ذکر آچکا ہے، مگر ان کا تعارف نہیں کرایا گیا ہے''(۲)۔

یہ طویل مقالہ یا کتابچہ ۴؍جمادی الآخرہ ۱۳۷۳ھ کا تحریر فرمودہ ہے۔

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث (قلمی) (۲) ایضاً

☆......☆......☆......☆......☆

☆......☆......☆......☆

☆......☆......☆

☆......☆

☆

حضرت شیخ الاسلام کی حیاتِ مبارکہ کے تین دور

اوران کی خصوصیات

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے علامہ اعظمیؒ کو جو تعلق خاطر تھا، وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے، حضرت مدنیؒ کی وفات کے بعد 'الجمعیۃ' کے شیخ الاسلام نمبر کے لیے یہ مضمون آپ نے تحریر فرمایا ہے، اس کا ابتدائیہ یہ ہے:

''مشاہیر اسلام میں کسی کو بدیع الزماں کے لقب سے پکارا گیا ہے، اور کسی کو مورخین نادرۃ العصر لکھتے ہیں، جن مشاہیر کو ان الفاظ سے یاد کیا گیا ہے، ان کے کسی ایک کمال کے لحاظ سے یہ القاب حقیقت پر مبنی ہوں تو ہوں، ان کے تمام اوصاف کے لحاظ سے خالی از مبالغہ نہیں؛ لیکن شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے جملہ اوصاف کے لحاظ سے بدیع الزماں، نادرۃ العصر اور یکتائے روزگار تھے، وہ اپنے متنوع علمی کمالات و باطنی مقامات، بے شمار محاسن اعمال، اور بے انتہا بلند اخلاق و کردار کے لحاظ سے بالکل منفرد اور بے مثال تھے''[1]۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے حضرت مولانا مدنیؒ کی حیات مبارکہ کو تین دور میں تقسیم کرتے ہوئے ہر دور کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے، جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

پہلا دور ۱۳۱۴ھ سے شروع ہو کر اسارت مالٹا (۱۳۳۴ھ) پر ختم ہوتا ہے۔ یہ خالص علمی خدمت کا دور ہے، اسی دور کی یادگار آپ کا فاضلانہ رسالہ 'الشہاب الثاقب' ہے، اور اسی دور میں ممتاز عالم مولانا عبدالحق مدنی نے آپ کے پاس علم حاصل کیا۔

دوسرا دور ۱۳۳۸ھ میں مالٹا سے واپسی کے بعد سے ۱۳۴۶ھ میں دارالعلوم دیوبند کی مسندِ صدارت پر فائز ہونے تک کا ہے، جو آپ کی سیاسی گرم جوشی، تحریکِ خلافت اور تحریکِ آزادی کی علم برداری سے عبارت ہے۔

تیسرا دور دارالعلوم کی صدارت سے لے کر وفات تک کا زمانہ ہے، جس میں آپ بیک وقت ازہرِ ایشیا دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث تھے، جمعیۃ علماء ہند کے صدر بھی تھے، اور ہندوستان کے سب سے بڑے شیخ طریقت بھی تھے۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنے اس مضمون میں مولانا مدنیؒ کے ساتھ اپنے ربط و تعلق کی ابتدا، اس میں استواری و پائیداری، اپنی عقیدت اور مولانا کی اپنے اوپر محبت و شفقت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس میں آپ نے لکھا ہے:

''پھر جب آپ ۱۳۴۶ھ میں دارالعلوم کی مسند صدارت پر رونق افروز ہوئے، تو اُس کے بعد

---

(۱) الجمعیۃ - شیخ الاسلام نمبر-:۳۹

سے مرضِ وفات تک یاد نہیں کتنی بار حضرت کی صحبت میں رہنے اور طویل وقصیر زیارت سے بہرہ ور ہونے اور آپ کی نوازشوں اور شفقتوں سے مالا مال ہونے کا موقع ملا۔

زیارتوں کا یہ سلسلہ بہت طویل اور اس کی مدت تیس سال سے زیادہ ہے، مگر اس پوری مدت میں -باوجودیکہ میرا تعلق بیعت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے تھا اور حضرت مرحوم کو اس کی اطلاع بھی تھی- میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ حضرت مرحوم اپنے اخص خواص تلامذہ ومریدین ومحبین کی نسبت سے کچھ کم اعتماد ومحبت وشفقت اس حقیر سے فرماتے ہیں۔ میں حضرت کی اس بلندیٔ اخلاق سے بہت متاثر تھا، اور ہوں"(۱)۔

اسی کے ساتھ مولانا مدنی کی شفقت ومحبت، اور اپنے اوپر ان کے اعتماد کے متعدد واقعات اور کچھ خطوط بھی نقل کیے ہیں، ان واقعات میں اعظم گڈھ میں سدھاری پر ہونے والا جلسہ بھی ہے، جو علامہ اعظمیؒ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، جس میں حضرت مدنی اور حضرت مولانا قاری طیب صاحب بھی شریک ہوئے تھے، اس میں اقبال سہیل نے جلسے کی مناسبت سے ایک طویل فارسی نظم پڑھی تھی، جس کا ایک شعر یہ ہے:

وزاں پس آں حبیب ما، ادیب ما، خطیب ما
کہ ذاتش در مئو احناف را حصن حصیں آمد

علامہ اعظمیؒ نے اپنے اس مضمون کو حضرت مدنی کی تاریخِ وفات پر ختم کیا ہے، تاریخ کی تخریج بہت دلچسپ ہے، اور اس سے علامہ اعظمیؒ کی دقتِ نظر اور قوت تخئیل کا پتہ چلتا ہے، لکھا ہے:

"اب صرف ایک بات عرض کر کے اس مضمون کو ختم کرنا چاہتا ہوں، آج فجر کی نماز کے بعد تلاوت کر رہا تھا، جب ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ﴾ پر پہنچا، تو یک بیک دل میں آیا کہ شاید فِي رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ سے سالِ وفات کے اعداد برآمد ہوں، اس خیال کے آتے ہی رکا، اور رک کر حروف کے اعداد پر غور کیا تو ٹھیک ۱۳۷۷ برآمد ہوئے"(۲)۔

☆......☆......☆

اعیان الحجاج

حج کے احکام ومسائل پر تو بہت ساری کتابیں تصنیف ہوئیں، اور عربی اور اردو وفارسی تینوں زبانوں میں اس کے احکام ومسائل کا بیش قیمت ذخیرہ بہم پہنچایا گیا، لیکن امت کے ایسے برگزیدہ اور سعادت مند افراد کا تذکرہ اور ان کے واقعات وحکایات جو اسلام کے اس اہم رکن اور فریضے سے بہرہ ور ہوئے، اس موضوع پر قلم اٹھانے کی ابھی تک زحمت نہیں گوارا فرمائی گئی تھی، اور نہ اس کو عنوانِ تصنیف وتالیف بنایا گیا تھا، علامہ اعظمیؒ نے اس کی طرف

(۱) الجمعیۃ - شیخ الاسلام نمبر-: ۴۰ (۲) ایضاً: ۴۵

اپنی عنانِ توجہ منعطف کی، اور چن چن کر ایسے منتخب اور برگزیدہ افراد کو ایک لڑی میں پرو دیا، جن کا سعادتِ حج سے بہرہ مند ہونے کا تذکرہ کتبِ تاریخ وسیر میں ملتا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اصل کتاب کے آغاز سے پہلے اس کا ایک نہایت جامع اور فاضلانہ مقدمہ تحریر فرمایا ہے، جو بارہ صفحات پر محیط ہے، اس مقدمے میں آپ نے حج کی مشروعیت، اس کی اہمیت اور دینی ودنیوی افادیت ونافعیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اس میں خطبے کے بعد تحریر فرمایا ہے:

''فرائض وارکانِ اسلام میں حج بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور قدرت واستطاعت کے باوجود اس کے ادائیگی میں تہاوُن وتکاسُل اور سستی وکاہلی سے کام لینا نہایت مذموم اور سخت خطرناک بات ہے، قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا:

وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً، وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ [آل عمران:] اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر حج کرنا اس گھر کا، جو شخص قدرت رکھتا ہو اس کی طرف راہ چلنے کی اور جو نہ مانے تو پھر اللہ پروا نہیں رکھتا جہان والوں کی۔

اس آیت میں قدرت کے باوجود حج نہ کرنے کو ''کفر'' کے عنوان سے ذکر کیا گیا، جو اپنے ظاہری معنی میں نہ سہی، لیکن اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ یہ ''کافرانہ'' کام ہے، ورنہ یہ عنوان اختیار نہ کیا جاتا، اور اسی لیے حدیثِ نبوی میں ترکِ حج کی مذمت اس عنوان سے بیان کی گئی:

مَنْ مَلَكَ زاداً وَّراحِلَةً تُبَلِّغُهُ إلىٰ بيتِ اللهِ وَلَمْ يَحجَّ فَلا عَليهِ أنْ يَّمُوْتَ يَهُوْدِيّاً أوْ نَصْرانِياً [ترمذی] جو آدمی راستہ کے خرچ اور سواری کا جو اس کو بیت اللہ تک پہنچا دے مالک ہو، یعنی اس پر قدرت رکھتا ہو، پھر حج نہ کرے، تو کچھ فرق نہیں کہ وہ یہودی مرے یا نصرانی مرے۔

مقصد یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ بھی حج کعبہ نہیں کرتے، تو اس باب میں وہ مسلمان عملاً یہود ونصاریٰ کا ہم آہنگ ہے''[1]۔

اس کے بعد آیت قرآنی ﴿وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالاً وَّ عَلىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ﴾ [الحج:] کی گویا تشریح فرمائی ہے، اس میں دنیوی منافع وفوائد کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اس کے ذریعے اسلامی علوم وفنون کی جو نشر واشاعت ہوئی تھی، اختصار کے ساتھ اس کا عہد بعہد تذکرہ کیا ہے، اور خاص طور سے علم حدیث کی اشاعت میں سفرِ حج کا جو رول رہا ہے، اس پر قدرے دراز گفتگو کی ہے، اس مقدمے کے کچھ حصوں کو یہاں نقل کر دینے کا جی چاہتا ہے، سفرِ حج کی برکت سے علم وفن کی جو اشاعت ہوئی ہے، اس کی تمہید باندھتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تاریخ وتذکرہ کی کتابیں آپ پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ قرون اولیٰ میں اور بعد کی صدیوں میں بھی

(۱) اعیان الحجاج: ۱/۱۰

تحصیل واشاعت علم کا بہت بڑا ذریعہ سفر حج تھا، خلفائے راشدین کے عہد میں اس سفر کی بدولت خلفاء اور ان کے معاصر اکابر صحابہ سے دنیائے اسلام کے کس کس حصے کے لوگوں نے مسائل اور اسلامی آداب سیکھے، اور روایتِ احادیث کا سلسلہ کہاں سے کہاں تک پہنچا، اس کی اچھی خاصی جھلک آپ کو خود صحاح ستہ میں نظر آسکتی ہے''(۱)۔

خود عہدِ صحابہؓ میں مکہ مکرمہ اشاعتِ علم کا کتنا بڑا مرکز اور گہوارہ ہوگیا تھا، اس کا اندازہ اس اقتباس سے ہوتا ہے:

''اس کے بعد تاریخیں آپ کو بتائیں گی کہ حضرت ابن الزبیرؓ کی شہادت کے بعد مکہ معظّمہ اکابر اہلِ علم کا ملجا وماویٰ بن گیا تھا اور مسجدِ حرام میں درس کے متعدد حلقے قائم ہوگئے تھے، اسی زمانہ میں ترجمان القرآن وحبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے چاہ زمزم کی عمارت میں اپنی نشست گاہ مقرر کی اور درس کا وہ حلقہ قائم ہوا، جس کی شہرت ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچی اور مختلف اطراف کے طلبہ اس میں شریک ہوئے، اور اس حلقۂ درس سے مجاہد، عطاء، طاوس یمانی، سعید بن جبیر کوفی، سلیمان بن یسار مدنی اور ابوالزبیر جیسے ائمۂ تفسیر وحدیث وفقہ پیدا ہوئے''(۲)۔

اس کے بعد دوصدیوں تک کی اس کی مرکزیت کو چند جملوں میں سمیٹ کر دریا کو کوزہ میں یوں بند کیا ہے:

''ابن عباسؓ کے بعد مکہ میں مجاہد، عطاء اور ابوالزبیر وعمرو بن دینار کے حلقہائے درس وتحدیث قائم ہوئے، جن میں امام ابوحنیفہ، امام ثوری، ابن عیینہ، مسلم بن خالد زنجی، امام اوزاعی، امام مالک، ابن ابی نجیح اور ابن جریج وغیرہ شریک ہوکر علم کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ اس کے بعد ابن ابی نجیح، ابن جریج، پھر ابن عیینہ ومسلم بن خالد کا دور آیا، اور ان کی خدمت میں امام شافعی، حمیدی، احمد بن حنبل وغیرہ نے حاضر ہوکر علم کی تحصیل وتکمیل کی، اور حمیدی کے حلقۂ درس میں امام بخاری اور اسحاق بن راہویہ شریک ہوئے۔ تذکرہ کی کتابیں شاہد ہیں کہ ابن عباسؓ کے عہد سے لے کر حمیدی اور ان کے بعد تک مکہ کے حلقہائے درس وتحدیث کی رونق سفرِ حج ہی کی بدولت تھی، لوگ حج کے لیے آتے تھے اور حج کے ساتھ علم کی دولت بھی ساتھ لے جاتے تھے''(۳)۔

پھر امام احمد، یحییٰ بن معین اور عبدالرزاق وغیرہ کے واقعات ذکر کیے گئے ہیں، امام بخاری کا اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ حج کے ارادے سے آنا اور تحصیلِ علم کے واسطے مکہ میں مقیم ہوجانا، اور مکہ کی اقامت کی حالت میں ان کے تصنیفی مشاغل کو ذکر کیا ہے۔

دوصدیوں کی ان علمی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے بعد، ہندوستانی علماء نے سفرِ حج کی برکت سے علم حدیث

(۱) اعیان الحجاج: ۱/۱۱ (۲) ایضاً: ۱/۱۲-۱۱ (۳) ایضاً: ۱/۱۲

کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، اس پر نسبتاً زیادہ توجہ مرکوز کی ہے، اور ان کی خدمات کو معرضِ تحریر میں لانے سے پہلے لکھا ہے:

''ان درمیانی صدیوں کی نسبت تھوڑا تھوڑا بھی لکھا جائے تو بہت زیادہ ہو جائے گا، اور تمہید تمہید نہ رہے گی، اس لیے ہم طَفرہ کر کے ایک دم سے دسویں صدی ہجری میں پہنچ کر یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں علمِ حدیث کی خدمت کے شاہکار اور محدثینِ ہند کی علمی یادگاریں جو ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں، وہ سب اسی سفرِ حج کی سوغات ہیں''(۱)۔

علماء ہند کی ان علمی یادگاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے جو سفرِ حج کی برکت سے معرضِ وجود میں آئی ہیں، سب سے اول شیخ علی متقی کی تصانیف کا ذکر کیا ہے، اور ان کی نسبت لکھا ہے:

''حدیثوں کا وہ عظیم الشان ذخیرہ جو 'کنز العُمّال' کے نام سے آٹھ جلدوں میں شائع ہو چکا ہے، اور 'منتخب کنز العمال' جو مصر میں چھپا ہے، اور 'منہج العمال' -قلمی- یہ سب حضرت شیخ علی متقی ہندی کے آثارِ علمیہ ہیں، جو سفرِ حج کی بدولت عالمِ ظہور میں آئے ہیں، حضرت شیخ جب حج کے لیے گئے، تو وہاں شیخ ابوالحسن بکری و شیخ ابن حجر مکی کی خدمت میں حدیث کا علم حاصل کیا، پھر وہیں مستقل قیام کر کے یہ کتابیں لکھیں''(۲)۔

اسی طرح مولانا محمد طاہر پٹنی کی 'مجمع البحار'، 'مغنی' اور 'تذکرۃ الموضوعات' بھی سفرِ حج اور علماء حرمین شریفین سے ان کے کسب و استفادہ کی بابرکت یادگار ہیں۔

پھر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی نسبت لکھا ہے:

''اور خود شیخ عبدالحق کی 'لمعات التنقیح فی شرح مشکاۃ المصابیح' -قلمی- 'اشعۃ اللمعات' ترجمہ مشکاۃ -مطبوعہ- اور 'فتح المنان' -قلمی- کا سارا مواد اسی سفر میں ان کو ہاتھ آیا تھا، اور ان مواد کو ان کتابوں کی شکل میں ترتیب دینے کا ولولہ بھی وہ مکہ ہی سے لائے تھے، جس کا اظہار انھوں نے 'اشعۃ اللمعات' اور 'فتح المنان' میں انھوں نے خود کیا ہے''(۳)۔

اس کے بعد حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''راستہ کو مختصر کرنے کے لیے بیچ میں ایک صدی چھوڑ کر اب بارہویں صدی میں آ جایئے، اور دیکھئے کہ آج ہندوستان میں جہاں جہاں قال اللہ و قال الرسول کا غلغلہ بلند ہے، آج جس جس جگہ درسِ حدیث کا سلسلہ جاری ہے، اور آج علمِ حدیث و رجال میں علماء ہند کے جو جو کارنامے ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں، یہ سب کس کا فیض ہے؟ کیا یہ سب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا فیض نہیں ہے؟ اور شاہ ولی اللہ کو یہ دولت کہاں ہاتھ آئی؟ اسی سفرِ حج کے بدولت مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں۔ ہم کو کسی بیرونی

(۱) اعیان الحجاج: ۱/۱۵-۱۴ (۲) ایضاً: ۱/۱۵ (۳) ایضاً: ۱/۱۵

شہادت کے پیش کرنے کی حاجت نہیں ہے، اس باب میں خود حضرت شاہ صاحب کا رسالہ 'انتباہ' - غیر مطبوعہ حصہ - اور رسالہ 'انسان العین فی مشائخ الحرمین' سب سے بڑی شہادت ہے''(۱)۔

شاہ ولی اللہ کے بعد حاجی صفۃ اللہ محدث خیر آبادی، علامہ غلام علی آزاد بلگرامی، مفتی ولی اللہ فرخ آبادی، مولانا محمد طاہر معروفی، مولانا عبدالحلیم لکھنوی، ان کے خلف ارشد مولانا عبدالحی لکھنوی، مولانا عبداللہ مئوی کے علاوہ علماء دیوبند میں حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی، حضرت تھانوی، حضرت مدنی، نیز مولانا محمد حسین الہ آبادی اور شاہ سلیمان پھلواروی کے سفر حج اور اس کی برکت سے علم حدیث سے بہرہ مندی کے اجمالی یا عبوری تذکرہ کے بعد لکھا ہے:

''قصہ مختصر یہ کہ سفر حج ہمیشہ بہت سے دینی وعلمی، ثقافتی واجتماعی منافع وفوائد پر مشتمل رہا ہے، اس سفر کی بدولت ہزاروں محقق علماء، بکثرت مصلحین اور کتنے اہل اللہ پیدا ہوئے، اور ایسے انسانوں کا تو شمار ممکن نہیں ہے، جن کی زندگی کا رُخ اس سفر نے موڑ دیا''(۲)۔

اس کے بعد حج پر جانے والے لوگوں کی موجودہ صورتِ حال پر افسوس اور گریہ وماتم کیا ہے، جن کے دلوں میں علمی شغف اور اس کے ذریعے سے اکتسابِ فیض تو دور کی بات ہے، اپنی حالت کی اصلاح کی بھی فکر نہیں ہوتی ہے، بلکہ بجائے عبادت کے حج کا سفر ایک تفریحی سفر بنتا جا رہا ہے، پھر لکھا ہے:

''ان حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد محض از راہِ دل سوزی برسوں سے یہ خیال دماغ میں پک رہا تھا کہ گزشتہ صدیوں کے بالعموم اور قرون اولیٰ کے بالخصوص ایسے حضرات کا ایک مفصل تذکرہ مرتّب کیا جائے، جن کو علم وتحقیق، زہد وتقویٰ، اور للّٰہیت وخلوص میں خاص مقام حاصل ہو، اور ان کی زندگی ہمارے لیے مثالی زندگی کا حکم رکھتی ہو، اور انھوں نے حج کی سعادت بھی حاصل کی ہو، جس میں خصوصیت کے ساتھ ان کے واقعۂ حج کی جزئیات اور عبرت آموز واقعات جہاں تک ممکن ہو، بالاستیعاب ذکر کیے جائیں۔

اسلاف کے کارنامے خلف کے لیے سرمایۂ عبرت ہوتے ہیں، اور بزرگوں کے تذکروں میں ایک خاص دلچسپی اور کشش ہوتی ہے، اور ان کے واقعات نہایت پُر تاثیر ہوتے ہیں، اس لیے امید ہے کہ یہ تذکرہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا، اور انشاءاللہ بے اثر کیے نہ رہے گا''(۳)۔

مقدمے کے آخر میں تالیفِ کتاب کا محرک، اس کا منہج، اور اس کی تصنیف وترتیب میں جن امور کو ملحوظ رکھا گیا ہے، ان کا بیان ہے، فرمایا ہے:

۱- اس تذکرہ کو لکھنے کا داعیہ تو - جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں - بہت دنوں سے تھا، مگر عزیزم قاضی اطہر مبارک پوری (رکن ادارۂ البلاغ - بمبئی) کا ایک سلسلۂ مضامین - جس کو انھوں نے البلاغ

(۱) اعیان الحجاج: ۱/۱۶ (۲) ایضاً: ۱/۱۸ (۳) ایضاً: ۱/۱۹

میں طبقات الحجاج کے عنوان سے شایع کرنا شروع کیا تھا- دیکھ کر یہ داعیہ قوی ہو گیا اور مدتوں کا ارادہ قوت سے فعل میں آیا، چنانچہ ابتداءً میں نے اس تذکرہ کی چند قسطیں البلاغ میں اور کچھ الصدیق -ملتان- میں شائع کرائیں۔

۲-ابتداءً یہ تذکرہ سید الابرار حضرت محمد رسول اللہ کے بعد صحابہ و تابعین اور دیگر افرادِ امت کے حالات پر مشتمل تھا، بعد میں انبیاء سابقین کے ذکر حج کا اضافہ مناسب معلوم ہوا، اس لیے کہ سلفِ صالح کی پیروی سے کہیں بڑھ کر انبیاء سابقین کا اقتدا ہے، امت تو امت خود رسول خدا ﷺ کو حکم الٰہی تھا: بِهُدَاهُمُ اقْتَدِه (ان کی ہدایت اور سیدھے راستہ پر چلنے کی اقتدا کیجئے)۔

۳-اس تذکرہ کو صدیوں کی ترتیب پر مرتب کیا گیا ہے، مگر کہیں کہیں کسی وجہ سے یہ ترتیب قائم نہیں رہ سکی ہے، انشاء اللہ خدا نے توفیق دی تو آیندہ اشاعت میں یہ جزوی بے ترتیبی بھی باقی نہ رہے گی۔

۴-اس تالیف میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ جن بزرگوں کا حال لکھا جائے، اس میں نہ زیادہ تطویل ہو، نہ بالکل اختصار؛ لیکن پھر بھی بعض تراجم آپ کو بہت مختصر محسوس ہوں گے، اس کی وجہ کہیں تو خود مواد کی کمی ہے، اور کہیں طبیعت کے نشاط کی۔ انشاء اللہ آیندہ اشاعت میں دوسرے قسم کے تراجم میں مناسب اضافہ کر دیا جائے گا''(۱)۔

کتاب کا آغاز سرکارِ رسالت مآب حضرت سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے حج سے ہوا ہے، اس کے بعد حضرت آدم کا تذکرہ ہے، پھر حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ و عیسیٰ، حضرت ہود و صالح، حضرت یونس، حضرت الیاس و خضر علیہم الصلاۃ والتسلیم کے حج کرنے کا تذکرہ کتبِ حدیث و سیر کے حوالوں سے کیا ہے۔

ہم یہاں بطور تیمّن و تبرّک کے آنحضرت ﷺ کا تذکرہ بعینہ و بتمامہ نقل کرتے ہیں:

''آپ نے نبوت کے بعد دو حج کیے ہیں، ایک قبل ہجرت اور ایک بعد ہجرت، اور روایات سے ثابت ہے کہ آپ نے قبلِ نبوت بھی حج کیے ہیں۔

آپؐ کے عمروں کی تعداد احادیث میں چار مذکور ہے، ان میں سے تین عمرے ماہ ذی القعدہ میں کیے ہیں، اور ایک ذی الحجہ میں۔

ہجرت کے بعد ۱۰ھ میں جو حج آپ نے کیا ہے، اس کا نام حجۃ الوداع ہے، اس کا اور اس کے سفر کا واقعہ شرح و بسط کے ساتھ کتبِ احادیث میں مذکور ہے، مسلمانوں کے لیے وہی حقیقی اُسوہ اور قابلِ تقلید نمونہ ہے، جس کی پیروی حج کی مقبولیت اور نجاتِ آخرت کی ضمانت ہے۔

یہاں تبرکاً صرف چار واقعے نقل کیے جاتے ہیں:

(۱) اعیان الحجاج: ۱/۲۰-۱۹

۱-حضرت قدامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے آنحضرتﷺ کو صفا ومروہ کے درمیان اونٹ پر اس طرح سعی کرتے دیکھا ہے کہ **لا ضرب ولا طرد ولا إلیک إلیک** (مشکوٰۃ) یعنی کسی کو مارنا تھا نہ ہنکانا، نہ ہٹو بچو۔ یعنی امیرانہ ٹھاٹھ سے نہیں، بلکہ فقیرانہ انداز میں سعی فرماتے تھے۔

۲-آپ کے ساتھ اس سفر میں صرف ایک اونٹنی تھی، اسی پر سوار بھی ہوتے تھے، اور اسی پر سامان بھی لدا ہوا تھا، اس کا کجاوہ بوسیدہ تھا، اور قطیفہ (گدا) صرف چار درہم کی قیمت کا تھا، اور زبانِ مبارک پر یہ کلمات جاری تھے: **اللّٰہمَّ حَجَّةً لا رِيَاءَ فِيها ولا سُمْعَةَ** (اے اللہ! یہ وہ حج ہے جس میں نام ونمود اور شہرت کی خواہش کو دخل نہیں ہے) بخاری وابن ماجہ۔

۳-حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ آنحضرتﷺ حجر اسود کے سامنے آئے اور اپنے لب ہائے مبارک اس پر رکھ کر دیر تک روتے رہے، اتفاق سے ایک بار آپ کی نگاہ اٹھی، تو دیکھا کہ حضرت عمرؓ بھی رو رہے ہیں، تو ارشاد فرمایا کہ: **هٰهُنا تُسكَبُ العَبَراتُ يا عمرُ** (اے عمر! یہ جگہ آنسو بہانے کی ہے) ابن ماجہ۔

۴-ایک بار طواف کی حالت میں نعل مبارک کا تسمہ ٹوٹ گیا، ایک صحابیؓ نے فوراً اپنے جوتے کا تسمہ نکال کر آپ کے نعل میں لگانا چاہا، تو آپ راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ یہ اَثَرَہ (اپنے کو دوسرے کے مقابل میں ترجیح دینا) ہے، اور میں اس کو پسند نہیں کرتا (مجمع الزوائد)۔''

حضرت آدم علیہ السلام کے تذکرے میں لکھا ہے کہ:

''حضرت آدم سب سے پہلے انسان اور انسانوں میں وہی سب سے پہلے حاجی ہیں، اور تمام بلاد وامصار میں صرف ہندوستان کو اللہ نے یہ عزت بخشی ہے کہ حج کے لیے سب سے پہلا سفر یہیں سے ہوا ہے''(۱)۔

اس کے بعد انبیاء سابقین میں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ وعیسی، حضرت ہود وصالح، حضرت یونس اور حضرت الیاس وخضر علی نبینا وعلیہم الصلاۃ والتسلیم کے تذکرے نہایت روح پرور اور بصیرت افروز ہونے کے ساتھ دلچسپ بھی ہیں۔

حضرات انبیاء کرام کے بعد آنحضرتﷺ کے جاں نثار صحابہ کے واقعاتِ حج ذکر کیے گئے ہیں، اور ان میں بھی پیغمبروں کے بعد سب سے افضل انسان سیدنا ابوبکر صدیق اکبرؓ کا تذکرہ ہے، اور ان کے بعد دیگر خلفاء راشدین کے واقعاتِ حج ان کی خلافت کی ترتیب پر ذکر کیے گئے ہیں۔

اس کتاب میں ساڑھے پانچ سو سے زیادہ برگزیدہ افراد کے حج کے تذکرے ہیں، پہلی جلد میں تقریباً دوسو (۲۰۰) بزرگوں کے واقعاتِ حج اور دوسری میں ساڑھے تین سو (۳۵۰) سے زیادہ حضرات کے تذکروں کو شامل کیا گیا ہے، اس میں ائمۂ فقہ، حفاظ حدیث، علماء دین وشریعت، ماہرین ادب ولغت، اولیاء کرام ومشائخِ عظام اور

(۱) اعیان الحجاج: ۲۲/۱

دیگر اصحابِ فضل وکمال کے علاوہ شاہان اسلام اور امراء وعمال کے واقعات بھی حوالۂ قلم کیے گئے ہیں؛ اسی طرح تاریخ اسلام کی بعض با کمال اور نامور خواتین کا بھی تذکرہ ہے، چنانچہ جلد اول کے آخر میں ہارون رشید کی والدہ خیزران اور زوجہ زبیدہ، اور جلد ثانی میں مشہور راویۂ حدیث کریمہ بنت احمد مروزیہ، ملکۂ زمرد خاتون اور ملکۂ خاتون عصمۃ الدین اور بعض دیگر خواتین کا تذکرہ نہایت خوبصورتی، خوش اسلوبی اور جامعیت کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔

کتاب کی خصوصیات:

۱-اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اکثر تذکرے درمیانہ ہیں، نہ بہت طویل نہ بہت مختصر؛ اگر چہ بعض تذکروں میں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے، لیکن اس طرح کے تذکرے بہت کم ہیں، احوال وواقعات کے بیان میں طوالت نہ ہونے کی وجہ سے قاری کا ذہن کسی بھی مقام پر اکتاہٹ اور ملال سے دوچار نہیں ہوتا، بلکہ ایک تذکرے سے اس کی طبیعت سیر اور آسودہ نہیں ہوتی، کہ دوسرا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے پڑھنے والے کی دلچسپی اور اس کا ذوق وشوق از اول تا آخر یکساں طریقے پر باقی رہتا ہے۔

۲-اکثر تذکروں میں صاحبِ تذکرہ کے حج کے ذکر کے ساتھ اگر اس میں کوئی خاص واقعہ رونما ہوا ہے، یا کوئی بزرگانہ کرامت ظاہر ہوئی ہے، تو اس کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، مثلاً مشہور محدث حضرت ایوب سختیانی کے بارے میں لکھا ہے:

> ''ابن الجوزی اور امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ ایوب حج کے لیے جا رہے تھے، مکہ کے راستے میں ایک منزل پر پانی نہیں ملا، اور سارا قافلہ پیاس سے تڑپنے لگا اور لوگوں کی جان پر آبنی، تو ایوب نے لوگوں سے عہد لیا کہ کہیں تذکرہ تو نہ کروگے، جب لوگوں نے وعدہ کیا تو انھوں نے زمین پر ایک دائرہ کھینچ کر دعا کی، وہاں سے پانی کا ایک چشمہ اُبلنے لگا، تمام قافلہ پانی پی کر سیراب ہو گیا، اور اونٹوں کو بھی پلا چکے، تو ایوب نے اس مقام پر اپنا ہاتھ پھیرا، وہ پھر پہلے کی طرح ہو گیا''(۱)۔

۳-اگر ان کے کچھ ناصحانہ اقوال کتابوں میں لکھے ہوئے ملتے ہیں، تو ان کو بھی نقل کیا ہے، مثلاً حضرت سعید بن مسیّب کے حال میں لکھا ہے:

> ''فرماتے تھے کہ مصیحف اور مسیجد (بصیغۂ تصغیر) خدا کے لیے جو چیز بھی ہے، وہ باعظمت اور حسین وجمیل ہے۔ کسی نے پوچھا عبادت کیا ہے؟ فرمایا: اللہ کے امر میں غور وفکر کرنا، حرام سے بچنا، اور خدا کے فرائض ادا کرنا، اور ایک روایت میں دین کی سمجھ پیدا کرنے کا بھی ذکر ہے، فرماتے تھے کہ جو شخص جماعت کے ساتھ نماز پنج گانہ پر محافظت ومداومت کرے، اس نے خشکی وتری کو عبادت سے بھر دیا''(۲)۔

---

(۱) اعیان الحجاج: ۱/۱۱۹ (۲) ایضاً: ۱/۱۰۱

اور حضرت مالک بن دینار کے تذکرہ میں لکھا ہے:

''فرماتے تھے بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ اللہ کہتا ہے کہ جب عالم دنیا کا دلدادہ ہوجاتا ہے، تو میں سب سے معمولی سزا اس کو یہ دیتا ہوں کہ میرے ذکر کی حلاوت وہ اپنے دل میں نہیں پاتا۔ فرماتے تھے کہ عالم تو بس وہ ہے کہ جب اس سے ملنے آؤ اور وہ گھر میں موجود نہ ہو، تو اس کے گھر کی چیزیں اس کا حال بتادیں، تم کو نماز پڑھنے کی چٹائی نظر آئے، قرآن پاک دکھائی دے، اور گھر کے ایک کونے میں وضو کا لوٹا رکھا ہوا ہو، غرض آخرت کی تیاری کا نشان ملے''[۱]۔

''فرماتے تھے جس دوست یا ساتھی یا ہم نشین سے دین کا فائدہ حاصل نہ ہو، اس کی صحبت پر لات ماردو''[۲]۔

۴- ہر تذکرے میں صاحبِ تذکرہ کا سن وفات اہتمام کے ساتھ ذکر کیا ہے، اور اگر تاریخ ولادت معلوم ہوئی ہے، تو بسا اوقات اس کو بھی ذکر کیا ہے۔

۵- اگر صاحب تذکرہ کا شمار رواۃ حدیث میں ہے، تو اس فن کی کتابوں میں ان کے متعلق جو اقوالِ جرح وتعدیل مذکور ہیں، ان کو بھی مستند کتابوں کے حوالے سے نقل کیا ہے، خاص طور سے تعدیل وتوثیق کی عبارتیں زیادہ اہتمام سے نقل کی ہیں۔

۶- صاحبِ تذکرہ کے زہد وتقویٰ، استغنا وبے نیازی اور سفر حج میں مشقت وجانفشانی اور عبادت گزاری کے واقعات پر بطور خاص توجہ صرف کی گئی ہے، جس سے حج پر جانے والوں یا اس کا قصد کرنے والوں کے لیے بے شمار نمونوں کا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔

۷- کتاب کے اندر ضمناً بہت سی علمی تحقیقات بھی آ گئی ہیں، مثلاً حضرت الیاس وخضر علیہما السلام کے تذکرے میں حضرت خضر کی نبوت کی بحث نہایت جامع اور محقق انداز میں سپرد قلم فرمائی ہے۔

۸- اسی طرح دورانِ تذکرہ بہت سے تاریخی اور جغرافیائی مباحث بھی آ گئے ہیں، جو بہت تحقیقی اور معلومات افزا ہیں، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حج کے واقعے میں ''وادیٔ روحاء'' کا ذکر آیا ہے، اس کی نسبت لکھتے ہیں:

''مکہ ومدینہ کے قدیم راستہ میں مدینہ سے ۲۸ میل پر ایک مقام سیالہ واقع ہے، سیالہ دو میل تک چلا جاتا ہے، جہاں ختم ہوتا ہے اس جگہ کا نام شرف الروحاء ہے، اس کے بعد ۱۲ میل کی مسافت پر روحاء ہے، روحاء مکہ کی طرف اور سیالہ مدینہ کی طرف ہے، سیالہ سے روحاء جاتے ہوئے ۹ میل پر عرق الظبیہ واقع ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ مدینہ سے تقریباً ۳۷ میل پر یہ وادی واقع ہے۔ وفاء الوفاء صفحہ ۱۳۱۴ میں مدینہ سے روحاء کا فاصلہ ایک روایت میں ۳۰، ایک میں ۳۵-۳۶، ایک میں ۴۲ میل اور ایک میں ۴ برید

(۱) اعیان الحجاج: ۱/۱۳۱-۱۳۰ (۲) ایضاً: ۱/۱۳۱

(۴۸ میل) مذکور ہے''[1]۔

اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کے واقعۂ حج میں ''ہرشیٰ'' کا ذکر آیا ہے، تو اس کی نسبت لکھا ہے:

''ہرشیٰ مکہ و مدینہ کے تقریباً بیچ میں ہے (مدینہ سے سقیاء ۹۶ میل، اور سقیاء سے ابواء ۲۱ میل، اور ابواء سے ہرشیٰ ۸ میل پر ہے، تو مدینہ سے ہرشی کی مسافت ۱۲۵ میل ہوئی)۔ آج کل جب رابغ سے مدینہ جانے کے لیے بسیں روانہ ہوتی ہیں، تو کئی میل چلنے کے بعد ایک چڑھائی ملتی ہے، جہاں حاجیوں کو اکثر بس سے اتار کر خالی بس چڑھائی پر لے جاتے ہیں، میں نے وہاں پہنچ کر ایک بدّو سے اس جگہ کا نام پوچھا، تو اس نے ہرشیٰ بتایا، کتابوں میں ہرشی کا بیان پڑھنے سے بدو کے قول کی تصدیق ہوتی ہے، کتابوں میں ہے کہ ہرشیٰ سے ۵ میل کے فاصلہ پر جُحفہ کا محل وقوع ہے، اور یہ بھی مذکور ہے کہ رابغ جحفہ کے قریب واقع ہے، وفاء الوفاء میں ہے: **رابغ واد من الجحفة** (۳۰۹/۲)، اور جحفہ کی نسبت لکھا ہے کہ مدینہ سے ۵ ½ مرحلوں پر اور مکہ سے ۴ ½ مرحلوں پر واقع ہے، یعنی جحفہ تک مکہ سے مدینہ کا راستہ آدھے سے کم طے ہوتا ہے، اس کے بعد مدینہ کی طرف ہرشیٰ پڑتا ہے، اس کی نسبت مذکور ہے کہ ہرشیٰ کی چڑھائی سے ایک میل آگے (مدینہ کی طرف) نصف کا نشان گڑا ہوا ہے (وفاء الوفاء ۳۸۶/۲ و ۲۷۹/۲)''[2]۔

اور مثلاً امام ابوداود سجستانی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ:

''امام ذہبی کی تحقیق ہے کہ سجستان اطرافِ مکران وسندھ سے متصل اور ہرات کے پیچھے واقع ہے، ابوداود وہیں کے باشندہ تھے''[3]۔

آگے ان ہی کے تذکرے میں اسی صفحہ پر بیر بضاعہ کی نسبت تحریر فرمایا ہے:

''آپ کا بیان ہے کہ مدینہ کی حاضری کے موقع پر میں بیر بضاعہ کی زیارت کو گیا، تو میں نے اس کو چادر سے ناپا، اس کا عرض سات ہاتھ تھا، جس باغبان نے دروازہ کھولا تھا اور مجھ کو کنویں تک پہنچایا تھا، اس سے میں نے پوچھا کہ عہدِ نبوی کے بعد اس کی دوبارہ تعمیر ہوئی ہے، یا نہیں؟ تو اس نے کہا: نہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کے پانی کو **متغیر اللون** (بدلے ہوئے رنگ کا) دیکھا۔

ناچیز مولف کہتا ہے کہ اس حقیر نے محرم ۱۳۷۰ھ، پھر محرم ۱۳۷۲ھ میں کئی بار اس کنویں کی زیارت کی ہے، اس کنویں سے مشین کے ذریعہ آب پاشی ہوتی ہے، اور اس کا پانی نہایت صاف شفاف وشیریں ہے''[4]۔

اسی طرح پہلی جلد کے آخر میں تاریخ اسلام کی باعظمت خاتون زبیدہ کے تذکرے میں نہرِ زبیدہ کا بیان نہایت دلچسپ اور معلومات میں اضافہ کرنے والا ہے۔

(۱) اعیان الحجاج: ۲۷/۱-۲۶ (۲) ایضاً: ۲۹/۱-۲۸ (۳) ایضاً: ۱۶۲/۱ (۴) ایضاً: ۱۶۳/۱-۱۶۲

لسانی وادبی حیثیت:

کتاب کی زبان نہایت سلیس، شستہ وشگفتہ اوررواں ہے، عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ پوری کتاب علم ومعرفت اور درس ونصیحت سے پُر ہے، اس کو پڑھنے والا پوری کتاب میں کہیں بھی ثقل لسانی، ژولیدہ بیانی، پیچیدہ عبارت، اورغریب ونامانوس الفاظ وکلمات سے دوچار نہیں ہوسکتا۔ زبان وبیان کے کچھ نمونے پیش خدمت ہیں، حضرت معاذ بن جبلؓ کی ایک نصیحت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

☆......: ''اپنے بیٹے سے فرماتے تھے کہ بیٹے نماز پڑھوتو یہ سمجھ کر پڑھو کہ یہ آخری نماز ہے، اس کے بعد پھر موقع نہ ملے گا۔

ایک آدمی سفر پر جارہا تھا، وہ ان کو سلام کرنے اوررخصت ہونے آیا، تو انھوں نے فرمایا کہ میں تم کو دو وصیتیں کرتا ہوں، ان کو یاد رکھو گے، تو تم محفوظ رہو گے، سنو! دنیا کے حصہ سے تم کو بے نیازی تو نہیں ہوسکتی، لیکن تم آخرت کے حصہ کے بہت زیادہ محتاج ہو، لہذا آخرت کے حصہ کو دنیا کے حصہ پر ترجیح دو۔ فرماتے تھے تکلیف ومصیبت کی آزمائش میں تو تم نے صبر کرلیا، لیکن اب خوشی اور آسائش دے کر تمھاری آزمائش ہوگی، اورمیرے نزدیک سب سے خطرناک فتنہ عورتوں کا ہے، جب وہ سونے کے کنگن اورشام ویمن کے بہترین کپڑے پہننے لگیں گی، اور مال داروں کو بھی مشقت میں ڈال دیں گی، اور ناداروں سے اس چیز کی فرمائش کریں گی، جو وہ بے چارہ پا نہیں سکتا''(۱)۔

☆......: جلد اصفحہ ۷۰ پر حضرت زید بن ثابتؓ کا تذکرہ ان الفاظ سے شروع کیا ہے:

''صحابہؓ میں عمر کے لحاظ سے چھوٹے اورعلم وفضل میں بہت بڑے تھے، فرائض میں یکتا اورفقہ میں امام تھے، عہد نبوی میں کاتبِ وحی تھے، اورحضرت صدیقِ اکبرؓ نے جمع قرآن کے لیے انھیں کو مامور فرمایا تھا''(۲)۔

☆......: ابووائل شقیق بن سلمہ اسدی کے تذکرے میں لکھا ہے:

تابعین کے طبقۂ اولیٰ میں ان کا شمار ہے، آنحضرتﷺ کا زمانہ پایا تھا، مگر دیدار وصحبت کا شرف حاصل نہ ہوسکا، حضرت عبداللہ بن مسعود کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے، بلکہ ابوعبیدہ کے خیال میں ان کی احادیث کے سب سے بڑے عالم تھے، ابراہیم نخعی لوگوں کو ہدایت کرتے تھے کہ شقیق کی صحبت اور شاگردی اختیار کرو، اس لیے کہ جب صحابہؓ وتابعین کی کثرت تھی، اس وقت بھی لوگ ان کو بہترین شخص سمجھتے تھے، کوفہ کے ممتاز عابدوں میں سے ایک وہ بھی تھے، دنیا سے بہت بے رغبت تھے، جتنے سے کسی طرح کام چل جائے اس سے زیادہ دنیا کی چاہت ان کو نہ تھی، نرکل یا بانس کا بنا ہوا ایک چھپر تھا، اسی میں خود بھی رہتے تھے اوراسی میں ان کا گھوڑا بھی بندھا رہتا تھا، جب جہاد میں شرکت کے لیے روانہ ہوتے، تو اس کو بھی اجاڑ کر خیرات کردیتے تھے، پھر جب واپس آتے تو دوسرا بنا لیتے تھے۔ خوف

(۱) اعیان الحجاج: ۱/۵۴ (۲) ایضاً: ۱/۷۰

وخشیت کا یہ عالم تھا کہ ابراہیم تیمی ان کے گھر میں وعظ کہتے تو ان کے بدن میں جھرجھری پیدا ہو جاتی اور چڑیوں کی طرح پھریری لینے لگتے تھے، جب گھر میں تنہا ہوتے تو تسبیح پڑھتے، اور اگر کوئی ساری کائنات پیش کرتا اور کہتا کسی کے سامنے تسبیح پڑھیں تو وہ ہرگز نہ کرتے، نماز پڑھتے تو ان کی گھگی بندھ جاتی‘‘[۱]۔

☆......: جلد اصفحہ ۱۰۲-۱۰۳ پر زین العابدین حضرت علی بن حسین-رضی اللہ عنہ- کے تذکرہ میں لکھا ہے:

’’آپ کا لقب زین العابدین، بہت خدا ترس، اور بڑے عبادت گزار تھے، حضرت حسینؓ کے صاحبزادے اور حضرت علی مرتضیٰؓ کے پوتے تھے، دلوں میں ان کی ایسی عظمت ووقعت اور نگاہوں میں ایسا احترام تھا کہ ہشام بن عبدالملک اپنی ولی عہدی کے زمانے میں ایک بار حج کو آیا تھا، اسی سال علی ابن الحسین بھی حج کو آئے تھے، اتفاق سے طواف میں ساتھ ہو گیا، اور ہشام ان سے پہلے حجر اسود کے پاس پہنچا، اس نے انتہائی کوشش کی کہ حجر اسود کا بوسہ نصیب ہو جائے، مگر کسی طرح ممکن نہ ہوا، اس کے بعد علی بن الحسین وہاں پہنچے تو سارے لوگ اپنی اپنی جگہ ٹھٹک گئے اور جو حجر اسود کے پاس تھے، وہ وہاں سے ہٹ گئے اور انھوں نے باطمینان حجر اسود کو چوما۔

ہشام کے آدمیوں نے اس سے پوچھا کہ یہ کون آدمی ہے؟ اس نے کہا میں نہیں پہچانتا۔ اس موقع پر فرزدق شاعر موجود تھا، اس نے نہایت جرأت سے کہا میں ان کو پہچانتا ہوں، یہ علی بن الحسین ہیں، اور اپنا وہ مشہور قصیدہ پڑھا جس کے ابتدائی شعر یہ ہیں:

هـذا ابـنُ خيـرِ عبـادِ اللهِ كـلِّهـمِ : هـذا التَّـقـيُّ الـنَّـقـيُّ الطـاهِـرُ العَلَمُ

هـذا الـذي تَـعـرِفُ البطحـاءُ وَطْـأتَـه : والبيـتُ يَـعـرِفُـه والحِلُّ والحَـرَمُ‘‘

☆......: امام ابوزرعہ رازی کے بارے میں لکھا ہے:

’’اپنے مرض الموت میں کہتے تھے کہ اے اللہ! میں تیرے دیدار کا مشتاق ہوں، پھر کہتے تھے کہ اگر وہ کہے کہ کس عمل کی بنیاد پر تم نے یہ حوصلہ کیا؟ تو کہوں گا کہ تیری رحمت کے بھروسہ پر‘‘[۲]۔

☆......: اور حضرت مالک بن دینار کے تذکرے میں ان کی بابت لکھا ہے:

’’فرماتے تھے کہ میں ایک بار بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا، اثنائے طواف میں میری نگاہ ایک عبادت گزار لڑکی پر پڑی، جو کہہ رہی تھی کہ خداوندا! کتنی خواہشیں ہیں جن کے مزے ختم ہو گئے اور ان کے خمیازے بھگتنے باقی ہیں؛ اے اللہ! کیا آگ کے سوا کوئی دوسری سزا، اور تنبیہ کے لیے کوئی اور چیز نہیں تھی؟ مالک فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم اس لڑکی نے وہیں کھڑے کھڑے صبح کر دی، اور صبح تک برابر یہی کہتی رہی، اس وقت میں نے اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر ایک چیخ ماری اور کہا کہ مالک کو اس کی ماں روئے، ایک لڑکی نے آج رات اس کو مات کر دیا‘‘[۳]۔

(۱) اعیان الحجاج: ۸۴/۱ (۲) ایضاً: ۱۵۴/۱ (۳) ایضاً: ۱۳۲/۱

احادیث وآثاراورعبارات واشعارکاترجمہ اس قدر برجستہ اور بامحاورہ ہے کہ اگر پڑھنے والا صاحبِ علم وفکر ہوگا، توان کو پڑھ کر حیرت واستعجاب کیے بغیر نہیں رہ سکتا، اس کے بھی چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

۱-آنحضرت ﷺ کے واقعۂ حج کے تذکرہ میں مشہور حدیث **لا ضــــربَ ولا طـــردَ ولا إليک إليک** کاترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے: ''نہ کسی کو مارنا تھا، نہ ہنکانا، نہ ہٹوبچو''۔

نیز آپ کے واقعۂ حج میں جو اور احادیث ہیں، یا دیگر انبیاء کے تذکروں میں جو احادیث نبویہ آئی ہیں، ان کا ترجمہ عام فہم ہونے کے علاوہ حد درجہ چست، برمحل اور پُر اثر ہے۔

۲-امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے سفر حج میں وادیٔ ضجنان سے گزرتے ہوئے جو اشعار پڑھے تھے، وہ اشعار اور علامہ اعظمیؒ نے ان کا جو ترجمہ کیا ہے، ملاحظہ ہو:

لا شيءَ مِمَّا تـرى تبقَى بَشاشتُه : يبقَى الإلـهُ ويُودي المـالُ والولدُ

جو چیزیں تمھاری نگاہ کے سامنے ہیں، ان میں سے کسی کی خوشحالی باقی نہ رہے گی، صرف اللہ باقی رہے گا اور مال واولاد سب فنا ہو جائیں گے۔

لـم تُغنِ عن هـرمـزٍ يوماً خـزائنُه : والخُـلـدَ قد حاولتْ عادٌ فما خَلَدوا

ہرمز کے خزانوں نے ایک دن بھی اس کو کچھ فائدہ نہ پہنچایا، اور قوم عاد نے زندگی دوام چاہی تھی، مگر حاصل نہیں ہوئی۔

أيـن الـمـلـوکُ التي کـانتْ نوافلُها : مِـنْ کـل أوبٍ إليهـا راکِبٌ يَفِـدُ

وہ بادشاہ لوگ اب کہاں ہیں جن کے عطیے حاصل کرنے کو ہر طرف سے وفد آیا کرتا تھا۔

حـوضٌ هـنـالِکَ مـورودٌ بلا کذبٍ : لا بُـدَّ مِـن وِردِه يـومـاً کـمـا وَرَدُوا

وہاں ایک -موت کا- حوض ہے، جس پر ایک دن ہم کو بھی یقینی اترنا ہے، جس طرح پہلے لوگ اتر چکے ہیں''۔

۳-تذکرۃ الحفاظ (۱/۲۲۴) میں حضرت لیث بن سعد کی نسبت امام شافعی کا یہ قول مذکور ہے: **هـو أفقـه من مالک إلا أن أصحابه لم يقوموا به.**

علامہ اعظمی نے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے: ''وہ امام مالک سے بھی زیادہ فقیہ تھے، مگر ان کے شاگردوں نے ان کو اونچا نہیں اٹھایا'' (اعیان الحجاج ۱/۱۲۸)۔

☆......: تذکرہ ہی میں لیث کی نسبت یحییٰ بن بکیر کا یہ قول منقول ہے: **هـو أفـقه من مالک لکن الحظوظ لمالک.**

اس کا ترجمہ یہ فرمایا ہے: ''لیث امام مالک سے فقہ میں بڑھے ہوئے تھے، مگر قسمت نے امام مالک کی یاوری کی ہے''۔

☆......: لیث ہی کی نسبت سعید بن ابی ایوب نے کہا تھا: لو أنَّ مالكاً والليث اجتمَعا لكانَ مالكٌ عندَ اللَّيثِ أبْكَمَ، وَلَباعَ اللَّيثُ مالِكاً فيمنْ يَزِيد.

اس کا ترجمہ یہ فرمایا ہے: ''اگر مالک ولیث کسی مجلس میں یکجا ہو جائیں، تو مالک ان کے سامنے گونگے ثابت ہوں گے اور لیث مالک کو نیلام میں بیچ ڈالیں گے''۔

☆......: اعیان الحجاج جلد ۲ صفحہ ۸۱ پر شیخ عبداللہ ارمنی کے تذکرے میں ایک شعر اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

ولو قيل لي مُتْ، قلتُ: سمعاً وطاعةً : وقلتُ لِداعي الموتِ أهلاً ومَرْحَبا

مجھ سے کہا جائے کہ مر جا تو میں کہوں گا کہ بسر وچشم : اور موت کے داعی سے کہوں گا مرحبا مرحبا۔

دیگر علمی فوائد ونکات:

کتاب کے اندر نوع بنوع کے علمی نکات وفوائد جا بجا بکھرے ہوئے ہیں، اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱- جلد ا صفحہ ۸۳ پر محمد بن یوسف بنّاء کے تذکرے میں لکھا ہے: ''اجرت پر معماری کا کام کرتے تھے''۔ پھر اس پر حاشیہ لکھا ہے کہ:

''صفۃ الصفوۃ میں ہے: كان يُفتي لِلنَّاس بأُجرةٍ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ وہ اجرت پر فتویٰ دیتے تھے، اور رسالہ 'الصدیق' ملتان میں یہی ترجمہ شائع ہو گیا ہے، مگر 'المنتظم' میں ہے: يَبني للنَّاس بأجرةٍ، اور یہی صحیح ہے، اور 'صفۃ الصفوۃ' میں غلط چھپ گیا ہے، لہذا اس کی بنیاد پر 'الصدیق' میں جو شائع ہو گیا ہے، وہ بھی صحیح نہیں ہے ۱۲ منہ''۔

۲- جلد ۲ صفحہ ۵۳ پر زمخشری کے تذکرے میں لکھا ہے:

''زمخشری حج کے ارادہ سے چل کر جب بغداد پہنچے، تو امالی ابن الشجری کے مصنف اور نحو ولغت کے امام ابوالسعادات علوی ان کی قیام گاہ پر ملنے کے لیے آئے، جب بیٹھے تو ابن الشجری نے متنبّی کا یہ شعر پڑھا:

واَستكبِرُ الأخبارَ قبلَ لِقائِهِ : فَلمَّا التَقَيْنَا صَغَّر الخَبَرَ الخُبَرُ

میں اس کی ملاقات سے پہلے لوگوں کے بیانات کو مبالغہ آمیز سمجھتا تھا، لیکن جب ملاقات ہوئی تو مشاہدہ نے بیانات کو کمتر ٹھہرایا۔

اس کے بعد ابن الشجری نے یہ شعر پڑھے:

كانتْ مُساءَلةُ الرُّكبانِ تُخبِرُني : عنْ جعفرِ بنِ فلاحٍ أحسَنَ الخَبَرِ

حتى التقَيْنَا فَلا وَاللهِ مَا سمِعتْ : أُذُني بِأطيَبَ مِمَّا قدْ رأى بصَري

زمخشری نے سن کر کہا کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جب زید الخیل آئے، تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ زید! جس کسی کو لوگوں نے بحالتِ کفر دیکھ کر اس کی تعریف مبالغہ سے کی، جب وہ مسلمان ہو کر میرے سامنے آیا تو میں نے اس کو اس سے کمتر پایا جتنا لوگوں نے بیان کیا، بس ایک تم البتہ مستثنیٰ ہو۔

راوی کہتا ہے: یہ ماجرا دیکھ کر ہم کو حیرت ہوئی کہ ایک عربی سید-ابن الشجری-شعر سے سند پکڑتا ہے، اور ایک عجمی-زمخشری-حدیث رسول سے''۔

۳-جلد۲ صفحہ ۶۱ پر قاضی فاضل کے تذکرے میں لکھا ہے:

''علم کا ایسا شوق اور کتابوں سے ایسا عشق تھا کہ متعدد کاتب اور جلد ساز ان کے یہاں ملازم تھے، جو ہمہ وقت کتابت اور جلد سازی کرتے رہتے تھے، وفات سے بیس سال پہلے ان کے کتب خانہ کے ملازم نے بتایا کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار کتابیں ان کے کتب خانہ میں ہیں، صرف حماسہ کے ۳۵ نسخے ان کے پاس مختلف خوش نویسوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے''۔

۴-جلد۲ صفحہ ۶۵ پر حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسی کے تذکرے میں ہے:

''ابن طاہر کے باب میں بعض محدثین نے کچھ جرحیں کی ہیں، لیکن ذہبی کا رجحان ان کی تعدیل کی طرف ہے''۔

۵-جلد۲ صفحہ ۷۷ پر ناصر بن ابی المکارم مطرزی کے بارے میں لکھا ہے:

''حنفی المذہب فقیہ، اور علوم ادبیہ نحو، لغت اور شعر وغیرہ میں ان کو بڑا کمال حاصل تھا، مقامات حریری کی ایک مختصر مگر نہایت مفید شرح لکھی تھی، لغت میں ایک کتاب مُغرِب کے نام سے لکھی ہے، جس میں ان الفاظ کی شرح کی ہے، جو فقہ کی کتابوں میں مستعمل ہوتے ہیں، اس کتاب کی بعض شوافع مثلاً امام یافعی نے بھی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ان سے اور ان کی کتابوں سے لوگوں نے بہت نفع حاصل کیا''۔

کتابی معلومات:

اعیان الحجاج کے جملہ محاسن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ علماء متقدمین کی کتابوں اور تصنیفات سے متعلق بہت سی مفید اور کارآمد باتیں معلوم ہوتی ہیں، مثلاً:

۱-جلد۲ صفحہ ۳ پر حضرت حسن بصری کے حالات میں فرمایا ہے:

''امام حسن بصری کے حالات میں حافظ ذہبی نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے، جس کا نام 'الزخرف القصری' ہے''۔

۲-جلد۲ صفحہ ۲۲ پر ابوالقاسم زجاجی نحوی کے تذکرے میں لکھا ہے:

''نحو میں ان کی کتاب 'الجمل' بہت نافع ومفید ہے، یہ کتاب انھوں نے مکہ میں تصنیف کی ہے، اس کا ایک باب لکھ لیتے تو خانہ کعبہ کا طواف کرکے دعا کرتے کہ اللہ تعالی اس سے لوگوں کو نفع پہنچائے، اسی طرح پوری کتاب لکھی''۔

۳- جلد۲ صفحہ ۳۲ پر شیخ الاسلام ابوعثمان صابونی کے تذکرہ میں عقائد پر ان کی تصنیف کا ذکر آیا ہے، تو اس کی بابت لکھا ہے:

''امام صابونی کا عقیدہ چھپ کر شائع ہو گیا ہے''۔

۴- جلد۲ صفحہ ۳۵ پر علم السنہ حافظ ابونصر سجزی کے تذکرے میں لکھا ہے:

''مسئلہ قرآن میں ان کی کتاب 'الإبانة الکبری' ان کی امامتِ فن پر شاہد عدل ہے''۔

۵- جلد۲ صفحہ ۳۶ پر امام ابوالقاسم قشیری کے ذکر میں ہے:

''ان کی کتاب 'الرسالة القشیریة' حقانی تصوف کی بہترین شرح اور سچے صوفیوں کے لیے مشعلِ راہ ہے''۔

۶- جلد۲ صفحہ ۲۰۵ پر محمد بن محمد خطیب شربینی (متوفی ۹۷۷ھ) کے تذکرے میں لکھا ہے:

''مدت ہوئی نول کشور پریس سے تفسیر کی ایک کتاب 'السراج المنیر' شائع ہوئی ہے، اس کے مولف بھی خطیب شربینی ہیں، مگر کتاب کے آخر میں ان کا نام محمد بن احمد چھپا ہے، اس لیے تحقیق طلب ہے کہ وہاں غلطی ہوئی ہے، یا 'شذرات الذہب' میں سہو ہوا ہے، یا دونوں کی شخصیتیں جدا جدا ہیں، 'السراج المنیر' کی تالیف سے ۹۶۸ھ میں فراغت ہوئی ہے، اس لیے زمانہ تو وہی ہے جو ہمارے خطیب شربینی کا ہے''۔

یہ تو صرف چند نمونے پیش کیے گئے ہیں، اسی طرح بے شمار کتابوں کی نسبت اور ان کی طباعت وغیرہ کے متعلق نہایت اہم معلومات اس کتاب سے حاصل ہوتی ہیں۔

مخطوطات کے متعلق اہم اطلاعات:

اس کتاب میں بہت سی قدیم کتابوں کے قلمی نسخوں کے بارے میں نہایت اہم اور مفید اطلاعات بھی موقع بہ موقع فراہم کی گئی ہیں، اس کی بعض مثالیں حسب ذیل ہیں:

۱- شیخ الاسلام قوام السنۃ حافظ ابوالقاسم اسماعیل بن محمد تیمی کی کتاب 'سیر السلف' کا 'اعیان الحجاج' کی پہلی جلد میں جا بجا حوالہ ملتا ہے، اس کتاب کا مطالعہ اور اس سے استفادہ آپ نے کہاں کیا ہے، اس کی نسبت جلد۲ صفحہ ۵۵ پر ان کے تذکرے میں فرمایا ہے:

''ان کی ایک نفیس تصنیف 'سیر السلف' ہے، جس کا ناچیز نے مطالعہ کیا ہے، اور اس کتاب کی پہلی

جلد میں اس سے استفادہ بھی کیا ہے، اس کا قلمی نسخہ حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے کتب خانہ میں تھا، جواب علی گڈھ میں ہے''۔

۲-جلد۲ صفحہ ۵۵ ہی پر رزین بن معاویہ عبدری کے تذکرے میں ان کی کتاب کے متعلق لکھا ہے:

''تجرید الصحاح -یا بقول ذہبی جامع الصحاح- کے مصنف ہیں، ان کی یہ کتاب رام پور کے کتب خانہ میں میں نے دیکھی ہے''۔

۳-جلد۲ صفحہ ۲۳۴ پر شاہ محمد عاشق پھلتی کے تذکرے میں لکھا ہے:

''شاہ صاحب -یعنی شاہ ولی اللہ صاحب- کے حالات میں انھوں نے 'القول الجلی' نام کی ایک کتاب لکھی ہے، جس کا قلمی نسخہ میں نے کاکوری میں دیکھا ہے، شاہ صاحب کی 'دعاء الاعتصام' کی شرح بھی لکھی ہے، اس کا قلمی نسخہ میرے پاس موجود ہے، ان دونوں کے علاوہ سلوک میں ایک رسالہ لکھا ہے، جس کا نام 'سبیل الرشاد' ہے، اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مصفّٰی شرح موطا کی تبییض انھیں نے کی ہے''۔

'اعیان الحجاج' دیکھ کر مولانا عبداللہ زمزمیؒ کا تاثر:

مولانا عبداللہ زمزمیؒ -متوفی ۱۳۸۶ھ = ۱۹۶۷ء- مکہ مکرمہ میں مقیم ایک عجیب وغریب اور خدا مست بزرگ تھے، انھوں نے جب اس کتاب کو دیکھا، تو علامہ اعظمیؒ کے پاس ایک خط لکھا، جس میں انھوں نے اس کتاب کو 'عجائب الدہر' اور 'اعجب العجائب' جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے، مولانا زمزمیؒ کا پورا مکتوب 'حیات ابوالمآثر' کی جلد اول میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

ماہنامہ 'برہان' کا تبصرہ:

اس کتاب پر ماہنامہ 'برہان' -دہلی- نے اگست ۱۹۵۸ء = محرم ۱۳۷۸ھ کے شمارے میں شاندار تبصرہ شائع کیا تھا، جس کا اقتباس درج ذیل ہے:

''حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ہمارے دور کے بلند پایہ عالم، جلیل القدر محدث اور عربی ادب کے باکمال استاذ سمجھتے جاتے ہیں، اس لیے زیر نظر کتاب کے اعتبار واستناد کے لیے مولانا کا نام ہی کافی ضمانت ہے؛ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، موصوف نے اس کتاب میں مشاہیر اسلام کے حالاتِ حج وزیارت کو دل پذیر اسلوب میں یکجا کیا ہے، اسی کے ساتھ ان اکابر کے مختصر سوانحِ حیات اور سبق آموز واقعات بھی لکھے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ مسائل اور فضائلِ حج پر تو بے شمار کتابیں لکھی گئیں، مگر اس موضوع پر کوئی مرتّب ومستند کتاب ابھی تک وجود میں نہیں آئی تھی، مولانا نے اس کی ضرورت محسوس فرمائی اور تاریخِ اسلام

کے اکابر اور سلفِ صالح کے ایمان افروز حالاتِ حج کو ہلکے پھلکے پیرایہ میں جمع کر دیا، ان واقعات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے اسلام کے اس پُرعظمت رکن کا حق کس ولولہ وشوق سے ادا کیا اور اس سے کیسی روحانی برکتیں حاصل ہوئیں۔

سوانح اور واقعاتِ حج کے علاوہ بہت سی تاریخی اور علمی معلومات کے اضافے سے کتاب کی افادیت اور قدر و قیمت بڑھ گئی ہے، اور اس سے نہ صرف زیارتِ حرمین سے مشرّف ہونے والے ہی نفع اٹھائیں گے، بلکہ اصحابِ علم ونظر کے لیے بھی اس میں بہت کچھ ملے گا''(۱)۔

پھر چند سطروں بعد لکھا ہے:

''ایک ایسے زمانے میں جبکہ دوسری عبادتوں کی طرح حج جیسی اہم عبادت بھی بڑی حد تک رسمی سی ہو کر رہ گئی ہے، اس کتاب کا مطالعہ خاص طور پر عبرت آموز ثابت ہوگا، اور اس کو پڑھ کر ہم عبادتِ حج کی نوک پلک درست کر سکیں گے''(۲)۔

آخر میں تبصرہ نگار کا نام (ع ر) لکھا ہوا ہے، جو غالباً ''عتیق الرحمٰن'' کا مخفَّف ہے، اور اس سے مراد حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم ہیں۔

ابتدا میں اس کی کچھ قسطیں ماہنامہ 'البلاغ' بمبئی، اور 'الصدیق' ملتان میں شائع ہوئی تھیں، کتابی شکل میں اس کے پہلی اڈیشن کی پہلی جلد ۱۹۵۸ء میں تنویر پریس -لکھنؤ- سے چھپ کر مکتبۂ اعظمی -مئو- سے اشاعت پذیر ہوئی، اور دوسری جلد ۱۳۹۶ھ = ۱۹۷۶ء میں اسرار کریمی پریس الہ آباد سے طبع ہو کر مکتبۂ اعظمی سے شائع ہوئی۔ پہلی جلد کا دوسرا اڈیشن ساجدی پریس گورکھپور سے ۱۹۹۶ء میں طبع ہوا، اور دوسری جلد کا دوسرا اڈیشن ۱۴۳۱ھ = ۲۰۱۰ء میں مکتبۂ اعظمی مئو سے شائع ہوا۔ بعد میں یہ کتاب ایک ہی جلد میں زمزم بک ڈپو کراچی -پاکستان- سے نیز ہندوستان کے بعض مکتبات سے شائع ہوئی۔

اس کتاب پر حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ کا ایک بہت ہی جامع اور پُرمغز مقدمہ ہے، جو پہلی جلد کے ساتھ شامل ہے۔

☆......☆......☆......☆

دستکارانِ اہل شرف

تذکرۂ نساجین

یہ کتاب پارچہ باف اہل فضل وکمال کے تذکروں پر مشتمل ہے، اس کے اندر علامہ اعظمیؒ نے سب سے پہلے ان انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کا تذکرہ کیا ہے، جن کی نسبت کپڑا بننے کا کام تاریخ وتذکرہ کی کتابوں سے

(۱) برہان جلد ۴۱، شمارہ ۲، ص: ۱۲۴ (۲) ایضاً: ۱۲۵

صراحۃً معلوم ہوتا ہے، انبیاء کرام کے بعد سرکار رسالت مآب ﷺ کے ان صحابۂ عظامؓ کا تذکرہ ہے، جن کے اس صنعت کے ساتھ اشتغال رکھنے کا ثبوت کتب سیر واحادیث سے فراہم ہوتا ہے، اس کے بعد یہ کتاب الف بائی ترتیب پر مشتمل ہے۔

لیکن ان تذکروں سے پہلے جو مقدمہ سپرد قلم فرمایا ہے، وہ نہایت جامع اور پُر مغز ہے، تسمیہ وتحمید وتسلیم کے بعد چھ ایسی حدیثیں ذکر کی ہیں، جن کے اندر دست کاری کو ذریعۂ معاش بنانے کی فضیلت اور تاکید وارد ہوئی ہے، ان احادیث کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے:

''مگر آج مسلمانوں نے اسلام کی دوسری بہت سی تعلیمات کے ساتھ اس تعلیم کو بھی بُھلا دیا ہے، عہدوں کے حصول اور ملازمتوں کو سرمایۂ عزت وافتخار اور ہاتھ سے کام کرنے کو معیوب اور پست کام سمجھنے لگے ہیں، اس کا ایک طرف یہ نتیجہ آنکھوں کے سامنے ہے کہ بے شمار اشخاص بے روزگاری کی مصیبت میں مبتلا ہیں؛ دوسری طرف یہ دیکھا جارہا ہے کہ جو لوگ دینی یا دنیاوی تعلیم سے بہرہ ور ہیں، یا ان کے پاس پیسے ہیں، وہ دست کاروں کو ذلت وحقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں''(۱)۔

پیشہ اور صنعت وحرفت کے معیوب سمجھنے کو اسلامی تعلیم کے خلاف قرار دیتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:

''حالانکہ یہ بات تعلیماتِ اسلام کے سراسر منافی ہے اور مسلمانوں میں اس قسم کے تصورات امتداد زمانہ کے بعد غیر قوموں کے اختلاط سے پیدا ہوئے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی جائز پیشہ نہ معیوب ہے، نہ اس کو اختیار کرنے والا ذلت وحقارت کا مستحق؛ اور اسلام کی تاریخ شاہد ہے کہ اکابرِ اسلام نے کبھی کسی پیشہ کو حقیر نہیں سمجھا ہے، بلکہ ان اکابر میں ایک بڑی تعداد ان حضرات کی ہے، جنھوں نے کسی پیشہ کو اپنایا اور اس کو ذریعۂ معاش بنایا ہے، اور دست کار ومُحترِف ہونے کے باوجود وہ اسلامی تاریخ کے ہیرو، دین کے امام، اور علم وعرفان کے آفتاب وماہتاب ہیں''(۲)۔

آپ نے اپنے اسی خیال اور نظریے کو اس کتاب کی وجہِ تالیف اور باعثِ تصنیف قرار دیا ہے، مقدمے ہی میں ''فائدہ'' کے ضمنی عنوان کے تحت آپ نے لکھا ہے کہ بُنائی کا کام کرنے والے کو عربی میں صرف حائک یا نساج ہی نہیں کہتے، بلکہ اس کے لیے اور بھی متعدد الفاظ استعمال ہوتے ہیں، منجملہ ان کے ایک لفظ ''قزاز'' ہے، لیکن قَزّ چونکہ ریشم اور ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں، اس لیے قزّاز کا اطلاق ریشمی کپڑا بننے والے پر ہوتا ہے، اسی طرح ''خام'' ایک قسم کا کپڑا ہوتا تھا، لہذا ''خام'' بننے والے پر ''خامی'' کا اطلاق ہوتا تھا، اسی طرح ''حراز'' اور ''حریری'' بھی ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے، کتاب کا آغاز انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے تذکرے سے ہوتا ہے، ان میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام، پھر حضرت ادریس علیہ السلام، حضرت شیث علیہ السلام، حضرت

(۱) دست کار اہل شرف: ۱۱ (۲) ایضاً: ۱۱

صالح علیہ السلام کا تذکرہ ہے، اسی میں حضرت حواء کے بھی کپڑا بننے کا تذکرہ ہے۔

انبیاء کرام کے بعد صحابہؓ کا تذکرہ ہے، ان میں حضرت ابوایوب انصاریؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ جیسے اجلۂ صحابہ ہیں، اسی زمرے میں قدرے تفصیلی تذکرہ حضرت قُتیلہ بنت قیس کا ہے، جو حضرت اشعث بن قیسؓ صحابی کی بہن تھیں، ان کے لیے یہ بڑے ہی شرف اور سعادت کی بات ہے کہ ان کا نکاح آنحضرت ﷺ سے ہو گیا تھا، لیکن ابھی رخصتی نہ ہوسکی تھی کہ آپ ﷺ کی وفات سے دنیا میں اندھیرا چھا گیا، ان کے ہاں بھی کپڑا بننے کا کام ہوتا تھا، اور خود اشعث سے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی ہمشیرہ ام فروہ کا نکاح کیا تھا۔

صحابہ کرامؓ کے تذکرے میں رسول خدا ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیر بن عوامؓ، فاتحِ مصر حضرت عمروؓ بن عاص اور امیر بصرہ کے والد حضرت عامر بن کریزؓ کا بھی تذکرہ ہے۔

اس کے بعد ایک عنوان یہ قائم کیا ہے: ''آنحضرت ﷺ کی نانہال میں بنائی کا کام ہوتا تھا، انصار مدینہ کا بہترین گھرانہ پارچہ باف تھا''۔ اور اس کے تحت حدیث و تاریخ کی کتابوں سے بنی نجار کے بنائی کرنے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

''معافری حضرات'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ صحابہ و تابعین و تبع تابعین نیز بعد کے لوگوں میں بہ کثرت حضرات اس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، ''معافر'' قبیلۂ ہمدان کی ایک شاخ ہے، یہ لوگ جہاں سکونت پذیر تھے، اس کو بھی معافر کہتے تھے، اور جو کپڑے تیار کرتے تھے، اس کو بھی ''معافر'' اور ''معافری'' کہتے تھے۔

'تذکرۃ النساجین' کے اندر تقریباً دوسو افراد کا تذکرہ کیا گیا ہے، اور حوالوں سے صنعتِ پارچہ بافی کے ساتھ ان کے اشتغال کو ثابت کیا گیا ہے، یہ کتاب ہر طبقے اور ہر میدان کے اہل فضل و کمال کے پارچہ باف حضرات کے تذکروں پر مشتمل اور ان سے مزین ہے، فقہاء و محدثین، اہل لغت و ادب و تاریخ، اصحابِ زہد و تقویٰ، غرض اسلامی علوم و معارف کی کوئی ایسی شاخ نہیں ہے، جس کے کسی نہ کسی نامور فرد کا اس میں تفصیلی یا اجمالی تذکرہ نہ ہو۔ محدثین و رواۃ حدیث میں بقاء بن سلامہ، عبدالرحمان بن معاویہ بن حُدَیج، ابن زکنون مولف 'الکواکب الدراری' اور عطاء سلمی وغیرہ کے تذکرے ہیں؛ فقہاء اسلام میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ، مفتیٔ شام شیخ اسماعیل حائک؛ اربابِ لغت و ادب میں ابوتمام صاحبِ 'دیوانِ حماسہ'، ابوعلی مرزوقی شارحِ 'حماسہ'، 'المُغرِب' کے مصنف ناصر بن عبدالسید بن علی المُطَرّز؛ اردو شعراء میں نواب فصاحت جنگ؛ اور طبقۂ زہاد و صوفیہ میں شیخ ابوبکر بن عبداللہ طوسی، حضرت جنید بغدادی، خواجہ بہاء الدین نقشبند، حضرت عزیزان کے علاوہ ایک جماعت کا تذکرہ ہے، اور کوئی بھی تذکرہ دلیل اور حوالے سے خالی نہیں ہے۔

کتاب کی خصوصیات:

اگر فن تذکرہ نگاری کے اعتبار سے کتاب پر نظر ڈالی جائے، تو واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب بہت سی خصوصیات

سے آراستہ نظر آتی ہے، اس کے بعض خصائص وامتیازات ذیل میں ذکر کیے جارہے ہیں:

۱- کتاب کو پڑھنے کے بعد سب سے پہلا جو تاثر پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے تذکروں میں نشاط اور انبساط کا بہت دخل ہے، بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ جب طبیعت نشاط پر رہی ہے، تو قدرے طویل تذکرے سپردِ قلم ہوئے ہیں، ورنہ اختصار غیر مخل سے کام لیتے ہوئے صرف چند سطروں میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ کتاب کی عبارت میں کہیں بوجھل پن اور ثقل نہیں آنے پایا ہے۔

۲- صاحبِ تذکرہ کے احوالِ زندگی کو قلم بند کرنے میں بالعموم اختصار سے کام لیا گیا ہے، نام ونسب اور وطن کا اہتمام کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، زندگی کا کوئی خاص واقعہ ہے تو عموماً اس کو بھی قیدِ تحریر میں لایا گیا ہے۔

۳- جس فن سے صاحبِ تذکرہ کا تعلق ہے، اس میں ان کے مقام ومرتبے کو اجاگر کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے، اگر حلقۂ صوفیہ وزُہاد سے تعلق ہے، تو طبقاتِ صوفیہ پر جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، ان سے انتخاب کیا گیا ہے، اسی طرح ادب وشعر یا کسی دوسرے علم وفن سے تعلق ہے، تو اس فن کی معتبر کتاب سے ان کا تذکرہ لکھ کر ان کے مقام کو واضح کیا گیا ہے۔

۴- اگر صاحبِ تذکرہ کوئی صاحبِ کرامت بزرگ ہیں، اور ان کے ذریعے کرامتوں کا ظہور ہوا ہے، تو ان کی ایک آدھ کرامتوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

۵- اگر صاحبِ تذکرہ کا تعلق تصنیف وتالیف سے بھی رہا ہے، تو کہیں تو صرف ان کی تصانیف یا مشہور تصانیف کا نام ذکر کیا گیا ہے، اور کہیں اہم کتابوں کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے، جیسے امام مرزوقی کی کتاب 'الأزمنہ والأمکنہ' کا تعارف، نیز ابن زکنون کی کتاب 'الکواکب الدراري' کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

۶- اگر حکمت ودانائی اور پند وموعظت کے متعلق صاحبِ تذکرہ کے اقوال ونصائح کتابوں میں ملے ہیں، تو ان کو بھی بسا اوقات ذکر کیا گیا ہے، جیسے ابتداء کتاب ہی میں شیخ ابوبکر بن عبداللہ طوسی کے متعدد مواعظ اور نصائح ذکر کیے گئے ہیں۔

۷- تقریباً ہر تذکرے میں صاحبِ تذکرہ کے سن وفات ذکر کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، اور اس سلسلے میں کوئی اختلاف ہے، یا کسی وجہ سے ان کے بارے میں مذکور سن وفات محل نظر ہے، تو اس کو بھی ظاہر کیا گیا ہے، مثلاً ابوعلی مرزوقی کے سلسلے میں لکھا ہے:

> ''آسمانِ علم وفضل کا یہ نیر تاباں ذی الحجہ ۴۲۱ھ میں غروب ہوگیا، یہ سن وفات سیوطی نے لکھا ہے، لیکن 'کتاب الأزمنہ' کی تصنیف سے فراغت کا جو سن کتاب الأزمنہ کے آخر میں لکھا ہوا ہے، اس میں اگر کوئی تصرف نہیں ہوا ہے، تو سیوطی کا لکھا ہوا سن وفات یقیناً غلط ہے، مگر ان کا سن وفات یاقوت وغیرہ نے بھی ۴۲۱ھ لکھا ہے''(۱)۔

(۱) دست کار اہلِ شرف: ۲۹

۸-اکثر تذکروں میں سالِ وفات کے ساتھ مقام قبر وموضع دفن بھی تحریر فرمایا ہے، مثلاً شیخ احمد بن حسین زاہد شیرازی کی نسبت لکھا ہے کہ ''ان کا مزار شیراز ہی میں مشہور ہے''، ابراہیم بن ابی بکر موصلی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ''تبوک میں مدفون ہوئے؛ شیخ ابواسحاق گازرونی کی نسبت لکھا ہے کہ ان کا مزار اچہ میں ہے؛ شیخ احمد نہروالی کے متعلق لکھا ہے کہ مزار مبارک بدایوں میں ہے؛ مفتی شام شیخ اسماعیل حائک کے بارے میں لکھا ہے کہ ''حضرت اوس بن اوس ثقفی صحابی رسول کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا''۔

۹-اگر شخصیات کے تذکرے میں کسی مقام اور جگہ کا نام آیا ہے، اور وہ جگہ زیادہ مشہور ومعروف نہیں ہے، تو بسا اوقات اس کی تحقیق اور تعیین بھی کی ہے۔

۱۰-مختلف بلاد اور علاقوں میں تیار ہونے والے کپڑے اور ان کی انواع واقسام پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اور ان کی طرف منسوب شخصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے، مثلاً صفحہ ۱۶ پر لکھتے ہیں:

> ''اس کے علاوہ احادیث، اشعارِ عرب اور تاریخ میں بہت سے کپڑوں کے نام آتے ہیں، مثلاً حبرہ، سحولیہ، معافریہ، قدمیہ، سدیریہ، سعیدی، تزیدی، حلہ نجرانیہ، عصب، یمنہ، حلۂ افواف، یہ سب یمن کے علاقے میں بنتے تھے، اطمینان وتصدیق کے لیے قاموس، نہایہ اور معجم البلدان وغیرہ کا مطالعہ کیجئے''۔

اسی طرح ''عمری'' کے عنوان کے تحت الضوء اللامع کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''عمر'' بناتے تھے، اور یہی ذریعہ معاش تھا، اس لیے عمری کہلانے لگے، اور منجد کے حوالے سے لکھا ہے کہ عمر اس رومال کو کہتے ہیں جو شریف عورتیں اپنے سر پر ڈالتی ہیں، لہذا اس کے معنی رومال بننے والے بھی ہوئے۔

اسی طرح قاسم بن زکریا بن یحییٰ مُطَرِّز کے حال میں پہلے تاریخ ابن خلکان اور لباب سے یہ نقل کیا ہے کہ مُطرِّز اس شخص کو کہتے ہیں، جو مُطرَّز کپڑے بناتا ہو، پھر لکھا ہے:

> ''لغت کی کتابوں میں ہے کہ رنگین دھاگوں سے پھول بوٹے اور تصویریں بنا کر کپڑے کو خوشنما بنانے کا نام تطریز ہے، اور طِراز اس کارخانہ یا فیکٹری کو کہتے ہیں، جہاں اعلیٰ درجہ کے نفیس کپڑے بنے جاتے ہیں''[1]۔

بعض دیگر علمی فوائد ونکات:

مذکورہ بالا خصوصیات کے علاوہ بھی بہت سے علمی نکات وفوائد جگہ جگہ اس کتاب میں دیکھنے کو ملتے ہیں، مثلاً:

۱:-اصول حدیث یا علم جرح وتعدیل میں ایک مشہور اصطلاح لیس بشيء کی استعمال ہوتی ہے، علمِ حدیث کی کتابوں میں اس فقرے کی تشریح میں لمبی لمبی بحث ملتی ہے، اس کتاب میں ایک جملے میں اس کو بیان

(۱) دست کار اہل شرف: ۱۱۰

کر دیا گیا ہے، عبید بن باب کے تذکرے میں لکھا ہے:

''ابن معین نے ان کی بابت فرمایا ہے: لیس بشيء، جس کا مطلب یہ ہے کہ کثیر الحدیث نہیں ہیں''(۱)۔

ب:- اگر کسی کتاب کے کسی قلمی نسخے کا ذکر آ گیا ہے، تو بعض دوسری تفصیلات کے ساتھ اس کی نشاندہی کر دی ہے کہ کہاں پایا جاتا ہے، جیسے ابن زکنون کی الکواکب الدراري کی نسبت لکھا ہے:

''اس کی صرف ایک ضخیم جلد کتاب الزکوٰۃ سے کتاب الحج کے آخر تک رام پور کے کتب خانہ میں موجود ہے، جو ان کے داماد ابراہیم بن محمد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے''۔

مولوی اکبر علی کی 'تعریف العارفین' سے بہت سے احوال وحکایات نقل کیے ہیں، اس کتاب کی نسبت شاہ گنج علی فتح پوری کے تذکرے میں لکھا ہے:

''تعریف العارفین کا قلمی نسخہ فقیر حقیر کے پاس موجود ہے''(۲)۔

خواجہ بہاء الدین نقشبند کے احوال میں الرسالۃ البھائیۃ کا تذکرہ آیا ہے، اس کی نسبت لکھا ہے:

''رسالہ بہائیہ کا قلمی نسخہ کتب خانہ شاہ پیر محمد (احمد آباد) میں موجود ہے، ہم نے اس نسخہ کو (ورق ۴۸۰) دیکھا ہے، داراشکوہ نے اس کے حوالے سے جو نقل کیا ہے، اس کو حرف بحرف صحیح پایا ہے۔ رسالہ بہائیہ کا دوسرا نسخہ سبحان اللہ کلیکشن علی گڈھ میں ہے''(۳)۔

ج:- بحر زخار کے حوالے اس کتاب میں بہ کثرت آئے ہیں، شاہ گنج علی فتح پوری کے تذکرے کے آخر میں لکھا ہے:

''بحر زخار کی تصنیف کا زمانہ ۱۲۰۰ھ سے ۱۲۰۵ھ تک ہے''(۴)۔

کتاب کے مراجع اور حوالہ جات:

پڑھنے والا اگر فکر و نظر کی صلاحیت رکھتا ہو، تو بآسانی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ کتاب مطالعہ کی کثرت و وسعت کا ثمرہ اور نتیجہ ہے، پوری کتاب حدیث و تاریخ، تذکرہ و تراجم اور ادب و لغت کے حوالوں سے بھری پڑی ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ حوالوں کی کثرت و بہتات کے باوجود اس کی زبان نہایت سلیس، شستہ و شگفتہ اور عام فہم ہے، یہ بات بے تامل کہی جاسکتی ہے کہ سہل ممتنع کا خوبصورت اور عمدہ نمونہ ہے۔

کتاب کے حوالوں کے ذکر پر یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صرف اس کے مقدمے میں کتب حدیث میں سے صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ، مسند احمد، طبرانی، مستدرک حاکم اور بیہقی کی شعب الایمان؛ اور تاریخ و تذکرہ میں الطالع السعید، التکملہ لوفیات النقلہ، اور سخاوی کی تحفۃ الاحباب کے حوالے نظر آتے ہیں۔

(۱) دست کار: ۹۹ (۲) ایضاً: ۱۱۶ (۳) ایضاً: ۵۶ (۴) ایضاً: ۱۱۷

مقدمے کے بعد کتاب کے ابتدائی پانچ صفحات میں فردوس دیلمی، کامل ابن اثیر، مقدمہ ابن خلدون، فصول البدائع، شرح شرعۃ الاسلام، مدارج النبوۃ، صحیح بخاری، ابن ماجہ، نہایہ، لسان العرب، شرح نہج البلاغہ، تذکرہ خواص الامۃ، البیان والتبیین، ثمار القلوب، معجم البلدان، العقد الفرید اور صفۃ جزیرۃ العرب کے حوالے آئے ہیں۔

اس کتاب میں متعدد قلمی کتابوں کا نام یا ان کے حوالے بھی آئے ہیں، جیسے 'بحر زخار' کے حوالے متعدد مقامات پر آئے ہیں، کئی ایک مقامات پر مولوی اکبر علی کی 'تعریف العارفین' کا حوالہ بھی ہے، سید شاہ کمال سنبھلی کی کتاب 'اسراریہ' کا بھی کہیں کہیں حوالہ ہے، ان کے علاوہ اور بھی متعدد قلمی کتابوں کا حوالہ یا ان کا تعارف کتاب میں آیا ہے، جس سے کتاب کے اندر معلومات کا ایک خزانہ جمع ہو گیا ہے۔

اس کا پہلا اڈیشن ۱۴۰۶ھ = ۱۹۸۵ء میں حسن پریس مئو سے طبع ہوا، اور دوسرا اڈیشن ۱۴۲۲ھ = ۲۰۰۱ء میں شیروانی آرٹ پرنٹرز دہلی سے طبع ہو کر مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو سے شائع ہوا۔

☆......☆......☆......☆......☆......☆

دنیا میں پارچہ بافی کے مرکز

یہ رسالہ ایک طرح سے 'دست کار اہل شرف' کی ایک فصل یا اس کا ضمیمہ ہے، جس میں دنیا کے بہت سے ایسے ملکوں کا تذکرہ تاریخی حوالوں کے ساتھ کیا گیا ہے، جہاں پارچہ بافی کا کام ہوتا تھا، اور وہاں اس صنعت کی شہرت اور دھوم دھام تھی۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے کیا گیا ہے:

> ''جو حضرات تاریخی وجغرافیائی حالات میں شغف رکھتے ہیں، ان کی دلچسپی کے لیے میں اس فصل کا اضافہ کرتا ہوں، اور اس میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلام کے بعد دنیا کے کس کس شہر یا جگہ نے پارچہ بافی کے لحاظ سے ناموری حاصل کی ہے، اور اسی سے پارچہ بافوں کی کثرتِ تعداد کا بھی کچھ اندازہ لگایا جا سکے گا''[1]۔

اس کے بعد سب سے پہلے مدینہ منورہ کا ذکر کیا ہے، اور احادیث وتاریخ کی کئی روایات نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ مدینہ منورہ کے متعدد گھرانوں میں یہ کام ہوتا تھا، جن میں سب سے مستند روایت یہ ہے کہ صحیح بخاری (۲۸۱/۱) میں ہے کہ ایک انصاری خاتون نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ایک کپڑا پیش کر کے کہا کہ: **إني نسجتُ هذه بيدي** (میں نے اس کو اپنے ہاتھ سے بُنا ہے)۔ علامہ اعظمیؒ نے عنوانِ مدینہ کے ضمن میں لکھا ہے:

> ''عرب میں عام ازیں کہ مدینہ ہو یا کوئی دوسری جگہ پارچہ بافی کے عام رواج ہونے کا بڑا زبردست ثبوت عربی لٹریچر ہے۔ عربی زبان میں پارچہ بافی کے تمام لوازم کے خالص عربی نام موجود ہیں، تفصیل کے لیے آلوسی کی کتاب 'بلوغ الارب' کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ عربی شعرا کے کلام میں

(۱) دستکار اہل شرف-ضمیمہ: دنیا میں پارچہ بافی کے مرکز-:۱۴۲

بکثرت ایسی تشبیہات اور ایسے استعارات پائے جاتے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس صنعت کا وہاں بڑا کافی رواج تھا''۔[۱]

مدینہ منورہ کے بعد یمن کا تذکرہ ہے، اور حدیث و تاریخ وادب اور اشعارِ عرب سے یمن کی صنعت پارچہ بافی کا نہایت قوی ثبوت بہم پہنچایا ہے، جو تین صفحات پر مشتمل ہے، اس کے شروع میں لکھا ہے:

''یمن - عرب کا صوبہ - پارچہ بافی کا بہت بڑا مرکز ہے، عرب میں عموماً یمن ہی کا کپڑا استعمال ہوتا تھا، آنحضرت ﷺ بکثرت یمن ہی کا کپڑا پہنتے تھے، یمن کی بنی ہوئی ''حبرہ'' نامی دھاری دار چادر آپ کو بہت مرغوب تھی''۔[۲]

حدیث و تاریخ وادب کی کتابوں سے چن چن کر صوبۂ یمن کے مختلف ایسے شہروں کے نام لکھے ہیں، جہاں بنائی اور پارچہ بافی کا کام ہوتا تھا، اور پھر حوالوں سے اس کا ثبوت پیش کیا ہے، اس کے مختلف شہروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قبیلہ کندہ اور قبیلہ اشعر دونوں یمنی قبیلے ہیں، اور دونوں حیاکت - پارچہ بافی - میں بدنام ہیں۔ عدن یمن ہی کا ایک شہر ہے، وہاں کا تہمد (لنگی) مشہور ہے، حضرت عثمانؓ عدنی ازار پہنتے تھے (مجمع الزوائد ۸۰/۹)''۔[۳]

اس کے بعد عراق، جزیرہ ومیسوپوٹامیا، عراق عجم، فارس اور بخارا وغیرہ، بخارا کا بیت الطراز، بلاد مغرب، ایشائے کوچک وٹرکی، قسطنطنیہ، البانیہ، چین وخطا وترکستان، تبت، شام، مصر اور ہندوستان وغیرہ کی صنعت پارچہ بافی کا نہایت دل نشیں انداز میں ذکر کیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ کا یہ رسالہ حدیث کے ساتھ ساتھ تاریخ وادب، لغت واشعارِ عرب کے وسیع علم ومطالعہ کا حسین اور خوبصورت امتزاج ہے، اور ان علوم وفنون کے وسیع علم ومطالعہ اور استحضار کا ثبوت فراہم کرتا ہے، تقریباً ۱۷ صفحات کی اس تحریر میں ان متنوع فنون کی تیسوں کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں۔

☆......☆......☆......☆......☆

فتوحاتِ حضرتِ معاویہؓ

اس مضمون کا آغاز ان الفاظ سے کیا گیا ہے:

''اسلامی تاریخ کا یہ نہایت مشہور واقعہ ہے کہ سرکارِ رسالت (ﷺ) کی وفات کے بعد عرب کے متعدد قبیلے مرتد ہو گئے تھے، اس فتنے کے استیصال اور مرتدین کی سرکوبی میں سرکار رسالت کے خلیفۂ اولین، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جس بے مثال عزم وحزم، اور جس بے نظیر استقلال و پامردی کا

(۱) دستکار اہل شرف - ضمیمہ: دنیا میں پارچہ بافی کے مرکز - :۱۴۳ (۲) ایضاً: ۱۴۳ ایضاً

ظہور ہوا، وہ تاریخ کے نوادر میں سے ہے، مجھے اس وقت اس فتنہ اور اس کے استیصال کی تفصیلات کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے، مجھے اس وقت صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ وفات نبوی کے بعد اسلامی فتوحات کی راہ میں یہ فتنہ سنگِ گراں بن کر اس طرح حائل ہوگیا تھا کہ جب تک کہ اس کو راستے سے ہٹا نہ لیا جاتا، اسلامی فتوحات کے آگے بڑھنے کی کوئی صورت ممکن نہ تھی۔ جب صدیق اکبرؓ اس عظیم الشان مہم کو سر کر چکے اور اس فتنہ کی طرف سے ان کو کلی اطمینان حاصل ہوگیا، تو انھوں نے ۱۳ھ میں شام پر کئی طرف سے لشکر کشی شروع کی، فتح دمشق کے لیے جو لشکر یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں روانہ کیا گیا تھا، اس لشکر کے علم بردار حضرت امیر معاویہؓ تھے‘‘(۱)۔

اس کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے معرکوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے سواحل اردن سے رومیوں کے مقابلہ میں شام کے امیر الامراء حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے مدد طلب کی، حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں جو فوج روانہ فرمائی، اس کے ہراول کے افسر حضرت امیر معاویہؓ تھے۔

۱۴ھ میں حضرت ابوعبیدہؓ کی قیادت میں دمشق کی فتح کے بعد یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے بحیرۂ روم کے ساحلی شہروں کی طرف کوچ کیا، اس دفعہ بھی ہراول کے افسر حضرت امیر معاویہؓ تھے۔

فلسطین کی مشہور بندرگاہ یافا کو بھی بعض مورخین کی رائے میں حضرت معاویہؓ نے فتح کیا۔

۱۸ھ میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد حضرت عمرؓ نے ان کی جگہ پر یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو شام کا گورنر نامزد فرمایا، اور ساتھ ہی قیساریہ پر فوج کشی کا فرمان بھی جاری کیا، یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہؓ کو اس کے محاصرہ کا حکم دیا، اور ان ہی کے ہاتھ پر وہ فتح ہوا، قیساریہ بحر روم کے ساحل پر بڑا عظیم الشان شہر تھا، یہ شہر ۱۸ھ کے اخیر یا ۱۹ھ کے اول میں فتح ہوا۔

۱۸ھ کے اخیر میں یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت فاروق اعظمؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کو حاکم شام مقرر فرمایا، اور شام کے باقی ماندہ مقامات کو فتح کرنے کا حکم بھی جاری فرمایا، اس وقت آپ نے عسقلان فتح کیا۔

’’فتح قبرس‘‘ کے عنوان کے تحت علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے کشتیوں کے ذریعے سمندر کو طے کر کے سمندر پار اسلامی جھنڈا لہرایا، ان سے پہلے مسلمانوں نے سمندر میں لشکر کشی نہیں کی تھی، یہ نہایت عظیم الشان فتح تھی، جو صلح کے ذریعے ہوئی تھی، اسی جنگ میں ام حرام رضی اللہ عنہا کی شہادت واقع ہوئی تھی۔

اس کے علاوہ حضرت معاویہؓ نے مصّیصہ پر فوج کشی کی، شمشاط اور ملطیہ فتح کیے، اس کے بعد حضرت

(۱) فتوحات حضرت معاویہ۔ قلمی۔، و ماہنامہ ’دارالعلوم‘ ج ۲۹ ش ا ص: ۳

امیرؓ نے اپنی توجہ فتح افریقہ پر مرکوز کی، علامہ اعظمیؒ نے اس کے ماتحت لکھا ہے:

''۵۰ھ میں حضرت معاویہؓ نے معاویہ بن حُدَیج رضی اللہ عنہ کو افریقیہ کی حکومت سے معزول کر کے ان کی جگہ پر عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا، عقبہ دس ہزار سواروں کی جمعیت لے کر افریقیہ روانہ ہوئے، جب وہاں پہنچے تو بربر قوم کے بہت سے لوگ بھی ساتھ ہو گئے، جس کی وجہ سے ان کے لشکر کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی، اہل افریقیہ کی عادت تھی کہ جب کوئی مسلمان امیر آتا، تو اس کی اطاعت کر لیتے، بلکہ بہت سے دائرۂ اسلام میں بھی داخل ہو جاتے، لیکن جہاں وہ امیر واپس ہوتا، بدعہدی شروع کر دیتے اور مرتد ہو جاتے؛ اس لیے عقبہ نے اچھی طرح سرکوبی کی، اور ساتھ ہی یہ مناسب سمجھا کہ یہاں ایک شہر آباد کر کے فوجی کیمپ قائم کیا جائے اور اس میں کافی تعداد میں مسلمان آباد کیے جائیں، وہاں ان کے اہل وعیال بھی ہوں اور ان کو جائدادیں بھی دی جائیں، تا کہ آئندہ اہل افریقیہ کو شورش پیدا کرنے اور بغاوت پھیلانے کا موقع نہ ملے۔ اس خیال کو عملی جامہ دینے کے لیے انھوں نے ایک زمین کا انتخاب کیا، وہ نہایت گھنا جنگل تھا، سانپ بچھو اور ہر قسم کے درندوں کی وہاں نہایت کثرت تھی، عقبہ بہت نیک اور مستجاب الدعوات بزرگ تھے، انھوں نے اللہ کی بارگاہ میں دعا کی، اس کے بعد جنگل میں کھڑے ہو کر ایک دفعہ پکار دیا کہ:

''اے جنگل کے سانپو اور درندو! ہم رسول اللہ (ﷺ) کے رفیق اور ساتھی ہیں اور اب ہم یہاں قیام کریں گے، لہذا تم یہاں سے رخصت ہو جاؤ، اس کے بعد اگر ہم نے تم میں سے کسی کو یہاں پایا تو جیتا نہ چھوڑیں گے''

اس اعلان کے بعد لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ چوپائے اور درندے اپنے بچوں کو اٹھائے ہوئے چلے جا رہے ہیں، اس واقعہ کا بربر قوم کے بھی بہتیرے افراد نے مشاہدہ کیا، ان پر اس کا ایسا اچھا اثر پڑا کہ وہ مسلمان ہو گئے۔ حضرت عقبہؓ نے جانوروں کے نکل جانے کے بعد جنگل کے درخت کٹوا کر شہر پناہ کی بنیاد ڈلوائی، شہر پناہ کا دور ساڑھے چودہ ہزار ہاتھ تھا، اس کی تیاری کے بعد جامع مسجد بنوائی، اور وہاں آباد ہونے والوں نے اپنے اپنے مکانات اور مختلف مسجدیں بنوائیں، تقریباً ۵ برس کی مدت میں یہ ساری چیزیں بن کر تیار ہو گئیں اور شہر آباد ہو گیا، یہ شہر سارے عالم میں قیروان کے نام سے مشہور ہے''[1]۔

حضرت معاویہؓ کی فتوحات میں مذکورہ بالا مقامات کے علاوہ جزیرۂ روڈس اور صقلیہ کا بھی ذکر کیا ہے، روڈس ایک شاداب اور زرخیز جزیرہ تھا، اس پر فوج کشی کے لیے حضرت معاویہؓ نے جنادہ بن ابی امیہ کو روانہ کیا، انھوں نے اس کو ۵۲ھ میں فتح کیا، اور جزیرۂ صقلیہ (سسلی) کے سلسلۂ کلام میں لکھا ہے:

(۱) فتوحات حضرت معاویہؓ (قلمی)

''صقلیہ گو حضرت معاویہؓ کے عہد میں فتح نہیں ہوا، لیکن اس کی داغ بیل حضرت معاویہؓ ہی نے ڈالی تھی، اس لیے مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا کے اصول سے اس فتح میں ان کا بھی حصہ ہے''(۱)۔

اور اسی عبارت پر یہ مضمون ختم ہوا ہے، یہ مضمون آٹھ صفحات پر مشتمل ہے، اور باریک خط میں تحریر فرمایا گیا ہے، تاریخِ تحریر ۲۹؍صفر ۱۳۵۹ھ ہے۔ یہ مضمون ماہنامہ 'دارالعلوم' میں اپریل ۱۹۶۵ء کے شمارے میں چھپا ہے۔ لیکن اس میں بہت اختصار ہے، اصل مضمون اس سے زیادہ طویل ہے جو 'دارالعلوم' میں چھپا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

تبصرہ بر شہید کربلا و یزید

واقعۂ کربلا اور اس میں سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور دیگر اہل بیت کی شہادت اسلامی تاریخ کا ایک بہت بڑا حادثہ تھا، اس حادثے نے ہر دور اور ہر زمانے میں لوگوں کو متاثر کیا ہے، اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے آل واصحاب -رضی اللہ عنہم- سے محبت رکھنے والوں کو آزردہ کیا اور تڑپایا ہے، لیکن اس واقعے کی وجہ سے دینی امور اور تاریخی حالات وواقعات کے نقل وبیان میں بہت افراط وتفریط سے بھی کام لیا گیا ہے، اس کو ڈھال اور بہانہ بنا کر کئی ایک فرقے وجود میں آئے، بہت سے گروہوں نے محبت اہل بیت اور حبّ آل رسول کی آڑ میں سیاسی فائدے اٹھائے اور اسلامی دنیا کے اندر الٹ پھیر کرنی چاہی۔

علمی تحقیق کے نام پر بھی اس میں حد اعتدال کو بہت کم ملحوظ رکھا گیا، اگر کچھ لوگوں نے علم وتحقیق کے نام پر حضرت حسینؓ کی شان میں جارحانہ انداز میں لب کشائی کی جرأت کی، تو دوسری طرف ایسے اہل علم کی بھی کمی نہیں، جن کا قلم نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ان کے دفاع کے لیے اٹھا مگر لغزش سے محفوظ نہ رہ سکا۔

حضرت حسینؓ کے موقف کی تنقید میں آج سے بہت پہلے ایک کتاب 'خلافتِ معاویہؓ ویزید' شائع ہوئی تھی، جس کے مصنف محمود عباسی تھے، اور کتاب -اغلباً ۱۹۵۸ء میں- کوہِ نور پریس دہلی سے چھپ کر شائع ہوئی تھی، اس کتاب نے ہندوستان کے طول وعرض میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا، اور اس کے خلاف بہت ساری کتابیں معرض تصنیف میں آئی تھیں، محمود عباسی کے خلاف لکھی جانے والی کتابوں میں ایک اہم کتاب 'شہید کربلا اور یزید' تھی، یہ کتاب دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمۃ کے کاوش قلم کا نتیجہ تھی، قاری صاحب کی یہ کتاب جب علامہ اعظمیؒ کی نگاہ سے گزری، تو آپ کو احساس ہوا کہ اس میں بہت سی باتیں تاریخی حقائق اور اہل سنت کے مسلمات کے خلاف ہیں۔ چونکہ قاری صاحب ایک ذمہ دار عالم تھے، اور ہندوستان کی سب سے مؤقر درس گاہ کے سب سے اہم منصب پر فائز تھے، اس لیے ان کی تحریر بہت نپی تلی ہونی چاہیے تھی؛

(۱) فتوحات حضرت معاویہؓ (قلمی)

مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا، اور علامہ اعظمیؒ، قاری صاحب کی فروگزاشتوں پر قلم اٹھانے کے لیے مجبور ہوئے۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنی کتاب کا آغاز کا ان الفاظ سے کیا ہے:

''معرکۂ کربلا کی نوعیت یا حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور یزید کے موقف پر ان دنوں متعدد کتابیں لکھی اور شائع کی گئیں، لکھنے والوں کے زاویہ ہائے نگاہ اس قدر مختلف ہیں کہ باہم بعد المشرقین نظر آتا ہے، اور ایک عامی آدمی ان کو پڑھ کر حیران ہو جاتا ہے، اور کسی طرح یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ ان میں کون سا نقطۂ نظر تحقیقی طور پر صحیح اور کون سا غلط ہے''۔

اس کے بعد قاری صاحب کی کتاب پر اپنی انفعالی وقلبی کیفیت اور اس کے رد پر مجبور ہونے کے متعلق لکھا ہے:

''اس سلسلہ کی پہلی کتاب 'خلافتِ معاویہ ویزید' ہے، جس کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا۔ مخالفت میں اس وقت تک سب سے آخری کتاب مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تصنیف 'شہیدِ کربلا اور یزید' ہے، اس کتاب کا بہت پہلے سے انتظار تھا اور امید تھی کہ مہتمم صاحب کا قلم اس مسئلہ کو پورے طور پر سلجھا دے گا، لیکن کتاب پڑھ کر بہت مایوسی ہوئی اور خلاف امید آپ کے قلم نے اس مسئلہ کو اور زیادہ الجھا دیا۔ مسئلہ کے الجھانے کے علاوہ مہتمم صاحب نے متعدد ایسے نظریے پیش کیے اور ایسے انداز میں پیش کیے کہ گویا وہ بالکل مسلَّم الثبوت اور نا قابلِ انکار ہیں، جن سے بہت سی غلط فہمیاں اور گمراہیاں پیدا ہو سکتی ہیں، اس لیے مجبوراً یہ چند سطریں محض غلط فہمیوں کے ازالہ کی غرض سے لکھی جاتی ہیں''۔

پھر قاری صاحب کی پوری کتاب پر اپنے تاثرات کا اجمالی طور پر اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''سب سے پہلی بات جو ہم کو بری طرح کھٹکتی ہے، یہ ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا جو موقف بیان کیا ہے اور یزید کی جو پوزیشن دکھائی ہے، اس کو وہ عقیدہ کا درجہ دے رہے ہیں، اور اس طرح یہ باور کرا رہے ہیں کہ اس کے خلاف جو بات بھی کوئی کہے وہ اہل سنت کے عقائد کے خلاف ہے''۔

علامہ اعظمیؒ نے قاری صاحب کے اس نظریے کو خلاف تحقیق قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''اتنی بات تو بالکل صحیح ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دوسرے صحابہ اور اہل بیت کی طرح واجب الاحترام سمجھنا، ان سے محبت رکھنے کو موجبِ سعادت یقین کرنا، ان کے حق میں بدگوئی اور ان کی اہانت وتحقیر کو ناجائز قرار دینا اور ان کو ہر اس فضیلت وبزرگی کا مستحق سمجھنا جو صحیح احادیث میں وارد ہوئی ہے، عقائد اہل سنت میں داخل ہے؛ لیکن غلط فہمی اور خطائے اجتہادی کو ان کے حق میں محال سمجھنا ہرگز عقائد اہل سنت میں داخل نہیں ہے''۔

پھر استشہاد کے طور پر اکتوبر ۱۹۵۹ء کے ’تذکرہ‘ صفحہ ۱۵ سے قاری صاحب کے جد امجد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا ایک قول نقل کیا ہے۔

اس کے آگے لکھا ہے:

’’اسی طرح عقائدِ اہل سنت میں یہ بات ہرگز داخل نہیں ہے کہ یزید کو لازمی طور پر فاسق وفاجر سمجھا جائے، یہ بات اگر عقائد اہل سنت میں داخل ہوتی، تو بہت سے اکابر علماء اہل سنت یزید کے باب میں اپنے ان خیالات کا اظہار نہ فرماتے، جن کو آگے کسی مناسب موقع پر ہم انھیں کے الفاظ میں نقل کریں گے‘‘۔

قاری صاحب کی کتاب کی نسبت دوسرا تاثر یہ ہے کہ:

’’مہتمم صاحب کا دوسرا نہایت غلط رویہ یہ ہے کہ انھوں نے بعض احادیث کے مجمل ومبہم الفاظ کو بعض اشخاص پر ایسے انداز میں منطبق کرنے کی کوشش کی ہے کہ ناواقف یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ یہ احادیث قطعاً اور یقیناً انھیں اشخاص کے باب میں وارد ہوئی ہیں، حالانکہ یہ حقیقت نہیں ہے‘‘۔

پھر تیسرا تاثر یہ بیان کیا ہے کہ انھوں نے اپنے نظریوں کو ثابت کرنے کے لیے جن حوالوں سے کام لیا ہے، انھیں حوالوں میں ان کے نظریے کے خلاف باتیں بھی مذکور ہیں، مگر مہتمم صاحب نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔

اس اجمالی تاثر کے بعد علامہ اعظمیؒ نے قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمۃ کی کتاب کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، اور اس کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے پہلے حصے کے متعلق لکھا ہے:

’’اس کتاب کے گویا تین باب ہیں، پہلے باب میں مصنف نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی صحابیت ثابت کی ہے، اس باب میں ان کا زاویۂ نگاہ بالکل درست اور حق وصواب ہے، صحابی کی معتمد علیہ تعریف کی بنا پر حضرت حسینؓ بلاشبہہ صحابی تھے‘‘۔

دوسرے باب میں قاری صاحب نے جو نقطۂ نگاہ پیش کیا ہے، وہ علامہ اعظمیؒ کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

’’دوسرے باب میں مہتمم صاحب نے بخیال خویش یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کی حکومت سے جو ٹکر لی تھی، اقتدار کی ہوس میں نہیں لی تھی، بلکہ یزید کے ظلم واستبداد اور شر وفساد کو نیست ونابود کرنے کے لیے انھوں نے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی‘‘۔

اس کے متعلق علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

’’مہتمم صاحب کا یہ دعوی اگر صرف تاریخی تحقیق کی حد تک ہوتا، تو ہم کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی؛ لیکن اس کو عقیدہ کا درجہ دینے کا تو مطلب یہ ہے کہ اس کے خلاف جو کہتا یا لکھتا ہے، وہ سنی نہیں ہے، اور مسلکِ اہل سنت کی وہ مخالفت کر رہا ہے۔ بس اس چیز سے ہم کو اختلاف اور سخت اختلاف ہے‘‘۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ ہوسِ اقتدار قاری صاحب کے خطیبانہ وانشاپردازانہ الفاظ ہیں، ان کے بجائے طلبِ امارت یا طلبِ خلافت کے الفاظ رکھ کر ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اکابرِ اہلِ سنت میں کتنے ایسے ہیں جنھوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خروج کا مقصد اسی کو قرار دیا ہے، اور اس کو ان کی شانِ صحابیت، ان کی بزرگی وعظمت اور ان کے تقویٰ وطہارت کے منافی نہیں سمجھا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے حافظ ابن کثیر کی 'البدایہ والنہایہ' (۱۶۳/۸) سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی نصیحت کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: **لا تَخرُج، فإنَّ رسولَ اللهِ ﷺ خيَّره اللّٰهُ بينَ الدنيا والآخرةِ، فاختارَ الآخِرةَ، وإنَّكَ بِضعةٌ منه ولا تَنالُها، يعني الدنيا.**

حضرت ابن عمرؓ کی اس نصیحت کو نقل کر کے آپ نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ ان الفاظ میں دنیا سے مراد طلبِ امارت کے سوا دوسری کون سی چیز ہو سکتی ہے؟

پھر ''نوٹ'' کے نام سے ایک ذیلی عنوان کے تحت لکھا ہے:

''یہاں دنیا سے مراد مباح دنیا ہے، جس کی طلب حرام نہیں ہے؛ مگر حضرت ابن عمرؓ نے اس مباح کی طلب کو بھی حضرت حسینؓ کے مرتبہ سے فروتر سمجھتے ہوئے منع کیا ہے، اور بتایا ہے کہ وہ بلحاظ علاقۂ جزئیتِ رسول نہ آپ کے شایانِ شان ہے، نہ اس طلب میں کامیابی ہی کی توقع ہے''۔

آگے لکھا ہے کہ ابن کثیر نے حضرت ابن عمرؓ کی اس نصیحت کو صفحہ ۱۶۰ پر بھی نقل کیا ہے، وہاں ان کے الفاظ یہ ہیں: **وَاللهِ لا يَلِيها أحدٌ مِنكُم.**

اس پر یہ سوال قائم کیا ہے:

''اگر حضرت حسینؓ طلبِ امارت ہی کے لیے کوفہ نہیں جا رہے تھے، تو حضرت ابن عمرؓ یہ کیا فرما رہے ہیں''؟۔

اس کے بعد تاریخ ابن کثیر ہی سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے حضرت حسینؓ کے واسطے ناصحانہ اقوال نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ صراحتاً اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آپ کا کوفہ جانا طلبِ امارت وخلافت کے لیے تھا۔

ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد بطور نتیجہ کے لکھا ہے:

''میرا مقصد یہ ہے کہ ایسا سمجھنا یا کہنا کہ حضرت حسینؓ طلبِ خلافت کے لیے کوفہ روانہ ہوئے تھے، عقائدِ اہلِ سنت کے خلاف نہیں ہے، اور یہ کہ اس کو عقیدۂ اہلِ سنت کے خلاف کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، اور حضرت ابن عباس سب خروجِ حضرت حسینؓ کے باب میں خدانخواستہ عقائدِ اہل سنت کے خلاف رائے رکھتے تھے''۔

اس کے بعد ابن کثیر کا ایک عنوان ''**قصة الحسين بن علي بن أبي طالب رضي الله عنهما**

وسببُ خروجِه بأهلِه مِن مكةَ إلى العراقِ في طلبِ الإمارةِ و كيفيةُ مَقتلِه رضي الله عنه (حضرت حسین بن علیؓ کا قصہ، اور امارت کی طلب میں اہل وعیال کو ساتھ لے کر مکہ سے عراق جانے کے سبب اور ان کی شہادت کی کیفیت کا بیان)''نقل کر کے تحریر فرماتے ہیں:

''اس میں ابن کثیر نے صاف لفظوں میں تصریح کر دی ہے کہ حضرت حسین کا خروج طلب امارت کے لیے تھا''۔

آگے لکھتے ہیں:

''اس کے علاوہ تمام اہلِ سنت علماء اور مصنفین جن کی تحریریں ہم نے پڑھی ہیں، حضرت حسینؓ کے خروج کا سبب یہ لکھتے ہیں کہ جب زمامِ حکومت یزید کے ہاتھ آئی تو آپ نے اس کی بیعت نہیں کی، اور مدینہ سے مکہ چلے آئے، مکہ میں چار مہینے کے اندر اہل کوفہ کے لاتعداد خطوط اور قاصد آئے کہ ہم نے یزید کی بیعت نہیں کی ہے، ہمارا کوئی امام نہیں ہے، والیٔ کوفہ کے پیچھے ہم جمعہ وعیدین میں شریک نہیں ہوتے، آپ کی تشریف آوری کی خبر مل جائے تو ہم والیٔ کوفہ کو یہاں سے نکال دیں، ہم آپ کے منتظر ہیں، آپ جلد تشریف لائیے تاکہ آپ کے ہاتھ پر ہم بیعت کریں''۔

اور اس سبب خروج کے لیے آپ نے تاریخ ابن کثیر کے علاوہ صواعق محرقہ، اصابہ، تعجیل المنفعۃ، تہذیب التہذیب اور تاریخ ابن اثیر وغیرہ کا حوالہ دیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے قاری صاحب کے اس خیال پر حیرت ظاہر کی ہے کہ وہ حضرت حسینؓ کے خروج کا سبب یزید اور یزیدیوں کے جور واستبداد، ان کے بے پناہ مظالم، ان کے اجتماعی فسق وفجور اور ان کی علانیہ خلاف ورزیٔ شریعت بتلا رہے ہیں، جب کہ محدثین ومورخین اہل سنت میں سے ایک بھی اس سبب خروج کا نام تک نہیں لے رہا ہے، بلکہ اس کے بجائے طلبِ خلافت کو ان کے خروج کا مقصد قرار دے رہا ہے۔

جہاں تک یزید کے ظلم وستم اور اس کے فسق وفجور کا سوال ہے، تو اس کے متعلق علامہ اعظمیؒ نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ:

''اواخرِ رجب ۶۰ھ سے اواخر ذی قعدہ ۶۰ھ تک یعنی ولایتِ یزید کے ابتدائی چار مہینوں میں یزید نے کون کون سے احکامِ شریعت بدلے، اس سے کیا اجتماعی فسق وفجور صادر ہوا، اور اس نے اس مدت میں کیا مظالم کیے؟''

اس کے بعد آپ نے خود اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ تاریخ کی کتابیں اس مدت میں یزید کے مظالم وغیرہ کے ذکر سے بالکل خاموش ہیں، اور جن الفاظ سے ان کو یہ شبہہ ہوا ہے وہ ان غدار شیعوں کے الفاظ ہیں، جنھوں نے پہلے حضرت علیؓ سے غداری کی، اور پھر حضرت حسینؓ کو کوفہ بلا کر ان کے دشمنوں سے جا ملے، وہ اپنے شیعی نقطۂ نظر سے حضرت معاویہؓ کی خلافت کو بھی حکومت جائرہ اور اپنے زعم باطل میں ان کو ظالم سمجھتے تھے۔

سبب خروج پر قاری صاحبؒ کا استدلال اور اس کا رد:

یہ ثابت کرنے کے لیے کہ حضرت حسینؓ کا خروج طلب خلافت کے لیے نہ تھا قاری صاحب نے پہلے حدیث پاک: **الخلافة بعدي ثلاثون سنة** نقل کرکے لکھا ہے کہ اس حدیث کے مطابق خلافت ہی باقی نہ رہی، تو حضرت حسینؓ اس کی طلب کیسے فرماسکتے تھے؟ لیکن چونکہ دوسری کئی حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خلافت اس کے بعد بھی باقی رہے گی، اس لیے تیس سال سے مراد خلافت راشدہ ہے، جو اپنی عمر پوری کر کے رخصت ہو چکی تھی، اور اس کے بعد کی خلافت مطلق خلافت ہے، جو ملوکیت کے ہم معنی ہے، تو اس کو طلب کرنے کے معنی بجز حکمرانی کی طلب کے دوسرے نہ ہوں گے، اور اہل اللہ کے لیے مطلق حکمرانی میں کوئی ذاتی دلچسپی نہیں ہوسکتی، اس لیے نہ انھوں نے اس کی طلب فرمائی اور نہ وہ ایک ختم شدہ شے کی طلب فرما سکتے تھے[1]۔

قاری صاحب نے تیس سال خلافت باقی رہنے والی حدیث کے علاوہ جن حدیثوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے: **لا يزالُ الإسلامُ عَزيزاً إلى اثني عشَرَ خليفةً (إلى) كلُّهم مِن قريش**، اور بعض روایتوں میں **عزیزاً** کے بجائے **قائماً** کا لفظ ہے۔

اس روایت کے متعلق علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

> ''دیکھئے یہ حدیث جس طرح اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مطلق خلافت کا انحصار صرف پانچ خلفاء میں نہیں ہے، اسی طرح یہ بھی پکار کر کہہ رہی ہے کہ بارہ خلفاء کے وجود وظہور تک اسلام باعزت وشوکت اور دین قائم رہے گا، کہ یہ ان خلفاء کے دینی شعور، احساسِ ذمہ داری، اور فرائض خلافت کی انجام دہی میں پوری مستعدی کا نتیجہ ہوگا، پس ایسی خلافت جو چاہے راشدہ نہ ہو، مگر دین کا قیام اور اسلام کی عزت وشوکت اس سے وابستہ ہو، کون کہہ سکتا ہے کہ وہ شرعاً مطلوب ومحمود نہیں ہے؟ اور کون کہہ سکتا ہے کہ اقامتِ دین اور اظہارِ شوکتِ اسلام کے لیے اس کی طلب وتمنا مقامِ ولایت کے منافی ہے''۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ بھی نقل کیا ہے: **لا يزالُ هذا الدينُ قائماً حتى يكونَ عليكم اثنا عشر خليفةً كلُّهم تجتمعُ عليه الأمةُ** (فتح الباری ۱۳/۱۶۷)۔

علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ حافظ ابن حجر نے اس حدیث پر بہت لمبی بحث کی ہے، اور آخر میں فرمایا ہے کہ اس کی شرح وتوجیہ میں جس قول کا پلہ سب پر بھاری ہے، وہ یہ ہے کہ اس حدیث میں خلیفہ پر امت کے مجتمع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ امت اس کی بیعت کے لیے منقاد ہو جائے گی، اور واقعات کی دنیا میں یہ وصف حضرات خلفاء اربعہ کے سوا جن پر صادق آیا ان کے نام یہ ہیں: حضرت معاویہؓ، یزید، عبدالملک، ولید، سلیمان، یزید ثانی، ہشام، ولید ثانی۔

---

(۱) دیکھئے 'شہید کربلا و یزید' ص: ۸۲-۸۳

سیوطی نے حافظ ابن حجرؒ کے حوالے سے تاریخ الخلفا (ص ۷) میں اس کو نقل کیا ہے، اور ملاعلی قاری نے شرح فقہ اکبر (ص ۸۲) میں ولید ثانی کے بجائے عمر بن عبدالعزیز کو رکھ کر انھیں اشخاص کو اس حدیث کا مصداق ٹھہرایا ہے، جن میں یزید بھی شامل ہے۔

صحیح بخاری کی کتاب الفتن میں ایک حدیث: **هَلَكَةُ أُمَّتي على أيدي غَلَمةٍ مِن قريش** وارد ہوئی ہے، قاری صاحب نے اس حدیث کو فسق یزید کے عقیدے کی بنیاد قرار دیا ہے، اور اس کے لیے انھوں نے متعدد اہل علم کا حوالہ دیا ہے[1]۔

علامہ اعظمیؒ نے اس سلسلے میں اولاً یہ سوال اٹھایا ہے کہ یزید کے باب میں جس عقیدے کا ذکر کیا ہے، وہ عقائد کی کتابوں میں سے کس کتاب میں مذکور ہے، اور وہ ائمۂ دین مثلاً ائمہ اربعہ، یا ابوالحسن اشعری، یا ابومنصور ماتریدی وغیرہم میں سے کس سے منقول ہے؟ ہر وہ بات جس کو جامعین عقائد یا شارحین کتبِ عقائد میں سے کوئی سلف کا حوالہ دیے بغیر عقائد کی کتابوں میں اپنی رائے کے طور پر لکھ دے، اس کو عقیدہ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

دوسری بات یہ لکھی ہے کہ:

''جس بات کی کسی حدیث میں تصریح نہ ہو، اور شارحین حدیث اپنے اپنے علم کے مطابق قرائن کی بنا پر حدیث کا محمل متعین کرنے کی کوشش کریں، تو شارحین کے بیان کردہ محامل کو حدیث کا درجہ نہیں دیا جاتا، اور منقولہ بالا حدیث میں صراحۃً یا اشارۃً کوئی تعیین ان چھوکروں کی نہیں ہے، اب اگر کسی قرینہ کی بنا پر کسی عالم نے یہ لکھ دیا کہ اس میں یزید کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے، تو اس بنیاد پر یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے کہ حدیث میں یزید کے ہاتھوں سے امت کی بربادی کی پیشین گوئی کی گئی ہے؛ زیادہ واضح لفظوں میں یہ کہ چند غیر متعین قریشی لڑکوں کے ہاتھوں امت کی بربادی کی خبر کو توحق تسلیم کرنا اور اس پر آمنا وصدقنا کہنا ضروری ہے، لیکن یہ تسلیم کرنا کہ ان لڑکوں میں یزید بھی داخل ہے، قطعاً ضروری نہیں ہے، اس لیے کہ اس کی تصریح حدیث میں نہیں ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ شرح احادیث میں جو احتمالات محدثین ذکر کرتے ہیں، ان کو قطع وجزم کے صیغے سے بیان کرنا علمی دیانت کے سراسر خلاف ہے، اسی طرح ان کی بنیاد پر حدیث کی کوئی مراد جزم کے ساتھ بیان کرنا یا ان احتمالات کو حدیث کے ساتھ جوڑ کر یہ کہہ دینا کہ حدیث کا یہ مضمون ہے، ہمارے نزدیک **مَن يَقُلْ عليَّ ما لَمْ أَقُلْهُ** کا مستحق بنتا ہے۔

قاری صاحب نے اس محمل کی تعیین کے لیے حافظ ابن حجر کی فتح الباری کا حوالہ دیا ہے، اس کے جواب میں علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

> ''دنیا میں ایک حافظ ابن حجر ہی حدیث کے شارح اور فن کے متبحر عالم نہیں گزرے ہیں، بلکہ اور حضرات کو بھی یہ سعادت نصیب ہوئی ہے، بالخصوص ہمارے اور آپ کے علمی مورث اعلیٰ، اور لقمی نہیں

(۱) دیکھئے 'شہید کربلا' ص: ۱۳۹-۱۴۰

بلکہ واقعی حکیم الاسلام شیخ المشائخ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ جو علم دقائق واسرار کتاب وسنت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے''۔

پھران کی ازالۃ الخفا (ص۱۵۴) سے ایک عبارت نقل کر کے لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب اس حدیث کا محمل عبدالملک بن مروان کی اولاد کو قرار دیتے ہیں۔اور شاہ صاحب نے جو محمل بیان کیا ہے، وہ خود صحیح بخاری میں اس حدیث کے ساتھ ہی حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد کی زبانی مذکور ہے، حضرت ابوہریرہؓ اس حدیث کے راوی ہیں، ان سے سعید بن عمرو نے اس کو سنا اور روایت کیا ہے، عمرو بن یحییٰ نے اس کو اپنے دادا سعید سے روایت کیا ہے، وہ اس حدیث کی روایت کے بعد فرماتے ہیں کہ میں اپنے دادا سعید کے ساتھ اس وقت ملک شام گیا، جب وہاں بنومروان کی حکومت تھی، تو میرے دادا سعید نے بنومروان کو نوخیز دیکھ کر فرمایا کہ ''دور نہیں کہ یہی وہ قریش کے چھوکرے ہوں''اس کے جواب میں ہم لوگوں نے کہا کہ اس کو تو آپ ہی ہم سے زیادہ جان سکتے ہیں۔

قاری صاحب نے حافظ ابن حجر کی جو عبارت نقل کی ہے، اس میں حافظ نے غلیمة کی تاویل ضعیف العقل اور ضعیف التدبیر سے کی ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس پر لکھا ہے:

''اسی طرح یزید کو لفظ غلام کا مصداق ثابت کرنے کے شوق میں وہ ابن حجر کی اس تاویل کو بے تامل مان لیتے ہیں کہ غلام اپنی حقیقت پر نہیں ہے، بلکہ مجازاً اس سے ضعیف العقل مراد ہے، مگر خود ابوہریرہؓ سے روایت کرنے والا لفظ غلمة کو اس کے حقیقی معنوں میں سمجھتا ہے، اور بنومروان کو نوخیز پا کر اس کا مصداق قرار دیتا ہے، تو اس کی کوئی قیمت مہتمم صاحب کے نزدیک نہیں ہے، حالانکہ ان کو معلوم ہے کہ حقیقت کو چھوڑ کر مجاز اختیار کرنا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک حقیقت متعذّر نہ ہو۔ نیز غلمة کی یہ تاویل اس لیے بھی قرین صواب نہیں ہے کہ دوسری روایت میں یہ حدیث بلفظ غلمة سفهاء وارد ہوئی ہے، اور خود بخاری نے ترجمۃ الباب میں اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے، لہذا غلمة میں تاویل کر کے اس کی مراد ضعفاء العقول قرار دینے کا مطلب یہ ہوا کہ آگے سفہاء کے اضافہ سے اسی کی تاکید منظور ہے، حالانکہ اہل عربیت کے نزدیک تاکید سے اولیٰ تاسیس ہے، لہذا اس قاعدہ کی رو سے بھی اولیٰ یہی ہے کہ غلمہ سے نوخیز لڑکے مراد لیے جائیں تاکہ لفظ سفہاء تاسیس کے لیے ہو''۔

۶۰ھ اور امارۃ صبیان:

قاری صاحب نے حدیث غلمہ سے یزید کے مراد ہونے کا فتح الباری کے حوالے سے یہ قرینہ ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ یہ دعا کیا کرتے تھے: أللّٰهُمَّ لا تُدرِكْني سنةُ ستينَ و لا إمارةُ الصِّبيانِ (اے اللہ! ۶۰ھ کا زمانہ مجھ پر نہ گزرے نہ امارۃ صبیان مجھے پائے)۔

علامہ اعظمیؒ نے جواب میں لکھا ہے کہ دو چیزوں کی دعا مانگنے سے یہ کیوں کر لازم آتا ہے کہ داعی ان چیزوں میں معیت ومقارنت کا اعتقاد رکھتا ہے؟ کیا دو چیزوں کو ایک ساتھ ذکر کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ ان دونوں کا وقوع بھی ایک ہی ساتھ ہوگا؟ بلکہ یہ طرزِ تعبیر صاف بتا رہا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ امارتِ صبیان کو ۶۰ھ سے بالکل علاحدہ اور الگ ایک مستقل چیز سمجھتے تھے؛ اگر دونوں میں معیت کا تصور ان کو ہوتا، تو لفظ لا کے اعادہ کے ساتھ اس کو پہلے پر عطف نہ کرتے، بلکہ یوں کہتے: **لا تدركني سنة ستين وإمارة الصبيان**.

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے جو لکھا ہے، وہ بہت غور طلب اور چشم کشا ہے، ان کی عبارت ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

''حضرت ابوہریرہؓ کا یہی اثر یا اس سے بالکل ملتا جلتا ایک اثر امام بخاری کی کتاب 'الأدب المفرد' میں مذکور ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

سَمِعتُ أبا هُرَيرةَ يتعوَّذُ مِن إمارةِ الصِّبيانِ والسُّفَهاءِ (حضرت ابوہریرہؓ لڑکوں اور کم عقلوں کی امارت سے پناہ مانگتے تھے)۔

راوی اس کے بعد بیان کرتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھا کہ اس کی نشانی یا پہچان کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ رشتۂ قرابت قطع کیا جائے گا، بہکانے والوں کی بات مانی جائے گی اور صحیح راستہ بتانے والوں کی سنی نہ جائے گی۔

اب آپ سوچئے کہ حضرت ابوہریرہؓ کے دماغ میں اگر یہ بات ہوتی کہ امارتِ صبیان کی ابتدا ۶۰ھ میں ہوگی، تو سائل کو جو پہچان انھوں نے بتائی ہے اس سے کہیں زیادہ آسان اور بسہولت گرفت میں آنے والی پہچان یہ تھی کہ وہ ۶۰ھ میں شروع ہوگی، لہذا حضرت ابوہریرہؓ اس کو بتاتے، مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ اس کا کوئی ذکر نہیں فرماتے۔

اسی طرح 'فتح الباری' میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ایک مرفوع حدیث میں بھی امارۃ الصبیان سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے، اس میں بھی کسی سائل کے سوال پر خود آنحضرت ﷺ نے اس کی پہچان بتائی ہے، مگر ۶۰ھ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے''۔

آگے لکھا ہے کہ امام حاکم نے حضرت حذیفہؓ بن الیمان کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حاکم کی نظر میں حضرت حذیفہؓ کے نزدیک **غلمة من قريش** کا مصداق قاتلینِ عثمانؓ ہیں۔

اس کے بعد تاریخ ابن کثیر (۲۳۱/۸) سے آنحضرت ﷺ کی ایک حدیث: **تَعَوَّذُوا بِاللهِ مِنْ سَنَةِ سَبْعِيْنَ وَمِنْ إمارَةِ الصِّبْيانِ** نقل کر کے لکھا ہے کہ اس میں امارۃ الصبیان کا ذکر ۷۰ھ کے ساتھ ہے، لہذا قاری صاحب کے استدلال کے بموجب اس میں آنحضرت ﷺ نے دونوں کو ساتھ ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ امارۃ الصبیان کی ابتدا ۷۰ھ سے یا ۷۰ھ کے بعد ہوگی، پس حدیث نبوی اور دعائے ابوہریرہؓ کے

اشاروں میں تعارض ہے، اور ظاہر ہے کہ ایسے تعارض کے وقت حدیثِ نبوی کو ترجیح دی جائے گی۔
اس کے بعد لکھا ہے کہ تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس پیشین گوئی کا ظہور و وقوع ۷۰ھ کے بعد ہی سے ہوا، چنانچہ اس کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

"عبد الملک بن مروان نے ۷۰ھ سے پہلے ہی خلافت کا دعویٰ کیا تھا، مگر علماء کے نزدیک وہ حضرت عبد اللہ بن الزبیرؓ کی حیات تک اس دعویٰ میں حق بجانب نہ تھا، ۷۳ھ سے وہ صحیح معنوں میں خلیفہ ہوا، اور اس کے بعد اس کے چار بیٹے خلیفہ یا بادشاہ ہوئے، جن میں کوئی ۲۴ برس کا، کوئی ۲۹ برس کا تھا، اور عبد الملک ہی نے حجاج جیسے خوں ریز کو کوفہ و بصرہ کی حکومت دی، اور عبد الملک اور اس کی اولاد نے معمّر والیوں کی جگہ پر کم عمروں کو والی بنایا"۔

پھر ابن کثیر کا ایک قول "فأقرَّ نُوَّابَ أبيهِ عَلَى الأقاليم، لَمْ يعزِلْ أحَداً مِنهُمْ، وهذا من ذَكائِه" نقل کر کے لکھا ہے کہ مہتمم صاحب نے یزید کی نسبت جو لکھا ہے کہ وہ شیوخ کو ہٹا کر صبیان کو مقرر کرتا تھا، تاریخ اس کی تکذیب کرتی ہے، ولید بن عتبہ اور حضرت نعمان بن بشیرؓ کو معزول بھی کیا تھا، تو ولید کو پھر مدینہ کا گورنر بنادیا تھا، اور حضرت نعمانؓ کو پہلے اپنے ہی پاس رکھ کر ان سے مشورہ لیتا تھا، اور بعد میں ان کو حمص کا والی بھی مقرر کر دیا تھا۔

فسقِ یزید کی بحث:

آگے علامہ اعظمیؒ نے ایک عنوان "فسق یزید" کا قائم کر کے اس پر طویل گفتگو کی ہے، اور تاریخی نقطۂ نظر سے اس کتاب کی اہم ترین بحث ہے، جس میں مستند تاریخی روایات اور واقعات کی روشنی میں اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

"تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے اواخر عہدِ خلافت میں یہ دیکھ کر کہ اکابرِ صحابہ سب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، اب صرف ان کی اولاد رہ گئی ہے، خواہ وہ صحابی ہو یا غیر صحابی، اور ان میں کوئی ایسا نہیں ہے، جس کے پاس منظّم طاقت، کوئی وفادار جماعت، اور کوئی بالفعل قوت و شوکت ہو، یہ صحیح ہے کہ حضرت ابن الزبیرؓ کا فی الجملہ اثر مکہ میں ہے، مگر یہ بہت چھوٹی جماعت ہے، حضرت حسینؓ کا اثر کوفہ میں ہے، مگر کوفہ والوں کی فتنہ پسندی اور بے وفائی شہرۂ آفاق ہے، اور حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کے ساتھ جو انھوں نے کیا، اس سے دنیا واقف ہے، رہے حضرت ابن عمرؓ تو وہ دنیا سے بالکل کنارہ کش اور ان جھمیلوں سے دور بھاگنے والے ہیں، عبد الرحمان بن ابی بکر کے پاس کوئی طاقت نہیں ہے، نہ ان کا کسی جگہ کوئی خاص سیاسی رسوخ ہے۔

ان باتوں کو نگاہ میں رکھ کر انھوں نے آئندہ کا یہ انتظام مناسب سمجھا کہ اپنے بعد خلافت کے لیے

یزید کو نامزد کر دیں، اور ابھی سے لوگوں کو آگاہ کر کے اس کے لیے بیعت لے لیں، چنانچہ انھوں نے اس کا اعلان کر دیا اور بیعت لینا شروع کی، اطرافِ مملکت کی تمام رعایا نے بیعت کر لی، صرف مذکورہ بالا چار شخصوں نے بیعت نہیں کی، اس کے بعد حضرت معاویہؓ عمرہ کرنے کے لیے مکہ آئے، واپسی میں مدینہ میں قیام کر کے اس مسئلہ کو بھی چھیڑا اور اہلِ مدینہ سے بیعت لینا چاہی، سب نے بیعت کر لی، صرف مذکورہ بالا چار حضرات نے بیعت نہیں کی، مگر بیعت نہ کرنے کا یہ سبب کسی نے بیان نہیں کیا کہ یزید فاسق وفاجر یا شرابی کبابی ہے، بلکہ کسی نے یہ کہا کہ یہ تو قیصر وکسریٰ کی سنت ہے کہ باپ بیٹے کو ولی عہد بنائے، کسی نے یہ کہا کہ یزید سے زیادہ مستحق ہم ہیں، کسی نے یہ کہا ایک وقت میں دو خلیفہ کے لیے بیعت نہیں ہوا کرتی، آپ اگر خلافت سے اکتا گئے ہیں تو اس سے دستکش ہو جایئے ہم یزید کے لیے بیعت کر لیتے ہیں، کسی نے یہ کہا کہ خلفائے راشدین میں سے کسی نے اپنے بیٹے کو جانشین نہیں بنایا، تاہم اگر سب لوگ بیعت کر لیں گے تو میں بھی کر لوں گا''۔

اپنی اس گفتگو کے لیے 'تاریخ ابن کثیر' اور 'تاریخ الخلفا' کا حوالہ دے کر لکھا ہے:

''یہاں تک جو میں نے عرض کیا، اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنی زندگی میں جس وقت یزید کے لیے بیعت لی تھی، اس وقت ایک متنفس نے بھی یہ نہیں کہا تھا کہ وہ فاسق وفاجر یا نااہل ہے، اور خود حضرت مہتمم صاحب کی تحریر کے بموجب یہی لازم وضروری ہے کہ وہ اس وقت تک بلکہ حضرت معاویہؓ کی وفات تک فاسق وفاجر نہ ہو، ورنہ فاسق وفاجر کے لیے بیعت لینا یا بیعت لینے کے بعد اس بیعت کو مسلمانوں کی گردنوں پر سوار رہنے دینا، درانحالیکہ جس کے لیے بیعت لی گئی ہے وہ فاسق وفاجر ہو چکا ہے، بڑی ناخدا ترسی، بڑی دنیاداری اور معصیت ہے، جس کی نسبت عام دین دار ومتقی مسلمان کی طرف بھی نہیں کی جا سکتی، چہ جائیکہ حضرت معاویہؓ یا کسی صحابی رسول کی طرف کی جائے''۔

اس کے بعد لکھا ہے:

''بہر حال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت معاویہؓ کی زندگی میں یزید کا فسق وفجور ظاہر نہیں ہوا تھا، نہ کسی کو اس کی شکایت تھی، نہ اس کی وجہ سے کسی کو اس سے تنفر تھا، جس کا سب سے بڑا ناقابلِ تردید ثبوت جنگ قسطنطنیہ میں اس کی سپہ سالاری اور اس کی ماتحتی میں صحابہ کی ایک جماعت کا شریکِ جہاد ہونا ہے''۔

پھر تاریخ ابن کثیر سے متعدد عبارتیں اس کے غزوۂ قسطنطنیہ میں شریک ہونے، اور اس کی ماتحتی میں صحابہ کے جہاد کرنے اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کے جنازے کی نماز پڑھانے کی نقل کی ہیں۔

اس کے بعد اس انداز میں دعوتِ فکر ونظر دی ہے:

''اب ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے، کہ یزید شراب خوار ہوتا، بے نمازی ہوتا اور دوسرے معاصی میں ملوث ہوتا، تو صحابہ کی ایک جماعت بلا کراہت ونفرت اس کی ماتحتی قبول کر لیتی؟ نیز اگر وہ ایسا ہوتا تو حضرت ابوایوبؓ اس کو اپنا وصی بناتے؟ اچھا ان باتوں سے بھی قطع نظر کیجئے، صرف اتنا سوچئے کہ اگر اس قسم کی کوئی بھی شکایت اس میں ہوتی، تو میدانِ جنگ سے واپسی کے بعد کیا پوری اسلامی مملکت میں اودھم نہ مچ جاتی کہ یزید ایسا فاسق ہے اور اسی کو مجاہدینِ اسلام کا سالار بنایا جاتا ہے!۔ کوئی بتا سکتا ہے کہ کہیں سے بھی کوئی آواز اٹھی؟

اس کے علاوہ حضرات صحابہؓ، اور کبار تابعین ہر سال حضرت معاویہؓ کے پاس شام جایا کرتے تھے، حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد حضرت حسینؓ بھی ہر سال شام کا سفر کرتے تھے، اور حضرت معاویہؓ فیاضانہ انعام واکرام سے ان کا استقبال کرتے تھے، لیکن کسی نے معاویہؓ کی زندگی میں یزید کے فسق وفجور کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

الحاصل ۴۱ھ میں حضرت حسنؓ وحضرت معاویہؓ میں صلح ہو جانے کے بعد انیس (۱۹) برس تک صحابہؓ وتابعین اور اشرافِ مکہ ومدینہ حضرت معاویہؓ کے پاس جاتے آتے رہے، مگر کسی نے یزید کے فسق وفجور کے باب میں ایک لفظ بھی زبان سے نہیں کہا (اگر کہا ہو تو تاریخوں سے کوئی ایک حوالہ پیش کیا جائے)''۔

اس کے بعد کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ رجب ۶۰ھ میں حضرت معاویہؓ کے انتقال کے بعد یزید کے لیے بیعت کے وقت حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر-رضی اللہ عنہم-بھی یزید کے فسق وفجور کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے، اور ان دونوں بزرگوں کے علاوہ تمام اہل مدینہ-جن میں ابن عمر وابن عباس بھی شامل ہیں-یزید کی بیعت کر لیتے ہیں، اور کوئی ایک شخص بھی زبان پر نہیں لاتا کہ وہ تو شرابی کبابی اور فاسق وفاجر ہے، حتی کہ جن دو بزرگوں نے بیعت سے پرہیز کیا وہ بھی اس کا اشارہ تک نہیں کرتے کہ ہم اس کے فسق وفجور کی وجہ سے پرہیز کرتے ہیں۔

اس کے بعد حضرت ابن عمر وابن عباس کا حضرت حسین-رضی اللہ عنہم-کو نصیحت کرنے، کوفہ والوں کی طرف سے خطوط ووفود کے آنے کو ذکر کر کے لکھا ہے:

''آپ تاریخ کے ہزاروں صفحات پڑھ کر بھی اس طرح کا کوئی ایک لفظ تاریخ سے پیش نہیں کر سکتے۔

الحاصل حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مدینہ سے روانگی سے لے کر حادثۂ کربلا کے پیش آنے تک تاریخوں میں کوئی ایک شہادت بھی یزید کے فسق وفجور کی نہیں ملتی۔

اور ملنا ممکن بھی نہیں ہے، اس لیے کہ فاسق کو امیر وامام بنانا چاہے حرام نہ ہو، پھر بھی ہمارے اعتقاد میں جس عہد میمون کی یہ بات ہے اس وقت تک ملتِ اسلامیہ کا ضمیر اتنا مردہ نہیں ہوا تھا کہ مدینہ منورہ

کے غیور مسلمان اور تمام بلاد اسلام میں جو صحابہ منتشر تھے، اور انبوہ در انبوہ اکابر تابعین موجود تھے، وہ سب کے سب چپ چاپ ایک فاسق و فاجر اور شرابی کبابی کے ہاتھ پر بیعت کرلیں۔

ہماری حلق سے یہ بات کسی طرح نہیں اترتی کہ مدینہ کے جن حضرات نے ۶۳ھ میں یزید کا فاسق وفاجر ہی ہونا ظاہر کرکے بیعت کے بعد اس کی بیعت توڑ دی تھی، اور کسی قیمت پر بھی خلع بیعت سے رجوع کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے، تا آنکہ حرہ کا خونیں واقعہ پیش آیا؛ اگر بیعت کے وقت بھی یزید فاسق ہی تھا، تو اس وقت وہ کیسے راضی ہوگئے تھے''۔

پھر ابن اثیر و ابن کثیر کی تاریخوں سے وہ تاریخی روایات جن میں حضرت حسینؓ کا راستے سے اپنے ساتھیوں کو واپس کرنے، یا خود واپس جانے، یا یزید کے پاس جا کر اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدینے کی پیشکش کا تذکرہ ہے، نقل کرکے لکھتے ہیں:

''اب ان باتوں کو دھیان میں رکھ کر بتایئے کہ اگر یزید فاسق ہوتا اور حضرت حسینؓ یزید کے فسق وفجور کو مٹانے کے لیے نکلے ہوتے، تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو واپس کرادیتے، یا خود لوٹنے کا ارادہ کرسکتے تھے؟ یا یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کی آمادگی ظاہر کرسکتے تھے؟ یا یہ کہہ سکتے تھے کہ مجھے یزید کے پاس روانہ کردو؟''

اس کے بعد اس بحث کا خلاصہ ان الفاظ میں تحریر فرمایا ہے:

''اس طویل گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ اس وقت تک یزید کے فسق کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی، نہ اس کی شہادت ملتی کہ حضرت حسینؓ اس کے فسق کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کے لیے نکلے تھے؛ بلکہ جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے وہ اپنے کو یزید سے افضل، اور اس سے زیادہ اپنے کو مستحق خلافت سمجھتے تھے، اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ جہاں تک علم وفضل، شرفِ صحبت، وعلاقۂ ابنیتِ رسول اور تقویٰ وطہارت کا تعلق ہے، یزید آپ کی جوتیوں کے تسمہ کے برابر بھی نہیں تھا، اس لیے آپ اپنے مقابل میں اس کو حق دارِ خلافت نہیں سمجھتے تھے، اور اس کے بجائے اس بات کو ملت کے لیے بہتر سمجھتے تھے کہ خود اپنی امارت قائم کریں، اور چونکہ کوفیوں نے آپ کو یقین دلایا تھا کہ ایک لاکھ جنگجو آپ کی حمایت میں ہیں، اس لیے آپ کو پورا اطمینان تھا کہ کوفہ میں صحیح حکومت ضرور قائم ہوجائے گی، کوفیوں کے وعدوں پر آپ کو اتنا یقین تھا کہ ابتداءً جتنے خیرخواہوں نے آپ کو کوفہ جانے سے روکا، کسی کی بات آپ نے نہیں مانی؛ لیکن راستے میں مسلم کی شہادت کی خبر سن کر آپ کا یقین بدل گیا، آپ پر کوفیوں کا فریب کھل گیا، اور آپ نے علی وجہ البصیرۃ معلوم کرلیا کہ ان حالات میں صحیح امارت کا قیام ناممکن ہے، اس لیے واپسی کی سوچنے لگے، مگر مسلم کے بھائی واپسی پر راضی نہ ہوئے؛ جب آگے بڑھے اور دوبارہ آپ نے واپسی کا یا کسی دوسری طرف نکل جانے کا ارادہ کیا تو حُر نے جو اس وقت تک آپ کا مخالف تھا، نہ واپس ہونے دیا نہ

دوسری طرف جانے دیا''۔

سیدنا حضرت حسینؓ کے قتل سے یزید کی براءت:

اس کے بعد ایک عنوان ''قتل سیدنا حسینؓ کے جرم سے یزید کی براءت'' قائم کر کے اس کے تحت وہ تاریخی روایات نقل کی ہیں، جن میں حضرت حسینؓ کی شہادت کی اطلاع ملنے پر یزید کی آنکھوں میں آنسو آ جانا اور ابن زیاد پر لعنت کرنا مذکور ہے، اور اس قسم کی متعدد روایات نقل کرنے کے بعد تاریخ ابن کثیر (۲۳۶/۸) کے حوالے سے یہ عبارت نقل کی ہے:

''یزید کا مرنے سے پہلے آخری کلام یہ تھا: اَللّٰهُمَّ لا تُؤاخِذْني بِمَا لَمْ أُحِبَّه وأُرِدْهُ واحْكُمْ بَيني وبَينَ عبيدِ الله بنِ زيادٍ. یعنی اے اللہ! میں نے جس بات کو نہ پسند کیا نہ اس کو چاہا، تو اس کا مواخذہ مجھ سے نہ کر، اور میرے اور ابن زیاد کے درمیان تو حکم بن اور فیصلہ کر۔ یہ بات نہایت اہم اور بہت زیادہ توجہ کے قابل ہے، کوئی مسلمان مرنے کے وقت کیا جھوٹ بولے گا؟ اور وہ بھی اس احکم الحاکمین کو مخاطب کر کے جو سب کے ظاہر و باطن سے واقف اور عالم الغیب والشہادۃ ہے۔ اور اسی واقعے سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ قتل حسین کے علاوہ اور جو مظالم یزید کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، وہ بھی اس کے عمال کے کرتوت ہیں، جن سے خود وہ راضی نہیں تھا''۔

یزید نے قاتلینِ حسینؓ کو معزول نہیں کیا:

اس کے بعد ایک عنوان ''یزید نے قاتلینِ حسینؓ کو معزول نہیں کیا'' کے تحت ابتداءً لکھا ہے:

''ہاں! یہ بالکل صحیح ہے کہ اس نے قاتلینِ حسینؓ کو کوئی سزا نہیں دی، نہ ان عمال و امراء کو معزول کیا، جن سے یہ ناروا حرکت اور شدید ترین شرعی جرم سرزد ہوا، بلکہ زبانی یا تحریری طور پر ان کو اس پر ملامت کرنا بھی ثابت نہیں، بے شک یہ سارے الزامات صحیح ہیں؛ لیکن یہ بات بھی دھیان میں رکھنی چاہئے کہ یزید اس وقت تک جس طرح کوئی فاسق مجاہر نہیں تھا، اسی طرح کوئی ولی، کوئی ممتاز صالح و متقی، کوئی بڑا پاکباز متشرع بھی نہیں تھا، اسی کے ساتھ امارت و حکومت کو کسی طرح ہاتھ سے دینے کے لیے تیار نہ تھا، اس لیے اس سے یہ توقع کہ حضرت حسینؓ کے واقعہ کے بعد شریعت و مذہب کے تقاضوں کو پورا کرے گا، ایک بے محل توقع ہے''۔

اس کے بعد تحریر فرمایا ہے:

''پھر اس طرح کے واقعاتِ قتل کو عام واقعات پر قیاس کرنا حقائق سے چشم پوشی ہے، اہلِ علم جانتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کا واقعۂ قتل حضرت حسینؓ کے واقعہ سے کہیں بڑھ کر تھا، اور حضرت علیؓ کو اقرار تھا کہ وہ ظلماً شہید کیے گئے، مگر انھوں نے سریر آرائے خلافت ہونے کے بعد نہ قاتلینِ عثمانؓ کو سزا دی،

نہ ان کو اپنی جماعت سے الگ کیا، بلکہ سب سے پہلے جس شخص نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی وہ بلوائیوں کا سرغنہ تھا، اور وہ ہمیشہ آپ کے ساتھ رہا، اور اسی قصاص عثمانؓ کے مطالبہ کی بنیاد پر جنگ جمل اور صفین میں خون کی ندیاں بہہ گئیں، کتنے اکابر صحابہؓ نے جام شہادت نوش کیا، مگر حضرت علیؓ نے قصاص کا مطالبہ پورا نہیں کیا؛ اس لیے نہیں کہ احکامِ شرع کے اجراء میں وہ کوتاہی کرنا چاہتے تھے، وہ رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی تھے، وہ خلیفہ راشد تھے، وہ امامِ ربانی تھے، وہ اپنے دور کے سرتاجِ اتقیا تھے، ان کی نسبت اس کا تصور بھی جائز نہیں۔ پھر آپ نے قصاص کیوں نہیں لیا، اور جن کے ہاتھ عثمانؓ کے خون سے رنگین تھے ان کو کیوں الگ نہیں کیا؟ صرف اس لیے کہ آپ کے خیال میں حالات سازگار نہیں تھے، ایسا کرنے سے ملتِ اسلامی کے شیرازہ کے بکھر جانے کا سخت اندیشہ تھا، اور اس رخنہ کو بند کرنے سے دوسرے بہت سے رخنوں کے پیدا ہو جانے کا بڑا ڈر تھا''۔

اس کے بعد یہ لکھ کر کہ بعید نہیں کہ اسی قسم کے سیاسی مصالح یزید کے بھی پیش نظر رہے ہوں، اور اگرچہ یزید کو حضرت علیؓ سے وہ نسبت بھی نہیں جو ذرے کو آفتاب سے ہوتی ہے، لیکن ایک مسلمان کے قول وفعل کو کسی اچھے محمل پر حمل کرنا چاہئے، لکھا ہے:

''میں سمجھتا ہوں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خاندان والوں کے پیش نظر بھی مذکورہ بالا اسبابِ تکاسل تھے، جو اُن کی نگاہ میں اس کو معذور ثابت کرتے تھے، اسی لیے ان حضرات کو یزید سے کوئی تنفر نہیں تھا، برابر ان کی آمد و رفت یزید کے یہاں جاری تھی، بغیر کسی کھچاوٹ کے اس کے مہمان ہوتے تھے، اور بلا کسی تکدر کے اس کے انعامات قبول فرماتے تھے''۔

اس کے بعد تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت محمد ابن الحنفیہ اور حضرت عبداللہ بن جعفرؓ یزید کے پاس جاتے اور اقامت کرتے تھے، اور ابن کثیر (۲۳۰/۸) کے حوالے سے لکھا ہے:

''عبداللہ بن جعفر یزید کے پاس گئے، تو اس نے دس لاکھ درہم ان کو دیے، اس دریا دلی پر عبداللہ ابن جعفر نے جن الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا ہے، آج اگر کوئی وہ الفاظ بولے تو نہ معلوم اس پر کیا فتویٰ لگ جائے گا، انھوں نے فرمایا: بأبي أنت وأمي (میرا باپ اور میری ماں تم پر قربان)۔ اس کے بعد اس نے پھر ایک لاکھ دیے، تو عبداللہ نے فرمایا کہ خدا کی قسم تیرے بعد کسی دوسرے کے حق میں یہ فقرہ (بأبي أنت وأمي) استعمال نہ کروں گا''۔

حادثۂ کربلا کے بعد:

اس کے بعد کا عنوان ہے ''حادثۂ کربلا کے بعد''۔ اور اس کے ماتحت جو مذکور ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ محرم ۶۱ھ تک یعنی واقعۂ کربلا تک یزید کے فسق وفجور کا ذکر تاریخوں میں نہیں ملتا، پہلی دفعہ اس کا ذکر اس

واقعے کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے ایک خطبے میں ملتا ہے، اس میں یزید کے نام کی تصریح تو نہیں ہے، لیکن راوی کا بیان ہے کہ یہ یزید پر تعریض تھی۔ اس لیے اس سے یزید کے فسق کا ثبوت نہیں فراہم ہوتا۔

اور دوسری مرتبہ اس کے فسق و فجور کا ذکر اس وقت ملتا ہے، جب مدینہ سے شام جانے والا وفد - جس میں عبداللہ بن مطیع وغیرہ بھی شامل تھے - واپس آیا ہے اور یہ کہہ کر کہ یزید شرابی ہے، بدمست رہتا ہے، اور بدمستی میں نماز بھی ترک کر دیتا ہے، اس کی بیعت توڑ دی، اور لوگوں کو بھی خلعِ بیعت پر آمادہ کیا۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ کی عبارت حسب ذیل ہے:

''لیکن تاریخوں میں جہاں یہ مذکور ہے، وہیں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت محمد ابن الحنفیہ نے نہایت سختی سے اس کی تردید کی، اور کوئی شبہہ نہیں کہ ابن الحنفیہ نے اس وقت جو کچھ فرمایا تھا، کوئی ذمہ دار عالمِ شریعت اس کے سوا دوسری بات نہیں کہہ سکتا تھا، ان کا وہ ارشاد آج بھی اس معاملہ میں افراط سے کام لینے والوں کے لیے سرمایۂ عبرت و ہدایت ہے''۔

اس کے بعد تاریخ ابن کثیر سے حضرت محمد ابن الحنفیہ اور عبداللہ بن مطیع کی گفتگو نقل کی ہے، جس میں ابن الحنفیہ نے اس کے فسق و فجور کی تردید کی ہے، اس گفتگو کو نقل کرنے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''یہاں پہنچ کر ایک بار پھر ہم اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارا مقصد ہرگز ہرگز یزید کو ولی، یا خلیفۂ راشد، یا امام و مقتدیٰ ثابت کرنا نہیں ہے؛ نہ ہم اس کو زمرۂ ابرار و اتقیاءِ مسلمین میں شمار کرنے کو کہتے نہ شمار کرتے ہیں، اور نہ ہم اس کے ساتھ ایسی حسنِ عقیدت رکھنے کی دعوت دیتے ہیں، جو عقیدت خلفاءِ راشدین، ائمۂ دین، بزرگانِ اسلام، صالحین و متقین، یا متشرع و عادل بادشاہوں کے ساتھ رکھی جاتی ہے۔

ہمارا مقصد تو صرف اتنا ہے - اس سے زیادہ کچھ نہیں - کہ سُنی ہونے اور مسلکِ اہلِ حق پر اپنے کو قائم ثابت کرنے کے لیے یزید کے فسق و فجور کا اعتقاد رکھنا ضروری نہیں ہے، نہ یہ بات عقائدِ اہلِ سنت میں داخل ہے۔

نیز یہ کہ یزید جمہور اہلِ سنت کی تصریح کے بموجب مسلمان تھا، اور کسی مسلمان کو فسق و فجور کے ساتھ متصف ماننے اور ثابت کرنے کے لیے شرعی اصول سے ضروری ہے کہ اس کے فسق و فجور کی چشم دید شہادتیں موجود ہوں''۔

تواتر کی حقیقت:

اس عنوان کے ماتحت اس خیال کا رد کیا ہے کہ یزید کی بداعمالیوں کی شہرت حدِ تواتر تک پہنچی ہوئی ہے، چنانچہ لکھا ہے:

''ہر افواہ جو پھیل جائے، اس کو خبر متواتر کہنا تواتر کی سخت توہین ہے، تواتر کے لیے جہاں اور شرطیں ہیں، اس کی ایک ضروری شرط یہ ہے کہ اگر خبر کا تعلق دیکھنے کی چیز سے ہو، تو ضروری ہے کہ اس کا مستند انتہا مشاہدہ ہو، ورنہ وہ متواتر نہیں ہو سکتی''۔

پھر چند سطروں کے بعد لکھا ہے:

''واقعہ تو یہ ہے کہ آنکھ سے دیکھ کر کہنے والا ایک شخص بھی نہیں ہے، چہ جائیکہ جم غفیر، اور دعویٰ کر دیا جاتا ہے تواتر کا؛ حالانکہ اس صورت سے تواتر تو در کنار شرعی اصول سے بداعمالیوں کا مطلقاً ثبوت نہیں ہوتا، ایسی صورت میں یزید پر شرعی اصول سے فاسق ہونے کا حکم کیسے لگے گا''۔

اس کے بعد شرح فقہ اکبر کے حوالے سے امام غزالی کا یہ قول نقل کیا ہے: **''لا یجوزُ نِسبةُ مُسلمٍ إلی کبیرةٍ مِنْ غَیرِ تحقیقٍ''**. پھر امام غزالی کے شاگرد اور قاضی عیاض کے استاد قاضی ابوبکر ابن العربی کی **العواصم من القواصم** سے کئی عبارتیں نقل کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں بھی یزید کا فسق محتاج دلیل ہے، یا ثابت نہیں ہے۔ متعدد عبارتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ:

''صفحہ ۲۳۳ میں امام احمد کی کتاب الزہد کے حوالے سے یہ دکھا کر کہ امام احمد نے یزید کے خطبہ کا ایک جزو بھی اس کتاب میں نقل کیا ہے فرماتے ہیں کہ اب ایک طرف امام احمد کا برتاؤ یزید کے ساتھ دیکھو کہ جس کتاب میں زہادِ صحابہ وتابعین کے اقوالِ موعظت لکھے ہیں، اس میں یزید کا قول بھی نقل کرتے ہیں؛ دوسری طرف مورخین کا برتاؤ دیکھو کہ وہ شراب خواری اور مختلف قسم کی بدکاریوں کی نسبت اس کی طرف کرتے ہیں''۔

یزید کے فسق کو ثابت کرنے کے لیے ایک حدیث نقل کی جاتی ہے کہ ''میری امت کا امر عدل کے ساتھ قائم رہے گا، یہاں تک کہ پہلا شخص جو اس میں رخنہ ڈالے گا بنی امیہ میں سے ہوگا، جسے یزید کہا جائے گا''۔

علامہ اعظمیؒ نے فرمایا ہے کہ سند کے لحاظ سے یہ حدیث لائق استناد واعتماد نہیں ہے، بلکہ منقطع یا مُعضَل ہے؛ نیز اس میں ایک راوی مدلّس ہے۔

دوسرے یہ کہ اسی جیسی ایک دوسری حدیث سے اس کا دفعیہ بھی ہو جائے گا، جس میں یہ مذکور ہے کہ یزید نے حدیث سن کر ابوذر سے پوچھا کہ وہ شخص میں تو نہیں ہوں؟ انھوں نے فرمایا کہ نہیں۔

پھر اس پر بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے کہ بنوامیہ میں ایک یہی یزید پیدا نہیں ہوا، صرف خلفا ہی کو لے لیا جائے تو ان میں ایک یزید بن عبدالملک بھی ہے۔

اور حدیث میں جس یزید کا ذکر ہے اس کی ولدیت اس میں مذکور نہیں ہے، لہٰذا اس یزید کو یزید بن معاویہ قرار دینا حدیث کا مضمون نہیں ہے، بلکہ ان علماء کا فہم ہے۔

اور آخر میں لکھا ہے:

''ان وجوہ سے اس حدیث کی بنا پر یزید بن معاویہ کے فسق کا جزم کر لینا کسی طرح صحیح نہیں، بالخصوص جبکہ ملاعلی قاری نے موضوعات کبیر (ص۲۰۹) میں یہ لکھ دیا ہے کہ یزید اور ولید اور مروان کی مذمت کی حدیثیں سب کی سب جھوٹ ہیں''۔

آگے لکھا ہے:

''یہی وجہ ہے کہ ابن تیمیہ جیسے وسیع النظر محقق نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ یزید کا فاسق وظالم ہونا محتاج ثبوت ہے''۔

لعن یزید کا حکم:

یزید کے فسق کی بحث بہت دراز ہے، اور اس کے درمیان ہی میں یزید پر لعنت کے مسئلے کو بھی اٹھایا ہے، اور ایک عنوان ''لعنِ یزید کا حکم'' قائم کر کے اس کے تحت یزید پر لعنت کے جواز اور عدم جواز کے سلسلے میں تفصیلی گفتگو کی ہے، اس عنوان کے تحت سب سے پہلے لکھا ہے:

''علماء اہل سنت کی تصریحات کے مطابق کسی معین شخص کو لعنت کرنا -خواہ وہ فاسق مسلمان ہو، یا زندہ کافر، یا مردہ کافر جس کا کفر پر مرنا معلوم نہ ہو- جائز نہیں ہے؛ ہاں جس کافر کا کفر پر مرنا معلوم ہو، جیسے فرعون، یا ابوجہل وابولہب، اس پر لعنت جائز ہے''۔

پھر اگلی سطروں میں لکھا ہے:

''اس اصول کے ماتحت یزید پر لعنت کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں نکل سکتی، اس لیے کہ اولاً تو وہ مسلمان تھا، امام غزالی نے فرمایا ہے: **صحَّ إسلامُه**، اور ملاعلی نے لکھا ہے: **إنَّ إيمانَ يزيدَ محقَّق** (شرح فقہ اکبر)۔ لہذا اب اگر وہ فاسق بھی ہو تو فاسق پر لعنت جائز نہیں؛ اور اگر بالفرض کفرض المحال وہ کافر ہو، تو چونکہ اس کا کفر پر مرنا معلوم نہیں، اس لیے بھی اس پر لعنت جائز نہیں ہو سکتی''۔

اس کے بعد حافظ ابن حجر ہیتمی کی 'صواعق محرقہ' اور امام یافعی کی 'مرآۃ الجنان' سے متعدد لمبی لمبی عبارتیں نقل کی ہیں، جن میں امام غزالی، حافظ ابوعمرو ابن الصلاح، امام یافعی اور دیگر اہل علم کے فتوے یزید پر لعنت کے عدمِ جواز کے سلسلے میں مذکور ہیں۔

پھر اس عدمِ جواز کے متعلق 'منہاج السنۃ' اور 'منتقی' سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا کلام بھی نقل کیا ہے، ان کے کلام کا آخری حصہ یہ ہے:

''پھر اس بات کو بھی نظر میں رکھنا چاہئے کہ جو بات موجبِ عذاب ہوتی ہے، وہ کبھی کسی راجح معارض کی وجہ سے مرتفع بھی ہو جاتی ہے، مثلاً گناہوں کو محو کرنے والی نیکیاں اور وہ مصیبتیں جو کفارۂ سیئات بنتی ہیں، ارشاد خداوندی ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ﴾

اورحدیث صحیح میں وارد ہوا ہے کہ پہلا لشکر جو قسطنطنیہ میں جنگ کرے گا، اس کی مغفرت کردی گئی ہے، اور جس لشکر نے سب سے پہلے قسطنطنیہ پر چڑھائی کی اس کا امیر یزید تھا''۔

اس کے بعد ابن حجر ہیتمی کے فتاویٰ حدیثیہ سے لعن کے عدم جواز کے سلسلے میں ایک عبارت نقل کر کے اس کی روشنی میں درج ذیل نکات تحریر فرمائے ہیں:

۱-یزید پر لعنت جائز نہیں۔

۲-جن لوگوں نے تسامح کر کے جائز کہہ دیا ہے، وہ کسی شمار میں نہیں ہیں، نہ احکامِ شرعیہ میں ان کے قول کا کوئی اعتبار ہے۔

۳-بعض تاریخوں میں یزید کی طرف قتلِ حسینؓ کی، یا حکم دینے کی، یا راضی ہونے کی نسبت جو کردی گئی ہے، اس سے حجت قائم نہیں ہوتی اوران باتوں کی نسبت یزید کی طرف جائز نہیں ہے۔

۴-اورسب سے آخر میں یہ لکھ کر کہ کسی مسلمان کی طرف بلاتحقیق کسی کبیرہ کی نسبت جائز نہیں ہے، یہ بھی ظاہر کردیا کہ یزید کی طرف شراب خواری وغیرہ کی جو نسبت کی جاتی ہے، چونکہ وہ بھی انھیں تاریخوں میں بلاتحقیق مذکور ہے، اس لیے ان باتوں کی نسبت بھی اس کی طرف جائز نہیں ہے۔

دندانِ حضرت حسینؓ کے ساتھ گستاخی کی بحث:

آگے ایک عنوان یہ ہے: ''دندانِ شہیدِ کربلا کے ساتھ گستاخی کس نے کی''؟ اوراس کے ماتحت لکھا ہے کہ دراصل یہ ملعون حرکت ابن زیاد نے کی تھی، یہی روایت صحیح ہے اوراس کو امام بخاری واحمد وغیرہما نے بسند متصل روایت کیا، اس روایت میں یہ ہے کہ ابن زیاد کو حضرت انسؓ نے ٹوکا تھا، اوردوسری روایت میں یہ ہے کہ ابن زیاد کو حضرت زید بن ارقمؓ نے ٹوکا تھا۔ متصل السند اورصحیح روایتوں میں یہی ہے۔

باقی جن روایتوں میں یہ آتا ہے کہ دندانِ مبارک کے ساتھ یزید نے گستاخی کی، وہ یا تو شیعہ اور رافضی راویوں کے ذریعے روایت کی گئی ہیں، یا ایسی سندوں سے جو منقطع ہیں اوران کے راوی مجہول ہیں۔ علامہ اعظمیؒ نے اس سلسلے میں علامہ ابن تیمیہؒ کی منہاج السنہ (۴/۱۷۷) کی ایک عبارت نقل کی ہے اوراس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''حضرت حسینؓ کا سر ابن زیاد کے پاس لے جایا گیا اوراسی نے آپ کے دانتوں کے ساتھ چھڑی سے گستاخی کی، یہی بات صحیح (بخاری) سے ثابت ہے اور یزید کے پاس سر مبارک کے لے جانے کی روایت باطل ہے اوراس کی اسناد منقطع ہے''۔

اورابن تیمیہ کے علاوہ حافظ ابن کثیر نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے کہ سر مبارک شام نہیں لے جایا گیا۔

قاری صاحب نے اپنی کتاب میں صفحہ ۱۴۰ پر لکھا تھا کہ فسقِ یزید کا مسئلہ ایک ''منصوص مسئلہ ہے، جس کی

بنیادیں کتاب وسنت میں موجود ہیں، گو درجۂ اجمال میں ہیں''۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کا بہت سخت الفاظ میں رد کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اگر منصوص مسئلہ کی تعریف یہ ہے کہ 'اس کی بنیادیں کتاب وسنت میں موجود ہوں، گو درجۂ اجمال میں ہوں' تو کیا اجتہادی مسئلہ اُس کو کہتے ہیں جس کی کوئی بنیاد کتاب وسنت میں اجمال کے درجہ میں بھی نہ ہو؟ اگر اجتہادی مسئلہ کی یہی تعریف ہے، تو اجتہادی مسئلہ اور بدعت میں کیا فرق رہ گیا؟ اور جب کوئی فرق نہیں رہ گیا، تو کیا جملہ مسائل اجتہادیہ بدعت ہیں''؟

''نیز جب منصوص کی تعریف یہ ہوئی کہ 'جس کی بنیادیں کتاب وسنت میں ہوں ولو اجمالاً' تو اس تعریف کی بنیاد پر کون سا مسئلہ ہے، جو منصوص نہیں ہے؟ ذرا کسی مسئلہ کو مثال میں پیش کر کے سمجھانے کی زحمت گوارا فرمائیے''۔

اس کے بعد تحریر فرمایا ہے:

''یزید کے فسق کو منصوص مسئلہ بتا کر مہتمم صاحب نے اتنی بڑی غلطی کی ہے، جس کی تلافی ممکن نہیں ہے؛ اس لیے کہ اس سے لازم آتا ہے کہ صحابہؓ کے ایک جم غفیر نے ایک منصوص مسئلہ کو ٹھکرا دیا۔ حضرت معاویہؓ نے اس منصوص فاسق کو ولی عہد بنایا، لوگوں کو ترغیب دے کر اس کی ولی عہدی کی بیعت لی، اور تمام صحابہؓ نے حضرت معاویہؓ کے ولی عہد کی حیثیت سے اس منصوص فاسق کی بیعت کر لی''۔

اس کے چند سطروں کے بعد لکھا ہے:

''ایسے منصوص فاسق کو حضرت معاویہؓ نے ولی عہد بنانے کا اقدام کیسے کیا؟ اچھا! انھوں نے کیا تھا، تو سب صحابہؓ نے ولی عہدی کی تحریک کے وقت ہی اس فاسق کا پتہ کیوں نہیں کاٹ دیا؟ سب نے اس کے منصوص فاسق ہونے اور اس کے ہاتھوں خلافت کی بربادی وغیرہ کی حدیثیں حضرت معاویہؓ کے سامنے کیوں نہیں رکھیں؟ حضرت معاویہؓ اولاً تو صحابی رسول تھے، دوسرے وہ بے مثال ولاثانی حلیم وبردبار تھے، حدیث کے آگے وہ یقیناً سر تسلیم خم کر دیتے، اور اگر بفرض محال یہ نہ بھی کرتے، تو کم از کم ان سے کسی سخت گیری اور فتنہ کا اندیشہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا''۔

علامہ اعظمیؒ نے اس ضمن میں قاری طیب صاحبؒ کی متعدد عبارتیں نقل کر کے اس کا رد کیا ہے، اسی ضمن میں لکھا ہے:

''ابن عمرؓ جیسے متبع سنت اور جلیل القدر صحابی نے یزید کے فاسق ہونے کا عقیدہ رکھنے کے بجائے اس کے اچھے اور بہتر ہونے کا احتمال بیان کیا، تاریخ الخلفا (ص ۱۳۴) وابن کثیر میں ہے کہ جب یزید کی بیعت کر لی گئی، تو ابن عمرؓ نے فرمایا: إنْ كانَ خَيراً رَضِينا، وإنْ كانَ بَلاءً صَبَرْنا (اگر یزید اچھا ہوگا تو ہم اس سے راضی رہیں گے، اور اگر وہ بلا ہوگا تو ہم صبر سے کام لیں گے)۔ کوئی انصاف سے

بتائے کہ نص نبوی سے یزید کے فاسق ثابت ہونے کے بعد اس کے بھلے ہونے کا کوئی بھی امکان ہے؟''

اس کے بعد اس پر اصولی حیثیت سے نگاہ ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''اگر اسی طرح کی پیشین گوئیوں کی بنا پر جن میں یزید کے نام کی تصریح نہیں ہے، آپ یہ قرار دے رہے ہیں کہ یزید کا فسق منصوص ہے، تو آپ کے اصول سے بارہ خلفاء والی حدیث میں یزید کا خلیفہ برحق ہونا، اپنے مخالفین پر اس کا منصور و مظفر ہونا، اس کے زمانہ میں خلافت کا باعزت ہونا، اور دینِ اسلام کا قائم ہونا بھی منصوص ہے۔

یہ ہم نہیں کہتے، بلکہ آپ کے اصول سے یہ لازم آتا ہے؛ اور اگر ہم سے پوچھئے تو جس چیز کو ہمارے علماء منصوص نہیں کہتے، ہم بھی اس کو منصوص نہیں کہتے، اور ہمارے علم میں علماء کسی ایسی چیز کو منصوص نہیں کہتے، جو اس طرح ثابت ہوتی ہو کہ اس کا ایک مقدمہ تو حدیث میں مذکور ہو، اور دوسرا مقدمہ خارج سے ملایا جائے، بلکہ ایسی چیز کی نسبت علما صرف اتنا کہتے ہیں کہ ہماری دانست میں فلاں حدیث میں فلاں بات یا فلاں شخص کی طرف اشارہ ہے۔

مثلاً قبیلۂ ثقیف میں ایک کذاب اور ایک مُبیر پیدا ہونے کی پیشین گوئی حدیث میں وارد ہوئی ہے، اور عام محدثین یہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کا مصداق مختار ثقفی اور حجاج ہے، مگر کوئی یہ نہیں کہتا کہ مختار کا کذاب ہونا، اور حجاج کا مبیر الامۃ ہونا منصوص ہے، چنانچہ امام ترمذی فرماتے ہیں: **یقال: الكذاب المختار بن أبي عبيد، والمبير الحجاج بن يوسف** (یعنی کہا جاتا ہے کہ کذاب مختار ہے اور مبیر حجاج ہے)''۔

اور آگے لکھا ہے:

''مہتمم صاحب ٹھنڈے دل سے یہ بھی ذرا سوچیں کہ اگر یزید کا فسق منصوص ہوتا، تو امام غزالی لعنِ یزید سے منع کرتے ہوئے یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ کسی مسلمان کو بے تحقیق فاسق کہنا جائز نہیں۔ اور ابن العربی جیسا حافظ حدیث یہ کیسے لکھ سکتا تھا کہ اس کا فسق کہاں سے معلوم ہوا؟ اور ابن تیمیہ جیسا متبحر محدث یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ جوازِ لعن یزید کے لیے اس کے ثبوتِ فسق کی ضرورت ہے''۔

یزید کے لیے دعاء رحمت:

اس بحث کے آخر میں ایک عنوان ''یزید کے لیے دعاء رحمت کا جواز'' قائم کر کے نہایت جامعیت کے ساتھ اس پر دو صفحات تحریر فرمائے ہیں، ہم اس کو بتمامہ نقل کرتے ہیں:

''اس بحث کے خاتمہ پر یہ بات جان لینا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ یزید پر لعنت کے مسئلہ کو تو

آپ نے دیکھ لیا کہ وہ مختلف فیہ ہے، بعض لوگ اس کو جائز کہتے ہیں، اور جمہور اہل سنت لعنِ یزید کو جائز نہیں کہتے؛ مگر دعائے رحمت کے جواز میں ہم کو کوئی اختلاف نہیں ملا۔ یعنی اس کی تصریح تو ملتی ہے کہ اس کے لیے دعائے رحمت جائز ہے، مگر کسی عالم کا یہ قول نہیں ملتا کہ اس کے لیے دعائے رحمت جائز نہیں ہے، حتیٰ کہ جن لوگوں کے اصول سے لعن یزید جائز ہے، ابن تیمیہ کے بیان کے بموجب ان کے اصول سے بھی اس کے لیے دعائے رحمت جائز ہے، اس لیے کہ وہ لوگ معیَّن فاسق پر لعنت کو جائز قرار دیتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ اس معیَّن فاسق کی نمازِ جنازہ بھی ہم پڑھیں گے، اور نماز جنازہ کا مقصد میّت کے لیے دعائے مغفرت ورحمت کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اس لیے ان حضرات کے اس قول کا صاف مطلب یہ ہوا کہ ہم معیَّن فاسق کے لیے دعائے مغفرت ورحمت کریں گے۔

اور واقعہ یہ ہے جس کا انکار ممکن نہیں ہے کہ یزید کی نمازِ جنازہ مسلمانوں نے پڑھی، اس نماز میں اس کا لڑکا معاویہ بن یزید امام تھا، جس کی نسبت مورخین متفق اللفظ ہیں کہ وہ بڑا نیک اور عبادت گزار تھا؛ اس کے علاوہ اس کے جیسے بلکہ اس سے بہتر بہت سے لوگ شریکِ جنازہ ہوں گے، ورنہ کم از کم اتنا تو یقینی ہے کہ کسی صحابی یا کسی عالم یا کسی تابعی کو یزید کی نماز جنازہ پڑھنے پر۔ یعنی اس کے لیے دعائے رحمت ومغفرت پر۔ اعتراض نہیں ہوا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ موتِ یزید کے وقت جو حضرات اہلِ علم موجود تھے، ان کے نزدیک یزید کے لیے دعائے رحمت ناجائز نہیں تھی۔

اس کے بعد سنئے کہ حجۃ الاسلام امام غزالی نے یزید کے لیے دعائے رحمت کو نہ صرف جائز بلکہ صراحۃً مستحب قرار دیا ہے، **وأما التَّرحُّمُ عَلَيهِ فَجَائزٌ بلْ مُستحَبٌّ** (مرآۃ الجنان ۱۷۶/۳)۔

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ مجتہد مطلق، خلیفۂ راشد، امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز، یزید کے حق میں دعائے رحمت کرتے تھے، حافظ ابن حجر نے 'لسان المیز ان' میں ابراہیم بن ابی عبد (ابن ابی عبلہ) کا قول نقل کیا ہے کہ **سمعتُ عمرَ بن عبد العزيزِ يَترحَّمُ على يزيدَ بنِ معاويةَ** (میں نے عمر ابن عبدالعزیز کو یزید کے حق میں دعائے رحمت کرتے خود سنا ہے)۔

حیرت ہے کہ یزید کے باب میں غلو کرنے والے لوگ عمر بن عبدالعزیز کے اس اثر کو اچھالتے پھرتے ہیں کہ انھوں نے ایک شخص کو صرف اس بنا پر بیس کوڑے مارے کہ اس نے یزید کو امیر المومنین کہہ دیا تھا، اور اسی اثر کے ساتھ ساتھ 'لسان المیز ان' میں یہ اثر مذکور ہے کہ عمر بن عبدالعزیز، یزید کے لیے دعائے رحمت کرتے تھے؛ تو اس کا کوئی نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا۔

حالانکہ کوڑے مارنے کی روایت بہت زیادہ محل نظر اور محتاج تحقیق ہے، اس لیے کہ ابن کثیر نے ابراہیم بن میسرہ کا قول نقل کیا ہے: **ما رأيتُ عمرَ بنَ عبدِ العزيزِ ضرَبَ إنساناً قط إلا إنساناً شَتَمَ مُعاويةَ، فإنَّه ضَرَبَه أسْوَاطاً** [۱۳۹/۸] (یعنی میں نے عمر بن عبدالعزیز کو کبھی بھی کسی

انسان کو مارتے نہیں دیکھا، بجز اس کے کہ ایک شخص نے حضرت معاویہؓ کے حق میں بدگوئی کی تھی، تو عمر نے اس کو چند کوڑے مارے تھے)۔

یہ روایت اُس روایت کو بالکل مشکوک بنا دیتی ہے جس میں یزید کو امیر المومنین کہنے پر کوڑے مارنے کا ذکر ہے۔ اس لیے کہ اس دوسری روایت میں ایک دفعہ کے سوا کوڑے مارنے کی قطعاً نفی کی گئی ہے، چنانچہ یہ اثر تاریخ الخلفا میں بھی مذکور ہے اور اس میں یہ تصریح ہے کہ سوائے ایک شخص کے جس نے معاویہؓ کو برا کہا تھا، انھوں نے کسی کو نہیں مارا (ص ۱۶۰)''۔

اور آخر میں ''غزوۂ قسطنطنیہ کی بشارت اور یزید'' کے عنوان کے ماتحت أولُ جَيْشٍ مِنْ أُمَّتي يَغْزُوْنَ مَدينةَ قَيصَرَ مَغفورٌ لَّهُمْ (میری امت کا سب سے پہلا لشکر جو قیصر کے شہر-قسطنطنیہ- میں جہاد کرے گا، اس کی مغفرت کر دی گئی ہے) والی حدیث پر بحث ہے، اور یزید کا اس حدیث کے مصداق ہونے پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں، ان کا جواب دیا ہے۔ سب سے پہلے علامہ اعظمیؒ نے اس کے ضمن میں لکھا ہے:

''تاریخوں سے تحقیقی طور پر ثابت ہے کہ مجاہدینِ اسلام کا پہلا لشکر جس نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا، اس کا سپہ سالار یزید تھا؛ لہذا اس نبوی بشارت کی رُو سے وہ بھی مغفور لہ قرار پاتا ہے''۔

علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے اندر مغفرت کی بشارت مطلق ہے، اور جب تک کوئی دوسری آیت یا حدیث اس کے مقید یا مشروط ہونے پر دلالت نہ کرے، اس کو مقید کرنا لَقَدْ تَحَجَّرْتَ وَاسِعاً کا مصداق ہے۔

اس مسئلے میں علامہ اعظمیؒ کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک گناہ تو کفر وارتداد ہے، لہذا کوئی مستحق بشارت اگر کافر و مرتد ہو جائے گا، تو اس کے حق میں وہ بشارت کام نہ آئے گی، بلکہ وہ سوخت ہو جائے گی۔ شرک وارتداد کے علاوہ اور جتنے گناہ ہیں، وہ سابق نیکیوں کے مُحبِط (سوخت کرنے والے) نہیں ہیں؛ نیز ان سب کی نسبت ارشاد خداوندی ہے: وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (اور اللہ تعالیٰ شرک کے علاوہ ہر گناہ بخش دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے)۔ اس کے بعد لکھا ہے:

''لہذا اگر کسی نیکی پر مغفرت کی مطلق بشارت ہو اور اس نیکی کے بعد کسی گناہ کبیرہ کا صدور بھی مستحق بشارت سے ہوا ہو، تو شرعاً اس میں کوئی استحالہ یا استبعاد نہیں ہے کہ حق تعالیٰ اس گناہ کبیرہ سے درگذر فرما کر اس مستحق بشارت کی مغفرت فرما دے کہ خود اسی کا ارشاد ہے: وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ''۔

اس کے بعد شرح فقہ اکبر سے ایسی عبارتیں نقل کی ہیں، جن میں مصرح ہے کہ شرک وکفر کے علاوہ جو گناہ بھی ہیں بلا توبہ ان کی مغفرت ہو سکتی ہے۔

کچھ لوگوں نے یزید کے غزوۂ قسطنطنیہ میں شریک ہونے کو مشکوک قرار دیا ہے، یا اگر اس کی شرکت کو تسلیم کیا ہے، تو اس کے امیر ہونے کا انکار کیا ہے، اس کو قاری صاحب نے اپنی کتاب میں بہت زور لگا کر نقل کیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کی امارت کے ثبوت میں متعدد تاریخی روایات اور اقوال علما نقل کیے ہیں، از اں جملہ حافظ ابن حجر کا یہ قول بھی ہے کہ: فإنّه كانَ أميرَ ذلكَ الجَيشِ بالاتفاقِ (یزید بالاتفاق اس لشکر کا امیر تھا)۔

اور لکھا ہے کہ ابن کثیر نے متعدد مقام پر اس کا شریک غزوہ ہونا، اور ایک مقام (۲۲۹/۸) پر بصراحت اس کا امیر الجیش ہونا لکھا ہے۔

علامہ اعظمی نے آگے لکھا ہے کہ اس میں یزید کے امیر ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ بیان صرف مورخین ہی کا نہیں ہے، بلکہ حدیث کی مستند کتابوں میں بھی یہ مروی ہے، اور اس سلسلے میں ابن کثیر ہی سے مسند احمد کی دو روایتیں نقل کی ہیں، حافظ ابن عبد البر کی استیعاب سے ایک عبارت نقل کی ہے، اسی طرح امام بخاری کی تاریخ صغیر سے بھی ایک روایت پیش کر کے اس سے یزید کے امیر غزوہ ہونے پر استدلال کیا ہے، اور ان سب کے آخر میں یہ لکھا ہے:

''اور ان سب شہادتوں سے اونچی اور واجب القبول شہادت حضرت محمود بن الربیع (صحابی) کی شہادت ہے، جس کو امام بخاری نے اصح الکتب بعد کتاب اللہ میں اپنی متصل سند سے ذکر کیا ہے، حضرت محمود فرماتے ہیں: فَحَدَّثْتُهَا قَوْماً فِيهِمْ أَبُو أيوبَ صاحِبُ رَسولِ اللهِ ﷺ في غَزْوَتِه الَّتِي تُوُفِّيَ فِيهَا وَيَزِيدُ بنُ مُعاوِيَةَ عَلَيْهِمْ بِأَرْضِ الرُّوم (صحیح بخاری بر ہامش فتح الباری ج۳ ص۴۰) یعنی میں نے یہ حدیث ایک قوم سے بیان کی، جس میں حضرت ابوایوب انصاریؓ صحابی رسول بھی تھے، اس غزوہ کے موقع پر جس میں ان کی وفات ہوئی، اس حال میں کہ یزید بن معاویہؒ ان کا امیر تھا سرزمین روم میں''۔

اس روایت کو نقل کر کے علامہ اعظمیؒ نے جو لکھا ہے، وہ بہت قابلِ غور اور چشم کشا ہے، فرمایا ہے:

''ناظرین! اس بات کو خوب دھیان میں رکھیں کہ یہ شہادت چشم دید، اور ایک صحابی رسول کی شہادت ہے، اور اصح الکتب میں صحیح و متصل اسناد سے مذکور ہے۔ اسی جگہ سے یہ بات بھی آفتاب کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ہمارے مصنفین بعض اوقات جذبات کی رَو میں بہہ جاتے ہیں، اور ایک خیال جو پہلے سے قائم ہو گیا ہے، خود اس پر نظر ثانی کرنے کے بجائے اس کے خلاف جو ثابت و نا قابلِ انکار حقیقت ہے، اسی کو قیل اور یقال کے عنوان سے بے ثبوت و بے سند باتیں نقل کر کے مشکوک بنانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں، جیسا کہ صاحب مرآۃ الزمان نے یزید کی امارت کے مسئلہ میں کیا ہے''۔

اس عبارت میں اشارہ 'مرآۃ الزمان' کی ایک عبارت کی طرف ہے، جس کے بارے میں علامہ اعظمیؒ نے ایک صفحہ پہلے یہ لکھا ہے:

''لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی امارت کا اور اس کی ماتحتی میں صحابہ کی شرکت کا انکار ایک ایسے قول پر مبنی ہے، جس کو صاحب مرآۃ الزمان نے بصیغۂ تمریض نقل کیا ہے''۔

ان تمام تفصیلات کے بعد علامہ اعظمیؒ نے جو لکھا ہے، وہ بھی کچھ کم لائقِ التفات نہیں ہے، فرماتے ہیں:

''غزوۂ قسطنطنیہ کی بشارت، اور اس حدیث کی تشریح و بیانِ مراد کے سلسلے میں ہمارے معروضات کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ مشہور حافظِ حدیث ابن عسا کر نے قاضی بحرین ابوالفضل محمد کی زبان سے سن کر بیان کیا ہے کہ انھوں نے یزید کو خواب میں دیکھا، تو اس سے پوچھا کہ تو حضرت حسینؓ کے قتل کا مرتکب ہوا تھا؟ یزید نے کہا: نہیں!۔ پھر انھوں نے کہا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے تیری مغفرت کردی، یزید نے کہا: ہاں! اور مجھے جنت میں بھی داخل کردیا (تاریخ ابن کثیر ۲۳۶)''۔

خلاصۂ مباحث:

علامہ اعظمیؒ نے اس رسالے کو ''خلاصۂ مباحث'' کے عنوان پر ختم کیا ہے، جس کا متن حسبِ ذیل ہے:

۱:-سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ باغی نہیں تھے، نہ ہمارے علم و اعتقاد میں ان کا خروج معصیت تھا، بلکہ وہ اپنے اجتہاد کی رُو سے اپنے کو حقدارِ خلافت سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے یزید کی بیعت نہیں کی، اور موقع کا انتظار کرتے رہے کہ صحیح خلافت قائم ہونے کے امکانات پیدا ہو جائیں، اس وقت اپنے لیے بیعت لیں؛ چنانچہ جب کوفیوں نے اپنے قاصدوں کی زبانی اور لاتعداد خطوط سے آپ کو مطمئن کردیا کہ ہم نے یزید کی بیعت کی نہیں ہے، اور ہم آپ کے انتظار میں ہیں، اس کے بعد مسلم بن عقیل نے بھی کوفہ جا کر اور حالات کا جائزہ لے کر آپ کو اطمینان دلایا، تب آپ کوفہ کے لیے روانہ ہوئے، مگر راستہ ہی میں آپ کو مسلم کی شہادت اور کوفیوں کی غداری کا علم ہو گیا، تو آپ نے پہلا ارادہ فسخ کردیا، مگر پہلے ساتھیوں نے اور بعد میں ابن زیاد کے آدمیوں نے آپ کو نہ واپس ہونے دیا اور نہ یزید کے پاس جانے دیا، مجبوراً آپ نے ابن زیاد کی فوج کا مقابلہ کیا، اور مردانہ وار لڑکر آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے جامِ شہادت نوش کیا، آپ ظلماً شہید کیے گئے، اور یہ واقعہ تمام تر ابن زیاد کی شقاوت و قساوت کا نتیجہ تھا۔

۲:-اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یزید نے حضرت حسینؓ کو قتل کیا، یا اس کا حکم دیا، یا وہ اس کے ساتھ راضی تھا۔

۳:-یزید کافر و مرتد نہیں تھا، بلکہ اس کے فسق کا بھی کوئی لائق اعتماد ثبوت نہیں ہے، علماء اعلام نے اس کے مسلمان ہونے کی تصریح کی ہے، اور کسی مسلمان کو بلا ثبوت و دلیل فاسق کہنا جائز نہیں ہے، کوئی شہرت جو عینی شاہدوں کی شہادت پر مبنی نہ ہو، لائقِ اعتماد و حجت نہیں ہے۔

۴:-یزید نہ تو ائمہ علم میں سے تھا، نہ ائمہ تقویٰ میں سے، وہ اپنے جیسے دوسرے مسلمان بادشاہوں کی طرح ایک بادشاہ تھا، وہ خلیفہ بھی تھا مگر خلیفۂ راشد نہ تھا؛ اسی لیے سیوطی وغیرہ نے اس کا ذکر بضمنِ خلفاء کیا ہے، اور ابن تیمیہ وغیرہ نے اس پر لفظ خلیفہ کا اطلاق کیا ہے۔

۵:-عقیدۂ فسق یزید کا تعلق سنیت سے نہیں ہے، نہ اثباتاً نہ نفیاً؛ بلکہ اس کی حیثیت محض ایک علمی تحقیق کی ہے، اگر کسی عالم کے نزدیک شرعی قواعد کے ماتحت اس کا فسق ثابت ہو، اور وہ اس کو فاسق مانتا ہو، تو وہ بھی سُنی ہے، اور کسی عالم کے نزدیک ان قواعد کی رو سے اس کا فسق ثابت نہ ہوتا ہو، اس لیے وہ اس کو فاسق نہ مانتا ہو، تو وہ بھی سُنی ہے۔

علامہ اعظمیؒ کا یہ رسالہ پچاسی (۸۵) صفحات پر مشتمل ہے، اور ایک صفحے میں ۱۶ سے لے کر ۱۸ تک سطریں ہیں، اور ہنوز تشنۂ طباعت ہیں۔

☆......☆......☆......☆......☆......☆......☆

عباسی کا رد قاضی اطہر کے قلم سے

محمود عباسی کی کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد اس کے خلاف برپا ہونے والے معرکے میں جن لوگوں کے قلم نے بے نیام ہو کر اس میں حصہ لیا، ان میں ایک بہت نمایاں شخصیت ہمارے محترم بزرگ مولانا قاضی اطہر مبارک علیہ الرحمہ کی تھی۔ قاضی صاحب دوسرے ایسے بڑے ذمہ دار عالم تھے، جنھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا، مگر افسوس کہ وہ بھی اپنے جواب میں افراط وتفریط سے محفوظ نہ رہ سکے، قاضی صاحب کی کتاب کا نام 'علیؓ وحسینؓ' تھا، اور اپریل ۱۹۶۰ء میں اتحاد پریس بمبئی سے چھپ کر شائع ہوئی تھی۔

قاضی صاحب کی کتاب جب منصۂ شہود پر آئی، تو علامہ اعظمیؒ کا وہ قلم جو تا زندگی علم ومعرفت کی سربلندی اور بحث وتحقیق کی بالادستی کے لیے رواں دواں اور سرگرداں رہا ہے، حرکت میں آیا، اور قاضی صاحب کے اشہبِ قلم نے جہاں جہاں لغزش کھائی ہے، اس کی نشان دہی کی، اور خالص عالمانہ اور محققانہ انداز میں ان کی کتاب میں پائی جانے والی غلطیوں پر سے پردہ اٹھا کر علم وتحقیق کی صحیح سمت میں رہنمائی کی۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنی تحریر میں ابتدائی چند سطروں کے بعد عباسی کا جواب لکھنے والوں کی تحریروں کا جو تجزیہ کیا ہے، وہ بہت بصیرت افروز اور سبق آموز ہے، اور نہ صرف اسی مسئلے سے متعلق بلکہ کسی بھی اختلافی موضوع پر قلم اٹھانے والے کے لیے ایک رہنما اصول کی طرح ہے، اس میں لکھتے ہیں:

> ''قاضی اطہر کی یہ کتاب ۳۳۶ صفحات پر مشتمل ہے، اس کتاب میں انھوں نے اپنے خیال میں عباسی صاحب کی تقریباً ہر بات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ہم عباسی صاحب کے حامی نہیں ہیں، ہم مانتے ہیں کہ ان کی کتاب میں بہت سی غلطیاں ہیں، یہ بھی صحیح ہے کہ حضرت علیؓ وحضرت حسینؓ پر انھوں نے جس انداز سے لکھا ہے، وہ انداز پسندیدہ نہیں ہے، اسی طرح انھوں نے یزید کے باب میں بھی غلو سے کام لیا ہے؛ لیکن ان باتوں کے باوجود ہمارے علما ہاتھ دھو کر جو عباسی کے پیچھے پڑے ہیں، اس سے بھی ہم کو اتفاق نہیں ہے۔ اتنی بات میں تو کوئی ہرج نہیں تھا، بلکہ ایک حد تک ضروری تھا کہ

عباسی کی کتاب میں جس حد تک مسلکِ اہل سنت سے انحراف پایا جاتا ہے، بس اس حد تک ہمارے علما اس کتاب کے رد میں اپنا زورِ قلم صرف کرتے، اس سے آگے بڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اور اگر آگے بڑھنے پر اپنی افتادِ طبیعت سے مجبور تھے، تو جن بے عنوانیوں کی شکایت ان کو عباسی سے ہے، اُن کا ارتکاب خود نہ کرتے، یعنی عبارتوں میں قطع و برید سے پرہیز کرتے، غلط ترجمے نہ کرتے، صرف مفیدِ مطلب ٹکڑوں کو نقل کرنے پر اکتفا نہ کرتے اور اپنے لیے مُضِر ٹکڑوں کو حذف نہ کرتے، نیز کسی صحابیؓ کی نسبت ایسا کوئی لفظ اپنی تحریر میں نہ آنے دیتے جو صحابہؓ کی حرمت کے خلاف ہوتا؛ مگر ہم کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عباسی کا رد کرنے والوں نے ان باتوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا ہے''[1]۔

قاضی صاحب نے اپنی کتاب میں عباسی کی کتاب کو بالکل مجروح قرار دیا ہے، اور اس پر نقد کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جس شخص کی اس قدر خیانتیں اجاگر ہو چکی ہوں، اس کی ایک بات بھی ماننے کے قابل نہیں رہ سکتی، جبکہ ایک کتاب میں دو چار جگہ اس طرح کی خیانت سے پوری کتاب مجروح ہو جاتی ہے، اور اس کی کوئی سطر بھی قابلِ اعتماد نہیں ہوتی'' (ص:۷)۔ سوچنے کی بات ہے کہ جس عالم و محقق کو عبارت فہمی میں اس طرح کی دشواری پیش آتی ہو، اور جو عربی اشعار اور عبارتوں کے مطالب و معانی غلط سمجھتا ہو، اس کی کسی معمولی تصنیف و تالیف پر کس طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے................معلوم نہیں مولف نے کن کن نازک جگہوں پر عبارتوں کے سمجھنے میں غلطی کی ہوگی (ص:۶۲)''۔

علامہ اعظمیؒ نے قاضی صاحب کے اس فیصلے کے بارے میں لکھا ہے کہ واقعی یہ بڑا جاندار فیصلہ ہے، لیکن ایسا فیصلہ ہے کہ اس کے رُو سے خود قاضی صاحب کی یہ کتاب نا قابل اعتبار ہو کر رہ جاتی ہے، اس لیے کہ ان سے بھی وہ ساری غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، جس کا انھوں نے عباسی کو الزام دیا ہے۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے قاضی صاحب کی کتاب کے مختلف مقامات سے دس ایسی مثالیں پیش کی ہیں، جن کی عبارتوں میں قاضی صاحب سے ترجمہ کی غلطی یا ان عبارتوں کو سمجھنے میں ان سے غلطی ہوئی ہے۔

ترجمہ کی غلطیاں ذکر کرنے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے ایک عنوان ''عدم احترامِ صحابیت'' قائم کیا ہے، اور اس کے ماتحت لکھا ہے:

''قاضی صاحب کو سخت شکایت ہے اور وہ اس شکایت میں بالکل حق بجانب ہیں کہ عباسی صاحب صحابیت کی حرمت کا پاس و لحاظ نہیں کرتے۔ مگر افسوس ہے کہ خود قاضی صاحب بھی اس امتحان میں پورے نہیں اترے؛ چنانچہ صفحہ ۱۱۳ میں ان کے یہ الفاظ ہم کو بہت گراں گذر رہے ہیں:

'حضرت علی کے خلاف حضرت معاویہ کا اقدام دمِ عثمان کے پردے میں غلط تھا'

(۱) عباسی کا رد قاضی اطہر کے قلم سے۔ قلمی۔

خط کشیدہ لفظ حضرت معاویہؓ کی نیت پر صاف حملہ ہے'' [۱]۔

علامہ اعظمیؒ اس کے بعد لکھتے ہیں:

''اسی طرح صفحہ ۱۸۱ پر یزید کی بیعت ولی عہدی لیے جانے کا نقشہ جن الفاظ میں قاضی صاحب نے کھینچا ہے، ان سے حضرت معاویہؓ کی نسبت نہایت بھیانک تصور قائم ہوتا ہے، اس کے علاوہ نقشہ بھی غلط ہے، ابن کثیر نے اس مقام پر نہ وفود بلائے جانے کا کوئی ذکر کیا ہے، نہ دھمکی کی وجہ سے آئے ہوئے لوگوں کے لب کشائی نہ کرنے کا!'' [۲]۔

قاضی صاحب کی اسی طرح کی کچھ اور عبارات وتعبیرات نقل کر کے علامہ اعظمیؒ نے اپنے خیال ورائے کا یوں اظہار کیا ہے:

''اگر قاضی صاحب احتیاط برتتے اور ان کو عباسی کے رد سے زیادہ حرمتِ صحابہؓ کا اہتمام ہوتا، تو وہ تاریخ کی کتابوں میں یزید کی ولی عہدی سے متعلق جملہ روایتوں کو پڑھ کر، اور ان کے راویوں کو جرح وتعدیل کی میزان میں تول کر جو روایت عقلاً اور نقلاً زیادہ قرین قیاس ہوتی، اس کو اپنی کتاب میں درج کرتے؛ مگر افسوس ہے کہ انھوں نے عباسی کی دشمنی میں نہ علمی امانت کا حق ادا کیا، نہ حرمتِ صحابہ کا پاس ولحاظ کیا'' [۳]۔

قاضی صاحب نے صفحہ ۳۰۷ و ۳۰۸ پر عباسی پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''امام مسعودی جیسے ثقہ اور مسلّم مورخ کو مجروح قرار دیا...................... ایک شیعہ مصنف کے علاوہ کسی اور شیعہ نے مسعودی کو اپنا پیشوا مانا ہے؟ یا اہلِ سنت کی کتابوں میں کہیں ان کے شیعہ ہونے کا ذکر آیا ہے؟''۔

علامہ اعظمیؒ نے قاضی صاحب کے اس چیلنج کا یوں جواب دیا ہے:

''مسعودی بلاشبہ کٹر شیعہ تھا، شیعوں میں مامقانی کے سوا، نجاشی نے بھی علماءِ شیعہ میں اس کا ذکر کیا ہے، اور سنیوں میں حافظ ابن حجر نے اس کی نسبت لکھا ہے: **كُتُبُه طافِحةٌ بأنَّه كانَ شِيعياً مُعتَزِلياً**، اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بھی مسعودی کا شیعہ ہونا ظاہر کیا ہے،............ ....قاضی صاحب 'تحفۂ اثناعشریہ' مطبوعہ دہلی ص ۸۸ کا مطالعہ کریں'' [۴]۔

پھر ابن قتیبہ کے بارے میں علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''اسی سلسلہ میں یہ ذکر کر دینا بھی خالی از فائدہ نہیں ہے کہ قاضی صاحب نے ابن قتیبہ کی کتاب 'المعارف' کے حوالہ سے بھی کچھ باتیں اپنی کتاب میں نقل کی ہیں، حالانکہ ابن قتیبہ صاحب المعارف کو

---

(۱) عباسی کا رد قاضی اطہر کے قلم سے- قلمی-:۵ (۲) ایضاً:۵ (۳) ایضاً:۶ (۴) ایضاً:۷

شاہ صاحب نے یقینی رافضی لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۸۸‘‘[۱]۔

علامہ اعظمیؒ کی تحریر کا ایک عنوان یہ ہے ’’**عبارت فہمی کا فقدان اور غلط نسبت**‘‘۔ اور اس کے تحت قاضی صاحب کی بعض بہت سنگین غلطیوں کی گرفت کی ہے۔ قاضی صاحب نے اپنی کتاب میں صفحہ ۱۱۸ پر لکھا ہے:

’’حضرت حسین اور ان کے ہمنوا امت داعیہ الی الخیر اور خیر امت تھے، جن کے بارے میں امام ابن تیمیہ نے فرمایا ہے: **هُمْ أعظمُ قدْراً عِندَ الله وأحسَنُ نيةً مِنْ غَيرِهِمْ**‘‘

پھر صفحہ ۱۲۸ میں لکھا ہے کہ:

’’امام ابن تیمیہ نے حضرت حسین کو نہایت واضح الفاظ میں اللہ تعالی کے یہاں بلند مرتبہ اور پاک نیت تسلیم کیا ہے (الی قولہ) علامہ ابن تیمیہ نے ایسے مردان حق اور ارباب صدق وصداقت کو خاموش رہنے والوں کے مقابلہ میں ہر اعتبار سے بہتر قرار دیا ہے‘‘۔

علامہ اعظمیؒ نے اس مقام پر لکھا ہے کہ حضرت حسین -رضی اللہ عنہ- کا پاک نیت ہونا ہم کو اور ہر سنی کو مسلّم ہے، اور وہ ابن تیمیہ کے نزدیک بھی یقیناً پاک نیت تھے، مگر قاضی صاحب نے یہاں جو فقرہ نقل کیا ہے اس کو ابن تیمیہ نے حضرت حسینؓ کے حق میں نہیں لکھا ہے، اسی طرح یہ بھی ابن تیمیہ پر افترا ہے کہ انھوں نے خاموش رہنے والوں کے مقابلہ میں حضرت حسینؓ کو ہر اعتبار سے بہتر قرار دیا ہے، علامہ اعظمیؒ نے ابن تیمیہ کی اس عبارت کی تشریح ضروری تفصیل کے ساتھ کی ہے، اور لکھا ہے:

’’علامہ ابن تیمیہ نے ’المنتقی‘ صفحہ ۲۸۵ میں بڑی صراحت سے یہ لکھا ہے کہ جب یزید جیسا کوئی خلیفہ حکومت پر قابض ومستولی ہو جائے، تو یہ کہنا کہ اس کو حکومت سے روکنا اور اس سے لڑنا واجب ہے۔ بالکل غلط اور فاسد رائے ہے، چاہے ایسے خلیفہ کے خلاف اقدام کرنے والا متدین ہی کیوں نہ ہو۔

’المنتقی‘ کے الفاظ یہ ہیں: **فإذا غلبَ على الأمرِ خليفةٌ كيزيدَ وعبدِ الملكِ والمنصورِ، فأمَّا أن يُقالَ يَجبُ منعُه مِنَ الأمرِ وقِتَالُه، فَهذا رأيٌ فاسِدٌ يُؤدّي إلى سَفْكِ الدِّماءِ وَإنْ كانَ الخارِجُ دَيِّناً**‘‘[۲]

علامہ اعظمیؒ نے اس کے آگے لکھا ہے:

’’اس کے بعد انھوں نے -ابن تیمیہ نے- اس رائے کے فاسد ہونے کو کئی مثالوں سے واضح کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اہل حرہ، اور ابن الاشعث، اور ابن المہلب نے خلفاء وقت کے خلاف خروج کیا، تو اس کے سوا کیا نتیجہ برآمد ہوا کہ شکست کھائی، اور نہ دین قائم کر سکے اور نہ دنیا باقی رکھی۔ اور اللہ تعالی ایسی بات کا حکم نہیں دیتا جس سے نہ صلاحِ دین حاصل ہو، نہ صلاحِ دنیا؛ اگر چہ اس کام کے کرنے

(۱) عباسی کا رد قاضی اطہر کے قلم سے-قلمی-:۷ (۲) ایضاً:۹

والے اللہ کے متقی بندے، اور جنتی ہوں؛ اس لیے کہ وہ خواہ کیسے ہی متقی ہوں، پھر بھی حضرت علیؓ وطلحہؓ وزبیرؓ وعائشہؓ سے افضل وبرتر نہ ہوں گے، بااین ہمہ ان حضرات نے جو باہم قتال کیا، اس کو خود انھوں نے بھی نہیں سراہا، نہ قابلِ مدح سمجھا، حالانکہ وہ لوگ -علیؓ وطلحہؓ وزبیرؓ وعائشہؓ- اللہ کے نزدیک بہت بلند مرتبہ اور اپنے علاوہ سب سے زیادہ نیک نیت ہیں"(۱)۔

اس کے بعد 'منتقی' کی اصل عربی عبارت بھی نقل کر دی ہے، پھر لکھا ہے:

"ناظرین ملاحظہ فرمائیں! کہ قاضی صاحب نے کس قدر غلط بیانی سے کام لیا ہے، یا ان سے عبارت کے سمجھنے میں کتنی بڑی غلطی ہوئی ہے، کہ ابن تیمیہ تو ان کے منقولہ فقرہ کو حضرت علیؓ وطلحہؓ وغیرہما کے باب میں لکھتے ہیں، اور وہ اس کو حضرت حسینؓ پر چسپاں کر رہے ہیں، درانحالیکہ سیاق وسباق میں کہیں حضرت حسینؓ کا نام نہیں آیا ہے۔

پھر ابن تیمیہ تو حضرت علیؓ وطلحہؓ وزبیرؓ کو صراحۃً دوسرے لڑنے والوں کے مقابلہ میں بلند مرتبہ اور نیک نیت فرما رہے ہیں، اور قاضی صاحب خاموش رہنے والوں کے مقابلہ میں بلندیٔ مرتبہ ونیک نیتی کی بات کر رہے ہیں"(۲)۔

اس کے بعد حضرت حسینؓ کے موقف کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ کی صاف وصریح عبارت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اور اُس وقت تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ ابن تیمیہ نے صراحۃً نام لے کر حضرت حسینؓ کے اقدام کو خطائے اجتہادی اور خاموش رہنے والوں کی رائے اور عمل کو حق وصواب بلکہ اسی کو اہل سنت کا طے شدہ عقیدہ قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود قاضی صاحب ان کی طرف کس بے باکی سے یہ نسبت کر رہے ہیں کہ انھوں نے خاموش رہنے والوں کے مقابلہ میں حضرت حسین اور ان کی جماعت کو ہر اعتبار سے بہتر قرار دیا ہے"(۳)۔

اس کے بعد 'المنتقی' کے صفحہ ۲۸۷ سے علامہ ابن تیمیہؒ کی ایک طویل عبارت نقل کر کے اس کا ترجمہ کیا ہے، جس میں ابن تیمیہ نے احادیث صحیحہ ثابتہ کی روشنی میں حضرت حسینؓ کو کوفہ جانے سے منع کرنے والوں کے موقف کو صحیح اور حضرت حسینؓ کے موقف کو خطائے اجتہادی قرار دیا ہے۔

قاضی صاحب کی بعض اور لغزشوں یا فروگزاشتوں کا ذکر کرنے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے حاکم یا والی کے خلاف خروج سے متعلق ایک اہم نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس کا صحیح حل یہ ہے کہ اُس وقت تک بلکہ اس کے کچھ دنوں بعد تک اس مسئلہ میں مجتہدین امت متفق الرائے نہ تھے، بلکہ صورت حال یہ تھی کہ اکثر مجتہدین منع خروج کے قائل تھے، اور بعض جواز کے۔

(۱) عباسی کا رد قاضی اطہر کے قلم سے: ۱۰ (۲) ایضاً: ۱۰ (۳) ایضاً: ۱۱

حضرت حسینؓ بھی مجتہد تھے، اوران کی رائے میں خروج جائز تھا، بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ خروج کو افضل بھی سمجھتے ہوں؛ اس لیے ان کا اقدام ان کے اجتہاد اوران کے علم و دیانت کی رُو سے بالکل جائز تھا، یہی وجہ ہے کہ ابن تیمیہ وغیرہ تمام اہل سنت حضرت موصوف کے حادثۂ قتل کو شہادت سمجھتے ہیں۔ قاضی صاحب سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ مجتہد سے اگر خطا بھی ہوجائے تو ماجور و مثاب ہوتا ہے۔

اس مسئلہ میں یہ اختلافِ اجتہاد بعد میں ختم ہوگیا، اور حسب تصریح ابن تیمیہ جملہ اہل سنت کی یہ رائے قرار پاگئی کہ خروج علی الائمہ جائز نہیں ہے''(۱)۔

علامہ اعظمیؒ نے ایک عنوان ''حضرت ابن عمرؓ وغیرہ پر طنز'' کا قائم کر کے اس کے ماتحت لکھا ہے:

''قاضی اطہر کی کتاب کا وہ مقام نہایت جگر خراش ہے جہاں انھوں نے حضرت حسینؓ اوران کے ساتھیوں کو ''مردان حق اورارباب صدق وصداقت'' کے عنوان سے یاد کیا ہے، اوران کے مقابل میں لڑائی سے الگ رہنے والے حضرات مثلاً ابن عمر وغیرہ کو ''مردان آخر بیں'' اور ''حامیان امن وصلح'' کے لفظ سے یاد کرتے ہوئے ان لفظوں کو واوین کے درمیان لکھا ہے، جو عموماً اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ یہ طنزیہ لفظ ہے۔ (ملاحظہ ہو علی و حسین ص:۱۱۹)''(۲)۔

علامہ اعظمیؒ کا مسودہ ۲۳ صفحات پر مشتمل ہنوز غیر مطبوعہ ہے، جس میں مذکورہ بالا مباحث کے علاوہ قاضی صاحب کے اور بھی بہت سے تسامحات پر مواخذہ کرتے ہوئے صحیح علمی تحقیق پیش کی گئی ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

علم رجال کی اہمیت

علم رجال ایک نہایت اہم اور عظیم الشان فن ہے، اس کے اندر حدیث کے راویوں کی جانچ پرکھ کر ان کے مقام و مرتبے کا پتہ لگایا جاتا ہے، اوران راویوں ہی کی حیثیت کو معلوم کر کے صحت و سقم کے اعتبار سے ان کی بیان کردہ روایت کی حیثیت متعین کی جاتی ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنے اس مضمون میں ''باب بیان أن الإسناد من الدين'' کا عنوان قائم کر کے ان الفاظ سے اس کا آغاز کیا ہے:

''یہ ایک باب کا عنوان ہے، جس کو امام نووی نے صحیح مسلم کے مقدمہ میں ایک جگہ قائم کیا ہے، اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ حدیثوں کی سندیں بیان کرنا، اوران سندوں کے صحت و سقم کا علم حاصل کرنا اوراس کی تعلیم دینا، یہ سب امور دین سے ہیں''(۳)۔

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے مشہور اور تاریخی قول **الإسنادُ مِنَ الدِّينِ، وَلَوْلا الإسْنادُ**

(۱) عباسی کا رد قاضی اطہر کے قلم سے: ۱۴ (۲) ایضاً: ۱۶ (۳) علم رجال کی اہمیت (قلمی)

لَقالَ مَنْ شَاءَ مَا شَاءَ کی تشریح کر کے لکھا ہے کہ اسناد کا دارومدار یا اسناد کا قوام وہ اسماء رجال - یعنی راویوں کے نام - ہیں، جو اسناد میں سلسلہ وار بیان ہوتے ہیں، پس اسناد اور علم اسناد کے دین ہونے سے اسماء رجال اور رواۃ احادیث کی معرفت، اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور ان کی جانچ پڑتال اور نقد وجرح کرنا بھی لازمی طور پر امور دین سے ہوا۔

آگے نہایت اختصار کے ساتھ اشارے کے انداز میں فن اسماء الرجال کی تصنیفات، ان کی خصوصیات، اوران میں سے جو طبع ہو چکی ہیں، ان کے مطبوع ہونے کا ذکر کیا ہے، امام احمد متوفی ۲۴۱ھ کی کتاب 'العلل ومعرفة الرجال'، اور یحییٰ بن معین متوفی ۲۲۳ھ کے بعض شاگردوں کے علم رجال سے متعلق سوالات پر ان کے جوابات، اور عجلی متوفی ۲۶۱ھ کی کتاب 'تاریخ الثقات' کا تذکرہ کر کے لکھا ہے:

''ان کے بعد پھر بعض ائمۂ فن نے صرف ثقہ راویوں کو کتاب الثقات کے نام سے اکٹھا کیا، جیسے ابن حبان المتوفی ۳۵۴ھ، اور ابن شاہین المتوفی ۳۸۵ھ نے کتاب الثقات تصنیف کی، اور بعض ائمہ نے صرف ضعفاء کو............اور صرف ان کے نام جمع کیے، جیسے ابن حبان کی کتاب الضعفاء والمجروحين، اور عقیلی المتوفی ۳۲۲ھ کی کتاب الضعفاء، اور دار قطنی المتوفی ۳۸۵ھ کی کتاب الضعفاء، اور ابن عدی المتوفی ۳۶۵ھ کی الکامل فی الضعفاء؛ اور کسی نے دونوں کو سامنے رکھ کر شرح وبسط کے ساتھ جہاں تک ہو سکا ثقات اور ضعفاء دونوں کا استیعاب کیا، جیسے عبدالرحمان بن ابی حاتم المتوفی ۳۲۷ھ نے کتاب الجرح والتعدیل لکھی، اور اس کام کو ان سے پہلے امام بخاری المتوفی ۲۵۶ھ نے بڑی تحقیق اور بڑی جستجو اور ایک حد تک استیعاب سے کیا ہے، ان کا شاہکار آج التاریخ الکبیر کے نام سے علمی کتب خانوں کی زینت بنا ہوا ہے''[1]۔

پھر متقدمین کی متعدد کتابوں کا تذکرہ کر کے تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب، تذہیب، تقریب اور تعجیل المنفعة، نیز میزان الاعتدال اور لسان المیزان وغیرہ کے امتیازات وخصوصیات کے ساتھ ساتھ ان کی طباعت بتصریح سنین اور عدم طباعت کو بھی ذکر کیا ہے۔

(۱) علم رجال کی اہمیت (قلمی)

☆......☆......☆......☆

☆......☆......☆

☆......☆

☆

قاضی اطہر مبارک پوری کی کتاب
’رجال السند والہند‘
پر ایک نظر

۱۳۷۷ھ = ۱۹۵۸ء میں قاضی اطہر مبارک پوری صاحبؒ کی مایہ ناز کتاب ’**رجال السند والهند**‘ طبع ہوکر شائع ہوئی، علامہ اعظمیؒ نے قاضی صاحب کی اس تصنیف پر نقد ونظر سے پہلے ان بلند آہنگ الفاظ میں اس کو خراج تحسین پیش کیا ہے:

’’ملک کے نامور انشا پرداز وصحافی قاضی اطہر مبارک پوری کی جس کتاب کے لیے ہم چشم براہ تھے، شکر ہے چند دن ہوئے وہ نہایت آب وتاب سے ٹائپ کے خوشنما حرفوں میں بمبئی سے شائع ہو گئی، یہ کتاب غیر منقسم بلکہ وسیع تر ہندوستان کے اہل کمال پر بہت تلاش اور تتبع سے لکھی گئی ہے، مدتوں سے اہل علم اور ہندوستان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے طبقہ میں اس کا چرچا تھا، اشاعت کی خبر پاتے ہی ہم نے اس کا ایک نسخہ حاصل کیا، اور بہت غور وفکر سے اس کا مطالعہ شروع کیا۔ اس میں شک نہیں کہ قاضی صاحب کی محنت وکاوش قابل داد ہے، اور قاضی صاحب اس لحاظ سے مستحق مبارک باد ہیں کہ جو کام علمی اداروں کے کرنے کا تھا، وہ محض ذاتی دلچسپی وشوق کی بنا پر انھوں نے تنہا انجام دیا‘‘۔

لیکن اسی کے ساتھ اس بیش قیمت کتاب میں کچھ لفظی ومعنوی ایسی خامیاں اور غلطیاں ہیں، جن پر تنبیہ کی ضرورت تھی، علامہ اعظمیؒ نے اپنی تحریر میں دونوں قسم کی خامیوں کے کچھ نمونے نقل کیے ہیں، لیکن چونکہ اس قسم کی تحریر کو کسی دوسرے محمل پر محمول کیا جاسکتا ہے، اس لیے اس پر روشنی ڈالنے سے قبل لکھا ہے:

’’قاضی صاحب اس صاف گوئی پر ہم کو معاف رکھیں، ہماری یہ گزارش از راہِ نکتہ چینی نہیں، بلکہ از راہِ نصیحت ہے‘‘۔

اس کے بعد پہلے لفظی خامیوں کی مثالیں پیش کی ہیں، اور ایسی بارہ عبارتیں نقل کی ہیں، جو عربیت کے لحاظ سے غلط یا غیر واضح ہیں، میں ان میں سے صرف ایک مثال کے نقل پر اکتفا کرتا ہوں:

’’صفحہ ۱۴۴ میں قاضی صاحب لکھتے ہیں: **كان في ديوانه نحو ألفين شعراً.** اس میں عربیت کی دو غلطیاں ہیں:

۱- **ألفين شعراً** کے بجائے **ألفي شعر** ہونا چاہئے، ألف کا ممیز منصوب نہیں بلکہ مجرور ہوتا ہے۔

۲- **شعر** کے بجائے **بيت** ہونا چاہئے‘‘۔

لفظی خامیوں کی بارہ مثالیں پیش کرنے کے بعد ’’معنوی خامیاں‘‘ کا عنوان قائم کیا ہے، اور اس کے

تحت لکھا ہے:

''معنوی خامیوں میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ بہت سے ایسے لوگوں کو جن کا سند سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے، قاضی صاحب نے ان کو رجالِ سند میں شامل کر دیا ہے، اور اس غلطی کی بنیاد یہ ہے کہ سندی کا لفظ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے: ایک تو نسبت کے معنی میں، یعنی سند والا (سند کا باشندہ یا سندی الاصل)؛ دوسرے محض بطریق علمیت، یعنی معنی نسبت کا لحاظ کیے بغیر صرف پکارنے کے نام کے طور پر''۔

پھر اپنے دعوے کی تائید وتقویت میں لکھا ہے:

''اور یہ اس لفظ کی خصوصیت نہیں ہے، بعض دوسرے الفاظ بھی مذکورہ بالا دونوں طریقوں سے مستعمل ہوتے ہیں، مثلاً لفظ ''مکی'' کہ وہ عموماً نسبت کے معنی میں بولا جاتا ہے، مگر علَم کے طور پر بھی مستعمل ہے، جیسے مکی بن ابراہیم''۔

پھر دوسری مثال لفظ ''حبشی'' کی پیش کی ہے، کہ محض کالا ہونے کی بنا پر کسی کا نام رکھ دیا جائے۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے اپنے دعوے کو مدلَّل اور مبرہَن کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ابن الاثیر جزری 'لباب' میں لفظ سندی کے تحت میں پہلے نسبتی معنی اور اس معنی کے لحاظ سے جو سندی تھے، ان کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: وفي الأسماءِ ما يُشْبِهُ هذهِ النِّسبَةَ، وهو السِّنديُّ بنُ شَاهِكَ صاحِبُ الحَرَمَينِ وغَيرُه (۱/۵۷۱)۔ یعنی بعض نام بھی اس نسبت کے مشابہ ہیں اور وہ سندی بن شاہک وغیرہ کے نام ہیں''۔

'رجال السند والھند' میں بہت سے ایسے افراد وشخصیات کے تذکرے ہیں، جن کا سندی ہونا علامہ اعظمیؒ کی نظر میں تحقیق طلب ہے، مثلاً کتاب کا پہلا نام احمد بن سندی، اسی طرح دوسرا نام، صفحہ ۵۵ پر احمد بن سندی باغی، صفحہ ۵۷ پر احمد بن القاسم المعروف بابن السندی، صفحہ ۵۹ پر احمد بن محمد بن الحسین صابونی، صفحہ ۶۸ پر ابراہیم بن علی، صفحہ ۷۹ پر اسلم بن السندی، صفحہ ۸۰ پر اسماعیل بن السندی، صفحہ ۹۵ پر حبیش بن سندی، ان لوگوں کی نسبت لکھا ہے کہ ان کے متعلق یہ تحقیق ضروری ہے کہ وہ واقعی سند سے نسبت رکھتے تھے؟ یا ان کا، یا ان کے باپ دادا کا محض نام سندی تھا۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ مذکورہ بالا نام تو خیر تحقیق طلب ہیں لیکن سندی بن شاہک تو حسب تصریح ابن الاثیر قطعاً سندی نہیں ہے، بلکہ اس کا علم سندی تھا، مگر قاضی صاحب نے اس کو اور اس کے اقرباء کو ایک سندی خاندان قرار دے کر رجال السند میں شامل کر دیا۔

☆......: سندی بن شاہک کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے کشاجم شاعر کو بھی قاضی صاحب نے سندی قرار دیا ہے، اسی طرح اس کو جرجی زیدان نے بھی هندي الاصل لکھا ہے، علامہ اعظمیؒ نے اس پر یوں نقد کیا ہے:

''جرجی زیدان نے جو کشاجم کو هندي الأصل لکھ دیا ہے، یہ اس کی غلطی ہے، اس کی کوئی

دلیل اس کے پاس نہیں ہے، اس کو بھی سندی بن شاہک کے نام سے دھوکہ ہوا ہے اور اس نے سندی کو نام کے بجائے نسبت سمجھ لیا ہے''۔

☆......: اسی طرح سندی بن یحییٰ الحرشی، سہل بن عبدالرحمان رازی، رجاء بن السندی، ان کے بیٹے محمد اور پوتے محمد بن محمد بن رجاء، سندی بن شماس، سندی بن صدقہ، سندی بن عبدویہ اور سندی بن علی کو رجال سند میں شمار کرنا غلطی ہے، جب تک یہ نہ ثابت ہو کہ یہ لوگ اصلاً سندی تھے۔

☆......: نیز ابان بن محمد اور ان کے بیٹے و بھائی حسن و علی کو رجال سند میں شمار کرنا غلط ہے۔

☆......: 'میزان الاعتدال' میں کتابت کی غلطی کی وجہ سے قاضی صاحب نے ابوجعفر مسندی کو ابوجعفر سندی سمجھتے ہوئے کتاب میں شامل کرلیا۔

☆......: صفحہ ۲۶۷ پر ایک نام یحییٰ ابومعشر سندی ہے، دراصل یحییٰ کے بجائے نجیح ہونا چاہئے، لہذا اس کو اور صفحہ ۲۸۶ سے ابومعشر سندی کے نام کو حذف ہونا چاہئے۔

☆......: قاضی صاحب نے محمد بن عبدالرحمان بیلمانی کوفی کا ذکر بھی اس کتاب میں کیا ہے، حالانکہ وہ اصلاً یمنی اور ابناء فارس میں تھے۔

☆......: آگے عبد بن حمید کی نسبت لکھتے ہیں:

''قاضی صاحب نے عبد بن حمید صاحب مسند کو ''کچھ'' کا باشندہ قرار دے کر اس کتاب میں ان کو ذکر کردیا ہے، حالانکہ یہ بالکل بے دلیل بات ہے، اور قاضی صاحب کا اس باب میں کوئی سلف نہیں ہے، قاضی صاحب کا یہ فرمانا کہ ''حموی نے تصریح کی ہے کہ عبد بن حمید ہندوستان والے ''کس'' کے باشندہ تھے'' بالکل غلط ہے۔ حموی نے دو شہروں کا نام ''کس'' بتا کر جن میں سے ایک سمرقند کے پاس دوسرا ہندوستان میں ہے، لکھا ہے کہ ''و مـمن یُنسَب إلیھا'' جو لوگ کس کی طرف منسوب ہیں ان میں سے عبد بن حمید بھی ہیں، حموی نے اس بات کی قطعاً تصریح نہیں کی ہے کہ عبد کس ''کس'' کی طرف منسوب ہیں، بلکہ اس کے برخلاف سمعانی، ابن الاثیر، صاحب قاموس، اور شاہ عبدالعزیز کے بیانات سے ان لوگوں کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبد بن حمید جرجان یا سمرقند کے پاس والے کس کے باشندہ تھے''۔

☆......: پھر چند سطروں کے بعد لکھا ہے:

''صفحہ ۱۷۴ میں علی بن احمد دیبلی کا اور صفحہ ۲۲۴ میں محمد بن عبداللہ دیبلی کا ذکر بھی بہت کچھ محل کلام ہے، اس لیے کہ سبکی نے علی بن احمد کے تذکرہ میں لفظ دبیلی کو لفظوں میں ضبط کر کے بتایا ہے کہ بائے موحدہ پہلے اور یاء تحتانی بعد میں ہے، اور وہیں اپنا خیال یہ ظاہر کیا ہے کہ علی بن احمد ابوعبداللہ مقری دبیلی کے پوتے ہیں، اس لیے سبکی کے نزدیک یہ دونوں بجائے دیبلی، دبیلی ہوئے؛ اور اس کا مؤید یہ ہے کہ ابوعبداللہ کی نسبت شامی بھی ہے، اور دبیل رملۂ شام کا ایک گاؤں ہے''۔

☆......: اسی طرح علامہ اعظمیؒ نے سہیل بن ذکوان ابوالسندی کی نسبت لکھا ہے کہ ان کے ابوالسندی ہونے سے خود ان کا سندی ہونا ثابت نہیں ہوتا ہے۔

☆......: قاضی صاحب نے فضل اللہ بن محمد بوقانی، محمد بن احمد بن محمد بوقانی، اور محمد بن احمد بن منصور بوقانی، اور محمد ابن اسعد بوقانی کو بھی سندی قرار دیا ہے، حالانکہ کسی مورخ نے ان میں سے کسی کے سندی ہونے کی تصریح نہیں کی ہے، اس سلسلے میں علامہ اعظمیؒ فرماتے ہیں:

''قاضی صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ بوقان (سند) کے علاوہ طوس کا ایک شہر نوقان (بالنون فی اولہ) اور سجستان کا ایک محلّہ نوقات (بالنون فی اولہ والتاء فی آخرہ) ہے، اس لیے جس نام کے آخر میں (لوقانی) اس شکل کی نسبت مذکور ہو، وہ بہت غور طلب ہوتی ہے، اور جانچنا پڑتا ہے کہ وہ مذکورہ تین مقامات میں سے کس کی طرف نسبت ہے''۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنے مضمون کے آخر میں ایک اصولی بات یہ تحریر فرمائی ہے:

''قاضی صاحب نے کئی ایک ایسے آدمیوں کو بھی اپنی کتاب میں ذکر کر دیا ہے، جن کی کنیت ابوالہندی ہے، حالانکہ قاضی صاحب اگر غور کریں تو یہ سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں ہے کہ کسی کا بیٹا ہندوستان آکر رہ پڑے اور ہندی ہو جائے، تو باپ ابوالہندی تو ضرور ہو جائے گا، مگر ہندی نہ ہوگا''۔

☆......☆......☆......☆......☆

ہندوستان میں علم حدیث

اور قاضی اطہر

علامہ اعظمیؒ نے اپنی اس تحریر میں قاضی اطہر صاحب کے ایک مضمون پر نقد کیا ہے، قاضی صاحب کا مضمون ''ہندوستان میں علم حدیث'' کے عنوان سے ماہنامہ 'معارف' - جنوری وفروری -۱۹۷۳ء میں چھپا تھا، اس مضمون میں قاضی صاحب نے ایسے لوگوں کو بھی شامل کر دیا تھا، جن کا یا تو علم حدیث سے تعلق نہیں تھا، یا وہ ہندی ہی نہیں تھے، علامہ اعظمیؒ نے اپنے تنقیدی مضمون میں اس -''ہندوستان میں علم حدیث'' -عنوان کا مفہوم اور اس کی حد متعین کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ اس عنوان کا مطلب ہے ہندوستان میں علم حدیث کا درس، یا اس علم میں تصنیف وتالیف، یا اس علم کی کتابوں کی اشاعت وغیرہ۔ کسی خطیب کا خطبہ میں کسی حدیث کو پڑھ دینا، یا دورانِ گفتگو میں کسی حدیث کو ذکر کر دینا، یا کسی ہندوستانی قیدی کا عرب پہنچ کر مسلمان ہو جانا اور اس کی نسل سے کسی محدث کا پیدا ہونا، یا ہندوستان سے کسی کا عرب جا کر حدیث حاصل کرنا

اور وہیں اس کی روایت کرنا، اس عنوان کے مفہوم میں ہرگز داخل نہیں ہے''[۱]۔

مگر قاضی صاحب نے اس فرق کا لحاظ نہیں کیا، اور ظاہر ہے کہ اس عدم تفریق کی وجہ سے بہت شدید اور سنگین قسم کی غلطیوں کے واقع ہونے کا امکان بہت زیادہ ہوگا، اور قاضی صاحب کے مضمون میں یہی ہوا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی باتیں قاضی صاحب نے غیر محتاط طریقے سے لکھی تھیں، جس پر علامہ اعظمیؒ نے متنبہ کیا ہے، مثلاً قاضی صاحب نے لکھا تھا کہ:

''جب دوسری صدی میں احادیث کے مجموعے اور صحیفے مدوّن ہوئے اور ان کی روایت کا سلسلہ شروع ہوا، تو ہندوستان کی فضا بھی أخبرنا اور حدثنا کے ترانوں سے گونج اٹھی''[۲]۔

علامہ اعظمیؒ نے اس پر یہ گرفت کی ہے:

''قاضی صاحب کے اس ارشاد کا کوئی ثبوت نہیں ہے، کیا قاضی صاحب کوئی ایک حوالہ بھی اس کے لیے دے سکتے ہیں کہ دوسری صدی میں فلاں مجموعہ کی روایت ہندوستان میں کی گئی؟ اور فلاں مقام میں أخبرنا اور حدثنا کا ترانہ بلند ہوا؟''۔

علامہ اعظمیؒ کے مضمون سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کے مضمون کے بہت سے مندرجات خود ان کی کتاب 'العقد الثمین' میں ان کی تحریر کی ہوئی باتوں کے خلاف ہیں۔

قاضی صاحب سے ایک چوک یا مغالطہ یہ ہوا ہے کہ کسی نام میں سندی دیکھا تو اس کو سندھ کا باشندہ یا اصلاً سندھی سمجھ کر اس کو اہل سندھ میں شمار کر لیا، جبکہ بسا اوقات ''سندی'' نام بھی ہوتا ہے، اور اس کا سندھ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔

ذیل میں ان لوگوں کا نام ذکر کیا جا رہا ہے، جن کو قاضی صاحب نے سندھی خیال کر کے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے، حالانکہ وہ سندھی نہیں ہیں، بلکہ ''سندی'' ان کا نام یا سلسلۂ نسب میں کسی کا نام ہے:

۱- قیس بن بسر بن سندی: یہاں سندی نسبت نہیں، بلکہ ان کے دادا کا نام تھا۔ قاضی صاحب نے خود ہی 'عقد ثمین' میں لکھا ہے کہ ایک صحابی کی اولاد اور عربی النسل نصری ہیں۔

۲- سندی بن شماس: سندی ان کا نام ہونے اور نسبت نہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اہل علم نے ان کو باب الأنساب میں نہیں، بلکہ باب الأسماء میں ذکر کیا ہے۔

۳- یزید بن عبداللہ بیسری: ان کے بارے میں قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ ''انھوں نے یہاں سے بصرہ جا کر واقدی............ سے روایت کی''۔ علامہ اعظمی نے لکھا کہ ان کی اصل سندھ سے تھی، معلوم نہیں ان کے باپ سندھ سے بصرہ گئے، یا ان کے دادا یا وہ خود۔

قاضی صاحب نے بعض لوگوں کی نسبت لکھا ہے کہ انھوں نے ہندوستان آ کر حدیثوں کی روایت کا

(۱) ہندوستان میں علم حدیث اور قاضی اطہر- قلمی-:۱ (۲) معارف- فروری ۱۹۷۳ء-: ۸۵

سلسلہ جاری کیا، لیکن علامہ اعظمیؒ نے اس پر یہ نقد کیا ہے کہ اس دعوی کے لیے کمزور سے کمزور ثبوت بھی نہیں پیش کیا گیا ہے، کسی محدث یا راوی کا تاریخ سے ہندوستان آنا ثابت ہوتا ہے، تو اس سے یہاں حدیث بیان کرنا اور اس کی روایت کرنا ثابت نہیں ہوتا۔

اس مضمون کے اندر قاضی صاحب کے تسامحات سے ایک بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایسے لوگوں کو بھی رواۃ اور محدثین میں شمار کر دیا ہے، جن کا شمار اس طبقے میں نہیں ہے۔

علامہ اعظمیؒ کی اس تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس میں بعض ایسے لوگوں کو بھی شمار کر دیا ہے، جن کا ہندوستان آنا ہی سرے سے ثابت نہیں ہے، مثلاً فرماتے ہیں:

''ہندوستان آنے والے صحابہ میں ربیع بن زیاد حارثی کا نام لینا، حالانکہ مستند تاریخوں سے ان کا صرف خراسان تک آنا ثابت ہے، اور اگر منہاج الدین کی روایت صحیح مانی جائے، تو زیادہ سے زیادہ مکران تک ان کا آنا ثابت ہوسکتا ہے؛ مگر مکران ہند میں نہیں ہے، اور سجستان تو بطریق اولیٰ نہیں ہے، 'معجم البلدان' کا مصنف تصریح کرتا ہے کہ ہند مکران کے مشرق میں ہے''[1]۔

اسی طرح اور بھی بہت سی فروگزاشتوں اور لغزشوں پر مواخذے کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کے مضمون میں بہت سی ایسی باتیں درج ہوگئی ہیں، جن کا ہندوستان میں علم حدیث کی روایت واشاعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆......☆

پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں

یہ مضمون ایک خاص سلسلے کے بزرگوں کے تذکروں اور ان کے حالات پر مشتمل ہے، جن کے وجود باجود اور گرمیٔ نفس سے خطۂ پورب نویں دسویں اور گیارہویں صدی ہجری میں فیض یاب ہوا ہے، اس مضمون کا آغاز حسبِ ذیل عبارت سے ہوتا ہے:

''پورب کے خطہ میں جو اولیاء کرام آسودۂ خاک ہیں اور ان کو شہرت دوام اور قبول عام حاصل ہے، ان میں ایک بہت برگزیدہ ہستی حضرت شاہ طیب بنارسی قُدِّس سرُّہ کی ہے۔

ایک عرصہ سے مجھے حضرت موصوف کے تفصیلی حالات معلوم کرنے کا شوق تھا، اور اس شوق میں مجھے 'مناقب العارفین' کی تلاش وجستجو تھی، جس کو اُن کے حالات میں اُن کے صاحبزادے شاہ محمد یسین قدس سرہ نے تصنیف فرمایا ہے، خوش قسمتی سے بنارس میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا اور میں اس کے مطالعہ سے بہرہ ور ہوا۔

(۱) ہندوستان میں علم حدیث اور قاضی اطہر (قلمی)

مجھے اس کتاب میں اچھا خاصہ تاریخی و علمی مواد نظر آیا، اس لیے میں نے اردو میں اس کا خلاصہ قلم بند کرلیا، اور آج اسی خلاصہ کو ناظرین معارف کے سامنے پیش کررہا ہوں''[۱]۔

مخدوم شاہ طیب بنارسی- متوفی ۱۰۴۲ھ-:

سب سے پہلے مخدوم شاہ طیب بنارسی کا تذکرہ کیا ہے، اور خاصہ مفصل اور سیر حاصل کیا ہے، جو دس صفحات سے زیادہ پر محیط ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ وہ نسباً فاروقی تھے، ان کا سن ولادت معلوم نہیں ہوسکا، دس سال کی عمر میں ان کے والد شیخ معین الدین کا انتقال ہوگیا، والدہ بقید حیات تھیں، مگر پرورش ان کی پھوپھی نے کی، قرآن پاک کے بعد صَرف ونحو کی تعلیم حاصل کی، پھر جون پور جاکر فقہ واصول کی تعلیم حاصل کی اور علم ظاہر کی تحصیل اسی منزل پر آکر رک گئی۔

شاہ مخدوم نے جون پور میں خواجہ کلاں کے دست حق پرست پر بیعت کی، اور چند ہی بار کی حاضری کے بعد شیخ نے ان کو اجازت نامہ اور پیراہن سے سرفراز فرمایا۔ پہلے منڈواڈیہہ آئے، مگر اطمینان خاطر نصیب نہ ہونے پر قلعۂ بنارس کے قریب گنگا و برنا کے درمیان اپنا حجرہ بنا کر دو تین دوستوں کے ساتھ رہنے لگے۔ بعد میں دہلی جاکر حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے، اُن سے سلسلۂ قادریہ کی اجازت حاصل کی اور ان ہی کے ہاتھ سے خرقۂ قادریہ پہنا۔

شوال ۱۰۴۲ھ میں مخدوم صاحب کا وصال مہ پورہ میں ہوا، وہاں سے نعش مبارک منڈواڈیہہ لائی گئی اور وہیں مدفون ہوئے۔

''تعلیم وتربیت''، ''بیعت''، ''معمولات''، ''طریقِ تربیت''، ''توکل وقناعت''، ''اخلاق وعادات''، اور''قوالی سے پرہیز'' وغیرہ کے عنوانات کے ماتحت ان کی زندگی پر خاصی روشنی ڈالنے کے علاوہ ان کے خلفاومریدین اور جانشین کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

''حضرت مخدوم کے خلفاومریدین'' کے عنوان کے ماتحت لکھا ہے:

> ''مخدوم شاہ طیب کے فیض تربیت سے جو بزرگ مرتبۂ کمال کو پہنچے ان کی تعداد بہت ہے، مگر ان میں دو بزرگ ان کے حقیقی خلیفہ ہیں کہ ان میں سے ہر ایک آفتابِ آسمانِ ہدایت اور قطبِ فلکِ ارشاد ہے''[۲]۔

ان دو بزرگوں میں سے ایک بندگی شیخ ناصر الدین صاحبزادہ مولانا خواجہ کلاں شیخ پوری ہیں، اور دوسرے بندگی میاں شیخ عبدالرشید جون پوری صاحبِ مناظرۂ رشیدیہ ہیں۔ ان خاص خلفا کے علاوہ شاہ مخدوم کے مریدوں میں میاں شیخ عالم، شیخ عبدالمومن کشمیری، شیخ فاضل پھلتی، شیخ حسن اور شیخ عبداللہ مشہدی کا تذکرہ ہے۔

---

(۱) معارف-صفر ۱۳۷۴ھ= اکتوبر ۱۹۵۴ء-ص: ۲۹۳ (۲) ایضاً: ۲۹۹

''مخدوم صاحب کے سجادہ نشیں'' کے عنوان سے لکھا ہے کہ مخدوم صاحب کے ممتاز خلفا میں خود ان کے صاحبزادہ مخدوم شاہ یٰسین بنارسی بھی ہیں، جو اُن کے بعد سجادہ نشیں ہوئے۔

شیخ تاج الدین جھونسوی - المتوفی ۱۰۳۰ھ:-

مخدوم شاہ طیب کے بعد شیخ تاج الدین جھونسوی کا تذکرہ ہے، اور اس کا آغاز یوں کیا گیا ہے:

''ہر چند کہ مخدوم شاہ طیب کو بیعت اور خلافت و اجازت مولانا خواجہ کلاں سے حاصل تھی، مگر چونکہ ان کی تربیت و تکمیل شیخ تاج الدین نے فرمائی تھی، اس لیے وہ ان کو اپنا پیر سمجھتے تھے، اور اپنے کو ان ہی کی طرف منسوب فرماتے تھے''[1]۔

شیخ تاج الدین جھونسوی کا تذکرہ علامہ اعظمیؒ نے تقریباً چار صفحات میں قلم بند کیا ہے، لکھا ہے کہ وہ مولانا خواجہ کلاں کے چچا زاد بھائی تھے۔ فارسی وغیرہ کی تعلیم کے بعد جون پور جا کر 'منار الاصول' تک کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد ایک قوی جذبہ اور داعیہ پیدا ہوا اور جون پور سے شیخ پورہ چلے گئے اور مولانا خواجہ کلاں کی خدمت میں منازلِ سلوک طے کرنے میں مشغول ہو گئے۔

ان کے ''معمولات و اخلاق و عادات'' کا تذکرہ کرنے کے بعد ''شریعت کی عظمت اور بدعت کی بیخ کنی'' کے عنوان کے ماتحت علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''شریعت کا بڑا احترام کرتے تھے، اور سختی سے اس کے پابند تھے، اس دیار میں جو بدعتیں رواج پا گئی تھیں، ان کو یکسر مٹا ڈالا تھا، کہیں اُن کا نام و نشان باقی رہنے نہ دیا تھا''[2]۔

تصنیف و تالیف کا ذوق بھی رکھتے تھے، رد بدعت پر ان کی تصانیف میں ایک رسالہ جلوہ کی حرمت میں تھا، جس کا نام 'قامع الجلوہ محی السنۃ و ماحی البدعۃ' تھا، جس میں تمام رسوم نکاح پر بحث تھی۔ ''علم و فضل'' کے عنوان کے ماتحت علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''باوجودیکہ آپ کی تحصیل منار الاصول سے آگے نہ تھی، مگر تسکینِ جذبہ کے بعد چند روز تک اصول وفقہ و حدیث و تفسیر کی کتابوں کا کما حقہ مطالعہ کیا تھا، اس لیے آپ کی نظر بہت وسیع ہو گئی تھی، حافظہ بہت قوی تھا، اس لیے مضامین ازبر تھے، آپ کے کتب خانہ میں دو تین سو کتابیں تھیں، سب پر ان کو عبور حاصل تھا، تصنیف کا مشغلہ بھی کچھ کچھ تھا، چالیس کے قریب رسائل وغیرہ تالیف فرمائے تھے، ظاہر شرع کی رعایت کمال درجہ ملحوظ خاطر تھی، اس لیے اسرار میں کوئی رسالہ تصنیف نہیں کیا''[3]۔

پھر طریق تربیت اور کچھ خاص مریدین کا تذکرہ کرنے کے بعد آخر میں ''وصال'' کے عنوان سے لکھا ہے کہ ۱۰۳۰ھ میں تریسٹھ سال کی عمر آپ نے وفات پائی اور جھونسی میں گنبد کے باہر دفن ہوئے۔

(۱) معارف: ۳۰۴　(۲) ایضاً: ۳۰۶　(۳) ایضاً: ۳۰۷

مولانا خواجہ کلاں-المتوفی ۱۰۰۴ھ-:

اسد العلما شیخ نصیر الدین شیخ پوری کے صاحبزادے تھے،صَرف ونحواورفقہ واصول کی اکثر کتابیں اپنے والد سے پڑھیں، پھر شاہ پورلونیہ میں افضل الوقت قاضی پیارے کی خدمت میں حاضر ہوکر علوم متداولہ کی تحصیل وتکمیل کی، شیخ حبیب اللہ سجادہ نشیں حضرت شیخ فرید بنارسی سے بیعت ہوئے،مگر تکمیل تربیت والد کے ذریعے ہوئی۔علامہ اعظمیؒ نے ایک صفحے سے کچھ زائد میں ان کے حالات اوراخلاق وعادات تحریر فرمائے ہیں،آپ کا قیام زیادہ تر جھونسی میں رہا کرتا تھا۔اسی سال (۸۰) کی عمر میں انتقال فرمایا،اور جھونسی میں اپنے والد کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

شیخ نصیرالدین-المتوفی ۹۸۰-:

تقریباً دوصفحے میں ان کے احوال سپردقلم فرمائے گئے ہیں،آپ کا لقب اسد العلما تھا،والد کا نام میاں شیخ بڈھ تھا،ان کی پرورش ان کے نانا میاں شیخ کے زیرسایہ ہوئی۔قرآن پاک اور فارسی کی تعلیم کے بعد میاں شیخ نے ان کو دس سال کی عمر میں شیخ فرید بنارسی کی خدمت میں پہنچا دیا،جن کے پاس انھوں نے صرف کی کتابیں پڑھیں، پھر شیخ فرید نے ان کو اپنے حلقۂ مریدین میں داخل کرلیا،بعد میں شیخ فرید نے ان کو اپنے بھتیجے شاہ حسن کے سپرد کردیا،شاہ حسن نے ان کو تحصیل علم کی طرف متوجہ کیا،چنانچہ شیخ نصیر جون پور جاکر تحصیل علم میں مشغول ہوگئے۔ فراغت کے بعد شاہ حسن نے ان کو اذکار کی تلقین کی اوراجازت وخلافت عطا کر کے جھونسی میں مشغول بیادِحق ہونے اور خلق خدا کو فائدہ پہنچانے کی ترغیب دی،اوروہ جھونسی میں کچا حجرہ بنوا کر رہنے لگے۔

شاہ حسن داود بنارسی-متوفی ۹۰۰ھ-:

آپ جید عالم تھے،اورصرف میں ایک رسالہ 'مرغوب الطالبین' لکھا ہے،نحو میں بھی آپ کا ایک رسالہ ہے، اکثر کتب متدوالہ اپنے چچا شیخ فرید سے پڑھیں،فراغت کے بعد ایک مدت تک مصروف درس وتدریس رہے، بعد میں یہ مشغلہ چھوڑ کر تمام تر تزکیۂ نفس،تصفیہ باطن اورمجاہدات وریاضات میں لگ گئے،قلعۂ بنارس کے کنارے ایک حجرہ بنوا کر تنہا اسی میں رہتے تھے،آخر وقت میں علوی پورہ میں بھی ایک حجرہ بنالیا،جس میں سات سال قیام کیا۔۴؍جمادی الاولی ۹۰۰ھ کو فرنگیوں کے حملے میں شہید ہوئے۔

شیخ فرید بنارسی-متوفی ۹۰۶ھ-:

شیخ فرید کے والد شیخ قطب بن خلیل موضع خانقاہ-ضلع غازی پور-میں سکونت پذیر تھے،ان کی وفات کے بعد شیخ فرید اوران کے بھائی شیخ داود بغرض تحصیل علم بنارس گئے،اور شیخ موسی فردوسی کی خدمت میں حاضر ہوئے، شیخ موسیٰ نے ان کو علوم ظاہری وباطنی کے لیے خواجہ مبارک کے پاس بھیج دیا،شیخ فرید نے تحصیل علم سے فارغ ہوکر

خواجہ مبارک کے ہاتھ پر بیعت کی، برسوں کے بعد خواجہ مبارک نے ان کو تلقین کی اجازت دی اور اپنا خرقۂ خاص پہنایا۔ خلافت پانے کے بعد وہ مرجع خلائق بن گئے، تاہم پیر کی صحبت کبھی ترک نہ کی اور تا زندگی ان سے جدا نہ ہوئے۔

خواجہ مبارک کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق برابر درس دیتے رہے، اکثر بعد ظہر سبق پڑھاتے، باقی اوقات عبادت وغیرہ میں گذارتے۔

۹۰۶ھ میں شیخ فرید ایک کام سے چنار گئے ہوئے تھے، وہاں سے کشتی پر واپس آرہے تھے، ملاح کی شرارت اور حاکم چنار کی سازش سے کشتی ڈوب گئی، اور شیخ فرید اپنے بھائی داود کے ساتھ غرقاب ہو گئے اور شہادت کا مرتبہ پایا۔

خواجہ مبارک بنارسی:

بڑے جید عالم تھے، ابتدا میں درس وتدریس کا مشغلہ تھا، اور اس میں ان کو اپنے ہم عصروں پر خاص تفوق حاصل تھا، خواجہ محمد عیسی جون پوری کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی، اور چند ہی دنوں کے بعد خواجہ نے ان کو خرقۂ خاص اور تلقین کی اجازت دے کر بنارس روانہ کیا۔ جون پور سے آنے کے بعد خواجہ مبارک نے شرح وقایہ وغیرہ کتبِ متداولہ کا درس ترک کر دیا اور کلیۃً یادِ حق میں مشغول ہو گئے، لیکن جب کوئی طالبِ حق آتا، تو پہلے اس کو علوم ظاہری تعلیم فرماتے اس کے بعد طریق تصوف سکھاتے۔

علامہ اعظمی نے لکھا ہے کہ خواجہ مبارک کا سن وفات معلوم نہیں ہو سکا، لیکن یہ یقینی ہے کہ نویں صدی ہجری کے آخر میں یا ۹۰۶ھ سے پہلے وفات ہوئی ہے، مزار راج گھاٹ - کاشی - اسٹیشن کے قریب گرانڈ ٹرنک روڈ سے دکھن کچھ فاصلہ پر ایک احاطہ میں ہے۔

آپ کے خلفا میں شیخ فرید کے علاوہ شیخ سعد اللہ بنارسی اور شیخ بڈھ حقانی جون پوری تھے۔

مخدوم محمد عیسی تاج قدس سرہ - المتوفی ۸۷۰ھ -:

محمد بن عیسی بن تاج الدین بن بہاء الدین جون پور کے اکابر مشائخ ومشاہیر اولیا میں ہیں، اور مخدوم محمد عیسیٰ تاج کے نام سے مشہور ہیں، شیخ عبد الحق دہلوی نے آپ کی نسبت لکھا ہے کہ هو مِمَّنْ يُتَّفق عَلَى وِلايَته وَعَظمَته و كَرَامَته۔ ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے شاگرد رشید تھے، یادِ حق میں بالکلیہ مستغرق اور دنیا واہل دنیا سے قطعی بے نیاز تھے۔

حضرت مخدوم کی وفات ۸۷۰ھ میں ہوئی اور جون پور میں مدفون ہوئے۔ شیخ عبد الحق محدث نے 'اخبار الاخیار' میں اور شیخ عبد الرحمٰن چشتی نے 'مرآۃ الاسرار' میں آپ کے حالات لکھے ہیں، اور شیخ غلام غوث جون پوری اور شیخ مصطفیٰ جون پوری نے آپ کے حالات میں مستقل رسالے لکھے ہیں۔

علامہ اعظمی کا یہ مضمون ماہنامہ 'معارف' کے دو شماروں اکتوبر و نومبر ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا۔

تصحیح واستدراک

بسلسلہ 'پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں'

یہ 'پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں' والے مضمون میں بعض اغلاط اور فرگزاشتوں کی تصحیح اور استدراک ہے، جو معارف جنوری ۱۹۵۵ء = جمادی الاولی ۱۳۷۴ھ میں شائع ہوا ہے، ذیل میں پورا مضمون بعینہٖ نقل کیا جارہا ہے:

''۱- اس مضمون میں شاہ یٰسین کو میں نے حضرت مخدوم شاہ طیب کا فرزند اس بنیاد پر لکھ دیا تھا کہ تذکرہ کی بعض کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہے، مثلاً 'بحر زخار' میں ہے:

''شاہ یسین خلف وخلیفہ شاہ طیب............مناقب العارفین نام کتاب در احوال اولیا جمع نمودہ''۔

لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ ان کے پروردہ ضرور تھے، مگر ان کے بیٹے نہیں تھے، اُن کے والد کا نام شیخ احمد تھا، اور وہ بندگی شیخ اوجھڑ صدیقی جون پوری کی اولاد میں سے تھے، سلسلۂ نسب اس طرح پر ہے:

شاہ یسین بن شیخ احمد بن شیخ محمد بن شیخ عبدالرحیم بن بندگی شیخ اوجھڑ۔ شاہ یسین کا مزار جھوسی میں شیخ نصیرالدین اسدالعلماء کے روضہ کے اندر ہے۔ ملاحظہ ہو سمات الاخیار، ص: ۶۸۔

۲- ایک جگہ میں نے شاہ یسین کے کڑہ جانے اور وہاں شیخ جمال اولیا کی خدمت میں ان کی تحصیل علم کا ذکر کیا ہے، یہاں کڑہ کے بجائے کوڑہ صحیح ہے۔ غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ فارسی کی قلمی کتابوں میں کڑہ اور کوڑہ دونوں کو کرّہ لکھا جاتا ہے، مگر پہلے کو کَرَہ پڑھا جاتا ہے اور دوسرے کو کُرَّہ، ابتداء مجھ کو تنبہ نہیں ہوا، اور 'مناقب العارفین' میں لفظ کرہ دیکھ کر اس مضمون میں اس کو کڑہ لکھ دیا، بعد میں تنبہ ہوا کہ جمال اولیا کا وطن تو کوڑہ (جہان آباد) تھا، اور وہی اُن کی جائے اقامت تھی، جیسا کہ تقصار- ذکر میر سید محمد کالپوری- وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے، اس لیے تصحیح کی ضرورت پیش آئی، کوڑہ کو بحر زخار میں اس شکل سے لکھا ہے کُرّہ، ملاحظہ ہو بحر زخار قلمی نسخہ فرنگی محل ذکر شیخ سالار بدھ کُرّوی۔

۳- اسی طرح میں نے شیخ سالار بڈھ کو ساکن کڑہ لکھا ہے، یا یہ لکھا ہے کہ اُن کا مزار کڑہ (مانک پور) میں ہے۔ وہاں کڑہ کے بجائے کوڑہ (جہان آباد) ہونا چاہئے، بحر زخار میں ہے کہ شیخ سالار بڈھ کی وفات ۹۴۶ھ میں ہوئی، اور کُرّہ (کوڑہ) کے چکلہ میں ان کا مزار ہے، اور مناقب العارفین میں ہے کہ:

''بر عوارف شرحے خوب نوشتہ''

۴- 'مناقب العارفین' میں شاہ حسن کے سال وفات کا جہاں ذکر ہے، وہاں تسع مائۃ تو بالکل صاف ہے، اس سے پہلے کے الفاظ مشکوک ہیں، اس لیے میں نے اُن کا سال وفات ۹۰۰ھ لکھ دیا ہے، لیکن شیخ فرید کے حال میں شاہ یٰسین نے لکھا ہے کہ ان کی وفات شاہ حسن کے تھوڑے ہی دن بعد ہوئی ہے، اس لیے صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ حسن کا واقعۂ شہادت بھی ۹۰۶ھ میں پیش آیا، 'مناقب العارفین' میں اس مقام پر بھی کاتب کے تصرف سے

عبارت منحرف ہوگئی ہے، ورنہ بات بالکل صاف ہوجاتی۔

تنبیہ: — مولانا سید عبدالحی ناظم ندوہ نے 'نزہۃ الخواطر' جلد چہارم میں غالباً گنج ارشدی کے حوالہ سے اور صاحب 'بحر زخار' نے بھی شاہ حسن کا سال وفات ۹۶۰ھ لکھا ہے، مگر یہ قطعاً غلط ہے؛ اس لیے کہ دونوں بزرگوں نے شیخ فرید کا سال وفات ۹۰۶ھ لکھا ہے، اور شاہ یٰسین نے تصریح کی ہے کہ شاہ حسن کی وفات شیخ فرید کی زندگی میں ہوئی ہے''۔

☆......☆......☆......☆......☆

بسلسلۂ 'قافلۂ اہل دل'

ماہنامہ 'الفرقان' لکھنؤ کے ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۷۴ء مطابق شعبان، رمضان، شوال ۱۳۹۴ھ کے تین شماروں میں مشہور عالم دین مولانا نسیم احمد فریدی امروہویؒ کا 'قافلۂ اہل دل' کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں انھوں نے حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے جانشیں اور خلیفہ حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ-متوفی ۱۲۴۰- کے خلفاء کے حالات قلم بند فرمائے تھے۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنے اس مضمون میں مولانا فریدی مرحوم کے اسی مضمون پر کچھ اضافہ اور استدراک کیا ہے، جو ایک مکتوب کی صورت میں مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمۃ کے پاس روانہ کیا گیا تھا، اس کے آغاز میں لکھا ہے:

''مولانا نسیم احمد فریدی نے اہل اللہ کے سوانح ومکاتیب وغیرہ سے متعلق مضامین کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے، بہت مرغوب خاطر ہے''۔

مولانا فریدی نے شمارۂ شعبان کے صفحہ ۱۲ پر حاشیہ میں حضرت شاہ ابوسعید مجددی کے رسالہ 'ہدایۃ الطالبین' کے بعض قلمی نسخوں کی نشاندہی کی تھی، اس کے بعد لکھا تھا:

''معلوم نہیں کہ یہ رسالہ طبع ہوکر شائع ہوا یا نہیں''۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کی بابت تحریر فرمایا:

''حضرت شاہ ابوسعید مجددی کا رسالہ 'ہدایۃ الطالبین' مدت ہوئی مطبع مجتبائی دہلی میں طبع ہوا تھا، رسالہ کے اول یا آخر میں سنہ طباعت مذکور نہیں ہے''۔

اسی شمارے کے صفحہ ۱۷ کے ایک حاشیہ میں کتابت کی غلطی سے حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ کا سنہ وفات ۱۳۲۶ھ درج ہوگیا تھا۔ علامہ اعظمیؒ نے اس کی نسبت لکھا کہ غالباً کتابت یا طباعت کی غلطی ہے، صحیح یہ ہے کہ ۱۲۹۶ھ میں وفات ہوئی۔

صفحہ ۱۸ کے حاشیہ میں حضرت شاہ سعد اللہ کا سنہ وفات تاریخ دکن کے حوالے سے ۱۲۷۱ھ لکھا گیا تھا، علامہ اعظمیؒ نے مولانا وکیل احمد سکندر پوری کی 'ہدیہ مجددیہ' اور مولوی خلیل الرحمٰن برہان پوری کی 'تاریخ برہان پور'

کے حوالے سے صحیح سن وفات ۱۲۷۰ھ قرار دیا ہے۔ جس کا پختہ ثبوت یہ ہے کہ مولوی خلیل الرحمٰن صاحب نے ''بفردوس دلبر رفت'' سے تاریخ وفات نکالی ہے، جس کے اعداد ۱۲۷۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔

علامہ اعظمیؒ نے 'ہدیہ مجددیہ' کے حوالے سے حضرت شاہ سعد اللہ کے تذکرے میں مولانا فریدی کے مضمون پر خاصا اضافہ بھی کیا ہے۔

خود حضرت شاہ غلام علی کے بارے میں بھی بعض بیش قیمت معلومات کا اضافہ کیا ہے، ان کے نام کی نسبت لکھا ہے:

''جس عالی شان بزرگ کے خلفاء کا ذکر ہو رہا ہے، ولادت کے بعد ان کا نام ان کے پدر بزرگوار نے ''علی'' رکھا تھا، بڑے ہونے پر خود صاحبِ نام نے اپنے کو ''غلام علی'' کے نام سے مشہور کیا، حضرت شاہ عبدالغنی فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ غلام علی صاحب کے چچا بڑے بزرگ شخص تھے، انھوں نے آنحضرت ﷺ کے (منامی) حکم سے ان کا نام عبداللہ رکھا تھا (ضمیمہ مقامات مظہری، ص:۲)۔

اسی لیے حضرت شاہ صاحب اپنے کو عبداللہ یا فقیر عبداللہ معروف بہ غلام علی یا عرف غلام علی لکھا کرتے تھے۔ اطمینان کے لیے مقامات مظہری ص ۳، ایضاح الطریقہ ص ۲ و ص ۳۶ وغیرہ دیکھئے''۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنے مضمون کو ایک غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے ختم کیا ہے، لکھا ہے:

''بعض عزیزوں نے ایک قلمی کتاب کے آخر میں (بید اضعف العباد شیخ غلام علی عفا اللہ عنہ) لکھا ہوا دیکھ کر جو یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ یہ کتاب حضرت شاہ علی قدس سرہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، صحیح نہیں ہے؛ شیخ غلام علی کوئی اور بزرگ ہیں، حضرت شاہ غلام علی کی تواضع اور کسر نفس کے پیش نظر یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے قلم سے اپنے کو شیخ غلام علی لکھیں گے''۔

☆......☆......☆

سیف و قلم

یہ علامہ اعظمیؒ کا ایک اہم علمی اور ادبی و تاریخی مضمون ہے، جس میں چند ایسے مسلمان فرمانرواؤں کا تذکرہ ہے، جنھوں نے مالک تخت و تاج ہونے کے ساتھ گلشن علم و حکمت کی آبیاری اور لیلائے شعر و ادب کی آرائش گیسو بھی کی ہے، بعض ایسے ملوک و سلاطین کے حالات زندگی ہیں جنھوں نے کشور کشائی اور حکمرانی کے ساتھ علم و فن کی سرپرستی اور نگہبانی کی ہے، علامہ اعظمیؒ نے اس مضمون کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے:

''دنیا کی کسی قوم میں خواہ مُردہ ہو یا زندہ، تاجداران بے علم یا علماء بے تاج کی کوئی کمی نہیں ہے، لیکن ایسے افراد جو مادی دولت کے ساتھ روحانی دولت کے بھی مالک ہوں، اعضاء و جوارح کے علاوہ اپنی نوع کے دل و دماغ پر بھی یکساں حکومت کرتے ہوں، خال خال پائے جاتے ہیں۔ یہ خصوصیت

نمایاں طور پر اگر کسی قوم میں نظر آ سکتی ہے، تو وہ مسلمان اور صرف مسلمان ہیں''[۱]۔

اس کے بعد سرسری طور پر خلفاء راشدین، عمر بن عبد العزیز، اور مامون عباسی وغیرہ کے دور کی علمی وروحانی سرگرمیوں اور ترقیوں اور ان کی شہرت وناموری کا ذکر کرتے ہیں، پھر دوسرے اہل علم وفن حکمرانوں کے علمی ذوق وشوق کے بارے میں مسلمانوں کی ناواقفیت کا یوں گلہ کرتے ہیں:

''لیکن جس طرح ان دو (یعنی عمر بن عبد العزیز اور مامون) فرمانرواؤں کے علمی کمالات سے بہت کم لوگ ناواقف ہوں گے، اسی طرح دوسرے تاجداران اسلام کے علمی فضائل وادبی خصوصیات کا بہت کم لوگوں کو علم ہوگا''[۲]۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد اپنے مضمون کے دائرۂ کلام کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''ہم چاہتے ہیں کہ قارئین 'دارالعلوم' کو ایسے صاحبِ سیف وقلم فرماں روایانِ اسلام سے روشناس کرائیں، لیکن اس سلسلہ میں خلفاء راشدین، حضرت عمر بن عبد العزیز اور مامون عباسی کا ذکر ہم قصداً نہ کریں گے، اس لیے کہ ان کے حالات میں مستقل متعدد تصنیفات شائع ہو چکی ہیں؛ اور بجائے ان کے اہل علم وصاحب کمال وزراء کا اضافہ کر کے ایک حد تک اِسی کمی کو پورا کریں گے''[۳]۔

☆ **عبد الملک بن مروان:** تمہیدی سطروں کے بعد سب سے پہلے عبد الملک بن مروان کا تذکرہ ہے، اور خلافت ملنے سے پہلے اس کی عبادت وریاضت اور زہد وتقویٰ کے ذکر کے ساتھ اس کے علمی شغف، قرآن کریم کی تلاوت کے ساتھ اس کا حد درجہ اہتمام، اور حدیث وفقہ میں اس کے انہماک اور مقام ومرتبہ کا تذکرہ کیا ہے۔ بعد ازاں اس کی شاعری کے نمونے کے لیے چار اشعار نقل کیے ہیں، اس کے بعد ''زبان دانی'' کا ایک ذیلی عنوان قائم کر کے اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''عربیت وزبان دانی میں اس کو بے حد قدرت ومہارت تھی، اس کا شمار ان چار شخصوں میں تھا، جن سے بولنے کے ضروری مواقع تو الگ رہے، ہنسی مذاق میں بھی زبان دانی سے متعلق کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی: امام شعبی، عبد الملک، حجاج بن یوسف، ابن القریہ''[۴]۔

اس کے بعد عبد الملک کے کمال عربیت اور اس کے بیٹے ولید کی اس سے ناواقفیت کو اس عبرت خیز انداز میں ذکر کرتے ہیں:

''نحو دانی وصحت اعراب کا اس کو اس درجہ اہتمام تھا کہ اپنے بیٹے ولید کو صرف اس وجہ سے کہ وہ نحو نہ جانتا تھا، جانشینی وولیعہدی کا اہل نہیں سمجھتا تھا۔ زمانہ کی نیرنگ سازی دیکھئے کہ باپ فصاحت وبلاغت کا تو وہ عالم تھا، اور بیٹے کی جہالت کا یہ حال کہ منبر نبویؐ پر خطبہ دینے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو کہتا ہے: یا أهلُ المدينة، قرآن کی آیت تلاوت کرتا ہے تو وہ بھی غلط''[۵]۔

(۱) دارالعلوم، ج ۱۳، ش ۱، ص: ۲۰ (۲) ایضاً: ۲۰ (۳) ایضاً: ۲۰ (۴) ایضاً: ۲۲ (۵) ایضاً: ۲۲

عبدالملک کے تذکرے ہی میں ضمناً عراق کے اس کے گورنر کی ادب شناسی اور سخنوری کا بھی تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے:

''عبدالملک جس پایہ کا ادیب وسخن داں تھا، حجاج جو عبدالملک کی جانب سے عراق کا گورنر تھا وہ بھی اس سے کسی طرح کم نہ تھا، اور صرف ادیب ہی نہیں، بلکہ حافظ قرآن، اور دوسرے علوم سے بھی واقف تھا؛ لیکن اس کی سفاکی وخونریزی اور ظلم وستم کے خونیں واقعات نے ان تمام خوبیوں پر پردہ ڈال دیا۔ عبدالملک نے دمشق میں ۱۵ / شوال ۸۶ ہجری میں وفات پائی''(۱)۔

☆ **ولید ثانی:** عبدالملک کے بعد اس کے پوتے ولید ثانی کا تذکرہ ہے، اس کی مذہبی واخلاقی کمزوریوں اور اس کی سیہ کاری وہوس پرستی کے ساتھ اس کے شعر وادب اور فصاحت وبلاغت کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے:

''ولید میں جہاں اتنی برائیاں تھیں، وہاں چند کمال بھی تھے، مورخین متفق اللفظ ہیں کہ خلفاء بنو امیہ میں بلحاظ کمال ادبیت وفصاحت اور بلحاظ مہارت عربیت وسخنوری کوئی اس کا ہمسر نہ تھا''(۲)۔

اس کے بعد نمونہ کے لیے اس کے چند اشعار بھی نقل کیے ہیں۔

☆ **منصور عباسی:** تیسرا اور آخری تذکرہ منصور عباسی کا ہے، اور یہ پہلے دونوں تذکروں کی بہ نسبت طویل ہے، جو چار صفحات پر مشتمل ہے، سب سے پہلے اس کے نام ونسب کا ذکر ہے، اور اس کی نسبت یوں مرقوم ہے:

''سلسلۂ عباسیہ کا دوسرا حکمراں تھا، اور ترجمانِ قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا پڑپوتا تھا، منصور لقب ہے نام ونسب یہ ہے: عبداللہ بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس۔ منصور ایک بربری کنیز سلامہ کے بطن سے ۹۵ھ میں پیدا ہوا''(۳)۔

بعد ازاں اس کی تعلیم وتربیت کا بیان ہے، پھر اس کی تخت نشینی کا عنوان بیان ہے، جو ۱۳۷ھ میں عمل میں آئی، پھر اس کے علم وادب اور فضل وکمال کا تذکرہ ہے، اس کے بعد ''ذوق علمی اور تراجم'' کا عنوان ہے، جس میں اس کے علمی ذوق اور شغف کے ساتھ اجنبی زبانوں کی کتابوں کو عربی میں منتقل کرانے کے اس کے اہتمام کا بیان ہے، اور لکھا ہے کہ کلیلہ دمنہ، اقلیدس، ارسطو کی منطقی تصنیفات اور فن ہیئت میں بطلیموس کی کتابوں کا عجمی زبانوں سے عربی میں ترجمہ اسی کے عہد خلافت میں ہوا۔ علامہ اعظمیؒ نے اس ضمن میں لکھا ہے:

''عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ فلسفہ کی اشاعت اور اجنبی کتابوں کے تراجم کی ابتدا مامون عباسی کے عہد حکومت میں ہوئی، اور اس میں اولیت کا شرف مامون ہی کو حاصل ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ فلسفہ کی عام اشاعت اور تراجم کی کثرت، اس کا تنوع مامون ہی کے عہد میں حاصل ہوا، اور اس جنس کی اتنی بہتات ہوئی کہ بغداد کے علمی بازاروں میں کوڑیوں کے مول بکنے لگی؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی داغ بیل منصور ہی نے ڈالی تھی، اور مامون نے منصور ہی کے لگائے ہوئے پودوں کی آبیاری کر کے

(۱) دارالعلوم، ج ۱۳، ش ۱، ص: ۲۲ (۲) ایضاً: ۲۲ (۳) ایضاً: ۲۳

اس کی محنت و کاوش کو بارآور کیا‘‘(۱)۔

اس کے بعد ایک عنوان ہے: ’’**منصور کا عہد خلافت اور تدوین علوم**‘‘ اور اس کے ماتحت حدیث پاک اور دوسرے علوم وفنون مثلاً نحو ولغت کی تدوین کا ذکر ہے، اور اس عنوان کے آخر میں مرقوم ہے:

’’یہاں پہنچ کر مجھے یہ ظاہر کر دینا چاہئے کہ تدوین علوم کا آغاز منصور کے اشارہ سے یا اس کی سرپرستی میں نہیں ہوا تھا، فلسفہ اور نجوم کی اشاعت ہوتے ہوئے دیکھ کر، بلکہ بطور خود علماء اسلام نے اس کی ضرورت محسوس کی اور جو کچھ ان سے ہوسکتا تھا، کیا؛ منصور کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا، بجز اس کے کہ محض بخت واتفاق سے اسلام کی یہ خدمت جلیلہ منصور کے عہد خلافت میں انجام پذیر ہوئی، اور اسی تقریب سے ہم نے منصور کے حالات میں اس کا ذکر کر دیا، اس تصریح سے ہمارا مقصود صرف اظہار واقعہ ہے‘‘(۲)۔

اس کے بعد ’’**منصور کے زریں کارنامے**‘‘ کے عنوان سے اس کے عہد کی فتوحات کا بیان ہے، پھر ’’**منصور کے عام حالات**‘‘ کے تحت اس کی حق پرستی، عدل گستری اور بردباری کے کئی واقعات تحریر فرمائے ہیں، اور آخر میں ’’شاعری‘‘ کا عنوان لکھ کر اس کی سخن وری اور موزونی طبع کا ذکر ہے، اور اس کے دوشعر بھی بطور نمونہ کے مذکور ہیں، علامہ اعظمیؒ نے منصور کے تذکرہ اور اپنے مضمون کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے:

’’منصور سے باقتضائے بشریت بعض ایسی حرکتیں بھی سرزد ہوئی تھیں، جن کو سن کر اسی قدر تکلیف ہوتی ہے، جتنی اس کے علم وانصاف کے واقعات پڑھ کر مسرت ہوتی ہے، حضرت امام اعظمؒ، حضرت سفیان ثوریؒ کو قید وبند کی تکلیف دینا، ابن عجلان وغیرہ کو کوڑے لگوانا اس کے دامن شہرت پر بدنما دھبہ ہے۔

منصور نے بماہ ذی الحجہ ۱۵۸ھ بیر میمونہ میں وفات پائی‘‘(۳)۔

علامہ اعظمیؒ کا یہ مضمون ماہنامہ ’دارالعلوم‘ میں اپریل ۱۹۵۷ء کے شمارے میں اشاعت پذیر ہوا۔

☆......☆......☆......☆......☆

علم وفضل میں خواتین کا حصہ

اس مضمون کی تمہید میں علامہ اعظمیؒ نے مسلم خواتین کے تعلیم وتعلُّم کے ساتھ اشتغال، اس کے اندر ان کے انہماک، ان کے علمی شغف اور ان کے ہاتھوں عالمِ وجود میں آنے والے علمی ودینی کارناموں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی ہے، اس تمہید کے اختصار اور جامعیت کا یہ حال ہے کہ تقریباً ڈیڑھ صفحے میں عہد صحابہ، عہد تابعین اور بعد کے زمانے کی خواتین کی علمی سرگرمیوں کو سمیٹ دیا ہے۔

---

(۱) دارالعلوم، ج ۱۳، ش ۱، ص: ۲۴ (۲) ایضاً: ۲۵ (۳) ایضاً: ۲۷

اس کے بعد چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کی چند نامور اور ممتاز خواتین کا تذکرہ کیا ہے، جو علم وفضل بالخصوص علم حدیث اور روایتِ حدیث میں نمایاں مقام رکھتی تھیں، اس مضمون میں جن خواتین کا تذکرہ وتعارف کرایا گیا ہے، وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱-بلقیس بنت سلیمان-ت ۵۹۲-:مشہور وزیر اور شافعی عالم نظام الملک طوسی کی پوتی تھیں۔

۲-تمنی بنت عمرو-ت ۵۹۳-: شیخ ابوحفص طیبی کی صاحبزادی تھیں، ابوالمظفر کرخی سے حدیث حاصل کی۔

۳-ام الحیاۃ فخر النساء فرحہ-ت ۵۹۸-: حافظ ابوالقاسم سمرقندی سے حدیث سنی، ان سے حافظ منذری کو اجازت حاصل تھی۔

۴-ام الحسن شمائل-ت ۵۹۸-:امام ابومنصور جوالیقی کی صاحبزادی اور ان کے علوم کی وارث تھیں۔

۵- زینب بنت امام صدر الاسلام-ت ۵۹۷-: اپنے والد ابوطاہر اسکندرانی سے حدیث سنی، خراسان، اصفہان اور بغداد کے بڑے بڑے محدثین سے ان کو روایتِ حدیث کی اجازت حاصل تھی۔

۶- تاج النساء امۃ الکریم -ت ۶۱۳-: شیخ عبدالقادر جیلانی کی بہو اور قاضی القضاۃ ابوصالح کی والدہ تھیں۔

۷-ست العرب حلل-ت ۶۱۳-: ابوالقاسم بن البنّاء سے حدیثیں سنیں، پھر اس امانت کو دوسروں تک پہنچایا۔

۸- الشیخۃ الصالحۃ ام المؤید-ت ۶۱۵-: ابوالقاسم صوفی کی صاحبزادی تھیں، عبدالغافر فارسی، حافظ منذری، اور علامہ زمخشری جیسے ائمۂ علم سے ان کو اجازت حاصل تھی۔

۹-فاطمہ جوزدانیہ-ت ۵۲۴-: اپنے وقت کی نہایت بلند پایہ راویۂ حدیث تھیں، امام طبرانی کی معجم کبیر ومعجم صغیر کو ان کے شاگرد ابن ریذہ سے انھوں نے روایت کیا ہے، اور ان کے واسطے سے ان کتابوں کو تمام بڑے بڑے محدثین وحفاظ روایت کرتے ہیں۔

۱۰- فاطمہ بنت علی مُقرِیہ-ت ۵۳۲-: ابوالحسین فارسی سے صحیح مسلم اور غریب الخطابی روایت کی ہے، قرأت کی ماہر تھیں۔

۱۱- فاطمہ بنت سعد الخیر-ت ۶۰۰-: جوزدانیہ وغیرہا کی شاگرد تھیں، طبرانی کے دونوں معجم ان سے روایت کرتی ہیں۔

۱۲-ام البہاء فاطمہ بنت محمد-ت ۵۳۹-: عورتوں میں وعظ کہتی تھیں، مسندۂ اصبہان کہلاتی تھیں۔

۱۳-خاصہ بنت مبارک-ت ۵۸۵-: یہ بھی واعظہ تھیں۔

۱۴-صفیہ بنت عبدالکریم -ت ۶۰۲-: ان کو الشیخۃ الاصیلۃ کہا جاتا تھا، ان کے والد اور دادا بھی محدث تھے۔

۱۵- ست الکتبۃ نعمۃ - ت ۶۰۴ -: ان کو الشیخۃ الصالحۃ ست الکتبہ کہا جاتا تھا، ان کے باپ دادا اور پردادا کے علاوہ ان کے بھائی اور دو بہنیں بھی محدث تھیں۔

۱۶- ام ہانی عفیفہ - ت ۶۰۶ -: فاطمہ جوزدانیہ وغیرہا سے حدیث سنی، اور کہا جاتا ہے کہ پانچ سو سے زیادہ مشائخ سے روایت حدیث کی اجازت حاصل تھی۔

۱۷- شُہدہ کاتبہ - ت ۵۷۴ -: الکاتبۃ المُسنِدۃ فخر النساء، چھٹی صدی ہجری کے نصف اخیر میں شاید سب سے زیادہ نامور اور بافیض محدثہ تھیں، نہایت خوشخط، دیندار اور عبادت گزار تھیں، داد و دہش ان کا شیوہ تھا۔

۱۸- کریمہ مروزیہ - ت ۴۶۳ -: پانچویں صدی کی نامور خاتون ہیں، صحیح بخاری کے معتمد راویوں میں ایک ہیں، صحیح بخاری کو کشمیہنی سے روایت کیا ہے، باوجودیکہ انھوں نے شادی نہیں کی تھی، مگر ان کی کنیت ام الکرام تھی۔

۱۹- کریمہ بنت عبدالوہاب - ت ۶۴۱ -: مسندۃ الشام کے لقب سے ملقّب تھیں، کثرت سے حدیثیں روایت کی ہیں۔

☆......☆......☆......☆......☆

اسلام اور صنف نازک

متوسط سائز کے آٹھ صفحات پر یہ ایک مختصر مضمون ہے، اس کے مشمولات خود اس کے عنوان اور سرنامے سے ظاہر ہیں، اس کی ابتدائی سطروں میں علامہ اعظمیؒ نے شعاع اسلام پھوٹنے سے پہلے نہ صرف عرب بلکہ دنیا کی دینی، اخلاقی اور معاشرتی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس کے بعد اسلام کی آمد، اس کے فیوض و برکات کا شیوع و عموم اور آنحضرت (ﷺ) کی رحمۃ للعالمینیت کا تذکرہ کیا ہے۔

اسلام کمزور طبقات کے ساتھ بطور خاص جس رحمت و محبت، اور ہمدردی و مہربانی کا مظاہرہ کرتا ہے، اس سلسلے میں اسلام جو تعلیم پیش کرتا ہے، اس کا اختصار و جامعیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔

اس کے بعد عورتوں کے ممتاز حقوق، اور ان کے ساتھ اسلام کی خصوصی مراعات، ان کے ساتھ نرمی اور مروت سے پیش آنے کے متعلق جو شریعت کی تعلیم اور اسلام کے احکام ہیں، اس کے بارے میں قرآن و حدیث میں جو نصوص ہیں، ان کو قیدِ تحریر میں لاکر اپنے دعوے کو بدلائل و براہین ثابت کیا ہے۔

یہ مضمون کلکتہ سے شائع ہونے والے رسالے 'المومن' میں صفر - جمادی الاولی ۱۳۴۳ھ = ستمبر - دسمبر ۱۹۲۴ء کے کئی شماروں میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ دوبارہ 'المآثر' جلد ۱۶ شمارہ ۳ و ۴ میں شائع کیا گیا۔

☆......☆......☆

☆......☆

مخطوطات و مسوّدات
کی
چند عکسی تصاویر

علمی و تحقیقی نگارشات

في التنفل بعد الوتر

(وتر کے بعد کی نفل نماز کے بارے میں)

مولانا محمد ابراہیم بنارسی - متوفی ۲۳؍صفر ۱۳۸۶ھ =۱۳؍جون ۱۹۶۶ء - بنارس کے ایک جید اور ممتاز عالم تھے، عمر میں علامہ اعظمیؒ سے بڑے تھے، مگر آپ کی علمی عظمت و بلندی کے معترف اور قدرداں تھے، اور علمی مسائل میں آپ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے، ۴؍رمضان المبارک ۱۳۴۹ھ =۲۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو انھوں نے علامہ اعظمیؒ کو خط لکھ کر وتر کے بعد کی نفل نماز کے متعلق اپنے کئی اشکالات پیش کیے۔

پہلا اشکال یہ تھا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی آخری نماز وتر ہوتی تھی۔

دوسرا اشکال یہ تھا کہ روایات میں ما زالُ کا لفظ آیا ہے، جبکہ بعد الوتر نفل آپ نے ایک دو مرتبہ پڑھی ہے، پھر ما زالت کا مفہوم کیا ہے؟

وتر کے بعد کی نفل جالساً افضل ہے یا قائماً؟

علامہ اعظمیؒ نے تیسرے سوال کا جواب پہلے دیا اور تفصیلی گفتگو فرماتے ہوئے لکھا کہ ان دو رکعتوں کو بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے، اور اپنے اس رجحان کی تائید میں متعدد احادیث پیش کیں، پہلی حدیث حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ہے، جو صحیح مسلم ۱/۲۵۶ و ۲۵۴، ابوداود ۱/۱۶۵، اور طحاوی شریف ۱/۱۶۶ وغیرہ میں مذکور ہے۔

دوسری حدیث حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی ہے، جو مسند احمد اور طحاوی وغیرہما میں ہے۔

تیسری حدیث حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی ہے، جو ابن ماجہ میں مذکور ہے۔

رہا ان دونوں رکعتوں کے ثبوت کا مسئلہ، تو حضرت عائشہؓ کی حدیث میں ما زالت اور لم تزل کا لفظ آیا ہے، اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کی صلاۃ اللیل کا تذکرہ ہے، اور اسی میں وتر کے بعد دو رکعت پڑھنے اور بیٹھ کر پڑھنے کا تذکرہ ہے، اور یہ مقولہ حضرت عائشہؓ کا ہے، جنھوں نے آنحضرت ﷺ کی نمازوں کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہے۔

وتر کے بعد نفل نماز کا ثبوت حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتا ہے، جو طحاوی ۱/۲۰۲، اور مشکوٰۃ ص ۱۰۵ بحوالہ دارمی مذکور ہے۔

اسی طرح اس کی تائید حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے، جو طحاوی ۱/۲۰۲ میں مروی ہے۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث جو طحاوی ۱/۲۰۳، التلخیص الحبیر ص ۱۱۷، اور مشکوٰۃ ص ۱۰۵ میں بحوالہ احمد وطبرانی مذکور ہے، اس سے بھی اس کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث جو طحاوی ۱/۱۶۹ میں مروی ہے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ وتر کے بعد کی نفل نماز کے ثبوت کو تسلیم کرنے کی صورت میں اس حدیث سے تعارض ہورہا ہے، جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ اجعَلُوا آخِرَ صَلاتِكُمْ بِاللَّيلِ وِتراً۔

تو علامہ اعظمیؒ نے اس تعارض کو اٹھانے کی مختلف صورتیں ذکر کی ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

پہلی صورت حافظ ابن حجر کی عبارت کی روشنی میں تحریر فرمائی ہے کہ اجعلوا آخر صلاتکم الخ میں صرف ان لوگوں سے خطاب ہو، جو اول شب میں وتر پڑھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں اور اخیر شب میں اٹھنا چاہتے ہوں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آخر سے آخر حقیقی نہ مراد لیا جائے، بلکہ اضافی مراد لیا جائے، یعنی ہر نماز سے آخر نہیں، بلکہ جو صلاۃ اللیل کا اکمل مصداق ہے، اس کے آخر میں ہونا چاہئے۔ دو رکعتیں بعد والی کو صلاۃ اللیل کہلائیں گی، لیکن چونکہ وہ بطور تتمہ اور رفد لکہ کے ہیں، اس لیے وتر کا ان سے اقدم ہوجانا مضر نہیں، حاصل یہ ہے کہ اکثر صلاۃ اللیل سے موخر ہونا مطلوب قرار دیا جائے۔

اور تیسرے جواب میں طحاوی شریف میں مذکور حضرت ابو ہریرہؓ کا ایک قول نقل کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تین اونٹ لا کر بٹھائے، پھر دو اونٹ لا کر بٹھائے، تو یہ سب وتر (طاق) ہوں گے، اسی طرح اگر وتر پڑھنے کے بعد دو رکعت نفل پڑھی جائے، تو اس وتر کی وجہ سے یہ بھی وتر ہوگی۔

دراصل یہ بحث علامہ نووی نے شرح مسلم (۲۵۴/۱) میں اٹھائی ہے، انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وتر کے بعد کوئی نفل مسنون نہیں ہے، نہ کھڑے ہوکر، نہ بیٹھ کر۔ علامہ اعظمیؒ نے علامہ نوویؒ کے اس خیال کا نہایت قوی اور متعدد دلائل سے رد کیا ہے، اور نہایت محدثانہ اور محققانہ انداز میں یہ مضمون سپرد قلم فرمایا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ ان دونوں رکعتوں کا ثبوت موجود ہے، اور اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ ان کو آپؐ بیٹھ کر ادا فرماتے تھے۔

علامہ اعظمیؒ نے جب اپنی تحقیق مولانا ابراہیم صاحب بنارسی کے پاس روانہ فرمائی، تو انھوں نے اس سلسلے میں مزید تفصیلات دریافت کیں، اس کے جواب میں آپ نے اپنے موقف کی وضاحت مزید مدلل اور مفصل طریقے سے فرمائی، اور ایک ایک نکتے کی توضیح وتشریح فرمائی۔

یہ تحریر 'المآثر' جلد نمبر ۹ شمارہ ا محرم - ربیع الاول ۱۴۲۱ھ اور شمارہ ۲ ربیع الثانی - جمادی الاخری ۲۱ھ میں اشاعت پذیر ہوئی۔

☆......☆......☆......☆......☆......☆

پیٹ پر پتھر باندھنے کی حدیث

عہدِ رسالت اور ابتدائے عہد صحابہ میں عسرت اور تنگ دستی میں گزر اوقات ہوتی تھی، فاقہ کشی کی وجہ سے جسم میں کم زوری اور لاغری پیدا ہونے لگتی تھی، ایسی حالت میں کمر سیدھی رکھنے کے لیے لوگ پیٹ پر پتھر باندھ

لیا کرتے تھے۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنے اس مختصر مضمون میں کتب حدیث سے اس موضوع کی متعدد احادیث جمع کر کے شُرَّاح حدیث کے اقوال سے اس کی تشریح وتوضیح کی ہے۔ سب سے پہلے بخاری شریف کی ایک حدیث کا یہ ٹکڑا نقل کیا ہے: ثُمَّ قامَ (رسولُ الله ﷺ) وبَطْنُهُ مَعْصُوبٌ بِحَجَرٍ، وَلَبِثْنا ثلاثةَ أيَّامَ لا نَذُوقُ ذَوَاقاً.
ترجمہ: پھر رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اس حال میں کہ ان کا شکم مبارک پتھر سے بندھا ہوا تھا، اور ہم نے تین دن سے کوئی چیز نہیں چکھی تھی۔

اور حافظ ابن حجر کے بیان کے مطابق یونس بن بکیر کے مغازی میں اس کے الفاظ یہ ہیں: وَبَطْنُهُ مَعْصُوبٌ بِحَجَرٍ مِّنَ الْجُوْعِ یعنی بھوک کی وجہ سے آپ کا پیٹ پتھر سے بندھا ہوا ہے۔

اس کے بعد مشکوٰۃ کے حوالے سے ترمذی کی حضرت ابوطلحہؓ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ: شَكَوْنا إلى رسولِ الله ﷺ الجُوعَ، فَرَفَعْنا عَنْ بُطُونِنا عَنْ حَجَرٍ حَجَرٍ، فَرَفَعَ رسولُ الله ﷺ عَنْ بَطْنِهِ عَنْ حَجَرَيْنِ. یعنی ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بھوک کی شکایت کی اور پیٹ سے کپڑا ہٹا کر ایک ایک پتھر بندھا ہوا دکھایا، تو آنحضرت ﷺ نے اپنے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہوئے دکھائے۔

پھر فتح الباری (۳۸۰/۶) کے حوالے سے صحیح مسلم میں مروی حضرت انسؓ کی حدیث، اور فتح الباری (۲۲۳/۱۱) سے بخاری میں مذکور حضرت ابوہریرہؓ کا اپنی نسبت بیان نقل کیا ہے۔

اسی طرح مشکوٰۃ صفحہ ۵۰۲ کے حاشیہ سے حضرت ابن سیرین کا ایک قول نقل کیا ہے، جس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''بعض بعض صحابیوں کو تین تین دن یوں گزر جاتے تھے کہ کچھ کھانے کو نہیں ملتا تھا، پھر اگر کوئی چمڑے کا ٹکڑا ہی مل گیا، تو اسی کو بھون کر کھا لیتے، اور اگر وہ بھی نہ ملا تو کوئی پتھر لے کر (پیٹ پر باندھ لیتے اور اس طرح) پیٹھ مضبوط کر لیتے''[1]۔

ان کے علاوہ کئی اور حدیثیں بھی نقل کی ہیں، نیز فتح الباری (۲۷۸/۷) سے حافظ ابن حجر کا یہ قول نقل کیا ہے: وفائدةُ ربْطِ الْحَجَرِ عَلَى البَطْنِ أنها تَضْمُرُ مِنَ الجوعِ، فيُخشىٰ على انحناءِ الصُّلْبِ بواسطةِ ذلك، فإذا وُضِعَ فَوْقَها الحَجرُ وشُدَّ عليها العِصَابةُ استقامَ الظهرُ. یعنی پیٹ پر پتھر باندھنے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ بھوک سے لاغر ہو جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے پیٹھ کے جھک جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، پس جب اس پر پتھر رکھ کر کسی پٹی سے باندھ دیا جائے، تو پیٹھ سیدھی ہو جاتی ہے۔

حافظ ابن حجر نے اسی طرح کی بات فتح الباری ۲۲۳/۱۱، اور ۱۴۹/۴ پر بھی لکھی ہے۔

ان تمام احادیث واقوال کو نقل کرنے کے بعد آخر میں علامہ اعظمیؒ نے نمبر وار اس کا خلاصہ تحریر کیا ہے، جو

(۱) پیٹ پر پتھر باندھنے کی حدیث۔ قلمی۔ :۲

حسب ذیل ہے:

۱-سخت بھوک کی حالت میں پیٹ پر پتھر باندھنا قدیم سے عرب کی عادت تھی۔

۲-یہ عادت حجاز میں خطابی المتوفی ۳۸۸ھ کے زمانے تک جاری تھی۔

۳-اس کا فائدہ یہ تھا کہ کئی دن کے فاقہ سے جب پیٹ بالکل خالی ہو جاتا ہے، تو پیٹھ جھکنے لگتی ہے اور سیدھا کھڑا ہونا دشوار ہو جاتا ہے، ایسی حالت میں پیٹ کے طول وعرض کے برابر پتلے پتلے پتھر لے کر پیٹ پر رکھنے اور ان کو کسی کپڑے سے کس کر باندھ دینے سے پیٹ کا حصہ سخت ہو جاتا ہے اور پیٹھ سیدھی ہو جاتی ہے۔

۴-یہ فائدہ محض قیاسی اور خیالی نہیں ہے، بلکہ تجربہ اس کا شاہد ہے، چنانچہ بعض تجربہ کاروں کا بیان ہے کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ پیٹ کو پیر اٹھائے ہوتے ہیں، لیکن اس تجربہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ پیروں میں کھڑے ہونے کی صلاحیت پیٹ کی بدولت ہے۔

☆......☆......☆......☆

سید الشہداء کی تحقیق

یہ ایک مختصر سا مضمون ہے، اس میں علامہ اعظمیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ شہید کے شرعی مفہوم کا تعین، اور کسی کے شہیدوں کا سردار ہونے کی تعیین عام انسان کی دسترس سے باہر اور اس کی حد سے ماورا ہے، شہید کے شرعی معنی اور کسی کے سید الشہداء ہونے کی تعیین اسی کے حق میں کی جاسکتی ہے، جس کا ثبوت قرآن کریم یا احادیث نبویہ سے بہم پہنچتا ہو۔

علامہ اعظمیؒ نے پیشِ نظر مضمون میں کتب حدیث سے متعدد روایات نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ ''سید الشہداء'' کا لقب صرف دو صحابیوں کے لیے وارد ہوا ہے: ایک حضرت حمزہ اور دوسرے حضرت بلال رضی اللہ عنہما۔ سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو ''سید الشہداء'' کا استعمال کیا جاتا ہے، اس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ کسی مذہبی روایت یا نص نبوی پر مبنی نہیں ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے:

> ''تحقیقی طور پر یہ تو معلوم نہیں کہ کب اور کس بنیاد پر اس کی ابتدا ہوئی، لیکن بظاہر اس کی ابتدا ان لوگوں نے کی ہے، جن کے نزدیک حُب اہل بیت کے معنی یہ ہیں کہ بے سروپا اور بے بنیاد فضائل ومناقب ان کے لیے ثابت کیے جائیں، اور دوسرے تمام صحابہؓ کے مدائح ومفاخر کا انکار کر کے ان سب کو زبردستی اہل بیت پر چسپاں کیا جائے؛ حالانکہ محبت وتعظیم کا یہ عنوان حد درجہ معیوب اور اظہارِ عظمت کا یہ طریقہ اہل خرد کے نزدیک بے حد مذموم ہے، سچی محبت اور حقیقی تعظیم یہ ہے کہ جتنی باتیں ثابت ہیں، صرف وہی ثابت کی جائیں، اور اظہارِ عقیدت میں دائرۂ شریعت اور نصوص نبویہ کے حدود سے تجاوز نہ کیا جائے''[1]۔

(۱) المآثر، ج۴، ش۲، ص: ۴۶

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا نچوڑ یہ ہے کہ کوئی شخصیت خواہ کتنی ہی لائق احترام اور مستوجب تعظیم کیوں نہ ہو، بلا سوچے سمجھے سادہ لوحی میں یا فرط عقیدت میں اس کے لیے کسی غیر ثابت شدہ فضیلت کو ثابت کرنے میں شرعی مفاسد بھی لازم آ سکتے ہیں، مثلاً ''امام'' کے لفظ کو بیشتر سنی حضرات، حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے ناموں کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، حالانکہ یہ بے شبہہ شیعوں کی ایجاد ہے، اور وہ اپنے مزعومہ مسئلۂ امامت کی بنیاد پر ان حضرات کو امام لکھتے ہیں، جس کے رُو سے یہ حضرات شیعوں کے نزدیک معصوم و مفترض الطاعۃ ہیں، اور اس معنی کے لحاظ سے کسی سنی کے لیے کسی غیر نبی پر ''امام'' کا اطلاق جائز نہیں ہے۔

اسی قبیل سے لفظ ''علیہ السلام'' کا استعمال بھی ہے، جو بہتیرے سنیوں کی تحریروں میں پایا جاتا ہے، حالانکہ یہ شیعوں کا مخصوص شعار ہے کہ وہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی طرح اپنے ائمۂ معصومین کے لیے بھی ''علیہ السلام'' کا استعمال کرتے ہیں۔

آگے تحریر فرمایا ہے:

> ''میری غرض یہ ہے کہ مخالفین کے بہت سے من گھڑت افسانے، ان کے مخترَع فضائل و مناقب، اور خانہ ساز القاب ہماری سادگی اور رواداری کی وجہ سے ہم میں رواج پا جاتے ہیں، انھیں میں سید الشہداء کا لقب بھی ہے، جو حضرت حسینؓ کے نام کے ساتھ لکھا اور بولا جاتا ہے، حالانکہ نصوص نبویہ میں اس کا کوئی نشان نہیں ہے''۔(۱)

اس کے بعد **هُمَا رَيْحَانَتَايَ مِنَ الدُّنيا، سَيِّدا شَبابِ أهلِ الْجَنَّةِ**، اور **اللّٰهُم إني أُحبُّهما فأَحِبَّهما** والی حدیثیں لکھ کر فرمایا ہے کہ ذخیرۂ احادیث میں ان کے لیے جو مناقب و فضائل ثابت ہیں، وہ ان کی بزرگی اور فضیلت کے لیے کافی ہیں، ان کے لیے بے سر و پا فضائل وضع کرنا تعظیم کے منافی اور غیر شرعی فعل ہے۔

یہ مضمون 'المآثر' جلد نمبر ۴، شمارہ نمبر ۲ میں شائع ہوا ہے۔

☆......☆......☆

تحقیقات مفیدہ

بعض انبیا سے متعلق اسرائیلی روایات یا دوسرے واسطوں سے بعض کتابوں میں بے سر و پا قصے درج ہو گئے ہیں، جو انبیا کی شان تقدس کے منافی ہیں، یہ مضمون ان ہی میں سے کچھ قصوں کے متعلق چند سوالات کا جواب ہے، جو ماہنامہ 'الفرقان' ۱۳۵۵ھ کے سالنامہ میں شائع ہوا ہے، استفسار اور اس کے جواب سے پہلے 'الفرقان' کے فاضل مدیر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ کے قلم سے چند سطری تمہید ہے، جو حسب ذیل ہے:

''چند مشہور قصوں کے متعلق- جو بعض مذہبی کتابوں میں درج ہو جانے کی وجہ سے بسا اوقات اہل علم

(۱) المآثر، ج ۴، ش ۲، ص: ۴۷

کے لیے بھی تشویش واضطراب کے باعث بن جاتے ہیں۔ضلع بارہ بنکی کے ایک مخلص دوست نے کچھ سوالات بھیجے تھے، میں خود اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے اُن کا جواب نہ لکھ سکا، اور ''گیا'' کے مناظرہ کے موقع پر استاذی المحترم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی خدمت میں وہ سوالات جواب کی درخواست کے ساتھ میں نے پیش کر دیے، حضرت ممدوح نے ان کا جو جواب تحریر فرمایا ہے، چونکہ وہ بہت سی مفید تحقیقات پر حاوی ہے، اس لیے ہم ناظرین الفرقان کے فائدہ کے لیے اس کو یہاں درج کرتے ہیں، امید ہے کہ انشاء اللہ بہت سوں کے لیے اطمینان قلبی کا باعث ہوگا، واللہ الموفق''۔

میرا خیال ہے کہ اس تمہید کے ساتھ عنوان -تحقیقات مفیدہ- بھی مولانا منظور نعمانیؒ صاحب ہی کا لگایا ہوا ہے، اور علامہ اعظمیؒ کی تحریر سوالات کے جوابات پر مشتمل ایک مکتوب کی صورت میں تھی، جس پر کوئی عنوان درج نہیں رہا ہوگا۔ ذیل میں سوالات اوران کے جوابات بہت ہی اختصار کے ساتھ نقل کیے جارہے ہیں۔

پہلا سوال حضرت داود علیہ السلام اور ''اوریا'' کے افسانے کے متعلق تھا، جس کے بارے میں ترجمہ ابن خلدون (۲۳۴/۱) مطبوعہ انوار احمدی الہ آباد میں تحریر ہے کہ ''اوریا'' کا قصہ محض جھوٹ، افترا، بہتان ہے۔

دوسرا سوال ہاروت و ماروت کے متعلق تھا کہ وہ فرشتہ تھے یا کیا تھے؟

تیسرا سوال حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق تھا کہ آپ کے جسم اطہر پر شیطان کا مسلط ہونا، اور جسم اقدس میں کیڑے وغیرہ پڑنا؟

چوتھا سوال حضرت سلیمان علیہ السلام کے حال میں صخرہ جن کا خادمہ کو بہکا کر انگشتری لے جانا اور خود حضرت سلیمان علیہ السلام کی صورت اختیار کر کے بادشاہت کرنا؟

۱-: علامہ اعظمیؒ نے پہلے سوال کے جواب میں لکھا ہے:

> ''بے شبہہ حضرت داود علیہ السلام کی نسبت یہ بیان کرنا کہ انھوں نے ''اوریا کو لڑائی میں اس لیے بھیج دیا کہ وہ شہید ہو جائے تو اس کی بی بی سے شادی کرلیں، کھلا ہوا افترا و بہتان اور نہایت ناپاک جھوٹ ہے''(۱)۔

اس کے بعد علامہ حافظ الدین نسفی، قاضی عیاض، ملا علی قاری اور علامہ ابوبکر بن العربی کی متعدد عبارتیں نقل کی ہیں، جن سے اس قصے کی تکذیب ہوتی ہے، اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ یکسر باطل اور مردود ہے، ایسی بات کی نسبت تو کسی نیک مسلمان کی طرف بھی نہیں کی جاسکتی، چہ جائیکہ کسی مشہور نبی کی طرف منسوب کی جائے۔

۲-: ہاروت ماروت والے قصے کو علامہ اعظمیؒ نے صحیح کہا ہے، اور لکھا ہے کہ امام احمد، ابن حبان، حاکم، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے اس کو روایت کیا ہے، اور حاکم وذہبی نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، اور اسی کی طرف ملا علی قاری کا بھی رجحان ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی نے 'القول المسدد' میں اس کو قوی بتلایا

(۱) الفرقان- سالنامہ ۱۳۵۵ھ- ص: ۱۲۳

ہے، اور ابن حجر مکی نے 'زواجر' میں اس کو صحیح تسلیم کیا ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے دونوں ابن حجر کی عبارتیں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''حاصل یہ ہے کہ ہاروت و ماروت کا قصہ چونکہ متعدد صحابہ۔ مثلاً حضرت ابن مسعود، حضرت علی، حضرت ابوالدرداء، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس - رضی اللہ عنہ - سے مرفوعاً یا موقوفاً باسانید قویہ مروی ہے، اور بہت سے ماہرین فن نے اس کی تصحیح کی ہے، لہذا اس کی صحت سے انکار نہ چاہئے، برخلاف اوریا کے قصہ کے کہ وہ بالکل بے سند ہے۔

اب رہا یہ شبہہ کہ ہاروت و ماروت کے قصہ سے عصمت ملائکہ درہم برہم ہوئی جاتی ہے، تو اس کا جواب ابن حجر مکی اور ملا علی قاری نے یہ دیا ہے کہ ملائکہ جب تک اپنے اصلی اوصافِ مَلَکیت پر ہوں، ان سے گناہ کا صدور نہیں ہوسکتا، لیکن جب ان میں شہوت پیدا کر دی جائے اور ملکیت سے بشریت کی جانب منتقل ہو جائیں، تو گناہ کا صدور جائے تعجب نہیں ہے، اور نہ یہ کہنا صحیح ہے کہ فرشتوں سے گناہ ہوا، اس لیے کہ اب وہ فرشتہ کہاں رہے..................... علاوہ بریں حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہاروت و ماروت کا جو قصہ پیش آیا ہے، وہ واقعی اور حقیقی طور پر نہیں ہے، بلکہ باب تمثیل سے ہے''[(۱)]۔

۳- حضرت ایوب علیہ السلام کی آزمائش کے متعلق سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ اس میں سب سے زیادہ صحیح وہ روایت ہے جس کو حاکم نے مستدرک (۵۸۱/۲) میں روایت کیا ہے، جس میں حضرت ایوب کا تیرہ سال تک آزمائش میں مبتلا رہنا، دو آدمیوں کے علاوہ سب کا علاحدہ ہو جانا، حضرت ایوب علیہ السلام کا بحالت رنج دعا کرنا، اور پھر بوحی الٰہی حضرت ایوب کا زمین پر پیر مارنا اور اس سے چشمہ ابل پڑنا، اور آپ کا اس میں غسل کر کے شفایاب ہونا مذکور ہے، اس حدیث کو حافظ ابن حجر نے صحیح قرار دیا ہے، علامہ اعظمیؒ نے اردو میں اس روایت کا مطلب و مفہوم نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''اب رہا شیطان کا آپ کے جسم پر مسلّط ہونا، تو یہ کہیں بھی مذکور نہیں ہے، نہ اس کے لیے کوئی وجہِ صحت ہے''[(۲)]۔

۴- صخر جنّ کے قصے کے متعلق لکھا ہے کہ از سر تا پا غلط اور دروغ بے فروغ ہے، پھر قاضی عیاض کی 'شفا'، ملا علی قاری کی 'شرح شفا'، ابوبکر بن العربی کی 'احکام القرآن'، حافظ الدین نسفی کی تفسیر 'مدارک' اور زمخشری کی 'کشّاف' کی عبارتیں نقل کر کے آخر میں لکھا ہے:

''حاصل ان عبارات کا یہ ہے کہ انگوٹھی اور جن کا قصہ یہودیوں کے باطل افسانوں میں سے ہے، اور شیطان ہرگز اس بات پر قادر نہیں ہے کہ وہ انبیا کی شکل و صورت اختیار کر کے اس قسم کے کام کرے، اور اس بے سروپا افسانہ کو علماء محققین نے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے''[(۳)]۔

(۱) الفرقان- سالنامہ ۱۳۵۵ھ- ص: ۱۲۵-۱۲۴ (۲) ایضاً: ۱۲۶ (۳) ایضاً: ۱۲۷

موضوعات القُصّاص

وعظ وتقریر اور بے تحقیق روایات

مقررین اور وعظ گو حضرات اپنے مواعظ اور تقاریر میں روایات کی تحقیق کیے بغیر جو کچی پکی ہر طرح کی روایتیں بیان کر دیتے ہیں، اس پر متنبہ کرنے کے لیے علامہ اعظمیؒ نے یہ مختصر سا مضمون سپرد قلم فرمایا ہے، اس کا آغاز یوں کیا ہے:

''بے تحقیق روایات بیان کرنے میں وعظ گو طبقہ ہمیشہ سے بدنام ہے، اور یہ بدنامی کچھ بے وجہ نہیں ہے، اس لیے کہ آج بھی مشاہدہ کیا جاتا ہے، کہ کم استعداد اور بے سواد واعظ ہی نہیں بلکہ اچھی استعداد کے بعض بعض مقرر حضرات بھی اس کا خیال نہیں رکھتے کہ اپنی تقریروں میں صرف وہی روایتیں بیان کریں، جو اہل فن کے معیارِ تحقیق پر پوری اتر چکی ہوں''(۱)۔

اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کی مرکزیت کے پیش نظر اس کے فرزندوں اور اس سے وابستہ حضرات کو اس اہم امر کی طرف بطور خاص متوجہ کیا ہے، اور اس سلسلے میں لکھا ہے:

''دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں درس حدیث کا سب سے بڑا مرکز ہے، اس سے تعلق رکھنے والے حضرات پر روایات کی تحقیق کی ذمہ داری سب سے زیادہ عائد ہوتی ہے، اس لیے ابناء دارالعلوم کو اس ذمہ داری کا بہت زیادہ احساس کرنے کی ضرورت ہے''(۲)۔

اس کے بعد آپ نے تین روایتیں نقل کی ہیں، جن کو عام طور پر واعظ حضرات بیان کرتے ہیں۔ پہلی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما سخت بیمار ہوئے، تو حضرت علی، حضرت فاطمہ اور ان کی لونڈی نے نذر مانی کہ اگر اللہ تعالی دونوں صاحبزادوں کو شفا دیدے، تو تین روزے شکرانہ کے طور پر رکھیں گے۔ اللہ تعالی نے ان کو شفا دے دی تو نذر ماننے والوں نے روزہ رکھنا شروع کیا، لیکن تینوں دن جب جَو وغیرہ پیس کر اور روٹی تیار کر کے افطار کا انتظام کیا، تو کسی سائل کے آجانے سے اس کو دے کر خود بھوکے سو رہے، جس پر سورۂ دہر کی آیت ﴿یُوفُونَ بِالنَّذْرِ﴾ الی قولہ ﴿جَزَاءً وَّلَا شُكُوراً﴾ نازل ہوئی۔ علامہ اعظمیؒ نے اس قصے کے متعلق لکھا ہے:

''حالانکہ یہ قصہ از سرتا پا جھوٹ ہے، اور اس قصہ کو آیات مسطورہ بالا کا سبب نزول بتانا افتراء محض ہے، علامہ سیوطی نے 'اللآلی المصنوعة' ص۱۹۴ جلد۱ میں حکیم ترمذی کے حوالہ سے بلا قیل وقال لکھا ہے: **هذا حديث مفتعل**. یہ گھڑی ہوئی حدیث ہے''(۳)۔

دوسرا قصہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ میکے گئیں، جب واپس

---

(۱) دارالعلوم، ج۲، ش۳، ص:۱۴۰ (۲) ایضاً: ۱۴۰ (۳) ایضاً: ۱۴۱

ہوئیں تو حجرۂ مبارکہ کا دروازہ بند ملا، دستک دینے پر آنحضرت ﷺ نے کچھ سوالات کیے، ان کو سن کر حضرت عائشہؓ خوف کے مارے اپنے میکے لوٹ گئیں، دوسرے روز آکر جب حضرتؐ سے واقعہ بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا: **لي مع الله وقت لا يسعني فيه ملَكٌ مقرَّب ولا نبي مرسل.**

علامہ اعظمیؒ نے اس کے متعلق لکھا ہے:

''اس قصہ کا کتب احادیث میں کوئی ذکر نہیں ہے، علی ھذا القیاس حدیث کے یہ الفاظ بھی کتب احادیث میں ناپید ہیں''(۱)۔

پھر علامہ ابن الدیبع شیبانی کی 'تمییز الطیب من الخبیث' کے حوالے سے کچھ مزید تفصیلات ذکر کی ہیں۔

تیسری چیز کے متعلق لکھا ہے:

''بعض حضرات بیان کر جاتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کو طور پر جوتے اتار دینے کا حکم ہوا، اور آنحضرت ﷺ جوتے پہنے ہوئے عرش پر تشریف لے گئے۔ اور ثبوت میں بعض تفاسیر کا حوالہ بھی پیش کر دیتے ہیں؛ لیکن ''لکل فن رجال'' کے اصول سے کسی حدیث کے صحت وسقم اور اس کے ثبوت وعدم ثبوت کے باب میں محقّق علماء حدیث کی تحقیقات پر اعتماد لازمی ہے، دوسرے فنون کے ماہر سے ماہر عالم کا کسی حدیث کو ذکر کرنا بلکہ اس کو صحیح قرار دینا قطعاً درخور اعتنا نہیں ہے''(۲)۔

پھر اس قصے کے موضوع ہونے سے متعلق متعدد ماہرین حدیث کی تصریحات نقل کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بھی منجملہ موضوع روایات کے ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے اپنے مضمون کے شروع میں موضوع حدیث یا روایت کے بیان کی نسبت یہ اصول اور قاعدہ کلیہ بھی ذکر کیا ہے:

''ان کا بیان کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے، تاوقتیکہ ان کا موضوع و باطل ہونا ظاہر نہ کیا جائے''(۳)۔

یہ مضمون تین صفحے سے بھی کم کا ہے، مگر بہت زیادہ پُر مغز اور سبق آموز ہے، جو ماہنامہ دارالعلوم کے ربیع الاول ۱۳۶۱ھ ہجری کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

دو متبرک اجازت نامے

یہ قلمی مسودہ کے پانچ صفحات پر مشتمل ایک مختصر مضمون ہے، اس میں حدیث کے دو اجازت ناموں کا ذکر کیا گیا ہے، پہلا اجازت نامہ حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر مدنیؒ کا تحریر فرمودہ ہے، جسے انھوں نے حضرت مولانا محمد طاہر معروفی کو عطا فرمایا تھا؛ اور دوسرا حضرت مولانا شاہ عبدالغنیؒ کا تحریر فرمایا ہوا ہے، جسے انھوں

(۱) دارالعلوم، ج ۲، ش ۳، ص: ۱۴۱ (۲) ایضاً: ۱۴۲ (۳) ایضاً: ۱۴۰

نے حضرت مولانا عبداللہ مئوی کو عطا فرمایا تھا۔

علامہ اعظمیؒ نے تمہید کے بعد تقریباً ایک صفحے میں مولانا محمد طاہر معروفی -متوفی ۱۲۹۶ھ- کا تذکرہ کیا ہے،(۱) ۱۲۶۰ھ میں ان کے حجاز جانے اور وہاں حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ سے سند واجازت حاصل کرنے کو ذکر کرکے، وہ اجازت نامہ نقل کیا ہے، اجازت نامہ ۲/جمادی الاولی ۱۲۶۰ھ کا نوشتہ ہے۔

پھر ڈیڑھ صفحے سے زیادہ میں مولانا عبداللہ مئوی کا تذکرہ کیا ہے، انھوں نے مولانا تراب علی لکھنوی -متوفی ۱۲۸۱ھ-، اور مولانا عبدالحلیم لکھنوی -متوفی ۱۲۸۵ھ- کی خدمت میں کتب درسیہ کی تحصیل کی، مولانا ایک ماہر طبیب تھے، منطق وفلسفہ میں بڑا دخل تھا، ساتھ ہی فقہ وحدیث سے بھی انتہا درجہ کا شغف تھا، منطق میں ایک رسالہ 'عرفان العرفان' آپ کی یادگار ہے، جو مولانا عبدالحلیم کے رسالہ 'العرفان' کی شرح ہے۔

مولانا عبداللہ مئوی کو کتابوں کا بھی بہت شوق تھا، علامہ اعظمیؒ نے ان کے پاس موجود متعدد قلمی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

مولانا عبداللہ -متوفی ۱۳۲۱ھ- نے ۱۲۸۶ھ میں حج کا سفر کیا، اور مدینہ منورہ میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ کی خدمت میں اوائل بخاری وترمذی پڑھ کر آپ سے سند واجازت حاصل کی۔

یہ مضمون دسمبر ۱۹۳۷ء کے 'معارف' میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

امام شافعی کے دو سفرنامے

یہ پانچ صفحات پر مشتمل ایک مختصر مضمون ہے، اس میں علامہ اعظمیؒ نے دو ایسے سفرناموں کا حال زار بیان کیا ہے، جو حضرت امام شافعیؒ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، ان میں سے ایک امام بیہقی، آجری اور فخر الدین رازی وغیرہ کی کتابوں میں مروی ومنقول ہے، اور دوسرا 'ثمرات الاوراق' وغیرہ میں مذکور ہے۔ جن میں امام مذکور کا بغداد جانا اور وہاں حضرت امام ابو یوسفؒ سے ملاقات کرنا مذکور ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے حافظ ذہبی، علامہ ابن کثیر دمشقیؒ اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ جیسے محققین اور ماہرین فن کی تحریروں کی روشنی میں گیارہ دلیلوں سے ان سفرناموں کا مصنوعی اور جعلی ہونا ثابت کیا ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے جو دلائل وشواہد پیش کیے ہیں ان سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام ابو یوسف کی حیات میں بغداد گئے ہی نہیں، ان کا بغداد جانا امام ابو یوسف کی وفات کے بعد ہوا ہے، ابن کثیر اور ابن حجر وغیرہ نے یہ تصریح کی ہے کہ امام شافعیؒ ۱۸۴ھ میں بغداد وارد ہوئے ہیں، اور اس سے دو سال پہلے امام ابو یوسفؒ فوت ہو چکے تھے۔ لہذا یہ سفرنامہ اور اس کی تفصیلات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ سب راویوں کے خود تراشیدہ افسانے ہیں۔

علامہ اعظمیؒ کی یہ تحریر ۲۷/محرم ۱۳۷۳ھ کی تحریر فرمودہ ہے۔

---

(۱) مولانا محمد طاہر معروفی کے حالات زندگی 'حیات طاہر' کے نام سے مولانا محمد عثمان معروفیؒ کی مستقل تصنیف میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات

پیش نظر تحریر درحقیقت مولانا ابوسلمہ شفیع احمد صاحب کے ایک مضمون پر اضافہ ہے، مولانا ابوسلمہ کا مضمون 'برہان' کے اگست وستمبر ۱۹۵۳ء کے شماروں میں شائع ہوا تھا، علامہ اعظمیؒ نے اپنی اس تحریر میں اس سلسلہ کو آگے بڑھا کر اس میں قابلِ ذکر اضافہ کیا ہے، آپ نے اپنی تمہید میں لکھا ہے:

''برہان - اگست وستمبر ودسمبر - ۱۹۵۳ء میں مسطورہ بالاعنوان (ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات) کے ماتحت مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاری کا مضمون پڑھ کر خیال ہوا کہ اگرچہ مولانا نے تمام تالیفات کے استیعاب کا ارادہ نہیں کیا ہے، تاہم اس سلسلہ کی جن تالیفات کا اب تک ذکر نہیں ہوا ہے، ان میں سے جن کے نام اس وقت ذہن میں ہیں، ان کو بھی پیش کر دیا جائے، تو خالی از فائدہ نہیں ہے، ذیل کی سطریں اسی خیال کی تکمیل ہیں''[1]۔

اب علامہ اعظمیؒ کے مضمون کا خلاصہ سطور میں ذیل پیش کیا جارہا ہے:

۱- ترجمہ مشارق الانوار: ملا عزیز اللہ مداری کی تحفۃ الابرار - قلمی - کے حوالے سے لکھا ہے کہ شیخ سلیمان محدث نے ۸۶۵ھ میں اس کی تکمیل کی۔

۲- **معدن الاسرار شرح مدارج الاخبار**: مولانا ابوسلمہ نے مدارج الاخبار کا ذکر کیا ہے، شرح ومتن دونوں خواجہ مبارک بن شیخ ارزانی کی کاوش کا نتیجہ ہیں، معدن الاسرار کا سال تصنیف ۹۵۲ھ ہے۔ ملا عزیز اللہ مداری نے خواجہ مبارک کے بارے میں لکھا ہے کہ: ''از فحول محدثین بود''، اور شاہ یٰسین بنارسی نے مناقب العارفین - قلمی - میں ''زبدۃ المحدثین'' لکھا ہے۔

۳- ریحانی شرح مشکوٰۃ المصابیح: از خواجہ مبارک۔

۴- **شرح حديث إنما الأعمال بالنيات، وحديث الإيمان بضع وسبعون شعبة**: نفس مصنف۔

۵- **مختصر المواهب اللدنية**: از شیخ طاہر بن یوسف سندی متوفی ۱۰۰۳ھ۔ اس کا قلمی نسخہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں دیکھا ہے، اس کو کاتب حسین بن یحییٰ نے ۱۰۰۲ھ میں نقل کیا ہے۔

۶- ترجمہ فارسی شمائل ترمذی: از قاضی محمد عاقل بن شیخ محمد خا کی شاگرد ملا جیون۔ اس کا قلمی نسخہ بمبئی جامع مسجد کے کتب خانے میں دیکھا ہے، ۳۳۹/اوراق پر مشتمل ہے، سالِ تصنیف ۱۱۲۳ھ ہے۔

۷- شرح شمائل ترمذی: از محمد عاشق بن محمد عمر حنفی محدث وفقیہ (ت ۱۰۳۲ھ) شاگرد مخدوم الملک ملا عبد اللہ سلطان پوری۔ اس کا قلمی نسخہ مولانا شمس الحق ڈیانوی کے کتب خانے میں تھا۔

---

(۱) برہان، ج ۳۲، ش ۲، ص: ۸۳

۸-أشرف الوسائل شرح الشمائل: از شیخ سیف اللہ بن نور اللہ بن نور الحق بن عبد الحق، سال تصنیف ۱۰۹۱ھ۔

۹-الفصول شرح جامع الاصول: از شیخ علی متقی (ت ۹۷۵)۔اس کا قلمی نسخہ بانکی پور میں ہے۔

۱۰-شمائل النبی ﷺ: از نفس مصنف۔اس کا قلمی نسخہ علی گڈھ میں ہے۔

۱۱-حواشی مشکوٰۃ: از شیخ عبداللہ سندی (ت ۹۹۶) شیخ علی متقی اور علامہ ابن حجر مکی کے شاگرد تھے، مشکوٰۃ کا ایک نسخہ تصحیح کا کمال اہتمام کر کے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا، اور اس پر حاشیہ بھی لکھا تھا، حواشی میں مذہب حنفی کی تائید اور اس کے دلائل ذکر کیے ہیں۔

۱۲-الحواشی علی منهج العمال في سنن الأقوال: تحشیہ از مولانا نجیب بن قاسم چندراوتی احمد آبادی۔منهج العمال (تصنیف: شیخ علی متقی) مع حواشی جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے میں ہے، محشی کے بھانجے قاضی عبداللہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، سن کتابت ۹۸۶ھ ہے۔

۱۳-رسالہ صداق السيدة فاطمة الزهراء: از شیخ صبغۃ اللہ بن محمد غوث مدراسی، سال تصنیف ۱۲۷۹ھ۔

۱۴-إزالة الصمة في حديث اختلاف الأمة: نفس مصنف۔

۱۵-رسالة تعليم النساء الكتابة: نفس مصنف۔

علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''ان تینوں رسالوں کے قلمی نسخے کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں میرے مطالعہ سے گزرے ہیں''۔

۱۶-ذيل القول المسدد: از شیخ صبغۃ اللہ مدراسی، سال تصنیف ۱۲۷۹ھ۔یہ رسالہ 'القول المسدد' کے ساتھ حیدرآباد سے چھپا ہے۔

۱۷-كشف الأحوال في نقد الرجال: از شیخ عبدالوہاب بن مولوی محمد غوث مدراسی۔یہ کتاب المقاصد الحسنة کے ساتھ لکھنؤ سے چھپی ہے۔

۱۸-ضوء المشكوٰة (حاشیہ مشکوٰۃ): از مولانا فیض الحسن ادیب سہارن پوری (ت ۱۳۰۴ھ)۔قلمی نسخہ کتب خانہ ٹونک میں ہے۔

۱۹-كشف الأستار عن رجال معاني الآثار: از مولانا ابوتراب رشد اللہ شاہ، صاحب العلم الرابع (پیر جھنڈا سندھ)۔امام طحاوی کی شرح معانی الآثار کے رجال پر ہے۔

۲۰-زجاجة المصابيح: از مولانا ابوالحسنات سید عبداللہ شاہ حیدرآبادی حنفی، مشکوٰۃ کے طرز پر لکھی گئی ہے، حیدرآباد سے چھپ کر شائع ہوئی ہے۔

۲۱-المناهل السلسلة في الأحاديث المسلسلة: از شیخ عبدالباقی انصاری فرنگی محلی، مصر میں چھپی ہے۔

۲۲-**الإسعاد بالإسناد:** از: شیخ عبدالباقی انصاری فرنگی محلی، مصر میں چھپی ہے۔
۲۳-**رسالة في لغات المشکوٰة:** از شیخ محمد طاہر پٹنی۔
۲۴-حاشیہ مشکوٰۃ: شیخ طیب برہان پوری۔
۲۵-رسالہ سودمند: از شاہ میر شیرازی گجراتی۔

۲۶-**شرح صحیح البخاری:** از حکیم عثمان بن شیخ عیسیٰ بن شیخ ابراہیم صدیقی بوبکانی مسندی ثم البرہانفوری متوفی ۱۰۰۸ھ (بحوالہ گلزار ابرار)، کتب خانہ رام پور میں ایک کتاب دو جلدوں میں **غایة التوضیح للجامع الصحیح** مصنفہ علامہ عثمان بن ابراہیم الصدیقی الحنفی کے نام سے ہے، علامہ اعظمی کے خیال میں یہی کتاب ہے۔

۲۷-**البرهان في علامات مهدي آخر الزمان:** از شیخ علی متقی، چھیاسی ورق کا رسالہ ہے۔

۲۸-**زبدة المقاصد في تجريد الزوائد:** از شیخ ابوالفضل عبدالحق بن فضل اللہ المحمدی البنارسی متوفی ۱۲۸۶ھ۔ سخاوی کی '**المقاصد الحسنة**' کا خلاصہ ہے، مولف کے مطابق صرف ان چیزوں کو جمع کر دیا ہے جو رسول خدا ﷺ کا کلام نہیں ہے، اور حدیث کے نام سے مشہور ہے، حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب ہے۔

۲۹-**تذكرة الأحياء في تصفية الإحياء:** از شیخ ابوالفضل بنارسی۔ حافظ عراقی کی تخریج احادیث احیاء کی تلخیص ہے، مولف کے بیان کے مطابق صرف ان روایات کو جمع کیا ہے، جو موضوع یا منکر ہیں، یا جن کی سند میں کوئی کذاب یا متہم بالکذب، یا مردود، یا متروک، یا فاسق راوی ہے، یا جس کی سند محدثین کے نزدیک معروف نہیں ہے۔

۳۰-**ثبت الشيخ عبد الحق المحدث الدهلوي:** اس رسالے میں شیخ نے اپنی اسانید اور اپنے شیوخ کے عطا کردہ اجازت ناموں کو ذکر کیا ہے۔

مذکورہ بالا چاروں کتابوں کے بارے میں علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے: ''بحمد اللہ سبحانہ میں ان ہر چہار رسالوں کے مطالعہ سے بہرہ یاب ہوا ہوں''۔

۳۱-**أسامي رجال صحيح البخاري:** از علامہ طاہر بن یوسف سندی۔
۳۲-**موجز القسطلاني:** نفس مصنف۔ قسطلانی کی شرح بخاری کا اختصار ہے۔
۳۳-**ملتقط جمع الجوامع:** نفس مصنف۔ سیوطی کی جمع الجوامع کا انتخاب ہے۔
۳۴-رسالہ در اصول حدیث: از مولانا عبداللہ محمدی الہ آبادی۔
۳۵-فرہنگ صحیح مسلم: نفس مصنف۔
۳۶-**تذكرة الموضوعات:** نفس مصنف۔
ان تینوں کتابوں کے بارے میں لکھا ہے کہ دارالعلوم ندوہ میں موجود ہیں۔

۳۷-**خير المواعظ**: **ازمولانا محمد زماں خاں شاہ جہاں پوری متوفی ۱۲۹۲ھ۔**
۳۸-اربعین مسمّٰی بہ **احاديث الحبيب المتبركه** (تاریخی نام): ازمفتی عنایت احمد متوفی ۱۲۷۹ھ۔
۳۹-اربعین مسمّٰی بہ تسخیر (تاریخی نام): ازمولوی ہادی علی، شاہ ولی اللہؒ دہلوی کی اربعین کا منظوم ترجمہ ہے۔

۴۰- **ضوء المشكوٰة**۔
۴۱-**ظفر الأماني بشرح مقدمة الجرجاني**: **ازمولانا عبدالحی لکھنوی متوفی ۱۳۰۴ھ۔**
۴۲-**سلطان الاذكار**: **ازنواب نورالحسن خاں ولد نواب صدیق حسن خان بھوپالی، مطبوع ہے۔**
۴۳-**أسماء رجال كتاب الآثار**: ازمولانا عبدالباری فرنگی محلی، امام محمد کی کتاب الآثار کے رجال کا بیان ہے۔

۴۴-**تسهيل المنهج في أسماء رجال كتاب الحجج**: **ازمولانا عبدالباری فرنگی محلی، امام محمد کی کتاب الحجج کے رجال کا بیان ہے۔**

علامہ اعظمیؒ نے ان دونوں کتابوں کی فروگزاشتوں کو بطور نمونہ ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ:

''افسوس ہے کہ یہ کام جتنی محنت وکاوش اور تلاش وجستجو سے انجام دینے کا تھا، اتنی محنت اور جستجو سے وہ -مولانا عبدالباری- کام نہ لے سکے''۔

۴۵-**الدرر الباهرة في الأحاديث المتواترة**: **ازمولانا عبدالباری فرنگی محلی۔**
۴۶-**الباقيات الصالحات في الأسانيد والأوائل والمسلسلات**: نفس مصنف۔

ان کی نسبت تحریر ہے کہ: ''یہ سب کتابیں چھپ چکی ہیں''۔

۴۷-شرح شمائل ترمذی (فارسی): از بابا حاجی، سالِ تصنیف ۹۷۷یا ۹۸۶ھ۔ لکھا ہے کہ: ''اس کا قلمی نسخہ ابھی حال میں میری نظر سے گزرا ہے، اسی وجہ سے اس کو تینتالیسویں نمبر پر جگہ ملی، ورنہ ترتیب زمانی کے لحاظ سے اس کا ذکر بہت پہلے ہونا چاہئے''۔

۴۸-**قلائد الأزهار شرح كتاب الآثار**: **ازمولانا مہدی حسن شاہ جہاں پوری مفتی دارالعلوم دیوبند۔**

۴۹-**الحاوي لرجال الطحاوي**: **ازعلامہ اعظمیؒ۔** اس کی نسبت لکھا ہے:

''اس کتاب کا ذکر اس سلسلہ میں محض تحدث بالنعمۃ کے طور پر ہے، حقیر راقم الحروف نے مشکل الآثار اور معانی الآثار دونوں کے رجال جمع کیے ہیں، اور بقدر امکان پوری تحقیق سے ان کے حالات لکھے ہیں، نیز دونوں کتابوں میں اسماء الرجال میں جو تحریفات وتصحیفات ہوئی ہیں، ان کی تصحیح میں بھی کاوش کی ہے، اب تک طبع نہیں ہوئی''۔

علامہ اعظمیؒ کا یہ مضمون ماہنامہ 'برہان' جمادی الثانیہ ۱۳۷۳ھ = فروری ۱۹۵۴ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ مضمون کی تلخیص مسودے سے کی گئی ہے، اس لیے ناموں کی ترتیب میں مطبوعہ مضمون سے کہیں کہیں فرق واقع ہوا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

تاج التراجم فی تفسیر القرآن للاعاجم

للامام شاہفور بن طاہر الاسفرائینی

۱۳؍اگست ۱۹۶۵ء کے 'صدق جدید' میں کتاب 'تاج التراجم' پر قاضی اطہر صاحب مبارک پوری کا کوئی نوٹ چھپا تھا، علامہ اعظمیؒ نے قاضی صاحب کے اس نوٹ کے بارے میں اپنے مضمون کی ابتدائی سطروں میں لکھا ہے کہ:

> ''تاج التراجم کے برہان پوری نسخہ کے آخر میں جو ترقیمہ درج ہے، اس کی بنا پر قاضی صاحب نے پہلے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مصنفِ کتاب ابوبکر بن محمد بن عبیداللہ خراسانی ہیں، پھر اس کو تحقیق طلب قرار دیا ہے''۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ چار سال پہلے برہان پور میں اس نسخے کو دیکھ کر ان کے دل میں بھی مصنف کی تحقیق کا داعیہ پیدا ہوا تھا، اس تحقیق سے جو نتیجہ سامنے آیا تھا، وہ یہ ہے کہ زیر بحث کتاب ابوالمظفر طاہر بن محمد اسفرائینی شافعی متوفی ۴۷۱ھ کی تصنیف ہے، دلائل حسب ذیل ہیں:

۱- کشف الظنون (۲۱۱/۱) مطبوعہ نظارۃ المعارف ٹرکی ۱۳۱۰ھ میں تحریر ہے: **تاج التراجم في تفسير القرآن للأعاجم: للإمام شاهفور وللشيخ الإمام أبي المظفر طاهر بن محمد الإسفرائيني الشافعي المتوفى سنة ٤٧١ إحدى وسبعين وأربع مائة۔**

'کشف الظنون' کی اس عبارت کو نقل کر کے علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نام کی دو کتابیں ہیں، ایک امام شاہفور کی دوسری ابوالمظفر طاہر کی۔ پھر فرمایا ہے کہ اس عبارت میں کئی غلطیاں ہیں، درحقیقت 'تاج التراجم' امام شاہفور کی تصنیف ہے، اور ابوالمظفر ان ہی کی کنیت ہے، اور طاہر بن محمد ان کے والد کا نام ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنی تحقیق کی تائید میں سبکی کی طبقات الشافعیہ (۱۷۵/۳) کی یہ عبارت پیش کی ہے، اور سبکی کا یہ قول ہی مصنف کتاب کے سلسلے میں آپ کی دوسری دلیل بھی ہے:

۲-شهفور بن طاهر بن محمد الإسفرائيني أبو المظفر الإمام الأصولي، الفقيه

المفسر، ارتبطه نظام الملک بطوس، قال: عبدالغافر: وصنف التفسیر الکبیر المشهور.......... توفي سنة إحدى وسبعين وأربع مائة.

اس کے بعد لکھا ہے کہ اس سے اگر چہ یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ کتاب پانچویں صدی کے وسط میں تصنیف کی گئی ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ فارسی زبان میں تفسیر کی اولین تصنیف یہی ہے، کیونکہ امام شاہفور کے معاصر شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری ہروی متوفی ۴۸۱ھ تھے، اور انھوں نے بھی قرآن پاک کے مکمل ترجمہ وتفسیر کا املاء کیا ہے، جس کو ان کے شاگرد ابوالفضل رشیدالدین میبذی نے قلم بند کیا اور اس کا نام "**کشف الأسرار وعدة الأبرار**" رکھا، پوری کتاب دس جلدوں میں ہے، اور اس کی کئی جلدیں ایران سے شائع ہوئی ہیں۔

مگر حاجی خلیفہ نے میبذی کی مُرتَّبہ کتاب کا نام صرف "**کشف الأسرار**" لکھا ہے، اور "**کشف الأسرار وعدة الأبرار**" کی نسبت لکھا ہے کہ وہ سعدالدین تفتازانی کی فارسی تفسیر کا نام ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے آگے لکھا ہے کہ اسی زمانے کی ایک اور تفسیر بھی ہے، جو تفسیر زاہدی کے نام سے مشہور ہے، پھر فرمایا ہے:

> "ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں اس کتاب کے قلمی نسخے پائے جاتے ہیں، میں نے حیدرآباد میں اس کے دو نامکمل نسخے دیکھے ہیں، ایک نسخے کی ابتدا میں اس کو سیف الدین ابوالنصر احمد ابن الحسن بن الارینی (کذا) السلیمانی الداروارجکی کی تصنیف بتایا گیا ہے، اور لکھا ہے: **شیخ امام اجل زاهد المجاهد أملی ببخاری فی شوال ۵۱۹**"۔

پھر لکھا ہے کہ اب تک کی معلومات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ فارسی تراجم میں تفسیر زاہدی تیسرے نمبر پر ہے۔

آگے فرمایا ہے کہ '**الجواهر المضیئة**' میں اختصار کے ساتھ فخر الاسلام ابونصر احمد بن الحسن بن احمد الدرواجکی الزاہد کا ذکر ملتا ہے، ہمارا خیال ہے کہ تفسیر زاہدی کے مصنف یہی بزرگ ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صحیح الداروارجکی نہیں بلکہ الدرواجکی ہے۔

'جواہر مضیئہ' میں لکھا ہے کہ سمعانی نے 'انساب' میں اس نسبت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس پر علامہ اعظمیؒ نے فرمایا ہے کہ یاقوت نے بھی 'معجم البلدان' میں "درواجک" کا ذکر نہیں کیا ہے، ہاں "دروازق" کا ذکر کیا ہے اور اس کو "دروازہ" کا مُعرَّب بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ مَرْو سے ایک فرسخ کے فاصلے پر ایک قریہ ہے، ممکن ہے کہ درواجکی دروازقی کی بگڑی ہوئی صورت ہو۔

علامہ اعظمیؒ نے اس مضمون میں اور بھی بہت سے علمی افادات وتحقیقات کے علاوہ حواشی 'طبقات الصوفیہ' سے 'کشف الاسرار' کے ترجمہ کے کچھ نمونے پیش کیے ہیں، اور مضمون کے اختتام پر لکھا ہے: "ربیع الثانی ۱۳۸۵ھ برائے صدق جدید"۔ ☆......☆......☆

'مبارق الأزهار' کس کی تصنیف ہے؟

یہ ایک بہت ہی اہم علمی و تحقیقی مضمون ہے، 'مبارق الازہار' حدیث شریف کی مشہور ومعروف کتاب 'مشارق الانوار' کی شرح ہے، اس کے مصنف عبد اللطیف بن عبد الملک یا ابن فرشتہ ہیں، یہ ایک مشہور اور نامور عالم تھے، اور 'مبارق' کے علاوہ بعض دوسری تصانیف بھی ان کی قلمی یادگار ہیں، ان میں شرح 'منار' خاصی شہرت کی حامل ہے۔

'مبارق الازہار' کی نسبت قاضی سید نور الدین حسین نے معارف (جولائی ۱۹۴۹ء) میں، اور ڈاکٹر سید باقر علی استاد شعبۂ عربی اسماعیل کالج بمبئی نے معارف (اکتوبر ۱۹۵۰ء) میں یہ انکشاف کیا کہ وہ ایک ہندوستانی عالم کی تصنیف ہے، جو احمد آباد کے باشندے تھے، ان کے والد کا نام عبد الملک بنبانی تھا، اور ان کی وفات ۹۱۵ھ میں ہوئی، ان کے صاحبزادے بھی عالم تھے اور ان کا نام خلیل محمد عباسی تھا۔

علامہ اعظمیؒ نے ان دونوں مضمونوں کے شائع ہونے کے بعد ان کا تنقیدی جائزہ لیا، اور اس انکشاف کو تحقیقی اعتبار سے غیر معیاری اور تاریخی اعتبار سے ناقابلِ تسلیم قرار دیا۔ آپ نے نہایت تحقیق کے ساتھ اور بہت مدلل طریقے سے ان دونوں مضمون نگاروں کے تخیلات کا رد کیا ہے، اور اپنی بات کی تائید کے لیے تاریخ وتذکرہ اور فقہ کی متعدد کتابوں سے دلائل فراہم کیے ہیں، اور 'مبارق' سے خود مصنف کا ایک قول نقل کیا ہے، جس میں انھوں اپنے نام کی تصریح کی ہے، وہ قول یہ ہے: **وبعد! فيقول العبد الضعيف العويز عبد اللطيف بن عبدالعزيز المعروف بابن الملک.**

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے مصنف عبد اللطیف بن عبد الملک نہیں، بلکہ عبد اللطیف ابن الملک ہیں۔

آگے لکھا ہے کہ اگر یہ خیال کیا جائے کہ 'مبارق' کے مصنف ابن فرشتہ ہی ہیں، مگر وہی عبد الملک کے لڑکے اور احمد آباد کے باشندے ہیں؛ تو یہ بات بھی قابلِ توجہ نہیں ہے، پھر اس کا غلط ہونا متعدد وجوہ سے ثابت کیا ہے کہ عبد اللطیف بنبانی اور ابن فرشتہ دونوں کے باپ، دادا، اور پردادا کے ناموں میں فرق ہے، بلکہ طاش کبریٰ زادہ کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ٹرکی کے باشندے تھے۔

معارف کے مقالہ نگاروں نے عبد اللطیف بنبانی کا سالِ وفات ۹۱۵ھ لکھا ہے، علامہ اعظمیؒ نے اس کا بھی تجزیہ کیا ہے کہ بظاہر یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے عبد اللطیف کے والد کی نسبت لکھا ہے کہ انھوں نے ۹۷۰ھ کے قریب انتقال کیا، اور یہ بات قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ بیٹے کی وفات باپ سے ۵۵ برس پہلے ہوئی ہو، الا یہ کہ کسی محقق تذکرہ نویس نے اس کی موجَّہ تصریح کی ہو۔

اس مضمون کی آخری چند سطریں پورے مضمون کا خلاصہ ہیں، لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ خلاصہ

بعینہ نقل کر دیا جائے، فرمایا ہے:

''دراصل اس غلطی کی بنیاد یہ ہے کہ قاضی سید نورالدین حسین صاحب نے مبارق الازہار کا مصنف ملک عبداللطیف داورالملک کو سمجھا اور ان کا سالِ وفات ۹۱۵ھ لکھا ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے عبداللطیف بن عبدالملک بنبانی کو مبارق کا مصنف تصور کر کے یہ تخیل قائم کیا کہ یہ عبداللطیف وہی ملک عبداللطیف داورالملک ہیں، لہٰذا انھوں نے ان کا سن وفات بھی ۹۱۵ھ لکھ دیا؛ حالانکہ یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ یہ دونوں دو عبداللطیف ہیں: عبداللطیف داورالملک کا شمار امرائے سلطان محمود بیگڑہ میں ہے اور وہ حضرت شاہ عالم گجراتی کے مرید وخلیفہ ضرور تھے، لیکن کسی نے اُن کے مشغلۂ تدریس وتصنیف کا ذکر نہیں کیا ہے، نیز ان کا سالِ وفات بھی ۹۱۵ھ نہیں ہے، بلکہ صاحبِ مرآۃ احمدی نے ۸۷۹ھ میں ان کی وفات بتائی ہے، پھر ان کے والد کا نام صاحب 'مرآۃ احمدی' نے ملک محمود بتایا ہے۔ اور عبداللطیف بن عبدالملک بنبانی حضرت شاہ مقبول عالم گجراتی کے استاذ الاستاذ تھے، شاہ مقبول عالم کی ولادت ۹۸۹ھ میں اور وفات ۱۰۴۵ھ میں ہوئی ہے۔

ان دونوں کے علاوہ عبداللطیف بن ملک تیسرے بزرگ ہیں، جن کی نسبت شوکانی نے -البدر الطالع ۱/۳۷۴ میں- بتصریح لکھا ہے: **لہ تصانیف، منہا: شرح المشارق. وکان من علماء الروم الموجودین في أیام السلطان مراد**''[1]۔

یہ مضمون ماہنامہ 'معارف' میں جمادی الاولی ۱۳۷۳ھ = جنوری ۱۹۵۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

'الذَّخائِر والتُّحَف' کس کی تصنیف ہے؟

کتاب الذخائر والتحف ڈاکٹر محمد حمید اللہ علیہ الرحمہ کے مقدمے کے ساتھ چھپی تھی، اس پر قاضی اطہر صاحب مبارک پوری نے مفصَّل نقد وتبصرہ تحریر فرمایا تھا، قاضی صاحب کا نقد وتبصرہ معارف کے دو شماروں اپریل ومئی ۱۹۶۰ میں شائع ہوا تھا[2]۔

ڈاکٹر صاحب نے کتاب کے مصنف القاضی الرشید ابن الزبیر کی نسبت اپنے مقدمے میں لکھا تھا کہ ان کا حال ہم کو کسی کتاب میں نہیں ملا، مگر کتاب کی اندرونی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ پانچویں صدی ہجری کے ایک عالم تھے۔

قاضی صاحب کو ڈاکٹر صاحب کی رائے سے اختلاف ہوا اور انھوں نے معارف -دسمبر ۱۹۶۰ء- میں

---

(۱) معارف ج ۷۳، ش ۱، ص: ۶۴

(۲) معارف میں قاضی صاحب کا مضمون ''ہند و عرب کے قدیم علمی اور ثقافتی تعلقات'' کے عنوان سے طبع ہوا ہے۔

اپنی تحقیق یہ لکھی کہ القاضی الرشید ابن الزبیر کا تذکرہ تاریخ ابن خلکان میں موجود ہے، اور وہ پانچویں نہیں بلکہ چھٹی صدی ہجری کے ایک جامع الفنون عالم تھے۔

اس اختلاف کے بعد علامہ اعظمیؒ نے تقریباً سات صفحات پر مشتمل ایک نہایت محققانہ اور فاضلانہ محاکمہ تحریر فرمایا، جو فروری ۱۹۶۱ء کے معارف میں اشاعت پذیر ہوا۔

علامہ اعظمیؒ نے قاضی اطہر صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا کہ قاضی رشید کا ذکر ابن خلکان میں موجود ہے، اور اس معلومات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ ان کا تفصیلی تذکرہ ابن خلکان کے علاوہ یاقوت کی 'معجم الادباء'، یافعی کی 'مرآۃ الجنان' اور ابن العماد حنبلی کی 'شذرات الذہب' وغیرہ میں بھی ہے۔

لیکن یہ بات تحقیق طلب ہے کہ کتاب الذخائر ان ہی القاضی الرشید کی تصنیف ہے یا کسی دوسرے کی؟ قاضی صاحب اس کو ان ہی کی تصنیف مانتے ہیں، اور ڈاکٹر صاحب اس کو تسلیم نہیں کرتے، کیونکہ باپ، بیٹے اور پوتے تین آدمیوں کا لقب قاضی رشید ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے یہ ہے کہ یہ کتاب ابن خلکان والے کی تصنیف نہیں ہے، اس لیے کہ وہ چھٹی صدی کے عالم تھے، اور کتاب کا زمانۂ تصنیف پانچویں صدی ہے۔ دلیل کے طور پر ڈاکٹر صاحب نے کتاب کی اندرونی شہادتیں پیش کی ہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ اور قاضی اطہر دونوں بزرگوں کو ابن خلکان والے قاضی رشید کے والد اور دادا کا تذکرہ کتابوں میں نہیں مل سکا تھا۔ علامہ اعظمیؒ نے فرمایا کہ ان دونوں کا تذکرہ 'الطالع السعید' مطبوعہ مصر ۱۳۳۳ھ میں موجود ہے، اس طرح یہ تینوں قاضی رشید معروف ہیں، ابن خلکان والے کا نام احمد ہے، ان کے والد کا علی، اور دادا کا ابراہیم ہے۔ علی کی نسبت لکھا ہے کہ وہ فاضل، شاعر اور رئیس تھے، ان کی وفات ۵۲۵ھ میں ہوئی، اور ابراہیم کی نسبت مرقوم ہے کہ وہ ۴۷۲ھ میں اضلاع قوص کے حاکم تھے، اور رشید و مہذب ان کے پوتے تھے۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے ڈاکٹر صاحب کی پیش کردہ اندرونی شہادتوں اور قاضی صاحب کے ذریعے کی جانے والی ان پر جرحوں کا تجزیہ کر کے ڈاکٹر صاحب کی رائے سے موافقت کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے شواہد اس بات کے مؤید ہیں کہ اس کے مصنف چھٹی صدی ہجری نہیں بلکہ پانچویں صدی میں گزرے ہیں، لہٰذا اس کتاب کا قاضی رشید احمد نہیں بلکہ ان کے دادا قاضی رشید ابراہیم کی تصنیف ہونا قرین صواب ہے۔

اس بحث کے بعد علامہ اعظمیؒ نے ان کے اختلاف کے علاوہ چند اور امور پر بھی ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے، ایک یہ کہ قاضی اطہر صاحب نے القاضی الرشید کا نسبی تعلق قبیلہ غسان سے بتایا ہے، اسی طرح یاقوت (متوفی ۶۲۶ھ) اور ابن خلکان (متوفی ۶۸۱ھ) اور یافعی (متوفی ۷۶۸ھ) نے ان کو غسانی ہی لکھا ہے، مگر جعفر ابن ثعلب ادفوی (متوفی ۷۴۸ھ) نے ان کو اور ان کے لڑکے ابراہیم بن احمد کو قرشی اسدی لکھا ہے۔ اس سے متبادر ہوتا ہے کہ القاضی الرشید اور ان کے اسلاف کو ابن الزبیر اس لیے کہتے تھے کہ وہ لوگ حضرت زبیر بن عوام قرشی اسدی کی اولاد سے تھے۔ بہر حال یہ بات تحقیق طلب ہے کہ اگر القاضی الرشید قرشی اسدی ہیں، تو یاقوت

وغیرہ مؤرخین نے ان کو الغسانی کیونکر لکھ دیا؛ اور اگر وہ غسانی ہیں، تو ادفوی نے قرشی اسدی کس بنیاد پر لکھا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس مضمون میں اور بھی متعدد علمی نکات کو اجاگر کیا ہے، ان میں آخری حسب ذیل ہے:

''ابوالمعالی سعد بن علی بغدادی خطیری کی کتاب کا نام معارف (دسمبر ۱۹۶۰ء) میں غلط چھپ گیا ہے[۱]، اس کا صحیح اور پورا نام **زینة الدهر وعصرة أهل العصر** ہے، اور وہ باخرزی کی کتاب **دمية القصر** کا ذیل ہے، اور باخرزی کی یہ کتاب ثعالبی کی '**يتيمة الدهر**' کا ذیل ہے، ابن العماد کاتب نے خطیری کی کتاب **زينة الدهر** کا ذیل **خريدة العصر** کے نام سے لکھا ہے، پھر خود ہی اپنی کتاب **خريدة** کا ایک ذیل لکھا ہے، اسی کا نام **كتاب السيل على الذيل** ہے، ابن العماد نے قاضی رشید کا ذکر **كتاب السيل** اور ذیل یعنی **خريدة العصر** دونوں میں کیا ہے، یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ **كتاب السيل** اور **خريدة** کے ذیل میں ذکر کیا ہے[۲]، اس لیے کہ **خريدة** کا ذیل تو خود **كتاب السيل** ہے''[۳]۔

علامہ اعظمیؒ کا یہ مضمون معارف شعبان ۱۳۸۰ھ = فروری ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا ہے۔ اپنے محاکمہ سے فارغ ہونے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں:

''یہ چند سطریں صرف علم کی خدمت کے لیے لکھی گئی ہیں، کسی پر اعتراض یا تنقیص مقصود نہیں ہے، بالخصوص فاضل عزیز قاضی اطہر صاحب مبارک پوری سے میرے تعلقات کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ میرے معروضات کو ان پر اعتراض کی حیثیت دی جا سکے۔ مجھے جو بات صحیح سمجھ میں آئی اس کے اظہار میں محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے بھی معذرت خواہ ہوں''۔

☆......☆......☆......☆

غریب الحدیث

علامہ اعظمیؒ نے اس مضمون کی تمہید میں پہلے غریب الحدیث کی تعریف کی ہے، اس کے بعد اس فن کے تدریجی ارتقا پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، غریب الحدیث کی تعریف آپ نے ان الفاظ میں کی ہے:

''حدیثوں کے مشکل اور دقیق الفاظ جن کا فہم آسان نہ ہو، ان کو غریب الحدیث کہتے ہیں''۔

پھر اس تعریف کی شہادت کے لیے امام خطابی کا ایک قول نقل کیا ہے۔

---

(۱) 'معارف' جلد ۸۶، ش ۶، ص ۴۵۳ میں کتاب کا نام یوں چھپا ہے: ''زینة دمیة الدهر''

(۲) 'معارف' ص ۴۵۴ پر قاضی صاحب کے الفاظ یہ ہیں: آگے چل کر علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ عماد نے بھی قاضی رشید کا ذکر کتاب السیل میں اور خریدہ کے ذیل میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

(۳) معارف، ج ۸۷، ش ۲، ص: ۱۴۶

غریب الحدیث کی اس تعریف کے بعد اس کے ارتقائی مراحل کو حسب ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

علماء اسلام نے جس طرح حدیث کی خاص خاص کتابوں کی شرحیں لکھی ہیں، جیسے شروح موطا، شروحِ بخاری اور شروحِ مسلم، اسی طرح متعدد علماء اسلام نے کسی خاص کتاب کے ساتھ تقیُّد کے بغیر احادیث کے مشکل الفاظ کی شرح وتوضیح میں کتابیں تصنیف کی ہیں، یہ فن غریب الحدیث کے ساتھ موسوم کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اس فن میں ابوعبیدہ معمر بن المثنی المتوفی ۲۰۸ھ نے ایک مختصر کتاب لکھی ہے، معمر کے بعد نضر بن شمیل المتوفی ۲۰۴ھ، اور اصمعی المتوفی ۲۱۵ھ اور قطرب المتوفی ۲۰۶ نے اس فن میں کتابیں لکھیں، مگر وہ کتابیں صرف چند اوراق پر مشتمل تھیں، اور ان کی حیثیت مختصر رسالوں کی تھی، ان کے بعد جب ابوعبید القاسم بن سلام کا دور آیا، تو انھوں نے ایک مبسوط کتاب لکھی، اور یہی کتاب بعد کے مصنفین کے لیے سنگِ میل ثابت ہوئی۔ ابوعبید کے بعد ابن قتیبہ دینوری المتوفی ۲۷۶ھ کی کتاب وجود میں آئی، دینوری کے بعد حافظ ابراہیم حربی وغیرہ بہت سے علماء اعلام نے مختلف زمانوں میں غریب الحدیث پر چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں، جن میں امام خطابی المتوفی ۳۸۸ھ کی کتاب بہت مشہور ومتداول تھی، اور اس کو نیز ابوعبید وابن قتیبہ کی کتابوں کو امہات الکتب قرار دیا جاتا تھا (کشف الظنون ونہایہ)۔ خطابی کے بعد ابوعبید احمد بن محمد ہروی المتوفی ۴۰۱ھ نے قرآن پاک اور حدیث نبوی دونوں کے مشکل الفاظ پر مشتمل ایک کتاب لکھی، جس کا نام کتاب الغریبین ہے''[۱]۔

علامہ اعظمیؒ کا یہ مضمون در اصل ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی کے ایک مضمون پر نقد اور تعقیب ہے، ڈاکٹر صاحب کا مضمون رسالہ 'دارالعلوم' کے دسمبر ۱۹۶۰ء کے شمارے میں ''غریب الحدیث'' کے نام سے شائع ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب کو ابوعبید قاسم بن سلام کی 'غریب الحدیث' اور ابوعبید احمد بن محمد ہروی کی کتاب 'الغریبین' کے درمیان اشتباہ ہوگیا تھا، اور اس اشتباہ کی وجہ سے انھوں نے احمد بن محمد ہروی کی کتاب 'الغریبین' کو قاسم بن سلام کی 'غریب الحدیث' سمجھ لیا تھا، علامہ اعظمیؒ اپنی تحریر میں فرماتے ہیں:

''وہ ابوعبید- قاسم بن سلام- کی 'غریب الحدیث' نہیں ہے، بلکہ ابوعبید- احمد بن محمد- کی کتاب 'الغریبین' ہے، ان دونوں مصنفوں کی کنیت اگرچہ ابوعبید ہے، اور گو دونوں کا آبائی وطن ہرات ہے، مگر ایک کا نام القاسم بن سلام ہے، اور وہ امام احمد، امام شافعی اور اسحاق بن راہویہ وغیرہم کے معاصر ہیں، اور ان کی وفات مکہ میں ۲۲۴ھ میں ہوئی ہے، ان کی تالیفات میں کتاب الاموال طبع ہوچکی ہے۔

دوسرے کا نام احمد بن محمد المودِب الہروی ہے، وہ ابوسلیمان خطابی اور ابومنصور ازہری کے شاگرد ہیں، اور انھوں نے ۴۰۱ھ میں وفات پائی ہے، ان کے نام کے ساتھ **صاحب کتاب غریبی القرآن والحدیث، یاصاحب الغریبین** لکھا جاتا ہے (معجم الادباء ص ۲۶۰ ج ۴)''[۲]۔

(۱) دارالعلوم فروری ۱۹۶۱ء، ص: ۳۴

(۲) ایضاً: ۳۵

آگے علامہ اعظمیؒ نے نہایت مستند دلائل وشواہد سے یہ ثابت کیا ہے کہ تکیہ کاظمیہ والا نسخہ قاسم بن سلام کی غریب الحدیث نہیں، بلکہ احمد بن محمد ہروی کی غریبین کا ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں جو دلائل پیش کیے ہیں، ان میں پہلی دلیل یہ ہے کہ اس کے آغاز میں جو سند مذکور ہے، اس میں اس کتاب کو ابوعبید احمد بن محمد سے ان کے شاگرد ابوسعد مالینی متوفی ۴۱۲ھ روایت کرتے ہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ تکیہ کاظمیہ والا نسخہ سند کے بعد ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے: **سبحان من له في كل شيء شاهد** اور حاجی خلیفہ نے کشف الظنون (۱۵۹/۲) اور نواب صدیق حسن خاں نے البلغہ (ص ۸) میں احمد بن محمد ہروی کی غریب القرآن والحدیث کے تذکرہ میں یہی عبارت نقل کی ہے، اور اسی طرح صاحب کشف الظنون نے خطبہ کے بعد جو عبارت لکھی ہے، وہی عبارت زیرِ بحث نسخے میں بھی ہے۔

قاسم بن سلام کی 'غریب الحدیث' اور احمد بن محمد کی کتاب 'الغریبین' میں ایک کھلا ہوا فرق یہ ہے کہ اول الذکر کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے نہیں ہے، جبکہ غریبین کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے، چنانچہ اول الذکر کا پہلا لفظ **زُوِيَتْ** اور آخری **يَـذْبُرُه** ہے، جبکہ کاظمیہ والے نسخے کی بابت ڈاکٹر صاحب موصوف نے خود لکھا ہے کہ اس کا آخر **الياء مع الهاء** ہے۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے 'غریبین' اور 'غریب الحدیث' دونوں کے قلمی نسخوں سے شروع اور آخر کی عبارتیں نقل کر کے دونوں میں مقارنہ وموازنہ کیا ہے، اور اس طرح اس کتاب کے کتاب 'الغریبین' ہونے کے ناقابل تردید ثبوت فراہم کیے ہیں۔

صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ اس فن پر ابوعبید ہروی کے بعد عالم وجود میں آنے والی کتابوں کا تذکرہ بھی کیا ہے، جن میں زمخشری المتوفی ۵۳۸ھ کی کتاب الفائق - مطبوعہ دائرۃ المعارف، حیدرآباد - ہے، اسی طرح ابوموسیٰ مدینی نے غریبین کا تکملہ لکھا ہے، اس فن کی شہرۂ آفاق کتاب مبارک بن محمد ابن الاثیر جزری متوفی ۶۰۶ھ کی نہایہ ہے، ابن الاثیر کے بعد اس موضوع پر ہندوستان کے مایۂ ناز محدث علامہ محمد بن طاہر گجراتی متوفی ۹۸۶ھ نے مجمع بحار الانوار تصنیف فرمائی، جو منشی نول کشور پریس سے متعدد بار شائع ہوئی۔

اس مضمون میں علامہ اعظمیؒ نے 'غریب الحدیث' اور 'الغریبین' کے قلمی نسخوں کی بھی نشان دہی فرمائی ہے، 'غریب الحدیث' کے بارے میں لکھا ہے کہ جہاں تک میں جانتا ہوں اس کے دو نسخے ہندوستان میں ہیں، اور ان دونوں کو میں نے دیکھا ہے: ایک مدراس میں ہے، دوسرا رضا لائبریری رام پور میں ہے، جو قدرے ناقص ہے۔

اسی طرح 'کتاب الغریبین' کے بھی دو نسخوں کا ہم کو علم ہے، ایک یہی تکیہ کاظمیہ کاکوری ضلع لکھنؤ کا جو دو ضخیم جلدوں میں ہے اور بہت اچھی حالت میں ہے، اور دوسرا نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے، کاظمیہ والے نسخے کے بارے میں لکھا ہے کہ میں نے اس کو دو بار دیکھا ہے۔

مضمون کے آخر میں 'غریب الحدیث' کے نسخے کے بارے میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے علاوہ دارالکتب

المصر یہ، جامع ازہر اور ماسکو وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

یہ مضمون ۲۴؍دسمبر ۱۹۶۰ء = ۵؍رجب ۱۳۸۰ھ کا حوالۂ قلم کیا ہوا ہے۔ اور فروری ۱۹۶۱ء کے ماہنامہ دارالعلوم میں شائع ہوا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

ابوعبید کی غریب الحدیث

امام ومحدث وحافظ ابوعمرو ابن الصلاح غریب الحدیث کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **وهذا فن مهم يقبُح جهله بأهل الحديث خاصةً، ثم بأهل العلم عامةً** (یہ ایک بہت اہم فن ہے، اس سے ناواقفیت اہل علم کے لیے عام طور سے اور اہل حدیث کے لیے خاص طور پر نازیبا اور غیر مناسب ہے)۔

اس کی اہمیت اور ہر ہر قدم پر اس کی ضرورت پیش آنے کی وجہ سے ہر دور اور ہر زمانے میں اہل علم اور علماء لغت نے اس کی طرف خصوصی توجہ صرف کر کے زیادہ سے زیادہ ذخیرہ اور سرمایہ فراہم کرنے کی کوشش کی ہے؛ اگر ہم دوسری اور تیسری صدی ہجری کی تصنیفی سرگرمیوں پر نگاہ ڈالیں، تو زبان ولغت کے علماء کی ایک بڑی تعداد ہم کو ایسی نظر آئے گی، جنھوں نے اس مبارک اور پاکیزہ فن میں تصنیف وتالیف کے جوہر دکھائے ہیں۔

ابتدائی دور میں غریب الحدیث پر کتاب تصنیف کرنے والوں میں سب سے زیادہ شہرت کے حامل ابوعبید قاسم بن سلام ہروی ہیں، یوں تو ابوعبید سے پہلے بھی اس فن میں متعدد کتابیں اور تصانیف عالمِ وجود میں آ چکی تھیں، لیکن احاطہ واستیعاب کے لحاظ سے جو شہرت ابوعبید کی کتاب کو حاصل ہوئی، وہ ان کے پیش رَو کسی عالم کو نہ حاصل ہوسکی، علامہ ابن الصلاح لکھتے ہیں: **وصنَّف بعد ذلك أبو عبيد القاسم بن سلام كتابَه المشهور، فَجَمَع وأجاد واستقصى، فوقع من أهل العلم بموقعٍ جليل، وصار قدوةً في هذا الشان** (یعنی نضر بن شمیل اور ابوعبیدہ معمر بن مثنی کے بعد ابوعبید قاسم بن سلامؒ نے اپنی مشہور کتاب تصنیف کی، انھوں نے اس میں عمدگی کے ساتھ الفاظ کا احاطہ اور استقصا کیا، چنانچہ اس کی اہل علم میں بہت پذیرائی ہوئی، اور اس فن میں بعد کے لوگوں کے لیے نمونہ ثابت ہوئی)۔

ابوعبید کی یہ اہم کتاب دائرۃ المعارف حیدرآباد سے ۴؍جلدوں میں طبع ہوئی، یہ کتاب مطبوعہ شکل میں جب علامہ اعظمیؒ کے ہاتھ میں پہنچی تو آپ کی مسرت وانبساط کی جو کیفیت تھی، اس کا اندازہ آپ کے ان الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے، فرماتے ہیں:

> ''دائرۃ المعارف العثمانیہ (حیدرآباد) کے علم دوست منتظمین تمام اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے اس کتاب کو شائع کر کے اسلامی مطبوعات میں ایک گراں قدر اضافہ فرمایا، ان کی توجہ سے اہل علم کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور اس نادر ونایاب کتاب سے ان کو استفادہ کا موقع ملا''[۱]۔

(۱) معارف، ج ۱۰۰، ش ۴، ص: ۳۰۵

علامہ اعظمیؒ نے اپنے مضمون میں کتاب کی خصوصیات، اس کے طریقۂ ترتیب، اوراس کی قدر وقیمت کے تذکرہ کے ساتھ محققین کے تسامحات اوران کی فروگزاشتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

آپ نے اس کے طرز تصنیف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی کوئی ترتیب نہیں ہے جس کا مصنف نے لحاظ رکھا ہو، یعنی کتاب نہ حروف کی ترتیب پر ہے، نہ مسانید صحابہ کی ترتیب پر؛ حروف کی ترتیب کا مطلب یہ ہے کہ حروف تہجی کی رعایت سے الفاظ کو جمع کیا گیا ہو، اور مسانید صحابہ کی ترتیب کا مطلب یہ ہے کہ ایک صحابی کی مرفوع حدیثوں میں جو مشکل الفاظ ہوں، ان کو یکجا کردیا جائے، اوراس طرح ہر صحابی کی مرفوع حدیثوں کے الفاظ کو علاحدہ علاحدہ ذکر کیا جائے؛ البتہ آثار صحابہ میں مصنف نے یہ رعایت ملحوظ رکھی ہے، مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ کے آثار میں جو مشکل الفاظ ہیں، ان کو یکجا ذکر کیا ہے، اس کے بعد حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور دوسرے آثار صحابہؓ کو یکے بعد دیگرے رکھا ہے۔

کتاب کے تعارف کے بعد علامہ اعظمیؒ نے جن نسخوں کی مدد سے کتاب ایڈٹ کر کے شائع کی گئی ہے، ان کا موازنہ کرتے ہوئے محققین کے تسامحات کا ذکر کیا ہے؛ یا ان امور کو بیان کیا ہے، جن کی طرف محققین کو توجہ دینے کی ضرورت تھی، مگر وہ ان کی طرف توجہ نہ دے سکے۔

آپ نے لکھا ہے کہ کتاب چار مخطوطوں کی مدد سے ایڈٹ کی گئی ہے، ایک مخطوطہ مدرسہ محمودیہ مدراس کا ہے، دوسرا رضا لائبریری رام پور کا، تیسرا لیڈن اور چوتھا مکتبہ ازہر یہ مصر کا۔ جن اہل علم نے کتاب کی تحقیق کی ہے، ان سے یہ تسامح ہوا ہے کہ اول الذکر کو اصل قرار دیا ہے، حالانکہ یہ بعینہ غریب الحدیث نہیں ہے، بلکہ اس کی تجرید اوراختصار ہے، کیونکہ مؤخرالذکر تینوں نسخے باسند ہیں، اوراول الذکر کے اندر سند حذف کردی گئی ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ابوعبید کی اصل غریب الحدیث نہیں ہے۔ اس لیے محققین کو چاہئے تھا کہ مدراس کے علاوہ دیگر تین نسخوں میں سے کسی کو اصل قرار دیتے، اوراگر کوئی مجبوری حائل تھی، تو ظاہر کردیا جاتا کہ ہم غریب الحدیث کی تجرید کو خاص اسباب کی بنا پر اصل قرار دے رہے ہیں، لیکن ہم التزام کریں گے کہ تجرید واختصار کرنے والے نے جتنی سندیں اور الفاظ کم کردیے ہیں، ان کو تعلیقات میں درج کریں گے، اگرچہ علماء دائرہ نے عملاً ایسا ہی کیا ہے کہ چھوڑی ہوئی چیزیں تعلیقات میں لے لی ہیں، مگر ایک تو اصل کی نسبت ظاہر نہیں کیا کہ وہ تجرید ہے، اور دوسرے تعلیقات میں جو استدراکات لیے ہیں، ان کو رام پور یا مصری نسخے کی زیادات سے تعبیر کیا ہے، حالانکہ وہ زیادات نہیں ہیں، بلکہ اصل کتاب کے اجزا ہیں۔

اس ضروری تنبیہ کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

> ''مصر اور لیڈن کے نسخے تو میں نے دیکھے نہیں، رام پور کا مخطوطہ دیکھا ہے، اس کے سوا اس کتاب کے دو نسخے مدینہ منورہ میں میری نظر سے گزرے ہیں، ایک کتب خانۂ محمودیہ میں، دوسرا کتب خانہ شیخ الاسلام میں، محمودیہ کا نسخہ ۱۰۶اھ کا لکھا ہوا ہے، اور کتب خانہ شیخ الاسلام والے مخطوطہ کا سن کتابت

۵۴۶ھ ہے''(۱)۔

اس کے بعد آپ نے دو کالم بنا کر ایک کالم میں کتب خانہ شیخ الاسلام والے مخطوطہ کی کچھ عبارتیں اور دوسرے کالم میں مطبوعہ غریب الحدیث کے ان ہی مقامات کی عبارتیں نقل کر کے لکھا ہے:

''ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ:

۱- مدراسی نسخہ میں حدیثوں کی سندیں تمام کی تمام حذف کر دی گئی ہیں۔

۲- اور اس کے نتیجہ میں جگہ جگہ تعبیر بھی بدلنا پڑی ہے۔

مزید مقابلہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ:

۱- بعض حدیثوں کا صرف ایک مختصر ٹکڑا لے لیا ہے اور سند کے ساتھ جو پوری حدیث مذکور ہے، اس کو بالکل چھوڑ دیا ہے۔

۲- مدراسی نسخہ میں کہیں کہیں عبارتوں میں اضافہ بھی کیا گیا ہے''(۲)۔

اس کے بعد مدراسی نسخے میں عبارتوں کی زیادات واضافے کی بہت ساری مثالیں پیش کر کے لکھا ہے:

''بہر حال ہمارے نزدیک ذمہ داری اور احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ جب سرورق پر کتاب کا نام ''**غریب الحدیث لأبي عبید**'' لکھا گیا ہے، تو اس کی تجرید یا اختصار کے بجائے حوض میں اصل غریب الحدیث کا متن رکھنا چاہئے تھا، اور اختلاف الفاظ وتعبیرات، یا اضافات یا اختصارات کی نشاندہی حواشی میں کرنا مناسب تھا''(۳)۔

پھر کچھ مزید فروگزاشتوں اور کتابت وطباعت کی چند غلطیوں کا نمونہ پیش کر کے آخر میں اس علمی ورثے کی اشاعت کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

''آخر میں پھر صدق دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ اس کتاب کی اشاعت دائرۃ المعارف کا بڑا اہم کارنامہ ہے، اور ان فروگزاشتوں کے باوجود ایک قابلِ قدر علمی خدمت ہے، جس کے لیے ارکانِ دائرہ ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں''۔

یہ مضمون ۱۶/ جمادی الاولی ۱۳۸۷ھ کا سپرد قلم کیا ہوا ہے۔ اور اکتوبر ۱۹۶۷ء کے ماہنامہ 'معارف' میں شائع ہوا ہے۔

(۱) معارف، ج۱۰۰، ش۴، ص:۳۰۵ (۲) ایضاً: ۳۰۷ ایضاً: ۳۱۱ مختصراً

☆......☆......☆......☆

☆......☆......☆

☆......☆

دِینَوَر اور مشائخ دینور

اس مضمون کا پسِ منظر خود حضرت علامہ الاعظمیؒ نے یہ تحریر فرمایا ہے:

''معارف (اگست ۱۹۶۵ء) میں جناب سید شمیم احمد صاحب - ڈھاکہ - کا ایک مقالہ مذکورہ بالا عنوان سے شائع ہوا ہے، جس میں موصوف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دینور - جس کی طرف حضرت ممشاد اور حضرت احمد اسود وغیرہ منسوب ہیں - سیلون کا ایک شہر تھا، انھوں نے اپنے اس خیال کی بنیاد یہ بتائی ہے کہ ابن بطوطہ نے جزیرۂ ''لنکا'' کے حال میں نہایت تفصیل وتشریح کے ساتھ دینور کا ذکر کیا ہے''[1]۔

علامہ اعظمیؒ نے پیش نظر مضمون میں سید شمیم صاحب کے اس خیال کا تعقُّب کیا ہے، اور نہایت مستحکم اور ٹھوس تاریخی اور جغرافیائی دلائل سے ان کا نقد اور رد کیا ہے، ابتداءً لکھا ہے کہ:

''صرف اتنی سی بات کہ لنکا کے نواح میں ایک دینور پایا جاتا ہے، یہ خیال قائم کرنے کے لیے کہ حضرت ممشاد وغیرہ اسی دینور کی طرف منسوب ہیں، کافی نہیں ہے؛ اس خیال کی صحت کا امکان اُس وقت تھا، جب اس دینور کے علاوہ کسی دوسرے دینور کا ذکر کہیں نہ ہوتا، یا ہوتا مگر کسی محقق کی یہ تصریح پائی جاتی کہ حضرت ممشاد وغیرہ لنکا والے ہی دینور سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ان دونوں باتوں میں کوئی بھی صحیح اور متحقق نہیں ہے''[2]۔

اس کے بعد مشہور مورخ بلاذری - متوفی ۲۷۹ھ - کی 'فتوح البلدان'، ابن الاثیر کی 'الکامل'، یاقوت حموی کی 'معجم البلدان'، سمعانی کی 'کتاب الأنساب'، نیز 'المنجد' کی عبارتوں سے ثابت کیا ہے کہ دینور ایران یا کوہستانِ عراق کا ایک مشہور شہر تھا، جس کے مقابلہ میں لنکا والے دینور کی شہرت کچھ بھی نہیں تھی، بلکہ ابن بطوطہ سے پہلے شاید کسی نے اس کا ذکر بھی نہیں کیا ہے، لہٰذا لنکا والے دینور کو تسلیم کرنا اور ایران والے دینور کا انکار کرنا تحقیق اور ریسرچ کی کوئی قابلِ تعریف مثال نہیں ہے۔

آگے لکھا ہے کہ ہمارے خیال میں کسی مورخ، محقق یا تذکرہ نگار نے حضرت ممشاد کو لنکا والے دینور کی طرف منسوب نہیں بتایا ہے، بلکہ بہ کثرت محققین نے ان لوگوں کو ایران والے دینور کی طرف منسوب بتایا ہے۔

پھر اپنی بات کی تائید کے لیے شیخ الاسلام ہروی کی 'طبقات الصوفیۃ'، اور مولانا جامی کی 'نفحات الأنس' کی عبارتیں نقل کی ہیں، اس کے علاوہ دینور کی طرف منسوب متعدد اہل علم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ تمام حضرات یا ان میں سے کوئی لنکا والے دینور کی جانب منسوب ہوتا، تو لازمی طور پر مورخین اس کی تصریح کرتے، مورخین کی مستمر عادت ہے کہ ایک نام کے دو شہر ہوتے ہیں، اور ان میں ایک

(۱) معارف، ج ۹۶، ش ۴، ص: ۳۰۴ (۲) ایضاً

زیادہ مشہور ہو دوسرا کم، تو جو شخص غیر مشہور شہر کی طرف منسوب ہوتا ہے، اس کے باب میں صراحت کر دیتے ہیں کہ یہ اس غیر مشہور شہر سے تعلق رکھتا ہے، جیسے صنعاء نام کے دو شہر ہیں، ایک یمن میں، دوسرا شام میں، تو جو آدمی صنعاء شام کا رہنے والا ہوتا ہے، اس کی نسبت بتا دیتے ہیں کہ **ھو من صنعاء الشام**، اس کی اور بھی متعدد مثالیں موجود ہیں''(۱)۔

مقالہ نگار نے خواجہ ممشاد کو خواجہ عبداللہ خفیف کا خلیفہ بتایا ہے، اور لکھا ہے:

''حضرت ممشاد علو دینوری کو حضرت عبداللہ خفیف سے بھی خلافت حاصل تھی''(۲)۔

علامہ اعظمیؒ نے فرمایا کہ اس میں دو وہم ہیں، ایک یہ کہ عبداللہ خفیف کے بجائے ابوعبداللہ خفیف ہونا چاہئے(۳)؛ دوسرے ممشاد کو ابوعبداللہ خفیف کا خلیفہ بتانا بالکل خلاف واقعہ ہے۔ حضرت ممشاد-متوفی ۲۹۹ھ- ابوعبداللہ خفیف کے مشائخ کے طبقہ میں تھے، پھر لکھا ہے کہ:

''تذکروں میں یہ ذکر تو آتا ہے کہ ابوعبداللہ خفیف نے ممشاد کو خواب میں دیکھا ہے، لیکن بیداری میں دونوں بزرگوں کی باہمی ملاقات کا ذکر ہمارے علم میں کسی تذکرہ نویس نے نہیں کیا ہے''(۴)۔

آخر میں لکھا ہے کہ مقالہ نگار نے غالباً مولانا جامی کے اتباع میں ابوعبداللہ خفیف کا سال وفات ۳۳۱ھ لکھا ہے(۵)۔ علامہ اعظمیؒ نے دس مصنفین کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ ان کا سال وفات ۳۷۱ھ ہے۔

یہ مضمون ۲۲/ربیع الثانی ۱۳۸۵ھ کا تحریر فرمودہ ہے، اور 'معارف' میں جمادی الثانیہ ۱۳۸۵ھ = اکتوبر ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا ہے۔

---

(۱) معارف، ج۹۶،ش۴،ص:۳۱۰

(۲) معارف، ج۹۶،ش۲،ص:۱۱۶

(۳) سید شمیم صاحب کے مضمون میں دسیوں جگہ یہ نام آیا ہوگا اور ہر جگہ ''عبداللہ خفیف'' لکھا ہے۔

(۴) معارف، ج۹۶،ش۴،ص:۳۱۱

(۵) دیکھئے 'معارف' جلد۹۶، شمارہ۲، ص:۱۱۴

☆......☆......☆......☆......☆

☆......☆......☆......☆

☆......☆......☆

☆......☆

☆

تعارف
اور
تبصرے

تخریجِ زیلعی

فقہ حنفی کی شہرۂ آفاق کتاب 'ہدایہ' اپنی وضع وترتیب اور جامعیت کے اعتبار سے نہ صرف مسلم لا (Muslim Law) بلکہ پورے اسلامی لٹریچر میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، اس کتاب کے محاسن میں سے ایک حسن یہ بھی ہے کہ اس کے مصنف علامہ برہان الدین مرغینانی -متوفی ۵۹۳ھ- نے مسلک احناف کے ساتھ ساتھ دوسرے ائمہ-بطور خاص امام شافعیؒ- کے نقلی وعقلی دلائل بھی نہایت اہتمام والتزام کے ساتھ ذکر کیے ہیں، چونکہ اس میں جو نقلی دلائل ہیں اس کی سندیں مذکور نہیں ہیں، اور بہت سی احادیث روایت بالمعنی کے طور پر ذکر کی گئی ہیں، اس لیے اس کتاب کے پڑھنے پڑھانے والوں کو ان کے تلاش وجستجو اور ان کے درجات کی معرفت میں دقت اور دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس مشکل کے حل کے لیے مشہور حنفی عالم اور امام ومحدث علامہ جمال الدین زیلعیؒ -متوفی ۷۶۲ھ- نے اس کی احادیث کی تخریج کی، اور **نصب الراية لأحاديث الهداية** کے نام سے ایک عظیم الشان کتاب تصنیف فرما کر فن حدیث کے ذخیرے میں ایک بیش قیمت اضافہ کیا۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنے مضمون 'تخریجِ زیلعی' میں اسی نصب الرایہ کی خوبیوں اور خصوصیتوں کا جائزہ لیا ہے، اور اس کے محاسن پر متعدد جہات سے روشنی ڈالی ہے۔

سب سے پہلے اس کے مصنف علامہ زیلعیؒ کے حالات تحریر فرمائے ہیں، ان کی نسبت حافظ ابن حجر اور سیوطی جیسے متعدد اہل علم وکمال کے اقوال وتاثرات نقل کیے ہیں، ان کے چند مشہور اساتذہ کا بھی ذکر کیا ہے، جو علم ومعرفت کے اساطین میں شمار کیے جاتے ہیں، منجملہ ان کے حافظ جمال الدین ابوالحجاج یوسف بن عبدالرحمٰن مزی -متوفی ۷۴۲ھ-، حافظ شمس الدین ذہبی -متوفی ۷۴۸ھ- علامہ علاؤالدین علی بن عثمان ماردینی صاحب 'الجوہر النقی' -متوفی ۷۴۵ھ- اور امام فخر الدین علی بن عثمان زیلعی صاحبِ 'تبیین الحقائق' -متوفی ۷۴۳ھ- ہیں۔

تخریجِ زیلعی کو، دیگر محاسن کے ساتھ، فضیلتِ تقدم بھی حاصل ہے، بعض لوگوں نے امام زیلعی کے استاد علامہ علاؤالدین ماردینی کی تصانیف میں ان کی تخریج ہدایہ کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن علامہ اعظمیؒ کی نگاہ میں ان کی طرف تخریج ہدایہ کی تصنیف کی نسبت صحیح نہیں ہے، علامہ علاؤالدین کے ایک شاگرد حافظ عبدالقادر قرشی نے البتہ ہدایہ کی تخریج لکھی ہے، لیکن چونکہ حافظ قرشی کا طبقہ زیلعی کے بعد ہے، اس لیے قرشی کی کتاب زیلعی کی کتاب سے متاخر تسلیم کی جائے گی، حافظ قرشی کی کتاب کا نام **'العناية في معرفة أحاديث الهداية'** ہے۔

حافظ عبدالقادر قرشی کی تخریج کے بارے میں علامہ اعظمیؒ نے نہایت مفید اور کارآمد معلومات بہم پہنچائی ہیں، اور لکھا ہے کہ خدیویہ مصر کی فہرست میں ۲۱۸/اوراق پر مشتمل ہدایہ کی ایک بے نام تخریج کا ذکر موجود ہے، مرتبِ فہرست نے اس کے مصنف کا نام محمد بن عبداللہ بن محمد بن ابی الوفا لکھا ہے، اور ان کا سن وفات ۷۷۵ھ بتایا ہے، علامہ اعظمیؒ کے خیال کے مطابق یہ حافظ قرشی کی العنایہ ہی ہے، اور فہرست نگار سے مصنف کے نام ونسب میں

غلطی ہوئی ہے، صحیح نام ابومحمد عبدالقادر بن محمد بن محمد بن نصر اللہ بن ابی الوفاء ہے۔

احادیثِ ہدایہ کی تخریج حافظ ابن حجر نے بھی درایہ کے نام سے کی ہے، علامہ اعظمیؒ نے مختصراً ان دونوں کتابوں -نصب الرایہ ودرایہ- کا موازنہ کرکے یہ بتایا ہے کہ درایہ اگر چہ تخریجِ زیلعی ہی کی تلخیص واختصار ہے، لیکن یہ ایسا اختصار ہے جو طالبِ تحقیق کی تشنگی دور کرنے کے لیے ناکافی ہے۔

آخر میں لکھا ہے کہ تخریج زیلعی کا پہلا اڈیشن ۱۳۰۱ھ میں مولوی خادم حسین عظیم آبادی کے اہتمام سے مطبع علوی لکھنؤ میں چھپا تھا، لیکن یہ اغلاط سے پُر اور معیار سے حد درجہ گرا ہوا تھا، بالآخر مجلس علمی -ڈابھیل- نے نہایت اہتمام کے ساتھ اس عظیم الشان کتاب کو طبع کرا کر شائع کیا، جس پر مجلس تمام اہلِ علم کی جانب سے شکریہ اور مبارک باد کی مستحق ہے۔

یہ کتاب کس قدر اہم اور بیش قیمت ہے، اس کا اندازہ حضرت علامہ اعظمیؒ کے ان الفاظ سے ہوگا:

''یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ زیلعی نے ہدایہ کی تخریج لکھ کر مذہبِ احناف کی بڑی خدمت انجام دی، اور علماء احناف پر بہت بڑا احسان کیا؛ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تنہا احناف ہی ان کے زیر بار احسان نہیں ہیں، بلکہ جیسا کہ ابھی اوپر گزرا، زرکشی اور ابن حجر جیسے علماء شافعیہ بھی ان کے رہینِ منت ہیں''[۱]۔

علامہ اعظمیؒ کا یہ مضمون 'معارف' میں جولائی ۱۹۴۰ء کے شمارے میں شائع ہوا، دوبارہ اس کی اشاعت المآثر کے پہلے شمارے جولائی-اگست-ستمبر ۱۹۹۲ء = محرم-صفر-ربیع الاول ۱۴۱۳ھ میں ہوئی۔

☆......☆......☆

الدراية في تخريج أحاديث الهداية

کا ایک نادر نسخہ

علماء اسلام نے احادیث نبویہ مقدسہ -علی صاحبہا الصلوات والتحیات- کی خدمت نئے نئے اور حیرت انگیز طریقوں سے انجام دی ہے، خدمتِ حدیث کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے، جس کو انھوں نے اپنی توجہ، دلچسپی اور جہد وکاوش کا مرکز نہ بنایا ہو، خدمتِ حدیث کے گوناگوں جہات میں ایک جہت یہ ہے کہ ایسی کتابیں جو فن حدیث کے علاوہ کسی دوسرے فن سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن ان کا رشتہ حدیث نبوی کے ساتھ بھی قائم رہتا ہے، یا احادیث مبارکہ کا قابل قدر ذخیرہ ان کے اندر موجود ہوتا ہے، تو ان احادیث مقدسہ طیبہ کی تخریج کا اہتمام کیا جاتا ہے، اور اِس کا سراغ لگانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ حدیثیں مجموعہائے حدیث میں سے کن کن کتابوں میں اور کہاں کہاں پائی

(۱) معارف، ج۴۶، ش۱، ص: ۶۷

جاتی اور روایت کی گئی ہوتی ہیں، جیسے فن تفسیر میں علامہ زمخشری کی 'کشاف' کی حدیثوں کی تخریج، علم اسرار شریعت میں 'إحیاء علوم الدین' کی حدیثوں کی تخریج کی گئی ہے، اس قسم کی تخریجات میں سب سے زیادہ اہمیت اور شہرت کی حامل 'نصب الرایة لأحادیث الهدایة' ہے، جس میں فقہ حنفی کی مشہور ترین اور معرکۃ الآراء کتاب ہدایہ کی حدیثوں کی تخریج کی خدمت نہایت عمدہ اور شاندار طریقے سے انجام دی گئی ہے۔

'نصب الرایۃ' کا اختصار اور تلخیص حافظ ابن حجر عسقلانی نے 'الدرایۃ' کے نام سے کیا ہے، علامہ اعظمیؒ نے اسی درایۃ کے ایک نسخے کا تعارف پیش نظر مضمون میں کیا ہے، یہ مضمون تقریباً ۹ رصفحات پر مشتمل ہے، اور نہایت بیش قیمت، پُر مغز اور معلومات افزا ہے، بلکہ ایک اہم علمی دریافت کی حکایت ہے۔

اس مضمون میں 'درایہ' کے ایک ایسے قلمی نسخے کا تعارف کرایا گیا ہے، جو قدر و قیمت کے لحاظ سے کسی گوہرِ نایاب سے کم نہیں ہے، یہ نسخہ درایہ کے صرف نصف ثانی پر مشتمل ہے، جو کتاب النکاح سے لے کر آخر تک کے تمام ابواب کو حاوی ہے، اس کی نسبت علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''ہمارے علم میں یہ نسخہ اپنی گوناگوں خصوصیات کے اعتبار سے انفرادی شان رکھتا ہے''[1]۔

پھر اس کی متعدد خصوصیات ذکر کی ہیں: کہ مصنف کی حیات میں، بلکہ کتاب کی تصنیف کے صرف تین سال بعد ۸۳۰ھ کا کتابت شدہ ہے؛ دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ نسخہ ابوالفتح محمد بن احمد خطیب طوخی -متوفی ۸۳۸ھ- کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، جو حافظ ابن حجر کے شاگرد اور ان کے معتمد علیہ تھے، اور ان کی بہت سی تالیفات کی کتابت کی تھی، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''اس لحاظ سے یہ نسخہ نوادرِ روزگار میں سے ہے''[2]۔

اس نسخے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مشہور ہندوستانی عالم و مصنف مولانا غلام یحییٰ بہاری کی ملک میں رہ چکا ہے، اور اس پر ان کی مہر ثبت ہے۔

نیز اس کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ تو اس نسخہ کے ظاہری خصوصیات ہیں، اسی کے ساتھ اس کی سب سے بڑی معنوی خصوصیت یہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے اس کتاب میں بہت سی حدیثوں کی نسبت یہ تحریر فرمایا ہے کہ لم أجده (میں نے اس کو نہیں پایا)، اس نسخہ میں ہر جگہ تو نہیں، لیکن پھر بھی بہت سے مقامات پر کسی قدیم حنفی محدث کے مختصر تعلیقات ہیں، ان تعلیقات کا خط اصل کتاب کے خط سے بہت مختلف ہے، پھر بھی بہت قدیم ہے، اور اغلب یہ ہے کہ اسی عہد کے کسی بزرگ کے تعلیقات ہیں، ان تعلیقات میں ان بزرگ نے یہ بتایا ہے کہ حافظ ابن حجر کو یہ حدیث نہیں ملی، مگر وہ فلاں فلاں کتاب میں موجود ہے''[3]۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے تعلیقات تحریر فرمانے والے ان بزرگ کا سراغ لگا کر فرمایا ہے کہ یہ شیخ ابن

---

(۱) معارف، ج ۶۶، ش ۲، ص: ۱۲۴ (۲) ایضاً: ۱۲۵ (۳) ایضاً: ۱۲۵

الہمام اور حافظ ابن حجر کے شاگرد، جلیل القدر مصنف اور مشہور حافظ حدیث وفقیہ حنفی علامہ قاسم بن قطلو بغا کے قلم سے ہیں، ان بزرگ کا سراغ لگانے میں حضرت علامہ اعظمیؒ کو کس قدر کاوش کرنی پڑی ہے، اس کی تفصیل بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہے، اس حکایت کو خود علامہ اعظمیؒ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''اس قلمی نسخہ کے آخری صفحہ پر حاشیہ میں ایک مٹی مٹی سی عبارت ہے، جس کے بعض الفاظ کسی کیڑے نے چاٹ ڈالے ہیں، اور کچھ جلد بند کی بے احتیاطی سے کٹ گئے ہیں، جب سے یہ نسخہ میرے ہاتھ لگا ہے، اس وقت سے اب تک کئی دفعہ میں نے اس کو پڑھنے کی کوشش کی، تو اب کی دفعہ تھوڑی ہی دیر غور کرنے کے بعد بڑی حد تک میں نے اس عبارت کو حل کر لیا، اگر چہ اب بھی پوری عبارت نہیں پڑھی جاسکی، لیکن جتنا حصہ پڑھا گیا، وہ میرے لیے بالکل کافی ہے اور وہ یہ ہے: **الحمد لله طالعت هذه النسخة وعلّقتُ في هوامشها ما لم يجد مؤلفها .... وكتب قاسم الحنفي.** ان فقروں کو پڑھ کر میں خوشی سے اچھل پڑا، اس لیے کہ ان فقروں نے ایک بڑی گرہ کھول دی، اور ان سے کاتب تعلیقات کا سراغ مل گیا''(۱)۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے مختصر مگر جامع الفاظ میں علامہ قاسم بن قطلو بغا کا تعارف پیش کیا ہے، اور آخر میں لکھا ہے:

''اور اسی کے ساتھ اس نسخہ کی ایک مزید عظیم الشان خصوصیت ظاہر ہوئی، اور وہ یہ کہ یہ نسخہ علامہ قاسم بن قطلو بغا کے مطالعہ میں رہ چکا ہے، اور اس پر خود ان کے دست مبارک کی تعلیقات ہیں''(۲)۔

علامہ اعظمیؒ نے اس نادرۂ روزگار نسخے کے تعارف سے فارغ ہو کر اس پر پائی جانے والی قاسم بن قطلو بغا کی تعلیقات نقل کی ہیں، جو انتیس (۲۹) کی تعداد میں ہیں۔

یہ مضمون ماہنامہ 'معارف' میں شوال ۱۳۶۹ھ = اگست ۱۹۵۰ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

☆......☆......☆

زجاجۃ المصابیح

'زجاجۃ المصابیح' مولانا ابوالحسنات محمد عبداللہ شاہ حیدرآبادی کی تصنیف ہے، علامہ اعظمیؒ کے اس مضمون میں اسی کا تعارف پیش کیا گیا ہے، 'زجاجۃ المصابیح' چونکہ 'مشکوۃ شریف' کے طرز کی کتاب ہے، اس لیے علامہ اعظمیؒ نے اپنی تحریر کا آغاز مشکوۃ شریف کے تعارف سے کیا ہے، جس میں اس کی اہمیت اور خصوصیات کو بیان کیا ہے، مشکوۃ کے مصنف شافعی المسلک تھے اس لیے اس کے ابواب فقہیہ میں زیادہ تر شافعی مسلک کی موید حدیثوں کو جگہ دی گئی ہے۔

(۱) الدرایہ کا ایک نادر نسخہ (قلمی) (۲) ایضاً

اس کے بعد مذہب حنفی کی تائید میں اس طرز پر تصنیف کی ضرورت کو بیان کرتے ہوئے ہندوستان میں مرتب ہونے والے مجموعوں-علامہ شوق نیموی کی 'آثار السنن'، حضرت تھانوی کی 'جامع الآثار'، اور حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی کی 'اعلاء السنن' وغیرہ-کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان مساعی جمیلہ کے بعد مطلوبہ نوعیت کا ایک مجموعہ مرتب کرنے کی آخری کوشش مولانا ابوالحسنات محمد عبداللہ شاہ حیدرآبادی نے کی، اور بالکل مشکوٰۃ کے ڈھنگ پر'زجاجۃ المصابیح' نام کی ایک کتاب چار جلدوں میں تصنیف فرمائی ہے، اب تک اس کی دو جلدیں حیدرآباد سے شائع ہوئی ہیں، پہلی جلد کتاب الایمان، کتاب العلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوۃ، کتاب الزکوۃ، اور کتاب الصوم پر مشتمل ہے؛ اور دوسری جلد میں کتاب الحج، کتاب الدعوات، کتاب البیوع، کتاب النکاح، کتاب الطلاق، کتاب العتاق کے ابواب ہیں''(۱)۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کتاب کے طرز واسلوب کی نسبت کچھ اہم اور مفید مشورے اور ضروری باتیں بھی ارقام فرمائی ہیں، اور اس سلسلے میں لکھا ہے:

''لیکن اسی کے ساتھ یہ عرض کرنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ اختلافی مسائل میں احادیث کے انتخاب کے وقت مزید توفیقِ نظر سے کام لینے کی ضرورت تھی، اور اس قسم کی احادیث پر حواشی، محدثانہ نقطۂ نظر سے لکھے جانے چاہئے تھے، نیز اس کا التزام کیا جاتا تو اچھا ہوتا کہ اپنے دلائل کی اسانید پر مخالفین نے جو اعتراضات کیے ہیں ان کے مختصر جوابات حواشی میں دے دیے جائیں، اور مخالفین کے دلائل میں جو واقعی کمزوریاں ہوں، ان کی طرف بھی اختصار کے ساتھ اشارہ کر دیا جائے''(۲)۔

پھر مثال دے کر اپنی اس رائے اور مشورے کو واضح کیا ہے، اور آگے لکھا ہے:

''علی ہذا کتاب کی ترتیب کی یہ صورت شاید زیادہ بہتر تھی کہ حوض کا حصہ صرف احادیث وآثار اور ان کی تصحیح وتحسین یا تضعیف نقل کرنے کے لیے مخصوص ہوتا، باقی چیزیں مثلاً وجہِ استنباطِ مسئلہ، یا معترضین کے جوابات یا بیانِ مذاہب وغیرہ کو حاشیہ میں جگہ دی جاتی''(۳)۔

علامہ اعظمیؒ نے مصنف کی کاوش اور محنت کی دل کھول کر تحسین وستائش کی ہے، اور اپنے تبصرے کے آخر میں لکھا ہے:

''ان چند باتوں سے غض بصر کرنے کے بعد مجموعی حیثیت سے مصنف کی محنت لائق ستائش ہے، اور ان کی یہ تصنیف اس قابل ہے کہ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے''۔

یہ تبصرہ 'الفرقان' محرم ۱۳۷۷ھ=اگست ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

(۱) الفرقان، ج۲۵، ش۱، ص:۴۱ (۲) ایضاً:۴۲ (۳) ایضاً:۴۲

تبصرہ بر

تصحيح الأغلاط الكتابية الواقعة في النسخ الطحاويه

جیسا کہ کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے، یہ تحریر مولانا حکیم محمد ایوب سہارن پوری کی کتاب ''تصحیح الأغلاط الكتابية الواقعة في النسخ الطحاوية'' پر تبصرہ ہے، یہ تبصرہ ۴ر صفحات پر مشتمل ہے، آغاز میں علامہ اعظمیؒ نے حدیث کے حفظ وروایت میں امام طحاوی کی عظمت وامامت، اور علم فقہ میں ان کے مرتبۂ اجتہاد کا نہایت اختصار کے ساتھ چند سطروں میں ذکر کر کے سرسری طور پر ان کی تصنیفات کا تذکرہ کیا ہے، اور لکھا ہے کہ امام طحاوی کی تصنیفات پچیس سے زائد ہیں، مگر پانچ کے سوا سب غیر مطبوع یا ناپید ہیں، جو پانچ کتابیں طبع ہو چکی ہیں، ان میں ایک مختصر رسالہ بیان اعتقاد أهل السنة معروف بہ مختصر طحاوی ہے۔

دوسری تصنیف 'شرح مشكل الآثار' ہے، جو حیدرآباد سے چار جلدوں میں ناتمام شائع ہوئی ہے[1]، اس کے متعلق علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''جتنا حصہ طبع ہوا ہے، وہ آدھے سے بھی کم ہے، اس کا کامل نسخہ نہایت صحیح ۷ر ضخیم جلدوں میں استنبول میں موجود ہے، جیسا کہ علامہ کوثری کا بیان ہے''۔

تیسری مطبوعہ تصنیف 'کتاب الشروط الکبیر' ہے، اس کا ایک ٹکڑا یورپ سے شائع ہوا ہے۔

چوتھی مختصر الطحاوی ہے، اس کو مولانا ابوالوفا افغانی نے تحقیق کر کے شائع کیا ہے، علامہ اعظمیؒ نے مولانا افغانیؒ کی اس علمی خدمت کو نہایت بلند آہنگ الفاظ میں سراہا ہے۔

اس کے بعد 'شرح معاني الآثار' کے بارے میں لکھا ہے کہ غالبًا امام طحاوی کی تصنیفات میں سب سے پہلے زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی، جو ہندوستان کے سوا کہیں اور نہیں چھپی ہے[2]، سب سے پہلے ۱۳۰۱ھ میں مطبع مصطفائی دہلی میں، پھر ۱۳۲۸ھ میں لاہور میں اور ۱۳۴۸ھ میں رحیمیہ دہلی میں چھپ کر شائع ہوئی، تصحیح کے اہتمام کے باوجود ان تمام طبعات میں بہت سی غلطیاں واقع ہوتی رہیں، اس کی طرف توجہ کرنے اور کتابت وطباعت کی غلطیوں کی طرف نشاندہی کرنے کی سخت ضرورت تھی، مولانا حکیم محمد ایوب صاحب سہارن پوری کو اس ضرورت کا احساس دامن گیر ہوا، اور انھوں نے اس کی اغلاط کی تصحیح کا عظیم الشان علمی کارنامہ انجام دیا، علامہ اعظمیؒ نے حکیم صاحب کی اس عظیم کاوش کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

''قدرت کی طرف سے یہ سعادت مولانا حکیم محمد ایوب صاحب سہارن پوری کے حصہ میں آئی، اور انھوں نے بڑی جانفشانی وجاں کاہی سے رجالِ اسانید، متونِ احادیث اور باقی عبارات کی ایک

(۱) اب یہ کتاب پوری حیدرآباد سے ۱۰ جلدوں میں اور بلاد عربیہ سے ۱۶ر جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔
(۲) یہ مضمون لکھے جانے کے وقت کی بات ہے، اب یہ کتاب بلاد عرب سے بھی چھپ چکی ہے۔

ایک غلطی کو پکڑا، پھر مراجع ومظان کا پورا تتبع کر کے اغلاط کی تصحیح کی، اور ان تمام اغلاط اور ان کی تصویبات کو ایک مجموعہ میں یکجا کیا جس کا نام 'تصحيح الأغلاط الكتابية الواقعة في النسخ الطحاوية' ہے، اس مجموعہ کی صرف پہلی جلد ابھی شائع ہوئی ہے، جو 'شرح معانی الآثار' جلد اول کے اغلاط اور اس کی تصویبات پر مشتمل ہے، صفحات کی تعداد اسی (۸۰) ہے، تقطیع 'معانی الآثار' کے برابر ہے''(۱)۔

آگے امام طحاوی کی تصنیفات کے ساتھ اپنے دیرینہ شغف اور مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے واسطے سے کتاب کی فراہمی کو ذکر کرتے ہوئے نہایت فراخ دلی اور وسیع القلبی کے ساتھ ایک بار پھر مولانا حکیم محمد ایوب سہارن پوری کی محنت وجانفشانی اور ان کے تتبع وجستجو کا ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد چند ایسے مقامات کا ذکر ہے، جہاں علامہ اعظمیؒ کو مولانا سہارن پوری کی تحقیق یا ان کی تصحیح وتصویب سے اختلاف ہوا ہے، اس اختلاف کی جو مثالیں ذکر کی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱-صفحہ ۹ میں مولانا سہارن پوری نے لکھا ہے کہ ''عیاض بن عبداللہ القرشی'' کے بجائے ''عیاض بن عبد اللہ الفہری'' صحیح ہے۔

اس پر علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ میرے نزدیک القرشي جیسا کہ معانی الآثار میں لکھا ہے، وہی صحیح ہے، اس لیے کہ مسند ابوعوانہ (۲۸۹/۱) میں اسی سند سے یہ حدیث مروی ہے اور اس میں القرشي ہی ہے، اور بیہقی (۱۶۴/۱) میں بھی القرشي ہی ہے۔

۲-صفحہ ۱۰ میں مولانا نے فرمایا کہ عبدالرحمٰن بن ثابت کے بجائے غالباً عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ثابت صحیح ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک عبدالرحمان بن عبدالرحمان بن ثابت صحیح ہے، اس لیے کہ مسند احمد (۳۷۳/۲) اور مجمع الزوائد میں یہی ہے۔

۳-صفحہ ۱۱ میں فرمایا کہ أنتم لا تسرعون کے بجائے لا تسوغون صحیح ہے۔

علامہ اعظمیؒ کے نزدیک صحیح لا تدعون ہے، اور عبارت درست اس طرح ہوگی: أنتم لا تدعون خصمكم أن يحتج عليكم.

۴-صفحہ ۲۱ میں یعقوب بن ابی عباد کے بجائے یعقوب بن ابی عبادہ کو صحیح قرار دیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ کے نزدیک صحیح ابن ابی عباد ہی ہے، جیسا کہ انساب سمعانی، تاریخ بخاری اور لباب میں ہے، اور اسی طرح معانی الآثار ص ۲۶، مشکل الآثار ج ۱ ص ۱۴۱، ج ۲ ص ۱۶۷، ج ۳ ص ۲۸ میں بھی ہے۔

۵-ص ۶۲ پر عن الزهري، عن عبدالرحمان بن الحارث بن هشام کے بجائے مولانا سہارن

(۱) الفرقان، ج۱۹، ش۸، ص:۴۶

پوری کاظن غالب یہ ہے کہ الزهري عن عبدالملك بن أبي بكر بن عبدالرحمان بن الحارث تھا۔

علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ میرا گمان غالب یہ ہے کہ الزهري عن أبي بكر بن عبد الرحمان تھا، اور اس گمان کی وجہ یہ قرار دی ہے کہ:

اولاً: اس لیے کہ اس حدیث کی اسناد صحیح بخاری میں بطریق شعیب یوں ہی ہے۔

ثانیاً: اس لیے کہ زہری کا اس حدیث کو ابوبکر سے روایت کرنا تو معلوم ومشہور ہے، لیکن عبدالملک سے اس حدیث کو زہری کا روایت کرنا اس وقت تک میرے علم میں نہیں ہے۔

ان تسامحات کو ذکر کرنے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ بعض مقامات ایسے بھی ہیں، جو تصحیح سے رہ گئے ہیں، اور ان سے مولانا سہارن پوری نے کوئی تعرض ہی نہیں کیا ہے، علامہ اعظمیؒ نے اس کی دس مثالیں ذکر کی ہیں، میں نمونہ کے لیے دو کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں:

۱- ج ا ص ۴۵ پر عمرو بن شریح کے بجائے عمر بن سریج صحیح ہے؛ یعنی عمرو کے بجائے عمر، اور شریح کے بجائے سریج سین مہملہ اور جیم کے ساتھ، اور یہ عمر منسوب الی الجد ہیں، ورنہ باپ کا نام سعید ہے۔

۲- ص ۴۳۵ پر إسرائيل عن أبي إسحاق عن أبي السفر واقع ہے۔ علامہ اعظمیؒ کے نزدیک صحیح یوں ہے: إسرائيل عن يونس بن أبي إسحاق عن أبي السفر؛ اس لیے کہ بیہقی کی اسناد میں ابوالسفر سے روایت کرنے والے یونس بن ابی اسحاق ہیں، ابواسحاق نہیں ہے، فرق صرف یہ ہے کہ بیہقی کے ہاں یونس کے شاگرد احمد بن خالد وہبی ہیں اور یہاں اسرائیل ہیں۔

آخر میں ایک بار پھر مصنف کی محنت وکاوش کو کھلے دل سے سراہا ہے، اور لکھا ہے کہ کتاب اس لائق ہے کہ ہمارے تمام مدارس، علمی ادارے، اور علم دوست حضرات اس کی قدر کریں، اور اس کی خریداری فرما کر مصنف کو موقع دیں کہ وہ اس کا دوسرا حصہ بھی جلد از جلد شائع کر سکیں۔

یہ تحریر ۲۹ ر رجب ۱۳۷۱ھ کی تحریر فرمودہ ہے، اور شعبان ۱۳۷۱ھ = مئی ۱۹۵۲ء میں ماہنامہ 'الفرقان' میں شائع ہوئی ہے۔

☆......☆......☆

فہرست مخطوطات عربیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

علامہ اعظمیؒ کا یہ نہایت معلومات افزا علمی وتحقیقی مضمون ہے، جو قاضی عبدالنبی کوکب صاحب کی ترتیب سے شائع کتاب 'فہرست مخطوطات عربیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور' پر نقد وتبصرہ کی صورت میں سپرد قلم کیا گیا ہے، اسی لیے ماہنامہ 'معارف' میں ''باب التقریظ والانتقاد'' کے تحت اشاعت پذیر ہوا ہے۔ یہ مضمون علامہ اعظمیؒ کے وسعت علم ومعرفت اور دقت نظر کی زبردست شہادت پیش کرتا ہے، اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

''مجھے مخطوطات سے بہت شغف ہے، ایک دن اتفاق سے دارالمصنفین جانا ہوا، تو پنجاب یونیورسٹی

لاہور کی فہرست مخطوطات عربیہ پر کتب خانہ میں نظر پڑ گئی، میں نے اس کو بہت شوق سے پڑھا، میں صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا ممنون ہوں کہ ان کی مہربانی سے یہ موقع نصیب ہوا، میں نے 'فہرست' پڑھی تو میرا جی چاہا کہ اس پر تبصرہ کی خدمت میں ہی انجام دوں، تا کہ جس مقصد کے لیے 'فہرست' کے مرتب قاضی عبدالنبی کوکب صاحب نے دارالمصنفین کو یہ پیشکش کی ہے، وہ پورا ہو جائے''(۱)۔

علامہ اعظمی نے تنقیدی نگاہ ڈالنے سے پہلے اس کے مرتب کی اس کوشش کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی محنت کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے:

''قاضی صاحب کی یہ کاوش لائق تحسین ہے، اور وہ اس کے لیے مستحق مبارکباد ہیں، انھوں نے فہرست نگاری کا حق ادا کر دیا ہے؛ اہل علم کا فرض ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی کے لیے مبارکباد پیش کرنے کے ساتھ اس کام میں ان کا تعاون بھی کریں''(۲)۔

علامہ اعظمیؒ نے اس مضمون میں مرتب کتاب اور بعض دوسرے اہل علم وتصنیف کی فروگزاشتوں کا ذکر کیا ہے۔ عنوان 'فہارس القرآن' کے تحت قاضی صاحب نے لکھا تھا کہ:

''قرآن کی اشاریہ سازی کی طرف توجہ کا سراغ واضح طور پر گیارہویں صدی ہجری میں پہنچتا ہے''(۳)۔

علامہ اعظمیؒ نے ۱۱۰۳ھ کی تصنیف کی ہوئی ایک ہندوستانی عالم مصطفیٰ بن سعید کی کتاب 'نجوم الفرقان لتخریج آیات القرآن' کی بعض تفصیلات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ گیارہویں صدی سے بہت پہلے اس موضوع پر کتابیں تالیف کی جا چکی ہیں۔ علامہ اعظمیؒ نے اس مناسبت سے 'نجوم الفرقان' کا مختصر تعارف بھی کرایا ہے۔

قاضی صاحب نے اپنی کتاب میں ملا صادق حلوائی کے بارے میں لکھا تھا کہ:

''ارشد صاحب نے اپنے اس سارے بیان کے لیے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا''(۴)۔

علامہ اعظمیؒ نے نواب علی حسن خاں صاحب کی کتاب 'تذکرہ صبح گلشن' کے حوالے سے مولانا محمد صادق حلوائی کے بارے میں مفصل معلومات تحریر فرما دیں، جو تقریباً ایک صفحے پر مشتمل ہیں۔

قاضی صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۴ پر بحرق کی 'شرح آیۃ الکرسی' پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کا تعارف پیش کیا تھا۔ علامہ اعظمیؒ نے ان کے تذکرے میں **'الضوء اللامع'** اور **'شذرات الذهب'** سے مزید معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ فہرست نگار نے ان کے ایک استاد کا نام عبداللہ مخرمہ لکھا تھا، علامہ اعظمیؒ نے اس کی تصحیح کی کہ عبداللہ بامخرمہ یا عبداللہ ابی مخرمہ ہونا چاہئے۔ اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے بحرق کی دو کتابوں **'الحديقة الأنيقة فی شرح العروة الوثيقة'** اور **'الحسام المسلول علی منتقصي أصحاب الرسول'** کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی ہیں کہ یہ دونوں کتابیں بالترتیب ۱۳۸۰ھ اور ۱۳۸۶ھ میں سابق مفتی مصر علامہ حسنین محمد مخلوف کے اہتمام میں مصر سے شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) معارف، اپریل ۱۹۷۹ء، ص: ۲۹۹ (۲) ایضاً: ۲۹۹ (۳) فہرست مفصل: ۱۳ (۴) ایضاً: ۲۰ (حاشیہ)

قاضی صاحب نے صفحہ ۳۹ پر 'جواہر الاصول' کو تقی الدین فاسی کی تصنیف قرار دیا ہے، اوران کا نام محمد بن احمد ابن علی بتلایا ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ اس میں قاضی صاحب نے خدابخش لائبریری کے فہرست نگار کی پیروی کی ہے، پھر خود کتاب کے حوالے سے ان کا صحیح نام محمد بن محمد بن علی الفارسی لکھا ہے۔ اسی طرح ان کی کنیت میں بھی غلطی کی ہے، اوران کی کنیت ابوالطیب لکھی ہے، جب کہ ان کی کنیت ابوالفیض تھی۔ اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ خدابخش لائبریری کے فہرست نگار سے چوک ہوئی ہے، اس نے 'فارسی' کے بجائے بعض نسخوں میں 'فاسی' دیکھا، اور محمد بن احمد بن علی تقی الدین فاسی معاصر حافظ ابن حجر کو ایک بلند پایہ محدث پایا، تو یہ خیال جما لیا کہ 'جواہر الاصول' کے مصنف وہی ہیں، اور محمد بن محمد کی طرف یا تو اس نے دھیان نہیں دیا، یا یہ سمجھا کہ یہ کتابت کی غلطی ہے، اور چونکہ فاسی کی کنیت ابوالطیب ہے، اس لیے 'جواہر' کے مصنف کی کنیت ابوالطیب لکھ دی۔ مانچسٹر کا فہرست نگار زیادہ ہوشیار اور دیدہ ور معلوم ہوتا ہے، اسی لیے اس نے یہ اقرار کر لیا کہ ہم کو مؤلف کا سراغ نہیں مل سکا''[(۱)]۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ تقی الدین فاسی اوران کی تصانیف کا تذکرہ حافظ سخاوی نے شرح وبسط کے ساتھ کیا ہے، لیکن 'جواہر الاصول' کے نام سے ان کی کسی کتاب، یا اصول حدیث پر ان کی کسی کتاب کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

پھر 'جواہر الاصول' کے بارے میں مزید معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جواہر الاصول کا مصنف بڑا خوش قسمت ہے کہ اس کی اس کتاب کے نسخے ہند وبیرون ہند کے مختلف کتب خانوں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ مکہ معظّمہ کے مکتبۃ الحرم میں بھی اس کا ایک نسخہ ہے، اس نسخہ کی پشت پر شیخ عبدالرحمٰن بن یحییٰ معلّمی - جو ایک وسیع النظر یمنی عالم تھے، برسوں دائرۃ المعارف حیدرآباد میں مصحح رہ چکے ہیں، آخر میں وہ مکتبۃ الحرم کے مدیر ہو گئے تھے، میرے ان سے دوستانہ تعلقات تھے، جب حجاز حاضری ہوتی تھی، تو مکتبۃ الحرم میں کبھی کبھی ان کے پاس نشست ہوا کرتی تھی - کے ہاتھ کی یہ تحریر موجود ہے کہ ''یہ کتاب ابوالفیض محمد بن محمد بن علی الفارسی کی تالیف ہے، یہ مصنف فصیح الادیب الحنفی کے نام سے پکارا جاتا تھا''۔ غالباً یہ بات انھیں 'ایضاح المکنون' - تکملہ کشف الظنون - سے معلوم ہوئی ہے''[(۲)]۔

علامہ اعظمیؒ نے اس مضمون میں ان کے علاوہ اور بھی کئی فروگزاشتوں کی نشان دہی کی ہے، ہم نے چند نمونے ذکر کر دیے ہیں، ان سے اس مضمون کی علمیت اور اس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ مضمون ماہنامہ 'معارف' میں اپریل ۱۹۷۹ء کے شمارے میں شائع ہوا، اس کے بعد دوبارہ سہ ماہی 'المآثر' میں رجب - رمضان ۱۴۲۶ھ جلد نمبر ۱۴ شمارہ نمبر ۱ میں شائع کیا گیا۔ ☆......☆......☆......☆......☆

(۱) معارف، ص: ۳۰۵ (۲) ایضاً: ۳۰۶

اصلاحی وتربیتی

رسائل

تصوف وطریقت

’’تصوف کو روحِ اسلام کہنا بے جا نہ ہوگا، مگر نااہلوں کے ہاتھ میں پڑ کر یہی چیز ننگِ اسلام بن گئی ہے‘‘

یہ علامہ اعظمیؒ کے الفاظ ہیں، جو اپنی ادارت میں شائع ہونے والے ’تذکرہ‘ کے نمونہ کے شمارے کے ایڈیٹوریل میں آپ نے تحریر فرمائے ہیں۔

اصلاح وتربیت علامہ اعظمی کی زندگی کا ایک خاص اور اہم عنوان تھا، اور انھوں نے اس کی انجام دہی سے زندگی کے کسی بھی حصے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی، اصلاح وتربیت کے لیے انھوں نے زبان وقلم دونوں سے بھرپور کام لیا، اور نہ صرف عوام بلکہ خواص کی تہذیب وتربیت کے لیے آپ نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، تصوف اور طریقت آپ کی شخصیت کا نہایت نمایاں رنگ اور عنصر تھا۔ تصوف نام ہی ہے نفس کشی، دنیا اور حطام دنیا سے بے رغبتی، اور فکر آخرت کا۔ اگر آپ کے حالات زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ چیزیں آپ کے اوصاف میں نمایاں نظر آتی ہیں، کتاب الزھد والرقائق کی تحقیق اور اس پر تعلیقات کی مشقت، تقریباً پچاس صفحات پر مشتمل اس کا طویل مقدمہ آپ کا علمی وقلمی شاہکار ہی نہیں، بلکہ آپ کی زاہدانہ ومتوکلانہ زندگی کا عکاس اور آپ کے غلبۂ تصوف کا آئینہ دار ہے۔ اس کتاب کے ذریعے، اس کے مقدمے میں زہد وورع کی انواع واقسام اور حضرت عبد اللہ بن مبارک کے حالاتِ زندگی کے ذریعے وہ اہل علم کے سامنے زندگی کا ایک منہج اور طریقہ پیش کرنا چاہتے تھے کہ علما کی زندگی کس انداز اور طریقے کی ہونی چاہئے، گویا خواص اہل علم کے لیے اصلاح وتربیت کی ضرورت کو سامنے رکھ کر یہ کتاب ایڈٹ کر کے شائع کی گئی ہے۔

تصوف وطریقت کے سلسلے میں آپ صرف رسمی بیعت وارادت کے قائل نہیں تھے، بلکہ آپ کی نظر میں اس کی اصل روح تزکیہ اور سلوک واحسان تھی، جس کے بغیر اس راہ کے مدارج طے نہیں کیے جا سکتے۔ علامہ اعظمی کی نگارشات میں ایک اہم مضمون ’’سیرت ابراہیم بن ادہم اور ان کے مدفن کی تحقیق‘‘ ہے، اس کے عنوان سے اس کے مشمولات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے، لیکن یہ پورا مضمون پڑھنے کے بعد کسی اہل بصیرت اور صاحب فکر ونظر کے لیے یہ سمجھنا ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا، کہ آپ نے اس کو موجودہ زمانے کے ارباب تصوف اور مشائخ طریقت کی حالت کو دیکھ کر قلم بند فرمایا ہے، اور اس میں راس الزہاد وسرخیل صوفیا حضرت ابراہیم بن ادہم کی زندگی کا نقشہ پیش کر کے آج کے صوفیا اور وابستگان طریقت کے سامنے ایک نمونہ پیش کرتے ہوئے لطیف پیرائے میں ان کو متنبہ کرنا چاہا ہے، کہ اس منزل کے رہ نوردوں کا طرز زندگی اور طریق زیست کیا ہونا چاہئے، اور سلوک کی کن منازل کو طے کرنے کے بعد انسان مقام مشیخت تک پہنچتا ہے۔ اس طرح یہ بھی ایک ایسی اصلاحی وتربیتی تحریر ہے، جو مشائخ تصوف اور پیرانِ طریقت کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔

علما اور اساتذہ وطلبہ کے درمیان جو خامیاں اور کمزوریاں آتی جارہی ہیں، اس پر تو آپ کی بہت خاص نگاہ رہا کرتی تھی، وہ مجالس جو علما اور طلبہ مدارس وغیرہ کے لیے مخصوص ہوا کرتی تھیں، ان میں اس صورتحال پر بہت سخت نکیر فرمایا کرتے تھے۔ ختم بخاری وغیرہ کی تقریبات اور اس طرح کی دوسری مجالس میں آپ کا روئے سخن خاص طور سے اہل علم کی طرف ہوتا تھا، اور ان مواقع پر اہل علم کو ان کی کمزوریاں دور کرنے اور سیرت وکردار کو اخلاق حسنہ سے آراستہ کرنے پر بطور خاص متوجہ کیا کرتے تھے۔

یہ احسانی ذوق ہی تھا، جو 'مناقب العارفین' نامی کتاب کے ترجمہ وتلخیص کا محرک بنا، اور 'پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں'' کے نام سے آپ نے اس کو اختصار کے ساتھ اردو کے قالب میں ڈھالا۔ اسی طرح یہ احسانی اور وجدانی ذوق 'اعیان الحجاج' اور 'دست کار اہل شرف' جیسی آپ کی تصانیف میں بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

ذیل میں خاص طور سے دو رسائل کا تعارف کیا جارہا ہے، جو اپنے موضوع ومحتویٰ کے لحاظ سے خالص اصلاحی وتربیتی ہیں، اور وہ دونوں یہ ہیں:

اہل دل کی دلآویز باتیں

اس رسالے کی تالیف میں اصلاح وتربیت کی یہی روح کارفرما تھی اور اس کا محرک تزکیہ نفس کا یہی جذبہ فراواں تھا، یہ رسالہ مختصر مگر نہایت سبق آموز اور درس ونصیحت سے بھرپور ہے، بزرگوں اور اللہ والوں کے چھوٹے چھوٹے واقعات دو دو چار چار سطروں یا آدھی سطر کے فقروں پر مشتمل ہیں، جو ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کا بہترین مصداق ہیں، لیکن یہ واقعات اتنے روح پرور اور ایمان افروز ہیں کہ اگر دل میں اتر جائیں، تو اس کی دنیا اور زندگی کی کایا پلٹ دیں۔ نہایت عام فہم اور آسان وسلیس زبان میں تحریر فرمائے گئے ہیں، جن کو ہر کس وناکس پڑھ اور سمجھ سکتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ان فقروں یا ملفوظات وواقعات کو درحقیقت ''صوفیانہ لطائف'' سے تعبیر کرنا چاہئے۔

یہ رسالہ دو حصوں میں ہے، پہلا حصہ ۲۴ر، اور دوسرا حصہ ۲۲ر صفحات پر مشتمل ہے، دونوں میں کل ملا کر تقریباً ۸۰ر واقعات قلم بند کیے گئے ہیں۔ اس کے پہلے حصے کی مختصر سی تمہید میں علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

> ''بزرگانِ دین رحمہم اللہ تعالیٰ کے بابرکت حالات وسوانح اور ملفوظات کے پڑھتے وقت اکثر ایسے فقرے نظر سے گزرے ہیں، جو آنکھوں کی راہ سے دل میں اتر گئے، دل نے لطف اٹھایا اور ایمان نے لذت پائی، جی چاہا کہ جو مزہ میں نے پایا ہے وہ دوسرے اہل ایمان بھی پائیں، اسی جذبے نے ان منتشر فقروں کو ایک سلکِ گہر میں پرو کر پیش کرنے کی ہمت کی۔ امید ہے کہ حکمت کے طالب مومن اس گم شدہ دولت کی قدر فرمائیں گے''۔

پہلے حصے کے واقعات زیادہ تر بلکہ تمام تر 'اخبار الاخیار' اور 'فوائد الفواد' سے ماخوذ ہیں، اس کی نسبت خود

علامہ اعظمیؒ نے اس حصے کے ختم پر ''تنبیہ'' کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے:

''اس رسالہ میں جو واقعات درج ہیں، وہ سب 'اخبار الاخیار' (مصنفہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی) یا فوائد الفواد (ملفوظات سلطان نظام الدین اولیاءؒ) سے ماخوذ ہیں، فوائد الفواد کے لیے (ف) لکھ کر صفحہ کا حوالہ دیا گیا ہے، اور اخبار الاخیار کے لیے کہیں کہیں (اخ) لکھ دیا گیا ہے، اور کہیں پر صرف صفحہ کا نشان دے دیا گیا ہے''۔

اور دوسرے حصے میں لطائف اشرفی، مکتوبات، ترجمہ فوائد سعدیہ، اخبار الاخیار، محاسن رزاقیہ، مقامات مظہری، نفحات الانس، تذکرۃ الاولیاء جیسی کتابوں کے علاوہ ایک آدھ مقام پر فتح الباری اور طبقات کبری سے بھی اقتباس کیا گیا ہے۔

حضرت تھانویؒ کے تاثرات:

اس رسالے کی اہمیت و نافعیت اور قدر و قیمت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی علیہ الرحمہ نے اس کو ملاحظہ فرمانے کے بعد تحریر فرمایا تھا:

''رسالہ کی زیارت سے دل خوش ہوا، اللہ تعالیٰ طالبین علم و عمل کے لیے نافع فرمائے، وسیفعل اِن شاء اللہ تعالی۔ طالب علموں اور مبتدیان طریق کے لیے بہت مفید ہے''۔

اس کے اب تک تین اڈیشن شائع ہو چکے ہیں، پہلا اڈیشن ۱۳۶۰ھ میں معارف پریس اعظم گڈھ سے طبع ہو کر اشاعت پذیر ہوا تھا۔ دوسرا اڈیشن ۱۴۲۲ھ = ۲۰۰۱ء میں مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ سے شائع ہوا، اور تیسرا اڈیشن بھی اسی ادارے سے ۱۴۲۶ھ = ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔

واقعات کے چند نمونے:

قارئین کی ضیافت طبع کے لیے اس کتاب کے چند واقعات نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں، جس سے کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکے گا، 'اخبار الاخیار' کے حوالے سے ایک عنوان ''بادشاہ کی امامت کرنے سے انکار'' کے تحت لکھا ہے:

☆......: ''مولانا کمال الدین زاہدؒ بڑے متقی عالم تھے، شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے 'مشارق الانوار' آپ ہی کی خدمت میں پڑھی تھی، سلطان غیاث الدین نے مولانا کمال الدین کو بلوا کر بصد آرزو یہ درخواست کی کہ آپ نماز میں ہماری امامت فرمایا کریں، ہم کو جناب کے کمال علم و دیانت و احتیاط کا پکا اعتقاد ہے، اگر منظور فرمائیے تو محض کرم ہوگا، نیز ہم کو اپنی نمازوں کی مقبولیت کی قوی امید ہو جائے گی۔ مولانا نے فرمایا کہ ہمارے پاس اب نمازوں کے سوا کوئی دوسری چیز تو رہ نہیں گئی، بادشاہ کیا چاہتا ہے کہ

اس کو بھی ہم سے لے لے۔ مولانا نے یہ جواب ذرا ڈانٹ کر اور پُر رعب لہجہ میں دیا تھا، بادشاہ دم بخود رہ گیا اور بڑی معذرتیں کر کے مولانا کو رخصت کیا''۔

ایک عنوان ''شیخ زندہ ہوتے تو خلافت نامہ واپس کر دیتا'' کے تحت لکھتے ہیں:

☆......: ''مولانا علاؤالدین نیلی اودھ کے بڑے جید عالم تھے، باوجودیکہ شیخ نظام الدین اولیا کے خلیفہ ومجاز مطلق تھے، لیکن ایک آدمی کو بھی مرید نہیں کیا تھا، بارہا فرماتے تھے کہ اگر شیخ زندہ ہوتے تو خلافت نامہ ان کی خدمت میں پہنچاتا اور کہتا کہ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا''۔

ایک عنوان ''بزرگی وولایت کھیل نہیں ہے'' کے تحت مذکور ہے:

☆......: ''قاضی خاں ظفرآبادی بڑے پایہ کے بزرگ تھے، فرماتے تھے کہ تیس سال جان کھپائی اور ریاضتیں کی ہیں، تو جا کر تھوڑا نفس کی چالوں کا علم حاصل ہوا ہے اور کچھ پتہ چلا ہے کہ کس کس طرح سے نفس راہ مارتا ہے، اور اس کی کیا کیا گھاتیں ہیں''۔

''استاد کے ساتھ عقیدت'' کے عنوان کے تحت 'مقامات مظہری' کے حوالے سے یہ دلچسپ واقعہ مرقوم ہے:

☆......: ''حضرت مرزا جان جاناں نے علم حدیث کی سند حضرت حاجی محمد افضل سے حاصل کی تھی، مرزا صاحب کا بیان ہے کہ تحصیل علم سے فراغت پانے کے بعد حضرت حاجی صاحب نے اپنی کلاہ جو پندرہ برس تک آپ کے عمامہ کے نیچے رہ چکی تھی، مجھے عنایت فرمائی، میں نے رات کے وقت گرم پانی میں وہ ٹوپی بھگو دی، صبح کے وقت وہ پانی املتاس کے شربت سے بھی زیادہ سیاہ ہو گیا تھا، میں اس کو پی گیا، اس پانی کی برکت سے میرا دماغ ایسا روشن اور ذہن ایسا رسا ہو گیا کہ کوئی مشکل کتاب مشکل نہ رہی''۔

''کلام میں اثر کب ہوتا ہے؟'' کے عنوان کے تحت 'طبقات کبریٰ' کے حوالے سے لکھا ہے:

☆......: ''حضرت حمدون قصار سے کسی نے پوچھا کہ اگلوں کا کلام (وعظ) ہمارے کلام سے زیادہ نفع بخش کیوں ہے؟ حمدون نے فرمایا کہ اگلے بزرگ اسلام کی سربلندی، روحوں کی نجات اور خدا کی خوشنودی کے لیے کلام کرتے تھے، اور ہم نفس کی عزت، دنیا کی چاہت اور مخلوق کی عقیدت حاصل کرنے کے لیے کلام کرتے ہیں''۔

'طبقات کبریٰ' ہی کے حوالے سے ''ماں کی خدمت'' کے عنوان کے تحت یہ نصیحت آمیز واقعہ مکتوب ہے:

☆......: ''حضرت مسعر بن کِدام حدیث کے امام اور بڑے باخدا بزرگ تھے، ایک دن عشاء کے بعد ان کی ماں نے پانی مانگا، یہ پانی لینے کو باہر نکلے، جب لے کر آئے تو ان کو نیند آگئی تھی، مسعر گلاس ہاتھ میں لیے انتظار کرنے لگے کہ آنکھ کھلے تو پانی پلاؤں، اسی انتظار میں کھڑے کھڑے صبح ہوگئی''۔

'تذکرۃ الاولیا' کے حوالے سے ایک عنوان ''ہوا پر اڑنے سے بڑا کمال نفس کی مخالفت ہے'' کے تحت یہ جامع نصیحت تحریر فرمائی ہے:

☆...... ''ابو محمد مرتعش سے کسی نے کہا کہ فلاں آدمی ہوا پر اڑتا ہے اور پانی پر چلتا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ جس کو حق تعالی یہ توفیق دے کہ نفس کی خواہش پر نہ چلے، وہ اس سے بزرگ و بہتر ہے، جو ہوا پر اڑتا ہے اور پانی پر چلتا ہے''۔

یہ چند واقعات بطور نمونہ کے محض اس لیے ذکر کر دیے گئے ہیں کہ ان کو اگر کوئی شخص درس و نصیحت کے جذبے سے پڑھے، تو نفس امارہ کی سرکوبی اور اصلاح و تربیت کا ایک سیدھا سادہ اور مختصر نسخہ کا کام دے سکتا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆......☆

حسن ادب اور اس کی اہمیت

'اہل دل کی دل آویز باتوں' ہی کے مشابہ یہ رسالہ بھی ہے، جو خاص طور سے مدارس دینیہ کے طلبہ کو پیش نظر رکھ کر تالیف کیا گیا ہے۔ ہمارے مدارس جو دینی تعلیم کے مراکز ہیں، اور جہاں صبح و شام اسلامی اخلاق و تعلیمات کا درس دیا جاتا ہے، جن کے دیوار و در قال اللہ اور قال الرسول کی صداؤں سے گونجتے رہتے ہیں، وہ اندر سے کس قدر بے روح، بے جان اور غیر موثر ہوتے جا رہے ہیں، ان میں اسلامی اخلاق و آداب کا کس قدر فقدان ہے، تعلیم و تعلم کے آداب واقدار کس طرح زوال آمادہ اور انحطاط پذیر ہیں، ان اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اور متعلمین کی استعداد و صلاحیت کس قدر کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی ہے، عادات و اطوار کس طرح دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں، ادب و تمیز، تہذیب و شائستگی، متانت و سنجیدگی کس طرح رخصت ہوتے جا رہے ہیں، اس کا احساس مدارس کی فضا میں رہنے والے حساس لوگوں کو عام طور سے ہے۔ اس صورتحال پر علامہ اعظمیؒ ہمیشہ متفکر اور دل گیر رہا کرتے تھے، اور اس کی اصلاح کے لیے کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، مدارس کی تقریبات میں ان کی موجودہ حالتوں پر کھل کر نکیر فرماتے، اور بڑے ہی پُر درد اور پُر سوز انداز میں ان پر متنبہ کرتے۔ آپ کے اس دل دردمند اور سوز دروں کا ایک نمونہ 'حسن ادب اور اس کی اہمیت' بھی ہے، جس میں مدارس دینیہ کے طلبہ اور حاملین علوم نبوت کو بطور خاص خطاب کیا گیا ہے، چنانچہ حضرت علامہ اعظمیؒ نے اس کا دوسرا نام ہی 'الهدية السنية لطلاب العلوم الدينية'' رکھا ہے۔

آج کے مدارس دینیہ کے طلبہ کے اخلاق و عادات پر کف افسوس ملتے ہوئے اسلامی طور طریق اور آداب کی اہمیت اپنی تمہید میں یوں بیان کرتے ہیں، جو کہ اس رسالے کی وجہ تالیف بھی ہے:

''بڑوں کا ادب و احترام اور اساتذہ و شیوخ کا اکرام و خدمت گزاری اور ان کا پاس و لحاظ ہمیشہ سے اکابرِ دین و علماءِ سلف کا امتیازی وصف رہا ہے، مگر آج آزادی کے غلط تصور اور مغرب زدگی کے اثر

سے یہ چیزیں رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہیں۔ آج سے پچیس تیس سال پہلے ہمارے دینی مدارس کے طلبہ میں جو شائستگی وتہذیب، جو متانت وسنجیدگی اور جو ادب واحترام پایا جاتا تھا، آج اس کی جھلک بھی کہیں مشکل ہی سے نظر آتی ہے۔ یہ کمی بڑی افسوسناک کمی ہے۔ علوم دینیہ کے حاملین کو اسلامی تہذیب، اسلامی آداب، اور اسلامی اخلاق کا حامل ہونا چاہئے، ہمارے لیے ہمارے اکابر واسلاف کی روش قابل تقلید ہے، اسی میں ہماری عزت وسربلندی ہے، اور اسلاف کی مستحسن روش ہی پر چل کر ہم اسلام کے تقاضے کو پورا کر سکتے ہیں۔ ہمارے مذہب نے جس طرح عقائد وعبادات اور معاملات کے سبق ہم کو بتائے ہیں، اسی طرح اس نے ہم کو آداب بھی سکھائے ہیں۔ نیک روش، اچھے چال چلن، اور عمدہ طور طریق کی تعلیم بھی دی ہے اور دوسرے امور دین کے ساتھ ساتھ ادب ووقار سیکھنے اور سکھانے کی تاکید بھی کی ہے''۔

علامہ اعظمیؒ کی یہ تحریر آج سے تقریباً ساٹھ برس پہلے کی ہے، جو کہ آج کل کے مقابلے میں بہت اچھا اور سنہرا دور تھا، اب تو یہ انحطاط اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے، آگے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہوگا۔ ان حالات میں یہ رسالہ طالبان علوم دینیہ ونبویہ کے لیے اہم مشعل راہ ہے، جس میں بڑوں کا ادب واحترام، اساتذہ ومعلمین کی تعظیم وتکریم، درس گاہوں اور کتابوں کے حقوق نہایت اختصار اور عمدگی کے ساتھ اور بہت ہی موثر اور بلیغ پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں، اور معتبر ومستند کتابوں سے اقتباس کر کے طلبہ ومتعلمین کے لیے بہت قیمتی نصائح زیب قرطاس فرمائے گئے ہیں، جس کا اندازہ اس کے ان عناوین سے لگایا جا سکتا ہے: ''استاذ کا مرتبہ''، ''استاذ اور ہر عالم کے حقوق''، ''اجلال علم وعلماء''، ''اجلال علم وتعظیم استاد کا لحاظ پہلے لوگوں میں''، ''استاذ کے ساتھ عقیدت''، ''بات چیت میں تمیز اور ادب کی تعلیم''، ''تذکرۃ السامع کی ایک فصل کا خلاصہ''، ''حضرت علیؓ کی نصیحتیں طلبا کو''۔

ناظرین کے سامنے اس رسالے کے چند اقتباسات پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

☆......: ''ثابت بُنانی حضرت انسؓ کے شاگرد اور تابعی ہیں، یہ جب حضرت انسؓ کی خدمت میں جاتے تو ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے، اس لیے حضرت انسؓ اپنی لونڈی سے کہا کرتے تھے کہ ذرا میرے ہاتھوں میں خوشبو لگا دے، وہ آئے گا تو بے ہاتھ چومے نہ مانے گا (مجمع الزوائد ۱/۱۳۰)''

☆......: ''سفیان بن عیینہ اور فضیل بن عیاض دونوں بزرگ حسین جعفی کے شاگرد تھے، ایک نے حسین کا ہاتھ دوسرے نے پاؤں چوما (آداب شرعیہ ۲/۲۷۲)''۔

☆......: ''خلف احمر کا بیان ہے کہ امام احمد میرے پاس ابوعوانہ کی مرویات سننے کے لیے آئے، میں نے بہت کوشش کی کہ ان کو بلند جگہ پر بیٹھاؤں، مگر انھوں نے فرمایا کہ میں تو آپ کے سامنے ہی (شاگردوں کی جگہ) بیٹھوں گا، ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ ہم جس سے علم حاصل کریں اس کے لیے تواضع کریں (آداب شرعیہ ۲/۲۵)''۔

☆......: ''صاحبِ ہدایہ فرماتے تھے کہ بخارا کے ایک بہت بڑے امام اپنے حلقہ درس میں درس دے رہے تھے، مگر اثنائے درس میں کبھی کبھی کھڑے ہو جاتے تھے۔ جب اس کا سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ میرے استاذ کا لڑکا گلی میں بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہے، کھیلتے کھیلتے وہ کبھی مسجد کے دروازے کے پاس بھی آ جاتا ہے، تو میں اس کے لیے بقصد تعظیم کھڑا ہو جاتا ہوں (تعلیم المتعلم ص:۷)''۔

☆......: ''خلیفہ ہارون نے اپنے لڑکے کو علم وادب کی تعلیم کے لیے امام اصمعی کے سپرد کر دیا تھا، ایک دن اتفاقاً ہارون وہاں جا پہنچے، دیکھا کہ اصمعی اپنے پاؤں دھو رہے ہیں اور شاہزادہ پاؤں پر پانی ڈال رہا ہے۔ ہارون نے بڑی برہمی سے فرمایا کہ میں نے تو اس کو آپ کے پاس اس لیے بھیجا تھا کہ اس کو ادب سکھائیں گے، آپ نے شہزادہ کو یہ حکم کیوں نہیں دیا کہ ایک ہاتھ سے پانی گرائے اور دوسرے ہاتھ سے آپ کا پیر دھوئے''۔

درج بالا اقتباسات سے اس رسالے کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ تحریر پہلی بار ماہنامہ 'دارالعلوم' دیوبند میں شعبان ۱۳۷۱ھ کے شمارے میں ایک مضمون کی شکل میں شائع ہوئی تھی، رسالہ 'دارالعلوم' ہی نے دوبارہ اس کو ذی قعدہ وذی الحجہ ۱۴۱۰ھ کے شمارے میں شائع کیا، اور تیسری بار یہ مجلّہ 'المآثر' جلد نمبر۳ شمارہ نمبر۱ یعنی محرم- ربیع الاول ۱۴۱۵ھ کے شمارے میں اشاعت پذیر ہوئی۔

اس کے بعد اس کا کتابی اڈیشن پہلی مرتبہ ۱۴۲۲ھ = ۲۰۰۱ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۴۲۴ھ = ۲۰۰۳ء میں مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ سے شائع کیا گیا۔

☆......☆......☆......☆......☆

☆......☆......☆......☆

☆......☆......☆

☆......☆

☆

عربی تصانیف
و
مضامین

الحاوي لرجال الطحاوي

یہ کتاب علامہ اعظمیؒ کے فضل وکمال کا شاہکار؛ ان کے خامۂ گہربار کی عظیم الشان یادگار؛ بحث وتفحص؛ نقد ونظر اور تلاش وجستجو کا زندہ جاوید نمونہ؛ عرق ریزی، جگر کاوی اور پتہ ماری کی حیرت انگیز مثال ہے۔ یہ کتاب علم ومعرفت کا ایسا زندہ وتابندہ نقش ہے جو اپنے مصنف کو مزّی، ذہبی اور ابن حجر جیسے نادرۂ روزگار اور یگانۂ زمانہ تذکرہ نگاروں کی صف میں کھڑا کرتی ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنی اس کتاب میں امام طحاوی کیؒ دو کتابوں کے راویوں کو تسبیح کے دانوں کی طرح ایک دھاگے میں پرونے کا کام کیا ہے، امام طحاوی صف اول کے محدثین اور ائمۂ فن میں تھے۔ روایت ودرایت، نقد ونظر، سردِ احادیث، جمع وتطبیق، حل معانی، بیان مفاہیم، احادیث وآثار کے بحر ناپیدا کنار میں غواصی، دقتِ نظر، رسائی فکر، تبحر وتعمق، گہرائی وگیرائی، ژرف نگاہی اور باریک بینی، ودیدہ وری جیسی صفات میں امام طحاویؒ کی مثال کم ملے گی۔ وہ حدیث وسنت کے زمانۂ تدوین کے نہایت ممتاز اور باکمال مصنفین میں تھے، ان کی تصانیف وتالیفات میں جو زندہ وپایندہ اور دستبرد زمانہ سے محفوظ ہیں، وہ اسلامی علوم ومعارف کی عظمت رفتہ کی شاندار اور پُر شوکت یادگار ہیں، اگر ان کی تصانیف کا عدل وانصاف کی نگاہ سے مطالعہ کیا جائے، تو یہ یقین کیے بغیر چارۂ کار نہیں رہے گا کہ ان کی کچھ ایسی خصوصیات ہیں، جن میں کوئی ان کا نظیر ومثیل اور ہم سر نہیں ہے۔ امام طحاوی نے اپنی متنوع تصانیف کی صورت میں جو بےنظیر اور لازوال علمی تحفے دیے ہیں، ان کی وجہ سے پوری علمی دنیا ان کی مرہونِ منت اور ان کے احسان سے گراں بار ہے۔

امام طحاویؒ کی تصانیف میں 'شرح معانی الآثار' اور 'شرح مشکل الآثار' نہایت بلند پایہ اور معرکۃ الآرا کتابیں ہیں، جو نہ صرف خزانۂ علم ومعرفت میں اضافہ کرتی ہیں، بلکہ اپنے پڑھنے اور مطالعہ کرنے والے کے سامنے تدبُّر وتفکُّر کی راہیں استوار کرتی اور قاری کی چشم بصیرت کو روشن اور مُجلّٰی کرتی ہیں۔

امام طحاویؒ 'شرح معانی الآثار' میں نہایت سلیقے اور قرینے سے ان احادیث کو ذکر کرتے ہیں، جن سے احکام ومسائل میں استدلال کیا گیا ہے، پہلے دوسرے مسلک مثلاً امام مالک اور امام شافعی کے دلائل بیان کرتے ہیں، اس کے بعد حنفیہ کے مستدلات کو ذکر کر کے ان پر حجت قائم کرتے ہیں، اور اسی پر بس نہیں کرتے، بلکہ اپنی نظر اور قیاس سے اس کو قوت پہنچاتے ہیں۔

احادیث میں قوت وضعف اور اعتبار وعدم اعتبار کا سارا مدار چونکہ ان سندوں پر ہوتا ہے، جن کو کسی کتاب کا مصنف اپنے روایتی سلسلے سے آنحضرت ﷺ تک، یا اگر صحابیؓ کا قول ہے، تو صحابیؓ تک پہنچاتا ہے۔ وہ رجال جو سند کے سلسلے میں آتے ہیں، ان کی تحقیق ومعرفت، شناخت وپہچان اور ان کے درمیان امتیاز اسلامی علوم وفنون میں سب سے مہتم بالشان اور مشکل ودقیق فن ہے، کیونکہ تمام علوم وفنون کی عمارتیں بالخصوص علم حدیث کا قصر

عظیم ان ہی رواۃ اور رجال اسناد کے دوش پر قائم ہے، رواۃ ورجال شناسی ایک ایسا فن ہے، جس نے اسلامی علوم وفنون کو وہ اعتبار اور رفعت وبلندی عطا کی ہے، جس کے سامنے دوسری اقوام ومذاہب کی نگاہیں سرنگوں ہوکر رہ جاتی ہیں، اور یہاں پہنچ کر ان کا قافیہ تنگ اور ناطقہ بند ہوجاتا ہے۔ ایک حدیث یا اثر یا قول ہے، اس کے روایت کرنے والے کیسے لوگ ہیں؟ ان کے حالات کیا ہیں؟ ثقہ ہیں یا غیر ثقہ؟ حافظہ مضبوط ہے یا دغا دیتا ہے؟ ان کی زندگی کیسی ہے؟ اسلامی احکام وتعلیمات پر عمل پیرا ہیں یا نہیں؟ ان پر کذب بیانی اور دروغ گوئی کا تو کبھی تجربہ نہیں کیا گیا ہے؟ الغرض ایک ایک راوی اور سند کے ایک ایک شخص کے بارے میں معلومات پوری امانت ودیانت کے ساتھ درج کی جاتی ہیں، اور اس میں کسی قسم کی بے انصافی اور بد دیانتی اور تملق ورواداری کو راہ نہیں دی جاتی۔ تذکرہ وتراجم اور رجال ورواۃ کی کتابیں اگر اٹھا کر دیکھیں تو اس میں انسانوں کا ایسا جنگل نظر آئے گا کہ آدمی حیران اور ششدر ہوکر رہ جائے گا۔

حدیث شریف کی کتابوں میں راویوں کی معرفت کو اولیت وفوقیت حاصل ہوتی ہے، اگر کسی حدیث کا ایک راوی بھی درجۂ استناد سے ساقط ہوگیا، تو پوری روایت زمیں بوس ہوجاتی ہے، اور اگر ہر راوی مضبوط اور قوی ہے، تو عمارت اپنی بلندی کے ساتھ قائم رہتی ہے۔ امام طحاوی کی تصانیف خاص طور سے 'شرح معاني الآثار' حنفی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت کی حامل ہے، اور حنفیہ کا مستند ترین مرجع وماخذ ہے، اس لیے اس کی روایات اور رجال ورواۃ پر لوگوں کی خاص نگاہیں رہتی ہیں، اور حنفیہ کے جو مخالف ہیں، ان کو اس کے راویوں کا کمزور پہلو تلاش کرنے کی فطری طور پر فکر رہا کرتی ہے، جس کے نتیجے میں احناف کو بھی ان راویوں کے حالات تلاش کرنے اور ان کو روایت کے اصول ومعیار پر جانچنے اور پرکھنے کی فکر ہونا ایک فطری بات ہے۔

....

امام طحاوی کی دوسری کتاب 'شرح مشکل الآثار' میں ان احادیث کے جمع وتطبیق اور توضیح وبیان کی خدمت انجام دی گئی ہے، جن کے مفہوم تک رسائی میں مشکل پیش آتی ہے، خاص طور سے جن حدیثوں میں تضاد اور تعارض معلوم ہوتا ہے، ان کو ذکر کرکے توجیہ وتطبیق سے کام لیا گیا ہے، امام طحاوی کی یہ کتاب احادیث نبویہ پر اعتراض کرنے والوں کے لیے منھ توڑ اور مسکت جواب ہے، جس کی کوئی نظیر نہیں ہے، 'تاویل مشکل الحدیث' پر کتابیں تو بہت تصنیف کی گئیں، لیکن جس پیمانے پر اور جس اسپرٹ کے ساتھ امام طحاوی نے یہ کارنامہ انجام دیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔

....

علامہ اعظمیؒ کو اپنے عنفوان شباب ہی میں ان دونوں کتابوں کے راویوں کے حالات تلاش کرنے اور ان کو حیطۂ تحریر میں لانے کی فکر دامن گیر ہوئی، امام طحاوی کی اول الذکر- شرح معانی الآثار- کے راویوں کے حالات پر تو متعدد کتابیں معرض وجود میں آئی ہیں، لیکن 'شرح مشکل الآثار' کے راویوں کے احوال کی بحث وجستجو کا خیال کسی

صاحب علم کے دل میں نہیں آیا تھا، یا اگر آیا تھا تو عملی ظہور نہیں ہوا تھا، 'شرح معانی الآثار' کے رجال پر اب تک جن کتابوں کا علم ہوسکا ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱:- **مغاني الأخيار في رجال معاني الآثار**: ہمارے علم کے مطابق 'شرح معانی الآثار' کے رجال پر سب سے پہلے وجود میں آنے والی علامہ بدرالدین عینی متوفی ۸۵۵ھ کی یہ کتاب ہے۔

۲:- **كشف الأستار عن رجال معاني الآثار**: علامہ عینیؒ کی کتاب کی تلخیص واختصار ہے، جو مولانا ابوتراب رشد اللہ شاہ سندھی کے ذریعے کیا گیا ہے۔ مولانا رشد اللہ سندھی کی یہ کتاب بڑی تقطیع میں ۱۳۴۹ھ میں جید برقی پریس دہلی سے طبع ہو کر دار الاشاعت والتدریس دیوبند سے اشاعت پذیر ہوئی ہے۔

۳:- **الإيثار برجال معاني الآثار**: نویں صدی ہجری کے بلند پایہ حنفی عالم ومحدث وفقیہ علامہ قاسم ابن قطلو بغا - متوفی ۸۷۹ھ - کی اس کتاب کا ذکر علامہ سخاوی نے 'ضوء لامع' (۱۶۹/۶) میں کیا ہے، اس کا نام کاتب چلپی نے 'کشف الظنون' (۴۶۰/۱)، بغدادی نے 'ہدیۃ العارفین' (۸۳۰/۱) اور نواب صدیق حسن خان نے 'اتحاف النبلا' (ص ۱۵۴) میں **الإيثار برجال معاني الآثار** لکھا ہے۔

۴:- **تراجم الأحبار من رجال معاني الآثار**: مولانا محمد ایوب مظاہری کی یہ کتاب بھی طحاوی شریف کے رجال پر ایک مفصل اور مبسوط کتاب ہے، جو محبوب پریس دیوبند سے طبع ہو کر اشاعت العلوم سہارن پور سے شائع ہوئی ہے۔

علامہ اعظمیؒ کا امتیاز:

علامہ اعظمیؒ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ نے 'شرح معانی الآثار' اور 'شرح مشکل الآثار' دونوں کتابوں کے رِجال ورُواۃ کو جمع کیا ہے، جو آپ کی عالی حوصلگی اور فکری بلند پروازی پر شاہد عدل ہے، اس کتاب سے آپ کی غیر معمولی جدوجہد، علمی انہماک، تاریخ وتذکرہ اور سیر وتراجم کے ساتھ شیفتگی ووارفتگی کا اظہار ہوتا ہے، جس میں فن کی معتبر کتابوں سے چیونٹی کے دانوں کی طرح چن چن کر احادیث وآثار کے کئی ہزار حفاظ ورواۃ کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ اس کتاب سے نہ صرف تلاش وجستجو بلکہ حسنِ انتخاب، بحث وتمحیص اور چھان پھٹک کی حیرت انگیز اور خداداد صلاحیت ومہارت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ذیل میں اپنی بساط واستطاعت کے بقدر اس کے تعارف کی کوشش کی جارہی ہے، اگرچہ اس کے بعد بھی یہی حسرت رہے گی کہ:

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

۱- اس کتاب کی ترتیب حروف تہجی کے طرز پر ہے، لیکن ایک حرف کے ضمن میں آنے والے راویوں کے تذکرے میں کوئی ترتیب قائم نہیں ہے، جیسا کہ اس صفحے سے اندازہ ہوگا جس کا عکس اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

۲- یہ کتاب متوسط تقطیع کی کاپی پر ہے، جس کے صفحات کی تعداد ۴۲۲ ہے، صفحہ ۳۵۴ تک راویوں کے نام بترتیب اسماء مذکور ہیں، اس کے بعد ۶۷ صفحات کُنیٰ اور انساب وغیرہ کے لیے مختص ہیں۔

۳- جن راویوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ دو طرح کے ہیں، بڑی تعداد تو ایسے راویوں کی ہے، جن سے صحاح ستہ کے مصنفین نے روایت لی ہے؛ اور دوسرے وہ رواۃ ہیں، جن کی روایتیں ان مصنفین کی کتابوں میں نہیں ہیں۔ دوسری قسم کے جو راوی ہیں، ان میں سے اکثر کے نام سے پہلے ''ز'' لکھ دیا ہے، جو غالبًا زائد کی علامت ہے؛ پہلی قسم کے راویوں کے نام علامت سے خالی ہیں۔

۴- پہلی قسم کے جو راوی ہیں، ان کے حالات حافظ ابن حجر کی 'تقریب' سے نقل کیے گئے ہیں، اور اسی پر اکتفا کیا گیا ہے؛ البتہ جو دوسری قسم کے راوی ہیں، ان کے حالات مختلف کتابوں کی ورق گردانی اور تتبع سے نقل کیے گئے ہیں۔

۵- اگر راوی کا نام 'شرح معانی الآثار' میں ہے، تو اس کے نام کے اوپر ''مع'' یا ''ع'' اور 'شرح مشکل الآثار' میں ہے، تو ''مش'' یا ''ش'' لکھ کر فرق کیا گیا ہے، اور اگر دونوں میں ہے، تو دونوں علامتوں کو جمع کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں کوئی نام علامت سے خالی بھی ہے، اور بیشتر ناموں پر علامت کے ساتھ کتاب کا صفحہ و جلد نمبر بھی دیا گیا ہے۔

۶- اگر زیر تذکرہ راوی کی کوئی روایت علم حدیث کے مجموعوں میں سے کسی میں - مثلاً مسند ابوداود طیالسی، مسند امام احمد، مستدرک حاکم اور سنن دارقطنی وغیرہ میں - علامہ اعظمیؒ کی نظر سے گزری ہے، تو اس کو بھی ذکر کر کے ایک نیا اضافہ کرتے ہیں۔

۷- اگر کسی راوی کے نام و نسب یا ولدیت یا اس کی روایت والی سند میں کوئی غلطی یا تصحیف ہوئی ہے، تو اس کی تصحیح دلائل کی روشنی میں اور حوالوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

۸- اس راوی کے تعلق سے کسی دوسری کتاب میں کوئی غلطی یا تصحیف پائی جاتی ہے، تو اس غلطی کی طرف اشارہ اور حتی الامکان اس کی تصحیح کرتے ہیں۔

۹- راوی کے جرح و تعدیل یا کسی اور تعلق سے کسی متقدم صاحب فن سے کوئی فروگزاشت ہوئی ہے، تو اس پر متنبہ کرتے ہیں۔

۱۰- بعض راویوں کے متعلق ائمۂ جرح و تعدیل کے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد اگر ضرورت محسوس کرتے ہیں، تو منصفانہ فیصلہ کرتے ہیں۔

۱۱- علامہ سندی کی 'کشف الاستار' میں اگر کسی راوی کا تذکرہ غلطی سے رہ گیا ہے، تو أهمله السندي لکھ کر اس کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

۱۲- 'حاوی' کی تصنیف سے فراغت تو ۱۳۴۸ھ میں ہوئی تھی، لیکن اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً بہت سے

اضافے اس میں کیے گئے ہیں، چنانچہ 'کشف الاستار' سے استفادہ بھی بعد ہی کا ہے۔

مذکورہ بالا خصوصیات کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد کا مجموعہ یہ کتاب ہے، اور اگر یہ کتاب طبع ہوکر اشاعت پذیر ہو جائے، تو اس فن کی چوٹی کی کتابوں میں شمار کی جانے کے قابل ہوگی۔ سر دست 'مشتے نمونہ از خروارے' کے طور پر کچھ راویوں کے تذکرے ان صفحات میں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، جس سے کتاب کی اہمیت اور قدر و منزلت کا اندازہ ہوگا، پہلے کچھ ایسے راویوں کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے جو 'تقریب' سے منقول ہیں، پھر دوسرے راویوں میں سے کچھ کا تذکرہ کیا جائے گا۔

١ – **أنـس بن عياض الليثي** [٨/مـع مـش]: أبـو ضمرة المدني، ثقة، من الثامنة، من رجال التقريب، روى له الجماعة.

٢ – **أسـد بـن مـوسى الأموي أسد السنة: صـدوق يُـغـرِب، مـن رجال التقريب، من التاسعة، روى له البخاري تعليقاً، وأبو داود والنسائي.**

٣ – **أحـمـد بـن عبـد الله بـن يـونس الكوفي التميمي اليربوعي: ثقة حافظ، من كبار العاشرة، أخرج له الجماعة.**

٤ – **علقمة بن وقاص الليثي المدني** [ع:٨٦]: **ثقة ثبت، من الثانية، أخطأ من زعم أن له صحبة، وقيل إنه ولد في عهد النبي ﷺ، أخرج له الجماعة.**

٥ – **أبـو أسـمـاء الرحبي** [ع:١١٩]: **اسـمـه عـمـرو بـن مـرثـد ويقال اسمه عبد الله الدمشقي، ثقة، من الثانية، أخرج له الخمسة، والبخاري في الأدب.**

....

٦ – **ز/ أحـمـد بن أبي عمران أبو جعفر** [مـع مـش]: **شيـخ الطحاوي، بغدادي نزل مـصـر، قـال ابـن يـونس: كان مكيناً في العلم، حسن الدراية، حدَّث بحديث كثير من حفظه وكـان ثـقة. وقـال عبـدالـغـني: كان أحد الموصوفين بالحفظ، روى حديثاً كثيراً من حفظه. ونتـرجم له في شيوخ الطحاوي. وصفه الذهبي في سير النبلاء بالحافظ. وذكره ابن الجوزي في المنتظم ج٥ ص١٤٦.**

٧ – **أحـمد بن أبي داود** [ش: ١/٨]: **شيـخ الـطـحـاوي، يـختـلج في نفسي أنه غلط والـصـواب أحـمد بن داود فليحرر. ووقع في ١٣٧ش ج١: أحـمـد بن أبي داود بن موسى، فـقـال مـصـحـح الـكتـاب: الـظـاهر أنه ابن أبي داود المنادي الذي قال ابن حجر في اسمه: الصحيح فيه محمد. ثم قال: ولعل السند الصحيح حدثنا أحمد بن أبي داود عن عبيدالله بن مـوسـى اهــ. وعـنـدي هذا كله تعسف، فإنه يلزم على هذا أن يكون عبيدالله روى عن مسدد**

وهو أصغر منه، ولم يثبت أنه روى عنه، ويلزم أيضاً أن الطحاوي وهِم في اسم محمد بن عبيد الله بن أبي داود، فقال أحمد، واستمرَّ على هذا الوهم في مواضع كثيرة. والظاهر عندي أنه أحمد بن داود بن موسى الذي مرَّ ذكره، وهو الراوي عن مسدد كما بيَّنّاه في شيوخ الطحاوي، ولينظر ما في ص ١٣ من ش ج ١، ويؤيد ما صححناه أن الطحاوي أخرج حديث إنزاء الحمر على الخيل عن أحمد بن أبي داود في المشكل ٨٤/١، وأخرجه في المعاني ١٥٨/٢ عن أحمد بن داود.

٨- **ز/ إسحاق بن ......مولى آل عمر** [ش: ٧٠/٤]: عن أبي بكر بن عمر بن عبدالرحمن بن عبد الله بن عمر، وعنه عبدالواحد بن زياد. عندي هو إسحاق بن شرقي كما في المسند ٦٤/٣، لكن فيه بالسين المهملة، والصواب بالشين المنقوطة كما يظهر من اللسان. ذكره ابن أبي حاتم ونقل توثيقه عن أحمد وأبي زرعة، قال الحافظ في اللسان: "أخرج له البزار حديث صلاة في مسجدي، وقال: لا نعلم حدَّث عن إسحاق إلا عبدالواحد، كذا قال. وذكر ابن أبي حاتم أنه روى عنه أيضاً الثوري ومسعر وأبوعوانة". قال الحافظ: "واختُلِف في ضبط أبيه، ففي تاريخ البخاري بالقاف، وعند الدارقطني بالفاء، قال ابن أبي حاتم: ويقال له إسحاق بن أبي شداد وإسحاق بن عبدالرحمن وإسحاق بن أبي نباتة". انتهى ما في اللسان. قال أبوالمآثر: قد روى عنه أيضاً محمد بن فضيل كما في المسند ٦٤/٣. والعجب من الحافظ أنه لم يذكر إسحاق هذا في التعجيل مع أنه من رواة المسند. وذكره البخاري في تاريخه، وفيه شرفي بالفاء، وقال: هو مولى عبد الله بن عمر ج١ ص٣٩٢.

٩- **أحمد بن علي**: ليس هو من رجال الإسناد، بل هو عندي من رواة الكتاب، ولم أقدر على تعيينه.

ثم بعد كتابتي هذا بثلثين سنة وقفت على نسخة خطية لشرح معاني الآثار في حيدرآباد برواية أبي الفتح مسعود بن شجاع الأموي بدمشق عن أبي العلا بن أبي الفتح بن أبي الفرج الميهمني ببخارا عن أبي القاسم بن رضوان قال: نا أبو بكر أحمد بن علي بن إبراهيم بن أهرويه المعروف بالحافظ الأصبهاني، قال: ثنا الشيخ أبو بكر محمد بن إبراهيم ابن علي بن عاصم بن زاذان المُقرئ قال: ثنا الطحاوي. فتعيَّن عندي أن أحمد هذا هو الراوي عن الحافظ المُقرئ وهو المعروف بالحافظ الأصبهاني. والنسخة التي رأيتها منقولة عن نسخة خطية كُتِبت في سنة ٦٨٤. وأحمد بن علي هذا ذكره الذهبي في تذكرة الحفاظ ج٣ ص٢٦٩، وقد روى عنه البيهقي عن المقرئ عن الطحاوي في مس الذكر من السنن

الكبرى.

١٠- **ثابت بن أبي قتادة** [ع: ٧١/١]: مـن أولاد الصحابة، وأبو قتادة هـو الصحابي الأنـصاري المعروف، روى عنه مصعب بن ثابت ابنه، وهو عن أبي قتادة. ذكره ابن حبان في الثقـات، وقـال: يـروي عـن أبيـه، وعنـه ابنه مصعب بن ثابت، مات في ولاية الوليد بن عبد الـملک، وكنيته أبو مصعب. وذكر في المغاني عن العجلي أنه قال: مدني تابعي ثقة، حكاه السندي. وذكره البخاري في التاريخ وذكر أثر أبي قتادة في الاغتسال يوم الجمعة.

قلت: ولعبد الله بن أبي قتادة ابن يسمى ثابتاً، يروي عن أبيه، وعنه ابنه مصعب. انظر معجم الطبراني الصغير ص٢٤٨ وص٢٤٧، فهو غير ثابت بن أبي قتادة.

١١- **الـحسيـن [بـن] مـحـمـد بـن عبـد الرحمن بن فهم** [ع]: قـال ابـن الجوزي: الـحسيـن بـن مـحـمد بن عبدالرحمن بن فهم بن محرز بن إبراهيم أبو علي، ولد سنة ٢١١، وسـمـع خـلف بـن هشـام ويـحيـى بـن مـعيـن ومحمد بن سعد وغيرهم. روى عنه أحمد بن مـعـروف الخشاب وابن كامل القاضي والخطبي والطوماري، وكان عسراً في الرواية متمنعاً إلا لـمـن أكثر ملازمته. قال ابن كامل: كان الحسين متقناً في العلوم، كثير الحفظ للحديث، مُسنـدِه ومقطوعِه، ولأصناف الأخبار والنسب والشعر والمعرفة بالرجال، فصيحاً، متوسطاً فـي الـفـقـه، يـميـل إلى مذهب العراقيين، سمعته يقول: صحبت يحيى بن معين فأخذت عنه معرفة الرجال، وصحبت أبا خيثمة فأخذت عنه المسند، وصحبت الحسن بن حماد سجادة فأخذت عنه الفقه. وقال الدار قطني: ليس بالقوي، اهـ باختصار.

قلت: ابن كامل أعلم به من الدارقطني وأعرف.

١٢- **خالد سبلان** [ع: ١٠٣/١]: هـو ابن عبد الله، ذكره ابن حجر في ترجمة خالد ابـن دهـقـان. ذكـره ابن عساكر في التاريخ فقال: خالد بن عبد الله بن الفرج أبو هاشم مولى بـنـي عبـس، ويـعـرف بـخـالـد سبـلان، ولـقب بذلک لعظم لحيته، سمع معاوية وعمرو بن العـاص. وأسـنـد ابـن عسـاكر إليه عن كهيل بن حرملة النمري عن أبي هريرة حديث صلاة الـوسـطـى صلاة العصر، وذكر أنه كان يوماً جالساً مع مكحول، فقال مكحول في قوله تعالى ﴿يُبَـدِّلُ سَيِّآتِهِمْ حَسَناتٍ﴾ يجعل مكان السيئات الحسنات. فقال خالد: لا، بل يُخرجهم من السيئـات إلـى الحسنات. فغضِب مكحول حتى جعل يرتعد. قال ابن ماكولا: سبلان، بفتح السين والباء المعجمة بواحدة، وقال أبو مسهر: ثقة، اهـ(٦٧/٥).

قـلـت: وتبيَّـن لک بهـذا أنَّ مـن قال فيه خالد بن سبلان، كابن حبان في ثقاته، فقد

وهم. ولم يتبين ذلک للسندي رحمه الله فتردَّدَ.

١٣- **خازم بن خزيمة** [ش:٢٦٣/٣]: هو البصري من تيم الرباب مولى بني سدوس من أهل البصرة، سكن بخارى، يكنى أبا خزيمة، روى عن مجاهد المكي وغيره؛ وعنه يحيى ابن عبد الله بن سالم بن عبد الله بن عمر بن الخطاب وعبد الجبار بن عمر الأيلي وأسلم بن بشر وحفص بن داود الربعي. ذكره ابن حبان في الثقات، وقال: ربما أخطأ، يُعتبر حديثه بروايته عن الثقات. أخرج له ....

ومن ههنا تبين لک أن ما في الكتاب من قوله "حازم بن خزيمة عن تميم الزيات" تصحيف قبيح، جنته أيدي النساخ، فزادوا في الإسناد رجلا، وإنما الصواب: خازم بن خزيمة من تيم الرباب. وتيم الرباب قبيلة، فراجع الأنساب للسمعاني.

١٤- **الصلت بن مهران**[:٣٧٠/١] في اللسان: الصلت بن مهران عن شهر بن حوشب وابن أبي مليكة والحسن؛ وعنه محمد بن بكر البرساني وسهل بن حماد، مستور. قال ابن القطان الفاسي: مجهول الحال، وقد قال ابن حبان في ترجمة الصلت بن بهرام أنه هو الذي يروي عن الحسن، ومن قال الصلت بن مهران فقد أخطأ ووهم، روى عنه محمد بن بكر وليس بالبرساني. قال ابن حجر: فليحقق.

قلت: أما الراوي عنه، فقد صرَّح عند الطحاوي أنه البرساني، وقد أخرج الحديث من جهة إمام الفن علي بن المديني فلا شک في أنه البرساني. وأما الصلت بن بهرام، فقال أحمد: كوفي ثقة؛ وقال ابن عيينة: كان أصدق أهل الكوفة؛ وقال يحيى: ثقة تكلم فيه أبو زرعة للإرجاء؛ وقال إسحاق في مسنده: أخبرنا وكيع ثنا الصلت بن بهرام وهو ثقة؛ وقال ابن معين وابن عمار: ثقة؛ وقال ابن سعد: ثقة إن شاء الله؛ وقال الدارقطني: لا بأس به مات سنة ١٤٧.

أخرج لابن مهران البزارُ في أماليه، والأغلب عندي أن الصواب ابن بهرام.

١٥- **عبد الله بن جرير** [ش:٦٥/٢]: صوابه عندي عبيد الله بن جرير بن عبدالله البجلي، فإن أباداود أخرج حديثه هذا من طريق شعبة عن أبي إسحاق عن ابن جرير غير مسمى، فذكره ابن حجر في التقريب وقال: كأنه عبيد الله. وأخرج أحمد هذا الحديث عن غندر عن شعبة عن أبي إسحاق عن عبيد الله بن جرير ج٤ ص٣٤٦، فالحمد لله.

١٦- **عرفطة** [ش:٢٧١/٢]: الصواب ههنا عبيد الله بن علي بن عرفطة، هكذا في ابن ماجه. نعم قال ابن حجر في التهذيب في ترجمة عبيد الله "وقيل عبيد الله بن علي عن

عرفطة".

قال أبو المآثر: وهو عندي وهم، فإن الحديث أخرجه الدولابي عن أبي معاوية وسفيان كليهما عن منصور عن عبيد الله بن علي بن عرفطة عن خداش.

١٧- **عباد الله بن زياد عن لقيط وعنه أبو الوليد** [ش: ٣٢٢/٤] أخرج الحديث الحاكم في المستدرك ٦٠٧/٢ عن عبد الملك بن عمير عن إياد بن لقيط عن أبي رمثة وألفاظهما مختلفة، وأخرجه الدولابي مطولاً عن عبيد الله بن إياد بن لقيط عن أبيه عن أبي رمثة، وهذا هو الصواب عندي. وفي المشكل تصرفات شتى من النساخ، فإنهم صحفوا عبيد الله بن إياد عباد الله بن زياد، وأسقطوا أبا رمثة من الإسناد، وجعلوا الحديث من رواية أبي لقيط. راجع الكنى ٢٩/١.

١٨- **عبد الرحمن بن الرجاج** [ع: ٢٢٨/١]: الصواب الزجاج، ذكره في التهذيب من رواة شيبة بن عثمان، وعنه عبد الله بن مسلم بن هرمز، قال السندي: "هو عوسجة بن الرماح الكوفي مقبول" اهـ. قلت: كلا، فإنه لم يذكر أحد أن عوسجة يسمى عبدالرحمن، بل هو عبد الرحمن بن الزجاج مولى ام حبيبة، أدرك النبي ﷺ فيما ذكره الذهبي، وذكره الكاشغري وقال: أدرك النبي ﷺ وقيل إنه عداده في التابعين، ذكره الفاسي في تاريخ مكة، وذكره الذهبي في التجريد، وذكره ابن حبان في ثقات التابعين.

٢٣- **عكاشة بن وهب الصحابي** [ع: ٤١٨/١]: هو من خطأ بعض النساخ أو اجتهاد بعض المصححين، والصواب عكاشة بن محصن. والذي اضطرهم إلى ذلك قوله في الرواية جدامة بنت وهب أخت عكاشة، فظنوا أنه أيضاً ابن وهب، ولم يدروا أنه أخ لها لأمها فقط لا لأبيها.

١٩- **عبد الله بن محمد الفهمي عن سليمان بن بلال وعنه روح بن الفرج** [ع: ٤٢٩/١]: هو الذي قال فيه الطحاوي يعرف بالسطري (وهو مصحف والصواب البيطاري)، ذكره السمعاني في البيطاري، فقال: أبو محمد عبد الله بن محمد بن إسحاق بن عبيد بن سويد البيطاري من أهل مصر، يروي عن سليمان بن بلال وابن لهيعة وملك (الصواب مالك) توفي في صفر سنة ٢٣١. وذكره ابن الأثير في اللباب وقال: كان ينزل بمصر في الموضع المعروف ببلال البيطار فنسب إليه. قلت: ويعرف بالبلبلي أيضاً نسبة إلى بلبلة بضم الموحدتين، وهم بطن من فهم كما في اللباب، وسقط في هذا الباب من اللباب اسم أبيه من نسبه. قال العيني في المغاني: روى عنه أبو زرعة الرازي ويعقوب بن سفيان

وموسى بن سهل الرملي، قال أحمد: ثقة صالح اهـ، وذكره ابن حبان في الثقات، حكاه السندي. وبذلك عرفت أن وصفه بالمطرف كما في المشكل ص...... والسطري كما في المشكل ص...... والشطاري كما في السندي مصحف.

٢٠ - **علي بن الحسين بن عبد الرحمن بن فهم عن أحمد شيخ الطحاوي** [ع: ١٦٤/٢]: الصواب حدثنا علي بن الحسين عن الحسين بن عبدالرحمن كما في الناسخ والمنسوخ لأبي جعفر النحاس ص ١٤، والحسين بن عبد الرحمن هو الحسين بن محمد بن عبد الرحمن بن فهم وقد تقدم. ولم يتنبه له السندي فقال: لم أر من ترجمه. وقد حكى القرشي قصة عن ابن حنبل برواية الطحاوي قال: سمعت علي بن الحسين أبا عبيد القاضي يقول حدثني ابن فهم الخ (جواهر ٢٢١/٢).

٢١ - **عبيد الله بن سعيد بن كثير بن عفير أبو القاسم المصري** [ز]: حدث [عن] أبيه؛ وعنه علي بن قديد والحسين بن إسحاق الأصبهاني، وروى عنه أبو عوانة في صحيحه والطحاوي. قال ابن حبان: لا يشبه حديثه حديث الثقات. وذكره ابن يونس فلم يذكر فيه شيئاً وذكر كنيته وقال: مات سنة ٢٧٣.

قلت: وابن يونس أعلم بحال أهل بلده، وقد أدخله أبو عوانة في الصحيح وهو تلميذه بغير واسطة، وشاهَدَ من أحواله وعرف ما لم يعرفه من جرَحَه.

٢٢ - **المفضل بن غسان العلائي** [ش: ٢٦٧/١]: وفي ٢٧٥/١ الغلابي، وهو الصواب، فإن الذهبي ساق نسبه هكذا: المفضل بن غسان بن المفضل بن معاوية بن عمرو ابن خالد بن غلاب الغلابي، روى عنه جعفر بن محمد بن الأزهر (بيهقي ٢٨٤/١). ذكره السمعاني في الأنساب تحت الغلابي، فقال: أبو عبد الرحمن المفضل بن غسان بن المفضل البصري الغلابي، سكن بغداد وحدث بها عن أبيه والخريبي وعبد الرحمن بن مهدي وأبي داود الطيالسي ويزيد بن هارون وسليمان بن حرب وروح بن عبادة؛ روى عنه ابنه الأحوص ويعقوب بن شيبة وابن أبي الدنيا وأبو القاسم البغوي وأبو الليث الفرائضي وكان ثقة، اهـ. ولم يذكر سن وفاته، وذكر أن ابنه مات سنة ٣٠٠. قلت: وله كتاب التاريخ رواه عنه ابنه الأحوص ينقل منه ابن حجر وغيره. وذكره ابن العماد في من توفي سنة ٢٤٦، فقال: وفيها الفضل بن غسان الغلابي ببغداد، روى عن عبدالرحمن بن مهدي وطبقته، وله تاريخ مفيد اهـ (شذرات ١١٢/٢) قلت: لكن فيها الفضل بحذف الميم من أوله والصواب إثباته. وذكره الخطيب، فقال: المفضل بن غسان بن المفضل أبو عبدالرحمن الغلابي بصري الأصل،

سكن بغداد وحدث بها عن أبيه إلى آخر ما ذكرنا عن السمعاني (١٣/ ١٢٤).

٢٣ - **محمد بن يزيد الرحبي عن شهر بن أبي حبيش وعنه إسماعيل بن عياش** [ع: ١/ ٣٢٦]: هو أبو بكر محمد بن يزيد الرحبي -نسبةً إلى رحبة دمشق، قرية من قراها فخربت- روى عن أبي إدريس وأبي الأشعث الصنعاني وعروة بن رويم ومغيث بن سمي وأبي خنيس الأسدي وعمر بن ربيعة وسعد بن عبدالعزيز وعبدالرحمن بن ثابت بن ثوبان والهيثم بن حميد ومحمد بن المهاجر وإسماعيل بن عياش وعبدالرحمن بن سليمان بن الجون مولى رسول الله ﷺ وأيوب بن حيان اهـ. حكاه الحموي عن أبي القاسم الدمشقي، وفي المطبوعة من المعجم سقماً في هذه الترجمة، والصواب عندي أن لفظة (وعنه) سقطت قبل (عمر بن ربيعة) معجم ٤/ ٢٣٥. وانظر هذا الكتاب ص ٢٨٥. وذكره البخاري في التاريخ، ويظهر منه أن الهيثم -هو ابن حميد- يروي عنه ولم يذكر جرحاً (ج١ق١ص ٢٦١).

یہ تذکرہ 'الحاوی' کے صفحہ ۳۰۵ پر ہے، صفحہ ۲۸۵ کا جو حوالہ دیا ہے، وہ 'حاوی' ہی کا ہے، اور وہاں لکھا ہے:

محمد بن يزيد الرحبي عن أبي إدريس وعنه إسماعيل بن عياش [ع: ١/ ١٦٨]: ذكره ابن حبان في الثقات، وقال الدمشقي يروي عن عروة بن رويم وعنه إسماعيل بن عياش اهـ، حكاه السندي. قال شيخنا إمام العصر أنور الكشميري ذكره ياقوت وجعله من الثقات (عرف ٢١٦) وانظر ص ٣٠٥ من هذا الكتاب.

٢٤ - **محمد بن بحر مطر البغدادي، شيخ الطحاوي**: ذكره الخطيب في تاريخه وقال: هو أبو بكر البزار سمع يزيد بن هارون وشجاع بن الوليد وهاشم بن القاسم والحسن ابن قتيبة المدائني ومعمر بن مخلد؛ وروى عنه أحمد بن محمد بن عمر المنكدري وأبو جعفر الطحاوي وعثمان بن محمد السمرقندي وأبو كثير محمد بن إبراهيم بن أبي الجهم البصري -قلت: سمع أبو كثير هذا منه بمكة كما يظهر من هذا الكتاب- تاريخ بغداد ج٢ص ١٠٥.

قلت: ليس هو بالواسطي المذكور في ميزان الاعتدال واللسان، وغفل ابن حجر رحمه الله فقال في الواسطي روى عنه الطحاوي، والحال أن الطحاوي روى عن البغدادي كما نسبه هو في كتابه.

٢٥ - **وبرة رجل من بني كلب** [ع: ٢/ ٨٨]: عن أبي بكر الصديق، وعنه حميد بن عبدالرحمن في حد الشرب، ذكره الحافظ في اللسان، وحكى عن ابن حزم أنه قال: هو

مجهول، ثم قال الحافظ ذكرت ترجمته في تهذيب التهذيب لأنه وقعت له رواية عند النسائي في الكبرى اهـ.

قلت: لم يترجم له في تهذيب التهذيب المطبوع، فلعل المصنف سها أو أسقطه النساخ.

٢٦- **يعقوب بن إسحاق بن أبي عباد** [ع: ١٠٣/١، ش: ١٤١/١]: العبدي المكي البصري ثم القلزمي، بصري أقام بمكة مدة وقدم مصر، وكان بالقلزم وسكنها فنسب إليه، وحدث، وكان ثقة، وبالقلزم كانت وفاته نحو سنة عشرين ومائتين. روى عن سعيد بن بشير وإبراهيم بن طهمان وحماد بن شعيب وعطاف بن خالد وإسماعيل بن إبراهيم بن علية وداود العطار ومحمد بن عيينة ونافع؛ روى عنه موسى بن سهل وعبدالرحمن بن عبدالله بن عبد الحكم المصري والربيع الجيزي ويوسف بن يزيد القراطيسي. قال ابن أبي حاتم: كان يسكن قلزم، قدمت قلزم وهو غائب فلم أكتب عنه، محله الصدق ولا بأس به (*انساب: قلزمی*)۔

قلت: نقل السندي ترجمته عن الثقات، وفي نسخته القازمي فقال: لم أر هذه النسبة في كتب الأنساب. والصواب كما ترى القلزمي نسبةً إلى قلزم. وذكره البخاري في التاريخ.

٢٧- **أبو إسحاق الضرير** [ش: ١٧٥/١] هو إبراهيم بن أبي زكريا المعلم يأتي، وما في الكتاب ههنا من قوله حدثنا إبراهيم، ثنا أبو داود ثنا أبو إسحاق فهو خطأ، والصواب: حدثنا إبراهيم بن مرزوق ثنا أبو إسحاق الضرير الخ. كما في ع ٢ص٣٤٢، فإن أبا إسحاق شيخ إبراهيم بن مرزوق كما أن أبا داود الطيالسي أيضاً شيخه، فقوله "ثنا" بينهما زيادة فاحشة. واعلم أن الطحاوي أخرج الحديث في المعاني فرواه من طريق أبي إسحاق فقط، وأخرج في المشكل فرواه من طريق أبي إسحاق وأبي داود جميعاً.

٢٨- **أبو داود الإيادي الشاعر** [ش: ٧٤/٤]: الصواب أبو دُوَاد، اسمه حارثة بن الحجاج وقيل جويرية بن الحجاج، والأول أصح، منسوب إلى إياد بن نزار بن معد بن عدنان، شاعر قديم من شعراء الجاهلية، وكان وصافاً للخيل، وأكثر أشعاره في وصفها، وله في غير وصفها تصرف بين مدح وفخر وغير ذلک إلا أن شعره في وصف الفرس أكثر (أغاني ٩١/١٥).

٢٩- **الرؤاسي** [ش: ٣٣١/٤]: هو محمد بن الحسن بن أبي سارة النيلي النحوي أستاذ الكسائي والفراء، وكان رجلاً صالحاً، ذكره الداني في طبقات القراء، وقال: روى الحروف عن أبي عمر وهو معدود في المقلين عنه، وسمع الأعمش، وله اختيار في القرأة ......

سمع الحروف منه خلاد بن خالد المنقري وعلي بن محمد الكندي وروى عنه الكسائي والفراء، قال الزبيدي: كان أستاذ أهل الكوفة في النحو، أخذ عن عيسى بن عمر (بغية الوعاة).

مذکورہ بالا تذکرے کتاب کے متعدد مقامات سے نقل کیے گئے ہیں، ان کے مطالعہ کے بعد اہل علم کو یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ علامہ اعظمیؒ نے اس کتاب کی تصنیف میں کس قدر دماغ سوزی، جگر کاوی اور عرق ریزی کی ہے، اور وسائل کی قلت کے باوجود کس طرح اس کے مواد ومراجع کو تلاش کرکے اوران کو کھنگال کر یہ کتاب تیار کی ہے، جس پر آپ کے استاذ امام العصر حضرت علامہ انورشاہ کشمیری علیہ الرحمہ بھی اظہار مسرت کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ علامہ اعظمیؒ نے اپنے منتشر اوراق میں ایک جگہ حضرت علامہ کشمیری کے تذکرے میں لکھا ہے:

لقيته واجتمعت به بديوبند في رمضان سنة ١٣٥٢، وكان رحمه الله قد أنهكه المرض وأدنفه، ما كدت أن أعرفه أول ما رأيته، فتكلم معي طويلا، وسألني عن 'الحاوي لرجال الطحاوي' الذي كنت فرغت من تصنيفه قبل ذلک بيسير، وسألني عن مآخذي فيه، فلما ذكرتها له سُرَّ واستبشر، ثم سألته رحمه الله أن يطالع 'الحاوي'، وينظر فيه نظر إصلاح، فقبل وأمرني أن أرسله إليه جزءاً جزءاً إذا وصل رحمه الله إلى ڈابهيل، فلم يمكنه الأجل المتاح أن يفارق ديوبند حتى فارق الدنيا في صفر من السنة المذكورة. وأمرني رحمه الله بالاجتهاد في الذب عن الإمام الأعظم والسعي وراء تحصيل شيء مما ردَّ القدماء على الخطيب البغدادي، وأجابوا عن ما رمى به الإمام الأعظم في تاريخه.

اس کتاب کو مطبوعہ شکل میں دیکھنے کا اشتیاق آپ کے ایک دوسرے استاذ علامہ شبیر احمد عثمانی کو اس قدر تھا کہ آپ نے ۱۴ر جمادی الاولی ۱۳۵۱ھ کو اپنے تلمیذ ارشد علامہ اعظمیؒ کو ایک خط میں لکھا:

''کاش 'الحاوی' چھپ جاتی، تو ہم کو بھی اپنے کام میں مدد ملتی، حق تعالیٰ کوئی سامان فرمادیں، انشاء اللہ مناسب موقع پر کوئی کوشش ہوسکی، تو دریغ نہ ہوگا''۔

اس کتاب کے تذکروں میں اگرچہ بعد میں آپ نے وقتاً فوقتاً اضافہ کیا ہے، لیکن اس کی تصنیف سے آپ ۷ر جمادی الاولی ۱۳۴۸ھ میں فارغ ہوئے تھے، جیسا کہ اس کے آخر میں لکھا ہے:

وهذا آخر الكنى ولله الحمد على ما وفقنا للإتمام، وكان ذلک يوم الجمعة لسبع مضين من جمادى الأولى سنة ١٣٤٨ الهجرية على صاحبها ألف ألف صلاة وتحية. أرخت عام تمامه بقولي: ع

إنه والله تصنيف شريف

سنة ١٣٤٨هـ

اس کتاب پر علامہ اعظمیؒ کا مقدمہ نہیں ہے۔ کتاب شروع کرنے سے دوورق پہلے تقریباً چار سطر کا خطبہ ہے، جو حسب ذیل ہے:

الحمد لله الذي خلق لحفظ آثار نبيه وُعاةً، وأقام لنشر علومه نَقَلَةً أُمناءَ ورواةً، ونصب من بين عباده إلى سَنن سُننه الكريمة دُعاةً؛ فتذاكروها وبلَّغ كل سلف منهم إلى خلف، وتناقلوها حتى صانوها من الضياع والتلف؛ فها هي على مرِّ الدهور مصونة، ومن غوائل الدثور مأمونة. والصلوة والسلام على الحرز المنيع والحبيب الشفيع سيدنا ونبينا محمد هادي الجميع، وعلى آله وصحبه العدول الأخيار، ورثة علومه وحاملي السنن وناقلي الآثار.

سرورق کے بعد والے صفحہ کے اوپری حصے پر اس کی تاریخ تصنیف سے متعلق کچھ اہم یادداشتیں درج کی گئی تھیں، جو تین سطری عبارتوں پر مشتمل تھیں، لیکن افسوس کہ اس کا کچھ حصہ پھٹ کر الگ ہوگیا ہے، ورنہ اس سے بہت اہم معلومات حاصل ہوتیں، جتنا حصہ محفوظ ہے، اس کی اوپری سطری سے راقم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس کی تصنیف کا آغاز اواخر ذی قعدہ ۱۳۴٦ھ میں ہوا تھا۔

دوسری اور تیسری سطر کی باقی ماندہ عبارت اس طرح ہے:

عمل إلى ٢٩ جولائی ٢٨ ء، ثم وقعت الفترة إلى ٨ جولائی ٢٩ء، ثم شرعت فی العمل ٩/ جولائی ٢٩ء المطابق لأول صفر ٤٨هـ.

اس کے بعد کئی سطر میں متعدد کتابوں کے نام ہیں، جو مراجع کے قبیل سے ہیں، اور جن سے اس کتاب کی تصنیف میں آپ نے مدد لی ہے، یا فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:

تقریب، تہذیب التہذیب، خلاصہ، میزان، لسان المیزان، الطالع السعید، بغیۃ الوعاۃ، انساب سمعانی، طبقات ابن سعد، تاریخ ابن عساکر، اغانی، فوائد بہیہ، جواہر مضیئہ، تعجیل المنفعۃ، تجرید الصحابہ، تذکرۃ الحفاظ، الکنی والأسماء للدولابی، مشتبہ النسبۃ لعبد الغنی۔

مسند طیالسی، تلخیص الحبیر، نصب الرایہ، صحاح ستہ، دارقطنی، بیہقی، مستدرک، معجم صغیر، الناسخ والمنسوخ للنحاس، الادب المفرد، فتح الباری، تاریخ قضاۃ مصر للکندی، بذل المجہود، موطا مالک، کنز العمال، مسند احمد۔

تاریخ الاسلام للذہبی: **طالعته في دار العلوم (ندوة العلماء) ١٢ جمادى الاولى ٤٩هـ.**

کتاب الثقات لابن حبان، وسیر النبلا للذھبی (مجلد ہفتم) وتاریخ مکۃ للتقی الفاسی: **طالعت الثلاثة في خزانة كتب مولانا عبد الحي اللكنوى.**

تاریخ خطیب بغدادی، جامع المسانید۔

اس فہرست میں متعدد کتابیں ایسی ہیں، جن کے قلمی نسخوں سے آپ نے استفادہ کیا تھا، یقین کے ساتھ اور حتمی طور پر تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کون کون سی ہیں، تاریخ الاسلام اور سیر النبلا کے بارے میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے وقت ان کا قلمی نسخہ آپ کے پیش نظر رہا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

الإتحافات السنيه بذكر محدثي الحنفيه

علامہ اعظمیؒ کی ابتدائی دور کی کتابوں میں سے ایک یہ بھی ہے، اس میں ان اہل علم کا تذکرہ ہے، جو فن حدیث میں مہارت یا اس کے ساتھ اشتغال رکھتے تھے، اور وہ فقہ حنفی پر عمل پیرا تھے، اس میں بعض تو ایسے ہیں، جن کا شمار حدیث شریف کے راویوں میں ہوتا تھا اور ان کی روایتیں حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں، اور دوسرے بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے تصنیف و تالیف، درس و تدریس یا دوسرے طریقوں سے اس مبارک علم کے ساتھ اشتغال رکھا۔ اس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ حنفیہ کا عمل حدیث پر نہیں ہوتا، اگر یہ خیال صحیح ہوتا تو اہل علم کی اتنی بڑی تعداد حدیث شریف میں مہارت و کمال - بلکہ بہت سے ایسے ہیں جو منصب امامت پر فائز ہیں- رکھتے ہوئے مذہب حنفی پر عمل پیرا نہ ہوتے، اور اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مذہب حنفی قرآن سنت سے پوری طرح ہم آہنگ اور اس کے ساتھ بالکلیہ مطابقت رکھتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوسری ضروری اور اہم مصروفیات کی وجہ سے علامہ اعظمیؒ کی یہ کتاب پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکی، ورنہ یہ بڑا عظیم الشان کام ہوتا، پھر بھی جتنا حصہ تحریر ہو سکا ہے اور موجود و محفوظ ہے، وہ نہایت اہم اور قابل قدر ہے، جس سے نہ صرف ارباب فضل و کمال حنفی محدثین کے عظمت و علو مرتبت کا، بلکہ مصنف کتاب کے ذوق تصنیف اور تاریخ و تذکرہ کے فن میں رسوخ اور ید طولی کا بھی اندازہ لگایا جا سکے گا۔ اس کتاب کی وجہ تالیف تسمیہ کے بعد یہ تحریر فرمائی ہے:

أما بعد! فإني سمعت بعض المتسمين بأهل الحديث يقول إن الحنفية بضاعتهم في الحديث مزجاة، وجل صناعتهم الرأي وليسوا في شيء مما سواه، وكذلك بعضهم يقولون إنه ليس لأحد منهم مؤلَّف في التفسير؛ فلما لم يكن هذا القول منهم إلا التزوير، أخذتني الأنفة والحمية، وحملتني العصبية المذهبية على أن أصنف كتاباً أجمع فيه المحدثين الأحناف، وآخر أُفرد فيه بذكر المفسرين من هولاء الأشراف، فتتبَّعتُ الصحُف والأسفار، وتصفَّحت الزُّبر، وجنيتُ من أوراقها الأثمار، فشرعت أولاً بجمع أفراد المحدثين، مستعيناً بالملك المعين، وسميته بإتحاف الأشراف بذكر محدثي الأحناف.

یہ تالیف حروف تہجی کے اعتبار سے ہے، صرف حرف ہمزہ کے تحت تقریباً ۱۲۰/افراد کا ذکر ہے، جو ۳۱/ صفحات میں ہے، مواد اور نشاط کی کثرت وقلّت کے اعتبار سے تذکروں میں بھی طول اور اختصار پایا جاتا ہے، بعض تذکرے ایسے ہیں کہ ایک ہی سطر میں سمیٹ دیے گئے ہیں، اور بعض ایسے ہیں جو ایک صفحہ یا اس سے زائد پر مشتمل ہیں، لیکن ہر ایک تذکرے میں حوالوں کے ساتھ صاحب ترجمہ کا حدیث کے ساتھ اشتغال ثابت کیا گیا ہے، خواہ وہ تصنیف وتالیف کے ذریعے سے ہو، یا درس وتدریس اور روایت وسماع کے ذریعے سے۔

کچھ حروف ایسے ہیں جن کے تحت دو چار ہی محدثین کے حالات درج کیے گئے ہیں، اور بعض حروف کے تحت کئی کئی صفحے کا بیاض چھوڑ دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اعظمیؒ اس پر مزید کچھ لکھنا چاہتے تھے، لیکن اس کو مکمل کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ سب سے زیادہ تذکرے حرف ہمزہ کے تحت ہیں، اس کے بعد حرف ''ع'' کے تحت ہیں، آپ نے اپنی اس کتاب میں قدماء محدثین سے لے کر بعد تک کے اہل فضل وکمال محدثین کا تذکرہ کیا ہے، اور اگر صاحب ترجمہ پر جرح وتعدیل وغیرہ کی گئی ہے، تو اس کو بھی نقل کیا ہے، افسوس ہے کہ کتاب ناتمام رہ گئی، ورنہ بہت اہم اور کارآمد چیز ہوتی۔

تراجم کے چند نمونے:

یہاں بطور نمونہ کے چند تراجم کا ذکر کیا جارہا ہے، جس سے آپ کے اسلوب کا اندازہ لگایا جاسکے گا:

۱ - **إبراهيم بن رستم أبو بكر المروزي:** تفقه على محمد ، وروى عن أبي عصمة نوح الجامع وأسد البجلي، وهما ممن تفقه على أبي حنيفة؛ وسمع من مالک والثوري وحماد بن سلمة وغيرهم، وقدم بغداد غير مرة فروى عنه أئمة الحديث أبو عبد الله أحمد بن حنبل وغيره، مات بنيسابور قدمها حاجاً سنة ۲۱۱ إحدى عشرة ومائتين.

قال أبو المآثر: ذكره الذهبي في الميزان، قال: إبراهيم بن رستم عن حماد بن سلمة، قال ابن عدي: منكر الحديث، وقال أبو حاتم: كان يرى الإرجاء، ليس بذاک، محله الصدق، وروى عثمان الدارمي عن ابن معين ثقة. قلت: وله عن الليث بن سعد ويعقوب القمي، وعنه الحسين بن الحسن المروزي بلديه، ومحمد بن عبدالرحمن السعدي، وهو خراساني مروزي جليل، اهـ.

۲ - **أحمد بن محمد بن حامد أبوبكر الطواويسي:** الفقيه الفاضل الورِع الزاهد الثقة. قال السمعاني: كان من عباد الله الصالحين، يروي عن محمد بن نصر المروزي ومحمد بن الفضل البلخي، وأثنى عليه أبو سعد الإدريسي في كتاب الكمال اهـ. مات في الحمام سنة أربع وأربعين وثلث مائة بسمرقند. ذكره ابن خلكان في وفيات الأعيان،

والشيخ محمد طاهر في المغني، والكفوي في الطبقات، وكذلك علي القاري والعلامة اللكنوي في الفوائد والنافع الكبير، والسيوطي في حسن المحاضرة.

٣ – **إبراهيم بن عيسى بن إبراهيم بن محمد الفقيه الحنفي المكي المشهور بأبي سلمة:** كان إماماً فقيهاً مطلعاً على فروع المذهب، متحرياً في الفتوى، ديِّناً، مولده ومنشأه بمكة، وأخذ عن العلامة إبراهيم الدهان، وبه تخرج، وحضر قبله دروس السيد عمر بن عبدالرحيم البصري وعبد الرحمن المرشدي، والفرائض والحساب عن السيد صادق، والحديث والتفسير عن الإمام الكبير محمد بن علان، وأخذ عنه جماعة من أهل مكة، وتوفي بمكة رابع عشر رمضان سنة ١٠٧٦ ودفن بالمعلاة (خلاصه).

٤ – **أحمد بن سليمان بن محمد بن عبد الله الحوراني الكناني المقري الحنفي نزيل مكة:** ولد ببلدة غزة، ودفن بها في سنة ٩٣٠هـ، ولد في حدود سنة ٨٦٠هـ، ونشأ بها، فحفظ القرآن ومجمع البحرين وطيبة النشر وغيرهما، واشتغل بالقراآت وتميَّز فيها، وفهم العربية واشتغل فيها، وقطن مكة على خير وانجماع مع تحرز. كذا ذكره السخاوي، قال: وقد لازمني في الدراية والرواية، وكتبت له إجازة.

٥ – **أحمد بن الشمس محمد بن القطب محمد بن السراج البخاري الأصل المكي الحنفي:** توفي في سنة ٩٥١ بجدة يوم السبت عاشر ربيع الثاني، وحمل إلى مكة، وكان مولده في صفر سنة ٨٨٣هـ بمكة، وقرأ على السخاوي سنن أبي داود والشفاء، ودخل القاهرة مراراً، وسمع الحديث فيها على جماعة، منهم الحافظ الديلمي والجلال السيوطي، وولي المناصب الجليلة كالقضاء والإمامة والمشيخة، كذا في النور السافر.

٦ – **أحمد بن إسماعيل بن محمد بن أبي الفتح بن صالح بن أبي العز بن وهيب الحنفي الدمشقي قاضي القضاة نجم الدين المعروف بابن ......** : ولد سنة عشرين وسبع مائة تقريباً، وولي القضاء بالقاهرة ودمشق، ودرس بأماكن، وكان عارفاً بمذهبه، مات في ذي الحجة مقتولاً سنة ٧٩٩، طعنه رجل بسكين. ذكره الحافظ ابن حجر في معجمه، وذكر شيوخه، وقال: إنه أجاز لي.

٧ – **أحمد بن أبي العز بن أحمد بن أبي العز بن صالح الأدرعي الحنفي، عرف بابن الثور بالمثلثة:** سمع من إسحاق الآمدي وعبدالقادر وغيرهما، ومات في صفر سنة ٨٠١، وله ثمانون سنة. ذكره ابن حجر وقال: أجاز لي سنة ٧٩٧.

٨ – **الزين بن عبدالخالق بن علي المزحاجي الحنفي الزبيدي:** الشيخ العالم الحافظ

المحدث. هكذا وصفه زباره في 'نيل الوطر' ٤٢٠/١، وقال: مولده سنة ١١٣٥، ونشأ بزبيد فأخذ عن علمائها وغيرهم، وكان عالماً تقياً، وتوفي سنة١٢٠٩هـ.

٩- عابد بن أحمد علي بن يعقوب الحافظ السندي المحقق المدقق الفقيه المحدث الجامع بين العلوم العقلية والنقلية، مدرس الحديث، الحامي لمذهب الحنفية: ولد في مدينة سيون، وهي بليدة على الشاطئ الشمالي لنهر حيدرآباد (السند)، هاجر منها جدُّه شيخ الإسلام إلى الحجاز، وأقام الشيخ محمد عابد في زبيد اليمن، واستفاد من علمائها، واقتبس من أشعة عظمائها، ثم دخل صنعاء اليمن وتزوج ابنة الوزير، وخرج إلى مصر مرة سفيراً من إمام صنعاء، وعاود منها إلى الوطن، وأقام في نواري أياماً، وهي قرية بقرب بندر كراجي من سند، ثم عاد إلى المدينة الطيبة وولي هناک رياسة العلماء من والي مصر. له رحمه الله تصانيف عديدة، بعضها مبسوطة، وبعضها مختصرة، منها: كتاب المواهب اللطيفة على مسند الإمام أبي حنيفة، وطوالع الأنوار على الدر المختار، وشرح تيسير الوصول إلى أحاديث الرسول، وشرح بلوغ المرام، توفي رحمه الله يوم الإثنين في ربيع الأول سنة ١١٥٧، ودفن في البقيع، انتهى ما في الحدائق معرَّباً.

قلت: وله 'حصر الشارد في أسانيد محمد عابد' رأيته في مكتبة مولانا عبدالحى اللكنوي. وقد ذكر المترجَم له الشوكاني في 'البدر' (٢٢٧/٢) وأطال في ترجمته وقال: صاحب الترجمة له يد طولى في علم الطب، ومعرفة متقنة بالنحو والصرف وفقه الحنفية وأصوله، ومشاركة في سائر العلوم، وفهم صحيح سريع، وقال إنه قرأ عليه -أي على الشوكاني- الميبذي، وذكر أن سفارته إلى مصر كان في ١٢٣٢هـ، أرسله الإمام المهدي إلى محمد علي پاشا، إلى غير ذلک، اهـ.

علامہ اعظمیؒ نے اس تذکرہ میں دوجگہ حاشیہ تحریر فرمایا ہے، پہلا حاشیہ 'المواهب اللطيفة' پر ہے، اس پر لکھا ہے:

> طالعت المجلد الثاني منه في خزانة دارالعلوم الديوبنديه، ورسالة له أنيقة في كرامات الأولياء في مكتبة جامع بومباي.

دوسرا حاشیہ ۱۱۵۷ھ پر ہے، اس پر لکھا ہے:

> وفي العناقيد للنيموي سنة ١٢٥٧، وقال هو من كبار المحدثين في عصره، وهو الصواب كما في حاشية البدر وغير ذلک. أجاز المترجَمُ لشيخ مشايخنا الشاه عبد الغني المجددي.

١٠١ – عاشق بن عمر الحنفي المحدث الفقيه: روى الحديث عن الشيخ عبد الله الأنصاري المعروف بمخدوم الملك ابن شمس الدين، له شرح بديع على الشمائل للترمذي، توفي سنة اثنتين وثلاثين وألف. قال في شرح الشمائل: أروي الشمائل عن الشيخ عبد الله الأنصاري المعروف بمخدوم الملك بن شمس الدين.

قلت: ونسخة شرحه موجودة في خزانة الكتب لأبي الطيب العظيم آبادي.

☆......☆......☆

الجنائز

کویت کی وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ کے ماتحت مرتب ہوکر شائع ہونے والی **الموسوعة الفقهية** کا ایک حصہ ''**جنائز**'' علامہ اعظمیؒ کے کاوشِ قلم کا ثمرہ ہے، جنائز کا باب موسوعہ کی جلد نمبر ۱۶ کے صفحہ ۵ سے شروع ہوکر صفحہ ۴۶ تک پھیلا ہوا ہے، ہر صفحے میں دو کالم ہیں، پورا مضمون ۴۹ فقروں پر مشتمل ہے۔ لیکن خیال رہے کہ علامہ اعظمیؒ کی پوری تحریر ''**جنائز**'' میں شامل نہیں ہے، اس لیے کہ موسوعہ الگ الگ مواد پر ترتیب دی گئی ہے، مثلاً ''**احتضار**'' -مرنے کے قریب کی حالت- کا مادہ الگ ہے، اور ''**مُحتضَر**'' کے احکام اس مادہ کے تحت ذکر کیے گئے ہیں؛ ''**تکفین**'' کا مادہ الگ ہے، اور اس کے احکام کو علاحدہ ذکر کیا گیا ہے؛ اسی طرح ''**دفن**'' کے احکام علاحدہ اس کے مادہ کے تحت مذکور ہیں۔ علامہ اعظمیؒ کے مسودے کا موسوعہ کے ان مواد سے مقابلہ کرنے کے بعد راقم الحروف اس نتیجے تک پہنچا ہے کہ ''**جنائز**'' تو تمام تر علامہ اعظمیؒ کا تحریر کردہ ہے، سوائے اس کے کہ ناشرین نے موسوعہ کے نہج کے مطابق بنانے کے لیے اس میں کہیں کہیں کچھ تصرّف کیا ہے، لیکن ''**احتضار**''، ''**تکفین**'' اور ''**دفن**'' دوسرے مقالہ نگاروں کے لکھے ہوئے ہیں، کیونکہ علامہ اعظمیؒ کے مقالے کا جو مسودہ ہمارے سامنے ہے اور اس میں یہ تینوں فصلیں ہیں، ان کا سیاق موسوعہ میں شائع سیاق سے مختلف ہے۔

اس وضاحت کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ ''**جنائز**'' کی بحث کے صفحہ ۵ کالم نمبر ۱ پر جب یہ عبارت دیکھی ''**وللمحتضر أحكام تُنظر في مصطلح: (احتضار)**''، اور صفحہ ۱۰ کالم نمبر ۲ میں ''**وتفصيل أحكامه في مصطلح: "تغسيل"**''، نیز ''**وتفصيل أحكامه يُنظر في مصطلح: (تكفين).**'' تو مجھے خیال ہوا کہ علامہ اعظمیؒ ہی کے مقالے کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کرکے ان مواد کے تحت شامل کردیا گیا ہوگا، لیکن مقابلے اور موازنے کے بعد یہ خیال تبدیل کرنا پڑا، اور اس نتیجے تک پہنچا کہ ان مادوں کے تحت جو مقالے ہیں، وہ اگرچہ ان ہی بحثوں پر مشتمل ہیں، جو علامہ اعظمیؒ کے مقالے میں ہیں، لیکن اسلوبِ تحریر اور سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے عالم وفاضل مقالہ نگار کے ہیں۔

کچھ جزوی تصرفات کا استثنا کرکے ''**جنائز**'' پورا کا پورا علامہ اعظمیؒ کے قلم سے ہے، ناشرین یا ادارۂ

موسوعہ کی طرف سے جو تصرفات کیے گئے ہیں، وہ ذیلی عنوانات، فقہا کے اقوال میں کہیں کہیں تقدیم وتاخیر اور حواشی سے متعلق ہیں۔ موسوعہ کا جو طبع شدہ حصہ ہے اس کے بہت سے ذیلی عنوانات علامہ اعظمیؒ کے مسودے میں نہیں پائے جاتے، اور وہ غالبًا بعد میں اہلِ ادارہ کی طرف سے لگائے گئے ہیں، مثلاً علامہ اعظمیؒ کے مسوّدے میں الجنائز کی تعریف کے بعد "**أحكام المحتضر**" کی شہ سرخی ہے، لیکن اس کے بعد "**تعريف المحتضر وتوجيهه وتلقينه**" نہیں ہے، جو کہ موسوعہ کے صفحہ ۵ کے پہلے کالم پر ہے۔ صفحہ ٦ پر **الإعلام بالموت**، صفحہ ۷ پر **قضاء الدَّين** اور **تجهيز الميت** کے ذیلی عنوانات آپ کے مسودے میں نہیں ہیں۔ اس لیے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر ذیلی عنوانات ادارے کی طرف سے لگائے گئے ہیں۔

علامہ اعظمیؒ کا مسودہ فل سکیپ سائز کے کاغذ پر تحریر کردہ ہے، اس میں سولہ سے زائد صفحات احکام غسل میت سے متعلق ہیں، لیکن چونکہ موسوعہ میں **تغسيل الميت** کا الگ مادہ ہے، اس لیے یہ زائد از سولہ صفحات اس میں شامل نہیں کیے گئے ہیں۔ اس کا آغاز علامہ اعظمیؒ نے **مبحث غسل الميت** کے عنوان سے کیا ہے، اس میں آٹھ صفحات **صفة الغسل** پر مشتمل ہیں، اس کے بعد ایک عنوان **فصل في من يُغسل ومن لا يُغسل من الموتى** کے تحت ان مُردوں کی تفصیل ہے، جن کو غسل دیا جائے گا یا نہیں دیا جائے گا۔ تین صفحے کے بعد **فصل فيما يتعلق بالغاسل** ہے، جس میں یہ تفصیل ہے کہ کن لوگوں کو غسل دینا چاہئے اور پھر غسل دینے والے کے احکام تفصیل سے درج ہیں۔ یہ بحث ٦ سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔

اس کے بعد **تكفين الميت** ہے، جو ۱۳ر صفحات پر محیط ہے، مگر موسوعہ میں چونکہ **تكفين** کا ایک الگ مادہ ہے، اس لیے اس میں مذکور نہیں ہے۔

بعدازاں **حمل الجنازة** کی بحث ہے، جو علامہ اعظمیؒ کے مسودے میں صفحہ ۳٦ کے نصف سے شروع ہو کر صفحہ ٦۷ کے نصف پر ختم ہوتی ہے، جو کہ موسوعہ میں کچھ جزوی تصرفات کے ساتھ صفحہ ۱۱ سے صفحہ ۴۲ کے پہلے کالم کے نصف تک پائی جاتی ہے۔

اس کے بعد صفحہ ۷۷ سے صفحہ ۹۰ تک ۱۴ر صفحات میں قبر ودفن سے متعلق احکام ہیں، جو موسوعہ میں الگ مذکور ہونے کی وجہ سے یہاں مذکور نہیں ہیں۔

پھر **مسائل شتى** کے تحت علامہ اعظمیؒ نے تعزیت اور ایصال ثواب وغیرہ کے متفرق مسائل بیان کیے ہیں، جو موسوعہ میں "**التعزية، الرثاء، وزيارة القبور ونحو ذلک**" (ص۴۲)، "**صنع الطعام لأهل الميت**" (ص۴۴) اور "**وصول ثواب الأعمال للغير**" (ص۴۵) کے ذیلی عنوانات کے تحت درج ہیں۔

مذکورہ بالا معروضات سے یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی کہ موسوعہ فقہیہ کے لیے علامہ اعظمیؒ نے "**جنائز**" کے عنوان پر نزع کی حالت سے لے کر مرنے کے بعد کے اعمال تک کے تمام مسائل واحکام سپرد قلم فرمائے تھے،

جوفل سکیپ سائز کاغذ کے تقریباً سوصفحات پر حاوی تھے، جوایک پوری کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں، ذیل میں علامہ اعظمیؒ کے مسودے سے اس کے عنوانات ذکر کیے جارہے ہیں:

الجنائز:- یہ مرکزی عنوان ہے، جس کے ماتحت تمام احکام بیان کیے گئے ہیں۔

أحكام المحتضر، ما ينبغي أن يُفعل بعد موته وما لا ينبغي، مبحث غسل الميت (صفة الغسل)، فصل في من يُغسل ومن لا يُغسل من الموتى، فصل فيما يتعلق بالغاسل، فصل في تكفين الميت، فصل في الكفن، كيفية التكفين، فصل في حمل الجنازة، ما ينبغي أن يُفعل مع الجنازة وما لاينبغي، فصل في الصلاة على الجنازة، صفة صلاة الجنازة، مسائل متفرقة -اس کے تحت مسبوق کے، متعدد مُر دوں کی ایک ساتھ نماز جنازہ، اور کسی میت کو نماز جنازہ کے بغیر دفن کردیا گیا ہو، تو اس کی قبر پر نماز پڑھنے کے احکام مذکور ہیں-**فصل في بيان من يُصلّى عليه ومن لا يُصلّى عليه، فصل في بيان من له ولاية الصلاة عليه، فصل في بيان ما يُفسدها وما يكره فيها، فصل فيما يتعلق بالقبر والدفن، مسائل شتى.**

مسودہ اور مطبوعہ میں فرق:

علامہ اعظمیؒ نے اس مقالے کی تسوید وتحریر اور ترتیب میں بہت تفصیل سے کام لیا تھا، راقم نے علامہ اعظمیؒ کے مسوّدے کا موسوعہ کے مطبوعہ حصے سے بالاستیعاب مقابلہ کیا ہے، اس مقابلے سے حسبِ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱-آپ کے مقالے میں ''احتضار''، ''تغسیل المیت''، ''تکفین المیت'' اور ''قبرودفن'' کے احکام بھی ہیں، لیکن موسوعہ میں علاحدہ مذکور ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ شامل نہیں کیے گئے ہیں۔

۲-علامہ اعظمیؒ نے مسائل سے متعلق فقہاء اربعہ کے مذاہب، بلکہ اصحاب ظاہر تک کے مذاہب قلم بند فرمائے تھے، لیکن مطبوعہ میں فقہاء اربعہ کے علاوہ باقی مذاہب کی تفصیل حذف کردی گئی ہے۔

۳-مطبوعہ میں اختصار کے پیش نظر کہیں کہیں حک واضافہ اور عبارتوں میں تقدیم وتاخیر سے کام لیا گیا ہے۔

۴-بیشتر مسائل بلکہ تقریباً ہر مسئلے میں علامہ اعظمیؒ نے پہلے حنفیہ کا مسئلہ ان کی معتبر کتابوں سے نقل کیا ہے، اس کے بعد دیگر فقہا کا اس میں جو اختلاف ہے، علیحدہ علیحدہ اس کو نقل کیا ہے؛ لیکن مطبوعہ میں **قال الحنفية** کی عبارت سے بہت سی جگہ اس کو بھی الگ کرکے ذکر کیا ہے، اور بعض جگہ ایسا تصرف کیا ہے، جس کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ وہ تصرف غیر مناسب بھی ہے، مثلاً صفحہ ۶ پر **الإعلام بالموت** کے عنوان کے تحت علامہ اعظمیؒ نے یہ مسئلہ لکھا تھا: **يُستحب أن يُعلم جيرانه وأصدقاؤه حتى يُؤدوا حقه بالصلاة عليه والدعاء له.** پھر چند سطروں کے بعد لکھا تھا: **وإليه ذهبت الشافعية.** لیکن ادارۂ موسوعہ کی طرف سے **وإليه ذهب الحنفية**

والشافعية کیا گیا ہے، یہ تصرف اس وجہ سے غیر مناسب ہے کہ علامہ اعظمیؒ نے پہلے حنفیہ کا مسئلہ لکھا، پھر واو عطف کے ذریعے وإليه ذهبت الشافعية سے بتلایا تھا کہ اسی کے قائل شافعی حضرات بھی ہیں، مطبوعہ کی عبارت میں وإليه ذهب الحنفية والشافعية میں کوئی معطوف علیہ نہیں رہ جاتا۔ اس لیے یا تو تصرف کرنا نہیں چاہئے تھا، یا پھر یوں تصرف کرتے إليه ذهب الحنفية والشافعية.

☆اسی طرح صفحہ ۸ پر النَّوح والصياح على الميت کے عنوان کے تحت علامہ اعظمیؒ کے مسودے میں عبارت یہ ہے: ويُكره النوح والصياح وشق الجيوب في منزل الميت وفي الجنازة (أو في محل آخر) للنهي عنه، ولا بأس بالبكاء بدمع والصبر أفضل.

مگر مطبوعہ میں والصبر أفضل کے پہلے قال الحنفية کا اضافہ کر دیا گیا ہے، جس کی میرے خیال میں کوئی ضرورت نہیں تھی۔

☆صفحہ ۷ پر قضاء دین کے مسئلے میں مطبوعہ میں وذهب الطحطاوي إلى قول الجمهور چھپا ہوا ہے، حالانکہ علامہ اعظمیؒ کی عبارت یہ تھی: وبالغ الطحاوي في نصرة قول الجمهور. جس میں نہ صرف طحاوی مصحّف ہو کر طحطاوی ہو گیا، بلکہ تعبیر بھی کچھ سے کچھ ہو گئی۔

۵- حواشی میں بھی بہت تصرف کیا گیا ہے، مثلاً علامہ اعظمیؒ نے جب متعدد کتابوں سے کوئی مسئلہ نقل کیا ہے، تو ہر فقرے یا ٹکڑے کا مستقل حوالہ دیا ہے، لیکن مطبوعہ میں بہت سے ٹکڑوں کے حوالے یکجا ذکر کر دیے گئے ہیں، ہم یہاں صرف ایک نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں، مثال کے طور پر مطبوعہ میں یہ عبارت ہے: وكره بعض الحنفية النداء في الأسواق قال في الهندية: إن كان عالماً، أو زاهداً، أو ممن يُتبرَّك به، فقد استحسن بعض المتأخرين النداء في الأسواق لجنازته وهو الأصح، ولكن لا يكون على هيئة التفخيم، وينبغي أن يكون بنحو: مات الفقير إلى الله تعالى فلان بن فلان. اور اس کے لیے یہ حوالہ دیا گیا ہے: الهندية ١٥٥/١، وابن عابدين ٥٩٧/١، ٦٢٩.

حالانکہ علامہ اعظمیؒ کے مسودے میں وكره بعضهم النداء في الأسواق پر حاشیہ کا نمبر دے کر الهندية کا حوالہ ہے، اور باقی عبارت کے لیے ابن عابدین کا حوالہ ہے۔

۶- حدیث کے حوالوں میں صحاح ستہ وغیرہ کے جو حوالے حواشی میں درج کیے گئے تھے، وہ علامہ اعظمیؒ کے مسودے میں ہندوستانی نسخوں کے تھے، مگر مطبوعہ میں بلاد عرب میں شائع ہونے والے نسخوں کے دیے گئے ہیں، اور اس کے ساتھ ایڈیشن اور بعض دوسری تفصیلات بھی درج حواشی کی گئیں۔

☆......☆......☆......☆......☆

الألباني

شذوذه وأخطاؤه

شیخ ناصرالدین البانی دنیائے عرب کے مشہور شیخ اور بہت ساری کتابوں کے مصنف تھے، حدیث شریف کی بہت سی کتابیں بھی ان کی تحقیق وتعلیق اورحواشی کے ساتھ شائع ہوئی ہیں، عالمِ عرب مرعوبیت کی حدتک ان سے متاثر تھا،فن حدیث کا ان کوایسا ماہر اور باکمال تصور کرلیا گیا تھا، کہ حدیث کے سلسلے میں ان کا فیصلہ حرف آخر اورقول فیصل سمجھا جاتا تھا، وہ اس دور میں سلفیت کے علم بردار اور جماعت اہل حدیث کے قافلہ سالار سمجھے جاتے تھے،ان کی شدت کا یہ حال تھا کہ ان کے نزدیک ائمۂ مذاہب تو درکنار بڑے بڑے محدثین اور ائمۂ حدیث بھی درخوراعتنا نہیں تھے،اوران ائمہ وعلما کے علمی جلالت ومرتبت سے کھیلنا ان کے نزدیک بچوں کے کھیل سے زیادہ نہیں تھا،حالانکہ خودان کی پراگندہ مزاجی کا حال یہ تھا کہ ایک کتاب میں کسی حدیث کوصحیح کہتے تھے،تو دوسری کتاب میں اسی روایت کو درجۂ صحت سے ساقط قرار دیتے تھے، ایک راوی کے بارے میں کسی کتاب میں کچھ کہتے،تو دوسری کتاب میں اس کے برعکس فیصلہ کرتے،ایک اصول اورضابطےکوایک جگہ استعمال کرتے تو دوسری جگہ اسی کو توڑ دیتے،ان کی اس روش اورطرز تحقیق واجتہاد کے باوجودان کا ہر فیصلہ قابل قبول سمجھا جاتا،اوران کے سامنے بڑے بڑے ماہرین فن اورائمہ حدیث کے فیصلوں کوردکردیا جاتا،ان کی شخصیت کواس قدرکوہ پیکر بنا کر پیش کیا گیا تھا، کہ جن عرب علما کوان کی تحقیقات سے اختلاف ہوتا تھا، وہ بھی ان کے خلاف زبان کھولنے یاقلم اٹھانے کی اپنے اندرجرأت اورہمت نہیں پاتے تھے۔

مگرعلامہ اعظمیؒ کو جب اپنے بیروت کے سفر میں خودالبانی صاحب کے ایماپران کے ناشر کے ذریعے ان کی کتابیں حاصل ہوئیں، اورآپ نے ان کا باقاعدہ مطالعہ کیا،تو آپ کی علمی ودینی غیرت وحمیت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ان کی کھلی ہوئی اور فاش غلطیوں پر پردہ ڈال کران کے سلسلے میں علمی دنیا کومغالطے میں رکھا جائے،اور ان کے موقف کے خلاف قلم نہ اٹھایا جائے، بالخصوص علم حدیث جیسے مقدس اور پاکیزہ علم اوراس کے قواعدواصول کے ساتھ مذاق پرخاموشی اختیار کر لی جائے۔علامہ اعظمیؒ کو یہ اولیت حاصل ہے کہ انھوں پوری قوت وجرأت اور ثابت قدمی کے ساتھ البانی صاحب کے خلاف قلم اٹھایا، اوران کی لغزشوں،غلطیوں اورفروگزاشتوں کا پردہ پوری طرح چاک کر کے رکھ دیا۔علامہ اعظمیؒ کے اس اقدام کے بعد جہاں ان کے معتقدین ومقلدین کی صفوں میں ہلچل پیدا ہوگئی، وہیں انصاف پسند علمی دنیا نے اس تعاقب کی پذیرائی اورتحسین وستائش کی،اورراحت کا سانس لیا۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنی اس کتاب میں-جو چاراجزا میں طبع ہوئی ہے- البانی صاحب کی غلطیوں،ان کی تضاد بیانیوں،فن حدیث کے اصول وقواعد کی خلاف ورزیوں اور تحقیق حدیث میں بےاعتدالیوں کوان کی اس

وقت تک شائع ہونے والی تمام تصانیف کا تحلیل وتجزیہ کرکے واشگاف کیا ہے، کتاب کا آغاز **مبلغ علم الألباني** کے عنوان سے کیا ہے، اور اس کو ان الفاظ سے شروع کیا ہے:

الشيخ ناصر الدين الألباني شديد الولوع بتخطئة الحُذاق من كبار علماء الإسلام، ولا يحابي في ذلک أحداً كائناً من كان، فتراه يُوهِّمُ البخاريَّ ومسلماً، ومن دونهما، ويُغَلِّط ابنَ عبدالبر وابن حزم وابن تيمية والذهبيَّ وابن القيم وابن حجر والصنعاني والشوكاني، ويُكثر من ذلک حتى يظُنَّ الجهلة والسُذَّج من العلماء أن الألباني نبغ في هذا العصر نبوغاً ينذُر مثله.

شیخ ناصر الدین البانی کو اکابر علماء اسلام میں سے ماہرین کو غلط ٹھہرانے کا بہت شوق ہے، اس میں وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے، چنانچہ وہ بخاری ومسلم کی فروگزاشتیں دکھاتے ہیں، اور ابن عبدالبر، ابن حزم، ابن تیمیہ، ذہبی، ابن القیم، ابن حجر، صنعانی اور شوکانی وغیرہ کی غلطیاں نکالتے ہیں، اور یہ کام اس کثرت سے کرتے ہیں کہ سادہ لوح اور علم سے نا آشنا افراد یہ گمان کرنے لگے کہ البانی کو اس فن میں وہ کمال حاصل ہے جس کی نظیر مشکل ہے۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے ان کی کتابوں کی عبارتوں سے کچھ ایسے نمونے پیش کیے ہیں، جن میں وہ اپنی تحقیقات کو نادر اور انوکھی وا چھوتی تحقیق کہہ کر، بڑھا چڑھا کر اور نئی تحقیق کہہ کر پیش کیا ہے۔

حالانکہ البانی صاحب کی تاریخ یہ ہے کہ انھوں نے تحصیل علم کے لیے طالب علمانہ زندگی نہیں گزاری ہے، اساتذہ اور اہل علم کی خدمت میں زانوئے تلمذ نہیں تہ کیا ہے، علما واساتذہ سے علم نہیں سیکھا ہے، جو ٹھوس اور پختہ علم کے لیے ضروری چیز سمجھی جاتی ہے، گھڑی سازی ان کا مشغلہ تھا، اور اس کام کے ساتھ کتابوں کا مطالعہ کرتے کرتے مقام اجتہاد تک پہنچ گئے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان سے فہم وتحقیق میں ایسی ایسی غلطیاں ہوئیں، جو مدارس کے طلبہ بھی نہیں کرتے۔ اس کی مثال میں علامہ اعظمی نے البانی صاحبؒ کی مختلف کتابوں سے بیسیوں نمونے پیش کیے ہیں۔

فعل مجہول کا استعمال:

البانی صاحب یہ سمجھتے ہیں اور اس پر ان کو اصرار ہے کہ فعل مجہول مثلاً ''رُوِيَ''، ''يُروىٰ'' اور ''يُذكر'' وغیرہ کا استعمال ہمیشہ تمریض کے لیے ہوتا ہے، اور ان صیغوں کے ساتھ جو قول مذکور ہوتا ہے، وہ یقینی طور پر ضعیف ہوتا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ البانی صاحب کا یہ گمان ایک فاسد اور باطل خیال وگمان ہے، پھر امام ترمذی وبخاری کی عبارتوں سے ۲۳ رمثالیں پیش کی ہیں، جن میں ان حضرات نے کسی حدیث کو صیغۂ مجہول۔ يُروىٰ یا يُذكر۔ جیسے الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے، حالانکہ وہ حدیث خود ان حضرات کے نزدیک صحیح وحسن یا قوی ہے؛ یا

دوسرے اہل علم وماہرین فن نے ان کی تصحیح وتحسین یا تقویت کی ہے۔

تیئیس (۲۳) مثالوں کو پیش کرنے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے یہ فیصلہ کن بات تحریر فرمائی ہے کہ جزم وتمریض کے صیغوں کے استعمال میں جوفرق ہے، اس کا لحاظ اور اعتبار رہنا چاہئے، یعنی صیغۂ جزم کا ضعیف کے لیے استعمال نہیں ہونا چاہئے، اور صیغۂ تمریض کا صحیح وقوی قول کی تعبیر کے لیے استعمال نہیں ہونا چاہئے، لیکن بہت سے مصنفین نے اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر نے علامہ نووی سے مقدمہ فتح الباری میں نقل کیا ہے۔

فعل مجہول کے صیغے کا تمریض کے لیے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کبھی تو اس کے استعمال سے قول کا ضعیف ہونا مراد ہوتا ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ صیغہ اسی لیے بنایا ہی گیا ہے، اور نہ ہی یہ مطلب ہے کہ اسی معنی میں وہ ہمیشہ استعمال ہوتا ہے، الا یہ کہ کسی مصنف نے اپنی کسی کتاب میں التزام ہی اس کا برتا ہو، جیسا کہ منذری نے ترغیب میں کیا ہے، انھوں نے صراحت کردی ہے کہ یُروی یا رُوی کے ذریعے جوحدیث ذکر کریں گے وہ ضعیف ہوگی۔

لیکن یہی صیغۂ مجہول جب امام بخاریؒ استعمال کرتے ہیں، تو کبھی وہ حدیث یا قول صحیح ہوتا ہے، کبھی حسن ہوتا ہے، اور کبھی ضعیف ہوتا ہے۔ ابن حجر نے اس کی تصریح کر کے اس کو مثالوں سے واضح کیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ صیغۂ تمریض سے جو قول نقل کیا جائے، اس سے اس کا صحیح ہونا تو معلوم نہیں ہوتا، لیکن یہ لازم بھی نہیں آتا ہے کہ اس صیغے سے جو قول یا حدیث ذکر کی جائے وہ لامحالہ ضعیف ہو۔

جمعہ کے پہلے کی سنتوں کا بیان:

البانی صاحب کے عجیب وغریب تصرفات کی بعض اور مثالیں اور نمونے پیش کرنے کے بعد کئی صفحات میں جمعہ کے پہلے کی سنتوں پر بحث کی ہے، البانی صاحب نے جمعہ کے پہلے کی سنتوں کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی مشروعیت کا ثبوت نہیں ہے، اور جن روایتوں سے ان کے ثبوت پر استدلال کیا جاتا ہے، ان سے استدلال باطل ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس بحث میں بہت تفصیل کے ساتھ البانی صاحب کے خیالات اور اس باب کی روایات پر ان کے اعتراضات کا رد کیا ہے، اور اصول وقواعد کی روشنی میں ان کا مُسکِت جواب دیا ہے، نیز دسیوں روایتوں سے ان کا مشروع ہونا ثابت کیا ہے، ان روایات میں بعض تو ایسی ہیں جو صحیح اور حسن کے درجے کی ہیں۔

ان روایات کو نقل کرتے ہوئے علامہ اعظمیؒ لکھتے ہیں:

إن الألباني لو كان صادقاً في ادعائه خلعَ رِبقةِ التقليد عن عنقه، لوجد في الأحاديث الصحيحة التي لا يحوم حولها شك: ما	اگر البانی اپنی گردن سے تقلید کا پھندا نکال پھینکنے کے دعوے میں سچے ہوتے، تو ان کو صحیح اور شک وشبہہ سے بالاتر روایتوں میں جمعہ

يـدل دلالة واضـحة عـلـى مشروعية الصلاة قبـل الـجـمـعة لمن شهدها في المسجد قبل خـروج الإمـام، ولـكن منعَه من الإيمان بهذه الأحـاديـث جموده على تقليد العلماء الذين حملوها على مطلق النافلة.

سے پہلے امام کے خطبہ کے لیے نکلنے سے قبل نماز کی مشروعیت کی واضح دلیل ملتی، لیکن ان علما کی جامد تقلید نے جنھوں نے اس کو مطلق نفل قرار دیا ہے، البانی صاحب کو ان پر ایمان لانے سے روک دیا۔

طائفہ منصورہ:

ذخیرۂ احادیث میں لا تزال طائفة من أمتي کے عنوان سے جو حدیثیں آئی ہیں، البانیؒ صاحب نے ان کو اہل حدیث پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے اس کے جواب میں لکھا ہے کہ یہ محض ناواقف اہل حدیثوں کو خوش کرنے کی کوشش اور تدبیر ہے؛ ورنہ کسی مرفوع حدیث سے، یا کسی صحابی یا تابعی کی موقوف روایت سے اس کا پتہ نہیں چلتا، ہاں بعد کے محدثین نے اپنے خیال اور گمان سے کام لیتے ہوئے محدثین کی جماعت کو یہ پیراہن عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ اس سلسلے میں البانیؒ صاحب نے ان صحابہؓ کا نام تو ذکر کیا، جن کی روایتوں سے اس قسم کی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، لیکن حدیث کے الفاظ ذکر نہیں کیے، ورنہ اسی سے البانی کے دعوے کی حقیقت معلوم ہوجاتی۔ پھر علامہ اعظمی نے ان روایتوں کے الفاظ ذکر کیے ہیں، جن سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصداق مجاہدین ہیں۔

البانی اور علامہ ابن تیمیہؒ:

علامہ اعظمیؒ نے ایک عنوان قائم کیا ہے: ولوع الألباني بنقض كلام ابن تيمية یعنی ابن تیمیہ کے کلام کے توڑ میں البانی کی دلچسپی۔ اس کے ماتحت البانی صاحبؒ کی مختلف کتابوں سے منتخب کرکے ۳۰ مثالیں پیش کی ہیں، جن میں البانی صاحب نے ابن تیمیہؒ کا رد اور توڑ کیا ہے، مثلاً ابن تیمیہؒ نے ایک حدیث پر کوئی حکم لگایا ہے، اس کو صحیح یا حسن یا قوی کہا ہے، یا کوئی مسئلہ بیان کیا ہے، تو البانی صاحبؒ نے اس کو غلط یا ابن تیمیہؒ کا وہم گردانا ہے۔

البانی صاحب کے مناقضات:

''مناقضات'' کا ایک عنوان قائم کر کے علامہ اعظمیؒ نے البانی صاحب کی کتابوں سے متعدد ایسی مثالیں پیش کی ہیں، جن میں خود البانی کا تناقض اور تضاد نظر آتا ہے، اور ایک ہی قاعدے کو انھوں نے کہیں حدیث کے ضعیف ہونے کے لیے استعمال کیا ہے، اور اسی قاعدے کی رُو سے کسی حدیث کو حسن اور کسی کو صحیح کہا ہے۔

روندی جانے والی تصویر کی حرمت کی بحث:

علامہ اعظمیؒ نے ''تحريم الصورة التي توطأ'' کا عنوان قائم کرکے احادیث کی روشنی میں نہایت

جامع اور پُرمغز گفتگو کی ہے۔ اس کے تحت اولاً البانی صاحب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

إن التحريم يشمل الصورة التي توطأ أيضاً، إن تُرِكت على حالها، ولم تُغَيَّر بالقطع، وهو الذي مال إليه الحافظ في الفتح.	یعنی تصویر کی حرمت اس تصویر کو بھی شامل ہے، جو روندی جاتی ہو، اگر اس کی حالت پر اس کو چھوڑ دیا جائے اور اس کو کاٹ کر اس کی ہیئت تبدیل نہ کر دی جائے۔ اسی کی طرف حافظ ابن حجر کا بھی فتح الباری میں رجحان ہے۔

اس قول کو نقل کر کے علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

قوله هذا مخالف للأحاديث الصحيحة.	البانی صاحب کا یہ قول صحیح حدیثوں کے خلاف ہے۔

البانی صاحب کے کلام کا مفہوم یہ ہے کہ تصویر اگر کاٹ کر اس کی شکل تبدیل نہ کی جائے، بلکہ اس کو اس کی حالت پر رہنے دیا جائے، تو خواہ وہ ایسی جگہ ہو جو روندی جاتی ہو اور اہانت ہوتی ہو، پھر بھی حرام ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے فرمایا کہ ان کی یہ بات صحیح حدیثوں کے خلاف ہے، اس لیے کہ صحیح حدیثوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے گھر میں ایسا پردہ لٹکایا تھا جس میں کچھ تصویریں تھیں، آپؐ نے اس تصویر والے کپڑے کو لٹکانے سے منع فرمایا، تو حضرت عائشہؓ نے اس کو کاٹ کر اس سے دو وسادہ - دو تکیے - بنا دیے۔ اس باب کی تمام حدیثوں سے صرف اس کپڑے کو دو ٹکڑے کر کے اس سے دو وسادہ بنانے کی بات معلوم ہوتی ہے، صورت تبدیل کرنے کا کسی روایت سے پتہ نہیں چلتا، اور نہ ہی اس کی تغییر کا حکم ثابت ہوتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تصویر کو احترام اور عزت کی جگہ سے ہٹا کر اہانت اور امتہان وابتذال کی جگہ استعمال کرنے سے اس کی حرمت باقی نہیں رہتی۔

اس باب میں متعدد حدیثوں اور روایتوں کے علاوہ امام بیہقی سے بھی نقل کیا ہے کہ انھوں نے سنن کبریٰ (۲۶۹/۷) میں روندی جانے والی تصویر میں رخصت ہونے کی تصریح کی ہے۔

اور بحث کے آخر میں لکھا ہے کہ امام بخاری نے صحیح بخاری میں **باب ما وُطئ من التصاوير** کا باب قائم کیا ہے، اور اس میں حضرت عائشہؓ کے الفاظ **فجعلنا وسادة أو وسادتين** سے استدلال کیا ہے۔ امام بخاری کے اس طرز عمل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسی تصویر مراد لے رہے ہیں جو اپنی حالت پر باقی تھی۔ اس لیے کہ کٹی ہوئی تصویر کا بیان وہ اس سے پہلے کر چکے ہیں۔

عورتوں کے لیے سونے کا زیور:

البانی صاحب نے فقہ کے جن نازک اور باریک مسائل سے تعرض کی جسارت کی ہے، اور اپنی شان اجتہاد کا مظاہرہ کیا ہے، ان میں عورتوں کے لیے سونے کے زیور کا استعمال ہے، کہ انھوں نے آداب الزفاف میں لکھا ہے کہ جس طرح مردوں کے لیے سونے کا استعمال حرام ہے، اسی طرح عورتوں کے لیے بھی سونے کے زیور کا

استعمال حرام ہے۔

البانی صاحبؒ نے اس کے لیے ابوداود اور مسند احمد کی ایک حدیث سے استدلال کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: **مَنْ أَحَبَّ أنْ يحلقَ حبيبَه بحلقةٍ من نارٍ فليحلقه حلقة من ذهب الخ.** یعنی جو شخص اپنے محبوب کو آگ کا حلقہ پہنانا پسند کرے تو اس کو سونے کا حلقہ پہنا دے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کے جواب میں لکھا ہے کہ البانی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، حالانکہ اس کی سند میں ایک راوی اسید بن ابی اسید براد ہے، جس کی ابن حبان کے سوا کسی ماہر فن نے توثیق نہیں کی ہے، اور البانی نے اپنی صحیحہ میں ابن حبان کی توثیق کو ایک جگہ نا قابل اعتماد اور دوسری جگہ ''لیِّن'' (نرم) قرار دیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ اگر البانی یہ کہیں کہ اسید کو حافظ ابن حجر نے ''صدوق'' کہا ہے؛ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر ناقدِ رجال نہیں ہیں، وہ محض کلام ائمہ کے ناقل ہیں، اور ائمۂ نقد میں سے کسی نے اسید کو صدوق نہیں کہا ہے۔ اور اگر ان کو ''صدوق'' بھی تسلیم کرلیا جائے؛ تو راوی کے محض صدوق ہونے سے حدیث ''صحیح'' نہیں ہوگی، جب تک کہ ''حافظ'' اور ''ضابط'' نہ ہو۔ البانی نے خود اپنی ''ضعیفہ'' میں لکھا ہے:

ومما لا شک عندنا أن أبا حنيفة من أهل الصدق، ولكن ذلک لا يكفي لِيُحتجَّ بحديثه حتى ينضمَّ إليه الضبط والحفظ، وذلک مما لم يَثبُتْ في حقه.

یعنی ہم کو ابو حنیفہ کے اہل صدق میں سے ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن ان کی حدیث سے احتجاج کے لیے اتنا ہی کافی نہیں ہے، جب تک کہ اس کے ساتھ ضبط وحفظ بھی شامل نہ ہو، اور ابو حنیفہ کے حق میں یہ ثابت نہیں ہے۔

البانی کے بیان کردہ اس قاعدے کی رُو سے اسید کی حدیث کو بھی حجت بنانا کافی نہ ہوگا۔ اور اگر البانی صاحب کے اندر ذرا بھی شرم وحیا ہوتی، تو ابو حنیفہ کو چھوڑنے اور اسید کی حدیث کو حجت ماننے کی حرکت نہ کرتے، جبکہ ان کے خیال میں دونوں صدوق ہیں، اور دونوں میں سے کسی کا حافظ ہونا ثابت نہیں ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ البانی صاحب کسی ماہر فن کا قول اس حدیث کے صحیح ہونے کے سلسلے میں پیش نہیں کر سکے، سوائے علامہ منذریؒ کے ایک قول کے کہ انھوں نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ ممکن ہے کہ منذریؒ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہو، لیکن نہ جانے کتنی حدیثیں ہیں، جن کو منذری، یا ذہبی، یا ابن خزیمہ، یا حاکم نے صحیح کہا ہے، مگر البانی نے اس کے کسی راوی کے ضعیف ہونے کا حیلہ تراش کر اس کو رد کر دیا ہے۔ پھر علامہ اعظمیؒ نے البانی صاحب کی ''صحیحہ'' و ''ضعیفہ'' سے اس قسم کی ایک درجن مثالیں پیش کی ہیں۔

اور پھر یہی نہیں کہ اسید کی کسی ماہر فن نے توثیق نہیں کی ہے، بلکہ اس کی روایت میں اضطراب بھی پایا جاتا ہے، کہ کبھی تو ابو ہریرہؓ کی حدیث سے روایت کرتے ہیں، اور کبھی ابو موسیٰؓ یا ابو قتادہؓ کی - شک کے ساتھ - حدیث سے، اور کبھی بغیر شک کے صرف ابو قتادہ کی حدیث سے، اور اس اضطراب کی تصریح خود البانی نے بھی کی ہے۔

البانی صاحب نے اس قسم کی بعض اور روایتیں بھی نقل کی ہیں، اور علامہ اعظمیؒ نے ان کی سند ومتن پر محدثانہ رنگ میں کلام کر کے ان کی حیثیت واضح کی ہے، اور ثابت کیا ہے کہ خود البانی کے اصول سے ان روایات سے احتجاج واستدلال نہیں کیا جا سکتا۔

اور جہاں تک ان روایات میں مذکور وعید کا مسئلہ ہے، تو اس کا مقصد دنیا بیزاری کی تعلیم دینا اور زینت کے اظہار اور فخر ومباہات سے منع کرنا ہے، چنانچہ اسی وجہ سے امام نسائی نے "**باب الكراهية للنساء في إظهار الحلي والذهب**" کا باب باندھا ہے، اور ابن حزم نے ممانعت کی حدیث روایت کرنے کے باوجود سونے کی زنجیر پہننے کو حرام نہیں کہا ہے۔

اگر البانی یہ کہیں کہ نسائی اور ابن حزم سے حدیث کا مطلب سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہے؛ تو ان کے جواب میں کہا جائے گا کہ پھر حدیث کی طرف رجوع کو واجب کہنے اور ائمہ کی پیروی کو ترک کرنے کا فائدہ کیا ہوگا؟۔ اس لیے کہ جب نسائی اور ابن حزم جیسے لوگ اتنی بڑی غلطی سے نہیں بچ سکے، تو پھر کون اس جیسی یا اس سے بھی بڑی غلطی سے بچ سکے گا۔

آگے علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ عورتوں کے لیے سونے کے زیور کے استعمال پر اجماع واقع ہو چکا ہے، اور خود البانی کو بھی اعتراف ہے کہ امام بیہقی وحافظ ابن حجر نے اس پر اجماع ہونے کو نقل کیا ہے۔ اس کے باوجود البانی صاحب اس اجماع میں رخنہ اندازی کرتے ہوئے اس کو ناجائز کہتے ہیں۔

البانی اور مخالفتِ اجماع:

علامہ اعظمیؒ لکھتے ہیں کہ اس مسئلے میں آ کر البانی صاحب کے رخ سے نقاب اتر چکا ہے، اور وہ اہلِ سنت کے مخالف اور معتزلہ کے ہم نوا نظر آتے ہیں۔ وہ "اجماع" کے عدم وقوع بلکہ اس کے عدم تصور کا بھی دعویٰ کرتے ہیں، اور اس کے لیے امام احمد کی ایک عبارت کا سہارا لیتے ہیں۔ علامہ اعظمیؒ نے اس کا رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ امام احمد پر افترا ہے، اور "مسودہ" کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ امام احمد نے خود متعدد مسائل میں اجماع کا دعویٰ کیا ہے، اور قاضی ابویعلی حنبلی وعلامہ ابن تیمیہ کی عبارتیں نقل کر کے امام احمد کے قول کا صحیح مفہوم پیش کیا ہے، اور خود علامہ ابن تیمیہؒ وغیرہ کے نزدیک اجماع کے حجت ہونے کو ثابت کیا ہے۔

اختلافِ علما:

اس عنوان کے تحت علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

البانی نے ابن حزم سے نقل کیا ہے کہ ہم پر فرض صرف قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کی صحیح حدیث کا اتباع ہے۔

نیز یہ نقل کیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے ارشاد ﴿وَلَا تَنَازَعُوا﴾ کے ذریعے تفرق اور اختلاف

سے منع کیا ہے۔

پس یہ ناممکن ہے کہ اس کے پیغمبر ہر صحابی کے قول کے اتباع کا حکم دیں، حالانکہ ان صحابہ میں کوئی ایک چیز کو حلال کہتا ہے، اور دوسرا اسی کو حرام کہتا ہے۔

اس کے جواب میں علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ ابن حزم اور البانی اتباعِ سنت کے معاملے میں ایک ہی گھوڑے پر سوار ہیں، اور کہتے ہیں کہ صرف وہی بات قابل اتباع ہوگی، جو خدا اور رسول کے کلام سے ثابت ہوگی، اس لیے کہ خدا نے اختلاف سے منع کیا ہے۔

پھر کیا وجہ ہے کہ ابن حزم غنا اور سماع کو جائز سمجھتے ہیں، اور البانی اس کو حرام کہتے ہیں؟ کیا اس کا حلال وحرام ہونا دونوں خدا اور رسول سے ثابت ہے؟

اور کیا وجہ ہے کہ ابن حزم تو ایک لفظ سے دی ہوئی تین طلاق کو نافذ مانتے ہیں، اور بیوی کو شوہر پر حرام کہتے ہیں، اور البانی صاحب اس کو ایک تسلیم کرتے ہوئے رجعت کرنے کو جائز بتلاتے ہیں؟

اسی طرح علامہ ابن تیمیہؒ اور ابن القیمؒ سے بھی البانی صاحب بہت سارے مسائل میں اختلاف کرتے ہیں، جن کو علامہ اعظمیؒ نے ان کی کتابوں کے حوالے سے نقل کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ البانی صاحب کے ان پیش رو بزرگوں نے خدا اور رسول کے احکام کو صحیح طور پر نہیں سمجھا، اور جب ان لوگوں نے بھی قرآن وسنت کے مفہوم کو صحیح طور پر نہیں سمجھا، تو اب اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں رہتا کہ لوگ البانی صاحب کو امام مان کر ان کی تقلید اور اتباع کریں، کیونکہ جب ابن تیمیہ، ابن قیم اور ابن حزم جیسے لوگ غلطی سے محفوظ نہیں رہ سکے، تو دوسروں کی عقل وفکر اور سمجھ کا کیا اعتبار؟ علامہ اعظمیؒ خلاصہ کے طور پر لکھتے ہیں:

ولا مجال إذاً للمسلم البصير في هذا العصر إلا أن يُقلِّدك ويُسلِمَ قيادة تفكيره لك، لأنه إن اجتهد بنفسه فلا محالة يقع في مخالفة السنة ولا يسلَمُ منها، إذ لم يَسلَم ابن تيمية، وابن القيم، وابن حزم، ومَنْ هو أجلُّ من هولاء.

وإن عمِل بما حقَّقُوه في كتبهم مخالفاً لنصيحتك وقع في مخالفة السنة أيضاً.

فلم يَبقَ إلا أن يَرجعَ إليك، وهذا هو المراد من قولك (وإلا سأل المتأهلين لذلك). لأنه لمَّا لم يتأهَّلْ ابن تيمية، وابن القيم لذلك، فمن الذي يستطيع أن يتأهل لذلك سواك أيها الإمام الألباني.

یعنی اب اس دور کے صاحبِ بصیرت مسلمان کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ آپ کی تقلید کرے، اور اپنی قیادت فکر آپ کے حوالے کردے؛ اس لیے کہ اگر وہ خود اجتہاد کرے گا، تو سنت کی مخالفت میں ضرور واقع ہوگا، اور اس سے بچ نہیں سکے گا، کیونکہ ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن حزم اور ان سے

بڑے بڑے لوگ اس سے بچ نہیں سکے۔

اور اگر آپ کی نصیحت کی مخالفت کرتے ہوئے ان علما کی ان تحقیقات پر عمل کرے گا، جو ان کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں، تو بھی سنت کی مخالفت میں گرفتار ہو سکتا ہے۔

لہذا اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں رہ جاتی کہ آپ کی طرف رجوع کرے، اور یہی مراد ہے آپ کے اس قول (وإلا سأل المتأهلين لذلك) کی، اس لیے کہ جب ابن تیمیہ اور ابن قیم اس کے اہل نہیں ہیں، تو اے امام البانی! آپ کے سوا اور کون اس کا اہل ہو سکتا ہے؟!۔

نبیذ کا مسئلہ:

اس بحث کے بعد نبیذ کے سلسلے میں طویل گفتگو کی ہے، اور نبیذ کی حقیقت، اس کی حلت اور شراب اور نبیذ کے درمیان فرق کو نہایت تفصیل کے ساتھ سپرد قلم فرمایا ہے، اور متعدد احادیث اور آثار صحابہؓ کی روشنی میں اس کا جائز ہونا، اور رسول اللہ ﷺ کا اس کو نوش فرمانا ثابت کیا ہے، یہ اس کتاب کی ایک معرکۃ الآراء بحث ہے، جو علامہ اعظمیؒ کی وسعتِ مطالعہ، قوتِ بصیرت، ژرف نگاہی، استنباط واستنتاج اور زبان وبیان پر قدرت کا واضح ثبوت پیش کرتی ہے۔ اس بحث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ نبیذ اور خمر (شراب) کے درمیان فرق نہیں کرتے، وہ حد سے کس قدر تجاوز کرتے ہیں۔

ستر المرأۃ:

اس عنوان کے تحت علامہ اعظمیؒ نے البانی صاحب کے اس فکر وخیال کا رد کیا ہے کہ عورت کے لیے چہرے کا چھپانا واجب نہیں ہے، کیونکہ حجۃ الوداع کے موقع پر قبیلۂ خثعم کی عورت آں حضرت ﷺ کے سامنے آئی تھی، اور ان خاتون کے چہرے پر نظر ڈالنے کی وجہ سے آپ ﷺ نے حضرت فضل بن عباسؓ کے چہرے کو اس عورت کی طرف سے پھیر دیا تھا، اس وقت اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا، اور وہ حالت اِحرام میں بھی نہیں تھی۔

علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ البانی صاحب کا اس عورت کو اِحرام سے باہر بتلانا علماء متقدمین ومتاخرین کی تحقیق کے خلاف ہے، اور متعدد روایات سے ثابت کیا ہے کہ خثعمی عورت نے جب مسئلہ پوچھا تھا، اس وقت وہ اِحرام کی حالت میں تھی، اس لیے اس سے البانی صاحب کا یہ استنباط صحیح نہیں ہے۔

اسی ضمن میں علامہ اعظمیؒ نے البانی صاحب کے اس قول کا بھی جواب دیا ہے کہ آدمی رمی جمار کے بعد احرام سے باہر ہو جاتا ہے اور اس کا احرام سے نکلنا حلق پر موقوف نہیں رہتا۔ آپ نے صحیحین وغیرہ کی متعدد احادیث اور بخاری وترمذی وغیرہ کے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ آدمی حلق کے بعد اور طواف افاضہ سے پہلے احرام سے باہر ہوتا ہے، البتہ اس کے لیے عورت کے قریب جانا طواف افاضہ سے پہلے حلال نہیں ہوتا۔

زیارتِ قبر نبوی کے لیے سفر:

اس کتاب کی ایک نہایت اہم، جامع اور پُرمغز بحث السفر لزيارة القبر النبوي صلى الله على صاحبه وسلم ہے۔ البانی صاحب علامہ ابن تیمیہ کے اتباع میں اس بات کے قائل ہیں کہ قبر نبوی کی زیارت اگر کسی بدعت اور مخالف شریعت امر کے بغیر ہو، جیسے اسی کی نیت سے سفر کرنا، اور اس کے واسطے شد رحال کرنا، تو مشروع ومستحب ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے جواب میں لکھا ہے:

عدُّه شدَّ الرحل لزيارة القبر النبوي من البِدَع، بِدْعٌ من القول، ومما شذَّ به شيخ الإسلام ابن تيمية، حمله عليه غلوُّه في الإنكار على القبوريين.	ان کا قبر نبوی کی زیارت کے لیے سفر کرنے کو بدعت کہنا ایک نئی بات ہے، جس میں ابن تیمیہ متفرد ہیں، جس کا سبب قبر پرستوں کی مخالفت میں ان کا غلو ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ اس باب کی حدیثیں ان کے دعویٰ پر کسی طرح دلالت نہیں کرتیں، سب سے پہلے یہ کہ ان لوگوں نے مستثنیٰ منہ کو عام مانا ہے؛ حالانکہ از روئے عقل مستثنیٰ کو مستثنیٰ منہ کی جنس سے ماننا چاہئے، علاوہ بریں مسند احمد کی ایک روایت میں مستثنیٰ منہ کے ''مسجد'' ہونے کی تصریح بھی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: لا ينبغي للمصلي أن يشُدَّ رحالَه إلى مسجدٍ يَبتغي فيه الصلاةَ غير المسجد الحرام والمسجد الأقصى ومسجدي هذا.

دوسرے یہ کہ لا تُشَدُّ الرِّحالُ، یا فلا تُعْمَلُ المَطيُّ کی عبارتیں اپنے مدلول اصلی یعنی حرمت پر دلالت نہیں کرتیں، اور اس کو متعدد وجوہ سے ثابت کیا ہے، جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ لا تُشَدُّ الرحالُ والی حدیثوں کے راوی حضرت عمر وابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بھی ہیں، اور یہ لوگ ان تین مسجدوں کے علاوہ بعض دوسری مساجد کی طرف سفر کرنے کو جائز سمجھتے تھے، اور یہ بات خود ان حضرات کی روایات اور ان کے طرز عمل سے ثابت ہوتی ہے۔

البانی صاحب کا معتزلہ کی مذمت کو پیروانِ ائمہ کی مذمت پر منطبق کرنا:

علامہ اعظمیؒ نے ایک عنوان تطبيق الألباني ذمَّ المعتزلة على ذم أتباع الأئمة کا قائم کر کے لکھا ہے کہ البانی صاحب نے خطیب بغدادی کی کتاب 'شرف أصحاب الحديث' سے ایک ادھوری عبارت نقل کر کے بے سوچے سمجھے، یا عوام کو مغالطہ دینے کے لیے اس کو ائمۂ مذاہب کے متبعین پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے، اور یہ باور کرانا چاہا ہے کہ خطیب نے اس میں اتباع ائمہ پر تعریض کی ہے، علامہ اعظمیؒ نے خطیب

کی پوری عبارت نقل کر کے اس کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ خطیب نے اس میں صرف معتزلہ کو مراد لیا ہے۔

پھر یہ کہ خطیب بغدادی خود امام شافعی کے پکے مقلد اور پیروکار ہیں، اس لیے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ مقلدین و متبعین پر طنز و تعریض کریں۔

دفاع حضرت امام ابوحنیفہؒ:

علامہ اعظمیؒ نے بیسیوں صفحات حضرت امام ابوحنیفہؒ کے دفاع کی نذر کیے ہیں، البانی صاحب نے ایک حدیث کو محض اس وجہ سے ضعیف قرار دے دیا ہے کہ اس کی سند میں امام ابوحنیفہ ہیں - حالانکہ ان کے متابع بھی موجود ہیں - ، اور محدثین نے ان کے سوء حافظہ کی شکایت کی ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے اس سلسلے میں محدثین کی جرحوں کا تحلیل و تجزیہ کیا ہے، اور اَن گنت ایسے راویوں کو مثال میں پیش کیا ہے، جن پر ابوحنیفہ سے زیادہ سخت جرحیں ہیں، اور محدثین بلکہ خود البانی نے انفراداً یا متابعت کی وجہ سے ان روایتوں کو قبول کیا ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے عدل گستر محدثین اور ائمہ جرح و تعدیل کی تصریحات سے ثابت کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ پر کی جانے والی جرحیں معاصرانہ چشمک، یا بغض و حسد کا شاخسانہ ہیں؛ اور اگر البانی صاحب کے قلب میں ذرا بھی وسعت اور کشادگی ہوتی، تو وہ ہرگز امام ابوحنیفہؒ کی روایت کو رد اور ان سے معمولی درجے کے راویوں کی روایتوں کو قبول نہ کرتے۔

کتاب کا یہ آخری جز جو تقریباً ۴۳ صفحات پر محیط ہے، علم حدیث اور فن جرح و تعدیل کے نہایت اہم اور دقیق مباحث اور ان کی توضیح و تشریح پر مشتمل ہے۔ اس میں البانی صاحب کی 'ضعیفہ' سے بطور نمونہ دسیوں ایسی حدیثیں لے کر - جن پر البانی صاحب نے موضوع ہونے کا حکم لگایا ہے - ردو قدح کی ہے، اور اصول کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ ان پر موضوع ہونے کا حکم لگانا غلط اور البانی صاحب کے اس فن کے نکات و دقائق سے نابلد ہونے کی دلیل ہے۔

کتاب کی خصوصیات

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد پہلا تاثر یہ ابھرتا ہے کہ اس میں البانی صاحب کے خلاف سخت لب و لہجے کا استعمال کیا گیا ہے، جو بظاہر ایک علمی و تحقیقی منہج کے خلاف ہے۔

اس کی نسبت عرض یہ ہے کہ علامہ اعظمیؒ نے ''رد غیر مقلدیت'' یا بلفظ دیگر ''دفاع حنفیت'' میں بیسوں مضامین، رسائل اور کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، لیکن مناظرانہ طنز و تعریض اور مدافعانہ چوٹ سے قطع نظر کسی میں بھی اس سخت زبان کا استعمال نہیں کیا گیا ہے، جو ''الألباني شذوذه وأخطاؤه'' میں نظر آتی ہے، ایسا نہیں ہے کہ یہ البانی صاحب کے خلاف کسی ذاتی عداوت، بغض و حسد یا معاصرانہ چشمک کا نتیجہ ہو، حاشا وکلا! ۔ اس کی اصلی اور

بنیادی وجہ یہ ہے کہ البانی صاحب کی تصنیفات وتحقیقات سے علماء سلف اور ائمۂ متبوعین کے خلاف ذہن بن رہا تھا، متقدمین اہل علم کا مقام واحترام لوگوں کے دلوں سے کم ہوتا جارہا تھا، کسی حدیث وروایت کے متعلق البانی صاحب کے حکم اور فیصلے کو آنکھ بند کر کے تسلیم کرلیا جاتا، چاہے وہ اصول حدیث اورفن جرح وتعدیل کے معارض ہی کیوں نہ ہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ البانی صاحب کی نگاہ میں حدیث کے قواعد وضوابط کی کوئی اہمیت نہیں تھی، اور اگر تھی تو صرف اس قدر جس سے ان کا مقصد پورا ہوتا، ایک ہی قاعدے کو ایک جگہ اور ایک روایت کے سلسلے میں وہ استعمال کرتے، اور دوسری جگہ اگر ان کے منشا کے خلاف ہوتا، تو اسے نہایت بے دردی سے پامال کردیتے۔ صحیح اور حسن درجے کی روایتوں پر ضعیف اور ضعیف پر موضوع ہونے کا حکم لگادینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ علمی وتحقیقی بے احتیاطی کی ایسی مثال علم حدیث کی پوری تاریخ میں کم ہی ملے گی، علامہ اعظمیؒ کا یہ جملہ پڑھئے:

وتصرُّفاتُه في هذا الباب عجيبة، فتراه ينقُض في الضعيفة، ما أبرمَه في الصحيحة، ويُهمل القواعد التي راعاها في الصحيحة، فلا يُقيم لها وزناً في الضعيفة.

اس بے احتیاطی اور بے اعتدالی کے خلاف قلم نہ اٹھانا علم دین کے نقصان اور اس کی پامالی سے چشم پوشی کرنا ہے، اور جس شخص کا قلم نصف صدی سے زیادہ علم ودین اور خاص طور سے حدیثِ رسول ﷺ کی خدمت میں رواں دواں رہا ہو، اس کو یہ کیسے گوارا ہوسکتا ہے کہ دین اسلام کے اہم رکن کے اصول وقواعد کو بازیچۂ اطفال بنتے ہوئے دیکھے اور خاموشی سے اس کو برداشت کرلے۔ احادیث وروایات پر البانی صاحب کے بے جا اور بے محابا فیصلوں سے متاثر ہوکر اور ان کی کتابوں اور تحریروں میں پائے جانے والے تناقضات وتضادات کی تہ تک نہ پہنچنے کی وجہ سے عربوں پر ان کا کس قدر سحر طاری تھا، اس کا اندازہ دنیائے عرب کے مشہور ادیب شیخ علی طنطاویؒ کی اس تحریر سے ہوتا ہے، لکھا ہے:

وأنا أُقرُّ له بالصدارة في علوم الحديث وأرجع فيها إليه، وأُنكر تفقُّهَه وآراءَه التي يُخالف فيها جمهورَ العلماء من الفقهاء (ذكريات ۲۸/۱).

۲- علم حدیث کے بڑے بڑے ائمہ وماہرین حتی کہ بخاری ومسلم اور ان کی کتابوں کی روایات بھی البانی صاحب کے تعاقب سے محفوظ نہ رہ سکیں، البانی صاحب کے اس طرز عمل سے یہ خیال پیدا ہونے کا اندیشہ تھا کہ حدیثوں کے تمام مجموعے حتی کہ صحیحین کی روایات بھی نقد ونظر اور بحث وتمحیص کی محتاج ہیں۔ اس فکر ونظر کا خطرناک نتیجہ یہ ہوتا - بلکہ بہت حد تک اس کے یہ اثرات پیدا ہو چکے ہیں - کہ معمولی معمولی حیثیت اور ذرا ذرا سے قد کے لوگ - جن کو اصول روایت ودرایت کی ہوا بھی نہیں لگی ہوتی - احادیث رسول پر حکم لگانے میں بے باک ہوگئے، اس صورتحال کے سد باب یا احتیاطی تدبیر کے طور پر علامہ اعظمیؒ یہ بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ صحیحین کی حدیثوں کے لیے تصحیح وتحسین کا اقدام کیا جائے، چنانچہ عرب کے ایک مشہور عالم وفاضل شیخ عبدالستار ابوغدہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

وأما تحقيق انتقاد أحاديث مسلم، فلم أتفرَّ غ له حتى الآن، ولعلَّ اللّٰهَ يُحدِثُ بعد ذلك أمراً. وأنا أميل إلى منع التصحيح والتحسين سداً للذريعة.

علامہ اعظمیؒ کا اہم مقصد فن حدیث کو نااہلوں کے ہاتھ کا کھلونا بننے سے بچانا تھا کہ اگر اسی طرح ناروا جسارت کا مظاہرہ کیا جاتا رہا، تو اس فن کے اصول وقواعد بے معنی اور بے حیثیت ہوکر رہ جائیں گے۔ اسی لیے علامہ اعظمیؒ کی اس کتاب کے تمام مباحث اصول حدیث کے گردگردش کرتے نظر آتے ہیں۔

۳- البانی صاحب اس گروہ کے سرخیل سمجھے جاتے تھے، جو فقہ اور ائمۂ فقہ سے بیزار ہے، اور جس کی تنقید وتعریض کا سب سے بڑا نشانہ مذہب احناف ہے۔ اور یہ وہ طبقہ ہے جو ائمہ مذاہب کے استنباط واجتہاد کو چھوڑ کر براہ راست اور اپنی عقل وفہم سے کتاب وسنت سے مسائل کا استنباط واستخراج کر کے اس پر عمل کا داعی ومبلغ ہے؛ لہذا ضروری تھا کہ اس مدعیٔ امامت واجتہاد کے مبلغ علم، حدیث فہمی اور صلاحیت واستعداد کو واضح کیا جاتا۔ اور علامہ اعظمیؒ نے اپنی کتاب میں ان تمام پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے، البانی صاحب کے مبلغِ علم واجتہاد اور جرح وتعدیلِ رواۃ میں معیار انصاف ودیانت کو آئینے کی طرح واضح کر کے علمی دنیا کے سامنے رکھ دیا ہے۔

۴- البانی صاحب کا توڑ اصول حدیث اور فن جرح وتعدیل کی روشنی میں اور خود البانی صاحب کی تحریروں سے کیا ہے، اس کے چند نمونے ہدیۂ ناظرین ہیں:

(الف) البانی صاحب نے جمعہ سے پہلی کی سنتوں کے بارے میں لکھا ہے کہ اس سلسلے میں آں حضرت ﷺ سے کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے اس کے جواب میں ۶/روایتیں پیش کر کے لکھا ہے:

فهذه ستة أحاديث، بعضها صحيح، وبعضها حسن، وبعضها ضعيف، وليس واحدٌ منها شديدَ الضعف إلا السادسَ، ولو فُرِض أنَّ كلَّها ضعيف، فهلا يُقوَّى بعضُها ببعض حتى يَبلغَ إلى درجة الحسن، وقد سلك الألبانيُّ هذا المسلكَ في مواطن كثيرة.	یعنی یہ کل چھ حدیثیں ہیں، جن میں بعض صحیح، بعض حسن، اور بعض ضعیف ہیں، اور چھٹی کے سوا ان میں سے کوئی بھی سخت ضعیف نہیں ہے؛ اور اگر ان سب روایتوں کو ضعیف بھی تسلیم کر لیا جائے، تو کیا یہ روایتیں ایک دوسری سے قوت پاکر حسن کے درجے تک نہیں پہنچ جائیں گی، جبکہ البانی صاحب نے بہت سے مقامات میں اسی طریقے پر عمل کیا ہے۔

پھر البانی صاحب کی مختلف کتابوں سے پندرہ (۱۵) مثالیں پیش کر کے لکھا ہے:

وقد أكثر الألباني من تحسين الأحاديث لشواهدها أو متابعاتها الضعيفة، حتى لقد أعياني أن أنقلها برُمَّتها، وقد يمَلُّ القارئ من قراءة ما نقلت منها، مع أنه قليل جداً.

البانی نے کم زور شواہد اور متابعات کی وجہ سے بہت سی حدیثوں کی تحسین کی ہے- اور وہ اس

کثرت سے ہیں- کہ میں ان سب کو نقل کرنے سے قاصر ہوں، اور ممکن ہے کہ جو مثالیں میں نے نقل کی ہیں ان ہی سے قارئین اکتا گئے ہوں، جبکہ یہ بہت کم ہیں۔

(ب) حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں بہت سے راویوں کی نسبت لفظ "مقبول" کی اصطلاح استعمال کی ہے، اس پر البانی صاحب نے اپنی "صحیحہ" میں کئی مقام پر لکھا ہے کہ "مقبول" توثیق کے لیے نہیں ہے، بلکہ "ليّن الحديث" کے معنی میں ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کے جواب میں پانچ مثالیں ایسی ذکر کی ہیں، جن کے کسی راوی کے متعلق حافظ ابن حجر نے "مقبول" کا لفظ استعمال کیا ہے، اس کے باوجود البانی صاحب نے اس حدیث کی تصحیح یا تحسین کی ہے۔

(ج) البانی صاحب نے اپنی "صحیحہ" میں متعدد مقامات پر کسی راوی کے متعلق ابن حبان کی توثیق کو ناقابل اعتماد قرار دیا ہے، جس کی کئی مثالیں علامہ اعظمیؒ نے روایت نمبر کے ساتھ نقل کی ہیں، پھر آپ نے کئی ایسے نمونے پیش کیے ہیں، جن میں البانی صاحب نے ایسی روایتوں کو صحیح کہا ہے، جن کے بعض راویوں کی ابن حبان کے سوا کسی نے توثیق نہیں کی ہے۔

(د) البانی صاحب نے بہت سی جگہوں پر امام ترمذی وغیرہ کے کسی حدیث پر "غریب" کے حکم کو اس کے ضعیف ہونے پر محمول کیا ہے، جس کی چھ مثالیں علامہ اعظمیؒ نے ان کی کتابوں سے پیش کی ہیں، پھر ایک ایسی حدیث پر جس کو ابونعیم نے "غریب" کہا ہے، صحیح ہونے کا حکم لگاتے ہوئے البانی صاحب نے لکھا ہے: **لأن الغرابة قد تُجامع الصحة كما هو مقرر في مصطلح الحديث** (صحیحہ ۴۲/۱)۔

(ہ) البانی صاحب نے اپنی "ضعیفہ" میں روایت نمبر ۳۹۷: **إذا طَلَعَ النجمُ رُفعتِ العاهة عن أهل كل بلد** کو اس وجہ سے رد کر دیا ہے کہ اس کے ایک راوی امام ابوحنیفہ ہیں، اور متعدد ائمۂ فن نے ان کے سوء حافظہ کی شکایت کی ہے، اور امام ابوحنیفہ کی متابعت عسل نام کے ایک راوی نے بھی کی ہے، مگر ان کے ضعف کی وجہ سے البانی صاحب نے ان کی متابعت کو مسترد کر دیا۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کا سختی سے رد کرتے ہوئے البانی صاحب کی کتابوں سے دسیوں ایسی مثالیں پیش کی ہیں، جن میں "عِسل" سے بھی کم تر اور کمزور تر راویوں کی روایتوں کو متابعت کے نام پر حسن یا صحیح قرار دیا ہے۔

۵- اس کتاب میں ضمناً یا اصالۃً علم حدیث کی بہت سی اصطلاحات پر گفتگو آئی ہے، جس سے اس فن کے بہت سے اہم اور دقیق مباحث پر روشنی پڑتی ہے، اسی طرح بہت سی اصطلاحات یا مشکل مباحث کی نہایت آسان اور سادہ الفاظ میں تشریح و توضیح کی گئی ہے، مثلاً:

(الف) تحریم ذہب کے مسئلے میں البانی صاحب نے ایک ایسی روایت سے استدلال کیا ہے، جس کا ایک راوی اسید بن ابی اسید ہے، جس کی ابن حبان کے علاوہ کسی نے توثیق نہیں کی ہے، اور البانی صاحب کے نزدیک ابن حبان کی توثیق کا اعتبار نہیں ہے، ان کے علاوہ دوسرے ائمۂ جرح و تعدیل میں سے کسی نے اسید کی

توثیق نہیں کی ہے، صرف حافظ ابن حجر نے ان کو "صدوق" کہا ہے۔ اس پر علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ حافظ ابن حجر ائمۂ جرح وتعدیل میں نہیں ہیں، وہ تو ائمہ نقد کے کلام کے ناقل ہیں۔ ممکن ہے کہ البانی صاحب اس کے بعد یہ کہیں کہ دارقطنی نے ان کے لیے "يُعتبر به" کہا ہے، علامہ اعظمیؒ نے کہا کہ یہ "صدوق" کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس کا مفہوم تو "لا يُحتجَّ به" ہوگا۔

(ب) علم جرح وتعدیل کی ایک اہم اصطلاح "اختلاط" کی ہے، علامہ اعظمیؒ نے نبیذ کی بحث میں صفحہ ۸۸ پر لکھا ہے:

معنى الاختلاط هو أن يكون عند راوٍ حديثان عن سفيان الثوري مثلاً، أحدهما عن منصور، وآخر عن الكلبي، فيروي حديث الكلبي عن الثوري عن منصور، وحديث منصور عن الثوري عن الكلبي.

اختلاط کی مثال یہ ہے کہ کسی راوی کے پاس دو حدیثیں ہوں، جن کو اس نے سفیان ثوری سے سنا ہو، ایک حدیث بواسطہ سفیان، منصور سے ہو؛ اور دوسری کلبی سے۔ پس وہ حدیث جو سفیان کے واسطے سے کلبی سے ہو، اس کو وہ راوی منصور سے روایت کردے، اور جو منصور والی ہے اس کو عن سفیان عن الکلبی کہہ کر روایت کرے۔

(ج) علامہ اعظمیؒ نے متعدد مقامات پر لکھا ہے کہ کسی سند کے کسی راوی کے وضّاع ہونے سے حدیث کا موضوع ہونا لازم نہیں ہوتا، جب تک کہ دوسرے ذرائع وقرائن سے ان کا موضوع ہونا معلوم نہ ہو، یا کسی ماہر حدیث نے اس کے موضوع ہونے کا حکم نہ لگایا ہو، صفحہ ۱۶۵ پر لکھا ہے:

فإنَّ مجرَّدَ كونِ الرجل موصوفاً بوضع الحديث لا يُوجِب كون جميع أحاديثه موضوعةً على الإطلاق، لأنه إن كان يُوجِب ذاك هذا لم يجز لمن أخرج حديث الموصوفين بالوضع أن يُخرج لهم شيئاً إلا ببيان وضعه.

پھر چند سطروں کے بعد لکھا ہے:

فهذا –والله– أول[1] دليل على جهل الألباني وأجلى برهان على أنه لا يكفي للحكم بوضع الحديث بمجرد وجود وضاعٍ في سند الحديث، بل لا بدَّ من أن يَنضمَّ إليه شيء مما يدلُّ على كونه موضوعاً.

۶- بے شمار راویوں کے حالات اس کتاب میں آ گئے ہیں، بلکہ کہیں کہیں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ مختصر سی کتاب فن رجال کا کوئی رسالہ ہو، راویوں پر گفتگو یا کلام کے ضمن میں علماء جرح وتعدیل کے اقوال اس فن کی معتبر کتابوں سے نقل کیے گئے ہیں، اور بوقت ضرورت روایت حدیث میں ان کی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً:

☆......: ہلال مولی عمر کو البانی صاحب نے مجہول قرار دیا ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے (صفحہ ۲۲ پر) لکھا ہے کہ ہلال سے

(۱) مطبوعہ میں 'أوَّل' (واو) کے ساتھ چھپا ہوا ہے، لیکن صحیح 'أدَلُّ' (دال) کے ساتھ ہے، جیسا کے علامہ اعظمیؒ کے مسودے میں ہے۔

عمر بن عبدالعزیز بن عمر، یزید بن جابر کے دوصاحبزادوں اور عبداللہ بن لہیعہ نے روایت کیا ہے، جس راوی سے چار شخص روایت کرتے ہوں وہ مجہول کیسے ہوسکتا ہے؛ اسی طرح وہ مستور بھی نہیں ہے، اس لیے کہ ابن عمار موصلی نے اس کی توثیق کی ہے، اور ابن یونس نے کہا ہے: **كان يُقرِئ القرآن بمصر** (مصر میں وہ قرآن پڑھاتے تھے)، اور ابن حجر نے 'تقریب' میں لکھا ہے: **إنه مقبول لم يثبُتْ أن مكحولاً كذَّبه** (وہ مقبول ہے، مکحول کا اس کی تکذیب کرنا ثابت نہیں ہے)۔

۷۔بعض راویوں کے سلسلے میں علماء جرح وتعدیل کے اقوال وعبارات اور ان کے فیصلوں کو نقل کرنے میں دوسرے مصنفین سے غلطی اور چوک ہوئی ہے، اور البانی صاحب نے اس کی حقیقت تک پہنچے بغیر کوئی فیصلہ کر دیا ہے، تو علامہ اعظمیؒ نے علماء جرح وتعدیل کے اقوال وعبارات کا تحلیل وتجزیہ کر کے راوی کی حیثیت کو واضح کیا ہے، مثلاً:

☆......: جمعہ سے پہلے کی سنت کے سلسلے میں جو روایتیں آئی ہیں، ان میں ایک حضرت علیؓ کی حدیث ہے، اس حدیث کو امام اثرم نے **حديث واهٍ** (گری پڑی حدیث) کہہ دیا، اور ابن حجر نے کہا کہ اس کی سند میں ایک راوی محمد بن عبدالرحمٰن سہمی ہے، اور وہ امام بخاری وغیرہ کے نزدیک کمزور ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے لکھا کہ ابن حجر کا قول محل نظر ہے، اس لیے کہ امام بخاری نے اس کو 'تاریخ' میں ذکر کیا ہے، اور اس کے سوا اس میں کچھ نہیں ہے کہ اس کی روایت سے ایک حدیث ذکر کر کے لکھا ہے: **لا يُتابعُ عليه.** اور ابن حجر نے 'لسان المیزان' میں بخاری کے اس قول کو نقل کیا تو اس کو **لا يُتابع على روايته** بنا دیا، جو بخاری کے قول کے موافق نہیں رہا۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ اس راوی کی صراحۃً تضعیف میں نے کہیں نہیں دیکھی، بخاری کے علاوہ ایک ابوحاتم ہیں، انھوں نے **ليس بمشهور** کہا ہے، جس سے صراحۃً ضعیف ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن معین نے اس کو ضعیف کہا ہے، اور ابن معین کے قول کو ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے؛ مگر ابن ابی حاتم کی کتاب ہمارے سامنے ہے اور اس میں ابن معین کا قول مذکور نہیں ہے، ہاں اس کو ابن ابی حاتم نے کسی دوسری جگہ نقل کر دیا ہو تو الگ بات ہے۔

بلکہ ابن عدی نے اس کی نسبت **لا بأس به** کہا ہے، اور ابن حبان نے اس کو ثقات میں ذکر کر کے اس کی یہی حدیث ذکر کی ہے، علامہ اعظمیؒ کی پوری عبارت ملاحظہ فرمائی جائے:

> **وثانيهما حديث علي: قال الأثرم: إنه حديث واهٍ، وقال ابن حجر: فيه محمد ابن عبدالرحمن السهمي، وهو ضعيف عندالبخاري وغيره. وفيما قاله نظر، فإن البخاري ذكره في التاريخ، وليس فيه سوى أنه ذكر حديثاً من روايته، ثم قال: "لا يتابع عليه". وحكاه ابن حجر في اللسان، فجعله: لا يتابع على روايته، فصار موهما**

بخلاف ما قال البخاري!

وأما التصريح بالضعف، فلم أجد له عيناً ولا أثراً، وأما غير البخاري فقال أبو حاتم: ليس بمشهور. وليس صريحاً في التضعيف، نعم حكى ابن حجر عن ابن معين أنه قال: ضعيف، ونقله ابن أبي حاتم، لكن كتاب ابن أبي حاتم بين أيدينا، وليس فيه ما ادعاه ابن حجر اللهم إلا أن يكون نقله في كتاب آخر.

وقد قال ابن عدي: عندي لا بأس به، وذكره ابن حبان في الثقات وذكر له هذا الحديث.

۸- حدیث، اصول حدیث اور رواۃ حدیث کے علاوہ بعض دیگر اصولی وفقہی مباحث بھی اس کتاب میں نہایت قوت ووضاحت کے ساتھ سپردقلم کیے گئے ہیں، مثلاً پامال کی جانے والی تصویر کی بحث، عورتوں کے لیے سونا استعمال کرنے کی بحث، خرق اجماع کی بحث، انقراض اجتہاد کی بحث، نبیذ اور زیارتِ قبور وغیرہ کتاب کی نہایت معرکتہ الآرا بحثیں ہیں۔

☆......☆......☆......☆......☆

تجريد شواهد أوضح المسالک

مع حل مختصر

أوضح المسالک فن نحو کی مشہور کتاب ہے، اوراس کا شماراس فن کی اہم کتابوں میں ہوتا ہے، 'اوضح المسالک' اوراس کے نہج پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں بہت بڑا حصہ ان شعراءِ عرب کے اشعار کا ہوتا ہے جو زبان کے معاملہ میں حجت اور سند تسلیم کیے جاتے ہیں، قطع نظر اس کے کہ وہ زمانہ جاہلی کے شعرا ہیں، یا عہد اسلامی کی ابتدا کے، ہاں ان کا شمار اس دور کے لوگوں میں ہونا چاہئے جن سے زبان ولغت کے مسائل کے ثبوت میں سند کا کام لیا جاتا ہے۔'اوضح المسالک' میں اس قسم کے جو اشعار آئے ہیں، علامہ اعظمیؒ نے ان کو یکجا کیا ہے، اور صرف ان کو یکجا اور مرتب کرنے پر بس نہیں کیا ہے، بلکہ بیشتر اشعار کے مشکل کلمات اور نامانوس الفاظ کا کہیں صرف ترجمہ اور کہیں تفسیر وتشریح کی ہے۔

اس میں تقریباً چار سو ساٹھ (۴۶۰) اشعار ہیں، اور بیشتر اشعار کے مشکل یا نامانوس الفاظ کی تفسیر وتشریح بھی وہیں پر بین السطور میں کی گئی ہے، جس کی گنجائش دو سطروں کے درمیان میں پائی جاتی ہے، اس تفسیر وتشریح میں غایت درجہ اختصار سے کام لیا گیا ہے، کہیں صرف ترجمہ کیا گیا ہے، یا معنی بتلا دیا گیا ہے، اور کہیں چند لفظوں میں تشریح کر دی گئی ہے، لیکن اس قدر وضاحت اور جامعیت کے ساتھ کہ الفاظ واشعار کا معنی ومفہوم واضح ہو جاتا

ہے۔ ذیل میں چند اشعار مع حل لغات پیش کیے جارہے ہیں:

۱- في فتيةٍ جعلوا الصليب إلٰههم حاشاي إني مسلم معذور

اس میں لفظ "معذور" کے اوپر لکھا ہے: أي مقطوع العذرة وهي قلفة الذكر.

۲- أنا ابن مُزَيْقيا عمرو وجدي أبوه منذر ماء السماء

اس شعر میں "ابن مزيقيا" پر لکھا ہے: لُقِّب به عمرو وكان من ملوك اليمن. اور "ماء السماء" پر لکھا ہے: هو لقب أم منذر فلُقب به ابنها.

۳- نحن اللذون صبَّحوا الصباحا يوم النخيل غارة ملحاحا

اس شعر میں "النخيل" پر لکھا ہے: مصغراً موضع بالشام. اور "ملحاحا" پر لکھا ہے: بكسر الميم من ألَحَّ السحاب، أي دام مطره.

۴- ألا عم صباحاً أيها الطللُ البالي وهل يُعمن من كان في العُصُر الخالي

اس شعر میں کئی الفاظ کی تشریح ہے، "عم" پر لکھا ہے: من تحيات العرب، عم صباحاً وعم مساءً أي أنعم الله في صباحك ومسائك. "الطلل" پر لکھا ہے: رسم الدار. "البالي" پر لکھا ہے: کہنہ۔ "يعمن" پر یہ لکھا ہے: أصله ينعمن. "العُصُر" پر لکھا ہے: بضمتين هو والعصر واحد. اور "الخالي" پر لکھا ہے: گذشتہ۔

۵- يُذيبُ الرعبُ منه كلَّ عضبٍ فلولا الغمدُ يُمسكُه لسالا

"يذيب" پر لکھا ہے: من الإذابة گداختن ۱۲۔ "الرعب" پر لکھا ہے: بالضم الخوف ۱۲۔ "عضب" پر لکھا ہے: بالفتح شمسیر بُران ۱۲۔ اور "الغمد" پر لکھا ہے: بالکسر نیام تیغ ۱۲۔

۶- فقلتُ يمين الله أبرحُ قاعداً ولو قطعوا رأسي لديك وأوصالي

اس شعر کی تشریح میں لکھا ہے: يمين الله برفع النون، أي: يمين الله قسمي؛ أو هو منصوب بنزع الخافض، أي: أُقسِمُ بيمين الله. وأبرح: أي لا أبرح. والأوصال: جمع وصل، وهو العضو.

۷- ألا يا اسلمي يا دارَ ميَّ على البلى ولا زال مُنهلًّا بجَرْعائِك القطرُ

اس شعر پر لکھا ہے: يا الأولى حرف النداء ومناداه محذوف، تقديره: يا هذه؛ أو حرف تنبيه موكد لِأَلَا. اسلمي: أمر من السلامة، ومعناه الدعا بالسلامة لدارِ ميَّ. ومي: اسم امرأة، وليس ترخيم مية. والبِلى: (کہنگی)۔ وعلى: بمعنى مع. والمُنهَلُّ: السائل بشدة. والجرعاء: تانيث الأجرع (ریگ ہموار کہ درو ہیچ نروید)۔ والقطر: جمع قطرة، المطر ۱۲.

۸- بني غدانة ما إن أنتم ذهبٌ ولا صريفٌ ولكن أنتم خَزَف

اس شعر میں ”غدانة“ پر لکھا ہے: بضم المعجمة: حيٌّ من يربوع ١٢۔ ”صريف“ پر لکھا ہے: بالمهملة الفضة الخالصة۔ اور ”خزف“ پر لکھا ہے: كل ما عمل من طين وشُوِي بالنار ١٢.

۹- وماذا عسى الحجاج يبلغ جهده   إذا نحن جاوزنا حفير زياد

اس میں ”حفير زياد“ پر لکھا ہے: موضع بين الشام والعراق.

۱۰- ألا اصطبارٌ لسلمى أم لها جلدٌ   إذا لاقى الذي لاقاه أمثالي

اس شعر کی تشریح یوں کی ہے: يقول إذا لاقيت ما لاقاه أمثالي، يعني إذا متُّ فهل تصبر سلمى أم لا يكون لها اصطبار.

۱۱- أبالأراجيز ياابن اللُّوم تُوعِدني   وفي الأراجيز خِلتَ اللُّوم والخورا

”الأراجيز“ پر لکھا ہے: جمع أرجوزة: القصائد الجارية على بحر الرجز ١٢. اور ”اللؤم“ پر لکھا ہے: اجتماع الشُّح ومهانةِ النفس ودناءةِ الآباء ١٢. اور ”الخَوَر“ پر لکھا ہے: هو الضعف ١٢.

۱۲- لا تركَنَنُ إلى الأمر الذي ركنتُ   أبناءُ يعْصُرَ حينَ اضطرَّها القَدَرُ

اس شعر میں لفظ ”يعصر“ پر لکھا ہے: على وزن ينصر أبو قبيلة من باهلة.

اس طرح جہاں اور جس لفظ پر ضرورت محسوس کی ہے، اختصار کے ساتھ اس کی تشریح کی ہے۔ کہیں اس کی تشریح عربی زبان ہی کے کسی مترادف لفظ کے ساتھ کرتے ہیں، کہیں فارسی اور اردو میں اس کا معنی ومفہوم بتلاتے ہیں۔ اگر کسی شعر میں جگہ کا نام آیا ہے، یا قبیلہ کا نام ہے تو اس کو بھی ذکر کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک مختصر مگر نہایت مفید انتخاب وتالیف ہے۔

اس کا زمانہ انتخاب ۱۳۵۲ھ ہے، جیسا کہ اس کے ختم پر لکھا ہوا ہے:

”۱۷؍ ذی قعدہ ۱۳۵۲ھ یوم الاحد۔ حبیب الرحمٰن الاعظمی“

☆......☆......☆......☆......☆

حجة لا ينساها التاريخ

(تاریخ کا ایک نا قابل فراموش حج)

یہ علامہ اعظمیؒ کا سات صفحوں پر مشتمل مضمون ہے، جو 'البعث الإسلامي' کی پہلی جلد کے چھٹے شمارے - رجب ۱۳۷۵ھ = مارچ ۱۹۵۶ء - میں شائع ہوا ہے۔

اس مضمون میں اسلام کے فرزند عظیم، مجاہد و مجدد اور مصلح قوم حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ایک سفر حج کی داستان، راستے میں پیش آنے والے واقعات، عوام اور مریدین کا جگہ جگہ آپ کے ہم رکاب ہو جانا، آپ کی معیت اور ہم سفری کے شرف کے حصول کے لیے لوگوں کا جوق در جوق امڈ پڑنا، برّی و بحری سفر کے واقعات وغیرہ بہ تفصیل بیان فرمائے ہیں۔

عید الفطر یعنی یکم شوال ۱۲۳۶ھ کو حضرت سید احمد شہید چار سو (۴۰۰) سے زائد عازمین کے ساتھ رخت سفر باندھ کر نکلے، اور مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے کلکتہ پہنچے، راستے میں ہر جگہ رفقا کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، یہاں تک کہ کلکتہ پہنچتے پہنچتے ساڑھے سات سو سے زائد نفوس کا جم غفیر آپ کے ہمراہ ہو چکا تھا، وہاں سے یہ قافلہ گیارہ کشتیوں - آبی جہازوں - پر سوار ہو کر جدہ کے لیے لنگر بردار ہوا۔ علامہ اعظمیؒ نے اپنے اس مضمون میں اس قافلے کی ایک ایک منزل کا ذکر کیا ہے، یہاں تک کہ ساڑھے دس مہینے کی صعوبت و مشقت سے بھرپور سفر کے بعد ۱۸ رشعبان ۱۲۳۷ھ کو خدا مستوں کا یہ قافلہ سرزمین حرم میں داخل ہوا ہے۔

راستے کے منازل، حرمین کے قیام، ایک مقام سے دوسرے مقام تک نقل و حرکت کے واقعات کے علاوہ حضرت سید احمد شہید کے اشارے سے حضرت مولانا عبد الحی اور حضرت مولانا اسماعیل شہید کا درس کے حلقے قائم کرنا، اور سید صاحب کا اپنے رفقا سے مقام عقبہ و حدیبیہ میں جہاد کے لیے بیعت لینے کا بھی ذکر کیا ہے۔

مضمون کے آغاز میں اس زمانے کے حج کے لیے راستوں اور منزلوں کی دشواریوں اور مشقتوں کا ذکر کیا ہے، اور آخر میں حاجیوں کی سہولیات اور راحت رسانی کے لیے شاہ عبد العزیز آل سعود اور ان کے بعد شاہ سعود بن عبد العزیز وغیرہ کی طرف سے جو بڑے پیمانے پر اور غیر معمولی کوششیں ہو رہی ہیں، اس پر ان کو پورے صدق دل اور کشادہ قلبی سے ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کیا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

في الميزان

ما تَمَسُّ إليه الحاجة لمن يُطالعُ ابنَ ماجه

یہ سوا صفحے کا ایک تبصرہ ہے، جو 'البعث الاسلامی' جلد اول شمارہ نمبر ۱۱ بابت ذی الحجہ ۱۳۷۵=اگست ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا ہے۔ ما تَمَسُّ إليه الحاجة مشہور عالم ومصنف مولانا عبدالرشید نعمانی کی بہترین تصنیف ہے، جو اُس وقت اصح المطابع - آرام باغ، کراچی - سے طبع ہو کر شائع ہوئی تھی۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنی تحریر میں اس کتاب کا اختصار کے ساتھ تحسین آمیز تعارف کرایا ہے، اس سلسلے میں لکھا ہے:

> **وقد درستُ الكتابَ دراسةً عميقةً، فوجدتُه متيناً ممتعاً، وإني لا أتوقَّفُ، وكذا لا يتوقَّف كلُّ من طالعَه، عن الاعترافِ بأنَّ المؤلف وفىَ لهذه العناوين حقَّها مِنَ البحثِ والتحقيقِ، وزِدْ على ذلک أنه أتىَ في أثناء هذه البحوثِ بنقولٍ نادرةٍ عن الجهابذةِ الأقدمين، واكتشافاتٍ بديعةٍ قلَّما تجدها عند غيره من المؤلفين في هذا العصر.**

میں نے اس کتاب کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا، تو میں نے اس کو ایک مفید اور سلجھی ہوئی کتاب پایا، مجھ کو - اسی طرح جو شخص بھی اس کا مطالعہ کرے گا، اس کو - یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوگا کہ مصنف نے ان عنوانات کی بحث وتحقیق کا حق ادا کر دیا ہے، مزید یہ کہ انھوں نے ان بحثوں کے درمیان اگلے ماہرین فن کی ایسی نادر نقلیں پیش کی ہیں، اور ایسی انوکھی تحقیقات ذکر کی ہیں، جو اس دور کے دوسرے مصنفین کے ہاں کم ملیں گی۔

☆......☆......☆......☆......☆

مسند الإمام أحمد

بشرح الشيخ أحمد محمد شاكر المحدث المصري

یہ مضمون 'البعث الإسلامي' جلد چہارم شمارہ نمبر ۱ - رجب ۱۳۷۸ھ = جنوری ۱۹۵۹ء - کی زینت بنا ہے۔ اس کے شروع میں مسند امام احمد کا مختصر مگر جامع تعارف ہے، اس کی بعض گزشتہ طباعتوں کا ذکر ہے، پھر علامہ محقق شیخ احمد محمد شاکر علیہ الرحمہ کی اس عظیم الشان خدمت حدیث کی تحسین وستائش اور ہدیۂ تبریک وتہنیت ہے جو انھوں نے اس قابل فخر سرمایۂ حدیث کی تحقیق وتعلیق اور شرح وتحشیہ کے ذریعے انجام دی ہے، اور ان کے فضل وکمال، محنت وجانفشانی اور عرق ریزی کا بھرپور اعتراف ہے۔ صرف یہی نہیں، انھوں نے 'استدراک وتعقیب' کا

عنوان قائم کر کے اپنی ہی تحقیق وتعلیق میں واقع اپنی غلطیوں کی جو تصحیح کی ہے، ان کو سراہتے ہوئے علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

”وفي كلامه هذا وصنيعه الذي حققه عملياً مُعتَبَرٌ أي معتبر لعلماء زماننا“

یعنی انھوں نے 'استدراک وتعقیب' کے عنوان کے تحت اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی جو اصلاح وتصحیح کی ہے، تو ان کا یہ طرزِ عمل ہمارے آج کل کے علماء کے لیے سبق آموز ہے۔

اور پھر دوسرے اہل علم وفضل کو اپنی غلطیوں کی نشان دہی کے لیے تعقیب واستدراک کی جو دعوت دی ہے، علامہ اعظمیؒ نے ان کی اس کشادہ دلی، وسعت قلبی، سیر چشمی، اور امانت وانصاف کی بھرپور داد تحسین دی ہے۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے دوران میری نگاہ میں کچھ ایسے مقامات آئے جن میں میرے علم کے مطابق شارح سے غلطی ہوئی تھی، اور کچھ ایسی تحقیقات پر بھی میری نظر پڑی جو استدراک اور نظر ثانی کی محتاج تھیں، ان کو میں نوٹ کرلیا تھا، لیکن اس خیال کے پیش نظر ان کے پاس روانہ کرنے کی جسارت نہیں کر پا رہا تھا کہ ممکن ہے کہ ان کو اس سے ناگواری اور کبیدگی ہو، لیکن جب تیسری جلد میں اہل علم کو استدراک وتعقیب لکھنے کی دعوت دیتے ہوئے دیکھا، تو میں نے پہلے خدا کا شکر ادا کیا، پھر شیخ احمد شاکر کی خدمت میں خلوص دل سے ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہوئے، اپنے ملاحظات روانہ کر دیے، جس کا انھوں نے وسعت ظرفی کے ساتھ مطالعہ کیا، اور اکثر استدراکات سے اتفاق کیا، اور صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے ان استدراکات کو مسند احمد کی پندرہویں جلد کے آخر میں شائع کر دیا۔ شیخ کی یہ وسعت ظرفی یہیں ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ انھوں نے مجھ سے مزید تعاقب واستدراک کی خواہش ظاہر کی۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی سے متاثر ہو کر میں نے ان کے پاس استدراکات کی ایک دوسری قسط بھی بھیجی، جو اس سے دو چند ہے، جو پندرہویں جلد میں شائع ہو چکے ہیں، جس کی نسبت مجھے امید ہے کہ نگاہ التفات ڈالیں گے۔

علامہ اعظمیؒ نے جب یہ مضمون سپرد قلم فرمایا تھا، اس وقت شیخ احمد شاکر حیات تھے، لیکن اس کی طباعت کے دوران ہی شیخ احمد شاکر کا کاسۂ عمر لبریز ہو گیا، اور علامہ اعظمیؒ کے یہ استدراکات جو بعد میں سپرد قلم کیے گئے تھے، معرض اشاعت میں نہ آسکے۔

علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ مسند احمد پر ان کے استدراکات چار قسموں پر مشتمل ہیں:

۱- وہ استدراکات ہیں جو متن یا اسناد کی تصحیح سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی وہ مقامات جن میں متن یا سند کی غلطیوں کی تصحیح کی ہے۔

۲- دوسری قسم ان استدراکات کی ہے جن میں سند کے رجال ورواۃ کی تحقیق ہے، جن کا تذکرہ شیخ احمد شاکر کو تذکرے کی کتابوں میں نہیں ملا، یا جن کی تحقیق ان کو نہیں ہوسکی۔

۳- تیسری قسم کے استدراکات احادیث کی تشریح اوران کے الفاظ کی تفسیر سے متعلق ہیں، یعنی حدیث کی تشریح میں ان سے جوغلطیاں ہوئی ہیں، ان پر متنبہ کیا ہے۔

۴- چوتھی قسم کے استدراکات وہ ہیں جو تخریج حدیث سے متعلق ہیں، یعنی بعض ایسی حدیثیں جن کے بارے میں شیخ کودوسری کتابوں میں ہونے کا علم نہ ہوسکا، علامہ اعظمیؒ نے ان کی نشاندہی کی ہے۔

یہ مضمون شیخ احمد محمد شاکر کی ۲۴ فروگزاشتوں کے بیان اوران کی تصحیح وتوضیح پر مشتمل ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

مسند الإمام الحميدي

یہ مضمون 'البعث الإسلامي' میں رمضان، شوال، ذی قعدہ ۱۳۷۹ھ = مارچ، اپریل، مئی ۱۹۶۰ء جلد ۵ شمارہ نمبر ۳و۴و۵ میں شائع ہوا ہے۔ یہ 'مسند حمیدی' کے تعارف پر مشتمل ہے، اورآپ کا وہ مقدمہ ہے، جو 'مسند حمیدی' کی پہلی جلد میں کتاب کے شروع میں شامل ہے۔ 'البعث الاسلامي' میں شائع ہونے والا یہ مضمون اسی مقدمے کا قدرے اختصار ہے۔ مقدمے کی تلخیص 'مسند حمیدی' کے تعارف کے ضمن میں آئے گی۔

☆......☆......☆......☆......☆

الإمام الرباني: عبد الله بن المبارك

یہ مضمون 'البعث الإسلامي' جلد نمبر ۱۱ شمارہ نمبر ۴ بابت شعبان ورمضان ۱۳۸۶ھ = دسمبر ۱۹۶۶ء وشمارہ نمبر ۵ بابت شوال ۱۳۸۶ھ = فروری ۱۹۶۷ کے شماروں میں شائع ہوا ہے۔

آگے آئے گا کہ امام ربانی رأس الاتقیا حضرت عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد والرقائق کوتحقیق کر کے شائع کرنا ہوا، تواس کے لیے علامہ اعظمیؒ نے ایک مبسوط اور مفصل مقدمہ تحریر فرمایا تھا، جس میں زہد کی حقیقت، اس کی ضرورت اوراقسام وغیرہ پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس مقدمے کا ایک حصہ حضرت عبداللہ بن مبارک کی کتاب زندگی پر مشتمل تھا، کتاب الزہد والرقائق چونکہ خالص علمی کتاب ہے، اورخالص علمی بلکہ ایک طرح کا خاص علمی وفکری ذوق رکھنے والے حضرات ہی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں، اس لیے افادۂ عام کی غرض سے اس کوعلامہ اعظمیؒ نے البعث الإسلامي میں شائع کرایا، تاکہ آسمان زہد وتقویٰ کے اس مہر جہاں تاب کی شعاعوں اورکرنوں سے عام اہل علم کا طبقہ بھی اپنے قلب کوروشن کر سکے۔

☆......☆......☆......☆......☆

الربانية: أصل الدين وسمة المسلمين

یہ بھی 'کتاب الزہد' کے مقدمے ہی کا حصہ ہے، لیکن یہ وہ حصہ ہے جو آغاز میں ہے، اور مقدمہ کے صفحات کے اعتبار سے صفحہ ا سے صفحہ ۱۶ تک پھیلا ہوا ہے، جس میں زہد کی حقیقت، اس کی اقسام، انسانی معاشرے کے لیے اس کی ضرورت اور اس فن کی تالیفات کا ذکر ہے۔

البعث الإسلامي میں یہ حصہ جلد ۱۱، شمارہ نمبر ۷ بابت ذی الحجہ ۱۳۸۶ھ = اپریل ۱۹۶۷ء، ومحرم ۱۳۸۷ھ = مئی ۱۹۶۷ء کے شماروں میں شائع ہوا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

كتاب نسب قريش للزبير بن بكار

یہ مضمون دراصل مشہور مصری عالم ومحقق شیخ محمود محمد شاکر کی تحقیق سے شائع ہونے والی زبیر بن بکار کی کتاب '**نسب قريش**' پر استدراک ہے، جو '**البعث الإسلامي**' اور مکہ سے شائع والے مجلّہ '**الحج**' میں جمادی الاولی ۱۳۸۳ھ = اکتوبر ۱۹۶۳ء میں اشاعت پذیر ہوا تھا، یہ مضمون علامہ اعظمیؒ کی ژرف نگاہی، دیدہ وری اور باریک بینی کا بین ثبوت ہے۔ مضمون کا آغاز کتاب کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کے بیان سے ہوتا ہے، جس میں اس کا ایک مختصر اور جامع تعارف پیش کردیا گیا ہے، اس کا آغاز یوں ہوتا ہے:

> **كتاب نسب قريش للزبير من أحدث ما ظهر في عالم المطبوعات، وإن كان من أقدم ما أُلِّف في الأنساب، وإنه تلو كتاب عمه مصعب بن عبدالله في نسب قريش تأليفاً وطبعاً.**

ان دونوں کتابوں کی اہمیت وافادیت کو بیان کرتے ہوئے علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ تاریخ وتذکرہ کی دوسری کتابوں میں ان کے حوالے اور اقتباسات سے اہل علم اکتساب فیض کرتے تھے، لیکن یہ حسرت تھی کہ ان دونوں کتابوں سے راست استفادہ کا موقع میسر ہوجاتا، علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

> **وكَمْ كُنا نَوَدُّ أنْ لو ظفِرنا بهما فنَتَلَقَّى فوائدَهما مباشرةً كأنَّما نسمعُ من أفواهِ مصنِّفَيهما.**

اس کے بعد مصعب بن عبداللہ کی 'نسب قریش' کی نسبت لکھا ہے کہ ۱۹۵۳ء میں مصر کے دار المعارف للطباعۃ والنشر کو اس کی طباعت کی عزت حاصل ہوئی۔ اس کتاب کے نو سال بعد ۱۹۶۲ء = ۱۳۸۱ھ میں مصعب کے بھتیجے زبیر بن بکار کی کتاب کی تحقیق واشاعت کی سعادت محقق وعلامہ محمود محمد شاکر مصری کے حصے میں آئی، فرماتے ہیں:

ثم وُفِّق البحَّاثة الكبير المحقق العلامة محمود محمد شاكر المصري لنشر كتاب الزبير في سنة ١٩٦٢م (١٣٨١هـ) فطبعه طبعاً متقناً بتعليقاته النفيسة الممتعة.

علامہ اعظمیؒ نے اپنے اس مضمون میں 'نسب قریش' کے مختلف مقامات سے انتخاب کر کے درس ونصیحت سے معمور ۱۲/واقعات نقل کیے ہیں، جو مسلمانوں کی عظمت وبلندی، اوران کے اخلاق وکردار کی روشن مثال ہیں، ان واقعات کونقل کرنے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

وهكذا ينتقل الزبير من ترجمة إلى ترجمة، وينتقي من أخبار صاحب الترجمة أطائبها، ويفيدنا بما سمعه من شيوخه أو شاهده بنفسه.

اس کے بعد کتاب کے محقق شیخ محمود شاکر کو ان کی اس تحقیقی خدمت پر خراج تحسین اور ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والمحقق البحاثة لو أخرج لنا هذا الكتاب كما هو، لكان منةً في رقابنا، لا نكاد نستطيع أداءَ الواجب من شكرها، لكنه فوق ذلك أسدى إلينا فأخرجه مضبوطاً، مشكّلاً، مشروحاً، محققاً، فضاعف بذلك الإحسان، فجزاه الله تعالى جزاء المحسنين، وضاعف له أجره.

لیکن تحقیق وتدقیق کی تمام کوششوں کے باوجود نظر کا چوک جانا،غلطیوں کا باقی رہ جانا،اور سہو وخطا کا سرزد ہوجانا مقتضائے بشریت ہے،اور یہ کسی عالم یا صاحب نظر کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر ذی علم کے ساتھ یہ باتیں پیش آتی ہیں، چنانچہ علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

ولكن المرء كلما اختار الدقة في عمله، ومهما بالغ في الاحتياط لنفسه، فهو مُعرَّض للسهو والغفلة، ولابد.

'نسب قریش' کے دوران مطالعہ متعدد مقامات پر علامہ اعظمیؒ کو شیخ محمود شاکر کی فروگذاشتیں نظر آئیں، جن کو قلم بند کر کے علمی امانت سمجھ کر شیخ محمود کے فضل وکمال اور علمی قدر ومنزلت کے اعتراف کے ساتھ شائع کیا، علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

فلا بِدعَ في أن نجد محققنا البحاثة، يخفى عليه شيء، أو يزل قدمه، أو يعثر جواد قلمه، في مواضع قليلة، ولولا أن أمانة العلم تتقاضى مني أن أوديها، لم أجترئ على أن أنبِّه على ما عثرت عليه في تلك المواضع القليلة من ذهول أو خطأ أو زلل، ومع هذا فهو لا يتنافىَ مع ما هو ملؤ قلبي من إجلال لشخصيته العلمية، وإكبار لعمله الجليل.

اس کے بعد گیارہ کی تعداد میں وہ مواخذات ہیں، جو شیخ محمود شاکر کی شرح وتحقیق پر کیے گئے ہیں۔

السيد مرتضى الزبيدي هندي

لا يحوم حوله شک

لغت کی عظیم الشان کتاب 'تاج العروس' سید مرتضی زبیدی کی تالیف ہے، یہ سرمایۂ لغت شیخ عبدالسلام احمد فراج کی تحقیق سے شائع ہوا ہے، اس پر محقق کا ایک مقدمہ بھی ہے، فاضل محقق نے اپنے مقدمے میں کتاب کے مصنف علامہ سید مرتضیٰ کے ہندوستانی ہونے کی بحث چھیڑی ہے، اوران کے ہندوستانی ہونے پر سوالیہ نشان لگاتے ہوئے اس کو مشکوک اور مستبعد قرار دیا ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے اپنے مضمون میں ان کے اسی شک کا علاج کیا ہے، اور رگِ تشکیک کو کاٹنے کی کوشش کی ہے، اور نہایت مستحکم تاریخی دلائل کے ساتھ ان کی بحث کا جواب دیتے ہوئے علامہ مرتضی زبیدی کے ہندوستانی ہونے کا اٹل اور پختہ ثبوت فراہم کیا ہے، علامہ اعظمیؒ نے اپنے مضمون کا آغاز ان جملوں سے کیا ہے:

> من المؤسف جداً أن السيد عبدالسلام أحمد فراج في مقدمته التي قدَّمها كمحقق لتاج العروس – من الآثار الخالدة للعلامة السيد مرتضى الهندي الزبيدي ثم المصري– قد أثار بحثاً لا مُسوِّغَ له، وهو أن السيد المذكور هندي أم لا؟ ومآل البحث استبعاد هنديته والتشكيك فيها دون الاعتماد على دليل وبرهان، وكان من الواجب إذ لم تتوفَّر عند المحقق الفاضل مصادر ترجمته أن يسأل الذين يعرفونه عن كَثَب، ويراجعهم في ذلک، قبل أن ينتهي إلى نتيجة، فسبَّب بإهمال هذا الواجب اغترار الكثيرين من قارئيه بما كتبه، وتقليدهم له في هذا الخطأ الفاضح.

اس کے بعد نہایت مضبوط اور غیر متزلزل لہجے میں ان کے ہندوستانی ہونے کا ذکر کرتے ہیں، اور لکھتے ہیں:

> والحقيقة التي لا يحوم حول ثبوتها وجلائها شک، أن السيد مرتضى هندي، استوطن عشيرته "بلجرام" الهند، منذ قرابة خمسة قرون، وإن الذين ترجموا له من أهل الهند فيهم من رأى أباه وصحب جده وهو نسيبه وبلديه، وفيهم من عاصره.

یہ بات بلا شک وشبہہ ثابت ہے کہ سید مرتضیٰ ہندوستانی ہیں، ہندوستان کا شہر ''بلگرام'' تقریباً پانچ سو سال سے ان کے خاندان کا وطن رہا ہے، اور جن ہندوستانی مورخین نے ان کا تذکرہ کیا ہے، ان میں بعض ایسے ہیں جنھوں نے ان کے والد کو دیکھا ہے اور ان کے دادا کے شاگرد اور ان کے ہم نسب

وہم وطن رہے ہیں، اور بعض وہ ہیں جو ان کے معاصر ہیں۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنے سات صفحے کے اس مضمون میں سید مرتضیٰ کے دادا سید قادری کے شاگرد اور ہم وطن وہم نسب سید غلام علی بلگرامی، سید مرتضیٰ کے ہم عصر 'بحر زخار' کے مولف شیخ وجیہ الدین کی تصریحات، اور نواب صدیق حسن خاں وصاحب نزہۃ الخواطر مولانا عبدالحی لکھنوی کی نقول، اور خود علامہ سید مرتضیٰ کے ایک علمی 'برنامج' کے ایک قلمی نسخے سے ثابت کیا ہے کہ وہ ہندوستانی ہیں، ان دلائل وشواہد کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

فعُلِم بهذا كله أنَّ الزبيدي هندي الأصل، تولّد من أبوين هنديين، وإن إنكار هذه الحقيقة سفسطة، والشك فيها ارتياب في رؤية الشمس في وضح النهار.

پس اس ساری تفصیل سے یہ معلوم ہوگیا کہ زبیدی اصلاً ہندوستانی ہیں، ان کے والدین ہندوستانی تھے، اس حقیقت کا انکار سطحیت ہے، اوران کے ہندوستانی ہونے میں شک کرنا نصف النہار میں سورج کی موجودگی کے بارے میں شک کرنا ہے۔

یہ مضمون مجلّہ 'البعث الإسلامي' جلد۲۰، شمارہ۸- ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ= اپریل ۱۹۷۶ء- میں شائع ہوا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

حول السنن الرواتب

شیخ محمد نور مکی نام کے کسی صاحب نے سنن رواتب -سنن موکدہ- پر کوئی مضمون یا رسالہ لکھا تھا، جس میں انھوں نے ان سنتوں کی اہمیت کو بہت گھٹا کر پیش کیا تھا، اوران کے بارے میں اس انداز سے خامہ فرسائی کی تھی، کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر ومنزلت نہ رہ جائے، اوراس کی حیثیت ایک اختیاری مضمون (Optional Subject) کی طرح ہوکر رہ جائے، کہ جی چاہے ان کو پڑھیں جی چاہے نہ پڑھیں، شریعت کی طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے اپنے اس مضمون میں شیخ محمد نور کے ان ہی خیالات کا قدرے تفصیل سے رد کیا ہے، اوراحادیث وآثار نیز فقہا کی تصریحات سے ان کا موکد ہونا، اور نہ پڑھنے والے کے لیے موجب خسران ہونا ثابت کیا ہے، خطبہ کے بعد اس کا آغاز یوں کیا ہے:

فقد قرأتُ رسالة المرحوم الشيخ محمد نور المكي قراءة إمعان، فلم أستنتج منها إلا أنها تُهوِّن أمر الرواتب، وتمحو ما لها من العظمة في القلوب، ويُسقِط منزلتها من الأعين، وتُشجِّع المصلين عامَّة أن يُهملوها متى شاؤا، وذلک ضد ما هو المرضي والمندوب، وخلاف ما هو الأولى والأحرى عند النبي ﷺ، فإنه عليه السلام كان يُواظِبُ عليها كما سيأتي في حديث أبي أمامة وأبي أيوب، وكان يَحُثُّ

علی بعضها أشدَّ الحثِّ، ویُرغِّبُ في بعضها بأنواع من الترغیب. ومَن تتبَّع الأحادیث من ذلک الباب لم یَرتَبُ في أنَّ النبي ﷺ لم یکن یرضی بترکها وبالتفریط فیها، سواءٌ کان المفرِّط آثما أو غیرَ آثم. فإذا کان الأمر کذلک فلا ینبغي لمسلم أن یُحَبِّذَ سعیاً یُنتج ضدَّ ما کان المرضيَّ عند رسول الله ﷺ.

اس کے بعد سنن موکدہ کی تاکید سے متعلق کتب حدیث سے ۶ مرفوع حدیثیں، اور ۶ آثار صحابہ وتابعین ذکر کیے ہیں، اور ضمناً 'نیل الاوطار' سے علامہ شوکانی کے بعض تشریحی اقوال وعبارات نقل کیے ہیں، جن کے اندر علامہ شوکانی نے نہ صرف ان کی پابندی اور کراہیتِ تفریط کو بیان کیا ہے، بلکہ بعض سنتوں کا مرتبہ وجوب تک پہنچایا ہے۔

احادیث وآثار کو نقل کرنے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کے الفاظ "اَدْبَارَ السُّجُوْدِ" میں مغرب کے بعد کی دو رکعت، اور "اِدْبَارَ النُّجُوْمِ" میں فجر سے پہلے کی دو رکعت سنت کی تفسیر حضرت عمر وعلی وحسن وابوہریرہ-رضی اللہ عنہم-وغیرہم سے منقول ہے، اس کے بعد لکھا ہے:

ومما یجب أن لا یُغفَلَ عنه أنَّ الرواتب وإن لم تکن واجباتٍ لکنها مکملاتٌ لها، ومن ذا الذي یدَّعي أنه فرائضه کاملة، فلا بد إذن أن تکون في صحیفة المصلي تطوعات، یکمل بها نقص فرائضه، فقد روی أبو هریرة أنه سمع رسولَ الله ﷺ یقول: إنَّ أول ما یُحاسَبُ به العبد یوم القیامة من عمله صلوته، فإنْ صلَحتْ فقد أفلحَ وأنجح، وإن فسدَتْ فقد خاب وخسر، فإن انتقص من فریضة شیئاً، قال الربُّ تبارک وتعالی: انظروا هل لعبدي من تطوع، فیکمل ما انتقص من الفریضة، ثم یکون سائر عمله علی ذلک (الترمذي: ۳۱۸/۱).

علامہ اعظمیؒ نے آخر میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی کتاب 'تحفۃ الاخیار' سے تین صفحات پر مشتمل ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے۔ علامہ فرنگی محلی نے اس میں سنن موکدہ کے متعلق متعدد فقہاء احناف کے اقوال نقل کیے ہیں، جس سے اس کی اہمیت، اس کا قریب بہ وجوب ہونا، اور اس کا ترک حرام کے قریب ہونا بتلایا گیا ہے، اور یہ کہ اس کے ترک سے آدمی آنحضرت ﷺ کی شفاعت سے محروم ہوسکتا ہے۔ اقوال فقہا کو نقل کرنے کے بعد آخر میں مولانا فرنگی محلی نے لکھا ہے:

"قلت: الحاصل أن ترکَ السنة علی سبیل الاستخفاف والاستهزاء بها -وإن کانت من الزوائد- کفر، وترکها عمداً لا علی سبیل الاستخفاف مکروه تحریماً، یُوجب إثماً وعتاباً إذا کانت مؤکدةً سواء کانت سنةَ الرسول أو سنة الصحابة.

علامہ اعظمیؒ کا یہ مضمون دارالعلوم دیوبند سے شائع ہونے والے سہ ماہی عربی رسالے 'دعوۃ الحق' میں محرم ۱۳۸۷ھ=مئی ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا ہے۔ ☆......☆......☆

اردو ترجمے

ترجمہ مُوَطّا امام مالک

علامہ اعظمیؒ کی علمی وقلمی فتوحات میں حدیث شریف کے عظیم الشان اور مبارک مجموعے امیر المومنین فی الحدیث امام مالک کی یادگار کتاب 'موطا امام مالک' کا ترجمہ بھی ہے، اس ترجمہ پر نگاہ ڈالنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصنف کے حالات پر اختصار کے ساتھ کچھ باتیں عرض کردی جائیں، جیسا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب علیہ الرحمہ نے بستان المحدثین میں لکھا ہے:

''وتعریف وتوصیف ایشاں نظر بکمال شہرت فضائل ومحاسن ایشاں فضولی می نماید، لیکن بقصد تبرک وتزئین ایں رسالہ پارہ از احوال کرامت اشتمال ایشاں نگاشتہ می آید''(۱)۔

ان کے فضائل ومحاسن کے کمال شہرت کو دیکھتے ہوئے ان کی تعریف وتوصیف فضول معلوم ہوتی ہے، لیکن تبرک اور اس رسالے کی زینت کے پیش نظر ان کے احوال کرامت اشتمال کا کچھ حصہ سپرد قلم کیا جارہا ہے۔

امام دارالہجرہ مالک بن انس

امام مالک کا نسبی تعلق قبیلۂ قحطان سے تھا، آپ کا نام ونسب یوں ہے: مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمرو بن الحارث الاصبحی المدنی۔ آپ کے پردادا ابو عامر کا شمار بعض اہل علم نے صحابہؓ میں کیا ہے، لیکن دوسرے اور مستند مورخین ان کی صحابیت کے قائل نہیں ہیں۔ دادا مالک اہل علم اور کبار تابعین میں تھے، اور حضرات عمر وعثمان وطلحہ وعائشہ -رضی اللہ عنہم- سے حدیثیں روایت کی تھیں، اور ان لوگوں میں تھے جو حضرت عثمان -رضی اللہ عنہ- کی شہادت کے بعد ان کی تجہیز وتکفین میں شریک تھے۔

ولادت:

امام مالک کی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے، راجح یہ ہے کہ **۹۳ھ** میں آپ تولُّد ہوئے۔

تحصیل علم:

آپ نے اپنے زمانے کے بڑے بڑے مشایخ حدیث اور افاضل مدینہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے حدیث شریف کے حفظ وسماع کا شرف حاصل کیا، اور بہت کم مدت میں حدیث شریف کی روایت ودرایت میں منصب امامت پر فائز ہوگئے، زرقانی نے لکھا ہے کہ امام مالک نے نوسو سے زائد شیوخ سے حدیثیں سنی ہیں، اور ایک لاکھ سے زائد حدیثیں اپنے ہاتھ سے لکھی ہیں۔(۲)

(۱) بستان: ۲ (۲) دیکھئے شرح زرقانی علی الموطا: ۳/۱

تدریس وافادہ:

امام مالک سترہ برس کی عمر میں تدریس حدیث کی مسند پر رونق افروز ہوگئے، اور ان کا حلقۂ درس ان کے مشائخ کی زندگی ہی میں اُن کے درس کے حلقوں سے بڑھ گیا تھا[۱]۔ امام مالک سے اتنی بڑی تعداد نے حدیث شریف کا علم حاصل کیا کہ ذہبی نے لکھا ہے: **حدَّث عنه أمم لا يكادون يُحصَون** [۲]۔ ان سے اتنی بڑی تعداد میں لوگوں نے حدیث روایت کی ہے جو حد شمار سے باہر ہیں۔

امام مالک کے فضائل ومناقب:

آپ کے فضائل اس کثرت سے ہیں کہ ان چند صفحات میں ان کو سمیٹنا اور احاطہ کرنا دشوار ہے، ذیل میں نہایت اختصار کے ساتھ ان کے بعض فضائل وکمالات کا ذکر کیا جارہا ہے:

☆ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر مالک اور ابن عیینہ نہ ہوتے تو حجاز کا علم ضائع ہوگیا ہوتا (تذکرہ ۱؍۱۹۴)۔

☆ ابن وہب کہتے ہیں کہ اگر مالک اور لیث نہ ہوتے تو ہم گمراہ ہوگئے ہوتے (تذکرہ ۱؍۱۹۴)۔

☆ شعبہ کہتے ہیں کہ میں نافع کے انتقال کے ایک سال بعد مدینہ آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مالک کا ایک حلقۂ درس ہے (تذکرہ ۱؍۱۹۴)۔

☆ اور خود امام مالک کہتے ہیں کہ میں نے اس وقت تک فتویٰ نہیں دیا جب تک ستر آدمیوں نے یہ گواہی نہ دے دی کہ میں اس کا اہل ہوں (تذکرہ ۱؍۱۹۴)۔

☆ عبدالرحمٰن بن مہدی - جو علم حدیث کے ایک بہت بڑے امام تھے - وہ امام مالک پر کسی کو فوقیت نہیں دیتے تھے (تذکرہ ۱؍۱۹۴)۔

☆ قعنبی کہتے ہیں کہ میں سفیان بن عیینہ کی خدمت میں حاضر تھا کہ مالک کی وفات کی خبر آگئی، ابن عیینہ نے غم زدہ ہوکر کہا کہ روئے زمین پر اپنا ثانی نہیں چھوڑا (تذکرہ ۱؍۱۹۵)۔

☆ اسحاق بن ابراہیم کہتے ہیں کہ اگر سفیان ثوری، مالک اور اوزاعی کسی بات پر متفق ہوجائیں، تو وہ سنت ہے، خواہ اس باب میں کوئی نص نہ ہو (تذکرہ ۱؍۱۹۵)۔

☆ ابن مہدی کہتے ہیں کہ سفیان ثوری حدیث میں امام ہیں سنت میں نہیں؛ اوزاعی سنت میں امام ہیں، حدیث میں نہیں؛ اور مالک کو دونوں میں امامت حاصل ہے [۳] (تنویر ۱؍۳، زرقانی ۱؍۳)۔

☆ یحییٰ بن سعید قطان اور یحییٰ بن معین نے کہا ہے کہ مالک امیر المومنین فی الحدیث ہیں (تنویر الحوالک ۱؍۳)۔

---

(۱) زرقانی: ۱؍۳ (۲) تذکرۃ الحفاظ: ۱؍۱۹۴

(۳) علامہ ابن الصلاح سے امام ابن مہدی کے اس قول کا مطلب دریافت کیا گیا، تو انھوں نے جواب دیا کہ یہاں سنت سے مراد بدعت کی ضد ہے، کبھی انسان حدیث کا تو عالم ہوتا ہے مگر سنت کا نہیں ہوتا (زرقانی وتنویر ۱؍۳)۔

☆امام مالک کی بڑی فضیلت اوران کے حق میں سب سے بڑا مژدہ یہ ہے کہ مشہور حدیث: "يُوْشِكُ النَّاسُ أنْ يَّضْرِبُوْا أكْبَادَ الإبِلِ في طلبِ العلمِ، فلا يَجِدوُنَ عالِماً أعلمَ مِنْ عالِمِ المدينَةِ" کا مصداق محدث عبدالرزاق-تذکرہ ۱/۱۹۴-،اور ابن عیینہ-تنویر وزرقانی ۱/۳-نے امام مالک کو ٹھہرایا ہے۔

امام مالک کی خوش پوشاکی:

امام مالک بہت خوش لباس وخوش پوشاک تھے،اوراس چیز کو عام تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے،حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

امام مالک-رحمہ اللہ- بسیار خوش لباس می بود، جامہائے عدن کہ شہریست در یمن، وثیاب آنجا بغایت نفیس وبیش قیمت می باشد می پوشید، وجامہائے خراسان ومصر وقسم اعلی می پوشید، وغالباً لباس ایشاں سپید می بود،اکثر اوقات عطر جیدمی مالید[1]۔

امام مالک-رحمہ اللہ- بہت خوش لباس تھے،عدن کے کپڑے-جو کہ یمن میں ایک شہر ہے،اور وہاں کے کپڑے غایت درجہ عمدہ اور قیمتی ہوا کرتے ہیں-زیب تن فرماتے تھے،خراسان ومصر کے اور اعلی قسم کے کپڑے پہنا کرتے،ان کا لباس زیادہ تر سفید ہوا کرتا،اوراکثر اوقات بہترین عطر لگایا کرتے۔

سراپا حلم ووقار:

علم وفضل کے اوج کمال پر ہونے کے ساتھ رعب ودبدبہ،حلم ووقار،غیرت وحمیت اور خلق ومروت کے بھی پیکر مجسم تھے،ذہبی نے لکھا ہے:

وكان مجلسُه مجلسَ وقار وحلم وعلم، وكان رجلاً مهيباً نبيلاً، ليس في مجلسه شيء من المراء واللغط ولا رفع صوت[2]۔

اور شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

ومجلس امام مالک مجلس ہیبت ووقار بود، ہرگز شور وغوغا وآواز بلند درانجا گنجائش نداشت[3]

امام مالک کی مجلس ہیبت ووقار کی مجلس ہوا کرتی تھی،شور وغوغا اوراونچی آواز کی گنجائش ہرگز نہیں ہوتی تھی۔

امام مالک حدیث شریف کی تعلیم وتدریس وروایت کے لیے بیٹھتے تو غسل فرماتے،خوشبو لگاتے،عمدہ کپڑے پہنتے،عمامہ باندھتے،اور پورے خشوع وخضوع اور وقار کے ساتھ اپنی مسند پر جلوہ فرما ہوتے اور مجلس میں عود کی دھونی رچاتے۔یہ سب اہتمام حدیث کی تعظیم میں تھا،ان کی تعظیمِ حدیث کا یہ حال تھا کہ ایک بچھو نے درس حدیث کی مجلس میں ان کو سولہ دفعہ ڈنک مارا،جس سے آپ کا رنگ متغیر ہوتا رہا،لیکن اختتام مجلس تک آپ جوں کے

(۱) بستان المحدثین:۴ (۲) تذکرۃ:۱/۱۹۷ (۳) بستان:۴

توں بیٹھے رہے[1]۔

خشیت الٰہی:

بایں جلالت قدر ومنزلت خوف خداوندی وخشیت الٰہی کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ آپ سے خیریت پوچھی گئی، توفرمایا کہ **في عمر ينقص و ذنوب تزيد**[2] (پیمانۂ عمر گھٹتا جارہا ہے اور گناہوں کی مقدار بڑھتی جارہی ہے)

مدینہ کا احترام:

شاہ صاحب نے لکھا ہے:

گویند کہ درتمام عمر درحد حرم مدینہ منورہ قضائے حاجت نہ نمودہ، بیرون حرم می رفت، مگر در حالت مرض وضرورت[3]۔

کہتے ہیں کہ عمر بھر حرم مدینہ منورہ کی حد میں قضائے حاجت نہیں کی، بوقت حاجت حدود حرم کے باہر چلے جاتے، بجز بیماری اور سخت مجبوری کی حالت کے۔

روایت وافتا میں احتیاط:

احتیاط کا یہ حال تھا کہ بقول زرقانی آپ سے ۴۸؍مسائل کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے ۳۲؍میں کہا کہ **لا أدري**. اورفرمایا کہ عالم کو چاہئے کہ اپنے ہم نشینوں کو **لا أدري** کہنے کا عادی بنائے، تاکہ یہ چیز ان کے لیے اصل کی طرح ہو، اور بوقت ضرورت وہ اس سے مدد حاصل کریں[4]۔

وفات:

ربیع الاول ۱۷۹ھ میں تقریباً چھیاسی برس کے سن میں یہ آفتاب علم وفضل تقریباً پون صدی کی ضیا پاشی کے بعد سرزمین مدینہ میں روپوش ہوگیا۔

مُوَطَّا امام مالک:

امام مالک کی کتاب الموطا حدیث شریف کے ان مجموعوں میں شمار ہوتی ہے، جو عہد تدوین کی ابتدا میں عالم وجود میں آئی ہیں، اور اس کتاب کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے، وہ کم کسی کتاب کے حصے میں آئی ہے، یہاں تک کہ امام شافعی جیسے بزرگ امام نے اس کے بارے میں فرمایا ہے: **ما على ظهر الأرض كتاب بعد كتاب الله أصح من كتاب مالك**؛ (روئے زمین پر قرآن کریم کے بعد موطا سے زیادہ صحیح کوئی کتاب نہیں ہے)، اور علامہ مغلطائی نے کہا ہے: **أولُ مَن صنَّف الصحيحَ مالكٌ** (سب سے پہلے جس نے صحیح

---

(۱) زرقانی: ۳/۱ (۲) ایضاً (۳) بستان: ۶ (۴) زرقانی: ۳/۱

حدیثوں کو جمع کیا وہ امام مالک ہیں)[۱]۔

موطا کی وجہِ تسمیہ:

موطا توطئہ سے بنا ہے، اور توطئہ کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کو نرم اور آسان بنانا اور تیار کرنا۔ اس کتاب کا نام موطا اس وجہ سے پڑا کہ لوگوں کے لیے اس کو آسان اور سہل بنا کر پیش کر دیا ہے، چنانچہ ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم کنانی اصفہانی کہتے ہیں کہ میں نے ابوحاتم رازی سے دریافت کیا کہ موطا مالک کا نام موطا کیوں پڑا؟ تو انھوں نے جواب میں فرمایا: **شيءٌ صنَعَه ووَطَّأه للناس حتى قيل موطأ مالك كما قيل جامع سفيان**[۲] یعنی ایک چیز ہے جس کو انھوں نے تیار کیا اور لوگوں کے واسطے آسان بنا دیا، یہاں تک کہ اس کو موطا کا نام دے دیا گیا، جس طرح جامع سفیان کا نام دیا گیا۔

اس کی ایک دوسری وجہِ تسمیہ خود حضرت امام مالک سے یہ منقول ہے: **عَرَضتُ كتابي هذا على سبعين فقيهاً من فقهاء المدينة، فكلُّهم واطأني عليه فسمَّيتُه المُوطأ**[۳] یعنی میں نے اپنی اس کتاب کو مدینے کے ستر (۷۰) فقہا کی خدمت میں پیش کیا، ان سب نے مجھ سے اتفاق کیا، تو میں نے اس کا نام موطا رکھ دیا۔

موطا کی روایات:

امام مالک کی موطا کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ کسی دوسری کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔ زرقانی (ص۶) اور سیوطی (ص۹) نے حافظ صلاح الدین علائی کا یہ قول نقل کیا ہے: **روى الموطأَ عن مالك جماعاتٌ كثيرة، وبين رواياتهم اختلاف من تقديم وتأخير وزيادة ونقص** (امام مالک سے موطا کو ایک بڑے انبوہ نے روایت کیا ہے، اور ان کی روایتوں کے درمیان تقدیم وتاخیر اور کمی وبیشی کا اختلاف ہے)۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ العزیز نے اس اختلاف کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے: وتا امام در قید حیات بود، موطا مسودہ بود، ولہذا نسخ بسیار دارد و ہر نسخہ ترتیبے دیگر دارد۔[۴] یعنی امام مالک جب تک بقید حیات تھے، موطا مسودہ کی شکل میں تھی، اور اسی وجہ سے اس کے نسخے بہت زیادہ ہیں اور ہر نسخے کی ایک الگ ترتیب ہے۔

امام مالک نے اپنی ایک لاکھ مرویات میں سے موطا کی روایات کا انتخاب کیا ہے[۵]

بعض حضرات کہتے ہیں کہ موطا پہلے دس ہزار روایات کا مجموعہ تھا؛ بعض دوسرے اہل علم نے کہا ہے کہ نو ہزار کا مجموعہ تھا، پھر امام صاحب اس میں سے برابر کانٹ چھانٹ کرتے رہے، تا آنکہ علی اختلاف الاقوال پانچ سو، یا سات سو یا چار ہزار روایات باقی رہ گئیں[۶]۔

(۱) زرقانی: ۸/۱، تنویر: ۸، مسوی: ۷ (۲) زرقانی: ۷/۱، تنویر: ۶-۷ (۳) زرقانی وتنویر: ۷
(۴) بستان المحدثین: ۹ (۵) زرقانی: ۷، تنویر: ۶ (۶) دیکھئے زرقانی: ۷، تنویر: ۶، وبستان: ۹

موطا مرفوع احادیث کے علاوہ، صحابہ وتابعین کے آثار پر بھی مشتمل ہے، اور اس میں بڑی تعداد مُرسَل روایات کی بھی ہے۔

موطا کے رواۃ اور اس کے نسخے:

موطا کے راویوں کی تعداد اس قدر رہے کہ ان کے بارے میں مذکور ہے:

الرواۃ عن مالک فیھم کثرۃ بحیث لا یعرف لأحد من الأئمة رواۃ کرواتہ[1]

امام مالک کے راویوں کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ کسی دوسرے امام کے راویوں کی اتنی بڑی تعداد معلوم نہیں ہے۔

اور شاہ صاحب نے لکھا ہے:

باید دانست کہ موطا را از حضرت امام در زمان ایشاں قریب ہزار کس شنیدہ وفرا گرفتہ ونسخ آں بسیار است واز طبقات مردم فقہا ومحدثین وصوفیہ وامراء وخلفاء بطریق تبرک ازاں عالی مقام آں را سند کردہ اند[2]۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ موطا کو حضرت امام مالک سے ان کے زمانے میں ایک ہزار کے قریب لوگوں نے سنا اور اس کو جمع کیا، اور اس کے نسخے بہت ہیں، اور فقہا ومحدثین وصوفیہ وامرا وخلفا ہر طبقے کے لوگوں نے بطور تبرک اس امام عالی مقام سے اس کی سند حاصل کی۔

موطا کا موجودہ نسخہ اور اس کے راوی:

آگے شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اس وقت دیار عرب میں اس کے چند نسخے رائج ہیں، جن میں اولیت اور شہرت یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کے نسخے کو حاصل ہے، پھر یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کے نسخے کی نسبت لکھا ہے:

نسخۂ اولیٰ کہ اروج واشہر است ومخدوم طوائف علماء است نسخۂ یحییٰ بن یحییٰ مصمودی اندلسی است کہ موطا عند الاطلاق بر ہماں منطبق می شود واز لفظ موطا بے تقید متبادر می گردد[3]۔

نسخہ اولیٰ جو کہ زیادہ رائج اور زیادہ مشہور اور جماعت علما کا مخدوم ہے، یحییٰ بن یحییٰ مصمودی اندلسی کا نسخہ ہے کہ موطا مطلقاً بولنے پر اسی نسخے پر منطبق ہوتا ہے۔

یحییٰ کا پورا نام ونسب:

یحییٰ بن یحییٰ بن کثیر بن وسلاس ابو محمد لیثی اندلسی ہے[4]۔

مصمود ان کے قبیلے کا نام تھا جس کی طرف نسبت کر کے مصمودی کہا جاتا ہے[5]، ان کے اجداد میں ایک شخص 'منقایا' نام کے تھے، جو حلقہ اسلام میں داخل ہوئے تھے، ان کا قبول اسلام یزید بن عامر لیثی کے ہاتھ پر ہوا

(۱) تنویر: ۱۰، زرقانی: ۵-۴ (۲) بستان: ۱۰ (۳) ایضاً (۴) تنویر: ۱۲ (۵) بستان: ۱۰

تھا، اس لیے بطریق ولاء ''لیثی'' بھی کہا جاتا ہے(۱)۔

یحییٰ کی وفات رجب ۲۳۴ھ میں ہوئی۔ شاہ صاحب نے یہ تفصیل لکھی ہے:

وفات یحییٰ در ماہ رجب در سنہ دوصد وسی و چہار واقع شدہ، وعمر او ہشتاد و دو سال بود، قبر او در قرطبہ است، مردم در وقت قحط باوی استسقا می کنند و تبرک می خواہند(۲)۔

یعنی یحییٰ کی وفات رجب ۲۳۴ھ میں بیاسی (۸۲) برس کی عمر میں ہوئی، ان کی قبر قرطبہ میں ہے، لوگ قحط کے وقت ان کے وسیلے سے استسقا کی دعا کرتے ہیں اور تبرک چاہتے ہیں۔

مغرب میں مذہب امام مالک کے شیوع کا بہت بڑا ظاہری سبب یحییٰ بن یحییٰ کی شاگردی اور ان کے نسخے کی اشاعت کو بھی حاصل رہا ہے، شاہ صاحب نے ابن بشکوال کے حوالے سے لکھا ہے:

یحییٰ بن یحییٰ مستجاب الدعوۃ بود، ودر وضع لباس ونشست و برخاست وہیئت ظاہری نیز تتبع حضرت امام مالک می نمود، وآنچہ از امام مالک شنیدہ بود بموجب آں فتوی می داد، ہرگز بخلاف مذہب امام مالک راضی نمی شد، حالانکہ درآں زمان تقیید بیک مذہب رائج نبود، نہ در عوام نہ در خواص(۳)۔

یحییٰ بن یحییٰ مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ لباس کی ساخت، نشست و برخاست اور ظاہری ہیئت میں بھی حضرت امام مالک کا تتبع کیا کرتے تھے، اور جو امام مالک سے سنا ہوتا، اسی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے، مذہب امام مالک کے خلاف پر ہرگز راضی نہ تھے، حالانکہ اُس زمانے میں کسی ایک مذہب کی پابندی کا رواج نہیں ہوا تھا، نہ عوام میں نہ خواص میں۔

علامہ اعظمیؒ کا ترجمہ

علامہ اعظمیؒ نے جہاں حدیث پاک کے مختلف قلمی نسخوں اور قدیم ترین مجموعوں کے اِحیا اور ان کی اشاعت کی خدمت انجام دی، اسی طرح اللہ رب العزت نے اس بلند پایہ کتاب کے ترجمہ کی سعادت بھی آپ کے حق میں مقدر فرمائی، اور آپ کے صحیفۂ حیات میں اس اہم اور جلیل القدر کتاب کی خدمت کا سنہرا باب بھی لکھ دیا گیا۔ 'موطا' کا ترجمہ علامہ اعظمیؒ کی ایسی خاموش خدمتِ حدیث ہے، جس کا کم لوگوں کو علم ہے، حالانکہ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ کسی صاحب علم کے نام کو باقی اور زندہ رکھنے کے لیے کوئی دوسری علمی خدمت نہ ہو تو یہی ایک کام کافی ہے۔ ترجمہ کا کام کتنا مشکل اور اہم ہوتا ہے اس کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جن کو اس سے سابقہ پڑا ہو، خاص طور سے احادیث وآثار کی کتابوں کا ترجمہ کرنا اور اس کو نبھانا اور مشکل ہوتا ہے، اس طرح استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ اتنے اہم مجموعۂ حدیث کا ترجمہ بلاشبہہ ایک ناقابلِ فراموش علمی و تصنیفی خدمت ہے۔

بجز ابتدائی چند اوراق کے اس کتاب کا پورا ترجمہ علامہ اعظمیؒ کے قلم کا لکھا ہوا اور آپ کا تحریر کردہ آپ

(۱) بستان: ۱۱ (۲) بستان: ۱۵ (۳) ایضاً: ۱۳

کے باقیات صالحات میں محفوظ ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے پوری کتاب کے ترجمہ کا کام انجام دیا ہے، لیکن شروع کے چند اوراق مفقود ہیں، ابتدا کی ۲۲/روایات کے ترجمہ کو چھوڑ کر پورا مسودہ محفوظ ہے۔ اس وقت جو حصہ موجود ہے، اس میں ''نماز سے سو جانے کا بیان'' سے پہلے کی ایک روایت کے ترجمہ سے شروع ہوتا ہے، اس کے بعد ختم کتاب تک بغیر کسی انقطاع کے پوری کتاب کا ترجمہ ہے۔ موجودہ مسودہ جہاں سے شروع ہوتا ہے، وہ یہ ہے:

''نافع کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ پر ایسی بے ہوشی طاری ہوئی کہ ان کی عقل جاتی رہی، پس انھوں نے نماز کی قضا نہ پڑھی۔ امام مالک کہتے ہیں کہ ہماری رائے میں قضا نہ پڑھنا اس سبب سے تھا کہ وقت نماز (بے ہوشی میں) جاتا رہا تھا، لیکن جو شخص وقت کے اندر ہوش میں آجائے، وہ نماز پڑھے گا''۔

یہ روایت موطا میں اس طرح ہے: **مالک عن نافع أن عبد الله بن عمر أُغمِيَ عليه، فذهب عقله، فلم يقضِ الصلوة. قال مالك: وذلك فيما نرى -والله أعلم- أنَّ الوقتَ ذهبَ، فأما من أفاق وهو في وقت، فإنه يُصلي.**

مذکورہ بالا حصہ ''**جامع الوقوت**'' کا آخری ٹکڑا ہے، اور جامع الوقوت کا باب تقریباً نصف صفحے پر مشتمل ہے، موطا میں اس باب سے پہلے چار ابواب اور بھی ہیں، جن کے تحت ۲۲/احادیث وآثار ہیں، جو تین صفحات میں ہیں، اتنے حصے کا ترجمہ موجودہ مسودے سے ساقط ہے، جو میرے خیال میں دستبرد زمانہ کا شکار ہو گیا ہے۔

ترجمے کا جو حصہ محفوظ ہے، وہ مذکورہ بالا عبارت سے شروع ہوتا ہے، اس کے بعد یہ باب ہے: ''نماز سے سو جانے کا بیان''، اس باب کا عنوان موطا میں ''**النوم عن الصلوة**'' ہے۔

ترجمہ کا اسلوب:

۱- پہلی قابل ذکر بات یہ ہے کہ علامہ اعظمیؒ نے سلسلۂ سند کے ابتدائی حصوں کو ترجمہ سے حذف کر دیا ہے، اور آخری ناموں کو ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے، مثلاً ایک روایت امام مالک اپنی سند سے ذکر کرتے ہیں، جس کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں، تو امام مالک سے لے کر اوپر تک کے تمام ناموں کو حذف کر دیتے ہیں، صرف حضرت ابوہریرہؓ یعنی راوی اول کا نام ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۲- دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہم نے اوپر جو ترجمہ نقل کیا ہے، اور اس کے بعد اصل روایت ذکر کی ہے، اس سے ناظرین نے اتنا ضرور اندازہ کر لیا ہوگا کہ کتاب کا ترجمہ لفظی نہیں کیا گیا ہے، بلکہ بامحاورہ ترجمہ پر توجہ مرکوز کی گئی ہے، اور جس زبان کی طرف کتاب کو منتقل کیا جا رہا ہے، اس کے انداز واسلوب کو بھی ملحوظ خاطر اور مدنظر رکھا گیا ہے۔ ذیل میں نمونہ کے طور پر کچھ ترجمے مع اصل روایت کے نقل کیے جا رہے ہیں، جس سے ترجمہ کی سلاست اور شگفتگی کا اندازہ کیا جا سکے گا۔

☆......: وضوء النائم إذا قام إلى الصلوة کے باب میں پہلی روایت یہ ہے:مالک عن أبي الزناد، عن الأعرج، عن أبي هريرة أنَّ رسول الله ﷺ قال: إذا استيقظ أحدكم من نومه فليغسل يده قبل أن يُدخلها في وَضوئه، فإنَّ أحدكم لا يدري أين باتت يده.

ترجمہ:-حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: جب تم سے کوئی نیند سے بیدار ہو، تو اپنے ہاتھ کو وضو کے پانی میں ڈالنے سے پہلے دھولے، اس لیے [کہ] تم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اس کا ہاتھ رات بھر کہاں رہا ہے۔

☆......: اسی باب کے آخر میں یہ روایت ہے: مالک عن نافع، عن ابن عمر أنه كان ينام جالساً ثم يُصلي ولا يتوضَّأ.

ترجمہ:-نافع حضرت ابن عمر سے ناقل ہیں کہ وہ بیٹھے بیٹھے سوجاتے پھر بے وضو کیے نماز پڑھتے۔

☆......: الطهور للوضوء کے باب میں یہ روایت ذکر کرتے ہیں: مالک، عن صفوان بن سليم، عن سعيد بن سلمة من آل بني الأزرق، عن مغيرة بن أبي بردة وهو من بني عبد الدار أنه أخبره أنه سمع أبا هريرة يقول: جاء رجل إلى رسول الله ﷺ فقال: يا رسولَ الله إنا نركب البحر ونحمل معنا القليل من الماء، فإن توضَّأنا به عطِشنا، أفَنَتَوَضَّأُ من ماءِ البحر؟ فقال رسول الله ﷺ: هو من ماء البحر، فقال رسول الله ﷺ: هو الطَّهورُ ماؤُه، الحلُّ ميتته.

ترجمہ:-حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول خدا ﷺ - کے پاس آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! ہم دریا میں (جہازوں پر) سوار ہوتے ہیں، اور اپنے ساتھ تھوڑا (شیریں) پانی بار کر لیتے ہیں، پس اگر اسی سے وضو بھی کریں تو پیاسے رہ جائیں گے، لہذا سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟ حضور نے فرمایا: سمندر کا پانی پاک کنندہ اور اس کا مردار (مچھلی) حلال ہے۔

☆......: ما جاء في بول الصبي کے باب میں امام مالک اپنی سند سے حضرت عائشہ کی یہ حدیث روایت کرتے ہیں: عن عائشة زوج النبي ﷺ أنها قالت: أُتِي رسولُ الله ﷺ بصبي فبال على ثوبه، فدعا رسولُ الله ﷺ بماءٍ فأَتْبَعَه إياه.

ترجمہ:-حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کے پاس ایک بچہ حاضر کیا گیا، (اتفاق سے) اس بچے نے حضور کے جامۂ اطہر پر پیشاب کر دیا، آپؐ نے پانی منگا کر اس کو پیشاب کے پیچھے بہادیا۔

☆......: کتاب الرضاعۃ میں روایت ہے:عن عمرة بنت عبدالرحمن أنَّ عائشةَ أُمَّ المؤمنين أخبرتها أن رسول الله ﷺ كان عندها وأنها سمعت صوت رجل يستأذن في بيت حفصة، قالت عائشة: فقلت: يا رسول الله! هذا صوت رجل يستأذن في بيتک، فقال رسول الله ﷺ: أُراه فلاناً لعمٍّ لحفصة من الرَّضاعة، قالت عائشةُ: يا رسول الله لو كان فلان حياً لِعمٍّ لها من

الرضاعة دخل عليَّ، فقال رسول الله ﷺ: نعم إنَّ الرضاعة تحرِّمُ ما تُحرِّمُ الولادة.

ترجمہ:- حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ میرے پاس تھے کہ میں نے ایک آدمی کی آواز سنی، جو حفصہ کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت مانگ رہا تھا، میں نے کہا یا رسول اللہ! یہ ایک مرد کی آواز ہے جو آپ کے گھر میں جانے کی اجازت مانگتا ہے، آنحضرت نے حضرت حفصہ کے رضاعی چچا کا نام لے کر فرمایا کہ میں اس کو فلاں آدمی سمجھتا ہوں؛ تو میں نے اپنے رضاعی چچا کا نام لے کر پوچھا کہ یا رسول اللہ فلاں زندہ ہوتا، تو وہ مجھ پر داخل ہو سکتا تھا؟ آنحضرت نے فرمایا ہاں! بے شک رضاعت حرام کرتی ہے اس چیز کو جس کو ولادت حرام کرتی ہے۔

☆......: اسی باب میں ہے: **مالک عن يحيى بن سعيد أنه قال: سمعت سعيد بن المسيب يقول: لا رضاعة إلا ما كان في المهد، وإلا ما أنبتَ اللحم والدم.**

ترجمہ:- سعید بن المسیب فرماتے تھے کہ رضاعت تو بس وہی ہے جو گہوارہ میں ہو اور جو گوشت اور خون پیدا کرے۔

☆ کتاب کے آخر میں **ما جاء في طلب العلم** کا باب ہے، اس باب کی حدیث یہ ہے: **مالك أنه بلغه أن لقمان الحكيم أوصى ابنه، فقال: يا بُنَيَّ! جالِسِ العلماءَ وزاحِمهم بركبتيك، فإنَّ الله يُحيي القلوبَ بنور الحكمة كما يُحيي الأرضَ الميتةَ بوابل.**

ترجمہ:- لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ اے بیٹے! علماء کی ہم نشینی اختیار کر، اور ان سے اپنے گھٹنے ملا کر بیٹھ، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ حکمت کی روشنی سے دلوں کو اس طرح زندہ کرتا ہے، جس طرح مردہ زمین کو بارش کے قطروں سے۔

ضروری الفاظ وکلمات اور مقامات کی تشریح:

۱-: علامہ اعظمیؒ نے الفاظ کے صرف ترجمہ پر نہیں اکتفا کیا ہے، بلکہ جہاں جہاں ضرورت محسوس کی ہے، الفاظ یا عبارتوں کی تشریح بھی کی ہے، تاکہ مفہوم بخوبی واضح ہو سکے، ترجمے کے جو نمونے اوپر نقل کیے گئے ہیں، ان میں قارئین نے دیکھا ہوگا کہ بہت سی جگہوں پر ہلالین میں کچھ الفاظ کا اضافہ ہے، یہ اضافہ علامہ اعظمیؒ نے روایات کی توضیح وتشریح کے لیے کیا ہے، اور ہر جگہ اس کو ہلالین میں رکھا ہے، تاکہ اصل روایت سے تمیز ہو سکے، تشریحات کے کچھ نمونے ہدیۂ ناظرین ہیں:

☆......: **ما لا يجب فيه الوضوء** کے باب میں ایک روایت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے سعید بن زید کے ایک مردہ لڑکے کو حنوط ملا اور اس کو گود میں اٹھایا پھر مسجد میں داخل ہوئے اور بے وضو لوٹائے نماز پڑھی (معلوم ہوا کہ مردہ کو چھونے اور اٹھانے سے وضو نہیں جاتا)۔

☆......: **جامع الوضوء** کی آخری روایت سے پہلے جو روایت ہے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

سعید بن المسیب سے پانی سے آبدست لینے کی نسبت پوچھا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ یہ عورتوں کا استنجا ہے (مراد یہ ہے کہ مَردوں کے لیے ڈھیلے بھی کافی ہیں، اگرچہ پانی افضل ہے)۔

☆......: **الرخصة في الصلوة في الثوب الواحد** کی پہلی حدیث کا ترجمہ اور اس کے ایک لفظ ''اشتمال'' کی تشریح ملاحظہ ہو:

حضرت عمر بن ابی سلمہ کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کو حضرت ام سلمہؓ کے گھر میں ایک کپڑے میں اس کے دونوں کناروں کو دونوں شانوں پر ڈال کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا (چادر کو کندھے پر رکھ کر اس کا بایاں کنارہ بائیں ہاتھ کے نیچے نکال کر داہنے شانے پر، اور داہنا کنارہ داہنے ہاتھ کے نیچے نکال کر بائیں شانے پر ڈال لیا جائے، تو اس ہیئت کو عربی میں اشتمال کہتے ہیں، اسی ہیئت سے آنحضرتؐ نے نماز پڑھی تھی)۔

۲-: کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ تشریح کسی کتاب سے منقول ہے، تو ہلالین میں ہی اس کتاب کا حوالہ بھی دے دیا ہے، مثلاً:

☆......: **الطهور للوضوء** کی آخری روایت کا ترجمہ مع تشریح یہ ہے:

حضرت ابن عمر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں عورت مرد یکجا وضو کرتے تھے (یعنی مرد اپنی بی بی یا اپنے محارم کے ساتھ ایک ظرف میں وضو کرتا تھا ۱۲، مصفی)۔

اس طرح حدیث شریف کی اس اہم اور بلند پایہ کتاب کا ضروری تشریحات کے ساتھ بہترین بامحاورہ اور شگفتہ ترجمہ انجام دیا گیا ہے۔

زمانۂ ترجمہ:

علامہ اعظمیؒ نے اس کتاب کے ترجمہ کا کام ۱۳۵۳ھ میں انجام دیا ہے، اس کے ختم پر یہ عبارت تحریر فرمودہ ہے:

تـم الـكتـاب بـعون الله الوهاب، والحمد لله حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه، وصلَّى الله عـلـى نبيه وصفيه محمد صلى الله عليه وسلم وعلى آله وصحبه أجمعين وعلى من تبعهم إلى يوم الدين.

وأنا عبده الفقير إليه:
حبیب الرحمٰن الاعظمی
صبیحہ یکم شوال معظم/۱۳۵۳ھ، مئو۔

اس اختتامی عبارت میں یکم شوال کے بعد کاغذ کا کچھ ٹکڑا پھٹا ہوا ہے، جس پر کچھ اور بھی تحریر تھا، چند حروف کٹے ہوئے باقی ہیں، جن سے پورا لفظ/ یا الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے ہیں۔

☆......☆......☆......☆......☆

'انتقاء الترغیب والترھیب'
کا اردو ترجمہ

علامہ اعظمیؒ کو حافظ ابن حجر کے تلخیص واختصارِ ترغیب وترہیب کے ساتھ خاص لگاؤ تھا، چنانچہ جہاں آپ نے اس کو تصحیح وتعلیق کے ساتھ شائع کیا، وہیں اس کی افادیت کو عام کرنے کے لیے اردو زبان میں اس کے ترجمہ کا بھی عمل شروع کیا، آپ کے مزاج میں چونکہ زہد وورع اور دنیا سے بے رغبتی رچی بسی تھی، اور آپ مسلمانوں کو علائق دنیا میں گرفتار اور آخرت سے غافل نہیں دیکھنا چاہتے تھے، اس لیے اس قسم کی کتابوں کی اشاعت سے مسلم سوسائٹی اور معاشرے میں اصلاح وتزکیہ کا ماحول دیکھنا اور بنانا چاہتے تھے، آپ کے مواعظ اور خطابات بھی ان ہی قسم کی نصیحتوں اور اصلاحی باتوں سے معمور رہا کرتے تھے۔ اس کتاب کے ساتھ دلچسپی کا اندازہ مولانا محمد موسی میاں کو لکھے ہوئے ایک خط سے ہوتا ہے، جو ۱۴؍رمضان المبارک ۱۳۷۸ھ کا مکتوب ہے، اس میں رقم طراز ہیں:

> اسی کے ساتھ ایک کتاب قلمی حافظ ابن حجر کی 'ترغیب وترہیب' نظر آئی، یہ کتاب حافظ منذری کی 'ترغیب وترہیب' کا اختصار ہے، اس کو میں نے عاریۃً حاصل کیا ہے، اس کا ترجمہ لکھنے کا خیال ہے، مجھ کو بہت پسند آئی ہے، اور خیال ہوتا ہے کہ ترجمہ کے ساتھ شائع ہو جائے تو مسلمانوں کو ان شاء اللہ بہت نفع ہوگا، ستر اسی حدیثوں کا ترجمہ ہو چکا ہے، اور سلسلہ جاری ہے، چھوٹی تقطیع پر ساڑھے تین سو صفحات ہوں گے (گنے نہیں ہیں)۔''

افسوس ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ پورا نہیں ہو سکا، ورنہ ایک اہم علمی ودینی واصلاحی کام انجام پذیر ہوا ہوتا، ہم کو جتنے حصے کے ترجمہ کا مسودہ آپ کے اوراق میں دستیاب ہو سکا ہے، اس میں شروع کتاب سے لے کر ''**الترغيب في المشي إلى المساجد**'' تک کا ترجمہ موجود ہے، جس میں چھیاسی (۸۶) روایات ہیں، جبکہ کتاب میں کل ۸۵۸ روایات ہیں، یعنی صرف دسویں حصے کا ہی ترجمہ ہوا ہے، اور میرا خیال ہے کہ اتنا ہی ترجمہ کیا جا سکا ہے، اس کے بعد کوئی دوسری مشغولیت مانع بن گئی، اور یہ چیز نامکمل اور تشنہ رہ گئی۔

ترجمہ کا اسلوب اور تشریح:

اس کتاب کے ترجمہ میں بھی علامہ اعظمیؒ نے وہی طریقہ اختیار کیا ہے، جو اوپر 'ترجمۂ موطا' کے تحت ذکر کیا جا چکا ہے، اس میں بھی آپ نے لفظی ترجمہ کی پابندی نہ کر کے اس کا بامحاورہ اور مطلب خیز ترجمہ کیا ہے، اور اس میں بھی اسی طرح تشریح طلب الفاظ وکلمات یا مقامات کی ساتھ ساتھ تشریح کی ہے، اور اس کو ہلالین میں رکھ کر

متن حدیث کے ترجمہ سے ممتاز اور نمایاں کیا ہے۔

حافظ ابن حجر کی یہ کتاب علامہ اعظمیؒ کی تصحیح وتحقیق اور تعلیقات سے آراستہ ہو کر شائع چکی ہے، اس کے شروع میں آپ کا جو مقدمہ ہے، جس میں کتاب اور مصنف کتاب اصل الترغیب والترہیب کے مصنف علامہ منذری اور اس کا اختصار کرنے والے حافظ ابن حجر عسقلانی کا مختصر تذکرہ وتعارف ہے، اس میں وہ سب نہیں ہے؛ جہاں سے اصل کتاب شروع ہوتی ہے، وہیں سے ترجمہ شروع کیا گیا ہے۔ ذیل میں اس کے کچھ نمونے مع اصل روایت نقل کیے جارہے ہیں، یہ کتاب 'كتاب الإخلاص' سے شروع ہوتی ہے، اور اس کی سب سے پہلی حدیث یہ ہے:

☆......: **عن أبي كَبْشَةَ الأنماري قال: قالَ رسولُ الله ﷺ: مَثَلُ هذه الأمَّةِ كَمَثَلِ أربعةِ نَفَرٍ: رجلٍ آتاه الله مالاً وعلماً فَهُوَ يعمَلُ بعلمِه في ماله فَيُنْفِقُه في حقِّه، ورجُلٍ آتاه الله علماً ولم يُؤتِه مالاً، فهو يقول: لو كان لي مثلُ هذا عملتُ فيه مثلَ الذي يعمَلُ. قال رسول الله ﷺ: فهما في الأجر سواء. ورجلٍ آتاه الله مالاً ولم يُؤته علما، فهو يخبط في ماله، يُنفِقُه في غير حقه، ورجلٍ لم يُؤته الله علماً ولا مالاً فهو يقولُ: لو كان لي مثلُ هذا، عملتُ فيه مثلَ الذي يعمل. قال رسول الله ﷺ: فهما في الوِزرِ سواءٌ. أخرجه الترمذي في أثناء حديث وصححه، وأحمد وابن ماجه واللفظ له، وأخرجه أبوعوانة في صحيحه وهو من زياداته على مسلم.**

ترجمہ:- ابو کبشہ انماری کہتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: اس امت کی مثال چار شخصوں کی سی ہے (۱) ایک شخص ہے کہ اس کو اللہ تعالی نے مال اور علم دونوں دیے ہیں اور وہ اپنے مال میں اپنے علم کے مطابق عمل کرتا ہے، پس جہاں خرچ کرنے کا حق ہے وہاں خرچ کرتا ہے، (۲) اور ایک شخص ہے جس کو اللہ نے علم دیا ہے مگر مال نہیں دیا ہے، تو وہ کہتا ہے کہ اگر میرے پاس بھی اس کی طرح مال ہوتا تو میں بھی اسی کی طرح کرتا (یہ کہہ کر) حضرت نے ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں آدمی اجر وثواب میں برابر ہیں، (۳) اور ایک شخص ایسا ہے جس کو اللہ نے مال دیا ہے، اور علم سے وہ محروم ہے، لہذا اپنے مال میں وہ خوب گڑبڑ کرتا ہے اور جہاں خرچ کرنے کا حق نہیں ہے وہاں خرچ کرتا ہے، (۴) اور ایک شخص ہے جس کو خدا نے نہ علم دیا ہے نہ مال، مگر وہ کہتا ہے کہ میرے پاس بھی اس کی طرح مال ہوتا، تو میں بھی اسی کی طرح کرتا۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں گناہ میں برابر ہیں۔ اس حدیث کو ترمذی، احمد، ابن ماجہ اور ابوعوانہ نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے۔

(فائدہ):- چوتھا شخص تیسرے کے برابر اس لیے قرار دیا گیا کہ ہاتھ میں پیسا نہ ہونے کی وجہ سے اس کا بس نہ چلا، ورنہ گناہ کرنے کا وہ پختہ ارادہ رکھتا تھا، یہ بات نہیں ہے کہ وہ اللہ کے خوف اور لحاظ سے باز رہا ہو۔

☆......: دوسری حدیث یہ ہے: **وعن ابن عباسٍ رضي الله عنهما أن رسولَ الله ﷺ قال فيما يروي عن ربه عز وجل: إنَّ الله تعالى كتب الحسناتِ والسيئاتِ ثُمَّ بيَّن ذلک، فمن همَّ بحسنةٍ فلم يعمَلها كتب الله عنده حسنةً كاملة، فإن همَّ بها فعملها كتبها الله عنده عشر**

حسناتٍ إلى سبع مائة ضعفٍ إلى أضعافٍ كثيرة، ومن همَّ بسيئة فلم يعمَلها كَتبها الله عنده حسنة كاملة، وإن هو همَّ بها فعملها كتبها الله عنده سيئةً واحدةً، متفق عليه وفي رواية كتبها الله سيئة أو محاها. ولا يَهْلِكُ على اللهِ إلاَّ هالِكٌ.

ترجمہ:- حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے رب عز وجل کا ارشاد بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نیکیوں اور برائیوں کو لکھا ہے، پھر اپنے نوشتہ میں (اس کا ضابطہ) یوں بیان کیا ہے کہ جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے مگر کر نہ پائے، تو اس کو اللہ ایک پوری نیکی لکھتا ہے؛ اور اگر ارادہ کرے اور کر بھی لے، تو دس نیکیاں، سات سونیکیوں تک بلکہ اس سے بہت زیادہ لکھتا ہے۔ اور جو شخص کسی بدی کا ارادہ کرے مگر اس کا ارتکاب نہ کرے (یعنی خدا کے خوف ولحاظ کی وجہ سے گناہ سے باز ہے جیسا کہ حدیث نمبر ۳ میں یہ بات صاف کر دی گئی ہے) تو اللہ اپنے پاس اس کو ایک پوری نیکی لکھتا ہے؛ اور اگر بدی کا ارادہ کر کے اس کا ارتکاب کرے، تو اللہ اپنے پاس اس کو ایک بدی لکھتا ہے، یا (اس کی مرضی ہوتی ہے تو) اس کو مٹا دیتا ہے اور خدا کے یہاں کوئی بڑا ابد بخت ہی ہلاک ہوتا ہے (کیونکہ اس کی رحمت بڑی وسیع ہے)۔

☆...... تیسری حدیث یہ ہے: **وعن أبي هريرة ﷺ أنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قال: يقول اللهُ عزَّ وجلَّ: إذا أرادَ عبدي أن يعملَ سيئةً فلا تَكْتُبوها عليه حتى يَعمَلَها، فإنْ عمِلَها فاكتُبوها مثلَها، وإنْ ترَكَها مِنْ أَجْلي فاكتبوها له حسنةً، وإذا أرادَ أن يَّعمَلَ حسنة فلمْ يعملْها فاكتُبوها له حسنةً، فإنْ عملَها فاكتبوها له بعشر أمثالها إلى سبع مائة. متفق عليه واللفظ للبخاري.**

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہؓ نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کہ میرا بندہ جب کسی برائی کا ارادہ کرے تو اس کو اس وقت نہ لکھو جب تک کر نہ لے، اور جب کر لے تو ایک برائی لکھ لو، اور اگر میری وجہ سے (میرے ڈر سے) باوجود ارادہ کے برائی نہ کرے تو اس کو ایک نیکی لکھ لو؛ اور جب کسی نیکی کا ارادہ کر کے نہ کرے تو اس کو بھی ایک نیکی لکھو اور اگر نیکی کر لے تو اس کو دس گُنے سے لے کر سات سو گُنے تک لکھو (بخاری ومسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جب میرا بندہ کوئی نیکی کی بات اپنے جی میں کرتا ہے تو جب تک نہیں کیا ہے، میں اس کو ایک نیکی لکھتا ہوں، اور جب کر لیتا ہے تو اس کو دس گُنا لکھتا ہوں۔

☆...... تیرہویں حدیث یہ ہے: **وعن العِرْباضِ بن ساريةَ قال: وَعَظَنا رسولُ اللهِ ﷺ [فذَكَرَ الحديثَ] وفيه: فَعَلَيْكُم بِسُنَّتي وسُنَّةِ الخُلَفاءِ الرَّاشِدينَ المَهْدِيِّينَ عَضُّوا عَلَيْها بالنَّواجِذِ وإيَّاكُمْ ومُحْدَثاتِ الأُمُوْرِ، فإنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلالَةٌ. رواه الأربعة إلا النسائي وصححه الترمذي وابن حبان.**

ترجمہ:- عرباض بن ساریہ نے بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے (ایک دن) ہم کو وعظ فرمایا، اس وعظ میں یہ بھی تھا کہ تم میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو اپنے اوپر لازم کرو اور اس کو دانتوں سے پکڑو، اور نئے

نکالے ہوئے کاموں سے دور رہو، اس لیے کہ ہر بدعت گمراہی ہے (ترمذی، ابوداود، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان)۔

(فائدہ):- بدعت سے وہ کام مراد ہے جس کی صحیح دلیل یا نظیر شریعت میں نہ ہو، ایسا ہر کام گمراہی ہے؛ اور جس کی کوئی اصل صحیح یا نظیر موجود ہو وہ شرعاً بدعت نہیں ہے۔

☆......: تیئیسویں حدیث یہ ہے: عن جريرِ بنِ عبدالله ﷺ قال: كُنّا في صَدرِ النَّهارِ عندَ رسولِ الله ﷺ، فجاءَ قومٌ [فذكر الحديث] فقال رسولُ الله ﷺ: مَنْ سَنَّ في الإسلامِ سُنَّةً حسنةً فله أجرُها وأجرُ مَنْ عَمِلَ بها مِنْ بَعده مِنْ غَيرِ أنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُورِهِمْ شيءٌ، ومَنْ سَنَّ في الإسلامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كانَ عَلَيه وِزرُها ووِزرُ مَنْ عَمِلَ بِها مِنْ غيرِ أن يَنْقصَ مِنْ أوزارِهم شيءٌ. أخرجه مسلم والأربعة إلا أباداود. وعند أحمد والحاكم نحوه من حديث حذيفة بلفظ مَنْ سَنَّ خيراً فاستُنَّ به، وعندالطبراني من حديث واثلة بن الأسقع بلفظ: فله أجرها ما عمل بها في حياته وبعد مماته حتى تُترك، وزاد: مَنْ ماتَ مُرَابِطاً جَرى عَلَيه عملُ المرابطِ حتى يبعث يوم القيامة.

ترجمہ:- حضرت جریر بن عبداللہؓ نے بیان کیا کہ ہم دن کے شروع میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ کچھ (خستہ حال) لوگ آئے، پس آپ نے (ان کی امداد کی تحریک کرتے ہوئے) فرمایا کہ جو شخص اسلام میں عمدہ سنت کا اجرا کرے (یا کسی ایسے طریقہ کی بنیاد ڈالے جس کا اچھا ہونا شرعی دلائل سے ثابت ہو) تو اس کو اس سنت کے اجراء کا اور جو لوگ اس کے بعد اس پر عمل کریں گے ان سب کا ثواب اس کو ملے گا، بغیر اس کے کہ عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی ہو؛ اور جو شخص اسلام میں کسی برے طریقہ کا اجراء کرے گا، اُس پر خود اپنے گناہ کے کے بوجھ کے علاوہ دوسرے عمل کرنے والوں کے گناہوں کا بوجھ بھی ہوگا بغیر اس کے کہ عمل کرنے والوں کے بوجھ میں کوئی کمی ہو (مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)۔ یہ حدیث مسند احمد و مستدرک حاکم میں الفاظ کے تھوڑے تغیر سے بروایت حضرت حذیفہ مروی ہے۔ اور طبرانی نے حضرت واثلہ بن الاسقع کے الفاظ میں یوں روایت کیا ہے کہ (جو اچھی سنت جاری کرے گا) اس کی زندگی میں اور مرنے کے بعد جب تک اس پر عمل ہوتا رہے گا، اس کو ثواب ملتا رہے گا، یہاں تک کہ وہ سنت (خدانخواستہ) متروک ہو جائے۔ اس روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ جو مرابط ہونے کی حالت میں مرے گا اس کو قیامت تک مرابط کا ثواب ملتا رہے گا (مرابط اس کو کہتے ہیں جو اسلامی حکومت کی سرحد کی حفاظت کے لیے کہ کوئی دشمن حملہ آور نہ ہو سرحد پر حفاظت کے ساز و سامان کے ساتھ قیام کرے)۔

مذکورہ بالا نمونوں سے یہ بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ صاف و شستہ اور شگفتہ ترجمہ کے ساتھ بقدر ضرورت تشریح و توضیح کا بھی کس قدر اہتمام برتا گیا ہے۔ اور ضرورت محسوس ہونے پر حدیث کے فوائد بیان کرنے پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ ۱۳۷۸ھ = ۱۹۵۹ء کا کیا ہوا ہے، جیسا کہ اس مکتوب مبارک سے معلوم ہو چکا ہے، جو شروع میں درج کیا گیا ہے۔☆......☆

لغات حدیث

(اردو)

غریب الحدیث علم حدیث کے فنون میں ایک نہایت اہم فن ہے، اور اس پر علماء اسلام نے بہت سی کتابیں تالیف کی ہیں، اردو زبان بھی اس مبارک فن پر تصنیف وتالیف سے محروم نہیں ہے۔ اس میں حدیث میں وارد ہونے والے غریب اور نامانوس الفاظ کی تفسیر وتوضیح کی جاتی ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کام کو شروع کیا، لیکن افسوس کہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا، اور جتنا حصہ انجام دیا گیا ہے، اس کو دیکھنے کے بعد یہ افسوس اور بڑھ جاتا ہے کہ کاش یہ کام مکمل ہو گیا ہوتا، تو اساتذہ وطلبۂ علوم نبوت کے لیے نہایت مفید اور کارآمد کتاب تیار ہوگئی ہوتی، لیکن اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ: ع

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

ذیل میں اس کتاب کے کچھ نمونے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیے جارہے ہیں:

أبجر: جس کی ناف اونچی اور سخت ہو۔

أبـدَّ يـدَه إلـى الارض: اپنا ہاتھ زمین کی طرف بڑھایا۔

أبدَّ بصرَه إلى السواك: سواک کی طرف اپنی نظر جمائی۔

أبدال: بدل کی جمع، اولیا اور عبادت گذاروں کی ایک نوع، ان کو ابدال اس لیے کہتے ہیں کہ جب ان میں سے کوئی مرتا ہے، تو اس کی جگہ دوسرا لے لیتا ہے۔

أبـرِقـوا: موٹے جانور کی قربانی کرو، یا ایسے بھیڑ بکرے کی قربانی کرو جس کے سفید اون اور بالوں میں جگہ جگہ سیاہ بھی ہو۔

ابتَسَرتُ: میں نے شروع کیا، **كان إذا نهض في سفره قال: اللهُمَّ بك ابتَسَرتُ**: جب اپنے سفر میں اٹھتے تھے تو فرماتے: اے اللہ میں نے اپنا سفر تیرے ساتھ شروع کیا، جب کسی چیز کو تازہ تازہ لیں تو کہتے ہیں: **بَسَرتُ و ابتَسَرتُ**. اس کو انتشرت بھی روایت کیا گیا ہے (میں متحرک ہوا چلا)۔

اَبَشُّ: زیادہ بشاش، **إذا اجتمع المسلمان فتذاكرا غفر الله لأبَشِّهما بصاحبه**. جب دو مسلمان اکٹھا ہو کر بات چیت کریں، تو ان میں سے جو زیادہ بشاشت وخوش دلی سے ملے گا اس کی مغفرت ہوجائے گی۔

انبعث: جوش سے اٹھا اور چل پڑا۔

أبـكـار: بكر کی جمع (پہلوٹا لڑکا) **لا تُعَلِّموا أبكارَكُم كُتُبَ النصارى** اپنے نوخیز بچوں کو مسیحیوں کی کتابیں نہ پڑھاؤ، یہاں ابکار سے نوخیز بچے مراد ہیں، **من النحل الأبكار** شہد کی مکھیوں کے بچے۔

أبـلـج الوجه: روشن چہرہ، جس کا چہرہ دمکتا ہو، نیز **أبلج** اس کو کہتے ہیں جس کی دونوں بھویں ملی ہوں، **أقرن** اس کی ضد۔

اَبلَسُوا: دم بخود ہوگئے، چپ ہوگئے۔

آل: اہل بیت، گھر کے لوگ، بنی ہاشم و بنی مطلب جن پر صدقہ حرام ہے، اور وہ لوگ جو آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے، نیز آل بمعنی سراب، لقد أعطي مزماراً من مزامیر آل داود میں آل زائد ہے۔ أهل و آل ہم معنی ہیں، مگر آل دینی و دنیاوی عزت والوں کے لیے مستعمل ہے جیسے آل فرعون؛ اور اھل عام، سب میں بولا جاتا ہے، اهل الله: خاصان خدا، اور اہل مکہ کو بھی تعظیماً اھل اللہ کہتے ہیں، یا اھل بیت اللہ اس کی مراد تھی، اهل القرآن: قرآن کے حافظ اور اس پر عامل۔ استعملت عليهم خيرَ أهلك میں خیر المہاجرین مراد ہے؛ ليس بك على أهلك هوان میں أهل سے مراد خود ذات نبوی ہے، یعنی لاحق ہوگا تم کو تمھارا سبک اور ہلکا ہونا تمھارے شوہر پر، یعنی اس سے کوئی سبکی تمھاری ان کے نزدیک نہیں ہوگی۔

آمین: أَمين بالقصر بھی ایک لغت ہے، یہ ایک اسم مبنی برفتحہ ہے، اس کے معنی اللهم استجِبْ (اے اللہ تو قبول کر) یا کذلك فليكن (ایسا ہی ہو) کے ہیں۔ آمين خاتم رب العالمين (آمین رب العالمین کی مہر ہے) یعنی اس سے آفتیں اور بلائیں دفع ہوتی ہیں جس طرح مہر بند لفافہ مہر کی وجہ سے محفوظ رہتا ہے۔

آبتُ: حتى آبتِ الشمس یعنی ڈوب گیا، اس لیے کہ جب آفتاب ڈوبتا ہے تو پھر اس طرف کو لوٹتا جہاں سے وہ طلوع ہوا تھا، اور یہ بات اگر چہ طلوع پر بھی صادق ہے، مگر طلوع کے معنی میں آب مستعمل نہیں ہے۔

أُبَيْنيٰ: (بروزن اُعیمی) اَبْنیٰ کی تصغیر، لفظ مفرد ہے مگر جمع پر دلالت کرتا ہے (بیٹے) اور بعض کہتے ہیں کہ أبنا اور أبناء دونوں ابن کی جمع ہیں اور ابينيٰ ابنا (بالقصر) کی تصغیر ہے (پیارے بیٹے) اور ابوعبید کا قول ہے کہ یہ لفظ اُبينيّ (بکسر نون وتشدید یائے ثانیہ) بَنِيَّ کی تصغیر ہے۔ اُبَيْنيٰ لا ترموا الجمرة حتى تطلع الشمس (بخاری) پیارے لڑکو جب تک آفتاب نہ نکلے رمی جمار نہ کرو۔

أجرٍ: جِرْو کی جمع جیسے أدلٍ دلو کی جمع، چھوٹے کھیرے، أتيتُ النبي ﷺ بقناعٍ من رُطبٍ وأجرٍ زُغْبٍ (میں حضرت کے پاس تازی کھجوروں کا ایک طبق اور چھوٹے چھوٹے کھیرے لائی جن پر نرم روئیں تھے (شمائل ص۱۲)۔

أُجِرَ: ما أنفقَ مومنٌ مِنْ نفقةٍ إلاَّ أُجِرَ فيها إلا نفقتَه في هذا التراب (مشکوۃ ۵/۴۳۳ ترمذی وابن ماجہ) آدمی جو خرچ کرے گا اس میں اجر (ثواب) دیا جائے گا، مگر مٹی (مکان بنانے) میں اجر نہ پائے گا (جب کہ ضرورت سے زائد ہو) إلا أُجِرْتَ عليها.

أبناء: ابن کی جمع۔ بادشاہ حبشہ نے جب یمن پر چڑھائی کی تو سیف بن یزن (بادشاہ یمن) نے کسریٰ سے مدد مانگی، کسریٰ نے فارسیوں (ایرانیوں) کا ایک جتھہ اس کی مدد کو بھیجا، اس نے بادشاہ یمن کی حمایت و مدد کر کے حبشیوں کو بھگا دیا اور حکومتِ یمن میں دخیل ہو کر وہیں رہ پڑے اور عربوں میں انھوں نے شادی بیاہ کر لیا، ان فارسیوں کی اولاد کو عرب لوگ ابناء (یعنی اولاد فارس) کہتے تھے، کتب احادیث

ورجال میں جہاں **کان من الأبناء** آتا ہے، اس سے یہی مراد ہوتی ہے۔

أبھر: پیٹھ کی ایک رگ ہے، اور بعضوں نے کہا کہ ابہر ایک رگ ہے جو سر سے شروع ہوتی ہے اور پیروں تک جاتی ہے اور اس کے ساتھ بہت سی باریک باریک رگوں کا بھی تعلق ہے، تو جو حصہ سر میں ہے اس کو **نأمة** کہتے ہیں، اور جو حلق سے متعلق ہے اس کو ورید، اور سینہ میں پہنچ کر اس کو ابہر، اور پیٹھ سے جس کا علاقہ ہے اس کو وتین (اسی سے دل معلق ہے) اور یہی ران میں پہنچ کر **نسأ** اور پنڈلیوں میں **صافن** کہلاتی ہے، **فھذا أوان وجدت انقطاع أبھري من ذلک السم** (خ ۱/۶۳۷، م ۵۳۵) یہ وقت ہے کہ اس (خیبر کے) زہر سے میں نے اپنی رگ ابہر کے کٹنے کو محسوس کیا۔

أوان: (وقت) **آونة** جمع۔ **ھذا أوان قطعت أبھري،** اُوان قطعت کی طرف مضاف ہے اور اس کو ضمہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہے، ضمہ تو ظاہر ہے خبریت کی بنا پر، اور فتحہ اس لیے کہ وہ مبنی بر فتحہ ہو مبنی کی طرف مضاف ہونے کی وجہ (نہایہ)۔

اتَّبِعُوا القرآنَ ولا يَتَّبِعَنَّكُمْ: قرآن کے پیچھے چلو اس کی پیروی کرو، اس کو امام بناؤ؛ اور وہ تمھارے پیچھے نہ ہو جائے، اس کی تلاوت اور اس پر عمل چھوڑ کر پس پشت نہ ڈالو، یا یہ کہ تمھارا پیچھا نہ کرے، جس طرح کہ اپنا حق لینے کے لیے کوئی کسی کا پیچھا کرتا ہے۔

أثل: جھاؤ کی طرح کا مگر اس سے بڑا ایک درخت **کان من أثل الغابة** آنحضرت کا منبر غابہ (مدینہ سے نو میل پر ایک جنگل ہے جس میں بکثرت درخت ہیں) کے اثل درخت کا تھا۔

اخاذات: **اخاذة** کی جمع، تالاب جس میں بارش کا پانی جمع ہو، **وکانت فیھا اخاذات أمسکت الماء،** صحیح بخاری میں **أجادب** ہے، اور ایک نسخہ میں نیز بعض روایات میں **اخاذات** ہے (دیکھو **اجادب**).

إخاذ: (بوزن کتاب) حوض یا تالاب اسم جنس، **إخاذہ** ایک، **إخاذات** جمع۔ **جالستُ أصحابَ رسولِ الله** صلی اللہ علیہ وسلم **فوجدتھم کالإخاذ،** وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح پانی کے تالاب چھوٹے بڑے مختلف قسم کے ہوتے ہیں، ایسے ہی صحابہ میں کوئی چھوٹا کوئی بڑا کوئی عالم اور کوئی اعلم تھا، جیسا کہ خود روایت میں آگے اس کا اشارہ ہے۔

أرب: ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ پوچھنا چاہا، تو لوگوں نے اس کو ڈانٹنا شروع کیا، آنحضرت نے فرمایا: **دَعُوُ الرَّجلَ أرب ماله** خ ۱/ص زکوۃ میں **دعوا الرجل** نہیں ہے) اس لفظ میں تین روایات ہیں:

۱- **أَرِبَ** بروزن علم (اس کے اعضاء کو صدمہ پہنچے) جو بظاہر بد دعا ہے، مگر مراد تعجب ہے، جس طرح کہ **تربت یداہ** (اس کے ہاتھ مٹی میں ملیں) بظاہر بد دعا ہے مگر محاورہ میں اظہارِ تعجب کے موقع پر بولا جاتا ہے، نیز لغت [میں] **أرِبَ** کے معنی ماہر ہونے، اور جانفشانی کے ساتھ کوشش کرنے کے بھی آتے ہیں، تو گویا آپ نے اس کی مہارت، سوجھ بوجھ اور کام کی بات پوچھنے [پر] خوشی سے اظہار تعجب کیا، پھر فرمایا

مالہ اس کو کیا ہوا ہے! وہ کیا چاہتا ہے!

۲-أَرَبٌ ما له (ہمزہ وراء کا فتحہ با کو تنوین) یعنی له حاجة (اس کو ایک مہم ومفید کام ہے جس کو لے کر چلا آیا ہے)۔

۳-أرِب: ہمزہ کے فتحہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ (زیرک وہوشیار) یعنی وہ زیرک ہے، وہ کیا چاہتا ہے، مگر ابن حجر نے کہا کہ اس روایت کی صحت کا مجھ کو علم نہیں ہے۔

اور ابن الاثیر نے أرُبَ بضم الراء (ک) بھی نقل کیا ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ باخبر اور دانا ہے وہ کیا چاہتا ہے۔

أرِنْ: أرن أو اعجل ما أنهر الدم (د

یہ لفظ بہت مشکل ہے، خطابی نے اس کی تحقیق میں بڑی کاوش کی ہے اور کہا ہے کہ وہ یا تو أرَانَ کا امر ہے اهلِکْ (ہلاک کر) کے معنی میں، کہتے ہیں أران القوم جب قوم کے مویشی ہلاک ہو جائیں؛ یا وہ أأرن (پھرتی کر، پھرتی دکھا) کے معنی میں، یعنی تیز چیز سے جلدی ذبح کرتا کہ گلا گھونٹنے کی صورت نہ پیدا ہو؛ یا وہ اِرْنِ بروزن ارم امر ہے، یعنی ذبیحہ پر نظر جمائے رکھ تا کہ ٹھیک جگہ پر چھری چلے، نہایہ [میں] رنوت سے ارم کے وزن پر لکھا ہے، جو بظاہر صحیح نہیں ہے، اُدُعُ کے وزن پر ہونا چاہئے۔

أزمة: قحط کا سال، خشک سالی کا زمانہ، اشْتَدِّيْ أزْمَةُ تَنْفَرِجِيْ (قضاعی) اے قحط کے سال تو سخت ہو جا، تو زائل ہو جائے گا کہ سختی کی انتہا کے بعد آسانی ہے۔

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
سختیاں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

حافظ ابن حجر نے "تبصیر المنتبہ" (قلمی) میں نقل کیا ہے کہ أزمہ ایک صحابی عورت کا نام ہے، ان کو درد زہ ہوا، تو آنحضرتؐ نے فرمایا اشتدي أزمة تنفرجي. مگر اس کے بعد یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہ روایت باطل ہے۔ ان قريشاً أصابتهم أزمة شديدة قریش کو بڑی سختی پیش آئی۔

أمانة: اس لفظ کا اطلاق کتب شریعۃ میں طاعت، عبادۃ ودیعۃ اور اطمینان وامان پر ہوتا ہے، المجالس بالأمانة یعنی مجلس کی باتیں امانت ہیں مجلس کے قول وفعل کا دوسری جگہ افشا واظہار نہ ہونا چاہئے، الأمانة غِنىً امانت داری (خیانت نہ کرنا) تونگری کا سبب ہے، قیامت کی علامتوں میں ایک علامت یہ ہے کہ آدمی امانت کی چیز کو مال غنیمت سمجھے، سمجھے کہ اچھا مفت مال ہاتھ آ گیا ہے والأمانة مغنماً (م ص۴۶۱) الزرع أمانة کاشتکاری امانت ہے، یعنی اس میں وہ خیانت جھوٹی قسم اور بڑھا چڑھا کر بات کرنا جو تجارت میں ہوتا ہے، نہیں ہے؛ أستودع الله دينك و أمانتك (ت۱۸۲/۲) اس میں امانت سے مراد اہل وعیال اور جو چیز مسافر چھوڑ جائے وہ مراد ہے۔ من حلف بالأمانة فليس منا یہاں امانت [سے] انسان کی صفت امانت مراد ہے، اور یہ اس لیے منع ہے کہ اللہ کی ذات وصفات کے علاوہ کسی چیز کی قسم نہ کھانی چاہئے اور فقہ حنفی میں جو لکھا ہے کہ و أمانة الله کہنے سے قسم ہو جاتی ہے، تو اس میں اس امانت کی قسم ہے جو اللہ کی صفت ہے۔ لا إيمان لمن لا أمانة له (م ص......) یہاں امانت کے مفہوم میں ودیعت میں خیانت نہ کرنا، اور

خالق یا مخلوق کی طرف [سے] جو ذمہ داری سپرد کی گئی ہوں، اس کو ایمان داری سے پورا کرنا سب مراد ہے۔

إذا ضُيِّعَتِ الأمانةُ (خ ص......) میں امانت کی مراد یہ ہے کہ جو جس چیز یا کام کا اہل ہو، وہ چیز یا کام اس کے سپرد کی جائے، ایسا نہ کرنا امانت کو برباد کرنا ہے۔

إمّا لا: جیسے **إمّا لا فلا تُبايِعُوا** (اگر نہیں تو باہم بیع وشرا نہ کرو) یہ إنْ اور ما اور لا سے مرکّب ہے، اور وہ **إنْ لم تفعلْ هذا** کے معنی میں ہے۔

إنِيـهْ: یہ ایک کلمہ ہے جس کو عرب انکار کے موقع پر بولتے ہیں، مثلاً کوئی کہے **جاء زيد** (زید آ گیا) اس کے جواب میں تم کہو **أ زيد إنِيهْ** (کیا زید؟ نہیں کبھی نہیں) اس کو بغیر ہمزہ کے نیز بھی بولتے ہیں، اور کبھی سوال واستفہام کے جواب میں نفس سوال پر اظہار تعجب ونکیر کے لیے بھی بولتے ہیں، مسند احمد کی ایک حدیث میں وارد ہوا ہے: **أ لـجليبيب إنِيه**، اس میں ایک روایت تو یہی ہے جو مذکور ہوئی؛ دوسری روایت جس کو ابوموسیٰ مدینی نے بہت پختہ بتایا ہے یہ ہے کہ یہ لفظ **اِبـنـهْ** ہے، جو اصل میں **ابنتي** تھا، یائے متکلم محذوف ہوگئی، اور حالت وقف میں ت ہ ہوگئی، اور مطلب یہ ہے کہ کیا جلیبیب کے لیے میری لڑکی! ایسا نہیں ہوسکتا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ **ابـنـه** کی اصل **ابنة** نکرہ ہو، اور مطلب یہ ہو کہ کیا جلیبیب کے لیے کوئی لڑکی! ارے اس کو تو کوئی لونڈی چاہئے۔

أبـؤس: **بأس** کی جمع **عسى الغويرُ أبؤساً** (عسی کی خبر ہونے کی وجہ سے نصب ہے) غویر ایک تالاب ہے، قریب ہے کہ غویر مصیبتوں کا مجموعہ ہو جائے۔ اس مثل کا مطلب یہ ہے کہ تم جو خبر لائے ہو، اندیشہ ہے کہ تم پر کوئی تہمت لگ جائے، یا تم پر کوئی سختی آئے۔

بَبّان: حضرت نے عمرؓ نے فرمایا: **لو لا أن أترك آخر الناس ببانا ليس لهم شيء ما فُتِحتْ عليَّ قرية إلا قسمتها** (خ ۲/۶۰۰) ابن الاثیر نے جو شرح کی ہے وہ قطعاً واضح نہیں ہے، صحیح یہ ہے کہ ببّاناً کے معنی یکساں اور متساوی کے ہیں، یعنی فقر وناداری میں برابر، اور مطلب یہ ہے کہ اگر یہ ڈر نہ ہوتا کہ بعد میں آنے والے لوگ بالکل نادار اور ناداری میں برابر رہ جائیں گے، تو میں تمام بلاد مفتوحہ کو غانمین میں تقسیم کر دیتا، مگر اسی ڈر سے ایسا نہیں کرتا ہوں (دیکھو فتح الباری ۷/۲۴۴) اس لفظ کو بعض لغویوں نے **بَيَّـــان** (بائے موحدہ کے بعد یائے مثناۃ) قرار دیا ہے۔

بـاقعة: بلا، آفت کا پرکالہ، تیز فہم، واقف کار، باقعۃ دراصل وہ چوکنی چڑیا ہے جو پانی پینے میں دائیں بائیں دیکھتی رہے۔

بـــالة: ایک لوہا جس سے مچھلی کا شکار کیا جاتا ہے (کانٹا)، **كره ضرب البالة: ضرب البالة** کو ناپسند کیا۔ شکاری سے کوئی یہ کہے کہ کانٹا پھینکو جو نکلے گا (پھنسے گا) وہ اتنے دام میں میرا۔

بـائن: وہ طلاق جس کے بعد شوہر بغیر جدید عقد کے عورت کو لوٹا نہ سکے۔ نیز حد سے زیادہ لمبا، حضرت کے حلیہ کے بیان میں ہے: **ليس بالطويلِ البائن** کہ آپ حد سے زیادہ لانبے نہ تھے۔

بـدعة: از روئے لغت ہر نئی چیز، اور از روئے شرع جو نئی بات کہ عہد نبوی اور عہد خلفاء راشدین میں نہ

رہی ہو، اور کسی شرعی دلیل سے ثابت نہ ہو، اس تعریف کے رو سے ہر بدعت مذموم ہے، جیسا کہ **کل بدعة ضلالة** سے ثابت ہوتا ہے، اور اگر بدعۃ کی یہ تعریف کیجئے کہ جو بات عہد نبوی میں نہ رہی ہو، تو ہر بدعت مذموم نہیں ہے، جو چیز خلافِ حکم خدا ورسول ہو، یا اس پر کوئی دلیل شرع دلالت نہ کرتی ہو وہ مذموم، اور جو کسی عموم کے تحت داخل ہو، یا اصول ومقاصدِ شریعت کے ماتحت آتی ہو تو وہ محمود ہے، پہلی صورت میں حضرت عمرؓ کے قول **نعمتِ البدعةُ هذه** میں بدعت کا لغوی معنی مراد ہے، اور دوسری صورت میں شرعی۔

تَبَشْبَشَ: بشّ سے ماخوذ ہے، دوست کا دوست کو دیکھ کر خوش ہونا، لطف ومہربانی سے پیش آنا۔ **لا يُوَطِّنُ الرَّجلُ المساجدَ للصلاةِ إلَّا تَبَشْبَشَ اللهُ لـه كـمـا يَتَبَشْبَشُ أهلُ البيتِ بغائِبِهم.** کوئی آدمی نماز کے لیے مسجدوں میں جم جائے تو خدا اس طرح لطف ومہربانی وخوشی سے پیش آتا ہے، جس طرح کسی گھر کا کوئی آدمی سفر سے واپس آتا ہے تو گھر والے خوش ہوتے ہیں۔ یہ حق تعالی کے...... اکرام کا ایک تمثیلی بیان ہے۔

تَبَعْثَرَتْ: إني إذا لم أرَكَ تبعثرَتْ نفسي. میں جب آپ کو نہیں دیکھتا تو میری طبیعت مضطرب اور بدحال ہو جاتی ہے۔

تاکل القُرى: (جو دوسری بستیوں کو کھا جائے گی) یعنی اس کے باشندے دوسری بستیوں پر اسلام کے ساتھ غالب آ جائیں اور اللہ اپنے دین کی مدد اس کے باشندوں کے ذریعہ کرے گا اور دوسری بستیوں کو ان کے لیے مال غنیمت بنادے گا جس کو وہ کھائیں گے۔

تألوه: ما من والٍ إلا وله بطانتان: بطانة تامره بالمعروف وتنهاه عن المنكر، وبطانة لاتالوه خبالاً. ہر حاکم کے دو رازدار اور مشیر کار ہوتے ہیں، ایک بھلائی کا حکم دیتا برائی سے روکتا ہے، اور دوسرا افساد اور بگاڑنے میں کوئی کمی نہیں کرتا۔

لا ايمن: اس کی اصل **لا آمن** ہے، مگر ان قبائل کی لغت کے مطابق جو علامات مضارع کو کسرہ دیتے ہیں یہاں ہمزۂ متکلم کو کسرہ دیا، اس کی وجہ سے اس کے بعد کی الف یے سے بدل گئی (میں اندیشہ کرتا ہوں)۔

لا تَبسُطْ ذراعَيک انبساطَ الكلب: نماز میں اپنے ہاتھوں [کو] اس طرح نہ پھیلا (زمین پر نہ رکھ) جس طرح کتا پھیلاتا ہے۔ انبساط کو بسط پر حمل کر کے **لا تبسط** کا مفعول مطلق بنا دیا گیا ہے۔

لا يَبِعْ أحدُكم على بيع أخيه: کسی سے بیع طے ہوگئی، یا طے ہونے کے قریب تھی کہ دوسرے نے زیادہ دام دے کر لینا چاہا، یا دوسرے نے اس سے اچھا سودا اتنے ہی دام پر دینے کی آمادگی ظاہر کی، یہ دونوں صورتیں مراد ہیں۔ بیع بیچنے اور خریدنے دونوں کو کہتے ہیں۔ پہلی صورت میں ترجمہ یہ ہے کہ کوئی اپنے بھائی کی خریداری پر خریدار نہ بنے؛ دوسری صورت میں یہ کہ کوئی اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے (نہایہ)۔

اس کتاب پر کہیں تاریخ مذکور نہیں ہے، لیکن بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۳۷۷ھ = ۱۹۵۷ء کا تحریر کردہ ہے۔

عَروض وقوافی

بحر سریع اور بحر رمل

علامہ اعظمیؒ جس طرح فن حدیث وفقہ میں امامت اور دیگر علوم اسلامیہ میں کمال ومہارت رکھتے تھے، اسی طرح ان کو شاعری اور فن عروض میں بھی خصوصی دستگاہ حاصل تھی، صرف شاعری کی نہیں ہے، بلکہ اوزان وبحور اور عروض میں پوری طرح درک اور رسوخ رکھتے تھے۔ شاعری کے فن اور عروض سے متعلق ہم کو آپ کی جو تحریریں ملی ہیں، ان صفحات میں ہم ان کو بھی شائع کردینا ضروری سمجھتے ہیں۔ پہلے ہم قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کے نام ایک مکتوب درج کرتے ہیں، اس مکتوب سے پہلے آپ نے علامہ سید سلیمان ندوی کے انتقال پر ایک نظم لکھ کر قاضی صاحب کے پاس روزنامہ 'انقلاب' میں اشاعت کے لیے بمبئی بھیجی تھی، لیکن قاضی صاحب نے اس کے بعض اشعار کو وزن سے ساقط خیال کر کے ان میں کچھ تبدیلی کردی تھی، علامہ اعظمیؒ نے اس نظم کے چھپنے کے بعد جب تبدیلیاں دیکھیں، تو قاضی صاحب کے نام وہ مکتوب لکھا جو ذیل میں درج کیا جائے گا، قاضی صاحب نے اس مکتوب کی اشاعت کے موقع پر اس پر ایک نوٹ لکھا تھا، ہم اصل مکتوب سے پہلے وہ نوٹ بھی درج کریں گے، اور اس سے بھی پہلے قاضی صاحب کے تصرف کے ساتھ 'انقلاب' میں جو قطعۂ تاریخ شائع ہوا تھا، اس کو نقل کریں گے تاکہ پورا قضیہ اہل علم کے سامنے آجائے۔

اور یہ بھی اچھا ہوا کہ قاضی صاحب نے ان اشعار میں تصرفات کردیے، اس لیے کہ اگر یہ تصرفات نہ ہوتے، تو اتنے اہم نکاتِ فن نہ سامنے آئے ہوتے، اور نہ علامہ اعظمیؒ کی شخصیت کے ایک نئے اور ایسے پہلو سے پردہ اٹھا ہوتا، جسے دیکھ کر یہ باور کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ یہ اسی خامۂ گہر بار کی کرشمہ سازی ہے جو علم حدیث کے سمندر میں غوطہ خوری، حدیث پاک کے مخطوطات میں غواصی، اور 'مصنَّف عبدالرزاق' 'مسند حمیدی' 'سنن سعید بن منصور' کی تحقیق اور 'الحاوی' جیسی کتاب کی تصنیف کے لیے وقف رہا ہے۔

'انقلاب' میں جب علامہ اعظمیؒ کا مکتوب شائع ہوا، تو شرف زیدی نام کے کسی صاحب نے آپ کے مکتوب کے جواب میں مضمون لکھا، جو روزنامہ 'جمہوریت' میں شائع ہوا، اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے وہ مضمون سپرد قلم فرمایا جو بغیر عنوان کے آپ کے مسودات میں محفوظ ہے، یہ ایک مراسلے کی شکل میں ہے، جو غازی صاحب -غالبًا مولانا حامد الانصاری غازی- کے نام مکتوب ہے، جس کو بالکل آخر میں بعینہ شائع کیا جارہا ہے۔ اس سلسلے کی ترتیب یہ ہے:

۱- علامہ اعظمیؒ کی لکھی ہوئی تاریخ وفات مع تمہید جو قاضی صاحب کے تصرُّفات کے ساتھ روزنامہ 'انقلاب'- بمبئی- میں ۱۵؍دسمبر ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں شائع ہوئی۔

۲- قاضی صاحب کے تصرفات پر علامہ اعظمیؒ کی تنقید اور اصل اشعار جو قاضی صاحب کے لگائے ہوئے عنوان اور نوٹ کے ساتھ یکم جنوری ۱۹۵۴ء کے انقلاب میں اشاعت پذیر ہوئی۔

۳-شرف زیدی کے مضمون پر علامہ اعظمی کی تنقید، جو روز نامہ 'جمہوریت' میں شائع ہوئی تھی، اور جس کا مسودہ آپ کے کاغذات میں محفوظ ہے۔

-۱-

تواریخ وفات علامہ سید سلیمان ندوی:

از: حضرت العلامہ ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی شیخ الحدیث، مئو، اعظم گڑھ

''علامہ سید سلیمان ندوی کے فراق سے آنکھیں پُرنم ہیں اور دل پُرغم۔ میرے اُن کے درمیان ۲۸-۳۰ برس سے پُرخلوص روابطِ مودت تھے۔ ان کی جدائی سے جو صدمہ مجھے ہوا ہے وہ نا قابلِ بیان ہے، یہ تو طبعی تاثر ہے۔ اس سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی سید صاحب کا سانحۂ وفات عالمِ اسلام کے لیے ایک فاجعۂ کبریٰ! ہندوستان کے علاوہ حجاز، مصر، شام اور بلادِ یورپ میں بھی ان کے فضل وکمال کا چرچا تھا۔ انھوں نے اپنی محققانہ تصنیفات کے ذریعے علم اور دین کی جو خدمتیں انجام دی ہیں، ان کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا؛ اور کچھ شبہہ نہیں کہ اس آخری دور میں دقت نظر، تبحر علمی اور جامعیت میں ان کی شخصیت ایک بے نظیر شخصیت تھی، افسوس ہے کہ ان کی وفات سے علمی دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے، جس کا پُر ہونا بظاہر ناممکن ہے!۔ اللہ اُن پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے، اور اُن کے مراتب بلند کرے، آمین۔

حبیب الرحمٰن الاعظمی''

داغ دے کر وہ محبّ با صفا
ہو گیا افسوس کہ ہم سے جدا
وارثِ اقلیمِ فضل و علم و دین
وہ سلیماں یعنی مور مصطفیٰ
ماہرِ تاریخ تفسیر و حدیث!
جس نے لکھی سیرت خیر الوری
حیف یہ گنجینۂ علم و ادب
گُم تہِ خاک کراچی ہوا
فقرۂ تاریخ کا جویا تھا میں!
بول اٹھا دل ''فاضل یکتا گیا''
۱۳۷۳ھ

-۲-

ایک علمی اورادبی مکتوب گرامی

بحر سریع اور بحر رمل کی ناقدانہ تشریح

حضرت العلامہ مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی شیخ الحدیث مفتاح العلوم، مئو، ایم-ایل-اے، جن کے تبحر علمی اور جلالت شان کے سامنے اچھے اچھے علماء کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں۔ علم الحدیث، علم رجال الحدیث، علم معانی وبیان، علم تاریخ وادب، اور تفسیر وفقہ میں آپ کی ذات جامع ومکمل ہے، یہی وجہ ہے کہ ان علوم وفنون کے سلسلے میں آپ سے مصر وحجاز اور ممالک غیر کے محققین خط وکتابت رکھتے ہیں؛ ساتھ ہی عربی، فارسی اور اردو شاعری اور ادب میں بھی اللہ تعالیٰ نے کمال عطا فرمایا ہے، اور ان تمام زبانوں میں آپ استاذانہ مقام رکھتے ہیں۔

ناظرین کرام کو یاد ہوگا کہ چند دنوں پہلے انقلاب میں حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کے متعلق آپ کے تاثرات اور اشعار درج ہوئے تھے، چونکہ آپ کے بعض اشعار باوجود بحور وقوافی پر پورے اترنے کے بظاہر وزن سے باہر معلوم ہوتے تھے، اور ناواقفوں کے لیے غلط فہمی کا باعث بن سکتے تھے، اس لیے نہایت عزت واحترام سے ہم نے ان میں تصرفات کر دیے تھے، اس کا مقصد بالکل نیک تھا، اور علم وفن کے پہاڑوں کے سامنے اپنی بلندی دکھانی نہیں تھی۔ حضرت مولانا نے کمال شفقت کے ساتھ ان اشعار کے متعلق توضیح فرمادی ہے، **اور شعر وادب کے بعض مخفی گوشوں پر روشنی ڈالی ہے،** نیز ہماری عربی نظم پر بھی استاذانہ نظر فرمائی ہے؛ اس لیے ہم نہایت فخر ومسرت کے ساتھ یہ گرامی نامہ شائع کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں، ساتھ ہی آخر میں آپ کی نظم من وعن شائع کرتے ہیں، **هکذا أُمِرنا أن نفعلَ بکبرائنا.**

(قاضی اطہر مبارک پوری)

۲۷/دسمبر ۵۳ء

عزیز گرامی! سلام مسنون۔

میں کل لکھنؤ سے مکان آیا، اور کل ہی آپ کا خط بھی آیا، تاریخوں کی اشاعت پر شکریہ۔ آپ کے ''تصرُّفات'' کی نسبت گزارش ہے کہ اصلاح اگر مُوجَّہ ہو، تو میں صرف خوش نہیں بلکہ شکر گذار بھی ہوتا ہوں، مگر آپ نے اپنے تصرفات کی کوئی وجہ نہیں لکھی، میں نے یہ وجہ سمجھی ہے کہ آپ نے اس نظم کو مثنوی مولانا روم کے وزن پر بحر رمل

مسدس محذوف میں خیال کیا، اس لیے جو مصرعے وزن سے گرتے تھے آپ نے اس وزن پر بناڈالا؛ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، میری نظم 'قران السعدین'، 'مخزن اسرار'، 'مطلع الانوار' اور 'سبحۃ الابرار' کے وزن پر، بحر سریع مطوی موقوف سے ہے، جس کا عروض وضرب مختلف یعنی ایک مطوی مکسوف (فاعلن) اور دوسرا مطوی موقوف (فاعلان) ہوسکتا ہے۔ اس بحر میں یہ بات ہوئی ہے، اس کے بعض شعر یا مصرعے بحر رمل [میں] بھی پڑھے جاسکتے ہیں، جیسے مولانا جامیؒ کے یہ اشعار:

(۱) رفتن او جستن تیر از کماں
جستن او حجت طے مکاں

(۲) توبہ دہ از سرکشی ایام را
باز خر از ما خوشی اسلام را

(۳) دیدۂ عالم بتو روشن شود
گلخن گیتی بتو گلشن شود

(۴) ظلمت بدعت ہمہ عالم گرفت
بلکہ جہاں جامۂ ماتم گرفت

مصرعۂ اولیٰ بحر رمل میں پڑھا جاسکتا ہے۔

(۵) چوں نہ بزرگست وشرعش سخن
منبر او بر سر او خورد کن

اس میں صرف مصرعہ ثانیہ بحر رمل میں پڑھا جاسکتا ہے، حالانکہ 'سبحۃ الاسرار' جامی بحر سریع میں ہے، اور اس کا پہلا مصرعہ:

''ہست صلائے بر خوان کریم''

ہے، اور اسی مثنوی کا یہ مشہور شعر ہے:

اے مبرا پردۂ یثرب بخواب
خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

آپ کی عربی نظم قابل تعریف ہے، مگر مخفیاً کے بجائے مخفیًّا (بتشدید اللام)، اور تُوفّٰی کے بجائے تُوُفِّی، اور أصدرہ کے بجائے صدَّرہ (اصدار صدر بنانے کے معنی میں نہیں آتا)، اور أسْفِیُ کے بجائے أسَفِیُ چاہئے، اسی طرح لیس لنا دون الممات مذهب چاہئے، اسم "لیس" میں زیادة با نہ چاہئے، عجائب کے کیا معنی؟ کفایة غائب بھی غیر مفہوم ہے، بدلنا چاہئے۔ اصلاح نہیں دے رہا ہوں متوجہ کررہا ہوں۔

ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی میں ایک قلمی کتاب 'مخبرالأ ولیاء' مصنفہ شیخ رشیدالدین چشتیؒ ہے، اس میں آپ کو 'رجال السند والہند' کے لیے مواد ملیں گے، اس سے جو نام آپ لیں اس کی ایک نقل مجھ کو درکار ہے۔ ......
....حبیب الرحمٰن الاعظمی۔

قطعہ تاریخ

فاضل علامہ سلیمان آج
ہو گئے افسوس کہ ہم سے جدا
آہ کہ اب ہند میں کوئی نہیں
فاضل و علامہ سلیمان سا
ماہر تاریخ و حدیث و سیر
واقف اسرار کتاب خدا
اردو تو اردو عربیت میں بھی
ان کو بہت دخل بڑا درک تھا
کیا نظر آتا ہے کہیں وہ کمال
ان کو جو انشاء و خطابت میں تھا
حیف یہ گنجینۂ علم و ادب
دفن تہِ خاکِ کراچی ہوا
فقرۂ تاریخ کا جویا تھا میں
دل نے کہا: فاضل یکتا گیا
۱۳۷۳ھ

☆......☆......☆......☆......☆

-۳-

محترم جناب غازی صاحب

السلام علیکم۔
میں پرسوں تقریباً تین ہفتے کے بعد لکھنؤ سے مکان آیا، تو فاضل گرامی جناب شرف زیدی صاحب کے اس مضمون کی نقل جو روزنامہ جمہوریت مورخہ ۱۴؍فروری ۵۴ء میں شائع ہوا تھا، دیکھنے کو ملی؛ چونکہ اس مضمون کی

آخری سطر سے موصوف کی یہ خواہش ظاہر ہوتی ہے کہ میں اپنی مفصل رائے کا اظہار کروں، اس لیے سطور ذیل میں اپنے خیالات پیش کر رہا ہوں۔

میں نے اپنے مکتوب بنام جناب قاضی اطہر میں لکھا تھا کہ:

''میری نظم بحر سریع مطوی موقوف سے ہے، جس کا عروض وضرب مختلف یعنی ایک مطوی مکسوف (فاعلن) اور دوسرا مطوی موقوف (فاعلان) ہوسکتا ہے'' (انقلاب یکم جنوری ۵۴ء)۔

فاضل زیدی کا شکر گذار ہوں کہ وہ اس کو صحیح تسلیم کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

''جہاں تک اس تفصیل کا تعلق ہے، یہ صحیح ہے'' (جمہوریت ۱۴ فروری ۵۴ء)۔

اس کے بعد میں نے اپنے مکتوب میں لکھا تھا کہ:

''اس بحر میں (یعنی بحر سریع میں) یہ بات ہوئی ہے کہ اس کے بعض شعر یا مصرعے بحر رمل میں بھی پڑھے جاسکتے ہیں''۔

اس سے میری مراد یہ تھی کہ بحر سریع کے بعض شعروں یا مصرعوں میں اتنی لچک ہوتی ہے کہ ان کی تقطیع بحر رمل میں ممکن ہوتی ہے۔

فاضل زیدی کو یہ بھی تسلیم ہے، فرماتے ہیں:

''تقطیع میں ایسا ممکن ہے کہ کسی طرح گھٹا بڑھا کر وزن برابر کرلیں، جیسے مولانا جامی کے دو مصرعے، جس طرح پہلا مصرع ...... بحر رمل مسدس مقصور میں تقطیع کیا جاسکتا ہے ...... اسی طرح دوسرا مصرع ...... بحر رمل مسدس محذوف میں تقطیع کیا جاسکتا ہے''۔

ملاحظہ فرمائیے کہ مولانا جامی کے دونوں مصرعے باوجودیکہ ایسی مثنوی کے مصرعے ہیں، جو بحر سریع میں ہے، فاضل زیدی صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ وہ بحر رمل میں تقطیع ہوسکتے ہیں۔ بس اتنا ہی میں بھی کہتا ہوں؛ باقی رہا موصوف کا یہ فرمانا کہ:

''کسی طرح گھٹا بڑھا کر وزن برابر کرلیں''

یعنی یہ اس وقت ممکن ہوتا جب کسی طرح کچھ گھٹایا بڑھایا جائے، تو موصوف بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ گھٹانے بڑھانے کی جو مثال انھوں نے پیش کی ہے، اس طرح کا گھٹانا بڑھانا صرف بحر سریع کے شعروں کو بحر رمل میں تقطیع کرنے کے لیے ہی نہیں، بلکہ بحر رمل کے بھی ہزاروں اشعار کی تقطیع کے لیے ناگزیر ہے، اور اہل فن کے نزدیک جائز اور ضابطہ کے موافق ہے، مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ ظلمت کی (ت) کے پیٹ سے یائے تمنائی نکالنی پڑے گی۔ تو اس میں کیا قباحت ہے، مولانا روم کی مثنوی تو قطعاً بحر رمل میں ہے، مگر اس کے حسب ذیل اشعار کی تقطیع اس وقت تک صحیح نہیں ہوسکتی، جب تک کہ آتشِ، جوششِ، حدیثِ اور محرمِ کے پیٹ سے یائے تمنائی نہ نکالئے، اشعار ملاحظہ ہوں اور ایک شعر کی تقطیع بھی:

آتش عشق ست کاندر نے افتاد : جوشش عشق ست کاندر می افتاد
آ تشے عش قست کندر نے فتاد : جو ششے عش قست کندر می فتاد
فا علا تن فا علا تن فاعلات : فا علا تن فا علا تن فاعلات
نے حدیث راہ پر خوں می کند : قصہ ہائے عشق مجنوں می کند
محرم ایں ہوش جز بے ہوش نیست : مر زباں را مشتری چوں گوش نیست
عشق جانِ طور آمد عاشقا : طور مست و خرَّ موسیٰ صعقا

اور بحر رمل پر ہی کچھ موقوف نہیں، دوسری بحروں میں بھی یہی کرنا پڑتا ہے، مثلاً بحر متقارب مثمن مقصور یا محذوف جس میں شیخ سعدی کی بوستاں ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بنام جہاندار جاں آفریں : حکیم سخن بر زباں آفریں
سرِ پادشاہاں گردن فراز : بدرگاہ او بر زمین نیاز
ادیم زمیں سفرۂ عام اوست : چہ دشمن بریں خوان یغما چہ دوست
کلاہ سعادت یکے بر سرش : گلیم شقاوت یکے در برش

ان اشعار کے الفاظ: بنامِ، حکیمِ، سرِ، زمینِ، ادیمِ، کلاہِ، اور گلیمِ ہرایک کے پیٹ سے جب تک یائے تمنائی نہ نکالئے تقطیع صحیح نہیں ہوسکتی۔

اور انھیں مثالوں سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ تقطیع میں بدعت کا (عت) اور عالم کا (لم) دوسری طرف شامل کرنا کوئی معیوب چیز نہیں ہے، جس طرح کہ اشعار مذکورہ بالا کی تقطیع میں لفظ عشق کا (عش) ایک طرف اور صرف (ق) دوسری طرف، یا لفظ سفرۂ کا (سف) ایک طرف اور (رۂ) دوسری طرف شامل کرنا پڑتا ہے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ''جہاندار جاں آفریں'' میں سے جہاندار کا (ر) اور آفریں کا (آ) جان کے ساتھ مل کر ایک رکن بنتا ہے یعنی (رجاں آ)۔

اس کے علاوہ بحر سریع میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں، جن کی تقطیع بحر رمل میں بغیر گھٹائے بڑھائے ممکن ہے، مثلاً امیر خسرو کی مثنوی 'قران السعدین' کا یہ شعر:

چوں سرم از بخت سرفراز گشت
تاج تو بر تارک من باز گشت

اور حضرت مولانا جامی کے اشعار نمبر ۱ اور ۲ و ۳ جو میرے مکتوب میں درج ہیں، ان کی تقطیع بھی اگر بحر رمل میں کی جائے تو کسی لفظ سے یائے تمنائی وغیرہ نکالنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تعجب ہے کہ زیدی صاحب نے ان اشعار کو نظر انداز کر کے جو پورے کے پورے بحر رمل میں تقطیع کیے جا سکتے ہیں، مولانا جامی کے صرف دو مصرعوں کو لے کر کیوں بحث کی؟!

بہر حال میں نے اپنے مکتوب میں جو بات لکھی تھی، اس کا مقصد اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھا کہ بحر سریع کے بعض بعض شعر یا کسی کسی مصرعہ میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ اس کی تقطیع بحر رمل کے وزن پر ہو جائے، اور اسی امکان کی بنا پر میری نظم کے کسی کسی مصرعہ سے قاضی اطہر صاحب کو دھوکا ہوا کہ یہ نظم بحر رمل میں ہے، لیکن دوسرے مصرعے بحر رمل کے وزن پر پورے نہیں اترتے تھے، اس لیے انھوں نے ان مصرعوں کو بدل کر بحر رمل کے وزن پر بنا ڈالا؛ حالانکہ میری نظم بحر رمل میں تھی ہی نہیں، وہ پوری بحر سریع میں تھی اور اس کے تمام اشعار بحر سریع کے وزن پر بالکل پورے اترتے تھے، جیسا کہ ہمارے فاضل دوست زیدی صاحب کو بھی اعتراف ہے کہ:

''عروضی قواعد کے مطابق قطعہ کی بحر بالکل صحیح ہے اور اس میں کسی اصلاح کی ضرورت نہیں ہے''

(جمہوریت ۱۴ر فروری ۵۴ء)۔

بس یہی میں بھی قاضی صاحب کو سمجھانا چاہتا تھا، میں نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ

''اس قطعہ کے بعض شعر یا مصرعے بحر رمل میں بھی پڑھے جاسکتے ہیں''۔

زیدی صاحب کو مغالطہ ہوا، میں نے اپنے قطعہ کی نسبت خصوصیت سے یہ بات نہیں لکھی ہے، بلکہ بحر سریع کے لیے عموماً لکھی ہے، اور اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ بحر سریع اور بحر رمل کا اجتماع ایک شعر میں درست ہے، نہ میں نے اس کے ثبوت میں مولانا جامی کے اشعار پیش کیے ہیں؛ بلکہ اس سے میرا مقصد صرف اتنا تھا کہ بحر سریع کے بعض اشعار کی تقطیع بحر رمل میں ممکن ہوتی ہے، جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے کہ یہ شعر بحر رمل میں ہے، اور اسی بنا پر قاضی اطہر صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔ فاضل گرامی زیدی صاحب نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ کسی شعر کا کوئی مصرع دوسرے وزن میں بھی تقطیع ہو جائے تو وہ شعر کی بحر نہیں قرار دی جاسکتی۔ میں بھی یہی کہتا ہوں اور اسی بنا پر باوجودیکہ میرے قطعہ کے بعض مصرعے بحر رمل میں تقطیع کیے جاسکتے ہیں، میں نے اپنے مکتوب میں واضح طور پر لکھا کہ قاضی صاحب کا میری نظم کو بحر رمل کے وزن پر خیال کرنا صحیح نہیں ہے، میری نظم بحر سریع مطوی موقوف سے ہے (انقلاب ص: ۵، یکم جنوری ۵۴ء)۔

اس تفصیل سے یہ بات بخوبی روشن ہوگئی کہ فاضل گرامی زیدی صاحب نے اپنے مضمون میں جو پانچ سوالات وارد کیے ہیں، وہ مجھ پر وارد نہیں ہوتے؛ وہ تو جب وارد ہوسکتے تھے جب میں یہ دعویٰ کرتا کہ ایک شعر میں اجتماع بحر سریع و بحر رمل درست ہے، اور یہ دعویٰ میں نے کیا ہی نہیں۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ بحر سریع کے کسی شعر یا مصرع کی تقطیع بحر رمل میں ممکن قرار دینے پر بھی یہ سوالات وارد ہوتے ہیں، تو عرض ہے کہ اس صورت میں جواب دہی کی ذمہ داری تنہا میرے سر نہیں ہے، بلکہ فاضل موصوف بھی ذمہ دار ہیں؛ اس لیے کہ انھوں نے بھی مولانا جامی کے دو مصرعوں کی نسبت جو بحر سریع میں ہیں، صاف اقرار کیا ہے کہ ان کو بحر رمل میں تقطیع کیا جاسکتا ہے۔

اور اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ فاضل مضمون نگار نے اپنی بحث میں جن باتوں کو واضح کیا ہے،

ان کو واضح کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی؛ اس لیے کہ جن معنوں میں وہ سریع ورمل کے اجتماع کو ناجائز کہتے ہیں، اس کو میں نے بھی جائز ثابت نہیں کیا ہے، نہ میں ایک مصرعہ کو بحر کہتا [ہوں]۔ اور اگر یہ اس بنا پر لازم آتا ہو، کہ میں نے ایک مصرعہ کی نسبت لکھ دیا ہے کہ بحر رمل میں تقطیع کیا جا سکتا ہے، تو یہ بات خود انھوں نے بھی مولانا جامی کے مصرع کی نسبت لکھی ہے کہ اس کو بحر رمل میں تقطیع کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح میں نے کسی شعر کو دو بحروں سے بھی منسوب نہیں کیا ہے۔

اپنے مقصود کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے ایک بار میں پھر کہنا چاہتا ہوں کہ مجھ کو قاضی اطہر صاحب سے یہ کہنا تھا کہ آپ کو میری نظم کے بعض مصرعوں سے شاید یہ مغالطہ ہوا کہ وہ بحر رمل کے وزن پر ہے، پھر جو مصرعے بحر رمل کے وزن پر پورے نہیں اترتے تھے، آپ نے ان کو بدل کر بحر رمل کے وزن پر بنا ڈالا؛ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ میری نظم بحر رمل کے وزن پر نہیں ہے، بلکہ وہ بحر سریع کے وزن پر ہے، اور اس لحاظ سے اس کے کسی مصرعہ کو بدلنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اب رہی یہ بات کہ جب میری نظم بحر سریع کے وزن پر ہے، تو اس کے کسی مصرعہ سے یہ مغالطہ کیوں پیدا ہوا کہ وہ بحر رمل میں ہے؟ تو اسی کی نسبت میں نے لکھا تھا کہ بحر سریع میں عموماً یہ بات ہوتی ہے کہ اس کے بعض شعروں یا بعض مصرعوں کی تقطیع بحر رمل میں ممکن ہو جاتی ہے، جیسے مولانا جامی کے وہ اشعار یا مصرعے جو میں نے اپنے خط میں نقل کیے ہیں کہ ان میں یہ بات پائی جاتی ہے۔ اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میری نظم کے جن مصرعوں کی تقطیع بحر رمل میں ممکن ہے، وہ بحر رمل میں داخل ہو گئے، یا وہ دو بحروں سے منسوب ہیں۔ اگر میرا یہ مقصد ہوتا تو میں صاف صاف اپنے مکتوب میں یہ کیوں لکھتا کہ:

''میری نظم کو آپ نے بحر رمل میں خیال کیا یہ صحیح نہیں ہے، میری نظم بحر سریع سے ہے''۔

میں نے اپنی نظم میں تصرف کی زحمت اٹھانے کی جو وجہ سمجھی ہے، وہ میرے نزدیک بالکل صحیح ہے، اور فاضل زیدی کو فقرۂ تاریخ والے شعر کی وجہ سے جو اشکال نظر آ رہا ہے اس کا دفعیہ یہ ہے کہ قاضی صاحب نے اس کے پہلے مصرع کو جیسا کہ زیدی صاحب نے لکھا ہے کہ ''اس طرح پہلا مصرع بحر رمل مسدس میں تقطیع کیا جا سکتا ہے'' اسی طرح بحر رمل میں تقطیع کیا؛ اب رہا دوسرا مصرع تو چونکہ (دل نے کہا) فاعلاتن کے وزن پر نہیں ہو سکتا تھا، اور قاضی صاحب اس نظم کو بحر رمل میں سمجھ رہے تھے، اس لیے پہلے رکن کو وہ سمجھ رہے تھے کہ فاعلاتن کے وزن پر ہونا چاہئے، تو انھوں نے جیسا کہ زیدی صاحب کا خیال ہے، پورے کلمہ ہی کو بدل ڈالا، اور (دل نے کہا) کے بجائے (بول اٹھا دل) کر دیا، اب وہ فاعلاتن کے وزن پر ہو گیا۔ یہ جو میں عرض کر رہا ہوں، زیدی صاحب کے اشکال کا دفعیہ ہے، ورنہ میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ میری نظم میں تصرف محض مغالطہ کی وجہ سے ہوا ہے، عروضی قواعد کا جہاں تک تعلق ہے، وہ محتاجِ تصرف نہ تھی۔

زیدی صاحب کو دوسرا اشکال یہ نظر آ رہا ہے کہ:

''فقرۂ تاریخ والے شعر کو بحر رمل میں تقطیع کریں گے، تو دوسرے مصرع کا دوسرا رکن فاعلاتن کے

وزن پر اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک فاضل کے (ل) کے پیٹ سے ایک (ی) نکال کر یوں نہ کہیں (فاضلے یک) اور جب ایسا کریں گے، تو اس (ی) کے بڑھانے سے تاریخ کے عدد بجائے (۱۳۷۳) کے (۱۳۸۳) ہو جائیں گے، اور اس وزن کو برابر کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ علامہ ندوی بھی دس سال بعد مرحوم ہوں گے''۔

تو عرض ہے کہ ہر چند کہ میں اس تصرف کو جو میری نظم میں ہوا ہے بے ضرورت سمجھتا ہوں، تاہم اس تصرف کے بعد بھی فقرۂ تاریخ بالکل صحیح ہے، اور اس کے عدد اس (ی) کی وجہ سے جو بضرورتِ تقطیع زیادہ کی جاتی ہے، تاریخ کے عدد نہیں بڑھ سکتے؛ تاریخ میں صرف مکتوبی حروف کے عدد لیے جاتے ہیں، اس کی ایک بہترین مثال ناظرین کی ضیافت کے لیے پیش کرتا ہوں، جو میرے دعوے کی نہایت روشن و مستحکم دلیل ہے۔ علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے 'خزانہ عامرہ' (ص:۲۱۱) میں حضرت امیر خسرو دہلوی کی تاریخ وفات سے متعلق یہ شعر نقل کیا ہے:

شد عدیم المثل یک تاریخ او : واں دگر شد طوطی شکر مقال

اتفاق سے یہ شعر بھی بحر رمل کے وزن پر ہے، اس میں حضرت امیر کی دوسری تاریخ وفات ''طوطی شکر مقال'' ہے، جس سے ۷۲۵ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اب دوسرے مصرع کی تقطیع کیجئے، تو دوسرا رکن (طوطی شک) ہوگا، جس کو بضرورتِ تقطیع (طوطیے شک) قرار دینا پڑے گا، ورنہ وزن برابر نہ ہوگا، اور وزن برابر کرنے کی وجہ سے ایک (ی) کا اضافہ ہو جائے گا، بایں ہمہ تاریخ کا عدد نہیں بڑھا اور حضرت امیر خسرو دہلوی دس سال بعد مرحوم نہیں ہوئے۔ اسی طرح علامہ ندوی بھی بحر رمل میں میرے مصرع کی تقطیع کی وجہ سے دس سال بعد مرحوم نہ ہوں گے، جس کا مجھے دلی افسوس ہے! کاش میری تاریخ تقطیع کی وجہ سے غلط ہو جاتی اور اس کے عوض میں علامہ ندوی دس سال بعد مرحوم ہوتے، تو مجھے بہزار دل و جان قبول تھا۔

ایک اور مثال سنئے! احمد شاہ درانی کو ''دتا'' کے مقابل میں جو فتح نصیب ہوئی تھی، اس کی تاریخ آزاد بلگرامی نے یہ لکھی ہے:

گفت تاریخ ایں ظفر آزاد : نصرت بادشاہ عالیجاہ

۳ ۷ ۱ ۱

(خزانۂ عامرہ، ص:۱۰۲)

آزاد کا یہ شعر بحر خفیف میں ہے، اور اس کا وزن فاعلاتن مفاعلن فعلان ہے۔ مصرع تاریخ کی تقطیع اس وزن پر ممکن نہیں جب تک کہ (نصرت) کے پیٹ سے ایک یائے تمنائی نہ نکالئے، یعنی (نصرتے با) فاعلاتن۔ اب اگر علامہ زیدی کی رائے مان لی جائے، تو یہ فتح بجائے ۱۱۷۳ کے ۱۱۸۳ میں حاصل ہوگی، اور فتح میں اس دس برس کی تاخیر کی وجہ سے معلوم نہیں کتنا جانی و مالی نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔

اس کے بعد صرف ایک بات اور عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، مجھے سخت تعجب ہے کہ علامہ زیدی

نے مولانا جامی کے دونوں مصرعوں کی نسبت یہ کس طرح لکھ دیا کہ وہ بحر رجز مسدس مرفوع ندال میں بھی آسکتے ہیں!۔علامہ جانتے ہیں کہ بحر رجز مسدس کے ارکان مستفعلن، مستفعلن، مستفعلن دو بار ہیں، مرفوع ندال کی قید کے بعد اس کے ارکان مستفعلن، مستفعلن، فاعلان دو بار ہو جائیں گے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان ارکان کے وزن پر مولانا جامی کے مصرعے کس طرح تقطیع کیے جاسکتے ہیں۔

مستفعلن ایک رکن سباعی ہے، جو دو سبب خفیف اور ایک وتد مجموع سے مرکب ہے، اب: ع (ظلمت بدعت ہمہ عالم گرفت) سے سات حرف لیجئے، (ظلمت بِدْع) یا بقول علامہ اپنی طرف سے ایک حرف بڑھا کر (ظلمتے بد) کہہ لیجئے، اور ان کو مستفعلن پر وزن کر کے دیکھئے کہ وزن ٹھیک ہوتا ہے، کبھی نہیں ہوسکتا۔

اور اس سے بھی زیادہ تعجب خیز ان کا یہ فرمانا ہے کہ عرفی شیرازی کی مثنوی کا یہ شعر:۔

مد نخست است زبحر کریم : بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسی بحر میں ہے؛ حالانکہ وہ بحر سریع میں ہے۔اور یہ ایسی ظاہر بات ہے کہ اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے، پھر بھی یہ ذکر کر دینا خالی از فائدہ نہیں ہے کہ آزاد بلگرامی نے خزانہ عامرہ میں عرفی شیرازی کے حق میں حکیم حاذق کا یہ شعر:۔

مثنویش طرز فصاحت نداشت : کان نمک بود ملاحت نداشت

نقل کر کے لکھا ہے کہ: ''اشارہ است بمثنوی عرفی کہ درہمیں وزن گفتہ مطلعش ایں است:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم : موج نخست است زبحر قدیم''

آزاد بلگرامی حکیم حاذق کے مذکورہ بالا شعر اور مثنوی عرفی دونوں کو ایک وزن میں فرماتے ہیں، اظہر من الشمس ہے۔میرا مقصد یہ ہے کہ حکیم حاذق کا شعر بحر سریع میں ہے، اور اسی کے ساتھ یہ مزید فائدہ بھی مفت ہاتھ آیا کہ عرفی کا صحیح مصرع (موج نخس است زبحر قدیم) ہے، یعنی ''موج'' کے بجائے ''مد'' اور ''قدیم'' کے بجائے ''کریم''، نہیں ہے، ''موج'' کے بجائے ''مد'' تو خود آزاد بلگرامی کی اصلاح ہے، چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں: ''مولف گوید بجائے لفظ ''موج'' لفظ ''مد'' مناسب تر است'' (خزانۂ عامرہ، ص:۳۱۹)۔

اب تک جو کچھ میں نے عرض کیا بر سبیل اِرخاء عنان ہے، اس کے بعد میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر بالفرض میں نے یہ دعویٰ کیا ہوتا کہ بحر سریع اور بحر رمل کا اجتماع ایک نظم میں جائز ہے، تو یہ کوئی غلط بات نہیں ہوسکتی تھی، جب کہ یہ واقعہ ہے کہ اہلی شیرازی نے اپنی مشہور مثنوی ''سحر حلال'' پوری کی پوری اسی التزام کے ساتھ لکھی ہے کہ اس کا ہر شعر بحر سریع میں بھی تقطیع کیا جاسکے اور بحر رمل میں بھی؛ اور اہلی شیرازی سے پہلے مولانا کاتبی نیشاپوری نے بھی اپنی مثنوی اسی التزام کے ساتھ لکھی ہے، اور اس کا تو نام ہی انھوں نے ''مجمع البحرین'' رکھا ہے، اہلی شیرازی مثنوی ''سحر حلال'' کے دیباچہ میں لکھتا ہے:

''اگر در مقابل مجمع البحرین او خوانند بر وزن مفتعلن مفتعلن فاعلن کہ بحر سریع مسدس مطوی

مکفوف ست و بحر رمل مسدس در تحت اوست، جواب آں باشد'' (ص:۳۰)

اور مثنوی میں لکھتا ہے: ؂

مجمع بحرین در افشاں دو بحر : جامع تجنیس دراں داں دو بحر

بہرحال اگر میں ایسا دعویٰ کرتا تو اس کی تغلیط وہی شخص کرسکتا تھا جو اہلی وکاتبی کی مثنویوں کے حال سے ناواقف ہو، علامہ زیدی جیسا صاحب نظر شخص اس کی جرأت کیوں کرسکتا ہے۔

نیز اس دعوے کی تکذیب وہ شخص کرسکتا ہے جو علم البدیع سے یکسر ناواقف ہو، اور اتنا بھی نہ جانتا ہو کہ اس فن کی کتابوں میں بضمن صنائع لفظی مستقل طور پر ایک صنعت کا ذکر کیا جاتا ہے، جس کا نام ''متلون'' یا ''ذوبحرین'' ہے، قواعد فارسی کی درسی کتاب 'احسن القواعد' میں لکھا ہے کہ:

''ایک صنعت متلون ہے کہ شعر کو دو بحروں مختلف میں پڑھا جاوے، جیسے مثنوی اہلی شیرازی کی، جس کا نام 'سحر حلال' ہے، اس کے اشعار یہ ہیں: ؂

اے شدہ در خانۂ جاں منزلت — خانۂ جاں یافتہ زاں منزلت

اے شدہ مہر رخ تو زیں چرخ — چرخ ازاں آمدہ در عین چرخ

اگر اضافات کو مختصر کر کے پڑھو تو وزن مفتعلن مفتعلن فاعلن بحر سریع مطوی موقوف کا ہوگا، اور اگر کھینچ کر پڑھو، تو وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن رمل مسدس محذوف کا ہوگا'' (ص:۲۰۲)

یہ ایسی باتیں نہیں ہیں، جن سے علامہ زیدی ناواقف ہوں، اس لیے اگر وہ بحر رمل و بحر سریع کے اجتماع کے درست ہونے کا انکار کریں تو بڑے تعجب کی بات ہوگی!۔

فاضل زیدی کی خواہش کی بنا پر میں تفصیل سے اپنی رائے پیش کر چکا، آخر میں میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی وجہ سے مجھے بات صاف صاف کرنے کا موقع ملا، اور اسی بنا پر مجھے ان کا مضمون پڑھ کر خوشی ہوئی۔

یکم مارچ ۵۴ء۔

☆......☆......☆......☆......☆

تحقیقات
و
تعلیقات

مختصر الترغیب والترھیب

حضرت محدث الاعظمیؒ کے دل میں قلمی کتابوں کا شغف حد سے بڑھا ہوا تھا، اور خاص طور سے علم حدیث سے متعلق مخطوطات کے آپ شیفتہ ووارفتہ تھے، اسلامی علوم وفنون کے نفائس ونوادر کی جستجو اور تلاش آپ کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی، اور اسی تلاش وجستجو کا نتیجہ تھا کہ حدیث پاک کے متعدد بیش قیمت مخطوطات آپ کی تگ ودو اور تلاش وجستجو سے از سر نو زندہ اور قابل استفادہ ہو کر اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچے، منجملہ ان کے ایک اہم کتاب 'مختصر الترغیب والترھیب' بھی ہے۔

'مختصر الترغیب والترھیب' - جیسا کہ اس کے نام سے عیاں ہے - حدیث کی اہم کتاب 'الترغیب والترھیب' کا اختصار ہے، جو علمِ حدیث کے جلیل القدر امام حافظ ابن حجر کی کاوش کا نتیجہ ہے، کتاب 'الترغیب والترھیب' مشہور امامِ حدیث حافظ منذری کی تصنیف ہے، ذیل میں اصل کتاب، اس کے مصنف اور مختصر کا تذکرہ وتعارف اختصار سے کیا جارہا ہے۔

حافظ منذری:

علم حدیث کے جلیل القدر امام وحافظ ابومحمد عبدالعظیم بن عبدالقوی منذری شامی ثم المصری شعبان ۵۸۱ھ میں پیدا ہوئے، فقہ وحدیث میں مہارت حاصل کی، بلاد اسلامیہ کے دور دراز علاقوں کا سفر کر کے ماہرین فن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے علم حدیث کی تحصیل کی، ان کے شاگردوں میں بھی فن کے بڑے بڑے ماہر پیدا ہوئے ہیں، ان میں حافظ دمیاطی اور امام تقی الدین ابن دقیق العید کا نام ہی کافی ہے، امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ان کے وقت میں ان سے بڑھ کر کوئی حدیث کا حافظ نہیں تھا؛ 'تنبیہ' کی شرح لکھی اور 'سنن ابوداود' اور 'صحیح مسلم' کا اختصار کیا۔ علامہ منذری نے ۶۵۶ھ میں وفات پائی۔

الترغیب والترھیب:

حافظ منذری نے کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، ان میں کتاب الترغیب والترھیب شہرۂ آفاق ہے، عمل کی ترغیب، فضائل ومحاسن اخلاق کی طرف دعوت وتحریک، نیکی کے کاموں کی طرف سبقت کرنے کی تاکید، فواحش ومنکرات سے بچنے اور برائیوں اور بداعمالیوں سے اپنی حفاظت کرنے سے متعلق جو حدیثیں ہیں، ان کا اتنا بڑا ذخیرہ یکجا کہیں اور نہیں مل سکتا، امام منذری نے اس سلسلے کی تمام حدیثوں کو جمع کر کے علم حدیث کی ناقابل فراموش اور بیش بہا خدمت انجام دی ہے، یہ کتاب ۴ چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

مختصر الترغیب والترھیب:

کتاب 'الترغیب والترھیب' چونکہ بہت ضخیم ہے، اور حدیث کے بہت بڑے ذخیرے پر مشتمل ہے، نیز

اس کے اندر ایسی حدیثیں بھی راہ پا گئی ہیں، جو قواعدِ حدیث کی رُو سے کم زور، ضعیف اور معلول ہیں، اس لیے اس سے استفادہ کرنا قدرے مشکل کام تھا، لہٰذا استفادہ کی آسانی پیدا کرنے کے لیے حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کا اختصار کیا، اور ہر باب سے ایسی حدیثوں کو منتخب کر کے جو ضعف اور علت قادحہ سے خالی ہیں، ایک چھوٹی سی کتاب تیار کر دی۔

مختصر کے قلمی نسخوں کی دریافت اور اس کی تحقیق و اشاعت:

اس کا قلمی نسخہ پہلی دفعہ شمالی ہند کے مشہور شہر بہرائچ میں مرزا مظہر جان جاناں کے خلیفہ مشہور صوفی وصاحبِ نسبت بزرگ عالم حضرت مولانا شاہ نعیم اللہ بہرائچی -متوفی ۱۲۱۸ھ- کے کتب خانے میں علامہ اعظمیؒ کی نظر سے گزرا، اس کتاب پر نظر پڑتے ہی آپ کے دل میں اتر گئی، اور اس کی اہمیت کا اس قدر احساس ہوا کہ آپ کے قلب میں اس کو مطبوعہ شکل میں منظر عام پر لانے کا خیال پیدا ہونے لگا، اس کے بہت زمانے کے بعد ۱۹۵۳ء میں اس کتاب کا ایک دوسرا قلمی نسخہ لکھنو یونیورسٹی کے کتب خانے میں آپ کو دستیاب ہوا، اس دوسرے نسخے کی دریافت کے بعد ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ ایک تیسرا نسخہ دارالعلوم دیوبند میں ہاتھ لگ گیا، ان دونوں نسخوں کی دریافت کے بعد آپ نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع کی، دریں اثنا مالیگاؤں میں مجلس احیاء المعارف کا قیام عمل میں آیا، مالیگاؤں کے دو مشہور عالم مولانا عبدالحمید نعمانی اور ان کے رفیق مولانا محمد عثمان نے علامہ اعظمیؒ سے کسی ایسی کتاب کے انتخاب کی درخواست کی، جو مجلس کی طرف سے شائع کی جا سکے۔ چنانچہ آپ نے دیوبند والے نسخے کو عاریۃً لے کر مولانا عبدالحمید نعمانی سے اس کی ایک نقل تیار کرائی، پھر اپنے عزیز ترین شاگرد حضرت مولانا عبدالجبار صاحب مئوی کو ساتھ لے کر لکھنؤ یونیورسٹی کے مخطوطے سے اس کا مقابلہ کیا۔ اس کے بعد اس نقل شدہ نسخے کا مقابلہ امام منذری کی ترغیب وترہیب سے کرایا، جس کی خدمت مولانا عبدالحمید نعمانی اور مولانا محمد عثمان نے انجام دی، بلکہ اس کے شروع کے کچھ حصے اور آخر کے تقریباً ۷۰ صفحات کا ترغیب وترہیب سے مقابلہ ان دونوں حضرات کے ساتھ مل کر خود بھی کیا۔

تعلیقات وحواشی:

اس کتاب پر تعلیق وتحشیہ میں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے، صرف نسخوں کے مقابلہ سے کتاب کی تصحیح پر اکتفا کیا گیا ہے، تعلیقات کی کثرت سے کتاب کی ضخامت کو بڑھانے سے پوری طرح گریز کیا گیا ہے، تاکہ اختصار کا مقصد فوت نہ ہونے پائے، تعلیقات کے اندر نسخوں کی علامت کے لیے حروف تہجی کا استعمال کیا گیا ہے، چنانچہ جہاں ''ل'' لکھا ہوا ہوتا ہے، اس سے مراد نسخۂ لکھنؤ ہوتا ہے، اور ''م'' سے منذری کی ترغیب وترہیب مراد ہوتی ہے، البتہ اگر ''الاصل'' لکھا ہوا ہو، تو اس سے مراد نسخۂ دیوبند اور ''الاصلین'' سے لکھنؤ اور دیوبند دونوں جگہ کے نسخے مراد ہوتے ہیں۔

مقدمہ وتعارفِ نُسَخ:

کتاب کے نقل ومقابلہ کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے اس کے شروع میں ایک مقدمہ تحریر فرمایا، جو دو صفحے پر مشتمل ہے، اس کے اندر حمد باری تعالیٰ اور صلاۃ وسلام کے بعد چند سطروں میں حدیث کی اہمیت اور اس کی حجیت پر روشنی ڈالی ہے، پھر چند ہی سطروں اور جملوں میں حدیثوں کی اس نوعیت کو ذکر کیا ہے، جو کتاب کا موضوع ہے، اس میں لکھا ہے: **والأحاديث النبوية أنواع: فنوع منها ما يتعلق بترغيب الناس في أعمال الخير، والتحلي بالأخلاق الفاضلة، وحثّهم عليها، وترهيبهم من اقتراف المعاصي والأعمال السيئة، وتحذيرهم عن التخلق بالأخلاق الردية، بذكر عواقبها الوخيمة.**

اس کے بعد ان محدثین کا نام ذکر کیا ہے، جنھوں نے امام منذری سے پہلے اس موضوع پر باقاعدہ کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، پھر امام منذری کی ترغیب وترہیب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ کتاب ان سے پہلے کی تمام کتابوں پر حاوی اور جامع تھی، امام منذری سے پہلے کی بعض کتابوں میں موضوع روایتیں بھی درج ہوگئی تھیں، جبکہ امام منذری نے تمحیص وتنقیح سے کام لیتے ہوئے اپنی کتاب کو موضوع روایات سے پاک اور محفوظ رکھا۔ ان خصوصیات کے باعث کتاب مقبول عام وخاص ہوئی، لیکن اس کی ضخامت اور طوالت کی وجہ سے اس سے فائدہ اٹھانا ایک صبر آزما اور مشکل عمل تھا۔

علاوہ ازیں ایک قابلِ لحاظ چیز یہ بھی تھی کہ اس کے اندر ضعیف حدیثیں بھی جگہ پا گئی تھیں، اور احادیثِ ضعیفہ اگر چہ فضائل اعمال کے باب میں مقبول ہوتی ہیں اور ان کو روایت کرنے میں علماء اصول کے نزدیک کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا، لیکن اگر کوئی کتاب ان سے بھی مُعرّیٰ ومُنزَّہ ہو، تو زیادہ نافع، مفید اور اوقع فی النفس ہوتی ہے۔

ان ہی امور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے خاتمۃ الحفاظ ونادرۂ روزگار حافظ ابن حجر عسقلانی کو اس کے اختصار کا خیال پیدا ہوا، اور انھوں نے چھانٹ اور چُن کر ان ہی حدیثوں کا انتخاب کیا جو سند کے اعتبار سے باقی حدیثوں سے قوی اور باعتبار متن زیادہ صحیح ہیں، ایک مفہوم کی بہت سی حدیثوں میں سے صرف چند ایک پر اکتفا کیا، امام منذری نے اپنی کتاب میں راویوں پر جرح وتعدیل کے اقوال کثرت سے نقل کیے تھے، مگر حافظ ابن حجر نے ایک دو لفظ اور جملے پر اکتفا کیا، جس کی وجہ سے یہ کتاب زیادہ مفید اور نفع بخش ہوگئی۔

یہ علامہ اعظمیؒ کے مقدمے کے اس حصے کا ماحصل ہے، جو اس کتاب کی اہمیت وحیثیت اور اس کی قدر وقیمت کے متعلق ہے، اس کے بعد آپ نے "نُسَخ الکتاب" کے عنوان سے کتاب کے ان نسخوں کا تعارف کرایا ہے، جن کو ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، نسخوں کا تعارف دو صفحے پر مشتمل ہے، پھر آدھے آدھے صفحے میں ترغیب وترہیب کے مصنف حافظ عبد العظیم بن عبد القوی منذری -۵۸۱ھ=۶۵۶ھ- اور حافظ ابن حجر عسقلانی -۷۷۳ھ=۸۵۲ھ- کا تعارف ہے۔

کتاب کی طباعت واشاعت:

یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۳۸۰ھ=۱۹۶۰ء میں علمی پریس مالیگاؤں سے طبع ہوکرادارہ احیاء المعارف مالیگاؤں سے شائع ہوئی، اس اشاعت میں کتاب اور مصنف کتاب کے نام کے بعدلکھا ہوا تھا: **حقق أصوله وعلّق عليه: العالم الشهير الجليل الشيخ حبيب الرحمان الأعظمي، والفاضلان عبدالحميد النعماني، ومحمد عثمان المالیگانوي.** یہ اشاعت کتابت وطباعت کی غلطیوں سے پُرتھی، چنانچہ علامہ اعظمیؒ نے اپنے نسخے میں بہت سی تصحیحات وتصویبات کی ہیں، جس سے اس کے اندر پائی جانے والی مطبعی غلطیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس کا دوسرا اڈیشن ۱۴۰۱ھ=۱۹۸۱ء میں مکتبۃ الغزالي دمشق سے ساریہ عبدالکرم الرفاعی کے اہتمام سے شائع ہوا، شیخ رفاعی نے اس اڈیشن میں بہت سی غلطیوں کی تصحیح وتصویب کی، نیز احادیث کے اندر جوغریب اور مشکل الفاظ تھے، حاشیہ میں ان کی تفسیر وتشریح کی، لیکن اس اڈیشن کا نامناسب پہلو یہ ہے کہ اس کے ٹائٹل سے مولانا عبدالحمید نعمانی اور مولانا محمد عثمان مالیگانوی کا نام حذف کردیا گیا۔

مختصر کے ابواب اور احادیث کی تعداد:

یہ مختصر بیس کتابوں پر مشتمل ہے، اور ہر کتاب میں کچھ فصول اور ابواب ہیں، اس کا پہلا اڈیشن دوسوپچیس صفحات اور آٹھ سوپچپن حدیثوں پر مشتمل تھا، دوسرے اڈیشن میں صفائی ستھرائی اور حسن اہتمام اور پھر شرح کلمات کی وجہ سے صفحات کا بڑھنا فطری امر تھا، چنانچہ فہرستوں کے علاوہ یہ اڈیشن دوسوناوے صفحات پر مشتمل ہے، اور اس میں حدیثوں کی تعداد آٹھ سواٹھاون ہوگئی، اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ پہلے اڈیشن میں حدیث نمبر ۹۵، ۴۲۸، اور ۸۳۷ پر نمبر دودفعہ پڑ گیا تھا، اور بعد والے اڈیشن میں جب اس کی تصحیح کی گئی تو اس میں تین نمبر بڑھ گئے۔

☆......☆......☆

مسند حُمَیدی

مُسْنَد کی تعریف:

مُسْنَد حدیث پاک کے اس مجموعے کو کہتے ہیں، جس میں حدیثیں صحابہؓ کی ترتیب سے جمع کی گئی ہوں، مثلاً پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مرویات کو یکجا ذکر کیا گیا ہو، اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کی، پھر دیگر خلفاء راشدین اور عشرۂ مبشرہ کی مرویات ہوں، اس کے بعد باقی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی۔

مسند کے طرز پر بہت ساری کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، مسانید عام طور سے اپنے مرتبین یا مصنفین کے

نام کی طرف اضافت کے ذریعے جانی اور پہچانی جاتی ہیں، جیسے مسند ابوداود طیالسی، مسند امام احمد اور مسند عبد بن حمید وغیرہ، ازاں جملہ مسند حمیدی بھی ہے، اس کتاب کا شمار اس نہج پر تصنیف کی جانے والی ابتدائی کتابوں میں ہوتا ہے، اس کے متعلق علامہ اعظمیؒ نے مولانا محمد موسیٰ میاں کو ایک خط میں لکھا ہے:

''مسند حمیدی کی بڑی قیمت یہ ہے کہ اس میں مسند احمد کی طرح رسول اللہ ﷺ اور مصنف کے درمیانی واسطے صحاح ستہ کے لحاظ سے کم ہیں، عموماً چار واسطے ہیں، اور اس کی ثلاثیات کی تعداد بہت ہے، صحاح ستہ سے جو کتابیں متقدم ہیں، ان کی اشاعت سے منکرینِ حدیث کے اس دعوے کا کذب اظہر من الشمس ہو جاتا ہے کہ ''حدیثیں مصنفینِ صحاح نے خود تصنیف کر لی ہیں، اس لیے کہ اگر انھوں نے تصنیف کی ہوتیں، تو ان سے پیشتر کی کتابوں میں وہ کیسے موجود ہیں؟''

امام حُمَیدی کا تعارف:

ان کا نام عبداللہ بن زبیر قریشی اسدی حمیدی مکی تھا، اور کنیت ابوبکر تھی، حدیث شریف کے بلند پایہ اور عظیم المرتبت حفاظ میں ان کا شمار ہوتا تھا، سفیان بن عیینہ ایک جلیل القدر امام حدیث تھے، حمیدی ان کے ممتاز تلامذہ میں شمار کیے جاتے تھے، ان کا شمار امام شافعی کے بھی خاص شاگردوں میں ہوتا تھا، ان کے ساتھ مصر گئے، ان سے ان کی فقہ سیکھی، امام شافعی کی فقہ پر نہ صرف عمل پیرا تھے، بلکہ اس میں کسی قدر متشدد بھی تھے۔

امام حمیدی سے ان کے زمانے کے کبار محدثین نے حدیثیں روایت کیں اور ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے، ان کے زمرۂ تلامذہ میں صرف امام بخاری ہی کا نام ذکر کر دینا کافی ہوگا، ان کے علاوہ اس وقت کے دوسرے بڑے محدثین نے بھی ان سے حدیثیں سنیں اور روایت کی ہیں۔

روایتِ حدیث میں ان کی امامت مسلّم تھی، اور فن جرح وتعدیل کے بلند رتبہ ائمہ نے ان کے حفظ وثقاہت کی تعریف کی ہے، امام بخاری کا ان کی روایت پر اعتماد کا یہ حال تھا کہ شدتِ طلب وجستجو کے باوجود جب کوئی حدیث امام حمیدی کے پاس ان کو مل جاتی تھی، تو پھر کسی دوسری سند سے حاصل کرنے کی ان کو فکر نہیں رہتی تھی۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنے مقدمے میں فرمایا ہے کہ حمیدی کے شرف کے لیے یہی کافی ہے کہ ابن عیینہ سے حدیث سننے میں وہ امام شافعی کے رفیقِ درس اور علمِ حدیث میں امام بخاری کے استاذ رہے ہیں، اور امام بخاری نے ان سے نہ صرف حدیث بلکہ علمِ فقہ بھی حاصل کیا ہے، حمیدی کی وفات ۲۱۹ھ میں ہوئی۔

امام حمیدی کا ایک کمزور پہلو:

بڑے بڑے اہل علم اور بزرگانِ دین بھی بشری کمزوریوں سے خالی نہیں ہوتے ہیں، امام حمیدی کی کمزوری یہ تھی کہ مؤرخین کی صراحت کے مطابق وہ اپنی مسلّمہ امامت اور جلالت رتبہ کے باوجود سریع الغضب، سخت زبان اور تلخ کلام تھے، اور خاص طور سے فقہاء احناف کے سلسلے میں ان کو بہت شدت تھی، علامہ اعظمیؒ نے لکھا

ہے کہ میں نے ان کا کوئی عیب لکھا ہوا نہیں پایا سوائے اس کے کہ فقہاء عراق کے باب میں وہ بہت سخت اور تیز زبان تھے، اگر یہ بات صحیح ہے تو ان کی امامت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے دامن کو اس سے بچا کر رکھتے۔

مسند حمیدی کی اہمیت:

امام حمیدی کی کئی تصانیف ذکر کی جاتی ہیں، لیکن ان میں اہم تر اور مشہور ترین ان کی یہی مسند ہے، ان کی مسند کی تصنیف کا زمانہ صحاح ستہ سے پہلے کا ہے، لہذا لازمی اور ضروری ہے کہ سند کے اعتبار سے اس کی روایتیں صحاح ستہ کی سندوں سے عالی ہوں، اور صرف یہی نہیں بلکہ صحاح ستہ میں پائی جانے والی روایتوں کو قوت بھی فراہم کرتی ہوں، کیونکہ اس کی بہت سی روایتیں ان ہی سندوں سے ہیں جن سے وہ صحاح ستہ میں ہیں، لہذا اس سے منکرین حدیث کے اس دعویٰ کے ردّ و ابطال میں مدد ملے گی کہ صحاح ستہ کی حدیثیں محدثین کی خود ساختہ ہیں، اور ان کتابوں کے مصنفین نے حدیثیں اپنی طرف سے بنا کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دی ہیں، مسند حمیدی اور اس جیسی دوسری کتابوں کے منظر عام پر آجانے سے حدیث و سنت کے دفاع کا ایک مضبوط وسیلہ حاصل ہو گیا کہ اگر یہ حدیثیں مصنفین صحاح ستہ کی خود ساختہ ہیں، تو بعینہ ان ہی سندوں سے ان کتابوں سے پہلے کی تصانیف میں کہاں سے آ گئیں۔

مسند حمیدی کی دریافت:

صحاح ستہ سے پہلے تصنیف کی جانے والی کتابوں میں چونکہ حدیث و سنت کا ایک بہت بڑا ذخیرہ محفوظ ہے، اور ان کی تحقیق و اشاعت سے اسلام کی ایک بہت بڑی اور اہم خدمت انجام دی جا سکتی ہے، اس لیے علامہ اعظمیؒ کے قلب میں ایک ہوک اور تڑپ رہا کرتی تھی کہ ان کو دریافت کر کے قابل اشاعت بنایا جائے، آپ کی اس دیرینہ آرزو اور تمنا کا اظہار مسند حمیدی پر لکھے ہوئے آپ کے مقدمے میں بھی ہوتا ہے، آپ نے لکھا ہے: **وكنت أودُّ منذ أعوام أنْ لو وفَّق الله أحداً من أهل العلم أن يُفتِّشَ عما بقي من هذه المسانيد في خزائن الكتب، فإن ظفِر بشيء منها قام بتصحيحه ونشره، لكان خدمةً لا تُنسىٰ ومنةً في رقاب أهل العلم، وكان أيضاً دفاعاً مجيداً عما رمى به أعداء الحديث مصنفي الصحاح من أنهم وضعوا الأحاديث التي أودعوها كتبهم.**

یعنی برسوں سے میری یہ خواہش تھی کہ کاش اللہ تعالیٰ کسی صاحبِ علم کو توفیق دیتا کہ کتابوں کے خزانوں میں مسند کے طرز پر مرتب اور دستبرد زمانہ سے محفوظ ان کتابوں کو تلاش کرتا، ان میں سے اگر کوئی کتاب اس کے ہاتھ لگ جاتی تو تصحیح کر کے اس کو شائع کر دیتا، تو یہ ایک نا قابل فراموش خدمت اور اہل علم پر ایک بڑا احسان ہوتا، اور اس سے دشمنانِ حدیث کی اس بہتان تراشی کا دفاع اور جواب بھی ہو جاتا کہ صحاح ستہ میں جو حدیثیں ہیں، ان کو ان کے مصنفین نے اپنی طرف سے وضع کر لیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ کی یہ دیرینہ آرزو اس وقت پوری ہوتی ہوئی نظر آنے لگی، جب آپ کو دار العلوم دیوبند کے کتب خانے میں 'مسند حمیدی' کے ایک قلمی نسخے کا سراغ لگا، اپنے مقدمے میں لکھا ہے: **کنتُ أوَدُّ هذا وكانت هذه الأمنية دائماً نصبَ عيني، حتى عثرتُ على نسخة من مسند الحميدي في مكتبة دار العلوم -بديوبند، الهند- فَطِرتُ فرَحاً وشكرتُ الله.**

لیکن کسی مخطوطے کے ایک نسخے کی بنیاد پر اس کی تحقیق واشاعت کا بیڑا اٹھانا مشکل کام ہے، اور تحقیق کرنے والے کو بڑی مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، اس لیے آپ کو اس کے مزید نسخوں کی تلاش رہی، اور اس کے لیے ہندو بیرون ہند کے کتب خانوں میں جستجو یا سلسلہ جنبانی کرتے رہے، یہ کوشش اس وقت بارآور ہوئی جب دسمبر ۱۹۵۸ء میں حیدرآباد کے ایک سفر کے دوران کتب خانہ سعیدیہ کی زیارت کا موقع ملا، وہاں آپ کو مسند حمیدی کا دوسرا نسخہ دستیاب ہوا، اور یہیں سے اس کتاب کی تحقیق وتحشیہ کا عزم راسخ ہو گیا۔ اس نسخے کے متعلق علامہ اعظمیؒ نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے، اس کے علاوہ مولانا محمد موسیٰ میاں بانی مجلس علمی کو ایک خط بھی اس کے بارے میں لکھا ہے، یہ ۲۷؍دسمبر ۱۹۵۸ء کا تحریر کردہ تین صفحات پر مشتمل ہے، لیکن مسند حمیدی کے تعلق سے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ حسب ذیل ہے:

''مسند حمیدی ۱۳؍انچ عرض والے ۱۳۷؍صفحات پر ہے، اگر اسی تقطیع پر چھپے تو تحشیہ کے ساتھ دوسو صفحات ہو جائیں گے، دیوبند کا نسخہ الہ آباد سے حاصل ہوا ہے، اور ۱۳۲۴ھ کا لکھا ہوا ہے، اس کا ایک نسخہ حیدرآباد میں بھی ہے، میں نے اس کو بھی دیکھا ہے، وہ اس سے کچھ قدیم ہے''۔

ان دونوں نسخوں کے دریافت ہونے کے بعد اگرچہ آپ نے اس کی تحقیق کا عزم مصمم کر لیا تھا، لیکن کام شروع کرنے سے پہلے دیوبند کے نسخے کا حیدرآبادی نسخے سے مقابلہ کے لیے آپ نے تقریباً آٹھ مہینے بعد حیدرآباد کا ایک اور سفر کیا، اس مرتبہ قسمت نے پھر یاوری کی اور وہیں ایک تیسرے نسخے کا بھی پتہ چلا۔ یہ واقعہ ستمبر ۱۹۵۹ء کا ہے، ۲۷؍ستمبر ۱۹۵۹ء = ربیع الاول ۱۳۷۹ھ کو مولانا موسیٰ میاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''کل جامعہ عثمانیہ کا کتب خانہ دیکھا، وہاں ایک نسخہ مسند حمیدی کا ملا، مگر روزانہ وہاں جا کر مقابلہ کرنا پڑے گا، جو میری قیام گاہ سے ۷؍میل دور ہے''۔

آپ نے دیوبند والے نسخے کو اصل قرار دے کر اس کی نقل اپنے صاحبزادے حضرت مولانا رشید احمد صاحب سے کرائی۔

ان تین نسخوں پر اپنے کام کی بنیاد رکھتے ہوئے علامہ اعظمیؒ نے اس اہم کتاب کے نصوص کی تصحیح اور اس پر تعلیق وتحشیہ کا آغاز کیا، آپ نے اپنے مقدمے میں ان تینوں نسخوں کا ایک جامع تعارف بھی پیش کیا ہے، یہ نسخے کب لکھے گئے، کس وقت عالم وجود میں آئے، اور کن کن لوگوں کی ملکیت میں رہے، تفصیل کے ساتھ اس کی روداد بیان فرمائی ہے، اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ ان کے مقابلہ کے بعد تصحیح کا طریقۂ کار کیا ہے۔

ابھی آپ اس کی تحقیق اور تعلیق وتحشیہ سے پوری طرح فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ دست قدرت نے

مکہ مکرمہ کے مکتبۃ النہضۃ الحدیثۃ کے مالک شیخ عبدالشکور فدا کی مدد سے ایک چوتھا نسخہ بھی آپ کے پاس پہنچا دیا، یہ دمشق کے دارالکتب الظاہریہ کے ایک نسخے کی عکسی تصویر تھی، لیکن یہ نسخہ آپ کے پاس اس وقت پہنچا، جب کتاب کی طباعت کا آغاز ہو چکا تھا، تاہم اس سے استفادہ کی بھی صورت آپ نے پیدا کر لی، اور وہ یہ کہ اس کا جو حصہ ابھی طبع نہیں ہوا تھا، اس کی تعلیقات میں اس نسخے سے استفادہ کیا، اور جو حصہ طبع ہو چکا تھا، اس کے متعلق جو کام کی چیزیں تھیں، ان کو یکجا کر کے کتاب کے آخر میں شامل کر دیا۔

اس طرح کل چار نسخوں کی مدد سے یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی: دیوبند کا نسخہ، سعیدیہ کا نسخہ، عثمانیہ کا نسخہ اور ظاہریہ دمشق کا نسخہ۔ آپ نے ان نسخوں کی نشاندہی کے لیے اختصار کی غرض سے رموز کا استعمال کیا ہے، دیوبند کے نسخے کو ''اصل'' کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، اور اس کو اور عثمانیہ کے نسخے کو ''اصلین'' کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، اور اگر کہیں صرف عثمانیہ کے نسخے کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو تو اس وقت ''ع'' کا حرف استعمال کرتے ہیں، اور سعیدیہ کے نسخے کے لیے ''س'' کا حرف، اور ظاہریہ کے لیے ''ظ'' استعمال کرتے ہیں۔

مسند حمیدی پر کام کی نوعیت:

علامہ اعظمیؒ نے مذکورہ بالا چاروں نسخوں کا باہم مقابلہ کیا، بلفظ دیگر ان چاروں کی مدد سے ایک صحیح نسخہ تیار کیا، اور ان نسخوں کے درمیان جو اختلافات تھے حاشیے میں ان کی وضاحت کی۔ اس کتاب پر کام کی نوعیت کی حسب ذیل صورتیں ذکر کی جا سکتی ہیں:

۱- سند و متن کی تصحیح: مذکورہ بالا نسخوں کے باہم مقابلہ نیز دیگر کتب حدیث سے موازنہ کے بعد صحیح ترین الفاظ و کلمات کو متن میں درج کرنا اور اختلافِ نسخ کی حاشیے میں وضاحت کرنا، یا اصل وغیرہ کے الفاظ کو متن میں برقرار رکھتے ہوئے صحیح لفظ کی طرف حاشیے میں نشاندہی کرنا۔

۲- غریب یا نامانوس اور مشکل الفاظ کی تفسیر و تشریح۔

۳- اگر حدیث کا مفہوم مبہم اور غیر واضح یا مشکل ہو، تو حاشیے میں اس کی توضیح۔

۴- احادیث کی تخریج اور دوسری متداول کتابوں سے اس کے حوالے۔

اس کتاب کی تحقیق اور اس کی احادیث کی تخریج میں علامہ اعظمیؒ نے اس بات کا اہتمام برتا ہے کہ صحیحین، صحاح ستہ اور مسند احمد کے حوالوں پر توجہ مرکوز رکھی جائے، اور تخریج کے وقت حوالوں کی کثرت کے بجائے صرف امہات الکتب میں ایک یا چند ایک کتاب کے حوالے پر اکتفا کیا جائے، تاکہ صفحات کی تعداد زیادہ نہ ہونے پائے، اور اہل علم کے لیے استفادہ میں آسانی رہے۔

پھر آپ نے ان ہی امور پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ قارئین کی آسانی کے لیے اس کی کئی ایک فہرستیں تیار کیں، جو حسب ذیل ہیں:

۱- چونکہ کتاب کی ترتیب صحابہ کے مسانید پر ہے، اس لیے آپ نے فقہی ابواب کے لحاظ سے ایک

فہرست تیار کی، تا کہ اگر کسی کو اس کتاب میں کوئی حدیث تلاش کرنی ہو اور راوی یا صحابی کا نام معلوم، یا محفوظ نہ ہو؛ تو اس کو اس فہرست میں آسانی سے تلاش کر سکے۔

۲- دوسری فہرست ان اسما واعلام کی بنائی جو کتاب کے درمیان میں آئے ہیں، جس سے کتاب کی افادیت اور نافعیت دو چند ہوگئی ہے۔

ان دونوں فہرستوں کے علاوہ مسند حمیدی کے مطالعہ کرنے والوں کو اس کے شروع میں ایک فہرست بھی نظر آئے گی، جس میں یہ ذکر ہوگا کہ فلاں صحابی کی مسند فلاں صفحے سے شروع ہوتی ہے، اس کے بارے میں علامہ اعظمیؒ نے اپنے مقدمے میں صراحت کر دی ہیں کہ یہ فہرست فاضل ادیب مولانا محی الدین الہ آبادی کی بنائی ہوئی ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کتاب پر ایک جامع اور پُر مغز مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے، جس میں مصنف -امام حمیدی- کا تعارف، کتاب کی اہمیت اور قدر وقیمت، اس کے نسخوں کی دریافت اور اپنے کام کی نوعیت کے علاوہ اس کے راویوں کا بھی تذکرہ اور تعارف کیا ہے، اس مقدمے کو پڑھنے کے بعد تمام ضروری اور اہم معلومات قاری کے ذہن میں آجاتی ہیں۔

امام حمیدی سے اس کو روایت کرنے والے بشر بن موسی اسدی -متوفی ۲۸۸ھ- ہیں، اور یہ کتاب دو جلدوں اور دس اجزا پر مشتمل ہے، ہر جلد میں پانچ اجزا آئے ہیں، کتاب میں کل تیرہ سو حدیثیں ہیں، لیکن اصل کے نسخوں سے ایک حدیث ساقط ہوگئی ہے، تو علامہ اعظمیؒ نے بعد میں ظاہریہ کے نسخے سے آخر میں **الاستدراک والتعقیب** کے عنوان کے تحت اس کا اضافہ کیا ہے، اس طرح اس کتاب کی حدیثوں کی تعداد ایک ہزار تین سو ایک (۱۳۰۱) تک پہنچتی ہے، پانچ سو تراسی (۵۸۳) حدیثیں پہلی جلد میں ہیں، اور باقی دوسری جلد میں۔ کتاب کے آخر میں امام حمیدی کا ایک مختصر سا رسالہ بھی ہے، جس کا نام 'أصول السنة' ہے، اس کو بھی امام حمیدی سے بشر بن موسیٰ ہی نے روایت کیا ہے۔

یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۳۸۲ھ=۱۹۶۲ء میں مجلس علمی- ڈابھیل، سملک، گجرات- سے شائع ہوئی۔

تحریف کی تہمت اور اس کا رد:

علامہ اعظمیؒ نے اس کتاب کے مختلف نسخوں کے مقابلہ، اس کی ایک ایک حدیث اور اس کے اسناد ومتن کی تحقیق اور تخریج، اس پر تعلیق وتحشیہ، اور اس کی فہرست سازی وغیرہ کے لیے جو عرق ریزی، جگر کاوی اور جاں فشانی کی ہے، اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے، اور یہی وجہ ہے کہ کتاب کے شائع ہوتے ہی اہل علم نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور علمی وتحقیقی حلقوں میں اس کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی؛ لیکن دنیا میں کچھ ایسے متعصب لوگ بھی ہیں جو حدیث پر اپنی اجارہ داری سمجھتے ہیں، اور اپنی جماعت کے باہر دوسرے اہل علم کی علمی وتحقیقی خدمات ان کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتی رہتی ہیں، کسی بھی محدث اور عالم ومحقق کی علمی تحقیق کی تنقیص کرنا اور ان کے اوپر

تحریف کی تہمت لگا دینا ان عصبیت زدہ لوگوں کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے، اس کا ظہور مسند حمیدی کے سلسلے میں بھی ہوا۔ یہ لوگ بجائے اس کے کہ اس اہم کتاب کی تحقیق واشاعت اور اس کو منصۂ شہود پر لانے کے لیے اس کے محقق کو ہدیۂ تبریک وتہنیت پیش کرتے، اور اس اہم دریافت پر خداوند قدوس کا شکر ادا کرتے، اس کی عیب جوئی اور نکتہ چینی میں لگ گئے، اور یہ بات ظاہر ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے اس کی کاوش کسی نہ کسی نوع کی کمی یا نقص سے خالی نہیں رہ سکتی، اور بالآخر ان مخالفین کو مسند حمیدی میں ایک ایسی جگہ مل گئی، جس کو بنیاد بنا کر حضرت محدث الاعظمیؒ پر کتاب میں تحریف اور ردوبدل کی تہمت لگائی، اور دشنام واتہام کے پتھر برسائے، حالانکہ اس الزام سے علامہ اعظمیؒ کا دامن پوری طرح پاک وصاف ہے۔

مخالفین نے جس حدیث کو لے کر دشنام واتہام کا محل تعمیر کیا ہے، مسند حمیدی کے مطبوعہ نسخے میں سند ومتن کے ساتھ وہ روایت اس طرح چھپی ہوئی ہے:

حدثنا الحميدي، قال: حدثنا الزهري، قال: أخبرني سالم بن عبد الله، عن أبيه قال: رأيت رسول الله ﷺ إذا افتتح الصلاة، رفع يديه حذو منكبيه، وإذا أراد أن يركع وبعد ما يرفع رأسه من الركوع فلا يرفع، ولا بين السجدتين.

اس حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ جب نماز شروع کرتے تھے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھاتے تھے، اور جب رکوع کا ارادہ کرتے تھے اور رکوع سے اٹھتے تھے تو نہیں اٹھاتے تھے، اور نہ دونوں سجدوں کے درمیان اٹھاتے تھے۔

اس حدیث سے نماز میں تکبیر تحریمہ کے علاوہ باقی مواقع پر رفع یدین کی نفی ہوتی ہے، جس کو ثابت کرنے کے لیے غیر مقلدین ایڑی چوٹی کا زور صرف کرتے ہیں، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ مسند حمیدی کی یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے واسطے سے مروی ہے، اور مخالفینِ حنفیہ رفع یدین کو ثابت کرنے کے لیے جس حدیث کو بنیاد بناتے ہیں اور جس کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں، وہ بھی صحیحین وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی کے واسطے سے روایت کی گئی ہے، چنانچہ جب یہ روایت مسند حمیدی میں آئی اور اس کو حضرت ابن عمرؓ کی مشہور روایت کے مفہوم کے خلاف دیکھا، تو حضرت علامہ اعظمیؒ نے باوجود متصلب حنفی ہونے کے نہایت احتیاط اور دیانت سے کام لیتے ہوئے اس پر یہ حاشیہ تحریر فرمایا:

أخرج البخاري أصل الحديث من طريق يونس عن الزهري، وأما رواية سفيان عنه فأخرجها أحمد في مسنده، وأبو داود عن أحمد في سننه، ولكن رواية أحمد عن سفيان تخالف رواية المصنف عنه، ففي مسند أحمد رأيت رسول الله ﷺ إذا افتتح الصلاة رفع يديه حتى يحاذي منكبيه، وإذا أراد أن يركع وبعد ما يرفع رأسه من الركوع، وقال سفيان مرة: وإذا رفع رأسه وأكثر ما كان يقول وبعد ما يرفع رأسه من الركوع، ولا يرفع بين

السجدتين (ج ۲ ص ۸). ففيه كما ترى إثبات الرفع عند الركوع والرفع منه ونفيه بين السجدتين؛ وفي رواية الحميدي نفيه في الركوع والرفع منه وفيما بين السجدتين جميعاً، ولم يتعرض أحد من المحدثين لرواية الحميدي هذه.

علامہ اعظمیؒ نے اپنے حاشیے میں پورے انصاف و دیانت سے کام لیتے ہوئے لکھ دیا ہے کہ اصل حدیث بخاری میں ہے، لیکن اس میں زہری سے اس کو روایت کرنے والے یونس ہیں، ہاں! سفیان کے واسطے سے زہری کی یہ روایت مسند امام احمد اور امام احمد کے واسطے سے سنن ابوداود میں موجود ہے، لیکن امام احمد نے سفیان سے جو روایت کیا ہے، وہ اس سے مختلف ہے جو بات حمیدی نے سفیان سے روایت کی ہے، چنانچہ مسند احمد والی روایت میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول اس طرح ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا کہ جب نماز شروع کرتے تھے تو اپنے ہاتھوں کو اپنے دونوں کندھوں تک اٹھاتے تھے، اور جب رکوع میں جاتے تھے اور جب رکوع سے اٹھتے تھے (تب بھی اپنے ہاتھوں کو اٹھاتے تھے)، اور دونوں سجدوں کے درمیان نہیں اٹھاتے تھے۔ اس روایت میں رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت بھی ہاتھ اٹھانے کا بیان ہے، اور دونوں سجدوں کے درمیان اٹھانے کی نفی ہے، مگر حمیدی کی روایت میں دونوں سجدوں کے ساتھ ساتھ رکوع میں جاتے وقت اور اس سے اٹھتے وقت بھی اٹھانے کی نفی ہے، لیکن محدثین میں سے کسی نے حمیدی کی اس روایت سے تعرض نہیں کیا ہے۔

یہ ہے مسند حمیدی کی وہ روایت اور اس پر علامہ اعظمیؒ کا حاشیہ۔ اس سے ناظرین کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ علامہ اعظمیؒ نے اپنے اس حاشیے میں کس قدر انصاف اور علمی دیانت سے کام لیا ہے، اور اس میں خالص محدثانہ طرز پر اور محققانہ رنگ میں گفتگو کی ہے، اور مسلکی نوعیت کے کسی بھی اختلاف سے قطعی کوئی تعرض نہیں کیا ہے۔ اس سے بڑھ کر منصفانہ اور دیانت دارانہ تحقیق کیا ہو سکتی ہے!!

بہتان وافترا کی بارش:

لیکن جب کتاب چھپ کر آئی تو اس کے تقریباً بیس برس بعد کچھ حُسَّاد زمانہ نے اس روایت اور اس کے حاشیہ کو بنیاد بنا کر اس کے محقق پر تحریف اور جعل سازی کی تہمت لگانی شروع کی، حالانکہ اگر حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو علامہ اعظمیؒ کا دامن اس الزام سے بالکل پاک ہے، اور مخالفین کا طریقہ نہ صرف غیر علمی بلکہ غیر اسلامی وغیر اخلاقی بھی ہے، سطور ذیل میں ان اتہامات کا تجزیہ کیا جا رہا ہے:

پہلا اتہام:

مارچ ۱۹۸۶ء میں جامعہ سلفیہ بنارس سے شائع ہونے والے 'محدث' میں ایک مضمون شائع ہوا، جس کا عنوان تھا: ''مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی کی حدیث رسول میں نارواخیانت اور جعل سازی''۔ یہ عنوان ہی بتا رہا ہے کہ مضمون نگار اخلاق وکردار کے کس ''بلند مقام'' پر فائز اور متمکن ہیں، اور ان کے اندر کس قدر تہذیب

وشائستگی اورعلم واہل علم کی کتنی قدر پائی جاتی ہوگی، اوراسی سے یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ جب عنوان کا حال یہ ہے، تو مضمون میں انھوں نے کس قدر مہذّب اور شائستہ لب ولہجہ استعمال کیا ہوگا، بہرحال یہاں ان کے پورے مضمون سے تعرُّض نہ کرتے ہوئے صرف ان کے اتہامات کے تجزیہ اور جواب پر اکتفا کیا جارہا ہے، مضمون نگار نے پہلی تہمت یہ لگائی ہے:

''مخطوطہ میں **حدثنا الحميدي** کے بعد **ثنا سفيان** ہے، مگر مولانا نے سفیان کو ساقط کردیا، اس کے بعد **نا الزهري** ہے، مگر مولانا نے نا کو گرادیا، اور الزھری کو سفیان سے قبل والے نا کے ساتھ جوڑ دیا ہے، اس طرح امام زہری کو امام حمیدی کا براہِ راست استاذ بنادیا گیا ہے، اور امام زہری سے امام حمیدی کے لیے سماع بھی ثابت کردیا گیا، حالانکہ امام زہری رمضان ۱۲۴ھ میں وفات پاچکے تھے، اور امام حمیدی امام شافعی (پیدائش ۱۵۰ھ) کے شاگرد ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام حمیدی کو اپنی پیدائش سے پہلے ہی امام زہری سے ملاقات، شاگردی اور سماع کا شرف حاصل ہوگیا، بھلا ایسی باکمال تحقیق مولانا اعظمی جیسے ''محدث جلیل'' کے سوا اور کس کے حصہ میں آسکتی تھی؟''[۱]

اہل علم کو اندازہ لگانے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوگی کہ اگر مضمون نگار کے اندر انصاف ودیانت کا ذرا سا بھی جوہر ہوتا، تو ان کو یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی کہ کتابت وطباعت کی غلطی سے مطبوعہ میں **ثنا سفيان** چھوٹ گیا ہے، اور یہ ایسی غلطی ہے جس سے دنیا کی شاید ہی کوئی کتاب خالی اور مبرا ہو، لہذا اس کی بنیاد پر کسی مصنف ومحقق کو ہدفِ طعن وتعریض بنانا حق وانصاف کا خون کرنا اور علمی واخلاقی دیوالیہ پن کا ثبوت دینا ہے۔

مضمون نگار کو کاغذ سیاہ کرنے سے پہلے سوچنا چاہئے تھا کہ اگر بالفرض محدث جلیل نے یہ کارروائی دانستہ بھی کی ہو، تو اس سے ان کو کون سا مقصد اور فائدہ حاصل ہوجائے گا، دنیائے علم وتحقیق مضمون نگار کی طرح ضعف بصیرت کا شکار نہیں ہے؛ اگر مولانا اعظمیؒ کے دل میں جعل سازی کا ذرا سا واہمہ بھی ہوتا، تو وہ پہلے یہ سوچتے کہ یہ کارروائی اہل نظر کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی، اور درمیانی واسطے کے ساقط ہونے کی وجہ سے یہ حدیث نہایت کم زور ہوجائے گی، اس لیے اگر مولانا اعظمیؒ کے دل میں اس سے کوئی ناروا فائدہ اٹھانا ہو، تو وہ ایسی کارروائی کیوں کر کریں گے، جس سے یہ حدیث بجائے قوی ہونے کے ضعیف ہوجائے گی، اور بجائے اس کے کہ مولانا اعظمیؒ کے مفید مطلب ہو الٹی نقصان دہ ثابت ہوجائے گی۔

پاکستان کے ایک عالمِ دین مولانا حافظ حبیب اللہ صاحب استاذ حدیث مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ نے مسند حمیدی کے شائع ہونے کے بعد علامہ اعظمیؒ کے پاس خط لکھ کر اس کی حقیقت دریافت کرنی چاہی، علامہ اعظمیؒ نے اس کا جو جواب تحریر فرمایا، اس کو مولانا حبیب اللہ صاحب نے اپنی کتاب 'نور الصباح فی ترک رفع الیدین بعد الافتتاح' میں شائع کیا ہے، لکھا ہے:

(۱) محدث: مارچ ۱۹۸۶ء

''مسند حمیدی کے مطبوعہ نسخہ میں حدثنا سفیان کا جملہ چھوٹ گیا ہے، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی محشی و محشی مسند حمیدی سے جب رابطہ قائم کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اس کی صحیح سند یوں ہے:

حدثنا الحميدي قال: حدثنا سفيان، قال: حدثنا الزهري الخ. مسند حمیدی کے نسخۂ مکتبۂ ظاہریہ اور اس کے ہندوستانی مخطوطات میں بھی یونہی ہے، مطبوعہ نسخوں میں حروف جوڑنے والوں کی غلطی سے **قال حدثنا سفیان** چھوٹ گیا ہے، اغلاط میں اس کو دینا چاہئے، مگر سہواً رہ گیا۔

والسلام حبیب الرحمٰن الاعظمی، بقلم خود

پٹھان ٹولہ، مئو، اعظم گڈھ، ۱۵/اگست ۱۹۶۵ء

اس کے بعد مزید کچھ عرض کرنے کی حاجت نہیں رہ جاتی، مگر ثبوت کے طور پر مبیّضہ کے اس صفحے کی تصویر یہاں منسلک کی جارہی ہے، تاکہ ناظرین کو اس میں کوئی شک نہ رہ جائے کہ علامہ اعظمیؒ کی نقل میں **قال حدثنا سفیان** والی عبارت موجود ہے، مطبوعہ میں جو غلطی ہے وہ محض کتابت یا کمپوزنگ کی ہے۔

دوسرا اتہام:

متن میں تحریف کا ہے، اس الزام یا تہمت کو سمجھنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ اور حدیث کے متن کو نقل کردیا جائے، مسند حمیدی کا متن یہ ہے:

رأيت رسول الله ﷺ إذا افتتح الصلاة رفع يديه حذو منكبيه، وإذا أراد أن يركع وبعد ما يرفع رأسه من الركوع فلا يرفع ولا بين السجدتين.

اس کے متعلق معاندین نے جو تہمت لگائی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ مخطوطہ میں **بعد ما يرفع رأسه من الركوع** کے بعد صرف **ولا يرفع بين السجدتين** تھا، لیکن محدث اعظمیؒ نے **واو** کو **ف** سے بدل کر **فلا يرفع** کردیا، اور **بين السجدتين** سے پہلے **ولا** کا اضافہ کردیا، اور اپنی اس تحریف میں قوت پیدا کرنے کے لیے **حذو منكبيه** کے بعد اور **وإذا أراد** سے پہلے ایک قامہ بڑھادیا۔

مضمون نگار نے اپنی اس تہمت کی شہادت اور ثبوت کے طور پر مکتبہ ظاہریہ کے نسخے کا سہارا لیا ہے، اور اس کے اس صفحے کا عکس شائع کیا ہے، جس میں یہ حدیث مذکور ہے۔

اس اتہام کا جواب:

اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ علامہ اعظمیؒ نے اپنے کام کا آغاز تین نسخوں - دیوبند، عثمانیہ اور سعیدیہ - کی بنیاد پر کیا تھا، ظاہریہ کا نسخہ آپ کو بعد میں دستیاب ہوا ہے، ظاہریہ والے نسخے کے متن میں اگرچہ فرق ہے، لیکن باقی تینوں نسخوں کے متن میں اتفاق ہے، اور وہ وہی ہے جو مطبوعہ میں ہے، اور علامہ اعظمیؒ نے اس کو اپنی تعلیق میں پوری وضاحت کے ساتھ ذکر کردیا ہے، اور دوسری کتابوں میں موجود زہری کی روایتوں سے اس کا مختلف ہونا بھی بیان کر

دیا ہے، یہ تو تحقیق کے اندر دیانت واحتیاط کا غایت درجہ ہے، لیکن افسوس ہے کہ علم وتحقیق کے دشمن اپنے مذہب کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس کو خیانت اور جعل سازی سے تعبیر کرتے ہیں۔

مسند ابوعوانہ کی روایت:

اس الزام تراشی کا دوسرا جواب یہ ہے کہ یہی حدیث اسی مفہوم کے ساتھ مسند ابوعوانہ میں بھی آئی ہے، اور اُس میں اس کو حمیدی کے علاوہ سفیان کے پانچ سے زیادہ شاگردوں نے ان سے تقریباً ان ہی الفاظ میں روایت کیا ہے، جو الفاظ حمیدی کے ہندوستانی نسخوں میں ہیں، مسند ابوعوانہ (۹۹/۲) کی روایت ملاحظہ ہو:

حدثنا عبدالله بن أيوب المخرمي وسعدان بن نصر وشعيب بن عمرو في آخرين، قالوا: حدثنا سفيان بن عيينة، عن الزهري عن سالم، عن أبيه قال: رأيت رسول الله ﷺ إذا افتتح الصلاة رفع يديه، حتى يحاذي بهما –وقال بعضهم: حذو منكبيه– وإذا أراد أن يركع وبعد ما يرفع رأسه من الركوع لا يرفعهما –وقال بعضهم: ولا يرفع بين السجدتين– والمعنى واحد.

مسند ابوعوانہ کی اس روایت کا مفہوم وہی ہے جو مسند حمیدی کے مطبوعہ نسخے کا ہے کہ آنحضرت ﷺ رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھنے کے بعد رفع یدین نہیں فرماتے تھے، اور بعض حضرات کی روایت میں یہ ہے کہ دونوں سجدوں کے درمیان بھی نہیں اٹھاتے تھے۔

اس روایت کو سفیان سے ان کے تین شاگردوں نے نقل کیا ہے، اور وہ ہیں عبداللہ بن ایوب، سعدان ابن نصر اور شعیب بن عمرو، لیکن اسی کے ساتھ ابوعوانہ نے **فی آخرین** بھی لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف یہی تین نہیں ہیں، بلکہ ابوعوانہ کو اس حدیث کی خبر دینے والے اور لوگ بھی ہیں، گویا پوری ایک جماعت نے اس حدیث کو ان ہی الفاظ میں روایت کیا ہے، جو مسند حمیدی کے مطبوعہ یا ہندوستانی نسخے کے ہیں۔

لیکن اسی پر بس نہیں ہے، آگے اسی روایت کو ابوعوانہ نے امام شافعی اور علی ابن مدینی کے واسطے سے سفیان بن عیینہ سے روایت کیا ہے، اس طرح سفیان سے روایت کرنے والے –حمیدی کے علاوہ– معلوم افراد پانچ ہوگئے، یعنی امام شافعی، علی بن مدینی اور اول الذکر تینوں حضرات۔

اس کے بعد ابوعوانہ نے یہ روایت ذکر کی ہے: **حدثنا الصائغ بمكة قال: حدثني الحميدي، قال: حدثنا سفيان، عن الزهري قال: أخبرني سالم، عن أبيه قال: رأيت رسول الله ﷺ مثله.**

اب قارئین غور فرمائیں کہ اس میں بھی امام حمیدی کی روایت وہی ہے جو مسند حمیدی کے تینوں ہندوستانی مخطوطوں میں ہے، اور سفیان بن عیینہ کے مذکورہ بالا پانچوں شاگرد –جن کا نام بنام ذکر ہے، ورنہ ان کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں– وہی بات کہتے ہیں، جو حمیدی کہتے ہیں، اور حمیدی کے شاگرد صائغ وہی بات کہتے ہیں، جو ان کے دوسرے شاگرد اور مسند حمیدی کے راوی بشر بن موسیٰ اسدی کہتے ہیں۔

ان پر نظر کرنے کے بعد مخالفین کی تعمیر کردہ تحریف وجعل سازی کے الزام کی پوری عمارت ریت کی دیوار کی طرح زمیں بوس ہو جاتی ہے، اور یہ حقیقت پوری طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ نہ صرف علامہ اعظمیؒ کا دامن اس تہمت سے پوری طرح پاک ہے، بلکہ دوسری بہت سی روایتیں اسی کی تائید کرتی ہیں، جو مسند حمیدی میں ہے، اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود ظاہر یہ والے نسخے میں کاتب نسخہ سے غلطی یا سہو ہوا ہے۔

اس قضیے کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ علامہ اعظمی نے دارالعلوم دیوبند کے جس نسخے کو اصل بنایا تھا، اس کے دو کاتب تھے، ایک حافظ نذیر حسین عرف زین العابدین اور دوسرے محی الدین زینبی، اور دونوں غیر مقلد تھے[۱]۔

مسند حمیدی پر رسالوں کے تبصرے:

علم ودانش کے جو حقیقی قدرداں ہیں، اس کتاب کے شائع ہوتے ہی ان کے درمیان اور عام علمی حلقوں میں مسرت وابتہاج کی ایک لہر دوڑ گئی، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اُس وقت ملک کے مختلف شہروں سے چوٹی کے چار رسالے نکلتے تھے، چاروں ہی نے اس پر فاضلانہ تبصرے شائع کیے، یہ رسالے ہیں: 'معارف' (اعظم گڈھ)، 'الفرقان' (لکھنؤ)، 'برہان' (دہلی)، اور 'البلاغ' (بمبئی)۔ ان چاروں رسالوں کے تبصروں کے اقتباسات ذیل میں نقل کیے جا رہے ہیں:

'معارف' اعظم گڈھ کا تبصرہ:

مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ نے رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ = فروری ۱۹۶۳ء کے 'معارف' کے شذرات میں لکھا:

> ''غرض یہ کتاب ''ایڈٹ'' کے جملہ لوازم وشرائط کے اعتبار سے مکمل اور ''اپ ٹو ڈیٹ'' ہے، فاضل مرتب کی تلاش وتحقیق اور محنت ودیدہ ریزی کا پورا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے، وہ اس اہم علمی ودینی خدمت کے لیے اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں''[۲]۔

'برہان' دہلی کا تبصرہ:

برہان کے نومبر ۱۹۶۳ء کے شمارے میں اسلامیات کے مشہور عالم وفاضل اور مصنف ومولف مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ نے تحریر فرمایا:

> ''بڑی خوشی کی بات ہے کہ **مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے جو برصغیر ہند و پاک میں فن حدیث کے محقق کی حیثیت سے اپنا جواب نہیں رکھتے**، اس طرف توجہ فرمائی اور ایک دیوبند اور دو حیدرآباد کے تین نسخوں کو سامنے رکھ کر اس دُرِّ ثمین کو مرتب کر کے وقف کر دیا، مولانا نے جس محنت وعرق ریزی اور جس قابلیت سے اس کتاب کو مرتب کیا ہے، اس کا صحیح اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہوسکتا ہے''[۳]۔

(۱) راحۃ القلب والعینین: ۱۱۰ (۲) معارف: ج ۹۱، ش ۲، ص: ۸۴ (۳) برہان، ج، ش، ص: ۳۱۵

'الفرقان' لکھنؤ کا تبصرہ:

سلطان المناظرین اور معروف عالم دین مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے اس کتاب پر نہایت شاندار اور جاندار تبصرہ تحریر فرمایا ہے، وہ الفرقان- رمضان، شوال، ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ- کے شمارے میں رقم طراز ہیں:

''اللہ تعالیٰ کا کتنا عظیم احسان ہے کہ وہی 'مسند حمیدی' نہایت مفید تعلیقات اور بڑی عظیم اور عمیق فنی خدمت کے ساتھ چھپ کر ہمارے ہاتھوں میں آ گئی ہے۔

عام ناظرین اس کتاب کی عظمت کا اندازہ اس سے کر سکتے ہیں کہ امام بخاری کے استاذ حدیث کی تالیف ہے، اور گویا صحیح بخاری کا ایک ماخذ ہے، امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں سب سے پہلی حدیث اپنے ان ہی استاد حمیدی سے روایت کی ہے، گویا ان ہی کے نام سے روایت کی بسم اللہ کی ہے''(۱)۔

آگے چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

''ہمارے اس دور اور ہمارے ملک کے ناقد بصیر محدث اور جلیل القدر عالم استاذ محترم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ سے اہل علم تو واقف ہی ہیں، لیکن 'الفرقان' کے تو عام ناظرین بھی ناواقف نہ ہوں گے، مسند حمیدی کو تصحیح اور تعلیق وتحشیہ کی خدمت کے ساتھ ممدوح ہی نے مرتب کیا''(۲)۔

پھر چند سطروں کے بعد لکھا ہے:

''کتاب کا مطالعہ کر کے فن حدیث کی نزاکتوں اور مشکلوں کے جاننے والے ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ممدوح سے یہ کتنا عظیم کام لیا ہے اور مقدس نبوی ورثہ سے اشتغال رکھنے والوں پر ان کا یہ کتنا بڑا احسان ہے''(۳)۔

'البلاغ' بمبئی کا تبصرہ:

اس کتاب کی تحقیق واشاعت پر نہایت بلند آہنگ الفاظ میں قاضی اطہر مبارک پوری نے 'البلاغ' میں خراج تحسین پیش کیا ہے، شوال ۱۳۸۲ھ = مارچ ۱۹۶۳ء کے شمارے میں لکھا ہے:

''یہ بات بڑے اطمینان کی ہے کہ مسند حمیدی کی اشاعت تحقیق وتلاش اور تعلیق وتحشیہ کی ان تمام ذمہ داریوں کے ساتھ ہوئی ہے جن کی وہ مستحق تھی، اور علم حدیث ورجال میں منفرد شخصیت محدث جلیل حضرت مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی نے اس عظیم الشان سرمایۂ سنت کی خدمت کا حق ادا فرمایا ہے، واقعہ یہ ہے کہ مولانا موصوف نے اس کتاب کی تعلیق وتحشیہ، تخریج وتحقیق اور نقد ونظر میں جو عبقریت ظاہر فرمائی ہے، وہ ان ہی کا حق ہے''(۴)۔

(۱) الفرقان: ج ۳۰، ش ۹-۱۱، ص: ۱۱۲ (۲) ایضاً: ۱۱۲ (۳) ایضاً: ۱۱۳-۱۱۲ (۴) البلاغ، ص: ۴۲

قاضی صاحب نے آگے لکھا ہے:

''فاضل محقق ومحشی نے سالہا سال تک اس کتاب پر اپنی بہترین علمی وتحقیقی کاوش خرچ کی ہے، اور اپنی بے بہا معلومات کے سمندر کو اس کوزے میں بند فرمایا ہے، نسخوں کا اختلاف، رجال کی تحقیق، روایات کے الفاظ کا اختلاف اور دوسری کتابوں میں اس کی احادیث کی نشاندہی، غرضکہ مسند حمیدی کے مختصر حواشی میں مغز ہی مغز ہے، کہیں چھلکا نظر نہیں آتا۔ اور مولانا موصوف اس تعلیق وتحشیہ کے آئینہ میں اپنے انفرادی فضل وکمال اور علمی وتحقیقی حسن وجمال کے ساتھ نظر آتے ہیں''(۱)۔

بیرون ملک کے رسائل کے تبصرے:

بیرون ملک کے اہل علم نے بھی اس علمی خدمت کا پوری کشادہ دلی سے اعتراف کیا، اور اس قابل قدر سرمائے کی تحقیق واشاعت پر مسرت کا اظہار کیا، چنانچہ مشہور شامی عالم ومحدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے اس پر ایک نہایت وقیع تبصرہ تحریر فرمایا، جس میں ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کی:

مجلة المجمع العلمي کا تبصرہ:

وقد صدر منه الجزء الأول محققاً عن أربع نسخ مخطوطة، في طباعة جيدة متقنة، وبتحقيق وتعليق العلامة الكبير المحقق المحدث مولانا الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي، الذي عرفه علماء بلاد الشام ومصر والمغرب وغيرها من تحقيقاته واستدراكاته النادرة الغالية على العلامة الشيخ أحمد شاكر رحمه الله تعالى في تحقيقه لكتاب 'مسند أحمد'، وقد أتم –حفظه الله تعالى– صنيعه الجميل في إخراج هذا 'المسند' أحسن إتمام.

اس کی پہلی جلد چار قلمی نسخوں کی مدد سے محقَّق ہوکر صاف اور عمدہ طباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہے، اس کی تحقیق وتعلیق کا کارنامہ علامہ کبیر محدث ومحقق حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نے انجام دیا ہے، جن کو مصر وشام اور مغرب وغیرہ کے اہل علم مسند احمد پر علامہ شیخ احمد شاکر رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق پر ان کے نادر اور گراں قدر استدراکات وتحقیقات کی وجہ سے جانتے ہیں، علامہ اعظمی –حفظہ اللہ تعالی– نے نہایت عمدہ طریقے پر اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر اہل علم کی خدمت میں پیش کیا۔

'المسلمون' جنیوا کا تبصرہ:

'المسلمون' کے نام سے جنیوا سوئٹزرلینڈ سے ایک بہت ہی موقر اور علمی رسالہ شائع ہوا کرتا تھا، اس وقت

(۱) البلاغ، ص: ۴۲

جس کے مدیر عالم عرب کے مشہور داعی شیخ سعید رمضان تھے، اس رسالے میں حسب ذیل تبصرہ شائع ہوا:

ولا يسعنا أمام هذا العمل المبرور الذي قام به الأستاذ الجليل الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي والمجلس العلمي بكراتشي إلا أن نذكره قوله ﷺ وكفى به تنويهاً: "نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَءً اً سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَوَعَاهَا وأَدَّاهَا كَمَا سَمِعَ".

استاذ جلیل شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی کے ہاتھوں اور مجلس علمی کراچی کے ذریعے انجام دیے جانے والے اس نیک اور مقبول عمل کو دیکھ کر ہم مجبور ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کے اس قول کی یاد دہانی کرائیں، جو ان کی فضیلت کے لیے کافی ہے کہ: "اللہ پاک شاداب رکھے اس شخص کو جس نے میری بات سنی، پھر اس کو محفوظ کرلیا اور جس طرح سنا اسی طرح دوسروں تک پہنچادیا"۔

آخر میں عالم عرب کے مشہور عالم فن حدیث ڈاکٹر محمود طحان کا اس کتاب پر تاثر بھی نقل کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے، جو ان کی مشہور کتاب 'أصول التخريج ودراسة الأسانيد' میں مرقوم ہے، لکھا ہے:

وحققه وعلّق عليه فضيلة الأستاذ الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي جزاه الله خيراً، وقد عني بتحقيقه والتعليق عليه عناية جيدة ....، وهو عمل يشكر عليه.

اور اس کو تحقیق وتعلیق سے آراستہ کیا ہے استاذ شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی نے، اللہ تعالی ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، واقعہ یہ ہے کہ محقق موصوف نے اس کی تحقیق وتعلیق میں بہت محنت وکاوش کی ہے، اور وہ ایسی علمی خدمت ہے جس پر وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔

☆......☆......☆......☆......☆

کتاب الزہد والرقائق

احادیث نبویہ مبارکہ کی جب نشر واشاعت کا دور دورہ ہوا، اور علماء اسلام کو زبانی روایت کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے ذریعے کتابوں کے اوراق میں ان کو محفوظ کردینے کا خیال پیدا ہوا، تو اس وقت تصنیف وتالیف کی ایسی گرم بازاری ہوئی، جس کی مثال دنیا کی کسی تاریخ میں پیش نہیں کی جاسکتی، ایک ایک وقت میں اور ایک ایک خطے اور علاقے میں بے شمار محدثین اور راویانِ احادیث اس ذخیرے کی نشر واشاعت اور حفاظت وصیانت میں مصروف اور سرگرم تھے۔ حدیث پاک کو کتابوں میں محفوظ کرنے اور بعد کے لوگوں تک پہنچانے کے متنوع انداز اور طریقے اختیار کیے گئے، کسی مصنف نے تمام صحابہ کی بیشتر مرویات کو مرتب کرنے کا اہتمام کیا، تو کسی دوسرے نے ان احادیث کو یکجا کیا، جو احکام شریعت اور اسلامی قانون سے تعلق رکھتی ہیں، ایک بڑی تعداد ایسے مصنفین کی بھی ہے، جنھوں نے کسی خاص موضوع پر پائی جانے والی حدیثوں کو جمع کرنے کا اہتمام کیا، ان موضوعات میں ایک اہم موضوع زہد ورقائق کا ہے، جس میں ایسی حدیثوں کو جگہ دی جاتی ہے جو دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی زندگی

اور اس کی نعمتوں کے شوق کی ترغیب دلاتی ہیں، اس موضوع پر تصنیف کی جانے والی کتابوں میں نمایاں ترین کتاب حضرت عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزھد والرقائق ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک:

امام الائمہ والحفاظ، راس الزہاد، قدوۃ الزاہدین شیخ الاسلام وامیر المومنین فی الحدیث حضرت عبداللہ بن مبارک بن واضح ابوعبدالرحمٰن الحنظلی المروزی باپ کی نسبت سے ترکی اور ماں کی نسبت سے خوارزمی تھے، بہت بڑے تجارت پیشہ اور کثیر الاسفار تھے۔ علم وفضل، زہد وورع، تقویٰ وطہارت، کثرت عبادت، جہاد، حج وزیارت، اور معمولات کی پابندی میں اسلامی تاریخ میں شاید ہی ان کا کوئی ہمسر ہوا ہو۔

حضرت عبداللہ بن مبارک کی ۱۱۸ھ یا ۱۱۹ھ میں ولادت ہوئی، انھوں نے بہت سے تابعین کا زمانہ پایا اور ان سے حدیثیں روایت کیں، ان کے فضائل ومناقب اس کثرت سے ہیں کہ ان کو بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے، ان کے علم وفضل اور علو رتبہ کی شہادت ان کے ہم عصر علماء ومحدثین اور بعد کے لوگوں نے دی ہے، اور تمام اصحاب تذکرہ وتاریخ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ سطور ذیل میں حضرت ابن مبارک کی شان میں علماء وائمہ کے کچھ اقوال نقل کیے جاتے ہیں:

☆...... ابواسامہ کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن مبارک سے بڑھ کر علم کا طلب گار نہیں دیکھا۔

☆...... امام احمد فرماتے ہیں کہ ان کے وقت میں ان سے بڑھ کر کوئی علم کا طلب گار نہیں تھا، بہت بلند رتبہ تھے، روایتِ حدیث میں ان سے کم لغزش والا کوئی نہیں تھا۔

☆...... ابن معین فرماتے ہیں کہ زیرک، پختہ کار اور ثقہ تھے، بڑے عالم اور صحیح حدیثوں کے حامل تھے، جن نوشتوں کی انھوں نے روایت کی ہے، وہ بیس یا اکیس ہزار ہوں گے۔

☆...... ابراہیم بن شماس فرماتے ہیں کہ ابن المبارک افقہ الناس -سب سے بڑے فقیہ- تھے۔

☆...... جعفر بن عثمان نے فرمایا کہ ابن المبارک امیر المؤمنین تھے۔

☆...... ابراہیم حربی نے کہا کہ معمر کے شاگردوں کا اگر کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو ابن المبارک کا قول معتبر ہوگا۔

☆...... عبدالرحمٰن بن مہدی کا کہنا ہے کہ ابن المبارک علم میں سفیان ثوری سے بڑھے ہوئے تھے۔

☆...... علی ابن المدینی کہتے ہیں کہ علم حدیث دو آدمیوں پر ختم ہو گیا، عبداللہ بن مبارک پر اور ان کے بعد یحییٰ ابن معین پر۔

☆...... جب ابن مبارک کی وفات ہوئی تو خلیفۂ وقت ہارون رشید نے فرمایا کہ **مات سید العلماء**. علماء کا سردار اٹھ گیا۔

☆...... سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ میں نے چاہا کہ اپنی پوری عمر میں کم از کم ایک سال عبداللہ بن مبارک کی طرح گزاروں، تو تین دن بھی اس طرح نہ گزار سکا۔ یعنی اس طرح کہ ان کے معمولات کے مطابق عمل کرسکتا۔

☆...... سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ میں نے صحابۂ کرامؓ اور ابن مبارک کی زندگیوں پر غور کیا، تو صحابہؓ کی فضیلت ابن مبارکؒ پر اس کے سوا اور کوئی نہیں پائی کہ ان کو آنحضرت ﷺ کی صحبت اور آپؐ کے ساتھ جہاد کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔

☆...... ابویعلی خلیلی نے 'ارشاد' میں لکھا ہے کہ ابن المبارک متفق علیہ امام ہیں، ان کی کرامات حد شمار سے فزوں ہیں۔

☆...... ابن عبدالبر کا ارشاد ہے کہ ابن المبارک کی بزرگی، ان کی امامت، عدالت اور قبولیت پر علماء کا اتفاق ہے۔

☆...... ابن عبدالبر ہی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ میرے علم میں کوئی ایسا فقیہ نہیں ہے، جس کی شان میں لب کشائی نہ کی گئی ہو سوائے ابن مبارک کے۔

یہ حضرت ابن المبارک کے بارے میں علماء اسلام کے اقوال وتاثرات کا ایک معمولی سا نمونہ ہے، علامہ اعظمیؒ نے اس قسم کے بہت سے اقوال کتاب الزہد کے اپنے مقدمے میں جمع کر دیے ہیں، اور ۲۵ رصفحات میں ان کے فضائل ومناقب اور احوالِ زندگی قلم بند فرمائے ہیں۔

ابن مبارک کی تصنیفات:

حضرت ابن مبارک علمِ حدیث کی خدمت واشاعت کے بڑے شیدائی تھے، انھوں نے زبانی روایت اور تصنیف وتالیف دونوں طرح سے حدیث شریف کی نشر واشاعت میں حصہ لیا ہے، چنانچہ تلامذہ کی ایک کثیر تعداد چھوڑنے کے علاوہ متعدد کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں، مثلاً کتاب السنن فی الفقہ، کتاب التفسیر، کتاب التاریخ، کتاب الزہد، اور کتاب البر والصلہ۔

ان کی کتابوں کی جامعیت کا اور اعتبار واستناد کا یہ حال تھا کہ مشہور محدث یحییٰ بن آدم کہا کرتے تھے کہ مجھے جب کسی مسئلے کے حل کے لیے تلاش وجستجو ہوتی اور اس کو ابن مبارک کی کتابوں میں نہ پاتا، تو اس کی طرف سے مایوس ہو جاتا تھا۔

ابن مبارک اور تربیتِ تلامذہ:

حضرت ابن مبارک صرف درس وروایتِ حدیث پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنے شاگردوں کی تربیت اور ذہن سازی بھی کیا کرتے تھے، ان کی رہنمائی کرتے اور بوقت ضرورت سختی اور تنبیہ کرتے تھے، چنانچہ حارث نامی ان کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ ایک بدعتی کے ہاں کچھ کھا لیا، یہ بات حضرت ابن

مبارک تک پہنچ گئی، انھوں نے فرمایا کہ میں تیس دن تک تم سے بات نہیں کروں گا۔

سطور بالا سے حضرت ابن مبارک کی جلالت قدر اور عظمت شان کا اندازہ ہوا ہوگا، اور اسی سے اُس کتاب کی فضیلت واہمیت کا بھی اندازہ لگانا چاہئے، جو اتنے جلیل القدر اور بلند رتبہ امام حدیث وفقہ کی یادگار ہو۔ زہد ورقائق کے موضوع پر یوں تو بہت سے محدثین نے کتابیں تصنیف کر کے اس سے متعلق احادیث وآثار کو اس میں جمع کیا ہے، لیکن ان تمام تصانیف میں حضرت ابن مبارک کی کتاب کو ایک خاص مقام حاصل ہے، چنانچہ حضرت محدث الاعظمیؒ نے اپنے مقدمے میں 'کشف الظنون' اور 'الرسالة المستطرفة' کے حوالے سے علامہ ابن تیمیہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

والذين جمعوا الأحاديث في الزهد والرقائق يذكرون ما رُوي في هذا الباب، ومن أجلِّ ما صُنِّف في ذلک: كتاب الزهد لعبد الله بن المبارک، وفيه أحاديث واهية ...... وأجود ما صُنِّف فيه: كتاب الزهد للإمام أحمد، لكنه مكتوب على الأسماء، وزهد ابن المبارک على الأبواب.

یعنی جن لوگوں نے زہد ورقائق کی حدیثوں کو ذکر کیا ہے، وہ اس باب میں مروی حدیثوں کو ذکر کرتے ہیں، سب سے بڑی کتاب جو اس موضوع پر لکھی گئی ہے وہ حضرت عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد ہے، مگر یہ ہے کہ اس کتاب میں کمزور حدیثیں بھی جگہ پا گئی ہیں، اور اس موضوع پر سب سے عمدہ تصنیف حضرت امام احمد کی کتاب الزہد ہے، مگر فرق یہ ہے کہ یہ کتاب ناموں کی ترتیب پر ہے، اور حضرت ابن مبارک کی کتاب الزہد ابواب کی ترتیب پر ہے۔

اس کتاب کی اہمیت اور اس کی قدر وقیمت کے پیش نظر حضرت علامہ اعظمیؒ کو اس کے قلمی نسخوں کی دریافت اور اس کی اشاعت کی فکر لاحق ہوئی، آخر کار اس کا ایک مخطوطہ اُس وقت کے حاکم قطر کے والد شیخ علی بن عبداللہ کے کتب خانے سے آپ کو حاصل ہوگیا، جس کو بنیاد بنا کر اس کام کی تحقیق کا آغاز کیا۔

یہ وہ دور تھا جب علامہ اعظمیؒ احادیث وآثار کے عظیم الشان مجموعے 'مصنف عبد الرزاق' کی خدمت وتحقیق میں مشغول تھے، لہذا آپ نے اس نسخے کی نقل تیار کر کے اس کو قابلِ اشاعت بنانے کے لیے مجلس احیاء المعارف مالیگاؤں کو بھیج دیا، مجلس احیاء المعارف نے اس کی طباعت واشاعت کا بیڑا اٹھالیا، پھر اس کے مدیر مولانا محمد عثمان علیہ الرحمۃ نے مصر میں زیر تعلیم اپنے کسی شاگرد کو اس سلسلے میں خط لکھا، انھوں نے مصر کے مشہور کتب خانے معہد المخطوطات میں اس کتاب کی محفوظ تین فلموں کی عکسی تصویر لے کر مجلس کے لیے ارسال کیا، ان نسخوں کی فراہمی کے بعد مولانا محمد عثمان نے حاکم قطر کے نسخے سے تیار شدہ نقل کا ان کے ساتھ مقابلہ کیا، اور ان کے درمیان جو فرق اور اختلاف تھا، ان کو حاشیے میں نوٹ کرتے گئے۔

اس ابتدائی اور ضروری کام کے بعد مجلس احیاء المعارف نے کتاب کی تحقیق اور تعلیق وتحشیہ کے لیے اس کو

علامہ اعظمیؒ کے حوالے کر دیا، آپ نے اپنے عزیز ترین شاگرد اور عمر بھر کے ساتھی حضرت مولانا عبدالجبار صاحب مئویؒ اور فرزند دلبند حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی صاحبان کے تعاون سے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

کتاب کے قلمی نسخے اور علامہ اعظمیؒ کے کام کی نوعیت:

۱-اوپر لکھا جا چکا ہے کہ اس کتاب کا قلمی نسخہ سب سے پہلے والیٔ قطر کے والد کے پاس سے حاصل ہوا تھا، جس کی بنیاد پر آپ نے اس کتاب کی تحقیق وتحشیہ اور اشاعت کا ارادہ کیا، والیٔ قطر کا یہ نسخہ بھی ایک دوسرے نسخے سے فلم لے کر تیار کیا گیا تھا، جو استانبول کے مکتبہ ولی الدین جار اللہ میں ۸۳۴ نمبر کے تحت مندرج تھا، مکتبہ ولی الدین جار اللہ والا یہ نسخہ جو نسخۂ قطر کی اصل ہے، ساتویں صدی سے پہلے قید کتابت میں آیا تھا، اور اہلِ علم کے ہاتھوں میں منتقل ہوتے ہوتے آخر میں ولی الدین جار اللہ کے ہاتھ میں پہنچا۔

یہ نسخہ گیارہ اجزا پر مشتمل ہے، پہلے جز کی روایت ابو غالب احمد بن الحسن بن احمد بن البناء متوفی ۵۲۷ھ نے ابو محمد جوہری متوفی ۴۵۴ھ سے کی ہے، اور باقی اجزا کی روایت ابو علی حسین بن محمد بن حسین بن ابراہیم دُلفی متوفی ۴۸۴ھ نے ابو محمد جوہری سے کی ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس نسخے کے تعارف میں مزید فرمایا ہے کہ اس کا پہلا صفحہ خط رقاع میں اور باقی پوری کتاب خط نسخ میں ہے، بہت صاف اور واضح ہے، دستبرد زمانہ سے محفوظ ہے، البتہ کہیں کہیں رطوبت کی وجہ سے کچھ الفاظ مٹ گئے ہیں، یا کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں۔

یہ نسخہ ۱۳۵/اوراق پر مشتمل ہے، اور حسین بن حسن مروزیؒ متوفی ۲۴۶ھ کا نسخہ ہے، جنھوں نے اس کو حضرت عبداللہ بن مبارک سے روایت کیا ہے، اور ان سے اس کو علماء مشرق روایت کرتے ہیں۔ اس نسخے کے لیے علامہ اعظمیؒ نے اپنے حواشی میں حرف ''ص'' کا رمز استعمال کیا ہے۔

۲-کتاب کا دوسرا نسخہ اسکندریہ کی میونسپل پبلک لائبریری کا ہے، جس سے تیار شدہ فلم معہد المخطوطات میں موجود ہے، یہ نسخہ ۱۸×۲۶ سائز کے ۱۵۳ صفحات پر مشتمل ہے، اور درمیان میں کہیں کہیں نقص ہے، ۴۶۶ھ کا مکتوب ہے، اس نسخے کو حضرت عبداللہ بن مبارک سے نُعَیم بن حماد نے روایت کیا ہے، اور نُعَیم سے علماء مغرب نے اس کو روایت کیا ہے، اس نسخے کے ابواب، ترتیب، ابواب کے عنوانات اور تعداد روایات حسین مروزی کے نسخے سے بہت مختلف ہیں۔

اس نسخے کا ایک طرۂ امتیاز یہ ہے کہ یہ ایک ایسے نسخے سے تیار کیا گیا ہے، جو حافظ ابو عمر ابن عبدالبر کے نسخے سے نقل کیا گیا تھا، پھر ابن عبدالبر کے نسخے سے اس کا مقابلہ کیا گیا تھا۔ اس نسخے کے لیے علامہ اعظمیؒ نے اپنے حواشی میں حرف ''ک'' کا رمز استعمال کیا ہے۔

۳-تیسرا نسخہ مکتبہ ظاہریہ دمشق کا ہے، مکتبہ ظاہریہ کا یہ نسخہ بھی معہد المخطوطات میں محفوظ ایک فلم سے تیار

کیا گیا تھا، یہ نسخہ ۲۰۷/اوراق پر مشتمل ہے، خط نسخ میں ہے اور ۶۰۶ھ کا لکھا ہوا ہے، یہ نسخہ حسین مروزی کے نسخے کے مطابق نویں جز کے آخری ورق سے شروع ہو کر تیرہویں جز کے اوائل پر ختم ہوتا ہے، اس نسخے کے لیے ''ظ'' کا رمز استعمال کیا گیا ہے۔

تحقیق کا منہج اور اس کے مراحل:

۱- اس کتاب کی تحقیق کے لیے سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ امام مروزی کی مرویات -یعنی نسخۂ قطر- کی ایک نقل تیار کرائی گئی، پھر کتاب کے دوسرے نسخوں -یعنی نسخۂ اسکندریہ وظاہریہ- سے اس کا مقابلہ کیا گیا ہے، اس مقابلے کے بعد ان نسخوں کے درمیان جو باہمی فرق تھا، اس کو حواشی میں ذکر کیا گیا۔

۲- کتاب میں اگر کہیں کوئی آیت یا کسی آیت کا کوئی ٹکڑا آیا ہے، تو حاشیے میں سورہ کا نام اور آیت کا نمبر ذکر کر دیا گیا ہے۔

۳- احادیث نبویہ اور اقوال صحابہ وتابعین کی حدیث وتفسیر کی دیگر متداول کتابوں کی مدد سے بقدر ضرورت تخریج کی گئی ہے، جس سے ان احادیث وآثار کے دوسری دستیاب کتابوں میں تلاش وجستجو اور ان کی شرح وتفسیر تک رسائی میں مدد مل سکتی ہے۔

۴- بسا اوقات کسی مبہم لفظ کی توضیح، یا حدیث کے معنی ومفہوم کی تشریح، یا کتاب الزہد کے کسی چھوٹے ہوئے لفظ پر تنبیہ کے لیے محولہ کتابوں سے حدیث کے الفاظ بھی نقل کر دیے گئے ہیں۔

۵- بہت سے مقامات پر سند میں اگر راوی کی تعیین نہیں ہو سکی ہے، تو حاشیے میں ان کی تعیین کر دی گئی ہے، اور اگر ضرورت محسوس ہوئی ہے تو ان کتابوں کا نام بھی ذکر کر دیا گیا ہے، جن کے اندر راوی کا تذکرہ پایا جاتا ہے، مثلاً حدیث نمبر ۴۶۳ میں عن أبي حيان عن أبيه ہے، تو علامہ اعظمیؒ نے عن أبي حيان پر لکھا ہے: **هو يحيى بن سعيد بن حيان التيمي، وهو وأبوه كلاهما من رجال التهذيب.**

اور مثلاً حدیث نمبر ۱ میں الفضل بن موسیٰ کا نام مذکور ہے، تو اس پر حاشیے میں لکھا ہے: **هو السيناني من رجال التهذيب.**

اور مثلاً حدیث نمبر ۱۰۵۹ کے ایک راوی عبد العزیز بن ابی عثمان الرازي ہیں، تو ان کی نسبت لکھا ہے: **ذكره ابن أبي حاتم وهو من أثبت رواة جامع سفيان.**

۶- امام مروزی کے نسخے میں اگر کہیں کوئی غلطی واقع ہو گئی ہے، تو اس پر متنبہ کیا گیا ہے۔

۷- اگر کسی روایت کا کوئی لفظ یا عبارت مشکل، نامانوس اور پیچیدہ ہے، تو اس کی تشریح کی گئی ہے۔

۸- نُعیم بن حماد کی وہ روایات جو سرے سے مروزی کے نسخے میں نہیں ہیں، ان کو الگ سے کتاب کے آخر میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ نعیم کی یہ زائد روایات کتاب الزہد کے ۵۶۴ صفحات کے بعد شروع ہوتی ہیں، اور ۱۳۲

صفحات اور ۴۳۶ روایات پر مشتمل ہیں۔

....

علامہ اعظمیؒ کے اس تحقیقی کارنامے میں دو چیزیں بطور خاص ذکر کردینا مناسب معلوم ہوتی ہیں، پہلی چیز اس پر آپ کا طویل اور مبسوط مقدمہ ہے، یہ مقدمہ ۶۳ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں آپ نے قرآن وحدیث کی نصوص سے زہد کی حقیقت اور اس کی حکمت واہمیت پر روشنی ڈالی ہے، نیز زہد کے انواع واقسام اور اس کے مراتب ودرجات کو بھی مناسب تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، بلکہ انسان کی جو ضروریات زندگی ہیں، اور دنیوی زندگی میں جو چیزیں ضروری ہوتی ہیں، ان کو بھی نوع بنوع ذکر کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ تفصیلی مقدمہ خود آپ کی زاہدانہ اور متوکلانہ زندگی کی ترجمانی اور تعبیر پیش کرتا ہے۔

اس مقدمے میں جن دیگر امور سے تعرض کیا گیا ہے، ان میں زہد کے موضوع پر تصنیف کی جانے والی کتابیں ہیں، اس فہرست میں حضرت عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد کے علاوہ ۱۷ مستقل تصانیف کا تذکرہ ہے۔

اس کے بعد کتاب الزہد کے نسخوں کا اور اسی ضمن میں ان رواۃ کا بیان ہے، جن کے واسطے سے حضرت ابن مبارک کے بعد یہ کتاب بعد کے لوگوں تک پہنچی ہے، سب سے پہلے حضرت عبداللہ بن مبارک کے شاگرد اور کتاب کے پہلے راوی حسین مروزی کے حالات بیان کیے ہیں، پھر ان کے شاگرد یحییٰ بن صاعد کا ذکر ہے، وھلم جراً۔

پہلے نسخے کے تعارف کے آخر میں ایک نام سلامہ بن حسین بن سعدان کا آیا ہے، سلامہ نے اس کتاب کو ۴۸۲ھ میں ابوعلی دُلفی سے پڑھا ہے، اور اس پر ان کا سماع بھی درج ہے، اس سے علامہ اعظمیؒ نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ نسخہ سلامہ ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اور اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ پانچویں صدی ہجری یا ممکن ہے اس سے بھی پہلے کا لکھا ہوا ہو۔

حسین مروزی کے نسخے کے بعد نُعیم بن حماد کے نسخے اور اس کے راویوں کا مناسب تفصیلات کے ساتھ تعارف ہے۔ اس سلسلۂ رواۃ میں سب اندلس اور مراقش وغیرہ کے اہل علم وکمال ہیں، جن کا تذکرہ خاص طور سے ان ہی کتابوں سے لیا گیا ہے، جو علماء مغرب کے تذکرے میں لکھی گئی ہیں۔

اس کے بعد ۲۵ صفحات میں مصنف کتاب حضرت عبداللہ بن مبارک کا نہایت جامع تذکرہ ہے، جس میں ان کے فضل وکمال اور زندگی کے تمام جوانب وجہات کو بلیغ اور موثر انداز میں سپردِ قلم کیا گیا ہے۔

اور آخر میں علامہ اعظمیؒ نے مصنف کتاب تک اپنی سند کا اور پھر پیشِ نظر کتاب کی تحقیق میں اپنے طرز اور طریقۂ کار کا ذکر کیا ہے۔

....

اس کتاب کی دوسری چیز جو قابلِ ذکر اور لائق توجہ ہے، وہ اس کی فہرست سازی ہے، کتاب ہاتھ میں لیتے ہی شروع میں قاری کی نگاہ جس چیز سے دوچار ہوتی ہے، وہ حسین مروزی اور زوائد نعیم کے نسخوں کے عنوانات

کی الگ الگ فہرست ہے۔اس کے بعد حروف تہجی کے اعتبار سے ان صحابۂ کرامؓ کے اسماء سامیہ کی فہرست ہے، جن کے واسطے سے آنحضرت ﷺ کی احادیث شریفہ اس کتاب میں روایت کی گئی ہیں، اس حصے کے آخر میں ان صحابۂ کرامؓ کی فہرست ہے، جو نام کی بجائے اپنی کنیت سے مشہور ہیں، پھر ان صحابیات کی فہرست ہے جن سے آپؐ کی کوئی حدیث اس میں آئی ہے۔

اس کے بعد ان تابعین یا تبع تابعین کے ناموں کی فہرست ہے، جنھوں نے آنحضرت ﷺ سے مُرسَل حدیثیں روایت کی ہیں، یعنی صحابی کا نام ذکر نہیں کیا ہے اور بغیر کسی واسطے کے آنحضرت ﷺ کا کوئی قول یا فعل روایت کیا ہے، اور اس میں بھی ترتیب یہی رکھی گئی ہے کہ پہلے حروف تہجی کے اعتبار سے ناموں کا ذکر ہے، پھر ان کو لیا ہے جو اپنی کنیت یا نسبت سے شہرت رکھتے ہیں۔

مرفوع روایتوں کو روایت کرنے والے ان صحابہؓ و تابعینؒ و تبع تابعینؒ کی فہرستوں کے بعد علامہ اعظمیؒ نے ان صحابہؓ کے نام کی فہرست تیار کی ہے، جن سے خود ان کا کوئی قول یا فعل نقل کیا گیا ہے، جس کو فن کی زبان میں موقوف روایت کہا جاتا ہے۔اس کے بعد اُن تابعین یا تبع تابعین کے ناموں کی فہرست ہے جن سے ان کا کوئی قول یا فعل روایت کیا گیا ہے، جس کو فن کی زبان میں مقطوع روایت کہا جاتا ہے۔ان دونوں فہرستوں میں بھی وہی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے، جو اوپر ذکر ہوئی ہے کہ پہلے ان لوگوں کو رکھا ہے جو اپنے نام سے جانے جاتے ہیں، یا روایت کے اندر ان کا نام ذکر کیا گیا ہے، پھر ان کو رکھا گیا ہے جو اپنی کنیت یا نسبت سے مشہور ہیں۔

آخر میں ان انبیاء سابقین کے اسماء شریفہ کی ایک فہرست ہے، جن سے اس کتاب میں ان کا کوئی قول یا وعظ ونصیحت وغیرہ مروی ہے، اس فہرست میں حضرت ایوب، حضرت موسیٰ، حضرت داود، حضرت سلیمان، حضرت عیسیٰ، حضرت یحییٰ، حضرت لقمان اور حضرت ذوالقرنین علیہم السلام کے نام مذکور ہیں۔

چونکہ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، ایک حصہ حسین مروزی کی روایت کا ہے، جو ۵۶۴ صفحات کو حاوی ہے، اور جس میں ۱۶۲۷ روایتیں ہیں، اور دوسرا حصہ ان زائد روایتوں کا ہے جن کو نعیم بن حماد نے روایت کیا ہے اور وہ حسین مروزی کے نسخے میں نہیں ہیں، یہ زوائد والا حصہ ۴۳۶ حدیثوں پر مشتمل ہے، اور اس کے صفحات کی تعداد ۱۳۲ ہے، علامہ اعظمیؒ نے پوری دقیقہ رسی سے کام لیتے ہوئے فہرست میں بھی اس کا لحاظ رکھا ہے، لہٰذا جب زوائد نعیم کی طرف اشارہ کرنا ہوا ہے، تو آپ نے نمبر سے پہلے (ز) بڑھا دیا ہے، البتہ کتاب الزہد سے استفادہ یا مراجعت کرنے والے کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ (ز) کے بعد جو نمبر ہوتا ہے، وہ حدیث نمبر ہے، یعنی مذکورہ نام کے راوی کی روایت زوائد نعیم کی روایت نمبر فلاں میں دیکھی جاسکتی ہے، اور حرف (ز) سے پہلے جو نمبر ہے وہ حسین مروزی والی روایات کے صفحات کے نمبر ہیں۔

یہ تمام فہرستیں کتاب کے شروع میں درج کی گئی ہیں، کتاب کے آخر میں ایک فہرست ان مراجع کی ہے، جن سے علامہ اعظمیؒ نے اس کتاب کی تحقیق میں استفادہ کیا ہے، اس کے بعد ۱۳ صفحات الاستدراک

و التعقیب پر مشتمل ہیں، اس کے اندر وہ تحقیقی اور فنی نکات یا تحقیقات ہیں، جو کتاب میں کسی وجہ سے سپردِ قلم ہونے سے رہ گئی ہیں، اس کے بعد ۸ صفحات **تصویبات الأخطاء** کے ہیں، اس حصے میں ان غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، جو کتابت وطباعت میں در آئی ہیں، اور ان کی جگہ صحیح لفظ بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

اس طرح یہ بیش قیمت کتاب ایک ضخیم جلد میں ۱۳۸۵ھ = ۱۹۶۶ء میں علمی پریس مالیگاؤں سے چھپ کر مجلس احیاء المعارف مالیگاؤں سے اشاعت پذیر ہوئی۔

کتاب الزہد اہل علم کی نظر میں:

’کتاب الزہد والرقائق‘ جب چھپ کر اہل علم کے سامنے آئی، تو اس کتاب کی اشاعت اور اس پر علامہ اعظمیؒ کی محققانہ تعلیقات پر قدر دانوں نے غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا، چنانچہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ۲۴؍ دسمبر ۱۹۶۷ء کے ایک خط میں علامہ اعظمیؒ کو لکھا ہے:

”میں نے کتاب الزہد والرقائق پوری پڑھ لی ہے، اگرچہ چھوٹا منھ بڑی بات ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ آپ کا علم وفضل، بصیرت ودقتِ نظر اور وسعتِ نظر کی داد نہیں دی جاسکتی، اس کا افسوس تھا کہ برصغیر ہندو پاک میں قاہرہ کے ساعاتی، احمد محمد شاکر اور کوثری جیسے محقق علماء نظر نہیں آتے، لیکن الحمدللہ آپ نے نہ صرف تلافی کر دی ہے، بلکہ ان حضرات سے بھی بعض چیزوں میں سبقت لے گئے ہیں“۔

مولانا اکبرآبادی نے ماہنامہ ’برہان‘ میں بھی بہترین تبصرہ سپردِ قلم فرمایا، جس میں انھوں نے لکھا ہے:

”مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی .... نے اس پر جو محنت کی ہے، وہ بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، اور اس کی داد وہی لوگ دے سکتے ہیں، جو خود اس میدان کے مرد ہوں“[1]۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے مشہور جریدے ’صدق جدید‘ میں اس کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

”محدث وقت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی خدمات فن حدیث میں یوں بھی کچھ کم نہ تھیں، مستحق تہنیت وتبریک ہیں کہ اس نادر کتاب کی بھی تدوین کی سعادت انھیں کے حصہ میں آئی“[2]۔

اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مصر کے صاحب فضل وکمال عالم شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے اپنی کتاب **’الإمام الرباني الزاهد عبد الله بن المبارك‘** میں اس کا اور اس کے محقق کا حسبِ ذیل الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:

”كتاب الزهد والرقائق ......، وقد حققه وعلق عليه الأستاذ المحدث المحقق الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي، وقد بذل المحقق جهداً مشكوراً حتى أخرجه في

(۱) برہان، ج ۶۰، ش ۱، ص: ۶۷ (۲) صدق جدید: ۲ جون ۱۹۶۷ء

صورة دقيقة وفي طبعة أنيقة"[1]۔

اور کتاب الزہد والرقائق ......، استاذ محدث ومحقق شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی نے اس کی تحقیق کی ہےاوراس پر تعلیقات سپرد قلم فرمائی ہیں، اوراس کی تحقیق میں لائق شکر کوشش صرف کی ہے، حتی کہ اس کو بہتر اور پاکیزہ صورت میں شائع کیا۔

☆......☆......☆

سنن سعید بن منصور

سعید بن منصور بن شعبہ نام، ابوعثمان کنیت، اور مروزی نسبت تھی، ان کی نسبت میں طالقانی اور بلخی بھی لکھا جاتا ہے، مورخین نے ان کو **الإمام الحافظ الحجة الثقة الثبت المُتقِن** جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے، ابن سعد کی طبقات، بخاری کی تاریخ کبیر وصغیر، اور ابن ابی حاتم کی کتاب الجرح والتعدیل سمیت تاریخ وتذکرہ کی تمام کتابوں میں ان کا اوران کے فضل وکمال کا نہایت شاندار تذکرہ ملتا ہے۔

امام سعید بن منصور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جوز جان میں پیدا ہوئے، بلخ میں نشو ونما پائی، مکہ میں سکونت اختیار کی اور بالآخر وہیں پیوند خاک ہوئے۔

سعید بن منصور نے علم حدیث کی تحصیل کے لیے دور دراز کے اسفار کیے، اور بلاد اسلامیہ کے مختلف علاقوں اور خطوں کی خاک چھانی، اور اپنے زمانے کے تقریباً تمام بڑے بڑے محدثین اور شیوخِ حدیث سے حدیثیں سنیں، ان کے اساتذہ وشیوخ میں امام مالک، حماد بن زید، سفیان بن عیینہ، ہشیم اور ابوعوانہ جیسے حدیث کے اجلۂ رواۃ ہیں، اور ان کے تلامذہ اور شاگردوں میں امام احمد بن حنبل، امام مسلم، ابوداود، محمد بن یحییٰ ذہلی، ابوحاتم اور ابوزرعہ رازی جیسے بلند پایہ محدثین اور اساطینِ فن ہیں۔

امام احمد نے بڑے بلند آہنگ الفاظ میں ان کی تعریف کی ہے، اسی طرح ان کے بیشتر ہم عصر اور ان کے بعد کے تمام مورخین اور ائمۂ جرح وتعدیل ان کی امامت وجلالت پر متفق نظر آتے ہیں، صحاح ستہ کے مصنفین نے اپنی کتابوں میں ان کی مرویات کو جگہ دی ہے۔

سعید بن منصور کی تاریخ وفات کے سلسلے میں اقوال مختلف ہیں، مگر صحیح یہ ہے کہ ۲۲۷ھ میں مکہ میں فوت ہوئے، انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ۹۰ برس تھی۔

کتاب السنن:

یہ کتاب ان کی عظیم الشان علمی یادگار ہے، جو گزشتہ دور میں شُرَّاح حدیث کے یہاں متداول تھی، اور وہ

(۱) الإمام الرباني: ۱۲۰

اس سے استفادہ کرتے، اپنی کتابوں میں اس کی روایات نقل کیا کرتے، اور اس کے حوالے دیا کرتے تھے، لیکن آہستہ آہستہ یہ کتاب لوگوں کی نگاہوں سے روپوش ہوتی گئی، حتی کہ اس کا شمار نادر و نایاب کتب حدیث میں ہونے لگا، بلکہ پوری کتاب اب بھی ناپید ہی کے حکم میں ہے، اور سوائے اس کے چند اجزا کے کتاب کے باقی حصوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔

یہ ایک حسن اتفاق اور خدا کا کرم تھا کہ مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم کو اس کا ایک قلمی نسخہ ترکی کے ایک سفر کے دوران ان کے ہاتھ لگ گیا، یہ اس کی دو جلدیں تھیں، جو پوری کتاب کا ایک مختصر سا حصہ ہے، اور ۱۳۸۰ھ میں مکتبہ محمد پاشا کوپریلی میں ان کو دستیاب ہوا تھا، یہ حصہ جلد ثالث کی پہلی اور دوسری قسم پر مشتمل ہے۔

سنن سعید کے اس نسخے کی دریافت کا واقعہ بھی عجیب و غریب ہے، جس کو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنے مقدمے میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ترکی کے مذکورہ بالا مکتبے نے ۱۳۸۰ھ میں ڈاکٹر صاحب کو کتب خانے کی ترتیب و تہذیب کی خدمات سپرد کیں، اس عمل کے دوران ان کی نگاہ سے ایک ایسا مخطوطہ گزرا، جس کی لوح پر 'مصنف ابن ابی شیبہ' لکھا ہوا تھا، لیکن نفس کتاب اور اس کے مشمولات پر نگاہ ڈالنے کے بعد اس کے مصنف ابن ابی شیبہ ہونے کے بارے میں ان کو شک ہوا، اس شک و شبہہ کی وجہ سے انھوں نے اس نسخے کا مقابلہ مصنف ابن ابی شیبہ کے دوسرے نسخوں سے کیا، جو ''توپ قاپی'' اور نور عثمانیہ'' کے کتب خانوں میں موجود تھے، اس مقابلہ کے نتیجے میں اور بعض دوسرے قرائن کی بنیاد پر ان کا یہ شبہہ قوی ہو گیا کہ کوپریلی کا یہ نسخہ مصنف ابن ابی شیبہ کا نہیں، بلکہ سعید بن منصور کی کتاب السنن کا ہے۔

اس مخطوطے کا دستیاب ہونا تھا کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کو علم اور اہل علم کے ایک سچے قدر داں اور معارف پرور مولانا محمد میاں سملکی مقیم جوہانسبرگ کے پاس بھیج دیا، مولانا محمد میاں کو جب یہ نادرۂ روزگار مخطوطہ وصول ہوا، تو اس کی تحقیق اور اس پر تعلیق و تحشیہ کے لیے پوری دنیائے علم میں ان کی نظر انتخاب ایک ہی شخصیت پر پڑی، اور یہ شخصیت اس بوریہ نشیں اور دلق پوش کی تھی جس کے لیے خداوند قدوس نے مملکتِ علم کی سروری اور تاجداری مقدر کر دی تھی، اور پھر مولانا محمد میاں نے اس بیش قیمت دستاویز اور علم حدیث کے اس گوہرِ نایاب کو حضرت علامہ اعظمیؒ کے پاس بھیج دیا، اور آپ نے اس وقت تک کی معلوم دنیا کے اس واحد اور منفرد نسخے کی تصحیح و تہذیب کر کے ایسا بنا دیا کہ اس کو دیکھ کر اہل علم کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں، اور ان کے لبوں سے بے اختیار تحسین و آفرین کے کلمات بلند ہونے لگے[1] حتی کہ خود اس مخطوطے کے سراغ رساں ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم نے مولانا محمد

(۱) مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس کتاب کو دیکھ کر علامہ اعظمیؒ کی خدمت میں لکھے ہوئے ایک مکتوب گرامی میں اپنے تاثرات یوں قلم بند فرمائے ہیں: ''پرسوں کتاب السنن لسعید بن منصور کا ایک نسخہ ملا، اور کل کسی طرح وقت نکال کر بہت کچھ پڑھ گیا۔ سبحان اللہ، صَلِّ علی، آپ اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے کیا عجیب و غریب کارنامہ انجام دیا ہے، دنیائے علم و تحقیق آپ دونوں حضرات کا جتنا بھی شکریہ ادا کرے اور احسان مند ہو، کم ہے۔ آپ نے ادھر چند سالوں میں کیا کچھ کر دکھایا، جب اس کا خیال کرتا ہوں تو ہر بن مو سے آپ کے لیے دعائیں نکلتی ہیں''۔

میاں کے صاحبزادے مولانا ابراہیم میں کو اپنے تاثرات ان الفاظ میں لکھے:

''مولانا الاعظمی سنن سعید بن منصور کی تحقیق کیا فرما رہے، کتاب کو چار چاند لگا رہے ہیں''۔

کتاب کی اہمیت:

یہ کتاب ذخائرِ حدیث وسنت میں نمایاں اہمیت کی حامل ہے، اس میں مرفوع احادیث یعنی آنحضرت ﷺ کے اقوال وافعال کے علاوہ صحابۂ کرام اور تابعین عظام کے فتاویٰ کا بھی ایک بڑا حصہ محفوظ ہے، اور پہلی ودوسری صدی ہجری میں پیش آنے والے بہت سے مسائل کا حل موجود ہے، جس کی وجہ سے یہ کتاب فقہ اسلامی کے مراجع ومصادر میں ایک اہم مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔

کتاب پر کام کی نوعیت:

۱-نہایت دقتِ نظر اور باریک بینی کے ساتھ سند ومتن کی تصحیح کی گئی ہے۔

۲-غریب، نامانوس اور مشکل الفاظ کی تشریح کا اہتمام برتا گیا ہے۔

۳-کتاب میں اگر کہیں کوئی مبہم عبارت ہے، تو تفسیر وتوضیح کے ذریعے اس کے ابہام کو دور کرنے کی حتی الامکان سعی کی گئی ہے۔

۴-بعض ایسے الفاظ جو ایک سے زائد معنی کا احتمال رکھتے ہیں، تو دوسری روایات کی روشنی میں ان کے معنی کی تعیین کی گئی ہے۔

۵-اگر کسی روایت میں کسی مقام یا جگہ کا نام آیا ہے، اور وہ مشہور ومعروف نہیں ہے، تو اس کی تعیین وتحدید کی گئی ہے۔

۶-احادیث وآثار کی تخریج میں زیادہ تر اولین اور قدیم ترین مراجع سے کام لیا گیا ہے۔

۷-کسی راوی کے نام یا عبارت میں کسی دوسری کتاب میں غلطی واقع ہوگئی ہے اور وہی روایت یہاں مذکور ہے، تو دوسری کتاب کی غلطی پر متنبہ کیا گیا ہے۔

۸-بہت سے مسائل میں مذاہب اربعہ کے اقوال کو نقل کیا گیا ہے۔

۹-کسی فقہی مذہب کے مسئلے اور خاص طور سے حنفیہ کے مذہب کو نقل کرنے میں کسی محدث یا شراح حدیث میں سے کسی نے غیر منصفانہ رویہ اختیار کیا ہے، تو اس پر متانت کے ساتھ متنبہ کیا گیا ہے۔

۱۰-علامہ اعظمیؒ پہلی دفعہ اپنی تعلیقات کے دوران حنفی فقیہ نظر آتے ہیں، اور مسلک حنفیہ کا دفاع کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، جبکہ مسند حمیدی میں بھی فقہی مقامات آئے تھے، لیکن اس میں کہیں بھی کسی فقہی بحث سے کوئی تعرض نہیں کیا، اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ مسند حمیدی مرفوع احادیث کا مجموعہ ہے، اور اس کے مصنف

کا مقصد فقہی نقطۂ نظر سے حدیثوں کو جمع کرنا نہیں تھا، لہذا علامہ اعظمی نے بھی یہ موزوں اور مناسب نہیں سمجھا کہ اس کتاب پر فقہا کے اقوال اور فقہی مباحث سے حاشیہ آرائی کریں، رہا سنن سعید بن منصور کا معاملہ تو اس کی تصنیف کا مقصد ہی اسلامی قانون وشریعت کے مراجع کی جمع وترتیب ہے، اس لیے یہاں علامہ اعظمی کو میدان کھلا ہوا اور وسیع نظر آیا، اور اسی نقطۂ نظر سے آپ نے اس کی تحقیق اور اس پر تعلیق وتحشیہ کی خدمت انجام دی، ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

اس کتاب کی تحقیق اور اس کے حواشی علامہ اعظمیؒ کے بے نظیر فضل وکمال کے شاہد عدل ہیں، ذرا غور کیجئے کہ صرف ایک ہی مخطوطہ ہے، اس کا دوسرا کوئی نسخہ سامنے نہیں ہے، اور تقریباً ساڑھے چھ سو سال پہلے کا کتابت شدہ ہے، اتنی طویل مدت میں اس نسخے کی حالت نہ جانے کیا سے کیا ہوگئی ہوگی، اس کے باوجود اس کو قابل اشاعت بنا دینا کوئی معمولی فضل وکمال اور علمی لیاقت کی بات نہیں ہے، اس کے بعد اس کے حواشی کو دیکھئے، گویا کتابوں کے دفاتر اور یادوں کے خزانے کھلے ہوئے ہیں، اور ایک ایک روایت کی بحث وتحقیق میں کہاں کہاں سے مواد ڈھونڈ کر لائے ہیں۔

یہ کتاب علامہ اعظمیؒ کی تعلیقات اور تحقیقی حواشی کے علاوہ آپ کے بیش قیمت مقدمے کے ساتھ دو جلدوں میں ۱۳۸۷ھ = ۱۹۶۷ء اور ۱۳۸۸ھ = ۱۹۶۸ء میں مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی۔

تعلیقات کے نمونے:

۱- قسم اول صفحہ ۳-۴ پر ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: **وميراث الإخوة لأم أنهم لا يرثون مع الولد، ولا مع ولد ابن، ذكراً كان أو أنثى، شيئاً، ولا مع الأب، ولا مع الجد أبي الجد، وهم في كل ما سوى ذلك يفرض لهم للواحد منهم السدس، ذكراً كان أو أنثى، فإن كانوا اثنين فصاعداً، ذكوراً أو إناثاً، فرض لهم الثلث، يقتسمونه بالسواء، للذكر مثل حظ الانثى.**

اس روایت میں **للذكر مثل حظ الانثى** پر علامہ اعظمیؒ نے یہ حاشیہ تحریر فرمایا ہے: **كذا في الموطا، وهو الصواب، وفي ص "مثل حظ الانثيين" خطأ، وليست هذه الكلمة في هق، بل انتهت روايته إلى قوله: "بالسواء". ولا يقول أحد بأن للذكر منهم مثل حظ الانثيين، سوى ابن عباس في رواية شاذة عنه، قال الجصاص في أحكام القرآن: لا خلاف أن الإخوة والأخوات لأم يشتركون في الثلث، ولا يفضل منهم ذكر على أنثى(۲/۱۰۸). واعلم أنه وقع في الموطأ المطبوع مع التنوير أيضاً "الأنثيين" ولكنه من أخطاء الطبع، ففي الموطأ المطبوع بدهلي (سنة: ۱۳۲۰)، والمصفى المطبوع بدهلي (سنة: ۱۲۹۳) "مثل حظ الانثى"، ويدل عليه صريح كلام مالك في آخر الباب "فكان الذكر والأنثى في هذا بمنزلة واحدة"،**

وكلامه في آخر باب ميراث الإخوة للأب (۵۱/۲).

اس روایت میں اخیافی بھائیوں -جن کی ماں ایک ہو، باپ مختلف ہوں- کی وراثت کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے، اس روایت کے آخر میں للذكر مثل حظ الأنثى جو آیا ہے، اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ موطا میں یونہی ہے اور یہی صحیح بھی ہے، اصل یعنی سنن سعید کے قلمی نسخے میں مثل حظ الأنثيين ہے جو غلط ہے، بیہقی کی سنن کبری میں بھی یہ روایت ہے، لیکن اس میں یہ آخری حصہ نہیں ہے، بیہقی میں یہ روایت بالسواء ہی تک ختم ہو جاتی ہے۔ مسئلہ مبحوث عنہا میں کوئی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا، سوائے حضرت ابن عباس -رضی اللہ عنہ- کی ایک شاذ روایت کے، جصاص نے احکام القرآن (۱۰۸/۲) میں لکھا ہے کہ فقہاء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اخیافی بھائی اور بہنیں ثُلُث میں شریک ہوں گے، اور مرد کو عورت پر فضیلت نہیں حاصل ہوگی۔ لیکن یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ 'تنویر الحوالک' کے ساتھ جو موطا چھپی ہے، اس میں الأنثى کے بجائے الأنثيين ہے، لیکن یہ طباعت کی غلطی ہے، کیونکہ دہلی کے ۱۳۲۰ھ کے 'موطا' کے چھپے ہوئے نسخے میں، اور دہلی ہی کے ۱۲۹۳ھ کے 'مصفّٰی' کے مطبوعہ نسخے میں "مثل حظ الأنثى" ہے، اور لفظ الأنثى کے صحیح ہونے پر موطا میں اس باب کے آخر میں امام مالک کا یہ قول بھی دلالت کرتا ہے کہ مرد اور عورت اس مسئلے میں ایک حکم میں ہوں گے، نیز باب ميراث الإخوة للأب کے آخر میں بھی ان کا کلام اسی پر دلالت کرتا ہے۔

ناظرین! یہاں غور فرمائیں کہ کتاب کا ایک ہی قلمی نسخہ ہے، اور اس میں جو مسئلہ زیر بحث ہے، اس میں للذكر مثل حظ الأنثيين ہے، الأنثيين کا لفظ علامہ اعظمیؒ کے ذہن میں کھٹکتا ہے، فقہ پر آپ کی مہارت اور دسترس آپ کو متنبہ کرتی ہے کہ الأنثيين کے بجائے الأنثى ہونا چاہئے، اس کی تصحیح کے لیے آپ کو اسی روایت کی تلاش ہوئی، بیہقی کی سنن کبری میں یہی روایت آپ کو مل جاتی ہے، لیکن مقصود حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں روایت کا یہ آخری حصہ ہی نہیں ہے، لیکن آپ کو اتنا یقین ہے کہ الأنثى ہی صحیح ہے، کیونکہ جصاص نے لکھا ہے کہ اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ اس صورت میں مرد و عورت کے حصے میں کوئی فرق نہیں ہوگا، بالآخر آپ کو یہ روایت موطا امام مالک میں ملتی ہے، موطا کے حوالے کے وقت آپ کے پیش نظر اس کا وہ نسخہ رہا کرتا ہے، جو امام سیوطی کی شرح 'تنویر الحوالک' کے ساتھ چھپا ہے، مگر فکر کی بات یہ ہے کہ اس میں بھی الأنثيين ہی کا لفظ ہے، پھر آپ نے موطا کے دوسرے نسخوں کی طرف مراجعت فرمائی، تو اس کے دہلی کے مطبوعہ نسخے نیز اس کی شرح مصفّٰی میں صحیح لفظ الأنثى موجود ملا، لیکن یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ دہلی کے چھپے ہوئے نسخوں ہی میں غلطی ہو، اور تنویر الحوالک کا متن صحیح ہو، تو اس اعتراض کے دفعیہ کے لیے خود امام مالک کا قول پیش کیا ہے، جس سے الأنثيين کے غلط ہونے اور الأنثى کے صحیح ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔

۲-صفحہ ۸۴ روایت نمبر ۳۲۵ کے تحت مذکور ہے: عن الشعبي أنه كان يقول: لا يجوز إقراره لها عند الموت، إلا أن يكون إقراره في الصحة قبل المرض، لأنها وارث، ولا تجوز وصية

لوارث. قال هشيم: وهو القول. یعنی امام شعبی سے منقول ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ مرتے وقت مریض کا اس کے لیے اقرار کرنا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ بیماری سے پہلے تندرستی کی حالت میں اقرار کیا ہو، کیونکہ وہ وارث ہوتی ہے، اور وارث کے لیے وصیت جائز نہیں ہوتی ہے، ہشیم کہتے ہیں کہ یہی قول ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس روایت پر یہ حاشیہ لکھا ہے: **هذه إحدى المسائل التي ردَّ فيها البخاري على بعض الناس، وقد دريت أن شريحاً والشعبي كانا يقولان بعدم جواز إقرار المريض، وروى ابن أبي شيبة عن عطاء قال: لا يجوز إقرار المريض. فهولاء ثلثة من أكابر التابعين سبقوا أبا حنيفة بعدم إجازة إقرار المريض، وهذا هشيم من أوسع المحدثين رواية، وأعلاهم حفظاً ودراية، يقول: هو القول.**

یعنی وارث کے لیے مریض کے اقرار کے عدم جواز کا مسئلہ ان مسائل میں سے ایک ہے جن میں امام بخاری نے صحیح بخاری میں بعض الناس پر رد کیا ہے، اور آپ نے دیکھ لیا کہ قاضی شریح اور امام شعبی بھی اسی کے قائل ہیں، اور ابن ابی شیبہ نے عطاء بن ابی رباح سے بھی یہی روایت کیا ہے کہ مریض کا اقرار جائز نہیں ہے، پس یہ تین بلند پایہ تابعین امام ابوحنیفہ سے پہلے سے مریض کے اقرار کے جائز نہ ہونے کے قائل تھے، اور ہشیم جیسے وسیع الروایۃ محدث اور حدیث کے بلند پایہ حافظ و عالم کہتے ہیں کہ **هو القول.**

۳-صفحہ ۲۴۸ پر اندراج نمبر ۱۰۲۳ کے تحت یہ روایت ہے: **حدثنا سعيد، قال: نا مالك بن أنس، عن سعيد بن عمرو بن سليم، عن القاسم بن محمد أن رجلاً قال: إن تزوجت فلانة فهي عليَّ كظهر أمي، فتزوجها، فسأل عمر بن الخطاب فقال: لا تقربها حتى تُكَفِّر كفَّارة الظهار.**

اس روایت پر علامہ اعظمیؒ نے یہ تعلیق لکھی ہے: **أخرجه هق من طريق مالك عن سعيد بن عمرو بن سليم، وقال: هذا منقطع (٣٨٣/٧)، وأخرجه ش كما في الفتح. وأما تعلُّل الحافظ بأنه لا يصح لأنه من رواية العمري عن القاسم، فعجيب؛ لأن العمري لم يتفرد به، بل تابعه سعيد بن عمرو بن سليم أيضاً عند مالك والمصنف، وأما قوله إن القاسم لم يدرك عمر فصحيح، لكن يؤيده ما رواه عبدالرزاق عن ياسين الزيات، عن أبي محمد، عن عطاء الخراساني، عن أبي سلمة بن عبدالرحمان أن رجلاً قال: كل امرأة أتزوجها فهي طالق، فقال عمر بن الخطاب: هو كما قلت (المحلى ٢٠٦/١٠) وأسرف ابن حزم فقال: إنه موضوع.**

یعنی سنن سعید بن منصور کی اس حدیث کو بیہقی نے بواسطہ مالک عن سعید بن عمرو بن سلیم روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ سند منقطع ہے، اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے بھی روایت کیا ہے، جیسا کہ فتح الباری میں مذکور ہے؛ اور حافظ ابن حجر کا یہ کہنا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کو قاسم بن محمد سے عمری نے روایت کیا ہے، تو یہ تعجب کی

بات ہے، اس لیے کہ اس کو روایت کرنے والا تنہا عمری نہیں ہے، بلکہ عمری کی متابعت سعید بن عمرو بن سلیم نے بھی کی ہے، البتہ حافظ ابن حجر کی یہ بات صحیح ہے کہ قاسم نے حضرت عمرؓ کو پایا نہیں ہے، مگر اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس کو عبدالرزاق نے اپنی سند سے حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمان سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ ہر وہ عورت جس سے میں نکاح کروں اس کو طلاق ہوگی، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جو تم نے کہا ہے اسی کے مطابق تم پر حکم ہوگا (محلی ۱/۲۰۶)۔ اور ابن حزم نے تو یہاں تک حد کر دی کہ اس کو موضوع کہہ دیا۔

☆......☆......☆

المُصَنَّف

حافظ عبدالرزاق صنعانی کی کتاب 'المصنف' اسلامی تہذیب وثقافت کا عظیم سرمایہ اور دنیائے علم کے قابلِ فخر کارناموں میں سے ایک ہے، یہ کتاب اسلام کے عہد زریں کا ایک تابندہ نقش ہے، اور اسلام اور فرزندانِ اسلام کے علمی ولولوں اور ثقافتی سرگرمیوں کا ایک زندہ جاوید نمونہ؛ اس کتاب کو دیکھنے کے بعد کسی حد تک یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی علمی وفکری، اور تہذیبی وثقافتی دولت وثروت کو محفوظ رکھنے، اور نہ صرف پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام، بلکہ آپ کے صحابہ-رضی اللہ عنہم-حتی کے ان کے پیروکاروں اور بعد کے لوگوں تک کے زبان ودہن سے نکلے ہوئے جواہر پاروں اور علم وحکمت کے موتیوں کو قرطاس وقلم کے حوالے کرنے میں کس قدر مشقت اور جانفشانی اٹھائی ہے۔

مصنف کی تعریف:

علامہ شیخ محمد جعفر کتانی نے 'الرسالة المستطرفة' میں مصنف کی جو تعریف کی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ مصنف ایسی کتاب کو کہتے ہیں جو فقہی ابواب پر مرتَّب کی گئی ہو، سنن اور شرائع اسلام پر مشتمل ہو[(۱)]۔

اور ڈاکٹر شیخ محمود طحان نے اپنی کتاب 'أصول التخريج ودراسة الأسانيد' میں اس کی تعریف یہ کی ہے کہ محدثین کی اصطلاح میں مصنف اس کتاب کا نام ہے، جو فقہی ابواب پر مرتب ہو، اور مرفوع، موقوف اور مقطوع حدیثوں پر مشتمل ہو، یعنی اس کتاب میں احادیث نبویہ کے ساتھ ساتھ صحابہؓ کے اقوال اور تابعین اور بسا اوقات تبع تابعین کے فتوے بھی ہوں[(۲)]۔

مصنف اور سنن میں فرق:

اس کے بعد ڈاکٹر طحان نے ''مصنف'' اور ''سنن'' کا فرق یہ بیان کیا ہے کہ ''مصنف'' مرفوع حدیثوں کے ساتھ موقوف اور مقطوع روایات پر بھی مشتمل ہوتی ہے، جب کہ ''سنن'' مرفوع حدیثوں کے علاوہ دوسری قسم

(۱) الرسالة المستطرفة: ۳۰ (۲) أصول التخريج: ۱۳۴

پرشاذ و نادر مشتمل ہوتی ہے، وجہ یہ ہے کہ موقوف اور مقطوع روایت کو محدثین کی اصطلاح میں ''سنن'' نہیں کہا جاتا ہے۔اس فرق کے علاوہ ''مصنف'' اور ''سنن'' میں پوری پوری مشابہت پائی جاتی ہے[1]۔

دوسری صدی ہجری میں جب حدیث وسنت کے جمع وتدوین کی سرگرمیاں بڑھی ہیں، تو متعدد بلند پایہ محدثین اور سرکردہ حفاظ حدیث نے مصنف کے نام سے بھی کتابیں تصنیف کیں، ان مشہور محدثین میں حماد بن سلمہ ابن دینار متوفی ۱۶۷ھ[2]، ابوسعید یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ متوفی ۱۸۴ھ[3]، ابوسفیان وکیع بن جراح متوفی ۱۹۶ھ یا ۱۹۷ھ ہیں[4]۔ان کے بعد عبدالرزاق اور ابوبکر بن ابی شیبہ نے مصنف کی تصنیف کو نقطۂ عروج تک پہنچایا۔

امام عبدالرزاق:

ابوبکر کنیت، عبدالرزاق بن ہمام بن نافع حمیری صنعانی نام ونسب، قبیلۂ حمیر کے مولیٰ-آزاد کردہ غلام- تھے، جس کی وجہ سے ان کو حمیری کہا جاتا ہے۔حدیث کے بہت بڑے حافظ، ثقہ اور اپنے زمانے کے دیگر حفاظ حدیث کا مرجع تھے، کوہ پیکر شخصیت کے مالک اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔

یمن کے صدر مقام صنعاء میں ۱۲۶ھ میں پیدا ہوئے، تحصیلِ علم کے لیے حجاز، شام اور عراق کا سفر کیا، اس کے علاوہ ملک شام کا تجارتی سفر بھی کیا، بیس سال کی عمر سے حدیث سیکھنا شروع کیا، فرماتے تھے کہ میں معمر کی خدمت میں سات سال رہا۔معمر کی وفات ۱۵۳ھ میں ہوئی۔

عبدالرزاق نے معمر، ابن جریج، اوازعی، مالک، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ اور اس زمانے کے دیگر کبار محدثین سے حدیث روایت کی ہے، ان کے اساتذہ وشیوخ میں اس وقت کے تقریباً تمام ممتاز اور جلیل القدر راویانِ حدیث اور ائمۂ فن کے نام نظر آتے ہیں۔

اسی طرح ان سے حدیث روایت کرنے والوں میں ان کے استاذ سفیان بن عیینہ اور معمر بن سلیمان ہیں، ان کے تلامذہ کی فہرست میں وکیع، ابواسامہ، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، علی ابن المدینی، یحییٰ بن معین، احمد بن صالح مصری، ابوخیثمہ زہیر بن حرب، عبد بن حمید، احمد بن منصور رمادی، اور اسحاق بن ابراہیم دبری جیسے لوگ ہیں۔یہ ان محدثین کی جماعت ہے، جو اس دور کے حدیث روایت کرنے والے چوٹی کے لوگوں میں تھے، ورنہ ان کے تلامذہ کی تعداد حد شمار سے باہر ہے۔سمعانی نے 'انساب' (۹۲/۸) میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد اس کثرت سے کسی کی طرف سفر نہیں کیا گیا، جس کثرت سے عبدالرزاق کی طرف کیا گیا، سمعانی کے اس قول کو ابن خلکان نے بھی 'وفیات الاعیان' (۱۰۳/۲) میں نقل کیا ہے۔

معمر کہا کرتے تھے کہ عبدالرزاق اگر زندہ رہ گئے تو وہ اس لائق ہیں کہ ان کی طرف اونٹوں پر سوار ہوکر

(۱) أصول التخریج: ۱۳۴ (۲) الرسالۃ المستطرفۃ: ۳۱ (۳) تاریخ بروکلمان: ۱۶۳/۳ (۴) الرسالۃ: ۳۰

جایا جائے۔

عبدالرزاق کی جلالتِ قدر کا یہ حال تھا کہ ان کی بود و باش ایسے گاؤں میں تھی، جہاں پانی نہیں تھا، تو امام احمد بن حنبل جیسے عظیم المرتبت امام دو میل سے ان کے لیے پانی بھر کر لاتے تھے۔

عبدالرزاق جرح وتعدیل کی روشنی میں:

تقریباً تمام بڑے محدثین اور ائمۂ جرح وتعدیل نے عبدالرزاق کی تعریف یا توثیق وتعدیل کی ہے، ان ائمۂ فن میں امام احمد، یحییٰ بن معین، محمد بن یحییٰ ذہلی، ہشام بن یوسف، یعقوب بن شیبہ، ابوحاتم رازی، ابوزرعہ دمشقی، ابوداود، بزار، ابن حبان اور حافظ ذہبی جیسے ائمۂ فن اور ناقدین رجال ہیں۔

لیکن عبدالرزاق پر کچھ محدثین نے جرحیں بھی کی ہیں، ان میں سب سے سخت جرح عباس بن عبدالعظیم عنبری کی ہے، انھوں نے عبدالرزاق کو کذّاب - بہت دروغ گو - کہا ہے؛ لیکن عنبری کی اس جرح پر کسی نے توجہ نہیں کی ہے، بلکہ محدثین نے اس کو سختی سے رد کر دیا ہے، حافظ ذہبی نے 'میزان الاعتدال' میں لکھا ہے:

هذا ما وافق العباسَ عليه مسلمٌ، بل سائر الحفاظ وأئمة العلم يحتجُّون به إلا في تلك المناكير المعدودة في سعة ما روى. (۱)

عباس عنبری کی اس جرح کی کسی بھی مسلمان نے موافقت نہیں کی ہے، بلکہ تمام حفاظ اور ائمۂ علم ان کو حجت مانتے ہیں سوائے ان چند منکر روایتوں کے، جو ان کی روایتوں کی وسعت کے مقابلہ میں معمولی ہیں

اور حافظ ابن حجر نے 'فتح الباری کے مقدمہ (ص: ۴۴۰) میں لکھا ہے:

وثّقه الأئمة كلهم إلا العباس بن عبدالعظيم العنبري وحده، فتكلّم بكلام أفرط فيه ولم يوافقه عليه أحد. (۲)

عبدالرزاق کو تمام لوگوں نے ثقہ قرار دیا ہے سوائے عباس بن عبدالعظیم عنبری کے، انھوں نے کچھ ایسا کلام کیا ہے جس میں زیادتی سے کام لیا ہے اور کسی نے ان کی موافقت نہیں کی۔

عبدالرزاق اور تشیع:

عبدالرزاق پر جو سب سے بڑی تہمت ہے، وہ تشیع کی ہے؛ لیکن یا تو یہ تہمت ثابت نہیں ہے، یا اگر ثابت بھی ہے تو ان کا تشیع ایسا سخت نہیں ہے، جو ان کی روایت کو قبول کرنے سے مانع ہو، حافظ ذہبی نے 'تذکرۃ الحفاظ' میں لکھا ہے:

وما كان يغلو فيه، بل كان يُحبُّ علياً رضي الله عنه، ويُبغِضُ من قاتله. (۳)

وہ تشیع میں غالی نہیں تھے، بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت رکھتے تھے، اور ان سے قتال کرنے والوں کو ناپسند کرتے تھے۔

(۱) میزان الاعتدال: ۲/ ۱۲۷ (۲) مقدمہ فتح الباری: ۴۴۰ (۳) تذکرہ: ۱/ ۳۳۱

سلمہ بن شبیب نے خود عبدالرزاق سے سن کر ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

والله ماانشرح صدري قط أن أُفضّل علياً على أبي بكر وعمر، رحم الله أبابكر وعمر وعثمان، من لم يُحبهم فما هو مؤمن، وقال: أوثق أعمالي حبي إياهم.[۱]

میرے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ علی کو ابوبکر وعمر پر ترجیح دوں، اللہ تعالیٰ ابوبکر وعمر وعثمان پر رحمت نازل فرمائے، جو ان سے محبت نہ کرے وہ مومن نہیں ہے، عبدالرزاق نے مزید کہا میرے اعمال میں سب زیادہ قابل بھروسہ عمل ان حضرات سے میری محبت ہے۔

اور بعض اہل علم کا یہ خیال ہے کہ عبدالرزاق چونکہ ایک کثیر الروایۃ محدث تھے اور ہر طرح کی چیز روایت کر دیا کرتے تھے، اس لیے مخالفینِ حضرت علیؓ کے مثالب میں ان کی روایتوں کی وجہ سے لوگوں نے ان پر تشیع کی تہمت عائد کر دی، چنانچہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ نے عبدالرزاق کے تشیع کی نسبت سوال کیا، تو انھوں نے جواب میں فرمایا:

أما أنا فلم أسمع منه في هذا شيئاً، ولكن كان رجلاً يُعجبُه أخبار الناس.[۲]

میں نے عبدالرزاق سے اس سلسلے میں کچھ نہیں سنا ہے، مگر بات یہ ہے کہ وہ ایسے آدمی تھے کہ ان کو لوگوں کی خبریں اچھی لگتی تھیں۔

اور حافظ ابن حجر نے 'تہذیب' میں ابن عدی کا یہ قول نقل کیا ہے:

ولعبدالرزاق أصناف وحديث كثير، وقد رحل إليه ثقات المسلمين وأئمتهم وكتبوا عنه، إلا أنهم نسبوه إلى التشيع، وقد روى أحاديث في الفضائل لم يتابَع عليها، فهذا أعظم ما ذمُّوه من روايته لهذه الأحاديث، ولما رواه في مثالب غيرهم؛ وأما في باب الصدق فأرجو أنه لا بأس به.[۳]

عبدالرزاق کے پاس بہت سی قسمیں اور بہت زیادہ حدیثیں تھیں اور مسلمانوں کے اصحاب امامت اور ثقہ بزرگوں نے ان تک سفر کیا اور ان سے حدیثیں لکھیں، مگر یہ ہے کہ ان لوگوں نے عبدالرزاق پر تشیع کی تہمت لگائی ہے، اور تحقیقی بات یہ ہے کہ عبدالرزاق نے (اہل بیت کے) فضائل میں کچھ ایسی حدیثیں روایت کر دی ہیں، جن میں کسی اور نے ان کی متابعت نہیں کی ہے، چنانچہ ان حدیثوں کی روایت اور اہل بیت کے مخالفین کے نقائص کی روایت ہی نے ان کی شان میں بٹہ لگا دیا ہے۔ جہاں تک عبدالرزاق کی صداقت کا تعلق ہے، تو میں امید کرتا ہوں کہ اس میں کوئی مضایقہ نہیں ہے۔

عبدالرزاق کی وفات ۲۱۱ھ میں ہوئی۔

---

(۱) تہذیب التہذیب: ۶/۳۱۳ (۲) میزان الاعتدال: ۲/۱۲۷

(۳) تہذیب التہذیب: ۶!۳۱۳

عبدالرزاق کی تصانیف:

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ عبدالرزاق ایک صاحب تصانیف بزرگ تھے، چنانچہ ان کی تصنیفات میں مصنَّف کے علاوہ ایک کتاب التفسیر بھی ہے، جواب کئی جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، نیز مورخین نے ان کی فہرست تصانیف میں 'الجامع'، 'السنن في الفقه'، 'المغازي' اور 'تزكية الأرواح عن مواقع الإفلاح' کا بھی تذکرہ کیا ہے؛ لیکن ان کی شہرت وناموری کو آسمان کی بلندی تک پہنچانے والی ان کی کتاب 'المصنف' ہے۔

مصنف کے راوی:

'المصنف' کو عبدالرزاق سے ان کے کئی شاگردوں نے روایت کیا ہے، لیکن روایات کے تتبع اور تجزیہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اجزا کو ان کے مختلف شاگردوں نے روایت کیا ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

اسحاق بن ابراہیم دَبَری:

عبدالرزاق سے مصنف کو روایت کرنے والے اسحاق بن ابراہیم صنعانی دَبَری ہیں، حافظ ذہبی نے ان کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

الشيخ العالم، المسند، الصدوق، أبويعقوب، إسحاق بن إبراهيم بن عباد الصنعاني الدبري، راوية عبدالرزاق، سمع تصانيفه منه في سنة عشر ومائتين باعتناء أبيه به، وكان حَدَثاً، فإنَّ مولدَه –على ما ذكره الخليلي– في سنة خمس وتسعين ومئة، وسماعه صحيح. [1]

اسحاق بن ابراہیم بن عباد صنعانی دبری، عبدالرزاق کی روایات کے سب سے بڑے راوی ہیں، شیخ عالم مسند اور راست گو ہیں، اپنے والد کی توجہ سے عبدالرزاق کی تصنیفات کو ۲۱۰ھ میں سن لیا تھا، اُس وقت وہ ۱۵/ برس کے کم عمر جوان تھے، کیونکہ ان کی ولادت ابویعلی خلیلی کی تصریح کے مطابق ۱۹۵ھ میں ہوئی تھی، لہٰذا ان کا سماع صحیح ہے۔

اور حافظ ذہبی ہی نے تذکرۃ الحفاظ (۱۴۸/۲) میں ان کے لیے "مسند اليمن" کا خطاب استعمال کیا ہے۔

دَبَر: یمن کے صدر مقام صنعاء میں ایک گاؤں کا نام تھا، اس کی طرف نسبت کر کے ان کو دبری کہا جاتا ہے [2]۔ حافظ ذہبی کی منقولہ بالا عبارت سے معلوم ہو چکا ہے کہ ۱۹۵ھ میں ان کی ولادت ہوئی ہے، ان سے حدیث روایت کرنے والوں میں ابوعوانہ اسفرائینی، خیثمہ بن سلیمان، محمد بن محمد بن عبداللہ بن حمزہ، محمد بن عبداللہ نقوی، ابوجعفر محمد بن عمرو عقیلی اور امام ابوالقاسم طبرانی کے علاوہ بہت سارے لوگ ہیں۔

---

(۱) سیر اعلام النبلاء: ۴۱۶/۱۳ (۲) الانساب: ۳۰۴/۵، لباب: ۴۰۹/۱

امام حاکم کہتے ہیں کہ میں نے امام دارقطنی سے اسحاق دبری کے بارے میں پوچھا کہ کیا ان کو صحیح میں جگہ دی جاسکتی ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ جی بالکل، وہ بہت راست گو ہیں، ان کے سلسلے میں میں نے کوئی اختلاف نہیں دیکھا(۱)۔

ذہبی نے لکھا ہے کہ مغرب کے لوگ اسحاق دبری کے واسطے دعا کیا کرتے تھے، اور اُن سے وعدہ کرتے کہ جب مکہ جائیں گے تو آپ کی طرف سے طواف کریں گے، اور عمرہ کریں گے، تو وہ خوش ہوتے(۲)۔

مسلم نے 'صلۃ' میں لکھا ہے کہ ان میں کوئی مضایقہ نہیں ہے، اور عقیلی ان کی روایت کو صحیح قرار دیا کرتے تھے، اور صحیح حدیثوں کا جو مجموعہ انھوں نے مرتب کیا تھا، اس میں ان کی روایتیں لی ہیں(۳)۔

حافظ ابن حجر نے 'لسان' میں لکھا ہے کہ ابوعوانہ نے اپنی صحیح میں ان کی روایت سے استدلال کیا ہے، اور طبرانی نے ان کے واسطے سے بہ کثرت روایت کیا ہے۔

اسحاق دبری نے طویل عمر پائی اور راجح قول کے مطابق ۲۸۵ھ میں وفات پائی۔

ابن الاعرابی:

مصنف کو عبدالرزاق سے اس کے زیادہ تر حصے کو روایت کرنے والے اسحاق دبری، اور ان سے روایت کرنے والے امام ابوسعید ابن الاعرابی(۴) ہیں، ذیل میں ابن الاعرابی کے کچھ حالات لکھے جارہے ہیں:

حافظ ذہبی نے 'تذکرۃ الحفاظ' میں ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

الإمام الحافظ الزاهد شيخ الحرم أبو سعيد أحمد بن محمد بن زياد بن بشر بن درهم البصري الصوفي صاحب التصانيف.(۵)	امام وحافظ وزاہد شیخ الحرم ابوسعید احمد بن محمد بن زیاد بن بشر بن درہم بصری صوفی متعدد تصانیف کے مصنف۔

پھر چند سطروں کے بعد ان کے اوصاف میں لکھا ہے:

وكان ثقةً ثبتاً عارفاً عابداً ربانياً كبير القدر بعيد الصيت.	(روایت حدیث میں) ثقہ وثبت تھے، خداشناس، عبادت گزار اور خدارسیدہ تھے، بڑے رتبہ والے اور شہرت یافتہ تھے۔

اور 'سیر اعلام النبلا' میں لکھا ہے:

الإمام المحدث القدوة الصدوق الحافظ، شيخ الإسلام، أبو سعيد ابن الأعرابي البصري الصوفي، نزيل مكة، وشيخ الحرم.(۶)	امام ومحدث وقدوہ، راست گو حافظ حدیث، شیخ الاسلام ابوسعید ابن الاعرابی بصری صوفی، مکہ میں مقیم اور حرم کے شیخ۔

(۱) سیر اعلام النبلاء: ۱۳/۴۱۷ (۲) ایضاً: ۱۳/۴۱۸ (۳) لسان المیزان ترجمہ اسحاق دبری

(۴) ابن الاعرابی کے نام سے ایک اور شخص بھی گزرے ہیں، ان کا نام محمد بن زیاد اور کنیت ابوعبداللہ تھی، لغات عرب کے امام تھے، ان کا سن ولادت ۱۵۰ھ، اور سن وفات ۲۳۱ھ ہے۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ: ۳/۶۶ (۶) سیر: ۱۵/۴۰۷

ابن الاعرابی کی ولادت ۲۴۶ھ میں ہوئی، بہت جانفشانی کے ساتھ علم حاصل کیا، مختلف علاقوں اور شہروں کا سفر کیا، اور بہت سے شیوخِ حدیث اور ائمۂ فن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے علم حدیث حاصل کیا، امام ابوداود سجستانی سے ان کی کتاب 'السنن' حاصل کر کے اس کو روایت کیا۔

ابن الاعرابی نے حسن بن محمد زعفرانی، محمد بن عبدالملک دقیقی، عبداللہ بن ایوب مخرمی، سعدان بن نصر اور امام ابوداود جیسے اکابر محدثین سے حدیثیں سنی ہیں؛ ابن الاعرابی سے بہت سارے لوگوں نے حدیثیں روایت کی ہیں، جن میں شیخ ابوعبداللہ بن خفیف، ابوبکر ابن المقر ی، ابوعبداللہ بن مندہ اور قاضی ابوعبداللہ بن مفرج کا نام سرفہرست ہے۔

ابن الاعرابی مصنف بھی تھے، اور حافظ ذہبی نے ان کی تصانیف میں تاریخ بصرہ اور طبقات النساک کا ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے ان کی تعدیل وتوثیق کے سلسلے میں بہت سے اقوال نقل کیے ہیں۔

ان کا مقام زہد وتقویٰ میں بھی بہت اونچا تھا، اور انھوں نے اپنے وقت کے مشائخ طریقت سے فیض اٹھایا تھا۔ حافظ ذہبی نے 'سیر' نیز 'تذکرہ' میں، اور ابن العماد نے 'شذرات' (۳۵۵/۲) میں ان کے ملفوظات اور عارفانہ کلام بھی نقل کیے ہیں، جن مشائخ کی صحبت سے انھوں نے فیض اٹھایا تھا، ان میں جنید بغدادی، عمرو بن عثمان مکی اور ابواحمد قلانسی وغیرہ ہیں۔ ذہبی نے لکھا ہے:

صحب المشايخ، وتعبّد وتألّه، وألّف مناقب الصوفية.(1)	مشائخ صوفیہ کی صحبت اٹھائی ہے، عبادت وریاضت کی ہے، اور صوفیہ کے مناقب میں کتاب بھی لکھی ہے۔

ابن الاعرابی نے ۹۴ برس کی عمر میں ۳۴۰ھ میں مکہ میں وفات پائی۔

ابن تغری بردی نے ابن الاعرابی کا چند سطروں میں نہایت جامع تذکرہ کیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تذکرے کے اختتام پر اس کو نقل کر دیا جائے، لکھا ہے:

كان إماماً حافظاً ثبتاً، سمع الكثيرَ، وروى عنه عالَم كثير، وكان كثيرَ العبادة، شيخ الحرم في وقته علماً وزهداً وتسليكاً، وكان صحب الجنيد وعمرو بن عثمان المكي وأبا أحمد القلانسي وغيرهم.(2)	امام، حافظ اور ثبت تھے، بہت حدیثیں سنی ہیں، اور بہت لوگوں نے ان سے روایت کیا ہے، بہت عبادت گزار تھے، اپنے وقت میں علم وزہد اور سلوک کے اعتبار سے شیخ حرم تھے، جنید بغدادی، عمرو بن عثمان مکی اور ابواحمد قلانسی وغیرہ کی صحبت سے شرفیاب تھے۔

ابن الجَبّاب:

مصنّف کو اسحاق دبری سے روایت کرنے والے دوسرے راوی ابن الجباب ہیں، ان کی نسبت علامہ

---

(۱) سیر اعلام النبلاء: ۴۰۸/۱۵ (۲) النجوم الزاہرۃ: ۳۰۷/۳

ذہبی نے 'تذکرۃ الحفاظ' میں لکھا ہے:

الحافظ العلامة شيخ الأندلس أبو عمر أحمد بن خالد بن يزيد القرطبي المعروف بابن الجَبَّاب نسبةً إلى بيع الجِبَاب [1].

حافظ وعلامہ شیخ اندلس ابوعمر احمد بن خالد بن یزید قرطبی، جبہ فروشی کی طرف ان کی نسبت کی وجہ سے ابن الجباب کے نام سے مشہور ہیں۔

ابن الجباب نے یمن میں اسحاق دبری اور مکہ میں علی بن عبدالعزیز کے علاوہ بقی بن مخلد، محمد بن وضاح اور قاسم بن محمد سے حدیثیں سنی ہیں؛ ان سے ان کے صاحبزادے محمد، محمد بن احمد بن ابی ولیم، عبداللہ بن محمد باجی اور قرطبہ کے لوگوں نے حدیثیں روایت کی ہیں، ذہبی کے بقول ان کا سن پیدائش ۲۴۶ھ ہے۔

حافظ ذہبی نے 'تذکرۃ الحفاظ' میں لکھا ہے:

وكان فريد عصره، ذكره القاضي عياض فقال: كان إماماً في الفقه لمالك، وكان في الحديث لا يُنازَع، سمع منه خلق كثير [2].

یکتائے روزگار تھے، قاضی عیاض نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ فقہ مالکی کے امام تھے، اور حدیث میں ان کا مرتبہ مسلّم تھا، بہت سے لوگوں نے ان سے حدیثیں سنی ہیں۔

اور 'سیر اعلام النبلاء' میں لکھا ہے:

الإمام الحافظ الناقد، محدث الأندلس ....، وكان من أفراد الأئمة، عديم النظير [3].

امام وحافظ وناقد، اندلس کے محدث تھے، یکتائے روزگار ائمہ میں تھے، اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

قاضی عیاض نے ترتیب المدارک (۵/۱۷۷) میں لکھا ہے کہ جب ابن الجباب رحم مادر میں تھے، تو ان کی والدہ نے خواب میں کسی کو کہتے ہوئے سنا کہ تمھارے شکم میں ایسا نطفہ ہے، جس سے دنیا روشن ہوگی۔

ابن الجباب کہتے ہیں کہ **كانت أمي تغزل وأبيع غزلها، فأشتري به الرَّق والكتب** [4]. میری والدہ سوت کاتا کرتیں اور میں ان کے کاتے ہوئے سوت کو فروخت کرتا، اور اس کی یافت سے کاغذ کتاب خریدتا۔

محمد بن ابی ولیم کہتے ہیں کہ احمد بن خالد - ابن الجباب - عالم اور بھلے آدمی تھے، ہم جب ان کے پاس جاتے تھے، تو دیکھتے تھے کہ وہ اپنے ہاتھ سے کھیتی باڑی کیا کرتے ہیں [5]۔

ابن الجباب کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ علامہ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ میں نے ان کو کبھی قبلہ کی طرف پشت کرتے ہوئے نہیں دیکھا [6]۔

---

(۱) تذکرہ: ۳/۳۴ (۲) ایضاً (۳) سیر: ۱۵/۲۴۰
(۴) ترتیب المدارک: ۵/۱۷۷ (۵) ایضاً: ۵/۱۷۵ (۶) ایضاً: ۵/۱۷۷

ابن الجباب نے علم حدیث کے لیے مکہ، یمن، اقریطش اور افریقہ کا سفر کیا، اور مکہ میں مجاورت بھی کی۔

قاضی عیاض نے 'ترتیب المدارک' میں، اور علامہ ابن فرحون نے 'الدیباج المذھب' (ص۹۲) میں ان کے علم و معرفت اور فضل و کمال کے متعلق اہل علم کے بہت سے اقوال نقل کیے ہیں۔

جمادی الاخری ۳۲۲ھ کے وسط میں شب دوشنبہ میں ابن الجباب کی قرطبہ میں وفات ہوئی [1]۔

عبدالاعلی بَوسی:

اسحاق دبری سے مصنَّف کو روایت کرنے والے ایک راوی عبدالاعلی بَوسی بھی ہیں۔ بَوس صنعاء کے ایک گاؤں کا نام ہے، اسی کی طرف نسبت کر کے ان کو بوسی کہا جاتا ہے [2]، عبدالاعلی بوسی کی نسبت ابناوی بھی کی جاتی ہے، ابناوی ان ایرانیوں کی اولاد کو کہا جاتا ہے، جنھوں نے یمن میں بود و باش اختیار کر لی تھی [3]۔

مصنف میں اسحاق دبری سے عبدالاعلی بوسی کی روایت جلد نمبر ۸ میں صفحہ نمبر ۳۶۹ پر دیکھی جا سکتی ہے، وہاں سند کے الفاظ یہ ہیں: **حدثنا أبو القاسم عبدالأعلى بن محمد بن الحسن بن عبدالأعلى البوسي القاضي بصنعاء.** اس راوی کی تحقیق اور ان کے بارے میں تفصیل رسالہ 'المآثر' جلد ۷ اشارہ ۳و۴ میں صفحہ ۵۵ سے صفحہ ۵۷ تک ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

مصنَّف عبدالرزاق کے دبری کے علاوہ دوسرے راوی:

عبدالرزاق صنعانی سے مصنف کو روایت کرنے والے دبری کے علاوہ بعض دوسرے لوگ بھی ہیں، ان میں سے ایک محمد بن علی نجار ہیں۔ عبدالرزاق سے ان کی روایت مصنف کی جلد نمبر ۶ صفحہ نمبر ۳ پر دیکھی جا سکتی ہے، جہاں سے ''**كتاب أهل الكتاب**'' شروع ہوتی ہے، نجار سے روایت کیا ہے محمد بن حسن بن ابراہیم بن ہشام طوسی نے، اور طوسی سے روایت کرنے والے ابوالحسن علی بن احمد اصبہانی ہیں۔ ان تینوں راویوں کا تذکرہ راقم الحروف کو کتب تذکرہ و تراجم میں نہیں مل سکا۔

محمد بن یوسف حُذَاقی:

عبدالرزاق سے مصنف کے کچھ حصوں کو محمد بن یوسف حذاقی نے بھی روایت کیا ہے، ان کی روایت جلد نمبر ۱۰ صفحہ ۳۱۱ پر ''**كتاب أهل الكتابين**'' کے ضمن میں دیکھی جا سکتی ہے، محمد بن یوسف حذاقی پر علامہ اعظمیؒ نے یہ حاشیہ تحریر فرمایا ہے:

قال السمعاني: من أهل صنعاء أخوان هما إسحاق ومحمد ابنا يوسف الحذاقي، رويا عن عبدالرزاق، روى عنهما عبيد بن محمد الكشوري، ذكره جميعه الدارقطني، وأما

---

(۱) ترتیب المدارک، لباب، تذکرۃ الحفاظ، سیر، نجوم زاہرہ ۲۴۷/۳، شذرات ۲۹۳/۲

(۲) معجم البلدان: ۵۰۸/۴ (۳) الانساب: ۱۰۰/۱

الحذاقي فهو بضم الحاء المهملة وفتح الدال المعجمة بعد الألف وفي آخرها قاف، نسبة إلى حذاقة بطن من إياد، وإياد من معد كما حققه ابن الأثير في اللباب ۱:۲۸۶.

یعنی سمعانی نے لکھا ہے کہ صنعاء والوں میں دو بھائی اسحاق بن یوسف اور محمد بن یوسف حذاقی گزرے ہیں، ان دونوں نے عبدالرزاق سے روایت کیا ہے، اور ان دونوں سے عبید بن محمد کشوری نے روایت کیا ہے، یہ تمام باتیں دارقطنی نے بیان کی ہیں۔ اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے ابن الاثیر کی 'لباب' کے حوالے سے لکھا ہے کہ حُذَاقی قبیلہ ایاد کی ایک شاخ حذاقہ کی طرف نسبت ہے، اور ایاد، معد کی شاخ ہے۔

ابومحمد کشوری:

حُذاقی سے روایت کرنے والے ابومحمد عبید بن محمد کشوری ہیں، علامہ اعظمیؒ نے ان کی نسبت حاشیے میں لکھا ہے: **بفتح أولها –وقيل بكسرها– وبالشين المعجمة بعدها واو مفتوحة وفي آخرها راء، نسبةً إلى كَشْوَر وهي من قرى صنعاء، وأبو محمد هذا هو عبيد بن محمد بن إبراهيم الصنعاني الأزدي يروي عن عبدالله بن أبي غسان الصنعاني أيضاً، وعنه أبو القاسم الطبراني، ذكره السمعاني وابن الأثير.**

یعنی کشوری ''ک'' کے زبر- اور دوسرے قول کے مطابق زیر- کے ساتھ ہے، اس کے بعد ''ش'' ہے، اس کے بعد ''واؤ'' ہے جس کے اوپر زبر ہے، اور آخر میں ''ر'' ہے، یہ صنعاء کے ایک گاؤں کشور کی طرف نسبت ہے۔ ابومحمد کا پورا نام عبید بن محمد بن ابراہیم صنعانی ازدی ہے، یہ عبداللہ بن ابی غسان صنعانی سے بھی روایت کرتے ہیں، اور ان سے ابوالقاسم طبرانی نے حدیث روایت کی ہے۔ یہ باتیں سمعانی نے 'انساب' میں اور ابن الاثیر نے 'لباب' میں لکھی ہیں۔

ابومحمد کشوری کا تذکرہ 'انساب' جلد ۱۱ صفحہ ۱۱۸ پر، اور 'لباب' جلد ۳ صفحہ ۴۲ پر ہے، 'انساب' میں ان کے شیوخ میں ہشام بن سلمہ میہنی اور ان سے روایت کرنے والوں میں ابوالحسن قطان کا نام بھی مذکور ہے۔

عبدالرزاق سے حذاقی اور حذاقی سے کشوری کی روایت دسویں جلد کے صفحہ ۴۷۳ پر بھی آئی ہے۔

ابن الجباب:

کشوری سے یہاں روایت کرنے والے وہی ابن الجباب ہیں، جن کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ قاضی عیاض نے 'ترتیب المدارک' (۱۷۵/۵) میں بتصریح لکھا ہے کہ ابن الجباب نے کشوری سے حدیث سنی ہے۔

مصنَّف کے نسخے:

مصنف عبدالرزاق کے سلسلے میں افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس کا کامل نسخہ اب تک کی حتمی معلومات کے

مطابق دنیا کے کسی کتب خانے میں نہیں پایا جاتا ہے، یوں تو عالمِ اسلامی کے متعدد کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی کامل اور مکمل نسخہ نہیں ہے، اس کے جو نسخے معلوم یا موجود ہیں، ان میں سے بعض تو صرف کچھ اجزا یا اوراق نہ ہونے کی وجہ سے ناقص رہ گئے ہیں، اور بعض ایسے ہیں کہ صرف چند اجزا یا اوراق ہی پر مشتمل ہیں، جیسا کہ درج ذیل تفصیلات سے واضح ہو جائے گا۔ اب ان نسخوں کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے، جن کی بنیاد پر علامہ اعظمیؒ نے اس عظیم کتاب کی تحقیق کا کارنامہ انجام دیا ہے۔

مراد ملا کا نسخہ:

یہ مخطوطہ دوسرے تمام نسخوں کی بہ نسبت زیادہ کامل اور اور قابل ذکر ہے، اور یہی علامہ اعظمیؒ کے کام کی اساس اور بنیاد ہے، بروکلمان کے بیان کے مطابق یہ نسخہ ترکی کے مکتبہ مراد ملا میں ۵۹۶-۶۰۰ نمبر کے تحت درج ہے۔

مراد ملا کا یہ نسخہ دوسرے تمام نسخوں سے زیادہ کامل ہونے کے باوجود نقص سے خالی نہیں ہے، چنانچہ خود علامہ اعظمیؒ نے کتاب الطہارۃ کے عنوان کے بعد اس پر اس طرح متنبہ کیا ہے:

''إنَّ النسخ التي عثرنا عليها، أو التي أحرزناها مصورةً أو مخطوطةً واعتمدناها في إعداد هذا الديوان الجليل للطبع .... كلها ناقصة، إلا نسخة مراد ملا (بالاستانة) فإنها كاملة إلا نقصاً بسيطاً في أولها، وفي فاتحة المجلد الخامس من مجلدات الأصل''.

یعنی اس عظیم الشان کتاب کو قابل اشاعت بنانے کے واسطے اس کے جن عکسی یا قلمی نسخوں کی ہم کو اطلاع ہوئی یا ہم کو دستیاب ہوئے وہ سب کے سب ناقص تھے، سوائے آستانہ کے مکتبہ مراد ملا کے نسخہ کے، کہ وہ ایک کامل نسخہ تھا، مگر اس کے بھی شروع میں اور اصل کی جلدوں کے پانچویں جلد کے آغاز میں کچھ حصہ کم تھا۔

مراد ملا کے نسخے کے شروع میں کمی کا ثبوت یہ ہے کہ یہ نسخہ باب غسل الذراعین سے شروع ہوتا ہے، اور اہل علم جانتے ہیں کہ سنن کے طرز پر جو کتابیں تصنیف ہوتی ہیں، ان کا اس قسم کے باب سے آغاز نہیں ہوتا، بلکہ اس سے پہلے بھی طہارت کے کچھ ابواب ہوتے ہیں۔

علامہ اعظمیؒ کی تصریح کے مطابق دوسرا نقص اصل کی پانچویں جلد کے شروع میں ہے، کتاب کے طبع شدہ اڈیشن میں یہ مقام آٹھویں جلد کے درمیان میں صفحہ ۲۹۲ پر **بـاب الـرجـل يُـخـرج الـخشبة من حقـه هل يضمن إذا أصاب إنساناً** سے ایک حدیث پہلے آتا ہے، چنانچہ اہل علم جب حدیث نمبر ۱۵۲۶۴ پر پہنچیں گے، تو وہاں حاشیہ نمبر (۲) کے تحت علامہ اعظمیؒ کی عبارت پائیں گے:

في هامش الأصل ''الجزء الخامس من مصنف عبدالرزاق وبه يتم الكتاب، والنقص من أوله لم يُعلم''.

یعنی اصل کے حاشیہ میں یہ عبارت تحریر ہے کہ ''یہ مصنف عبدالرزاق کا پانچواں جز ہے اور اسی جز پر کتاب پوری ہوتی ہے، اور اس کے شروع میں جو کمی ہے وہ نامعلوم ہے''۔

لیکن اس سے پہلے حدیث نمبر ۱۵۲۶۳ پر - جو کہ باب من مات وعليه دين کی آخری حدیث ہے - علامہ اعظمیؒ نے جو حاشیہ تحریر فرمایا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چوتھی جلد میں بھی کچھ نقص ہے، اس حاشیے کی عبارت یہ ہے: **فُقِد من الأصل الذي عندنا ورقة أو ورقات، وكان تمام الحديث المرقم برقم ١٥٢٦٣ فيما فُقد، فأتممته من عند أبي داود.** یعنی ہمارے پاس جو قلمی نسخہ ہے اس کا کوئی ورق یا کچھ اوراق گم شدہ ہیں، اور حدیث نمبر ۱۵۲۶۳ کا تکملہ اسی گم شدہ حصے میں تھا، پس میں نے اس حدیث کو ابوداود سے پورا کیا۔

مخطوطے کی یہ پانچویں جلد **كتاب اللقطة** پر ختم ہوتی ہے، اور **كتاب اللقطة** کا خاتمہ جلد نمبر ۱۰ صفحہ ۱۴۵ پر ہوتا ہے، چنانچہ علامہ اعظمیؒ نے آخر **كتاب اللقطة** پر حاشیے میں تحریر فرمایا ہے:

وانتهى بذلك المجلد الخامس من أصل المصنف للإمام عبدالرزاق بن همام الصنعاني كما نص عليه ناسخ النسخة المرادية المحفوظة بمكتبة مراد ملا (بالآستانة) وإليك نصه: "كمل جميع ...... والحمد لله كثيراً، والصلاة والسلام على من أرسل بشيراً ونذيراً، وعلى آله وصحبه وذريته وسلم تسليماً كثيراً، وكان الفراغ من نسخه بكرة نهار يوم الخميس مستهل شهر شعبان المكرم سنة سبع وأربعين وسبع مائة.

لیکن یہ واضح ہونا چاہیئے کہ جلد نمبر ۱۰ صفحہ ۱۴۶ سے جلد نمبر ۱۰ صفحہ ۳۰۹ تک یعنی **باب ما جاء في الحرورية** سے **خنثى ذكر** تک کی حدیثیں - جن کا نمبر ۱۸۶۴۹ - ۱۹۲۰۸ ہے - بھی مراد ملا کے نسخے میں موجود ہیں، مراد ملا کے نسخے میں یہ حدیثیں **كتاب اللقطة** سے پہلے تھیں، لیکن علامہ اعظمیؒ نے ان کو وہاں سے حذف کر کے **كتاب اللقطة** کے بعد اس کو رکھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ علامہ اعظمیؒ کے پاس مصنف کے جو قلمی نسخے تھے، ان میں مراد ملا کے نسخے کے علاوہ ایک استنبول کے مکتبہ فیض اللہ آفندی کا بھی تھا، لیکن فیض اللہ آفندی کا نسخہ صرف کتاب کے آخر کے چند اجزا پر مشتمل تھا، مخطوطۂ مراد ملا کے پانچ اجزا تھے، لہذا علامہ اعظمیؒ نے مخطوطۂ فیض اللہ آفندی کو چھٹا جز قرار دیا، کتاب کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فیض اللہ آفندی کے نسخے میں **كتاب اللقطة** نہیں تھا، اور وہ **باب ما جاء في الحرورية** سے شروع ہوتا تھا، لہذا علامہ اعظمیؒ نے فیض اللہ آفندی کے نسخے کو چھٹا حصہ فرض کرتے ہوئے مقابلہ کی سہولت اور آسانی کے لیے اور کتاب کی منطقی ترتیب کو باقی رکھنے کے لیے **كتاب اللقطة** کو مقدم اور **باب ما جاء في الحرورية** کو مؤخر کر دیا۔ دیکھئے **كتاب اللقطة** شروع ہونے سے پہلے صفحہ ۱۲۶ پر حاشیے میں ''تنبيه'' کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے:

في نسخة مراد ملا (بإستنبول) عقيب الباب السابق ذكره "باب ما جاء في قتل

الحروراء''، وهذا الباب في نسخة فيض الله آفندي (بإستنبول) في فاتحة الجزء السادس، وليس الجزء السادس إلا مصوراً عن نسخة فيض الله، فلا جرم أن حذفنا من هنا هذا الباب، ووضعنا في مكانه ما كان يتلوه في نسخة مراد ملا أعني ''كتاب اللقطة'' وما بعده، وأبقينا الجزء السادس كما كان.

فیض اللہ آفندی کے نسخے کو چھٹا جز فرض کرنے کے علاوہ باب ما جاء في الحرورية سے آخر تک حاشیے میں جہاں ''ص'' آتا ہے- جو کہ اصل کا مخفف ہے- تو اس سے مراد یہی فیض اللہ آفندی والا نسخہ ہوتا ہے، اور مراد ملا والے نسخے کو ''المرادية'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، جب کہ اس سے پہلے ''ص'' - یعنی اصل - سے مراد وہی مراد ملا کا نسخہ ہوتا تھا، اور کبھی اس کو ''الخامس'' سے تعبیر کیا ہے، جیسا کہ کتاب الفرائض میں دیکھنے میں آتا ہے۔

ظاہریہ کا نسخہ:

یہ نسخہ تیرہ (۱۳) اوراق پر مشتمل ہے، اس کی ابتدا ''باب مسح الأصلع'' سے ہوتی ہے، اور باب هل يتوضأ لكل صلاة پر ختم ہوتا ہے۔ یہ نسخہ مطبوعہ ایڈیشن کے ۴۳ صفحات - از صفحہ ۱۵ تا صفحہ ۵۷ پر - مشتمل ہے، حضرت محدث الاعظمیؒ نے مولانا محمد موسیٰ میاںؒ کو ۳ / رمضان ۱۳۸۲ھ کو اس نسخے کے متعلق لکھا ہے:

''الحمد للہ کہ آج ہی ''كتاب الصلاة لعبدالرزاق'' کا عکسی نسخہ دستیاب ہوا، یہ مئو ہی کے ایک عزیز کے ذریعہ ملا ہے، جو قطر میں رہتے ہیں، اور مکتبہ ظاہریہ دمشق سے اس کی فلم منگوائی ہے، مگر افسوس ہے کہ یہ صرف ۱۳ ورق پر مشتمل ہے، اور کوئی الگ کتاب نہیں ہے، بلکہ مصنف عبدالرزاق ہی کا ایک ٹکڑا ہے، جو باب مسح الأصلع سے شروع ہوتا ہے، اور باب هل يتوضأ لكل صلاة پر ختم ہوتا ہے''۔

اس کے بعد ۱۳ / رمضان ۱۳۸۲ھ = ۹ / فروری ۱۹۶۳ء کے ایک خط میں اس نسخے کا وصف یوں بیان فرمایا ہے:

''مکتبہ ظاہریہ کے كتاب الصلاة کے ۱۳ / ورق کے جو فوٹو قطر سے آئے تھے، بہت صحیح تھے، پانچویں صدی کے لکھے ہوئے تھے، ان سے مقابلہ ہو گیا، کئی مفید اضافے ہوئے، تین چار حدیثیں اس میں زاید ملیں، کاش اس کی ایک جلد کامل ہوتی''۔

علامہ اعظمیؒ نے مراد ملا کے نسخے سے مقابلہ کر کے اس نسخے کی مدد سے بہت سے کلمات، جملوں اور عبارتوں میں اضافہ کیا ہے، اور ایسی حدیثوں کا بھی اضافہ کیا ہے جو مراد ملا والے نسخے میں نہیں تھیں، یہ احادیث یا آثار مطبوعہ میں حدیث نمبر ۶۰، ۸۴، ۱۳۶، اور ۱۴۰ کے تحت درج ہیں۔

المکتب الاسلامی کا نسخہ:

میرا خیال ہے کہ یہ نسخہ بیروت میں قیام کے زمانے میں علامہ اعظمیؒ کو دستیاب ہوا تھا، یہ صاف اور

خوبصورت خط میں لکھا ہوا نسخہ تھا، تیسری و چوتھی جلد کے بیشتر حصوں پر مشتمل ہے، چنانچہ مصنف عبدالرزاق کا مطالعہ کرنے والے کو تیسری جلد کے صفحہ ۲۹ سے لے کر چوتھی جلد کے صفحہ ۴۰۶ تک اس نسخے کی طرف اشارہ ملے گا، جو حدیث نمبر ۴۶۷۸ سے حدیث نمبر ۸۲۳۹ تک نظر آتی ہے، اس نسخے کے لیے علامہ اعظمیؒ نے ''ز'' کی علامت استعمال کی ہے، جس سے صاحب المکتب الاسلامی زہیر شاویش کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ان ہی کے یہاں یہ نسخہ تھا۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے غالب گمان یہ ہے کہ یہ نسخہ آپ کو بیروت کے زمانۂ قیام میں دستیاب ہوا تھا، اس وقت کتاب تحقیق وتعلیق کے مراحل سے گزرنے کے بعد طباعت کے مرحلے میں تھی، اور باوجودیکہ علامہ اعظمیؒ اس کی تحقیق سے فارغ ہو چکے تھے، لیکن اس دریافت شدہ نسخے سے مقابلہ میں بھی آپ نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، اور یہ نسخہ جتنے حصے پر مشتمل تھا، اس کا مراد ملا کے نسخہ سے مقابلہ کر کے اس کے فرق کو حاشیہ میں واضح کیا، اور مراد ملا والے نسخے کی چھوٹی ہوئی بہت سی چیزوں کا اس کی مدد سے اضافہ کیا، ان اضافوں میں عبارتوں اور جملوں کے علاوہ بہت سی احادیث بھی ہیں، چنانچہ حدیث نمبر ۴۷۷۲، ۴۷۷۳، ۴۹۸۵، ۵۰۰۱، ۵۰۰۲، ۵۱۸۶، ۵۹۲۱، ۵۹۶۸، ۶۱۴۳، ۶۱۴۴، ۶۱۹۹، ۶۲۰۴، ۶۲۰۵، ۶۲۱۶، ۶۶۱۷، ۶۶۴۷، اور ۷۴۴۸ کو بغور مطالعہ کر کے دیکھنا چاہئے کہ نسخوں کے باہمی مقابلہ میں کس قدر باریک بینی اور دقیقہ رسی سے کام لیا گیا ہے۔

حیدرآبادی نسخہ:

اس نسخے کے ابتدائی دو صفحے **كتاب اللقطة** کے تین ابواب **باب الذي يستعير المتاع ثم يجحده، وباب النهبة ومن آوى محدثا**، اور **باب الاختلاس** پر اور **باب الخيانة** کی دو حدیثوں پر مشتمل ہیں، یہ تینوں ابواب اور ان کی حدیثیں مطبوعہ کی جلد نمبر ۱۰ میں موجود ہیں، اور ان کی احادیث کا نمبر ۱۸۸۳۰-۱۸۸۶۱ ہے، اس کے بعد اس نسخے میں چھ ورق سے زائد بیاض پایا جاتا ہے۔

پھر یہ نسخہ **كتاب الطلاق** کے وسط اور **باب المرأة تُملَّك أمرها فردَّته هل تستخلف؟** کے درمیان سے شروع ہوتا ہے، چنانچہ اس کی ابتدا مطبوعہ کی حدیث نمبر ۱۱۹۰۸ کے آخری فقرہ سے ہوتی ہے، اور حیدرآباد کے اس نسخے میں طلاق کے ابواب ورق نمبر ۹ سے شروع ہو کر ورق نمبر ۵۹ کے پہلے صفحے تک پائے جاتے ہیں۔

اس کے بعد ورق نمبر ۵۹ کے آخری صفحہ سے ورق نمبر ۶۴ کے دوسرے صفحہ تک **كتاب الشهادات** ہے، اس کے بعد ورق نمبر ۱۰۵ تک **كتاب العقول** ہے، لیکن **كتاب العقول** اس نسخے میں پوری نہیں ہے، اور اس کے تقریباً ۱۸؍ابواب ساقط ہیں، جن کی حدیثیں مطبوعہ میں حدیث نمبر ۱۸۴۴۴ سے حدیث نمبر ۱۸۶۴۸ کے تحت درج ہیں، اور کچھ حصہ حدیث نمبر ۱۸۴۴۳ کا بھی غائب ہے۔

اس کے بعد **كتاب الأيمان والنذور** ہے، پھر **كتاب الفرائض** ہے، پھر **كتاب أهل الكتابين**

ہے، اس کے بعد کتاب العقیقة، پھر کتاب الأشربة ہے، سب سے آخر میں ورق نمبر ۱۳۶ سے لے کر آخر یعنی ورق نمبر ۱۹۴ تک کتاب الجامع ہے۔

پس بشمول کتاب الجامع اس نسخے کے اوراق کی تعداد ۱۹۴ ہے، اس نسخے کی ترتیب مراد ملا کے نسخے سے کچھ مختلف ہے، ابھی اس کے ابواب کی جو تفصیل ذکر کی گئی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کتاب العقول کے بعد کتاب الأیمان والنذور ہے، اور اس کے دو باب کے بعد کتاب العقیقة اور کتاب الأشربة ہیں، جب کہ مطبوعہ اڈیشن میں جو کہ مراد ملا کی اصل کے مطابق ہے، اس کی ترتیب یہ ہے کہ "کتاب الأیمان والنذور"، "الأشربة" اور "العقول" سے پہلے ہے، کتاب العقیقة مراد ملا میں دو جگہ تھی، علامہ اعظمیؒ نے اس کو دوسری جگہ سے حذف کر دیا اور پہلی جگہ برقرار رکھا، جو کہ "الصیام" اور "الاعتکاف" کے بیچ میں ہے، اسی طرح اس نسخے کے مذکورہ بالا ابواب کے درمیان سے بہت سے ایسے ابواب ساقط ہیں، جو کہ مراد ملا کے نسخے میں موجود تھے۔

یہ نسخہ بہت صاف اور واضح ہے، ہر صفحے میں ۲۹ سطریں ہیں، اس کے تراجمِ ابواب اور ہر روایت کا پہلا لفظ یعنی لفظ "أخبرنا" سرخ روشنائی سے لکھا ہوا ہے، یہ چودھویں صدی کے نصف اول کے آخر میں معرضِ کتابت میں آیا ہے، جیسا کہ اس کے کاتب نے آخر میں لکھا ہے:

الحمد لله سبحانه، قد تمَّ كتابة هذه النسخة الشريفة على يد الراجي إلى الله أبي محمد خليل الله بن محمد صبغة الله قاضي الملك إمام العلماء، وفي آخر هذا بعض الصحف على يد ابني وقرة عيني محمد حميد الله. اللهم وفقهما بالخير والطاعة بجاه نبيك المصطفى سيدنا وحبيبنا محمد ﷺ وعلى آله وأصحابه وسلم. وذلك في إحدى عشر خلون من شهر المبارك ربيع الأول سنة ثمان وأربعين بعد الألف وثلث مائة من هجرة النبي الأمين ﷺ في بلدة حيدرآباد صانها الله تعالى من شرور الزمان وأهله والفتن.

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ علامہ اعظمیؒ کو بالکل آخر میں دستیاب ہوا، اس لیے کہ اس نسخے کا حوالہ آپ کے حواشی میں کتاب العقول سے ملتا ہے، اور کتاب العقول مطبوعہ کی نویں جلد میں نصف کے بعد سے ہے، علامہ اعظمیؒ نے اس نسخے سے متعدد حدیثوں کا اضافہ کیا ہے، مثلاً حدیث نمبر ۱۷۴۲۰، ۱۷۷۱۹، اور ۱۷۷۹۴، اسی نسخے سے لی گئیں ہیں۔

فیض اللہ آفندی کا نسخہ:

یہ نسخہ "باب ما جاء في الحرورية" سے شروع ہو کر کتاب الجامع پر ختم ہوتا ہے، لہٰذا اس کی حیثیت مصنّف کے تتمہ یا تکملہ کی کہی جا سکتی ہے۔ اس نسخے کی روایتیں مطبوعہ کی جلد نمبر ۱۰ صفحہ ۱۴۶ حدیث نمبر ۱۸۶۴۹ سے

آخر تک ہیں، یہ نسخہ **کتاب العقول** کے ۳۶؍ابواب پر، پھر **کتاب الفرائض، کتاب أهل الکتابین** اور **کتاب الجامع** پر مشتمل ہے، مصنّف پر علامہ اعظمیؒ کے حواشی اور دیگر تصریحات کا بنظر غائر جائزہ لینے کے بعد میرے نزدیک یہ بات یقین کی حد تک پہنچتی ہے کہ جلد نمبر ۱۰ صفحہ ۱۴۶ سے آخر تک علامہ اعظمیؒ نے اپنے حواشی میں ''ص'' کا جو رمز استعمال کیا ہے، اس سے مراد یہی نسخہ ہے، اسی طرح **کتاب الأیمان والنذور** میں حدیث نمبر ۱۵۸۱۱ سے ۱۶۱۳۷ تک اور **کتاب الأشربة** میں ۱۶۹۲۴ سے ۱۷۱۷۲ تک اپنے حواشی میں ''**السادس**'' کا جو لفظ استعمال کیا ہے، اس سے مراد یہی نسخہ ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ فیض اللہ آفندی کا یہ نسخہ **کتاب الأیمان والنذور** پر، **کتاب العقول** کے کچھ حصے پر، اور **کتاب الأشربة، کتاب الفرائض، کتاب أهل الکتابین** اور **کتاب الجامع** پر مشتمل ہے۔

اس نسخے کے آخر میں یہ عبارت تحریر ہے:

تـمَّ کتـابُ الـجـامع بحمد الله وعونه وقوته، وبتمامه تم جمیع کتاب المصنف لأبي بـکـر عبـدالـرزاق بن همام بن نافع الصنعاني الیماني، والحمد لله رب العالمین بما هو أهله، وصـلی الله علی محمد نبیه وآله وسلم تسلیماً، في الثالث والعشرین من جمادی الأولی سنة ست وست مائة.

اس نسخے کی کیفیت کا اندازہ اس خط سے کیا جا سکتا ہے، جسے علامہ اعظمیؒ نے ۳۰؍شوال ۱۳۸۱ھ=۱۹۶۲ء کو مولانا محمد موسیٰ میاں کو لکھا ہے:

> ''قطر میں مکتبہ فیض اللہ آفندی آستانہ سے مصنف عبدالرزاق کی ایک جلد کا مائیکروفلم آیا ہے، جو ۲۱۴؍اوراق پر مشتمل ہے، اس کی ابتدا **ما جاء في الحروریة** سے ہوتی ہے، اور اس کا نمبر ۵۴۱ ہے، اصل نسخہ پانی کھایا ہوا ہے، کہیں بدقت پڑھا جاتا ہے، مگر ہمارے نسخہ سے صحیح اور قدیم معلوم ہوتا ہے، اس کے دو ورق کا فوٹو میرے پاس آیا ہے''۔

رمادی کا نسخہ:

یہ ایک بڑا اہم، بیش قیمت اور نادرۂ روزگار نسخہ ہے، جس سے علامہ اعظمیؒ نے اس کتاب کی تحقیق وتصحیح میں فائدہ اٹھایا ہے، یہ ''جامع عبدالرزاق'' کے کچھ حصے پر مشتمل ہے، علامہ اعظمیؒ نے جلد ۱۰ صفحہ ۳۸۰ پر تحریر فرمایا ہے:

وعـنـدي مـن هـذه النسخة –نسخة أحمد بن منصور الرمادي– صورة ورقتین منها، وصورة لوحته فقط.

یعنی میرے پاس رمادی کے اس نسخے کا صرف ٹائٹل اور دو ورق کی فوٹو کاپی موجود ہے۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جب کتاب کی ورق گردانی کی جاتی ہے، تو رمادی کے نسخے کے حوالے جلد نمبر ۱۰ صفحہ نمبر ۳۸۰ سے جلد نمبر ۱۰ صفحہ ۴۳۵ تک ملتے ہیں، دوورق ۵۵ صفحات تک کس طرح پھیل سکتے ہیں؟۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ علامہ اعظمیؒ کو صفحہ ۳۸۰ پر اس عبارت کے لکھتے وقت رمادی کے نسخے سے دوورق اور اس کے ٹائٹل سے زیادہ نہیں ملا تھا، اس کے بعد خوش قسمتی سے رمادی کی روایت کا ایک دوسرا نسخہ بھی دستیاب ہو گیا، لیکن وہ اپنی تعلیقات میں کہیں اس دوسرے نسخے کی طرف اشارہ نہیں کر سکے، لیکن دوسرے شواہد سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ رمادی کی روایت کے دو نسخے آپ کو دستیاب ہوئے تھے، ان دونوں نسخوں کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

ا-: پہلا نسخہ جس کی طرف علامہ اعظمیؒ نے اپنے حاشیے میں اشارہ کیا ہے، بہت صاف ہے اور خط نسخ میں لکھا ہوا ہے، اس کے پہلے ورق کی پشت پر یہ عبارت تحریر ہے:

الجزء الأول من كتاب الجامع

تاليف: الإمام عبدالرزاق بن همام الصنعاني

رواية أبي بكر أحمد بن منصور بن سيار الرمادي عنه

پھر حافظ ابن حجر عسقلانی تک سلسلہ وار راویوں کے نام تحریر کیے گئے ہیں، حافظ ابن حجر سے اس کو روایت کرنے والے ان کے مشہور شاگرد ابوالفضل عبدالرحمٰن بن احمد بن اسماعیل قلقشندی ہیں۔

اس کی پشت ہی پر نیچے محدث قطب الدین ابوالخیر محمد بن محمد بن عبداللہ الخیفر ی کا حافظ ابن حجر کے پاس اس نسخے کا پڑھنا، اور امام وعلامہ علی بن احمد بن اسماعیل قلقشندی، ان کے صاحبزادگان احمد وابراہیم، علاتی بھائی ابوالفضل عبدالرحمٰن بن احمد بن اسماعیل اور قاضی جمال الدین عبداللہ بن شیخ محبّ الدین محمد اور دوسروں کا سماع درج ہے۔

اس کے آخر میں یہ عبارت تحریر ہے:

وصحَّ ذلک في ليلة الجمعة السابع عشر من شعبان المكرم سنة ثلاث وأربعين وثمان مائة.

رمادی کی روایت کا یہ نسخہ **كتاب الجامع** کی ابتدا سے **باب تسليم القليل على الكثير** پر مشتمل ہے، لیکن یہ باب اس میں پورا نہیں ہے، بلکہ اس باب کی پہلی حدیث اور دوسری حدیث کا کچھ حصہ موجود ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے **البعث الإسلامي** کے رجب ۱۴۰۵ھ کے مضمون میں اس کی کیفیت یہ بیان کی ہے:

هي نسخة جميلة الخط جداً لصاحبها تقي الدين القلقشندي من أنجب تلامذة الحافظ ابن حجر، والنسخة أُرها بخطه.

ب- رمادی کی روایت کا دوسرا نسخہ جامع عبدالرزاق کا پہلا جز پورا ہے، یہ نسخہ تیرہ اوراق پر مشتمل ہے،

اور کتاب الجامع کے شروع سے باب قتل الحیة والعقرب تک ہے، اس کے آخر میں یہ عبارت تحریر ہے:

"آخر الجزء الأول، يتلوه في الثاني إن شاء الله باب حب المال."

اس نسخے کا خط ایسا ہے کہ اس کا پڑھنا مشکل ہے، مگر اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ رمادی کی روایت والے پہلے نسخے سے پرانا ہے، علامہ اعظمیؒ نے البعث الإسلامي میں لکھا ہے:

"فالأقدم، وهو الجزء الأول منه بتمامه بخط الإمام الحافظ المفيد أبي الفتح نصر ابن أبي الفرج الحصري، المتوفى سنة ٦١٩ھ".

علامہ اعظمیؒ نے اس نسخے کا تفصیلی تعارف اپنے مضمون کتاب الجامع لعبدالرزاق الصنعاني میں کرایا ہے، جو البعث الإسلامي کے رجب ۱۴۰۵ھ کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

مصنَّف کی تحقیق کا منہج:

کوئی محقق جب کسی کتاب کی تحقیق کے لیے قدم اٹھاتا ہے، تو اپنے ذہن میں ایک خاکہ اور طریقہ مرتب کرتا ہے، اور اس خاکے کے مطابق اپنا قدم آگے بڑھاتا ہے، چونکہ علامہ اعظمیؒ نے اس کتاب پر مقدمہ نہیں لکھا ہے، اس لیے بعض اہل علم کو اس کی تحقیق میں آپ کا منہج اور طریقۂ کار سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی ہے، یا سمجھتے ہوئے بھی بدگمانی پھیلانے کا موقع مل گیا ہے؛ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خطوط اور تعلیقات کی روشنی میں اس کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے۔

مصنَّف میں علامہ اعظمیؒ کے منہج تحقیق کو سمجھنے کے لیے جو چیز ہم کو بنیاد فراہم کرتی ہے، وہ مولانا محمد موسیٰ میاںؒ کے نام تحریر کردہ ۳۰؍شعبان ۱۳۸۱ھ کا ایک خط ہے، جس میں منجملہ دیگر باتوں کے ارقام فرماتے ہیں:

"مصنَّف عبدالرزاق پر کام کا معیار یہ ہوگا:

۱- تصحیح اغلاطِ اصل نسخہ، ۲- اس کی مرفوع حدیث کسی دوسری کتاب میں بواسطۂ عبدالرزاق مروی، یا بحوالہ عبدالرزاق منقول ہے، تو اس کا حوالہ، ۳- مشکل ومُغلق الفاظ کی تفسیر، ۴- جہاں شدید ضرورت محسوس ہو، وہاں مجمل حدیث کا بیان، ۵- غیر صحاح کے راویوں کا تعارف اور جرح وتعدیل، ۶- جہاں ضرورت ہو، وہاں تعیین کر کے یہ بتانا کہ یہ فلاں راوی ہے، مگر یہ سب غایت اختصار کے ساتھ تا کہ تعلیق طویل نہ ہو"۔

کتاب کی تحقیق کے سلسلے میں علامہ اعظمیؒ نے یہ جو معیار قائم کیا ہے، اس کی پابندی پوری کتاب میں دکھائی دیتی ہے، آپ نے نہایت اختصار کے ساتھ تعلیقات سپردِ قلم فرمائی ہیں، طویل اور دراز حواشی سے کتاب کے حجم کو بڑھانے سے پوری طرح گریز کیا ہے۔ اس کتاب کی تحقیق کا عمل کتنا مشکل تھا، اس کا اندازہ اس مکتوب سے ہوتا ہے جسے ۲۲؍ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ کو مولانا محمد موسیٰ میاں کے نام لکھا ہے، اس میں رقم طراز ہیں:

''مصنف عبدالرزاق کا کام اپنے گمان سے بہت زیادہ مشکل ثابت ہوا، کراچی کی نقل بہت ناصاف ہے، غلط اور سہو سے پُر ہے، پہلے اس کے حروف کو واضح کرنا؛ پھر جو بیاض چھوڑے ہیں اُن کا پُر کرنا، جگہ جگہ ایک ایک سطر عبارت چھوڑ دی، اس کو اضافہ کرنا؛ پھر اصل کتاب کی غلطیوں کو درست کرنا جو ہر صفحہ میں دس بارہ سے کم نہیں ہیں؛ متنِ حدیث میں سہوِ کاتب کی وجہ سے چھوٹے ہوئے الفاظ وکلمات کو بڑھانا؛ سند میں چھوڑے ہوئے رواۃ کی نشان دہی کرنا؛ پھر احادیث کی تخریج کے لیے بہت ساری کتابوں کی مراجعت۔ اتنا لمبا کام ہے کہ مولانا منظور نعمانی سلمہ تو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یہ بالکل واقعہ ہے کہ اکیلے ایک شخص کا یہ کام نہیں ہے''۔

پھر ۳۰ رشوال ۱۳۸۱ھ کو لکھا ہے:

''طباعت کے وقت ہر جلد کے شروع میں رموز (عب، طب، الکنز، وغیرہ) کی تشریح کر دی جائے گی۔ غیر مشہور راویوں کا کسی ایک جگہ تعارف کرا دیا گیا ہے، ہر ہر جگہ تعرض نہیں کیا گیا۔ 'کنز العمال' کے ساتھ دوسری کتابوں میں بھی اکثر حدیثوں کی نشان دہی کر دی گئی ہے، جیسا کہ آئندہ نمونہ میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے''۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے اس کتاب کے سلسلے میں علامہ اعظمیؒ کے منہج تحقیق وتعلیق کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے، اسی طرح 'مصنف' پر آپ کے تعلیقات کو دیکھ کر بھی ان امور کو سمجھا جا سکتا ہے۔ خطوط کے ان اقتباسات اور کتاب پر آپ کی تعلیقات کی روشنی میں آپ کے قائم کردہ منہج کو درج ذیل نکات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱- تصحیحِ سند ومتن:

سب سے اہم اور بنیادی مقصد سند ومتن کے اعتبار سے کتاب کی تصحیح ہے، اور اس کا محرک یہ ہے کہ حدیث شریف کے اس عظیم سرمائے کو اہل علم کے ہاتھوں میں جہاں تک ممکن ہو سکے صحیح صورت میں پیش کیا جا سکے۔ اس کا آپ نے جس قدر اہتمام کیا ہے اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، کتاب کی تصحیح کے لیے آپ نے جن وسائل سے کام لیا ہے، وہ درج ذیل ہو سکتے ہیں:

الف) مختلف قلمی نسخوں کا باہم مقابلہ کیا گیا ہے، حتی کہ ان نسخوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، جو عبدالرزاق کے دوسرے راوی ابومنصور رمادی کی روایت سے پائے جاتے ہیں۔

ب) مصنف کی روایات کا ان کتابوں سے مقابلہ جن میں وہ روایات عبدالرزاق کے واسطے سے یا ان کی سند یا حوالے سے پائی جاتی ہیں، مثلاً امام بیہقی کی 'سنن کبری' اور شیخ عبدالوہاب ہندی متقی کی 'کنز العمال' وغیرہ۔ کتاب کی تعلیقات کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے قلمی نسخوں کے بعد اس کی تصحیح کے لیے زیادہ مدد ان ہی کتابوں سے لی گئی ہے، غالباً اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے کہ وہ اس کتاب کے نصوص کی تصحیح کے لیے

اپنی توجہ کو ان ہی روایات پر مرکوز رکھنا چاہتے ہیں، جو عبدلرزاق کے واسطے سے یا ان کی سند سے پائی جاتی ہیں۔

ج) کتاب کا مقابلہ اسی جیسی ایک دوسری کتاب مصنف ابن ابی شیبہ سے جو اپنی وضع وترتیب اور محتویات ومضامین کے لحاظ سے پوری طرح مصنف عبدالرزاق کے مشابہ اور مماثل ہے، مصنف ابن ابی شیبہ سے مقابلہ کا اس قدر اہتمام دیکھنے میں آتا ہے کہ بسا اوقات یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ آپ اپنے حواشی میں ابن ابی شیبہ کا نچوڑ اور مغز نکال کر رکھ دینا چاہتے ہیں؛ نیز اگر وہ روایات صحاح ستہ میں پائی جاتی ہیں، تو ان سے بھی حتی الامکان مقابلہ کیا گیا ہے۔

د) ان سب امور کے علاوہ جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے، اپنے ذوق اور وجدان سے بھی کام لیا ہے۔

درج بالا امور سے پوری کتاب بھری ہوئی ہے، اس کے ثبوت کے لیے مثال پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کتاب کی ایک جلد کے چند اوراق دیکھ کر بھی بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۲-ضرورت کے وقت راویوں کا تعارف:

اگر کوئی راوی اہل علم کے درمیان مشہور نہیں ہے، یا صحاح ستہ کے رجال میں سے نہیں ہے، تو اختصار کے ساتھ اس کا تعارف کرایا گیا ہے۔

مثلاً: روایت نمبر ۷۵۹ میں **عبدالرزاق عن ياسين عن حماد بن أبي سليمان** ہے، یاسین پر 'لسان المیزان' (۲۳۸/۶) کے حوالے سے یہ تعلیق تحریر فرمائی ہے:

☆......: **هو ياسين بن معاذ الزيات، يروي عن الزهري وحماد بن أبي سليمان، وعنه عبدالرزاق، وكان من كبار الكوفة ومفتيها، وأصله يماني، يكنى أبا خلف.**

اور مثلاً روایت نمبر ۸۹۸ میں جویبر نام کے ایک راوی ہیں، ان کے نام پر حاشیہ میں لکھا ہے:

☆......: **هو جويبر بن سعيد الأزدي، أبو القاسم البلخي، ويقال: اسمه جابر، وجويبر لقب، روى عن أنس بن مالک والضحاک بن مزاحم، وعنه ابن المبارک والثوري وحماد بن زيد (ته).**

۳-بوقت ضرورت راویوں کی تعیین:

الف) راویوں کی تعیین کے سلسلے میں نوعیت بدلتی رہتی ہے، کبھی تو الفاظ وحروف کی حرکت ضبط کر کے تعیین کرتے ہیں، مثلاً:

☆......: حدیث نمبر ۲۷ میں عبداللہ بن محرر نام کے ایک راوی ہیں، اس پر آپ نے لکھا ہے: **هو بـرائـين العامري الجزري.**

ب) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سند میں راوی کا صرف نام ہوتا ہے، کسی قبیلے یا وطن کی طرف نسبت نہیں ہوتی،

تو اس کی تعیین کے لیے نسبت بھی ذکر کر دیتے ہیں، جیسا کہ اوپر عبداللہ بن محرر کی نسبت لکھا ہے، اسی طرح حدیث نمبر ۶۱ کی سند میں محمد بن مسلم کا نام آیا ہے، تو حاشیے میں لکھا ہے: **هو الطائفي.**

ج) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ راوی کا نام آتا ہے، لیکن ولدیت وغیرہ نہیں مذکور ہوتی، تو ولدیت اور دیگر نسبتیں ذکر کر کے راوی کی تعیین کرتے ہیں، مثلاً:

☆......: حدیث نمبر ۱۹۲ کی سند میں ثعلبۃ نام کے راوی ہیں، تو ان کے بارے میں حاشیہ میں لکھا ہے: **عندي هو ثعلبة بن يزيد الحماني من رجال التهذيب.**

☆......: حدیث نمبر ۲۳۲ کی روایت کے بعد عبدالرزاق نے کہا ہے: **وسمعت أنا إبراهيم وغيره،** اس پر حاشیہ میں لکھا ہے: **هو إبراهيم بن محمد بن أبي يحيى الأسلمي.**

☆......: حدیث نمبر ۱۵۲ کی سند میں **عن القاسم الشامي** ہے، تو اگر چہ ان کی نسبت مذکور ہے، مگر اس کے باوجود حاشیہ میں لکھا ہے: **القاسم الشامي هو القاسم بن عبدالرحمن مولى آل أبي سفيان بن حرب الأموي من رجال التهذيب.**

یہ صرف نمونہ کے طور پر چند مثالیں سپرد قلم کر دی گئی ہیں، ورنہ اس قسم کے افادات سے پوری کتاب بھری ہوئی ہے۔

د) کبھی سند میں راوی کی صرف نسبت مذکور ہوتی ہے، نام نہیں آتا ہے، تو حاشیہ میں اس کے نام کی تعیین کر دیتے ہیں۔ مثلاً:

☆......: روایت نمبر ۹۵ کی سند میں **عن ابن التيمي** ہے، اس پر یہ تعلیق لکھی ہے: **هو معتمر بن سليمان التيمي من رجال التهذيب.** اور روایت نمبر ۱۲۲ کی سند میں **عن الخارفي** ہے، اس پر لکھا ہے: **هو الحارث الأعور.**

ھ) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سند میں راوی کا نام آتا ہے، اور وہ محدثین اور اہل علم کے نزدیک اپنی کنیت سے مشہور ہوتا ہے، تو اس کی کنیت ذکر کر دیتے ہیں، مثلاً:

☆......: روایت نمبر ۲۴۵۴ کی سند میں **عمر بن راشد** نام کے ایک راوی ہیں، ان کے نام پر یہ حاشیہ تحریر فرمایا ہے: **هو أبو حفص اليماني من رجال التهذيب، ضعيف.**

و) اور اس کے برعکس تعلیقات بکثرت ہیں، کہ سند میں راوی کی کنیت مذکور ہوتی ہے، نام نہیں ہوتا ہے، تو ضرورت محسوس کرنے پر نام کی تعیین کرتے ہیں، مثلاً:

☆......: روایت نمبر ۶۸ کی سند میں **عن أبي مسكين** ہے، اس پر یہ تعلیق لکھی ہے: **هو حر بن مسكين، روى عنه الثوري، ذكره ابن حبان في الثقات، أخرج له النسائي، قلت: روى عنه أبو الأحوص عند ش.**

☆......: اورروایت نمبر۱۴۶۱ میں عن أبي عمرو الشيباني ہے،تواس پر یہ تعلیق ہے:هو سعد بن إياس الكوفي، يروي عن علي كما في التهذيب.

ز)انواع تعیین میں ایک یہ بھی ہے کہ اگر کوئی راوی مبہم ہوتا ہے،یعنی نام،کنیت اورنسبت وغیرہ کچھ بھی نہ ہو،توحتی الامکان اس کی بھی تعیین کرتے ہیں،مثلاً:

☆......: روایت نمبر۱۳۸۲ کی سندیوں ہے: عن الثوري عن رجل، اس میں رجل کےلفظ پر یہ تعلیق ہے: أظنه طلق بن معاوية جد حفص بن غياث، فإن الثوري يروي عنه كما في التهذيب، وإن طلقاً روى هذا الأثر كما في "ش" رواية حفيده عنه.

☆......: اورنمبر۵۰۹ کی سندمیں ہے:عمرو بن شعيب عن امرأة سماها، تواس پرتعلیق لکھ کرمبہم عورت کےابہام کویوں دورکیا ہے:هي زينب السهمية كما في رواية حجاج عن عمرو، ورواية عبدالحميد عن الأوزاعي عند "قط" ص ۲۵.

☆......: اورروایت نمبر۴۱۰۷ میں عن الثوري عن شيخ من الأنصار آیا ہے،توشيخ من الأنصار پرلکھا ہے: هو عمر الأنصاري كما في "ش" و"هق".

راویوں پرتعلیقات اوران کی تعیین کی یہ چندمثالیں ہیں، جوصرف شروع کی ایک دوجلدوں کی سرسری ورق گردانی کے نتیجے میں قلم بندہوگئی ہیں،ظاہر ہےاس مختصرتعارفی مضمون میں اس طرح کےفنی نکات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، کتاب پرنگاہ ڈالنے کے بعدہی اس کے محقق علام کی محنت شاقہ ، نیز ان کے غیرمعمولی فضل وکمال اور وسیع علم ومطالعہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۴-درمیانِ متن آنے والے نام کی تحقیق:

متن کے درمیان میں اگرکوئی نام آیا ہے،تواس کی تحقیق کی بھی کوشش کی گئی ہے،مثلاً:

☆......: روایت نمبر۱۱۹ میں ہے کہ عبداللہ بن محمد بن عقیل بن ابی طالب حضرت رُبیِّع بنت عفراء کے پاس تشریف لے گئے،توانھوں نے حضرت عبداللہ سے ان کی والدہ کا نام دریافت فرمایا،توانھوں نے ريطة بنت علي بن أبي طالب یاکوئی اورنام بتایا، پھراس کے بعدلمبی روایت ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے ريطة پر یہ تعلیق تحریرفرمائی ہے:

وفي كتاب نسب قريش لمصعب الزبيري "كانت زينب الصغرى بنت علي عند محمد بن عقيل بن أبي طالب فولدت له عبدَ الله الذي يُحدث

مصعب زبیری کی کتاب نسب قریش میں ہے کہ حضرت علیؓ کی لڑکی زینب صغری محمد بن عقیل بن ابی طالب کے نکاح میں تھیں، ان سے عبداللہ پیدا ہوئے جوکہ ان سے حدیث روایت کرتے ہیں، اور مصعب زبیری نے

عنه ص ٤٥، ولـم يذكر في بنات علي ريطة.	حضرت علی کی صاحبزادیوں میں ریطہ نام کی کسی لڑکی کا ذکر نہیں کیا ہے۔

یعنی مصعب زبیری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ کی والدہ کا نام ریطہ نہیں تھا، بلکہ زینب تھا۔

۵-الفاظ کی تشریح:

غریب اور نامانوس الفاظ کی تشریح وتفسیر کا بھی غیر معمولی اہتمام نظر آتا ہے، پوری کتاب میں جہاں کہیں بھی کوئی ایسا لفظ آیا ہے، جس کے بارے میں آپ کو اندازہ ہے کہ پڑھنے والے کے لیے یہ لفظ نامانوس ہے، اور قاری اس سے آشنا نہیں ہے، تو اس کو آپ نے تشریح کے بغیر نہیں چھوڑا ہے، اور اس طرح بے شمار الفاظ وکلمات کی تشریح اس کتاب کے حواشی میں آ گئی ہے۔

☆......: مثال کے طور پر کتاب کی پہلی ہی روایت میں **كظامة** کا لفظ آیا ہے، آپ نے حاشیہ میں اس کی تشریح یوں فرمائی ہے:

الكِظامة بالكسر الميضأة يعني المطهرة كما في سنن أبي داود (ج ١) وهي أيضاً بئر بجنب بئر بينهما مجرى تحت الأرض.	کظامہ وضو کے برتن کو کہتے ہیں جیسا کہ سنن ابوداود میں ہے، اور کظامہ اس کنویں کو بھی کہا جاتا ہے، جس کے قریب کوئی دوسرا کنواں ہوتا ہے، اور ان دونوں کے درمیان زمین کے نیچے راستہ ہوتا ہے۔

☆ اور مثلاً روایت نمبرے میں ایک لفظ الیافوخ آیا ہے، اس کی تشریح یوں کی ہے:

هو الموضع الذي يتحرَّك من وسط رأس الطفل.	یافوخ سر کے اس حصے کو کہتے ہیں جو بچے کے سر کے درمیان میں حرکت کرتا رہتا ہے۔

اور اسی روایت کا آخری لفظ "**قط**" ہے، کتاب سے استفادہ کرنے والے کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ استعمال تو "**فقط**" ہوتا ہے، لہذا "قط" کے بجائے "**فقط**" ہونا چاہئے، حضرت محدث الاعظمیؒ نے اس وہم کے ازالہ کے لیے حاشیہ میں نہ صرف اس کی وضاحت کر دی، بلکہ حدیث ہی کی ایک مستند ومتداول کتاب سے اس کی دلیل بھی پیش کر دی، چنانچہ اس پر یہ تعلیق تحریر فرمائی ہے:

هكذا في الأصل في كثير من المواضع بدون الفاء ولا بأس به وقد ورد هكذا في سنن أبي داود في صفة الوضوء ١:١٥.	یعنی مصنف کے اس قلمی نسخے میں بہت سے مقامات پر یہ لفظ اسی طرح بغیر ف کے (قط) آیا ہے، ور اس استعمال میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے، چنانچہ خود سنن ابوداود کے صفة الوضوء کے ابواب میں بھی یہ لفظ اسی طرح استعمال ہوا ہے۔

۶- لفظی تطورات کی تشریح:

آپ نے اپنی تعلیقات میں بسا اوقات یہ بھی کیا ہے کہ لفظ اگر معنوی تطورات سے گزرا ہے، تو اس کی بھی توضیح کی ہے، مثلاً روایت نمبر ۱۴۳۱۶۸ میں لفظ ظعینة ہے، اس پر لکھا ہے:

وأصل الظعينة: الراحلة يرحل أي يسار عليها، ثم قيل للمرأة في الهودج: ظعينة، ثم قيل للمرأة بلا هودج وللهودج بلا امرأة.	ظعینہ اصل میں تو اس سواری کو کہا جاتا تھا، جس پر سفر کیا جاتا تھا، پھر ہودج نشیں عورت کو ظعینہ کہا جانے لگا، اس کے بعد بغیر ہودج نشیں عورت کے لیے اور بغیر عورت کے ہودج کے لیے بھی یہ لفظ بولا جانے لگا۔

۷- احادیث وآثار کی تشریح:

بوقت ضرورت احادیث وآثار کی تشریح کا بھی اہتمام کیا ہے، مثلاً:

☆......: الف) روایت نمبر ۲ میں ہے: **عن ابن جريج قال: قلت لعطاء: (فاغسلوا وجوهكم وأيديكم إلى المرافق) فيما يُغسل؟**

اس کی تشریح آپ نے اپنی تعلیق میں یوں کی ہے: **يعني هل المرافق تُغسل؟** یعنی ابن جریج نے عطاء سے پوچھا کہ کیا وضو میں کہنیوں کو بھی دُھلا جائے گا؟

☆......: اور مثلاً روایت نمبر ۱۷۶۴ میں طاؤس کا یہ قول ہے: **إنا لنصُرُّه صراً.**

اس کی تشریح یوں کی ہے: **صرَّ: ربط، والمعنى إنا نحتاط كيلا يسبق شيء منه، وهذا يدل على أنه كان يصلي في حال المدافعة،** یعنی صرَّ کا معنی باندھنا ہے، اور اس قول کا مطلب یہ ہے کہ ہم نماز میں بہت محتاط رہتے تھے تاکہ حدث نہ لاحق ہو جائے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدافعت کی حالت میں بھی نماز پڑھا کرتے تھے۔

☆......: ب) روایت نمبر ۹ یہ ہے: **عن نافع أن ابن عمر كان يُحدث لرأسه ماءً.**

اس پر علامہ اعظمیؒ کی تعلیق یہ ہے: **في الأصل "لرأسي"، والصواب "لرأسه"، ففي "ش" من طريق يحيى بن سعيد عن نافع أن ابن عمر كان يأخذ لرأسه ماءً جديداً.**

یعنی قلمی نسخے میں "لرأسي" ہے، مگر صحیح "لرأسه" ہے، کیونکہ مصنف ابن ابی شیبہ میں یہی روایت بواسطہ یحیی بن سعید عن نافع یہ ہے کہ **أن ابن عمر كان يأخذ لرأسه ماءً جديداً.** یعنی حضرت ابن عمرؓ اپنے سر کے مسح کے لیے نیا پانی لیتے تھے۔

اس روایت میں جس طرح ایک لفظ کی تصحیح وتصویب ہے، اسی طرح دوسرے لفظ **يُحدث** کی تشریح بھی ہے کہ یہاں اس کا مطلب نیا پانی لینا ہے۔

☆......: ج) روایت نمبر ۱۴۵ میں حضرت حسن کا یہ قول ہے:

ما ينادي منادٍ من أهل الأرض بالصلاة حتى ينادي منادٍ من أهل السماء: قوموا يا بني آدم! فأطفئوا نيرانكم، قال: فيقوم المؤذن يؤذن ثم يقوم الناس إلى الصلاة.

یعنی زمین پر کسی موذن کے اذان دینے سے پہلے آسمان میں ایک فرشتہ یہ صدا لگاتا ہے کہ اے انسانو! اٹھ جاؤ، اپنی آگوں کو بجھادو۔ حضرت حسن کہتے ہیں کہ اس کے بعد مؤذن اذان دینے کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور لوگ نماز کے واسطے کھڑے ہوتے ہیں۔

حضرت حسن کی اس روایت پر علامہ اعظمیؒ کی یہ تعلیق ہے:

في المجمع عن ابن مسعود مرفوعاً: يُبعث منادٍ عند حضرة كل صلاة فيقول: يا بني آدم قوموا، فأطفئوا عنكم ما أوقدتم على أنفسكم، فيقومون، فيتطهَّرون، ويُصلُّون، فيُغفر لهم ما بينهما، الحديث. وبهذا يتضح معنى حديث الحسن. یعنی مجمع الزوائد میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع روایت مذکور ہے کہ ہر نماز کے وقت ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے، وہ پکار کر کہتا ہے کہ اے آدم کی اولاد! کھڑے ہو جاؤ، اور بجھا دو اس آگ کو جو تم نے اپنے واسطے جلا رکھی ہے، تب لوگ کھڑے ہوتے ہیں، وضو کرتے ہیں، اور نماز پڑھتے ہیں، پس دو نمازوں کے درمیان کے جو گناہ ہوتے ہیں، وہ بخش دیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد علامہ اعظمیؒ کہتے ہیں کہ اس سے حسن بصری کی حدیث کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

ان مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ علامہ اعظمیؒ نے نہ صرف الفاظ کی تشریح بلکہ احادیث وآثار کی توضیح کا بھی اہتمام برتا ہے؛ اسی کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ کبھی تو روایت کی تشریح وتوضیح اپنے الفاظ میں کرتے ہیں جیسا کہ (الف) کی مثالوں میں ہے، اور اکثر وبیشتر ایسا ہوتا ہے کہ روایت کی تشریح کسی دوسری روایت سے کرتے ہیں، خود راوی کا قول اگر ایسا مل جاتا ہے جس سے مصنَّف کی پیش نظر روایت کی تشریح ہو جاتی ہے، تو اس کو نقل کرتے ہیں، جو (ب) کی مثال سے واضح ہے؛ ورنہ کسی دوسری مرفوع یا موقوف روایت اس کی توضیح کے لیے لاتے ہیں، جیسا کہ (ج) میں ہے۔

۸- احادیث وآثار کی تخریج:

تخریج میں آپ کے پیش نظر حوالوں کی کثرت اور بہتات نہیں ہے، بلکہ تعلیقات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تخریج کے سلسلے میں آپ کا اصل مقصد اس کی روایتوں کو عبدالرزاق یا ان کے اوپر کے کسی راوی کے حوالے سے دریافت کرنا ہے، اور کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نشاط کی کمی یا کسی اور وجہ سے صرف سند ومتن کی تصحیح پر اکتفا کیا ہے، اور روایت کی تخریج اور اس کے حوالے پر توجہ ہی نہیں دی ہے؛ اور زیادہ تر یہ ہوا ہے کہ 'مصنَّف' کی روایت آپ کو عبدالرزاق یا ان کے اوپر کے کسی راوی کے واسطے سے مل گئی ہے، تو اسی پر اکتفا کیا ہے، مزید حوالوں

کی ضرورت نہیں محسوس کی ہے، چاہے وہ روایت صحاح ستہ ہی میں کیوں نہ ہو؛ چنانچہ بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ متاخرین کی کتابوں مثلاً 'شرح معانی الآثار للطحاوی'، 'سنن دارقطنی' یا بیہقی کی 'سنن کبری' سے حدیث کی تخریج کی ہے، جبکہ وہ روایت متقدمین کے مجموعوں میں بھی موجود ہوتی ہے، اور ایسا عام طور پر اس وجہ سے کیا ہے کہ آپ نے جس کتاب کا حوالہ دیا ہے، یا جس سے تخریج کی ہے، اس میں وہ روایت عبدالرزاق یا ان کے کسی راوی کے واسطے سے آئی ہے۔

علاوہ بریں 'مصنَّف ابن ابی شیبہ' کے حوالے کا آپ نے خاص اہتمام برتا ہے، اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتی کہ عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہ دونوں کی کتابوں کی نوعیت اور طرز تالیف ایک ہے، اور دونوں کے زمانوں میں زیادہ بُعد بھی نہیں ہے، چنانچہ عبدالرزاق کی بہت سی روایتیں ان کے کسی شیخ یا ان کے اوپر کے راوی کے واسطے سے ابن ابی شیبہ کے ہاں بھی ملتی ہیں، اس لیے آپ نے اس کتاب کی احادیث وآثار کی تخریج میں 'مصنَّف ابن ابی شیبہ' کے حوالے کا خاص اہتمام کیا ہے۔

عبدالرزاق کی روایت یا ان کی کتاب کے حوالے کے غیر معمولی اہتمام کی وجہ سے آپ کی تعلیقات میں ان کتابوں کی مراجعت کا خاص رجحان نظر آتا ہے، جو سندوں سے مُعرّیٰ ہیں، اور زمانۂ تدوینِ حدیث کے بعد معرضِ تصنیف وتالیف میں آئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کی بہت سی روایات میں صرف 'کنز العمال' کا حوالہ نظر آتا ہے، جب کہ وہ باسند کتابوں میں بھی موجود ہوتی ہیں، بلکہ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک حدیث صحاح ستہ یا صحیحین وغیرہ میں موجود ہوتی ہے، لیکن آپ اپنی تخریج وتعلیق میں دوسری کتابوں کے حوالوں کو ان پر مقدَّم رکھتے ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ حدیث ان کتابوں میں عبدالرزاق کے حوالے سے، یا ان کے واسطے سے، یا ان کے شیوخ میں سے کسی کے واسطے سے ہوتی ہے، اور صحاح ستہ یا صحیحین کے حوالے کو اس وجہ سے بعد میں ذکر کرتے ہیں کہ ان کی کتابوں کی سند عبدالرزاق کی سند سے اوپر جاکر ملتی ہے، ذیل میں تخریج کی چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں:

☆......: مصنَّف میں روایت نمبر ۱۷۱/ یوں ہے: **عبدالرزاق، عن ابن جريج، قال: أخبرني نافع: أنَّ عبد الله بن عمر كان يَكرَه أن يتوضَّأً في النحاس.**

علامہ اعظمیؒ نے اس روایت کی تخریج یوں کی ہے: **الكنز برمز "عب" و "ص" ٥ رقم: ٣٣٩٣، وأخرجه "ش" من طريق عبيد الله عن نافع.** یعنی یہ روایت 'کنز العمال' جلد ۵ میں اندراج نمبر ۳۳۹۳ کے تحت عبدالرزاق اور سعید بن منصور کے حوالے سے مذکور ہے۔ نیز اس کو ابن ابی شیبہ نے بواسطہ عبید اللہ عن نافع روایت کیا ہے۔

☆......: روایت نمبر ۲۴۷ یہ ہے: **عبدالرزاق، عن معمر، عن أيوب، عن عكرمة، أن عمر بن الخطاب ورد ماءً، فقيل له: إنَّ الكلابَ والسباعَ تَلِغُ فيه، قال: قد ذهبتُ بما ولغتُ في بطونها.**

علامہ اعظمیؒ نے اس کی تخریج یوں کی ہے: الكنز برمز "عب" ٥ رقم: ٢٨٦٠، وأشار إليه "هق" ١: ٢٥٩، ورواه "ش" عن هشيم، عن حصين، عن عكرمة ص ٩٥. یعنی یہ حدیث 'کنز العمال' جلد ۵، اندراج نمبر ۲۸۶۰ کے تحت بحوالہ عبدالرزاق مذکور ہے، اس روایت کی طرف بیہقی نے بھی جلد ا رصفحہ ۲۵۹ میں اشارہ کیا ہے، اور اس کو ابن ابی شیبہ نے ہشیم عن حصین عن عکرمہ کے طریق سے صفحہ ۹۵ پر روایت کیا ہے۔

☆...... روایت نمبر ۲۵۲ یہ ہے: عبدالرزاق، عن إبراهيم بن محمد، عن داود بن الحصين، عن أبيه، عن جابر بن عبد الله: أنَّ رسولَ الله ﷺ توضأ بما أفضلتِ السباع.

علامہ اعظمیؒ نے اس حدیث کی تخریج اس طرح کی ہے: الكنز برمز "عب" رقم ٥: ٢٨٦٦، وقد أخرجه "قط" ص ٢٣ و"هق" ١: ٢٤٩ من طريق عبدالرزاق والشافعي. یعنی یہ حدیث 'کنز العمال' جلد ۵ میں اندراج نمبر ۲۸۶۶ کے تحت مذکور ہے، اس حدیث کو دارقطنی نے ص ۲۳ پر اور بیہقی نے جلد ا صفحہ ۲۴۹ پر بواسطہ عبدالرزاق وشافعی روایت کیا ہے۔

☆...... روایت نمبر ۱۲۵۲ کی سند اور متن یہ ہے: عبدالرزاق، عن الثوري، عن منصور بن صفية، عن أمه، عن عائشة قالت: كان النبي ﷺ يضع رأسه في حجري وأنا حائض ثم يقرأ القرآن.

اس حدیث کی تخریج میں لکھا ہے: الكنز برمز "عب" ٥، رقم: ٢٨٢٢، وابن ماجه من طريق عبدالرزاق، وهو عند البخاري من حديث زهير عن منصور، وعند مسلم من طريق داود المكي عنه.

☆...... روایت نمبر ۱۲۷۷ کی سند یہ ہے: عبدالرزاق، عن معمر، عن عاصم الأحول، عن معاذة العدوية قال: سألت عائشة، الحديث.

علامہ اعظمیؒ نے اپنی تخریج میں لکھا ہے: الكنز برمز "عب" رقم: ٣٠٩٠، وأخرجه مسلم ١: ١٥٣، وأحمد ٥: ٢٣١، وأبو عوانة ١: ٣٢٤، وهق ١: ٣٠٨ كلهم من طريق عبدالرزاق.

☆...... روایت نمبر ۱۷۷۶، اذان کی ابتدا سے متعلق ہے، اور اس کی سند یہ ہے: أخبرنا عبدلرزاق قال: أخبرنا ابن جريج، قال: أخبرني نافع أنَّ ابن عمر كان يقول: كان المسلمون، الحديث.

علامہ اعظمیؒ نے اس کی تخریج میں لکھا ہے: أخرجه أحمد ٢: ١٤٨، و "خ" و "م" (بدء الأذان) و"قط" ص٨٨ كلهم من طريق عبدالرزاق، والكنز ٤ رقم: ٥٤٦٤ (عبدالرزاق).

☆...... روایت نمبر ۲۰۴۲، ۲۰۴۳ کو عبدالرزاق نے سفیان ثوری سے روایت کیا ہے، ان دونوں روایتوں کی نسبت علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے: نقلهما ابن التركماني في الجوهر النقي ج ١: ٤٤٣ عن مصنف عبدالرزاق وأخرجه الطحاوي من طريق العَقَدي عن الثوري ١: ١١٤.

☆...... روایت نمبر ۴۰۸۴ میں حضرت قیس بن ابی حازم کہتے ہیں: أخبرني قيس بن فهد الأنصاري أنَّ إمامهم اشتكى على عهد رسول الله ﷺ قال: فكان يؤمنا جالساً ونحن جلوس.

علامہ اعظمیؒ نے اس پر لکھا ہے: نقله الحافظ في الفتح وصحَّح إسناده ٢: ١٢٠. یعنی حافظ ابن حجر نے 'فتح الباری' جلد ۲ صفحہ ۱۲۰ میں اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

☆...... روایت نمبر ٦١٢٦ میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے وقت ان کا غسل کرنا، کفن کے کپڑے منگانا، ان میں حنوط لگانا، پھر ان کو پہنانا اور بعض دیگر باتیں مذکور ہیں، یہ روایت جلد ۳ صفحہ ۴۱۱ پر آئی ہے، اس کے متعلق علامہ اعظمیؒ نے اپنی تعلیق میں لکھا ہے: نقله الزيلعي من مصنف عبدالرزاق الحديث بتمامه ٢: ٢٥١، وقال: سنده ضعيف ومنقطع، قال: ورواه الطبراني من طريق عبدالرزاق. یعنی علامہ زیلعی نے 'نصب الرایۃ' ۲/۲۵۱ میں یہ پوری حدیث بحوالہ عبدالرزاق نقل کی ہے، اور کہا ہے کہ اس کی سند کمزور اور کٹی ہوئی ہے، اور کہا ہے کہ اس کو طبرانی نے عبدالرزاق کے واسطے سے روایت کیا ہے۔

☆...... روایت نمبر ۶۹۶۷ جلد ۴ صفحہ ٦١ پر شہد کی زکاۃ کے متعلق ہے، علامہ اعظمیؒ نے اس پر اپنی تعلیق میں لکھا ہے: نقله الحافظ في الإصابة من المصنَّف ٣: ٦٠٧. یعنی اس کو حافظ ابن حجر نے اصابہ ۳/۶۰۷ میں مصنَّف کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

☆...... اور جلد نمبر ۴ ہی میں صفحہ ۵۰۹ پر روایت نمبر ۸۶۶۹ کے متعلق لکھا ہے: نقله ابن حزم في المحلى عن المصنف ٧: ٣٩٤. یعنی اس کو ابن حزم نے محلی ۷/۳۹۴ میں مصنَّف عبدالرزاق کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

۹-آیات قرآنیہ کی تخریج:

احادیث وآثار میں جو قرآنی آیات آئی ہیں، ان کی بھی تخریج کی ہے، چنانچہ جہاں بھی متن میں قرآن کریم کی کوئی آیت آتی ہے، تو حاشیہ میں پہلے سورۃ کا نام پھر کولن (:) دے کر آیت نمبر لکھتے ہیں۔

۱۰-اسماء اماکن کی تشریح:

متن میں اگر کسی مقام یا جگہ کا نام آیا ہے، تو بہت پابندی کے ساتھ حواشی میں اس کی تحدید اور جغرافیائی پوزیشن ذکر کی ہے، مثلاً:

☆...... روایت نمبر ۲۱۰۱ میں ''ذات الجیش'' نام کا ایک مقام مذکور ہے، اس پر لکھا ہے: واد على ستة أميال من ذي الحليفة، وأبعد فؤاد عبدالباقي فقال: على بريد من المدينة. یعنی ذات الجیش مقام ذو الحلیفہ سے ۶/میل کے فاصلے پر ہے، اور فواد عبدالباقی بہت دور چلے گئے اور کہا کہ مدینہ سے ایک برید پر ہے۔

☆...... پھر روایت نمبر ۲۱۰۳ میں ''مر'' کا لفظ آیا ہے، تو اس کے متعلق لکھا ہے: في ص "من"، والصواب

عـنـدي "مر" وبطن مر، ويقال له مر الظهران، موضع على مرحلة من مكة قاله المجد، وقال: الـظهـران واد قـرب مـكة يـضاف إليه مر. یعنی قلمی نسخے میں "من" ہے، لیکن میرے نزدیک صحیح "مر" ہے یطن مر- جس کو مرالظہران بھی کہا جاتا ہے- مکہ سے ایک منزل کے فاصلے پر ہے، اس کو مجدالدین نے لکھا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ ظہران مکہ کے نزدیک ایک وادی ہے، جس کی طرف "مر" کی نسبت کر کے "مرالظہران" بھی کہا جاتا ہے۔

☆......: روایت نمبر ۲۱۵۸ میں یہ ہے کہ **فـلـمـا كـان رسـول الله ﷺ بقاع نمرة من الجحفة**، نمرہ کے لفظ پر یہ حاشیہ تحریر فرمایا ہے: **نـمـرة كعطرة موضع بقديد، والذي بعرفات موضع آخر، أو هو جبل.** یعنی نمرہ بروزن عطرہ قدید میں ایک مقام کا نام ہے، اور عرفات میں جو نمرہ ہے وہ ایک دوسری جگہ یا پہاڑ ہے۔

پھر اسی روایت میں یہ عبارت ہے: **حتى كان بذي طوى**، تو اس پر یہ تحریر فرمایا ہے: **موضع غربي مـكة عـلى مقربة منها ويقال له اليوم أبار الزاهر.** یعنی "ذی طوی" مکہ کے قریب مغرب میں ایک جگہ کا نام ہے، آج کل اس کو "ابارالزاہر" کہا جاتا ہے۔

آپ نے اپنی تعلیقات میں صرف گاؤں یا بستیوں کی تحدید نہیں کی ہے، بلکہ بڑے بڑے شہروں اور صوبوں کی بھی تعیین و تحدید کی ہے، مثلاً:

☆......: روایت نمبر ۴۳۵۸ میں "سجستان" آیا ہے، تو اس پر لکھا ہے: **بـلاد واسعة بين إيران وأفغانستان.** ایران وافغانستان کے درمیان ایک بڑے علاقے کا نام ہے۔

☆......: اسی طرح روایت نمبر ۴۳۳۹ میں "أذربیجان" واقع ہوا ہے، تو اس پر لکھا ہے: **ويـقـال آذربيجـان، إقـليم في بلاد إيران على الحدود الشمالية الغربية.** یعنی أذربیجان کو آذربیجان بھی کہا جاتا ہے، ایران کی شمالی مغربی حدود پر ایک خطے کا نام ہے۔

۱۱- دفع تعارض:

اگر "مصنّف" کی کسی روایت کا دوسری کسی روایت کے ساتھ تعارض ہوا ہے، تو اس تعارض کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً:

☆......: روایت نمبر ۴۷۹۰ میں مجاہد حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو بیسیوں بار دیکھا ہے کہ آپ فجر کی سنت میں **قل يآ أيها الكفرون** اور **قل هو الله أحد** پڑھتے ہیں۔

علامہ اعظمیؒ نے اس حدیث پر یہ تعلیق تحریر فرمائی ہے: **أخـرجه ابن نصر بإسناده عن نافع عن ابن عـمـر، وقـال: هـذا غيـر محفوظ عندي، لأن المعروف عن ابن عمر أنه قال: تلك ساعة لم أكـن أدخـل عـلـى الـنبـي ﷺ فيها. قلت: لكنه لم ينفرد به نافع، بل تابعه مجاهد، ولعل ابن**

عمر يروي هنا ما رآه في الأسفار فلا ينافي المعروف عنه.

یعنی حضرت ابن عمرؓ کے اس قول کو نافع نے بھی نقل کیا ہے، جس کو ابن نصر نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے، ابن نصر نے اس کو روایت کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ قول میرے نزدیک غیر محفوظ ہے، کیونکہ ابن عمرؓ کی مشہور روایت یہ ہے کہ انھوں نے کہا ہے فجر کے وقت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں میری حاضری نہیں ہوتی تھی۔ علامہ اعظمیؒ نے فرمایا کہ اس قول کو روایت کرنے میں نافع تنہا نہیں ہیں، بلکہ مجاہد بھی اس کو روایت کرتے ہیں، لہذا اس کو غیر محفوظ نہیں کہا جا سکتا، ممکن ہے کہ ابن عمرؓ نے ان دونوں سورتوں کے پڑھنے کو جو بیان کیا ہے، وہ سفر کا واقعہ ہو، لہذا ان کی مشہور روایت کے منافی نہیں ہوگا۔

ناظرین غور فرمائیں کہ محمد بن نصر مروزی جیسے محدث وفقیہ نے جن دو روایتوں کو متعارض اور ایک دوسرے کے منافی خیال کیا تھا، علامہ اعظمیؒ نے اپنی فراست وبصیرت سے کس خوبصورتی کے ساتھ ان دونوں میں تطبیق کی صورت پیدا کر دی۔

۱۲- اختلاف ائمہ اور فقہی مذاہب کا بیان:

''مصنَّف عبدالرزاق'' میں ''سنن سعید بن منصور'' کی طرح بہ کثرت تو نہیں، لیکن بہت سے مسائل میں ائمہ کے اختلاف کو بھی بیان کرتے ہیں۔ جس کا صحیح اندازہ آپ کی تعلیقات پر غور کرنے کے بعد لگایا جا سکتا ہے، اس کی کچھ مثالیں رسالہ ''المآثر'' جلد ۷ اشارہ ۳-۴ میں بھی ذکر کی جا چکی ہیں۔ اور بسا اوقات اپنی تعلیقات میں امام ابوحنیفہ یا حنفیہ کے مسلک کو بھی بیان کرتے ہیں، مثلاً:

☆...... روایت نمبر ۲۵۳۸ کے الفاظ یوں ہیں: **عن حماد قال: إذا نسي الرجل تكبيرة مفتاح الصلاة أعاد الصلاة، وبه يأخذ الثوري.** یعنی حماد کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص تکبیر تحریمہ چھوڑ دے تو نماز کا اعادہ کرے، اور اسی کو ثوری نے لیا ہے۔

اس پر علامہ اعظمیؒ کی تعلیق ہے: **وإليه يذهب أبو حنيفة.** یعنی یہی امام ابوحنیفہ کا بھی مذہب ہے۔

☆...... روایت نمبر ۲۷۵۶ میں حضرت علیؓ کا یہ قول مروی ہے کہ اگر کوئی شخص ظہر، عصر اور عشا کی پہلی دونوں رکعتوں میں قرأت کرنا بھول جائے تو آخری دونوں رکعتوں میں قرأت کر لے، اور یہ قرأت اس کے لیے کافی ہوگی۔

اس پر تعلیق تحریر فرمائی ہے: **بهذا يقول الحنفية، ويسجد السهو للأثر الذي في أول الباب.** یعنی اسی بات کے (بھول جانے کی صورت میں آخری دونوں رکعتوں میں قرأت کے) قائل حنفیہ بھی ہیں، لیکن حنفیہ کے نزدیک مصلی کو سجدۂ سہو بھی کرنا ہوگا، بوجہ اس حدیث کے جو باب کے شروع میں مروی ہے۔

بہر حال اس کتاب پر علامہ اعظمیؒ کی تعلیقات اور ان کے فنی وتحقیقی نکات، ان کے علم ومعرفت، فضل

وکمال، وسعتِ مطالعہ، ذہانت وفطانت، فہم وذکاوت اور جامعیت واستحضار کا عجیب وغریب اور حیرت انگیز نمونہ پیش کرتے ہیں، اور اس کے مطالعہ کے بعد آدمی ورطۂ حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ مختصر اور بقدر ضرورت تعلیقات وحواشی سے کس طرح دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے، اور عقل حیران رہ جاتی ہے کہ گیارہ ضخیم جلدوں کی کتاب کو -جو اکیس ہزار تینتیس (۲۱۰۳۳) روایتوں پر مشتمل ہے- کس طرح ایک شخص نے تن تنہا ایک ایک لفظ کی تحقیق وتصحیح کر کے اشاعت کے قابل بنایا ہے۔

'مصنّف عبدالرزاق' یوں تو علم حدیث کا ایک بہت بڑا اور قابلِ فخر سرمایہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب پہلی اور دوسری صدی ہجری کے عربی زبان وادب، عام بول چال، روزمرہ کے عام مسائل، اسلامی کلچر اور ثقافت کی حقیقی اور زندہ تصویر پیش کرتی ہے، ادبی اور لسانی ذوق رکھنے والے کو اس کتاب میں اپنی دلچسپی کا کافی مواد مل سکتا ہے، جس کے مطالعہ سے بآسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے کا ادب کیا تھا، گفتگو میں کس طرح کی زبان استعمال کی جاتی تھی، اور عام لوگوں کی زندگی دین ومذہب سے کس طرح مربوط ہوا کرتی تھی، علما وفقہا کو کس طرح مرجعیت حاصل تھی۔

علامہ اعظمیؒ کے تعلیقات وحواشی سے آراستہ ہو کر علم حدیث اور اسلامی ثقافت کا یہ عظیم الشان سرمایہ گیارہ ضخیم جلدوں میں ۱۳۹۲ھ=۱۹۷۲ء میں بیروت سے طبع ہو کر مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوا۔

'مصنّف عبدالرزاق' کی تعلیقات میں 'مصنّف ابن ابی شیبہ' کی تلخیص اور اس پر مولانا محمد منظور نعمانی اور بعض دوسرے اہل علم کے تاثرات:

'مصنّف عبدالرزاق' پر علامہ اعظمیؒ کے حواشی اور تعلیقات میں سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس میں اسی جیسی ایک دوسری کتاب 'مصنّف ابن ابی شیبہ' کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے، جس سے اس کتاب کی افادیت میں چار چاند لگ گئے ہیں، اور اس کا اندازہ ہر صاحب بصیرت اس کے حواشی دیکھ کر کر سکتا ہے، لیکن یہاں ہم دو اہل علم کے اعترافات ذکر کر دینا مناسب سمجھتے ہیں، پہلا مشہور عالم اور بزرگ مصنف حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ کا ہے، وہ 'الفرقان' میں 'مسند حمیدی' پر تبصرے کے ضمن میں رقم طراز ہیں:

> ''ناظرین کو یہیں یہ خوش خبری سنانے کو بھی جی چاہتا ہے کہ حضرت مولانا اعظمی مدظلہ 'مسند حمیدی' کے کام سے فارغ ہونے کے بعد اب 'مصنّف عبدالرزاق' کی تصحیح اور اس پر تعلیق وتحشیہ کا کام بھی اسی انداز میں کر رہے ہیں، بلکہ قریباً ایک چوتھائی کام کر بھی چکے ہیں۔ 'مصنّف عبدالرزاق' کے بارے میں سنا تو پہلے بھی تھا کہ وہ احادیث وآثار کی قدیم تالیفات میں بے نظیر خزانہ ہے، لیکن جو حصہ مولانا تیار فرما چکے ہیں گزشتہ ہی ہفتہ میں ان کی خدمت میں حاضری کے موقعہ پر اس کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ہمارے

کتب خانوں میں اس کا نہ ہونا بہت ہی بڑا خلا ہے، بہت کچھ سننے کے باوجود اس کی عظمت وافادیت کا یہ اندازہ بالکل نہیں تھا، پھر حضرت ممدوح اس کا تحشیہ اس طرح کررہے ہیں کہ 'مصنّف ابن ابی شیبہ' کا کافی موادبھی اس کے حواشی اور تعلیقات میں آجائے گا۔ 'مصنّف عبدالرزاق' بجائے خود بہت ضخیم کتاب بلکہ کہنا چاہئے کہ احادیث وآثار کا نہایت وسیع دفتر ہے، چار ضخیم جلدیں ہیں، اوراس کا صرف ایک عکسی نسخہ ہے جس سے مولانا سارا کام کررہے ہیں، پھراسی کے ساتھ مولانا کی یہ کوشش ہے کہ اس کی تعلیقات میں 'مصنّف ابن ابی شیبہ' کو بھی کسی طرح سمیٹ لیں۔ یہ اتنا وسیع اور عظیم کام ہے جس کے لیے معاونین کا ایک عملہ درکار ہے، لیکن جہاں تک میں نے محسوس کیا مولانا خود ہی سارا کام کررہے ہیں، میں نے اصرار سے عرض کیا کہ کم ازکم دورفیق اس کام کے سلسلہ میں اورساتھ لے لیجئے، فرمایا کیا کیا جائے، جو کام آسکتے ہیں وہ مشغول ہیں اورمل نہیں سکتے، اور جومل سکتے ہیں اُن سے کچھ کام نہیں چلتا،،[1]۔

مولانا فضل اللہ مرحوم کے تاثرات:

امام بخاریؒ کی بلند پایہ کتاب 'الأدب المفرد' کی شرح 'فضل اللہ الصمد' کے مصنف مولانا فضل اللہ علیہ الرحمہ ایک صاحب فضل وکمال عالم اورمشہور بزرگ حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کے پوتے تھے، ان کی صاحبزادی ڈاکٹر حنیفہ رضی نے علی گڈھ کے شعبۂ دینیات سے مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے زیرنگرانی ریسرچ کی ہے، ان کے مقالے کا عنوان ہے: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اوران کی فقہ''، اور یہ مقالہ مطبوعہ شکل میں ۱۳۸۷ھ = ۱۹۶۷ء میں ندوۃ المصنفین - دہلی - سے شائع ہوچکا ہے، ڈاکٹر حنیفہ رضی نے اس میں لکھا ہے:

''میرے والد صاحب نے فرمایا کہ ان علم دوست حضرات - یعنی ارباب مجلس علمی - کی بے دریغ دریادلی سے میرے علم میں ہندوستان میں تین بڑے بیش بہا علمی کام ہورہے ہیں، جن میں سب سے بلندتر کام وہ ہے جو حضرت مولانا ابوالمآثر محمد حبیب الرحمٰن الاعظمی انجام دے رہے ہیں، یہ ہے مصنف عبدالرزاق کی تصحیح کا کام۔ مصنف عبدالرزاق کی تصحیح وطباعت کا کام متعدد پہلوؤں سے بہت بلند ہے:

۱-: ایک تو ایسے بڑے محدث کی کتاب کا کام ہے، جو صحاح ستہ کے مصنفین کے شیوخ اوراساتذہ میں سے ہیں۔

۲-: مذہب حنفی کے مآخذ سے جو حضرات ناواقف ہیں اورجن کو اس مذہب کے متعلق غلط فہمی ہے کہ مذہب حنفی صرف قیاسات کے مجموعہ کا نام ہے، اس میں سنت سے بڑی بے نیازی برتی گئی ہے، مصنّف کی تصحیح اوراشاعت کا کام جس طریقہ سے ہورہا ہے، اس سے اس ناواقفیت کا پردہ چاک ہو

(۱) الفرقان: رمضان، شوال، ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ = مارچ اپریل ۱۹۶۳ء، جلد ۳۰، شمارہ ۹، ۱۰، ۱۱، ص: ۱۱۴-۱۱۳

جائے گا۔

۳-: جس طریقہ سے اس مصنّف کو حنفیہ ایک مستند کتاب جانتے ہیں، دوسرے مختلف فقہی مکاتبِ خیال کے حضرات بھی اس کو مستند ہی سمجھتے ہیں، اس طریقہ سے طرفین کی علمی متفقہ معیاری کتاب کی اشاعت باہمی غلط فہمیوں کو دور کر کے اتحاد کی راہ کھولے گی۔ اس کام کے عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے یہ کام بین الاقوامی وعالمگیر حیثیت کا بھی حامل ہے، یہ بات بھی اس کام کی وقعت کو بلند قرار دیتی ہے۔

۴-: یہ کام مولانا ابوالمآثر محمد حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی انجام دے رہے ہیں، اس کام کا آپ کے ہاتھ میں ہونا اس کے معیاری ہونے کا ضامن ہے"[1]۔

جامع عبدالرزاق یا جامع معمر؟

اس کتاب کی اشاعت کے بعد یہ قضیہ اٹھایا گیا کہ اس کے آخر میں جلد نمبر۱۰ کے تین چوتھائی کے بعد سے یعنی صفحہ ۳۷۹ روایت ۱۹۴۱۹ سے ختم کتاب تک کا حصہ جو کتاب الجامع کے نام سے ہے، عبدالرزاق کی مصنف کا حصہ نہیں ہے، بلکہ ان کے استاذ معمر بن راشد کی تصنیف ہے، لیکن کتاب کے محقق کو اس پر تنبہ نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کا دعویٰ:

یہ قضیہ دنیائے اسلام کے ایک بڑے محقق، مخطوطات کے غواص اور شناور، ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم کی طرف سے بہت شد و مد سے اٹھایا گیا، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اس کا انکشاف 'مصنّف' کے شائع ہونے کے تقریباً دس سال کے بعد ۱۹۸۳ء میں اعظم گڈھ سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'الرشاد' کے لکھے ہوئے ایک مراسلے میں کیا، یہ مراسلہ ۱۵/ جمادی الاولی ۱۴۰۳ھ کا تحریر کردہ ہے، اور مذکورہ بالا ماہنامے کے اپریل کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مرحوم کے مراسلے کا متن یہ ہے:

> "مصنف عبدالرزاق کی آخری دو جلدوں میں جامع معمر بن راشد چھپی ہے، اس کے آڈیٹر مولانا اعظمی -مولانا حبیب الرحمٰن صاحب- کو انتباہ نہ ہوا کہ یہ الگ کتاب ہے، مصنف عبدالرزاق نہیں، بلکہ عبدالرزاق کے استاذ معمر بن راشد کی کتاب الجامع ہے"۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مذکورہ بالا شمارے میں اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل پیش نہیں کی ہے، ان کا یہ انکشاف یا دعوی علمی دنیا کو حیرت میں ڈال دینے والا تھا، ساتھ ہی علامہ اعظمیؒ کی اس عظیم الشان علمی خدمت، ان کی دس سالہ عرق ریزی اور جانفشانی پر علامت سوال بننے کے لیے کافی تھا، اور اس قسم کے دعوے سے جس کی کوئی

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ: ۲۱۴-۲۱۵

ٹھوس دلیل نہ پیش کی گئی ہو، ایک ایسے عالم ومحقق پر جس نے دس سال تک کتاب کی تصحیح وتحقیق میں خونِ جگر جلایا ہو، جس قدر اثر ہوسکتا ہے اس کو دوسرا شخص تصور ہی نہیں کرسکتا۔

علامہ اعظمیؒ کا جواب:

'الرشاد' میں ڈاکٹر صاحب کے اس انکشاف کو دیکھنے بعد علامہ اعظمیؒ نے ایک مختصر سا مضمون سپرد قلم کر کے 'الرشاد' میں اشاعت کے لیے روانہ کردیا، جو مئی ۱۹۸۳ء کے شمارے میں شائع ہوا، علامہ اعظمیؒ نے اپنے مضمون میں اس حصے کے عبدالرزاق کی تصنیف اور مصنّف کا حصہ ہونے کے متعدد دلائل پیش کیے تھے، جو درج ذیل ہیں:

۱- 'کتاب الاوائل' میں شیخ محمد سعید بن سنبل مکی نے مصنف عبدالرزاق کی آخری حدیث **كان شعرُ رسولِ الله ﷺ إلى أنصافِ أُذُنيه** نقل کرکے لکھا ہے: **وهو آخر مصنَّفه**. یعنی یہ حدیث مصنَّف عبدالرزاق کی آخری حدیث ہے۔ اور مصنَّف عبدالرزاق کے مطبوعہ نسخے بشمول کتاب الجامع میں آخری حدیث یہی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنَّف کے ساتھ شائع ہونے والی کتاب **الجامع** عبدالرزاق ہی کی جامع ہے، معمر کی نہیں۔

۲- شاہ عبدالعزیز صاحب علیہ الرحمہ 'بستان المحدثین' میں تحریر فرماتے ہیں کہ دلچسپ بات یہ ہے کہ امام عبدالرزاق نے اپنی مصنف شمائل رسول پر ختم کی، اور شمائل کو آنحضرت ﷺ کے موئے مبارک پر ختم کیا۔

۳- علامہ اعظمیؒ نے جلد ۱۰ میں سات اور جلد ۱۱ میں اٹھائیس ایسی حدیثوں کی نشان دہی کی، جن کو عبدالرزاق نے معمر کے علاوہ اپنے دوسرے شیوخِ حدیث سے روایت کیا ہے، اور ان کا معمر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۴- حاجی خلیفہ نے 'کشف الظنون' میں عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا ذکر کیا ہے، اور فواد سید و شیخ البانی نے لکھا ہے کہ الجامع لعبدالرزاق کا ایک نسخہ مکتبہ ظاہریہ دمشق میں محفوظ ہے، اور اس پر ۵۵۸ھ کا ایک سماع بھی درج ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا جواب الجواب:

علامہ اعظمیؒ کے پیش کردہ مذکورہ بالا دلائل ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو مطمئن نہیں کرسکے، اور وہ اپنے اس دعوے پر جمے رہے کہ مصنّف کا یہ آخری حصہ جامع معمر ہی ہے، ڈاکٹر صاحب نے اپنے موقف کی تائید اور علامہ اعظمیؒ کے پیش کردہ دلائل کی تردید میں قدرے مفصل مضمون لکھا، جو 'الرشاد' کے جون وجولائی ۱۹۸۳ء کے شمارے کی زینت بنا، اس میں مصنّف کی بابت ڈاکٹر صاحب نے جو ردوقدح کی ہے، وہ حسب ذیل ہے:

۱- جامع معمر بن راشد کے ترکی میں دو مخطوطے ملے ہیں، جن پر نام بھی صرف جامع معمر ہے اور جن میں

مندرجات بھی ایک چھوٹی کتاب کے ہیں، جلد میں اور کوئی چیز نہیں، ان میں ایک جو بہت قدیم ۱۴۶ھ کی تحریر ہے، انقرہ میں ہے، دوسرا مماثل نسخہ استانبول میں ہے۔ میں نے جامع معمر کے ان دونوں مخطوطوں کے مندرجات کا 'مصنف عبدالرزاق' کے باب کتاب الجامع سے مقابلہ کیا، تو پتہ چلا کہ وہ ہو بہو ایک ہی چیز ہے، فرق ہے تو وہی جو ایک ہی کتاب کے دو مخطوطوں میں ہوتا ہے۔

۲-'مصنَّف عبدالرزاق' کے جو متداول نسخے دنیا کے مختلف ملکوں میں ملتے ہیں، ان میں 'کتاب الجامع' کتاب کے آخر میں موجود ہے۔ اگر ایسا ہی ایک نسخہ شیخ سعید سنبل یا حضرت عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہما اللہ کی نظر سے گزرا ہو، اور انھوں نے کچھ لکھا ہو اور کچھ خیال آرائی کی ہو، تو قصور ان کا نہیں۔ بے خیالی میں ہر کسی سے ایسا ہی ہوسکتا ہے، اگر کسی نے انھیں توجہ دلائی ہوتی اور اس کے بعد بھی وہ اپنی رائے پر قائم رہتے، تو وہ اہم چیز ہوتی، موجودہ صورت حال سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔

۳- اگر جامع معمر میں جو مصنف عبدالرزاق کا ضمیمہ بن گئی ہے، چند ایسی حدیثیں ہیں، جو عبدالرزاق نے معمر سے نہیں بلکہ کسی اور شیخ سے روایت کی ہوں، تو اس سے بھی کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ مصنف کا وہ حصہ جو بلا اختلاف مصنف عبدالرزاق ہے (۹۹٪)، ان میں کثرت سے حدیثیں ''عبدالرزاق عن معمر'' ملتی ہیں، اس سے وہ جامع معمر کا جز نہیں بن جاتیں۔

۴- دمشق کے مخطوطے کو مصر کے فواد سید نے عبدالرزاق کا قرار دیا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انقرہ اور استانبول کے مخطوطوں سے واقف نہ تھے، ترکی کے فواد مسٹر گبن [1] جامع معمر کو اشاعت کے لیے تیار کرنے کے بعد دمشق گئے اور وہاں کے مخطوطے کو دیکھا، پھر رباط جا کر وہاں کے مخطوطے کو بھی دیکھا، وہ اپنی جرمن کتاب 'تاریخ تالیفات عربی' میں لکھتے ہیں کہ جامع معمر کے راوی عبدالرزاق ہیں، اور انھوں نے اسے اپنی مصنف کا ذیل بنایا، اور اس میں کچھ حدیثوں کا اضافہ بھی کیا ہے، اور یہ کہ 'اصابہ' ابن حجر ۴ ص ۳۱۱، ص ۶۰۲ میں بھی جامع معمر کے اقتباسات ہیں۔

۵- میری دانست میں پرکھنے کا بہترین معیار ہے یہ ہو کہ داخلی شہادت پر جائیں، معمر بہت قدیم مؤلف ہیں، ان کے استاد ہمام بن منبہ کے وقت حدیث کے مجموعوں میں کوئی تبویب مطلق نہیں ہوئی تھی، معمر گویا تبویب کا آغاز کرتے ہیں، لیکن جو زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہے، ان کے شاگرد عبدالرزاق تبویب کو مزید ترقی دیتے ہیں اور فقہی ابواب پر کتاب الطہارۃ، کتاب الحیض، کتاب الصلوۃ، کتاب الجمعہ، عیدین، جنائز، زکوۃ، صیام، عقیقہ وغیرہ حدیثیں مرتب کرتے ہیں اور ان کتابوں کے تحت وہ ذیلی ابواب دیتے جاتے ہیں، یہ چیزیں صرف 'مصنَّف' میں ملتی ہیں، کتاب الجامع میں نہیں ملتیں، اس کا نہج بالکل الگ ہے اور تبویب نسبتاً ابتدائی حالت میں ہے، 'مصنَّف' میں کتاب الاشربہ اور کتاب البیوع کی حدیثیں دوبارہ الگ مقام پر (یعنی جامع معمر میں) نہ ہوتیں، اگر دونوں

(۱) الرشاد میں یہی طبع ہوا ہے، لیکن صحیح ''فواد سیزگین'' ہونا چاہئے۔

ایک ہی کتاب کے اجزاء ہوتے تو دو جگہ ذکر کی ضرورت نہیں تھی، یہی حال 'مصنّف' میں حضرت عمرؓ کی وصیت کا ہے، جو مصنف میں بھی ہے اور جامع معمر میں بھی، اور یہ...... دیگر تفصیلوں پر مشتمل ہے، ایسی اور چیزیں بھی ملتی ہیں جو اندرونی شہادت ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون کو اگر غور سے دیکھا جائے تو مذکورہ بالا پانچ دفعات میں سے صرف پہلی شق کو ان کے دعوے کی دلیل کہا جا سکتا ہے، چوتھی شق کے بالکل آخری جملے کو بھی ان کی دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، پانچویں شق کو انھوں نے شہادت کے طور پر پیش کیا ہے، باقی دوسری، تیسری اور چوتھی شقیں 'الرشاد' میں علامہ اعظمیؒ کے شائع شدہ مضمون میں ان کے پیش کردہ دلائل کا جواب ہیں۔

علامہ اعظمیؒ کا آخری اور فیصلہ کن جواب:

'الرشاد' میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے شائع ہونے والے اس مضمون کے بعد جب علامہ اعظمیؒ کو یہ اندازہ ہو گیا کہ ڈاکٹر صاحب کو اپنے موقف پر شدید اصرار ہے؛ تو آپ نے ایک بہت مفصل مضمون عربی زبان میں حوالۂ قلم کیا، جو 'البعث الإسلامي' کے رجب ۱۴۰۵ھ = مارچ و اپریل ۱۹۸۵ء کے شمارے میں اشاعت پذیر ہوا۔ علامہ اعظمیؒ نے اپنے مضمون میں 'مصنّف' والی کتاب الجامع کے **الجامع لعبدالرزاق** ہونے کے پہلے دلائل کے علاوہ مزید اور مضبوط دلائل پیش کیے، اور پوری قوت کے ساتھ ثابت کیا کہ زیر بحث حصہ معمر کی تصنیف نہیں، بلکہ عبدالرزاق ہی کی تصنیف کا ایک حصہ ہے۔ البعث میں شائع ہونے والے اس مضمون کے بعد ڈاکٹر صاحب کی طرف سے کوئی اور تحریر نہیں دیکھنے کو ملی، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے علامہ اعظمیؒ کے موقف کو تسلیم کر لیا، اور اپنے موقف پر اب ان کو اصرار نہیں رہا، لیکن کاش ڈاکٹر صاحب نے کسی تحریر کے ذریعے اپنے موقف سے رجوع کا اقرار کر لیا ہوتا، یا ان کو اگر اب بھی اتفاق نہیں تھا، تو اس اختلاف کو مزید دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہوتا، تا کہ بعد کے بعض مضمون نگاروں اور نام نہاد محققین کو اس سلسلے میں بدگمانی پھیلانے کا موقع نہ ملتا۔

ذیل کی سطروں میں 'البعث الإسلامي' میں پیش کردہ علامہ اعظمیؒ کے دلائل کا جائزہ لیا جاتا ہے، اس کے بعد اس حصے کے جامع عبدالرزاق ہونے کے کچھ مزید دلائل پیش کیے جائیں گے، جو 'البعث الإسلامي' میں شائع شدہ دلائل کے علاوہ ہوں گے۔

۱- علامہ اعظمیؒ نے **البعث الإسلامي** والے مضمون کے آغاز میں ''جامع'' کی ابتدا اور ارتقا پر مختصر گفتگو کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں کتاب الجامع کے عنوان سے تصنیف و تالیف کا اہتمام ہوا، بعض اہل علم نے کتاب الجامع کے نام سے مستقل کتاب تصنیف کی، جیسے جامع سفیان ثوری و جامع معمر، اور بعض دیگر حضرات نے کوئی دوسری کتاب تصنیف کی، اور کتاب الجامع کو اس کا ضمیمہ اور ایک مستقل فصل کی حیثیت سے اس کے ساتھ شامل کیا، اور اس کی مثال میں مصنف عبدالرزاق کے علاوہ موطا امام مالک و محمد کو پیش کیا۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنی بحث کے اس جز میں ضمناً یا اشارۃً ڈاکٹر احمید اللہ صاحب کی بیان کردہ پانچویں وجہ کا جواب دیا ہے، جس میں انھوں نے یہ استشہاد کیا ہے کہ ''جامع'' چونکہ ابتدائی دور کی چیز تھی، اور ابھی تبویب کی ابتدا ہوئی تھی، اور عبدالرزاق کے ذریعے تبویب کو ترقی دینے کے بعد اس کا نہج الگ کر دیا گیا۔ عبدالرزاق سے کچھ ہی پہلے کا زمانہ امام مالک اور امام محمد کا رہا ہے، اور ان کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ان حضرات نے جامع لکھ کر اپنی اپنی موطا کا جز یا فصل بنایا ہے، اور یہی طریقہ عبدالرزاق نے 'مصنَّف' میں بھی اختیار کیا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کی اس توجیہ میں کوئی وزن نہیں ہے۔

۲- مصنَّف عبدالرزاق کے قلمی نسخوں میں مصنَّف کے ساتھ کتاب الجامع بھی پائی جاتی ہے۔ لہذا یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ پوری کتـاب الـمـصنَّف تو عبدالرزاق کی تصنیف ہے، اور اسی کے ساتھ شامل ایک حصہ جو **کتاب الجامع** کے نام سے ہے، وہ عبدالرزاق کا تصنیف کردہ نہیں ہے، بلکہ ان کے استاد معمر کا ہے۔

۳- کتاب الجامع میں متعدد جگہ یہ تصریح ملتی ہے کہ اس کو اسحاق دبری نے عبدالرزاق سے روایت کیا ہے، جس طرح مصنَّف کے باقی یا بیشتر حصوں کا ان کی روایت سے مروی ہونا ثابت ہے۔

۴- شیخ محمد سعید سنبلؒ نے رسالۃ 'الاوائل' میں جامع کو مصنَّف کا جز قرار دیا ہے۔

۵- شیخ المشایخ حضرت شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ نے بھی 'بستان المحدثین' میں اس کو مصنَّف کا جز مانا ہے۔

۶- اس کے جامع عبدالرزاق ہونے کی سب سے مضبوط دلیل یہ ہے کہ امام عبدالرزاق صنعانی کبھی اس کو مصنَّف کے ساتھ روایت کرتے تھے، اور کبھی الگ سے مستقل طور پر روایت کرتے تھے، کتاب الجامع کو عبدالرزاق سے مستقل طور پر الگ سے روایت کرنے والے احمد بن منصور رمادی جیسے بلند پایہ محدث ہیں۔ علامہ اعظمیؒ کو رمادی کی روایت کے دو قلمی نسخے دستیاب ہوئے تھے، اور ان دونوں نسخوں پر اجلۂ محدثین کے سماعات درج ہیں، اس کی تفصیل میں جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ایک نسخے کے مطابق احمد بن منصور رمادی متوفی ۲۶۵ھ سے لے کر ساتویں صدی کے اوائل یا چھٹی صدی کے اواخر تک، اور دوسرے نسخے کے مطابق رمادی سے لے کر نویں صدی تک کے محدثین اس کو بحیثیت 'جامع عبدالرزاق' روایت کرتے رہے ہیں، اور وہ اسی نام سے ائمۂ حدیث میں متداول رہا ہے، ذیل میں اختصار کے ساتھ ان دونوں نسخوں کا تعارف پیش کیا جارہا ہے:

☆ پہلا نسخہ جونسبۃً قدیم ہے، ابوالفتح نصر بن ابی الفرج الحصری - متوفی ۶۱۹ھ - کے ہاتھ کا لکھا ہے، اس کے سرورق پر یہ عبارت مرقوم ہے:

الجزء الأول من **كتاب الجامع عن عبدالرزاق** بن همام أبي بكر الصنعاني

رواية أبي بكر أحمد بن منصور بن سيار الرمادي عنه

رواية أبي علي إسماعيل بن محمد بن إسماعيل بن صالح الصفار عنه

رواية أبي الحسين علي بن محمد بن عبد الله بن بشران ...... عن الصفار عنه

رواية أبي المعمر عبد الله بن سعد ...... يعرف بخزيفة عن أبي طلحة سماع منه لصاحبه نصر بن أبي الفرج

اوراس کے آخر میں مکتوب ہے:

الجزء الأول، يتلوه في الثاني إن شاء الله : باب حب المال، والحمد لله حق حمده وصلاته على سيدنا محمد وآله وسلم. في النسخة المنقول منه ذكر سماع جماعة بخط الحافظ أبي المحاسن القرشي، وقد نقله من خط أبي المعمر الأنصاري منهم عبدالوهاب الصابوني، وعبدالواحد بن الحسين بن عبدالواحد البارزي وخزيفة ...... الوزان وغيرهم بقراءة ثابت الكيلي في رجب سنة اثنتين وتسعين وأربع مائة على الشيخ حسين بن طلحة النعالي، وكتب نصر بن أبي الفرج الحصرى.

اس کے بعد تحریر ہے:

وسمع الأول من جامع عبدالرزاق على ابن طلحة ...... جماعة منهم شهدة بنت أبي نصر الأبري، ومفوذ بن الحسين، ومحمد وعبدالرحمن ابن الطا ...... بن الفضل بن طاهر في جمادى الأخرى من سنة تسعين، نقلته من خط ابن الأخضر.

مذکورہ بالا تینوں عبارتوں کو ملانے کے بعد ان سے درج ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱- امام نصر بن ابی الفرج حصری -متوفی ۶۱۹ھ- خزیفہ سے اس کا سننا ذکر کرتے ہیں، اور اس کو جامع عبدالرزاق قرار دیتے ہیں۔

۲- نصر بن ابی الفرج نے اس کو ایک ایسے نسخے سے نقل کیا ہے، جس پر محدث بغداد حافظ ابوالمحاسن قرشی کے ہاتھ سے یہ لکھا ہوا ہے:

☆ جامع عبدالرزاق کے اس جز کو حسین بن طلحہ نعالی سے ایک جماعت نے سنا ہے، جن میں عبدالوہاب ابن الصابونی -متوفی ۵۵۶ھ-، عبدالواحد بن حسین بن عبدالواحد بارزی -متوفی ۵۶۲ھ- اور خزیفہ وزان -متوفی ۵۶۲ھ- ہیں، ان حضرات کا یہ سننا حافظ ثابت کیلی -متوفی ۵۲۸ھ- کی قرأت سے تھا، اور قرأت وسماع کا یہ واقعہ رجب ۴۹۲ھ کا ہے۔

یعنی حافظ ابوالمحاسن قرشی -متوفی ۵۷۵ھ- نے بھی اس کو جامع عبدالرزاق ہی سمجھا ہے، نیز حسین بن طلحہ سے جن لوگوں نے اس کو سنا ہے، یعنی عبدالوہاب بن صابونی، عبدالواحد بارزی، خزیفہ وزان، اور ثابت کیلی سب اس کو جامع عبدالرزاق ہی سمجھتے ہوں گے۔

۳- پھر امام نصر بن ابی الفرج نے امام وحافظ ابن الاخضر کی یہ تحریر نقل کی ہے کہ:

جامع عبدالرزاق کے جزء اول کو ابن طلحہ سے ایک جماعت نے سنا ہے، منجملہ ان کے مسندۃ العراق فخر

النساء شہدہ بنت ابی نصر ہیں، اوران لوگوں نے اس کوابن طلحہ سے جمادی الآخرہ ۴۹۰ھ میں سنا ہے۔

☆ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابن الاخضر -متوفی ۶۱۱ھ- نے بھی اس کو جامع عبدالرزاق ہی سمجھا اور لکھا ہے، اسی طرح حضرت شہدہ بھی اس کو جامع عبدالرزاق سمجھ کراس کی سماعت کررہی ہیں۔

۴-اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے اس نسخے کے کچھ اور مندرجات نقل کیے ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حافظ عمر بن حاجب متوفی ۶۳۰ھ نے امام نصر حصری کے اس نسخے کو حاصل کیا اور اس پر "**الأول من جامع عبدالرزاق**" لکھ کر اپنے کتب خانے میں دائمی طور پر وقف کردیا۔

۵-عمر بن حاجب نے حافظ تقی الدین انماطی -متوفی ۶۱۹ھ- کا ایک اندراج نقل کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نصر بن ابی الفرج حصری، ابوالفضائل ھبۃ اللہ بن سلامہ بن مسلم مصری اور ان کے صاحبزادے ابوالحسن وغیرہ نے ۵۷۱ھ میں حضرت شہدہ سے اس نسخے کا سماع کیا ہے۔

۶-حافظ انماطی نے اپنی تحریر کے لیے حافظ ابوالمواہب بن صصری کی تحریر کا حوالہ دیا ہے، اورانھوں نے اس کو عمر بن محمد امینی کے خط سے نقل کیا ہے۔

☆ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حافظ ابوالمواہب بن صصری -متوفی ۵۸۶ھ-، اور حافظ تقی الدین ابن الانماطی -متوفی ۶۱۹ھ-، مسندالدیار المصریہ علامہ علی بن ھبۃ اللہ مصری -متوفی ۶۴۹ھ- اوران کے والد ابوالفضائل ھبۃ اللہ، ان سب محدثین نے جامع عبدالرزاق ہی کی حیثیت سے اس کا سماع کیا ہے۔

۷-امام نصر حصری کے اسی نسخے پر حافظ عبدالغنی مقدسی -متوفی ۶۰۰ھ- کا ایک سماع درج ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی امام حصری کے ساتھ عالمہ وفاضلہ حضرت شہدہؒ سے اس نسخے کو سنا ہے، اور علامہ مقدسی نے بھی اس کو **الجزء الأول من جامع عبدالرزاق** کے نام سے موسوم کیا ہے۔

۸-اس پر جو سماعات درج ہیں، اس کے ایک اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو حضرت شہدہؒ سے حافظ عبدالقادر رہاوی -متوفی ۶۱۲ھ- نے بھی سنا ہے۔

حافظ ابونصر بن ابی الفرج حصری کو جامع عبدالرزاق کے اس جز کا اس قدر اہتمام تھا کہ انھوں نے اس کو خود اپنے ہاتھ سے نقل کیا، اور متعدد محدثین کے پاس اس کو کئی بار پڑھا اور روایت کیا، چنانچہ ۵۵۸ھ میں خزیفہ ابن سعد کے سامنے اس کی قرأت کی، ۵۵۹ھ میں عبدالواحد بارزی کے سامنے اس کو پڑھا، پھر ۵۷۱ھ میں حضرت شہدہؒ کے پاس اس کی قرأت کی۔

۹-اس نسخے کے ایک اندراج سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حافظ احمد بن محمود جوہری -متوفی ۶۴۳ھ- اس کو مصر لے گئے، اور وہاں انھوں نے امام ومحدث علی بن ھبۃ اللہ المعروف بہ ابن الجمیزی کے پاس اس کی قرأت کی، اس وقت کثیر الاسفار محدث علی بن بلبان مقدسی -متوفی ۶۸۴ھ- نے اس کا سماع کیا، ابن الجوہری نے لکھا ہے:

قرأتُ جميعَ هذا الجزءِ الأولِ من جامع عبدالرزاق.

۱۰-اس کے بعد حافظ ابن الجوہری کو جامع عبدالرزاق سے اس قدر دلچسپی ہوئی کہ انھوں نے اس کے دوسرے، تیسرے اور چوتھے اجزا کو بھی حاصل کیا، اور ان کو نقل کر کے پہلے جز کے ساتھ شامل کیا، پھر مسندۃ الشام کریمہ بنت عبدالوہاب کی مجلس درس حدیث میں شریک ہو کر ان کے سامنے ان چاروں اجزا کی قرأت کی، اور اُس پر اپنے ہاتھ سے یہ تحریر فرمایا: **قرأتُ جميعَ هذا الجزء الأول وما بعده من الأجزاء الأربعة وهو جميع كتاب الجامع لعبدالرزاق بن همام على الحرة الأصيلة كريمة بنت عبدالوهاب، الخ.**

رمادی کی روایت کا دوسرا نسخہ:

مذکورہ بالا تفصیلات احمد بن منصور رمادی کی روایت سے پائے جانے والے جامع عبدالرزاق کے ایک قلمی نسخے کے سلسلے کی تھیں، اس کے علاوہ ایک دوسرا قلمی نسخہ بھی ہے، جس کے کاتب حافظ ابن حجر عسقلانی کے بہت خاص اور مقرب شاگرد حافظ وعلامہ تقی الدین قلقشندی ہیں، اس نسخے پر لکھا ہوا ہے:

الجزء الأول من كتاب الجامع

تاليف: الإمام عبد الرزاق بن همام الصنعاني

رواية أبي بكر أحمد بن منصور بن سيار الرمادي عنه

رواية أبي علي إسماعيل بن محمد بن إسماعيل الصفار عنه

رواية أبي الحسين علي بن محمد بن عبد الله بن بشران المعدل عنه

رواية أبي عبد الله الحسين بن أحمد بن محمد بن طلحة النعالي عنه

رواية شهدة بنت أحمد بن الفرج بن عمر الأبري الكاتبة عنه

رواية أبي الحسن علي بن هبة الله بن سلامة بن المسلم السلمي ابن بنت الجميزي عنها

رواية أبي زكريا يحيى بن يوسف بن المصري عنه إجازةً

رواية أبي العباس أحمد بن الحسن بن محمد القدسي السويداوي عنه إجازةً

رواية الحافظ أبي الفضل أحمد بن علي بن محمد بن حجر العسقلاني عنه

رواية أبي الفضل عبد الرحمن بن أحمد بن إسماعيل القلقشندي عنه

اس کے نیچے اسی صفحے پر حافظ تقی الدین قلقشندی نے ۸۴۳ھ میں حافظ ابن حجر کے سامنے اس نسخے کا پڑھا جانا اور اس کا سماع تحریر کیا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ اور ان کے والد کے ہاتھ کا کتابت شدہ نسخہ:

مذکورہ بالا تفصیلات، اجلۂ حفاظ ومحدثین کی تصریحات، ان کے اندراجات اور سماعات وقرأآت اس بات

کی واضح، قطعی اور بیِّن دلیل ہیں کہ مصنف عبدالرزاق کے آخر میں جو کتاب الجامع ہے، وہ جامع عبدالرزاق ہی ہے، جامع معمر نہیں ہے، اور اس کو جامع معمر باور کرنا یا کرانا حقیقتِ واقعہ کے خلاف ہے، اور اس کا ایک مسکت جواب یہ ہے کہ حیدرآبادی قلمی نسخے میں بھی کتاب الجامع کو مصنف عبدالرزاق کے ساتھ شامل کیا گیا ہے، اور یہ نسخہ ڈاکٹر حمید اللہ کے والد اور اس کا کچھ حصہ خود ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ کا نقل کیا ہوا ہے، چنانچہ اس کے آخر میں ڈاکٹر صاحب کے والد نے لکھا ہے:

الحمد لله سبحانه قد تم كتابة هذه النسخة الشريفة على يد الراجي إلى الله أبي محمد خليل الله بن محمد صبغه الله قاضي الملك إمام العلماء، وفي آخر هذا بعض الصحف على يد ابني وقرة عيني محمد حميد الله ....، وذلک في إحدى عشرة خلون من شهر المبارک ربيع الأول سنة ثمان وأربعين بعد الألف وثلاث مائة من هجرة النبي الأمين ﷺ، في بلدة حيدر آباد.

زیر بحث حصے کے 'جامع عبدالرزاق' ہونے کے کچھ اور دلائل:

'جامع عبدالرزاق' کے سلسلے میں پیش کی گئی اب تک کی معروضات **البعث الإسلامي** میں شائع ہونے والے علامہ اعظمیؒ کے مضمون کا خلاصہ ہیں، اس تفصیل کے بعد ذیل میں کچھ اور نا قابل تردید دلائل پیش کیے جا رہے ہیں:

۱- **البعث الإسلامي** میں جہاں علامہ اعظمیؒ کا مضمون ختم ہوتا ہے، اس کے بعد آپ نے اپنے خاص شمارے میں یہ عبارت تحریر فرمائی ہے:

(إضافة): ومما يدل دلالة واضحة أن كتاب الجامع جزء من مصنف عبد الرزاق أن الحافظ قال في موقوف عمار الذي علَّقه البخاري في باب 'إفشاء السلام من الإيمان' أنَّ معمراً رواه في جامعه –يعني موقوفاً–، وكذا رواه عبدالرزاق في مصنَّفه عن معمر، انتهى. وقد فتشنا عن هذا الموقوف في مصنف عبدالرزاق، فلم نجده إلا في كتاب الجامع الذي هو آخر كتاب المصنَّف لعبد الرزاق، انظر المصنف (۳۸۶/۱۰).

وكذا الحافظ عزا حديثاً لعبد الرزاق وهو في كتاب الجامع من مصنفه، انظر المصنف لعبد الرزاق (۱۲۹/۱۱).

یعنی اس بات کی روشن دلیل کہ 'کتاب الجامع' مصنَّف عبدالرزاق کا جز ہے، ایک یہ بھی ہے کہ حافظ ابن حجر نے حضرت عمار بن یاسرؓ کے اس موقوف اثر کے بارے میں جس کو بخاری نے باب إفشاء السلام من الإیمان میں تعلیقاً روایت کیا ہے، لکھا ہے کہ معمر نے اس کو اپنی 'جامع' میں موقوفاً روایت کیا ہے، اور اسی طرح اس کو

عبدالرزاق نے بھی اپنی مصنَّف میں روایت کیا ہے۔ اس کے بعد علامہ اعظمیؒ کہتے ہیں کہ اس موقوف روایت کو ہم نے مصنف عبدالرزاق میں تلاش کیا، تو کتاب الجامع کے علاوہ کہیں اور نہیں ملی، دیکھئے مصنَّف ۱۰/۳۸۶۔

اسی طرح حافظ نے ایک اور حدیث عبدالرزاق کی طرف منسوب کی ہے، اور وہ ان کی جامع میں ہے، دیکھئے مصنَّف ۱۱/۱۲۹۔

باب إفشاء السلام والے جس موقوف اثر کے بارے میں علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے، وہ صحیح بخاری میں ان الفاظ میں ہے: **وقال عمار: ثلاثٌ مَن جمعَهنَّ فقد جمَعَ الإيمانَ: الإنصاف من نفسک، وبذل السلام للعالَم، والإنفاقُ من الإقتار.** اس روایت کی نسبت حافظ ابن حجر تصریح کرتے ہیں کہ مصنَّف عبدالرزاق میں بھی یہ اثر مروی ہے۔ اور یہ اثر مصنَّف عبدالرزاق کے اسی حصے میں ہے، جو کتاب الجامع کے عنوان سے ہے، مصنَّف میں اس روایت کا نمبر ۱۹۴۳۹ ہے۔

۲- جلد نمبر ۱۱ صفحہ ۱۲۹ پر جو روایت ہے، اس کا نمبر ۲۰۱۱۴ ہے، اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

أخبرنا عبد الرزاق عن معمر عن صالح بن مسمار وجعفر بن برقان أنَّ النبي ﷺ قال للحارث بن مالک: ما أنت يا حارث بن مالک؟ قال: مؤمن يا رسولَ الله، قال: مؤمن حقاً؟ قال: مؤمن حقاً. قال: فإنَّ لكل حقٍ حقيقةً، فما حقيقة ذلک؟ قال: عزفت نفسي من الدنيا، وأسهرتُ ليلي، وأظمأتُ نهاري، وكأني أنظر إلى عرش ربي حين يجاءُ به، وكأني أنظر إلى أهل الجنة يتزاورون فيها، وكأني أسمع عواء أهل النار. فقال النبي ﷺ: مؤمن نور قلبه.

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کے لیے عبدالرزاق کا حوالہ 'اصابہ' میں دیا ہے، انھوں نے اس میں حدیث کے ان ہی الفاظ کو نقل کیا ہے، 'اصابہ' میں لکھا ہے:

روى حديثه ابنُ المبارک في الزهد عن معمر عن صالح بن مسمار أن النبي ﷺ قال: يا حارث بن مالک كيف أصبحتَ؟ قال: أصبحتُ مؤمناً حقاً، الحديث.

پھر پوری روایت نقل کرنے کے بعد ابن حجر نے لکھا ہے:

وكذا أخرجه عبدالرزاق عن معمر عن صالح بن مسمار وجعفر بن برقان أن النبي ﷺ قال للحارث.

۳- صحیح بخاری کے "**باب أمور الإيمان وقول الله تعالى** ﴿لَيۡسَ الۡبِرَّ أَنۡ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ﴾ **الآية.** کی شرح میں حافظ ابن حجر نے 'فتح الباری' (۱/۵۱) میں لکھا ہے: **ووجه الاستدلال بهذه الآية ومناسبتها لحديث الباب تظهر من الحديث الذي رواه عبد الرزاق وغيره من طريق مجاهد أنَّ أبا ذر سأل النبي ﷺ عن الإيمان، فتلا عليه (ليس البر) إلى آخرها.**

حافظ ابن حجر نے اس روایت کے لیے عبدالرزاق کا حوالہ دیا ہے، اور یہ روایت مصنف عبدالرزاق کی جلد ۱۱ صفحہ ۱۲۸ میں ہے، اس کا نمبر ۲۰۱۱۰ ہے، مصنف میں اس کی سند یہ ہے: **أخبرنا عبد الرزاق عن معمر عن مجاهد أنَّ أبا ذر سأل النبي ﷺ عن الإيمان، الحديث.**

۴- امام بخاری نے "**باب كتابة العلم**" میں حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ حدیث ذکر کی ہے: **ما من أصحاب النبي ﷺ أحدٌ أكثرَ حديثاً عنه مني إلا ما كان من عبد الله بن عمرو فإنه كان يكتب ولا أكتب.**

صحیح بخاری کی اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہؓ سے ہمام بن منبہ روایت کرتے ہیں، اور ہمام سے ان کے بھائی وہب بن منبہ روایت کرتے ہیں۔

اس کو روایت کرنے کے بعد امام بخاریؒ نے لکھا ہے: **تابعه معمر عن همام عن أبي هريرة.** یعنی ہمام سے اس حدیث کو روایت کرنے میں وہب کی متابعت معمر نے بھی کی ہے۔

اب دیکھیے حافظ ابن حجر 'فتح الباری' (۱/۲۰۷) میں لکھتے ہیں:

والمتابعة المذكورة أخرجها عبد الرزاق عن معمر. یعنی متابعت والی اس روایت کی تخریج عبدالرزاق نے معمر کے واسطے سے کی ہے۔

اور پھر جب اس کو تلاش کیا جاتا ہے، تو یہ روایت 'مصنَّف' کی جلد ۱۱ صفحہ ۲۵۹ میں ملتی ہے، اس روایت کا نمبر ۲۰۴۸۹ ہے، اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

أخبرنا عبد الرزاق عن معمر عن همام بن منبه أنَّه سمع أبا هريرة يقول: لم يكن من أصحاب محمد ﷺ أحدٌ أكثرَ حديثاً مني إلا عبدَ الله بن عمرو، فإنه كتب ولم أكتبْ.

۵- محدث وعلامہ حافظ ابن عبدالبر اپنی کتاب 'الاستیعاب' میں فرماتے ہیں:

وذكر عبد الرزاق عن معمر في جامعه عن قتادة عن الحسن وغيرِه قالوا: أول من أسلم بعد خديجة علي بن أبي طالب رضي الله عنه وهو ابن خمس عشرة سنة أو ست عشرة سنة.

وحدثنا معمر عن عثمان الخوزي عن مقسم عن ابن عباس قال: أول من أسلم علي رضي الله عنه (۱).

یعنی عبدالرزاق نے اپنی 'جامع' میں معمر سے، انھوں نے قتادہ سے، اور قتادہ نے حسن وغیرہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بعد سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا۔

پھر عبدالرزاق نے معمر سے، انھوں نے عثمان خوزی سے، انھوں نے مقسم سے، اور مقسم نے حضرت

(۱) استیعاب: ۲/۴۵۸

ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ سب سے پہلے حضرت علیؓ نے اسلام قبول کیا۔

حضرت حسن وغیرہ کی روایت مصنف عبدالرزاق جلد ۱۱ صفحہ ۲۲۶-۲۲۷ پر ہے، اس کا نمبر ۲۰۳۹۱ ہے، اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت صفحہ ۲۲۷ پر ہے اور اس کا نمبر ۲۰۳۹۲ ہے۔

ان تمام روایات سے بھی یہ بات قطعی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ مصنَّف عبدالرزاق کی دسویں جلد کے اواخر اور پوری گیارہویں جلد میں جو کتاب الجامع ہے، وہ عبدالرزاق ہی کی ہے، معمر کی تصنیف نہیں ہے، حافظ ابن عبدالبر جیسے عظیم محدث وحافظ اور حافظ ابن حجر جیسے کثیر الاطلاع عالم ومحدث اِن روایات کے لیے مصنَّف عبدالرزاق یا جامع عبدالرزاق کا حوالہ دیتے ہیں، اور وہ روایات اسی حصے میں پائی جاتی ہیں جو کتاب الجامع کے نام سے ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

مصنَّف ابن ابی شیبہ

مسلمان اہل علم وکمال نے علم ومعرفت کو جس عظمت وبلندی پر پہنچایا ہے، اور تصنیف وتالیف کو جو تقدس اور پاکیزگی عطا کی ہے، دنیا کی دوسری قومیں اس میں ان کی گرد راہ کو بھی نہیں پاسکتیں، اسلامی تہذیب وثقافت کے عظیم الشان علمی وتصنیفی سرمایوں میں سے ایک 'مصنف عبدالرزاق' کا تعارف گزر چکا، مصنَّف عبدالرزاق اپنے طرز کی واحد کتاب نہیں ہے، بلکہ اس نہج پر اور بھی متعدد تصانیف عالمِ وجود میں آئی ہیں، منجملہ ان کے مصنَّف ابن ابی شیبہ بھی ہے، جس کو نہ صرف عبدلرزاق کی مصنَّف کے ہم پلہ بلکہ روایات کی کثرت کے لحاظ سے اس سے فزوں تر قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کو دیکھنے کے بعد یہ بات بے تأمُّل کہی جاسکتی ہے کہ محدثین واہل علم کے غیر معمولی قوت حافظہ، عجیب وغریب یادداشت، تصنیف وتالیف کی حیرت انگیز صلاحیت واستعداد، علم وفن کی بے لوث اور مخلصانہ خدمت، شب وروز جگر کاوی اور جانفشانی، تحصیل علم واسانید کے لیے مدتوں صحرا نوردی وبادیہ پیمائی، اہل علم سے ملاقات اور ان کی مرویات کی تحصیل کے لیے دور دراز اور دشوار گزار مقامات تک صعوبتِ سفر برداشت کرنے کی بیِّن شہادت پیش کرتی ہے۔ ذیل میں مصنَّف کے تعارف سے پہلے اس کے مصنِّف ابن ابی شیبہ کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

ابن ابی شیبہ کا نام ونسب اور حالات زندگی:

ابوبکر کنیت، اور عبداللہ بن محمد بن ابراہیم بن عثمان بن خُوَاسْتی نام تھا، ان کے والد اور دادا ابراہیم دونوں منصبِ قضا پر فائز رہ چکے تھے، ان کے دادا ابراہیم کی کنیت ''ابوشیبہ'' تھی، اسی نسبت سے ابراہیم کی اولاد واحفاد ''ابن ابی شیبہ'' کہلاتے تھے، قبیلہ عبس کے مولیٰ ہونے کی وجہ سے ان کو عبسی کہا جاتا تھا، ابوبکر ابن ابی شیبہ کی

ولادت ۱۵۹ھ میں کوفہ میں ہوئی، اور ۲۳۵ھ میں کوفہ ہی میں وفات پا کر ہمیشہ کے لیے اسی کی خاک کا پیوند ہو گئے۔

ابن ابی شیبہ کا پورا خاندان ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کا مصداق تھا، حافظ ذہبی نے 'سیر اعلام النبلا' میں لکھا ہے: **هم بيت علم، وأبو بكر أجلهم** [1]. ان کا گھر علم کا گھر تھا، اور ابوبکر ان میں سب سے بلند رتبہ تھے، چنانچہ ابوبکر کے والد محمد، ان کے دادا ابراہیم، بھائی عثمان اور قاسم، اور صاحبزادگان ابراہیم اور محمد سب اصحاب علم و فضل تھے، ابوبکر ابن ابی شیبہ کے علم و کمال، قوت حفظ و ادراک، اور تصنیف و تالیف میں ان کے ملکہ تامہ کی داد ان کے معاصرین، ائمہ فن اور اصحاب تذکرہ و تراجم نے دی ہے۔

ابن ابی شیبہ کے اساتذہ و شیوخ:

ابوبکر بن ابی شیبہ نے اپنے وقت کے اجلۂ اہل علم اور ائمۂ حدیث سے حدیثیں سنی اور روایت کی ہیں، ان کے اساتذہ و مشایخ میں یحییٰ بن سعید قطان، وکیع بن جراح، سفیان بن عیینہ، ابوداود طیالسی، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن مبارک، عفان بن مسلم، ابواحمد زبیری، یزید بن ہارون اور یحییٰ بن آدم جیسے حفاظ حدیث کے نام آتے ہیں، جو حفظ و روایت کے اس دور کے اساطین تھے، ان کے علاوہ محدثین کی بہت بڑی تعداد سے انھوں نے حدیثیں سنیں اور روایت کی ہیں۔

تلامذہ:

اسی طرح ابن ابی شیبہ سے بھی بڑی تعداد نے حصول علم اور اکتساب فیض کیا، چنانچہ ان کے زمرۂ تلامذہ میں حضرت امام احمد بن حنبل، ان کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد بن حنبل، امام بخاری، مسلم، ابوداود، ابن ماجہ، ابوزرعہ، ابوحاتم، ابن ابی عاصم، ابراہیم حربی، صالح جزرہ، اور ابن ابی الدنیا جیسے اہل علم و کمال ہیں۔

تصانیف ابن ابی شیبہ:

تصنیف و تالیف میں ابن ابی شیبہ کا رتبہ بہت بلند تھا، ان کی تصانیف میں تین کتابیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں: ایک تفسیر؛ دوسری مسند؛ تیسری مصنَّف۔ ان کی کتاب ''تفسیر'' کا ذکر علماء سیر میں سے خطیب بغدادی نے 'تاریخ بغداد' (۱۰/۶۶) میں، اور حافظ ذہبی نے 'تذکرۃ الحفاظ' (۲/۱۹) اور 'سیر اعلام النبلا' (۱۱/۱۲۲) میں کیا ہے، 'درمنثور' میں جس کا مدار تفسیری روایات پر ہے، اس کتاب سے بہت سی روایتیں لی گئی ہیں، اور اس کے اہم مراجع میں سے ایک یہ ہے۔

'مسند' جو عام مسانید کے طرز پر تصنیف کی گئی ہے، اس کا کچھ حصہ طبع بھی ہو چکا ہے، اس کی روایتیں حافظ ابن حجر نے '**المطالب العالية**' اور علامہ بوصیری نے '**إتحاف السادة المهرة**' میں لی ہیں۔

---

(۱) سیر أعلام النبلاء: ۱/۱۲۲

ابن ابی شیبہ کی کتابوں میں 'المصنَّف' شہرۂ آفاق اور احادیث وآثار کا عظیم الشان سرمایہ ہے، مصنَّف عبدالرزاق کے برعکس اس کے قلمی نسخے خاصی تعداد میں عالم اسلام کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، اور کئی دفعہ۔کبھی کامل کبھی ناقص۔زیورِ طبع سے بھی آراستہ ہو چکی ہے، اس کتاب کی نسبت شیخ عوامہ نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے:

فهو كتاب الكتب، وديوان الدواوين، وجامع الجوامع، وهو مكنز الآثار في فقه السلف عامة، وفي فقه أهل الكوفة خاصة، مروياً بالأسانيد إلى أربابها، وهذا أمر لا يضاهيه فيه كتاب من الكتب المطبوعة، ولا من الكتب المخطوطة المحفوظة فيما أعلم.

یعنی مصنف ابن ابی شیبہ کتابوں کی کتاب، دیوانوں کا دیوان، اور مجموعۂ احادیث میں نمایاں ترین مجموعہ ہے، عام اسلاف بالخصوص اہل کوفہ کے فقہی آثار کا گنجینہ ہے، جو اہل علم وفقہ سے سندوں کے ساتھ روایت کیا گیا ہے، جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، اس باب میں کوئی اور کتاب اس کے ہم رتبہ نہیں ہے، نہ مطبوعہ کتابوں میں اور نہ محفوظ قلمی نسخوں میں۔

مصنَّف کے راوی:

'المصنَّف' کو ابن ابی شیبہ سے روایت کرنے میں صرف ایک عالم ومحدث کا نام ملتا ہے، اور وہ بھی مشرق کے علمی ایوانوں سے بہت دور سبزہ زار اندلس کے جلیل القدر امام وفقیہ ومحدث بقی بن مخلد۔

بقی بن مخلد:

علم حدیث کے جلیل القدر حافظ وامام تھے، قرطبہ کے رہنے والے تھے، ۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۶ھ میں وفات پائی، حصول علم کے لیے مملکتِ اسلامیہ کے مشرقی خطوں کا سفر کیا، اور ائمۂ حدیث کی ایک بڑی تعداد کی خدمت میں حاضر ہو کر علم حدیث کی تحصیل کی، ذہبی نے 'تذکرۃ الحفاظ' (۱۸۴/۲) میں ان کے شیوخ کی تعداد دوسواسی (۲۸۰) سے زائد لکھی ہے، ان کے اساتذہ وشیوخ میں ابن ابی شیبہ سب سے بڑھ کر ہیں۔بقی بن مخلد نے اپنے شیخ ابن ابی شیبہ سے مصنف کو حاصل کیا، اور یہ وہ شرف ہے جس کے وہ تنہا حامل ہیں، اور اس میں کوئی دوسرا ان کا سہیم وشریک نہیں معلوم ہوتا۔

بقی بن مخلد خود بھی ایک بلند پایہ مصنف تھے، اور انھوں نے بھی اپنے شیخ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے 'مسند'، 'مصنف' اور 'تفسیر' کے نام سے کتابیں لکھی ہیں، ان کی 'مصنَّف' کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ دیگر تمام مصنفات اور اس نوع کی دوسری کتابوں سے فائق اور بڑھ کر ہے۔

حدیث کے حفظ وروایت میں بقی بن مخلد کو بخاری ومسلم ونسائی جیسے حفاظ حدیث کا ہم سر قرار دیا جاتا

ہے، امام ذہبی نے بقی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: **كل من رحلت إليه فماشياً على قدمي**[1]، میں تحصیل علم کے لیے جس شیخ کے پاس بھی گیا پیدل چل کر گیا۔

علم حدیث میں اپنی مسلّمہ امامت وجلالت کے ساتھ بقی بن مخلد بڑے عبادت گزار، خدا ترس اور شب زندہ دار تھے، ان کا شمار مستجاب الدعوات بزرگوں میں ہوتا تھا، کہا جاتا ہے کہ ہر رات تیرہ رکعت میں ایک ختم قرآن کرتے تھے، مستقل روزہ رکھتے، اور شوق جہاد کا حال یہ تھا کہ ستر (۷۰) غزوات میں حصہ لیا، ذہبی نے ان کی نسبت لکھا ہے:

وكان إماماً، عَلَماً، قُدوةً، مجتهداً، لا يُقلد أحداً، ثقةً، حجةً، صالحاً، عابداً، متهجداً، أواهاً، عديم النظير في زمانه[2].

اتنے عظیم الشان اور جلیل القدر پیکر علم وعمل کی روایت سے یہ نسخہ بعد کے لوگوں تک پہنچا ہے۔

کتاب کی طباعت کی تاریخ:

مصنّف ابن ابی شیبہ کی طباعت کے لیے متعدد بار کوشش کی جا چکی ہے، سب سے پہلے چودھویں صدی ہجری کے وسط میں شیخ ابوتراب عبدالوہاب ملتانی نے اس کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا، انھوں نے دمشق کی پبلک لائبریری سے اس کتاب کا ایک نسخہ حاصل کر کے اس کی اشاعت کی ابتدا کی، ان کا ارادہ پوری کتاب کو پندرہ جلدوں میں شائع کرنے کا تھا، لیکن پہلی اور چوتھی جلد کے علاوہ باقی جلدیں ظہور پذیر نہیں ہوسکیں، پہلی اور چوتھی دونوں جلدیں ملتان سے طبع ہوئی تھیں۔

اس کے کچھ عرصے بعد کچھ اہل علم نے حیدرآباد دکن میں اس کو شائع کرنا شروع کیا، لیکن وہاں سے بھی اس کی صرف پانچ ہی جلدیں طلوع ہوسکیں، اور باقی تشنۂ طبع رہ گئیں؛ اس کے بعد بمبئی کے مطبعہ سلفیہ نے اس کی اشاعت کا جوکھم اٹھایا، اس نے حیدرآباد کی پانچ جلدوں کا فوٹو لے کر شائع کیا، اور باقی کتاب کو اسی نہج پر پورا کر کے اہل علم کے لیے استفادہ کا موقع فراہم کر دیا۔

مصنّف کی تحقیق کے محرّکات:

مصنّف ابن ابی شیبہ کی جملہ خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ قرنِ اول وثانی کے فقہا کے اقوال ومذاہب کا عظیم ترین ذخیرہ ہے، جو سندوں کے ساتھ اس کتاب میں محفوظ ہے، خاص طور سے فقہاء احناف کے اقوال اور ان کے مسلک کی تائید کرنے والے دوسرے اہل علم وفقہ کے اقوال ومذاہب بہ کثرت مذکور ہیں، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کی فراہمی اور اس کو قابلِ اشاعت بنانے کا جذبہ علامہ اعظمیؒ کے قلب میں نہ جانے کتنی مدت سے موج زن رہا ہوگا، اس خیال کی تائید مصنّف عبدالرزاق کی تعلیقات سے بھی ہوتی ہے جن کو دیکھ کر

---
(۱) تذکرۃ الحفاظ: ۱/۱۸۵ (۲) ایضاً: ۲/۱۸۴

یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے اندر مصنَّف ابن ابی شیبہ کو سمو کر اور اس کا مغز نکال کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔

۱۳۹۸ھ اور ۱۳۹۹ھ میں آپ کا ساتواں اور آٹھواں سفر حج پیش آیا، ان دونوں سفروں میں سے کسی ایک میں مشہور عالم دین مولانا عاشق الٰہی بلندشہری علیہ الرحمۃ نے علامہ اعظمیؒ سے ملاقات کر کے آپ سے مصنَّف عبدالرزاق کے طرز پر مصنَّف ابن ابی شیبہ کی بھی تحقیق وتصحیح اور تعلیق وتحشیہ کی درخواست کی، یہ درخواست گویا آپ کی تمنا کے عین مطابق تھی، جس کو آپ نے کبرسنی اور پیرانہ سالی کے باوجود منظور کرتے ہوئے اس کا بیڑا اٹھالیا، حالانکہ آپ اپنی عمر اور قُویٰ کے لحاظ سے چراغ سحری ہو چکے تھے، لیکن عزم وحوصلہ اور ارادہ ایسا تھا گویا ابھی شباب کی دہلیز پر ہوں۔

آپ نے اس کے بعد اس کام کا آغاز کر دیا، اور دیگر علمی وتحقیقی مشاغل کے ہجوم کے باوجود کراچی کے نسخے کے مطابق قریباً دس برس کے عرصے میں اس کی تقریباً بارہ جلدوں کی تصحیح اور تعلیق وتحشیہ کا کام انجام دے ڈالا، آپ نے اس کتاب کی ۳۳۵۴۵ روایات کی تحقیق وتخریج کا فریضہ انجام دیا۔ شیخ محمد عوامہ نے جلد ۱۷ صفحہ ۸۷۴ پر روایت نمبر ۳۳۵۴۵ کے حاشیہ میں لکھا ہے:

وهذا آخر ما كتبه شيخنا الأعظمي في خدمة هذا الديوان العظيم، تغمَّده الله برحمته، وتقبَّل ذلك منه بأحسن قبول.

اس سے سوچنا چاہئے کہ عمر کی آخری منزل میں- اس وقت آپ کی عمر تقریباً ۸۰ برس تھی- اتنا بڑے کام کا بیڑا اٹھانا کتنی عظیم اور عبقری شخصیت اور حیرت انگیز عزم وہمت اور ثبات واستقلال کے ذریعہ عمل میں آ سکتا ہے۔

مصنَّف کے قلمی نسخے اور علامہ اعظمیؒ کا تحقیقی عمل:

مصنَّف ابن ابی شیبہ کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کے قلمی نسخے کامل یا ناقص صورتوں میں دنیا کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، جن میں سے بعض اجلۂ اہل علم اور کبار محدثین کے ہاتھوں یا ان کی عنایت وتوجہ سے معرضِ کتابت میں آئے ہیں، اسی سے اس کتاب کے ساتھ اہل علم کی دلچسپی اور ان کے نزدیک اس کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے، علامہ اعظمیؒ نے جس دور میں اپنے علمی وتحقیقی کاموں کو انجام دیا ہے، اس وقت کسی مخطوطے تک رسائی یا اس کی اصل یا عکس کا حصول آسان کام نہیں تھا، اور پھر جس تنگ دستی اور بے سروسامانی کی حالت میں ان کو قابلِ اشاعت بنایا ہے، اس کا تصور بھی تکلیف دہ ہے۔ اس کتاب کی تحقیق کے لیے اس کے مطبوعہ تینوں ایڈیشنوں کے علاوہ اس کے جو قلمی نسخے آپ کو دستیاب ہوئے، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱- سعیدیہ کا نسخہ: یہ نسخہ مکتبہ سعیدیہ حیدرآباد میں محفوظ تھا، وہاں سے اس کو حاصل کر کے اسی کو اپنی تحقیق کے لیے اصل اور بنیاد بنایا، یہ نسخہ نہایت واضح اور صاف خط میں لکھا ہوا ہے، علامہ اعظمیؒ نے اپنی تعلیقات میں اس کو ''اصل'' سے تعبیر کیا ہے۔

۲- پیر جھنڈا پاکستان کا نسخہ: کتاب الصلاۃ کے درمیان تک پہنچنے کے بعد آپ کو اس نسخے کا علم ہوا، ناشر نے

فاضل جلیل مولانا سید حامد میاں-عمید جامعہ مدنیہ لاہور- کے توسط سے حاصل کر کے اس کو ارسال کیا، اس نسخے کو شیخ ابوتراب (پیر جھنڈا) نے مولانا شمس الحق ڈیانوی سے ان کا نسخہ طلب کر کے اس سے ۱۳۱۷ھ میں نقل کیا تھا۔ یہ نسخہ جب آپ کو دستیاب ہوا تھا، تو آپ مطبوعہ کی تقریباً ڈیڑھ جلدوں سے فارغ ہو چکے تھے، کیونکہ اس نسخے کا حوالہ باب في الرجل ينقص صلاته، وما ذكر فيه، وكيف يصنع فيها؟ میں روایت نمبر ۲۹۳۱ سے شروع ہوتا ہے۔

۳-شیخ عابد انصاری کا نسخہ: علامہ شیخ محمد عابد انصاری متوفی ۱۲۵۷ھ اپنے وقت کے نہایت جلیل القدر اور باکمال عالم ومحدث تھے، انھوں نے ۱۲۲۹ھ میں اپنے لیے اس کتاب کی نقل کرا کر ایک نسخہ تیار کرایا تھا، اور اب یہ نسخہ مدینہ منورہ کے مکتبہ محمودیہ میں محفوظ ہے۔ اس کا عکس کویت سے شیخ عبدالستار ابوغدہ نے ارسال کیا تھا، جو علامہ اعظمیؒ کو تحقیق شروع کرنے کے بعد دستیاب ہوا تھا، اس کے لیے آپ نے اپنی تعلیقات میں ''ع'' کا رمز استعمال کیا ہے۔ آپ کی تعلیقات کو دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ آپ کو پیر جھنڈا کے نسخے سے بھی بعد میں ملا تھا، کیونکہ اس نسخے کا حوالہ پہلی جگہ باب في صلاة النهار كم هي؟ کے تحت روایت نمبر ۶۶۱۴ میں نظر آتا ہے، جو کہ جلد ۳ صفحہ ۳۴۲ پر ہے۔

تحقیق کا منہج:

کتب حدیث کے قلمی نسخوں کی تحقیق میں علامہ اعظمیؒ کے پیش نظر سب سے اہم مقصد یہ ہوتا تھا، کہ کتاب کے مختلف نسخوں، یا اس کی روایات کا دوسری کتابوں میں موجود ان ہی روایتوں سے مقابلہ اور معارضہ کر کے صحیح ترین نسخہ تیار کر دیا جائے، وجہ اس کی یہ ہے کہ نسخوں کے نقل وکتابت کے وقت نسخہ نویسوں سے بہت سی فروگزاشت اور غلطیاں ہو جایا کرتی ہیں، کبھی کوئی لفظ یا عبارت چھوٹ جاتی ہے، کبھی الفاظ وحروف کچھ سے کچھ ہو جایا کرتے ہیں، معمولی اور چھوٹے چھوٹے اختلافات تو ایک کتاب کے متعدد نسخوں میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی تو ایک ہی اصل سے تیار کیے گئے مختلف نسخوں اور ان کی روایات میں بڑا فرق اور اختلاف ہو جاتا ہے؛ اس لیے علامہ اعظمیؒ کی بنیادی توجہ ان نسخوں یا ان کی روایات کا مقابلہ کر کے صحیح ترین نسخہ تیار کرنے پر ہوتی تھی، تا کہ اہل علم کے ہاتھوں میں کتاب کا صحیح ترین ایڈیشن پہنچ سکے؛ اسی لیے آپ کی تعلیقات میں نسخوں کے چھوٹے چھوٹے اختلافات کی وضاحت بھی نظر آتی ہے۔

مصنّف ابن ابی شیبہ کے ناشر شیخ عبدالحفیظ ملک عبدالحق نے اپنے مقدمے کے آخر میں ''عمله في التحقيق'' کے عنوان سے علامہ اعظمیؒ کے کام اور تعلیقات کی نوعیت کو ۶ نکات میں تقسیم کیا ہے، جس کا ترجمہ ومفہوم حسبِ ذیل ہے:

۱-مخطوطہ یا مطبوعہ نسخوں میں جو کتابت یا طباعت کی غلطیاں واقع ہوئی ہیں، ان کی نشان دہی اور تصحیح کی ہے، اگر اس نسخے میں جس کو آپ نے ''اصل'' قرار دیا ہے، کوئی لفظ یا عبارت یا حدیث چھوٹ گئی ہے، تو دوسرے نسخوں کی مدد سے اس کمی کو پورا کیا ہے؛ اور اگر دوسرے نسخوں میں کوئی کمی پائی جاتی ہے، تو اس کی طرف اپنی

تعلیقات میں اشارہ کیا ہے۔

۲- مرفوع روایات کی تخریج کی ہے، لیکن کتابوں کے حوالے میں غیر معمولی اختصار سے کام لیا ہے۔

۳- غیر معروف راویوں کے نام یا کنیت وغیرہ ذکر کر کے ان کی تعیین کی ہے، اور ایسے راویوں پر ائمۂ جرح وتعدیل کا اگر کوئی کلام پایا جاتا ہے، تو اس کو نقل کیا ہے۔

۴- احادیث وروایات میں پائے جانے والے مشکل اور نامانوس الفاظ کی تشریح کی ہے۔

۵- حدیث سے متعلق بعض دیگر علمی مباحث بھی ذکر کیے ہیں۔

۶- بوقت ضرورت بعض دوسرے مصنفین کی غلطیوں پر متنبہ کیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ اس کتاب کی تقریباً ۱۱ جلدوں کی تحقیق کر لی تھی، لیکن ابھی چار ہی جلدیں چھپ سکی تھیں کہ وہ پریس بند ہو گیا جہاں سے کتاب طبع ہو رہی تھی، پھر باقی جلدیں معرضِ تعویق والتوا میں رہ گئیں۔ یہ کتاب مدینہ منورہ کے مطابع الرشید میں چھپ رہی تھی، پہلی جلد ۱۴۰۳ھ=۱۹۸۳ء میں اور باقی تین جلدیں ۱۴۰۴ھ=۱۹۸۴ء میں طبع ہو کر مکتبہ امدادیہ مکہ مکرمہ سے اشاعت پذیر ہوئیں۔

☆......☆......☆......☆......☆......☆......☆......☆

المطالب العالیة بزوائد المسانید الثمانیة

اسلام کے مختلف ادوار کی تصنیفی وتالیفی سرگرمیوں کا اگر جائزہ لیا جائے، اور ہر دور کی تصنیفات پر نگاہ ڈالی جائے، تو واضح ہوگا کہ احادیث مبارکہ کی تدوین کا زمانہ تقریباً تین صدیوں پر محیط ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر، بلکہ پانچویں صدی ہجری کے نصف تک کے محدثین نے احادیث وآثار کو ان کی سندوں کے ساتھ کتابوں کے اوراق میں محفوظ کرنے کا اہتمام کیا۔ چوتھی صدی ہجری کا اختتام ہوتے ہوتے مختلف فنون کے اعتبار سے احادیث نبویہ کے بے شمار مجموعے مرتب اور مدوّن ہو کر محفوظ ہو گئے تھے، اس دور میں مدوّن ومرتّب ہونے والے حدیث پاک کے مجموعے اتنے متنوع اور ہمہ جہت اور اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ ان کو دیکھ کر بلکہ ان کو سوچ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔

حدیثیں جب سندوں کے ساتھ کتابوں میں محفوظ ہو گئیں، اور ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں رہ گیا، تو ان سے افادیت کی راہوں اور طریقوں کو مزید آسان بنانے کے لیے اہل علم کو ایسی کتابیں تصنیف کرنے کا خیال پیدا ہوا، جو سندوں سے مُعرّیٰ ہوں، یعنی ایسی کتابیں جن میں سندوں کو حذف کر کے صرف متون کو ذکر کیا جائے، 'مصابیح السنۃ' اور 'مشکوٰۃ المصابیح' جیسی کتابیں اسی خیال کے تحت معرضِ تصنیف میں آئی ہیں۔

کتبِ حدیث کی تصنیف وتالیف میں بہت سے طریقے اختیار کیے گئے، ایک طریقہ تو یہ تھا کہ حدیثوں کو ابواب کے مطابق قلم بند کیا جاتا تھا، مثلاً طہارت سے متعلق جو حدیثیں ہوتی تھیں، وہ ایک جگہ ذکر کی جاتی تھیں،

پھر نماز سے متعلق حدیثیں، پھر زکاۃ اور دوسرے احکام ومسائل سے متعلق حدیثیں ہوتی تھیں، اس طرح اسلامی احکام وشرائع سے متعلق احادیث نبویہ کو ایک جگہ جمع کر دیا جاتا تھا، معمولی جزوی فرق کے ساتھ صحاح ستہ کی ترتیب اسی وضع ونہج پر ہے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ صحابہ کے عنوان پر حدیثوں کی تخریج کی جاتی تھی، یعنی ایک صحابی کی تمام مرویات ایک جگہ ذکر کی جاتی تھیں، چاہے ان کا تعلق کسی مسئلے اور کسی باب سے ہو، مثلاً حضرت ابوبکرؓ سے جو حدیثیں روایت کی گئی ہوتی تھیں وہ ایک جگہ مذکور ہوتی تھیں، پھر دیگر خلفاء راشدین اور عشرۂ مبشَّرہ کی حدیثیں ہوتی تھیں، اس کے بعد باقی صحابہؓ کی حدیثوں کی تخریج کی جاتی تھی۔ علماء اسلام اور ائمۂ حدیث کی ان مساعیٔ حمیدہ وجمیلہ سے حدیث پاک کا تقریباً پورا ذخیرہ محفوظ ہوگیا۔ مُسنَد کے نام سے بے شمار کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ شہرت امام احمد بن حنبل - متوفی ۲۴۱ھ - کی مسند کو حاصل ہے، یہ سب سے زیادہ جامع مسند ہے، اور مرفوع احادیث کا اتنا بڑا ذخیرہ دوسری کسی کتاب میں موجود نہیں ہے، امام احمد سے پہلے نیز ان کے بعد بہت سے دوسرے محدثین نے بھی مسند کے نام سے کتابیں لکھیں، امام احمد بن حنبل کی مسند کے علاوہ جو بعض مشہور مسانید ہیں، ان میں مسند ابوداود طیالسی - متوفی ۲۰۴ھ -، مسند حمیدی - متوفی ۲۱۹ھ -، مسند ابن ابی عمر - متوفی ۲۴۳ھ -، مسند مسدَّد - متوفی ۲۲۸ھ -، مسند احمد بن منیع - متوفی ۲۴۴ھ -، مسند ابی بکر بن ابی شیبہ - ۲۳۵ھ -، مسند عبد بن حمید - متوفی ۲۴۹ھ -، اور مسند حارث بن ابی اسامہ - متوفی ۲۸۲ھ - ہیں۔

صحاح ستہ کے عالم وجود میں آنے کے بعد سے اہلِ علم اور اربابِ بحث وتحقیق کی ان کی طرف خاص توجہ رہی ہے، کسی حدیث یا شرعی دلیل کی تلاش وجستجو کے وقت صحاح ستہ ہی ان کا اولین اور اہم ترین مرجع اور ماخذ ہوتی ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی طے شدہ ہے کہ صحاح ستہ حدیث کے تمام ذخیرے پر مشتمل نہیں ہے، دوسری کتابوں میں بہت سی ایسی حدیثیں پائی جاتی ہیں، جو صحاح ستہ میں موجود نہیں ہیں، ان ذخیرۂ احادیث پر نگاہ ڈالنے کے بعد یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ صحاح ستہ میں احادیث نبویہ کا عشر عشیر بھی نہیں ہے، چنانچہ حدیثوں کے مدوَّن ہو جانے کے بعد بعض محدثین کی طرف سے یہ کوشش کی گئی کہ کچھ دوسری کتابوں کی ان حدیثوں کو جمع کیا جائے جو صحاح ستہ میں نہیں ہیں، اس چیز کا سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اہتمام حافظ ابوبکر نور الدین ہیثمی نے کیا، اور انھوں نے مجمع الزوائد کے نام سے ایک ایسی کتاب مرتب کی، جس میں انھوں نے مسند احمد، مسند ابویعلی - متوفی ۳۰۷ھ -، مسند بزار - متوفی ۲۹۲ھ -، اور امام طبرانی - متوفی ۳۶۰ھ - کی معجم کبیر، معجم اوسط اور معجم صغیر کی ان روایات کو جمع کیا، جو صحاح ستہ میں نہیں ہیں، چونکہ یہ مسانید ومعاجم احادیث نبویہ کے بہت بڑے ذخیرے پر مشتمل ہیں، اس لیے اس کتاب کا فائدہ یہ ہوا کہ ان روایات واحادیث کا بہت بڑا حصہ سامنے آگیا، جو صحاح ستہ میں نہیں ہیں، اور پھر جب صحاح ستہ کے ساتھ ان کو بھی سامنے رکھا جائے، تو احادیث نبویہ کا تقریباً پورا ذخیرہ نگاہ کے سامنے نظر آنے لگتا ہے، علامہ ہیثمی نے زوائد پر مجمع الزوائد کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، جو 'کشف الاستار' کے تعارف میں

ذکر کی جائیں گی۔

علامہ ہیثمی کے شاگرد حافظ ابن حجر عسقلانی نے زوائد کے کام کو مزید آگے بڑھایا، اور انھوں نے 'المطالب العالیه بزوائد المسانید الثمانیة' کے نام سے مسند ابوداود طیالسی، مسند حمیدی، مسند ابن ابی عمر، مسند مسدَّد، مسند احمد بن منیع، مسند ابی بکر بن ابی شیبہ، مسند عبد بن حمید اور مسند حارث بن ابی اسامہ کے زوائد کو جمع کیا، یعنی اِن کتابوں کی اُن روایتوں کو جمع کیا جو صحاح ستہ نیز مسند امام احمد میں نہیں ہیں۔ ان آٹھ کتابوں کے زوائد کے علاوہ حافظ ابن حجر نے مسند ابویعلی کی ان روایتوں کو بھی لے لیا، جو علامہ ہیثمی سے 'مجمع الزوائد' میں چھوٹ گئی تھیں، حالانکہ وہ صحاح ستہ کے زوائد میں سے ہیں، یعنی صحاح ستہ میں سے کسی میں ان کی تخریج نہیں کی گئی ہے؛ نیز ان کو مسند اسحاق بن راہو یہ -متوفی ۲۳۸ھ- کا بھی کچھ حصہ دستیاب ہو گیا تھا، جو پوری کتاب پر مشتمل نہیں تھا، حافظ ابن حجر نے اس کے زوائد کو بھی 'المطالب العالیه' میں شامل کرلیا، اس طرح کہنا چاہئے کہ حدیث شریف کی دس اہم کتابوں کے زوائد اس میں جمع ہو گئے ہیں۔ محدثین کی ان کاوشوں سے احادیث نبویہ مبارکہ کا نہایت عظیم الشان ذخیرہ حوادث زمانہ سے محفوظ ہو کر اہل علم کے استفادہ کے قابل ہو گیا ہے، حافظ ابن حجر نے مذکورہ بالا مسانید کے زوائد کا انتخاب کرنے کے بعد ان کو فقہی ابواب کے طرز پر مرتَّب کیا، یعنی ان کی ترتیب مسانید کے اعتبار سے نہیں رکھی، بلکہ ان کی وہ ترتیب رکھی جو احکام وشرائع سے متعلق تصنیف کی جانے والی حدیث کی کتابوں کی ہوتی ہے۔

المطالب العالیه کی اہمیت:

علامہ اعظمیؒ نے اس کتاب کی تحقیق کے وقت اس پر جو مقدمہ لکھا ہے، اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، کتاب کے مقام ومرتبے سے متعلق آپ کی عربی عبارت کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

> کتب احادیث میں 'المطالب العالیه' نہایت مفید اور کارآمد ذخیرہ وسرمایہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے یہ کتاب آٹھ مسانید کے زوائد پر حاوی ہے، اس کے علاوہ دو اور مسندوں کے زوائد کے خاص حصے پر مشتمل ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ اس کتاب کے ذریعے آٹھ- بلکہ مسند ابویعلی اور مسند اسحاق کو شامل کر کے دس- کتابوں میں بکھری ہوئی حدیثیں فقہی ترتیب پر جمع ہو گئی ہیں، اور اس لیے بھی کہ بہت سے مقامات پر حدیث کے درجے کا بھی بیان ہے کہ وہ صحیح ہے یا ضعیف، اور متصل ہے یا منقطع۔
>
> ہمارے زمانے میں اس کتاب کی قدر وقیمت اور بڑھ گئی ہے، اس لیے کہ مطالب کی حدیثیں جن کتابوں سے منتخب کی گئی ہیں، ان میں سے بیشتر ناپید اور دستبرد زمانہ کا شکار ہو چکی ہیں، لہذا جب ان کتابوں سے استفادہ کا کوئی امکان نہیں رہا، تو ضروری ہو گیا کہ اس بیش قیمت کتاب کی قدردانی اور حفاظت کی جائے، کیونکہ یہ کتاب ان کے- یعنی مسانید ثمانیہ کے- خلا کو پُر کرتی ہے۔

مطالب کے مخطوطات کی تلاش:

کتاب کی اسی اہمیت کے پیش نظر علامہ اعظمیؒ کے قلب میں اس کا شوق وولولہ تھا، اوران کواس کی جستجو اور تلاش رہا کرتی تھی، آپ نے اپنے مقدمے میں ''**مخطوطات الكتاب**'' کے عنوان کے تحت جو کچھ لکھا ہے، اس سے آپ کے غیر معمولی اشتیاق اور تلاش وجستجو کا اندازہ ہوتا ہے، آپ کی عبارت کا حاصل یہ ہے:

> میں نے '**المطالب العالية**' کو ہندوستان اور حجاز کے کتب خانوں میں بارہا تلاش کیا، لیکن مجھے اس میں کامیابی نہیں ملی، ١٩٥٨ء میں مکتبہ سعیدیہ حیدرآباد میں اس کا ایک نسخہ دستیاب ہو گیا تھا، مگر وہ صرف کتاب کے نصف اول پر مشتمل تھا۔
>
> محقق کبیر سید سلیمان ندوی کے دسمبر ١٩٢٦ء کے ایک مضمون میں میری نظر سے گزرا تھا کہ اس کا ایک نسخہ مکتبہ محمودیہ میں موجود ہے، لیکن جب میں نے ١٩٦١ء اور ١٩٦٥ء میں اس کتب خانے کی زیارت کی، تو مجھے وہ نسخہ وہاں نہیں مل سکا۔ رجسٹر میں اس کے نام کے اوپر حرف ''م'' لکھا ہوا دیکھا، جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ مفقود ہے۔''

''جوینده یابندہ'' مشہور ہے، آپ کی کوشش رائگاں نہیں گئی، اور قسمت نے اس طرح یاوری کی کہ آپ کو اس کے دو نسخے دستیاب ہو گئے، ان نسخوں کی فراہمی کا شرف المکتبۃ العلمیۃ - مدینہ منورہ - کے مالک شیخ محمد سلطان نمنکانی کو حاصل ہوا، انھوں نے اپنی دریافت سے اس کتاب کے دو نسخے علامہ اعظمیؒ کے پاس ارسال کر دیے، ان میں سے ایک نسخہ سند کے ساتھ تھا، اور دوسرا اس سے معرّیٰ، شیخ نمنکانی کو ان دونوں نسخوں کی زیروکس ترکی سے حاصل ہوئی تھی۔

علامہ اعظمیؒ نے اُس نسخے کو جس میں سندیں مذکور نہیں تھیں، اپنے کام کی بنیاد بنایا، اوراس کے متون کی تحقیق وتصحیح کر کے اپنے تعلیقات وحواشی سے مزین اور آراستہ کیا، لیکن اس نسخے کو جو باسند تھا، یکسر نظر انداز نہیں کیا، بلکہ اس کی خصوصیات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، دونوں نسخوں کے درمیان مقابلہ کیا، اور بغیر سند والے نسخے میں نسخہ نویس یا سند حذف کرنے والے سے جو غلطیاں اور فروگزاشتیں ہو گئی تھیں، پوری جانفشانی اور عرق ریزی سے ان کی تصحیح واصلاح کی۔

اسی پر بس نہیں، بلکہ '**المطالب العالية**' ہی کے طرز پر اسی دور میں ایک اور کتاب بھی لکھی گئی تھی، یہ حافظ شہاب الدین احمد بن ابی بکر بن اسماعیل بن سلیم بوصیری **المتوفی ٨٤٠ھ** کی کتاب '**إتحاف السادة المهرة بزوائد المسانيد العشرة**' ہے، بوصیری کی اس کتاب کے بارے میں خیال یہ کیا جاتا ہے کہ وہ 'مطالب' کا چربہ ہے، کیونکہ بوصیری حافظ ابن حجر کے شاگرد ہیں، اور حافظ عراقی سے تحصیل علم میں حافظ ابن حجر کے ساتھ شریک رہے ہیں، بوصیری نے 'اتحاف' میں ان ہی کتابوں کے زوائد کو جمع کیا ہے، جن سے حافظ ابن حجر نے لیا ہے، پھر

'مختصر إتحاف السادة' کے نام سے اس کا ایک بغیر سند کا نسخہ بھی تیار کیا ہے، اس طرح 'مطالب' اور 'اتحاف' دونوں میں حد درجہ مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے، البتہ علامہ بوصیری نے حدیث کے درجات کو بیان کرنے اور ان پر صحت وسقم کا حکم لگانے کا کام حافظ ابن حجر سے زیادہ اہتمام کے ساتھ کیا ہے، جس کی وجہ سے یہ کتاب بھی بہت سی خصوصیات اور فوائد کی حامل ہوگئی ہے، لہٰذا علامہ اعظمیؒ نے اپنی تعلیقات میں 'اتحاف' کی خصوصیات اور بوصیری کے بیان کردہ فوائد کو بھی لینے کا پورا پورا اہتمام کیا ہے، جس سے اس کتاب کی افادیت میں چار چاند لگ گیا ہے۔

'مطالب' کی تعلیقات پر نگاہ ڈالنے والے کے سامنے یہ بات روز روشن کی طرح واضح اور آشکارا ہو جائے گی کہ علامہ اعظمیؒ نے اس میں نہ صرف 'مطالب' کے دونوں نسخوں اور 'اتحاف' کے فنی افادات کا مغز نکال کر رکھ دیا ہے، بلکہ اپنے وسعت علم ومطالعہ اور حیرت انگیز استحضار سے جو فنی نکات ذکر کیے ہیں، اس نے اس کتاب کو تحقیق وتعلیق کا خوبصورت مرقّع بنا دیا ہے۔

'مطالب' کے قلمی نسخوں کا تعارف:

علامہ اعظمیؒ کو 'مطالب عالیہ' کے جو دونوں قلمی نسخے حاصل ہوئے تھے، ان میں پہلا نسخہ جو سند کے ساتھ تھا، وہ ترکی کے کسی کتب خانے کے نسخے کی فوٹو کاپی تھا، اس کا خط مشرقی تھا، ۸۴/اوراق اور ۱۶۸ صفحات پر مشتمل تھا، ہر صفحے پر ۶۵ سطریں تھیں، سطریں بہت قریب قریب تھیں اور خط نہایت باریک تھا، چونکہ فوٹو کاپی اصل نسخے سے چھوٹے سائز میں بنائی گئی تھی، اس لیے تصویر صاف نہیں تھی، جس کی وجہ سے فوٹو کاپی کے حروف اصل سے بھی زیادہ باریک ہوگئے تھے، اور ان سب پر ستم یہ کہ یہ نسخہ اغلاط اور تصحیفات وتحریفات سے پُر تھا۔

علامہ اعظمیؒ نے اس نسخے کی یہ حالت بیان کر کے لکھا ہے کہ اس کے باوجود میں نے اس کتاب کی تحقیق میں اس نسخے کو پڑھنے اور اس کے فوائد کو اخذ کرنے کی مشقت وصعوبت برداشت کی۔

درحقیقت یہ ایک ایسا نسخہ تھا، جس کو کوئی غیر معمولی استعداد وصلاحیت اور اعلیٰ درجے کی مہارت رکھنے والا شخص ہی پڑھ سکتا تھا۔ اوپر جو اس کی کیفیت بیان کی گئی ہے، وہ علامہ اعظمیؒ کے مقدمے سے لی گئی ہے، آپ نے ۸/جولائی ۱۹۶۶ء کے ایک خط میں مولانا ابراہیم میاں کو بھی اس کی نسبت لکھا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خط کے اس حصے کو اس مقام پر نقل کر دیا جائے، ارقام فرماتے ہیں:

> ''آپ کو یاد ہوگا نمنکانی صاحب مدینہ منورہ میں جن نادر کتابوں کا فوٹو لائے تھے، آپ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ ان کے باب میں ان سے بات کیجیے، میں نے زبانی بھی بات کی تھی، اور واپسی کے بعد خط وکتابت بھی کرتا رہا، اب انھوں نے **المطالب العالية في زوائد المسانيد الثمانية للحافظ ابن حجر العسقلاني** کا فوٹو میرے پاس بھیج دیا ہے، کہ آپ اس کو ایڈٹ کر کے چھپوائیں، جو مجلس اس کو چھپوائے گی، اس سے کچھ نسخے لاگت کے داموں پر میں خرید لوں گا، کتاب رکھی

ہوئی ہے، ابھی میں نے ان کو کوئی جواب نہیں دیا ہے، کتاب کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ۸۶ ورق پر مشتمل ہے، ہر ورق میں دو صفحے، اور ہر صفحہ میں ۶۵ سطریں، حروف اس قدر باریک کہ خورد بین جو ہمارے پاس موجود ہیں، ان کی مدد سے بھی تمام الفاظ نہیں پڑھے جاتے، اس لیے جب تک کوئی بہت ہی ماہر آدمی اس کو پڑھ کر املا نہ کرائے گا، تنہا ایک آدمی اس کو نقل بھی نہیں کر سکتا''۔

اور پھر غالباً اسی نسخے کے متعلق ۱۹/ جمادی الاولی ۱۳۸۷ھ = ۲۶/ اگست ۱۹۶۷ء کو مولانا ابراہیم میاں کو لکھا ہے:

''**المطالب العالیہ** کی دوسری جلد جو پہلی سے بھی ناصاف، باریک اور مٹی مٹی سی ہے، اس کے لیے ایک وقت مقرر کر کے خود بدقت تمام پڑھتا ہوں، اور مولوی رشید احمد سلمہ سے لکھواتا ہوں، ۹۰/ صفحات سے زائد لکھے جا چکے ہیں، مگر ابھی اصل کے صرف ساڑھے چار ورق لکھے جا سکے ہیں''۔

یہ نسخہ کس کتب خانے سے حاصل کیا گیا تھا، یہ معلوم نہیں ہو سکا، علامہ اعظمیؒ نے ۱۸/۴/۱۳۸۶ھ = ۶/۸/۱۹۶۶ء کو مولانا ابراہیم میاں کو لکھا ہے:

''مولانا نمنکانی صاحب نے زبانی فرمایا تھا کہ میں کتاب کا عکس ٹرکی سے لایا ہوں، جو اوراق میرے پاس انھوں نے بھیجے ہیں، اس میں کسی کتب خانہ کا نام ونشان نہیں ہے، میں ان کو خط لکھ کر مزید تفصیل معلوم کروں گا''۔

یہ نسخہ ملا محمد بن ملا محمد فرید بن ملا محمد عثمان السلیمانی الافغانی کے ہاتھ سے جمادی الاخری ۱۱۱۰ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس نسخے کے تعارف کے آخر میں لکھتے ہیں:

وقد وقع الفراغ من نسخها على يد ملا محمد بن ملا محمد فريد بن ملا محمد عثمان السليماني الافغاني في جمادى الأخرى من شهور سنة (۱۱۱۰) عشرة ومائة والف للهجرة.

سند سے معرّیٰ نسخہ:

دوسرا نسخہ جو مجرّدہ یعنی سند سے معری تھا، وہ بھی ٹرکی ہی کی کسی لائبریری کا عکس تھا، مشرقی خط میں کتابت شدہ تھا، ۲۵۷/اوراق پر مشتمل تھا، ہر ورق میں ۲ صفحے تھے، اور ہر صفحے میں ۲۹ سطریں بہت باریک حروف میں تھیں۔

یہ نسخہ ۱۱۱۲ھ کا کتابت شدہ تھا، اور احمد بن عبدالقادر رفاعی نامی کسی شخص نے مقام ادلب میں اس کی کتابت کی تھی۔

علامہ اعظمیؒ نے دونوں نسخوں کے تعارف کے بعد لکھا ہے کہ ان دونوں نسخوں میں سوائے اس کے کوئی

فرق نہیں ہے کہ بعد والے نسخے سے سندیں حذف کردی گئی ہیں، اور صرف صحابی کا نام باقی رکھا گیا ہے، یہاں تک کہ روایت کے لیے "عن" وغیرہ کے جو الفاظ ہوتے ہیں، وہ بھی مذکور نہیں ہیں، اور غالباً اس کی مصلحت یہ ہے کہ بہت سی روایتیں "عن" کے علاوہ دوسرے الفاظ سے بھی ہوتی ہیں، جیسے "سمعت" یا "حدثني" یا "رأيت" وغیرہ۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ سند حذف کرنے والے نے حافظ ابن حجر کے بہت سے ضروری کلام کو بھی حذف کر دیا ہے، اور اپنی طرف سے "رفعه" کا لفظ بڑھا دیا ہے، باوجودیکہ اس کے بعد قال رسول الله کی عبارت موجود ہے، اہل علم جانتے ہیں کہ "رفعه" کا لفظ قال رسول الله کی جگہ پر استعمال ہوتا ہے، اسی طرح بہت سی موقوف روایتوں سے پہلے بھی "رفعه" لکھ دیا ہے، جو سراسر غلط ہے۔

تحقیق کا منہج:

علامہ اعظمیؒ نے اپنے مقدمے میں "طريقة تحقيق الكتاب" کے عنوان سے اپنی تحقیق کے منہج کو خود ہی بیان کر دیا ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱- آپ نے پہلا کام یہ کیا کہ جدید طرز اِملا و کتابت کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے بغیر سند والے نسخے کا ایک مبیَّضہ تیار کرایا۔

۲- ہر حدیث پر شروع سے آخر تک مسلسل نمبر دیا۔

۳- باسند نسخے کا بغیر سند والے نسخے سے مقابلہ کیا اور دونوں کے درمیان فرق کو واضح کیا، اور بے سند والے نسخے سے حافظ ابن حجر کی جو عبارتیں حذف کر دی گئی تھیں، باسند نسخے کی مدد سے ان کو شامل کیا، یا جن عبارتوں کو مختصر یا مجمل چھوڑ دیا تھا، ان کی توضیح کی۔

۴- کتاب کی حدیثوں کا علامہ بوصیری کی 'مختصر إتحاف السادة المهرة' سے مقابلہ کیا، اور اس کی تصحیح و تصویب میں اس سے مدد لی، اور بوصیری نے حدیثوں پر جو حکم لگایا ہے، اس کو اہتمام سے حواشی میں نقل کیا، اور بوصیری نے کہیں سکوت اختیار کیا ہے، تو اس حدیث پر حاشیے میں لکھ دیا کہ سكت عليه البوصيري.

۵- حدیثوں کے درجات و مراتب کو بیان کیا ہے، اور اس کے لیے درج ذیل وسائل سے کام لیا ہے:

الف) اگر نسخہ نویس نے مجرَّدہ سے حافظ ابن حجر کے کلام کو حذف کر دیا ہے، تو مسندہ سے لے کر اس کو شامل کیا ہے۔

ب) بوصیری نے 'اتحاف' میں حدیث پر جو حکم لگایا ہے، اس کو نقل کیا ہے۔

ج) ہیثمی نے 'مجمع الزوائد' میں حدیث کی صحت یا عدم صحت کے سلسلے میں جو کلام کیا ہے، اس کو نقل کیا ہے، 'مجمع الزوائد' کے لیے اختصار کے واسطے 'الزوائد' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

د) کسی حدیث پر اگر ان دونوں محدثین میں سے کسی نے کلام نہیں کیا ہے، تو علامہ اعظمیؒ نے اس کی سند کے مرفوع یا موقوف، مُرسَل یا موصول ہونے کو بیان کیا ہے، اور کتبِ رجال کی مدد سے اس کے رجال پر کلام کیا ہے، کبھی نشاط کی کمی ہونے کی وجہ سے اس کو چھوڑ بھی دیا ہے۔

۶- اصل کتاب میں حدیث کا جو حوالہ دیا گیا ہے، اس کے علاوہ بھی کسی کتاب میں اگر وہ حدیث ملی ہے، بالخصوص اگر وہ 'مجمع الزوائد' میں ہے، تو اس کے حوالے کا التزام کیا گیا ہے، اور حتی الامکان یہ کوشش کی گئی ہے کہ حوالے اصل ماخذ سے دیے جائیں، لیکن اگر اصل ماخذ دستیاب نہیں ہے، یا وہاں تک رسائی ممکن نہیں ہے، تو بعد کے مجموعوں مثلاً کنز العمال وغیرہ کے حوالے دیے گئے ہیں۔

۷- اگر کتاب میں کوئی ایسی حدیث آ گئی ہے، جو اس کی شرط کے مطابق نہیں ہے، یعنی وہ حدیث صحاح ستہ یا مسند احمد میں سے کسی میں موجود ہے، تو اس کی وضاحت اور اس پر تنبیہ کی گئی ہے۔

۸- مختصر تعلیقات وحواشی کے ذریعے حدیثوں کے غیر مانوس اور مبہم الفاظ کی تشریح وتفسیر کی ہے، اور بوقت ضرورت راویوں کا تعارف بھی کرایا ہے۔

۹- قاری کی آسانی اور سہولت کے لیے اس کتاب میں یہ طریقہ اختیار کیا ہے، کہ ہر اس حدیث پر جو صحیح ہو، یا جس کے رواۃ ثقہ ہوں، اس کے نمبر سے پہلے ایک چھوٹا سا ستارہ بنا دیا گیا ہے، تا کہ قاری کو اول وہلہ میں ہی اس کے صحیح ہونے کا علم ہو جائے۔ حدیثوں کی صحت کا فیصلہ تعلیقات کی روشنی میں کیا گیا ہے، اور روایت کی تحسین وتصحیح میں جو اختلاف ہوتا ہے، اس سے تعرُّض نہیں کیا گیا ہے، اور کسی حدیث پر ستارہ نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ روایت مردود ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ روایت محتاج بحث وتحقیق ہے۔

۱۰- بعض روایتوں کے آخر میں یہ نشان (=) لگا ہوا ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے حوالے کا تعلق بعد والی روایت سے ہے، اور دونوں یا تینوں- جتنی روایتوں کے بعد علامت موجود ہو- روایتوں کا ماخذ ایک ہے۔

مذکورہ بالا امور سے یہ اندزہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اس کتاب کی تحقیق وتعلیق، اس کو قابلِ استفادہ بنانے اور اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچانے میں کس قدر کدوکاوش اور جگر کاوی کرنی پڑی ہے۔ علاوہ بریں اس کتاب پر آپ نے ایک نہایت بیش قیمت مقدمہ سپردِ قلم کیا، اور اس کو دو حصوں میں تقسیم کر کے کتاب کے مولف حافظ ابن حجر عسقلانی کے حالات تحریر فرمائے؛ اور دوسرے حصے میں کتاب کا تعارف، اس کی اہمیت اور مخطوطے کی دریافت اور اس نوعیت کی دوسری کتابوں کی حیثیت اور مقام پر مفصل گفتگو کی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی:

احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی بن احمد نام ونسب، کنیت ابوالفضل، اور لقب شہاب الدین ہے، آل حجر کی طرف نسبت کر کے ''ابن حجر'' کہا جاتا تھا، قبیلے کی طرف نسبت کر کے ''کنانی'' اور ساحل فلسطین کے ایک گاؤں کی

طرف نسبت کر کے ''عسقلانی'' کہا جاتا تھا، کیونکہ ان کے اجداد اصلاً عسقلان کے باشندے تھے، ابن حجر مصر میں تولد ہوئے اس لیے ''مصری'' اور قاہرہ منتقل ہو گئے تھے، اس لیے ان کے نام کے ساتھ ''قاہری'' بھی لکھا جاتا تھا۔ ابن حجر ۲۲/شعبان ۷۷۳ھ میں پیدا ہوئے تھے، اور ۲۸/ذی الحجہ ۸۵۲ھ میں قاہرہ میں وفات پائی۔

ابن حجر خوبصورت، سفید ریش، دبلے پتلے، شیریں زبان، اور بہت ذہین وزیرک تھے۔ ان کے والدین کم سنی میں وفات پا گئے تھے، اس لیے زکی الدین خروبی نام کے ایک بڑے تاجر نے بحیثیت وصی کے ان کی پرورش وپرداخت کی، پانچ سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوئے، اور ۹/برس کے سن میں قرآن کریم حفظ کر لیا، اور پھر کم عمری ہی میں متون کی بہت ساری کتابیں زبانی یاد کر لیں، اس کے بعد ان کو تاریخ اور شعر وادب کا شوق پیدا ہوا، اور ہر ایک میں کمال ومہارت حاصل کی، تحصیل علم وحدیث کے لیے مملکت اسلامیہ کے مختلف علاقوں کے سفر کیے، اور اس زمانے کے اجلہ اہل علم سے سند واجازت حاصل کی۔ تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد مختلف درس گاہوں میں درس وافادہ کی مسند کو زینت بخشی، تقریباً ۲۱/برس تک مصر کے منصب قضا پر فائز رہے۔

ابن حجر کا فضل وکمال اور تصنیف وتالیف میں ان کا مرتبہ وپایہ محتاج بیان نہیں ہے، پوری علمی دنیا میں ان کے علم ومعرفت کا سکہ چلتا ہے، حتی کہ اگر صرف ''حافظ'' کا لفظ بولا جائے، تو اس سے ابن حجر کے علاوہ کسی اور کی طرف ذہن نہیں منتقل ہوتا، اور متفقہ طور پر مطلقاً بولنے پر صرف ان ہی کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اسی سے 'المطالب العالیہ' کی قدر وقیمت کا اندازہ لگانا چاہئے کہ اتنے عظیم المرتبت محدث ومصنف اور حافظ حدیث کی عظیم الشان یادگار اور ان کی ترتیب وانتخاب ہے۔

علامہ اعظمیؒ کی تحقیق اور تعلیق وتحشیہ کے بعد یہ عظیم الشان سرمایۂ حدیث پہلی دفعہ کویت کے **المطبعة العصریه** میں طبع ہو کر حکومتِ کویت کی **وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية** سے ۱۳۹۰ھ=۱۹۷۰ء میں ۴ جلدوں میں اشاعت پذیر ہو کر اہل علم کے علمی ذوق کی آسودگی کا سامان بنا۔

☆......☆......☆......☆

المطالب العالية

مسندة

عمر کے آخری حصے میں جب کہ 'مصنف ابن ابی شیبہ' کی تحقیق کا کام جاری تھا، اسی وقت آپ نے 'المطالب العالیہ' کے مسند نسخے کا کام شروع کیا، اس وقت آپ کو کتب خانہ محمودیہ- مدینہ منورہ- کا نسخہ بھی دستیاب ہو گیا تھا۔ پہلے اس کو پورا نقل کرایا، پھر ترکی اور مدنی دونوں نسخوں کا مقابلہ کیا، اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی تعلیقات سپرد قلم فرمائیں، اس طرح اس با سند نسخے کے نصف سے زائد کی تحقیق کا کام انجام دے دیا تھا، مگر اجل نے تکمیل کی مہلت نہ دی، اور یہ عظیم الشان کام بھی- جس کی آپ کو شدید آرزو تھی- آپ کے ہاتھوں پورا ہونے سے رہ گیا۔

كشف الأستار عن زوائد البزار

المطالب العالية کے تذکرے میں لکھا جاچکا ہے کہ ''زوائد'' عموماً کسی کتاب کی ان حدیثوں کو کہتے ہیں، جو صحاح ستہ میں نہیں ہیں، لیکن کبھی بعض مصنفین ''زوائد'' کو الگ کرنے کے لیے صحاح ستہ کے ساتھ بعض اور کتابوں کو بھی شامل کرلیا کرتے ہیں، چنانچہ 'المطالب العالية' میں مسند امام احمد کو صحاح ستہ کے ساتھ رکھا گیا ہے، یعنی مسند امام احمد کو صحاح ستہ کے ساتھ شامل کر کے ان حدیثوں کو لیا گیا ہے، جو مسند ابوداود طیالسی اور مسند حمیدی وغیرہ میں ہیں، اور صحاح ستہ و مسند امام احمد میں نہیں ہیں؛ اور جو صحاح ستہ یا مسند احمد میں ہیں ان کو نہیں لیا گیا ہے۔

آٹھویں صدی ہجری کے محدثین میں ایک جلیل القدر امام اور ماہر حدیث حافظ نورالدین علی بن ابی بکر ہیثمی -۷۳۵ھ=۸۰۷ھ- تھے، انھوں نے مسند بزار کی ان حدیثوں کو ایک مجموعے میں جمع کیا، جو صحاح ستہ میں نہیں تھیں، اور اس کا نام 'كشف الأستار عن زوائد البزار' رکھا، مسند بزار حافظ ابوبکر بزار کی ایک اہم تصنیف ہے، جس میں انھوں نے مسند کی ترتیب پر حدیثوں کو جمع کیا ہے، ان کی یہ کتاب حدیث شریف کی اہم مدوّنات اور تصانیف میں شمار ہوتی ہے، بزار کی کتاب کا نام 'البحر الزخار' ہے، جس کو 'المسند المُعلَّل' بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ کسی حدیث میں اگر کوئی علت ہوتی ہے، تو امام بزار اپنی اس کتاب میں اس کی علت بھی بیان کرتے ہیں، 'بحر زخار' ضخیم کتاب ہے، اور اب ۱۳؍جلدوں میں شائع ہوچکی ہے۔

امام بزار:

'المسند المعلَّل' یا 'البحر الزخار' کے مصنف کا نام و نسب ابوبکر احمد بن عمرو بن عبدالخالق بصری ہے۔ ہدبہ بن خالد، عبدالاعلی بن حماد، حسن بن علی بن راشد اور عبداللہ بن معاویہ جمحی وغیرہ سے حدیثیں سنی ہیں؛ اور ان سے عبدالباقی بن قانع، محمد بن عباس بن نجیح، ابوبکر ختلی اور ابوالشیخ کے علاوہ بہت سے لوگوں نے حدیثیں روایت کی ہیں، مقام رملہ میں ۲۹۲ھ میں وفات پائی۔ حافظ ذہبی نے الحافظ العلامۃ کے لفظ سے ان کا ذکر کیا ہے(۱)۔

علامہ ہیثمی:

زوائد بزار یعنی 'کشف الاستار' کے مصنف کا نام و نسب علی بن ابی بکر بن سلیمان بن ابی بکر بن عمر بن صالح نورالدین ابوالحسن ہیثمی قاہری ہے، ۷۳۵ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کم عمری ہی سے اس زمانے کے عظیم المرتبت محدث و علامہ زین الدین عراقی کے دامن فضل و کمال سے وابستہ ہوگئے، اور ان کی صحبت سے خوب خوب فیض اٹھایا، حج اور دیگر اسفار میں ان کے رفیق سفر رہے، اور سفر و حضر کہیں بھی ان سے جدا

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ۲؍۲۰۴

نہیں ہوئے، ان ہی سے تربیت پائی، حدیث کا علم حاصل کیا، ان کے معتمد علیہ بن کر رہے، اوران کے مجالس درس واملا میں ان کے افادات وامالی کی کتابت کی، اس ممارست ومزاولت کا نتیجہ یہ ہوا کہ حدیث کے بہت بڑے عالم وحافظ کی حیثیت سے شہرت دوام حاصل کی، یہاں تک کہ علامہ عراقی کی صاحبزادی ہی سے آپ کا نکاح بھی ہوا۔

زہد وتقوی، محاسن اخلاق، مروت ومحبت، دینداری وخدا ترسی، عبادت وریاضت، سلامت طبع، مسلمانوں کی خیر خواہی، تحصیل علم میں محنت ومشقت اور جانفشانی، تحمل وبرداشت اور ملازمت شیخ جیسے اوصاف وکمالات میں نہایت بلند مقام کے حامل تھے، حافظ ابن حجر جیسے بلند پایہ عالم ومحدث کے استاذ وشیخ تھے، حافظ ابن حجر نے ان کی یوں مدح سرائی کی ہے:

كان هيِّناً ليِّناً خيِّراً ديِّناً مُحباًفي أهل الخير، لا يسأم ولا يضجر من خدمة الشيخ وكتابة الحديث، وكان سليم الفطرة، كثير الخير، كثير الاحتمال للأذى، خصوصاً من جماعة الشيخ، قرأتُ عليه الكثيرَ قريناً للشيخ، ومما قرأت عليه بانفراده نحوَ النصف من 'مجمع الزوائد' له، ونحوَ الربع من زوائد مسند أحمد ومسند جابر من مسند أحمد[1]۔

اورعلامہ سخاویؒ نے ان کی ثناخوانی کرتے ہوئے لکھا ہے:

وكان عجباً في الدين والتقوى والزهد، والإقبال على العلم والعبادة والأوراد، وخدمة الشيخ، وعدم مخالطة الناس في شيء من الأمور، والمحبة في الحديث وأهله، وحدَّث بالكثير رفيقاً للزين، بل قلَّ أن حدَّث الزين بشيء إلا وهو معه، وكذلك قلَّ أن حدَّث هو بمفرده، لكنهم بعد وفاة الشيخ أكثروا عنه، ومع ذلك فلم يُغيِّرْ حالَه، ولا تصدَّر، ولا تمشيَخ[2]۔

حافظ ہیثمی کی اواخر رمضان ۸۰۷ھ میں وفات ہوئی۔

حافظ نورالدین ہیثمی کو'زوائد' جمع کرنے سے بہت دلچسپی اور شیفتگی تھی، جس کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے متعدد کتابوں کے زوائد کو جمع کرنے کی غیر معمولی خدمت انجام دے کر امت محمدیہ پر زبردست احسان کیا، 'مجمع الزوائد' کے نام سے ان کا تالیف کردہ مجموعہ شہرۂ آفاق ہے، جس میں انھوں نے مسند امام احمد، مسند ابویعلی، مسند بزار اور طبرانی کی معاجم ثلاثہ-معجم کبیر، معجم اوسط اور معجم صغیر- کے زوائد کو جمع کیا؛ اسی طرح انھوں نے 'موارد الظمآن' کے نام سے صحیح ابن حبان کے زوائد کو جمع کیا؛ 'بغية الباحث' کے نام سے مسند حارث کے زوائد کو جمع کیا؛ حافظ ہیثمی کے ان ہی طلائی سلسلوں میں ایک 'كشف الأستار عن زوائد البزار' بھی ہے۔ حافظ ہیثمی کے ان کارناموں کے بارے میں علامہ اعظمیؒ نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ ان کا احسان تمام علماء حدیث کی گردنوں پر ہے کہ انھوں نے ان احادیث سے استفادہ کی راہ کو آسان بنادیا، جو صحاح ستہ میں نہیں پائی جاتی ہیں، اوردوسرے مجموعوں

(۱)إنباء الغُمر بأبناء العمر: ۲۵۶/۵-۲۶۰ (۲)الضوء اللامع: ۱۸۰/۵

میں موجود ہیں۔

’کشف الأستار‘ ایک نایاب کتاب تھی، اس کا مطالعہ اور اس سے استفادہ کا تصور اہلِ علم کے حاشیۂ خیال میں بھی آنا مشکل تھا، بلکہ اگر کہا جائے کہ بیشتر علمی دنیا اس کے نام سے بھی واقف اور آگاہ نہیں تھی، تو مبالغہ نہیں ہوگا؛ لیکن یہ علامہ اعظمیؒ کا حدیث نبوی کے ساتھ شغف، ان کا فضل وکمال اور بحث وجستجو کی کرشمہ سازی تھی کہ انھوں نے نہ صرف اس گوہرِ نایاب کو دریافت کیا، بلکہ اس کو گوشۂ گمنامی سے باہر نکال کر اور اپنے تعلیقات وحواشی سے آراستہ کر کے خرمنِ علم وفن کے خوشہ چینوں کے سامنے پیش کر دیا، اپنے مقدمے میں اس کی دریافت اور اس تک رسائی کی حکایت یوں قلم بند کی ہے:

وقد عثَرتُ صُدفةً على نسخة خطية من ’كشف الأستار‘ في غاية الجودة، فَعلِقتُ بقلبي، وعلِقتُ بها، وبذلتُ ما طلب صاحبها حتى اقتنيتها.

یعنی اتفاقاً مجھے ’کشف الاستار‘ کا ایک نہایت عمدہ قلمی نسخہ دستیاب ہوگیا، اس نے میرے دل کو موہ لیا، اور میں اس پر فریفتہ ہوگیا، اور منھ مانگی قیمت دے کر میں نے اس کو حاصل کیا۔

مقدمے کی عبارت سے یہ عقدہ نہیں کھلتا کہ یہ نسخہ آپ کو کہاں دستیاب ہوا تھا، اس کا سراغ ایک خط میں ملتا ہے، جسے آپ نے ۱۸؍ذی قعدہ ۱۳۸۵ھ = ۱۲؍مارچ ۱۹۶۶ء کو مولانا ابراہیم میاں کے نام لکھا ہے، اس میں تحریر ہے:

’’مکہ معظّمہ میں میں نے زبانی ذکر کیا تھا کہ جون پور کے ضلع میں ایک صاحب کے پاس ’سنن کبریٰ للنسائی کی دوسری جلد، اور ہیثمی کی ’زوائد مسند بزار‘ کا ایک نسخہ موجود ہے، سال بھر سے کوشش کر رہا ہوں کہ وہ ان دونوں کو ہمارے ہاتھ فروخت کر دیں، پہلے تو وہ بہت زیادہ دام مانگ رہے تھے، مگر اب امید ہے کہ یہ دونوں چیزیں چھ سات سو روپے میں دے دیں گے۔ ’زوائد مسند بزار‘ کامل ہے، مگر ’سنن کبریٰ‘ کا صرف نصف اخیر ہے‘‘۔

پھر ۸؍جولائی ۱۹۶۶ء کو مولانا ابراہیم میاں کو اس کی دستیابی کی خوش خبری سناتے ہوئے لکھا ہے:

’’دونوں نسخے بہت ہی عمدہ اور تاریخی ہیں‘‘۔

مخطوطہ کا تعارف:

علامہ اعظمیؒ نے اپنے مقدمے میں ’کشف الاستار‘ کے اس قلمی نسخے کا تعارف تفصیل کے ساتھ کرایا ہے، اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

والتي ظَفِرتُ بها، فهي نسخة مصحَّحة مقروءة على المولف الهيثمي، بخط مشرقي نسخي جميل لا يعرى من إعجام وضبط بالقلم في كثير من الكلمات، عدد

أوراقها ثمان مائة وست وثلاثون ورقة، مقاسها ۱۹ سنتيمر عرضاً، و ۲۶ ½ سنتيمتراً طولاً.

یعنی مجھے جونسخہ دستیاب ہوا، وہ ایک تصحیح شدہ نسخہ ہے، جو اس کے مولف علامہ ہیثمی کے پاس پڑھا گیا ہے، اور خوبصورت مشرقی خط نسخ میں لکھا ہوا ہے، بہت سے الفاظ پر نقطے لگائے گئے ہیں اور حرکت بھی ضبط کی گئی ہے، اس کے اوراق کی تعداد ۸۳۶ ہے، اس کا سائز ۱۹ سینٹی میٹر چوڑا، اور ۲۶½ سینٹی میٹر لمبا ہے۔

یہ نسخہ متعدد حفاظ حدیث کے پاس بار بار پڑھا جا چکا ہے، جیسا کہ اس کے حاشیے پر لکھی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے، جن حفاظ حدیث کے پاس اس نسخے کو پڑھا گیا ہے، ان میں ایک عثمان بن محمد دیمی ہیں۔

اس کی ایک خاص اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ حافظ ابن حجر عسقلانی کے زیر مطالعہ رہ چکا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی طرف بہ کثرت مراجعت کیا کرتے تھے، جیسا کہ کئی مقامات پر ان کے ہاتھ کی تحریر کردہ تعلیقات سے پتہ چلتا ہے۔

اس نسخے کی قدامت واصالت اور اسی کے ساتھ قدر وقیمت کا اندازہ علامہ اعظمیؒ کی اس عبارت سے ہوتا ہے:

وهذه النسخة انتسخها العالم الفاضل علي بن أحمد بن علي الحلبي الأصل، في رجب سنة ۷۸۰ في حياة المؤلف، ومن أصله فيما أرى، وكأن الناسخ حاول أن لا تختلف نسخته عن أصلها، فنسخها كما هي حتى إنه لم يُهمِل الأحاديث أو الأبواب المضروب عليها، بل نقلها، ثم ضرب عليها، وكذلک لم ينسخ في حاق الكتاب ما ألحقه المؤلف في الهوامش في نسخته، بل أبقاه في الهوامش، كما كان في الأصل.

یعنی اس نسخے کو عالم وفاضل علی بن احمد بن علی حلبی نے ۷۸۰ھ میں مؤلف کی زندگی میں اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان کے اصل نسخے سے نقل کیا ہے، اور بظاہر نسخہ نویس نے یہ کوشش کی ہے کہ ان کا نسخہ اصل سے مختلف نہ ہو، چنانچہ انھوں نے اس کو اسی طرح نقل کیا جیسا تھا، یہاں تک کہ ان احادیث اور ابواب کو بھی نہیں چھوڑا جن کو قلم زد کیا گیا تھا، بلکہ ان کو پہلے نقل پھر قلم زد کیا، اسی طرح مصنّف نے اپنے نسخے کے حاشیے پر جو حدیثیں لکھی تھیں، تو ان کو اصل کتاب میں نہ لکھ کر اصل کی طرح حاشیے میں باقی رکھا۔

نسخہ نویس کا مقام ومرتبہ:

علامہ اعظمیؒ نے نسخہ نویس کے بارے میں لکھا ہے کہ اصحابِ فضل وکمال میں تھے، اور ان کے فضل وکمال

کا اندازہ ان حواشی سے ہوتا ہے، جو کہیں کہیں انھوں نے حوالہ قلم کیے ہیں، چاہے ان حواشی کا تعلق کسی مبہم لفظ کی تشریح سے ہو، یا کسی عبارت کی توضیح سے۔ وہ اپنی تعلیقات کو کتبہ الحلبي لکھ کر ختم کرتے ہیں۔

یہ اہم اور بیش قیمت تاریخی نسخہ جب علامہ اعظمیؒ کو دستیاب ہوا، تو ممکن نہ تھا کہ اہل علم اس سے استفادہ سے محروم رہ جاتے، اور حدیث وکتبِ حدیث کی اشاعت کا شغف اس بیش قیمت سرمائے کی طباعت واشاعت کے لیے آپ کو مہمیز نہ کرتا، چنانچہ آپ نے اپنے صاحبزادے مولانا رشید احمد الاعظمی صاحب کے ذریعے اس کی ایک نقل تیار کرائی، اور اپنے عزیز اور خاص وحاضر باش شاگرد مولانا عبدالجبار صاحب علیہ الرحمہ کو مامور کیا کہ 'کشف الاستار' کی حدیثوں کو 'مجمع الزوائد' میں تلاش کریں، اور اس میں علامہ ہیثمیؒ نے متعلقہ احادیث پر جو کلام کیا ہے، اس کو 'کشف الاستار' کے حاشیے پر نقل کریں۔

جب اس کام سے فراغت ہوگئی، تو علامہ اعظمیؒ نے از اول تا آخر پوری کتاب پر نظر ثانی کر کے نسخہ نویس سے اگر کوئی غلطی ہوگئی ہے، تو اس پر متنبہ کیا، جو عبارتیں محتاج تفسیر وتشریح تھیں، ان کی تفسیر وتشریح کی، اور اگر ضرورت پڑی تو علامہ ہیثمی کے کلام کی تکمیل کی، اور بسا اوقات دوسرے مصنفین کی اغلاط پر بھی متنبہ کیا۔

علامہ اعظمیؒ اس کتاب کی تحقیق سے ۱۳۹۹ھ میں فارغ ہوئے، چنانچہ آپ نے مقدمہ سے فراغت کی تاریخ ۵/ جمادی الآخرہ ۱۳۹۹ھ تحریر فرمائی ہے، اس کا پہلا اڈیشن اسی سال یعنی ۱۹۷۹ء میں چھپ کر موسسۃ الرسالۃ بیروت سے اشاعت پذیر ہوا۔

☆......☆......☆

مجمع بحار الانوار

دین اسلام نے جب سے ہندوستان میں اپنا قدم جمایا اسی وقت سے حدیث وسنت کی تخم ریزی شروع ہوگئی تھی، ہندوستان کی زرخیز زمین نے بہت جلد اسلامی علوم وفنون کی خیرات وبرکات کو اپنے سینے میں جذب کر لیا، اور اس کے ثمرات کو ظاہر اور نمودار ہوتے دیر نہیں لگی، لیکن تاریخی حقائق وواقعات کے مطالعہ وتجزیہ کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ابتدائی چند صدیوں تک اس کا اثر ہلکا اور نقش دھندلا رہا، سرزمین ہند پر علم حدیث کے تعلق سے قابل ذکر سرگرمی کا آغاز نویں صدی ہجری کے اواخر سے ہوتا ہے، مشہور عالم دین وماہر تاریخ علامہ سید سلیمان ندویؒ اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

> ''علم حدیث کے ہندوستان میں فروغ کا حقیقی زمانہ نویں صدی ہجری کا خاتمہ اور دسویں صدی کا آغاز ہے''(۱)۔

اس کے باوجود ہندوستانی اہل علم اور محدثین کا علم حدیث کی اشاعت میں جو حصہ رہا ہے، اس کی تاریخ

(۱) ہندوستان میں علم حدیث: مقالات سلیمان ۲/ ۱۰

بہت روشن اور درخشاں ہے، یہاں پیدا ہونے اور پروان چڑھنے والے ارباب فضل وکمال نے جو تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں، ان کی فہرست طویل ہے۔ اس ملک کے علما کے قلم سے معرض تصنیف میں آنے والی کتابوں میں نہایت اہم اور مشہور کتاب **مجمع بحار الانوار في غرائب التنزيل ولطائف الأخبار** ہے، جو حدیث کا بے نظیر لغت ہے، اور اپنے موضوع پر شہرۂ آفاق ہے، جو نہ صرف احادیث شریفہ کے مشکل اور نامانوس الفاظ وکلمات کی شرح وتفسیر پر مشتمل ہے، بلکہ بہت سی عبارتوں اور دشوار ترکیبوں کی وجہ سے ایک حد تک ذخیرۂ احادیث کی شرح کی حیثیت رکھتی ہے۔

مصنّف کا تعارف:

'مجمع بحار الانوار' کے مولف ہندوستان کے مایہ ناز عالم ومحدث اور علم لغت کے ماہر علامہ محمد بن طاہر بن علی حنفی پٹنی گجراتی ہیں، ''پٹن'' میں جو گجرات کے صدر مقام احمد آباد سے تقریباً ۸۰ میل کے فاصلے پر ایک مشہور ضلع ہے، علی اختلاف الروایات ۹۱۳ھ یا ۹۱۴ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نسبی تعلق بوہرہ قوم سے تھا، آپ کے نام کے ساتھ ''صدیقی'' بھی لکھا جاتا ہے، لیکن یہ ثابت اور محقّق نہیں ہے، صحیح اور راجح یہی ہے کہ وہ بوہرہ قوم سے تھے، اور ان کے اسلاف جدید الاسلام تھے[1]۔

تعلیم وتربیت:

پٹن جس کا قدیم نام ''نہروالہ'' تھا، اس زمانے میں علم وفن کا مرکز اور گہوارہ تھا، اور بڑے بڑے جید الاستعداد اور ماہر اساتذۂ فن سے درس وافادہ کی مسندیں آراستہ تھیں، علامہ پٹنی نے جن اہل علم سے استفادہ کیا، ان میں ملا مہتہ، شیخ ناگوری، مولانا برہان الدین سمہودی اور مولانا یداللہ سوہی وغیرہ کے نام ذکر کیے جاتے ہیں۔ مولانا پٹنی نے علم کی تحصیل اس قدر جانفشانی وتن دہی سے کی، اور خاص طور سے علم حدیث میں وہ غیر معمولی استعداد ومہارت بہم پہنچائی کہ ان کے ہم عصروں میں اس علم پاک میں ان کا کوئی ہم سر اور ہم پلہ نہیں۔

علامہ پٹنی نے ۹۴۴ھ میں حرمین کے لیے رخت سفر باندھا، وہاں انھوں نے فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد کئی برس تک اقامت اختیار کی، اس وقت حرمین شریفین میں شیخ ابوالحسن بکری، احمد بن حجر مکی، علی بن عراق، شیخ جار اللہ بن فہد، شیخ عبید اللہ سرہندی، سید عبداللہ عیدروس اور شیخ برخوردار سندھی جیسے اساطین علم ومعرفت بساطِ علم وفضل بچھائے ہوئے تھے، علامہ پٹنی نے ان ارباب فضل وکمال کے خوان علم سے خوشہ چینی کی، لیکن سب سے زیادہ شیخ علی متقیؒ کے دامن تقدس سے وابستہ رہے، اور ان علما سے حدیث شریف کی اجازت وسند لینے کے علاوہ حضرت شیخ علی متقی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر خلعتِ خلافت سے سرفراز ہوئے[2]۔

علامہ پٹنی حرمین شریفین سے بے پناہ ظاہری وباطنی فیوض سے بہرہ مند ہونے کے بعد ۹۵۰ھ میں

(۱) دیکھیے سبحۃ المرجان: ۴۴، مآثر الکرام: ۱/۱۹۶، اتحاف النبلاء: ۳۹۸ (۲) زاد المتقین-قلمی-ص: ۱۸۷

مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔

علامہ پٹنی کی علمی ودینی سرگرمیاں:

حجاز سے واپسی کے بعد اپنی تمام تر کوشش علم دین بالخصوص علم حدیث کی اشاعت، اور بدعت وضلالت کی بیخ کنی کی طرف مبذول کردی، علم کو فروغ دینے کا کیسا جذبہ آپ کے اندر پایا جاتا تھا، اس کا اندازہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اس تحریر سے لگایا جاسکتا ہے:

''وے بوصیت شیخ سیاہی بجہتِ امداد طلبہ راست می کرد، ودروقت درس نیز بہ حل کردن آں مشغول می بود، تا دست نیز درکار باشد''[1]۔

اپنے شیخ کی وصیت کے مطابق اپنے ہاتھ سے روشنائی بنا کر طالب علموں کو مفت دیا کرتے، پڑھاتے وقت بھی ہاتھ سے سیاہی گھولا کرتے تاکہ ہاتھ بھی کام میں مشغول رہے۔

مولانا پٹنی کے دل ودماغ میں اشاعتِ علم کا ایسا شوق وولولہ اور طلبہ کی امداد واعانت کا اس قدر جذبہ کارفرما تھا کہ شیخ عبدالقادر حضرمی نے 'النور السافر' میں، اور ان کے حوالے سے ابن العماد نے 'شذرات' میں، نیز دوسرے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کو اپنے والد سے وراثت میں بہت سارا مال ملا تھا، مگر آپ نے اس کو طلب گاران علوم نبوت پر خرچ کردیا، آپ بچوں کے معلم سے کہلواتے کہ جو بچہ زیرک اور ہوشیار ہو، اس کو میرے پاس بھیج دو، بچہ آپ کے پاس آتا تو اس سے اس کی حالت دریافت فرماتے، اگر کوئی نادار طالب علم ہوتا، تو اس سے فرماتے کہ دل جمعی کے ساتھ تحصیل علم میں لگے رہو اور اپنے معاش کی طرف سے بےفکر رہو، تمھاری اور تمھارے اہل خانہ کی کفالت میرے ذمے ہے۔

مولانا پٹنی اور مقابلۂ بدعت وضلالت:

علامہ پٹنی کی قوم بوہرہ اسماعیلی شیعوں کے عقائد پر عمل پیرا تھی، لیکن اس فرقے کے کچھ لوگوں نے شیعیت سے تائب ہوکر اہل سنت کا طریقہ قبول کرلیا تھا، علامہ پٹنی اشاعتِ علم کے ساتھ اپنی قوم کی اصلاح اور ان کے اندر پھیلی ہوئی بدعت وضلالت کے ازالہ لیے بھی تاعمر جدوجہد کرتے رہے، حتی کہ اسی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کردیا۔

گجرات میں اس زمانے میں تحریک مہدویت کا بڑا زور تھا، اور اس نے بہت شورش برپا کر رکھی تھی، علامہ پٹنی نے اس کی بیخ کنی کے لیے پورا زور صرف کردیا، اور عہد کرلیا کہ جب تک یہ فتنہ سرزمین گجرات سے نیست ونابود نہیں ہوجاتا، اپنے سر پر عمامہ نہیں باندھیں گے، پھر جب مغل فرمانروا اکبر نے ۹۸۰ھ میں گجرات فتح کیا، تو علامہ طاہر سے ملاقات کر کے اپنے ہاتھ سے ان کے سر پر عمامہ باندھا اور کہا کہ دین کی مدد اور آپ کے

(۱) اخبار الاخیار: ۲۷۳

حسب منشا اس بدعت کا ازالہ ہمارے ذمے ہے، اس کے بعد اکبر نے اپنے رضاعی بھائی مرزا عزیز الدین کوکہ کو گجرات کا گورنر بنایا، مرزا عزیز نے شیخ کی مدد کی، اور جہاں تک ہوسکا اس بدعت کا ازالہ واستیصال کیا، لیکن جب مرزا عزیز کو اس کے منصب سے معزول کر دیا گیا، اوراس کی جگہ عبدالرحیم بیرم خاں گونر مقرر ہوا، تو مہدویت کے تن مردہ میں جان پڑ گئی، مہدویوں کے حوصلے بڑھ گئے، اور اپنے خفیہ ٹھکانوں سے باہر نکل کر دوبارہ سرگرم عمل ہو گئے۔ یہ رنگ دیکھ کر شیخ نے اپنا عمامہ پھر کھول دیا، اور اکبر سے ملنے کے لیے آگرہ کے سفر پر روانہ ہوگئے، مہدوی فرقے کے کچھ لوگوں نے پوشیدہ طور سے ان کا تعاقب کیا، اور موقع پا کر اجین کے علاقے میں ان کے اوپر حملہ کر کے ان کو شہید کر ڈالا، وہاں سے ان کا جسد خاکی پٹن لایا گیا، اور آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا، آپ کا واقعۂ شہادت ۹۸۶ھ میں پیش آیا[1]۔

علامہ پٹنی کا علمی مقام اوران کے فضل وکمال کا اعتراف:

علامہ محمد طاہر پٹنی کا مقام ومرتبہ ہندوستانی اہل علم بالخصوص زمرۂ محدثین میں بہت اونچا ہے، اہل علم کے نزدیک ان کی عظمت شان اور جلالتِ قدر مسلم ہے، اوراہل تاریخ وتذکرہ نے شاندار الفاظ وکلمات کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا ہے، "**ملک المحدثین**" اور "**رئیس محدثي الهند**" جیسے بلند آہنگ القاب سے کتابوں میں ان کا ذکر کیا گیا ہے، علامہ عبدالقادر حضرمی نے 'النور السافر' میں ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

كان على قدم من الصلاح والورع والتبحر في العلم[2].

وہ نیکی وپرہیزگاری اور تبحر علم میں بہت بلند پایہ تھے۔

نیز لکھا ہے:

وبرع في فنون عديدة وفاق الأقران، حتى لم يُعلم أن أحداً من علماء كجرات بلغ مبلغه في فن الحديث[3].

متعدد فنون کے ماہر اور اپنے ہم عصروں پر فائق تھے، یہاں تک کہ فن حدیث میں گجرات کے علما میں ہمارے علم میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ان کے مقام تک پہنچا ہو۔

مولانا عبدالحی لکھنوی نے نزہۃ الخواطر (۲۹۸/۴) میں ان کا تذکرہ ان شاندار الفاظ اور جملوں سے کیا ہے:

الشيخ العالم الكبير، المحدث اللغوي العلامة، مجد الدين محمد بن طاهر بن

(۱) اخبار الاخیار: ۲۷۳، شذرات ۸: ۴۱۰، النور السافر - اردو ترجمہ -: ۲۹۴، سبحۃ المرجان: ۴۴، مآثر الکرام: ۱۹۵، ابجد العلوم ۳: ۱۷۸، اتحاف النبلا: ۳۹۸، حدائق الحنفیہ: ۳۸۶، تذکرۂ علماء ہند: ۱۹۵، التعلیقات السنیۃ: ۱۶۵، نزہۃ الخواطر ۴: ۳۰۱-۳۰۰، اعیان الحجاج ۲: ۲۹۱، دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۱۹: ۴۴۰، رود کوثر: ۳۹۳-۳۹۲

(۲) النور السافر: ۴۷۵ (۳) ایضاً

علي الحنفي الفتني الگجراتي، صاحب مجمع بحار الأنوار في غريب الحديث، الذي سارت بمصنفاته الرفاق، واعترف بفضله علماء الآفاق.

اور عمر رضا کحالہ نے معجم المولفین (۱۰/۱۰۰) میں لکھا ہے:

محدث، مفسر، لغوي، صرفي، عارف بالرجال.

ان سب سے بڑھ کر علامہ محمد طاہرؒ پٹنی کی فضیلت یہ ہے کہ شیخ عبدالوہاب متقی کا بیان ہے کہ مجھ کو ایک بار آنحضرت ﷺ کی خواب میں زیارت حاصل ہوئی، میں نے سوال کیا: **یا رسول الله من أفضل الناس في هذا الزمان؟** (اس زمانے میں سب سے افضل شخص کون ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا: **أفضل الناس میاں غیاث، ثم شیخک، ثم محمد طاهر.** سب سے افضل میاں غیاث ہیں، پھر تمھارے پیر، پھر محمد طاہر(۱)۔

علامہ پٹنی کی تصنیفات:

آپ کا پایہ تصنیف وتالیف میں بھی نہایت بلند تھا، اور متنوع فنون پر متعدد مفید کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، ان کا شمار ان خوش قسمت مصنفین میں کیا جا سکتا ہے، جن کی تصنیفات سے علم وفن کی دنیا مسلسل خوشہ چینی کر رہی ہے، علامہ پٹنی کی کتابوں کی اہمیت وافادیت کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی سند نہیں ہوسکتی، جس کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار (ص:۲۷۳) میں لکھا ہے:

در علم حدیث توالیف مفیدہ جمع کرد (علم حدیث میں مفید کتابیں لکھیں)

علامہ پٹنی کی تصانیف میں شہرۂ آفاق حدیث کا وہ لغت ہے، جو اپنے موضوع کی جامع ترین اور بے نظیر کتاب ہے، اس کے علاوہ آپ کی اور بھی کئی ایک کتابیں ہیں، جن میں سے بعض مطبوع اور دستیاب ہیں، اور بعض ایسی ہیں، جو ابھی تک قلمی اور اہل علم کی دسترس سے باہر ہیں، تتبع سے آپ کی درج ذیل کتابوں کا پتہ چلتا ہے:

۱-مجمع بحار الانوار في غرائب التنزيل ولطائف الأخبار، ۲- تذكرة الموضوعات، ۳-قانون الموضوعات، ٤- تلخيص خواتم جامع الأصول، ٥-المغني في ضبط أسماء الرجال، ٦- رسالة في لغات المشكوٰة، ۷- كفاية المفرطين شرح الشافية، ۸- تعليق الترمذي، ۹- المشبهات، ۱۰- تبويب مقاصد جامع الأصول، ۱۱- رسالة تحفة الولاة ونصيحة الرعية والرعاة.

اس فہرست کی اول الذکر پانچ کتابیں مطبوع ومتداول ہیں، چھٹی کتاب 'لغات المشکوٰۃ' کا تذکرہ علامہ اعظمیؒ نے اپنے ایک مضمون -ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات- میں، اور ڈاکٹر زبید احمد نے 'عربی ادب میں ہندوستان کا حصہ' (ص۲۸۲) میں کیا ہے، آخر کی پانچ کتابوں کے نام 'گجرات کے علماء حدیث وتفسیر' پر اعتماد کر کے درج کیے گئے ہیں۔

(۱) اخبار الاخیار: ۲۷۲، اعیان الحجاج ۲: ۲۲۰

مجمع بحار الانوار:

اس کی نسبت محدث دہلویؒ نے فرمایا ہے:

''از انجملہ کتابے است کہ متکفل شرح صحاح ستہ مسمی بمجمع البحار''۔ یعنی ان کی تصانیف میں 'مجمع البحار' نامی کتاب ہے، جو صحاح ستہ کی شرح کی ضرورت پوری کرتی ہے۔

اور محدث الاعظمیؒ اس کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''آپ نے علم حدیث میں کئی مفید کتابیں تالیف فرمائی ہیں، ان میں سب سے بہتر اور اس فن کی دوسری بہت سی کتابوں سے فائق کتاب 'مجمع البحار' ہے، وہ بظاہر لغت حدیث کی کتاب ہے، مگر درحقیقت اس کو پوری صحاح ستہ کی شرح وتوضیح کہنا چاہئے''(۱)۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کتاب پر اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ اللہ رب العزت نے مصنف کی اس کاوش کو شرفِ قبول بخشا، اور اہلِ علم میں اس کو مقبولیت عطا فرمائی، چنانچہ جیسے ہی یہ کتاب معرض تصنیف وتالیف میں آئی، اہلِ علم کی توجہ کا مرکز بن گئی، اور اسی وقت سے اس سے استفادہ کا سلسلہ شروع ہوگیا، مصنف کی زندگی ہی میں اس کے نسخے رواج پذیر ہوکر دور دور تک پھیل گئے، چنانچہ اس کا ایک قلمی نسخہ لکھنؤ میں ہے، جو مصنف کی زندگی کا لکھا ہوا ہے، اور دوسرا حیدرآباد میں ہے، اور یہ بھی غالبًا ان کی حیات ہی کا لکھا ہوا ہے، اس کتاب کے ساتھ لوگوں کی دلچسپی کا یہ حال ہے کہ ہندوستان کا شاید ہی کوئی اہم کتب خانہ اس سے خالی ہو، اور شاید ہی کوئی علم کا شائق اور شیدائی ہو، جس کے پاس یہ کتاب نہ ہو، اور وہ اس کی طرف مراجعت اور اس سے استفادہ نہ کرتا ہو، اس کی شہادت وہ نسخہ دیتا ہے، جس کو ۱۲۸۳ھ میں لکھنؤ سے کتاب کی طباعت کے وقت اصل بنایا گیا تھا، اور یہ وہ نسخہ ہے جو ۱۰۱۹ھ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے سامنے لکھا گیا تھا۔

پھر جب پریس کا زمانہ آیا، تو لکھنؤ کے منشی نول کشور کو اہل علم کے واسطے اس کتاب کی ضرورت کا احساس ہوا، اور انھوں نے اس کی طباعت کا پختہ ارادہ کرلیا، چنانچہ انھوں نے مختلف شہروں میں اس کے نسخے تلاش کرائے، اور کافی رقم اس کے نسخوں کی فراہمی پر صرف کی، تا آنکہ ان کو اس کے چھ نسخے دستیاب ہوگئے، اس کے بعد انھوں نے مولانا محمد مظہر نانوتوی -متوفی ۱۳۰۳ھ = ۱۸۸۵ء- کو اس کے مقابلہ اور تصحیح کے لیے تیار کیا، اور مولانا مظہر ہی وہ شخص ہیں جن کو صحاح ستہ، مشکوۃ اور ان کی شرحوں کی طباعت کے بعد مجمع البحار کی طباعت کی ضرورت کا پہلے پہل احساس ہوا تھا، ان کے دل میں اس کتاب کی بہت قدر ومنزلت تھی، چنانچہ انھوں نے اس خدمت کو غنیمت سمجھا، اور اس فن سے متعلق دیگر کتابوں کی طرف مراجعت کرکے اس کے مقابلہ وتصحیح کی خدمت انجام دی۔

اس طرح پہلی مرتبہ یہ کتاب نول کشور کے سنگی پریس سے ۱۲۸۳ھ میں طبع ہوئی، جس کے بعد اس سے عام استفادہ کی صورت پیدا ہوگئی، پھر دوبارہ اسی پریس میں یہ کتاب ۱۳۱۴ھ میں چھپی، پھر اس کا تیسرا اور چوتھا اڈیشن بھی

(۱) اعیان الحجاج ۲/۲۱۸

منظر عام پر آیا، یہاں تک کہ پریس کمزور ہوتے ہوتے بند ہوگیا، اور اس کے نسخے نایاب اور ناپید ہوتے چلے گئے۔

نول کشور پریس کے بند ہو جانے کے بعد ایک عرصے تک یہ کتاب دوبارہ طبع نہ ہوسکی، جس کی وجہ سے اس سے استفادہ کی صورت بھی معدوم ہونے لگی، حجاز میں علامہ محمد طاہر پٹنی کے ہم وطن کچھ متمول اور اہل ثروت حضرات رہتے ہیں، جن میں قابلِ ذکر شیخ عبدالقادر نورولی ہیں، ان کے دل میں اس کتاب کی از سرِ نو اور عصر حاضر کے تقاضے کے مطابق تحقیق وتصحیح کے ساتھ طباعت کا خیال پیدا ہوا، اور اس کے اخراجات کے لیے سرمایہ لگانے کا حوصلہ ہوا، اس کام کے لیے انھوں نے مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی سے گفت وشنید کرکے ان سے اس کی تصحیح وتحقیق کی ذمہ داری کا بار اٹھانے کی درخواست کی، لیکن جب یہ کام انجام نہیں پا سکا، تو حضرت مولانا علی میاں نے علامہ اعظمیؒ سے اس کام کو اپنی نگرانی میں پورا کرنے کی درخواست کی، علامہ اعظمیؒ اس وقت اپنے دیگر علمی کاموں میں بے حد مصروف تھے، اس لیے آپ نے مولانا علی میاں سے فرمایا کہ اگر اس میں میرا کوئی معاون ہوتو اس کو قبول کرسکتا ہوں، پھر معاون کے طور پر مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی کو متعین کرکے مئو بھیجا گیا، علامہ اعظمیؒ نے اس کے نسخوں کی فراہمی کے لیے مولانا بلیاوی اور مولانا اقبال احمد - حال مقیم لندن - کو لے کر گجرات کا سفر کیا، اور وہاں اس کے نسخوں کو تلاش کیا، بالآخر دو قلمی نسخے - ایک کتب خانہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں اور دوسرا مصنف کے شہر پٹن میں - دستیاب ہوگئے، جس کے بعد مجمع کا کام شروع کردیا گیا۔ اسی سفر میں پٹن کے کتب خانہ سے آپ کو مسند حارث بن ابی اسامہ کا نسخہ دستیاب ہوا تھا، جس کو ایک متعین مدت تک کے لیے عاریت پر آپ لے آئے تھے، اور اس کی نقل کراکے واپس کردیا تھا۔

اس ضمن میں علامہ اعظمیؒ نے ۵/رمضان المبارک ۱۳۸۵ھ = ۲۸/دسمبر ۱۹۶۵ء کے ایک مکتوب میں مولانا ابراہیم میاں کو لکھا ہے:

''جدہ کے ایک پٹنی تاجر جو صاحبِ مجمع البحار کی قوم سے ہیں، انھوں نے کئی ہزار روپے 'مجمع البحار' کے نئے مصحَّحہ ایڈیشن کے لیے نکال دیے ہیں، اور علی میاں نے اس کام کی ذمہ داری لے لی تھی، مگر اب تک کچھ نہیں ہوا، اب بڑی لجاجت سے علی میاں نے مجھ سے اپنی نگرانی میں کام کرانے کے لیے کہا، چنانچہ اس بنا پر احمد آباد اور پٹن کا سفر ہوا تھا، کہ وہاں کے قلمی نسخوں کو دیکھ کر جو اہم ہوں، ان کو مقابلہ کے لیے حاصل کیا جائے، چنانچہ ایک نسخہ احمد آباد سے پانچ ہزار کی نقدی ضمانت پر مئو لایا گیا ہے، اور دو عالم مئو میں مقابلہ اور تصحیح میں مصروف ہیں، میں کسی کسی وقت ان کے کام کی دیکھ بھال کردیتا ہوں، یا ان کو جو پوچھنا ہوتا ہے پوچھتے رہتے ہیں''۔

اور خود مولانا علی میاں صاحب علیہ الرحمۃ نے ایک مکتوب میں آپ کو لکھا ہے:

''بڑے اصرار وخواہش سے آپ کو اس پر آمادہ کیا کہ 'مجمع بحار الانوار' کی اشاعت ثانیہ اور تصحیح کا کام اپنی نگرانی اور ماتحتی میں کروائیں، آپ نے اس کو قبول فرمالیا اور اس کا وعدہ فرمایا کہ آپ کسی صاحبِ علم سے اپنی نگرانی میں یہ کام لیں گے''۔

۱۹۶۵ءاور اس کے بعد کے کئی برسوں کے مولانا علی میاں کے ان خطوط میں جوانھوں نے علامہ اعظمیؒ کو لکھے ہیں 'مجمع بحار الانوار' اور اس کی طباعت وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے، یہ خطوط المآثر کے متعدد شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔

بہر حال علامہ اعظمیؒ نے اپنی شدید ترین مصروفیت میں سے وقت نکال کر اس کا محقَّق اور صحیح ترین اڈیشن تیار کر کے اس کو از سر نو اشاعت کے قابل بنا دیا، آپ نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے:

ولـم نـألُ جهداً في تصحيح الكتاب وعرضه مطابقاً لأصل المصنف، وإخراجه مزوَّداً بكل ما يتطلَّبه من الدقة والإتقان والأناقة.

ہم نے کتاب کی تصحیح میں، اس کو اصلِ مصنف کے مطابق بنانے میں، اور دقت رسی، عمدگی اور پختگی کے تقاضوں کے مطابق بنانے میں کوئی کوشش نہیں اٹھا رکھی۔

مجمع البحار کی خصوصیات:

علامہ اعظمیؒ نے اپنے مقدمے میں کتاب کی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، جس سے اس کتاب کا مقام اور اس کی اہمیت پوری طرح اجاگر ہو جاتی ہے، اس کی خصوصیات کو اختصار کے ساتھ سطور ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:

۱-مصنف نے 'نہایہ' یا علماء حدیث کے درمیان رائج الفاظ میں سے شاید ہی کسی لفظ کو چھوڑا ہوگا، نیز 'كتاب الغريبين' اور اس کے علاوہ دوسری کتابوں میں جو مفید مباحث ہیں، ان کو بھی شامل کر لیا ہے۔

۲-اپنے پیش رَو مصنفین کے مباحث کو شامل کرنے کے ساتھ عباراتِ حدیث کی ترکیبات اور لطائف ونکات کے بیان کا اہتمام کر کے نیا اضافہ کیا ہے۔

۳-غریب الحدیث کے موضوع پر لکھی جانے والی دوسری کتابوں میں صرف مفرد لفظ کی تشریح ہوتی ہے، مفہومِ حدیث کو سمجھنے کے لیے شروح حدیث کی ورق گردانی کرنا پڑتی تھی، مصنف علام نے متعلقہ احادیث کی بھی تشریح کی ہے۔

۴-بسا اوقات کسی لفظ کا معنی مشہور ہونے کی وجہ سے غریب الحدیث کے دیگر مصنفین اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں، لیکن حدیث میں کسی قسم کی تاویل کے ساتھ استعمال ہونے کی وجہ سے مصنف اس کو ذکر کرتے ہیں، پھر مستند مراجع سے اس کی تاویل سے متعلق اقوال نقل کرتے ہیں۔

۵-اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مصنف علام ایک لفظ ذکر کرتے ہیں اور اس کو ذریعہ بنا کر حدیث کی تشریح کرتے ہیں، جیسے کلمۂ "إلا" ہے، مصنف نے اس کا اضافہ کر کے ان احادیث کی تشریح کی ہے جن میں یہ کلمہ آیا ہے، اور وہ حدیثیں محتاجِ تشریح تھیں۔

۶- اس کتاب کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ابن الاثیر عموماً الفاظ کی حرکت ضبط نہیں کرتے، لیکن مصنف نے شاذونادر ہی اس کو چھوڑا ہوگا۔

۷- طلبہ کی آسانی کے لیے، یا یہ سوچ کر کہ یہ لفظ اسی طرح وضع ہوا ہے، اور کسی دوسرے لفظ سے مشتق نہیں ہے، بسا اوقات لفظ کو اسی طرح ذکر کرتے ہیں جس طرح حدیث میں آیا ہے، جیسے أجادب اور إثمد وغیرہ ہیں۔

۸- اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مصنف کسی مادے کے ان مشتقات کا اضافہ بھی کرتے ہیں، جو حدیث میں وارد ہیں، مگر ابن الاثیر وغیرہ نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے، مثال کے طور پر ابن الاثیر نے بـــــرأ کے مادے میں استبـرأ لـدینه کو نہیں ذکر کیا، مگر مصنف نے اس کو بیان کیا، اسی طرح **أبـرأ إلى الله** اور **فتُبـرئكم يهود** جیسے الفاظ کا استدراک کیا ہے۔

مختصر یہ کہ غریب الحدیث کی جامع ترین تصنیف اور متعدد کتابوں کا عطر مجموعہ ہونے کے ساتھ حدیث کے معانی اور مشکل مقامات کی ایک بہترین اور مفید شرح بھی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ 'مجمع البحار' نام کی ان کی ایک ایسی کتاب ہے جو صحاح ستہ کی شرح کی کفالت کرتی ہے۔

اور نواب صدیق حسن خان نے 'ابجد العلوم' (۱۷۹/۳) میں لکھا ہے:

"وهـو كتـاب متـفـق عـلـى قبوله، متداوَل بين أهل العلم منذ ظهر في الوجود، وبالله التوفيق.

اس کتاب کی مقبولیت متفق علیہ ہے، اور جب سے وجود پذیر ہوئی ہے اہل علم میں متداول ہے۔

سطور بالا سے اس کتاب کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت واضح ہوگئی ہوگی، اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس بلند پایہ کتاب کی طباعت و اشاعت فن حدیث کی کتنی بڑی خدمت تھی، جس کو علامہ اعظمیؒ نے اپنی شدید ترین مصروفیات کے باوجود وقت نکال کر انجام دیا، اور تصحیح و مقابلہ کے ساتھ تحقیق و تعلیق کے محاسن سے آراستہ ہو کر آپ کی توجہ اور نگرانی اور مولانا عبدالحفیظ بلیاوی کی محنت اور لگن سے یہ کتاب از سر نو طباعت و اشاعت کے قابل ہوئی۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کے لیے ایک مفصل اور مبسوط مقدمہ لکھا، جو تیرہ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں اس فن -غریب الحدیث- کی تاریخ، اس کے آغاز، اس کے اندر تصنیف و تالیف کی ابتدا، پھر تدریج و ارتقا، اس کی عہد بعہد تصنیفات اور علامہ ابن الاثیر جزری کے ہاتھوں اس کے منتہائے کمال تک پہنچنے کا جائزہ لیا ہے۔ بعد ازاں اس کتاب کا تعارف اور اس کی امتیازی خصوصیات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ علامہ پٹنی کی کتاب کی فضیلت کے ساتھ ساتھ اس فن کی تاریخ کے متعلق بہت اہم اور قیمتی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہ مقدمہ جب مولانا علی میاں ندوی کی نظر سے گزرا، تو ۲۱ر جمادی الثانیہ ۱۳۸۷ھ = ۲۶ر ستمبر ۱۹۶۷ء کے ایک مکتوب میں انھوں نے علامہ اعظمیؒ کو لکھا:

"ماشاء اللہ بڑا فاضلانہ مقدمہ ہے، اس فن کے ارتقا اور عہد بعہد تالیفات کا جائزہ لے لیا ہے،

کتاب کے خصائص مبصرانہ ہیں، انھیں تحقیقات وخصوصیات کی بنا پر میرے دل میں آپ کی جو قدر ومنزلت ہے، اس کو خدا جانتا ہے''۔

کئی سال کی شبانہ روز محنت اور عرق ریزی کے بعد یہ کتاب ۱۳۸۷ھ = ۱۹۶۷ء میں دائرۃ المعارف العثمانیہ-حیدرآباد- سے پانچ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی۔

☆......☆......☆......☆......☆

تلخیص خواتیم جامع الاصول

''ابن الاثیر'' نام سے مشہور تین بھائی گزرے ہیں، تینوں نے اپنی علمی وفکری جولانی کے لیے الگ الگ میدان کا انتخاب کیا، اور اپنے اپنے میدان میں تینوں کامل وماہر اور امام ہوئے۔ پہلے اور بڑے مجد الدین ابوالسعادات مبارک بن محمد بن محمد بن عبدالکریم بن عبدالواحد الشیبانی الجزری -۵۴۴ھ =۶۰۶ھ- تھے، یہ علم حدیث کے امام اور فقہ وغیرہ کے ماہر تھے؛ دوسرے عزالدین ابوالحسن علی بن محمد- ۵۵۵ھ =۶۳۰ھ- تھے، جو تاریخ وانساب میں منصبِ امامت پر فائز ہونے کے ساتھ حدیث میں بھی یدطولیٰ رکھتے تھے، **'الکامل فی التاریخ'**، **'لباب'** اور **'اسد الغابہ'** جیسی بے نظیر کتابوں کے مصنف تھے؛ تیسرے اور چھوٹے بھائی ضیاء الدین ابوالفتح نصر اللہ بن محمد- ۵۵۸ھ = ۶۳۷ھ- ادب وانشا کے فن میں امام اور نابغۂ روزگار تھے، **'المثل السائر في أدب الكاتب والشاعر'** جیسی یادگار کتاب ان کے خامۂ گہربار کا ثمرہ ہے۔

مجد الدین ابوالسعادات مبارک بن محمد نے دسیوں تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں، لیکن ان کی تصانیف میں **'جامع الأصول في أحاديث الرسول'** اور **'النهاية في غريب الحديث والأثر'** کو جو شہرت وقبولیت حاصل ہوئی، وہ کسی اور کو نہ حاصل ہوسکی، اور ان ہی دونوں کتابوں کی برکت سے ان کا نام قائم ودائم اور زندہ ہے۔

مجد الدین ابن الاثیر نے جامع الاصول میں صحاح ستہ کی حدیثوں کو جمع کیا ہے، اور صرف جمع کر دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ہر حدیث میں جو مشکل اور غریب الفاظ ہیں، ان کی تشریح کی ہے، معانی اور احکام کی بھی توضیح کی ہے، اور ان کے راویوں کا بھی تعارف کرایا ہے، اس کتاب کی نسبت یاقوت حموی نے لکھا ہے: **أقطع قطعاً أنه لم يُصنَّف مثلُه قط ولا يُصنَّف.** [1] (میں یقین کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ اس جیسی کتاب نہ لکھی گئی اور نہ آئندہ لکھی جائے گی) جامع الاصول ۱۴ر ضخیم جلدوں میں مصر سے شائع ہوچکی ہے۔

علامہ ابن الاثیر نے اپنی اس کتاب کو تین ارکان پر تقسیم کیا ہے: ۱-مبادی، ۲-مقاصد، ۳-خواتم۔

مبادی میں اصول حدیث کا بیان ہے؛ مقاصد میں احادیث کو جمع کیا ہے؛ اور خواتم کے دوسرے فن میں صحاح ستہ میں وارد اسماء والقاب وانساب کا تعارف کرایا ہے۔

---

(۱) معجم الادباء: ۱۷/۷۶

ہندوستان کے نابغۂ روزگار محدث ومصنف علامہ محمد طاہر پٹنی نے 'جامع الاصول' کے اس تیسرے حصے کا اختصار اور تلخیص کی ہے، جس میں اختصار کے ساتھ صحاح ستہ کے نہ صرف راوی بلکہ ان میں مذکور اور بھی بہت سارے ناموں کا سرسری تذکرہ اور تعارف پیش کیا گیا ہے۔

مقدمہ مولف کے بعد کتاب کا آغاز سید الانبیاء والمرسلین سرخیل پیغمبراں سرور دو جہاں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے تذکرے سے ہوا ہے، جو مختصر مگر بہت جامع اور پُر مغز ہے۔ یہ پہلی فصل ہے۔ اس کے بعد دوسری فصل میں دوسرے پیغمبروں کے تذکرے ہیں، جن میں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت ادریس علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل واسحاق علیہما السلام، حضرت یعقوب ولوط وموسیٰ وداود وسلیمان وعیسی وخضر علیہم السلام کے سرسری تذکرے ہیں، پیغمبروں کے تذکرے میں ان کے مبعوث کیے جانے اور دنیا میں آنے کی درمیانی مدت کو ذکر کرنے کا بھی اہتمام کیا ہے، جو اگرچہ حتمی اور یقینی نہیں ہے، لیکن اس کے لیے بڑی کتابوں کی ورق گردانی کے بعد ہی یہ معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

تیسری فصل میں صحابۂ کرام، تابعین عظام اور بعد کے لوگوں کا تذکرہ وتعارف ہے، اس فصل کو دو نوع میں تقسیم کیا ہے، پہلی نوع میں عشرہ مُبشَّرہ کا تذکرہ ہے، اور دوسری نوع میں باقی پوری کتاب آتی ہے، جس کے صفحات کی تعداد ساڑھے چار سو کے قریب ہے، اس نوع میں عشرہ مبشرہ کے ماسوا باقی دیگر صحابہ کرام اور دوسرے لوگوں کے تذکرے ہیں، ان کا ذکر مصنف علام نے حروف تہجی کی ترتیب پر کیا ہے، ہر حرف کے ضمن میں متعدد ابواب ہیں، اور ہر باب کئی قسموں پر مشتمل ہے، اور پھر ہر قسم کی بھی کئی فروع اور شاخیں ہیں۔ مثلاً:

حرف ہمزہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں ان لوگوں کو رکھا ہے، جو اپنے نام سے مشہور ہیں، اور پھر اس باب میں دو قسم کی ہے، پہلی قسم میں مَردوں کا تذکرہ ہے، اور اس میں بھی تین فرعیں ہیں: پہلی فرع میں صحابہ کا تذکرہ ہے؛ دوسری فرع میں تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں کے تذکرے ہیں؛ اور تیسری فرع میں کچھ متفرق تذکرے ہیں۔

دوسری قسم میں ان عورتوں کا تذکرہ ہے جو اپنے نام سے مشہور ہیں، جیسے ''اسماء'' اور ''امامہ'' وغیرہ۔

دوسرا باب کُنیٰ پر مشتمل ہے، اور اس میں بھی دو فرعیں ہیں، پہلی فرع میں صحابہؓ اور دوسری میں بعد کے لوگوں کا تذکرہ ہے۔

تیسرے باب میں وہ لوگ ہیں، جو ''ابن'' سے شہرت رکھتے ہیں، مثلاً: ابن ادریس وابن اسحاق وغیرہ۔

چوتھے باب میں ان لوگوں کو رکھا ہے، جو لقب سے مشہور ہیں، مثلاً: آبی اللحم، اخرم، اشج وغیرہ۔

اور پانچویں باب میں نسبت سے شہرت رکھنے والے لوگوں کا بیان ہے، مثلاً: ازہری، اسفرائینی، اور اسماعیلی وغیرہ۔

اسی طرح آخری حرف ''ی'' تک ہر حرف کے تحت متعدد ابواب اور ان کے تحت اقسام وفروع کر کے

ایک بڑی تعداد کا اجمالی تعارف پیش کر دیا گیا ہے۔

تلخیص اور تذکرہ کی دوسری کتابوں میں فرق:

رواۃ حدیث کے تذکروں پر عام طور سے جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، ان سے اس کتاب کا موضوع اور طرز ومنہج قدرے مختلف ہے، سرسری طور پر اس کی ورق گردانی سے جو فرق سامنے آتا ہے، وہ حسبِ ذیل ہے:

۱- سب سے پہلا فرق اس میں اور اسماء رجال کی دوسری کتابوں میں یہ ہے کہ ان کتابوں میں صرف راویوں کے تذکرے پر اکتفا کیا جاتا ہے، صحاح ستہ کے راویوں کے تذکرے میں اگر کتاب ہے، تو اس میں صرف کتب ستہ کے راوی ہوتے ہیں، یا کتب ستہ یا اور کسی کتاب کی قید نہیں ہوتی، تب بھی صرف رواۃ حدیث ہی مذکور ہوتے ہیں، لیکن یہ کتاب علما، محدثین اور اس دور میں استعمال ہونے والے بہت سے الفاظ واسماء پر مشتمل ہے، مثال کے طور پر:

(الف) اس کتاب میں بڑی تعداد ان محدثین کی ہے، جو صحاح ستہ کے مرتبین سے متاخر تھے، یا ان کے بعد دنیا میں آئے ہیں، جیسے:

☆...... ابراہیم بن محمد بن سفیان نیساپوری متوفی ۳۰۸ھ: امام مسلم کے شاگرد ہیں، اور ان سے صحیح مسلم کو روایت کیا ہے۔

☆...... ابراہیم بن محمد بن عبید دمشقی متوفی ۴۰۱ھ: کثیر الاسفار محدث تھے، اور دور دراز کا سفر کر کے حدیثیں لکھی ہیں، صحیح بخاری ومسلم کا اس قدر اہتمام تھا کہ أطراف الصحیحین پر کتاب مرتب کی تھی۔

☆...... احمد بن ابراہیم ابوبکر اسماعیلی متوفی ۳۷۱، ابوبکر احمد بن علی بن ثابت خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ، ابوالعباس احمد بن عمر بن سریج قاضی متوفی ۳۰۶ھ، احمد بن موسیٰ بن مجاہد متوفی ۳۲۴ھ، احمد بن محمد ابوحامد اسفرائینی متوفی ۴۰۶ھ، احمد بن محمد برقانی متوفی ۴۲۵ھ، امام ابومحمد حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ۔

ان تمام محدثین کے سنین وفات پر نگاہ ڈالنے سے ہی یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ حضرات اگر مصنفین صحاح میں سے کسی کے معاصر بھی ہیں، تو وفات کے لحاظ سے متاخر ہیں، یا پھر ولادت ووفات ہر لحاظ سے متاخر ہیں، اور راویانِ ستہ میں سے نہیں ہیں، مگر ان کے تعارف وتذکرہ سے بھی کتاب کو زینت دی گئی ہے۔

(ب) محدثین کے علاوہ دوسرے طبقے اور فن کے لوگوں کا بھی تعارف وتذکرہ کیا گیا ہے، مثلاً:

'مجمل اللغہ' کے مصنف ابوالحسن احمد بن زکریا بن فارس لغوی، 'صحاح' کے مصنف اسماعیل بن حماد جوہری نیساپوری متوفی ۳۹۳ھ، 'تہذیب اللغہ' کے مصنف ابومنصور الازہری، اور خلفاء میں ابوالعباس احمد المستظہر باللہ، ابوالعباس احمد بن اسحاق القادر باللہ متوفی ۴۲۲ھ، ابوالفضل جعفر المقتدر باللہ متوفی ۳۲۰ھ وغیرہ۔

(ج) بعض ایسے کفار ومشرکین کا بھی تعارف ہے، جن کا حدیث کی کتابوں میں نام مذکور ہے، مثلاً:

ابی بن خلف، امیۃ بن خلف، اسود عنسی، امیہ بن ابی صلت، اور جیسون غلام جس کو حضرت خضر نے قتل کیا تھا۔

(د) بعض اسلامی فرقوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، اوران کی وجہ تسمیہ بتائی ہے، مثلاً حروریہ اور خارجی وغیرہ۔

۲- علمی وتدریسی حلقوں میں کتب رجال میں سب سے زیادہ متداول کتاب حافظ ابن حجر کی تہذیب التہذیب اور تقریب التہذیب ہے، ان کتابوں کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے ان رجال کا تذکرہ ہے، جو اپنے نام سے مشہور ہیں، پھر کُنیٰ سے جولوگ مشہور ہیں، اس کے بعد ان لوگوں کا تذکرہ ہے، جو باپ یا ماں یا دادا وغیرہ کی طرف منسوب ہیں، اور ''ابن'' سے شہرت رکھتے ہیں، اس کے بعد جولوگ شہروں یا پیشوں یا القاب وغیرہ کی نسبت سے مشہور ہیں، اور آخر میں خاتون راویوں کا تذکرہ ہے۔

لیکن 'تلخیص' میں ہر حرف کے تحت مرد راویوں کو، عورتوں کو، جولوگ کنیت سے مشہور ہیں ان کو، یا جو اپنی نسبتوں سے معروف ہیں، ان کو ہر حرف کے تحت ہی ذکر کیا ہے۔

۳- راویوں کے تذکرے میں عموماً اختصار سے کام لیتے ہوئے ان کے مشہور شیوخ اور تلامذہ کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے، لیکن کہیں کہیں کسی راوی کے متعلق اقوال جرح وتعدیل بھی نقل کیے گئے ہیں۔

کتاب کی دریافت اوراس کی تحقیق:

علامہ اعظمیؒ نے اس کتاب پر اپنے مقدمے میں اس کی تحقیق کا محرک یہ بیان کیا ہے کہ وہ ۱۳۹۳ھ میں مکہ مکرمہ سے واپسی کے وقت شیخ محمد نورولی کے دولت کدے پر قیام پذیر تھے، شیخ محمد نورولی چونکہ علامہ محمد طاہر پٹنیؒ کے خاندان اور وطن سے تعلق رکھتے تھے، اس کی مناسبت سے علامہ پٹنی کے علمی کارناموں اور ان کی تصنیفات کا بھی ذکر آ گیا، ان کی تالیفات ہی کے ضمن میں اس کتاب کا بھی تذکرہ آیا، جس کو انھوں نے اپنی تنگیوں اور پریشانیوں سے جو اس وقت ان کو درپیش تھیں نجات حاصل کرنے کے لیے بطور وسیلہ کے تصنیف فرمایا تھا، اس تبادلۂ خیال کے بعد شیخ محمد نورولی نے اس کتاب کی طباعت واشاعت کا عزم کرلیا، اور علامہ اعظمیؒ سے درخواست کی کہ وہ خود ہی اس کام کی ذمہ داری قبول فرمالیں، آپ اس کے لیے آمادہ ہو گئے، اور وطن واپس آنے کے بعد کتاب کے قلمی نسخوں کی فراہمی کے لیے کوشاں ہو گئے۔

قلمی نسخے:

علامہ اعظمیؒ کے علم میں اس کتاب کے متعدد قلمی نسخے ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے تھے، جن نسخوں کا اپنے مقدمے میں تذکرہ کیا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

۱- رضا لائبریری رام پور کا نسخہ۔
۲- خدابخش لائبریری - بانکی پور، پٹنہ - کا نسخہ۔
۳- کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلما کا نسخہ۔

۴-مصنف کے شہر پٹن کا نسخہ۔

مذکورہ بالا نسخوں کو سامنے رکھ کر آپ نے اس کتاب کی تحقیق کی خدمت انجام دی، ان میں سے دوسرے اور تیسرے نسخے کے متعلق لکھا ہے کہ اغلاط سے بھر پور تھے، جس کی وجہ سے اس کی تصحیح وتصویب میں بہت محنت اور جانفشانی کرنی پڑی، اوران کو سامنے رکھ کر اپنے صاحبزادے مولانا رشید احمد صاحب سے ایک صاف ستھرا علاحدہ نسخہ تیار کرایا۔

ان قلمی نسخوں کے علاوہ آپ نے خدا بخش لائبریری سے 'جامع الاصول' کے رکن ثالث کے فن اول وثانی کی زیروکس بھی حاصل کی، جس سے تلخیص کے قلمی نسخوں کی تصحیح میں کافی مدد ملی، حالانکہ فوٹو کاپی کے سائز کے چھوٹے ہونے اوراس کے ناصاف اور کہیں کہیں حروف کے مٹے ہونے کی وجہ سے اس سے استفادہ آسان نہیں تھا، بہر حال اس مشقت وجانفشانی اور عرق ریزی کے بعد- کہ نہ صرف اصل نسخوں سے اس کا مقابلہ کیا گیا، بلکہ ابن الاثیر کی 'جامع الاصول' کے اصل نسخے سے بھی اس کی تصحیح میں مدد لی گئی- اس کتاب کو طباعت واشاعت کے لیے پریس کے حوالے کیا گیا، مگر افسوس کہ اس کے باوجود طباعت وکتابت کی بہت سی غلطیاں باقی رہ گئیں، جس کی وجہ سے اس کے آخر میں اغلاط نامہ لگانے کی بھی ضرورت پڑی۔

کتاب کا نام:

اس کتاب کے متعلق ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مصنف نے کہیں اس کے نام کی صراحت نہیں کی ہے، کسی مخطوطے پر اس کے نسخہ نویس نے اپنی طرف سے تَمَّ كتابُ التوسُّل لکھ دیا ہے، اور خدا بخش لائبریری کے نسخے پر یہ عبارت درج ہے: **هذه النسخة في أسماء رجال جامع الصحاح.** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف علام کو اس کے کسی نام پر استقرار اور ٹھہراؤ نہیں ہوسکا، اس کی تحقیق کے وقت علامہ اعظمیؒ نے اپنی طرف سے کوئی نام تجویز کرنا مناسب نہیں سمجھا، اور کسی نام کے بغیر کتاب کی طباعت واشاعت بھی نہیں ہوسکتی تھی، اس لیے آپ نے اس کے موضوع کو دیکھتے ہوئے '**تلخيص خواتم جامع الأصول**' کے نام سے شائع کیا۔

علامہ اعظمیؒ کے کام کی نوعیت:

اس کتاب کی طباعت واشاعت نہ صرف تذکرہ وتراجم بلکہ علم حدیث کی ایک بہت اہم خدمت ہے، اس کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر معرضِ اشاعت میں لانا ہی ایک بڑا اور قابلِ ذکر علمی کارنامہ ہے، اگر اس کتاب میں اور کچھ نہ کر کے صرف اس کے نسخوں کا مقابلہ اور تصحیح کر کے لائق اشاعت بنا دیتے، تب بھی ایک قابلِ قدر اور لائق تحسین وآفرین علمی خدمت ہوتی، چہ جائیکہ آپ نے اس پر حسبِ ضرورت تعلیقات اور فُٹ نوٹس لکھ کر اس کی افادیت کو دو چند کر دیا، اس کی تعلیقات پر غور کرنے کے بعد آپ کے کام کی نوعیت حسبِ ذیل نکات میں تقسیم کی جا سکتی ہے:

۱- تصحیح متن:

سب سے اہم مقصد جو آپ کے پیش نظر ہے، وہ کتاب کا صحیح اور اغلاط سے پاک نسخہ علمی دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے، آپ نے اپنی اصل توجہ اسی پر مرکوز رکھی ہے کہ اس کے قلمی نسخوں کے اندر جو اغلاط در آئی ہیں، ان کی اصلاح کر کے کتاب شائع کی جائے، اس کے لیے آپ نے کتاب کے نسخوں کے باہم مقابلہ کے علاوہ دوسرے مراجع سے بھی مدد لی ہے، ابن الاثیر کی 'جامع الاصول' کے رکن ثالث کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا، اس کے علاوہ تذکرہ وتراجم سے تعلق رکھنے والی بہت سی کتابوں سے مدد لی گئی ہے؛ مزید برآں آپ نے اپنے ذوق عربیت، قوت حافظہ اور وسعت مطالعہ سے بوقت ضرورت کام لیا ہے۔ تصحیح وتصویب سے تو پوری کتاب بھری پڑی ہے، یہاں ذوق عربیت سے تصحیح کی چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں:

(الف) صفحہ ۳ پر مقدمۂ مولف میں یہ عبارت ہے: **دام تـوفيـقـاً لإقامة فريضة الجهاد.** علامہ اعظمیؒ نے "توفیقاً" پر حاشیہ کا نمبر دے کر اس پر یہ تعلیق تحریر فرمائی ہے: **كـذا في الأصلين، ولعل الصواب موفقاً** یعنی دونوں اصلوں میں یونہی ہے، اور غالباً صحیح لفظ "موفقا" ہے۔

(ب) صفحہ ۴ پر یہ عبارت ہے: **وبـالإسداد بهذا الأمر إن شاء الله جدير.** اس میں **بالإسداد بهذا** پر حاشیہ تحریر فرمایا ہے: **كـذا في الأصلين ولعل الصواب "وبالانتداب لهذا"** یعنی دونوں اصلوں میں یہی ہے، غالباً صحیح **بالانتداب لهذا** ہے۔

(ج) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تذکرے میں صفحہ ۱۶ پر یہ عبارت ہے: **تـولـى الـخـلافة لثلاث عشر ربيع الأول الخ.** اس پر یہ حاشیہ تحریر فرمایا ہے: **كذا في الأصل، وينبغي أن يكون (لثلاث عشرة من ربيع الأول)** یعنی اصل میں یونہی ہے، مناسب عبارت یہ ہوگی: **لثلاث عشرة من ربيع الأول.**

۲- ناموں کی توضیح:

کتاب میں جو نام ذکر کیے گئے ہیں، اگر ان کے تعارف کے سلسلے میں کسی توضیح کی ضرورت محسوس کی ہے، تو اس کی توضیح کی ہے۔ اس کے لیے آپ نے دو طریقے اختیار کیے ہیں، کبھی تو متن ہی میں حاجزین کے درمیان میں اپنی عبارت کا اضافہ کر دیا ہے، اور اس طرح [..........] لکھ دیا ہے، مثلاً:

(الف) صفحہ ۷۷ پر ابوعبدالرحمن جبیر بن نفیر الحضرمی کے تذکرے میں یہ اضافہ کیا ہے: **[مـن كـبـار تـابعي أهل الشام، ذكره الطبري في طبقات الفقهاء]** یعنی اہل شام کے کبار تابعین میں سے تھے، طبری نے ان کو طبقات الفقہا میں ذکر کیا ہے۔

(ب) صفحہ ۹۹ پر ایک تذکرہ یوں ہے: **الـحسيـن بـن عبـدالـرحـمن الأشجعي، تابعي، قليل الـحديثِ روى عن سعد بن أبي وقاص، وقيل [إن اسمه] عبدالرحمن بن حسين.** اس تذکرے

میں حاجز ین میں إن اسمه کا اضافہ ہے،اس اضافے کے بعد پوری عبارت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حسین بن عبدالرحمٰن اشجعی تابعی ہیں، حدیث کم روایت کرنے والے ہیں سعد بن ابی وقاص سے حدیث روایت کی ہے، کہا جاتا ہے کہ ان کا نام حسین بن عبدالرحمٰن کے بجائے عبدالرحمٰن بن حسین ہے۔

اگر إن اسمه کا اضافہ نہ رہا ہوتا تو اس عبارت کا مطلب یہ بھی سمجھا جا سکتا تھا کہ حسین بن عبدالرحمٰن تابعی ہیں، حدیث کم روایت کرنے والے ہیں، سعد بن ابی وقاص سے اور کہا جاتا ہے کہ عبدالرحمٰن بن حسین سے حدیث روایت کی ہے، یعنی عبارت کے آخری حصے کا مطلب ہی بدل کر رہ جاتا۔

(ج) صفحہ ۱۱۹ پر ہے: **خالد بن دهقان الشامي من أهل دمشق، روى عن هانئ، قليل الحديث، لا بأس به، [روى عنه الأوزاعي وغيره].**

مذکورہ بالا مثالوں کے علاوہ صفحہ ۱۲۳ پر خولہ بنت ثامر، صفحہ ۱۲۹ پر الدونی، صفحہ ۱۳۶ پر ربیعہ بن سیف، صفحہ ۱۸۷ پر ام سعد، صفحہ ۲۵۹ پر عبدالحمید بن عبداللہ، صفحہ ۲۶۹ پر عبدالرحمٰن بن مل، صفحہ ۲۷۳ پر عبدالغافر، صفحہ ۲۷۴ پر عبداللہ بن بریدہ، صفحہ ۳۱۷ پر عمرو بن شعیب، صفحہ ۳۲۴ پر عاقب، صفحہ ۳۵۹ پر کریمہ بن ہمام کے تذکروں میں نہایت مفید اور اہم اضافے کیے ہیں، اور یہ محض وہ مقامات ہیں، جن میں اپنے ذوق یا وسعت مطالعہ کی مدد سے اضافہ کیا ہے، اور حاشیہ میں لکھ دیا ہے کہ زدتُه أنا، یا الإضافة مني۔ ان کے علاوہ وہ مقامات جہاں حاجز ین میں اضافہ ہے، لیکن حاشیہ میں لکھا نہیں ہے، یا جامع الاصول کی مدد سے جو اضافے کیے ہیں، تو ان کی تعداد بہت ہے۔

ناموں کی توضیح کے لیے حاشیے اور تعلیقات میں آپ نے جو عبارتیں تحریر فرمائی ہیں، وہ بہت کثرت سے ہیں۔ اس کی صرف چند مثالیں ہدیۂ ناظرین ہیں:

(الف) حضرت سعد بن ابی وقاص کی نسبت صفحہ ۱۸-۱۷ پر لکھا ہے: **أسلم قديماً.** آپ نے حاشیے میں اس کی وضاحت کی کہ **أي بيد أبي بكر.** اگر یہ وضاحت نہ ہوتی، تو کتاب میں درج تذکرے سے پتہ نہ چلتا کہ کس کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، اور متبادر یہی ہوتا کہ پیغمبر خدا ﷺ کے دست مبارک پر قبول اسلام کیا ہوگا، مگر ان چند لفظوں نے اس کی وضاحت کر دی۔

(ب) صفحہ ۲۲ پر **الأغر المزني**، ان کے بعد **الأغر بن يسار الجهني** کا تعارف ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے: **وجعل أبو موسى هذا وما قبله واحداً.** یعنی ابوموسی نے اغر بن یسار جہنی اور اغر مزنی کو ایک قرار دیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے ابوموسی کی تعیین کرتے ہوئے حاشیہ میں لکھا ہے: **يعني أبا موسى المديني.**

(ج) صفحہ ۲۳ پر امیہ کے تذکرے میں ہے: **والد يعلى الذي يقال له يعلى بن منية.** یعنی امیہ یعلی کے والد ہیں جن کو یعلی بن منیہ بھی کہا جاتا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے منیہ پر حاشیہ تحریر فرمایا: **هي أمه وأمية أبوه.** یعنی منیہ، یعلی کی والدہ ہیں اور امیہ ان

کے والد ہیں۔

(د) صفحہ ۲۸ پر ابراہیم بن محمد بن عبید دمشقی کے تذکرے میں ہے: **روى عنه أبو القاسم الطبري.** ابوالقاسم طبری پر حاشیہ لکھا کہ: **هو اللالكائي.**

اس قسم کے توضیحی حواشی سے پوری کتاب بھری ہوئی ہے، زیادہ مثالوں سے طوالت کا اندیشہ ہے، لیکن جی چاہتا ہے کہ اس کی چند اور مثالیں دے دی جائیں، جیسے:

(ہ) صفحہ ۷۷۳ پر معن کے تذکرے میں ہے: **هو معن بن عدي بن الجد وهو أخو عاصم، شهد بدراً وما بعدها والعقبة، وقُتِل في زمن الصديق شهيداً، وآخى بينه وبين زيد [بن] الخطاب، فقتلا معاً يومئذٍ.** یعنی معن بن عدی بن الجد، عاصم کے بھائی ہیں، بدر اور اس کے بعد کے غزوات نیز بیعت عقبہ میں شریک ہوئے، حضرت صدیق کے زمانے میں شہید ہوئے، (آنحضرت ﷺ نے) ان کے اور زید بن خطاب کے درمیان مواخات کرائی تھی، تو وہ دونوں اسی دن ایک ساتھ شہید ہوئے۔

اس میں **يومئذٍ** کے لفظ سے قطعاً پتہ نہیں چلتا کہ کب شہادت ہوئی تھی، علامہ اعظمیؒ نے حاشیہ میں یہ لکھ کر قارئین کے لیے آسانی پیدا کر دی کہ **يعني يوم اليمامة** کہ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے تھے۔

۳- ضبط اسماء:

بہت سے اسما خاص طور سے ان اسما کو ضبط کیا ہے، جن کی ادائیگی میں اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے، تو حاشیے میں بتلا دیتے ہیں کہ اس نام میں کون سے حروف ہیں؟ یا کون سا صیغہ ہے؟ ضبط اسم کی کئی نوعیتیں دیکھنے میں آتی ہیں:

(الف) حروف اور ان کی حرکت لکھ کر تعیین کرتے ہیں، مثلاً:

☆ صفحہ ۷۰ پر ثمامہ بن حزن القشیری میں حزن پر حاشیہ لکھا ہے: **بفتح المهملة وسكون الزاي ثم نون.**

☆ صفحہ ۷۱ پر ابوالجہم ثویر بن ابی فاختہ میں فاختہ پر لکھا ہے: **بمعجمة مكسورة ومثناة فوقانية.**

☆ صفحہ ۷۶ پر جندب بن عبداللہ بن سفیان البجلی العلقی ہے۔ العلقی چونکہ ایسا لفظ ہے جو کتابوں میں کم نظر آتا ہے، اس لیے حاشیے میں اس کی تعیین یوں کی ہے: **العلقي بفتحتين ثم قاف،** یعنی ''ع'' اور ''ل'' پر زبر ہے، پھر ''ق'' ہے۔

☆ صفحہ ۷۷ پر جعفر بن سلیمان الحرشی ہے، تو حرشی پر حاشیہ میں لکھا ہے: **بفتح الحاء المهملة والراء والشين المعجمة.**

☆ صفحہ ۸۶ پر حبشی بن جنادہ ہے۔ جن لوگوں کو راویوں کے نام کی تحقیق نہیں ہوگی، وہ اس کو زبر کے

ساتھ حَبشی پڑھیں گے، مغالطہ سے بچانے کے لیے علامہ اعظمیؒ نے اس پر حاشیہ لکھ دیا کہ **بضم أوله وسكون الموحدة**، یعنی یہ لفظ حَبشی نہیں بلکہ حُبشی ''ح'' کے پیش کے ساتھ ہے۔

یہ صرف چند مثالیں پیش کی گئی ہیں، ورنہ اس قسم کے علمی افادات سے پوری کتاب پُر ہے، یہ دیکھنے میں بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں، لیکن اہل علم- خاص طور سے وہ اہل علم جن کو اس قسم کے کام سے سابقہ پڑا ہو- سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کام کس قدر ذمہ داری کا حامل اور وسیع علم ومطالعہ کا متقاضی ہے۔

(ب) بہت سے اسما جو صیغۂ تصغیر کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں، ان کی وضاحت کی ہے، مثلاً:

☆ حسیل بن جابر کو حاشیہ میں لکھ دیا ہے: **بالتصغير.**

☆ حدیر بن کریب: دونوں- حدیر اور کریب- کی نسبت حاشیہ میں لکھا ہے: **مصغراً وكذا كريب.**

☆ عبداللہ بن زریر میں زریر پر لکھا ہے: **بتقديم الزاي مصغَّراً.**

☆ معاذ بن عبداللہ بن خبیب الجہنی میں خبیب پر لکھا ہے: **مصغَّراً أوله معجمة،** چونکہ ایسا شخص جس کو تحقیق نہ ہو، حَبیب پڑھ سکتا ہے، اس لیے واضح کر دیا کہ ''خ'' سے ہے اور اس پر پیش ہے۔

(ج) اگر کسی لفظ کے تلفظ میں اختلاف ہے، تو اس کو بھی ذکر کر دیا ہے:

☆ صفحہ ۲۰۱ پر صبیغ بن عسل تمیمی کا نام ہے، تو صبیغ پر لکھا ہے: **صَبِيغ بوزن عظيم آخره معجمة، ويقال بالتصغير، واقتصر في الجامع على الأول.** یعنی صَبیغ بروزن عظیم ہے جس کے آخر میں ''غ'' ہے، اور اس کو تصغیر کے ساتھ بھی بولا جاتا ہے، جامع الاصول میں پہلے قول پر اکتفا کیا ہے۔

☆ صفحہ ۵۵ پر بزیل نام کے ایک راوی کا ذکر ہے، اس پر حاشیہ میں لکھا ہے: **قال ابن الأثير: بزيل بضم الباء وفتح الزاي وسكون الياء تحتها نقطتان وباللام(جامع الأصول) ولم يذكر غير هذا، وفي النسخة المطبوعة من الترمذي (بديل) وضبطه المباركبوري بالدال، وذكره في الإصابة بالدال ثم قال: وقيل بالراء بدل الدال، وكلام ابن الأثير في جامع الأصول نص على أنه في نسخته من الترمذي (بالزاي) وفي المصورة أيضاً (بزيل).** یعنی ابن الاثیر نے جامع الاصول میں حرفوں کو ضبط کرتے ہوئے (بُزَيْل) لکھا ہے، اور ترمذی کے مطبوعہ نسخوں میں (بُدَيْل) ہے؛ اور مبارک پوری صاحب نے اس کو دال کے ساتھ ضبط کیا ہے؛ حافظ ابن حجر نے 'اصابہ' میں دال کے ساتھ (بُدَيل) لکھا ہے، پھر لکھا ہے کہ ''ر'' کے ساتھ بھی کہا جاتا ہے (بُرَيْل)۔ ابن الاثیر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ترمذی شریف کے ان کے نسخے میں (بُزَيْل) ہی ہے، اور 'جامع الاصول' کے عکسی نسخے میں بھی بُزَيْل ہی ہے۔

مذکورہ بالا امور کے علاوہ دیگر بہت سے اہم اور مفید حواشی سے یہ کتاب پُر ہے، جس میں راویوں کے نام، نسبت، سنین وفات، مقامات اور ان کے علاوہ بہت ساری بیش قیمت معلومات اس کے حواشی میں بکھری ہوئی ہیں، اور اس قدر اختصار کے ساتھ ان حواشی کو سپرد قلم کیا گیا ہے کہ دریا بکوزہ والی مثال اس پر پوری طرح صادق

آتی ہے۔

یہ کتاب مالیگاؤں کے علمی پریس اور ہمدم پریس سے چھپ کر شائع ہوئی۔ علامہ اعظمیؒ نے چار صفحات پر مشتمل ایک جامع مقدمہ بھی اس کے لیے ارقام فرمایا ہے۔

☆......☆......☆

کتاب الثقات

علامہ اعظمیؒ نے جن قلمی کتابوں کو اپنی تعلیقات سے سنوارا ہے، ان میں ایک اہم کتاب علامہ ومحدث ابن شاہین کی تصنیف کردہ 'کتاب الثقات' ہے، اس کتاب اور اس کے مصنف کا تعارف حسبِ ذیل ہے:

ابن شاہین:

تاریخ اسلام کے بلند پایہ اہل علم وکمال اور علوم اسلامیہ کے کثیر الروایۃ وعظیم المرتبت مصنفین میں سے ایک تھے۔ ان کا نام ونسب عمر بن احمد بن عثمان بن احمد بغدادی تھا، ابوحفص کنیت تھی، اور ابن شاہین کے نام سے شہرت حاصل ہوئی، مدینۃ السلام بغداد میں سکونت تھی، لیکن اصلاً صوبۂ خراسان کے شہر مرورود کے تھے۔ خطیب بغدادی نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے: وأصلنا من مرورُّوذ من كور خراسان(۱)۔

ابن شاہین کی ولادت صفر ۲۹۷ھ میں ہوئی، گیارہ سال کی عمر میں ان کو حدیث شریف کے سماع کا شرف حاصل ہو گیا تھا، ابوبکر محمد بن محمد باغندی، ابوالقاسم بغوی، محمد بن ہارون المجدر، شعیب بن محمد الذارع، ابوبکر ابن ابی داود کے علاوہ اس زمانے کے حفاظ حدیث اور اجلۂ اہل علم کی بڑی تعداد سے علم کی تحصیل وروایت کی۔ ابن شاہین سے حدیث روایت کرنے والوں میں ابوسعد مالینی، ابوبکر برقانی، ابوالقاسم تنوخی اور ابومحمد جوہری جیسے بلند رتبہ اہل علم وکمال ہیں۔ ابن شاہین نے علم حدیث کی تحصیل واکتساب کے لیے بصرہ اور شام وفارس کا سفر کیا۔ ان کو ''الواعظ'' بھی کہا جاتا تھا۔

ابن شاہین اہل علم کی نظر میں:

ابن شاہین کے سلسلے میں اہل علم اور اصحابِ جرح وتعدیل کے جو اقوال پائے جاتے ہیں، ان کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بسیار نویسی نے ان کو جرح وقدح اور نقد کا نشانہ بنا دیا تھا، ورنہ ابن شاہین فی نفسہ ثقہ اور معتبر راوی تھے، اور متعدد اہل علم نے ان کی توثیق وتعدیل کی ہے، چنانچہ:

ابوالفتح محمد بن ابی الفوارس نے کہا ہے: ثقة مأمون، صنَّف ما لم يُصنِّفه أحد(۲)۔ وہ ثقہ اور مامون تھے، اور جتنا انھوں نے لکھ دیا ہے کسی نے نہیں لکھا ہے۔

---

(۱) تاریخ بغداد ۱۱/۲۶۵ (۲) تاریخ بغداد: ۱۱/۲۶۷، تذکرۃ الحفاظ: ۳/۱۸۴، سیر اعلام النبلاء: ۱۶/۱۸۴

ابوالولید باجی نے ان کی توثیق کی ہے[1]۔ ابوالقاسم ازہری نے کہا ہے: **كــان ثــقـةً، عـنـده عـن البـغوي سبع مائة جزء**[2]. ثقہ تھے، ان کے پاس بغوی سے روایت کردہ سات سو اجزا تھے۔ یہ تذکرہ وسیر میں ہے، تاریخ بغداد میں ہے کہ سات یا آٹھ سو اجزا تھے[3]۔

دارقطنی کا باوجودیکہ ابن شاہین کی نسبت ایک سخت کلام ذکر کیا جاتا ہے، لیکن انھوں نے بھی توثیق کی ہے، حمزہ بن یوسف کہتے ہیں کہ میں نے دارقطنی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ: **ابـن شـاهـيـن يُلـح على الخطأ وهو ثقة**[4]. ابن شاہین کو اپنی غلطی پر اصرار رہتا ہے، مگر وہ ثقہ ہیں۔

محمد بن عمر داودی نے کہا ہے: **كـان ابـن شـاهـيـن شيـخـاً ثـقـة يُشبـه الشيوخ، إلا أنـه كان لحاناً**[5]. ابن شاہین شیخ تھے، ثقہ تھے، شیوخ کے مشابہ تھے، مگر غلطیاں کرنے والے تھے۔

اور علامہ مرتضی زبیدی نے ابن شاہین کو ان اہل علم میں شمار کیا ہے، جن کی تصانیف ان کی کرامت کی دلیل ہیں، اور جن کے لیے زمانے کے بساطیں لپیٹ دی گئی تھیں۔[6]

ابن شاہین کا مسلک:

علما کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن شاہین کسی خاص امام یا ان کی فقہ کے متبع اور پابند نہیں تھے، باوجودیکہ ان کو فقہ میں کوئی دسترس نہیں تھی، لیکن انھوں اپنے کو کسی خاص مذہب کا پابند نہیں بنایا تھا، اور داودی نے ان کی اس روش کو ایسے سلسلۂ کلام میں ذکر کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اس طریقے کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا، داودی نے اپنے مذکورہ بالا قول کے بعد متصلاً لکھا ہے: **وكـان أيضاً لا يعرف من الفقه لا قـليلاً ولا كثيـراً، وكـان إذا ذكـر لـه مـذاهب الفقهاء كالشافعي وغيره، يقول: "أنا محمدي الـمـذهـب"**[7]. وہ فقہ بالکل نہیں جانتے تھے، اور جب ان سے فقہا کے مذاہب مثلاً امام شافعی وغیرہ کا مسلک ذکر کیا جاتا، تو کہتے کہ ''میں محمدی المذھب ہوں''۔

ابن شاہین کی ایک کمزوری اور ان پر نقد:

ابن شاہین اپنی مسلمہ عدالت وامانت کے باوجود نقد سے بچ نہیں سکے، لیکن ان کے اوپر کی جانے والی نقد وجرح بظاہر ان کی بسیار نگاری اور زود نویسی کے نتیجے میں ہے، ان کے نوشتوں یا کتابوں میں غلطیاں واقع ہو جایا کرتی تھیں، اور وہ ان کی اصلاح نہیں کر پاتے تھے، جہاں تک میں نے غور کیا ہے، اسی چیز نے ان کو مورد طعن بنا دیا۔ داودی کا بیان ہے کہ دارقطنی نے کہا کہ ابن شاہین کا قلب کتنا تاریک ہے، میرے پاس اپنی وہ کتاب لائے جو تفسیر میں لکھی ہے اور مجھ سے اس کی غلطیوں کی اصلاح کرنے کو کہا، میں نے دیکھا کہ کئی جگہ ابوالجارود کی تفسیر کو نقل کیا ہے، اور **عـن أبـي الـجـارود عـن زياد بن المنذر** لکھا ہے، حالانکہ ابوالجارود ہی کا نام زیاد بن

(۱) سیر: ۴۳۳/۱۶ (۲) تذکرۃ وسیر (۳) تاریخ بغداد: ۲۶۸/۱۱
(۴) تاریخ بغداد: ۲۶۸/۱۱، تذکرۃ الحفاظ: ۱۸۴/۳، سیر: ۴۳۳/۱۶ (۵) تاریخ بغداد: ۲۶۷/۱۱
(۶) مقدمہ اتحاف السادۃ المتقین: ۲۷/۱ (۷) تاریخ بغداد وتذکرۃ الحفاظ وسیر اعلام النبلا

المنذر ہے[۱]۔

ابن شاہین چونکہ کثیر التصانیف تھے، اس لیے قوی امکان ہے کہ ان کو اپنے نوشتوں کو مقابلہ اور نظر ثانی کرنے کا موقع نہ ملتا رہا ہو، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خود اعتمادی کی وجہ سے وہ نظر ثانی نہیں کرتے تھے۔

داودی کہتے ہیں کہ میں نے ابن شاہین کو کہتے ہوئے سنا ہے: **أنا أكتب ولا أعارض** [۲]. میں لکھتا ہوں اور مقابلہ نہیں کرتا ہوں؛ اور برقانی کہتے ہیں کہ مجھ سے ابن شاہین نے کہا: **جميعُ ما خرَّجتُه وصنَّفتُه من حديثي لم أعارِضْه بالأصولِ -يعني ثقةً بنفسه فيما ينقله- قال البرقاني: فلذلك لم أستكثِرْ منه زهداً فيه**[۳]. میں نے جن حدیثوں کی تصنیف وتخریج کی ہے ان کا اصول سے مقابلہ نہیں کیا ہے -یعنی اپنی نقل پر اعتماد کی وجہ سے-، برقانی کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے میں نے ان سے زیادہ اکتساب کرنے سے پرہیز کیا۔

حافظ ذہبی نے ابن شاہین کے بارے میں نہایت نپی تُلی اور دوٹوک بات لکھی ہے: **ما كان الرجلُ بالبارع في غوامضِ الصنعةِ، ولكنه راويةُ الإسلامِ، رحمه الله**[۴]. ابن شاہین فن کی باریکیوں میں مہارت تو نہیں رکھتے تھے، لیکن وہ تاریخِ اسلام کے بہت بڑے راوی تھے، اللہ ان پر رحم فرمائے۔

ابن شاہین کی تصانیف:

ابن شاہین ایک کثیر التصانیف محدث وحافظ تھے، ان کا اپنا بیان ہے کہ میں نے تین سوتیس کتابیں تصنیف کی ہیں، ان میں سے ایک تفسیر کبیر ہے جو ایک ہزار اجزا میں ہے، اور ایک مُسند ہے، جس کے ایک ہزار تین سو اجزا ہیں، اور تاریخ ہے جس کے ایک سو پچاس اجزا ہیں، اور زہد پر ایک کتاب ہے جو سو اجزا میں ہے۔[۵]

ذہبی نے شیخ عماد الدین سے سن کر لکھا کہ ان کی تفسیر تقریباً تیس جلدوں میں ہے، ذہبی کے زمانے میں ان کی یہ تفسیر واسط میں موجود تھی[۶]۔

ناقدین، مورخین اور تذکرہ نویسوں نے ابن شاہین کے کثیر التصانیف ہونے کو خاص طور سے ذکر کیا ہے، ابن ابی الفوارس کا یہ قول اوپر گزر چکا ہے: **صنَّف ما لم يُصنِّفه أحدٌ.** ابن ماکولا نے ان کی نسبت کہا ہے: **هو الثقة الأمين، سمع بالشام، والعراق، وفارس، والبصرة، وجمع الأبواب والتراجم، وصنَّف كثيراً**[۷]۔

داودی کہتے ہیں کہ میں نے ابن شاہین کو فرماتے ہوئے سنا ہے: **حسبتُ ما اشتريتُ به الحبرَ إلى هذا الوقتِ فكان سبعَ مائة درهم.** (میں نے اب تک روشنائی خریدنے میں جو رقم لگائی ہے، اس کو شمار

---

(۱) تاریخ بغداد: ۱۱/۲۶۷ (۲) ایضاً: ۱۱/۲۶۸ (۳) ایضاً: ۱۱/۲۶۸
(۴) سیر اعلام النبلاء: ۱۶/۴۳۴ (۵) تذکرۃ: ۳/۱۸۴، سیر ۱۶/۴۳۲
(۶) تذکرۃ: ۳/۱۸۴، سیر: ۱۶/۴۳۴ (۷) تذکرۃ: ۳/۱۸۴، سیر: ۱۶/۴۳۲

کیا تو سات سو درہم ہوئے) خود داودی کہتے ہیں کہ ایک درہم میں ۴؍رطل روشنائی خریدا کرتے تھے۔ اور ابن شاہین نے جب یہ بات کہی تھی اس کے بعد بھی ایک مدت تک وہ بقید حیات رہے[1]۔

شیخ صبحی سامرائی نے اپنے مقدمے میں ابن شاہین کی حسب ذیل تصانیف ذکر کی ہیں:

۱-**المسند**: تیرہ سو اجزا پر مشتمل، ۲-**التفسیر الکبیر**: ایک ہزار اجزا میں تھی، ۳-**تاریخ أسماء الثقات**، ۴-**الضعفاء أو المجروحین**: سامرائی نے لکھا ہے کہ اس کا قلمی نسخہ مراکش میں سیدی یوسف کے کتب خانے میں محفوظ ہے، ۵-**معجم الشیوخ**، ۶-**الأفراد**: سامرائی نے لکھا ہے کہ اس کے ایک جز کا قلمی نسخہ مکتبہ ظاہریہ میں موجود ہے، ۷-**الترغیب في فضائل الأعمال**: سامرائی کی تحریر کے مطابق اس کا ایک قلمی نسخہ مکتبہ محمودیہ مدینہ منورہ میں، اور دوسرا مکتبہ محمودیہ مدراس میں ہے، ۸-**ناسخ الحدیث ومنسوخہ**: سامرائی نے لکھا ہے کہ اس کا ایک قلمی نسخہ پیرس میں ہے، ۹-**کتاب في أسماء الصحابة**.

ابن شاہین کی وفات ۱۲؍ذی الحجہ ۳۸۵ھ میں ہوئی[2]۔

کتاب الثقات:

ابن شاہین کی تصانیف میں ان کے سیرت نگاروں کے ہاں 'کتاب الثقات' کا صراحۃً تذکرہ نہیں ملتا، اور جہاں تک راقم نے تتبع کیا ہے، اس کو یہ اندازہ ہوا ہے کہ کسی بھی مورخ یا تذکرہ نویس نے ان کی تصانیف کو بالاستیعاب ذکر نہیں کیا ہے، صرف ان کی چند ضخیم یا مشہور کتابوں کے تذکرے ہی پر اکتفا کیا ہے؛ البتہ حافظ ابن حجر نے تہذیب وغیرہ میں جگہ جگہ کتاب الثقات کی عبارتیں نقل کی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان کے زیر مطالعہ رہی ہے، اور انھوں نے اس پر اعتماد اور اپنی تصانیف میں اس سے کافی حد تک استفادہ کیا ہے، ہاں عام طور پر مصنفین کے اس کا تذکرہ نہ کرنے سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب نادر الوجود تھی، اور خاص خاص اہل علم ہی کی اس تک رسائی تھی۔

کتاب الثقات کے قلمی نسخے:

دنیا کے مختلف کتب خانوں میں اس کے متعدد قلمی نسخے پائے جاتے ہیں، تین نسخوں کی نشان دہی شیخ صبحی سامرائی نے اپنے مقدمے میں کی ہے، پہلے نسخے کی نسبت شیخ سامرائی نے لکھا ہے کہ یہ قدیم نسخہ ہے، جس پر تاریخ کتابت اور نسخہ نویس کا نام درج نہیں ہے، اوراق کی تعداد ۸۸ ہے، اور اچھے خط میں ہے، اور یمن کی جامع کبیر میں محفوظ ہے۔

☆...... دوسرے نسخے کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ بھی یمن میں ہے، ۱۳؍رجب ۱۱۷۳ھ میں اس کی کتابت سے فراغت ہوئی ہے، اوراق کی تعداد ۶۱ ؍ہے، اور نسخہ نویس کا نام احمد بن یوسف بن حسین بن حسن بن منصور باللہ

(۱) تاریخ بغداد: ۱۱/۲۶۷، تذکرۃ: ۳/۱۸۴، سیر: ۱۶/۴۳۳ (۲) تاریخ بغداد: ۱۱/۲۶۸

القاسم بن محمد بن علی ہے۔

☆...... تیسرے نسخے کی نسبت انھوں نے لکھا ہے کہ جامعۃ الملک عبدالعزیز کی سینٹرل لائبریری میں محفوظ ہے اور بارہویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے۔

قاضی اطہر مبارک پوری صاحب نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ اس کا ایک نسخہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی لائبریری میں بھی ہے، اور لکھا ہے کہ وہ بمبئی والے نسخے سے نقل کیے گئے نسخے کی فوٹو کاپی ہے۔

اسی طرح شیخ صبحی سامرائی نے دوسرے نمبر پر جس نسخے کا تعارف کرایا ہے، اس کی اور بمبئی والے نسخے کی بھی اصل ایک ہی ہے، جیسا کہ بمبئی والے مخطوطے کے تعارف سے واضح ہو جائے گا۔

جامع مسجد بمبئی کا نسخہ:

اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں محفوظ ہے، یہ نسخہ بارہویں صدی ہجری کے نصف آخر کا کتابت کیا ہوا ہے، ۱۳؍رجب ۱۱۷۳ھ یکشنبہ کی شب کو اس کی کتابت سے فراغت ہوئی ہے، جیسا کہ اس کے آخر میں درج ہے، اس کے ناقل وناسخ احمد بن یوسف بن حسین بن حسن بن منصور باللہ القاسم بن محمد بن علی ہیں۔

نسخہ نویس کے مختصر حالات:

علامہ شوکانی نے 'البدر الطالع' (۱؍۱۲۸-۱۳۰) میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی ولادت ۱۱۲۰ھ کے بعد بتلائی ہے، لیکن زرکلی نے اعلام (۱؍۲۷۵) میں ان کا سن پیدائش ۱۱۱۱ھ لکھا ہے، یمن کے صدر مقام صنعا میں نشوونما پائی، علم حدیث کے ساتھ ان کو اس قدر اشتغال تھا کہ ان کا لقب ہی "الحدیث" پڑ گیا تھا، شوکانی نے ان کا تذکرہ ان الفاظ سے شروع کیا ہے: **المحقِّقُ العلامةُ المحدِّثُ البارعُ في علم السنة المشهورُ بحفظها وحفظِ رجالِها، حتى لُقِّب "الحديث" لغَلبتِه عليه.** اور زرکلی نے لکھا ہے: **فقيه زيدي يماني.** شوکانی نے لکھا ہے کہ تمام علوم آلیہ کے شناور تھے، علم ادب اور ولولہ انگیز قصائد کہنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور ایک صفحے پر مشتمل ان کا واعظانہ قصیدہ بھی نقل کیا ہے۔ خوش خلقی، تواضع اور فروتنی، تحمل اور برداشت، اور حلم ووقار میں مشہور تھے، آخر جمادی الاخری ۱۱۹۱ھ مطابق ۱۷۷۷ء میں وفات پائی اور صنعا میں مدفون ہوئے۔ ان کی ایک تصنیف **'تخريج مجموع الإمام زيد بن علي'** کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

راویانِ نسخہ:

'کتاب الثقات' کے شروع میں تسمیہ وتحمید وتصلیہ کے بعد یہ سند درج ہے: **أخبرنا الشيخ أبو عبد الله محمد بن أبي نصر بن عبد الله الحميدي رضي الله عنه قرأة عليه في منزله ببغداد قال: أنا الشيخ الإمام القاضي الشريف أبو الحسين محمد بن علي بن المهتدي بالله في الإجازة**

وغيره، عن أبي حفص عمر بن أحمد بن شاهين الواعظ رحمه الله.

ابن المہتدی باللہ:

ابن شاہین سے 'کتاب الثقات' کو روایت کرنے والے ابوالحسین محمد بن علی ہیں، ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بن علی بن محمد بن عبیداللہ بن عبدالصمد بن محمد بن المہتدی باللہ الہاشمی الخطیب۔ ''ابن الغریق'' کے نام سے مشہور تھے، کنیت ابوالحسین تھی، ابن شاہین کے علاوہ دارقطنی وغیرہ سے حدیث روایت کی ہے، اپنے زمانے کے سردارِ بنی عباس تھے، ان کی دین داری و پرہیزگاری کا چرچا تھا، بہ کثرت روزے رکھتے، جس کی وجہ سے ان کو ''راہب بنی ہاشم'' کہا جانے لگا تھا، خطیب بغدادی نے ان سے حدیث لکھی تھی، خطیب نے ان کی شان میں لکھا ہے: وكان فاضلاً نبيلاً، ثقةً صدوقاً. مدینۃ المنصور کے قاضی رہ چکے تھے۔ ۳۷۰ھ=۹۸۰ء میں ان کی ولادت اور یکم ذی الحجہ ۴۶۵ھ=۱۰۷۴ء میں ۹۵ برس کی عمر میں وفات ہوئی[1]۔

حمیدی:

ابن المہتدی باللہ سے اس کو روایت کرنے والے امام حمیدی ہیں، یہ وہ حمیدی نہیں ہیں، جو مُسنَد کے مصنِّف ہیں، اور جن کا مُسنَد حمیدی کے ذکر میں تعارف کرایا جا چکا ہے۔ اِن کا نام ابوعبداللہ محمد بن فتوح بن عبداللہ ابن حُمید بن یصل الحمیدی الاندلسی المیورقی ہے، تاریخ و تذکرہ کی بیشتر کتابوں میں ان کے حالات مرقوم ہیں، ذہبی نے 'تذکرۃ الحفاظ' (۱۷/۴) میں الحافظ الثبت القُدوة، اور سیر اعلام النبلاء (۱۲۰/۱۹) میں الإمام القُدوة الأثري، المُتقِن الحافظ، شيخ المحدثين جیسے الفاظ سے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ اصلاً قرطبہ کے تھے، اندلس میں جزیرہ میورقہ میں ۴۲۰ھ سے قبل پیدا ہوئے، اندلس میں علامہ ابن عبدالبر اور ابومحمد ابن حزم ظاہری وغیرہ سے حدیثیں سنیں، نیز مصر و شام اور عراق و حجاز وغیرہ کا سفر کر کے وہاں کے محدثین سے حدیثیں سنیں، اور بغداد میں طرح اقامت ڈالی۔

مورخین نے اپنی کتابوں میں حمیدی کی بہت تعریف کی ہے، ذہبی نے ابن ماکولا کا یہ قول نقل کیا ہے: لم أرَ مثلَ صديقِنا الحُميدي في نزاهته وعِفَّته ووَرَعِه وتشاغُلِه بالعلم[2]. صفدی نے لکھا ہے: وكان من الحفاظ ثقةً متديناً بصيراً بالحديث عارفاً بفنونه، حَسَنَ النغمة بالقرأة، مليحَ النظم، ظاهريَّ المذهب، له شعر في المواعظ[3]. اور ذہبی نے 'عبر' میں لکھا ہے: وكان ظاهريَّ المذهب، دؤوباً على طلب العلم، كثيرَ الاطلاع، ذكياً فطِناً صيِّناً ورِعاً أخبارياً متفنِّناً، كثيرَ التصانيف، حجةً ثقةً رحمه الله[4]۔

(۱) تاریخ بغداد: ۱۰۹/۳-۱۰۸، الوافی بالوفیات: ۱۰۱/۴، العبر: ۲۶۰/۳، شذرات: ۳۲۴/۳، اعلام: ۲۷۶/۶، معجم المولفین: ۵۴/۱۱

(۲) سیر: ۱۲۳/۱۹-۱۲۲، تذکرہ: ۱۸/۴ (۳) الوافی بالوفیات: ۲۲۵/۴ (۴) العبر: ۲۳/۳

حمیدی نے بہت سی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، جن میں **جذوۃ المقتبس** اور **الجمع بین الصحیحین** مشہور ہیں، ۔ ۱۷/ذی الحجہ ۴۸۸ھ کو وفات پائی، پہلے مقبرۂ باب ابرز میں دفن کیے گئے، دو سال کے بعد کسی وجہ سے ان کی قبر کھودی گئی، اور ان کا جسد مبارک وہاں سے منتقل کر کے مقبرۂ باب حرب میں بشر حافی کے پائینتے دفن کیا گیا[۱]۔

مخطوطہ کی دریافت اور علامہ اعظمیؒ کی تحقیق وتعلیق:

'کتاب الثقات' کا ایک اہم قلمی نسخہ علامہ اعظمیؒ کو بمبئی کے اپنے ایک سفر کے دوران دستیاب ہوا، جو وہاں کی جامع مسجد میں محفوظ تھا، علامہ اعظمیؒ نے اس کو حاصل کر کے قاضی اطہر مبارک پوری سے اس کی نقل تیار کرائی، اس کے بعد بڑی محنت اور عرق ریزی سے اس پر حاشیہ نگاری کا کام کیا، لیکن افسوس کہ اس کی طباعت کا خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا، قاضی اطہر صاحب کی جو نقل ہے، وہ فل سکیپ کے ۱۰۹ صفحات پر مشتمل ہے، اور اس کے بعد ایک صفحے پر ابن شاہین کے حالات مذکور ہیں، یہ نقل کاغذ کے ایک جانب ہے، اور ہر صفحے پر ۲۳-۲۴ سطریں ہیں، نیچے ۷-۸ سطریں حواشی وتعلیقات کے لیے چھوڑی گئی ہیں، یہ سطریں جب علامہ اعظمیؒ کی تعلیقات سے پُر ہوجاتی ہیں، تو دوسری جانب کے سادے صفحے پر باقی تعلیقات لکھی جاتی ہیں۔

تعلیقات کی خصوصیات:

ان میں بھی دوسری کتابوں کی تعلیقات کی طرح ایجاز واختصار سے کام لیا گیا ہے، اور یہ وصف پوری کتاب میں نمایاں ہے، اور شروع سے آخر تک یکساں ہے، کچھ خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱- راویوں کے نام یا کتاب کی عبارتوں میں اگر کہیں تصحیف یا غلطی ہوگئی ہے، تو اس کی تصحیح پر توجہ صرف کی گئی ہے۔

۲- ابن شاہین نے راوی کی توثیق وتعدیل کے لیے جس امام جرح وتعدیل مثلاً ابن معین یا احمد بن حنبل کا قول نقل کیا ہے، تو اس راوی کے متعلق اس فن کی دوسری کسی کتاب میں اسی ماہر فن کا کوئی قول مذکور ہوتا ہے، تو اس کے حوالے سے اس قول کو نقل کر کے سند فراہم کی جاتی ہے۔

۳- حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ابن شاہین کے حوالے سے 'کتاب الثقات' میں مذکور راوی کے متعلق قول نقل کیا ہے، تو اس کو علامہ اعظمیؒ نے تہذیب سے موازنہ کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے۔ اگر تہذیب میں بعینہ وہی کلام ہوتا ہے، جو ثقات میں ہے، تو اس کا حوالہ دے دیتے ہیں، لیکن اگر کچھ اختلاف ہے، تو اس پر متنبہ کرتے ہیں۔

۴- اگر کہیں متن یا مصنف کی عبارت میں ابہام یا ژولیدگی ہے، تو اس کی توضیح میں کوئی دقیقہ

(۱) سیر: ۱۹/۱۲۶، الوافی: ۴/۲۲۵

فروگزاشت نہیں کیا ہے۔
۵-بعض مقامات پر راوی کا صرف نام ہے، مگر اس نام کے دیگر راوی بھی ہیں، جس کی وجہ سے تعیین مشکل ہے، تو آپ نے اپنے حواشی میں نسبت وغیرہ ذکر کر کے تعیین کر دی ہے۔

علامہ اعظمیؒ کی تعلیقات اور 'ثقات' کے مطبوعہ نسخوں کے درمیان موازنہ اور فرق:

علامہ اعظمیؒ کے علاوہ دو اور اہل علم نے 'کتاب الثقات' کی تحقیق کی ہے، اور اس پر تعلیق وتحشیہ کی خدمت انجام دی ہے، ان دونوں اہل علم کی تحقیق سے کتاب اشاعت پذیر ہو چکی ہے، ان میں سے ایک تو عراقی عالم شیخ صبحی سامرائی ہیں، جن کی تعلیقات کے ساتھ پہلا اڈیشن ۱۴۰۴ھ=۱۹۸۴ء میں الدار السّلفیہ کویت سے شائع ہوا ہے، جس کے شروع میں ۲۰ صفحات پر مشتمل ایک اہم اور معلومات افزا مقدمہ ہے، مقدمے کے آغاز میں حدیث شریف کی حجیت اور روایت ودرایت کے اعتبار سے اس کی استنادی حیثیت پر گفتگو ہے، نیز اسماء الرجال کی بعض کتابوں کا ذکر، اور پھر ابن شاہین نے جن اہل علم کے اقوال اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں، ان کا مختصر تذکرہ ہے۔ اس کے بعد تعدیلِ رواۃ کے مراتب کا ذکر کیا ہے، پھر ثقات پر لکھی گئی بعض کتابوں کا تعارف ہے، اس کے بعد ابن شاہین کے حالات اور آخر میں 'کتاب الثقات' کے مخطوطوں کا بیان ہے۔

'کتاب الثقات' کی تحقیق قاضی اطہر صاحب مبارک پوری نے بھی کی ہے، اور ان کی تحقیق سے ۱۴۰۶ھ=۱۹۸۶ء میں شرف الدين الكتبي وأولاده بمبئی کی طرف سے شائع ہوئی ہے، اس کے شروع میں ۹ر صفحات پر مشتمل قاضی صاحب کا تحریر کردہ مقدمہ ہے، جس میں ثقات پر دوسرے مصنفین کی تصانیف کے علاوہ بمبئی والے نسخے کا بیان ہے جس کو اصل بنا کر قاضی صاحب نے کتاب کی تحقیق کی ہے اور اس کو شائع کیا ہے، اس کے بعد مصنف یعنی ابن شاہین کے حالات ذکر کیے ہیں۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنے تحقیق کردہ نسخے میں مقدمہ نہیں تحریر فرمایا ہے، اور اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ کتاب ابھی معرضِ طباعت واشاعت میں نہیں تھی، اس لیے آپ نے مقدمہ تحریر کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی ہوگی، اور اس طرح اس میں یہ کمی اور تشنگی باقی رہ گئی۔

اس کتاب کے تذکرہ وتعارف کے ضمن میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اعظمیؒ کی تعلیقات اور باقی دونوں فاضل بزرگوں کی تعلیقات وحواشی کے درمیان جو نمایاں فرق ہے، موازنہ کر کے اس کو واضح کیا جائے، اور وہ حسبِ ذیل ہے:

۱- علامہ اعظمیؒ نے صفحہ کے کنارے جس راوی کا تذکرہ ہے، اس کا نام لکھ دیا ہے، جس سے اول وہلہ میں مترجَم لہ کا نام معلوم ہو جاتا ہے، ورنہ کتاب میں بسا اوقات جب تک مصنف کی پوری عبارت نہ پڑھی جائے، راوی کا نام معلوم نہیں ہو سکتا، مثلاً اسماعیل بن عیاش کے ذکر میں ہے:

نـا عبـد الله بن محمد البغوي، قال ثنا محمد بن غيلان، ثنا ابن معين: إسماعيل ابـن عيـاش ثـقــه، وفـي روايـة أخـرى: ليــس بــه بـأس. وقال أحمد بن حنبل: كان إسماعيل بن عياش صاحبَ حديث.

شیخ صبحی سامرائی اور قاضی اطہر مبارک پوری دونوں کی تحقیق سے شائع اڈیشنوں میں جب تک مصنّف کی پوری یا آدھی عبارت نہ پڑھی جائے، معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اسماعیل بن عیاش کا تذکرہ ہے؛ لیکن علامہ اعظمیؒ نے ان کے تذکرے کے سامنے ''اسمعیل بن عیاش'' بطور سرخی کے لکھ دیا ہے، جس سے قاری کے لیے تلاش وتتبع میں آسانی ہوتی ہے، اور یہ بہت نمایاں فرق ہے جس کی وجہ سے اس سے استفادہ نسبتاً سہل ہے، کیونکہ ابن شاہین نے اکثر راویوں کا تذکرہ اسی طرح کیا ہے، کہ پورا تذکرہ پڑھے بغیر اس سے سمجھنا مشکل ہے کہ کس کا تذکرہ ہے۔

۲- علامہ اعظمیؒ نے صفحے کے کنارے جہاں راوی کا نام لکھا ہے، وہاں ایسے رموز لکھ دیے ہیں، جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی روایت صحاح ستہ میں ہے یا نہیں، مثلاً اگر اس راوی کی روایت صحاح ستہ میں ہے، تو اس کے لیے وہ علامتیں لکھ دیتے ہیں جو تہذیب وغیرہ میں ہیں، اور اگر ان میں نہیں ہے، تو اس کے لیے ''ز'' کی علامت استعمال کی ہے، جس سے ''زائد'' کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

قاضی اطہر صاحب والی اشاعت میں تو اس کا بالکل ہی اہتمام نہیں ہے، نہ اس کا پتہ چل سکتا ہے، شیخ سامرائی نے بہت حد تک اس کا اہتمام کیا ہے، لیکن اس کا پتہ ان کے حواشی وتعلیقات کو پڑھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ ان حواشی میں تقریب وغیرہ کی جو عبارتیں وہ نقل کرتے ہیں، تو ان کے ضمن میں رموز بھی آتے ہیں، مستقل انھوں نے کوئی رمز استعمال نہیں کیا ہے۔

۳- علامہ اعظمیؒ کے جو حواشی وتعلیقات ہیں، ان کا انداز ایسا ہے، جس سے باور ہوتا ہے کہ 'کتاب الثقات' کی استنادی حیثیت کے اثبات پر بھی توجہ صرف کرنا مقصود ہے، جبکہ باقی دونوں فاضلوں کے ہاں یہ چیز مفقود ہے۔ مثال کے طور پر:

☆......: الف) ابن شاہین نے لکھا ہے:

إسـمعيـل بـن مـجالد صالح، وقال عثمان بن أبي شيبة: كان إسمعيل بن مجالد ثقةً وصـدوقـاً، وليتـنـي كنت كتبتُ عنه، كان يُحدِّث عن أبي إسحاق وسماک وبيان، وليس به بأس. وقال أحمد بن حنبل: ما أراه إلا صدوقاً.

علامہ اعظمیؒ نے **وقال عثمان** پر علامت لگا کر حاشیہ میں صرف اس قدر لکھا:

نقله ابن حجر في التهذيب عن ثقات ابن شاهين.

قاضی صاحب نے حاشیہ میں اگرچہ ابن حجر کی پوری عبارت نقل کر دی ہے، لیکن پیرایۂ بیان کا جو فرق ہے، اس کو اہل علم سمجھ سکتے ہیں، قاضی صاحب کا حاشیہ یہ ہے:

قال ابن حجر في ذكره: قلت: وروى الحاكم عن الدار قطني ليس فيه شك أنه ضعيف، ولما ذكره ابن شاهين في الثقات حكى عن عثمان بن أبي شيبة أنه قال: كان ثقةً وصدوقاً، وليتني كنت كتبتُ عنه، كان يُحدث عن أبي إسحاق وسماك وبيان، وليس به بأس (التهذيب ۱:۳۲۸)

اور شیخ صبحی سامرائی نے لکھا ہے:

إسماعيل بن مجالد بن سعيد الهمداني أبو عمر الكوفي نزيل بغداد. قال البخاري: صدوق. ⁄خت. التاريخ رقم ۱۳۰۹، التاريخ الكبير: ۳۷٤/۱، تاريخ بغداد: ۲٤٥/٦، تهذيب: ۳۲۷/۱.

☆......: ب) ابن شاہین نے اسماعیل بن عُلَیَّہ کے ترجمہ میں لکھا ہے:

نا محمد بن الحسن، قال: نا الحسين بن إدريس، قال: سمعت عثمان بن أبي شيبة، يقول: ابن عُلية أثبت من حماد بن زيد وحماد بن سلمة، ولا أُقدِّم على ابن علية أحداً من البصريين، لا يحي، ولا عبدالرحمن، ولا بشر بن المفضل.

علامہ اعظمیؒ نے عثمان بن ابی شیبہ یقول پر علامت لگا کر اپنی تعلیق میں صرف اس قدر لکھا ہے:

نقله ابن حجر عن ثقات ابن شاهين.

اور قاضی صاحب نے لکھا ہے:

هو إسمعيل بن إبراهيم بن مقسم الأسدي مولاهم، أبوبشر البصري المعروف بابن علية وهي أمه علية بنت حسان، وكان مقسم من سبي القيقانية، أفردت سيرته في الأردو.

اور شیخ سامرائی کی تعلیق یہ ہے:

إسماعيل بن إبراهيم بن مقسم أبو بشر البصري الإمام الحجة المعروف بابن علية. ⁄ع. مات سنة ۱۹۳. تاريخ بغداد: ۲۲۹/٦، ميزان الاعتدال: ۲۱٦/۱، تهذيب: ۲۷٥/۱.

☆......: ج) ثقات میں ابراہیم بن العلاء ابو ہارون الغنوی کا تذکرہ ہے، اس پر علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

قال ابن حجر في اللسان: ذكره ابن شاهين في الثقات.

قاضی صاحب نے اس پر کچھ نہیں لکھا ہے۔ شیخ سامرائی نے لکھا ہے:

ثقة⁄خ. الجرح والتعديل: ۱۲۰/۲، تقريب: ٤٨٣/۲.

☆......: د) ابراہیم بن العلاء کے ایک تذکرہ کے بعد ابراہیم بن الزبرقان کا تذکرہ ہے، اس پر بھی قاضی صاحب کی کوئی تعلیق نہیں ہے، علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

قال ابن حجر في اللسان: ذكره ابن شاهين في الثقات.

اور سامرائی صاحب نے لکھا ہے:

التاريخ: رقم ٢٠٢٨. وقال أبوحاتم: محله الصدق يُكتبُ حديثه ولا يُحتجُّ به. الجرح والتعديل: ١٠٠/٢، ميزان الاعتدال: ٣١/١.

منہجِ تحقیق کا یہ بہت اہم اور بنیادی فرق ہے، مختلف کتابوں کے حوالہ جات نقل کر دینے سے یہ فائدہ ضرور حاصل ہوتا ہے کہ جن کتابوں میں اس راوی کے متعلق معلومات درج ہوتی ہیں، ان کا علم ہو جاتا ہے، لیکن جو کتاب صدیوں سے گوشۂ گمنامی میں پڑی رہی ہو، اور اہل علم کی دسترس میں نہ ہو، اس کی تحقیق میں نہایت ضروری اور بنیادی امر یہ ہوتا ہے کہ اس کی اصلیت اور مصنف کی طرف نسبت کی صحت کو ثابت کیا جائے، اور دوسری کسی کتاب سے اس کے اقوال وعبارات کی سند پیش کی جائے، مخطوطات اور قلمی نسخوں کی تحقیق کی یہ روح اور جان ہوتی ہے، اور یہی چیز علامہ اعظمیؒ کے پیش نظر تھی، باقی اس راوی کے متعلق دوسری کتابوں میں تذکرے، تو یہ ایسی چیز ہے کہ جس شخص کو اس فن سے مناسبت ہوگی، وہ اس کو تلاش وجستجو سے معلوم کر لے گا۔

۴- رواۃ حدیث میں ایک بڑی تعداد ایسے راویوں کی ہوتی ہے، جن کے نام اور ولدیت میں یکسانیت ہوتی ہے، اور بسا اوقات ان کے درمیان تمییز اور فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے، کتاب الثقات میں اگر ایسے راوی کا ذکر ہے، اور نسبت وغیرہ ذکر نہیں ہے، تو علامہ اعظمیؒ عموماً حاشیہ میں راوی کی نسبت ذکر کر کے اس کی تعیین کر دیتے ہیں، جبکہ سامرائی اور قاضی صاحب کے حواشی میں یہ چیز کم نظر آتی ہے، مثلاً:

☆......: الف) ثقات میں ہے: **إسمعيل بن أوسط، صالح.**

قاضی صاحب کی تحقیق کردہ کتاب میں تو سرے سے اس پر کوئی حاشیہ ہی نہیں ہے۔ سامرائی صاحب نے لکھا ہے:

تاريخ عثمان بن سعيد الدارمي: ورقة ٧، تعجيل المنفعة: ٣٤، ترتيب ثقات ابن حبان الأول: ق ١٣١ب.

اور علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

هو البجلي أمير الكوفة، يروي عن أبي كبشة الأنماري، وروى عنه المسعودي، وثَّقَه ابنُ مَعين وغيرُه، وذكره ابن حبان في الثقات (لسان).

☆......: ب) ثقات میں ہے: **إسحاق بن سويد ثقة.**

ان کے تذکرے میں قاضی صاحب نے لکھا ہے:

ذكره ابن حبان في الثقات. وقال أبوالعرب الصقلي في الضعفاء: كان يحمل على علي تحاملاً شديداً، وقال: لا أحب عليا، وليس بكثير الحديث، ومن لم يحب الصحابة فليس بثقة ولا كرامة (التهذيب ١:٢٣٦)

شیخ صبحی سامرائی نے لکھا ہے:

وقال الحافظ: صدوق تُكلم فيه للنصب / خ م د س. الجرح والتعديل: ٢٢٢/٢، تقريب: ٥٨/١.

لیکن علامہ اعظمیؒ نے اس پر صرف اس قدر لکھا ہے: "**هو العدوي البصري**" اوراس جامع کلام سے اس کی شخصیت کی طرف رہنمائی کر دی، اب جس کو مزید حالات کی ضرورت ہوگی وہ تذکرہ کی کتابوں میں مراجعت کر کے مزید تفصیلات معلوم کر لے گا۔

☆......: ج) ثقات میں ہے: **إسحاق بن أبي بكر ثقة ثقة.**

قاضی صاحب کی کتاب اس پر کسی تعلیق سے خالی ہے۔اور سامرائی کے ہاں یہ حاشیہ ہے:

معرفة الرجال: ٢٨٢/١ رقم ١٨٢٠. وقال ابن معين: صالح. وذكره ابن حبان في الثقات. وقال الحافظ: فقيه صدوق / م س. تهذيب: ٢٢٨/١، تقريب: ٥٦/١.

اور علامہ اعظمیؒ نے صرف اتنا لکھ کر اشارہ کر دیا ہے: **هو المديني الأعور.**

قارئین کو اس سے یہ بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اگر راوی تہذیب کے رجال میں سے ہے، تو اس کی طرف صرف اشارہ کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں، جیسا کہ (ب) اور (ج) کی مثالوں میں ہے، اور اگر رجالِ تہذیب سے نہیں ہے، تو اس کے سلسلے میں نہایت اختصار کے ساتھ بالکل ضروری اور بنیادی معلومات ذکر کرتے ہیں۔

۵- علامہ اعظمیؒ نے بوقت ضرورت کلام کرنے والے شخص کی بھی تعیین کی ہے، مثلاً ثقات میں ہے:

إسمعيل بن سميع كوفي ثقة، وقال مرة أخرى: ثقة مأمون.

علامہ اعظمیؒ نے "**قال**" پر علامت لگا کر حاشیہ میں لکھا ہے: **وقال أي ابن معين كما في التهذيب.** جس سے معلوم ہوگیا کہ **ثقة مأمون** ابن معین کا قول ہے، جبکہ سامرائی صاحب اور قاضی صاحب دونوں میں سے کسی نے اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا ہے۔

۶- متن میں جو نام آئے ہیں، اگر نسخہ نویس سے یا کسی اور وجہ سے اس میں کہیں غلطی ہوگئی ہے، تو علامہ اعظمیؒ کے ہاں اس کی تصحیح کا خاص اہتمام نظر آتا ہے، مثلاً مخطوطہ میں تھا:

☆......: الف) **وقال ابن معين: إسمعيل بن مسلم العبدي ثقة، وهو بصري، روى عنه ابن معين.**

متن کے آخر میں جو **ابن معين** ہے علامہ اعظمیؒ نے اس کو قلم زد کر کے **ابن مهدي** بنا دیا، اور اس پر یہ حاشیہ ارقام فرمایا:

في الأصل ابن معين، وهو خطأ عقلاً ونقلاً، والصواب ابن مهدي، فإنه يروي عنه كما في التهذيب والجرح والتعديل.

جبکہ باقی دونوں فاضلوں کے ہاں اس سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے۔

☆...... ب) ابراہیم بن میمون کے حال میں مخطوطہ میں یہ ہے: **يروي عنه وكيع وأبو حامد الزبيري.**

علامہ اعظمیؒ نے **أبو حامد** پر یہ تعلیق لکھی ہے:

كذا في الأصل، والصواب أبو أحمد الزبيري.

باقی دونوں حضرات کے ہاں اس سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے۔

☆...... ج) باب الثاء میں ثقات کے اصل نسخے میں یوں ہے: **قال: وسألتُه عن ثابت بن يزيد بن أبي زيد؟ فقال: شعبةُ دلَّهم عليه، وهو ثقةٌ.**

علامہ اعظمیؒ نے متن میں **ثابت بن يزيد بن أبى زيد** کو **ثابت بن يزيد أبو زيد** بنایا ہے، اور اس پر یہ تعلیق تحریر فرمائی ہے:

في الأصل ثابت بن يزيد بن أبي زيد، والصواب ثابت بن يزيد أبو زيد كما في التهذيب وتاريخ البخاري.

مگر قاضی صاحب اور سامرائی صاحب کے ہاں یہ تصحیح نہیں کی گئی ہے۔

☆...... د) ثقات میں ایک جگہ ہے: **وعبيد الصمد، صويلح.**

اس کو علامہ اعظمیؒ نے **عبيد الصيد** بنایا ہے، اور اس پر یہ تعلیق لکھی ہے:

في الأصل عبيد الصمد، وليس في الرواة من يُسمى بهذا –فيما أعلم–، والصواب عندي عبيد الصيد (بكسر المهملة وسكون التحتانية) وهو ابن عبد الرحمن، قال فيه ابن معين: صويلح كما في التهذيب، وكتاب الجرح والتعديل.

☆...... ہ) ثقات میں ہے: **غالب القطان، ليس به بأس، قاله يحيى. وقال يحيى: غالب القطان ثقة ثقة.**

اس عبارت میں دوسری جگہ جہاں یحییٰ آیا ہے، علامہ اعظمیؒ نے علامت لگا کر حاشیہ میں لکھا ہے:

كذا في الأصل، والصواب أحمد كما في التهذيب والجرح والتعديل. جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے بارے میں **ثقة ثقة** یحییٰ نے نہیں، بلکہ امام احمد نے کہا ہے۔

قاضی صاحب نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے، شیخ سامرائی والے اڈیشن میں متن میں ''احمد'' ہے، اور اس کی تصحیح کا کوئی اشارہ نہیں ہے، ممکن ہے کہ شیخ سامرائی صاحب کو تنبہ ہوا ہو، اور تصحیح کر دی ہو، یا ان کے مخطوطے کی اصل میں ''احمد'' ہی ہو، اور اگر ایسا ہے تو یہ علامہ اعظمیؒ کی دقتِ نظر اور گہرائی و گیرائی پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔

☆...... و) ربیع بن صبیح کے بارے میں ثقات میں ہے: **قال: يحيى ثقة، وقال مرة أخرى: ضعيف، وقال فيه يحيى: لا بأس به رجل صالح.**

علامہ اعظمیؒ اور قاضی صاحب کے اصل نسخے میں اسی طرح ہے، اور سامرائی صاحب کے مطبوعہ میں ''وقال فيه: لا بأس به رجل صالح'' ہے، یعنی فرق صرف یہ ہے کہ لفظ ''یحییٰ'' مذکور نہیں ہے، اور تینوں نسخوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ لا بأس به رجل صالح بھی یحییٰ ہی کا کلام ہے۔

قاضی صاحب اور سامرائی صاحب دونوں میں سے کسی نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے، مگر علامہ اعظمیؒ نے دوسری جگہ والے یحییٰ پر علامت لگا کر یہ حاشیہ تحریر فرمایا ہے:

كذا في الأصل، والصواب: ''وقال فيه أحمد'' لأن المصنف قد فرغ فيما تقدَّم عن ما قال فيه يحيى، ولأن ابن حجر حكى هذا القول عن أحمد، راجع التهذيب.

٦- علامہ اعظمیؒ کی تعلیقات میں بہت سے مواقع پر ایسے فنی نکات نظر آتے ہیں، جن سے ہمارے دونوں فاضلوں کی تعلیقات خالی ہیں، مثلاً حبیب کے عنوان سے جن لوگوں کا تذکرہ ہے، اس میں ثقات میں ہے:

☆......: الف) **وقال: حبيب بن المعلم بصري ثقة، وقال أحمد: ثقة ما أصح حديثه.**

علامہ اعظمیؒ نے متن میں ''بن'' کو قلم زد کر دیا ہے، پھر اس پر یہ حاشیہ لکھا ہے:

في الأصل حبيب بن المعلم، والصواب حبيب المعلم، واختلف في اسم أبيه، فقيل زيد وقيل غير ذلك كما في التهذيب. وأما ما حكى ابن حجر عن أحمد أنه قال: ما أُحتجُّ بحديثه، فوهم منه، والصواب أن أحمد قال: ما أصحَّ حديثَه كما نقل عنه ابن شاهين ههنا، والذهبي في الميزان، وابن أبي حاتم في الجرح والتعديل، وليراجع إلى تهذيب الكمال.

علامہ اعظمیؒ نے اس تعلیق میں صرف ''حبیب معلم'' کی تصحیح ہی نہیں کی ہے، بلکہ کتاب الثقات اور دوسری کتابوں میں امام احمد کے نقل کیے ہوئے قول میں اور تہذیب التہذیب میں منقول قول میں جو اختلاف ہے، اس کو ذکر کر کے جو قرین صواب ہے اس کو ظاہر کر دیا ہے۔ باقی دونوں فاضلوں کی کتابوں میں نہ تو حبیب معلم والی تصحیح سے تعرض کیا گیا ہے، اور نہ امام احمد کے قول میں واقع اختلاف کی طرف کوئی اشارہ کیا گیا ہے۔

☆......: ب) ثقات میں ہے: **سليمان بن بلال، لا بأس به، وليس ممن يُعتمد على حديثه قاله عثمان بن أبي شيبة.**

اس پر صبحی سامرائی نے حاشیہ لکھا ہے:

تقدم برقم ٤٥٧. ونقل الحافظ في التهذيب رواية ابن شاهين. التهذيب: ١٧٦/٤.

اور قاضی صاحب نے لکھا ہے:

مكرر. وقال ابن حجر: وقال ابن شاهين في الثقات: قال عثمان بن أبي شيبة: هو ثقة (التهذيب ٤: ٢٢١)

مگر علامہ اعظمیؒ نے تہذیب التہذیب کے صرف حوالے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ابن حجر کی ایک دوسری

کتاب مقدمہ فتح الباری سے عثمان بن ابی شیبہ کے قول "**لیس ممن یُعتمد علی حدیثه**" کا غیر مقبول ہونا بھی ذکر کر دیا ہے، چنانچہ لکھا ہے:

حكاه ابن حجر عن ابن شاهين عن عثمان. وقال في مقدمة الفتح: نقل ابن شاهين في كتاب الثقات عن عثمان بن أبي شيبة أنه قال فيه: لا بأس به، لكن ليس ممن يُعتمد على حديثه. قلت: وهو تليين غير مقبول فقد اعتمده الجماعة.

تنبیہ:- قاضی صاحب کے حاشیے میں ایک چوک یہ ہوئی ہے کہ انھوں نے عثمان بن ابی شیبہ کا جو قول "**هو ثقة**" تہذیب سے نقل کیا ہے، اور اس کے لیے صفحہ ۲۲۱ کا حوالہ دیا ہے، وہ تہذیب میں **سليمان بن بلال** کے متعلق نہیں ہے، بلکہ **سليمان بن المغيرة** کے متعلق ہے، جن کا تذکرہ کتاب الثقات میں سلیمان بن بلال کے دو راویوں کے بعد ہے، یعنی سلیمان بن بلال کا نمبر شمار ۳۹ ہے اور **سليمان بن المغيرة** کا ۴۲۔ پھر دوسری لغزش قاضی صاحب سے یہ ہوئی کہ سلیمان بن بلال سے پہلے نمبر ۳۸ پر **سليمان بن ابی المغيرة** تھا، تو اس میں "ابی" کو حذف کر کے **سليمان بن المغيرة** بنا دیا، اور حاشیہ میں لکھا: **وفي الأصل "أبي المغيرة" خطأ، وهو سليمان بن المغيرة القيسي مولاهم أبو سعيد البصري.** اور **سليمان بن المغيرة** کا نام آیا، تو اس پر حاشیہ لکھا "**مكرر**". جبکہ **سليمان بن المغيرة** اور **سليمان بن ابی المغيرة** دونوں دو ہیں، اور دونوں کا تذکرہ تہذیب میں موجود ہے۔

☆...... ج) سیف نام کے جو راوی ہیں، ان میں ایک تذکرہ یہ ہے: **سيف بن سليمان التمار، ثقة من كبار أصحاب أبي جعفر.**

اس پر صبحی سامرائی اور قاضی اطہر دونوں فاضلوں نے سکوت اختیار کیا ہے، مگر علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

لم أجده في ما عندي من كتب أهل السنة في الرجال، ووجدته في رجال النجاشي من كتب رجال الشيعة، وفيه أنه ثقة يروي عن أبي عبدالله يعني جعفراً الصادق، وليس فيه أنه من أصحاب أبي جعفر فضلاً عن كبارهم، وهذه الترجمة أخشى أن يكون مما دسَّه بعض الناسخين، لأن النسخة التي عثرتُ عليها هي بخط بعض الزيدية.

☆...... د) ایوب کے نام سے جن راویوں کا تذکرہ ہے، ان میں ایک ایوب بن موسی کی نسبت ثقات میں ہے:

قال أحمد بن حنبل: أيوب بن موسى ثقة.

قاضی صاحب نے تو اس پر کچھ لکھا ہی نہیں، سامرائی صاحب نے لکھا ہے:

العلل ومعرفة الرجال: ۲٤٧/۱. ثقة / ع. تهذيب التهذيب: ٤١٤/۱.

لیکن ایوب بن موسی نام کے ایک سے زائد راوی ہیں، اس لیے اس کی تعیین ضروری تھی، اور وہ علامہ اعظمیؒ کی تعلیق میں ہے، اور آپ نے صرف اسی پر اقتصار نہیں کیا بلکہ ایک باریک بات بھی بتا دی کہ رواۃ حدیث

میں اس نام اور ولدیت کے ساتھ یہی مشہور ہیں، چنانچہ لکھا ہے:

عندي أن ابن شاهين أراد به أيوب بن موسى بن عمرو بن سعيد الأموي المكي المخرج له في الصحاح، فإنه هو الأشهر بهذا الاسم والنسب في رواة الحديث.

۷- متقدمین میں سے اگر کسی ماہر فن یا کسی تذکرہ نگار عالم ومحقق سے کوئی سہو یا وہم ہوا ہے، تو علامہ اعظمیؒ اس پر متنبہ کرتے ہیں، جبکہ باقی دونوں فاضلوں کے ہاں یہ چیز مفقود ہے، مثلاً:

☆...... الف) ثقات میں ہے: **وقال ابن معين: أبو بدر شجاع بن مخلد أعرفه ليس به بأس الخ.**

اس پر قاضی صاحب کی تعلیق یہ ہے:

وفي التهذيب ٤: ٣١٢ شجاع بن مخلد الفلاس، أبو الفضل البغوي نزيل بغداد، قال ابن معين: أعرفه ليس به بأس، نعم الشيخ ثقة.

اور شیخ سامرائی نے لکھا ہے:

شجاع بن مخلد الفلاس أبو الفضل البغوي نزيل بغداد. قال الحافظ: صدوق /م د ق. الجرح والتعديل: ٣٧٩/٤، تقريب: ٣٧٤/١.

لیکن علامہ اعظمیؒ کی تعلیق بالکل مختلف اور مبصرانہ وناقدانہ ہے، آپ نے لکھا ہے کہ شجاع بن مخلد کی کنیت ابوالفضل ہے، جیسا کہ الجرح والتعدیل اور تہذیب وغیرہ میں ہے، اور ابوبدر جس راوی کی کنیت ہے، اس کا نام شجاع بن الولید ہے، اس لیے اگر قلمی نسخے کی صحت پر اعتماد کیا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ابن معین سے اس میں وہم ہوا ہے۔ آپ کی تعلیق کے الفاظ یہ ہیں:

شجاع بن مخلد يكنى أبا الفضل كما في كتاب ابن أبي حاتم والتهذيب وغيرهما، وأما الذي يكنى أبا بدر فاسمه شجاع بن الوليد، فإن نعتمدُ على الأصل فلا شک أن ابن معين وهم فيه.

☆...... ب) ثقات میں ہے: **أبو العامر الحرار، اسمه صالح بن رستم، صادق الحديث قاله يحيى.**

علامہ اعظمیؒ نے پہلے تو "الحرار" میں "ح" اور "ر" دونوں پر نقطہ لگا کر "الخزاز" بنایا، اس کے بعد یہ حاشیہ لکھا:

في الأصل من غير نقط، والصواب "الخزاز" بمعجمات، وأبو عامر الخزاز هو الذي ذكره ابن شاهين في الثقات، ولم يذكر صالح بن رستم الذي يكنى أبا عبدالسلام كما ترى، ووهم ابن حجر فقال: إن أبا عبدالسلام وثقه ابن شاهين.

حرار کی تصحیح تو دونوں فاضلوں نے بھی کی، مگر حافظ ابن حجر کے وہم پر کسی کی نگاہ نہیں ٹھہری، یا یہ کہ کسی نے اس پر متنبہ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی، بلکہ قاضی صاحب نے تو یہ کیا کہ تہذیب میں دیکھ کر اس سے ہلالین میں صالح بن رستم ابوعبدالسلام کا تذکرہ بڑھا دیا۔

☆...... ج) ثقات میں ہے: **العلاء بن عتبة الحمصي، روى عنه إسماعيل بن عياش، وقال: كان ثقةً.**

قاضی صاحب کی اس پر کوئی تعلیق نہیں ہے۔ شیخ سامرائی نے لکھا ہے:

قال الحافظ: صدوق /د. الجرح والتعديل: ٣٥٨/٦، ميزان: ١٠٣/٣، تقريب: ٩٣/٢.

اورعلامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

قال ابن حجر في التهذيب انه ذكر ابن شاهين في الثقات قال يحيى بن معين: ثقة. قلت: وأنت ترى أن ابن شاهين لم يحک توثيقه عن ابن معين، بل حكاه عن إسماعيل بن عياش.

☆...... د) ثقات میں ہے: **وقال أحمد: عمران القصير، ثقة، وهو عمران بن مسلم.**

قاضی صاحب کی اس پر بھی کوئی تعلیق نہیں ہے۔ شیخ سامرائی نے لکھا ہے:

معرفة الرجال: /٣٤٠ رقم ٢٢٣٠. عمران بن مسلم ابوبكر القصير المنقري /خ م د س ق. الجرح والتعديل: ٣٤٠/٦، تقريب: ٨٤/٢.

مگر علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

لم ينقل ابن حجر في التهذيب توثيقه عن أحمد، وقد رواه ابن أبي حاتم في الجرح والتعديل وحكاه ابن شاهين كما ترى، فالعجب من الحافظ كيف أهمله في التهذيب. یعنی ابن حجر نے امام احمد سے عمران قصیر کی توثیق نقل نہیں کی، حالانکہ اس کو ابن ابی حاتم نے الجرح والتعدیل میں روایت کیا ہے اور ابن شاہین نے حکایت کیا ہے، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، لہذا حافظ ابن حجر پر تعجب ہے کہ اس کو تہذیب میں کیسے نظرانداز کر دیا۔

☆...... ہ) ثقات میں ہے: **غريف بن درهم التيمي، روى عنه وكيع، وقال: كان ثقةً.**

اس پر ہمارے دونوں فاضلوں کی کوئی تعلیق نہیں ہے، لیکن علامہ اعظمیؒ کی بصیرت اور عقابی نگاہ دیکھئے کہ انھوں نے مختلف حوالوں سے ثابت کیا کہ ان کا نام ''غریف'' غین معجمہ سے نہیں، بلکہ ''عریف'' عین مہملہ سے ہے، اور ''غریف'' لکھنا ہمارے مصنّف ابن شاہین کی غلطی ہے؛ دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حافظ ابن حجر پر تعجب ہے کہ انھوں نے 'لسان المیزان' میں ان کا تذکرہ کیا ہے، لیکن ان کے سلسلے میں جو تعدیل وتوثیق کے اقوال ہیں، ان کو نقل نہیں کیا، علامہ اعظمیؒ کی تعلیق ملاحظہ ہو:

ذكره ابن أبي حاتم في العين المهملة فقال: عريف بن درهم الجمال الكوفي أبو هريرة .... روى عنه وكيع ومروان بن معاوية وأبو نعيم. ثم قال: سألت أبي عن عريف بن درهم الهمداني فقال: هو صالح الحديث لا بأس به. حدثنا أبو نعيم عنه. وذكره ابن حجر أيضاً في اللسان في العين المهملة، وكذا العقيلي كما حكاه ابن حجر، والبخاري في الواحد من العين المهملة. فثبت أن ذكر ابن شاهين إياه في الغين المعجمة وهم منه. والعجب من الحافظ أنه لم يذكر في اللسان ما قيل في توثيقه وتعديله.

☆......: و) عیاض بن عبداللہ الفھری کے تذکرے میں ثقات میں ہے:

وقال أحمد بن صالح: عياض بن عبد الله الفهري من أهل المدينة، ثبت، له شأن، ليس بالمدينة من حديثه شيء.

حافظ ابن حجر نے تہذیب (٢٠١/٨) میں ثقات ابن شاہین سے اسی جملے کو اس طرح نقل کیا ہے:

وقال أبو صالح: ثبتٌ، له بالمدينة شأن كبير في حديثه شيءٌ.

تہذیب کی اس عبارت کا مطلب ثقات کے اصل نسخے کی عبارت سے مختلف ہو گیا، یعنی یہ کہ وہ ٹھوس ہیں، مدینہ میں ان کو بڑی شان حاصل ہے، ان کی حدیث میں کچھ ہے۔ یعنی کوئی علت وغیرہ ہے۔

ثقات کے اس مقام پر قاضی صاحب نے تو یہ کیا کہ متن کتاب کو تہذیب کی عبارت کے مطابق بنا دیا، اور حاشیہ میں اس کو بتا دیا کہ متن میں یہ غلطی ہے، اور تہذیب میں اس طرح ہے۔

سامرائی صاحب نے حاشیہ میں تصحیح کی نشان دہی نہیں کی، لیکن میرا خیال ہے کہ انھوں نے تہذیب التہذیب کو سامنے رکھ کر اصل نسخے کی عبارت میں اصلاح کر دی ہے۔

لیکن علامہ اعظمیؒ نے اس جگہ جو کچھ لکھا ہے، وہ بہت موزوں ومعقول اور قابلِ توجہ ہے، آپ نے لکھا ہے:

نقل ابن حجر هذا القول من ثقات ابن شاهين فقال: قال أبو صالح: ثبت له بالمدينة شأن كبير في حديثه شيء. فليحرر، والذي تحرَّر عندي أن الصواب في عبارة التهذيب قال ابن صالح، وهو أحمد بن صالح. ولم يُصِب الحافظُ في حكاية قول ابن صالح، والصواب ما هنا، ومراده أنه لم يُروَ حديثه ولم ينتشر بالمدينة، بل بغيرها من البلاد، كمصر. ونظيره قول أحمد بن صالح في محمد بن عبدالرحمن أبي الأسود: ما بالمدينة من حديثه عشرة أحاديث، وحديثه بمصر كما يأتي.

یعنی ابن حجر نے ’’ثقات ابن شاہین‘‘ سے اس قول کو اس طرح نقل کیا ہے: **قال أبو صالح: ثبت له بالمدينة شان كبير في حديثه شيء.** علامہ اعظمیؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک تہذیب کی عبارت میں ’’ابو

صالح''، کے بجائے ''ابن صالح''، صحیح ہے، جس سے احمد بن صالح مراد ہیں۔ اور حافظ ابن حجر نے ابن صالح کے قول کی حکایت صحیح نہیں کی؛ صحیح وہ ہے، جو یہاں (یعنی ثقات میں) ہے، اور مراد یہ ہے کہ ان کی حدیثوں کی روایت مدینے میں نہیں ہوئی اور نہ وہ اس میں پھیل سکیں، بلکہ مدینے کے علاوہ دوسرے شہروں میں- جیسے مصر میں- اس کا پھیلاؤ ہوا۔ اور اس کی مثال احمد بن صالح کے اس قول کی طرح ہے، جو محمد بن عبدالرحمن ابی الاسود کے بارے میں انھوں نے کہا ہے کہ مدینے میں ان کی دس حدیثیں بھی نہیں ہیں، اور ان کی حدیثیں مصر میں ہیں۔ جیسا کہ آئے گا۔

۸- 'کتاب الثقات' سے اگر کوئی ایسے نکتے اور فائدے کی بات معلوم ہوتی ہے، جس کا پتہ دوسری کتابوں سے نہیں چلتا، تو علامہ اعظمیؒ اس کی طرف اپنے حاشیے میں متوجہ کرتے ہیں، جبکہ ہمارے باقی دونوں فاضلوں کے حاشیوں میں یہ چیز عنقا ہے، مثلاً:

☆......: الف) ثقات میں ہے: **الحسن بن ذكوان بصري ثقة، ليس بينه وبين الحسين بن ذكوان قرابة.**

اس پر قاضی صاحب کا تو حاشیہ یہ ہے:

الحسن بن ذكوان أبو سلمة البصري، والحسين بن ذكوان المعلم العوذي البصري المكتب (التهذيب ٢:٢٧٦ و٣٣٨)

اور سامرائی صاحب کی تعلیق یہ ہے:

أخرج له / خ د ت ق. الجرح والتعديل: ١٣/٣، تهذيب: ٢٧٦/٢، تقريب: ١٦٦/١.

مگر علامہ اعظمیؒ نے یہاں حوالہ دینے کی ضرورت نہیں محسوس کی، اس کے بجائے ''ثقة'' پر علامت لگا کر یہ لکھا:

لم يذكر هذا القول عن يحيى ابنُ حجر في التهذيب ولا الذهبيُّ في الميزان، فهذا من فوائد هذا الكتاب، وفيه كثير من أمثاله.

☆......: ب) اس کے کچھ ہی بعد ہے: **وقال يحيى: الحسن بن عطية العوفي، لم يكن به بأس.**

قاضی صاحب نے اس پر کچھ نہیں لکھا۔ سامرائی صاحب نے لکھا ہے:

التاريخ: رقم ٢٧٦١. وقال خ: ليس بذاك، وقال أبو حاتم: ضعيف، وقال الحافظ: ضعيف / د. التاريخ الكبير: ٣٠١/٢، الجرح والتعديل: ٢٦/٣، ميزان الاعتدال: ٥٠٣/١، تقريب: ١٦٨/١.

علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

كلام يحيى هذا من فوائد هذا الكتاب لم يحكه الذهبي ولا ابن حجر.

☆...... ج) ثقات میں ہے: **حُبیب بن حجر العبسي، لیس به بأس، قاله یحیی.**

قاضی صاحب تو اس پر خاموش ہیں۔ سامرائی صاحب نے لکھا ہے:

وذكره ابن حبان في ثقاته. ترتيب الثقات: الأول: ق ۷۸، تعجيل المنفعة: ۸۵.

اور علامہ اعظمیؒ کی تعلیق یہ ہے:

وفي التعجيل "القیسي" ذکره البخاري وابن أبي حاتم، وتوثیق یحیی إیاه من فوائد هذا الکتاب، فإن ابن حجر ذکره في التعجیل ولم یزد علی قوله ذکره ابن حبان في الثقات.

اس حاشیے میں علامہ اعظمیؒ نے اول یہ فرق بتلایا کہ اس کتاب میں ان کی نسبت "**العبسي**" مذکور ہے، لیکن تعجیل میں "**القیسي**" ذکر کی ہے۔

پھر اس فائدے کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے، جو اس کتاب سے معلوم ہوتی ہے اور 'تعجیل المنفعہ' میں ان کا ذکر ہونے کے باوجود اس کو ابن حجر نے نقل نہیں کیا ہے، جس میں حافظ ابن حجر کے تسامُح کی طرف مودبانہ پیرائے میں ایک لطیف اشارہ بھی ہے۔

ایک اہم اور بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ سامرائی صاحب کی تحقیق سے طبع شدہ کتاب میں **حُبَیْب** ہے، یعنی 'ی' پر سکون ہے، جبکہ علامہ اعظمیؒ نے اپنے نسخے میں اپنے قلم سے 'ی' پر تشدید لکھ کر اس کو **حُبیّب** بنایا ہے، اور قاضی صاحب کا نسخہ کسی بھی حرکت سے خالی ہے۔

☆...... د) ثقات میں ہے: **حجاج بن دینار، واسطي ثقة. قاله یحیی الخ.**

اس پر قاضی صاحب نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ سامرائی صاحب نے لکھا ہے:

التاریخ: رقم ٤٨٧٤، معرفة الرجال: ١٩٩/١. وقال ابن المبارک ثقة ووثقه یعقوب بن شیبة وأبو داود والعجلي. وقال الدارقطني: لیس بالقوي. الجرح والتعدیل: ١٥٩/٣، میزان الاعتدال: ٤٦١/١، تهذیب: ٢٠٠/٢.

علامہ اعظمیؒ نے **قاله یحیی** پر علامت لگا کر فٹ نوٹ میں صرف اتنا لکھا: **هذا من فوائد هذا الکتاب.** یعنی ابن معین کے ان کو ثقہ کہنے کا علم صرف اسی کتاب سے حاصل ہوتا ہے۔

☆...... ہ) اس کے بعد ہے: **حجاج بن أبي زینب قاله یحیی هو واسطي ثقة. وقال ابن أبي خیثمة: لیس به بأس.**

قاضی صاحب نے تو یہ کیا کہ اس کا متن اس طرح بنا ڈالا:

حجاج بن أبي زینب لیس به بأس قاله یحیی، هو واسطي ثقة، وقال ابن أبي خیثمة: لیس به بأس. اور **لیس به بأس** پر یہ حاشیہ لکھ دیا:

في الأصل ههنا سقوط وفي التهذیب ٣: ٢٠١ "قال ابن معین: لیس به بأس" فکتبنا

منه.

سامرائی صاحب والے اڈیشن میں "قاله يحيى" کے بجائے "قال يحيى" ہے، اب یہ نہیں معلوم کہ ان کی اصل میں اسی طرح تھا، یا انھوں نے تصحیح کر دی ہے، اور اس تصحیح کا ذکر نہیں کیا ہے، پھر انھوں نے مختلف کتابوں کے حوالے سے حجاج بن ابی زینب کی نسبت علماء جرح وتعدیل کے اقوال نقل کیے ہیں۔

علامہ اعظمیؒ نے یہ کیا کہ متن میں جو "قاله" تھا، اس کو برقرار رکھ کر اس پر علامت لگائی، اور حاشیہ میں تحریر فرمایا:

الصواب "قال". وقول يحيى هذا من فوائد هذا الكتاب، فإن ابن حجر لم يحك عنه إلا قوله ليس به بأس.

۹- 'کتاب الثقات' میں مکرّرات کی تعداد بہت ہے، اکثر مکرّرات میں تو کوئی فرق نہیں ہے، لیکن کہیں ایسا ہوا ہے کہ ایک مقام پر راوی کی توثیق ایک ماہر فن نے کی ہے، اور دوسری جگہ دوسرے نے۔ جہاں کوئی فرق نہیں ہے، وہاں علامہ اعظمیؒ نے مکرر لکھ دیا ہے، اور یہی دوسرے دونوں فاضلوں نے بھی کیا ہے، لیکن جہاں دوسری صورت ہوتی ہے تو علامہ اعظمی اس کی طرف متوجہ کرتے ہیں، مثلاً:

☆...... الف) زیاد بن ابی مسلم کا تذکرہ دو جگہ ہے۔ دوسری جگہ علامہ اعظمی نے حاشیہ کا نمبر دے کر لکھا ہے:

كرّره لحكاية قول أحمد.

پہلی جگہ زیاد بن ابی مسلم کی توثیق یحییٰ بن معین کے اقوال کے ضمن میں ہے، اس لیے جب دوسری جگہ نام آیا تو متنبہ کر دیا کہ احمد کے اقوال کے ضمن میں اس کو مکرر ذکر کیا ہے۔ جبکہ ہمارے دونوں فاضلوں نے اس اہم نکتے کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔

☆...... ب) عثمان بن غیاث کا تذکرہ دو جگہ ہے، پہلی جگہ اقوالِ احمد کے ضمن میں، اور دوسری جگہ اقوالِ یحییٰ کے ضمن میں۔ علامہ اعظمی نے دوسری جگہ لکھا ہے:

تقدّم، كرّره لحكاية قول يحيى فيه.

جبکہ ہمارے دونوں فاضلوں نے صرف تقدّم یا مکرر لکھنے پر اکتفا کیا، اور اس فائدے کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا، جس کو علامہ اعظمیؒ نے ذکر کیا ہے۔

☆...... ج) عثمان بن المغیرۃ کا تذکرہ دو جگہ ہے، دوسری جگہ دونوں فاضلوں نے تقدّم یا مکرر لکھنے پر اکتفا کیا ہے؛ مگر علامہ اعظمیؒ نے دوسری جگہ لکھا ہے: تقدّم، كرر لحكاية قول يحيى فيه. یعنی پہلی جگہ امام احمد کے اقوال کے ضمن میں ان کی توثیق مذکور تھی، اور دوبارہ یحیی بن معین کے اقوال کے ضمن میں ہے۔

☆...... د) عمارۃ بن غزیہ کا ترجمہ مکرر ہے، دونوں فاضلوں نے دوسری جگہ تقدّم یا مکرر لکھ دیا ہے؛ مگر علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے: كرّره لحكاية قول أحمد فيه. یعنی پہلی جگہ یحییٰ بن معین کے اقوال کے ضمن میں

ان کا ذکر تھا، اور یہاں امام احمد کے اقوال کے ضمن میں وارد ہوا ہے۔

۱۰- علامہ اعظمیؒ نے اپنے نسخے میں دو راویوں کا تذکرہ بڑھایا ہے، جو تہذیب التہذیب میں مذکور ہیں، اور ان کی نسبت حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن شاہین نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے، علامہ اعظمیؒ نے جب اپنے مخطوطے میں ان دونوں راویوں کا تذکرہ نہیں دیکھا، تو **زيادة من التهذيب** کا عنوان لکھ کر ان کو ذکر کر دیا۔ پہلا اضافہ حرف ''ب'' کے اختتام پر ''بریدہ بن سفیان اسلمی'' کا ہے، یہاں علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے:

بريدة بن سفيان بن فروة الأسلمي، حكى ابن شاهين في الثقات عن أحمد بن صالح أنه قال: هو صاحب مغازٍ، وأبوه سفيان بن فروة له شأن من تابعي أهل المدينة (۴۳۳/۱)

دوسرا اضافہ حرف ''س'' کے تحت ہے، اس میں جس جگہ ''سعید'' نام کے راویوں کا تذکرہ ہے، وہاں لکھا ہے:

سعيد بن زنبور، أو سعد بن زنبور، يروي عن هشيم، وعنه أحمد بن علي الأبار، قال ابن معين: ثقة وما أراه يكذب. قال ابن حجر: ذكره ابن شاهين في الثقات. قلت: ولم أجده في نسختي.

تلک عشرۃ کاملۃ۔ یہ کل دس امور ہوئے جن میں علامہ اعظمیؒ اور قاضی اطہر و شیخ صبحی سامرائی کی 'کتاب الثقات' پر تعلیقات میں پائے جانے والے فرق کا نمونہ پیش کیا گیا ہے، ان کے علاوہ اور بھی قسم کے فرق پائے جاتے ہیں، جیسے بعض ژولیدہ عبارتوں کی توضیح، بعض مشکل کلمات کی تفسیر، اور بعض بعض راویوں پر نقد و نظر وغیرہ، لیکن طوالت اور ناظرین کی اکتاہٹ کے خوف سے ان ہی دس قسم کے امور و نکات پر اکتفا کیا جاتا ہے، اور یہ سوچ کر مزید سے صرف نظر کیا جاتا ہے کہ اس کے بعد قارئین کہیں یہ نہ کہہ اٹھیں:

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر : اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

کتاب الثقات سے متعلق کچھ اہم معلومات:

علامہ اعظمیؒ کو اس کا مخطوطہ بمبئی میں ۱۳۷۸ھ کے ایک سفر میں دستیاب ہوا تھا، مولانا محمد موسیٰ میاں کو ۱۴/ رمضان المبارک ۱۳۷۸ھ کے خط میں لکھا ہے:

''میں اپنی کتاب 'اعیان الحجاج' کا دوسرا حصہ اکثر و بیشتر لکھ چکا تھا کہ بمبئی وحیدرآباد کا سفر پیش آ گیا، اس سفر میں ایک قیمتی اور بہت قدیم 'کتاب الثقات لابن شاہین' المتوفی ۳۸۵ھ دستیاب ہوئی، اور میں نے اس کو نہایت تندہی سے نقل کرا لیا، نقل کے بعد حرفاً حرفاً خود اصل سے مقابلہ کر کے ساتھ لایا، اس وقت اسی کی تصحیح و تعلیق کے کام میں لگا ہوا ہوں، رُواۃ کے تراجم اس میں بہت مختصر ہیں، مگر چوٹی کے ناقدین امام احمد و امام ابن معین وغیرہما کے اقوال سے جن راویوں کی توثیق ثابت ہے، ان کا ذکر کر

کے موثّق کا قول کبھی سند کے ساتھ اور کبھی بلا ذکر سند نقل کر دیتے ہیں۔ لمبی تقطیع کے ایک سو پندرہ صفحات پر مشتمل ہے، اور ہر صفحہ میں ۲۰-یا ۲۵ راویوں کا ذکر ہے۔''

اس خط سے اس نسخے کی دریافت کے علاوہ اس کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے اسی وقت اس کی تحقیق وتعلیق کا کام انجام بھی دیا تھا، یعنی سامرائی صاحب اور قاضی صاحب کی تحقیق کردہ کتاب کے منصۂ شہود پر آنے سے تقریباً ۲۶، اور ۲۸ سال پہلے اس کی تعلیق سے فارغ ہو چکے تھے، جیسا کہ ۱۰/ ذی قعدہ ۱۳۷۸ھ = ۱۹/ مئی ۱۹۵۹ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے، جس میں مولانا محمد بن موسیٰ میاں کو لکھا ہے:

''کتاب الثقات کے حواشی خود میں نے بہت محنت سے لکھے ہیں''۔

مولانا محمد بن موسیٰ میاں کے نام لکھے ہوئے بعض خطوط میں آپ نے اپنے کام کی نوعیت کا بھی کچھ ذکر کر دیا ہے، ۲۱/ ذی قعدہ ۱۳۷۸ھ = ۳۰ مئی ۱۹۵۹ء کے خط سے نہایت بیش قیمت معلومات حاصل ہوتی ہیں، جو حسبِ ذیل ہیں:

''کتاب الثقات' اور 'مسند حمیدی' دونوں کے شروع میں صاحبِ نسخہ کی سند موجود ہے، اور حمیدی سے 'مسند' کو اور ابن شاہین سے 'ثقات' کو روایت کرنے والے راویوں کے جو نام مذکور ہیں، وہ معروف ہیں، پھر میں نے 'ثقات' کے حواشی میں جگہ جگہ یہ بتا دیا ہے کہ اِن اِن مقامات کے حوالے حافظ ابن حجر وغیرہ نے دیے ہیں۔ ان حوالوں سے بھی کتاب کی نسبت صحیح ثابت ہوتی ہے، اور حمیدی کی حدیثوں کو بھی صحیح بخاری وسنن بیہقی وغیرہ سے متعدد مقامات میں ملا کر اطمینان کر لیا ہے۔''

اسی خط میں آگے لکھا ہے:

''اس خط کے آخری صفحہ پر برخوردار مولوی رشید احمد کے قلم سے 'کتاب الثقات' کی چند سطریں اور سرخ لکیر کے نیچے اپنے تعلیقات وحواشی کا نمونہ بھیج رہا ہوں، تا کہ اس کتاب کے ساتھ برخوردار مذکور کے خط کا نمونہ بھی آپ دیکھ لیں، کتاب الثقات کے حاشیہ پر راویوں کے نام میں نے لکھے ہیں، اور ناموں کے اوپر تقریب وغیرہ کے مطابق اصحاب صحاح کی کتابوں کے رموز بھی دے دیے ہیں، تا کہ سرسری نظر میں جس راوی کی تلاش ہو مل جائے، اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ اصحاب صحاح کا راوی ہے یا نہیں، اور ہے تو کس کتاب کا۔ جو راوی ان کتابوں کے رجال میں سے نہیں ہے، اس کے نام پر حرف 'ز' (زوائد) کی علامت درج کی ہے۔''

علامہ اعظمی کو اس کتاب کی اشاعت کی بہت فکر اور خواہش تھی، لیکن یہ بات موجب افسوس ہے کہ اس کے لیے کوئی سامان نہیں پیدا ہو سکا، اس کی طباعت واشاعت کی خواہش کا اظہار مولانا محمد بن موسی میاں کو لکھے ہوئے متعدد خطوط میں کیا ہے، ۲۰/ شوال ۱۳۷۸ھ = ۲۰/ اپریل ۱۹۵۹ء کے خط میں لکھا ہے:

''کتاب الثقات لابن شاھین کو میں مجلس علمی کے لیے نامزد کرتا ہوں۔ ....

کتاب الثقات لابن شاھین کی نسبت دریافت طلب ہے کہ اس کو کیا کرنا ہوگا؟ میرے نسخہ سے مطبع کا کاتب متن کی کتابت تو کرے گا، مگر میرے حواشی کا خط باریک اور شکست ہے، اس کی کتابت پر وہ قادر نہ ہوگا، اس کام کے لیے ایک صاف نقل تیار کرانا پڑے گی، جس میں حواشی صاف، آسانی سے پڑھے جانے کے قابل لکھے جائیں۔

نیز اس کی طباعت کہاں ہوگی؟ ان امور کے متعلق اگر مجھ کو کوئی ہدایت دینے کی ضرورت آپ محسوس فرماتے ہوں، تو بوضاحت تحریر فرمایئے تاکہ اس کے مطابق عمل کیا جائے''۔

۳۰؍محرم ۱۳۷۹ھ = ٦؍اگست ۱۹۵۹ء کے خط میں رقم طراز ہیں:

''اب آپ غور فرما کر یہ بھی متعین فرمادیں تو بہتر ہے کہ 'کتاب الثقات' لابن شاہین کی طباعت کہاں پر اور کب تک شروع ہو؟ یہ معلوم ہو جائے تو اس کے حواشی وتعلیقات صاف نقل کرا دیے جائیں تاکہ کمپوزیٹر کو کمپوزنگ میں سہولت ہو اور غلطیاں کم ہوں''۔

۱۵؍رمضان المبارک ۱۳۷۹ھ = ۱۴؍مارچ ۱۹٦۰ء کے خط میں ارقام فرمایا ہے:

''کتاب الثقات لابن شاہین کی نسبت دریافت طلب امر ہے کہ اس کے متعلق کیا ارادہ ہے، صاف لکھئے تاکہ دوسرے خواہش مندوں سے بات کی جاسکے''۔

۱۵؍شوال ۱۳۷۹ھ = ۱۲؍اپریل ۱۹٦۰ء کے مکتوب میں تحریر فرمایا ہے:

''کتاب الثقات کے لیے بمبئی کے ایک دوست یحییٰ زبیر صاحب نے کہا تھا، مگر اس وقت میں نے ان کو لکھ دیا تھا کہ مجلس علمی اس کو طلب کر رہی ہے، اب پھر بمبئی سے۔کسی ادارہ نے نہیں بلکہ۔ایک شخص نے پوچھا ہے، اس لیے میں نے آپ کا عندیہ معلوم کیا''۔

☆......☆......☆......☆......☆......☆

استدراکات قاسم ابن قُطلُوبُغا

حافظ قاسم بن قُطلُوبُغا نویں صدی ہجری کے باکمال اور اصحاب فضل علما میں شمار ہوتے ہیں۔ وسیع المطالعہ، دقیق النظر ہمہ جہت اور متبحّر محدث وفقیہ تھے، اصلاً جرکسی تھے، ان کے والد قطلو بغا نوعمری میں مصر کی فوج میں بھرتی کے لیے قوقاس سے لائے گئے تھے، قطلو بغا کا مطلب مبارک مرد یا سردار وغیرہ ہوتا ہے۔ قاسم کی پیدائش مصر کے پایۂ تخت قاہرہ میں محرم ۸۰۲ھ میں ہوئی، بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا، یتیمی کی حالت میں نشو ونما پائی اور پروان چڑھے، تعلیم کا آغاز قرآن کریم کے حفظ سے کیا، اس کے بعد حدیث وفقہ وتفسیر اور دیگر علوم وفنون کی تحصیل اس وقت کے اجلّۂ اہل علم سے کی، ان کے شیوخ واساتذہ میں حافظ ابن حجر، علامہ ابن الہمام، سراج قاریٔ الہدایہ، علاء بخاری اور احمد فرغانی جیسے لوگ ہیں۔ اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے والوں میں

حافظ سخاوی جیسے اہل علم وفن ہیں۔

علامہ قاسم بن قطلو بغا نے متنوع علوم وفنون میں غیر معمولی مہارت بہم پہنچائی، خاص طور سے حدیث وفقہ اور نقد رجال میں بے نظیر فضل وکمال کے حامل تھے۔ تصنیف وتالیف میں بھی وہ نہایت بلند مقام رکھتے تھے۔ علامہ زاہد کوثری نے 'منیۃ الالمعی' کے مقدمہ میں سخاوی کے حوالے سے ان کی تیس سے زائد تصانیف کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ سخاوی نے 'ضوء لامع' میں ان کا چھ صفحے میں سیر حاصل تذکرہ کیا ہے، اور ان کے اوپر کیے جانے والے بعض اعتراضات کا دفاع کیا ہے۔

حافظ قاسم بن قطلو بغا کا شمار سرکردہ علماء احناف میں ہوتا تھا، بلکہ خدمت حدیث وسنت کے ساتھ انھوں نے اپنی تصانیف وتالیفات کے ذریعے حنفیت کی بھی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں، ان کی تصانیف متنوع علوم وفنون پر ہیں، لیکن ان کی فہرست تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ تخریج احادیث سے ان کو خاص شغف تھا۔

۴ر ربیع الآخر ۸۷۹ھ کو پنجشنبہ کی شب میں ۷۷ برس کی عمر میں علم وفضل کا یہ آفتاب غروب ہوگیا۔

علامہ قاسم کے تبحر علم، وسعت مطالعہ، دقت نظر اور جلالت قدر ومنزلت کا اندازہ ان کے اس مجموعۂ استدراکات سے لگایا جا سکتا ہے، جس میں انھوں نے ان حدیثوں کی نشان دہی کی ہے، جو علامہ جمال الدین زیلعی جیسے وسیع النظر محدث ومصنف کی دسترس سے باہر رہ گئیں، ان کے استدراکات کا یہ مجموعہ پچاس صفحات پر مشتمل ہے، اور محدث وعلامہ شیخ زاہد کوثری کی تحقیق سے مصر سے شائع ہو چکا ہے، اسی طرح ان استدراکات سے بھی ان کے غیر معمولی فضل وکمال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جو انھوں نے حافظ ابن حجر کی 'درایہ' پر کیے ہیں۔

اہل علم کو معلوم ہے کہ 'نصب الرایۂ' علامہ جمال الدین زیلعی کی وہ شہرۂ آفاق کتاب ہے، جس میں انھوں نے فقہ حنفی کی مشہور ترین کتاب 'ہدایہ' کی احادیث وآثار کی تخریج کی ہے، لیکن علم اور خاص طور سے علم حدیث وسنت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بڑے سے بڑا عالم اور محدث ومصنف بھی اس راہ میں خود کو درماندہ وکوتاہ اور بے بضاعت سمجھتا ہے، علامہ زیلعی کے سامنے تخریج احادیث کے دوران بہت سی روایات واحادیث ایسی آئیں، جن کے مصادر ومراجع تک ان کی رسائی نہیں ہوسکی، اور ان کے ذکر میں امام زیلعی کو اپنی کوتاہ نظری کا اعتراف کرنا پڑا، اور ایک دو نہیں ایسی حدیثوں کی بہت بڑی تعداد 'نصب الرایۂ' میں پائی جاتی ہے۔ علامہ قاسم بن قطلو بغا نے ان میں سے بیشتر حدیثوں کا تتبع اور تلاش کر کے ان کی نشاندہی کر دی اور بتلا دیا کہ یہ حدیثیں فلاں کتاب یا کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے 'درایۂ' کے نام سے 'نصب الرایۂ' کا اختصار کیا ہے، انھوں نے بھی اپنی اس کتاب میں بہت سی حدیثوں کی نسبت لکھا ہے کہ: لم أجده -میں نے اس کو نہیں پایا-، تو ان میں سے بہت سی روایات اور احادیث وآثار کا پتہ لگا کر حافظ قاسم بن قطلو بغا نے بتلا دیا ہے کہ فلاں کتاب میں یہ روایت موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ علامہ زیلعی اور حافظ ابن حجر جن روایتوں کی نسبت اپنی نارسائی کا اعتراف کریں، اور ان کے بارے میں کوئی

کہے کہ یہ حدیث فلاں کتاب میں موجود ہے، تو وہ بہت غیر معمولی علم و معرفت کا حامل ہی ہوسکتا ہے۔

'منية الالمعي' اگر مصر کے محدث علامہ زاہد کوثری کو حاصل ہوئی، تو **تعليقات القاسم على الدرايه** ہندوستان میں محدث جلیل علامہ اعظمیؒ کو دستیاب ہوئی، اس کی صورت یہ ہوئی کہ علامہ اعظمیؒ کو کہیں سے 'درایہ' کے نصف اخیر کا قلمی نسخہ ہاتھ لگ گیا، خوش قسمتی سے اس پر حافظ قاسم بن قطلو بغا کی اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی جگہ جگہ تعلیقات تھیں، اس نسخے اور اس پر علامہ قاسم کی تعلیقات کی دستیابی کی بعد ظاہر ہے علامہ اعظمیؒ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ اُدھر مصر میں 'منیۃ الالمعی' کی اشاعت کے سلسلے میں علامہ زاہد کوثری الگ پس وپیش میں تھے، لیکن جب ان کو علامہ اعظمیؒ کے خط سے معلوم ہوا کہ ان کی ملکیت میں 'درایہ' کا ایک ایسا نسخہ ہے، جس پر علامہ قاسم کے قلم سے ان احادیث کی تخریج ہے، جن تک حافظ ابن حجر کی رسائی نہیں ہوسکی ہے، جیسے ہی علامہ کوثریؒ کو اس کی اطلاع ملی انھوں نے خط لکھ کر علامہ اعظمیؒ سے ان استدراکات کو طلب کیا، چنانچہ علامہ اعظمیؒ نے ان کو نقل کر کے علامہ کوثری کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ اس کی دستیابی کے بعد 'منیہ' اور 'درایہ' پر استدراکات دونوں کی اشاعت کا علامہ کوثری کا عزم راسخ اور پختہ ہوگیا، اور آپ نے دونوں کو ایک ساتھ اس طرح طبع کرایا کہ آخر میں تعلیقات قاسم علی الدرایہ کو شامل کر کے بے انتہا مفید اور نافع بنا دیا۔

یہ پوری تفصیل علامہ زاہد الکوثری کے مقدمۂ 'منیہ' میں دیکھی جاسکتی ہے، اس کے آخر میں علامہ کوثری نے علامہ اعظمیؒ کی اس بے لوث بہترین علمی کاوش کو ان الفاظ میں ہدیۂ تشکر پیش کیا ہے:

> **هذا وإني أشكر مولانا العلامة النحرير والجهبذ الخبير أبا المآثر حبيب الرحمن الأعظمي ...... على تفضله بكتابة التعليقات بخط يده المباركة، ومبادرته بإرسالها إلى هذا العاجز مع ما له من الأشغال الكثيرة؛ فإنه هو السبب الأوحد لنشر الإثنين معاً.**

> میں شکریہ ادا کرتا ہوں علامہ بزرگ و برتر اور باکمال ماہر فن ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی کا کہ انھوں نے از راہ فضل و احسان اپنے مبارک ہاتھوں سے ان حواشی و تعلیقات کو تحریر فرمایا اور کثرت اشغال کے باوجود بلا تاخیر ان کو اس عاجز کے پاس روانہ فرمایا، مولانا کی ذات ہی ہے جو دونوں کے یکجا طبع ہونے کا ذریعہ بنی ہے۔

یہ کل انتیس (۲۹) استدراکات یا تعلیقات تھے، جن کو علامہ اعظمیؒ نے 'درایہ' کے نسخے سے نقل کر کے اور بقدر ضرورت اپنے حواشی لکھ کر علامہ زاہد کوثری کی خدمت میں روانہ فرمایا، اور شیخ نے ان کو 'منیۃ الالمعی' کے آخر میں طبع کیا، علامہ اعظمیؒ نے ان تعلیقات کے آخر میں لکھا ہے:

> **''وهذا ما وجدناه من تعليقات الحافظ قاسم على الدراية بخط يده، على هوامش نسخة من النصف الأخير للدراية، وهي بخط محمد بن أحمد الخطيب**

الطوخي المُترجَم له في الضوء اللامع، وقد وقع فراغه من كتابتها سنة ٨٣٠هـ. نسخها أبو المآثر حبيب الرحمن الأعظمي لست بقين من شعبان سنة ١٣٦٩هـ".

یہ حافظ قاسم کے دست مبارک کی تحریر کردہ وہ تعلیقات ہیں، جن کو ہم نے 'درایہ' کے نصف آخر کے حاشیہ پر پایا ہے، اور 'درایہ' کا یہ نسخہ محمد بن احمد خطیب طوخی کے قلم سے لکھا ہوا جن کا تذکرہ ضوء لامع میں موجود ہے، محمد طوخی اس کی کتابت سے ۸۳۰ھ میں فارغ ہوئے ہیں۔ حافظ قاسم کی ان تعلیقات کو ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی نے ۲۴ر شعبان ۱۳۶۹ھ کو نقل کیا ہے۔

منية الالمعی مطبعۃ السعادۃ مصر سے چھپ کر ۱۳۶۹ھ=۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

رسائل خاندان ولی اللّٰہی

شاہ ولی اللہ اور اہل ہند پر ان کے احسانات:

خانوادۂ ولی اللّٰہی ہندوستان کا سب سے با برکت اور فیض رساں خاندان تھا، جس نے اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کی دستگیری اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیا، جب مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام تھا، بساط سیاست پر اورنگ زیب عالمگیر کے بعد مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی، اور خود حکمراں خاندان خانہ جنگی کا شکار تھا، علوم اسلامیہ اپنی جدت طرازی، اثر آفرینی، ولولہ خیزی اور فکر انگیزی کھو کر جمود و تعطل کی کیفیت سے دوچار تھے، ذلت وادبار کی مہیب گھٹائیں چاروں طرف سے اٹھ اٹھ کر مسلمانان ہند پر سایہ فگن ہو رہی تھیں، ایسے نازک دور میں شاہ ولی اللہ احمد بن عبدالرحیم دہلویؒ - ولادت ۱۷۰۳ء وفات ۱۱۷۶ھ=۱۷۶۲ء - کو اللہ تعالیٰ نے مسیحا نفس اور مجدد امت بنا کر بھیجا، اور انھوں نے اپنی قوت فکر و نظر سے اسلام اور مسلمانوں کے نیم مردہ جسم میں نئی روح پھونک کر ایک انقلاب برپا کر دیا، اور اپنے وسیع و عمیق مطالعہ، تبحر علمی، نکتہ سنجی، دقیقہ رسی، بلند نگاہی اور قوت اخذ وادراک سے اسلامی علوم وفنون کو حیات نو بخشی، اور ایسے وقت میں جب کہ علمی وفکری انحطاط اپنی آخری منزل کو پہنچ چکا تھا، تعلیم وتربیت کا ایسا اثر آفریں نظام قائم کر دیا، جو علوم اسلامیہ کے لیے مژدۂ جانفزا ہونے کے ساتھ وقت کے تقاضوں اور زمانے کے چیلنجوں کے مطابق تھا۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

> ''اس بزرگ نے نہ صرف قوم کو ایک نئی روحانی اور اخلاقی زندگی عطا کی، .... بلکہ عقائد وخیالات کا ایک ایسا نظام مرتب کر دیا، جو اسلامی ہندوستان کے خاص حالات کے لحاظ سے سب سے زیادہ موزوں تھا، اور فی الحقیقت قوم کی نئی تنظیم کے لیے روحانی اساس ثابت ہوا''[1]۔

(۱) رود کوثر ۵۳۴-۵۳۳

تحریک ولی اللہی کا اثر صرف نظام تعلیم وتربیت اور مسجد ومدرسہ کے درو دیوار تک نہیں تھا، بلکہ اس کے اثرات ہمہ جہت اور ہمہ گیر تھے، اور ان کے برپا کیے ہوئے افکار وخیالات پھیل کر ریاست وسیاست، ملکی تدبیر، حرب وضرب اور جہاد کے میدانوں تک پہنچ چکے تھے، شیخ صاحب رقم طراز ہیں:

''مغلوں کی وسیع سلطنت جاتی رہی، لیکن ان راحت طلبوں نے کروٹ نہ لی۔ مرہٹے، روہیلے، انگریز جو کوئی بھی آیا، اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا؛ لیکن ولی اللہی تحریک کا اثر تھا کہ لوگ اپنے گھروں سے سینکڑوں میل دور بالاکوٹ کی پہاڑیوں میں پروانہ وار اپنی جان پر کھیلتے تھے''(۱)۔

اور یہ ولی اللہی تحریک ہی کا اثر تھا کہ ۱۸۵۷ء میں مٹھی بھر سرفروش مسلم مجاہدین مسلم حکومت کے ٹمٹاتے ہوئے چراغ کو گل ہونے سے بچانے کے لیے جھرجھری لے کر کھڑے ہوئے، اور سفید فام انگریز حملہ آوروں سے ملک کو بچانے کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا، پھر ملک پر انگریزوں کے تسلط کے بعد کبھی آرام سے نہیں بیٹھے۔ یہ اسی سلسلۂ ولی اللہی کے لوگ اور فکر ولی اللہی کے حاملین تھے، جو اس وقت تک مسلسل ان غاصب حکمرانوں کے خلاف جدوجہد کرتے رہے جب تک ان کو دیس نکالا نہ دے دیا۔ اور یہ فکر ولی اللہی کا فیض تھا کہ ان کے سلسلے کے فیض یافتہ ارباب فکر وبصیرت نے دارالعلوم دیوبند اور اس طرز کے ایسے ادارے پورے برصغیر میں قائم کر دیے، جس نے دین اسلام اور علم دین کے تحفظ وبقا کی راہیں ہموار کر دیں، اور دشمنان اسلام جو ہندوستان میں اسلام کی آخری ہچکی کا انتظار کر رہے تھے، ان کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ آج ہندوستان کے گوشے گوشے اور چپے چپے پر قال اللہ اور قال الرسول کے جو ترانے اور زمزمے گونج رہے ہیں، یہ سب اسی فکر ولی اللہی کے برگ وبار اور ان کے برپا کردہ نظام کی بازگشت صدائیں ہیں۔ اور بے سروسامانی کی تصویر بنے یہی وہ ادارے یا مدارس ہیں، جنھوں نے آج ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کو زندہ رکھا ہے۔

شیخ اکرام نے اس دور کے حالات وواقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس بزرگ نے ایک تو قوم کو قرآن فہمی کی نعمت عظمیٰ عطا کی، اور دوسرے اُس نے اور اس کی اولاد نے ایک ایسا نظام قائم کر دیا، جو انیسویں صدی کی مذہبی کشمکش میں ہماری سب سے بڑی ڈھال رہا ہے، یہ اس خاندان ہی کا فیض تھا، کہ جب ہندوستان پر مشنریوں اور مادہ پرستوں کے حملے ہوئے، تو لوگ مذہب اسلام سے واقف تھے، اس میں دلچسپی لیتے تھے، اور مخالفوں کا مقابلہ کر سکتے تھے''(۲)۔

شاہ صاحب کے اولاد واخلاف:

شاہ ولی اللہ کے چار فرزند ہوئے، اور چاروں ہی علم ودانش کے آفتاب وماہتاب تھے، ان میں سے ہر ایک اپنے پدر بزرگوار کا جانشیں اور ان کے فکر ونظر کا علم بردار تھا، ان میں بڑے اور فکر ولی اللہی کے سب سے بڑے

(۱) رود کوثر ۵۳۳ (۲) ایضاً

حامل اور فکر ولی اللہی کے سب سے بڑے شارح وترجمان مولانا شاہ عبدالعزیز - ولادت ۱۱۵۹ھ = ۱۷۴۶ء وفات ۱۲۳۹ھ = ۱۸۲۳ء - تھے، ان کے بعد شاہ رفیع الدین - متوفی ۱۲۳۳ھ - تھے، پھر شاہ عبدالقادر - ولادت ۱۱۶۷ھ = ... وفات ۱۲۳۰ھ = ۱۸۱۴ء -، اور سب سے چھوٹے مولانا شاہ عبدالغنی - متوفی ۱۲۲۷ھ - تھے۔ یہ علم وادب اور فضل وکمال کا ایسا گہوارہ تھا، جس کا ہر رکن علم ومعرفت، زہد وتقوی اور عبادت وریاضت کی گود کا پروردہ، اور ''جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے'' کا حقیقی مصداق تھا۔ ہم کو آئندہ چونکہ شاہ رفیع الدین علیہ الرحمہ کے بعض رسائل پر گفتگو کرنا ہے، اس لیے یہاں ان کے حالات سپرد قلم کیے جارہے ہیں۔

شاہ رفیع الدین دہلوی:

اسی طلائی سلسلے کی ایک کڑی اور جامع کمالات خاندان کے درعدن تھے، جن کا تذکرہ صاحب نزهة الخواطر نے یوں شروع کیا ہے:

الشيخ الإمام العالم الكبير العلامة رفيع الدين .... المحدث المتكلم الأصولي الحجة الرُّحلة، فريد عصره ونادرة دهره.(۱)

ولادت اور نام ونسب:

۱۱۶۳ھ = ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد ماجد کے ظل عاطفت میں حاصل کی، لیکن ابھی عمر کی صرف تیرہ منزلیں طے کی تھیں کہ پدر بزرگوار کا سایۂ شفقت سر سے اٹھ گیا، لیکن آپ کے برادر مشفق حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے - جو آپ سے محض ۳-۴ سال بڑے تھے - یتیمی کا داغ محسوس نہیں ہونے دیا، اور نہ صرف شاہ رفیع الدین بلکہ ان سے چھوٹے دونوں بھائیوں - مولانا عبدالقادر ومولانا عبدالغنی - کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری اس حسن وخوبی کے ساتھ انجام دی کہ ان میں سے ہر ایک صاحب فضل وکمال بن کر اپنے والد کے فیوض وبرکات کا حامل، ان کے علوم ومعارف کا امین اور ان کے افکار ونظریات کا شارح وناشر بنا۔

آپ شاہ رفیع الدین کے نام سے مشہور ہیں، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ آپ کا لقب تھا، اصلی نام یہ نہیں تھا، اگر چہ اس کی تصریح راقم کو نہیں ملی، لیکن 'نزهة' الخواطر کی عبارت سے اس کا اشارہ ملتا ہے، اس میں آپ کا نام یوں مرقوم ہے:

الشيخ الإمام العالم الكبير رفيع الدين عبدالوهاب بن ولي الله بن عبدالرحيم العمري الدهلوي.

اس عبارت میں آپ کا نام رفیع الدین کے ساتھ عبدالوہاب بھی لکھا ہے، اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبدالعزیز، عبدالقادر اور عبدالغنی کے وزن پر اصلی نام ''عبدالوہاب'' تھا، لیکن علمی دنیا میں شہرت ''رفیع الدین''

(۱) نزهة الخواطر: ۱۸۲/۷

کے نام سے ہوئی، اور یہ اصلی نام پر غالب ہو گیا۔

درس و تدریس اور وعظ و ارشاد:

شاہ رفیع الدین کی شخصیت شریعت و طریقت، عقل و نقل، تصوف و سلوک اور علم و معرفت کی جامع تھی، آپ نے درس و تدریس، وعظ و ارشاد، تصنیف و تالیف اور اصلاح و تربیت ہر انداز سے علم و دین کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ بیس سال کی عمر میں انھوں نے مفتی اور مدرس کا منصب سنبھالا اور کچھ عرصے بعد وہ اپنے بھائی اور استاد شاہ عبدالعزیز کے جانشین ہو گئے، جو اپنی بینائی اور تندرستی کھو بیٹھے تھے۔ چنانچہ آپ کے چشمۂ علمی سے فیض اٹھانے کے لیے لوگ ہر طرف سے ٹوٹ پڑے، اور بڑی تعداد میں فضلاء دہر نے آپ کے حلقہ درس سے فیض اٹھایا[1]۔ اور یہی وجہ ہے کہ خانوادۂ شاہ ولی اللہ میں آپ کا مرتبہ مصنف سے زیادہ مدرس اور واعظ کی حیثیت سے مسلّم ہے[2] محقق متقن، فقیہ محدث تھے[3]، اپنے بیشتر ہم عصروں پر فائق تھے، اگلوں کے علم پر بھی آپ کو کامل دستگاہ حاصل تھی[4]۔ سرسید احمد خان نے ان کے علم و فضل اور تدریسی صلاحیت کے متعلق لکھا ہے:

> ''ہر فن کے ساتھ اس طرح کی مناسبت تھی کہ ایک وقت میں فنون متباینہ اور علوم مختلفہ درس فرماتے تھے، جب ایک کی تعلیم سے دوسرے کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوتے، حضّار خدمت کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اسی فن میں جامۂ یکتائی ان کے قامت استعداد پر قطع ہوا ہے''[5]۔

بیعت و سلوک:

سلوک و طریقت میں بھی آپ کا مرتبہ مسلّم تھا، سرسید لکھتے ہیں:

> ''باوجود ان کمالات کے افاضۂ باطن کا یہ حال تھا کہ جنید بغدادی اور حسن بصری کہ اگر اُن کے وقت میں ہوتے، تو بے شک و ریب اس میں اپنے تئیں کمترین مستفیدان تصور کرتے''[6]۔

شاہ صاحب نے خرقۂ سلوک و طریقت حضرت شاہ محمد عاشق پھلتی سے حاصل کیا تھا[7]۔

وفات:

تذکرۂ علماء ہند (ص ۶۶) میں شاہ صاحب کا سال وفات ۱۲۴۹ھ، اور حدائق الحنفیہ (ص ۴۷۰) میں ۱۲۳۸ھ لکھا ہے، لیکن یہ ان مصنفوں کا سہو یا سبقت قلم معلوم ہوتا ہے، نزہۃ الخواطر میں ۶ رشوال ۱۲۳۳ھ لکھا ہے، اور دائرۃ المعارف الاسلامیہ (۳۱۸/۱۰) میں بھی یہی ہے، اور اس کے مطابق انگریزی تاریخ ۹ راگست ۱۸۱۸ء لکھی

---

(۱) نزہۃ الخواطر ۱۸۳/۷ (۲) دائرۃ المعارف: ۳۱۹/۱۰ (۳) حدائق الحنفیہ: ۴۷۰
(۴) الیانع الجنی: ۷۵ (۵) آثار الصنادید: ۵۴۳ (۶) آثار: ۵۴۳
(۷) نزہۃ الخواطر ۱۸۳/۷

ہے۔موج کوثر، مقدمہ مجموعہ رسائل اور حاشیہ آثار الصنادید میں بھی ۱۲۳۳ھ ہی لکھا ہے۔

تصنیفات وتالیفات:

شاہ رفیع الدین صاحب نے کم وبیش بیس کتابیں لکھیں، جن میں سے بیشتر عربی اور فارسی میں اور چند اردو میں ہیں[۱]۔آپ کی تصانیف آپ کے علم وفضل، عقل وفہم، ذہانت وذکاوت، تبحر وتعمق اور گہرائی وگیرائی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔آپ کی تصانیف کی نسبت نواب صدیق حسن خاں نے 'الیانع الجني' سے یہ جامع تبصرہ نقل کیا ہے:

ولـه مولفات جيدة يُكثِر فيها من رموزٍ خَفيَّةٍ يَعسُر الاطلاعُ عليها، ويَجمَعُ مسائلَ كثيرةً في كلماتٍ يسيرةٍ[۲].

''تالیفات جیدہ کیں، جن میں کثرت سے ایسے رموز خفیہ کو داخل کیا کہ ان پر مشکل سے اطلاع ہو سکتی ہے، اور کلمات یسیرہ میں مسائل کثیرہ جمع کیے''[۳]۔

اور دائرۂ معارف اسلامیہ (۳۱۸/۱۰) میں آپ کی تصانیف کے بارے میں لکھا ہے:

''خیالات کی لطافت اور اسلوب کی بلاغت میں ان کی بڑی تعریف کی جاتی ہے''

مجموعۂ رسائل کے مقدمے میں آپ کی جن تصانیف کی فہرست ذکر کی گئی ہے، وہ یہ ہیں:

۱-ترجمۂ قرآن کریم: اس کے متعلق لکھا ہے: ''یہ ترجمہ غالباً اردو زبان میں سب سے پہلا تحت اللفظ ترجمہ ہے، اور نہایت عمدہ ہے''۔ ۲-قیامت نامہ یا علامات قیامت، ۳-اسرار المحبۃ، ۴-تکمیل الاذہان، ۵-تفسیر آیت النور، ۶-دمغ الباطل، ۷-رسالہ حملۃ العرش، ۸-رسالہ بیعت، ۹-رسالہ شرح چہل کاف، ۱۰-رسالہ شرح رباعیات، ۱۱-رسالہ نذور بزرگاں، ۱۲-رسالہ جوابات سوالات اثنا عشر، ۱۳-رسالہ شرح برہان العاشقین، ۱۴-رسالہ اذان نماز، ۱۵-رسالہ فوائد نماز، ۱۶-فتاوی شاہ رفیع الدین، ۱۷-رسالہ رویت باری تعالی۔

ان میں سے بہت سے رسائل ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ-پاکستان- سے مولانا عبدالحمید سواتی کی تحقیقی کاوشوں کی برکت سے چھپ چکے ہیں۔

رسائل سلسلہ ولی اللہی اور ان کی اشاعت میں علامہ اعظمیؒ کی دلچسپی:

مجلس علمی کے بانی وسرپرست مولانا محمد بن موسی میاں کو اپنے بزرگوں کے علمی سرمائے کی نشر واشاعت میں حد سے زیادہ دلچسپی اور لگن تھی، اور اسی مقصد کے پیش نظر انھوں نے مجلس علمی قائم کی تھی، مولانا محمد میاں کو اپنے پروگرام کے تحت خاندان ولی اللہی کی وراثت کو بھی منظر عام پر لانے کی فکر دامن گیر ہوئی، ان کے اس عزم وارادہ کو

(۱) دائرۃ المعارف: ۳۱۸/۱۰ (۲) ابجد العلوم: ۱۹۵/۳ (۳) حدائق الحنفیہ: ۴۷۰

روبہ عمل لانے میں علامہ اعظمیؒ ہر طرح معاون اور مددگار رہے، علامہ اعظمیؒ اور مولانا محمد میاں کے باہمی مکاتیب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں یہ ہُمک اور تڑپ تھی کہ خاندان ولی اللہی کے رسائل - بالخصوص وہ رسائل جو کبھی طبع نہیں ہوئے ہیں - کم از کم ایک دفعہ زیور طباعت سے آراستہ ہو جائیں، کیونکہ یہ ہمارے پیش رو بزرگوں کے نہایت بیش قیمت علمی وفکری آثار اور قلمی اثاثے ہیں، جن کی طباعت واشاعت کی اگر فکر نہ کی گئی، تو بعید نہیں کہ حوادث دہر کی نذر ہو کر ضائع ہو جائیں۔ اور زمانہ گواہ ہے کہ ان کی اشاعت میں علامہ اعظمیؒ نے کسی بھی قسم کی مخلصانہ کوشش سے دریغ نہیں کیا۔

۱۱؍شعبان ۱۳۷۸ھ کے خط میں شاہ رفیع الدین صاحب کی کتاب 'تکمیل الاذہان' کی نسبت لکھا ہے:

''تکمیل الاذہان' کا ایک نسخہ دیوبند میں تھا، مگر میں نے اس دفعہ تین دن تک اس کو تلاش کیا اور کرایا، مگر نہیں مل سکا، معلوم نہیں کہاں رُل گیا۔ دوسرا نسخہ اس کا رام پور کے کتب خانہ میں ہے، مزید تفتیش کر رہا ہوں، یہ کتاب میں نے دیکھی ہے، بہت لطیف الحجم ہے، اس کا چھپنا آسان ہے، ۷۰-۸۰ صفحات ہوں گے''۔

۵؍شوال ۱۳۷۸ھ = ۱۴؍اپریل ۱۹۵۹ء کے مکتوب میں مرقوم ہے:

'لمحات' کے طباعت کی تجویز سے مسرت ہوئی، شاہ صاحب رحمہ اللہ کے رسالے 'سطعات' 'ھمعات' تو طبع ہو چکے ہیں، مگر ان کی طباعت کو ایک مدت ہو چکی، پھر طباعت اور کاغذ بھی بہت خراب ہے، مناسب سمجھیں تو انھیں کو دوبارہ تصحیح اور دوسرے قلمی نسخوں سے مقابلہ کے بعد طبع کرا دیں، ہاں حضرت شاہ صاحب کا ایک رسالہ یا دعا جس کا نام 'الاعتصام' ہے، اور اس کی شرح فارسی میں ان کے خلیفہ ارشد شاہ محمد عاشق پھلتی نے لکھی ہے ۴۲-۴۴ صفحات پر مشتمل ہے، اس کو طبع کرانا چاہیں، تو اس کا ایک نسخہ احقر کے پاس موجود ہے، مگر وہ مصحح نہیں ہے، جگہ جگہ کتابت کے اغلاط موجود ہیں، مگر یہ رسالہ اب تک طبع نہیں ہوا ہے - فیما اعلم -، اور اگر چہ 'شرح الاعتصام' کی نسبت شاہ محمد عاشق کی طرف ہے، مگر درحقیقت وہ سب ولی اللہی معارف ہیں۔

اسی طرح شاہ صاحب کی غیر مطبوعہ تصنیفات میں 'انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ' کا دوسرا حصہ ہے، جس میں شاہ صاحب نے اپنے تحصیل علم ظاہر کے سلسلوں کا ذکر کیا ہے''۔

۱۰؍ذی قعدہ ۱۳۷۸ھ = ۱۹؍مئی ۱۹۵۹ء کے والا نامہ میں لکھا ہے:

''آج کے خط سے معلوم ہوا کہ 'تکمیل الاذہان' کے دو نسخے کراچی میں موجود ہیں، مگر یہاں پر گھوسی والے نسخہ کی نقل شروع ہو چکی ہے، اور جس نسخہ سے بھی اس کتاب کی طباعت ہو، اس کا مقابلہ رامپوری نسخہ سے ضروری ہے، اس لیے کہ وہ بخط مصنف ہے، جو نقل یہاں ہو رہی ہے اسی کا ساتھ لے جانا آسان ہے، کراچی والا نسخہ معلوم نہیں یہاں آ بھی سکے یا نہیں۔

میرے خیال میں اس پر نوٹ اور حواشی کی بھی ضرورت ہے، اس کے ساتھ کسی اور رسالہ کو جوڑنے کی ضرورت ہو تو حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کی 'تفسیر آیۃ النور' جوڑی جاسکتی ہے، اس کا قلمی نسخہ بھی اسی 'تکمیل الاذہان' کے ساتھ مجلد ہے؛ 'سطعات' 'ھمعات' کے مطبوعہ بھی مل جائیں گے، قلمی نسخے میرے پاس موجود ہیں، 'لمحات' کو میں نے پڑھا نہیں ہے، مگر میرا اندازہ ہے کہ یہ تینوں ساتھ چھپ سکتی ہیں''۔

۲۱رذی قعدہ ۱۳۷۸ھ=۳۰رمئی ۱۹۵۹ء کے خط میں تحریر فرمایا ہے:

''۱-'تکمیل الاذہان' کی نقل ہو رہی ہے۔

۲-'سطعات' (شاہ ولی اللہؒ) کے مطبوعہ نسخہ کا مقابلہ قلمی نسخہ سے میں نے کرلیا ہے۔

۳-شرح 'الاعتصام' کی تصحیح بھی ہوگئی ہے۔

۴-شاہ رفیع الدین دہلوی کا ایک رسالہ 'اسرار المحبۃ' قلمی بمبئی میں دیکھا تھا، اور ایک رسالہ ان کا سیرت میں بہرائچ میں ہے، اگر ان کی نقلیں ہوتیں تو 'تکمیل الاذہان' کے ساتھ ان کو جوڑنا مناسب تھا''۔

اسی خط میں آگے لکھا ہے:

''شرح 'الاعتصام' 'اعیان الحجاج' کی تقطیع پر ۴۶ صفحات میں ہے، مگر سطریں گنجان اور خط باریک ہے، ذرا جلی خط میں کتابت کرائی جائے، تو غالباً ۵۶ صفحات میں آئے گی، 'لمحات' کی ضخامت معلوم ہوتی، تو اب میرا خیال ہے کہ اس کو اور 'ہمعات' و'سطعات' اور 'شرح الاعتصام' کو ایک ساتھ جوڑ دیا جاتا، صرف شرح الاعتصام کے مصارفِ طباعت بشمول اجرتِ کتابت ایک سو بارہ روپے، اور تقریباً دو سو روپے کے کاغذ میں ایک ہزار نسخے تیار ہو جائیں گے''۔

۴رذی الحجہ ۱۳۷۸ھ=۱۲رجولائی ۱۹۵۹ء کے خط میں لکھا ہے:

''رسالہ 'ھمعات' کا موضوع خود مصنف کے قلم سے یہ ہے:

''ایں کلمۂ چند است کہ از رشحاتِ الہام بر قلبِ ایں شیفتۂ مستہام نزول فرمودہ اند تا دستور باشد ویرا و تابعان وے را در سلوک صراط مستقیم و نموذجے باشد از نسبتے کہ حضرت دیاب در دل وے ودیعت نہادہ، و بیانے باشد طریقے را کہ بسوئے آں دلالت نمودہ'' (مطبوعہ اسلامی پریس تحفہ محمدیہ) شہر کا نام ندارد۔

اور 'سطعات' کی نسبت فرماتے ہیں:

''ایں کلمۂ چند است مسمی بسطعات در بیان طلسم الٰہی کہ رابطۂ است در میان مجرد محض و عالم شہادت و بعض خواص و آثار آں'' (مطبوعہ مطبع احمدی، شہر کا نام مذکور نہیں)۔

حاصل یہ کہ 'ھمعات' میں شاہ صاحب کے طریق سلوک و تربیت کا بیان ہے، اور 'سطعات' میں

شاہ صاحب کے مخصوص علوم ومعارفِ حقیقت کا بیان ہے۔دونوں کی تعدادِ صفحات پہلے لکھ چکا ہوں۔

''تکمیل الاذہان کے اب صرف دس ورق رہ گئے ہیں، وہ بھی نقل ہولیں،تو 'تفسیر آیۃ النور' کی نقل شروع کراؤں،۲۰x۲۶ کی تقطیع پر نقل کرائی ہے، ہر صفحہ میں ۱۷سطریں ہیں۔''

اسی مکتوب میں آگے لکھا ہے:

''تکمیل الاذہان' کا جونسخہ دستیاب ہوا ہے، اس میں کتابت کی غلطیاں بہت ہیں، نیز اس کا پہلا باب جو منطق میں ہے، وہ غایتِ اختصار کی وجہ سے بہت اَدَق اور مُغلَق ہے، اس لیے اس کی تصحیح وتحشیہ لابدّ ی ہے۔لہٰذا اس کے باب میں بھی جو آپ کی مرضی ہو، صراحۃً تحریر فرمایا جائے۔

میں نے 'سطعات' 'ہمعات' کے مطبوعہ نسخے مدرسہ مفتاح العلوم سے عاریت لے کر دونوں کا اپنے قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے تصحیح کر دی ہے، اور بوقتِ ضرورت دونوں کے مطبوعہ نسخے کراچی بھیجے جاسکتے ہیں''۔

۱۰؍اکتوبر ۱۹۵۹ء کے ایک خط میں مولانا محمد موسیٰ میاں کو لکھا ہے:

''یہاں 'اسرار المحبۃ' للشاہ رفیع الدین کا نسخہ دستیاب ہو گیا اور اس کو نقل کے لیے دے دیا ہے''۔

اور اس مکتوب کے آخر میں لکھا ہے:

'لمحات' کا ایک اچھا نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں دستیاب ہوا تھا، بہت صاف اور سالم ہے؛ اگر ضرورت ہوتو اس کا عکس یا نقل حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، امید ہے کہ ڈاکٹر یوسف الدین یا اور کسی کو لکھوں گا، تو وہ نقل حاصل کرنے کا انتظام کر دیں گے''۔

۳۰؍محرم ۱۳۷۹ھ = ۶؍اگست ۱۹۵۹ء کے مکتوب میں تحریر فرمایا ہے:

''لکھنؤ میں تکمیل الاذہان کا ایک نسخہ دستیاب ہوا، جو نواب صدیق حسن مرحوم کے والد کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، اس سے اپنے نسخہ کا پورا مقابلہ کر کے تصحیح کی، اور اس میں جو منہیات تھے اس کو بھی اپنے نسخہ میں نقل کر لیا''۔

۱۹؍صفر ۱۳۷۹ھ = ۲۵؍اگست ۱۹۵۹ء کے مکتوب میں درج ہے:

''رام پور میں شاہ محمد عاشق قدس سرہ کی 'شرح الاعتصام' کا بھی ایک نہایت خوش خط نسخہ ہے، مگر میرا نسخہ اس سے بہت زیادہ صحیح ہے۔

یہاں پر حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کی کتاب 'دمغ الباطل' کا بھی ایک عمدہ نسخہ ہے، جو وحدت وجود و وحدت شہود کے درمیان جمع کی مبحث میں مولانا غلام یحییٰ بہاری کے رسالہ 'کلمات الحق' کے جواب میں بڑی تقطیع پر (ہدایہ کی تقطیع) ۳۱۵ صفحات کی کتاب ہے، فی صفحہ ۲۳ سطریں ہیں''۔

اسی خط میں چند سطروں کے بعد لکھا ہے:

''رام پور کے بعد چند گھنٹوں کے لیے میں بریلی بھی گیا، معلوم ہوا تھا کہ وہاں بھی ولی اللہی خاندان کے بہت سے نوادر ہیں، جانے پر معلوم ہوا کہ یہ بات صحیح ہے، چنانچہ 'تکمیل الاذہان' کے ۲ نسخے اور 'دمغ الباطل' کے تین نسخے وہاں موجود ہیں، نیز ایک مجموعہ میں اس خاندان کے متعدد قلمی رسائل ہیں، 'عبقات' شاہ اسماعیل شہیدؒ کا بھی قلمی نسخہ ہے؛ مگر میں صرف 'تکمیل الاذہان' اور 'دمغ الباطل' دیکھ سکا، اس لیے کہ دوسری کتابیں سر دست مل نہیں سکیں اور بعض امروہہ گئی ہوئی تھیں، وہاں 'اسرار المحبۃ' (للشاہ رفیع الدین) کا بھی ایک ناقص نسخہ ہے، مالک کتب خانہ نے دوبارہ باصرار بریلی کی دعوت دی ہے، اور جس کتاب کی ضرورت ہو اس کی نقل بخوشی دینے کی رضامندی ظاہر کی ہے، مالک کا نام حکیم مختار احمد صاحب امروہوی ہے، جو حضرت مولانا احمد حسن امروہوی کے شاگرد ہیں''۔

۲۶؍ربیع الآخر ۱۳۷۹ھ = ۲۹؍اکتوبر ۱۹۵۹ء کے خط میں ارقام فرمایا ہے:

''حیدرآباد میں 'لمحات' کا ایک نسخہ دستیاب ہوا تھا، جو بھوپال میں لکھا گیا ہے، اور ایک یمنی الاصل کا لکھا ہوا ہے۔ میں نے اس کی اطلاع مولانا طاسین صاحب کو کر دی ہے، اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ضرورت ہو تو اس کی نقل حاصل کرنے کے لیے میں خط و کتابت کروں۔

حیدرآباد سے واپسی میں بمبئی ٹھہر کر میں نے 'اسرار المحبۃ' پوری نقل کرالی، اور اس کو اپنے ساتھ لایا ہوں، اصل نسخہ ۶۴ ورق پر مشتمل ہے، اور دس ورق میں ابن سینا کا قصیدہ اور اس کا جواب از حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی اس کے ساتھ ملحق ہے، یہ کل ۷۴؍اوراق میں نے نقل کرا لیے ہیں۔ چھ آنے فی صفحہ کے حساب سے چون روپے بارہ آنے 54\12 اس کی اجرتِ نقل ہوئی، پھر میں نے اصل سے نقل کا مقابلہ بھی کر لیا، 'اسرار المحبۃ' کا ناتمام نسخہ بریلی میں بھی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی 'انتباہ' کے متعلق پہلے میں نے لکھا تھا کہ اس کا مطبوعہ نسخہ نامکمل ہے، اب اگر چھاپنا ہے تو پورا چھاپنا چاہئے، یعنی نصف ثانی جو اسانید فقہ و حدیث پر مشتمل ہے اس کو بھی طبع ہونا چاہئے، کامل نسخہ حیدرآباد میں ملے گا ممکن ہے پاکستان میں بھی ہو''۔

۱۹؍جمادی الاولی ۱۳۷۹ھ = ۲۱؍نومبر ۱۹۵۹ء کے خط میں لکھا ہے:

''ولی اللہی خاندان کے مخطوطات کو بے شک عربی ٹائپ ہی میں چھپوایا جائے اور متجانس رسالوں کو یکجا چھاپا جائے، مناسب ہے، مگر اس کو شروع کر دیا جائے۔ اس کے بعد فارسی رسائل کو الگ الگ چھاپنے میں کوئی مضایقہ نہیں؛ بہر حال عربی کا کام شروع کرا دیجئے، فارسی میں پہلے 'انتباہ' کو لیجئے، اور جیسا کہ میں نے بار بار لکھا ہے اس کو مکمل طبع ہونا چاہئے، مطبوعہ نسخہ ناقص ہے''۔

علامہ اعظمیؒ کی دیرینہ کوشش سے ایک دو نہیں متعدد رسائل فراہم ہو گئے، اور ان کی اشاعت کا سامان ہو گیا، اس سلسلے میں مولانا محمد موسی میاں کے ایک خط کا اقتباس بنام علامہ اعظمیؒ نقل کر دینا مناسب ہوگا، ۹؍ذی الحجہ

۱۳۷۸ھ=۱۶؍جون ۱۹۵۹ء کو علامہ اعظمیؒ کے نام ایک طویل خط میں لکھا ہے:

''الحمدللہ آپ کی کوششوں سے ولی اللہی علوم ومعارف کے آٹھ دس اجزا فراہم ہونے کی توقع ہو گئی ہے، اس بنا پر خیال یہ ہوتا ہے کہ بجائے اس کے کہ انھیں الگ الگ چھپایا جائے، یا دو تین مجموعہ بنائے جائیں، کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ سب کو ایک ہی بڑے مجموعہ میں سمیٹ لیا جائے، اور سب چھوٹے موٹے عربی وفارسی مخطوطے یکجا جمع ہو جائیں، اوراس کا کوئی مناسب نام تجویز کر دیا جائے، آپ کی جو کچھ رائے ہو تحریر فرمائیں''۔

یوں تو آپ کی مساعی جمیلہ سے ۸-۱۰ کی تعداد میں فکر ولی اللہی کے رسالے منصۂ شہود پر آنے کے لیے تیار ہو گئے، جن کے نقل ومقابلہ اور کئی ایک کے تصحیح متون پر آپ نے محنت صرف کی، یہاں ہر ایک کی تفصیل میں نہ جا کر ہم صرف تین رسالوں کا تذکرہ اور تعارف کرانا چاہتے ہیں۔

اسرار المحبۃ

یہ اپنی نوعیت کا نادر اور منفرد رسالہ ہے، محبت کے موضوع پر اس تفصیل اور اس کی انواع واقسام اور شعبوں کا اس طرح تجزیہ کر کے ابھی تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی، اس کتاب کو علم النفس -نفسیات- کی کتاب سمجھنا چاہیے، جس کے بارے میں مولانا ڈاکٹر محمد شفیع لاہوری نے دائرۂ معارف اسلامیہ میں لکھا ہے کہ:

''بعض نئے نکات ومعارف پر مشتمل ہے اوراس میں تجزیہ نفس کے عناصر بھی شامل ہیں''(۱)۔

اصل کتاب کے تین اجزا ہیں: ۱-تحصیل، ۲-تذئیل، ۳-تفصیل۔

تحصیل:

جزء اول یعنی تحصیل کی ابتدا ان جملوں سے کی ہے:

الذي نعتقده ونجزم به أنه لا ريب أن المحبة سر قدسي غيبي وشأن عظيم إلٰهي، كل ما يقال في الإنباء عن شأنه واستيفاءً لبيانه، فهو عن حقيقتها قاصر، وسعة سباسبها لسيل المدارک حاصر. وهي كسائر الصفات الإلٰهية من العلم والحيوة والقدرة مستوعبة الظهور للمظاهر بجملتها، وسارية ينبوعها في الأكوان برمتها(۲).

اس میں محبت کی حقیقت، اوراس کی بہت سی اقسام اور شعبوں پر گفتگو کی ہے، مثلاً رحمت خداوندی، ولایت، ایمان، حصول نجات اور مراتب توحید وغیرہ سب کو محبت کا فیضان قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب محبت کی ابتدائی تین قسمیں کرتے ہیں: محبت الٰہی؛ محبت بشری؛ اور محبت جامعہ۔ اول کو دو شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں:

(۱) دائرۃ المعارف: ۳۱۹/۱۰ (۲) اسرار المحبۃ: ۲۵

محبت من اللہ؛ محبت مع اللہ۔ اسی طرح دوسری قسم کو بھی دو شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں: محبت طبعیہ؛ محبت غرضیہ۔ اور تیسری کا صرف ایک شعبہ ہے جو دونوں سے مرکب ہے، اور یہ اللہ کے واسطے لوگوں کی باہمی محبت ہے۔

شعبۂ اولی: اس میں محبت ذاتیہ اور محبت اسمائیہ کی تحقیق کی ہے، اور اس شعبے میں دو نکتے بیان کیے ہیں۔ پہلے نکتے میں یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالی کی تربیت (مظہر ربوبیت) دو قسموں میں منقسم ہے:

تربیت ایجاد و امداد: جس کی نسبت قرآن کریم میں اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿كُلًّا نُمِدُّ هٰؤُلَآءِ وَهٰؤُلَآءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ﴾ اور ﴿قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا﴾ اور اس محبت میں اللہ تعالی کی وہ نعمتیں ہیں، جس سے سعید و شقی اور مومن و مشرک دونوں متمتع ہوتے رہتے ہیں۔

تربیت اِرشاد و اِرفاد: جس کی نسبت قرآن پاک میں ارشاد ہے: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ اور ﴿الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ﴾ اور یہ محبت کا وہ مظہر ہے جس سے سعید اور خوش بخت لوگ ہی سرفراز اور شاد کام ہو سکتے ہیں۔

اس دوسری قسم یعنی تربیتِ ارشاد کے تحت شاہ صاحب نے لکھا ہے:

ولها فروع غير محصورة بحسب استعدادات الأشخاص وسوانحهم، وهي معاملات شريفة تُستوفَى أصولُها للكاملين ويُكتفَى ببعضها لغيرهم، وتختلف جميعاً كما وكيفاً وتترقى بمرور الأوقات من حد إلى حد، بينهما كما بين السماء والأرض[1].

اس کے بعد اس کی بہت سی فروع بیان کی ہیں۔

دوسرے نکتے میں محبۃ اللہ مع العباد- اللہ پاک کی محبت بندوں کے ساتھ- پر گفتگو کی ہے، اور اس کے چار درجات قائم کر کے دو درجوں کا بطور خاص بیان کیا ہے۔ پہلا درجہ عام ہے جو ''صوریہ مطلقہ'' ہے؛ دوسرا خاص ہے جو ''صوریہ منجزہ'' ہے۔ پھر عامہ صوریہ مطلقہ کی تشریح یوں کی ہے:

بيان للأولى: أن كل حسنة وهي محبوبة مرضية له تعالى، ومن ثم لا يؤاخذ بها أحداً أثاب عليها أو لم يُثِبْ، كما أن كل سيئة مكروهة عنده تعالى لا يرحم بفعلها أحداً عاقب عليها أو لم يعاقب؛ فمن وُفِّق لشيء من الحسنات فقد استحقَّ منه سبحانه للإحسان وتعرَّض للرحمة والرضوان، واستعد لنعيم الآخرة ودخول الجنان، ولكن بشرط الختم على الإيمان والخروج عن عهدة ما ارتكب من العصيان[2].

(۱) اسرار المحبۃ: ۳۰ (۲) ایضاً: ۳۲-۳۳

پہلے درجے کی توضیح یہ ہے کہ ہر نیکی اللہ کو محبوب اور پسندیدہ ہے، چنانچہ اسی وجہ سے اس نیکی پر وہ مواخذہ نہیں کرے گا، خواہ وہ ثواب عطا کرے یا نہ کرے، جس طرح ہر برائی خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہے، اس کی وجہ سے کسی پر رحم نہیں کرے گا، چاہے اس پر وہ عذاب دے یا نہ دے؛ لہٰذا جس شخص کو کسی نیکی کی توفیق ہوگئی، تو وہ خدائے پاک کے احسان اور اس کی رحمت ورضوان کا مستحق ہو جائے گا، اور آخرت کی نعمت اور دخول جنت کا سزاوار ہوگا، بشرطیکہ ایمان پر خاتمہ ہوا ہو اور نافرمانی کے ارتکاب سے عہدہ برآ رہا ہو۔

اور دوسرے درجے یعنی ''خاصہ صوریہ منجزہ'' کا بیان یوں فرمایا ہے:

وبيان الثانية: أن بعد الإيمان في الأعمال الصالحة ما يرضى به الرب تبارك وتعالى حتماً باتاً من غير تعليق ولا تأجيل، وربما كانت تلك الأعمال موجبة لحسن الخاتمة حافظة لها كما وقع في أهل بدر: "اعمَلُوا ما شِئتُم فَقد غَفرتُ لكم"، وفي أهل الحديبية: "لَن يَّلِجَ النارَ أحدٌ ممن بايَعَ تحتَ الشَّجرَةِ"، وفي أمير المؤمنين عثمان –رضي الله عنه– : "ما ضرَّ عثمانَ ما عمِلَ بعدَ هذا"[1].

دوسرے درجے کی توضیح یہ ہے کہ ایمان کے بعد بعض اعمال صالحہ ایسے ہیں جن کے بارے میں بغیر کسی تعلیق وتاجیل کے معلوم ہے کہ ان کو حق تعالی کی خوشنودی حاصل ہے، اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ اعمال حسن خاتمہ کے موجب اور اس کے محافظ بن جاتے ہیں، جیسا کہ اہل بدر کی نسبت حدیث شریف میں وارد ہے: "**اعملو ما شئتم فقد غفرت لكم**" (تم جو چاہے کرو تحقیق کہ میں نے تمھاری مغفرت کردی)، اور اہل حدیبیہ کے بارے میں ہے: "**لن يلجَ النارَ أحدٌ ممن بايعَ تحتَ الشجرَة**" (درخت کے نیچے جن لوگوں نے بیعت کرلی ان میں سے کوئی دوزخ میں نہیں داخل ہوگا)، اور جیسا کہ امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی –رضی اللہ عنہ– کے بارے میں حدیث میں آیا ہے: "**ما ضرَّ عثمانَ ما عملَ بعد هذا**" (اس کے بعد عثمانؓ کوئی بھی عمل کریں اس سے ان کو نقصان نہیں پہنچے گا)۔

اس کے بعد اس کی کچھ تفصیلات تحریر فرمائی ہیں، جو تقریباً تین صفحات پر مشتمل ہیں، اور ان کے مختلف شعبوں اور مراتب کا بیان ہے۔

شعبۂ ثانیہ: اس میں شاہ صاحبؒ نے مختلف نفوس پر محبت کے فیضان کو بیان کیا ہے، جس میں بیس جہات ذکر کی ہیں، اور ہر جہت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ان جہات میں محبت کی کیفیتِ حدوث، نشو ونما، مراتبِ قوت وضعف، تربیت، محبت کی تبدیلیاں، اور عقل کے ساتھ محبت کی کشمکش اور ان کے علاوہ بہت سی کیفیات

(۱) اسرار المحبۃ: ۳۴

کو تفصیل سے بیان کیا ہے، اس ضمن میں بعض نہایت اہم اشکالات کو ذکر کر کے ان کا جواب بھی دیا ہے۔

شعبۂ ثالثہ: میں محبت طبعیہ کا بیان ہے، اس کی ابتدا میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

فمن أصول المتأصلة عندالخائضين والغائصين أن وجه الاتحاد بين الشيئين يُثمر الأنسة والايتلاف، وأن وجه الافتراق يُورث الوحشة والاختلاف، وبغلبة وجوه الاتحاد يزداد المحبة، وبغلبة جهات التفارق يزداد النفرة[1].

یعنی محققین کے یہاں اس کی اصل اصول یہ ہے کہ دو چیزوں کے درمیان وجہ اتحاد اُنس والفت پیدا کرتی ہے، اور وجہ افتراق دوری اور اختلاف پیدا کرتی ہے، اور وجوہ اتحاد کے غلبہ سے محبت میں افزایش ہوتی ہے، اور جہات افتراق کے غلبے سے نفرت میں اضافہ ہوتا ہے۔

اس اصول پر شاہ صاحب نے کچھ اعتراض کرنے کے بعد اس محبت کے علی اختلاف المراتب بارہ اسباب بتلائے ہیں، اس کے بعد لکھا ہے کہ حسن کے چار مراتب ہوتے ہیں۔ اس کے بعد مناسبات کے پانچ اصول بیان کیے ہیں۔ ان اصول کے بیان کے بعد محبت کے مختلف مدارج اور کیفیات کے اعتبار سے اس کے ناموں کا شمار کرایا ہے، سب سے پہلا مرحلہ اُنس کا ہوتا ہے، پھر غرام، پھر حُب، پھر ایثار، پھر فدا، پھر ہویٰ، پھر دہش، پھر صَعق، پھر وداد، پھر مصافات، پھر خُلّۃ، پھر شوق، پھر صبابہ، پھر ولوع۔ اس کے بعد اور بھی کئی مدارج شاہ صاحب نے لکھے ہیں، اور ہر ایک کی تشریح بھی کی ہے، ولوع کی تشریح بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب نے مجنوں اور بعض دوسرے شعراء عرب کے نہایت خوبصورت اشعار نقل کیے ہیں، ہم یہاں اس وجہ سے ان اشعار کو نقل کر دینا چاہتے ہیں، کہ ان سے شاہ صاحب کے اعلیٰ شعری ذوق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

أقول وقد أطلقتها من وثاقها — فأنتِ لليلى ما حييتِ طليق
أيا شبه ليلى لا تُراعي فإنني — لكِ اليوم من بين الأنام صديق
فعيناكِ عيناها وجيدكِ جيدها — ولكنَّ عظم الساق منكِ دقيق

دوسرا شعر:

لثمتُ ثغر عَذولي حين سمَّاكِ — بفيه حتى كأني لاثِمٌ فاكِ

تیسرا قطعہ:

أحِبُّ من أجلكم من كان يُشبِهكم — حتى لقد صرتُ أهوى الشمس والقمرا
أمُرُّ بالحجر القاسي فأشمُّه — فإنَّ قلبَك قاسٍ يُشبه الحجرا

محبت کی اس قسم یا اس شعبے کو بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب اس کے جو نتائج بیان فرماتے ہیں، وہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، لکھتے ہیں:

---
(۱) اسرار المحبۃ: ۴۸

وقد برهنتُ على أن العشق بهذا النوع أخبث الفِتَن وأشنع المِحَن إلا لمن عصمه الله تعالى في ابتلائه، كما أنه بالنوع المذكور في الشعبة الثانية أشرف النعم وأفضل المنن بأن لنا سبعة أشياء لا شيء يدانيها في عزتها وشرفها، كل منها لذة العيش وخلاصة الحياة، وهي: راحة القلب، وراحة البدن، والعقل، والعرض، والمال، والشريعة، والطريقة، وهذا يُفسد الكل ويهدمه، ثم لا يَعقُبه غاية محمودة يَخلُفها[1].

میں ثابت کر چکا ہوں کہ اس قسم کا عشق بدترین فتنہ اور سخت ترین آزمائش ہے مگر جس کو اللہ تعالی اس کی آزمائش میں محفوظ رکھے، جس طرح دوسرے شعبے میں مذکور قسمیں بلندترین انعامات اور بہترین احسانات ہیں، بایں طور کہ ہمارے پاس سات چیزیں ایسی ہیں کہ عزت وشرافت میں ان کے پاسنگ برابر بھی کوئی چیز نہیں ہے، اور ان ساتوں میں سے ہر ایک لذت زیست، حاصلِ زندگی اور خلاصۂ حیات ہے، اور وہ یہ ہیں: راحت قلب، راحت بدن، عقل، آبرو، مال، شریعت اور طریقت۔ اور محبت کی یہ قسم ہر ایک کو بگاڑ اور برباد کر کے رکھ دیتی ہے، اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس کے بعد اس کا کوئی اچھا نتیجہ اور انجام بھی نہیں ظاہر ہوتا۔

اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ اول الذکر پانچ چیزوں میں تو اس کی خرابی ظاہر ہے، ہاں شریعت وطریقت کے مسئلے میں یہ اتنی ظاہر نہیں ہے، تو اس کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے کہ:

فأما الشريعة فلأنَّ بناء ها على الانقياد التام للشارع بنعت التوحيد والإخلاص، والمعشوقُ ربما يأمر ويرضى بالمعصية، فإن أطاعه بطل الدينُ، وإن لم يُطعُه، فسد العشق؛ وأما الطريقة فلأن أصلها تخلية القلب عما سوى الله وهذا يضادُّه[2].

شرعی زندگی کو تو عشق اس طرح خراب کرتا ہے کہ شریعت کی بنیاد ہی توحید واخلاص کی صفت کے ساتھ شارع کی پوری طرح اطاعت وفرماں برداری ہے، اور معشوق کا حال یہ ہے کہ بسا اوقات وہ معصیت کا حکم دیتا ہے اور اسی میں اس کی خوشی ہوتی ہے، اب اگر عاشق معشوق کی بات مانتا ہے تو دین بگڑتا ہے، اور اگر اس کی بات نہ مانے تو عشق میں دراڑ پیدا ہوتی ہے؛ اور رہا مسئلہ طریقت کا تو اس کی اصل ہی ماسوی اللہ سے دل کو خالی رکھنا ہے اور عشق کا معاملہ اس کے یکسر برعکس ہے۔

پھر کچھ اور حکمتیں بیان کرنے کے بعد شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اگر عشق میں پاکیزگی ہو، تو وہ کبھی دلِ خفتہ وبستہ کو برانگیختہ اور بیدار کر دیتا ہے، اور ایسے عاشق کی عنان اگر کسی شیخ کامل کے ہاتھ میں چلی جائے، تو وہ اس کی زندگی کا رخ بدل دیتا ہے، اور اس کی باطنی کیفیت کو اس طرح پروان چڑھاتا ہے کہ وہ عبادت وریاضت میں

(۱) اسرار المحبۃ: ۵۵ (۲) ایضاً: ۵۵

لذت محسوس کرنے لگتا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عشق میں ناکامی، پشیمانی اور مایوسی اس کے لیے توبہ کے دروازے کھول کر رکھ دیتی ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے صوت، غنا اور لحن وغیرہ کی قسموں اور ان کے اندر موجود تاثیر کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

شعبۂ رابعہ میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ انسان موجودات کی تمام قوتوں کا جامع ہے، خواہ وہ ارضی ہوں یا سماوی، فلکی ہوں یا عنصری، معدنی ہوں یا حیوانی یا مَلَکی مگر عقل کی وجہ سے انسان کو دوسرے موجودات پر یک گونہ فضیلت حاصل ہے۔ شاہ صاحب نے طبعی اور غرضی کا فرق یوں بیان کیا ہے:

هذه الشعبة فرع ما قبلها، كما كانت الثانية شعبة لما قبلها؛ والفرق بين البشريتين أن ما يكون سبب المحبة معها أو قبلها، فطبيعية؛ وما كان بعدها، فغرضية[1].

یہ شعبہ اس پہلے والے شعبے کی فرع ہے، جس طرح دوسرا شعبہ پہلے والے شعبے کی فرع تھی؛ اور محبت بشریہ کے ان دونوں شعبوں میں فرق یہ ہے کہ طبیعیہ میں سببِ محبت اس کے ساتھ یا پہلے ہوتا ہے، اور غرضیہ میں محبت کے بعد ہوتا ہے۔

پھر شاہ صاحب نے حصول لذت کے لیے نفس کی کوشش، محبت کی اغراض مختلفہ ومتفرقہ کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔

پانچواں شعبہ: اس میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ استفاضہ بقدر مناسبت ہوتا ہے، اور عام انسان کا احساس وادارک اس کے دائرۂ محسوسات سے باہر نہیں ہوتا، اور حق تعالی کی ذات اس کی رسائی عقل وادارک سے وراء الوراء ہوتی ہے، اس لیے اس کو ایک مرشد اور دلیل راہ کی ضرورت ہوتی ہے، جو حق تعالی تک اس کی رہنمائی کر سکے۔ اس شعبے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو کے ساتھ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کو بھی ہلکے سے ٹچ کیا ہے، نیز فلسفۂ وحدۃ الوجود اور نصاری وہنود کے فلسفۂ حلول کے درمیان فرق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ کاملین کے ساتھ محبت کے فوائد اور اثرات ونتائج بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

وبهم تمّت المناسبة مع الحق سبحانه في استفاضة الكمالات الظاهرة والباطنة، فوجب التوسُّل بهم في معرفة الحق، وسلوك سبيله، واقتناء رضائه، وبقدر المحبة يحصل الاتباع لهم، والانصباغ بهم، فيكمل الانتفاع، ويتم الاستمتاع، فصار حبهم أشرف الأغراض عقلاً وطبعاً كما كان كذلك شرعاً، وأجمعها للفوائد وأدومها في الدارين، الخ.[2]

(۱) اسرار المحبۃ: ۶۱ (۲) ایضاً: ۶۵

ان کاملین ہی کے ذریعے کمالات ظاہریہ وباطنیہ کے حصول میں حق تعالی کے ساتھ مناسبت کی تکمیل ہوتی ہے، لہذا حق کی معرفت، اس کے راستے کے سلوک، اس کی رضا کے حصول کے واسطے ان کو وسیلہ بنانا ضروری ہوتا ہے، اور محبت کے بقدر ہی ان کی پیروی ہوتی ہے، اور ان کا رنگ چڑھتا ہے، تب جا کر پورا پورا فائدہ اور نفع حاصل ہوتا ہے، لہذا ان کی محبت عقلاً وطبعاً بلندترین غرض ہے، جیسا کہ شرعاً بھی وہ بلندترین ہے، نیز تمام فوائد کی جامع اور دارین کے اندر دائم رہنے والی ہے۔

پھر اس شعبے کے بہت سے اصول، جزئیات اور کاملین کے مراتب کا بیان فرمایا ہے، متحابّین فی اللہ کی فضیلت، "المرء مع من أحب" کا مژدہ، حب فی اللہ اور تحابّ فی اللہ کا فرق اور اس طرح کے بہت سے دقیق اور باریک نکات پر گفتگو کی ہے، اللہ کے واسطے محبت کی فضیلت میں وارد بہت سی احادیث وروایات کو بھی ذکر کیا ہے اور معیت کا مفہوم نیز مراتب کا تفاوت اور فرق بھی بتلایا ہے۔ اللہ کے ساتھ محبت، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت، اہل بیتؓ اور صحابہ کرامؓ کے ساتھ محبت، صلحاء واولیاء کے ساتھ محبت اور اس سے مستفید ہونے کی شرائط کو شاہ صاحب نے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، بیعت وارشاد اور سلوک وتصوف کی حیثیت سے بھی یہ حصہ کتاب کی جان ہے۔

تذئیل:

اس حصے میں کتاب ہذا کی وجہ تالیف بیان کی ہے، اور خواجہ حسن مودودی لکھنوی -متوفی ۱۲۴۱ھ- کی وہ مراسلت ذکر کی ہے، جو انھوں نے حضرت شاہ صاحبؒ سے محبت کے مختلف نکات کو سمجھنے کے لیے کی تھی، اور جو اس رسالے کی تصنیف وتالیف کا باعث اور محرک بنی، شاہ صاحبؒ نے خواجہ صاحبؒ کا مکتوب بھی یہاں ذکر کر دیا ہے۔

اس میں بیان کیا گیا ہے کہ محبت کے کیا حقوق ہیں، اور طرفین کے لیے محبت کن شرائط کے ساتھ مفید ہو سکتی ہے، اور یہ بھی کہ کفار کو بھی اللہ تعالی شانہ کے ساتھ محبت ہوتی ہے، لیکن ان کی محبت میں نقص ہوتا ہے، جس کی وجہ سے عالم آخرت میں وہ محبت ان کے لیے مفید نہیں ہو سکتی، اس میں شاہ صاحبؒ نے اس نقص کی تفصیل بھی بیان فرمائی ہے۔

اسی طرح اہل ایمان میں جو ناقص محبت والے ہوتے ہیں، ان پر بھی آخرت میں محبت خداوندی کا ظہور اور رحمت خداوندی کا بیان فرمایا ہے۔

اس حصے میں شاہ صاحبؒ نے ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ﴾ کا مفہوم بیان کرنے کے ساتھ اس کا اور حدیث پاک "المَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ" کا فرق واضح کیا ہے۔

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ محبت روحانیہ کا خاص حکم اطاعت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، لیکن اطاعت ضروری نہیں ہے کہ روحانی محبت کا نتیجہ ہو، کیونکہ ہر مطیع ومنقاد محبّ نہیں ہوتا، جیسا کہ ہر مطاع محبوب نہیں ہوتا، ہاں

حالت اختیار اور مطاع کی لاعلمی میں اطاعت ظاہر ہوتی ہے، تو وہ محبت کی وجہ سے ہوگی۔ اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے اطاعت کے بعض اسباب بیان فرمائے ہیں، اور آگے لکھا ہے کہ روحانی محبت ہی کا نتیجہ تھا کہ حضرت سلمان -رضی اللہ عنہ- کا شمار اہل بیت میں ہوگیا۔ آگے چل کر شاہ صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اولیاء اللہ کے ساتھ محبت کا دعویٰ کرتا ہے اور ان کے احوال وافعال کے قریب نہیں جاتا وہ دروغ گو اور جھوٹا ہے، پھر اس کی کچھ تفصیل بیان کرنے کے بعد محبت الٰہیہ کے خواص، اور اولیاء کرام کی صفات کو ذکر کیا ہے۔

تفصیل:

حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے اس حصے میں حصۂ اول یعنی ''تحصیل'' کی بعض مجمل اور مبہم باتوں کی تفصیل بیان کی ہے، نیز درجات محبت کی تفصیل ذکر کی ہے، اور یہ بیان کیا ہے کہ ادنیٰ درجہ محبت کا وہ ہے جو اعیانِ جمادیہ سے تعلق رکھتا ہے، اس کے بعد دوسرا درجہ شعور کے تابع ہے، تیسرا درجہ اعیان شاعرہ کے ساتھ، اور چوتھا درجہ حس کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، اور سالکین وواصلین کے مراتب کی تفصیل ہے۔

اس میں موت کے بعد باہم تجاذب کے شواہد اور ان کی شرح، اور پھر اس ضمن میں بعض عجیب وغریب اور حیرت انگیز واقعات وحکایات اور ان کے دقائق واسرار کو بیان کیا ہے۔

کتاب کے آخر میں نفس اور معرفۃ نفس سے متعلق کچھ قصائد ذکر کیے گئے ہیں، جن میں ایک قصیدہ الشیخ الرئیس ابوعلی بن سینا کا ہے، اس کے بعد اس کے جواب اور رد میں شاہ صاحبؒ کا ایک طویل قصیدہ ہے؛ اس کے بعد ایک قصیدہ بیسویں صدی کے امیر الشعراء احمد شوقی کا ہے، پھر شاہ صاحبؒ کے دو قصیدے اور ہیں، جن میں سے ایک شاہ رفیع الدین صاحب کا مخمس حقیقت نفس کے سلسلے میں اپنے والد کے کسی قصیدے پر ہے، اور دوسرا اور آخری معراج النبی ﷺ کے بیان میں قصیدہ ہے، اور یہی خاتمۂ کتاب ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے کتاب کی اہمیت وافادیت اور اس کے مضامین کی نُدرت اور اچھوتے پن کا اندازہ ہوگیا ہوگا۔ اگر چہ ان سطروں میں کتاب کے تعارف کا ادنی سا حق بھی نہیں ادا کیا جاسکا ہے، لیکن ان سے کتاب کی قدر وقیمت کا اندازہ تو ضرور کیا جاسکتا ہے۔ اس اہم کتاب کو لائق اشاعت بنانے میں علامہ اعظمیؒ کا جو اہم حصہ اور رول رہا ہے، اس کو مولانا محمد بن موسیٰ میاں اور علامہ اعظمیؒ کی اس مراسلت سے سمجھا جاسکتا ہے، جو چند صفحات پہلے ذکر کی جاچکی ہے، ذیل میں 'اسرار المحبۃ' کے مقدمے سے - جو اس کے مصحح مولانا عبدالحمید سواتی کا تحریر کردہ ہے - کچھ اہم باتیں نقل کی جارہی ہیں۔ مولانا موصوف نے اس کتاب کی نقول کے تعارف میں سب سے پہلے اسی کو ذکر کیا ہے، اور اس میں لکھا ہے:

> ''اس کتاب کی نقل ہم نے ''مجلس علمی کراچی'' کے نسخہ سے حاصل کی ہے، اور ''مجلس علمی'' نے اس کی نقل انڈیا سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دامت برکاتہم کے توسط سے حاصل کی ہے، چنانچہ

حضرت مولانا نے ایک مکتوب میں اس کے بارہ میں یوں انکشاف فرمایا ہے:

''اسرار المحبۃ کی نقول بھی مجلس علمی کے پاس میری ہی بھیجی ہوئی ہیں، جس کو مجلس کے سرپرستوں کی خواہش پر میں نے نقل کرایا اور بھیجا ہے، 'اسرار المحبۃ' کے حاشیہ پر بھی جگہ جگہ میرے قلم سے تصحیحات ہیں، فرصت نہیں تھی ورنہ اس سے زیادہ مکمل تصحیح ہوگئی ہوتی''(۱)۔

اس کے بعد ہی مولانا سواتی لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا اعظمی کی ان تصحیحات سے بہت زیادہ فائدہ ہوا، لیکن پھر بھی بعض مقامات میں غلطیاں رہ گئی تھیں''(۲)۔

اس کے تقریباً ڈیڑھ صفحے بعد ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہوئے مولانا سواتی لکھتے ہیں:

''اسی طرح حضرت مولانا اعظمی دامت برکاتہم کے بھی ہم از حد ممنون ہیں، جن کی تصحیحات سے ہم نے فائدہ اٹھایا اور جو اپنے گرانقدر علمی مشوروں سے ہم جیسے کم علم لوگوں کو نوازتے ہیں اور حوصلہ افزائی فرماتے ہیں، ادام اللہ فیوضہم و برکاتہم''(۳)۔

اور آخر میں حاشیے کے اشارات و رموز کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اور جہاں حاشیہ میں ''مولانا اعظمی'' ہوگا، اس سے مراد سید الفقہاء تاج العلماء رئیس المحدثین وشیخ الحدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دامت برکاتہم .... کی ذات گرامی ہوگی''(۴)۔

دمغ الباطل

مسئلۂ وحدۃ الوجود کی بحث صدیوں سے ایک نہایت متنازَع فیہ بحث تھی، اور اس بحث میں علماء اسلام کے اختلافات بہت شدت اختیار کر گئے تھے، اگرچہ بقول مفتی محمد شفیع صاحب یہ ''کوئی تصوف کا مسئلہ ہی نہیں بلکہ مسئلہ کلامیہ ہے''؛(۵) لیکن درحقیقت یہ مسئلہ زیادہ اختلافی صورت میں خانقاہ کے گوشوں سے اٹھا اور نہایت اہم موضوع بحث بن گیا تھا، اور اس مسئلے میں اتنی شدت آئی کہ حضرت محی الدین ابن عربی جن کو نظریۂ وحدۃ الوجود کا موجد اور بانی سمجھا جاتا تھا، ان کی ذات ہی بہت زیادہ مختلف فیہ ہوگئی۔ مسئلۂ وحدۃ الوجود کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا عبدالحمید سواتی لکھتے ہیں:

''درحقیقت یہ صرف علم تصوف وسلوک وحقائق سے ہی متعلق نہیں ہے، بلکہ یہ مسئلہ صفات الٰہی سے بھی تعلق رکھتا ہے، ذات بحت کے علاوہ اسماء اور صفات کی بحث بھی ضروری ہے''(۶)۔

---

(۱) مقدمہ اسرار المحبۃ: ۱۵ (۲) ایضاً: ۱۵ (۳) ایضاً: ۱۷ (۴) ایضاً: ۲۰

(۵) دمغ الباطل- مقدمہ مولانا عبدالحمید سواتی -: ۲۸ (۶) ایضاً: ۶

سرزمین ہند میں منصب امامت پر فائز دوسرے ہزارے کے مجدد شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے اس مسئلے میں جو لوگ غلط رُخ اختیار کر چکے تھے، ان کا رخ دوسری طرف پھیرنے کے لیے وحدۃ الشہود کی تعبیر پیش کی تاکہ تنزیہ باری تعالی میں کسی قسم کا وہم نہ پیدا ہو، پھر جب حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا زمانہ آیا، تو بعض اہل علم نے آپ سے اس مسئلے کی حقیقت دریافت کی، تو آپ نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں تطبیق پیش کی اور ثابت کیا کہ حقیقت ایک ہے، فرق صرف تعبیر کا ہے، اور یہ صرف لفظی اختلاف ہے، حقیقی نہیں (۱)۔

مولانا غلام یحییٰ بہاری -متوفی تقریباً ۱۱۸۶ھ- ہندوستان کے ایک بہت بڑے عالم اور معقولات کے امام گزرے ہیں، سلوک وطریقت میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے ارادت کیش اور خلیفۂ مجاز تھے، معقولات میں آپ کو ایسی دستگاہ حاصل تھی کہ اس فن میں اپنے تمام معاصرین واقران پر فائق تھے، چنانچہ اس فن میں آپ کی بعض کتابیں اور حواشی کافی شہرت کے حامل ہیں۔ مولانا بہاریؒ نے 'کلمات الحق' کے نام سے ایک رسالہ تالیف کیا، جس میں شاہ صاحب کی اس تطبیق کا رد کیا۔

مولانا غلام یحییٰ مرحوم کے جواب کے بعد ان کے رد اور شاہ صاحب کے دفاع میں آپ کے خلف الرشید اور مسند علم ومعرفت کے جانشین مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے اس مسئلے پر قلم اٹھایا، اور یہ معرکۃ الآرا کتاب اور شاہکار عالم وجود میں آیا، جس میں انھوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ مولانا بہاری مرحوم کا رد کیا ہے اور اس اہم اور دقیق مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ مولانا عبدالحمید سواتی لکھتے ہیں:

> ''مسئلہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی اصل حقیقت اور دینی عقائد میں ان کا مرتبہ اور ضرورت سے بحث کی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ علوم ومعارف، حقائق ودقائق، اسرار ونکات کا ایک بحرِ ذخار بہا دیا ہے، اہل علم جب اس کو غور سے پڑھیں گے، تو انھیں اس میں علوم ومعارف کے بڑے بڑے خزانے دستیاب ہوں گے، اور انھیں معلوم ہوگا کہ اس عظیم باپ کے اس عظیم فرزند کو خدا تعالی نے علوم وحکمت سے کس قدر نوازا ہے'' (۲)۔

تذکرہ نگاروں نے شاہ صاحب کی اس کتاب کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، اور اس کتاب کے اسلوب تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو لکھتے وقت ان کی طبیعت جولانی پر اور ان کا قلم اپنی پوری روانی پر ہے، اور کہیں کہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وجد کا عالم طاری ہے۔ چنانچہ اسی ملی جلی کیفیت کا اثر ہے کہ سرسری نظر ڈال کر فرق کرنا مشکل ہے کہ اصل کتاب عربی میں ہے یا فارسی میں، اس لیے کہ عربی اسلوب اختیار کرتے ہیں، تو صفحات کے صفحات صرف عربی میں کلام کرتے ہیں، اور فارسی میں قلم چلتا ہے، تو کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

اس کتاب کا نام شاہ صاحب نے 'الفیض بالحق' اور لقب 'دمغ الباطل' رکھا ہے۔ اور مولانا عبدالحمید صاحب

---

(۱) مقدمہ دمغ الباطل: ۲۱-۲۰ (۲) ایضاً: ۲۴

سواتی کے تصحیح وتقدمہ کے ساتھ ۱۹۷۶ء میں ادارۂ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سے شائع ہوئی ہے۔

دمغ الباطل کی اشاعت میں علامہ اعظمیؒ کا حصہ:

علامہ اعظمیؒ کو خود بھی شاہ رفیع الدین صاحب کی تصانیف کے ساتھ دلچسپی تھی، اور آپ ان کی اشاعت کے لیے متمنی اور فکرمند تھے، اور پھر مولانا عبدالحمید سواتی گوجرانوالہ کا شغف دیکھا، تو علم وفن کی اس خدمت کے لیے کسی بھی تعاون سے دریغ نہیں کیا، مولانا عبدالحمید سواتی نے علامہ اعظمیؒ کا ایک مکتوب نقل کیا ہے، جو ۱۱رنومبر ۱۹۶۴ء کا مرقوم ہے، اس میں علامہ اعظمیؒ نے مولانا سواتی کو لکھا ہے:

''حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کی تصنیفات سے جو شغف آپ کو ہے، اور ان کے علوم ومعارف کی اشاعت کی جو لگن آپ کے دل میں ہے اور اس سلسلہ میں آپ جو مسلسل دماغ سوزی فرمارہے ہیں، اس کے لیے آپ بہت زیادہ مستحق مبارک باد ہیں۔ اس بات کو میں نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا، اس لیے مجھ کو بھی لالچ تھا کہ اس سلسلہ میں جو تعاون ممکن ہو اس سے دریغ نہ کروں۔ اس خیال کے تحت 'دمغ الباطل' کی نقل حاصل کرنے اور منقولہ نسخہ کو دوسرے نسخوں سے مقابلہ کرانے کی کوشش کرتا رہا''[1]۔

اس کتاب کے قلمی نسخوں کی دریافت اور اس کو لائق اشاعت بنانے میں علامہ اعظمیؒ کا بہت بڑا حصہ رہا ہے، آپ نے رام پور سے اس کی ایک نقل تیار کرائی، پھر اپنے بعض ذی استعداد شاگردوں کے ذریعے اس نقل کا اصل سے مقابلہ کرایا، اور اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ جہاں تک ممکن ہوا خود بھی نظر ثانی کر کے حتی الامکان اس کی تصحیح کی۔ مولانا عبدالحمید سواتی اس کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''پاکستان میں مختلف جگہوں میں پتہ کیا گیا، مگر کوئی قلمی نسخہ 'دمغ الباطل' کا دستیاب نہ ہوسکا، میں نے انڈیا میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دامت برکاتہم سے خط وکتابت کی، تو معلوم ہوا کہ 'دمغ الباطل' کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے؛ چنانچہ میں نے حضرت مولانا کے توسط سے اس کی نقل حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی، حضرت مولانا اعظمی صاحب نے رضا لائبریری کے انچارج سے بات چیت کر کے کاتب سید محمود علی رام پوری سے نقل کرانی شروع کرادی، کاتب صاحب نے اس کی نقل نومبر ۱۹۶۳ء کو مکمل کرلی''[2]۔

علامہ اعظمیؒ نے جب اس نقل کو دیکھا، تو اصل سے مقابلہ کرنے کے لیے دو عالموں کو رام پور بھیجنا ضروری سمجھا، مولانا سواتی نے لکھا ہے:

''چنانچہ نقل کے بعد جب یہ نسخہ مولانا اعظمی صاحب کے پاس پہنچا تو اس کی اغلاط کی بنا پر اصل کے ساتھ ملانا ضروری تھا، چنانچہ مولانا اعظمی نے لکھا کہ:

(۱) مقدمہ دمغ الباطل: ۳۰ (۲) ایضاً: ۲۹-۲۸

''دو عالموں کو 'دمغ الباطل' کی تصحیح کے لیے رام پور جانے پر آمادہ کررہا ہوں، دونوں صاحبوں نے شوال میں جانے کو لکھا ہے۔ خدا کرے کہ کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے''[۱]۔

اس کے بعد حضرت مولانا عبدالحفیظ بلیاویؒ -مصنف مصباح اللغات واستاذ ندوۃ العلما لکھنؤ- اور مولانا اقبال احمد صاحبان کے رام پور جانے اور پوری تن دہی اور محنت کے ساتھ اس کے مقابلہ کرنے کی تفصیل لکھی ہے۔

اس کے بعد آپ نے بھی اس پر نظر ثانی فرمائی اور جہاں تک ہوسکا اس کی تصحیح فرما کر اس کی نقل کو مولانا سواتی کے پاس بھیج دیا۔ مولانا سواتی نے لکھا ہے:

''علاوہ ازیں مولانا اعظمی صاحب نے خود بھی 'دمغ الباطل' کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات دیکھے اور تصحیح بھی فرمائی۔ مولانا اعظمی نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ 'دمغ الباطل' کا ایک قلمی نسخہ حیدرآباد دکن میں سالار جنگ کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے اور میری نظر سے گذرا ہے، اور سنا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں بھی اس کا قلمی نسخہ موجود ہے، اور بعض احباب نے یہ بھی بتایا کہ 'دمغ الباطل' کا ایک نسخہ بریلی میں حکیم نثار احمد صاحب کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے''[۲]۔

بہرحال اس خط سے، اس کے نسخوں کی طرف رہنمائی اور بے دریغ تعاون سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اعظمیؒ کو اس علمی سرمائے کی اشاعت کی کس قدر فکر دامن گیر تھی، اور ان کی مخلصانہ توجہات اور کوششوں سے کیسے کیسے گوہر نایاب گوشۂ گمنامی سے نکل کر اور زیور طباعت سے آراستہ و پیراستہ ہوکر علمی حلقوں اور اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچے۔

داستاں ان کے اداؤں کی ہے رنگیں لیکن اس میں کچھ خون تمنا بھی ہے شامل میرا

☆......☆......☆

تکمیل الاذہان

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے فکر و نظر کی تقویت اور ذہن و دماغ کی بالیدگی کے لیے لکھی گئی ہے، محقق و مصحح مولانا عبدالحمید سواتی کے بقول یہ شاہ صاحب کی سب سے آخری تصنیف ہے، جس سے ظاہر ہے کہ اس میں حضرت مصنف نے اپنے علوم و فنون اور فضل و کمال کی پختگی اور کہنہ مشقی کا کس قدر مظاہرہ کیا ہوگا، چنانچہ مولانا سواتی اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''شاہ رفیع الدین نے اپنی اکثر تصانیف میں اختصار پسندی کا شیوہ اختیار کیا ہے، لیکن 'تکمیل الاذہان' میں تو آپ نے بہت ہی زیادہ اختصار کو ملحوظ رکھا ہے، بلکہ علمی تصانیف کے سلسلہ میں جس قدر

(۱) مقدمہ دمغ الباطل: ۲۹ (۲) ایضاً: ۳۱-۳۰

متون لکھے گئے ہیں، مثلاً: علامہ تفتازانی کی ’تہذیب‘، علامہ ابن حاجب کا ’کافیہ‘، عبداللہ نسفی کی ’کنز الدقائق‘، محبّ اللہ بہاری کا ’سلم العلوم‘ اور ’مسلم الثبوت‘ وغیرہ، ان تمام متون سے کہیں بہت زیادہ اختصار شاہ رفیع الدینؒ نے ’تکمیل الاذہان‘ میں اختیار کیا ہے، بلکہ اختصار کی حد کر دی ہے، بعض مقامات پر تو چیستان یا الغاز و معمّٰی قسم کی عبارت نظر آئے گی؛ بایں ہمہ یقینی بات ہے کہ علمی نکات سے لبریز کتاب ہے‘‘[۱]۔

اس کتاب میں چار ابواب ہیں، باب اول منطق کے بیان پر مشتمل ہے، چونکہ مختلف علوم میں منطق سے امداد حاصل کی جاتی ہے، اس لیے شاہ صاحبؒ نے منطق کو بھی تکمیل اذہان میں جگہ دی ہے۔ اس باب میں ایک مقدمہ، دو مقصد اور ایک خاتمہ ہے۔

مقدمہ میں علم کی تعریف اور ’’علم کاسِب‘‘ کی دو قسمیں تصور و تصدیق ذکر کی ہیں، اور پھر نظر و فکر کی تعریف کی ہے، اس میں اور بھی بہت سے مفید نکات اور دقائق ذکر کیے ہیں، چنانچہ مقدمہ کا تعارف کراتے ہوئے مولانا سواتی نے لکھا ہے:

’’شاہ رفیع الدینؒ نے مقدمہ میں بہت سی مفید اور گرانقدر علمی باتیں درج فرمائی ہیں، بعض باتیں تو ایسی ہیں کہ بالکل بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے اس فن میں اضافات فرمائے ہیں‘‘[۲]۔

مقدمہ کے بعد مقصد اول میں ’’تصورات‘‘ کا بیان ہے۔

دوسرے مقصد میں ’’تصدیقات‘‘ کا بیان ہے، اس کی ابتدا شاہ صاحب نے ’’قضیہ‘‘ کی تعریف سے کی ہے، آپ نے اس کی تعریف یہ کی ہے: القضيةُ قولٌ حاكٍ عنِ الواقع إيجاباً أو سلباً. اس تعریف پر مولانا سواتی نے مقدمہ میں یہ تبصرہ کیا ہے کہ قضیہ کی ایسی جامع مانع تعریف واقعی شاہ صاحب کا اس فن میں مجتہدانہ کمال ہے۔ اس کے بعد ’’تصدیقات‘‘ کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

پہلا باب ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

’تکمیل الاذہان‘ کا دوسرا باب ’’تحصیل‘‘ ہے، اس میں تحصیل کی تعریف اور اس کی تدوین کی تاریخ بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کو دراصل ان کے والد حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے مدوّن کیا ہے، پھر شاہ رفیع الدینؒ نے اس میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ نے اس فن کو ’’فن دانشمندی‘‘ سے تعبیر فرمایا ہے۔ شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے ’’تحصیل‘‘ کی ابتدا میں اس کا موضوع اور غرض وغایت بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اس فن میں پانچ چیزوں پر نگاہ ہوتی ہے:

۱-مناظرہ، ۲-تدریس، ۳-تلمذ، ۴-تصنیف، ۵-مطالعہ۔

ان پانچ چیزوں میں انحصار کی وجہ شاہ صاحب نے یہ بیان کی ہے کہ منکر کے ساتھ مناظرہ کی ضرورت

(۱) مقدمہ تکمیل الاذہان: ۱۴ (۲) ایضاً: ۴

پڑتی ہے، اور ماننے والے کے حق میں تلمذ اور تدریس کا سلسلہ ہوتا ہے، اور یہ تینوں باتیں تقریر کے ذریعے ہوتی ہیں؛ اور تحریر کی شکل میں تصنیف اور مطالعہ کی ضرورت پڑتی ہے[۱]۔

پھر شاہ صاحب نے ان پانچوں میں سے ہر ایک کی تفصیلات بیان کی ہیں، اور ان کے قواعد وضوابط تحریر فرمائے ہیں۔ کتاب کا یہ حصہ پندرہ صفحات پر مشتمل ہے۔

تیسرے باب میں امور عامہ کے ان خاص مباحث کو ذکر کیا ہے، جو کثیر الاستعمال ہیں اور اگر ان میں غلطی واقع ہو جائے تو انسان اشتباہ میں پڑ جاتا ہے، اور یہ خاص مباحث عقلیات کے مختلف علوم وفنون کے اہم مبادیات میں شمار ہوتے ہیں[۲]۔

چوتھے باب میں ''تطبیق آراء'' کا بیان ہے۔ اس باب کا تعارف کرتے ہوئے مولانا سواتی نے لکھا ہے:

> ''اگر چہ شاہ صاحب سے قبل بھی اہل علم نے مختلف ومتضاد نظریات واقوال وآراء میں کچھ نہ کچھ تطبیق دی ہے، خصوصاً محدثین کرام اور فقہاء امت اس سلسلہ میں بہت مشہور ہیں کہ وہ متخالف ومتعارض احادیث کے جمع وتطبیق میں کوشاں رہتے ہیں، لیکن یہ شرف وسعادت صرف شاہ رفیع الدینؒ کو حاصل ہوا ہے کہ انھوں نے تطبیق الآراء کو ایک مستقل علمی فن بنا دیا ہے، اور اس کے اصول وضوابط اور قواعد ومبانی متعین کیے ہیں، اور پھر دنیا میں جو مختلف ومتحارب نظریات پائے جاتے ہیں اور بعض اہم متقابل ومتضارب باتوں کو عملی شکل میں تطبیق دی ہے''[۳]۔

اس باب کو شاہ صاحب نے چھ۶ فصلوں میں منقسم کیا ہے، فصل اول ماہیت تطبیق کے بیان میں، فصل دوم موازین تطبیق کے بیان میں، فصل سوم اسباب اختلاف میں، فصل چہارم ضوابط تطبیق کے بیان میں، فصل پنجم جرح وترجیح کے بیان میں، اور فصل ششم تطبیق کی مثالوں پر مشتمل ہے، جو واہم (غلطی کرنے والے) کے لیے توضیح اور فاہم (سمجھ دار) کی تمرین کے لیے ہے۔

سابقہ دونوں رسالوں کی طرح اس کی تصحیح اور اشاعت میں بھی علامہ اعظمیؒ کا خاص حصہ رہا ہے، چنانچہ اس کے محقق اور مصحح مولانا سواتی نے اس کے مختلف قلمی نسخوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اس کے بعد 'تکمیل الاذہان' کا نسبتاً ایک بہتر اور جامع قلمی نسخہ ہمیں مجلس علمی کراچی کے ناظم حضرت مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ سے حاصل ہوا، یہ بڑا صحیح اور مکمل نسخہ ہے؛ دراصل یہ نسخہ فخر المحدثین، سید الفقہاء وتاج العلماء حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دیوبندی دامت برکاتہم کے توسط سے حاصل کیا گیا ہے، اور آپ نے اس کی تصحیح بھی کی ہے، اور بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ یہ نسخہ متعدد قلمی نسخوں سے تقابل کے بعد تیار کیا گیا ہے''[۴]۔

اسی طرح درمیان کتاب میں الباب الثانی کے بعد کتاب شروع ہونے سے پہلے مولانا سواتی نے یہ

---

(۱) دیکھئے مقدمہ تکمیل الاذہان از مولانا سواتی: ۶ (۲) ایضاً: ۸ (۳) ایضاً: ۱۰ (۴) ایضاً: ۱۶

نوٹ لگایا ہے:

نـقـلنا هذا الباب أولاً من كتاب أبجد العلوم من ص ١٢٧ إلى ص ١٣٢، وكذا الباب الثالث والرابع، ثم قابلنا هذه الأبواب بنسخة خطية لمولانا عبدالتواب الملتاني وصححنا بقدر الإمكان، ثم بعد ذلک قابلنا بنسخة أخرى (خطية) للمجلس العلمي في كراتشي، وهي نسخة جيدة مصححة من يد المحدث الشهير والعالم النحرير مولانا حبيب الرحمن الأعظمي.

یعنی ہم نے اس باب کو اسی طرح تیسرے اور چوتھے باب کو اولاً کتاب ابجد العلوم از صفحہ ۱۲۷ تا صفحہ ۱۳۲ نقل کیا، پھر ان ابواب کا حتی الامکان مقابلہ اور تصحیح مولانا عبدالتواب ملتانی کے قلمی نسخے سے کی؛ اس کے بعد ہم نے اس کا مجلس علمی کراچی کے ایک قلمی نسخے سے مقابلہ کیا، اور یہ نہایت ہی عمدہ نسخہ ہے، جس کی محدث شہیر اور عالم نحریر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے ہاتھ سے تصحیح کی گئی ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

فتح المغيث

'فتح المغیث' اصول وقواعد حدیث کی جامع ترین کتاب ہے، جو دراصل محدث وحافظ عبدالرحیم عراقی کے منظومہ 'الفیۃ الحدیث' کی شرح ہے، الفیہ میں روایت ودرایت حدیث کے اصول وقواعد منظوم صورت میں بیان کیے گئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں اختصار کے ساتھ 'فتح المغيث' اور 'الفية الحديث' کے مصنف کے حالات ذکر کر دیے جائیں۔

حافظ عراقی:

پورا نام ونسب ابوالفضل عبدالرحیم بن الحسین بن عبدالرحمٰن عراقی ہے، اثر (حدیث) کی طرف نسبت کرتے ہوئے انھوں نے خود کو اثری بھی لکھا ہے، جمادی الاولی ۷۲۵ھ میں قاہرہ کے قریب مصر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اپنے وقت کے جلیل القدر امام وعلامہ اور بے نظیر حافظ حدیث تھے، تحصیل علم وحدیث کے لیے دور دراز مقامات کے سفر کیے، اور مدۃ العمر درس وافادہ کا سلسلہ رکھا، حدیث پاک کی نشر واشاعت کا زندگی بھر مشغلہ رہا، اور آپ کے فیض صحبت سے ایک سے بڑھ کر ایک ماہر فن پیدا ہوئے، جن میں علامہ ہیثمی، حافظ ابن حجر اور علامہ عینی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

حدیث میں متعدد تصانیف ان کی امامت فن پر شاہد عدل ہیں۔ درس وافادہ اور تصنیف وتالیف کے علاوہ تین سال تک مدینہ منورہ کے منصب قضا پر فائز رہے۔ زہد وتقویٰ، طہارت ونظافت، سلامت طبع، عبادت

گزاری، قناعت پسندی، فروتنی وتواضع، اور وجاہت ووقاران کے خاص اوصاف تھے۔ فقہ میں بھی بلند پایہ مقام کے مالک تھے اور مذہب امام شافعی پر عمل پیرا تھے۔ شعبان ۸۰٦ھ میں ۸۱ برس سے زیادہ کے سن میں رہگرائے عالم آخرت ہوئے۔

حافظ سخاوی:

نام ونسب محمد بن عبدالرحمٰن بن محمد بن ابی بکر بن عثمان بن محمد تھا، شمس الدین لقب اور ابوالخیر کنیت تھی، سخا مصر کا ایک گاؤں ہے، اصلاً وہیں کے تھے، لیکن قاہرہ میں ربیع الاول ۸۳۱ھ میں پیدا ہوئے، قرآن کریم حفظ کیا، اور فقہ وحدیث کے متعدد متون کو زبانی یاد کیا، حافظ ابن حجر عسقلانی کے تلمیذ ارشد اور بہت مقرّب تھے، ابن حجر کے علاوہ دوسرے اساتذہ ومشایخ حدیث سے بھی استفادہ کیا، لیکن ابن حجر کے ساتھ خصوصیت سے وابستہ رہے، اور ان کے جیتے جی ان سے جدا نہ ہوئے۔ نجم الدین غزی نے 'الکواکب السائرة بأعیان المئة العاشرة' (۵۳/۱) میں ان کا تذکرہ الشیخ الإمام العالم العلامة المسند الحافظ المتقن جیسے الفاظ سے کیا ہے۔

حافظ سخاوی اپنے وقت کے نہایت جلیل القدر، عظیم المرتبت اور کثیر الروایۃ حافظ حدیث تھے، صرف صحیح بخاری شریف کی اجازت وروایت ایک سو بیس (۱۲۰) سے زائد شیوخ حدیث سے ان کو حاصل تھی، مذہباً شافعی تھے اور اپنے زمانے کے اجلۂ فقہا سے علم فقہ کی تحصیل کی تھی۔

بایں ہمہ فضل وکمال اپنے دور کے کثیر التصانیف عالم تھے، اور ان کی متعدد تصانیف آج بھی اہل علم کے قلوب کو سیراب کر رہی ہیں، اور ان کی علمی وادبی تشنگی کے لیے روح افزا کا کام کر رہی ہیں، چنانچہ ان کی تصانیف میں 'الضوء اللامع' المقاصد الحسنة' اور 'فتح المغیث' شہرۂ آفاق ہیں۔

امام سخاوی کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے، بعض اہل علم نے ۸۹۵ھ لکھا ہے، لیکن نجم الدین غزی نے اس کو رد کیا ہے اور اس کو غلط قرار دیا ہے؛ صحیح اور راجح یہ ہے کہ ۹۰۲ھ میں ان کی وفات ہوئی، انتقال کی تاریخ بعض لوگوں نے ۱۳/ ذی قعدہ بمقام مکہ مکرمہ لکھی ہے، اور کسی نے ۱۷/ ذی قعدہ بمقام مدینہ منورہ لکھی ہے۔

فتح المغیث کی تحقیق واشاعت:

علامہ سخاوی نے 'فتح المغیث' میں حافظ عراقی کی 'الفیة الحدیث' کی شرح کی ہے، 'فتح المغیث' کا شمار اس فن -یعنی اصول حدیث- کی جامع اور مبسوط ترین کتابوں میں ہوتا ہے، اس میں علامہ سخاوی 'الفیہ' کے ایک ایک لفظ کو لے کر اس کی مفصل تشریح وتوضیح کرتے ہیں۔

'فتح المغیث' ۱۳۰۳ھ ہجری میں مطبع انوار محمدی لکھنؤ میں بڑی تقطیع میں چھپی تھی، اور پوری کتاب ایک جلد میں تھی، جو ۵۰۰ صفحات پر مشتمل تھی۔

اس کا دوسرا اڈیشن ۱۳۸۸ھ = ۱۹۶۹ء میں عبدالرحمٰن محمد عثمان کے ضبط وتحقیق سے مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ

سے ۳؍جلدوں میں شائع ہوا تھا۔

مکتبہ سلفیہ کے اس اڈیشن میں تصحیح وتصویب کا خاص اہتمام کیا گیا تھا، لیکن اس کے باوجود اغلاط سے خالی نہیں تھا؛ لہذا جب یہ کتاب علامہ اعظمیؒ کو دستیاب ہوئی، تو آپ نے اس کی غلطیوں کی تصحیح کی اور اس پر حواشی لکھے۔ آپ کی تعلیقات کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تصحیح کرتے وقت مطبوعہ دونوں نسخوں کے علاوہ اس کتاب کے اور نسخے بھی آپ کے پاس تھے، لیکن اس کی تفصیل نہیں معلوم ہوسکی۔

علامہ اعظمیؒ کی تصحیح وتعلیق کے بعد یہ کتاب مطبعة الأعظمي سے چھپ کر شائع ہوئی، لیکن اس کا افسوس ہے کہ اس کی ایک ہی جلد چھپ سکی، باقی دونوں جلدیں تشنۂ طبع رہ گئیں، جب کہ باقی دونوں جلدوں پر آپ کی تصحیحات وتعلیقات پہلی جلد کی بہ نسبت بہت زیادہ ہیں۔

☆......☆......☆......☆

درسِ بخاری
تعدیل وتصحیح وتہذیب

شیخ الحدیث والتفسیر استاذ العلما حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ علامہ اعظمیؒ کے اساتذہ میں تھے، اپنے وقت کے نہایت بلند پایہ اور متبحر عالم تھے، درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف اور وعظ وتقریر میں ید طولی رکھتے تھے، علوم عقلیہ ونقلیہ کے جامع تھے۔ آپ نے اپنی جولانی قلم کے لیے زیادہ تر ان مضامین کا انتخاب کیا، جن کو لے کر اسلامی عقائد اور اس کے احکام وتعلیمات پر شکوک وشبہات کی گرد اڑائی جاتی ہے، انھوں نے اسلامی عقائد ونظریات کو اسلامی اصول ومسلمات کے ساتھ جدید علوم وفنون کی مدد سے نا قابل تردید دلائل وبراہین کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ آپ کی عظیم الشان تصانیف میں قرآن کریم کے تفسیری افادات اور صحیح مسلم کی شرح 'فتح الملہم' کے علاوہ اردو زبان میں متعدد کتب ورسائل ہیں۔

حضرت مولانا عثمانی ۷؍محرم ۱۳۰۴ھ = ۱۸۸۵ء میں بریلی میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز تھے، از ابتدا تا آخر تمام تر تعلیم دار العلوم دیو بند میں ہوئی، اور وہیں ۱۳۲۵ھ = ۱۹۰۸ میں دورۂ حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔ وفور علم اور وسعت مطالعہ کے ساتھ ذہانت وفطانت اور ذکاوت میں اپنے دور کے ممتاز اہل علم میں تھے۔

فراغت کے بعد مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں صدر مدرس ہوگئے، دوسال کے بعد ۱۳۲۸ھ = ۱۹۱۰ء میں دار العلوم دیو بند میں آپ کا تقرر ہوا، اور وہیں سے آپ کی شہرت وناموری کا آغاز ہوا، اس دور میں آپ کے صحیح مسلم کے درس کو خصوصیت کے ساتھ بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۳۴۵ھ میں دار العلوم دیو بند میں کچھ ایسے

حالات پیش آئے کہ علامہ انور شاہ کشمیری اور علامہ عثمانی سمیت متعدد اساتذہ نے دار العلوم سے علاحدگی اختیار کر لی، اور تعلیم الدین ڈابھیل کی فضا کو اپنی علمی و تدریسی خوشبوؤں سے معطر کر دیا۔ ۱۳۵۲ھ میں حضرۃ العلامہ انور شاہ کی وفات کے بعد تعلیم الدین ڈابھیل میں بخاری شریف کا درس آپ سے متعلق ہو گیا۔

تقسیم ہند کے سانحے کے بعد علامہ عثمانیؒ پاکستان چلے گئے، اور وہیں ۱۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء = ۲۱ر صفر ۱۳۶۹ھ کو علم و معرفت اور فضل و کمال کا یہ نیر تاباں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ آپ کی وفات پر آپ کے تلمیذ عزیز حضرت الاعظمی نے عربی زبان میں ایک طویل مرثیہ لکھا تھا، جو ماہنامہ 'برہان' میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔

۱۳۵۲ھ میں آپ نے جو بخاری شریف کا درس دیا ہے، اس سال جامعہ اسلامیہ کی دورۂ حدیث کی جماعت میں مولانا عبد الوحید صاحب صدیقی فتح پوری بھی شریک تھے، انھوں نے اہتمام کے ساتھ حضرت مولانا عثمانی کی درسی تقریر کو قلم بند کیا۔ یہ تقریر ان کے پاس سالہا سال تک محفوظ رہی، اس جیسی بیش قیمت متاع علمی کی اشاعت کی تمنا اور فکر ایک فطری امر ہے، اور یہ فکر مولانا عبد الوحید صدیقی کو بھی لاحق تھی، اس کو قلم بند کرنے کے بعد تقریباً ۴۵ر برس کا عرصہ گزر گیا، اس کے بعد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا نسیم احمد فریدی کے توسط سے اس کی اشاعت کا سامان ہوتا ہوا نظر آیا، جب اس کی اشاعت کا مرحلہ آیا تو ان بزرگوں کو خیال ہوا کہ چونکہ یہ ایک درسی تقریر ہے، اور درس کی تقریروں کے قلم بند کرنے میں بہت تسامحات ہوا کرتے ہیں، حالانکہ اس کو خود حضرت مولانا عثمانی نے بھی ملاحظہ فرمایا تھا، لیکن ان حضرات کا یہ خیال تھا کہ اس پر کسی صاحب بصیرت اور بالغ نظر عالم کی نظر ثانی ہو جاتی، تو اگر کہیں قلم وغیرہ کی کوئی چوک ہوتی، تو اس کی اصلاح ہو جاتی، اس کام کے لیے ان تمام بزرگوں کی نگاہ ایک ہی جگہ ٹھہری، اور اس شخصیت کے بارے میں مولانا عبد الوحید صاحب خود ہی اپنے ''تعارف و تقدمہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''مزید احتیاط و اطمینان کے لیے یہ بھی مناسب سمجھا گیا کہ اس پر ایک اصلاحی نظر محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ العالی کی پڑ جائے، تا کہ اگر کہیں مجھ سے بھول چوک ہوئی ہو، یا عام ناظرین کو غلط فہمی سے بچانے کے لیے کسی مقام پر وضاحت کی ضرورت محسوس ہو، تو اصلاح یا توضیح کر دی جائے۔ اس کے لیے حضرت ممدوح مدظلہ العالی سے درخواست کی گئی اور میری اور کتاب کی انتہائی خوش قسمتی کہ حضرت ممدوح نے شدید ضعف کے باوجود حضرت علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خصوصی تلمذ کے تعلق کی بنا پر اس کو منظور فرما لیا، اور تقریر کا مسودہ بامعان نظر ملاحظہ فرمایا، اور ضروری اصطلاحات (کذا) و توضیحات فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کو اس کا بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے، آمین۔''

یہ تقریر کتابی شکل میں گجرات کے مشہور و معروف ادارہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے شائع ہوئی ہے، اس کے عالم و فاضل مہتمم حضرت مولانا محمد سعید بزرگ اپنے ''کلمات تشکر و امتنان'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''لیکن چونکہ اس تحریر کی حیثیت درسی تقریر کی تھی اور دوران درس میں اس کا اہتمام بہت مشکل ہے کہ کہنے والے کی ہر بات بلاکم وکاست جوں کی توں ضبط کی جا سکے، اس لیے ضرورت تھی کہ یہ تحریر کسی صاحب نظر اور محقق عالم کی نظر سے گزر جائے، چنانچہ اس کے لیے ہم سب کی نگاہ محدث وقت حضرت علامہ حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ پر پڑی، جن کو حضرت علامہ عثمانیؒ سے شرف تلمذ بھی حاصل ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ جاننے والے جانتے ہیں کہ موصوف اس وقت حدیث ورجال کی معرفت میں دنیائے اسلام کی منفرد شخصیت ہیں۔ ہم نے مولانا سے اس بات کے لیے درخواست کی، اور موصوف نے باوجود اپنی شدید مصروفیتوں اور پیرانہ سالی کے ہماری درخواست کو شرف قبول بخشا اور کتاب کی پہلی جلد پر نظر ثانی فرما کر اس لائق کر دیا کہ اب ہم اطمینان واعتماد کے ساتھ پریس کے حوالہ کر سکیں''۔

چار صفحات پر مشتمل حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ کا اس پر ایک ''پیش لفظ'' بھی ہے، انھوں نے بھی اس چیز کو تحریر فرمایا ہے، چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:

''از راہ احتیاط یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ فن حدیث کے کوئی ماہر اور صحیح بخاری شریف کے کوئی باکمال استاذ اس کو ملاحظہ فرمالیں، تاکہ اگر کہیں کوئی سہو قلم محسوس ہو، یا کوئی بات وضاحت طلب ہو، تو اس کی اصلاح یا توضیح کر دی جائے۔ اس کے لیے محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ سے عرض کیا گیا اور حضرت ممدوح نے قبول فرمالیا۔ اب یہ حضرت ممدوح مدظلہ العالی کی نظر سے گذرنے کے بعد شائع کی جارہی ہے''۔

ان تمام مساعی حمیدہ کے بعد علم ومعرفت کے اس اہم خزینے کی پہلی جلد ۱۴۰۰ھ میں علامہ اعظمیؒ کے فرزند ارجمند حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے اہتمام سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے شائع ہوئی، جو کتاب الایمان اور کتاب العلم پر مشتمل اور مع فہرست وغیرہ کے ۴۵۶ صفحات پر حاوی ہے، مولانا صدیقی اپنے ''تعارف وتقدمہ'' ہی میں آگے تحریر فرماتے ہیں:

''سب سے آخر میں کتابت اور طباعت کا مرحلہ تھا، اس ہفت خواں کو طے کرنے کی مجھ میں بالکل صلاحیت نہ تھی، نہ میں اس کا کوئی انتظام ہی کر سکتا تھا، حضرت مولانا نعمانی نے حضرت مولانا اعظمی مدظلہ العالی کے فرزند اکبر مولانا رشید احمد اعظمی کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کرلیا کہ وہ اس کی ذمہ داری قبول کرلیں، الحمدللہ وہ آمادہ ہوگئے اور بتوفیقہ تعالی ان کی توجہ اور محنت سے اتنا کام ہوگیا کہ کتاب کی پہلی جلد جو کتاب الایمان اور کتاب العلم پر مشتمل ہے، اور جو کتاب کا اہم حصہ ہے، شائع ہورہی ہے''۔

اس پر علامہ اعظمیؒ نے جو کام کیا ہے، اس کے بارے میں سرورق پر لکھی ہوئی عبارت یہ ہے: ''تعدیل وتصحیح وتہذیب''

☆......☆......☆

حیاۃ الصحابہ
پر
نظر ثانی

مولانا محمد یوسف صاحب کے مختصر حالات:

ہندوستان کی جن بزرگ اور باکمال شخصیتوں نے صفحۂ ہستی پر اپنا نقش دوام چھوڑا ہے، ان میں مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ بانی جماعت تبلیغ کو ایک نمایاں اور امتیازی مقام حاصل ہے، ان کی سعی مشکور نے دینی دعوت کی جو فضا پیدا کی ہے، اس کے اثرات ونتائج آج دنیا کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں۔

مغربی اتر پردیش کا قصبہ کاندھلہ اپنی مردم خیزی میں مشہور ہے، اور مولانا محمد الیاس علیہ الرحمہ کے انتساب نے اس کی شہرت کو چار چاند لگا دیا ہے، اس خاک سے ایک سے بڑھ کر ایک لعل وگہر پیدا ہوئے ہیں، ان ہی میں ایک مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ تھے، جو مولانا محمد الیاس علیہ الرحمۃ کے پارۂ جگر اور فرزند ارجمند تھے۔

نشو ونما اور تعلیم وتربیت:

مولانا محمد یوسف صاحب کی ولادت ۲۵/ جمادی الاولی ۱۳۳۵ھ = ۲۰/ مارچ ۱۹۱۷ء بروز چہارشنبہ کاندھلہ میں ہوئی، نشو ونما اور تعلیم وتربیت کے لیے ان کو ماحول پوری طرح ساز گار ملا، اور عہد طفولیت خالص دینی فضا میں گزرا، برگزیدہ اور خدا رسیدہ والد کے آغوش تربیت اور سایۂ عاطفت میں پروان چڑھے، تعلیم وتربیت خالص دینی ہوئی۔ دس برس کے سن میں حفظ قرآن کریم کی دولت سے بہرہ مند ہوگئے، عربی اور درس نظامی کی تعلیم مدرسہ کاشف العلوم بستی حضرت نظام الدین اور مظاہر علوم سے حاصل کرنے کے بعد ۱۳۵۴ھ میں فاتحۂ فراغ پڑھی۔

مولانا مرحوم کی خمیر میں علم کا شوق وشغف اور دعوت وتبلیغ کا فکر وولولہ دونوں چیزیں گندھی ہوئی تھیں، اور ان کی حیات مستعار دونوں ہی کے درمیان امتزاج اور آمیزش کا نمونہ تھی، ان کی کتاب زندگی جہاں دعوتی وتبلیغی سرگرمیوں اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے شب وروز جد وجہد سے عبارت ہے، وہیں 'شرح معانی الآثار' کی شرح اور 'حیاۃ الصحابہ' جیسی بلند پایہ کتابیں ان کی کاوشِ قلم کا ثمرہ ہیں۔

نکاح:

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا علیہ الرحمہ، مولانا محمد الیاس صاحب کے بھتیجے اور حضرت مولانا محمد

یحییٰ کاندھلوی علیہ الرحمہ کے خلف الرشید تھے، تحصیل علم سے فراغت کے بعد ان ہی کی صاحبزادی سے مولانا محمد یوسف صاحب کا نکاح ہوگیا۔ جن سے ایک صاحبزادے محمد ہارون نامی پیدا ہوئے، مگر وہ جوانی ہی میں واصل بحق ہوگئے۔

بانی جماعت تبلیغ کی وفات اور مولانا محمد یوسف کی جانشینی:

۲۱؍رجب ۱۳۶۳ھ=۱۳؍جولائی ۱۹۴۴ء بروز پنج شنبہ داعی الی اللہ مولانا محمد الیاس صاحب اپنے رب کی دعوت پر سفر آخرت پر روانہ ہو گئے، ان کی وفات کے بعد ان کے خلف الرشید اور جانشین صادق مولانا محمد یوسف صاحب کو تبلیغی جماعت کا امیر منتخب کیا گیا، اور انھوں نے جانشینی اور امانت کا پورا پورا حق ادا کر دیا، اور اپنی جہد مسلسل سے دعوت وتبلیغ کے کام کو پورے عالم میں متعارف کرا دیا، اردو زبان کے مشہور ادیب اور انشا پرداز جناب ماہر القادری صاحب لکھتے ہیں:

> ’’حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے تبلیغی جماعت کے کام کو جس مقام پر چھوڑا تھا، ان کے لائق جانشیں اور سعادت مند فرزند مولانا محمد یوسف نے اسے منزلوں آگے پہنچا دیا‘‘(۱)۔

وفات:

۲۹؍ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ=۲؍اپریل ۱۹۶۵ء بروز جمعہ لاتعداد دلوں کو حرارت ایمانی سے روشناس اور نور ایمان سے منور کرنے والے اس گوہر شب تاب کی زندگی کا چراغ پاکستان کے شہر لاہور میں گل ہوگیا، نیم شب میں جسد خاکی کو بذریعہ طیارہ دہلی لایا گیا، اور بستی نظام الدین میں مرحوم ومغفور والد بزرگوار کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

تصانیف:

ذکر وشغل کے ہنگامے میں گھرے ہونے کے باوجود مولانا مرحوم نے تصنیفی کارنامے بھی انجام دیے ہیں، جن میں ایک نہایت علمی کتاب طحاوی شریف کی شرح ’مبانی الاحبار‘ ہے، اس کتاب کی داغ بیل مولانا نے عہد طالب علمی میں دورۂ حدیث کے دوران ڈالی تھی، وقفے وقفے سے اس کی چار جلدیں - دو مولانا کی حیات میں اور دو بعد از وفات - معرض اشاعت میں آئیں، پہلی جلد ۱۳۷۹ھ میں، دوسری ۱۳۸۲ھ میں، تیسری ۱۳۹۴ھ اور چوتھی ۱۳۹۷ھ میں منصۂ شہود پر آئیں، مگر ان چار جلدوں میں پوری ’معانی الآثار‘ کی شرح نہیں ہوسکی ہے، بلکہ

---
(۱) یاد رفتگاں: ۲/۲۷۷

تقریباً چوتھائی کتاب ہی تک کی شرح ہوسکی ہے۔

حیاۃ الصحابہ:

دوسری کتاب 'حیاۃ الصحابہٰ' ہے، جو مولانا مرحوم کے تبحر علمی، وسعت مطالعہ، اور حسن انتخاب کا نمونہ ہے، یہ کتاب اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ مولانا مسلمانوں کی زندگی اور اسلامی معاشرے کو صحابہؓ کی زندگیوں پر دیکھنے کی خواہش اور تڑپ رکھتے تھے، اور نمونۂ عمل ہی کے واسطے انھوں نے اس موضوع اور عنوان کا انتخاب کیا تھا، اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے حضرت مولانا علی میاں مرحوم کے یہ الفاظ کافی ہیں:

كتاب عديم النظير في بابه، لم ينسج من قبل على منواله، فهو زاد الدعاة إلى الله، ومادة المصلحين والمربين والمجددين، وقد وضعته الجماعة في مقرراتها الأساسية، وسار به المشاة والركبان، وعكف عليه الأفراد والجماعات، وقد بذل فيه مؤلفه مهجة نفسه وحشاشة قلبه، وجمع النصوص من عشرات من كتب الحديث والسيرة والتاريخ، ورتبها ترتيباً بديعاً، وأخرجها تشعل في القلوب جذوة الإيمان، وتلهب عواطف الشوق والحنان، وتثير كوامن الحب والوجدان، وتقدّم أمثلة رائعة عجيبة من حياة الصحابة – رضي الله عنهم – الحافلة بقصص الإيثار والتضحية، والاستماتة والتفاني وبذل المُهج والأرواح لله ولرسوله – صلى الله عليه وسلم –.

یعنی اپنے موضوع پر یہ ایک بے نظیر کتاب ہے، اس سے پیشتر اس طرز کی کتاب نہیں لکھی گئی، یہ کتاب داعیوں کا توشہ، اور اصلاحی، تربیتی اور تجدیدی کام کرنے والوں کا سرمایہ ہے، اس کو جماعت نے اپنی بنیادی نصاب میں شامل کرلیا ہے، اپنے اسفار میں وہ اس کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں، اور انفرادی واجتماعی طور پر اس کی تعلیم میں مشغول رہتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ مولف نے اس میں خون جگر نکال کر رکھ دیا ہے، اور حدیث وسیرت وتاریخ کی دسیوں کتابوں سے اس کو منتخب کیا ہے، اس کو انوکھے طرز پر مرتب کیا ہے، اور اس کو اس انداز پر پیش کیا ہے جو دلوں میں شعلہ ایمانی کو روشن کرتا ہے، شوق وذوق کے جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے، اور محبت ووجدان کی دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دیتا ہے، اور صحابہ –رضی اللہ عنہم– کی ایثار وقربانی، جاں نثاری وفرزانگی سے بھرپور زندگیوں، اور اللہ اور اس کے رسول –صلی اللہ علیہ وسلم– کے واسطے جان ودل کا نذرانہ پیش کردینے کی حیرت انگیز مثال پیش کرتا ہے۔

یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے، اس کا پہلا اڈیشن دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے شائع ہوا ہے، حیدرآباد سے اس کی تینوں جلدوں کی اشاعت بالترتیب ۱۳۷۹ھ، ۱۳۸۲ھ، اور ۱۳۸۵ھ میں ہوئی تھی، پھر اس کے کئی اڈیشن بیرون ہند کے مطابع سے طبع ہوئے، ہندوستان سے بھی اس کے کئی اڈیشن طبع ہوکر اشاعت پذیر ہوئے،

جن میں ایک مولانا محمد عبداللہ طارق دہلوی کی تحقیق وتعلیق سے بھی ۱۴۰۷ھ=۱۹۸۷ء میں ادارۂ اشاعت دینیات نظام الدین دہلی سے شائع ہوا تھا۔

مولانا محمد الیاس بارہ بنکوی کی تحقیق اور علامہ اعظمیؒ کی نظر ثانی:

'حیاۃ الصحابہ' کی از سر نو تحقیق واشاعت کا بیڑہ مولانا محمد الیاس بارہ بنکوی استاذ مدرسہ کاشف العلوم بستی نظام الدین نے اٹھایا، اور بڑی سخت محنت اور جہد مسلسل کا مظاہرہ کر کے اس پر تعلیقات وحواشی لکھے، نسخوں کا مقابلہ کر کے اس کی تصحیح کی خدمت انجام دی، اس کے مصادر ومراجع کے ساتھ اس کا معارضہ کیا، الفاظ وعبارات پر اعراب لگائے، مشکل اور غریب الفاظ وکلمات کی تشریح کی، اس کے بعض نسخوں پر حضرت مولانا انعام الحسن صاحب وحضرت مولانا اظہار الحسن صاحب علیہما الرحمہ کے بھی حواشی ہیں، ان کو بھی مولانا الیاس صاحب نے اپنے حواشی میں سمیٹ لیا، ان پُر مشقت اور محنت طلب امور کو انجام دینے کے بعد کتاب کو نہ صرف از سر نو اشاعت کے قابل بنایا، بلکہ اس کو ایک نئے پیراہن میں ڈھال دیا، مگر اشاعت سے پہلے انھوں نے مناسب سمجھا کہ ان کی تعلیقات پر کسی ماہر، دقیقہ رس اور دیدہ ور صاحب علم کی نگاہ پڑ جائے، اس کے لیے انھوں نے حضرت محدث الاعظمیؒ سے درخواست کی، اور باوجود پیرانہ سالی اور ہجوم مشاغل کے آپ اس کے لیے رضا مند ہو گئے، اور اس طرح آپ نے پہلی جلد پر نظر ثانی فرمائی، اور جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی اپنے حواشی کا اضافہ کیا، جس سے کتاب کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ خود فاضل محقق نے لکھا ہے:

> **التعليقات القيمة للشيخ المحدث الجليل حبيب الرحمن الأعظمي: وقد عُنيَ الشيخ بتحقيق نصوصه، والتعليق عليه، وتبيين معنى غريبه، والتحقيق بأسماء رجاله، والتصحيح لألفاظه المصحَّفة، وقد قام بتحقيق جميع النصوص والتعليقات الأخرى على هذا الكتاب أيضاً، بإمعان النظر من أولها إلى آخرها حرفاً حرفاً، وقد تفضَّل ببذل جهوده البالغة في هذا العمل لوجه الله تعالى مع كبر سنه وكثرة مشاغله. جزاه الله أحسن الجزاء، وأطال بقاءه ونفع جميع الأمة بعلومه.**

علامہ اعظمیؒ کے جہاں جہاں اضافے ہیں، وہاں مولانا محمد الیاس صاحب نے ((الأعظمي)) لکھ کر اس کو ممتاز کر دیا ہے۔ ان اضافوں میں کہیں اعراب کی تصحیح ہے، کہیں الفاظ کی تصحیح ہے، کہیں الفاظ وعبارات کی توضیح ہے، کتاب میں واقع ناموں میں اگر کہیں غلطی واقع ہو گئی ہے، تو اس کو درست کیا ہے۔

اس طرح یہ پہلی جلد ملّت پریس- دودھ پور، علی گڈھ- سے شائع ہوئی۔

علامہ اعظمیؒ کے اس کتاب پر حواشی کے صرف چند نمونے ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں:

۱- صفحہ۲ پر متن میں یہ آیت ہے: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَأُوْلٰئِكَ هُمُ

الْفَآئِزُوْنَ﴾ ۔اس آیت پر علامہ اعظمیؒ نے حاشیے میں لکھا ہے: ((يَتَّقْهِ)) –بسكون القاف، وكسر الهاء في قراء تنا، وفي قراء ة أخرى –بكسر القاف وسكون الهاء، وفيه قراء ة أخرى. راجع حاشية جمل.

۲-صفحہ ۱۸ پر یہ متن ہے: قال الحسن: فكتمتها (الحسين) بن علي زماناً.

(الحسين بن علي) پر مولانا انعام الحسن صاحب کا یہ حاشیہ ہے: وفي الأصل: الحسن بن علي، ولعله: الحسين بن علي وهو نص الشمائل للترمذي (۲٤/). یعنی اصل میں حسن بن علی ہے، لیکن غالباً صحیح ''حسین بن علی'' ہے، اور وہی شمائل ترمذی میں ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کے بعد لکھا ہے: أثبته المؤلف كما وجده في البداية، والصواب جزماً (الحسين بن علي) كما في دلائل النبوة برواية الفسوي. یعنی مصنف–مولانا محمد یوسف صاحب– نے اس کو بدایہ میں جیسے پایہ ویسے ہی نقل کر دیا، یقینی طور پر صحیح ''حسین بن علی'' ہے، جیسا کہ 'دلائل النبوۃ' میں بروایت فسوی ہے۔

اس میں علامہ اعظمیؒ نے جو بات مولانا انعام الحسن صاحب کے حاشیے میں شک کے ساتھ کہی گئی تھی، اس کو جزم وایقان کے ساتھ بیان کر دیا، اور فسوی کی روایت کا خاص طور سے اس وجہ سے حوالہ دیا کہ حیاۃ الصحابہ میں جو واقعہ ہے، وہ فسوی ہی کی روایت سے ماخوذ ہے۔

۳-صفحہ ۲۸ پر سطر ۹ میں هَجَّاداً بالأسْحار، آیا ہے۔علامہ اعظمیؒ نے اس پر یہ تعلیق تحریر فرمائی ہے: أي كثير السَّهَر بالأسحار، من هجد إذا سهر. یعنی هجاداً بالأسحار کا مطلب ہے سحر کے وقت بہ کثرت جاگنے والا۔اگر کوئی شخص جاگے تو کہا جاتا ہے کہ هجد.

۵-صفحہ ۱۰۵ پر مرحباً بالصُّدَيِّ بن عجلان ہے۔اس پر علامہ اعظمیؒ نے یہ توضیحی حاشیہ تحریر فرمایا ہے:

اسم أبي أمامة الباهلي صحابي مشهور. سكن الشام، ومات بها سنة ست وثمانين.

یعنی صدی بن عجلان حضرت ابوامامہ باہلیؓ کا نام ہے، انھوں نے شام میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں ۸۶ھ میں انتقال ہوا۔

۶-صفحہ ۱۸۳ پر متن کی ایک عبارت یہ ہے: وقال سهيل بن عمرو يوم حنين: لا يَجْتَبِرُها محمدٌ وأصحابُه.

علامہ اعظمیؒ نے اس عبارت کی توضیح یوں فرمائی ہے:

يعني أن محمداً –صلى الله عليه وسلم– وأصحابه لا يُصلحون ما فقدوا بهذه الهزيمة ولا يستدركونها. یعنی محمد–صلی اللہ علیہ وسلم–اور ان کے صحابہ–رضی اللہ عنہم–کو اس شکست سے جو نقصان ہوگا، وہ اس کی تلافی اور

اصلاح نہیں کرسکیں گے۔

۷-صفحہ ۴۷۹ پر متن کی دوسری سطر میں یہ ہے: **وفيه عبدالرحمن بن (سعد) ابن عمار وهو ضعيف.** اس میں عبدالرحمٰن بن سعد کے بجائے عبدالرحمٰن بن سھل لکھا ہوا تھا، علامہ اعظمیؒ نے سھل کو سعد بنا کر یہ حاشیہ لکھا:

كذا في المعجم الكبير للطبراني (٣٣٨/١)، والتهذيب، والتقريب. ووقع في الأصل: (بن سهل)، أثبته المؤلف كما وجد في المجمع (٢٧٤/٥)، وقد وقع فيه على الصواب، انظر (١٨٣/٢).

یعنی طبرانی کی معجم کبیر اور تہذیب وتقریب میں یہ نام اسی طرح -یعنی سعد ہے-، اور اصل میں (سھل) ہو گیا ہے -یعنی حیاۃ الصحابہ کی اصل میں یہ نام سعد کے بجائے سھل ہو گیا ہے-، کیونکہ مصنف نے اس کو 'مجمع الزوائد' (۲۷۴/۵) میں اسی طرح پایا اس لیے اس کو اسی طرح نقل کر دیا، حالانکہ اسی میں -مجمع الزوائد میں- جلد ۲ صفحہ ۱۸۳ پر صحیح چھپا ہے۔

۸-صفحہ ۴۸۴ پر متن کی آخری سطر میں مُجَمِّع بن حارِثہ تھا، علامہ اعظمیؒ نے ''حارثہ'' کو ''جاریہ'' بنا کر اس پر یہ حاشیہ تحریر فرمایا:

كذا في الإصابة انظر: (٣٦٦/٣)، وقد تصحَّف في الأصل وفي الإصابة في موضعين فصار (حارثة). یعنی اصابہ (۳۶۶/۳) میں مجمع بن جاریہ ہی لکھا ہوا ہے، اصل میں -یعنی حیاۃ الصحابہ کی اصل میں- اور 'اصابہ' میں دو جگہ غلطی سے ''جاریہ'' کے بجائے ''حارثہ'' ہو گیا ہے۔

۹-صفحہ ۵۶۴ پر ایک عبارت یہ ہے: **ثم مضوا حتى نزلوا ((معان)) من أرض الشام.** ''معان'' پر محقق فاضل نے یہ حاشیہ لکھا ہے: **وفي الأصل ((معانا)) وكذا في الأصل وهي مدينة في طرف بادية الشام تلقاء الحجاز من نواحي البلقاء، وكان النبي ﷺ بعث جيشاً إلى مؤتة فيه زيد بن حارثة الخ. معجم البلدان.** یعنی اصل میں **(معاناً)** ہے، اور یہ بادیہ شام کی طرف حجاز کی جانب بلقاء کے علاقے میں ایک شہر ہے، اور حضور ﷺ نے زید بن حارثہ کی سرکردگی میں موتہ کی جانب ایک لشکر روانہ فرمایا تھا۔ معجم البلدان۔

یہاں علامہ اعظمیؒ نے لکھا ہے: **قلت: فعلى هذا التفسير ينبغي أن يُعرب (معان) بإعراب غير المنصرف للعلمية والتانيث.** یعنی چونکہ یہ شہر کا نام ہے، اس لیے عَلَمِیَّہ اور تانیث کے سبب اس کا اعراب (معاناً) کے بجائے (معانَ) غیر منصرف والا ہونا چاہئے۔

۱۰-صفحہ ۶۱۵ پر موجودہ عنوان اس طرح ہے **الاستقراض للجهاد.** اصل میں **الاستقراض** کے بجائے **القرض** تھا، علامہ اعظمیؒ نے اس میں تبدیلی کر کے اس پر یہ حاشیہ لکھا:

الاستقراض أولی بدل القرض. یعنی ’’القرض‘‘ کے بجائے ’’الاستقراض‘‘ کا لفظ زیادہ مناسب ہے۔

ہم نے نمونہ کے طور پر یہاں کئی مثالیں ذکر کر دی ہیں، جن سے اندازہ کیا جا سکے گا کہ اس کتاب پر علامہ اعظمیؒ کی تعلیقات کس قدر متنوع اور ہمہ جہت ہیں۔

☆......☆......☆......☆......☆

جزء خطبات النبي ﷺ

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب علیہ الرحمۃ کی ایک مایہ ناز اور عظیم الشان تصنیف **حجۃ الوداع وجزء عمرات النبي** ﷺ ہے، جس میں آنحضرت ﷺ کے حج مبارک اور عمروں کی تفصیلات پورے شرح وبسط کے ساتھ زیبِ قرطاس کی گئی ہیں، جو حج وعمرہ سے متعلق احکام ومسائل، اس کی جزئیات اور درس ونصیحت سے بھرپور واقعات پر مشتمل ہے، لیکن اس میں ایک تشنگی یہ رہ گئی تھی کہ حجۃ الوداع کے خطبے کی نقل پر کما حقہ توجہ نہیں صرف کی گئی، اور نہ اس کی جزئیات کا احاطہ کیا گیا۔ علامہ اعظمیؒ نے اس ضرورت کا احساس کر کے حدیث کی متعدد کتابوں سے اس خطبے کا متن نقل کر کے اس کو مرتب کر دیا، جو حضرت شیخ الحدیث علیہ الرحمۃ کی کتاب کے آخر میں بعد کے اڈیشنوں میں بطور ضمیمہ **جزء خطبات النبي** ﷺ کے نام سے شائع ہوا۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنی اس تالیف میں حمد وصلوٰۃ کے بعد حضرت شیخ الحدیث کی کتاب حجۃ الوداع کا نہایت تحسین وآفرین اور ستائش آمیز انداز میں تذکرہ کیا ہے، اور اس تصنیف پر اس کے باکمال مصنف کو پوری وسیع الظرفی اور کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خراج تحسین پیش کیا ہے۔

اپنے تمہیدی کلمات کے بعد علامہ اعظمیؒ نے خطبۂ حجۃ الوداع کی قدر وقیمت، اس کی جامعیت، اس کے اندر پوشیدہ درس ونصیحت، اسلامی تعلیم کی آفاقیت وابدیت، اور اس میں قیامت تک لیے جو دستور العمل پیش کیا گیا ہے، اس کی طرف اشارہ کرنے کے بعد مختلف روایتوں سے اس عظیم الشان اور بابرکت خطبے کے متن کو نقل کیا ہے، اور ہر روایت کی سند پر محدثین کا جو کلام ہے، اس کو بھی بحوالہ نقل کیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنی اس کاوش کے ذریعے حضرت شیخ کی کتاب کی افادیت اور نافعیت کو دوچند اور اس کے حسن کو دوبالا کر دیا۔

☆......☆......☆

رسالة الأوائل

محدثین کا ایک مبارک اور قابل ذکر طریقہ کتب حدیث کی سند واجازت لینے کا ہے، اور یہ اس علم کے حاملین کا شروع ہی سے طغرائے امتیاز رہا ہے، سند واجازت لینے کے واسطے دور دراز کے سفر سے کتب تاریخ ورجال کے صفحات بھرے ہوئے ہیں، محدثین اور رواۃ حدیث کے حالات زندگی پڑھنے سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس کے لیے وہ کیسی کیسی صعوبتیں اور مصیبتیں برداشت کیا کرتے تھے، اور اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے سند واجازت کے سلسلے کو سہل الحصول بنانے کے لیے کیسی کیسی اہم اور مایہ ناز کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔

محمد سعید بن سنبل مجلّائی (۱) مکی بارہویں صدی ہجری کے ایک بڑے فقیہ ومحدث عالم تھے، مسجد حرام میں درس وافتا کی مبارک خدمت انجام دیا کرتے تھے، ۱۱۷۵ھ = ۱۷۶۱ء میں طائف میں آپ کی وفات ہوئی (۲)۔ علامہ عبدالحی کتانی نے ان کا تذکرہ **علامة مكة ومفتيها** (۳) جیسے الفاظ کے ساتھ کیا ہے۔

شیخ محمد سعید سنبل درس وتدریس کے علاوہ تصنیف وتالیف سے بھی اشتغال رکھتے تھے، اور متعدد کتابیں یادگار چھوڑ کر دنیا سے گئے، آپ کی فہرست کتب سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اسانید حدیث کا آپ کو خاص اہتمام تھا، اور اسی مبارک فن کو آپ نے تصنیف وتالیف کا خاص موضوع بنایا، چنانچہ آپ کی مصنفات میں جو کتابیں ذکر کی جاتی ہیں، ان کے نام یہ ہیں: **الأوائل السنبلية، إجازات للسيد علاء الدين، إسناد محمد سعيد** اور ایک ثبت ان کی یادگار ہیں۔

الاوائل السنبلية کو **رسالة الأوائل** کے نام سے شہرت دوام حاصل ہوئی، کتب حدیث کی سند واجازت کے حصول کے لیے اس کتاب کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس میں مصنف علام نے ۴۳ رکتب حدیث سے ایک ایک حدیث نقل کی ہے، چونکہ بیشتر احادیث جن کتابوں سے لی گئی ہیں، ان کی پہلی حدیثیں ہیں، اس لیے اس کا نام **رسالة الأوائل** رکھا گیا ہے، ورنہ بعض حدیثیں بعض کتابوں کے آخر کی بھی ہیں، جیسے مصنف عبدالرزاق کی آخری حدیث اس میں درج کی گئی ہے۔ 'اوائل' اصل میں ایک دوسری کتاب کا اختصار ہے، جس کی خدمت شیخ سنبل کے ذریعہ انجام دی گئی ہے۔ علامہ عبدالحی کتانی نے اس 'اوائل' کی نسبت لکھا ہے:

وهذه الأوائل هي المستعملة بديار الهند والحجاز غالباً (۴).	یہی اوائل ہندوستان اور حجاز میں عام طور پر استعمال کی جاتی ہے۔

شیخ محمد سعید سنبل نے اوائل کا ایک ذیل بھی لکھا تھا، جس میں اوائل میں شامل کی گئی احادیث کے علاوہ دیگر کتابوں کی تقریباً تیس (۳۰) ایسی حدیثیں تھیں، جو اوائل کے اصل ماخذ میں موجود نہیں تھیں، ذیل کی ان

(۱) یہ اعلام میں ہے، معجم المولفین میں مجلّائی کے بجائے محلاتی لکھا ہوا ہے، جو غالباً کتابت کی غلطی ہے۔
(۲) اعلام: ۶/۱۴۰، معجم المولفین: ۱۰/۳۶ (۳) فہرس الفہارس والاثبات: ۱/۱۰۰ (۴) فہرس الفہارس: ۱۰۱

روایتوں کو ان سے ان کے شاگرد شیخ اسماعیل نقشبندی اور شمس محمد بن سلیمان کردی مدنی نے روایت کیا ہے [۱]۔

علامہ اعظمی کی تحریر سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اس کو پہلی دفعہ مولانا نور محمد رسڑاوی نے مطبعۃ اِکلیل المطابع - جو پہلے رسڑا میں قائم کیا گیا تھا اور بعد میں بہرائچ منتقل ہوگیا تھا - سے طبع کرایا تھا، دوبارہ یہ رسالہ مصر سے طبع ہوکر شائع ہوا، لیکن مرور زمانہ کے ساتھ ان دونوں اشاعتوں کے نسخے ناپید اور تشنگان علم ومعرفت کے لیے نایاب ہوگئے، حسن اتفاق کہئے کہ علامہ اعظمی کے پاس ہندوستان کا مطبوعہ اس کا ایک نسخہ موجود تھا، جس میں کہیں کہیں حضرت مولانا شیخ عبدالحق مہاجر مکی کے تعلیقات وحواشی تھے، لیکن پھر بھی طباعت وکتابت کی غلطیوں سے خالی نہیں تھا۔ علامہ اعظمی نے اس کی غلطیوں کی اصلاح اور تصحیح کر کے اس کو اشاعت کے قابل بنایا، اس طرح اس کا تیسرا اور اہم اڈیشن آپ کی کاوش سے ۱۳۸۲ھ=۱۹۶۲ء میں **مطبعة ندوة العلماء** لکھنؤ میں طبع ہوکر **مكتبة الأعظمی** مئو کی طرف سے شائع اور مقبول ہوا۔

اس اڈیشن کے شروع میں تقریباً ایک صفحے پر مشتمل علامہ اعظمی کا مقدمہ ہے، جس میں آپ نے اس رسالے کی سابقہ طبعات کا ذکر کیا ہے، اس مقدمے کے آخر میں ۲۲ / جمادی الآخرہ کی تاریخ درج ہے۔

اس رسالے کے آخر کے کچھ اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی روایت کی اجازت شیخ محمد سعید سنبل سے ان کے صاحبزادے علامہ محمد طاہر کو حاصل ہوئی، اور علامہ محمد طاہر نے اس کی اجازت دی شیخ عمر بن عبدالکریم بن عبدالرسول - متوفی ۱۲۴۷ھ - کو، شیخ عمر بن عبدالکریم نے اس کی اجازت حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق علیہ الرحمہ کو دی، جیسا کہ 'رسالۃ الاوائل' کے صفحہ ۳۰ پر شیخ عمر کے لکھے ہوئے اس اجازت نامہ سے معلوم ہوتا ہے، جو ۱۲۴۱ھ کا تحریر کردہ ہے۔

حضرت شاہ اسحاق صاحب نے اس کی اجازت حضرت مولانا محمد قطب الدین دہلویؒ - متوفی ۱۲۷۹ھ - کو دی۔

حضرت مولانا محمد قطب الدین صاحب سے اس رسالے کو پڑھ کر مولانا محمد عبدالحق الہ آبادی نے اجازت حاصل کی۔

مولانا عبدالحق الہ آبادی سے ذی قعدہ ۱۳۲۱ھ میں مکہ مکرمہ میں حضرت مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی نے اس کی اجازت حاصل کی۔

اور ۹ / صفر ۱۳۴۱ھ کو دوشنبہ کے دن تین مجلسوں میں اس رسالے کو پڑھ کر علامہ اعظمی نے مولانا عبدالغفار صاحبؒ سے اس کی اجازت حاصل کی۔

حضرت مولانا عبدالغفار علیہ الرحمہ سے علامہ اعظمی کو دیگر کتب صحاح، جوامع، سنن، مسانید، مسلسلات اور حدیث کے مجموعوں کے علاوہ اوراد وإذکار وغیرہ کی کتابوں کی بھی اجازت حاصل تھی، جیسا کہ 'رسالۃ الاوائل' کے صفحہ ۳۴ پر علامہ اعظمیؒ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔☆......☆......☆

(۱) فہرس الفہارس: ۱۰۱

چند مکاتیب

علامہ اعظمیؒ کا ایک خط سید سلیمان ندویؒ کے نام
اور
ایک تاریخی پیغام علماء اسلام کے نام

ذیل میں حضرۃ العلامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ کے نام علامہ اعظمی کا ایک مکتوب گرامی درج کیا جارہا ہے، اس مکتوب کو علامہ سید سلیمان ندوی کے صاحبزادے ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے مولانا رشید احمد الاعظمی صاحب کو ارسال کیا تھا، جس کے ساتھ ڈاکٹر سلمان صاحب نے ایک طویل خط بھی لکھا تھا، جو 'المآثر' کے جلد نمبر ۱۰ شمارہ نمبر۲ میں بتمامہ شائع ہوا ہے۔ علامہ اعظمی کا خط اور آپ کا تاریخی پیغام نقل کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بطور تمہید کے ڈاکٹر سلمان ندوی صاحب کے خط کا وہ حصہ نقل کردیا جائے، جس میں اس خط اور پیغام کا پس منظر بیان کیا گیا ہے، جو حسب ذیل ہے:

''یہ مکتوب دراصل احتفال علماء اسلام کے سلسلہ میں ہے، یہ احتفال ۱۹۵۱ء میں کراچی میں والد ماجدؒ کی سیادت میں منعقد ہوا تھا، اس احتفال کے جلسۂ عام کی صدارت مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی نے کی تھی۔ والد ماجد نے دعوت نامہ حضرت مولانا کو بھیجا ہوگا، اسی دعوت نامہ کے جواب میں یہ مکتوب ہے۔ علماء اسلام کا اتنا بڑا بین الاقوامی سطح پر اجتماع پہلی بار ہوا تھا اور بہت تاریخی تھا۔ اس احتفال کا افتتاح پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے کیا تھا۔ مکتوب میں اصل خطاب تو علماء سے عربی میں ہے، اور اردو میں والد ماجد کے نام چند سطریں ہیں۔''

سید صاحب کے نام علامہ اعظمیؒ کا خط

مخدومی! السلام علیکم

میں اپنی حیثیت کے لحاظ سے موتمر علمائے اسلام میں شرکت کے قابل نہیں ہوں، اور موانع کی وجہ سے تماشائی کی حیثیت سے بھی حاضری ممکن نہیں، پھر نقار خانہ میں طوطی کی آواز ہی کیا؟! لیکن موتمر کے مقاصد پڑھ کر رہا نہیں گیا، اور جی چاہا کہ میں بھی آپ کے توسط سے اپنے دل کی بات علمائے اسلام کے سامنے رکھوں۔ **میرا روئے سخن ان علماء یا مولویوں کی بھیڑ کی طرف ہے جن کے اعمال وافعال کو دیکھ کر عوام کے قلوب سے دین کی عظمت نکلتی جارہی ہے۔** والسلام حبیب الرحمٰن الاعظمی

ایک خط پرسوں روانہ کر چکا ہوں۔

اس رائے کا پیش کرنا آپ کی رائے پر موقوف ہے، آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں۔

پیغام بنام علماء اسلام

پٹھان ٹولہ، مئو، اعظم گڈھ، یوپی۔

إلى السكرتائر الأفخم! السلام عليكم ورحمة الله

أرجو إبلاغَ تحياتي إلى علماء الإسلام المُساهِمين في المؤتمَر، ثم تبليغَ رسالتي هذه.

يا علماءَ الإسلام! إني قد أطَلْتُ التفكيرَ، فلَمْ أرَ أدعَى إلى انتشارِ الإسلام في العالَم ولا أشدَّ تأثيراً في نفوسِ المُجتمَعِ وأقمَعَ لِأدوائِهم مِنْ أن يقومَ المُتَّسِمونَ بالعِلم أولاً بإصلاحِ نفوسِهم، وتهذيبِ أخلاقِهم، وتحسينِ أعمالِهم، والاهتداءِ بالهدي النبوي في كلِ ما يأتُون وما يَذرون، والاقتداءِ بهم في كل أخذٍ وردٍّ.

فَلْيكُنْ هذا أولَ قَرارٍ تَتَّخِذونَه في هذا المؤتمر، ولْيكُنْ هذا أولَ عهدٍ نأخُذُه على أنْفُسِنا. فوالله ما أنتم في جسدِ العالَم الإسلامي إلا مضغةٌ إذا صلُحتْ صلُح الجسدُ كلُّه، وإذا فسَدتْ فسدَ الجسدُ كلُّه، هذا وأستميحُ منكمُ العفوَ، فإنه الرأي يُصدِرُه الصغيرُ أمام الكبيرِ، والسلام

حبيب الرحمن الأعظمي

١٥/ جمادى الأولى ١٣٧١هـ

ترجمہ:

کانفرنس میں شریک علماء اسلام کو میرا اسلام پھر میرا یہ پیغام پہنچا دیں

علماء اسلام! بہت غور وفکر کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ دنیا میں اسلام کی اشاعت، لوگوں کے دلوں میں اس کی زبردست تاثیر، اور ان کی بیماریوں کے استیصال کے لیے اس سے بڑا کوئی محرک نہیں کہ حضرات علماء پہلے خود اپنی اصلاح کریں، اپنے اخلاق کو سنواریں، اپنے اعمال کو عمدہ بنائیں، اور اپنے ہر کام اور ہر عمل میں رسول اللہ ﷺ کے طریقے کا اتباع اور پیروی کریں۔

اس کانفرنس میں آپ حضرات جو تجاویز پاس کریں ان میں یہ اولین قرار داد اور پہلا عہد ہونا چاہیئے جس کی ہم خود پابندی کریں۔ بخدا آپ حضرات عالم اسلام کے جسم میں ایک ٹکڑا - دل - ہیں کہ جب وہ درست ہوگا، تو پورا جسم درست ہوگا؛ اور اگر وہ خراب ہوگا، تو پورا جسم خراب ہوجائے گا۔ آپ حضرات مجھے معاف فرمائیں یہ ایک رائے ہے اگرچہ چھوٹا منھ بڑی بات کا مصداق ہے۔

مکتوب بنام ڈاکٹر صلاح المنجد

٢٤/ أكتوبر ٦١م =١٣ جمادى الأولى ٨١هـ يوم الثلاثاء

الأستاذ الدكتور صلاح الدين المُنَجِّد

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

وبعد! فقد تلقيت خطابكم المورخ ١٦/ ٩/ ٦١م، الخطاب الذي يحمل بُشرى إرسال الفهارس والمجلة، فحصلت على سرور عظيم، ثم بعده بنحو شهر وصلتني الطرود المرسلة، فازددت سروراً على سرور، وها أنا أرفع أسمىٰ تحياتي، وجزيل شكري إليكم على حسن صنيعكم وجميل بِرِّكم.

وإني حين سرحتُ نظري في الفهارس أدهشني هذا العدد الضخم من الأفلام، وهذا العمل المُضني في فَهْرَسَتِها، فجزاكم الله الجزاءَ الأوفى عنا وعن سائر المشغوفين بالعلم في العالم، ولقد -والله- قصَّرتم الطريق لتتبع نوادر الكتب المبثوثة في العالم الإسلامي.

وإن كان لي ما ألاحظ على هذه الفهارس فهو يسير جداً بالنسبة إلى ما تحتويه من الكتب الكثيرة العدد، وإليكم بعضَ ملاحظاتي عليها:

الجزء الأول

١- ص٧٥: الجامع الكبير لأبي الفضل الكرماني. ينبغي أن يُحذف من هنا، لأنَّ موضوعه الفقه الحنفي، وقد ذُكر فيه باسم شرح الجامع الكبير، انظر ص٢٦٣.

٢- ص١٥ رقم ٨٢: مختلف الرواية. موضوعه الفقه الحنفي وقد وُضع هناك فعلاً، فينبغي أن يُحذف من هنا.

٣- ص ٢٩ رقم ١٠٦: تفسير القرآن للطحاوي؟ كذا مُعْلَماً بعلامة السؤال، وظني أنه أحكام القرآن للطحاوي، فإن كان ظني صادقاً، فلا بد من أن يكون الكتاب مقتصراً على تفسير آيات الأحكام فقط، كنظائره من كتب أحكام القرآن، وأما أنه للطحاوي أو لغيره، فالطحاوي يسرد الأحاديث بأسانيده، وأسانيده لا تخفىَ على المشتغلين بالحديث، فإنْ أُعيدَ النظرُ فيه تبيَّن الأمر الواقع.

٤- ص٤٨ رقم ٢٦٦: نزهة الأعين النواظر في علم الوجوه والنظائر. أظن أنه لا يختلف عن الوجوه والنظائر المذكور تحت رقم ٢٩٠، فكان ينبغي التنبيه عليه، وليُحقق.

٥- ص٦٣ رقم ١٠٢: بحر الفوائد، ومعاني الأخبار (رقم ٤٧٩). كلاهما واحد،

فكان ينبغي أن ينبَّه على هذا.

٦- ص ...... رقم ٢٦: الكواكب الدراري. كتاب جليل لابن عروة الدمشقي، رتَّب فيه مسند أحمد وشَرَحَه، وأكثر في شرحه من نقل الرسائل الممتعة بتمامها، منه المجلدات في ظاهرية دمشق، وقد طالعت مجلدة منه في الهند.

٧- ص١٢٥ رقم ١٠٢: الرد على الغزالي والجويني. هذا الكتاب ردَّ فيه مصنِّفه على الغزالي في ......(ا) المسائل الفقهية، وانتصر منه للإمام أبي حنيفة؛ فمحله إذن 'الفقه الحنفي' أو 'المناقب' لا 'التوحيد'. ثم إن مولفه هو محمد بن عبدالستار بن محمد، لا كما كتب الفاضل المُفَهرِس محمد بن محمد بن عبد الستار؛ وكذا الرد على الغزالي والجويني المرقم برقم ١٠٣، ينبغي وضعه حيث يحسن وضع سابقه.

وكان لازماً على المفهرِس حين ذكر 'التعليم في الرد على الغزالي والجويني' في ص١٢١، وقال انظر: الرد على الغزالي، كان لازماً أن يقول 'الرد على الغزالي لمسعود بن شيبة'، فإنه هو الذي يسمَّى بالتعليم دون ما ألفه الكردري؛ وهنا خطأ مطبعي أيضاً، وهو "الكردي"، والصواب "الكردري"، وقد تكرَّر هذا الخطأ مع الخطأ في تسمية أبيه في ص١٥٨ رقم ١٦٢، ووضعُ الكتاب هناك في "التصوف" خطأ ثالث.

٨- ص ١٢٠ رقم ٥٧: تبصرة الأدلة وتمهيد قواعد التوحيد. هكذا سمَّاه المُفهرِس الفاضل مع أن 'تمهيد قواعد التوحيد' كتاب على حدة لأبي المعين، وقد ذكره المفهرس الفاضل في ص١٢٢ تحت أرقام ٧٤، ٧٥، ٧٦ . فإن كانت تبصرة الأدلة (رقم ٥٧) يليها 'تمهيد قواعد التوحيد'، فمن الواجب أن يُنبَّه عليه، وإلا فليقارن بين الكتاب (رقم ٥٧) والكتاب (رقم ٧٤) ليتبيَّن الأمر الواقع؛ وأكبر ظني أن إضافة 'تمهيد قواعد التوحيد' إلى 'تبصرة الأدلة' في تسمية الكتاب وقعتُ خطأً من بعض الناسخين؛ وقد رأيت نسخةً من 'تبصرة الأدلة" في بومباى قد اقتصر ناسخها في تسمية الكتاب على 'تبصرة الأدلة' فقط. وقد فرَّق بين الكتابين حاجي خليفه أيضاً في كشف الظنون، وكذا غير واحد ممن ترجم أبا المعين كالقرشي في الجواهر المضيئة.

٩- ص ١٣١ رقم ١٥٢، وص١٣٦ وص١٣٧رقم ٢٠٣ ورقم ٢٠٤: الثلاثة أجزاءُ كتابٍ واحدٍ، وقد فات المفهرسَ أن يُنبِّه عليه.

١٠- ص١٣١ رقم ١٥٣: شرح مطالع الأنوار. وُضع في التوحيد، وهو في فن المنطق.

(ا) یہاں اصل مکتوب میں ایک لفظ کے بقدر کاغذ پھٹا ہوا ہے، جس کی وجہ سے ہم نے بیاض چھوڑ دیا ہے۔

١١- ص٢٥٣ رقم ١١٩: نهاية الوصول. محله في علم التوحيد، فإن مسألة إمامة أبي بكر من علم العقائد.

١٢- ص٣٥٢ رقم١١٣: حدائق الأزهار. وُضع هنا في علم اللغة، وقد مرَّ ذكره في علم الحديث، وهو الصواب.

١٣- ص٢٠٨ رقم٩١: دانشنمائى علائي . الصواب في اسمه دانش نامهٔ علائي، فقد ذكره حاجي خليفه باسم دانش نامه، والكتاب قد طبع في حيدرآباد بمطبعة فيروز دكن سنة ١٣٠٩ باسم 'مايهٔ دانش المعروف بحكمة العلائي' ومعنى 'مايهٔ دانش': متاع الحكمة أو مادة الحكمة، ولعلَّ الطابع أخطأ في قرأة اسم الكتاب، والصواب 'نامهٔ دانش' أي كتاب الحكمة. والمطبوع يشتمل على ثلاثة فنون، فن المنطق في ٧٢ صفحة، وفن الإلٰهيات في ١٣٧ صفحة، وفن الطبيعيات في ٧٦صفحة.

هذا ما حضرني الآن، ولعل لي عودةً إن بدا لي شيء من أمثال هذه الملاحظات. ومعذرتي إلى الفضلاء المُفهرِسين، فليس لي نية من ذلك إلا مساهمتَهم في خدمة العلم.

وأرجو أن يكون 'الترغيب والترهيب' -انتقاء الحافظ ابن حجر- قد وصلكم، أو سيصل بعد أيام.

هذا وأبوح إليكم بحاجتي إلى نسخة مصورة من الجامع لعبد الرزاق -المذكور بين رقمي ١٨٧ و ١٨٨ من الحديث- فدُلُّوني على ما يلزمني في هذا الصدد، ولكم المنة.

والسلام عليكم ورحمة الله- المخلص: حبيب الرحمن الأعظمي

بعد کا اضافہ: *تذکرۃ الکحالین فارسی قلمی کی اطلاع، نیز مسند حمیدی جلد اول کے عنقریب شائع ہو جانے کی خبر، اور یہ کہ مجلس علمی عقیدۃ الاسلام، اور عقبات کے نسخے معہد کو اهدا کرے گی۔*

....

مکتوب بنام شیخ رشاد عبدالمطلب

٢٦/ ١١/ ١٣٨١هـ

فضيلة الأستاذ رشاد عبدالمطلب حفظه الله تعالى

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

وبعد! فإني طالب علم أحتاج دائماً إلى الاتصال بأهل العلم، وقد كنت أتصل بالشيخ العلامة محمد زاهد الكوثري مكاتبةً حين كان الشيخ حياً، وإني قد تعقَّبتُ على تعليقات المرحوم الشيخ أحمد محمد شاكر على مسند أحمد، وقد نشر تعقيباتي في آخر

المجلد الخامس عشر من المسند؛ ثم إني اتصلت بالدكتور صلاح الدين المنجد، فأرسل إليَّ فهارس المخطوطات التي بمعهد المخطوطات، وأمرت مجلس إحياء المعارف -بماليگاؤن- فأرسل إليه نسخة من الترغيب والترهيب بانتقاء الحافظ ابن حجر الذي قام المجلس بطبعه ونشره بإشارة مني، ثم إني أنفذتُ إليه كتاباً مورخاً ٢٤/١٠/١٩٦١م مُرَفَّقاً ببعض ملاحظاتي على المجلد الأول من فهارس المخطوطات، وأنا إلى وقتي هذا متشوف إلى جوابه، وقد بلغني الآن أنه غادر القاهرة، وقد تولَّى منصِبه فاضل آخر من فضلاء مصر لستُ أعرف اسمه، فأردتُ أن أكلفكم، راجياً أن لا تحرموني الإجابة على كتابي هذا.

١-مجلس إحياء المعارف -ماليگاؤن، ناسك، الهند- عازم على نشر كتاب الزهد والرقائق لعبد الله بن المبارك، وله أفلام مأخوذة من نسخ مختلفة، فهل تسمح الإدارة الثقافية بمنح نسخة فوتوغرافية مُصورةٍ عن إحدى النسخ؟ فإن سمحتُ فما هي تكاليفها؟ وكيف يمكن أن نُؤدِّيَ مبلغ تكاليفها إلى الإدارة؟ والنسخة التي ينبغي تصويرها نسخة الظاهرية التي رقمها في الفهرس ٢٣٣ (التصوف والآداب الشرعية).

٢- قام هذا العاجز بتحقيق مسند الحميدي -أستاذ الإمام البخاري- وهو الآن جارٍ طبعُه في حيدر آباد على نفقة المجلس العلمي -بكراتشي (الباكستان) وڈابهيل، سملك (الهند).

ثم أُنهي إليكم أني قد حصلتُ على الجزئين الأولين من سير أعلام النبلاء بعد جهد طويل، فامتلأ قلبي سروراً. وقد أدهشني ما شاهدت من أناقة الطبع وجمال الإخراج، ولكني لما تصفَّحتهما، لمحتُ فيهما أغلاطاً غير يسيرة، وأيقنتُ أن المحقق شغلته الشواغل عن اختيار الدقة في التحقيق، وإليكم بعضَ أمثلتها، ولو شئتم أن أستوعبها، اختلست له فرصةً من أوقاتي إن شاء الله.

ص٥ س٢: ثنا أبو المغيرة صفوان وغيرهما	:	صوابه: ثنا أبو المغيرة عن صفوان، ويُحذف "وغيرهما" راجع مسند أحمد ١: رقم ١٠٨
ص٨ س٩: قال علبه	:	صوابه: قال ابن علية
ص٧ س٢٢: أبو حسنه	:	صوابه: أبو حسبه، كذا ضبطه الذهبي في المشتبه
ص١١ س٦: جرير بن عثمان	:	صوابه: حريز بن عثمان
ص١١ س٤: تحتاج إليه	:	صوابه: نحتاج إليه (ابن سعد)
ص١٤ س٤: فسأله كيف هو	:	صوابه: يسأله كيف هو

ص٣٥ ت١: قوله: لم أجده الخ	:	قلت: هو في مسند عثمان، انظر المسند ١: رقم٤٥٥
ص٣٣ ت١: قوله: لم يذكره في مسند الزبير	:	قلت: ذكره في مسند أسماء (احمد ٦: ص٣٥٢ الميمنية)
ص٥٦ س٥: الابار بن حصين	:	صوابه: الابار عن حصين
ص١١٢ س١٠: أبو النظر	:	صوابه: أبو النضر
ص١١١ س١٤: لولان	:	صوابه: لو أذن (ابن سعد ٣/ ٣٩٤)
ص١١١ س١٦: عبداً مجتهداً	:	صوابه: عابداً مجتهداً (الاستيعاب)
ص١١٤ س٧: عاصم بن عبد الله	:	صوابه: عاصم بن عبيد الله (ابن سعد)
ص١١٤ س٤: حط	:	صوابه: خط

إلى غير ذلك مما يطول تعداده.

نبَّهتُ على هذا خدمةً للعلم، ومساهمةً في أداء الواجب الذي تقوم به الإدارة الثقافية، وإني أعُدُّ إخراجَ هذا الكتاب من جلائل أعمال الإدارة، والسلام.

....

بنام شیخ اسماعیل انصاری

مئو- ١٠ ذي القعدة ١٣٨١هـ = ٦/ أبريل ٦٢ء

صاحب الفضيلة العالم الكبير الشيخ إسماعيل الأنصاري حفظه الله

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

وبعد: فقد سُرِرت جداً بوصول كتابكم الكريم المورخ ١٠/ ٩/ ٨١ من وجوه شتى، منها الاطلاع على أحوالكم وتحسُّن حال عائلتكم وقاكم الله تعالى وإياها كل سوء؛ ومنها الوقوف على كيفية نسخة المصنف المحفوظة بالمكتبة السعودية، إلى غير ذلك. فجزاكم الله تعالى خيراً وشكر مساعيكم.

١- أما الآن فأفيدكم أن أمَّ النسخة السعودية هي بعينها أمُّ نسختي الفوتوغرافية، التي أنا أقوم الآن بتحقيقها والتعليق عليها، وأنا في أشد حاجة إلى نسخة أخرى لأتمكن من تلافي ما في نسختي من النقص في أوله أو في أي موضع آخر، وقد كتب إلي صديق لي من مكة المكرمة أن عند الشيخ محمد عبدالرزاق حمزة مدير دار الحديث نسخةً من مصنف عبدالرزاق، فإن قَدِمتم إلى مكة، فابحثوا لي عنها، وأفيدوني ولكم الشكر.

٢- هل يمكن الحصول على نسخة فوتوغرافية من تفسير عبدالرزاق، فإن أمكن فتكاليفها على ذمتي، أدفعها إليكم إن شاء الله بواسطة السيد عبد الشكور فدا الكتبي بمكة المكرمة.

٣- أنا شديد الأسف على عدم وصول مختصر الترغيب والترهيب إليكم، وسأكتب إلى الكتبي المذكور آنفاً أن يدفع إليكم نسخة منه إن أتيحت له زيارتكم في موسم الحج.

٤- قد وصلني ثلاث نسخ من كل من 'الإلمام' و'التحفة'، ولا أستطيع أن أقوم بشكركم على هذا الجميل، وسأرسل نسخةً من كل منهما إلى مدير المجلس العلمي بكراتشي إن شاء الله.

٥- قد ضِقتُ ذرعاً لسوء معاملة طابع مسند الحميدي، فإنه لم يُكمِّل طبعَه حتى الآن، وإني لما رأيت تأخُّرَ صدورِه، بدا لي أن أجعله في جزئين، فأرسلت إليه الفهارس والاستدراكات، والمقدمة ليطبعها، ويضمها مع النصف الأول من الكتاب، فيصير الجميع الجزء الأول منه، نقدمه إلى القراء عاجلاً، لكنه سامحه الله لم يكمل حتى الآن طبع المقدمة فضلاً عن الفهارس وغيرها، وكنت قد أكدت عليه أن يُتم ذلك كله قبل انقضاء ميعاد بواخر الحُجاج، وإلا لا يمكن إرسال النسخ إلى الحرمين.

٦- طالعت مقالتكم الرائعة في الملاهي، فاستحسنتها جداً مقالة متينة ممتعة لقد أوردتَ وأصدرتَ فجزاك الله خيراً.

٧- كتاب 'تحفة الأشراف' للحافظ أبي الحجاج المزي من أبدع الكتب في أطراف الكتب الستة قد حوت جميع أحاديثها بأسانيدها مرتبة على مسانيد الصحابة، ومنه عدة نسخ في الهند -نسختان ناقصتان في حيدرآباد، ونسخة كاملة في بتنه، وأخرى كاملة في كلكتا- وعدد أوراق هذه الأخيرة ٧٨٧ ورقة من القطع الكبير . وأما تكاليف الطبع فالإخوان في الرياض أعرف بها مني.

٨- ظني أنكم ستقدمون مكة في موسم الحج، فاكتبوا لي عنوان محلكم فيها حتى أرسل لكم ورقة الإجازة، والآن أنا أجيزكم بكل ما تجوز لي روايتُه عن أشياخي الأجِلّاء:

(١) إمام العصر الشاه محمد أنور الكشميري وهو -أجلهم- عن الشيخ محمود الحسن عن الشيخ قاسم النانوتوي.

(٢) وتاليه في العلم مولانا الشيخ عبد الغفار بن عبد الله المئوي، عن الشيخ

الجليل رشيد أحمد الكنكوهي، كلاهما [1] عن الشيخ عبدالغني المجددي الهندي ثم المدني.

(٣) والشيخ عبدالغفار المذكور عن الشيخ عبدالحق الا له آبادي ثم المكي، عن النواب قطب الدين خان.

(٤) والشيخ عبدالرحمان البوفالي، عن الشيخ عبد القيوم البوفالي.

ثلاثتهم [2]: عن الشهير في الآفاق الشيخ محمد إسحاق الدهلوي ثم المكي، عن الشيخ عبدالعزيز، عن الشيخ ولي الله بن عبدالرحيم الدهلوي، عن الشيخ محمد طاهر بن إبراهيم الكردي، عن أبيه بسنده المذكور في ثبته المسمى بالأمم في إيقاظ الهمم.

وللشيخ محمد إسحاق إجازة عن الشيخ عمر بن عبدالرسول المكي برواية جميع ما تصح له روايته عن مشايخه، قد أجازني برواية جميعه الشيخ عبدالغفار عن الشيخ عبدالحق عن النواب قطب الدين، عن الشيخ محمد إسحاق. وراجع رسالة الأوائل للشيخ سعيد بن سنبل.

والرجاء أن لا تنقطع المكاتبة بيني وبينكم، والإفادة عن ميعاد وصولكم بمكة، ومحل إقامتكم فيها. والسلام ودمتم.

في سنة ١٣٤٥ كان بالمدينة المنورة مكتبة باسم مكتبة مشهد عثمان –برباط العجم– وكان فيها إذ ذاك 'المعجم الكبير' للطبراني، والكافي لابن عبدالبر ، فإذا أتيحت لكم زيارة المدينة فابحثوا عنهما في تلك المكتبة . وقد سمعنا وقرأنا كثيراً عن المكتبة الثمينة التي في رباط مظهر، فإن ساعدتكم الظروف فزوروها وأفيدونا عنها مشكورين.

وأُكلِّفُكم إبلاغ سلامي إلى أخينا في الله الشيخ حماد الأنصاري وغيره من الإخوان. هذا وقد كتب إليَّ بعض الإخوان من أهل العلم من دهلي أن أستورد أو أستوهب له نسخة من 'المستفاد من مبهمات المتن والإسناد' . فإن تيسَّر فواسطة وصوله إليَّ أخونا السيد عبدالشكور فدا، فهو يرسله وما سواه من الكتب بيد أحد الحُجَّاج الوطنيين.

وأعود، فأقول إني قد أجَزْتُ أخانا الفاضل الشيخ حماد الأنصاري بجميع ما أجزت به لكم، والحمد لله أولًا وآخراً.

(١) يعني الشيخ قاسم النانوتوي والشيخ رشيد أحمد الكنكوهي (مسعود)

(٢) يعني الشيخ عبد الغني المجددي، والنواب قطب الدين خان، والشيخ عبدالقيوم الوفالي (مسعود)

مکتوب شیخ حسن مظفر الرزو بنام علامہ اعظمی

بسم الله الرحمن الرحيم

١٠/ رمضان ١٤٠٥هـ

إلى الإمام المحدث حبيب الرحمن الأعظمي حفظه الله

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته.

لقد يسَّر الله تعالى لنا العمل على جمع مرويات الإمام عبد الله بن عقبة الحضرمي المَكْنِي بابن لهيعة، مِمَّن خرَّج له من أصحاب الكتب الستة ومسند الإمام ابن حنبل رضي الله عنهم، وذلك للموازنة بين مروياته باعتماد الضوابط المرعية بين علماء الحديث.

ولقد وجدنا بأن خير سبيل لإنجاز هذه الموازنة هو الاعتبار لمعرفة المتابعات والشواهد لمروياته.

ونظراً لكونكم مرجعاً لعلماء الحديث وطلبته في عصرنا هذا –حفظكم الله ذخراً لنا وللمسلمين– توجَّهنا برسالتنا إليكم راجين أن تُوضحوا لنا رأيكم فيما يلي:

١– رأيكم في الإمام ابن لهيعة الحضرمي.

٢– الطريق المناسب للموازنة بين مروياته.

٣– المنهج الذي يمكن اعتماده في هذه المناسبة.

نختم عجالتنا هذه بسؤال الباري عز وجل في هذه الأيام المباركة أن يُطيل في عمركم ويحفظكم مرجعاً للعاملين في علوم الحديث، وأن يُهيءَ لنا رؤيتكم في المستقبل القريب إن شاء الله تعالى، إنه سميع مجيب. وكتب

حسن مظفر الرزو – الموصل/ الجمهورية العراقية.

....

مکتوب علامہ اعظمی بنام شیخ حسن مظفر الرزو

بسم الله الرحمن الرحيم

يوم الأحد – ٢/ من ذي القعدة ١٤٠٥هـ = ٢٠/ يوليو/ ١٩٨٥م

إلى الفاضل المحقق حسن مظفر حفظه الله تعالى

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد:

فقد وافتني رسالتكم في حينها، ولم أنشَط للإجابة في شهر رمضان، ولم أتفرَّغ لها

في شوال، لافتتاح العام الدراسي في المعاهد العلمية عندنا في شوال، وتشاغُلِنا بشئون الطلبة.

وقد اختلستُ الفرصة اليوم للإجابة فأقول: إنه قد وقع مني موقع الاستحسان والتقدير انصرافُكم إلى جمع مرويات القاضي ابن لهيعة المصري، والموازنة بين مروياته، وبين مرويات مشاركيه في تلك الروايات لِيَتبيَّن أنه أخطأ في بعضها أو لم يُخطِئ، وإن كان أخطأ ففي كم؟ أعني ما النسبة بين خطئه وصوابه.

وأما رأيي في ابن لهيعة، فهو عندي حسن الحديث، وإني أقول فيه ما قال ابن القطان في عبد الله بن صالح المصري: إنه صدوق، ولم يثبت عليه ما يسقط له حديثه إلا أنه مختلَف فيه، فحديثه حسن (تهذيب التهذيب: ٢٦٠/٥) . وهو الذي يشير إليه قول الإمام أحمد في ابن لهيعة: مذهبي في الرجال أني لا أترك حديث محدث حتى يجتمع أهل مصر على ترك حديثه(تهذيب: ٣٧٧/٥).

وقد نحا هذا المنحى الهيثمي، فحسَّن حديثه في عدة مواضع (انظر مجمع الزوائد ج٧١/٦ و١٦١، و٣٠٦/٧، و١٦٥/٨، و٣٠/١٠ و١٥٩)، ومعلوم قطعاً أن الهيثمي قد تخرَّج على الحافظ العراقي وأنه عمل هذه الزوائد تحت إشرافه، ولم يَحْكِ أحد أن العراقي ردَّ عليه، وقد قرأ الحافظ ابن حجر في مجمع الزوائد، وتعقَّب على الهيثمي في مواضع، لكنه لم يردَّ عليه تحسينه لحديث ابن لهيعة.

وهذا الذي أقوله في ما رواه غير العبادلة عنه، وأما ما رواه العبادلة –ابن المبارك، وابن وهب، والمقرئ– عنه، فقد قال الحافظ عبدالغني بن سعيد: إنه صحيح، وذكر الساجي وغيره مثله.

هذا والمأمول الإفادة عن وصول هذا الجواب، ومواصلة المكاتبة، والسلام

حبيب الرحمن الأعظمي

بقلم: ابنه رشيد أحمد الأعظمي.

....

مکتوب الشیخ محمد عوامۃ بنام علامہ اعظمی

بسم الله الرحمن الرحيم

سماحة سيدي الأجل مولانا العلامة الحجة الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي

حفظه الله تعالى وأمتع المسلمين بحياته وعلومه

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد:

فـأرجـو اللّٰه تعالى بمنِّه ويُمنه أن يجعلكم بخير وصحة وعافية، ويُمتعَنا والمسلمين بحياتكم الخيِّرة الزاخرة بخدمة سيد المرسَلين عليه أفضل الصلاة والتسليم . وإنني يا سيدي أحـمـد إليـكـم اللّٰه تـعـالـى عـلـى عـظـيـم فـضله ونعمته عليَّ، وأرجوكم الدعاء بما تُحِبُّونه لخادمكم الصغير، المُقصِّر معكم، فسامحوني يا سيدي.

وعسـى أنـي أقـوم ببـعـض واجبكم عليَّ وعلى طلاب العلم، وذلك أني أقرأ عنكم السلام على حضرة النبي ﷺ كلما تشرَّفتُ بالسلام عليه، ولا أملك شيئاً أعزَّ عندي من هذا.

مـنـذ أيـام قليلة أعددت رسالة كتبت فيها لحضرتكم أسألكم فيها عن أمرين اثنين، وإذ بـفـضيـلة سيـدي تـلـميذكم ومعرِّفِ الناس ببلادنا على بعض فضلكم يأمرني أن أكتب إليـكـم بـأمـر ثـالـث، وهو: أنه يرغب بخدمة كتابكم "شذوذ الألباني وأخطاؤه"، ولا سيما الـقسـم الـرابـع الذي فيه الدفاع عن الإمام الأعظم رضي اللّٰه عنه، ويرغب أن يُشرِّفني والأخ الشيخ محمود ميرة بالمشاركة أيضاً.

وهـذه الـخـدمة تكون على وجه تبسيط العبارة وكشف ما فيها من تنبيهات علمية دقيقة، يغيب فهمها عن القارئ المتوسط، ونحو ذلك من ألوان الخدمة.

فهـو يـرغـب بتعميم نفعها، وقطع ألسنة المغالطين والغالطين، ويرجو من فضيلتكم الإذن والـمـوافـقة، وإمـداده بـمـا تيسَّـر لكم من زيادات عليها، جزاكم اللّٰه خيراً، وحفظكم ذخراً.

أما ما أرجوكم إفادتي به:

١ – مـا هـو الـقـول الـفصل عندكم في توثيق ابن حبان إذا انفرد، وما رأيكم بكلام الـمعلِّمي في "التنكيل" ١:٤٢٧، وقد اعتمده الألباني؟ وهل من فرق بين منهج ابن حبان في "الثـقات" و"الصحيح" له؟ فإنَّ بعض المشتغلين يرى أن منهجه في "الصحيح" أقوى وأشد، بـنـاءً عـلـى كـلامـه فـي مـقـدمته ١:٨٢، ونحوه في مقدمة "المجروحين" ص٨ من الطبعة المصرية.

٢ – فسَّـر الـحـافـظ ابـن حـجـر فـي "التهـذيب" ترجمة الحارث بن سعيد الثقفي، وحُـريـث بـن ظهيـر، فسَّـر قـول الـذهبـي "لا يُعرف" بجهالة العدالة، مع أن ظاهر كلامه في تـرجمة النضر بن عبد اللّٰه السلمي، ونهيك بن يريم الأوزاعي، أنه يُفسِّرها بجهالة العين، فهل هذا تعارض؟ أو أن كلمة الذهبي تشمل الجهالتين، ففسَّرها في كل موضع بما يتناسب؟

وأمـر ثـالـث يـاسيـدي: يـرى الحافظ في مقدمة "تهذيبه" أن المزي قصد استيعاب

شيوخ المترجَم وتلامذته، فهل هذا صحيح؟

تكرَّموا بإفادتي أثابكم الله وحفظكم بكل خير وعافية، وتحياتي لمولانا العزيز رشيد أحمد، وسعيد أحمد، والأنور، الأزهر، الأرشد، والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته. المدينة المنورة، ص ب ٤٦٧٥. ١٤١٠/٦/٥هـ. خادمكم/ محمد عوامة.

....

جواب علامہ اعظمی بنام شیخ محمد عوامہ

بسم الله الرحمن الرحيم

١٤١٠/٧/١٠هـ = ١٩٩٠/٢/٧م

إلى الفاضل الذكي، والعالم اليلمعي، الشيخ محمد عوامة حفظه الله ورعاه

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد:

فقد وافتني رسالتكم في حينها، وإرجاء الإجابة والردِّ عليها له أسباب لا أُحِبُّ أنْ أُحصِيَها، لكني أشير إلى بعضها، فمنها: أنَّ ابنتي الكبرى قد تُوُفِّيتُ في جمادى الأخرى، ومنها: أني أقاسي ألماً ووجعاً شديداً في رجلي اليسرى، يمنعني من النهوض، وهو الذي يُثبِّطني عن السفر إلى الحرمين، مع أني آذنتُ صاحبي العزيز الأستاذ/ أيمن رشدي سويد/ عدة مرات على التلفيون بأني قادم إلى السعودية في الشهر الفلاني، مع شدة شوقي إلى زيارة الحرمين ولقاء الإخوان.

ثم إني قرأتُ اقتراحكم عليَّ، وأذِنتُ لكم وللشيخ محمود ميرة بخدمة كتابي -الألباني: شذوذه وأخطاؤه- وأرسلُ إليكم عدة تعقيباتٍ أُخرَ على كلام الألباني مما لم يُطبعُ بعد، وفي تلك التعقيباتِ الجوابُ على سؤالكم عن توثيق ابن حبان.

أما السؤال عن منهج ابن حبان في صحيحه؟ فالجواب أن منهجه في توثيق الرجال في صحيحه وفي كتاب الثقات واحد.

فإنه يُعدِّل من لم يُعلَمُ بجرح ويقول هو عدل إذا لم يُبيَّنُ ضدُّه(الثقات ١/١٣).

وكذلك يقول في مقدمة صحيحه: إنَّ العدالةَ في الدين بالستر الجميل(انظر مقدمة صحيح ابن حبان بترتيب الأمير علاء الدين، ص:١٣٩).

فتبيَّن من هذا أن منهج التعديل واحد، نعم منهج تصحيح حديثه يختلف عن منهج

تـوثيـقه، فهو لا يحتجُّ في صحيحه إلا بحديث من اجتمع فيه مع العدالة والصدق (العقل بما يُحدِّث، والعلم بما يُحيل من معاني ما يروي، وتعرِّي خبره عن التدليس) فكلُّ من اجتمع فيه هـذه الخصال الخمس احتجَّ به ابن حبان في صحيحه، ويؤيِّدُ ما قلتُه قولُ الحافظ في ترجمة أبي سلمة الجُهَني: الحق أنَّه مجهول الحال، وابن حبان يذكر أمثالَه في الثقات ويحتجُّ به في الصحيح إذا كان ما رواه ليس بمنكر (٣٨٧/٦).

وأمـا سـؤالك عـن قـول الحافظ في مقدمة تهذيبه: أن المِزِّي قصد استيعاب شيوخ المترجَم وتلامذته؟ فالجواب أنه صحيح عندي، لأنَّ المِزِّي نفسه قد قال في مقدمة 'تهذيب الكمال':

"وذكـرت أسـمـاء مـن روى عنه كل واحد منهم، وأسماءَ من روى عن واحد مـنهـم فـي هـذه الـكتب أو في غيرها على ترتيب حروف المعجم أيضاً، على نحو تـرتيب الأسماء في الأصل، ورقمتُ عليها أو على بعضها رقوماً بالحمرة يعرف بها فـي أي كتـاب مـن هذه الكتب وقعت روايته عن ذلك الاسم المرقوم عليه، ورواية ذلك الاسـم الـمـرقـوم عـنـه، ثـم ذكرتُ في تراجمهم روايتهم عنه، أو روايته عنهم كذلك، لتكونَ كلُّ ترجمة شاهدة للأخرى بالصحة، والأخرى شاهدة لها بذلك".

وأمـا تـوثيـق ابـن حبـان إذا انـفرد؟ فهو مقبول عندي معتدٌّ به، إذا لم يأتِ بما يُنكَر عـليـه، وهـو الـذي يـؤدِّي إليـه رأي الـحـافظ ابن حجر، فإنه أقرَّ قول الذهبي في الميزان، أنَّ الـجمهور على أنَّ من كان من المشايخ قد روى عنه جماعة، ولم يأتِ بما يُنكَرُ عليه فحديثه صحيح، أقرَّه الحافظ في حق من لم يُوثِّقه أحدٌ، فإذا كان ابن حبان وثَّقه فهو أولى بالقبول.

وأما قول الذهبي: "لا يُعرف"، ففسَّره الحافظ في كل موضع بما دلَّتْ عليه القرينةُ، ولا شكَّ أنَّ كلام الذهبي يحتمل كلا التفسرين.

والـمـامول منكم أنْ تُنبِّهوا الشيخ عاشق إلهي والأستاذ أيمن رشدي سويد أن قطعَ المراسلة نوعُ قطيعةٍ عفا اللّٰه عنهما . أبلِغوا سلامي إليهما وإلى الشيخ الجليل عبد الفتاح أبو غده إن تيسَّر، وكذا على العزيزينِ الشيخ أسامة وسارية، والسلام عليكم ودمتم.

وافَتَنِي بعد كتابتي هذه رسالة الشيخ عاشق فاتركوه واقتصروا على إبلاغ السلام.

....

تعقيبات العلامة الأعظمي على الشيخ ناصر الدين الألباني

وهي سوى ما في كتاب "الألباني: شذوذه وأخطاؤه"

بسم اللّٰه الرحمن الرحيم

١ – قال الشيخ ناصرالدين في حديث: "أفعمياوان أنتما"؟: قوّى الحافظ إسناده في الفتح، وفيه نظر، فإنَّ نبهانَ هذا لم يُوثِّقه غير ابن حبان ...... ولهذا تراه –أي الحافظ– لم يوثقه في التقريب، بل قال فيه: (مقبول) أي عندالمتابعة، وليس له متابع على هذا الحديث(فقه السيرة: ٤٤).

وقال في محمد بن عبد اللّٰه بن قيس: إنَّ الحافظ لما أورده في التقريب لم يُوثقه، بل قال فيه: (مقبول) يعني أنه ليِّن الحديث حيث لا يتابَع كما نصَّ على هذا في مقدمة الكتاب، انتهى ص: ٧٣.

وقد تفوَّهَ بنحو هذا في مواضع من كتابيه: الأحاديث الصحيحة، والأحاديث الضعيفة.

أقول: إنَّ الشيخ ناصر الدين أخطأ في فهم كلام الحافظ، فوضعه في غير موضعه، فإنَّ ابن حجر لم ينصَّ على أنَّ الراويَ الذي يحكمُ عليه بأنه مقبول فهو لين الحديث إن لم تجد له متابعاً في حديث خاص، بل ينص على أنني "أحكم على شخص منهم بحكم يشمل أصحَّ ما قيل فيه وأعدلَ ما وُصِف به ....، وباعتبار ما ذكرت انحصر لي الكلام على أحوالهم في اثنتي عشرة مرتبة ....، فأولاها الصحابة ....، السادسة: من ليس له من الحديث إلا القليل، ولم يثبت فيه ما يترك حديثه من أجله، وإليه الإشارة بلفظ مقبول حيث يُتابَع، وإلا فلين الحديث" (مقدمة التقريب ص:٣) يعني أنه يحكم بلفظ مقبول على من ليس له من الحديث إلا القليل ولم يثبت فيه ما يترك حديثه من أجله إذا كان يتابع، وإن كان من هذا حاله من الرواة لا يتابَعُ فيشير إليه بلفظ لين الحديث، ومعنى هذا أنه لا يحكم على أحد بأنه مقبول إلا إذا ثبت عنده أن هذا الراوي ربما تابعه غيره، والذي يحكم عليه أنه لين الحديث، فيحكم بهذا إذا ثبت عنده أنه لا يتابعه على أحاديثه غيره.

فكل من قال فيه (مقبول) فهو ممن له متابع في الجملة، وسواءٌ كان له متابع أو لم يكن، فهو ممن لم يثبت فيه ما يترك حديثه من أجله، أفليس هذا توثيقاً له؟.

هذا معنى نص الحافظ، وإلا فلا يكون من المعقول أن يحكم على راوٍ لا يتابع على

حديثه بأنه مقبول، وعلى آخر مثله بأنه ليِّن الحديث، بل يُعدُّ هذا تهافتاً من الحافظ. فإذا زعم الشيخ الألباني أن محمد بن عبد اللّٰه بن قيس قال فيه الحافظ: مقبول، يعني أنه لين الحديث حيث لا يتابَع، فلسائل يسأل الشيخ فلما [ذا] لم يقل فيه الحافظ لين الحديث مباشرة؟ ولماذا لم يقل في أحمد بن عبيد بن ناصح: انه مقبول، يعني أنه لين الحديث حيث لا يُتابع؟ بل أعرض هذا وقال: هو لين الحديث. وهذا السوال وارد على الشيخ في كثير من الرواة أُسمِّي منهم بعضهم تيسيراً على الشيخ، وهم مثلاً: إبراهيم الهجري، وإبراهيم بن يحيى الشجري، وإسحاق بن إبراهيم مولى مزينة، وإسماعيل بن إبراهيم صاحب القوهي، وأيوب ابن ثابت المكي، ومسعود بن واصل صاحب السابري، ومسهر بن عبدالملك الهمذاني، ومسلمة بن محمد الثقفي. أفصح ابن حجر في كل واحد منهم: أنه لين الحديث، فهلا قال: إنه مقبول؟ أعني أنه لين الحديث حيث لا يتابع؟

وكذا للسائل أن يعود فيسأل الشيخ أن ابن حجر قال في مئاتٍ من الرواة أن كل واحد منهم مقبول، ومعناه عند الشيخ الألباني أنه لين الحديث حيث لا يتابع، فلماذا لم يقل فيه ابن حجر من أول الأمر أنه لين الحديث؟ ما هو الداعي إلى العدول عن هذا واختيار ذاك؟

وأُسَمِّي منهم على سبيل التمثيل: إبراهيم بن عبدالرحمن بن أبي ربيعة أخرج له البخاري، وإبراهيم بن مرزوق أخرج له البخاري في الأدب المفرد، وإسحاق بن راشد، وإسحاق بن الربيع العصفري، وإسحاق بن الصباح الأشعثي أخرج له أبوداود، وإسحاق بن طلحة التيمي، أخرج له (د) و(ق)، وتميماً أبا سلمة الفهري أخرج له النسائي، وبلال العكي أخرج له البخاري في الأدب المفرد، ويطول تعدادهم. قال ابن حجر في كل واحد منهم إنه (مقبول)، ومعناه عند الألباني لين الحديث حيث لا يتابَع، فهلا قال من أول الأمر أنه (لين الحديث)؟

☆ ومما يدلُّ دلالةً واضحةً على صحة ما ذكرنا أنَّ الحافظ نفسه لم يضعِّف حديث من هو مقبول في قوله، بل حسَّن حديثه ووثَّق رجالَه جميعاً، كحديث محمد بن عبد اللّٰه بن قيس في هم رسول اللّٰه ﷺ بالسمر مرتين قبل البعثة، وهو المذكور في فقه السيرة ص:٧٢، أورده الحافظ في المطالب العالية ٤/١٧٨ عن مسند إسحاق بن راهويه وقال: وهذه الطريق حسنة جليلة .... وهو حديث حسن متصل، ورجاله ثقات. قلت: وتابعه البوصيري فقال: رواه إسحاق بإسناد حسن، وسبقهما ابن حبان فأخرجه في صحيحه.

ولهذا لم يتجاسر ابن كثير أن يضعفه، فكف لسانه عنه، واقتصر على قوله: هذا حديث غريب جداً. والغرابة كما يعلمه كل من له أدنى إلمام بالمصطلح لا تنافي الصحةَ،

فكم من حديث صحيح حكم عليه الترمذي بأنه صحيح غريب، وأكثر منه ما وصفه بحسن غريب، ولم يتعقَّبُه أحد من النُّقَّاد وجَهابذةِ الحديث على جمعه بين صحيح وغريب، وقد صرَّحوا في علم المصطلح أنَّ الغريب ينقسم إلى صحيح وغيره، وصرحوا أن حديث "إنما الأعمال بالنيات" غريب، ثم صار مشهوراً.

☆ وكذلك فقدان المتابعة لا يُوجِب ضعفاً، فقد قال البخاري في أسماء بن الحكم: انه لم يرو عنه إلا هذا الحديث، وحديث آخر لم يتابَع عليه ، فقال المزي: هذا لا يقدح في صحة الحديث، لأن وجود المتابعة ليس شرطاً في صحة كل حديث صحيح (تهذيب التهذيب ٢٦٧/١).

= وقال المباركفوري: قول البخاري "لا يتابَع عليه" لا يضر، فإن محمد بن عبد اللّٰه ثقة ولحديثه شاهد، وقال: كون الحديث غريباً لا يستلزم معلوليته وضعفه كما تقرَّر في مقره(أبكار المنن ص: ٢٢٢).

= وكحديث عمير بن إسحاق في هجرة الحبشة، أخرجه البزار، وأبو يعلى، ساقه الحافظ عن أبي يعلى، وقال: هذا حديث حسن (المطالب العالية ١٩٨/٤) مع أنه صرَّح بتفرُّد عمير بن إسحاق به، وقد قال فيه في التقريب: مقبول.

= وكحديث عبدالكريم بن سليط في الوليمة، فإنه قال في الفتح: إسناده لا بأس به، ورجاله ثقات، مع أنه قال فيه في التقريب: مقبول. ومن العجيب أنَّ الشيخ الألباني حكاه عن ابن حجر فأقرَّه واحتجَّ بالحديث (انظر آداب الزفاف، ص: ٦٤ و٨٨).

= وكحديث نبهان (أفعمياوان أنتما؟) قال فيه في التقريب: (مقبول) وقوَّى إسناد حديثه في الفتح كما حكاه الألباني نفسه (فقه السيرة ص: ٤٤).

☆ ومن عجيب الذهول، أو غريب التناقض أنَّ الشيخ عنده له نظائر، وأنه قوَّى غير واحد من الأسانيد التي فيها راوٍ "مقبول" عند الحافظ.

= فقد حسَّن في "حجاب المرأة المسلمة" حديث أبي ربيع الأيادي، مع أنه قال الحافظ: مقبول، والحديث من أفراده عند الحافظ، انظر ص: ٣٠.

= وقال في الأحاديث الصحيحة (رقم: ٣٧٢) المنذر هذا مقبول، كما في التقريب، فالحديث صحيح.

= وقال في الصحيحة (رقم: ٢٥٨) وقال الحافظ: مقبول، فحديثه يحتمل التحسين.

= وقال في الصحيحة: هذا سند حسن، مع اعترافه بأن في رجاله من قال فيه

الحافظ: مقبول، انظر رقم: ٢٢٧.

= وقال في "حجاب المرأة المسلمة" (ص:٦٦): إسماعيل هذا لم يذكر (ابن أبي حاتم) فيه جرحاً ولا تعديلاً، وفي التقريب: (مقبول) فمثله يُستشهَد به، ولا سيما وقد حسَّن إسناده الذهبي.

٢- حديث عمر بن الخطاب عن شأن ساعة العسرة . ذكره في فقه السيرة (ص: ٤٤٠) فعلَّق عليه الشيخ الألباني: أنه ذكره ابن كثير في التاريخ (٩/٥) من رواية عبد الله بن وهب بسنده عن ابن عباس، ثم قال: إسناده جيد، (قال الألباني) وهو عندي غير جيد لأنه من رواية عتبة ابن أبي عتبة، وقد ذكره الحافظ في اللسان (١٢٩/٤) انتهى.

قلت: هذا وهم وخطأ من الشيخ، فإن عتبة بن أبي عتبة راوي هذا الحديث من رجال الصحيحين، مذكور في التهذيب وغيره، لأنه هو الذي يروي عن نافع بن جبير وعنه سعيد بن أبي هلال، وأما الذي في اللسان فهو يروي عن عكرمة، فعتبة هذا غير عتبة المذكور في اللسان، ويدل على هذا أيضاً أن البزار أخرج هذا الحديث بهذا الإسناد الذي فيه عتبة، فقال الهيثمي: رجاله ثقات، كما حكاه عنه الألباني نفسه، فتوثيق رجال هذا الإسناد الذي فيهم عتبة دليل أنه غير عتبة المذكور في اللسان، راجع الحديث في كشف الأستار عن زوائد مسند البزار (٣٥٤/٢).

فائدة أخرى:

وليعلم الشيخ الألباني أن عتبة بن أبي عتبة الذي من رجال الصحيحين لم يوثقه إلا ابن حبان، لكن روى عنه جماعة، فأدخلاه في الصحيح، فليحفظ الشيخ الألباني هذه النكتة، وليعلم أن بعض رجال الصحيحين لم يُوثِّقه أحدٌ سوى ابن حبان، وأنَّ توثيقه لا يكون دائماً غيرَ معتمَد.

٣- حديث: "مالي وللدنيا إنما أنا كرجل قال تحت ظِلِّ شجرة ثم راح وتركها" (فقه السيرة، ص:٤٧٨) . علَّق عليه الشيخ الألباني: صحيح، أخرجه الترمذي (٢٧٨/٣) وصحَّحه.

قلت: كيف أقرَّ الشيخ تصحيح الترمذي وفي إسناده المسعودي وقد اختلط بأخرة، ولم يتبيَّن أنَّ زيدَ بن الحباب سمع منه قبل الاختلاط؟ فإذا لم يوافق الشيخ مسلماً على تصحيحه حديث أبي الزبير عن جابر لتدليسه، فعليه أن لا يوافق الترمذيَّ على تصحيحه حديثَ زيدِ بن الحباب عن المسعودي، فإنْ أقرَّ هذا التصحيح لمتابعة جعفر بن عون زيدَ بن الحباب عند الحاكم، فليُصحِّح جميعَ ما هذا شأنه.

قلت: وتابعهما يزيد بن هارون عند أحمد، وهو ممن سمع بعد الاختلاط.

٤- ثم قال الشيخ: وصحَّحه الحاكم على شرط البخاري ومسلم، ووافقه الذهبي.

قلت: لم يصحِّح الحاكم على شرط مسلم، بل على شرط البخاري وحده، وإنما أعلمه بعلامة خ، م، الذهبي فقط.

٥- حديث: "أعني على سكرة الموت" (الصواب في لفظه: "أعني على غمرات الموت أو سكرات الموت") (الترمذي).

قال الشيخ الألباني: ضعيف، أخرجه الترمذي وغيره من طريق موسى بن سرجس عن القاسم عن عائشة، وقال: حديث غريب، يعني ضعيف، لأن موسى هذا لم يُوثقه أحد، فهو مجهول (فقه السيرة: ٤٩٩).

قلت: لم يُنصفِ الشيخ، بل لم يُصِبُ، إذ قال فيه: مجهول، فإنَّ من روى عنه اثنان لا يبقى مجهولاً، فإذا لم يُنقَل فيه توثيق عن أحد، فلا يصح أن يقال هو مجهول، بل يقال إنه مستور، ولهذا نص عليه الحافظ في التقريب: والمستور يُحَسِّنون حديثَه كثيراً، وقد اعترف بذلك الشيخ الألباني في المستور من التابعين، قال في الأحاديث الصحيحة: ومن مذهب بعض المحدثين كابن رجب وابن كثير تحسين حديث المستور من التابعين (٤/١٠١/رقم:٣٠٨).

= وقد حسَّن ابن حجر حديث محمد بن عبد الله بن قيس، ولم يُوثِّقه إلا ابن حبان، وإنَّ توثيقه عند الألباني وجوده وعدمه سواء (انظر فقه السيرة، ص: ٤٤).

= وقال في الأحاديث الضعيفة: توثيق ابن حبان إذا تفرَّد غير موثوق(ص٧٤ رقم ٤٥٧).

= وقال في الأحاديث الصحيحة: من المعلوم أنَّ توثيقه غير معتمَد عند المحققين (ص٦٥ رقم ٣٤٢).

= وكذا حسَّن الحافظ حديث منية بنت عبيد عن أبيها، ولم يُوثِّقها أحد، قال في التقريب: لا يعرف حالها، وعبيد أبوها لم أجد له ترجمة. انظر المطالب العالية، رقم ٢٧٤٠.

=وحسَّن الألباني سنداً فيه راوٍ ذكره الخطيب ولم يذكر فيه جرحاً ولا تعديلا، أعني لم يُوثقه أحد أصلاً، فهو مجهول على حد تعبير الألباني . انظر الأحاديث الصحيحة(٤٩/١).

=وأدخل الألباني حديث زوجة أبي سعيد في الصحيحة، مع قول ابن حزم: إنها مجهولة، وأقرَّه الذهبي على ما صرَّح به الألباني . وقال في التقريب: مقبولة، ولم يُوثِّقها إلا ابن حبان.

=وحسَّـن الـحـافـظ إسناداً فيه مستوارن -فضلا عن واحد- قال في لسان الميزان: فالحديث حسَنُ الإسناد، ولأنَّ راوييه مستوران لم يتحقَّق أهليتهما ولم يُجرَحا(١٠٠/٤).

=وقـول الـحافظ عقبه (ولحديثهما شاهد قوي) لا مدخل له في حسن الإسناد، بل الـمتن يزداد به قوةً، وكـذا قـولـه: وصـرَّحـا بالسماع وما رُميا بالتدليس يزيد الإسناد حسناً، وليس شرطاً في تحقُّق حسنه.

=وقـال الـذهبـي فـي الـميزان: الجمهور على أن مَن كان مِن المشايخ قد روى عنه جـمـاعة ولـم يـأتِ بـما يُنكر عليه، أنَّ حديثَه صحيح. وقـد أقـرَّه ابن حجر في حق من كان مشهوراً في طلب الحديث والانتساب إليه.

=وقال الذهبي: في رواة الصحيحين عدد كثير ما علمنا أن أحداً نصَّ على توثيقهم، ولـم يـوافـقـه ابـن حـجر في دعوى الكثرة في رواة الأصول، وسلَّم له في القليل النادر منهم، ووافقه في حق من خرَّجا له استشهاداً.

قـلـت: وشـواهـد الـصـحيـحيـن لا تكون أقلَّ من الحَسَن لذاته (انظر ترجمة مالك الزيادي من الميزان واللسان).

☆ وأمـا ابـن حبـان: فمن قاعدته أنَّ مجهول الحال عنده ثقة، قال ابن حجر في ترجمة أبي سلمة الجهني: الحق أنه مجهول الحال، وابن حبان يذكر أمثاله في الثقات ويحتج به في الصحيح إذا كان ما رواه ليس بمنكر (٣٨٧/٦).

أقـول: إنَّ ابـن حبـان بالغ فأدخله في الصحيح، وأما غيره -وهم كثيرون- فسلكوا مسلك الاعتدال، فاقتصروا على تحسين إسناد حديث المستور، ومن أمثلة ذلك:

= أنَّ عبـد الحميد بن عبد اللّٰه بن أبي عمرو بن حفص المخزومي مستور، لم يُوثقه أحد، وقد أخرج له النسائي حديثاً مقروناً بغيره، وعلَّقه البخاري بصيغة الجزم، فهذا تصحيح له (انظر تهذيب التهذيب ١١٩/٦).

= وحسَّـنَ التـرمـذي حـديـث عبـد الـرحـمـن بن الأخنـس، وهو مستور، كما في التقريب، ولم يتَعقَّب الترمذيَّ أحدٌ. انظر التحفة(٣٢٦/٤).

= وعبـد الـرحـمن بن بشير بن مسعود أبو بشر الأنصاري مستور، لم يُوثِّقه أحد إلا ابن حبان، أخرج له مسلم في صحيحه، وقال فيه الحافظ: مقبول.

= وعبـد الـرحـمـن بـن الـمسـور بن مخرمة بن نوفل الزهري، لم يوثقه أحد إلا ابن حبان، وهو غير معتمَد عند الشيخ الألباني، فهو مستور، وقد أدخله مسلم في الصحيح.

= وعبـد الـرحمن بن فروخ العدوي، علَّق البخاري بصيغة الجزم قصةً يرويها عمرو

ابن دينار عن عبد الرحمن بن فروخ، فالإسناد عنده صحيح.

= وعبيد الله بن محمد بن يزيد بن خنيس لم يُوثِّقه أحدٌ، فهو مستور، وقد روى عنه مسلم ستة أحاديث وأدخله في الصحيح.

= وعبيد بن البراء بن عازب الأنصاري، لم يُوثقه أحدٌ، روى له مسلم وأدخله في الصحيح.

= وعبيد بن أبي مريم المكي مجهول أو مستور، لم يُوثقه أحد إلا ابن حبان، وقال ابن المديني: لانعرفه. مع هذا روى له البخاري وأدخله في الصحيح. انظر الفتح(٩/ ١٢٠).

=هذا، ولو أردنا الاستقصاءَ لأطَلْنا الخَطبَ، وفي ما أوردناه كفاية وغنية، ونظير هؤلاء المستورين: عتبة بن أبي عتبة الذي لم يوثقه أحد إلا ابن حبان، وقد أدخله الشيخان في صحيحيهما، وقد تقدَّم ذكره.

٦- ثم علَّق الشيخ الألباني على حديث: ”أعني على سكرة الموت(كذا): أنَّ الترمذي حسَّنَه (فقه السيرة، ص: ٤٩٩، التعليق (١).

قلت: لم يُحسِّنه الترمذي مطلقاً، بل قال: حسن غريب، وغريب بمعنى ضعيف عند الشيخ، فالترمذي حسَّنه وضعَّفه معاً، انظر التعليق (٣) في هذه الصفحة.

ثم إن الشيخ قد صححه وفيه ابن إسحاق وهو مدلس وقد عنعن، فكيف سوَّغ تصحيحه هنا، ولم يُسوِّغ في ص٤١٠، حيث يقول: (ولكن لم يُصرِّح فيه ابن إسحاق بالسماع). ولم يُسوِّغ تصحيح حديث أبي الزبير عن جابر في ص٤٤١، وقال: إنَّ أبا الزبير مُدلِّس، وأنَّه لا تُقبَل روايته المعنعنة، وضعَّف حديث أبي الزبير في ص ٤٣٢، متعلِّلاً بأنَّ أباالزبير مدلِّس، وقد عنعنه.

وله نظائر يَصعُب إحصاؤها.

☆......☆......☆......☆......☆

فہرستِ مراجع

۱-آئینۂ گجرات-ترجمہ مرآۃ احمدی-: ترجمہ: رضی الحق عباسی، گاندھی نگر: گجرات اردو ساہتیہ اکیڈمی، ۲۰۰۱ء

۲-آثارالصنادید: سرسید احمد خاں، دہلی: اردو اکادمی، ۲۰۰۰ء

۳-أبجد العلوم: السيد صديق حسن خان القنوجي، بيروت: دار الكتب العلمية ١٤٢٠هـ=١٩٩٩م

۴-إتحاف السادة المتقين: المرتضى محمد بن محمد الحسيني الزبيدي، بيروت: موسسة التاريخ العربي، ١٤١٤هـ=١٩٩٤م

۵-اتحاف النبلاء المتقین-فارسی-: السید صدیق حسن خاں القنوجی، کان پور: مطبع نظامی ۱۲۸۸ھ

۶-الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان: علي بن بلبان الفارسي، تحقيق: شعيب الأرنؤط، موسسة الرسالة، ط:٣

۷-اخبارالاخیار: شیخ عبدالحق محدث دہلوی، دہلی: مطبع مجتبائی ۱۳۰۹ھ

۸-الاستيعاب: أبو عمر يوسف بن عبد الله ابن عبد البر، حيدرآباد: دائرة المعارف النظامية، ١٣٣٦هـ

۹-اصحاب رسول اللہ اور معاویہ کی صحابیت: سید بابا خلیل احمد، بنارس: علمی الیکٹرک پریس

۱۰-أصول التخريج ودراسة الأسانيد: محمود الطحان، بيروت: دار القرآن الكريم، ١٤٠١هـ=١٩٨١م، ط:١

۱۱-الأعلام: خير الدين الزركلي، بيروت: دارالعلم ١٩٧٩م

۱۲-الإمام الرباني الزاهد عبد الله بن المبارك: عبد الحليم محمود، القاهرة: دار التراث العربي

۱۳-إنباء الغمر بأبناء العمر: أحمد بن على بن حجر العسقلاني، بيروت: دارالكتب العلمية، ١٤٠٦هـ=١٩٨٦م، ط:٢

۱۴-الأنساب: أبو سعد عبد الكريم بن محمد السمعاني، حيدرآباد: دائرة المعارف العثمانية، ١٣٨٥هـ= ١٩٦٦م، ط:١

۱۵-البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع: محمد بن علي الشوكاني، مصر: مطبعة السعادة، ١٣٤٨هـ، ط:١

۱۶-برصغیر کے علماء معقولات اوران کی تصنیفات: عبدالسلام خاں، پٹنہ: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۶ء

۱۷-برہان مجادلہ: محمد اعجاز حسن بدایونی، لکھنؤ: سرفراز قومی پریس

۱۸-بستان المحدثین-فارسی-: شاہ عبدالعزیز دہلوی

۱۹-بقي بن مخلد القرطبي: أكرم ضياء العمري، بيروت: ١٤٠٤هـ=١٩٨٤م، ط:١

۲۰-پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے نادر عربی مخطوطات کی فہرست مفصل-جلد اول-ترتیب: قاضی عبدالنبی کوکب، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۵ء

۲۱-تاریخ الأدب العربي: كارل بروكلمان، تعريب: عبدالحليم النجار، مصر: دارالمعارف، ط:۳

۲۲-تاریخ اولیاء گجرات-ترجمہ مرآۃ احمدی-: ترجمہ: سید ابوظفر ندوی، گاندھی نگر: گجرات اردو ساہتیہ اکادمی ۲۰۰۱ء

۲۳-تاریخ برہان پور: محمد خلیل الرحمٰن برہان پوری، برہان پور: کوثر پرنٹنگ پریس

۲۴-تاریخ بغداد: ابوبکر احمد بن علی خطیب بغدادی، دارالفکر

۲۵-تاریخ دارالعلوم دیوبند: سید محبوب رضوی، ادارۂ اہتمام دارالعلوم دیوبند، ۱۳۹۸ھ=۱۹۷۸ء، ط:۱

۲۶-التحقیق البارع فی حقوق الشارع: سید محمد اشرفی، جون پور: برقی پریس

۲۷-تحقیق الکلام: محمد عبدالرحمٰن مبارک پوری، دہلی: مطبع فاروقی، ۱۳۳۵ھ

۲۸-تذکرہ حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی: نورالحسن راشد کاندھلوی، کاندھلہ: مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، ۱۴۲۸ھ=۲۰۰۷ء

۲۹-تذكرة الحفاظ: شمس الدين ابو عبد الله الذهبی، حیدرآباد: دائرة المعارف النظامية، ۱۳۳۳ھ

۳۰-تذکرۂ علماء اعظم گڈھ: حبیب الرحمٰن قاسمی، بنارس: جامعہ اسلامیہ، ۱۳۹۶ھ=۱۹۷۶ء

۳۱-تذکرۂ علماء ہند-فارسی-: رحمان علی، لکھنؤ: نول کشور ۱۹۱۴ء

۳۲-تذکرۂ علماء ہند-اردو ترجمہ-: ترجمہ: محمد ایوب قادری، کراچی: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ۱۹۶۱ء

۳۳-تذکرۂ علماء ہند-اردو ترجمہ-: ترجمہ: زین العابدین معروفی، مئو (پورہ معروف): مکتبہ قادریہ ۱۴۲۶ھ=۲۰۰۵ء

۳۴-تراجم الأحبار: محمد أيوب المظاهري، دیوبند: محبوب پریس

۳۵-تراجم علماء اہل حدیث: ابویحییٰ امام خاں نوشہروی، دہلی: جید برقی پریس، ۱۳۵۶ھ=۱۹۳۸ء

۳۶-ترتيب المدارك وتقريب المسالك لمعرفة أعلام مذهب مالك: عياض بن موسى بن عياض السبتي، الرباط: المملكة الغربية، ۱۳۸۳هـ = ۱۹۶۵م

۳۷-التعليقات السنية على هامش الفوائد البهية: عبدالحي اللكنوي الفرنگي محلي، مصر: مطبعة السعادة ۱۳۲٤هـ

۳۸-تنبیہ الناصبین: محمد اعجاز حسن بدایونی، لاہور: واشنگٹن پرنٹنگ ورکس، ۱۳۴۸ھ=۱۹۲۹ء

۳۹-تنوير الحوالك: جلال الدين السيوطي، مصر: دار إحياء الكتب العربية، ۱۳٤۳هـ

۴۰-تهذيب التهذيب: أحمد بن علي ابن حجر العسقلاني، حیدرآباد: دائرة المعارف النظامية، ۱۳۲٦هـ

۴۱-الثقافة الاسلامية في الهند: عبد الحي الحسني اللكنوي، دمشق: ۱۳۷۷هـ=۱۹۵۸م

۴۲-جواہر الفقہ: مفتی محمد شفیع دیوبندی

۴۳-الحاوي في سيرة الإمام أبي جعفر الطحاوي: محمد زاهد الكوثري، القاهرة: مطبعة الأنوار، ۱۳٦۸هـ

۴۴-حدائق الحنفیہ -اردو-:فقیر محمد جھیلمی لاہوری،لکھنؤ:منشی نول کشور۱۳۰۳ھ=۱۸۸۶ء، باراول
۴۵-حیات سلیمان:شاہ معین الدین ندوی،اعظم گڑھ:مطبع معارف،۱۳۹۳ھ=۱۹۷۳ء
۴۶-حیاتِ شیخ عبدالحق:خلیق احمد نظامی،دہلی:ندوۃ المصنفین،۱۳۷۳ھ=۱۹۵۳ء
۴۷-حیاتِ طاہر:محمد عثمان معروفی،پورہ معروف:مدرسہ معروفیہ،باراول
۴۸-خطبۂ صدارت:ابوالقاسم بنارسی،بنارس:نورانی پریس
۴۹-خزانۂ عامرہ(فارسی):غلام علی آزاد بلگرامی،کان پور:منشی نول کشور۱۹۰۰ء،باردوم
۵۰-دائرۂ معارف اسلامیہ:لاہور:دانش گاہ پنجاب۱۴۰۶ھ=۱۹۸۶ء
۵۱-الديباج المذهب في معرفة أعيان علماء المذهب: ابن فرحون إبراهيم بن نور الدين المالكي، دراسة وتحقيق: مأمون بن محي الدين الجنان، بيروت: دارالكتب العلمية، ١٤١٧هـ=١٩٩٦م، ط:١
۵۲-ذكريات: علي الطنطاوي، جدة: دار المنارة، ١٤٠٥هـ = ١٩٨٥م، ط:١
۵۳-راحۃ القلب والعینین باحادیث ترک رفع الیدین:احمد اللہ قاسمی
۵۴- رجال السند والهند: قاضی اطهر مبارك پوری، بومبای: المطبعة الحجازية، ١٣٧٧هـ=١٩٥٨م
۵۵-الرسالة المستطرفة: محمد بن جعفر الكتاني، بيروت: ١٣٣٢هـ، ط:١
۵۶-رکعات التراویح:محمد عبداللہ غازی پوری،بنارس:سعید المطابع،۱۳۲۰ھ=۱۹۰۳ء باردوم
۵۷-رودِکوثر:شیخ محمد اکرام،دہلی:تاج کمپنی۱۹۹۱ء
۵۸-زادالمتقین -قلمی-:شیخ عبدالحق محدث دہلوی
۵۹-سبحة المرجان فی آثار هندوستان: میر غلام علی آزاد بلگرامی، بمبئی
۶۰-سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی:سید محمد ثانی حسنی،لکھنؤ:کاکوری آفسیٹ پریس،۱۴۲۰ھ=۱۹۹۹ء بار ہفتم
۶۱-سير أعلام النبلاء: شمس الدين محمد بن احمد بن عثمان الذهبي، بيروت: موسسة الرسالة، ١٤٠٣هـ=١٩٨٣م، ط:١
۶۲-شذرات الذهب في أخبار من ذهب: عبدالحي بن العماد الحنبلي، بيروت: دار إحياء التراث العربي
۶۳-شرح الزرقاني على موطأ الإمام مالك: محمد الزرقاني، بيروت: دار المعرفة، ١٣٩٨هـ=١٩٧٨م
۶۴-شرح معاني الآثار: أبو جعفر الطحاوي، لاهور، المطبع الإسلامية، ١٣٢٨هـ
۶۵-شہید کربلا اور یزید:قاری محمد طیب قاسمی،دیوبند:تاج المعارف،۱۹۶۰ء
۶۶-الضوء اللامع لأهل القرن التاسع: محمد بن عبدالرحمن السخاوي، بيروت: دارالكتب

العلمية، ٢٠٠٣م= ١٤٢٤هـ، ط:١
٦٧-العبر في خبر من غبر: محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي، تحقيق: فواد سيد، الكويت: التراث العربي، ١٩٦١
٦٨-علی وحسین: قاضی اطہر مبارک پوری، مبارک پور: مکتبہ دائرۂ ملیہ، ۱۹۶۰ء
٦٩-عزاداری کی تاریخ اوراس کا اثبات سنی نقطۂ نظر سے: سید سبط الحسن فاضل ہنسوی، لکھنؤ: نظامی پریس، ۱۹۴۱ء
۷۰-فهرس الفهارس والأثبات: عبدالحي الكتاني، دار الغرب الإسلامي ١٤٠٢هـ=١٩٨٢م
۷۱-کاروان رفتہ: اسیر ادروی، دیوبند: دارالمولفین، ۱۴۰۵ھ=۱۹۹۴ء، طبع اول
۷۲-كشف الأستار عن رجال معاني الآثار: أبو تراب رشد الله شاه السندهي، ديوبند: دارالاشاعت والتدريس
۷۳-كشف الظنون: ملا كاتب چلبي، ١٣١٠هـ، ط:١
۷۴-الكواكب السائرة بأعيان المائة العاشرة: نجم الدين الغزي، بيروت: دار الآفاق الجديدة، ١٩٧٩، ط:٢
۷۵-گجرات کے علماء حدیث وتفسیر: محبوب حسین احمد عباسی، احمد آباد ۲۰۰۳ء
۷۶-گجرات کی علمی، ادبی اور ثقافتی وراثت (جرنل): ترتیب: محی الدین بمبئی والا، احمد آباد: حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر ۲۰۰۷ء
۷۷-اللباب في تهذيب الأنساب: ابن الأثير الجزري، القاهرة: مكتبة القدسي ١٣٥٦هـ
۷۸-لسان الميزان: أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، حيدرآباد: دائرة المعارف النظامية، ١٣٣٠هـ
۷۹-مآثر الکرام-فارسی-: میر غلام علی آزاد بلگرامی، آگرہ: مفید عام ۱۹۱۰ء=۱۳۲۸ھ
۸۰-محدث پٹنی: محمد ولی عبداللہ نورولی، دہلی: جمال پرنٹنگ پریس
۸۱-محدث الهند الكبير العلامة حبيب الرحمن الأعظمي: سعيد الأعظمي الندوي، مَئُو: مكتبة المحدث الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي، ١٤٢٨هـ=٢٠٠٧م، ط:١
۸۲-معجم الأدباء: ياقوت الحموي، بيروت: دار إحياء التراث العربي
۸۳-معجم البلدان: ياقوت الحموي، بيروت: دار صادر ١٣٨٤هـ = ١٩٥٥م
۸۴-معجم المولفين: عمر رضا كحالة، بيروت: دار احياء التراث العربي
۸۵-معلم الامہ حضرت عبداللہ بن مسعود اوران کی فقہ: ڈاکٹر حنیفہ رضی، دہلی: ندوۃ المصنفین
۸۶-المغني في ضبط الأسماء لرواة الأنباء: محمد بن طاهر الفتني، تحقيق: زين العابدين الأعظمي، كشمير: مكتبة دارالعلوم الرحيمية، ١٤٢٦هـ، ط:١
۸۷-مقالات سلیمان: ترتیب: شاہ معین الدین احمد ندوی، اعظم گڈھ: مطبع معارف ۱۳۸۷ھ=۱۹۶۸ء

۸۸-**مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی اوران کی علمی خدمات: محمد صہیب، مئو: مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ، ۱۴۲۸ھ=۲۰۰۷ء**

۸۹-میزان الاعتدال في نقد الرجال: شمس الدين محمد بن أحمد الذهبي، مصر: مطبعة السعادة، ١٣٢٥هـ ط:١

۹۰-**میں منکر حدیث کیوں ہوا؟: حق گو، امرتسر: ثنائی برقی پریس**

۹۱-النجوم الزاهرة في ملوك مصر والقاهرة: يوسف بن تغري بردي، مصر: وزارة الثقافة والإرشاد القومي

۹۲-نزهة الخواطر: عبدالحي بن فخر الدين الحسني، حيدر آباد: دائرة المعارف العثمانية، ١٣٧٤هـ=١٩٥٤م، ط:١

۹۳-**نقوشِ عظمتِ رفتہ: محمد اسحاق بھٹی، نئی دہلی: الکتاب انٹرنیشنل، ۲۰۰۳ء**

۹۴-النور السافر عن أخبار القرن العاشر: عبد القادر بن عبد الله العيدروس الحسيني الحضرمي، بيروت: دار صادر، ١٤٢٧ه=٢٠٠٦م، ط:٢

۹۵-**النور السافر-اردو ترجمہ-: ترجمہ: محمد عارف الدین فاروقی، گاندھی نگر: گجرات اردو ساہتیہ اکاڈمی ۲۰۰۱ء**

۹۶-**نہایات الارب فی غایات النسب: مفتی محمد شفیع دیوبندی، دہلی: بمبئی جوب برقی پریس**

۹۷-الوافي بالوفيات: صلاح الدين الصفدي، بيروت: دار إحياء التراث العربي

۹۸-وفيات الأعيان: أحمد بن محمد بن أبي بكر ابن خلكان، بيروت: دار إحياء التراث العربي، ١٤١٧هـ=١٩٩٧م

۹۹-هدية العارفين: إسماعيل باشا البغدادي، بيروت: دار إحياء التراث العربي

۱۰۰-**ہمعات (فارسی): ولی اللہ احمد بن عبدالرحیم دہلوی، اسلامی پریس، تحفۂ محمدیہ**

۱۰۱-**یادایام: عبدالحی حسنی لکھنوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ۱۴۰۳ھ=۱۹۸۳ء**

۱۰۲-**یادرفتگاں: ماہر القادری، نئی دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی، طبع اول، ۲۰۰۰ء**

۱۰۳-اليانع الجني في أسانيد الشيخ عبدالغني -على هامش كشف الأستار-: محسن بن يحيى الترهتي

....

مجلّات ورسائل

۱-ارشاد	پندرہ روزہ	امرتسر
۲-انقلاب	روزنامہ	بمبئی
۳-اہل حدیث	ہفت روزہ	امرتسر
۴-برہان	ماہنامہ	دہلی

۵-البعث الاسلامی-عربی-	ماہنامہ	لکھنؤ
۶-البلاغ	ماہنامہ	بمبئی
۷-ترجمان الاسلام	سہ ماہی	بنارس
۸-تجلی	ماہنامہ	دیوبند
۹-تذکرہ		مئو
۱۰-تعمیر افکار-مولانا محمد طاسین نمبر-		کراچی
۱۱-الجمعیۃ-شیخ الاسلام نمبر-		دہلی
۱۲-الحج-عربی-	ماہنامہ	مکہ مکرمہ
۱۳-الداعی	ماہنامہ	لکھنؤ
۱۴-الداعی-عربی-	ماہنامہ	دیوبند
۱۵-دارالعلوم	ماہنامہ	دیوبند
۱۶-دعوۃ الحق-عربی-		دیوبند
۱۷-الرشاد	ماہنامہ	اعظم گڈھ
۱۸-ریاض الجنۃ	دوماہی	جون پور
۱۹-الصدیق	ماہنامہ	ملتان
۲۰-صدق جدید	ہفت روزہ	لکھنؤ
۲۱-العدل	ہفت روزہ	گوجرانوالہ
۲۲-فاران	ماہنامہ	کراچی
۲۳-الفرقان	ماہنامہ	لکھنؤ
۲۴-الفقیہ	ہفت روزہ	امرتسر
۲۵-القاسم	پندرہ روزہ	امرتسر
۲۶-المآثر	سہ ماہی	مئو
۲۷-محدث	ماہنامہ	بنارس
۲۸-محمدی	پندرہ روزہ	دہلی
۲۹-المسلمون-عربی-	ماہنامہ	جنیوا
۳۰-مجلۃ المجمع العلمی العربی-عربی-	سہ ماہی	دمشق
۳۱-معارف	ماہنامہ	اعظم گڈھ
۳۲-النجم	ماہنامہ	لکھنؤ

محدث کبیر ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی رح

کی علمی خدمات کا تعارف و تلخیص

حیاتِ ابوالمآثر

جلد ثانی

از

ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی

باہتمام

حضرت مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی



مدیر

مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ

پوسٹ بکس نمبر ۱، مئو ۲۷۵۱۰۱ (الھند)